غزل

[illegible]
[illegible]
خوشی خرید لو تم کو جہاں جہاں سے ملے
خود آشنائی کے اس عہدِ بدترین میں تم
جو ڈھونڈتے ہو خدا آشنا کہاں سے ملے
سنائیں اب کسے رودادِ خونچکاں اپنی
یہاں تو زخم بہاروں میں باغباں سے ملے
کچھ اس طرح رخِ جاناں پہ جم گئیں نظریں
بچھڑ کے جیسے کوئی اپنے کارواں سے ملے
نثار اس پہ دو عالم کی راحتیں عاصم
بطورِ خاص جو غم ان کے آستاں سے ملے

تلاشِ معاش

دور در پے ہے آدمی کے واسطے فکرِ معاش
سخت مشکل کام ہے دنیا میں روزی کی تلاش
پیٹ بھرنے کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں لوگ
کیسے کیسے ڈھنگ سے اپنا شکم بھرتے ہیں لوگ
اک مصور تھا انھیں افکار میں ڈوبا ہوا
سوچتا تھا ان کو لائے کیسے کاغذ پر بھلا
ذہن میں خاکے کئی ابھرے کئی شکلیں بنیں
سب کو ٹھکراتا رہا اس کا دماغِ نکتہ چیں
باغ کی جانب اٹھیں اس کی نگاہیں ناگہاں
تاڑ پر چڑھتے ہوئے اک شخص کو دیکھا وہاں
اس نے سوچا تھی اسی تصویر کی مجھ کو تلاش
ہوگی یہ آئینہ دارِ سعیِ تحصیلِ معاش

پتھر کے دیوتا

کوئی درویش کی صدا کی طرح
کوئی پتھر کے دیوتا کی طرح
قیدِ زنجیرِ بندگی میں کوئی
عرش پر ہے کوئی خدا کی طرح
باطل و حق ہیں معرکہ آرا
آج بھی دشتِ کربلا کی طرح
زندگی قیدِ بامشقت ہے!
عمر ہے مدتِ سزا کی طرح
ہوگئی ہیں مسرتیں عنقا!
زیست سے سایۂ ہما کی طرح
زندگی نے وفا نہ کی ناوک
شوخ و طرار بیسوا کی طرح

ناوک حمزہ پوری

نئی دہلی
جلد اول
چوتھا شمارہ
صدیقی
نئی دہلی ۱۲

بہت بڑا امتحان

بالآخر صدر جمہوریہ ہند نے مرکزی کابینہ کی سفارش پر لوک سبھا کو توڑنے اور از سر نو انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ اب عوام کو ایک مرتبہ پھر اپنی مرضی کے مطابق اپنے نمائندے چننے کا موقع ملے گا۔

صدر جمہوریہ ہند کا اعلان کسی کے لئے بھی حیران کن نہیں ہے بلکہ توقع کے عین مطابق ہے۔ پارلیمانی حلقوں اور ان سے باہر بھی اس حد تک پیش گوئی کی جانے لگی تھی کہ جس دن (۲۷ دسمبر کو) ریڈیو سے اطلاع نشر کی گئی کہ وزیر اعظم ہند قوم کے نام اپنا پیغام نشر کریں گی۔ تو ہر شخص نے سمجھ لیا کہ مسز گاندھی نئے انتخابات کا "مژدہ" سنانے والی ہیں۔ اور واقعتاً ایسا ہی ہوا۔ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ پارلیمنٹ توڑ کر نئے سرے سے انتخابات کرائے جائیں گے اس اعلان سے امید و بیم کی وہ حالت ختم ہو گئی جو اب تک ملک میں مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی۔

بلاشبہ پارلیمنٹ کو توڑنے اور از سر نو انتخابات کرانے کا فیصلہ ایک غیر معمولی فیصلہ ہے لیکن آئینی اعتبار سے صحیح اور سیاسی اعتبار سے ایک دلیرانہ اقدام ہے۔ موجودہ حکومت چاہتی تو ۱۹۷۲ء تک برسر اقتدار رہ سکتی تھی کیونکہ ممبروں کی اکثریت کا اسے تعاون حاصل تھا اور عدم اعتماد کی کئی تحریکیں نامنظور کی جا چکی تھیں۔ لیکن تنظیمی کانگریس اور اس کے ساتھی گروپوں نے سرکاری کارکردگی میں قدم قدم پر جو رکاوٹیں پیدا کیں ان سے وزیر اعظم نے محسوس کیا کہ ان حالات میں ملک میں سماجی انقلاب لانا ممکن نہیں ہے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وہ انتخابات کا خطرہ مول لیں اور [illegible] کا الزام لگانے والے احتساب کرائیں جو بہرحال طاقت [illegible] ہیں۔ اندرا سرکار کے اس اقدام کا مخالف جماعتوں [illegible]

[illegible] ہونا چاہئے تھا [illegible] نہیں [illegible] حکومت کے خلاف کسی "عدم اعتماد" منانے کی ضرورت پیش نہیں آئی بلکہ صدر جمہوریہ ہند نے خود "مخالف سرکار" کو جیسا کر دہ اس حکومت کو گھٹنے ٹیکنے اور اس سے بہتر حکومت قائم کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخالف جماعتوں کے لئے صدر کا اعلان ایک طرح سے "بے ہنگم" ثابت ہوا انہیں توقع نہ تھی کہ اتنی جلدی انتخابات کا اعلان کر کے انہیں عوامی مواخذہ کے لئے مجبور کر دیا جائے گا۔ ان جماعتوں کے جو بیانات سامنے آئے ہیں ان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اب اپنی بے حقیقتی کا احساس ہو رہا ہو۔ اور وہ اپنے "کارناموں" کے ساتھ عوام کے سامنے جانے سے گھبرا رہی ہوں۔ شاید اپنے دل کی تسکین کے لئے انہوں نے یہی صورت بہتر سمجھی کہ اندرا سرکار اور صدر جمہوریہ ہند دونوں کو مطعون کر کے پارلیمنٹ توڑنے اور از سر نو انتخابات کرانے کے اقدام کو غیر اخلاقی اور غیر آئینی قرار دیا جائے لیکن یہ اقدام نہ غیر آئینی ہے اور نہ غیر اخلاقی بلکہ جمہوریت اور آئین کی منشا کے عین مطابق ہے۔ برسر اقتدار حکومت جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو اگر محسوس کرتی ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں کو بروئے کار نہیں لا سکتی تو اسے عوام کے سامنے جانے کا حق ہے۔

بعض جماعتوں اور لیڈروں نے "نگران حکومت" کا سوال بھی اٹھایا ہے کہ جب تک انتخابات ہوں موجودہ حکومت برسر اقتدار نہ رہے۔ بلکہ کوئی اور "نگران حکومت" قائم کی جائے اس مطالبہ میں بھی کوئی جان نہیں ہے اس لئے کہ جمہوریت کے طور طریقوں میں ہم نے جن ممالک کی پیروی کی ہے وہاں بھی اس قسم کی "نگران حکومت" کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ اور نہ کبھی مخالف جماعتوں کی طرف سے اس کا مطالبہ ہی کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں خاتمۂ جنگ کے بعد برطانیہ میں جب لیبر پارٹی مخلوط حکومت سے الگ ہوئی تو انتخابات کے دوران اس نے چرچل گورنمنٹ کے برسر اقتدار رہنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسی طرح امریکہ میں انتخابات کے دوران صدر کو ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ خود ہمارے یہاں اس سے قبل جو انتخابات عمل میں آئے ہیں ان میں کسی "نگران حکومت" کے قیام کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ پھر اس مرتبہ کیوں؟

انتخابات کا سارا انتظام الیکشن کمیشن کے ہاتھ میں ہے جو ایک خود مختار ادارہ ہے اور اس خود مختار ادارہ سے کسی کو کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ وہ جانبداری سے کام لے گا۔ انتخابات یقینی ہے کہ غیر جانبدارانہ اور آزادانہ ہوں گے اور عوام [illegible] اپنا ووٹ استعمال کرنے کا موقع ملے گا [illegible] ملک میں حکومت بنا سکیں گے۔ انہیں صرف [illegible] پالیسیوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس وقت واضح [illegible] کی حامل جماعتیں ہمارے سامنے ہیں ایک وہ جو ملک کو [illegible] لے جانا چاہتی ہیں اور ایسی حکومت قائم کرنے کی کوشش [illegible] میں عوام کو پست کرنے کا زیادہ سے زیادہ امکان رہے گا۔ اور دوسری طرف وہ سوشلسٹ طاقتیں ہیں جو ایک ایسی سوشلسٹ جمہوریت کے قیام کی متمنی ہیں جس میں نابرابری اور عوامی استحصال کو ختم کیا [illegible] مگر ان نظریات کے ساتھ ساتھ تمام ووٹروں کو ہر پارٹی کا ماضی کا کردار بھی سامنے رکھنا ہوگا اور عمل کی کسوٹی پر کسنا ہوگا کہ کس پارٹی نے کس حد تک اپنے وعدے پورے کئے اور کس حد تک وہ انہیں پورا کرنا چاہتی ہے۔

ووٹروں کے لئے ایک اور غور و فکر کی بات یہ ہے کہ [illegible] آپس میں اس حد تک تقسیم ہو جائیں کہ کوئی پارٹی قطعی اکثریت میں آ کر حکومت قائم نہ کر سکے۔ اگر ایسا ہوا تو کوئی مضبوط حکومت قائم نہ ہو سکے گی۔ اور مخلوط حکومت قائم کرنے کے لئے ہر پارٹی "ہمخیال" جماعتوں کی محتاج رہے گی اور اس "ہمخیالی" کو اگر تنظیمی کانگریس (جو سوشلسٹ اصولوں کی علمبردار ہے) جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی پر منطبق کیا جائے تو اس کے معنی "موقع پرستی" کے علاوہ کچھ نہیں جس کی کامیابی اس دل بدلی کے زمانہ میں محض عارضی ہے۔ اس "ہمخیالی" کا نتیجہ ہم یوپی، بہار اور دوسری ریاستوں میں دیکھ چکے ہیں اور اس وقت بھی کہیں کہیں دیکھ رہے ہیں۔ اس [illegible] کے انتخابات ہمارے لئے ایک سبق ہیں جہاں [illegible] پارٹیوں نے انتخابات میں حصہ لیا تھا لیکن عام ووٹروں نے دو کے علاوہ سب کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ ہندوستان میں بھی بہت سی پارٹیاں ہیں۔ کچھ اکیلے ہی میدان میں کود پڑیں گی اور کچھ [illegible] کر کے سامنے آئیں گی۔ کاش ووٹر اپنی صوابدید سے کام لیں اور دیکھیں کہ موجودہ حالات میں کونسی پارٹی اتنی طاقتور ہے کہ [illegible] پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پورے ملک کو [illegible] گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اس کے لئے اپنے [illegible] نئی حکومت کے چننے کا اور ملک [illegible] کو ختم کرنے کا موقع بہم پہنچایا [illegible] سرمایہ دار [illegible] ملک [illegible] ایک بہت بڑا امتحان ہے [illegible]

وزیر اعظم کی پریس کانفرنس

"کوئی بھی شخص جو کسی ہندو یا مسلمان کا قتل کرے معاف نہیں کیا جاسکتا۔"

لوک سبھا کی برخاستگی کے بعد مسز اندرا گاندھی نے ۲۹ دسمبر کو وزیر اعظم کی حیثیت سے جیسا کہ انہوں نے وضاحت کی پہلی پریس کانفرنس طلب کی اسمیں ملک کی سماجی اور سیاسی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو زیر بحث نہ آیا ہو۔ ایک بڑی جماعت اور تاریخی پریس کانفرنس تھی جسے طلب کرنے کا فیصلہ شاید فوری طور پر کیا گیا کیونکہ اخباری نمائندوں کو دعوت نامے وقت کم وقت جاری کئے گئے تھے۔

پریس کانفرنس ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ وگیان بھون کا کمیٹی روم تقریباً دو سو ہندوستانی اور غیر ملکی نامہ نگاروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہت سے مائیکروفون ان کے سامنے رکھے تھے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن اور ٹیپ ریکارڈنگ کے محکمے کے کارکن مستعدی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

اخباری نمائندے بڑی دور کی کوڑی نکال کر لاتے ہیں وزیر اعظم کی ساڑھی کے رنگ سے لیکر ان کے پارلیمانی حلقہ تک کے بارے میں سوالات پوچھ ڈالے۔ مسز گاندھی سلک کی ساڑھی زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ ملے جلے رنگ گلابی، زیتونی اور سبز رنگ کی ساڑھی۔

وزیر اعظم پر انگریزی میں سوالات کی بوچھاڑ ہوئی۔ اور لگاتار ۹۳ سوالات پوچھ ڈالے گئے۔ مگر ہندی میں صرف دو۔ سرکاری زبان قرار دیئے جانے کے ۲۰ برس بعد بھی ہندی کی اس بے قدری کا پیر رد نہ آیا۔ دراصل یہ ہندی والوں کے کٹرپن اور "دیگر زبانوں سے نفرت کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ جنوبی ہند والوں کو چھوڑیئے شمالی ہند تک میں "اردو دشمن" پالیسی اپنا کر ہندی والوں نے ہندی کو برسوں پیچھے پھینک دیا۔ بلکہ صورت حال ایسی ہے کہ شاید انگریزی ہمیشہ راج کرے گی۔

وزیر اعظم ہند نے اس پریس کانفرنس میں جو کچھ فرمایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آئین ہند میں بنیادی ترمیم چاہتی ہیں تاکہ ان سوشلسٹ اقدامات کو بروئے کار لایا جاسکے جو موجودہ حالات میں ضروری ہیں آئین میں ترمیم کا ایک طریقہ آئین ساز اسمبلی طلب کرنے کا تھا لیکن وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ آئین میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لئے لوک سبھا کو توڑ کر از سر نو اس کے انتخابات کرانا مناسب سمجھا گیا۔

پارلیمنٹ کی برخاستگی اور از سر نو انتخاب کا اعلان بڑی اہمیت کا حامل ہے ایک نامہ نگار نے پوچھا یہ اعلان (۲۷ دسمبر) رات ہی کو کیوں کیا گیا۔ کیا اس وقت اعلان کے لئے کوئی شبھ گھڑی تھی؟ لیکن وزیر اعظم نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ "میں تو جوتش کے شروع سے خلاف رہی ہوں۔ بچپن سے اس کے خلاف ہوں

میرا راستہ صحیح ہے یا غلط اس بات کا فیصلہ میں نے عوام پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ کسی بھی جمہوریت میں آخری جج عوام ہی ہوسکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ عوام ہمارے حق میں فیصلہ کریں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارا ہر نیا قدم اپنے ساتھ نئی مشکلات لائے گا لیکن پھر بھی ہمیں آگے بڑھنا ہوگا، مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور مسائل کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔

اس لئے اب تبدیلی کا اس میں کوئی سوال نہیں۔" لیکن انہوں نے یہ ضرور کہا کہ تمام اہم فیصلے رات ہی کو ہوتے ہیں۔ بات بالکل صحیح ہے۔ پاکستان میں ایوب صاحب رات ہی کو انقلاب لائے تھے۔ عراق کے مرحوم قاسم نے بھی رات ہی کو اپنے ٹینکوں سے چڑھائی کی تھی ہر جگہ رات ہی میں انقلاب آیا ہے۔ خود ہمارے ملک میں آزادی کا انقلاب ۱۹۴۷ء میں رات کو بارہ بجے آیا تھا اور اگر اس مرتبہ بھی رات ہی کو "انقلاب" کا اعلان کیا گیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

وزیر اعظم کو اپنی پارٹی کی کامیابی پر پورا بھروسہ ہے اسی لئے جب اُن سے پوچھا گیا کہ دوبارہ آپ وزیر اعظم کے عہدہ پر

ہمیں بڑھتی ہوئی غریبی اور بیروزگاری کے خلاف کچھ کرنا ہی ہوگا۔

واقعات نئی دہلی

فائز ہوں گی تو انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا "امید تو ایسی ہی رکھتی ہوں"۔ اور چونکہ انہیں اپنی کامیابی پر یقین ہے۔ اپنے ووٹروں پر بھی یقین ہے اس لئے انہوں نے اس بات کی تردید کر دی کہ وہ بریلی کا اپنا انتخابی حلقہ بدل رہی ہیں۔

وزیر اعظم نے اس پریس کانفرنس میں کئی باتیں صاف کہیں (ایک یہ کہ انکی پارٹی لوک سبھا کی تمام سیٹوں (۵۲۰) پر اپنے امیدوار کھڑے کرے گی۔ اور وہ کسی پارٹی کے ساتھ گٹھ جوڑ نہ کرے گی۔ یہ بھی کہا کہ لوک سبھا کے انتخابات کے ساتھ ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات نہیں ہونگے۔ البتہ بنگال کے انتخابات کا امکان ہے جہاں اس وقت صدر کی حکومت قائم ہے۔

کشمیر میں محاذ استصواب رائے کے بارے میں وزیر اعظم نے وضاحت سے کہدیا کہ اگر آئینی آزادیوں کو علیحدگی پسندانہ مقاصد کی عمل آوری کے لئے استعمال کیا گیا تو اسے برداشت نہ کیا جائے گا وزیر اعلیٰ کشمیر صادق صاحب بھی اس قسم کی وارننگ دے چکے ہیں

ایک اہم بات وزیر اعظم نے اپنی حکومت کے بارے میں کہی اور ان لوگوں کو دندان شکن جواب دیا جو کہتے ہیں کہ انتخاب تک "ایک قومی نگراں حکومت" قائم ہونی چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ انکی حکومت کو برخاست شدہ پارلیمنٹ کا پورا اعتماد حاصل تھا اسی لئے اس حکومت کے مستعفی ہونے اور اسکی جگہ کوئی اور حکومت بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تک کے انتخابات میں کبھی ایسا

نہیں ہوا پھر اس مرتبہ کیوں ایسا ہوا؟

وزیر اعظم نے اپنی پریس کانفرنس میں اقلیتی مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ اور مسلم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اسے آپ ایک فرقہ پرست جماعت سمجھتی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی بات کہی کہ اسکا مقابلہ صرف اقلیتوں کی جائز شکایات کو دور کر کے کیا جا سکتا ہے۔ صرف مسلم لیگ ہی کیا فرقہ وارانہ بنیاد پر جو بھی تنظیم معرض وجود میں آ رہی ہے یا آچکی ہے اسکا مقابلہ اس فرقہ یا طبقہ کو مطمئن کر کے کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ جماعتیں وجود میں آ رہی ہیں تو اسکی وجہ اسکے علاوہ کچھ نہیں کہ آزادی کے ۲۳ برس بعد بھی اقلیتوں کی شکایات کو دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔

اردو کے بارے میں تو خود وزیر اعظم نے تسلیم کیا کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا کہ "اردو کی ترقی و ترویج کے لئے کچھ کرنا ہی ہوگا" وہ اور انکی حکومت کیا کریگی یہ انہوں نے نہیں بتایا لیکن انھوں نے جو کچھ کہا اور جس انداز میں کہا اس سے انکے عزم کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے اسی دلیری سے اس سلسلہ میں قدم اٹھایا جس دلیری کے ساتھ انہوں نے دوسرے مسائل کے سلسلہ میں اٹھایا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اردو

مسلم لیگ جیسی جماعتوں کا مقابلہ مسلمانوں کی جائز شکایات کو دور کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔

* ہمیں کل کے ہندوستانیوں کا مستقبل سنوارنا ہے۔

کر اس کا حق نہ ملے۔

مسلم یونیورسٹی کے بارے میں وزیر اعظم نے جو کچھ کہا وہ روشن خیال طبقوں کی توقعات سے بہت کچھ کم ہے۔ وہ یونیورسٹی میں ایسی تبدیلیاں چاہتی ہیں جو انکے بقول وقت کے مطابق ہوں انہوں نے کہا کہ "یہ تبدیلیاں خود مسلمانوں کے حق میں ہیں" مگر تبدیلیاں تو بہت پہلے ہو چکی ہیں۔ یہ کتنی بڑی تبدیلی ہے کہ یونیورسٹی کا کورٹ کے دروازے غیر مسلموں کے لئے کھول دیئے گئے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی کے عملے اور طلبا کی تعداد میں تیس فی صدی سے زیادہ غیر مسلم ہیں اور میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں تو ان کا تناسب ۴۰ فی صدی سے بھی زیادہ ہے۔ اب اگر اس کے اقلیتی اور اقامتی کیریکٹر کے بارے میں چند تحفظات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے تو اس پر اعتراض کیوں؟ کیا چھ کروڑ کی اقلیت کو یہ بھی حق نہیں کہ وہ کسی ایک یونیورسٹی پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکے کہ یہ ہماری یونیورسٹی ہے۔

یقین ہے وزیر اعظم تمام حالات کو سمجھتی ہونگی اور یہ بات بھی ان کے ذہن میں ہوگی کہ اگر یونیورسٹی میں اور تبدیلیاں کی گئیں اور اسے دوسری یونیورسٹیوں کی سطح پر لے آیا گیا تو ان قوم کی رہنماؤں کو سخت تکلیف پہونچے گی جنہوں نے اس یونیورسٹی کی بنیاد رکھی تھی۔

بہر نوع وزیر اعظم کی پریس کانفرنس ایک طرح سے پالیسی بیان کی پریس کانفرنس تھی اس سے سمجھنے والوں کو اپنی سمجھ کے لئے اور آئندہ انتخابات میں کوئی فیصلہ کرنے کے لئے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ اسے ہم مخالف جماعتوں کے خلاف وزیر اعظم کا پہلا دھماکہ بھی کہہ سکتے ہیں جس کے بڑے دور رس نتائج نکلیں گے۔ ●●

وہی رفتار بے ڈھنگی

بنگال میں بدستور قتل و غارت گری اور بم اندازی کے واقعات جاری ہیں۔ اور پولیس کو وسیع اختیارات دیئے جانے کے باوجود صورت حال میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ خود وزیر اعظم نے اپنی پریس کانفرنس میں تسلیم کیا کہ بنگال کے حالات ابھی تک معمول پر نہیں آئے ہیں۔ اسے بنگال پولیس کی ناکامی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بڑی بنگال پولیس کی ناکامی کیا ہوگی کہ وہ ابھی تک ان آٹھ یا گیارہ لاشوں کا معمہ بھی حل نہ کر سکی جو ۲ نومبر کو ضلع ۲۴ پرگنہ کے براسات میں پڑی ہوئی ملی تھیں۔ اس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس ایس، ایم گھوش نے اعلان کیا تھا کہ میرے ریٹائر ہونے سے پہلے پہلے یہ معمہ حل ہو جائے گا۔ لیکن وہ ۳۰ نومبر کو ریٹائر ہو گئے اور معمہ اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حکومت نے پولیس کے نظام کو بہتر بنانے

کچھ ماہ قبل بعض پولیس افسروں اور ریاستی نظم و نسق سے تعلق رکھنے والے دوسرے ذمہ داروں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جب تک پولیس کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ شبہ میں جسے چاہے پکڑ سکے اس وقت تک حالات درست نہیں ہوں گے! ان افسروں کی یہ خواہش بھی پوری کر دی گئی لیکن وہی رفتار بے ڈھنگی بدستور اب بھی موجود ہے۔ خبر ہے کہ پولیس نے اس قانون کے تحت پانچسو آدمی بھی نہیں پکڑے۔ شاید اسلئے کہ پولیس لوگوں کو پکڑنے کے مقابلہ میں انھیں شوٹ کرنے سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ گزشتہ نو مہینے کے صدر راج میں اس نے ۵۴ نام نہاد نکسلیوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔

صدر راج کے نو ماہ پورے ہو رہے ہیں اور اب توقع ہے کہ جلد ہی "مجلس قانون ریاست بنگال" معرض وجود میں آنے والی ہے۔ وزیر اعظم نے اشارہ دیا ہے کہ لوک سبھا کے انتخابات کے ساتھ ساتھ بنگال میں بھی انتخابات عمل میں آئیں گے۔ شاید اس کے بعد حالات سدھر جائیں بشرطیکہ بنگالیوں نے مشرقی بنگال کے اپنے بنگالی بھائیوں سے سبق لیا جنہوں نے سب پارٹیوں کو ختم کر کے صرف ایک پارٹی (عوامی لیگ) کو چن لیا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا

لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات کی خبریں سنکر گجرات میں بھی سابق ریاستی حکمرانوں کی سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ اور وہ لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں آرہے ہیں۔ ایک خبر کے مطابق ان کی طرف سے "ہم خیال" سیاسی جماعتوں کے ساتھ "عظیم گٹھ جوڑ" کی باتیں ہونے لگی ہیں تاکہ وہ اور انکے "ہمخیال" کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں۔ ان "ہم خیال" جماعتوں میں سب سے پہلے انکی نظر سنڈیکیٹ کانگریس پر پڑی ہے جو اس وقت گجرات کے سرکردہ اور با اثر لیڈروں کی "ہمہ گیر پیمانے پر بے وفائی" سے سخت پریشان ہے اور جس کی کشتی حقیقی معنوں میں بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ خبر ہے سرکردہ سنڈی کیٹی جن میں مرارجی ڈیسائی اور ہتیندر ڈیسائی (وزیر اعلیٰ گجرات) شامل ہیں۔ سابق حکمرانوں کے دست تعاون کو "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" سمجھ رہے ہیں اور اسکی قیمت بھی وہ دینے کے لئے تیار ہیں ایک قیمت یہ ادا کی جا رہی ہے کہ گجرات سنڈی کیٹ کانگریس سوراشٹر سے چھ پارلیمانی سیٹوں میں سے تین سے سابق حکمرانوں کے حق میں دستبردار ہو گئی ہے ایک سیٹ سریندر نگر کی ہے جہاں سے پہلا اجودھ راجہ کھڑے ہوں گے، بھاؤ نگر کی سیٹ مہاراجہ سیدا شنکر جی گوہل کی اور جونا گڈھ کی سیٹ سے پوربندر کے مہارانا نٹور سنگھ جی میدان میں آئیں گے۔ (وہ سوراشٹر کے حکمرانوں کی کونسل کے چیئرمین ہیں) یہ ابتدا ہے آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے اور کن کن سیٹوں سے سنڈی کیٹ کانگریس دستبردار ہوتی ہے۔ خود مسٹر ڈیسائی کی سیٹ خطرہ میں ہے۔ ●●

واقعات نئی دہلی

ہمارے پڑوسی

سیلون

بحرِ ہند کا گوہر

شہاب پرویز

سیلون کا جزیرہ ہندوستان کے عین جنوب میں بحرِ ہند میں واقع ہے اور اپنے حسنِ فطرت کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں کچھ بڑی خوبصورت تصویریں ابھرتی ہیں۔ اور یہ تصویریں ہیں ناریل اور چائے کے باغوں کی حسین پہاڑوں کے دامن میں بہتے ہوئے آبشاروں کی اور جھرنوں کی، گہرے مٹیالے دریاؤں اور خوب صورت جھیلوں کی۔ میری عرصہ سے خواہش تھی کہ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھوں، خدا نے میری یہ آرزو پوری کر دی، اور گزشتہ ماہ مجھے تین ہفتے سیلون میں گزارنے کا موقع ملا مجھے یہ لکھتے ہوئے انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ میں نے سیلون کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، حرف بحرف سچ ثابت ہوا۔

کولمبو ایئر پورٹ پر اترتے ہی صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی تازگی بخش جھونکوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ سارا آسمان برسات کے سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں کولمبو کا جدید ایئر پورٹ حال ہی میں کینیڈا کی امداد سے تعمیر کیا گیا ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ ہوائی اڈے کے ارد گرد دور دور تک ناریل کے باغات ہیں۔ یہاں سے جو سڑک شہر جاتی ہے وہ غالباً انہیں باغات کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ راستہ میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے کیبن لگے ہیں جہاں گرم گرم چائے ہر وقت تیار ملتی ہے ساتھ ہی انناس اور کیلے کے انبار بھی نظر آتے ہیں۔ ان سرسبز درختوں میں جھانکتی ہوئی ان کیبنوں کی سرخ سرخ چھتیں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کولمبو قدامت اور جدت کا بڑا حسین سنگم ہے۔ یہاں سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جدید طرز کے عالیشان ہوٹل ہیں۔ بڑی بڑی فرموں اور فضائی کمپنیوں کے دفتر ہیں۔ اسی علاقہ میں ایس۔ آئی۔ ٹی کا سینٹر بھی ہے جو حال ہی میں کھولا گیا ہے۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ایس۔ آئی۔ ٹی۔ اے فضائی کمپنیوں کے ٹیلی کمیونیکیشن نظام کا مخفف ہے۔ یہیں تو اسی علاقے میں پارلیمنٹ کی بلند عمارت ہے اور کچھ نئی نئی کئی منزلہ عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔ شہر میں کچھ قدیم وضع کی عمارتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں سیلون کے باشندے بھی اپنی زندگی کے کچھ ایسے ہی دور سے گذر رہے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اپنی روایات اور پرانی قدروں سے پیار ہے اور نئی پود زمانے کے نئے تقاضوں کو اپنانے کے لئے بے چین نظر آتی ہے مگر بے حد احتیاط اور قناعت کے ساتھ۔ یہاں مغربی تہذیب کا تباہ کن سیلاب ایک مضبوط بند سے ابھی تک رکا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے سیلون کی خواتین کی سادگی ان کے نمایاں وقار اور رکھ رکھاؤ سے ہوا۔ سنجیدہ مزاج اور تعلیم یافتہ نوجوان خواتین اپنے ملک کی ترقی کے لئے مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں اور جہاں خواتین میں جذبۂ عمل ہو یہ عالم ہو وہ ملک رفتار کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرتا ہے۔

کولمبو سیلون کا دارالحکومت ہونے کے ساتھ مغرب اور مشرق کے آبی راستے پر ایک بہت اہم بندرگاہ بھی ہے۔ اس کے سمندر میں ہر وقت جہازوں کی ایک بڑی تعداد رواں دواں نظر آتی ہے، اس شہر میں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہے۔ یہ لوگ خود کو "مُور" نسل کے بتاتے ہیں اور تاجر پیشہ ہیں۔ انھیں اپنے ملک کی اکثریت کے برابر حقوق حاصل ہیں اور کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب اعلیٰ سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ شہر میں بڑی خوبصورت مساجد بھی ہیں۔ جن میں نماز بڑی پابندی سے ادا ہوتی ہے۔ اس شہر میں جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی یہاں کے عوام کی شہری اصولوں سے آگہی اور ضبط و تنظیم بسوں کے اڈوں پر، بازاروں میں، ریلوے اسٹیشن پر تفریح گاہوں، باغوں اور پارکوں میں بدتہذیبی اور ناشائستگی کا چھوٹا سا مظاہرہ بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہ ایک قوم کے لئے بلاشبہ بڑے فخر کی بات ہے سیلون کا سرکاری مذہب بدھ مت اور سرکاری زبان سنہالی ہے

تانا اور خوبصورتی بی ارزاں ہے۔ یہاں کا اندازہ لگا سب سے بے حد حوصلہ افزا ہے۔ ہوٹل کا بیرا بھی بڑی روانی سے انگلش بولتا ہے اس وجہ سے سیاحوں کو یہاں اگر کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کولمبو سے ستر میل مشرق کی طرف یعنی سیلون کے عین وسط میں سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار چھ سو فٹ کی بلندی پر کینڈی Kandy کا شہر واقع ہے۔ کولمبو سے یہاں تک تین گھنٹے کا سفر ہے۔ راستہ بے حد دلکش اور پرفضا ہے۔ کولمبو شہر سے نکلتے ہی دور دور تک پانی میں دھان کے ہرے ہرے کھیت نظر آتے ہیں۔ جا بجا چھوٹے بڑے ندی نالے اور انکے کناروں پر آباد دیہاتی بستیاں شاہکار منظر پیش کرتی ہیں۔ گاڑی جوں جوں آگے بڑھتی ہے پہاڑیاں بلند ہوتی جاتی ہیں بعض جگہوں پر ٹرین بڑے گھنے جنگلوں اور لمبی لمبی سرنگوں میں سے گذرتی ہے کینڈی کا شہر کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ یہاں تارکول کی بل کھاتی پہاڑی سڑکوں پر بسیں اور کاریں دوڑتی پھرتی ہیں حتیٰ کہ ایک اونچی پہاڑی کی چوٹی پر بھی کار جا سکتی ہے۔ یہاں پہاڑ کے دامن میں ایک نہایت خوبصورت جھیل ہے جسکے دوسرے کنارے پر بودھوں کا ایک عظیم الشان مندر ہے۔ اس میں مہاتما بدھ کا مقدس دانت رکھا ہوا ہے۔ شہر سے چار میل دور سرسبز قطعات اور گھنے جنگل کے درمیان کینڈی کی سادہ مگر دلکش عمارتیں واقع ہیں جو کئی میل کے حلقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں کا ماحول پسندیدہ اور قابل قدر ہے۔ ہم نے یہاں بے شمار طالب علموں کو اپنی درسگاہوں میں داخل ہوتے اور باہر آتے دیکھا۔ ان کے چہروں پر بلا کی سنجیدگی اور متانت تھی۔ اور علم کی راہ میں ان کا ہر قدم جیسے نپا تلا اٹھ رہا تھا۔

کینڈی کے پرفضا شہر میں ایک بے مثال نباتاتی باغ بھی ہے جس میں دنیا بھر کے درخت پھول اور پودے موجود ہیں۔ اس باغ کی خوبصورتی کیا بیان ہو بس روش روش رنگوں کا ایک سیلاب موجزن ہے۔ خیاباں خیاباں خوشبو کی لہریں رواں ہیں۔ ہوا کے ہر جھونکے میں عجیب قسم کی لطافت ہے۔ یہاں دھوپ نکلتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے قوس قزح پھولوں کے رنگ اپنے دامن میں بھرنے آئی ہو اور جب دھند چھا جاتی ہے تو جیسے نیلگوں آسماں کے سائے اسرار فضاؤں میں بکھیر دیتی ہے۔ انھیں باغوں کے ارد گرد گہرے نیلے رنگ کا ایک دریا بہتا ہے جس سے یہاں کے حسن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

کینڈی سے ۰۰ میل دور سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے ... فٹ کی بلندی پر سیلون کا سب سے خوبصورت مقام نوریلیا واقع ہے۔ کولمبو سے کینڈی تک کا راستہ تو دلکش تھا ہی مگر کینڈی سے نوریلیا تک پہاڑی راستہ خالق حقیقی کی صناعی کا وہ شاہکار ہے کہ زبان و قلم میں اسے بیان کی طاقت نہیں۔ میں نے بے شمار پہاڑی مقام اور راستے دیکھے ہیں مگر جو دلفریبی اور دل آویزی یہاں پائی جاتی ہے وہ اور کہیں نہ تھی۔ پوری رہ گزر آبشاروں دریاؤں اور چشموں سے پٹی پڑی ہے۔ کہیں دور پہاڑوں پر سے پانی سیال چاندی کی مانند گرتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو کہیں ریلوے لائن کے بالکل ساتھ ساتھ پتھریلی گذرگاہوں پر بہنے والے خوبصورت اور چمکدار جھرنے نشیب کے بڑے دریاؤں سے ہمکنار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکی دل موہ لینے والی سریلی جھنکاروں سے ساری فضا سُر ساگر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بعض جگہ تو ایسے خوبصورت منظر دکھائی دیتے ہیں کہ انسان دم بخود رہ جائے۔ یہ راستہ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے چائے کے باغات کا سہانا منظر بھی پیش کرتا ہے۔ پہاڑوں پر منڈلانے والی ساون کی اودی گھٹاؤں میں ان باغوں کے اندر عورتیں، بچے چائے چنتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں بلندیوں پر درختوں کے جھنڈوں میں جا بجا بے حد خوبصورت کاٹیج بھی بنے ہوئے ہیں۔ غرض ان پہاڑوں کے آغوش میں خدا نے حسن فطرت کے وہ ناقابل فراموش جلوے بکھیرے ہیں کہ نگاہ ایک پل کو بھی ان سے غافل نہیں ہونا چاہتی۔ یہ خطہ دنیا کے حسین ترین خطوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ٹرین کا سفر جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے نوریلیا کے شہر تک پانچ میل کا راستہ بذریعہ کار طے کرنا پڑتا ہے۔ جو حسن فطرت کے پرستاروں کے لئے مزید دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ نوریلیا کا شہر بس کیا کہوں کہ کیسا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دنیا سے الگ تھلگ کوئی اور ہی جہان ہے۔ صاف ستھرا نکھرا نکھرا... جیسے شبنم سے دھویا گیا ہو۔ پرسکون وادیاں۔ خوابیدہ درخت... نہ جانے کن خیالوں میں گم، وہ بلند و بالا چوٹیاں جن پر ہمہ وقت گہری کہر چھائی رہتی ہے کہیں جھیلیں تو کہیں ننھے ننھے آبی راستے۔ ہر طرف پھولوں کے رنگ اور غنچوں کی خوشبو۔ خنک اور معطر ہوا کا ہر جھونکا روح کے لئے تازگی کا پیغام لاتا ہے۔ اس شہر کی سڑکوں پر بھی کاریں چلتی ہیں۔ اسلئے سیاح اسکے گرد و نواح کی سیر تھوڑے وقت میں اچھی طرح سے کر سکتے ہیں۔ نوریلیا میں تین دن قیام کے بعد اس کی دلنشین یادلئے ہم کولمبو واپس آئے اور راہ کی ہر آبشار سے میں نے پھر یہاں آنے کا وعدہ کیا۔

سیلون قدرتی وسائل اور خام اجناس سے مالا مال ہے یہاں کی مشہور ترین برآمدی اشیاء چائے اور ناریل ہے۔ نہایت

جھیل کینڈی میں نہایا ہوا ایک گلاب

عمدہ قسم کی چھوٹی الائچی بھی یہاں کی مشہور پیداوار ہے۔ پھلوں میں اناناس، کیلا مشہور ہیں۔ چھالیہ پیدا کرنے والے ممالک میں سیلون غالباً سرفہرست ہے۔ یہاں کے لوگ سیدھے سادے ملنسار اور خلیق ہیں۔

سیلون کی موجودہ حکومت کو اگرچہ بے شمار مسائل کا سامنا ہے مگر وہ پورے خلوص اور دیانت سے انھیں حل کرنے میں مصروف ہے بیرونی زر مبادلہ کی دقت کے باعث سامان تعیش کی درآمد پر مکمل پابندی ہے اور سیلونی قوم اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی حکومت سے مکمل تعاون کر رہی ہے۔

سیلون میں تین ہفتے گذارنے کے بعد ہم بادل ناخواستہ سنگاپور اور بنکاک وغیرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم صبح کی پہلی پرواز میں کولمبو سے جا رہے تھے، اور نصف شب کی موسلا دھار بارش میں یو۔ ٹی۔ اے کا طیارہ ہمیں لے کر سنگاپور کی طرف پرواز کر گیا سیلون بہت دور رہ گیا مگر اس حسین جزیرے کی سحر انگیزیاں دل و دماغ پر انمٹ نقش بن کر ثبت ہو گئیں۔ ●●

یادیں

جو خروشچیو کے ذہن میں اب بھی زندہ ہیں

کبیر کوثر

ماسکو کے مضافاتی علاقہ میں ایک ایسے گوشہ نشین کی طرح میں زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں، جو محض اپنے پہرہ داروں سے گفتگو کر سکتا ہے جو اسے عوام سے اور عوام کو اس سے علیحدہ رکھنے کے لئے متعینات کئے گئے ہیں"۔

ان الفاظ کے ساتھ سابق وزیر اعظم روس، نکیتا خروشچیو نے اپنی گزشتہ زندگی کی کہانی شروع کی ہے۔ اس یادداشت یا سوانح عمری کو اس لئے کہانی کے نام سے موسوم کیا گیا کہ خروشچیو نے صاف اور واضح الفاظ میں اس کتاب کے مصنف ہونے سے انکار کر دیا ہے لیکن مغربی پریس اور روس کے بارے میں بادثوق اطلاعات رکھنے والے ماہرین نے اصرار کیا ہے کہ یہ کتاب نکیتا خروشچیو کی ہی لکھی ہوئی ہے اس کتاب کا مقدمہ لکھنے والے ایڈورڈ کرینک شا نے خروشچیو کی جانب سے اسکی تردید پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ موجودہ حالات میں سابق وزیر اعظم اسکے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

خروشچیو اگرچہ عنفوانِ شباب سے ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں لیکن ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۴ء تک وہ روس کے عظیم ترین رہنما ہی نہیں رہے بلکہ دنیا کے ان گنے چنے آدمیوں میں شمار کئے جاتے تھے جن کے معمولی اشارے پر قیامت خیز ہنگامے جنم لے سکتے تھے۔ خروشچیو اس اعتبار سے بھی اہم ترین شخصیت قرار دیئے گئے ہیں کہ انھوں نے اسٹالن جیسے عظیم انسان کے روس پر چھائے ہوئے تصور کو خاک میں ملا ڈالا۔ انھوں نے اسٹالن کے سیاہ کرتوتوں کی اسوقت مذمت کی جب روس کی اکثریت اپنے آنجہانی ڈکٹیٹر کے خلاف ایک لفظ سننے کی بھی روادار نہ تھی۔ خروشچیو کو اقتدار کی کرسی سے ہٹاتے وقت الزامات کی ایک طویل فہرست انکے سپرد کی گئی تھی۔ ان میں ہندوستان دوستی کا بھی ایک الزام تھا۔ نکیتا نے ہندوستان اور چین کی جنگ کے دوران ہندوستان کو مگ جہاز فراہم کر کے چین کے کمیونسٹوں کے علاوہ روس کے چین نواز کمیونسٹ عناصر کو بھی اپنا دشمن بنا لیا تھا۔

بہرحال ۱۹۶۴ء کے بعد وہ گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ چھ سال کے بعد روس کی سرکاری خبر رساں ایجنسی "تاس" کو ان کا تذکرہ محض اس لئے کرنا پڑا کہ اُسے اُنکی وہ تردید شائع کرنا تھی جس میں انھوں نے مذکورہ کتاب سے اپنی لاعلمی اور سراسر بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ ایک جانب مصنف اس بات پر مصر ہے کہ اس نے یہ کتاب نہیں لکھی دوسری جانب کتاب شائع کرنے والے ادارے جن میں مشہور رسالہ لائف (LIFE) پیش پیش ہے سیکڑوں ماہرین سے اپنی شہادتیں دلا رہے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب خروشچیو نے لکھی ہے لیکن روس میں کسی

کی حیثیت سے زندگی گذارنے والا ضعیف اور لاچار انسان مجبور ہے کہ اپنی جان بچانے کی خاطر اس کا مصنف ہونے سے انکار کرے۔ بہرحال آنکھوں پر معاملہ تصنیف طلب ہے اور مستقبل ہی اس متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

خروشچیو نے اس کتاب میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۶۲ء تک رونما ہونے والے واقعات درج کئے ہیں جو سامراللف، جنرل ایک اثاثم وغیرہ قسط وار شائع کر رہے ہیں۔

کامریڈ نکیتا خروشچیو کے خیال میں جوزف اسٹالن خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا لیکن اس کی شخصیت میں بیک وقت خوبیاں اور خرابیاں دونوں جمع تھیں۔ کامریڈ اسٹالن ایک ایسا ڈکٹیٹر تھا جو روسی عوام کو اپنا تابع فرمان بنانے سے زیادہ انکو اپنی ذات سے خوف زدہ رکھنا چاہتا تھا۔ انھوں نے تحریر کیا ہے:

"کامریڈ اسٹالن سے میری ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی جب میں پارٹی کانگریس کے چودھویں اجلاس میں شرکت کی غرض سے ماسکو گیا ہوا تھا۔ اُس وقت میں اپنی ماں کے دھرم اور دینی تعلیمات اپنے ذہن و دماغ سے نکال کر پھینک چکا تھا۔ میں ان دنوں دو بچوں کا باپ تھا۔ میری پہلی بیوی ۱۹۲۱ء میں قحط کا شکار ہو کر داعی اجل کو لبیک کہہ چکی تھی۔ اور میں نے نینا کو اپنا رفیق حیات ثانی بنا لیا تھا۔ ماسکو پہونچنے پر میں پارٹی کانگریس کے اجلاس میں اس لئے قبل از وقت پہونچ گیا کہ اگلی صفوں سے اسٹالن کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر سکوں۔

۱۹۳۰ء کے دوران جب میں ماسکو انڈسٹریل اکیڈیمی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا مجھے سمارا کے علاقہ میں مشترکہ زرعی فارموں کو چندے کی شکل میں جمع کیا ہوا روپیہ پہونچانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ سمارا میں پہونچتے ہی میں نے غربت و نکبت کے وہ مناظر دیکھے جن سے میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ کاشتکار قحط سالی اور غلہ کی کمیابی کی وجہ سے بھیڑ بکریوں کی طرح مر رہے تھے۔ مجھے وہ لمحات اچھی طرح یاد ہیں جب میں نے کئی کسانوں کو روپیہ لانے کی خوشخبری دی لیکن میں نے دیکھا کہ انکے چہرے پر خوشی کی کوئی کرن نمودار نہیں ہوئی۔ وہ مدہوش انکے ایک بزرگ نے کہا:

"ہمیں روپیہ کی ضرورت نہیں۔ نہ ہم کاشت کاری کے لئے ...... چاہتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ہمیں کھانے کے لئے غلہ فراہم کر دیا جائے۔"

بعد کی رپورٹوں نے مجھے مشترکہ کاشت کاری کی زبوں حالی اور ابتری سے روشناس کرایا۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسٹالن کا نافذ کیا ہوا یہ حکم بہت سی حکمتوں سے خالی تھا اور اس طریقۂ کار نے سارے علاقہ کو اناج سے محروم کر دیا ہے۔ یوکرین جہاں کا میں رہنے والا تھا اسٹالن کے اس حکم سے اتنی بری طرح متاثر ہوا کہ ہزاروں آدمی فاقہ کشی کی وجہ سے موت کو لبیک کہتے رہے لیکن کسی میں جرأت نہ ہوئی کہ وہ کامریڈ اسٹالن کو اس طریقہ کار کی خرابیوں اور بدعنوانیوں سے آگاہ کر سکے۔ یہ وہ طریقۂ کار تھا جس کے تحت ایک انگوٹھا چھاپ کاشتکار (فارم کے لیڈر) کے سامنے بقیہ کسان ایسے تھراتے تھے جیسے چھرے کے سامنے کوئی بکرا کانپنے لگتا ہے۔

انڈسٹریل اکیڈیمی میں اسٹالن کی بیوی میرے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میری اس کی یہی جان پہچان اسقدر مفید ثابت ہوئی کہ ۱۹۳۴ء میں مجھے ماسکو کا پارٹی لیڈر چن لیا گیا۔ اگرچہ اسٹالن کی اس بیوی نادیہ نے جو سوتیلانہ کی ماں تھی ۱۹۳۲ء میں خودکشی کر لی تھی لیکن میرے لئے اسکی مخلصانہ سفارش اسٹالن کے ذہن میں آخر وقت تک نقش رہی اور جب پارٹی کے بیشتر سربراہ اسٹالن کے عتاب کا شکار ہو کر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے میں نادیا کی وجہ سے زندہ و سلامت رہا۔ اسٹالن کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کسی سے محبت کرتا تھا نہایت لغویات ہے لیکن اپنی زندگی کی آخری سانس تک وہ میری عزت کرتا رہا، اس کا مجھے اعتراف ہے۔

اسٹالن نے لینن جیسے روس کے معمار اعظم کی بیوی اور بہن سے کبھی مشفقانہ برتاؤ نہیں کیا۔ اسٹالن کی موت کے بعد ہمیں ایک خفیہ کمرے سے ایک لفافہ دستیاب ہوا جس میں لینن کا تحریر کیا ہوا ایک نوٹ موجود تھا۔ اس نوٹ میں لکھا ہوا تھا کہ اسٹالن نے اس کی بیوی کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا اس لئے اس نے اسٹالن سے کہا تھا کہ اگر وہ اس کا رفیق بنا رہنا چاہتا ہے تو اسکی بیوی سے معافی مانگ لے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن اسٹالن نے مجھے ٹیلیفون پر ماسکو کے غسل خانے اور پاخانے صاف رکھنے کا حکم دیا تھا کسی نے اس سے راجدھانی میں پھیلی ہوئی گندگی کے بارے میں شکایت کی تھی۔ لہٰذا بلگانن کی معیت میں جو بعد میں روس کے وزیر اعظم ہوئے مجھے اس مسئلہ کو سلجھانا ہی پڑا۔

خروشچیو اور اسٹالن - دو کامریڈ

۳۴ء میں ہی مجھے ایک اور ٹیلیفون کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ ٹراٹسکی کے ماننے والوں میں سے کسی نے لینن گراڈ کے پارٹی لیڈر سرجی کیروف کو قتل کر دیا ہے۔ بس پھر کیا تھا اسٹالن کی خفیہ پولیس نے اپنے چیف کے اشارے پر تقریباً دس لاکھ

اسطالن ـــ کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے

اس ... بھر کا ... ایسے ان گنت لوگوں کا بھی صفایا کر دیا گیا جن کا اس ... سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے علاوہ تقریباً پانچ لاکھ ... موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور اس طرح کمیونسٹ پارٹی کے عہدیدار جن کے دامن قتل سے داغ دار تھے۔ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان شہیدوں کی یاد کو تازہ رکھیں اور ان سے اپنی عقیدت و تعزیت کا اظہار کریں تاکہ اس خون ناحق کی خیالی تلافی ہو سکے۔

۱۹۴۳ء کی جنگ عظیم ثانی کے دوران یوکرین میں اتنا ہولناک قحط پڑا کہ لوگوں نے انسانوں کا گوشت کھانا شروع کر دیا ہزاروں آدمی روزانہ مرنے لگے لیکن اسٹالن نے یوکرین میں غلہ پہنچانے کا کوئی حکم صادر نہیں کیا۔ اور جب میں نے بالمشافہ اس قحط کی داستان اسے سنائی تو اس نے کہا کہ یوکرین میں غلہ کی افراط ہے اور تمہیں بے وقوف بنانے کے لئے ایسی اطلاعات پہنچائی جا رہی ہیں۔

اپنے آخری دنوں میں اسٹالن عجیب بے تکی اور مجنونانہ حرکتوں کا ارتکاب کرنے لگا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حکومت کے تقریباً فیل ہو جانے کی وجہ سے روس میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ اور اسٹالن اپنے مخصوص آدمیوں کے ساتھ وقت گزاری کیا کرتا تھا۔ اُس نے اِن دنوں اپنے ساتھیوں کے دو گروپ بنا دیئے تھے۔ کبھی اس گروپ کے آدمیوں کو بلا لیتا کبھی اُس گروپ کے ساتھیوں کے ساتھ دن بھر بیٹھا ہوا گفتگو کرتا رہتا یا تفریحی مشاغل میں انہماک رہتا۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ کریملن کی لائبریری میں گزارتا یا پھر کریملن ہی میں بنے ہوئے سینما ہال میں امریکی فلم دیکھ کر ان پر نکتہ چینیاں کرتا رہتا اس طرح کبھی کبھی رات کے دو بج جاتے۔ اور پھر وہ کہتا کہ آؤ کھانا کھائیں۔ اگرچہ یہ سونے کا وقت ہوتا اور ہمیں نیند لینے کی یوں بھی ضرورت تھی کہ صبح ہوتے ہی اپنے متعلقہ فرائض کی انجام دہی بھی کی جائے اتنی ہی ضروری تھی جتنی کہ اسٹالن کے ساتھ شب باشی۔ اس کے باوجود سب کو ہی اس کی ہاں میں ہاں ملا کر کہنا پڑتا کہ ہاں ابھی بھوک لگی ہے اور کھانا کھانے کے لئے چلتے ہیں۔ اب کریملن سے یہ قافلہ اسٹالن کے مضافاتی گھر کی جانب روانہ ہو جاتا۔ ہر شب وہ مختلف راستے سے اپنے مکان کی جانب جاتا۔ کسی کو کبھی بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کس راستے سے اپنے گھر جائے گا۔ کھانے کے وقت وہ کبھی کسی کی پلیٹ کی جانب پہل نہیں کرتا۔ اسے ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کے کھانے میں زہر نہ ملا دیا گیا ہو۔ اسی لئے وہ اپنے پسندیدہ کھانے کی پلیٹ پہلے کسی افسر کی جانب بڑھاتا اور جب وہ افسر اس میں سے لقمہ لینے کے بعد کچھ دیر تک کسی شکایت کا اظہار نہ کرتا تو اسٹالن اس میں سے کھانا شروع کر دیتا۔

اسٹالن کو اونگھنے والے لوگوں سے سخت نفرت تھی اسی لئے ہم دن میں تھوڑی دیر سو لیتے تاکہ اس کے لئے ناگواری کا باعث نہ بن سکیں۔ کھانے کے دوران اسٹالن خود بھی زیادہ شراب پیتا اور اپنے ساتھیوں کو بھی ڈٹ کر پلاتا تھا اس لئے بیریا، مالنکوف، مکویان وغیرہ چپکے سے شراب لانے والے ساقیوں سے درخواست کر کے رنگین پانی منگوا لیا کرتے تھے تاکہ اسٹالن کی خوشنودی بھی حاصل کر سکیں اور زیادہ شراب پینے سے بھی بچ جائیں۔

اگرچہ مجھے اس کی عظمت کا اعتراف ابھی تک ہے لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر وہ زندہ ہوتا اور میرے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہوتی تو میں اس کے جرائم کیخلاف مقدمہ چلا کر اسے معقول سزا دلواتا لیکن افسوس ہے کہ موجودہ روسی حکومت ایکبار پھر اسی شخص کی عقیدتوں کے راگ الاپنے میں مشغول ہو گئی ہے۔

بہر حال اسٹالن جیسا بلا نوش اس کے خاص رفیقوں میں اور کوئی نہ تھا وہ شراب پی کر اتنا بدمست ہو جاتا تھا کہ اپنے معزز اور باوقار ساتھیوں کا مذاق اڑانے لگتا۔ انہیں ذلیل کرنے میں اسے مزہ آنے لگتا تھا۔ ایک بار اُس نے مجھے گوپک رقص کرنے کے لئے کہا اور بدرجہ مجبوری مجھے اس کے احکام کی تعمیل میں سر تسلیم خم کر کے یہ ذلت گوارا کرنی پڑی۔

زندگی کے آخری دنوں میں اس کی حالت سال بسال دگرگوں ہوتی گئی۔ اُسے کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا بلکہ بقول خود اسے اپنی ذات پر بھی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی موت سے اتنا خائف رہنے لگا تھا کہ اس کے ذہن میں سوائے اس ایک خیال کے اور کچھ باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر اتنا گم صم رہتا کہ ایک بار وہ اپنے دیرینہ ساتھی بلگانن کا نام ہی بھول گیا۔ اپنی زندگی کے

خروشچیو اور کیوبا کے کاسترو

آخری نئے سال کے جشن پر اس نے اپنی بیٹی سویتلانا کو مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے ناچنے پر مجبور کیا۔ اور جب اس نے اس حکم کی تعمیل میں کچھ ذلت محسوس کی تو اسٹالن نے اس کی چوٹی پکڑ کر اُسے مہمانوں کے سامنے دھکا دے دیا۔ میں نے خود دیکھا کہ وہ حاضرین کے سامنے سکتے کے عالم میں کھڑی ہوئی وفورِ غم سے آنسو بہا رہی تھی اس کی آنکھیں غصے کے مارے انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اسٹالن نے پھر بھی اسے معاف نہیں کیا۔ وہ نشے میں اس بری طرح چور تھا کہ آگے بڑھ کر اسے پشت کی جانب سے دھکیل کر رقص کے فرش پر لے آیا۔

ان دنوں اس کی مجنونانہ حرکتیں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ بلگانن نے جو اکثر اس کے ڈنر پر مدعو رہتا مجھ سے ایک روز کہا۔

" خروشچیو ہم لوگ اسٹالن کے کھانے کی میز پر ایک دوست کی طرح شریک تو ہوتے ہیں لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ واپسی پر وہ اپنے گھر لوٹے گا یا اسے جیل خانہ میں ٹھونس دیا جائے گا۔" اگرچہ مجھے اس کی عظمت کا اعتراف ابھی تک ہے۔ لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر وہ زندہ ہوتا اور میرے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہوتی تو میں اس کے ان جرائم کے خلاف مقدمہ چلا کر اسے معقول سزا دلواتا لیکن مجھے افسوس ہے کہ موجودہ روسی حکومت ایک بار پھر اسی شخص کی عقیدتوں کے راگ الاپنے میں مشغول ہو گئی ہے جو ہزاروں اور لاکھوں بے گناہوں اور معصوموں کے قتل عام کا ذمہ دار تھا۔

آزاد ہندوستان کے آزاد بھکاری

شاہد صدیقی

بھیک مانگنا ہمارا پیدائشی حق ہے

ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد جس چیز پر سب سے پہلے کسی غیر ملکی کی نظر جاتی ہے وہ ہیں یہاں کے بھکاری۔ یہاں کی غربت، یہاں کے بھکاری اور ان کی طرف عام لوگوں کا رویہ دیکھ کر غیر ملکیوں کو ایسا ذہنی جھٹکا لگتا ہے کہ کئی روز تک ان کا ذہن اس مسئلے میں ہی الجھا رہتا ہے۔ امریکا اور دوسرے دولت مند ملکوں کے بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو زندگی میں پہلی بار اس قسم کی غربت اور انسانی بیچارگی دیکھتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں پچاس لاکھ سے زاید بھکاری ہیں جو کسی چھوٹے موٹے ملک کی کل آبادی کے برابر ہیں۔ صرف بمبئی میں پچاس ہزار فقیر ہیں ویسے کلکتہ اس معاملے میں بمبئی سے دو ہاتھ آگے ہی ہے۔ کلکتہ اور بمبئی کے بعد مدراس اور حیدرآباد کا نمبر آتا ہے اور پھر دارالحکومت دہلی کا۔ بمبئی اور کلکتے سے دہلی آنے والے بہت سے لوگوں کو چاروں طرف دیکھنے کے بعد حیرت سے کہتے سنا ہے "ارے یہاں تو ایک بھی فقیر نظر نہیں آرہا ہے"۔ یعنی اب ہندوستانیوں کے لیے فقیروں کی بہتات غور طلب مسئلہ نہیں ہے بلکہ کسی جگہ ان کا نظر نہ آنا حیرت کی بات ہے۔

آزادی کے بعد جہاں ہندوستان کی دوسری صنعتوں نے ترقی کی وہاں بھیک مانگنے کی صنعت نے بھی خوب ترقی کی۔ عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے ہو تو بھلا ہندوستانی عوام کا یہ محبوب پیشہ کیوں نہ ترقی کرے۔ ملک نے پچھلے بیس سال میں خوب ترقی کی۔ ملک کی دولت میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہوا اور آہستہ آہستہ تمام دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آگئی۔ ان نئے دولتمندوں کو زیادہ سے زیادہ نفع چاہیے۔ اور زیادہ سے زیادہ نفع تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب سو آدمیوں کا کام ایک مشین سے کرایا جائے۔ آدمیوں کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ جہاں سیٹھوں کی دولت میں اضافہ ہوا وہیں فقیروں اور بھک منگوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ اس میں اضافے کا باعث شہر میں روزگار کا لالچ بھی ہے جو ہر روز ہزاروں گاؤں والوں کو شہر کی جانب کھینچتا ہے۔ لیکن شہر میں روزگار کہاں؟ یہاں تو آدمی کا کام بھی مشینیں کرتی ہیں۔ مجبوراً یہ ہزاروں بے روزگار لوگ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سب ہی لوگ مجبوری کی وجہ سے بھیک مانگتے ہیں۔ جی نہیں، ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی کمائی کے عادی بن چکے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں، بھیک مانگنا جن کا خاندانی پیشہ ہوتا ہے۔ بھیک کی روٹی پر ہی ان کا بچپن گزرتا ہے اور خود بھی یہ بڑے ہو کر بھیک مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔

آج بھی ایسے بہت سے گروہ موجود ہیں جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر دور دراز شہروں میں لے جاتے ہیں اور ان سے بھیک منگواتے ہیں۔ یہ لوگ اس دھندے کو باقاعدہ کاروبار کی طرح چلاتے ہیں اور اپنی دولت کے بل پر سماج میں باعزت شہری بن کر رہتے ہیں۔ پھر ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو محنت مزدوری کرنا چاہتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ مزدوری سے زیادہ بھیک مانگنے میں کمائی ہو جاتی ہے تو اس نفع بخش پیشے کو اختیار کر لیتے ہیں۔

بھکاریوں کی ایک قسم اور بھی ہے جنھیں ہم "پارٹ ٹائم بھکاری" کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم میں وہ جوتے ہیں جو دن میں جوتا پالش کرتے ہیں اور رات کو بھیک مانگتے

تیرے دوار کھڑا بھگوان، بھگت بھر دے رے جھولی:
ہمارے فقیر لوگوں کے مذہبی اعتقادات اور توہم کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہیں یا دو دو میں جوت ... ہیں ... شام کو کسی ... کے باہر ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جوان بھکاری عورتوں میں کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو دن کو بھیک مانگتی ہیں اور رات کو پیشہ کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو بھیک مانگنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

سب سے زیادہ دلچسپ ان بھکاریوں کے بھیک مانگنے کے نت نئے طریقے ہیں۔ آپ بس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سوچ رہے ہیں کہ جلدی سے گھر پہنچیں اور کھانا کھا کر آرام کریں۔ اچانک بس میں ایک لڑکا داخل ہوگا اور سب کے ہاتھ میں ایک ہینڈ بل تھماتا چلا جائے گا جس پر ہندی، اُردو اور انگریزی میں اس لڑکے کی بپتا لکھی ہوگی۔ عام طور پر ان ہینڈ بلوں کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ لڑکے کے ماں باپ مر گئے ہیں، دو بہنیں ہیں، لڑکا ان کی شادی کرنا چاہتا ہے اور اب ان کے جہیز کے لیے چندہ جمع کرتا پھر رہا ہے۔ نیچے کسی پٹواری یا کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے تصدیقی دستخط ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں تو لوگ اس قسم کے ہینڈ بلوں سے متاثر ہوتے تھے اور اس لڑکے کی بہنوں کا جہیز تیار کرانے میں دل کھول کر دان دیتے تھے۔ لیکن جب یہ 'جہیز' کا چکر روز کا معمول بن گیا تو لوگوں نے دان دینا بند کر دیا۔ پھر بھی بہت سے سیدھے سادے لوگ آج بھی اس جھانسے میں آجاتے ہیں۔

ایک اور دلچسپ طریقہ 'جھنڈوں' کے ذریعے بھیک مانگنے کا ہے۔ آپ بڑے اطمینان سے چاندنی چوک میں ہاتھ ہلاتے اور شوکیس میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھتے چلے جا رہے ہیں کہ اچانک نہ جانے کدھر سے ایک موٹی تازی، لمبی تڑنگی عورت آپ پر جھپٹا مارے گی اور آپ کے سینے پر جھنڈا گاڑ دے گی۔ جی ہاں میں اسے جھنڈا گاڑنا ہی کہوں گا، کیوں کہ میں خود بھی کئی مرتبہ اس 'چڑھائی' کا شکار ہو چکا ہوں۔ پن میں لگا ہوا جھنڈا کچھ اس انداز سے سینے پر لگایا جاتا ہے کہ پن کپڑوں سے گزرتی ہوئی سینے میں اتر جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ درد سے بے چین ہو کر چیخ ماریں، آپ کے آگے ایک ڈبہ کر دیا جائے گا کیوں کہ اب جھنڈا آپ کے سینے پر گڑ چکا ہے اس لیے یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ دان ضرور دیں (یاد رکھیے ۲۵ پیسے سے کم دان قبول نہیں کیا جائے گا)۔ کچھ دیر بعد جب آپ کے حواس قابو میں آجائیں گے اور آپ جھنڈا اکھاڑ کر دیکھیں گے تو آپ کو پتہ لگے گا کہ جھنڈا تو صرف ایک لال رنگ کے کاغذ کا ٹکڑا ہے اور اس کا تعلق کسی سوسائٹی سے نہیں ہے۔ چوں کہ اب مجھے اس قسم کے حملوں کا کافی تجربہ ہو چکا ہے، اس لیے اب جیسے پھرتی سے مجھ پر حملہ کیا جاتا ہے اسی پھرتی سے میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ اس کا نتیجہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ یا تو پن بازو میں اُتر جاتی ہے اور یا پھر قمیص کا کوئی گوشہ پھاڑتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی ہے۔

فقیروں کی ایک قسم ہے جو صرف بس کے اڈوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ ایسے بس اڈوں پر جہاں بہت لمبی لمبی لائنیں لگی رہتی ہیں۔ یہ لوگ لائن کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک سروے کرتے رہتے ہیں، اور چند ہی گھنٹوں میں یہ اتنا کما لیتے ہیں جتنا ایک مزدور تمام دن کی محنت کے بعد بھی نہیں کما سکتا۔ دہلی میں فوارے کے بس اڈے پر ایک دس بارہ سال کی لڑکی ہے جو بھیڑ کے وقت دو گھنٹے کے اندر اندر چھ سات روپے کما لیتی ہے۔ یہ لوگ ہر شخص کی نفسیات سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان جوڑوں کا پیچھا یہ لوگ کبھی نہیں چھوڑتے۔ کالج میں پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں عام طور پر انکی چرب زبانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ "بابو جی تمھاری جوڑی بنی رہے۔ جلدی سے شادی ہو جائے۔ دونوں امتحان میں پاس ہو جاؤ۔ وغیرہ وغیرہ" نوجوان جوڑا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کہیں کسی نے سنا تو نہیں۔ پھر جھینپ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ لڑکا اپنی پینٹ میں ہاتھ ڈالتا ہے اور لڑکی اپنا پرس کھولتی ہے۔ دونوں ایک ساتھ فقیر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور فقیر اس دوہرے فائدے پر دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اگر بابو نے بہت ہی سفید چمک دار کپڑے پہن رکھے ہیں تو فقیر لڑکا بار بار بابو کے کپڑے چھوتا ہے۔ بابو گھبرا کر کپڑوں کو میلے ہاتھوں کے داغ سے بچانے کے لیے پیسا اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔

بعض اسٹینڈوں پر ایک بہت ہی خاص قسم کے فقیر بھی ہوتے ہیں۔ ان فقیروں کو دیکھ کر آپ قطعاً نہیں

ہندوستان کا مستقبل
کل کا ہندوستانی جو دن بھر بھیک مانگتا ہے اور رات کو جہاں ٹھکانہ ملتا ہے سو جاتا ہے۔

[illegible] کی دیتے آزاد —
— [illegible] دنیا چاند پر ہے

کہہ سکتے کہ یہ فقیر ہیں۔ اچھے خاصے کپڑے پہنے ہوئے ایک بڑے میاں آپ کے پاس آئیں گے اور آپ کو ایک کونے میں لے جا کر بتائیں گے کہ کس طرح ان کی جیب کٹ گئی اور اب انھیں گھر جانے کے لیے کچھ پیسے چاہئیں۔ قدرتی بات ہے کہ دہلی جیسے شہر میں جہاں ہر وقت جیبیں کٹا کرتی ہیں، آپ ان کی بات کا یقین کر لیں گے اور ہمدردی میں انھیں صرف بس کا کرایہ ہی نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی پیسے دے دیں گے۔ آپ کو اپنی بے وقوفی کا احساس اس وقت ہوگا جب تین چار دن بعد پھر وہی بوڑھا آکر آپ کو وہی پرانی کہانی سنائے گا۔

دہلی میں ڈیفنس کالونی، ساؤتھ ایکسٹنشن اور آس پاس کے علاقے دولتمند لوگوں سے آباد ہیں۔ صبح کو دفتر جانے کے لیے یہ لوگ لنک، وڈ سے گزرتے ہیں۔ صبح کو دس بجے دفتر کے اوقات میں کاروں کی لائن لگ جاتی ہے اور یہی حال شام کو پانچ بجے ہوتا ہے اس سڑک پر ان اوقات میں ایک بوڑھا فقیر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ فقیر نہ تو کوئی آواز لگاتا ہے اور نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے۔ بس اس کے سامنے ایک کے بعد ایک گاڑی رکتی ہے اور اس میں سے کوئی ہندوستانی میم صاحب یا صاحب بہادر اس کے پیالے میں پیسہ گراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھیک اصل میں اس فقیر کو نہیں دیتے بلکہ اپنے ضمیر کو دیتے ہیں جو ہر وقت اندر بیٹھا بیٹھا ان کی ناجائز حرکتوں پر شور مچاتا رہتا ہے یہ رشوت دینے کے بعد ان کا ضمیر آرام سے سو جاتا ہے اور وہ تمام دن اطمینان سے چور بازاری، منافع خوری، اسمگلنگ اور ہر طرح کی جائز و ناجائز حرکت کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستان کے فقیر ہندوستان کے سب سے زیادہ سیکولر باشندے ہیں۔ عام ہندوستانیوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ عام طور پر آپ کسی فقیر کو دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اگر ابھی ایک فقیر دہلی کے برلا مندر کے با[illegible] ان رہا ہے تو کچھ دیر بعد وہ جامع مسجد کے دروازے پر نمازیوں کے انتظار میں بیٹھا نظر آئے گا۔ اگر علاقہ ہندوؤں کا ہے تو فقیر بھجن گائے گا، اگر مسلمانوں کا ہے تو نعت اور اگر عیسائیوں کا ہے تو پاک مریم اور پاک بیٹے کے نام پر بھیک مانگے گا۔ جب تک بھیک دیتے رہیں بھکاری کے لیے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب برابر ہیں۔

فقیر لوگوں کے مذہبی اعتقادات اور توہم کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر انھیں طرح طرح سے بیوقوف بنا کر پیسہ لوٹتے ہیں۔ بہت سے سادھو نما فقیر ناگ دیوتا کو ساتھ لیے گھومتے ہیں۔ اگر آپ دینے سے انکار کریں گے تو دھمکی دیتے ہیں کہ رات کو ناگ دیوتا آپ کے پاس آئے گا۔ عام طور پر کچے عقیدے کے لوگ خوفزدہ ہو کر ناگ دیوتا کو کچھ نہ کچھ بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

دہلی کے ایک سینما گھر کے باہر ایک بوڑھا فوجی اپنی حرکتوں سے لوگوں کو خوش کر کے پیسے بٹورتا ہے۔ یہ بوڑھا پرانا سا فوجی ڈریس پہنے اور سر پر ٹوٹی ہوئی لوہے کی کیپ لگائے، اپنے ڈنڈے کو فرضی بندوق بنائے سنبھال کے سامنے پریڈ کرتا رہتا ہے۔ لوگ اس کو دیکھ کر ہنستے ہیں اور کچھ نہ کچھ دے جاتے ہیں۔

بھکاریوں کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس کی طرف سماج نے ابھی زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی الگ مسئلہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ بذاتِ خود معاشرے کے دوسرے مسائل کی پیداوار ہے۔ غربت، بے روزگاری، روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی اس قسم کے مسائل ہیں جو زیادہ تر بھکاریوں کو جنم دیتے ہیں۔

بمبئی میں بھکاریوں کے لیے ایک گھر بنایا گیا ہے جس میں صرف ایک ہزار بھکاریوں کے لیے گنجائش ہے جب کہ اس وقت بمبئی میں پچاس ہزار سے زائد بھکاری ہیں۔ اس گھر میں انھیں درزی، بڑھئی، موچی اور اس قسم کے دوسرے کام سکھائے جاتے ہیں۔

دہلی میں بھی اس قسم کا ایک سینٹر کنگس وے کیمپ کے پاس کھولا گیا ہے۔ اس کیمپ میں بھی ایک ہزار آدمیوں کی گنجائش ہے۔ یہاں فی بھکاری ۶۰ روپے مہینہ خرچ کیا جاتا ہے لیکن جب بھکاری یہاں سے باہر نکلتا ہے تو ایک بار پھر بھکاری بن جاتا ہے۔ جس سماج میں پڑھے لکھے، صحت مند لوگوں کے لیے روزگار نہیں ہے وہاں ان بھکاریوں کو کیسے روزگار مل سکتا ہے!

ایک سوال یہ ہے کہ لوگ بھیک دیتے ہی کیوں ہیں جب کہ وہ جانتے ہیں کہ ایسا کر کے وہ اس شخص کو فائدہ پہنچانے کی بجائے الٹا نقصان پہنچا رہے ہیں؟ کیا

"بابو ایک پیسہ دے دے"
ہندوستان میں ۲۵٪ بھکاری چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔

لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ان کا بھیک دینا مسئلے کا حل نہیں ہے؟ اصل میں لوگ بھیک یا تو نرم دل ہونے کی وجہ سے دیتے ہیں یا پھر اپنے ضمیر کو رشوت دینے کے لیے۔ بعض لوگوں کو بھیک دینے کی عادت سی پڑ جاتی ہے اس لیے وہ عادت سے مجبور ہو کر بھیک دیتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے دوستوں یا جان پہچان والوں کے سامنے فقیروں کو بھیک دینے میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ بھیک دینا ان کے لیے ایک طرح کا 'STATUS SYMBOL' بن جاتا ہے۔ بہت سے سیٹھ ساہوکار بنیے، کوئی کالا دھندا، کرنے سے پہلے بھگوان سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ان کا کام پورا ہو گیا تو وہ اتنے فقیروں کو کھانا کھلائیں گے یعنی اس طرح وہ بھگوان کو رشوت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ مذہبی تعلیمات سے متاثر ہو کر بھیک دیتے ہیں اور عام طور پر بھیک دینے کے بعد محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے بھیک دے کر اپنے سب پاپ دھو لیے۔ اب انھیں ایک بار پھر پاپ کرنے کی کھلی چھوٹ ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے فلمی گلوکار جیسے محمد رفیع اور لتا وغیرہ اپنی سریلی آوازوں میں گا گا کر اس پیشے کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک فلمی گانا ہے "تو ایک پیسہ دے گا وہ دس لاکھ دے گا" اتنا بڑا انعام تو آپ کو کسی لاٹری میں بھی نہیں مل سکتا۔ آرام سے یہاں ایک پیسہ دیجئے اور بھگوان کے پاس دس لاکھ لیجئے۔ کیسا ہے یہ بزنس! نفع بخش! کیا اتنا نفع آپ کو کسی دوسرے بزنس میں ہو سکتا ہے؟ ●●

اسپین

تاریخ اپنے آپ کو دھراتی ھے

ایک مرتبہ پھر خبروں میں کیتھولک اسپین کا نام آنے لگا ہے۔ شاید اس لئے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ اسپین میں آٹھ سو برس مسلمانوں نے حکومت کی لیکن حکومت گئی تو وہاں سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ ان کے آثار تک مٹا دیئے گئے۔ جو قوم اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے۔ علامہ اقبال مرحوم اسپین گئے تو وادی الکبیر دریا کے کنارے (جس کے قریب ہی مسجد قرطبہ واقع ہے) کھڑے ہو کر صرف پرانے زمانے کا خواب دیکھ کر رہ گئے۔

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اسپین نے گذشتہ تین چار سو برس میں بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں اور یہ تو ہماری اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ نام نہاد جمہوریت پسندوں اور ڈکٹیٹر فرانکو کے درمیان سخت جنگ لڑی گئی۔ ۳ سال کی خانہ جنگی کے بعد بالآخر فرانکو کامیاب ہو گئے۔ اور یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو نئی مملکت اسپین کا قیام عمل میں آیا۔ (جو کیتھولک مذہب کی مملکت ہے۔) حکومت کے سربراہ اور سب کچھ جنرل فرانکو تھے۔ اور آج بھی وہ اس کے سب کچھ ہیں۔ اور گذشتہ ۳۱ برس میں کسی کو ان کے ہاتھ سے اقتدار چھیننے کی جرأت نہیں ہوئی ہے لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "آسمان رنگ بدل رہا ہے"۔ اور باسک (BASQUE) کے شمالی حصے کے چار صوبوں کی علیحدگی پسند کمیونسٹ دہشت پسندوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ میڈرڈ سے ۱۳۰ میل دور برگوش کے شہر میں دہشت گردی اور قتل و غارت گری کے الزامات میں ۱۶ دہشت پسندوں کے خلاف جو مقدمات شروع کئے گئے۔ ان سے حالت اور خراب ہو گئی ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دہشت پسند پچھلے دنوں ایک جرمن ڈپلومیٹ

باقیات نئی دہلی

ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن جیسے بڑے بڑے ڈکٹیٹر ایک ایک کر کے وقت کی گرد میں دب گئے لیکن بوڑھے فرینکو کی حکومت آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ فرینکو اپنے جرنیلوں کے ساتھ۔

یوحن بیہل کو بطور یرغمال اغوا کر کے لے گئے اور اعلان کر دیا کہ اگر ان کے آدمیوں کو نہ چھوڑا گیا اور مقدمات واپس نہ لئے گئے تو یوحن بیہل کو قتل کر دیا جائے گا۔ علیحدگی پسندی کی تحریک کی جڑیں بڑی گہری معلوم ہوتی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ اسپین کا کوئی ایسا بڑا شہر نہیں تھا کہ جہاں ہڑتالیں، مظاہرے اور پولیس کے ساتھ تصادم نہ ہوئے ہوں۔

جنرل موفرانکو کے حامیوں نے شاید مخالفوں کو مرعوب کرنے کے لئے پلازای اورینٹ (PLAZA DE ORIENT) پر پانچ لاکھ کی تعداد میں جمع ہو کر زبردست مظاہرہ کیا۔ اور جنرل فرانکو کے حق میں نعرے لگائے۔ ان کا خاص نعرہ تھا "خدا ہمیں کمزور حکومت سے بچائے"۔ جنرل فرانکو بالکونی پر آئے مظاہرین کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ شاید وہ مطمئن تھے کہ علیحدگی پسندی کا مقابلہ وہ اپنی "فلینگ اسپینولا" نامی پارٹی سے وابستہ محنت کش طبقہ کی مدد سے کر سکیں گے فلینگ

اسپینولا انکی وہ پارٹی ہے جس میں انھوں نے اپنی کامیابی کے بعد تمام "قومی تحریکوں" کو مدغم کر دیا تھا۔ لیکن طاقت کا خواہ کتنا ہی بڑا مظاہرہ کیوں نہ کیا جائے "ہر کمالے را زوالے"۔ ایک تاریخی حقیقت ہے جنرل فرانکو ۳۱ برس ڈکٹیٹر کی حیثیت سے حکومت کر چکے ہیں۔ اب انکی سیاست بوڑھی ہو چکی ہے وہ خود بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ۷۸ سال کی عمر میں اگر فوجی وردی پہن کر عوام کے سامنے آجاتے ہیں تو انکی ہمت کی بات ہے۔ لیکن اور چند دن دیکھ لیجئے یہ "ہمت" خود بخود ختم ہو جائیگی انقلابی طاقتیں خواہ وہ کسی قوم یا طبقہ کی ہوں جب ابھر کر سامنے آتی ہیں تو کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسپینیوں میں انقلاب لانے کا جذبہ پیدا ہوا ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ ان میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی ہے کیونکہ بقول اقبال ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

میڈرڈ میں پانچ لاکھ اسپینیوں نے ڈکٹیٹر فرانکو کی فاشسٹ حکومت کی حمایت میں مظاہرہ کیا۔ دارالحکومت فرانکو کا گڑھ ہے لیکن باقی تمام ملک ان کا دشمن ہو چکا ہے۔

پولینڈ

گوشت نہیں ریفریجریٹر کھاؤ

ہندوستان والے بڑے صابر و شاکر لوگ ہیں کہ بیس گنی مہنگائی ہو جانے کے باوجود اسے خاموشی سے برداشت کر رہے ہیں لیکن ہر ملک والے ایسے نہیں ہوتے، کم از کم پولینڈ کے لوگوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایسے نہیں ہیں۔ ادھر کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ادھر انہوں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ پولینڈ کے لوگ بڑے بیف (گائے کا گوشت) خور ہیں بیف کے بغیر ان کا نوالہ انہیں نہیں ٹوٹتا۔ اسکی قیمت میں ۲۶ فی صدی کے اضافے سے وہ سخت مشتعل ہو گئے۔

اسی طرح کوئلے کی قلت میں دس سے بیس فیصدی تک اور قہوہ کی قیمت میں ۹۲ فیصدی کا اضافہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

ایک طرف قیمتوں میں اضافہ اور دوسری طرف یہ اعلان کہ اُجرتیں نہیں بڑھیں گی۔ یہ اعلان ہونا تھا کہ وہاں مزدوریوں سمجھئے کہ پاگل ہو گئے۔ حکومت نے انکی توجہ ہٹانے کے لئے ایسی چھوٹی مشینوں اور آلات کی قیمتوں میں کمی کی جو گھروں میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً ٹیلی ویژن سیٹ، کپڑا دھونے کی مشینیں اور ریفریجریٹر وغیرہ۔ بہت سے "پولستانیوں" کے لئے یہ بات

پولینڈ کی سڑکوں پر ٹینک دوڑ رہے ہیں۔ عوام کا نعرہ ہے "ہمیں روٹی چاہیئے مشینیں نہیں۔"

پولینڈ کے سابق وزیر اعظم گوملکا

بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی ان سے کہے کہ روٹی گوشت نہیں "ریفریجریٹر کھاؤ۔"

یاد ہوگا پولینڈ وہی ملک ہے جس پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے حملہ کیا تھا اور دنیا کی دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی تھی اس کا رقبہ ۱۲۱،۱۳۱ مربع میل ہے اور آبادی ۱۹۵۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۴۹۷۶۹۲۶ ہے لیکن اب تین کروڑ سے کیا کم ہوگی یہ وسطی یورپ میں واقع ہے اور مشرق میں اس کی سرحدیں روس سے، مغرب میں جرمنی سے اور جنوب میں چیکوسلاویکیا سے ملتی ہیں۔ شمال میں بحر بالٹک ہے۔ اسی بحر بالٹک کی بندرگاہ ڈینزگ سے اس مرتبہ بغاوت کا آغاز ہوا۔ اور پھر گڈینیا، اسٹیٹن (STASTANE) اور دوسرے شہروں میں ہنگامے پھیل گئے۔

پولینڈ کی زبردست اکثریت کیتھولک عیسائیوں پر مشتمل ہے اور وہ یوم کرسمس بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ مناتے ہیں۔ اجتماعی ڈنر کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور دوسری تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کرسمس سے صرف گیارہ دن قبل قیمتوں میں اضافہ ان کے لئے فوری اشتعال کا باعث بنا۔ اور وزیر اعظم ولاڈس لاگومولکا کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔

مسٹر گومولکا اپنے ملک کے بڑے ہر دلعزیز لیڈر رہے ہیں۔ وہ ایک پولش کسان کے بیٹے ہیں جو امریکہ میں ترک وطن کر گیا تھا لیکن مایوس ہو کر (جیکوسلاویکیا کے دبچیک کے والد کی طرح) واپس آ گیا۔ اسٹالن کے زمانے میں انہیں جیل کی ہوا کھانی پڑی لیکن جب "اسٹالینزم" کا دور ختم ہوا تو پولینڈ پر روس کی گرفت ڈھیلی ہونے پر ۱۹۵۶ء میں انہیں رہا کر دیا گیا۔ وہ ایک قومی ہیرو کے طور پر جیل سے باہر آئے۔ وہ ایک ایسے "پول" تھے جو تمام پولوں کے لئے سب کچھ تھے۔ مخالف کمیونسٹ سمجھتے تھے کہ وہ ایک ایسی تحریک کے لیڈر ہیں جس کا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے۔ اصلاح پسندوں کے خیال میں وہ ڈیموکریٹک سوشلزم کی راہ پر چل رہے تھے اور کمیونسٹ انہیں "ٹوٹتے ہوئے کمیونسٹ نظام کا بچانے والا لیڈر" سمجھتے تھے غرضیکہ ہر طبقۂ خیال کے لوگ ان سے خوش تھے اور وہ مسلمہ طور پر ایک قومی لیڈر تھے۔ پھر یکایک یہ انقلاب کیسے آ گیا اور ۶۵ سالہ گومولکا اور ان کے ساتھی کیوں گدی چھوڑنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلا واقعہ ۱۹۵۸ء میں اس وقت ہوا جب انھوں نے انیسویں صدی کے ایک ایسے ڈرامہ پر پابندی لگا دی جو روس کے خلاف تھا۔ اس پر طلباء میں خاص طور سے جوش پیدا ہوا اور ان کے اور پولیس کے درمیان تصادم ہوا۔ طلباء میں یہودی طلباء دوسروں سے زیادہ پیش پیش تھے۔ یہودیوں کی مخالفانہ سرگرمیوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سابق وزیر داخلہ میسٹر لاموزر نے انکے خلاف باقاعدہ تحریک شروع کی تھی جس کی وجہ سے ۲۵ ہزار یہودیوں میں سے جو جنگ کے بعد پولینڈ میں باقی رہ گئے تھے پندرہ ہزار ترکِ وطن کر گئے۔ مسٹر گومولکا نے وزیر داخلہ کو الگ کر دیا لیکن یہودیوں کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔ خود گومولکا کی بیوی کہ یہودی ہے نتیجہ میں حکومت کی جڑیں کمزور ہوتی رہیں۔ اور اس امر کے باوجود کہ وہ سیاسی میدان میں بہت حد تک کامیاب ہوئے اور انھوں نے پولینڈ کی سیاست میں روسی مداخلت کو کافی کم کرنے کے لئے روسی لیڈروں کو رضامند کر لیا۔ اقتصادی بے چینی ان کے لئے مصیبت بن گئی۔ سیاسی مخالفین اور یہودیوں کو جو ذمہ دار عہدوں سے بڑی تعداد میں ہٹائے جانے کے بعد سماجی زندگی میں کافی دخیل ہیں عوام کو بھڑکانے کا موقع مل گیا اور مسٹر گومولکا مستعفی ہونے کے لئے مجبور ہو گئے۔

نئے سربراہ مسٹر ایڈورڈ گیرک مقرر کئے گئے ہیں جو دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کے مقابلہ میں زیادہ لکھے پڑھے اور زیادہ اعتدال پسند ہیں لیکن وہ سخت بھی ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے طلباء کے ہنگاموں کے دوران انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر مظاہرین نے ان کے کوئلہ کی کانوں والے شہروں میں داخل

ہونے کی کوشش کی تو ان کے سر پھوڑ دیئے جائیں گے۔

مسٹر گیرک کے مغربی ممالک کے لوگوں کے ساتھ ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ جب انکی تیرہ برس کی عمر تھی وہ اپنے والدین کے ساتھ فرانس چلے گئے تھے اور اس کے بعد وہ ۲۰ برس تک فرانس اور بلجیم میں رہے اور دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد اپنے وطن واپس آئے۔ دیکھنا ہے کہ وہ اب اپنے ملک کے باشندوں کی امنگوں کا کس طرح ساتھ دیتے ہیں جو غذائی قیمتوں میں اضافے سے سخت بے چین ہیں۔

اومان

عربوں کی بدقسمتی

اومان جنوب مشرقی عرب کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ گذشتہ جولائی میں سلطان قبوس نے اپنے والد سلطان سعید کو معزول کر کے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ عوام نے اس کا خیر مقدم کیا اس لیے کہ سلطان سعید اپنے مظالم کے لیے کافی بدنام ہو گئے تھے نئے سلطان نے بہت سی اصلاحات جاری کی ہیں اور وہ عوام کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن وہ اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوں گے اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے کیوں کہ اومان کے سب سے جنوبی صوبے ضحفر میں گوریلوں کی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری ہیں۔ ان چھاپہ ماروں کو روس اور چین دونوں ملکوں کی طرف سے فوجی امداد مل رہی ہے۔ ان گوریلوں میں جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد ہے اومان کے باشندوں کے علاوہ جنوبی یمن کے قبائلی بھی شامل ہیں۔ پورے علاقے کی دو ہی آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔ گوریلا لیڈر محمد احمد غاسانی ہیں اور ان کے تیس کے قریب لیفٹیننٹ ہیں جن کی گوریلا تربیت چین میں ہی ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ تین سو کے قریب گوریلوں کو چینی انسٹرکٹروں نے تربیت دی ہے۔ یہ گوریلے اپنے آپ کو "عوامی آزاد فوج" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ان کا مقصد اومان کی سلطانیت کو ختم کر کے پورے جنوبی عرب خاکنائے پر کنٹرول کرنا ہے۔ کسی وقت یہ گوریلے صرف پرانی قسم کی بندوقوں اور رائفلوں سے مسلح تھے لیکن اب وہ جدید ہتھیاروں سے مسلح ہیں جن میں ہلکی بھاری توپیں بھی شامل ہیں۔

ایک بڑے خطرے کے پیش نظر سلطان قبوس نے اپنے ۴۸ سالہ چچا طارق بن تیمور کو جو جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، واپس بلا کر وزارتِ عظمیٰ ان کے سپرد کر دی ہے تاکہ گوریلا باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے۔ اگر ایسا ہوا تو ایک مرتبہ پھر اومان کی سرزمین بھائیوں بھائیوں کے خون سے رنگین ہوگی۔

عربوں کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں اکثر اختلافات رہتے ہیں اور اختلافات نہ ہونے کی صورت میں خود اندرون ملک ہی خانہ جنگی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اومان کے معاملات میں بڑی طاقتیں بھی ملوث نظر آتی ہیں کیوں کہ یہ ریاست خلیج فارس اور خلیج عدن کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں سب سے بڑی ہے اور اومان کے شمال میں رود بار ہرمز سے مغربی یورپ کے ساتھ تجارت کا بہت بڑا راستہ ہے۔

سلطان قبوس فوج کا معائنہ کر رہے ہیں

اسرائیل

مجاہدین کا ہوا

بیت اللحم میں دو ہزار زائرین جمع ہوئے اور رات کی دعائیہ سروس میں شرکت کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ اس سے قبل زائرین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی لیکن کچھ اسرائیل کی پابندیوں سے اور کچھ اسرائیل میں غیر یقینی حالات کی بنا پر ان کی آمد پر اثر پڑا ہے ـــــ بیت اللحم وہ جگہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی تھی یہ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی مقدس جگہ ہے۔ پہلے یہ اُردن کے کنٹرول میں تھی لیکن اب اسرائیل کے قبضے میں ہے۔

اسرائیل نے کرسمس کے دن اس علاقے کی ناکہ بندی کر دی اور صرف انھیں لوگوں کو وہاں جانے دیا جنھیں سرکاری طور پر پاس دیے گئے تھے، ساتھ ہی ایک ہیلی کوپٹر پرواز کرتا رہا تاکہ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ حادثہ کا ڈر اُسے عرب مجاہدین کی طرف سے تھا جنھوں نے اسرائیلیوں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اسرائیل اپنے ظلم و ستم سے ان کی سرگرمیوں کو دبانا چاہتا ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ آزادی کی کسی بھی تحریک کو جتنے زیادہ ظلم و ستم کے ساتھ دبانے کی کوشش کی گئی، وہ اتنی ہی زیادہ ابھری اسرائیل میں بھی حکومت کے مظالم کے ساتھ ساتھ یہ تحریک ابھر رہی ہے اور اس نے سب سے زیادہ کوئی اور نہیں بلکہ وہاں کے وزیر دفاع موشے دایان پریشان نظر آتے ہیں، شاید اسی لیے وہ اب سوچنے لگے ہیں کہ عربوں کے ساتھ سمجھوتہ ہونا چاہیے تاکہ غیر یقینی حالات ختم ہوں۔ پچھلے دنوں انہوں نے نہر سوئز کے علاقے میں امن قائم کرنے کے لیے اچھی خاصی معقول تجویز پیش کی تھی لیکن وزیر اعظم مسز گولڈا مائر اور ان کے ہمنواؤں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ گذشتہ ماہ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ اسرائیل کو امن کی بات چیت میں بھی حصہ لینا چاہیے جو ڈاکٹر گنار یارنگ ـــ

"نیا سال، نئی امیدیں، نئی کامیابیاں" فلسطینی بچوں کے بنائے ہوئے کیلنڈر کا ایک صفحہ

نمائندہ اقوامِ متحدہ کی وساطت سے ہو رہی ہے۔ اس بات چیت میں شرکت کے حامی امریکا میں مامور اسرائیلی سفیر جنرل یٹ زک دامین بھی ہیں جو ۱۹۶۷ء میں اسرائیلی فوجوں کے چیف آف اسٹاف تھے۔ وہ خاصا سیاسی ذہن رکھتے ہیں اور وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار بھی ہیں۔

اسرائیل کے چند ذمہ داروں کی یہ ذہنی تبدیلی ایک خوش آئند تبدیلی کہی جا سکتی ہے لیکن سر پھروں کو اب بھی وہاں بالادستی حاصل ہے جن کی اصلاح میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اور عرب مجاہدین کی طویل جنگِ آزادی بالآخر انھیں جھکنے پر مجبور کر دے گی۔

جرمنی

ایک شہر کے دو ٹکڑے

ایک ملک کے دو ٹکڑے ہم نے سُنے تھے لیکن ایک شہر کے دو ٹکڑے آپ کو صرف برلن میں نظر آئیں گے۔ چھ فٹ اونچی دیوار دونوں حصّوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ اس دیوار کے ساتھ ساتھ گھومتے آپ کو جرمنوں کی بے بسی پر رونا آ جائے گا۔ آپ حیرت سے سوچنے لگیں گے کیا یہ وہی قوم ہے جو اپنے آپ کو "آریائی" کہہ کر سب سے افضل بتاتی تھی اور جو ہٹلر کی قیادت میں آج سے اکتیس برس قبل طوفان کی طرح اٹھ کر یورپ پر چھا گئی تھی اور جس کی شروع کی ہوئی جنگ کے نتیجے میں پانچ کروڑ انسانوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا (ان میں ۱۲۰،۰۰۰،۱۷ میدانِ جنگ میں ہلاک ہوئے تھے)۔ جرمن قوم کی یہ تباہ حالی ان لوگوں کے لیے ایک سبق ہے جو ہٹلری پالیسی پر عمل کرنے والوں کو اپنا گرو مانتے ہیں۔

دونوں حصّوں میں دیوار کے پیچھے آپ کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف زندگی نظر آئے گی۔ گزشتہ ۲۵ برس میں دونوں حصّوں میں بہت بڑا فرق ہو گیا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ دونوں حصّوں کے درمیان ابتدا میں جو کشیدگی تھی وہ ابھی تک موجود ہے۔ لیکن یہ کشیدگی ان بڑی طاقتوں کی پیدا کردہ ہے جو فاتح کی حیثیت سے جرمنی میں داخل ہوئی تھیں۔ عوام یہ کشیدگی پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مغربی جرمنی میں ولی برانت کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے مشرق کے ساتھ مصالحت کرنے کا نعرہ لگایا تو عوام نے اس کو اس حد تک کامیاب کرایا کہ وہ فیڈرل ڈیموکریٹک پارٹی کے تعاون سے حکومت قائم کرنے کی پوزیشن میں آ گئی اور کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی جس کے ہاتھ میں گزشتہ ۲۰ سال سے اقتدار تھا حزبِ اختلاف کی پوزیشن میں آنے کے لیے مجبور ہو گئی۔ ولی برانت چانسلر بنے اور وزارتِ خارجہ فیڈرل ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر والٹر شیل کو سونپی گئی۔ ولی برانت اور والٹر شیل کی جوڑی نے ایک سال کے عرصے میں مشرق کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لیے بڑا کام کیا۔ ولی برانت ماسکو گئے، وارسا گئے اور مشرقی جرمنی کے وزیرِ اعظم ولی اسٹوف

ولی برانت اور وزیرِ خارجہ والٹر شیل

ایک سال کے اندر اندر ولی برانت مغربی جرمنی کے نوجوانوں کا محبوب ترین لیڈر بن گیا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس تصویر سے ہو سکتا ہے۔

کل ہند
مسلم سیاسی اجتماع

انڈیا مسلم سیاسی کنونشن کے صدر بدر الدین طیب جی
ش ، ۱۹۰۷ء ۔ ہندوستان کے مشہور قومی رہنما اور
ین کانگریس کے تیسرے صدر بدرالدین طیب
کے پوتے ہیں۔ آپ بمبئی اور آکسفورڈ میں تعلیم
ل کرنے کے بعد انڈین سول سروس میں شامل
گئے۔ طیب جی انڈونیشیا، ایران، جرمنی اور جاپان
ہندوستان کے اسفیر رہ چکے ہیں۔ آپ کچھ عرصہ تک
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ
ہیں۔

کل ہند مسلم سیاسی کنونشن (امپوکس) منعقدہ دہلی کو اگر ہم فرقہ پرست عناصر کا اجلاس نہیں کہہ سکتے تو موجودہ بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں اسے کوئی دانشمندانہ قدم بھی نہیں گردانا جا سکتا۔ آج جب تمام ترقی پسند طاقتیں (اندرا کانگریس) سمیت ایک ہو کر فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں سے لڑ رہی ہیں۔ مسلمانوں کو ایسے مواقع نہیں فراہم کرنا چاہئیں جن کا سہارا لے کر فرقہ پرست طاقتیں سیاسی مفاد حاصل کر سکیں۔ اسی قسم کے کنونشنوں سے جن سنگھ، سوتنترا اور سنڈیکیٹ جیسی جماعتوں کو یہ کہنے کا موقع ملجائیگا کہ اگر وہ فرقہ پرست ہیں تو کیا ہوا مسلمان بھی تو فرقہ پرست ہیں۔ اس وقت موقعہ ہے کہ ہم جذبات سے کام لینے کی بجائے سیاسی شعور سے کام لیں۔ کم از کم ایکبار آگے بڑھتی ہوئی سیکولر اور ترقی پسند طاقتوں کو آزمائیں۔ اور انھیں پوری آزادی کیساتھ کچھ کرنیکا موقع دیں۔ موجودہ سیاسی ماحول میں علیحدہ سیاست کی بات سیاسی خودکشی کے ہم معنیٰ ہوگی۔ اور اس سے صرف جن سنگھ اور سوتنترا جیسی فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتوں کو فائدہ پہنچے

آل انڈیا مسلم سیاسی کنونشن کا ایک منظر

گا۔ جو نہ صرف مسلمان دشمن ہیں بلکہ عوام دشمن بھی ہیں اور جو سرمایہ داروں اور راجاؤں کے ہاتھ کا کھلونا بن چکی ہیں۔

اس کنونشن کے دعوت نامے میں تحریر کیا گیا تھا کہ ملت اسلامیہ کے مشترک بنیادی ملی مسائل نیز شہری زندگی میں ان کی فلاح و بہبود اور گذشتہ ۲۳ برس کے تلخ تجربات کی روشنی میں ان کے مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر مستقبل کے لیے بہتر تدابیر کی نشاندہی کے لیے یہ کنونشن بلایا جا رہا ہے۔

۱۹۶۴ء میں بھی تقریباً انہی اغراض و مقاصد کے تحت مسلم مجلسِ مشاورت کے قیام کے سلسلے میں لکھنؤ میں ہندوستان کے مسلم دانشوروں کا اجلاس ہوا تھا اور بات ایک ہی تھی کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کو ان کا جائز مقام دلانے میں مدد و معاون ثابت ہوں۔ مسلم مجلسِ مشاورت اگرچہ ایک غیر سیاسی تنظیم تھی اور اس کے پرچم تلے سبھی اہلِ درد جمع ہوئے تھے لیکن نتائج کے لحاظ سے یہ تنظیم کامیاب نہ ہو سکی۔ اور ملک میں فرقہ پرست جماعتوں کا اثر و اقتدار کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا۔ آج نئی کانگریس کی تنظیم مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ حقیقی معنوں میں ہندوستان کو ایک جمہوری ملک بنانے کی خواہش مند ہیں۔ ایسا ملک جس میں فرقہ پرستی کا نام و نشان نہ ہو۔ ایک ایسا ملک جس کے باشندوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں اور ایک ایسا ملک جو امن و سلامتی کے ساتھ اقتصادی ترقی کے منازل طے کرتا ہوا ساری دنیا کے لیے مشعلِ ہدایت بن سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات پیدا کرنے کی جدوجہد میں مسلمانوں کو تو کیا ملک کے کسی بھی طبقے اور فرقہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی لیے ایمپوک کے سرابراہوں سے ایسی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں کہ وہ دانشمندی سے کام لے کر نئی کانگریس کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بن سکیں گے۔

۱۹ اور ۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو رنگ روڈ نئی دہلی کے لیک آڈیٹوریم میں ایمپوک کا اجلاس تلاوتِ کلامِ پاک سے شروع ہوا۔ اس کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا خطبۂ افتتاحیہ پڑھا گیا۔ موصوف اپنی علالت کی وجہ سے بذاتِ خود شرکت سے معذور رہے۔ خطبۂ افتتاحیہ میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ ہندوستان میں پھیلی ہوئی بے چینی، افراتفری اور سیاسی بے اصولیوں کو دیکھ کر کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس ملک میں سوا دو چیزوں کے باقی سب موت کے گھاٹ اتر چکی ہیں۔ اور یہ دو چیزیں ہیں تعصب و نفرت (خواہ کسی فرقے سے ہو یا ذات برادری یا مخالف و حریف سے) اور دولت و حکومت حاصل کرنے کی جدوجہد ہیں۔ پورے ملک میں چور بازاری اور رشوت ستانی عام ہو چکی ہے افراد اور اقلیتیں اتنی غیر یقینی صورتِ حال میں زندگی گزار رہی ہیں کہ وہ کبھی کبھی انگریزوں کے دورِ غلامی کو یاد کرنے لگتی ہیں۔ اقلیتوں کو اپنے حال سے زیادہ مستقبل سے مایوسی ہو چکی ہے۔

موجودہ سیاسی حالت میں یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ مسلم سیاسی کنونشن مسلمانوں اور ملک کو کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اس وقت حکومت کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنا لینا بہت بڑی سیاسی بھول ہوگی اور اس سے بلاشبہ جن سنگھ اور دوسری رجعت پسند طاقتوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

اس خطبۂ افتتاحیہ میں انھوں نے فرمایا کہ اس وقت ہمارا ملک تباہی کے عمیق غار کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ملک کے تمام فرقے، ان کی زبانیں، مذہب، کلچر، امنگیں، آرزوئیں کچھ بھی ہوں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، حتیٰ کہ خدا کے منکر، سب ایک ایسی کشتی میں سوار ہیں جس میں ایک بڑا سوراخ ہو چکا ہے۔ اگر یہ کشتی ڈوب گئی تو نہ کوئی مذہب بچ سکے گا اور نہ کوئی پارٹی۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم سیاسی جدوجہد سے کنارہ کش ہونے کی بجائے اس میں اپنا پورا وزن ڈال کر صورتِ حال میں ایسی تبدیلی پیدا کریں کہ ماحول پر انسان دوستی اور حب الوطنی کے عناصر غالب ہو سکیں اور ساری قوم دولت اور کرسی کے ذاتی مفاد سے بالاتر ہو جائے۔"

خطبۂ افتتاحیہ کے بعد محمد ذوالفقار اللہ صاحب نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ڈیلی گیٹوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا کہ تقسیمِ ہند کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس تقسیم میں اور بھی کئی سیاسی پارٹیوں کا ہاتھ تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد سے مسلمانوں پر نت نئے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کے مسائل سلجھنے کی بجائے روز بروز الجھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ جن سنگھ اور آر ایس ایس کے پھیلائے ہوئے فتنہ و فساد کے خلاف حکومتِ وقت کوئی مؤثر اقدام نہ کر سکی۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ذوالفقار اللہ صاحب نے کہا کہ جنوبی ہندوستان کے برعکس شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا، خصوصاً یوپی کے ایک کروڑ مسلمان شمالی ہندوستان میں چھائی ہوئی تعصب کی فضا سے بری طرح متاثر ہیں۔

کنونشن کی صدارت سابق آئی سی ایس افسر جناب بدرالدین طیب جی نے کی۔ انھوں نے خطبۂ صدارت میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک کا شکوہ کیا وہیں ملک کی یکجہتی اور سلامتی کے لیے مسلمانوں کو منظم رہنے کی دعوت دی۔ موصوف نے کنونشن کی غرض و غایت پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے جائز مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے جدوجہد کرنے والے کسی بھی طرح فرقہ پرستی کے ملزم قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اگر عام سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے مطالبات کے لیے جدوجہد کرتیں اور ان کو ملک میں جائز حقوق دلوانے میں مؤثر اقدام کرتیں تو اس کنونشن کے انعقاد کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوتی۔ طیب جی نے فرمایا کہ پارٹیوں کی کارگزاریوں اور عمل سے ہی ان کی جانچ ہو سکتی ہے نام اور لیبل سے ان کو فرقہ پرست قرار دے دینا بے انصافی ہے۔ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک نہیں ہے۔ یہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اور تمام پسماندہ طبقوں کا مشترکہ ملک ہے اس لیے تمام قوموں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کا مساوی حق ہے۔ لیکن حقوق بھیک مانگنے سے نہیں ملا کرتے۔ ان کے حصول کے لیے جدوجہد درکار ہے۔ اس لیے اپنے دفاع کے لیے تمام پسماندہ طبقوں کو تیار ہو جانا چاہیے [illegible]

(قومی آواز نئی دہلی)

بھی حشرات الارض جیسا ہو کر رہ گیا۔ قومی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے ہیں۔ پنڈت نہرو جیسی عظیم ہستی انھیں حل کر سکی اس لیے ہمیں مضبوط قدموں سے ایسے راستوں پر چلنا ہے جو منزل تک پہونچنے کی مہم کو آسان بنا دیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی ترقی میں ملک کی فلاح اور بہبود کا راز مضمر ہے۔ اُردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اوقاف، مسلمانوں کی جان ومال کے تحفظ، ان کی تعلیم، ان کے مذہب اور دیگر مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے صدر موصوف نے کہا کہ ہمیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے ایک نئے مستقل آزاد ادارہ کا قیام عمل میں لانا ہوگا جسے ہم آل انڈیا پولیٹیکل کنسٹیٹیوٹ کمیٹی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔

ایمپوک کے شرکا میں جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کے لیڈر بخشی غلام محمد ایم پی، مغربی بنگال خلافت کمیٹی کے صدر ملا جان محمد، کانگو کے مولوی عبدالغنی ڈار ایم پی، بھیم سینا کے بابو شام سندر کے علاوہ مدھیہ پردیش کے رہنما، عوامی تنظیم بہار، اتحاد المسلمین آندھرا پردیش، میسور، تامل ناڈو، اور مغربی بنگال کی مسلم لیگ اور آل انڈیا شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن کے نمائندوں نے شرکت کی۔ خصوصی مہمانوں میں دلّی کے سابق میئر نورالدین احمد، سابق جسٹس سنہا اور بی شام سندر وغیرہ جیسے لوگ شامل تھے۔

ایک تجویز کے ذریعے طیب جی نے ایک ایسا متحدہ محاذ بنانے کا خیال ظاہر کیا جس میں پس ماندہ طبقات کے عناصر بھی شامل ہوں تاکہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کی جا سکے۔ یہ تجویز بھاری اکثریت سے پاس ہو گئی۔ اس تجویز میں صدر کو اس متحدہ محاذ کی تشکیل کے لیے ایک مسلم پولیٹیکل کنسٹیٹیوٹ کمیٹی بنانے کا اختیار دے دیا گیا۔ دوسرے دن اس کمیٹی کے ممبران کو صدر نے نامزد کر دیا جس میں مندرجہ ذیل صاحبان شامل ہیں۔

صلاح الدین اویسی ایم ایل اے اور اسمٰعیل بندہ (آندھرا) خلیل احمد اور یعقوب یونس (بہار) شیخ محمد یحییٰ (دہلی)، غلام محمد لے مین (گجرات)، ڈاکٹر حبیب اللہ فاضل (تامل ناڈو)، شبیر احمد [illegible] نقشبندی (بہار) اشتیاق نواب محمد صابر قلی خاں اور مولانا مسعود احمد صدیقی (مدھیہ پردیش) ایم۔ اے۔ قیوم قریشی (میسور) منظور عالم اور احمد بخش (راجستھان)، ڈاکٹر جلیل فریدی اور محمد ذوالفقار اللہ (یوپی) سید محمد زیدی (بمبئی)، کو اس کمیٹی کا سکریٹری نامزد کیا گیا۔ یہ کمیٹی مارچ ۷۱ء میں حیدرآباد میں ہونے والے سیشن کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔

اس کنونشن میں دو غیر مسلم حضرات نے بھی تقریریں کیں۔ بابو شام سندر بھیم سینا کے نیتا نے انتہائی تلخ انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہم حال اور ماضی کے اچھوت ہیں اور اگر آپ لوگ متحد ہو کر جدوجہد کرنے سے معذور رہے تو مستقبل میں آپ کی حیثیت بھی ہم اچھوتوں جیسی ہو جانا یقینی ہے۔"

الٰہ آباد کے سابق جسٹس شوہری سنہا نے فرمایا کہ حالاتِ حاضرہ کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہو کر شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہئیں۔

ایک دوسرے ریزولیوشن کے ذریعے مسلم عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ مسلم اقلیت، پس ماندہ طبقات اور دیگر کمزور لوگوں کی معاشی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالت سدھارنے کے لیے جہاں سے بھی اور جو امداد بھی حاصل ہو سکے اس کے لیے سر توڑ کوشش کریں۔

۲۰ تاریخ کو اس دو روزہ کنونشن کا آخری اجلاس ہوا، اس میں ایمپوک نے ایک تجویز پاس کی جس میں انتخابات کے موجودہ طریقہ کار میں ایسی تبدیلی کرنے کا مطالبہ کیا جو مسلمانوں کو ان کے تناسبِ آبادی کے اعتبار سے پارلیمنٹ وغیرہ میں نمائندگی دے سکے۔

ایک دوسری تجویز میں مسلمانوں کے چند خصوصی مطالبات کا تذکرہ کیا گیا جس میں سے ایک مطالبہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، پنجاب، ہریانہ اور دلّی میں اس کا صحیح اور جائز مقام دلانا تھا۔ دوسرے مطالبات میں مسلمانوں کو فوج، پولیس اور دیگر محکمات میں آبادی کے تناسب سے ملازمتیں فراہم کرنا، علی گڑھ یونیورسٹی کو مسلم ادارہ تسلیم کرنا، فرقہ وارانہ فسادات کو سختی سے کچل دینا اور مجرموں کو ایسی سزا دینا کہ دوسروں کے لیے عبرت کا موجب بن سکے اور ان افسروں سے جو فساد کو ہوا دیتے ہیں باز پرس کرنے کے علاوہ ایک اہم مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان بھر میں درسی کتابوں سے ایسے حصے حذف کر دیے جائیں جو فرقہ وارانہ کشمکش اور اختلافات پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کی تجویز بھی پاس کی گئی۔

صدر کنونشن بدرالدین طیب جی نے پاس شدہ تجاویز پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایمپوک انتخابات میں حصہ نہیں لے گی لیکن عام مسلمانوں کے رجحانات کا اظہار کرے گی تاکہ مسلمانوں کے ووٹ بے کار نہ جا سکیں۔ البتہ یوپی میں مسلم مجلس کو انتخابات لڑنے کا حق حاصل ہوگا اور مسلم مجلس شمال میں مسلم لیگ کے خلاف اپنے امیدوار کھڑے کرنا چاہے گی تو اسے اس کی اجازت ہوگی۔

بہر حال مسلمانوں کا یہ کنونشن سابقہ روایات سے زیادہ کامیاب رہا اور شرکا نے اس نکتہ کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کر دیا کہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں فرقہ پرستانہ ذہنیت کو داخل نہ ہونے دیں گے اور ضرورت پڑنے پر سوائے آر ایس ایس اور جن سنگھ کے تمام ان پارٹیوں سے تعاون کریں گے جو ان کے مسائل کو سلجھانے میں ان کی ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

اس کنونشن کی کارروائی پر جن اصحاب نے تنقید کی ان میں پی۔ ایس۔ پی کے چیئرمین این۔ جی۔ گورے بھی ہیں۔ انھوں نے اس کنونشن کو آر ایس ایس کی طرح فرقہ پرستی کا زہر پھیلانے کا ذمہ دار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس کنونشن کی تجاویز منظور کر لی گئیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ریاست کے اندر ایک نئی ریاست دے دی جائے گی۔

بہر حال اگر مسلم پولیٹیکل کنونشن کا مارچ میں ہونے والا سیشن کسی ایسے نتیجے پر پہونچ گیا جس پر عمل کرنے سے ہندوستان کے آئندہ انتخابات میں ایسی پارٹی برسرِ اقتدار آ سکی جو بلا لحاظ قوم، مذہب اور فرقہ سارے ملک میں اقتصادی خوش حالی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے والی ہو تو ہندوستان کی تاریخ میں اس کنونشن کا ذکر جلی حروف میں کیا جا سکے گا۔ ●●

آئینے کی

دھلی کے وگیان بھاون میں بلجیم ھاؤس میں روس کے کزاقی نوجوانوں نے بہت خوبصورت رقص پیش کیا۔ یہ نوجوان آل انڈیا یوتھ فیڈریشن کی دعوت پر ھندوستان آئے ہوئے ھیں اور ھندوستان کے مختلف حصوں میں پروگرام پیش کریں گے۔

صدر گری کی عمر دس سال کم

پچھلے دنوں صدر وی وی گری آریو ویدک علاج کے لیے کیرالا گئے تھے۔ دھلی آکر انہوں نے بیان دیا کہ علاج کے بعد انہیں ایسا محسوس ھوتا ہے کہ ان کی عمر دس سال کم ہو گئی ہے۔ اتنا زیادہ چست اور تندرست انہوں نے اپنے آپ کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ تصویر میں کیرالا سے واپسی پر ھوائی جہاز سے نیچے اتر رھے ھیں۔

کوڑے گھوڑے کی طرح خوبصورت

برمی رقاصاؤں کا ایک گروپ آج کل ھندوستان کا دورہ کر رھا ہے۔ اب تک یہ دھلی اور بمبئی میں اپنے فن کا مظاھرہ کر چکا ہے۔ اس کا ارادہ ھندوستان کے تمام بڑے شہروں میں رقص کے پروگرام پیش

[illegible]

مہاراجاؤں
کے پریوی پرس
آئین اور سپریم کورٹ

سلیمان صابر

سابق حکمرانوں کے بارے میں سپریم کورٹ نے جو فیصلہ دیا ہے اس سے پورے ملک میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے اور موافقین و مخالفین میں پوری شدت کے ساتھ قلمی جنگ جاری ہے۔ بعض حلقوں کا خیال تھا کہ حکومت پارلیمنٹ کے اسی اجلاس میں سابق حکمرانوں کے پریوی پرسز اور دیگر مراعات کو ختم کرنے کے لئے کوئی نیا بل لائے گی۔ جو بدلے ہوئے حالات میں یقیناً پاس ہو جائے گا لیکن شاید اس بنا پر اس نے کوئی عاجلانہ اقدام نہیں کیا کہ مبادا پھر کوئی قانونی سقم باقی رہ جائے اور سپریم کورٹ کو ایک مرتبہ پھر مداخلت کا موقع مل جائے۔

یہ اقدام یقینی طور پر اسلئے بھی نہیں کیا گیا کیونکہ سپریم کورٹ نے سابق حکمرانوں کی پریوی پرسوں کو ان کی جائداد تسلیم کیا ہے۔ جائداد کا معاملہ بنیادی حقوق میں آتا ہے جن میں حکومت کو ترمیم کا حق نہیں اس کے بارے میں سپریم کورٹ اس سے قبل حکومت کے خلاف فیصلہ دے چکی ہے پس کوئی قدم اٹھانے سے قبل حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام پہلوؤں کا قانونی جائزہ لے۔ اور اس بات کا خیال رکھے کہ آئین کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اسی لئے اس نے کوئی قدم نہ اٹھایا اور اس نے ایسا کر کے بہت اچھی پالیسی اختیار کی۔

مہاراجاؤں کو شان و شوکت چھوڑنی ہوگی۔ آزاد ہندوستان میں سب برابر ہیں

پارلیمنٹ میں وزیر اعظم سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے اگرچہ اعلان کیا کہ انکی حکومت سابق حکمرانوں کو حاصل شدہ مراعات ختم کرنے کی پابند ہے لیکن کہا کہ "یہ مراعات آئین کے اندر رہتے ہوئے ختم کی جائیں گی۔"

آئین کا یہ احترام جمہوریت کی بقا اور اس کے استحکام کی نشانی ہے۔ وزیر اعظم نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کا کوئی برا نہیں مانا بلکہ اسے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ سنا اور دوسرے خواہ کچھ کہیں اور کسی طرح بھی انکے اور انکی حکومت کے اقدامات کا مذاق اڑائیں لیکن انہوں نے یہی کہا کہ "میں اسے اپنی شکست تسلیم نہیں کرتی۔"

اس لئے کہ یہ وزیر اعظم کا کوئی ذاتی معاملہ نہیں تھا انہیں سابق راجوں مہاراجوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ یہ پوری قوم کا اور ایک سوشلسٹ سماج کے اصول کا معاملہ تھا اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی کسی سوسائٹی یا سماج نے قدیم بندھنوں کو توڑ کر اس سے نکلنے کی کوشش کی ہے اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

سپریم کورٹ یا کسی بھی عدالت کو کسی فرد یا جماعت کے جذبات واحساسات سے کوئی سروکار نہیں [illegible]

یا حاکم عدالت کسی شخص سے خواہ کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ رکھتا ہو اگر قانون کے ضابطے اسکے موافق نہیں جاتے تو وہ اس کے حق میں کبھی فیصلہ نہیں کرے گا۔ ہم نے ایسے قاضیوں اور حاکموں کے قصے تاریخ میں پڑھے ہیں جنہوں نے قانون کے احترام میں بیٹوں اور اپنے عزیزوں کو پھانسی کی سزا کا حکم سنایا ہے۔

سابق حکمرانوں کے معاملہ میں بھی قانون نے ان کا ساتھ دیا اور وہ جیت گئے۔ اگر قانونی خامیاں نہ ہوتیں تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ اور صدر کی طرف سے جو حکم جاری کیا ہوا سپریم کورٹ اسے کبھی غیر قانونی قرار نہ دیتی۔

چیف جسٹس مسٹر ہدایت اللہ اور ججوں کی اکثریت کا کہنا تھا کہ "پریوی پرسز کا حق سابق حکمرانوں کو محض ان اقرار ناموں اور معاہدوں کے ذریعہ نہیں ملا جو انکے ساتھ کئے گئے تھے بلکہ دستور ہند کی دفعہ ۲۹۱ کے تحت بھی انھیں یہ حق حاصل ہے۔ چیف جسٹس نے اپنے فیصلہ میں یہ بھی کہا کہ "چونکہ آئین کی دفعہ ۲۹۱ کے تحت ان پریوی پرسز کی ادائیگی "مجامل مجتمعہ" (CONSOLIDATED FUND) سے عمل میں آئے گی۔ اس لئے یہ جائداد کی تعریف میں آتی ہے اور جائداد کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے جن میں حکومت ترمیم کرنے کی مجاز نہیں ہے۔" دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ چیف جسٹس کے اس فیصلہ کی روشنی میں جب تک حکومت بنیادی حقوق میں [illegible]

سابق حکمرانوں کے لیڈر ڈاکٹر کرنی سنگھ (آف بیکانیر)

اختیار حاصل نہ کرے اس وقت تک وہ پریوی پرسز کو ختم کرنے کے سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اس مطلب کا ایک بل پہلے ہی سوشلسٹ پارٹی کے ممبر مسٹر ناتھ پائی کی طرف سے پارلیمنٹ میں پہلے سے پیش ہے لیکن نہیں معلوم کن وجوہ کی بنا پر وہ پارلیمنٹ کے سابق اجلاس میں زیر بحث نہ آسکا۔ اور آئندہ بھی زیر بحث آئے گا یا نہیں اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

کچھ پر جوش قسم کے سوشلسٹ جو غالباً قانونی باریکیوں کو نہیں سمجھتے سپریم کورٹ کے فیصلے سے بہت مایوس نظر آتے ہیں۔ اس کا اظہار نجی بات چیت سے بھی ہوتا ہے اور ان خطوط سے بھی جو روزانہ اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا کہ "سپریم کورٹ کے فیصلہ پر مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میں نے اس دن روٹی نہیں کھائی۔" ایک اور صاحب کا خیال ہے کہ "سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ حکومت کے ترقی پسندانہ اقدامات کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے۔ اسے فوراً کوئی دوسرا حکم جاری کرنا چاہیئے۔"

یہ عوام کی باتیں ہیں خود پارلیمنٹ کے ممبروں نے جوش و جذبات سے مغلوب ہوکر فیصلہ معلوم ہونے کے فوراً بعد حکومت پر زور دیا کہ وہ سپریم کورٹ میں ایسے ججوں کو مقرر کرے جو سوشلسٹ نظریات کے حامل ہوں۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ لیکن وزیر اعظم نے اس قسم کی تمام باتوں کو سنا اور ہنس کر ٹال دیا۔ صرف اتنا کہا کہ "ہم سابق حکمرانوں کی مراعات ختم کرنے کی پالیسی کے پابند ہیں۔ دستور کے اندر رہتے ہوئے اس سلسلہ میں قدم اٹھایا جائے گا۔"

جذبات سے مغلوب اشخاص جو سوشلسٹ نظریات کے حامل ہیں یا ان کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں آج وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ پر چیں بجبیں ہوسکتے ہیں لیکن جذبات ٹھنڈے ہونے پر کل وہ محسوس کریں گے کہ اگر عدالت کو اور خاص طور پر سپریم کورٹ کو اتنی آزادی حاصل نہ ہو کہ وہ ایگزیکیٹو کے کسی فیصلہ کو منسوخ کرسکے تو اس ملک میں تاراج پھیل جائے گا۔ اور یہاں سب کچھ ہوگا لیکن جمہوریت نہ ہوگی۔ تمام سنجیدہ اور دانشور طبقے اس بات پر متفق ہیں کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ عدلیہ کی برتری کا مظہر ہے اور اس بات کی نشانی ہے کہ ایگزیکیٹو کے مطلق العنانہ احکام ملک کی سب سے بڑی عدالت میں چیلنج سے مبرا نہیں ہیں۔

واقعات فتح دہلی

یہ طبقے جہاں اس بات کے حامی ہیں کہ سابق حکمرانوں کی مراعات ختم ہونی چاہئیں کیونکہ وہ جمہوریت کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتیں وہاں ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ حکومت کو بنیادی حقوق میں ترمیم کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے۔ اور یہ بات بڑی افسوسناک ہوگی کہ محض سابق حکمرانوں کی خاطر وہ بنیادی حقوق میں ترمیم کرنے کا حق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا ہوا تو اس سے صرف سابق حکمران ہی نہیں بلکہ ملک کے ۵۵ کروڑ کے قریب باشندے متاثر ہوں گے۔ ایک خیال یہ ہے کہ اگر بنیادی حقوق میں حکومت کو ترمیم کرنے کا حق مل گیا تو ہندوستان کے آئین میں کچھ باقی نہ رہ جائے گا۔ ہندوستان کے آئین کا اگر آج دنیا میں احترام کیا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ اس کے تحت ہر شخص کو بنیادی حقوق حاصل ہیں جن میں عقیدہ اور مذہب کی آزادی اور اسی قسم کے دوسرے حقوق شامل ہیں یہ حقوق اگر ایگزیکیٹو کے رحم و کرم پر رہ گئے تو ملک میں جمہوری سماج کے لئے زبردست خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ اس لئے کہ کسی وقت بھی ایسی حکومت برسر اقتدار آسکتی ہے جو کسی فرد اور کسی کمیونٹی کے بنیادی حقوق کی قائل ہی نہ ہو۔ جن رہنماؤں نے ہندوستان کا آئین وضع کیا وہ بڑی دوربین نظر رکھتے تھے انہوں نے اس آئین میں ایسی بندشیں رکھ دیں کہ مطلق العنانیت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے تاکہ اگر کبھی ایسی پارٹیاں بھی برسر اقتدار آجائیں جو رجعت پسند تنگ نظر اور مذہبی جذبات سے متاثر ہونے والی ہوں تب بھی آئین کا احترام اپنی جگہ باقی رہے اور تمام فرقے اور طبقے برابر کی حیثیت سے اس ملک میں رہ سکیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "دستور ہند کے تحت اس ملک میں ایسا نظام حکومت قائم کیا گیا ہے کہ کوئی فرد کسی کمیونٹی کے اور کوئی کمیونٹی کسی فرد کے حقوق کو پامال نہ کرسکے تاآنکہ ایسا کرنا بہت ضروری ہو اور اس کے لئے اہم وجوہ موجود ہوں۔

پریوی پرسز کو ختم کرنے کا بل جو لوک سبھا میں منظور ہوچکا تھا خواہ راجیہ سبھا میں صرف ایک ہی ووٹ سے نامنظور کیوں نہ ہوا ہو وہ بہر حال ملک کی پارلیمنٹ میں نامنظور ہی سمجھا جائے گا ایسی صورت میں اچھا تھا کہ صدر کی طرف سے حکم جاری کرنے میں عجلت سے کام نہ لیا جاتا اور سپریم کورٹ سے مشورہ کر لیا جاتا لیکن یہ بھی ایک اچھی بات ہوئی۔ سپریم کورٹ نے اپنا یہ حق تسلیم کرالیا کہ اسے آئین کی وضاحت کرنے کا اختیار حاصل ہے علاوہ ازیں آنے والی حکومتوں کے لئے اس بات کا ایک انتباہ بھی ہے کہ وہ مطلق العنانہ پالیسی سے احتراز اور تمام فرقوں اور طبقوں کے ان بنیادی حقوق کا احترام کریں جو انکو حاصل ہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ "عظیم مغلوں یا برطانوی تاج کو جو اقتدار اعلیٰ حاصل تھا وہ صدر کو وراثت میں مل گیا ہے"۔ یہ اقتدار اعلیٰ جمہوریت میں کسی فرد یا کسی جماعت کو حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ مختلف اداروں میں تقسیم ہوتا ہے اگر یہ اس طرح سے تقسیم نہ ہو اور عوام کو کچھ بنیادی حقوق حاصل نہ ہوں یا ان حقوق میں پارلیمنٹ کو ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل ہو تو پھر جمہوریت کی جگہ ملک میں ڈکٹیٹر شپ لے لے گی اور جو پارٹی برسر اقتدار آجائے گی وہ اپنی من مانی کرسکے گی جس دن ایسا ہوا وہ دن ملک کی تاریخ میں ایک تاریک اور بہت ہی افسوسناک دن ہوگا۔ ان حالات میں اب سوال یہ ہے کہ سابق حکمرانوں کو صرف خاص کی رقمیں اور انہیں حاصل کچھ غیر جمہوری مراعات کس طرح ختم کی جائیں۔

اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ملک میں ایک اور آئین ساز اسمبلی از سر نو منتخب ہو جو ہندوستان کے لئے نئے حالات کے مطابق کوئی نیا آئین وضع کرے اور یا پھر سابق حکمرانوں کے ساتھ مذاکرات کئے جائیں اور باہمی بات چیت کے ذریعے کوئی ایسا حل نکالا جائے جس سے سابق حکمران بھی مطمئن ہوسکیں اور جمہوری اور سوشلسٹ سماج کے تقاضے بھی پورے ہوجائیں۔

جہاں تک معلوم ہے سابق حکمران بات چیت اور بقول خود "قربانی" کرنے اور اپنی مراعات سے محروم ہونے کے لئے تیار ہیں لیکن ظاہر ہے سپریم کورٹ کے فیصلے سے وہ اپنی پوزیشن کو مضبوط سمجھ رہے ہیں۔ اور اس لئے انکی شرطیں پہلے کے مقابلہ میں کچھ سخت ہی ہوں گی۔ اگرچہ سابق حکمرانوں کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ "جو چیز مناسب اور معقول ہوگی ہم اسے منظور کرلیں گے خواہ اس سے ہمیں نقصان ہی کیوں نہ پہونچے۔"

سابق حکمرانوں کے رویہ میں یہ تبدیلی ایک خوش آئند تبدیلی ہے جس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور دوستانہ فضا میں تمام مسائل طے ہونے چاہئیں۔ بلاشبہ سابق حکمرانوں کا ماضی جہاں تک عوام کا تعلق ہے کچھ اچھا نہیں رہا ان کے ظلم و ستم کی داستانیں تاریخ ہند میں سیاہ دھبے کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن کسی انتقامی کارروائی سے جسے پھر سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جاسکے حالات میں تناؤ پیدا ہوجائے گا اور یہ بات ملک کے مفاد کے خلاف ہوگی۔

لال قلعہ سے قطب مینار تک

دہلی ڈائری

دلی کے بازار کسی زمانے میں دنیا کے ارزاں ترین بازار ہونے کے علاوہ ایمانداری، خوش نمائی اور خوش خلقی کا گہوارا سمجھے جاتے تھے۔ بیرونی سیاحوں نے یہاں کے بازاروں پر سیر حاصل تبصرے کیے ہیں اور ان کی خوبیوں کو نہایت اچھے پیرایے میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن آج دلی کے بازار تین چار سو برس قبل تو کیا آزادی کے قبل کے بازاروں سے بھی مختلف ہیں۔ جو خوبیاں ان بازاروں کے بارے میں بیان کی گئی ہیں وہ سراسر برائیوں اور بدعنوانیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔

جہاں تک ان بازاروں میں فروخت ہونے والی اشیا کے ارزاں ہونے کا سوال ہے وہ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ یہاں عام طور پر تمام اشیا کے نرخ گاہک کی صورت اور لباس کو دیکھ کر بتائے جانے کا عام رواج ہے۔ یہی دستور حکیم ڈاکٹر جیسے معزز پیشہ وروں کا ہے جو مریض کی صورت اور لباس دیکھ کر ہی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ آج دلی دنیا کا سب سے مہنگا شہر ہے۔ کل کی سرائیں، جہاں قیام کے علاوہ طعام بھی مفت فراہم کیا جاتا تھا، اب ایسے ہوٹلوں کی شکل اختیار کر چکی ہیں جہاں شب گزاری کے لیے اوسطاً کم از کم پچاس روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ پرانی دلی کے معمولی ہوٹلوں سے لے کر نئی دلی کے اشوکا اور اوبے رائے کانٹی نینٹل میں ایک کمرے کا یومیہ کرایہ آٹھ روپے سے چار سو روپے یومیہ تک پہونچ چکا ہے۔ ان ہوٹلوں میں فروخت ہونے والی ہر چیز بازار سے دگنی یا سہ گنی قیمت پر فروخت کی جاتی ہے۔ ۲۰ پیسے کے سوڈے کی قیمت اشوکا ہوٹل میں ایک روپیہ سے کم نہیں۔ اسی طرح جامع مسجد کے اطراف شفاف ہوٹلوں میں جو کھانا شکم سیر ہو کر تین روپیہ میں کھایا جاتا ہے کناٹ پلیس میں دس روپے اور اوبے رائے کانٹی نینٹل میں ۳۰ روپے میں بھی نہیں کھایا جا سکتا۔

طعام و قیام کے علاوہ عام اشیا کا بھاؤ دلی کے تمام بازاروں میں مختلف ہے۔ کسی معمولی ہوٹل میں چائے کی پیالی کی قیمت پچیس تیس پیسے ہے۔ لیکن نئی دلی میں اسی ایک پیالی کی قیمت کہیں کہیں تین روپے تک پہونچ جاتی ہے۔ سبزی منڈی میں فروخت ہونے والی سبزی اور پھل قدم قدم پر اپنے بھاؤ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہی پھل اور سبزیاں نئی دلی پہونچ کر دوگنی قیمتوں میں فروخت کی جاتی ہیں یہی حال گوشت کا بھی ہے۔ گرمیوں کی شدت کے دوران ایک آنے کلو ملنے والا برف ایک روپیہ کلو بھی ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پان اور ماچس کی قیمتوں میں بھی تفاوت ہے۔ کناٹ پلیس میں پان کھانے والے ایک گاہک کو اپنی جیب بقدر تیس پیسے کے ہلکی کرنی پڑتی ہے جب کہ یہی پان چاندنی چوک میں دس پیسے میں مل جاتا ہے۔ نرخوں کی اس تبدیلی کا اثر اجنبیوں کے لیے تو اکثر بسا اوقات خود دلی کے رہنے بسنے والوں کے لیے ایک ایسا مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے جس کی تفصیلات میں جانے کے لیے سیکڑوں صفحات درکار ہیں۔

الغرض انسانی ضروریات سے متعلق جملہ اشیا کے نرخ دلی کے مختلف بازاروں میں مختلف ہیں۔ جس کا جو جی میں آتا ہے نرخ مقرر کر کے اشیائے ضروری فروخت کرتا رہتا ہے۔ پولیس، حکومت اور دیگر متعلقہ محکمہ جات کے افسران اس اندھیر گردی کے خلاف کارروائی کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس گریز کے اسباب ایسے راز ہیں جنھیں سربستہ نہیں کہا جا سکتا۔

دنیا بھر میں گراں ترین مارکیٹ ہونے کے علاوہ یہاں کے بازاروں کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ڈالڈا، مونگ پھلی کا تیل، مٹی، چاول، مٹی کا تیل، کوئلہ جیسی چیزیں یک لخت دم بازاروں سے غائب ہو جاتی ہیں اور خریداروں کو مجبور ہو کر ان کے منہ مانگے دام دینا پڑتے ہیں۔ ہند پاک جنگ کے دوران ان بازاروں میں کچھ ایسے گل کھلے کہ دنیا بھر میں سراسیمگی پھیل گئی کیٹی آدمیوں کو پیر کے روز شام کے وقت گیہوں کی روٹی کھاتے وقت گرفتار کر لیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو ایک بوتل مٹی کا تیل لے جانے کی سزا پچاس ساٹھ روپے کے قریب بھگتنا پڑی۔ سنیچر کو چاول کھانے کی پاداش میں پولیس چوکیوں کے چکر لگانے پڑے۔ کئی غیر ملکی نمائندے ان گرفتار شدگان سے ان کی گرفتاری کی یہ وجہ سُن کر چکرا گئے کہ وہ گیہوں کی روٹی کھا رہے تھے۔ بہت بڑے کنبے والے اس دوران بیس پچیس کلو گیہوں آٹا یا چاول لاتے ہوئے اپنے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے بجائے تہاڑ جیل کی چکیاں چلانے کے لیے پہونچا دیے گئے۔

اور اب بھی موسم گرما میں ماوا، ربڑی اور ایسی ہی دودھ کی بنی ہوئی چیزیں فروخت کرنا اور ان کا خریدنا مساوی جُرم قرار دیا جاتا ہے۔

ان ہی بازاروں میں شراب کا بازار بھی ہے۔ شراب منگل اور جمعے کے علاوہ عموماً تہواروں اور پہلی تاریخ کو بند کر دی جاتی ہے۔ شراب کے اوقات دوکانداری کے مقررہ اوقات سے آدھ گھنٹہ زیادہ ہیں۔ لیکن ان مقررہ اوقات کے علاوہ دلی کے ہر کوچہ و بازار میں شراب ملتی ہے، گانجا ملتا ہے، چرس ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ممنوعہ دنوں میں بھی خفیہ دکانوں پر عام نرخوں سے چار روپے سے دس روپیہ زیادہ پر ہر جگہ شراب کی بوتلوں کی خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے۔ یہ چور بازار کے بیوپاری دن رات اسی تگ و دو میں مصروف ہیں کہ دلی

باقی صفحہ ۴۲ پر

واقعات نئی دہلی

ہاشم حسن سعید (ایم اے عثمانیہ)

مردم شماری

اردو سماج کی تشکیل جدید کا سنہری موقع

ستان میں مردم شماری کا زمانہ سر پر آ پہونچا ہے
۱۹۷ء سے ملک بھر میں مردم شماری کا کام شروع
۔ اس موقع پر ہندوستانی عوام کے بارے میں سترہ
مات حاصل کی جائیں گی جنکا تعلق نام، عمر، مذہب
تعلیم اور پیشہ وغیرہ سے ہے اس مردم شماری
ملک کی صحیح آبادی کا اندازہ کیا جاسکے گا ،
یا جائے گا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے
ں کی تعداد کیا ہے۔ یوں تو تمام کی تمام مسلّمہ
لیئے یہ مردم شماری بڑی اہمیت کی حامل ہے
کی بنا پر ہر زبان کا لسانی موقف متعیّن ہوگا
خاص اُردو کے لیئے اس کی بہت اہمیت ہے
سے یہ اردو بولنے والوں کے لسانی شعور کا
ہے اور اسی کے نتیجہ پر سارے اردو معاشرہ کی تشکیل
نحصار ہے۔ ہمیں حکومت سے بہت سی شکائتیں
یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ مرکزی حکومت یا علاقائی
لسانی معصیت کا شکار ہیں اور اُردو کو ملک بدر
منصوبے پر عمل کر رہی ہیں۔ ملک کی مختلف
یاں اور مدارس سے اردو تعلیم کی سہولتیں ختم
ہیں۔ اور اُردو بولنے والوں کے ساتھ حصول ملاز
میں ناانصافی کی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ اور اسی
دوسری شکائتیں بڑی حد تک درست ہیں۔ لیکن
پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل
ذمہ داری حکومت پر کم اور اُردو داں طبقہ پر زیادہ

عائد ہوتی ہے مثلاً یہی دیکھئے کہ ہم اپنے بچوں کو بصد ناز و
افتخار انگلش میڈیم مدارس میں داخل کراتے ہیں بالخصوص
ایسے مشن اسکولوں میں جہاں اردو ثانوی زبان کی حیثیت
سے بھی نہیں پڑھائی جاتی چنانچہ جب یہی بچے اسکول سے
نکل کر کالجوں میں پہنچتے ہیں تو الف کا نام بھالا نہیں جانتے
اور مجبوراً انھیں ہندی یا کوئی اور زبان ثانوی زبان کی
حیثیت سے پڑھانا پڑتی ہے۔ اگر کالجوں میں اُردو پڑھنے
والے طلباء کی تعداد گھٹ رہی ہو یا کسی کالج سے اردو تعلیم
کی سہولت ختم کیجا رہی ہے تو اس کے لئے ہم کسی صورت
میں حکومت یا ارباب یونیورسٹی کو ذمہ دار قرار نہیں دے
سکتے۔ ہمارا لسانی شعور مردہ ہوچکا ہے اور ایک طرح سے ہم
لسانی احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُردو
لکھنے پڑھنے والے اپنے بچوں کو اُردو کی تعلیم دلوانے اور
اُردو کو اپنی مادری زبان ظاہر کرنے میں جھجکتے ہیں اور
اپنی اس جھجک اور احساس کمتری کی تاویلات مختلف
طریقے پر پیش کرتے ہیں۔ ہم میں اس اخلاقی جرأت کی بڑی
کمی ہے۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے کہ حق و صداقت کے لئے
آواز بلند کریں اور دستور کے تحت جو حقوق اور مراعات
ہمیں حاصل ہیں ان سے استفادہ حاصل کریں وہاں تو
سیاسی مصلحتوں یا ذاتی مفادات کے تحت کچھ نہیں کرتے
اس کی بجائے بعد میں حکومت پر جا بے جا اعتراض کرتے
رہتے ہیں۔ ان اعتراضات یا نعرہ بازیوں کا مقصد اپنے
آپ کو اُردو کا سچا بہی خواہ ظاہر کر کے سوائے سستی شہرت

حاصل کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

ہمارے اس رجحان سے اُردو کو جتنا نقصان پہونچ رہا ہے اتنا اُردو کے بدترین مخالفین اور کٹر "جن سنگھیانہ" ذہنیت رکھنے والے افراد سے بھی پہونچنے کی توقع نہیں — من جملہ اور شکایتوں کے ہماری ایک بڑی شکایت حکومت سے یہ ہے کہ اُردو کو اُردو کی جنم بھومی میں سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں پس و پیش اور تردد کیا جارہا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ۵۴ کروڑ کے اس آبادی والے ملک میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد ایک قریبی اندازے کے مطابق ½ ۱۲ کروڑ ہے اردو کی کوئی علیحدہ ریاست نہیں ہے۔ کشمیر میں بھی جس کو خاص اردو کا علاقہ سمجھا جاتا تھا اب آہستہ آہستہ وہاں کی مقامی زبانیں کشمیری، ڈوگری وغیرہ سر اٹھارہی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان ہی میں سے کوئی ایک اُردو کو بے دخل کر کے وہاں کی مستقل علاقائی زبان کی حیثیت اختیار کرلے۔

اُردو بولنے والوں کی کثیر تعداد دہلی، اتر پردیش، بہار مدھیہ پردیش، اڑیسہ، میسور، اور آندھرا پردیش میں موجود ہے اور اُردو کو کم از کم ان علاقوں کی دوسری علاقائی زبان بننا چاہیے۔ لیکن ایسا اس لئے نہیں ہوسکا کہ گذشتہ مردم شماری کے موقع پر اُردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے زمانہ سازی سے کام لیتے ہوئے اپنی مادری زبان اردو کی بجائے ہندی لکھوائی تھی جس کے نتیجہ میں تقریباً ہر ریاست

ہیں ان کا لسانی موقف متاثر ہوگیا اور وہ کسی جگہ اکثریت میں نہیں رہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سارے ہندوستان میں اُردو کو اپنی مادری زبان لکھوانے والوں کی تعداد صرف سوا کروڑ ہے۔ ظاہر ہے غلطی ہماری اپنی ہے اسلئے حکومت سے گلہ شکوہ کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا ہے

آج جبکہ ہندوستان میں پھر مردم شماری ہونے والی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں اور اس غلطی کا اعادہ نہ ہونے دیں جو پچھلی دفعہ ہم سے ہوئی تھی۔ ہم یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ اردو کا مستقبل حکومت کے ہاتھ میں نہیں صرف ہمارے ہاتھ میں ہے ہم ہی چاہیں تو اُردو کو مٹا سکتے ہیں اور اگر مٹ رہی ہو تو بچا سکتے ہیں۔ اب ہمارا، ہمارے علمی اداروں اور ادبی انجمنوں کا فرض ہے کہ رائے عامہ کو متحرک کرنے کے لئے اپنے تمام تر اختلافات اور ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر ایک مشترک پلیٹ فارم سے "مردم شماری میں اُردو مادری زبان لکھوائیے" کی مہم منظم طریقے پر چلائیں۔ اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کریں۔ اسی طرح ہماری پچھلی غلطیوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور اسی میں اُردو کی بقاء، ترقی اور سلامتی ہے۔ اب ہم کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے کہ ہمارا "اُردو ریاست کا خواب" اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جب کہ ہم میں سے ہر ایک شخص جوان، بچہ، بوڑھا، مرد، عورت بلا ایل و حجت مردم شماری میں اپنی مادری زبان "اردو" لکھوادے۔

اس سلسلے میں شاید بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں کہ مردم شماری کا پہلا مرحلہ "خانہ شماری" ہے جس کے تحت تمام مکانوں اور رہائش گاہوں کا نئے سرے سے شمار کیا جائے گا اور نو تعمیر شدہ مکانات کی نمبر اندازی کی جائے گی۔

ہر مکان میں کتنے خاندان رہتے ہیں اور ہر خاندان کتنے افراد پر مشتمل ہے اس کی تفصیلات معلوم کی جائیں گی یہ کام جو مردم شماری کی بنیاد ہے ۱۵ر دسمبر سے شروع ہو کر ۱۴ر دسمبر تک تکمیل پا جائے گا۔ خانہ شماری میں شامل ہونے والے کارکن تمام مکانات پر سہولت کی غرض سے پنسل کوئلہ یا تارکول سے کوئی نشان بنا دیا کرتے ہیں اور مردم شماری کے

خاموشی سے بس گھما کر چڑیا گھر لے چلو — ورنہ .....

موقع پر صرف ان ہی مکانات کے افرادِ خاندان کا شمار کیا جاتا ہے جن پر خانہ شماری کرنے والوں نے کوئی نشان بنایا ہو۔ اس لئے ہمیں چوکس رہنا چاہئے کہ ہمارا مکان کہیں شمار ہونے سے رہ نہ گیا ہو۔ اگر دسمبر کی ۲۸ر تاریخ تک ہمارے مکان پر کوئی نشان نہ دکھائی دے تو ہم سمجھ لیں کہ اس بار ہمارا شمار "مردم شماری" میں ہونے والا نہیں ہے، اس کی اطلاع فوراً ہی مردم شماری آفیسر کو دینا چاہئے نیز مردم شماری کے وقت جو انفرادی پرچہ (INDIVIDUAL - SLIP) ہر فرد کو دیا جاتا ہے اس کی خانہ پری میں خاص احتیاط برتی جائے۔ اگر شمار کنندہ اپنا کوئی غلط مشورہ ہم پر مسلط کرنا چاہتا ہے تو اس کی رپورٹ اسی وقت متعلق عہدہ داروں کو کیجائے۔ یہ اور اسی قسم کی شکایات کے انسداد کے لئے اور "مردم شماری میں اُردو اپنی مادری زبان لکھوائیے" کی تحریک باقاعدہ طور پر چلانے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ایک جامع اور منظم پروگرام ترتیب دیں۔ اس پروگرام کے چند اہم خدوخال یہ ہیں انہیں خطوط پر ہم کام کرکے اپنے لسانی شعور کے بیدار ہونے کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

۱۔ ہر ریاست میں شہروں اور اضلاع کی تمام انجمنیں اور ادارے متحد ہو کر ایک مرکزی مردم شماری کمیٹی یا رابطہ کمیٹی کے تحت محلہ واری اساس پر کام کریں۔

۲۔ مردم شماری کے موقع پر جہاں کہیں ناانصافی ہوئی ہو وہاں کمیٹی کے ارکان پہونچ کر فوری معاملہ

۳۔ "اُردو مادری زبان لکھوائیے" مہم کے اخباروں میں کم از کم ہفتے میں دو بار اعلان جائیں اور یہ کام ابھی سے شروع ہونا چاہئے

۴۔ اس سلسلے میں کثیر تعداد میں ورقیے او کر سنیما ہالوں اور پبلک مقامات پر تقسیم یہ ورقیے صرف اُردو ہی میں نہ ہوں بلکہ ہند اور مقامی زبانوں میں بھی شائع کئے جائیں۔

۵۔ اگر ممکن ہو تو سنیما سلائیڈز کے ذریعہ انتظام کریں۔

۶۔ بڑے بڑے پوسٹر شہروں کی گنجان آ حصوں میں نمایاں جگہ پر چسپاں کئے جائیں۔

۷۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے اور اُردو کے بہی خواہوں سے درخواست کی ج کی مالی اعانت فرمائیں۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تجاویز جو ہمار ہیں کس حد تک عملی جامہ پہنتی ہیں۔ یہ تو وقت کرے گا کہ یہ ہوائی قلعے ثابت ہوتی ہیں یا اُردو دا خوابیدہ شعور کو مہمیز کرکے اُردو معاشرے کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں۔

نیتاجی زندہ ہیں؟

ناوک حمزہ پوری

آج ایسا کون ہے جو ہندوستان کے لائق فخر سپوت اور جنگ آزادی کے جاں باز سپاہی نیتاجی سبھاش چندر بوس سے ناواقف ہوگا۔ انکی روپوشی ابتک ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ اُن کی موت و حیات کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا دشوار ہے ویسے انکی موت کی تحقیقات کے لیے مقرر کمیشن کے سربراہ جنرل شاہ نواز خاں نے ۱۹۵۶ء میں انکی موت کی تصدیق کردی تھی۔ اور تاریخ کا یہ باب ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا سا لگتا تھا لیکن حالات نے کروٹ لی اور اب پھر از سرِ نو پنجاب ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب جی ڈی کھوسلا کو اس امر کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ انھوں نے ۱۶ر اکتوبر، ۱۹۷۰ء سے اپنا کام شروع بھی کردیا ہے۔

اس کمیشن کے سامنے ابتک جنرل شاہ نواز خاں، ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا، نیتاجی کے بڑے بھائی سریش چندر بوس اور کئی دوسرے لوگوں کے بیانات ہوچکے ہیں۔

اس راز سے اب پردہ اٹھا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جہاز کے حادثے میں نیتاجی کی مبینہ موت کے بعد انگریزی سرکار نے امریکہ کے خفیہ محکمہ سے اس کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کو کہا تھا اور مذکورہ محکمہ نے انگلش سرکار کو معلومات فراہم کی تھیں نیز یہ کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت نے بھی اپنے خفیہ محکمہ کے لوگوں کو تحقیقات کے لیے جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں میں بھیجا تھا۔ آخر یہ ساری رپورٹیں کہاں ہیں اور کیوں نہیں کھوسلہ کمیشن کے سامنے رکھ دی جاتیں؟ ایسا کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے جاتے جاتے اس سے متعلقہ کچھ فائلیں جلا ڈالی تھیں لیکن کچھ کا مطلب ساری فائلیں نہیں ہوتا۔ باقی ماندہ کاغذات ہی کمیشن کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل اپنے دو معتبر آدمیوں پرپھل چندر سین اور بلا پرشاد چالیہا کو نیتاجی کا پتہ چلانے کے لئے بھیجا تھا۔ تو کیا اس وقت تک خود پنڈت نہرو کو نیتاجی کی موت کا یقین نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان لوگوں نے کیا پتہ لگایا۔ پنڈت جی تو اب نہیں ہیں۔ لیکن یہ دونوں حضرات موجود ہیں کیا یہ قوم کے سامنے اپنی تحقیقات کا خلاصہ رکھ سکیں گے؟

نیتاجی کے ساتھ رضاکار کی حیثیت سے کام کئے ہوئے ایک شخص کے پاپی رگوسوامی نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے نیتاجی کو الٰہ آباد کے خسرو باغ میں سادھو کے بھیس میں ایک بار دیکھا تھا۔ کیا یہ حقیقت ہے۔؟

شری پرن سین گپتا نے روزنامہ "امرت بازار پتریکا" میں اپنے ایک مضمون میں دعوے کیا ہے کہ انھیں تین اشخاص نے فوٹوؤں کے ساتھ یہ خبر دی ہے کہ نیتاجی زندہ ہیں ان میں سے ایک پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔

نیتاجی کی موت کی خبر ٹوکیو ریڈیو سے ان کی مبینہ موت کے پانچ دن بعد کیوں نشر کی گئی۔ یہ بات ایسی ہے کہ اس سے جنرل میک آرتھر جیسا شخص بھی شبہ میں پڑ گیا تھا اور انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بذریعہ تار اپنے اس شبہ کی اطلاع بھی دی تھی۔

۲ر ستمبر ۱۹۴۵ء کے لندن "سنڈے آبزرور" میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "نیتاجی کی موت کی کہانی پر شبہ ظاہر کرنے کی بے انتہا گنجائش موجود ہے" اس سلسلے میں صورت حال کا پتہ لگانے کی کوئی کوشش نہ ہوئی۔

۲۰ر جنوری ۱۹۵۵ء کے "امرت بازار پتریکا" میں چنتامنی نام کے ایک شخص نے ایک ریڈیو نشریہ شائع کرایا تھا جسکے متعلق اس نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ پیغام خود نیتاجی نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۶ء کو منچوریا سے نشر کیا تھا۔ پیغام کچھ اس طرح بتایا گیا ہے "میں سبھاش چندر بوس بول رہا ہوں، جے ہند! اپنی روپوشی کے بعد میں یہ تیسری بار اپنے ہندوستانی بھائی بہنوں سے مخاطب ہوں، عنقریب بھارت کو آزادی مل جائے گی اور اس کے بعد ہی میں سودیش لوٹ آؤں گا۔"

کچھ لوگ مانتے ہیں کہ منچوریا سے نیتاجی روس چلے گئے اس بات کو اس خبر سے تقویت ملتی ہے کہ روس میں ہندوستانی سفیر مسز لکشمی پنڈت سے نیتاجی کی ملاقات ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے کہ جب وجے لکشمی پنڈت نے ایک مجلس میں یہ کہنا شروع کیا کہ میں ایک ایسے راز پر سے پردہ اٹھانے والی ہوں جسکو سن کر سارے لوگ غرق حیرت ہوجائیں گے تو پنڈت نہرو نے انھیں ڈانٹ کر چپ کرادیا۔

۱۹۴۸ء میں روس کے اپنے ایک سفر سے واپس آنے پر پنڈت نہرو نے ایک حکم جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ساری عوامی عمارتوں سے نیتاجی کی تصویریں ہٹادی جائیں۔ یہ حکم کس بنا پر تھا۔؟

پریس ٹرسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا (جو برن میں ہندوستانی سفارت خانے کے فرسٹ سیکریٹری رہ چکے ہیں) نے بتایا ہے کہ انھیں یہ خبر ملی ہے کہ نیتاجی سائبیریا کی روسی جیل میں ہیں۔

ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا نے اس امر کا انکشاف بھی کیا ہے کہ پیکنگ کے ہندوستانی سفارتخانے کے ایک افسر بریگیڈیر ٹھیکر کا عہدہ صرف اس لئے گھٹادیا گیا ہے کہ اس نے دو قوم پرست چینیوں سے گفتگو کی اور بھارت سرکار کو اپنی یہ رپورٹ بھیجی کہ نیتاجی روسی قیدخانے میں زندہ ہیں اور ہندوستان آنا چاہتے ہیں۔

شری ہری وشنو کامتھ نے کمیشن سے درخواست کی ہے کہ وہ تحقیقات میں تائی وان سے مدد لے۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ تائی وان نے انکی درخواست پر تائی پیہہ میں نیتاجی کی جہاز کے حادثہ میں مبینہ موت کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ اور انھیں مطلع کیا تھا کہ تحقیقات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تائی وان کے غیر ملکی معاملے کے ایک افسر مسٹر لن نے انھیں ۱۹۶۶ء میں آگاہ کیا کہ کوئی ایسا حتمی ثبوت نہیں ملا کہ اس تاریخ کو تائی پیہہ میں حادثہ رونما ہوا۔

ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا نے کہا ہے کہ انھیں یہ پختہ خبر ہے کہ ۱۹۴۶ء کے موسم سرما سے لیکر ۱۹۵۰ء تک نیتاجی سائبیریا کی جیل میں تھے۔ اس کے بعد نیتاجی کے متعلق انھیں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

نیتاجی کے بڑے بھائی سریش چندر بوس نے بتلایا ہے کہ شاہ نواز کمیشن کے وہ ایک ممبر تھے اور اس کمیشن کی رائے سے انھوں نے اختلاف کیا تھا لیکن جب کمیٹی نے ان کی رائے کو کوئی

باقی ص۴۲ پر

آر-ایس-ایس کے رہنما اور جنگِ آزادی

محمد شاہد عظیم

ہمارے قومی قائدین کے خلاف ہندو فرقہ پرستوں کا بنیادی الزام یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کا بٹوارہ قبول کرکے ملک سے بیوفائی کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کی غیر ضروری طور پر دلجوئی کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کو بگاڑنے کا تعلق ہے گاندھی جی کو ملزم نمبر ا گردانا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہماری قیادت نے جداگانہ انتخاب کے اصولوں کو مان کر فاش غلطی کی جس کے نتیجے میں مسلم فرقہ پرستی کی ہمت افزائی ہوئی لیکن گاندھی جی پر تنقیدیں کرتے ہوئے بعض تاریخی حقائق کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ آنجہانی گوپال کرشن گوکھلے ہی تھے جنھوں نے سو سال قبل ۱۸۷۰ء میں مارلے منٹو اصلاحات کی تائید کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے اصول کو سب سے پہلے تسلیم کیا تھا۔ دوسرے لوکمانیہ تلک تھے جنھوں نے ۱۹۱۶ء میں انھیں خطوط پر چلتے ہوئے لکھنؤ پیکٹ کی تائید کی تھی۔ لکھنؤ میں کانگریس سیشن کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ ”مسلمانوں کو اپنے طور پر حکومت چلانے کے اختیارات دیے جانے چاہئیں، اس طرح ہماری جدوجہد تین طرفہ نہیں رہے گی جیسی کہ آج ہے۔“

یہ بات واقعی حیرتناک ہے کہ گاندھی جی کو اپنے مذموم حملوں کا نشانہ بنانے والے فرقہ پرست گوکھلے اور لوکمانیہ تلک کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ آر ایس ایس کے سرسنچالک گولوالکر مسلمانوں کو بنیادی طور پر اس لیے فرقہ پرست قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تھا۔ یہاں اس بات کو بھلا دیا گیا ہے کہ وہاں جداگانہ انتخاب کسی مطالبے کے بغیر کرایا گیا تھا۔ یہ انگریزوں کی ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ والی پالیسی کا ایک حصہ تھا صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے اپنے تمام مقبوضہ علاقوں میں اس حربے کو استعمال کیا تھا۔ مثلاً سیلون میں بدھسٹوں اور ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بدھسٹوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو جداگانہ انتخاب کا اختیار دیا گیا تھا۔

بقول ڈاکٹر رام منوہر لوہیا سردار پٹیل اور جواہرلال نہرو وہ بنیادی مجرم ہیں جنھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جس کے نتیجے میں ملک کا بٹوارہ ناگزیر ہو گیا تھا فرقہ پرست تقسیم کی ساری ذمہ داری گاندھی جی کے سر تھوپنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جب کہ آخر وقت تک انھوں نے اس تقسیم کی مخالفت کی تھی۔ ڈاکٹر لوہیا اس بات میں ایقان رکھتے تھے کہ اگر ان میں سے کسی ایک فرد نے بھی، خواہ وہ پٹیل ہوں یا نہرو، گاندھی جی کا ساتھ دیا ہوتا تو کبھی بھی وہ تقسیم کو قبول نہ کرتے۔ بادشاہ خاں نے ایک جگہ اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں، جس میں خود انھوں نے شرکت کی تھی، راجہ جی اور سردار پٹیل ہندوستان کی مجوزہ تقسیم کے سلسلے میں دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بادشاہ خاں نے اس موقع پر یہ اعتراض کیا تھا کہ جناح اپنے مطالبے پر اٹل ہیں کہ وہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ علاقے کریں گے جب کہ کانگریس نے ایسا کوئی موقف اختیار نہیں کیا ہے۔ دراصل یہی وہ تذبذب تھا جو بعد میں ہندوستان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

شری۔ کے۔ ایم۔ منشی کا کہنا ہے کہ وہ تمام افراد جو کبھی اکھنڈ بھارت کے کٹر حامی تھے تقسیم کے مطالبے کی تائید میں محض سردار پٹیل کی تاویلات کی بنا پر انھیں اپنے خیالات بدلنے پڑے اور انگریزوں نے قیام پاکستان کا مطالبہ مان لیا۔ گاندھی جی کے قاتل گوڈسے نے قیام پاکستان کے واقعے کا ایک ڈرامے کی حیثیت سے ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی کو اس کا ”ویلن“ قرار دیا ہے۔ گوڈسے کو آر۔ ایس۔ ایس سے یہ شکایت ہے کہ جب ملک کی تقسیم ہو رہی تھی تو اس وقت آر۔ ایس۔ ایس۔ نے اپنی آواز کیوں نہیں بلند کی۔ آر۔ ایس۔ ایس کو لازم تھا کہ وہ انگریزوں سے لڑے لیکن گوڈسے نے یہاں ایک بات کو بھلا دیا ہے کہ آر ایس۔ ایس۔ کی ایسی کوئی روایت نہیں ہے کہ اس نے کبھی انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں حصہ لیا ہو۔ ہندو فرقہ پرستوں کی استعداد کا ذکر کرتے ہوئے نیتاجی سبھاش چندر بوس نے اپنی کتاب ”ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی“ میں ایک جگہ یوں لکھا ہے کہ ”ہندو مہاسبھا دیگر مسلمانوں کی طرح صرف پرانے قوم پرستوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس سے ایسے ہزاروں افراد بھی وابستہ ہیں جو کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینے سے ڈرتے ہیں۔ تاہم وہ اپنے لیے ایک محفوظ پلیٹ فارم چاہتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ پرست تنظیموں کے اضافے سے دونوں فرقوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی میں اضافہ ہوگا۔

نیتاجی کا یہ اقتباس آج خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ ان دنوں بعض فرقہ پرست نیتاجی سے اپنے گہرے خلوص کا اظہار کر رہے ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی دعویٰ ہے کہ تمام قومی قائدین میں نیتاجی ان سے زیادہ قریب ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس خلوص کی بنیاد گاندھی جی اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کے نظریات پر رکھی گئی ہے۔ نیتاجی کے سیاسی نظریات اگرچہ مہاتما گاندھی سے الگ رہے ہیں۔ تاہم جہاں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کا تعلق ہے دونوں کا عام رویہ یکساں رہا ہے۔ ہندو فرقہ پرستوں کی مہاتما گاندھی سے مخاصمت تقسیمِ ملک ہی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ مہاتما گاندھی کے فرقہ وارانہ اتحاد کی پالیسی کی بنا پر ۱۹۲۳ء سے ہی ان پر تنقیدیں کی جاتی رہی ہیں۔ ایسی تنقیدیں خود ویر ساورکر نے کی تھیں۔ گاندھی جی نے عام سیاسی بیداری کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو ناگزیر قرار دیا تھا۔ ہندوستان کی تحریک جدوجہدِ آزادی کو مہاتما گاندھی نے جو اہم عطیہ دیا ہے وہ عام سیاسی بیداری ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نیتاجی اس نقطۂ نظر میں جہاں مہاتما گاندھی کے ہم خیال تھے وہیں ویر ساورکر نے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ غرض اس حقیقت کا واضح طور پر اظہار کیا جا سکتا ہے کہ جدوجہدِ آزادی کی تحریک کے دوران فرقہ پرستوں کا رویہ منفی رہا اور آج آزادی کے بعد وہ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کر کے سیاسی طور پر اپنے وجود کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

●●

ایک جائزہ

بنکاک میں چھٹے ایشیائی کھیل

ایشیائی کھیلوں میں گولڈ میڈل جیتنے والی پہلی ہندوستانی لڑکی کمل جیت سندھو اور دوسرے ہندوستانی کھلاڑی راشٹرپتی بھون میں صدر گری کے ساتھ۔

پچھلے دنوں ایشیا کے تمام لوگوں کی نظریں بنکاک کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں چھٹے ایشیائی کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ ہندوستانی کھلاڑیوں نے اس مرتبہ کافی کھیلوں میں حصہ لیا تھا۔ اس لئے کھیل میں ہندوستانیوں کی دلچسپی ایک قدرتی امر تھا۔

اولمپک کھیلوں میں پاکستانی ہاکی ٹیم کی فتح کے بعد سے ہی ہندوستانی کھلاڑیوں نے ایشیائی کھیلوں کے لئے تیاری شروع کر دی تھی، اپنے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لینے کا اس سے اچھا موقعہ ہندوستانی ہاکی ٹیم کو اور کہاں مل سکتا تھا۔ چنانچہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بنکاک میں ہندوستان کا کھیل پاکستان سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک بار پھر قسمت نے ہندوستانی کھلاڑیوں کا ساتھ نہیں دیا۔

بنکاک کا ہاکی اسٹیڈیم ہندوستانی اور پاکستانی باشندوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دونوں طرف سے حلق پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے جا رہے تھے کھیل شروع ہونے کے بعد کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ اور واقعی کھیل تھا بھی ایسا ہی شاید پچھلے دس سال میں اولمپک اور ایشیائی کھیلوں میں ہاکی کا اتنا عمدہ کھیل دیکھنے کو نہ ملا ہو، دونوں ٹیمیں برابر کا کھیل، کھیل رہی تھیں۔ ایک طرف پاکستان کے مشاق اور تجربہ کار کھلاڑی تھے اور دوسری طرف ہندوستان کے نوجوان اور پھرتیلے کھلاڑی۔ ستر منٹ تک کھیل چلتا رہا لیکن کوئی ٹیم گول نہیں کر پائی۔ دونوں طرف سے کوشش تو بہت ہوئی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پندرہ منٹ کے زائد وقفے کے باوجود کوئی گول نہ ہو سکا اس لیے پندرہ منٹ اور دیے گئے لیکن کھیل ختم ہونے سے دو منٹ پہلے وہ لمحہ بھی آ گیا جس نے گولڈ میڈل کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ پاکستان کا سینٹر فارورڈ، رشید پٹھان تیزی کے ساتھ گیند لیکر آگے بڑھا اور تقریباً تین گز دور سے گول کر دیا اور تمام پاکستانی کھلاڑی مغرب کی طرف رخ کر کے سجدے میں گر پڑے۔

گول نے ہار اور جیت کا فیصلہ تو ضرور کر دیا لیکن اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ بہتر کھیل کس ٹیم کا تھا۔ سچائی یہ ہے کہ دونوں ٹیموں نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اور ان کے کھیل کو ہندسوں میں نہیں بلکہ صرف کھیل کے میدان ہی میں دیکھا جا سکتا تھا

سونے کا تمغہ حاصل کرنے والے ہندوستانی پہلوان چنگی رام اور کمل جیت سندھو

دھلی میں پروین کمار کو ان کے چاھنے والوں نے کندھے پر اٹھالیا

تاہم ایک بات طے ہے کہ ہندوستانی ہاکی ٹیم نے یہاں میکسیکو اولمپک سے زیادہ بہتر کھیل کا مظاہرہ کیا۔

ہندوستان ہاکی کا گولڈ میڈل تو نہ حاصل کر سکا لیکن دوسرے بہت سے کھیلوں میں اس کے کھلاڑیوں نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ کمل جیت سندھو نے چار سو میٹر کی دوڑ میں سونے کا تمغہ جیت کر ایشین کھیلوں میں تمغہ جیتنے والی پہلی ہندوستانی عورت ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ہندوستانی باکسر ہوا سنگھ نے غیر متوقع طور پر ہیوی ویٹ باکسنگ میں سونے کا تمغہ حاصل کیا، جبکہ دوسرے ہندوستانی باکسر منو سوامی نے پاکستان کے سلامیر کو ہرا کر فیدر ویٹ میں چاندی کا تمغہ جیتا۔

ہندوستانی فٹ بال ٹیم نے بھی اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ مرڈیکا میں کمزور کھیل کے بعد فٹ بال ٹیم نے ہمیں بہت نا امید کر دیا تھا۔ لیکن لگتا ہے کہ مرڈیکا کے بعد کوچ پاشا نے نئے کھلاڑیوں پر بہت محنت کی۔ ہندوستان نے تھائی لینڈ کے ساتھ (۲-۲) برابر کیا۔ پھر جنوبی ویٹ نام کو ۵-۲ سے ہرایا۔ اس کے بعد مرڈیکا چیمپئن انڈونیشیا کو ۰-۲ سے ہرایا۔ لیکن ایشین چیمپئن برما سے ۰-۲ سے ہار گئی۔ اس کے بعد ہندوستانی ٹیم نے اولمپک کے نمبر تین ملک جاپان کو ہرا کر کانسے کا میڈل حاصل کر لیا۔

ہندوستان میں شاید زیادہ تر لوگ واٹر پولو کے نام تک سے واقف نہ ہوں۔ اس کے باوجود ہندوستان نے اس کھیل میں بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کر کے کانسے کا تمغہ حاصل کیا۔

کشتیوں کے نتائج بھی کچھ زیادہ برے نہیں رہے۔ چندگی رام نے سونے کا تمغہ، جیت سنگھ نے چاندی کا اور ادم پرکاش، مختیار سنگھ اور نیتر پال نے کانسے کے تمغے حاصل کئے۔

جہاں ایک طرف ہم نے بہت سی کامیابیاں حاصل کیں وہاں دوسری طرف بہت سی ناکامیاں بھی ہمارے حصے میں آئیں۔ ہماری باسکٹ بال ٹیم بری طرح ناکام ہوئی۔ ہماری سائیکلنگ ٹیم جس کا بہت شور تھا مذاق بن گئی۔

کل ملا کر ہندوستان نے ۶ سونے کے ۹ چاندی کے اور ۱۰ کانسے کے تمغے حاصل کئے۔ اس طرح ہندوستان کا نمبر پانچواں رہا۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندوستانی کھلاڑیوں نے پہلی بار ہاکی اور کشتی کے علاوہ دوسرے کھیلوں میں بھی بہت سے تمغے حاصل کئے۔

مہندر سنگھ ۔ سنہری چھلانگ

حاصل کردہ تمغے

ملک	سونے کے	چاندی کے	کانسے کے
جاپان	۷۴	۴۷	۲۳
جنوبی کوریا	۱۸	۱۳	۲۳
تھائی لینڈ	۹	۱۷	۱۳
ایران	۹	۷	۷
ہندوستان	۶	۹	۱۰
اسرائیل	۶	۶	۵
ملیشیا	۵	۱	۷
برما	۳	۲	۷
انڈونیشیا	۲	۵	۱۳
سیلون	۲	۲	۰
فلپائن	۱	۹	۱۲
تائیوان	۱	۵	۱۲
پاکستان	۱	۲	[illegible]
سنگاپور	۰	۶	[illegible]
کمبوڈیا	۰	۲	[illegible]
جنوبی ویتنام	۰	۰	۲

آج سے لگ بھگ تین سو سال پہلے تیرہ سو روپے میں کلکتہ کا تمام علاقہ فروخت کرنے والے شخص کے خاندان کے کچھ افراد کس مپرسی کی حالت میں ایک نزدیکی بستی پاری شاہ میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کے پاس پہننے کے لئے چیتھڑے اور رہنے کے لئے پرانے زمانے کے ایک شومندر کا کھنڈر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک بزرگ نے جس کا نام لکشمی کانت ودیا دھر تھا انگریزوں کی جعل سازی اور دباؤ کے زیر اثر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں کلکتہ کا علاقہ تیرہ سو روپے میں فروخت کر دیا تھا۔

یہ علاقہ ودیا دھر کے پردادا کو شہنشاہ اکبر نے حسن خدمات کے صلہ میں عطا کیا تھا اور اسے موجہدار (مجموعہ دار) کے منصب سے بھی نوازا تھا۔ اس علاقے میں کالی گھاٹ، گوبند پور اور ستانتی تین گاؤں شامل تھے۔

ودیا دھر نے حکمت عملی سے اس جاگیر کے جنگلوں کو کٹوا کر رہائش کے لئے مکانات بنوائے اور پوجا پاٹ کے لئے شومندر۔ اس کے علاوہ تجارت کے لئے ایک تجارتی منڈی کی بھی بنیاد رکھی۔ اس منڈی کی عمارتیں مکمل ہونے کی خبر قریب وجوار میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ تجارت پیشہ لوگوں نے جوق در جوق اس منڈی کی طرف رخ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ منڈی روئی کی خرید و فروخت کا مرکز بن گئی۔

ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندے ہندوستان میں اپنے قدم جمانے میں مصروف تھے۔ اسی عرصہ میں کمپنی کا ایک ملازم جس کا نام جوب چارنوک تھا اس منڈی کی شہرت سن کر سیاح کی حیثیت سے یہاں وارد ہوا۔ دریائے ہگلی کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے چارنوک کی عقابی نظریں بھانپ گئیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہونے کی صورت میں یہ منڈی ان کی قسمت بنا دے گی۔

ذہن میں ساری تجویز کا خاکہ تیار کر کے چارنوک واپس مدراس چلا گیا اور وہاں کمپنی کے دوسرے سربراہوں کے ساتھ اس خصوص میں مفصل بحث کی۔

جنوبی ہند میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان کچھ عرصے کے لئے لڑائیاں بند ہو گئیں تو چارنوک ۲۴ر اگست ۱۶۹۰ء کو ستانتی جا پہونچا۔

کلکتہ کی تاریخ ۲۴ر اگست ۱۶۹۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ چارنوک ۱۰ر جنوری ۱۶۹۳ء کو فوت ہو گیا تھا لیکن اسے اس بات سے بہت سکون حاصل ہوا کہ اس نے اس علاقے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاؤں جمانے کے لئے زمین ہموار کر دی ہے۔

ستانتی کو قبضہ میں لینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا اگلا قدم اس کے نواحی علاقوں میں اپنے پیر پھیلانا تھا۔ ان تجاویز کو مد نظر رکھ کر کمپنی کی بنگال کونسل نے لندن میں ڈائرکٹروں کو ۲۴ر دسمبر ۱۶۹۳ء کو ایک مراسلہ ارسال کیا جس میں درج تھا "چارنوک کی وفات نے یہاں ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے، جس کی وجہ سے اس علاقے پر پورا قبضہ کرنے کے تمام ذرائع ختم ہو چکے ہیں خاص کر نواب کے دیوان کی موجودگی میں یہ بات ناممکن ہے۔ اگرچہ کوششیں جاری ہیں کہ کسی طرح ستانتی کے گرد و نواح کی بستیوں کو دو ہزار روپے سالانہ ادھار پٹے پر لے لیا جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو امید واثق ہے کہ ستانتی گاؤں کی اہمیت بڑھ جائے گی اور کمپنی کے سالانہ مالیہ میں اضافہ ہو جائے گا۔ حال ہی میں ستانتی کی منڈی سے جو محصول وصول ہوا وہ دو سو روپے ماہوار ہے جب کہ اس سے پہلے کبھی تیس روپے سے زیادہ رقم حاصل نہیں ہوئی۔"

بنگال کونسل کے اس مراسلے کے جواب میں لندن سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹروں نے لکھا۔

"ستانتی کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر اطمینان ہوا لیکن اس سلسلے میں اس حکم کا اجرا ہوگا کہ آئندہ کمپنی کا کوئی ملازم زمین کے لین دین سے سروکار نہ رکھے ایسا کام بورڈ آف ڈائرکٹرز کی رضامندی بغیر غیر قانونی ہوگا۔ کمپنی آئندہ ان حرکات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھے گی۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ کلکتہ کے پرانے علاقے کے مالکان رائے چودھری اور کمپنی کے کارندوں کے درمیان دوستانہ تھا لیکن اس کے باوجود اپنے علاقے کی چپہ بھر زمین سے بھی دستبردار ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے رائے چودھری ودیا دھر انگریزوں کے جال میں پھنس گیا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ ستانتی کا علاقہ آنے والے دنوں میں کلکتہ نام سے انگریزی سامراجیت کا دوسرا مرکز بنے گا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال برانچ کے ایک سربراہ کی لکھی ہوئی ڈائری مورخہ ، مارچ ۱۶۹۸ء کے مندرجہ ذیل واقعہ سے تمام حالات کا صحیح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

"انتہائی کوششوں کے باوجود ودیا دھر اپنی زمین کا کوئی حصہ بھی کمپنی کے نام بیع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ زمین اس نے اپنے بزرگوں سے وراثت میں حاصل کی ہے جو ان کی حسن خدمات کے صلے میں انھیں مغل شہنشاہ نے جاگیر کی شکل میں دی تھی۔

جب ودیا دھر کسی صورت میں بھی اس علاقے کو بیچنے پر راضی نہ ہوا تو انگریز سوداگروں نے صوبے کے گورنر عظیم الشان شہزادہ فرخ سیر کو اٹھارہ ہزار روپے نذرانہ دے کر جوار کی زمین کو بیع کرا لینے کا حکم نامہ حاصل کیا۔ اس حکم کو دیکھ کر ودیا دھر رائے چودھری کے پاس زمین بیچنے کا دوسرا چارہ نہ رہا۔ اور مجبوراً یہ زمین جس پر آج کلکتہ ہے اس نے تیرہ سو روپے کی حقیر رقم کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دی۔"

بعض مبصرین کا خیال ہے کہ یہ حکم نامہ جعلی تھا کیونکہ کمپنی کبھی بھی ڈائرکٹر نے شہزادہ فرخ سیر سے ملاقات نہیں کی تھی۔ کسی شہزادہ کو دلی کے شہنشاہ وقت کی موجودگی میں ایسا فرمان جاری کرنے کا استحقاق تھا۔

محبت کی دیوی وینس کو رام کرنے کے انسانی منصوبے

منظور احمد سوز (ایم اے)

اس دور میں انسانی ذہن زمین کی حدود سے نکل کر دیگر اجرام فلکی میں بھی اپنے لئے نئی نئی رہائش گاہیں تلاش کر رہا ہے یہ تگ و دو کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب اگر انسان کی موجودہ تخریب کارانہ ذہنیت میں تلاش کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ وہ مستقبل کی اس عالم گیر ایٹمی تباہی سے خوفزدہ ہے جو وہ خود اس دنیا پر لانے کا تہیہ کر چکا ہے اور اس سے بچنے کے لئے وہ ابھی سے نئی نئی پناہ گاہیں تلاش کر رہا ہے — ہاں اگر اس جدوجہد کو اس کی سلامت روی پر محمول کیا جائے تو دنیا کی بڑھتی ہوئی بے تحاشا آبادی اور زمین کی تنگ دامانی بھی اس کا جواب ہو سکتا ہے۔

چاند کی تسخیر اس منزل کی طرف انسان کا پہلا قدم تھا لیکن یہ سعی ناکام ثابت ہوئی۔ انسان کا گمان تھا کہ چاند پر زندگی کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گی مگر سرزمین چاند پر تو زندگی کی بنیادی علامت کا بھی فقدان نظر آیا، نہ وہاں ہوا ملی اور نہ پانی۔ حد نظر تک سنسان و ویران چٹیل پہاڑیاں تھیں یا لق و دق ریگزار، یا پھر شہاب ثاقب کی وہ ہولناکیاں تھیں جو شگاف نما غاروں کی صورت میں نظر آئیں۔ الغرض یہ انسانی قافلہ بے نیل مرام ہی زمین پر واپس آیا۔

اب انسان کی مریخ پر نظر ہے اور چاند کو سنگ میل بنا رہا ہے، لیکن مریخ کے متعلق تو ماہرین فلکیات اس صدی کی ابتدا میں ہی یہ فیصلہ صادر کر چکے ہیں کہ بے شک کبھی مریخ پر نہ صرف زندگی کے آثار ہی موجود تھے بلکہ وہ زندگی شاید اس ارضی زندگی سے بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ زندگی تھی —— مگر اب تو یہ تمام سیارہ برف کی لپیٹ میں ہے اور اس پر ہزارہا سال سے "عصر برفانی" مسلط ہے۔ وہاں اب زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں اور نہ اب زندگی کے قیام کا کوئی امکان ہی باقی رہا ہے۔ مگر انسانی فطرت قدرت سے ہار ماننے کو کبھی تیار نہیں ہوئی اور نہ وہ آج ہی آمادہ ہے۔

چنانچہ امریکی یونیورسٹی، واشنگٹن کے ممتاز پروفیسر ڈاکٹر میتھیو نارٹن نے چند ہفتے قبل ہی "ویسٹرن اسپیس کانگریس" میں سیارہ وینس پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ان امکانات کا انکشاف کیا ہے کہ وینس (زہرہ) کو بھی انسان کے لئے قابل بود و باش بنایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نارٹن کا کہنا ہے کہ یہ سیارہ سورج سے اپنی قربت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر آتا ہے اس لئے اس وقت اس کی حدت و حرارت نقطۂ جوش [Boiling Point] پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قیامت کی گرمی میں زندگی کی بقا ممکن نہیں۔ مگر ان کے نظریے کے مطابق اس حدت کو اعتدال پر یقیناً لایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر نارٹن نے اپنے اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ فی الوقت یہ سیارہ گھنی کاربن ڈائی آکسائڈ سے گھرا ہوا ہے اور اس کی موجودہ ناقابل برداشت حرارت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ گیس اس سیارے کی حدت کو اس کی سطح پر ہی مقید رکھتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سیارہ کی بلند ترین فضا میں برف کے ذرات بھی پائے جاتے ہیں۔ سیارے کی فضا کا یہ نقطۂ انجماد ہی ڈاکٹر نارٹن کی امیدوں کا مرکز ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ اس خنک فضائی طبق میں اگر انسان کوئی کائی نما پودا پیدا کر دے تو یہ نباتات ایک ایسے قدرتی عمل کی ابتدا کر دے گی جو بالآخر اس سیارہ کی غیر معمولی حرارت کو اعتدال پر لے آئے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک عام بات ہے کہ پودوں کی زندگی کا انحصار کاربن ڈائی آکسائڈ پر ہوتا ہے کیونکہ وہ اس گیس سے ہی کاربن کو بطور غذا حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پودوں میں اس گیس کی تحلیل صرفی کا خاصہ بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر نارٹن کے قول کے مطابق اگر انسان اس خنک فضائی طبق میں یہ کائی نما پودا پیدا کر دیتا ہے تو یہ نباتات نہ صرف اپنی ضرورت کے مطابق اس گیس سے اپنی غذا حاصل کرنا شروع کر دیگی بلکہ اس کی قوت تحلیل صرفی کے نتیجے میں اس گیس کا دوسرا جزو آکسیجن پراگندہ ہو کر فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی جگہ بھی لینا شروع کر دے گا۔ جو در اصل بقائے انسانی کا ضامن ہے اور جس کی پودوں کو ضرورت بھی نہیں ہوتی — یہ تو حقیقت ہے کہ ابتدا میں یہ کائی نما نباتات اپنے مسلسل البتہ حجم کے اعتبار سے معمولی اثر و نفوذ کے مطابق نہایت قلیل مقدار میں اپنی غذا قبول کرے گی۔ باقی ماندہ زائد کاربن سیارہ کی سطح پر جمع ہوتا رہے گا۔

مگر اس نظریے کے مطابق اس انسانی کوشش کی کامیابی پر ایک اور قدرتی عمل "فوٹو تھنسس" کی بھی از خود ابتدا ہو جائے گی، یعنی گھاس سورج کی روشنی کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائڈ کو کاربوہائیڈریٹس میں بھی بدل دیتی ہے جو گھاس کو خود بخود بڑھانے والا ایک اہم مادہ ہے۔ چنانچہ یہ کائی نما نباتات یا گھاس بھی اسی طرح کاربوہائیڈریٹ پیدا کرے گی اور دن بدن اس کا حجم بڑھتا چلا جائے گا۔ الغرض یہ خودکار سلسلے ایک طرف تو اس کائی نما نباتات کی افزائش کا موجب ہوں گے اور دوسری طرف یہ بڑھتی ہوئی نباتات —— کاربن ڈائی آکسائڈ سے زیادہ سے زیادہ کاربن بطور غذا حاصل کرے گی اور اسی نسبت سے آکسیجن کی مقدار بھی بڑھتی اور پیدا ہوتی چلی جائے گی —

ڈاکٹر نارٹن کے نظریے کے مطابق جب اس متذکرہ بالا تحلیلی انتشار سے کاربن ڈائی آکسائڈ کا وجود رفتہ رفتہ فنا ہو گا تو وہ دائمی حدت و حرارت جو سیارے کی سطح پر مقید تھی آزاد ہو کر فضا میں بلند ہو گی اور انجام کار برف کے ذرات سے ٹکرا کر ان کو بارش کی شکل میں سیارہ پر برسائے گی۔ ان بارشوں کی ابتدا ہوتے ہی اس سیارے کی سرزمین پر قسما قسم کی روئیدگیاں جنم لیں گی اور ممکن ہے کہ ہمارے اس صنعتی دور میں ہی یہ تمام سیارہ سرسبز و شاداب ہو جائے۔

پروفیسر نارٹن کا خیال ہے کہ اس انقلاب کے نتیجے میں جو آب و ہوا اس سیارہ پر پیدا ہو گی وہ منطقہ حارہ کے علاقوں کی مانند ہو گی —— پھر کیا ہے اس سیارہ پر کھیتیاں لہلہائیں گی۔ پھل پھول مہکیں گے۔ سبک رو دریا گنگنائیں گے اور گھنے اور تاریک جنگل باہم سرگوشیاں کریں گے اور محبت کی دیوی وینس یوں انسان پر اپنی بے پایاں محبت نچھاور کرنے پر مجبور ہو گی ——

خرگوش

ایک جرمن کہانی

ترجمہ
سید آل رسول

ماسٹر زیڈلاک نے اوائل نومبر میں ایک خرگوش خریدا اور بیوی سے بولے: "کرسمس آنے کو ہے، اسے خوب کھلاؤ پلاؤ تاکہ موٹا ہو جائے اور تہوار کے موقع پر اس کے مزے دار کباب بن سکیں۔"

یہاں پر ماسٹر زیڈلاک نے 'تاکہ' کہا تھا یا نہیں اس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ خود ان کی بیوی نے خرگوش خریدنے کے دوسرے دن یہ بات مجھے بتائی تھی۔

زیڈلاک کی بیوی بہت مہربان خاتون تھیں اور ہر مہمان کی دل و جان سے خاطر مدارات کیا کرتی تھیں۔ ہر وقت کام میں جٹی رہتی تھیں۔ گھر کا سارا کام کاج، 'اٹھائی دھری' جھاڑو برتن، صفائی، غرض خانہ داری کا ہر کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں اور کیا مجال کہ کسی کام میں ذرہ بھر چوک تو ہو جائے۔ ہر کام اپنے مقررہ وقت پر اور انتہائی سلیقے سے انجام پاتا تھا۔ پھر صفائی کا تو یہ عالم تھا کہ میرا خیال ہے اگر کپڑوں، برتنوں، جوتوں اور دوسری چیزوں کے منہ میں زبان ہوتی تو وہ یقیناً اپنی مالکہ کو 'پیاری اماں' کہہ کر خطاب کیا کرتے۔

ان کے یہاں کوئی بچہ نہ تھا لیکن خرگوش کے آنے کے بعد یہ کمی پوری ہو گئی تھی۔ وہ خرگوش کے متعلق بہت کچھ کہا کرتی تھیں۔ اس کی اچھل کود، شوخیاں، فرمانبرداری اور مسخرے پن کی باتیں ان کی گفتگو کا دلچسپ موضوع تھا۔ خصوصاً یہ بات کہ وہ ان کی ایک ہی سیٹی پر کس طرح دوڑا چلا آتا ہے، یا یہ کہ وہ ان کی آنکھوں کے اشارے تک سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح خرگوش سے متعلق تمام کام اور اس کی پھیلائی ہوئی گندگی کو بھی وہ اس کی دلچسپیوں کی خاطر برداشت کر لیتی تھیں۔ یہ جانور ان کے لیے بچوں کے کھلونے کی سی حیثیت رکھتا تھا جس کے نت نئے کھیل کبھی ختم ہی نہ ہوتے تھے۔

خرگوش کے رہنے کے لیے لکڑی کا ایک صندوق نما ڈربہ بنایا گیا تھا اور غذا کے لیے باورچی خانے کی جوٹھن مقرر کر دی گئی تھی۔ یہ جوٹھن زیڈلاک کے دسترخوان پر موٹا دوپہر کے کھانے کے بعد کافی مقدار میں بچ جایا کرتی تھی۔

خرگوش موٹا ہونے لگا۔ اس کا پیٹ نکل آیا تھا۔ اور گلے پھول گئے تھے، خاتون کا کہنا تھا کہ اب جوں ہی ماسٹر زیڈلاک اس تیار جانور کو دیکھتے ان کی رال ٹپک پڑتی اور وہ خواہ مخواہ منہ چلانے لگتے۔ دوسری طرف یہی پانی آنسو بن کر بیوی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگتا جب وہ یہ سوچتیں کہ آنے والے تیوہار تک پیارے خرگوش کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

خرگوش کے مٹاپے کو دیکھ کر خاتون دل ہی دل میں خوش ہوتیں۔ وہ اس کو بہر حال خانہ داری کی ایک اہم جنس

تی تھیں جس کی دیکھ بھال پر انکو ہمیشہ فخر محسوس ہوتا تھا
س کے ساتھ ہی کرسمس کے کبابوں کا مسئلہ انکی خانہ
ی زندگی کا ایک اہم مسئلہ بنا ہوا تھا — خاتون زیڈلاک
ہیں صرف پیٹ ہی نہ تھا جس کو بھرنے کی ضرورت
ہے بلکہ ان کے سینے میں ایک دل بھی دھڑکتا تھا جس
حساسات بھرے ہوئے تھے۔ شکم اور دل کے نزاع نے
ن کے ذہن میں شدید کشمکش پیدا کر دی۔ پیٹ نے جس
سے اتنی بڑی امید لگا رکھی تھی وہی بات دل کے لئے
ن ناامیدی کا باعث بنی ہوئی تھی۔

ماسٹر زیڈلاک نے ذبح کی تاریخ بھی مقرر کر دی
ں نے اپنے مالک مکان کے بڑے لڑکے کو جسے جنگ میں
ں کارنامے دکھانے پر کئی تمغے انعام میں بھی مل چکے تھے
ابے کے فرائض انجام دینے کی دعوت دی جو بڑی خندہ
شانی سے قبول کر لی گئی۔

خرگوش کے انجام کا آخری فیصلہ ہونے کے ساتھ ہی
اتون کا رویہ یک لخت بدل گیا، اب انھوں نے خرگوش
و برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ بے چارے جانور کو عام
لور سے "کم بخت" کہا جانے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس
بں تمام دنیا کی برائیاں بھی نظر آنے لگیں۔

"تمام گھر سڑا رکھا ہے، نہ دن کو چین ہے نہ رات کو
آرام، ساری رات صندوق میں پڑا خرخرا تا رہتا ہے کم بخت
لوگوں کی نیند حرام کر رکھی ہے مردود نے۔ ایندھن کی الگ
کمی ہے اور اس نابکار کے ڈربے میں ڈھیروں لکڑی لگی
ہوئی ہے۔ پھر ٹو بھی تو کم بخت غضب کا ہے بھلا آج کل
ترکاریوں کے لئے ڈنٹھل کہاں میسر ہیں کہ اس کی روز
بھری جا سکے — اچھا ہی ہے کہ کرسمس آئے اور یہ
منحوس جلدی سے دفع ہو۔"

رہا گوشت کا معاملہ، جس کے بارے میں خود
خاتون نے پہلے کئی بار بڑے یقین کے ساتھ اس کے وزن
کے متعلق اپنا اندازہ پیش کیا تھا، سو اب اسکے بارے میں
بھی اب یہ کہا جانے لگا کہ پہلا اندازہ غلط تھا، بھلا اس میں
گوشت رکھا ہی کہاں ہے بس دیکھنے بھر کا ہی پھولا ہوا ہے۔
لیکن میں نے محسوس کیا کہ جب بھی خاتون جانور کا تذکرہ غذا
کے طور پر کرتی تھیں ان کی آواز غیر معمولی طور پر پھنسی پھنسی
سی محسوس ہوتی تھی۔

بے چارہ جانور بھی اپنی مالکہ کے اس عجیب و غریب
رویے اور تلون مزاجی سے الجھن میں پڑ گیا۔ ایک طرف وہ
اس غیریت آمیز رویے پر کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ دوسری
جانب اس کو اپنی مالکہ کا گزشتہ سلوک اور ان کی بھلائیوں
کا احساس اور شدید صورت اختیار کر گیا اب وہ کسی قیمت پر
بھی ان تمام احسانات کا بدلہ چکا دینا چاہتا تھا۔

ہوا بھی ایسا ہی — اس نے، جی ہاں خرگوش
نے، وہی کیا جو اس اضطراری دور میں ایک ماہر نفسیات
خرگوش کو کرنا چاہئے تھا۔ ویسے میرا خیال ہے اگر کوئی
دوسرا خرگوش بھی ہوتا تو شاید وہ بھی اس کے سوا اور
کچھ نہ کرتا —

"اس نے خاتون زیڈلاک کی انگلی میں کاٹ کھایا۔"
مسماۃ لہک کر بولیں — "یہ دیکھو آج تو اس منحوس
نے میری انگلی میں کاٹ کھایا — موا مردم خور —"
لیجئے اقدام قتل کا مقدمہ تیار ہو گیا۔ فرد جرم بھی عائد
کر دی گئی، ملزم کے خلاف موت کا فیصلہ سنانے کا پورا
پورا اخلاقی و قانونی جواز فراہم ہو گیا۔

دوستی کا وہ رشتہ جو مہربان مالکہ اور جانور کے درمیان
قائم ہوا تھا خود جانور کی ہی غلطی سے ٹوٹ گیا۔ آخر اس نے
اتنا بڑا جرم کیوں کیا؟ جی ہاں! اس نے مالکہ کی انگلی چبائی
تھی۔ جرم بہرحال جرم ہے اور اس کی ایک سزا بھی ہے
بس خرگوش کے کباب بن گئے — انصاف بہرحال
انصاف ہے۔

خاتون مجھ سے خرگوش کے انجام کے بارے میں گفتگو
کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت ضبط سے کام
لے رہی ہیں، اور اپنے جذبات مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی
ہیں لیکن اندر کی کشمکش سے ان کا لہجہ بار بار کھسیانا سا
ہو جاتا تھا۔ آخر ایک ایسی ہی کھسیانی ہنسی ہنستے
ہنستے ان کے آنسو نکل آئے۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگیں۔
"کیسا موٹا خرگوش تھا۔"

کھال سوکھنے کے لئے دھوپ میں پھیلا دی گئی۔ اسکی
بھی ایک قیمت تھی۔ نعمت خانے کے لحاظ سے جانور پر کم موٹا
ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا لیکن یقین جانیئے تقریب میں
اس نے کافی سے زیادہ ہونے کا ثبوت دیا۔ رہا مفید ہونا
تو اس بات کا ثبوت تو بے چارہ اس وقت بھی انگلی سے
ٹپکتا ہوا دے رہا ہے۔

اب گھر جانور کی بدبو سے نہیں سڑتا اور نہ کسی کے
خرخرانے سے گھر والوں کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔ رہی ایندھن
کی کمی تو ڈربہ موجود ہے لیکن ڈربے پر کسی نے کلہاڑی نہیں
چلائی۔ ایندھن کی سخت قلت کے دنوں میں بھی ڈربہ بدستور
ڈربہ رہا۔ آپ کو علم ہے ڈربہ کیوں برقرار رہا؟ —
"ماسٹر زیڈلاک نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ پھر ایک خرگوش
خریدیں گے۔"

لیکن میں سوچتا ہوں کیا خاتون زیڈلاک اس مرتبہ
بھی جانور پر کوئی فرد جرم عائد کر سکیں گی؟ خواہ وہ انکی
انگلی میں کاٹ ہی کیوں نہ کھائے!

ایران۔ قدیم ترین تہذیب و تمدن کا گہوارہ

حال ہی میں ہارورڈ کے ماہرین آثار قدیمہ نے جنوب
مشرقی ایران کے ایک بلند ٹیلے تی یحییٰ کی کھدائی کے بعد
انکشاف کیا ہے کہ ایران میں تہذیب و تمدن کے آثار دنیا کے
تمام ممالک سے ایک ہزار سال قبل موجود تھے اس کھدائی
میں ایک ایسی عمارت برآمد ہوئی ہے جس میں ۱۲ فیٹ چوڑے
اور ۱۲ فیٹ لمبے ۵ کمرے موجود ہیں۔ بظاہر یہ اس دور
کے کسی دفتر کی عمارت خیال کی جاتی ہے، یہاں کچھ ایسی
تختیاں پائی گئی ہیں جن میں غلے کا حساب درج ہے۔ یہ
ایک منزلہ عمارت مٹی کی اینٹوں سے تعمیر کی گئی اور اس میں
بے شمار مٹی کی بنی ہوئی کنالیاں پائی گئی ہیں جو غالباً غلہ
رکھنے کے مقصد سے اس عمارت میں رکھ دی گئی تھیں۔

میسوپوٹامیہ میں ۳۵۰۰ قبل مسیح کے آثار قدیمہ
سب سے پرانے تہذیب و تمدن کے آثار سمجھے جاتے رہے ہیں
لیکن ایران کی اس حالیہ کھدائی نے ظاہر کر دیا ہے کہ
ایران میں تہذیب اور تمدن اس دور سے بھی ایک ہزار برس
پہلے اپنے عروج پر تھا۔

ہارورڈ کے ماہرین آثار قدیمہ ان لکڑی کی تختیوں پر
لکھی ہوئی زبان کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہیں اگر
ان پر لکھی ہوئی عبارتیں سمجھ لی گئیں تو آج سے ساڑھے چار
ہزار سال قبل کے نظام حکومت کے طریق کار کو سمجھ لینا
مشکل نہ ہو گا بہرحال ان ماہرین نے دعویٰ کیا ہے کہ
وہ مارچ ۱۹۷۱ء میں اپنی فائنل رپورٹ پیش کر دیں گے۔

دانشوروں کی پیدائش

روس کے سائنسدانوں نے بتایا ہے کہ دنیا میں دانشوروں کی اکثریت ایسے وقت پیدا ہوئی ہے جب ان کے والد کی عمر ۳۸ اور ماں کی عمر ۲۷ برس کی تھی۔ اس سلسلے میں تحقیقات کے لیے انھوں نے تقریباً پانچسو مشہور اور عظیم ہستیوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا۔

دلّی یونیورسٹی میں مے نوشی

ایک سرسری جائزے کے مطابق دلّی یونیورسٹی کے ۷۰ فی صدی طلبا اور ۲۶ فی صدی طالبات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ موقع ملنے پر شراب نوشی سے نہیں چوکتے۔ اس جائزے میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ یونیورسٹی کے ۹۰ فیصدی طلبا نے کسی نہ کسی موقعہ پر ضرور شراب چکھی ہے۔ اس اطلاع کے بموجب یہ طلبا، وقت گزاری کے لیے شراب نوشی کا شغل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اپنے دوست احباب۔ کے ساتھ پیتے ہیں لیکن جو گھروں میں اپنے کنبے کے ساتھ پیتے ہیں ان کی تعداد معدودے چند ہی ہے

امریکی انصاف

ایک امریکی عدالت اپیل نے ایک ایسے قیدی کی۔ جو بنک میں ڈاکہ زنی کے جرم میں جیل کی سزا بھگت رہا ہے یہ کہہ کر اپیل منظور کر لی کہ جس جج نے اُسے ۲۸ سال کی سزا دی ہے اس کا دماغی معائنہ کرایا جائے۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ وہ جج اب اس دنیا کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ لہٰذا قیدی کی استدعا کے بموجب اب اس کے مقدمہ کا فیصلہ وہی جج کرے گا جس کے بارے میں ڈاکٹروں کی یہ رپورٹ آ جائے کہ وہ ذہنی طور پر درست ہے۔

ماؤ کے نعرے

اندھرا پردیش کے وزیر داخلہ نے ودھان سبھا کو بتایا کہ وساکھاپٹنم کے ساحلوں پر نمودار ہونے والی چند آبدوز کشتیوں پر ماؤزے تنگ کے نعرے لکھے ہوئے پائے گئے۔ انھوں نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ سال رواں میں نکسلائٹوں نے ۶۳ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود ان کے گروہ کے ۱۹ دہشت پسند پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً مارے گئے۔

کتّے اور بلّی کی دوغلی نسل

انگلستان کے شہر ہاسٹن کے لے ٹٹ نے کتّے اور بلّی جیسے جانوروں سے جو ایک دوسرے کی دشمنی کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہیں ایک دوغلی نسل تیار کر کے ساری دنیا کو محوِ حیرت کر دیا ہے۔ اس دوغلی نسل کے بچے ڈیٹ کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ ان کا اگلا حصّہ کتّے جیسا اور پچھلا بلّیوں جیسا ہے۔ سر کتّے سے مشابہت رکھتا ہے اور پاؤں بلّی جیسے ہوتے ہیں۔ ان کی آواز بھی کتّوں کے بھونکنے اور بلّی کے میاؤں میاؤں کرنے کی درمیانی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔

افزائش نسل کے خلاف انوکھی مہم

مثل مشہور ہے کہ نیک کاموں کی ابتدا گھر سے ہونی چاہیے۔ اس کہاوت کے تحت راجستھان کے ضلع چتوڑ گڑھ کے افسروں نے طے کیا ہے کہ وہ زیادہ بچے پیدا کرنے کے خلاف نعرہ لگانے سے قبل خود اپنا آپریشن کرائیں گے۔ چنانچہ تمام ایسے افسران جو دو یا دو سے زیادہ بچوں کے والدین جلد ہی آپریشن کرالیں گے تاکہ عوام ان کے بتائے ہوئے راستے پر برضا و رغبت چل سکیں۔

منی اسکرٹ کے بعد منی کتّے

چھوٹا کنبہ، چھوٹی کار، چھوٹا گھر اور چھوٹے ریڈیو کے اس دور میں کوئینس لینڈ کے ایک کتّے پالنے والے شخص نے چھوٹے کتوں کی ایسی نسل پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جن کا وزن سوا تین سو گرام سے زیادہ نہیں ہے اور انھیں سبزی لانے والے تھیلوں یا عورتوں کے ویلیٹی بیگ میں رکھ لیا جاتا ہے۔ ان کتوں کی اونچائی ۱۵، اور لمبائی ۲۰ سینٹی میٹر کے قریب ہے۔ ابھی تک اس نسل کے لیے کوئی نام تجویز نہیں کیا جا سکا ہے۔

وزارت کی لاٹری

بہار میں ایس۔ وی۔ ڈی کے ۱۱ آزاد ممبران ودھان سبھا کو چیف منسٹر شری کرپوری ٹھاکر نے ان میں سے ایک وزیر چن لینے کی اجازت دے کر وزارت سازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ ان آزاد ممبران نے قرعہ اندازی کے ذریعہ شری جے رام گری کو وزارت کے لیے چن لیا۔

تبدیلیٔ جنس کی ہوا

لندن سے موصول شدہ اطلاعات کے تحت عورتوں اور مردوں میں تبدیلیٔ جنس کی ہوا بری طرح پھیل گئی ہے یورپ کے پرائیویٹ ہسپتالوں میں ایسے آپریشن کی فیس اٹھارہ ہزار روپیہ ہے۔ سالِ رواں میں تقریباً سات مرد تبدیلیٔ جنس سے صنفِ نازک کی صف میں شامل ہو چکے ہیں۔ ۴۵ مرد اور عورتیں اسی غرض سے ہسپتال میں داخل ہیں۔ دس مرد اپنا اندراج انتظار کرنے والوں کی فہرست میں کرا چکے ہیں اور تقریباً بیس آدمیوں پر تجربے کیے جا رہے ہیں۔

کتّے نے مالک پر فائر کر دیا

۲۷ سالہ سوسوسیٹو سارے ٹوکیو میں اپنی نشانہ بازی کی وجہ سے ماہر شکاری تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان کی مہارت نے ہی انھیں اپنے کتّے سے زخمی کرا دیا۔ وہ چاولوں کے کھیت میں بطخوں کا شکار کرنے کے دوران اپنی رائفل کو ایک جھاڑی سے ٹکا کر ناشتہ کرنا چاہتے تھے کہ ان کے شکاری کتّے نے ان کے اسلحے پر حملہ کر کے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ بندوق سے نکلی ہوئی گولی سیٹو کی کمر میں لگی۔ کہا جاتا ہے کہ گولی کا زخم مندمل ہونے میں ایک ماہ کا عرصہ لگ جائے گا۔

خدائی اولاد بننے کے لیے اولاد کشی

میڈرڈ میں مغربی جرمنی کے ایک ۵۹ سال کے باشندے نے اپنی ۴۱ سال کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد ۱۸ اور ۱۵ برس کی بیٹیوں کو بھی چھری سے ذبح کر ڈالا۔ پولیس کی باز پرس کے دوران اس نے بتایا کہ وہ "خدائی اولاد" نام کی مذہبی تحریک سے وابستہ ہے۔ اس نے اپنی اولاد اور اپنی بیوی کو خدا کے نام پر اس لیے ذبح کر دیا کہ اس قربانی سے اُسے خدا کی اولاد بن جانے کا مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔

ہرے رام ہرے کرشنا

شری کرشن کی جنم بھومی سے ہزاروں میل دور مغربی ورجینیا میں ۲۰۰ سو ایکڑ پر پھیلے ہوئے رقبہ میں زندگی اسی ماحول کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے جو آج سے چار پانچ ہزار سال پیشتر شری کرشن کی موجودگی میں ورنداون یا گوکل پھیلا ہوا تھا۔ یہاں امریکی کرشنا بھگت گائیں چراتے ہیں اور عورتیں گوپیوں کی طرح دودھ دوہتی ہیں۔ ریڈیو ٹیلی وژن کا تصور اس جگہ بے معنی ہے۔ ہارمونیم، ستار، رباب، بربط اور پیانو کی بجائے بانسری بجائی جاتی ہے اور اس کالونی میں یہی واحد موسیقی پیدا کرنے والا آلہ ہے۔ سال میں ایک بار رتھ یاترا ہوتی ہے۔ یہاں کے رہنے والے شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء کے علاوہ گوشت کے استعمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ ساری کالونی کے باشندے بین الاقوامی کرشنا جاگرتی سوسائٹی ISKON کے ممبر ہیں۔ اس سوسائٹی کے بانی ہندوستان کے باشندے شری اے۔ سی بھکتی ویدانتا سوامی پربھوپادا ہیں جن کا صدر مقام بمبئی ہے۔ اسکان کا قیام ۱۹۶۶ء میں عمل میں آیا اور جلد ہی اس کی شاخیں کناڈا، جاپان، جرمنی، انگلستان اور امریکا جیسے سرمایہ دار اور تہذیب کے علمبردار ملکوں میں قائم ہو گئیں اور مغربی ورجینیا میں مذکورہ بالا کالونی بنا دی گئی جسے چار ہزار برس قبل کے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر کہنا چاہیے۔ اس تحریک نے چار سال کے اندر ان ممالک میں پچاس مندر تعمیر کر ڈالے۔ اسکان میں پانچ سو سے زیادہ کرشن بھگت داخل ہو گئے۔ یہ سب کے سب دنیا کی مادی راحتوں کو تج چکے ہیں اور ان میں اور ہپیوں میں صرف یہی امتیاز ہے کہ ہپیوں کے برعکس یہ لوگ جنسی ملاپ، نشہ اور گوشت کو اپنی زندگی کے معمولات سے خارج کر چکے ہیں۔

اکتوبر میں اسکان کے پیرو ہندوستان آئے۔ ان میں سے ۲۰ تو براہ راست بمبئی پہونچے اور ۵ کلکتے ہوتے ہوئے دلی آئے۔ ان کے عقائد کے تحت شری کرشن کا نام ورد زبان کر لینے سے دنیا کی تمام تکالیف دور ہو جاتی ہیں، انسان مایا کے جال سے نکل آتا ہے اور مادی عیش و آرام کی خواہشات سے نجات پا لیتا ہے۔ رنگ، نسل، ذات، پات اور مذاہب کی قید و بند سے آزاد ہو کر وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی گزارتا ہے جو کسی کے لیے باعث آزار نہیں ہوتی۔ یہ لوگ شری کرشن کے پھیلائے ہوئے دھرم کو مانتے تو ہیں لیکن اس پر مکمل پابندیوں کے ساتھ عمل پیرا ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ البتہ انھیں شری کرشن کے بیشتر اصولوں اور ان کے بتائے ہوئے زندگی کے راستوں پر چلنے سے خوشی اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اسکان کے گرو کے بقول اور سفید فام چیلوں کے عقیدوں کے مطابق شری کرشن دین دھرم اور مسلک سے

بھگوان کرشن کا ایک جاپانی چیلہ

ذہب کے بندھنوں سے آزاد تھے۔ وہ ساری دنیا کے
یے مساوی طور پر ہستی عظیم ہیں۔ ایسی ہستی جس کے نام
ی مالا جپنے سے ہی تمام دکھ اور درد کافور ہو جاتے ہیں
ام جھگڑے، اختلافات، فسادات، آپس کی کشمکش
ر بغض و عناد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگر مغربی طاقتیں شری
رشنا کے اصولوں کو احترام کی نظروں سے دیکھیں تو
ساری دنیا میں امن و سلامتی کی فضا قائم ہو جائے گی۔
ن الاقوامی خرخشوں اور اختلافات کا خاتمہ ہو جائے گا۔
سل انسانی اپنے اصل مقصد کی جانب لوٹ جائے
ی اور یہ دنیا نمونۂ ارم بن کر تمام بنی نوع انسان کے
صائب کا مداوا کرے گی۔ کرشن بھگتی ہی تمام امراض
کے لیے مسیحائی کا کام کر سکتی ہے۔ ان چیلوں کا خیال
ہے کہ جب انھیں

ہرے کرشنا، ہرے کرشنا، کرشنا کرشنا ہرے ہرے

ہرے راما، ہرے راما، راما راما ہرے ہرے

ا منتر پڑھنے سے دنیاوی تفکرات سے نجات مل کر اطمینان
ال اور مکمل سکون حاصل ہو جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں
ہ مغرب کی مادہ پرست آبادی کو اس مہامنتر سے فائدہ
اصل نہ ہو۔

اکتوبر میں بمبئی شہر میں چوپاٹی کے مقام پر بھارت
سادھو سماج کا سیشن ہوا جس میں امریکا سے آئے
ہوئے ہرے کرشنا ڈیلی گیشن کے ۲۰ افراد بھی شریک
ہوئے۔ ان کا لباس، طور طریق، چہرہ مہرہ بالکل سادھوؤں
یسا تھا اور انھوں نے اپنے نام بھی بدل کر ہندوؤں جیسے
رکھ لیے ہیں۔ جب ان لوگوں سے ان کے پرانے نام دریافت
کیے گئے تو انھوں نے ماضی کی یادوں کے جھروکے کھولنے
سے انکار کر دیا۔ کسی نے بھی اپنے اصل نام نہیں بتائے
لبتہ نئے نام بتاتے رہے۔ اور جب ٹائمس آف انڈیا کے
یک نمائندے کے۔ آر۔ سندر راجن نے ادھیکاری نام کے
ایک امریکن سے دریافت کیا کہ اس کے پاس ہندوستان
یں چھائی ہوئی غربت اور اس کے باعث پھیلی ہوئی بے اطمینانی
کا کیا حل ہے تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ
ہندوستان امریکا سے کہیں زیادہ دولتمند ملک ہے چونکہ
یہ لارڈ کرشنا کا ملک ہے۔ ایسا ملک جہاں اتنی عظیم ہستی
پیدا ہوئی کبھی بھی غریب نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس نے بتایا

کہ امریکا، کناڈا، برطانیہ اور مغربی جرمنی کے ۲۱ شہروں
کی سڑکوں پر نگ روزانہ جلوس کی شکل میں شری کرشن کے
نام کی مالا جپتے ہوئے نکلتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ مستقبل
قریب میں دنیا کے ایک ایک شہر کی فضا میں یہ نام گونجنے لگے گا۔

دلی کی سڑکوں پر بھی نومبر کے اوائل میں ایسے چار
امریکی اور ایک جاپانی سادھو زرد لباس میں ملبوس، پیشانی
پر صندل لگائے اور سر پر لمبی چوٹی لیے نمودار ہوئے۔
کلکتہ کی راہ سے دہلی آنے والے یہ کرشن جی کے بھگت
ہر دوار جا رہے تھے۔ انھوں نے بھی ہرے رام ہرے کرشن
کے نعرے لگائے اور جہاں کہیں کوئی مجمع ان کو دیکھ کر
جمع ہو جاتا تو ان پانچوں سادھوؤں کی منڈلی میں سے
ایک سادھو نکل کر اس مجمع کو اس مہامنتر کے گنوں کی
تفصیل بتاتے ہوئے سمجھاتا کہ ان کا مشن تمام مذاہب
کی یکجہتی پر قائم ہے اور وہ ساری دنیا کی سیاسی،
معاشی، سماجی اور اقتصادی تحریکوں کو ایک پرچم کے
تلے اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو کر رہیں گے اور یہ پرچم
کرشن جاگرتی کا پرچم ہوگا۔ دلی میں ان سادھوؤں پر انگریزی
روزنامہ ہیرلڈ آٹ کی نمائندہ پورنیما شکلا نے اپنے ایک
مضمون میں تحریر کیا ہے کہ یہ بات ان کی سمجھ سے باہر ہے
کہ شری کرشنا کے ان عقیدتمندوں نے سارے ملک کا
چکر لگانے کے باوجود بندرابن یا گوکل کی سمت رُخ

دہلی کی سڑکوں پر

نہیں کیا۔ انھوں نے سابق ہپیوں کی اس تحریک کے
مستقبل کی جانب اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے لکھا
ہے کہ انھیں یقین نہیں کہ یہ لوگ اس راستے پر مستقل مزاجی
سے چلتے رہیں گے۔

بہرحال ہندوستان کی لادینی حکومت کے زیر سایہ یہ
امریکا سے آئے ہوئے معدودے چند افراد ہندو دھرم کو
تقویت پہونچانے اور ہندو سماج کو پھر سے اپنے پرانے
راستے پر گامزن ہونے کی تلقین میں مصروف ہیں اور ان
کی نظر میں ہندوستان کی اقتصادی بدحالی کا علاج محض
روحانیت ہے جس کا جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوئی
واسطہ نہیں۔ ان کا مشن ہی یہ ہے کہ ہندوستان سائنس کو
چھوڑ کر محض ہرے رام ہرے کرشنا جپ کر اپنی عظمتوں کا
پرچم بلند کر سکتا ہے۔ ●●

شناگو کے بھگوان داس
ہرے کرشنا
ہرے کرشنا
ہرے راما
ہرے راما
ہرے ہرے"

[illegible]

ڈھول کا پول

از
آموس توتولہ

آموس توتولا کا شمار اب نائجیریا کے مشہور ادیبوں اور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی اور اس نے ساری کامیابیاں صرف اپنی محنت کے بل پر حاصل کیں۔ بچپن میں وہ اتنا غریب اور محتاج تھا کہ تعلیم کے معمولی اخراجات بھی برداشت کرنا اس کے لئے دشوار تھا۔ چنانچہ اس نے تعلیم جاری رکھتے ہوئے کھیتوں میں مزدوری شروع کر دی۔ پھر وہ بازاروں میں لکڑی بیچتا تھا۔ اس کے بعد مزید ترقی کی تو کوکو اور اخروٹ وغیرہ بیچنے لگا۔ اور اس طرح اپنی تعلیم کے مراحل پورے کر لئے۔

اس نے بعد میں خود تجارت شروع کی تو اس کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔ وہ بہت سے ناولوں اور مختصر کہانیوں کا مصنّف ہے۔ استعمار کے خلاف اس کے ناولوں نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ زیر ترجمہ قصہ بھی ایک "جادوگر طبیب" کی کہانی ہے۔ جس کا تعلق ایک خاص قبیلہ سے تھا اور اس قبیلے میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ یہ کہانی افریقی سماج کو استحصال پسندوں کی ریشہ دوانیوں پر متنبہ کرتی ہے اور حریت اور آزادی کی روح پھونکنے کا باعث ہے۔

ایک گاؤں میں ایک نوجوان رہتا تھا، جس کا نام "اجالی" تھا۔ اس کے باپ کی ملکیت میں ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ اور اجالی اس کے کاموں میں اپنے باپ کی مدد کیا کرتا تھا۔ لیکن جب باپ ایک دم بوڑھا ہو گیا اور کام کرنے کے قابل نہ رہا تو اجالی کو مجبوراً اس کھیت میں تنہا کام کرنا پڑا۔

پھر اجالی نے شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ چونکہ وہ بہت ہی غریب تھا اس لئے کسی مناسب اور بہتر لڑکی سے رشتہ کی بات امید نہ تھی کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جو شادی کے سلسلے میں اس کی مالی مدد کر سکے۔ چنانچہ ایک ساہوکار کے یہاں پہونچ کر اس نے اپنے آپ کو گروی رکھ دیا، اس کے بدلے میں اسے جو کچھ ملا اُسے اس نے ایک لڑکی سے اپنی شادی میں لگا دیا۔

شادی کو ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے کہ اس کا باپ بیمار پڑ گیا۔ مرض جان لیوا ثابت ہوا اور چار دن کے اندر باپ داغِ مفارقت دے گیا۔ اجالی کے پاس ایک دمڑی بھی نہیں تھی وہ اپنے باپ کے جنازے کے اخراجات کیسے برداشت کرتا۔ چنانچہ مجبوراً اسے ایک دوسرے ساہوکار کے پاس جانا پڑا اور اس نے اپنے آپ کو دوبارہ گروی رکھ کر کچھ پیسے حاصل کئے۔ ان پیسوں کو اس نے اپنے باپ کے جنازے کے اخراجات میں لگا دیا۔

اب اجالی دو مختلف ساہوکاروں کے پاس گروی ہو چکا تھا۔ چنانچہ اپنا قرض چکانے کے لئے وہ ایک ساہوکار کے یہاں صبح سے دوپہر تک کام کیا کرتا تھا اور دوسرے ساہوکار کے یہاں دوپہر سے سورج ڈوبنے تک۔ اس طرح اس کا سارا دن ان دونوں ساہوکاروں کا قرض چکانے میں گزر جاتا تھا۔ چونکہ اس کے پاس اس کے بعد کام کے لئے کوئی وقت نہیں بچتا تھا اس لئے اپنے کھانے کپڑے کے لئے وہ کچھ بھی نہیں کر پاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلسل فاقوں پر مجبور ہو گیا اور اس کی حالت دیکھ کر گاؤں والے بھی اس پر ترس کھانے لگے۔

ایک دن اس کے ایک پڑوسی کے دل میں خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ اجالی کو لے کر قبیلے کے اس جادوگر طبیب کے پاس گیا جو بڑی شہرت کا مالک تھا تاکہ اس سے اس غریب کے معاملہ میں مشورہ کرے اور وہ اسے اس غربت سے نجات دلانے کی کوئی ترکیب بتا سکے۔

اجالی کسی پس و پیش کے بغیر اس کے ساتھ جادوگر کے گھر چلا گیا۔ جادوگر نے اجالی کی پوری کہانی سنی اور پھر اسے مشورہ دیا کہ اگر تم اپنی غربت دور کرنا چاہتے ہو تو ایک کام کرنا ہوگا، نو بھیڑیں خریدو اور نو ہی ٹوکرے۔ پھر ساری بھیڑوں کو ان ٹوکروں میں بند کر کے آدھی رات کے وقت اپنے باپ کی قبر کے اوپر رکھ آؤ، اور دیکھنا اس عمل کے فوراً بعد واپس اپنے گھر لوٹ آنا، پھر جب تم سویرے قبر پر دوبارہ جاؤ گے تو تمہیں بڑی حیرت ہوگی۔ کیونکہ وہاں قبر کے پاس خالی ٹوکروں کے سوا تمہیں اور کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھیڑوں کو تمہارے باپ نے قبول کر لیا ہے۔ اس کے بعد ان خالی ٹوکروں کو اپنے گھر واپس لے کر چلے آنا اور انہیں اپنے کمرے میں بحفاظت رکھ لینا۔ چند دنوں کے بعد تم کو ایک اور حیرت کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ ان تمام ٹوکروں میں ایک دن صبح سویرے تمہیں چاندی سونے کے سکّے بھرے ملیں گے۔ یہ وہ سکّے ہوں گے جنہیں تمہارا باپ ان بھیڑوں کے بدلے میں واپس کرے گا جو اس نے لے لیں تھیں۔ دراصل تمہارا باپ ہی تمہارے فقر و فاقے کا اصل سبب ہے۔ کیونکہ تم نے اب تک اس کی قبر پر کوئی چڑھاوا نہیں چڑھایا تھا، ظالم تو نے اب تک اس کے نام پہ کوئی بھیڑ بھی ذبح نہیں کی۔ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب تم ان نو بھیڑوں کی بھینٹ چڑھا دو تمہاری ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔

ساری رام کہانی اجالی نے صبر کے ساتھ سنی اور جادوگر طبیب کا شکریہ ادا کر کے واپس چلا آیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی بیوی دوڑی ہوئی آئی۔ "طبیب نے کیا کہا ہے؟"

"ایک ترکیب بتائی ہے جس سے ہم اس فقر و فاقہ سے نجات پا سکتے ہیں!"

پھر اجالی نے جادوگر طبیب کے ساتھ اپنی گفتگو اور اس کے مشوروں کی تفصیلات بتائیں۔ اور آخر میں جب اس نے کہا

ہمارے پاس اتنی رقم کہاں ہے کہ ہم نو بھیڑیں خرید سکیں تو اس کی بیوی نے گھبرا کر کہا "تو کیا واقعی ہم بھوکوں مر جائیں گے ہم نے دو ساہوکاروں کے پاس اپنے آپ کو گروی کر رکھا ہے، اب اگر مزید رقم کے لئے تیسرے ساہوکار کے پاس بھی خود کو گروی کر دو گے تو کبھی اس مصیبت سے نجات نہ پاؤ گے" لیکن مصیبت سب سے بڑی یہ ہے کہ اس زندگی سے نجات پانے کا واحد ذریعہ بھی یہی ہے کیونکہ اسی طرح ہمیں اتنی رقم مل سکتی ہے جس سے ہم نو بھیڑیں خرید کر انکا چڑھاوا چڑھا سکیں۔

اپنی بیوی کی ساری باتیں سن کر اجائی نے گہری سانس لی اور پھر اس سے پوچھا: "اگر میں خود کو تیسرے ساہوکار کے پاس گروی رکھ دوں تو پھر چند لقموں بھر جو میں باقی وقت میں کمالیا کرتا ہوں وہ کہاں سے ملے گا؟ کیونکہ پھر تو کام کا کوئی بھی وقت باقی نہیں رہے گا!"

بیوی نے کہا "ابھی اس کی فکر نہ کرو کیونکہ کچھ دن تک ہم کسی بھی حالت میں گزر بسر کر سکتے ہیں۔"

دوسرے دن اجائی کی بیوی ایک ساہوکار کے پاس گئی، جس نے اسے دس پونڈ دیئے۔ پھر وہ اپنے شوہر کو لے کر بازار بھیڑیں خریدنے گئی تو بدقسمتی سے اتنی رقم میں کسی طرح نو بھیڑیں نہیں مل سکیں، بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ صرف چھ بھیڑوں کی قیمت کے برابر ہو سکی۔

اجائی سخت پریشان ہوا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر نامراد گھر واپس آگیا۔

بیوی نے ایک نیا مشورہ دیا، "نو بھیڑیں نہیں ملتیں تو کیا ہوا؟ دس پونڈ میں جتنی بھی بھیڑیں اور خالی ٹوکرے ملتے ہیں انھیں خرید لیا جائے اور انھیں کو تمھارے باپ کی قبر پر چڑھا دیا جائے۔ پھر تم اپنے باپ سے درخواست کرو کہ وہ انھیں قبول کرلے۔ اور اس سے وعدہ کرلو کہ جب بھی موقعہ ملے گا تم باقی تین بھیڑیں بھی چڑھا دو گے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر یہ رقم اسی طرح ہمارے گھر میں رہی تو یہ سب ختم ہو جائیگی اور پھر کبھی ہم یہ بھینٹ نہ چڑھا سکیں گے اور کبھی اس زندگی سے ہمیں نجات نہ ملے گی۔"

اجائی کو اپنی بیوی کا یہ مشورہ پسند آیا چنانچہ چھ بھیڑیں خریدی گئیں۔ اور انھیں چھ ٹوکروں میں وہ اپنے باپ کی قبر پر لے کر آیا پھر قبر پر کھڑے ہو کر اس نے وعدہ کیا کہ جوں ہی اسے مزید رقم کہیں سے ملی وہ پہلی فرصت میں باقی تین بھیڑیں بھی چڑھا دے گا۔

صبح تڑکے ہی اٹھ کر اجائی اور اس کی بیوی دونوں اپنے باپ کی قبر پر پہونچے، بھیڑیں وہاں نہیں تھیں اس لئے انھیں بڑی خوشی ہوئی کہ ان کی نذر قبول ہوگئی ہے۔ اور اب بہت جلد ان کے بُرے دن ختم ہونے والے ہیں۔

خالی ٹوکرے لے کر دونوں اپنے گھر آگئے اور انھیں اجائی نے اپنے کمرے میں بڑی حفاظت سے رکھ دیا، پھر میاں بیوی ان ٹوکریوں کے بھر جانے کا انتظار کرنے لگے، دونوں روزانہ صبح سویرے انھیں کھول کر دیکھتے کہ ان کے باپ نے نذر کے بدلے اس میں سونا چاندی بھری یا نہیں! انتظار میں کئی مہینے گزر گئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پھر ایک سال پورا ہو گیا اور ٹوکرے جوں کے توں خالی تھے۔ ان کی حالت پہلے سے بھی دگرگوں ہو چکی تھی۔ اور کئی کئی دن کے مسلسل فاقے کرنے پڑ رہے تھے۔

اجائی نے ایک دن اپنی بیوی پر سارا غصہ اتارا "میں نے تم سے پہلے ہی دن کہا تھا کہ دس پونڈ لے کر ہم گھر چلیں کیونکہ ان سے نو بھیڑیں نہیں خریدی جا سکتی تھیں۔"

لیکن بیوی ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی، اس نے کہا کہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم ایک مرتبہ پھر جادوگر طبیب کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ اب ہم اور زیادہ محتاج کیوں ہو گئے ہیں۔"

اجائی جادوگر کے پاس آیا اور اپنی ساری رام کہانی سنانے کے بعد اس سے مزید مشورہ کیا۔ جادوگر نے جواب میں پہلے تو ایک لمبی آہ بھری اور پھر کہا: "جب تک تم باقی تین بھیڑیں بھی نذر نہ کرو گے تمھاری مصیبتیں دور نہیں ہو سکتیں۔"

اجائی یہ سن کر گھر واپس چلا آیا اور پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا "تم تو جانتی ہی ہو کہ اب ہمارے پاس ایک دھیلا بھی نہیں پھر ہم اتنی رقم کہاں سے لا سکتے ہیں کہ تین بھیڑوں کی بھینٹ چڑھا سکیں۔"

پھر اجائی اچھل کر بولا۔ "ایک صورت میری سمجھ میں آرہی ہے کہ میں آدھی رات کو اپنے باپ کی قبر کھود کر اس سے ملاقات کروں اور اس سے پوچھوں کہ جب تم مرے تھے اس وقت بھی ہمارے پاس ایک دمڑی نہیں تھی پھر تم ہم سے اتنی بڑی نذر کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟

"اگر میرے باپ نے یہ کہا کہ مزید تین بھیڑوں کی نذر کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔"

چنانچہ اس تجویز کے مطابق اجائی نے آدھی رات کے اندھیرے میں تین خالی ٹوکرے لئے اور اپنے باپ کی قبر پر پہونچ گیا پھر اس نے دو ٹوکروں میں اس طرح مٹی بھری کہ دور سے دیکھنے والے کو معلوم ہو کہ اس میں بھیڑ ہی ہوگی اور تیسرے میں چاقو کھول کر خود چھپ گیا اور بھیڑیں لینے کے لئے اپنے باپ کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

جب رات ڈھلنے لگی اور دو بجے کا وقت ہوا تو جادوگر طبیب قبر کے پاس آیا، اس کے ساتھ اس کے بعض ملازم بھی تھے۔ ملازموں نے تینوں ٹوکرے اٹھائے اور انھیں جادوگر طبیب کے گھر پہونچا دیا۔ یہ ٹوکرے اس کے خاص کمرے میں رکھے گئے اور جوں ہی ملازم باہر نکلے طبیب نے ان میں بھیڑوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

دو ٹوکرے تو اسے مٹی سے بھرے ملے لیکن تیسرا ٹوکرا جونہی اس نے کھولا اجائی اچھل کر اس میں سے باہر نکل آیا چاقو کھلا ہوا اس کے ہاتھ میں تھا۔

جادوگر اسے دیکھ کر پیچھے ہٹا اور ممیانے لگا۔

"لیکن تم آج بچ کر نہیں جا سکتے، اچھا تو تم ہی میرے مردہ باپ ہو! جلدی کرو اور آج ہی رات مجھے اس فقر و فاقہ سے نجات دلاؤ۔" اجائی نے گرج کر کہا۔

"لیکن میں تمھارا مردہ باپ مطلق نہیں ہوں!"

نہیں نہیں تم میرے مردہ باپ ہو، تم مجھے میری غربت سے نجات دلانے کی طاقت رکھتے ہو اور آج رات ہی تمھیں یہ کام کرنا پڑے گا۔"

پھر اجائی نے گرج کر کہا "فوراً وہ جگہ بتا دو جہاں تم نے اپنی دولت چھپا کر رکھی ہے۔" اور یہ کہتے کہتے اس نے جادوگر کی گردن پکڑ لی، وہ اس پر چھرا پھیرنے ہی والا تھا کہ جادوگر نے اپنی ساری دولت کا اسے پتہ بتا دیا۔ اجائی سارا مال لیکر اپنے گھر واپس آگیا۔

اس کی بیوی نے جب اُسے دیکھا تو گھبرا کر پوچھا "اجائی تمھارے باپ نے کیا کہا، ہم اس زندگی سے کب نجات پائیں گے؟" اور اجائی نے چلا کر جواب دیا۔

"کل ہم اپنا سارا قرض چکا دیں گے، آج رات جادوگر طبیب میرا مردہ باپ بن گیا تھا!!!"

بقیہ دو جرمنی کی نظر میں

سے بات چیت کی۔ روس اور پولینڈ کے ساتھ معاہدوں پر دستخط کیے اور مشرقی جرمنی کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیے کوشش کی اور کر رہے ہیں۔ مشرقی جرمنی کے ساتھ انھوں نے کم از کم بیس برس کے تعطل کو توڑا اور یہ کہہ کر بات چیت سے انکار نہیں کیا کہ اس کا مطلب مشرقی جرمنی کی حکومت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنے عمل سے یہ تسلیم کر لیا کہ مشرقی جرمنی بھی ایک کروڑ ۷ لاکھ افراد کی ایک قوم ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ (مغربی جرمنی کی آبادی چھ کروڑ کے قریب ہے) اس سے بین الاقوامی اور امن پسند دنیا میں مغربی جرمنی کا وقار بڑھ گیا۔ خود اندرونِ ملک انھوں نے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دل جیت لیے۔ لیکن ایسے بھی ہٹلرانہ خیالات کے حامل مخالف عناصر ہیں جو ولی برانٹ کو اقتدار سے محروم کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ فیڈرل ڈیموکریٹک پارٹی کے تین ممبروں اور دو سابق وزرا کی "دل بدلی" سے ولی برانٹ کی بنڈسٹاغ (پارلیمنٹ) میں بارہ کی اکثریت اب صرف چھ کی اکثریت رہ گئی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ چند دنوں میں کیا صورت ہوگی۔ لیکن چونکہ وفاقی جرمنی کا بنیادی دستور خاصا پیچیدہ ہے اور عدم اعتماد کی تحریک پیش کرانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ہندوستان میں ہے۔ اس لیے یقیناً ولی برانٹ کی حکومت برقرار رہے گی۔

حالات کا اقتضا ہوا تو "وسط مدتی" انتخابات کرانے کے لیے عملی اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ اور اگر واقعی یہ انتخابات ہوئے تو یوں سمجھیے وہ "نیشنل ڈیموکریٹکوں" کے لیے موت کا وارنٹ ہوں گے کیوں کہ عوام اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ طاقت کا توازن کسی چھوٹی سی پارٹی کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

یہ جرمنی کا ہی معاملہ نہیں۔ جہاں کہیں بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے والی کوئی چھوٹی اور بے اثر جماعت پہونچے گی وہ سیاسی عدم استحکام کا باعث ہوگی۔ شاید پاکستانی عوام نے اُسے سب سے پہلے سمجھا۔ اور امید ہے کہ ہندوستان والے بھی آئندہ وسط مدتی انتخاب میں اسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کریں گے۔ ●●

بقیہ۔ نیتاجی زندہ ہیں؟

اہمیت نہیں دی تو انھوں نے اپنی رائے کو ایک کتابچہ کی شکل میں الگ سے چھپوایا۔ اور وہ کتابچہ رجسٹری کے ذریعہ پنڈت نہرو کو بھیجوایا لیکن انھوں نے اس کی وصولیابی کی رسید تک نہ دی۔ انھوں نے مزید الزام لگایا ہے کہ تائی پیہہ کے حادثہ کے ساتھ نیتاجی کی موت کی کہانی کو شاہنواز کمیشن نے اس لئے جوڑ دیا کہ اسے "ایسا کرنے کا حکم تھا۔"

مغربی بنگال سرکار کے ایک سابق افسر شری ایس، ایم گوسوامی نے جانچ کمیشن کو بتایا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن نے دلی میں ان سے کہا تھا کہ "نیتاجی انھیں ۱۹۴۸ء میں ماسکو میں ملے تھے۔" نیتاجی نے ان سے کہا تھا کہ وہ (رادھا کرشنن) ان کے (نیتاجی) ہندوستان جانے کا بندوبست کریں۔ شری گوسوامی کے بیان کے مطابق رادھا کرشنن نے کہا تھا "میں نے افسرانِ اعلیٰ سے اس بارے میں گفتگو کی تھی لیکن انھوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ یہ بات ظاہر کی جائے۔"

شری گوسوامی نے مزید دعویٰ کیا کہ جب رادھا کرشنن بی سی رائے کی موت پر بنگال آئے اس وقت وہ ہندوستان کے صدر تھے اور اس وقت بھی انھوں نے نجی گفتگو میں اپنے اس بیان کی تصدیق کی تھی۔

اِن حالات میں یہ کہنا کہ دراصل کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ قبل از وقت ہوگا۔ پوری قوم کھوسلہ کمیشن کی تحقیقاتی رپورٹ کا انتظار کرے گی۔ فی الحال صورتِ حال یہ ہے کہ اگر یہ صحیح بھی ہو کہ فارموسا کے تائی پیہہ ہوائی اڈے پر ہونے والے مبینہ ہوائی حادثہ میں نیتاجی کی موت واقع ہوگئی تھی تب بھی پوری قوم اس بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اور اس شبہ کا دور ہو جانا ضروری ہے۔

بقیہ: لال قلعہ سے قطب مینار تک

میں شراب ممنوع قرار دے دی جائے تاکہ ان کا یہ سیاہ دھندا انھیں لکھ پتی سے کروڑ پتی بنا دے۔ بہر حال یہ بدعنوانیاں تو غیر سرکاری حلقوں سے متعلق تھیں۔ جہاں تک سرکاری حلقوں کا تعلق ہے انھوں نے بھی اپنے تجارتی کاروبار میں مہنگائی کے دیوتاؤں کو سر پر بٹھا لیا ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں آپ ریلوے پارسل بھیجنے کی بجائے اگر خود ٹرین کے ذریعے سفر کر کے پارسل پہونچا آئیں تو زیادہ نفع میں رہیں گے۔ ڈی۔ ٹی۔ یو۔ کی بسوں میں سفر کرتے وقت بھی آپ سے اکثر و بیشتر زیادہ کرایہ لیا جاتا ہے۔ چاہے آپ دس پیسے کی مسافت کا سفر کریں یا پانچ پیسے کی، آپ سے دس پیسے ہی وصول کیے جائیں گے۔ دلی دودھ سپلائی کرنے والی اسکیم آپ کو بھینس کے دودھ کے داموں پر دودھ کا پوڈر سپلائی کرنے اور خالص گھی اور مکھن کی جگہ ناریل کا تیل ملا ہوا گھی انھیں داموں میں فروخت کرنے پر کبھی نادم یا شرمندہ نہ ہوگی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ دلی کے بازاروں کی سب سے بڑی لعنت "کیو" ہے۔ جدھر دیکھیے، جہاں جائیے، آپ کو کیو سے سابقہ پڑے گا۔ علی الصباح سرکاری ڈپو ہو یا کسی اہیر کی ذاتی دکان، آپ کو دودھ خریدنے کے لیے کیو سے واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ ریلوں، بسوں، حتیٰ کہ چار سیٹوں والی اسکوٹروں میں جگہ حاصل کرنے کے لیے بھی آپ کیو سے نجات نہیں پا سکتے ہیں۔ خریداروں کے اس کیو کے علاوہ اگر آپ بجلی پانی کے بل ادا کرنے جائیں تو بھی آپ کو کیو میں کھڑے ہو کر انتظار کی آگ میں تپنا پڑے گا ——— بہر حال بقول مرحوم جمال عبدالناصر انتظار انسان ہی کیا قوموں کی زندگی کم کر دیتا ہے۔ اور کیو میں کھڑے ہو کر کسی چیز کو خریدنے والا انسان روپے کے ساتھ اپنے خون کو پسینہ کر کے ہمیشہ گھاٹے ہی میں رہتا ہے۔

جہاں تک دلی میں رہائش کے لیے کرایہ پر مکانات لینے کا سوال ہے اس کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ چند علاقوں میں آپ کو بغیر پگڑی ادا کیے مکان کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ پرانی دلی سے قطع نظر کناٹ پلیس میں ایک عظیم الشان عمارت کی قیمت اور اسی عمارت میں ایک کمرے کو کرایے پر حاصل کرنے کے لیے پگڑی کی رقم تقریباً برابر ہی ہو جاتی ہے۔ پرانی دلی میں مکانات کرایہ پر حاصل کرنے کے لیے اگر پگڑی دینا ایک بغیر لکھا ہوا قانون ثابت ہوا ہے تو نئی دلی میں کرایہ اتنا مہنگا ہے کہ ایک برساتی یا ایک کمرہ دو ڈھائی سو روپے ماہوار سے کم پر ملنا ممکن ہی نہیں۔

بہر حال اس شہر میں جہاں جینا بھی ہے دیگر اشیائے ضروری کی گرانی کا کیا ذکر، پانی بھی سیر ہو کر پینے کے لیے دس پیسہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ●●

آسان کیلنڈر

				جنوری اکتوبر	مئی	اگست	فروری مارچ نومبر	جون	ستمبر دسمبر
۲۲	۱۵	۸	۱	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
۲۳	۱۶	۹	۲	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات
۲۴	۱۷	۱۰	۳	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ
۲۵	۱۸	۱۱	۴	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۲۶	۱۹	۱۲	۵	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
۲۷	۲۰	۱۳	۶	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
۲۸	۲۱	۱۴	۷	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS R. N. NO. 19869/70

JANUARY 1971
(FIRST HALF)

WAQIAT

REGD. NO. D 629
TELEPHONE : [illegible]

آج کا نوجوان ـــ بے چین کیوں؟

واقعات
نئی دہلی

جنوری ۱۹۷۱ء

نصف دوم

تیسرا سال ــــــ پانچواں شمارہ

مُدیر

عبدالوحید صدیقی

صدر دفتر

ڈی ۱۰۰، نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۱۳

ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵

ایک کاپی کی قیمت ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۱۸ روپے

مضامین، نثر و نظم خواہ کسی ذریعہ سے وصول ہوں ان کے سلسلہ میں خط و کتابت کرنے کی ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی مواد کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا مُدیر کو کلی اختیار ہے۔

مضامین کے مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ ذمہ دار نہیں ہے۔

واقعات میں شائع شدہ مضامین "واقعات نئی دہلی" کے حوالے سے شائع کرنے کی عام اجازت ہے۔

انتظامی اور ادارتی امور متنازعہ کے فیصلہ کا اختیار صرف نئی دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا

مُدیر، طابع اور ناشر عبدالوحید صدیقی
مطبع برہان آفسیٹ پریس، دریا گنج دہلی

غزل

ملے جو منزلِ دار و رسن تو کیا ہوگا ۔۔۔ حیات اوڑھ کے نکلے کفن تو کیا ہوگا

جو راز راز میں اب تک رہا ہے ہم راز ۔۔۔ کُھلا وہ راز سرِ انجمن تو کیا ہوگا

کسی سے آہ جو سُلجھانے سے نہیں سُلجھی ۔۔۔ تمھاری زلفِ شکن در شکن تو کیا ہوگا

سفر سے پہلے مسافر کو سوچ لینا ہے ۔۔۔ سفر میں آئی جو یادِ وطن تو کیا ہوگا

ابھی تو چاک گریباں ہیں تیرے دیوانے ۔۔۔ ترا بھی چاک ہوا پیرہن تو کیا ہوگا

ابھی تو آپ چھڑاتے ہیں اپنے دامن کو ۔۔۔ سنبھل گیا مرا دیوانہ پن تو کیا ہوگا

یہ سوچنا ہے گرفتار ہونے سے پہلے ۔۔۔ قفس میں آیا خیالِ چمن تو کیا ہوگا

جنونِ عشق میں چھوے جو اپنے ہاتھوں سے ۔۔۔ مرا دماغ تمھارا بدن تو کیا ہوگا

بکھر گیا جو نہ پاکر کبھی منوّر کو
تمھارے ہاتھ پہ خونِ سخن تو کیا ہوگا

رُباعیات

تقی شاعر (باقری)

لکھتا ہے صنم کے دل میں "گیتا انجلی" ۔۔۔ پتھر میں اتارتا ہے نازک سی کلی
دراصل چبا رہا ہے لوہے کے چنے ۔۔۔ اوروں کو جو بانٹتا ہے مصری کی ڈلی

کاغذ کی یہ ناؤ ہے جو میں کھیتا ہوں ۔۔۔ اکتا کے کتاب دور رکھ دیتا ہوں
الواحِ وجود پر ابھرتے ہیں نقوش ۔۔۔ آنکھوں کو کبھی جو بند کر لیتا ہوں

سُلگے ہوئے ہوں دیدۂ پُرنم جیسے ۔۔۔ شعلے کو ملے برف کا سنگم جیسے
ہیں اپنے مزاج میں بہم آتش و آب ۔۔۔ تلوار کی دھار پہ ہو شبنم جیسے

اداریہ

واقعات نئی دہلی

حقیقی جمہوری اور مستحکم حکومت کی ضرورت

پچھلے شمارے میں ہم نے لکھا تھا کہ وسط مُدتی انتخابات عام ووٹروں کے لیے بڑا امتحان ہیں۔ حالات جو رُخ اختیار کر رہے ہیں اُن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ رجعت پسند قوتیں جس شدّومدّ سے میدان میں اتری ہیں اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ اس بار مسز گاندھی کو اقتدار سے محروم کر کے ہی دم لیں گی۔

چار سیاسی جماعتوں کا گٹھ جوڑ اسی مقصد سے عمل میں لایا گیا ہے ورنہ ان جماعتوں کے درمیان پالیسی کے لحاظ سے کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ نجلنگپا کانگریس نے اپنے دس نکاتی پروگرام سے جو حقیقی معنوں میں ایک سوشلسٹ پروگرام تھا ابھی تک اپنی دستبرداری کا اعلان نہیں کیا ہے اور اسی طرح سمیکت سوشلسٹ پارٹی بدستور سوشلسٹ اصولوں کی علمبردار ہے جن میں سرمایہ دارانہ اصولوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے باوجود اگر یہ دونوں جماعتیں جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کے ساتھ مل گئی ہیں جو واضح طور پر فرقہ وارانہ اور سرمایہ دارانہ پالیسی کی حامل ہیں اور ملک کو آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف گھسیٹنا چاہتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گٹھ جوڑ محض انتخابات جیتنے کی خاطر کیا گیا ہے۔ یہ ایک منفی پالیسی اور موقع پرستی کے علاوہ کچھ نہیں ــــ اقتدار کی بھوک ان جماعتوں کو ستا رہی ہے اور اس بھوک میں وہ اپنے بنیادی اصولوں تک کو بھول گئی ہیں۔

اس گٹھ جوڑ کے جواز میں اپوزیشن کانگریس کے لیڈر ایسے لایعنی بیانات دے رہے ہیں کہ ان سے ہم کیا خود ان کی پارٹی کے کارکنوں کی بڑی تعداد مطمئن نہیں ہے۔ اس کا ثبوت گجرات اور میسور میں مخالف کانگریس سے بہت سے ذمہ دار کارکنوں کی بغاوت ہے۔ یہ کارکن محسوس کرتے ہیں کہ ان کی جماعت نے محض اقتدار کی خاطر اپنے اصولوں کو قربان کر دیا لہٰذا اب اس جماعت میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

مخالف کانگریس کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ عوام کے روبرو جانے کی اس میں ہمت نہیں ہے کیونکہ اس کانگریس کے رہنماؤں کی اصل کانگریس سے (چیف الیکشن کمشنر نے اندرا نواز کانگریس کو ہی اصل کانگریس قرار دیا ہے) علیحدگی کی وجہ یہ ہے کہ مسز گاندھی اور اُن کے ہمنوا کانگریسی لیڈر کانگریس کے منظور شدہ ترقی پسندانہ پروگراموں کو تیز رفتاری کے ساتھ عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ ان ہی پروگراموں کو لے کر اب اپوزیشن کانگریس کے لیڈر عوام کے روبرو جائیں تو سخت مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اسی لیے اب انھوں نے فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کا سہارا لیا ہے تاکہ عام ووٹروں کے جذبات سے کھیل کر اپنا مطلب حاصل کر سکیں۔ یہ ان لیڈروں کی زبردست شکست ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ عام ووٹروں کے جذبات سے کھیل سکیں گے؟ ہمارا خیال ہے کہ جمہوریت کے بیس برس کے عرصے میں عام ووٹروں میں کافی پختگی آ گئی ہے اور انھوں نے اپنے ووٹوں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ یہ بات ہم پریوی پرسز کے معاملہ پر عوام کے ردِّ عمل کا اندازہ لگا کر کہہ رہے ہیں۔ پریوی پرسز کے معاملے پر کسی بچے سے پوچھ لیجیے یہی کہے گا کہ جمہوریت میں آخر شہری شہریوں میں فرق کیوں کیا جائے ــــ یہ محض ۵ کروڑ روپے سالانہ کی رقم کا سوال نہیں ہے جسے چرن سنگھ (لیڈر بی، کے، ڈی) کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اصول کا معاملہ ہے۔ اصول یہ ہے کہ جمہوریت میں سب برابر ہیں اور سب کو برابر کے حقوق حاصل ہیں لیکن "گٹھ جوڑی لیڈروں" کو سابق حکمرانوں کا تو غم کھائے جا رہا ہے ان کروڑوں عوام کی انھیں کوئی فکر نہیں جن میں سے لاکھوں کو دو وقت خشک روٹی بھی نہیں ملتی۔

بلاشبہ جمہوریت کا بڑا منشا تبدیلی ہے کیوں کہ تبدیلی حکمران طبقہ کو جامد ہونے سے روکتی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں ایک جماعت ڈو ٹرم کے بعد مشکل ہی سے برسرِ اقتدار رہتی ہے لیکن وہاں حالات ایسے نہیں ہیں کہ کسی غیر مستحکم حکومت کے برسرِ اقتدار آ جانے کا اندیشہ ہو اسی لیے بلا تکلف لوگ کسی ایک یا دوسری پارٹی کے حق میں ووٹ دیتے ہیں لیکن یہاں ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا۔ کانگریس کے علاوہ کوئی جماعت اپنی دوٹوک پالیسی کے ساتھ سامنے نہیں بلکہ کھچڑی بن کر ہم جماعتیں سامنے آئی ہیں۔ کیا ایسی "کھچڑی" کو کامیاب کر کے کوئی مضبوط حکومت بنائی جا سکتی ہے۔ اور کیا اس قسم کی "کھچڑی حکومت" ملک و قوم کی خدمت اور بین الاقوامی دنیا میں ملک کے وقار کو قائم رکھ سکتی ہے جبکہ اس میں شامل جماعتیں بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہوں۔

اسی لیے ہم نے کہا کہ آنے والے انتخابات ہمارا بہت بڑا امتحان ہیں۔ ہر ووٹر کو اس میں سوجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا اور اقلیتوں کو خاص طور پر دیکھنا ہوگا کہ ان کے ووٹ تقسیم ہو کر بیکار ضایع نہ ہو جائیں۔ طاقتی توازن میں ان کے ووٹوں کی بڑی اہمیت ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ مسلم لیگ اور مسلم مجلس جیسی مسلم جماعتوں نے فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعتوں سے الگ رہنے اور سیکولر طاقتوں کے ساتھ تعاون کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے مرکز میں ایک مضبوط حکومت کے قیام میں مدد ملے گی۔ مسز گاندھی کی حکومت کی جو خامیاں رہی ہیں وہ بے شک ہمارے سامنے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو ــــ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں ان کی کمزور پالیسی۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر آئندہ انتخابات میں کانگریس زیادہ طاقتور بن کر سامنے آئی تو وہ یقیناً اقلیتوں کے جائز مطالبات کا ازالہ کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے کی پوزیشن میں ہوگی کم از کم مسز گاندھی کی ذات سے ہمیں ایسی ہی امید ہے۔

تمام اقلیتوں اور دوسرے سیکولر ووٹروں کو بھی یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انھیں اس وقت نقلی جمہوریت اور حقیقی جمہوریت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہے۔ پہلی ام نہاد جمہوریت میں اصل اقتدار سرمایہ داروں اور مفاد پرستوں کے ہاتھوں میں رہے گا اور حقیقی جمہوریت میں طاقت کا اصل سرچشمہ عوام ہوں گے ــــ وہی حکومت کو منتخب کریں گے اور ان ہی کے لیے یہ منتخبہ حکومت کام کرے گی۔ اس قسم کی عوامی اور مضبوط حکومت ہم اسی وقت بنا سکتے ہیں کہ ہم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائیں بلکہ متحد ہو کر اس جماعت کو کامیاب کرائیں جس نے سیکولر جمہوریت کے اصولوں کو بروئے کار لانے اور اقتصادی نابرابری کو ختم کرنے کا عزم کیا ہے۔ ■■

۱۹ء
ایک جائزہ

۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو غروب ہوجانے والے سورج کی پہلی کرن نے جب اگلے دن ۱۹۷۰ء کی آمد کا اعلان کیا تو بین الاقوامی دانشوروں نے نئے سال کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے نئی دنیا کے لئے امن وسکون کا سال قرار دیا۔ سائنس دانوں، دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں نے نئے سال کے ساتھ نئی نئی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں لیکن کوئی بھی امید بر نہ آئی۔ سیاسی اعتبار سے ۱۹۷۰ء جمود کا سال تھا۔ ۱۹۶۷ء میں چھینا ہوا عربوں کا علاقہ اسرائیلیوں کے ہی قبضہ واقتدار میں رہا۔ ہندوستان سے لیا ہوا ہزاروں مربع میل کا علاقہ چین کے پاس ہی رہا۔ ویت نام اور کمبوڈیا وغیرہ میں خون کے دریا بہتے رہے اور اقوام متحدہ شیر قالین لبوں پر قفل لگائے ہوئے سال بھر خاموش بیٹھے رہے۔

لیکن ۱۹۷۰ء بین الاقوامی تاریخ میں کئی حادثات کی وجہ سے ضرور اہم سال قرار دیا جائے گا۔ اس سال کربلا کے معرکہ کی تاریخ اردن میں دہرائی گئی۔ ہزاروں عربوں نے آپسی کشمکش اور باہمی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کی جان لے کر تمام دنیا خصوصاً اسرائیل پر واضح کر دیا کہ وہ ابھی تک عرب اتحاد کا ڈھونگ رچا رہے تھے۔ اس سرزمین سے اٹھنے والے ہوائی جہازوں کے ہائی جیکنگ کے فتنہ نے روس اور امریکا کی افواج کو تیسری عالمگیر جنگ کے مورچوں پر اکٹھا کر دیا لیکن صدر ناصر نے اپنی حکمت عملی سے مشرق وسطیٰ کو آگ اور خون کے شعلوں سے بچاتے ہوئے خود اپنی جان اسی مورچے پر توڑ دی۔

اردن کی خانہ جنگی اور صدر ناصر کی غیر متوقع موت نے عرب ممالک کی امنگوں پر سرد لہر دوڑا دی۔ ڈاکٹر جارج حبش اور لیلیٰ خالد کی نادانی ہزاروں بچوں کو یتیم اور ہزاروں عورتوں کو بیوہ بنا گئی۔ جنرل ڈیگال بھی اس سال فرانس کو یتیم بنانے کے لئے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

اگست ۱۹۷۰ء میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان پہلا عارضی سمجھوتہ ہوا جسے نومبر میں مزید نوّے روز کے لئے توسیع دے دی گئی۔

ہندوستانی سپریم کورٹ نے حکومت کے دو فیصلوں کو خلاف قانون قرار دیا جن میں ایک تو بینکوں کے قومیانے کے بارے میں تھا اور دوسرا صدر کا وہ حکم جس کے تحت والیانِ ریاست سے تمام مراعات واپس لے لی گئی تھیں۔

بہر حال بینکوں کو قومی ملکیت قرار دے دیا

صدر ناصر کی موت عالمِ عرب کے لئے ایک ناقابل تلافی المیہ ہے۔

بہر حال مصر کے نئے صدر انور سادات نے صدر ناصر کی کمی کو کافی حد تک پورا کر دیا ہے۔

واقعات تصویروں میں

چارلس ڈیگال کی موت نے تاریخ کے ایک باب کو بند کر دیا۔ ڈیگال نے اپنی پوری زندگی لڑتے ہوئے گزاری۔ لیکن ان کی موت بہت پرسکون ہوئی۔

گیا لیکن والیانِ ریاست سے اپنا معاملہ چکانے کے لئے شریمتی اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ کو شکست کر دینے کے اعلان سے پارلیمانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پارلیمنٹ کو قبل از وقت توڑ دینے اور ساٹھ دن کے اندر نئے چناؤ کرانے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ ملک میں غربت، بدامنی اور بدعنوانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ حزب مخالف ان کی ہر ممکن مخالفت پر اتر ہوا ہے اور وہ پارلیمنٹ میں اپنے حمایتی اور موجودہ تعداد کی قلت کی وجہ سے ملک کی خوش حالی اور اقتصادی ترقی کے لئے کوئی بھی قدم نہیں اٹھا سکتیں۔ فرقہ پرست اور سرمایہ نواز طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ انہی عناصر نے مئی میں بھیونڈی اور جلگاؤں جیسے صنعتی شہروں کو فرقہ پرستی کے شعلوں سے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

جلگاؤں کے فرقہ وارانہ فساد کی شاید دنیا بھر میں کہیں مثال نہ مل سکے جہاں بغیر اسباب و علل خون کی ہولی کھیلی گئی۔ ۱۹۷۰ء کے ماہ مئی نے اس واقعہ کو جنم دے کر ہندوستانی جمہوریت کے تابناک رخ پر سیاہی پھیر دی۔

ہندوستان میں ۱۹۷۰ء نے کئی نئی تحریکوں کو جنم دیا اور یہ سب کچھ مارچ میں مغربی بنگال کی جمہوری حکومت کے خاتمہ اور صدر راج کے بعد ہوا مغربی بنگال وارداتوں کا مرکز بن گیا۔ نکسلائیٹ تحریک نے شدت اختیار کر لی اور کوئی دن ایسا نہ گیا جب قتل و خون، لوٹ اور غارت گری کی خبریں کلکتہ کے نام سے اخبارات میں شائع ہونے سے رہ گئی ہوں۔ اس کے علاوہ زمینوں پر غیر قانونی قبضہ مکانوں اور دکانوں کا کرایہ ادا نہ کرنے کی تحریکیں مغربی بنگال سے عبور کر ملک بھر میں پھیل گئیں۔

صدر کانگریس جگجیون رام اور وزیر اعظم کے کھیتوں تک پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ملک بھر میں اس ذہنیت کو کچلنے کے لئے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ ان تحریکوں میں عورتوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۷۰ء میں جلسہ اور جلوس اپنا سابقہ ریکارڈ توڑ گئے۔ خود راجدھانی میں اتنے جلوس اور اتنے جلسے ہوئے کہ یہ شہر جلوسوں کے نام سے پکارا جانے لگا۔ نئی بات یہ ہوئی کہ نیتاؤں علی الخصوص شریمتی گاندھی کو جلسہ طلب کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی اس کے بجائے خود جلسوں نے ان کے گھر پر آ کر ان سے تقریر کرنے کو کہا۔ شاید اتنی ہولناک ہو گی اور دوسری مثال کہیں بھی ملنا مشکل ہو جائے جب لوگوں نے خود جلوس کی شکل میں اپنے رہنما کے گھر جا کر اس سے تقریر کرنے کی درخواست کی ہو۔

اسی سال کیرالا بھی اسمبلی توڑ کر دوسرے الیکشن کر ڈالے۔ یو۔پی میں دوسری حکومت بنی۔ بہرحال ۱۹۷۰ء ہندوستان میں ہماہمی کا سال رہا ہے اور اس سال نے اپنے بطن سے ایسے کئی مسائل کو جنم دیا جو ہندوستان کے مستقبل کے لئے خوش آیند قرار

پاکستان میں پہلی بار عام انتخابات ہوئے۔ پاکستان کے عوام نے نئے ترقی پسند لیڈروں کو کامیاب کر کے ثابت کر دیا کہ پاکستان کے عوام میں اب کافی سیاسی شعور پیدا ہو گیا ہے

لیبیا۔ مصر اور سوڈان کی فیڈریشن بنی تو صدر ناصر کی موت کے بعد ان کا وہ خواب پورا ہو گیا جو انہوں نے ساری زندگی دیکھا۔ بعد میں اس فیڈریشن میں شام اور لبنان بھی شامل ہو گئے۔

جارج حباش کے اشارے پر تین جہازوں کا اغوا کر کے اردن کے ریگ زار میں کھڑا کر دیا گیا۔ دنیا ایک بار پھر تیسری جنگ عظیم کے دہانے پر جا پہنچی لیکن صدر ناصر کی حکمت عملی نے دنیا کو ایک اور بھیانک جنگ سے بچا لیا — لیلیٰ خالد اپنی بہادری اور ہمت کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے۔ دنیا بھر کے نوجوان لیلیٰ خالد کے کارناموں سے سبق لیتے ہیں

سامراجی طاقتوں کے اشارے پر شاہ حسین نے اردن میں خون کی ندیاں بہادیں۔ ۲۵ ہزار سے زائد فلسطینی جوانوں، بچوں اور عورتوں کا قتل عام کیا گیا۔ لاکھوں لوگوں کو ایک بار پھر بے گھر کر دیا گیا۔

شرقی پاکستان میں اس صدی کا سب سے بڑا طوفان آیا جس میں ایک اندازے کے مطابق ۹ لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔
تصویر میں بھوکا فرزبہ کے بھوکے بچے روٹی مانگ رہے ہیں

دیئے جا سکتے ہیں علی الخصوص پالیمنٹ کو نئے چناؤ کی خاطر توڑ دینے سے ہندوستان کے شاندار مستقبل کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔

۱۹۷۰ء نے اگرچہ ہندوستان کو عالمی شہرت یافتہ سائنسداں، سر سی۔ وی۔ رمن سے محروم کر دیا لیکن اسی سال ڈاکٹر ہرگوبند کھورانہ نے وسکانسن یونیورسٹی میں ایک نئے سائنسی انکشاف سے ساری دنیا کے سائنس دانوں کو متحیر کر دیا۔ ڈاکٹر کھورانہ نے بتایا کہ وہ انسانی جین سے ایک ایسے عنصر کی تلاش میں کامیاب ہو چکے ہیں جس پر انسانی نسل کی پیداوار کا انحصار ہے۔ اس تلاش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مصنوعی طور پر انسانی نسل کی افزائش ممکن ہو جائے گی اور یہی عنصر بڑھتی ہوئی آبادی کو بریک لگانے کے سلسلہ میں بھی ممد و معاون ثابت ہو سکے گا۔

بین الاقوامی سطح پر ہونے والے ان گنت نقصانات میں سر فیروز خاں نون، ڈیگال، ناصر کے علاوہ ممتاز فلسفی برٹ اینڈ رسل کی تلافی بھی ناممکن ہے۔

مشرقی پاکستان میں اس سال دوبار خوفناک سیلاب اور طوفان نے قیامت برپا کر دی۔ خصوصاً ۱۲ نومبر کو آنے والے ہولناک طوفان نے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے۔ لاکھوں انسان مر گئے اربوں روپے کا نقصان ہو گیا۔ انسان پر تباہی اور بربادی کے اس اندوہ ناک المیہ نے ساری دنیا کو تھوڑے عرصہ کے لئے متحد کر دیا۔

ہندوستان نے اس المیہ سے نپٹنے کے لئے پاکستان کو دو کروڑ روپے کے علاوہ ہر قسم کے تعاون کی پیشکش کی۔ پاکستان میں اسی سال قیام مملکت کے بعد بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات عمل میں لائے گئے۔ مشرقی پاکستان سے ہندوستان نواز شیخ مجیب الرحمن اور مغربی پاکستان سے ہندوستان دشمن ذوالفقار علی بھٹو نے اکثریت کی طرف دوڑی حاصل کی۔

برطانیہ اور سیلون میں بھی عام انتخابات ہوئے اوّل الذکر مملکت نے ہیتھ اور موخر الذکر نے مسز بندرا نائیکے جیسے متضاد مزاج والی ہستیوں کو وزیر اعظم چنا۔ دونوں ممالک دولت مشترکہ کے ممبر ہیں۔ وزیر اعظم ہیتھ نے جنوبی افریقہ کو ہتھیاروں کی امداد دے کر افریشائی ممالک کو اپنا دشمن بنا لیا جبکہ مسز بندرا نائیکے نے حکومت اسرائیل سے اس وجہ سے سفارتی تعلقات توڑ دیئے کہ اس نے عربوں کے مقبوضہ علاقے دینے سے انکار کر دیا۔ امریکہ میں بھی اسی سال عام انتخابات عمل میں لائے گئے۔

ایجادات اور مہمات کے اس دور میں امریکا نے ۷۴۷ جمبو جیٹ کے روپ میں ایک اڑتے ہوئے شہر کو پیش کیا جبکہ روس نے ایک خود کار گاڑی چاند پر پہونچا دی۔

لیکن ان تمام واقعات اور حادثات سے قطع نظر اقوام متحدہ کی وہ ۲۵ سالہ برسی ہے جو اسی سال دھوم دھام سے منائی گئی جبکہ یہ ادارہ اپنی گزشتہ زندگی میں امن و انصاف قائم کرنے کی بجائے بین الاقوامی قزاقوں کی سرپرستی ہی کرتا رہا ہے۔

احمد آباد کے بعد بھیونڈی اور جلگاؤں میں ایسے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے کہ سارے ملک کی گردن شرم سے جھک گئی۔ ہزاروں لوگوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی

آج کا طالب علم

ایک سیاسی طاقت

(سیدہ فہیم)

سیدہ فہیم ۔ گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد میں فنون کی طالبہ ہیں۔

"آج کا طالب علم بے چین ہے، وہ تخریب پسند ہے، اسے توڑ پھوڑ، بھوک ہڑتال یا گھیراؤ کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں سوجھتا۔ آج کے طالب علم کا اخلاق تباہ ہوگیا ہے، وہ استادوں کی عزت کرنا نہیں جانتا، وہ شراب، جوا اور عیاشی کو نئی تہذیب کا ایک جز سمجھتا ہے۔"

یہ وہ جملے ہیں جو آئے دن ہماری نظروں کے سامنے اخبار کی سرخیوں کی صورت میں آتے ہیں یا پھر "دیش بھگت" نیتا انھیں اپنی تقاریر میں دہراتے رہتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے طالب علم کو مورد الزام ٹھہرا دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ طلبا کی اس تباہی اور افراتفری میں خود ان کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ اس بے چینی کا سدباب کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ صرف تنقید کرنا جانتے ہیں، بیماری کا علاج ان کے پاس نہیں۔

یہ بات ایک حقیقت ہے کہ آج کل نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں طلبا مختلف تحریکوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ ہڑتالیں کرتے ہیں۔ کالج کی عمارتوں کو آگ لگاتے ہیں، بسوں اور ریلوں کو نذر آتش کرتے ہیں۔ نعرہ بازی کرتے ہیں اور اکثر اوقات یہ بھی نہیں جانتے کہ آیا وہ حق پر ہیں یا موقع پرست سیاست دانوں کا شکار بن رہے ہیں۔ اس بے چینی اور افراتفری کی فضا کو ختم کرنے کے لئے ہم بزرگ سیاستدانو سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ سیاستداں اکثر طلبا کو ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں یا پھر تعلیم کو سیاست سے الگ رکھنے کی بات کرتے ہیں۔ سیاست کو تعلیم سے دور رکھنے کی بات عموماً ساری دنیا میں اور خصوصاً ہندوستان میں بہت سنی جا رہی ہے۔ اب ہمیں سوچنا یہ ہے کہ واقعی کیا یہ ممکن بھی ہے؟ موجودہ دور میں سیاست زندگی کے ہر شعبے میں بری طرح دخیل ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں جو بظاہر تو ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن آپس میں ان کا ایک نامیاتی رشتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تعلیم بھی زندگی کا ایک پہلو ہے اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں مثلاً سیاست تہذیب اور مذہب سے اس کا اَن دیکھا لیکن گہرا رشتہ ضرور ہے۔ جو لوگ سیاست سے تعلیم کو دور رکھنے کی بات کہتے ہیں وہ بکواس کرتے ہیں اور یہاں ان کی جہالت سے کوئی بحث نہیں۔ ہماری درسگاہوں کی طرف دیکھئے بلکہ بھر میں کتنے ایسے اسکولس، کالجس، اور یونیورسٹیاں ہیں جن کے نام گاندھی، نہرو، آزاد یا پٹیل کے ناموں سے موسوم ہیں سیاسی لیڈروں کے ناموں سے کسی درسگاہ کو موسوم کرنے کا فعل ہی سیاست سے تعلیم کے گہرے رشتے کا بیّن ثبوت ہے۔

مذکرہ بالا بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ کیا ہم طلبا کی موجودہ بے چینی کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ یہ طے شدہ بات ہے کہ سیاست سے تعلیم کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ کرنا چاہیئے کیونکہ موجودہ دور میں سیاسی سوجھ بوجھ ایک طالب علم کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ خود تعلیم۔

کسی بھی جمہوری نظام میں سیاسی سوجھ بوجھ بہر حال انتہائی اہم جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جمہوری حکومت کا تعلق عوام کی مرضی سے ہوتا ہے اور خود عوام درسگاہوں سے منسلک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک جال سا بنا ہوا ہے جسے ٹٹولا جائے تو سیاست آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ طلبا کو صحت مند سیاست کی طرف راغب کرائیں تاکہ وہ اقتدار اور شہرت کے بھوکے موقع پرست نیتاؤں کا شکار نہ ہو سکیں۔ یہ نیتا صرف اپنی غرض کی خاطر طلبا کو استعمال کرتے ہیں اور ان کے ناپختہ ذہنوں کا ناجائز

تہران میں طلبا نشانہ ... کا استعمال کرتے ہوئے

پیرس میں کمیونسٹ انقلابی نوجوانوں اور پولیس کے درمیان جنگ

بالشکریہ [illegible]

فاتحہ اٹھاتے ہیں۔ وہ طلبار کو اکثر مذہب زبان اور علاقہ واریت کے نام پر بھڑکاتے ہیں۔ نتیجہ میں انتشار پھیلتا ہے لاٹھی چارج ہوتا ہے، آنسو گیس استعمال کی جاتی ہے گولیاں چلتی ہیں، بھوک ہڑتالیں ہوتی ہیں یا پھر گھراؤ کیا جاتا ہے، دیش کا کروڑوں روپے کا نقصان ہوتا ہے طلبار کی تعلیم پر بہت برا اثر پڑتا ہے لیکن یہ نیتا اہم شخصیتوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ طلبار نہیں ہیں جو موجودہ بے چینی کلچر انتشار کے ذمّہ دار ہیں بلکہ یہ وہ موقع پرست نیتا ہیں جو طالب علم کے کاندھے پر بندوق رکھ کر شکار کھیل رہے ہیں۔ وہ طلبار کو اپنی اور اپنی پارٹی کی پبلسٹی کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہماری تنقید کا رخ طلبا کی طرف ہونے کے بجائے موقع پرست سیاست دانوں کی طرف ہونا چاہئے۔ ہم نے اصل مسئلے کو سمجھا ہی نہیں اسی لئے ہم ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ امریکا کے گٹار نواز باب ڈیلن (Bob Dylon) نے اسی بات کو خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

Come Mothers and Fathers
throughout the land
And donot criticize what
you donot understand
Your sons and daughters are
beyond your command

ہمارے بزرگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے موجودہ دور کی روح کو نہیں سمجھا۔ موجودہ صدی دراصل ایک عبوری دور ہے اور اس کے خاتمے کے بعد انسان کو کوئی نہ کوئی منزل مل جائے گی۔ یہ انتشار، یہ ہنگامہ، یہ افراتفری، یہ بے چینی دراصل امن اور سکون کی منزل پانے کے لئے ہے۔ ہر دور میں انسان نے امن کے لئے جدوجہد کی ہے فرق صرف جدوجہد کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جو لوگ طلبار پر تنقید کرتے ہیں وہ اکثر پرانی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے ساتھ ایک محدود سا نظریۂ حیات لئے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں تہذیب و تمدّن کے جو اقدار ہوتے ہیں وہ بھی موجودہ معاشرے کی قدروں سے میل نہیں کھاتے۔ آج جو جوان ہیں اور تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ ایٹمی دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے ذہنوں پر نہ تو دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں کا اثر ہے

عجیبی طلبار لمبے لمبے بال اور عجیب سا درویشانہ لباس انہیں دوسرے طلبار سے ممتاز کرتا ہے۔

اور نہ ہی سرد جنگ (Cold War) کے مضر اثرات کا۔ یہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جو ٹکنالوجیکل سائنس کی ترقیات کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے انسان نے اپنے قدم چاند پر رکھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آج کا نوجوان صرف اس لئے بے چین ہے کہ ہماری زندگی بڑی بے رنگ ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک فرد کا دوسرے فرد سے رشتہ ختم ہو گیا ہے۔ جو لوگ دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے واقف ہیں وہ امن کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور ایک بین الاقوامی معاشرہ چاہتے ہیں جس میں تمام ممالک کے لوگ مل جل کر رہ سکیں اور مزید جنگ کے خطرات کو ٹالا جا سکے

ہپیوں کا ایک میلہ — ہپی جو سماج کے ہر اصول سے بیر رکھتے ہیں۔

اسی طرح شمس نے اقوام متحدہ کو ختم رکھا تھا۔ لیکن جوانی کا جوان میں ایسی ذہنی کیفیت بالکل مختلف ہے۔ وہ اس بےرنگ سی مشینی زندگی سے پریشان ہیں جس نے انہیں ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ انہیں بھی سکون کی تلاش ہے لیکن اسے پانے کے لئے کونسا راستہ اختیار کیا جائے اس سے یہ واقف نہیں اس لئے ان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ آج کل کے نوجوان طلبار انہی مشکلات سے دوچار ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نوجوان طلبار کے مسائل کو نوجوانوں کے نقطۂ نظر سے ہی سمجھنے کی کوشش کریں۔

چند سال پہلے الہ آباد کے کسی کالج میں ایک سمپوزیم کے دوران اوماشنکر جوشی نے بڑی خوبصورت بات کہی تھی۔ ان سے پوچھا گیا تھا کہ آج کل کے نوجوان کو کونسی چیز بےچین کئے ہوئے ہے؟ ان کا جواب تھا۔

”یہی کہ وہ نوجوان ہے!“

یہ بات بہت زیادہ دلچسپ ہے کہ دنیا کی موجودہ صورتحال نے نوجوان طلبار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ طلبار کا ایک گروپ ہپی ازم (Hippieism) کی تائید میں ہے اور دوسرا گروپ انقلابیوں پر مشتمل ہے۔

ہپیوں نے موجودہ انسانی تہذیب کے اقدار کو چیلنج کیا ہے۔ وہ سوچنے سمجھنے اور محنت کرنے کے فعل کو غیر ضروری اور تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ سوچتا ہوا ذہن ان کے پاس زہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ موجودہ اور پر تصنع اور ریاکارانہ زندگی سے بےزار ہیں۔ ایسے طلبار کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بہت نظر آتے ہیں۔ ان کے لمبے لمبے بال اور عجیب سا اور وحشیانہ لباس انہیں دوسرے طلبار سے ممتاز کرتا ہے۔

ہپی طلبار دراصل بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ بھوک غریبی اور لاچاری کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن ان تمام برائیوں کو ختم کرنے کی طاقت ان میں نہیں اس لئے وہ اس دنیا کو ہی بھلا دینا چاہتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت وہ نشہ آور چیزیں مثلاً گانجہ۔ افیون چرس وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی اس بیمار ذہنیت کے باوجود وہ موجودہ معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں ہیں لیکن تبدیلی لانے کا راستہ بہت زیادہ مبہم ہے۔ وہ فرد اور اس کی انفرادیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور خود اپنے آپ کو پڑھنے اور سمجھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تبدیلی خود اپنے

ہم انقلاب چاہتے ہیں

ہم تبدیلی چاہتے ہیں

آپ کو بدلنے کے بعد لائی جا سکتی ہے اور یہ تبدیلی تشدد یا جبر کے بجائے محبت کے اصولوں پر عمل کر لائی جانی چاہیئے۔ اسی لئے اکثر ان کا نعرہ ہوتا ہے۔ ”محبت ـــــ نہ کہ جنگ“

انقلابی طلبار بھی پورے معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں لیکن وہ یہ تبدیلی انقلاب کے ذریعے لانا چاہتے ہیں چاہے پھر وہ خونی انقلاب ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے طلبار ہندوستان میں نکسلائیٹ تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ موجودہ طبقاتی نظام سے نالاں ہیں۔ اس نظامِ حکومت سے موجودہ لیڈروں نے انہیں دھوکہ دیا ہے۔ ان سے کئے گئے وعدے وفا نہیں ہوئے، ان طلبار نے کئی ممتاز لیڈروں کے مجسمے توڑ ڈالے۔ ان کا یہ فعل ایک عجیب سی نفسیاتی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ وہ موجودہ موقع پرست لیڈروں سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے ماضی کے لیڈروں کے مجسمے توڑتے ہیں کیونکہ موجودہ نیتا انہی بزرگ لیڈروں کے نام پر قسمیں کھاتے ہیں اور دھوکہ دیتے ہیں۔ انہیں ان لیڈروں سے کوئی شکایت نہیں جن کے وہ مجسمے توڑتے ہیں۔ اس طرح کی پیچیدہ ذہنی کیفیت انہیں پریشان کئے رہتی ہے اور وہ پھٹ پڑتے ہیں۔ ایڈورڈ شیلس (EDWARD SHILS) نے ہندوستانی طلبار کی موجودہ افراتفری پر سروے کرنے کے بعد لکھا ہے کہ طلبار وائس چانسلر پر، کلکٹر پر، پولیس افسروں اور ان کے مکانات پر، بس ڈرائیوروں پر، ٹیلیفون خانوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر حملے کرتے ہیں۔

اس افراتفری اور بےچینی کے ذمہ دار یقیناً وہ بوڑھے سیاستداں ہیں جو اپنی سیاسی اغراض کے لئے طلبار کو استعمال تو کرتے ہیں لیکن حکومتی مشنری میں ان کے دخل کو پسند نہیں کرتے اور تعلیم کو سیاست سے دور رکھنے کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی۔ موجودہ نوجوان طلبار کی نسل ایک سیاسی طاقت بن کر دنیا کے ہر حصے میں نمودار ہوئی ہے یہ طلبار مزید دھوکہ کھانا نہیں چاہتے بلکہ حکومتی پالیسیوں میں ایماندارانہ دخل چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا کے مختلف ملکوں میں اور خود ہندوستان میں اٹھارہ سال کی عمر میں ووٹ دینے کا حق کے نظریہ کی تائید کی جا رہی ہے ـــ یہ مطالبہ بالکل بجا ہے کیونکہ جمہوریت نام ہے عوامی حکومت کا نہ کہ بوڑھے لوگوں کی حکومت کا۔

اگر آج کے نوجوان طلبار کو حکومت اور سیاست میں بہتر طور پر حصہ لینے کی اجازت دی گئی تو ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ موجودہ افراتفری میں کسی قدر کمی واقع ہو۔

اسرائیلی درندے اور مجاہدینِ فلسطین

بن غازی (لیبیا) سے جناب شعیب نگرامی نے ازراہِ کرم قارئین "واقعات" کی آگاہی کے لئے حرب اسرائیل آویزش پر ایک **حقیقت پسندانہ** تبصرہ ارسال کیا ہے جسے شکریے کیساتھ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے

(ادارہ)

اب اسرائیل اور مغربی سامراجیوں کے ہر حملے کا جواب فلسطین، مصر، شام، لیبیا اور سوڈان کے عوام ایک ہو کر دیں گے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کی تقسیم فلسطین سے متعلق قرارداد انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کے سب سے بڑے "ڈاکے" کا نقش اول تھی۔ یہ قرارداد بیسویں صدی کے سب سے بڑے المیہ کی ابتداء تھی۔ اس ظالمانہ فیصلے نے لاکھوں ماؤں کی گودوں کو ویران کر دیا ہزاروں دلہنوں کے سہاگ کو اجاڑ دیا بیکڑوں پھول جیسے معصوم بچوں کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین لی۔ یہ قرارداد فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کے متعلق نام نہاد اس برطانوی شہنشاہیت کے وعدہ کا سرکاری اعلان تھی جس کی عظمت و سطوت کا سفینہ ۵۶ء میں نہر سویز میں تہہ آب ہو گیا۔ اور جس کے غرور کا جنازہ عدن کے حریت پسندوں نے نکالا۔ اور اب جس کی نام نہاد حریت و آزادی کے دعوے کی دھجیاں شمالی آئرلینڈ کے عوام اڑا رہے ہیں۔ عالمی ادارہ کی مذکورہ قرارداد کے بعد مشرق وسطیٰ کے نقشہ سے ایک امن پسند قوم مٹی اور اس کی جگہ اسرائیل کی شکل میں ظلم و استبداد، اور دہشت انگیزی اور تشدد نے سر اٹھایا۔ صیہونیت نے فلسطین میں قدم جمانے کے بعد اپنے گمراہ کن پروپیگنڈہ سے دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اب فلسطین نام کی کوئی چیز دنیا میں نہیں باقی رہی، اب اصل مسئلہ عرب، اسرائیل سرحدوں پر ہونے والی جھڑپوں کا ہے۔ رہے فلسطینی عوام تو ان کا مسئلہ خود عربوں کا پیدا کردہ ہے کیونکہ عرب حکومتیں ان دس لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کو اپنی سرزمین پر بسانے کے لئے تیار نہیں ہیں صیہونیت اور سامراج نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس نے دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مشرق وسطیٰ میں کوئی بھی ایسا فلسطینی نہیں ہے جو اپنی اس سرزمین کو واپس جانا چاہتا ہے جہاں اس نے آنکھیں کھولیں! اور بچپن و جوانی کا دور بتایا۔

اسرائیل کی عبرو یونیورسٹی میں ریاضیات کے سابق پروفیسر مسٹر "ماشوبر" لکھتے ہیں کہ صیہونی حکام نے اپنی مظلومیت کی تصویر کشی کر کے عالمی رائے عامہ کو اس حقیقت سے دور رکھنے کی کوشش کی کہ خیموں میں بسنے والے دس لاکھ فلسطینی پناہ گزین اپنے گھروں کو جانے کے لیے بے تاب ہیں! وہ اپنی زمین کی حفاظت اور جائز حقوق کے لیے اپنے خون کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ پروفیسر "ماشوبر" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اسرائیل نے اب تک عربوں پر جتنی بار بھی حملے کئے ان کا اہم مقصد فلسطینی عوام کی اس مسلح جدو جہد کو ختم کرنا تھا جو ۱۹۵۵ میں شروع ہو چکی تھی، کیونکہ اسرائیلی حکام کے لئے اصل خطرہ مسلح جدو جہد ہے۔ یہ وہ خطرہ ہے جس نے تل ابیب کے حکام کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں اور اس بڑھتی ہوئی مسلح جدو جہد کے سامنے اسرائیلی لیفٹننٹ اور پارلیمنٹ کے ممبر قومی اتحاد ہرگز قائم نہیں رکھ سکتے ہیں جون ۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ نے اس مسلح جدوجہد کو ایک نئی زندگی بخشی فلسطینی عوام جو اقوام متحدہ کی جانب سے مایوس ہو چکے ہیں اور جن پر یہ راز منکشف ہو چکا ہے کہ اس متمدن دنیا میں جنگل کے قانون کا بول بالا ہے۔ انہوں نے اپنے ۴۸ء کے لگے ہوئے زخموں کا علاج خود کرنے کا فیصلہ کیا ہے فلسطینی پناہ گزین جو اب تک عالمی خیرات پر

یپام بم کا شکار یہ معصوم نہ صرف اپنا گھر بار بلکہ
پنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بھی محروم ہو گیا ہے

فلسطینی مجاہد جنہیں آج ایک نہیں بلکہ درجنوں دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے
ایکطرف اگر اسرائیل و امریکہ ہیں تو دوسری طرف اُردن' لبنان اور خود انکی آپس کی پھوٹ

سوں میں زندگی گذارا کرتے تھے اب انہوں نے ہتھیار
ٹھاکر عالمی رائے عامہ سے اپنے وجود کو تسلیم کروالیا ہے۔

فلسطینی حُریت پسندوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے
ن اسرائیلی حکام کو ہراکر رکھ دیا ہے جنہیں ۶۷ء کی
ح نے مست کر رکھا تھا۔ اور جو عربوں کے گھٹنے ٹیکنے کا
ہانا خواب دیکھ رہے تھے۔ تل ابیب کے حکام عارضی
ح کے نشہ میں یہ بھول گئے کہ انھوں نے اس قوم کو للکارا
ہے جو سر دھڑ کی بازی لگانا خوب جانتی ہے۔

اسرائیل کی گمراہ کن پروپیگنڈہ مشینری ایک بار پھر
رکت میں آئی اور حُریت و آزادی کے ان متوالوں کو "تخریب
سند" اور "دہشت پسند" جیسے خطابوں سے نواز لہ دنیا
ے سامنے ان کی مقدس جدوجہد کو رسوا کرنے کی کوششیں شروع
ردیں! اور دوسری جانب اسرائیل کے جنگ باز حکام نے
س تحریک آزادی کو جو بقول ممتاز برطانوی صحافی "مائیکل آدمز"
دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں کے خلاف یورپین قوم
جدوجہد سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ "ناپام" بموں سے مٹانا
اہا، چنانچہ ۲ نومبر ۶۸ء کو "الکرامۃ" نامی گاؤں کے فلسطینی
او گزینوں پر جو سوئے ہوئے تھے دریان کی فوج نے ایک طرف تو بھاری
پوں سے گولہ باری کی اور دوسری جانب اسرائیلی طیاروں
ے آسمان سے خیموں میں رہنے والے نہتے بوڑھوں اور بچوں پر

آگ کی بارش کی۔ اس شرمناک فوجی کارروائی میں سیکڑوں
شہیدوں نے اپنے خون سے حریت و آزادی کے پودے کی
آبیاری کی۔ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے جسے عالمی رائے
عامہ کا ضمیر کہا جاتا ہے، اس انسانیت سوز حرکت کی مذمت

میں کب
واپس
گھر جاؤں گا

کی اور اسے اقوام متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی قرار دیا۔
لیکن اسرائیلی حکام نے جو ہر قسم کی اخلاقی اور انسانی قدروں
کو پامال کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں اعلان کیا کہ اگر
فلسطینی حریت پسندوں کی سرگرمیاں جاری رہیں تو وہ
اس سے بھی بڑی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کریں گے۔ چنانچہ
۱۵ فروری ۶۹ء کو اسرائیلی فوجیں دریائے اردن کے
پار پناہ گزینوں کے ۲۰ گاؤں پر حملہ آور ہوئیں ایک بار پھر
سیکڑوں نہتے انسان خون میں نہا گئے اور ستر ہزار سے زائد
بے گھر خیموں سے بھی محروم ہو گئے۔

اسرائیل کی یہ وحشیانہ حرکتیں فلسطینیوں کے حریت
و آزادی کے جذبہ کو دبانے میں بُری طرح ناکام رہی ہیں۔
بلکہ ان حرکتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے حُریت پسندوں
نے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا۔ اور انہوں نے اسرائیل کے
اندر گھس کر تل ابیب کے حکام کے وطنی اتحاد کو برقرار رکھنے
کے خواب کو خاک میں ملا دیا۔ فلسطینی عوام کی مسلح جدوجہد
"مارو اور بھاگو" کے مرحلہ سے گذر کر "مارو اور جمے رہو"
کے مرحلہ میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کا نتیجہ
حیفا۔ عفولہ۔ خضیرہ۔ نامی شہروں کی تباہی ہے۔
فلسطینی فدائیین نے اس مرحلہ میں داخل ہو کر "وادی بیسان"
نامی اسرائیلی نو آبادی کے باشندوں کا دن کا سکون اور رات
کی نیندیں چھین لی ہیں۔ ●●

انڈین یا ہندوستانی

ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ یافتہ
بنگالی مصنف آنند شنکر رے

اس مضمون کے مصنف جناب آنند شنکر رے (۶۶ سال) کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام مل چکا ہے وہ ایک مشہور بنگالی مصنف ہیں، اور اب تک ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں وہ ۱۹۵۱ء میں آئی سی ایس سے ریٹائر ہوئے تھے۔

چند سال پہلے کی بات ہے۔ لندن میں میرے ایک دوست کی یہودی بیوی نے کہا تھا کہ "سامی نسل سے دشمنی یورپ والوں کی ایک دائمی بیماری بن چکی ہے۔"

اس خاتون کا غم زدہ چہرہ اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ اسی طرح کا غم اس وقت میرے دل پر بھی چھا جاتا ہے جب مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ "مسلم دشمنی کا احساس سرزمین ہند کا ایک دائمی مرض بن چکا ہے"۔ لوگ اب حفاظت کے لئے نہ گاندھیائی فلسفہ کے ماننے والوں پر اعتماد کرتے ہیں، اور نہ پولیس پر اور یہ فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر ایک چیخ فضا میں بلند ہوتی ہے کہ فوج کو حفاظت کے لئے بلاؤ۔

انگریز اب ہندوستان میں موجود نہیں اس لئے ہم اپنی مصیبتوں کا الزام ان پر نہیں لگا سکتے۔ اور نہ اسکا ہمیں حق پہنچتا ہے کہ انکی پالیسی کو ہر وقت کوستے رہیں۔ خود اپنے لاینحل مسائل کی ذمہ داری سے اگر ہم بچنا بھی چاہیں تو نہیں بچ سکتے برسوں سے پاکستان میں ہندو کشی کا کوئی واقعہ نہیں ہوا، اس لئے ہم اس ملک کو بھی مورد الزام قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں فسادات آئے دن کے معمولی واقعات کی بنا پر پھوٹ پڑتے ہیں، اور یہ ساری قتل و غارت گری ہندوستان کی سرزمین پر ہوتی ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ فساد ہمیشہ مسلمان شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں کے فسادات میں در اصل پاکستان کا ہاتھ ہے لیکن ان دعووں کو کبھی ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی ثبوت اور دلیل نہیں تو ایسے دعوے صرف مسترد ہی کئے جا سکتے ہیں۔ جو لوگ اس طرح کے دعوے کرتے ہیں وہ خود کسی حادثہ کی ذاتی طور پر تحقیقات نہیں کرتے۔ اور نہ اس کی تفصیلات میں جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انکی رسائی سرکاری دستاویزات تک کبھی نہیں ہوتی اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ باتوں کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ہند میں مسلم دشمنی کا جذبہ اور فروغ پاتا ہے۔

دستور کے تحت ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر ملازمتوں کا کوئی مقررہ کوٹہ نہیں ہے اور نہ مذہب کی بنیاد پر الگ رائے دہندگی کا طریقہ باقی ہے اس لیے ہندوستان میں مسلمان اپنے آپ کو ایک غیر منفعت بخش پوزیشن میں پاتے ہیں۔ کمپٹیشن سخت ہے۔ انھیں تعلیم میں پس ماندگی کی بنیاد پر کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ نوجوان مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنی مرضی سے ترک وطن کرکے پاکستان چلا جاتا ہے۔ جو اپنا گھر بار چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ گھر میں بیٹھ کر آنسو بہاتے رہیں میں بھی ان لوگوں کے لئے روتا ہوں لیکن ابتک اس صورت حال کا کوئی علاج مجھے نظر نہیں آیا میرے خیال کے مطابق فرقہ کی بنیاد پر ملازمتوں کا کوٹا متعین کرنا ایک غلط طریقہ ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں صلاحیت کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ خود میں اپنی نوجوانی میں اس طرح کے امتیاز کا شکار ہوا ہوں

تاریخ کے مختلف ادوار میں دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح کی صورت حال پیدا ہو چکی ہے۔ ایک دور تھا جب برطانوی پارلیمنٹ کیلئے یہودی اور کیتھولک عیسائیوں کا انتخاب ناممکن سی بات تھی۔ لیکن صرف اس وجہ سے انہوں نے جد و جہد ترک نہیں کی۔ انہوں نے زراعت، بینکنگ، تجارت، صنعت اور دستکاری کو فروغ دیا کیونکہ ان میدانوں میں انھیں پسپا کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مصائب در پردہ شرطیاں جنکا وہ ایک مدت تک شکار رہے، بعد میں چل کر ان کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئیں۔

مذہب کی بنیاد پر ملازمتوں میں الاٹمنٹ اور الگ رائے دہندگی کا طریقہ اب ہندوستان میں نافذ ہونے والا نہیں ہے۔ بعض مسلمان اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں کہ ایسا ہو جائے گا۔ لیکن یہ خواب سے زیادہ کچھ نہیں، اور اس کا حقیقت سے کوئی بھی تعلق نہیں کیونکہ اس بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونی چاہیئے کسی کا مذہب اس کے لئے نہ ملازمت کی ضمانت بنے اور نہ اس بنیاد پر کسی کو ملازمت سے محروم کیا جائے۔

اس ملک میں خون خرابہ کا سب سے بڑا سبب گائے ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد گائے کا ذبیحہ اور اس کے گوشت کی فروخت کئی ریاستوں میں خلاف قانون قرار دے دی گئی ہے۔ اگر یہ بات مسلمانوں کی مرضی سے انجام پاتی تو کبھی حادثہ کا باعث نہ بنتی لیکن فیصلہ یک طرفہ کیا گیا ہے۔ ایک جمہوری ملک میں اکثریت کا دوسری قومیت رکھتا ہے، اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اقدام غیر جمہوری طریقہ پر کیا گیا ہے۔ لیکن ان روایات کے مطابق جن کا اکثر جمہوری ملکوں میں لحاظ رکھا جاتا ہے جو امور مذہب سے متعلق ہوتے ہیں ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ووٹوں کی اکثریت سے بھی زیادہ کچھ باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی روایت خوراک کے مسئلہ میں بھی برتی جاتی ہے۔ بنگالی مچھلی خور ہیں۔ اگر بہار کی حکومت کسی

> "پاکستان کی تشکیل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان خالص ہندوؤں کا وطن ہو گیا ہے، اگر اس سے مسلمانوں اور دوسروں کو خارج کر دیا جائے تو انڈین کی اصطلاح بے معنی بن کر رہ جاتی ہے ـ!"

قانون منظور کرے جس کے تحت گائے کا ذبیحہ ممنوع قرار پا جائے تو یہ اقدام غیر جمہوری نہیں ہوگا، لیکن اسے جمہوری روح کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی وجہ سے مغربی بنگال میں جانور ذبح کرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔

مسجد کے سامنے باجہ بجانے پر بھی کم خون خرابہ نہیں ہوا ہے حال ہی میں سپریم کورٹ نے رولنگ دی تھی کہ عام سڑک پر باجہ بجانے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ اس رولنگ پر ہندوؤں کو اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی مسلمانوں کو ناراضگی۔ اسی بات پر کلکتے میں ایک فساد بھی ہو گیا لیکن سوال یہ ہے کہ کچھ لوگ عام سڑک پر ہی ہی، مسجد کے سامنے اور وہ بھی خاص طور سے نماز کے وقت باجہ کیوں بجاتے ہیں؟ مغربی بنگال میں اب بھی اس سلسلے میں مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا جاتا ہے۔

اردو زبان ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔ اس زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر بنایا اور پروان چڑھایا۔ یہ زبان کسی ایک فرقہ کی تخلیق کبھی نہیں تھی۔ پنجاب اور یوپی میں بہت سے ہندوؤں کی مادری زبان اردو ہے، پھر ہندی کے لئے اردو کو قربانی کا بکرا کیوں بنایا جاتا ہے جسطرح سے اس زبان کو گذشتہ بیس سال میں نظر انداز کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں اس اندیشے کو تقویت ملی ہے کہ یہ زبان ملک میں ہمیشہ کے لئے کچل دی جائے گی اس اندیشہ کو مبالغہ آمیزی قرار دیا جاسکتا ہے لیکن یہ غیر حقیقی نہیں ہے۔

پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلقات کا ایک بندھن بنگالی زبان ہے اور دوسرا اُردو۔ اگر یہ دونوں بندھن بھی توڑ دیئے جائیں تو ہندوستان اور پاکستان ہر حیثیت سے ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احمد آباد کے ہندو اس ترغیب کا شکار ہو گئے کہ چونکہ مسلمانوں کے لئے پاکستان نام کا ایک ملک بنا دیا گیا ہے اسلئے ہندوستان میں ان کے قیام کے لئے کوئی جواز نہیں۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے، جس کا جواب بیس سال پہلے دستور ہند نے بھی دیا تھا اور گاندھی جی کی شہادت بھی اس کا جواب تھی لیکن ۲۰ سال کی طویل مدت کے بعد یہ سوال پھر اٹھایا گیا ہے اور وہ بھی ناقابل تصور تشدد کے ساتھ!

کیا ایک عام ہندوستانی کو پھر یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ملک کا نام "انڈیا" رکھا گیا ہے۔ ہندوستان نہیں ہم نے اپنے ملک کے دروازے تمام مذاہب کے ماننے والوں کے

[illegible]

لئے کھول دیئے ہیں، اور اس لئے اسے سیکولر ملک قرار دیا گیا ہے ہم ایک ایسی قومیت میں یقین رکھتے ہیں جو مختلف اعتقادات کی حامل ہو اور جسکی زبانیں بھی مختلف ہوں، ایسی ہی ایک قوم کی تعمیر کا ارادہ تھا جس کے لیے ہم نے جنگ لڑی تھی۔ ہر ہندوستانی باشندہ کو ہم اس کی دعوت دیتے ہیں کہ اس ملک کی ترقی اور استحکام کی جدو جہد میں وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو۔ ہماری قومی تہذیب ایک رنگا رنگ تہذیب ہے، جس کے لئے مسلمانوں نے اور دوسروں نے اپنا بھرپور حصہ ادا کیا ہے! اور ہماری معیشت مشترک ہے، جس میں مسلمانوں کو بھی قیمتی کردار ادا کرنا ہے۔

ہم مسلمانوں کے بغیر انڈین نہیں ہوسکتے، ہمارا "انڈین" ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہوں، اس ملک میں مسلمان بھی باقی رہیں، اگر وہ یہاں سے چلے جاتے ہیں تو ہم صرف "ہندوستانی" باقی رہ جائیں گے۔ اور ہمارے ملک کا نام ہندوستان ہو جائے گا قطعی طور پر یہی وہ چیز ہے جس کا پاکستان خواہشمند ہے۔

ہمارے ہندو فرقہ پرستوں کی نظر میں یہ بات زیادہ قابلِ احترام ہے کہ ہندوستانی قومیت کی قسم کھائی جائے لیکن جب وہ اس ملک کو انڈیا یا بھارت کہہ کر پکارتے ہیں تو ان کے دل و دماغ میں یہ نام ایک ایسے ملک کا ہوتا ہے جو صرف ہندوؤں کا ملک ہے وہ مسلمانوں کو غیر ہندوستانی قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہندو نہیں ہیں۔ انکی نظروں میں ہندو ہی صرف سچے انڈین ہیں۔ یہ الجھاؤ اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ یہی ایک نام

مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ معنی ایک ے متضاد ہیں۔ "ہندو" ایک ایسی اصطلاح ہے جو ہندو کو اپنے سے خارج کر دیتی ہے، جبکہ "انڈین" کی اصطلاح کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ ہندو ازم ایک مذہب ہے، لیکن انڈ ایک ملک ہے، جس میں اس کے تمام باشندے شامل ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ ایک مرتبہ پھر واضح اور غیر مبہم الفا میں اس کی وضاحت کر دی جائے۔ کہ اس ملک کا نام "ا رکھا گیا ہے اور یہ تمام مذہب کے ماننے والوں کا ملک ہے حقیقت قطعی طور پر یہی ہے، اور اس کے باوجود کہ ملک کا حصہ اس سے جدا ہو گیا تھا۔ "انڈیا" کے عوام "انڈ میں صدیوں سے "انڈین" رہے ہیں، اور انھیں "انڈیا نا کرنے کی از سرِ نو کوئی ضرورت نہیں، اور خاص طور سے ا وجہ سے بھی کہ ایک علیحدگی پسند حصہ نے اپنا نام پاکستان لیا ہے۔ ★

چلتا پھرتا چاکلیٹ۔
برازیل کی تتلی جس سے چاکلیٹ کی خوشبو آتی ہے اسکا رنگ بھی چاکلیٹی ہوتا ہے۔

جدید امریکا کے حقیقی معمار

امریکن نیگرو

شاہد صدیقی

پندرہویں صدی کے ساتھ یوروپ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ بہت سی نئی دریافتیں ہوئیں۔ ترقی کے نئے راستے ڈھونڈے جانے لگے۔ علم وادب، آرٹ و سائنس غرض کہ ہر میدان میں یوروپ آگے بڑھنے لگا۔ وہ وقت تھا جب "نئی دنیا" کی تلاش شروع ہوئی۔ یوروپی جہازرانوں نے ایشیا اور افریقہ تک پہونچنے کے سمندری راستے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ حالانکہ ایشیا اور افریقہ کی بہت سی قومیں امریکا کے سمندری راستے سے واقف تھیں اور گیارہویں صدی میں یوروپین جہازراں وکنگ بھی انجانے میں امریکا دریافت کر چکا تھا لیکن جدید یوروپ کے لئے امریکا کی دریافت کولمبس نے کی۔

کولمبس نے امریکا ۱۴۹۲ء میں دریافت کیا اور وہاں یوروپ کے لوگوں کی پہلی بستی ۱۶۲۰ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بعد کثیر تعداد میں یوروپ سے لوگ امریکا منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ ۱۷۶۳ء تک امریکا میں "گوروں" کی ۱۳ مختلف کالونیاں بن چکی تھیں۔ ۱۷۸۱ء میں جارج واشنگٹن کی قیادت میں برطانیہ سے جنگ کے بعد ان ۱۳ کالونیوں نے آزادی حاصل کر لی اور ۱۷۸۹ء میں جارج واشنگٹن کی صدارت میں متحدہ حکومت بنائی۔ اس سال سے امریکا کی ترقی اور خوشحالی کے دور کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں آج امریکا دنیا کا سب سے طاقتور، سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بن گیا ہے۔

کیا یہ ساری ترقی اور دولت یوروپ کے "گوروں" کی عقلمندی اور محنت ہی کا نتیجہ ہے؟ کیا امریکا کو امریکا بنانے میں صرف اس قوم کا ہاتھ ہے جو آج اس پر حکومت کر رہی ہے؟

نیویارک کی یہ بلند و بالا عمارتیں اور واشنگٹن کے یہ عظیم الشان محل کس نے بنائے؟ ان سب سوالات کا جواب بہت آسان ہے۔ ان سوالات کا جواب سوشل ہسٹری کا کوئی بھی معمولی طالب علم دے سکتا ہے۔ یہ محل، یہ عمارتیں، یہ کارخانے یہ مشینیں ان کالے غلاموں کی محنت کا نتیجہ ہیں جنکو لاکھوں کی تعداد میں یوروپین "گورے" اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں لاکھوں افریقی بھیڑ بکریوں

امریکن گاندھی۔ مارٹن لوتھر کنگ قتل کیے جانے سے کچھ دیر پہلے اپنے ہوٹل کی بالکونی پر کھڑے ہیں۔

کی طرح امریکا لیجائے گئے۔ مذہب اور انسانیت کے ان جھوٹے علمبرداروں نے ان غلاموں سے جانوروں کی طرح کام لیا۔ یہ ان لوگوں کی ہی دن رات کی محنت کا نتیجہ تھا کہ چند ہی سال میں امریکا کے بنجر علاقے اور گنجان جنگل سرسبز و شاداب کھیتوں میں تبدیل ہو گئے۔ ان غلاموں سے چوبیس گھنٹے کام لیا جاتا تھا اور عام طور پر انھیں زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ کسی گورے کے لئے کسی کالے کا قتل کر دینا قانوناً جائز تھا۔ عام طور پر گورے نوجوان جوانی کا پہلا تجربہ نیگرو لڑکیوں ہی پر کرتے تھے۔ نیگرو بچوں کو بہت چھوٹی عمر ہی میں ان کے ماں باپ سے چھین کر کسی غلاموں کے سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا۔ ویسے بھی غلاموں کو کسی طرح کی شادی شدہ زندگی گزارنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

ظلم اور بربریت کا یہ سلسلہ تقریباً دو سو سال تک چلتا رہا۔ انیسویں صدی کے ساتھ دنیا بھر میں صنعتی دور کا آغاز ہوا۔ نئی نئی صنعتیں ترقی کرنے لگیں۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانوں نے لے لی، گاؤوں کی جگہ بڑے بڑے شہر وجود میں آنے لگے۔ صنعتی ترقی میں امریکا بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا لیکن امریکا میں یہ صنعتی ترقی جنوبی صوبوں کے مقابلے شمالی صوبوں میں زیادہ

"بلیک پینتھر" تحریک کے لیڈر جو مارکس کے فلسفے کو ہی امریکہ کی تمام برائیوں کا حل تصور کرتے ہیں۔

تیزی سے ہوئی۔

جلد ہی شمالی صوبے امریکا کے صنعتی صوبے بن گئے کیونکہ زیادہ تر کھیتی باڑی جنوبی صوبوں میں ہوتی تھی اس لیے بیشتر سیاہ غلام بھی جنوب میں ہی تھے۔ شمالی صوبوں میں کارخانوں میں کام کرنے کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ کیونکہ نیگرو گوروں کے زرخرید غلام ہوتے تھے اس لیے وہ اپنے مالک کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے انیسویں صدی میں جب کہ دنیا کافی ترقی کر چکی تھی افریقہ سے نئے غلام منگانا بھی کافی دشوار تھا۔ ان سب وجوہات کی بنا پر شمال کے گوروں نے غلاموں کو آزاد کرنے کی مانگ شروع کر دی تاکہ یہ غلام جنوب کے کھیتوں کو چھوڑ کر ان کے کارخانوں میں کام کر سکیں، اور کارخانوں میں مزدوروں کی قلت کسی طرح ختم ہو جائے۔ جنوب کے گورے غلاموں کو آزاد کرنے کے سخت مخالف تھے کیونکہ انھیں کھیتوں میں کام کرنے کے لئے غلام چاہئے تھے اسی مسئلے کی بنیاد پر ۱۸۶۰ء میں ابراہیم لنکن کے دور صدارت میں شمالی اور جنوبی صوبوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شمالی صوبوں کی قیادت لنکن خود کر رہے تھے، کئی سال کی خانہ جنگی کے بعد شمالی صوبے فتح یاب ہوئے اور تمام غلاموں کو آزاد کر دیا گیا۔

یہ آزادی امریکن نیگرو کو بہت مہنگی پڑی۔ ایک تو یہ آزادی برائے نام تھی اور نیگرو کا امریکن معاشرے میں اب بھی وہی پہلے جیسا مقام تھا۔ اسے اب بھی کولھو کے بیل کی طرح کام کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے اب مالک ان کے مرنے یا جینے کی زیادہ فکر نہیں کرتے تھے۔ پہلے مالک ان کی صحت کا خیال رکھتے تھے اور کم از کم پیٹ بھر کھانے کو ضرور دیتے تھے تاکہ کہیں غلام مر نہ جائے اور ان کا نقصان نہ ہو جائے لیکن اب مالک کو فکر نہ تھی کہ ان کے غلام مر رہے ہیں یا جی رہے ہیں۔ کیونکہ اب یہ کرائے کے نوکر تھے اور ایک نوکر کے مرنے پر انکو دوسرا نوکر مل سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ نیگرو شہروں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئے اور انھوں نے کارخانوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے آزادی کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور آہستہ آہستہ اپنی ایک کے بعد ایک بات منوانے میں کامیاب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے قانونی برابری کا حق حاصل کر لیا اور صدر جانسن کے دور حکومت میں ووٹ ڈالنے کا برابر حق بھی حاصل کر لیا لیکن یہ سب تو کاغذ پر ہوتا رہا۔ حقیقت آج بھی بہت مختلف ہے آج بھی امریکن نیگرو کو معاشرے میں برابری کا حق حاصل نہیں۔ معاشرے ہی میں کیا قانونی طور پر بھی امریکن نیگرو وہاں کے گوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ امریکن پولیس اور امریکن گورے ان لوگوں پر طرح طرح کے ظلم توڑتے ہیں اور قانون بیٹھا تماشہ دیکھتا رہتا ہے۔ جب صدیوں سے پسے ہوئے لوگ کوئی جوابی کارروائی کرتے ہیں تو پورا امریکن پریس اور امریکن عوام چیخ اٹھتے ہیں

آج کا امریکن نیگرو بہت بدل چکا ہے آج کا امریکن نیگرو کل کا "انکل ٹام" نہیں ہے جو مالک کا ہر ظلم خاموشی سے برداشت کرتا کرتا ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ کے قتل کے بعد پرامن حل کا دور بھی ختم ہو چکا ہے۔ آج کا امریکن نیگرو جان چکا ہے کہ یہ گھی سیدھی انگلی سے نکلنے والی نہیں۔ ان میں ایک نئی بیداری جنم لے رہی ہے انھیں اپنے بڑے پن، اپنی صلاحیتوں اور اپنی طاقت کا ایک نیا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ امریکن نیگرو جان گیا ہے کہ آج امریکا جو کچھ بھی ہے اس کی ہی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے۔ آج امریکن نیگرو بہترین شاعر، آرٹسٹ مصنف موسیقار، سائنس داں، اور کھلاڑی پیدا کر رہا ہے۔ آج امریکہ میں جتنا بھی فن جنم لے رہا ہے وہ زیادہ تر ان ہی کالوں کا مرہون منت ہے۔ خاص طور پر امریکن کھیل اور موسیقی کے میدان میں تو نیگرو پوری طرح چھایا ہوا ہے لیکن سب سے بڑی تبدیلی جو آج امریکن نیگرو میں پیدا ہوئی ہے وہ ہے اس کے سوچنے سمجھنے کا طریقہ۔ کل تک نیگرو صرف پٹنا ہی جانتے تھے لیکن آج وہ طاقت کا جواب طاقت سے دے رہے ہیں۔ آج ان کے لیڈر انھیں امن اور شانتی کا پیغام دینے کی بجائے خون اور گولی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ آج ان کی زبان پر حضرت عیسیٰ اور گاندھی کا نام نہیں بلکہ ماؤ اور شی گیوارا کا نام ہے۔

کینیڈی اور جونسن کے دور صدارت میں حالات پھر بھی اتنے زیادہ خراب نہیں تھے لیکن آج حالات بالکل مختلف ہیں۔ نکسن نے شروع ہی سے کالوں سے کوئی ہمدردی نہیں دکھائی۔ نکسن کے خیال میں نیگرو تشدد کا راستہ اپنا کر

بیکس ـــ تعلیمی اور معاشی میدان میں آگے بڑھ کر ان کالوں کے مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے

غلطی کر رہے ہیں۔ انھیں انتظار کرنا چاہئے وقت اپنے آپ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔

اس وقت امریکن نیگروؤں میں چار تحریکیں کام کر رہی ہیں پہلی تو وہ ہے جس کے خیال میں نیگرو کو گوروں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہئے اور اپنے مسائل کا کوئی پرامن حل

نوجوان پینتھر لیڈر۔ انجیلا ڈیوس جس کی گرفتاری نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔

چاہیئے۔ مارٹن لوتھر کنگ کی موت کے بعد سے اس
یں یقین رکھنے والوں کی تعداد کافی کم ہو گئی ہے
ہے علی جاہ محمد کی بلیک مسلم تحریک۔ اب سے دو
ال پہلے اس تنظیم نے بہت زور پکڑا تھا لیکن یہ اب
ت کمزور پڑ گئی ہے۔ تیسری تحریک ہے نوجوان لیڈر
سن کی تحریک جو بہت تیزی سے زور پکڑ رہی ہے
کہنا ہے کہ کالوں کو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے
اور غیر قانونی دونوں ہی طریقے استعمال کرنے نہیں
ان کہنا ہے کہ بارہ فیصد کی اقلیت کے لئے
یت سے جھگڑا مول لینا مناسب نہیں کیونکہ ایسا کرنے
کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ نسلی فسادات میں زیادہ تر
ہی مارے جاتے ہیں کیونکہ پولیس اور قانون بھی
ا ہی کا ساتھ دیتا ہے۔ اس لئے فسادات کے بعد یہ بھی
ساتھ دیتا ہے۔ اور ان نیگروؤں پر ظلم و ستم کا ایک نیا
لہ شروع ہو جاتا ہے۔ جیکسن کا کہنا ہے نیگرو کے لئے
بڑھنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے کہ وہ تعلیمی
معاشی میدان میں اپنی حیثیت کو منوائے۔ نیگرو کے لئے
ی تعلیم حاصل کرنا ہی ضروری ہے بلکہ ہر میدان میں

آزادی کی دیوار — ایک نیگرو نے اپنے تعمیر کی دیوار پر یہ تصویر بنا رکھی ہے۔

اول یہ کہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ گوروں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں۔ دوسری طرف نیگرو کو معاشی میدان میں ترقی کرنی ہوگی اس کے لئے جیکسن نے بہت سے دلچسپ طریقے نکالے ہیں۔ ان کی جماعت کے کچھ لوگ کسی بھی فیکٹری یا فرم میں جا کر معلوم کرتے ہیں کہ وہاں کتنے نیگرو کام کر رہے ہیں۔ اگر وہاں نیگرو ملازمین کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے تو وہ اس فرم کے مالکان کو الٹی میٹم دیدیتے ہیں کہ اگر ایک مقررہ تاریخ تک مزید کالوں کو نوکری نہیں دی جاتی تو تمام نیگرو اس فرم یا فیکٹری کا مکمل بائیکاٹ کر دیتے ہیں۔ یہ طریقۂ کار ان علاقوں میں زیادہ کامیاب رہتا ہے جہاں نیگرو آبادی زیادہ ہے جیکسن نے اس طریقے سے کافی کامیابی حاصل کی ہے۔ اور وہ ہزاروں کالوں کو نوکری دلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ دکانیں جو نیگرو فیکٹریوں کا بنایا ہوا مال نہیں رکھتیں اس بات پر مجبور کی جاتی ہیں کہ وہ نیگرو فیکٹریوں کا مال رکھیں۔ تمام نیگرو یہ کوشش کرتے ہیں کہ صرف ایسی ہی چیزیں خریدیں جو نیگرو فیکٹریاں بنا رہی ہیں جیکسن نے اس اقتصادی بائیکاٹ کے ذریعے بہت سی کمپنیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا روپیہ نیگرو بینکوں میں جمع کرائیں۔

یہ طریقۂ کار استعمال کر کے انھوں نے ایک بینک کی کل رقم کو چند مہینوں کے اندر اندر پچاس لاکھ ڈالر سے دو کروڑ بیس لاکھ ڈالر تک پہونچا دیا۔ ان بینکوں سے کالوں کو بزنس شروع کرنے کے لئے قرض دیے جاتے ہیں جیکسن کا اپنی مانگیں منگوانے کا یہ طریقہ نیگروؤں میں کافی مقبول ہو رہا ہے اور آہستہ آہستہ سارے امریکا میں پھیل رہا ہے جیکسن کے خیال میں کالوں کو برابری اسی وقت مل سکے گی جب وہ گوروں کو یہ یقین دلا دیں گے کہ ان کے بغیر امریکا کا چلنا مشکل ہے۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ہر نیگرو اپنی جگہ یہ سوچ لے کہ اسے آگے بڑھنا ہے۔ اور اپنی حیثیت کو ہر میدان میں منوانا ہے۔ جب کالے بے روزگار ہوتے ہیں تو انھیں سست اور کاہل کہا جاتا ہے جب گورے بے روزگار ہوتے ہیں تو اسے پوری سوسائٹی کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ جیکسن کے خیال میں سوچنے کے اس ڈھنگ سے سیاست کے ذریعے نہیں لڑا جا سکتا اس سے لڑنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کوئی نیگرو ڈاکٹر ڈاکٹری اس لئے نہ کرے کہ اسے کچھ دولت چاہیئے۔ بلکہ اس

لئے کرے کہ اسے کچھ کر دکھانا ہے اور اس طرح اپنی قوم کا نام اونچا کرنا ہے۔ کوئی نیگرو قانون اس لئے نہ پڑھے کہ اسے جج بننا ہے بلکہ اس لئے پڑھے کہ اسے انصاف مانگنا ہے۔ کوئی نیگرو ٹیچر کسی اسکول میں پڑھانے اس لئے نہ جائے کہ اسے چند ڈالروں کی ضرورت ہے بلکہ اس لئے جائے کہ اسے علم کی شمع روشن کرنی ہے۔ خود علم حاصل کرنا ہے اور اپنے ملک کے دوسرے لوگوں کو علم کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔"

ایک تیسری تحریک جو بہت تیزی سے امریکن نیگروؤں میں پھیل رہی ہے وہ ہے بائیں بازو کی انتہا پسند بلیک پینتھر تحریک۔ یہ لوگ اپنے کو مارکسسٹ کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں امریکن نیگرو اور ساری دنیا کے غریبوں کی اصل دشمن سامراجیت اور سرمایہ داری ہے۔ امریکن نیگرو کو نہ صرف امریکن گوروں سے لڑنا ہے بلکہ امریکن سامراجیت اور امریکن سرمایہ داری سے

بھی جنگ کر رہی ہے۔ اس جنگ میں وہ ان گورے نوجوانوں کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں جو ان کے ہم خیال ہیں۔ امریکا میں کمیونزم بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کی مقبولیت صرف کالوں ہی کے درمیان نہیں بلکہ گورے نوجوانوں کے درمیان بھی ہے۔ ویسے تو امریکا میں درجنوں تحریکیں جنم لے رہی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبولیت بلیک پینتھر تحریک کو حاصل ہوئی ہے۔ بلیک پینتھر کے معنی ہیں کالا تیندوا۔ یہ لوگ امریکن پولیس کو سُور کے لقب سے حاصل کرتے ہیں۔ انکے خیال میں امریکن سوسائٹی درست نہیں ہو سکتی جب تک کہ امریکن گوروں کو مار مار کر انسان نہ بنا دیا جائے۔ اس جماعت کا طریقہ کار ہندوستانی نکسلیوں کے طریقے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ یہ لوگ حکومت کی مختلف عمارتوں کو بم سے اڑا دیتے ہیں موقع ملنے پر پولیس والوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ گوری پولیس میں خوف و ہراس پھیلا کر اسے ناکارہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اب تک یہ لوگ بیس سے زاید گورے پولیس والوں کا قتل کر چکے ہیں۔

ان حملوں سے گھبرا کر پچھلے دنوں نیویارک کی پولیس نے ایک جلوس نکالا جس میں انھوں نے مانگ کی کہ انھیں ان لوگوں سے نپٹنے کی کھلی چھوٹ دی جائے۔

بلیک پینتھر صرف توڑ پھوڑ کی کارروائی ہی نہیں کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے امریکا بھر میں مختلف اسکول کھولے ہیں جہاں انھیں صحیح تعلیم دی جاتی ہے۔ روز صبح ہزاروں کی تعداد میں نیگرو بچوں کو ناشتہ فراہم کیا جاتا ہے۔ سڑک پر آوارہ گردی کرنے والے بچوں کو پکڑ کر کسی فائدہ مند کام پر لگایا جاتا ہے۔ بلیک پینتھر تحریک کے اور بھی بہت سے پروگرام ہیں لیکن اس کے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد سے اس کے پروگرام کافی ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔

امریکن حکومت نے بلیک پینتھر تحریک سے گھبرا کر اس کے لیڈروں اور کارکنوں پر ظلم و تشدد کے دروازے کھول دیئے۔ سیکڑوں بلیک پینتھروں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ ان پر جھوٹے سچے اور بے بنیاد مقدمے چلائے گئے۔ قانون کو بالائے طاق رکھ کر جیل میں ان پر ہر طرح کے ظلم توڑے گئے۔ لیکن لگتا ہے کہ ظلم و بربریت کا یہ سلسلہ اب زیادہ دن جاری نہ رہ سکے گا کیونکہ بیشتر امریکن نیگرو اور بہت سے گورے نوجوان انکے ساتھ ہیں۔ پچھلے دنوں اس تحریک کی لیڈر اور نوجوان حسینہ انجیلا ڈیوس کی گرفتاری عمل میں آئی۔ انجیلا ڈیوس ان چند خوش نصیب کالوں میں سے ایک ہے جسے بچپن ہی سے یورپ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس نے فلاسفی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد کانٹ کے فلسفے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ انجیلا شروع ہی سے مارکس کے فلسفے سے متاثر تھی۔ اس نے مارکس لینن اور دوسرے سوشلسٹ فلسفیوں کا بہت تفصیلی مطالعہ کیا۔ انجیلا نے مارکسزم کسی جوش سے متاثر ہو کر نہیں اپنایا بلکہ اس نے مارکسزم کو پوری طرح سمجھنے کے بعد یہ راستہ اختیار کیا۔ انجیلا کو (UCLA) یونیورسٹی میں جونیئر پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی گئی جسے اس نے قبول کر لیا۔ لیکن یونیورسٹی کی جماعت منتظمہ نے اسے اس لئے نوکری سے علیحدہ کر دیا کہ وہ کمیونسٹ تھی۔

طالب علموں اور استادوں کے سخت احتجاج پر انجیلا کو واپس بلا لیا گیا۔ جس وقت انجیلا نے اپنا پہلا لیکچر دیا اس وقت تقریباً دو ہزار طالب علم اور استاد موجود تھے چند ہی دنوں میں انجیلا یونیورسٹی کی سب سے زیادہ ہر دلعزیز استاد بن گئی۔ لیکن ایک سال بعد پھر گورننگ باڈی نے انجیلا کو اس بنا پر علیحدہ کر دیا کہ وہ طالب علموں میں کمیونز

انجیلا کو شروع ہی سے بلیک پینتھروں سے ہمدردی تھی اور وہ ان کی تمام میٹنگوں میں شامل ہوتی تھی انھیں جذبات کی بجائے دماغ سے کام کرنے کی تلقین کرتی تھی اور صحیح مشورے دیتی تھی۔ پچھلے دنوں اسے تین پینتھروں کو عدالت سے فرار کرانے کی سازش میں حصہ لینے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا

کہا جاتا ہے کہ ڈیوس دو ہینڈ گن، ایک رائفل اور ایک شوٹ گن عدالت میں لائی۔ سترہ سال کی ایک اور نوجوان لڑکی جوناتھن نے یہ ہتھیار عدالت کے اندر پہنچائے۔ ابھی عدالت کی کارروائی شروع ہی ہوئی تھی کہ جوناتھن نے بندوق دکھا کر تینوں پینتھروں کو آزاد کرا لیا ساتھ ہی وہ پانچ گوروں کو جس میں جج بھی شامل تھا اپنے ساتھ لے گئی۔ انکو ایک وین میں لیجایا جا رہا تھا کہ پولیس اور پینتھروں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ شروع ہو گیا جس سے دو پینتھر، جج اور نوجوان لڑکی جوناتھن مارے گئے۔

انجیلا ڈیوس کو کچھ دن کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔

اس وقت بلیک پینتھر تحریک کے زیادہ تر بڑے لیڈر گرفتار ہو چکے ہیں۔ لیکن توڑ پھوڑ کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

امریکن حکومت کالوں کو تو ظلم و تشدد سے دبا سکتی ہے لیکن اس کے لئے گورے تشدد پسندوں سے نپٹنا بہت مشکل ہوگا امریکا میں ماؤ کے پیروکاروں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ کوئی بڑا خطرہ نہیں لیکن آنے والے چند برسوں میں یہ خطرہ نازک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکن حکومت اس خطرے سے کیسے نپٹے گی۔

بظاہر اس مسئلے کا بجز اس کے اور کوئی حل نظر نہیں آتا کہ کالوں کو بھی امریکن معاشرے میں برابری کا حق دیدیا جائے ان کو معاشرے میں وہی جگہ دی جائے جو گوروں کو حاصل ہے انکے معاشی اور تعلیمی حالات کو سدھارا جائے، ورنہ آج کی یہ چنگاری کل بھڑکتا ہوا شعلہ بھی بن سکتی ہے۔

قارئینِ
واقعات کیلئے خوشخبری

قارئین کے اصرار پر ہم نے واقعات کی ضخامت میں ایک کاپی (۸ صفحات) کے اضافے کا فیصلہ کیا ہے لیکن قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

واقعات جیسے بلند معیار پرچے کے لئے یہ اضافہ ایک بھاری بوجھ ہے اور اس کی تلافی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ قارئین اس کی توسیع اشاعت کے لئے بھرپور کوشش کریں۔

ہم نے یہ اضافہ اس لئے کیا ہے کہ قارئین تک زیادہ سے زیادہ موضوعات پر زیادہ سے زیادہ معلومات پہنچا سکیں ہمیں یقین ہے قارئین اور ایجنٹ حضرات ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔

(منیجر واقعات)

(سلسلہ) خروشچیو کی گمشدہ ڈائری کے اوراق

کبیر کوثر

دوسری جنگ عظیم نے سب سے زیادہ نقصان روس کو پہنچایا۔ جنگ کے اختتام کے بعد معلوم ہوا کہ روس اپنے سوا دو کروڑ شہریوں، فوجیوں اور دانشوروں سے محروم ہو چکا ہے۔ اس عظیم نقصان کی وجہ اسٹالن اور ہٹلر کا وہ صلحنامہ تھا جو ۱۹۳۹ء میں ہوا اور جس کی رُو سے دونوں ملکوں نے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ یہ صلح نامہ اسٹالن نے صیغہ راز میں رکھا تھا اور دونوں فریقوں کے دستخطوں کے ایک روز بعد جب میں اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیل کر اسٹالن کے مضافاتی مکان پر مع شکار کے پہنچا تو کھانے کی میز پر اسٹالن نے اپنے رفقائے کار سے کہا:

"کامریڈز ہٹلر کے وزیر خارجہ ون ربن ٹراپ اپنے ساتھ روس، جرمنی دوستی کا عہد نامہ لے کر آئے تھے جس پر ہٹلر کے دستخط موجود تھے۔ میں بھی اس معاہدہ پر دستخط کر چکا ہوں۔" تھوڑی دیر شغل شراب میں منہمک رہنے کے بعد اسٹالن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بدمستی کے عالم میں کہا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کو احمق بنانے کے کھیل میں مصروف ہیں۔ ہر ہٹلر کا خیال ہے کہ انہوں نے مجھے بے وقوف بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میں نے انہیں احمق بنا دیا ہے۔"

اسٹالن کے اس انکشاف نے ہم سب کو چونکا دیا۔ چونکہ یہ صلح نامہ روس کی خودکشی کے مترادف تھا۔ ایک طویل خاموشی اور بھیانک سناٹا اُس کھانے کی میز پر پھیلا ہوا تھا۔ اسٹالن کو جب یہ احساس ہوا کہ اس کے ساتھی اس کی اس بے وقوفی سے متاثر ہیں۔ تو اس نے ایک بار پھر خاموشی کے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔

"انگریز اور فرانسیسی ہٹلر کے 'پہلے مغرب کو تباہ کرو پھر مشرق کی جانب رُخ کرو' والے منصوبے کے شرمندۂ تعبیر ہونے سے پہلے ہی جرمنی کی طاقت کو کچل کر رکھ دیں گے۔"

اگرچہ اسٹالن نے اس صلح نامہ پر دستخط کر کے تاریخ عالم میں ایک عظیم غلطی کا ارتکاب کیا تھا لیکن بقول اس کے کمیونسٹ پارٹی کے ممبران کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے اس عہد نامہ پر دستخط کئے تھے۔ بہرحال جرمنی کی فسطائی قوت سے روس کی اشتراکی حکومت کا یہ پیمان وفا اتنے صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا کہ کبھی بھی پارٹی سطح پر افادی یا غیر افادی پہلوؤں پر بحث و مباحثہ نہیں ہوا۔

اسی دوران اسٹالن سے ایک اور عظیم غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے فن لینڈ کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی سرحدوں پر متعینات کی ہوئی فوجوں کو جنوب سے ہٹا کر شمالی سرحدوں پر جمع کرے۔ تاکہ روس کا دوسرا عظیم شہر لینن گراڈ فن لینڈ کی فوجوں کے توپخانہ کی زد سے محفوظ ہو جائے۔ لیکن فن لینڈ کے انکار پر اُس نے فوج کشی کا حکم دے دیا۔ فن لینڈ کی اس جنگ نے جو ۱۹۴۰ء کے دوران ہوئی دس لاکھ روسی

باقی صفحہ۔۔۔

• وشچیو کی خودنوشت
تاریخ حیات کی دوسری
حاضر ہے۔ جس کے
سے میں خود خروشچیو
ہے کہ انہوں نے
لکھی۔ مغربی اخبارات
دعویٰ ہے کہ یہ داستان
خروشچیو ہی کی لکھی ہوئی
۔ ان کے پاس خروشچیو
کی لکھی ہوئی
سے ربط داستان
موجود ہیں جو ان کے
مطابق روس۔
شکل لی گئی ہیں۔
سچ ہے اور کیا جھوٹ
نہیں جا سکتا
اس ڈائری نے تمام
میں تہلکہ مچادیا
•

افواج کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ لینن گراڈ جیسی معمولی طاقت کے ہاتھوں اتنا عظیم نقصان اٹھائے جانے پر تمام دُنیا کی نظروں میں روسی فوجی طاقت کا بھرم کھل گیا۔ اسٹالن اپنی اس حماقت پر اتنا چراغ پا ہوا کہ اس نے محکمہ دفاع کے کیسار Commissar وارشیلوو کو کریملن میں بُلانے کے بعد اس سے اپنا فوجی لباس اُتار دینے کو کہا۔

وارشیلوو نے اس حکم کی تعمیل کی بجائے کہا:

"روسیوں کے اس عظیم نقصان کا باعث تم ہو اور تمہارا طفلانہ فیصلہ ہے۔ ہمارے بہترین جنرلوں کی موت کی ذمہ داری تمہارے ہی کاندھوں پر ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کھانے کی میز پر رکھے ہوئے ایک گوشت کے ٹکڑے کو پلیٹ سے اٹھا کر میز پر پسل کر رکھ دیا۔

روس پر جرمنی کے حملے کے دوران مجھے یوکرین میں پولٹ بیورو کا نمائندہ بنا دیا گیا تھا۔ جرمنی کے حملہ سے قبل اسٹالن پر ہٹلر کا بے پناہ خوف طاری تھا اور وہ اپنے خیالوں کے محل میں بیٹھا ہوا یہ توقع کرتا رہتا تھا کہ جرمن فوج اس پر حملہ نہیں کرے گی۔ اس لئے جب ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جرمنی فوج نے رُوس پر حملہ کیا تو اسٹالن نے رُوسی فوج کے کمانڈروں کو جوابی حملہ کرنے سے روک دیا موت کا بگل بج چکا تھا لیکن وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ حملہ کسی غلط فہمی کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

یوکرین کے سبزہ زاروں پر جب نازی بھیڑیوں نے آگ اور خون کے دریا بہا دیئے اور نہتے یوکرینی باشندے جرمنی کے ٹینکوں کے تلے سبزے کی طرح کچلے جا رہے تھے میں نے اسٹالن کو صورتِ حالات سے مطلع کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے حکم دیا گیا کہ میں ریاستی دفاعی محکمہ کی کمیٹی کے رکن جارجی مالنکوف سے بات کروں۔ میں نے مالنکوف کو جرمنی کے شدید حملہ اور یوکرین کی بے لبسی سے مطلع کرتے ہوئے فوج طلب کی اور اسلحہ مانگے۔

ٹیلیفون پر جواب دیتے ہوئے مالنکوف نے کہا "تمھیں یوکرین کی فیکٹریوں کی بنائی ہوئی کلہاڑیوں، تلواروں اور نیزوں پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔"

میں یہ جواب سُنکر حیران ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم جرمنی کے ٹینکوں پر نیزوں سے حملہ کریں

مالنکوف نے یہ جواب دیتے ہوئے ٹیلیفون رکھ دیا کہ مٹی کے تیل کی بوتلوں میں آگ لگا کر ٹینکوں پر پھینکنا شروع کر دو۔"

اور جب نازی افواج کریملن سے کچھ دُور رہ گئیں تو اسٹالن پر اتنا خوف طاری ہوا کہ وہ خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں پناہ لینے لگا اور مارے غصے کے ان جنرلوں کے خاندانوں کو سائبیریا پہونچانے لگا جو حملہ آوروں کے قیدی بن چکے تھے اس پر ہٹلر کا اتنا خوف چھایا کہ اس نے سرکاری کاغذوں پر دستخط کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اور اپنے سایہ سے بھی لرزنے لگا۔ ۱۹۴۲ء میں جب خارکوف کے مقام پر ڈولاکھ روسی فوج کے سپاہی اور افسران نازی افواج کے ہتھیاروں کی بھینٹ چڑھ گئے تو اس نے کئی جنگیا روسی افسران کو اس نقصان کا ذمہ دار قرار دیکر موت کے آغوش میں پہونچا دیا۔ اُنہی دنوں اس نے مجھ سے ٹیلیفون پر بات کرتے ہوئے کہا۔

"خردشیچو، تمہیں یاد ہے کہ گذشتہ جنگِ عظیم میں ایسی ہی غلطی کی بنا پر زارِ روس نے ایک جنرل کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا تھا۔"

میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اب میرا وقت بھی آپہنچا جواب میں اس سے کہا،

"کامریڈ اسٹالن مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ اور زار نے واقعی اسے پھانسی پر لٹکا کر انصاف کیا تھا۔ چونکہ میزانیکوف غدار تھا۔ خارکوف کے معرکہ میں پہلے ہی صلاح دے چکا تھا کہ وہاں سے فوج کی بڑی تعداد ہٹالی جائے۔"

بہرحال میری جان بچ گئی۔

اسٹالن گراڈ میں جب نازیوں کا جھنڈا ڈیژن مارا گیا اور جنگ کی ہوا کا رُخ بدلتا ہوا صاف صاف معلوم ہونے لگا تو اسٹالن نے زخمی اور مُردہ نازی سپاہیوں کی لاشوں کو اکٹھا کر کے بجائے دفن کرنے کے جلا دینے کا حکم دیدیا۔

نپولین کہا کرتا تھا کہ دشمنوں کی لاشوں کو نذرِ آتش کرنے ...
ایک پسندیدہ خوشبو پھوٹ کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے
لیکن مجھے نپولین کے اس خیال سے اتفاق نہیں۔ مجھے ج...
عظیم ثانی پر لکھی ہوئی روسی تاریخوں سے بھی اتفاق نہیں جن...
رُوسی افواج کے دلیرانہ اور سرفروشانہ کارناموں کا ذکر...
اور نہ مجھے اتحادیوں کے اُن کارناموں سے اتفاق ہے جن...
ذکران اوراق پر کئے جاتے وقت اصلیت سے قطع نظر...
کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ اسٹالن پر حقائق روزِ روشن کی طر...
واضح تھے اس نے ان پر تنہا اپنے غسلخانے ہی میں غور کر...
لیکن محفلوں اور مجلسوں میں شرکت کرتے ہوئے وہ ا...
پر جھوٹ کے کثیف اور دبیز غلاف چڑھا دیا کرتا تھا۔ چنا...
جب برطانیہ اور امریکہ سے غذائی اور دفاعی کمک کے قافل...
روس کی سرزمین پر آنا شروع ہوئے تو اس نے ایک ہی سا...
میں آئزن ہاور کی تعریف کرتے ہوئے صدر ٹرومین کی...
مذمت بھی کی۔

میں اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا ج...
میں نے زوخوف کی زبانی ہٹلر کی موت کی خبر سنکر اسٹا...
کو مُبارکباد پیش کی تھی۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے
بڑے تلخ لہجہ میں کہا تھا،

"کامریڈ، فضول باتیں سُننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

گویا اُسے رُوس کی فتح کامل کا یقین تھا لیکن...
میں بخوبی جانتا ہوں کہ جنگ کے دوران وہ اسقدر خو...
اور ہراساں تھا جس کا تصور بھی اس کے حواریین...
بعید تھا۔

★ ★

میں اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب میں نے زوخوف کی زبانی ہٹلر کی موت کی خبر سنکر اسٹالن کو مبارکباد پیش کی تھی۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ "کامریڈ فضول باتیں سننے کیلئے میرے پاس وقت نہیں ہے"

مشرق وسطیٰ میں ایک نئی ریاست کا ظہور

مشرقِ وسطیٰ میں ایک اور عرب ریاست عنقریب وجود میں آنے والی ہے۔ یہ ریاست خلیج فارس کے علاقہ میں قائم ہوگی۔ اور ابتداء میں یہ تین موجودہ امارتوں یعنی (۱) ابو ظہبی (۲) قطار (۳) دوبئی پر مشتمل ہوگی۔ اس کے قیام کا اعلان سالِ رواں کے اختتام سے قبل ہی کر دیا جائے گا۔ جبکہ برطانوی فوجیں اس علاقہ کو خالی کریں گی۔

پانچ دوسری امارتوں (۱) شارجہ (۲) عجمان (۳) ام القوین (۴) راس الخیمہ اور (۵) فجیرہ۔ فی الحال دفاع اور امور خارجہ میں مجوزہ ریاست سے تعلق رکھیں گی اور باقی معاملات میں آزاد رہیں گی۔

اس یونین کا رقبہ ۳۲۳۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ۲۲۸ ہزار ہوگی۔ اور وہ اقوام متحدہ اور عرب لیگ کے اداروں میں شامل ہونے کی کوشش کرے گی۔

خلیج فارس میں چھوٹی بڑی نو ریاستیں ہیں جن میں سات ایسی ہیں جو عارضی صلح کی پابند امارتیں کہلاتی ہیں۔ قطار اور بحرین ان سے الگ ہیں لیکن برطانیہ کے ساتھ اُن کے بھی ایسے ہی معاہدے ہیں جیسے کہ سات دوسری ہیں۔ برطانیہ کے ساتھ سب

شہزادہ فاہد ابن عبدالعزیز سعودی عرب کے نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ

سے پہلا معاہدہ ۱۸۲۰ء میں ہوا تھا جبکہ ان امارتوں نے اس پابندی کو قبول کیا تھا کہ وہ بحری قزاقیاں نہیں ڈالیں گے۔ دراصل اس زمانہ میں برطانیہ اس علاقے کو اور پورے ایشیا کو لوٹ رہا تھا۔ جس کے جواب میں اس علاقے کے لوگ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں پر حملے کرتے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں برطانیہ اور ان کے درمیان مستقل امن کا معاہدہ ہوا اور اس کے بعد برطانیہ اپنے تسلط کو مضبوط کرتا رہا نتیجہ میں ۱۸۹۲ء میں ایک اور خصوصی معاہدہ پر دستخط ہوئے جس کے تحت ان امارتوں کے امور خارجہ کو برطانیہ نے قطعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ان کی آزادی پوری طرح سلب کر لی گئی۔ اور اتنی سخت پابندیاں عائد کی گئیں کہ برطانیہ کے علاوہ ان امارتوں کو کسی اور کے ساتھ خط و کتابت تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ وہ کسی غیر ملکی ایجنٹ کو اپنے یہاں بلا سکتی تھیں اور نہ انھیں برطانیہ کے علاوہ کسی اور ملک کے حق میں اپنے کسی علاقہ سے دستبردار ہونے یا اسے فروخت کرنے کی آزادی تھی۔

لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ حالات بدلے اور بین الاقوامی دباؤ سے حکومت برطانیہ جہاں اپنے دوسرے بیرونی مقبوضات چھوڑنے کے لئے مجبور ہو گئی۔ وہاں اس نے ۱۹۷۱ء کے اختتام تک خلیج فارس کے علاقہ کو بھی خالی کرنے کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ کے اس اعلان سے قدرتی طور پر چھوٹی چھوٹی امیروں کو اپنے تحفظ کی فکر ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے اور اس علاقے کے مستقبل پر غور و خوض کیا۔ انھوں نے اس علاقے کے تحفظ کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اس کا اظہار اس بات

بحرین کے شیخ عیسیٰ تہران کے نیاوران محل میں شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کے ساتھ

سے ہوتا ہے کہ برطانیہ نے اپنا اعلان جنوری ۱۹۶۸ء میں کیا تھا اور مارچ ۱۹۶۸ء میں ان امیروں نے اپنی ایک فیڈریشن قائم کرنے کی داغ بیل ڈالدی۔ اس میں قطار اور بحرین کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ لیکن یہ محض ایک برائے نام یونین تھی۔ جب بھی حکمران کوئی ٹھوس پروگرام طے کرنے کے لئے جمع ہوئے وہ کسی فیصلہ پر نہ پہونچ سکے۔ کیونکہ ان میں باہم بد اعتمادی پائی جاتی تھی۔ اور کوئی بھی اپنے ذاتی مفادات اور اپنی مطلق العنانیت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ ہر حکمران محسوس کرتا تھا کہ وہ اپنی امارت کا بادشاہ ہے۔ لیکن اب جوں جوں برطانوی انخلاء کا وقت قریب آرہا ہے ان امارتوں میں اپنے تحفظ کا احساس بڑھ رہا ہے اور اس علاقہ کی اہمیت کے پیش نظر وہ اپنی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے لگی ہیں۔

اس علاقہ کی اہمیت یوں تو ہمیشہ ہی رہی ہے۔ اس لئے کہ یہ مشرق و مغرب کے درمیان اہم تجارتی گذرگاہ رہا ہے۔ لیکن تیس چالیس سال کے عرصہ میں جب سے کہ اس علاقہ میں تیل برآمد ہوا ہے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ماہرین کے اندازہ کے مطابق دنیا میں تیل کا جتنا ذخیرہ ہے اس کا ساٹھ فیصد اسی علاقہ میں موجود ہے۔ جس پر صرف بڑے ممالک ہی کی نہیں بلکہ چھوٹے ممالک کی بھی نظریں ہیں۔

باقی صفحہ ۵۰ پر

مشرق وسطیٰ

آتش فشاں

"آپ کس ایئر لائن کے جہاز سے تشریف لائے" اسرائیلی وزیر اعظم مسز گولڈا مائر نے سکوت کو توڑتے ہوئے اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندہ ڈاکٹر گنار یارنگ سے دریافت کیا۔

"ال آل" سے "۔ ڈاکٹر یارنگ کا جواب تھا۔

ڈاکٹر یارنگ اپنے خاص مشن پر نیویارک سے یروشلم پہنچے تھے۔ اور وزیر اعظم اسرائیل مسز گولڈا مائر اور وزیر خارجہ مسٹر ابا ایبان سے بات کر رہے تھے۔ عام طور پر ملاقاتوں میں اسی قسم کی باتوں سے سکوت ٹوٹتا ہے۔ ہم لوگ جب کوئی مسئلہ نہ ہو تو موسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

" آج سردی بہت ہے۔ اس مرتبہ خشک سردی پڑ رہی ہے" ایک شخص بولے گا اور فوراً دوسرا اسے پھر دہرائے گا۔ "جی ہاں اسی لئے اس مرتبہ بیماریاں زیادہ ہیں۔ جسے دیکھو بخار میں پڑا ہے" اسرائیلی وزیر اعظم کو شاید "موسم" اپنے خلاف نظر آیا اس لئے انھوں نے موسم کی نہیں بلکہ ہوائی جہاز کی بات پوچھی اور جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر یارنگ اسرائیلی کمپنی کے جہاز سے آئے ہیں تو خوش ہو کر بولیں "جی ہاں یہ بڑی محفوظ کمپنی ہے اس کا کوئی طیارہ "ہجیک" نہیں ہوا۔ لیکن کوئی طیارہ "ہجیک" ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن عربوں کے خیال میں ڈاکٹر یارنگ کا "ہجیکنگ" (اغوا) ضرور ہو گیا۔ نیویارک سے یروشلم تک ۴۴ ہزار ۱۱۳ میل کا ان کا آنا جانا محض اس لئے تھا تاکہ "امن مذاکرات" کے طریقہ کار کے بارے میں اسرائیلی ذمہ داروں کے ساتھ بات چیت کر لی جائے۔ اسرائیلیوں کو بات چیت کے اصل مقصد کے مقابلے میں اس کے طریقہ کار کی زیادہ فکر ہے۔ اس بارے میں نیویارک میں بھی بات چیت ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر یارنگ کو اس کے لئے یروشلم بلایا گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا۔ اس کی توضیح اسرائیلی لیڈر ہی کر سکتے ہیں۔

لیکن اس کے علاوہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسرائیل شاید اپنی اہمیت جتانا چاہتا تھا لیکن اس کی کیا اہمیت ہے دنیا والے جانتے ہیں امریکہ پشت پناہی نہ کرے تو طاقت کا سارا بھانڈہ پھوٹ جائے۔ "امن مذاکرات" سفیروں کی سطح پر ہو رہے ہیں اور آج کل مانہٹن میں اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر کی ۳۸ ویں منزل ان مذاکرات کا مرکز ہے۔ ڈاکٹر یارنگ کا دفتر یہیں واقع ہے۔ عرب ممالک چاہتے ہیں کہ یہ مذاکرات نیویارک میں سفیروں کی سطح پر ہی ہونے چاہئیں۔ تاکہ اسرائیل پر ایک طرح کا بین الاقوامی دباؤ رہے جبکہ اسرائیل چاہتا ہے کہ وہ قبرص، روڈز، کریٹ یا بحیرۂ روم کے کسی اور علاقہ میں ہوں اور ان میں سفیروں کے بجائے وزراء خارجہ

انور السادات نے عوام سے پوچھا "کیا آپ جنگ سے تھک چکے ہیں؟" سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا "نہیں نہیں ہم لڑتے رہیں گے۔"

حصہ لیں اور بالمشافہ گفتگو ہو لیکن عرب بالمشافہ گفتگو کے لئے تیار نہیں کیونکہ وہ اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔

"تازہ اطلاعات کے مطابق اسرائیل تیار ہو گیا ہے کہ اگر بات چیت نیویارک میں جاری رہتی ہے تو جاری رہے لیکن اس کے رویہ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ عربوں کا کہنا ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے قبل اسرائیل کو تمام مقبوضہ عرب علاقے خالی کر دینے چاہئیں لیکن اسرائیل کا کہنا ہے کہ جب تک اسرائیل کی مستقل اور محفوظ سرحدیں طے نہ کی جائیں گی اس وقت تک وہ ان علاقوں کو خالی نہ کرے گا۔

ڈاکٹر گنار یارنگ اس امید میں اسرائیل آئے تھے کہ شاید وہاں کوئی ٹھوس چیز مل سکے گی۔ لیکن عرب حلقوں کے مطابق وہ "خالی ہاتھ" آئے ہیں اور اسرائیل نے اپنی وہی پرانی تجاویز دوہرا دیں جن کا وہ بار بار اعلان کرتا رہا ہے بات چیت میں وقت گزر رہا ہے اور جنگ بندی کے خاتمہ کا وقت قریب آ رہا ہے۔ آئندہ ماہ کی پانچ تاریخ کو وہ ختم ہو جائے گی۔ اسی لئے بعض حلقوں میں فکر و تشویش کے ساتھ پوچھا جا رہا ہے کہ کیا اسمیں مزید توسیع ہو گی۔؟ متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر مسٹر انور سادات اعلان کر چکے ہیں کہ وہ مزید توسیع صرف اسی صورت میں قبول کریں گے کہ بات چیت میں کوئی ٹھوس اور مثبت پیش رفت عمل میں آئے اسلئے کہ وہ جنگ بندی کی حالت جاری رکھ کر عربوں کو اس حالت پر قناعت کرنے کا عادی نہیں بنانا چاہتے۔

گنار یارنگ، گولڈا مائر اور ابا ایبان یروشلم میں

بات کسی حد تک صحیح ہے جب اسرائیل سے مقبوضہ علاقے جنگ ہی کے ذریعے حاصل کرنے ہیں تو یہ جنگ ابھی وقت کیوں نہ لڑی جائے۔ غالباً انور سادات اسی اصول پر اپنا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اور وہ ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔

گزشتہ ہفتہ انہوں نے دریائے نیل کے ڈیلٹا میں طانطا میں جو تقریر کی اس سے انکے عزم کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے بارہ ہزار کے جلسہ میں اعلان کیا "مقبوضہ علاقوں کے بارے میں اسرائیل سے کوئی مصالحت نہیں ہو گی، ہم ایک انچ زمین نہیں چھوڑیں گے، یہ لڑائی ہمارے کھیتوں، ہماری فیکٹریوں، ہمارے شہروں، قصبوں اور سڑکوں پر لڑی جائے گی" ایسے ہی عزم کا اظہار عام مصریوں نے بھی کیا۔ صدر سادات نے جب ان سے پوچھا "کیا آپ لڑائی سے بیزار ہیں، کیا آپ واقعی لڑائی سے تھک گئے ہیں" اور تمام حاضرین نے بلند آواز سے جس نے پوری فضا کو گونجا دیا جواب دیا "ہم لڑیں گے ہم لڑیں گے"۔ "سادات تو ہماری رہنمائی کر کہ ہم آزادی سے ہمکنار ہوں"

یکھئے کہ مشرق وسطیٰ آج بھی ایک آتش فشاں
ہے کب پھٹ پڑے

ملیشیا

مینڈکوں کی لڑائی

ات سے کوئی ملک خالی نہیں، ملیشیا میں بھی لوگ
ہ قائل ہیں۔ کہتے ہیں جب مینڈکوں میں لڑائی ہوتی
انہ کوئی آفت آتی ہے۔ پچھلے دنوں کوالالمپور سے
ال مشرق میں پچاس مینڈکوں کے درمیان سخت
ہو گئی۔ اتنی سخت لڑائی ہوئی کہ کمک
ے کی ضرورت محسوس کی گئی اور جلد ہی لڑنے والے
ں کی تعداد تین ہزار تک پہونچ گئی۔ یہ جنگ دو
جاری رہی اور جب صلح ہوئی تو میدان جنگ میں
ولاشیں پڑی ہوئی تھیں۔
س قسم کی لڑائیاں ملیشیا میں عام طور پر نظر آیا
یں۔ جانور شناسوں کا کہنا ہے کہ یہ جوڑے جوڑے
ہ لئے زمین حاصل کرنے کی جنگ ہے ــ انسان
ے لئے لڑتا ہے تو مینڈک کو کس نے روکا ہے۔
تو ہم پرست ملیشیائیوں کا کہنا ہے کہ یہ لڑائیاں
فت کا پیش خیمہ ہوتی ہیں، ثبوت میں یہ لوگ
یں کہ ۱۹۴۰ء میں مینڈکوں کی لڑائی ہوئی تو
ول نے ملایا پر حملہ کیا۔ اسی طرح دہشت پسند
سٹوں کے خلاف جب ۱۲ سالہ جنگ شروع ہوئی
س سے قبل ۱۹۴۸ء کے اوائل میں کیدہ کے مقام
ڈک باہم لڑے تھے۔ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں جب
بنیاد پر فسادات بھڑکے تو اس سے پہلے پینانگ
یب مینڈکوں کی جنگ ہوئی تھی۔ پس جب گزشتہ
ں سگی سی پت میں مینڈکوں کی جنگ کی خبر ملی
ہم پرستوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ملک پر کوئی آفت
نے والی ہے اور واقعی یہ آفت آ گئی اور اسی ماہ
س کا اتنا زبردست طوفان آیا کہ ملک کی تاریخ
بھی نہیں آیا تھا۔ ۶۰ اشخاص اس طوفان کے
یں ہلاک ہو گئے اور دو لاکھ سے زائد گھر سے بےگھر
ئے اور بارش کے پانی میں ایسے گھرے کہ ان کے
ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ کوالالمپور تک کو خطرہ
پیدا ہو گیا اس لئے کہ شہر میں بہنے والے دو دریاؤں میں
زبردست طغیانی آ گئی اور ان کا پانی پھیل گیا ــــ
تن عبدالرزاق وزیر اعظم ملیشیا نے ہنگامی صورت حال
کا اعلان کر دیا، اور انھوں نے ساری توجہ مصیبت زدوں
کی مدد کی طرف لگا دی اور بہت سے دوسرے ممالک
نے بھی امداد دی ــــ

لیبیا

قزافی کو مطمئن کرنا ہوگا

کرنل قزافی ۔ جو اسرائیل کے معاملے میں بہت سخت پالیسی کے حامل ہیں

مغربی ممالک کے تقریباً تمام شہرت یافتہ رسائل اور اخبارات جو لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں مشرق وسطیٰ کے بارے میں کچھ ایسا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ عرب ممالک کو اسی طرح باہم لڑایا جائے جس طرح کہ وہ اب تک لڑتے رہے ہیں۔ انور سادات کے بارے میں انہوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے کہ وہ عرب کاز کے مقابلہ میں خود اپنے ملک کے مسائل کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں اور اسی لئے وہ امن چاہتے ہیں۔ کرنل قزافی کے بارے میں ان کا پروپیگنڈا ہے کہ انکے اندر حد سے زیادہ امنگ ہے اور وہ عبدالناصر کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔ مقصد شاید یہ ہے کہ انور سادات اور قزافی میں اختلاف پیدا کیا جائے جو دونوں عرب یونین کے چار ملکوں میں سے دو اہم ملکوں کے سربراہ ہیں (باقی دو ملک سوڈان اور شام ہیں)

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ صحیح ہے کہ کرنل قزافی اسرائیل کے معاملہ میں بہت سخت پالیسی کے حامل ہیں۔ نہ وہ اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ امن مذاکرات پر یقین رکھتے ہیں ایسی حالت میں اگر کوئی مصالحت ہوگی جس کا امکان بہت کم ہے۔ تو یقیناً انور سادات قزافی کو اعتماد میں لیں گے۔ عرب یونین کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔

قزافی جنہوں نے ریگستان میں بسنے کے ایک خانہ بدوش خاندان کے خیمہ والے گھر میں جنم لیا تھا آج بھی عزم رکھتے ہیں۔ آہنی عزم کے مالک نہ ہوتے تو صرف ۲۰ برس کی عمر میں اپنے ملک کے سربراہ نہیں بن سکتے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۹ء میں شاہ ادریس اول کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد صرف پندرہ ماہ میں انہوں نے ملک میں بڑے بڑے انقلابی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان ہی میں ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تیل کی غیر ملکی ۳۳ کمپنیوں پر جو لیبیا میں تیل نکالتی ہیں ٹیکس لگا کر ملک کی قومی آمدنی میں ۳۳ کروڑ ڈالر کا اضافہ کر دیا۔ غیر ملکی بینکوں کو بھی انھوں نے قومی ملکیت میں لے لیا۔ اور ۶۰ فی صدی غیر ملکی بیمہ کمپنیوں کو ضبط کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ بہت سی سماجی اصلاحات بھی جاری کیں۔ مثلاً شراب بندی کی اور نائٹ کلبوں کی لعنت کو ختم کیا۔ نیز وہیلس کے ہوائی اڈے سے چھ ہزار امریکی فوجیوں کو بھگایا۔ اور ۲۵ ہزار اطالوی نو آبادکاروں کو نکالا جو مقامی آبادی کی لوٹ کھسوٹ کر رہے تھے۔

لیبیا آج عرب ممالک میں اسی طرح مالدار ملک سمجھا جانے لگا ہے جس طرح سعودی عرب کو سمجھا جاتا ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ کو نہر سویز کے بند ہونے سے جو نقصان ہو رہا ہے اسکی تلافی کرنے میں لیبیا بھی ہاتھ بٹاتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جب لیبیا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے تحت آزاد ہوا۔ (اس وقت تک اٹلی کی تولیت میں تھا) تو اسکے بجٹ کے نقصان کو پورا کرنے کے لئے برطانیہ اور امریکہ کروڑوں پونڈ اور ڈالر کی امداد دیتے تھے۔ اور اس کے بدلے میں دونوں ملکوں نے یہاں اپنے فوجی اڈے قائم کئے لیکن ۱۹۵۹ء میں تیل کی برآمد کے بعد اس کی سالانہ آمدنی ایک ارب ۳۰ کروڑ ڈالر تک پہونچ گئی ہے جبکہ اخراجات صرف ۴۳ کروڑ ہیں۔ باقی روپیہ سے لیبیا دل کھول کر دوسرے عرب ملکوں کی امداد کرتا ہے۔ شام کے صدر حافظ الاسد سے مسٹر قزافی ملنے کے لئے گئے تو ایک کروڑ ڈالر کا چیک انکے لئے چھوڑ آئے۔

لیبیا شمالی افریقہ کی مملکت ہے۔ اس کا رقبہ ۶۷۹،۳۵۸ مربع میل اور اسکی آبادی (۱۹۶۵ء کی مردم شماری کے مطابق) ۱،۳۸۰۰۰۰ ہے۔ آزادی کے بعد سنوسی مذہبی فرقہ کے رہنما محمد ادریس المہدی السنوسی کو بادشاہ بنایا گیا وہ ۱۹۲۲ء سے جلاوطن تھے

اسرائیل

بایاں بازو کامیاب

اسرائیل نے گذشتہ ستمبر میں امن کے مذاکرات سے [illegible]رکی اختیار کی تھی لیکن اب دوبارہ بات چیت میں شریک [illegible]نے کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ کچھ اس لئے کہ امریکہ کی طرف سے [illegible] ڈالا گیا اور زیادہ اسلئے کہ خود اندرون ملک بائیں بازو کی [illegible] کی طرف سے زور دیا گیا کہ اسرائیل کو [illegible] میں حصہ [illegible] چاہیئے۔ اس سوال پر اسرائیلی کابینہ میں بڑی طویل بحث [illegible]۔ ایک گروہ جس میں نائب وزیر اعظم یگال ایلون وزیر خارجہ [illegible]بان اور وزیر خزانہ پنہاس ساپیر جو وزیر اعظم کے وارث [illegible] جاتے ہیں جلد از جلد یارنگ مشن میں شمولیت کا حامی تھا اور [illegible] گروہ جس کی قیادت وزیر اعظم گولڈا مائر کر رہی تھیں اور [illegible] کابینہ کے شعبہ خاص اسرائیل گہیلی شامل تھے اصرار پر مصر تھا [illegible]ت چیت سے قبل متحدہ عرب جمہوریہ کو نہر سویز کے علاقے [illegible] اپنی تنصیبات ہٹا لینی چاہئیں۔ وزیر دفاع موشے دایان [illegible]ن کے بین بین تھے۔

بات چیت سے [illegible] اسرائیلی [illegible] کیا۔ [illegible] ہوئے نظر آرہے ہیں

واقعات نئے موڑ پر

بالآخر پارلیمنٹ میں معاملہ گیا اور اسرائیلی سینٹ (پارلیمنٹ) نے ۳۲ کے مقابلہ میں ۷۰ ووٹوں سے شرکت کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ اس سے قبل مسز گولڈا مائر نے اعلان کیا تھا کہ انکی سرکار بات چیت میں شرکت کے لئے تیار ہے لیکن اسکے لئے شرط یہ ہے کہ:

۱: امریکہ اسرائیل کی فوجی اور اقتصادی امداد کا طویل مدتی پروگرام بنائے۔

۲: وزیر خارجہ امریکہ مسٹر راجرس اپنی اس تجویز کو واپس لیں کہ "غیر واقعی تنگ سرحدوں" کے علاوہ اسرائیل سب عرب مقبوضہ علاقے خالی کردے۔

امریکہ پچاس کروڑ ڈالر کی فوجی امداد جس میں خاص طور پر جیٹ فائٹر، الیکٹرونک سامان اور ٹینک شامل ہوں گے دینے کے لئے تیار ہو گیا لیکن مقبوضہ عرب علاقوں کی واپسی کی تجویز کو واپس لینے سے انکار کردیا۔

اسرائیل بات چیت میں حصہ لینے کے لئے بہرحال تیار ہو گیا۔ اور بائیں بازو کو دائیں کی شدت پسند پالیسی کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہوئی۔

مسائل

فلاحی اقدام

۶۰ لاکھ کا ٹرسٹ

ایک ایسے وقت جبکہ نظام حیدرآباد کسی ریاست کے حکمران نہیں ہیں انکی طرف سے ساٹھ لاکھ کے فلاحی ٹرسٹ کا قیام ایسا فیاضانہ اقدام ہے جس کا ان تمام طبقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا جو ملک کے کسی طبقے کو پسماندہ یا پچھڑا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ ٹرسٹ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے کام کرے گا۔ اور ان کے لئے عام اور اخلاقی تعلیم کا بندوبست کرے گا۔

نظام حیدرآباد کو یہ قدم اٹھانے کی ترغیب شاید اسلئے ہوئی کہ سابق ریاست حیدرآباد یا تلنگانہ کے علاقہ کے مسلمان آزادی کے ۲۴ سالہ دور میں زندگی کے تمام شعبوں خاصکر تعلیمی شعبے میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ملازمتوں میں صنعت و حرفت اور تجارت میں اور دوسرے تمام شعبوں میں انکی پسماندگی ظاہر و نمایاں ہے، ہاں "رکھشا پلروں" کے شعبہ کو اگر اسے واقعی شعبہ کہا جا سکتا ہے تو انہوں نے خوب ترقی کی ہے اور صرف حیدرآباد کے ۲۵ ہزار رکھشا پلروں میں اپنی تعداد کو ۲۴ ہزار تک پہونچا دیا ہے۔

لیکن یہ حالت صرف حیدرآباد آندھرا کے دوسرے علاقوں تک ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسری ریاستوں کے بیشتر حصوں میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت نظر آتی ہے مسلم تنظیمیں اس کمی کو دور کرنے میں بڑا رول ادا کرسکتی تھیں لیکن انہیں باہم دست و گریبان ہونے ہی سے فرصت نہیں ہے۔ یوں الگ الگ کافی شور مچاتی ہیں۔ اور قراردادیں بھی منظور کرتی ہیں۔ لیکن اگر اس طرح شور مچانے یا قراردادیں پاس کرنے سے مسئلہ حل ہو سکتا تو اب سے بہت پہلے حل ہو چکا ہوتا۔ اس کے لئے تو ٹھوس اور تعمیری اقدام کی ضرورت ہے اور ان مسلم تنظیموں کے پاس اسی چیز کی کمی ہے۔

نظام حیدرآباد کا اقدام ان تنظیموں کے لئے ایک سبق ہے۔ قدرت جس سے چاہے کام لے۔ یہ تنظیمیں جو مسلمانوں کی خدمت کا بڑا دم بھرتی ہیں۔ دیکھتی رہیں اور نواب برکت علی خاں اپنا کام کر گئے۔ حقیقتاً انہوں نے بڑا بنیادی کام کیا ہے۔ جو بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

اس ٹرسٹ کا دائرہ اگرچہ حیدرآباد تک ہی محدود نہیں ہے لیکن ظاہر ہے یہ پورے ملک کی ضرورتوں کی کفالت نہیں کرسکتا۔ ضرورت ہے کہ دوسرے مقامات پر بھی مخیر حضرات سامنے آئیں اور اس قسم کے ٹرسٹوں کی داغ بیل ڈالیں جو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی طرف توجہ دیں۔ نظام حیدرآباد نے ایک راہ دکھائی جس کی سب جگہ پیروی کی جانی چاہئے

دوسری کمیونٹیوں میں بھی اس قسم کے ادارے موجود ہیں جو فلاحی کاموں میں مصروف ہیں وہ زیادہ تر تعلیم کی طرف توجہ دے رہے ہیں اور خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کئی کئی اسکول اور کالج چلا رہے ہیں۔ اور اپنے اپنے طور پر اپنی کمیونٹی کی جہالت و ناخواندگی کو دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسلم کمیونٹی کے لئے بھی فلاحی ادارے قائم کئے جا سکتے ہیں اور انہیں چلانے کے لئے

حکومت سے مدد لی جا سکتی ہے۔

بلا شبہ اس سلسلہ میں حکومت پر بھی بہت سی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں لیکن ساری ذمہ داریاں حکومت پر ہی چھوڑ دینا اپنی کمزوری کا اظہار کرنا ہے۔ اپنی ہمت سے جو طبقے آگے بڑھتے ہیں انہیں سب طرف سے مدد ملتی ہے، حکومت بھی انکی مدد کرتی ہے اور خدا کی طرف سے بھی مدد ملتی ہے۔ خدا انکی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔

غالباً نظام حیدر آباد نے اسی اصول کے پیش نظر ایک قدم بڑھایا ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس سے بڑے کام نکلیں گے اور تعلیمی میدان میں یہ دوسری جگہوں کے لئے ایک مشعل راہ ثابت ہوگا۔

آر۔ایس۔ایس

زور گھٹ رہا ہے

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے نیتاؤں کے ذہن و دماغ پر "گرو دکشنا" کے موقع پر جمع ہونے والے چندے کی کمی کی وجہ سے بڑی سخت چوٹ پڑی ہے۔ اور وہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے سنگھاسن ڈولنے لگے ہیں۔ نئی دلی اور پرانی دلی میں کام کرنے والی ۲۷ شاخوں نے گذشتہ سال سوا سات لاکھ روپیہ جمع کیا تھا جبکہ اس سال یہ رقم ساڑھے پانچ لاکھ تک بھی نہ پہونچ سکی۔ ۱۹۶۸ء میں ان شاخوں نے دس لاکھ روپیہ اکٹھا کر لیا تھا اور شاید یہی سال آر ایس ایس کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد سے اس کا زور دلی میں گھٹتا دکھائی دے رہا ہے۔ اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جمع کردہ رقم ۱۹۷۱ء میں نصف ہو کر رہ گئی۔ جماعت کے اثرات کو کم کرنے میں جن سنگھ کے نیتاؤں کی من مانی کارروائیوں کے علاوہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دلی کے اس حکم نامہ کا بھی ہاتھ ہے جس کے ذریعے اس جماعت کی فوجی مشقوں پہ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اس کمزوری کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ آر ایس ایس کے نیتاؤں نے چیلنج کیا تھا کہ اگر انکی جماعت پر کسی قسم کی بھی پابندی عائد کی گئی تو دو ہزار سویم سیوک اس حکم کے خلاف مظاہرہ کریں گے لیکن حکم نافذ ہونے کے بعد ایسا کوئی مظاہرہ نہیں کیا گیا۔

ناگپور جو اس جماعت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے اس سال گرو پردا کے موقع پر اپنی دیرینہ روایات کو قائم نہ رکھ سکا۔ اور شاید دلی کے لئے بھی ایسے خفیہ احکامات صادر ہوئے جس کے نتیجہ میں اس سال یہاں آر ایس ایس کے باوردی نوجوان سڑکوں پر پریڈ کرتے جلوس کی شکل میں دکھائی نہیں دیئے۔

گرو گولوالکر ـــــ ہنگاموں کے دلدادہ

جماعت کے سرکردہ نیتا گرو گولوالکر کی علالت اور حکومت کے سخت رویہ کے تحت گرو دکشنا پر بھینٹ کی جانے والی شردھانجلی نے ثابت کر دیا کہ راجدھانی میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے قلعے کی دیواروں میں جگہ جگہ شگاف پڑنا شروع ہو چکے ہیں۔

پنجاب اور یوپی میں بھی محسوس ہو رہا ہے کہ جماعت کا زور روبہ انحطاط ہے۔ پنجاب میں اکالی جن سنگھ اتحاد نے آر ایس ایس کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے لئے اکالی جیسے اپنے بدترین مخالف سے اتحاد جن سنگھ کی کمزوری یا بے ضابطگی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس اتحاد کے خاتمہ اور وزارت کے ٹوٹنے کے بعد جن سنگھ کے بہت کارکن کانگریس کی صفوں میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ گرو پروا کے موقع پر جمع ہونے والا چندہ گذشتہ سال کے مقابلہ میں دو لاکھ روپیہ کم ہوا۔

اسی طرح یوپی میں ایس، وی، ڈی میں داخل ہو جانے کے بعد جن سنگھ نے اپنے پیروں پر آپ ہی کلہاڑی ماری ہے یوپی کے ایک سرکردہ جن سنگھی رہنما نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اگلا سال ان کے لئے موت اور زیست کی کشمکش لے کر آنے والا ہے۔ میرٹھ ڈویژن سے موصول ہونے والی خفیہ اطلاعات کے تحت گذشتہ سال کے مقابلہ میں روزانہ پریڈوں میں حصہ لینے والوں کی تعداد چالیس فیصد کم ہو چکی ہے۔ اگرچہ گرو پردا کے موقع پر گذشتہ سال کے مقابلہ میں اس سال پانچ ہزار روپیہ زیادہ جمع ہوئے ہیں لیکن جونہی ایس وی ڈی کا مورچہ ٹوٹے گا آر ایس ایس کی کمزور دیواریں بھی منہدم ہو جائیں گی۔

لیکن راجستھان، مدھیہ پردیش، بہار میں گرو پروا کے موقع پر کافی چندہ اکٹھا ہوا اور اس کی وجہ ان ریاستوں کے وہ والیان ریاست ہیں جو آنے والے الیکشن میں کانگریس سے آخری مورچہ لینے کے لئے سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔ گوالیار کی راج ماتا اور اُن کے تحت جگر جن سنگھ میں شامل ہو چکے ہیں۔ والیان ریاست اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے سارا زور لگانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ اُن کے اقتدار حاصل کرنے کی آخری جنگ ہے۔ اسی لئے ان صوبوں کے راجہ مہاراجہ اور دیگر عناصر جو کانگریس حکومت میں اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے نہ رہ سکیں گے۔ جن سنگھ کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن ان صوبوں میں جن سنگھ اور آر ایس ایس کا بڑھتا ہوا زور اتنا خطرناک نہیں جتنا پنجاب، دلی، ہماچل پردیش اور ہریانہ جیسے شمالی علاقوں میں ہو سکتا ہے اور انہی علاقوں میں دونوں جماعتیں نڈھال ہو رہی ہیں جس کا لازمی اثر دوسرے صوبوں پر پڑے گا۔

صوبے

مدھیہ پردیش

باسی کڑھی میں ابال

آج کل سابق حکمران بڑے سرگرم نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں پتہ چلا کہ سابق حکمران پریوی پرسز کے معاملے پر حکومت کے ساتھ کوئی باعزت سمجھوتہ کرنے کے حق میں ہیں اگر انہیں مناسب معاوضہ مل جائے تو وہ پریوی پرسز سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ مگر ان میں صرف چھوٹے حکمران ہی شامل تھے، ان کی آواز پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ کیونکہ بڑے

سابق حکمرانوں کا رویہ سخت ہے وہ کانگریس کو سبق دینا چاہتے ہیں۔

اس طبقہ کی قیادت راج ماتا گوالیار، بیگم بھوپال، اور پٹنہ کا اردھا اور ٹیہری گڑھ کے سابق حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ عظیم اتحادی گٹھ جوڑ کے حق میں ہیں۔ بہت سے حکمرانوں کی نظریں جن سنگھ پر ہیں۔ لیکن کچھ دوسرے ہیں جو سیاسی پارٹیوں خاص کر جن سنگھ کے ساتھ کسی گٹھ جوڑ کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ میدان سیاست میں اکیلے ہی آگے بڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ریاستی اسمبلی کے ۲۹۶ حلقوں میں سے ۱۰۰ حلقے سابق ریاستوں میں واقع ہیں اور اگر وہ متحد ہو کر آگے بڑھیں تو طاقتی توازن ان کے ہاتھ میں آسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں راج ماتا سندھیا کی مثال دی جاتی ہے جنہوں نے کانگریس کے خلاف تحریک چلا کر ۱۹۶۷ء میں اپنے علاقہ میں ایک کے علاوہ باقی تمام سیٹوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اس وقت اگر مسٹر ڈی۔ پی مصرا مہاراجہ ریوا کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہتے جن کے علاقہ میں کانگریس نے ۸ سیٹیں حاصل کیں تو مدھیہ پردیش میں کانگریس کبھی اکثریت میں نہ آسکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ "حکومت" چھن جانے کے باوجود ابھی تک سابق حکمران اپنی سابق "رعایا" میں کافی اثر رکھتے ہیں اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ سابق ریاستوں کے لوگ آزادی کے وہ فائدے حاصل نہ کر سکے جن کی وہ توقع کر رہے تھے تاہم حکمران کانگریس کو توقع ہے کہ اُسے سب ہی سابق حکمرانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا نہیں ہوگا۔ متعدد بااثر حکمران کانگریس کے ساتھ بھی ہیں کیونکہ انھیں بہرحال احساس ہو گیا ہے کہ عدم مساوات زیادہ دنوں تک چل نہیں سکتی اور جلد یا بدیر انھیں اپنی تمام مراعات سے محروم ہونا پڑے گا اس لئے اچھا یہ ہے کہ حکمران جماعت کے ساتھ تلخی پیدا نہ کی جائے۔

تاہم کچھ میں جن کی باسی کڑھی میں ابال آیا ہوا ہے اور پرانی "سلطنت" کے خواب انھیں ستانے لگے ہیں۔

گجرات

سنگباری۔ پاگل پن

گجرات سنڈیکیٹ کانگریس کا گڑھ کہا جاتا تھا لیکن جب سے اس کانگریس نے جن سنگھ اور سوتنتر پارٹیوں کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے۔ یہ گڑھ ٹوٹ گیا ہے۔ اور ہزاروں

واقعات نئی دہلی

کانگریسی کارکن جن میں بعض وزراء، ممبران اسمبلی اور اضلاع کے کارکن شامل ہیں، کانگریس میں آ کر مل گئے ہیں۔ ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ جس پارٹی میں چاہے شامل ہو جائے کسی پر کسی قسم کا دباؤ نہیں۔ اسمبلیوں تک میں دل بدل ہوتی ہے تو یہ عام ممبروں کی "دل بدلی" ہے۔

پتھروں کی بوچھاڑ میں

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے گجرات سنڈیکیٹ کانگریس کے کچھ سر پھرے لوگ اس پر خوش نہیں ہیں۔ اور وہ اپنے دل کے جلے پھپھولے تشدد کے ذریعہ پھوڑنا چاہتے ہیں اور یہ تشدد بھی کسی اور کے ساتھ نہیں بلکہ خود وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے ساتھ۔ سورت میں وزیر اعظم کے بھرے جلسہ میں ان بے وقوفوں نے سنگباری شروع کر دی۔ اور یہ بھول گئے کہ اس سے خود ان کی جماعت کو نقصان پہنچے گا۔ کیونکہ بہرحال اتنی بات سے تو سبھی واقف ہو گئے ہیں کہ جمہوری فیصلہ پولنگ بوتھوں پر ہوا کرتا ہے۔ پتھروں کے ذ[illegible]یں، پتھر تو پاگل مارا کرتے ہیں۔

مگر وزیر اعظم کی ہمت قابل داد ہے۔ پتھروں کی بارش میں وہ تقریر کرتی رہیں۔ اور لوگوں کو بتاتی رہیں کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ اور انہوں نے کیوں الیکشن کرائے ہیں۔ مسز گاندھی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بڑی آہنی عزم کی خاتون ہیں۔ اور ان کا یہی عزم انکی عظیم الشان کامیابی کی نشاندہی کرتا ہے۔

کشمیر

سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے

کشمیر میں محاذ استصواب پر پابندی لگا دی گئی ہے اور اس کے لیڈروں کو ریاست بدر کر دیا گیا ہے — جمہوریت کے زمانے میں اس قسم کی پابندی بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی انسان کو اپنی مرضی کے خلاف بھی کام کرنے پڑتے ہیں۔ صادق صاحب بڑی نرم پالیسی کے آدمی ہیں اور اس پالیسی کے لئے اکثر وہ نکتہ چینی کا نشانہ بھی بنے ہیں لیکن انھوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی اور ایک جمہوریت پسند کی حیثیت سے محاذ استصواب رائے کو الیکشن میں حصہ لینے تک کی اجازت دے دی، حالانکہ بعض حلقوں کی طرف سے اعتراض کیا گیا کہ ایسی جماعت کو الیکشن لڑنے کی اجازت کیسے دی گئی جو اس آئین ہی کو نہیں مانتی جس کے تحت انتخابات لڑے جا رہے ہیں لیکن صادق صاحب سب کچھ سنتے رہے اور انھوں نے محاذ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ حقیقتاً انھوں نے اس کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ لیکن جب پانی سر سے گزرنے لگا تو اسے حلق میں جانے سے روکنے کے لئے کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ علیحدگی پسندی کا پروپیگنڈہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے اور بڑھنے کی اجازت نہ دی جا سکتی تھی۔ لیکن اچھا ہوتا اسے کچھ دن اور برداشت کر لیا گیا ہوتا، اس لئے کہ علیحدگی پسندوں کا حال پتلا ہو چلا تھا اور علیحدگی کی باتیں سنتے سنتے خود کشمیری عوام نے ان کو الگ کرنے کی بات سوچ لی تھی، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا۔ اس کا احساس غالباً محاذ والوں کو ہو گیا تھا اسی لئے انھوں نے سخت زبان میں بولنا شروع کر دیا تاکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ الیکشن میں حصہ بھی نہ لیں اور اپنے آدمیوں میں سرخرو بھی رہیں۔ خدا معلوم کیا کیا بولے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو ریاست بدر ہو گئے یا سنٹرل جیل پہونچ گئے اور الیکشن میں مقابلہ پر آنے سے بچ گئے۔ یہی ان کا مقصد تھا۔ یوں کہیے ریاست بدری بھی محاذ کے لیڈروں کی لاج رکھنے کا ذریعہ بن گئی۔ اس کے لئے انھوں نے صادق صاحب یا حکومت کشمیر کا شکریہ ادا نہ کیا تو بڑی ناشکری کی بات ہوگی۔

کینیڈا کے جوان اور کنوارے وزیر اعظم ٹروڈیو نے ہوائی جہاز
وزیر اعظم اندرا گاندھی کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ یہ ہار
تھے۔ ٹروڈیو کامن ویلتھ کی میٹنگ میں شرکت کیلئے سنگاپور جاتے ہوئے

پانچ جوکر:۔ جی نہیں یہ ہیں سیاسی سرکس کے پانچ رنگ ماسٹر۔ (بائیں سے دائیں) ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ (سنڈیکیٹ) شری روی راؤ (ایس۔ ایس۔ پی) شری اٹل بہاری باجپئی (جن سنگھ) جارج فرنانڈیز اور راج نرائن سنگھ (ایس۔ ایس۔ پی)

بمبئی میں جلد ہی ساڑھے چار کروڑ
شیراٹن ہوٹل کا افتتاح ہو
سب سے زیادہ ماڈرن ہوٹل ہوگا

دہلی میں جشن جمہوریہ کی تیار
ہیں۔ راشٹرپتی بھون اور شہا
بنا یا جا رہا ہے۔ تصویر میں د

کھلاڑی اور فلم اسٹار بھی سیاست میں :- ہندوستان میں سیاست صرف نواب راجاؤں اور دولت مند لوگوں کا مشغلہ ہے۔ اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو آپ کہیں سے بھی الیکشن کا ٹکٹ حاصل کرسکتے ہیں۔ فلمی ستاروں کے پاس بھی کافی مقدار میں فالتو پیسہ ہے۔ اس لئے سننے میں آیا ہے کہ تقریباً آدھے درجن فلمی ستارے الیکشن میں کھڑے ہورہے ہیں۔ مہاراشٹر میں الیکشن لڑنے کیلئے شیوسینا کے 'باس' بال ٹھاکرے کا آشیرواد ضروری ہے۔ دائیں سے بائیں :- دھرمیندر، راجندر کمار، بال ٹھاکرے، آئی۔ ایس۔ جوہر اور منوج کمار

سامراج کی قبر بنے گی، ایشیا کی دھرتی پر :
دہلی میں برطانیہ کے وزیر اعظم ایڈورڈ ہیتھ کا استقبال "ہیتھ واپس جاؤ" کے نعروں سے کیا گیا۔
جگہ جگہ برطانیہ کے جنوبی افریقہ کو ہتھیار دیئے جانے کے خلاف مظاہرے کیئے گئے۔ پالم ہوائی اڈہ کے باہر نوجوان طالب علم مظاہرہ کررہے ہیں۔

حسینۂ عالم کی شادی :- ہندوستانی لڑکی حسینۂ عالم ریتا فیریا کے عشق اور شادی کی افواہیں کافی دن سے اڑ رہی تھیں۔ ہر روز ایک نئے عشق کی افواہ اڑائی جاتی تھی ریتا نے پچھلے دنوں ڈاکٹر ڈیوڈ پاول سے شادی کرکے افواہیں اڑانے والوں کے منہ بند کردیئے۔

ڈھائی کلو کا آلو :-
سی۔ آر۔ جانسن نے اپنے باغ میں، عام آلو کے بیج سے ڈھائی کلو کا یہ آلو پیدا کیا ہے۔

کیا جائے کہ ہندوستان میں تیز گیند پھینکنے والے عنقا ہیں ———

اس وقت ٹیم میں تین بہت عمدہ اوپننگ بلے باز موجود ہیں یعنی گواسکر جینتی لال اور منکڈ۔ ویسے تو جے سمہا، سارڈیسائی اور عابد علی بھی اوپن کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ درمیان میں کھیلیں تو زیادہ کارآمد ثابت ہوں گے۔ دونوں وکٹ کیپر نوجوان اور پھرتیلے ہیں۔ کرشنا سورتی کی عمر ۲۳ سال ہے جبکہ جی بی جی کی عمر ۲۲ سال۔ پرسنا، راگھون بیدی اور درانی کا شمار دنیا کے بہترین اسپنروں (؟) میں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی سولکر اور جے سمہا بھی انکے اچھے معاون ثابت ہوں گے۔ نئی گیند گووند راج اور عابد علی کے ہاتھ میں دی جا سکے گی۔ دونوں درمیانی رفتار سے تیز گیند پھینک لیتے ہیں۔

ٹیم اگلے مہینے ویسٹ انڈیز کے لئے روانہ ہو جائیگی اس سے پہلے تمام کھلاڑیوں کو دس روز تک مکمل ٹریننگ دی جائے گی۔

ٹیم کا مختصر تعارف : ———

اجیت واڈیکر (کپتان) پیدائش یکم اپریل ۱۹۴۱ء

واڈیکر کا شمار ہندوستان کے بہترین بلے بازوں میں ہوتا ہے واڈیکر بائیں ہاتھ سے بلے بازی کرتے ہیں۔ واڈیکر تیز کھیلنے والوں میں ہے۔ واڈیکر کا بلّہ بالکل کسی آرٹسٹ کے برش کیطرح گھومتا ہے ہک لگانے میں واڈیکر کا جواب نہیں۔ واڈیکر بہت عمدہ سلپ فیلڈر بھی ہے پہلی مرتبہ واڈیکر کو ۶۷-۱۹۶۶ میں ویسٹ انڈیز کے خلاف میچ میں کھیلنے کا موقع دیا گیا اسی وقت سے اس نے ہندوستانی کرکٹ ٹیم میں اپنے لئے مستقل جگہ بنالی ہے اب تک وہ ٹیسٹ میچوں میں ایک سنچری اور دس آدھی سنچریاں بنا چکا ہے۔

ایس وینکٹا راگھون عمر ۲۵ سال نائب کپتان :۔ مدراس کا دبلا پتلا اور پھرتیلا نوجوان وینکٹا راگھون بہت عمدہ آف اسپنر ہے پہلی بار نیوزی لینڈ کے خلاف ۱۹۶۵ء میں ٹیسٹ ٹیم میں شامل کیا گیا۔ اب تک ۱۴ ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے جنمیں اس نے ۱۱۸۳ رن دیکر ۴۰ وکٹ لئے بلاشبہ راگھون اس وقت ہندوستانی ٹیم کا سب سے عمدہ

واقعات نئی دھلی

ہندوستان کے نئے کپتان

اجیت واڈیکر

فیلڈر ہے۔ عام طور پر گلی اور (؟) میں فیلڈنگ کرتا ہے موقعہ پڑنے پر (؟) بنا لیتا ہے۔

سلیم درانی عمر ۳۶ سال :۔ راجستھان کا چھوٹا دبلا پتلا اور خوبصورت آل راؤنڈر ہے سلیم درانی ٹیم کا سب سے زیادہ معمّر کھلاڑی ہے۔ درانی کا شمار ہندوستان کے بہترین آل راؤنڈروں میں ہوتا ہے۔ درانی بائیں ہاتھ سے بلے بازی کرتا ہے اور جب جم جاتا ہے تو چھکوں اور چوکوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے۔ درانی جیسے ہی فیلڈ میں اترتا ہے کھیل میں جان آجاتی ہے اسکور بورڈ تیزی سے چلنا شروع ہو جاتا ہے وہ بہترین آف اسپنر بالر ہے۔ درانی اس سے پہلے بھی ویسٹ انڈیز جا چکا ہے اور اسے وہاں کے پچوں کا کافی تجربہ ہے ہمیں یقین ہے کہ درانی ویسٹ انڈیز میں بہترین بلے باز اور بالر ثابت ہوگا۔

ایم۔ ایل جے سمہا عمر ۳۱ سال :۔ جے سمہا ٹیم کا سب سے زیادہ تجربہ کار کھلاڑی ہے۔ اب تک ۳۶ ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں انگلینڈ میں ٹیسٹ میچ کھیلا۔ ۱۹۶۷ء میں جے سمہا کو ٹیم سے نکال دیا گیا تھا لیکن پھر اسے دوبارہ آسٹریلیا بلا لیا گیا تھا۔ جے سمہا میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ کئی سال سے حیدرآباد کا کپتان ہے۔ بہترین بلے باز ہے۔ حالات اور وقت کے مطابق تیز اور دھیما کھیل کھیلنے پر قادر ہے۔ نئی گیند کا بھی اچھا استعمال کر لیتا ہے۔ پرانی گیند سے عمدہ آف بریک بالنگ کرتا ہے جے سمہا عمدہ فیلڈر بھی ہے۔ اب تک تین سنچریاں اور بارہ آدھی سنچریاں بنا چکا ہے۔

دلیپ سارڈیسائی۔ عمر ۳۰ سال۔ بمبئی کا یہ عمدہ بلے باز کسی زمانے میں ہندوستان کا اوپننگ بلے باز تھا۔ لیکن اب مناسب یہ ہوگا کہ یہ درمیان میں کھیلے بورڈی اور بورڈے کی غیر موجودگی میں درمیان کا کھیل سنبھالنے والا اب اور کوئی بلے باز موجود نہیں ہے۔ سارڈیسائی بھی دوسری بار ویسٹ انڈیز جا رہا ہے۔ اب تک اکیس ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے۔ ایک ڈبل سنچری، دو سنچری اور سات آدھی سنچریاں بنا چکا ہے۔

ای۔ اے۔ ایس پرسنا عمر ۳۰ سال :۔ پرسنا کا شمار دنیا کے بہترین آف اسپنر بالروں میں ہوتا ہے۔ پرسنا درمیانی قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک ہے، اچھا فیلڈر اور بیٹس مین بھی ہے۔ اس دورہ ہندوستانی ٹیم کی سب سے بڑی امید پرسنا ہی ہے۔ اب تک ۲۰۵۷ رن دیکر ۱۱۳ وکٹ لے چکا ہے۔

سیّد عابد علی عمر ۲۹ سال :۔ حیدرآباد کا آل راؤنڈر ہے۔ اچھا اوپننگ بلے باز اور گیند پھینکنے والا ہے۔ بہترین فیلڈر اور بہت چست اور پھرتیلا کھلاڑی ہے۔ اب تک ۱۲ ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے جن میں اس نے کل ۵۳۰ رن بنائے۔ ۶۲۶ رن دے کر ۲۱ وکٹ لے چکا ہے۔

اشوک منکڈ عمر ۲۵ سال :۔ بمبئی کا یہ نوجوان کھلاڑی اپنے وقت کے بہترین آل راؤنڈر ونو منکڈ کا لڑکا ہے عمدہ بلے باز ہے۔ کافی تیز کھیل کھیلتا ہے آف اسپنر بالر بھی ہے اور اچھا فیلڈر بھی۔ اب تک سات ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے جن میں اس نے کل ۶۲۲ رن بنائے۔

بشن سنگھ بیدی عمر ۲۴ سال :۔ دہلی کا بائیں ہاتھ سے گیند پھینکنے والا اسپن بالر ہے پہلی مرتبہ ویسٹ انڈیز کے خلاف ۶۷-۱۹۶۶ء میں کھیلا۔ ہماری تمام امیدیں بیدی اور پرسنا ہی سے وابستہ ہیں اسپنروں کے اس جوڑوں نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے۔ بیدی اب تک ۱۹ میچوں میں ۱۷۹۸ رن دے کے وکٹ لے چکا ہے۔

ایکناتھ سولکر۔ عمر ۲۲ سال :۔ بائیں ہاتھ سے کھیلتا ہے لیکن خراب حالت میں ہاتھ روک کر کھیلنے پر بھی قادر ہے۔ درمیانی رفتار کی تیز گیند اور اسپن گیند دونوں ہی پھینک لیتا ہے۔ سولکر ان نوجوان کھلاڑیوں میں سے ہے جن کا شمار آئندہ ہندوستان کے بہترین کھلاڑیوں میں ہوگا۔ اب تک پانچ ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے۔

وشوا ناتھ عمر ۲۱ سال:۔ وشوا ناتھ کا شمار ان خوش نصیب کھلاڑیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے ٹیسٹ میچ میں سنچری بنائی۔ بہت تیز کھیل کھیلتا ہے اس کے باوجود کہ بہت دبلا پتلا اور چھوٹے قد کا ہے وشوا ناتھ بہت ہی طاقتور شاٹ لگاتا ہے۔ اب تک چار ٹیسٹ کھیلے ہیں جن میں کل ۲۴۴ رن بنائے ہیں ایک سنچری اور دو آدھی سنچریاں بنا چکا ہے اس حساب سے وشوا ناتھ کے کھیل کا اوسط ٹیم میں شامل دوسرے تمام ٹیسٹ کھلاڑیوں سے بہتر ہے۔

جینتی لال عمر ۲۲ سال:۔ حیدرآباد کا نوجوان کھلاڑی بہت عمدہ بلے باز ہے طاقتور شاٹ لگاتا ہے پہلی بار ٹیسٹ ٹیم میں شامل کیا گیا ہے۔

گووندراج عمر ۲۳ سال:۔ گووندراج بھی حیدرآباد ہی کا رہنے والا ہے اور اچھا [illegible] ہے۔ گووندراج کافی عرصہ سے کرکٹ ٹیسٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے پچھلے دنوں رانجی ٹرافی اور دلیپ ٹرافی میچوں میں بہت عمدہ بالنگ کی۔

سنیل گواسکر عمر ۲۱ سال:۔ بہت عمدہ [illegible] بلے باز ہے پچھلے دنوں انٹر یونیورسٹی کے لئے کھیلتے ہوئے ۳۲۷ رن بنائے۔ اس طرح اس نے اجیت واڈیکر کا ۳۲۴ رن کا ریکارڈ توڑ دیا۔ یقیناً گواسکر بہت عمدہ ٹیسٹ کھلاڑی ثابت ہوگا۔

کرشنا مورتی عمر ۲۲ سال:۔ کرشنا مورتی اچھا وکٹ کیپر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا بلے باز بھی ہے اس لئے اندازہ ہے کہ ٹیم میں پہلا انتخاب اسی کا ہوگا۔ جھنگا بادسے کے لئے کھیلتے ہوئے کافی اچھی وکٹ کیپری اور بلے بازی کا مظاہرہ کیا

جی جی بھولی عمر ۲۰ سال:۔ بنگال کا یہ نوجوان بھی اچھا وکٹ کیپر ہے شاید فاروق انجینئر اور کرمانی کی کمی کو پورا کر دے۔ جی جی بھولی کو ابھی اپنی بیٹنگ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

ڈیورینڈ فٹ بال ٹورنامنٹ

صلاح الدین شاکر

کھیل ہیں کھیل فٹ بال کا۔ اس میں اصل طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ "فٹ بال بِلی پاور"۔ دلی گیٹ پر میں دو اشخاص کے درمیان یہ گفتگو دور تک سنتا چلا گیا۔ فٹ بال کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر انہوں نے بحث نہ کی ہو۔ فٹ بال کا کھیل کہاں سے شروع ہوا۔ اس کا میدان کتنا بڑا ہوتا ہے۔ اس کھیل نے کیسے ترقی کی، کون کون سے لوگ اس کھیل میں آگے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چند منٹ کے اندر اندر انہوں نے سب پر تبصرہ کر ڈالا یہ دونوں معمولی کام کرنے والے ورکر تھے لیکن فٹ بال کا شوق انھیں روز دلی گیٹ کی طرف کھینچ کر لے جاتا تھا۔ دلی گیٹ کا پورا ماحول آج کل "فٹ بالی" ہے۔ کیونکہ کارپوریشن اسٹیڈیم کے سو فٹ لمبے اور ۷۰ فٹ چوڑے میدان میں آج کل ڈیورینڈ کھیلے جا رہے ہیں۔ ہر طبقہ خیال کے لوگ ان کھیلوں کو دیکھنے کے لئے جاتے ہیں اور پورا اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ بھیڑ کا صحیح اندازہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب شام پانچ بجے کھیل کے خاتمہ پر لوگ قطار در قطار باہر نکلتے اور پورے علاقے پر چھا جاتے ہیں۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پوری دلی دلی گیٹ پر سمٹ آئی ہو۔ فضا پر ایک فٹ بالی چھائی ہوتی ہے۔ فٹ بال کے علاوہ اس ماحول میں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ غمگین سے غمگین کا غم بھی فٹ بال کے جھمیلوں میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔

اس کارپوریشن کے میدان میں کچھ دن پہلے دلی کلاتھ ملز ٹورنامنٹ کھیلے گئے۔ اچھی خاصی ٹیموں نے ان میں حصہ لیا۔ نوان کلب کی ٹیم تک آئی لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی تھی۔ ڈیورینڈ سے اس کا کیا مقابلہ!

ڈیورینڈ، ڈیورینڈ ہے جو اپنے پیچھے ایک تاریخ رکھتا ہے یہ ٹورنامنٹ ملک میں سب سے قدیم ٹورنامنٹ ہیں۔ بڑی بڑی

ڈیورینڈ کپ

ٹاسو ٹیموں نے اس ٹورنامنٹ اور پورے ملک کا نام روشن کیا ہے جو چند لوگ اس زمانے کے کھیل دیکھنے والے باقی ہیں ان کا دل آج کے مقابلوں کو دیکھ کر نہیں بھرتا۔ کیونکہ کھیل کا معیار پچھلے برسوں میں بڑھا نہیں گھٹا ہے۔

ڈیورینڈ ۱۸۸۸ء میں یعنی آج سے پورے ۸۲ برس قبل شروع ہوئے تھے انھیں شروع کرنے کا اعزاز اس وقت کے حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کے سیکریٹری مورٹمر ڈیورینڈ کو حاصل ہے۔ وہ فٹ بال کے اس کھیل کو جو برطانیہ میں انگلش اسکولوں سے شروع ہو کر مختلف ممالک میں پھیل رہا تھا اسے ہندوستان میں بھی فروغ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کھیل کے شائقین کے تعاون سے اسکا انتظام کیا اور ایک خوبصورت اور قیمتی کپ تیار کرا کر مقابلے شروع کر دیئے ٹورنامنٹ کو انہی کے نام پہ ڈیورینڈ ٹورنامنٹ کا نام دیا گیا۔ اور کپ کے بارے میں طے کیا گیا کہ جو ٹیم تین سال تک لگاتار اسے اٹھائے گی اسے مستقل طور پر اپنے پاس رکھ سکے گی۔ ہائی لینڈ انفنٹری سب سے پہلی ٹیم تھی جو ۱۸۹۳ء، ۹۴ء اور ۹۵ء میں لگاتار کپ اٹھا کر اسکی حقدار بنی اس کے بعد ۱۸۹۹ء، ۹۸ء، ۹۹ء میں مسلسل کامیاب ہو کر بلیک واچ نے اس کپ کو حاصل کیا۔ سر مورٹمر ڈیورینڈ نے دو مرتبہ کپ مہیا کر دیا! ور تیسری بار فٹ بال کے شائقین نے اسکا انتظام کیا۔

بعدازاں جب سر ڈیورینڈ ہندوستان میں اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے تو طے کیا گیا کہ یہ ایک چیلنج کپ ہوگا جس پہ

صلاح الدین شاکر

ن ملکیت نہ ہوگا۔ اسطرح موجودہ ڈیورینڈ کپ ستر سال پرانا
عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں صرف فوجی ٹیمیں ہی
ہ سکتی ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے بعض غیر فوجی ٹیموں
اس میں شریک کیا جاتا تھا اور آج فوجی محکمے کے زیر انتظام
چلنے کے باوجود اس پر غیر فوجی ٹیموں کا غلبہ ہے۔ گزشتہ ۲۰
کے عرصہ میں صرف تین مرتبہ فوجی ٹیموں کو فائنل جیتنے کا موقع

جیسا کہ اوپر ذکر آیا، ڈیورینڈ کے مقابلے ۱۸۸۸ء میں شروع
تھے۔ وہ ۱۹۱۳ تک پابندی سے جاری رہے لیکن ۱۹۱۴ء میں
جنگ عظیم شروع ہو جانے پر مسلسل چھ سال بند رہے۔ ۱۹۲۰ء میں
سلسلہ پھر شروع ہوا جو ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ اور ایک مرتبہ
ہ (دوسری جنگ عظیم) نے ان کھیلوں میں رکاوٹ پیدا کر دی
۱۹۴۵ء میں ختم ہو چکی تھی لیکن شاید سیاسی اتھل پتھل کی
سلسلہ شروع نہ ہو سکا۔

حالات میں کچھ استحکام پیدا ہوا تو فٹبال کے شائقین کو کچھ
ملا اور ۱۹۵۰ء میں پھر ڈیورینڈ شروع کر دیئے گئے۔

الیکشن کمیشن نے اعلان کیا ہے کہ دو بیلوں کی جوڑی کا نشان اندرا کانگریس کو دیا جائیگا۔

۱۹۶۱ء تک ان کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۶۲ء میں چین کے حملے کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر ان میں تعطل پیدا ہو گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ تعطل صرف ایک برس جاری رہا اور ۱۹۶۳ء سے پھر باقاعدگی کے ساتھ سلسلہ جاری ہوا تو وہ آج تک جاری ہے

ہر سال عام طور پر دسمبر یا جنوری میں یہ ٹورنامنٹ شروع ہوتے ہیں اور ایک ماہ کے قریب جاری رہ کر راجدھانی میں اچھی خاصی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ تقریباً ایک سو ٹیمیں شامل ہونے کی خواہش مند ہوتی ہیں لیکن کانٹ چھانٹ کے بعد نصف کے قریب مقابلوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ دلی سے نصف درجن کے قریب ٹیمیں اس ٹورنامنٹ میں حصہ لیتی ہیں لیکن عام طور پر دوسرے یا زیادہ سے زیادہ تیسرے راؤنڈ میں ہتھیار ڈال دیتی ہیں سیٹی کلب بڑے دھوم دھڑکے سے اٹھا تھا۔ لیکن اس مرتبہ جس بری طرح سے پٹا ہے اسے دیکھ کر امید کم ہی نظر آتی ہے کہ وہ آئندہ ابھر سکے گا۔ سب سے بڑا سوال پریکٹس کا ہے کشمیری گیٹ کے بڑے بڑے میدان بس اڈے نے ہضم کر لئے۔ اور دوسری جگہوں پر بھی اچھے اچھے میدانوں کی کتر بیونت کر کے دلی ایڈمنسٹریشن نے انھیں ٹیکسی اسٹینڈوں کی نذر کر دیا۔ کھلاڑی جائیں تو کہاں جائیں۔ ویسے سب لوگ شور مچاتے رہتے ہیں کہ — "اپنی صحت بناؤ"۔ مگر صحت یوں خالی کہہ دینے سے تھوڑا ہی بنتی ہے۔ اس کے لئے بڑے اہتمام کی ضرورت

ہے۔ فٹ بال میں اب تک بنگال سب سے آگے تھا۔ گذشتہ ۲۰ برس کا نتیجہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس مرتبہ بنگال کی ٹیموں نے ہی کپ اٹھایا۔ اور چھ مرتبہ جنوبی ہند کی ٹیموں نے اس پر قبضہ کیا۔ شمالی ہند والے بیچارے منہ تکتے رہے اور اس میدان میں پھسڈی رہ گئے لیکن اب پنجاب نے سر نکالا ہے۔ شاید پنجاب والے "فٹ بال بائی پاؤں" کی کہاوت کو صحیح کر دکھانا چاہتے ہیں۔ پنجاب والے کافی تنومند لوگ ہوتے ہیں پھر وہ کیوں پیچھے رہیں۔ سالِ گذشتہ بارڈر سیکورٹی فورس نے کپ اٹھایا۔ اور اس سال بھی وہ کامیابی کی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

لیکن یو پی کیا کر رہا ہے؟ وہ صرف حکومتیں بدلنے میں لگا ہے۔ نو کروڑ کی آبادی والی ریاست اور وہاں ایک ٹیم ایسی نہیں جو دلی میں سیکنڈ یا تھرڈ راؤنڈ تک بھی کھیل جائے۔ یہ یو پی کے کھیل کے کرتا دھرتاؤں کے منہ پر بہت بڑا چپت ہے۔ ریاستی حکومتوں کی کھیلوں سے یہ عدم دلچسپی ہمارے آگے نہ بڑھنے اور فٹ بال کے میدان میں روس ہی سے نہیں بلکہ یوگوسلاویہ، بلغاریہ اور ایران جیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں سے پیچھے رہ جانے کی ایک خاص وجہ ہے۔ ■■

نیم عریاں ڈانس اور چند بیہودہ گیت ۔ یہ ہماری ہندی فلموں کا طرۂ امتیاز ہیں ۔

ایک عاشق ایک محبوبہ اور ایک ویلن، کچھ اچھل کود اور ایک درجن گانے ۔ فلم کا یہ پوسٹر آپکو یہ سب کچھ دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے

• سنگم۔ آیا موسم پیار کا۔ آئی ملن کی بیلا۔ آن ملو سجنا۔ پھر وہی دل لایا ہوں۔ دل دیکے دیکھو۔ زندگی ہے پیار سے" جیسے عنوانات کے ساتھ ایک نیم برہنہ جوڑے کی تصویر پوسٹرز وغیرہ پر دیکھ کر ہی صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ آج کل فلموں میں سوائے بازاری قسم کے عشق اور رومان کے کسی دوسرے پہلو کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ ان فلموں میں قدم قدم پر جذبات میں ہیجان اور سنسنی پھیلانے والے" بول رادھا بول سنگم ہوگا کہ نہیں" جیسے جنسیاتی گیت رہی سہی کسر پوری کر دیتے ہیں۔ بیشتر فلموں میں زندگی کو محض جنسیاتی زاویۂ نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پریم کتھا کے علاوہ اور کسی موضوع سے واقف ہی نہیں۔ عموماً دو نوجوانوں میں ایک دوشیزہ کو حاصل کرنے کے لئے جنگ چھڑ جاتی ہے اور یہ دونوں اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کے ذرائع اور وسائل اختیار کرنے سے نہیں چوکتے۔ لیکن ہیرو کے لئے منصفانہ اور ایماندارانہ ذرائع وقف کر دیے جاتے ہیں جبکہ ولین دنیا بھر کے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ ہر فلم میں یہ جوڑا خوبصورت ہی دکھایا جاتا ہے اور ہر کہانی میں عاشق اور رقیب ایک دوسرے کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے ہیں پوری کہانی ان دونوں کی ایک عورت کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں ختم ہو جاتی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ہیروئن خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہتی ہے اگر اس نے بہت کیا تو دو تین یاس انگیز

ں سے اپنا دل ہٹا لیا یا پھر ... کے ساتھ ... ں
ناشروع کردیں۔ والدین اس عشق بازی سے ذیادہ تر
ت برتتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ انسانی زندگی میں سدھار اور اصلاح
لئے فلم انڈسٹری بڑے کارنامے انجام دے سکتی ہے
نکہ ہندوستان تقسیم ہوگیا ملک میں انقلاب کے سیکڑوں
ار سے سبد گئے اور آج بظاہر قوم کے سامنے داخلی اور
جی مسائل پہاڑوں کی طرح کھڑے ہیں۔ بے روزگاری
ی فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ ہندوستان کی سرحد
وں کی یلغار سے متاثر ہیں۔ سارا ملک نیم فاقہ کشی کی
میں مبتلا ہے۔ صنعتی ترقی پر بریک لگ چکا ہے۔ قتل و
گری کے واقعات سے اخبارات بھرے نظر آتے ہیں۔
امیں پھیلی ہوئی افراتفری نے تعلیم کے میدان کو جنگ و
ل کا مورچہ بنا دیا ہے۔ اس ہنگامی دور میں لوگوں کو
ئے حصول معاش کے اور کوئی مشغلہ ہی نظر نہیں آتا
شق کے بازاروں میں شیخ سعدی کا یہ شعر ہر خریدار کے
ساز دعام ہے سہ

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

ن ہندوستانی فلم پر اس انقلاب کا کوئی اثر نہیں۔ ۹۰ فیصدی
دل میں محض عشق و عاشقی، چند نیم برہنہ ڈانس اور دس بارہ
ی ہیجان پھیلانے والے گانوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور
مر واقعہ ہے کہ ہندوستان کے سماج کو عاشقی اور نامرادی
مذموم فضا میں لا کھڑا کرنے میں اس فلم انڈسٹری کا
ہاتھ ہے۔ حکومت اور برسر اقتدار پارٹیوں کے علاوہ
سمی اداروں نے فلم انڈسٹری کے اس قاتلانہ اور قوم
یشانہ رویہ پر کبھی بھی کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا۔ ہندوستانی
موں پر کھوسلا تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی فائنل رپورٹ
انتہائی مایوسانہ لہجہ میں تحریر کیا ہے کہ:۔

"ہندوستانی فلموں میں عام طور پر ایسے مناظر کی
کاسی کیجاتی ہے جنکا تعلق زیادہ تر شہری زندگی سے
رہتا ہے۔ جہاں محض عاشق اور رقیب، ہیرو اور ولین
ل پائے جاتے ہیں ــــ فلموں میں ہیرو کا رول ادا
کرنے والے عموماً حسین و جمیل ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ زیور
علم سے آراستہ ہوتے ہیں لیکن کسی پیشے یا ملازمت سے
واقعات نئی دہلی

ان کا کوئی ... یا واسطہ نہیں دکھایا جاتا ہے۔"

ساری داستان ایک لڑکی سے شادی کرنے
کی جدوجہد میں ختم ہوجاتی ہے۔ داستان کا خاتمہ ہیرو کی
فتح اور ولین کی شکست پر ہوتا ہے۔ اس طرح تقریباً
ساری انڈسٹری ہیر رانجھا۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد
رومیو جولیٹ کے مسائل کے علاوہ اپنے کیمرہ کا رخ
ملک کے دیگر مسائل کی جانب کرنے سے پرہیز کرتی ہے
اس مسئلے پر ہندوستان کے مشہور پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں
سے بات کیجئے تو کچھ پروڈیوسروں کو چھوڑ کر جنھوں نے
سماجی مسائل پر فلمیں بنائیں اور جن کی یہ فلمیں زیادہ تر فلاپ
ہوئیں، باقی پروڈیوسروں کا جواب یہ ہوگا کہ عام طور پر رنگین
فلم بنانے پر ساٹھ ستر لاکھ کا سرمایہ لگانا پڑتا ہے سیاہ اور
سفید فلموں کا مارکیٹ گر چکا ہے اس لئے رنگین فلموں کے
لئے اتنے عظیم سرمایہ کو کسی ایسی کہانی پر لگا دیا جائے جسے
عوام ناپسند کریں تو اس کا لازمی نتیجہ نقصان مایہ اور
شماتت ہمسایہ ہوگا۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ فلم بیں حضرات
سوائے چند خاص ہیرو اور ہیروئنوں کے کسی اور کو پسند
نہیں کرتے اور یہ مقبول عام ایکٹر ۵ سے دس لاکھ اور کبھی
کبھی پندرہ لاکھ روپے پر بھی کام کرنے سے گریز کرتے ہیں

کہانی پر پوری فلم کے سارے خرچ کا ۰ فیصدی
سے زیادہ صرف ہوجاتا ہے۔ باقی روپیہ فائنانسر اور ڈسٹری بیوٹر
کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ فلم بنانے والے کے تذبذب
کا یہ عالم ہے کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر پروڈیوسر مہورت
نکالنے پر مجبور ہے جبکہ اکثر و بیشتر یہ مہورت بھی دھوکہ
دیجاتی ہے اور پروڈیوسروں کو مجبوراً فلموں کو ڈبوں
میں بند کرکے مفلسی اور گمنامی کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے
یہ پروڈیوسر کئی اصلاحی فلموں کی ناکامی کا حوالہ دے کر
آپ کو بتائیں گے کہ جب فلم دیکھنے والے ہی عشق و عاشقی
بوسہ بازی اور نیم برہنہ رقص کو پسند کرتے ہیں تو اس میں فلم
انڈسٹری کا کیا قصور ہے کیونکہ بہر حال یہ انڈسٹری ہے
یونیورسٹی نہیں۔

لیکن قوم اور ملک کے مذاق کو بگاڑ کر عیش و عشرت
میں زندگی گزارنے والے یہ چند فلم کار ہندوستان کی اخلاقی
اقتصادی اور سماجی ترقی کی راہ میں پتھروں کی طرح حائل
ہیں اس قدر نقصان عظیم کا باعث ہیں جسے سارے
ملک کے سدھار کرنے والے بھی پورا کرنے سے معذور ہیں
ہندوستانی معاشرے کے مکمل طور پر برہنہ ہوجانے
سے قبل صرف ایک ہی ٹھوس قدم کی ضرورت ہے اور وہ
یہ کہ فلم انڈسٹری کو قومیا لیا جائے اور ملک میں ایسی
صاف ستھری فلمیں دکھائی جائیں جن سے عزائم اور
حوصلوں کے قلعے تعمیر ہو سکیں، نئی زندگی کے نئے
تقاضوں کو پورا کیا جا سکے اور نوجوانی کے بہتے ہوئے دھاروں
کا رخ عاشقی اور رومان کی جانب سے پھیر کر قوم کی
ترقی اور خوشحالی کی جانب کر دیا جائے جس کی آج کے
ہندوستان کو اتنی ہی شدید ضرورت ہے جتنا کہ جان
کی سلامتی کے لئے سانس ضروری ہے۔ ■

[ا]کوپنکچر طریقۂ علاج جاپان اور چین میں عام ہے۔ یہ وہاں کا ہزاروں سال پرانا طریقۂ علاج ہے۔ آجکل پھر آکوپنکچر پر کافی ریسرچ کی جارہی ہے۔ اور اسے ماڈرن بنانے کی طرف توجہ دی جارہی ہے

پانچ ہزار سال پرانے طریقۂ علاج کا احیاء

نظریاتی اعتبار سے اکوپنکچر طریقۂ علاج اس بنیادی نقطہ پر قائم ہے کہ کسی کے جسم کے بھی مرض یا درد کو دور کرنے کے لئے اُس سے دور کسی عضو میں چند ملی میٹر گہری سوئیاں چبھا دینے سے درد یا مرض دفع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دس یا گیارہ مرتبہ اگر جسم کے مناسب حصوں پر سوئیاں چبھانے کا عمل جاری رکھا جائے تو مرض یا درد ہمیشہ کے لئے دفع ہو جاتا ہے۔ ہمدرد کے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن ریسرچ تغلق آباد کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالجلیل نے اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جسے ہندوستان کے اسٹینڈرڈ ویکلی نے گذشتہ سال شائع کیا تھا۔

آج سے پانچ ہزار سال قبل چین کے شہنشاہ نے اپنے خصوصی طبیب سے اس طریقۂ علاج پر روشنی ڈالنے کی خواہش کی تھی۔ چین کی مشہور کتاب نائی چنگ میں شہنشاہ کی اس خواہش کا تذکرہ درج ہے۔ دردوں اور امراض کو رفع کرنے کا یہ طریقہ علاج چین اور جاپان میں تو عام ہے ہی لیکن ان ممالک کے علاوہ یورپ کے کئی ممالک بشمول روس اور امریکہ کے کئی حصوں میں بھی اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

علاج کا یہ طریقہ منفی اور مثبت کے اصولوں کے علاوہ پانچ عناصر، لکڑی، آگ، خاک، دھات اور آب پر مبنی ہے۔ جو چیز بھی عالم وجود میں ہے اسمیں منفی اور مثبت کے دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ انھیں چینی زبان میں "ین" اور "یانگ" کہا جاتا ہے۔ ین کو تاریکی اور مفعول قرار دیا جائے تو یانگ کو روشنی اور فعالی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مرد یانگ اور عورت ین سمجھی جاتی ہے۔ جسم کے بیرونی حصوں کو یانگ اور اندرونی حصوں کو ین کے اصطلاحی نام دیئے گئے ہیں۔ اکوپنکچر دو لفظوں سے بنا ہے۔ اکو "سوئی کو" پنکچر "چھید کو" کہتے ہیں۔ طریقۂ کار سے ناواقف کو اس علاج میں اس لئے کشش نہیں محسوس ہوتی کہ متاثرہ عضو کو چھوڑ کر غیر متاثرہ جسمانی حصے میں سوئیاں چبھو دینے سے مرض کا رفع ہو جانا اتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اسکی کامیابی میں یقین نہیں لاسکتا۔ لیکن ڈاکٹروں، طبیبوں اور چند ایسے مریضوں کو جو ان امراض کا شکار رہے ہیں۔ اچھی طرح معلوم ہے کہ تلی پر ورم آجانے سے شانے کے عین وسط میں شدید درد محسوس ہونے لگتا اور مریض محسوس کرنے لگتا ہے کہ اسکے کاندھے میں کسی نے باریک سی سوئی چبھو دی ہے لیکن اصل وجہ اس کے طحال کی خرابی ہے جس کا اثر کاندھوں نے محسوس کیا۔ قلب کا دورہ پڑنے کے بعد مریض اپنے بائیں بازو میں تکلیف محسوس کرتا ہے یا دانتوں کی تکلیف کا اثر آنکھوں پر یا نزلہ زکام کا اثر بالوں پر، دانتوں اور آنکھوں پر محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

اکوپنکچر عجیب وغریب طریقۂ علاج ہے۔ اس علاج میں جسم کے مختلف حصوں میں خاص قسم کی سوئیاں اتار دی جاتی ہیں۔ مرض کے مطابق کئی روز تک یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ اور مریض جلد ہی شفایاب ہو جاتا ہے

ڈاکٹر عبدالجلیل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیکل ریسرچ کے ڈائرکٹر ہیں۔ حال ہی میں آکوپنکچر طریقہ علاج کا مطالعہ کرنے کیلئے جاپان تشریف لے گئے تھے۔

آج فلسطین کے قضیہ میں اسرائیل و مغربی ممالک
کا جوڑ اگر چہ گھناؤنا ہے لیکن حیرت ناک ضرور ہے۔ وہ
سیاسی نظریاتی اور معاشی پالیسیوں کے اعتبار سے
یک جان دو قالب بن چکے ہیں اور اکثر انھیں مذکورہ
پہلوؤں پر دونوں فریقوں کے جائزے لیے جاتے رہے
ہیں لیکن اگر ان پہلوؤں سے قطع نظر کچھ دیر کے لیے دونوں
کے تعلقات کا مذہبی میدان میں جائزہ لیا جائے تو بلاشبہ
حیرت انگیز تلخ حقیقتوں کی واضح تصویر ہمارے سامنے
آجائے گی جنکو یا تو دونوں بھول چکے ہیں یا پھر سیاست
پر قربان کر چکے ہیں۔ آج سبھی مغربی ممالک جن کی بیشتر
آبادی دینِ مسیحی کی پیرو ہیں کسی نہ کسی بہانے سے یہودی
اسرائیل سے ہمدردی رکھتی ہیں، ان تلخیوں میں اضافہ
اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے جب کلیساؤں کی دل
آزاریاں قاتلین مسیحؑ کے حق میں پائی جاتی ہیں۔ یاد
رہے کہ آج کلیسا نے یہود کو قتل مسیح سے بے گناہ قرار دیا
ہے۔ اس جائزہ کی صداقت و ایمان داری میں دونوں
مذہب کی مقدس کتب "بائبل" اور "تلموذ" سے بڑھکر
کوئی اور ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا ——————

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہودی قوم نے اپنی سرشت کے
مطابق حضرت عیسیٰؑ سے بے اندازہ فائدہ اٹھایا ہے لیکن
اس کے بدلے میں حضرت مریم عذراؑ اور حضرت مسیحؑ کی
تذلیل و تحقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا حق احسان شمار
کیا۔ پیدائش مسیحؑ سے آسمان کی جانب دعوت تک
دونوں ماں بیٹے اپنے احسان کشوں کے ظلم و تعدی کا
نشانہ بنے رہے۔ سارے احسانوں کا بدلہ مذہبی عناد
سے دیا گیا اور سارا عناد انکی مذہبی کتاب تلموذ کے احکام
کے عین بموجب تھا۔ چنانچہ تلموذ میں محسن یہود کی تعریف
ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

یسوع ناصری تیل وایندھن کی دہکتی ہوئی جہنم ہے
اس کی ماں ایک سپاہی "پانڈارا" سے ملوث
ہوکر (نعوذ باللہ) حاملہ ہوئی تھی۔ نصرانیوں کے عبادت
خانے گندگی خانے ہیں اور نصرانی پیشوایان دین
بھونکنے والے کتے ہیں۔"

ایک دوسری جگہ درج ہے: "عیسیٰ دینِ یہودی کا مرتد
ہے اور بتوں کی پرستش کرنے والا ہے، نیز ہر مسیحی خدا
اور یہود کا دشمن ہے۔"

یہودی مذہبی تنظیم "سنہوری" جو اپنے عقائد میں حد
سے زیادہ متشدد تھی، اس نے ہی حضرت عیسیٰ کے لیے
سولی دینے کا فتویٰ صادر کیا تھا اور والیٔ سلطنت
"پیلاطس" پر زور دیا تھا کہ حضرت یسوع کو سولی پر
چڑھایا جائے لیکن اس نے ان کی مانگ
کو رد کر دیا اور صاف الفاظ میں
اعلان کر دیا کہ "میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں ——
کوئی برائی نہیں پاتا" (لوقا۔ ۲۳۔ ۷) اور اگر ایسا کیا گیا
تو اس بیگناہ کے خون سے قطعی بری الذمہ ہونگا" (متی
۲۷ع) اس اعلان پر یہودی برانگیختہ ہوکر چلانے لگے کہ
ہمارے ناموس کی حفاظت اسی صورت میں ممکن ہے جب
اس کو قتل کیا جائے کیونکہ یہ خدا کا بیٹا ہونے کا مدعی ہے"
(یوحنا۔ ۱۹: ۷) آنا کہ گروہ ہنگامہ کرنے لگے اور مطالبہ کرنے
لگے کہ "اسے سولی پر چڑھاؤ، اسے سولی پر چڑھاؤ" (لوقا ۲۳)
اس وقت اس نے ان کو ظاہرین کے سپرد کر دیا تاکہ وہ
اسے پھانسی دے دیں" (یوحنا: ۱۹: ۱۶) تب انھوں نے
نہایت بے دردی سے کوڑے مارنا شروع کئے آخر کار انہیں
لہولہان سولی پر چڑھا دیا اور وہ بے تحاشہ چیخ رہے تھے،
اس کا خون ہماری نسلوں کے لئے ہے"

علاوہ ازایں قرونِ ماضیہ کے یہودی پیشوایان دین
کی وصیتیں اور احکام بھی کم حیرتناک نہیں ہیں جو مسیحیوں کے
خلاف کینہ پروری اور بغض و عداوت کا بیّن ثبوت ہیں۔
لطف یہ ہے کہ یہ کوئی خفیہ احکامات یا خیالات کی شکل میں
نہیں بلکہ عام اور پرزور نصیحتیں جس سے ہر پیشوا واقف
ہیں۔ ملاحظہ ہو تلموذ کا ایک مقدس حکم: "ہر یہودی پر
واجب ہے کہ وہ دن میں تین مرتبہ نصاریٰ پر لعنت کرے
اور خدا سے انکی حکومت اور ملک کی ہلاکت کی دعا کرے"
یہودیوں کا فریضہ ہے کہ وہ مسیحیوں کے ساتھ ایک گندے
ذلیل ترین جانور کا سا سلوک کریں" آگے چل کر نفرت
انتہا پر پہونچ کر قتلِ عام کی ترغیب دیتی ہے۔ تلموذ ہی کے
الفاظ ہیں:۔
"مسیحیوں کو قتل کرنا ایسا کارنامہ ہے جس پر خدا

یا نوازشیں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی یہودی کسی وجہ سے بچے قتل پر قادر نہ ہو تو اس کے ذمہ یہ نصیحت ہے کہ وہ ایسے مواقع کی جستجو میں رہے جنہیں یا نکو ہلاک کرنا ممکن ہو سکے۔

اے اژدھوں کی اولاد

دوسری جانب دینِ مسیحی کے مطالعہ کے وقت حضرت عیسٰی کے ان الفاظ و القاب کی گونج سنائی دیتی ہے جن سے یہودیوں کی ساری عیاری و مکاری کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہوں انجیل کے الفاظ: ۲۳ "تباہی و بربادی ہو تمہارے لئے اے یہودیو! تم انبیاءؑ کی قبروں کی تزئین و آرائش کرتے ہو، تم کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے آباؤ اجداد کے وقت ہوتے تو انبیاء کرام کے قتل میں شریک نہ ہوتے، اس طرح تم خود اپنے متعلق گواہی دیتے ہو کہ تم انبیاء کے قاتل ہو۔ تم اپنے آباؤ اجداد کی مثل ان اعمال کا دوسرا پلڑہ ہو! اے زہریلے سنپولو! اے اژدھوں کی اولاد! تم جہنم سے بھاگ کر کہاں جاؤگے؟ تمہارے پاس انبیاء کرام اور صلحاء عظام صحائف لے کر بھیجے جاتے ہیں تو تم انکو قتل کر ڈالتے ہو یا سولی پر چڑھا دیتے ہو۔ ان کو بستیوں سے نکال دربدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتے ہو! کیا اس لئے؟ کہ ہابیل سے لے کر زکریا بن برخیا تک ہر پاکباز و متقی کا خون تمہارے لئے نام لکھ دیا جائے؟"

(انجیل: ۲۳) آگے یہی انجیل مقدس ان الفاظ میں لعنت بھیجتی ہے۔ متی ۲۵: "دور ہو جا اے ملعون قوم! تیرا ٹھکانا وہ ہمیشہ ہمیش کی جہنم ہے جو ابلیس اور اس کے پیروکاروں کی لئے دہکائی گئی ہے، میں بھوک سے تڑپتا رہا اور تم سے ایک ٹکڑا نہ دیا گیا، پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور تم سے ایک قطرہ پانی نہ دیا گیا، میں لاوارث و بے سہارا ہوا تو تم سے دادرسی تک نہ کی گئی، میرے تن پر کپڑا نہ تھا لیکن تم سے ایک چیتھڑا نہ دیا جا سکا۔۔۔ دور ہو جاؤ ملعونو!"

سب سے حیران کن یہودیوں کی یہ روایت و رواج ہے کہ انکی کوئی بھی خوشی خواہ وہ تہوار کی شکل میں ہو یا ذاتی زندگی سے متعلق، اس وقت تک نامکمل ہوتی جب تک ایسے مواقع کے مخصوص پکوانوں میں کسی مسیحی کے خون کی آمیزش نہ کی جائے۔ یا ایسا ممکن نہ ہونے پر کم سے کم ایک مسیحی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا عزم مصمم اس کا قائم مقام سمجھا جاتا ہو۔ کیا "اس پرستیت" خونریزی سے مسیحی اقوام ناواقف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم ان کو مطلع کرنے کی خیر خواہی انجام دیتے ہیں، اگر وہ اس پر یقین کرنے میں متامل ہوں تو تلمود سے سن لیں: "ہمارے دو خونی واقع ایسے ہیں جن سے ہمارا معبود یہوہ خوش ہوتا ہے جن میں سے پہلی ہماری عید ہے جس میں انسانی خون کی آمیزش والے کھانے چلتے ہیں، دوسرا موقع ہمارے بچوں کے ختنہ پر منائی جانے والی خوشیاں" مذکورہ عید اول ہر سال عموماً مارچ کی چوتھی تاریخ کو منائی جاتی ہے اسکو پوریم کہتے ہیں اس میں خاص طور پر بالغ آدمی کے خون کی شرط ہے۔ دوسری عید "فصح" کہلاتی ہے جو اوائل اپریل میں منعقد کی جاتی ہے اس میں دس سال سے کم عمر کے بچوں کے خون کی خصوصی شرط ہے اس میں قربانی کا جو وحشتناک طریقہ مستحسن ہے وہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں جس میں بچہ کو لٹا کر اس کے جسم کو نوکیلے ہتھیاروں سے گود گود کر خون جمع کیا جاتا ہے تاکہ تہواری کھانوں میں مزید لذت پیدا کی جا سکے۔ اس وحشیانہ رسم کی تصدیق قرونِ وسطیٰ کے متعدد مؤرخوں نے بھی کی ہے۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ یورپ سے یہودیوں کے اخراج کا سبب ان کی خفیہ خونریزی تھی جس میں وہ اپنی مذہبی رسومات کے لئے مسیحی بچوں کو چرا کر ان کی پوشیدہ قربانی کو زیادہ مرغوب خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تاریخ کے صفحات میں لاکھوں مسیحیوں کے خون ناحق کی سرخی تر و تازہ ملے گی جو محض اختلافِ مذہب کی نا پر یہودیوں کے ہاتھوں نہایت سفاکانہ طریقے سے ذبح کر ڈالے گئے۔ یہود و نصاریٰ کے مذہبی عناد کے سلسلے میں تاریخ کے جو اوراق رہنمائی کرتے ہیں ان کی روشنی میں یہود نے ۶۱۴ء میں سرزمینِ فلسطین پر لاکھوں مسیحی مردوں، عورتوں اور بچوں کو سڑکوں پر ذبح کر ڈالا پھر اس خونریزی نے ایک دلچسپ مشغلہ کی صورت اختیار کر لی، مثلاً ۱۱۵ء اور عہد "حاخام" "اکیبا" میں ۲ لاکھ مسیحیوں کے سر تن سے جدا کئے گئے۔ ۲ لاکھ چالیس ہزار نفوس "لیبیا" میں تہ تیغ ہوئے تقریباً ۲ لاکھ انسانی جانیں ۱۳۲ء میں قبرص کے علاقوں میں ضائع کی گئیں۔

۱۸۵۵ء میں یہودی حکمرانِ وقت نے حاخام (یمونا) کی سازشوں میں آکر ملک کے ہر عیسائی کو قتل کروا دیا اس دوران قبرص میں عیسائیوں کے سر سڑکوں پر گیند کی مانند اچھالے گئے۔ اور ہزاروں معصوم بے گناہوں کو کتوں کی طرح ان کی بستیوں سے دھتکار دیا گیا۔ انہیں حوادث کا رستا ہوا ناسور تھا جو ایک عرصۂ دراز گزرنے کے بعد مندمل نہ ہو سکا تھا اور اس کی ٹیسوں نے فتح بیت المقدس کے وقت عیسائی پیشوایانِ مذہب کو حضرت عمرؓ کے سامنے یہ فریاد کرنے پر مجبور کر دیا کہ فتح کے بعد آپ کو مکمل اختیار ہے لیکن اگر آپ ناپاک ذلیل یہودیوں کو سرزمینِ قدس سے نکال دینے کا وعدہ فرما لیں تو ہم بے چون و چرا آپ کی حکمرانی تسلیم کر لیں گے اور قلعہ آپ کے سپرد کر دیں گے۔

خود تاریخ دینِ مسیح کا ایک تاریک ترین دور بھی ہے جس پر ہر عیسائی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور اس بھیانک دور کا تصور ایک کپکپی پیدا کر دیتا ہے جب ایک ہی دین کے یہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے نام پر اپنے بھائیوں کے خون سے چلو بھرنے میں منہمک تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یورپ ہی نہیں بلکہ ساری کائنات خونی غسل کر رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے ذرا مشکل ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ تاریخی خونریزی ان کے موجودہ "حلیفوں" کی ہی کرشمہ سازی تھی۔ یہ بلاشبہ یہود کی سازش تھی تاکہ انکی طاقت کا شیرازہ بکھیر کر اپنی بالادستی قائم کر سکیں اور دینِ مسیحی میں من مانے طور پر مداخلت کر سکیں۔

دورِ حاضر میں یہودی بالادستی

آج عربوں کے مقابل عیسائیت اور یہودیت کے اتحاد کو اگرچہ اس سائنٹیفک دور میں مذہبی آزادی، روشن خیالی اور وسعتِ قلبی کے نادر نمونے کا نام دیا جاتا ہے لیکن انہیں اقوام میں بہت سے ایسے اہلِ بصیرت و دانش بھی ہیں جو اپنے ماضی کی تلخیوں کو حال کی "سیاستھا" سے اس میں لپیٹ کر نگل نہیں سکتے۔ وہ اس اتحاد و دوستی کے دلفریب پردہ میں اپنی مذہبی، تہذیبی، سیاسی اور معاشی غلامی کی بھیانک تصویریں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ آج جن سنپولوں کو دودھ پلا کر انکی قوم دوسرے کے گھروں میں چھوڑ رہی وہ کل اژدہے بن کر ان کی اپنی قوم کو بھی ڈسنے میں قطعاً کوئی تکلف نہ برتیں گے۔ وہ اچھی طرح واقف ہیں

یہودی قوم کا نعرہ اس وقت نیل سے فرات تک
س کے ذہن میں مقدس تلمود کے یہ احکام بھی نقش
یں۔ تلمود کے واضح الفاظ میں: "ہر یہودی پر
ہے کہ وہ پورے روئے زمین پر دوسری قوموں کی
ت اکھاڑ پھینکنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دے
رف یہودیوں کا ہی غلبہ وسلطنت ساری اقوام پر
کے لئے قائم ہو جائے۔ خواہ اس کے لیے جنگ ضروری
ین جتنے دنیا کی ہلاکت۔۔۔"

ان مقدس الفاظ کا اثر آج کی دنیا میں بڑھتے
ے بڑھتا دیکھ کر ہر یہودی کے عقیدے میں مزید
ں اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بھولے نہیں
ہ جب صرف تین سو یہودیوں کو ساری دنیا پر حکمراں
ب میں دیکھتے ہیں۔ وہ حکمراں انکی خفیہ تنظیم
نیت" کی ترویج وترقی کے ذریعے اپنے مقاصد کے
میں منہمک ہے اس تنظیم کے سربراہ کا انتخاب
ی خفیہ طور پر ہوتا ہے۔ اور منتخب سربراہ حضرت
و حضرت سلیمان ؑ کی بادشاہت کا وارثِ حقیقی سمجھا
ہے۔ جرمنی کا ایک یہودی سابق وزیر [illegible]
ے صریح الفاظ میں کہتا ہے "تین سو ایسی اہم
یتیں ہیں جن کے درمیان نہ صرف یورپ بلکہ
دنیا کے سائل حکومت محدود ہیں"۔

صیہونی تنظیم صرف عرب ممالک کیلئے ہی سم قاتل نہیں
اپنے آقا مغربی عوام کی فہم وفراست میں بھی
ی طرح اندر ہی اندر کام کر رہی ہے اپنے نظریات و
ے جراثیم ان کے ذہنوں میں بھر دینے کی ہر ممکن
ں کر رہی ہے۔ امریکی دانشور بنجامین فرینکلن
نے والی تباہی کو محسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کو ان
ے آگاہ کیا ہے۔

"یہودی ایک زبردست تباہی ہیں کیونکہ جس
ں انھوں نے پڑاؤ ڈالا وہاں اخلاقی پستی، بدکرداری
رتی وسیاسی خیانت کا بازار گرم ہو گیا۔ اگر ہم
ریکا میں یہودیوں کے داخلے پر دستوری پابندی
ی تو سو سال سے کم عرصے میں ہماری قوم ہولناک
ل میں پھنس کر لرزہ خیز حوادث سے دوچار ہو جائے
اں تک کہ وہ ہماری خون پسینہ کی کمائی ہوئی

اقتباسات شوق دہلی

آزادی اور نظام حکومت کی دھجیاں بکھیر دیں گے
اگر ہم نے ان کے قیام امریکا پر آئینی پابندی نہ
لگائی تو وہ دن دور نہیں جب ہماری اولاد کھیتوں اور

بے گار خانوں میں یہودیوں کی غلام بن جائے گی۔ وہ اپنی
جان کی بازی لگانے پر مجبور ہوں گے تاکہ ان کے مالکوں
کی جھولیاں بھر سکیں۔ اور ان کے ڈھانچوں پر یہودی عشرت
گاہیں بن سکیں"۔

فرینکلین کی دور اندیشی اس وقت اور بھی اہمیت
اختیار کر لیتی ہے جب اس کے ساتھ امریکا میں فراہم کئے
ہوئے حالیہ اعداد وشمار کا مطالعہ کیا جائے۔ ان اعداد وشمار
کے مطابق اس وقت امریکا میں ساری ملکی معیشت پر حیرت
ناک یہودی غلبہ ہو چکا ہے، جب کہ امریکی آبادی میں یہودی
تناسب صرف ۴ فی صد ہے لیکن امریکی تجارت میں یہ ۔۔
فی صد تک غالب ہے، ملک کے عظیم ترین سرمایہ داروں میں
اکثریت یہودی ہے۔ اسی طرح صنعت وحرفت کے
میدان میں بھی انھیں مکمل فوقیت حاصل ہے۔ اسکے علاوہ
امریکی زراعت میں ۹۵ فی صد کا تناسب یہودیوں کو حاصل ہے
اور یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ سیاست پر انکا سو فی صد
کنٹرول ہو چکا ہے۔ اس حیثیت سے امریکا اور بیشتر مغربی
ممالک اپنی قومی انفرادیت کھو کر دنیا کے روبرو یہودی وصیہونی
ایجنٹ اور ڈھنڈورچی بن کر رہ گئے ہیں۔ امریکی سیاست
میں وہی پالیسی یا اصول زندہ رہ سکتا ہے جس کو یہودیوں
کی سب سے بڑی امریکی "موثر تنظیم" زندہ رہنے کی
اجازت دے دے۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ بھی کسی مسئلہ پر فیصلہ
کرنے سے پہلے ان پالیسی ساز یہودیوں کی رائے کو مد نظر
رکھنے پر مجبور ہے۔ اس پہلو سے امریکا کے عظیم ترین باشندے
یہودی بالواسطہ طور پر دنیا کے ایک بڑے حصے کی زمام
سلطنت پر قبضہ کر چکے ہیں۔

کیا ان تلخ ترین حقائق سے امریکی اور مغربی عوام
کوئی عبرت حاصل کر سکیں گے؟ (الشہاب)

دنیا میں مقدس عصمت فروشی کا رواج

یونس آگاسکر
(ایم اے)

ماہرین انسانیات وسماجیات کی تحقیق کے مطابق دنیا میں فحاشی اور عصمت فروشی کی ابتدا مذہب کی آڑ میں ہوئی۔ دنیا کے قدیم ترین لٹریچر کے مطالعے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں ایسی عورتوں کی موجودگی لازم ہوتی تھی جو پجاریوں اور مسافروں کی دلبستگی کا سامان مہیا کر سکیں اور اس خدمت کو حصول ثواب کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ یونان کے شہر کورنتھ کے قلعے میں افرودایت (AFRODITE) کے مندر میں ایک ہزار سے زائد "مقدس اچھوتیاں" مندر کی خدمت کے لئے وقف رہا کرتی تھیں۔ بابل کے شہر اریخ میں اشتار دیوی کے مندر میں بھی بکثرت عورتیں خدمت خلق کے لئے ہمیشہ موجود رہتی تھیں۔ اسی قسم کا رواج ایشیا کے مختلف حصوں، شمالی و مغربی افریقہ، جزیرۂ قبرص اور روم و مصر وغیرہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ ایشیا میں ہندوستان اس سلسلے میں دیگر ممالک سے کافی آگے تھا۔

ڈاکٹر جے۔ جی۔ فریزر کی تحقیق کے مطابق اس [illegible] کے عقیدے اور رواج کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلے پہل مواصلت و مباشرت کا طریقہ دیوتاؤں کی [illegible] سمجھ کر دیویوں اور دیوتاؤں ہی سے منسوب کیا گیا۔ عقیدہ یہ تھا کہ انسانی و حیوانی افزائش نسل اور فصلوں کی شادابی کے لئے دیوتاؤں نے یہ راہ دنیا والوں کو

سکھا دیا۔ اس عقیدے کے تحت لوگ دیوی دیوتاؤں کے استھان میں جا کر مباشرت کرنے لگے۔ مدت دراز کے بعد جب لوگ تہذیب سے آشنا ہوئے اور انفرادی شادی بیاہ کا طریقہ رائج ہوا تو بلا امتیاز اختلاط کو مذموم سمجھا جانے لگا اور فحاشی کا کسی حد تک انسداد ہو گیا۔ لیکن چونکہ پرانا عقیدہ مر نہیں سکتا تھا نیز پجاریوں اور صاحب اقتدار مردوں کو ہوس رانی کا چسکا پڑ چکا تھا اس لئے مذہب کی آڑ میں عورتوں کے ذریعے مندروں اور عبادت گاہوں میں "مقدس عشوہ فروشی" کو رواج دیا گیا۔

مختلف ملکوں میں ان عصمت فروش عورتوں کے مختلف نام ہوتے تھے۔ روما میں "وسٹا کی کنواریاں" (Vesta Virgins) کہلاتی تھیں۔ یونان میں ان کا نام "ہاروڈیول" (Herodules) تھا۔ بابل میں "کادشتو" (Kadishto) کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ ہندوستان میں دو تین ہزار سال تک "مرلیاں اور دیوداسیاں" کہلائیں اور مسیحی دنیا میں "نن" (Nuns) ہو گئیں۔

ترغیبات جنسی از نیاز فتحپوری صفحہ ۱۰۴

غرض دنیا کے تمام مذاہب میں اور خصوصاً بابل، مصر اور یونان والوں میں تو جسم فروشی کو موقر درجہ دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ [illegible] درباری رقاصاؤں کو دیوتاؤں کی دلبستگی کے لیے ملازم رکھ کر نچواتے تھے۔ قدیم یونان میں محبت کی دیوی وینس (Venus) کے مندر تو فاحشاؤں اور ان کے خریداروں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ مصر کے "راعمسیس" اور "اوسیرس" دیوتاؤں کے منادر کی رقاصاؤں کے [illegible] تیوہاروں اور جلوسوں کی خصوصیت ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں دیوداسیاں ہوا کرتی تھیں جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہودیت اور نصرانیت میں بھی اسلام

سے پہلے اس قسم کی گھناؤنی جنسیت کا رواج تھا۔

بقول نیاز فتحپوری جب استداد زمانہ کے [illegible] مذہبی رہنماؤں کا اثر زیادہ قوی ہو گیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ لوگ اس طریقہ عصمت فروشی سے متنفر ہوئے جاتے ہیں یہ تبلیغ شروع کی کہ جو شخص دیوی دیوتاؤں کے استھان پر کوئی چیز چڑھا دیتا ہے خواہ وہ عصمت وعفت ہی کیوں نہ ہو اسے بہت نفع ہوتا ہے اور عورت کی قوت تولید بڑھ جاتی ہے۔

چنانچہ آہستہ آہستہ اس عقیدے کو اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی کہ قدیم قوموں میں عورتوں کے لئے یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ عمر بھر میں کم از کم کسی ایک اجنبی مرد کو ملتفت ہونے کا موقع دیں اور اس مقصد کے لئے عبادت گاہوں خصوصاً دیویوں کے مندروں کو مرکز بنا دیا گیا۔ مثلاً بابل میں ہر عورت کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ کسی غیر مرد کو اپنا جسم بیچ کر اپنی کمائی زرخیزی فصل کی دیوی میلتا (My Litta) کے مندر کو نذر کے طور پر دے۔ اس سلسلے میں نوجوان اور خوبصورت عورتیں جلد ہی خریدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھیں جب کہ بعض کو ہفتوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔

مورخ و سیاح ہیروڈوٹس کے الفاظ میں: "بابل والوں میں ایک نہایت شرمناک رواج یہ ہے کہ ہر عورت کا جو اس ملک میں پیدا ہو فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ افرودیت (AFRODITE) دیوی کے مندر میں جا کر بیٹھے اور آزادانہ مردوں سے ملے چنانچہ اس مندر میں عورتوں کی بہت بڑی تعداد ایسی نظر آتی ہے جو اپنی چوٹیوں میں پھول گوندھے ہوئے بیٹھی رہتی ہیں۔ غیر مرد ان کو دیکھتے ہوئے [illegible] سے گزرتے رہتے ہیں اور جس پر نظر انتخاب پڑ گئی [illegible] سمجھے جاتے

[illegible]

ہیں۔ جو عورت ایک مرتبہ بیٹھ جاتی ہے پھر اسے اس وقت تک جانے کی اجازت نہیں ملتی جب تک کوئی غیر محرم اس کی گود میں چاندی کا سکہ پھینک دے۔

جب مرد چاندی کا سکہ گود میں ڈال دیتا ہے تو وہ اپنے منہ سے یہ الفاظ نکالتا ہے " ملتیا دیوی تیرا بھلا کرے" تب عورت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے اور اس کی پرواہ نہیں کرتی کہ وہ نقرئی سکہ کتنا بڑا ہے۔ جب وہ گود میں پھینک دیا جاتا ہے تو اس کے لینے سے انکار کرنا اصولاً جرم ہے کیونکہ وہ سکہ متبرک ہو جاتا ہے۔ جو عورتیں حسین ہوتی ہیں وہ بہت جلد چھٹکارا حاصل کر لیتی ہیں' جو بدصورت ہوتی ہیں ان کو زیادہ مدت صرف کرنی پڑتی ہے اور تین تین چار چار دن تک وہاں پڑی رہتی ہیں"۔

ہیروڈوٹس کے بیان کردہ رواج سے ملتی جلتی رسوم کا وجود کلدانیہ میں می لتا، فنیقہ اور قرطاجنہ میں اشتار ایران میں متّرا، یونان میں وینس اور ہندوستان میں سوریہ و شیو کے مندروں میں پایا جاتا تھا۔ ہندوستان میں البتہ عام عورتیں اس طرح علانیہ فحاشی کی مرتکب نہیں ہوا کرتی تھیں۔ صرف درباری رقاصائیں اور مندر کی دیوداسیاں غیر مردوں سے مواصلت اختیار کرتی تھیں۔

دیوداسیوں کا ذکر ویدک اور بدھ مت سے قبل کی مذہبی کتابوں میں نہیں ملتا۔ لیکن ساتویں صدی میں ہوین سانگ کی آمد سے قبل یہ روگ مذہبی حلقوں میں سرایت کر چکا تھا۔ ہوین سانگ نے بھی اس قسم کے مندروں کا ذکر کیا ہے جن میں دیوداسیاں بڑی تعداد میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھیں۔ ان میں ملتان کا سوریہ مندر خاص شہرت رکھتا تھا۔ مذہبی ہدایتوں سے "بھوشیہ پران" کے مطابق جنت کے حصول کا آسان طریقہ یہ تھا کہ ایک ناچنے والی لڑکی سورج دیوتا کے مندر کے لئے وقف کر دی جائے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کو ناچ گانا سکھا کر سورج دیوتا کے مندر کو حصول جنت کی آرزو میں وقف کر دیا کرتے تھے۔

یوں بھی ہوتا تھا کہ غریب ماں باپ بھوک سے مجبور ہو کر اپنی اولاد کو پجاریوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی اوہام پرست ماں باپ لڑکی کو منحوس خیال کر کے مندر کی خدمت پر مامور کر دیتے تھے اور یہ لڑکیاں بھی بعد میں دیوداسیاں بنالی جاتی تھیں لیکن عموماً مندروں کی یہ دیوداسیاں فاحشہ

واقعات نقوش دہلی

عورتوں یا طوائفوں کے خاندانوں سے چنی جاتی تھیں۔

انیسویں صدی کے سیاح "ایب ڈوبیس" نے جنوبی ہند میں رائج ایک خاص طریقہ "انتخاب" کا بھی ذکر کیا ہے کہ جب مورتی کو کسی تہوار کے موقعہ پر باہر نکال کر گشت کرایا جاتا تھا تو پجاری یاتریوں اور زائرین کے درمیان جا کر خوبصورت لڑکیوں کو ان سے مانگا کرتے تھے۔ اس سیاح کے قول کے مطابق لوگ طوعاً و کرہاً اس پر آمادہ ہو جاتے تھے لیکن بعض لوگ انکار بھی کر دیا کرتے تھے۔

دیوداسیوں کی تاریخ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے اس گھناؤنے رواج کو فروغ دینے میں پجاریوں سے زیادہ راجاؤں کا ہاتھ تھا۔ مندروں کی آمدنی میں اضافہ کر کے حکومت کے خزانۂ عامرہ میں اضافہ کرنا ان کا مقصد ہوتا تھا۔ چنانچہ ان دیوداسیوں کا کام تہواروں اور تقریبات کے موقعوں پر دیوتاؤں کے سامنے رقص کرنا، گانا اور زائرین کو زیادہ سے زیادہ بھکشا دینے پر آمادہ کرنا ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں لوگوں کی دلبستگی کرنا بھی ان پر لازم تھا۔

اسی طرح وہ ناٹکوں وغیرہ میں پارٹ ادا کر کے بھی پیسے کمایا کرتی تھیں۔ دیگر اوقات میں انھیں پجاریوں اور امراء کے بستروں کی زینت بھی بنا پڑتا تھا۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ عہد وسطیٰ میں بعض دیوداسیوں کا ایرکبیر اور انتہائی معزز عورتوں میں شمار ہوا کرتا تھا۔ انکی اتنی عزت تھی کہ وہ راجاؤں کے محلوں میں جا کر ان کے ساتھ خورد و نوش میں بھی شریک ہو سکتی تھیں۔

دیوداسیوں کے سلسلے میں سورج دیوتا کے مندر خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ ان دیوداسیوں کی تعداد سے مندر کی شان اور دولت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ محمود غزنوی کے حملوں کے وقت سومنات کے مندر میں (یہ شیو دیوتا کا مندر تھا اور آج بھی اپنی نئی شکل میں اسی جگہ قائم ہے) پانچ ہزار دیوداسیاں تھیں جو رات دن مورتی کے سامنے گاتی بجاتی رہتی تھیں۔ عہد وسطیٰ کی ایک تحریر کے مطابق صرف گجرات میں ۲۰ ہزار دیوداسیاں مختلف مندروں میں دیوتاؤں کی خدمت پر مامور تھیں۔

اگرچہ دیوداسیوں کو سماج میں کافی عزت حاصل تھی لیکن تعلیم یافتہ برہمن طبقہ اس رواج کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا

اسوقت کے انتظار میں۔ جب دنیا سے یہ لعنت دور ہوگی

تھا۔ اسلام کے ورود و اثر کے بعد آہستہ آہستہ اس رسم کا دائرہ محدود ہو گیا۔ صرف وجے نگر میں یہ رواج فروغ پاتا رہا لیکن انگریزی دور میں سارے ہندوستان سے دیوداسیوں کا وجود تقریباً ختم ہو گیا۔ صرف گوا میں جہاں پرتگالیوں کا اثر و اقتدار قائم تھا یہ گھناؤنی رسم آزادی کے بعد بھی جاری رہی چنانچہ بمبئی کی اکثر نرتکیاں اور اونچے درجے کی طوائفیں گوا کی دیوداسیوں کی نسل سے ہیں۔ گوا کی آزادی کے بعد ملک کے دیگر حصوں کی طرح گوا بھی اس لعنت سے پاک ہو رہا ہے

ارجک سنگھ

ایک نومولود جماعت

۲۰ وینڈسر پلیس پر لگا ہوا ارجک سنگھ کا وسیع و عریض بورڈ اتنے جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ شاید یہ اعزاز کسی بھی سیاسی پارٹی کے بورڈ کو حاصل نہ ہو۔ ارجک سنگھ ہندوستان کے پسماندہ طبقات کے دانشوروں کا ایسا ادارہ ہے جو بقول ان کے بانی شری رام سروپ ورما سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور نہ وہ ارجک سنگھ کو پارٹی کہنے کے حق میں ہیں۔ شری ورما نے اس ادارہ کو یکم جون ۱۹۶۸ء کو قائم کیا۔ اس ادارے میں جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کے علاوہ تقریباً تمام پارٹیوں کے مقتدر رہنما پارلیمنٹ کے ارکان، صوبائی اسمبلی کے ممبران شریک ہیں۔ ارجک سنگھ کی سب سے بڑی مخالف یہی دونوں جماعتیں (جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی) ہیں۔ اور خود ارجک سنگھ برہمن ازم کا سخت ترین دشمن ہے۔ ادارے کے قواعد و ضوابط کے تحت برہمن ازم کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جبکہ خود برہمنوں سے اسکو اسی طرح کوئی بیر نہیں ہے جیسے مہاتما گاندھی کو انگریزی حکومت سے اختلاف کے باوجود انگریز قوم سے کوئی پرخاش نہ تھی۔

ارجک سنگھ سماج میں مساوات لانے کی مہم لے کر قائم ہوا ہے۔ اس کے نزدیک ذات پات اور بھید بھاؤ ملک و قوم کے لئے ایسی عظیم رکاوٹ ہے جو ہندوستان کو کبھی بھی ترقی کی منازل پر نہیں پہونچنے دے گی۔ در اصل یہ معاشرتی ادارہ ہے، انسان اور انسان کے درمیان مساوات قائم کرنے کے علاوہ مزدور کی عظمت و حرمت کا قائل ہے۔ مزدوروں میں کسی بھی قسم کی تخصیص کا قائل نہیں جو عزت دماغی اور ذہنی مزدور کی ہے اس کا حق دار جسمانی محنت کرنے والا مزدور بھی ہونا چاہیئے۔ مزدور اور مزدور میں پائی جانے والی سماجی نابرابری کا استیصال ہونا ملک اور قوم کے لئے خوشحالی کا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام سیاسی رہنما جو سماجی عدم مساوات کے مخالف ہیں جیسے ایس۔ ایس۔ پی۔ بی۔ کے۔ ڈی، کانگریس اور ریپبلکن پارٹی کے سرکردہ ممبران ارجک سنگھ میں شامل ہو چکے ہیں۔ شری مہاراج سنگھ بھارتی ایس۔ ایس۔ پی کے ممبر لوک سبھا ارجک سنگھ کے مرکزی دفتر کے انچارج ہیں۔ شری مہاراج سنگھ جو پیشے کے اعتبار سے کسان ہیں تقریباً ساری دنیا کے دورہ کے بعد مختلف ممالک میں کاشتکاری اور زراعت کے تجربات سے استفادہ کر کے ہندوستان کے زراعتی مزدوروں کے لئے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ عملاً سارے ہندوستان میں اس نوزائیدہ جماعت کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں لیکن بہار، یوپی، مدھیہ پردیش، ہریانہ وغیرہ میں جماعت بڑی سرگرمی سے کام کر رہی ہے اور یہ وہ علاقے ہیں جہاں جسمانی مزدوروں کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ انھیں کم تر اور چھوٹا سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں اس جماعت کے لگ بھگ ۲۰ ہزار سرگرم کارکن ہیں۔ لفظ ارجک کا مطلب ایک ایسا پیشہ ور فرقہ ہے جس کے ۹۵ فیصدی افراد روزی کمانے کے لئے جسمانی محنت میں مشغول ہیں۔

اس جماعت کی فیس ممبری ۲۵ پیسے ہے لیکن ندرانے اور پیشکش کی صورت میں وصول ہونے والی رقومات سے جماعتی تنظیم اور اخبار کے مصارف برداشت کر لئے جاتے ہیں۔ جون ۱۹۶۸ء میں قائم ہونے والی اس جماعت نے اتنے قلیل عرصے میں تقریباً سارے ملک میں اپنی شاخیں قائم کر کے گذشتہ سال کے ماہ مارچ سے ایک ہفت روزہ ہندی ارجک بھی نکالنا شروع کر دیا ہے جو اس جماعت کا سرکاری آرگن ہے۔ لکھنؤ میں جماعت کے چیرمین شری موتی رام کا قیام ہے جو یوپی بی، کے، ڈی کے سیکریٹری بھی ہیں۔

جماعت کے بانی شری رام سروپ ورما بیس سال سے سوشلسٹ پارٹی میں کام کر رہے ہیں وہ ۱۹۵۷ء میں یوپی اسمبلی میں ممبر چنے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں یوپی کی ایس، وی، ڈی میں وزیر مالیات بھی رہ چکے ہیں۔ شری ورما نے ۱۹۴۸ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد کانپور کی سوشلسٹ پارٹی میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا خود وہ کرمی (KURMI) نام کے پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو، ہندی، انگریزی زبانوں سے کماحقہ واقفیت پیدا کرنے کے علاوہ انھوں نے سیاسی زندگی میں کارہائے

شری مہاراج سنگھ بھارتی۔
سوشلسٹ پارٹی کے ایم پی اور ارجک سنگھ کے دفتر کے انچارج

نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے خون اور پسینہ ایک کیا۔ آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے اپنے تعلیمی ارتقاء کو نظر انداز کر دیا اور اس کا پھل انھیں یہ ملا کہ سماج میں انکی وہ حیثیت نہیں جو اعلیٰ ذات کے ان ہی جیسے ہندوؤں کی ہے۔ شری ورما کو یہ بات کھٹکتی رہی اور انھیں اس احساس کمتری نے اس منزل پر پہونچا دیا جہاں سے وہ ارجک سنگھ کے بانی ہو کر ذات پات کو ہندوستان سے ختم کرنے کا منصوبہ لے کر پھر خاردار راہوں سے انجانے مسافر کی طرح منزل کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ ان کے احساس، شعور اور ادراک کو جس چیز نے سخت مجروح کیا وہ ملک میں تمام منافع کی چیزوں پر برہمنوں کا قبضہ تھا۔ ایک برہمن جب چاہے شودر ہو سکتا ہے، وہ مچھلی اور گوشت کی تجارت کر سکتا ہے، سڑکیں صاف کر سکتا ہے، مچھیرا بن سکتا ہے، زراعت، کاشتکاری، چمڑا سازی اور دیگر صنعتوں میں غرض کہ جہاں بھی اسے منافع کی راہیں دکھائی دیں اس کے لئے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک ہریجن جو کسی مہتر کے یہاں پیدا ہوا ہو یا جس نے کسی چمار بسوڑ کے گھر میں جنم پایا تا عمر ہریجن کی حیثیت سے ہی رہے گا۔ اگر وہ حلوائی کی دوکان کھولتا ہے تو تمام اعلیٰ ذات کے لوگ اس کا بائیکاٹ کر دیتے ہیں اسے کسی اعلیٰ اور معزز پیشہ کو اختیار کرنے کا حق تو ہے لیکن اس کے اس حق کی حمایت کرنے والا اور اس کے ساتھ تعاون کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح ملک میں جہاں

بشکریہ [illegible]

مزدوری کرنے والے کروڑوں انسان سماجی عدم مساوات کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں، انکی امنگیں اور حوصلے پست کئے جا چکے ہیں۔ آواگون کے عقیدے نے انہیں واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے پچھلے جنم کے برے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ارجک سنگھ اسی لئے آواگون میں یقین کرنے والے تمام طبقوں کا کٹر مخالف ہے اور اس جماعت کے نزدیک جب تک آواگون کا عقیدہ ختم نہ ہوگا اور ذات پات کے مدارج قائم رہیں گے ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا۔ چونکہ جب تک سماج میں معاشرتی مساوات کا پرچم پوری طرح بلند نہ ہوگا وہ اقتصادی اور سیاسی ارتقار کے صحیح مفہوم سے ناآشنا اور محروم رہے گا جماعت کے خیال میں سماج کو انسانی جسم کے چار حصوں کی طرح تسلیم کر کے تقسیم کیا جانا اقتصادی ترقی کی راہوں میں خار دار جھاڑیاں بچھا دینے کے مترادف ہے چونکہ انسان کے ذہن و دماغ کا جو درجہ ہے وہ برہمن کے لئے مخصوص ہے اور جو ہاتھوں کو عظمت اور طاقت حاصل ہے وہ کھتری کے لئے وقف کر دی گئی ہے۔ انسان کے معدہ کو ویش سے تعبیر کیا گیا ہے اور نچلے حصے یعنی پاؤں وغیرہ کو شودر قرار دیکر سارے سماج کو چار حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ شری مہاراج سنگھ نے کہا کہ دماغ کو ہر قسم کی آزادی دیدی گئی ہے وہ بھیک مانگ کر بھی گزارا کرے تو اس کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاتھوں کو کاٹ کر کھانے کمانے کے ذرائع مہیا کر دیے گئے اور اس کے اس بہیمانہ فعل کو دلیری اور جرأت کے کارناموں میں جگہ دی جاتی ہے اور معدہ کو انسانی ضروریات زندگی کے ہیر پھیر، چور بازاری منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، کے بعد بھی اہمیت حاصل ہے لیکن انسان کا نچلا حصہ جتنی محنت کرتا ہے جس قدر مشقت کا کام کرتا ہے اسے اتنا ہی حقیر اور کمتر سمجھا جاتا ہے اور اسے اس کے کئے ہوئے کام کی اس اُجرت کا دسواں حصہ بھی نہیں ملتا جو دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں اسکا پیدائشی حق بن چکا ہے۔ سماج میں نہ اس کی کوئی عزت ہے اور نہ کوئی مقام ہے۔

ارجک سنگھ سارے ملک کی واحد جماعت ہے جو معاشرے میں پھیلی ہوئی اس ناانصافی کا استیصال کرنے کے لئے میدان میں آ چکی ہے۔ لیکن یہ جماعت جمہوری دستور میں یقین رکھتی ہے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے بعد ہی اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اسے ایک ایسے محل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو محض دو ستونوں پر قائم ہے۔ ایک ستون انسان اور انسان کے درمیان سماجی مساوات کی نمائندگی کرتا ہے اور ذات پات کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ دوسرا ستون جسمانی محنت کرنے والے مزدوروں کے لئے اسی عزت اور احترام کا خواہاں ہے جو کسی پروفیسر، سائنس داں، انجینیر یا تنظیمی کام کرنے والے دانشور کو حاصل ہے۔

ارجک سنگھ کے نظریات کے تحت معاشرہ میں جب تک مکمل سماجی مساوات کا قیام عمل میں نہیں آتا اقتصادی سماجی، معاشی، صنعتی زراعتی، اور سائنسی ترقی کا آنا خواب و خیال کی بات ہے۔ شری مہاراج سنگھ بھارتی کے خیال میں دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں ذات، پات کے جھگڑوں کی موجودگی میں صنعتی ترقی ہوئی ہو۔ لہٰذا سماج سے ان فرسودہ اور دقیانوسی مدارج کو نکال باہر کرنا ہی ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی کا موجب بن سکتا ہے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان کا ثقافتی ڈھانچہ بھی سماجی، معاشی تہذیبی ہے اس میں اس قدر اونچ نیچ ہے کہ ایک اعلیٰ طبقہ ہمالیہ کی طرح سرفراز اور سربلند ہے جبکہ نچلا طبقہ اتنا ہی پست اور نیچا ہے جتنا بحر ہند کا کوئی عمیق حصہ ہو سکتا ہے۔ جب تک یہ اونچائی اور یہ نیچائی یہ پستی اور بلندی قائم ہے سماج کی بنیادیں مستحکم نہیں ہو سکیں۔ اس طرح معاشی ڈھانچے میں پائی جانے والی ناانصافیاں دراصل اسی سماجی ناانصافی کا نتیجہ ہیں اور جب تک کسی ملک اور قوم کی معاشی حالت درست نہیں ہوتی اسے جابر اور ظالم قومیں ہمیشہ تختہ مشق بناتی رہیں گی اور سیاسی شعبوں میں کام کرنے والے مٹھی بھر افراد عیش و عشرت میں زندگی گزارتے رہیں گے۔ اور ان تینوں کے گٹھ جوڑ کا سب سے بُرا اثر تہذیب و تمدن کے عنصر پر ہی پڑے گا جو انسانی زندگی کا سب سے پسندیدہ پہلو ہے شری رام سروپ ورما کے بقول یہ ادارہ جہاں بانی اور ملک گیری کی حرص و آز کے ہر جذبہ سے پاک ہے اور اس کے قیام کا مقصد انسانی فلاح و بہبود کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ جماعت سیاسی منافقتوں اور تفرقوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتی اور نہ مزدوروں پر کئے جانے والے ظلم و تشدد کو گوارہ کر سکتی ہے۔

اس جماعت نے مزدوروں کو انکا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اسی غرض سے ارجک سنگھ اس بات کا قائل ہے کہ ہر فرد اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتا ہے اور اسے پیشے کے اعتبار سے بلند اور پست سمجھنے کی ذہنیت کو کچلنا ہے تاکہ سائنس کے ادراک اور عصر حاضر کے تکنیکی ارتقار میں ہندوستان اپنا صحیح رول ادا کر کے ایک عظیم ملک کا درجہ حاصل کر سکے۔

بہرحال ہندوستانی سماج میں پھیلے ہوئے ذات پات کے جراثیم کا استیصال کرنے والی یہ ڈھائی برس کی نومولود جماعت اگرچہ سیاسی پارٹی ہونے سے انکار کرتی ہے لیکن دنیا جانتی ہے کہ آج سیاست کی عمارت کی بنیادیں معاشی اور اقتصادی مسائل پر ہی قائم ہیں اور ہندوستان کے پسماندہ طبقے اقتصادی اور معاشی آزادی کو ہی سیاسی آزادی سمجھ کر ارجک سنگھ کے پرچم تلے جمع ہو کر پرامن طریقوں سے وہی کچھ حاصل کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہیں جو دہشت پسند نکسلائیٹ سارے نظام کو درہم برہم کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ارجک سنگھ جمہوریت کا دلدادہ ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پرامن ذرائع استعمال کرنے میں یقین رکھتا ہے، اس کا خیال ہے اگر بالغ رائے دہندگان جمہوری ذرائع سے اپنے مسائل حل نہیں کر سکتے اور ایک عظیم اکثریت ہو کر بھی خود کو جبر و استبداد کے چنگل سے نہیں چھڑا سکتے تو وہ خود ہی قصوروار اور خطاکار ہیں۔

ترجمہ و تلخیص۔ سید عارف نعمانی

تاریخ عالم میں تین عظیم فلسفیوں کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کے میلانات کو نئی سمتوں میں موڑ دیا اور انسان کی زندگی اور اس کے مقدر پر فکر انگیز نظر ڈالی۔ یہ عظیم فلسفی سقراط' افلاطون اور ارسطو ہیں۔ سقراط کا شمار تمام صاحب بصیرت اور دانائے راز مفکروں میں سر فہرست آتا ہے۔ سقراط ۴۶۹ ق م میں ایتھنس کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ ق م میں زہر کا پیالا پی کر ابدی نیند سو گیا۔

ایک دن یونان کی ایک فوج اپنے کیمپ میں آرام کر رہی تھی کہ ایک سپاہی جو اپنی بہادری اور عظمت کے لئے مشہور تھا اچانک سڑک پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ تقریباً چوبیس گھنٹے تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ اس کے سب دوست اس کے اطراف جمع ہو گئے۔ آخر میں جب اسے ہوش آیا تو اس کے تمام دوستوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے دوستوں نے اس کے ظاہر میں کوئی تبدیلی نہیں پائی مگر اس کا باطن بدل گیا تھا۔ یہ سپاہی سقراط کے علاوہ اور کوئی نہ تھا

سقراط کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات ملی ہیں۔ سپاہی بننے سے پہلے وہ ایک سنگ تراش تھا اور اسکی ماں ایک دایا تھی۔ سقراط بے حد بدصورت تھا۔ اس کے شانے پھیلے ہوئے اور آنکھیں ڈراؤنی تھیں۔ اس کا جسم بھی بے ڈول اور غیر متناسب تھا۔ وہ یونان میں اپنی بدصورتی کے لئے مشہور تھا مگر پھر بھی لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ اسکی دماغی صلاحیتوں کے دل سے قائل تھے اور اسکی عقل و فراست کی داد دیتے تھے۔ سقراط ایتھنس کے گلی کوچوں میں ننگے پیر لوگوں کو عقل و منطق کی باتیں بتاتا پھرتا تھا۔ اس کی باتوں میں جدت اور تازگی پا کر نوجوان اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے مگر کبھی کبھی سقراط کی کڑوی باتوں اور تیکھے سوالات سے لوگ جھلا اٹھتے تھے۔

اہل یونان کو ڈلفک آریکل (یونان کی ایک عورت جو پیشن گوئی کرنے کے لئے مشہور تھی) سے بڑی عقیدت تھی ڈلفک آریکل عوام کے تمام پیچیدہ سوالات کا صحیح اور فوری جواب دینے میں مہارت رکھتی تھی۔ یونان کے ذہین ترین لوگ بھی ڈلفک آریکل سے رائے مشورہ کیا کرتے تھے' ایک دن چیری فان نے ڈلفک آریکل سے سوال کیا کہ تمام یونان میں اس وقت سب سے زیادہ عقلمند آدمی کون ہے۔ ڈلفک آریکل نے فوراً سقراط کا نام لے کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

سقراط کی بیوی نہایت چڑچڑی اور غصہ ور تھی۔ اسے ہمیشہ سقراط سے یہ شکایت رہی کہ وہ اپنے گھر اور بیوی بچوں کی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر گلی کوچوں میں فضول باتیں کرتا پھرتا ہے۔ سقراط بڑا صابر واقع ہوا تھا۔ وہ ہر کڑوی بات کو پی جاتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس کی بیوی نے غصہ کی حالت میں اس کے سر پر ایک بڑا مٹی کا برتن دے مارا۔ جب برتن ٹوٹ گیا اور سقراط کا سارا جسم پانی میں نہا گیا تو سقراط نے مسکرا کر اپنی بیوی سے کہا "بجلیاں اور گڑگڑاہٹیں تو بہت ہوئیں مگر پانی کم برسا؟"

سقراط سڑکوں' گلیوں' ورزش گاہوں اور مارکیٹوں میں اپنا وقت گزارتا جہاں اسے سیکڑوں مرد اور عورتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا تھا۔ وہ ان کو عقل و حکمت کی ساری باتیں سمجھا دیتا تھا۔ اس کی زندگی بڑی سادہ اور درویشانہ تھی۔ سسلی کے رئیس گھرانے کے لوگ اپنے بچوں کو اسکے پاس بھیج دیتے تھے تاکہ وہ سقراط کے طور طریقوں کو سیکھیں سقراط بغیر معاوضے کے ان بچوں کو درس دیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ انہیں سادگی اور اچھے اخلاق کی تلقین کرتا تھا۔ حالانکہ سقراط نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ کوئی مدرسہ یا ادارہ بھی نہیں چلایا پھر بھی اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین استادوں میں ہوتا ہے۔ وہ بے حد امانت دار تھا اس کے قول اور فعل میں کبھی

یں پایا گیا۔ اس نے لوگوں کو امانت داری اور سچائی کی
مانی اور تزکیہ نفس کو بے حد اہم قرار دیا۔ اس نے پرانی
ت کی مذمت کی اور شخصیت پرستی کا مذاق اڑایا۔ وہ
سوالات کے ذریعہ لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا کرتا تھا۔
علمی تحقیقات کا طریقہ نکالا اور الفاظ کی تعریف و تشریح
اپنے وقت کے تمام داناؤں اور مفکروں سے بحث و
ذکر کے یہ ثابت کر دیتا تھا کہ وہ سب بیوقوف ہیں جن
معانی تسکین کی تلاش و جستجو میں گم ہو کر وہ اکثر اپنے گھریلو
ت سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ یونان کے تمام فلسفی اور مفکر
سے حسد کرنے لگے۔ سقراط ان سے کہا کرتا تھا وہ جن
ں کی پرستش میں لگے ہوتے ہیں وہ سب کے سب باطل
وتے ہیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خدا تو صرف ایک ہے۔ اور
الق عبادت ہے۔

اس نے اپنے شاگردوں سے کہا "تمہاری اصل زندگی
ری باطنی صفائی میں ہے۔ تم اپنے جسم سے زیادہ اپنی
ی حفاظت کرو۔ وہ بے وقوف ہیں جو اپنے جسم کی پروا
یں۔ جسم تو فانی چیز ہے مگر روح غیر فانی ہے۔
حقیقی مسرت اچھے کپڑے پہننے اور اونچے محلوں میں
سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ حقیقی مسرت تو خدا کی بندگی
ں کی عبادت کا نام ہے۔" وہ اکثر لوگوں سے کہا کرتا کہ
زار اور شہرت و دولت کے پیچھے نہ بھاگیں بلکہ سچائی
بائی کو اپنائیں۔"

سقراط کی تعلیمات کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے پرانے
ے درہم برہم ہو کر رہ گئے۔ اور یہ بات اس دور کے
ں کو اچھی نہ لگی۔ انہوں نے سقراط پر الزام لگایا کہ وہ
یں خطرناک خیالات کا پرچار کر رہا ہے اور ایتھنس
اؤں کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔

سقراط پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے خاص حریفوں میں
ں لی سن اور اینی ٹش کے نام قابل ذکر ہیں۔ اینی ٹش
دش تھا وہ سقراط کا جانی دشمن تھا۔ سقراط مجرم
یا اور حراست میں لے لیا گیا۔ سینٹ کے ۲۸۰ ممبروں
ٹ دیا کہ سقراط کو پھانسی پر لٹکا یا جائے۔ بقیہ ۲۲۰
نے سقراط کی طرفداری کی۔ عدالت میں سقراط نے
سب کچھ جو میرے لئے ہو رہا ہے یہ محض ایک
ں نہیں ہے" اور پھر عوام سے مخاطب ہو کر اس

نے کہا "دوستو! میں تم سے ایک گزارش کرتا ہوں۔ جب
میرے بچے بڑے ہو جائیں اور وہ سچائی اور ایمانداری کو
چھوڑ کر دولت اور اقتدار کی طرف بھاگیں تو انہیں ایسی
ہی سزا دو جیسی آج مجھے دی جا رہی ہے۔

اگر سقراط سچائی اور ایمانداری پر قائل نہ رہتا تو وہ آسانی
سے اپنی جان بچا سکتا تھا کیونکہ ایتھنس کے قانون کے
مطابق اسے یہ رعایت اور موقعہ بھی دیا گیا تھا کہ وہ پھانسی
کی سزا سے بچنا چاہے تو جلاوطن ہو جائے۔ مگر سقراط نے
جلاوطن ہونے کو اچھا نہیں سمجھا۔ کریٹو اور افلاطون نے
جیلر کو رشوت دی اور گزارش کی کہ وہ سقراط کو جیل سے بچ
نکلنے کا موقعہ دے مگر سقراط کو یہ بات بھی اچھی نہ لگی۔ وہ
موت سے بے خوف تھا۔ مقدمے کی سماعت کے خاتمے
کے بعد اپنے شاگردوں سے اس نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے
کہ ہم یہاں سے کوچ کر جائیں۔ میں موت سے ہم آغوش ہو
جاؤں گا۔ اور تم زندہ رہو گے۔ موت اچھی ہے یا زندگی یہ
خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک ماہ تک سقراط کو جیل میں رکھا گیا۔ جیل میں اکثر
وہ شعر کہا کرتا تھا۔ اس نے اپنی نظموں میں خدا کی عظمت
اور بزرگی کے گیت گائے۔ اگر وہ فلسفے کی طرف دھیان نہ دیتا تو آج
وہ دنیا کا عظیم شاعر کہلاتا۔

افلاطون نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "فیاڈو" میں
سقراط کی زندگی کے آخری دن کا حال لکھا ہے۔ "سقراط
کے تمام شاگرد اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے
بے اختیار آنسو جاری تھے۔ اس کی بیوی بھی اپنے شیر خوار
بچے کے ساتھ وہاں پہنچی اور بے تحاشا رونے پیٹنے لگی۔

سقراط نے اپنے شاگرد کریٹو کی طرف دیکھا اور بڑے
اطمینان سے کہا "کریٹو تم میری بیوی کو اس کے گھر پہنچا دو۔"
کریٹو اس کی بیوی کو تسلی دلاتا ہوا باہر لے گیا۔ سقراط نے
اپنی زندگی کی آخری رات بھی حسب معمول بڑے اطمینان
سے گزار دی۔ وہ دیر تک اپنے شاگردوں کو روح کی ابدیت
کے بارے میں بتلاتا رہا۔ اس کے شاگرد کریٹو نے اس سے
پوچھا کہ اس کی موت کے بعد اسے کس طرح دفن کیا جائے۔
سقراط نے مسکرا کر کہا "تم مجھے جس طرح چاہو دفن کر دینا۔
تم میرے جسم ہی کو دفن کر سکتے ہو، میری روح کو نہیں۔"

سقراط نے موت کی بڑی جامع تعریف کی ہے۔ اس
نے موت کو تمام تکالیف کا خاتمہ قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے
کہ موت ایک نئی اور تازہ زندگی کا آغاز ہے۔ موت ایک
چھٹکارا ہے۔ یہ روح کے جسم سے الگ ہونے کا نام ہے۔"

آخر وہ وقت آپہنچا جب سقراط کو زہر کا پیالہ پی کر
ہمیشہ کے لئے سو جانا تھا۔ جیلر نے اسے ایک زہر کا پیالہ دیا
خود جیلر بھی اس منظر کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ دیر تک منہ پھیر
کھڑا روتا رہا۔ سقراط کے تمام شاگرد بے اختیار رونے لگے۔
سقراط کا ایک دوست لکھتا ہے "ہمیں اس وقت ایسا
محسوس ہو رہا تھا کہ ہم یتیم ہو رہے ہیں اور ہمارا باپ ہم سے
ہمیشہ کے لئے چھوٹ رہا ہے۔ جیل میں موجود ہر شخص رونے
لگا مگر سقراط تھا کہ خاموش اور مطمئن تھا۔ اس پر کسی قسم کا
خوف یا جذبہ طاری نہ ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے شاگردوں
سے کہا "میں نے اپنی بیوی کو اسی لئے بھیج دیا کہ وہ اس منظر کو
برداشت کرنے کے قابل نہ تھی۔ پھر اس نے کہا۔ میں نے سنا
ہے کہ کسی کی موت کے وقت رونا پیٹنا ٹھیک نہیں ہے۔"
اس کے شاگرد یہ سن کر اور بھی بے اختیار رونے لگے۔ سقراط
بڑی لاپروائی سے زہر کا پیالہ پی گیا اور پھر ادھر ادھر ٹہلنے لگا
مگر بہت جلد ہی اس کے پیر وزنی ہو گئے اور وہ پلنگ پر
لیٹ گیا۔ کپڑے سے اس کے چہرے کو ڈھانپ دیا گیا تھا مگر
سقراط نے اپنے چہرے سے کپڑے کو ہٹاتے ہوئے اپنے عزیز
شاگرد کریٹو سے کہا "کریٹو، میں نے ایاکلی پس سے ایک
مرغی قرض لی تھی۔ تم میری موت کے بعد میرے اس قرض
کو چکا دو۔" کریٹو نے روتے ہوئے سقراط سے پوچھا "میرے
آقا کیا آپ کی اور بھی کوئی خواہش ہے؟" مگر سقراط نے کوئی
جواب نہ دیا۔ اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔

ملی جلی شادیاں – ایک دھوکہ ہیں

اس میں شک نہیں کہ شریکِ حیات تلاش کرنا ہمیشہ سے دنیا بھر کے انسانوں کا ذاتی مسئلہ رہا ہے۔ اور جب کسی مجنوں، رانجھا یا رومیو نے کسی لیلیٰ، ہیر یا جولیٹ کو اپنا رفیقِ زندگی بنانا چاہا تو سماج کے قانون اور مذہب نے اس کی راہ میں سیکڑوں دیواریں کھڑی کر دیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شریکِ حیات کا انتخاب یا شادی کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اگر اس کا بنیادی مقصد صرف عیش و مسرت کی زندگی بسر کرنا اور ایک دوسرے کے جنسی جذبات کی بلا روک ٹوک تسکین پہونچانا قرار دیا جائے تو ہمیں اسکو ذاتی مسئلہ ماننے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ساتھ ہی ہم اگر دنیا کے تہذیب و تمدن کے ارتقاء پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ عہدِ قدیم میں انسان جبکہ بالکل جنگلی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اور غذا کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا اور اس صورت میں جبکہ حلال اور حرام کی کوئی تمیز اور حد مقرر نہیں ہوئی تھی اور نہ سوسائٹی میں کوئی ایسا قانون تھا جسے نکاح یا شادی کا نام دیا جا سکے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کا انسان بھی جانوروں کی طرح اپنے جذبۂ شہوانی کو پورا کرتا ہوگا۔ پھر آج کے ایٹمی دور کے انسان اور عہدِ قدیم کے اس غیر متمدن انسان میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ جس طرح وہ اپنے جذبۂ شہوت رانی کی تکمیل میں کسی بھی قید و بند کو گوارہ نہیں کرتا تھا اسی طرح ہم بھی کسی ضابطۂ اخلاق کو ماننے کے لئے تیار نہیں لیکن اس ضمن میں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ گرچہ بظاہر اس کی حیثیت ذاتی اور انفرادی ہے لیکن اس کا اثر اجتماعی معاشرہ اور خاندان پر پڑنا لازمی ہے۔ اور اگر یہ حقیقت ہے تو ہمیں اس کا پورا پورا حق ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کی بہتری اور بہبودی کی خاطر کوئی مناسب ضابطۂ اخلاق مقرر کریں جو ایک طرف انکی امنگوں کی راہ میں حائل نہ ہو اور دوسری طرف انھیں جنسی آوارگی اور بے راہ روی سے روکنے میں مفید ثابت ہو۔

اوپر جن افسانوی کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے نزدیک شادی یا نکاح کا مفہوم عشق و محبت کے سوا کچھ اور نہ تھا اور وہ ہماری طرح شادی کو ایک سماجی ضرورت یا مقدس فرض ہرگز نہیں سمجھتے تھے ورنہ سماج کے مرتب کردہ اصول و قواعد اور مذہبی و شرعی احکام کو راستہ کی رکاوٹ یا بندش سمجھ کر کبھی بھی بغاوت پر آمادہ نہیں ہوئے۔

فاضل مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں ملی جلی شادیاں آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے عام ہیں اور ثبوت کے طور پر مغل شہنشاہ اکبر اور دیگر نوابوں راجاؤں اور امیروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے متعلق مختصراً اتنا ہی عرض کرنا کافی ہوگا کہ ہندوستان میں ملی جلی شادیوں کا عام رواج کبھی نہیں رہا اور جہانتک شہنشاہ اکبر کی شادی کا تعلق ہے جس طرح ان کا قائم کردہ مذہب "دینِ الٰہی" کی حیثیت سیاسی مذہب سے زیادہ نہیں تھی ٹھیک اسی طرح اسی زمانے کی زیادہ تر ایسی شادیاں ملکی مصلحت کے پیشِ نظر کی جاتی تھیں اور ہم ایسی شادیوں کو "سیاسی شادی" کے علاوہ اور کوئی نام دینے سے مجبور ہیں۔ باقی رہ گئے نواب، امراء اور راجے مہاراجے تو ان کی شادیوں میں نہ کسی ذہنی بیداری یا سیاسی شعور کو دخل تھا اور نہ کسی سماجی سدھار کا جذبہ تھا، بلکہ زیادہ تر شادیوں کی وجہ انکی حد سے بڑھی ہوئی عیش پرستی تھی۔

فاضل مضمون نگار کے لکھنے کے مطابق راجہ رام موہن رائے، چترنجن داس اور سر سید احمد خاں نے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی شادی کی غرض سے تبدیلیٔ مذہب اور ملی جلی شادیوں کی حمایت کرتے تھے۔ لیکن جہانتک راقم الحروف کو معلوم ہے کہ ان بزرگوں کے زمانے میں ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔ اور ان لوگوں نے ایسی شادیوں کی کبھی بھی ہمت افزائی نہیں کی۔ البتہ ہندوؤں میں ستی کے رواج، بیوہ کی دوسری شادی، انگریزی تعلیم سے نفرت اور سماج سدھار کے دوسرے کام اور دیگر بہت سی خرابیوں اور برائیوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔

ہمارے مضمون نگار کا یہ بھی کہنا ہے کہ آزادی سے پہلے ہندوستان کے پڑھے لکھے اور اونچے طبقہ میں اس قسم کی شادیاں عام ہو چکی تھیں اور اسی سلسلہ میں انھوں نے مسٹر محمد علی جناح، ہمایوں کبیر اور سابق چیف جسٹس ہدایت اللہ کی مثالیں پیش کی ہیں۔ واضح رہے کہ ان شادیوں کے پس پشت کچھ تو انگریزی تہذیب کا اثر، مخلوط تعلیم کا نتیجہ اور بہت کچھ ان کی پسند کو دخل تھا۔ جہاں تک قبولِ عام کا سوال ہے عام لوگوں نے کبھی بھی بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھا اور کسی مذہب و فرقہ نے اس کی حمایت کی۔

یہ سچ ہے کہ آزادی کے بعد ماحول میں کافی تبدیلی آگئی ہے اور بہت حد تک اونچ نیچ کا امتیاز ختم ہو گیا اور اس طرح اونچی اور نیچی ذات میں شادی کو ایک حد تک فروغ ہوا۔ لیکن ہندو مسلم شادیوں میں کمی آگئی۔ جہاں تک اونچی اور نیچی ذات میں شادی کا تعلق ہے اس کی پہلی وجہ تو وہی مخلوط تعلیم کے بدلے ہوئے حالات اور مذہبی احکام سے لگاؤ تھی۔ دوسری بڑی وجہ چھوت چھات سے کنارہ کشی اور ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کی ایک وحدت

واقعات نئی دہلی

نفرت میں کمی تھی۔ ان نوجوانوں کی شادیوں
ہ روشن خیالی اور قومی یکجہتی کا جذبہ کارفرما
تقسیم ملک کی وجہ سے جوان نوجوانوں میں
ا گیا تھا اس کے خاتمہ کا اثر جیسا کہ مضمون
ا ہے۔ برعکس کے حقائق اس بات کے
ہندو مسلم شادیاں تو ضرور ایک بار پھر مری
نے لگیں لیکن اب حالات اور زمانے بدل
یم ہند سے پہلے عموماً ہندو لڑکیاں مسلمان
سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا پسند کرتی
زیادہ تر مسلمان لڑکیاں ہندو نوجوانوں
یات بننا باعث فخر سمجھتی ہیں۔ اس کی اصل
نوجوانوں کی حقیقت پسندی، روشن خیالی
تی نہیں بلکہ فرقہ واریت اور سیاسی مصلحت
موصیات ہیں۔

بانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان تمام
نے جنکا ذکر پہلے گزر چکا ہے ہندو لڑکیوں
ت شادیاں کی تھیں جب ملک کا بٹوارہ
اور نہ جانے جبلپور، کشمیر اور پونہ کی کہانی
پر دہرائی جا چکی ہوتی۔

گواہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ایسی
ولی فرقہ بھی عام طور پر نوٹس نہیں لیتا تھا۔
یاں کسی ہندو مسلم فساد کا باعث بنا کرتی تھیں
کے بعد ایسی ملی جلی شادیاں جس میں اتفاق
رو مذہب سے تعلق رکھتی ہو اور لڑکے کا
اسلام سے ہو۔ عام مسلمانوں کی عزت،
ری اور ان کے مال و متاع کی تباہی کی
ہے ہیں۔

ہوں جلیسے شیر میلا ٹیگور اور جنتی گوپا کی تازہ
رے سامنے موجود ہیں جنھوں نے نہ صرف
خوشی سے بلکہ اپنے خاندان کی رضامندی
اشارے پر شادیاں کیں۔ لیکن اس کے باوجود
ن رکھنے والے لیڈروں اور دیگر فرقہ پرستوں
قوم کی بے عزتی قرار دے کر بھولے بھالے
انے کی کوشش کی اور فرقہ وارانہ فضا کو
شنے کی کوشش کی اور اس طرح نہ جانے
نئی دہلی

کتنے نوجوان ہیں جنکا علم سوائے خدا کے کسی کو بھی نہیں جو اپنی تمناؤں کے جنازے اپنے کاندھوں پر لئے گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہاں کی سیاسی فضا انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اپنی تمناؤں کی تکمیل میں کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ اور اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ خواہ فلم ایکٹرس نرگس ہو یا مصری لڑکی ساجدہ توفیق، انھوں نے جب ہندو نوجوانوں سے شادیاں کیں تو نہ ہی گرو گولوالکر جی نے کچھ فرمایا اور نہ کسی مسلم لیڈر نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ گرو جی کی خموشی تو صحیح معنوں میں ان کی خوشی اور آشیرواد کا اظہار ہے، لیکن اس سلسلے میں مسلمانوں کی خموشی کو سیاسی حالات کا تقاضہ یا احساسِ کمتری کے سوا اور کیا سمجھا جائے۔

آج کی فضا میں ایسی شادیوں کی مخالفت اور مذہبی نقطۂ نظر سے شادیوں کی حمایت کو بلاشبہ قدامت پرستی سے موسوم کیا جائے گا کیونکہ مغرب کی حد سے زیادہ مادّی نظریوں نے ہمارے نوجوانوں کو ذہنی طور پر نقصان پہونچانے کے ساتھ ساتھ انکی اخلاقی قدروں اور جسمانی صحت کو بھی تباہ کر ڈالا ہے۔ وہ روشن خیالی اور حقیقت پسندی کے دھوکہ میں عصمت و عفت نیز پاکیزگی کا تصوّر تک بھلا بیٹھے ہیں۔ پھر بھی ہم اس پیغام کو جسے خدا نے اپنے نیک بندوں کے ذریعہ ہم تک پہونچا دیا ہے جتنی جلد تسلیم کر لیں ہمارے لئے اور ہماری آئندہ نسلوں اور تمام بنی نوعِ انسان کے لئے بہتر ہوگا جسکی قرآن حکیم نے یوں وضاحت کی ہے:۔

" ایمان والوں سے کہدو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کریں اور اپنے آرائش کی نمائش سے پرہیز کریں، ماسوا اُن عضووں کے جو ضروری ہیں۔ اور انھیں پیروں کو پٹخنے سے منع کر دو تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس حرکت سے چھپے ہوئے آراستہ عضو نمایاں ہو جائیں۔ اور اے ایمان والو! تم سب خدا کی طرف رجوع کرو تاکہ تم زندگی میں کامیاب رہو۔"

محمد نظام الدین۔ کراچی

مکرمی تسلیم۔

واقعات کا تیسرا شمارہ میرے سامنے ہے۔ یہ اپنے اگلے دونوں شماروں سے بہتر اور دلفریب ہے اور یقین ہے کہ اسی طرح آئندہ کا ہر شمارہ اپنے گزشتہ شماروں سے بہتر اور افضل ہوگا۔ خدا آپ کا حوصلہ اور بلند کرے اور وہ دن جلد آئے جب میں واقعات کو ایک ہفت روزہ جریدے کی شکل میں دیکھ سکوں!

دراصل ہما کے کالم میں جب میں نے واقعات کا اشتہار دیکھا تو ہما کی طرح اس رسالے کا بھی مستقل خریدار بننے کا میں نے ارادہ کر لیا، یہ سوچ کر کہ محترم عبدالوحید صدیقی صاحب کی ادارت میں جب ہما جیسا لاثانی رسالہ نکل سکتا ہے تو بے شک واقعات کا ہر شمارہ بھی اپنی مثال آپ ہوگا، اور مجھے واقعات کا تیسرا شمارہ ملنے کے بعد اسکا وثوق ہو گیا۔

جناب شاہد صدیقی کا مضمون "ملی جلی شادیاں" بے حد پسند آیا، موجودہ معاشرت میں ایسے مضامین کی اشد ضرورت ہے جو ہمارے دلوں سے کدورت اور ذہنوں سے تنگ نظری اور تعصّب کے رجحان کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہو۔ اگر اسی طرح کے مضامین کا سلسلہ آئندہ بھی چلتا رہے تو یقیناً قارئین کیلئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ بنگلا کہانی کا ترجمہ الوکھا علاج بھی خوب ہے سلیم عادل صاحب کا شکریہ، اگر وہ اسیطرح دوسری زبانوں کی بہترین تخلیقات ہمیں فراہم کرتے رہے تو یقیناً ہمیں مستفیض ہونے کا بہتر موقع ملیگا۔

" دنیا بھر کی خبریں"... میں سائنسی خبروں کی کچھ کمی محسوس ہوئی۔ دراصل یہ سائنس اور ٹکنولوجی کا زمانہ ہے۔ لوگ سائنسی خبروں کو بڑی دلچسپی اور حیرت کے ساتھ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اس لئے آپ ایسی خبریں زیادہ سے زیادہ چھاپیں۔

نسیم انصاری۔

محترمی۔ خلوص بیکراں،

واقعات کے تینوں شمارے اپنی آب و تاب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ثابت ہوئے۔ اُردو میں پندرہ روزہ رسالے کی جو کمی تھی وہ آپ نے پوری کر دی۔ آپ کی تعریف کروں یا واقعات کی ؟ دلی مبارکباد قبول فرمایئے تیسرے تازہ شمارے میں شاہد صدیقی کا مضمون "ملی

جل شادیاں، بہت ہی معلومات آفریں ہے۔ جاوید عالم اور عینی گوہا کی مشترکہ تصویر اردو داں طبقہ میں پہلی مرتبہ دیکھی گئی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پر مضمون تشنگی کو اور بڑھاتا ہے۔ بھیونڈی کے بھیانک فساد پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا کہ چاہیئے تھا۔ خوب سے خوب تر واقعات کو بنانے جائیے۔ مجید آزاد۔ شیخ حمید الزماں۔

محب مکرم۔ تسلیم

کل اتفاقاً بک اسٹال پر پندرہ روزہ واقعات کا تیسرا شمارہ رکھا ہوا دیکھا۔ اسے اٹھا کر سرورق الٹتے ہی آں محترم کے اسم مبارک پر نظر پڑی۔ میں نے دوکاندار سے اور شمارے طلب کئے مگر صرف دوسرا اور تیسرا شمارہ ہی دستیاب ہو سکا جنھیں لے کر چلا آیا۔ رات کو فرصت میں دونوں شمارے شروع سے آخر تک دیکھ ڈالے اور کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات اور واقعات نے دل کی خاک کو کریدا ہے اور جو دل لگی آپ نے اٹھا رکھی ہے اس میں سے دھواں پیدا ہو کر واقعات کے صفحات پر چھایا ہوا ہے اور خوش قسمتی سے اسمیں چار سو پھیل جانے کی اہلیت بھی ہے۔ واقعات کی خوبیوں کے متعلق سردست صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ:۔

"کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است۔"

ساحر بھوپالی۔

تسلیمات!

چورنگی کراسنگ کے بک اسٹال سے 'واقعات' خریدا تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد محسوس کرتا ہوں کہ "واقعات" نے مجھے خرید لیا۔

عید کے ایک روز پہلے تک میں نے بارہا کوشش کی کہ اگلا شمارہ حاصل کر لوں۔ بار بار اپنے گھر سے چت پور روڈ کی بک سٹال اور چورنگی کی بک اسٹال پر گیا مگر ہر بار ناکام رہا حالانکہ ان ہر دو جگہ کا فاصلہ میرے گھر سے ۹ میل دوری پر ہے اور واقعات کی قیمت سے کئی گنا واقعات کو پانے کے لئے خرچ کر چکا ہوں۔ گھر سے بازار کی طرف منہ کرتے ہی جیب میں ہاتھ جانا شروع ہو جاتا ہے اور مجھ جیسا فقیر جو کاسہ بھر کے لے جاتا ہے اور جب تک خالی نہ ہو جائے ٹھکانے پر لوٹتا ہی نہیں۔

بہت دنوں سے ایک ایسا اخبار پڑھنے کا تمنائی تھا جیسا واقعات کا پہلا شمارہ پڑھ کر محسوس ہوا۔ اب جب تک دوسرا شمارہ ہاتھ میں نہ آ جائے میری یہ تمنا تشنۂ کام ہی رہے گی۔ تمنا ہی جو ٹھہری۔

صوفی سورج پرکاش دہلوی۔ بنگال

محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔

"ہما اور ہدیٰ" جیسے انتہائی معیاری ڈائجسٹ نکالکر بیائے اردو ادب میں جو بے مثال کارنامے انجام دے رہے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپ کی بے لوث ادبی خدمات کو فراموش کرنا ادب فراموشی ہی نہیں بلکہ احسان فراموشی بھی ہوگی۔ ہماری آنے والی نسلیں یقیناً آپ پر فخر کریں گی۔ اردو میں ڈائجسٹوں کی شکل میں اتنے نایاب مہر دینے کے بعد اب 'واقعات' کی صورت میں ایک نہایت معیاری سیاسی اور ادبی جریدہ نکالنا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ واقعی صاحب! صحرا میں پھول کھلانا کوئی آپ سے سیکھے، پتھر کو کاٹ کر ہیرے نکالنا آپ ہی جیسے بے جگر اردو کے فدائین کا کام ہے۔ میری تمام تر نیک خواہشات آپ کے حوصلۂ ادبی کے ساتھ ہیں۔

یوسف جمال۔ راج گنج پور

امکرمی۔ السلام علیکم

'واقعات' کے تینوں شمارے پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ آپ نے کروڑوں اردو دوستوں کے دل کی پکار سن لی ہے۔ جو بھی واقعات دیکھتا ہے پڑھے بغیر نہیں رہتا اور جب پڑھ لیتا ہے تو سراہے بغیر نہیں رہتا اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس طرح لگائیے کہ ہر چھوٹے بڑے مقام پر یہ ملنے لگا ہے اور یہ کیفیت ایسے وقت کی ہے جب کہ واقعات صرف ڈیڑھ ماہ کا نومولود ہے۔ اس سے اس کے تابناک مستقبل کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ دعا ہے کہ 'واقعات' ہمارے دلوں کی دھڑکن بن کر سدا زندگی کا پتہ دیتا رہے۔!!

والسلام۔ یعقوب سروش

محترمی تسلیم۔

آج واقعات کا دوسرا شمارہ کتابی دنیا سے خریدا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کاغذ اچھا لگا۔ "کیمرے کی تاک جھانک" میں نئی تصویریں چھاپئے۔ میں آپ کی صحافت کا اس وقت سے معترف ہوں جب آپ نے "نئی دنیا" نکالا تھا۔ میں آپ کو بابائے صحافت کے لقب سے یاد کرتا ہوں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے آپ پڑھنے والوں کے لئے بھی ایک صفحہ رکھئے اور پڑھنے والوں سے موضوع پر مضامین بھی لکھوائیے۔ "ہمارے لیڈر، ہماری جماعت" کا سلسلہ بند نہ کیجئے۔ فلموں پر تصویر مضمون بھی ٹھیک ہے مگر آخری صفحوں پر یہ سلسلہ رکھئے۔ "کیمرے کی تاک جھانک" شروع کے صفحات پر رکھئے، قاری جو واقعات اخبار میں روز پڑھ لیتا ہے وہ دیکھنا بھی چاہے گا۔ "واقعات" میں سب سے پہلے تصاویر ہی چھپیں تو بہتر ہے۔

شفیق احمد۔ لکھنؤ

عجیب وغریب

فارسی کا شاعر رداغی جس نے شراب کی تعریف میں ۱۰۰ جلدوں پر مشتمل ایک خوبصورت نظم لکھی اس نظم میں ۱۰ لاکھ سے زائد اشعار تھے۔

رُداغی کے بارے میں ایک عجیب و دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے یہاں ایک ہی تاریخ میں ۳ لڑکے، تین پوتے اور دو پڑپوتے پیدا ہوئے۔ رداغی پیدائشی اندھا تھا۔

●

سمرسٹ ماہم

محمد سعد اللہ

یکس کیلیڈا کو میں ملاقات سے پہلے ہی ناپسند تھا۔

ہلی جنگِ عظیم ابھی ابھی ختم ہوئی تھی! ور بحری ں پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ جگہ ملنی مشکل تھی اس لئے ز کچھ انتظام کر دیتے اسی کو غنیمت سمجھنا پڑتا تھا کسی رہ کیبن ملنا ممکن ہی نہ تھا اس لئے جب مجھے ایسا ملا جس میں صرف دو مسافروں کے لئے برتھ تھیں تو شکر ادا کیا لیکن جب مجھے اپنے ہمسفر کا نام معلوم ہوا ل بیٹھ سا گیا۔ پہلے تو چودہ دن تک ایک کیبن میں کسی کے ساتھ سفر کرنا ہی میرے لئے سوہانِ روح تھا ان فرانسسکو سے کوبے (جاپان) جا رہا تھا لیکن دہ افسوس نہ ہوتا اگر میرے ساتھی کا نام اسمتھ یا ہوتا۔

جب میں جہاز پر سوار ہو کر اپنے کیبن میں داخل ہوا تے فرش پر مسٹر کیلیڈا کا سامان بکھرا ہوا دیکھا۔ اسکی ی ہیئت مجھے اچھی نہ لگی۔ سوٹ کیس پر بہت سے چپکے ہوئے تھے اور سامان کا صندوق بہت بڑا س نے اپنی آرائش کا سامان کھول کر بازار سا لگا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مونیشور کوتی "(مشہور آرائشی اشیاء بنانے والے) کی بہت بڑی سرپرست تھی۔ "کوتی" کے عطریات، تیل، ہیر واش، اسنو وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔ ابھونی کے برشوں پر اس کا مونوگرام سنہری الفاظ میں ثبت تھا۔

میں نے مسٹر کیلیڈا کو کبھی پسند نہیں کیا۔

میں سگریٹ نوشی کے کمرے میں گیا اور تاش منگوا کر پیشنس (تاش کا ایک کھیل جو تنہا کھیلا جاتا ہے) کھیلنے لگا میں نے کھیل شروع ہی کیا تھا کہ ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہا کہ کیا وہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہے کہ میرا نام فلاں ابن فلاں ہے۔ "میں میکس کیلیڈا ہوں" اس نے آگے کہا اور مسکرایا جس سے اس کی چمکدار سفید بتیسی ظاہر ہو گئی وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اوہ ہاں میرا خیال ہے کہ ہم ایک ہی کیبن میں ہم سفر ہیں"۔

"میں اس کو خوش قسمتی سمجھتا ہوں کیونکہ ہمیں کس کے ساتھ رکھ دیا جائے گا ہم جان بھی نہیں سکتے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ انگریز ہیں تو میری خوشی کی حد نہ رہی۔ مجھے یہ بہت پسند ہے کہ ہم انگریز باہری دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ سفر کریں۔ آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہونگے"۔

"کیا آپ انگریز ہیں؟"

"ہاں! کیا آپ کے خیال میں میں کسی امریکی کی طرح لگتا ہوں، میں ہڈیوں تک انگریز ہوں"۔

اس بات کو ثابت کرنے کے لئے مسٹر کیلیڈا نے اپنی جیب سے ایک پاسپورٹ نکالا اور میری آنکھوں کے سامنے لہرا دیا۔ بجائے کنگ جارج کی رعایا میں کیسے بھانت بھانت کے لوگ شامل ہیں۔ مسٹر کیلیڈا ایک چھوٹے قد گٹھیلے جسم، داڑھی مونچھ صفاچٹ، سیاہی مائل جلد کا آدمی تھا۔ ایک بڑی سی چونچ جیسی ناک چہرے پر چسپکی ہوئی تھی۔ آنکھیں پرنم اور بڑی بڑی تھیں۔ کالے کالے لمبے اور گھونگھریالے بال تھے، وہ بے تکان اور روانی سے باتیں کئے جاتا تھا۔ کثرت سے حرکات سے کام لیتا تھا جس میں انگریزوں جیسی کوئی بات نہ تھی۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ اگر اس کے پاسپورٹ کی چھان بین کی جائے تو شاید یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اسکی پیدائش انگلستان کے بند آسمان کے نیچے نہیں بلکہ کسی کھلے نیلے آسمان کے نیچے ہوئی ہوگی۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے؟" اس نے دریافت کیا

میں نے اس کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ شراب بندی کا زمانہ تھا۔ اور ظاہر میں جہاز بالکل "خشک" نظر آتا تھا۔ مسٹر کیلیڈا نے ایک پراسرار مسکراہٹ پھینکی۔

"وہسکی سوڈا۔ یا خشک مارٹینی؟ بس آپ حکم دیجئے"۔

اپنی ہر جیب سے اس نے ایک ایک بوتل نکال کر میرے

تسنات نئی دہلی

سامنے میز پر رکھ دی۔ میں نے مارٹینی پسند کی۔
اس نے اسٹیوارڈ کو بلا کر ایک برف کا مگ اور دو گلاس لانے کا حکم دیا۔

"ایک بہترین کاک ٹیل۔" میں نے کہا۔

"اوہ! جہاں سے یہ آئی ہے وہاں اور بہت ہے۔ اگر جہاز پر آپ کا کوئی دوست ہو تو اس سے بلا تکلف کہہ دیجئے کہ آپ کا ہمسفر دنیا بھر کی شرابیں پلا سکتا ہے۔"

مسٹر کیلیڈا بہت باتونی تھا۔ اس نے سان فرانسسکو اور نیو یارک کے حالات سنائے، پھر ڈرامے، فلم و سیاست پر تبصرے کئے۔ وہ حب الوطن بھی تھا۔ اس کے نزدیک یونین جیک قابلِ احترام شے ہے لیکن جب اُسے کوئی اسکندریہ یا بیروت کا آدمی لہرائے تو یہ مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کی شان کچھ کم لگتی ہے۔ مسٹر کیلیڈا بہت بڑا واقف کار تھا لیکن مجھے یہ پسند نہ تھا کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہو جائے اس نے مجھے بے تکلف کرنے کے لئے کسی قسم کا تکلف یا آداب کا لحاظ نہیں رکھا۔

میں نے مسٹر کیلیڈا کو پسند نہیں کیا۔

اُس کے آتے ہی میں نے تاش کی گڈی ایک طرف سرکا دی تھی لیکن اب یہ خیال کر کے کہ ہماری بات چیت ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہے میں نے اپنا تنہا کھیل پھر شروع کر دیا۔

"تین چار پر" ! مسٹر کیلیڈا نے کہا۔

"پیشنس" کے کھیل میں اس سے زیادہ برہمی کی کوئی بات نہیں ہوتی کہ جب آپ کھیل رہے ہوں تو آپکے پتہ دیکھنے سے قبل ہی کوئی آپ کو یہ بتائے کہ جو پتہ آپ نے اٹھایا ہے اُسے کہاں رکھا جائے۔

"یہ آ رہا ہے۔ یہ آ رہا ہے"۔ وہ چلایا "دہلا غلام پر!"

اپنے دل میں جھنجھلا کر میں نے کھیل ختم کر دیا۔ اس نے تاش کی گڈی لی۔

"کیا آپ "کارڈ ٹرک" پسند کرتے ہیں؟"

"نہیں، میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔"

"اچھا تو میں آپ کو صرف یہ ایک بتاؤں گا۔"

اس نے مجھے تین بتائیں۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ میں کھانے کے کمرے میں جاؤں گا تاکہ ٹیبل پر جگہ حاصل کر سکوں۔"

"اوہ آپ فکر نہ کریں!" میں نے آپ کے لئے کھانے کی جگہ حاصل کر لی ہے۔ میں نے سوچا کہ جب کہ ہم ایک ہی کیبن میں ساتھ رہ رہے ہیں تو کیوں نہ ہم ایک ہی ٹیبل پر کھانا کھائیں؟"

میں نے مسٹر کیلیڈا کو پسند نہیں کیا۔

نہ صرف میں اس کے ساتھ ایک کیبن میں رہنے اور دن میں تین مرتبہ ایک ہی ٹیبل پر اس کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے مجبور رہا۔ بلکہ بغیر اسے ساتھ لئے عرشہ پر گھومنا بھی میرے لئے مشکل ہو گیا۔ اُس سے چھٹکارا پانا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہ آئی کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ ہر شخص اس کو دیکھ کر اتنا ہی خوش ہوتا ہے جتنا وہ اس شخص کو دیکھ کر۔ اپنا گھر ہوتا تو آپ گردن پکڑ کر اسے گھر سے باہر کر دیتے، دروازہ بند کر دیتے۔ اسے صاف سنا دے کہ وہ بے ضرورت ملاقاتی ہے۔ لیکن یہاں کیا کیا جا سکتا تھا؟

وہ بہت جلد گھل مل جانے والا آدمی تھا۔ اور تین دن کے اندر ہی اسکی سارے جہاز سے جان پہچان ہو گئی۔ وہ ہر بات کا انتظام کرنے کو تیار رہتا تھا، کھیلوں کا انتظام، نیلام کا انتظام، انعامات کے لیے رقومات کا انتظام وہ کرتا۔ وہ ہر جگہ، ہر موقعہ پر موجود رہتا۔ یقیناً وہ جہاز پر سب سے ناپسندیدہ شخص تھا۔ ہم اس کو "ہمہ داں" نہ صرف اس کے پیچھے بلکہ اس کے منہ پر بھی کہہ دیتے تھے، وہ اس کو اپنی تعریف سمجھتا تھا لیکن کسی موقعہ پر تو وہ بالکل ہی ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ زیادہ وقت وہ ہمیں اپنے رحم و کرم پر رکھتا۔ وہ دلدار، پُر مذاق، چرب زبان اور جھکی تھا۔ وہ ہر بات کو ہر شخص سے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے زیادہ فخر کی وجہ سے ہر شخص اس کی رائے سے اختلاف رکھتا تھا۔ وہ کسی موضوع کو اس وقت تک نہ چھوڑتا جب تک گھما پھرا کر آپ کو اپنا ہم خیال نہ بنا لیتا۔ اس بات کا امکان کہ وہ غلطی کر سکتا ہے، اس کے ذہن میں کبھی نہ آتا۔ وہ خود کو ایسا آدمی سمجھتا جو "ہمہ داں" ہے۔

ہم اکثر ڈاکٹر کے ٹیبل پر بیٹھا کرتے۔ مسٹر کیلیڈا یہاں بھی اکثر اپنا رنگ جما لیتا کیونکہ ڈاکٹر ایک سست قسم کا آدمی تھا اور میں بالکل غیر جانبدار۔ صرف ایک ہی آدمی ہمارے ٹیبل پر ایسا تھا جو مسٹر کیلیڈا کی طرح خود رائے تھا اور اسے کیلیڈا کی ہمہ دانی پر فوراً غصہ آ جاتا تھا۔ یہ تھا مسٹر ریمزے۔ ریمزے امریکی قونصل خانے میں ملازم تھا۔ اور کوبے (جاپان) میں متعین تھا۔ وہ مغرب وسطی (امریکہ) کا رہنے والا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ اپنے تیار شدہ کپڑوں کے اندر وہ کچھ پھولا پھولا سا لگتا تھا۔ وہ ہوائی جہاز سے نیو یارک اپنی بیوی کو لینے گیا تھا جو ایک سال سے گھر رہی تھی۔ اور اب اپنی سروس پر رجوع ہونے کے لئے لوٹ رہا تھا۔

مسز ریمزے ایک بہت ہی خوبصورت عورت تھی جس کے طور طریقے بڑے ہی دلکش تھے۔ قونصل کی نوکری کم تنخواہ کی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ سادے لباس میں رہتی تھی۔ لیکن اُسے مناسب ڈھنگ سے کپڑے پہننے آتے تھے۔ اس نے ہر ایک کو اپنی سادگی سے متاثر کر رکھا تھا۔ جو خوشنما پودے کے پھول کی طرح جھلک دکھاتی تھی۔

ایک شام ڈنر کے وقت اتفاق سے بات چیت کا موضوع، موتیوں کی طرف مڑ گیا۔ اس وقت اخبارات میں جاپانی نقلی موتیوں کا زور و شور سے چرچا ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ یقینی طور پر یہ اصلی موتیوں کی قدر گھٹا دیں گے۔ اس وقت بھی وہ کافی اچھے ہیں اور تجربات کے بعد تو پورے طور پر وہ مکمل ہو جائیں گے۔

مسٹر کیلیڈا اپنی عادت کے مطابق فوراً اس نئے موضوع میں دخل انداز ہو گیا۔

اُن نے ہم کو وہ سب سُنا ڈالا جو موتیوں کے بارے میں تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ریمزے بھی موتیوں کے بارے میں کچھ جانتا ہو گا لیکن وہ اس "ہمہ داں" سے چھیڑ کر کے اُلجھنے کا موقعہ پا کر چُپ نہ رہ سکا اور پانچ منٹ کے اندر ہم گرما گرم بحث کے طوفان میں پھنس چکے تھے۔ اس سے قبل بھی مسٹر کیلیڈا کو جوش و خروش کے ساتھ بحث کرتے دیکھ چکا تھا لیکن اس موقع کی طرح اس کو آپے سے باہر کبھی نہ دیکھا تھا۔ آخر کار ریمزے کی کسی بات نے ڈنک مار دیا کیونکہ اس نے ٹیبل پر زور سے مُکا مار کر چیخا "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں میں جاپان اسی لئے جا رہا ہوں کہ جاپانی نقلی موتی

واقعات تنے دھلو

خود معائنہ کروں میں اسی کاروبار میں ہوں
واقف کار یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں موتیوں کے
جو کہہ رہا ہوں وہ ٹھیک نہیں ہے۔"
لئے نئی خبر تھی کیونکہ مسٹر کیلیڈا نے
وں کے باوجود کبھی یہ نہ بتایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے
تھا کہ وہ جاپان کسی تجارتی معاملے کے سلسلے
ہا ہے۔ اس نے ٹیبل کے گرد فتح مندی کر دیکھا
کبھی ایسا نقلی موتی نہیں بنا سکینگے کہ جسے
ہر فن آدھی آنکھ سے بھی دیکھ کر پہچان نہ سکے۔"
نے رمزے کی بیوی کے گلے کے موتیوں کے ہار کی
ہ کیا۔
میری بات پر یقین کیجیے مسٹر رمزے کہ آپکے گلے
یمت کسی کبھی وقت ایک پائی بھی کم نہ ہوسکیگی۔"
رمزے اپنی انکساری کی وجہ سے شرمندہ سی
ہار کو اپنے لباس کے اندر کھسکانے لگی۔
ے آگے جھکا، اس نے ہم سب پر نظر ڈالی۔ اسکی
ب شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔
سز رمزے کا ہار بہت ہی اچھا ہے؟ ہے نا؟"
ں نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا" مسٹر کیلیڈا
میں نے دل میں کہا وہ اصلی موتی کا ہی ہے۔"
یں نے اسے خود نہیں خریدا، کیا تم مجھے بتاؤگے
خیال میں اس کی کیا قیمت ہوگی۔"
ہ بیوپاری بھاؤ سے یہ تقریباً پندرہ ہزار ڈالر کا
ن اگر تم نے اسے نیویارک کے ففتھ ایونیو کے
ری سے خریدا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی
ہ اسے تیس ہزار ڈالر میں خریدا ہو۔"
یزے سنجیدگی سے مسکرایا۔
تمہیں یہ سُنکر تعجب ہوگا کہ مسز رمزے نے یہ ہار
سے روانگی سے ایک دن پہلے وہاں کے ایک
نٹ اسٹور سے صرف اٹھارہ ڈالر میں خریدا ہے۔"
مسٹر کیلیڈا کا چہرہ ایک دم سُرخ ہوگیا۔
بکواس! یہ ہار نہ صرف اصلی ہے بلکہ اتنے سڈول
لڑی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"
کیا تم شرط لگاتے ہو؟ میں تم سے سو ڈالر کی شرط
ہوں کہ یہ نقلی ہیں۔"

منظور"

"اوہ ایلمر تم شرط مت لگاؤ" مسز رمزے نے
ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اسکی آواز میں ارتعاش تھا
"کیوں کیا میں شرط نہیں لگا سکتا؟ اس طرح
آسانی سے حاصل ہونے والے پیسے کو گنوانے والا
تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا۔"
"لیکن اس کا ثبوت کس طرح دیا جا سکتا ہے"
وہ بولی" مسٹر کیلیڈا کے مقابلے میں تو میرے صرف
الفاظ ہیں۔"
"مجھے اس ہار کو غور سے دیکھنے دیجئے۔ اگر وہ نقلی
ہوں گے تو میں فوراً بتا دوں گا میں سو ڈالر گنوانا پسند نہیں
کرتا۔" مسٹر کیلیڈا نے کہا۔
"ڈیر اسے اتار دو۔ اور اس "ہمہ داں" کو جی بھر
کر دیکھ لینے دو۔"
ایک لمحہ کے لئے مسز رمزے تذبذب میں پڑ گئی اس
نے اپنا ہاتھ آنکڑے پر رکھ لیا۔
"میں اس کو کھول نہیں سکتی" وہ بولی "مسٹر کیلیڈا
آپ میری بات پر یقین کر لیجئے۔"
مجھے ایک دم شک ہوا کہ کوئی منحوس بات ہونے
والی ہے۔ لیکن میں خاموش رہا۔
رمزے اچھلا" اس کو کھولوں گا" اس نے ہار
اتار کر مسٹر کیلیڈا کو دیا۔ مسٹر کیلیڈا نے اپنی جیب سے
ایک محدب شیشہ نکالا اور غور سے لڑی کا معائنہ کیا۔ اس
کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ہار
واپس کیا اور کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر
مسز رمزے کے چہرے پر جا پڑی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا
تھا۔ جیسے وہ بس بے ہوش ہونے والی ہو۔ وہ پھیلی
ہوئی اور سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف ٹکٹکی لگائے
دیکھ رہی تھی اسکی نگاہوں میں ایک بے بس سی التجا تھی اتنی صاف
کہ مجھے تعجب ہوا کہ اس کا شوہر اسے کیوں نہ دیکھ سکا۔
"مسٹر کیلیڈا کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ وہ ایکدم
بے چین سا ہوگیا۔ کوئی بھی اس کی اپنے آپ پر قابو پانے
کی کوشش کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔
"میں غلطی پر تھا" اس نے دھیرے سے کہا۔
"یہ بہت ہی اچھی نقل ہے لیکن بے شک جیسے ہی میں نے
اسے اپنے شیشہ میں دیکھا مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ اصلی موتی
کا نہیں ہے میرا خیال ہے کہ اس کی اٹھارہ ڈالر ہی قیمت
مُناسب ہے۔"
اس نے اپنی ڈائری نکالی اور اس سے سو ڈالر کا
نوٹ نکال کر بغیر کچھ کہے رمزے کے حوالے کر دیا۔
"میرے دوست۔ شاید تم کو اس بات سے یہ سبق
ملے۔ کہ ہر بات میں ہمہ دانی جتانا ٹھیک نہیں ہے۔" رمزے
نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔
میں نے دیکھا کہ مسٹر کیلیڈا کے ہاتھ تھر تھرا رہے تھے۔
ہر کہانی کی طرح یہ کہانی بھی جلد ہی سارے جہاز پر
پھیل گئی۔ یہ ایک پُر مذاق موضوعِ گفتگو بن گیا کہ جناب
"ہمہ داں" خود اپنے دام میں آ گئے۔ مسز رمزے کی طبیعت
خراب ہوگئی تھی اسلئے وہ اپنے کیبن میں چلی گئی تھی۔
دوسری صبح میں اٹھا اور شیو کرنے لگا مسٹر کیلیڈا
بستر پر پڑا سگریٹ کے مرغولے بناتے ہوئے چھت کو گھور
رہا تھا۔ اچانک ایک سرسراہٹ کی آواز آئی میں نے
دیکھا کہ دروازے کے نیچے کی درز سے فرش پر ایک لفافہ
سرکا دیا گیا ہے میں اٹھا۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔
کوئی نظر نہ آیا میں نے لفافہ اٹھایا۔ اس پر میکس کیلیڈا کا
نام موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا میں نے اسے اس
کے حوالے کر دیا۔
"یہ کس کی طرف سے ہے۔" اس نے لفافہ چاک کیا
"اوہ"۔ لفافہ کے اندر سے خط کے بجائے سو ڈالر کا
ایک نوٹ نکلا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اور اس کا
چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اس نے لفافہ پھاڑ کر باریک ٹکڑے
کئے اور کھڑکی کی راہ سمندر میں ڈال دیئے۔
"کوئی بھی شخص بیوقوف نظر آنا پسند نہیں کرتا۔" اس نے کہا
"کیا وہ موتی اصلی تھے؟"
"اگر میری کوئی خوبصورت بیوی ہوتی تو میں خود
کوبے میں رہ کر اُسے نیویارک میں ایک سال تک تنہا
چھوڑنا پسند نہ کرتا۔"
اس وقت پہلی مرتبہ میرے دل نے مسٹر کیلیڈا
کو ناپسند نہیں کیا۔
اس نے اپنی ڈائری نکالی اور سو ڈالر کا نوٹ
احتیاط سے اس کے اندر رکھ لیا۔ ▲▲

بقیہ:۔ نئی ریاست کا ظہور

خود اس علاقہ کے اہم ممالک ایران، عراق اور سعودی عرب کے اپنے مفادات ہیں۔ جو قدرتی طور پر اس علاقہ پر اپنا اثر قائم رکھنے یا کم سے کم ایسی یونین کے قیام کے خواہاں ہیں جو ان کی دوست ہو۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہر ملک ضبط و تحمل سے کام لے رہا ہے۔ اور اسرائیلی پریس کا یہ پروپیگنڈہ کہ ایران اور عرب ریاستیں باہم ٹکرا جائیں گی۔ کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ شط العرب کے مسئلہ پر بھی جس پر ایران اور عراق میں اختلاف ہے زیادہ کشیدگی نہیں بڑھی ہے۔ ہر ملک یہ محسوس کر رہا ہے کہ برطانیہ کے انخلاء کی صورت میں اس علاقہ میں ایسی مملکت قائم ہونی چاہیئے جو اپنا دفاع خود کرنے کے قابل ہو۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کی بنا پر گذشتہ ماہ سعودی عرب کے دوم نائب وزیر اعظم و وزیر داخلہ شہزادہ فاہید ابن عبد العزیز لندن پہنچے اور برطانوی ذمہ داروں سے بات چیت کی افتتاحی اجلاس میں برطانوی وزیر خارجہ ڈگلس ہوم نے بھی شرکت کی۔ ایک ہفتہ کی بات چیت کے بعد جو اعلانیہ جاری کیا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعودی عرب اور برطانیہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ خلیج فارس (جسے عربوں نے اب خلیج عرب کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے) کی امارتوں کی ایک فیڈریشن کے قیام کے سلسلہ میں تیز رفتاری کے ساتھ اقدامات کئے جائیں۔

ادھر ایران کی بھی خواہش ہے کہ خلیج فارس کی امارتوں آزاد ہوں اور وہ سب ایک فیڈریشن میں شامل ہو جائیں۔ پچھلے دنوں بحرین کے حکمران علیسی بن سلمان آل خلیفہ جب ایران کے دورہ پر گئے تھے تو ان کا وہاں بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ حالانکہ پچھلے دنوں تک بحرین پر ایران اپنی حکمرانی کا دعویٰ رکھتا تھا اور حکمران خاندان سے جو کویت کا خاندان ہے اس کے تعلق خوشگوار نہ تھے۔ (بحرین پر ۱۷۸۰ء تک ایران ہی کا قبضہ تھا۔) شاہ ایران نے عیسیٰ بن سلمان کو اپنے محل میں مدعو کیا اور خلیج فارس کے مستقبل پر اہم گفتگو کی۔

بحرین خلیج فارس کے مغربی ساحل پر دوسری چھوٹی چھوٹی امارتوں کے مقابلہ میں سب سے بڑی ہے یہ کئی چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے جن میں بعض کا رقبہ تین اور چار میل سے زیادہ نہیں ہے سب سے بڑا جزیرہ بحرین کا ہے جو ۲۰ میل لمبا اور دس میل چوڑا ہے مجموعی رقبہ ۲۳۱ میل ہے اور آبادی (۱۹۶۵ء کی مردم شماری کے مطابق) ۱۸۲۲۰۳ ہے ان میں نصف وہاں کے اصل باشندے ہیں، جو شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی جن میں حکمران خاندان بھی شامل ہے سنی ہیں۔

بحرین اور قطر بھی اگر معاہدہ کی پابند سات امارتوں کے ساتھ مل جائیں تو اس علاقہ میں ایک اچھی خاصی مملکت قائم ہو سکتی ہے جو رقبہ میں اردن کے برابر اور آبادی ۴ لاکھ ہوگی لیکن اگر بحرین نے ایک الگ آزاد ریاست کی حیثیت سے رہنا پسند کیا تو اگرچہ رقبہ کے لحاظ سے زیادہ فرق نہ پڑے گا لیکن آبادی نصف رہ جائے گی۔ تاہم جو کچھ ہو بحرین مجوزہ ریاست میں شامل ہو یا الگ رہے خلیج فارس میں نئی اور ایسی مملکت کا معرض وجود میں آنا لازمی ہے جو مستحکم ہو اور جو برطانوی افواج کے چلے جانے کی صورت میں پیدا ہونے والے طاقتی خلاء کو پورا کر سکے۔

اس نئی یونین کی فوج فی الحال برطانیہ ہی کی نیابت میں قائم ہوگی وہی اسے ٹریننگ بھی دے گا۔ اور برطانوی افسران ہی مقرر کئے جائیں گے لیکن آزادی کا جو جذبہ ان امارتوں کے لوگوں میں موجود ہے اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ بہت جلد وہ دن آئے گا جب وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں گے اور انھیں برطانوی افسروں کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

●●

بقیہ:۔ اکوپنکچر

انسانی جلد کے ٹھیک نیچے رگوں کا جال بچھا ہوا ہے جو جسم کے سارے حصوں کو ایک دوسرے سے مربوط کئے رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم کے اندر کے اعضا کسی نہ کسی طرح جسم کی اوپری جلد سے واسطہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جسم کے کسی حس دار حصہ کے اندر جب ایک سوئی چبھا دی جاتی ہے تو نظام اعصاب کے ذریعہ دماغ کے مرکزی حصہ کے زیریں رگوں کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور جب دوران خون ایک بار پھر اسی سوئی کی طرف بڑھتا ہے تو اس عرصہ میں سوئی سے متاثرہ حصہ اپنا اصل توازن قائم کر لیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سر کے درد کا علاج گدی کے دبانے سے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پیشانی پر بام لگانے سے اکثر سر کے درد میں کمی ہو جاتی ہے۔

جن چینی طبیبوں نے اس طریقہ علاج کو جاری کیا ان کے نظریہ میں ساری دنیا کا دارومدار ین۔ یانگ کی تقابلی کشمکشوں پر ہے منفی اور مثبت قوتوں کے عمل اور ردعمل سے ساری کائنات کا وجود ہے۔ منفی کے اندر مثبتی اور مثبت کے اندر منفی عناصر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں ان کے خیال میں انسانی جسم اور دماغ ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہیں جسم کے کسی حصہ کی فوری تکلیف کا احساس صرف دماغ ہی کو ہوتا ہے۔ چنانچہ اکوپنکچر کے عمل سے دماغ کو ہی متاثر کیا جاتا ہے۔ اور جسم کے اندر جگہ جگہ پنکچر کر دینے سے منفی اور مثبت طاقتوں میں کشمکش پیدا ہو جانے سے اندرونی حصوں کا توازن برابر ہو کر مرض رفع ہو جاتا ہے۔ جدید ریسرچ نے بتایا ہے کہ انسانی جسم پر اکوپنکچر کرنے کے لئے ہزار سے زیادہ نقطے ہیں جہاں سوئیاں چبھو کر مختلف امراض پر قابو پا لیا جاتا ہے۔

عرق النساء کے مریض کو آٹھ ڈاکٹر اسکی ایک ٹانگ پر چار چھ جگہ اکوپنکچر کر دیا جاتا ہے چھوٹی بڑی سوئیاں تقریباً ۲۰ منٹ کے لئے ایک ہی حالت میں چبھی رہتی ہیں۔ ان سوئیوں کے جلد کے اندر داخل ہوتے ہی مریض کو سکون مل جاتا ہے۔ اگر وہ اس عمل سے سات مرتبہ گذر جائے تو یہ مرض عمر بھر کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔

بہرحال آج سے پانچ ہزار برس پہلے اس چینی طبیب نے اپنے شہنشاہ سے کہا تھا کہ اکوپنکچر ایک ایسا طریقہ علاج ہے جو جسم کے کمزور حصہ کو طاقتور حصوں سے حاصل کی ہوئی توانائی بخش کر نظام اعصاب کے توازن کو قائم رکھتا ہے۔ اور اس توازن کے غلط ہو جانے کی وجہ سے امراض پیدا ہوتے ہیں اور درد رونما ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اکوپنکچر کو رائج کرنے کے لئے ڈاکٹر عبد الجلیل کو جاپان کے اکوپنکچر انسٹی ٹیوٹ روانہ کرنے کا فیصلہ جولائی ۱۹۷۰ء میں کیا گیا تھا۔ اگر ڈاکٹر موصوف اس طریقہ کار کو رائج کرنے میں کامیاب ہوئے تو ہندوستان کے غریب مریضوں کا اس ارزاں علاج سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کی توقعات وابستہ رکھنا واجب ہے۔

نکسن عربوں کی نظر میں

واقعات نئی دہلی

آرہی ہے پھر الکشن کی بہار
جن سروں پر ووٹ کے بولیں گے وار
گھر سے نکلے گا ہر اک سرمایہ دار
ہاتھ میں چنبیلی لیے دیوانہ وار
لو بدھوے کے جھنڈا آئیں گے
ووٹروں کے سامنے گنگنائیں گے
ہر طرف تقدیر کی ہوگی بہار
موسمی لیڈر پہ آئے گا نکھار
نعرہ بازی سے فضا گونجے گی پھر
پھر اپیلیں ہوں گی ہر جا منتشر
شیخ جی پنڈت کے گھر پھر جائیں گے
برہمن مُلّا سے ملنے آئیں گے
خان صاحب شیخ سے ٹکرائیں گے
رام جی بھی شام سے رُٹھ جائیں گے
ہر طرف گڈی اڑے گی نوٹ کی
جان سے قیمت بڑھے گی ووٹ کی
وہ جنھیں فاقہ کشوں سے ہے گریز
مفلسوں کے در پہ ہوں گے سجدہ ریز
خوب راموکو ملے گا روزگار
در پہ جھٹ کے لگے گی روز کار
جھونپڑی میں ہوگی پھر دیپا ولی
پھر نظر آئے گی جوڑی بیل کی
اک درانتی اور گندم کا نشاں
فاقہ مستوں کا بنے گا ہم زباں
کوئی آئے گا منی فسٹو لیے
مجلس میں پھر کوئی ملائے گا دیے
کہہ رہی ہے پھر تیج ہماری کتاب
کرنے والے ہیں وطن میں انتخاب

از — قلیچ رمانی

اے اسرائیل

حریفِ امن واماں شر پسند اسرائیل
لفظ سے گر گیا، دنیا میں ...
میں تیرے خواب کی تاویل کہہ رہا ہوں آج
یہ سن کہ سخت بھیانک ہے خواب ...
رہے گا خواب پریشاں ہر ایک خواب ترا
سجھا نہ پائے گا ہرگز تو ...
وہ ضرب ہند پہ آئی جو ضرب مصر پہ تھی
گر اہل مصر ہوئے قتل ...
ہیں اک مزاج صحارا و راجپوتانہ
ہیں ایک رنگ بہم ...
کشاں کشاں وہیں پہونچیں گے ہند کے فرزند
جہاں جہاں انھیں آواز ...
جو سامراج ہے بدنام شاطری کے لیے
اُسی کے حکم کی کرتا ...
جہاں میں ہوتا ہے جو جنگ و قحط و بیماری
پسارتا ہے تو اُس ہی کے ...
کر انتخاب کہ آگے ہے تیرے جنگ و امن
مثال آتش نمرود ...
فضائے امن کے بارے میں تجھ کو قیل و قال
فضائے امن ہے مستی ...
تجھے یہ چاہیے اپنی خطا پہ نادم ہو
سنبھل شتاب کہ باقی ...

وہ دیکھ پرچم جمہور لہلہاتا ہے
وہ دیکھ زمزمہ خواں ہے بشر کی فکر جمیل

ادم ...

JANUARY 1971
(SECOND HALF)
WAQIAT
"آپ کا فاتحہ ادا کیا جا چکا ہے — مس"
OP
SAMAN
میں ۲۴ گھنٹے کی ہڑتال پر جا رہی ہوں
واپس آ کر بخار دیکھوں گی —

واقعات
ذلفی
تا
ذوالفقار علی
بھٹو
*
پاکستان کا
مستقبل
؟

غزل

تم نہیں تو کوئی شادابی بہاروں میں نہیں
کیف نظروں میں نہیں لذت نظاروں میں نہیں

رنگ پھولوں میں نہیں تابش ستاروں میں نہیں
جب سے تابانی مرے دل کے شراروں میں نہیں

ماہ و انجم سے سنواری تھی جنھوں نے یہ زمیں
روشنی کی اک کرن ان کے مزاروں میں نہیں

کس قدر خوش رنگ ہیں میرے دلِ بسمل کے زخم
پھول کھلتے ہیں مگر ایسے بہاروں میں نہیں

پی گئے اک جام میں ساری انا ساری خودی
اب من و تو کے وہ جھگڑے بادہ خواروں میں نہیں

خود ہی منزل، خود ہی رہرو، خود ہی یہ کارواں
میں ہی میں ہوں اور کوئی رہگذاروں میں نہیں

کتنے خرمن پھونک ڈالے کتنے گھر ویراں کیے
پھر بھی گرمی کم محبت کے شراروں میں نہیں

کیا سُنے گا وہ کہ ہیں بے سود ناقوس و اذاں
قلب کی آواز ان اونچی پکاروں میں نہیں

روح کے زخموں سے رستا ہے لہو اب تک نظامؔ
باسلیقہ کوئی میرے چارہ کاروں میں نہیں

نظام آبادی

جب فریبِ نظر یاد آئے
زندگی کے قدم ڈگمگائے

بھول کر بھی جو ہم مسکرائے
مدتوں ہم نے آنسو بہائے

غم تھے جتنے بھی اپنے پرائے
دل نے کتنی خوشی سے اٹھائے

ان بہاروں سے دھوکا نہ کھانا
یہ ہیں صیاد و گلچیں کے سائے

ان کا دامن سجایا ہے میں نے
میرے آنسو بہت کام آئے

چھا گیا ہے خرد کا اندھیرا
کوئی شمعِ محبت جلائے

لوٹ کر سارے اہلِ چمن کو
یہ بہارِ چمن پھر نہ آئے

اک خطائے محبت پہ یوں تو
دل نے کُل زندگی زخم کھائے

درد کے طوفان جب تھم جائیں گے
جب اندھیرے ظلم کے چھٹ جائیں گے
ہر طرف خوشیوں کے بادل چھائیں گے
زندگی سے سارے غم مٹ جائیں گے
جب خوشی کے گیت ہم تم گائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

جب بدل دے گا زمانہ اپنی خو
جب نہ ہوگا امتیازِ رنگ و بو
جب بہے گا یوں نہ غنچوں کا لہو
جب نہ کلیوں کی لٹے گی آبرو
پھول جب ایسے نہ مسلے جائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

جب نہ اجڑیں گی دلوں کی بستیاں
جب نہ ہوں گی ظلم کی خرمستیاں
جب نہ ہوں گی غم کی چیرہ دستیاں
اوج پر جب ہوں گی ساری پستیاں
جب دلوں سے نفرتیں مٹ جائیں گی
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

زیست پر ہوں گے نہ سائے موت کے
بجھ نہ پائیں گے جب آشا کے دیے
کوئی ترسے گا نہ روٹی کے لیے
بلبلائیں گے نہ بچے بھوک سے
جب نہ یوں انساں کو انساں کھائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

جھومتی لہراتی آئے گی بہار
ہر طرف برسے گی جب رم جھم پھوار
جب نہ تولا جائے گا سکوں میں پیار
جب نہ ارباب وفا یوں ہوں گے خوار
سب مرادیں اپنی اپنی پائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

نئے چراغ

نئے چراغ جلاؤ بہت اندھیرا ہے
چمن کو تند ہواؤں نے آ کے گھیرا ہے
فساد و ظلم کا افلاس کا بسیرا ہے

ہیں مشتعل در و دیوار مشتعل راہیں
کہیں ہے بھوک کہیں پیاس اور کہیں آہیں

عوام خوش ہیں، نہ دہقان کو مسرت ہے
خوشی سے جینے کی محنت کشوں کو حسرت ہے
دلوں میں رنج ہے ذہن و نظر کو حیرت ہے

نہ علم و فن، نہ ترقی کی راہ ہے کوئی
نہ اہلِ فکر، نہ عالی نگاہ ہے کوئی

دلوں میں جذبۂ ایثار ہو اگر بیدار
تو کھیتیوں میں ہو غلّے کی خوب پیداوار
ہو صنعتوں میں ترقی تو ہے وطن کا وقار

نہ تنگ آ کے کوئی خودکشی کو نکلے گا
حمید بن کے ہر انساں وطن پہ جاں دے گا

نہ علم و فن کی کبھی ملک میں کمی ہوگی
نہ بھوک ہوگی یہاں اور نہ تشنگی ہوگی
دلوں میں مہر و محبت کی روشنی ہوگی

تو نئے چراغ اگر پیار کے جلائیں گے
ہر ایک دکھ پہ مصیبت پہ فتح پائیں گے

واقعات

فروری ۱۹۷۴ء

نصف اوّل

ل ——— اٹھائیسواں شمارہ

مدیر

عبدالوحید صدیقی

صدر دفتر

ی ۱۰ ، نظام الدین ایسٹ، نئی دہلی ۱۳

ٹیلیفون ——— ۶۱۹۰۹۵

ـ کاپی کی قیمت ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۱۸ روپے

ئین کار ——— ای روز ——— بہزاد راہی
ـ طابع و ناشر : عبدالوحید صدیقی ———
ہمدرد شوز اکنسٹیٹیوٹ پرنٹرز، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی

اداریہ

خودکشی کی دوسری کوشش

پاکستان کے صدر جناب ذوالفقار علی بھٹو آجکل تعلقات توڑنے کی سیاست پر عمل کر رہے ہیں جس رفتار سے بنگلا دیش کو تسلیم کرنے والے ملکوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اسی رفتار سے ان ملکوں کی تعداد بھی بڑھ رہی جن سے پاکستان قطع تعلق کر رہا ہے۔ اگر تعلقات شکنی کی یہ رفتار جاری رہی تو نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کتنے ملکوں سے پاکستان کے سفارتی تعلقات باقی رہ جائیں گے۔

ایسا لگتا ہے کہ پاکستان تعلقات شکنی کی اس مہم پر اپنی مرضی سے عمل نہیں کر رہا ہے بلکہ دنیا کی کچھ طاقتیں اپنی جھینپ مٹانے کے لئے اسکو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ ہر اس ملک سے سفارتی تعلقات منقطع کرے جو بنگلا دیش کو تسلیم کرے ——— اگر پاکستان کوئی طاقتور ملک ہوتا یا سیاسی اعتبار سے ایسا ملک ہوتا جس کی دوستی دنیا کے ملکوں کے لئے اہمیت رکھتی تو اس کی موجودہ روش قابل فہم تھی۔ لیکن ان دونوں باتوں سے پاکستان محروم ہے۔ اس لئے پاکستان کی موجودہ روش خودکشی کی دوسری کوشش تو کہی جا سکتی ہے عقلمندی اور معاملہ فہمی کی بات نہیں قرار دی جا سکتی۔

اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ امریکا اور چین کے آسرے پر پاکستان نے جنگ کی راہ اختیار کی تھی۔ اسے امید تھی کہ یہ دونوں ممالک جنگ میں اس کی بھرپور مدد کریں گے۔ امریکا کے ساتویں بیڑے کی خلیج بنگال میں آمد بھی پاکستان کو امریکی امداد کا یقین دلانے کی ایک چال ہی تھی۔ لیکن پاکستان اور پوری دنیا نے دیکھ لیا کہ چین اور امریکا کی حمایت اور ان دونوں ملکوں کے امداد کے وعدے فریب محض کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ اس لئے اگر اب بھی پاکستانی حکمرانوں کو یہ امید ہو کہ ان دونوں ملکوں کی مدد سے وہ حقیقتوں کو بدل دینگے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اب بنگلا دیش کی آزاد حیثیت کو ختم کرنا ناممکن ہے۔

شیخ مجیب کی رہائی کے بعد یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ پاکستان میں اب جنرلوں کی سیاست کا خاتمہ ہو جائے گا اور جمہوری ذہن کو تقویت حاصل ہوگی لیکن بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آج بھی پاکستان کے حکمرانوں کا ذہن نہیں بدلا ہے۔ اس روش کے نتیجے میں پاکستان مزید کمزور ہوگا اور برصغیر میں امن و سلامتی کے امکانات مزید تاریک ہو جائیں گے۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ تعلقات شکنی کی موجودہ سیاست سے پاکستان بنگلا دیش پر اپنے حق کو زندہ رکھ سکے گا لیکن اس حق کو زندہ رکھنے کے سلسلے میں پاکستان کو جو نقصانات ہونگے وہ اس فائدے سے کہیں زیادہ ہیں۔ پاکستان کی تمام توانائیاں جنگی تیاریوں پر صرف ہونگی، ملک کے اندر بے چینی کا عالم رہے گا، صنعتی اور اقتصادی ترقی کی راہیں مسدود ہوں گی، بین الاقوامی برادری میں اس کے دوستوں کی تعداد بھی گھٹ جائے گی اور ان سب کا نتیجہ نئی ڈھاکہ کے تین پات ـ کی شکل میں نمودار ہوگا۔

پاکستان کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ سیاست کی دنیا میں کوئی بھی کسی کا مستقل دوست یا مستقل دشمن نہیں ہوتا۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ چین اور امریکا کی دشمنی کا خاتمہ بھی اب قریب آرہا ہے۔ اس لئے اگر آج امریکا اسکا دوست ہے تو کل مخالف بھی بن سکتا ہے، اور اگر آج چین ہندوستان سے دشمنی رکھتا ہے تو کل چین اور ہندوستان کے درمیان دوستی بھی ہو سکتی ہے ———

ان حالات میں پاکستان کے لئے بہتر صورت یہی ہوگی کہ وہ چین اور امریکا کے مفادات پر اپنے مفادات کو قربان نہ کرے اور اسے ہزاروں دشواریوں اور مصائب سے دوچار ہونے کے بعد کل جو راستہ اختیار کرنا ہے وہی راستہ آج اختیار کرلے۔ اب برصغیر میں امن و سلامتی کا انحصار بنگلا دیش، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نفرت و حقارت کے جذبات کے خاتمے پر ہے۔ ان ہی جذبات کے نتیجے میں پاکستان کے بے رحم فوجی حکمران خودکشی کر چکے ہیں، اور اب پاکستان کے نام نہاد دوست صدر بھٹو کی قیادت میں پاکستان سے سیاسی خودکشی کی راہ پر چلنے کی توقعات قائم کئے ہوئے ہیں ——— کاش پاکستان کے عوام ان چالوں کو سمجھیں اور اپنے خوش آئند مستقبل کے لئے بنگلا دیش کی حیثیت کو تسلیم کرکے برصغیر میں امن و سلامتی کے نئے دور کا آغاز کرنے والوں کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے پر تیار ہو جائیں۔ ••

شاہ مہندرا کا انتقال

یوں تو دنیا میں آج بھی سب سے زیادہ بادشاہ ہیں لیکن نیپال کے بادشاہ بیر بکرم شاہ دیوا دنیا کے واحد عوامی بادشاہ تھے، اور انکے عوامی بادشاہ بننے میں ہندوستان کا جو کردار رہا ہے اسے شاید کبھی نہ بھلایا جا سکے گا۔

شاہ مہندرا کے والد شاہ تربھون راناؤں کے چنگل میں بری طرح پھنسے ہوئے تھے اور وہ اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد اپنے محل کی چہار دیواری میں قیدیوں کی سی زندگی گزار رہے تھے لیکن ہندوستان کی بے لوث امداد کے ذریعے انہوں نے راناؤں کے چنگل سے نجات حاصل کی اور انکی موت کے بعد مہندرا کو عوام کے قریب آنے کا موقع ملا۔

شاہ مہندرا نے ۳۵ سال کی عمر میں ۱۹۵۵ء میں تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد ناطرفداری کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا اور اپنی پسماندہ ریاست کو انتہائی دانشمندی کے ساتھ پسماندگی سے نکالنے کی کوششیں کیں۔ انھوں نے اپنے ملک میں بہت سے سماجی اور اقتصادی انقلابات برپا کئے اور بادشاہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے عوام کو جاگیردارانہ نظام کے چنگل سے نجات دلائی۔ یہی وجہ ہے کہ نیپال کے عوام کو اپنے بادشاہ سے بے انتہا محبت تھی اور انکے انتقال پر انھوں نے اس طرح غم منایا جیسے انکے خاندان کا سربراہ اٹھ گیا ہو۔

شاہ مہندرا کی جگہ پر انکے بڑے بیٹے شاہ برندرا نے نیپال

کی حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ چونکہ وہ جدید تعلیم سے لیس ہیں اور جدید دور کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں اس لئے امید ہے کہ نیپال میں تعمیرات کا جو عمل شاہ مہندرا نے شروع کیا تھا وہ شاہ برندرا کی قیادت میں جاری رہے گا۔ ••

آسام کے وزیر اعلیٰ کا استعفیٰ

آسام میں ریاستی اسمبلی کے لئے کانگریسی امیدواروں کے انتخابات کے سوال پر اچانک شدید اختلاف رائے پیدا ہونے کے نتیجے میں وزیر اعلیٰ مسٹر ایم ایم چودھری نے استعفیٰ دے دیا اور ایڈہاک پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر مسٹر سرت چندر سنہا نے نئے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ریاست کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ مسٹر چودھری نے کئی اصولوں کی بنا پر استعفیٰ دیا۔ وہ پردیش کانگریس کی جگہ پر ایڈہاک کمیٹی کی تقرریوں کے مخالف تھے اور یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ پردیش ایکشن کمیٹی انکے ۱۰ ساتھی وزیروں کو ٹکٹ دینے سے گریز کرے۔ لیکن انکی طاقت اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنی دونوں باتوں کو منوا سکتے۔ اس لئے انھوں نے جھگڑے کو طول دینے کی بجائے کھلاڑیوں کی اسپرٹ سے کام لیتے ہوئے اپنا استعفیٰ دے دیا۔

مسٹر چودھری کے نظریات سے کوئی اختلاف کرے یا اتفاق، لیکن ان کے اس اقدام کی ہر شخص تعریف کرے گا کہ انھوں نے اپنی کمزوری کو محسوس کر لینے کے بعد آسام میں سیاسی بے چینی کے لئے راہ ہموار نہیں کی بلکہ ان لوگوں کے لئے میدان چھوڑ دیا جو ان سے زیادہ طاقت ور تھے۔ انھوں نے یہ ایک اچھی جمہوری مثال قائم کی ہے۔ اس سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو جمہوریت میں اپنی طاقت کم ہو جانے کے باوجود اکثریت کے فیصلے کو نہیں مانتے اور اقتدار کے لئے ملک کی سیاسی فضا تک کو پراگندہ کر دیتے ہیں۔ ••

مدھیہ پردیش میں تبدیلی

مدھیہ پردیش میں بھی آسام ہی کی طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن مدھیہ پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر شکلا نے آسام کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر ایم ایم چودھری کی طرح اخلاقی جرات کا ثبوت دینے میں قدرے پس و پیش کیا۔ وہ بار بار دہلی آئے، انھوں نے مرکزی قیادت کو کسی طرح سے منانے کی کوشش کی اور جب انھوں نے یہ دیکھ لیا کہ انکی کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہوگی تو وہ مجبوراً مستعفی ہو گئے۔

اب مسٹر شکلا کی جگہ پر مسٹر پی سی سیٹھی رقبے کے اعتبار سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے وزیر اعلیٰ بن گئے ہیں اور ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اسمبلی کے انتخابات ہیں۔ جن سنگھ سے لوہا لینا ہے جو مدھیہ پردیش میں راج ماتا گوالیار کی مدد سے برسر اقتدار آنے کے دعوے کر رہی ہے۔ مسٹر سیٹھی نے جو مرکز میں وزیر مملکت برائے پیٹرولیم و کیمیکلز تھے وزارت اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد امید ظاہر کی کہ کانگریس مدھیہ پردیش اسمبلی کی ۲۹۶ نشستوں میں سے ۲۰۰ پر قبضہ کرے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جن سنگھ کا اگر یہ خیال ہے کہ وہ ریاستی حکومت پر قبضہ کر لے گی تو وہ خوابوں کی دنیا میں رہتی ہے۔

لیکن مسٹر شکلا اور انکے حامیوں کی طرف سے کانگریسی امیدواروں کی انتخابی مہم کو ناکام بنانے کی کوشش کے امکانات کی موجودگی میں انھیں بڑی دانشمندی اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ ••

پھول اور کانٹے

● دیسی شراب کی کافی دوکانیں کھولی جائیں۔ ایک اخباری سُرخی

—— تاکہ لوگ نقلی شراب پی کر مرنے کی بجائے اصلی شراب پی کر مرا کریں۔

● فرقہ پرستوں سے بچو —— قوم کو اندرا جی کا انتباہ۔

—— لیکن فرقہ پرستی تو اس ملک میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور وبا سے خدا ہی بچا سکتا ہے خود انسان کے لئے وبا سے بچنا محال ہے۔

● دہلی کارپوریشن کا بجٹ سوشلزم سے کوسوں دور —— ایک اخباری سُرخی۔

—— جن سنگھ نے کب سوشلزم کا دعویٰ کیا ہے جو اسکے بجٹ کے غیر سوشلسٹ ہونے کی شکایت کیجاتی ہے۔

● پنجاب کے ۴۵ کانگریسی امیدواروں کا فیصلہ ——

—— ہم الیکشن نہ لڑیں گے۔!

● دو ماہ کے اندر روزگار —— مدھیہ پردیش سرکار کی نئی اسکیم۔

—— خیال رہے کہ دو ماہ کے بعد ریاستی اسمبلی کے انتخابات بھی ختم ہو جائیں گے۔

● چرن سنگھ نے بی کے ڈی کو توڑنے کی تحریک کی تردید کی ہے —— ایک خبر۔

—— شاید انھیں آخری رسوم کی ادائگی کا انتظار ہے۔

● مرارجی ڈیسائی نے پاکستان کے ٹوٹنے کا الزام نکسن اور چاؤ این لائی پر لگایا ہے۔

—— لیکن اس میں ہندوستان کا کیا نقصان ہوا۔؟

● دلائی لاما تبت میں رائے شماری کرانے کے حق میں۔

—— لیکن ماؤزے تنگ تو اس کے حق میں نہیں ہیں۔

● وزیر اعظم ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد کابینہ میں ردو بدل کریں گی۔

—— لیکن بہتوں کی نیند ابھی سے حرام ہو گئی ہے۔

● جی ڈی برلا نے امریکی امداد کی منسوخی کا خیر مقدم کیا ہے

—— اب وہ زیادہ رقم دے کر زیادہ منافع کما سکیں گے۔

آتشزدہ جہاز کے کپتان

ذوالفقار علی بھٹو

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ــــ جنہیں پیار سے بچپن میں انکے والدین ذلفی کہتے تھے، ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کو لاڑکانہ (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ انکے والد سر شاہ نواز خاں بھٹو اپنے صوبے کے سب سے بڑے زمینداروں میں سے ایک تھے۔ وہ دو سال (۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء) بمبئی کی حکومت میں وزیر کے عہدے پر مامور رہے اور اس کے بعد جوناگڑھ کے دیوان مقرر کئے گئے جو ۱۹۴۹ء میں ریاست کے ہند میں ادغام تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مسٹر بھٹو کے والدین پاکستان ترک وطن کر گئے۔

مسٹر بھٹو نے ایک دولت مند گھرانے میں جنم لیا تھا۔ اسی ماحول میں انکی پرورش ہوئی اور اعلیٰ سطح پر انکی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کراچی میں ہوئی لیکن بعد میں انھیں بمبئی کے کیتھیڈرل اینڈ جان کونن اسکول میں داخل کر دیا گیا جو دولتمندوں کا اسکول سمجھا جاتا تھا۔

بھٹو خاندان کئی برس بمبئی میں رہا اور بمبئی کی رنگین زندگی میں اسے گھلنے ملنے کا خوب موقع ملا۔ اعلیٰ حلقوں میں اس خاندان کے افراد کا ملنا جلنا تھا۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے مسٹر بھٹو امریکا بھیجے گئے ــــ برکلے (کیلیفورنیا) یونیورسٹی سے انھوں نے گریجویشن لیا اور اس کے بعد کرائسٹ چرچ کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے، بعدازاں لنکنس ان سے قانون کی ڈگری لی اور کچھ عرصے تک انھوں نے ساؤتھمپٹن یونیورسٹی انگلینڈ میں بین الاقوامی قانون کا مطالعہ کیا اور پھر ۱۹۵۳ء میں کراچی واپس آگئے جہاں ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی لیکن وکیل کی حیثیت سے انھوں نے کوئی خاص مقام پیدا نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ انھیں وکالت سے کم اور سیاست سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اور ایک دولت مند فرد کی حیثیت سے انھیں اس میدان میں آگے بڑھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی ــــ

اس کے لئے انھیں ایک اچھا موقع اس وقت مل گیا جب ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب خاں نے ملک میں مارشل لا کا اعلان کیا اور ایک نئی حکومت بنائی۔ اس حکومت میں مسٹر بھٹو کو وزیر تجارت کی حیثیت سے شامل کیا گیا اسوقت انکی عمر صرف تیس برس تھی ــــ اور دوسرے تمام وزیروں میں سب سے کم عمر تھے ــــ اس کے بعد وہ کئی عہدوں پر مامور رہے ــــ قومی تعمیرات نو اور اطلاعات و امور کشمیر ــــ صنعت و حرفت اور قدرتی وسائل۔ ۱۹۶۳ء میں انھیں وزیر خارجہ بنایا گیا جب وہ ایک پاکستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے کشمیر کے مسئلے پر بات چیت کرنے کے لئے دہلی آئے۔

وزیر خارجہ کی حیثیت سے انھیں اس بات کا کریڈٹ حاصل ہے کہ انھوں نے چین کے ساتھ دوستی کی۔ ہندوستان کے معاملے میں انکا رویہ بہت سخت تھا۔ ۱۹۶۵ء میں ۲۲ دن کی جنگ کے بعد جب تاشقند میں جنگ بندی کا معاہدہ ہوا تو انکی طرف سے اس معاہدے کی مخالفت کی گئی اس پر ان کے اور صدر ایوب کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی نتیجے میں مسٹر بھٹو وزارت سے مستعفی ہوگئے۔ کچھ دن خاموش رہے، ۱۹۶۷ء میں پھر سیاست میں آئے اور صدر ایوب خاں کے خلاف کھل کر نکتہ چینی کی ــــ پہلے مسلم لیگ کے سرگرم ممبر تھے، اس کے سکریٹری جنرل بھی رہ چکے تھے۔ لیکن اس مرتبہ انھوں نے بائیں بازو کی پیپلز پارٹی کے نام سے ایک نئی پارٹی قائم کی۔ یہ پارٹی یکم دسمبر ۱۹۶۷ء کو قائم کی گئی اور مسٹر بھٹو نے اپنی پارٹی کے مقاصد ان الفاظ میں بیان کئے ہے۔ "اسلام ہمارا عقیدہ ہے، جمہوریت ہماری پالیسی ہے، اور ہم عوام کے اقتدار اعلیٰ پر یقین رکھتے ہیں۔"

دو سال بعد انھیں عوام کو تشدد کے لئے بھڑکانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور تین ماہ کی جیل کاٹی ــــ اس سے انکی شہرت اور ہوگئی اور جب رہا ہوئے تو عوام نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ــــ صدر ایوب خاں خاص طور پر اپنے لڑکے کے کرتوتوں کی بنا پر بہت بدنام ہو چکے تھے۔ مسٹر بھٹو کو موقع مل گیا اور انھوں نے صدر ایوب کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ انھیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا انھوں نے حکومت کی باگ ڈور صدر یحییٰ خاں کے سپرد کر دی۔

صدر یحییٰ خاں نے سول حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ اپنے اس وعدے کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے دسمبر ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات کرائے جس میں شیخ مجیب الرحمٰن کی جماعت عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان کی ۱۶۹ سیٹوں میں سے ۱۶۷ سیٹیں ملیں اور مغربی پاکستان کی ۱۴۴ سیٹوں میں ۸۵ سیٹیں (بھٹو کی پیپلز پارٹی۔) کو حاصل ہوئیں ــــ لیکن ان انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کا اجلاس کبھی نہ بلایا جا سکا ــــ بھٹو صاحب کی مہربانی سے مشرق و مغرب کا تنازعہ شروع ہوا، اور ایسے شروع ہوا کہ مشرقی پاکستان "آزاد بنگلادیش" میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

مسٹر بھٹو بہت پرجوش اور چالاک سیاستدان ہیں لیکن انکی طبیعت میں ابھی کچا پن موجود ہے۔ کبھی وہ بڑے خوش خلق اور بامروت نظر آتے ہیں اور کبھی نہایت تندخو اور بدمزاج ــــ کبھی ہندوستان سے دوستی کی باتیں کہتے ہیں اور کبھی ایک ہزار سال تک لڑنے کا اعلان کرنے لگتے ہیں۔

حصول اقتدار کی ہوس انکے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے صدر کے عہدے پر پہونچنے کے لئے جہاں کہ وہ پہونچنا چاہتے تھے وہ آج اپنے آپ کو مبارکباد دے سکتے ہیں اسلئے اگر سابق صدر یحییٰ خاں شیخ مجیب الرحمٰن سے کوئی مصالحت کر لیتے تو بھٹو صاحب کبھی بھی اپنے ملک کے صدر نہ بن سکتے تھے۔ یہ ان ہی کی ذات تھی کہ جس نے یحییٰ مجیب ــــ بات چیت کو کامیاب نہ ہونے دیا اور دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

کل وہ اس بات کے بھی روادار نہ تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کو منظور کر لیں۔ لیکن آج پورا پاکستان انکے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔

بھٹو صاحب اب اپنے ملک مغربی پاکستان کے صدر ہیں انکا برسوں کا خواب پورا ہو گیا ہے لیکن خود انکے بقول وہ ایک ایسے جہاز کے کپتان بنائے گئے ہیں جس میں آگ لگی ہوئی ہے جو برباد ہو چکا ہے اور جسکے ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ دیکھیں وہ اس "ڈوبتی نیا" کو کیسے پار لگاتے ہیں ــــ اسکا انحصار انکی صلاحیتوں پر ہے۔

واقعات نئی دہلی

ذلفی ـ تا ـ ذوالفقار علی بھٹو ـ چند یادیں

بھٹو خاندان کئی برس بمبئی میں رہا اور بمبئی کی رنگین زندگی میں اسے کھلنے ملنے کا خوب موقع ملا ـ خود مسٹر بھٹو کے مخصوص دوستوں میں مسٹر پیلو مودی کا نام سرفہرست ہے ـ (مسٹر مودی آجکل ہند پارلیمنٹ کے ممبر ہیں)

مسٹر مودی اپنے یار ذلفی کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں یہ ان ہی کی زبانی سنیئے: پچھلے دنوں جب ایک صحافی نے ان سے مسٹر بھٹو کے بارے میں انٹرویو لیا تو بولے:

" ارے وہ ذلفی شراب اور لڑکیوں کا رسیا ـ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ بچہ تھا ـ وہ مجھ سے بہت چھوٹا ہے پورے دو برس ـ بہت چیخ کر بولتا تھا ـ کافی شائستہ نظر آتا تھا ـ پرجوش و متحرک ـ دراصل وہ میرے ایک چچازاد بھائی کا دوست تھا ـ یہ ۳۹ - ۱۹۳۸ء کی بات ہے اس وقت ہم دونوں بمبئی کے ایک ہی اسکول میں تھے یعنی کیتھڈرل اسکول میں ـ لیکن میری اس کی دوستی اس وقت ہوئی جب وہ سینئر کیمبرج کر رہا تھا ـ اور پھر ہم دونوں گہرے دوست بن گئے گھنٹوں ہم بیٹھے رہتے ـ اور اپنی زندگی، اپنے مستقبل اور سیاست پر گفتگو کیا کرتے "

(مسٹر پیلو مودی اس موقع پر اپنا البم اٹھا لائے جو خود انکے اور مسٹر بھٹو کے فوٹوؤں سے بھرا تھا اور جو ان کے نوجوانی کے دنوں کی یاد دلاتا تھا)

اور پھر انھوں نے بات چیت کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا: " وہ فاتح نوازتھا اور میں نہرو نواز ـ ان تمام برسوں میں میں نے یہ تاثر لیا کہ وہ بڑا فراخدل اور باوفا تھا اور انتہائی جاہ طلب ـ ہم بمبئی کے ولنگڈن کلب کے تالاب کے کنارے بیٹھے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے "

مسٹر پیلو مودی اپنے دوست کے بارے بتاتے بتاتے چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے ـ وہ ماضی کے اس زمانے میں کھو گئے تھے جو انھوں نے مسٹر بھٹو کے ساتھ گزارا تھا ـ

کہنے لگے " اس کے بعد کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ہم روم پارٹنر بن گئے ـ سینئر کیمبرج کے امتحان میں بھٹو کچھ زیادہ ذہین ثابت نہ ہوا لیکن یونیورسٹی میں پہونچ کر وہ بہت ذہین نکلا ـ اسکی یادداشت بڑی زبردست تھی ـ وہ ہر بات کو یاد رکھتا تھا ـ سیاسی کتابوں کا بہت مطالعہ کرتا اور جو کچھ پڑھتا اس سے اپنے دلائل کو وزن دار بنانے میں کام لیتا ـ وہ ملک کی تقسیم کے حق میں تھا کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ پاکستان میں اسے ابھرنے کے مواقع زیادہ ملیں گے ـ میں نے پیش گوئی کی تھی کہ پاکستان واپس پہونچنے کے سات سال بعد وہ وزیر کے عہدے پر پہونچ جائے گا ـ اسے صدر بننے کے لئے بیس برس کا عرصہ لگا "

" مسٹر بھٹو کی، عادتیں کیا تھیں"؟ مسٹر پیلو مودی سے سوال کیا گیا ـ

" مجھے یاد ہے بھٹو فرصت کے اوقات کا بڑا دلدادہ تھا " مودی صاحب نے جواب دیا ـ یہی کیفیت میری بھی تھی ـ ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے ـ صبح ساڑھے سات بجے ہم دونوں ولنگڈن پہونچ جاتے ـ ٹینس کھیلتے، مشروبات سے لطف اندوز ہوتے اور ایک بجے تک سوئمنگ پول میں تیرتے رہتے ـ دوپہر کا کھانا کھاتے اور پکچر دیکھنے چلے جاتے، وہاں سے پھر کلب چلے جاتے واپس آ کر گھر والوں کے ساتھ ڈنر لیتے اور اس کے بعد چہل قدمی کے لئے نکل جاتے ـ ہم بمبئی کے جے جے اسکول آف آرٹس میں ۴۵ سے ۱۹۴۷ء تک ایک ساتھ رہے ـ کیا خوب زمانہ تھا ـ

آتا ہے یاد مجھکو گزرا ہوا زمانہ "

" انکی کچھ اور خصوصیتوں پر کچھ روشنی ڈالیں مودی صاحب " نامہ نگار نے کہا ـ

" وہ بڑا خوش پوش لڑکا تھا " مودی صاحب سگریٹ کا کش لگا کر بولے " طبیعت میں بڑی نفاست پسندی تھی ـ صاف ستھرا اور سلیقے کا ڈریس زیب تن کرتا ـ دوسروں سے بھی چاہتا تھا کہ لباس کے معاملے میں باسلیقہ رہیں ـ سن ۴۵ ـ ۶ کی بات ہے جب ہندوستان کی کرکٹ ٹیم انگلستان جارہی تھی تو اس نے اپنے والد کو اس بات کے لئے رضامند کر لیا کہ وہ تمام کھلاڑیوں کے لئے عمدہ سوٹ تیار کرا دیں تا کہ سب کھلاڑی طرحدار نظر آئیں ـ وہ خود کرکٹ کا شوقین تھا اور مشتاق علی

بھٹو اور پیلو مودی بمبئی کے ولنگڈن کلب میں ٹینس کھیلنے کے بعد ——— ۱۹۴۶ء

کھلاڑی تھا۔"

پیلو موری اور بھٹو بمبئی میں کچھ زیادہ فاصلے پر نہ رہتے
ایک دوسرے کی پرائیویٹ زندگی میں دخیل تھے۔
ت ایک دوسرے سے پوشیدہ نہ تھی کہنے لگے۔
بھی بھی مسرف نہیں رہا۔ جتنی رقم اس کے پاس ہوتی
کم خرچ کرتا تھا۔ ہاں من موجی ضرور تھا۔ ایک شب
پینے اور قہوے کی ایک پیالی لینے کے لئے کیلی فورنیا
دور برکلے سے کار میں پہونچا اور واپس آیا۔"
کے پاس کار تھی؟" نامہ نگار نے سوال کیا۔

میں وہ ہمیشہ میری کار استعمال کرتا تھا۔" پیلو موری
نے۔ لیکن وہ میرے دوسرے دوستوں کی طرح رہتا تھا"
کی ایک اور خوبی مسٹر پیلو موری نے یہ بتائی کہ "وہ بڑا نقال
بسروں اور دوستوں کی بہترین نقل اتارتا تھا۔ لیکن
معاملے میں بڑا محتاط تھا اور اپنے دوستوں کے دوستوں
ستی نہ کرتا تھا۔"

ودی صاحب نے فرمایا "ابھی آزادی کو زیادہ زمانہ نہ
زلفی پاکستان کے معاملے میں کچھ مایوس سا نظر آنے
دن کہنے لگا "پاکستان ناکام ہوگیا ہے"۔ میں نہیں
اس نے یہ بات کیوں کہی اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ
نظریات کب اس کے ذہن میں آئے۔ غالباً وہ
ن کے سوشلسٹ نظریات کے پروپیگنڈے سے متاثر

ہوا ہوگا۔"

"زلفی کرشنا مینن کا بڑا مداح تھا اور کہتا تھا کہ اقوام متحدہ
میں انھوں نے جو پارٹ ادا کیا ہے اس سے ہندوستان کی
کافی اہمیت بڑھی ہے اور دنیا اس کی طرف متوجہ ہوگئی ہے۔
بہرحال اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود زلفی نے مسٹر کرشنا مینن
کا رول ادا کرنا شروع کردیا ہے۔ اقوام متحدہ میں اس نے
اپنے ملک کی طرف سے جو رول ادا کیا ہے اس سے یہی ظاہر
ہوتا ہے۔"

کیلیفورنیا اور لنکنس ان کے بعد مسٹر بھٹو کے ساتھ مسٹر
پیلو موری کا رابطہ قائم نہ رہا لیکن یونہی سرسری طور پر چار مرتبہ
ملاقات ضرور ہوئی۔ انکی آخری ملاقات ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ کو ہوئی
تھی، فرمانے لگے:۔

"میں نے محسوس کیا کہ اس میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی
ہے اور میری توقعات کے مطابق ہی وہ چل رہا ہے۔ وہ
ہمیشہ اینٹی۔۔۔۔" موری صاحب اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ
رک گئے اور نامہ نگار سے بھی کہا کہ وہ اپنا قلم روک لے۔
انھوں نے کہا کہ آگے کے الفاظ "آف دی ریکارڈ" ہیں۔ یہ
"آف دی ریکارڈ" الفاظ کیا ہوسکتے ہیں ہر شخص بہ آسانی
اندازہ لگا سکتا ہے۔ یعنی "اینٹی ہندوستان"۔
اور پھر موری صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ جیسے
انھیں زلفی کی کوئی بات یاد آگئی ہو۔ فرمایا:۔

۱۹۴۵ء۔ زلفی بمبئی کے اپنے مکان کھیا مینشن میں آرام کرتے ہوئے۔

"زلفی کو اپنے گھر والوں کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔ اسکے
اندر محبت کے بڑے جذبات تھے۔ کبھی کبھی وہ اس لئے
محبت کرتا تھا کہ کوئی اس سے محبت کرے۔ لیکن ایک
لڑکی کی طرف اسکا بڑا رجحان تھا۔ میرا خیال ہے وہ اسکو
کبھی نہیں بھولا۔ اس کے والدین اس معاملے میں قطعی مخالف
تھے۔ لیکن۔" موری صاحب نے فرمایا "یہ لڑکی مشہور
فلم اسٹار نرگس نہیں تھی جس کے ساتھ اکثر بھٹو کا نام جوڑ کر انکے
رومانی قصے گڑھے گئے ہیں۔"

"خود فلم اسٹار نرگس کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"
ایک صحافی نے جب نرگس سے پوچھا "کیا آپ کے اور مسٹر بھٹو
کے درمیان خصوصی تعلقات تھے؟":

"جی بالکل نہیں۔ وہ اکثر و بیشتر اسٹوڈیو آیا کرتا تھا۔
اس وقت جب میں شوٹنگ میں حصہ لیتی تھی۔ لیکن جونہی وہ
آتا، بیگم پارہ (اس وقت وہ مشہور فلم اسٹار تھی) اور میں
کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے تمسخر کی ہنسی ہنستے
اور ذوالفقار کو برا بھلا کہتے۔"

"مگر آپ کے اور بھٹو کے بارے میں بڑی دلچسپ کہانیاں
سننے میں آئی ہیں" صحافی نے کہا۔

"جی ہاں بہت سی کہانیاں ہیں" نرگس بولی۔ "لیکن میں
نہیں سمجھتی کہ میرے ساتھ اسے اس سے زیادہ لگاؤ تھا جو نوجوانوں
کو ہر لڑکی دیکھ کر ہوجاتا ہے۔ فلمی دنیا میں یہ شاید اس وقت
کی میری بڑھتی ہوئی شہرت تھی جس نے اسکو متوجہ کرلیا۔ ہم
اکثر ایک ہی پارٹی میں شامل ہوتے تھے اس لئے دوست بننا
قدرتی تھا۔ وہ دلچسپ اور دل پسند لڑکا تھا لیکن شرمیلا
تھا۔ دراصل یہ اسکا بھائی یا چچازاد بھائی سکندر تھا جو مجھے پریشان
واقعات [illegible]

۱۹[illegible]ء میں لاس اینجلز میں لی ہوئی ایک تصویر —— بھٹو اپنے ہندوستانی دوستوں کے ساتھ

کرتا تھا اور ہروقت میرے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ کہتا "تم مجھ سے شادی نہ کروگی تو خودکشی کرلوں گا"۔

خانگی زندگی کے بارے میں نرگس بولی۔ میرے ملنے جلنے والوں میں کسی کو بھی اسکی خانگی زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیل معلوم نہیں تھی (وہ کرکٹ کلب یا ولنگڈن کلب زیادہ جاتا تھا۔) البتہ ایک ملنے والے نے یہ مشکوک سی اطلاع ضرور دی کہ ذُلفی کے تین چار سوتیلے بھائی ہیں جو اس سے نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ گانے والی کا لڑکا ہے"۔

"کیا نوجوان بھٹو کے بارے میں آپ کا اندازہ تھا کہ وہ مستقبل میں کیا بننے والا ہے"!

مجھے کبھی اسکا اندازہ نہ ہوا۔ بھٹو کی جو نئی شکل میرے سامنے ہے میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بڑے زمیندار کا لڑکا ہے شہزادوں جیسی طبیعت پائی ہے۔ گھوڑ دوڑ، کاک ٹیل پارٹیاں، شکار اور رقص یہ اس کی دلچسپیاں تھیں۔ مجھے معلوم ہے وہ ہر سنیچر کو ایک نئی اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ رقص کرتا تھا۔ اس کے والد جوناگڑھ کے دیوان تھے اور وہ دولت میں کھیلتا تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ وہ کسی دولت مند خوب صورت عورت سے شادی کرے گا۔ اپنے والد کے کاروبار میں لگ جائے گا۔ خوبصورت سکریٹریز رکھے گا اور ایک دولتمندانہ رنگین زندگی گزارے گا"۔

"آپ کی بھٹو سے ملاقات کب ہوئی"۔ نرگس سے پوچھا گیا اور انھوں نے جواب میں کہا:۔

"میری اس سے ملاقات ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی جب میری عمر ۱۴ برس تھی اور فلمی دنیا میں داخل ہی ہوئی تھی۔ میری ماں مشہور فلم اسٹار ببّو کی سہیلی تھی جس نے ذوالفقار کے بھائی یا چچازاد بھائی امداد علی بھٹو سے شادی کرلی تھی۔ انکے صحیح رشتے کا کبھی پتا نہ چلا۔ امداد کے بھائی سکندر اور بھٹو ہماری جماعت کا حصہ بن گئے۔ پکنک پارٹی ہو یا شکار پارٹی یا فلم بینی۔ ہم سب ساتھ رہتے تھے۔

اور پھر نرگس بولی "تقسیم کے بعد اسکا خاندان پاکستان چلا گیا اور اس کے بعد اسکا خیال بھی ذہن میں نہ آیا تا آنکہ میں نے دیکھا کہ اخبارات میں بھٹو کا بڑا نام آرہا ہے۔ پہلے مجھے یقین نہ آیا کہ یہ وہی لڑکا ہے جسے میں جانتی ہوں ــــــ وہ اسوقت کتنا بدل گیا ہے۔ ●●

(جہاں گرد کے قلم سے)

آئندہ مارچ میں ہونے والے گیارہ ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات کی تیاریاں زور وشور سے جاری ہیں۔ لیکن اس بات کو کانگریس کے بدترین مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہوا کا رخ کانگریس کی طرف ہے۔ اس رُخ کو بدلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا جارہا ہے، جس کی کامیابی کے زیادہ امکانات نہیں ہیں، لیکن الیکشن میں سب کچھ ممکن ہے۔

ایک بار پھر جن سنگھ نے اپنی قسمت جاگیردارانہ نظام کے محافظوں سے وابستہ کردی ہے حالانکہ جن سنگھ کے غازی آباد اجلاس میں منظور شدہ تجاویز سے سیاسی مبصروں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات کے نتائج سے سبق لے گی، لیکن جس پارٹی کی بنیادوں ہی میں خرابی موجود ہو وہ اپنے راستے کو کیسے بدل سکتی ہے۔

جن سنگھ کو بہار، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں کامیابی کے سب سے زیادہ امکانات نظر آرہے ہیں۔ بہار میں ذات پات کی تفریق اور فرقہ واریت کے سہارے پر جن سنگھ آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ راجستھان اور مدھیہ پردیش میں کانگریسیوں کی باہمی پھوٹ اور جاگیرداروں کی مدد سے وہ ترقی کے منازل طے کرنا چاہتی ہے لیکن یہ سہارے زیادہ مضبوط نہیں ہیں کیونکہ کانگریس لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات میں ان سہاروں کی کمزوری کا واضح ثبوت پیش کرچکی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کانگریس مسز اندرا گاندھی کی عوامی مقبولیت اور حالیہ جنگ میں پاکستان کی شکست سے پورا فائدہ حاصل کرے گی، لیکن ہندوستان کی انتخابی سیاست بڑی نازک ہے اور اکثر وبیشتر اصولوں ونظریات پر جذبات وتعصبات حاوی ہوجاتے ہیں، اس لئے کانگریس کو انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا۔ ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ حالیہ جنگ میں ہندوستان کی جیت نے کانگریس کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے، لیکن اس جنگ کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کی شدت کو بھی کم نہ سمجھنا چاہئے۔ گرانی بڑھی ہے، منافع خوری میں اضافہ ہوا ہے ضروریاتِ زندگی کی بہت سی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی نے عوامی اذہان کو متاثر کیا ہے۔ مخالف پارٹیاں بھی شکست خوردگی کے سنگین احساس میں مبتلا ہیں۔ ان حالات میں وہ امن وقانون کے لئے مسائل پیدا کرسکتی ہیں اور تھوڑی سی غفلت کے نتیجے میں ہوا کا رُخ بدل سکتا ہے۔

اسوقت کسی بھی ریاست میں کانگریس کے مقابلے پر کوئی بڑی سیاسی طاقت نہیں ہے۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ سیاسی طاقت اچانک بنتی اور بگڑتی ہے۔ جن سنگھ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے فن میں تمام پارٹیوں سے زیادہ مہارت رکھتا ہے اور انتخابات سے پہلے وسوسوں کے ذریعے بے چینی پیدا کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرتا اس لئے ریاستی حکومتوں بالخصوص مرکزی حکومت کو جن سنگھ کی چالوں سے ہوشیار رہنا ہوگا۔

انتخابات کے دوران جن سنگھ کی مہم کا کیا رخ ہوگا اسکا اندازہ اسکے لیڈروں کے اخباری بیانات سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ ہم ایک غیرجانبدار مبصر کی حیثیت سے کسی جماعت سے کسی قسم کا بغض نہیں رکھتے۔ لیکن ماضی کے تجربات کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جن سنگھ فرقہ وارانہ فضا کو خراب کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے کیوں نہ ابھی سے اسکا انتظام کرلیا جائے کہ شکست خوردہ عناصر کوئی شرارت نہ کرسکیں۔ ●●

مولانا محمد علی جوہر

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(سلیمان ہندی)

۴ جنوری کا سورج حسب معمول طلوع ہوا اور واقعات کے ناگزیر تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹ کر غروب ہو گیا شب کی سیاہ چادر نے دن بھر کے ہنگاموں پر پردہ ڈال دیا۔ مگر جب اس کی بے چین روح نے ان ہنگاموں، واقعوں اور متفرق پروگراموں پر نظر ڈالی ہوگی تو اسے تعجب خیز حیرانی سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ کہ آج دن بھر میں برصغیر کے کروڑوں عوام میں سے چند ہی لوگوں نے اس عظیم ہستی کی ناقابل فراموش خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جس نے اپنی تمام عمر اور تمام صلاحیتیں ملک و ملت کی سربلندی اور اس کے وقار کے لئے وقف کردی تھیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ جس طرح چٹانوں میں انگلی سے سوراخ کرکے پانی کی دھار نہیں نکالی جاسکتی اسی طرح ہمارے قومی اور ملی کشت زار کو اپنے خون دل سے سینچنے والی شخصیتوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی تاریخ آزادی اور تحریک حریت کے وہ جیوٹ اور کڑیل سپاہی جن کو ہم علی برادران کے نام سے جانتے ہیں نہ صرف اپنی جرات گفتار کے باعث ہمارے احساس پر چھائے ہوئے ہیں بلکہ جذبۂ اخلاص و ایثار کی وجہ سے تاقیامت بھلائے نہیں جا سکتے۔

"مسلمانان ہند کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کرنے کی سب سے زیادہ ذمے داری علی برادران پر عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے کانگریس میں داخل ہو کر نہ صرف امن پسند ہندوؤں کو تحریک آزادی میں شامل کرلیا بلکہ مسلمان فوجیوں کو بغاوت پر آمادہ بھی کیا"
ولنٹائن شرل۔

مولانا محمد علی جوہر اور انکے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کے جذبۂ حریت کا تجزیہ کرنے کے لئے اگر ہم اس دور کے حالات کا جائزہ لینے کی خاطر تاریخ کے صفحات الٹیں تو تین اسباب خاص طور سے سامنے آئیں گے جن کے باعث علی برادران کی جنگ آزادی اور تحریک خلافت نے جنم لیا تھا۔

اگرچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں نے پوری طرح حصہ لیا تھا مگر تاریخ شاہد ہے کہ دیگر برادران وطن کی بہ نسبت مسلمانوں نے زیادہ قربانیاں دیں۔ اس کی خاص وجوہات یہ تھیں کہ انگریزوں نے فریب اور مکاری سے کام لے کر تخت اقتدار پر قبضہ جمالیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی متاع گم گشتہ کو حاصل کرنے کے لئے ایک فیصلہ کن معرکہ سرانجام دیا۔ مگر قیادت کی ناکامی اور اجتماعی شعور کے فقدان کی وجہ سے یہ عظیم الشان جدوجہد تاریخ کے صفحات پر نہ صرف "غدر" کے نام سے محفوظ رہی بلکہ باغیوں کی قیادت اور سلطنت انگلشیہ سے غداری کی وجہ سے انکو بے پناہ جانی اور مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

چنانچہ ردعمل کے طور پر مسلمانان ہند من حیثیت القوم انگریزوں کے خلاف ہو گئے، اور یہ طے کیا کہ انگریز سامراج کی خدمت کرنا یا انگریزی تعلیم حاصل کرنا انگریزوں سے تعاون کے برابر ہے۔ اس کے برعکس دیگر قوموں نے حالات سے سمجھوتہ کرکے انگریزی تعلیم حاصل کی اور حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوکر انکے اقتدار کو مستحکم کرنے کا باعث بنے۔ ان رجحانات کی وجہ سے کچھ عرصے بعد مسلمان زندگی کے تمام شعبوں میں دیگر قوموں سے پیچھے رہ گئے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے سرسید مرحوم اور انکے ساتھی نواب محسن الملک نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ سیاست کی پُرخار راہوں سے بچتے ہوئے مستقبل کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ بدقسمتی سے اس تحریک کو مسلمانوں کے ایک طبقے کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرا سبب حکومت وقت کی پالیسی (پھوٹ ڈالو اور راج کرو) تھی۔ اس پالیسی کے تحت انھوں نے ہر دو فرقوں کی مذہبی کمزوریوں کا پتا لگایا اور انھیں ایک دوسرے کے درپئے آزار کر دیا۔ تیسرا سبب زبان کا مسئلہ تھا۔ انگریزوں کے خریدے ہوئے ابن الوقتوں نے "ہندی قومی زبان ہوگی" کی تحریک شروع کردی جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک طبقے میں اردو کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوگئے۔

الغرض ان اسباب کے مطالعے کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ دور نہ مسلمانوں کے لئے سازگار تھا نہ ہندوؤں کے لئے مفید۔ ان حوصلہ شکن حالات اور پرآشوب دور میں ۱۸۷۸ء کے اواخر میں مولانا محمد علی کا ظہور ہوا۔ آپ میں شروع ہی سے تعلیمی استعداد و قابلیت اپنے ہم عصروں سے زیادہ تھی۔ اس لئے عمر کے بیسویں سال میں امتیازی نمبروں سے بی۔ اے کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اگرچہ آپ کے بھائی مولانا شوکت علی کا خیال انکو آئی۔ سی۔ ایس

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی مرحوم کے ساتھ

آفیسر بنوانے کا تھا۔ اس غرض سے انھوں نے آبائی جاگیر فروخت کر کے انکو آکسفورڈ بھی روانہ کیا۔ مگر محمد علی کی طبیعت ان مضامین میں نہیں لگی۔ مولانا محمد علی انگریزی تحریر و تقریر میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ذہن و قلب بھی حساس پایا تھا اسلئے ہر مسئلہ اور مضمون میں ایسے نکتے پیدا کرتے کہ سننے والے بے ساختہ جھوم اٹھتے۔

لندن سے ڈگری لے کر لوٹنے کے بعد نواب آف رام پور کے اصرار پر آپ ریاست میں افسر تعلیمات رہے۔ اس کے بعد بڑودہ کے کنور فتح سنگھ نے نوساری ضلع کی کمشنری عطا کی جہاں انھوں نے نئے سرے سے انتظام کر کے کافی نام کمایا مگر دوران ملازمت کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ آپ نے ملازمت سے توبہ کی اور اپنی توجہ حالات کے مطالعے کے بعد ملک و ملت کی تعمیر پر مرکوز کر دی کیونکہ آپ انگریزی صحافت میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے تھے اسلئے لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے ۱۱ جنوری ۱۹۱۰ء میں کلکتے سے "کامریڈ" نکالا۔ اس اخبار کی پالیسی اور ادارتی خوبیوں سے متاثر ہو کر بہت سے انگریز بھی خریدار بن گئے۔ مگر مالی وسائل کی کمی اور بی اماں کی وفات کے بعد ۱۹۳۶ء میں یہ اخبار بند ہو گیا۔ جب حالات موافق ہو گئے تو پھر اخبار کے اجرا کا خیال آیا۔ چنانچہ دوسرا اخبار دہلی سے بنام "ہمدرد" نکالا جس نے لوگوں میں بیداری پیدا کر کے حالات کے خلاف جدوجہد پر ابھارا۔ مگر حکومت کی معاندانہ پالیسی کے خلاف مضمون لکھنے کے جرم میں اخبار کو ضبط کر کے محمد علی کو گرفتار کر لیا گیا۔

جب آپ چھندواڑہ جیل میں تھے تو امرتسر میں جلیانوالا باغ کا دلخراش واقعہ پیش آیا۔ اس جاں گسل حادثے نے عوام کو اتنا برافروختہ کر دیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف تشدد پر آمادہ ہو گئے۔ جب پانچ سال بعد آپ رہا ہوئے تو سیدھے امرتسر پہونچے جہاں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ علی برادران تشریف لا رہے ہیں تو نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہوئے لاکھوں کی تعداد میں اسٹیشن روانہ ہوئے اور انھیں جیپ میں بٹھا کر پنڈال تک لائے۔ جلسہ گاہ میں پہونچتے ہی صدر اجلاس پنڈت موتی لال نہرو نے آپ حضرات کا استقبال کیا اور تقریر کی دعوت دی۔ جلیانوالا باغ کے حادثے سے آپ دل گرفتہ تھے ہی، شیدائیانِ آزادی کے سامنے ایسی تقریر کی کہ سارا پنڈال لوگوں کے نعروں سے گونجنے لگا۔ آپ نے کہا:-

"آزادی کے لئے ہمیں پھر جیل جانا چاہیئے۔ ملک کو نظر بند ہونا چاہیئے۔ مسز اینی بسنٹ کو پھانسی پر چڑھنا چاہیئے مگر ان وحشیانہ مظالم کا خاتمہ ہونا چاہیئے جو انگریز جلادوں نے اس باغ میں انجام دیے ہیں"

یہ تقریر ایک ایسی یادگار اور پر اثر تقریر تھی جس نے تمام لوگوں کو محمد علی کا عاشق اور شیدائی بنا دیا۔ اسکے بعد آپ مسلم لیگ کے جلسے میں گئے وہاں بھی ایسی ہی تقریر کی اور لوگوں کو اجتماعی جدوجہد پر ابھارا۔ اسی سال یعنی دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں تحریکِ ترکِ موالات کا پروگرام منظور ہوا اور قیادت کے لئے مہاتما گاندھی کا انتخاب ہوا۔ انھی دنوں میں اسلامی ممالک پر انگریزوں کی جارحیت اور مداخلت کی وجہ سے بمبئی، کراچی اور دیگر صوبوں کی خلافت کانفرنسوں میں انگریزوں کے خلاف عدم تعاون کا ریزولیوشن منظور ہوا۔

مولانا محمد علی بیت المقدس میں مسجد عمر کے صحن کے ایک حجرے میں دفن ہوئے۔ یہ انکا آخری فوٹو ہے ـــــ

چنانچہ ہندو مسلمان دونوں نے انگریزوں کا بائیکاٹ کرنے کی مہم شروع کی۔ کراچی میں خلافت کانفرنس میں دیوبند، فرنگی محل اور دیگر اسلامی مدارس کے تقریباً پانچسو علماء نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا کہ انگریزوں سے تعاون اور انکی ملازمت حرام ہے۔

اس اعلان کے بعد مسلمان شہریوں کے علاوہ پولیس اور فوج نے بھی اپنے استعفیٰ نامے روانہ کر کے قومی اور ملی بیداری کا ثبوت دیا۔ مزید برآں مہاتما گاندھی کے ساتھ علی برادران نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کر کے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کیا۔

ان دوروں کے موقعوں پر آپ کی شعلہ بار تقریروں اور پر اثر بیانات نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے اجلاس اور مشہور لیڈر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سرگرمیاں حکومت کی نظروں میں بری طرح کھٹکنے لگیں۔ ان تحریکوں اور سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مشہور انگریز صحافی ونسٹائل شرل لکھتا ہے۔

"مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے سب سے زیادہ ذمے داری علی برادران پر عائد ہوتی۔ انھوں نے کانگریس میں داخل ہو کر نہ صرف امن پسند ہندوؤں کو تحریک آزادی میں شامل کر لیا بلکہ مسلمان فوجیوں کو بغاوت پر آمادہ بھی کیا۔"

ان تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز سامراج برادران کی سرگرمیوں کو بالکل ناپسند کرتا تھا۔ لہٰذا والٹیئر کے مقام پر ان دونوں بھائیوں کو جبکہ وہ مہاتما گاندھی کے، دورہ کر رہے تھے یکایک ۱۴ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کر لیا گیا۔

رہا ہونے کے بعد مولانا محمد علی کو آل انڈیا کانگریس نے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسے کے لئے بطور صدر منتخب کیا آپ نے دورانِ صدارت انتہائی بردباری اور توازن کے ساتھ ہندو اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر منزلِ آزادی کی طرف پیش رفت شروع کی مگر انگریزوں کی دیرینہ سازش کی بدولت ہندو اور مسلمان نہ صرف ایک دوسرے سے متنفر ہو گئے بلکہ سوامی شردھانند کی جاری کردہ شدھی سنگھٹن تحریک کے بلا ایک دوسرے سے بدگمان بھی ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر مولانا محمد علی کو بہت دکھ ہوا۔ انھوں نے ہندو لیڈروں کو سمجھایا، آ کے واسطے دیے مگر وہ باز نہ آئے بلکہ جلیانوالا جیل میں جہاں ہندو مسلم اسیرانِ آزادی ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھا تھے سوامی شردھانند نے اعلان کیا:-

"اگر مسلمانوں کے ساتھ کھانا کھانے سے آزادی مل سکتی ہے تو میں ایسی آزادی پر غلامی کو ترجیح دوں گا۔"

انگریزوں کا وار کامیاب رہا اور سوامی جی دیگر قیدیوں سے قبل ہی رہا ہو گئے اور رہا ہوتے ہی شدھی سنگھٹن کی تحریک زور سے شروع کر دیا۔ ان حالات سے محمد علی بہت ہی دلگیر ہوئے مگر وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آئے چنانچہ آخر جدوجہد کے طور پر انھوں نے دہلی میں اتحاد کانفرنس منعقد کی اور ہر دو فریقوں کو ایک میز پر اکٹھا کیا۔ اس کانفرنس

(بقیہ ص ۴۵ پر)

مستقبل
کی جنگ
کیا خشکی کے مقابلے میں

میں زیادہ لڑی جائے گی؟

بحری بیڑوں کو بڑھانے کے لیے امریکا اور روس کی دوڑ

امریکا کے محکمہ سراغرسانی کے ذریعہ امریکی حکومت
ا ایسے روسی بحری جہاز کی تصویریں ہاتھ لگی ہیں جو
دو میں زیر تعمیر ہے۔ یہ نصف کے قریب بن چکا ہے
ا سے مکمل کیا جا رہا ہے۔ تصویروں سے ظاہر ہوتا
یہ حملہ کرنے والی فوجوں اور جنگی ساز و سامان کو لے
۔ والا جہاز ہے۔ روس کے پاس اس وقت ایسا کوئی
یں ہے جبکہ امریکا کے پاس ایسے ۱۴ جہاز ہیں۔
اگر روس کے پاس ایسے جہاز نہیں ہیں تو اسکا مطلب
ہ ہے کہ وہ انہیں بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا
ں روس کی اب تک کی پالیسی دفاعی رہی ہے اور
نے اپنے بحری بیڑے کی تنظیم بھی اسی بنیاد پر کی ہے۔
۔ جبکہ ایسا بحری بیڑا تیار کر لیا ہے جو مکمل طور سے
اکا دفاع کر سکتا ہے اس نے حملہ کرنے والے جہازوں
رف توجہ دی ہے۔ اسے امریکا روس کی پالیسی میں
۔ بڑی تبدیلی سمجھ رہا ہے اور اسے اب روس کے
ں کے بارے میں تشویش ہو رہی ہے۔

حملہ کرنے والے جہازوں کے بغیر بھی روس کا
ا بیڑہ بہت طاقتور ہے اور نفسیاتی اعتبار سے اسکی
ت اس کی اصل طاقت سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اسکی
روس کی دوسری سر دیں ہیں جن میں وہ امریکا سے
ہ ہے۔ مثلاً ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک
سنے والے میزائلوں میں وہ امریکا کے مقابلے میں دو
ین کی نسبت سے آگے ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس کے
ا ایسے ۱۵۰ میزائل ہیں۔ روس کے بحری بیڑے میں

اضافہ ۱۹۶۱ء سے یعنی اس وقت سے شروع کیا گیا جب
امریکہ نے بحر منجمد شمالی میں اپنی ایٹمی آبدوزیں ان علاقوں میں
بھیجنے کا فیصلہ کیا جہاں سے روس کے بڑے بڑے نشانے
ان کی زد میں تھے۔ کیوبا کے "مزائل کرائسس" نے روس پر
یہ بات ظاہر کر دی کہ بحریہ کی کتنی اہمیت ہے۔ دس سال
سے بھی کم مدت میں روس نے اپنے بحریہ کو اتنا مضبوط بنا لیا
ہے کہ اس نے جنوب اور شمال دونوں طرف سے ناٹو
ممالک کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا ہے۔ شمالی اوقیانوس
میں اس وقت ناٹو کے ایک جہاز کے مقابلے میں روس
کے چھ جہاز ہیں۔ اسی طرح بحر روم میں امریکا کے چھٹے بحری
بیڑے کے جہازوں کے مقابلے میں روسی جہازوں کی تعداد
بڑھ گئی ہے۔ امریکہ کے چالیس اور روس کے ساٹھ جہاز
اس وقت بحر روم میں ہیں۔ ظاہر ہے اس سے نہ صرف
ترکی، یونان اور اٹلی کو تشویش ہے بلکہ یوگوسلاو بھی
پریشان ہے۔ اس لیے کہ مشرق وسطیٰ کی جنگ کی صورت
میں روسی بحر ایڈریاٹک کے ساحل پر کسی یوگوسلاوی بندرگاہ
کو اپنے کنٹرول میں لینے کی کوشش کریں گے جو ان کے
اڈے کے طور پر کام دیگا۔

اسوقت صورت یہ ہے کہ روس کے جنگی جہاز اکثر و بیشتر
مصری اور شامی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے ہیں۔ مغربی
ممالک کے خیال میں ان کا خاص مقصد اسرائیل کو فضائی
حملوں سے باز رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ اسکندریہ اور لیبیا
کی سرحد کے درمیان وہ نئی بحری سہولتیں مہیا کر رہے ہیں۔
جنگ کی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ اسرائیل کی ناکہ بندی
کر دیں جس سے کہ وہ مغرب کی طرف سے ممکنہ امداد سے
محروم ہو جائے، خواہ اس کے نتیجہ میں امریکا کے چھٹے بحری
بیڑے سے اس کی ٹکر ہی کیوں نہ ہو جائے۔

U.S. (610,000 MEN)	NAVAL STRENGTH	U.S.S.R. (460,000 MEN)
Attack carriers		
Helicopter and support carriers		Helicopter carriers
Cruisers		Cruisers
Destroyers, frigates & destroyer escorts		Destroyers, frigates & destroyer escorts
Nuclear-powered submarines		Nuclear-powered submarines
Other submarines		Other submarines
Landing craft		Landing craft
Torpedo and missile boats		Torpedo and missile boats
Merchant fleet (millions of d w tons)		Merchant fleet (millions of d w tons)

امریکہ و روس کی بحری قوت ——— ایک موازنہ

روسی بحریہ کے چیف مارشل گورشکوف

واشنگٹن کو خلیج فارس اور بحرِ ہند میں بھی روسی بحری بیڑوں کی سرگرمیوں پر تشویش ہے۔ امریکی محکمۂ خارجہ اور محکمہ دفاع کے افسروں کا خیال ہے کہ جلد یا بدیر ہندوستان

روسی بحری کروزر کرسٹا۔۲ جس میں خودکار میزائل لگے ہوئے ہیں بحرِ ہند میں امریکی ساتویں بیڑے کو ان روسی جہازوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

حالیہ ہند پاک جنگ میں روسی امداد کے بدلے کے طور پر بحرِ ہند میں روسی بحری بیڑے کیلئے ہندوستانی ساحل پر بحری سہولتیں مہیا کر دے جیسے کہ مصر نے کی ہیں (ہندوستان نے جسے اپنے بحری بیڑے پر فخر ہے۔ اس قسم کی سہولتیں مہیا کرنے سے انکار کیا ہے)

بحرِ ہند میں روس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیشِ نظر ہی امریکا نے فیصلہ کیا ہے کہ بحرالکاہل میں موجود اسکا ساتواں بحری بیڑا اکثر اوقات بحرِ ہند کا گشت کیا کریگا۔ لیکن اس فیصلے سے جاپان پریشان ہے کیونکہ بحرالکاہل سے ساتویں بحری بیڑے کے چلے آنے سے اسکا دفاع خطرے میں پڑ جائے گا۔ علاوہ ازیں اسے یہ بھی خطرہ ہے کہ چین کی سرزمین خاص کے قریب روسی بحری بیڑے کی موجودگی چین کو اپنا بحری بیڑا اور زیادہ طاقتور بنانے کے لیے اکسا سکتی ہے۔ اور اس طرح جاپان کو مزید خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

روس کی یہی بڑھتی ہوئی بحری سرگرمیاں ہیں جنھوں نے گذشتہ سے پیوستہ ہفتے صدر نکسن کو کانگریس سے دفاعی مقاصد کے لیے اور زیادہ فنڈ مخصوص کرنے کا مطالبہ کرنے کے لیے مجبور کیا۔ کسی زمانے میں برطانیہ سب سے بڑی طاقت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ تیسرے درجے کی طاقت بن کر رہ گئی ہے۔ امریکا اور روس اس سے کہیں زیادہ آگے چلے گئے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے بڑے موثر بحری بیڑے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں لگے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ـــــ کس لیے؟

کیا مستقبل کی لڑائی خشکی کے مقابلے میں سمندر میں زیادہ لڑی جائے گی؟ اس وقت خود امریکا کے دروازے پر روس کا چیلنج موجود ہے۔ روس نے امریکا کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر کم از کم پانچ نئی آبدوزیں لگا رکھی ہیں جو کسی وقت بھی ایٹمی میزائلوں سے امریکا کو نشانہ بنا سکتی ہیں۔

آبگینہ

آسکر وائلڈ

ایم۔ آئی۔ ساجد

- محبت کا راز موت کے راز سے زیادہ عظیم الشان ہے
- اگر کوئی خاتون اپنی غلطیوں میں دل کشی پیدا نہیں کر سکتی تو وہ صرف عورت ہے۔
- میں انتخاب کرتا ہوں اپنے دوستوں کا خلوص کے لحاظ سے۔ اپنے ملاقاتیوں کا سیرت کے لحاظ سے اور اپنے دشمنوں کا ذہانت کے لحاظ سے۔
- وہ شخص جو شادی کرنا چاہتا ہے اسے یا تو سب کچھ جاننا چاہئے یا کچھ بھی نہیں۔
- شادی کی یہ خصوصیت کس قدر عجیب ہے کہ وہ مکر و فریب کی زندگی کو دونوں کے لئے ضروری بنا دیتی ہے
- دنیا کے بدترین کام ہمیشہ بہترین نیت کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔
- کہنے کے قابل ہمیشہ وہی چیزیں ہوتی ہیں جن کو ہم بھلا دیتے ہیں۔
- ایک بات صرف اس بناء پر صحیح قرار نہیں دی جا سکتی کہ کسی نے اس کے لئے جان قربان کر دی ہے۔
- جھوٹ کا مقصد صرف دل کشی و مسرت پیدا کرنا ہے۔ اس لئے ایک جھوٹا انسان معاشرے کی بنیاد ہے۔
- کہنے کے قابل وہی باتیں ہیں جنہیں ہم بھول جاتے ہیں جس طرح وہی باتیں کرنے کے قابل ہیں جن پر دنیا تعجب کرے۔
- خلوص ہر حال میں برا ہے۔ جب تک تھوڑا ہے خطرناک ہے اور بڑھ جائے تو مہلک۔
- اعادہ جوانی کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ پھر جوانی کی حماقتوں کی تکرار کی جائے۔
- ہم کرتے ہیں غلطیاں اور انکا نام رکھتے ہیں تجربہ
- ادب اور صحافت میں کیا فرق ہے۔ صرف یہ کہ ادب کوئی پڑھتا نہیں اور صحافت پڑھنے کے قابل نہیں
- عورتوں کو سمجھو۔ ان سے لطف اٹھانے کی صورت یہ ہے کہ انھیں صرف دیکھو۔ انکی سنو نہیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی جیل کی کہانی خود ان کی زبانی

شیخ مجیب الرحمٰن نے فاتحانہ واپس بنگلادیش پہونچکر ڈھاکا میں اخباری نمائندوں کو جو بیان دیا اس میں انہوں نے اپنی نو ماہ کی قید تنہائی کی تفصیل بتائی۔ ذیل میں ہم امریکی رسالہ نیوز ویک کے نامہ نگار سائمن ڈرنگ کی رپورٹ کے اقتباسات درج کر رہے ہیں جو اس نے شیخ مجیب الرحمٰن سے انٹرویو لے کر اپنے رسالہ کو ارسال کی —— اس انٹرویو میں شیخ مجیب کی نو ماہ کی کہانی خود ان ہی کی زبانی سنیے۔

"جسمانی طور پر میرے ساتھ کبھی بدسلوکی نہیں کی گئی صرف ذہنی تکلیف مجھے پہونچائی گئی۔ مجھے قید میں ڈالنے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر انہوں نے مجھے زیادہ ستایا تو میں اپنی زندگی ختم کر ڈالوں گا۔ غریب افسران جو میری نگرانی پر مامور تھے انہیں حالات کا کچھ علم نہ تھا۔ وہ اندر آیا کرتے اور مجھے سلام کیا کرتے، میں وہاں بیٹھ جاتا اور کہتا "بہتر ہے جو چاہتے ہو تم میرے ساتھ کرو۔ اسکے علاوہ تم میرے لیے کر بھی کیا سکتے ہو؟"

سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مجھے اتنے طویل عرصہ تک قید تنہائی میں رکھا گیا۔ باہری دنیا سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ مجھے اخبارات ملتے تھے، نہ کتابیں اور نہ اپنے خاندان والوں کے خطوط۔ ۲۷ر دسمبر تک میں ہر چیز سے محروم تھا۔ کوٹھری میں ہمیشہ تاریکی ہوا کرتی تھی، پورے نو ماہ تک سوائے ان سرکاری افسروں کے جو میری دیکھ بھال پر مامور تھے یا ان لوگوں کے جنہوں نے مقدمہ میں حصہ لیا میں کسی اور سے ملاقات نہ کر سکا۔ میں سابق پاکستانی صدر یحییٰ خاں سے بھی نہیں ملا اور رہائی کے بعد صرف بھٹو سے ملاقات ہوئی۔

میرے خلاف جو مقدمہ چلایا گیا وہ کوئی مناسب مقدمہ نہ تھا۔ یہ محض ایک ڈھونگ تھا یہ دراصل میرا "کورٹ مارشل" تھا اور ان لوگوں نے اپنے اس منصوبہ کو ظاہر کر دیا تھا کہ وہ مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکانا چاہتے تھے۔ مقدمہ کی سماعت بند کمرے میں ہوئی ایک فوجی بریگیڈیر عدالت کا چیرمین تھا اور اس میں دو کرنل ایک ونگ کمانڈر، ایک بحری کمانڈر اور ایک ڈسٹرکٹ

سیشن جج شامل تھا۔ مقدمہ چھ ماہ تک چلا۔ یہ ایک جھوٹا مقدمہ تھا۔ میں نے صاف کہدیا تھا کہ میں اپنے مقدمہ کی پیروی نہیں کروں گا، میں نے انہیں بتایا کہ چونکہ یحییٰ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیں اور انہوں نے ہی یہ مقدمہ چلانے کا حکم دیا ہے اس لیے مقدمہ کی پیروی کرنا اور صفائی پیش کرنا بے کار ہے وہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ میں غداری کا مرتکب ہوں اور اس کی مجھے سزا ملنی چاہیئے میں نے عدالت سے کہا "میری طرف سے مقدمہ کی پیروی

مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے

فوجی ہیلی کاپٹر نے مجھے راولپنڈی کے باہر ایک بنگلے میں پہونچادیا

اور صفائی پیش کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آپ لوگ یحییٰ کو پیغام پہونچا دیں کہ وہ جو چاہیں کریں۔" یہ مقدمہ محض ڈھونگ ہے اور اس کا مقصد دنیا کو دھوکا دینا ہے۔"

اس کے بعد اچانک مقدمہ کی کارروائی رک گئی اور مجھے بتایا گیا کہ میرا جرم ثابت ہو گیا ہے اور مجھے پھانسی دی جائے گی لیکن بنگال میں پاکستانی فوجوں کی شکست تک کوئی بات سامنے نہ آئی۔ جب جنگ ـــــ ختم ہو چکی اور بھٹو برسر اقتدار آگئے تو یحییٰ خاں نے کہا وہ مجھے پھانسی کے تختہ پر لٹکانا چاہتے ہیں۔ یہ اس دن کی بات ہے جس دن کہ پاکستانی فوجوں نے مشرقی بنگال میں ہتھیار ڈالے تھے۔ بھٹو نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، پاکستانی جنگی قیدیوں کی بہت بڑی تعداد ہندوستان کے قبضہ میں ہے۔ مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ بھٹو نے مجھے بچانے کی کوشش کی اور خدا نے مجھے بچایا۔

یحییٰ کے منصوبہ کو روکنے کی بھٹو کی کوششوں کے باوجود ایک شب کو جیل کے اندر مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ مسٹر بھٹو نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے جو میری حفاظت پر مامور تھا، ل کر مجھے وہاں سے نکلوایا۔ وہ مجھے صبح ۳ بجے جیل سے نکال کر لے گیا اور ایک اور مکان میں خاموشی سے منتقل کرنے سے قبل جو میانوالی سے ۳۰ میل کے فاصلے پر تھا دو دن تک مجھے اپنے گھر میں رکھا۔ وہ مجھے تین چار دن کے لیے اس مکان میں چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ایک فوجی ہیلی کاپٹر آیا اور اس نے مجھے راولپنڈی سے باہر ایک بنگلے میں اُتار دیا۔ وہاں میری رہائی تک فوجی سپاہی میری نگرانی پر مامور تھے۔

جس دن میں اس بنگلے میں پہنچایا گیا میرے پہرے داروں نے مجھے بتایا کہ کوئی شخص مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے آیا ہے۔ مجھے کچھ گمان نہ تھا کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے لیکن جب مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا تو میں نے وہاں مسٹر بھٹو کو بیٹھے ہوئے دیکھا وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہاں کس طرح پہنچے؟" انہوں نے جواب دیا "میں اب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر رہوں۔"

میں سن کر بولا "بہت خوب۔ یہ بتایئے کہ میں آزاد ہوں یا نہیں، اگر آزاد ہوں تو بات چیت کے لیے تیار ہوں ورنہ نہیں۔" انہوں نے جواب میں کہا کہ میں آزاد ہوں لیکن ساتھ ہی پوچھا کہ کیا میں چند دن اور انتظار کر سکتا ہوں۔ میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور ہم دونوں بیٹھے اور باتیں کیں۔ ہم نے تمام پرانے مسائل پر بات چیت کی اور ان باتوں پر بھی جن کی وجہ سے یہ مسائل پیدا ہوئے اور اس کے بعد مسٹر بھٹو نے مجھ سے اپیل کی کہ میں ملک کے دونوں حصوں کے درمیان کچھ نہ کچھ تعلق قائم رکھوں۔ میں نے ان سے کہا کہ جب تک میں یہ نہ معلوم کر لوں کہ کیا کچھ ہو چکا ہے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے ضروری ہے کہ میں اپنے لوگوں سے ملوں ان کی باتیں سنوں اور دیکھوں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ۲۷ دسمبر تک یعنی جب مسٹر بھٹو سے میری ملاقات ہوئی میں نے نہ تو کوئی ریڈیو سنا تھا اور نہ کوئی اخبار پڑھا تھا لیکن قید تنہائی کے دوران بھی میں جانتا تھا کہ میرے ملک میں کیا ہو رہا ہے اس لیے کہ میں اپنے عوام کو اچھی طرح جانتا تھا، میں اپنے ساتھیوں کی طاقت سے آگاہ تھا، مجھے اپنی تنظیم قیادت کے حدود اربعہ کا بھی علم تھا، طالب علموں کے محاذ سے بھی آگاہ تھا، مزدور محاذ کو بھی جانتا تھا، مجھے علم تھا کہ وہ کس طرح ایک ایک قدم لڑیں گے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان مہینوں میں کیا کچھ ہوا ہے حالانکہ میں بالکل اکیلا تھا اور تصورات کی دنیا میں کھو جانے کے علاوہ میرے پاس کوئی کام نہ تھا۔ میں

مرد آہن شیخ مجیب الرحمٰن

ہمیشہ اس بات سے آگاہ رہا کہ میرے عوام میری پشت پر ہیں ـــــ میں جانتا تھا کہ خدا میری مدد کرے گا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ جھوٹ اور سچائی کے درمیان جنگ کے درمیان جھوٹ کو پہلی بار فتح ہوتی ہے لیکن بالآخر فتح سچائی ہی کی ہوتی ہے۔

یہی وہ احساس تھا جس سے میں زندہ اور ثابت قدم رہا۔ میں اتنے مہینوں میں اپنی قید تنہائی کے دوران نہیں رو دیا، میں اس وقت بھی نہیں رویا جب نے میرے خلاف مقدمہ چلایا لیکن جب یہاں واپس آیا اور اپنے حیرت انگیز "سونار بنگلا" کو دیکھا تو میں

ہمارا اتحاد

صرف جنگ کے نام پر ہی نہیں

بلکہ بنیادی آدرشوں کے لئے ہونا چاہیئے

— اندرا گاندھی

اس قسم کے پودے کی پوری دیکھ بھال ہونی چاہیئے تاکہ یہ خوب پھلے پھولے۔

جوانوں نے جس لڑائی کو میدانِ جنگ میں جیتا ہے اسے ہر شہری کو گھریلو محاذ پر جاری رکھنا ہے۔

آؤ! پھوٹ ڈالنے والوں اور خصوصی مراعات کے اجارہ داروں کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔

آؤ! قوم کے اتحاد اور ہر ایک کے لئے سماجی انصاف کے واسطے جدوجہد کریں۔

ہندوستانی فضائیہ

(سید ظہیرالدین)

ایک معلومات افزا جائزہ

آئی۔اے۔ایف (انڈین ایر فورس یا ہندوستانی فضائیہ) یکم اپریل ۱۹۳۳ء کو وجود میں آئی۔ یہ ۵ افسران اور ۱۹ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہندوستانی فضائیہ نے قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے۔ ہندی فضائیہ نے ۲۲ اعزازات (ڈی۔ ایف۔ سی) حاصل کئے۔ آئی۔ اے۔ ایف کے کارناموں کے باعث اس کا رتبہ بڑھا کر اس کو آر۔ آئی۔ اے۔ ایف (رائل انڈین ایر فورس شاہی ہندی فضائیہ) بنا دیا گیا۔ اب ہندی فضائیہ برطانوی فضائیہ کا ایک بازو تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آر۔ آئی۔ اے۔ ایف کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ ہندوستان میں موجود رہا جبکہ دوسرے حصے کو پاکستان بھیج دیا گیا۔ تقسیم کے وقت ۹ میں سے دو اسکویڈرن پاکستان کے حصے میں آئے، اور ہندی فضائیہ کو، اسکویڈرن ملے۔ اگلے چند مہینوں تک دونوں فضائی بیڑے رفیوجیوں کے انخلا میں مصروف رہے۔

ابھی بہتا ہوا خون خشک بھی نہ ہو پایا تھا۔ ابھی جلتے ہوئے گھروں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا کہ۔ پاکستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے مقابلے کے لئے آر۔ آئی۔ اے۔ ایف نے انڈین ایر لائنز کے اشتراک سے پیادہ افواج کشمیر پہونچائیں۔ لیکن فضائیہ نے براہِ راست جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو رائل انڈین ایر فورس کے نام سے رائل کا لفظ ہٹا دیا گیا۔ اب یہ انڈین ایر فورس تھی۔ یکم اپریل ۱۹۵۴ء کو ایر مارشل گیبز کی جگہ پر اوّلین ہندوستانی ایر مارشل سبرتو مکرجی کا تقرر ہوا۔

ایشیا میں ہندوستانی فضائیہ پہلا فضائیہ تھا جس نے اپنی افواج میں جیٹ طیارے شامل کئے۔ اوّلاً ویمپائر خریدے گئے بعد ازاں یہ سلسلہ جاری رہا اور ہندی فضائیہ میں طوفانی، میٹرس، کینبرا امبار، ہنٹر، نیٹ اور روسی مگ ۲۱ وسکھوئے شامل کئے گئے۔

۱۹۵۰ء میں ایچ اے ایل (ہندوستان ایرونائکس

مگ۔ ۲۱ جو ہندوستانی فضائیہ کا سب سے عمدہ طیارہ ہے۔

لمیٹڈ بنگلور نے برطانیہ سے لائسنس حاصل کرکے نیٹ
طیاروں کی تخلیق کا آغاز کیا۔ بعدازاں ایچ ایف ۲۴ مروت
وایچ جے ٹی ۱۶ کیرن بنائے گئے۔ ایچ اے ایل تاسک نے روس
سے ۵۰۰ مشینیں بنانے کا لائسنس حاصل کرکے مگ ۲۱ کی تخلیق

سے اعانت کی درخواست کی گئی۔
نیٹ بنامِ سیبرہ ہوابازوں کو دیئے گئے او
کے صرف دو ہی منٹ بعد ایک ہی ہوائی پٹی سے
۲۸ عدد طیارے فضا میں بلند ہوچکے تھے پانچ بجکر

کی۔ اب مگ ۲۱ میں اہم تبدیلیوں کے بعد مگ ۲۱ ایم کی تخلیق
جاری ہے۔ ڈکوٹا کی جگہ سی ۱۱۹ فیئر چائلڈ پیکٹ کیری بس
اور اے این ۱۲ بھاری باربردار طیارے بنائے گئے ایچ اے
ایل کان پور ایچ ۷۴۸ ایورو طیارے بنا رہا ہے۔
۱۹۵۴ میں فضائیہ کا ہیلی کوپٹر بازو قائم کیا گیا اس
مقصد کے لئے اولاً ایس ۵۵ و ایس ۶۲ اور بعدازاں

لے کانگو بھیجے گئے۔ کٹانگا گورنمنٹ کے خلاف اقوام
متحدہ کی درخواست پر کینبرا بمباروں کا ایک اسکویڈرن
بھی بھیجا گیا تھا۔
جنگ کا دوسرا دور ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندی فضائیہ کو
اولاً اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اور ہمارے دلیر

منٹ سے ۶ بجے تک دشمن کی بری افواج پر ۲۸ حملے
گئے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ پاکستانیوں کو اپنے ۱۳ ٹینکوں
ہاتھ دھونا پڑے۔ جلد ہی پاک فضائیہ اپنی بری افواج
حفاظت کے لئے چھمب کی فضاؤں میں منڈلانے لگی
ہی مقابلے کے دوران ہم کو دو ویمپائر طیاروں سے ہاتھ
دھونا پڑا۔ دو دن تک کوئی فضائی جنگ نہ لڑی جا
دو دن بعد چھمب کی فضاء میں ایک بار پھر دونوں ممال
کے طیارے ایک دوسرے کے مقابلہ پر تھے۔ اس بار
پاکستان کے سیبر اور ہمارے 'حقیر' نیٹ طیاروں کے در
تھا چند منٹوں کی اس جنگ کے بعد سیبر طیارہ اپ
اپنے عقب میں دھویں کی لکیر بناتا تیزی سے زمین کی طر
گر رہا تھا۔ طیارے کے دیو پیکر جسم کو شعلوں نے گھیر

بیل ماڈل حاصل کئے گئے۔ لیکن یہ سبھی طیارے بلند پرواز
کے قابل نہ تھے چینی خطرے کے پیش نظر ایسے ہیلی کاپٹروں
کی ضرورت تھی جو کافی بلندی پر پرواز کرسکیں اس مقصد
کے حصول کے لئے روسی ایم آئی ۴ و فرانسیسی دیلویٹ
III بی ہیلی کاپٹر خریدے گئے۔ ان ہیلی کاپٹروں کے لئے
قابلِ پرواز بلندی ۱۹ ہزار فٹ ہے۔ فرانس کی اعانت سے
ایچ اے ایل ایک ہیلی کاپٹر کی تخلیق میں مصروف ہے۔
ہندی فضائیہ کے طیارے روز ہی بیہ کے ہوائی مستقر
پر اترتے ہیں جو کہ دنیا کا بلند ترین مستقر ہے۔
۱۹۶۵ء تک ہندی فضائیہ نے جنگ کا ذائقہ
نہ چکھا تھا۔ اس دوران اس کا عمل سیلاب و دیگر تباہ کاریوں
کے دوران امدادی اڑانوں تک محدود تھا۔ اس کے علاوہ
۱۹۶۰ء میں ہندوستانی ہواباز اقوام متحدہ کی مدد کے

ہوابازوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ کمتر اسلحہ جات کے
باوجود اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ بہتر نتائج حاصل کرسکتے
ہیں۔ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو صبح ۴ بجے جبکہ وادیٔ کشمیر کہر کا
غلاف اوڑھے خوابِ خرگوش کے لطف اٹھا رہی تھی۔
پاکستان نے ٹینکوں کے ذریعہ چھمب پر حملہ کر دیا جغرافیائی
مشکلات کے باعث ہمارے ٹینکوں کا اکھنور سے آگے جانا
ممکن نہ تھا۔ پاک حملے کو ناکام بنانے کے لئے ہندی فضائیہ

تھا۔ دوسری طرف اسکویڈرن لیڈر ٹریور کیلر فوز سے
کئے اپنے حقیر نیٹ کے ساتھ تیز رفتاری سے اپنے منزل
سمت گامزن تھے۔ اس طرح نیٹ اور سیبر کی پہلی ہی لڑ
میں ٹریور کیلر نے ویر چکر اور حقیر نیٹ نے 'دیوہار' کا اع
حاصل کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور سیبر گرا کر اپنے دو
جہازوں کا بدلہ لے لیا گیا۔
نیٹ دراصل ایک برطانوی جہاز ہے جس کو شا

ہ اور نیٹو ممالک کے لئے تیار کیا گیا تھا، لیکن شاہی
ہ نے حقیر جثے کے باعث اس چھوٹے سے جہاز کو ناقابل
قرار دے کر اس کی تخلیق ختم کر دی صرف چند جہاز
لاویہ اور فن لینڈ کو دیئے گئے شاہی فضائیہ اور
الک کی نظر میں محدود دائرہ عمل کا یہ چھوٹا سا جہاز
ہ آواز سے تیز رفتار دیو ہیکل طیاروں کے مقابلے
ل جنگ و بیکار تھا۔ ہندوستانی ماہرین نے اپنی
بائی ضرورتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس جہاز کی تخلیق
ہ لائسنس کی درخواست کی تو اسپر کڑی نکتہ چینی کی
ٹ کی تخلیق کو ضیاع زر و ضیاع وقت کہا گیا لیکن
قابلے کے بعد جیٹ طیارے اپنی اہمیت ثابت کر چکے تھے۔
، ایل بنگلور میں بننے والے ۳۱ فیٹ طویل اور ۲۲ فیٹ
(پروں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک) اور ۶۶۵۰
وزن والے اس یک نشستی طیارے کی رفتار ۶۹۵ میل
ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت اسکا کم وزن اور اسکی
تاری کے ساتھ بلند ہونے کی صلاحیت ہے۔ یہ ایک منٹ
ا ہزار فیٹ کی بلندی تک پہونچ سکتا ہے اور زیادہ سے
پچاس ہزار فیٹ کی بلندی تک پرواز کرنے کی صلاحیت
ہے۔ ۲۰ ہزار فیٹ کی بلندی پر اسکا دائرۂ عمل ۱۰۰ میل
یل جاکر لوٹنے کی صلاحیت) ہے لیکن ۴۰ ہزار فیٹ سے
واز کے لئے دائرۂ عمل صرف ۲۴۰ میل رہ جاتا ہے۔ اسکے
عمل میں زائد ٹنکیاں لگا کر اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔
یں ۳۰ ملی میٹر دہانے کی دو توپیں نصب ہیں جو کافی طویل
لے تک گولے پھینک سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ پانچسو پاؤنڈ
دو بم یا ۱۳ انچ قطر کے ۱۲ راکٹ لیجانے کی صلاحیت
رکھتا ہے۔

امریکی ایف ۸۶ سیبر نیٹ سے بہتر طیارہ ہے ۳۷ ½
طویل اور ۳۹ فیٹ عریض، اس جہاز کا وزن ۱۱۱۲۵ پاؤنڈ
ٹ سے دوگنا) ہے۔ اس کے بھاری وزن کے باعث اسکی
۶۷۸ میل فی گھنٹہ اور فضا میں بلند ہونے کی صلاحیت
ار فیٹ فی منٹ (نیٹ سے نصف ہے) یہ ۵۵ ہزار فیٹ
ندی تک پرواز کرسکتا ہے۔ اسکا دائرۂ عمل ۱۱۵۵ میل تک
۔ اس میں ۵ انچ دہانے کی چھ مشین گنیں اور ہوا سے ہوا میں
نے والے دو سائڈ ونڈر میزائل لگے ہوئے ہیں۔ اسکے
یہ پانچسو پاؤنڈ کے دو بم یا ۵ انچ قطر کے چھ عدد راکٹ

لیجانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے سیبر کی بالادستی ظاہر ہے
اسکا دائرۂ عمل نیٹ سے کافی وسیع ہے اسلئے یہ کافی طویل
فاصلے تک جاکر بمباری کرسکتا ہے۔ اسلحہ جات کے میدان میں
بھی سیبر نیٹ سے بہتر ہے۔ اس میں لگے ہوئے ساؤنڈ ونڈر
میزائل ایک بار داغے جانے کے بعد اپنے آگے اڑنے والے
طیارے کے انجنوں سے نکلنے والی گرمی کا تعاقب کرتے ہیں۔
انجنوں سے نکلنے والی حرارت انکی رہنمائی کرتی ہے۔ اگر اگلا طیارہ
کسی سمت مڑتا ہے تو یہ میزائل اس کے تعاقب میں اسی سمت
مڑ جاتے ہیں اور آخرکار طیارے کو تباہ کر کے دم لیتے ہیں۔

ایک بار داغے جانے کے بعد ان میزائیلوں سے بچنا
ناممکن ہے۔ اس لئے نیٹ طیارے ہمیشہ سیبر طیاروں پر
پشت سے حملہ کرتے ہیں اور حتی الامکان سیبر کے سامنے یا بازوؤں
کی طرف نہیں آتے، اسطرح سیبر طیاروں کو اپنے میزائیلوں کے
استعمال کا موقع ہی نہیں مل پاتا۔ نیٹ کے کم وزن اور تیزی
سے بلند ہونے کی صلاحیت نیٹ کو فوقیت دلاتے ہیں۔ عام طور
پر ہند پاک تنازعات کے دوران فضائی جنگیں بہت کم بلندی
پر ہوئیں۔ کم بلندی پر نیٹ ہلکا ہونے کے باعث تیزی سے
دائیں بائیں گھوم سکتا ہے اور موقع پڑنے پر انتہائی سرعت
کے ساتھ فضا میں بلند ہوسکتا ہے، جب کہ اپنے بھاری اور
طویل جسم کے باعث سیبر کے لئے اتنی تیز رفتاری سے مڑنا یا
گھومنا ممکن نہیں۔ دوئم یہ کہ انکو گھومنے کے لئے ایک طویل

زمین سے ہوا میں مار کرنے
والا اے-۲ میزائیل
اس میزائیل کا استعمال
ہلے اور جہازوں کو مار گرانے
کے لئے کیا جاتا ہے۔

فاصلے کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ نیٹ طیارے کے لئے یہ دوری
سیبر سے مقابلتاً کم ہے۔ جب بھی نیچی پروازوں کے دوران نیٹ
سیبر پر پشت سے وار کرتے ہیں تو سیبر کے طیارچی انتہائی
سرعت کے ساتھ سیبر کو فضا میں بلند کرنے کی کوشش کرتے
ہیں تاکہ مقابلے کے لئے کھلی فضا اور طویل فاصلہ بہم ہو سکے۔
لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ نیٹ کے بلند ہونے کی رفتار سیبر
سے دوگنی ہے اور انکی یہ بھول ہی انکی تباہی کا سبب بن جاتی
ہے کیونکہ نیٹ جلد ہی انکو جالیتے ہیں اور نیٹ کی توپوں کے
شعلے ان کو زمین بوس کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نیٹ
طیارے نیچی پروازوں کے دوران اپنے حقیر جسم اور کم وزن
کے باعث خود سے بہتر طیارے کا باآسانی مقابلہ کرسکتے ہیں
لیکن بلندی پر ہونے والی جنگوں کے دوران نیٹ دیگر طیاروں
کے سامنے حقیقتاً مچھر ہی ہیں۔ (نیٹ GNAT کا اردو ترجمہ
مچھر یا ایسا ہی دیگر حقیر پتنگا ہے۔)

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندی فضائیہ کے پاس نیٹ طیاروں
کے علاوہ کینبرا، ہنٹر گرگان، سٹیر، طوفانی ویمپائر اور مگ ۲۱
جہاز تھے۔ مگ-۲۱ کے علاوہ یہ سبھی پرانے قسم کے طیارے
ہیں۔ اس کے مقابلے پر پاک فضائیہ سیبر طیاروں کے علاوہ
بی ۵۷ کینبرا اور ایف-۱۰۴ اسٹار فائٹر طیاروں سے لیس
تھی جو کہ بہتر طیارے ہیں۔ اسکے علاوہ پاک فضائیہ کو ہم سے
بہتر راڈار کی اعانت حاصل تھی۔ راڈار کا یہ جال تمام مغربی
سرحد پر پھیلا ہوا تھا لیکن پاکستانی سیبر طیاروں کی طرح اس
عمدہ مگر پیچیدہ راڈار کے جال کا استعمال نہ کر پائے۔ اسکی
وجہ یقیناً ٹریننگ کی کمی تھی۔ جنگ بندی کے وقت تک ہندوستانی

۱ واقعات ننی دہلی

دہلی ڈائری

۲۶ جنوری کو ۲۲ واں یوم جمہوریت بڑی دھوم م سے منایا گیا۔ ہر سال ہی یہ دھوم دھام سے منایا ہے لیکن اس مرتبہ جوش و خروش پہلے سے زیادہ تھا ا بھی چاہیئے تھا کیونکہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان ظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ہندوستان پڑوس میں "بنگلا دیش" کے نام سے ایک نیا جمہوری دوست ملک ابھر کر سامنے آیا ہے۔

اس جمہوریت کی پریڈ کو دیکھنے کے لیے تقریباً دس ہ انسانوں کا جم غفیر انڈیا گیٹ پر جمع تھا۔ بہت سے ل رات ہی کو پہونچ گئے تھے۔ ساری رات شہر میں چہل پہل ، اور رات بھر اسکوٹر اور موٹر گاڑیاں انڈیا گیٹ تک شائیوں کو ڈھوتی رہیں۔ ایک انسانی سمندر تھا جو نظر تک انڈیا گیٹ پر نظر آتا تھا۔

فوجی پریڈ میں زیادہ تر وہ فوجی دستے تھے جو حالیہ لک میں حصہ لے چکے تھے اور کامیاب و کامراں واپس ٹے تھے۔ مسٹر وی وی گری نے وجے چوک پر جہاں سلامی یٹیج بنایا گیا تھا سلامی لی۔ اب سے پہلے راج پتھ پر سلامی کا چبوترہ ہوا کرتا تھا۔

یوم جمہوریت کی اس تقریب کی خاص بات یہ تھی ہ وزیراعظم نے جنگ میں مرنے والوں کی یاد میں انڈیا گیٹ پر "امر جوان جیوتی" جلائی۔ جونہی وزیراعظم نے س یادگار پر پھول مالا چڑھائی ۵۰ فوجیوں پر مشتمل ستہ نے اپنی بندوقیں الٹی کر دیں۔

پریڈ میں فوجی دستوں کے علاوہ بورڈر سیکورٹی فورس، سینٹرل ریزرو پولیس، ہوم گارڈز، سول ایمرجنسی فورس، دلی فائر بریگیڈ، این سی سی، اور پورے گرلز اسکاؤٹس نے بھی حصہ لیا، بیل گاڑیاں، موٹر گاڑیاں اور ہاتھی بھی پریڈ میں نظر آتے تھے۔ سب سے دل چسپ سرکس کے کھلاڑیوں کی ٹولیاں تھیں جو اپنے کرتب دکھا کر تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر رہی تھیں۔

جو جھانکیاں یوم جمہوریت کے اس جلوس میں شامل کی گئیں ان میں بنگلا دیش کی جھانکی عجیب تھی۔ جھانکی کیا یہ ایک ڈراما سا تھا جو وجے چوک پر کھیلا گیا اور اس میں کئی سو ایکٹروں نے حصہ لیا۔ ان میں 'بنگلا دیش کے شہری' مکتی باہنی کے سپاہی، پناہ گزیں انڈین ڈاکٹر اور نرسیں، رضا کار، پاکستانی اور ہندوستانی فوجیں شامل تھیں۔ لیکن جو ڈرامہ پیش کیا گیا اسے صرف وہی لوگ صحیح طور پر دیکھ سکے جو وجے چوک کے حلقوں میں اپنی نشستیں لئے ہوئے تھے۔ دور کے تماشائیوں کے لیے اس کا دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اس ڈرامے کی بعض باتیں ایسی تھیں جنہیں سنجیدہ طبقوں نے شامل پریڈ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ ایک باوقار قوم کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنی جمہوریت یا فتح کا جشن بھی باوقار طریقہ پر ہی منائے۔ لیکن پتا نہیں کیوں نہیں ان کا مشورہ قبول نہیں کیا گیا۔

ہندوستان کی آزادی سے متعلق جھانکی خاصی دل چسپ تھی۔ اس میں بہت سے مرد عورتیں اور بچے حصہ لے رہے تھے۔ اور ایسے ہی نعرے لگا رہے تھے جیسے کہ آزادی کی تحریک کے دوران لگائے جاتے تھے پیچھے پیچھے برطانوی سپاہی چل رہے تھے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ڈنڈی مارچ کرنے والے بہت سے والنٹیروں نے آجکل کے ہپی ٹائپ کی پوشاک کو کیوں ترجیح دی؟۔

پرانے قلعہ میں بھی تین دن تک آواز اور روشنی کے ذریعہ خاص پروگرام پیش کیا گیا۔ اس میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے لے کر بنگلا دیش کی آزادی تک کی جھانکیاں پیش کی گئیں اور پرانے قلعے کے کھنڈرات نے آواز و روشنی کے امتزاج سے ایک ایسی کہانی بیان کی جو نمائش کے عام طریقوں کے ذریعے نہیں بیان کی جا سکتی تھی۔ ■

آرزوؤں کا شہر

دہلی میں میٹروپالیٹن کونسل کے انتخابات کی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ دہلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے آجکل اخبارات میں جو اشتہارات شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں راجدھانی کو آرزوؤں کا شہر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اشتہارات دہلی والوں کو تو خیر کیا گمراہ کر سکیں گے شہر کی حالت ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ لیکن دہلی سے باہر رہنے والے

مسز گاندھی بھارت رتن کا اعزاز حاصل کرنے کے فوراً بعد راشٹرپتی بھون میں

ہوابازوں کی دلیری کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے اس طیارے کا طول ۹۰ فیٹ اور پروں کی چوڑائی ۱۳۲ فیٹ ہے۔ یعنی یہ طیارہ بوئنگ ۷۰۷ طیارے سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ یہ اپنے شکم میں ۱۶ ٹن وزن جس میں ایک بھرا ہوا فوجی ٹرک بھی شامل ہے لیکر پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اپنے دیو پیکر جسم اور سست رفتاری کے باعث یہ طیارہ پندرہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے پاکستانی لڑاکا طیاروں اور طیارہ شکن توپوں کے لیے سہل ترین نشانہ تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستانیوں کیلئے خطرناک ترین طیارے بھی تھے کیونکہ ایک ہی اڑان کے ذریعے وہ دشمن پر ۱۶ ٹن وزنی بموں کی بارش کرتے تھے جو کہ عام طیاروں کے ذریعے لیجائے جانے والے بموں سے متعدد گنا زیادہ ہے۔

۳ اور ۴ دسمبر کی راتوں میں ان ہی طیاروں نے چنگا منگا کے پیٹرول کے ذخیروں کو آگ کی نذر کیا۔ بعد ازاں انہی طیاروں نے چھب کے علاقے میں دشمن پر ٹنوں آتش گیر مادہ برسایا۔ اسطرح باربرداری کے ان طیاروں نے دور دراز علاقوں تک بمباری کرنے والے بھاری بمبار طیاروں کی جگہ پوری کی، حالانکہ فضائیہ کا یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا لیکن یہ امر مزید باعثِ حیرت ہے کہ دوران جنگ کسی بھی اے این ۱۲ طیارے کو خراش تک نہیں آئی۔ یقیناً اسکا سبب ہمارے ہوابازوں کی عمدہ ٹریننگ اور بہترین ہوابازی کی صلاحیت ہے۔

۳ دسمبر کی یخ بستہ شام۔ سورج کی آخری کرنیں سرزمین ہند کو الوداعی بوسہ دے رہی تھیں اور سیاہ رات نے اپنے پر پھیلانے شروع کردیے تھے کہ اچانک شمال ہندوستان میں دور دور تک سائرن چیخنے لگے۔ پاکستانی لڑاکا اور بمبار طیارے ہندوستان کے ۱۲ ہوائی اڈوں پر بمباری کر رہے تھے۔ اچانک پاکستانی ہوائی حملہ کی خبر نہ صرف ہندوستانی عوام بلکہ اعلیٰ افسران و حکام پر بجلی بن کر گری۔ عرب اسرائیل جنگ کا نقشہ ہر شخص کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وزیر اعظم انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ کلکتے سے دہلی روانہ ہوئیں۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک جبکہ وزیر اعظم نے قوم کے نام پیغام نشر کیا، حملوں سے ہونے والی تباہی سے متعلق پوری معلومات حاصل نہ ہوسکیں تھیں۔ وزیر اعظم کی پریشانی انکی آواز سے ہویدا تھی۔

آہستہ آہستہ بمباری سے متعلق اطلاعات ملنا شروع ہوئیں اور سنجیدہ چہروں پر مسکراہٹیں لوٹ آئیں۔ پاکستانی اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہوچکے تھے۔ پاکستانیوں کے مقاصد واضح تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اچانک حملہ کرکے ہماری فضائیہ کو نقصان پہونچایا جائے۔ بیشتر جہاز زمین پر کھڑے کھڑے تباہ کردیے جائیں۔ ہوائی پٹریوں کو تباہ کرکے ہوائی مستقروں کو ناقابلِ عمل اور فضائیہ کو مفلوج کردیا جائے۔ لیکن پاکستانی ایک مقصد میں بھی کامیاب نہ ہوسکے۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ رات کو ساڑھے گیارہ بجے سے ہندی فضائیہ نے جوابی کارروائی کا آغاز کردیا تھا۔ پاکستان کے آٹھ ہوائی مستقروں پر تمام رات بمباری جاری رہی۔ اسمیں سرگودھا اور چنگا منگا جیسے سرحدی ہوائی اڈے بھی شامل تھے اور مسرور (کراچی) اور ملتان جیسے دور دراز ہوائی مستقر بھی۔ پاکستانی فضائیہ نے اولین نشانہ ہوائی پٹریوں کو بنایا تھا، لیکن وہ کسی بھی ہوائی پٹری کو ناقابلِ عمل نہ بنا سکے اور نتیجتاً ہوائی اڈوں پر موجود طیاروں کو مفلوج کرکے اگلے حملے میں ان کو زمین پر ہی تباہ کرنے کے مقصد میں پاکستانی فضائیہ کامیاب نہ ہوسکی۔ پاک فضائیہ کے طیارے جب دوسرے حملے کے لئے ہندوستانی اڈوں پر آئے تو ان کے استقبال کے لئے ہندوستانی طیارے ہوا موجود تھے۔

جنگ کے اوائل میں پاک فضائیہ نے زوردار حملے کئے لیکن انکا زور گھٹتا گیا اور جنگ کے اواخر میں ہندی فضائیہ کا پلڑا بھاری تھا۔ بنگلادیش میں موجود پاک فضائیہ کے طیارے اولین چند ایام کے دوران ہی تباہ کردیے گئے تھے اور بنگلادیش کی فضاؤں پر پوری طرح ہمارا قبضہ تھا۔ ہمارے طیارے بغیر کسی روک ٹوک کے بنگلادیش کی فضاؤں میں اڑتے۔ انکا راستہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ مغربی سرحدوں پر ہمارے طیاروں نے کراچی جیسے دور دراز علاقوں پر بمباری کرکے پیٹرول کے ذخیروں میں آگ لگا دی۔ ہماری فضائیہ نے چھب، شکرگڑھ اور دوسرے علاقوں میں بری افواج کو بھرپور تعاون دیا۔

جنگ کے دوران مشرقی اور مغربی سرحدوں پر ہمارے طیاروں نے ۴ ہزار حملے کئے۔ جنگ کے دوران دونوں سرحدوں پر روزانہ ۵۰۰ سے زائد حملے کئے۔ جنگ بندی تک ہماری فضائیہ نے پاک فضائیہ کے ۹۴ طیارے جن میں مراج اور اسٹار فائٹر بھی شامل ہیں زمین بوس کردیے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے طیاروں نے ۱۴۶ ٹینک تباہ کئے۔ ۳۰ ریل گاڑیوں پر حملے کئے ۶ ریلوے مارشلنگ یارڈ نیست و نابود کردیے۔ ملتان کے پیٹرول صاف کرنے کے کارخانے اور سکھر کے سوئی گیس کے پلانٹ شعلوں کی نذر کردیے۔ بنگلادیش کے تقریباً سب اڈوں کو ناکارہ بنا دیا گیا۔ ۱۰۰ سے زاید توپ بگی اور دیگر اقسام کے اسٹیمر اور کشتیاں پانی کی گود میں سلا دی گئیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بنگلادیش کی آزادی اور مغربی سرحدوں پر ہماری کامیابی فضائیہ کے بغیر ممکن نہ تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر ہماری فضائیہ بنگلادیش میں موجود پاک فضائیہ کے تمام طیاروں کو تباہ نہ کرپاتی تو ہمارے سست رفتار جاسوس طیارے بنگلادیش کی فضاؤں میں آزادانہ پرواز کرکے فوجی ٹھکانوں اور فوجی ورسدی قافلوں سے متعلق اہم اطلاعات بہم نہ پہونچا سکتے تھے۔ پاک فضائیہ کی غیر موجودگی کے باعث ہمارے باربردار طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے چھاتا بردار افواج ڈھاکا کے قرب و جوار میں اتاری گئیں۔ پاک فضائیہ کی موجودگی میں یہ اقدام یقیناً خودکشی کا باعث ہوتا اور سیکڑوں ندی نالوں کی سرزمین بنگلادیش کی آزادی اتنے قلیل عرصے میں نہ مل پاتی۔

شاباش! ہندوستانی فضائیہ کے دلیر ہوا بازو، ہندوستانی عوام کا تم کو سلام۔ تم ہماری سالمیت وقار اور آزادی کے ضامن ہو۔ تم کو بنگلادیش کے سات کروڑ عوام کا سلام جن کے آزادی کے خوابوں میں تم نے حقیقت کا رنگ بھرا۔ تم کو انسانیت کا سلام کیونکہ تم نے حق کے لئے لڑکر ظلم کو شکست دی۔ ہماری دعا ہے۔

اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ۔ ●●

ہوا اور پانی کے درمیان ہوائی کرتبوں کا ایک منظر۔ اس جنگ میں بھارتی بحری ایئر فورس (وکرانت) نے اہم رول ادا کیا۔

کرسکتے ہیں۔ مگ ۲۱ میں نصب راڈار ۳۰ میل کے دائرے میں قابل عمل ہے۔ مگ کے مقابلے میں الف ۱۰۴ اسٹار فائٹر تیز رفتار امریکی لڑاکا بمبار طیارہ ہے۔ اس کی رفتار ۱۵۲۰ میل فی گھنٹہ اور دائرہ عمل ۲۰۰۰ میل ہے۔ مگ ۲۱ کی طرح اسٹار فائٹر کی ناک میں ایک توپ نصب ہے۔ اس کے علاوہ اس میں دو ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے میزائل بھی نصب ہیں۔ موقع پڑنے پر یہ بمباری بھی کرسکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ ایک ہزار پاؤنڈ وزنی ۴ بم لیجانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن مگ ۲۱ کے مقابلے میں اسٹار فائٹر کو زمینی عملے سے زیادہ تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ مراج ۳ ای بھی الف ۱۰۴ کی طرح لڑاکا بمبار طیارہ ہے۔ عرب اسرائیل جنگ کے دوران ان طیاروں نے بڑی شہرت حاصل کی ــــ ان طیاروں کے ذریعے اسرائیل نے اچانک حملہ کرکے مصری فضائیہ کو تباہ و برباد کردیا تھا۔ اس کی رفتار ۱۵۰۰ میل فی گھنٹہ اور دائرہ عمل ۸۶۰ (مراج ۳) سے ۲ ہزار (مراج ۵) میل ہے۔ اس میں ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے اے ایس ۳۰ میزائل سے لیس ہیں۔ اطلاعات کے مطابق پاک فضائیہ کے پاس ۱۲۵ اسٹار فائٹر، ۲۵ مراج ۳ ای اور ۳۰ مراج ۵ طیارے ہیں۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسٹار فائٹر اور مراج ۳ و ۵ مگ ۲۱ سے قدرے تیز رفتار طیارے ہیں لیکن انکا دائرہ عمل مگ ۲۱ سے بہت وسیع ہے۔ اس کے علاوہ دونوں طیارے بمباری کے فرائض بھی انجام دے سکتے ہیں جبکہ مگ ۲۱ مخصوص مزاحم طیارہ ہے لیکن نیٹ کی طرح مگ ۲۱ کی کارگزاری بھی ہوا بازوں پر منحصر ہے۔ ماہر ہاتھوں میں یہ بآسانی اسٹار فائٹر اور مراج کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرسکتا ہے۔ حالیہ جنگ میں اس امید کو ہندوستانی ہوا بازوں نے سچ کر دکھایا۔ ایچ اے ایل ناسک مختلف تربیتوں کے بعد مگ ۲۱ ایم طیارے کی تخلیق میں مصروف ہے جس میں مگ ۲۱ کی زیادہ تر خامیاں مثلاً محدود دائرہ عمل کو دور کردیا جائے گا۔

سکھوئی ۷ (ایس یو ۷) ایک روسی لڑاکا بمبار طیارہ ہے۔ ہندوستان کے پاس ایک اطلاع کے مطابق اس قسم کے ۱۴۰ طیارے ہیں۔ یہ طیارے خصوصاً زمینی حملے کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اس کی رفتار ۱۰۸۵ میل اور دائرہ عمل ۳۰۰ میل ہے۔ اس میں ۳۰ ملی میٹر دہانے کی دو توپیں نصب ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ۵۵ ملی میٹر کے ۳۸ راکٹ (ہر بازو پر ۱۹ عدد) یا دو ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے میزائل اور ایک ہزار پاؤنڈ وزنی پانچ بم بھی لیجاسکتا ہے۔ اس کے بلند ہونے کی رفتار ۳۰ ہزار فیٹ فی منٹ ہے اور یہ ۵۵ ہزار فیٹ کی بلندی تک بآسانی پرواز کرسکتا ہے۔ ایس یو ۷ پاکستان کو ملے ہوئے مگ ۱۹ لڑاکا بمبار طیاروں سے بہتر طیارہ ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق ہند فضائیہ میں ان طیاروں کی تعداد ۱۴۰ ہے۔

ہاکر ہنٹر ایف ۵۶ یہ برطانوی لڑاکا اور بمبار طیارہ ہے۔ اس ایک نشستی طیارے کی رفتار ۷۱۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ اس میں ۴ عدد ۳۰ ملی میٹر دہانے کی توپیں نصب ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہزار پونڈ وزنی ۲ بم، ۳۰ انچ قطر کے ۲۴ یا دو انچ قطر کے ۳ راکٹ لیجانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اسکا دائرہ عمل ۴۲۵ میل ہے۔ زائد پیٹرول ٹنکیوں کے ذریعے اسکو ۵۵۰ تک بڑھایا جاسکتا ہے۔ یہ ۷۲۰۰ فیٹ فی منٹ کی رفتار سے ۵۳ ہزار فیٹ تک بلند ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق ہندی فضائیہ کے پاس ۸۰ ہاکر ہنٹر ہیں۔

ایچ۔ایف ۲۴ مروت: ایک خود ساختہ ہندوستانی لڑاکا بمبار طیارہ ہے جو کہ ایچ اے ایل بنگلور میں تیار کیا جاتا ہے۔ یہ متحدہ عرب جمہوریہ اور ہندوستان کے اشتراک کا نتیجہ ہے۔ ۶۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے اس طیارے کا دائرہ عمل ۲۴۰ میل ہے۔ آٹھ ہزار فیٹ فی منٹ کی رفتار سے بلند ہوکر یہ ۵۲ ہزار فیٹ کی بلندی تک پرواز کرسکتا ہے۔ اس میں ۳۰ ملی میٹر دہانے کی ۴ توپیں نصب ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ۴۸ ہوا سے زمین پر مار کرنے والے راکٹ اور ۴ ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے میزائل یا ایک ہزار پاؤنڈ وزنی ۴ بم لیجانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور موقع کے مطابق اس یک نشستی طیارے میں مزید ایک سیٹ کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے پاس ان طیاروں کا ایک اسکویڈرن ہے۔

کینبرا: ایک دو نشستی بمبار طیارہ ہے جس میں ۲۰ ملی میٹر دہانے کی ۴ توپیں نصب ہیں۔ ۵۰۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والا یہ طیارہ ایک ہزار پاؤنڈ وزنی ۶ بم لیجانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ۴۸ ہزار فیٹ کی بلندی پر پرواز کرسکتا ہے۔ ہندی فضائیہ کے پاس تین اسکویڈرن بی ۸ کینبرا طیارے ہیں۔ یہ طیارہ اولاً برطانیہ نے بنایا، بعد ازاں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اسی طیارے کو بی ۵۷ کینبرا کے نام سے تیار کیا۔ پاک فضائیہ کے پاس امریکہ سے ملے ہوئے بی ۵۷ بمبار طیاروں کے دو اسکویڈرن ہیں۔

مندرجہ بالا طیاروں کے علاوہ پاکستان نے آئی ایل ۲۸ قسم کے ایک اسکویڈرن طیارے چین سے حاصل کئے ہیں۔ یہ ایک پرانی قسم کا بمبار طیارہ ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکا دائرہ عمل کینبرا بمبار طیاروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس بمبار طیارے کو حاصل کرنے کے بعد پاکستان دور دراز علاقوں تک بمباری کرسکتا ہے جبکہ اس سے قبل معدودے چند ہوائی مستقروں تک ہی پاکستانی طیاروں کی پہونچ تھی۔

ہندوستانی فضائیہ نے بمباری کے لئے جو طیارے استعمال کئے وہ یقیناً اپنی جگہ ایک جنگی کارنامہ ہے۔ ہندی فضائیہ کے پاس تقریباً ۳۰ عدد اے این ۱۲ باربرداری کے جہاز ہیں ان میں سے ایک اسکویڈرن طیارے بمباری کے لئے استعمال کئے گئے۔ اے این ۱۲ کو بمباری کے لئے استعمال کرنیوالے

راڈار ۔ جس کے ذریعے دشمن کے حملہ آور جہازوں کا پتا لگتا رہتا ہے۔

فضائیہ کا اسکور ۷۳ طیارے اور ۱۲۰ ٹینک تھا جبکہ ہمکو صرف ۳۸ طیاروں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ جنگ میں حاصل کردہ اہم فتوحات اور نمایاں جنگی کارناموں کے پیش نظر ہندی فضائیہ کے سربراہ کا عہدہ ایر مارشل سے ترقی دے کر ایر چیف مارشل کر دیا گیا۔ ارجن سنگھ ہندوستان کے اولین ایر چیف مارشل ہوئے۔

حالیہ جنگ

۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد فضائیہ کی نشوونما جاری رہی۔ جدید تیز رفتار طیارے حاصل کئے گئے فضائیہ کی اعانت کے لئے راڈار لگائے گئے۔ متعدد نئے ہوائی مستقر تعمیر کئے گئے تاکہ فضائیہ کو دور دور تک پھیلایا جاسکے اور کسی اچانک فضائی حملے سے کم سے کم نقصان ہو۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو پاکستانی آمروں نے نہتے بنگالی عوام پر مشین گنوں کے دہانے کھول دیئے۔ آزادی کے بدلے انکو موت دی گئی۔ پاک فضائیہ کے طیاروں نے شہروں اور دیہی بستیوں پر بمباری کی۔ اپنی جان کی سلامتی کے لئے لاکھوں کی تعداد میں بنگالی عوام ہند کی سرحدوں کی طرف بڑھنے لگے۔ دنیا نے محسوس کیا برصغیر پر ایک بار پھر جنگ کے بادل چھا رہے ہیں۔ مہاجرین کی آمد جاری رہی لیکن بڑی طاقتیں آنکھیں موندے رہیں۔ نتیجتاً دونوں ممالک کی افواج آمنے سامنے تھیں۔ پاک فضائیہ کے طیارے ہماری سرحدوں کی خلاف ورزیاں کر رہے تھے۔ فضائیہ کو سرحدی خلاف ورزی کرنے والے طیاروں کو مار گرانے کا حکم دیا گیا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو چار پاک سیبر طیاروں نے معمول کے مطابق مشرقی سرحد عبور کی۔ چار نیٹ طیاروں کو مزاحمت کا حکم دیا گیا۔ نیٹ طیاروں نے سیبر طیاروں کو کلکتے سے تیس میل شمال مشرق میں جا لیا۔ نیٹ نے ایک بار پھر اپنے خطاب "دیو مار" کو ثابت کر دکھایا۔ تین سیبر طیاروں کو تباہ کر دیا گیا جبکہ چوتھا طیارہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمارے تمام طیارے صحیح سلامت لوٹ آئے۔ جنگ سے قبل ہی صفر کے مقابلے میں تین کا اسکور کچھ برا نہ تھا۔

۱۹۷۱ء سے قبل ہندوستانی فضائیہ کتنے طیاروں پر مشتمل تھی۔ اس سوال کا بالکل صحیح جواب دینا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر ملک کی فوجی طاقت ایک اہم راز ہوتی ہے جو کہ منظر عام پر آنا ممکن نہیں۔ اس کے باوجود دنیا کے مختلف ادارے مختلف ممالک کی افواج کی تفصیلات شائع کرتے رہتے ہیں جو کہ بڑی حد تک صحیح ہوتے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ہندوستان کی فضائیہ ۴۵ اسکویڈرن پر مشتمل ہے۔ ایک اسکویڈرن میں آٹھ سے چوبیس تک طیارے ہو سکتے ہیں۔ لیکن خیال ہے کہ ہندی فضائیہ کے ایک اسکویڈرن میں طیاروں کی تعداد ۱۶ ہے۔ اس طرح ہندوستان کے پاس طیاروں کی کل تعداد ۷۲۰ ہوئی جبکہ اسکویڈرن میں ریزرو طیارے بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں پاکستانی فضائیہ ۲۲ اسکویڈرن پر مشتمل ہے۔ اگر پاک فضائیہ کے ایک اسکویڈرن میں بھی طیاروں کی تعداد ۱۶ مان لی جائے تو پاک فضائیہ کے پاس کل ۳۵۲ طیارے ہوئے۔ برطانوی ادارے دی انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹیجک اسٹڈیز (جو کہ صحیح اعداد و شمار کی اشاعت کے لئے مشہور ہے) کے دیے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستانی فضائیہ ۹۰ ہزار افراد اور ۶۲۵ جنگی (لڑاکا بمبار اور مزاحم (INTERCEPTOR) جہازوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستانی فضائیہ کی تعداد ۱۵ ہزار اور جنگی جہازوں کی تعداد ۲۷۰ ہے۔ اس میں وہ ۲۴ میراج ۳ ای طیارے شامل ہیں جو کہ جنگ سے کچھ عرصہ قبل پاکستان نے فرانس سے حاصل کئے تھے۔ ونگ کمانڈر موہن سنگھ کے اندازے کے مطابق ان کے علاوہ ہندی فضائیہ کے پاس تقریباً ۲۰۰ ٹرانسپورٹ طیارے اور ۲۵۰ ہیلی کاپٹر ہیں۔ ہندوستانی فضائیہ میں طیاروں کی کل تعداد (جنگی، باربردار، ہیلی کاپٹر، تربیتی اور دیگر طیارے) ۱۵۵۰ ہے۔ آیئے ہند و پاک فضائیہ کے طیاروں کا تفصیلی جائزہ لیں۔

نیٹ اور سیبر کا مقابلہ ہم اس سے قبل ہی دیکھ چکے ہیں۔ مختلف اطلاعات کے مطابق جنگ کے آغاز تک ہندی فضائیہ کے پاس ۱۵۰ نیٹ اور پاک فضائیہ کے پاس ۱۰۸ سیبر طیارے تھے۔

مگ ۲۱ بمقابلہ میراج اور اسٹار فائٹر

مگ ۲۱ ہندی فضائیہ کا عمدہ ترین طیارہ ہے۔ یہ ایک روسی مزاحم (INTERCEPTOR) طیارہ ہے جو ہر قسم کے موسم میں قابل عمل ہے۔ ہندوستانی فضائیہ کے علاوہ یہ طیارہ کیوبا، چیکوسلاواکیا، فن لینڈ، مشرقی جرمنی، ہنگری، انڈونیشیا، عراق، شمالی ویت نام، مصر اور یوگوسلاویا کی فضائیہ میں بھی شامل ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق ہندوستانی فضائیہ کے پاس ۱۲۰ مگ ۲۱ طیارے ہیں۔ روس سے ۴۵۰ طیارے بنانے کا لائسنس حاصل کر کے ایچ اے ایل ناسک، کانپور اور حیدرآباد میں مگ ۲۱ طیارے تیار کئے جا رہے ہیں۔ ۴۷ فیٹ طویل اور ۲۵ فیٹ عریض اس یک نشستی طیارے کا وزن (بغیر ہتھیار) ۱۷ ہزار پاؤنڈ ہے۔ ۳۶ ہزار فیٹ کی اونچائی پر یہ ۱۳۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر سکتا ہے۔ اس کا دائرۂ عمل ۳۷۵ میل ہے اس میں ایک بار ۳۰ ملی میٹر بار کی توپ اور دو عدد ایٹول میزائل لگے ہوئے ہیں۔ میزائل کی غیر موجودگی میں دونوں بازوؤں پر ۵۵ ملی میٹر قطر کے ۳۲ راکٹ لگائے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ایک ہزار پاؤنڈ وزنی بم بھی لیجا سکتا ہے۔ اس کے بلند ہونے کی رفتار ۳۶ ہزار فیٹ فی منٹ ہے اور یہ ساٹھ ہزار فیٹ کی بلندی تک پرواز

ں پر یقین کریں گے اور جن سنگھ والے ان کہانیوں
یاستوں میں سیاسی فائدہ کے لیے استعمال
. حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں روزگار کی حالت
ی ہے. کرپشن طویل شب فراق کی طرح بڑھا ہے۔
رغلاظت شباب پر ہے۔ جھونپڑیوں اور جھگیوں کی
ھی اضافہ ہوا ہے۔ سب کے لیے تعلیم تو ہے لیکن
ن اور ایڈمنسٹریشن کے اسکولوں میں تعلیم کا معیار
ہا ہے۔ خوبصورت بستیوں کے قلب میں بھی غلاظتوں
رملتے ہیں، پرانی اور گندی بستیوں کا تو ذکر ہی کیا۔
سنگھ ایڈمنسٹریشن نے چند فواروں اور چند پارکوں
کے خوب چرچے کئے ہیں لیکن انہوں نے تمام دوسرے
و فراموش کرنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ
یشن کے انتخابات کے ذریعہ بہرحال ظاہر ہوگا۔ ■

...شراب کیوں پیتے ہیں؟

رامن رکشا کھینچتا تھا لیکن اس کی اکلوتی بیٹی
یڈی کہتی تھی کیونکہ ڈیڈی کہلانا رامن کا پیدائشی حق
یک بار اس کی جھگی کے قریب سے گذر کر بس اسٹینڈ
ہوئے مرکزی سکریٹریٹ کا ایک سکشن آفیسر جو اپنے
ادر جن پپوؤں اور گڈیوں کا ڈیڈی ہے، رامن کی اکلوتی
و "ڈیڈی ٹاٹا" کہتے سنکر چونک پڑا تھا اور اس کے
پر چوٹ لگی تھی کہ ایک غلیظ رکشا والا بھی ڈیڈی کہلانا
۔ اور اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب
پپوؤں اور گڈیوں سے کہدے گا کہ وہ اسے ڈیڈی
کریں۔ اسے ڈیڈی سے نفرت ہوگئی تھی۔
یہی رامن گذشتہ ہفتہ گھر واپس نہیں آیا اور اس
لڈی اپنے ڈیڈی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ———
تے روتے سوگئی ——— اپنے ڈیڈی کو بھول گئی ———
اور صرف ایک ہی رامن نہیں درجنوں رامنوں نے
وڑی دیر کے لیے غم حیات کو بھول جانے کی آرزو میں آٹھ
نے دیکر پورا ایک گلاس چڑھا کر خود کو موت سے ہمکنار
ر لیا۔ ایک سو کے قریب رامن ابدی نیند سو گئے۔ شور
یا کہ تحقیقاتی کمیشن مقرر کرو۔ یہ کمیشن مقرر ہوگیا ہے۔
ن کمیشنوں کی رپورٹوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ سب کو معلوم

تحقیقاتی کمیشن قائم ہوا تھا لیکن اس کی رپورٹ سرد خانہ
میں دب کر رہ گئی۔

ناجائز شراب کا کاروبار بند نہ ہونا تھا نہ ہوا ———
آئندہ بھی اس کے بند ہونے کا امکان نہیں۔ دلچسپ بات
یہ ہے کہ یار لوگوں نے اس حادثہ کو سیاسی پروپیگنڈہ کا
ذریعہ بنا لیا ہے۔ جن سنگھ والے اس کا الزام کانگریس پر
عاید کر رہے ہیں اور کانگریس والے یہ کہہ رہے ہیں کہ جن سنگھ
ان اموات کا ذمہ دار ہے۔ کانگریس والوں کی بات ایک
حد تک سمجھ میں آتی ہے کیونکہ ایڈمنسٹریشن جن سنگھ کے ہاتھ
میں ہے لیکن جن سنگھ کی صفائی اپنی نااہلیت پر پردہ ڈالنے
کے علاوہ کچھ نہیں ——— ایک دفعہ ریل کے ایک حادثہ
میں آنجہانی لال بہادر شاستری جو اس وقت ریلوے منسٹر تھے
اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے تھے لیکن یہاں ایکسائز کے محکمہ
کے انچارج جن سنگھی ایگزیکٹو کونسلر مسٹر شبھ کے کان پر
جوں تک نہیں رینگی ——— کیا اچھا ہو کہ وہ خود ہی "باعزت"
طور پر اپنا عہدہ چھوڑ دیں ——— اس سے مرنے والوں کی روحوں
کو سکون ہو نہ ہو دلی والے ضرور سکون محسوس کریں گے ■

گاندھی کے اصولوں کی موت

ہندوستان کی تاریخ میں ۳۰ جنوری کو بھی
بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ دن تھا جب بابائے
قوم مہاتما گاندھی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دن مہاتما
گاندھی کی سمادھی پر پھول مالائیں چڑھائی گئیں، پرارتھنا
ہوئی اور مہاتما گاندھی کے دل پسند گیت گائے گئے۔
گاندھی سدن میں جو کچھ دن پہلے تک "برلا ہاؤس"
تھا اور جہاں مہاتما گاندھی کو ابدی نیند سلایا گیا تھا اس
موقع پر خاص تقریبات ہوئیں۔
ہر سال ہی یہ تقریبات ہوتی ہیں اور ہم لوگ ان کو
منانے کے بڑے پابند ہیں۔ کاش ان تقریبات کی پابندی
کے ساتھ ساتھ ہم مہاتما گاندھی کے ان اصولوں کی بھی
پابندی کریں جن کے لیے انھوں نے اپنی جان دی! ■

۳۰ جنوری کو صدر گری گاندھی سمادھی پر راشٹر پتا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے

فیشن
عورتوں
نفسیاتی
ضرورت
مجیب الرحمٰن

موجودہ دور کی ایجادات اور ترقی نے انسانوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے جس کی وجہ سے انکے معیار زندگی میں بہت بڑا فرق آگیا ہے۔ وہ قدیم رسم و رواج کے بندھن سے آزاد ہو کر ماڈرن طرز زندگی یا نئے طور طریقے اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے ذہن و دماغ میں قدیم خیالات و نظریات فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اور حال و مستقبل کی تمام نئی چیزیں انکی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں مرد ماڈرن تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر نئی شاہراہ پر گامزن ہیں وہیں نئی روشنی کی عورتیں اور لڑکیاں بھی ان سے کہیں آگے ہیں۔ خاص طور پر لباس کے معاملے میں عورتیں بالکل ہی ماڈرن لباس کی غلام بن چکی ہیں۔ اسکول کالج اور دفاتر میں کام کرنے والی ماڈرن لڑکیاں، منی اسکرٹ، سلیکس، ہپّی ڈریس اور دیگر چست لباسوں پر فریفتہ ہیں۔ اسیطرح بالوں کے سنوارنے اور غازہ پوڈر سے اپنے چہرے کی آرائش و زیبائش کی بری طرح دلدادہ ہیں۔

یہاں نفسیاتی طور پر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ شوقین عورتیں کس کیلئے بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ کیا وہ بذات خود اپنے آپ کیلئے بنتی سنورتی ہیں یا اپنے شوہر کے لئے، یا ان کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ عمدہ اور ماڈرن لباس پہن کر اپنی ہم جنسوں کے سامنے اپنے آپ کو اجاگر کریں اور فخر محسوس کریں اور یہ کہ آخر کونسی عورت خوبصورت ہے؟ کیا عورتوں کو واقعی اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے دل کی تسلی کے واسطے بناؤ سنگار پر کافی محنت و مشقت اور کثیر مالی خرچ کریں۔ چنانچہ یہ سوالات دنیا کے ماہرین نفسیات کے نزدیک مستقل موضوع بحث بن چکے ہیں اور ان لوگوں کے درمیان عورتوں کی عقل و دانائی سمجھنے کے لئے بحث چھڑ گئی ہے کہ آخر کونسی نئی باتیں اور اسباب ہیں جو عورتوں کے خیالات و افکار پر غالب ہو کر انھیں زیب و زینت اور عمدہ لباس اختیار کرنے پر مجبور کرتے رہیں۔

مسٹر جان براؤن (JOHN BROWN) ان ماہرین نفسیات میں سے ہیں جنہوں نے اس بحث میں حصہ لیا تھا۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ شادی کے بعد میں اپنی بیوی کے ساتھ تقریباً پندرہ سال زندگی گزار چکا تھا۔ اس کے تمام عادات و اطوار سے میں واقف ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ جو میں بہار میں پورے دن کام کرنے کے بعد تھکا ماندہ شام کے وقت اپنے گھر لوٹا لیکن اس روز میری بیوی

اق سے گھر میں نہیں تھی جو میرا استقبال کرتی جیساکہ وہ روزانہ ایک
ریب مسکراہٹ سے کیا کرتی تھی اور میرے تینوں بچے مجھ سے بےپروا
لیویژن دیکھنے میں مشغول تھے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان
ں کو ڈسٹرب کروں، لہٰذا میں خاموشی کے ساتھ اپنی لائبریری
کمرے میں چلا گیا اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا ہاتھ بڑھا کر ایک
تاب اٹھائی اور اسے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ پھر میرے دل
ں خیال پیدا ہوا کہ میری بیوی کب گھر لوٹے گی اور کب شام کا کھانا
یار کرے گی جب کہ مجھے اس رات کو بے انتہا کھانے کی خواہش
حسوس ہو رہی تھی۔ اس سوچ میں ایک گھنٹا یا دو گھنٹے گزر گئے
ان تک کہ گھر کے دروازے کے قفل میں کنجی گھمانے کی آواز سنائی
ی۔ میں نے سمجھ لیا کہ بیوی گھر واپس آگئی ہے۔ پھر میں نے بچوں کا
شور اور اونچی ہنسی کی آواز سنی، اس شور کا سبب معلوم کرنے
کے لئے میں اپنی کرسی سے اٹھ کر باہر آیا۔ میں نے دیکھا کہ میری بیوی
بچوں کے درمیان گھری ہوئی مکان کے صحن میں کھڑی ہے
بچے خوش ہو ہو کر اس کے پہنے ہوئے لباس کی تعریف کر رہے ہیں
ور بچوں کے ان تعریفی کلمات سے ماں بھی خوش ہو رہی ہے۔ پھر
میں نے محسوس کیا کہ میری بیوی میرے قریب آرہی ہے۔ قبل اس
کے کہ میں اس سے کوئی سوال کروں اس نے مجھ سے سوال کیا کہ:

"میرے لباس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

اس وقت میں سوچنے پر مجبور ہوا کہ حقیقتاً میری بیوی اس
بات ان عورتوں کی طرح بدل چکی ہے جو اس کی سہیلیاں ہیں اور
جن کے ساتھ وہ گھومتی پھرتی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میری بیوی
اس قدر بدل جائے گی۔ میں پہلی بار اپنی بیوی میں بناؤ سنگار دیکھ
رہا تھا۔ اس نے اپنے سر کے بالوں کو سفید اور سنہرے باریک
تاروں سے اوپر کی طرف باندھ رکھا ہے اور اس کی پلکوں پر
چمکدار سیاہ لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ دونوں ہونٹ قرمزی رنگ
سے رنگے ہوئے تھے یہی رنگ اس کے اسکرٹ کا بھی تھا جس
میں اس کا پورا بدن چھپا ہوا تھا کیونکہ یہ لباس سلیپنگ سوٹ کی
طرح اس کی گردن سے لے کر دونوں پاؤں سے ذرا اوپر تک
بنا ہوا تھا۔

ادھر میرے شریر بچے میرے ارد گرد میرے جواب کا انتظار
کر رہے تھے جو کچھ ان کی ماں نے اپنے بارے میں مجھ سے پوچھا تھا
وہ بھی خود اپنے سر، چہرے اور لباس کی آرائش و زیبائش
سے متعلق میری رائے جاننے کے لئے بیتاب تھی، لیکن میرے
جواب نہ دینے پر ان سب کی امیدیں منقطع ہو گئیں، پھر

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سے سوال کیا۔ "یہ تم نے اپنے آپ کو کیا
بنا لیا ہے ڈارلنگ"! اس نے جواب دیا "کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو
میری ماڈرن وضع قطع کو جس کے لئے میں نے مکمل چار گھنٹے صرف کئے
ہیں تاکہ میں تمہارے سامنے اپنی خوبصورتی کا اظہار کروں، لہٰذا
برائے مہربانی کچھ بھی میرے متعلق کہو"۔ میں نے جواب دیا "کیا تم نہیں
جانتی ہو کہ میں نے تم سے شادی بغیر کسی بناؤ سنگار کے کی ہے
اور تمہیں کچھ یاد ہے کہ جب میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہوئی تھی
تو تم چھوٹی سی نوخیز لڑکی تھیں اور ایک معمولی سا صاف اسکرٹ
پہنا کرتی تھیں، چنانچہ تمہاری وہی تصویر اب تک میرے خیالات
میں باقی ہے اور تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میرے لئے بناؤ
سنگار کرو"۔

اس واقعے سے مسٹر جان براؤن نے ثابت کیا کہ عورتیں بناؤ
سنگار اور لپ اسٹک مردوں کو خوش رکھنے اور تعریفی کلمات سننے
کیلئے کیا کرتی ہیں، اور لباس تو عورتوں کے لئے ایک ایسا سمندر ہے
جس میں وہ بلا سوچے سمجھے ڈبکی لگا کر غرق ہو جاتی ہیں۔

بعض ماہرین نفسیات نے یہ ثابت کیا ہے کہ عورتیں آرائش
اور تزئین پہلے اپنی ہم جنسوں کو خوش کرنے کے لئے کرتی ہیں پھر وہ یہ
ارادہ کرتی ہیں کہ شوہر ان کے چمکدار بالوں، خوبصورت لباسوں
اور چہرے کے میک اپ کی تعریف کریں۔ اس وجہ سے اس شوہر
اور بیوی کے ازدواجی تعلقات اچھے نہیں رہتے جو اپنی بیوی کو خوش
رکھنے کے لئے اس قسم کی نفسیاتی چیزوں کو نہیں پہچانتا۔ اسی
طرح بعض ماہرین نے یہ ثابت کیا ہے کہ عورتیں میک اپ یا
بناؤ سنگار صرف اپنے واسطے یا اپنے شوہر کے واسطے نہیں کرتیں
بلکہ ان کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے عمدہ اور ماڈرن
لباس پر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کے درمیان فخر محسوس کر سکیں
اس طرح وہ نہ صرف اپنے شوہر کے منہ سے تعریفی کلمات سننا
چاہتی ہیں بلکہ ان عورتوں سے بھی اپنی تعریف سننے کی متمنی رہتی
ہیں جو لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوتی ہیں۔

بہرکیف میک اپ اور تکلفات کے سلسلے میں سبھی عورتیں
یکساں نہیں ہوتیں ان میں بھی اختلاف ہے کیونکہ ایک عورت وہ ہے
جسے اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر حسن و جمال عطا کیا ہے، اس قسم
کی عورتیں میک اپ اور بناؤ سنگار کا بالکل اہتمام نہیں کرتیں
کیونکہ وہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتیں۔

دوسری متوسط درجے کی عورتیں ہیں جو آرائش، زیب و زینت
کا اہتمام کرتی ہیں اور تیسری وہ عورتیں ہیں جو حسن و جمال

سے محروم ہیں، چنانچہ وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بے انتہا بناؤ سنگار
اور میک اپ کا خیال رکھتی ہیں کیونکہ درحقیقت وہ ایسا کرنے پر
مجبور ہیں۔ اسی طرح ایک تعلیم یافتہ مہذب عورت ہے جو اپنے
میک اپ کے لئے ماڈرن لباس اور جدید آرائش و زیبائش کا سامان
بہت کم استعمال کرتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ شوہر کو خوش
رکھنے اور اسکا دل موہ لینے کے دوسرے بہت سے طریقے موجود
ہیں جو میک اپ کے مقابلے میں مردوں کے دلوں پر زیادہ گہرا اثر
چھوڑتے ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ عورتیں زیادہ میک اپ وغیرہ کا
اہتمام نہیں کرتیں تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زندگی کے
صحیح لطف سے محروم ہیں۔ اس پوائنٹ پر بہت سے محققین
نے بیان کیا ہے کہ عورتوں کے اندر اصل چیز انکی نسوانیت اور
ذکاوت ہے۔ یہی دونوں چیزیں ایسی ہیں جو مردوں کو ان کی

طرف راغب کرتی ہیں اور خوبصورتی بھی عورتوں کی ایک بیش بہا
دولت ہے جس کی طرف مرد طبعی طور پر راغب ہوتا ہے لیکن یہ حسن
اسی وقت تک مردوں کے لئے پرکشش ہے جب تک کہ اس کے پیچھے
کوئی عیب اور برائی پوشیدہ نہ ہو۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ عورتوں
کی نسوانیت، صحیح تعلیم و تربیت اور بات کرنے کا خوبصورت
انداز ہی اصل جوہر ہے جو عورت کی شخصیت کو ابھارتا ہے
اور خوبصورت چہرہ تو محض نسوانیت کی تصویر کا ایک فریم ہے
ماہرین نفسیات کے نزدیک دوسرا موضوع عورتوں کا جادو ہے
یعنی ساحرہ عورتیں۔ چنانچہ لفظ سحر اور اس کے اسباب کے
معنی کی وضاحت میں محققین نے ایک طویل بحث کی ہے انہوں
نے تشریح کی ہے کہ لفظ سحر کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ جو چیز حیرت

(سلیم عرفانی)

...مان طلاق عورت اور پورے سماج کے ساتھ ناانصافی

سلم پرسنل لا کی بحث یوں تو اسی دن شروع ہوگئی تھی
دن ہندو کوڈ بل منظور کیا گیا تھا اور ہندو خواتین کو طلاق و وراثت
رہ کے حقوق سے نوازا گیا تھا، لیکن اب اس بحث میں کافی شدت
ہوگئی ہے اور نہ صرف اخبارات کے کالموں تک محدود ہے بلکہ
نین کے جلسوں اور دانشوروں کے سیمناروں تک جا پہونچی ہے۔
کی ایک بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکثریت روزِ اوّل سے یہ
البہ کرتی رہی ہے کہ یا تو دونوں فرقوں ـــ ہندو ـ مسلمان ـــ
لئے ایک مشترکہ سول کوڈ ہو یا پھر مسلم پرسنل میں ایسی تبدیلی کی
ئے کہ اس میں اور ہندو کوڈ میں کوئی خاص فرق نہ رہے اور بقول
مسلم خواتین کو انکے وہ حقوق مل سکیں جن سے انھیں اب تک
دم رکھا گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے مطالبے میں
ت بھی خود حکومت کے ذمے داروں نے پیدا کی ہے ـــ جگہ جگہ
نین کے جلسے طلب کئے گئے ہیں جن میں نام نہاد ترقی پسند خواتین
شامل کیا گیا اور ان سے اپنے مطلب کے ریزولیوشن پاس
ئے گئے ـ بڑے پیمانے پر پچھلے دنوں پونا میں کانفرنس کا انعقاد
میں آیا جس میں ملک کے طول و عرض سے تعلیمیافتہ خواتین اور خا
سے خواتین ٹیچروں کو مصارف ادا کرکے مدعو کیا گیا اور مسلم پرسنل لا
تبدیلی کے حق میں قراردادیں منظور کرائی گئیں۔

پونا کانفرنس کے بعد نئی دلّی میں ہندو مسلم دانشوروں اور
ں کا ایک سیمنار منعقد ہوا جس میں ایک یوروپین مستشرق نے
شرکت کی ـ اس سیمنار میں چند کو چھوڑ کر باقی سب نے مسلم پرسنل لا
تبدیلی کرنے پر زور دیا ـ بعض ایسے بھی تھے جو مسلم خواتین کیساتھ
ردی کے جوش میں حد سے تجاوز کر گئے اور انھوں نے مسلم شریعت
پر ایسے ناروا حملے کئے جنہیں کوئی بھی پسند نہیں کر سکتا۔

ان کانفرنسوں اور سیمناروں کا خاص مقصد ایسی فضا پیدا
کرنا معلوم ہوتا ہے جس سے مسلم پرسنل لا میں حکومت کے لئے ترمیم کے
متعلق کوئی قدم اٹھانا آسان ہو جائے ـ حکومت نے یہ پالیسی اختیار
کی ہے کہ وہ کسی خاص فرقے کے معاملات میں اس وقت تک دخل نہیں
دے گی جب تک کہ خود اس فرقے کے افراد کسی تبدیلی کا مطالبہ نہ کریں
یہی وجہ ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ خود کچھ آزاد خیال مسلمان "آگے آئیں"
تاکہ حکومت مذہبی امور میں مداخلت کے الزام سے بچ جائے، اور
لاٹھی ٹوٹے بغیر سانپ مر جائے ـ کوئی تعجب نہیں کہ پارلیمنٹ کے آئندہ
اجلاس میں اسکے لئے ایک بل بھی پیش کر دیا جائے اور حکومت
کی طرف سے اس کی حمایت کیا ئے۔

لیکن اگر ایسا کیا گیا تو اس سے معاملات سلجھنے کی بجائے اور الجھ
جائیں گے ـ عاجلانہ اقدام کے کبھی بھی اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے ـــ
روشن خیالی یا جدیدیت کو باہر سے نہیں ٹھونسا جاسکتا بلکہ اسکی نشو و نما
خود ایک فرقے کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں ہوتی ہے اور اس کے
لئے طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات ماننی ہوگی کہ یہاں شادی اور
طلاق کے بعض مسائل جو اس وقت رائج ہیں ان میں کہیں کہیں ترمیم
کی ضرورت ہے ـ ضرورت یہ ہے کہ ہم خود اس بات کا جائزہ لیں کہ
قرآن اور سنّت کی روشنی میں پرسنل لا میں کیا تبدیلیاں ہو سکتی ہیں؟

سب سے اہم مسئلہ طلاق کا ہے ـ طلاق بعض حالات میں
ناگزیر ہو جاتی ہے، لیکن کیا یہ مناسب ہے کہ اگر ایک مرد ایک ہی
وقت میں تین طلاقوں کی گردان کر ڈالے تو وہ طلاق ہو جائے گی۔!
ممکن ہے کسی زمانے میں ایسا کرنا قرینِ مصلحت رہا ہو لیکن آج کے
حالات میں یہ طریقۂ عمل عورت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ طلاق دینے
والے مرد کے ساتھ اور پورے سماج کے ساتھ بے انصافی ہے ـــ

> آج کل مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مسئلہ
> بڑی شد و مد سے زیرِ بحث ہے ـ یہ ایک اہم
> سماجی مسئلہ ہے جس پر فوری توجہ دینے کی
> ضرورت ہے ـ ان کالموں میں ہم اپنے
> قارئین کے خیالات شائع کریں گے، خواہ
> ہم ان سے متفق ہوں یا نہ ہوں ـ آپ بھی
> اپنے خیالات سے نوازیئے ـــ مدیر

شادی ایک مقدس معاہدہ ہے اسے کسی کو یکطرفہ طور پر بلا سوچے سمجھے
توڑنے کی اجازت نہ دی جانی چاہئے ـ طلاق کے اس آسان طریقۂ عمل
نے ہزاروں اشخاص کی زندگیاں اجیرن کر دی ہیں اور بہت سے مسلمانوں
کے گھر تباہ ہوگئے ہیں ـ ضروری ہے کہ ہمارے علماء کرام اس مسئلے
پر غور کریں اور ایسی ترمیم کو منظور کرلیں جس سے کہ ایک بیوی ہر وقت
اپنے اوپر طلاق کی لٹکی ہوئی تلوار سے محفوظ رہ سکے۔

دوسرا اہم مسئلہ تعدّدِ ازدواج کا ہے ـ اسلام میں کہیں
بھی ایک سے زیادہ شادی کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ بعض شرائط کے
تحت مخصوص حالات میں محض اجازت دی گئی ہے ـ یہی وجہ ہے کہ اگر
اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو دوسرے فرقوں کے مقابلے میں ایسے
مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو ایک سے زیادہ بیویوں کے شوہر ہوں
لیکن افسوس پروپیگنڈا اس طور پر کیا جا رہا ہے جیسے ہر مسلمان
کے گھر میں چار چار بیویاں بیٹھی ہیں۔

اس قسم کے پروپیگنڈے کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ
تعدّدِ ازدواج کے سلسلے میں ہم خود ایسی پابندیاں اپنے اوپر عائد
کرلیں کہ دوسروں کو شکایت یا مداخلت کا موقع نہ ملے ـ مثلاً یہ کہ
دوسری شادی کرنے کے لئے کسی کونسل یا مجلس سے اجازت لینا
ضروری قرار دے دیا جائے اور وہ خاص ضرورتوں کے پیشِ نظر
دوسری شادی کی اجازت دے۔

تعدّدِ ازدواج کی اجازت حقیقتاً لامحدود جنسی بے راہ روی کو
روکنے کے لئے دی گئی ہے لیکن پھر بھی دوسری شادی پر مکمل پابندی مناسب
نہیں کیونکہ اس سے جہاں جنسی بے راہ روی کو فروغ ملے گا وہاں یہ طریقہ
بھی ناپسندیدہ ہے کہ ایک شخص کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی
کھلی چھٹی حاصل رہے۔

تعدّدِ ازدواج اور طلاق کے معاملات کے علاوہ بعض دوسری
باتوں پر بھی قرآن و سنت کی روشنی میں نظرِ ثانی کی جاسکتی ہے، اور
ایسا ضرور کیا جانا چاہیے تاکہ مسلم پرسنل لا کے خلاف جو پروپیگنڈا ہو رہا
ہے اس کا سدِ باب ہو سکے ـ اگر خود ہمارے دانشور، فقہا اور علماء
سر جوڑ کر بیٹھیں تو پرسنل لا کو ہم خود اس طرح ایک جدید پرسنل لا
بنا سکتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر اسلام کے خلاف نہ ہو ـ اگر ایسا کیا گیا
تو ہم حکومت کو پرسنل لا میں ترمیم کرنے سے روک سکیں گے اور اگر
ہم اپنی بات پر اڑے رہے اور ہم نے خود کوئی قدم نہ اٹھایا تو جو
حالات پیدا کئے جا رہے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تبدیلیاں
کرنے کے لئے خود حکومت قدم اٹھائے گی جس کے لئے اس نے فضا کو
ہموار کرنا شروع کر دیا ہے۔

جنگ کب ہوگی؟

صدر مصر مسٹر انور السادات نے گذشتہ سال اعلان کیا تھا کہ ۱۹۷۱ء کا سال ایک فیصلہ کن سال ہوگا جس کے دوران اسرائیل کے ساتھ تنازعہ یا تو پُرامن طور پر حل ہوجائے گا یا پھر مصر اس کے ساتھ جنگ کریگا. سادات اپنی ان دونوں باتوں میں سے کسی پر پورے نہ اترے۔ نہ وہ پرامن طریقہ پر اسرائیل کے ساتھ اپنے تنازعات نمٹا سکے اور نہ جنگ کرنے کی ہمت ہوئی۔

کہتے ہیں گذشتہ سال دسمبر میں وہ خاموشی سے ماسکو پہونچے تاکہ روس سے معلوم کرسکیں کہ کیا وہ اسی طرح مصر کی حمایت کرے گا جس طرح اس نے ہندوستان کی مدد کی ـــــ لیکن خفیہ حلقوں کے مطابق روس نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ اور ظاہر ہے روس کی امداد کے بغیر مصر اپنی جدید ترقی کے باوجود اس قابل نہیں ہے کہ اسرائیل کا مقابلہ کرسکے۔

انور السادات کی گول مول یعنی نہ امن کی نہ جنگ کی پالیسی ہے۔ اس لیے مصر کے عوام اکتائے اور انہوں نے ہنگامہ آرائی شروع کردی. کالج کے طلباء نے خاص طور پر زیادہ ادھم مچایا اور انھوں نے انور السادات کو پالیسی کی وضاحت کرنے پر مجبور کردیا۔

چنانچہ سادات نے ایک گھنٹہ تک ریڈیو ٹیلیویژن پر تقریر کی اور کہا کہ: "میں نے اور میرے مشیروں نے دسمبر میں اسرائیل کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا. لیکن چونکہ برصغیر ہند و پاکستان میں جنگ کے بادل منڈلانے لگے اس لیے اس فیصلہ پر عمل نہ کیا جاسکا."

سادات کا کہنا تھا کہ ہند پاک جنگ سے روس اور امریکا کے درمیان بین الاقوامی رقابت پیدا ہوگئی ہے۔ اور امریکا کو ہندوستان میں اپنی پالیسی کی ناکامی پر جو خفت ہوئی ہے اسے مٹانے کے لیے وہ اسرائیل کی پشت پناہی کرنے میں زیادہ سرگرم ہوگیا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ایک طرف امریکا نے اسرائیل کی سرگرمی کے ساتھ پشت پناہی کی اور دوسری طرف روس دور کھڑا تماشا دیکھتا رہا تو اس کا نتیجہ مصر اور دوسرے عرب ممالک کی تباہی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

امریکا مشرق وسطیٰ اور اسرائیل کی حمایت میں کتنا سرگرم ہے۔ یہ اس نے اسرائیل کو ۱۸ فینٹم طیارے مہیا کرنے کا فیصلہ کر کے ظاہر کردیا........

اور اس معاملہ میں دونوں ملکوں کے درمیان بظاہر تعلقات کشیدہ نظر آنے لگے تھے۔ لیکن وزیر اعظم اسرائیل مسز گولڈا مائر امریکا گئیں اور کامیاب لوٹیں اور انور السادات ماسکو گئے اور ناکام واپس آگئے۔

اب خبر ہے کہ سادات پھر ماسکو جانے والے ہیں تاکہ روس کو ایک مرتبہ پھر زیادہ امداد دینے کے لیے رضامند کرسکیں۔ اسرائیل کے خلاف ان کے اقدام کا انحصار زیادہ تر روس ہی پر ہے۔ لیکن کیا روس مشرق وسطیٰ میں جنگ کی اجازت دیدے گا؟ کیا وہ اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کے لیے رضامند ہوسکتا ہے جسے قائم کرانے میں وہ بھی پیش پیش تھا۔؟

انور سادات اندرون ملک عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جن طلباء نے "نہ جنگ نہ امن" کی پالیسی کے خلاف احتجاج کیا تھا ان سے بھی انھوں نے ملاقات کی ہے اور ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وزراء میں ردوبدل کیا ہے اور ۷۱ سالہ وزیر اعظم محمود فوزی کی جگہ ۵۱ سالہ عزیز صدقی کو وزیر اعظم مقرر کیا ہے۔ جو ایک انقلاب پسند اور ہارورڈ یونیورسٹی کے تربیت یافتہ انجینئر ہیں۔ اس سب کارروائی سے ان کا مقصد گرتے ہوئے اعتماد کو بحال کرنا ہے لیکن وہ آخر کب تک اس طرح اپنے اس اعتماد کو قائم رکھ سکیں گے؟

عرب ممالک کا سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے وسائل سے کبھی فائدہ نہ اٹھایا۔ مغربی ممالک نے انہیں اس طرح عیش و عشرت میں پھنسا دیا کہ انہیں ملک کی تعمیر کا کبھی خیال ہی نہ آیا۔ ان کی موٹر کا کوئی پرزہ خراب ہوگیا تو انہوں نے اس کار کو ریت میں پھینک کر دوسری کار درآمد کرنے کو اپنی دولتمندی کی نشانی سمجھا اور اس پر فخر کیا لیکن کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ ایسی موٹر گاڑیاں اندرون ملک تیار کرانے اور ان کی مرمت کرنے کے لیے اپنے نوجوانوں کو انجینئر بنائیں۔

قدرت نے انہیں پٹرول کی نعمت سے نوازا ہے۔ وہ اپنے ان وسائل سے کیا کچھ نہیں کرسکتے لیکن ان کی عیش پرستی اور "جارحانہ قوم پرستی" انہیں کچھ نہیں کرنے دیتی ـــــ وہ ایک بندوق کے لیے بھی روس کی طرف دوڑتے ہیں ـــــ جب تک وہ ہتھیاروں میں خودکفیل نہ ہونگے اور اپنی مدد کے لیے روس یا کسی اور ملک کی طرف دوڑتے رہیں گے یہ امر مسلمہ ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ صدر انور سادات اگر چاہتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء کا سال حقیقی معنوں میں ایک فیصلہ کن سال ثابت ہو تو انہیں ملک کو ہر میدان میں خودکفیل بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ خالی خولی دھمکیاں دینے اور اپنے عوام کو "فیصلہ کن سال" کا نعرہ دے کر فریب میں مبتلا کرنے سے اسرائیل سے مقبوضہ علاقے حاصل نہ کرسکیں گے!

گولڈا مائر اور سادات۔ سادات کی ہر روز دی جانے والی دھمکیاں ٹائمز کے کارٹونسٹ کی نظر میں

بھول جاتی ہے کھیل تو پھر کھیل ہے۔

لیکن جب جنگ ختم ہو گئی اور اس کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں نکلا تو پھر کھیل کی سوجھی اور ڈیورینڈ کو ملک کی خوشی دو بالا کرنے کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اور اسے شروع کر دیا گیا۔ ہاں سبوتو مکرجی ٹورنامنٹ جو ڈیورینڈ ہی کے زیر اہتمام ہوتا ہے اور جس میں اسکولوں کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں، ضرور جنگ کی زد میں آ گیا اور اسے ترک کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا۔

ابتداً اس ٹورنامنٹ کا مقصد شملہ میں سرکاری ملازموں میں کھیل کی سرگرمیوں کا شوق پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ عملاً یہ ٹورنامنٹ برطانوی فوجی ٹیموں اور مقامی ٹیموں کے درمیان مقابلوں کا ٹورنامنٹ بن گیا۔

دونوں بڑی لڑائیوں کی مدت کے علاوہ ڈیورینڈ شملہ میں برابر جاری رہا۔ اور ۱۹۴۰ء تک یوں سمجھئے ڈیورینڈ کپ پر انگریز فوجی ٹیموں کو اجارہ داری حاصل رہی۔ ۱۹۴۰ء میں پہلی بار محمڈن اسپورٹنگ نے یہ کپ جیتا جبکہ اتفاق سے اس برس پہلی بار یہ ٹورنامنٹ دلی میں کھیلا گیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کافی مدت تک کھیل شروع کرنے میں دقتیں پیش آئیں لیکن بہرحال ٹورنامنٹ کمیٹی کے اسسٹنٹ سکریٹری شری ایس ڈی سنہا اور اس وقت کے محکمہ دفاع کے سکریٹری کی کوششوں سے ۱۹۵۰ء میں یہ ٹورنامنٹ شروع ہو گیا۔

دلی میں اس کے دوبارہ آغاز اور اس کی مقبولیت سے ظاہر ہوا کہ ابھی اس کے ساتھ عوام کی دلچسپی کم نہیں ہوئی۔ اسوقت اس ٹورنامنٹ کی کوئی فوجی نوعیت موجود نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کا انتظام محکمۂ دفاع کی مدد سے ہوتا ہے ورنہ اس میں حصہ لینے والی ٹیموں میں غیر فوجی ٹیموں ہی کا غلبہ ہے۔

ڈیورینڈ ٹورنامنٹ کے بعد ملک میں کئی ٹورنامنٹ شروع ہوئے۔ مثلاً ۱۸۹۱ء میں رووَرس فٹبال ٹورنامنٹ کے بعد ۱۸۹۳ء میں آئی۔ ایف۔ اے شیلڈ کا آغاز ہوا۔ دونوں علی الترتیب بمبئی اور کلکتہ میں کھیلے جاتے ہیں۔ ڈی۔ سی۔ ایم انٹرنیشنل ٹورنامنٹ حال کی پیداوار ہیں

لیکن دونوں کوئی اچھا معیار حاصل نہ کر سکے۔ اول الذکر ایک کاروباری ادارہ کے زیر انتظام کھیلا جاتا ہے جس میں ظاہر ہے کاروباری مفادات کو سامنے رکھا جاتا ہے اور عوام سے روپیہ بٹورنے کے لیے چند برس سے "تہران کلب" کی ٹیم کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ سب سے بڑی اور افسوسناک خامی اس ٹورنامنٹ میں یہ دیکھنے میں آئی کہ اس میں جانبداری سے کام لیا جاتا ہے اور ٹیموں کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے۔ محمڈن اسپورٹنگ کیساتھ اس برس جو بے انصافی کی گئی اور جس طرح انہوں نے محمڈن کے حق میں گول کا فیصلہ دیکر پھر اسے واپس لے لیا وہ سب پر ظاہر ہے۔ اسی قسم کی خامیاں اگر اس ٹورنامنٹ میں دیکھنے میں آئیں تو وہ دن دور نہیں جب

یہ ٹورنامنٹ اپنی جاذبیت قطعی طور پر کھو بیٹھے گا۔

اس کے برعکس ڈیورینڈ کا کاروباری نقطۂ نظر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے ملک میں فٹبال کی حوصلہ افزائی کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ اور یہ ڈیورینڈ کا ہی طفیل ہے کہ اس نے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک فٹبال کے کھلاڑی پیدا کر دیے اور ان کا معیار اچھا خاصا بلند کر دیا۔ اسکا ثبوت ۱۹۷۰ء میں بنکاک میں ملا جہاں ہندوستانی ٹیم نے ایشیائی کھیلوں میں حصہ لے کر کانسی کا تمغہ جیتا

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان ایشیا بھر میں فٹ بال کا چیمپین تھا لیکن اس کے بعد اس کا معیار کافی حد تک گر گیا جس پر کھلاڑی حلقوں میں تشویش کا اظہار کیا گیا۔ بنکاک کے ایشیائی کھیلوں میں کم سے کم اس بات کا ثبوت مل گیا کہ کھیل کا معیار اب گر نہیں رہا ہے بلکہ بڑھ رہا ہے اور اس معیار کو بڑھانے میں ڈیورینڈ فٹ بال ٹورنامنٹ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس وقت فٹ بال میں ہندوستان ایشیا میں تیسرے نمبر پر ہے

ڈیورینڈ کا کپ ایک خوب صورت کپ ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ملک کی سب ہی ٹیمیں خواہش رکھتی ہیں اور اس کے لیے پورا زور بھی لگاتی ہیں۔ سر ڈیورینڈ نے جب یہ ٹورنامنٹ شروع کیا تھا تو انہوں نے طے کیا تھا کہ جو ٹیم تین سال تک لگاتار اسے اٹھائے گی مستقل طور پر اسے رکھ سکے گی۔ ہالی فیلڈ سب سے پہلی ٹیم تھی جو ۱۸۹۳ء ۱۸۹۴ء ۱۸۹۵ء میں لگاتار کپ اٹھا کر اسکی حقدار بنی اس کے بعد ۱۸۹۷ء ۹۸ء اور ۹۹ء میں مسلسل کامیاب ہو کر بلیک واچ نے اسے حاصل کیا۔ سر موٹمر ڈیورینڈ نے دو مرتبہ کپ مہیا کر دیا اور تیسری بار فٹ بال کے شائقین نے اس کا انتظام کیا۔

سر موٹمر ڈیورینڈ جب ہندوستان میں اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے تو طے پایا کہ یہ ایک چیلنج کپ ہوگا جس پر کسی کا حق ملکیت نہ ہوگا اور اس طرح موجودہ ڈیورینڈ کپ ستر سال پرانا ہے۔ گذشتہ دس برس کی مدت میں اس کپ کو جو ٹیمیں حاصل کرتی رہی ہیں انکے نام یہ ہیں۔

موہن بگان (۱۹۵۹ء)، موہن بگان دیسٹ بنگال (۱۹۶۰ء)، آندھرا پولیس (۱۹۶۱ء)، ــــ ۱۹۶۲ء میں ٹورنامنٹ نہیں ہوا، موہن بگان (۱۹۶۳ء)، موہن بگان (۱۹۶۴ء)، موہن بگان (۱۹۶۵ء)، گورکھا برگیڈ (۱۹۶۶ء)، ایسٹ بنگال (۱۹۶۷ء)، بورڈر سکورٹی فورس (۱۹۶۸ء)، گورکھا برگیڈ (۱۹۶۹ء) اور ایسٹ بنگال (۱۹۷۰ء)۔

اس سال دیکھئے قرعہ کس کے نام نکلتا ہے۔ ■

ڈالے وہ سحر ہے۔ لیکن ساحرہ عورت کیا چیز ہے اور اسکا کیا مفہوم ہے یہ ایک اہم سوال ہے۔ بعض ماہرین نے کہا ہے کہ عورتوں کی خوبصورتی کا معیار مختلف ہے کیونکہ ایک ملک کی خوبصورتی کا معیار دوسرے ملک کی عورتوں کی خوبصورتی کے معیار سے بالکل الگ ہے۔ اسی طرح ایک زمانے کا معیار دوسرے زمانے سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ اسکیمو عورتوں کے حُسن کا معیار خطِ استوا کے علاقے کے معیار سے بے انتہا مختلف ہے۔ اسی طرح ساحرہ عورتوں کے تذکرے قدیم تاریخی کتابوں میں بھی موجود ہیں اس سحر کے بارے میں ایک رومانی مزاج شاعر LEMARTIN (لیمارٹن) کہتا ہے کہ وہ عورت جو موسمِ بہار کے کھلے ہوئے پھول کی مانند ہو وہ ساحرہ ہے کیونکہ اس کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے اس کے علاوہ اور کسی دوسری صفات کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ پھر یہ کہ عورتوں کا جادو آخر کہاں چھپا ہوا ہے۔ کیا انکی خوبصورتی میں جادو ہے یا ذکاوت میں یا انکی باتوں میں یا مسکراہٹ میں جبکہ یہ تمام صفات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور کوئی شخص اس بات کا تعین نہیں کر سکتا کہ عورت کے جسم میں کس جگہ جادو بھرا ہوا ہے وہ صرف کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر اتنا بتا سکتا ہے کہ یہ جادوگر عورت ہے۔

ایک انگلش شاعر رابرٹ براؤننگ (ROBERT-BROWNING) جو ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوا تھا وہ ساحرہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عورت کی ظاہری خوبصورتی کا نام سحر ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو خریدی نہیں جا سکتی۔ وہ ایک ایسا باریک کپڑا ہے جسے عورت لپیٹ کر پوشیدہ رکھتی ہے، یا وہ سحر عورت میں ایک نرم تکیہ ہے یا سریلی میوزک ہے یا عورتوں کی وہ حسین مسکراہٹ ہے جس کی وجہ سے مرد ان کے اردگرد جمع ہوتے ہیں یا وہ باریک آواز ہے جسے مرد ایک مرتبہ سننے کے بعد خواہش کرتا ہے کہ کاش میں اس آواز کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزار دیتا لہٰذا ایسی مختلف صفات عورتوں میں موجود ہیں جن کی وجہ سے انھیں ساحرہ کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ابراہیم لنکن نے عورت کے جادو کے متعلق کہا ہے کہ عورت کا سحر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لئے کہ زندگی ہبہ کی گئی ہو بلکہ زندگی ایک ایسی اہم چیز ہے جس کے لئے سحر کو پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے ساحرہ وہ عورت ہے جو اس سے بہت زیادہ عطا کرتی ہے جو وہ دوسروں سے حاصل کرتی ہے اور یہی عورتوں کا جادو ہے

دِلّی کی فضا ایک مرتبہ پھر "فٹ بالی" ہو گئی ہے شام کو دلّی گیٹ پر پہونچیے آپ کو ایک انسانی سمندر نظر آئے گا۔

یہ کون لوگ ہوں گے؟ وہ جو کارپوریشن اسٹیڈیم سے میچ دیکھ کر باہر آئیں گے۔ اس وقت اس علاقے میں آپ کے لیے پیدل چلنا مشکل ہوگا۔ یہ سب لوگ فٹبال کے رسیا ہیں۔ اپنے تمام غموں کو بھلا کر اسٹیڈیم پہونچتے ہیں اور بڑے شوق سے کھیل دیکھتے ہیں۔ ان میں تعلیم یافتہ بھی ہیں اور غیر تعلیم یافتہ بھی۔ دولت مند بھی غریب بھی اور متوسط درجے کے وہ لوگ بھی جو نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر۔

اب سے ۸۴ برس پہلے اس وقت کے محکمہ خارجہ کے سکریٹری مورتر ڈیورینڈ نے جب فٹبال کا یہ ٹورنامنٹ شروع کیا تھا جو بعد میں ان ہی کے نام سے موسوم ہوا تو انہیں یہ اندازہ نہ ہوگا کہ جس برطانوی کھیل کو وہ اس ملک میں شروع کر رہے ہیں وہ کتنی مقبولیت حاصل کرے گا۔ ۱۸۸۸ء میں جب انہوں نے شملہ میں ڈیورینڈ کو شروع کیا تھا تو اس میں صرف چھ ٹیمیں شریک ہوئی تھیں لیکن اب کم سے کم چالیس ٹیمیں اس میں حصّہ لیتی ہیں۔

یہ ٹیمیں تقریباً سب ہی ریاستوں سے آتی ہیں۔ شمال سے، جنوب سے، مشرق سے اور مغرب سے۔

بنگال ہمیشہ فٹ بال میں آگے رہا ہے۔ وہاں کی بہترین ٹیمیں ٹورنامنٹ میں حصّہ لیتی ہیں اور بہت صاف ستھرا کھیل کھیلتی ہیں جنوبی ہند کی ٹیمیں بھی بنگال کی ٹکر کی ہیں اور بعض اوقات بہت اچھے کھیل کا مظاہرہ کرتی ہیں اسی طرح بمبئی اور گوا کی ٹیمیں ہیں انہوں نے بھی اس ٹورنامنٹ میں نام پیدا کیا ہے اور اب پنجاب بھی فٹ بال کے میدان میں کودا ہے لیکن پنجاب والوں کا کھیل دوسرے علاقوں کی ٹیموں کے برابر صاف ستھرا نہیں۔ پنجاب کی بعض ٹیمیں تو بڑا رف کھیلتی ہیں اور محض "فٹ بال بائی پاور" پر یقین رکھتے ہوئے طاقت کے بل بوتے پر ہی کپ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

یوپی جو کسی زمانے میں تعلیم میں اور کھیل میں بلکہ سب ہی کاموں سے آگے ہوتا تھا، اب ہر میدان میں پیچھے جا پڑا ہے۔ فٹ بال کی اب تک کی جو ٹیمیں یوپی کے مختلف علاقوں سے آئی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ دوسرے راؤنڈ تک چلی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یوپی اور دلی والوں کا اس معاملہ میں سمجھوتا ہے۔ سیاست میں سارے ملک کی رہنمائی اور کھیل میں سارے ملک سے پھسڈی۔

ہر برس کی طرح اس برس بھی ڈیورینڈ فٹ بال ٹورنامنٹ گذشتہ دسمبر میں شروع ہونے والا تھا لیکن جنگ نے روک لگا دی۔ جنگ شروع ہو جائے تو قوم ہر چیز

واقعات نئی دہلی ۷

۱۹۷۲ء کا تحفہ

ہاٹ پینٹ

جدید حیات اور جدید زندگی ہپیوں اور بی فری اور تحریک آزادی نسواں کا شکار ہو گئی ہے۔ سنہ ۱۹۷۲ء منی اسکرٹ سے ہاٹ پینٹ کی طرف رواں دواں ہے۔ انسانی فطرت اور انسانی زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ جلد اکتا جاتی ہے۔ قدیم روایات قدیم اصول اور قدیم باتیں جدید حیات اور نئی روشنی میں ماند پڑ جاتی ہیں۔ انسانی ذہن سدا سے بے چین رہا ہے اور امریکی طرز حیات اور برق رفتاری حیات نے امریکی نازنینوں اور حسن کو منی اسکرٹ کے بعد ہاٹ پینٹ سے آشنا کر دیا ہے۔ سان فرانسسکو، لاس اینجلس اور دیگر امریکی شہروں میں ہاٹ پینٹ ہی ہاٹ پینٹ نظر آیا کرتے ہیں۔ خوب سے خوب تر اور خوب رو بننے کی تمنا سدا سے امریکی عورتوں کو رہی ہے اور اسی لئے ہاٹ پینٹ مقبول ہو گیا ہے جسمانی حظ اور جسمانی خد و خال اور جسمانی خطوط کا بھرپور مظاہر ہوا کرتا ہے۔ امریکی طرز زندگی سنہ ۱۹۷۲ء تک پہنچتے پہنچتے اتنی بے قابو اور گمبھیر ہو چکی ہے کہ اب ہر آن اور ہر دم فیشنوں اور لباسوں اور کپڑوں کی تراشی میں فرق ہو جاتا ہے۔ پیرس اور سان فرانسسکو میں فیشن پرست ہر دم تنوع اور تبدیلی چاہتے ہیں اور عورت ذات کو حسین سے حسین تر دیکھنے اور ان علذت کوشی نے عورت کو بالکلیہ برہنہ کر دیا ہے۔ یوں بھی عورت طبعاً حسن نما اور خوشامد پسند ہوا کرتی ہے نکھرنے اور بننے سنورنے کا خیال ہمیشہ سے اسکی جبلت رہا ہے۔ سنہ ۱۹۷۲ء میں امریکی فضاؤں میں پھرتی ہوئی یہ عورتیں، ہاٹ پینٹوں میں زندگی کا نیا انداز پیش کر رہی ہیں، امریکا، فرانس، لندن، قاہرہ، ٹوکیو اور دیگر متمدن اور جدید تہذیب یافتہ شہروں میں منی اسکرٹ نے وقت کا ساتھ نہیں دے رہا ہے اور اس کی جگہ ہاٹ پینٹ نے لے لی ہے۔ امریکی رسالے اور امریکی مخصوص پرچے ایسی عورتوں کی تصاویر سے بھرے پڑے ہیں۔ ہپی ازم — تحریک آزادی نسواں بی فری تحریک دراصل مغربیت کی مادیت سے پیدا ہوئی ہیں اور سنہ ۱۹۷۲ء تک ان تحریکات نے امریکی حیات کو ایسا مسموم بنا دیا ہے کہ جدید تہذیب اپنے ہی ہاتھوں لائی ہوئی مصیبتوں میں گرفتار ہو چلی ہے۔ انسان فطرتاً جمالیاتی ذوق کا حامل ہے اس کی آنکھیں حسن کو بھرپور دیکھنے کی متلاشی رہتی ہیں۔ مردوں نے معاشرہ میں عورتوں کو خوبصورت سے خوبصورت لباسوں میں ملبوس کر کے اپنی انا کو تسکین دینی شروع کر دی ہے۔ پیرس، لندن، نیویارک اور لاس اینجلیس کے ہزاروں لاکھوں، کروڑوں لباس وضع کرنے والوں نے عورتوں سے منی اسکرٹ چھین کر اسے ہاٹ پینٹ پہنا دیا ہے جدید تہذیب ایل۔ ایس۔ ڈی گولیوں کو نگلنے والی گنوارے کر گھومنے اور بدمستی کا خلاصہ بن گئی ہے اس کا ذمہ دار آج کا انسان اور اس کا بے چین ذہن ہے۔ ہپی ازم، بی فری ازم اور جدید نوجوانوں کی نشہ آور نسل وقتی قرار کا فلسفہ حیات اختیار کرنے والی نئی نسل آج کی تہذیب کا نمونہ ہے۔ سنہ ۱۹۷۲ء اپنی جلو میں ان تہذیبی ناسوروں اور مکروہ صورتوں کو لے کر آیا ہے۔

آج کا انسان عقلیت اور روحانیت سے محروم ہو کر تہذیب کے چکر کے مصداق قدیم ادوار کی طرف پلٹ رہا ہے۔ حد سے زیادہ (POSH) زندگی، زندگی کا HERA MODERN ہونا اور جدید روشنی میں جسموں کو رنگنا، انہیں داغدار بنانا اور غیر ذمہ دارانہ زندگی، روایات سے منحرف ہو کر والدین کی نافرمانی کرنا اور نشہ آور اور مسکرات کا استعمال اور جدید زندگی گزارنے والی خواتین کا جدید نقطہ نظر اور فطری اصولوں سے انحراف اور فطری قوانین کی حد بندیوں کو توڑنا دراصل اپنے مادی وجود کو کیڑے لگانا ہے۔ ہاٹ پینٹ بے ترتیب بال اور رنگ برنگے کپڑے، سستی نشہ آور اشیاء کا استعمال اور حد سے زیادہ جنسی اختلاط تہذیب کی ترقی نہیں ہے بلکہ تہذیب کی معکوسی ترقی کا پہلو ہے۔ تعلیم اور جدید مغربیت سماج میں عورتوں کو برہنہ کر چکی ہے۔ نئی نسل بے فکری کی زندگی سے عبارت ہے اور سنہ ۱۹۷۲ء تیزی سے نت نئے مسائل اور نت نئی تحریکات سے بے چین انسانوں کے ذہن کو اور بھی بے چینیاں عطا کر رہا ہے۔ ★

محمد عبدالحفیظ

فیض احمد فیض

ے دلِ بے تاب ٹھہر

دلِ بے تاب ٹھہر!
تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندیِ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی ڈھل جائے گی
یہ گرانباریِ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی
چھنکتی ہی رہے

دہلی کا موسم سرما بھی ایسا ہی روح فرسا ہے جیسا کہ جان لیوا موسم گرما، لیکن اہل ثروت کے لئے نہ سردی باعث کلفت ہے اور نہ گرمی وجہ مصیبت، موسم گرما میں عیش و راحت کے وسائل پنکھے، فریج، کولر اور ایر کنڈیشنڈ مکانات دیکھنا ہے تو جل کر بھسم ہو جانا ہے اور سردی بیچاری ساری رات باہر سے کنڈی کھٹکھٹاتی رہتی ہے اور صبح ہوتے ہی آفتاب سے شرما کر چلی جاتی ہے جیسے اسے رسوائی کا ڈر ہو۔

سرما میں سرمایہ داروں کے لئے لطف و عیش کی محفلیں ہیں اور شراب و کباب کی سرمستیاں، ان کے لئے سردی جشن بہاراں کا ساماں مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن یہ دہلی کی چالیس لاکھ کی آبادی جس میں سروے کے مطابق تیس لاکھ انسانوں کو پسماندہ اور غریب قرار دیا گیا ہے انکے لئے سردی کیا ہے؟ ایک قیامت! یہ فقیر یہ پھیری والے، یہ ریڑھی والے، مزدور، دھوبی، رکشا چلانے والے اور دوسرے فلاکت زدہ انسان سردی کیسے کاٹتے ہیں؟ کسی رات سڑکوں اور گلیوں میں جا کر چکر لگائیے، آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا، جگہ جگہ آپ کو پانچ پانچ چھ چھ افراد پر مشتمل گروپ ملیں گے جو کوڑا کباڑ جلا کر اس کے ارد گرد ایسے بیٹھے ہوئے ہوں گے جیسے آتش شادمانی کا جشن منا رہے ہوں۔ دہلی کے ہر علاقہ میں ایسے لاتعداد آتش کدے ملیں گے جہاں لوگ ہاتھ پھیلائے ہوئے سردی کی آفت سے پناہ مانگ رہے ہوں گے، کچھ ہوں گے جو بے سُرے گیت، مذاق، دل لگی اور بے تُکی باتیں بگھار رہے ہوں گے مگر انہیں کبھی شکوہ نہیں ہوتا کہ "ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے" جیسے جیسے رات گذرتی جاتی ہے دن بھر کی جسمانی تھکاوٹ نظری اور فطری آرام کو طلب کرتی ہے چنانچہ غشی طاری ہوتی ہے لیکن بے رحم سردی پھر بے پاؤں آکر سوار ہو جاتی ہے مجبوراً خاطر داری میں اٹھ کر آتشکدہ میں کچھ ضیافتی کباڑ ایندھن جھونکنا پڑتا ہے تاکہ اس بن بلائے مہمان کو جلد رخصت کیا جاسکے۔ پھر کچھ گرمی آتی ہے، دن کی تھکاوٹ اپنا معاوضہ مانگنے لگتی ہے۔ بہر حال اجیر کو کچھ نہ کچھ اجرت ضرور دینی پڑتی ہے اگر نہ دو تو کہیں کل سے کام چھوڑنے اور ہیلتھ آفیسر سے نمٹنا پڑے اور لینے کے دینے پڑ جائیں، غشی طاری ہوتی ہے اور وہ بے حسی کی گود میں پھر سے پہونچ جاتا ہے۔

"لمبی ہے شام غم مگر شام ہی تو ہے"

لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس بے زبان جسم کا ہم ہمیشہ استحصال کرتے رہیں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں، اگر آپ حق پورا نہیں دیتے تو حکومت جسم کے افسروں دل و دماغ کو رشوت دینی پڑے گی، چنانچہ دیسی شراب، چرس، بھنگ وغیرہ سے انکی تواضع کیجاتی ہے "مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو" غرضیکہ اس بیچارے کو ہر وہ جتن کرنے پڑتے ہیں جو ایک عاشق سرگرداں کو برضائے معشوق، تاکہ آنے والے کل کے لئے بھی اس کو خدمت پر آمادہ رکھ سکے اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے، یہ رت جگا اور جشن آتش شادمانی کہاں مناتے ہیں تو اس کا جواب سننے سے پہلے آپ یہ بتایئے کہ رات کے وقت جب بسیں نہیں چلتیں تو یہ بس اسٹاپ، پانی کے پیاؤ اور پل کے نیچے کی سڑکوں کے فٹ پاتھ کس مصرف میں لائے جائیں گے، ایسی جگہوں میں نئی دہلی اسٹیشن کے پل کو خاص شہرت حاصل ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خاندانوں نے وہاں سال کے بارہ مہینو کے لئے اپنا ٹھکانا بنا لیا ہے میں نے وہاں ایک سے پوچھا، رات کو تم یہاں کیوں رہتے ہو؟ تو پھر ہم جائیں کہاں!! اس نے برجستہ جواب دیا، میں نے ازراہ ہمدردی اس سے کہا۔ کارپوریشن نے بہت سے رین بسیرے بنائے ہیں، تم ضرور۔ پولیس کے آدمی ہو؟ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا، میں نے اس کو بمشکل تمام سمجھایا کہ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں اور نہ کوئی دکھ دینے کے لئے پوچھ رہا ہوں پھر اس نے ایک وجہ بتائی "وہاں کمبلوں میں بہت جوئیں ہیں" اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا یہ صحیح ہے کہ کارپوریشن نے بے گھر لوگوں کے لئے رات گذارنے کو تھوڑا بہت انتظام کیا ہے اس نے رین بسیرے قائم کئے ہیں جن کی کل تعداد اکیس ہے ان میں سے گیارہ تو سال کے بارہ مہینے کھلے رہتے ہیں اور دوسرے دس صرف سردیوں کے چار مہینے استعمال ہوتے ہیں، یہ عارضی رین بسیرے ٹین کی چھت کے ہیں مستقل رین بسیروں میں سے بھی صرف پانچ رین بسیروں کا خرچ کارپوریشن اٹھاتی ہے جبکہ دیگر چھ خیراتی ادارے لائنلس کلب، بھارت سیوک سماج اور عیسائی مشنری کی طرف سے چلتے ہیں۔ یہ رین بسیرے، بجے شام کو کھل جاتے ہیں اور صبح ۷ بجے بند ہو جاتے ہیں، فرش پر ٹاٹ بچھا ہوتا ہے۔ جب کوئی ضرورت مند آتا ہے تو اسے ایک یا دو کمبل دیئے جاتے ہیں۔ پانی کا مفت انتظام ہے اور بیمار پڑنے پر فوراً دواخانے میں داخل کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ مرض دوسرے تک تجاوز نہ کر جائے اسکی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔

رین بسیروں میں تقریباً پانچ ہزار افراد کی گنجائش ہے یہ ایک میں کم سے کم پچاس افراد سو سکتے ہیں اور جو عارضی ہیں انہیں ایک ہزار تک کی تعداد کھپ سکتی ہے۔ میں نے ۲۶ رات کو تقریباً آٹھ رین بسیرے دیکھے جو کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے جن میں مزید کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ فضا بیڑی کے دھوئیں سے بوجھل تھی جسمانی بدبو اور سانس سے خارج شدہ ہوا نے سانس لینا دو بھر کر دیا، جو ناقابل برداشت تھا، تازہ ہوا کے آنے کے لئے بہت کم جگہ تھی اور جس وقت میں پہونچا تو ہوا باہر پھینکنے والا آلہ بھی بے حرکت تھا غالباً وہ بھی سردی سے متاثر تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے کسی بند کمرے میں جانوروں کو ٹھونس دیا گیا ہو لیکن شاید لوگ جانور بننا اس لئے پسند کرتے ہیں کہ باہر وہ سردی کی پکڑ میں آجائیں گے۔

ابھی چند دن قبل یہ سردی تین جانیں لے چکی ہے۔ اور انہیں ایک تو اچھا خاصا نوجوان تھا ــــ بڑی امیدیں لے کر یوپی کی کسی جگہ سے آیا تھا لیکن وہ اپنی ساری امیدیں اپنے ساتھ لے کر رخصت ہو گیا ــــ اور نہ جانے کتنے ہیں جو سردی ہو یا گرمی، موسم برسات ہو یا موسم خزاں ــــ مرغ بسمل کی طرح تڑپتے رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی ــــ یہ ہندوستان ہے جہاں سب لوگوں کو یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہیں ــــ اور جہاں سب کو آگے بڑھنے کے یکساں مواقع میسر ہیں۔

مجھے میرے ہمسایوں سے بچاؤ

(شوکت حریم)

کون آیا تھا۔ کیوں آیا تھا؟

ان ہی دو سوالوں کا جواب دے دے کر تھک چکی ہوں، اور
ب تو یوں لگتا ہے کہ اگر یہ سوال اب کسی نے مجھ سے کیا تو میں
اسکا سر توڑ دوں گی یا اپنا سر پیٹ لوں گی۔ انتہا ہو گئی ہر
نا ء اللہ ہمارا خاندان بھی بہت بڑا ہے، کوئی دن ایسا نہیں
ر تا کہ کوئی نہ کوئی آتا نہ ہو۔ گھر میں کالج میں پڑھنے والے
بھی ہیں۔ لڑکوں کے دوست بھی آتے ہیں اور لڑکیوں کی سہیلیاں
)۔ اب ہم اپنے ہمسایوں کو کہاں تک بتائیں کہ بھئی فلاں شخص
تھا۔ ہمارے یہاں آنے والوں کے نام تک انھیں ازبر ہو گئے
۔ میں کالج سے گھر لوٹتی ہوں تو مجھے پوری رپورٹ مل جاتی ہے
فلاں فلاں آیا تھا۔ کس وقت آیا اور کس وقت گیا ——
کیوں آیا؟ ——

اور ہاں کچھ اسی پر اکتفا نہیں۔ محلے بھر کی خبریں بھی مجھے
پہونچائی جاتی ہیں۔ "اس کونے والے گھر میں آج اتنے مہمان آئے
منے والے گھر میں ایک اس حلیے کا آدمی آیا۔ نیچے والوں کے
ں عجیب وضع قطع کے لوگ آکر ٹھہرے ہوئے ہیں، اور وہ پیچھے
گھر میں جو لڑکی ہے نا وہ بہت مغرور ہے۔ اپنے جوڑے ہی میں

مگن رہتی ہے ہر روز ایک نیا اسٹائل بنا ہوتا ہے۔ غور سے دیکھو
تو کچھ زیادہ خوبصورت نہیں رنگ بھی سانولا ہے مگر دور سے اچھی
لگتی ہے۔ اونہہ، ہمیں کیا اچھی ہے تو اپنے لئے۔ اور ہاں وہ جو
سامنے آدمی ہے نا۔ وہ بڑا بدمعاش ہے چھجے پر ہی کھڑا رہتا ہے
چوبیس گھنٹے۔ کونے کے گھر والے تو بڑے نیک اور پارسا ہیں۔ لڑکی
لڑکی بھی بے پردہ ہے اور بہو بھی، لڑکا بھی آوارہ ہی سا ہے دس بار
تو مجھے دیکھ کر مسکرایا، دو ایک بار سلام بھی کیا۔ شکل نہیں دیکھتا
اپنی۔ جی چاہتا ہے تو جوتے صبح کو لگاؤں اس کی چاند پر اور تو
جوتے شام کو لگاؤں۔ چڑیمار کہیں کا۔"

یہ سب باتیں میں سنتی رہتی ہوں اور ہوں ہاں کرتی رہتی ہوں
بارہا میں نے اپنی ان کرم فرما کو سمجھایا بھی کہ تمہیں یہ کیا روگ لگ
گیا ہے، کہیں کوئی آئے کوئی جائے تمہیں کیا۔

میرے گھر پہونچتے وہ بھی آنکھیں نچاتی مل جاتی ہیں اور میں
گو نگے کا گڑ کھائے ہوں ہاں کرتے انھیں ٹالنے کی کوشش
کرتی ہوں مگر وہ یہ بتانے پر مصر ہیں کہ وہ جو دائیں طرف کی گلی میں
پہلا گھر ہے اس گھر کی عورت کو توپلنگ توڑنے کے علاوہ کوئی
کام ہی نہیں ہے، روزانہ اسکا میاں صبح دفتر جانے سے پہلے
جھاڑو دے کر جاتا ہے، اور جس روز ناندی آجائے تو غریب کی
شامت ہی آجاتی ہے بے چارے کو فرش بھی دھونا پڑ جاتا ہے ——
بے چارہ۔ مجھے تو اس پر بڑا ترس آتا ہے اور آرام طلب عورت
کے برابر میں جو عورت رہتی ہے نا اس کے گھر میں سب سے زیادہ
سامان ہے، ویسے دیکھنے میں تو ایسے نہیں لگتے نہ جانے کہاں سے
دولت پھٹ پڑی ہے ان پر۔ اور مارے جلن کے اس نے اپنے ہی
ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ لیا۔

چوتھے والی ہے نا، اس کے برابر میں سید صاحب رہتے ہیں
سید ویدتو خاک ہی ہوں گے، بنے ہوئے سید لگتے ہیں، کہیں بہو
پڑھانے جاتی ہے بیٹیاں بھی پڑھتی ہیں کوئی بی اے میں ہے کوئی

ایم اے میں سب بے پردہ، سب ماڈرن، اولاد بالکل بے لگام ہیں، کہنے
کو سید ہیں نیک ہیں۔ بھلا بے پردہ عورتیں بھی کہیں اچھی ہوتی ہیں
سائی بتا رہی تھی کہ انکی لڑکیاں تو دن بھر ناولیں پڑھتی ہیں۔ بھلا
کوئی ناول بھی لڑکیوں کے پڑھنے کی چیز ہے۔"

اور یہ ٹیپ ریکارڈ مجھے روز ہی سننا پڑتا۔ وہ تو اپنا ذہن
ہلکا کر کے رخصت ہو جاتی ہیں اور میں بوجھل ذہن اور تھکے ہوئے
جسم کو ذرا آرام پہونچانے کے لئے سونے کی کوشش کرتی ہوں
مگر اللہ بھلا کرے ہمارے ہمسایوں کا، کیا مجال جو میری آنکھ لگنے
دیں۔ کبھی ایک کا بچہ دھنا پیٹ جاتا ہے کبھی دوسرے کا۔ چھری
دیدو، قینچی دیدو، ماچس دیدو اور پھر چھری لے لو، قینچی لے لو، یہ اپنی
ماچس لے لو۔ یا اللہ اگر یہ چیزیں لی تھیں تو دیدار کو کیا جانیں
اس اٹھک بیٹھک سے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور
سر پکے پھوڑے کی مانند دکھنے لگتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا
کروں اور کیا نہ کروں۔ ذہن میں یہ مصرعہ ابھرتا ہے کہ ؎

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مگر نہ شاعر کو نوحہ گر ملا اور نہ مجھے نصیب ہوگا۔ پھر دل چاہتا
ہے کہ اللہ میاں سے لڑائی کروں۔ آخر اس نے کیوں مجھے اچھے ہمسائے
نہیں دیے۔ ٹھیک تو ہے تم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
ہم نے اپنی زندگی میں بیسیوں مکان بدل لئے مگر ہمسایہ اچھا کبھی
نہ ملا۔ ایسا اچھا ہمسایہ کہ جسے ہم اللہ کی رحمت قرار دے سکیں
ہمارے لئے تو یہ ہمسایہ طرح خاں ہی ثابت ہوا۔ اس وقت مجھے راشد
کی امی یاد آجاتیں، وہ بھی ہماری پڑوسن تھیں۔

ہر چوتھے روز بات بے بات لڑنا ان کا کام تھا۔ کبھی بچوں
پر لڑائی ہو جاتی کبھی ہلدی مرچوں پر۔ ہم نے یہ چیز مانگی تھی تم
نے نہیں دی۔ بے چاری میری امی۔ لڑائی سے کوسوں دور
بھاگنے والی۔ بھلا اس کا مقابلہ کیا کرتیں۔ وہ لڑتی رہتیں میری
امی روتی رہتیں۔ میرا جی چاہا کرتا تھا کہ اسکا منہ نوچ لوں۔ میری امی
سے لڑتی ہے۔ مگر میں بس یہ سوچ کر ہی رہ جاتی۔

ایک دفعہ ہمارے پڑوس میں فرحت کی امی آکر رہی تھیں۔ بس
انھیں ۲۴ گھنٹے ایک ہی وہم کھائے جاتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے یہاں
پتھر پھینکتے ہیں۔ اب بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ بھلا کوئی دماغ
خراب ہے کہ اور کچھ نہیں تو پتھر ہی پھینکنے لگے۔

اور زاہدہ کی امی تو اور بھی عجیب تھیں انھیں بس یہی دکھ تھا کہ کون
کس سے ملتا ہے اور کیوں ملتا ہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھیں کہ

کی جدید انتظامی شکل

شیخ مجیب الرحمٰن نے پارلیمانی نظام کو کیوں ترجیح دی

(سلیمان صابر

شیخ مجیب الرحمٰن سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے صدارت پر وزارتِ اعلیٰ کو کیوں ترجیح دی"؟

جواب میں انھوں نے کہا:" مجھے عوام پر اعتماد ہے۔"

شاید لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے ملک میں صدارتی انتظامیہ بنائیں گے اور اس طرح وسیع اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ امریکا جیسے بعض ممالک میں صدارتی انتظامیہ کا نظامِ حکومت قائم ہے۔ اس نظام میں انتظامیہ بہت حد تک پارلیمنٹ یا قانون ساز جماعت کی بازپرس سے آزاد ہوتی ہے سربراہِ مملکت برائے نام اختیارات کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کے اختیارات حقیقی اور اصلی ہوتے ہیں۔ مثلاً امریکی صدر کو وسیع اختیارات حاصل ہیں اور وہ انھیں پورے طور پر استعمال کرتا ہے۔ وہ کانگریس کے پاس کئے ہوئے قوانین کو نامنظور کر سکتا ہے اور بیرونی اور خارجی پالیسی کو پوری طرح کنٹرول کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ صدارتی نظامِ حکومت جمہوریت کے باوجود ایک طرح سے مطلق العنان نظامِ حکومت ہے۔ اس مطلق العنانیت کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ کابینہ پورے طور پر صدر کے ماتحت ہوتی ہے۔ صدر ہی وزیروں کو مقرر کرتا ہے اور وہی برخاست کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ کابینہ کے ممبروں یا وزیروں کا انتخاب کانگریس یا پارلیمنٹ سے نہیں ہوتا بلکہ وزرا پورے طور پر صدر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ وزرا نہ تو مجلسِ قانون ساز کے ممبر ہوتے ہیں اور نہ وہ اس کی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں اور نہ انھیں قانون ساز جماعت میں ووٹ دینے کا حق ہے۔

امریکا میں اگر اس "مطلق العنانیت" کو برداشت کرلیا گیا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہاں کے وفاقی نظام میں ریاستوں کو خود مختاری حاصل ہے، گورنر تک عوام کے منتخب شدہ ہوتے ہیں صرف قومی مسائل ہی میں مرکزی حکومت کو غلبہ حاصل ہے۔ علاوہ ازیں عوام کا جمہوری شعور انتہا کو پہونچا ہوا ہے لیکن دوسرے مقامات پر جہاں کہیں بھی صدارتی نظامِ حکومت کو ترجیح دی گئی ہے وہ حقیقی معنوں میں ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل ہوگیا۔ مثال کے طور پر پاکستان کے سابق صدر ایوب خان نے اپنے ملک میں صدارتی نظام کی داغ بیل ڈالی اور اپنی صوابدید کے مطابق اپنے وزرا کو جو الکشن سے دور رہے تھے منتخب کرلیا (موجودہ صدر بھٹو بھی انہی میں سے ایک تھے) اور اس طرح وہ پاکستان کے آمرِ مطلق حکمراں بن گئے۔ ایک ڈکٹیٹر اور ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ پورا نظامِ حکومت انکے اشارۂ چشم وابرو کا محتاج بن کر رہ گیا۔ انکی جگہ صدر یحییٰ خاں آئے تو وہ بھی ایک مطلق العنان حکمراں بن کر بیٹھ گئے اور جیسا کہ پاکستان کی پیپلز پارٹی کے ایک سرکردہ لیڈر نے کہا:

"جمہوریت کا گلا گھونٹ کر رکھدیا گیا ہے۔"

اور جو مظاہرہ اپنے آخر دنوں میں انھوں نے کیا اسے لکھتے ہوئے تو قلم لرزتا ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے صدارتی نظام کی جگہ جس پارلیمانی نظامِ حکومت کو ترجیح دی ہے اسکا سربراہ انگلستان کیطرح ایسا بادشاہ بھی ہوسکتا ہے جو وراثتاً چلا آرہا ہو، اور ایک صدر بھی ہوسکتا ہے جسے عوام نے منتخب کیا ہو، جیسا کہ ہندوستان میں ایک صدر کو قانونی اعتبار سے اگرچہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ محض معمولی اختیارات ہی استعمال کرسکتا ہے۔ حقیقی اختیارات صرف کابینہ کو حاصل ہوتے ہیں جسکا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وزرا سربراہِ مملکت کے ذریعے مقرر نہیں ہوتے بلکہ انھیں وزیر اعظم مقرر کرتا ہے اور انکے لئے لازم ہے کہ وہ ملک کی قانون ساز جماعت کے منتخب شدہ ممبر ہوں اور انکا تعلق اکثریتی پارٹی سے ہو۔ اگر کسی جگہ ایک پارٹی اکثریت میں نہ ہو تو دوسری جماعت سے ملکر ایسی مخلوط جماعت قائم کرنے کی کوشش کیجاتی ہے جو ایوان کے اعتماد کے ساتھ نظم ونسق چلا سکے۔

اس نظامِ حکومت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ قانون ساز اور انتظامی شعبوں میں مفاہمت اور یگانگت رہتی ہے۔ جبکہ صدارتی حکومت میں ہر وقت ٹکراؤ کا امکان رہتا ہے امریکا میں آج کل قانون ساز جماعت یعنی امریکی کانگریس اور صدر کے درمیان ٹکراؤ ہے۔ کانگریس میں ڈیموکریٹک پارٹی کی اکثریت ہے جبکہ صدر نکسن ریپبلکن پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں (حالیہ جنگ میں ڈیموکریٹک پارٹی کا رجحان ہند کے حق میں تھا اور صدر نکسن کا پاکستان کی طرف ۔۔۔ اس کشمکش کی بنا پر امریکی اخبارات میں بڑی دلچسپ رپورٹیں شائع ہوئیں اور ایک کالم نویس نے تو صدر کی خفیہ میٹنگوں کی کارروائی چھاپ کر ساری دنیا میں اچھی خاصی سنسنی پیدا کردی تھی)

لیکن بہرحال پارلیمانی نظام کی بھی بہت سی خرابیاں ہیں مثلاً یہ کہ اس میں ہر چیز کا انحصار ووٹوں پر ہوتا ہے، حکومت مستحکم نہیں ہوتی، وزیروں کو اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اگلے الیکشن میں ہار نہ جائیں اسلئے وہ بہت سے کاموں کو الیکشن جیتنے اور ووٹروں کو خوش رکھنے کی غرض سے کرتے ہیں۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ اصل اقتدار اکثریتی پارٹی کے چند لیڈروں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے اور وہ جسطرح چاہتے ہیں حکومت کو چلاتے ہیں اور جسکو چاہتے ہیں عہدے دیتے ہیں

لرح حکومت چند لوگوں کا کھلونا بن کر رہ جاتی ہے اور وہ
یتم سے دل نشین نعرے لگاکر عوام سے ووٹ حاصل
نے کی کوشش کرتے ہیں۔

ردنوں طرز ہائے حکومت کی اچھائیوں اور برائیوں کو
ِ نظر رکھا جائے تو اسی نتیجے پر پہونچا جائے گا کہ خواہ کسی
م کا بھی نظامِ حکومت قائم ہو اس کی کامیابی کا زیادہ تر
ہار عوامی شعور پر ہے۔ بنگلا دیش کے عوام اپنے شعور
س حد تک ثبوت دیتے ہیں اسکا جواب آنے والے زمانے
ے گا۔ فی الوقت بنگلا دیش کے عوام کی ۹۸ فیصدی
یت عوامی لیگ اور اس کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو
صل ہے اور اسی لئے شیخ صاحب نے پارلیمانی نظامِ
ومت کو منتخب کرتے وقت یہ کہا ہے کہ:۔

"مجھے عوام پر اعتماد ہے"۔

اس نظام کی بنیاد اسلامی جمہوریت پر بھی رکھی جا سکتی
ی اور اسکا بنگلا دیش کے لوگوں کو حق تھا کیونکہ ان کی
کثریت مسلمان ہے، لیکن وہاں ایک کروڑ غیر مسلم بھی ہیں۔
بنًا اسی لئے بنگلا دیش کی حکومت نے ہندوستان کی پیروی
رتے ہوئے جمہوریت کے ساتھ ساتھ سیکولرازم کو بھی اپنی حکومت
کی بنیادی پالیسی قرار دیا ہے اور مذہب کی بنیاد پر شہریوں
میں کسی قسم کا امتیاز کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس
سے وہاں کی اقلیت میں اعتماد پیدا ہوگا اور باہمی یگانگت
مستحکم ہوگی جس سے آخر میں خود حکومت کی بنیادیں مضبوط
ہوں گی۔ ●●

انسانی زندگی پر ستاروں کی گردش کا کافی اثر پڑتا ہے۔
اس موضوع پر کافی تحقیق ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ جدید سائنس
بھی اس حقیقت سے منکر نہیں کہ شب و روز کی گردش کے نتیجے میں
موسموں کی تبدیلی وغیرہ کا انسان پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوئی
غیب داں نہیں ہیں، غیب کا حال تو صرف خدا کو معلوم ہے۔ ہم تو
صرف اپنی معلومات کی بنا پر یہ پیشگوئی شائع کر رہے ہیں۔

یکم فروری سے ۱۴ فروری تک ۱۴ دن آپ کے لئے
کیسے ہوں گے؟ آپ اپنے نام کا پہلا حرف دیکھ کر معلوم کر لیجئے۔

ا ع ل م ن :۔ امتحان میں کامیابی۔ کاروبار میں منافع۔
عزیزوں سے امداد ملنے کی امید۔ جمعہ کا دن بہت مسرت بخش ثابت
ہوگا۔ مرض سے نجات ملے گی صحت میں مزید خرابی پیدا نہ ہوگی۔

ب پ م :۔ کاروبار میں گھاٹا۔ دوستوں سے فائدے کی امید
نہیں۔ گھر میں نئے مسائل۔ سفر میں فائدے کا امکان۔ مالی حالت
جوں کی توں رہے گی۔ گھریلو تعلقات میں سدھار پیدا ہوگا۔ نیا کاروبار
نہ کریں گھاٹے کا امکان ہے۔

ہ ح ھ و :۔ محبت میں کامیابی۔ افکار گھٹیں گے۔ کاروبار
میں منافع ہوگا۔ گھر میں لڑائی جھگڑے کا اندیشہ۔ صحت خراب
رہ سکتی ہے۔ کوئی خوشخبری ملنے کا امکان۔ کسی پرانے شناسا سے
ملاقات۔ حکام سے فائدہ پہونچے گا۔

ث س ش ص :۔ یہ ۱۴ دن آپ کے لئے ملے جلے اثرات کے
حامل ہیں۔ کاروبار میں ترقی ہوگی۔ دوستوں اور عزیزوں سے راحت
ملے گی۔ مالی حالت بھی بہتر رہے گی کوئی خوشخبری ملے گی۔ سنیچر کو
سفر نہ کریں بچھڑے ہوئے ساتھی کی خبر ملے گی لیکن کسی کی جدائی
کی خبر بھی ملے گی۔

و ڈ ر ڑ ع :۔ محبت میں کامیابی۔ نئے مسائل پیدا ہوں گے، مگر
دشمن کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہوگی۔ بیوی بچوں سے راحت
ملتی رہے گی کاروبار میں نقصان ہوگا۔ صحت بھی خراب رہے گی

ر ج چ خ غ ف :۔ صحت میں سدھار مگر گھریلو حالات جوں
کے توں رہیں گے۔ دشمن نقصان پہونچانے کی کوشش کرے گا مگر ناکام
رہے گا۔ قرض ادا ہونے کی صورت نکلے گی۔ محبت میں کامیابی کا امکان
آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ صحت کا خیال رکھیں۔

ت ٹ ق ک گ :۔ بیماری سے نجات ملے گی۔ اتوار بدستور
پریشانیوں کا دن ہوگا لیکن سب بگڑے کام بنیں گے۔ کاروبار میں
فائدہ ہوگا۔ صحت میں کوئی خاص قابلِ ذکر تبدیلی نہ ہوگی۔ مجموعی طور
پر یہ ۱۴ دن آپ کے لئے کسی خاص اور قابلِ ذکر واقعے سے یکسر
خالی ہوں گے۔ ●●

پہلا ہفتہ ملے جلے اثرات کا حامل ہے۔

ز ظ ض ے :۔ آمدنی میں اضافہ۔ خرچ بھی ضرورت سے زیادہ
ہوں گے۔ دوستوں سے راحت ملے گی۔ ملازمت میں ترقی کے امکانات
نئے لوگوں سے تعلقات میں فائدہ پرانے تعلقات بھی مفید نتائج
کے حامل ہیں۔ محبت میں ناکامی یقینی ہے۔ یہ ۱۴ دن آپ کے
لئے ملے جلے اثرات کے حامل ہیں۔

مدینہ کی ایک یادگار ادبی محفل

عشاء کی نماز کے بعد میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلا ہی تھا کہ "باب المجیدی" پر صدر بزم اردو جناب سید احمد مدنی صاحب پر نظر پڑی چند روز پہلے بزم کے جنرل سکریٹری جناب صابر القاسمی شہید کی جانب سے آج بزم اردو کے زیر اہتمام غالب و اقبال کی یاد میں منعقد ہونے والی مجلس میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ اردو زبان سے ہمارا جو رشتہ ہے اس کی موجودگی میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہیں یا کوئی دوسرا اردو دوست گہوارۂ اردو سے ہزاروں میل دور میسر آنے والی کسی اردو مجلس سے اس طرح غائب ہو جائے کہ اسے یاد دہانی کی ضرورت محسوس ہو۔ لیکن یہ صدر بزم اور دوسرے اراکین کی احتیاط پسندی کا اعلیٰ معیار ہے کہ وہ ہمارے استقبال کے لئے باب حرم تک آگئے تھے۔ جیسا کہ صدر بزم نے بتایا کہ "یاد غالب" وقت پر اس لئے نہیں منائی جا سکی کہ حج کی مشغولیتیں اجازت نہیں دے سکیں۔ چنانچہ جب تاخیر ہو گئی تو مناسب یہی سمجھا گیا کہ اقبال اور غالب دونوں کی یادیں ایک ساتھ ہی جمع کر لی جائیں۔ ابھی جلسے کی کارروائی شروع ہونے میں کچھ دیر تھی میں نے موقع غنیمت جان کر صدر بزم سے درخواست کی کہ وہ اس وقفہ میں مجھے بزم اردو کے دفتر اور لائبریری کی ایک جھلک دکھادیں جسے انتہائی مشغولیت کے باوجود موصوف نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا اور مجھے ساتھ لے کر نیچے اتر آئے۔ پہلی نظر میں ہمارے سامنے جو چیزیں آئیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔ میرے دائیں ہاتھ پر ایک لمبی خوبصورت سی میز پر کچھ کاغذات۔ ایک ٹائپ رائٹر اور دوسری چیزیں اور ایک تختی نظر آئی جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "صابر القاسمی شہید جنرل سکریٹری بزم اردو مدینہ منورہ" اس کے مقابل والی دوسری میز پر سید احمد مدنی صدر بزم اردو مدینہ کی تختی اپنے لوازمات کے ساتھ نظر آئی۔ اور دروازے کے مقابل جو میز لگی ہوئی تھی اس پر یہ الفاظ سایہ کر رہے تھے "مولانا محمد عبد الملک جامعی نگرانِ اعلیٰ بزم اردو" فرش پر حسین قالین، خوب صورت سی چاندنی تقریباً ایک درجن نفیس کرسیاں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ گو یا پورے ماحول میں نفاست اور لطافت رچی بسی ہوئی تھی۔ میں ابھی انہی چیزوں کو دیکھنے میں محو تھا کہ مدنی صاحب نے ہماری توجہ کتابوں کی طرف دلائی۔ جب تک ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یہ صرف دفتر ہی نہیں بلکہ قابل قدر لائبریری بھی ہے۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر جانب کتابیں نظر آئیں جو دیواروں سے لگی الماریوں میں سلیقے کے ساتھ سجی ہوئی تھیں۔ وقت اتنا تنگ تھا کہ مجھے کتابوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا یاد نہیں رہا۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ ۸۰۰ سے زیادہ اور ۱۰۰۰ سے کم ہی ہونگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اراکین بزم خاص طور پر بانی و صدر جناب سید احمد مدنی صاحب کے لئے بے ساختہ دل سے دعائیں نکلیں شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اردو کی یہ پذیرائی ایک ایسا موثر جملۂ تسلی ہے جو اپنے گہوارہ میں اردو کو دم توڑتا دیکھ کر رو دینے والی آنکھوں سے آنسو خشک کرتا ہے اور اس امید کو یقین بنایا جا سکتا ہے کہ بلائیں لاکھ ہیں لیکن بین الاقوامی سطح پر اردو کو جو قبول عام حاصل ہوا ہے اسے روکنا ناممکن ہے اور اردو دشمن طاقتوں کے سرغرور پاش پاش ہونے میں اب دیر نہیں ہے۔

ابھی ہم نے لائبریری پوری طرح دیکھی بھی نہیں تھی اطلاع ملی کہ وقت ہو گیا ہے حاضرین انتظار میں ہیں اور جلسے کی کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ جلسے کا انتظام موسم کی مناسبت سے اوپر فراخ چھت پر کیا گیا تھا۔ ہم فوراً اوپر پہونچے۔ حاضرین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اکثر اسلامک یونیورسٹی کے طلباء نظر آئے، شہر کے بھی لوگ تھے اور کچھ حجاج بھی۔ ایک حسین اجتماع تھا، اسٹیج کے دائیں بائیں "یاد غالب" اور "یاد اقبال" کے خوبصورت کتبے آسمان اردو کے آفتاب و ماہتاب کی یاد دلا رہے تھے۔ تخت صدارت پر متمکن حضرت مولانا خلیق الرحمن نعمانی صاحب مظاہری کی شخصیت تھی۔ اسٹیج سکریٹری کی جگہ خالد نعمانی صاحب جلوہ فرما نظر آئے پروگرام کی ریکارڈنگ کا بھی اچھا انتظام تھا۔

جلسے کی کارروائی سلسلے وار چلی۔ تلاوت کے بعد محترم سوختہ صاحب نے اقبال مرحوم کی نعت اپنے دلآویز انداز میں پیش کی۔ خطبۂ افتتاحیہ

صدرِ بزم جناب سیّد احمد مدنی صاحب نے پیش کیا جس کے بارے میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ دل سے نکلے ہوئے سچے جذبات اور دعوتِ عمل پر مشتمل یہ خطبہ مدینہ منورہ کی بزمِ اُردو کے شایانِ شان تھا۔ اس جاندار خطبے کے بعد ایک صاحب نے اقبال کی زبان میں غالبؔ کو خراجِ تحسین پیش کر کے ایسی قابلِ تحسین مثال پیش کی کہ جس نے اہلِ نظر کو کافی متاثر کیا۔ یہ تنبیہ تھی ان کم نگاہوں کو جو اُردو کو آفاقیت سے نکال کر جغرافیائی حدود میں مقید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُردو کی ناخدائی میں ہر دو معزز شخصیتوں کی منفرد لیکن مشترک خدمات ہمیں یہی درس دیتی ہیں۔ یہ وہی نظم تھی جس میں غالبؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے علّامہ اقبالؔ کی زبان سے یہ دو مصرعے نکلے اور ہر اُردو داں کی زبان پر رواں ہو گئے؎

گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیٔ دل سوزیٔ پروانہ ہے

جالی صاحب کا مقالہ (میرا پسندیدہ شاعر) اقبالؔ کی شخصیت اور شاعری سے متعلق دلچسپی سے سُنا گیا۔ مقالات کے بعد مدعوئین کا منتخب کلام پیش کیا گیا۔ اس دور میں مدثر حسین جوہر صدیقی، عبد الجلیل صاحب سوختہ اور حجاز میں اُردو کے عظیم نکتہ شناس اور نکتہ آفرین شاعر صوفی غلام محمد صوفی صاحب حیدرآبادی بہت کامیاب رہے۔ محترم حافظ محمد امین زاہد صاحب نے اقبالؔ کے کچھ فارسی اشعار اور اس کی تشریح اچھے انداز میں پیش کی۔

مشاعرے کا دور مختصر لیکن مثالی رہا۔ جوہر صدیقی صاحب نے محترم جناب افقرؔ موہانی صاحب کی غزل پیش کی جو موصوف نے غالبؔ کی یاد میں منعقد ہونے والی اس مجلس کے لئے خاص طور پر ارسال کی تھی ظاہر ہے کہ غالبؔ کی ہی نذر کی گئی تھی۔ حافظے نے اس مرصع غزل کے تین اشعار آپ کے لئے محفوظ کر لینے میں پوری مدد کی، لیجئے سُن لیجئے؎

مٹانے کے لئے مردہ زبانیں اور بھی تو ہیں
نظر بد دور پامالِ خزاں اردو زباں کیوں ہو
لحد کیسی کہاں کی چادرِ گل شمعِ تربت کیا
جو تم پہ مر مٹا ہو اس کا اتنا بھی نشاں کیوں ہو
مرے خونِ وفا کی سرخیاں جس میں نہ ہوں افقرؔ
کسی کا ہو گا افسانہ وہ میری داستاں کیوں ہو

عبد الجلیل صاحب سوختہ کے اشعار اور ترنم دونوں ہی دادِ تحسین کے قابل ہیں چنانچہ انھوں نے اپنی حسین غزل کے ہر شعر پر داد وصول کی غزل کے یہ چار مصرعے اب تک لوحِ ذہن پر مرتسم ہیں۔

دل کے تاروں کو چھو گیا ہے کوئی
ذکرِ چنگ و رباب رہنے دو
روزِ محشر کہے گا ربِ جلیل
سوختہؔ بے حساب رہنے دو

ملاحظہ کیا آپ نے۔ نام اور تخلّص بیک وقت دونوں سے کتنی چابکدستی سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔ ایک اور صاحب کے یہ دو اشعار مجھے کافی پسند آئے مجلس کا حال نہیں کہہ سکتا لیکن میں انھیں بھلا نہیں سکتا حالانکہ صاحبِ کلام کا نام ایسا ذہن سے نکلا کہ ہزار کوشش کے باوجود یاد نہیں آسکا۔ اشعار یہ تھے؎

ارے او میری جانب مسکرا کے دیکھنے والے
ترا ہی نام ہے مرقوم ہر تارِ گریباں پر!
میرا خونِ جگر شامل ہے تعمیرِ گلستاں میں!
میرے اشکوں کا بھی احسان ہے فصلِ بہاراں پر

مسجدِ نبوی کا
حسین و جمیل منبر

صوفی غلام محمد صاحب صوفی اس دور کے آخر میں تشریف لائے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں آپ کی شخصیت شعر و ادب میں بھی اتنی ہی منفرد ہے جتنی اور دوسرے میدانوں میں۔ خوش گو بھی ہیں اور خوش بیان بھی۔ آپ بھی یہ چند اشعار سن لیں؎

وسعتِ کون و مکاں میں بھی سمائے نہ بنے
دل کی پہنائی میں بھی آپ سے آئے نہ بنے
کوئی دکھلائے ہمیں لاکھ بنا کر خود کو
وہ بگڑ کر جو بنے کوئی بنائے نہ بنے
سب یہ کہتے ہیں کہ صوفی بھی صنم پوجے ہے
نقشِ برحق تو بھلا ہم سے مٹائے نہ بنے

مشاعرے کے دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ہر شاعر نے مرحومین (غالبؔ اور اقبالؔ) ہی کی شہو زمینوں میں طبع آزمائی کی تھی۔

مشاعرے کے بعد صدرِ جلسہ جناب مولانا خلیل الرحمٰن صاحب نعمانی نے اپنے اختتامیہ کلمات میں جلسے کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی تحسین فرمائی اور ساتھ ہی بزمِ اُردو کے اراکین کو جو صحرائے عرب میں گلِ اُردو کی آبیاری کر رہے ہیں انکی کوششوں پر مبارکباد دیتے ہوئے بیش بہا مشوروں سے نوازا۔

آخر میں محترم جناب عبد السلام فارانی کی معیت میں جملہ حاضرین نے سفینۂ اُردو کے ان ناخداؤں کے لئے مغفرت اور رحمت کی دعا کی۔ غفر اللہ لھما۔ اس کے بعد صدرِ بزم جناب سید احمد مدنی صاحب نے مہمانوں کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے مجلس کے اختتام کا اعلان کیا۔

اس طرح رات کے دو بجے ہم مجلس سے یہ جذبہ لے کر لوٹے کہ اس جلسہ اور بزمِ اُردو کا ذکر ہند و پاک کی ہر علمی مجلس میں پہنچا کر محبانِ اُردو سے درخواست کریں گے کہ وہ اس ادارے کی ترقی و بقاء کیلئے کسی ممکن تعاون سے دریغ نہ کریں اور خاص طور پر کتابوں کے عطیے سے اُردو لائبریری کی توسیع میں بھرپور حصہ لیں۔ امید ہے کہ ہماری آواز دردمند دلوں تک پہنچے گی۔ مندرجہ ذیل پتوں پر ڈاک سے کتابیں روانہ کی جاسکتی ہیں:-

۱۔ سیّد احمد مدنی۔ صدر بزمِ اُردو۔
۲۔ صابر القاسمی شہید جنرل سکریٹری۔
پوسٹ بکس نمبر ۱۵۰، مدینہ منورہ
سعودی عربیہ

ہندوستانی زندگی میں مسلمانوں کا حصّہ

مذہبی، نسلی اور لسانی رواداری کے آدرش ہمارے آئین کا حصّہ ہیں

ہندوستان میں زندگی کا بمشکل ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس پر اسلامی طرز فکر اور ثقافت کی کچھ چھاپ نہ ہو۔ یہ چھاپ جتنی گہری ہے اتنی ہی گوناگوں بھی ہے۔ فنون اور فنِ تعمیر میں، صنعت اور سماجی تنظیم میں، زبان اور فلسفے میں، موسیقی اور ادب میں، تعلیم اور آدابِ مجلس میں مسلمانوں کا حصّہ نمایاں ہے۔

سرزمینِ ہند پر مسلمانوں کی بے شمار یادگاریں ہیں جو ایک عام سیاح کو اس ملک کے روایتی جذبۂ رواداری کی یاد دلاتی ہیں عربی اور فارسی کے الفاظ بہت سی ہندوستانی زبانوں میں رائج ہیں

جدید ہندوستانی ثقافت موٹے طور پر ایک ایسا امتزاج پیش کرتی ہے جس میں مسلمانوں اور دوسرے لوگوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ یہ امتزاج ساتویں صدی میں اسلام کی آمد سے شروع ہوا۔ اس سرزمین پر بادشاہوں اور شہنشاہوں کے آنے سے بہت پہلے ہندوستان میں ترغیب و تحریک کے ذریعے اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کا رابطہ پہلے پہل ساتویں صدی میں قائم ہوا تھا جبکہ وہ کچھ عرب تاجروں کے طور پر اس ملک کے مغربی ساحل پر آئے۔

شہنشاہ اکبر، تاج محل کے معمار شاہ جہاں، حیدر علی اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ جیسے فراخدل بادشاہوں اور خواجہ معین الدین چشتی جیسی صاحبِ بصیرت اور ضدارسیدہ شخصیتوں نے مسلمانوں کو ہندوستانی سماج میں جذب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا چنانچہ انھیں اس ملک کی تاریخ میں قدر و عزت کا مقام حاصل ہے۔

زبانوں نسلوں اور عقائد کے سطحی اور مصنوعی اختلاف کی تہہ میں دلوں اور دماغوں کا یہ بنیادی اتحاد ہندوستان کی زندگی میں ایک زوردار لہر کی طرح جاری و ساری ہے۔ قوم پرستی اور سیکولرازم کی قوتوں کو مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں زبردست تقویت ملی۔ ۱۸۸۵ء میں قائم کی ہوئی تمام مذاہب اور عقائد کے ہندوستانیوں کی غیر مذہبی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ بے شمار روشن خیال مسلمان رہنما اور سرکردہ مذہبی شخصیتیں وابستہ رہی ہیں۔ ہندوستان کی قومی تحریک کی رہنمائی کرنے والی سرکردہ شخصیتوں میں حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان، آصف علی اور رفیع احمد قدوائی، بدرالدین طیب جی اور محمد رحمت اللہ سیانی پیش پیش تھے اور کئی سڑکوں، لائبریریوں، مارکیٹوں اسکولوں اور سرکاری عمارتوں کے نام ان ہستیوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔

ملک کی تقسیم سے بھی ہند کے کروڑوں مسلمانوں کا عقیدہ متزلزل نہ ہوا کیونکہ وہ اپنی مادرِ وطن کی یک جہتی میں یقین رکھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مشترکہ ثقافت اور سیکولرازم کے آدرش انھیں ان قوتوں سے زیادہ عزیز تھے جو انھیں آپس میں بانٹ دینے کے لئے کوشاں تھیں ——— ہندوستان کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے۔ یہ ایک سیکولر ملک ہے۔ آزادی سے قبل کی شام کو جواہر لال نہرو نے کہا تھا "ہمارا مذہب خواہ کچھ بھی ہو ہم سب بھارت ماتا کے بیٹے ہیں اور سب برابر ہیں۔ ہم فرقہ پرستی یا تنگ نظری کو بڑھنا پسند نہیں کرسکتے کیونکہ ایسی کوئی قوم بڑی نہیں بن سکتی جسکے لوگوں کے نظریات و اعمال تنگ نظری پر مبنی ہوں"۔

مذہبی، نسلی اور لسانی رواداری کے آدرش ہمارے آئین کا حصّہ ہیں جس کو ساری قوم متبرک سمجھتی ہے۔ یہ جدید ہندوستان کے کارناموں میں سے ایک ہے۔ اسے مرتب کرنے والوں میں کم سے کم ۴۵ مسلمان تھے اور دیگر مذہبوں کے باقی رکن تھے۔

اس آئین نے ہندوستان کے تمام شہریوں کو قانون کی نظر میں برابر کا درجہ دیا ہے اور انھیں فکر و اظہار، عقیدے اور مذہب اور عبادت کے یکساں مواقع اور آزادی دی ہے۔

انڈونیشیا اور بنگلادیش کے بعد دنیا بھر میں تیسرے نمبر پر مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی ہندوستان میں ہے۔ پاکستان چوتھے نمبر پر ہے۔ وسعت کے اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی عراق، سیریا، ایران، مصر اور سعودی عرب کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کے بعد مسلمان دوسرا سب سے بڑا فرقہ ہیں۔

غیر ملکی حکومت سے آزادی کے حصول کے بعد قوم کے اندر نئی طاقت اور تیز رفتار ترقی کے لئے ایک نئی قوت اور زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو نئی نئی آزمائشوں اور بے پناہ مواقع سے بھرپور تھا۔ آج سے ۲۵ برس قبل جبکہ یہ عظیم کام شروع ہوا، اس وقت سے مسلمان سرگرمی کے ساتھ اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ قومی زندگی میں وہ کئی کلیدی اور ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین جو ایک ممتاز ماہر تعلیم اور مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھی تھے پہلے جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور بعد میں صدر ہوئے۔ ایک اور نامور شخصیت جسٹس ہدایت اللہ ہندوستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں ہندوستان کی پارلیمنٹ میں کئی مسلمان ممبر ہیں جو مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہیں۔ وزراء کی مرکزی کونسل میں دو مسلمان جناب فخر الدین علی احمد اور جناب معین الحق چودھری کیبنٹ منسٹر ہیں۔ مسٹر شاہ نواز خان اور پروفیسر نور الحسن وزیر مملکت اور مسٹر آر۔ ایچ محسن اور مسٹر محمد شفیع قریشی دو نائب وزراء ہیں۔ صوبائی اسمبلیوں اور وزارتوں میں کئی مسلمان ممبر اور وزیر ہیں۔ دو صوبوں کے وزیر اعلیٰ مسلمان ہیں۔ راجستھان کے وزیر اعلیٰ مسٹر برکت اللہ خاں ہیں اور جموں و کشمیر کے سید میر قاسم۔ ایک اور اہم شخصیت مسٹر علی یاور جنگ مہاراشٹر کے گورنر ہیں۔

سارے ملک میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی سروسوں میں اگرچہ مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ان کی نمائندگی بہت کم ہے لیکن پھر بھی بہت سے مسلمان اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ متعدد مسلمان غیر ممالک میں ہند کے سفیر اور ڈپلومیٹ کی حیثیت سے مامور ہیں۔

فنونِ لطیفہ۔ ادب۔ فلم۔ موسیقی۔ رقص۔ ڈراما۔ تعلیمات اور مسلح افواج کے شعبے میں قومی اعزازات حاصل کرنے والوں کی فہرست میں ایسے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شامل ہے جنہوں نے کسی نہ کسی میدان میں ایک خاص مقام پیدا کیا ہے۔

پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے مذہبی اداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دنیا بھر کے مسلم ممالک کے طلباء ہندوستان آتے ہیں۔ ہندوستان اس بات پر فخر کرسکتا کہ یہاں اسلامی فلسفے، طرزِ فکر اور ثقافت پر بہترین لائبریریاں موجود ہیں۔

سیکولرازم کا نظریہ کوئی منفی نظریہ نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی حالیہ جنگ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ یہاں سیکولرازم کی بنیادیں اتنی گہری ہیں کہ مذہب کے نام پر وہ ہل نہیں سکتیں۔ اپنے ملک کی علاقائی یکجہتی کی حفاظت میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑائی لڑی ہے۔ سیکولرازم کے اصول پر ایک آزاد اور خود مختار ملک بنگلادیش کے قیام نے دو قوموں کے نظریے کی بنیاد تک کو ہلا کر رکھ دیا ہے کا

کیا ہندوستانی مسلمانوں کو ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کی ضرورت ہے؟

محترمی! آداب

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے آج تک کے حالات کا عمیق نظروں سے جائزہ لیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس برصغیر کے مسلم ذہن اور سیاسی شعور کا ترکیبی عنصر صرف مذہب ہی نہیں ہے بلکہ عقیدے۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ آبادی DEMOGRAPHY حالات کے تقاضوں اور سیاسی امکانات اور اس کے نتائج سے مل کر تشکیل پایا ہے۔ ہندوستان کے براعظمی سماج میں اسلام کی ابتدار۔ ارتقاء۔ پھیلاؤ اور موجودہ کی بوقلمونی مسلم ذہن اور سیاسی شعور کے خدوخال کے تعین کے لیے حالات کے ایک انوکھے چوکھٹے کا کام دیتی رہی ہے۔ اسلام ہندوستان میں ہند ثقافتی تہذیبی اور تخلیقی اکائیوں سے گذشتہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے سے مقابلہ کر رہا ہے۔ لیکن ابھی تک نہ تو اسلام نے پوری طرح فتح پائی ہے۔ اور نہ مقامی اکائیاں اسے اپنے اندر جذب کر سکی ہیں۔

چنانچہ ہندوستان میں اسلام اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ ایک ہندوستانی مظہر بن گیا ہے۔

اس تاریخی پس منظر میں اس برصغیر کے لیے مذہب یا فرقے کے نام پر علیحدہ سیاسی تنظیمیں نہ صرف ہمالیہ جیسی بڑی غلطی ثابت ہوئی ہیں بلکہ آج کے سیکولر سوشلسٹ اور جمہوری ہندوستان کے مزاج اور تنوع کے پس منظر میں اور بھی فرسودہ نظریۂ حیات اور غیر حقیقت پسندانہ اندازِ فکر ہے۔

اس برصغیر کی تقسیم اسی نظریہ کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اگر دوبارہ اس قسم کے خطرناک رجحانات کو نشوونما کا موقع فراہم کیا گیا تو پھر ایک بار مسلم شعور و اندازِ فکر کے دیوالیہ پن اور مسلمان قوم کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔

اگر ہم بیسویں صدی کے مسلم دانشوروں اور مفکروں (طیب جی اور مولانا آزاد سے لے کر عابد حسین تک) کے قومی احساسات اور سیاسی تصورات کا تنقیدی جائزہ لیں تو بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ وہ ہندوستانی سماج کے متنوع کردار کے معنی و مطلب خوب سمجھتے تھے۔ اس ضرورت کا بھی انہیں پوری طرح احساس تھا کہ اس براعظمی تنوع کے اندر ہی ایک "مسلم منزل" MUSLIM DESTINY کا نقشہ ترتیب دینا ہے۔ ان مفکرین کا خیال تھا کہ اگرچہ امت داخلی طور پر جسد واحد INTEGRATED SOCIETY ہے لیکن اسے سماج کے دوسرے غیر مسلم اجزاء سے اتحاد کرتے ہوئے گھبرانا نہیں چاہیے۔ مدینہ منورہ میں رسول اللہ نے SOCIAL CONTRACT کی اساس پر نہ صرف یہودیوں اور کافروں سے تعاون کرنا منظور کیا تھا بلکہ اور آگے بڑھ کر مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان اس تعاون عمل کو امت واحدہ INTEGRATED AND ONE COMMUNITY سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن آج مسلم ذہن و شعور کٹر فرقہ پرستوں اور سیاسی جارحیت پسندوں کی طاقت آزمائیوں کا شکار بنا ہوا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عہد حاضر کی بے رحم تاریخی سچائی "اقلیت پسندی" اور علمی روح کے واضح تقاضوں سے صلح کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مختصر یہ کہ اس انتہائی برق رفتاری سے بدلتے حالات اور سائنسی دور میں مسلم قوم علیحدہ سیاسی تنظیم کے ذریعہ حاصل ہونے والے "تحفظات"، "عنایات"، اور احساسات کے سہارے اپنی "منزل" تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ آج تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اکثریت کے ساتھ تعاون عمل کرتے ہوئے سائنسی تکنیک عقلیت پسندی تجرباتی علوم اور جمہوری نظام کو اپنے اندر جذب کریں اور اپنی جدتِ طبع کا مظاہرہ کریں اور اس طرح یہ ممکن ہے کہ ہندوستان دارالاسلام نہ سہی دارالامان ضرور بن جائے گا۔

ایم عزیز حسین۔ ایم ایس سی عثمانیہ

محترمی جناب!

ہندوستانی مسلمانوں کو کیا الگ سیاسی جماعت بنانی چاہیے؟

یہ سوال بے حد پیچیدہ ہے۔ اور چند صاحبان اس سوال کو قیام پاکستان کے پلڑے پر رکھ کر پرکھتے ہیں لیکن حقیقی طور پر وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ قیام پاکستان کے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اب کی حالت سے بہت بہتر تھی۔ چاہے وہ آبادی کے لحاظ سے ہو یا سیاسی، سماجی یا اقتصادی حالت میں۔

ہمیں اس وقت یہ نہیں سوچتے رہنا چاہیے کہ آیا ہم الگ سیاسی جماعت کا قیام عمل کریں یا نہ کریں۔ اگر ہم میں اب بھی اچھا سیاسی شعور ہے۔ اور اگر ہم بہت سے کام لیں تو ہندوستانی سیاسی جماعتوں میں کسی ایک اچھی سیکولر جماعت کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اور اس جماعت میں شامل ہو کر ہم اس کے اصولوں کی حدود میں رہ کر ہی ملک و قوم کی خدمت کریں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اقلیت ہوتے ہوئے بھی اکثریت میں شمار کیے جانے لگیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ان جماعتوں میں سے کس جماعت کا انتخاب کریں۔ اس کا جواب آپ کو گذشتہ درمیانی مدت کے پارلیمنٹ الیکشن میں کانگریس کی کامیابی کی صورت میں ملے گا۔ ہر خاص و عام جانتا ہے کہ اس پارٹی کو کامیاب کرنے میں اقلیتوں خاص کر مسلم اقلیت نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ میرا مطلب اس پارٹی کا ہنددگپنڈا کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ جسے ہر ایم پی (بشرطیکہ وہ کامیاب ہوا ہو) سے لے کر وزیر اعظم ہند تک تسلیم کرتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا سیاسی جماعتیں مسلم نمائندگی قبول کریں گی۔ اس کا جواب ملک کے عوام دے سکیں گے۔ ہر جماعت اقلیت کو اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہے خاص کر

مسلم اقلیت کو۔ یہاں تک کہ جن سنگھ جیسی فرقہ پرست جماعت بھی اپنے چند خاص اصولوں کے تحت اپنی جماعت میں مسلم نمائندگی لے رہی ہے۔ اگر ہم مسلمان چاہیں تو اس جماعت میں ہی قدم جما سکتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ فرقہ وارانہ منافرت پھیلے گی، فرقہ وارانہ کشیدگی اور کشمکش بڑھے گی۔ علیحدگی پسند سیاست کو تقویت ملے گی جس سے ملک میں انتشار و خلفشار بڑھے گا۔ اور ہمارے اندر ہندوستانیت کا جذبہ کبھی نہ ابھر سکے گا۔ اس وقت ملک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

ہر فرقے میں رجعت پسندوں کا گروہ موجود ہے یہ گروہ اپنے فرقے کے لوگوں کو قومی دھارے سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہے۔ اس قبیل کے لوگوں کی طرف سے ہی علاحدہ سیاسی جماعت کی بات کہی جاتی ہے۔ سیکولرازم، سماجی برابری، معاشی انصاف اور یکساں مواقع کے اصول ہمارے سیاسی نظام کی بنیاد ہیں۔ ان اصولوں پر چل کر ہی مختلف فرقوں میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان اصولوں کو ٹھیک ڈھنگ سے سمجھیں اور پھر اپنے فکر و عمل کو اس کے مطابق ڈھالیں تاکہ اپنے اپنے مفادات کی خاطر مذہب کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں کھڑی کریں۔ ضرورت فرسودہ اندازِ فکر کو بدلنے کی ہے۔

کے۔ ڈی۔ ناگپال۔ چنڈی گڑھ۔

مکرمی تسلیم!

میرے خیال میں مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمان کا مسئلہ اتنا زیادہ سیاسی نہیں ہے جتنا کہ معاشی اور تعلیمی ہے۔ اس مسئلہ کا حل بھی سیاست میں نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج کے دور میں اور خاص طور پر جمہوریت میں بغیر سیاست کو سمجھے اور جانے خوشگوار شہری زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ لیکن یہ بھی پتہ ہے کہ ایک جمہوریت میں جہاں سیاسی اکثریت کی رائے زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔ کوئی بھی قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاسی طور پر اپنے کو اقلیت بنا کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی قومی اقلیت اس وقت ہی قومی زندگی میں کوئی بہتر رول ادا کر سکتی ہے جبکہ وہ تعلیمی اور معاشی طور پر بہتر ہو۔

ہندوستانی مسلمانوں کو ایک علیحدہ معاشی اور تعلیمی تنظیم کی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن ایک علیحدہ سیاسی جماعت ان کو کسی بھی طرح سے فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

زیادہ تر مسلمان غریب ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ مزدور اور دستکار ہیں لیکن ہندوستان میں صرف مسلمان ہی غریب اور پسے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کی ۸۰ فیصد آبادی غریبی اور معاشی استحصال کی شکار ہے۔ ہر سیاسی جماعت معاشرے کے کسی طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ غریب اور مزدور پیشہ اور استحصال کے شکار مسلمانوں کو ایسی جماعتوں میں شامل ہو جانا چاہیے جو غریبوں اور مزدوروں کے حقوق کے لیے لڑ رہی ہیں۔ مسلمانوں کو نہ صرف ان جماعتوں میں شامل ہونا چاہیے بلکہ ان جماعتوں کی لیڈر شپ اپنے ہاتھ میں لے لینی چاہیے کیونکہ مسلمان دوہرے استحصال کا شکار ہیں۔ معاشی، معاشرتی اور مذہبی۔ اس حالت میں مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے حقوق کے لیے لڑیں بلکہ دوسرے طبقوں اور مذہبوں کے کروڑوں پسے ہوئے لوگوں کو بھی راستہ دکھائیں۔ اس طرح مسلمان ایک سیاسی اقلیت نہیں بلکہ سیاسی اکثریت کا حصہ بن جائیں گے۔ کسی بھی جمہوریت میں اقلیت سے اکثریت کا بننا ہی سیاسی کامیابی کہلاتی ہے۔ ہر سیاسی جماعت ہر وقت ہر کام اقلیت سے اکثریت بننے کے لیے کرتی ہے۔

دوسری طرف بہت سے دولت مند مسلمان بھی ہیں۔ جن کی نمائندگی دوسری بہت سی جماعتیں زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتی ہیں۔ اگر مسلمان سیاسی طور پر اپنے کو پوری قوم سے الگ کر لیں تو وہ ہمیشہ کے لیے ایک سیاسی اقلیت تو بن سکتے ہیں لیکن اکثریت نہیں۔ اس طرح کچھ وقت کے لیے وہ منفی رول ادا کر کے ہو سکتا ہے کہ کچھ مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن اس قسم کے منفی اور PRESSURE POLITICS زیادہ دن تک کامیاب نہیں رہتی اور ایسی سیاسی جماعتیں بہت جلد تمام سیاسی جماعتوں کا اعتبار کھو دیتی ہیں۔

اس لیے میرے خیال میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ تعلیمی اور معاشی تنظیمیں بنانے کا ہے نہ کہ سیاسی جماعتیں۔ اگر مسلمان تعلیم یافتہ ہوں گے تو انھیں ان حقوق کو حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ تعلیمی اور معاشی طاقت ہی ہے جس کے بل پر مٹھی بھر یہودی دنیا کی سیاست پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ محمد واحد۔ جے پور

مکرمی تسلیم

میں واقعات بڑے شوق سے پڑھا کرتا ہوں۔ آپ نے جس موضوع پر قارئین کی رائے دریافت کی ہے۔ اس کے تحت میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی ایک الگ سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ آج کا دور سیاست کا دور ہے ہمارے ملک میں بہت سی سیاسی جماعتیں یا پارٹیاں کام کر رہی ہیں جن کا الگ الگ منشور بھی ہے۔ انتخابات سے قبل سیاسی جماعتیں مسلمانوں کو جو سبز باغ دکھاتی ہیں وہ صرف فرضی ہوا کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے لے کر آج تک سیاسی جماعتوں کی حکومتیں چاہے وہ صوبائی ہوں یا مرکزی مسلم مسائل کو سلجھاتی کیا بلکہ الجھاتی ہی چلی گئیں۔ مثال کے طور پر اردو اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہی لیا جائے کہ ان کے ساتھ کتنی ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔ فرقہ پرست جماعتیں تو مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہیں۔ اگر ہمیں اپنی ہستی اور تہذیب و تمدن کو برقرار رکھنا ہے اور اس ملک میں باعزت طور پر رہنا ہے تو یہاں ملک گیر پیمانہ پر ایک سیاسی جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ اس سے ملی اور ملکی اتحاد کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس کے ذریعہ سیاسی و مذہبی بیداری لائی جا سکتی ہے۔ آج کا مسلمان اپنے کو بھول کر سبھی پارٹیوں میں منقسم ہو گیا ہے جہاں اس کے ذاتی مفاد کچھ حد تک پورے ہو جاتے ہیں۔ لیکن قومی فلاح و بہبود کی بات وہ سوچ تک نہیں سکتا۔ آج بھی ملک کے اندر کچھ مسلم سیاسی جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن یا تو ان کا نظم و نسق ڈھیلا ہے یا مسلمانوں کا ابھی اس طرف رجحان نہیں۔ مسلمانوں کی بدحالی کم کرنے میں ایک مسلم سیاسی جماعت اہم رول ادا کر سکتی ہے

ابو بشر خاں۔ بمبئی

جناب ایڈیٹر صاحب! آداب

کیا ہندوستانی مسلمانوں کو علاحدہ سیاسی جماعت

زورت ہے ؟
ہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے ۔ اس کے حق میں اور
ے خلاف بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ۔ میرے خیال
ندوستانی مسلمانوں کو علاحدہ سیاسی جماعت کی
بت نہیں ۔ ملک میں ایک ایسی پارٹی کی تنظیم کرنا
ن ایک مذہبی فرقے کے مفاد کو تقویت پہنچانا چاہتی
یکولرازم اور جمہوریت کی اسپرٹ کے منافی ہے ۔
ر ایک ایسی سیاسی جماعت جس کی رکنیت صرف
ی فرقہ تک محدود ہوگی ۔ سو فیصدی فرقہ پرست
ت ہوگی ۔ علاوہ ازیں اس کا ردِ عمل دوسرے
ں میں بھی ہوگا ۔ مسلمانوں کی طرح اگر وہ لوگ
اپنے اپنے فرقے کے مفادات کی خاطر مذہب کی
پر الگ الگ سیاسی جماعتیں بنالیں تو ملک میں
ں حکومت میں حصہ لینے کے لیے سوچا ۔

مسلمان کہیں بھی ہوں ایک ہیں ۔ علی گڑھ یونیورسٹی
، یو پی والوں کا ہی نہیں مسلمانانِ ہند کا قومی سرمایہ
کیرلا ہو یا کشمیر سب مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی سے
روحانی تعلق ہے ۔

فیشن ایک سماجی برائی ہے " محمد رضی الدین کا مضمون
غور طلب ہے جو سماج کے لیے تباہ کن اور گمراہ کن
انھوں نے سنجیدگی سے تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھ
یک اہم مسئلہ پر توجہ دی ہے ۔ اسی طرح اگر آئندہ
ان کی انگلی ایسے ہی دوسرے مسائل پر جائے گی
ا ہوگا ۔ مثلاً جہیز ، شادی ، رسم و رواج ، تعلیم نسواں "
۔ ان کا مضمون سماجی اصلاح کے لیے کارآمد ہے ۔
لکھنے والوں کی واقعات ضرور ہمت افزائی کرے ۔

داودی بوہرا " میں اگر وسیع النظری پھیل جائے تو
مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔ مگر مسلمان ہیں کہ متفق
نے کا نام ہی نہیں لیتے ۔ کاش وہ جلد ہی سنبھل جائیں
واقعات کو آپ نے نئے دھارے پر لے جانے کی کوشش
ہے ۔ مگر آپ کے ستارے " نئے دور کے لیے زیب نہیں
آپ کے ستارے چمکیں گے تو خوشی حاصل ہوتی ہے
دھر بگڑ جائیں تو فکر لاگو ہوتی ہے اس لیے بند
دینا بہتر ہے ۔

طنز و مزاح کا سلسلہ کافی مزاحیہ ہے ۔ عبد البصیر نعیمی

کا قلم بالکل صحیح راہ پر چل رہا ہے ۔ اس لیے عورتوں کو
ان کی باتیں سننا چاہئیں ۔ اسلام میں کسی پر زیادتی کی
اجازت نہیں ہے ۔ ہر ایک کے حقوق برابر بانٹ دیئے گئے
ہیں ۔

آپ نے اس کے ساتھ ساتھ فلم کے لیے بھی ایک صفحہ
رکھا ہے ۔ بہت مسرت ہوئی ۔ فلم ایک برائی کے ساتھ ساتھ
تفریح ہے ۔ اگر اس صفحہ پر آئندہ فلم کی حقیقت پر روشنی
ڈالیں تو اچھا ہوگا ۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں عام معلومات
کے لیے بھی ایک صفحہ مخصوص کریں ۔ داسودی عبد الجلیل ـــ

نیا ہندوستان اور مسلمان

مکرمی ! السلام علیکم

سہ روزہ دعوت ، دہلی مورخہ ۲۸ دسمبر ۷۱ء کے شمارے
میں میرے مضمون نیا ہندوستان اور مسلمان (واقعات دسمبر
نصف دوم) پر تنقید کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ میں نے
جماعت کے تعلق سے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور یہ
کہ فرقہ پرستی جماعت کا شیوہ نہیں ۔ اس کے ثبوت کے طور
پر احمد آباد اور بہار کی مثالیں دی گئیں ہیں ۔ جہاں ریلیف
کا کام کرتے ہوئے جماعت نے ہندو اور مسلمان میں تفریق
نہیں برتی ۔ جماعت کا یہ رویہ قابلِ ستائش ہے اور مجھے
افسوس ہے کہ میں اپنے مضمون میں جماعت کا یہ مثبت پہلو
نہ لا سکا ۔

لیکن مجھے یہ کہنے دیجیے کہ اس طرح یہ ثابت نہیں کیا
جا سکتا کہ جماعت اسلامی بہت زیادہ سیکولر یا غیر فرقہ پرست
آرگنائزیشن ہے ۔ میں نے جو بھی لکھا وہ پوری ذمہ داری کے
ساتھ لکھا ۔ میں نے کئی لوگوں سے انٹرویوز لیے ۔ جماعت
کے تعلق سے ان کی رائیں معلوم کیں ۔ زیادہ تر لوگوں کا
یہی خیال ہے کہ جماعت اسلامی کی وجہ سے فرقہ پرستی
کو تقویت پہنچتی ہے اور ہندو فرقہ واریت کے لیے جواز
پیدا ہوتا ہے ۔ جماعت کے وسیع لٹریچر سے یہ بات تو ظاہر
ہوتی ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی فلاح و بہبود چاہتے
ہیں ۔ لیکن اس تعلق سے لوگوں کی اور خصوصاً مسلمانوں
کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ ان لوگوں کو اپنے
دلوں کو ٹٹولنا چاہیے ۔ کیا واقعی یہ لوگ سیکولرزم اور
سوشلزم پر یقین رکھتے ہیں ۔

تنقید نگار نے اس بات کا دعویٰ تو کر دیا کہ جماعتِ
اسلامی جمہوریت پر یقین رکھتی ہے ، لیکن بڑی ہوشیاری
سے میرے مضمون کا وہ حصہ حذف کر گئے ، جہاں میں نے
مولانا مودودی کی اس تقریر کا حوالہ دیا تھا ، جس میں
انھوں نے سیکولرزم ، قوم پرستی اور جمہوری اصولوں کی
نفی کی تھی ۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان کی جمہوریت
پسندی کے تعلق سے کوئی ٹھوس دلائل بھی نہیں دیئے
کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی نے جو کچھ
کہا تھا وہ سب لغو تھا ؟ یا اب جماعت نے کوئی نئی پالیسی
اپنائی ہے ؟

اس کے علاوہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے مقصد پر
ذرا غور کیجیے ۔ اور آج کے موجودہ ہندوستان کی عمومی
حالت پر نظر ڈالیے ۔ آج کا مسلمان ان گنت معاشی ،
سیاسی ، تہذیبی اور ثقافتی مسائل سے دوچار ہے ۔ ایسی
فضا میں خلافت کی طرز پر اسلامی حکومت کا قیام کیا ممکن
ہے ؟ اور کیا ایسی حکومت آج کے مزاج کے مطابق
ہو سکتی ہے ۔ ظہیر محسن ۔ اورنگ آباد

جماعتِ اسلامی فرقہ پرست نہیں

مکرمی و محترمی ! آداب عرض

واقعات کا نیا شمارہ نظر نواز ہوا ۔ جو ایک قوس و قزح
بن کر نگاہوں کے سامنے چکر لگانے لگا ۔ صفحہ اول سے
آخر تک تمام رنگینیاں بھری ہوئی ہیں ۔ واقعات کا ٹائٹل
بھی حسین ہے ۔ آپ کا اداریہ یک طرفہ نظر آتا ہے ۔ شاید
یہ حکومت کے خوف سے ہو ۔ کیونکہ آپ نے دوسرا رُخ چھپا
رکھا ہے ۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر ۔ کیونکہ اس میں صرف
یحییٰ خان کی بنگالیوں پر بربریت کا رونا رویا ہے ۔ مگر
بے قصور اور معصوم غیر بنگالیوں پر جو مظالم بنگالیوں نے
ڈھائے ہیں انھیں پردۂ راز میں رکھا ہے ۔ پاکستان میں
نام کو تو اسلام ہے مگر اب بنگلا دیش میں اسلام کا نام
لینے کے لیے بھی یہاں کے لوگ شرمائیں گے ۔ مسلمانوں کو افسوس
ہونا چاہیے کہ وہ اب بھی متحد نہیں ہوتے جبکہ چین اور امریکا
مل سکتا ہے ۔

"دہلی کی ڈائری" کو مستقل عنوان کے طور پر رکھیے۔
شاید آپ نے "گوتم گاندھی کا دیس" سیاسی پارٹیوں کا تعارف بند کر دیا ہوگا۔ مگر اس کے بجائے اگر کچھ دلچسپ عنوانات رکھے جائیں تو بہتر ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت، خواتین کا صفحہ سائنس وغیرہ۔

"پھول اور کانٹے" بے حد پسند آیا۔ خدارا اس کو کبھی بند نہ کیجیے۔ اس کے لیے ایک صفحہ کی بجائے دو صفحات ہوں تو اور بہتر ہے۔ "افکار و آرا" "مشرقِ وسطیٰ" کی زبان میں اور زیادہ لچک روانی اور جوش رہے تو دلچسپ رہے گا۔

ظہیر محسن نے جو ایک وسیع خیالات اور مسلمانوں کے لیے ترقی پسند بھی دکھائی دیتے ہیں، اپنی ترقی پسندی اور وسیع نظری کو اور زیادہ وسیع کرنے کے لیے اپنے مضمون "نیا ہندوستان اور مسلمان" میں جماعت اسلامی اور جن سنگھ کو ایک صف میں اس لیے کھڑا کیا ہے کہ توازن برقرار رہے۔ جماعت جو ایک فلاحی جماعت ہے سیاست سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ ایک سیاسی اور فرقہ پرست پارٹی جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس سے بے دھڑک موازنہ کیا ہے۔ اس کی پالیسی جمہوری نہیں ہے اس لیے وہ جمہوری حکومت میں حصہ نہیں لیتی۔ اور پاکستان میں جمہوری حکومت ہی کہاں تھی۔ اور وہاں سیکولرزم اور سوشلزم کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اس لیے جماعت اسلامی نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال صحیح طریقے سے کر کے اس جماعت کے فرقہ پرست اصولوں کو سیکولر اصولوں میں بدل سکتے ہیں۔

کیا یہ ملک و قوم کی خدمت نہیں؟ اور کیا قوم و ملک کی خدمت کرنے کے لیے الگ سیاسی جماعت کا قیام ضروری ہے۔ سراج۔ ع۔ غ۔ (رنگ ہلی)

کچھ "واقعات" کے بارے میں

السلام علیکم:-

واقعات کا معیار آپ نے تقلیدی حد تک بلند کیا ہے۔ لئے ہم اردو صحافت کا درخشندہ شاہکار سمجھتے ہیں کاش اس کی دیکھا دیکھی اور بھی پرچے اپنے معیار صحافت کو بلند کر سکیں۔ کامیابی کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔

تقی شاعر بھاگلپور

محترم بھائی! عقیدتیں

دسمبر ۱۹۷۱ء کے واقعات کا نصف دوئم بے حد پسند آیا۔
اس مرتبہ کی خوشگوار تبدیلیاں کافی حسین بھی ہیں اور اہم بھی اسے دیکھنے اور پڑھنے کے بعد تاخیر کی ساری تھکن جاتی رہی۔ لیکن پیاس بڑھ بھی گئی۔ اس لیے کہ اس میں مزید تبدیلیوں کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔

خلوص کار — فاروق راہب

محترم صدیقی صاحب — السلام علیکم

واقعات کا دوسرا روپ دیکھ کر مسرت ہوئی۔ امید کہ واقعات اسی طرح علم و ادب اور خبروں کا خزانہ بن کر ناظرین کے لیے دلچسپی کا مظاہرہ کرے گا۔

خدا سے دعا ہے کہ واقعات روز افزوں ترقی کرے آمین۔

عاصی — محمد سرور خاں اندرونِ پھاٹک

مکرمی جناب منیجر صاحب؛ سلام مسنون

دسمبر نصف دوم کا واقعات نظر نواز ہوا۔ واقعات پہلے سے کہیں زیادہ عمدہ، بلند اور جاذبِ نظر نظر آیا تمام مضامین تعریفوں کی حدوں سے بھی زیادہ بلند اور اونچے ہیں۔ خاص کر محمد رضی الدین صاحب نے "فیشن ایک سماجی برائی ہے" کے اندر ہر ایک پہلو کو اجاگر کر کے اس کے بُرے اثرات اور تباہ کن نتائج کا خوب جائزہ کیا ہے۔ جناب عبدالبصیر صاحب نعیمی کا مضمون "مسلم خواتین اور موجودہ سماج" جدید تہذیب اور نئی روشنی کی دلدادہ عورتوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے سیاسی اور مذہبی فرقوں پر معلومات افزا مضامین کا سلسلہ اسی طرح برابر قائم و جاری رکھیے۔ گویا واقعات کا ہر شمارہ یہ کہتا ہوا اپنے قاری کے پاس پہنچتا ہے کہ ع
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

خیر اندیش العبد محمد منصور احمد قاسمی (بہار)

مکرمی محترمی! تسلیم

واقعات اب بڑا ہی خوبصورت، دیدہ زیب اور معیاری ہوگیا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ گذشتہ شمارے میں مسلمانوں کے بوہرا طبقہ پر مضمون معلوماتی اور چونکا دینے والا تھا۔ نئے انداز کو یہاں مقامی علمی و ادبی حلقے میں سراہا جا رہا ہے۔

محمد شاہد عظیم (حیدرآباد)

ﻻنا محمد علی جوہر

جو تقریر کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندو مسلم
قدر حامی تھے۔ انھوں نے کہا۔
لی ہندو میرے گھر والوں کی توہین کرے یا بی اماں پر
ے تو نہ میں عدالت میں جاؤں گا نہ اس سے بدلہ
ر اس صورت حال کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ ہماری تفرقہ
ے انگریزوں کا فائدہ ہو رہا ہے" مگر افسوس اتنے
ا رکے باوجود بھی ملاپ نہ ہوسکا۔
لانا محمد علی کی آخری تقریر جو انھوں نے لندن میں
ر کانفرنس میں ہندوستانی نمائندے کی حیثیت سے

قدس میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کا مزار ۔۔۔

رگی کی حالت میں کی تھی اس بات کا پتا دیتی ہے کہ انکی
طبیعت غلام ملک میں زندہ رہنے کی بجائے آزاد دیار
مرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ آخر کار قدرت کو بھی ان کی
پسند آئی اور کانفرنس کے اختتام کے بعد ۴ جنوری
ا کو آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور آپ
ت کو لندن سے بیت المقدس میں لیجا کر سپرد خاک کیا گیا۔
ے ملت پہ ہے تیری موت کی تابندگی
تک ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہِ افتخار
مولانا جوہر آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، اور نہ انکی یاد
نے کے لئے ہمارے پاس وقت ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے
ملت اپنے اکابرین کی خدمات کو فراموش کرتی ہے زمانہ بھی
نظر انداز کر دیتا ہے۔ ●●

بلا تبصرہ

بقیہ ۔۔۔ مجھے میرے ہمسایوں سے بچاؤ

سب لوگ انھیں سامنے بٹھا کر انکی پوجا کرتے رہیں۔ ہم جہاں کسی اور ہمسائے کے یہاں آئے یا گئے یا کسی اور سے زاید تعلقات بڑھائے تو انکا منہ پھول گیا۔ ان کے یہاں جاؤ، میرے یہاں کیوں آئی ہو۔ ان سے ملو، مجھ سے مل کر بھلا تمہیں کیا ملے گا۔؟ میں تمہاری کیا لگتی ہوں۔

مسز دیدانی بھی ہماری ایک ہمسائی تھیں۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ نہ جانے زندہ ہیں یا مر گئیں۔ بہرحال محلّے بھر میں لڑائی کروانے میں وہ ماہر تھیں۔ ہر روز کسی نہ کسی گھر میں وہ لڑائی کرا دیتیں اور پھر صلح صفائی کرانے بھی خود ہی پہونچ جاتیں۔ تیری نند نے یوں کیا۔ تیری بھاوج نے یہ کہا۔ اس کی ساس یہ کرتی ہے تیرا میاں ایسا ہے۔

بس لگائی بجھائی کر کے تماشا دیکھتیں اور پھر کٹنی بن کر باتیں بنانے لگتیں۔ میں نے یوں تو نہیں کہا تھا۔ میں نے تو یہ کہا تھا اور اس لئے کہا تھا۔

ایک اور ہماری ہمسائی ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھیں ہم احتراماً خالہ بی کہا کرتے تھے۔ بس کچھ نہ پوچھئے خالہ بھانجی کا حق انھوں نے یہ ادا کیا کہ مجھے زندگی سے بیزار کر دیا۔ نہ میرے بغیر انکی کبھی کوئی شاپنگ ہوتی تھی نہ میرے مشورے کے بغیر انکی کوئی تقریب انجام کو پہونچتی تھی۔ ان کے بچے اسکول میں داخل کرانے جاؤں تو میں، ان کے اسکولوں میں جب بھی جلسے میلے ہوں تو بھی خالہ کے بجائے مجھے ہی بچوں کے ساتھ جانے کا فریضہ انجام دینا پڑے۔ ان کے یہاں کوئی مہمان آئے تو مجھ اس سے ضرور ملنا چاہئے۔ بس اللہ سے دبے لفظوں شکایت بھی کرتی کہ اے خدا اگر یہ مجھ پر اتنی ہی فریفتہ ہیں تو تو نے مجھے انہی کے گھر پیدا کر دیا ہوتا تاکہ میں خالہ بی اور کام آتی۔

میں اکیلی ہی نہیں بلکہ میرے پورے گھر سے وہ اسی طرح کام لیتی ہیں ذرا انکار کرو یا تساہل برتو، تو بس ایک دم سیخ پا ہو جاتی ہیں، میں تو تم پر اپنی جان بھی قربان کر دوں اور تم میرے لیے اتنا ذرا سا بھی کام نہیں کر سکتے۔

ان کے تجربے سے میں نے ایک سبق حاصل کیا کہ پڑوسیوں سے کبھی زیادہ ربط و ضبط نہ بڑھانے چاہئیں اور پاس رہتے ہوئے اجنبیوں کی طرح گزرنے ہی میں عافیت ہے۔ اگر کوئی مجھے اکل کھرّا کہے تو کہے، مغرور سمجھے تو سمجھے۔ کوئی سچ پوچھے تو میں ہمسایوں سے عاجز آگئی ہوں۔ جب ایک نئی کالونی میں منتقل ہوئے تو سوچا تھا کہ شاید یہاں کچھ اچھے لوگ مل جائیں گے مگر یہاں آکر تو یہی جی چاہا کہ میں اس کالونی کو بھی چھوڑ جاؤں۔ اس کالونی کو جس کی خوبصورتی پر میں فدا ہو گئی تھی۔ صاف ستھری اور ہوادار خوبصورت فلیٹس پر مشتمل۔ بالکل جدید انداز کی۔ امریکی اسٹائل کی بنی ہوئی یعنی بالکل فری اسٹائل۔ باورچی خانے کی کھڑکی میں سے دوسرے گھروں کے صحن، برآمدوں اور خوابگاہوں تک میں جھانک لیجئے، جو پردہ کرنا چاہے وہ یا تو نقاب ڈال لے یا پیٹھ موڑ کر بیٹھ جائے۔ کوئی کسی کو کچھ نہیں کہتا کیونکہ ہر گھر کی ہر گھر سے برابر کی بے پردگی ہے لہٰذا کون کسے کہے۔ ہر شخص اپنے فلیٹ میں مطمئن ہے کسی کا کسی چیز میں ساجھا نہیں۔ یہاں کی زندگی کتنی مطمئن ہوتی اگر یہاں کے لوگوں کے ذہن روشن اور دل کشادہ ہوتے۔ کوئی کسی کے یہاں آئے کوئی کسی کے یہاں جائے۔ کوئی اکیلا آئے۔ اکیلا جائے۔ پردہ کرے یا بے پردہ رہے۔ بھلا کسی کو کیا۔ خواہ مخواہ خود بھی الجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھاتے ہیں۔ میرے نزدیک تو اب دو ہی حل ہیں کہ یا تو یہ کالونی چھوڑ جاؤں یا تہجد پڑھ کر یہ دعا مانگنا شروع کر دوں کہ مجھے میرے ہمسایوں سے بچاؤ۔ ●●

شن مکھانند ہال بمبئی میں ۱۹۷۰ کی فلموں کے سلسلے میں بھارت اور اُروشی ایوارڈ پانے والے اداکار سنجیو کمار اور ریحانہ سلطان۔ بہترین چائلڈ ایکٹر کا ایوارڈ پانے والے رشی کپور (بائیں طرف) کے ساتھ

فلمی دنیا

دو بوند پانی

نیا سنسار کی ایسٹ مین کلر فلم دو بوند پانی سنسر نے پاس کر دی ہے اور اسی ماہ ریلیز کیجا رہی ہے۔ خواجہ احمد عباس اس فلم کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور افسانہ نگار ہیں۔ گانے کیفی اعظمی اور اور بال کوی بیراگی کے ہیں۔ سمی گریوال۔ مدھو چندا۔ جلال آغا کے ساتھ ہی خواجہ صاحب روایت کے مطابق ایک نیا چہرہ کرن کمار پیش کر رہے ہیں۔

ننھی کلیاں

راجا فلمز کی ننھی کلیاں سنسر سے پاس ہو گئی ہے۔ ڈائریکٹر رتن دیپ چوپڑا کی اس فلم کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک گھوڑا اس فلم کا ہیرو ہے اور تین کمسن بچے راجا۔ راجو اور رانو اس فلم کی جان ہیں۔ اداکاروں میں چاند عثمانی۔ مراد۔ رشید خان۔ سندیپ اور رینا بھی شامل ہیں۔ یہ فلم آج کل ہی میں ریلیز ہونے والی ہے۔

پڑوسی

ہمسایہ فلم کی پڑوسی بھی سنسر سے پاس ہو گئی ہے۔ پرتھوی راجکپور، ریحانہ سلطان اور دلیپ راج نے اس فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ معاون اداکار دھومل۔ نیلم۔ سلوچنا چٹرجی اور جانی وسکی وغیرہ ہیں۔ جگدیش پنت اس فلم کے افسانہ نگار، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہیں۔ موسیقی روی کی اور گانے پردیسی اور اسد بھوپالی کے ہیں۔ یہ فلم جلد ہی پردۂ سیمیں پر آنے والی ہے۔

عادل رشید کی موت

گزشتہ ۳ جنوری کو ناناوتی ہسپتال بمبئی میں اُردو کے صاحب طرز افسانہ نگار عادل رشید کا انتقال ہو گیا۔ وہ صرف ۵۲ سال کے تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور چھ بچے چھوڑے ہیں۔ عادل رشید کو جوہو کے قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کے جنازے میں زیادہ تر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی کیونکہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے انھیں گہری وابستگی تھی۔ خواجہ احمد عباس۔ کرشن چندر۔ جاں نثار اختر۔ حسرت جے پوری۔ لیش چوپڑا اور ایس۔ ایم۔ ساگر نے انھیں سپرد خاک کیا۔

عادل رشید ۱۵۰ ناولوں کے خالق تھے۔ انکا پہلا ناول "روپ" تھا جس کے کئی ایڈیشن اردو اور ہندی میں شائع ہوئے اور آخری ناول "دل کی کہانی" تھا۔ گیسٹ ہاؤس، حسینہ اور مالہ کے آنسو کی کہانیاں عادل رشید ہی نے لکھی تھیں۔

اے جی فلمز کی آئندہ فلم کے لئے وہ اسکرین پلے اور مکالمے لکھ رہے تھے۔ یہ فلم انکے ناول "برباد آشیانے" کی بنیاد پر بن رہی تھی۔ انتقال سے پہلے وہ اپنے ناول "ارچنا" کی بنیاد پر خود اپنی فلم تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے جس کے لئے ریحانہ سلطان کو سائن کر لیا گیا تھا لیکن موت نے انھیں اس کی اجازت نہ دی۔

مرحوم کے سینے میں بہت بھرا دل تھا۔ وہ انتہائی ملنسار اور بے تکلف انسان تھے افسوس کہ آج وہ ہمارے درمیان سے اٹھ چکے ہیں۔

حسد کی آگ

فلم اسٹاروں میں حسد کا جذبہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اس جذبے کے اظہار کی بدترین مثال گزشتہ ۲۳ جنوری کو بمبئی میں اسوقت دیکھنے میں آئی جب ۱۹۷۰ کی فلموں کے لیے ۱۸ ویں نیشنل ایوارڈز کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس وقت تقریب میں راجکپور اور دتی کو چھوڑ کر باقی تمام بڑے بڑے فلمسٹار شریک نہیں ہوئے۔ بی۔ این سرکار کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ۔ ستیہ جیت رے کو بہترین ڈائریکٹر اور اسکرین پلے رائٹر ایوارڈ۔ سنجیو کمار، ریحانہ سلطان اور رشی کپور کو بالترتیب بہترین ایکٹر، بہترین ایکٹریس اور بہترین چائلڈ ایکٹر ایوارڈ دیے گئے۔ مرکزی وزیر اطلاعات شریمتی نندنی ستپتی نے یہ ایوارڈ تقسیم کئے۔

فلم "دستک" کا ایک منظر جس میں بہترین اداکاری کے لیے سنجیو کمار اور ریحانہ سلطانہ کو اس سال کا اروشی ایوارڈ دیا گیا۔

کشمیر — عزائم

جمہوریہ ہند کے ایک حصہ کے طور پر جموں و کشمیر ریاست نے گذشتہ ۲۲ برس میں بہت کچھ ترقی کی ہے مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ چناں چہ وزیرِ اعلیٰ **سید میر قاسم** نے اس کام کا ایک مختصر خاکہ تیار کیا ہے جو ہمارے سامنے ہے مثلاً:۔

- زرعی میدان میں چو طرفہ توسیع
- خشک سالی سے مقابلہ کرنے کے لیے آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ
- بے روزگاری کی صورتِ حال سے سختی سے نمٹنا
- فنِ باغبانی کی ترقی
- بڑے پیمانے پر بجلی سپلائی کو بہتر بنانا
- چار سو دیہات میں بجلی پہونچانا
- صنعتی میدان میں منصوبہ بند ترقی
- چھوٹی صنعتوں میں چار سو نئی یونٹیں قائم کرنا
- جنگلات کی صنعت میں سرکاری سیکٹر کی توسیع
- دستکاری کو ترقی دینا
- تعلیمی سہولتوں کی اس طور پر توسیع کہ ۶ سے ۱۱ سال تک کے تمام بچے مستفید ہو سکیں.
- اپنے عوام کے پسماندہ طبقوں کی حالت کو بہتر بنانا

آئیے اس یومِ جمہوریت اور نئے سال میں ہم عہد کریں کہ ہم انتھک کام کریں گے اور ان مقاصد اور دوسرے کاموں کے حصول کے لیے جو ہمارے سامنے ہیں، اپنی زندگی کو وقف کر دیں گے!

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS R.N.NO.

FEBRUARY
FIRST HALF

WAQIAT

REGD. NO. D 629
TELEPHONE : 613095

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

- دنیا اکیسویں صدی میں
- افغانستان — ایک کوہستانی

گاندھی جی نے کیا کہا تھا!

وقارِ مادرِ ہندستاں

بس اہلِ دل سے غمِ کامراں کی بات کرو
نہ کم نصیبوں سے بختِ جواں کی بات کرو

ہے اچھے اچھوں کے چہروں پہ زردئ افلاس
کہاں ہے حسن جو حسنِ بتاں کی بات کرو

اسی کی خاک سے پیدا ہوئے اسی پہ مٹو
وقارِ مادرِ ہندوستاں کی بات کرو

ہنسا و اب نہ زمانے کو اپنی وحشت پر
خدا کے واسطے امن و اماں کی بات کرو

بھلا دو دل سے یہ بغض و عناد کے قصے
بس اب حسابِ دلِ دوستاں کی بات کرو

جیو تو حق کے لئے اور مرو تو حق پہ مرو
رہِ وفا میں نہ سود و زیاں کی بات کرو

نہ اٹھ سکا جو فرشتوں سے بھی ازل کے دن
کرو تو بس اُسی بارِ گراں کی بات کرو

بنا دو عزم سے گلزار آتشِ نمرود
سقر میں رہ کے نہ باغِ جناں کی بات کرو

تڑپ دکھا دو زمانے کو دردِ فرقت کی
قفس کو لے اڑو جب گلستاں کی بات کرو

کمندیں ڈال بھی دو بڑھ کے بامِ رفعت پر
اگر ہو مرد تو عزمِ جواں کی بات کرو

عروجِ آدمِ خاکی کا یہ زمانہ ہے
مئے خودی پیو اور لامکاں کی بات کرو

کہیں نہ خود کو رہِ جستجو میں کھو دینا
سمجھ کے سوچ کے اس بے نشاں کی بات کرو

ہے باقی لغزشِ آدم سے شانِ آدم کی
نہ مجھ سے طاعتِ کرّو بیاں کی بات کرو

نہ جھک سکے گا سرِ عشق سجدہ گاہوں میں
جو فخرِ سجدہ ہے اس آستاں کی بات کرو

مٹا سکے گا نہ مجھ کو جہاں کا کوئی غم
نہ مجھ سے بخششِ صاحبقراں کی بات کرو

نتیجہ ایک ہی نکلے گا دردِ فرقت کا
یہاں کی بات کرو یا وہاں کی بات کرو

نہ چھیڑو قصۂ عیشِ جہاں کہ دل ہے اُداس
بس اب تو لذتِ دردِ نہاں کی بات کرو

کبھی نہ چھوڑیں گے ہم مادری زباں اپنی
کمالِ عزم سے اُردو زباں کی بات کرو

نوازتا ہے تمہیں اب کلامِ ساحر کو
کبھی تو بھولے سے اس کے بیاں کی بات کرو

ساحر بھوپالی

غزل

غنچہ غنچہ چاک بداماں
گلشن کا اللہ نگہباں

وہ آئے ہیں آج پشیماں
ضبطِ مسلسل تیرے قرباں

میری فطرت میں خود داری
اُن کا تغافل ناز کا خواہاں

مجھ کو خوشی دو یا تم غم دو
وہ بھی احساں یہ بھی احساں

وہ دن بھی اب یاد رہیں گے
حاصل تھا جب کیفِ بہاراں

کوئی یہ پوچھے مجھ کو ڈبو کر
پھر کس سے ٹکرائے گا طوفاں

انساں کو احساس نہیں ہے
گر گئی کتنی قیمتِ انساں

دیکھ کے جس کو حیرت سی ہے
تیرا ادیب اور شاداں شاداں

منظور ادیب

ثقافت
نئی دہلی
فروری سنہ ۱۹۸۱ء
نصف اول دوم
جلد ——— ساتواں شمارہ
مدیر
عبدالوحید صدیقی
صدر دفتر
[illegible] نظام الدین ایسٹ ۔ نئی دہلی ۱۳
ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵
ایک کاپی کی قیمت ۸۰ پیسے سالانہ ۱۸ روپے

مضامین نثر و نظم خواہ کسی ذریعہ سے وصول ہوں ان کے سلسلے میں خط و کتابت کرنے کی ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی مواد کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا مدیر کو کلی اختیار ہے۔
مضامین کے مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ ذمہ دار نہیں ہے۔

ثقافت میں شائع شدہ مضامین واقعات "نئی دہلی" کے حوالے سے شائع کرنے کی عام اجازت ہے۔

انتظامی اور ادارتی امور متنازعہ کے فیصلے کا اختیار صرف نئی دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا۔

پرنٹر پبلشر اور ناشر عبدالوحید صدیقی
[illegible] (آفسیٹ) پریس دہلی ۶

اداریہ

واقعات نئی دہلی

ایک تیر سے دو شکار

اخبارات وجرائد میں پہلے کچھ وقت سے لاہور ہوائی اڈے پر ہندوستانی ہوائی جہاز کی تباہی کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے۔ یہ اس امر کا مظہر ہے کہ یہ کوئی معمولی نہیں بلکہ بڑا سنگین واقعہ تھا جس کا دنیا نے سخت نوٹس لیا۔ پاکستان اس واقعے کے لیے صرف ان دو کشمیریوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے جنھیں اب ہوائی قزاق کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے لیکن ہندوستان ہی نہیں بلکہ خود پاکستان میں بھی ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو پاکستان کی لاتعلقی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ان کا یقین ہے کہ پاکستان کے حکمران طبقہ کی طرف سے یہ کارروائی جمہوری حکومت کے برسر اقتدار آنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کی گئی ہے۔ کم از کم مشرقی پاکستان کے باشندوں کا یہی خیال ہے عوامی لیگ کے مختلف لیڈروں کی طرف سے جو بیانات دیے گئے ہیں ان میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ آمریت پسند لوگ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور جو واقعہ پیش آیا ہے وہ آمریت کا شاخسانہ ہے۔

اس واقعے کے گہرے دور رس نتائج کو سامنے رکھا جائے اور اس بات کو نہ بھلایا جائے کہ سامراجی طاقتیں کبھی اپنے بڑے حلقۂ اثر کو بڑھانے اور دوسرے ممالک کے نظم و نسق پر اثر انداز ہونے کی کوششیں کرتی ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ لاہور کے واقعے کا تانا بانا بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔

آخر یہ واقعہ ایسے وقت ہی کیوں پیش آیا جب ہندوستان میں تمہ تیج کے سب سے بڑے انتخابات عمل میں آنے والے ہیں؟ کہیں اس کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا تو نہیں ہے کہ ایک طرف پاکستان میں جمہوری حکومت کے قیام میں رکاوٹ ڈالی جائے اور دوسری طرف ہندوستان میں ان رجعت پسند اور عوام دشمن طاقتوں کو برسر اقتدار لایا جائے جو سامراجی طاقتوں کا آلۂ کار بننے اور ملک کو سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ ڈگر پر ڈالنے کے لیے بے چین ہیں۔ اس کا اشارہ بڑودہ اور احمد آباد کے ان حالیہ ہنگاموں سے ملتا ہے جو لاہور کے واقعے کے نام پر برپا کیے گئے۔

مقصد شاید اندرا سرکار کو یہ کہہ کر بدنام کرنا تھا کہ وہ ہوائی ڈکیتیوں تک کو روکنے کی اہلیت نہیں رکھتی، لیکن دنیا کو معلوم ہے کہ اندرا سرکار نے اس ہوائی ڈکیتی کے خلاف جو سخت اور مضبوط قدم اٹھایا اتنا مضبوط شاید کوئی اور حکومت نہ اٹھا سکتی تھی۔ سوتنتر پارٹی کے مسٹر مسانی تک بول اٹھے تھے کہ اندرا سرکار نے جو کچھ کیا، صحیح کیا۔ پاکستان کے خلاف یہ کتنی سخت کارروائی ہے کہ ہندوستانی علاقے میں اس کی تمام فوجی اور غیر فوجی پروازوں پر پابندی لگا دی گئی یہ پابندی اتنی موثر اور پاکستانی معیشت پر اتنا اثر ڈالنے والی ثابت ہوئی کہ دو ہی دن میں حکومتِ پاکستان چیخ پڑی اور ہندوستان سے اپیل کرنے لگی کہ اپنے اس فیصلہ پر نظرثانی کرو۔

یہی نہیں بلکہ اسلام آباد میں تمام غیر ملکی سفراء کو طلب کر کے ان سے بھی ہندوستانی اقدام کی شکایت کی گئی اور الزام لگایا گیا کہ ہندوستان صورتِ حال کو کشیدہ بنا رہا ہے یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے لگا۔ اس شکایت کا مقصد شاید بین الاقوامی دنیا میں ہندوستان کے خلاف ماحول پیدا کرنا تھا لیکن اس میں پاکستان کو منہ کی کھانی پڑی کیونکہ اکثر ممالک نے ہوائی جہاز کے اغوا اور اس کی تباہی کی مذمت کی ہے اور اس کے لیے پاکستان کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ بین الاقوامی ٹرانسپورٹ فیڈریشن نے جو ۸۰ ملکوں کے شہری پرواز کے ڈھائی لاکھ ملازمین کی انجمن ہے وارننگ بھی دی ہے کہ اگر پاکستان نے ہند کے جائز مطالبات کو منظور نہ کیا تو فیڈریشن پاکستان کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہوگی۔

عالمی رائے کو پاکستان کے خلاف کر دینا حکومتِ ہند کی پالیسی کی بہت بڑی کامیابی ہے لیکن اس کامیابی کو نظر انداز کر کے ہندوستان کی مختلف پارٹیوں نے اس قومی مسئلہ کو اپنی پوزیشن بنانے کا ذریعہ بنا لیا اور عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں لگ گئیں بعض فرقہ پرست جماعتوں نے تو انتہائی خطرناک طور پر فرقہ وارانہ جذبات کو بھی مشتعل کرنا شروع کر دیا لیکن یقین ہے کہ وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ عوام کو خوب معلوم ہے کہ عین انتخاب کے موقع پر وہ دونا ایسی حرکت اس لیے کی گئی ہے کہ ہندوستانی عوام کا شیرازہ بکھر جائے افراتفری میں وہ رجعت پسند اور پست فطرت عناصر پالا مار لے جائیں جو ملک کو آگے کی بجائے پیچھے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

جہاں تک ہندو پاکستان کے عوام کا تعلق ہے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آنے کی خواہش رکھتے ہیں اس کا ثبوت خاص طور پر مشرقی پاکستان کے حالیہ انتخابات ہیں جہاں عوام نے عوامی لیگ پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا جو ہند کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی خواہش مند ہے۔ یہاں ہندوستان میں بھی پاکستانی عوام کے تئیں خیر سگالی کے جذبات موجود ہیں جن کا اظہار مشرقی پاکستان کے طوفان زدہ لوگوں کی امداد کی صورت میں ہو چکا ہے۔

دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے بے چین ہیں لیکن آمریت پسند اور سامراجی طاقتوں کے ہاتھ میں کھیلنے والے عناصر ان کو قریب آنے سے روک رہے ہیں، اور ایسی کارروائیوں میں مصروف ہیں جن سے دونوں ملکوں میں زیادہ سے زیادہ کشیدگی پیدا ہو۔ ہوائی جہاز کا معاملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی نظر آتا ہے اور اس کے پیچھے ہم بہت بڑی سازش دیکھ رہے ہیں جس سے ہند کے ہر باشندے کو ہوشیار اور خبردار رہنے کی ضرورت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ جذبات کی رو میں بہہ کر غلط راہ پر پڑ جائیں۔

اس وقت سب سے بڑا اور اہم سوال یہ ہے کہ ملک کو رجعت پسندوں اور جمہوریت دشمنوں سے بچایا جائے اور ان جماعتوں کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں جو ملک میں ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم کر کے اسے ترقی کی راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مسز گاندھی نے ملک کے سامنے جو سوشلسٹ پروگرام پیش کیا ہے اگر اسے عمیق نظر سے دیکھا جائے اور اس پر توجہ دی جائے تو کسی فرد کو بھی اپنی راہ متعین کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

ادھر پاکستان میں بھی یقین ہے کہ جلد یا بدیر عوامی اور جمہوری حکومت ہی برسر اقتدار آئے گی کیوں کہ عوامی نمائندوں کو اب زیادہ الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر پاکستان میں اچھے اور سمجھدار لوگ برسر اقتدار آئے اور ادھر ہندوستان میں مضبوط و پائدار حکومت قائم ہوئی تو یقین رکھنا چاہیے کہ نہ صرف یہ کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات خوشگوار و مستحکم ہو جائیں گے بلکہ دونوں مل کر برصغیر کو پائدار امن کے ساتھ ترقی کی اس منزل پر پہونچا دیں گے جہاں اسے دیکھ کر دوسرے سب ممالک کو رشک آئے گا۔ •

روٹی کپڑا اور مکان

عام آدمی کی بُنیادی ضرورت

سیاسی پارٹیاں کیا کہتی ہیں!

ان کے الیکشن مینی فیسٹو

روٹی، کپڑا، اور مکان :-

یہ عوام کی ایسی بنیادی ضرورت ہے کہ جو کوئی بھی اس کا نعرہ لگاتا ہے جنتا اس کا دم بھرنے لگتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں نے شاید اسی نفسیات کو سامنے رکھ کر اپنے اپنے انتخابی مینی فیسٹو تیار کئے ہیں اور مخالف پارٹیوں نے جن میں "چار جماعتی گٹھ جوڑ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ایسے لمبے چوڑے وعدے کئے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ بس یہ برسرِ اقتدار آئے اور ملک میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔

یہ چار جماعتی گٹھ جوڑ بھی خوب ہے۔ اسے بعض لوگ "ساجھے کی ہنڈیا" کہہ کر پکارتے ہیں جو کبھی کبھی کیا ہمیشہ ہی چوراہے پر پھوٹا کرتی ہے۔ اس میں دراڑ تو اسی وقت پڑ گئی جب یہ گٹھ جوڑ جسے نجلنگپا ڈیسائی اینڈ کو "عظیم اتحاد" کے نام سے پکارتے ہیں اپنا مشترکہ مینی فیسٹو جاری کرنے میں ناکام رہا۔

"یہ عظیم اتحاد" اس لئے عمل میں لایا گیا ہے تاکہ اندرا سرکار کو ہٹا کر اس پر قبضہ کیا جائے اور "چوں چوں کا مربہ" قسم کی ایسی ہی ملی جلی سرکار قائم کی جائے جیسی کہ اس وقت یو پی میں قائم ہے۔

اس "عظیم اتحاد" کی جس میں چار پارٹیاں۔ سنڈیکیٹ کانگریس۔ سوتنتر۔ جن سنگھ اور سوشلسٹ۔ شامل ہیں مشترکہ پالیسی کیا ہوگی اور ان کا کم سے کم پروگرام کیا ہوگا اس کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا۔ ہاں ہر پارٹی نے اپنا اپنا الگ انتخابی مینی فیسٹو جاری کر کے ووٹروں پر اثر انداز ہونے کی کوشش ضرور کی ہے۔

ان میں جن سنگھ پارٹی سب سے آگے نظر آتی ہے۔ بلاشبہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ کسی دن زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہے کہ مستقبل قریب میں اس کے برسرِ اقتدار آنے کا کوئی امکان نہیں اسی لئے اس نے کوئی مکمل پروگرام اپنے امیدواروں کے لئے نہیں کئے

اس کا فوری مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح وہ اپنی موجودہ پوزیشن کو برقرار رکھے، اور اگر ہو سکے تو اسے کچھ بہتر بنائے۔ اسی لئے وہ لمبے چوڑے دعوؤں اور بھوک اور بیروزگاری کے خاتمے کے وعدوں کے ساتھ میدان میں اتری ہے۔

اس کا دوسرا مقصد دائیں بازو کی سب سے زیادہ طاقتور جماعت بن کر ابھرنا ہے تاکہ تمام رجعت پسند طاقتیں تجارت کے لئے صرف اس کی طرف دیکھیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسے اپنا تعاون دیں۔ اس لئے اس نے اپنے مینی فیسٹو میں عوام سے بڑے لمبے چوڑے وعدے کئے ہیں اور اعلان کیا ہے کہ کام جاننے والے تمام لوگوں کو تین سال کے اندر اور باقی بیکار لوگوں کو پانچ سال کے اندر کام مہیا کر دے گی۔ دس سال کے اندر اندر ہر خاندان کو مکان بھی دیا جائے گا۔ پسماندہ طبقوں کو اونچا اٹھانے کے لئے کام کیا جائے گا۔ اور ایسے ایسے کام کئے جائیں گے کہ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیا کریں گے۔ ہر آدمی کو ہر چیز کی چوری بند کرا دی جائے گی۔

یہ جماعت عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے سوشلزم کا پرچار کر رہی ہے

اس نے بڑے پرشکوہ انداز میں غربت کے خلاف جنگ کا اعلان کیا ہے تاکہ اس کے خیال کا ایک بہادر نیا ہندوستان وجود میں آ سکے۔ لیکن جن سنگھ نے امریکا میں تربیت یافتہ جن ماہرین اقتصادیات سے اپنے مینی فیسٹو کا مسودہ تیار کرایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ غربت اور بے روزگاری کا کوئی ٹھوس حل پیش نہیں کر سکا۔ بے روزگاری کا ایک حل اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ ملک میں نیوکلر پروگراموں کو بڑھاوا دیا جائے یعنی کہ ایٹم بم بنائے جائیں۔ بے روزگاروں کی ایک بڑی تعداد اس میں کھپ جائے گی۔ یہ ہوائی اور خیالی بات نہیں تو اور کیا ہے۔؟

درا صل جن سنگھ پارٹی کا خاص مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے غربت اور بے روزگاری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جس طرح کہ کسی وقت ہٹلر نے برسراقتدار آنے کے لئے ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مینی فیسٹو کا انداز بالکل ہٹلرانہ ہے اور یہ دلچسپ بات ہے کہ جن سنگھ ہر چیز کو "بھارتیانے" کے لئے بے چین ہے۔ اس نے ہٹلری پروگرام کو "بھارتیانے" کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ہٹلر نے جرمن عوام سے بڑے بڑے وعدے کئے تھے انھیں زیادہ روزگار اور زیادہ اجرتوں کا یقین دلایا تھا اور یہ اعلان کر کے عوام کے جذبات سے کھیلا تھا کہ معاشی ترقی چند سرمایہ داروں اور وزیروں کا کام نہیں ہے جو اپنے آدمیوں کو پرمٹ اور لائسنس جاری کرتے ہیں بلکہ عوام کو چاہئے کہ وہ ترقیاتی منصوبوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔

ہٹلرانہ انداز میں ایسی ہی باتیں جن سنگھ پارٹی کی طرف سے بھی کہی گئی ہیں لیکن ہٹلر وعدے کر کے سب باتیں بھول گیا تھا۔ جن سنگھ بھی یہی سب کچھ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور مفاد پرستوں کی خدمت کے لئے بے چین ہے بلکہ ملک کو بین الاقوامی اجارہ داروں کے چنگل میں پھنسا دینا بھی چاہتا ہے۔ وہ "غیر ملکی امداد ختم کرو" کا تو نعرہ لگا رہا ہے لیکن زور دے رہا ہے کہ "عالمی سرمایہ مارکیٹ سے قرض لو"

یہ عالمی سرمایہ مارکیٹ کیا ہے۔ امریکی سرمایہ داروں کا ادارہ ہے۔ اسی ادارے کو جن سنگھ پارٹی ملک سونپ دینا چاہتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ جن سنگھ پارٹی اس دستور پر بھی کلہاڑا چلا دینا چاہتی ہے جو ملک کے دانشوروں اور قانون دانوں نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ اس دستور کی بنیاد سیکولرزم پر رکھی گئی ہے۔ جن سنگھ اس بنیاد کو ملیامیٹ کرنے کے در پے ہے۔ وہ اسے غیر حقیقی قرار دیتی ہے اور کہتی ہے کہ پارٹی اس نقلی سیکولرزم کو تسلیم نہیں کرتی جو اقلیتوں کو چاپلوسی اور خوشامد کے ساتھ سلاتی ہو۔

اے۔ بی۔ باجپئی۔ صدر بھارتیہ جن سنگھ
عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں

گویا جن سنگھ کے خیال میں آج کل کے سیکولرزم کا نام "چاپلوسی" ہے۔ چاپلوسی اور خوشامد کس کی — اقلیتوں کی اور خاص کر مسلمانوں کی۔ وہ ان سب کو ڈنڈے کے زور سے ایک رنگ میں رنگ دینا چاہتا ہے۔

ایس۔ ایس پی۔

چار پارٹی گٹھ جوڑ میں شامل دوسری پارٹی ایس۔ ایس پی ہے۔ اس کے بانی آنجہانی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا تھے۔ وہ سوشلزم کے علمبردار تھے لیکن نہرو دشمنی کے جذبے سے بعض اوقات ان کا رویہ ایسا ہو جاتا تھا کہ خود سوشلسٹوں کو اس پر اعتراض ہوتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے

یہ نہیں کہا تھا کہ اگر نہرو جی نے سوشلزم کو اپنایا تو ان کی دشمنی میں سوشلزم ہی کو خیرباد کہہ دیں۔

لیکن ڈاکٹر لوہیا کے جانشینوں کی اندرا دشمنی آج اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جس دن سے اندرا جی نے سوشلزم کا نعرہ لگایا ہے ان سوشلسٹوں نے سوشلزم ہی سے منہ موڑ لیا اور سوشلزم کے دشمنوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر ڈالا۔

سمیکت سوشلسٹ پارٹی — اور جن سنگھ کسی زمانہ میں آگ اور پانی تھے، اور دونوں کا میل ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن آج دونوں ایک دوسرے کی بلائیں لے رہے ہیں۔ زبان کے معاملے میں یہ جماعت جن سنگھیوں سے پہلے ہی آگے تھی، لیکن اب اقلیتوں کے معاملے میں بھی اس نے جن سنگھیوں اور آر۔ ایس۔ ایس والوں کی زبان میں بولنا شروع کر دیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ ملک کی فرقہ پرست طاقتوں کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔ یہ تنبیہ مسلمانوں کو نہیں بلکہ آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کی جارحانہ فرقہ پرستی کو کی جانی چاہیے تھی کیونکہ یہ ان جماعتوں کی جارحانہ فرقہ پرستی ہی ہے جو فرقہ وارانہ امن و صلح کے ماحول کو خراب کر رہی ہے اور جس نے ہزاروں بے گناہوں کو خون میں نہلایا۔

آج کل کے الیکشن کے زمانے میں ملک میں پھیلا رہا ہے

واقعات نئی دہلی

ـٹ پارٹی چ تی ھے [illegible] والی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے

ام کر رہی ہے اور اس نے احمد آباد اور بڑودہ
ن کو تباہ کر ڈالا جہاں سنڈیکیٹ کی حکومت اپنی
ی ڈینگیں مارا کرتی ہے۔
اس پارٹی فساد انگیز مذہبی کتابوں کو رائج کرنے
ر وہ اردو کو دوسری زبان تسلیم کرنے کے خلاف
ں کے لئے سوشلسٹ پارٹی جو اپنے آپ کو
وادارانہ جماعت سمجھتی ہے، فرض تھا کہ جن سنگھ کو
تا۔ لیکن وہ جن سنگھ کی پیٹھ ٹھونک کر اُلٹا مسلمانوں
ا رہی ہے کہ وہ فرقہ پرستی کے شکار نہ ہوں —
س بھی کیا چیز ہے انسان سب کچھ بھول جاتا ہے
ہٹ کانگریس۔

ہ سنڈیکیٹ کانگریس کا جائزہ لیں کہ وہ کتنے
۔ مگر اس کا پانی تو یو پی میں معلوم ہو گیا —
ت کر دیا کہ اقتدار سنبھالنے کے بعد وہ رائے عامہ
ہا کرتی۔ پرواہ کرتی تو منی رام کے انتخاب میں
بعد مسٹر ٹی۔ این۔ سنگھ — گدی پر نہ بیٹھے
جماعت جمہوریت کو بچانے کے لئے دوسری جماعتوں
ا رہی ہے۔ لیکن خود جمہوریت کے پرخچے اڑانے
بت محسوس نہیں کرتی۔ اسے ہم اس کی دو رنگی
تعبیر کر سکتے ہیں۔

س کی دوسری دو رنگی یہ ہے کہ اپنے مینی فیسٹو میں
یقین دلاتی ہے کہ وہ پریوی پرس کو ختم کرنے کی
پر قائم ہے لیکن "مناسب طریقے سے" کے الفاظ
سری طرف سابق حکمرانوں کو بھی خوش کر دیتی ہے
۔

بال بھی بیکا نہ ہو، راضی رہے صیاد بھی"
دہ پر عمل رہتا ہے۔ لیکن اسے شاید معلوم نہیں
ہ دوٹر پہلے سے چالاک ہو گئے ہیں۔ دو رنگی پالیسی
حال اس چمگادڑ جیسا ہوتا ہے جو پرندوں میں
وحشیوں میں سے ہیں ہونے کا دعوٰی کرتا تھا۔
[illegible] اعلان کیا ہے کہ اس کا خاص

شری گپتا
اندرا کو ہٹاؤ — دیش کو بچاؤ

مقصد ملک میں جمہوری، سوشلسٹ اور سیکولر سوسائٹی قائم کرنا ہے لیکن اس نے اس امر کی توضیح نہیں کی کہ وہ سابق حکمرانوں، سرمایہ داروں اور جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی سے مل کر جو سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کی حمایت کرنے کی پابند ہیں کس طرح اور کس قسم کی سوسائٹی قائم کر سکے گی۔

سنڈیکیٹ کے مینی فیسٹو کی ابتداء سیاسی صورتِ حال کے جائزے سے ہوتی ہے۔ یہ عجیب طریقِ ابتداء ہے۔ غیر منقسم کانگریس نے کبھی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا۔ اس بار ایسا اس لیے کیا گیا کہ حکمران کانگریس کو جی بھر کر مطعون کیا جا سکے۔ سنڈیکیٹ نے اندرا سرکار پر یہ الزام لگایا کہ وہ کمیونسٹوں اور فرقہ پرستوں کا تعاون حاصل کر رہی ہے اور تخریبی طاقتوں کو بڑھاوا دے رہی ہے — یہی نہیں بلکہ خارجہ پالیسی میں روس کی مداخلت کا الزام لگایا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہ ایسی پالیسی اختیار کرے گی جو حقیقی معنوں میں غیر جانب دار ہو گی۔

زرعی اصلاحات کے سلسلے میں سنڈیکیٹ نے صرف ایک جملہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا ہے کہ "ہم جو پہلے وعدے کر چکے ہیں ان کے مطابق کام کریں گے۔" پہلے کیا وعدے لیے گئے تھے ان کی تلاش کا کام خود کسانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے — آخر سارا کام ایک جماعت ہی کیوں کرے!

اقلیتوں کے بارے میں سنڈیکیٹ نے جو پالیسی اپنائی ہے وہ بھی انتہائی حیرت انگیز ہے۔ احمد آباد، بھیونڈی، جلگاؤں، رانچی اور دوسرے مقامات پر جو کچھ ہوا ہے اس کا مینی فیسٹو میں کوئی تذکرہ نہیں۔ لیکن اس کے برعکس سنڈیکیٹ ناراض ہے کہ ماضی قریب میں — اقلیتوں کے خوف و خدشات کو پارٹی کے محدود مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے افسوسناک رجحانات دیکھنے میں آئے ہیں۔ کہا گیا کہ "کانگریس (سنڈیکیٹ) نے ہمیشہ فرقہ پرستی کے خطرات کو محسوس کیا ہے اور اس نے ہمیشہ اس کے خلاف جدوجہد کی ہے" لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اب سنڈیکیٹ نے اس جدوجہد کو اور تیز کرنے کے لیے جن سنگھ کے ساتھ

اشتراک کر لیا ہے"۔ اس کے برعکس اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ "علیحدگی پسندانہ رجحانات جو فرقہ پرست جماعتوں اور بعض سیکولرزم کی دعویدار پارٹیوں کے ذریعہ پیدا کیے جا رہے ہیں ان سے اقلیتوں کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ نے اقلیتوں اور خاص کر مسلمانوں کو بھارتیانے کا جو نعرہ بلند کیا ہے اس پر وہ قطعی خاموش ہے۔ شاید اس لیے کہ دوستی میں فرق آ جائے گا۔

اقتصادی پروگراموں کے بارے میں بڑے لمبے چوڑے دعوے کیے گئے ہیں کہ دس لاکھ رہائشی گھر سالانہ بنائے جائیں گے لیکن ان "گھروں" کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا جنھیں ملک کی پوری معیشت پر اجارہ داری حاصل ہے — سنڈیکیٹ اپنے لمبے چوڑے معاشی پروگراموں کے لیے روپیہ کہاں سے لائے گا یہ اس نے کہیں نہیں بتایا۔ اس

واقعات نئی دہلی

قسم کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے لیے سنڈیکیٹ کے پاس وقت نہیں ہے۔

سوتنتر پارٹی

سوتنتر پارٹی پہلے کوئی اپنا انتخابی مینی فیسٹو شائع کرنا نہ چاہتی تھی، بلکہ اس نے آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی (سنڈیکیٹ) کی ۲۸ جون ۱۹۷۰ء کی قرارداد کی بنیاد پر ہی الیکشن لڑنے کا ارادہ کیا تھا کیونکہ اس قرارداد میں نہ صرف یہ کہ سوشلزم اور سیکولرزم بلکہ غیر منقسم کانگریس کے دس نکاتی پروگرام کے حوالہ جات بھی نظر انداز کر دیے گئے تھے۔ لیکن کہتے ہیں خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ بدلتا ہے۔ جن سنگھ نے اپنا انتخابی مینی فیسٹو جاری کیا تو سوتنتر پارٹی بھی کب پیچھے رہنے والی تھی۔ اس نے بھی ایک مینی فیسٹو شائع کروا ڈالا۔ لیکن جیسا کہ سوتنتر لیڈروں نے تسلیم کیا ہے۔ یہ مینی فیسٹو محض ووٹ طلب کرنے کی اپیل زیادہ ہے جو سنڈیکیٹ کانگریس کے پروگرام کے اندر رہتے ہوئے کی گئی ہے۔

سوتنتر پارٹی کے مسانی
"امریکہ کی غلامی ہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی آزادی ہوگی"

نجلنگپا جی اس کے لیے مسانی اور اتکاجی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے بڑی اچھی دوستی نبھائی۔ تاہم وہ اس دوستی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ سوتنتر پارٹی کا اصل چہرہ بھی خواہ اُسے کتنا ہی چھپایا جائے ان کے سامنے ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ سوتنتر پارٹی کے پردے کے پیچھے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی چوکڑی جمی بیٹھی ہے۔ لیکن پارٹی کے صدر مسٹر مسانی فرماتے ہیں کہ "ان کی پارٹی ایک انقلابی پارٹی ہے" کیسے! اس کی تشریح انھوں نے نہیں فرمائی۔

واقعات نئی دہلی

لیکن اس لحاظ سے واقعی اسے انقلابی پارٹی مان لینا چاہئے کہ سنڈیکیٹ اور جن سنگھ کے ساتھ مل کر وہ سوشلسٹ پارٹی کی پالیسی میں انقلاب لے آئی۔

سنڈیکیٹ کانگریس کی طرح سوتنتر پارٹی الفاظ کے گورکھ دھندے پر یقین نہیں رکھتی بلکہ اس کی دوٹوک پالیسی یہ ہے کہ وہ نجی جائداد کو بنیادی حق مانتی ہے اور اس بات کے خلاف ہے کہ پریوی پرس کو ختم کیا جائے یا دولت مندوں کی لاکھوں کروڑوں کی جائداد پر ہاتھ ڈالا جائے۔ ان کے خیال میں یہ ایک جمہوریت پسندانہ اقدام ہے کیونکہ اگر راجے مہاراجے اور دولت مند ختم ہو گئے تو غریب کسانوں کے فائدوں اور سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کی بھی خیر نہیں۔

سنڈیکیٹ کانگریس کی طرح سوتنتر پارٹی کے مینی فیسٹو کی بنیاد بھی ان لمبے چوڑے وعدوں پر ہے جو عوام سے کئے گئے ہیں۔ بے روزگاروں کو مژدہ سنایا گیا ہے کہ پانچ برس میں ان کے لیے دس ارب روپے خرچ کیے جائیں گے اور صنعت کاروں کو دس برس میں ۱۲۰۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ روپیہ کہاں سے اکٹھا کیا جائے گا۔

"عوام کی جیبیں کترنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟"

بھارتیہ کرانتی دل

بھارتیہ کرانتی دل چار جماعتی گٹھ جوڑ میں شامل نہیں ہے۔ لیکن یوپی میں بھارتیہ کرانتی دل کے ایک نمبر کی حیثیت سے وہ عملاً گٹھ جوڑ سے الگ بھی نہیں ہے۔ وہ بھی جائداد کی ملکیت کو بنیادی حق مانتی ہے اور آئندہ بھی اسی پالیسی پر قائم رہنا چاہتی ہے۔ سوتنتر پارٹی کی طرح بی۔ کے۔ ڈی نے بھی چھوٹی جائداد کے مالکوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ملکیت کے اس حق میں رد و بدل کی مخالفت کریں۔

اس نے کمیونزم کا ہوّا بھی کھڑا کیا ہے اور عوام کو اس خطرے سے آگاہ کیا ہے کہ کمیونسٹ اور انکے ساتھی جائداد کے حق کو چھیننے کے لئے دستور میں ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔

چرن سنگھ — وزارت عظمیٰ کے خواب۔

بی۔ کے۔ ڈی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کی بھی مخالف ہے۔ وہ سنڈیکیٹ کی طرح سوشلزم کی بات نہیں کرتی بلکہ ایسے نظام کے خلاف ہے جس میں ذرائع پیداوار اور ان کی تقسیم پر سرکار کا کنٹرول ہو۔ وہ مزدوروں کو ان کی ہڑتال کا حق بھی نہیں دینا چاہتی۔ وہ صدارتی طرز حکومت لانا چاہتی ہے اور

بھارتیہ کرانتی دل کے پرکاش ویر شاستری
"مزدوروں کے دشمن"

نظام چاہتی ہے جیسا کہ امریکہ میں ہے۔ اس طرح وہ سوتنتر پارٹی سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ اور دلچسپ یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو کسانوں کی کہتی ہے اور دعویٰ کرتی ہے کہ اس کے ووٹر کسان ہیں۔ لیکن اس بار معلوم ہو جائے گا کہ کسان اس کے ساتھ ہیں۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی

پہلے یہ باتیں بازو سے تعلق رکھنے والی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ جو اپنی انتہا پسندی میں آگے نظر آتی ہے۔ اس کی تنقید سے کوئی پارٹی نہ اس نے کانگریس کو بخشا اور نہ چار جماعتی گٹھ جوڑ کو۔ کمیونسٹ پارٹی پر بھی لے دے کی ہے اور ہر پارٹی پر بھی صرف اکالیوں پر مہربانی کی ہے کہ خلاف کوئی بات نہیں کہی۔ شاید پنجاب میں کوئی معاملہ ہوا ہوگا۔

اس پارٹی نے بھی بے روزگاری کو اپنے مینی فیسٹو کی بنیاد بنایا ہے اور اس بات پر تشویش ظاہر کی ہے کہ ملک میں ایک کروڑ بیس لاکھ بے روزگار ہیں جن میں پندرہ لاکھ تعلیم یافتہ (بشمول ۷۰ ہزار انجینئر) شامل ہیں۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے جیوتی باسو

"کسی کو ووٹ دو لیکن کسی فرقہ وارانہ جماعت کو نہیں"

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بے روزگاری کے اس مسئلے پر قابو پانے کے لئے اس پارٹی نے کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا ہے کہ ۔۔۔

"اندرا گاندھی کا یہ اعلان الیکشن اسٹنٹ ہے کہ ہر سال پانچ لاکھ ملازمتیں نکالی جائیں گی۔ وہ کوئی ملازمت ایسی نہیں ہوگی جس پر ایک شخص کو سو روپیہ ماہوار سے کم مل رہا ہو"

مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی پر عوام کو اعتراض ہو سکتے ہیں لیکن بہرحال یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ فرقہ پرست جماعت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے مینی فسٹو میں پچھلے برسوں میں ہونے والے فسادات پر اپنی گہری فکر و تشویش ظاہر کی ہے۔ اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جن سنگھ جیسی فرقہ پرست جماعتیں مسلمانوں کو بھارتیکرن کا نعرہ لگا کر ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔

> مارکسی پارٹی نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ کسی ایسی پارٹی کے حق میں ووٹ نہ دیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر فرقہ پرستی کی حامی ہو۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی گورنروں کے عہدوں کے خلاف ہے اور چاہتی ہے کہ ریاستوں میں گورنری حکومت کا طریقہ ختم ہو۔ وہ لامرکزیت اور ریاستوں کی خود مختاری کی حامی ہے اور ملک میں ایک ایسا دیہاتی طرز حکومت کا قیام عمل میں لانا چاہتی ہے جس میں آزادانہ طور پر ریاستیں شریک ہوں۔

کمیونسٹ پارٹی

کمیونسٹ پارٹی بھی ریاستی خود مختاری اور انہیں زیادہ اختیارات دینے کی حامی ہے لیکن قومی ایکتا کی قیمت پر نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ریاستوں کو زیادہ اختیارات دینے کے لئے آئین میں اس طرح کی ترمیم ہونی چاہئے کہ ملک کی بنیادی یکجہتی متاثر نہ ہو۔ کمیونسٹ پارٹی کی یہ تجویز بڑی [illegible] ہے کہ دیہاتی کونسلوں کے ممبروں کی تعداد اس طور پر مقرر کی جائے کہ وہ لوک سبھا یا اسمبلیوں کے منتخب شدہ ممبروں کی تعداد [illegible] سے زیادہ ہو۔ نیز وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ [illegible] لوک سبھا اور متعلقہ اسمبلی کا ممبر ہو۔

کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ڈانگے "اندرا کو ووٹ دو"

کے ساتھ قریبی دوستی اور تعاون رکھا جائے۔ نیز معاہدہ تاشقند کے تحت ہند پاک تعلقات کو بحال کرنے کے لئے جدوجہد کو جاری رکھا جائے اور چین کے ساتھ بھی تعلقات میں اس وقت جو تعطل ہے اسے ختم کیا جائے۔

کانگریس

ان سب پارٹیوں کے درمیان کانگریس سے اس کا مقابلہ دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں سے تعلق رکھنے والی جماعتوں سے ہے۔ گویا اسے بیک وقت دو محاذوں پر انتخابی جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ لیکن اس کی اصل جنگ دائیں بازو کے انتہا پسندوں ہی سے ہے جو نظام حکومت کی بنیاد اور جمہوری قدروں کو بدلنے کے درپے ہیں اور ہٹلری طور طریقے اپنا کر ملک کو ڈکٹیٹری کی طرف لے جانے کے حق میں ہیں۔ مقابلہ اس لئے زیادہ سخت ہے کہ تنگ نظری اور قدامت پسندوں کی تمام طاقتیں محض اس ایک مقصد سے جمع ہو گئی ہیں کہ کسی طرح اندرا سرکار کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے۔

اندرا سرکار پر عوام کو اعتماد و یقین ہے اور یہ اعتماد و یقین [illegible] اور بعض ایسے ہی بنیادی اقدامات سے استحکام ہو گیا ہے۔ لیکن سنڈیکیٹوں کی علیحدگی کے باوجود کانگریس اپنے وعدوں اور حکومت کی کارکردگی کے درمیان فرق کو دور نہیں کر سکی۔ بات کسی حد تک بے چینی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ لیکن عوام نے خود یہ بات پسند کی کہ کانگریس نے بڑی دلیری سے اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو تسلیم کر لیا۔ اس سے اس کا وقار گرا نہیں بلکہ آئندہ کے لئے اس نے عوام کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ

سوتنتر پارٹی بھی "انقلابی پارٹی" بن گئی

پارٹی نے اقلیتی فرقوں کے تحفظ کے لئے تمام قانونی اور انتظامی اقدامات پر زور دیتے ہوئے فرقہ وارانہ سرگرمیوں پر پابندی کا مطالبہ کیا ہے۔ خارجی امور میں اس نے کہا ہے کہ روس اور دوسرے سوشلسٹ ممالک

جو جماعت خود اپنی خامیوں کو تسلیم کر لے، وہ یقیناً اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتی ہے۔ ذمہ داریوں کو محسوس نہ کرتی تو وقت سے پہلے انتخابات نہ ہوتے۔

دوسری جماعتوں کی طرح کانگریس نے اپنے مینی فسٹو

واقعات نئی دہلی

...مانوں کیلئے صرف وعدے ہی وعدے - لیکن الیکشن کے بعد!!!

جگو بھائی — "میں نے انکم ٹیکس ادا کر دیا۔"

میں لمبے چوڑے وعدے نہیں کئے ، بلکہ بڑی متوازن پالیسی اختیار کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتی ہے اسے عملی جامہ پہنانے کا ارادہ بھی رکھتی ہے — یوں، کوئی لوگوں سے کہے کہ میں چاند کو زمین پر لے آؤں گا تو اس سے کیا حاصل ہوگا —؟

کانگریس نے اپنے منی فیسٹو میں عوامی بیداری کا ذکر کیا ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اقتصادی اور سماجی ترقی کا ایک حقیقی انقلابی پروگرام ہی نئے چیلنج کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے آئین میں ایسی ترمیم کا بھی اعلان کیا ہے کہ قدامت پسند ہی نہیں بلکہ عدالتیں بھی اس کے ترقی پسندانہ اقدامات میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

کانگریس نے کہا ہے کہ " ہماری کوشش ہوگی کہ ایسی آئینی راہیں نکالی جائیں کہ سماجی انصاف کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں پر غالب آیا جا سکے "

کانگریس سوشلسٹ طرز کے ایسے نظام کو مستحکم کرنا چاہتی ہے جس میں اقتصادی نابرابری ختم ہو سکے۔ مثلاً وہ چاہتی ہے کہ نظام معیشت کو اس طرح منتقل کیا جائے کہ اس سے دولت اور پیداواری ذرائع و رسائل کے ارتکاز کی راہ ہموار نہ ہو اور یہ بات عوامی فلاح کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔

> اقلیتوں کے بارے میں کانگریس نے اعلان کیا ہے کہ وہ ان کے حقوق اور ان کے مفاد کے تحفظ کی پابند ہے " اس نے ان فسطائی طاقتوں کی مذمت کی ہے جو مذہب، نسلی برتری اور علاقائی جذبات کو ہوا دے کر عوام کے جائز مطالبات کو کچلنے کی کوشش میں ہیں۔

اردو کے بارے میں اعلان کیا گیا ہے کہ " اس زبان کو وہ جگہ دی جائے گی جس کی وہ مستحق ہے جس سے کہ اب تک اسے محروم رکھا گیا ہے " ملازمتوں کے بارے میں انھیں یقین دلایا ہے کہ " اقلیتوں کے ساتھ برتے جانے والے امتیازات کے تدارک کی کوشش کی جائے گی "

ان سب پروگراموں کی تعمیل کے لئے وزیر اعظم چاہتی ہیں کہ کانگریس کو بھاری اکثریت میں کامیاب کیا جائے تاکہ وہ مستحکم حکومت قائم کر سکیں اور کسی گروپ کے دباؤ کے بغیر اپنی پالیسیوں پر عمل کر سکیں — پالیسیوں پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حقیقتاً ایک مضبوط حکومت ہو۔ اب عام ووٹروں میں اس کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔

ڈی ایم کے اور اکالی دل ——— کی طرف سے بھی الیکشن منی فیسٹو جاری کئے گئے ہیں جن میں بعض باتیں مشترک نظر آتی ہیں — دونوں جماعتیں ریاستوں کو زیادہ وسیع اختیارات دینے کی حامی ہیں — (ایسی ہی مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی خواہش ہے) ڈی ایم کے نے خاص بات ہندی کے بارے میں کہی ہے۔ وہ یہ کہ خواہ کچھ ہو ہندی کے لئے اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں — یہ ہندی والوں کی شدت پسندی کا نتیجہ ہے — یہ شدت پسندی ہی ہے جو بعض اوقات [illegible] کراتی ہے — کانگریس نے بیان [illegible] اختیار کی ہے جو تمام دوسری پارٹیوں [illegible] کی جاتی ہے ———

ادھر وہ آن پڑا ہے کہ اٹھا۔

بھارتیہ کرانتی دل مزدوروں کو ہڑتال کا حق دینے کے خلاف

ایک کوہستانی جنت

قاضی نسیم ایم اے

جدید افغانستان کے بانی
شاہ محمد ظاہر شاہ

"اے سرزمین وطن! اے خاک پاک کابل! طویل
ہے سے تیری جدائی مجھے مُرغِ بسمل کی طرح تڑپا رہی ہے۔
ے لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، جھومتے مرغزار، لالہ زار گلرنگ گلوں
ی پُر وادیاں، کوہستانوں کی برف پوش چوٹیاں جن کی سفیدی و
یزگی دیکھ کر کوہ قاف کی پریاں بھی رشک کرتی ہیں تیری تعلق
تی ہوئی، مستی و شباب کا نغمہ گاتی کوہستانی ندیاں، بلندیوں
ے گرتے دُودھ جیسے صاف و شفاف آبشار، اور ابلتے بلورین
موں کا تصور کر کے وہ کون بدبخت ہوگا جو تیری محبت میں
بقرار نہ ہو جائے۔ وہ کون ناشکرا بندہ ہوگا جو قدرت کی ان
رنگیوں اور عطا کردہ نعمتوں کو دیکھ کر بارگاہِ خداوندی میں سجود
ہو جائے۔

آہ! وہ کابل کی کشادہ سڑکیں اور تنگ بازار، شوخیاں کرتے
وئے گلاب جیسے تروتازہ بچے، سرِ شام سڑکوں پر پھسلتی کاریں
سکرٹ میں ملبوس چہچہاتی تھرکتی حسینائیں، یہ دورِ جدید کے چلتے
مرتے بُت، ان کے گداز بازو، متناسب جسم، نقرئی کھنکتی آوازیں
بقعۂ نور ریسٹورانوں سے ابھرتی ہوئی موسیقی کی ہلکی ہلکی دھنیں چھلکتا
شباب، کھنکتے جام، لڑکھڑاتے قدم، بہکتی آوازیں، فلک شگاف
قہقہے۔ اور کہیں کہیں سراپا قدیم افغانستان کی برقعہ پوش،
متحرک اور جیتی جاگتی تصویریں۔ یہ تمام مناظر اور میرا ملک میرا
عزیز وطن، مشرق و مغرب، جدید و قدیم کا سنگم، ہاں وہی
میرا وطن آج مجھے شدت سے یاد آرہا ہے۔
وہی وطن جہاں بچپن کے ایام میں نے گذارے
طفلانہ شوخیاں کیں اور جوانی میں قدم رکھتے ہی عشق و محبت

افغانستان کے
وزیر اعظم کی
رہائش گاہ

لے والہانہ رسیلے لیجے گائے۔ ہاں وہی وطن آج مجھے یاد آرہا ہے۔ اے وطن عزیز! تیری عظمت کو سلام۔ اے ارضِ پاک اب مجھے تابِ جدائی نہیں۔ میں تیری طرف دوڑا آرہا ہوں، تاکہ تیری مقدس خاک کو عقیدت سے اپنی پیشانی پر لگالوں۔"

یہ ہے ہندوستان سے روانگی سے قبل لکھا ہوا ایک افغان طالب علم عبدالستار مُقروال کی ڈائری کا ورق جو تین سال سے کولمبو پلان کے تحت یہاں زیرِ تربیت تھا۔ یہ سطور وطن سے حقیقی محبت کی ترجمان ہیں جن کے ہر ہر لفظ سے حب الوطنی جھلکتی ہے۔ انھیں پڑھنے کے بعد ایک اجنبی کے دل میں افغانستان کی سیاحت کا جذبہ فطری طور پر سر اُٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آئیے ہم بھی اس جنت کی سیر کریں۔

افغانستان کی کوہستانی، خشک آب و ہوا نہایت ہی صحت بخش ہے۔ یہاں پر انواع و اقسام کے لذیذ ترین پھلوں کی بہتات ہے، جن میں قندھاری سیب دُنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہاں کے انگور، تربوز، خربوزے، شفتالو اور توت اپنی مثال آپ ہیں۔ توت تازہ بھی کھایا جاتا ہے اور خشک بھی۔ اسے سکھا کر آٹے کی طرح پیس کر لیا جاتا ہے جو بعد میں جم کر سخت ہو جاتا ہے جسے "تلخان" کہتے ہیں۔ یہ برسوں خراب نہیں ہوتا برف کے ساتھ اس کی شیرینی بہت ہی مزہ دیتی ہے۔ یہ زود ہضم اور بہت ہی مقوی ہوتا ہے۔ ایک انگریز کہتا ہے کہ ایسی جمی ہوئی سخت غذا ہی شاید افغانوں کو مضبوط اور سخت جسم کا جنگجو بناتی ہے۔ خشک میوہ جات میں بادام، پستہ، کشمش، اخروٹ اور چلغوزے بھی افراط سے ہوتے ہیں۔ قالین بافی یہاں کی مشہور ہے۔ زیادہ تر عورتیں ہی کھلے میدانوں اور گھروں میں یہ کام کرتی ہیں۔ یہ قالین جو نہایت ہی گراں داموں فروخت ہیں، یہ صرف خوبصورت ہی نہیں ہوتے بلکہ بیحد پائیدار بھی ہوتے ہیں۔

بہار کا موسم یہاں مارچ سے اگست تک ہوتا ہے۔ ان ہی ایام میں ایران کی طرح جشنِ نوروز یہاں بھی نہایت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ افغانستان کا سالِ نو مارچ میں اسی روز سے شروع ہوتا ہے۔ موسمِ گرما جون سے اگست تک، نومبر اور موسمِ سرما دسمبر سے فروری تک ہوتا ہے اوسط ۱۰ سے بھی کم ہے۔ سیاحت کے لئے ما... کے آخر تک کا موسم مناسب ہے۔

افغانستان کے تاریخی مقامات، سربہ برف پوش پہاڑ، اس کے ریگستانی علاقہ میں چلتے کے کارواں، مختلف تہذیبوں کے آثار، اُن کا... اور پھر موجودہ زمانے کا اُبھرتا ہوا جدید افغا... کے لئے ایک ایسی طلسماتی کشش اپنے... کہ وہ اس کی جلوہ سامانیوں میں گم ہو کر...

افغانستان جانے کے لئے ہر چہار طر... راہیں مسدود ہیں، اندرونِ ملک بھی ریلوے نہیں ہے، خشکی کے راستے بس یا کار سے ہی سفر کیا جا سکتا ہے۔ کابل یہاں کا د... اور موجودہ فرمانروا اعلیٰ حضرت شاہ ظاہر... اگر ہندوستان سے خشکی کے راستہ

پشاور، اور درۂ خیبر کو عبور کرکے تورخم و جلال
وئے ہم کابل پہنچ سکتے ہیں۔ کوئٹہ کی سمت سے قندھار
وستے ہوئے کابل تک راستہ جاتا ہے، اور اگر ایرانی
ے کابل جاتا ہو تو افغانی سرحد اسلام قلعہ سے ہرات
مار ہوتے ہوئے کابل تک راستہ ہمیں لے جائے گا
عان شمار نے جو کابل انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے ریڈیو
نجینئرنگ سے منسلک ہیں میرے سوالات کے تسلی بخش
دیئے۔ انھوں نے کہا: "افغان آریانہ" افغانستان کی
وس ہے۔ دیگر ممالک سے رابطہ قائم رکھنے کے علاوہ
لک کے بڑے بڑے شہروں کو بھی یہ سروس ایک دوسرے
ہے۔ ہندوستان، ایران، پاکستان، روس اور
دیکھیہ کی ہوائی سروسیں یہاں سے ہو کر گذرتی ہیں۔
ان سروسوں کے ذریعہ، امرتسر، دہلی، تہران، دمشق،
کراچی، تاشقند، ماسکو اور پشاور کے درمیان آمد و رفت
مقامی ہوائی سروس قندھار، ہرات، مزار شریف،
رگیست کے درمیان اپنی خدمت انجام دیتی ہے۔
یانہ ائرلائن کا بکنگ آفس کابل ہوٹل کی عمارت میں
جگہ نئے ہوائی اڈے کچھ تو بن چکے ہیں اور کچھ ابھی زیر

احوں کی سہولت کے لئے وزارت اطلاعات نے
مشہور مقامات کی سیر کے لئے بسوں کا خاص انتظام کر رکھا
ہے۔ قابلِ دید مقامات کی سیر کے لئے کابل میں ٹیکسی موزوں
نہیں ہے۔ کیونکہ ٹیکسی کا میٹر یہاں برائے نام ہے اور
ڈرائیور اپنی مرضی کے مطابق کرایہ طلب کرتے ہیں۔ ملٹری کیمپ
اور چند مخصوص مقامات کے علاوہ فوٹو گرافی پر کسی قسم کی پابندی
نہیں ہے۔ یہاں کی مصنوعات میں قالین مشہور ہیں۔ کراکلی
(پوستینی) کوٹ، جیکٹ، ٹوپیاں، پائیدار چرمی جوتے، کشیدہ
کاری کی رنگین ٹوپیاں، واسکوٹ، ہینڈلوم کپڑا، اسٹائیل
کے بنے مٹی کے خوب صورت برتن، قیمتی پتھر، مقامی طرز کے
نقرئی زیورات، پرانی بندوقیں اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں
ایک اجنبی کے لئے کشش کا باعث ہیں۔ کراکلی، ٹوپی، کوٹ
اور جیکٹ کافی مہنگے داموں فروخت ہوتے ہیں۔ امریکی خواتین
پوستین سے بنے جیکٹ زیادہ پسند کرتی ہیں۔

بزکشی یہاں کا مقبول ترین قومی کھیل ہے جو گولف کی
طرح وسیع میدان یا وادی میں گھوڑوں پر سوار ہو کر دو ٹیموں
کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔ اس خطرناک کھیل میں کبھی
کبھار زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ حقیقتاً یہ بہادری
اور جرأت کا مظاہرہ ہے۔ دوسرے کھیل نیزہ بازی اور پیغ

افغانستان میں
قدیم بودھ
کے نشانات
آج بھی پائے
جاتے ہیں

ہ کابل
یر کرنے
آتے ہیں
یری طرح
ر رہتے ہیں

شی ہیں جو گھوڑے پر سوار ہو کر ہی کھیلے جاتے ہیں۔

یہاں پر عام تعطیل کا دن جمعہ ہے اور جمعرات کو
سف روز چھٹی رہتی ہے۔ رمضان کی پہلی تاریخ، عید الفطر
ین روز، عید قرباں چار روز، عید میلاد النبی اور عاشورہ
حرم ایک ایک روز کی مذہبی تعطیلات ہیں۔ ۲۱ مارچ کو
شن نوروز سے افغانستان کا نیا سال شروع ہوتا ہے۔ اس دن
نگا رنگ پروگرام، رقص، اونٹوں کی جنگ اور مویشیوں کی
ائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ درخت کی شاخوں اور پھولوں
ے مکانات کی آرائش کی جاتی ہے۔ اگست میں جشنِ استقلال
نایا جاتا ہے تین روز تمام دفاتر اور اسکول و کالج بند رہتے ہیں
ے میں بڑے پیمانے پر آتشبازی ہوتی ہے۔ قومی نمائش منعقد
جاتی ہے اس میلہ میں مقامی مصنوعات اور ہاتھ کی بنی
وئی چیزیں رکھی جاتی ہیں دور و نزدیک سے سمٹ کر عوام
بل کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں یکم ستمبر کو یوم پختونستان
نایا جاتا ہے۔ ۱۴ اکتوبر شاہ ظاہر شاہ کی سالگرہ کا دن ہے
س روز خصوصیت سے بزکشی کا مظاہرہ وسیع میدان میں
وتا ہے۔

یہاں امریکی، روسی، ایرانی اور انگریزی فلمیں بھی آتی ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی فلموں کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی فلمی نغمے حد سے زیادہ مقبول ہیں۔ کابل میں تو ایک سینما گھر ایسا ہے جہاں پر صرف مار دھاڑ اور دارا سنگھ کی ہی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ پامیر، زینت، کابل کابل ننداری اور بہزاد وغیرہ یہاں کے سینما گھر ہیں۔ کابل میں انٹرنیشنل، اسکائے، اسپورٹس، گولف اور فرینچ کلب ہیں۔ خیبر ہوٹل میں ہفتہ میں ایک دو بار رقص کا پروگرام بھی ہوتا ہے۔ اسپنسر راور کابل ہوٹل کا شمار شہر کے بہترین ہوٹلوں میں ہوتا ہے خیبر میں مغربی طرز کے کھانے بھی تیار ہوتے ہیں۔

قندھار، مزار شریف، بامیان، جلال آباد اور دوسرے علاقوں میں جابجا ریسٹوران اور چھوٹے چھوٹے چائے خانے کثرت سے ہیں۔ افغان بغیر دودھ کی ہلکی چائے پیتے ہیں۔ افغانستان انواع و اقسام کے پلاؤ کے لئے مشہور ہے یہاں کی مشہور ڈشوں میں بولانی، آشک اور بریانی عمدہ کھانے ہیں سیخ اور کباب تنوری نان سے کھائے جاتے ہیں ہلکی چائے کثرت سے پی جاتی ہے۔ کابل کے قریب باغ بالا مقامی کھانوں کے لئے مشہور ہے۔ صحت بخش آبی ذخائر چشموں کی صورت میں ہر جگہ موجود ہیں کابل سے تھوڑے سے فاصلہ پر پغمان کا پانی صحت بخش سمجھا جاتا ہے۔

افغانستان کا مقامی وقت انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ یوروپی و امریکی ڈاکٹر مقامی ڈاکٹروں کے دوش بدوش بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دواؤں کی دکانیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں جہاں تمام انگریزی ادویات آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

کابل افغانستان کا دار السلطنت ہے۔ جو ایک زرخیز وادی میں آباد ہے۔ یہاں کی آب و ہوا نہایت ہی خوش گوار ہے موسم گرما میں ۸۰ ڈگری فارن ہائٹ ٹمپریچر رہتا ہے جبکہ موسم سرما میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ اس کا شمار وسطی ایشیا کے قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں مشہور "شاہراہ ریشم" کے ذریعہ افغانستان سے تجارت ہوتی تھی۔ اس وقت یہ ہندوستان میں داخل ہونے کا دروازہ تھا اور دنیا کے مصروف ترین تجارتی شہروں میں شمار کیا جاتا تھا ظہیر الدین بابر کا مقبرہ آج بھی یہاں اپنی شان

دو افغان بچے

نورستان کا ایک بازار

ستان

طرن

ں کا اعلان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ قدیم کابل میں رنگا
بازار صدہا چیزوں سے بجے نظر آتے ہیں۔ آثارِ قدیمہ
۔ راور ایک عام شخص دونوں کے لئے یہ شہر یکساں
ں کا باعث ہے۔ دوسری اور تیسری صدی کے مہاتما بُدھ
کے آثار کابل کے اطراف میں دکھائی دیتے ہیں۔ کابل میوزیم
انستان کے مختلف ادوار کے قدیم فنِ نقاشی کے ساتھ
بُدھ و یونانی آرٹ بھی موجود ہے۔ اعلیٰ اور قیمتی نوادرات کے
ہاتھی دانت پر نقاشی کے اعلیٰ ترین نمونے اور طرح طرح
ں کا ذخیرہ قابلِ دید ہے۔ باغ دار الامان کو کابل جدید
ہا ہے۔ باغِ چہل ستون، باغِ ریش خور، پارک زرنگار اور
بہر نو تفریحی مقامات ہیں مقبرۂ نادر شاہ کے علاوہ مسجد
مسجدِ پل خشتی، مسجد شیر پور اور مسجدِ شاہِ شمشیر دیکھنے سے
ہلتی ہیں مزارات میں پسران خواجہ عبد اللہ انصاری اور درگاہ
شیر ولی شہر کے متبرک مقامات میں سے ہیں۔ کابل میں
ہوں اور چوراہوں پر ٹریفک کی تیز رفتاری اور حادثات کے
رجا بجا یہ تختیاں لگی نظر آتی ہیں "دیر رسیدن بہتر است از
ن"

ابل کے مغرب میں ۱۹ کلو میٹر دور بلندی پر خوبصورت اور
مقام باغِ پغمان ہے۔ موسم گرما میں کاروں اور بسوں سے
س یہاں آتے ہیں۔ یہاں کی صحت بخش آب و ہوا اور دلکش
ہر کسی کو یہاں آنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

کابل سے ۶۰ کیلو میٹر پر کوہستانی آبادی استالیف
کے عقب میں کوہِ ہندوکش کی چوٹیاں قدرت کا شاہکار
ہوتی ہیں۔ بیگرام کی کشادہ سطح مرتفع اس کے دامن میں
دیم طرز کے نیلے رنگ کے مٹی کے برتن یہاں صدیوں
سے بنتے چلے آرہے ہیں۔

کابل سے ۵۲ میل پر تانگی گھارو ایک مقام ہے یہاں
سے ایک نیا راستہ جلال آباد سے پشاور تک سرنگوں سے
ہوتا ناگ کی طرح بل کھاتا ہوا جاتا ہے جو کہ تین ہزار فٹ نشیبی
علاقوں سے جا ملتا ہے۔ دریائے کابل کا حسین آبشار "ماہ پار"
کے نام سے یہاں پر ہی گرتا ہے۔

کابل سے ۱۲۴ کیلو میٹر کے فاصلہ پر "سالانگ" ہے۔ کوہِ
ہندوکش کا یہ نہایت ہی دشوار گذار اور پُرپیچ علاقہ ہے دنیا
کی طویل اور بلند ترین سرنگ جو کہ گیارہ ہزار فٹ لمبی ہے عقلِ
انسانی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

جلال آباد کابل سے ۱۴۵ میل پر آباد ہے جو پاکستان کے
سرحدی شہر پشاور کا ہمسایہ ہے۔ پشاور سے تنگ اور خمدار
راستہ تین ہزار فٹ کی بلندی پر جلال آباد تک جاتا ہے سردیوں
میں موسم نہایت اچھا اور قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ گرمی
قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ دو تین گھنٹوں کی مسافت طے کر کے
بذریعہ بس ایک سیاح کابل اور ہندوکش کی بلندی میں سوئیوں کی
طرح چبھنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے بھاگ کر یہاں کی خوشگوار
فضا میں سکھ کا سانس لے سکتا ہے۔

مزار شریف بلخ صوبہ کا دسطی شہر ہے۔ یہاں فیروزی رنگ
سے بنی ایک عالیشان مسجد اور فیروزی نقش و نگار سے مزین
ایک عظیم المرتبت بزرگ کا مقبرہ ہونے کی وجہ سے یہ متبرک شہر
مانا جاتا ہے۔ افغانیوں کے عقیدے کے مطابق اس عالیشان
گنبد میں جو مزار ہے وہ آنحضرتؐ کے چچا زاد بھائی اور داماد
خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کا ہے (حالانکہ حضرت علیؓ کا مزار
عراق کے شہر کوفہ میں ہے) درگاہ کے احاطہ میں ہزاروں سفید
کبوتر ہیں۔ یہ مشہور زیارت گاہ مزار سخی کے نام سے مشہور ہے
افغان عام طور پر "ترا قسم حضرت سخی است" کہتے ہوئے دکھائی
دیں گے۔ سالانہ جشن کے موقعہ پر چند خوش نصیب نابینا یہاں
سے بینائی لیکر لوٹتے ہیں جب کسی کی بینائی واپس لوٹ آتی ہے
اور وہ خوشی سے چلا اٹھتا ہے تو فوراً مجمع اس پر ٹوٹ پڑتا ہے
اور جب تک اس کے بدن کا پیرہن تار تار نہ ہو جائے اس
وقت تک اُس غریب کی جان آفت میں رہتی ہے کیونکہ اس
کے پیرہن کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا لوگ بطور تبرک حاصل
کرنے کی جد و جہد کرتے ہیں۔

بلخ کو "اُم المدین" کہا جاتا ہے یہ مزار شریف سے
صرف تیرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ شہر زمانۂ قدیم کی عظمت
کا آئینہ دار ہے۔ یہاں اب صرف کچھ کھنڈرات باقی رہ گئے
ہیں جن میں "محرابِ نو بہار" اور بُدھ کے استوپ ہیں۔
سولھویں صدی کے تیموری عہد کی کچھ تاریخی یادگاریں،
درخشاں ماضی کی یاد دلاتی ہیں۔ خواجہ محمد پارسا کی مسجد ان
ہی نوادرات میں سے ایک ہے۔ احمریں محرابوں اور مینا کاری
کے ٹائیلوں سے بنی ہوئی اس مسجد کو دیکھنے کے بعد کوئی بھی
بیساختہ تعریفی کلمات کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پُلِ خمری ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو کہ ٹیکسٹائل انڈسٹری
کا مرکز مانا جاتا ہے۔ یہاں سے دو الگ الگ راستے قندوز
اور بلخ کو جاتے ہیں۔

پُلِ خمری سے ۱۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر سُرخ کوتل ہے۔
یہاں پر پہلی صدی عیسوی کا ایک کشانی مندر کھنڈر کی صورت
میں آج بھی موجود ہے۔ پہاڑی چٹانوں کو تراش کر بڑے بڑے
زینے بنائے گئے ہیں جو ایک آتشکدہ تک جاتے ہیں۔ جسے

کشان شہنشاہ کنشک نے بنوایا تھا۔ حال ہی میں فرانسیسی آثارِ قدیمہ کے مشن کے تحت اِنھیں کھود کر نکالا گیا ہے۔

قندھار افغانستان کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے اِسے یونان والے Arachosia کے نام سے پکارتے تھے سکندر نے یہ شہر محافظ فوجی دستوں کے لئے بنوایا تھا۔ اور جس کا نام اس نے Alexandra of Arachosia رکھا تھا۔ افغانستان کی جدید شہنشاہیت نے یہیں جنم لیا جسکی ابتداء ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ دُرانی سے ہوئی۔ یہاں پر ایک عالیشان مسجد میں آنحضرتؐ کا لبادہ بطور تبرک رکھا ہوا ہے۔ قندھار میں دیگر آثارِ قدیمہ کے علاوہ "چہل زینہ" یعنی چالیس سیڑھیاں ہیں جو ایک ہی چٹان میں تراشی گئی ہیں۔ یہ زینے ایک محراب تک جاکر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس محراب پر شہنشاہ بابر نے سولہویں صدی میں اپنی فتوحات بطور یادگار کندہ کرائی ہیں۔ اوپر پہنچنے پر ارگنداب کے میدان وآثارِ قدیمہ اور جدید قندھار کا نظارہ نہایت ہی دلکش دکھائی دیتا ہے۔

قندھار سے دو سو کیلو میٹر پر افغانستان کا ایک ترقی پذیر اور دلکش گوشہ لشکرگاہ بُست کے نام سے مشہور ہے یہی اس ملک کا وہ علاقہ ہے جہاں پہلے پہل اسلام کی روشنی ساتویں صدی عیسوی میں نمودار ہوئی۔ گیارھویں صدی میں سلطان مسعود غزنوی نے اپنا عالیشان قصر یہیں پر دریائے ہلمند کے کنارے تعمیر کرایا تھا۔ اس نے موسم سرما کے لئے اپنی فوج کا ہیڈ کوارٹر اور ایک فیل خانہ بھی یہاں پر بنوایا تھا، جسے چنگیز خان نے تیرھویں صدی میں تہ و بالا کر دیا۔ اب بھی سلطان مسعود کا یہ عالیشان محل اس کے دربار کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ آج یہ لشکرگاہ بُست آبپاشی کے ایک بڑے جدید ترین پروجیکٹ کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے جو اس صوبہ کا قلب بھی ہے۔ سیّد عثمان خاں نے بتایا کہ پہاڑ پر ایک بلند محراب ہے جہاں زیرِ زمین سات طبقات پر مشتمل ایک تہہ خانہ ہے جو زندان خانہ یا جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے اس کے ۳۲ طبقات تھے۔ مگر صدیاں گزر جانے کے بعد مٹی اور ملبہ سے پُر ہو کر اب صرف سات طبقات باقی رہ گئے ہیں۔

ھرات جنوب مغرب میں افغانستان کا ایک اہم شہر ہے۔ سکندر نے اسپر یورش کے بعد موجودہ ہرات کے پہلو میں ایک شہر ارتکانا (Artakna) کے نام سے بسایا تھا مسلم سلاطین کے دور میں خراسان اس کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ اسے پہلے چنگیز خاں نے تباہ و برباد کیا اور پھر تیمور لنگ نے بھی کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کا تیموری دور ہرات کا سُنہرا دور کہا جاتا ہے جس کی گواہی آج بھی اس کے کھنڈرات، مساجد کے بلند و بالا مینار، دیگر یادگاریں، دستاویزات اور مخطوطات دے رہے ہیں۔ یہ چیزیں اس دور کی یاد دلاتی ہیں جب نقّاشی اور فنِ خطاطی، ادبیات، نفاست و شائستگی معراجِ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ یہاں پر بہت سے مزارات ہیں۔ اس لئے ہرات کو اولیاء عظام کا شہر کہا جاتا ہے۔ جن میں سے خواجہ عبداللہ انصاریؒ، سلطان میر عبدالواحد شہیدؒ، شیخ احمد زندہ فیل احمد جامؒ، خواجہ غلطان ولیؒ، بابا عبداللہ کوہیؒ، امام فخرالدین رازیؒ اور مولانا عبدالرحمٰن جامی جیسی جلیل القدر ہستیاں یہاں پر استراحت فرما ہیں۔ جامع مسجد ہرات اتنی خوبصورت اور دلفریب ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے انسانی ہاتھوں نے نہیں بلکہ فرشتوں نے آراستہ کیا ہے۔ ہرات میں گلاب کثرت سے ہوتے ہیں اور ہر طرف خوبصورت پھول کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہرات کی زمین سے مصوّر، نقّاش، موسیقار اور مشہور ہستیاں جنم لیتی ہیں۔ مشہور مصوّر بہزاد اور ایک شاعر و بزرگ ہستی مولانا جامیؒ یہیں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہرات سے قریب ہی جام ہے جہاں پر ۲۰۰ فٹ بلند منقش و نگار اور قرآنی آیات سے مزیّن ایک مینار ماضی کی عظمت کا اعلان کر رہا ہے۔ ایران کی سرحد کے قریب فرح ایک مقام ہے جہاں مہدی موعود کا مزار ہے۔ مہدویہ طریقت و مسلک سے تعلق رکھنے والے کافی لوگ ہندوستان میں بھی ہیں۔ چشت افغانستان کا وہ مقام ہے جس سے سلسلہ چشتیہ منسوب کیا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی بہت سی بزرگ ہستیاں استراحت فرما ہیں۔

بامیان وادی بُدھ تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اہم تاریخی مقامات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ وادی کابل سے ۸۰ میل کی دوری پر جنوب مغرب میں کوہ بابا اور کوہ ہندوکش کے برف پوش کوہستانی علاقہ کے درمیان ہے۔ واقعی یہاں کا نظارہ قابلِ دید ہے۔ زور و شور سے رواں دواں کوہستانی دریاؤں میں لذیذ قسم کی مچھلیاں "تقا" اور "ٹراوٹ" پائی جاتی ہیں۔ مہاتما بُدھ کے دنیا کے سب سے بڑے دیو قامت مجسمے یہاں پر ایستادہ ہیں۔ یہ مجسمے ۱۷۵ فٹ اور ۱۲۰ فٹ بلند ہیں اور ایک دوسرے سے ۴۰۰ گز کی دوری پر واقع ہیں۔ چٹانوں کی عجیب و غریب قدرتی بناوٹ نے اسے دلکش ترین مقام بنا دیا ہے۔ یہ وادی بُدھ تہذیب کا پہلی صدی سے لیکر چھٹی صدی تک گہوارہ رہی ہے۔ ہزار بُدھ بھکشو ان گپھاؤں کی خانقاہوں میں رہتے تھے او ہزارہا اس مذہب کے پیرو ہر چہار جانب سے کھنچے ان مورتیوں کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ حال ہی میں بھارت سرکار اور حکومت افغانستان میں اِن آثارِ قدیمہ کی حفاظت کے لئے ایک معاہدہ ہوا ہے جس کے مصارف دونوں حکومتیں مشترکہ طور پر برداشت کریں گی۔

وادیٔ بامیان سے ۷۳ کیلومیٹر دور مغرب میں بند پر گہرے نیلے رنگ کے تالاب ہیں جن کا پانی نہایت صاف و شفاف ہے۔ حضرت علیؓ سے منسوب کر کے اِن کا "بندِ امیر" رکھا گیا ہے۔ یہاں پر ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں یہ پانی کہاں گہرائیوں میں غائب ہوتا چلا جاتا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔

افغانستان کا نہایت ہی خوبصورت مشرقی نورستان ہے یہ پہلے کافرستان کے نام سے مشہور تھا کیونکہ یہاں کافر قبائل آباد تھے۔ جو بت پرست تھے مگر اس علاقہ پر امیر عبدالرحمٰن کی فوج کشی کے بعد یہ تمام داخلِ اسلام ہو گئے! اور اس کا نام بدل کر نورستان یعنی land of light رکھ دیا گیا۔ نورستانی اپنی طرزِ رہائش اور وضع قطع کے ساتھ بلندیوں پر بنے ہوئے مخصوص قسم کے چوبی مکانات کی وجہ سے ہر نو وارد کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ نورستان کی سیر کے لئے افغان ٹورسٹ آرگنائزیشن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اِس ملک کے قابلِ رشک مناظر سے لطف اندوز ہو کر دلوں کے تار مسرت سے جھنجھنا اُٹھتے ہیں سینکڑوں اونٹوں سے ترتیب دیئے ہوئے کوچی خانہ بدوش اور ہزارہ قبائل کے قطار اندر قطار گزرتے ہوئے کاروانوں کا منظر اور صدائے جرس کے ساتھ اٹھنے والی رسیلی نغموں کی لے انسان کو طلسماتی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ بلاشبہ یہ کوہستانی خطّۂ ارض قدرت کا ایک ایسا حسین شاہکار ہے جسے دستِ قدرت نے عروسِ نو کی طرح خود سنوارا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اپولو ۱۴

کا مشن کامیاب

محمد سلیمان صابر

اپالو-۱۴ کے خلا باز چاند کی سطح پر اپنے سائنسی آلات اور اس کے چٹانی نمونوں کی بار برداری کے لئے دو پہیوں والی ایک گاڑی اپنے ساتھ لے گئے تھے جس کی مدد سے وہ پچھلے خلا بازوں کی نسبت زیادہ تیزی سے کام کر سکے۔

خلا بازوں نے اس گاڑی کے کئی نام رکھے ہیں۔ وہ اسے رکشا۔ وھیل بیر۔ اور کیڈی کارٹ کہتے ہیں بعض صورتوں میں الیومنیم کی یہ گاڑی ان سب سے مشابہ ہے لیکن پھر بھی ان سے مختلف ہے۔ امریکی خلائی ایجنسی نے اس کا نام "ماڈیولر ایکوپمینٹ ٹرانسپورٹر" (ایم۔ای۔ٹی) رکھا ہے۔

خالی حالت میں زمین پر اسکا وزن ۲۰ پونڈ ہے۔ آلات وغیرہ لاد کر اس کا وزن ۹۰ پونڈ بنتا ہے لیکن چاند کی سطح پر جہاں زمین کے مقابلے میں صرف ۱/۶ کشش ثقل پائی جاتی ہے۔ اس گاڑی کا وزن آلات لادنے کے بعد بھی تقریباً ۱۵ پونڈ رہا اور یہ چاند کے ماحول کے مطابق چاند کے چٹانی نمونوں کے ۶ پونڈ اٹھا سکی۔

اس کا ہینڈل اس ڈھنگ سے بنایا گیا تھا کہ خلا بازوں کے دباؤ بھرے دستانوں والے ہاتھوں سے اسے چلایا جا سکے اسے کھینچنے میں صرف ایک پونڈ کے قریب قوت استعمال ہوئی۔

گاڑی کی ہر ایک جانب پلاسٹک کا ایک ایک تھیلا اور اس کے پیچھے کی طرف دو پلاسٹک کے تھیلے لگے تھے جن میں خلا باز چاند کی سطح پر سے چٹانوں کے ٹکڑوں کو چن چن کر ڈالتے جاتے تھے۔ اس گاڑی کی چھت پر ایک ایسا تھیلا رکھا ہوا تھا جس میں ہر ایک ٹکڑے کو الگ الگ لپیٹنے کے لئے ریپر تھے۔

گاڑی میں متعدد کیمرے رکھنے کے لئے بھی جگہ بنائی گئی تھی۔ کھدائی کی کدال اور بیلچے بھی تھے تاکہ کھدائی سے سطح کی ساخت اور اس کے آپس میں جڑے اور چپکے رہنے کے خواص کا پتہ لگایا جا سکے۔

چاند کی اہمیت اسی وقت سے ہے جب ہمارے آباؤ اجداد نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا۔ ابتدائی عہد کے لوگ چاند کی تبدیلیوں سے وقت کا اندازہ لگاتے تھے۔ اب بھی کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بعض متمدن اقوام نے اس کی پرستش کی ہے۔ لونا اور سیلین رومن اور یونانی نام ہیں جو چاند دیویوں کے لئے عام طور پر مستعمل ہیں۔ شاعروں نے اس کی خوب صورتی کے ترانے گائے ہیں اور اپنے معشوق کو چاند سے تشبیہہ دی ہے۔ آج بھی گلیوں میں بچے گاتے پھرتے ہیں:۔

؎ میرے سامنے والی کھڑکی میں اک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے

خلا کے بارے میں لکھنے والے مصنفین چاند تک بے شمار سفروں کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔

زمانہ قدیم میں لکھنے والے اپنی کہانیوں کے ہیروؤں کے کرداروں کو پرندوں یا ہواؤں کے ذریعے چاند پر پہنچاتے تھے۔

اپالو ۱۲ چاند کی سطح پر اترتے ہوئے

ایک مصنف نے تو اپنے ہیرو کو راکٹوں کے ذریعے اچھالنے کا تخیل پیش کیا تھا۔

پس یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انسان نے خلائی پرواز کے لئے اپنے اولین نشانے کے طور پر چاند کو منتخب کیا۔ زمین سے ڈھائی لاکھ میل دور ہونے کے باوجود خلا میں یہ ہمارا قریب ترین پڑوسی ہے۔

چاند زمین سے کہیں چھوٹا ہے۔ اس کا قطر صرف ۲۱۶۰ میل ہے جبکہ زمین کا قطر ۷۹۹۰ میل ہے۔ اس کی کشش ثقل زمین کی کشش ثقل کے مقابلے میں صرف ۱/۶ ہے اور اس کے اندر کوئی کرہ ہوا نہیں ہے۔ جس سے گزر کر خلا باز پیراشوٹ کی مدد سے نیچے اتر سکے۔

چاند پر درجہ ہائے حرارت میں انتہائی شدت پائی جاتی ہے۔ سورج کی روشنی میں وہاں درجۂ حرارت ۲۲۰ ڈگری فارن ہائٹ سے بھی بڑھ جاتا ہے اور اسی طرح سائے میں وہ صفر سے ۲۴۰ ڈگری نیچے چلا جاتا ہے۔

امریکا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے چاند کو سر کیا اور امریکی خلا بازوں نے اس کی اس سطح کو روند کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ چاند کے سفر کے سلسلے میں امریکا کا پہلا قدم مرکزی پروجیکٹ تھا۔ اس سے ہمیں یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ خلا باز خلا میں کس طرح کام کر سکتا ہے اور وہ اپنے خلائی جہاز پر کس طرح کنٹرول کر سکتا ہے اور کس طرح اسے بہ حفاظت مدار میں واپس لا سکتا ہے

دوسرا قدم جیمنی تھا جو نسبتاً بڑا خلائی جہاز تھا اور جس میں دو خلا باز کئی دن تک مدار میں گھوم سکتے تھے۔ ان خلائی جہازوں کے ذریعے اس بارے میں زیادہ معلومات حاصل کی گئیں کہ خلا میں کس طرح کام کیا جا سکتا ہے اور مدار میں کس طرح دو خلائی جہازوں کو جوڑا جا سکتا ہے۔ دو خلائی جہازوں کا جوڑ ہی حقیقت میں چاند کے مشن کی کامیابی کی کنجی ہے۔ دو خلائی جہازوں کے خلا میں جڑ جانے کے تجربے کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ چاند گاڑی کو چاند پر سے اٹھانے کے بعد کمان گاڑی سے ملایا جا سکتا ہے اور خلا باز پھر سے اپنے خلائی جہاز میں واپس آ سکتے ہیں۔ کمان گاڑی خلائی جہاز کا وہ اصلی خول ہے جس میں خلا باز چاند کے قریب تک اور پھر وہاں سے زمین پر واپس آنے کا سفر کرتے ہیں۔

... کے امریکی منصوبے کا آخری قدم اپالو تھا

یہ منصوبہ خلا بازوں کو ارضی مدار میں بھیجنے سے شروع کیا گیا۔ زمین کے گرد پروازوں سے خلا باز اپنے قمری راکٹوں سے آشنا ہوئے اور بہت سے ان کاموں کا انھیں تجربہ ہوا جو انھیں چاند کے سفر کے دوران انجام دینا پڑے۔

اپولو ۱۰ تک مختلف تجربات ہوتے رہے اور اس کے بعد بالآخر چاند کو سر کرنے کا وقت آ گیا۔ اپولو ۱۱ نے جس کے ذریعے ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو آرم اسٹرانگ چاند کی سطح پر پہونچے خلائی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور خلائی تاریخ کا دوسرا سنہری باب اس وقت لکھا گیا جب ۱۹ نومبر ۱۹۶۹ء کو اپولو ۱۲ کے ذریعے امریکا دوسری بار انسان کو چاند پر اتارنے میں کامیاب ہوا۔ گزشتہ اپریل میں اپولو ۱۳ کا مشن ناکام رہا جب خلا باز چاند پر نہ پہونچ سکے۔ لیکن اس لحاظ سے کامیاب تھا کہ خلائی جہاز کو جبکہ وہ اپنے سفر کا دو تہائی حصہ طے کر چکا تھا زمین پر اتار لیا گیا۔ اور اب اپولو ۱۴ کے ذریعے عظیم کامیابی حاصل کی گئی، جب دو امریکی خلا باز پہلے خلا بازوں کے مقابلے میں زیادہ وقت تک چاند پر رہنے کے بعد واپس آ گئے۔ یہ خلا باز ہیں ۴۷ سالہ نیوی کیپٹن ایلن بی شیپرڈ اور ۴۰ سالہ ایڈگر مچل۔ تیسرے خلا باز ۳۷ سالہ ایئر فورس میجر اسٹوارٹ لئے رہے جو چاند سے کوئی ۷۰ میل (۱۱۲ کلومیٹر) کی بلندی پر چاند کے بیضوی مدار میں اپنی کمان گاڑی (KITTY HAWK) میں گھومتے رہے اور جہاز پر رکھے ہوئے حساس آلوں اور کیمروں کے ذریعے چاند کی تصویر ...

…چاند پر اترنے کے مقامات اور چاند کی سطح
…ں کے متعلق صحیح اور تفصیلی پیمائش کرتے رہے
…لیپ کینیڈی سے ۳۱ فروری کو ۳۰: بجکر ۴۳ منٹ
…لا تھا۔ لیکن گھنے بادلوں کی وجہ سے اس کے
…منٹ کی تاخیر ہوگئی۔ تاہم چاند پر اترنے سے
…پوری کر لی گئی۔

…بازمیں جو سائنسی آلات رکھے گئے تھے ان کے
…وسیع کھوج اور ایسے ارتقائی تجربے کئے گئے جو
…فلکی کرے میں نہ آپ کئے گئے تھے ان خلا بازوں
…نے کے مقام کا نام زمانہ وسطیٰ کے ایک اطالوی
…منشہ کشش کے نام پر "فراموریو" رکھا گیا۔

…لیا جاتا ہے کہ یہ خطہ ایک سائنسی خزانہ ہے اور یہ
…ندرونی گہرائیوں سے نکلے ہوئے چٹانی ٹکڑوں کے
…بارے گہرے طور پر بکھری ہوئی ہے۔ اس خطے
…ا رباز اپنے ساتھ لائے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے
…بھا جائے گا کہ وہ کتنے پرانے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ
…قدیم ہوں جتنا کہ خود یہ نظام شمسی ہے۔

…پرڈ اور مچل بالترتیب پانچویں اور چھٹے خلا باز ہیں
…وم رکھا۔ وہ اپنے ساتھ سامان ڈھونے کی دو
…الی ایک گاڑی میٹ (MET) بھی لے گئے تھے جسے
…ام بھی دیا گیا ہے اس مدد سے وہ چاند پر سائنسی
…بھرے فلیں۔ کھدائی اور چھیدنے کے آلات بہ آسانی
…سے دوسری جگہ لے جا سکے اور اسی کی مدد سے انھوں
…چٹانوں کے جمع کئے ہوئے ٹکڑے چاند گاڑی تک

…پرڈ اور مچل ۵ فروری کو صبح ۴ بج کر ۲۱ منٹ
…بس۔ٹی) پر چاند کی سطح پر اترے اور پھر صبح ۹ بجے
…ی این ٹیرس (ANTARES) سے نکل کر چاند کی سطح
…قیقی کام شروع کر دیا۔ ۴½ گھنٹے تک چہل قدمی
…نے کے بعد وہ چاند گاڑی میں پہونچ گئے اور دوسرے
…روری صبح ۵ بجکر ۱۵ منٹ (ای۔ایس۔ٹی) پر
…اند گاڑی سے باہر آئے اور چاند پر ۴½ گھنٹے تک
…ام میں مصروف رہے۔ بعد ازاں چاند گاڑی میں
…ر چاند کی سطح پر پرواز کرتے ہوئے اپنے ساتھی روسا
…اور زمین کی طرف ان کی واپسی شروع ہوگئی۔

شیپرڈ اور مچل چاند کی سطح پر اترے تو انھوں نے وہاں ایک رنگین ٹیلی ویژن کیمرہ نصب کر دیا تھا جس کی مدد سے امریکا میں ٹیلی ویژن پر انکی کارروائی کو دیکھا جا سکا۔

خلا بازوں کو اس مرتبہ ایسے خطے میں اتارا گیا جو زیادہ چٹانی تھا۔ ۶ فروری (ہفتہ) کو وہ ۴۰۰ فیٹ اونچے ایک مخروطی شکل کے دہانۂ آتش فشاں کی طرف بڑھے لیکن زمینی کنٹرول نے انھیں زیادہ آگے بڑھنے سے روک دیا کیونکہ انکے دل کی حرکت تیز ہو گئی تھی۔ تاہم خلا بازوں نے چاند کے بہت سے ٹکڑے اور پتھر جمع کر کے گاڑی میں رکھ لیے۔

چاند پر خلا بازوں کا کام ۶ فروری بروز ہفتہ کو ختم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنی چاند گاڑی کے ذریعے کمان گاڑی سے آملے۔ چاند گاڑی جب کمان گاڑی سے آکر ملی تو سرنگ کے ذریعے خلا باز اس میں پہونچ گئے اور چاند سے لائے ہوئے ٹکڑے بھی اس میں پہونچا دیئے۔ بعد میں چاند گاڑی کو چھوڑ دیا جو چاند پر گر کر ختم ہو گئی۔

منگل کے دن صبح ۲ بجے (ہندوستانی وقت) خلا باز وسط بحر الکاہل میں اتر گئے اور اس طرح ان کا نو دن کا سفر پورا ہو گیا۔ اس سفر کے نتیجے میں بہت سی نئی معلومات حاصل ہوں گی جن سے آئندہ کے پروگراموں میں بڑی مدد ملے گی۔ سائنسداں اور ماہرین دراصل یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ چاند پر کون کون سی دھاتیں مل سکتی ہیں اور کیا ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔ جہاں تک زندگی کا سوال ہے، یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ وہاں عام حالات میں انسان زندہ رہ سکے۔ انتہائی کم اور انتہائی زیادہ درجۂ حرارت میں جو چاند پر رہتا ہے انسان کا زندہ رہنا ممکن ہی نہیں۔

چاند کے بعد دوسرا مستقل قریب ترین پڑوسی زہرہ ہے، وہ پھر بھی بہت دور ہے۔ جب وہ ہمارے سب سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے تو زمین سے اس کا فاصلہ چاند کے مقابلے میں سو گنا یعنی ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ میل ہوتا ہے۔ بعید ترین سیارہ پلوٹان ہے جو کبھی بھی تین ارب بیس کروڑ میل سے زیادہ قریب نہیں آتا۔ بین السیاریاتی خلائی جہاز جتنی قوتِ رفتار کے ساتھ اس وقت بھیجا جا سکتا ہے اتنی رفتار سے اگر پلوٹان پر آنے جانے کا سفر اختیار کیا جائے تو اس میں تقریباً پوری زندگی ختم ہو جائے گی۔

لوئی شیفرڈ اور لڑکیاں

لوئی مائیکل اور خاندان

جان روزا اور بچے

لیکن ان طویل فاصلوں کے باوجود ایک دن ایسا آئے گا جب انسان نظام شمسی کے پورے علاقے میں سفر کر سکے گا۔ اس صدی کے اختتام سے قبل انسان شاید مریخ کا سفر کر چکا ہوگا اور غیر انسان بردار خلائی جہاز مشتری اور شاید عطارد اور زحل تک پہونچ چکا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کبھی ستاروں تک پہنچ سکے گا۔ جو ستارہ زمین کے سب سے زیادہ نزدیک ہے وہ بلا شبہ ہمارا سورج ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ انسان جو تصور کرتا ہے اسے کر بھی سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے کچھ عرصہ درکار ہوگا۔ اس میں ایک صدی یا اس سے بھی زیادہ عرصہ لگ سکتا ہے۔ لیکن ستارے انتظار کریں گے اور جب انسان اپنی مہم کے لئے تیار ہوگا وہ اپنے گردش کرنے والے سیاروں کے ساتھ وہاں موجود ہوں گے لیکن پھر بھی انسان دیکھے گا کہ یہ ستارے ہی کائنات کا اختتام نہیں ہیں۔ بلکہ ؎

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

واقعات نئی دہلی

اسرائیل میں رہنے والے عربوں کو عرب غدار اور اسرائیلی جاسوس سمجھتے ہ

عرب بچوں کو ۲۵۶ گھنٹے بائیبل کی تعلیم دی جاتی ہے اور صرف ۳۰ گھنٹے قرآن کی تع

اسرائیل

عرب دوسرے درجے کے شہری

اسرائیل کی تیس لاکھ کی آبادی میں عربوں کی تعداد صرف چار لاکھ ہے۔ کہنے کو سرکاری طور پر انہیں مساوی سماجی اور سیاسی حقوق دئے گئے ہیں لیکن عملاً وہ ان حقوق سے محروم ہیں یہودی شہری تک یہ نہیں کہہ سکتے کہ عربوں سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کیا گیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ انہیں بہتر طبی سہولیات حاصل ہیں۔ اور انہیں ہمسایہ عرب ملکوں کے مقابلے میں زیادہ اجرتیں ملتی ہیں لیکن سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے وہ دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ گئے ہیں۔

ایک اسرائیلی عرب نے جو سرکاری ملازم تھا اور جسے شاید اسرائیلی پروپیگنڈے کے لئے ہندوستان بھی بھیجا گیا تھا اپنی حکومت کی تعریف کرنے کے باوجود پرائیویٹ ملاقات میں اقرار کیا کہ اسرائیل میں انکے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ ایک اور اسرائیلی عرب نے کہا "بعض اوقات میں سوچا کرتا ہوں ہم نہ حقیقی عرب ہیں اور نہ حقیقی اسرائیلی کیونکہ عرب ممالک میں ہمیں غدار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسرائیل میں کہا جاتا ہے کہ ہم جاسوس ہیں۔"

تعلیم کے معاملے میں بھی اسرائیل میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہودی ہائی اسکولوں میں تاریخ کی کتابوں میں ۹۴ فیصدی یہودی تاریخ کا ذکر ہے جبکہ عرب اسکولوں میں عرب تاریخ کو صرف ۱۰ فیصدی جگہ دی گئی ہے۔ غیر مذہبی یہودی اسکولوں میں ۶۴۰ نصابی گھنٹے بائبل اور یہودی روایات کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ اسلام کا ان میں تذکرہ نہیں جبکہ عرب اسکولوں میں ۲۵۶ گھنٹے بائبل اور یہودی روایات کی تعلیم کے لئے اور صرف ۳۰ گھنٹے قرآنی تعلیم کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود تعلیمی سرگرمیوں کے جائزے سے

ایک عرب اسرائیلی اسکول

ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیلی اساتذہ عرب نوجوانوں کے قومی احساسات پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہے ہیں۔ اور وہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان ثقافتی فرق کو ختم نہیں کر سکے ہیں۔ خود اسرائیلی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق عرب نوجوانوں میں ۴۲ فیصدی ایسے ہیں جو محسوس کرتے ہیں کہ اسرائیل کو ایک الگ مملکت کی حیثیت سے رہنے کا کوئی حق نہیں ہے جبکہ انکے والدین میں اس خیال کے حامیوں کی تعداد صرف ۳۰ فیصدی ہے۔ اسرائیل عرب بچوں کو مسخ تاریخ پڑھا کر انکے ذہنوں کی صفائی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا اثر الٹا پڑ رہا ہے اور یہودیوں کے تئیں ان کے دلوں میں زیادہ نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ ذہنوں کی صفائی اصل میں مسخ شدہ تاریخ پڑھانے سے نہیں ہوتی بلکہ اکثریت کے عمل سے ہوتی ہے۔ اقلیت سے تعلق رکھنے والے نوجوان خواہ کتنی ہی مسخ شدہ تاریخ پڑھ لیں جب عملی میدان میں وہ محسوس کریں گے کہ وہ امتیازی سلوک کا شکار ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگی اور وہ یہی سوچیں گے کہ اس مملکت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن شاید اسرائیل اس بنیادی بات کو محسوس نہیں کرتا۔

مشرقِ وسطیٰ

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں بھاگتے

متحدہ عرب جمہوریہ نے جنگ بندی میں مزید [illegible] ماہ کی توسیع منظور کر لی ہے۔ اس سے قبل دو ہفتے کے اندر امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس انور سادات کے نام تین مراسلے بھیج چکے تھے جن میں یقین دلایا گیا تھا کہ ڈاکٹر گنار یارنگ کی۔ برابری میں امن کی جو بات چیت ہو رہی ہے اس میں امریکہ بھی مدد دے گا۔ اسی اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل اوتھانٹ نے سلامتی کونسل کو پیش کردہ اپنی رپورٹ میں کہا کہ بات چیت میں "کسی قدر پیش رفت" عمل میں آئی ہے۔ وزیر خارجہ امریکہ کی یقین دہانی اور سکریٹری جنرل اقوام متحدہ کی رپورٹ کے بعد انور سادات ایک ماہ کی توسیع منظور کرنے پر رضامند ہو گئے [illegible] کے ذریعہ کا مظاہرہ [illegible]

[illegible]

کی بات [illegible]

خود اقوام متحدہ کے سکریٹری [illegible] نے اپنی رپورٹ میں بڑی محتاط پر امیدی کا اظہار کیا ہے اس کی وجہ صاف ہے، کہ اسرائیل نے جو سخت رویہ اختیار کر رکھا ہے اس میں وہ تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ۱۹۶۷ء کی چھ دن کی جنگ میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس نے ابھی تک اس کے دماغ کو خراب کیا ہوا ہے۔

انور سادات نے تو یہ پیشکش بھی کی کہ اگر اسرائیل نہر سوئز کے علاقے سے جزوی طور پر بھی اپنی فوجیں ہٹالے تو وہ نہر کو دوبارہ کھول سکتے ہیں۔ لیکن اسرائیل کے پاس

"تارا کیشوری سنہا کی گالیاں" مخالفین کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوئے

دہاں پر ہر آدمی اپنی ذات برادری پر جان دیتا ہے۔ کانگریس نے سب سے زیادہ یعنی ۲۷ امیدوار کھڑے کئے ہیں۔ سنڈی کیٹ جن سنگھ اور سوشلسٹ پارٹی ہر ایک پارٹی اپنے سولہ سولہ امیدوار میدان میں لائی ہے جبکہ کمیونسٹ پارٹی اور پرجا سوشلسٹ پارٹی نے علی الترتیب ۱۱ اور ۱۲ امیدواروں کو ٹکٹ دیے ہیں۔

کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیاں اپنی پوزیشن کو بہتر بنا سکتی ہیں بشرطیکہ باہمی تعاون سے کام کریں اور اسی طرح جن سنگھ کو امید ہے کہ اس کی پوزیشن بھی بہتر ہو جائے گی۔ اگر اس کے دو ممبر بھی کامیاب ہو گئے تو یوں سمجھئے اس کی تعداد سو فیصدی بڑھ جائے گی یعنی اس کے دو ممبر ہو جائیں۔ برخاست شدہ لوک سبھا میں اس کا صرف ایک ہی ممبر تھا۔

پارٹیوں کے متحدہ محاذ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا تھا لیکن اس مرتبہ نہ تو ۱۴ پارٹیوں والا محاذ ہی موجود ہے اور نہ ہی قدیم کانگریس باقی ہے۔ سب کے ٹکڑے ہو گئے۔ کوئی یہاں گرا اور کوئی وہاں گرا۔ ریاست کی پالٹکس کا نقشہ ہی بدل گیا۔ الگ الگ محاذ بن گئے اور الگ الگ گروپ۔ اس گروپ بندی میں ظاہر ہے اس بار بھی کسی ایک یا دوسری پارٹی کے اکثریت

ایرفورس کی گیارہ بٹالین بھی امن و انتظام کے سا کرنے کے لئے موجود رہیں گی۔ ریاست کی ۱۱۰ ہزار پولیس علاوہ ہے۔ اتنی پولیس فورس اور فوج کے باوجود اگر قائم نہ رہ سکا تو یہ نظم و نسق کی بہت بڑی کمزوری ہو جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے، وزیر اعظم مستحکم حکومت کے قیام کی جو اپیل بنگال کے شہر

کیا موجودہ حالات میں بنگال میں انتخابات ممکن ؟

بنگال

تشدد اور قتل و غارتگری کے باوجود اگر بنگال میں لوک سبھا کے ساتھ ساتھ اسمبلی کے وسط مدتی انتخابات عمل میں آتے ہیں تو اس کا اعزاز مسز گاندھی کی جمہوری پالیسی کو ملنا چاہئے بنگال کے حالات ایسے ہیں کہ بہت آسانی سے انتخابات ملتوی کئے جا سکتے تھے لیکن مرکزی حکومت نے ایسا نہیں کیا اور بنگال کو ایک مرتبہ پھر اپنی نئی حکومت چننے کا موقعہ دیا۔

۱۹۶۹ء کے انتخابات میں ووٹروں کو کانگریس یا ۱۴

میں آنے کا امکان نہیں۔ یعنی پھر وہی جوڑ توڑ والی حکومت بنے گی جیسی کہ پہلے بنی تھی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بنگال والوں کی بہت بڑی بدقسمتی ہو گی۔

کانگریس کو امید تھی کہ بنگلا کانگریس کی امداد اور اشتراک سے شاید کچھ ابھار دل ادا کر سکے گی لیکن دونوں جماعتوں میں کوئی مصالحت نہیں ہوئی۔ ممکن ہے سنڈی کیٹ کانگریس اور بنگلا کانگریس کے درمیان کوئی مصالحت ہو جائے۔ آجکل سنڈیکیٹ نے مصالحت کرنے میں ریکارڈ مات کر رکھا ہے۔ کامراج کا کوئی اور ریکارڈ قائم نہ کر سکے تو سمجھوتوں کا ہی سہی۔ بے جان جماعت سمجھوتے نہ کرے گی تو کیا کرے گی۔

لیکن یہ اچھی بات ہے عوام میں تشدد کے واقعات کی مذمت کی جا رہی ہے اور اسی لئے مارکسی کمیونسٹ پارٹی جو تشدد اور اپنی انتہا پسندی کے لئے بدنام ہے، غیر مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ حکومت نے طے کیا ہے کہ وہ الیکشن کے دوران ہر حالت میں امن و انتظام برقرار رکھے گی۔ اس مقصد کے لئے ریاست کے تمام اضلاع اور سب ڈویزن ہیڈ کوارٹرس میں فوجی دستے پہونچ گئے ہیں۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی اس طرح فوج کی تعیناتی کے خلاف ہے لیکن عوام اس سے مطمئن ہیں خاص طور پر اس لئے کہ عام طور پر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ مقامی پولیس میں مارکسی کمیونسٹ ورکر گھس گئے ہیں۔ جب انکی حکومت تھی انھوں نے اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لئے نہ جانے کیا کیا کر ڈالا تھا۔ فوج کے علاوہ بورڈ سیکورٹی فورس کی نواور سنٹرل

تھی اسے انھوں نے توجہ سے سنا ہے، یقین ہے ان مسلم لیگ جس نے اب اپنا نام بدل کر لیگ کر لیا ہے، اس سلسلے میں اہم رول ادا کرے گی علقوں میں طاقت کا توازن اس کے ہاتھ میں بنگال میں مسلم ووٹروں کی تعداد ۷۲ لاکھ ہے۔

میسور

میسور سنڈی کیٹ کانگریس کا گڑھ نجلنگپا جی جو میسور کے سابق وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے تھے کہ میسور میری جیب میں ہے لیکن اب ان کے "جیب" سے نکل رہی ہے۔ وزیر اعظم مسٹر محمد علی اور وزیر قانون مسٹر کے پٹا سوامی نے وزیر اعلیٰ مسٹر ویریندر پاٹل کے پیچھے تھے کہ اب سنڈی کیٹ کانگریس سے بڑے عہدہ داروں کی علیحدگی سے ان پر بجلی ہو گئی۔ اور ان کی رفتار و گفتار میں وہ آ رہی جو کسی وقت پائی جاتی تھی۔

اور جب سے یہ مطالبہ شروع ہوا اعتماد کا ووٹ حاصل کریں پاٹل جی کی راتوں ہو گئی ہے۔ وہ اپنی وزارت کو بچانے کے پیر مار رہے ہیں۔ سرکاری ملازمین اور

ایچ کری ——— مقابلہ سخت ہے

دانشور نئی دہلی

الیکشن کا بخار ـــ جیوتشیوں کا دھندا زوروں پر

[illegible] میں کسی کو توم کا علم ستارہا ہے کوئی حکمراں کانگریس کو [illegible] دینا چاہتا ہے اور کوئی شخص اس لئے انتخاب لڑ رہا ہے [illegible] کی پوزیشن اونچی ہو جائے گی اور وہ اپنے نام کے آگے [illegible] ڈیٹ کے الفاظ لکھ سکے گا۔

[illegible] شخص کے اپنے اپنے اغراض ہیں جن کی بنیاد پر وہ [illegible] سابق حکمرانوں کے اغراض تو [illegible] ہیں۔ متعدد ممتاز سابق حکمراں یا تو آزاد [illegible] اور سوتنتر یا جن سنگھ جیسی جماعتوں کے ٹکٹوں پر [illegible] ہیں جو سرمایہ داروں کے مفاد کی نگراں ہیں۔ یہ سابق حکمراں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر بلا تخصیص مذہب و ملت ایک [illegible] پر جمع ہو گئے ہیں، خود اپنے امیدواروں کی مدد کر رہے [illegible] ان جماعتوں کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں جو ان کے [illegible] کی حمایت کر رہے ہیں۔

مثال کے طور پر بیگم ساجدہ سلطان سابق حکمراں بھوپال جن سنگھ کے امیدوار مسٹر بھالو پرکاش سنگھ سابق حکمراں نرسنگھ گڑھ کی الیکشن مہم میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے جب کہ ان کے صاحبزادے نواب پٹوڈی گوڑ گاؤں میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہے ہیں۔

غرض جس شخص کو جس جگہ اپنا مفاد محفوظ نظر آیا ہے اس نے وہیں اپنا تعلق پیدا کر لیا۔ ان سیاسی جماعتوں تک نے جنکی بنیادی پالیسیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں محض اس لئے گٹھ جوڑ کر لیا ہے کہ کسی طرح حکمراں کانگریس کو اقتدار سے محروم کر سکیں۔ زیادہ تر یہ گٹھ جوڑ ان جماعتوں کے مابین ہوئے ہیں جو حکمراں کانگریس کی سوشلسٹ پالیسیوں سے خائف ہیں جن کو وہ برسر اقتدار آنے کے بعد بروئے کار لانا چاہتی ہے۔ لیکن عام طور پر یقین کیا جا رہا ہے کہ گٹھ جوڑ کامیاب نہیں ہوں گے۔ یوپی، بہار، ہریانہ اور راجستھان وغیرہ سے آنے والی اطلاعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ حقیقتاً اندرا سرکار کے حق میں ایسی فضا بن گئی ہے کہ دوسری جماعتوں کے کارکنوں کو اکثر مقامات پر جلسے منعقد کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ہر جگہ اندرا آئی ہے نئی روشنی لائی ہے کے نعرے سننے میں آتے ہیں [illegible] سے ہر جگہ فضا گونجتی رہتی ہے۔

جوتشیوں کا دھندا آج کل بہت چل رہا ہے، اور خاص طور پر جو الیکشن کی پیشین گوئیاں کرنے کے رسیا ہیں، بے فکری کے ساتھ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ اندرا سرکار کے امیدواروں کے مقابلے میں تمام مخالف پارٹیوں کے امیدوار خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔

بچوں کی بزرگوں سے شکایت

حال ہی میں نیو جرسی میں تعلیم پانے والے دس سالہ بچوں سے محکمۂ تعلیم نے دریافت کیا کہ اپنے بزرگوں سے انہیں جو شکایات ہیں ان کی تفصیل پیش کریں۔ پھر کیا تھا ہر بچہ دس دس، بارہ بارہ صفحات پر اپنی شکایات لکھ کر لایا۔ تمام شکایات کا بغور معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمام بچوں کو اپنے والدین سے کم و بیش ایک درجن مندرجہ ذیل شکایات ہیں۔

۱: بزرگ ہمیشہ درس دیتے ہیں کہ وعدہ خلافی نہ کی جائے، جبکہ وہ خود اپنے کئے ہوئے سو فیصدی وعدوں کو جان بوجھ کر فراموش کر جاتے ہیں، اور جب انکو یاد دلایا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ انھوں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا۔

۲: بزرگ ان باتوں کو خود نہیں کرتے جن کے لئے وہ ہمیں حکم دیتے ہیں [illegible] ہمیشہ سچ بولو" [illegible]

۳: والدین بچوں کو [illegible] پہنانا چاہتے ہیں۔ بچوں کے لباس کے بارے میں ہمیشہ اپنی رائے کو مقدم رکھتے ہیں جبکہ خود اپنے لباس کے بارے میں کبھی بچوں سے رائے نہیں لیتے۔ چاہے وہ اس لباس میں کتنے ہی ہیبت ناک لگ رہے ہوں۔

۴: یہ لوگ کبھی ہماری بات اطمینان اور سکون سے نہیں سنتے بلکہ پوری بات ختم ہونے سے پہلے ہی مشورے دینے لگتے ہیں۔

۵: ہم لوگوں کی غلطیوں پر سزا دینا انھوں نے اپنا فرض بنا لیا ہے، جبکہ خود اپنی غلطیوں پر وہ کبھی بھی ندامت محسوس نہیں کرتے۔

۶: بچوں کے معاملات میں ہمیشہ دخل اندازی کرتے رہتے ہیں لیکن اگر کوئی بچہ انہیں صحیح مشورہ بھی دے تو اس کی گوشمالی کر دیتے ہیں۔

۷: بچوں کی پسند کو وہ کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے! ور ان کے ہر فعل و عمل کو نادانی پر محمول کرتے ہیں۔

۸: ہمیں اُن باتوں سے منع کرتے ہیں جو بقول خود وہ اپنے بچپن میں کرتے رہے تھے۔

۹: کبھی معمولی بات پر سخت سزا دیتے اور کبھی یہ بھاری غلطی کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

۱۰: ہم سے کہتے ہیں کہ سورج ڈوبنے کے بعد گھر سے مت نکلو اور خود شام ہوتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔

۱۱: ہمیشہ پیسے کی اہمیت جتاتے رہتے ہیں۔ اور خود پیسے کو ہاتھ کا میل کہتے ہیں

۱۲: والدین کہتے ہیں کہ کسی کی برائی کرنا اچھی بات نہیں جبکہ ان کا زیادہ وقت دوسروں کی برائی میں

...میں فاشزم پھر جنم لے رہا ہے ۔ فاشسٹ مسولینی کے چیلے ایک بار پھر سر اٹھا رہے ہیں ۔ ان فاشسٹ نوجوانوں نے پچھلے دنوں اٹلی کے کئی شہروں میں فساد برپا کر دیئے ۔ کئی جگہ کمیونسٹوں اور فاشسٹوں کے درمیان باقاعدہ جنگ ہوئی ۔

ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے
بمبئی کے سانتا کروز ہوائی
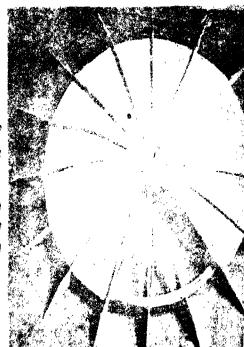
سستی کاروں کے ماڈل ۔
بہت سے ملکوں نے پیش کش کی ہے کہ وہ ہندوستان کے لئے سستی کار بنانے کو تیار ہیں ۔
(۱) رینالٹ 8R ۔ فرانس
(۲) فیٹ ۱۲۷ اٹلی
(۳) دائسن ۱۲۰۰ جاپان
(۴) فورڈ ایسکورٹ امریکہ
(۵) واکس ویگن ۔ جرمنی

تال کٹورا باغ میں
...سے بڑا ڈھکا ہوا
...م بن رہا ہے ۔
...ہم ایک

مرنے سے پہلے مسکراہٹ — پچھلے سال ہالی وڈ میں مشہور فلم ایکٹریس شیرن ؟
حاملہ تھی اور دوسرے سات لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ قتل کے الزام میں کافی طویل ،
بعد دو لڑکیوں ربن وِنکل اور سوزن اٹکنز (مسکراتے ہوئے) کو سزائے موت اور تیسری لڑ
کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ تینوں فیصلہ سننے کے بعد عدالت سے نکلتے ہوئے۔

کا دورہ شروع کر دیا ہے۔ ویسٹ انڈیز کے لئے روانہ ہونے سے قبل
ستانی ٹیم کے کپتان، جیت واڈیکر اپنے گھر والوں کے ساتھ

پچھلے دنوں امریکی ادیب ایڈگر سنو چین گئے تو انہوں نے ماؤزے تنگ
اور ان کے دستِ راست لن پیاؤ سے ملاقات کی۔ ماؤ کے دائیں طرف
لن پیاؤ اور بائیں طرف سنو کھڑے ہیں

ن ڈیزائنر نے
ایک نئی قسم
ہے جس کا نام
(HOT) یعنی
سردی کے
لگوں کیا ہے
کہ اس گرم

امریکہ ویت نام اور کمبوڈیا میں مار کھانے کے بعد لاؤس میں مداخلت
کرنے کی غلطی کر بیٹھا ہے۔ لگتا ہے امریکی سامراجیت کی موت انڈوچائنا کے

لڑکیوں کا محبوب اداکار

راجیش کھنہ

(فلمی مبصر کے قلم سے)

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکالی دیکھ لی!

راجیش کھنہ آج کل مقبول ترین ستاروں میں شمار ہونے لگا ہے۔ دو تین سال پہلے ہی کی بات تو ہے کہ جہاں کہیں دیو آنند کی پکچر ریلیز ہوئی۔ جوان لڑکیوں اور عمر رسیدہ عورتوں کے غول کے غول سنیما ہال پر ٹوٹ پڑے۔ جس لڑکی کے منہ سے سنئے، دیو آنند کی تعریف۔ کہا جاتا تھا کہ دیو آنند لڑکیوں کا محبوب ستارہ ہے۔ لڑکیاں ہی اس کی زیادہ پکچر دیکھتی ہیں۔

لیکن صاحب جب سے راجیش کھنہ نے فلمی میدان سنبھالا ہے، جوان لڑکیوں کو تو آپ ایک طرف چھوڑیے، بوڑھی عورتیں بھی دل و جان سے راجیش پر فدا ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے کہ ایک محترمہ جن کی عمر تقریباً ۵۵ سال تو ضرور ہی ہوگی راجیش کھنہ کی ہر ہر ادا پر دل و جان نثار کئے دے رہی تھیں۔ ان کے خیال میں جب راجیش آنکھیں نیچی کر کے اوپر اٹھاتا ہے تو پورے پیسے وصول ہو جاتے ہیں۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ پونا کے فلم اسکول میں پڑھائی بالکل بند رہی۔ لڑکیوں کا عجیب حال تھا کوئی کسی درخت کا سہارا لئے اداس کھڑی ہے تو کوئی ڈیسک پر سر رکھے سسک رہی ہے، کوئی گھٹنوں میں سر دیے

بلک رہی ہے۔

وجہ یہ تھی کہ کہیں سے انھوں نے سن لیا تھا کہ راجیش کی کار پونا سے بمبئی آتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی ہے ہائے! نہ جانے ان کے محبوب راجیش کا کیا ہوا؟ —
سونے پر سہاگا یہ کہ استاد اور پرنسپل بجائے ان پر ناراض ہونے کے انھیں طرح طرح سے تسلیاں دے رہے تھے۔ اس لئے کہ راجیش ان کا بھی تو محبوب تھا۔!

کسی بھی فلمی ہیرو کے لئے اتنی عزت اور دلوں میں اتنی جگہ سہگل کے بعد سننے میں نہیں آئی۔

راجیش اس وقت کا سب سے ہر دلعزیز ہیرو بنا ہوا ہے۔ سہارنپور کے ایک وکیل صاحب جو فلموں کے بہت زیادہ مخالف ہیں، انھوں نے اپنی لڑکیوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ راجیش کی ہر فلم دیکھ سکتی ہیں۔

بمبئی کے سنڈے ریویو میں کئی لڑکیاں راجیش کا فوٹو اپنی ڈائری میں رکھتی ہیں اور فرصت کے لمحے میں انکی ڈائری کھل جاتی ہے۔

راجیش کھنہ کے والد کے انتقال پر ایک صاحب نے اپنی بیوی کو آگرہ دی کہ ان کے سسر کا انتقال ہو گیا ہے۔ لڑکی اداس بھی ہوئی اور شرم سے پانی پانی بھی—

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شوہر بھی اپنی بیویوں کو چڑاتے ہیں۔ بہت سے نوجوان اور بچے راجیش کھنہ اسٹائل کرتے ہیں کہ ایسے فخریہ انداز میں چلتے ہیں گویا وہ بھی راجیش بن گئے۔

ان تمام باتوں سے بڑھ کر جو بات ہے وہ شاید آپ کو سنے میں اچھی نہ لگے اور شاید آپ اس پر یقین بھی نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سی آزاد خیال لڑکیوں نے راجیش کا نام اپنی کلائی پر، کاندھے پر اور سینے تک پر کھدوالیا ہے جب ان لڑکیوں سے کہا گیا کہ کل جب تمھاری شادی ہوگی تو یہ نام دیکھ کر تمھارا شوہر ناراض نہیں ہوگا؟ تو جواب میں انھوں نے کہا—

"ایسے چھوٹے دل والے آدمی سے شادی ہی کون کریگا"

کچھ لڑکیوں کے یہاں نما لاکٹ میں راجیش کی تصویر لٹکی ہوتی ہے۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔"

"کیا آپ نے کبھی پہلے بھی کسی ہیرو کی اتنی چاہت سنی تھی۔!"

جب راجیش کھنہ سے دریافت کیا گیا کہ "کیوں راجیش تمہیں معلوم ہے یہ سب کچھ؟" تو راجیش نے کہا۔
"سب کچھ تو نہیں لیکن پھر بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔"

راجیش سے پوچھا گیا۔
"یہ سب سن کر آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے۔" راجیش اپنی عادت کے مطابق سر جھکا کر مسکراتا ہے اور آہستہ سے کہتا ہے۔
"اچھا!"
"اچھا تو ہے مگر کیسا اچھا؟ میرا مطلب ہے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ لوگوں کے دلوں پر اسطرح راج کریں گے!"
راجیش کا جواب تھا—
"ایسا بھی کوئی جان پایا ہے؟"
"اچھا آپ نے اپنی کامیابی کی امید تو ضرور کی ہوگی! کیا آپ کو امید تھی کہ آپ اتنے کامیاب ہوں گے" راجیش نے بتایا کہ—
"ایسا بھی نہیں تھا۔ ہاں کچھ کرنے کی خواہش ضرور تھی لیکن اسکے ساتھ خوف بھی تھا کہ کہیں لوگوں کو پسند نہ آیا تو—؟"
"اچھا اگر ان دیوانی لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی سامنے آ کر I love you کہہ دے تو کیا کروگے؟"
"لڑکیوں سے تو میں بہت گھبراتا ہوں۔"
"اگر کوئی لڑکی آکر آپ سے کہے کہ آپ کا فوٹو میرے لاکٹ میں ہے یا میرے بازو پر آپ کا نام کھدا ہے تو آپ کیا کریں گے؟"
"بھولی گنگا دیوی جی آپ کی ذرہ نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ میں تو ایک معمولی سا انسان ہوں۔ پھر بھی جو کچھ ملا ہے اس پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر گزار ہوں۔ مجھے جو کچھ فلمی دنیا میں آکر ملا اسے محفوظ رکھنے کے لئے جی توڑ کوشش کروں گا۔"

راجیش کو شہرت فلم ارادھنا کے بعد سے ملی۔ اسکے بعد اس نے آنند اور سفر جیسی سنجیدہ آرٹسٹک فلموں میں عمدہ اداکاری کرکے اپنی دھاک بٹھا دی۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ راجیش کی شہرت اور مقبولیت میں اس کی اداکارانہ صلاحیتوں سے زیادہ اس کی خوب صورت پرسنالٹی کا ہاتھ ہے۔

بہت سے نوجوانوں کا خیال ہے کہ راجیش دیوانند کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں تک غیر سنجیدہ اور کھلنڈرے نوجوان Play Boy ٹائپ اداکاری کا تعلق ہے، ہم راجیش کا موازنہ دیو آنند سے کر سکتے ہیں۔ لیکن سنجیدہ اور جذباتی اداکاری میں راجیش دلیپ کمار سے کہیں آگے ہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ جذبات دلیپ کمار نے بھی راجیش کی اداکاری کو سراہا ہے۔

راجیش اگر اپنی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا صحیح اور مناسب استعمال کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا فن روپے اور دولت کے دھارے میں بہہ جائے۔

بہرحال یہ ایک خوش آئند علامت ہے کہ نو والی اداکاروں میں جیتندر اور اس قسم کے دوسرے اداکاروں کی جگہ راجیش کھنہ، سنجیو کمار اور لچھ ساہنی جیسے اداکاروں نے لی ہے۔

یہ تینوں ڈرامائی اداکاری کی بجائے قدرتی اداکاری کرتے ہیں۔ ان تینوں کی مقبولیت اس بات کی نشانی ہے کہ اب عوام فن اور تھیٹر میں تمیز کرنے لگے ہیں۔ اگر سفر، خاموشی اور بھون شوم جیسی فلموں کا سلسلہ جاری رہا تو جلد ہی ہندی فلمیں بھی بنگالی فلموں کی طرح بین الاقوامی فلموں میں اپنے لئے ایک اہم جگہ بنالیں گی۔

آنیوالی فلم

کٹی پتنگ

"کٹی پتنگ" کی کہانی کچھ اسطرح ہے۔ ہیروئن کی شادی ہو رہی تھی کہ وہ اپنے گھر سے بھاگ کر اپنے محبوب کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ محبوب دھوکے باز نکلتا ہے جب ہیروئن گھر واپس آتی ہے تو بارات واپس جا چکی ہوتی ہے۔ اسکا بدنصیب ماموں صدمے کی وجہ سے ملک عدم پہنچ چکا ہوتا ہے۔ عموماً ہندی فلموں کی ہیروئن جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے تو ہدایت کار پہلے ہی سے ہر ندی کنارے کوئی دھوبی یا کوئی دوسرا آدمی متعین کر دیتا ہے تاکہ جب ہیروئن پریشانیوں سے گھبرا کر خودکشی کرنے لگے اسے فوراً بچا لیا جائے اور فلم آگے چل سکے۔ گلشن نندہ —

واقعات نئی دہلی

(ایک شامی کہانی) ترجمہ: سید آل رسول

معمولی سی اس عمارت کے ایک کمرے میں وہ آدمی رہتا تھا تنہا۔۔ بالکل تنہا۔ کسی سے بھی اس کا میل جول نہیں تھا۔ نہ وہ کہیں جاتا اور نہ اس کے پاس کوئی آتا۔

چند سال پہلے کی بات ہے اس کی ٹانگوں میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ شروع میں یہ تکلیف اگرچہ معمولی تھی، لیکن انجام کار اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا اور وہ چلنے پھرنے کی طاقت سے محروم ہو گیا۔ اب وہ ایک جامد چٹان کی طرح تھا۔ اس کے لئے زندگی میں کوئی لطف اور کشش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

شروع شروع میں جب مرض معمولی تھا تو وہ لاٹھی کے سہارے گھوم پھر سکتا تھا لیکن جب تکلیف نے شدت اختیار کی تو وہ لاٹھی کی بجائے بیساکھیوں کے سہارے چلنے لگا اور جب اس کی بھی سکت نہ رہی تو اس نے بیساکھیاں ایک طرف پھینک دیں اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ جب حرکت کرنے کی حاجت محسوس ہوتی تو زمین پر گھسٹ گھسٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا تھا۔

وہ پورا دن گوشۂ تنہائی میں گزار دیتا۔ اپنے گرد و پیش کی زندگی کے شور و شغب کو کان لگا کر سنتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے کہیں دور، بہت دور کی دنیا سے آنے والی آواز پر کان لگائے بیٹھا ہے۔ وہاں آوازوں کو سنتا اور سنتے سنتے اس کی کشادہ پیشانی پر غصے کی شکنیں نمایاں ہو جاتیں جن میں مایوسی اور ناامیدی کے ساتھ ساتھ بدگمانی کا رنگ بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اسے ان لوگوں پر رشک آتا تھا جو چلنے کی طاقت رکھتے تھے اور زندگی کی رنگینیوں، رونق اور چہل پہل سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ ان کا یہ رشک آہستہ آہستہ حسد میں تبدیل ہوتے جا رہا تھا ۔۔۔

لگا تھا۔

کوئی بھی اس کے پاس نہ پھٹکتا تھا اس لئے کہ وہ ایک ایسے بچھو کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو اپنے سوراخ میں رینگتا رہتا ہے۔ دم کو اکڑائے گھومتا رہتا ہے اور جب زہر پھرا ڈنک پیٹھ سے ٹکرا جاتا ہے تو اس کے غیظ و غضب اور جوش انتقام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس آدمی نے تھوڑی بہت پونجی جمع کر رکھی تھی جس میں سے وہ روکھی سوکھی روٹی کھا کر وقت گزار رہا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بھی ختم ہوتی جا رہی تھی ۔۔۔ وہ اکثر سوچتا کہ اگر یہ پونجی ختم ہو گئی تو پھر کیا ہو گا ۔۔۔؟

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے گا اور دروازہ بند کر کے ایک خوددارانہ اور باعزت موت کا انتظار کرے گا۔ وہ اسی نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا کہ اسے باہر سے موسیقی کی دھنیں سنائی دیں جن کے ساتھ ساتھ گیتوں اور نعروں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے یہ آوازیں کافی بلند تھیں۔ اسے "شباب" اور "یوم شباب" کے الفاظ واضح طور پر سنائی دے رہے تھے۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی غیر مرئی قوت اسے کمرے سے باہر نکلنے پر ابھار رہی ہے۔ وہ رینگتا ہوا باہر چھجے پر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ نیچے بازار میں نوجوانوں کا ایک زبردست جلوس چلا آ رہا ہے۔ ہشاش بشاش نوجوان بڑے ہی جوش و خروش سے رجز یہ نغمے اور شعر پڑھتے ہوئے آ رہے ہیں۔ ہاتھوں میں صندوقچیاں اٹھا رکھی ہیں اور آسودہ حال لوگوں سے چندہ جمع کرتے ہوئے بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

"یہ یوم شباب ہے"

"جوش۔۔۔ آپ نوجوانوں کی خاطر دیں کیونکہ وہ نوجوان اور ملک کی بہبود کے لئے ہو گا۔ وہ نوجوانوں کی بہبود کے لئے ہے اس سے نوجوانوں کی حالت بہتر بنائی جائے گی۔ آج کے نوجوان کل کے ذمہ دار شہری ہوں گے۔ انہی کے زور بازو پر قوم و ملک کی عظمت و شوکت کا دار و مدار ہے"

اور اس آدمی نے ہجوم پر پھر ایک نظر ڈالی بڑبڑانے لگا۔

"نوجوان ۔۔۔ ہنہ ۔۔۔ نوجوان۔ بھلا مجھے ان سے کیا تعلق۔ بلکہ تمام انسانوں سے کیا واسطہ ہے۔ سب سے تنہا ہوں۔ مجھے ان سے کیا ملا ہے۔ انکار، نفرت، حقارت ۔۔۔ اس کے سوا اور کیا؟ اب تو مجھے انہیں بھی کچھ ملے گا"

وہ دوبارہ اپنے گوشۂ تنہائی کی طرف پلٹنا چاہتا تھا ۔۔۔ مگر ۔۔۔

مگر سورج کی روشنی میں کئی حسین رنگ نمایاں اور بھیگے بھیگے باد نسیم کے جھونکے فضا میں خوشبوئیں بکھیر رہے تھے۔ اسے یہ دلکش اور پرکیف منظر بہت اچھا لگا اور وہ کچھ دیر کے لئے رک گیا پھر غیر ارادی طور پر دیوار کی طرف رینگنے لگا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گیا۔

نوجوانوں کے گیت فضا میں برابر گونج رہے تھے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رگ رگ میں ایک انجانی لہر دوڑ رہی ہے اور ساتھ وہ اپنے ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ اسے اپنا گزرا ہوا شباب یاد آ گیا۔ شاداب بارونق اور نورانی چہرہ، مضبوط اور طاقتور جسم، توانائی اور جوش سے بھرپور اور سب سے بڑھ کر جوش جوانی سے چھلکتی ہوئی زندہ دلی۔ اسے یاد آنے لگا کہ عہد شباب میں اپنے گرد و پیش کی رونق اور زندگی کی چہل پہل اسے کس قدر بھلی معلوم ہوتی تھی اور اس سے کس درجے محظوظ ہوا کرتا تھا۔

موسیقی اور گیتوں کی آوازیں رک گئی تھیں اور اب فضا خاموش تھی۔ مگر وہ مسلسل دور افق کو دیکھے جا رہا تھا جیسے بیتے ہوئے دنوں کی تلاش کر رہا ہو۔

اچانک آسمان پر ایک سفید بادل نمودار ہوا جو فضا میں یوں تیر رہا تھا جیسے کوئی حسینہ موجوں سے کھیلتی ہوئی گزر رہی ہو۔

آدمی بادل کو دیکھتے ہی چونک پڑا اور وہ اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ کیا واقعی یہ بادل ہے ۔۔۔؟ مگر بادل

ہے اور دل کش انداز میں نہیں اڑا کرتے۔ آدمی وہ غور سے اسے دیکھنے لگا اور جلد ہی اسے معلوم ہو گیا ل نہیں بلکہ سفید کبوتروں کا ایک غول ہے جو کبھی تا ہے کبھی نیچے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں۔ اس غول ان سے فضا میں ایک عجیب و غریب حسن پیدا ہو گیا تھا

وہ بڑے اشتیاق سے کبوتروں کے اس غول کی یال دیکھتا رہا۔ کبوتر مسلسل اڑ رہے تھے اور وہ سا دیکھے جا رہا تھا۔ اسے وہ دائرے بے حد دل کش ہے تھے جو کبوتر فضا میں اڑتے ہوئے بنا رہے تھے اڑتے وہ کبھی یوں اکٹھا ہو جاتے کہ ایک ہی کبوتر کی معلوم ہونے لگتی۔ وہ اس منظر میں بالکل کھو گیا۔

کبوتر یونہی اڑتے رہے اور فضا میں دائرے تے رہے۔ جب وہ ایک چکر پورا کر لیتے تو فوراً ہی دوسرا شروع کر دیتے۔ وہ سوچنے لگا۔

یہ بار بار چکر کیوں کاٹ رہے ہیں۔ کیا انھیں کوئی ں ادا کرنا ہے۔

پھر خود ہی جواب دینے لگا۔ "ہاں اس وسیع نات کی ہر شے اپنا چکر مکمل کرنے پر مجبور ہے۔ ہر فرد اپنا کردار ادا کرنا ہی ہے۔"

پھر اسے نوجوانوں کے اس جلوس کا خیال آیا۔ کیا یہ وں بھی مختلف افراد کا ایک مجموعہ نہیں ہے؟ تمام افراد ہی مقصد کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ کیا انسانی کبوتروں یہ بھی ایک غول نہیں جو زندگی کے میدان میں اپنا چکر کاٹ رہا ہے۔" آدمی نے سر جھکا لیا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

"اور میں۔ میرا غول کہاں ہے ...؟ اور اس غول ں میرا کیا مقام ہے؟"

اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور اسے تنہائی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ کسی گہرے احساس کی شدت سے س کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ کسی نامعلوم شے کی رغبت اور رزو کا احساس تھا۔ کسی ایسی شے کی رغبت کا جو بہت ی مشکل الحصول دکھائی دیتی ہو۔

کبوتروں کا غول افق کی پہنائیوں میں اڑے رہا تھا۔

تکئے کے سہارے لیٹ کر اس دلچسپ منظر کو بڑے شوق و تجسس کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک ننھا سا کبوتر غول سے بچھڑ گیا ہو پھر وہ پھڑپھڑاتا ہوا زمین پر آ گرتا ہے۔

یہ ننھا سا کبوتر اس کے بالکل پاس ہی گرا تھا۔ وہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ تڑپ تڑپ کر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زمین سے بدقت تھوڑا اٹھتا پھر نیچے آ گرتا۔ بہت جلد وہ نڈھال ہو گیا اور زمین پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔

آدمی تیزی سے رینگتا ہوا اس کے پاس گیا۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اس نے محسوس کیا کہ کبوتر زندہ ہے۔ پرندے کے دل کی دھڑکنوں کی تیز لہریں اٹھ اٹھ کر آدمی کے ہاتھ کو گرما رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ بے چارہ اڑان کی کثرت سے تھک کر چور ہو گیا ہے ـــــ وقتی بے ہوشی ہے ـــــ ٹھیک ہو جائے گا۔"

بڑی تیزی سے اس نے کبوتر کو سائے میں ڈال دیا پھر وہ رینگتا ہوا کچھ دیر کے لئے اندر گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی کا برتن اور روٹی کے ٹکڑے تھے۔ وہ پرندے پر جھکا۔ اسے کھلانے پلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی یہ کوشش کارگر ہوئی۔ پرندہ سنبھل گیا تھا اور اب وہ برتن سے خود ہی پانی پی رہا تھا۔ اور روٹی کے ٹکڑے کھا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کبوتر پنجوں کے بل کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا وہ اب کچھ اچھل بھی سکتا تھا ایکدم دوبارہ پھر برتن کی طرف گیا۔ کچھ اور کھایا اور پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر یہی ہوتا رہا۔ آدمی ننھے کبوتر کو برابر دیکھے جا رہا تھا۔ چند لمحے کے بعد اسے اپنے پاس سے ہوا کے تیز جھونکے کی مانند کوئی چیز گزرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے بالکل قریب ہی ـــ یہ کبوتروں کا غول تھا۔

ننھے کبوتر میں ایک نئی امنگ پیدا ہو گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اچھلنے اور پھڑپھڑانے لگا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ جیسے اپنے غول کو رکنے کے لئے کہہ رہا ہو تاکہ وہ بھی اس سے پھر جا ملے۔ کچھ دیر پیچھے پر سکون رہا۔ کبوتر سنبھلنے کی برابر کوشش کر رہا تھا اور آدمی اسے بڑے اشتیاق اور تجسس سے دیکھ رہا تھا۔

کبوتروں کا غول جوں ہی دوبارہ مکان کے پاس سے گزرا تو کبوتر نے جان توڑ کر ایک سپاٹا بھرا اور پھر سے اڑ کر اس میں شامل ہو گیا اور کچھ ہی لمحے بعد وہ ان میں پہلے ہی کی طرح سے گھل مل چکا تھا۔

آدمی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پہلوؤں میں رشک کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ ایسا رشک جو اس نے کبھی پہلے محسوس نہیں کیا تھا۔ خوشی میں ڈوبا ہوا رشک۔ اس نے قریب المرگ ننھے سے کبوتر کی جان بچائی تھی اور اسے اپنے ساتھیوں میں جا ملنے میں مدد دی تھی۔

اچانک موسیقی اور گیتوں کی آوازیں پھر سنائی دیں فضا شگاف نعروں سے فلک گونج رہا تھا۔ نوجوانوں کا عظیم الشان گروہ پھر "یوم شباب" کے نعرے لگا رہا تھا۔ آدمی نوجوانوں کی ٹولی کو دیکھنے لگا اور بڑے غور سے موسیقی اور گیت اور نعرے سننے لگا۔

"یہ یوم شباب ہے۔ جو پیسہ آپ نوجوانوں کی خاطر دیں گے وہ نوجوانوں کی بہبود پر خرچ ہو گا۔ وہ نوجوانوں کے فائدے کے لئے ہو گا ـــ نوجوانوں کے زور بازو پر قوم و ملک کی عظمت و شوکت کا دارومدار ہے ـــ"

اس نے اپنے اندر ایک زبردست ارتعاش محسوس کیا ایسا ارتعاش جس سے وہ متزلزل ہو گیا۔ ایک نیا احساس اس کی رگ رگ میں رواں دواں تھا۔ مسرت و شادمانی اور جوش و زندہ دلی کا ایک عظیم سیلاب۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے نوجوانوں کے جلوس کو دیکھ کر اس کا عہد شباب لوٹ آیا ہے۔ کیا وہ بھی باقی انسانوں کی طرح ایک انسان نہیں؟ اسے زندگی سے لطف اندوز ہونے کا حق نہیں؟ کیا اُسے اپنا فرض ادا نہیں کرنا ہے؟

اسی لمحے اس کی نظریں بیساکھیوں کی طرف اٹھ گئیں جو زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں مکڑی نے جالے تان دیئے تھے۔ وہ رینگتا ہوا بیساکھیوں کی طرف بڑھا۔ بڑی دقت کے بعد وہ ان کے سہارے کھڑا ہو سکا اور انھیں اپنی بغلوں میں دبا کر وہ یوں چلنے لگا جیسے ایک ننھا سا بچہ چلنے کی پہلی کوشش کرتا ہے۔

وہ چلنے لگا ـــ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا ـــ وہ دروازے تک پہنچ گیا۔ اور جیسے ہی وہ دروازے تک پہنچا نوجوانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا جلوس اس کے دروازے پر آ گیا۔ بڑی سرعت کے ساتھ وہ اس جلوس میں شامل

گھر بیٹھے تمام چیزوں کی خرید و فروخت کر لیا کریں گے

صدی میں دنیا کا کیا نقشہ ہوگا ؟ ہماری تہذیب و معاشرے پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔
ھرت میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی ؟ مستقبل پر گہری نظر رکھنے والے سائنس دانوں نے
لات کا بڑی تفصیل سے دیا ہے۔ جس کا خلاصہ ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں ۔ (ادارہ)

دنیا
سویں صدی میں

صابر علی

ادیں صدی میں انسان اپنی قسمت کا خود مالک
عروج و ارتقا اس کے اختیار میں ہوگا۔ سال ائی توڑ
یدہ اپنی نسل کی افزائش پر قادر ہوگا ، صنف ، جلد،
ر وقامت جسمانی سکت ، اعصابی قوت اور دماغی
ان تمام کی نوعیت قبل از وقت حسب منشا تعین کی
یادداشت کے کمپیوٹر اور انسانی قوت حافظہ کو ایک
ٹرمی کے ذریعے باہم مربوط کر دینے سے اس کی دماغی
ہنی وسعتوں اور تجرباتی صلاحیتوں کو کہیں زیادہ عظیم
ش بنایا جا سکے گا۔ جذبات پر کنٹرول پانے کے لئے
ایسی دوائیں دستیاب ہو سکیں گی جن سے ایک
بانہ قوتوں میں ضعف پیدا ہوگا تو دوسری طرف اس
بیت پذیری اور سماجی فلاح و بہبود سے تعلق رجحانات
مل ہوگا۔

اسلی طریقہ علاج کی ترقی سے امراض قلب ، کینسر،
ر نسل انسان کی دیگر بہت سی قدیم مہلک بیماریاں
جڑ بنیاد سے ختم ہو جائیں گی۔ چند امراض جن میں انسان انتہائی
لاغر اور ناتواں ہو جاتا ہے اور جن کی تکلیف انتہائی ناقابل برداشت
ہوتی ہے ان کا علاج ڈنا (DNA) کی چند حیات بخش متناسب
خوراکوں سے کیا جا سکے گا۔ اوسطاً انسان کی عمر میں بیس برس
کا اضافہ ہو جائیگا۔ آدمی معمر ہو جانے کے باوجود کمسن نظر آئے گا۔
وہ اس وقت سے کہیں زیادہ چست اور پھرتیلا ہوگا کہن سالی
اور قوت حافظہ کی کمزوری کے مابین جو چولی دامن کا ساتھ
ہے وہ یکسر ناپید ہو جائے گا۔

تبدیلی اعضاء کا علم انسانی ساخت کو ایک نیا استحکام
بخشے گا۔ انحطاط پذیر اعضاء اور بے وقت موت کا ایک نیا بدل
تلاش کر لیا جائیگا۔ ہر انسان کے ناکارہ اور بوسیدہ اعضاء،
دل ، جگر ، گردے ، پھیپھڑے کے اسپتال میں ایک آپریشن کے ذریعہ
دوسرے تندرست قدرتی اعضاء یا مصنوعی اور دیرپا میکانکی
اعضاء سے تبدیل کیا جا سکے گا۔ مصنوعی ہاتھوں اور پیروں کو ایک
کمپیوٹر کے ذریعہ دماغ سے منسلک کر کے ان میں تحریک پیدا کی
جا سکے گی۔ اور ایسے اعضاء کو استعمال کرنے والا حسب منشا
ان میں حرکت پیدا کر کے ہر قسم کا کام انجام دے سکے گا۔

آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ساری باتیں کسی دیوانے کی بڑ
ہیں۔ نہیں بلکہ یہ تو ان سائنسدانوں کے اقوال ہیں جو انسانی
معاشرے کا دماغ سمجھے جاتے ہیں۔ خصوصاً اس لئے بھی ہم
ان کے دعووں کو بے بنیاد قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ کسی نہ کسی
حد تک وہ عملی کسوٹی پر بھی کھرے ثابت ہو چکے ہیں۔ آج بہت
سے امریکی ، فیل پیکر، خود مکتفی شہروں میں جنہیں "میگا اسٹرکچرز"
کہا جاتا ہے۔ رہتے ، کام کرتے اور زندگی کے عیش و آرام سے
لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کے کمرے، کام

الی کیلئے نہ اسکول جانے کی ضرورت اور نہ کالج۔ گھر بیٹھے تعلیم حاصل کیجئے

کے دفاتر، دکانیں اور دیگر مقامات اپنی بلندی
رجھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی
بارہی دنیا سے بیحد مختلف ہے۔ بہت سے لوگ
شرکیپرز میں دو سو منزلہ یا اس سے بھی زیادہ بلندی پر
تے رکھتے ہیں۔ یہ بہت سی قطاروں والی عمارتیں ایک
سازنجیر کی متعدد کڑیوں سے باہم مربوط ہیں۔ بہت سے
دیکھے چبوترے پر بنے ہوئے پلیٹ فارم نما شہر میں بھی
سرکھتے ہیں جس کے نیچے ٹریفک کی آمد و رفت کا بہترین
ام ہے۔ یہ زمین دوز راستہ شہر کے دونوں سروں پر پیدل دوڑ
لا ہوا ہے۔ سطح زمین سے ہموار سڑک کے دونوں کنارے
زیر دو فٹ پانی ہیں۔ اور ان کے پہلو بہ پہلو تا حد نظر
ہری گھاس کی پٹیاں چلی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں آلود یافتہ
حرارت کے زیر سایہ دھوپ سینکنے کا لطف بھی حاصل
ہے۔ ان محرابی شکل کی عمارتوں میں پورے سال ہمہ وقت
اور کام کرنے کے لئے معیاری آب و ہوا اور ماحول دستیاب ہے۔

بہرحال سائنسدانوں کے خیال کے مطابق ۲۱ ویں
ی میں زندگی کے ہر شعبہ پر کمپیوٹر کا عمل دخل ہوگا۔ میونسپلٹیوں،
تر، لائبریریوں، ہوٹلوں، اسکولوں، اور دیگر اطلاعاتی مرکزوں
صابی جال کی طرح کمپیوٹری نظام محیط ہوگا۔ اور ان
شمار اور لاتعداد کمپیوٹروں کا سلسلہ ایک مرکزی کمپیوٹر
مربوط ہوگا۔ عوام تقریباً اپنے ہر کام کیلئے کمپیوٹر کا استعمال
ہی بے تکلفی سے کر سکیں گے جیسے کہ آج وہ ٹیلی ویژن کا
عمال کرتے ہیں۔ مرکز سے جڑے ہوئے کمپیوٹر انفرادی مکانوں
پی عوامی خدمات پیش کریں گے۔ انسان نما مشینیں،
ے کے اندر کمپیوٹر فٹ ہوں گے۔ اور انسانوں کی طرح ہی
کے ہاتھ اور انگلیاں ہوں گی۔ وہ برشوں اور پانی کھینچنے
نالیوں کی مدد سے گھر کی صفائی کا کام انسانی ہاتھوں
مقابلہ میں بہتر طور پر انجام دے سکیں گی۔

باورچی خانہ پورے طور پر خودکار بن چکا ہوگا۔ گھر کی مالکہ
نہ ہفتے کے لئے ایک مرتب فہرست طعام مرتب کرے گی۔
رہ کی غذا مناسب جگہوں پر رکھ دے گی اور اپنا تیار کردہ
گرام چھوٹے سے کمپیوٹر کو کھلا دے گی۔ پیکا گئی یا نہیں
ں اندر وقت مقررہ پر پروگراموں کے تحت مختلف چیزوں
رکت دیں گی۔ وہ پکائیں گی اور گھر والوں کو پیش کر
ہ گی۔ مینگا اسٹور کے لئے شاپنگ کرنا عہد رفتہ کی بات
ہو چکی ہے۔ گھر کی مالکہ وائنڈ فون (وہ فون جس کے ذریعے
آنکھوں سے اوجھل اشیاء دیکھنے کا کام لیا جاتا ہے) کا سوئچ
مقامی سپر مارکیٹ پر گھماتی ہے۔ چیزوں کو دیکھتی اور پرکھتی
ہے۔ ہر ایک کا نرخ معلوم کرتی ہے، اور پھر گھر بیٹھے بیٹھے اپنی
ضرورت کی تمام اشیاء خودکار راکٹوں کے ذریعہ منگا لیتی ہے۔

لین دین اور خرید و فروخت میں کیش اور چیک کا استعمال
بالکل اٹھ جائے گا۔ تمام کاروبار کی بنیاد جمع خرچ کے ایک
ایسے نظام پر ہوگی جو اول تا آخر کمپیوٹروں کے ذریعہ اختتام
پذیر ہوگا۔ دکانوں، گوداموں، خریدنے اور فروخت کرنے
والوں کے مکانوں کے کمپیوٹر بینک کے کمپیوٹر سے باہم مربوط
ہوں گے۔ اور وہ اکاؤنٹس کے سارے فرائض از خود انجام
دیں گے۔ ملازم کو تنخواہ دینے کی صورت یہ ہوگی کہ آفس کا
کمپیوٹر اس کے بینک کے حساب میں اس کی تنخواہ جمع
کرا دے گا۔ اور وہ جب بھی کہیں سے کوئی چیز خریدے گا تو
اسٹور کمپیوٹر اس کے بینک کے کمپیوٹر کو فوری طور پر ہدایت
دے گا کہ اس کے حساب سے اتنی رقم وضع کر لی جائے۔

کمپیوٹری طریقہ تعلیم کا ایسے ہی رواج ہو جائے گا،
جیسے کہ آج کلاس روم میں پڑھایا لکھایا جاتا ہے۔ اس کا تلفظ
بہت ہی واضح اور صحیح ہوگا۔ درجہ بندیوں کے تکلفات
ناپید ہو جائیں گے۔ اور ہر لڑکا اپنی صلاحیت کے مطابق
اپنی تعلیمی رفتار جاری رکھ سکے گا۔ کمپیوٹر کے اندر نصب شدہ
معلم مشینیں بچوں کو حساب اور گرامر سکھائیں گی۔ انہیں
پڑھنے اور لکھنے کا طریقہ بتائیں گی۔ اور ہر وقت ان کی غلطیوں
کی اصلاح کریں گی۔ اونچی کلاسوں کے لڑکے صرف جزوی تعلیم
کے لئے ہی اسکول جایا کریں گے۔ اور باقی تعلیم وہ ٹیلی ویژن
کے ذریعہ حاصل کریں گے جن کا تعلق ایک
ہوگا۔

چار برس کی عمر سے بیس برس کی عمر تک تعلیم لازمی قرار
دے دی جائے گی جن میں کم از کم دو سال کے بچے بھی شامل
ہیں۔ بہت سے کالج محض "ایجوکیشن سروس سینٹر" کی
حیثیت سے باقی رہ جائیں گے۔ اور ان بالغوں کے لئے
پورے سال کھلے رہیں گے جو کہ خود کو بدلتی ہوئی ذمہ داریوں
کا اہل بنانے کے لئے یا انفرادی تسلی اور تشفی کے لئے مزید
تربیت حاصل کرنا یا اپنا تعلیمی معیار بلند کرنا چاہیں گے۔
لائبریری خدمات اور تجارتی تعلیمات گھر بیٹھے بیٹھے
کمپیوٹر کے پھیلے ہوئے جال کے ذریعہ حاصل کی جا سکیں گی۔
وہ لڑکا جسے کسی موضوع پر معلومات فراہم کرنی ہوں۔ وہ چند
کلیدی لفظوں کو کمپیوٹر میں رکھ دیگا اور چند سیکنڈ کے اندر
ایک کامل و مکمل فہرست ٹیلی ویژن کے پردے پر نمودار ہو جائیگی۔
اور پھر فہرست کے مخصوص آئٹموں پر دباؤ ڈالنے سے مطلوبہ
مضمون کی صحیح شکل یا اس کا مکمل حوالہ فوراً تحریر میں اس
کے سامنے ظاہر ہوگا۔

مصنوعی سیاروں کی مدد سے ہر گھر عالمگیر نظام اطلاعات،
تعلیمات اور تفریحات سے بہرہ ور ہو سکے گا۔ ٹیلی ویژن کے
طول و عرض پردے جو بالکل کمرے کی پوری ایک دیوار کو گھیرے
ہوئے ہوں گے۔ مختلف رنگوں میں ہمارے سامنے ٹھوس
تصویریں (طول عرض اور عمق رکھنے والی تصویریں) پیش کریں
گے۔ کوئی مخصوص خبر جسے پردۂ ٹیلی ویژن پر آپ ایک بار دیکھ
چکے ہوں۔ کمپیوٹر سے درخواست کر کے آپ دوبارہ بھی اسے دیکھ
یا سن سکیں گے۔ وائنڈ فون (دیکھو فون) کی مدد سے آن کے
آن میں کسی بھی آدمی سے کتنے ہی فاصلے پر بالمشافہ گفتگو
کا لطف حاصل کیا جا سکے گا۔

کام کی فطرت و ماہیت تبدیل ہو جائیگی۔ تمام چھوٹی بڑی
چیزوں کی پیداوار اور ہر قسم کے فرائض کی انجام دہی خودکار
مشینوں اور کمپیوٹر کے ذریعے ہوگی۔ زراعتی کام از اول تا آخر
آٹومیٹک ہوگا۔ کاشتکار بہت کم رہ جائیں گے۔ تقریباً صرف
دو فیصد آدمیوں کی ضرورت باقی رہے گی، جو نگرانوں کی حیثیت سے
سارا کام کمپیوٹر سے لیں گے۔ انسان نما ٹریکٹر اور دوسری آٹو
میٹک مشینیں ایک ایکڑ زمین سے اتنا غلہ پیدا کر سکیں گی
جتنا آج ہم بیس تیس برس پیشتر تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس میں مزدور طبقہ اپنے فن و پیشے میں طاق اور ماہر
ہوگا۔ یہ صنعت و حرکت کی تیز رفتار تبدیلیاں اس بات کی
متقاضی ہوں گی کہ ہر انسان اپنی روزی روٹی کمانے کے لئے
ایک سے زیادہ یا تین چار پیشوں کے اندر پوری مہارت رکھتا
ہو۔ اوسطاً ہر انسان اپنی پہلی تہائی عمر تعلیم حاصل کرنے میں،
دوسری تہائی کام کرنے میں اور آخری تہائی اپنی محنت کی موجودہ
کے پھل حاصل کرنے میں صرف کرے گا۔

پورے ہفتے میں کام کے اوقات مجموعی طور پر تیس گھنٹوں
سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اور فالتو وقت سے لطف اندوز ہونا ہی
پورے وقت کے ایک پیشے کی شکل اختیار کر لیگا۔ فرصت کے

اکثر دبیشتر اوقات ہر گھر میں کمپیوٹر کے رنگا رنگ پروگرام سننے میں
صرف کئے جائیں گے جن کے ذریعہ ہر خاندان کو مفت تعلیم،
بہترین تفریح اور معیاری موسیقی میسر ہوگی۔ بیرونِ خانہ سرگرمیوں
جیسے پکچروں، ناٹکوں، سرکسوں اور تھیٹروں وغیرہ کی مانگ
ہی گھٹ جائے گی، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جاسکتی
کہ ۲۱ویں صدی کے اس خوشحال اور فارغ البال معاشرے میں
اوقات فرصت کا معنی خیز استعمال ایک مسئلہ بن جائے گا۔

یہ ہے آپ کی ۲۱ویں صدی کا نقشہ جسے ہمارے
بہت سے ماہر سائنسدانوں نے پیش کیا ہے۔ تاہم دوسرے
کئی دانشوروں نے اس صدی کے تاریک ترین پہلوؤں پر بھی
توجہ دلائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آنے والی صدی میں فرصت کے
اوقات گزارنا ہی ایک مشکل مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے علاوہ
سینکڑوں ناقابلِ حل مسائل ہوں گے، جن سے عہدہ برا ہونا
انسان کے بس سے باہر کی بات ہوگی۔ انھیں اندیشہ ہے کہ
قبل از وقت ایک ایسا مستقبل انسان پر آن پڑے گا جس کے
واسطے وہ ہنوز آمادہ نہ ہوں گے۔ ایک ایسا ترقی پذیر اور خود سر
مستقبل جو پوری سوسائٹی کو مکمل طور پر تہہ و بالا کر کے رکھ دیگا۔
انھیں خطرہ ہے کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور ذرائع اطلاعات کی
تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں انسان کے شخصی اور انفرادی
طریقۂ عمل میں ایک قسم کا عدم استحکام اور بے ثباتی پیدا ہو جائیگی۔
نئی اخلاقی قدروں کے عروج و ارتقا سے ہماری زندگی کے
اندرونی و بیرونی دونوں پہلو بہت تیزی سے متاثر ہوں گے۔
افراد ناقابلِ بیان حد تک اپنے ماحول کے ساتھ معقولیت پسندانہ
طرزِ عمل کے نااہل ہوں گے۔ ان کے اندر اتنی صلاحیت نہ ہوگی
کہ تیز گام تبدیلیوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر سکیں۔

بصیرت رکھنے والے سائنسداں جب انسان، اس کی
مربوط مشینوں اور کمپیوٹر زدہ معاشرے کے نتائج و عواقب پر
غور کرتے ہیں تو ان کے سامنے طرح طرح کے خدشات و خطرات
اپنا سر اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ بڑھتے ہوئے لاشخصی
رجحانات، اور انسان کی روز افزوں محرومیوں و ناکامیوں کو
تشویش کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں کمپیوٹر سی
کھاتہ نویسی کا نظام اگر آپ کے حساب میں کوئی غلطی کر دے
تو آپ اسے کیسے باور کرا سکیں گے کہ تم نے ایسا کیا ہے یا آپ
ایک ایسے کمپیوٹر کو کیسے یقین دلا سکیں گے کہ میرے ساتھ
ایک ہمنام مسافر تھا جس کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا جاتا تھا۔

اور اس بنا پر اپنی کار کی رفتار تیز کرنے پر مجبور تھا۔ اس سماجی
تنظیم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی جس میں وہ ذمہ دارکے
در پردہ پوشی کے شخصی حقوق بری طرح پامال ہو جائیں گے۔
اور سرکاری بینک پر ہر شخص کی آمدنی، خرچ، بینک بیلنس اور
اس کی ٹیکسوں میں ادا کی ہوئی رقم کو ہر خاص و عام کے لئے طشت
از بام کر دیں گے۔ کئی ایک ماہرین نے تو بڑے افسردہ لہجہ میں
یہ پیش گوئی بھی کی ہے کہ اس وقت اقتدار صرف چند برسر آوردہ
لوگوں تک محدود ہوگا جو ایک ایسے بے شعور اور بے دماغ انبوہ
کے اوپر حکمرانی کریں گے جنکو دوائیں پلا پلا کر تھیٹر اور سرکس
دکھا دکھا کر مسرور و مطمئن رکھا جائے گا۔

۲۰ویں صدی کی تکمیل میں صرف تیس برس باقی رہ گئے
ہیں۔ اور آنے والی صدی کے آثار و علامات بتدریج ہمارے
سامنے آتے جا رہے ہیں۔ سائنسی، صنعتی، اطلاعاتی، تعلیمی
اور زراعتی انقلابات کا ظہور اتنے دھماکہ خیز انداز میں ہو رہا ہے
جس سے انسانی سماج کا ڈھانچہ اور اس کی تمام خاندانی
قدریں تیزی سے بدلتی جا رہی ہیں۔

پچھلے دس برسوں میں علم الحیات میں جو عظیم انقلاب
آیا ہے، اس نے انسان کو ایک ایسے عہد کی دہلیز پر لا
کھڑا کیا ہے جو کہ انتہائی اہم اور دور رس نتائج کا حامل ہے۔
۱۹۶۱ء میں ماہرینِ علم الحیات زندگی کے چار بنیادی کیمیاوی عناصر
کا پتہ لگا چکے ہیں جو کہ ڈنا (DNA) کے اندر یکجائی طور پر
پائے جاتے ہیں۔ (یہ ایک پیچیدہ سالمہ ہے جو تولید کے اسرار و
رموز کا حامل تصور کیا جاتا ہے) اور اسطرح وہ تحقیق کے سربستہ راز
میں ایک شگاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آج
سائنسداں اسی راز اور معمے کی عقدہ کشائی میں سرگرم عمل ہیں۔
اور جس وقت وہ یہ تخلیقی راز معلوم کریں گے تو نوعِ انسان
حیات کا رازداں بن جائے گا۔ وہ تخلیقی قوت کا مالک بن جائیگا۔
مشہور و معروف امریکی کیمسٹ، ڈاکٹر چارلس کا کہنا ہے
کہ "زندگی کی کیمیا اب ہمارے دسترس میں ہے، لیکن میرا یہ
نظریہ ہے کہ صرف نظام ہائے حیات کی جزوی کیمیا گری میں
کامیاب ہو کر ۱۹۴۰ء کے مقابلے میں، جبکہ نیوکلیر انرجی کا
انکشاف ہوا تھا یا ۱۹۶۹ء کی بہ نسبت جبکہ خلائے بسیط میں
پہلا انسان بھیجا گیا تھا، ہم کوئی زیادہ نمایاں کام انجام نہ
دے سکیں گے۔ ٹیسٹ ٹیوب میں ترکیبی عناصر کو باہم مجتمع کر دینے
کی اہمیت [illegible] بھی سیاسی، سماجی، حیاتیاتی

امراضِ قلب، کینسر، جراثیمی اور انسان کی دیگر بہت سی مہلک بیماریاں جڑ سے ختم ہوجائیں گی

اور اقتصادی اثرات مرتب ہوں گے، وہ ایٹامک انرجی کے
انکشافات اور خلائے بسیط کی تسخیر کے سامنے بالکل ٹمٹماتے ہوا
سے نظر آئیں گے۔"

الغرض آنے والی صدی میں ہماری زندگی آج کی
زندگی سے قطعی طور پر مختلف ہوگی۔ اس صدی میں زندگی کے
ہر شعبے پر کمپیوٹروں کا کنٹرول ہوگا۔ وہ کمپیوٹر جو تعلیم یافتہ
ہوں گے۔ جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بھی کر سکیں
گے، اور وہ صدی جس میں انسان: "مخلوق سے خالق" بن
جائے گا۔

اسی لئے امریکہ کے شہرۂ آفاق ماہرِ معاشیات "کینتھ
باؤلڈنگ" جو کہ آنے والی صدی کے بارے میں کافی سوجھ بوجھ
رکھتے ہیں، بہت ہی پرزور الفاظ میں کہتے ہیں کہ: "اگر
انسان کو آئندہ بھی زندہ رہنا ہے تو اُسے آنے والے صرف
۲۵ برس کے اندر خود کو اپنے اندر تبدیلی کر کے اس حد تک بدل
دینا ہوگا جتنا کہ اس نے گذشتہ ڈھائی ہزار برسوں میں تبدیل
کیا ہے۔"

ہمایوں قدیر

جوتے بازی

سنا ہے کہ پچھلے دنوں انگلستان کی پارلیمنٹ میں جوتا چل گیا۔ یہ امر ہمارے لئے باعثِ اطمینان اور فخر ہونا چاہئے کہ اب ہماری جمہوریت کی دھاک ساری دنیا پر بیٹھ گئی ہے۔ یہ ہم نے انگلستان کی طرزِ جمہوریت کو گلے لگانے میں جتنی جلد بازی کا اظہار کیا تھا اتنی ہی تاخیر انگلستان نے ہماری "جمہوری سوغات" اپنانے میں لگائی، تاہم دیر آید درست آید کے مصداق آخر کار جمہوریت کے سب سے بڑے ٹھیکیدار انگلستان کو ہماری برتری کا اقرار کرنا ہی پڑا۔

جس دن ہم نے اپنے ملک کے لئے جمہوریت کا انتخاب کیا تھا اسی دن سے دنیا کے لئے ہمارا چیلنج یہ رہا ہے کہ ہم ایک ایسی مثالی جمہوریت قائم کریں گے جو پہلے کبھی بھی عالمِ وجود میں نہ آئی ہو۔ اور خدا گواہ ہے کہ ہم جھوٹ کبھی نہیں بولتے ــــ ہمارے تو اکثر دیومالائی تصور کی بنیادیں ہی اس مقولے پر رکھی گئی ہیں کہ:-

"جان جائے پر وچن نہ جائے"

دنیا اب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو گئی ہے کہ جمہوریت اور جوتے بازی کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ جہاں بھی جمہوریت ہوتی ہے (نام نہاد نہیں) وہاں جوتے بازی کا ہونا لازمی امر ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ جوتے بازی، جمہوریت کی مقدار ناپنے کا پیمانہ ہے۔ گویا جس ملک میں جتنی زیادہ جوتے بازی ہوتی ہے وہ ملک اتنا ہی جمہوری ہے۔

دنیا میں اگرچہ اب تک سیکڑوں ممالک نے جمہوری ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی جمہوریت کو پرکھنے کے لئے اس خالص جمہوری پیمانے کا استعمال کرتا حالانکہ اس کی اہمیت ہر دور میں تسلیم شدہ رہی ہے۔ یہاں یہ سہرا بھی ہمارے سر اسی طرح خود بخود بندھتا ہے جس طرح دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا۔

ہمارے ایوانہائے قانون ساز سے جب جوتے بازی کی دل نشین، دل افروز اور جمہوریت بخش صداؤں کی بازگشت ساری دنیا میں پھیلتی ہے تو ہم کو کیسا سرور اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے اور دنیا کے سامنے ہمارا سر فخر کے ساتھ بلند ہوتا ہے اس کا اندازہ بھی وہی لگا سکتے ہیں جن کے یہاں جمہوریت ہوتے ہوئے بھی جوتے بازی نہیں ہے۔

وہ مناظر کتنے دلربا ہوتے ہیں جب اپنے جائز مطالبات کو منوانے کے لئے ہم اپنے ہاؤس کے چیرمین یا اسپیکر پر بڑے خلوص و محبت کے ساتھ جوتوں کی بارش شروع کر دیتے ہیں یا جب اپنی "جمہوری مانگوں" کی مخالف جماعتوں کے ارکان کی تواضع نو ایجاد گالیوں اور پاؤں کے جوتوں سے کی جاتی ہے۔ گویا اس طرح ہمارے قانون ساز اداروں کے ممبران اپنے برادرانہ تعلقات اور آپسی بھائی چارے کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ بات مصدقہ ہے کہ ہمارے ملک میں جوتا سب سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز شئے ہے۔ آئے دن کی پر خلوص جوتے بازی سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے عوام اور خواص سب جوتے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔

اب اگر کوئی بے بصیرت شخص یہ سوال کرنے لگ جائے کہ آخر ہم جوتے سے اسقدر محبت کیوں کرتے ہیں تو اس سوال کے ایک نہیں بلکہ سیکڑوں جواب موجود ہیں۔

جوتے کی مقبولیت کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ دیگر ملکوں کی بہ نسبت سستے، اچھے، مضبوط اور بہت بڑی تعداد میں بنتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ زندگی بھر انسان کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور موقع پڑنے پر ایک لمحے میں اپنی موروثی جگہ تبدیل کر کے یعنی پیر سے ہاتھ میں آ جانے کی صلاحیت اپنے اندر بدرجہ اتم رکھتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ زمانہ قدیم کی طرح ہاتھ میں ڈنڈا یا لاٹھی رکھنے کا رواج تو اب ختم ہو چلا ہے لیکن موقع پڑنے پر یہ لاٹھی کا نہایت عمدہ بدل ثابت ہو سکتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ یہ ایسے موثر ہتھیار کا رول ادا کرتے ہیں جس کی کوئی جامع تعریف ہی متعین نہیں کی جا سکتی۔

پانچویں یہ کہ مخالف کے سر پر ان کو دے مارنے کے بعد جائے وقوع سے ننگے پیر بھاگ نکلنے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔

سنا ہے کہ ننگے پیر چلنے سے صحت بنتی ہے لہٰذا ہم ہر وقت اس تاک میں رہتے کہ کب جوتے بازی کی نوبت آئے اور ہم کو جوتا چھوڑ کر بھاگنے کا بہانہ مل جائے اور اس طرح ہم اپنی صحت کو بہتر بنا سکیں۔ یقین کیجئے کہ جوتا چھوڑ کر بھاگنے میں ہماری بزدلی یا پست ہمتی کو قطعی دخل نہیں ہوتا ــــ بلکہ یہ جو اکثر ایک دوسرے پر جوتے اچھال کر ہم راہِ فرار اختیار کرتے ہیں تو اس کے پس پشت بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ ہم اپنی صحت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔۔۔۔ ہمارے قانون ساز اداروں کے ارکان خاص طور پر اس طرف رجوع رہتے ہیں کیونکہ حقیقی معنوں میں ملک کا سارا بوجھ انھیں کے کاندھوں پر ہوتا ہے لہٰذا اگر ان کی صحت اچھی نہ ہوگی تو پھر وہ اس بارِ گراں کے متحمل کیوں کر ہو سکیں گے۔

جوتے کی افادیت کا اظہار اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ اپنی مانگوں کو بلا چون و چرا تسلیم کرانے اور اپنے مخالفوں کے منہ کو بند رکھنے کے معاملات میں اب تک کے تجربات کی رو سے یہ بے مثال ثابت ہو چکا ہے۔

کیونکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جوتا اور جمہوریت لازم و ملزوم ہیں لہٰذا دنیا کی ساری جمہوری مملکتوں سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ جوتے کے فروغ کے لئے جلد سے جلد ممکنہ کوششیں شروع کر دیں۔ اگر دنیا کی جمہوری مملکتیں یہ چاہتی ہیں کہ دنیا میں جمہوریت پھلے پھولے اور پروان چڑھے تو وہ سب سے پہلے جوتے بازی کو اپنے ملک میں عام کریں اور پھر عالمی سطح پر ایک "جوتا وفاق" کا قیام عمل میں لائیں۔ ہم دل سے

کہہ سکتے ہیں کہ مجوزہ جوتا وفاق دنیا کے موجودہ پیچیدہ لاینحل مسائل کا حل یوں "جوتا بجاتے" پیش کردے گا کہ دنیا کے سارے رجعت پسند انگشت بدنداں رہ جائیں گے اور بالآخر انکو جمہوریت ہی کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی۔

اب آخر میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوری مملکت ہونے کے ناطے ہم اپنی حکومت کو چند مخلصانہ مشورہ جوتا بازی کے فروغ کے سلسلے میں دینا چاہتے ہیں کیونکہ موجودہ جوتے بازی کی رفتار انتہائی درجہ سست اور غیر اطمینان بخش ہے اگر ہم نے اس طرف خاص توجہ نہ دی تو ڈر ہے کہ وہ دوسرے ممالک جو ہماری دیکھا دیکھی اپنے یہاں ابھی جوتے بازی کا آغاز ہی کررہے ہیں ہم سے آگے نکل جائیں گے اور ہم باوجود اس پر افادیت نسخے کے موجود ہونے کے پچھلی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔ چنانچہ ہم اپنی حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مندرجہ ذیل طریقوں کو اپنا کر جوتے کو ملک میں فروغ دے اور اپنے جمہوریت نواز ہونے کا ثبوت بہم پہنچائے۔

مرارجی بھائی اور جیوتشی (بشکریہ شنکر)

۱۔ جوتے کو قومی نشان کا درجہ دیا جائے اور اس کو صد درجہ لائق عزت و تکریم گردانا جائے اور اس کی بے عزتی کرنے والوں کے لئے سخت ترین سزائیں مقرر کیجائیں۔

۲۔ جوتے بازی سکھانے کے لئے ملک بھر میں جابجا ٹریننگ اسکول کھولے جائیں جہاں باقاعدہ فن جوتا بازی کی تعلیم ملک کے عام شہریوں اور خصوصاً قانون ساز اداروں کے ممبران کو دیجائے تاکہ وہ اس فن کے داؤ پیچ سے کما حقہ طور پر واقف ہو سکیں۔ بلکہ اس ضمن میں خصوصاً ایک جوتا بنوایا جائے جو قانون ساز اداروں کے ممبران ہی کے لئے وقف ہو اور اس کی خصوصیات یہ ہوں کہ یہ باسانی پاؤں سے کسی بھی وقت اتارا جاسکے۔ ایوان میں اچھالنے پر خوب اونچائی تک جاسکے اور مخالف کا سر پھوڑنے کے سلسلے میں بے مثال کارکردگی سرانجام دے سکے۔

۳۔ جوتا بازی کے باقاعدہ مقابلے منعقد کئے جائیں جس سے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں جوتے کے تئیں عزت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو سکے اور ان مقابلوں میں جیتنے والوں کو قومی ہیرو قرار دیا جائے تاکہ ہمارے طلبا ان کی تقلید میں ماہر جوتے باز بننے کی کوشش اسی طرح کریں جس طرح آج فلمی ہیرو کی تقلید میں فلمی ہیرو بننے کی کرتے ہیں۔

۴۔ ملکی اور صوبائی سطحوں پر باقاعدہ حکومت کے ایک جز کی حیثیت سے محکمۂ جوتا کھولا جائے اور اس کا قلمدان فی الفور کسی ماہر جوتے باز ممبر پارلیمنٹ یا اسمبلی کو مقرر کیا جائے۔ اس طرح وزیروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ان کے لئے ایک نئے محکمہ کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔

۵۔ سرکاری نوکریاں دیتے وقت اس شرط کو ملحوظ رکھا جائے کہ امیدوار جوتے بازی کے فن سے بخوبی واقف ہو بلکہ سرکاری ملازمتوں کے لئے اشتہار ہی اس قسم کے دیئے جائیں:-

"ضرورت ہے ایک ماہر انجینیر کی جو جوتے بازی کے فن میں بھی طاق ہو اور وقت آنے پر اپنے جوتے سے مخالف کا سر پھوڑنے میں کمال رکھتا ہو۔

نوٹ:- امیدواروں میں باہم جوتے بازی کا مقابلہ کرایا جائے گا اور جیتنے والے ہی کو بطور انجینیر نوکری دیجائے گی۔"

۶۔ ابتدائی درجات میں اسکول کے بچوں کو ملکی زبان کیساتھ ساتھ فن جوتا بازی کی ابجد سے واقف کرانا بھی لازمی قرار دیا جائے۔

۷۔ جوتے بازی کے محاسن پر قومی اور یونیورسٹی سطح پر سیمیناروں کا انعقاد کیا جائے جس سے عوام کے ذہن میں جوتے کی خوبیاں بخوبی رچ بس جائیں اور وہ کسی بحث کے موقع پر جوتے کی برتری کو ثابت کرنے کے لئے خاطر خواہ دلائل دے سکیں

مرغی پر جھگڑا

(سعد شبنم)

اس درد بھری داستان کا آغاز اس وقت ہوا جب میں انجینئر صاحب سے ایک نہایت معمولی سی بات پر جھگڑ بیٹھا۔ یہ جھگڑا بس اس قسم کا تھا کہ میں نے ان کی طرف منہ کر کے چار باتیں بلند آواز میں کہہ ڈالیں اور انھوں نے میری صورت دیکھ کر ان باتوں کا جواب دے دیا۔ اور اس کے بعد ہم دونوں میں بول چال بند۔ شریف آدمیوں سے یہی توقع ہونی چاہئے۔

مجھے اعتراف ہے کہ جہاں تک ٹکنیکل اور سائنٹفک امور کا تعلق ہے۔ میں ان میں بالکل کورا ہوں۔ ویسے تو میں ہر قسم کے ہر موضوع پر دھواں دھار بحث کر سکتا ہوں لیکن جہاں کوئی ایسی ویسی بات نکل آئے جس میں سائنس کو دخل ہو تو میں چاروں شانے چت نظر آتا ہوں، سائنسی اصطلاحوں میں باتیں کرنے والے لوگ مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتے ہیں۔ حالانکہ آج کل مجھے اس صنف میں کچھ دسترس حاصل ہو گئی ہے۔ جسے سائنس کہتے ہیں۔ مثلاً خراب بلب کو ہولڈر سے بخوبی نکال لیتا ہوں اور اس کی جگہ نیا بلب لگا بھی دیتا ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ فوراً ہی اسے جلا کر دکھا بھی دیتا ہوں کہ بالکل صحیح فٹ کیا گیا ہے۔ میں انجینئر صاحب کی اس ایجاد پر تو اب تک انگشت بدنداں ہوں جس کے ذریعے وہ خراب بلب کو ٹھیک کر کے پھر استعمال کے قابل بنا دیتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی اس عجیب و غریب ایجاد کو ضرور پیٹنٹ کرالیں، لیکن وہ عجیب صوفی منش طبیعت کے مالک ہیں، ہنس کر ٹال دیا۔ سنتے ہیں، نیوٹن اور آئن سٹائن بھی ایسی ہی لاابالی طبیعت کے مالک تھے۔

میں ان کا پڑوسی ہوں۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کرنا میں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ لیکن ان کے کارناموں کو دیکھ کر بھی یقین کرنا مشکل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں انھیں انجینئر صاحب کہا کرتا ہوں۔ یہی شخص میرے جانے پہچانے تھے۔ بلکہ دوست تھے۔ جانے پہچانے تو خیر اب بھی ہیں۔ ان کی وجہ سے مجھے بڑا آرام تھا بس یوں سمجھئے کہ ان غیر یقینی اور غیر ضروری چیزوں پر سر کھپانے کی ضرورت مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ریڈیو خراب ہوا ان کے سر پہ بھیج دیا۔ سلائی کی مشین نے احتجاج کیا تو انجینئر صاحب کے گھر بھجوا دیا۔ گھر کا کوئی پوائنٹ خراب ہو گیا تو انھیں بلا کر لے آیا۔ میرے لئے فکر کی کوئی بات نہ تھی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن اب یہ میری نااہلی اور ناعاقبت اندیشی کے سوا اور کیا تھا کہ میں اپنی بیوی کی اس بات پر یقین کر بیٹھا کہ انجینئر صاحب کی بیوی اکثر میری بیوی کی مرغی کو پکڑ کر ڈربے میں بند کر دیتی ہے اور اسے انڈا دینے پر مجبور کرتی ہے۔ اور اسی بات پر میں ان سے جھگڑ بیٹھا۔

جھگڑا مول لے کر میں نے اچھا نہیں کیا تھا یہ تو میں بخوبی جانتا تھا لیکن اس کی مزید تصدیق یوں ہو گئی کہ تیسرے ہی روز غسل خانے کا بلب فیوز ہو گیا۔ ہر چند کہ میں نے اس بلب کی جگہ کامیابی سے نیا بلب لگا دیا، لیکن بہت پچھتایا۔ کاش اتنے دنوں میں انجینئر صاحب سے فیوز بلب کو ٹھیک کرنے کا نادر طریقہ ہی سیکھ لیتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

مشکل سے چند روز گذرے ہوں گے کہ ایک روز صبح صبح جب میں نے اپنے ریڈیو سیٹ کا سوئچ دبایا تو وہ ہائی دینے لگا۔ غور سے سنا تو پتہ چلا کہ اس نے عام دنیا کی نشریات کی خبریں لانا ترک کر دیا ہے اور کسی اور ہی سیارے سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے۔ میں سیاروں کی مخلوق کی زبان نہیں سمجھتا۔ ناچار زندگی میں پہلی بار ریڈیو سمیت عمر دراز "ریڈیو سروس" کی دکان پر گیا اور دل ہی دل میں اپنے ریڈیو کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتے ہوئے کہا "یہ خراب ہے"

"بتائیے کیا خرابی ہے اس میں؟" عمر دراز صاحب نے اس طرح کہا جیسے چیلنج کر رہے ہوں کہ دکھا دیجئے کوئی خرابی تو جانیں!

"پہلی خرابی تو یہ ہے کہ کوئی اسٹیشن نہیں پکڑتا"

"کوئی اسٹیشن نہیں؟"

"جی نہیں! دیکھئے نا۔ آپ خود دیکھ لیجئے۔ اور جب میڈیم ویو سے شارٹ ویو بدلتا ہوں تو "کھڑاک" کی ایک گرجدار آواز آتی ہے۔ جیسے میری پڑوسن کا بڑا کتا بھونکتا ہے۔ پھر جب شارٹ ویو سے میڈیم ویو بدلتا ہوں تو دھڑاک دھڑاک کی آواز آتی ہے جیسے میری پڑوسن کا چھوٹا کتا بھونکتا ہے اور پھر جب سیلون لگانے کی کوشش کرتا ہوں تو سیٹیاں بجاتا ہے جیسے ان کتوں کے ڈر سے میرا خارش زدہ کتا۔"

"ارتھ استعمال کر کے دیکھا آپ نے؟" انھوں نے میری چٹ پٹی تشبیہوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور ان تینوں ذہنی کتوں کا گلا دبا دیا۔ میں نے کچھ پریشان ہوتے ہوئے پوچھا

جی؟ ارتھ یعنی زمین؟ وہ کیا؟"

"آپ ارتھ بھی نہیں جانتے؟ کس کا ریڈیو ہے یہ؟ معلوم ہوتا ہے.....؟"

"حضرت! آپ تو ناحق برہم ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ... پوری بات سن کر کہنے لگے۔

"میں نے دیکھ لیا ہے۔ ریڈیو سیٹ ٹھیک ہے۔ ذرا پرانا ہو گیا ہے... لے جائیے لیکن ارتھ استعمال کرنا نہ

بھولیے اور ہاں - ریڈیو بجتے وقت والیوم کم کر دیا کریں ورنہ وہ اس اے نفتی تھری والا والو ہے نا - وہ فیوز ہو جائے گا اس وقت آوٹ آف سٹاک ہے ۔"

گرامر کے لحاظ سے ہر جملے کے تین حصے ہوتے ہیں۔ فاعل۔ فعل اور مفعول ۔ مگر دکاندار صاحب کے جملے کا جو حصہ میں پوری طرح سمجھ سکا وہ صرف فعل تھا یعنی صرف یہ پتہ چلا کہ کچھ ہو جائے گا ۔ مزید کچھ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی میں نے جھٹ ریڈیو سیٹ بغل میں دبایا اور پیچھے مڑا۔

" اجی سنئے ذرا ٹھہریئے " پیچھے سے آواز آئی " بل تو چکاتے جایئے ۔"

" کیسا بل ؟ "

انھوں نے جواب دینے کی زحمت نہ کی اور میرے ہاتھ میں ایک کیش میمو تھما دیا " دس روپے "

" یہ دس روپے کیسے ؟ " میں نے مری ہوئی آواز میں احتجاج کیا ۔

" جناب ! یہ تو ریڈیو دوکان پر لانے کا چارج ہے ۔ بل لوا کرنا پڑا ۔

ایک دن نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر ایک دوست کے بہکانے پر ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید ی ۔ میرا دوست جو میٹرک میں کئی بار فیل ہو چکا ہے ، پرانی چیزوں کی خرید و فروخت کا بڑا تجربہ رکھتا ہے ۔ اس موٹر سائیکل کے بارے میں اس نے کہا ۔

" بھئی سچ پوچھو تو جو مزہ سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل میں ہے ، نئی میں کہاں ۔۔۔ ؟ اگر تھوڑے تھوڑے وقفے پر موٹر سائیکل خراب نہ ہو تو آدمی بھول ہی جاتا ہے کہ یہ موٹر سائیکل ہے یا بائیسکل ۔ ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ، یہ میڈ ان جرمنی ہے ۔" اس نے یہ بھی نصیحت کی کہ موٹر سائیکل کو کبھی ورکشاپ نہ بھیجنا لیکن اس کے بدلے میں مجھے کیا کرنا تھا ، یہ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتانے کی زحمت کی ۔

موٹر سائیکل چلانا کیسے سیکھا یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں ۔ مختصراً صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ تین ہفتوں کی انتھک کوشش کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ موٹر سائیکل پر دفتر جا سکوں ۔ تفریح کی تفریح بھی ۔ تھی اور پیسے کی بچت بھی ۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا ۔ دفتر جاتے ہوئے ایک دن

واقعات ملی دھلی

بیچ راستے میں موٹر سائیکل نے دم توڑ دیا ۔ لاکھ کک مارا ، سارا لے کر دوڑا ، چند لونڈوں سے دھکا لگوایا لیکن سٹارٹ نہیں ہوئی دفتر کا وقت ہو چکا تھا ۔ نزدیک ہی ایک شاپ تھی ۔ میں نے اپنے دوست کی نصیحت کو نظر انداز کیا اور موٹر سائیکل کو ہانکتا ہوا اور خود ہانپتا ہوا وہاں پہنچا ۔ ایک دبلے پتلے سے لڑکے نے آ کر میرے ہاتھ سے موٹر سائیکل لے لی ۔ میں نے کہا " دیکھو ۔ اس کو کیا ہو گیا ہے ۔ سٹارٹ نہیں ہوتی ۔"

اس نے ایک آدھ کک ماری پھر پوچھا " کل رات آپ نے اسے بارش میں چھوڑ دیا تھا ۔

میں نے جواب دیا " واہ ۔ مفت کی ہے جو بارش میں چھوڑ دوں گا ۔ ؟ میاں اپنے کمرے میں رکھتا ہوں ۔"

" پھر اس پر پانی کس نے پھینکا ؟ " اس نے تشخیص کی ۔ " کاربوریٹر میں پانی جم گیا ہے ۔"

" خیر - جو ہوا سو ہوا " میں نے نامانوس لفظ سے پہلو بچاتے ہوئے کہا " اسے جلدی سے ٹھیک کر دو ۔"

" شام کو لے جایئے گا ۔"

میں چونکا ۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن جب اسے اپنی موٹر سائیکل کو دوسری موٹر سائیکلوں کے انبار میں بے دردی سے دھکیلتے ہوئے دیکھا تو میری رگ شفقت پھڑک اٹھی ۔ میں نے للکار کر کہا ۔

" میاں ذرا سنبھال کے ۔ تم نے تو اتنی ہی دیر میں میری نئی موٹر سائیکل ۔۔۔ " میں نے لفظ " نئی " پر اتنا زور دیا کہ جملہ پورا کرنا یاد ہی نہ رہا ۔ اس دبلے پتلے لڑکے نے مڑ کر میری طرف دیکھا پھر موٹر سائیکل کی طرف ۔ پھر میری طرف پھر موٹر ۔۔۔ شاید وہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ میری عمر زیادہ ہے یا موٹر سائیکل کی ، میں فوراً ادھر اُدھر دیکھتا ہوا کھسک گیا ۔

شام کے وقت موٹر سائیکل واپس کرتے ہوئے اور پیسے لیتے ہوئے اسی دبلے پتلے لڑکے نے کہا " سپارک پلگ بدلوا لیجئے گا ۔"

مجھے اس کا یہ سلوک نہیں بھولا تھا ۔ میں بھڑک اٹھا " ابھی پرسوں ہی پہیہ بدلوایا ہے اور تم آج کہتے ہو ۔۔۔ بدلنا پڑے گا " باوجود کوشش کے میں اس چیز کا نام ذہن میں نہ رکھ سکا جس کے بارے میں وہ کہہ رہا تھا کہ بدلوا لینا ۔

" دیکھئے صاحب ! موٹر سائیکل پرانی ضرور ہے لیکن چیز اچھی ہے ، بہت دن سروس دے گی ۔ بس آپ اس کے کچھ پرزے بدلوا دیجئے ۔"

میں نے اس کی تجویز پسند کی اور کہا " اچھا دیکھو تم مجھے ایک کاغذ پر ان تمام پرزوں کے نام لکھ کر دے دو ۔"

وہ بولا " ٹھیک ہے ۔ آپ لکھئے میں بولتا ہوں پسٹن رنگ ، سائیلنسر ، گیئر باکس میں کاؤنٹر گیئر ، بیٹری ۔۔ یہ سب تو بڑی چیزیں ہوئیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں ، مثلاً سپارک پلگ اور ہاں ڈائنامو کا آرمیچر کوائل جل گیا ہے ۔"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا جھلا کر کہا " تمہارا دماغ چل گیا ہے ۔ بکواس کرتے ہو ۔" میں نے قلم جیب میں رکھا اور کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا ۔

اب تک تو میں جانتا تھا کہ موٹر سائیکل میں صرف چار چیزیں ہوتی ہیں ، ہینڈل ، سیٹ ، انجن اور پہیے کسی پانچویں چیز کی گنجائش ہی نہیں ۔ اور نہ جانے وہ کیا کیا بکے جا رہا تھا ۔ ضرور مجھے دھوکا دینا چاہتا تھا ۔ میرے دوست نے کچھ غلط نہیں کہا تھا ۔ اور ایسے میں انجینئر صاحب سے دوستی قائم ہوئی تو فکر کی بات ہی نہ تھی ۔ میں نے دل ہی دل میں مرغی کو بہت کوسا جس کی وجہ سے ۔۔۔

چند دن خیریت سے گزرے ۔ اس کے بعد تجربے کی بنا پر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ موٹر سائیکل کو کچھ ہو گیا ہے ۔ یہ سوچ کر کہ اس کے روگ کا صحیح علاج اس کا فیملی ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے ، میں اس کے پچھلے مالک کے پاس پہنچا اور کہا ۔

" دیکھئے ، اس نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے ۔ ہر روز ایک نئی خرابی ۔" میں نے مبالغے سے کام لے کر اپنے بیان کو موثر بنانے کی کوشش کی ۔

" کیا خرابی ہے ؟ "

" میں ٹھیک نہیں بتا سکتا ۔ ویسے کچھ سے ترود ، کیونکہ جب بھی کسی اونچے نیچے راستے پر ڈالتا ہوں تو ۔ تو ۔۔ میرا مطلب ہے ذرا مہربانی کر کے آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں ۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا ۔"

میں نے موٹر سائیکل ایک نہایت خراب سڑک پر ڈال دی ۔ ایک چھوٹے سے گڑھے کے اوپر سے گزرتے ہوئے میں نے منہ پھیر کر پوچھا " غور کیا آپ نے ؟ نہیں ؟ اچھا دیکھئے اس بار ٹھیک سے دیکھئے میں اس گڑھے میں لے چلتا ہوں ۔ دیکھا ۔ ؟ "

باقی صفحہ ۱۴۱

حکیم بدھن نے گھر بسایا

بہزاد لکھنوی

حضرات آپ نے آج تک حرام خور اور حلال خور تو بہت دیکھے ہوں گے، لیکن شاید جورو خور کم ہی ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ اس لئے کہ یہ شرف خور ش خاص مقدر والوں کے حصے میں ہی آتا ہے۔ تو جناب حکیم بدھن ایسی ہی قسمت ایسا ہی مقدر لے کر آئے تھے۔ تین عدد جوروؤں کو نوش فرمانے کے بعد اب پھر "الجوع الجوع" کی صدائیں لگا رہے تھے۔ پہلا لقمہ تو آٹھ دس برس کے بعد حلق سے نیچے اترا تھا۔ دانت کچھ کم تیز تھے لیکن دوسرا اور تیسرا لقمہ تو دو دو سال کے اندر ہی حلق سے ایک دم نیچے اتر گیا ـــــ اور اب بھائی کا یہ عالم تھا کہ:۔

"پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں"

ان کی اس عجیب و غریب صفت کے باعث شہر کی ہر لڑکی کا باپ ان کا نام نامی سن کر کانوں پر ہاتھ دھر لیتا

کرتا۔ اب اس غریب حکیم بدھن کا باپ تھا تو میں۔۔۔ بھائی تھا تو میں، چچا تھا تو میں۔ دوست تھا تو میں، ملازم تھا تو میں۔ چنانچہ میرے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ میں ان کی بھوک کا کوئی انتظام کروں۔ لیکن جناب میں نے جس کسی سے بھی کہا، اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا کہ:۔

"بھیا بہزاد تمہارا بہت بہت شکریہ۔ لیکن معاف کرنا مجھے تم سے انکار کرنا پڑ رہا ہے۔ حکیم بدھن میں کوئی عیب نہیں ہے۔ ماشاءاللہ کماؤ ہیں، خوبصورت ہیں، عزت دار ہیں، حسب نسب میں کھرے ہیں لیکن ان کا پہرہ عورت کے حق میں اچھا نہیں ہے"

جب میں نے ان کے اس انکار پر مزید گفتگو شروع کی تو وہ بولے۔

"اچھا بھیا استخارہ تمہارے سامنے دیکھے لیتا ہوں"

انھوں نے فوراً تسبیح نکال کر استخارہ لیا۔ استخارہ منع آیا۔ اب وہ بولے:۔

"اب کیا کہتے ہو بھیا بہزاد؟"

میں نے کہا "بھائی! میں اتنی اتنی باتوں پر اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہوں"

وہ بولے:۔ "ارے بھیا بالفرض اگر میں اعتبار بھی کر لوں تو میرے گھر والے قیامت ڈھائیں گے۔ حکیم بدھن کی جورو خوری ہر طرف مشہور ہو چکی ہے"

میں نے برابر والوں کے علاوہ کچھ کمتر لوگوں میں بھی بات چلائی، لیکن ہر طرف سے یہی جواب ملا۔

"جیتے جی تو ہم اپنی لڑکی کو کفن نہیں پہنا سکتے"

اب بتائیے میں کرتا تو کیا کرتا۔ ادھر حکیم بدھن کا یہ عالم تھا کہ صبح فیکٹری میں آتے ہی پہلا سوال یہ ہوتا:

"کہو بھیا! کہیں کوئی بات بنی؟" ـــــ میں دل رکھنے کو کہہ دیتا:۔

"وہ لوگ سوچ رہے ہیں"

حکیم بدھن کی اس طلب سے ہر شخص آگاہ تھا اور کئی صاحبان بھی حکیم بدھن کو بے وقوف بنا کر جانے کا کرایہ وصول کر رہے تھے۔ کبھی کوئی آکر یہ کہہ دیتا کہ سارا گھر راضی ہے صرف خالہ اڑنگا لگا رہی ہیں۔ ان کے لئے جانا ضروری ہے دو روپے کرایہ کے دیدو کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ حکیم بدھن غریب سب سمجھتا تھا مگر بدھو بن جاتا تھا۔ ایک دن مجھے اپنی میز پر بلا کر کہا

"یار بہزاد! دن تو تمہارے ساتھ کٹ جاتا ہے۔ رات کمبخت کاٹے نہیں کٹتی۔ تم کو اس کا علم ہے میں آوارہ نہیں ہوں۔ اگر آوارگی پر اتر آؤں تو کمی نہیں مجھے تو ایک شریک حیات چاہیئے شریک نشاط نہیں"

میں نے کہا "بھائی بدھن مجھے تمہاری تکلیف کا مکمل احساس ہے۔ گھبراؤ نہیں جلد یا بدیر کوئی صورت ضرور نکلے گی"

مرد باید کہ ہراساں نہ شود
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود

وہ میری بات سے چپ تو ہو جاتا تھا لیکن آئے دن ٹھنڈا ... لگتا تھا۔ خریداروں سے بھی اب وہ کم التفاتی برتتے ... واقعات نتی دن ...

ایک دن صبح جو فیکٹری میں گئے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دور سے تین بار ہاتھ ملایا اور اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں آ کر ان کی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی حکیم بدھن نے ایک چھوٹا کاغذ نکالا اور کہا۔

"اس کو پڑھو یار اور مجھے بتاؤ کیا کروں؟"

میں نے اس کاغذ کو کھولا۔ تحریر صاف زنانی تھی مضمون کچھ یوں تھا۔

"اجی لے! تم کون ہو روز صبح صبح کہاں جایا کرتے ہو۔ صاف صاف لکھو تو میں تم کو اپنا حال سناؤں۔ اسکا جواب لکھتے لاؤ۔ دیوار سے ملا ہوا ایک لنگر تمھیں نظر آئے گا اس میں باندھ دینا۔ لیکن ذرا اِدھر اُدھر دیکھ کر۔ دن کے دس بجے آجانا"

میں نے کہا "یار یہ تحریر کہاں ملی؟"

بولے "بھیا کیا بتاؤں۔ میں روز گھر سے چھپداروں کے تکیے کی طرف ہوتا ہوا فیکٹری آتا ہوں آج ابھی ابھی ایک مکان کی پشتی دیوار سے یہ چھوٹا کاغذ ایک ڈھیلے میں بندھا ہوا میرے سامنے اوپر سے آ کر گرا۔ میں نے جھک کر اٹھایا اور اوپر نظر کی تو بھیا کیا بتاؤں۔ مر گیا تمھارا حکیم بدھن ہائے ہائے صرف ایک جھلک دیکھی تھی لیکن برا حال ہو گیا۔ وہ جلوہ ایکدم سے غائب ہو گیا۔ گلی تم کو معلوم ہے، بالکل سنسان رہتی ہے۔ میں نے وہ ڈھیلا کھول کر پھینک دیا اور اسکو پڑھ کے حیران رہ گیا"

میں نے کہا "مبارک ہو۔ میں نہ کہتا تھا بلبلیے تمھارا ارمان پورا ہو جائے گا"

وہ بولے "یار ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ ہاں ذرا جواب تو لکھو لیکن ذرا لکھنے میں ہاتھ روک کر۔ تمھارا جناتی خط ہے جو جنات ہی پڑھ سکتے ہیں۔ انسان تو پڑھ نہ پائیں گے"

یہ کہہ کر کئی ماہ بعد حکیم بدھن کا قہقہہ گونجا۔ میں نے کاغذ نکال کر سامنے رکھا اور حکیم بدھن نے بولنا شروع کیا۔

"میرا نام حکیم بدھن ہے۔ پاٹے نالے پر رہتا ہوں۔ بیوی مر چکی ہے۔ جو خدمت بھی ہو جان و دل سے حاضر ہوں"

میں نے ہاتھ روک کر ہر لفظ علیحدہ علیحدہ لکھ کر دیا۔ حکیم بدھن نے اس کی چھوٹی تہہ کرنے کے بعد گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ حکیم بدھن نے یہ تین گھنٹے کیونکر گزارے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اتفاق سے دس بجے تک کوئی خریدار بھی نہیں آیا۔ ٹھیک دس بجے حکیم بدھن باہر نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے فرنگی محل کے پل کی طرف چل دیے۔ کوئی ایک گھنٹے میں واپسی ہوئی چہرہ مارے خوشی کے دمک رہا تھا۔ آتے ہی مجھ سے بولے۔

"یار جب میں پہنچا تو ایک ڈور میں بندھا ہوا لنگر دیوار سے لٹک رہا تھا۔ میں نے ڈور کو تھام کر ایک ہلکی سی ٹھمکی دی اور پرچہ باندھ دیا۔ لنگر فوراً اوپر کھینچ لیا گیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں دیوار کے اوپر ایک چہرہ نظر آیا۔ بھیا بہزاد کیا بتاؤں! کیا حسن تھا۔ میں نے آج تک ایسی صورت نہیں دیکھی۔ بڑی بڑی آنکھیں ستواں ناک۔ کتابی چہرہ۔ پتلے پتلے ہونٹ غضب ڈھا رہے تھے۔ سب مجھے دیکھ کر ایک برقِ ستم مجھ پر یہ گرائی گئی کہ ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جب کوئی راہ گیر گزرتا تو میں زمین کی طرف جھک کر اس طرح دیکھنے لگتا گویا کوئی چیز گر گئی ہو اور میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کوئی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ چہرہ پھر دیوار پر نمودار ہوا اور لنگر نیچے لٹکا دیا گیا۔ اس میں یہ کاغذ بندھا ہوا تھا۔ میں نے وہ کاغذ کھول کر ہاتھ میں لے لیا اور ڈور کو ٹھمکی دی۔ لنگر پھر اوپر کھینچ لیا گیا۔ میں نے یہ کاغذ کھولا تک نہیں یہاں سیدھا تیر کی طرح آیا ہوں۔ بھیا ذرا کھول کر پڑھو تو۔ دیکھو کیا نوشتۂ تقدیر ہے"

میں نے اس کاغذ کو کھولا۔ کاغذ پر جا بجا عطر لگا ہوا تھا جس کے ہرے ہرے دھبے نمایاں تھے۔ خط کا مضمون اس طرح سے تھا۔

"حکیم صاحب میں بہت دکھیاری عورت ہوں۔ اگر آپ واقعی میری مدد کر سکتے ہوں تو مجھ سے اقرار کیجیے۔ ورنہ خدا کیلئے میرے ساتھ کھیلنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ اس خط کا جواب دوپہر کو ڈیڑھ بجے تک مجھے مل جانا چاہیئے۔ میں بہت ستائی ہوئی ہوں۔ ڈیڑھ بجے والے خط کا جواب چار بجے آ کے لے جائیے گا"

میں نے کہا "استاد تمھاری تو منہ مانگی مراد پوری ہو چکی ہے۔ بولو کیا جواب لکھوں۔"

میں نے کاغذ سامنے رکھ لیا۔ وہ بولے۔

"لکھو! میں خدا کی قسم کھا کر لکھ رہا ہوں کہ اگر میری جان بھی تمھارے کام آئے تو مجھے کوئی عذر نہ ہو گا۔ تم مجھ پر قطعی اعتبار کر سکتی ہو۔ انشاء اللہ مجھ سے دغا نہ پاؤ گی۔

تمھارا غلام۔ حکیم بدھن۔"

میں نے کہا "واہ بیٹا ابھی سے خطِ غلامی لکھے دیتے ہو" وہ قہقہہ مار کر بولے:۔

"یار اگر غلام سے گرا ہوا کوئی اور لفظ ہوتا تو وہ بھی میں لکھوا دیتا"

میں نے اپنی جان پر کھیل کر صاف صاف خط لکھا ورنہ میرا خط تو جیسا ہوتا ہے میں ہی جانتا ہوں۔ حکیم نے خط لیتے ہی کہا۔

"استاد چلو ذرا امین آباد حضرت گنج کی سیر کر آئیں اس فیکٹری میں تو وقت کاٹے نہیں کٹے گا"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "اس دوپہر میں تفریح کی سوجھی ہے۔ کچھ پاگل ہوئے ہو"

وہ بولے "استاد تم کسی پر عاشق ہو تو تم کو بیقراری کا پتہ چلے"

میں نے کہا "یہ عشقِ یک نظری آپ ہی کو مبارک رہے جناب والا"

نادر نہیں مانا۔ مجھے زبردستی ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا اور ایک جاتے ہوئے تانگے کو آواز دے کر اس پر بیٹھ گئے۔ نخاس سے امین آباد اور امین آباد سے حضرت گنج، حضرت گنج سے چھتر منزل ہوتے ہوئے نخاس کی واپسی میں بہرطور وقت کٹ گیا۔

ڈیڑھ بجنے میں کچھ منٹ تھے جب حکیم بدھن نے تانگہ فرنگی محل کے پل پر چھوڑ دیا اور مجھے لیے ہوئے چھپداروں کے تکیے کی طرف روانہ ہوئے۔ گلی کے آغاز پر مجھے اسی جگہ چھوڑا جہاں اس مکان کی پشتی دیوار صاف نظر آ رہی تھی۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ حکیم بدھن نے جاتے ہی وہ رقعہ لنگر میں باندھ دیا اور میرے پاس چلے آئے۔ ہم دونوں فیکٹری پہنچے جہاں تین چار خریدار ایک ساتھ موجود تھے۔ میں اور حکیم دونوں کام میں لگ گئے۔ آخری خریدار کو میں سودا دے کے حکیم بدھن ٹھیک سوا چار بجے چل دیے کوئی آدھ گھنٹے میں واپس آ کر بالکل میرے برابر آ کر بیٹھ گئے۔ اس

آخری خریدار مال لے کر جا رہا تھا اس کے جاتے ہی صاحب نے ایک کاغذ نکالا۔ یہ کاغذ بجائے پرزہ زے کے کاپی کا تھا۔ غالباً کسی اسکول کی کاپی سے ریا گیا تھا۔ میں نے کھولا۔ لکھا تھا۔

"حکیم صاحب آپ کے خط نے مجھے دوسری زندگی دی ہے۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ اگر آپ نے بھی میری مدد کر دی اور مجھ کو اس مشکل سے نکال لیا سا تا عمر آپ کی لونڈی بنی رہوں گی۔ اب میری بپت کا حال غور سے سنیے:

میرے ابو جانی کا نام منجو صاحب ہے اور وہ زرگری کا کام چوک میں کرتے ہیں مشہور آدمی ہیں، ان سے بہتر زرگر شہر میں کوئی اور نہیں ہے۔ میں نصیبوں جلی ان کی سب سے بڑی لڑکی ہوں میری ماں کا میری پیدائش کے بعد انتقال ہو گیا۔ میرے والد نے دوسری شادی کر لی جن سے دو بھائی اور دو بہنیں اور ہیں۔

جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو میری شادی میرے خالہ زاد بھائی کے ساتھ کر دی گئی۔ لیکن میری بدنصیبی کہ میرا دولہا جب بارات کے ساتھ جا رہا تھا تو میرے شوہر جس گھوڑے پر وہ دولہا بنے ہوئے سوار تھے، وہ گھوڑا آتش بازی کی وجہ سے بھڑکا اور وہ زمین پر گر پڑے اور گرتے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نصیبوں جلی کنواری ہی بیوہ ہو گئی۔ میرے ابو جانی پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔ ہمارے خاندان میں بیوہ کا عقد نہیں کرتے بلکہ برا سمجھتے ہیں میری دو پھوپیاں بھی جوانی میں بیوہ ہو کر گھر بیٹھی رہیں یہاں تک کہ مر گئیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں بیوہ ہو گئی اور آدھے راستے ہی سے میرا ڈولا واپس آ گیا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ میرے اوپر کیا بیتی ہو گی۔

دو سال کے بعد میرے والد کو ان کے خاص دوستوں نے مجبور کیا کہ وہ میرا عقد پھر کر دیں اس لئے کہ میں دراصل کنواری ہی ہوں اور ہوں گی کا ٹیکہ خواہ مخواہ میرے ماتھے پر لگ گیا ہے۔ وہ راضی تو نہیں البتہ مجبور ہو گئے۔ اب کے میری شادی ایسے رشتے دار کے ساتھ کی گئی جن کی پہلی بیوی مر چکی تھیں اور دو اولادیں تھیں۔ وہ بارات لے کر گھر آئے۔ نکاح ہوا اور نکاح ہوتے ہی، میری بدنصیبی ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ فوراً اسپتال پہونچائے گئے جہاں پہونچتے ہی انھوں نے مجھے تین طلاقوں کے علاوہ طلاق نامہ میرے والد کے پاس بھجوا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں منحوس ہوں اور واقعی طلاق پر دستخط کرتے ہی ان کا درد ایک دم سے جاتا رہا۔ اب حکیم صاحب میرے منحوس ہونے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔!

چنانچہ اس واقعہ کو پانچ برس ہو گئے ہیں، میں اپنے گھر میں بھی منحوس سمجھی جاتی ہوں۔ برادری میں منحوس اور محلہ بھر میں منحوس۔ لوگ میرے سائے سے بچتے ہیں۔ میں اوپر کے ایک کمرے میں تنہا زندگی کے دن گزار رہی ہوں میرے بھائی اور بہنیں میرے سائے سے بھاگتے ہیں۔ آنے جانے والے بچتے ہیں مجھے گھر کا بچا کچا کھانے کو دیا جاتا ہے اور پہننے کے لئے چھوٹی بہنوں کی اترن۔ میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں، موت مانگتی ہوں اور مجھے نہیں آتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ بولئے! آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھیے کہ دو شوہروں کو کھا چکی ہوں، نگل چکی ہوں، میں منحوس ہوں میرے دل بہلنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ میں اس دیوار سے گلی کا نظارہ کرتی رہوں میرے پاس کوئی آتا نہیں ہے اور نیچے جانے کا حکم نہیں ہے۔ گلی سے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بہل جاتی ہوں۔ آپ کو کئی مہینوں سے مسلسل صبح ادھر سے گزرتے دیکھ کر خدا جانے مجھے کیونکر ہمت ہوئی کہ میں نے آپ کو رقعہ لکھا۔ اب میری عزت آپ کے ہاتھ ہے۔ اس خط کا جواب مجھے کل مل جانا چاہئے خواہ وہ انکار ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کے انکار سے میرا دل ٹوٹنے کا نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں سو وہ پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا ہے۔"

حکیم بدھن نے خط ختم ہوتے ہی کہا۔

"استاد لکھو!" میں نے کہا۔

"یار تم جلد بازی سے کام نہ لو۔ پہلے سوچ سمجھ لو بھائی منجو صاحب زرگر کو تم بھی پہچانتے ہو میں بھی پہچانتا ہوں وہ انتہائی بدمزاج، بدزبان اور تھڑ چھوٹ آدمی ہے۔ سر بازار کسی کی عزت اتار لینا اس کے آگے کوئی بات نہیں ہے۔ اگر وہ صاحب کمال زرگر نہ ہوتا تو شاید۔ دمڑیوں کو ترستا"۔ حکیم بدھن نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"پھر جناب شاعر صاحب آپ کا مقصد کیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مقصد صرف اتنا ہے کہ اس خط کا جواب لکھوانے سے پہلے سوچ لو کہ کس مزاج کے آدمی سے نپٹنا ہے۔"

وہ میری بات سے جھلا گئے اور ناک پر انگلی رکھ کر مٹک کر بولے۔

"اوئی اللہ میں کیا مردوں میں آئی۔ اجی تم اپنا مشورہ دل کو ادھر ہی رکھو۔ میں ایسے ایسے منجو صاحب نہ جانے کتنے بڑے گھر بھجوا چکا ہوں۔ یہ میں کیا پدی کیا پدی کا شوربہ ہے؟"

میں نے ان کی اشیم دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھیا خفا ہونے کی بات کیا ہے۔ میں نے تو ذرا سی بات تم کو سمجھائی تھی۔"

وہ اسی تیور کے ساتھ بولے:۔

"گویا میں اندھا تھا اور جناب مجھے سمجھا رہے تھے اجی حضرت لکھیے جو میں لکھوا رہا ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا اور کاغذ پر قلم رکھ کر میں حکیم بدھن کی طرف دیکھنے لگا۔

"لکھو! پیاری بیگم۔ تمہارا پورا پورا حال پڑھ کر میں تمہارا اور بھی گرویدہ ہو گیا۔ تم بڑی، سیدھی اور نیک صورت ہو۔ تم اگر واقعی مجھ پر بھروسہ کرنے کا وعدہ کرو اور اس کی قسم کھاؤ کہ جیسا میں کہوں گا تم ویسا ہی کرو گی۔ تو میں اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے پندرہویں دن تم اس مصیبت سے نجات پا جاؤ گی۔ میں اپنی جان، مال، عزت آبرو سب تم پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔" ہمیشہ کیلئے تمہارا

حکیم بدھن

میں نے اس مضمون کو صاف صاف ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے لکھ دیا۔ حکیم بدھن مجھ سے خط لے کر چلے گئے اور تقریباً بارہ بجے آٹھ بجے فیکٹری میں آئے۔ میں گھر جانے کے لئے آخری چائے کی پیالی پی رہا تھا۔ آتے ہی میرے ہاتھ میں ایک کنجی پکڑاتے ہوئے بولے:۔

"بھیا کل صبح بجائے فیکٹری آنے کے تم سیدھے منجو صاحب زرگر کے مکان چلے جانا۔ ان کے مکان سے بالکل ملے ہوئے مکان میں بالو صاحب کرایہ دار رہتے ہیں۔ ابھی وہ کیا ہو رہے بالو صاحب! کہاں گئے؟"

میں نے گردن ہلا دی۔ وہ بولے۔
"وہ نیچے کے مکان میں کرائے پر رہتے ہیں۔ انھیں کے مکان کا اوپر کا حصہ خالی ہے۔ ان کے اور منجو صاحب کے دروازوں کے درمیان زینے کا دروازہ ہے جس میں قفل لگا ہوا ہے۔ تم اس کنجی سے قفل کھول لینا۔ ایک مزدور بھی پکڑ لے جانا اور اوپر کا کمرہ جس کے سامنے تھوڑا سا صحن ہے۔ ایک طرف باورچی خانہ غسل خانہ اور پاخانہ ہے، صاف کرا لینا۔ میں ابھی ابھی اس کا پیشگی دو ماہ کا کرایہ دے کر آ رہا ہوں۔ میں نے کرائے پر لے لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو کیا پاٹے نالے والا مکان چھوڑ رہے ہو۔۔۔!"

وہ بولے: "یار تم بھی بڑے گاؤدی ہو۔ پاٹے نالے والا مکان کیوں چھوڑ دوں گا۔ یہ تو میں نے مصلحتاً لیا ہے (میرے کان کے پاس منہ لگا کر) اس کمرے کی دیوار اور اس کمرے کی دیوار ایک ہی ہے جس میں زہرہ جبیں مشتری شمائل غنچہ دہن رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور جس کا نام بھی عاشق نامدار کو معلوم نہیں۔"

وہ چڑ کر بولے: "اجی تم کو اس سے کیا؟ مذہب عشق میں نام و نشان کی قید نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "بہتر ہے۔ انشاء اللہ میں مزدور کو وہاں صفائی کے لئے چھوڑ کر یہاں آ جاؤں گا۔"

وہ بولے: "یار بہزاد تم مجھے کھا جاؤ گے اگر تم کو ایک بات بتا دوں۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر کھا جانے دو۔ تمھارا نقصان کیا ہے!"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے:

"یار وہ کمرہ آسیب زدہ مشہور ہے۔ کوئی کرائے پر لیتا ہی نہیں ہے۔ خود مالک مکان کالے صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مکان آسیب زدہ ہے تم کیا کرو گے لے کر، وہاں کوئی ٹکتا ہی نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر تم نے کیا کہا؟"

بولے۔ "میں نے کہا کہ میں تو صرف کنکوا اڑانے کی مشق اس بالاخانے پر کروں گا۔ دن بھر رہوں گا رات کو خالی رہے گا۔ تب وہ راضی ہو گئے اور مجھے مکان کی کنجی حوالے کی۔ لیکن یار دو مہینے کا ایڈوانس کرایہ بھی لے لیا۔ آدمی چالاک ہے۔"

صبح سویرے ہی میں ایک مزدور کو لے کر جب اس بالاخانے کا دروازہ کھولنے لگا تو ابو صاحب شیدا باہر ہی کھڑے تھے۔ مجھ سے بولے:

"اجی بہزاد ۔۔۔ یہ تم اس بھوت خانے میں کہاں جا رہے ہو بھیا؟"

میں نے کہا۔ "حکیم بدھن نے کنکوے بازی کی مشق کے لئے اسے کرائے پر لیا ہے۔ دن بھر کنکوا اڑائیں گے۔ رات بھر خالی رہے گا۔"

وہ بولے: "خیر کوئی بات نہیں ہے لیکن میری طرف سے حکیم بدھن سے کہہ دینا کہ ہرگز ہرگز اس کمرے میں رات کے وقت قیام نہ کریں۔"

میں بہت اچھا کہتا ہوا اوپر چڑھا۔ یہ زینہ ایک صحن میں نکلتا تھا۔ چھوٹا سا صحن تھا جس کے ایک جانب باورچی خانہ، غسل خانہ اور پاخانہ تھا۔ صحن سے ملحق ایک کمرہ تھا جو کافی بڑا تھا اور ایک بغلی کوٹھری۔ مکان بہت صاف اور ہوادار تھا۔ مزدور کو بھی صرف گرد و غبار ہی جھاڑنا تھا وہاں کوڑا کرکٹ نام کو نہیں تھا۔ میں مزدور کو چھوڑ کر کیسے جاتا؟ آدھے گھنٹے میں اس نے پوری صفائی کر دی۔ میں نے اس کو مزدوری دی اور زینے کو مقفل کرتا ہوا جب چائے خانے پہنچا تو حکیم بدھن میری بری طرح سے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی بولے۔

"صفائی ہو گئی؟"

میں نے کہا "یار وہاں کوڑا کرکٹ نام کو بھی نہیں تھا۔ صرف گرد و غبار تھا۔ بھیا مکان بے حد صاف ستھرا تھا۔"

وہ بولے۔ "پڑوس کی برکت ہے شاعر صاحب۔"

میں نے کہا۔ "اب تو تمھیں وہاں کی ہر شے ہری ہی ہری نظر آئے گی۔"

انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ پڑھو! ہم نے بھی اب تک پڑھا نہیں ہے تمھارا پڑھنا میرے لئے مبارک ہوتا ہے۔" میں نے لے کر پڑھنا شروع کیا۔

"میرے اچھے حکیم صاحب! آپ کے خط نے میرے مردہ جسم میں جان ڈال دی ہے۔ میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ جو کچھ کہیں گے میں اس کے خلاف بالکل نہیں کروں گی۔ خواہ میرے خیال میں وہ بات صحیح نہ ہو۔ میں تمام زندگی آپ کی لونڈی بن کر آپ کے قدموں میں رہنے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ میں منحوس ہوں۔"

آپ کی ازلی کنیز ۔۔۔

پیاری بیگم ۔۔۔

حکیم صاحب نے خط کا مضمون سنتے ہی بھاؤ بتا بتا کر ناچنا شروع کر دیا۔ اس وقت خریدار بھی دو چار ہی تھے۔ مالک چائے خانہ ببّا صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"حکیم صاحب آج تو آپ بڑے بڑے ناچنے والوں کو مات کئے دے رہے ہیں۔"

وہ بولے۔ "اجی ببّا صاحب آج میں بے حد خوش ہوں اس لئے رقص کر رہا ہوں۔ ذرا دو پیالیوں میں ایک ایک چھٹانک بالائی ڈال کر بھجوا دیجئے تو۔"

چائے پیتے ہی حکیم بدھن نے کہا۔

"بہزاد بھیا۔ خدا تمھیں سلامت رکھے۔ ذرا لکھو تو:

"پیاری بیگم۔ تمھارا محبت نامہ کیا تھا میرے لئے آبِ حیات تھا۔ میں بھی محبت کا بھوکا ہوں۔ محبت مجھے آج تک نصیب ہی نہیں ہوئی۔ تم آج سے اپنے کو کبھی منحوس نہ سمجھنا اور نہ لکھنا۔ تمھارے دشمن منحوس ہوں گے۔ میں نے تمھارے بالکل برابر والا بالاخانہ جو بھوتوں کا کوٹھا کہلاتا ہے کرائے پر لے لیا ہے۔ تم گھبراؤ نہیں مجھ سے بڑے بھوت نہیں ہوں گے جو وہاں قابض ہیں۔ تم اس دیوار پر کھڑی ہونے کی کوشش کرو جو اس مکان اور بالاخانے کے صحن میں حائل ہے یعنی پردے کی دیوار۔

انشاء اللہ اب خود باتیں ہوں گی۔ اپنے گھر میں سنانے کا وقت مجھے بتا دو۔ میں آج دوپہر تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔

تمھارا غلام ۔ حکیم بدھن"

میں نے کہا ۔۔۔ "یار یہ لفظ غلام لکھتے ہوئے مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

وہ بولے ۔۔۔ "بھیا یہ لکھنؤ ہے۔ یہاں تو رئیس معشوق کے وقت سالیاں کہلواتی ہیں۔" بیوی آنکھیں کھولو میں تمھارا غلام ہوں۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی اس قدر گرا ہوا انداز سے اچھا نہیں ہے۔"

[illegible] میں

[illegible] میرا پیغام [illegible]

میں نے کہا: واہ بیٹا!

وہ بولے: آج چھوڑو یہ مذاق۔ ذرا جلدی سے فیشن والی گلی میں جو دوکان ہے جمو صاحب کی وہاں سے دو نواڑی پلنگ، دو دریاں، دو چاندنیاں، دو گاؤ تکیے، ایک اگالدان لے کر بالاخانے پہونچ لو۔ میں یہ خط دیتا ہوا کورے گھڑے، صراحیاں اور آبخورے اکبری دروازے سے لیتے ہوئے پہونچتا ہوں۔"

میں فوراً روانہ ہو گیا۔ جب جمو صاحب کو پتہ بتا کر بالاخانے پہنچا تو حکیم بدھن گھڑے صراحیاں اور آبخورے لئے ہوئے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ کنجی میرے پاس تھی۔ ہم دونوں اوپر سامان رکھ ہی رہے تھے کہ ٹھیلے پر نواڑی پلنگ اور دریاں وغیرہ بھی آگئیں۔ حکیم بدھن نے ٹھیلے کے مزدوروں کی مدد سے کمرے میں دریاں اور چاندنیاں بچھوائیں۔ پلنگ دونوں جانب لگنے سے کمرہ اچھا بھلا معلوم ہونے لگا۔ مجھے پلنگ پر بٹھا کر حکیم بدھن نے کہا۔

"استاد اب صبح سویرے چائے خانے میں پھیرا کرتے ہوئے یہاں آجایا کرو۔"

میں نے کہا: "اور خریداروں کا کیا ہوگا؟"

بولے۔ اس کا انتظام میں کروں گا۔ دن کے دس بجے تک میں خریداروں کے آرڈر لے آیا کروں گا۔"

میں نے کہا: "اچھی بات ہے۔"

وہ بولے: "ذرا میں اپنے خط کا جواب لے آؤں۔ یہی وقت دیا ہے۔"

یہ کہہ کر حکیم بدھن چلے گئے۔ معاملہ کچھ دور کا نہیں تھا۔ کوئی پندرہ منٹ میں اکڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے میں سمجھ گیا کہ جواب لے آئے ہیں۔ میں نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لے کر کھولا۔ لکھا تھا۔

میرے دل و جان کے مالک حکیم صاحب! تم نے غضب کر دیا کہ بھوتوں والا بالاخانہ کرائے پر لے لیا ۔۔۔ مجھے ہول ہو رہی ہے۔ خدا نہ کرے تم پر کچھ ہو جائے لیکن دیکھو شام کو یہاں کبھی قیام نہ کرنا۔ دن بھر کوئی بات نہیں ہوتی ہے بھوت حملہ نہیں کرتے۔ اب سنو!

ابا جانی صبح سات بجے اپنی گٹھری لے کر چوک چلے جاتے ہیں اور رات کو آٹھ بجے آتے ہیں۔ میری سوتیلی ماں بہری ہیں۔ جب تک کوئی چیخ چیخ کر نہ کہے وہ کچھ سنتی ہی نہیں ہیں۔ خدا کرے اور بہری ہو جائیں۔ میرے دونوں بھائی لنگاڑے ہیں۔ ابو جانی کے جاتے ہی گھر سے گوشت ترکاری دے کر نکل جاتے ہیں۔ مارے مارے پھرتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے نہیں ہیں۔ دوپہر میں آکر ابو جانی کو کھانا پہنچا کر خود کھانا کھا لیتے ہیں اور پھر دن بھر کے لئے غائب ہو جاتے ہیں۔ میری دو بہنیں برابر میں خالہ جان (ان کی خالہ) کے یہاں جا کر سینا پرونا سیکھتی رہتی ہیں اور وہاں کام کاج کرتی ہیں۔ شام کے وقت آتی ہیں۔ یہاں بالکل سناٹا رہتا ہے۔ میری تمہاری گفتگو سننے والا کوئی نہیں ہے۔ پردے کی دیوار ذرا اونچی ہے میں اینٹیں جمع کر کے چبوترہ بنا رہی ہوں۔ دن کے دو بجے تک اگر چبوترہ بن گیا تو دیوار پر کھڑی ہو جاؤں گی۔"

تمہاری۔ پیاری بیگم۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ حکیم بدھن کا برا حال تھا۔ وقت گزاری کے لئے پریشان تھے۔ اتنے میں ان کا ملازم چائے کا اسٹوو، پیالیاں اور چائے شکر لے کر آگیا۔ چائے کا دور شروع ہو گیا۔

حکیم بدھن رہ رہ کر گھڑی دیکھنے لگے۔ نوکر چائے بنا کر پلٹ گیا اور وہاں سے کھانا لے کر تقریباً ایک بجے پلٹا۔ حکیم بدھن سے کھانا بھی صحیح طور پر کھایا نہیں گیا۔ میں تو مزے سے کھاتا رہا۔ کھانے کے دوران میں نے کہا۔

جناب حکیم صاحب قبلہ! کیا مرضِ عشق میں بھوک بھی اڑ جاتی ہے؟"

وہ جل کر بولے۔۔۔

"جی نہیں مرضِ عشق میں آدمی اتنا کھاتا ہے جتنا ایک ہاتھی۔"

میں نے کہا: "سبحان اللہ کیا تحقیق ہے۔"

وہ جل کر بولے۔

"یار ایک تو مجھ سے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے دوسرے تم مجھے آگ جلا رہے ہو۔"

کھانا ختم ہوتے ہی نوکر کو روانہ کرنے کے بعد حکیم بدھن نے مجھ سے کہا۔

"یار تم کمرے میں چھپ جاؤ۔۔۔ کہیں تمہیں دیکھ کر وہ خفا نہ ہو جائیں۔"

[illegible] ایک چہرہ دیوار پر ابھرا یقین مانئے بلا کا حسن تھا۔ عجیب کشش اور معصومیت تھی اس چہرے میں۔ حکیم بدھن کا دیکھتے ہی برا حال ہو گیا۔

میں دروازے کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں میں گفتگو شروع ہوئی۔ یہ اتنی آہستہ ہو رہی تھی کہ سوائے کھسر پھسر کے میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی حکیم کی ملتجیانہ صدا سنائی دے جاتی تھی اور کبھی مساۃ کی دلبرانہ صدا۔ میں کوفت کھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ خدا جانے کب تک گفتگو ہوتی رہی غالباً میں سو گیا تھا۔ حکیم بدھن نے مجھے جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہا۔

"یار بہزاد میں تو اب بالکل ہی مر گیا۔"

میں نے کہا: "بھیا کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ اچھے خاصے بحمد اللہ زندہ سلامت موجود ہو۔"

"یار مرنے سے میرا مقصد تمہاری طرح فریفتہ ہونا یار تم شاعر کیسے ہو۔ ایسا سادہ محاورہ سمجھ میں نہیں آتا۔" حکیم بدھن مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

میں نے کہا: "یہ محاورے بازی چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا بھگانے کا ارادہ ہے؟"

حکیم بدھن کا چہرہ ایک دم غصے سے لال ہو گیا اور بولے: "کہیں شریف کسی کی بہو بیٹی کو بھگاتے ہیں جو میں بھگاؤں گا۔"

میں نے کہا۔۔۔ پھر ان مساۃ کے حصول کی کیا صورت ہوگی۔ تم تو مر چکے ہو۔ آخر تمہیں جلانے کے لئے کوئی شکل نکلے گی یا نہیں؟ کیا پیام دلاؤ گے ان کے والد کو؟"

بولے: "یار وہ بڑا ضدی آدمی ہے۔ بقول تمہارے زبان کا بھی پھوہڑ اور ہاتھ کا بھی خراب۔ وہ میرا خیال ہے مانے گا نہیں۔"

میں نے پوچھا: "پھر!"

بولے: "یار مجھے کوئی نسخہ لکھنا پڑے گا۔ نسخہ سمجھ میں آگیا ہے بتاؤں گا نہیں۔ میرے ساتھ چلو اب شام کو پانچ بجے سے پہلے وہ جلوہ نظر نہیں آنا ہے۔"

میں مکان میں قفل لگا کر حکیم بدھن کے ساتھ نکلا حکیم بدھن سیدھے نخاس پہونچے۔ امریکن مشن اسکول کے سامنے کپڑے والوں کے لاتعداد کیبن تھے۔ حکیم بدھن نے ایک دوکان سے پانچ گز پھوٹ کا شرعی کپڑا خرید اور

ڈھائی گز جیسکا اور تین گز کا بنارسی دوپٹہ۔
میں نے حیرت سے پوچھا: "یہ کپڑا کیا ہوگا؟"

وہ بولے ــــ "دلہن کا سوٹ بنے گا!"
میں نے پوچھا: "کس کی دلہن!"
بولے: "حکیم بدھن کی دلہن۔" یہ کہہ کر ایک بے اختیار قہقہہ مارتے ہوئے بولے۔
"یار بہزاد تم بھی یوں ہی رہے۔ بھیا میرے نسخے کی تم نے ابھی چند ہی دوائیں دیکھی ہیں۔ آگے آگے دیکھتے جاؤ اور ہاں سیدھے علی حسن درزی کے چلو۔ آج سے پانچویں دن مجھے یہ جوڑا تیار ملنا چاہیئے۔"
میں کیا کہتا۔ عدیا گنبرن کی گلی میں علی حسن درزی کی دوکان پر کپڑے پہونچ گئے۔ منہ مانگی مزدوری طے ہوگئی۔ اب حکیم بدھن مجھے لئے ہوئے سیدھے قصائیوں کی مسجد گئے۔ میں حیران حیران ان کی کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ مسجد کے پیش امام ایک صوفی جی تھے۔ ان سے آج سے پانچویں دن ظہر و عصر کے درمیان نکاح پڑھنے کا وعدہ لے کر آگے بڑھے۔ اب ان کا رخ مخصوص خریداروں کے گھر کی طرف تھا۔
بھیا ندرت، جناب اختر، جناب تاباں، جناب تیر کے مکانوں پر دس دس منٹ ٹھہر کر ان سے وعدہ لیا کہ وہ آج سے پانچویں دن یعنی جمعرات کو ظہر اور عصر کے درمیان بالاخانے پر پہونچ جائیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا اور میں نے کہا۔
"یار یہ کیا ترکیب کر رہے ہو؟"
بولے "دیکھتے جاؤ۔ ابھی مجھ سے پوچھو نہیں۔"
وہاں سے سیدھے امین آباد کا رخ کیا۔ دیانند پارک کے اب جھنڈے والا کے قریب نصیر الدین فوٹو گرافر کو بھی بالاخانے جمعرات کے دن بلا کر پلٹے اور ٹھیک پانچ بجے بالاخانے پہونچ گئے، جہاں جلوہ پہلے ہی سے منتظر تھا۔ مجھے کمرے میں دھکا دے کر پھر کھسر پسر شروع ہوگئی۔ میں تو یہ مطلع پڑھتا رہا ـــ

نہ دیکھا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

شام ہوتے ہی حکیم بدھن مجھے بالاخانے سے سیدھے بالاخانے پہونچ گئے غریبوں کے اکثر پرچوں کی صورت محمد بنا صاحب نے دیدئے۔ اب میرا کام شروع ہوگیا۔ میں نے تو بالاخانے جانے سے انکار کر دیا۔ حکیم بدھن صبح سے شام تک بالاخانے پر پڑے رہنے لگے۔ لیکن پٹھے نے مجھے ذرہ برابر بھی کسی معاملہ کی بھنک تک نہ دی۔
جمعرات کے دن صبح سویرے ہی سویرے حکیم بدھن میرے گھر آگئے اور مجھے لئے ہوئے سیدھے بالاخانے پہونچے۔ ناشتہ بالاخانے ہی پر تیار ہوا۔ حکیم بدھن نے خود اپنے ہاتھوں کا کمال دکھایا۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ مجھے لے کر زینے سے نیچے اترے۔ منو صاحب زرگر کے دروازہ پر شکرم کھڑی تھی اور منو صاحب ساٹن کی پھولدار شیروانی میں عجیب سے لگ رہے تھے۔ شکرم میں زنانی سواریوں کو چڑھا کر منو صاحب نے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ اور خود شکرم کے اندر بیٹھ کر روانہ ہوگئے ـــ
میں نے کہا۔
"یہ کیا۔ کیا گھر میں کوئی نہیں رہا جو باہر سے مقفل کر گئے؟"
بولے "نہیں۔ گھر میں وہ جان جہاں، دل آرام مہ ملا فتنہ انگیز، سراپا قیامت موجود ہے۔ خدا غارت کرے اسکو۔ ان کو منحوس سمجھ کر چھوڑ گیا ہے۔ یہ سارا گھر ایک شادی میں گیا ہے اور رات کو دس بجے پلٹے گا۔"
میں نے پوچھا "کیا تم کو اس پروگرام کا پہلے ہی سے علم تھا؟"
وہ بولے۔ ہاں مجھے انھوں نے پہلے بتا دیا تھا، اور دیکھو میں تو علی حسن کے ہاں سے جوڑا اور پھول والی گلی سے پھولوں کا گہنا لینے جا رہا ہوں۔ رمضانی (ملازم) ایک سیڑھی لے کر آئے گا تم اس کو لے کر اوپر ایک طرف رکھ دینا۔"
میں نے کہا "استاد نقل اور چھوارے نہ بھولنا۔"
بولے "واللہ خوب یاد دلایا ـــ مجھے تو خیال بھی نہیں رہا تھا۔"
حکیم بدھن گلی کے نکڑ تک پہونچے ہوں گے کہ رمضانی ایک سیڑھی لئے ہوئے آیا۔ میں نے سیڑھی اس سے لے کر اسے رخصت کر دیا۔ میں نے جوں ہی سیڑھی ایک طرف رکھی کہ ایک آواز آئی۔
"اے حکیم صاحب!"
میں نے کہا۔ "حکیم صاحب کام سے گئے ہوئے ہیں میں بہزاد بول رہا ہوں۔ فرمائیے!"
وہ بولیں "آداب عرض ہے بھائی بہزاد۔ آپ کا ذکر وہ بہت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میرا واحد دوست ہے۔"
میں نے کہا: "یہ ان کی بندہ نوازی ہے۔"
وہ بولیں "اے بھائی مجھے تو یقین نہیں آتا ہے جو کچھ حکیم صاحب نے مجھ سے کہا ہے اس پر۔"
میں نے کہا: "بھابی آپ خدا کے لئے یقین کر لیجئے وہ ایسا ہی آدمی ہے۔ جو کہتا ہے اسکو پورا کرتا ہے۔"
وہ بگڑتی ہوئی بولیں "یہ آپ نے مجھے بھابی کیسے کہا بہزاد صاحب؟"
میں نے کہا "اب نہیں تو تھوڑی دیر بعد مجھے اسکے کہنے کا حق ہو جائے گا۔"
وہ ٹھنک کر بولیں "اے آپ مذاق کرتے ہیں دیکھئے جیسے ہی وہ آجائیں ذرا آپ زور زور سے رمضانی رمضانی پکار دیجئے گا۔ میں سمجھ جاؤں گی کہ وہ آگئے ہیں۔"
کوئی گیارہ بجے حکیم بدھن لدے پھندے ہوئے پہونچے۔ کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرنے کے بعد بولے۔
"یار اب اس قیامت کو کیونکر بلاؤں؟"
میں نے کہا ـــ "قیامت کو میں آواز دیئے دیتا ہوں۔" میں نے رمضانی رمضانی زور زور سے کئی بار پکارا۔ اتنے میں اوپر سے آواز آئی۔
"اے کیا آگئے وہ بھائی بہزاد؟"
میں نے کہا "جی ہاں!"
حکیم بدھن نے فوراً کہا "بیگم میں سیڑھی ادھر لگا رہا ہوں۔ ادھر تم چبوترے پر کرسی رکھ کر آجاؤ اور سیڑھی کے ذریعے ادھر اتر آؤ۔ میں بہزاد کو ہٹائے دے رہا ہوں۔"
آواز آئی "اے ان سے کیا پردہ۔ میں تو انکو بھائی کہتی ہوں۔"
حکیم بدھن نے دیوار سے سیڑھی لگادی اور وہ حکیم بدھن کی قیامت سیڑھی سے اترتے ہوئے ادھر آگئی۔ میں حیران رہ گیا۔ آپ یقین جانیئے ایسا سڈول جسم

[illegible] سے کہہ رکھی تھی۔ کپڑے انتہائی بوسیدہ اور پرانے تھے۔ حکیم بدھن نے کہا:

"بیگم کمرے میں جا کر پہلے جوڑا بدل لو۔ پھولوں کا گہنا پہن لو۔ کپڑے کے نیچے آئینہ، کنگھا، تیل کی شیشی اور عطر کی شیشی ایک دفتی کے ڈبے میں موجود ہے۔ ایک بجے میرے مہمان آجائیں گے۔"

یہ کہہ کر حکیم بدھن پھر چلے گئے اور ایک مزدور کے ذریعے دو دریاں، دو چاندنیاں، اور ایک گاؤ تکیے کر گئے۔ ہم دونوں نے مل کر فرش کمرے کے آگے صحن میں بچھا لیا۔ تقریباً ایک بجے چاروں خریدار آگئے اور ان کے پیچھے ہی صوفی جی بھی تشریف لے آئے ان کے ہاتھ میں نکاح نامے کا رجسٹری کا غذ دبا ہوا تھا۔ صوفی جی کے بیٹھتے ہی حکیم بدھن بولے۔

"حضرات میں ایک نکاح کر رہا ہوں جس مساۃ کے ساتھ نکاح ہو رہا ہے وہ بالغ ہے عمر بیس اکیس سال کی ہوگی۔ ان کے والد مر چکے ہیں لہٰذا بھائی بہزاد کی وکالت اور بھیا ندرت اور تاباں کی گواہی میں یہ نکاح صوفی صاحب پڑھائیں گے۔ میرے ایجاب و قبول کے گواہ بھائی احقر اور نیر ہوں گے۔ ہاں بھائی بہزاد تم ندرت اور تاباں کو لے کر ایجاب و قبول کروالو۔"

مجھے کرنا ہی کیا تھا۔ کمرے کے درمیانی دروازے کے پاس جا کر میں نے کہا۔

"مساۃ پیاری بیگم۔ بنت منجھو صاحب، ہم نے آپکا نکاح سید مرتضےٰ حسین عرف حکیم بدھن ولد عالی جناب حکیم اولاد حسین سے بالعوض مہر چھ ہزار روپے سکہ رائج الوقت، کردیا۔ آپ کو قبول ہے"!

اندر سے آواز آئی۔

"مجھے قبول ہے۔"

تین بار ایجاب و قبول کے بعد صوفی جی کے پاس آیا۔ انھوں نے خطبۂ نکاح پڑھنے کے بعد حکیم بدھن سے کہا۔

"سید مرتضےٰ حسین عرف حکیم بدھن ولد جناب حکیم اولاد حسین صاحب۔ ہم نے آپ کا نکاح نامہ مساۃ پیاری بیگم بنت جناب منجھو صاحب کے ساتھ بالعوض مہر چھ ہزار روپے سکہ رائج الوقت کردیا۔ آپ نے قبول کیا؟"

حکیم بدھن کے تین بار اقرار کے بعد دعا ہوئی۔

میں نے چھوارے لٹا دیے۔ اس کے فوراً بعد ہی ایک گروپ فوٹو نصیر الدین فوٹو گرافر نے کھینچا جس میں درمیان میں دولہا دلہن اور ادھر اُدھر ایک گواہ اور دو وکیل تھے۔ فوٹو کے بعد سب نے حکیم بدھن کو بڑھ بڑھ کر مبارکباد دی اور رخصت ہوگئے۔ چلتے وقت حکیم بدھن نے صوفی جی کو کیا نذر کیا مجھے معلوم نہ ہوسکا۔ پھر ان سب کے جاتے ہی حکیم بدھن نے کہا۔

"بھیا کسی مزدور پر یہ دریاں، چاندنیاں اور گاؤ تکیے تم جھمو صاحب کی دوکان پر پہنچوا دو اور چائے خانے چلے جاؤ۔ ٹھیک پانچ بجے پہونچ لینا۔"

میں چلا گیا۔ شام کو پانچ بجے جب میں پلٹ کر یہاں آیا تو بھابی سیڑھی پر چڑھ کر اپنے گھر میں اتر رہی تھیں اور انھوں نے اپنے پرانے کپڑے پھر پہن لئے تھے۔

میں نے انکے جانے کے بعد کہا۔

"بھیا مبارک ہو تمھارا داغِ یتیمی دھل گیا" وہ قہقہہ مارتے ہوئے بولے۔

"استاد زندگی میں ایک جملہ تم نے شاعرانہ بولا ہے۔ ورنہ جیسے تم سوکھے سڑے شاعرانہ مزاج کے آدمی ہو وہ میں ہی جانتا ہوں۔"

میں نے کہا "خیر اپنی دریافت تو اپنے پاس ہی رکھو اس ایک روزی نکاح سے کیا فائدہ ہوگا تم کو۔؟ کیا یہ دیوار بازی ہر روز رہے گی۔"

وہ بولے "تم دیکھتے جاؤ۔ میں اپنی اسکیم قبل از وقت کبھی ظاہر نہیں کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "بہتر ہے، اپنی اسکیم کو اپنے قلب مبارک کے گوشے ہی میں محفوظ رہنے دو۔"

ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا۔ عام طور پر چوں دوپہر حکیم بدھن زیر سایہ دیوار ایستادہ رہتے۔ اور انکی زوجہ محترمہ بالائے دیوار ایستادہ رہتیں۔ کھسر پسر ہوا کرتی اور یوں دن تمام ہو جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حکیم بدھن اپنا گھر بسائیں گے کیونکہ بھابی کے والد منجھو صاحب نوکر بلا کے بدزبان، منہ پھٹ اور بلانے بے دریاں قسم کے آدمی تھے۔ حکیم بدھن کو بھی میں نے اس تمام ہفتے فکرمند ہی دیکھا۔ چائے خانے میں وہ کھوئے کھوئے سے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دن مجھ سے بولے۔

"کل صبح تم بانکے مہتاب کے گھر چلے جانا۔ وہ تم کو منجھو صاحب کے گھر لیجائیں گے۔ تم اپنے ساتھ نکاح کا گروپ فوٹو اور نکاح نامہ لیتے جانا۔"

میں نے کہا "استاد مجھے کیوں گالیاں کھلوانے کا ارادہ کر رہے ہو۔ منجھو کم از کم مجھے بخشنے والا نہیں ہے۔"

وہ بولے "استاد تم مجھ پر اعتماد کرو۔ انشاء اللہ تم کامیاب ہی پلٹو گے۔ تم کو صرف اتنا معلوم ہے کہ بانکے مہتاب علی فیکٹری کے مستقل گاہک ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ تمھاری بھاوج پیاری بیگم کے سگے نانا ہیں۔"

میں نے کہا "اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں چلا جاؤں گا۔"

صبح بجائے فیکٹری جانے کے میں سیدھا بانکے مہتاب علی صاحب کے ہاں پہنچا۔ لکھنؤ میں اس دور میں یہی ایک بانکے باقی رہ گئے تھے جن کی دھونس ہر شخص مانتا تھا۔ حالانکہ آج تک بانکے مہتاب علی نے کوئی شورہ پشتی، کوئی دھن دھونکڑی کہیں نہیں کی تھی۔ شاعر تھے اور لٹھ مار شاعر۔ وہ گھر پر میرے منتظر تھے۔ ساٹن کی پھولدار شیروانی، اسی کپڑے کی دو پلی ٹوپی اور چوڑی دار پاجامے میں ان کا بھاری بھرکم جسم بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک موٹا سا روغنی ڈنڈا تھا جس پر چاندی کی شام چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"آؤ بھیا بہزاد میں تمھارا ہی منتظر تھا کہ آج پہلی مرتبہ تمھارے ساتھ اس بدمعاش منجھو کے ہاں چل رہا ہوں۔ میں زندگی میں کبھی نہ جاتا۔ لیکن حکیم بدھن نے مجھے مجبور کردیا۔"

میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ گلیوں گلیوں کوئی پندرہ منٹ میں منجھو صاحب کا مکان آگیا۔ بڑا پکا بالاخانہ بند تھا۔ غالباً حکیم بدھن نہیں آئے تھے۔ ان کی آواز پر دروازہ کھلا اور منجھو صاحب کا چہرہ بانکے مہتاب علی کو دیکھتے ہی اتر گیا۔ وہ گھبرا سے گئے اور بولے۔

"حضور نے بڑا کرم فرمایا۔ میں ابھی بیٹھک کھولتا ہوں۔"

کوئی دو منٹ کے بعد بیٹھک کھل گئی۔ اندر [illegible]

پلنگ اور تیمچہ جلا کر سامان پڑی ہوئی تھیں بانکے کرسی

پر بانکے مہتاب علی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"منجھو! میں زندگی میں پہلی بار تمہارے یہاں آیا ہوں

اس مرتبہ مجھ سے ہوش میں رہ کر گفتگو کرنا۔ میں انسان

کو انسان بنانا جانتا ہوں۔"

منجھو صاحب نے کہا۔

"آپ میرے بزرگ ہیں میری کیا مجال کہ آپ کے

سامنے گردن بھی اٹھا سکوں۔ انشاءاللہ جو کچھ ارشاد ہوگا

اس کی تعمیل ہوگی۔"

وہ بولے۔ "اور اگر نہ ہوگی تو آج یہ ڈنڈا ہوگا

اور دوسرے کا سر۔"

منجھو صاحب کے چہرے پر بھی غصے کے آثار رونما

ہوئے لیکن وہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

"ارشاد۔"!

بانکے نے کہا۔ "تم میرے زبردستی کے داماد ہو۔

میں نے خوشی سے تم کو اپنی بیٹی نہیں دی تھی۔"

منجھو صاحب نے دبی زبان سے کہا۔

"حضور وہ بات تو پرانی ہو چکی ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "تمہارے لئے پرانی ہوگی میرے

لئے وہ ہمیشہ ہی نئی رہے گی۔ تم کو معلوم ہے کہ میرے

خاندان میں بھی بیوہ کا دوسرا عقد جائز نہیں ہوتا سوہ

تا زندگی میکے یا سسرال میں شوہر کے نام پر بیٹھی۔"

منجھو بولے۔ "جی ہاں میرے خاندان کی بھی

یہی آن ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "میرے پہلے داماد کے انتقال

کے بعد میری اکلوتی بیٹی جانی بیگم گھر بیٹھی ہوئی تھی۔

کل دو سال ہی گزرے تھے کہ تم نے خدا جانے کیونکر اس

کو دیکھ لیا اور اس کی خالہ کے ذریعے سے اس کو ہموار

کیا اور اس کی خالہ کے گھر پر بغیر میری اطلاع کے تم نے

میری بیٹی سے نکاح کر لیا تھا۔"

منجھو صاحب نے کہا۔ "حضور یہ پرانی باتیں آپ

کیوں دہرا رہے ہیں۔ ان بیچاری کا انتقال بھی ہو چکا

ہے۔ اس گفتگو سے ان کی روح کو صدمہ پہونچے گا۔"

بانکے نے کہا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو

سنتے جاؤ۔ اور یاد رکھو جو ہوا کرتا ہے وہ اس دنیا میں

اس کو ویسا ہی پھل ملتا ہے۔ بالکل ویسا ہی۔"

منجھو نے کہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

بانکے نے کہا۔ "سمجھ جاؤ گے۔ میری مرحوم بیٹی کے

بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام پیاری بیگم ہے۔

جو میری نواسی ہے۔ میرا خون ہے۔ میری مرحوم بیٹی کی

نشانی ہے۔"

منجھو بولے۔ "بحمداللہ موجود ہیں۔ میں پردہ کرائے

دیتا ہوں۔ حضور مل لیں۔"

وہ بولے۔ "مل لوں گا۔ جلدی نہیں ہے۔ سنتے جاؤ

میرے سننے میں آیا ہے کہ تم نے اس کا ایک نکاح کیا

اور وہ بارات کے دن ہی بیوہ ہو گئی۔ پھر اپنی خاندانی آن

توڑ کر تم نے اس کا دوسرا نکاح کیا۔ اور وہ بھی دو گھنٹوں

کے بعد طلاق پر تمام ہو گیا۔"

منجھو بولے۔ "جی ہاں۔ بدنصیب لڑکی ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "اس کے بعد میری نواسی میری اکلوتی

بچی کی واحد نشانی، تمہارے ہاں منحوس قرار دے کر ایک

کمرے میں قید تنہائی کی زندگی گزار رہی ہے۔ تم اس کو

جھوٹا کھانا اور پہنے ہوئے کپڑے دیتے ہو۔ اس سے

کوئی بات کرنے کا روادار نہیں ہے۔ اس کا تم کو کب

حق ہے۔"!

منجھو بولے۔

"جناب والا۔ اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ اس کو سب

کے سب ہی منحوس خیال کرتے ہیں۔ خاندان بھر میں کوئی اسکی

پرچھائیں کا بھی روادار نہیں ہے۔ میں سب کے دل کیونکر

بدل سکتا ہوں۔"

بانکے نے کہا۔ "اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ گھٹ گھٹ

کر مر جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب سنو! تم اس کا نکاح

کرنے پر تیار ہو یا نہیں۔"

منجھو صاحب نے کہا۔ "بالکل نہیں۔"

بانکے نے کہا۔ "بہتر ہے۔ جس طرح اس کی ماں نے

بغیر اپنے باپ کی مرضی کے تمہارے ساتھ خود نکاح کر لیا تھا

اسی طرح اگر پیاری بیگم کر لے تو تم کو کوئی عذر ہوگا۔"؟

وہ بولے۔ "جناب والا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میرے

یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔"

بانکے نے کہا۔ "اور اگر ایسا ہو گیا ہو تو۔"؟

منجھو کے چہرے پر غیظ کے آثار جھلکنے لگے اور بولے

"ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو گیا ہے تو مجھے کیا

انکار ہو سکتا ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "جس طرح میں نے اپنی لڑکی کے معاملے

میں تمہارے ساتھ کوئی فساد نہیں کیا۔ تم کو بھی اپنی لڑکی کے

معاملے میں ایسا ہی کرنا ہوگا۔"

وہ بولے۔ "جناب آپ کی بات میری سمجھ میں

نہیں آ رہی ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "تو سنو! تمہاری لڑکی یعنی میری

نواسی پیاری بیگم نے اپنا عقد خود حکیم بدھن کے ساتھ کر لیا

ہے۔" اب تم کیا کہتے ہو۔؟

منجھو نے غصے میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "نکاح

کر لیا ہے، حکیم بدھن کے ساتھ۔ اس کا ثبوت دیجئے۔ مجھے

کوئی عذر نہیں۔ زبانی باتوں کا میں قائل نہیں ہوں۔

رہے حکیم بدھن۔ ان کو میں خوب جانتا ہوں۔ گو صاحب

سلامت نہیں ہے، آدمی اچھے، کماؤ اور خاندانی ہیں۔"

بانکے مہتاب علی نے جیب سے نکاح نامہ لے کر

سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کو پڑھو۔" منجھو صاحب نے اس نکاح نامے

کو پڑھنے کے بعد کہا۔

معاف فرمائیے گا۔ اس قسم کے نکاح نامے جتنے

آپ کہیے میں آپ کو بنا کر دکھا دوں۔ گواہ یقیناً سب

کے سب شریف ہیں، معتبر ہیں، قاضی بھی معتبر ہیں، لیکن

اس کا کیا ثبوت ہے کہ پیاری بیگم بنت منجھو صاحب

کسی اور عورت کا نام نہیں ہو سکتا، میری ہی بیٹی کا نام

ہے۔ قاضی اور گواہ صرف نام سنتے ہیں صورت نہیں

دیکھتے۔"!

بانکے مہتاب علی نے جیب سے نکال کر گروپ فوٹو کو

سامنے رکھا اور کہا۔

"اب اس تصویر میں دیکھ لو۔ دلہن میری نواسی، اور

میری بیٹی پیاری بیگم ہی ہے یا کوئی اور ہے۔"

گروپ فوٹو دیکھ کر منجھو صاحب کا چہرہ اتر گیا

اور وہ بولے۔

"بے شک یہ تصویر اس ناشدنی ہی کی ہے لیکن یہ

نکاح کیونکر ہوا۔ کب ہوا۔ کس جگہ ہوا۔ جب کہ پیاری بیگم ایک

باقی نمبر شپ پر

بے صبری سے نکاح پڑھا۔ بہلا یہ کہاں ممکن تھا۔ بہرحال بیگم جس طرح بھی باہر گئی۔
... ہو کہ بیگم میری بالجبر نکاح کر لیا تھا
میری خاندانی آن کو صدمہ پہونچایا تھا میرے قلب کو
دکھ دیا تھا۔ وہی صورت تمہارے سامنے آ رہی ہے مجھو۔
اس دنیا میں جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی پھل اس کو ملتا
ہے۔ جس طرح میں نے صبر کیا اسی طرح تم بھی صبر کرو
میں اس کا نانا اسے لینے آیا ہوں۔ میرے ساتھ کر دو
میں اس کے شوہر کے گھر اسے پہونچا دوں۔"

مجھو صاحب نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

"بہتر ہے ڈولی بلوا لیجئے، میں اس نا شدنی کو
آپ کے حوالے کر دوں۔ لیکن اس سے کہہ دیجئے کہ وہ اس
گھر سے اب ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "میں نے بھی اپنی بیٹی یعنی تمہاری بیوی سے
یہی الفاظ کہلوائے تھے۔ بالکل یہی الفاظ۔"

ڈولی منٹوں میں آ گئی۔ اور بانکے مہتاب علی اپنی
نواسی کو لئے ہوئے سیدھے حکیم بدھن کے گھر پاٹے نالے
پہونچ لئے۔

"یوں حکیم بدھن صیاد بروزن بہزاد نے اپنا
گھر بسایا۔"

بقیہ:- مرغی پر جھگڑا

نہ جانے انھوں نے کچھ دیکھا یا نہیں مگر مجھے تو وہ سب
نظر آگیا جو آج تک کبھی نہ دیکھا تھا اور اگر ذرا سی کوشش
کرتا تو شاید جنت یا دوزخ بھی دیکھ لیتا۔ آخر میں صرف اتنا
ہو سکا کہ کچھ لوگ مجھے ایک رکشے پر سوار کرا رہے ہیں۔ قسطوار
سے آدمی میرا سر رکشے پر رکھتا ہے تو کوئی دوسرا پاؤں اور۔

جب ہوش میں آنے پر میں نے اپنی ایک آنکھ کھولی
چونکہ دوسری پر پٹی بندھی تھی، تو دیکھا میرے سرہانے بیٹھی
میری بیوی آنسو بہا رہی ہے۔ میں نے غور کیا کہ ایک زبان
ہی ایسا عضو رہ گیا ہے جسے میں اپنی مرضی کے مطابق ہلا سکتا
تھا میں اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لئے اپنی بیوی پر
برس پڑا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ خواہ مخواہ اتنی چھوٹی سی
بات پر انجینئر صاحب ..."

میرا مطلب سمجھتے ہوئے اس نے کہا "ٹھیک کہتے
ہیں آپ ہم نے بیکار کا جھگڑا مول لیا اور پھر وہ مرغی بھی
آج مر گئی ہے۔"

"مر گئی کمبخت ، چلو اچھا ہوا خس کم جہاں پاک۔
میں اب ان سے معافی مانگ لوں گا۔"

سامنے سے انجینئر صاحب وارڈ میں داخل ہوئے
میرے قریب پہنچ کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے معذرت
خواہ لہجے میں کہا۔ "معاف کر دیجئے مجھے۔ دراصل غلطی میری ہی
تھی یعنی سراسر زیادتی تھی۔"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل بات یہ
ہے میں ذرا اس لئے حاضر ہوا تھا کہ دفتر میں مجھ پر چارج
شیٹ لگا ہے۔ آپ میرا ایک کام کر دیجئے۔ ذرا جلدی سے۔
بڑی مہربانی ہوگی۔"

"اور میرا ریڈیو سیٹ میری موٹر سائیکل سب آپ کے
بغیر ....."

"سب ٹھیک ہو جائے گا گھبرانے کی بات نہیں۔"
اس طرح دو شریف آدمیوں میں پھر میل ہو گیا۔

بقیہ:- قطرہ اور سمندر

تجزیہ اس میں بالکل گھل مل گیا۔ اس نے اپنی جیب
سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی جس میں اس کی تمام نقدی پونجی
کا باقی ماندہ حصہ موجود تھا۔ اس نے وہ تھیلی چندے کی
صندوقچی میں ڈال دی۔

اب وہ کمرے میں دروازہ بند کر کے عالم مایوسی
میں موت کا انتظار نہیں کرے گا۔ اب وہ محنت کرے گا
جینے کے لئے اور اپنا کردار ادا کرنے کے لئے۔ اب وہ محبت
کی مٹھاس سے لطف اندوز ہوگا۔

وہ بھی ایک ننھا سا کبوتر تھا جو ہلاک ہونے ہی کو
تھا اور جسے اب نئے سرے سے زندگی مل چکی تھی۔
جلوس کے نعروں اور گیتوں میں اب اس کی آواز بھی شامل
تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی عظیم خانوادۂ بشریت
کا ایک فرد ہے۔ ایک جزو ہے۔
اور قطرہ سمندر میں مل کر بے کراں ہو گیا تھا۔

ماؤں بصارت ہوں وہ محروم نظر ہوں میں
ودی بجھ گیا ہے وہ چراغ رہ گزر ہوں میں
مجھے گھیرے ہوئے ہے ہر طرف بادل اندھیرے کا
نظر آتا نہیں، ہاں نام سنتا ہوں سویرے کا

نور و ظلمت زندگی سے میں نے پائی ہے
پہلے چاند تھا اب میرا گھر تاریک گھاٹی ہے
مگر پھر بھی غنیمت ہے، نشیبِ زندگی اپنا
کہ رستہ پتھروں میں، ڈھونڈ لیتی ہے ندی اپنا

جب شمعِ تصورِ زینتِ فانوس کرتا ہوں
آنچل کی ہوا سے رنگ تک محسوس کرتا ہوں
دکھا دیتی ہے رنگِ گلستاں پھولوں کی بو مجھ کو
بتا دیتی ہے سن، دوشیزگی کی گفتگو، مجھ کو

صور میں، زمینِ رقص خود ہموار ہوتی ہے
سر دھنتا ہوں جب پازیب کی جھنکار ہوتی ہے
جوانی جلوہ گر پاتا ہوں، خوشبو میں پسینے کی
میں چھو کر دیکھ سکتا ہوں نزاکت آب گینے کی

نقابِ رُخ اُلٹ کر جلوۂ بیتاب دیکھا ہے
کھلی تھیں اپنی آنکھیں میں نے جب یہ خواب دیکھا ہے
پلک پر کس طرح تتلے ہیں لمحے، جانتا ہوں میں
گھڑی کیا ہے؟ گھڑی کی نبض تک پہچانتا ہوں میں

کسی کے دل کی بات آئی ہوئی خوشبو سے کہہ دوں گا
سحر کی اوس ہے، یا شام کی میں چھو کے کہہ دوں گا
تنفس کی حرارت، صبح کا پیغام دیتی ہے
مرے ناخن کی خنکی، خود نویدِ شام دیتی ہے

[illegible] مجھے بالکل نمایاں احساس ہوتا ہے
[illegible] میں مرے ہی پاس ہوتا ہے
[illegible] سے تلخ تر ہے محبت ہے
بصارت کی جگہ آنکھوں میں اب [illegible] ہے

[illegible]
[illegible]

چلو اے برف سی ٹھنڈی ہواؤ

چلو اے برف سی ٹھنڈی ہواؤ
تم اتنی سنگدل ہرگز نہیں ہو
کہ جتنا وہ جو مطلب پورا کر کے
کسی سے واسطہ بالکل نہ رکھے
تمہارے سرد ہاتھوں میں بھی آتی
نہ زہریلی چبھن ہے اور نہ تیزی
سبب یہ ہے نظر آتی نہیں ہو
ہوا کرتی ہو تم تکلیف دہ گو
تنا بو تن تنا بو تن تنا بوتے
اٹھو مل کر خوشی کے گیت گاؤ
دغا اور دوستی ہے جھوٹ کے باتیں
محبت اور الفت بے وقوفی
تنا بو تن تنا بو تن تنی ہے ہے
مسرت ہی مسرت زندگی ہے
فضا اے آسمان ٹھنڈک سی بھر دے
تو اتنا قابلِ نفرت نہیں ہے
کہ جتنا کوئی ایسا شخص جس نے
بھلا ڈالے ہوں سب احسان کسی کے
جما دیتا ہے گو ندیوں کے سینے
تو اتنا سرد بھی لیکن نہیں ہے
کہ جتنا کوئی ایسا دوست جس نے
دیے ہوں توڑ سارے رشتے ناطے
تنا بو تن تنا بو تن تنا بوتے
اٹھو مل کر خوشی کے گیت گاؤ

[illegible]

FEBRUARY 197?
(SECOND HALF)

WAQIAT

TELEPHONE

"کیا جوتا پھینکنے والے صاحب مہربانی کرکے دوسرا جوتا بھی پھینکیں گے ؟"

تمہارا دوست جانسن؟ اُف وہ کس قدر لذیذ تھا ۔۔۔!

نکسلائٹ! ۔ ڈاکٹر پہلے مجھے دیکھ لو۔ میں نے ایک دستی بم نگل لیا ہے۔

ارے یہ کون کم بخت
پردہ پکڑ کے آگے
کھڑا ہو گیا۔؟

ارے یار میرے تو نمبر
آگئے ۔ اس سال بھی

عوام کی نظر میں

نئی حکومت پر

لوک سبھا کے عام انتخابات ختم ہو چکے ہیں اور اگرچہ چند ریاستوں میں باقی ہیں تو وہ دس مارچ تک ختم ہو جائیں گے اور پھر سب کی توجہ وزارت سازی کی طرف منعطف ہوگی۔ عام ووٹروں نے نئی کانگریس کے حق میں جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ زمام اقتدار ایک مرتبہ پھر اسی جماعت کو سونپی جائے گی اور مسز گاندھی جن کا کانگریس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے انتخاب یقینی ہے، نئی طاقت اور نئے اختیارات کے ساتھ اپنی نئی حکومت بنا سکیں گی۔

دراصل نئی کانگریس کی اس کامیابی کا تمام تر سہرا مسز گاندھی کے سر ہے جنہوں نے سوشلزم کے اپنے پیغام کے ذریعے پورے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک نئی روح پھونک دی۔ ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس طرح بہت بڑی اکثریت کی حمایت حاصل کر لیں۔

اس کے مقابلے میں رجعت پسند فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ سنڈیکیٹ کانگریس کا گٹھ جوڑ خود اس کی اپنی کمزوری کا باعث بن گیا۔ اجلاس لکھنؤ میں جب مسٹر مرارجی ڈیسائی نے فرقہ پرستوں اور سرمایہ پرستوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے حق میں تجویز پیش کی تھی تو یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ اس قسم کا گٹھ جوڑ ان کی مزید کمزوری کا باعث ہوگا۔ شاید انہوں نے گٹھ جوڑ کا فیصلہ کرتے وقت محض اکثریتی فرقے کی خوشنودی کو سامنے رکھا اور اقلیتی فرقوں کے حقوق اور ان کے تحفظات کو یکسر بھلا دیا۔ نتیجے میں وہ ملک کی ایک بڑی اقلیت کا ووٹ کھو بیٹھا

[illegible]

ہندوستان اس وقت ملک کی نظریں نئی حکومت کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی حکومت برسر اقتدار آئے عوام بجا طور پر اس سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کی ترقی کے لئے ٹھوس اور مثبت اقدام کرے گی۔ کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس نے لمبے چوڑے وعدے نہ کئے ہوں۔ لیکن اب عوام محض وعدوں پر نہیں جی سکتے۔ وہ اب ہر جماعت کا عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ووٹنگ میں انہوں نے اسی بات کو پیش نظر رکھا ہے۔ جمہوری شعور کی یہ بیداری ایک خوش آیند بیداری ہے اس سے جمہوریت مضبوط ہوگی۔

مسز گاندھی کی مقبولیت اور نئی کانگریس کی اہمیت اگر پچھلے دنوں میں بڑھی ہے تو اس کا سبب وہ عملی اقدامات ہی ہیں جو قومی معیشت کے سلسلے میں اندرا سرکار نے کئے ہیں۔ سابق حکمرانوں کے پریوی پرسوں کو ختم کرنے سے متعلق اقدام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا جو بدقسمتی سے رجعت پسندوں اور سرمایہ پرستوں کی پیدا کردہ رکاوٹوں کے باعث نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا۔ جس پر قدرتی طور سے باہمی کشمکش شروع ہوئی اور نئے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو سکے اور ایسی حکومت کا قیام عمل میں آ سکے جو عوام کی حقیقی نمائندہ ہو۔

اگر عوام ایک رجعت پسند اور سرمایہ نواز حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو قائم کریں انھیں اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر حکمراں کانگریس ہی اپنی نئی حکومت قائم کرے گی اور اس مرتبہ زیادہ طاقت اور زیادہ اختیارات کے ساتھ حکومت بنائے گی جس سے کہ وہ اپنی سوشلسٹ پالیسیوں کو باسانی بروئے کار لا سکے۔ اور اقتصادی نابرابری کو ختم کرنے کے لئے مناسب اقدامات کر سکے۔

اس وقت حقیقت یہ ہے کہ ملک میں اقتصادی اور معاشی مسائل کو اولیت حاصل ہے اور تمام سیاسی اور دوسرے مسائل پس پشت جا پڑے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بنگال تک میں جہاں تشدد اور قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے عوام کی بے چینی کا اصل سبب معاشی مسائل ہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری، گرانی، اچھے رہائشی مکانات کی قلت اور اسی قسم کے دوسرے مسائل ہیں جن کی وجہ سے تخریب پسندوں کو اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع مل گیا اور بنگال کا امن خطرے میں پڑ گیا۔ ایسی ہی بے چینی ملک کے دوسرے حصوں میں بھی موجود ہے۔ اگر بڑھنے دیا گیا تو بنگال کی طرح وہاں بھی خطرناک نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں۔ یہ نئی حکومت کا کام ہوگا کہ عوام کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ دی جائے تاکہ معاشی بے چینی کو دور کیا جا سکے۔

عوام اب ایسی حکومت کے متمنی ہیں جو ان کے معاشی مسائل حل کر سکے اور ان کی وہ مشکلات دور ہو سکیں جو آج کل کمر توڑ گرانی کی بنا پر انھیں پیش آ رہی ہیں۔

نئی حکومت اور نئی پارلیمنٹ کو جن اہم معاشی مسائل پر توجہ دینا ہوگی ان میں سے چند یہ ہو سکتے ہیں۔

۱۔ روزگار کے زیادہ مواقع مہیا کر کے عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانا۔

۲۔ ضروری اشیاء کی قیمتوں کو مستحکم کر کے آمدنی میں اضافہ کرنا

۳۔ تعلیم کی بہتر سہولتیں مہیا کرنا۔

۴۔ زیادہ سے زیادہ رہائشی مکانات کا انتظام کرنا۔

۵۔ علاج معالجہ کی زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ضروری قدم اٹھانا۔

نئی کانگریس نے ان تمام سہولتوں کے لئے وعدہ ہی نہیں کیا بلکہ مسز گاندھی کی سربراہی میں ان مقاصد کے حصول کے لئے عملی اقدامات بھی کئے ہیں۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہئے کہ ایک مستحکم حکومت بنانے کی صورت میں وہ اور زیادہ بہتر اقدامات کر سکے گی اور اقتصادی اور معاشی نابرابری کو جو کہ مختلف طبقوں میں پائی جاتی ہے ختم کرنا اپنا بنیادی مقصد بنا لے گی۔

ان ہی مسائل کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے مسائل بھی ہیں جنھیں صرف معاشی و اقتصادی نابرابری ہی کی شکایت نہیں بلکہ یہ بھی شکایت ہے کہ ان کی تعلیمی اور ثقافتی قدروں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ اب جبکہ اقلیتوں اور خصوصاً مسلم اقلیت نے مسز اندرا گاندھی اور نئی کانگریس پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے، انھیں یقین ہے کہ نئی کانگریس ان وعدوں کو پورا کرے گی جو اس نے الیکشن مینی فیسٹو میں کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو کے بارے میں یقین دلایا گیا ہے کہ اردو کو اس کا وہ جائز مقام دلایا جائے گا جسے وہ ابھی تک حاصل نہیں کر سکی ہے۔

جائز مقام کیا ہے؟ اس کی وضاحت کی جانی چاہئے

باقی صفحہ پر

[illegible]

اسرائیل ابھی تک ماضی کی دنیا میں ہے۔ یہ ۱۹۶۷ء نہیں ۱۹۷۱ء ہے

صدر انور سادات سے انٹرویو

مشرق وسطیٰ کے حالات کے بارے میں اسرائیل اور عربوں کے موقف میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسرائیل سمجھتا ہے اس نے عربوں کو شکست دی ہے اس لئے اسے اپنی مرضی کے مطابق شرائط پیش کرنے کا حق ہے جب کہ عربوں کا کہنا ہے کہ انھیں صرف ایک معرکے میں شکست ہوئی ہے لیکن وہ جنگ نہیں ہارے ہیں۔ یہ بات صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انور سادات نے حال ہی میں نیوز ویک کے سینیر ایڈیٹر مسٹر ارنوڈ ڈی بورچ گریو سے کہی۔

نیوز ویک ایک امریکی میگزین ہے اور اس پر یہودی سرمائے کا غلبہ ہے۔ انور سادات نے کہا کہ۔

"چونکہ اسرائیل کا بنیادی موقف غلط ہے اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے وہ بھی غلط ہے"

مسٹر ارنوڈ نے مسٹر سادات سے جو سوالات کئے اور انھوں نے ان کے جو جوابات دیئے وہ حسب ذیل ہیں۔

سوال۔ تب نیا بنیادی موقف کیا ہونا چاہئے۔؟

جواب۔ اگر وہ امن چاہتے ہیں تو ہم بھی امن کے خواہاں ہیں لیکن کیا ایسی صورت میں امن قائم ہو سکتا ہے جب کہ ایک فریق دوسرے فریق کے علاقے پر قابض رہے۔ امن صرف انصاف کی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے۔

سوال۔ مسز مائر (وزیر اعظم اسرائیل) دوسرے امور پر بات چیت کرنے سے قبل نہر سوئز کو پھر سے کھولنے کے بارے میں کسی بھی تجویز پر بات چیت کے لئے تیار ہیں۔ لیکن وہ نہر سوئز کے علاقے میں شہری زندگی کو معمول پر لانے پر زور دیتی ہے اور کہتی ہے کہ جنگی تیاریاں کم ہونی چاہئیں۔ کیا یہ ایسی تجویز نہیں ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔؟

جواب۔ وہ حالت کو معمول پر لانے کی بات تو کرتی ہیں لیکن انہیں ہمارے اپنے ملک کے شہریوں کے بارے میں بولنے کا کیا حق ہے۔ کیا امریکا دریائے مسی سپی کے علاقے میں حالات کو معمول پر لانے کے متعلق کسی غیر ملکی طاقت سے بات چیت کرے گا۔ نہر سوئز مصریوں کی ہے اور اسرائیلی اسٹیٹ کے قیام سے بہت قبل اس کی تعمیر عمل میں آچکی تھی۔ یہ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے۔

سوال۔ کیا آپ کی تجویز میں اسرائیلی جہازوں کی آزادانہ آمد و رفت کی اجازت دی گئی ہے۔؟

جواب۔ جی ہاں مسٹر یارنگ کو ہماری طرف سے جو میمورنڈم پیش کیا گیا ہے اس میں ہم نے اس پر اظہار رضامندی کیا ہے لیکن اس سے قبل اسرائیل کو اقوام متحدہ کی قرارداد کے تحت اپنی تمام ذمے داریاں پوری کرنا ہوں گی۔

سوال۔ اسرائیل کہتے ہیں کہ امن کے بغیر وہ قبضہ نہیں چھوڑیں گے، اور آپ کہتے ہیں کہ مقبوضہ عرب علاقوں کے انخلا سے قبل کوئی امن نہیں ہوگا۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ اسرائیل کے حقیقی ارادوں کا پتہ لگانے کے لئے امن کے معاہدے کی شرط منظور کر لیں اور پھر دیکھیں کہ وہ مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کرتا ہے یا نہیں۔

جواب۔ اگر آپ اقوام متحدہ کی قرارداد کو غور سے پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ معاہدہ امن کا آغاز ہے۔ ہم اس کے پابند ہیں لیکن ابھی تک دوسری جانب سے اس کی عمل آوری کے منتظر ہیں۔ صرف ہم ہی کو تمام وعدوں کا پابند کیوں کیا جائے۔ اس نفسیاتی بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ جزوی انخلا سے اسرائیل کے بدنیتی ارادوں کا پتہ چل جائے گا۔ ساری دنیا کی آزادانہ جہاز رانی کے لئے نہر سوئز کو کھول دیجئے اور اس کے بعد مسٹر یارنگ پورے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک ٹائم ٹیبل بنا سکتے ہیں۔ جنگ بندی میں معینہ وقت تک کی مزید توسیع قبول کر لوں گا۔ اس کے بعد ہم مستقل امن کے لئے قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اسرائیلیوں کے معاملہ میں مشکل یہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنی فتحیابی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ اگر حقیقی معنوں میں امن چاہتے ہیں تو ہم بھی اس کے لئے تیار ہیں۔

سوال۔ جزوی انخلا کا مطلب کیا ہے۔؟

جواب۔ جزوی انخلا کا مطلب العریش کے عقب تک پیچھے ہٹ جانا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسرائیل ماضی کی دنیا میں رہ رہا ہے۔ یہ ۱۹۷۱ء ہے ۱۹۶۷ء نہیں۔

...ام نہاد فوجی ماہرین ہماری نئی فوج کے بارے میں نہیں جا...

واقعات نیو دہلی

سوال۔ اگر وہ ان علاقوں سے ہٹ گئے تو اس کے بدلے میں آپ کیا رعایت دیں گے۔

جواب۔ میں ۶ ماہ کے اندر اندر نہر سوئز کو بین الاقوامی تجارت کے لئے کھول دینے کی گارنٹی دوں گا۔ اس بات کی بھی گارنٹی دوں گا کہ آبنائے طیران میں آزادانہ جہاز رانی ہوگی اور شرم الشیخ میں بین الاقوامی فوج تعینات رہے گی۔ اس فوج میں چار بڑی طاقتیں شامل ہوں یا کوئی ملک بھی شامل ہو۔ ہمیں اس پر اعتراض نہیں۔ ہماری ایک نرم پالیسی ہوگی اور ہم کسی بھی ایسی تجویز پر بحث کرنے کے لئے تیار ہوں گے جس سے کہ اس حصہ ارض میں امن قائم ہو سکے۔ مگر سمجھوتہ ان تمام عرب علاقوں کے بارے میں ہونا چاہئے جن پر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔ کسی ایک یا دوسرے علاقے کے لئے نہیں۔

سوال۔ بعض فوجی ماہرین کا کہنا ہے کہ آنے والے کئی برس تک مصری فوجوں کی اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ اسرائیلیوں کو ان سے کوئی خطرہ محسوس ہو۔ اور آپ کے کچھ نکتہ چیں کہہ رہے ہیں کہ جنگ بندی کی توسیع کی ۷ مارچ کی تاریخ مقرر کر کے آپ اسرائیلیوں کے ساتھ چوتھی جنگ کے قریب ہو رہے ہیں، جسے آپ جیت نہیں سکتے۔ اس بارے میں آپ کا کیا جواب ہے؟

جواب۔ اس قسم کے نام نہاد ماہرین ہماری نئی فوج کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جو بھی صدمہ ہمیں برداشت کرنا پڑے گا اور جو بھی قیمت اور قربانی دینا پڑے گی ہم دیں گے۔ آپ کا کسی بھی طاقت کے ساتھ مقابلہ ہو عوام کے عزم و ارادے کو بدل نہیں سکتے۔

ویت نام میں دس سال کے بعد آپ امریکی اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اگر اسرائیل ہمارے علاقے خالی نہیں کرے گا تو ہم اپنے علاقوں کو خالی کرانے کے لئے ہر وہ قیمت ادا کریں گے جس کی ضرورت ہوگی۔

سوال۔ اسرائیلیوں نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ دوبارہ جنگ کی ابتدا اپنی طرف سے نہیں کریں گے۔ اگر آپ نے فائرنگ شروع کی تو اس کا مطلب غالباً بڑے پیمانے پر انتقامی کارروائی ہوگا۔ پس کیا مصری گولہ باری کا مطلب چوتھی مرتبہ جنگ کا آغاز نہیں ہوگا؟

جواب۔ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں جو تیسری مرتبہ جنگ شروع کی تھی وہ ابھی تک جاری ہے۔ اسرائیلیوں نے ہمارے ملک پر بمباری کی اور آگ لگانے والے بم گرائے۔ ان حملوں میں اس کے ۱۰۰ ہوائی جہاز تک حصہ لیتے تھے اور وہ ۲۴ گھنٹے میں ۱۰ گھنٹے حملے کرتے تھے۔

جو امریکی بم انھوں نے گرائے ان کی روزانہ قیمت پانچ لاکھ سے دس لاکھ ڈالر تک پہونچتی تھی اس کی اس بمباری میں عارضی جنگ بندی سے رکاوٹ پڑ گئی ہے۔ وہ ہمیں خوفزدہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس طرح امن قائم نہیں ہو سکا۔

سوال۔ کیا آپ کو اپنے اوپر اعتماد ہے کہ آپ اب اس پوزیشن میں ہیں کہ نہر سوئز کو پار کر کے دوسری طرف اپنے قدم جما سکیں؟

جواب۔ میں اس بارے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں یہ فوجی معاملہ ہے جسے بتایا نہیں جا سکتا۔

سوال۔ کیا یہ صحیح ہے کہ نہر سوئز کے علاقے میں آپ کی میزائل تنصیبات کا تمام انتظام مصریوں کے ہاتھ ہے۔

جواب۔ جی ہاں یہ صحیح ہے۔ نہر سوئز کے علاقے میں روسیوں کے بارے میں اسرائیل نے جو کچھ کہا وہ بالکل غلط تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا ہمارے لئے جنگ کرے۔

سوال۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات بڑی اہم ہے کہ آپ صفائی کے ساتھ اس امر کی وضاحت کر دیں کہ امن کے معاہدے کے لئے آپ کس رعایت کے لئے تیار ہوں گے۔

جواب۔ اگر اسرائیل اقوام متحدہ کی قرارداد کے تحت ہمارے علاقے واپس کر دیتا ہے تو اس علاقے کے ہر اسٹیٹ کی جن میں اسرائیل بھی شامل ہے سیاسی آزادی اور اس کے علاقائی تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔ اس کا ہم وعدہ کرتے ہیں جس پر ہم قائم رہیں گے۔ تسلیم شدہ سرحدوں کے اندر اسرائیل کی علاقائی سالمیت کی ضمانت چار بڑی طاقتوں کی طرف سے دی جائے گی۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضمانت دی جائے گی کہ اسرائیل کو نہر سوئز اور آبنائے طیران میں جہاز رانی کی آزادی حاصل ہوگی لیکن ان سب باتوں کے لئے ضروری ہوگا کہ فلسطینیوں کے مسئلے کا کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے۔

سوال۔ فلسطینی مسئلے کے بارے میں کافی الجھاؤ پایا جاتا ہے اس تجویز پر آپ کا کیا اعتراض ہے کہ فلسطینی پناہ گزینوں کو مالی معاوضہ دیدیا جائے اور اردن دریا کے مغربی علاقے اور غزہ میں اس بات کے لئے عام رائے شماری ہو کہ کیا فلسطینی اپنی ایک الگ ریاست کے خواہاں ہیں یا وہ اردن کے ساتھ وفاق چاہتے ہیں اور یا اردن کے ایک لازمی حصے کے طور پر رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

جواب۔ فلسطینیوں کے بارے میں میں کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں لیکن معاوضہ اور ریفرنڈم کے ذریعے مسئلے کو حل کرنا ایک نامناسب طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ دراصل فلسطینیوں کو خود اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

سوال۔ آپ کہہ چکے ہیں کہ آپ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ذہن میں کیا خاص بات موجود ہے۔

جواب۔ گولڈا مائر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ امن صرف اسی وقت قائم ہوگا جب وہ تل ابیب سے قاہرہ تک اپنی کار میں کچھ شاپنگ کرنے کے لئے جا سکیں گی۔ یہ ان کا ایک خواب ہے جو وہ احساس فتح کے بنیاد پر دیکھ رہی ہیں۔

جہاں تک سفارتی تعلقات کا معاملہ ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ چین کی علاقائی سالمیت تو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے سفارتی تعلقات قائم نہیں ہیں۔ سفیروں کا تبادلہ ایک ٹیکنیکل معاملہ ہے۔ اصل سوال جھگڑا کا ہے جس کے بارے میں ہر قوم خود اپنا فیصلہ کرتی ہے۔ لیکن اسرائیل کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ میں نے یہ کہا تھا۔ میں اسرائیل کی علاقائی سالمیت کو تسلیم نہیں کروں گا یہ ایک جھوٹا پروپیگنڈہ ہے اور اس کا مقصد رائے عامہ کو مخالف بنانا ہے۔

سوال۔ دو سال قبل جب میں نے صدر ناصر سے پوچھا تھا کیا وہ ریگستان سینائی سے اسرائیلیوں کی واپسی کے جواب میں اس بات کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ شرم الشیخ میں اہم بڑی طاقتوں کے فوجی دستے تعینات کئے جائیں۔ تو انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس بات کا نفی میں جواب دیا تھا لیکن اس معاملے پر آپ کی پوزیشن بالکل بدلی ہوئی ہے۔

جواب۔ میں نے اس تجویز کو محض اس مقصد سے قبول کیا ہے کہ اس علاقے میں پائیدار امن قائم ہو سکے۔ عام مصری اسے پسند نہ کریں گے اسی وجہ سے صدر ناصر اس کے خلاف تھے۔ لیکن میں ایک خطرہ مول لوں گا۔ اور اگر اس کے بعد بھی عالمی رائے عامہ ہمارے طرز عمل کو نہیں سمجھتی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے پوری کوشش کر کے دیکھ لی۔

اگر اسرائیلی ان ضمانتوں کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں جو انھیں پیش کی گئی ہیں تو اس کی ذمہ داری ہمارے

وقار انبالوی

کیا کیا گزر گیا ہے نگاہوں میں کچھ نہ پوچھ | آیا ہے جب زباں پہ کبھی نامِ بوالکلام
لب سے کوئی پچاس برس پہلے کی ہے بات | وہ دِن ۔ خدا گواہ، تھے ایامِ بوالکلام
ہر شیخ کو تھا حلقہ بگوشی پہ اُس کی فخر | ہر برہمن کے لب پہ تھا۔ ہُوں رامِ بوالکلام
اُس کی زبان کا رَس تھا طلسمِ قلوب رَس | اُس کے بیاں کا نام تھا، الہامِ بوالکلام
اُس کے قلم میں سحرِ حیات جدید تھا | پیغامِ نو بہار تھا پیغامِ بوالکلام
علم اُس کی پیش گاہ سے وابستہ رُوز و شب | فکر۔ اِک غلامِ بندۂ بے دامِ بوالکلام
وہ گفت گو کہ شہد و شکر سے خراج گیر | وہ ہاؤ ہو کہ زلزلہ، اقدامِ بوالکلام
مغرب میں بوالکلام فرنگی کے دِل کا درد | مشرق میں دردِ دل کی دوا نامِ بوالکلام
طوفانِ عزم و شوق کہ رُکتا نہ تھا کہیں | سیلاب بے پناہ کہ ابرامِ بوالکلام
ملت کے بے ستوں کا جگر سوز کوہکن | شیرینِ حریت فقط انعامِ بوالکلام
آج اس کے ہر کمال سے اِنکار عام ہے | وہ صبح بوالکلام تھی، یہ شامِ بوالکلام

موضوعِ ذکرِ بزمِ رفیقانِ عصر میں
احسانِ بوالکلام نہ اکرامِ بوالکلام

محمد افضل خان

اگر آپ دلی کی پرانی تہذیب کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں تو آئیے کچھ دیر کے لئے مٹیا محل پر چہل قدمی کریے۔ رنگ برنگے ہوٹل، رنگ برنگی دکانیں۔ رنگ برنگے ٹھیلے اور رنگ برنگے لوگ آپ کا استقبال کرینگے۔ ذرا سنبھل کر چلیے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آپ کے سوٹ بوٹ کو دیکھ کر فقرہ چست کر دے "ابے سیر کو کہاں جا رہا ہے" اور آپ خواہ مخواہ اس سے جھگڑ کر اپنی درگت نہ بنوالیں۔

یہ علاقہ اور یہاں کے لوگ بڑے عجیب ہیں۔ آپ کو یہاں ہر قسم کا آدمی مل سکتا ہے۔ کلرک بھی، آفیسر بھی، بزنس مین بھی اور دکاندار بھی۔ کارخانہ دار (جنھیں یہاں کرخندار کہا جاتا ہے) بھی، چرس افیون کا دھندا کرنے والے بھی، شریف بھی، بدمعاش بھی، اچکے بھی، جیب کترے بھی، اٹھائی گیرے بھی غرض آپ کو جس قسم کے بھی آدمی کی ضرورت ہو، وہ آپکو یہاں مل سکتا ہے۔ مگر یہاں کے لوگ ہیں سب سے الگ تھلگ۔ انکی تہذیب بھی الگ ہے۔ لباس بھی اور رہن سہن بھی۔ خاص طور پر ان کی بولی سے آپ بہت زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

ڈھیلے ڈھالے گھیر دار شلوار یا رنگ برنگا تہمد جس پر جگہ جگہ ماڈرن آرٹ کی جھلک ملے گی۔ ڈھیلی ڈھالی قمیض جس کی جیب کا اوپری حصہ سفید ہونے کے باوجود کالا ہوگا۔ جیب کے اندر کاغذوں اور سید پان کی ملی جلی گڈی۔ جس کے بوجھ سے جیب اپنا توازن کھو کر ایک طرف کو لٹک گئی ہوگی۔ سر بالوں سے بے نیاز۔ اگر اتفاق سے بال ہوں بھی تو ایسے جیسے چیل کا گھونسلا۔ آنکھیں سرمے سے آباد لیکن بے رونق، بڑی بڑی تلوار کٹ مونچھیں۔ کچھ ہاتھ کے ٹھیلوں پر سامان سجائے بیچ رہے ہوں گے۔ کچھ جھلی میں پھل لئے سڑک کے ادھر ادھر بیٹھے حسرت بھری نگاہوں سے سڑک پر چلتے لوگوں کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ یا بیڑی ہونٹوں میں دبائے جھلی کے اندر کچے سیبوں کو اٹھا کر انھیں اپنے تہمد سے رگڑ کر چمکانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ کچھ ہوٹلوں کے اوپر دوکاندار کی حیثیت سے کچھ گاہکوں کی حیثیت سے، غرض آپ کو زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہر طرف نظر آئیں گے۔

دیکھئے ایک ایسا ہی آدمی اپنے ہاتھ ٹھیلے پر (جس میں سیکڑوں پیوند لگے ہوئے ہیں اور جس کی لکڑی پانی سے گل چکی ہے) ککڑیاں بیچ رہا ہے۔ گھڑی گھڑی آواز بھی لگاتا جاتا ہے۔ "چار آنے میں چھٹانک" پھر خواجہ کے دربار کی ککڑیاں ہو "ہر آواز کے ساتھ پانی کا چھینٹا ککڑیوں پر ڈالنا بھی نہیں بھولتا۔ اس کے باوجود کہ ککڑی والا چیخ چیخ کر ککڑی کا بھاؤ بتا رہا ہے گاہک اس سے سوال کرے گا "کیوں پہلوان ککڑیاں کیا بھاؤ بیچ دیا ہے جی" اور کچھ ناک بھوں چڑھا کر ایک دو ککڑی چکھنے کے بعد وہ سیر بھر ککڑیاں لیکر آگے بڑھ جائے گا۔ ملک کلو باٹ اور نئے پیسے چلتے برسوں ہو گئے۔ مگر انکے لئے تو وہی سیر اور آنے سب کچھ ہیں۔ ان کا کلوگرام اور نئے پیسوں کوئی تعلق نہیں۔

ایسے ٹھیلے والے اور خوانچے والے آپکو ہر طرف نظر آئیں گے انکی سب سے بڑی دشمن میونسپلٹی کی گاڑی ہے میونسپلٹی کی گاڑی کے نام سے ان بیچاروں میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ اور اپنے خوانچے اور ٹھیلے لے کر کسی نہ کسی تنگ گلی کے اندر گھس جاتے

محمد افضل خان

جامع مسجد کا کباڑی بازار

اس علاقہ میں آپکو امیر بھی ملیں گے اور غریب بھی۔

اور سپاہی طبقے کے لوگ بھی غریب بیچارے ایک وقت روٹی اور دوسرے وقت بھوک سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اور خدا کا شکر ادا کرکے اپنے بستروں میں گھس کر صبح کا انتظار کرتے ہیں ــــ درمیانی طبقے کے لوگ دونوں وقت اپنا پیٹ کسی نہ کسی طرح بھر لیتے ہیں۔ اور امیر؟ ـــــ وہ انڈے اور مرغیاں کھاتے ہیں، شام کو جگادری کی بوتل کے ساتھ شغل کرتے ہیں ــ گھوڑوں کی ریسوں میں پیسہ ہارتے ہیں یا جیتتے ہیں مینڈھوں کی لڑائیوں میں شرطیں لگاتے ہیں۔ اور شام کو گھر آکر بچوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ اور بیوی کی پٹائی کرتے ہیں۔

آیئے آپکو ایک ایسی گلی میں لیکر چلیں جہاں تقریباً سارے ہی ایسے لوگ رہتے ہیں۔ جیسے ہی آپ اس گلی کے اندر گھسیں گے آپ کو اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لینا پڑیگا۔ اگر اتفاق سے اس گلی کے سرے پر نل بھی ہو تو واہ وا۔ آپ کو اس گلی کے اندر کیچڑ کی قالینیں بھی ملے گی۔ گلی کے اندر دونوں طرف نالیاں ہوں گی۔ جنکا گندہ پانی آزادی کے ساتھ گلی کے بیچ میں چہل قدمی کرتا نظر آئے گا۔ ان نالیوں کو کبھی کبھار کوئی بھنگی صاف کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ مگر مایوسی کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ اور بغیر انکو صاف کئے ناکام واپس لوٹ جاتا ہے۔ گلی کے اندر جگہ جگہ سبزی اور ترکاری کے چھلکے بھی پڑے نظر آئیں گے جن کو گھروں سے بڑی بے نیازی کے ساتھ گلی میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی بہت سارے بچے (جن کے جسم پر کپڑا نام کی کوئی شئے مشکل سے ملے گی اور اگر ملے گی بھی تو بے انتہا گندی اور بوسیدہ جسکا کئی جگہ سے پھٹا ہونا بہت ضروری ہے۔) نظر آئیں گے۔ یہ بچے غل مچاتے ہوں گے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپکو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کچھ گلی ڈنڈا، کچھ گیند بلا، کچھ پھوداری اور کچھ کانچ کی گولیاں کھیل رہے ہیں۔ ان بچوں کے منہ سے گالیاں اتنی روانی کے ساتھ بہتی ہیں جیسے نل کے پائپ سے پانی۔

اکثر و بیشتر ایسی گلیوں میں چند عورتیں بھی لڑتی جھگڑتی نظر آئیں گی۔ پہلے طعنے کشی سے ابتدا ہوتی ہے۔ پھر کچھ گالیوں وغیرہ کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے میدان جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس جنگ میں بعض عورتوں کی چوٹیوں کے بال ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور کچھ کے چہروں پر ناخونوں کی خراشیں نظر آنے لگتی ہیں۔ بچے اس جنگ میں ایک اہم پارٹ ادا کرتے ہیں اور اپنی ماؤں یا بہنوں کا پورا پورا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر جب کسی بچے کی والدہ محترمہ یا بہن صاحبہ کسی سے پٹنے لگتی ہیں۔ تو یہ بچے بڑے زور و شور سے رونے لگتے ہیں۔ اور چیختے چلاتے اپنے والد صاحب کو بلانے کے لئے کارخانے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور نوبت مردوں کی لڑائی تک پہنچ جاتی ہے۔ دو چار کے سر پھٹتے ہیں۔ کچھ کے ہاتھ اور کچھ کے پاؤں ٹوٹتے ہیں۔ معاملہ پولیس تک پہنچتا ہے۔ مگر عدالت تک کبھی نہیں پہنچتا۔ کیونکہ چند معزز لوگ (جو جرس یا افیون کا کاروبار کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر تھانے یا حوالات کی سیر کرتے رہتے ہیں) اپنی جان پہچان اور رسوخ سے دونوں حریفوں میں صلح نامہ کرا دیتے ہیں۔ اور یہ حریف اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں اور ہاتھوں کو بھول کر فوراً گلے لگ جاتے ہیں۔ عورتوں کے اندر کچھ روز کشیدگی چلتی ہے۔ مگر پھر وہی میل جول اور وہی تعلقات پیدا ہوجاتے ہیں جو لڑائی سے پہلے ہوا کرتے تھے۔

تہوار کے موقعوں پر ان لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ مزدور رات اور دن محنت کرکے تہوار کیلئے پیسہ کمانے کی سوچتا ہے۔ اور ہفتہ بھر پہلے سے جان توڑ کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے مالک کو گھڑی گھڑی بتاتا رہتا ہے "میاں کرخندار دیکھنا ہمارا خیال رکھنا۔ تہوار کا سر ا ہے۔ چاروں لونڈوں اور تینوں لونڈیوں کے کپڑے لتے بنوانے ہیں۔ گھر والی کا بھی جوڑا بنوانا ہے اور پھر تہوار پر خرچہ پانی کو بھی تو چاہیئے گا" اگر کرخندار تنگ کرکے کہتے ہیں "اب جب میں تجھے سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تیرے کو نوٹ نکال دوں گا تو پھر کیوں بک بک کر رہا ہے" کاریگر ہنس کر کہتا ہے "نہیں کرخندار میں تو ذرا دھیان دلوا رہا تھا"

تہوار کے دن بڑے عجیب رنگ ہوتے ہیں۔ ناٹلون کا باریک کرتا جس کے گلے پر سنہری کڑھی ہوئی بیل۔ اس کے نیچے بنا ہوا بنیان لٹکتی ہوئی کلر تہمد جس کے دونوں طرف کے سرے نیچے کو لٹکے ہوئے۔ پھٹے ہوئے پیروں کے اندر سنہری کام دار پشاوری چپل۔ آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل۔ مونچھوں پر کاجل اور تیل کا میک اپ۔ بالوں سے بے نیاز سر پر چپڑا ہوا تیل۔ کاندھوں پر دو بچوں کو بٹھائے دو کے ہاتھوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے نظام الدین کا میلا دیکھنے جاتے ہیں۔ سرخ رنگ کے مخمل کے کپڑوں پر سے سفید برقعہ (جو کسی زمانے میں سفید رہا ہوگا اور جس کو کبھی دھونے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی) پیروں میں چاندی کی پازیب۔ ایک بچے کو گود میں لئے چھن چھن کرتی ہوئی ان کی بیوی بھی پیچھے پیچھے چلی آرہی ہیں۔ ایک ویڑھے میں بیٹھ کر نظام الدین پہنچ جاتے ہیں۔ سارے دن بچا بوں کے منبرے میں پتنگ بازی کرتے ہیں۔ باہر حلوہ پراٹھا، جلیبی، کباب سے شوق فرماتے ہیں۔ مہینے بھر کے کمائے ہوئے پیسوں کو چار پانچ گھنٹے میں خرچ کرکے خوشی خوشی واپس گھر لوٹ جاتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی اس بات کی فکر نہیں کرتے کہ کل کیا ہونا ہے۔

کچھ لوگ جن میں بوڑھے زیادہ شامل ہوتے ہیں زندگی کی رنگ رلیوں سے سبکدوش ہوکر سیاست میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ کیونکہ جوانی کے ساتھ سارے عیش تو چلے جاتے ہیں۔ اب بڑھاپے میں کیا کریں۔ سیاست ایک دلچسپ تفریح ہوتی ہے۔ تاش، چوپسی یا شطرنج کی محفلوں کے اندر ملک کی سیاست پر گفتگو کی جاتی ہے۔ ایک بڑے میاں فرماتے ہیں "میاں شمشاد تم نے اور کچھ بھی سنا۔ وہ اندرا گاندھی ہے نا! اس نے پارلیمنٹ کو توڑ دیا ہے۔ اور اب ووٹ دوبارہ پڑیں گے" شمشاد میاں جو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ مگر

(ماہنامہ ... دہلی)

چھینکنے کی ایکٹنگ کرتے تھے اور جواب دیتے تھے "اماں خلیفہ! کمالات کرتے ہو یہ کیسے چھینکتا ہے۔ کل تو میں انٹر گیت لیا تھا میں نے پارلیمنٹ کو پاگل خانہ ثابت کر دکھا۔ پھر ایسا گاندھی لے رات ہی رات میں اسے کیسے ہنڈیا سے توڑ سکی جاندار بغاوت تھی۔ اور اگر تو کبھی بیا نو پوٹ دیا نہ کیوں پڑیں گے؟"

بنگالی بھی ان محفلوں میں کافی بحث و مباحثہ ہوتا ہے کیا ٹیم آگیا ہے نقلی گھی کھچ پیک رہا ہے۔ ہائے ہائے کیا زمانہ تھا۔ روپے کا دھڑی بھر گھی لیا کرتے تھے۔ وہ بھی دیسی — میاں ہم کیا جانیں یہ ڈالڈا کیا ہوتا ہے۔ انگریز گیا تو ڈالڈا یہاں چھوڑ گیا۔ دیسی گھی اپنے ساتھ لے گیا۔ ان بڈھوں کو اپنی جوانی پیاری ہے اپنے زمانے پر اور اپنی تہذیب پر بڑا ناز ہے۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی ان سب مشغلوں کو یاد کر کر کے ان کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں یا پھر مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں شاید خدا سے شکایت کرنے یا اپنے گناہوں کی معافی مانگنے۔

الیکشن کے دنوں میں یہاں کی سیاست بھی عروج پر ہوتی ہے۔ برساتی مینڈک جگہ جگہ سے سمٹ کر پرانی دہلی کے ان علاقوں میں گھس جاتے ہیں اور اپنی سیاسی چالوں اور چکنی چپڑی باتوں سے پہلے ان سیدھے سادے لوگوں کا دل موہ لیتے ہیں اور بعد میں ووٹ۔ اکثر ان لوگوں کو لائسنس دلوانے کا، شراب یا پوست کا ٹھیکہ دلوانے کا۔ ان کے نئے گھر بنوانے کا، انکو روزی دلوانے کا، گھروں کے اندر فلش کی ٹٹی اور نل بجلی لگوانے کا لالچ دیتے ہیں اور انکو بچوں کی طرح بہلا پھسلا کر ووٹ لینے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آخر میں کچھ نہیں تو "ووٹ دو اور نوٹ لو" کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے غریب لوگوں میں جمہوریت کا جنازہ نوٹوں کی شکل میں بہت جلد نکل جاتا ہے۔ ان علاقوں سے کوئی بھی لیڈر روپیہ خرچ کر کے کارپوریشن سے پارلیمنٹ کے دروازے تک باسانی پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ اسکے پاس خرچ کرنے کو بلیک کا پیسہ ہو۔

بعض دفعہ یہیں کے رہنے والوں کو الیکشن کا شوق چرانے لگتا ہے۔ اور وہ بھی سیاست کو کشتی کا اکھاڑا سمجھ کر مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چند شاطر اور چھچھے قسم کے لوگ ایسے لوگوں کو جنکے پاس تھوڑی بہت جائداد یا تھوڑا بہت پیسہ ہوتا ہے، چڑھا کر الیکشن میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ ایسے لیڈروں کی لیڈری الیکشن کے ختم ہونے پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لیڈر صاحب اور ان کا سامان بھی گروی رکھ چکے ہیں اور اپنی لیڈری کے

واقعات نئی دہلی

"کیونکہ یہ ملک کا سب سے بڑا چناؤ حلقہ ہے اس لئے اس کا نمائندہ صرف میں ہی ہو سکتا ہوں۔"

نر لیڈر بھی۔ ستم یہ کہ ان کی ضمانت بھی ضبط ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی تقریریں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں پچھلے چناؤ میں ایک ایسے ہی لیڈر صاحب الیکشن میں کھڑے ہوئے، جو اسٹیج پر کھڑے ہو کر جانوروں کی اور عورتوں کی آوازوں کی نقل کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی ناچنے بھی لگتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو ہنسا کر ووٹ لینے کی کوشش کی تھی۔ مگر الیکشن کے بعد بھی لوگ ہنس رہے تھے۔ ان کی ایکٹنگ پہ نہیں ان کی بے وقوفی پر اور ان کے رونے پر۔

ایک عرصہ ہو گیا۔ دہلی بہت ترقی کرتی جا رہی ہے۔ ہماری گورنمنٹ نے ہمارے لیڈروں نے دہلی کو خوبصورت بنانے کے لئے بڑی بڑی اسکیمیں بنائی ہیں۔ نئی دہلی کو اور نیا بنایا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ فوارے، تالاب، پارکنگ شیڈ اور سڑکیں بنائی جا رہی ہیں۔ رہنے کے لئے کوارٹر بنائے جا رہے ہیں، خوبصورت بنگلے اور پارکوں سے نئی دہلی کو سجایا جا رہا ہے۔ مگر پرانی دلی آج بھی ویسی ہی ہے جیسی پچاس برس پہلے تھی۔ پرانی دہلی میں خاص طور سے جامع مسجد کے اندرونی علاقوں میں آج بھی گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں آج بھی وہاں شکستہ مکان نظر آتے ہیں۔

وہ لیڈر اور وہ نیتا جو ہر الیکشن میں ان گندی گلیوں میں گھس کر اور ان شکستہ مکانوں کی چوکھٹوں پر پہنچ کر ووٹوں کی بھیک مانگتے ہیں۔ اپنی مرادیں بر آنے کے بعد ان گلیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ہر دفعہ الیکشن سے پہلے ان شریف اور سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور پھر یوں منہ موڑ لیتے ہیں، جیسے ان سے کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ بس وہ ڈاکٹر جو کسی الیکشن میں کھڑا ہونے جا رہا ہو۔ الیکشن سے پہلے مریضوں کو دیکھنے کی کوئی فیس نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ ان کے گھروں پر جانے کی فیس بھی ختم کر دیتا ہے۔ مگر الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد ہی سے اپنی فیس دوگنی کر دیتا ہے۔ تاکہ الیکشن سے پہلے کا حساب چکتا کرے۔

آخر ان لوگوں پر توجہ کیوں نہیں دی جاتی۔ کیا اس لئے کہ یہ لوگ غریب ہیں۔ اپنا حق نہیں لے سکتے۔ بلیک مارکیٹنگ نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگ ان کو سماج کے اوپر ایک بدنما داغ بتاتے ہیں۔ ملک کے اوپر ایک بدنما دھبا کہتے ہیں۔ مگر ان کو بدنما داغ بنانے میں کس کا ہاتھ ہے۔ ہمارے لیڈروں کا، ہماری گورنمنٹ کا، یا خود ہمارے اپنے نظام کا......

سوال :۔ مسٹر جناح کیا آپ کبھی کانگریس میں نہیں تھے ؟
جناح :۔ "میں کبھی پرائمری اسکول میں بھی تھا ــــ"

(ظفر اللہ خان)

صحافیوں کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ طرح طرح کے سوالات کر کے عظیم رہنماؤں کا قافیہ تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ہر ایک رہنما کو اپنی زندگی میں سیکڑوں صحافیوں کے تلخ و شیریں سوالات کی بوچھار سننی پڑتی ہے۔

ذہین صحافی گھما پھرا کر ایسے سوالات بھی کر بیٹھتے ہیں کہ سیاستداں سیاست بھول کر اپنے دل کے پوشیدہ خیالات کو عریاں کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی چند سوالات جو عالم صحافت کے درخشاں صحافیوں نے دوران ملاقات یا کسی پریس کانفرنس کے وقت عالم سیاست کے چند حسین ترین بتوں سے کئے ہیں۔ پیش ہیں۔ دیکھئے تو سہی اہل دل نے کیسی کیسی گلفشانیاں کی ہیں۔

ظفر اللہ
خان

مہاتما گاندھی۔ باپائے قوم ــــــــ

گاندھی جی جب ایک کانفرنس کے سلسلے میں لندن پہونچے تو ایک برطانوی اخبار کے متعصب نمائندے نے ان کے نیم عریاں جسم اور سادہ لباس پر نظر ڈالتے ہوئے بطور طنز اُن سے سوال کیا۔

س۔ ہندوستانیوں نے آپ کو ہی اپنی نمائندگی کے لئے کیوں منتخب کیا ہے۔ کیا آپ سے بہتر نمائندہ انھیں نہیں مل سکتا تھا۔

گاندھی جی نے جواب دیا۔

"شاید یہ بات ہو کہ ان کی نظر میں مجھ جیسا حقیر آدمی ہی برطانیہ والوں کے مقابلے میں بھاری ہو۔"

س۔ کیا آپ عورت کو کمزور سمجھتے ہیں؟

ج۔ عورت کو مرد سے کمزور دیکھنا ایک غلطی ہے اور مردوں کی ناانصافی کا ثبوت ہے۔ اگر طاقت سے مراد صرف حیوانی طاقت ہے تو پھر یقیناً عورت مرد سے کمزور ہے، اور اگر طاقت سے مراد اخلاقی قوت ہے تو عورت مرد سے کئی گنا اعلیٰ اور برتر ہے۔ اس میں ایثار کا جذبہ بھی مرد سے زیادہ ہے اس میں قوتِ برداشت بھی بہت ہوتی ہے۔

عورت کے بغیر مرد کا وجود ممکن نہیں اور اگر عدم تشدد ہماری آزادی کی جنگ کا سب سے بڑا اصول ہے تو مستقبل عورت کے ہاتھ ہے۔

قائد اعظم۔ محمد علی جناح

جناح جب لندن میں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے تو ایک نوعمر صحافی نے انھیں مخاطب کر کے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

س۔ مسٹر جناح! کیا آپ کبھی کانگریس میں نہیں تھے؟

جناح کا جواب بھی تلخ تھا۔

ج۔ "میں کبھی پرائمری اسکول میں بھی تھا۔"

پاکستان بن جانے کے بعد ڈھاکہ میں ایک صحافی نے قائد اعظم سے پوچھا۔

س۔ "پاکستان کی قومی زبان کونسی ہے؟"

ج۔ پاکستان کی مشترکہ قومی زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اُردو ہے۔ اُردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔ ملک کی سرکاری

"اندرا جی ایک کلی کی طرح ہیں ــــ ابھی اس کلی کو نکھرنا ہے، اس کلی کو کھلنا ہے اس کلی کی آبیاری کیجئے ــــ اس کو پانی پہنچائیے" ــــ (شیخ عبداللہ)

"اسلام محبت کا مذہب ہے، اخوت کا مذہب ہے، امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ قوت اور صلابت کا مذہب ہے، ترقی اور فضیلت کا مذہب ہے" ــــــ (شاہ فیص

محمد علی جناح

زبان بھی ظاہر ہے اُردو ہی کو ہونا چاہیئے۔ یہ وہ زبان ہے جسے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے اور اسے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک سمجھا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اُردو میں صوبائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا بہترین سرمایہ پایا جاتا ہے اور اُردو ہی دوسرے اسلامی ملکوں کی زبانوں سے قریب تر ہے۔

شیخ محمد عبد اللہ ــــــ

س۔ "آپ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ کس شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں؟"

ج۔ علامہ اقبال سے۔ میں علامہ سے ملاقاتیں بھی کر چکا ہوں۔ ان کے کلام نے مجھے ایک نیا پیغام دیا ہے۔ میرے جذبات کو جھنجھوڑا ہے۔

س۔ "اُردو کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟"

ج۔ میں اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا۔ کیونکہ مسلمان تو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر ملک کا مسلمان اُردو نہیں بولتا۔ نہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے نہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ عبدالرحیم اُردو کا نہیں ہندی کا شاعر تھا اور دیا شنکر نسیم ہندی کے نہیں اردو کے شاعر تھے۔ میں لسانی مسئلے کو مذہب سے جوڑنا نہیں چاہتا۔

س۔ ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟

ج۔ اندرا جی ایک کلی کی طرح ہیں۔ ابھی اس کلی کو نکھرنا ہے اس کلی کو کھلنا ہے ــــــ اس کلی کی آبیاری کیجئے سکو پانی پہنچایئے۔ ــــــ

عصمت انونو ــــــ

ترکی کے سابق وزیر اعظم اور صدر موجودہ قائد حزب اختلاف جن پر عرصہ دراز سے اسلام دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے۔

س۔ کیا آپ سیاست میں مذہب کا دخل ضروری سمجھتے ہیں

ج۔ نہیں میں یہ نہیں چاہتا۔ میں اس معاملے میں ایک دوسری رائے رکھتا ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مذہب کا سیاست سے تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ اسے عیسائی عقیدہ کہہ سکتے ہیں یا کوئی اور ــــ میں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اس کی پیشانی پر یہی لکھا نظر آیا۔

س۔ "آپ نے یہ خیال کہاں سے اخذ کیا۔"؟

ج۔ دیکھئے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انھوں نے معاشرے کے افکار بدلے نظریات بدلے ضابطۂ اخلاق بدلا۔ اجتماعی نظام بدلا اور ایک سیاسی انقلاب برپا کیا پھر خلافتِ راشدہ کے عہد میں اسلام کا اجتماعی نظام ق رہا، پھر ملوکیت کا دور دورہ ہوا اور مذہبی پروہتوں۔ اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئیں کے دور میں ہم ان خرابیوں سے صرف اسی صورت میں ب رہ سکتے ہیں کہ مذہبی گروہ کو برسرِ اقتدار نہ آنے دیں۔

س۔ آپ کو معلوم ہے کہ ترکی میں احیائے قوم کی ت تحریک اٹھی ہے، کیا یہ اس بات کی علامت نہیں کہ قوم آپ کی مذہب دشمن پالیسی کو قبول نہیں کیا۔

ج۔ چند پاگلوں کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو ہم نے جو نئی نسل تیار کی ہے وہ پوری قوت سے مزاحمت

س۔ کیا آپ ترکی میں اشتراکیت لانا پسند کریں گے

ج۔ میری یہ خواہش ہے کہ میرے ہم وطنوں کی مع حالت بہتر ہو۔ بس میں یہی چاہتا ہوں۔

سلیمان ڈیمریل ــ وزیر اعظم جمہوریۂ ترکی۔

س۔ ڈیمریل صاحب! آپ انتخابات سے خوف کھاتے ہیں؟

ج۔ خوف کس بات کا۔ اگر ہم عوام کی نمائندگی کر دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں عوام کے سامنے جاتے ہوئے خو گھبراہٹ کیوں محسوس ہو۔ انتخابات تو ہماری اصل قوت ان کے ذریعے سیاسی آب و ہوا اور موسم کا اندازہ رہتا ہے ا سے بڑھ کر یہ کہ انتخابات یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ ک کے اصل حکمراں عوام ہیں۔ ایک شخص، ایک پارٹی یا چند خا نہیں ہیں۔"

س۔ آپ کے ملک میں پریس کو بڑی آزادی ہے۔ کیا اگر

"سوشلزم کا جوہر یہ ہے کہ ایک ایسا ترقی یافتہ اور تر و تازہ معاشرہ پیدا کیا جائے جس میں دولت کی تق عادلانہ بنیادوں پر ہو اور جس سے تمام لوگوں کی ضروریات پوری ہو سکتی ہوں" (حبیب بورقی

پیمانہ نہیں ہے کہ بعض اخبارات بیرونی طاقتوں کے ہاتھوں
فروخت ہو کر ملک کے مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں
بے شک پریس کی مکمل آزادی کی وجہ سے بعض اخبارات
غیر ذمہ داری کا رویہ اختیار کرتے ہیں، مگر جب دوسرے اخبار
عوام کے سامنے صحیح اور مستند تصویر پیش کرتے ہیں تو عوام جان
لیتے ہیں کہ کونسا اخبار ذمہ دار ہے اور کونسا غیر ذمہ دار۔
یقین ہے میرے ملک کا کوئی صحافی اپنی قوم کے خلاف آلۂ کار
نہیں بن سکتا۔ ایسا سوچنا اور کہنا تو میری قوم اور میرے وطن کی
توہین ہے۔ میں جانتا ہوں پریس کا ایک حصہ ہماری پالیسیوں کا
مخالف ہے لیکن اگر کبھی ملک کی سالمیت اور حفاظت کا مسئلہ پیدا
ہوا تو سارا پریس متحد ہو کر وطن کی حفاظت کرے گا۔

ملک کے وزیر اعظم سلیمان ڈیمریل
جسٹس پارٹی کے نشان گھوڑے کے ساتھ

س۔ کیا آپ کے ملک میں اشتراکیت کے پھیلنے کا خطرہ نہیں ہے؟
ج۔ ہم عوام کو بتا چکے ہیں کہ اشتراکیت قبول کرنے کا مطلب
یہ ہے کہ وہ خاندانی نظام سے دستبردار ہو جائیں گے۔ انھیں
انفرادی ملکیت سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ تمام آزادیاں قربان
کرنی ہوں گی۔ جمہوریت کو خیرباد کہنا ہو گا اور ایک جابرانہ
نظام کے تحت زندگی بسر کرنی ہو گی۔
اگر عوام یہ سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں تو وہ
شوق سے اشتراکیت کو گلے لگا لیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے
ملک کے عوام ایسا احمقانہ فیصلہ کبھی نہیں کریں گے۔
س۔ طلبا کا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا ٹھیک ہے یا نہیں؟
ج۔ صحت مند سیاسی سرگرمیاں کسی اعتبار سے بری نہیں
طلبا کو آگے چل کر قوم اور ملک کے معاملات طے کرنے ہوں گے، اس

لئے انھیں سیاسی شعور اور تربیت کی ضرورت ہے۔ طلبا اور تربیت
کو ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔
ہمارے ہاں زیادہ تر یونیورسٹیاں مکمل طور پر آزاد ہیں۔
علم آزاد فضا ہی میں برگ و بار لاتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ
طلبا اور اساتذہ ملکی مسائل پر تحقیق کرتے ہیں اور ہمارے
سامنے ٹھوس حل پیش کرتے ہیں ہمیں ان کی صلاحیتوں کو قومی
ترقی اور سیاسی صحت مند زندگی کے لئے استعمال میں لانا چاہئے۔

حبیب بورقیبہ ـ سربراہ تیونس

س۔ "آپ جس دستوری سوشلزم" کا دعویٰ کرتے ہیں اسکی
تفصیل کیا ہے؟"
ج۔ سوشلزم کا جوہر یہ ہے کہ ایک ایسا ترقی یافتہ اور
ترقی پذیر معاشرہ پیدا کیا جائے جس میں دولت کی تقسیم عادلانہ
بنیادوں پر ہو اور جس سے تمام لوگوں کی ضروریات پوری ہو سکتی
ہوں۔ دستوری سوشلزم جس کو ہم نے اختیار کر رکھا ہے اس کے
بارے میں فیصلہ نتائج کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہم
اپنی اقتصادیات کو بڑھا رہے ہیں اور باقاعدہ منصوبہ بندی
کے ساتھ انھیں اجتماعی انصاف کی طرف ترقی دے رہے ہیں۔
اجتماعی انصاف ہی باشندگان ملک کے اندر جذبہ و ارادہ
پھونک سکتا ہے اور ان کے اندر وہ فراواں جوش و ولولہ ابھر سکتا
ہے جو پیداوار کو وافر مقدار تک ترقی دے سکے۔ اسی چیز
کو ہم دستوری سوشلزم کہتے ہیں۔ اس کی رو سے بیک وقت
تقسیم کے نظام میں بھی عدل قائم رہتا ہے اور پیداوار میں بھی
اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ بات ـــ دلیل کی محتاج نہیں ہے
اس لئے کہ انسان فطرتاً عدل اور اطمینان سے محبت رکھتا ہے
اور جب انسان یہ دیکھے کہ تمام معاملات انصاف کے ساتھ
چل رہے ہیں اور وہ ظلم و غبن کے شر سے محفوظ ہے تو اس کی
کارکردگی اور جوش و جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ زیادہ سے
زیادہ محنت کرنے لگتا ہے، اس کے نتیجے میں پیداوار میں خود بخود
اضافہ ہوتا ہے اور تمام انسانوں کا معیار زندگی معقول حد
تک بلند ہو جاتا ہے۔

شاہ فیصل ـ سربراہ مملکت سعودی عرب

س۔ کیا نئی زندگی کے نئے تقاضوں کی روشنی میں اسلام
کی تشریح یا اس کے نظام میں کوئی تبدیلی درکار ہے؟
ج۔ اسلام محبت کا مذہب ہے اخوت کا مذہب ہے

واقعات کے آئندہ شمارہ میں

مشہور و مقبول افسانہ نگار

واجدہ تبسم

کا تازہ ترین افسانہ

چاندی کا تخت

ملاحظہ فرمائیے

رجسٹریشن آف نیوز پیپرایکٹ کے رول نمبر ۸ کے مطابق پندرہ روزہ واقعات نئی دہلی کی تفصیل

(۱) مقام اشاعت:۔	نئی دہلی
(۲) وقت اشاعت:۔	پندرہ روزہ
(۳) پرنٹر کا نام:۔	عبدالوحید صدیقی
قومیت:۔	ہندوستانی
(۴) پبلشر کا نام:۔	عبدالوحید صدیقی
قومیت:۔	ہندوستانی
پتہ:۔	ڈی۔ ۱۔ نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۱۳
(۵) ایڈیٹر کا نام:۔	عبدالوحید صدیقی
قومیت:۔	ہندوستانی
پتہ:۔	ڈی۔ ۱۔ نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۱۳

ان افراد کے نام اور پتے جو اخبار کے مالک شراکت دار یا کل
سرمایہ کے ایک فیصد سے زائد کے حصہ دار ہیں۔
عبدالوحید صدیقی۔ ڈی۔ ۱۔ نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۱۳
میں عبدالوحید صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ متذکرہ بالا تفصیل
میرے علم و ذہن کے مطابق صحیح ہے۔ پبلشر کے دستخط
عبدالوحید صدیقی

امن و سلامتی کا مذہب ہے، قوت اور صلابت کا مذہب
ہے، ترقی اور فضیلت کا مذہب ہے۔ جس کو اسلام عزیز ہو
اور اس کی نصرت و عزت عزیز ہو اسکے لئے راستہ واضح ہے
اور جو تحریف کرنا چاہتے ہیں اور اسلام سے وہ چیزیں منسوب
کرنا چاہتے ہیں جن سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے ـــ
وہ مسلمان نما کے منکر ہیں ـــ

ابوالکلام آزاد اور غبارِ خاطر

حمیرا صدیقی (ایم۔اے)

علمی اور ادبی حیثیت سے مولانا آزاد کا اُردو ادب میں ایک الگ مقام ہے۔ ادب اور صحافت کی تاریخ میں ان کی جگہ زبان کے ممتاز ترین انشاء پردازوں کے ساتھ ہے۔ ان کی تحریروں میں انفرادیت کے ساتھ سرسید، شبلی ٹیگور، محمد علی اور اقبال کے ادبی، علمی اور مذہبی افکار کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔

اس بات سے شاید کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا نے اُردو ادب کو نئے نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ ان کی آواز اور لہجے میں انفرادیت اور انانیت کی وہ کھنک ہے جو اس دور کے کسی ادیب کے یہاں نہیں ملتی۔ اس انانیت نے ان میں سچائی اور خلوص اور ان کی شخصیت میں عظمت پیدا کر دی ہے۔ دنیا ان کی نگاہوں میں ایک کفِ دست سے بھی مختصر اور ایک ایسا چٹیل میدان ہے جس کی ہر راہ سے وہ واقف اور ہر روش سے آشنا ہیں۔

واقعات نئی دہلی

اسی خود اعتمادی نے ان کی تحریر اور اسلوب میں وہ انشاء پردازانہ رنگ بھرا ہے جو ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی یہ مخصوص طرزِ تحریر وہ سوانح سرسید، افسانۂ ہجر و وصال اور اس طرح کے دیگر انشاء پردازانہ رنگ کے مضامین میں خاص طور سے نظر آتی ہے۔"

مولانا کا دوسرا طرزِ تحریر خطیبانہ کہا جا سکتا ہے جو الہلال اور البلاغ کے اکثر مضامین کی خصوصیات ہیں۔

غبارِ خاطر مولانا کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں اپنے محترم رفیق اور دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھے تھے۔ اور جیسا کہ اس کتاب کے دیباچے میں درج ہے کہ مکاتیب نجی کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کئے جائیں گے، اور چونکہ یہ خطوط مولانا کی زندگی کی ایک مختصر مدت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس لئے جب تک مولانا کے اور مکاتیب سامنے نہ آ جائیں۔ اُردو خطوط نگاری کی تاریخ میں ان کا مقام متعین کرنا مشکل ہے۔

مولانا کے خطوط میں روز مرہ کی سادگی ا
کی چاشنی نہیں ہے۔ ان خطوط میں مولانا نے عو
رشتہ توڑ لیا ہے۔ مکاتیبِ غالب کی طرح ان
مراسلہ کو مکالمہ نہیں بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ
ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو اسیری کے زمانے
ذوقِ نگارش کی تسکین کے لئے لکھے گئے تھے ا
اس بات کا خیال بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی شائع ہو
مکتوب الیہ تک پہنچیں گے۔ اس لئے اس میں
کی خود کلامی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اس لئے ان
موازنہ کسی دوسرے مکاتیب سے کرنا ٹھیک نہ
خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکث
اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس ط
دل میں ہوتا ہے اسی طرح صفحۂ قرطاس پر بکھر جا
اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر
دیتا ہے تو شاید زیادہ ٹھیک رہے گا۔ غبارِ خاط
اگر اس روشنی میں کیا جائے تو مولانا آزاد کی نفس
بہت سے گوشے اس آئینے میں بے نقاب ہو جاتے

غبارِ خاطر میں غالب اور سرسید کی ساد
شبلی اور آزاد کی مرصع نگاری اور رنگینی، نذیر احم
کی متانت اور سنجیدگی۔ مہدی افادی اور نیاز کی
اور جمالیاتی تشنگی۔ اقبال کے فکر کی گہرائی اور معنو
کے منفرد اسلوبِ نگارش میں گھل مل گئی ہے۔ اس
نہیں کہ غبارِ خاطر بعض حیثیتوں سے مکتوب نگار
سے الگ بھی ہے۔ انشاء اور مکتوب نگاری کے لحا
اس کا درجہ اتنا بلند نہیں جتنا خود نوشت اور ادبی
کے لحاظ سے بلند ہے۔ اس میں رعنائی اور لطافتِ
دونوں موجود ہیں۔ اس کی نثر میں شعر کی ساری ا
سموئی ہوئی ہیں۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر محمد حسن ۔
اسلوب کے لحاظ سے تخیل کا اوزار کہا ہے جو ہزار دا
تراشتا اور لاکھوں صنم آراستہ کرتا ہے۔

غبارِ خاطر کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے ک
خط غبار سے مولانا کی وارداتِ قلب اور نفسیات
لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں مولانا کی فطرت کی تص
نظر آتی ہے، اور ان کی مشکل پسندی، غمگینی اور ا

حکمت [illegible] اناٹیت اور [illegible] کائنات اور مشاہدۂ فطرت۔ مذہب اور فلسفے کے مسائل سب پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ادب اور زندگی کی کوئی بھی راہ ہو مولانا تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل ہیں وہ کسی ایسی عمومیت سے مفاہمت نہیں کر سکتے جو ان کے مخصوص انفرادیت کے سانچے میں نہ ڈھل سکے۔ وہ معمولی سی معمولی باتوں میں بھی اپنے لئے ایک امتیاز پیدا کر لیتے ہیں۔ سیدھی سادی بات بھی عمومی انداز میں نہیں کہہ سکتے۔ قید کی پابندیوں میں اپنے ذوقِ نگارش کا بیان بھی اسی انداز سے ختم کرتے ہیں۔

"لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا
کبھی بالِ کبوتر سے۔ ہمارے حصے میں عنقا آیا"

اسی طرح سونے جاگنے اور کھانے پینے میں بھی ان کا مسلک تقلید نہیں اجتہاد ہے۔ مثلاً اپنے خطوط میں سونے اور جاگنے کے اوقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی ساری دنیا سے الٹی چال میرے حصے میں آئی۔ دنیا کے سونے کا وقت جو سب سے بہتر ہے وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں اور میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت اندوز ہوتا رہوں۔"

جلوت سے بیزاری اور خلوت سے لگاؤ فطری چیز ہے اس کو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں جلوت سے زیادہ خلوت سے لگاؤ تھا۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے اس لئے خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے۔ مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنے کام جو گوشوں میں الگ گھس گیا"

حقیقت کی [illegible] چونکہ انھیں ایک طرح کی تنہائی اور بے چارگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور اپنی زندگی کے سوز و گداز کو اس شاعرانہ انداز بیان میں بیان کرتے ہیں۔

جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں
کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصے میں
تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انھوں
نے پھول چن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے
ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے

ان کے خیالات کی طرح ان کی خودی کا درجہ بہت اونچا تھا۔ ان کے دل پر کچھ بھی گزر جائے دوسروں کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ اور انتہائی کرب و اذیت کی حالت میں بھی ان کے وقار اور تمکنت میں فرق نہ آتا تھا۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ان کی اہلیہ کی موت ہے جو ان کے ایامِ اسیری میں ہوئی تھی۔ دیکھئے اس حادثے کو کس خودداری اور وقار کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

"جیلر اخبار لے کر سید ھا میرے کمرے میں آتا ہے۔ جوں ہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ شروع ہوتی ہے دل دھڑکنے لگتا ہے کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی۔ لیکن پھر میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی، اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کر کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو حسبِ معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا تھا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے۔ اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا، گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ساری ظاہر داریاں مکاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا ایک مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

غرض مولانا نے اپنی انفرادیت، انانیت اور دماغ [illegible] ڈرامے کا طرز بیان [illegible] واقعات زندگی مولانا زندگی کے لازوال حقائق اور مظاہر کو جس گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کا اندازہ غبارِ خاطر کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں موسیقی سے اپنے شغف اور ہندوستان میں فنِ موسیقی کے کمالات اور اس کی تاریخ تفصیل سے بیان کی ہے۔ یہ مطالعے کے شوق کا نیا پہلو ہے۔ ایک مکتوب میں اپنے شاعرانہ وجدان کو اس وارفتگی سے بیان کرتے ہیں۔

"رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا، اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے ان ہی آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ ..... رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی چاندنی اور اپریل کی بھیگی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں، بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردۂ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔"

انشاء اور مکتوب نگاری کے نقطۂ نظر سے ممکن ہے غبارِ خاطر کے مکاتیب زیادہ وقعت نہ رکھتے ہوں لیکن اگر خطوط سے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے تو یقیناً ان اوراق کے غبار میں مولانا کی شخصیت بڑی حد تک بے نقاب نظر آتی ہے۔ اسی عالم کو خیالات کی رفعت، فکر اور ادب و آرٹ کے وہ نمونے ملتے ہیں جو مولانا کو ایک بڑے آرٹسٹ اور ایک بلند پایہ ادیب، ایک عظیم مفکر و فلسفی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

فرخ رو پارسا

ایران کی خاتون وزیر تعلیم

۱۹۶۸ء میں شاہ ایران اور شاہ بانو ہندوستان آئے۔ دہلی میں وزیر اعظم اندرا گاندھی اور مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے ساتھ۔

فرخ رو پارسا کا نام ہم ہندوستانیوں کے لئے ذرا اجنبی ہے لیکن ایران میں بہت کم لوگ اس نام سے ناواقف ملیں گے۔ یہ نام ہے ایران کی خاتون وزیر تعلیم کا جنہوں نے معلی استانی کے درجے سے ترقی کر کے ایرانی کابینہ میں وزارت تعلیم کا ممتاز اور اہم عہدہ حاصل کیا ہے۔ فرخ رو پارسا شادی شدہ ہیں اور چار بچوں کی ماں ہیں جن میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ لڑکے کی عمر ۲۲ برس ہے اور لڑکیاں بالترتیب ۱۳، ۱۷، ۲۰ برس کی ہیں۔ ان کے شوہر احمد پارسا ایرانی فوج میں ایک ممتاز عہدے پر فائز ہیں۔

وہ اپنی وزارتی اور گھریلو ذمے داریاں کو اس خوش اسلوبی سے نباہتی ہیں کہ ان کی زندگی نئے ایران کی لڑکیوں کے لئے نمونہ بن گئی ہے۔

شادی شدہ عورت کو سب سے زیادہ دلچسپی گھر، بچوں سے اور شوہر سے ہوتی ہے۔ لیکن وزارت کی عظیم ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد انہیں اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جن سے انہیں والہانہ محبت ہے فرصت کے چند لمحات گزار سکیں۔ انہوں نے ایران کی خاتون صحافی مریم خوانزی سے حال ہی میں ایک انٹرویو میں بڑی حسرت کے ساتھ کہا تھا کہ۔

ان کے ۲۴ گھنٹوں میں سے پندرہ گھنٹے وزارتی مصروفیتوں میں گھر سے باہر اور سیاسی ہلچل سے دور گزرتے ہیں۔ گھر میں وہ بمشکل ۹ گھنٹے رہ پاتی ہیں۔ ان میں سے بھی دو گھنٹے اشد ضروری دفتری کام کاج کے لئے اچانک میرے پڑ جاتے ہیں۔ تقریباً پانچ گھنٹے سونے میں صرف ہوتے ہیں۔ شوہر اور بچوں کے ساتھ رہنے کے لئے صرف دو گھنٹے کی مہلت ملتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ۔

"تاہم میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کو کسی وقت بھی نظر انداز نہ ہونے دوں۔ لیکن بسا اوقات سینما جاتے وقت یا دوسرے تفریحی پروگراموں یا ضیافتوں وغیرہ میں جب میں ان کا ساتھ نہیں دے پاتی تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔"

وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے

اس خاتون وزیر سے انٹرویو لینے والی خاتون صحافی کا دوسرا سوال قدرتی طور پر ان کی شادی کے بارے میں تھا۔ وہ فطری طور پر یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ کیا انکی شادی کسی رومانس کا نتیجہ تھی۔

"عورت وزیر بننے کے بعد بھی عورت ہی رہتی ہے" جواب دیتے ہوئے اگر فرخ رو پارسا کے رخساروں کی سرخی ذرا گہری ہو گئی تو اسے ماضی کی خوشگوار یادوں کا اثر ہی سمجھنا چاہئے۔ تاہم انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہ ان کی شادی کسی رومانس کا نتیجہ تھی۔ جواب میں وہ اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں گویا ہوئیں۔

"وقت بھی کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ اب میری شادی کو ۲۸ برس ہو چکے ہیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہماری شادی کی تہہ میں کوئی ایسی بات تھی۔" پھر ذرا ٹھہر کر کہنے لگیں۔

"میں اور وہ [ان کے شوہر احمد پارسا] دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ پڑوسی ہونے کے باعث ہم اور ہمارے والدین ایک دوسرے سے تھوڑا واقف تھے۔ ہمارے تعارف کو سات برس ہو چکے تھے کہ مجھے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں اور احمد کو ملٹری کالج میں داخل ہونا پڑا۔

جب وہ فارغ التحصیل ہو کر لوٹا تو میں بھی ڈگری لے چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں ہماری شادی ہو گئی۔

شادی شدہ زندگی کے ان ۲۸ برسوں کا بڑا حصہ میں نے ملازمت میں گزارا ہے۔ ۱۴ برس تک میں رضا شاہ کبیر اسکول میں استانی رہی۔ پھر ۶ برس تک اسی اسکول میں ہیڈ مسٹریس رہی۔ لیکن آج کل کے مقابلے میں ان دنوں میرا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ وزیر بننے کے بعد اب مجھے یہ آسانی ہے کہ دو گھنٹے روزانہ گھر پر وزارتی کام کر سکتی ہوں۔

جب میں طالب علم تھی تو کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ میں وزیر تعلیم بھی بن سکتی ہوں۔ اس وقت میں یہی سوچتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ ہیڈ مسٹریس بن سکوں گی۔

ہاں تو اب کہ ایک عرصے [illegible]

وہ ہیڈ مسٹریس بننے کا خواب دیکھتی تھی لیکن وزیر تعلیم بن گئی

ے آرائش گیسو کیلئے بھی وقت نہیں ملتا اور درزی میری وعدہ خلافی کا عادی ہو چکا ہے

ین لیڈی ڈاکٹر بنوں یا ٹیچر۔ ۱۹۵۰ء میں میں نے میڈیکل یونیورسٹی
ہ ڈاکٹری کی سند لی تھی لیکن فالتو وقت میں بچوں کو پڑھایا کرتی
ی اس میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ بالآخر میں نے استانی کا پیشہ
ختیار کر لیا۔ کیونکہ اس طرح مجھے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت
زارنے کا موقع ملتا تھا جو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

میرے وزیر بننے سے میرے شوہر مطلق پریشان نہ
ئے۔ وہ بہت خوش ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ یا تو عورتیں
ھر کے باہر مطلق کام نہ کریں۔ اور اگر کام کریں تو مردوں کی
رح اعلیٰ عہدوں تک پہنچیں۔"

"شوہر اور بیوی دونوں گھر سے باہر کام کرتے ہوں تو
ر کا ماحول کس طرح خوشگوار رہ سکتا ہے۔؟" اس کا جواب
ہوں نے یوں دیا۔

"میں اور میرے شوہر کبھی اپنی دفتری مصروفیات کو گھر
ے معاملات میں مخل نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ میں اور میرے شوہر
ر میں قدم رکھتے ہی اپنے دفتری عہدے اور پوزیشن کو بالکل بھول
تے ہیں اور عام زن و شوہر کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔
ں کی پرورش کا بوجھ ہم مل کر اٹھاتے ہیں اور اس ذمے داری
و مساوی طور پر انجام دیتے ہیں۔

میاں بیوی کے جھگڑے......

دوسرے گھر والوں کی طرح ہمارے درمیان بھی اختلافات
وتے ہیں۔ بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی ہمارے درمیان اکثر
ختلاف رائے ہوتا ہے۔ مثلاً میرے شوہر اکثر بچوں کی ضد کے
امنے جھک جاتے ہیں اور ان کی بات مان لیتے ہیں جب کہ میں
یسا کرنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن بالعموم ہم میں سے ایک فریق
دوسرے کی بات مان لیتا ہے اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم
پنے بچوں کے سامنے کبھی اختلافِ رائے کا اظہار نہیں کرتے اور
نہ کبھی اس بات کا بچوں کو پتہ چلنے دیتے ہیں۔

مجھے گھر داری میں اور گھر سے باہر کام کرنے میں یکساں
ور برابر کی مسرت ہوتی ہے۔

پسندیدہ خوراک

لیکن میرا تفریحی مشغلہ کھانا پکانا ہے۔ مجھے بھی پکانا
بہت پسند ہے۔ میں بھی سے انواع و اقسام کے اچھے اچھے کھانے
تیار کر سکتی ہوں جن کو میرا سلاد اکثر بڑے شوق سے کھاتا ہے
انہیں مربے اور میٹھی چٹنیاں بھی بہت پسند ہیں، چنانچہ میں اکثر
یہ چیزیں تیار کرتی رہتی ہوں جو بہت جلد ختم ہو جاتی ہیں۔
انہیں ہجی (ناشپاتی کی ایک قسم) کا مربہ بہت پسند ہے جو
میں اکثر تیار کرتی رہتی ہوں۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتی کہ
اعلیٰ درجے کا کھانا پکا لیتی ہوں۔ لیکن میں اپنی طرف سے
کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔"

"مجھے وقت کی کمی کا اس وقت بڑا شدید احساس
ہوتا ہے جب مجھے آرائش گیسو کے لئے جانا پڑتا ہے یا لباس
کی تیاری کے لئے درزی کے پاس جانا پڑتا ہے۔ میں نے
آرائش گیسو کے لئے ایک عورت کو مخصوص کر رکھا ہے۔ مجھے اس کام
کے لئے صبح سویرے ۶ بجے کا وقت ہی ملتا ہے کیونکہ گھر کے کام
کاج اور وزارت کی ذمے داریاں ایسی ہیں کہ دوسرا کوئی وقت مل
ہی نہیں سکتا۔ جہاں تک درزی کا تعلق ہے وہ وعدہ
پورا نہ کرنے اور پروگرام منسوخ کرنے کا عادی ہو چکا ہے
میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت
اور دوروں میں ریڈی میڈ۔ سلے سلائے کپڑے خرید لوں لیکن
اگر ضرورت پڑے تو میں اپنا لباس خود بھی تیار کر سکتی ہوں۔
ادھڑے ہوئے کپڑوں کو سینے کا سارا کام اب بھی میں خود ہی کرتی
ہوں۔ گھر کے سب لوگوں کے کپڑوں میں بٹن بھی میں خود ہی
ٹانک لیتی ہوں۔"

تقریری اقتباس

جب بھی میرے شوہر کو مجھے چھیڑنا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں
"کیا آپ ایک منٹ کے لئے اپنی وزارت کو چھوڑ کر میرا یہ بٹن
لگا دیں گی؟"

مجھے اتنا وقت نہیں ملتا کہ تقریبات میں زیادہ عورتوں اور ضیافتوں
میں اپنے شوہر کے ساتھ جا سکوں۔ لیکن ہم دونوں اس بات کی
انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ پندرہ دن میں کم از کم ایک بار ساتھ
کھانا کھا سکیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی اعلیٰ درجے
کے ہوٹل میں یا تہران کے کسی پرسکون فرحت بخش مقام پر تفریح
کے لئے جائیں اور چند لمحے فراغت اور سکون کے ساتھ گزاریں
لیکن اس وقت بھی کچھ لوگ مل جاتے ہیں جو اس بات کا احساس
نہیں کرتے کہ ہمیں چند لمحے سکون سے گزار لینے دیں۔ یہ لوگ ہماری
کھانے کی میز پر آ جاتے ہیں اور مجھ یا میرے شوہر سے اہم
امور پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ غرض ہمیں چین نہیں لینے
دیتے——— جب میں رضا شاہ کبیر اسکول
میں ٹیچر تھی اور اس کے بعد جب میں ہیڈ مسٹرس ہو گئی تو مجھے
ایک عجیب پریشانی کا سامنا تھا۔ میرے بچے بھی اسی اسکول
میں پڑھتے تھے۔ ہر وقت وہ ہم سے شکایت کرتے کہ اگر وہ تعلیم
پر توجہ نہیں کرتے اور ان کا تعلیمی نتیجہ خراب ہوتا ہے تو انہیں
سزا ملتی ہے اور جب وہ محنت کر کے پڑھتے ہیں اور اچھے نمبر
حاصل کرتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی ماں ہیڈ مسٹرس ہے
اس لئے انکو اچھے نمبر ملے ہیں۔" جب تک میں اس اسکول میں
رہی مجھے اس دشواری کا سامنا رہا۔

اب جب میں وزیر بن گئی ہوں تو لوگ میرے شوہر کو
اور دوسرے رشتہ داروں کو ہر وقت پریشان کرتے رہتے ہیں
اور سمجھتے ہیں کہ ان پر دباؤ ڈال کر وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے
مسائل کو میرے ذریعے طے کرا لیں گے۔ جو لوگ میرے شوہر سے
اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ
میرے شوہر میرے دفتری فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں
اور میں ایک فرمانبردار مشرقی بیوی کی مانند ان کی ایسی تمام باتوں
کو مان لیتی ہوں۔

اگرچہ میرے شوہر فوجی افسر ہیں لیکن میرے مکان
میں فوجی نظم و ضبط کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں
کہ اس کے فوجی افسر ہونے کی وجہ سے گھر میں بڑا نظم و ضبط
ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس میرا شوہر بہت نرم دل ہے اور
بچوں کے بہت زیادہ قریب ہے۔ میرے مقابلے میں میرا شوہر
بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا ہے، تاہم اتنا ضرور ہے
کہ ہم سب لوگوں کو صبح ۶ بجے بستر سے اٹھا دیتا ہے۔ چھٹیوں
میں بھی وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اگر وہ
ایسا نہ کرتا تو شاید آج یہ عہدہ اور یہ پوزیشن میں حاصل نہ کر پاتی۔

بے نظیر ہوں اور میرے شوہر فوجی لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی ہم اپنے عہدے کو بھول جاتے ہیں

عرب اپنی دلیرانہ جدوجہد میں ضرور کامیاب ہونگے

ماہ جنوری کا عرب کیلنڈر

یکم جنوری ◀ اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی برائے مشرقِ وسطیٰ بذریعہ ہوائی جہاز نیویارک پہونچتے ہیں اور عرب اسرائیل مذاکرات امن کے لئے میں تیاریاں شروع کردیتے ہیں۔

۲ جنوری ◀ صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انورالسادات ایک بڑی پریس کانفرنس میں اعلان کرتے ہیں کہ وہ جنگ بندی میں مزید توسیع کی اجازت نہیں دیں گے تاآنکہ سلامتی کونسل کی قرارداد کو جامۂ عمل پہنانے کے سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا جائے۔

۳ جنوری ◀ عراق میں ناخواندگی دور کرنے کے لئے پندرہ سالہ مہم کا افتتاح دس اور پینتالیس سال کے اشخاص کے لئے تقریباً ۵۰۰ مرکز کھولے گئے ہیں جہاں تعلیم حاصل کرنے والے بارہ ہزار اشخاص کی گنجائش ہے۔ بغداد اور نواحی علاقوں کے لوگوں کو ٹیلی ویژن پر بھی درس دیے جائیں گے۔

۴ جنوری ◀ اسرائیل میں زبردست جنگی بجٹ پیش کیا جاتا ہے جس میں ۱۳ ارب ۳۰ کروڑ اسرائیلی پونڈ کی رقم جنگی مقاصد کے لئے مخصوص رکھی جاتی ہے۔ اسرائیل کا مجموعی خسارہ ایک ارب ۳۰ کروڑ ڈالر سے بڑھ کر ایک ارب ۴۴ کروڑ ڈالر تک پہنچ جائے گا۔

—— صدر نکسن نے مشرقِ وسطیٰ میں طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لئے اسرائیل کو یقین دلایا کہ وہ اسرائیل کو برابر ہتھیار مہیا کرتا رہے گا۔

—— متحدہ عرب جمہوریہ نے مختلف ممالک کی راجدھانیوں کو اپنے ایلچی روانہ کئے تاکہ انھیں مشرقِ وسطیٰ کے حقیقی حالات سے آگاہ کیا جاسکے۔

—— عراق نے اپنی فوج کی پچاسویں سالگرہ منائی اور صدر احمد حسن البکر نے فوج سے سلامی لی۔

۶ جنوری ◀ متحدہ عرب جمہوریہ کے پارلیمانی مشن نے جس کی قیادت ڈاکٹر لبیب شقیر کررہے تھے نئی دہلی میں صدر وی وی گری سے ملاقات کی اور ان کے روبرو مشرقِ وسطیٰ کے حالات کی وضاحت کی۔

۷ جنوری ◀ متحدہ عرب جمہوریہ۔ لیبیا۔ سوڈان اور شام کی مجوزہ فیڈریشن کے وزراء تعلیم کا دو روزہ اجلاس دمشق میں شروع ہوا۔

۸ جنوری ◀ متحدہ عرب جمہوریہ اور اردن کے درمیان تجارتی معاہدے کے تحت دونوں ملک ایک دوسرے کو جو برآمد کرتے ہیں اسے ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دیا گ

۱۰ جنوری ◀ عرب لیگ کے زیر اہتمام ٹریپولی عرب موسیقی کانفرنس کا انعقاد —— کسی عرب ملک منعقد ہونے والی اپنی نوعیت کی یہ پہلی کانفرنس تھی۔

—— عرب لیگ کے سیکریٹری جنرل مسٹر عبدالخالق نے پہلی عرب ٹیکسٹائل نمائش کا افتتاح کیا اس نمائ میں متحدہ عرب جمہوریہ۔ شام سوڈان۔ تیونس۔ عراق لبنان نے شرکت کی۔

۱۲ جنوری ◀ سوڈان اور کویت کے لیڈروں تمام عرب علاقوں کے فوری طور پر مکمل انخلا کا مطالبہ صدر سوڈان نے میجر جنرل نمیری کے چار روزہ دورہ کے بعد تک جاری کیا گیا، اس میں یہ مطالبہ بھی کیا برطانیہ خلیج فارس کے علاقے کو خالی کردے اور اس کے باشندوں کے حق و اختیاری کو تسلیم کرلے۔

—— سوویت روس کے صدر مسٹر پدگورنی قاہرہ

۱۵ جنوری ◀ آسام بند کا افتتاح عمل میں اسی دن مرحوم صدر ناصر کا یوم پیدائش بھی تھا۔

۱۶ جنوری ◀ متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیر مسٹر نے مشرق وسطیٰ سے متعلق اقوام متحدہ کے نمائندے گنار یارنگ سے ملاقات کی اور انھیں مشرقِ وسطیٰ کے میں عرب موقف سے آگاہ کیا۔

۱۸ جنوری ◀ سعودی عرب نے خود اپنی سرک نیوز ایجنسی شروع کی جو خصوصی طور پر مشرق وسطیٰ میں صحیح خبریں مہیا کرے گی۔

عرب شہری فضائیہ کی کونسل نے ہوائی جہا ہائی جیکنگ ۔ کی مذمت کی اور کہا کہ یہ غیر قانونی ہیں یہ کونسل نے جسکا ایک ہفتے تک قاہرہ میں اجلا رہا تمام عرب ریاستوں پر زور دیا ہے کہ مستقبل میں ہوائی جہازوں کے اغوا کی واردا توں کو روکنے موثر اقدامات کریں۔

صدر سوویت روس مسٹر پدگورنی نے اپنے ا میں امید ظاہر کی کہ عرب لوگ اپنی دلیرانہ جدوجہد کامیاب ہوں گے۔

—— عرب لیگ کے ہیڈکوارٹر میں چھٹی عرب انشو

افتتاح ہوا جس میں تمام عرب ممالک کے ۴۰ انشورنس کمپنیوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ عرب لیگ کے سکریٹری جنرل مسٹر عبدالخالق حسونہ نے بیمہ کے میدان میں عربوں کے درمیان اشتراک و تعاون پر زور دیا۔

۱۰ جنوری ◀ ترپولی چارٹر میں شامل چار ممالک متحدہ عرب جمہوریہ۔ سوڈان۔ لیبیا اور شام۔ کی چوٹی کانفرنس قاہرہ میں شروع ہوئی۔

نئی دہلی میں ہند اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان تجارتی بات چیت کا آغاز ہوا۔

۲۱ جنوری ◀ ترپولی چارٹر میں شامل ممالک کا بند کمرے میں اجلاس۔

صدر فرانس مسٹر پومپیڈو نے کہا کہ اسرائیل ان علاقوں کو خالی کرنے کا پابند ہے جن پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔

۲۲ جنوری ◀ بیروت میں انکشاف ہوا کہ فلسطینی فدائین کی جاسوسی کرنے کے لئے اسرائیل نے ایک جال بچھا رکھا ہے جس میں خاص طور سے عورتوں کو بھرتی کیا گیا ہے۔

۲۳ جنوری ◀ تیونس کے صدر مسٹر حبیب بورقیبہ نے واشنگٹن میں وزیر خارجہ مسٹر راجرس سے کہا کہ "اگر خانہ برباد فلسطینی مہاجرین کے مسئلے کا کوئی منصفانہ حل معلوم نہ کیا گیا تو مشرق وسطیٰ میں پائیدار امن ممکن نہیں۔"

کویت میں عام انتخابات شروع۔

چلی کے صدر ڈاکٹر ایس۔ ایلنڈے نے مشرق وسطیٰ سے متعلق اپنے ملک کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے عربوں کے موقف کی حمایت کی۔

۲۴ جنوری ◀ لیبیا کے وزیر اعظم کرنل معمر القذافی نے اعلان کیا کہ جلد ہی صدر کے انتخاب کے لئے عام رائے شماری ہوگی۔

اردن کی قومی معیشت کے وزیر عمر نابلسی کی قیادت میں اردن کا ایک تجارتی وفد نئی دہلی پہنچا اور دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو بڑھاوا دینے کے لئے ہندوستانی افسروں سے بات چیت کی۔

۲۵ جنوری ◀ حبشہ کے شہنشاہ ہیلا سلاسی نے عرب مقاصد کی حمایت کا اعلان کیا۔

—— کرنل قذافی کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ وہ عہدۂ صدارت کے انتخاب میں کھڑے ہوں گے۔

۲۶ جنوری ◀ پولینڈ نے اعلان کیا کہ وہ عربوں کے موقف سے پوری طرح ہمدردی رکھتا ہے اور وہ عرب عوام کی حمایت کرے گا۔

—— اردن نے سلامتی کونسل کے صدر کو سات نکاتی تجاویز پیش کیں جن میں عرب علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کی فوری واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔

۲۷ جنوری ◀ عرب لیگ نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ اسرائیل ہیبرون (خلیل) کے شہر کو یہودیوں کے شہر میں بدل دینا چاہتا ہے اور وہاں اس نے بڑی تعداد میں یہودیوں کو بسانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ عرب ملکوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ تمام ممالک کو اسرائیل کے اس ناپاک منصوبے سے باخبر کریں۔

—— کویت کے حکمراں نے شیخ جابر الاحمد الصباح کو نئی حکومت بنانے کی ہدایت کی۔ انتخاب کے نتیجے سے معلوم ہوا کہ قومی اسمبلی کے پچاس ممبروں میں پندرہ نئے ممبر منتخب ہوئے۔

۲۸ جنوری ◀ یروشلم کے مشنری نے اعلان کیا ہے کہ اسرائیل اردن کے مقبوضہ مغربی کنارے کے قریہ جات کو بیت المقدس میں شامل کرکے اسے اور وسعت دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

—— وزیر اعظم اسرائیل مسز گولڈا مائر نے طالب علموں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل ہرگز ان علاقوں کو خالی نہیں کرے گا جن پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔

—— سعودی عرب کے وزیر تجارت نے جدہ میں اعلان کیا کہ حکومت نے سعودی عرب میں صنعتی سیکٹر کو ترقی دینے کے لئے نئے اقدامات کئے۔ باہر سے منگائی جانے والی بہت سی خام اشیاء، مشنری اور فالتو پرزوں پر کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔ ■■

پاکستان میں صوبائی خودمختاری کا مطالبہ زور پکڑ گیا

پاکستان

پاکستان میں گورنر مشرقی پاکستان مسٹر ایس ایم احسن کی برطرفی اور آئین ساز اسمبلی کے اجلاس کا غیر معینہ عرصے کے لئے التوا تعجب خیز نہیں ہے۔ ابتدا ہی میں صدر پاکستان جنرل یحییٰ خاں نے شرط لگا دی تھی کہ اگر ۱۲۰ دن کے اندر آئین تیار نہ ہوا تو اسمبلی توڑ دی جائے گی اور پھر از سر نو انتخابات کرائے جائیں گے لیکن اسمبلی کے اجلاس شروع ہونے سے پہلے ہی یہ پتہ چل گیا کہ مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ اور مغربی پاکستان کی پیپلز پارٹی اور دوسری پارٹیوں کے درمیان بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ شیخ مجیب الرحمان۔ یہ عوامی لیگ بضد ہیں کہ جو بھی آئین تیار ہوگا وہ ان کے چھ نکات کی بنیاد پر تیار ہوگا جبکہ مغربی پاکستان کی پارٹیاں جن میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ قیوم گروپ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہتی ہیں کہ اگر مجیب الرحمان کے چھ نکات کی بنیاد پر آئین تیار ہوا تو ملک کی سالمیت ختم ہو جائے گی اور وہ بنیاد ہی باقی نہ رہے گی جس پر کہ پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ لہذا وہ اس معاملہ میں شیخ کے ساتھ تعاون نہیں کریں گی اور اسمبلی کا بائیکاٹ کر دیں گی۔ ان چھ نکات کا مقصد صوبوں کو مکمل خودمختاری دینا اور مرکز کو تمام کلیدی اختیارات سے جن میں ٹیکس لگانے کا اختیار بھی شامل ہے محروم کرنا ہے۔

پچھلے دنوں جب شیخ مجیب الرحمان اور مسٹر بھٹو کی ملاقات کے پروگرام کا اعلان ہوا تھا تو یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کی بڑی پارٹیاں باہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گی اور ان بنیادوں پر مصالحت ہو سکے گی جن پر کہ آئین کی تیاری عمل میں آئے گی۔ لیکن یہ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ دونوں پارٹیوں کے لیڈر اپنے بنیادی اختلافات کو دور نہ کر سکے۔ شاید یہ اختلافات دور ہو بھی نہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ شیخ مجیب الرحمان نے جس بنیاد پر الیکشن جیتا اس پر وہ قائم رہنے کے پابند ہیں یوں بھی جب ۳۰۰ ممبروں کی قومی اسمبلی میں انھیں ۱۶۰ سیٹیں حاصل ہوں تو ان کا رویہ قدرتی طور پر سخت ہونا چاہئے۔ طاقت خود بخود رویہ سخت بنا دیتی ہے مگر دوسری طرف مغربی

صدر یحییٰ خان — جو نہیں چاہتے کہ پاکستان میں عوامی حکومت قائم ہو

پاکستان میں مسٹر بھٹو کی بھی اپنی طاقت ہے۔ ان کی پارٹی کو ایوان اسمبلی میں مغربی پاکستان کی تمام دوسری پارٹیوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی ۸۱ سیٹیں حاصل ہیں۔

دونوں پارٹیوں کے رویہ میں تھوڑی لچک ہوتی تو مفاہمت کوئی مشکل نہ تھی لیکن ہر ایک پارٹی اپنے اپنے موقف پر سختی سے قائم رہی، اور نتیجہ میں صدر پاکستان کو اسمبلی کا اجلاس عرصہ غیر معینہ کے لئے ملتوی کر دینا پڑا یہی نہیں بلکہ مشرقی پاکستان کے گورنر کی جگہ جو صرف چھ دن پہلے اسلام آباد میں صوبائی گورنروں اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد صدر یحییٰ کا پیغام خیر سگالی شیخ کے نام لے کر گئے تھے لفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ محمد یعقوب خاں کو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا ہے سابق گورنر مسٹر ایس۔ ایم احسن نے شیخ مجیب الرحمان کو ایک باوقار سیاستداں قرار دیا تھا شاید اسی کی سزا انھیں مل رہی ہے کہ وہ اپنے عہدہ سے الگ کر دیئے گئے۔

قومی اسمبلی کے غیر معینہ عرصے کے لئے التوا کا قدرتی طور پر مشرقی [illegible] پاکستان میں سخت رد عمل ہوگا اور مظاہرے اور احتجاجی جلوس [illegible] تشدد کے واقعات بھی ہو سکتے ہیں جہاں بھاشانی جیسے [illegible] پسند لیڈر موجود ہوں وہاں کیا کچھ ممکن نہیں لیکن اگر ایسا ہوا تو مشرقی پاکستان کے رہنما ایک جمہوری حکومت قیام میں مزید تاخیر کا سبب بنیں گے اور موجودہ حکمرانوں کو اسمبلی کا اجلاس اور زیادہ دنوں تک ملتوی رکھنے کا عذر مل جائیگا

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اسے اس بات پر افسوس ضرور ہے کہ پاکستان میں عوامی جمہوریت کے قیام میں بعض چند لیڈروں کے سخت رویہ کی بنا پر تاخیر ہو رہی ہے۔ لیکن یہ پاکستان کا اپنا اندرونی معاملہ ہے ہندوستان کو اس میں کسی نوعیت سے بھی ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ صدر یحییٰ نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کی جو ایک وجہ بتائی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہیں وہ ایک بالکل بے جوڑ بات ہے اصل وجہ وہی ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیڈر الگ الگ راستوں پر چل پڑے ہیں۔ اور ایسی صورت حال صرف اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ اقتصادی ترقی کی دوڑ میں مشرقی پاکستان پیچھے رہ گیا ہے اور زیادہ فائدہ مغربی پاکستان اور مغربی پاکستان میں بھی صرف پنجاب کے لوگوں کو پہنچا۔ آفت اور اس عدم برابری سے مختلف علاقوں میں جو بے چینی پیدا ہوئی ہے اسے آج کل کے اس مادی دور میں مذہبی رشتوں کا حوالہ دے کر دور کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر آج مشرقی پاکستان میں حالات ناموافق ہیں تو اس کی تمام تر ذمہ داری مغربی پاکستان کے ان حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے نظم و نسق اور اقتصادی ترقی میں انصاف سے کام نہ لیا۔ اور نتیجہ میں صوبائی خودمختاری کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ اس مطالبہ کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مارشل لا کے تحت پولیس اور فوج کی طاقت سے اُسے کچھ عرصے کے لئے دبا دیا جائے۔ پاکستان میں ایک وفاقی حکومت ہی دونوں حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک رکھ سکتی ہے۔

ترکی

۱۹۴۶ء میں جب امریکی بحری جہاز مسوری استنبول پہونچا تو امریکی ملاحوں کی وہ آؤ بھگت ہوئی کہ اس سے پہلے کسی کی نہ ہوئی تھی۔ اپنی ضرورت کی جو چیزیں وہ خریدتے

یہ امریکی بیڑے کا قحبہ خانہ نہیں ہے

ان سے اس کی قیمت تک نہ لی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں طوائفوں نے بھی ان کے لئے اپنے دروازے مفت کھول دیئے تھے۔

بات یہ تھی کہ گزشتہ ۳۰۰ برس کے دوران ترکی کے ساتھ تیرہ جنگیں لڑنے کے بعد روس ایک مرتبہ پھر باسفورس اور دره دانیال کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا۔ بیس برس تک امریکیوں کی خوب خاطرداری ہوتی رہی۔ اور امریکہ نے اس محبت کا جواب ۵ ارب ڈالر کی فوجی اور اقتصادی امداد کی صورت میں دیا۔ دونوں ملکوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی اور دونوں اس حد تک شیر و شکر ہو گئے کہ جب امریکا نے اشارہ دیا تو ترکی نے ۱۹۵۰ء میں ڈھائی ہزار فوجیوں پر مشتمل اپنا ایک بریگیڈ کوریا بھیج دیا۔

طلباء امریکہ کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے۔

لیکن ۱۹۶۹ء تک جب امریکا کا بحری جہاز فورسٹال استنبول پہنچا تو فضا بالکل بدل چکی تھی۔ امریکی مخالف ہجوموں نے کئی امریکی ملاحوں کو باسفورس کے پانی میں پھینک دیا اور ترک خواتین نے ان تختیوں سے امریکی جہاز کا استقبال کیا جن پر لکھا تھا: "استنبول چھٹے امریکی بحری بیڑے کا قحبہ خانہ نہیں ہے۔"

ابھی پچھلے چند ہفتوں میں امریکی دفاتر، امریکی مکانات اور امریکی تنصیبات پر بم پھینکے گئے۔ دو ہفتے قبل انقرہ کے نزدیک پانچ ترک نوجوانوں نے ایک امریکی ہوا باز کو اغوا کر لیا اور ۱۰ گھنٹے بعد اسے چھوڑا۔ ایسی ہی اور بھی بہت سی وارداتیں ہو رہی ہیں جن میں بتایا جاتا ہے "انقلابی تحریک نوجوانان" کے آدمی ملوث ہیں۔

وزیر اعظم سلیمان دیمرل ان انقلاب پسندوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرنے سے جھجکتے ہیں کہ مبادا ظلم و زیادتی کے لئے بدنام ہو جائیں اور ان کا وہی حشر ہو جو وزیر اعظم عدنان میندریس کا ہوا تھا۔ (انھیں پھانسی دیدی گئی تھی)

اسرائیل

اسرائیل سرحدوں میں رد و بدل کی شرط کے ساتھ مقبوضہ عرب علاقے خالی کرنے کے لئے تیار ہے لیکن بیت المقدس کو خالی کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اس پر اسکا کہنا ہے کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد سے اقوام متحدہ دو بار اسرائیل کے ساتھ بیت المقدس کے الحاق کے خلاف احتجاج کر چکی ہے اور گذشتہ ہفتہ سکریٹری جنرل او تھانٹ نے پھر شکایت کی لیکن اسرائیل کے کانوں پر کوئی جوں نہیں رینگتی۔ اس نے بیت المقدس کو اسرائیل کے نظم و نسق میں لے لیا ہے اور علانیہ عالمی رائے کو ٹھکرا رہا ہے۔

اپنے قبضہ کو اور مضبوط کرنے کے لئے اس نے بیت المقدس میں بہت بڑے پیمانہ پر تعمیرات کے ناپاک منصوبہ پر عمل شروع کر دیا ہے۔ گذشتہ ہفتے اسرائیل کے وزیر تعمیرات زیو شریف نے اعلان کیا کہ حکومت شہر کے تین نواحی علاقوں میں ایک لاکھ اشخاص کیلئے مکانات تعمیر کریگی۔ یہ بھی کہا "حکومت اسرائیل اس بات کا عزم کئے ہوئے ہے کہ یروشلم (بیت المقدس) ہر حالت میں ایک یہودی شہر رہے۔"

جن مقامات پر مکانات تعمیر ہو رہے ہیں ان میں ۲۰۰ فٹ بلند ہی سموال نامی پہاڑی بھی شامل ہے۔ یہاں دس ہزار مکانات کی تعمیر کا منصوبہ ہے۔ کہتے ہیں صلیبی جنگ لڑنے والوں نے پہلی بار اسی پہاڑی سے شہر کو دیکھا تھا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء میں یہ پہاڑی اردن کا ایک مورچہ تھی جہاں سے اردنی توپوں نے نئے یروشلم کے یہودی علاقہ پر گولے برسائے تھے۔ اسرائیل اب اس پہاڑی پر مکانات تعمیر کر کے گولہ باری کے خطرے کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہتا ہے۔

مزید تین ہزار مکانات اس علاقہ میں تعمیر کئے جا رہے ہیں جو گورنمنٹ ہاؤس کے نام سے موسوم ہے اور جہاں کسی زمانے میں برطانوی انتداب کا صدر مقام تھا۔ وسط شکول اور فرینچ ہل پر سے مکانات تعمیر کے بعد یہودی خاندانوں کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ دوسرے متعدد علاقوں میں بھی مکانات تعمیر ہو رہے ہیں جن میں یہودیوں کو بسایا جائیگا اور چند مکانات عربوں کو دے دیئے جائیں گے۔ چار لاکھ ایکڑ زمین جن میں سے بیشتر عربوں کی ملکیت ہے مکانات کی تعمیر کیلئے حاصل کر لی گئی ہے۔

[illegible] کی تعمیر ہی کے ساتھ ہو رہا ہے کہ اس [illegible] کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں سمجھی جا رہی جبکی [illegible] پیدا ہو گئی ہے۔ گذشتہ ہفتہ [illegible] نے مظاہرہ کیا اور نعرے لگائے [illegible] خوبصورت بھی کیوں نہ بنایا

اسرائیل کی تعمیر کردہ نئی عمارتیں

اسرائیل چاہتا ہے کہ بیت المقدس ایک یہودی شہر میں بدل

واقعات (جہاں نما)

ے "مطالبہ یہ تھا کہ مکانات کے پہلے نقشے تیار کراؤ، پھر تعمیر شروع کرو۔ لیکن حکومت کا واضح جواب یہ ہے کہ امن مذاکرات اسرائیلی توقعات سے زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں پھر مکانات کی تعمیر بھی نہ تیز ہو۔ اصل میں صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر سادات کی نئی پالیسی نے اسرائیل کو ڈپلومیٹک اعتبار سے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔۔۔ اسرائیل چاہتا ہے کہ امن مذاکرات کا کوئی نتیجہ نکلنے سے قبل وہ بیت المقدس کو ایک یہودی شہر میں تبدیل کر دے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔" اسی لئے وہ دھڑا دھڑ عمارتیں تعمیر کر کے یہودیوں کو بسا رہا ہے لیکن کیا دنیائے عرب، دنیائے اسلام اور انصاف پسند دنیا اس بات کو تسلیم کرے گی کہ بیت المقدس پر اسرائیل کا ناجائز قبضہ باقی رہے؟۔

عرب علاقے خالی نہ کئے گئے تو ایک جنگ اور لڑی جائے گی۔

متحدہ عرب جمہوریہ کی پالیسی میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ مرحوم صدر ناصر اسرائیل کو نہر سویز یا آبنائے طیران میں جہاز رانی کی آزادی اور شرم الشیخ میں اقوام متحدہ یا چار بڑے ممالک کے فوجی دستوں کو متعین کرنے پر رضامند نہ تھے۔ لیکن انٹرویو سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر انور السادات اس کے لئے تیار ہیں — بشرطیکہ اسرائیل ان تمام عرب علاقوں کو خالی کر دے جن پر اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا اور فلسطینی پناہ گزینوں کے مسئلہ کو مناسب طور پر حل کرنے کے لئے قدم اٹھائے۔

یہی نہیں بلکہ مسٹر سادات اس حد تک آگے چلے گئے ہیں کہ انھوں نے تمام پناہ گزینوں کی ان کے اصل مقامات میں واپسی کا مطالبہ ترک کر دیا ہے اور فلسطینیوں کو معاوضہ دینے اور غزہ اور دریائے اردن کے جنوبی علاقے میں ایک مناسب تجویز قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ خود فلسطینیوں کی اس بارے میں رائے لی جائے۔

شاید انھوں نے یہ پالیسی اس لئے اپنائی ہے تاکہ دنیا پر اسرائیل کے ناپاک ارادے ظاہر ہو جائیں اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اسرائیل معاہدہ امن کی جو رٹ لگا رہا ہے وہ محض ایک ڈھونگ ہے اور حقیقت میں وہ نہ امن چاہتا ہے اور نہ ان علاقوں کو خالی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جن پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔ دراصل اسرائیل اپنے احساس برتری میں ابھی تک اندھا ہو رہا ہے۔

اور اسے غلط فہمی ہے کہ وہ عرب فوجوں کو اسی طرح شکست دے سکتا ہے جس طرح کہ اس نے ۱۹۶۷ء میں انھیں شکست دی تھی۔ لیکن مسٹر سادات کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ کی فوجیں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ... ہیں اور وہ اسرائیل سے ٹکرا سکتی ہیں۔ لیکن یہ ٹکر لینا ... یا ناکام ہونے کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ آزادی اور علاقائی ... کے تحفظ کا سوال ہے۔ جس کیلئے کمزور سے کمزور قوم بھی ... قربانی دینے کیلئے تیار ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ... فوجوں کے لئے ویٹ نام کے باشندوں کی جنگ آزادی ... ہے۔ وہ دس سال سے امریکہ جیسی بڑی طاقت سے ... رہے ہیں اور عظیم نقصانات کے باوجود انھوں نے آج ... شکست تسلیم نہیں کی وہ اپنی غلامی پر اپنی موت کو ترجیح ... یہی حال ہم مشرق وسطیٰ کے عرب عوام میں بھی دیکھ رہے ...

مگر یہ اچھا ہے کہ مسٹر انور السادات نے ڈپلو... مار دینے کی پالیسی اپنائی ہے اور انھوں نے تاش کے ... میز پر ڈال دیئے ہیں۔ دیکھنا اسرائیل اب کیا نئی چال ... اور کن بنیادوں پر امریکہ اسکی مدد جاری رکھتا ہے۔ ... واضح ہے کہ اس نے مقبوضہ عرب علاقے خالی نہ کئے ... بیت المقدس شامل ہے تو مشرق وسطیٰ میں ایک ... لڑی جائے گی اور اس وقت ان ممالک کی ہمدردیا... کے ساتھ ہوں گی جو اب تک اسرائیل کا دم بھرتے ہیں ... کے سامنے اس وقت صرف ایک مسئلہ ہے اور ... وہ کہتے ہیں "میں ایک وقت میں صرف ایک مسئلہ ... ہوں، جبکہ مرحوم ناصر بیک وقت بہت سے مس... سکتے تھے کیونکہ ان کے اپنے ذہن کے لئے ایک ... تھا۔ لیکن میں صرف اسرائیل سے نمٹنے کی کوشش ... اور اسرائیل سے نمٹنے کا انھوں نے یہ انداز اختیا... پہلے اسے ڈپلومیٹک میدان میں شکست دے دی ... کے بعد ضرورت پڑے تو اسے میدان جنگ میں لا...

مشرق وسطیٰ!

مشرق وسطیٰ کی صورت حال کے بارے میں صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انور السادات نے نیوز ویک کے سینیر ایڈیٹر آرنوڈ ڈی بورچ گریو کو جو طویل انٹرویو دیا ہے اس کا بیشتر حصہ اسی اشاعت میں درج کیا جاتا ہے۔ اس انٹرویو کی ابھی متحدہ عرب جمہوریہ کی طرف سے تصدیق ہونا باقی ہے۔ لیکن اگر مسٹر انور السادات نے ایڈیٹر نیوز ویک کے مطابق جو کچھ کہا وہ صحیح ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ سے متعلق

"ہم بھی امن چاہتے ہیں۔ لیکن ہم تمہارے علاقے خالی نہیں کریں گے۔" گولڈا مائر

سادات

سویز

گولڈا مائر

آئرلینڈ

جمہوریہ انسان جیسا بنتا ہے ویسا ...

ب کے نام پر فسادات روز کا معمول بن گئے ہیں

لینڈ کی لڑائی بڑے پیمانہ پر گوریلا جنگ میں تبدیل نہ ہو جائے۔ بیلفاسٹ کے ایک ایڈیٹر نے وارننگ دی ہے کہ آنے والے مہینوں میں اور زیادہ تشدد کا امکان ہے۔ اور اگر کسی چیز کا امکان نہیں ہے تو وہ ہے امن و امان" ——

امراج کا جہاں جہاں غلبہ رہا وہاں اس نے لوگوں کو
ی مذہب کی بنیاد پر اور کبھی زبان کی بنیاد پر ——
اؤ اور حکومت کرو" کی بنیادی پالیسی بنالی۔ اور اسی
بنیاد پر ہندوستان کے دو ٹکڑے کرائے گئے۔ لیکن آج
ر اپنے گھر میں مذہب کی بنیاد پر ایسے جھگڑے ہو رہے ہیں
انے کی تاریخ سامنے آگئی ہے کہ جب پروٹسٹنٹ اور
یک دوسرے کو زندہ جلا دیا کرتے تھے۔

مالی آئرلینڈ میں مذہبی بنیاد پر جھگڑے دو سال کے ع
رہیں ہوئے ہیں معمولی معمولی بات پر جذبات اتنے
بانے ہیں کہ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔
ٹ کے شہر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آج وہ رنج و غم
ن کر رہ گیا ہے۔ اور وہاں کے باشندے مسرت و شادمانی
ا ہو چکے ہیں اب سے چند ہفتے پہلے اس وقت تشدد
ات شروع ہوئے جب برطانوی فوجوں سے پر ایک
کار سے ایک پانچ سالہ کیتھولک لڑکی ٹکرا کر جاں بحق ہو
ب گیا تھا کیتھولک ہجوم نے برطانوی فوجیوں پر سنگباری
اور انکی گاڑیوں کو جلا ڈالا یہی نہیں بلکہ کیتھولک
نے گھات لگا کر فائرنگ شروع کر دی —— دوسرے دن
ی علاقوں میں بھی دہشت زدگی پھیل گئی اور کیلہ انتہا
کے گھاٹ اتار دیا گیا۔
الت اس درجہ خطرناک ہے کہ شبہ ہے کہ کہیں شمالی آئر

اٹلی

اٹلی میں فسطائی جماعتیں پھر سر اٹھا رہی ہیں۔ نئی فسطائی جماعت کے لیڈر ہیں جارجیا المیرانتے۔ انہوں نے اپنے چیلوں کے ایک جلسہ عام میں کہا کامریڈ و اور ساتھیو! ہم جنگ کی حالت میں ہیں۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اب صرف ہمارا ہی خون نہیں بہے گا" اور یہ فسطائی لیڈر کی خالی خولی دھمکی ہی نہیں تھی بلکہ جس وقت وہ دھمکی دے رہا تھا اسی وقت جنوبی اٹلی کے ایک شہر میں بائیں بازو کی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے مظاہرین پر دستی بم پھینکا گیا جس کے نتیجے میں ایک سوشلسٹ ہلاک اور ۱۲ زخمی ہو گئے۔ میلان کے ایک ۸۰ سالہ وکیل نے مسولینی کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں پچاس سال پہلے کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں۔ کالی قمیصیں اور پھندے کا راج پھر نظر آنے لگے ہیں صرف کاسٹر آئل کی کمی ہے۔ جو مسولینی کے جوان اپنے دشمنوں کے گلوں میں زبردستی ڈالا کرتے تھے "

یہ نئی فسطائی جماعت اگرچہ اب سے بیس سال قبل قائم ہوئی تھی اور ۶۳۰ ممبروں پر مشتمل پارلیمنٹ میں اسے ۲۷ سیٹیں حاصل ہیں لیکن اس کی اصل سرگرمیاں وہ ہیں جن کے پروگرام خفیہ بنتے ہیں اور جن پر پارٹی کے پانچ ہزار سے دس ہزار تک تربیت یافتہ جوان عمل کرتے ہیں۔

ان جوانوں نے تشدد کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور اگرچہ مذکورہ فسطائی جماعت ان نوجوانوں سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ المیرانتے اور اس کے ساتھی ان لوگوں کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں، مدد کرتے ہیں۔ المیرانتے جن کی عمر اس وقت ۵۶ سال ہے مسولینی کی کابینہ میں شامل تھے۔ فسطائیوں نے ۱۹۶۹ء میں دو رنگی پالیسی اختیار کی ہے۔ ان کا ایک بازو پارلیمنٹ میں ہے جو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے اور ان کا دوسرا بازو سڑکوں پر ہنگامے برپا کرتا ہے اور قتل و غارتگری میں حصہ لیتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اٹلی میں فسطائیوں کا غلبہ ہونے والا ہے۔ عام لوگ فسطائی دہشت پسندوں کو علیحدگی پسند یا گل کہتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ ان کی جمہوریت دشمن سرگرمیاں کامیاب نہیں ہوں گی۔

اطالوی وزیر اعظم ایمیلو کولمبو نے گذشتہ ہفتے اپنی کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبروں کے روبرو جو تقریر کی اس میں انہوں نے کہا۔

" ہمیں یقین ہے کہ ایک ملک جس کے دستور کی بنیاد فسطائیت کے خلاف جنگ پر رکھی گئی ہے فسطائیت کے احیاء کے امکان سے باخبر و ہوشیار رہے گا۔"

حکومت اٹلی فسطائی تحریک سے باخبر ہے اور عوام بھی باخبر ہیں۔ وہ فسطائیت کے خطرناک نتائج دیکھ چکے ہیں اور دوبارہ اس کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ ——

عام لوگ فسطائی دہشت پسندوں کو علیحدگی پسند یا گل کہتے ہیں

واقعات نئی دہلی

جو جماعتیں عوام کی سماجی اور معاشی ترقی کا کوئی پروگرام نہیں رکھتیں

وہ بھولے بھالے عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کرتی ہیں!

مسائل

فرقہ وارانہ ہنگامے

الیکشن کی ہلچل ختم ہوگئی۔ بعض پہاڑی اور برفیلے علاقوں کے علاوہ سبھی جگہوں کے عوام نے نئی حکومت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ انتخابات مجموعی طور پر پُرامن رہے البتہ کہیں کہیں ہنگامہ آرائیاں ہوئیں — ہندوستان جیسے پسماندہ اور ناخواندہ ملک میں اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں تعجب خیز نہیں ہیں۔

لیکن تعجب خیز بات اس وقت ہوتی ہے جب ان ہنگامہ آرائیوں کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی جائے۔

جمہوریت کے قیام کے بعد سے عام طور پر دیکھا جا رہا ہے کہ الیکشن کے موقعے پر معمولی معمولی تنازعات کو فرقہ وارانہ نوعیت دے دی جاتی ہے۔ اس مرتبہ بھی اسی قسم کی مذموم کوشش کی گئی اور علی گڑھ جیسے مقامات پر اچھے خاصے بڑے پیمانے پر ہنگامہ برپا کیا گیا۔

اس قسم کی حرکتیں اصل میں وہ جماعتیں کرتی ہیں جو عوام کی سماجی اور معاشی ترقی کا کوئی پروگرام نہیں رکھتیں — وہ بھولے بھالے عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکاتی اور فرقہ وارانہ نفرت کی بنیاد پر ووٹ حاصل کرتی ہیں، کہیں کہیں انھیں کامیابی بھی ہو جاتی ہے —

لیکن اطمینان کی بات ہے کہ اب عوام میں خود بخود ان کے خلاف جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور وہ یہ بات سمجھنے لگے ہیں کہ یہ سب کچھ سرمایہ پرست طبقوں کی چالیں ہیں جو ملک کی دولت کے بڑے حصے پر کالے ناگ بنے بیٹھے ہیں وہ اس لئے فسادات کراتے تاکہ عوام ان سے اپنا حصہ طلب نہ کر سکیں اور انھیں اپنا "دیوتا" سمجھتے رہیں۔

الیکشن میں بہت ہی دل خوش کن مثالیں بھی سامنے آئیں۔ مثلاً بیشتر حلقوں میں ہندو مسلمانوں اور ہر طبقے کے لوگوں کو کاندھے سے کاندھا ملا کر مشترکہ امیدوار کی حمایت میں دیکھا گیا۔ اس سے ان چند ہنگاموں کی تلافی ہو جاتی ہے جو فرقہ پرستوں اور تنگ نظروں نے کرائے۔ آخر میں کامیابی ان ہی لوگوں کو ہوگی کیونکہ جو پارٹی بھی اپنی جیت کی بنیاد فرقہ وارانہ ہنگاموں پر رکھتی ہے وہ حقیقت میں اپنی کمزوریوں کا اظہار کرتی ہے اور زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ اپنی موت آپ مر جائے گی یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ فسطائیت کا نہیں۔ آنے والے انتخابات کے نتائج سے مرنے والی کچھ جماعتوں کا اندازہ ہو سکے گا۔ ■■

بنگال

دہشت پسندوں کی شکست

بنگال میں مقررہ پروگرام کے مطابق انتخابات عمل میں آئے۔ اگر نہ آتے تو حقیقت میں یہ ان عناصر کی کامیابی ہوتی جو

جیوتی باسو — ایک ہفتہ میں تین قاتلانہ حملے

اجائے بالو — سیٹ خطرے میں

انتخابات پر یقین نہیں رکھتے۔ مسز گاندھی نے بالکل سچ کہا تھا کہ تشدد پسند عناصر سے بہر حال مقابلہ کرنا ہوگا خواہ اس وقت مقابلہ کیا جائے یا بعد کو۔ اور یہ بہتر ہے کہ اسی وقت دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ بنگال میں انتخابات تشدد پسند عناصر کی بہت بڑی شکست ہے اور مسز اندرا گاندھی کی بہت بڑی کامیابی کہ انہوں نے دہشت گردی کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس سے مسز اندرا گاندھی اور کانگریس دونوں کا وقار بڑھ گیا۔ اور اب یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نئی کانگریس کو اطمینان بخش کامیابی حاصل ہوگی۔ یوں بھی بنگال میں کانگریس کی بدنام حکمرانی کی تمام تر ذمہ داری ان کانگریسیوں پر ہے جن کا تعلق سنڈیکیٹ کانگریس سے ہے ان کی علیحدگی کے بعد عوام میں کانگریس کے تئیں ایک اعتماد کی نئی فضا پیدا ہو گئی ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں عوام کی بہت بڑی تعداد بائیں بازو کی ان پارٹیوں سے بدظن ہو گئی جن کے اقتدار کے دوران عوام کی امنگیں پوری نہ ہو سکیں ان پارٹیوں میں مارکسی کمیونسٹ پارٹی خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے پچھلے الیکشن میں کامیابی کی بنا پر اسمبلی میں اس نے ۸۰ سیٹیں حاصل کی تھیں بائیں بازو کی سب سے بڑی پارٹی

عوام اب ان سرمایہ داروں اور ملک دشمن عناصر کی چالوں کو سمجھ گئے ہیں

واقعات نئی دہلی

یوپی میں مسلم ووٹ فیصلہ کن ووٹ ہوگا

اندرا گاندھی رائے بریلی کے ایک جلسے میں عورتوں سے مخاطب ہیں۔

توقع یہ ہے کہ لوک سبھا کی ۸۵ سیٹوں میں سے کانگریس ۵۵ سیٹوں پر قبضہ کرلے گی۔ اگرچہ پارٹی کے ذمہ دار عہدہ داروں کا اندازہ ہے کہ اس کے ۸۰ امیدواروں میں ۶۰ اور ۶۵ کے درمیان کامیاب ہو جائیں گے۔

سیاسی شاہدین دوسرا نمبر جن سنگھ کو دے رہے ہیں ان کے اندازے کے مطابق جن سنگھ پندرہ سیٹوں پر کامیاب ہوگا لیکن حکمراں کانگریس کے حلقوں پر اسے دس سیٹوں سے زیادہ نہ مل سکیں گی۔ برخاست شدہ لوک سبھا میں اس کے دس ممبر تھے۔ سنڈی کیٹ کانگریس کو کسی جگہ اہمیت نہیں دی جارہی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اگر اس کی ساکھ بچ جائے تو یہ اس کی بڑی کامیابی ہوگی۔

بی۔ کے۔ ڈی کا حال اس سے بھی برا ہے وہ چار سیٹوں سے زیادہ شاید ہی لے سکے۔ سنڈی کیٹیوں اور جن سنگھیوں کے ساتھ مسٹر چرن سنگھ کو دوستی راس نہیں آئی۔ البتہ ایس ایس پی کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ اسے یقین ہے کہ اس کے ۴۴ امیدواروں میں سے ۲۵ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن یہ صرف یقین ہی یقین ہے باقی کچھ نہیں۔

انتخابات کا جو نتیجہ نکلنے والا ہے اس کے پیش نظر قبل از وقت کہا جا سکتا ہے کہ یوپی کی کھچڑی حکومت کی خیر نہیں۔ دراصل انتخابات شروع ہونے سے قبل ہی یہ حکومت ٹوٹ جانی چاہئے تھی اس لئے کہ اس حکومت میں شامل ہونے کے باوجود ۴۴ حلقوں میں جہاں امیدوار کھڑے کرنے کے سلسلے میں چار جماعتوں میں مصالحت ہوگئی تھی بی کے ڈی نے اپنے الگ امیدوار کھڑے کر ڈالے۔ اس بغاوت پر بی کے ڈی کو حکومت سے خارج کر دینا چاہئے تھا لیکن اس کے باوجود اگر سنڈی کیٹ اور اس کی ساتھی جماعتیں خاموش ہیں تو محض اس لئے کہ اس سے حکومت کا تانا بانا کھیل بگڑ جاتا

اور پانچوں پارٹیوں کی مخلوط سیاسی موت ہو جاتی لیکن قریب المرگ بیمار کو آکسیجن دے دے کر کب تک زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ آخر وہ اللہ کو پیارا ہوگا اور اسی طرح یوپی کی پانچ پارٹیوں والی حکومت بھی جلد ہی "ملک عدم" کی طرف کوچ کر جائے گی۔

یوپی کے الیکشن کے بارے میں یہ بتانا خالی از اہمیت نہیں ہے کہ اس پر مسلم ووٹ بے حد اثر انداز ہونگے۔ اس ریاست میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی آبادی ۱۴٫۵ فیصدی ہے اور مغربی اضلاع میں ۲۵ اور بعض جگہ اس سے بھی زیادہ تک پہونچ جاتی ہے۔

مدھیہ پردیش میں بھی فرقہ پرستوں کو دن میں تارے نظر آرہے ہیں

مدھیہ پردیش

فرقہ پرستوں کے قلعے ٹوٹ گئے

ہر جگہ کی طرح مدھیہ پردیش میں بھی فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کے گٹھ جوڑ کے تار پود بکھرے نظر آرہے ہیں۔ کانگریس کو بڑی تشویش تھی کہ یہاں سرمایہ داروں اور سابق راجوں مہاراجوں کی بڑی بڑی توپیں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں جو کانگریس کے سوشلزم کی دیوار کو ڈھا کر ہی دم لیں گی۔ لیکن مسز گاندھی نے جو مورچہ سنبھالا اور الیکشنی محاذ پر پہونچیں تو مخالفین کی تمام مورچہ بندیوں میں دراڑ پڑ گئی۔ حد یہ کہ گوالیار تک میں جو وجے راجیہ سندھیا اور ان کے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ لڑکے مادھو راؤ سندھیا کا گڑھ تھا وہاں بھی لوگوں نے "کانگریس کی جے" کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔

جن سنگھ اور اس کی ساتھی جماعتوں کی طرف سے کانگریس کے خلاف خاص پروپگنڈا یہ ہے کہ اگر وہ برسر اقتدار آگئی تو وہ حقوق ملکیت کو سلب کرلے گی۔ مسٹر اٹل بہاری باجپائی اور دوسرے جن سنگھی لیڈروں نے ووٹروں کو خوفزدہ کیا کہ کانگریس ان کے مکانات تک چھین لے گی۔

وزیر اعظم کے خلاف خاص طور پر پروپگنڈا کیا جارہا

باقی صفحہ ۲۵ پر

چرن سنگھ

کی

تاک

جھانک

پچھلے دنوں
لاس اینجلز امریکہ
میں ایک زبردست زلزلہ
آیا جس میں ۵۰ سے زائد
آدمی ہلاک اور ۱۰۰۰ سے زائد
زخمی ہوئے ■

طویل غیر حاضری کے بعد ہالی وڈ کی فلم اسٹار الزبتھ ٹیلر
یکبار پھر فلمی دنیا میں واپس آگئی ہے۔ ٹیلر پچھلے کافی دن سے بیمار تھی ■

ایدو ایکٹروں کے درمیان ایک اور ایکٹر ــ
ن آباد ضلع ٹانڈہ کی دیوار پر کانگریس کا ایک پوسٹر ■

"بنگال مرنا جانتا ہے، جھکنا نہیں۔"
مشرقی پاکستان کے مقبول لیڈر
شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو اور یحییٰ کی
مانگوں کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا ہے۔
مجیب الرحمٰن کی مقبولیت کا اندازہ
آپ اس تصویر سے لگا سکتے ہیں ■

مسز گاندھی اور نئی کانگریس پر مکمل اظہار ا

سوشلزم اور سیکولرزم کی عظیم فتح

لوک سبھا کے انقلاب انگیز نتائج

اندرا گاندھی زندہ باد۔

سوشلسٹ اور سیکولر ہندوستان زندہ باد۔

آنجہانی جواہر لال جو نہ کرسکے وہ ان کی پیاری بیٹی نے کر دکھایا پنڈت نہرو کی آتما خوش ہوئی ہوگی کہ انکی پیاری بیٹی اس ملک کو وہ ملک بنا رہی ہے جس کا خواب خود انہوں نے دیکھا اور جسے پورا کرنے کے لیے وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسا قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہ تھے جیسا کہ ان کے بعد ان کی حقیقی جانشین ان کی بیٹی نے کیا۔

— اندرا گاندھی ہندوستان کی پیاری بیٹی ہیں۔ ہم انہیں سلام کرتے ہیں۔ پورا ہندوستان سلام کرتا ہے۔

غیر منقسم کانگریس کا سرمایہ پرستوں اور اجارہ داروں نے کیا حال بنایا وہ جماعت کو اور ملک کو کس طرف لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایسا ہندوستان بنانے کی کوشش کر رہے تھے جو نہ مہاتما گاندھی کا ہندوستان تھا اور نہ جواہر لال نہرو کا— مسز گاندھی نے سیاست کے ٹھیکیداروں سے بغاوت کی اور انتہائی جرأت سے کام لے کر اپنا الگ راستہ بنایا۔ نتیجہ میں سرمایہ پرست رجعت پسند الگ ہوگئے اور وہ کانگریس دو حصوں میں تقسیم ہوگئی جو اپنے پیچھے ایک صدی سے کچھ کم عرصہ کی تاریخ رکھتی تھی اور جس نے برطانیہ جیسی طاغوتی طاقت سے ٹکرلے کر ملک کو آزاد کرایا تھا۔

یہیں سے ملک کی سیاست میں ایک عجیب انقلاب آیا اور دو واضح نظریات کی جنگ شروع ہوگئی۔ ایک نظریہ تھا سوشلزم اور سیکولرازم کا نظریہ۔ یعنی یہ کہ اس ملک میں دولت کی مساوی تقسیم ہو، غربت و افلاس کا خاتمہ ہو۔ اور بلا تخصیص مذہب و ملت اس ملک میں — سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں ذات پات، نسل یا مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہ کیا جائے وغیرہ — اور دوسرا نظریہ تھا۔ رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کا — کانگریس کا یہ گروپ نہیں چاہتا تھا کہ ایک طبقے کو جو بے جا مراعات حاصل ہیں اور مختلف شعبہ ہائے پر اسے جو اجارہ داری ملی ہوئی ہے اس سے وہ محروم ہو جائے۔

پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ کے باہر دونوں جگہ ان دو نظریات کے درمیان ٹکر ہوتی رہی۔ تمام رجعت پسند طاقتیں ایک جگہ مجتمع ہوگئیں۔ اخبارات کی بڑی تعداد بھی جن پر سرمایہ داروں کا پہلے ہی اثر تھا پوری طرح ان کے کنٹرول میں آگئی۔ نتیجے میں مسز گاندھی کی حکومت کے لئے اپنے ترقی پسندانہ اقدامات کو روبہ عمل لانا ممکن نہ رہا۔ اور جب ریاست کے پریوی پرسز کو ختم کرنے میں ... تو اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا کہ ... اعتماد حاصل کیا جائے۔

اور اب مسز گاندھی کی سربراہی میں ... جو حقیقت میں اصل کانگریس ہے عوام کا ...

ہندوستان کے روشن مستقبل کی

فخر الدین علی احمد

جگجیون رام

ہندوستان کی پیاری بیٹی اندرا گاندھی کو ادارہ واقعات کی جانب سے

...خواتین مسلم اقلیت نے نئی کانگریس کو کامیاب کر کے دم لیا

شفیع قریشی — وائی۔ بی چوہان — جنرل شاہنواز — دنیش سنگھ — بی۔ پی موریہ

ہندوستان کے نئے معمار

...ندر حاصل کیا اس کی توقع خود نئی کانگریس کے
...انہ تھی۔

...زم اور سیکولرزم کے اصولوں کو ناکام بنانے
...بڑی چالیں چلی گئیں۔ سیاسی گٹھ جوڑ عمل میں
...سرمایہ لٹایا گیا۔ فرقہ وارانہ نفرت پھیلائی
...لسانی جذبات برانگیختہ کئے گئے لیکن عام ووٹرس
...ور اتنا بیدار ہو چکا تھا کہ "عوام دشمن" طاقتیں
...ہ نہ کر سکیں۔

...پاکستانی عوام کی سیاسی بصیرت کی مثالیں دے
...بال کہ عوام نے دو الگ الگ حصوں میں دو مخصوص
...پنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا وہ اب محسوس کریں گے
...عوام بھی کچھ کم سیاسی بصیرت نہیں رکھتے۔
...نے رجعت پسندوں اور موقع پرستوں کا قلع قمع
...نہیں ایسا سبق دیا کہ آئندہ انہیں عوام کے
...کھیلنے کی جرات نہ ہوگی۔

...نتخابات سے ایک بات یہ سامنے آئی کہ اب عوام
...ور اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ جو بھی ان کی امنگوں
...ورت بنے گا وہ اسے اپنی راہ سے ہٹا دیں گے۔۔۔
...پتی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

مسٹر مرارجی ڈیسائی کی شخصیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟۔ پنڈت نہرو کے ساتھی اور مہاتما گاندھی کے چیلے لیکن ان کی کوئی آواز عوام کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی ۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی جماعت کی شکستہ عمارت کے ایک ستون کے طور پر باقی رہ گئے ۔۔۔۔۔۔ پہلے کے مقابلہ میں بہت ہی کم اکثریت کے ساتھ۔ لیکن ان کے بڑے بڑے ساتھی لڑھک گئے۔ انکے مضبوط ستون ٹوٹ گئے۔ خود سنڈی کیٹ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ (سابق وزیر) کو اندرا سرکار سے بغاوت کا 'انعام' مل گیا۔ انہوں نے وزارت عظمیٰ کا خواب دیکھا تھا لیکن وہ لوک سبھا میں اپنی سیٹ تک نہ لے سکے۔

اشوک مہتہ "عظیم سوشلسٹ" تھے لیکن جن سنگھیوں سے ساز باز کی تو عوام نے انھیں مطلع سیاست سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا۔۔۔ مادھو لمایے اور جارج فرنانڈس جنھیں اپنے سوشلزم پر بڑا ناز تھا جب تنگ نظروں اور فرقہ پرستوں سے جا کر ملے تو انھیں عوامی سزا مل گئی۔ عوام نے ایسے لیڈروں کو اپنی نمائندگی کے قابل نہ سمجھا جو ظاہر میں سوشلسٹ ہوں لیکن موقع ملنے پر سرمایہ پرستوں کے ساتھ گٹھ جوڑ بھی کر ڈالیں۔ مسز کرپلانی اور مسز تارا کیشوری سنہا کے نام کس نے نہیں سنے۔ کہتی تھیں کہ کسی عورت ہی کے ہاتھ میں زمام اقتدار رہنی ہے تو ہم میں سے کسی کو دو"۔ لیکن عوام نے انھیں بھی اپنی راہ سے ہٹا دیا۔

ڈاکٹر سوشیلا نائر جن کے کندھے پر مہاتما گاندھی ہاتھ رکھ کر چلتے تھے۔ جب انہوں نے مہاتما گاندھی کے اصولوں کو بھلا دیا تو عوام بھی انھیں بھول گئے۔ ان کی شخصیت کو بھول گئے ۔۔ ایسی ہی شخصیت ایس کے پاٹل کی تھی، لیکن انھیں بھی ٹھکرا دیا گیا۔ سب ایسے لوگوں کو ٹھکرا دیا گیا جو عوام کو چھوڑ کر سرمایہ داروں کے ساتھ مل گئے تھے۔

سوتنتر پارٹی کے مسٹر مسانی جن کی اپنی شخصیت تھی اور جن کا اپنا حلقۂ اثر تھا لوک سبھا کے لئے منتخب نہ ہو سکے۔۔۔ اسی طرح مسٹر چرن سنگھ جن کی سیاست ایسی "لوٹا سیاست" تھی جسکا کوئی پیندہ نہ تھا عوام نے اسے لڑھکا دیا خدا جانے وہ کہاں جا کر پہونچے۔ ان کی پوری پارٹی کا صفایا ہو گیا۔ اسیطرح سوشلسٹ پارٹی کا وجود مٹ گیا عوام نے کسی کو نہ بخشا جو ترقی پسندی کی راہ میں آیا اسے راستے سے ہٹا دیا گیا۔

عام انتخابات میں یہ مسز اندرا گاندھی اور نئی کانگریس کی زبردست کامیابی ہے جسکا قدرتی طور پر ان دو تین ریاستوں پر اثر پڑے گا جہاں اقتدار سنڈی کیٹی گٹھ جوڑ

حکومت کا کام ہے کہ وہ عوام سے کیے ہوئے وعدے پورے کرے

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں • تو ہائے گل پکار میں چلا

کے ہاتھ میں ہے۔ خاص طور سے یوپی اور بہار میں۔ اڑیسہ میں پہلے ہی اثر پڑ چکا ہے۔ جہاں اسمبلی کے انتخابات میں کانگریس سب سے بڑی پارٹی کے روپ میں آ رہی ہے۔ یوپی میں کھچڑی حکومت ہے جو اب زیادہ ٹکنے والی نہیں بہار کی وزارت بھی چند دنوں کی مہمان سمجھئے۔ اور دلی کے جن سنگھی ایڈمنسٹریشن کی عمر بھی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

یوں کہئے لوک سبھا میں انقلاب کیا آیا پورے ملک میں انقلاب آ گیا۔ ایک پر امن انقلاب جس میں سرمایہ پرست و تنگ نظر رجعت پسند فرقہ پرست خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ آر۔ ایس۔ ایس والوں کی چلی اور نہ شیو سینا جیسی جارح تنظیموں کی۔ خدا جانے سابق جنرل کریاپا کس طرح شیو سینا کے چکر میں پھنس گئے تھے۔ اب روتے ہوں گے کہ آخری عمر میں مٹی خراب کی۔

مسٹر پرکاش ویر شاستری کی شکست بھی بڑی عبرتناک ہے وہ مسلم یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے تھے اب خود انکی اور انکی پارٹی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ایسے فرقہ پرست اور تنگ نظروں کے لئے یقین ہے آئندہ زمین تنگ ہوتی جائے گی۔ (ان کے مقابلے پر مسٹر بی پی موریہ کامیاب

انہوں نے انکی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا اور نئی کانگریس کو کامیاب بنا کر دم لیا۔

اب جبکہ کانگریس نے عوام کا اعتماد حاصل کر لیا ہے اور اسے مرکزی حکومت بنانے کا اختیار مل گیا ہے یہ اس کا کام ہے کہ وہ عوامی جذبات کا احترام کرے اور ان وعدوں کو پورا کرے۔ جو اس نے تمام طبقوں سے جن میں اقلیتیں بھی شامل ہیں، کئے تھے۔ اس نے وعدے پورے کئے، غریب عوام کی حقیقی خدمت کی تو کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ بھی عوام اس پر اعتماد نہ کریں۔ اور یقین ہے کہ وہ وعدے پورے کرے گی اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ اصل طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ جنکا سیاسی شعور اب بیدار ہو چکا ہے۔

نہیں معلوم ہارنے والے لیڈروں کی حالت کیا ہے لیکن وہ ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کی ہمدردی کر سکتے ہوئے ہیں)

الغرض عوام نے نئی کانگریس اور مسز گاندھی پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور بلا امتیاز مذہب و ملت کیا۔ اقلیتوں اور خاص کر مسلم اقلیت نے دل کھول کر نئی کانگریس کی مدد کی اور اگرچہ فرقہ پرست جماعتوں نے مسلم نمائندے کھڑے کرکے ان کے ووٹ کاٹنے کی کوشش کی۔ لیکن

اور یہ شعر گنگنا سکتے ہیں ؎

"آ عندلیب مل کے کریں آہ و
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں

فروری ۱۹۷۱ء

ہمیں افسوس ہے کہ راجدھانی پر اس بکھواڑے کے واقعات کی اشا
تمام پریس انتخابی پوسٹروں اور پمفل
مصروف رہے کہ کتابوں کی طباعت
ہولی کی چھٹیوں کی بنا پر بھی ڈاک ک
روز کی تاخیر کا امکان ہے۔

دوران عام انتخاب کے
شروع ہو گئے جس نے ملک کی سیا
ملک کی سیاست میں ایک ایسا انقلا
۲۴ سالہ تاریخ میں اس سے قبل کبھ

ایک ایسے وقت جبکہ "واقعات
چھپ چکی ہیں عوامی انتخابات اور ان
دور رس نتائج سے اگر قارئین محروم
یہ ہوتا کہ وہ ملک کی سیاست کے ایک
رہ جاتے۔ لہٰذا اہم شمارے میں چار صف
ہیں تاکہ انقلاب انگیز انتخابات کے
سے وہ واقف ہو سکیں۔ ان چار
بنا پر قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا
نامساعد حالات کی بنا پر جن
بکھواڑے کے "واقعات" کی اشاعت
کے لئے ہم اپنے قارئین سے معذرت خ
کوشش ہوگی کہ ہمارے قارئین انت

مسٹر بلراج مدھوک جنہیں عوام نے بھار دیا — راج نرائن — پاٹل — تارکیشوری سنہا

جو ستون گر گئے

... اور سوشلسٹ پارٹی کا صفایا ہو

میں فریزیر سے پھر لڑوں گا

محمد علی کا بیان

فریزیر — گھر والوں کے ساتھ

محمد علی کلے

مکہ بازوں کی دنیا بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ا کا جوش ہر وقت ان کے چہروں سے عیاں رہتا محمد علی کلے اور فریزیر کے درمیان جب کے شرائط نامہ پر دستخط ہوئے تب ہی دونوں کچھ میں آگئے تھے اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں دونوں میں ز وقت ہی مقابلہ شروع نہ ہو جائے۔ وہ تو کہیے محمد علی کلے کی تحمل مزاجی کام آگئی ورنہ اسی وقت دو دو ہاتھ ہو جاتے۔ لیکن بہر حال ۸ مارچ کو یہ دو دو ہاتھ ہوئے اور مقابلہ میں محمد علی شکست کھا گئے۔

ان کے کیریر کی یہ پہلی شکست تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے ۲۹ مقابلوں میں حصہ لیا اور ہر ایک میں کامیاب رہے حد یہ کہ تین سال کی پابندیوں کے بعد جب انہیں مقابلہ میں حصہ لینے کی اجازت ملی تو انہوں نے مشہور مکہ باز جیری کومیری کو تیسرے راؤنڈ ہی میں ناک آوٹ کر دیا۔

لیکن محمد علی فریزیر سے ناک آوٹ نہیں ہوئے بلکہ ۹ کے مقابلے میں صرف ۶ پوائنٹ سے ہار گئے۔ کشتی یا مکہ بازی میں اتنے پوائنٹ کی ہار کوئی بڑی ہار نہیں۔ اسی لئے محمد علی کلے نے حوصلہ نہیں ہارا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ فریزیر سے پھر لڑیں گے۔

محمد علی نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ میں مقابلہ سے مطمئن ہوں۔ مطمئن ہونا بھی چاہیے۔ برابر کی ٹکر تھی صرف دسویں راؤنڈ میں پہنچ کر فریزیر ان پر غالب آسکا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ ان کا جبڑہ اس کے مکہ کی زد میں آگیا۔

مکہ بازی کا یہ مقابلہ نیویارک کے میڈیسن اسکوائر میں ہوا جہاں بیس ہزار سے زائد تماشائی موجود تھے۔ ٹیلی ویزن سے مقابلہ دیکھنے والوں کی تعداد شامل کر لی جائے تو وہ تین کروڑ بیٹھتی ہے۔

دونوں مکہ بازوں کو پچیس پچیس لاکھ ڈالر ملیں گے۔

لیکن ہر ایک سے بھاری ٹیکس وصول کیا جائے گا۔ پندرہ لاکھ وفاقی خدمت اور ۱/۲ لاکھ ریاستی حکومت وصول کرے گی اور اس طرح ہر مکہ باز کو پاس ۱/۲ لاکھ ڈالر رہ جائیں گے۔

دونوں مکہ باز نیگرو ہیں۔ دونوں جنوب کے علاقے میں پیدا ہوئے اور اتفاق سے دونوں جنوری میں۔ البتہ فریزیر محمد علی سے دو سال بعد پیدا ہوئے۔ محمد علی کا سال پیدائش ۱۹۴۲ء ہے۔

دنیا کی نظریں اب ان کے آئندہ کے مقابلہ پر لگی ہوئی ہیں۔

ہندوستانی ٹیم کی پہلی شاندار کامیابی

نواب صاحب کرکٹ سے علیحدہ ہو کر سیاست میں ہو گئے۔ واڈیکر ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے نئے کپتان گئے اور ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے پر روانہ ہو گئی۔ طرح کی قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہندوستان اس مرتبہ ضرور اپنی کئی سال پرانی خواہش کرے گا۔ یعنی پہلی بار ویسٹ انڈیز کو ہرانے میں کامیاب ہو سکے گا۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ ہاتھی مر کر سوا لاکھ کا رہتا ہے۔ یعنی ویسٹ انڈیز کی ٹیم ان دنوں ہی لیکن پھر بھی ہندوستانی ٹیم سے بہتر ہے۔ ہندوستانی ٹیم ویسے ہاری تو دنیا کی ہر ٹیم سے ہے لیکن ویسٹ کے علاوہ اور سب کو ایک آدھ مرتبہ ہرانے میں بھی ضرور یاب ہوئی۔

پورٹ آف اسپین میں کھیلا جانے والا یہ دوسرا ٹیسٹ ہندوستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان کھیلے جانے میچوں کی سلور جوبلی میچ تھا اور سلور جوبلی کے موقع ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے اپنی ایک بہت پرانی تمنا پوری ویسٹ انڈیز کی اس ہار کی دو وجوہات ہیں پہلی تو یہ کہ آج ویسٹ انڈیز کی ٹیم وہ نہیں جو دو یا تین سال پہلے تھی۔ جب ہندوستانی بلے باز بال اور گر منتھو کی گیندوں کے سامنے پکے ہوئے آموں کی طرح گرا کرتے تھے۔ آج وہاں کی ٹیم میں سوبرس، کنہائی اور لائیڈ کے علاوہ دوسرا کوئی قابل ذکر کھلاڑی نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف ہندوستان کو واڈیکر کی شکل میں ایک بہت ہی عمدہ اور جری کپتان مل گیا ہے۔ ہندوستان کے بلے باز اور بالر دونوں ہی آج کل فارم میں ہیں۔ سردیسائی نے پہلے ٹیسٹ میں ڈبل سنچری ماری اور دوسرے ٹیسٹ میں بھی سنچری ماری گواسکر اور سولکر نے بھی بہت ہی عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا ودانی اور واڈیکر بھی پیچھے نہیں رہے۔ یعنی دونوں بوڑھے کھلاڑی اور نوجوان کھلاڑی بہتر سے بہتر کھیل کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

اس میچ کی فتح کا زیادہ تر کریڈٹ وینکٹ راگھون اور درانی کو جانا چاہئے۔ دونوں ہی نے دوسری اننگز میں بہت عمدہ بالنگ کی۔ اگر ہمارے کھلاڑی اسی طرح کے عمدہ کھیل کا مظاہرہ کرتے رہے تو یقیناً وہ پہلی بار ویسٹ انڈیز سے ربر جیتنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

ادریس صاحب کا مزار ہے۔ اس مزار کی یہ خصوصیت
رگدھے سو جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کے مزار کے
ہیں۔ اور کمال یہ کہ غلاظت نہیں پھیلاتے۔

جیوتی بین مہتا —
ہندوستان کی واحد عورت
ہیں جو خطرناک سے خطرناک جانوروں
سدھا سکتی ہیں۔
جیوتی بین خوفناک اجگر، مگرمچھ اور
چیتے راجو کے ساتھ۔

گر ہمت ہو تو
کیا نہیں ہو سکتا۔
بمبئی کا یہ نوجوان
دونوں ہاتھ نہ
ہونے کے باوجود
بھی اپنی روٹی آپ
کماتا ہے۔
نقلی ہاتھ کی
مدد سے یہ دن
رات غبارے بیچتا ہے
اور شام کو اپنی محنت
کی کمائی سے
پیٹ بھر کر روٹی کھاتا
ہے۔

یورپ میں آجکل دھات سے بنے ہوئے
لباس بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ بشرطیکہ آپ
انہیں لباس ماننے کو تیار ہوں۔

باجپئی

گئتو ماتا کی گود سے راج ماتا کی گود میں

ہے کہ وہ ملک کو روس کا آلۂ کار بنا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لئے سابق حکمرانوں سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ سابق مہاراجا اودے پور بھگوت سنگھ کو راجپوت حلقوں میں خوب گھمایا گیا اور وزیر اعظم کے خلاف دل کھول کر پروپیگنڈا کیا گیا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جتنا زیادہ مخالفانہ پروپیگنڈا ہوا مسز گاندھی کی اتنی ہی مقبولیت بڑھی۔ بھوپال میں جن سنگھ نے سابق حکمراں مہارانی ساجدہ سلطان سے امداد لینے کی کوشش کی لیکن کام نہ بنا۔ جب ساجدہ سلطان نے مسٹر بھانو پرکاش سنگھ سابق مہاراجا نرسنگ گڑھ کی حمایت میں تاجروں اور ریٹائرڈ سرکاری ملازمین کو محل میں طلب کیا تو ان سے صاف کہہ دیا گیا کہ بھوپال کے مسلمان کسی ایسی جماعت کی حمایت نہیں کر سکتے جو "انڈیانائزیشن" کے پردے میں فرقہ وارانہ نفرت و عداوت پیدا کر رہی ہے اور اقلیتوں کے استیصال پر تلی ہوئی ہے۔

ساجدہ سلطان کے مقابلے میں مسز بیگم آف بھوپال شہر بانو میمونہ سلطان نے کانگریسی امیدوار کے حق میں اپیل کی جس کا اچھا اثر پڑا۔ کانگریسی امیدوار ڈاکٹر ایس ڈی شرما کو اپنی کامیابی کا یقین ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی کانگریس کے حق میں پلڑا بھاری نظر آ رہا ہے اور عوام کا کہنا ہے کہ الیکشن کے نتائج حیرت انگیز نکلیں گے۔

کہئیے یہ نئے فیشن کا بشرٹ کیسا رہا؟

جیسے ہی الیکشن جیتوں گا سب سے پہلے اس بنئے کے بچے سے پوچھوں گا جس نے لوک سبھا کے ٹوٹتے ہی مجھے ادھار دینا بند کر دیا تھا۔

مہربانی کر کے آپ یہ ہار واپس کر دیں۔ کیونکہ آدھے گھنٹے بعد ایک اور امیدوار بھی آنے والا ہے۔

میں نے بالکل سچ کہا تھا کہ یہاں کے عوام میرے پیچھے ہیں"

فلم ایکٹریس جینتی مالا جی بھی الیکشن لڑ رہی ہیں۔ انہیں ایک کہانی کار جو ان کی تقریریں لکھے، ایک گلوکار جو ان کے لئے گانے گاتے اور ایک ڈائرکٹر، جو انہیں ڈائرکشن دے، کی ضرورت ہے۔

واقعات نئی دہلی

روم میں دشمن کی کھوپڑی سے فٹ بال کھیلی جاتی تھی

اشتیاق احمد
انصاری

فٹبال جسے آج کے دور میں بین الاقوامی مقبولیت حاصل ہے کب؟ کہاں؟ اور کسطرح وجود میں آیا۔ اس کی کہانی کافی دلچسپ ہے اور یقین ہے کہ "واقعات" کا مطالعہ کرنے والے اسے پسند کریں گے۔

اٹلی:۔ میں یہ دستور تھا کہ جشن فتح مناتے وقت وہ لوگ دشمنوں کے سروں کو تن سے جدا کر کے انھیں ٹھوکر مار کر ایک طرف سے دوسری طرف لے جاتے تھے۔ اور اس کھیل کا نام انھوں نے "کالیشور" CALISHWAR رکھا تھا

جاپان:۔ جاپانیوں نے اس کھیل کو چودہ سال پہلے کھیلنا شروع کیا عام تہواروں اور تقریبوں میں یہ کھیل آٹھ آٹھ کھلاڑیوں کے درمیان کھیلا جاتا تھا اور اسکا نام "کیمیاری" CAMIARE رکھا گیا تھا۔

روم:۔ رومیوں میں بھی یہ کھیل عام تھا جس کو وہ لوگ ہرماسٹم HARMASTAM کہتے تھے۔

چین:۔ کہا جاتا ہے کہ چین کے ایک بادشاہ "اوال" WALL O پر ایک مرتبہ کسی کتے نے حملہ کیا اس نے غصے میں کتے کو لات ماردی تو وہ تقریباً بیس گز کی دوری پر جا گرا، اس وقت سے بادشاہ کو یہ خبط ہو گیا کہ وہ آس پاس رکھی ہوئی چیزوں پر ٹھوکر مار کر لطف اندوز ہونے لگا۔ اسطرح بادشاہ نے کچھ ہی دنوں میں بیشمار قیمتی چیزوں کو توڑ ڈالا۔ چنانچہ درباریوں کو فکر لاحق ہوئی کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کیجائے جو نرم بھی ہو اور سستی بھی۔ پہلے تو ایک پتھر کے گولے کو آزمایا گیا مگر جب اس پر ٹھوکر مارنے سے پیر کی انگلیوں کو تکلیف ہونے لگی تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس کی جگہ لکڑی کا گولا وجود میں آیا۔ مگر جب یہ بھی حسب خواہ نہ ہوا تو بلیڈر کے چمڑے کی گیند بنائی گئی۔ یہ دو ہزار دو سو سال قبل کی بات ہے جب دنیا کے کسی ملک میں اس کھیل کا تصور بھی نہ تھا اس زمانے میں چینی اسے "سوچو" کے نام سے یاد کرتے تھے جس میں گیند کو ٹھوکر مار کر گول پوسٹ میں ڈالا جاتا تھا۔ گول پوسٹ لکڑیوں کے بنے ہوتے تھے جیسا کہ آج بھی ہوتا ہے چین میں یہ کھیل فوجی مشق کا ایک ضروری حصہ تھا۔ آہستہ آہستہ یہ کھیل عام شہری کھیلنے لگے۔ لوگ اسکو سڑکوں پر کھیلتے۔ دکاندار اور دوسرے لوگ اپنی دکانیں اور کام بند کر کے اس کھیل میں شریک ہو جاتے اسطرح یہ ایک عوامی کھیل بن گیا۔ اور اس سے کاروبار میں رخنے پڑنے لگے۔ اکثر حکومت کے افسروں کو موقعہ پر پہنچ کر اسے بند کرنا پڑتا تھا۔ اس کھیل کے متعلق ضروری باتیں درج ذیل ہیں۔

انگلستان:۔ کہتے ہیں کہ گیارھویں صدی میں انگلینڈ پر ڈنمارک نے قبضہ کر لیا اور پچاس سال تک اسے اپنے ماتحت رکھا اس درمیان میں ڈنمارک والوں نے انگلینڈ کے باشندوں کیساتھ بہت برا برتاؤ کیا جس سے انگریزوں کے دلوں میں ڈنمارک والوں سے بے پناہ نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی۔ انگلینڈ والوں نے کئی بار غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد کی لیکن ناکام رہے۔ لیکن بالآخر وہ وقت آگیا جب انھوں نے ڈنمارک والوں کو مار بھگایا۔ اپنا ملک آزاد کرا لینے کے بعد بھی انکے دلوں میں نفرت بھری ہوئی تھی۔ ایک دن زمین کھودتے ہوئے کچھ انگریز مزدوروں کو مردے کی ایک کھوپڑی ملی۔ اور یہ سوچ کر کہ یہ کسی ڈنمارک سپاہی کی ہے۔ نفرت سے اسے ٹھوکر ماردی اور وہ کھوپڑی کھڑکھڑاتی ہوئی دور چلی گئی۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے مزدوروں نے بھی یہی سمجھا اور ٹھوکر ماردی۔ اسطرح اس کھوپڑی میں ٹھوکریں لگنا شروع ہو گئیں۔ یہ عمل انکی تفریح کا ذریعہ بن گیا۔ پھر عام انگریز بھی اس میں ٹھوکریں مارنے لگے اسکی شہرت اتنی بڑھی کہ لوگ اپنی تفریح کے لئے جانوروں کی جھلی کے غبارے بنا کر ٹھوکریں مارنے میں لطف لینے لگے۔

دور حاضر میں فٹبال:۔ موجودہ زمانے میں فٹ بال بہت زیادہ مقبول کھیل تصور کیا جانے لگا ہے لوگ اسے آسانی سے کھیل سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ دراصل اسکی ابتدا انگلستان کی سرزمین پر ہوئی۔ یہ دلچسپ کھیل پہلے انگلستان کے امیروں نے کھیلنا شروع کیا، پھر رفتہ رفتہ اس میں عوام، طالبعلم جہازراں، مزدور، انجینئر ہر قسم کے لوگ دلچسپی لینے لگے۔ اسکی مقبولیت وہاں سے نکل کر دوسرے ممالک میں بھی پہنچی یہ بھی صرف برطانیہ ہی وہ ملک ہے جہاں اس کھیل پر کسی حد تک اختیار تھا۔ مختلف جگہوں پر مختلف قوانین کے تحت فٹبال کھیلا جانے لگا۔ فٹ بال کا ایک اہم ادارہ انگلستان میں قائم کیا گیا اور اسکا سرپرست "ڈیچ ہریشن" [illegible]ATCH HARISHAN ہوا جو ایک بینک میں کام کیا کرتا تھا۔ ہریشن نے اس کھیل کیلئے کچھ بین الاقوامی قوانین بنائے جس کے تحت یہ کھیل کھیلا جانے لگا۔ اس دور میں انگلش فٹبال ایسوسی ایشن دنیا کی سب سے

اشتیاق احمد
انصاری
جو محمڈن اسپورٹنگ
کلب کلکتہ میں کھیلتے
ہیں۔

بڑی فٹبال کی انجمن تھی۔ اسی لئے۔ ای۔ ایف۔ اے E.F.A. کو اس کھیل کا رہبر اول کہنا بہتر ہوگا۔ انگلش ایف۔ اے نہیں چاہتی تھی کہ بیرونی ممالک کے لوگ اس کے بنائے ہوئے قوانین کو ترک کریں اس لئے مجبور ہو کر (E.I.F.A.) کو منظور نہ کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی ای۔ ایف۔ اے کو اپنا ایک وفد ۱۹۵۶ء میں برلن کانفرنس میں بھیجنا پڑا۔ اس کانفرنس میں وفد بھیجنا اس لئے ضروری ہوگیا تھا کہ ایک اچھے فٹ بال فیڈریشن کی تشکیل ہو جائے اور (E. F. A.) کے سالہا سال کے تجربات سے اس فیڈریشن اور یورپ کے دوسرے مقامات کے کھیلنے والے اداروں کو فائدہ پہنچے۔ چنانچہ ای۔ ایف۔ اے۔ کی تنظیم نے (E. I. F. A.) کو تسلیم کرلیا اور اس سے منسلک ہوگئی۔ لنکاسا کے ڈان اونفال کو F. A. کا صدر چنا گیا۔ اس اتحاد نے فٹبال کو نئی زندگی بخشی۔ اب اس کھیل میں ہر جگہ بڑے بڑے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔ جن میں سے چند خاص کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے

ورلڈ کپ :۔ فٹبال کی دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت ورلڈ کپ کو حاصل ہے۔ اس میں فٹبال کے بہترین کھلاڑیوں کو کھیل دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ اس میں تمام دنیا کے شوقین اور پیشہ ور (PROFESSIONAL) کھلاڑی حصہ لے سکتے ہیں۔ ورلڈ کپ کی ابتدا ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ ابھی تک کوئی ملک اس کپ کو تین بار حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن اس سال اس روایت کو توڑنے کا سہرا برازیل کے سر رہا۔ اس کپ کو اب تک مندرجہ ذیل ممالک نے حاصل کیا ہے۔ یوروگے، اٹلی، برازیل، انگلینڈ۔

اولمپک گیمس :۔ اولمپک گیمس کے مقابلے میں صرف شوقین کھلاڑی ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ اس لئے اس کھیل کو دیکھنے میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ اب تک روس، یوگوسلاویہ، ہنگری اور جرمنی اس میں اپنے معیاری کھیل کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

یورپین کپ :۔ اس کپ میں صرف یورپ کی مقامی ٹیمیں ہی حصہ لیتی ہیں۔ اسکے اکثر کھلاڑی پیشہ ور ہوتے ہیں۔ اس کپ کو مسلسل پانچ بار جیتنے کا سہرا ریل میڈرڈ کے سر ہے۔

ایف۔ اے کپ :۔ یہ انگلینڈ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ کچھ دنوں پہلے فٹ بال کی دنیا کا خاص مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے دوسرے ملکوں کے لوگ بھی آتے ہیں۔ یہ مقابلہ فٹبال ایسوسی ایشن انگلینڈ کے زیر اہتمام ہوتا ہے اس لئے یہ کپ بھی اس سے منسلک ہے۔

ایشیائی گیمس :۔ اس مقابلے میں صرف براعظم ایشیا کے ممالک ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ اس مقابلے میں انڈونیشیا، چین، جنوبی کوریا اور ہندوستانی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔

آغا خاں گولڈ کپ :۔ یہ پاکستان کا سب سے اہم مقابلہ ہے اس میں صرف پاکستان کی محدود ٹیمیں ہی حصہ نہیں لیتیں، بلکہ انڈونیشیا، تھائی لینڈ، سیلون اور ہندوستان کی مشہور ٹیمیں بھی شریک ہوتی ہیں۔ اب کچھ دنوں سے ہندوستانی ٹیم اس میں شرکت نہیں کر رہی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں کلکتہ کی مشہور ٹیم محمڈن اسپورٹنگ نے اپنے زبردست حریف انڈونیشیا کو ایک گول کے مقابلے میں چار گول سے شکست دیکر خوبصورت ٹرافی حاصل کی تھی۔ اس کھیل میں محمڈن اسپورٹنگ کے انٹرنیشنل کھلاڑی رحمت اللہ کو ہیٹ ٹرک مارچنٹ کا خطاب ملا (جوان دنوں پاکستان کی محمڈن اسپورٹنگ کے کوچ ہیں)

مردیکا ٹورنامنٹ :۔ ملایا کے وزیراعظم تنکو عبدالرحمٰن ہر سال ملایا کے یوم آزادی کے موقع پر اس ٹورنامنٹ کا انتظام کرتے ہیں۔ مردیکا کے معنی ملایا کی زبان میں آزادی کے ہیں۔ اسی لئے اس ٹورنامنٹ کا نام مردیکا ٹورنامنٹ رکھا گیا۔

ڈیورنڈ کپ :۔ یہ ہندوستان کا سب سے پہلا کپ ہے۔ اسکی ابتدا ۱۸۸۸ء میں ہوئی اب تک جن ٹیموں نے اس پر قبضہ کیا ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ محمڈن اسپورٹنگ، موہن بگان، ایسٹ بنگال، حیدرآباد پولیس، مدراس ریجنل سینٹر۔ یہ مقابلہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں ہر سال ہوا کرتا ہے۔

اوورس کپ :۔ اسکی ابتدا ۱۸۹۱ء میں ہوئی اسکے مقابلے بمبئی میں ہوتے ہیں۔ یہ بمبئی کا سب سے مشہور [illegible] اس میں سب سے اچھا ریکارڈ حیدرآباد پولیس کا ہے۔ [illegible] بعد محمڈن کا نمبر آتا ہے۔ موہن بگان بھی اس کپ کو [illegible] حاصل کر چکی ہے۔ اس سال بھی اس خوبصورت کپ کو [illegible] بگان نے ہی حاصل کیا ہے۔

چین کے بادشاہ کو چینی [illegible] پر ٹھوکر مارنے کا خبط [illegible] اس خبط نے ہی چین [illegible] فٹبال کے کھیل کو جنم د[illegible]

آئی۔ ایف۔ اے شیلڈ :۔ اس کا آغاز ۱۸۹۳ء میں [illegible] اس مقابلے میں ہندوستان کی مشہور و معروف ٹیمیں لیتی ہیں۔ اس شیلڈ پر سب سے زیادہ قبضہ موہن بگ[ان] اور ایسٹ بنگال کا رہا ہے۔ اور بعض اوقات محمڈن [illegible] نے اپنے قبضے میں کیا ہے۔ لیکن بنگال میں فٹبال کا [illegible] جتنا بلند تھا اب اتنا ہی پست ہوتا جا رہا ہے اور گز[شتہ] دو سال سے نہ لیگ کے فائنل اور نہ شیلڈ کے فائن[ل] ہو سکے۔

نیشنل فٹبال :۔ اس ٹرافی کا آغاز ۱۹۴۱ء میں ہوا۔ [illegible] اسے سنتوش ٹرافی کے نام سے جانتے ہیں۔ اس ٹر[افی] پندرہ ہزار روپے لاگت آتی ہے۔ یہ سنتوش کے را[جہ] من متھرا رائے چودھری کی یاد میں آئی۔ ایف۔ اے۔ [illegible] پیش کی تھی۔

شری کرشنا گولڈ کپ :۔ یہ کپ بہار [illegible] سابق وزیر شری کرشنا کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ یہ [illegible] بہار کے دارالسلطنت پٹنہ میں ہر سال ہوا کرتا ہے [illegible] کپ کو بارہ بار جیتنے کا سہرا محمڈن اسپورٹنگ کلکتہ [illegible] سر ہے۔

دہلی کلاتھ ملز ٹورنامنٹ :۔ دہلی کلاتھ ملز ٹورنا[منٹ] کے کھیل دہلی میں ہوا کرتے ہیں۔ اس میں بھی ہندوستان [illegible] مشہور و معروف ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ اس کپ کو محمڈن [illegible]

ذہنی انتشار یا کسی چھپے ہوئے جذبے کے اظہار اور
تسکین کے لئے انسان نے جو طریقے اب تک استعمال کئے ہیں
ان میں سگریٹ نوشی کو صف اول پر شمار کیا جاسکتا ہے۔
سگریٹ نوشی کسی شخص کی انفرادی ضرورت پوری کرنے کے
ساتھ ساتھ معاشرے کی ایک عام ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے
یعنی رسم و رواج کا لازمی جزو بن جانے کی وجہ سے لوگ اسے

صرف ضرورتاً ہی نہیں بلکہ رسم کے طور پر بھی استعمال کرتے
ہیں۔ تقریباً تمام اقوام میں ہمیشہ سے کوئی ایسی چیز ضرور
مروج رہی ہے جو فرد اور معاشرہ کی عام ضرورت کو پورا
کرتی رہی ہو۔ مثلاً چین میں "جنگ سنگ" نامی بوٹی کا
رواج اس قدر عام ہوگیا تھا کہ وہ تبادلۂ اشیاء کا ذریعہ
بن گئی تھی۔ اسی طرح پاک و ہند میں پان اور تمباکو کا

رواج ہوا اور یورپی اقوام میں شراب نوشی
کی وبا عام ہوگئی۔
اگر اقوام عالم کے رہن سہن اور اطوار پر ا
نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی ہر قوم
شئے کے استعمال کی عادی رہی ہے جو اس
نقصان دہ تھی، مگر پھر بھی اس کا ترک کر

لئے محال رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک میں زندگی جس قدر سہل اور نمائشی ہوگئی ہے اسی قدر زندگی کے مسائل اور پُر پیچ ہوگئے ہیں۔ مثلاً امریکا کے سات کروڑ سگریٹ نوش افراد سے اگر سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لئے کہا جائے تو انکی ذہنی حالت اس وقت کیا ہوگی؟ اس کا جواب سرجن لوتھر کی اس رپورٹ سے ملتا ہے جو اس نے سگریٹ نوشی کے مضر اثرات کے بارے میں پیش کی ہے۔ اس رپورٹ میں اس نے بیشتر شبہات کو رد کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بلاشک و شبہ سگریٹ نوشی "انسانی بقا" کی دشمن ہے۔" لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ سگریٹ نوشی کا ترک کر دینا ایک عالمگیر مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ اور اس رجحان کو ختم کرنے کے لیے حکومت اور عوام نے جو مہم شروع کی ہے وہ بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو کم کرنے کے لئے جو کچھ بھی کیا جا سکتا تھا وہ کیا جا رہا ہے اور سگریٹ کے ضرر رساں اجزاء کو ہر طرح ختم کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ برطانیہ میں تو حال ہی میں یہ تجربات کئے جا رہے ہیں کہ اصلی تمباکو کے بجائے ایسی تالیفی یا مصنوعی تمباکو کا استعمال شروع کیا جائے جو زہریلے جز نکوٹین سے قطعی مبرا ہو۔

۱۹۶۲ء میں رائل کالج آف فزیشن برطانیہ نے اپنی رپورٹ تیار کی تھی اس میں سگریٹ کو انسانی صحت کا دشمن قرار دینے کے ساتھ ساتھ بہت سی مہلک بیماریوں کا سبب بھی قرار دیا تھا۔ اس رپورٹ میں جنرل لوتھر کی رپورٹ کی طرح چونکہ یہ بات وثوق سے نہیں کہی گئی تھی کہ سگریٹ نوشی "انسانی بقا" کے لئے سم قاتل ہے۔ اس لئے برطانیہ میں کچھ عرصے تک تو رائل کالج آف فزیشن کی رپورٹ [illegible] مگر پھر رفتہ رفتہ عوام نے اس کو بھلا دیا۔ اس [illegible] امریکا کے محکمۂ صحت نے اموات کا [illegible] گوشوارہ پیش کیا اور [illegible] اموات میں یہ اضافہ سگریٹ نوشی کی بنا پر ہے تو سرجن لوتھر کی سرکردگی میں سیکڑوں ڈاکٹروں کا بورڈ اس سلسلے میں تحقیق کرنے کے لئے سرگرداں ہو گیا چنانچہ اس بورڈ نے جب پچھلے چالیس سال میں ہونے والی اموات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ۱۸۶۲ء میں پانچ لاکھ سگریٹ نوش حضرات اس کی مختلف بیماریوں کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔ اس اعتبار سے یہ بھی دیکھا گیا کہ جوں جوں سگریٹ نوشی میں اضافہ ہوتا گیا اسی اعتبار سے شرح اموات بھی بڑھتی گئی۔ مثلاً ۱۹۱۰ء میں امریکا میں ۱۳۸ سگریٹ فی کس سالانہ کا اوسط آتا تھا مگر یہ اضافہ ہوتے ہوتے ۱۹۶۱ء میں فی کس ۳۹۸۶ سگریٹ سالانہ پیے جانے لگے اور یوں بتدریج اموات میں بھی اضافہ ہوتا رہا جس کا اندازہ درج ذیل جدول سے ہو سکتا ہے اس گوشوارہ میں بتایا گیا ہے کہ صرف پھیپھڑوں کے سرطان سے مرنے والوں کی تعداد کا تناسب ذیل کے مطابق رہا ہے۔

سال	تعداد
۱۹۳۲ء	۳۰۰۰ افراد
۱۹۴۰ء	۳۲۶۰۰ افراد
۱۹۵۲ء	۴۰۰۰۰ افراد
۱۹۶۲ء	۵۶۸۰۰۰ افراد

اس جدول سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دس سال میں اموات کا تناسب تقریباً دس گنا ہو گیا ہے۔ چنانچہ برطانیہ میں جب ایسے ہی اعداد و شمار جمع کئے گئے تو معلوم ہوا کہ پچھلے دس سال میں سگریٹ نوشی میں اضافے کے ساتھ ساتھ سگریٹ پینے والوں کی اموات میں بھی سات گنا اضافہ ہوا ہے۔

سگریٹ نوشی کی تاریخ

امریکا میں سگریٹ نوشی کی تاریخ کی ابتدا سولہویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے جب کہ اسپین کے لوگوں نے پائپ کے ذریعے تمباکو کا استعمال شروع کیا۔ وہ تمباکو آج کل کے تمباکو سے زیادہ تیز ہوتی تھی یعنی اس میں نکوٹین کی مقدار بہت زیادہ ہوتی تھی۔ سولہویں صدی کے آخر میں تقریباً ۱۵۹۰ء میں انگلستان کی سرزمین پائپ کے وجود سے واقف ہوئی اور امراء و روساء نے اس کو تہذیب کا ایک نشان قرار دیتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور یوں سترھویں صدی ہوتے ہوتے تمباکو اعلیٰ طبقے کے محدود حلقے سے نکل کر عوام تک پہنچ گئی۔ پھر تمباکو نوشی کی مختلف شکلیں نکلیں جن سے رفتہ رفتہ سگریٹ وجود میں آیا۔ ویسے سب سے پہلے سگریٹ بنانے کا سہرا اسپین کے لوگوں کے سر ہے جب کہ جنگ کریمیا سے واپس آنے والے سپاہی اس کو انگلستان لائے تھے۔ پھر اٹھارہویں صدی عیسوی میں سگریٹ نوشی برطانوی اور یورپی رواج کا ایک ضروری حصہ بن گئی۔ اس کے بعد سگریٹ کے علاوہ سگار بھی بننے لگے اور انھوں نے خواص میں بہت مقبولیت حاصل کی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے جہانگیر کے عہد میں تمباکو اس دور تحفے کے طور پر سگار لے کر ہندوستان آئے اور جہانگیر کو پیش کئے۔ جہانگیر کو سگاروں کی خوشبو اتنی پسند آئی کہ اس نے انکا استعمال شروع کر دیا۔ اس زمانے کے حکماء نے تمباکو کو گلے کی نالیوں کے لئے انتہائی مضر قرار دیا اور مشورہ دیا کہ اگر اس کو براہِ راست نہ پیا جائے تو اس کے مضرت رساں اثرات بہت کم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس کے مضرت رساں اثرات کو کم کرنے کے لئے حقہ ایجاد کیا گیا۔ پانی میں تمباکو کے دھوئیں کے بعض اجزاء شامل ہو جاتے اور تمباکو کا دھواں براہِ راست منہ تک نہیں آتا۔ یہ رواج عام ہونا شروع ہوا اور وہ رفتہ رفتہ رسم و رواج کا ایک حصہ بن گیا۔ اسی زمانے میں سگار بھی مستعمل تھے لیکن ان کا استعمال محدود ہی رہا۔ انیسویں صدی میں سگریٹ انگلستان سے منگائے جاتے رہے مگر بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کے خود ساختہ سگریٹ فروخت ہونا شروع ہوگئے۔

سگریٹ کے اجزائے ترکیبی کی ضرر رسانی:

سگریٹ دیکھنے میں تو چھوٹی، نازک اور دلکش ہے مگر جب سائنس دانوں نے اس کے اجزاء کی جانچ کی تو معلوم ہوا کہ اس کے دھوئیں میں ۳۰۰ مختلف اجزاء ہوتے ہیں۔ ان اجزاء میں مختلف گیسیں اور رقیق مادے شامل ہیں۔ ان میں نو مختلف گیسیں ایسی ہوتی ہیں جو [illegible] کے لئے انتہائی نقصان دہ ہوتی ہیں۔ یہ گیسیں چھوٹے قطرات سے مل کر بنتی ہے جو انچ کے چالیس لاکھویں حصے کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ قطرات پھیپھڑوں کی دیواروں کی [illegible] گلے کی نالیوں پر جم جاتے ہیں اور ان کے لئے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ تمباکو میں بعض گیسیں نشہ آور ہوتی ہیں جو سگریٹ نوشی کو عادت بنانے کا باعث ہوتی ہیں۔

سگریٹ کے سب سے بڑے جز کا نام نکوٹین ہے۔ اس کی مقدار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ ایک سگریٹ کے ذریعے ایک سے تین ملی گرام تک انسانی

کے اندر داخل ہوجاتی ہے۔ جو لوگ دیر تک دھویں کو کشید کرتے ہیں وہ ۹۰ فی صد نکوٹین جذب کر لیتے ہیں اور جو لوگ فوراً ہی دھواں باہر نکال دیتے ہیں وہ صرف ۱۰ فیصد نکوٹین جذب کرتے ہیں۔ نکوٹین کا اثر براہ راست قلب و دوران خون، ہاضمی نظام اور گردوں کے عمل پر ہوتا ہے خون کے دباؤ میں زیادتی، نبض کا تیز چلنا بھی اسی اثر کے تحت ہوتا ہے۔ منہ کا لعاب جو ہاضمہ کے لئے مددگار ثابت ہوتا ہے سگریٹ کی نکوٹین اس میں شامل ہو کر اس کے ہاضمی اثر کو کم کر دیتی ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ زیادہ سگریٹ نوشی کرنے والے حضرات کا ہاضمہ بہت سست ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے حضرات ثقیل یا مرغن غذاؤں کے ہضم نہ کر سکنے کی شکایت بھی کیا کرتے ہیں۔ سرطان زا کے مادے اور سنکھیا کے بعض مرکبات کی موجودگی سرطان جیسے مہلک مرض کا باعث بنتی ہے۔

سگریٹ کا استعمال :۔

کسی شے کا ضرر رساں یا سود مند ہونا اس کے مختلف افعال اور ان کے نتائج پر منحصر ہوتا ہے اور جب تک ان سب پر روشنی نہ ڈالی جائے کوئی حتمی فیصلہ ناممکن بھی ہے اور بے اثر بھی۔ سگریٹ کے مضر ہونے کا دارو مدار بہت کچھ اس کے استعمال کرنے کے طریقے پر بھی ہوتا ہے کیونکہ محققین نے سگریٹ پینے والے مختلف اشخاص کا جائزہ لے کر یہ معلوم کر لیا ہے کہ کثرت سے سگریٹ استعمال کرنے والے لوگ متعدد بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح سگریٹ نوشی کے عادی لوگ سگریٹ نہ پینے والے لوگوں کے مقابلے میں قبل از وقت موت کا بہت زیادہ شکار ہوتے ہیں، جبکہ سگار اور پائپ پینے والوں کی شرح اموات کم و بیش نہ پینے والوں کے برابر ہوتی ہے یا دوسرے معنوں میں اس میں بہت معمولی سا فرق پایا جاتا ہے

بیماریاں اور نقصانات :۔

لوتھر کی رپورٹ کے مطابق سگریٹ نوشی کے مضر اثرات میں پھیپھڑوں کے سرطان کا نمبر سر فہرست ہے۔ اس سلسلے کی جانچ اور تجربات کے لئے جب سرطان کے مریضوں کی جانچ پڑتال اور ان کی پچھلی زندگی پر نظر ڈالی گئی تو معلوم ہوا کہ ان میں ستر فیصد سگریٹ نوش تھے۔ یہ اعداد و شمار صرف امریکا اور برطانیہ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اعداد و شمار کے ذریعے یہی نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

دوسرا موذی مرض جو سگریٹ نوشی سے لاحق ہوتا ہے وہ کھانسی اور بلغم کا سانس کی نالیوں میں جم جانا ہے۔ ڈیورن اور ھل کے تجربات کے مطابق ۲۵ سگریٹ روزانہ پینے والے ایسے افراد شرح اموات میں تین گنا اضافہ کر دیتے ہیں چنانچہ صرف برطانیہ میں ۱۹۶۲ء میں ۱۵۰۰۰ سگریٹ نوشی کرنے والے حضرات اس مرض کا شکار ہو کر جان بحق ہوئے

رائل کمیشن آف فزیشن کی رپورٹ کے مطابق سگریٹ کا دھواں سانس کی نالیوں کے لئے ضرر رساں ہوتا ہے اور سگریٹ پینے والے نہ پینے والوں کی نسبت ۷ فیصد زیادہ اس مرض کا شکار ہوتے ہیں یا ان امراض میں مبتلا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ ان بیماریوں کے علاوہ تپ دق اور ناسور معدہ (PEPTIC ULER) کا خطرہ بھی ۴ فیصد بڑھ جاتا ہے۔ نفاخ (EMPHYSEMA) کا امکان سگریٹ کی بنا پر ۱۳ گنا بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ امریکا میں عام طور پر سگریٹ نوشی کرنے والے ۷ فیصد افراد اس مرض کا شکار ہوتے ہیں۔

دل کی بیماریوں کا بھی ایک بڑا سبب سگریٹ نوشی ہے اس لئے کہ نکوٹین کے اثر سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے چنانچہ سگریٹ نہ پینے والے عام آدمی کا دل ایک منٹ میں جتنی مرتبہ دھڑکتا ہے سگریٹ پینے والے شخص کا دل نکوٹین کے اثر سے اس سے ۱۵ تا ۲۵ مرتبہ زیادہ دھڑکتا ہے۔ ہیمنڈ اور ہارن کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ دل کی بیماریوں کا خطرہ سگریٹ نوشی سے پختہ عمر کے لوگوں میں ۳ گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

عورتوں پر تجربات میں سگریٹ نوشی کے مضر اثرات کے مطالعے کے بعد جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی عورتیں جو مستقلاً سگریٹ کی عادی ہوتی ہیں ان کے یہاں پیدا ہونے والے بچوں کا وزن ان عورتوں کے بچوں کی بہ نسبت بہت کم ہوتا ہے جو سگریٹ کبھی کبھی پیتی ہیں یا بالکل نہیں پیتیں۔ ایک مشاہدہ کے مطابق ان کے بچے وزن میں ۲۵۰۰ گرام کم ہوتے ہیں۔

اب تک تو سگریٹ نوشی کے ان مضر اثرات کا بیان کیا گیا ہے جو براہ راست سگریٹ نوشی کرنے والوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے نقصانات بھی ہیں جو جان و مال دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً امریکا میں ایک سال میں آگ کے حادثے ۱۸ فی صد سگر[یٹ] ٹکڑے کو بے احتیاطی سے پھینک دینے کی وجہ [سے ہوئے] ہیں جس کی وجہ سے ۱۲۷۴ جانیں تلف ہوئیں۔ ا[س] میں امریکا کی میٹرو پولیٹیکل لائف انشورنس کمپنی۔ اس کے گاہکوں میں ۱۶ فیصد حادثات سگریٹ [سے] ہوتے ہیں۔

سگریٹ سے متعلق دوسرے پہلو کو نفسیاتی [طور پر] دیکھنا زیادہ بہتر ہوگا۔ سگریٹ نوشی کا ایک بڑا اور نما[یاں] یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ دماغی الجھنوں کو کم کرتی ہے ا[ور تھکے] ہوئے دماغ کو سکون بخشتی ہے۔ چنانچہ اس کے [عادی] جب تھکن محسوس کرتے ہیں تو جلد جلد سگریٹ پی[تے ہیں] اس کے نہ پینے سے انکی کارکردگی پر اثر پڑتا ہے او[ر وہ سستی] اور تساہلی محسوس کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ معاشر[تی] ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مختلف لوگ اس کو مختل[ف حالات] کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ غور[و فکر کے] وقت اسے پیتے ہیں یا کھانے کے بعد اس کا اس[تعمال کرتے] ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ سگریٹ عام ضرورت سے رسم و رواج کا جز بن گیا ہے۔

امریکا میں ایک مشاہدہ کے دوران معلو[م ہوا] کہ زندگی میں سکون سے محروم ایسے بے چین لوگ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں جن کی شخصیت [...] ہے اور کام کرنے کی صلاحیت بھی ان میں پینے وا[لوں سے] زیادہ ہوتی ہے۔ سگریٹ نہ پینے والے عموماً خاموش سنجیدہ اور علیحدگی پسند قسم کے لوگ ہوتے ہیں جب[کہ] پینے والے اکثر ہنگامہ پسند، یار باش، کثیر الاحبا[ب] پسند ہوتے ہیں۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ایسے لو[گ] جلد جلد نوکریاں بدلتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کے نفسیاتی پہلو کے مد نظر جو فوائد یا نقصانات ہیں وہ کسی حالت میں بھی اس [سے] ہونے والی بیماریوں اور نقصانات پر سبقت نہیں [لے جا سکتے] اس کے علاوہ اس کے نقصانات کے پیش نظ[ر] فوائد کو بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے ایسی حال[ت میں یہ] امر نہایت ضروری ہے کہ سگریٹ نوشی کے رجحا[ن کو ختم] کرایا جائے یا کوئی دوسرا نعم البدل وجود میں [لایا جائے] جو ضرر رساں نہ ہو۔

اوپر سے ماں اور باپ کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے لڑکی کے بے جان چہرے کیطرف دیکھا اور ایک بار پھر تصویر پر نظر ڈالی ان میں ذرا برابر فرق نہ تھا۔

میرا خیال ہے وہ ہماری طرف پیٹھ کر کے اس لئے بیٹھا ہے کہ ہم وہ خاکہ نہ دیکھ سکیں۔" میں نے کہا۔

"ہم دیکھ کر بھی کیا کریں گے۔" میرے ساتھی پال نے جواب دیا۔ "دیکھنے کے لئے دوسری چیزیں جو ہیں چھوڑو۔ پال "معلوم ہوتا ہے وہ ہماری تصویریں بنا رہا ہے اس قصے کو جانے دو۔ دیکھنے کے لئے واقعی ہماری نظروں کے سامنے بہت کچھ تھا ــــ یہ جگہ دنیا کی سب سے زیادہ حسین اور مسرت افزا جگہ ہے۔ کم از کم اس وقت میں یہی سمجھتا تھا۔

اگر میں اپنی زندگی کے تیس دن وہاں گزار لیتا، تو بقایا زندگی کبھی یہ نظارے نہ بھول سکتا لیکن اب بھی وہ ایک دن جو ہم نے وہاں گزارا تھا، کبھی فراموش نہ کر سکونگا۔"

ہوا ہیرے کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ اتنی گرم اتنی پیاری کہ جسم کی ساری طاقتیں اور روح کے سارے گوشے اس کی لطافت میں جھومتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ دائیں طرف سمندر سے اس پار نوکدار چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں اور بائیں طرف تھوڑے فاصلے پر یورپ کا ساحل جھلملا رہا تھا۔ پٹمس میں "آرچپلاگو" کے نو جزیروں میں سے ایک جزیرہ جو اکی اپنے تن پر سرو کے درختوں کا جنگل اٹھائے، خاموش چوٹیوں کے درمیان ایک دل کش خواب کی طرح کھڑا تھا، وہ ان لوگوں کیلئے پناہ گاہ تھا جو زندگی سے مایوس ہو چکے ہوں۔

پہاڑی کے گرد پھیلا ہوا پرامن سمندر یوں نظر آرہا تھا جیسے اس میں کئی رنگ گھول دیئے گئے ہوں ــــ دور فاصلے پر یہی سمندر دودھ کی طرح سفید نظر آتا تھا ــــ جہاں سے پہاڑی کا رنگ گہرا سبزی مائل اور نیلا تھا۔ پاگل صاف شفاف شیشے کی طرح جو اپنی خوبصورتی پر نازاں ہو۔ پھر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دوڑتی ہوئی آتیں اور زور سے پہاڑی کے پاؤں کے ساتھ ٹکراتیں۔ بڑے بڑے جہاز نہیں نظر نہ آتے تھے، صرف دو چھوٹی چھوٹی کشتیاں ساحل کے ساتھ ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک دخانی کشتی تھی، ملاحوں کے جھونپڑے جتنی بڑی۔ دوسری میں تقریباً بارہ چپو تھے اور جب ملاح ان چپوؤں کو اٹھاتے، تو پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ان سے ٹپکنے لگتا۔ لمبی لمبی مچھلیاں کشتیوں کے درمیان سے ابھرتیں اور دور تک پانی کی سطح پر تیرتی چلی جاتیں۔ نیلے آسمان پر سے سورج کی کرنیں زمین پر اس طرح آرہی تھیں جیسے فرشتے زمین اور آسمان کے مابین فاصلے کی پیمائش کر رہے ہوں۔

یہ پہاڑی پھولوں کے تختوں سے اٹی ہوئی تھی۔ ان پھولوں کی خوشبو سے ہوا عطر بیز تھی۔ سمندر کے قریب کافی ہاؤس سے آرکسٹرا کی آواز مدھم سی صاف شفاف ہوا کے دوش بدوش پر تیرتی ہوئی ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس منظر کا تاثر ابدی تھا۔ ہم سب خاموشی سے قدرت کے ان خوبصورت مناظر کا مشاہدہ کر رہے تھے اور ہماری روحیں جنت کی اس تصویر پر فریفتہ ہو چکی تھیں۔ نازک اندام لڑکی اپنا سر شوہر کے سینے پر رکھے اور اپنی سڈول ٹانگیں گھاس پر پھیلائے نہ جانے کیا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے بیضوی چہرے پر ہلکا سا رنگ آرہا تھا اور چند ہی لمحوں بعد اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ــــ اس کا محبوب شوہر سمجھ گیا وہ جھکا اور اس کے آنسوؤں سے اپنے ہونٹ تر کرنے لگا۔ ماں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور میرا دل بھی بھر آیا۔

"میں یہاں ضرور اچھی ہو جاؤں گی۔" لڑکی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "یہ جگہ کتنی مسرت انگیز ہے!"

"خدا بہتر جانتا ہے میرا یہاں کوئی دشمن نہیں، لیکن اگر ہوتا، تو میں ضرور اُسے معاف کر دیتا۔" اس کا باپ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

سب خاموش ہو گئے۔ قدرت کے ان مسحور کن نظاروں نے جیسے ہمیں سلا دیا اور ہم پر مدہوشی سی طاری ہو گئی۔ اس مدہوشی کے عالم میں پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ یونانی مصور اٹھا، اپنے کاغذات تہہ کئے اور سر کو ہلکا سا خم دیکر چلا گیا۔

اور پھر کئی گھنٹے بعد جب فاصلے کی ہر چیز پر نقشہ سا سی نظر آنے لگی اور جنوب کی سمت ڈوبتے ہوئے سورج کا سرخ عکس سمندر کے پانی سے اٹھکیلیاں کرنے لگا، تو اس کی ماں نے ہمیں یاد دلایا کہ واپس چلنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم اٹھے اور ہوٹل کی طرف جانے والی پگڈنڈیوں سے نیچے اترنے لگے ہم بچوں کی طرح اچھل اچھل کر چل رہے تھے۔

ہوٹل کے برآمدے میں پہنچ کر ہم نے کرسیاں منگوائیں، اور وہیں براجمان ہو گئے۔ دفعتہً نیچے سے کسی کے جھگڑنے کی آواز سنائی دی۔ جھانک کر دیکھا تو وہی یونانی مصور ہوٹل کے مالک سے بحث کر رہا تھا۔ یونہی طبیعت بہلانے کے لئے ہم ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ تم کیا حرکتیں کرتے ہو، اگر مجھے اور مہمان نہ ملے تو کیا کروں گا؟"

میرے ساتھی پال نے وہاں پہنچتے ہی پوچھا۔

"کیا بات ہے جناب، آپ لوگ کیوں لڑ رہے ہیں اور یہ کون صاحب ہیں؟"

"میں اسکا نام نہیں جانتا، ہم اسے شیطان کہہ کر پکارتے ہیں۔" ہوٹل کے مالک نے جواب دیا۔

"شیطان! کیوں؟"

"یہ کام ہی ایسے کرتا ہے، ادھیڑ عمر تا تصویریں بناتا ہے، تو صرف مُردوں کی۔ یہاں جب بھی کوئی شخص مرتا ہے، اس کے پاس مرنے والے کی مکمل تصویر موجود ہوتی ہے۔ یہ پہلے ہی سے تصویر بنا لیتا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی۔"

میرے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کی ماں کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ لڑکی کا شوہر ایک ہی جست میں مصور کے پاس پہنچ گیا اور اسے دھکا دیکر وہ کاغذ چھین لئے جنہیں اس نے بغل میں داب رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر میں بھی نیچے بھاگا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ کاغذ زمین پر بکھر گئے تھے اور ان میں سے ایک پر اسی سیک سی لڑکی کا خاکہ بنا ہوا تھا، جسے میں اوپر چھوڑ آیا تھا۔ عین اسی وقت اوپر سے ماں کی چیخ پھر سنائی دی اور پھر باپ کی سسکیاں۔ میں گھبرا گیا اور گھٹنوں کے بل جھک کر تصویر کی طرف دیکھنے لگا۔

اوپر سے ماں اور باپ کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے لڑکی کے بے جان چہرے کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر تصویر پر نظر ڈالی۔ ان میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔

مختلف زمانوں میں

شادی میں مساوات کی تلاش

زمانۂ ماقبل تاریخ میں شادی میں کفو (مساوات) کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب معاشرہ مختلف طبقوں میں بٹ گیا۔ لیکن ابتدائی دور میں، جبکہ تمام لوگ ایک ساتھ رہتے اور شکار کھیل کر پیٹ بھرتے تھے، ان میں باہم کسی قسم کا تفاوت یا امتیاز نہیں تھا۔ ہر انسان کا ذریعہ معاش شکار کرنا اور اسے بھون کر کھانا تھا۔ اس دور میں نہ تو کوئی سرمایہ دار تھا اور نہ کوئی مزدور، نہ کوئی غلام تھا اور نہ کوئی آقا۔ پوری کی آبادی ایک خاندان کے افراد کی طرح مل جل کر رہتی تھی۔ اس لئے اس زمانے میں شادی کے وقت کفو کی تلاش کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن اس کے بعد بنی نوع انسان نے جب اپنے دوسرے دور کا آغاز کیا، جانوروں کی پرورش اور زراعت کے طور طریق سے واقفیت حاصل کی، تو انسان اور انسان کے درمیان اونچ نیچ کی بنیاد پڑ گئی۔ مالدار اور غریب کی پہچان ہوئی۔ رعیت اور حاکم کے الفاظ وجود میں آئے۔ جو لوگ ابتک کھیتی و چرواہی کے فن سے ناواقف تھے اور شکار ہی پر گزر بسر کرتے تھے، ان کو یہ چرواہے اور کاشتکار حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اس طبقے میں بھی جو لوگ نسبتاً دولت مند تھے، وہ اپنے ہم پیشہ غریب بھائیوں کو اپنے سے کمتر و فروتر تصور کرنے لگے۔ یہیں سے غلامی کی رسم شروع ہوئی اور بتدریج اس کو فروغ حاصل ہوتا گیا۔ اب "اونچے لوگ" "نیچے لوگوں" کے ساتھ شادی کرنے سے احتراز کرنے لگے۔ چرواہوں اور کسانوں نے چرواہوں اور شکاریوں سے ازدواجی تعلقات پر پابندی لگادی۔ غلام اور آزاد کی شادی بھی ممنوع قرار دیدی گئی۔

شادی میں مساوات کی اس تلاش نے بعض

سوڈان اور کانگو میں باپ کی شادی بیٹی سے اور بھائی کی شادی بہن سے کردیجاتی تھی

شخص کسی شودر عورت کے ہونٹوں کو بوسہ دے، خود کو اس سے ملوث کرے اور اس
رت سے صاحبِ اولاد ہو جائے تو اس کی شدھی کی کوئی صورت نہیں" ——— منو

بانی بکھ مشکوک حد تک صورت اختیار کر لی۔ بمثال کے
جمہوریۂ سوڈان اور جمہوریۂ کانگو میں پائے جانے
زانندی قبیلے کے فرمانرواؤں میں باپ کی شادی
ے اور بھائی کی شادی بہن سے کردی جاتی تھی۔
حکمت سے لوگوں سے ازدواجی تعلق قائم کرنے
وا اپنی بے عزتی اور نقصان سمجھتے تھے جمہوریہ سوڈان
لوک نام کا ایک قبیلہ ہے جس میں ابھی ماضی
ب تک شہزادیوں کی شادی صرف اس بنا پر جائز نہ
ی کی جاتی تھی کہ اس کا کوئی کفو نہیں ہو سکتا۔ اور
ی قسمت کی ماری شہزادی حاملہ ہو جاتی تو اُسے فوراً
ل کر دیا جاتا تھا۔

زمانہ جاہلیت میں ——— اسلام سے پہلے عربوں
حسب نسب کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ اپنی لڑکیوں
شادی اپنے ہم رتبہ و ہم نسب لوگوں میں ہی کرتے تھے
ماہلِ عرب اپنی بیٹیوں کی شادی میں کفو کا کتنا خیال
تے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔
ی الدولہ کی حکومت میں عقیل بن علفہ نامی ایک دیہاتی شاعر
۔ ایک دن وہ عثمان بن حیان کے پاس گیا جو ان
ں والی شہر تھے۔ اس نے عثمان سے کہا "اپنی بیٹی
مجھ سے عقد کر دو" اس پر وہ بولا "کیا آپ میری کسی
ان اونٹنی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟" عثمان نے کہا
عقل تو نہیں ہو گئے؟" اس نے کہا "یہ آپ نے کیا فرمایا
" اس پر عثمان نے اپنا جملہ دہرایا۔ عقیل نے جواب دیا
س نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ اگر آپ کسی نوجوان اونٹنی کو
ی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے بسر و چشم تسلیم ہے ورنہ
معذور سمجھئے۔

شہری معاشروں میں شہری زندگی
ارتقاء کے ساتھ، مختلف طبقوں کے درمیان اختلاف
امتیاز کی خلیج اور بھی وسیع ہوگئی۔ کبھی ایسا قانون
بنایا گیا جس کی رو سے مطلقاً اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں کے
درمیان ازدواجی تعلقات پر پابندی کردی گئی۔ اور
کبھی یہ پابندی صرف ایک طرف لگائی گئی یعنی اونچے
خاندان کی عورت اور نیچے خاندان کے مرد میں شادی
نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس اونچے خاندان کے
مرد کو مکمل آزادی تھی۔ وہ حسبِ منشا نیچے خاندان کی
عورت سے شادی کر سکتا تھا۔ بہرحال قانون خواہ کچھ بھی
رہا ہو لیکن عام لوگ اپنے سے ادنیٰ طبقے والوں سے شادی
کرنے کو معیوب سمجھتے رہے ہیں۔ اور ان کی حتی المقدور
کوشش یہی رہی ہے کہ اپنے حسب نسب میں رشتہ
طے پا جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ رسم و رواج کے بندھن
کو توڑ کر جو لوگ شادی کر لیا کرتے تھے، ان سے ان
کے طبقے والے ناراض ہو جایا کرتے تھے۔ انھیں وہ نفرت
اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

ہندوستان میں قدیم ہندوستان
(ویدوں کے زمانے) میں اگرچہ کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا
جس سے اس امر کی نشاندہی ہو سکے کہ اس وقت مختلف
طبقوں کے درمیان شادی جائز نہیں تھی لیکن پھر بھی ہندو
دھرم کے تمام مفکرین بین الطبقاتی شادی کو نفرت کی نگاہ
سے دیکھتے آئے ہیں۔ بالخصوص برہمنوں کا طبقہ غیر برہمنوں
سے ازدواجی تعلق کو قطعی طور پر حرام سمجھتا ہے چنانچہ مشہور
ہندو مفکر منو لکھتا ہے "جو برہمن گمراہ ہو کر شودر عورت
سے شادی کر لیتا ہے اس کا پورا کا پورا خاندان شودر
ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی برہمن شودر عورت سے تنہائی میں
ملنے کے بعد برہمن باقی نہیں رہتا۔ اس عورت سے جو
اولاد ہوگی وہ بھی شودر ہی ہوگی" ایک دوسرے مقام
پر یوں لکھتا ہے "جو شخص کسی شودر عورت کے ہونٹوں
کو بوسہ دے، خود کو اس کے ساتھ ملوث کرے اور اس
عورت سے صاحب اولاد ہو جائے تو اس کی شدھی کی
کوئی صورت نہیں ہے"

قدیم چین میں قدیم چین میں شیہہ (SHIH)
اور شو (SHU) طبقوں کے درمیان شادی ممنوع
تھی۔ اور یہ ممانعت چونکہ اختلافِ نسب کی بنیاد پر تھی
اس لئے کوئی شخص سیاسی یا اقتصادی طور پر کتنا
ہی ممتاز کیوں نہ ہو جائے لیکن اس سے سماج یا معاشرہ
قطعی طور پر متاثر نہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ اس رواج کی خلاف
ورزی کرتے تھے انھیں عام لوگ قابلِ نفرت و ملامت
سمجھتے تھے۔ کافی دنوں تک تو ایسی شادی کے خلاف
قانون بھی نافذ تھا۔ نیز ایک قانون ایسا بھی بنایا گیا
جس کی رو سے بدکار، ایکٹر اور سازندے شریف لڑکیوں
سے شادی کرنے کے مجاز نہ تھے۔ ایسے لوگ اگر کسی شریف
لڑکی سے شادی کر لیتے تو ان کو سو کوڑوں کی سزا دی
جاتی تھی نیز اگر لڑکی والے، لڑکے کی حیثیت سے
واقف ہوتے تو یہی سزا لڑکی کے سرپرست کو بھی
بھگتنی پڑتی تھی۔ ایک طرف تو یہ سزا تھی اور دوسری
طرف بحکم سرکار عقد فوراً توڑ دیا جاتا اور لڑکی کو اس
کے خاندان والوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

قدیم روم میں قدیم روما میں بھی ایک قانون
کے ذریعے سربرآوردہ اور عام لوگوں میں ازدواجی رشتہ
ممنوع تھا۔ اسی طرح ایک قانون اس مفہوم کا بھی نافذ
تھا جس سے آزاد شدہ لوگوں اور خاندانی آزاد لوگوں
کے مابین شادی طے نہیں کی جا سکتی تھی۔ بعد میں
اگرچہ یہ قانونی پابندیاں اٹھالی گئیں لیکن عملی طور پر
اس پر برابر عمل درآمد ہوتا رہا۔

قدیم جرمنی میں آزاد اور غلام کا رشتہ
جرمنوں کے یہاں بھی ناجائز تھا۔ یہاں کے قانون کے
مطابق اگر کوئی آزاد آدمی کسی باندی سے عقد کر لیتا
تو بطور سزا اس کی آزادی سلب کر لی جاتی تھی اور

واقعات متفرقہ

منی میں غلام سے شادی کرنے والی عورت کو بھی غلام بنا دیا جاتا تھا

اس کے برعکس بھی اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے نکاح کر لیتی تو اسکو اپنی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ جرمنی میں رواج یہ تھا کہ اگر کوئی لڑکی اپنے والدین کی خواہش کے برخلاف کسی غلام سے رشتہ ازدواج استوار کرنا چاہتی تو فرمانروائے وقت اسکو تلوار اور تکلا پیش کرتا۔ اگر وہ تلوار لے لیتی تو اس پر ضروری تھا کہ اسی تلوار سے اس غلام کی گردن اڑا دے، اور اگر تکلا قبول کرتی تو وہ آزادی سے محروم کر دی جاتی تھی۔

قانون حمورابی مذکورہ بالا قوانین اور پابندیوں کے برخلاف قانون حمورابی، آزاد اور غلام کے درمیان رشتے کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس قانون کے مطابق، غلام خواہ کسی عام آدمی کا ہو یا قصر شاہی کا، وہ کسی بھی آزاد عورت سے شادی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اور اس عقد سے عورت کی حریت پر بھی کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔ اس قانون کی کچھ ذیلی دفعات بھی تھیں۔ مثال کے طور پر غلام کے آقا کو اس عورت کی اولاد سے خدمت لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ غلام کی وفات کے بعد عورت جو کچھ میکے سے لاتی تھی، اس کی بلا شرکت غیر مالک ہوتی تھی۔ غلام کی معیت میں جو جائداد وہ بناتی تھی، اسکو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ایک حصے کی مالک عورت اور اس کی اولاد ہوتی تھی اور دوسرے حصے کا مالک غلام کا آقا۔

اسلام میں باوجود اس بات کے کہ اسلام طبقاتی امتیازات کا قائل نہیں ہے پھر بھی فقہائے امت نے بوقت شادی میاں بیوی کے درمیان کفو کو لازم قرار دیا ہے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ شادی کے لئے کفو کی شرط غیر ضروری ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شادی بہر صورت صحیح ہے خواہ شوہر، بیوی کا ہم نسب و ہم رتبہ

واقعات نیچے دیکھیں

ہو یا نہ ہو، وہ اپنی تائید میں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (یعنی تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی آیت پیش کرتے ہیں۔ نیز النّاس سواسیة کاسنان المشط لا فضل لعربی علی العجمی الا بالتقوی (تمام لوگ کنگھے کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں۔ معیار فضیلت صرف تقویٰ اور خدا ترسی ہے) کی حدیث بھی ان کے قول کی تصدیق کرتی ہے ان علماء نے اپنے موقف پر ایک عقلی دلیل بھی دی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر شریعت کفو کا اعتبار کرتی تو قوانین تعزیرات کے اندر بھی اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے بالخصوص اس لئے بھی کہ شریعت اس بات میں بہت ہی زیادہ احتیاط برتتی ہے لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ شریف آدمی کو فاسق آدمی کے بدلے اور عالم کو جاہل کے قصاص میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور جب قانون تعزیرات میں اس کا اعتبار نہیں تو شادی میں بدرجۂ اولیٰ اس کا اعتبار نہیں ہونا چاہیئے۔

اس ضمن میں شیعوں کے مشہور امام ابو جعفر محمد بن الحسن لکھتے ہیں: "نکاح کے معاملے میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا کفو ہے۔ جیسے کہ تعزیرات کے باب میں وہ کفو ہیں حسب نسب کا اختلاف بے معنی اور لغو ہے، چنانچہ اگر ایک مسلمان کسی مسلمان لڑکی کے بارے میں پیغام بھیجے اور پیغام بھیجنے والے کے پاس اتنی دولت بھی ہو کہ وہ عورت کے نان نفقہ کا کفیل ہو سکتا ہے نیز وہ صحیح العقیدہ اور نیک اطوار ہو، فسق و فجور کا مرتکب نہ ہو تو صرف اس بنا پر کہ وہ خاندانی حیثیت سے حقیر اور مال و دولت کے لحاظ سے غریب ہے، لڑکی والے کو شادی سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اگر اس نے ایسا کیا تو اللہ اور اسکے رسولؐ کی سنت کا مخالف ہوگا۔"

مثلاً سائن عوام فرماتے ہیں، تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اسلام میں ایک سیاہ فام حبشی بھی ہاشمی خلیفہ کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔"

لیکن جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ شادی میں کفو کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ شادی چند در چند مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ اور ان مصالح و مقاصد کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جبکہ میاں بیوی کے درمیان قابل لحاظ حد تک یکسانیت و قرب ہو۔ نیز عام لوگ ان لوگوں سے رشتہ قائم کرنا جو وجاہت نسبی اور اقتصادی لحاظ سے ان کے ہم رتبہ نہ ہوں مناسب نہیں سمجھتے۔ بلکہ ایسے رشتے کو وہ اپنے لئے باعث ننگ و عار تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ امام سرخسی کا قول ہے۔ "نکاح میں کفو کا خیال رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ معاملہ ساری عمر کے لئے ہوتا ہے۔ باہمی صحبت، میل محبت ایک ساتھ زندگی بسر کرنا اور بہت سے نئے رشتے وجود میں لانا شادی کے مقاصد میں داخل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی تکمیل دو ہم حیثیت میاں بیوی کے درمیان ہو سکتی ہے۔ اگر کسی اونچے آدمی کی شادی کسی نیچی عورت سے کر دی جائے تو بجائے بیوی کے وہ عملی طور پر اس کی ایک کنیز بن کر رہ جائے گی اور یہ بیوی کی توہین ہے۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تب تو عورت کی اور بھی توہین ہے۔ اس لئے بوقت عقد ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔"

جو علماء مساوات (کفو) کو شرط مانتے ہیں، ان میں بھی کافی اختلاف ہے۔ کیونکہ یہ تو ایک اضافی چیز ہے کم سے کم مساوات اور زیادہ مساوات کے درمیان بیشمار درجات و مراتب ہیں جن کی تشریح و تعیین نہایت ہی دشوار ہے لیکن اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو لوگ کفو کی شرط کے قائل ہیں وہ تمام تر پابندیاں صرف مرد ہی پر عائد کرتے ہیں یعنی مرد کے لئے یہ ضروری ہے کہ عورت کی حیثیت کا ہو لیکن اس کے برخلاف عورت پر

دوں میں جو بات غور کرنے کے قابل ہے
کہ یہ لوگ اس شادی کو بھی باطل قرار نہیں دیتے جو سراسر
غیر کفو میں ہو تی ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ کفو کا مطالبہ لڑکی اور
اس کے سرپرستوں کا حق ہے لہذا اگر وہ اپنے حق سے
خود دستبردار ہو جاتے ہیں تو اس میں کسی کو کیا اعتراض
ہو سکتا ہے۔

بہرحال فقہائے اسلام کے یہ دو نظریے ہیں ایک
نظریہ وہ ہے جو حسب نسب کو کوئی اہمیت اور قدر
نہیں دیتا اور دوسرا وہ ہے جو سابقہ رواج و رسوم کو حق
بجانب قرار دیتے ہوئے اس کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم
کرتا ہے لیکن یہ دونوں ہی نظریئے اسلام کے اندر معمول بہ
رہے ہیں چنانچہ اسلامی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی
بن الحسین نے ایک انصاری کی اُمِ ولد (کنیز) سے
شادی کر لی تھی جب عبدالملک بن مروان نے اس ضمن
میں آپ کو ملامت کی تو آپ نے جواب دیا "اسلام
ایک ایسا جوہر ہے جو ہر کمی اور نقصان کی تلافی کر دیتا
ہے۔ اگر ایک مسلمان کسی مسلم باندی سے شادی کر لے تو اس
میں کوئی شرم و عار کی بات نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے خود اپنی باندی اور اپنے غلام کی عورت سے شادی کی
تھی" اس پر عبدالملک نے آپ کی تحسین و تعریف کی تھی۔

اسی کے مقابلے میں ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔
"قبیلہ بنی سلیم کے چند بادیہ نشین حالات کے زیر اثر روحار
میں آکر بس گئے۔ یہاں کے ایک سردار نے ان میں سے کسی
کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی، اور دونوں
طرف کی رضامندی سے یہ رشتہ طے پا گیا۔ روحار میں محمد
بن بشیر نامی ایک خارجی بھی رہتا تھا۔ اسے اس رشتے
پر بڑا تاؤ آیا۔ گھوڑے کی باگ سنبھالی، اور والئ شہر،
ابراہیم بن ہشام کے پاس آکر اس معاملہ کی شکایت کی۔
اس پر ابراہیم نے روحار کے مسلمانوں کے نام ایک تحریر
لکھی جس میں میاں بیوی کے درمیان فوری تفریق کے
علاوہ سردار کیلئے دو سو کوڑوں کی سزا تجویز کی اور
ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کے سر، داڑھی اور بھنوؤں کے
بال مونڈ دیئے جائیں۔ اس فیصلے سے خوش ہو کر محمد بن بشیر
نے ابراہیم کی انصاف پسندی اور عدل گستری کی تعریف میں
ایک نظم بھی کہی تھی۔

آزاد اور غلام کا رشتہ: ـــ بعض فقہاء نے آزاد آدمی
اور غیر کی باندی کے درمیان اور اسی طرح آزاد عورت اور
غیر کے غلام کے درمیان عقد کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ
اس ذیل میں فقہ کی مشہور کتاب "النہایہ" میں فقیہ ابو جعفر
محمد بن الحسن لکھتے ہیں "آزاد مرد اگر آزاد عورت سے
شادی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو کسی دوسرے کی
کنیز سے بھی عقد کر سکتا ہے لیکن شادی سے پہلے اس
کے آقا سے اجازت لینی ہوگی، اور تھوڑا بہت جو مہر ٹھہرے
اس کو بھی ادا کرنا پڑے گا۔ مالک سے اجازت حاصل کرنے
کے بعد جب باندی سے شادی کرے گا تو اس سے جو اولاد
ہوگی وہ آزاد سمجھی جائے گی بشرطیکہ آقا نے غلامی کی شرط
لگائی ہو، اور جب وہ آقا کی مرضی سے اس سے شادی
کرے گی تو اس کی اولاد آزاد ہوگی، ہاں اگر آقا نے اولاد کی
غلامی کی شرط کے ساتھ اجازت دی ہے تو دوسری بات ہے

جدید معاشرہ: ـ نئے معاشرہ میں شادیوں پر
لگائی ہوئی تمام پابندیاں تقریباً
ختم کی جا چکی ہیں۔ رسم غلامی کی جڑ ہی کاٹ دی گئی تاکہ
آزاد اور غلام کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے۔ آج دنیا کے
بیشتر ممالک میں اس مفہوم کے قانون بن گئے ہیں جن
سے مختلف طبقات کے درمیان حائل شدہ تفریقات و
امتیازات کی دیواریں منہدم ہو گئی ہیں۔ آج ہر انسان
قانون کی نگاہ میں ایک ہی حیثیت اور رتبے کا مالک
ہے۔ نئے قوانین میں تمام ہموطنوں کے حقوق و فرائض کی
تشریح کرتے ہوئے اس بات کی مکمل طور پر توضیح کر دی
گئی ہے کہ کسی کو سرزبان، مذہب یا رنگ و نسل کی بنیاد
پر کسی قسم کی بالادستی و برتری حاصل نہیں ہو سکتی، اس قسم
کے قانون صرف یورپی ممالک ہی میں نہیں بلکہ بلا تفریق
اشتراکی و غیر اشتراکی دونوں قسم کے ممالک میں نافذ
ہیں۔ حالانکہ ماضی قریب تک وہ طبقاتی اونچ نیچ کے
زبردست حامی رہے ہیں۔

ہندوستان میں ۱۸۷۲ء میں ایک قانون کے
ذریعے دو مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو باہم
شادی کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ اس طرح ۱۹۵۵ء
میں جو قانون پاس کیا گیا اس میں بھی ازدواجی تعلق کے
بارے میں ہر شخص کی آزادی اور خود مختاری کا احترام کیا
گیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جاپان نے بھی ایک دستور منظور کیا
جس میں اس بات کی تصریح تھی کہ کسی بھی جاپانی کو کسی
دوسرے جاپانی پر حسب نسب، مال و دولت، یا مذہب و عقیدہ
کی بنیاد پر فضیلت و فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

تاہم اس نئے دور میں بھی بہت سی ایسی ماڈرن
قومیں ہیں جہاں نسلی و جنسی امتیاز پر بدستور عمل ہو رہا ہے
اور ازدواجی تعلقات کے اندر اس کی خصوصیت سے چھان
بین کی جاتی ہے۔ دراصل اس طریقہ کار کو معاشرے کا
بالادست طبقہ اپنی حکمرانی و بالادستی کو محفوظ رکھنے کے لئے
نہایت ہی موثر سمجھتا ہے۔

مثال کے طور پر جرمنی میں ہٹلر کے جاری کردہ فرمان کی
رو سے تمام جرمن لوگ ساری دنیا کی قوموں کے مقابلے میں
خود کو اعلیٰ و افضل تصور کرنے لگے، اس کے فوراً بعد جرمن اور
غیر جرمن شادی پر کلیتاً پابندی لگا دی گئی تاکہ جرمنوں کی
نسل خلط ملط نہ ہو جائے اور پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ جرمن
نژاد یہودیوں اور غیر یہودیوں کی بھی شادی روک دی گئی
نیز یہاں کا حکمران طبقہ صرف آپس میں شادی کر سکتا تھا لیکن
ہٹلر کے زوال کے ساتھ ہی اس کے نافذ کردہ تمام عائلی قوانین
کے تار و پود بھی بکھر گئے۔

متحدہ امریکہ کی بہت سی ریاستوں میں آج بھی،
کالے اور گورے کے باہمی رشتہ پر قانونی پابندی ہے اور
اس قانون کا امریکی باشندے بڑا احترام کرتے ہیں۔
امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں جہاں کالے زیادہ تعداد میں
رہتے ہیں۔ اس قانون پر بڑے شد و مد سے عمل کیا جاتا ہے۔
متحدہ امریکہ کی مغربی ریاستوں میں جہاں زرد رنگ چینی اور
جاپانی بکثرت رہتے ہیں۔ وہاں ایک دوسرے قانون کے
ذریعے گوروں اور زرد رنگ والوں کے درمیان بھی شادی
کرنے پر پابندی عائد ہے۔

جنوبی افریقہ کی ان ریاستوں میں، جہاں پر گوری
اقلیت قابض ہے۔ ۱۹۴۹ء میں قانون بنا کر گوروں اور
غیر گوروں کے ازدواجی تعلقات پر روک لگا دی گئی۔
اس قسم کا کوئی بھی رشتہ اگر طے پا جائے تو سرکار کو اسے توڑ
دینے کا حق حاصل ہے۔ اور اگر حکمراں طبقے کا کوئی فرد دیدہ
دانستہ قانون شکنی کا مرتکب ہو تو اس کے لئے سخت
سے سخت سزائیں متعین ہیں۔ ❋❋

واقعات منیج دھلی

آکھیٹ

۱۹۰۰ء میں میری عمر ۲۳ سال تھی۔ علی گڑھ کالج میں ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ مگر میرا گھوڑا دو مرتبہ اس ٹٹی کو کودنے میں ناکام رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بابا جان نے چھوٹے صاحب، بڑے صاحب، ننھے صاحب، کالے صاحب، گورے صاحب غرضیکہ ہر قسم کے صاحب لوگوں سے سعی و سفارش کر کے مجھے ایک سرکاری محکمے میں نمک خوارِ سرکار بنا ہی دیا۔ اپنے عہدے کے فرائض کی انجام دہی کے لئے مجھ پر لازم تھا کہ شمالی ہندوستان کے ایک ایسے وحشتناک صحرائی اور پہاڑی حصے میں گھوڑے کی پیٹھ پر لدا ہوا مارا مارا پھرا کروں جس کا کچھ حال اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے سنا دینا چاہئے تاکہ پڑھنے والے میری داستان کے ماحول سے کسی قدر آشنا ہو جائیں۔

شمالی ہندوستان میں ہمالیہ کے سربلند سلسلے کا دامن سیکڑوں میل لمبے چوڑے جنگل ہیں۔ اس قدر گھنے کہ سورج کی روشنی بمشکل ان کے اندر پہونچ پاتی ہے اور اس قدر مرطوب کہ گرم موسم کی جلتی ہوئی دوپہر میں آپ یکایک اس جنگل کے اندر داخل ہوں تو مارے سردی کے کانپنے لگیں۔

خدا کی اس سرزمین پر صبح صادق کی ہلکی روشنی اور گلابی جاڑوں کی کم و بیش گیارہ مہینے قائم رہتی ہے۔ سرکاری اصطلاح میں دامنِ ہمالہ کے ان جنگلوں کو "ترائی" کہتے ہیں۔ اور واقعی یہ اسم صفت ہے بھی اس جنگل کی دنیا کا صحیح نام۔

اس خطے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قدرت نے وہاں اپنی نعمتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ پہلو بہ پہلو۔ زہر اور شہد۔ سرسبزی و شادابی، قدرتی مناظر کا حسن روح پرور، حسین پرندوں کے ساحرانہ نغمے۔ یہ سب ایک طرف اور دوسری طرف کروڑوں حشرات الارض۔ سانپ، بچھو، شیر، ہاتھی، اژدھے، دلدلیں، بھیڑیے کے جراثیم، زہریلے کانٹے اور ہر وہ چیز جو انسان کی جان کی دشمن ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے اپنی قوتِ تخلیق کے سارے خزانے خوب ہی دل کھول کر ان جنگلوں میں لٹائے ہیں — خوبی کمال اور کثرت، تینوں چیزیں موجود ہیں۔ نعمت ہو یا لعنت ہر چیز میں کثرت مقدار و تعداد سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ سبزہ اور قدرتی مناظر، دریا، جھیلیں، حسین اور خوشگلو پرندے اتنے ہیں کہ شمار سے باہر۔ اسی طرح سانپ، شیر اور خونخوار جانور اتنے ہیں کہ ان کی تعداد اندازے سے باہر۔ القصہ لعنتوں اور نعمتوں کے اس ہجوم میں جو انسان اپنی زندگی کے بارہ مہینے گزار دے اور پھر وہ اس طرح داستان کو بیان کرنے کے لئے زندہ بھی رہے وہ ایک عجوبے سے کم نہیں۔

سرکاری پروانہ آیا تو مجھے یاد ہے کہ ابا جان بہت ہی خوش ہوئے لیکن ہمارا یہ حال تھا کہ اپنی قسمت پر لعنت بھیجتے گھر سے نکلے۔ کام ہمارا یہ تھا کہ ہم ان جنگلوں میں بارہ مہینے دورہ کرتے رہیں اور دورے کا حال یہ تھا کہ دو چار ملازم اور ایک ماتحت ہمارے ساتھ اور ہم۔ ایک خیمہ۔ دو گھوڑے (جن میں سے ایک کو ایک دفعہ شیر کھا گیا) ایک رائفل ایک معمولی بندوق۔ جنگل میں جہاں دس پانچ گز زمین کھلی ہوئی پائی ڈیرا لگوا دیا۔ خیمے کے چاروں طرف خندق، خندق کے چاروں طرف آگ روشن تاکہ خونخوار درندے خیمے پر حملہ نہ کر سکیں۔ خیمے کے اندر ہم ایک پلنگ پر جس کے چاروں پائے پانی سے بھری ہوئی ناندوں میں رکھے جاتے تھے تاکہ زہریلے جانور بستر پر نہ آ سکیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک یہ عالم ہوتا تھا کہ ہم پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں فرش پر قدم نہیں رکھ سکتے۔ ایک بندوق ہماری گود میں رکھی ہوئی ہے۔ باہر خیمے کے گرد شیر دہاڑ رہے ہیں۔ سو سو دو دو سو ہاتھیوں کا گلہ چکر لگا رہا ہے۔ دو چار ریچھ گھوم رہے ہیں۔ یہ تو باہر کا حال ہے اور اندر۔ خیمے کے اندر فرش پر سانپ ریلا رہے ہیں دو، چار، چھ، دس، ناچ رہے ہیں۔ ہماری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ جسم پر ٹھنڈا پسینہ ہے۔ ہاتھ قابو میں نہیں۔ پانی کی صراحی پاس رکھی ہے۔ ہر پانچ منٹ میں حلق کو تر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مغرب کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک یہ حال رہتا تھا۔ آفتاب کی پہلی شعاع جنگل کی الجھی ہوئی شاخوں میں داخل ہوئی اور رات کا یہ تماشا ختم ہوا۔ جنگل کے تمام خوفناک ایکٹر اسٹیج سے رخصت ہو کر اپنے ٹھکانے لگے۔ اور صبح صادق کی روح پرور فضا میں خوش گلو پرندوں نے اپنے گیت شروع کر دیے۔

بارہ مہینے اللہ کی زمین پر راقم الحروف کی زندگی اسی طرح گزری۔ غور کیجئے! قصہ مختصر یہ جگہ تھی یہ حال تھا یہ ماحول تھا جہاں ایک عجیب و غریب واقعہ مجھ پر گزرا۔

جنگل کی سرحد پر ضلع پیلی بھیت کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کا نام "کھیا" تھا۔ جنگل کے مضافات سے

[illegible] اس کا [illegible] پاس [illegible]
کسی جلسے میں چار دن گزار کر اپنے فرسودہ اعصاب کو آرام
دیتا تھا۔ اس طرف آکر ٹھہرنے اور دم لینے کی ایک وجہ یہ بھی کہ
کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔ انسانوں کی کچھ غذا میسر آجاتی تھی۔
ورنہ ان جنگلوں میں تو سوائے سوکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی بیلیوں
اور آلوؤں کے کچھ نصیب ہی نہ ہوتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ
دودھ کا ایک قطرہ میسر نہ آسکتا تھا۔ حالانکہ ان جنگلوں کا ہر
کاشتکار دو دو سو گائے بھینسیں پالتا تھا اور ان کے
گلے جنگلوں میں پھرتے رہتے تھے۔ لیکن خدا کی اس انسان صورت
جنگلی مخلوق کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ دودھ بھی کوئی پینے کی چیز
ہے۔ کٹیشا نشاہ قریب کے اضلاع سے دودھ آتا رہتا تھا اور
جب میں وہاں مقیم ہوتا تو خدا کی یہ نعمت مجھے بھی نصیب ہو جاتی
تھی۔ اپنی شیر خوارگی کے زمانے میں دودھ کی طرف جو رغبت
ہوگی وہی اب جوانی میں مجھے کٹیشا آنے کے لئے بیتاب کرتی تھی
یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جنت کی کسی نہر کا بہاؤ آسمان سے زمین
کی طرف ہو گیا ہے، اور گویا اس نہر کا خالص دودھ کٹیشا میں
اللہ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جب میرا کیمپ کٹیشا کی طرف آیا
تو مجھے معلوم ہوا کہ بستی کے اندر سخت طاعون پھیلا ہوا ہے
چنانچہ میرا خیمہ بستی سے کچھ فاصلہ پر لگایا گیا۔ عموماً شام کو
قبل مغرب میں اپنے کیمپ میں خیمے کے سامنے کچی سڑک کے پاس
کرسی بچھا کر بیٹھا کرتا تھا۔ انسان کے ہم صورت جنگل کے جانور
جو اکا دکا اس طرف گزرتے تھے ان کی صورتیں بیٹھا دیکھا کرتا
تھا۔ اس مشغلے میں تنہائی کے اوقات کٹ جاتے تھے۔ اب
داستان شروع ہوتی ہے۔

ایک دن شام کو حسب معمول سرِ راہ بیٹھا ہوا تھا
میرا منہ گاؤں کی طرف تھا۔ کچی سڑک پر جو خشک تالاب
کے اندر سے گزر کر گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ میں نے ایک
شخص کو آتے دیکھا۔ آٹھ مہینے مجھے اس جنگل میں گزر چکے
تھے اس سے پہلے اس وضع اور صورت کا انسان میں نے
یہاں نہ دیکھا تھا اس لئے توجہ کا پیدا ہوئی۔ جب وہ
صاحب میرے قریب سے گزرنے لگے تو بے اختیار میں نے
ان کو مخاطب کر کے کہا۔

"السلام علیکم"

وہ میری آواز سن کر میرے قریب آکر رک گئے
نہایت شائستہ اور شیریں زبان میں انھوں نے سلام کا جواب دیا
میں نے کہا۔

"تشریف رکھئے" اور وہ بے تکلفی سے خالی کرسی کھینچ کر
بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ داستان کا سلسلہ بڑھاؤں ذرا ان کا
حلیہ بھی سن لیجئے۔

حلیے کے متعلق کیا اس قدر کہنا کافی نہ ہوگا کہ یہ صاحب
اتنے حسین اور خوش رو تھے کہ میں نے اپنی عمر میں ان سے زیادہ
حسین آدمی نہیں دیکھا۔

مردانہ حسن کا ایک عجیب و غریب نمونہ تھا جو میں نے
نہایت میلے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھا۔ آج تک وہ تصویر
میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے۔ وضع قطع بھی دیکھ لیجئے
پاؤں میں ندر دکمل کی پھٹی ہوئی سلیم شاہی جوتی۔ چوڑی دار
پاجامہ میلا اور پھٹا ہوا باریک ململ کا کرتا جس پر لکھنؤ کی
چکن بنی ہوئی تھی۔ مگر نہایت میلا اور بوسیدہ۔ سر پر دو پلی
ٹوپی وہ بھی میلی۔ سر پر چھوٹے چھوٹے پٹے، بالوں میں تیل
اور مانگ نکلی ہوئی۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں لیکن
داڑھی ندارد۔ منہ میں پان، آنکھوں میں ہلکا سا سرمہ۔

یہ ان کی تصویر ہے۔ میں نقاش یا مصور ہوتا تو
رنگ اور موقلم سے کاغذ پر کھینچ دیتا۔ ان کا بال بال میری
نظر میں محفوظ ہے۔ میں نے کہا۔

"حضرت آپ جیسا آدمی یہاں کہاں"؟ کہنے لگے۔
"کیوں مجھ میں آپ نے کیا خاص بات پائی"؟ میں
نے کہا "حسن اور شائستگی جو اس ویرانے میں عنقا ہے"
مسکرا کر کہنے لگے۔

"کیسی غلط بات آپ فرما رہے ہیں۔ حسن کی موجودگی سے
کوئی جگہ خالی نہیں ہے، اسی طرح جس طرح خدا ہر جگہ
موجود ہے۔ آپ نے ترائی کے بھینسوں، ریچھوں، ہاتھیوں
اور سانپوں میں حسن کو نہیں دیکھا"؟

میں نے کہا۔ "یہ سب صحیح، مگر اس اجاڑ میں آج پہلی
ہی دفعہ تصوف کے یہ موتی بکھرے ہوئے دیکھے ہیں" یہ مسکرا کر
کہنے لگے۔

"اگر کان نہ سنیں، آنکھیں نہ دیکھیں تو کیا اس دلیل پر
ہم موتی کے وجود سے انکار کر دیں گے بھائی صاحب"!
میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے۔

"بد صورت سے بد صورت مرد اور بد صورت سے بد صورت
[illegible]
فرض [illegible] معلوم [illegible] کہ حضرت کوئی غیر معمولی
انسان ہیں۔ وضع قطع اور نیاز بر گفتگو۔ بہت سی ادھر
باتیں ہوئیں مگر وقت کم تھا انھوں نے کہا کہ مغرب سے
پہلے ان کو بستی ضرور پہنچنا ہے۔ اور دوسرے دن آنے کا وعدہ
کر کے چلے گئے۔

دوسرے دن وہ کوئی پانچ بجے آگئے۔ میں نے ان سے
دریافت کیا کہ وطن اور مکان کہاں ہے۔ کہنے لگے۔
"سامنے گاؤں میں رہتا ہوں کئی سال ہو گئے۔
زراعت سے معاش پیدا کرتا ہوں فرصت کے اوقات میں
جنگل کی سیر کرتا رہتا ہوں"۔

چاہتا تھا کہ پوچھوں آخر اس ویرانے میں وطن کیوں
بنایا۔ مگر ابتدائی ملاقات میں کچھ ہمت نہ ہوئی۔ وہ ہر روز
آنے لگے اور ہر روز ان کے نت نئے کمالات اور جوہر مجھ پر آشکار
ہونے لگے۔ شاعر تھے اور پھر سخن فہم۔ ہزار ہا شعر اردو فارسی
کے ان کو یاد تھے۔ کھانا نہایت نفیس پکاتے تھے، جیسا کہ انھوں
نے پکا پکا کر کھلایا آج تک کبھی نصیب نہ ہوا۔ یا تو یہ حال تھا کہ
سوائے سوکھے آلو اور سوکھی مچھلی پر جسم و جان کے تعلق کا انحصار
تھا یا یہ عیاشیاں" کہ وہ روز کھانا پکانے کا کچھ سامان وہاں
ٹھا بانڈہ کراتے اور بریانی کباب مرغ اور قسم قسم کے میٹھے
کھانے بیٹھ کر پکاتے۔ خود بھی مزے لے لے کر کھاتے اور مجھے
بھی اتنا کھلاتے کہ کھاتے کھاتے لیٹ جاتا۔ شطرنج خوب۔
خوب نہیں بلکہ استادانہ کھیلتے تھے۔ علمی حالت بہت بلند تھی
جس مسئلے پر گفتگو کرتے تھے کم از کم مجھے تو زبان کھولنے کا
موقع نہ ملتا تھا۔

تین چار ہی دن میں کچھ ایسے بے تکلف ہو گئے کہ تم
اور تو تک نوبت آگئی اور خدا بے تکلفی رہی تو پٹنہ والی
زہرو اور الہ آباد کی چھپن چھری اور کلکتے کی گوہر کے تذکرے
ہونے لگے۔ اس سلسلے میں پتہ چلا کہ موسیقی سے صرف واقف
ہی نہیں بلکہ گاتے بھی خوب ہیں۔

میں سوچتا تھا کہ خدا کی شان دیکھو اس ویرانے
میں جہاں انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گئے تھے یہ
مافوق الانسان نظر آیا۔

ایک دن کہنے لگے "میاں تم جانتے ہو کہ دنیا میں
خدا کی دو بہترین نعمتیں ہیں" میں نے کہا "کیا"؟ کہنے لگے۔
واقعات [illegible] دہلی

"ایک نوخیز حسین عورت اور ایک قیمتی لذیذ غذا" مگر یہ کہنے لگے۔ "اس آدمی کے بچے نے جس کا نام انسان ہے کبھی یہ جانا کہ ان دو نعمتوں سے مستفیض کیونکر ہونا چاہئے۔ عورت کو بچہ پیدا کرنے کی مشین یا اپنی نفس پرستی کا آلہ بنا لیا اور اچھی غذاؤں کو اس گنوار پن کے ساتھ کھانا شروع کیا کہ بدہضمی ہونے لگی۔ اب ضعفِ باہ اور ضعفِ معدہ کے نسخے تلاش کرتا پھرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید مرد کی فطرت ہی ایسی ہے۔" کہنے لگے۔

"کیا بکواس کرتے ہو، فطرت بھی کبھی غلط ہو سکتی ہے۔ فطرت کا نام کیوں لیتے ہو، جس کو تم جیسے گدھے فطرت کہتے ہیں وہ درحقیقت تمہارا آوارہ اور بےکار نفس ہے۔" اور پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ عورت اپنا بدلہ تم سب سے ضرور لینے والی ہے۔ ایک لطیفہ سناؤں۔ ان جنگلوں میں ایک وحشی قوم آباد ہے۔ تعداد تو زیادہ نہیں، یہی کوئی دس بارہ ہزار نفوس ہیں۔ مگر ان کے تمدن میں مرد و عورت کی حیثیت بالکل منقلب ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی قوم میں ہر عورت برہمن ہے اور ہر مرد چمار۔ یعنی میاں بیوی اور باپ بیٹی ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھا نہیں سکتے۔ ایک دوسرے کے برتن استعمال نہیں کر سکتے۔ عورت کے لئے مرد نجس العین ہے۔ یہ اس بغاوت کی بدترین صورت ہے۔"

ان کی گفتگو کا یہ ایک نمونہ میں نے پیش کیا۔ ان کی دعوت میں کئی ہفتے تک کٹھیا میں ٹھہرا رہا۔ بہت چاہا کہ وہ میرے ساتھ چلیں یا کسی رات میرے خیمے میں قیام کریں لیکن اس پر وہ کبھی آمادہ نہ ہوئے۔

چند روز کے لئے میں جنگلوں میں چلا گیا۔ پھر ان کی یاد کا ستایا ہوا کٹھیا آیا۔ جس دن میں آیا اس کے دوسرے دن صبح کو وہ آئے۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں خلافِ معمول خیمے کے فرش پر بیٹھا ہوا دفتر کے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ میرا پیشکار سامنے بیٹھا تھا۔ میں عموماً سانپوں کے ڈر سے فرش کی نشست کم پسند کرتا تھا۔ لیکن اس دن خاصا کام تھا۔ بہت بڑے بڑے رجسٹر دیکھنے تھے۔ اس لئے ان کو پھیلا کر سامنے رکھنے کے لئے فرش پر بیٹھنا پڑا تھا۔ وہ آئے اور وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ یکایک میرا پیشکار اٹھ کر بھاگا: "سرکار سانپ۔۔۔ سانپ"

"ارے کہاں۔ کدھر؟" میں نے کہا۔

"کتاب کے نیچے۔۔۔ کتاب کے۔۔۔ اس کو نہ چھوئیے" پیشکار بدحواس ہو رہا تھا۔ میں بھی اٹھ کر بھاگا اور بھاگ کر خیمے کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

یہ حضرت اس تمام شور و شر میں بیٹھے رہے۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ قائم تھی جو ہمیشہ ان کے چہرے پر کھیلتی رہا کرتی تھی۔ میں نے کہا۔

"خدا کے لئے بھاگو، بیٹھے کیا دیکھ رہے ہو" مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑی کتاب کو اٹھایا۔ بھورے رنگ کا ایک پتلا ڈیڑھ ہاتھ لمبا سانپ پھنکار کر ان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں مبہوت اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے بےتکلف ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ سانپ نے پلٹ کر ان کے ہاتھ کی پشت پر پے در پے تین جگہ کاٹا۔ تینوں جگہ خون نکلنے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے انھوں نے اس کا سر توڑ کر جسم سے الگ کر لیا اور اس کو خیمے سے باہر پھینک کر اپنے کرتے کے دامن سے اپنے ہاتھ کا خون صاف کرنے لگے۔

"بہت زہریلی قسم کا تھا یہ سانپ۔ ہم لوگ اس کو سنگ کہتے ہیں۔ ذرا دیکھنا کسی ملازم سے کہو کہ اس کے سر کو کچل کر کہیں دور پھینک دے۔"

وہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے یہ ہدایات جاری فرما رہے تھے اور میں ان کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"جاؤ۔ جاؤ بہت جلدی ڈاکٹر صاحب کو لاؤ۔" میں نے پیشکار سے کہا۔

"جی نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ گھبراؤ نہیں خون نکل گیا زہر بھی نکل گیا۔" انھوں نے اس قدر اطمینان سے فرمایا کہ مجھے غصہ آ گیا۔

"عجیب الو ہو تم۔ سانپ کا زہر کوئی ایسی چیز ہے جسے تم ہضم کر جاؤ۔ انسان ہو یا کوئی دیو بھوت؟" میں نے جل کر کہا۔

خیر جانے دو۔ ہوش میں آؤ۔ یہاں آ کر بیٹھو اور قلیہ پوچھو۔ انسان ہو کہہ تو دیا تم سے کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر ہی نہیں ہوا کرتا۔

"دس منٹ میں تم لمبے لمبے لیٹ جاؤ گے۔ شاید اپنی جوانی پر اکڑ رہے ہو۔" وہ مسکرا رہے تھے۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ میں عادی ہو گیا ہوں۔ ہزاروں دفعہ سانپوں نے کاٹا ہے۔ اب کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔"

"سانپ کاٹے اور اثر نہ ہو! تم باولے ہو یا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"پاگل نہ تم ہو نہ میں ہوں۔ گھنٹا دو گھنٹہ دیکھو خود تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ اچھا اب باورچی کو بلاؤ۔ تو میں بریانی پکانے کا انتظام کروں۔"

آج تک میں حیران ہوں کہ وہ قصہ کیا تھا۔ ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے ان کو کوئی دوا ایسی معلوم ہو یا کوئی عمل یا تعویذ ایسا ہو جو ان کو سانپ کے زہر سے محفوظ رکھتا ہو۔ بہت پوچھا، بہت اصرار کیا، لڑا، جھگڑا، خوشامد کی مگر اس اللہ کے بندے نے کچھ بھی نہ بتایا کہ یہ بھید کیا ہے۔

ایک دن میں اور وہ بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ باتوں باتوں میں ان جنگلوں کے زہریلے جانوروں کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے۔

"تم نے کبھی یہاں کے بچھو بھی دیکھے ہیں؟"

میں نے کہا "دیکھے تو نہیں مگر سنا ہے کہ ظالم ایک ایک بالشت لمبے ہوتے ہیں اور بہت زہریلے۔"

کہنے لگے "میں تمہیں دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے سر سے ٹوپی اتاری اور اس کو سامنے فرش پر لوٹ دیا۔ میں کیا بتاؤں کہ میرا کیا حال ہوا۔ میں سانپ سے زیادہ بچھو سے ڈرتا ہوں۔ اور وہ بچھو جو ان کی ٹوپی میں سے نکلا۔۔۔۔ اللہ محفوظ رکھے۔ دس انچ سے تو کم نہ ہوگا۔ میں اٹھ کر بھاگا۔ میں نے کہا۔

"خدا کے لئے اٹھاؤ اس کو۔ میرا تو دم فنا ہو رہا ہے۔" مسکراتے ہوئے انہوں نے اس کا ڈنک پکڑ کر اٹھا لیا اور پھر اپنی ٹوپی میں رکھ کر ٹوپی سر پر رکھ لی۔

"ہو نہ ہو یہ کوئی عمل یا تعویذ ہے۔" میں نے کہا "کچھ بھی ہو۔ تمہیں بتانا ہوگا۔ اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گا۔ آج تم نہیں رہا میں نہیں بتاؤ" میں ان کے سر ہو گیا۔

کہنے لگے "بیٹھو خدا دم لو۔ بات سنو۔ میرے سر ہونے سے کیا فائدہ۔ کچھ ہو تو بتاؤں کہ کیسا عمل اور کیسا تعویذ۔ میں نماز تک پڑھتا نہیں۔ اللہ کا نام لینا ہی دشوار

ہے جہاں آس پاس کوئی دیہات کا ذکر ہے۔ میں جاہتا ہوں ساری عمر کان دا اور خرافات میں کیا جاہلوں پیروں کی کرامات؟
میں نے کہا: "میں تو نہ مانوں گا، پھر تو ضرور ہے۔
سانپ کا زہر تم پر اثر نہیں کرتا، ایسے خوفناک بچھو کو تم ہمسر پر رکھے پھرتے ہو۔" قطع کلام کر کے کہنے لگے۔
"سنو سنو تم نے کبھی خوف کے فلسفے پر غور نہیں کیا۔
انسان کے تمام محسوسات میں سب سے قوی ہے۔ پیر فقیر، حاکم سب اس سے کام لیتے ہیں، خوف نہ ہو تو دنیا میں کوئی کسی کا محکوم نہ رہے۔ یہ سب لمبی لمبی داڑھیوں والے اپنے ہاتھ پر بیعت کراتے ہیں، لوگوں سے منواتے ہیں۔ گلے میں ہار ڈلواتے ہیں، یہ سب اسی جنس کے سوداگر ہیں، دلوں میں خوف پیدا کر کے اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ اپنی زندگی کی ترکیب سے خوف کے عنصر کو نکال دو، پھر دیکھو دنیا کی کوئی طاقت تمھیں مرعوب نہ کر سکے گی۔ سانپ کے زہر میں ہلاکت کے جن اجزا کو شامل سمجھتے ہو، وہ درحقیقت زہر کے اندر موجود ہی نہیں، وہ خود تمھارے اندر ہیں۔ اپنے اندر کو ان اجزا سے پاک کر لو پھر سانپ کے منہ میں انگلی ڈال دو ویسے ہی محفوظ رہو گے جیسا کہ میں ہوں، سمجھے؟"
"خاک بھی نہ سمجھا" میں نے کہا۔ "سمجھوں تو جب جب تم سمجھنے کی کوئی بات کہو، خوف کا ایک عجیب فلسفہ نکال کر لائے ہو، خوف تو فطرتِ انسانی کا ایک جزو ہے۔"
"نہیں۔ غلط! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ خوف فطرتِ انسانی کا ایک جزو ہے۔ شیرخوار بچہ بالکل بے خوف ہوتا ہے۔ سانپ کا منہ اس کے منہ پر رکھ دو۔ آگ کی طرف اس کا ہاتھ لے جاؤ، کبھی خوفزدہ نہ ہوگا، مگر جب شعور آئے گا تو وہ دیکھے گا کہ آگ سے سب ہی ڈرتے ہیں، سانپ سے خوفزدہ ہیں، خوف کے جراثیم اس کے دماغ میں جگہ پا جائیں گے اور اس کی فطرت مسخ ہو کر رہ جائے گی۔"
"عجیب سنکی ہو" میں نے کہا۔ "ساری دنیا کے علوم سے اور انسان کی صدیوں کی تحقیقات سے انکار کر کے مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں اصل حالات معلوم کر کے رہوں گا۔ آج نہ سہی کل سہی۔"
غرض کہ ہر روز ان سے اسی طرح تو تو میں میں ہوتی تھی مگر اللہ کا بندہ کبھی نہ کھلا۔ کبھی اس نے ایک حرف ایسا نہ کہا جس سے پتا چلتا کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ جس قدر ٹالتا

میری کرید بڑھتی۔ آخر ایک دن خود ہی مجھ سے سوال کر بیٹھا۔
"آج کے دن سے تم میرے تعلق ہو، اب تم کو میرے ہی پاس رہنا ہے، بعنت بھیجو کھیتی اور کاشت کاری پر۔ میں جہاں جاؤں میرے ساتھ رہو۔ ابھی دو چپراسی بھیج کر تمھارا سب سامان منگوائے لیتا ہوں۔"
یکایک اس کا مسکراتا ہوا چہرہ نہایت سنجیدہ ہو گیا۔ پیشانی پر شکن، آنکھوں میں ایک قسم کی چمک، آواز میں لچک کی بجائے کرختگی۔ یہ رنگ میں نے اب تک دیکھا ہی نہ تھا۔
کہنے لگے: "مذاق اور دل لگی سے قطع نظر، ایک بات میری سن رکھو، وہ یہ کہ میری تمھاری دوستی کی پہلی اور مستحکم شرط یہ ہے کہ کبھی مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں تمھارے پاس رہوں یا کبھی ایک شب بھی تمھارے پاس گزاروں۔ میری تمھاری دوستی دن بھر کی ہے، وہ بھی جب تم کھیت آؤ۔ میں کون ہوں، کہاں رہتا ہوں، کیا کرتا ہوں، اس سے تمھیں کوئی واسطہ نہیں۔ جس دن تم نے ان باتوں کی تلاش شروع کی ہمارا تمھارا یارانہ ختم، اسی دن ہم تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت! یہ خوب سمجھ لو۔! اب چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔"
میں نے پہلے کبھی ان کی یہ حالت نہ دیکھی تھی، کچھ مرعوب سا ہو کر حیران رہ گیا۔
ایک دن کہنے لگے: "تمھیں مچھلی کے شکار کا بھی شوق ہے؟"
میں نے کہا: "شوق تو ہے مگر میرے پاس سامان نہیں۔"
"کہنے لگے: "سامان میں سب لیتا آؤں گا۔ یہاں ایک پہاڑی چشمے میں آج کل مچھلیاں بہت ہیں، کل تمھیں فرصت ہو تو چلیں۔"
چنانچہ دوسرے دن وہ آئے، مچھلی پکڑنے کی ڈنگیں اور کانٹے اور چارہ سب لے کر آئے۔ میرے کیمپ سے دو میل کے فاصلے پر جنگل کے اندر وہ ندی تھی۔ ہم دونوں کنارے پر جا بیٹھے، کانٹے پانی میں ڈال دیئے۔ مچھلیاں تو بہت تھیں مگر کانٹے کو نہ لگتی تھیں۔ گھنٹا دو گھنٹے انتظار کر کے میں اکتا گیا۔
کہنے لگے: "کبھی تم نے ہاتھ سے بھی مچھلی پکڑی ہے۔
آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ کمر کمر پانی میں گھس گئے۔ میں کیا بتاؤں، میں نے دیکھا کہ ایک لمحے کے اندر سینکڑوں مچھلیاں بڑی اور چھوٹی۔ ان کے چاروں طرف کودنے لگیں اور وہ ان کو ہاتھ سے پکڑ پکڑ کر کنارے پر پھینکنے لگے۔ مچھلیاں اس طرح ان کی طرف آتی تھیں جس طرح مقناطیس کے ٹکڑے

کی طرف کھنچ کر آتے ہیں اور میں حیران و ششدر رہ گیا۔
آخر وہ ندی سے باہر آئے۔ میں نے کہا۔
"قسم ہے تمھیں اپنے خالق کی۔ یہ کیا جادو کیا تم نے، اصل حال بتاؤ مجھے۔" ہنسنے لگے۔
"چھوٹی چھوٹی خفیف باتیں بھی جن کو انسان نہ سمجھے کس قدر بڑی اور اہم بن جاتی ہیں۔ تم جب اس فن سے واقف ہی نہیں تو سمجھو گے کیا خاک۔"
میں نے کہا: "مرد خدا پانی کو بچا کر مچھلیاں پکڑتے میں نے لوگوں کو دیکھا ہے اور بھی بہت سی ترکیبیں معلوم ہیں، مگر اس طرح مچھلیوں کو آزادی سے جسم پر لپٹتے ہوئے میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔"
کہنے لگے: "ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے اور سنا ہی کیا ہے، بچے ہو۔ لو چلو اب مچھلیوں کو جمع کر لیکا دیں۔"
ایک دفعہ شیروں اور اسی قسم کے خونخوار جانوروں کا ذکر ہو رہا تھا، کہنے لگے کہ۔
"اگر تم شیر سے خوف نہ کرو تو وہ تم سے خوفزدہ ہو سکتا ہے۔ خوف کے فلسفے کو سمجھ لو پھر تم میری حرکتوں پر ذرا بھی متعجب نہ ہو گے۔ تم نے سنا ہوگا کہ لوگ شیر کی گردن پر سوار ہو جاتے ہیں اور ایسی تصویریں تو بہت دیکھی ہوں گی۔ پھر کیا یہ لوگ جو ایسا کرتے ہیں جادوگر ہیں؟ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شیر کے دل میں خوف پیدا کر دیتے ہیں اور اپنے دل سے نکال دیتے ہیں۔"
"خدا کے لئے کیوں مجھ سے مذاق کرتے ہو۔ کل کو کہنے لگو گے کہ میں خود شیر بن سکتا ہوں، ہاتھی کی صورت اختیار کر سکتا ہوں۔ یہ طلسم ہوشربا کی داستانیں۔ جو کچھ تمھیں آتا ہے وہی سنا دو مجھے۔"
ایک دن وہ میرے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے، میرا پیشکار روتا ہوا آیا اور کہا کہ اس کی اکلوتی لڑکی کو طاعون ہو گیا ہے اور وہ بستی میں پڑی ہے۔ شطرنج چھوڑ کر یہ حضرت کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔
"چلو میں دیکھتا ہوں۔" مجھ سے کہا کہ "تم بھی چلو۔"
میں نے عذر کیا۔ ہنسنے لگے۔
"پھر وہی خوف۔ جب تک خوف تمھارے دل میں جگہ نہ پائے گا طاعون کبھی غالب نہیں آ سکتا۔ لوگ طاعون میں مبتلا ہو کر اس لئے مرتے ہیں کہ طاعون کے نام سے ڈرتے

واقعات نئی دہلی

سپاہی طوطا رام

ہیں۔ خوف الٰہی کی جان لیوا سے نہ کر طاعون ۔"

میں ان کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ وہ یہ کہہ کر بستی کی طرف چل دیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئے۔ میں نے پوچھا۔

"کیا کیا تم نے؟ کیا حال ہے مریضہ کا؟"

کہنے لگے۔ "برا حال ہے۔ میں کرتا بھی تو کیا۔ نہ طبیب نہ ڈاکٹر۔ خدا کرے بے چاری تندرست ہو جائے۔ اکلوتی اولاد ہے۔"

دوسرے دن صبح کو میں نے اپنے پیشکار سے پوچھا تو اس نے کہا کہ رات بھر میں لڑکی کا بخار بھی اتر گیا۔ اور گلٹیاں بھی غائب ہو گئیں۔ میں نے دریافت کیا کہ دوا بھی کچھ دی تھی۔ کہنے لگا۔ "دوا تو کچھ بھی نہیں دی البتہ تھوڑا سا گڑ پانی میں گھول کر پلایا تھا اور یہ کہہ آئے تھے کہ تھوڑا تھوڑا گڑ کھاتی رہے۔" تھوڑی دیر بعد یہ حضرت آئے تو میں نے کہا۔

"کیوں جی یہ کیا شعبدہ دکھایا تم نے۔ گڑ کھلا کر طاعون کا علاج۔" کہنے لگے۔

"یوں بھی ہوتا ہے علاج۔ آج میں شطرنج کا ایک نیا نقشہ سوچ کر آیا ہوں۔ لاؤ تو ذرا بساط۔"

اس شخص نے میرے دماغ میں اتنے الجھیڑے ڈال دیے تھے کہ میری عقل ان الجھنوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ حیران بھی تھا چڑ جاتا بھی تھا۔ غصہ بھی آتا تھا۔ مگر کرتا کیا۔؟ بحث کروں تو وہ الٹا مجھ ہی کو بے وقوف بنا دیتے تھے۔ میں روحانیات۔ کرامات اور معجزوں کا قائل نہیں مادیت اور دہریت کی طرف جھکا ہوا ہوں۔ والد کبھی کبھی میری موجودگی میں اپنے ہم درد دوستوں کو اس قسم کے قصے سنایا کرتے تھے تو میں ان کی بیوقوفی پر دل ہی دل میں ہنسا کرتا تھا شعبدہ بازوں کے شعبدے بہت سے دیکھے تھے ہر ایسی کرامت کو ان شعبدوں میں شامل کر کے سمجھ لیا کرتا تھا کہ پیر جی یا شاہ صاحب نے ابا جان کو خوب احمق بنایا۔ مگر اس شعبدے باز نے تو میرے چھکے چھڑا دیئے۔ یہ تو آج تک مجھے یقین نہیں کہ اس شخص کی غیر معمولی حرکتیں کوئی روحانی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر کچھ ایسا چکرا گیا ہوں کہ جھٹلا بھی نہیں سکتا۔

ایک دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ اس شخص کی پوری تاریخ معلوم کی جائے۔ اس کے ماضی و حال سے کچھ اس کی کیفیات کا اندازہ کیا جائے۔ ایک دن صبح کو وہ آئے شام تک میرے پاس رہے حسب معمول مغرب سے پہلے رخصت ہو کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ آج تو ان کا پتہ نشان معلوم کر ہی لینا ہے۔ کہاں جاتے ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ جب وہ سو دو سو قدم آگے بڑھ گئے تو میں نے اپنے سائیس سے کہا کہ گھوڑا لے کر ان کے پیچھے پیچھے جائے اور خود ایک لکڑی ہاتھ میں لے کر ان کے پیچھے چل دیا۔

کھلے ہوئے میدان میں وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ کہیں لوٹ کر نہ دیکھ لیں۔ بہر حال وہ چلتے چلتے خشک تالاب کے پاس پہنچے اور چونکہ وہ کچی سڑک اس خشک تالاب کے اندر ہو کر گزرتی تھی۔ وہ تالاب کے نشیب میں میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے اپنی رفتار کو ذرا تیز کر دیا۔ لیکن جب میں تالاب کے کنارے پہنچا تو سڑک خالی تھی اور وہ غائب تھے جنگل نہ تھا جس میں وہ ادھر ادھر نکل گئے ہوں۔ پہاڑیاں نہ تھیں۔ غار نہ تھے کوئی آبادی نہ تھی جہاں وہ چھپ رہتے کھلا ہوا میدان اور خشک تالاب کھلی ہوئی کچی سڑک جو میرے خیمے سے سیدھی گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ پھر وہ کہاں غائب ہو گئے۔؟

یہ سوالات ہیں جو آج تک تشنہ جواب رہے۔ ان کو تلاش کرنے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کہاں کہاں آدمی نہ دوڑائے۔ اس گاؤں کا ایک ایک گھر چھان مارا کھیتوں کے ایک ایک آدمی سے دریافت کر لیا جنگلوں میں ڈھونڈ لیا لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن۔ آخری دفعہ میں نے اس خشک تالاب کے کنارے ان کو دیکھا اور پھر کبھی نہ دیکھا یہ واردات میری زندگی کا ایک عجیب معمّا ہے۔ ■

اڈریسی، فرانس کا ایک خوبصورت ساحلی شہر ہے۔ جہاں ہر سال ملک بھر سے لوگ گرما کی چھٹیاں گزارنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ ۱۹۸۸ء کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں سے نکل کر سمندر کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ کچھ لوگ تیرنے میں مصروف تھے اور کچھ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر بیٹھے گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

صبح کے سورج کی کرنیں سمندر کی لہروں سے ٹکرا رہی تھیں اور ساحل پر کھڑی ہوئی بلند و بالا عمارتوں پر سورج کی کرنیں پڑنے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دیواروں پر پیلا رنگ کر دیا گیا ہو۔

علی الصباح حسب معمول ہوٹل کا بیرا "اینڈرسونٹ" کو جگانے جب ان کے کمرہ میں داخل ہوا، تو وہ وہاں نہیں تھے۔ وہ سونٹ کو ڈھونڈتا ہوا حمام میں پہنچا اور یہ دیکھ کر اسکی چیخ نکل گئی کہ اینڈرسونٹ کی برہنہ لاش خون میں لت پت اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ آدھا جسم ٹب کے اندر تھا اور آدھا ٹب کے باہر جھول رہا تھا۔ سر کے آر پار گولی کا سوراخ تھا اور ان کے کپڑے ایک پوٹلی کی شکل میں بندھے ان کے پاس ہی پڑے تھے۔ بیرا بدحواسی کے عالم میں سیدھا ہوٹل کے منیجر کے پاس بھاگا اور پھر کچھ ہی دیر بعد پیرس کے مشہور محکمہ سراغرسانی کے ہیڈکوارٹر میں فون کی گھنٹی بجی اور

پیرس کے ہیڈکوارٹر سورٹ" (suret) نے اپنے سب سے ہوشیار اور مشہور آفیسر لی ڈرو" DRAO " کو ایک ٹیلیگرام کر کہا کہ وہ جلد سے جلد اڈریسی پہنچ جائے اور اینڈرسونٹ کے قاتل کو پکڑ کر عدالت کے سامنے کھڑا کر دے۔ لی ڈرو اس وقت اڈریسی سے صرف دو میل دور ایک گاؤں لی ہاور کسی کام سے گیا ہوا تھا۔

ROBERT LEDRAID پیرس کے محکمہ سراغرسانی کا ایک نوجوان محنتی اور ذہین ممبر تھا اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے فرانس بھر میں مشہور تھا۔

اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ صرف پاؤں کا نشان دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ کس کے قدم کے نشان ہیں اس کے علاوہ سگریٹ کی راکھ سونگھ کر تمباکو کی قسم اور سگریٹ کا نام بتا دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ آج تک جتنے بھی قتل و خون کے کیس لی ڈرو کے ذمے کئے گئے ان کے قاتلوں کو پکڑنے میں اسے کبھی بھی ناکامی نہیں ہوئی۔ جس کیس کو لی ڈرو کے ذمہ کیا جاتا تھا۔ لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ قاتل ضرور پکڑا جائیگا کیسا ہی ہوشیار اور چالاک قاتل کیوں نہ ہو۔ لی ڈرو کے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا اس کے انہی کارناموں کی وجہ سے ملک کے بچے بچے کی زبان پر اس کا نام تھا اور وہ قوم کا ہیرو سمجھا جانے لگا تھا۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی اس بار لی ڈرو جانتا تھا کہ وہ اتنا ذہین اور ہوشیار نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ وہ ایک سست معمولی کام پر زیادہ وقت لگانے والا اور چھوٹے سے چھوٹے کو بڑی محنت اور جانفشانی سے کرنے والا شخص تھا جب کوئی کیس اس کے ذمے کیا جاتا تو وہ اس کمرہ کا جہاں قتل ہوا ہو بغور معائنہ کرتا لاش کے آس پاس پڑی ہر چیز کو اپنے قبضہ میں کر لیتا چاہے وہ کوئی دھاگے ہو یا ماچس کی جلی ہوئی تیلی حتیٰ کہ سگریٹ کے گل کو چھوڑتا اور اس کی دوسری عادت یہ تھی کہ وہ لاش ۵۰ فٹ کے فاصلے تک ہر مربع فٹ کا فوٹو لیتا لاش کے جسم کے ہر عضو کا الگ الگ زاویئے سے فوٹو ایسا وہ اس لئے کرتا تھا کہ وہ زیادہ ذہین اور ہوشیار تھا اسی لئے وہ معمولی معمولی چیزوں پر توجہ دیتا اور ان معمولی چیزوں پر ریسرچ کیا کرتا۔ مثال کے طور پر اگر لاش کے پاس ایک بٹن بھی مل جائے تو وہ اس کے بارے میں گھنٹوں سوچتا کہ یہ بٹن کس کا ہوگا اور اس شناسا لوگوں میں کون کون لوگ اس قسم کے بٹن کرتے ہیں اپنی انہی عادتوں کی وجہ سے وہ بعض بڑے بڑے مجرموں اور قاتلوں کو سزائے موت دلا چکا

اس کے علاوہ لی ڈرو جانتا تھا کہ اگر اس کے افسر کو پتہ چل جائے کہ وہ کتنا سست ہے اور معمولی سے چیز پر کس طرح گھنٹوں غور و فکر کرتا ہے تو یقیناً اس کو دھکا پہنچے اس لئے وہ ہمیشہ اپنی رپورٹ کو بڑھا کر اور جہاں تک ہو سکے بہتر طریقے پر پیش کرنے کی کوشش کرتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بات معلوم کرنے کے اس نے گھنٹے لگوا دیئے۔ تو وہ اپنی رپورٹ میں لکھتا وہ فوراً اس خیال پر پہنچ گیا۔ یہ بات اس کے افسر کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ اور اس طرح ان کا یقین ہو جاتا کہ لی ڈرو واقعی ایک ذہین سراغرساں ہے۔

لیکن سچ پوچھو تو غریب لی ڈرو کو ایک ایک پر رات رات بھر جاگنا پڑتا تھا بعض وقت وہ صرف تین گھنٹے ہی سویا کرتا تھا اور اس طرح اسے ہفتہ اوسطاً صرف ۲ گھنٹے سونا نصیب ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی

واقعات [illegible]

۲۴ گھنٹے مقتل وخون کے بارے میں سوچتے رہنے
اُسے خواب بھی اسی قسم کے آنے لگے تھے۔ بعض وقت
اب میں دیکھتا کہ وہ خود کسی کا خون کر رہا ہے اور فوراً
ار کر نیند سے بیدار ہو جاتا اور اپنی تحقیق میں جٹ جاتا

لی ڈرو، اڈریس پہنچا۔ تو اپنی عادت کے مطابق
ایک چیز کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ جب اس نے مونٹ
اش کے پاس پڑی ہوئی کپڑوں کی پوٹلی کو کھولا تو چیز
ے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ کپڑوں میں کئی سوفرانک بندھے
، تھے۔ لی ڈرو سوچنے لگا کہ قاتل اگر پیسوں کے لئے
کرتا تو یہ کئی سوفرانک اپنے ساتھ ضرور لیجاتا۔ اسکے
مونٹ کوئی مالدار آدمی بھی نہیں تھا۔ صرف معمولی سا
مین تھا۔ اسی سوچ میں وہ کھنڈر کھو رہا پھر اس
کیمرے کی مدد سے اس نے لاش سے ۵۰ فٹ کے
لے تک کے کئی سو فوٹو لے ڈالے۔ اور حسب عادت ہاں
ہر شے اپنے قبضے میں کرلی۔ وہ ان کاموں میں اتنا گم
کہ اسے خبر تک نہ ہوئی کہ کب رات ہوگئی۔ رات ہوتے
لیڈرو گھر نہیں لوٹا۔ بلکہ ایک لالٹین کی مدد سے
ن بین میں مصروف رہا۔

وہ لالٹین ہاتھ میں لئے سمندر کے کنارے پھیلی
رُ ریت پر قدموں کے نشان ڈھونڈنے لگا۔ یکایک
کے قدم رک گئے۔ اس کو جس چیز کی تلاش تھی وہ
مل گئی۔ اسے قدموں کا اک سلسلہ نظر آیا جو حمام کی
ن سے آرہا تھا۔ اور دور تک چلا گیا تھا۔ لیڈرو کو سمجھنے
دیر نہ لگی کہ یہ نشانات قاتل کے ہیں۔ پھر اس نے ان
وں کے نشانوں کے بے حساب فوٹو لے لئے۔

اس کام میں لیڈرو رات بھر منہمک رہا۔ اور
سرے دن پولیس ہیڈکوارٹر پہنچ گیا۔ جہاں سب لوگ
بینی سے اس کا اور اس کی رپورٹ کا انتظار کر رہے تھے۔

" میں نے مجرم کا پتہ لگا لیا ہے۔ " یہ کہتے ہوئے لیڈرو
نی رپورٹ پیش کردی۔ اور ایک کے بعد دوسری
چیزیں جن میں تصویریں بھی شامل تھیں۔ بتلانے
متعلقہ افسران چیزوں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے
کچھ دیر بعد لیڈرو نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں
نا شروع کیا۔

" ان تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ قاتل کے بائیں
[illegible]

پاؤں کا انگوٹھا نہیں ہے۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ یہ قدموں کے نشان
اسی شخص کے ہیں جس نے مونٹ کا خون کیا ہے۔ " لیڈرو
کہے جا رہا تھا۔ اور محکمہ سراغرسانی کے افسر دم سادھے
سن رہے تھے۔ اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا
معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اب کوئی انوکھی اور حیران کن
بات کہنے والا ہے۔

کچھ دیر کے وقفے کے بعد لیڈرو اپنے بائیں پیر
کے جوتے کی ڈوریاں کھولنے لگا۔ سب لوگ حیرت سے آنکھیں
پھاڑے لیڈرو کو دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں گھڑی کی ٹک
ٹک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جب لیڈرو نے جوتا الگ کیا تو سب کی آنکھیں حیرت و
استعجاب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت سے کبھی
لیڈرو کو دیکھتے اور کبھی اس کے بغیر انگوٹھے بائیں پیر
کو اور کبھی اُن تصویروں کو جن میں قاتل کے پاؤں کے
نشان تھے۔ کچھ دیر بعد لیڈرو نے افسروں کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا۔ " میں مونٹ کا قاتل ہوں۔ میں نے ہی مونٹ
کو قتل کیا ہے۔ "

اس کے بعد تفصیل کے ساتھ فوٹوؤں سے لیڈرو
کے پاؤں اور ہاتھوں کا مقابلہ کیا گیا اور اُسے مونٹ
کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

دوسرے دن ایڈریس اور پیرس کے اخباروں
میں جب یہ خبر شائع ہوئی تو سارے ملک میں ایک
سنسنی سی پھیل گئی۔ ہر گلی کوچے میں اسی موضوع پر
بحث کی جا رہی تھی۔ لوگ حیرت و استعجاب میں ڈوبے
ہوئے آپس میں لیڈرو کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے
دوسرے دن لیڈرو کو عدالت کے سامنے پیش کیا
گیا اور مکمل تحقیقات کرنے کے بعد اسے مونٹ کے قتل کے
الزام میں عمر قید کی سزا کا حکم دے دیا گیا۔

لیکن ایک سوال رہ رہ کر لوگوں کے دل میں اٹھ
رہا تھا کہ لیڈرو نے مونٹ کو قتل کیوں کیا ہوگا؟ محکمہ
سراغرسانی کے حکام، اس کے دوست احباب، عزیز و
اقارب یہ سوال جب بھی اُس سے پوچھتے۔ وہ یہی کہتا
" میں نہیں جانتا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ "

آخر کار عدالت کے کہنے پر فرانس کے بڑے بڑے
ڈاکٹروں کو بلوا کر لیڈرو کا معائنہ کرایا گیا۔

کئی گھنٹے کی جانچ کے بعد ڈاکٹروں کی مشترکہ
رائے یہ تھی کہ " لیڈرو دماغی کمزوری کے مرض ——
(Mental Illness) میں مبتلا ہو گیا ہے۔ جب بھی یہ
کمزوری اس پر غالب ہوتی ہے۔ وہ بڑے خوفناک قسم کے
کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اس نے مونٹ کا خون
اسی دماغی کمزوری کے غالب آجانے کی وجہ سے کیا ہے۔ "

یہ بیماری صرف رات کے وقت ہوتی ہے اور دن
کی روشنی میں یہ بالکل اسی طرح رہتا ہے جس طرح تمام
لوگ رہتے ہیں۔

جب عدالت پر یہ ظاہر ہوا کہ لیڈرو نے جان بوجھ
کر یا کسی ذاتی مفاد کے لئے مونٹ کا خون نہیں کیا بلکہ
دماغی بیماری کی وجہ سے ایسا ہوا تو عدالت نے دوسرا
فیصلہ سنایا۔

" لیڈرو صرف رات کو قید رکھا جائے گا اور دن
میں آزاد رہے گا اور ہمیشہ کی طرح اپنا کام انجام دیا کرے گا۔
کیونکہ وہ ایسی بیماری میں مبتلا ہے جو صرف رات کو
ہوتی ہے۔ "

اس اعلان کے بعد لیڈرو کو رہا کر دیا گیا لیکن
صرف دن کے لئے رات ہوتے ہی وہ خود بخود جیل خانے
میں چلا جایا کرتا۔

اس دوران لیڈرو نے کبھی بھی کوئی ایسی حرکت
نہیں کی جس سے ظاہر ہو کہ وہ خونی ہے۔ یا دماغی مریض
ہے۔ وہ اپنا فرض بخوبی نبھاتا رہا اور کئی قاتلوں کو پکڑ
کر عدالت کے حوالے بھی کیا۔ لیکن شام کو چھ بجے کے
بعد وہ اپنے تمام سرکاری اور غیر سرکاری کام چھوڑ
سیدھا جیل چلا جایا کرتا۔ اگر کبھی اُسے آنے میں دیر
ہو جاتی یا وہ بھول جاتا تو پولیس خود اسے لاکر قید خانے
میں بند کر دیتی تھی۔ صرف رات بھر کے لئے دوسری صبح
اُسے پھر چھوڑ دیا جاتا۔

لیڈرو یوں ہی اپنی زندگی کے شب و روز
کاٹتا رہا۔ آخر کار ۸۱ سال کی عمر میں ۱۹۳۶ء کی
ایک رات اس کا انتقال اسی قید خانے میں ہو گیا۔

اس طرح فرانس کی تاریخ کا عجیب و غریب
قیدی جو صرف رات کا قیدی تھا۔ نہ صرف رات
کے قید سے بلکہ زندگی کی قید سے بھی آزاد ہو گیا۔ ●●

اسپین کی سرزمین پر مسلمانوں کی عظمت کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ اسپین کے وحشی عیسائی مسلمانوں ہی کے خون کے پیاسے نہیں بنے ہوئے تھے بلکہ ان کی وحشت و بربریت سے خود ان کے ہم مذہب بھی محفوظ نہیں رہے تھے۔ اسپین میں مسلمانوں کو چن چن کر ذبح کیا گیا تھا لیکن پھر بھی چند خوش نصیب مسلمان ان درندوں سے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور شہزادہ مسعود جس کے آباؤ اجداد کئی صدی تک لوپے کے اس ملک پر حکومت کرتے رہے تھے ان ہی معدودے چند خوش نصیب نوجوانوں میں سے ایک تھا۔

اسپین میں مسلمانوں کی شکست کے بعد ایک عرصہ تک بقیۃ السیف اسپینی مسلمانوں کی تلاش جاری رہی تھی۔ اسپینی فوج کے سپاہی ان کی تلاش کے لئے دور دراز کے جنگلوں اور پہاڑیوں میں گشت کرتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود بعض مسلمان ساحل بحر تک پہونچنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اور اگر حسنِ اتفاق سے انھیں آبنائے جبل الطارق کے پار شمالی افریقہ کے ساحل تک لیجانے والا کوئی جہاز مل جاتا تھا تو ان کی جان بچ جاتی تھی۔

شہزادہ مسعود بھی اسی امید پر غیر مانوس اور غیر آباد راستوں کو طے کرتا ہوا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ وہ یہ سفر ایک کمزور اور تھکے ہوئے گھوڑے کے ذریعے طے کر رہا تھا۔

ایک رات جب مسعود ایک ایسے مقام سے گزر رہا تھا جہاں وہ بظاہر خود کو عیسائی درندوں سے محفوظ سمجھتا تھا گھوڑے سے اترا اور اسے ایک درخت سے باندھ کر خود آرام کرنے کی غرض سے زمین پر لیٹ گیا۔ سفر کی تھکان کے باعث فوراً ہی اسے نیند آ گئی۔

ابھی مسعود کو سوئے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چند غیر معمولی آوازوں نے اسے بیدار کر دیا۔ چاند اپنی پوری درخشانیوں کے ساتھ چمک رہا تھا اور اس کی روشنی میں آس پاس کی پہاڑیاں ایک دل کش منظر پیش کر رہی تھیں۔ اگرچہ فضا پر کامل سکوت طاری تھا لیکن کبھی کبھی ایک پہاڑ کی طرف سے آنے والی چیخوں کی آواز فضا کے اس سکوت و سکون کو درہم برہم کر دیتی تھی۔

مسعود کو ان ہی چیخوں نے بیدار کیا تھا۔ لیکن اب پھر ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی تھی اور مسعود سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی اس نے چیخوں کی آواز سنی تھی؟ یا کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا؟

ابھی مسعود کسی نتیجہ پر نہ پہونچنے پایا تھا کہ فضا میں چیخوں کی آواز پھر بلند ہوئی اور مسعود ایک لمحے توقف کئے بغیر اس پہاڑی کی طرف چل پڑا جہاں سے وہ آواز آ رہی تھی۔ فضا پر اب پھر خاموشی چھا گئی تھی مگر مسعود کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ قریب ہی کوئی انسانیت سوز واقعہ رونما ہو رہا ہے۔ دفعتاً ایک بار پھر چیخیں بلند ہوئیں اور انھیں کی رہنمائی میں وہ ایک ایسے غار کے دہانے پر پہونچ گیا جس کے اندر سے بات چیت اور کبھی کبھی کسی عورت کی مظلومانہ چیخوں کی آواز آ جاتی تھی۔ وہ غار کے دہانے پر کھڑا ہو کر اندر کے حالات کا اندازہ کرنے لگا۔

"مغرور حسینہ!" کسی مرد نے اپنی کرخت آواز میں کہا۔ "اپنی ضد سے باز آ جاؤ۔ اب تمہارے لئے میری گرفت سے نکلنا ممکن نہیں ہو سکتا۔"

"ظالم کتے!" ایک عورت کی آواز آئی۔ "تجھے ایک مظلوم لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ یاد رکھ خدا میری مدد کرے گا اور تو میری زندگی میں میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ اب کوئی قوت بھی تمہیں میری گرفت سے نجات نہ دلا سکے گی، اور اگر تم اسی طرح اپنی ضد پر قائم رہیں تو میرا خنجر تمہارے سینے میں تیرتا ہوا نظر آئے گا۔" مرد نے کہا۔

"اپنی عزت کی حفاظت کے لئے میں جان دے دینے کو ایک معمولی بات سمجھتی ہوں۔ آگے بڑھو اور اس خنجر کو میرے سینے میں پیوست کر دو۔" لڑکی نے جواب دیا۔

اب مسعود پورے واقعہ کو سمجھ چکا تھا اور اس کے لئے مزید تاخیر ناممکن تھی۔ وہ چاند کی روشنی میں دبے پاؤں غار کے اندر گھس گیا۔ غار میں ایک فوجی سردار ایک حسینہ کے روبرو کھڑا اپنا خنجر تول رہا تھا کہ مسعود نے اپنی تلوار سے اس پر حملہ کر دیا۔ اسی لمحے اس سردار نے بھی

اپنا خنجر حسینہ پر چلایا جو حسینہ کے سینے میں پیوست تو نہ ہو سکا لیکن وہ زخمی ضرور ہو گئی۔
مسعود نے اچانک حملہ کر کے اس حسینہ کی جان بچالی تھی اگرچہ وہ زخمی ہو جانے کے بعد بے ہوش ہو گئی تھی لیکن فوجی سردار ہلاک ہو چکا تھا۔ مسعود نے جھک کر بے ہوش پڑی ہوئی حسینہ کو دیکھا تو اچانک اس کی زبان سے نکلا

"یہ تو صوفیہ ہے۔ ڈیوک آف نارمن کی لڑکی صوفیہ اس ظالم سردار کی بیٹی جس نے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔"

اور اس تصور کے ساتھ ہی مسعود کو وہ زمانہ بھی یاد آگیا جب وہ شہزادے کی حیثیت سے صوفیہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اور جب یہ دونوں بچپن کے دور سے گزر کر جوانی کی منزلوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ وہ اپنے دل میں صوفیہ کی محبت کا ایک جذبہ محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ اب مسعود شہزادہ نہیں بلکہ ایک بے یار و مددگار نوجوان تھا اور صوفیہ ایک ایسے عیسائی سردار کی بیٹی تھی جس نے اسپین کی اسلامی حکومت کو تباہ کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ اس لئے مسعود سوچ رہا تھا کہ اسے صوفیہ کے ساتھ ہمدردی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اُسے اسی حال میں چھوڑ کر چلا جانا چاہیئے۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ بہر حال اس وقت صوفیہ مظلوم ہے اور ایک مسلمان کو کسی حال میں بھی مظلوم کی حمایت سے دست کش نہ ہونا چاہیئے۔

یہ سوچ کر مسعود نے مقتول عیسائی سردار کے لبادہ سے صوفیہ کے زخم کو صاف کر کے اس پر پٹی باندھی اور بے ہوشی کی حالت میں اُسے اٹھا کر کسی نہ کسی طرح گھوڑے پر بٹھایا اور صبح کے قریب ایک گاؤں کی سرائے میں جا پہونچا۔

اب صوفیہ کو ہوش آگیا تھا۔ اس نے مسعود کو اپنے قریب بیٹھا ہوا دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "میں اس وقت کہاں ہوں اور اس فوجی سردار کا کیا حشر ہوا جو مجھے فریب دے کر لے آیا تھا۔" اور مسعود نے اس پر تمام صورت حال واضح کرنے کے بعد کہا۔

"اب تم شہر کے قریب ہو آسانی کے ساتھ اپنے گھر واپس جا سکتی ہو۔ ہاں میں تم سے اس بات کی امید رکھتا ہوں کہ تم کسی کو بھی اس نواح میں میری موجودگی کی اطلاع نہ دو گی۔"

لیکن مسعود! صوفیہ نے کہا۔ "اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میری زندگی میں کوئی شخص بھی، خواہ وہ میرا باپ ڈیوک آف نارمن ہی کیوں نہ ہو تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔"

مسعود بچپن ہی سے صوفیہ کے ساتھ والہانہ محبت کرتا تھا اور خود صوفیہ کا دل بھی مسعود کی محبت سے خالی نہیں تھا کہ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال نے حالات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ انقلاب حکومت کے دوران میں ان دونوں کے میل جول کے تمام رشتے ٹوٹ چکے تھے اور انہیں مستقبل میں ایک دوسرے سے ملنے اور جوانی کے سنہرے خوابوں کی تکمیل کی کوئی توقع باقی نہ رہی تھی۔ لیکن جس طرح صوفیہ کو مسعود کے احسان نے حیرت میں ڈال دیا تھا، اسی طرح مسعود بھی صوفیہ کی بات سن کر متحیر ہو گیا تھا۔ اس نے صوفیہ کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ بدلے ہوئے حالات میں اسے اپنی خواہش کی تکمیل پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن انجام کار اسے صوفیہ کے اصرار سے مجبور ہو جانا پڑا اور وہ اسے اس کے گھر تک پہونچانے پر رضامند ہو گیا۔

ابھی سورج کی روشنی اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ مسعود صوفیہ کو گھوڑے پر بٹھائے اور خود اس کی باگ پکڑے ہوئے شہر میں داخل ہوا لیکن ـــ وہ ڈیوک کے محل کے قریب پہنچا ہی تھا کہ محافظ سپاہیوں نے اسے پہچان لیا اور تلواریں لئے ہوئے اس کی طرف بڑھے مگر صوفیہ نے فوراً ہی انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"بزدلو! ایک ایسے شخص پر جو تنہا تمہارے درمیان کھڑا ہوا ہے اور جس نے میری جان بچا کر تم سب پر احسان کیا ہے تمہیں تلوار اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔"

صوفیہ کئی روز سے لاپتہ تھی اور جب تلاش کے باوجود اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا تو یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس ہنگامی صورت حال میں کسی مسلمان نے اسے قتل کر دیا ہے اس لئے اس وقت اسے زندہ و سلامت دیکھ کر محل کے خدام نے ڈیوک کو اطلاع دی اور ابھی سپاہیوں اور صوفیہ کے درمیان بات چیت جاری تھی کہ ڈیوک بھی وہاں پہونچ گیا اور صوفیہ سے تمام حالات معلوم کرنے کے بعد مسعود اور صوفیہ کو ساتھ لے کر محل میں چلا گیا۔

ڈیوک صوفیہ اور مسعود کی محبت سے اچھی طرح واقف تھا اور مسعود کے احسان نے اس کے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ اس لئے اس نے مسعود کو شکر گزاری کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسعود! محبت سلطنت کے اختلافات سے بالاتر ہے اس میں شک نہیں ہے کہ میں نے اس ملک سے مسلمانوں کی حکومت کو ختم کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔ لیکن تم نے میری بیٹی کی جان اور آبرو بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور تم دونوں کے درمیان محبت کا جو رشتہ قائم ہے اسے توڑ دینا اب میرے قابو سے باہر ہے اس لئے میں صوفیہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ میں تمہاری حفاظت کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں لیکن اگر صوفیہ رضامند ہو اور تم میری ریاست میں رہنے پر آمادہ نہ ہو تو میں تمہیں حفاظت کے ساتھ باہر بھیجنے کا انتظام بھی کر سکتا ہوں۔"

ڈیوک کے طرز عمل نے مسعود کو بہت زیادہ متاثر کیا اب اس کی محبت کے رنگین خوابوں کے پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بے حد ممنون ہوں صوفیہ کی جان بچا کر میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنا ایک انسانی فرض انجام دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ابھی ساحل کے قریب اسی سرزمین پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک آخری معرکہ برپا ہوگا، مجھے اس معرکہ میں شریک ہونا چاہیئے میں اس میں شریک ہوں گا اور اگر زندہ رہا تو واپس آکر صوفیہ سے ملوں گا۔ فی الحال میں صوفیہ اور آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔"

ڈیوک مسعود کی یہ درخواست سن کر حیران رہ گیا لیکن وہ اسے مسترد بھی نہیں کر سکتا تھا اس نے مسعود کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"مسعود! جس قوم میں تم جیسے بہادر نوجوان پیدا ہو سکتے ہیں وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔"

اور اب پھر مسعود اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ ـــ

[illegible] فٹ بال

[illegible] کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔
شائستہ [illegible] اس کے کھیل ہمارے یہاں بہر حال ہوتے ہیں۔ اس ٹورنامنٹ میں کلکتہ کی کئی ٹیمیں اور دوسری ریاستوں کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ اب تک زیادہ کامیابی موہن ہی کو حاصل ہوئی ہے۔

جہاں اس کھیل میں اتنے بڑے بڑے ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں وہیں ان ٹورنامنٹوں نے اچھے اچھے کھلاڑی بھی پیدا کئے۔ ان کھلاڑیوں میں سب سے زیادہ شہرت برازیل کے پیلے کو حاصل ہے۔ یہ فٹ بال کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ پیلے کے ایک ہزار گول کرنے پر برازیل کی حکومت نے اسکے نام کا ڈاک ٹکٹ جاری کیا جس پر پیلے کی تصویر شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ چند مشہور کھلاڑیوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابرٹ (ہنگری) (یوگوسلاویہ) آنڈوانوف (روس) بیگ (یوگوسلاویہ) جارج الاڈیوروجیس، لاتنول سانچز (چیلی) گلیمر، ہن سٹوس، زیٹو، امریلیڈو، پیلے، واوا، ڈی ڈی، گورنچا، ٹیکاس، (برازیل) شوٹ، لاسہ، سکیمولارٹ، شیٹر (چیکوسلاواکیہ) سوسا، ولیم ماٹینر (یوروگے) گروسکس، سلیموسل (ہنگری) تاسن گولکیپر، (روس) ٹریوپڈ (اٹلی) رتن فلادرس، اسٹینلی میفوز (انگلینڈ) ٹیکاس (برازیل) اسلیٹر (مغربی جرمنی)
چند مشہور ہندوستانی کھلاڑی :: میوہ لال، لطیف، رحیم، سلیم، جمعہ خاں، عثمان، حافظ رشید (محمد جانگیر) چنی گوسوامی، پی کے بنرجی، جرنیل سنگھ، یوسف خاں، نعیم، حبیب، تھنگا راج، مصطفےٰ، سرمد خاں، سردار خاں، پیٹنا، گھوسٹو پال، سعادت اللہ، اپالا راجو، راجندر موہن، مترکی، اسی پرشاد، جان، الطاف، لطیف (مثلاً جسے اس سال پدم بھوشن کا خطاب ملا) عابد حسین، فخری (جوان دنوں انگلستان میں ہے)

بقیہ:۔ ایڈیٹوریل

حامیانِ اُردو چاہیں گے کہ جس ریاست میں بھی اُردو بولنے اور پڑھنے والے موجود ہیں ان کو اس کی تعلیم کی پوری سہولتیں دی جائیں اور یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، پنجاب اور دلی جیسے علاقوں میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا جائے تاکہ سرکاری سطح پر اس کی اہمیت کو محسوس کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں قومی سماج میں جس میں سرکاری ملازمتیں بھی شامل ہیں اقلیتوں کو کتنا حصہ ملنا چاہئے اسکی طرف بھی دھیان دیا جائے، اور سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ امن و انتظام رکھنے کے لئے مرکزی حکومت اپنی ریزرو فورس کو اتنا مضبوط بنادے کہ وقتِ ضرورت یہ ہر ریاست میں فوری طور پر امن و امان قائم کر سکے اور اسے قائم بھی رکھ سکے۔

نئی حکومت کی یہ اہم داخلی ذمے داریاں ہوں گی جن کو پورا کر کے وہ نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی اپنی پوزیشن کو مستحکم بنا سکے گی کیونکہ اس صورت میں کسی کو اس ملک کی بدامنی، قتل و غارت گری یا یہاں کی غربت و افلاس کے نام پر بین الاقوامی دنیا میں اسے بدنام کرنے کی جرأت نہ ہو سکے گی۔

ان توقعات کے ساتھ ہم مرکز میں قائم ہونے والی ہر نئی حکومت کا خیر مقدم کریں گے اور اگر مسز گاندھی کو حکومت قائم کرنے کا موقع ملا۔ جسکا ہمیں یقین ہے تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکیں گے کہ وہ کانگریس کی اعلان کردہ پالیسیوں کو بروئے کار لائیں گی اور اپنے ووٹروں کو کسی طرح مایوس نہ کریں گی۔

بقیہ:۔ انور سادات سے انٹرویو

اوپر عائد نہیں ہو گی۔
سوال۔ آپ کے خیال میں امریکا کیا کچھ کر سکتا تھا جو اس نے نہیں کیا۔
جواب۔ امریکی نظم و نسق حقیقت میں امن کی کنجی ہے۔ اگر وہ چاہے تو اس کے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں کہ ہمارے نیک ارادوں کے بارے میں اسرائیل کو مطمئن کر سکے۔ آپ نے ناز و نعم میں پال کر اسرائیل کی عادت کو بگاڑ دیا ہے۔ آخر امریکا اسرائیل کے ساتھ اپنے دوسرے اتحادیوں سے مختلف سلوک کیوں کرتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ہم نے جنگ شروع نہیں کی تھی اور اس نے سینائی سے اسرائیلیوں کو نکالنے میں مدد کی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں بھی ہم نے جنگ شروع نہیں کی ہمارے تین شہروں کو مکمل طور پر برباد کر دیا گیا ہے۔ اگر امریکا کو اب بھی انصاف کا کوئی احساس ہے تو وہ مشرقِ [illegible] مطالبہ کر سکتا ہے۔

سوال۔ آخر میں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اسرائیل کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے کہ آپ کا مقصد اب یہ نہیں ہے کہ جزوی صلح کے بعد ایسا طریقۂ عمل اختیار کیا جائے کہ اسے تباہ کیا جا سکے۔
جواب۔ آپ الٹی باتیں کر رہے ہیں اصل میں تو یہ ہم ہیں جنہیں کہ اسرائیل کے ارادوں کے بارے میں مطمئن کرنا ہو گا۔

بقیہ:۔ دنیا دور بینی کی نظر میں

فرانس

لیجئے اب ججوں نے بھی احتجاج اور مظاہرے شروع کر دیئے۔ اسکی مثال فرانس کے ججوں نے پیش کی ہے گذشتہ سے پیوستہ ہفتہ فرانس کے باقی کورٹوں کے تقریباً ایک ہزار جج اپنی اپنی عدالتیں بند کر کے پیرس میں جمع ہوئے اور حکمراں گورسٹ پارٹی کے نئے سکریٹری جنرل ادین تو ناسینی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا۔ تو ناسینی نے ججوں پر الزام لگایا تھا کہ بائیں بازو کے نوجوان ایکی ٹیٹروں کو وہ سخت سزائیں نہیں دے رہے ہیں اور اسطرح اپنی "بزدلی" کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ججوں نے سیکریٹری جنرل کے ان الفاظ کو اپنی سخت توہین سمجھا اور اپنا ایک احتجاجی جلوس نکال ڈالا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ جب "نرم طرزِ عمل" اختیار کرنے والے ججوں پر تو ناسینی نکتہ چینی کر رہے تھے تو فرانس کے ہائی سکولوں کے طلبہ اس بات کے خلاف احتجاج کر رہے تھے کہ ایک پولیس مین کے منہ پر طمانچہ مارنے کے الزام میں ایک نوجوان کو چھ ماہ کی سزا کیوں دی گئی۔ (بعد میں یہ سزا معاف کر دی گئی)

ججوں اور وکیلوں کی طرف سے جو زبردست احتجاج کیا گیا اس سے تو ناسینی معافی مانگنے کیلئے مجبور ہو گئے اور صدر جارج پومپیدو کے نام اپنے ایک خط میں انھوں نے ججوں پر لگائے گئے تمام الزامات کو واپس لے لیا۔

فرانس میں کہنا چاہئے ابھی عدلیہ کا بڑا وقار ہے حقیقتاً یہ عدلیہ ہی ہے جس کے سہارے جمہوریت کی دیوار کھڑی رہ سکتی ہے ورنہ اگر یکطرفہ جانے کب اس دیوار کو زمیں بوس کر دے [illegible]
واقعات [illegible]

MARCH 1971
(FIRST HALF)

WAQIAT

REGD. NO. D
TELEPHONE

ایک اہم امتحان کا آغاز

• اسرائیل کی وزیراعظم گولڈا مائر سے انٹرویو

ادارے — واقعات نگار علی

شرارت پسند عناصر سے ہوشیار

حالیہ انتخابات نے یہ حقیقت ظاہر کردی ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں کافی مضبوط ہوگئی ہیں۔ عوام نے فرقہ پرستی مذہبی تنگ نظری اور فسطائی رجحانات کو مسترد کردیا ہے اور اس جماعت پر اپنے کلی اعتماد کا اظہار کیا ہے جس نے سیکولر جمہوریت کو مضبوط بنانے کا اعلان کیا تھا۔ یہ جماعت تھی کانگریس۔ اب اسے پھر وہی مستحکم پوزیشن حاصل ہوگئی ہے جو پنڈت نہرو کے زمانے میں حاصل تھی۔ بلکہ اس لحاظ سے وہ زیادہ مضبوط ہے کہ اسے ہمیشہ کے مقابلے میں زیادہ عوامی ووٹ ملے ہیں۔

کانگریس کی اس کامیابی میں سب ہی طبقوں کا ہاتھ ہے لیکن اقلیتوں نے بالخصوص اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسکا اقرار خود صدر کانگریس مسٹر جگجیون رام اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تمام اقلیتیں کانگریس کو کامیاب بنانے کے لئے متحد ہوگئیں اور انھوں نے مکمل طور سے اپنے آپ کو اس جماعت سے وابستہ کرلیا۔

اس کی وجہ کیا تھی اور انھوں نے کیوں اس جماعت کی آواز پر لبیک کہا۔ اس لئے کہ اس جماعت کی طرف سے انھیں بڑی مانند کی دھمکیاں نہیں ملیں۔ انھیں نفرت کے پھندے میں پھنسانا نہیں چاہا۔ بلکہ انھیں محبت کا پیغام ملا۔ مساوات کا نعرہ ان کے کانوں میں گونجا۔ انھوں نے یہ آواز سنی کہ سماجی معاشی اور سیاسی انصاف ہمارے آئین کی بنیاد ہے۔ سب ہندوستانی ہیں سب برابر ہیں نہ کوئی

واقعات نگار علی

بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا۔ اور کانگریس نے حلف اٹھایا تھا ہے کہ وہ سب اقلیتوں کے حقوق و انصاف کی حفاظت کرے گی۔"

یہ سب کے دلوں کو لگنے والی آواز تھی۔ اقلیتوں کے دلوں کو خاص طور پر لگی اور انھوں نے مکمل طور پر کانگریس کا ساتھ دیا۔ نتیجے میں کانگریس ایک مضبوط جماعت بن کر سامنے آئی۔

فرقہ پرستوں نے الیکشن کے دوران ہی شرارتیں شروع کردی تھیں اور ان مقامات پر جہاں کانگریس نے عوامی نمائندگی کیلئے کسی اقلیتی فرد کو نامزد کیا تھا انھوں نے فرقہ وارانہ جذبات برانگیختہ کرنے کا ناپاک منصوبہ بنالیا تھا۔ علی گڑھ کا ہنگامہ اسی منصوبے کی ایک کڑی تھا۔ بدقسمتی سے لوگ جذبات میں بہہ گئے۔ اس حد تک بھی غنیمت تھا لیکن ودھایک دل کے کارندوں نے سی۔ بی گپتا جیسے ودھایکی لیڈروں کے اشتعال انگیز بیانات سے اشارہ پاکر جو اودھم بازی کی اور جس طرح بالغرض غیر لیا کی عزت کو خاک میں ملایا۔ وہ یوپی کی کمزور حکومت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا ہے۔ علی گڑھ کا اثر مراد آباد پہنچا۔ وہاں بھی فرقہ پرستوں نے مذہبی جذبات بھڑکا کر ووٹ لینے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب ہوگئے۔ برہانپور (مدھیہ پردیش) اور دیگر مقامات کے ہنگاموں کو بھی فرقہ پرستوں کی سازش قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ سب باتیں ایسی ہیں جس پر صرف ریاستی حکومتوں کو نہیں بلکہ مرکزی حکومت کو بھی سخت نوٹس لینا چاہئے۔

کانگریس نے اپنے مینی فیسٹو میں واضح طور پر کہا ہے کہ "اس کا مقصد محض حکومت کی باگ ڈور سنبھالے رہنا نہیں ہے بلکہ حکومت حاصل کرلے اسکا مقصد یہ ہے کہ عوام کی زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔" لیکن اگر فسادات ہوتے رہے اور ملک کے ایک بہت بڑے طبقے کو وقتاً فوقتاً تباہ و برباد کیا جاتا رہا تو کیا اسکی حالت بہتر ہوسکے گی۔ یہ اقلیتیں بھی بہرحال عوام ہی کا ایک حصہ ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ امن و امان کے مسئلے کو دوسرے تمام معاملات کے مقابلے میں اولیت دی جائے اور اسے صرف ریاستی حکومتوں پر نہ چھوڑا جائے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی آئینی الجھن پیدا ہو تو اسے کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔ خود کانگریس کے مینی فیسٹو میں کہا گیا ہے کہ جمہوریت کے بنیادی مقصد یہ ہے کہ آئینی عوام

[illegible]۔ آئین میں اقتصادی بہبودی کے لئے پہلے بھی تبدیلیاں کیجا چکی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ سماجی انصاف کے راستے میں جو رکاوٹیں آتی ہیں انھیں دور کرنے کے لئے ایسی مزید ترمیمیں کیجائیں۔"

اقتصادی بہبودی کے لئے تبدیلیاں بلاشبہ ضروری ہیں مگر انکا نفاذ اسی وقت ممکن ہے جب ملک میں امن و امان بھی ہو اور ہندوستانی سماج کا ہر حصہ جارحانہ بالادستی سے محفوظ رہے۔ فسطائی عناصر الیکشن میں ناکام ہوکر عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ انھیں اگر ڈھیل دیجائے گی تو وہ سیکولر جمہوریت کی بنیاد کو کمزور کرنے کے اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اندرا گورنمنٹ روز اول سے فسطائی عناصر کی حرکتوں کو دبانے کے حق میں تھی لیکن شاید اس لئے وہ کوئی مؤثر قدم نہ اٹھاسکی کہ وہ اپنے آپ کو کمزور سمجھتی تھی مگر حالیہ انتخابات کے بعد وہ اپنے آپ کو کمزور نہیں کہہ سکتی پوری قوم نے اس پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود کہتے ہیں اس لئے نئی حکومت عوامی فلاح و بہبود اور سماجی انصاف کے سلسلے میں جو بھی اقدامات کرے گی ان کا خیر مقدم کیا جائیگا لوک سبھا میں زبردست اکثریت حاصل کرنے کے بعد کانگریس گورنمنٹ کی ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ عوام متوقع ہیں کہ جس طرح انھوں نے اس حکومت پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے اسی طرح وہ بھی اپنی نعرے اور پالیسی سے عہدہ برآ ہوگی اور بلا کسی جھجک کے ان طاقتوں کا قلع قمع کرنے کے لئے میدان میں آئے گی جو خود کانگریس کے بقول :

"جمہوری اور سماج وادی مقاصد کی بنیادوں کو تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور مختلف طبقوں کے مذہبی جنون نسلی برتری اور توسیع پسندی کے جذبات کو بھڑکا رہی ہیں۔"

اگر نئی حکومت ایسا کرنے میں کامیاب ہوسکی اور اقلیتوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کرسکی جسکے لئے کانگریس اپنے منشور کے تحت پابند ہے تو ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ ملک جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

ہماری آنکھیں جنت کے اس نمونے کو دیکھنے کے لئے پہلے تابہ ہیں۔

—

وزیراعظم اسرائیل

مسز گولڈا مائر سے انٹرویو!

پچھلے شمارے میں نیوز ویک سکو ایک امریکی میگزین ہے] سینئر ایڈیٹر مسٹر آرنلڈ ڈی بورچ گریو کے ساتھ متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر انور سادات کا ایک انٹرویو شائع ہو چکا ہے جس سے عربوں کی پالیسی کی وضاحت ہوتی ہے۔ آج کی اشاعت میں وزیراعظم اسرائیل مسز گولڈا مائر کے ساتھ اسی ایڈیٹر کے انٹرویو کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے اور معلوم ہو سکے کہ اسرائیل کس طرح اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔

ڈی بورچ گریو مصر نے پہلی بار ایک امن سمجھوتے پر دستخط کرنے اور اسرائیل کو ایک آزاد ریاست تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ ماضی میں ہمیشہ آپ نے کہا ہے کہ مصر کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے سے انکار امن کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ کیا مسٹر سادات نے اس رکاوٹ کو دور کر دیا ہے۔؟

مسز مائر۔ ہم اس بات کو نظرانداز نہیں کر سکتے کہ ایک اہم تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ اگر اس بنیاد پر فریقین آگے بڑھنے کے لئے تیار ہوں تو اور بھی زیادہ اہم باتیں ظہور میں آئیں گی لیکن ایک رکاوٹ باقی رہ گئی ہے جو ہمیں امید ہے دور کر دی جائے گی۔ یہ رکاوٹ ہے مصر کی طرف سے بات چیت سے قبل پیشگی شرطیں۔ ہم کسی بھی امن کی بات چیت کے لئے کوئی شرط نہیں لگاتے اور اس طرح ہم پیشگی شرطیں منظور بھی نہیں کرتے۔

س۔ انور سادات کے بیان کو آپ نے حوصلہ افزا قرار دیا ہے اس کے علاوہ آپ کا اور کیا موافقانہ ردعمل ہے۔

جواب۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم تمام معاملات پر بامقصد بات چیت کرنے اور ان سرحدوں تک پیچھے ہٹنے کے لئے تیار ہیں جو محفوظ اور تسلیم شدہ ہیں۔

س۔ صدر سادات امن کے معاہدہ میں جن باتوں کے لئے تیار ہیں وہ انہیں پورا کرنے کا عہد کرتے ہیں اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی مقبوضہ علاقوں سے واپسی کا وعدہ کریں اگرچہ وہ آپ کے حق میں معمولی سرحدی ردوبدل کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر رہے ہیں۔ ان حالات میں کیا اب وقت نہیں آگیا ہے کہ آپ دنیا کو بتا دیں کہ محفوظ و تسلیم شدہ سرحدوں سے آپ کا منشا کیا ہے۔

ج۔ سادات سینائی اور غزہ کے علاقے کا مکمل انخلا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک تمام مقبوضہ علاقے خالی نہ کئے جائیں گے پائدار امن نہیں ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سرحدی ردوبدل منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

س۔ مشرق وسطیٰ میں ایسے حالات ہیں کہ ایک اور جنگ شروع ہو سکتی ہے جس میں امریکا اور روس ملوث ہو سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا دنیا کو یہ معلوم کرنے کا حق نہیں ہے کہ آپ کس جگہ اپنی نئی سرحدیں قائم کرنا چاہتی ہیں۔

ج۔ فرض کیجئے کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہم کہاں اپنی سرحدیں چاہتے ہیں تب بھی اس سے جنگ کیسے رک جائے گی تاوقتیکہ مصر ان نئی سرحدوں کے بارے میں ہم سے بات چیت کرنے کے لئے تیار نہ ہو

س۔ کیا عرب یہ جاننے کا حق نہیں رکھتے کہ ان کے کتنے علاقے پر آپ قبضہ رکھنا چاہتی ہیں۔

ج۔ بلاشبہ انہیں حق ہے لیکن براہ کرم اتنا سمجھ لیجئے کہ یہ علاقوں کو قبضے میں رکھنے کا سوال نہیں بلکہ محفوظ سرحدیں حاصل کرنے کا سوال ہے۔

س۔ اگر عرب ممالک ڈاکٹر یارنگ (اقوام متحدہ کے نمائندے) کے ذریعے آپ سے امن کا نقشہ طلب کریں تو کیا اس پر آپکو اعتراض ہے۔

ج۔ کیا آپ کو کسی ایسے مقدمے کا علم ہے جس میں امن و امان چاہنے والے فریقوں نے ایک دوسرے کو دیکھنے سے انکار کیا ہو۔

س۔ طلاق شدہ جوڑے کے بارے میں آپ کیا کہیں گی کیا وہ اپنے وکیلوں کے ذریعے بات نہیں کرتے۔

ج۔ طلاق کے بارے میں کون بات کر رہا ہے ہم تو شادی کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔

س۔ کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ جب سرحدوں کا معاملہ سامنے آئے گا تو اس پر آپ براہ راست بات چیت کریں گی؟

ج۔ میں کہنا چاہوں گی کہ یہی بہترین طریقہ ہے لیکن اگر اس معاملہ پر ڈاکٹر یارنگ کے ذریعے بات چیت کی جا [illegible] ہیں تو اس پر بھی ہمیں اعتراض نہیں۔ تاہم [illegible]

ملاقات [illegible]

واضح و مستقل مسائل پر ہم کس طرح بالواسطہ طور پر بات چیت کر سکیں گے۔

س۔ آپ کہتی ہیں کہ اسرائیل ۱۹۶۷ء کی سرحدوں پر واپس نہیں جائے گا۔ لیکن کیا ان سرحدوں کی بنیاد پر آپ بات چیت کے لئے تیار ہیں۔

ج۔ ہم چاہتے ہیں کہ دونوں فریق بیٹھیں اور ایسی سرحدوں کے بارے میں بات چیت کریں جو محفوظ و تسلیم شدہ ہوں۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان اسرائیل کی جو سرحدیں تھیں وہ تسلیم شدہ اور قطعی نہیں تھیں اگرچہ ہم اس پر مطمئن تھے۔ لیکن عربوں کی طرف سے اس پوری مدت میں کہا جاتا رہا کہ اسرائیل کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ لیکن اب وہ ان ہی سرحدوں پر زور دے رہے ہیں جن کے بارے میں پہلے کہتے تھے کہ یہ ہماری سرحدیں نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں مناسب ہے کہ ہم بیٹھیں اور اپنی سرحدوں کا کوئی نقشہ تیار کریں۔

س۔ جو آپ کہتی ہیں کہ آپ کی نئی سرحدیں ۱۹۶۷ء کی سرحدیں نہیں ہوں گی اور نہ ہی وہ موجودہ جنگ بندی لائن کی سرحدیں ہوں گی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سرحدیں کہیں درمیان میں ہوں گی۔

ج۔ صریحاً ایسا ہے۔

س۔ لیکن اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آپ اپنے ذہن میں بڑی تبدیلیاں لئے ہوئے ہیں۔

ج۔ جب وہ ہمارا نقشہ دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ یہ چھوٹی تبدیلیاں ہیں یا بڑی۔ ہم وہی کر سکتے تھے جو مصریوں نے کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اپنا نقشہ بناتے اور پیش کر دیتے کہ اسے قبول کرو یا مسترد کرو۔ بہت سے لوگ اسے الٹی میٹم کہتے ہیں۔ ہم نے اس قسم کا الٹی میٹم نہیں دیا۔ ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور گفتگو کا مطلب ہمیشہ "دو اور لو" ہوتا ہے۔ بعض جگہ سرحدی تبدیلی بالکل معمولی ہوگی اور دوسرے مقامات پر بڑی تبدیلیوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

س۔ مخصوص و متعین علاقوں کے بارے میں سوالات کا جواب نہ دے کر آپ یہ تصور پیدا کر رہی ہیں کہ آپ لوگ نئے نقشے کے بارے میں باہم متفق نہیں ہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے۔

ج۔ سرحدوں سے متعلق بات چیت شروع ہونے کے بعد ہی گفتگو کے اندر نئے نقشے کے بارے میں ہماری تجاویز پیش کی جائیں گی۔

[illegible]

س۔ کیا آپ اس امر کی وضاحت کر سکتی ہیں کہ محفوظ و قابل دفاع سرحدوں سے آپ کا کیا مطلب ہے۔

ج۔ یہ ایسی سرحدیں ہیں کہ اگر ہم پر دوبارہ حملہ ہو تو ہم حفاظت کر سکیں۔ یہ ایسی سرحدیں ہوں گی جو حملوں کو روک سکیں گی۔

س۔ سادات نے ہم سے کہا تھا کہ اگر آپ اپنی فوجوں کو سینائی میں العریش کے عقب تک لے جائیں تو وہ نہر سوئز کو کھول دیں گے جس میں تمام ممالک کو جن میں اسرائیل بھی شامل ہے جہاز رانی کی اجازت ہوگی اور وہ بحر طہران میں بھی جہاز رانی کی اجازت دیں گے۔ کیا سادات کی اس تجویز سے آپ دلچسپی رکھتی ہیں؟

ج۔ آزاد جہاز رانی سے یقیناً ہمیں دلچسپی ہے۔ لیکن ڈاکٹر یارنگ کو انہوں نے جو جواب دیا ہے اس میں انہوں نے ۱۸۸۸ء کے معاہدۂ قسطنطنیہ کی شرط لگائی ہے۔ علاوہ ازیں ماضی میں انہوں نے اس قسم کی آزادی کو ختم کر دیا تھا۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے عمل کی تردید معلوم ہوتی ہے جس پر واضح طور سے بات چیت ہونی چاہئے۔

س۔ نہر سوئز کے علاقے سے جزوی واپسی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ج۔ سادات نے جزوی واپسی کی تجویز اپنے اس بیان سے پہلے نشر کی تھی کہ ہمارے ساتھ وہ معاہدۂ امن کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اب ہم جزوی واپسی کی نہیں بلکہ امن کے معاہدے کی بات چیت کر رہے ہیں۔ خود مصر کی طرف سے بھی یہی بات کہی جا رہی ہے۔

س۔ موشے دایان (وزیر دفاع) نے حال ہی میں کہا تھا کہ شرم الشیخ کے بغیر کسی معاہدے کے مقابلے میں وہ اس بات کو ترجیح دیں گے کہ معاہدے کے بغیر شرم الشیخ کو اپنے پاس رکھیں۔ خود آپ کی لیبر پارٹی کے پلیٹ فارم سے گزشتہ انتخابات سے قبل یہ بات کہی گئی کہ شرم الشیخ میں اسرائیل کی موجودگی کا تعلق علاقائی تسلسل کے ذریعے ایلات کی بندرگاہ سے ہے کیا آپ کی حکومت آج بھی اسی موقف پر قائم ہے۔

ج۔ اسرائیلی حکومت نے کسی نقشے کی قطعی حدود تیار نہیں کی ہیں۔ جوں ہی سرحدوں کے بارے میں بات چیت شروع ہوگی یہ نقشہ تیار کر لیا جائے گا۔ ہم مصریوں کی کسی بھی تجویز پر غور کریں گے۔

س۔ کیا شرم الشیخ میں اسرائیلی فوجوں کے بجائے متبادل تجویز کے طور پر اسرائیل یہ بات تسلیم کر سکتا ہے کہ وہاں بین الاقوامی فوج تعینات رہے۔

ج۔ محفوظ و تسلیم شدہ سرحدوں کے مقابلے میں ہماری رائے میں کوئی بھی متبادل تجویز مناسب نہیں ہے۔ اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۵۷ء میں اس بات پر اتفاق ہو گیا تھا کہ جب تک حالات معمول پر آئیں شرم الشیخ میں بین الاقوامی فوج رہے گی لیکن ۱۹۶۷ء میں صورت حال قطعی طور پر معمول پر نہیں تھی جب کہ ناصر نے سیکیورٹی بحالی اور اقوام متحدہ کی فوج وہاں سے ہٹا دی۔

س۔ لیکن ایسی ضمانت سلامتی کونسل کی طرف سے نہیں دی گئی تھی جہاں چار بڑی طاقتوں کو ویٹو کا اختیار حاصل ہے۔

ج۔ امن کے معاہدے پر متفق ہونے اور سرحدوں کا تعین کرنے کے بعد ہم کسی بھی اضافی ضمانت پر بات چیت کرنے کے لئے تیار رہیں گے جو پیش کی جائے گی۔

س۔ قاہرہ کا کہنا ہے کہ آپ نے اسرائیل کو تسلیم کر لینے کے بدلے میں سینائی خالی کرنے کی ڈاکٹر یارنگ کی تجاویز مسترد کر دی ہیں۔

ج۔ ہم نے کوئی تجویز مسترد نہیں کی۔ ہم نے صرف الٹی میٹم کو مسترد کیا ہے۔ یعنی ان شرائط کو جو مفاہمت امن کے بدلے میں قاہرہ کی طرف سے لگائی گئیں۔ یہ بات چیت کا طریقہ نہیں ہے۔

س۔ کیا اردن کے مغربی کنارے پر آپ کی نظریں ہیں۔

ج۔ کسی چیز پر ہماری نظریں نہیں ہیں۔ یہ تاثر قطعی طور پر مضحکہ خیز ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی ایک سہانی صبح کو اسرائیل نے طے کیا کہ وہ زیادہ علاقے کا خواہشمند ہے اور اس لئے اس نے جنگ شروع کر دی۔

س۔ اگر مغربی کنارے پر آپ کی نظریں نہیں ہیں تو آپ ہیبرون میں یہودی خاندانوں کو کیوں بسا رہی ہیں۔

ج۔ میں اس ترکیب سے پوچھے گئے سوال کا جواب نہیں دوں گی۔

س۔ تب پھر کیوں آپ ہیبرون میں یہودی خاندانوں کو بسا رہی ہیں؟

ج۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہیبرون کس کے حیطۂ اختیار میں رہے گا ایک یہودی کیوں یہ محسوس کرے کہ دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے جو اس کے لئے ممنوع ہے۔ ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ ہیبرون اردن کو واپس مل جائے گا تو کیا وہاں یہودیوں

کو نہیں رہنے دیا جائے گا جس طرح کہ چار لاکھ عرب اسرائیل
میں آباد ہیں۔ ہیبرون کا یہودیوں کے ساتھ ایک تاریخی
تعلق ہے۔ ۱۹۲۹ء تک جب کہ ان پر حملے ہوئے اور وہ قتل
کئے گئے وہ وہاں صدیوں رہتے رہے تھے۔

س۔ مقبوضہ علاقوں میں آپ کی نئی بستیوں کے بارے میں
عرب سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کی توسیع پسندی کی علامت ہیں آپ
اس زمین پر کیوں اپنی بستیاں بسا رہی ہیں جو آپ کی ملکیت
نہیں ہے۔

ج۔ عرب بہت سی باتیں کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتے
ہیں کہ اسرائیل ہم کو ان سے چھین لیا گیا ہے۔ آپ کا اس
سے کیا مطلب ہے کہ ہم نے عربوں سے زمین چھینی ہے۔ اس
بات کو نہ بھولئے کہ اردن نے مشرقی یروشلم (بیت المقدس)
کو ۱۹۴۸ء میں طاقت کے ذریعہ قبضہ کیا تھا۔ جو یہودی
شہری وہاں رہ رہے تھے ان سب کو وہاں سے نکال دیا گیا
ہم اس اصول پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ اردنی علاقے میں
یہودی نہیں رہنے چاہئیں۔

س۔ کیا معاہدے کی صورت میں آپ نئی بستیوں کو مسمار کر دیں گی

ج۔ آپ یہ فرض کر رہے ہیں کہ کوئی یہودی سرحد کی دوسری
جانب نہیں رہ سکتا۔ میں اس طرح کے مفروضے کو تسلیم نہیں
کرتی اور میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اردن کے ساتھ
ہماری سرحدیں کہاں رہیں گی۔

س۔ اسرائیل کا اعلان یہ ہے کہ وہ گولان کی پہاڑیوں کو
خالی نہیں کرے گا۔ کیا اس اعلان کا اطلاق شامی شہر القنیطرہ
اور گولان میدان پر بھی ہوتا ہے۔ جن پر آپ کا قبضہ ہے۔

ج۔ میں آپ کے لئے نقشہ تیار نہیں کر سکتی جب ہم شام
سے بات چیت کریں گے تو سرحدوں کا مسئلہ بھی زیر بحث
آئے گا۔

س۔ آپ کہتی ہیں کہ آپ کو علاقے سے نہیں بلکہ سلامتی کے
ساتھ دلچسپی ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہر چیز طے ہو چکی ہے
آپ کن علاقوں کو مستقل طور پر غیر فوجی علاقوں میں منتقل
کرنا پسند کریں گی۔

ج۔ ہم غیر فوجی سرحدوں کو منظور کریں یا نہ کریں یہ ایسا
مسئلہ ہے جس پر گفتگو ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن مصر ہم سے
مطالبہ کرتا ہے کہ ہم سینائی اور غزہ کو خالی کر دیں اور اپنی پرانی
سرحدوں پر واپس چلے جائیں اس کے بعد وہ برابر برابر کے
فاصلے پر غیر فوجی علاقے قائم کرنے کے لئے تیار رہیں گے۔ اس
سے ہم کہاں پہونچ جائیں گے۔

س۔ وزیر خارجہ امریکا مسٹر راجرس نے جو پلان پیش کیا ہے
اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے!

ج۔ راجرس کے پلان میں پہلے سے سرحدی تبدیلیوں کا ذکر
ہے اور ہمارا موقف یہ ہے کہ سرحدوں کے معاملے پر بات چیت
ہونی چاہئے۔

س۔ آپ کسی عرب ملک کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے پر بھروسہ
نہیں کر رہی ہیں ایسی صورت میں امن کا سمجھوتہ ہونے تک عبوری
دور میں اگر سلامتی کونسل کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے چار
بڑی طاقتوں کی طرف سے ضمانت دیجائے تو آپ کے خیال میں
وہ مؤثر کیوں نہیں ہے۔

ج۔ ہم کسی سے کسی رعایت کے طالب نہیں ہیں۔ ہر ملک کی اپنی
سرحدیں ہوتی ہیں اور وہ انکی حفاظت کا ذمے دار ہوتا ہے
ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اوپر کوئی نگرانی رکھے اور ہمارے تحفظ
کا ذمے دار ہو۔ یہ بات ہم نے ڈاکٹر یارنگ سے بھی کہہ دی ہے
لیکن امن کے قطعی سمجھوتے پر بات چیت مکمل ہو جانے کے بعد
ہم اضافی تحفظات سے متعلق کسی بھی دوسری تجویز پر غور کریں گے۔

س۔ اگر جنگ میں توسیع نہ ہوئی (مصر نے جنگ بندی میں توسیع
سے انکار کر دیا ہے) اور مصریوں نے نہر سوئز کے پار گولہ باری
شروع کر دی تو کیا آپ محسوس کرتی ہیں کہ آپ کے پاس اتنی
طاقت موجود ہے کہ نہر سوئز کے علاقے میں مصریوں کے میزائلی
تنصیبات کو ناکارہ بنا دیں۔

ج۔ ہم اس بات سے مطمئن ہیں کہ صورت حال سے نمٹنے
کی ہم اتنی ہی صلاحیت رکھتے ہیں جتنی کہ پہلے رکھتے تھے لیکن
ہم جنگ نہیں چاہتے، اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہمیں یقین
ہے کہ مصری بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہوں گے کیونکہ جنگ سے
وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔

س۔ کیا آپ کی فوجی کارروائیاں نہر سوئز کے علاقے تک محدود
رہیں گی۔

ج۔ میں سرحدیں متعین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں اسی طرح
اپنے فوجی منصوبوں کو بھی ظاہر نہیں کر سکتی۔

س۔ سادات کہتے ہیں کہ ان کے خیال میں فلسطینی پناہ
گزینوں کے مسئلے کا مناسب حل یہ ہوگا کہ انہیں معاوضہ دیدیا جائے
غزہ اور مغربی کنارے کے علاقوں میں اس بات کے لئے ریفرنڈم
کرایا جائے کہ کیا وہاں کے لوگ کسی الگ ریاست کے خواہشمند
ہیں یا وہ اردن کے ساتھ وفاقی نظام میں منسلک ہونا چاہتے
ہیں یا اس کے ساتھ قطعی الحاق پسند کریں گے۔ اسرائیل کو
واپسی کا مطالبہ اب تک کیا گیا ہے۔ اس بارے میں آپ کو
کیا اعتراض ہے۔

ج۔ ہمارا کہنا ہے کہ تسلیم شدہ سرحدوں کے باہر جو لوگ
رہتے ہیں وہ کسی بھی طریقے سے اپنے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں
لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ بحیرہ روم اور عراقی سرحد کے درمیان تین ریاستوں
کی گنجائش ہے دوسری ریاست اگر اپنے آپ کو اردن یا فلسطین
یا اردن و فلسطین یا فلسطین و اردن پکارتی ہے تو اس سے
ہمارا کوئی مطلب نہیں ہے۔ لیکن اگر اس علاقے میں امن دائمی
قائم رکھنا ہے تو تیسری مملکت ممکن نہیں ہے۔ خاص طور پر
ایسی مملکت جس میں ایک اور جنگ کے جراثیم موجود ہوں

س۔ لیکن کیا آپ اس قسم کے ریفرنڈم کو مسترد کرتی ہیں
جسے سادات نے ایک مناسب حل قرار دیا تھا۔

ج۔ سادات کے ساتھ آپ کی ملاقات کے چند دن بعد صدر
یوگوسلاویہ نے قاہرہ کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کے بعد جو
اعلانیہ جاری کیا گیا تھا اس میں اس بات کی ضرورت پر زور
دیا گیا کہ فلسطینیوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق
ہے۔ یہی نہیں بلکہ مادر وطن میں حقوق کی بحالی کے لئے ان کی
جدوجہد کی بھی حمایت کی گئی۔

س۔ اس اعلانیہ کا اور جو کچھ کہ سادات نے مجھ سے کہا
ضروری نہیں ہے کہ اسکا ایک دوسرے پر انحصار ہو۔

ج۔ اگر فلسطینی عوام کی طرف سے بولتے ہیں جیسے عرفات
حبش اور دیگر لوگ ان سب کے خیال میں اسرائیل اور مادر وطن
ایک ہی ہیں اور ان کا ایک ہی علاقے سے مطلب ہے۔

س۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ عمان کی حکومت کسی ایسے سمجھوتے
پر دستخط کر دے گی جس کے تحت اسرائیل کے حق میں بیت المقدس
سے دستبرداری دی گئی ہو۔

ج۔ میں عمان کے بارے میں نہیں کہہ سکتی۔ میں صرف ایک
بات جانتی ہوں وہ یہ کہ مشرقی یروشلم (بیت المقدس) اردن
کی حکمرانی میں وہاں کے باشندوں کی مرضی سے نہیں آیا تھا بلکہ
اس طرح آیا تھا کہ ہر اس یہودی کو جو زندہ بچ گیا تھا وہاں
سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو نسلوں سے وہاں
آباد تھے۔

قضیہ فلسطین کے متعلق
جمہوریہ لیبیا کے وزیر اعظم
کرنل
معمر القذافی
سے ایک اہم انٹرویو

ترجمہ و تلخیص: شعیب نگرامی (مقیم بن غازی)

کرنل معمر القذافی (بائیں طرف) شاہ سعود اور مرحوم صدر ناصر کے ساتھ

لیبیا کے انقلاب کے جواں سال لیڈر اور وزیر اعظم کرنل معمر القذافی نے تونس کا سرکاری دورہ ختم کرنے کے بعد تونس کی افریقن نیوز ایجنسی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مسئلہ فلسطین کا واحد حل عربوں کی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کر کے غاصب دشمن کے خلاف برسر پیکار ہونا ہے۔

نوجوان سربراہ حکومت نے عرب اسرائیل تنازعہ کو قومی جنگ میں تبدیل کرنے کے متعلق اپنے ملک کے منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے کہا اس منصوبے کو تیار کرنے کے سلسلے میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

۱۔ اسرائیل نہ تو صرف فلسطین پر اکتفا کرے گا اور نہ اس کی وسعت پسندانہ پالیسی کے لئے مقبوضہ عرب علاقے کافی ہیں۔ اسرائیل درحقیقت ایک وسعت پسندانہ منصوبے پر عمل کر رہا ہے جس کا مقصد آہستہ آہستہ پورے عرب ممالک کو ہڑپ کر جانا ہے۔

۲۔ اقوام متحدہ کے بارہ ممالک جنہیں چھوٹے اور بڑے ممالک کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ سب کے سب بائیس سال گزر جانے کے باوجود مسئلہ فلسطین کو حل نہ کر سکے اور اس پورے عرصے میں براہ راست نقصان اٹھانے والے عرب اور صرف عرب رہے۔

۳۔ اسرائیل فوجی نقطہ نظر سے کوئی ایسا معجزہ نہیں جس کو قابو میں کرنا بس کے باہر ہو۔

۴۔ اسرائیل اور اس کے حلیفوں کو عربوں کی متحدہ طاقت کا بخوبی اندازہ ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے

داقعات ننی دہلی

کہ عربوں کی یہ طاقت بکھری ہوئی ہے اور عربوں کو خود اپنی اس طاقت کا اندازہ نہیں جس کے تصور سے دشمن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۵۔ مسئلہ فلسطین کا واحد حل دشمن کے خلاف قومی پیمانے پر اعلان جنگ ہے اور اس کے لئے عربوں کی بکھری ہوئی طاقت کو یکجا کرنا بہت ضروری ہے۔ نیز یہ کہ دشمن کے خلاف یہ جنگ دفاعی نہیں بلکہ صولی ہونی چاہئے۔ کیونکہ دشمن عرب سرزمین پر قابض ہے دفاعی جنگ تو اس صورت میں لڑی جاتی ہے جس وقت دشمن وطن کی سرحدوں کے باہر ہوتا ہے۔

۶۔ عرب اس وقت فوری طور پر ایک ہزار جنگی جہاز پانچ ہزار ٹینک اور دس لاکھ فوجی بآسانی مہیا کر سکتے ہیں اور یہ طاقت جو مستقبل میں بڑھائی بھی جا سکتی ہے دشمن کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہی ہے کہ یہ جنگ قومی پیمانے پر لڑی جائے ورنہ بکھری ہوئی طاقت صفر کے برابر ہوگی۔

نوجوان لیبیائی وزیر اعظم نے فرانس سے "میراج" ساخت کے لڑاکا طیاروں کے خریدے جانے اور ان طیاروں کو مستقبل میں مشرق وسطیٰ کی کسی جنگ میں استعمال کئے جانے سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ فرانس سے لڑاکا طیاروں کے خریدنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہم اپنی تمام قومی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو گئے جن اسلحوں کو ہم پیسے دے کر خریدیں گے ان کے استعمال میں ہم بالکل آزاد ہیں اور دنیا میں صرف میراج طیارے ہی نہیں ہیں اگر ضرورت پڑی تو خدا نے ہمیں اتنی قدرت دی ہے کہ ہم دوسرے ملکوں سے مزید سستے نرخوں پر جنگی ضرورت کا سامان خرید سکیں۔

وزیر اعظم کرنل معمر القذافی نے مشرقی عرب ممالک اور مغربی عرب ممالک، تیونس، الجزائر، مراقش کے درمیان لیبیا کے محل وقوع اور اس کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم مشرق و مغرب کے عرب ممالک کے درمیان نقطہ نظر ہیں اور ہم تمام عرب ممالک کے سامنے تعاون اور محبت کا ہاتھ اس امید پر بڑھاتے ہیں کہ عربوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم ہو سکے۔

لیبیائی سربراہ کرنل معمر القذافی نے اپنے انٹرویو کے آخر میں تیونس کے عوام کی مسئلہ فلسطین اور عرب اتحاد سے دلچسپی کو سراہتے ہوئے کہا کہ تیونس پر مجھ کو فخر ہے کیونکہ اس نے ماضی میں فرانسیسی سامراج کے چنگل میں پھنسنے کے باوجود اپنے عربی اور اسلامی کردار پر دھبہ نہیں آنے دیا اور تیونسی عوام نے سامراج کے ظلم و ستم کے باوجود دین حنیف اسلام کو حرز جان بنائے رکھا اور اس کے احکام پر عمل پیرا رہے اور اب بھی ہیں۔

شعیب نگرامی

پاکستانی خواتین

شفیق احمد صدیقی

"پاکستانی خواتین نے اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر لانے کے لئے بہت محسوس قدم اٹھائے ہیں" یہ الفاظ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علیخاں کی اہلیہ بیگم لیاقت علیخان نے جو پچھلے دنوں نجی دورے پر ہندوستان آئی تھیں ایک انگریزی اخبار کی خاتون جرنلسٹ سے کہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا۔

"اس وقت بھی ہماری خواتین ہندوستانی خاتونوں سے پیچھے ہیں۔ اب سے پچاس سال پہلے گاندھی جی نے عورتوں کو برابر کے حقوق دلانے کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن پاکستانی خواتین میں اپنے حقوق و فرائض حاصل کرنے کا جذبہ تقسیم کے بعد ہی ابھرا اور پھر ابھرتا ہی گیا۔"

بیگم رعنا لیاقت علیخاں پاکستان کی ممتاز خواتین میں سے ایک ہیں جن کی شخصیت صرف پاکستان کی سرحدوں تک ہی محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی آپ کا نام جانا پہچانا ہے۔ ہم بیگم خان کی سیاسی زندگی کو پنڈت جواہر لال نہرو کی ہمشیرہ مسز وجے لکشمی پنڈت کی زندگی سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مسز پنڈت کو ہندوستان کی پہلی خاتون سفیر بننے کا شرف حاصل ہے۔ مسز پنڈت کو چار بڑے ملکوں ۔ انگلینڈ، امریکا روس اور فرانس میں ہندوستان کے سفیر کا عہدہ کامیابی سے سنبھال چکی ہیں اور اقوام متحدہ کی صدر بھی رہ چکی ہیں۔

اسی طرح بیگم خان کو بھی پاکستان کی پہلی خاتون سفیر بننے کا شرف حاصل ہے۔ وہ بارہ سال تک غیر ممالک میں اپنے ملک کی سفارتی نمائندگی کر چکی ہیں۔ انھوں نے کچھ دنوں تک اقوام متحدہ میں بھی اپنے ملک کی نمائندگی کی ہے۔ بیگم خان کے علاوہ پاکستان کی دو اور خاتونوں کو غیر ممالک میں اپنے ملک کی سفارتی نمائندگی کرنے کا شرف حاصل ہے ان میں سے ایک شائستہ چودھری ہیں جو برازیل میں اور دوسری شہزادی سلطانہ ہیں جو ماریشش میں پاکستان کی سفیر رہ چکی ہیں۔

اب سے ٹھیک ۲۲ سال پہلے بیگم خان نے پاکستانی خواتین کے وقار کو بلند کرنے کے لیے ایک سماجی انقلاب لانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں بیگم خان نے ایک جماعت "پاکستان وی مینس نیشنل گارڈ" بنانے کا اعلان کیا تھا۔ موصوفہ کے ایک اشارے پر پاکستانی عورتوں میں مردوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا جوش و ولولہ اُبل پڑا اور اب پاکستان کے ہر شعبے میں عورتیں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہسپتالوں میں نرسیں اسکولوں میں استانیوں کے علاوہ عورتیں پولیس۔ وکالت اور ایگزیکیوشو میں بھی اونچے عہدوں پر معمور ہیں اور بڑی جرأت اور خوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

"وی مینس نیشنل گارڈ" کے علاوہ خواتین کی اور بہت سی جماعتیں وجود میں آ چکی ہیں اور رفتہ رفتہ وجود میں آ رہی ہیں جنکا مقصد مستورات کو ہر طرح کی تربیت دینا اور اُن میں ترقی کا جذبہ پیدا کرنا بے سہارا اور بیواؤں کی مالی امداد کرنا اور انھیں دستکاری سکھانا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں بیگم خان کی سرپرستی میں ایک اور جماعت "آل پاکستان وی مینس ایسوسی ایشن"

بیگم لیاقت علیخان ـ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کی پاکستان ویومنز ایسوسی ایشن کی صدر رہ چکی ہیں۔ نیدرلینڈ اور اٹلی میں پاکستان کی سفیر بھی رہیں۔

وجود میں آئی۔ یہ جماعت اب تک قائم ہے اور پاکستانی خواتین کی ترقی اور بہبودی کے لئے ایک اہم رول ادا کر رہی ہے بہت سے ادارے اسکول ہسپتال بیگم خان نے اس جماعت کی سرپرستی میں چل رہے ہیں۔ یہ جماعت وقتاً فوقتاً بہت چیرٹی شو اور تفریحی ڈراموں کی مدد سے کثیر رقم جمع کر لیتی ہے جو جماعت کی سرپرستی میں چلنے والے اداروں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ جماعت کی ممبر بھی جماعت کو مقررہ چندہ دیتی ہے۔ جماعت کی اقتصادی حالت بہت اچھی ہے۔

پاکستانی عورتیں کسی طرح بھی مردوں سے پیچھے نہیں اب ان میں اپنے حقوق حاصل کرنے کا شعور پوری طرح بیدار ہو گیا ہے۔ تعلیم یافتہ خاتونوں نے ملک کی سیاست میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس وقت بھی سیاست کے میدان میں ان کے قدم بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ پاکستان کی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں بھی وہ اپنے علاقے کے عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کے انتخاب میں ۱۲ خواتین قومی اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئی ہیں۔

پاکستانی خواتین نے پرانے اور دقیانوسی رسم کا خاتمہ کر کے نئے اور ترقی یافتہ دستوروں کو اختیار کیا

(اقتصادات فنی دھلی)

پاکستانی عورتیں فیشن کے معاملہ میں بھی کسی سے کم نہیں۔

پی۔ آئی۔ اے کی ایئر ہوسٹس

ہوسٹس کا یہ لباس پاکستانی اور ہندوستانی خواتین میں کافی مقبول ہوا

نے والی نسلوں کے لئے ایک مفید ٹانک سے بھی زیادہ فائدہ مند ثابت ہوں گے۔ اس وقت بھی جب کوئی کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا یا کوئی قانون انھیں ناپسند ہوتا ہے کراچی، اسلام آباد، لاہور اور ڈھاکہ جیسے بڑے شہروں میں خواتین کے جلوس اور مظاہرے عام ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں جب فیملی لاز بل زیر غور تھا انھوں نے قومی اسمبلی کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ حکومت بل کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ پاکستانی خواتین کی متحدہ آواز کے سامنے حکومت کو جھکنا پڑا اور ان کے مطالبے کے مطابق حکومتِ پاکستان کو بل منظور کرنا پڑا۔ اسی دن سے وہ بل قانون بن گیا تھا۔ اس بل کے تحت خواتین کو ناپسندیدہ شوہروں سے طلاق لینے کا حق جائز قرار دیا گیا ہے۔

بیگم خان نے بتایا کہ تقسیم کے بعد ۹۰ فیصدی پاکستانی خواتین بے پڑھی لکھی تھیں اور پانچ فیصدی تعلیم یافتہ تھیں صرف دو فیصدی تعلیم یافتہ کہلائے جانے کی مستحق تھیں۔ ان کوششوں اور جدوجہد کے بعد پاکستانی خواتین کی توجہ تعلیم کی طرف دلائی گئی۔ اب بھی ۸۰ فیصدی خواتین ایسی ہیں جنہیں پڑھانے اور لکھانے سکھانے کی ضرورت ہے۔ گاؤں میں رہنے

وانقات نقش و علی

والی عورتوں میں تعلیم عام کرنے کے لئے حکومت پاکستان بہت ٹھوس قدم اٹھا رہی ہے اس لئے لڑکیوں کے لئے جونیئر اور ہائر سکنڈری تک تعلیم مفت کر دی گئی ہے۔ پاکستانی سربراہوں کا خیال ہے کہ ان کے ملک کی آئندہ نسل سو فیصدی تعلیم یافتہ ہوگی۔

بیگم خان نے بتایا کہ آل پاکستان ویمنس ایسوسی ایشن شادی شدہ ان پڑھ عورتوں کی توجہ تعلیم کی طرف دلاتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بہت سی بال بچے دار عورتیں چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ مدرسے میں پڑھتی لکھتی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک سروے کے مطابق پاکستان میں طلباء کی آدھی سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۶۵ فیصدی گریجویٹ عورتیں ہیں۔ پاکستانی تعلیم یافتہ خواتین میں زیادہ تر نرسیں اور استانیاں بننا چاہتی ہیں۔ اسپتالوں اور اسکولوں کے علاوہ بھی دوسرے اداروں، مجلسوں اور دفتروں میں وہ اپنے پیر مضبوطی سے جماتی جا رہی ہیں۔

اس وقت پاکستان میں تقریباً ستر ہزار مستورات سرکاری اور غیر سرکاری اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جن میں زیادہ تر مجسٹریٹ، وکیل، انجینئر، منصف اور بینک ایگزیکیٹیو ہیں۔ محکمۂ پولیس میں بھی تین گزیٹڈ عہدوں پر سرفراز ہیں۔ ۳۴ سالہ کنیز فاطمہ کراچی شپ ایسوسی ایشن کی صدر ہیں۔ انیسہ غلام علی "آل پاکستان لیڈی ٹیچرس یونین" کی صدر ہیں۔ نوکری کرنے والی خواتین میں ۴۰ فیصدی غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شادی ان کی ترقی میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے جس سے وہ منزلِ مقصود تک کامیابی سے نہیں پہونچ پاتیں یہی وجہ ہے کہ نوکری کرنے والی خاتونیں کسی خاص کیریر میں ایک اہم مقام بنا لینے کے بعد شادی کرتی ہیں۔

پاکستان میں شادیاں بزرگوں کے ذریعے طے ہوتی ہیں، جو بیگم خان کی نظر میں ایک قابلِ احترام طریقہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ محبت کی شادیاں زیادہ عرصے تک کامیاب نہیں رہتیں۔ اور ان کے نتائج نہایت تباہ کن ہوتے ہیں۔ پاکستان میں تعلیم یافتہ خواتین کے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہے لیکن پھر بھی کچھ تنگ نظر نوجوان زیادہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو نظر میں نہیں لاتے۔ ان کا خیال ہے کہ زیادہ تعلیم یافتہ لڑکیاں ان کی بیویاں بن کر ان کے اشاروں پر نہیں چل سکتیں۔

پاکستانی خواتین میں جدید فیشن کی وبا بہت تیزی سے

ہندوپاک کی مشہور ادیبہ
ہاجرہ مسرور

زبیدہ آغا کا شمار پاکستان کے چوٹی کے مصوروں میں ہوتا ہے۔ آپ ماڈرن آرٹ میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔

پھیل رہی ہے۔ سڑکوں پر لڑکیاں نئے نئے فیشن کے لباس میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ فیشن میں یورپ کو بھی پیچھے چھوڑ گئی ہوں۔ بہت سی تعلیم یافتہ اور فیشن پرست عورتوں نے فیشن اسکول کھول رکھے ہیں جہاں لڑکیوں کو موجودہ فیشن کی تربیت دی جاتی ہے۔

پاکستان میں برقعے کا عام دستور نہیں رہا۔ صرف پرانے خیالات کی عورتیں ہی برقعہ پہنتی ہیں، نئی روشنی کی لڑکیاں برقعہ پہننا جہالت سمجھتی ہیں۔ شلوار اور چوڑی دار پاجامے کو انہوں نے نئی شکل دیدی ہے۔ وہاں دوپٹہ اوڑھنے کا دستور بھی دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔

امریکہ اور امریکی کانگریس

یہودیوں کے اشاروں پر ناچتی ہے

(محمد ولی رحمانی)

اقلیت کا اکثریت پر اثر انداز ہونا۔ بظاہر تو ناممکن معلوم ہوتا ہے مگر امریکا جیسے مضبوط ملک میں یہ ناممکن چیز ممکن ہے اور وہاں کے یہود امریکی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو اتنا منظم کر لیا ہے کہ وہائٹ ہاؤس ان کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ امریکی انتظامیہ انکے مفاد کے خلاف حرکت میں آسکتی ہے — امریکا کے یہود تجارت، صنعت اور علم و سائنس پر چھائے ہوئے ہیں — دولت حاصل کرنا انکا پرانا پیشہ ہے اور امریکا سے نکلنے والے اخبارات میں سے ستر فیصدی کی پالیسی انھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی سیاست پر انھیں، قابو حاصل ہے۔

لیکن امریکا میں یہودیوں کو یہ مقام بڑی محنت کے بعد حاصل ہوا۔ آج کے حالات نصف صدی سے زیادہ کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ دنیا کے سب سے اہم ملک میں موثر پوزیشن حاصل کرنے کی یہودی تاریخ ۱۸۹۰ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۸۹۰ء تک امریکا کے یہودیوں کی تاریخ بعد کی تاریخ سے مختلف ہے۔

۱۸۹۰ء سے پہلے بھی امریکا میں یہودی آباد تھے مگر انھیں وہاں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ تجارت میں حصہ لیتے تھے مگر سیاسی پوزیشن صفر کے برابر تھی۔ ان کی ساری تنظیمی صلاحیت دینی کاموں کو چلانے پر صرف ہوا کرتی تھی۔ اس وقت امریکا میں یہودیوں کی تین دینی جماعتیں تھیں۔ انجمن محافظین متجددین اور ارفوزوکس۔ یہ تینوں اپنے خیالات کے مطابق یہودی مذہب کی حفاظت و اشاعت کا کام کر رہی تھیں۔

متجددین کے گروپ کو دینی حلقے میں اہمیت حاصل تھی اور مرکزیت بھی۔ وہ نئے حالات میں یہودی مذہب کو مقبول بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ماضی کے ساتھ اس کا رویہ شر سلانہ یا گریز کا نہیں تھا۔ یہ گروپ چاہتا تھا کہ ماضی کے قابل فخر سرمایہ اور قدیم دینی کاغذ کی پوری حفاظت کے ساتھ نئے ماحول میں یہودیت کو ترقی دی جائے اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ لوگ اسے قبول کر سکیں — لیکن یہ تینوں جماعتیں دینی خدمت کے نام پر امریکی سماج میں ضم ہوتی جا رہی تھیں اور سیاست سے بالکل الگ ہونے کے نتیجے میں یہودیوں کی قومی حیثیت مٹتی جا رہی تھی۔

۱۸۹۰ء میں امریکا کے یہود کو باہر سے تازہ غذا ملی۔ یہ غذا ان افراد کی شکل میں تھی جو بڑی تیزی کے ساتھ مشرقی یورپ سے [illegible] حالات تنگ [illegible]

سے امریکا آرہے تھے اور تیس سال کے عرصے میں جن کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی۔ یہ آنے والے علم وفن کی دولت سے لیس اور تجارت و سیاست کی تکنیک سے پورے طور پر واقف تھے۔ ان کی نفسیات وہی تھی جو عام طور پر ایک تارک وطن کی ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں مظلومیت کا احساس تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوت کی کمی نے انہیں دردر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا۔ ان میں جدوجہد کا بھرپور جذبہ اور زندگی کی دوڑ میں آگے نکل جانے کی تڑپ تھی اور اپنے قومی وجود اور قومی تشخص کے لئے بے پناہ تعصب۔

ان لوگوں نے امریکا پہونچ کر سب سے پہلے تجارت پر قبضہ کیا اور مذکورہ تینوں تنظیموں کو قوت پہونچانے کے ساتھ انھوں نے دولت اور علم کے ذریعے امریکی سیاست پر قابو پانے کی کوشش شروع کردی۔ قومی وجود کو منوانے کے لئے مختلف قسم کی انجمنیں اور تنظیمیں بنیں۔ ۱۸۹۸ء میں امریکی صیہونی تنظیم کی بنیاد ڈالی گئی اور اس کے ذریعے دنیا بھر کے یہودیوں اور خصوصاً صیہونی تنظیموں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ بعد کی تاریخ نے امریکا کے یہودیوں کی انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہونے والی اس تنظیم کی اہمیت کو مان لیا جس نے تمام امریکی یہودیوں میں سیاسی بیداری اجتماعی کوشش اور قومی جدوجہد کی روح پھونک دی تھی

اس تنظیم کے سہارے امریکا کے یہودیوں نے جمہوریت کے نام پر نعرہ لگایا کہ امریکا کی حیثیت ایک گلدستے کی ہے جس میں مختلف قومیں آباد ہیں اور ہر قوم اپنی تہذیب، تمدن، دینی حیثیت اور قومی وجود کو برقرار رکھتے ہوئے امریکی ترقی میں حصہ لے رہی ہے ــــــ خوش قسمتی سے امریکا اور یورپ کے بعض اہم مفکرین نے یہودیوں کے اس انداز فکر کی پوری تائید کی اور انہیں کامیاب شہری بنے اور شہریوں کے حقوق دلوانے میں پورا سہارا دیا جس کے نتیجے میں امریکی سیاست نے امریکی یہودیوں پر اپنا دروازہ کھول دیا۔

۱۹۰۶ء میں امریکن یہودی کونسل کی تشکیل ہوئی یہ امریکا میں یہودیوں کی سب سے بڑی انجمن تھی جسے بےحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ کونسل نے یہود کے مفاد کے لئے کئی اہم کام کئے۔ اس کی نگرانی میں "یہود پروپیگنڈہ ڈپارٹمنٹ" قائم ہوا جس کے ذریعے یہودیوں کی مظلومیت کا احساس اور وابستہ مفادات تحفظ ملا

ان کے حقوق کی بحالی کی حمایت کا جذبہ پیدا ہوا اور مظلومیت کے سہارے وہ مضبوط قوم کی شکل میں ابھرنے لگے۔ امریکا کے یہودیوں کی قوت اس وقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ یہود کے آزاد اور خود مختار وطن کا نقشہ تیار کرنے لگے۔ انھوں نے امریکا اور برطانیا کی حکومت کو نہ صرف اس تخیل سے آگاہ کیا بلکہ اس مقصد کے لئے انکی ہمدردی بھی حاصل کی۔ برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بالفور کے مشہور "اعلان" (۱۹۱۷ء) میں امریکا کے یہودیوں کو بڑا دخل تھا جس اعلان میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ "فلسطین کو یہودیوں کا آزاد قومی وطن بنایا جائے گا"

یہودی مردوں کی تحریکوں نے عورتوں کو بھی متاثر کیا ۱۹۲۲ء میں یہودی عورتیں بھی میدان عمل میں آگئیں اور صیہونی عورتوں کی تنظیم "حداسہ" بنی جس نے عورتوں میں تعلیم اور قومی کاموں میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لینے کا جذبہ پیدا کر دیا۔

کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸۹۰ء کے بعد یہودیوں کی غیر معمولی ذہنی بیداری کا عہد ہے جسکا واضح ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۹۰ء سے لیکر ۱۹۲۵ء تک بہت ساری تنظیمیں اور انجمنیں بنیں۔ متعدد تحریکیں چلائی گئیں لیکن ان انجمنوں اور تحریکوں کے افراد ذہنی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے کبھی نہیں الجھے۔ ہر انجمن اپنا کام کرتی رہی اور دوسری انجمن کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع بھی دیتی رہی۔ جس کے نتیجے میں آج بھی پرانی اور نئی تمام انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ ان میں تصادم نہیں ہمدردی اور مفاہمت کا جذبہ ہے مختلف طرح کی ان تنظیموں کے افراد یہ سمجھتے ہیں کہ قومی حیثیت سے بلندی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب یہ انجمنیں اور تنظیمیں اپنے اپنے دائرۂ کار میں سرگرم عمل رہیں۔

یہودیوں نے محسوس کیا کہ جب تک امریکی عوام کی ہمدردی حاصل نہ کیجائے اور امریکا کی حکومت پر گہرا اثر نہیں ہو صرف دولت کے ذریعے عالمی سطح پر یہودیوں کے مفادات کا تحفظ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے انھوں نے پروپیگنڈے کے ذرائع پر قابو پانا شروع کیا۔ ۱۹۲۹ء میں بڑے پیمانے پر "یہود خبر رساں ایجنسی" بنائی پھر نہایت تیزی اور بڑی چابکدستی کے ساتھ صحافت پر چھانے لگے۔ ریڈیو اسٹیشن قائم کئے معیاری اخبارات نکالے اور اہم اخبارات کو خرید لیا۔ امریکا سے آج کل جتنے بھی اخبارات نکلتے ہیں وہ یا تو یہودیوں

کی ملکیت ہیں یا ان کی پالیسی پر یہود اثر انداز ہیں جس کی بڑی وجہ یہودی فرموں کے اشتہارات ہیں۔ اخبارات کی اصل آمدنی اشتہارات سے ہوا کرتی ہے۔ کسی بھی اخبار کا اشتہار کے بغیر چلنا مشکل ہے۔ تجارت پر قابض ہونے کی وجہ سے عام طور پر اشتہارات یہود کے قبضے میں ہیں۔ اگر کوئی اخبار یہودیوں کے مفاد کے خلاف کچھ لکھنے کی ہمت کرتا ہے تو یہودی فرمیں اشتہار دینا بند کردیتی ہیں۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اور اخبارات پروپیگنڈہ کے ان اہم ذرائع یہود کے قبضے سے بیک وقت انہیں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بڑی آسانی سے اپنی بات پوری دنیا میں پھیلا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے ذریعے امریکا کی سیاست پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ امریکا کا کوئی بھی ذمّے دار اپنی بات عوام تک پہونچانے کے لئے ان ذرائع کا ہی سہارا لیتا ہے خصوصاً الیکشن کے موقعے پر انکی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے امریکا کا ہر ذمّے دار اپنی ضرورت کے تحت یہود سے معاملہ کرنے پر مجبور سا ہے اور تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ ہر نمائندے کو اپنے حق میں جھکانے کی قوت رکھتے ہیں۔

نصف صدی سے زیادہ کی جدوجہد کے نتیجے میں امریکا کے یہود کے پاس دولت، پروپیگنڈے کی صلاحیت اور مختلف طرح کی سیاسی ثقافتی انجمنیں اور علم و سائنس کی قوت ایسا ہتھیار ہے جس کی وجہ سے وہ امریکی سیاست پر گہرا اثر رکھتے ہیں اور امریکا کے راستے سے دنیا بھر کے ممالک کی پالیسی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور ساری دنیا کے یہودیوں کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔

امریکا میں بسنے والے یہود تعداد کے اعتبار سے نہایت کمزور اقلیت ہونے کے باوجود اکثریت سے کسی طرح بھی کمزور نہیں۔

چاندی کا تخت

واجدہ تبسم

"لکھو بیٹی"۔

"پتہ نہیں ان بوڑھی آنکھوں کو کب تیرا سہرا اور چاند ایسی دلہن دیکھنا نصیب ہو... یہاں تو ہر دن موت سے قریب تر ہو رہی ہوں۔ تو ایک بار چند روز کے لئے ہی سہی آجا......

اماں بولتی رہیں —— ان کے گلے میں رہ رہ کر پھندے سے پڑتے رہے۔ آنسو پی پی کر، بہا بہا کر جب وہ خط مکمل کروا چکیں تو آس بھرے لہجے میں بولیں۔

"بیٹی اس کا جواب کب تک آجائیگا۔؟"

"جواب ——؟" میں نے حلق میں پھڑ پھڑاتے دل کو بڑی مشکل سے قابو میں کر کے کہا —— "یہی کوئی بارہ پندرہ دن میں اماں ——"

"اماں ——" میں نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا۔ "یہ سلسلہ کھیل اب مجھ سے نہیں کھیلا جاتا —— تم جو ہر پندرہ دن کو ایک خط پاتی ہو وہ میری طرف سے ہوتا ہے اور جو جواب تم لکھواتی ہو وہ تمہارے بیٹے تک نہیں پہنچ سکتا —— کیونکہ اماں آج تک مرنے والوں تک کوئی ہرکارہ ایسا پیدا نہیں ہوا جو خط پہنچا سکے۔ میرا صبر مت توڑو اماں —— تمہارا بیٹا، تمہارا شہزادہ وہ تمہاری زندگی کا اکلوتا اور آخری سہارا جنگ میں کام آچکا ہے۔ اسے خط لکھواتی رہو گی۔ اس کی دلہن کے لئے جوڑے سی سی کر رکھتی رہو گی لیکن وہ اس جگہ جا چکا ہے اماں جہاں تمہارے آنسو اور آہیں بھی نہیں پہنچ سکتیں۔

لیکن —— لیکن میں نے اماں کے کمزور ناتواں اور دکھوں سے بوجھل جھکے ہوئے وجود کو دیکھا اور اپنے پہلو میں ٹوٹتے دل کو مسوس کر بڑے ذرا بشاشت سے کہا۔

"اماں خطوں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ تم اتنی بے کل کیوں ہو جاتی ہو۔ اس کا دنیا میں سوائے تمہارے کوئی ہے؟ پھر وہ تمہیں یاد نہ کرے گا تو اور کسے کریگا۔؟"

"ارے نہیں بیٹا ——" وہ جھلاتے ہوئے مگر پیار سے لبریز لہجے میں بولیں —— "ان آجکل کے چھوکروں کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ چار یار دوستوں میں مل بیٹھے اور یہ بھی بھول گئے کہ کوئی ماں بھی ہے....؟"

"ارے نہیں اماں تم غلط سوچتی ہو۔ یوسف ایسا نہیں ہو سکتا ——"

اب بیٹا تو اسکی طرفسے نہیں بولے گی تو کون بولے گا۔ ویسے تو ہمیشہ اس سے خود جھگڑتی رہی لیکن جہاں میں نے کچھ کہا مجھے اور بڑا آکر اس پر پیار آیا —— ہاں بیٹا یہ بھی یاد سے لکھ دینا کہ منہ دکھائی میں تو اپنی دلہن کو انگوٹھی پہنائے گا یا کلائی پر گھڑی باندھے گا؟ مجھے تو ایک چیز جو سُوجھ رہی ہے —— وکت پہ ایک دم سے سوجھا بھی نہیں —— یاد سے پوچھ لینا بیٹی....

"ہاں اماں ——" میں نے سر جھکا لیا ——
اور کچھ کہنا ہے ——؟

"نا بیٹا —— اب کیا لکھنا ہے؟ اور جو پوچھے تو اتنا لکھوانا ہے کہ آسمان جتنا بڑا کاغذ بھی کافی نہ ہو۔ یہ ماں کا دل ہے نا بیٹا —— اس کے پیار اور ممتا کا کوئی اور چھور نہیں ہے"

میں اٹھنے لگی تو اچانک انہیں جیسے پھر کچھ یاد آگیا —— "بیٹا یہ بھی پوچھ لینا کہ آج کل تو نیا زمانہ ہے۔ نئے نئے فیشن نکلے ہیں، ہمارے زمانے میں تو سہاگ کا سرخ جوڑا چڑھتا تھا۔ اب تو گلابی، نارنجی اور سفید تک چڑھنے لگے ہیں۔ اپنی پسند کا رنگ بتلا دے"

وہ ان دیکھی دلہن —— وہ پھولوں بھری سہاگن جو وقت سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی۔ اماں اسے کون سا رنگ سجے گا ——؟ نہ دولہا ہے نہ دلہن —— اماں یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس راز کو پالتے پالتے مجھے تو ہو جائیگی ...... مگر میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"اطمینان رکھو اماں۔ میں سب لکھ دوں گی"

اور اپنے کمرے میں آکر میں سسک پڑی ——

اماں بے چاری کے نصیب بھی کیا نصیب تھے؟ بچپن سے غریبی میں گذر بسر ہوئی —— جوانی آنے پر ماں باپ نے اپنی ہی حیثیت دیکھ کر شادی کر دی۔ شادی کے ایک ہی سال بعد ایک معمولی سی بیماری میں میاں اللہ کو پیارے ہو گئے —— یوسف باپ کی موت کے دو ماہ بعد دنیا میں آیا —— جوان بیوہ کا اکلوتا سہارا —— غریبی کے ہاتھوں نوکری ڈھونڈتی ڈھونڈتی جب وہ ہمارے در پر پہنچی ہیں۔ اُس وقت ہمارے ہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ کئی ننھی ننھی جانوں کو چھوڑ کر میری امی موت کو اپنا چکی تھیں —— بڑے بچے تو کیسے بھی پل ہی جاتے ہیں۔ ایسا بچہ جس نے ماں کے سینے کی گرم اور زندگی بخش لمس کو محسوس تک نہ کیا ہو جس نے ابھی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھا تک نہ ہو ایک دم بھری پڑی دنیا میں تنہا رہ جائے تو —— بیکوں اس دل [illegible] کے سامنے سارے بچوں کی ذمہ داری آپڑی —— [illegible]

کی جگہ گود میں ایک دودھ پیتا چھوٹا سا بچہ تھا ——— چھوٹے بچے بھلے سے دوسروں کے ہوں، ان کو ایک ایسی عورت ہی بہت سے پال سکتی ہے جس کے اپنے دل کو ممتا کی کلپ لگی ہوئی ہو۔ مگر زینت بی نے تو کچھ زیادہ ہی کر دکھایا۔ اپنے نسبتاً بڑے بیٹے کو انہوں نے اوپر کے دودھ سے لگا دیا اور اپنے نئے مالکوں کی بچی کو اپنے سینے سے لگا لیا ——— راتوں کی نیندیں، دن کا چین حرام کر کے، اپنے جسم کا خون پلا پلا کر انہوں نے گھر والوں سے صرف ایک ہی التجا کی ———

"غلطیاں انسان سے ہوتی ہیں ——— میں بھی انسان ہوں خطاؤں کی پوٹ ——— لیکن میرے کسی قصور پر مجھے اس گھر سے نہ نکالا جائے۔ اس بچی سے جدا نہ کیا جائے۔ اس کے بغیر جی نہ سکوں گی ———

میں نے اس کے لئے نو مہینے کا وہ کرب نہیں جھیلا جسے جیت کر ایک ماں جنت کی خالق بنتی ہے، لیکن میں نے اسے جوانی نذر کی ہے جو ایک عورت کا سب سے خوبصورت سرمایہ ہوتی ہے ———"

اور یہ حقیقت تھی کہ میری خاطر راتوں کو جاگ جاگ کر، وقت بے وقت کی روں روں، دل پر اپنا چین لٹا کر، انہوں نے اپنے خوبصورت سیاہ بالوں کو غمناک آنچ پر جلا کے رکھے تھے ——— اور وہ جو سارے گھر کی محض "زینت بی" تھی ——— ان دو ننھے منے ہونٹوں کی جنہوں نے پہلی بار بولنا سیکھا تو "اماں" ہی سیکھا ——— شروع سے آخیر تک صرف اماں ہی اماں تھی ——— اور وہی ایک ہستی اماں جیسے خوبصورت خطاب کی مستحق ہو سکتی ہے جو کسی معصوم کی تکلیف پر اپنی آنکھیں نم کرے ——— اور یہاں تو اماں نے جیسے ساری زندگی بھر کے لئے میری خاطر آنسوؤں کا ٹھیکہ لے لیا تھا ———

میں جب خدا بڑی ہوئی اور ایسی چاہنے والی ماں کا اصل روپ دیکھا اور جانا تو میرا دل درد و کرب سے بھر گیا۔ ان کی وہ جھونپڑی سی [illegible] کوٹھری ——— [illegible] چارپائی [illegible] سے دھلی چادر [illegible] [illegible] ——— میں نے پہلی بار جب [illegible] [illegible] [illegible] پہلی بار اپنے [illegible] سے جدا [illegible]

ہماری وعدہ کیا تھا۔

اماں جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو تمہیں چاندی کے تخت پر بٹھاؤں گی ——— خوب نرم نرم ریشمی روئی بھرا گدا ——— اس پر ریشمی چادر ——— ساری دنیا آئے گی، دیکھے گی اور حیرت سے پوچھے گی بھئی یہ چاندی کے اس شاندار تخت پر کون بیٹھا ہے ——— اور میں سب کو فخر سے بتاؤں گی ——— یہ میری اماں ہے۔"

اماں بڑے پیار سے ہنس پڑی تھیں، مسکرا کر بولی تھیں۔

"اور میرا یوسف میرے لئے کچھ نہیں کرے گا ——— ؟"

"کرے گا کیسے نہیں ——— وہ بڑا ہو کر تمہارے لئے گھر میں ایک چاند جیسی بہو لائے گا ——— پھر اپنے گھر میں خوب سارے ننھے ننھے بچے ہوں گے اور مارے شور کے تم بوکھلا بوکھلا کر ان کے پیچھے بھاگو گی ......"

یہ خواب ایک ساتھ اماں نے اور میں نے دیکھا تھا ——— لیکن خواب کی تعبیر یہ تھی کہ اماں کا جوان بیٹا جنگ میں مارا جا چکا تھا اور وہ آس بھری نامراد ماں ہر پندرہ دن میں اپنے جگر گوشے کو ایک خط لکھواتی تھی کہ میرے اعضا جھک گئے ہیں ——— سر پر سورج سایہ فگن ہے ——— دکھوں اور غموں نے وقت سے پہلے ہی جوانی کو الوداع کہہ دی ہے، ایسے میں آنکھوں کی ایک ہی تمنا ہے کہ تجھے دولہا بنا دیکھیں ———"

اماں مجھے یوسف سے کسی بھی طرح کم نہ چاہتیں۔ ورنہ یوسف کی جدائی شاید انہیں مار ہی ڈالتی ——— انہیں خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ مجھے بے پناہ چاہتی ہیں۔ اور میں تو خیر خدا کے بعد انہی کے سہارے زندہ رہی تھی۔ ایسے میں میرے لئے یہ کیسے کرب کی بات تھی کہ پچھلے کئی سال سے اس راز کو پالے جا رہی تھی ——— لگتا تھا دل میں پھوڑا ہو جائے گا اور یہ بوجھ کسی دن یوں بڑھے گا کہ میرا دل پھٹ جائے گا ——— میں اس دن کے بارے میں سوچتی جب ایک المناک سے دن، ایک خط آیا تھا ——— جس نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ یوسف میدان جنگ میں کام آ گیا ——— گھر میں ضبط اور حوصلے سے کام لے کر کسی دن اماں کو بتا دیتی کہ اماں تم نے جو ایک پودا لگایا تھا وہ بھری جوانی بھری بہار میں منہ موڑ گیا ہے اور اب زندگی بھر کے لئے تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں، تو شاید

وہ وجود کو سہتے سہتے پتھر بن چکی تھیں یہ وار بھی سہہ ہی جاتیں ——— لیکن میں خود ہی یہ قدم نہ اٹھا سکی ——— اور میں نے ایک بڑے جرم کا فیصلہ کر لیا ———

"میں زندگی بھر ——— اماں کی زندگی بھر یہ راز کو پالوں گی کہ یوسف مر چکا ہے۔"

یوسف اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ اماں کو پچیس روپے بھی بھجواتا تھا ——— یہ مرحلہ میرے لئے سب سے کٹھن تھا ——— میں پچیس روپے ماہانہ آخر کہاں سے لاؤں گی ——— ؟ بہرحال یہ منزل طے کرنی تھی۔ میں اماں کی طرف سے خط لکھتی ——— ان بے چاری کو تو لکھنا پڑھنا آتا ہی نہ تھا ——— وہ مجھ سے کہتیں، میں لکھتی جاتی۔ پھر یوسف کی طرف سے بھی میں خود ہی جواب لکھ کر پوسٹ کر دیتی ——— یوسف کی زندگی میں مخصوص فوجی نمبر والے خط آتے تھے، ممکن ہے اماں تاڑ جائیں کہ اب خط ویسے نہیں ہوتے تو اب میں خط کاپی میں رکھ کر انہیں سنایا کرتی ———

ہر مہینے بڑے جتن سے منی آرڈر کرتی اور اماں انگوٹھا لگا کر وہ روپے وصول کرتیں اور خوش ہو ہو کر خرچ کرتیں ———

"اے بیٹی ——— اب کی بار چاندی کی پازیب خریدلیں گے ——— دلہن سارے میں چھم چھم کرتی گھومے گی تو گھر میں بڑی رونق لگے گی۔"

"بیٹا اب کے سے ناک کی نتھ بنوالیں گے۔ نتھ نہ ہو تو دلہن کے نور نہیں کھلتا۔ روپ ——— نہیں اترتا۔"

"بیٹی اب کے کنگن ——— کنگن نہ ہیں تو ———"

میں سوچتی میری شادی ہو جائے گی تو کون اس راز کو پالے گا ——— ؟ پھر سوچتی اماں کو اپنے ساتھ ہی اپنی سسرال لے کر کیوں نہ چلی جاؤں ——— ؟ لیکن ہم کچھ اور سوچتے ہیں، وقت کچھ اور کرتا ہے ——— میری شادی کی بات ابھی پکی ہوئی بھی نہ تھی کہ اماں کو نمونیہ ہو گیا اور آخری بلاوا آ گیا ———

شاید مرنے والوں کو احساس ہو جاتا ہے کہ یہ ہماری آخری گھڑی ہے ——— اُس دن جب اماں کی اکھڑی اکھڑی سانسیں چل رہی تھیں، انہوں نے مجھ سے پوچھا

باقی صفحہ [illegible] پر

جب سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد سرنگاپٹم لوٹا گیا

عدیل عباسی
چڑیاکوٹی

حضرت ٹیپو مستان شاہ کی دعاؤں کی برکت سے حیدر علی کی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والا فرزند مادرِ وطن کا جیالا سپوت، شمعِ آزادی کا پروانہ، ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ، انسانیت، خلوص اور خوش اخلاقی کا نمونہ، اعلیٰ سیاست داں، بے مثال دلیر، بہادر اور شجاع شیرِ میسور ابوالفتح علی سلطان ٹیپو نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم میں انگریزی افواج سے دست بدست جنگ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا اور بھارت کی دھرتی کو اپنے خون سے سرخ رو کر دیا۔

ٹیپو سلطان جیسی عظیم ہستیاں صدیوں میں جنم لیتی ہیں۔ قابلِ احترام ہے وہ سرزمین جہاں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔

سرنگاپٹم کے آخری محاصرے سے پہلے تین لڑائیوں میں انگریزوں کو ٹیپو سلطان کے مقابلے میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ شرمناک پسپائی نصیب ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ٹیپو سلطان کو سامراجیوں کی فوجیں کبھی نہیں ہرا سکیں۔ بلکہ نظام، مرہٹوں اور خود اُس کے غدار امراء اور وزراء نے اُسے شکست دی۔ ان غداروں میں میر صادق، پورنیا، میر قاسم علی اور میر عالم کے نام سرِ فہرست ہیں۔ انہیں غداروں کی بدولت جس لڑائی کو اُس نے میدانِ جنگ میں جیت لیا قلعہ کی چہار دیواری کے اندر ہار گیا۔

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد تہذیب اور شائستگی کے جھوٹے نام نہاد علمبردار انگریزوں نے جس طرح لوٹ اور غارتگری کا بازار گرم کیا اُسے سن کر دل لرز جاتا ہے۔ سرنگاپٹم کے زوال کے بعد وہاں کی معصوم اور بے گناہ رعایا پر اس قدر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے کہ اس کے آگے ہلاکو کے جور و تشدد بھی ماند پڑ گئے۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کی شب میں سرنگاپٹم پر جو مصیبت آئی اُس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ شہر میں مشکل سے کوئی مکان بچا ہوگا جو لوٹا نہ گیا ہو۔

قلعہ کی تسخیر کے بعد جو مالِ غنیمت انگریزوں کے ہاتھ لگا اس کی تفصیل "ماڈرن میسور" کے مصنف نے یوں بیان کی ہے۔

"مالِ غنیمت کے تقسیم کرنے پر جو جماعت مامور تھی وہ محل کی دولت دیکھ کر حیران و ششدر ہو گئی۔ آنکھیں تعجب سے چُندھیا گئیں۔ لاکھوں جواہرات کے علاوہ سونے اور چاندی کی سلاخیں زیورات اور نہایت قیمتی اور نایاب چیزیں محل کے اندر رکھی ہوئی تھیں۔ زنانہ حصہ کے سوا محل کی تمام عمارت اور دربار کا کمرہ ان چیزوں کے لئے استعمال میں لایا گیا تھا۔

جواہرات مقفل صندوقوں میں تھے جو محل کے اندر تاریک کمروں میں رکھے ہوئے پائے گئے۔ یہ جواہرات جن صندوقوں میں تھے اُن پر حیدر علی اور سلطان کی مہریں ثبت تھیں اسی طرح سونے کی سلاخیں اور زیورات جن کی خوبصورتی بیان میں نہیں آ سکتی ایک دوسری جگہ سربمہر صندوقوں میں رکھے ہوئے ملے۔ زیورات میں بازو بند، انگوٹھیاں، گلوبند اور دوسری آرائش کی بے شمار چیزیں تھیں۔ اوپر کے کمرے میں چاندی کی سلاخیں اور اُس سے بنی ہوئی چیزوں کے ذخیرے تھے۔ ایک جگہ دو ہودے تھے جو پورے پورے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ بہت سے چاندی کے بڑے بڑے طبق تھے جن میں ہیرے اور دوسرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ہتھیار ایک کمرے میں تھے۔ ان میں کئی بندوقیں اور تلواریں تھیں جن میں سونا اور جواہرات لگے تھے۔ ہاتھی دانت کے دروازے اور دوسری کئی قیمتی بڑی بڑی اشیا بھی محل کے اندر پائی گئیں۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ نہایت قیمتی

ماقات نئی دھلی

اور بے شمار بیش قیمت قالین بھی تھے۔

نہایت عمدہ ململ، ساٹن، ریشم، شال اور دوسرے قیمتی کپڑوں کے گٹھڑ بندھے ہوئے رکھے تھے۔ جن کا اندازہ کیا گیا کہ پانچ سو اونٹ ان کے اٹھانے کے واسطے درکار ہوں گے۔

مال غنیمت میں روز بینیں اور دوسرے شیشے ہر آنکھ کیلئے موزوں اور مختلف قد و قامت کے آئینے اور لاتعداد تصاویر تھیں اور اس قدر کانچ اور چینی کے ظروف تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑی دوکان ہے۔

ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس میں نہایت قرینے سے کتابیں رکھی گئی تھیں۔ بعض کتابوں کی جلدیں ہیرے اور جواہرات سے مرصع تھیں۔ ایک اور کمرے میں نہایت ہی قیمتی ہودہ اور تخت رکھا ہوا تھا۔

محل سے ملحق بیس اناج کے ذخیرے اور سات گودام تھے ان میں چاول اور گرم مسالا بھرا ہوا تھا۔ ایک گودام میں گیارہ سال پرانے چاول رکھے ہوئے تھے جو نہایت عمدہ حالت میں محفوظ تھے۔ قلعہ میں ایک ہزار توپ، پانچ لاکھ گولیاں، بارہ ہزار گولے اور ساٹھ ہزار بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان توپوں میں ۵۱ توپیں انگریزی ساخت کی تھیں۔ باقی سلطانی کارخانوں کی بنی ہوئی تھیں ان کے متعلق جب تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ساخت کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

اس مال غنیمت میں سے ٹیپو سلطان کی ایک تلوار جنرل ہیرڈ کو بطور انعام دی گئی اور دوسری لارڈ ولزلی کو۔

اس کے علاوہ لارڈ ولزلی کو ایک ہیروں کا جھومر اور تھوڑے سے زیورات تحفہ بھیجے گئے۔ سلطان کی پگڑی اور ایک تلوار لارڈ کارنوالس کو بطور تحفہ بھیجی گئی۔ مال غنیمت میں جنرل ہیرس کے حصہ میں ایک لاکھ بیالیس ہزار نو سو دو اشرفیاں آئیں جن کی قیمت موجودہ شرح تبادلہ سے پندرہ لاکھ روپے ہوتی ہے۔

قلعہ کی بے پناہ دولت اور مال و زر کے بارے میں ناظرین نے ایک تاریخی بیان ملاحظہ کیا۔ اس لوٹ کھسوٹ اور بربریت میں شامل میجر پرائس کی زبانی بھی کچھ حالات سنئے۔ میجر نے چشم دید واقعات قلمبند کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"سرنگا پٹم کے مشہور قلعہ کو فتح کرنے کے بعد کمپنی نے فیصلہ کیا کہ جواہرات، روپیہ اور سامان کو (جس کی مجموعی قیمت ۲۵ لاکھ پونڈ تھی) موقع پر ہی تقسیم کر لیا جائے۔ جس افسر نے جس قدر خدمت کی ہے اس کا لحاظ اور اندازہ لگا کر اُسے مال غنیمت میں حصہ دے

واقعات فتح دھلی

دیا جائے۔ اس تقسیم کے لئے ایجنٹ مقرر کئے گئے۔ میں بھی ان میں تھا۔ قلعہ کی دولت دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی ناقابل یقین دولت اور لاتعداد زر و جواہر قلعہ میں کہاں سے آ گئے۔ مختلف قسم کے پارچہ جات اور طرح طرح کی قیمتی اور نادر اشیا، سونے چاندی کے ظروف، جواہرات اور موتیوں کے بے مثل و لاجواب ذخیرے سامنے کھلے پڑے تھے۔ ہماری عقل حیران تھی۔ فرد حساب بھی تیار نہ کر سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ بیرونی دروازوں سے ہمارے سپاہی اور توپ خانوں کے لوگ گھس آئے تھے اور کافی مال لے کر فرار ہو گئے۔

شہر میں بھی ہمارے افسروں نے خوب لوٹ مار کی بیسوں گھروں میں جا کر روپیہ پیسہ چھین لیا۔ ڈاکٹر ملٹن کے ہاتھ ۷۴ نمبر کی رجمنٹ کے ایک سپاہی نے نہایت معمولی رقم میں پرانے اور کپڑے فروخت کئے جن میں اس قدر قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ اُن کی مجموعی قیمت کا اندازہ ایک ہندوستانی جوہری نے چالیس ہزار پونڈ لگایا تھا اور بعض زیوروں کی قیمت کا اندازہ لگانے سے جوہری بھی قاصر تھے۔ اس سپاہی نے یہ کپڑے ایک گھر سے چرائے تھے۔ پھر اپنی رجمنٹ کے ایک ڈاکٹر کے ہاتھ نہایت معمولی رقم کے عوض بیچ دیئے۔

لارڈ ہیرس کے ڈھیر میں ایک وہ ہار بھی تھا جس کی قیمت (۱۳۵۰۰) تیرہ ہزار پانچ سو پونڈ بتلائی جاتی ہے۔

سر ڈیوڈ کراس کے حصہ میں ایک انگشتری ملی جس کی قیمت پچاس ہزار روپے تھی مگر اس نے اس وقت غصہ میں آ کر اُسے پھینک دیا کہ یہ تو رنگا ہوا شیشہ ہے۔ ایک سپاہی نے اٹھا کر پانچ ہزار روپے میں فروخت کیا۔

ٹیپو سلطان نے ایک تخت بے مثل ساخت کا بنوایا تھا جو خالص سونے کی چادروں کا تھا۔ اُس کے پشتہ پر ایک ہما کی تصویر بنی ہوئی تھی جو سونے اور جواہرات کی تھی۔ تخت چار سونے کے شیروں کی پشت پر قائم تھا۔ اس تخت کے ٹکڑے کر کے ڈھیر لگا دیئے گئے تھے اٹھارہ سو پونڈ ہر شخص کے حصہ میں آئے۔ تخت کی چھت جنرل گانٹ کے ہاتھ ۲۵۰۰ پونڈ میں فروخت کر دی گئی جو اس کے بعد دگنی قیمت پر علیحدہ ٹکڑوں کی صورت میں بیچی گئی۔

اس تخت کے سامنے کے دو شیر جو ٹھوس اور خالص سونے کے تھے بادشاہ کو ولایت بھیج دیئے گئے اس کے ساتھ کچھ ہیرے جواہرات اور قیمتی ہتھیار بھی روانہ کئے گئے۔

یہ تو افسروں اور حاکموں کو ملا۔ ہر سپاہی کو جنہیں پرائیوٹ کہا جاتا ہے تقریباً چھ چھ پونڈ تو ضرور مل گئے لیکن انہوں نے ذاتی طور پر کافی روپیہ لوٹا۔ بہت سے یورپین سپاہیوں نے کئی کئی ہزار کے جواہرات بیچے اور پھر اپنی نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ بعض سپاہیوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک شراب کی بوتل کی خاطر کئی کئی سو روپے کی مالیت کے جواہرات کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے۔

سپاہیوں کو بطور انعام تمغے بھی دیئے گئے تھے۔ خاص بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ان تمغوں کے ایک طرف تو سرنگا پٹم کے فتح ہونے کی تاریخ درج تھی اور دوسری طرف دریائے کاویری میں ایک کھاتے ہوئے شیر کی تصویر تھی جس کو ہیٹ جارج ایک گھوڑے پر بیٹھا ہوا نیزہ سے مار رہا تھا۔"

اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہے کہ ہمارے ہیرو شہید سلطان ٹیپو کو انگریز بھی شیر میسور ہی نہیں بلکہ شیر ہندوستان تسلیم کرتے تھے اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بیان کر کے میں اس لرزہ خیز داستان کو ختم کر دینا چاہتا ہوں جو یقیناً ناظرین کے لئے تعجب خیز ہوگا، مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

سلطانی محل کے ایک وسیع کمرے میں ایک خوشنما قالین پڑا ہوا تھا۔ قالین پر ایک خوبصورت اور دلفریب جھاڑی بنی ہوئی تھی جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جھاڑی کے کنارے ایک نہایت تندرست اور خونخوار شیر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ جھاڑی کے پیچھے پتوں کی آڑ میں ایک شکاری ہاتھ میں بندوق لئے شیر پر نشانہ لگا رہا تھا۔ شکاری کے سر پر ایک فلیٹ ہیٹ تھی شیر اس شکاری کی موجودگی سے بالکل بے خبر تھا۔

ایک صاحب حال بزرگ فقیرانہ لباس میں سلطان کی طلب پر اسی کمرے میں داخل ہوئے۔ بزرگ بہت انہاک سے دیر تک قالین کو دیکھتے رہے۔ پھر سلطان اور بزرگ کے درمیان کچھ دیر تک گفتگو ہوئی۔ سلطان بزرگ سے بے حد متاثر ہوا۔ جب بزرگ رخصت ہو کر جانے لگے تو ٹیپو سلطان نے اُن سے نہایت عاجزی اور انکساری سے ایک سوال پوچھا۔

"حضرت! کچھ میری قسمت کے بارے میں بتاتے جائیے"

"تمہاری قسمت؟ اس قالین پر نقش ہے"۔ بزرگ نے نرم لہجے میں جواب دیا اور چلے گئے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس قالین پر جو نقش تھا وہ صرف ٹیپو سلطان کی قسمت کا نقش نہیں تھا بلکہ وہ سارے بھارت کے مقدر کا نقش ثابت ہوا۔

کوشش اور جدوجہد کامیابی کی کنجی ہے

محمد سلیمان صابر

علامہ اقبال نے کہا تھا۔ ع

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

لیکن اگر کوئی طبقہ خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہے اور اپنی خوبیوں کو اجاگر نہ کر سکے تو کیا وہ اپنا مقام پیدا کر سکتا ہے۔؟ جمہوریت کے اس دور میں اگر کوئی جماعت یا طبقہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اس کی بڑی حد تک ذمے داری خود اسی جماعت یا طبقے پر عائد ہوتی ہے۔

کوشش اور جدوجہد ہماری کامیابی کی کنجی ہے۔ خدا اس قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش نہ کرے۔ جو لوگ کوشش کرتے ہیں اور اپنی مدد آپ کرتے ہیں خدا بھی انکی مدد کرتا ہے۔

ہندوستان کی جمہوریت میں اقلیتوں اور خاص کر مسلم اقلیت کو بہت سی شکایات ہیں۔ ان میں کچھ صحیح بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر شکایت کرنے والوں نے خود اپنی خامیوں کا جائزہ نہ لیا تو وہ اپنے ساتھ بڑی زیادتی کریں گے۔

جمہوریت میں سب کو یکساں حقوق دیئے گئے ہیں اور ملک کے عوام نے حالیہ انتخاب میں ثابت کر دیا ہے کہ وہ مذہبی شدت پسندی کے خلاف، اور ایسی سیکولر جمہوریت کے حامی ہیں جن میں سب طبقوں اور فرقوں کی یکساں حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہو۔ اب ان بہت سے طبقوں اور فرقوں میں جو بھی کوشش اور جدوجہد کرے گا اس کا پھل پائے گا۔ جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے گا پیچھے رہ جائے گا اور اپنا کوئی مقام پیدا نہ کر سکے گا۔ بے شک مقابلہ سخت ہے لیکن باصلاحیت اور باہمت لوگ کبھی اپنی ہار نہیں مانتے بلکہ مقابلے میں انھیں مزہ آتا ہے۔ ہم نے کسی ایسے شخص کو اپنے حق سے محروم نہیں دیکھا جو صاحب صلاحیت اور پرخلوص ہو اور جو مسلسل جدوجہد کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتا ہو۔

ایسی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت لوگ سامنے آئے اور انہوں نے پوری قوم کی قیادت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

تاریخ کے اس دور کو چھوڑ دیجئے جب مسلمان اس ملک میں حکمراں تھے انگریزی حکومت اور آزادی کے ۲۳ سالہ دور میں بھی ایسی مسلم شخصیتیں ابھریں جنہوں نے ملک کی قیادت میں نمایاں حصہ لیا۔ کیا ہندوستانی قوم ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسی شخصیتوں کو کبھی بھلا سکتی ہے۔

رفیع احمد قدوائی جنہیں بچھڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کے احترام میں ہندوستانی آج بھی اپنی گردن جھکا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس جیسا ایڈ منسٹریٹر آج تک کوئی اور نہیں ہوا۔

یہ تو ہوئی بڑی اور ممتاز شخصیتوں کی بات ایک معمولی شخص بھی بشرطیکہ وہ باصلاحیت ہو اور اپنے اندر حقیقی جذبۂ خدمت رکھتا ہو، دوسروں میں ممتاز ہو سکتا اور انھیں اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں ناردرن ریلوے میں ملتا ہے۔ پورے ڈویژن میں مسلمان ملازموں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے (اور یہ افسوسناک بات ہے) لیکن اس کے باوجود ڈویژن میں کسی جگہ چلے جایئے کوئی ریلوے ملازم ایسا نہیں ملے گا جو آفتاب احمد صدیقی کے نام سے واقف اور انکا گرویدہ نہ ہو۔

طویل القامت اور چھریرا بدن مسٹر صدیقی جنکی عمر تقریباً ۴۸ سال ہے دور سے جانے پہچانے جا سکتے ہیں۔ معمولی انکوائری کلرک ہیں (اب غالباً سپروائزری پر پروموشن ہو چکا ہے) لیکن انکا یہ معمولی عہدہ ریلوے ملازمین کی قیادت کرنے کی انکی اہلیت میں رکاوٹ نہیں بن سکا۔

ملازمین کے حقوق کے لئے لڑنے پر ڈھائی سال معطل رہنے کے بعد صدیقی صاحب بحال ہوئے تو ریلوے ملازمین نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔

آفتاب احمد
صدیقی

انھیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ معطلی اور تنزلی کا بھی شکار ہوئے لیکن کبھی مایوس و ہراساں نہ ہوئے اور نتیجے میں ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ انھوں نے بلا تخصیص مذہب و ملت اپنے محکمے کے تمام ملازمین کی پرخلوص خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا اور یہ اسی خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج اس ڈویژن کا ہر ملازم صدیقی پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ باصلاحیت لوگوں کی کسی بھی طبقے میں کمی نہیں ہے۔ ابھرتے نوجوان ہر جگہ نظر آئیں گے۔ اگر یہ نوجوان آگے آئیں اور خلوص و راستبازی کے ساتھ دوسروں کی خدمت کریں تو ہر شعبۂ زندگی میں وہ ایک قائدانہ رول ادا کر سکتے ہیں۔

کسی اقلیتی فرد کے ابھر کر سامنے آنے سے صرف ٹریڈ یونین ہی کو استحکام نہیں ملتا بلکہ قومی یکجہتی جیسے مقاصد کو بھی اس سے بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے اور عملی طور پر ان تنگ نظروں کو جواب ملتا ہے جو ملک کو ہندو مسلمانوں کے دو الگ الگ خانوں میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مجھے مسٹر صدیقی کے ہمراہ مذکورہ ریلوے ڈویژن کے ایسے حصوں میں جانے کا موقع ملا ہے جہاں نہ صرف یہ کہ اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والا کوئی ملازم نظر نہ آیا بلکہ اس علاقے کی آبادی میں بھی مسلم اقلیت ختم ہو چکی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگوں نے صدیقی کو پھولوں سے لاد دیا اور ان کا عظیم الشان جلوس نکالا۔ سب لوگ قومی یکجہتی کے جذبے سے سرشار تھے۔

یہ لوگ ۴۷ء۱۹ کے زمانے کو بھی یاد کرتے پلٹ گئے وہ روتے اور کہتے تھے کہ جو کچھ ہوا برا ہوا۔ ہم سب پر شیطان غالب آگیا تھا۔ آؤ اب اس شیطان کو بھگائیں اور پھر سے

عوام کا یہ احساس اس امر کا مظہر ہے کہ جذبات ہمیشہ برانگیختہ نہیں رہتے۔ شیو سینا۔ آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا جیسی فرقہ پرست جماعتیں کتنے عرصے سے جذبات کو بھڑکا رہی ہیں۔ کہیں کہیں وہ کامیاب بھی ہوئی ہیں لیکن خوشی کی بات ہے کہ ان کا اثر محدود ہو رہا ہے۔ مہاراشٹر جیسے علاقے میں جہاں فرقہ پرستوں نے اودھم مچا رکھی تھی عوام نے ان کی جارحانہ فرقہ پرستی کی پالیسی کو مسترد کر دیا۔

مسٹر صدیقی جنکا اوپر ذکر آیا وہ جب اپنے ایک بھائی (پھوپھی زاد) کو جو ۴۷ء۱۹ کے قتل عام سے بچ گیا تھا اور ایک عرصے سے گمنامی میں رہ کر کسی پسماندہ طبقے کے ایک گھر میں پل بڑھ رہا تھا لینے کے لئے بھٹنڈہ گئے تو وہاں کے ڈپٹی کمشنر نے آنسوؤں کے ساتھ اس لڑکے کو ان کے حوالے کیا۔ "حوالگی" کے اس جلسے میں سب ہی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ۴۷ء۱۹ کے ان واقعات پر بے حد پشیمان تھے جن میں صدیقی کے پھوپھا حافظ وہاج صاحب (اس وقت کے اسٹیشن ماسٹر بھٹنڈہ کے ہیڈ کلرک) کو اور انکے بارہ افراد خاندان کو شہید اور انکی پیاری بیٹی مسعودہ بیگم کو اغوا کیا گیا تھا۔ (مسعودہ بیگم کی ایک لمبی کہانی ہے جو چند سال قبل اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ مسعودہ بیگم انتقال کر چکی ہے اور اس کا مزار صدیقی کے وطن مالوف نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہے)

اس قسم کا رجحان طبع عمومی طور پر پیدا ہو رہا ہے۔ اسی دلی میں ایک فرقہ پرست لیڈر جسے "بھارتیانے" کا نعرہ لگانے پر پھولوں سے لاد دیا جاتا تھا پچھلے دنوں پولیس کی مدد سے اپنی جان بچا کر بھاگا، اس کی کار جلتے جلتے بچی۔

فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والوں کے خلاف بڑھتے ہوئے اس جذبے سے اگر استفادہ کیا جائے اور اقلیتی افراد خواہ وہ کہیں ہوں آگے آکر قائدانہ رول ادا کریں تو وہ عملی طور پر قومی یکجہتی کے کام کو تقویت پہونچائیں گے۔

قومی یکجہتی کا مقصد ناراض ہو کر الگ ہونے یا ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجد الگ بنانے سے حاصل نہیں ہوگا بلکہ باہم گھلنے ملنے اور ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرنے سے ہوگا۔

پچھلے چند برسوں میں کتنی ہی یکجہتی کانفرنسیں منعقد کی گئیں لیکن وہ سب بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ ان کے مقابلے میں اکیلے صدیقی نے اپنے ڈویژن کی پوری فضا کو بدل دیا۔ اسی

مسلمانوں اور دوسرے پس ماندہ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود آگے بڑھ کر تعلیمی، معاشی اور سیاسی میدان میں اپنی جگہ بنائیں حکومت یا کسی دوسرے کی مدد کا انتظار نہ کریں۔ اپنے اخلاق اور خلوص سے وہ سب کو اپنا گرویدہ بنا سکتے ہیں

طرح اگر دوسرے سرکاری ملازمین میں سے بھی اقلیتی افراد ابھریں اور اکثریت سے تعلق رکھنے والے ذمّے دار لوگوں کے ساتھ تعاون سے کام کریں تو ان تمام ملازمین کی اصلاح ہو سکتی ہے جن کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انکے ذہن صاف نہیں ہیں۔

قومی یکجہتی کا ابتدائی کام اسکولوں اور کالجوں سے ہی شروع کئے جانے کی ضرورت ہے جہاں اس بات کی نگرانی رکھی جائے کہ کوئی کلاس کسی طبقے کی نمائندگی سے محروم نہ ہو۔ ملے جلے طبقوں اور فرقوں کے نوجوان طلبا میں جو دوستی ہوگی وہ کبھی مٹنے والی نہ ہوگی۔ کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں کسی دوسرے طبقے یا فرقے کے طلبا کی عدم نمائندگی حقیقت میں فرقہ وارانہ بداعتمادی کی فضا پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندو مسلم طلبا کی مشترکہ زندگی سے ان کے ایک دوسرے کے قریب آنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ لیکن جیسا کہ شروع میں ذکر آیا ہے کسی بھی فرقے کے افراد کو اس بات کا انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ کوئی دوسرا اسکی مدد کرے گا۔

جمہوریت کے اس دور میں ہر طبقے اور ہر فرقے کو اپنی جگہ خود بنانی ہے اور اسے یہ عزم کرنا ہے کہ کسی کا انتظار کئے بغیر وہ ہر بدمنظر نقش کہن کو مٹا دے گا۔ نوجوانوں کی روح اگر بیدار ہو جائے تو وہ ملک و قوم کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ نوجوانوں کا انداز فکر تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

.... کنووکیشن کا دن۔ منجو کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔
خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مُفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹروں سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔
خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے
پُرمسرّت
دن

ترکی میں ایکبار پھر جمہوریت کا جنازہ نکل گیا

دنیا دوربین کی نظر میں

ترکی

ترکی کے صدر سعادت ثنائی نے نہت ادم کو نئی حکومت بنانے کی ذمے داری سونپی ہے۔ وہ ترکی کے نائب وزیر اعظم رہ چکے ہیں اور قانون کے سابق پروفیسر ہیں جسٹس پارٹی سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس سے مستعفی ہو گئے ہیں تاکہ ایک غیر جانبدار حکومت بنا سکیں۔

اس تبدیلی کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل امن و انتظام قائم رکھنے میں ناکام ہو گئے تھے پارلیمنٹ میں انکی اکثریت بہت کم ہو گئی تھی بعض اوقات صرف ایک کا فرق رہ جاتا تھا نتیجے میں ملک کے اندر تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوتا گیا اور جب پچھلے دنوں امریکی فضائیہ کے چار افسروں کا اغوا کر کے چار لاکھ ڈالر تاوان کا مطالبہ کیا گیا تو صورت حال اور بگڑ گئی۔ حکومت نے اغوا کرنے والوں سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے برخلاف پولیس اور فوج نے راجدھانی کے کالج کیمپسوں کو چھان مارا۔ اغوا کرنے والے اتنے گھبرا گئے کہ انھوں نے چاروں امریکی افسروں کو چھوڑ دیا اگرچہ اس تلاش اور طلباء کے ساتھ تصادم میں تین جانیں گئیں۔ لیکن ان امریکی افسروں کی رہائی ڈیمرل کو نہ بچا سکی۔ چار ہی دن بعد ترکی کے چیف آف اسٹاف جنرل ممدوح تگمک اور فوج کے تینوں بازوؤں کے کمانڈروں نے صدر ثنائی کو الٹی میٹم دیا کہ "یا تو مضبوط و مستحکم حکومت بناؤ جو کمال اتاترک کے اصلاحی کام کو جاری رکھ سکے ورنہ فوج اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لے گی"۔

ترکی کے سابق وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل

فوجی کمانڈروں کی طرف سے جو میمورنڈم صدر کو پیش کیا گیا اس میں الزام لگایا گیا کہ "پارلیمنٹ اور حکومت اقتصادی اور سماجی بے چینی کا باعث بنی ہے اور اس نے ملک کو انارکی کے دہانے پر پہونچا دیا ہے"۔ جس وقت ریڈیو سے یہ میمورنڈم براڈکاسٹ ہو رہا تھا اس وقت بھی انقرہ کے کلیدی مقامات پر فوج کھڑی ہوئی تھی اور پورے شہر کو اس نے گھیر رکھا تھا۔

۴۶ سالہ سلیمان ڈیمرل خاموشی کے ساتھ مستعفی ہو گئے انھیں پھر سے نئی حکومت بنانے کا موقع دیا گیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ نئی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں ۸۷ سالہ عصمت انونو کا بھی نام آیا وہ کمال اتاترک کے قریبی رفقاء میں سے ہیں لیکن بعض سیاستدانوں کا کہنا ہے کہ ان کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی اچھی باتیں کرتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی بھول جاتے ہیں۔ بالآخر نہت ادم کو نئی حکومت کی تشکیل کا کام سونپا گیا ہے۔ یقین ہے وہ نئی حکومت تشکیل کر سکیں گے۔ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ نئی حکومت کی پالیسی امریکا کے ساتھ دوستی کی رہے گی اور ناٹو کے مفادات کو بھی نقصان نہیں پہونچے گا۔ فوجی افسران بھی یہی چاہتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ملک میں روس نواز طاقتیں ابھریں۔ ان طاقتوں کو دبانے کے لئے وہ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے کی حد تک جانے کو تیار ہیں۔

فوجیوں نے ۱۹۶۰ء میں بھی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا جب انھوں نے ڈیمرل کے پیش رو عدنان مینڈریس پر جبر و تشدد اور بد عنوانیوں کا الزام لگا کر انھیں عہدے سے ہی نہیں ہٹایا بلکہ — پھانسی کے تختے پر بھی لٹکا دیا تھا سلیمان ڈیمرل فوجیوں کی اس دھینگا مشتی کو دیکھ چکے تھے وہ مستعفی نہ ہوتے تو انکا بھی یہی حشر ہو سکتا تھا اور اس صورت میں ترکی کافی دنوں کے لئے جمہوریت سے محروم ہو جاتا۔ انھوں نے خاموشی سے استعفیٰ دیکر جمہوریت کو بچا لیا۔ ■

اسرائیل

یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ اسرائیل طاقت کے نشے میں چور ہے اور اب امریکا کی بات بھی سننے کو تیار نہیں جس نے اسے پال پوس کر موٹا کیا ہے۔ اسے اپنی طاقت پر زعم ہے اور اسی لئے وہ کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ مسٹر راجرس (وزیر خارجہ امریکا) تک کی تجاویز اس نے مسترد کر دیں۔

اسرائیل سمجھتا ہے کہ میدان جنگ میں عرب اسے شکست نہیں دے سکتے۔ ۱۹۶۷ء کی چھ دن کی جنگ میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی اس نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے اسی لئے وہ علانیہ عالمی رائے عامہ کو ٹھکرا رہا ہے اور جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔

لیکن دوسری طرف متحدہ عرب جمہوریہ کی بھی تیاریاں کچھ کم نہیں ہیں۔ چھ دن کی جنگ میں اسے جو زبردست نقصان پہنچا تھا روس نے اس کی تلافی کر دی ہے۔ سب سے زیادہ ہوائی جہازوں کا نقصان ہوا تھا لیکن اب روس کی مدد سے متحدہ عرب جمہوریہ کا فضائی بیڑہ ۴۵۰ جیٹ طیاروں پر مشتمل ہے۔ اس میں پچاس نئے مگ۔ ۲۱ قسم کے طیارے شامل ہیں بحر روم کے کنارے سوویت روس نے راڈار نصب کیا ہے تاکہ اسرائیلی جنگی سرگرمیوں کا پتہ لگتا رہے۔ حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ نے اسرائیل کی جو آبدوزیں بحر روم میں ڈبوئی ہیں غالباً ان کا پتا لگانے میں بھی اسی راڈار سسٹم سے مدد ملی۔

علاوہ ازیں دفاعی نظام میزائیل اڈے قائم کر کے مضبوط بنایا گیا ہے۔ حال ہی میں ۶۰ نئے میزائیل اڈے قائم

استنبول میں طالبعلموں اور فوج کے درمیان ایک جھڑپ

اسرائیل طاقت کے نشہ میں چور ـ عرب ممالک ترنوالہ نہیں

گولڈا مائر ـــــ طاقت کا نشہ

حبشہ کے شاہ ـــــ ہیل سلاسی

کئے گئے ہیں جہاں اس وقت زمین سے ہوا میں مار کرنے والے سام ـ ۶ قسم کے ۱۸۰ روسی میزائیل نصب ہیں۔ ۲۴۰ سام ـ ۳ قسم کے میزائیل ہیں جو زیادہ ماڈرن اور زیادہ خطرناک ہیں۔ اس دفاعی نظام یا دوسرے الفاظ میں ہوائی چھتری کے نیچے ایک لاکھ مصری فوج نہر سوئز کے علاقے میں تعینات ہے جو جدید ترین اسلحے سے لیس ہے۔ ان طیاروں میں ۵۰ روسی ساخت کے اور ۲۵۰ چیکوسلاواکیا کے ٹینک شامل ہیں ایک ہزار چھوٹی بڑی توپیں بھی نصب ہیں جن میں سے تین درجن روسی ساخت کی اتنی بڑی توپیں ہیں جو مصر کے ۱۸ میل اندر کے علاقے سے دو سو پونڈ وزن کے گولے اسرائیلی محاذ پر پھینک سکتی ہیں۔ ایسی اطلاعات بھی ہیں کہ مصریوں کو زمین سے زمین پر مار کرنے والے میزائیل بھی مل گئے ہیں جو ۲۰ سے ۴۰ میل تک کی دوری تک ۵۰۰ پونڈ وزن کے مہلک گولے پھینک سکتے ہیں۔

بارہ ہزار روسی ماہرین بھی مختلف محاذوں پر مصری فوجوں کو ضروری ہدایات دینے کے لئے موجود ہیں۔ گویا متحدہ عرب جمہوریہ جنگ کے لئے پوری طرح لیس ہے۔ لیکن اسکے باوجود وہ امن کی تلاش میں اس حد تک آگے چلا گیا ہے کہ صدر ناصر کے زمانے میں شاید ہی جاسکتا تھا۔

اس پر بھی اسرائیل اکڑا ہوا ہے اور رٹ لگا رہا ہے کہ وہ مقبوضہ عرب علاقے خالی نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ اسکے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ وہ طاقت کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ مضبوط سمجھتا ہے اور اگرچہ اس کی فوجوں کی تعداد جو متحدہ عرب جمہوریہ کے بالمقابل جمع ہیں صرف ۸۵ ہزار ہے ـــ لیکن اسے اعلیٰ قسم کے ٹینکوں اور ہوائی بیڑے کی مدد حاصل ہے ٹینکوں کی تعداد ۱۲۵۰ اور ہوائی جہازوں کی تعداد ۵۱۲ ہے جس میں حال ہی میں ۱۲ امریکی فینٹم طیارے شامل کئے گئے ہیں اسی قسم کے ۷۰ طیارے امریکا سے حاصل کئے جانے والے ہیں)

اسرائیلی اور دوسرے مغربی مبصرین کہتے ہیں کہ اسرائیلی ہواباز دنیا میں اعلیٰ قسم کے تجربے کار ہواباز سمجھے جاتے ہیں جبکہ روسی ہوابازوں کو ۲۵ برس سے میدان جنگ میں آنے کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت اسرائیلی طیارے چیوں کو نچی پرواز کے ساتھ بمباری کرنے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے تاکہ وہ متحدہ عرب جمہوریہ کے میزائیل تنصیبات کو تباہ کر سکیں۔

اپنی اسی فضائی طاقت پر بھروسہ کرکے ایک اسرائیلی ڈپلومیٹ نے پچھلے ہفتے کہا "میں سمجھتا ہوں مصریوں کو ہم تقریباً ایک ماہ کا موقع دیں گے۔ اس مدت میں ہم دیکھیں گے کہ مصریوں کی طرف سے مصالحت کیلئے کیا قدم اٹھایا جاتا ہے اور اسکے بعد انہیں نیل کے خودروں میں ملبوس ہمارے لڑکوں کیلئے جگہ چھوڑ دینی ہوگی۔"

اس قسم کی روش ظاہر کرتی ہے کہ اسرائیل ایک اور جنگ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اور یہ جنگ ایسا نظر آتا ہے کہ ہو کر رہے گی۔ صدر شام جناب حافظ الاسد کا کہنا ہے کہ "عرب مقبوضہ علاقے جنگ کے بغیر خالی نہیں ہونگے۔" یقیناً اسی خطرہ کے پیش نظر انہوں نے اس بات کو منظور کر لیا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور شام کی فوجیں ایک ہی کمان میں رہیں۔ دوسرے عرب ممالک بھی اپنی فوجوں کو ایک ہی کمان میں لے آئیں تو وہ ایک مضبوط دشمن کا مقابلہ باآسانی کر سکتے ہیں۔ اسوقت اسرائیل کو غلط فہمی یہ ہے کہ اردن و شام یا کوئی اور عرب ملک مصر کی مدد نہیں کرے گا یہی وجہ ہے کہ وہ متحدہ عرب جمہوریہ کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ اور دوسرے عرب ملکوں کے خلاف بھی اس کی جارحانہ کاروائیاں شروع ہو گئی ہیں جو کچھ ہو اسرائیل کو اس بار معلوم ہو جائے گا کہ متحدہ عرب جمہوریہ ترنوالہ نہیں ہے۔

حبشہ

حبشہ کے شمالی صوبہ ایری ٹیریا میں شہنشاہ حبشہ کے خلاف جنگ جاری ہے۔ حبشہ کی حکومت اس صوبہ کے محاذ آزادی کو ڈاکوؤں کا گروہ کہتی ہے۔ ہر حکومت حریت پسندوں کو اسی قسم کا نام دیتی ہے۔ لیکن حبشہ کی حکومت ایری ٹیریا کے حریت پسندوں کو خواہ کچھ کہے وہ آزادی کا تہیہ کر چکے ہیں۔

ایری ٹیریا کے محاذ آزادی کی تنظیم بارہ برس پہلے عمل میں آئی تھی۔ اس کے ممبروں کی بڑی تعداد عدن میں ٹریننگ حاصل کرتی ہے۔ بہت سے چین میں بھی تربیت حاصل کرتے ہیں اور بحر احمر گویا ایک ہزار میل لمبی سوڈانی سرحد پار کرکے ایری ٹیریا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

محاذ آزادی میں مسلمان اور عیسائی دونوں ہی شامل ہیں لیکن عملاً اب وہ عربوں کی ہی تنظیم بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس کا صدر مقام دمشق (شام) میں ہے۔

حبشہ کی حکومت نے ایری ٹیریا میں ہنگامی صورت حال کا اعلان کر رکھا ہے اور اس صوبہ کی بیس لاکھ کی آبادی پر فوج کی حکمرانی تھوپ رکھی ہے۔ لیکن اس قسم کے اقدامات آزادی کے جذبہ کو نہیں دبا سکتے۔

تین ماہ قبل آزادی چاہنے والوں کے خلاف جارحانہ کاروائی بھی شروع ہو گئی اور ویٹ نام کے طرز پر تقریباً دو سو ۲۰۰ دیہات کی "قلعہ بندی" کی گئی۔ لیکن چھاپہ ماروں کے حوصلے پست نہ کئے جا سکے۔

ایری ٹیریا جیسا کہ اس سے قبل بھی لکھا جا چکا ہے، ۱۸۸۵ء میں ایک اطالوی نوآبادی بنا لیا گیا تھا اور ۱۹۴۱ء تک اس پر اٹلی کا تسلط رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایری ٹیریا کو اقوام متحدہ کے فیصلہ نے اس کی خود مختاری قائم کرتے

سلاسی کا جبر و تشدد حریت پسندوں کے ارادوں کو نہیں بدل سکتا

محاذ آزادی کے کچھ مجاہد حملہ کرتے ہوئے۔

جنرل اسٹینر

سوڈان کے فوجی باغی

ہوئے حبشہ کے حوالہ کر دیا لیکن ۱۹۶۲ میں حبشہ نے اپنے یکطرفہ فیصلہ کے تحت اس کی خود مختاری کو ختم کر دیا۔ اور اسے اپنے دوسرے صوبوں کے برابر حیثیت دیدی۔ اسکا قدرتی طور پر سخت ردِ عمل ہونا تھا چنانچہ اس علاقہ کے لوگوں نے آزادی کی تحریک شروع کر دی۔ محاذ آزادی کا جسکے لڑتے والے سپاہیوں کی تعداد تین ہزار ہے پورے دیہی علاقہ پر اثر ہے لیکن کنٹرول نہیں ہے۔ حبشہ کے ایک بریگیڈیر جنرل نے حال ہی میں کہا کہ "یہ چھاپہ مار محض گھات لگا کر حملہ کرنے کے ماہر ہیں۔ کسی ایک جگہ جم کر ودمنٹ نہیں لڑ سکتے" لیکن وقت آئیگا جب وہ جم کر بھی لڑیں گے اور اپنی آزادی حاصل کر کے رہیں گے۔ شہنشاہ ہیل سلاسی کا جبر و تشدد حریت پسندوں کو ان کے مقصد کے حصول سے نہیں روک سکتا۔ شہنشاہیت زیادہ دن نہیں چل سکتی •

سوڈان

سوڈان کے ۴۱ سالہ جنرل جعفر نمیری کو جنوب کے ساٹھ لاکھ کالوں کی بغاوت کا سامنا ہے۔ (شمال میں ۱۰ لاکھ عرب اور تیس لاکھ کالے ہیں) جنوب کے لوگ خود مختاری کا مطالبہ کر رہے ہیں کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ نظام حکومت میں شمال کے عرب انھیں حقیقی اختیارات دینے والے نہیں ہیں۔ شمال کے طور پر ۱۹۵۰ء میں آزاد ہونے پر ۸۰۰ سرکاری ملازمتوں میں سے ۷۹۶ پر شمال والوں نے قبضہ کر لیا۔ گزشتہ دسمبر سے جنوب کے تین صوبوں میں حکومت کے خلاف گوریلا جنگ جاری ہے اور اسے دبانے کے لئے واقعات نگار دہلی

پوری طاقت استعمال کیجا رہی ہے۔ یوگینڈہ کی سرحد کے قریب باغیوں کے ایک اڈے پر بمباری کی گئی جس کے نتیجے میں ایک ہزار شہری ہلاک و مجروح ہو گئے۔

جنوب کے باغی ہر جگہ کے باغیوں کی طرح باہر سے مدد لے رہے ہیں۔ ایک خبر ہے کہ اسرائیل نے پیراشوٹ کے ذریعے ان باغیوں کو اسلحے کی امداد دی ہے۔ سوڈان اسرائیل کے خلاف عرب محاذ میں شامل ہے اس لئے یہ قدرتی تھا کہ سوڈان کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے باغیوں کو مدد دے۔ علاوہ ازیں حبشہ بھی بالواسطہ طور پر باغیوں کی مدد کر رہا ہے۔ حبشہ سوڈان سے اس لئے ناراض ہے کہ وہ ایری ٹیریا کے باغیوں کو سوڈان کی سرحد پار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

پچھلے دنوں تک ایک جرمن نژاد فوجی رالف اسٹینر نے بھی جنوبی سوڈانیوں کی بڑی مدد کی ہے۔ وہ ہند چینی، الجزائر اور بیافرا میں لڑ چکا ہے۔ اس نے تیرہ ماہ تک جنوبی سوڈانیوں کو حکمراں عربوں کے خلاف لڑنے کی ٹریننگ دی۔ ایک ملاقات میں اس نے کہا کہ "یہ لوگ آپس میں تو خوب لڑتے ہیں لیکن جب عربوں سے مقابلہ ہو تو اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں"

گزشتہ سال کے آخر میں یوگینڈا کی حکومت اسٹینر کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی جب وہ جنگ کے علاقے سے باہر چھٹی منا رہا تھا۔ تین ماہ یوگینڈا کی جیل میں رکھ کر حکومت نے اسے سوڈانی حکام کے حوالے کر دیا اب وہ خرطوم کی جیل میں ہے جہاں جلد ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ مشرقی جرمنی کے تقریباً پچاس ماہرین جو سوڈانی حکومت کو اس کی سلامتی کے بارے میں مشورے دے رہے ہیں اس کے خلاف مقدمہ تیار کر رہے ہیں۔ اسٹینر کو شاید پھانسی دیدی جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ جو کچھ ہو اگر جنوبی سوڈانیوں کی اقتصادی بدحالی دور کرنے کی طرف توجہ نہ دی گئی تو شاید موجودہ بے چینی دور نہ ہو سکے گی۔

اقتصادی اور سماجی عدم مساوات کا جب لوگوں کو احساس ہو جائے تو مذہبی رشتہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔

"ارے یہ سب شادی سے پہلے کے چونچلے ہیں ذرا شادی ہو جانے دو پھر دیکھنا یہی اسے منو کی اماں کہہ کر پکارے گا۔"

مسٹر جناح کی پیش گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے

پاکستان بٹوارے کے دہانے پر

۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے بعد مسٹر جناح نے کہا تھا "اگر ہم نے اپنے آپ کو پہلے بنگالی، پنجابی اور سندھی کہنا شروع کر دیا اور بعد میں مسلمان اور پاکستانی تو پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا"۔

مسٹر جناح کی یہ پیشگوئی صحیح ہوتی نظر آرہی ہے۔ اور دنیا کا پانچواں سب سے زیادہ گنجان آبادی والے ملک پاکستان کا دو حصوں میں بٹ جانا یقینی سمجھا جا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے تسلیم شدہ واحد لیڈر شیخ مجیب الرحمن کا اعلان ہے کہ —

"پاکستان جس صورت میں کہ اب تک قائم تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ اس بارے میں سمجھوتہ کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی"۔

ابتدا میں شاید سمجھوتہ کی کوئی صورت نکل سکتی تھی کیونکہ شیخ نے اپنے چھ نکاتی پروگرام کے تحت مکمل آزادی کا نہیں بلکہ سیاسی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن پیپلز پارٹی کے صدر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے دباؤ میں آکر صدر یحییٰ خاں نے جو روش اختیار کی اور جس طرح مشرقی پاکستان کے مارشل لاء حکام کی طرف سے احکام جاری کئے گئے ان کی بنا پر شیخ کا سر دینے پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان کا شہری نظم و نسق کو ہاتھ میں لینا اور نیم فوجی دستوں کو جنہیں مارشل لاء حکام نے فوراً کام پر واپس آنے اور بصورت دیگر — فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کی دھمکی دی تھی۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کی ہدایت دینا اس امر کا مظہر ہے کہ اب وہ مغربی پاکستان سے کٹ کر اپنی دنیا الگ بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوقت وہ مشرقی پاکستان کے عملی حکمراں ہیں اور شہری نظم و نسق ان ہی کی ہدایت کے مطابق چل رہا ہے۔ حکمراں طبقہ کے خلاف کسی قوم کے اتنے مستحکم اتحاد کی بہت کم مثالیں ملیں گی۔

صدر یحییٰ خاں بھاگم بھاگ ڈھاکہ پہونچے ہیں اور انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ شیخ مجیب الرحمن سے بات چیت کی ہے۔ انکی کوشش ہے کہ مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکا تو مشرقی پاکستان کے عوام اور وہاں تعینات ۶۰ ہزار فوج کے درمیان جسکا زیادہ حصہ مغربی پاکستانیوں پر مشتمل ہے — تصادم ناگزیر ہے۔ اسے خانہ جنگی قرار دیا جا سکتا ہے جس پر ایک پڑوسی ملک کی حیثیت سے ہندوستان کو یقیناً تشویش ہوگی۔

مشرقی پاکستان میں ایسے حالات کیوں پیدا ہوئے اور شیخ مجیب الرحمن یا دوسرے بنگالی لیڈروں کو الگ ہو جانے کا جذبہ کیوں پیدا ہوا اس کا اگر عمیق نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا اس کی تمامتر ذمہ داری مغربی پاکستان کے حکمراں طبقے پر ہے۔ مشرقی پاکستان کو شکایت ہے کہ پاکستان کو ملنے والی غیر ملکی امداد کا ستر فیصدی حصہ مغربی پاکستان میں خرچ کیا جاتا ہے جبکہ مشرقی پاکستان کی ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ کی آبادی کے مقابلہ میں مغربی پاکستان کی آبادی صرف پانچ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔ غیر ملکی امداد ہی نہیں بلکہ ۸۰ فیصدی درآمدی سامان بھی مغربی پاکستان ہی میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں سرکاری ملازمتوں میں ۸۵ فیصدی اور فوج میں ۹۰ فیصدی مغربی پاکستان کا حصہ ہے۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں جو دنیا سے

شیخ مجیب الرحمن ووٹ ڈالتے ہوئے

"ہم بنگال میں سیکولر، جمہوری، سوشلسٹ حکومت کا قیام عمل میں لائیں گے۔"
(مجیب)

کا حکم چل رہا ہے اور عملاً مشرقی پاکستان یا "بنگلا دیش" کے اصل حکمراں وہی ہیں۔

یحیٰی خاں نے ۲۵ مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا ہے لیکن آثار وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید عوامی لیگ اس میں شامل نہیں ہوگی۔ اس سے پہلے اجلاس کا بائیکاٹ مسٹر بھٹو کی پارٹی نے کیا تھا اور اس بار شیخ ناراض ہیں۔
اس قسم کے اعلانات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ طاقت کے ذریعہ اگر کوئی قوم دوسرے لوگوں پر اپنا غلبہ رکھ سکتی تھی تو برطانیہ کی عظیم سلطنت جس میں سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا،

ن ترین آباد علاقوں میں سے ایک ہے (۱۳۰۰ اشخاص
ع میل) غربت وافلاس کا دور دورہ ہے۔ یہ تو تھی مشرقی
ان کو مغربی پاکستان سے شکایت لیکن خود مغربی پاکستان
صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کو اور ہندوستان سے
رنے والے لوگوں کو شکایت ہے کہ ہر شعبۂ زندگی پر
چھائے ہوئے ہیں اور وہ کسی کو اپنے مقابلے میں نہیں
رتے حتیٰ کہ سرکاری ملازمین میں بھی دوسروں کے ساتھ
برتا جاتا ہے۔ مغربی پاکستان کے لوگوں کی بے چینی ابھی دبی
ہے لیکن مشرقی پاکستان میں جو غبار عرصہ سے جمع ہو رہا
دھماکا بن کر پھٹ پڑا ہے۔
صدر ایوب۔ مشرقی پاکستان کی اس بے چینی کو
کیلئے دبانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن دو سال
رقی پاکستان کے ساتھ اپنی بے توجہی کی بنا پر ہی انہیں
ہدے سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔
صدر یحیٰی خاں ان کے جانشین بنے۔ اگرچہ وہ ایک
لعنان حکمراں ہیں لیکن معقول ذہن رکھتے ہیں اور اسی
وں نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یقین دلایا کہ
ت میں ان کا حصہ دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ اسی مقصد
وں نے گذشتہ دسمبر میں انتخابات کرائے۔ لیکن انہیں یہ
نی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے حامی اتنی بڑی تعداد میں کامیاب
گے۔ ان کا خیال تھا کہ عوامی لیگ ۳۱۹ کے ایوان میں
پاکستان کیلئے ۱۶۹ الاٹ شدہ سیٹوں میں سے
سے زیادہ ساٹھ فیصدی سیٹیں لے سکے گی اور اسطرح
پاکستان کے نمائندے مشرقی پاکستان کے چالیس فی
نمائندوں کے ساتھ مل کر ملک کا نظم ونسق چلا سکیں گے۔

لیکن عوامی لیگ نے چھ نکاتی پروگرام کا جو نعرہ دیا اس نے مشرقی پاکستان کے تقریباً سب ہی باشندوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور مغربی پاکستان بہ الفاظ دیگر پنجاب کی گرفت سے نجات حاصل کرنے کے لئے پوری قوم نے متحد ہوکر عوامی لیگ کے ۱۶۷ امیدواروں کو کامیاب کرا دیا۔
دوسری طرف مغربی پاکستان میں مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی ابھر کر سامنے آئی۔ اور اس نے مغربی پاکستان کی ۱۴۴ سیٹوں میں سے ۸۳ سیٹوں پر قبضہ کر لیا۔ دونوں پارٹیوں کی پالیسیوں میں بعد المشرقین ہے۔ اسی لئے انتخابات کے نتائج سامنے آنے کے فوراً بعد یہ خدشات پیدا ہو گئے تھے کہ پاکستان کے دونوں حصے ایک ساتھ نہ رہ سکیں گے۔
انہی خدشات کے پیش نظر ۴۳ سالہ مسٹر بھٹو مشرقی پاکستان پہنچے تاکہ ۴۸ سالہ شیخ مجیب الرحمٰن سے بات چیت کرکے سمجھوتہ کی کوئی صورت نکال سکیں۔ لیکن وہ انہیں موم نہ کر سکے۔
شیخ نے اپنے چھ نکاتی پروگرام میں تبدیلی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تاہم انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ "میں اپنے اس پروگرام کو مغربی پاکستان پر نہیں تھوپ رہا ہوں البتہ بنگلا دیش کے لوگ اس کے حقدار ہیں اور وہ اپنے اس حق کو حاصل کر کے رہیں گے۔"
اس چھ نکاتی پروگرام کو کامیاب بنانے کیلئے شیخ مجیب الرحمٰن نے عدم تعاون کی تحریک شروع کر رکھی ہے۔
اگرچہ ریڈیو پاکستان پر تفصیل سے اسکی خبریں نہیں آ رہی ہیں لیکن جو بھی اطلاعات مل رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری شعبوں میں کام کرنے والے تمام لوگ شیخ کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ عدالتوں تک میں شیخ مجیب الرحمٰن

مشرقی بنگال میں ہر روز لاکھوں لوگ شیخ مجیب الرحمٰن کی حمایت میں مظاہرہ کر رہے ہیں۔ شیخ نے الزام لگایا ہے کہ فوج نے ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے

تحلیل نہ ہو جاتی۔ اسی لئے پاکستان کی سالمیت بھی طاقت کے سہارے قائم نہیں رکھی جا سکتی بلکہ بنگالیوں اور سب صوبوں کے باشندوں کے دلوں کو بدلنے اور سب کو مطمئن رکھنے کے بعد ہی قائم رکھی جا سکتی ہے۔ علاقائی عصبیت صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان اور دنیا کے ہر حصہ میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ جب بھی کسی علاقے یا صوبے کی حق تلفی یا اس کے ساتھ بے انصافی ہوگی علیحدگی کا مطالبہ ابھر کر سامنے آ جائیگا۔ ●

یہاں کلے کی ہمت جواب دے گئی

فریزیئر شدید ترین چوٹ لگنے کے
باوجود کلے سے مقابلہ کرتا رہا۔

باکسنگ کے اس تاریخی مقابلہ کے بعد
کلے نے کہا کہ میں فریزیئر سے پھر مقابلہ کروں گا۔

لڑائی کے بعد فریزیئر اور کلے۔ فریزیئر کے منہ اور دانتوں سے خون بہہ رہا ہے۔

پچھلے دنوں برطانیہ کے شہزادہ فلپ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن فجی کے دورے پر گئے جب ان کی یاچ فجی کے ساحل پر پہنچی تو ۳۰ فجینیوں نے آگے بڑھ کر اسے کندھے پر اٹھا لیا اور ساحل پر لے آئے۔ یہ اس لئے کیا گیا تاکہ پانی میں چلنے سے ان کے پاؤں نہ بھیگ جائیں ۔

امریکہ، وینا
غلطی کر رہا
ہو رہے ہیں
پچھلے دنوں
کانگریس کے

بمبئی کے مچھیروں نے ماھم کے ساحل پر ایک ۲۵ فٹ لمبی ۴ فٹ اونچی اور چھ فٹ چوڑی مچھلی پکڑی۔ یہ مچھلی رھاٹنوڈرن قسم میں سے ھے اور ۵۰ فٹ کی لمبائی تک بڑھ سکتی ھے

لاؤس میں امریکہ کا تباہ شدہ ھیلی کوپٹر ——— فسطائیت کا

ایک امریکی سائنس داں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ھے جس سے رات کے اندھیرے میں بھی دیکھا جا سکتا ھے اپنی طرف آنیوالی روشنی کو ۴۵۰۰۰ گنا زیادہ کر دیتا ھے۔ ھندوستانی حساب سے اس آلہ کی قیمت تقریباً ۲۸ ہزار روپے ھے ۔

جن سنگھ سے جب کچھ نہ بن پڑا تو اس نے فسادات کرا دیئے۔ علی گڑھ ان فسادات کا نشانہ بنا۔

ھر روز درجنوں ہندوستانی برطانیہ میں داخل ھونے سے روک دیئے جاتے ھیں یہ ھندوستانی افریقہ سے آنیوالے برطانوی شہری ھیں۔ تصویر میں کچھ ھندوستانی لندن میں مظاھرہ کر رہے ھیں

[illegible]داخلت کرنے کے بعد لاؤس میں مداخلت کرنے کی
کے درجنوں ہیلی کوپٹر اور ہوائی جہاز تباہ
میں پیچھے ہٹ رہی ہیں۔
[illegible]خلاف احتجاج کے طور پر کسی نے امریکی
[illegible] اڑا دیا۔

دہلی میں پارلیمنٹ کے اجلاس سے دو دن پہلے کانگریس پارلیمانی بورڈ کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں شریمتی اندرا گاندھی کو متفقہ طور پر پارٹی لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ تصویر میں وائی۔ بی۔ چوہان تقریر کر رہے ہیں پیچھے مسز گاندھی اور جگ جیون رام بیٹھے ہیں

"مجھے اپنے ہارنے کا افسوس نہیں ہے افسوس ہے تو اندرا کے جیتنے کا۔"
(تارکیشوری سنہا)

روسی سائنس داں پروفیسر گراسیمی نے تیمور لنگ کی کھوپڑی کی مدد سے اس کا چہرہ تیار کیا ہے۔ اوپر تیمور لنگ کی کھوپڑی۔ نیچے اس کا خیالی چہرہ

دنیا کے سب سے زیادہ شہرت یافتہ کنوارے کینیڈا کے ۴۵ سالہ وزیر اعظم ٹروڈیو تھے لیکن پچھلے دنوں ان کی شادی ۲۲ سالہ حسینہ مارگریٹ سے ہو گئی۔

نئی پارلیمنٹ

چوتھی لوک سبھا کا اجلاس جب ختم ہو رہا تھا تو مسٹر ایس ایم بنرجی نے اپنے ساتھیوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا "پھر ملیں گے اگر خدا لایا" اس وقت دراصل وسط مدتی انتخاب کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اور یہ یقین نہ تھا کہ سب ہی ممبران دوبارہ منتخب ہو کر آجائیں گے لیکن یہ یقین بھی نہ تھا کہ بڑی بڑی توپیں لڑھک جائیں گی۔ گذشتہ جمعہ کو جب پانچویں لوک سبھا کا اجلاس شروع ہوا تو ایس۔ ایم بنرجی تو موجود تھے لیکن آنکھیں رام سبھاگ سنگھ (سنڈیکیٹ)۔ این جی رنگا سوتنتر، مسٹر ایس۔ ایم۔ دویدی ای۔ ایس۔ پی ہالاچ کمنانندیس (ایس۔ ایس۔ پی) ایس۔ کے پاٹل اور مسز تارکیشوری سنہا (ادون سنڈیکیٹ) جیسے مشہور ممبران کو دیکھنے کیلئے ترس رہی تھیں۔ لوک سبھا کا "چہرہ" بالکل بدل گیا تھا۔ پارٹیوں کے لحاظ سے بھی کہ بعض کا بالکل وجود ہی مٹ گیا اور عمر کے لحاظ سے بھی کہ پہلے سے زیادہ نیا خون آگیا۔ تقریباً نصف ممبران ایسے ہیں جن کی عمر چالیس سے کم ہے۔ کرپلانی جیسے بوڑھوں نے پہلے ہی انتخاب نہ لڑا تھا۔ شاید انھیں ہوا کے رخ کا احساس ہو گیا تھا۔ اور کچھ کو عوام نے اپنے گھروں میں بٹھا دیا۔ ہاں سیٹھ گووند داس کو چھوڑ دیا۔ غالباً اس لئے کہ ان کے ذریعہ حلف دلوانا تھا۔ وہ ۴۸ برس سے جبلپور کے حلقہ سے مسلسل منتخب ہو کر آ رہے ہیں۔ یہ چوتھا موقع تھا کہ انھوں نے معمر اور سینیئر ممبر کی حیثیت سے اسپیکر کے فرائض انجام دیئے اور ممبروں سے حلف اٹھوایا۔ پہلے دن ۴۷۰ ممبروں نے حلف لیا اور باقی نے پیر کے دن (ہفتہ اتوار دو دن چھٹی)

پانچویں لوک سبھا جو اس بار منتخب ہو کر آئی ہے اسکی نوعیت پچھلی لوک سبھاؤں کے مقابلہ میں بالکل مختلف ہے۔ پہلی تین لوک سبھاؤں میں بھی کانگریس کو دو تہائی اکثریت حاصل تھی۔ لیکن ان میں ایسے ممبر بھی تھے جو سوشلزم یا سماجی انصاف میں یقین نہ رکھتے تھے۔ کچھ نہ کم ایک درجن سابق حکمران پارٹی میں شامل تھے جنھوں نے ہمیشہ ہر ترقی پسندانہ پروگرام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی۔ ۱۹۶۷ء کے الیکشن میں جبکہ کانگریس دو تہائی اکثریت حاصل نہ کر سکی، قدامت پسندوں کو اور زیادہ غلبہ حاصل رہا اور کانگریس پارٹی "غریبی ہٹاؤ" سے متعلق اپنے دس نکاتی پروگرام کو بھی بھول گئے اور ان تمام وعدوں کو بھی جو الیکشن مینی فیسٹو میں کئے گئے تھے۔ نتیجہ میں کانگریس تقسیم ہو گئی اور اسکی بڑی لمبی کہانی ہے، مختصر یہ کہ قدامت پسند، رجعت پسند اور سرمایہ دارانہ ذہن رکھنے والے ایک طرف ہو گئے اور کانگریس سوشلسٹ پروگرام کو اپنانے والے دوسری طرف۔ عوام نے آخر کار انکو چن لیا۔

دوسرے الفاظ میں کانگریس ٹکٹ پر آنیوالے تمام ممبران ایک واضح پروگرام کی بنیاد پر منتخب ہوئے ہیں اور وہ الیکشن مینی فیسٹو میں کئے گئے تمام وعدوں کو پورا کرنے کے پابند ہیں۔ وہ اپنے تمام وعدوں کو پورا کریں گے اس کی توقع اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ اس بار کانگریس پارٹی میں انقلابی ذہن رکھنے والے ممبروں کا غلبہ ہے۔ جن پر یقین ہے کہ وہ اپنے فرض سے کبھی غافل نہیں ہوں گے۔

دوسری طرف حزب اختلاف کا ڈھانچہ بھی بالکل بدل گیا ہے۔ مخالف ممبروں کی تعداد گھٹ کر پہلے کے مقابلہ ایک تہائی رہ گئی ہے اور اسکا اثر دائیں بازو کی پارٹیوں پر پڑا ہے۔ سنڈیکیٹ کانگریس، جن سنگھ اور سوتنتر پارٹیوں کی نمایاں حیثیت بالکل ختم ہو گئی۔ بالخصوص سنڈیکیٹ کا جو اپنے ۶۵ ممبروں کے ساتھ چند ماہ تک لوک سبھا کے مطابق پہلی تسلیم شدہ حزب اختلاف کی حیثیت سے چھائی رہی برا حال بنا۔ وہ ۱۶ سیٹوں سے زیادہ نہ لے سکی۔ اور مخالف جماعتوں میں پانچویں نمبر پر پہنچ گئی۔ جو تھا نمبر جن سنگھ کو ملا نے دعویٰ کیا تھا کہ ملک میں متبادل حکومت صرف وہی بنا سکتی ہے۔ اس کے صرف ۲۲ ممبر کامیاب ہوئے جبکہ پچھلی لوک

صدر وی۔ وی گری، موہن کمار منگلم کو وزارت کا حلف دلا رہے ہیں

مرارجی کے صوبے سے نئی کانگریس کے امیدوار

ششی بھوشن

ملاقات نئی دہلی

راج بہادر

ایچ۔ آر۔ گوکھلے

معین الحق چودھری

سدھارتھ شنکر رے

اس کے ممبروں کی تعداد ۴۳ تھی۔ اور ان ۲۲ کامیاب
والے ممبروں میں بھی گیارہ مدھیہ پردیش کے مدھیہ بھارت
کے علاقہ سے کامیاب ہونے والے ممبر شامل ہیں۔ یعنی سابق
راجوں کے گڑھ سے۔ دلی میں جن سنگھ کا "دبدبہ" بالکل
ختم ہوگیا۔ عوام نے اس کی پالیسی اور طریقہ عمل کو قطعی طور
مسترد کردیا۔ راجدھانی کو جن سنگھ "اپنا ایک مضبوط قلعہ
سمجھتا تھا۔ یہ "قلعہ" بالکل مسمار ہوگیا اور وہ ایک سیٹ
بھی حاصل نہ کرسکا۔

سوتنتر پارٹی صرف ۸ ممبروں کو کامیاب کرا سکی جبکہ
پچھلی لوک سبھا میں اس کے ممبروں کی تعداد ۳۵ تھی ——
ایس ایس پی، جن کے ۲۱ ممبر پچھلی لوک سبھا میں ادھم مچایا
کرتے تھے۔ اس کے ٹکٹ پر صرف ۳ ممبر کامیاب ہو سکے۔
جن سنگھیوں اور رجعت پسندوں و تنگ نظروں کے ساتھ ناپاک
گٹھ جوڑ کرنے پر سوشلزم کی دعویدار اس جماعت کو عبرتناک
سزا مل گئی۔ "اندرا ہٹاؤ" نعرہ کا جواب مل گیا۔ بی کے ڈی
کی حیثیت تو بالکل ہی ختم ہوگئی۔ پہلے بھی کوئی حیثیت نہ تھی
پھر بھی دو چار ممبر تھے۔ لیکن اس بار اسکا صرف ایک ممبر
آ گیا اور وہ بھی علی گڑھ میں فساد اور فرقہ وارانہ جذبات کو
بھڑکانے کے بعد۔ یوں کہیئے کہ دائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے
والی تمام جماعتوں کا "بیڑا" ہوگیا۔ اس کے برعکس بائیں بازو
کی پارٹیوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی پوزیشن کو برقرار رکھا ہے بلکہ
اسے بہتر بنایا ہے۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی نے مخالف پارٹیوں
میں سب سے زیادہ یعنی ۲۵ سیٹیں حاصل کی ہیں جبکہ کمیونسٹ
پارٹی نے ۲۴ پر قبضہ کیا۔ اور ۲۳ سیٹیں ڈی ایم کے کو ملیں
بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جمہوری پارٹیوں کی مجموعی تعداد
۷۷ ہے جبکہ دائیں بازو کی جماعتوں کے صرف پچاس ممبر ہیں
پچھلی لوک سبھا میں دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مخالف ممبروں
کا غلبہ تھا اور انکی تعداد ڈیڑھ سو سے اوپر تھی۔ لوک سبھا
کے ڈھانچہ کی اس تبدیلی سے ایوان کی کارکردگی میں یقیناً
فرق آئیگا۔ حکومت "غریبی ہٹاؤ" کے اپنے پروگرام کو جامۂ
عمل پہنانے کیلئے تیزی سے کام کریگی۔ البتہ عام تماشائی
ایک بات سے محروم رہیں گے۔ یہ کہ وہ پچھلی مارکیٹ کے ان
نظاروں کو نہ دیکھ سکیں گے جو پچھلی لوک سبھا میں دیکھنے میں آتے
تھے۔ ●

کمیونسٹ پارٹی (مارکسٹ) کے
اے۔ کے۔ گوپالن جو حزب مخالف
کی سب سے بڑی پارٹی کے لیڈر
منتخب کئے گئے

مکل بنرجی

تحریک آزادی
کی عظیم مجاہدہ
سبھدرا جوشی

ہنگامہ آرائیاں اور ظلم و تشدد ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتا

...پولنگ کے نتائج
...ایک سبق ہیں

...بھا کے حالیہ الیکشن کے نتائج ان جماعتوں
...تی ہیں جو عوام میں رجعت پسند و قدامت پرست مشہور
...عتوں نے کامیابی حاصل کرنے کیلئے باہم گٹھ جوڑ
...یہ گٹھ جوڑ خود انکی موت کا سبب بن گیا۔ پارلیمنٹ
...تی دل کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اسکا صرف ایک ممبر
...تا مگر کسی سیاسی نظریہ کی بنا پر نہیں بلکہ دھینگا
...گڈھ میں فساد برپا کرانے کے نتیجے میں۔ ایس ایس
...یکدم صفایا ہوگیا اور اس کے ۲ ممبروں میں سے
...گئے۔

...ی کیٹ کانگریس جس کے ممبروں کی تعداد پچھلے
...تھی اس کے صرف سولہ ممبر کامیاب ہوسکے اور
...ی تو ہیں جن میں خود پارٹی لیڈر ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ
...ہیں لڑھک گئے۔ جو پارٹی حکومت کی باگ ڈور
...کے خواب دیکھ رہی تھی وہ ایوان میں ایک موثر حزب
...ی نہ بن سکی۔ اس پارٹی کی یوں سمجھیے کہ سیاسی موت

...سنگھ اقتدار کے لحاظ سے مقابلتاً زیادہ ٹوٹے ہیں
...اور اس کے صرف ۱۱ ممبر کم آئے ہیں یعنی ۳۳ کی جگہ
...گر کامیاب ہونے والے ممبروں پر نظر ڈالی جائے
...گا کہ اسکا صرف ایک محدود علاقہ میں اثر ہے۔
...سکے ۱۱ ممبر مدھیہ پردیش کے اس علاقہ سے کامیا
...ایک زمانے میں مدھیہ بھارت کے نام سے موسوم
...چار سیٹیں راجستھان سے لی ہیں۔ مدھیہ پردیش
...سیٹیں سابق راجواڑوں کے اثر میں تھیں

جن سنگھ کی پشت پناہ، گوالیار کی راج ماتا

جو جن سنگھ کی پشت پناہی کررہے تھے۔ ان کی کامیابی میں جن سنگھ کے سیاسی نظریہ کو کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح سوتنتر پارٹی کے آٹھ ممبروں کی کامیابی سابق حکمرانوں اور سرمایہ داروں کی سرپرستی کی مرہون منت ہے۔ اسکے آٹھ ممبروں میں سے صرف تین راجستھان سے کامیاب ہوئے ہیں جو سابق رجواڑوں کا گڑھ ہے۔

ان تمام پارٹیوں کی سرمایہ دارانہ اور رجعت پسندانہ پالیسی کو عوام نے مسترد کردیا۔ کے کے برلا اور ٹاٹا جیسے سرمایہ داروں کو بھی قبول نہ کیا جو آزاد امیدوار کے طور پر کھڑے ہوئے تھے، وہ بیچارے اپنی ضمانتیں تک نہ بچا سکے۔ اصل میں ملک کا رجحان سوشلزم کی طرف ہے، ایسی معیشت کی طرف ہے جس میں سب ساجھے دار ہوں۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو اب عوام برداشت نہیں کرسکتے۔ کانگریس نے ان تمام بے انصافیوں کو ختم کرنے اور ملک میں ایسا سماج لانیکا وعدہ کیا جس سے عدم مساوات کو بڑی حد تک ختم کیا جاسکے تو عوام اسکے پیچھے آگئے۔ کانگریس کی جیت حقیقت میں سوشلسٹ نظریات کی جیت ہے، سیکولر جمہوریت کے ان اصولوں کی جیت ہے جنکی بنیاد پر اس ملک کا ڈھانچہ کھڑا ہوا ہے۔ رجعت پسند اور قدامت پرست پارٹیاں اس ڈھانچہ کو گرانے پر تلی ہوئی تھیں، لیکن عوام نے انکا کان پکڑکر ہندوستان کے مطلع سیاست سے انھیں اس طرح باہر نکال پھینکا جسطرح دودھ میں سے مکھی کو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ تقریباً سب ہی پارٹی لیڈروں نے اپنی شکست کو تسلیم کرلیا ہے لیکن نجلنگپا جی اب بھی "جمہوریت کو زندہ رکھنے کیلئے" اپنی جماعت کو مضبوط بنانے کی باتیں کررہے ہیں۔ یہ لوا بھی نہیں تو کیا ہے۔ ●

صوبے

یوپی

یوپی میں ٹنی رام کے ضمنی انتخابات میں مسٹر ٹی۔ این سنگھ (وزیر اعلیٰ) کی ناکامی اس بات کا ثبوت تھا کہ اس ریاست میں سنڈی کیٹ کانگریس پر عوام کو اعتماد نہیں ہے۔ ٹی۔ این سنگھ کو اسی وقت مستعفی ہوجانا چاہیے تھا جب انھیں عبرتناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ دل کی پارٹیوں نے انھیں مارکوٹ کر ان کی کرسی پر بٹھائے رکھا۔ شاید انھیں توقع تھی کہ وہ لوک سبھا کے الیکشن میں اپنی حقیقت عوام سے منوالیں گے چنانچہ الیکشن پر اس مقصد کے لئے بڑی بڑی چالیں چلی گئیں، جگہ جگہ ہنگامے کرائے گئے، فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ کیا گیا، ذات پات کے جھگڑے اٹھائے گئے، علی گڑھ اور مرادآباد وغیرہ میں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا۔ ہریجنوں اور پسماندہ لوگوں کو ووٹ دینے سے روکا گیا۔ ٹی۔ این سنگھ نے گمراہ کن بیانات دیئے اور اپنی مطلب براری کے لئے فرقہ وارانہ اشتعال پھیلایا۔ لیکن۔

"الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا"

لوک سبھا کی ۸۵ سیٹوں میں سے سنڈی کیٹ صرف ایک سیٹ لے سکی عوام نے جن سنگھیوں اور سرمایہ پرستوں کے ساتھ ساز باز کرنیوالی

...لنگپا کی صدا انہیں لے ڈوبی۔ سنڈیکیٹ کی کمر ٹوٹ گئی

ٹی این سنگھ بدستور وزیر اعلیٰ ـــ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی

سی۔ پی۔ گپتا

ڈنڈے تو بہت چلائے لیکن....

اس کنڈم جماعت کو بالکل مسترد کر دیا۔ ایسی صورت میں مسٹر ٹی۔ این۔ سنگھ کو ایک منٹ بھی اپنی گدی پر نہ رہنا چاہئے تھا اور انھوں نے اس کا فیصلہ بھی کر لیا تھا لیکن ان کے "ہمدردوں" یا کہئے خود اپنے مفادات کی حفاظت کرنے والوں نے انھیں پھر ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ انھیں مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے عہدے پر بدستور کام کرتے رہیں اور اپنی بے اصولی حکومت کو برقرار رکھیں ـــ شاید مسٹر نجلنگپا کے الفاظ میں ایسا "جمہوریت کو مضبوط بنانے" کے لئے کیا گیا ہے۔ لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی، مسٹر ٹی۔ این۔ سنگھ کو بہرحال عوام کے روبرو جانا ہوگا کیونکہ وہ انتخابات میں کامیاب ہوئے بغیر چھ ماہ سے زیادہ وزیر اعلیٰ نہیں رہ سکتے۔ عوام ایک مرتبہ انھیں "رجیکٹ" کر چکے ہیں دوسری مرتبہ بھی یقیناً ان پر اظہار بد اعتمادی کریں گے اور اس وقت وزارت کے کوچے سے انھیں بہت بے آبرو ہو کر نکلنا ہوگا۔ اس وقت نکل آتے تو راجیہ سبھا میں انکی پچھلی سیٹ موجود تھی۔ خاموشی سے آکر اس پر بیٹھ جاتے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ٹی۔ این۔ سنگھ کو خود کنڈم پارٹیوں کی فٹبال بننے میں مزہ آ رہا ہے۔

گجرات

سنڈی کیٹ وزیر اعلیٰ مسٹر ہتیندر ڈیسائی الیکشن سے پہلے اپنی سنڈی کیٹی حکومت کو بچانے کی کوششوں میں مصروف تھے کابینہ میں ریکارڈ توڑ اضافہ اسی لئے کیا گیا تھا تاکہ کسی طرح حکومت بچ سکے۔

دوران الیکشن بھی ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے گئے اور ایسے شرپسندوں کی خدمات حاصل کی گئیں جو پوری ریاست میں خوف و دہشت پھیلا سکیں۔ ان میں آر۔ ایس۔ ایس کے والنٹیر پیش پیش تھے۔ ایک نوجوان دھیرج لال پٹیل کو جو ایک معروف کمیونسٹ لیڈر کا لڑکا تھا دن دھاڑے اس لئے قتل کر دیا گیا کہ وہ مسٹر مرارجی کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے چوکھا والا کی حمایت میں الیکشن پروپیگنڈہ کر رہا تھا۔ ان سب حرکتوں کا مقصد سنڈی کیٹی امیدواروں کو کامیاب کرانا تھا۔

ہتیندر ڈیسائی

حکومت خطرے میں ـــ

تشدد کے واقعات صرف سورت تک محدود نہیں رہے جہاں سے مسٹر مرارجی الیکشن لڑ رہے تھے بلکہ بڑودہ اور احمد آباد میں بھی ایسی ہی متشددانہ سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں ـــ بڑودہ میں آر۔ ایس۔ ایس کے والنٹیروں نے پی۔ ایس۔ پی کے امیدوار ایس۔ مہتہ کے الیکشن آفس کو لوٹ لیا اور احمد آباد میں بھی انھوں نے ایسا ہی کیا جس سے کہ اکثریتی فرقے کا فرقہ پرست طبقہ تک بدظن ہو گیا نتیجے میں ایک لکھ پتی سرمایہ دار بے کشن ہری ولبھ داس کے مقابلے میں آزاد امیدوار یاجنک کامیاب ہو گئے۔

راجکوٹ میں سوتنتر پارٹی کے لیڈر مسٹر سانی کو جو جن سنگھ کے ساتھ اتحادی گٹھ جوڑ میں شامل تھے آر۔ ایس۔ ایس کے والنٹیرو کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اس لئے کہ یہ والنٹیر جن سنگھ کے امیدوار کو کامیاب کرنا چاہتے تھے۔ سانی ہار گئے۔ لیکن کانگریس نے گجرات میں لوک سبھا کی نصف سیٹوں پر قبضہ کر لیا اور سنڈی کیٹ کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ ابھی سنڈی کیٹ ہی کی حکومت قائم ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب میسور کی طرح گجرات میں بھی سنڈی کیٹ کا قلعہ ٹوٹ جائے گا۔

میسور

میسور شری نجلنگپا کا دیش ہے۔ وہاں انکی پارٹی کی حکومت قائم تھی۔ ہر قسم کے وسائل اس پارٹی کو حاصل تھے لیکن جب ایک ماہ قبل تین وزیروں محمد علی، کے۔ پٹا سوامی اور وسنت راؤ ایل پاٹل نے استعفے دے کر اپنے اضلاع گلبرگہ میسور اور بیجاپور میں کانگریس کے لئے کام کرنا شروع کیا تب ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔

میسور کے عوام نے لوک سبھا کی ستائیس کی ستائیس سیٹیں کانگریس کو دے کر ثابت کر دیا کہ وہ جن سنگھی یا سوتنتری سیاست کو پسند نہیں کرتے۔ ان جماعتوں کے ساتھ سنڈی کیٹ کے گٹھ جوڑ کی مخالفت کی گئی تھی لیکن نجلنگپا کی خوش فہمی نے ڈبو دی اور میسوری عوام نے انھیں ایسی سزا دی کہ وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ہندوستان کی پالیٹکس میں میسور کے عوام نے سیاسی سوجھ بوجھ کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔

الیکشن کی انقلاب انگیز نوعیت کا جو نتیجہ ظاہر ہونا تھا وہ ۱۵ مارچ کو اسمبلی کے اجلاس کے پہلے ہی دن ظاہر ہو گیا جب ناراض ممبروں نے وزیر خزانہ کو بجٹ پیش کرنے دیا۔ اس کے بعد ۱۸ مارچ کو اس وقت ظاہر ہوا جب وزیر اعلیٰ مسٹر ویریندر پاٹل کو اس لئے مستعفی ہونا پڑا کہ انکی پارٹی کے بیس ممبر کانگریس پارٹی سے جا ملے۔

مسٹر نجلنگپا کے لئے یہ خبر بڑی اندوہناک تھی لیکن وہ کیا کر سکتے تھے کہنے لگے: "ویریندر پاٹل نے حالات کے مطابق ٹھیک ہی کیا ہوگا" مگر ساتھ ہی اپنی شکست تسلیم نہیں کی بلکہ اعلان کیا

جن سنگھی اور سوتنتری سیاست ناکام ہو گئی

وزارت اعلیٰ کی چاٹ کرسی سے نہیں اٹھنے دیتی

"ارے بھائی کتنی بار بولا کہ اخبار میں تمہارا نام نہیں ہے۔ کامراج اور سنجیوا ریڈی

ویریندر پاٹل ..... مستقبل کی فکر

کہ میں اپنی جماعت کو مضبوط بناؤں گا۔" اس لئے کہ وہ ہندوستان میں جمہوریت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ شاید ان کے خیال میں اس وقت ڈکٹیٹری کا دور دورہ ہے۔ میسور سے کانگریس نے سب کی سب سیٹیں لے لیں۔ یہ اس کی ڈکٹیٹری یا زبردستی نہیں تو اور کیا ہے۔ دوسروں کو تو کانگریس مساوات کا سبق دیتی ہے اور کہتی ہے مل بانٹ کر کھاؤ اور یہاں ساری سیٹیں اکیلے ہی ہضم کر لیتی ہے۔ نجلنگپا جی واقعی ہمدردی کے قابل ہیں۔

بہار

بہار میں بھی سینکت ودھایک کی پارٹیوں کے مسلح غنڈے پولنگ کے دوران ریاست میں گھومتے رہے اور انہوں نے بہت سے مقامات پر جبر و تشدد سے کام لیا۔ پولنگ سے دو ہفتے قبل ہی دہشت زدگی پھیلانا شروع کر دی تھی۔ دربھنگہ میں جن سنگھی جاگیرداروں نے تین کمیونسٹوں، دو ہریجنوں اور ایک مسلمان ورکر کو بندوق کا نشانہ بنا دیا۔ پولنگ کے دوران پولنگ بوتھوں پر قبضہ کر لیا۔ جیپ گاڑیوں میں مسلح غنڈے مختلف علاقوں میں گھومتے اور ووٹروں کو خوفزدہ کرتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود لوک سبھا کی ۵۳ سیٹوں میں سے سنڈیکیٹ کو صرف تین، پرجا سوشلسٹ پارٹی اور جن سنگھ کو صرف دو دو سیٹیں مل سکیں۔

رام سبھاگ سنگھ لیڈری بھی گئی ـــ

سنڈیکیٹ لیڈروں میں صرف ایس۔ این۔ مصرا کامیاب ہو سکے جبکہ مسز تارکیشوری سنہا اور ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ جیسے لیڈر جو سنڈیکیٹ کانگریس کے ستون سمجھے جاتے تھے کانگریس کے غیر معروف امیدواروں کے مقابلے میں ہار گئے۔ اس ہار کے بعد پرجا سوشلسٹ وزیر اعلیٰ مسٹر کرپوری ٹھاکر کو مستعفی ہو جانا چاہیے تھا لیکن مفت میں "پیغمبری" ملجائے تو کون چھوڑتا ہے۔ عوام کی نظر میں کچھ ہوں مگر وزیر اعلیٰ تو کہلا رہے ہیں۔ حالانکہ سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری جارج فرنانڈیس کی ہدایت ہے کہ چونکہ عوام نے ودھایک دل کی سیاست کو مسترد کر دیا ہے اس لئے ہمیں ان دلوں کو چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن کرپوری ٹھاکر ہیں کہ اپنی کرسی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ وزارت اعلیٰ کی چاٹ انہیں کرسی سے اٹھنے نہیں دیتی بلکہ اسے اور مضبوط کرنے کے لئے انہوں نے غنڈوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے جو الیکشن کے بعد بھی ہنگامہ آرائیوں میں مصروف ہیں۔ دربھنگہ میں ایک جن سنگھی ہجوم نے بہت سے مسلمانوں کی دوکانیں پولنگ کے بعد ہی نذر آتش کیں۔ ان مسلمانوں کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اس علاقے کے ایک کمیونسٹ امیدوار کی حمایت میں ووٹ دیئے تھے۔

لیکن اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں اور ظلم و تشدد ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتا۔ غنڈہ گردی چلنے والی نہیں۔ ودھایک دل کی حکومت کی زندگی اب چند دن کی معلوم ہوتی ہے اور اب اس کا حشر بھی وہی ہونے والا ہے جو میسور میں سنڈیکیٹی وزارت کا ہوا ہے۔ ■■

بنگال

بنگال میں ایسے وقت انتخابات کرانا جبکہ وہاں تشدد

میں اپنی جماعت کو مضبوط بناؤں گا۔ نجلنگپا کے دم خم

ملاقات انور علی

بنگال میں ایک مرتبہ پھر کانگریس برسرِ اقتدار آئے گی

کا دور دورہ تھا اور قتل وغارت گری کے واقعات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اندرا گورنمنٹ کا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ غالباً اسی جرأت مندی کا کانگریس کو یہ صلہ ملا کہ وہ اسمبلی میں دوسری سب سے بڑی جماعت بن کر سامنے آئی۔ پچھلی اسمبلی میں اس کے صرف ۴۰ ممبر تھے جبکہ نئی اسمبلی میں اس کے ۱۰۵ ممبر کامیاب ہوئے۔ پہلی بڑی پارٹی مارکسی کمیونسٹ پارٹی ثابت ہوئی جس نے ۱۱۱ سیٹوں پر قبضہ کر لیا اور اگر اس کے محاذ میں شریک دوسرے ممبروں کو شامل کر لیا جائے تو اس کی تعداد ۱۲۴ تک پہونچتی ہے۔ لیکن حکومت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ۲۸۰ کے ایوان میں کسی ایک یا دوسری پارٹی کو کم از کم ۱۴۱ ممبروں کی حمایت حاصل ہو۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر جیوتی باسو چاہتے تھے کہ انھیں حکومت بنانے کا موقع دیا جائے لیکن گورنر نے ان کے اس مطالبے کو منظور نہیں کیا۔ کیونکہ کانگریس کے علاوہ بنگلا کانگریس، کمیونسٹ پارٹی، فارورڈ بلاک اور مسلم لیگ وغیرہ کے ممبر بھی ہیں جو مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ ریاست میں غیر مارکسی حکومت قائم ہو۔ جن کی مجموعی تعداد ۱۵۳ بیٹھتی ہے اگر ان کا باہم سمجھوتہ ہوا

جیوتی باسو
عوام نے ہمارے حق میں فیصلہ دیا ہے

جیسا کہ یقین ہے ہو جائے گا تو بنگال میں ایک مرتبہ پھر کانگریس زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے گی۔ یہ مسز گاندھی کی زیر قیادت کانگریس کی بہت بڑی کامیابی قرار دی جاسکتی ہے۔

لوک سبھا کے الیکشن میں بھی کانگریس نے اپنی پوزیشن کو بیحد مضبوط بنایا ہے۔ ۴۰ سیٹوں میں سے ۲۰ مارکسی کمیونسٹ پارٹی نے حاصل کی ہیں اور ۱۳ کانگریس نے۔ باقی ۷ میں سے ۲ کمیونسٹ پارٹی نے اور ایک ایک بنگلا کانگریس، پرجا سوشلسٹ پارٹی، انقلابی سوشلسٹ پارٹی اور مسلم لیگ نے۔ سنڈیکیٹ کانگریس کا اس ریاست میں بھی برا حال ہوا۔ ریاستی اسمبلی کے لئے اس نے اپنے ۲۳۰ امیدوار کھڑے کئے لیکن صرف ۲ کامیاب ہو سکے جبکہ لوک سبھا کے لئے اس کے ۳۰ امیدواروں میں سے ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ کہتے ہیں اپنی پارٹی کی اس زبردست اور عبرتناک شکست سے نجلنگپا پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے دو وقت کھانا نہیں کھایا اور جب انھوں معلوم ہوا کہ انکی پارٹی کے روح رواں اتلیا گھوش اپنی ضمانت بھی نہ بچا سکے تو دیر تک اپنے آنسو پونچھتے رہے۔

مرارجی بھائی

یوسفِ بے کارواں

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مسٹر ایس، کے، پاٹل ہ- لوک سبھا کا الیکشن ہار گئے انہوں نے کہا چلو یہ اچھا ہوا برا نہ ہوا، کیونکہ اگر میں کامیاب ہوجاتا تو ہاؤس میں میرا برا حال ہوتا۔ کہتے ہیں جب ایک لومڑی انگور کے کسی خوشے کو توڑ نہ سکی تو اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ انگور کھٹے ہیں۔ مسٹر پاٹل بھی لومڑی کی طرح اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں لیکن یہ مسٹر ڈیسائی کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہو گئی انھوں نے یہ تصور کیا ہے کہ انھیں لوک سبھا کے منددیپ اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ بے چارے اگر وہاں حال سے بے حال ہو گئے تو انھیں کون دلاسا دے گا۔

یہ حال جو انکی سب سے بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ۵۱۸ سیٹوں میں جن کے لئے انتخابات لڑے گئے مسٹر ڈیسائی کی پارٹی صرف ۱۶ نشستیں حاصل کر سکی۔ اس سے تو برخاست شدہ ایوان ہی غنیمت تھا کہ ۶۵ سیٹوں پر ان کے سنڈی کیٹی ممبر براجمان تھے۔ انتخابات سے انھوں نے بڑی بڑی آسیں لگا لی تھیں آدھی سے زیادہ سیٹیں حاصل کرنے کے لئے جن سنگھیوں اور سوتنتر پرستوں سے گٹھ جوڑ بھی کئے تھے۔ لیکن سہ

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مادرچہ خیالیم و فلک درچہ خیال۔

انتخابات میں سیٹیں ہی نہ مل سکیں کہ برا حال بننے سے بچ سکتے سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے، اور وقیانوسی کانگریس کی لاش پہ رونے کے لئے مرارجی بھائی کو اکیلا چھوڑ دیا — یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔

کم از کم ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ کو آنا چاہئے تھا — وہ اپوزیشن کے لیڈر تھے۔ برطانیہ میں اپوزیشن لیڈر کا درجہ وزیر اعظم کی ٹکر کا سمجھا جاتا ہے۔

رام سبھاگ سنگھ بھی اپنے عمل و کردار سے کچھ ایسا ہی طرز اختیار کئے ہوئے تھے جیسے وہ کم سے کم مستقبل کے وزیر اعظم ہوں۔ لیکن یہ انھوں نے کیا کیا کہ عین موقعے پر دغا دے گئے لوگ اب ان کے فربہ اور نیچے ہی نیچے پھیلے ہوئے جسم کو دیکھنے سے محروم رہیں گے۔ جسم بھی چھوڑیئے وہ جب زمین کو "جمین" اور غریب کو "گریب" بولتے تھے اور ایسوسی ایشن کو "ایسوسی ایسن" تو لیجئے لسانیت کے پھولوں سے پورا ایوان معطر ہو جاتا تھا ہائے ہائے انھوں نے ڈیسائی کا ساتھ چھوڑ دیا۔

اور اگر ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ نہ آئے تو یہ تارا کیشوری سنہا کو کیا ہو گیا۔ وہ تو ڈیسائی جی کی بڑی پرانی رفیق تھیں، ہر وقت کا ساتھ تھا حتیٰ کہ وزارت خزانہ تک میں ساتھ رہا — ایک وزیر تو دوسرا نائب وزیر۔ انھوں نے اس نازک وقت پر کیوں بے وفائی کی — یوں بھی تارا کیشوری ایوان کی جان تھیں۔ ان کے دم سے ایوان کی رونق تھی۔ جب بولتیں تو انکے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ کانگریسی انکی گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہوتے تھے اور ڈیسائی کی گردن اکڑ جاتی تھی۔ لیکن اب یہ بہار کے دن اجڑ گئے۔ دونوں کے دونوں غائب ہو گئے بالکل ایسے جیسے کسی کے سر سے سینگ غائب ہو گئے ہوں۔ اور یہ کتنا غضب ہے کہ خود گئے تو گئے اشوک مہتہ کو بھی لے گئے امریکی طرز کی سوشلزم کے "باوا آدم"۔ انکی خشخشی داڑھی والا چہرہ ڈیسائی کے لئے ایک سہارا تھا سنٹرل ہال میں وہ جب سگار سلگاتے تو ان کا چہرہ چرچل کا موڈ بن جاتا تھا۔

انھیں بھی چھوڑیئے یہ آخر سوچیتا کرپلانی اور ڈاکٹر سوشیلا نائر کو کیا ہوا؟ یہ دونوں تو بڑی سنجیدہ خواتین تھیں کم از کم ان ہی کو ڈیسائی صاحب کے حال پہ رحم آنا چاہئے تھا کہ بے چارے اتنے بڑے ایوان میں اکیلے رہ جائیں گے اور اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا؟ ہم انکی اس بے وفائی پہ سخت احتجاج کرتے ہیں۔ اور ڈیسائی بھائی کی بے کسی پہ اپنے دو قیمتی آنسو بہاتے ہیں۔

ڈیسائی صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ بالکل نہ گھبرائیں اور ہمارا خیال ہے کہ وہ گھبرائیں گے بھی نہیں [illegible]

باقی صفحہ ۳۹

(طنزیہ)

قصہ میرے چار جنموں کا

ناوک حمزہ پوری

یہ کہنا کہ آپ مجھے نہیں جانتے بے وقوفی ہی نہیں حماقت ہوگی۔ کیونکہ راجا ہو یا پرجا۔ امیر ہو یا فقیر۔ نیتا ہو یا جنتا۔ سب کے سب نہ صرف یہ کہ میرے واقف کار بلکہ عاشق زار ہیں۔۔۔ ویسے میں بتا چلوں کہ میرا نام پیسہ ہے۔ جی ہاں پیسہ۔ ایک ایسا پرکشش نام جس کی قوتِ مقناطیسی سب کو اپنی طرف کھینچے لئے جاتی ہے۔ ہر آدمی کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے پاس روپیے ہوں۔ مثل بھی مشہور ہے کہ:

"جس کے پاس نہیں ہو پیسہ، اس کا جگ میں جینا کیسا"

اگر آپ کی عمر دس پندرہ سال سے کم ہے تو پھر مجھے آپ سے کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ آپ ٹھہرے نابالغ۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کو کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو بہ لحاظِ عمر تو بالغ ہوتے ہیں لیکن دوسرے کئی اعتبارات سے کورے نابالغ ہی رہ جاتے ہیں۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ ممکن ہے آپ کو اپنی بات سمجھانے میں مجھے دقت ہو۔ ویسے اگر آپ کو دلچسپی ہو تو میرے پچھلے جنموں کا حال آپ کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تناسخ پر میرا عقیدہ ہے۔ دور کیوں جایئے سُنا ہے چچا غالب بھی تناسخ کے قائل تھے۔

میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اگر آپ کی عمر پندرہ برس کی بھی ہے تو آپ میرے پچھلے جنم میں بھی ضرور میرے شناسا رہے ہوں گے۔ میرا پرانا روپ بڑا نا پیسہ۔ ایک انچ قطر والا۔ آٹھ آنے بھر وزن والا۔ میری وہ شکل و صورت کئی جگوں تک برقرار رہی۔

دیش آزاد ہوا تو ظاہر ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مسرت ہوئی تھی۔ آزادی کا ماحول پاکر انگوٹھے کا نشان لگانے والے کونسل کی ممبری سے وزارت کی کرسی تک پر براجمان ہوئے۔ سبنے سیٹھ جی اور نیتا دھنوان ہوگئے تو میری بھی کچھ امید بندھی کہ اب کچھ پھلنے پھولنے کا موقعہ مجھے بھی ملے گا۔ لیکن ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ساری آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ میرا جو جنم ہوا تو میں پہلے سے بھی چھوٹا تھا سنتا ہوں کہ وجہ ماہرین کا خیال ہے کہ اپنے دیش میں انسانوں کو مقوی غذا نصیب نہیں اور نتیجے میں دن بدن نسل خراب ہوتی جارہی ہے۔ ناٹے ٹھونٹھے۔ لاغر و کمزور لوگ اور پھر یہی حالت اگر سو دو سو سال برقرار رہی تو اپنے ملک میں صرف آدمی نما گدھے ہی رہ جائیں گے۔۔۔ عقل سے عاری اندازہ ہے کہ میری نسل بھی کچھ یونہی متاثر ہوئی ہوگی۔ ورنہ میں چھوٹا کیسے ہوتا۔ پھر بھی صبر کیا کہ جانے دو بلا سے چھوٹا ہوں۔ شکل و صورت تو باپ داداؤں سے ملتی جلتی ہے۔

میری داستان بڑی دردناک ہے جناب۔ کہیں آپ بور تو نہیں ہو رہے ہیں؟ معاف کیجئے یہ اس لئے پوچھا کہ اکثر لوگوں کو دوسروں کی مصیبتوں کا احساس کم ہی ہو پاتا ہے اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر ایک انسان دوسرے انسان کو کیوں چھرا گھونپتا۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کیوں گولی مار دیتا۔۔۔ بچی۔ آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ مجھ سے جان پیسے سے بھی بُرا۔ بلکہ پیسے کا جنا۔ معذرت خواہ ہوں جناب۔ آپ بھی آدمی ہی ہوں گے شاید!۔ میں سارے آدمیوں کو نہیں کہتا، لیکن کچھ لوگ تو واقعی پیسے کے جنے ہوتے ہیں۔

بات سے بات یاد پڑتی ہے۔ اب جب گولی کا ذکر چھڑا ہے تو عرض ہے کہ اب کے پھر جب میرا جنم ہوا تو میرے سینے پر ایک بڑا سوراخ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے چھاتی پر گولی ماردی ہو اور وہ صاف آر پار ہوگئی ہو۔ پتہ نہیں یہ بھی نسل کی خرابی کا نتیجہ تھا یا کچھ اور۔ ہاں سُنا ہے کہ ایٹمی ذرات کے اثر سے بھی نسلِ انسانی متاثر ہوئی ہے۔ اخبار پڑھ تو نہیں سکتا لیکن جب لوگ اسے پڑھتے ہوتے ہیں تو ان کی جیب میں چپکا بیٹھا سنتا رہتا ہوں۔

سُنا ہے کئی بچے ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کے کان ہیں تو آنکھ نہیں، پاؤں ہیں تو ہاتھ ندارد۔ لوگ ایسے موقعوں پر خدا کی قدرت کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں سنتا ہوں تو ہنسی آجاتی ہے۔ کرنی اپنی تھوپ دی خدا کے سر۔ بیچارا خدا۔ وہ اس کے علاوہ اور کیا کرتا ہے کہ آپ ببول لگائیں تو ببول اگا دے اور آم لگائیں تو آم پھیلا دے۔ پتہ نہیں اپنی ہی ایجادات کو اپنی ہی تباہی کے لئے انسان کیوں استعمال کرتا ہے۔۔۔؟ لیکن چھوڑیئے ان ظالموں، جاہلوں کو۔ مجھے تو اپنی فکر ہے۔

وائے بر حالِ من۔ اس بار جو پھر میرا نیا جنم ہوا تو میں خود اپنے آپ کو پہچان بھی نہ سکا۔ یہ پیسہ تھا یا پیسے کا بچہ۔ دل کا زخم تو بھر آیا تھا لیکن احساسِ زخم پھر سے ہرا ہوگیا۔ کیا بتاؤں ایسا چھوٹا سا۔ اتنا ذرا سا کہ جیسے عورتوں کی بندیا۔ شرم آتی ہے اپنا حال بیان کرتے ہوئے لیکن ایک بار پھر آدمیوں کی حالت کو دیکھ کر دل مضبوط کیا۔ معاف کیجئے گا۔ اب آپ کی برادری میں بھی شرم و حیا، لوک لاج نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ یہ سوچ کر کھلے بندوں گھومنا پھرنا شروع کردیا۔ اب تک پھر بھی ایک بات کا اطمینان تھا یعنی یہ کہ شکل و صورت میں کچھ بھی زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ چہرے پر وہی سُرخی تھی یعنی رگوں میں ویسا ہی خون۔

خون کا ذکر چل نکلا تو خیال آتا ہے کہ خون کا سفید ہونا بھی مثل ہو رہی ہے۔ سر گریبان میں ڈال کر ذرا غور کیجئے تو سہی۔ آپ کے بھائی بندوں میں بھی کئی ایسے نکل آئیں گے جن کا خون آپ کو سفید معلوم ہوگا۔ میرے ساتھ یہ سانحہ بھی عجوبہ ہی رہا ہوا۔ یعنی موجودہ جنم میں میرا خون بھی سفید ہوگیا۔ شکل بگڑ گئی صورت چوپٹ ہوگئی۔ آہ کیسا خوبصورت گول سا چہرہ چوکور ہوکر چوپٹ ہوگیا ہے۔

باقی ص ۳۷ پر

شناسی

کلاسیکل رقص اور قدیم روایات کا پرستار ـــــ منی پور

سید عارف نعمانی

ہرے بھرے کھیت اور گنگناتے ہوئے جھرنے حسین تحفوں سے مالا مال پرسکون جنگل اور ان گنت جھرنوں سے بھرا یہ علاقہ منی پور کہلاتا ہے جو ہمالہ کی گود میں شمال مشرق میں واقع ہے۔ سیاح جو اس علاقے کی سیر کے لئے آتے ہیں اس کے بے پناہ حسن سے مسحور ہو کر جاتے ہیں۔

منی پور کا یہ علاقہ ۸۰۰۰ مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے مشرق اور جنوب میں برما اور مغرب میں آسام اور ناگا لینڈ سے گھرے ہوئے اس علاقے کی آبادی سات لاکھ اسی ہزار ہے۔ اس کا پایۂ تخت امپھال ہے اور یہاں کے لوگوں کی زبان منی پوری اور آسامی ہے۔

اس پہاڑی علاقے کے لوگ اپنا تعلق مہابھارت کے پانڈوؤں سے جوڑتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق مہابھارت کا ہیرو ارجن ایک دفعہ انجانے طور پر خاندان کے اصولوں کو توڑ کر اپنی تیر کمان لینے کے لئے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اسکا بھائی "یدھشٹر" اور بیوی "دروپتی" (جو سات بھائیوں کی مشترکہ بیوی تھی) بیٹھے ہوئے تھے۔ ارجن کو اس طرح مخل ہونے کے جرم میں بارہ سال تک کے لئے جلاوطن کر دیا گیا۔

ارجن مشرقی پہاڑوں میں چلا آیا جہاں اس کی ملاقات شہزادی الوپی سے ہوئی۔ ارجن الوپی کو اپنا دل دے بیٹھا مگر وہ چند ماہ بعد مہندرا پور چلا گیا جہاں اس کی شادی وہاں کے ایک راجا بادھیترا دھن کی بیٹی چترن گرما سے ہو گئی ان کا پہلا بیٹا ببرو واہن پہلا آریا راجا بنا۔ اس نے چند بڑے صوبے فتح کئے اور ناگا علاقے (آج کا ناگا لینڈ) پر حملہ کیا جو ناگا راجا نے بغیر مقابلہ کئے اپنی سلطنت جو منی کے نام سے مشہور تھی اس کے ماتحت کر دی اس دن سے آج تک اس علاقے کو منی پور کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

منی پور میں لوگ قدیم روایتوں اور اصولوں کے پرستار ہیں۔ منی پور کے قبائلی متھی کے نام سے مشہور ہیں۔ مضبوط دل اور جسم کے یہ قبائلی کافی لمبے ہوتے ہیں۔ زراعت انکا خاص پیشہ ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کے مرد عورتوں کی بہ نسبت بڑے لاابالی اور کاہل ہوتے ہیں۔

تھی سماج میں عورتوں کو اچھا مقام حاصل ہے۔ یہاں کی عورتیں کھانے پکانے، سینے پرونے اور کپڑے بنانے میں مشغول رہتی ہیں۔ یہ عورتیں بہت کم شرماتی ہیں۔ ریشمی اور سوتی ساریاں یہاں کی عورتوں کا محبوب لباس ہے۔

عورتوں کو رنگریزی کے فن میں کمال حاصل ہے۔ ان عورتوں کو زیورات پہننے کا بھی بڑا شوق ہے۔ یہاں کی غریب سے غریب عورت بھی سونے کے زیورات میں لدی ہوئی نظر آتی ہے۔ عورتیں فطرتاً بڑی فیاض اور مہمان نواز واقع ہوئی ہیں چندہ اور خیرات کے معاملے میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں۔ ایک دفعہ جب سبھاش چندر بوس جی نے اپنی آزاد ہند فوج کی تنظیم کے لئے ان عورتوں سے چندہ دینے کی اپیل کی، تو انھوں نے فوراً اپنے سونے چاندی کے زیورات سبھاش جی کی نذر کر دیے۔ نیتا جی نے پہلی دفعہ اس علاقے میں ہی عورتوں اور مردوں پر مشتمل اپنی فوج کی تنظیم کی تھی۔

منی پور کے لوگ ہندو مذہب کو مانتے ہیں۔ ان کا مشہور تہوار "لائی ہوراؤبا" کے نام سے مشہور ہے۔ جو بڑی شان و شوکت سے علاقے بھر میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار میں علاقے کی تمام عورتیں اپنے قبائلی لباس پہن کر رقص و سرود کی محفلوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتی ہیں۔

منی پور کی قدیم تاریخی داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ یہاں شمسی خاندان کے ایک راجا کی تخت نشینی کے وقت ایک جھگڑا ہو گیا تھا اور پوری ریاست پر مشکل آپڑی تھی۔ ایسے وقت میں لوگ اپنی تمام خوشیوں کو بھلا کر ملک کے دفاع کے لئے دل و جان سے تیار ہو گئے تھے۔

ایک مختصر سی جنگ کے آخر میں جب ان کے بادشاہ کو پھر اقتدار حاصل ہو گیا تو اس خوشی کے موقع پر ریاست بھر میں ایک جشنِ مسرت منعقد ہوا۔ اس جشن میں پہلی بار منی پور کے مرد اور عورتوں نے ایک تاریخی رقص پیش کیا تھا آج بھی منی پور میں ہر سال اس تاریخی واقعے کی یاد میں ایک شاندار جشن منعقد ہوتا ہے اور منی پور کے ان شہیدوں کی یاد کو تازہ کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنے علاقے کی آزادی کے لئے جان دی تھی۔

منی پور کی عورتیں فنِ رقص کی باریکیوں کو خوب سمجھتی ہیں اور مختلف قسم کے رقص جانتی ہیں۔ یہاں رقص کو ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔

واقعات نئی دہلی

بقیہ:- قصہ میرے چار جنموں کا

ہاں تو محترم! —— لیکن ذرا رک جائیے۔ اب تک میرا تخاطب صرف مردوں کے لئے ہوتا آیا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ عورت ہوں۔ ایسی حالت میں ایک آدھ تخاطب آپکے لئے بھی ہونا ضروری تھا۔ ناراض نہ ہوں۔ یہ چوک صرف جذبات کی رو میں بہہ جانے کی وجہ سے ہو گئی ہے ورنہ ہم عورتوں کی زیادہ عزت کرتے آئے ہیں۔ ہم تو سیتا رام کہنے کے عادی ہیں رادھے کرشن کو جپنے والے ہیں۔ ویسے ذرا آپ ہی غور فرمائیے کہ ایک ساتھ دونوں کو مخاطب کرنے یعنی۔ محترم، محترمہ بولنے یا لکھنے میں کتنی دقت ہوتی ہے۔ عقلمند نکلے تو انگریزی والے ہی۔ ان لوگوں نے ایک "کامن جینڈر" بھی بنا ڈالا۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ مخنث ہوں۔ نہ عورت، نہ مرد۔ معاف کیجئے آپ کی دل شکنی میرا مقصد نہیں تھا۔ لیکن یہ بات تو آپ کو بھی ماننی چاہئے کہ ملک کے لوگوں میں نامردی اور بزدلی گھر کرتی جا رہی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو مادرِ وطن کے اتنے بڑے بڑے خطوں پر دشمنوں کا قبضہ اب تک کیسے بنا رہ سکتا تھا۔

ہاں تو محترم یا محترمہ، جو کچھ بھی آپ ہوں۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اب تک تو صرف شکل و صورت کی بات ہوئی قدر و قیمت کی نظر سے بھی مجھے انسانوں نے آسمان سے اتار کر زمین پر پھینک دیا ہے۔ لیکن آدمی بھی عجیب الٹی کھوپڑی والا ہے جب بھی قیمتوں کا ذکر کرتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ قیمتیں آسمان کو چھوتی جا رہی ہیں۔

معاشیات کے عالم جانتے ہیں کہ کوٹلیہ کے وقت میں ایک پیسے (ایک پیسے کے) بدلے آپ دو سیر شکر، ڈھائی سیر چاول یا گیہوں اور آدھ من نمک خرید سکتے تھے۔ یہاں تک کہ گھی بھی ایک پیسے کا دو سیر مل جاتا تھا۔

منی پور کے مرد دھوتی اور قمیص پہن کر، اور عورتیں اپنے روایتی اسکرٹ میں جب قطار در قطار رقص کرتی ہیں تو یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

چند رقص ایسے بھی ہیں جن کے دوران عورتیں منظوم داستانیں سناتی ہیں۔ ایسا ہی ایک رقص جوگالی ہے جو ایک قدیم کہانی پر مشتمل ہے۔ یہ ایک شہزادی کا المیہ ہے جو ایک عام آدمی سے محبت کرنے لگی تھی۔

منی پور قدرت کے مناظر اور ہمارے ملک کی پرانی تہذیب اور کلچر کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ میں اسے "دیوتاؤں کا ملک" کہہ کر پکارا گیا ہے۔

میری یہ قدر و قیمت تقریباً سترہ سو سال تک یعنی ۱۳ویں یا ۱۴ویں صدی تک قائم رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے آپ لوگوں نے میری شان میں بٹہ لگانا شروع کر دیا۔ اور آج تو یہ حال ہے کہ آپ ہی کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں آپ مجھے جیب میں رکھ کر ذرا بازار گھوم آئیں۔ میرے بدلے آپ کونسی چیز خرید سکتے ہیں۔ جس دوکاندار سے آپ کچھ مانگیں گے وہ چاہے آپ کو سچ مچ جھاڑو نہ مارے لیکن محاورے والا جھاڑو ضرور مار دے گا۔ اور آخر کار جب مایوس ہو کر آپ لوٹیں گے تو جی میں آئے گا کہ چلو اور کچھ نہ بن سکا تو بھکاری ہی کو دے ڈالوں۔ ویسے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے لینے سے انکار کر دیگا ممکن ہے ابھی انکار کرے لیکن ذرا اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کیجئے گا۔ آپ کو لگے گا جیسے وہ زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔ ایک خطرہ اور ہے۔ ممکن ہے آپ اسے جیسے ہی پیسہ تھما کر آگے بڑھیں وہ آپ کو دعاؤں کے بدلے کوئی موٹی سی گالی دے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ذرا تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے نکل جائیے گا۔

مصیبت یہیں ختم ہو جاتی تو صبر کر لیتا۔ چلو نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے لیکن ایک خوفناک خطرے کی بو مجھے مل رہی ہے آپ دیکھ لیجئے گا۔ ایک دن یہ انسان میرا وجود مٹا کر ہی دم لے گا۔ ہاں ہاں! میں نے آدمیوں کو بہت دیکھا پرکھا ہے تعمیر سے کہیں زیادہ تخریب میں اس کی دلچسپی ہے۔ ■■

موپاساں

زندگی میں میں کئی قسم کے مکانات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے چھوٹے بڑے، نئے پرانے، پتھر اور لکڑی کے مکانات۔ لیکن ایک مکان اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر مجھے اب تک یاد ہے اور شاید ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ کوئی عظیم عمارت نہ تھی، معمولی سا ایک منزلہ مکان تھا تین کھڑکیوں والا، بظاہر ایک ایسی معمّر اور کوتاہ قد عورت کی طرح جس نے سر پر ٹوپی پہن رکھی ہو سفید دیواروں اور سرکنڈے کی چھتوں پر کائی جم چکی تھی اور چاروں طرف درخت سبز جھاڑیاں اور پھولوں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ درخت اور پودے مکان میں رہنے والوں نے لگائے تھے سیدھے صحن میں جانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اس سڑک پر چونکہ گاڑیوں کی آمد و رفت نہ تھی، اس لئے زیادہ راہ گیر ادھر نہیں جاتے تھے مکان کی کھڑکیاں ہمیشہ بند رہتی تھیں، کیونکہ یہاں رہنے والوں کو روشنی کی زیادہ پروا نہ تھی۔ وہ کھڑکیاں اس لئے بھی نہیں کھولتے تھے کہ انھیں تازہ ہوا کا شوق نہ تھا۔ وہ لوگ جو پھولوں اور سبزے کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں فطرت کے مناظر میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ تو صرف سیاح اور شاعر لوگ ہیں جنھیں خدا نے حُسنِ فطرت کے لئے چشمِ بصیرت دی ہے۔ رہے عام لوگ تو وہ فطری حسن کے وجود سے واقف بھی نہیں ہوتے۔ وہ اس چیز کی کیا قدر جانیں جو انھیں افراط سے ملتی ہے۔ ویسے بھی جو کچھ ہمارے پاس ہوتا ہے اُسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں اس چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی جو ہماری دسترس میں ہے۔

یہ چھوٹا سا مکان ہرے بھرے درختوں کی جنتِ ارضی میں واقع تھا۔ ان درختوں کی شاخوں پر آزاد منش چڑیوں کے گھونسلے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن مکان میں رہنے والے... اف! کس قدر بے بس اور بند دماغ کا مکان تھا یہ۔ سردیوں میں تو اس جگہ سے بالخصوص ٹھنڈ، اداسی اور وحشت ٹپکتی تھی۔

میں نے پہلی بار یہ مکان اس وقت دیکھا جب بہت عرصہ پہلے ایک کاروبار کے سلسلے میں یہاں آیا۔ اس مکان کا مالک ایک کرنل تھا اور میں اس کی بیوی اور لڑکی کے لئے ایک خط لے کر اس جگہ آیا تھا۔ وہ وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ لمحے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ذرا چالیس برس کی ایک نحیف و ناتواں خاتون کا تصوّر کیجیے جو خوف و اضطراب سے آپ کی طرف دیکھ رہی ہو۔ آپ ایک اجنبی بے ضرر نوجوان ہیں، پھر بھی وہ آپ سے خوفزدہ ہو۔ آپ کے پاس کوئی چاقو، پستول یا بندوق نہیں۔ آپ اخلاق و تواضع سے مسکرا رہے ہیں لیکن وہ مسلسل ڈرے جا رہی ہو اور پھر اس کے ہونٹ ہلتے ہیں۔

"جناب میں کس سے متعارف ہونے کی مسرت حاصل کر رہی ہوں؟" بات کرتے ہوئے اس کی آواز کانپ رہی ہے۔

تو صاحب یہ سارا قصّہ تھا۔ جواب میں میں نے اپنا تعارف کرایا۔

خوف اور حیرت کی جگہ عارضی خوشی نے لے لی۔ وہ تیز لہجے میں بولی:

"اچھا، اچھا" ان الفاظ کی بازگشت سے ہال کمرہ گونج اٹھا۔ پھر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور وہاں سے اندرونی حصّے کی طرف۔ تھوڑی دیر بعد مکان میں سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔

پانچ منٹ بعد میں مہمان خانے میں نہایت نرم اور آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ چاروں طرف ابھی تک لفظ "اچھا" کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ سیلن اور بکری کے کچّے چمڑے کی بو آ رہی تھی۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے جن پر مکھیاں بیٹھی تھیں۔ دیوار پر ایک راہب کی روغنی تصویر آویزاں تھی تصویر کے شیشے کا ایک کونہ ٹوٹ گیا تھا۔ راہب کی تصویر کے ساتھ ساتھ گھر کے دوسرے لوگوں کی تصویریں بھی لٹک رہی تھیں۔ میز پر سوئیاں، دھاگے کا گولا اور ایک نامکمل موزہ پڑا تھا جسے ابھی بنا جا رہا تھا۔ کاغذ کے بنے ہوئے سلائی کے چند نمونے بھی تھے۔ ساتھ والے کمرے میں خوفزدہ اور حیران و ششدر دو عورتیں فرش پر سے اسی قسم کے نمونے جمع کر رہی تھیں۔ ان میں سے عمر رسیدہ خاتون بولی:

"معاف کیجیے یہاں خاصی گندگی ہے"

مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے دوسرے کمرے کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک فرش پر کاغذ کے نمونے بکھرے ہوئے تھے۔ اسی کی طرح کمرے کا دروازہ بھی شرمندہ نظر آتا تھا کیونکہ ایک انچ دو انچ کھلتا، پھر بند ہو جاتا۔ آخر دروازہ کھلا اور انیس بیس برس کی ایک دبلی پتلی لڑکی اندر آئی۔ اس نے بہت معمولی کپڑے پہن رکھے تھے۔ چہرے کا رنگ اڑا اڑا سا۔ لمبی ناک پر چیچک کے داغ اور سرخ سرخ آنکھیں۔ عورت اسے دیکھتے ہی بولی:

"یہ میری لڑکی ہے۔"

میرا تعارف کرایا گیا۔ کاغذی نمونوں کی تعداد پر میں نے تعجب ظاہر کیا تو ماں اور بیٹی نے اپنی نظریں جھکا لیں

خاتون نے کہا۔

"میرے شوہر کی تنخواہ زیادہ نہیں ہم دوسروں کی بنائی ہوئی چیزیں نہیں خرید سکتے یہاں سٹیشن کے پاس ہر سال ایک میلہ لگتا ہے ہم اس میلے میں سے کپڑا گوٹا وغیرہ خرید لیتے ہیں اور سال بھر خود کام کرتے ہیں۔"

"لیکن اتنے کپڑے آپ کریں گی کیا؟ آپ تو صرف دو ہیں۔"

"اوہ آپ سمجھے نہیں یہ کپڑے پہننے کے لئے نہیں، یہ تو میری بیٹی کے جہیز میں دیئے جائیں گے۔"

"امّی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، نہ معلوم یہ کیا سمجھیں گے میں شادی نہیں کروں گی۔ جی ہاں میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" لڑکی نے بظاہر ملامت کی، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ شادی کے ذکر سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا ہے اور آنکھوں سے خوشی ٹپک رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد چائے، بسکٹ، مکھن اور جام سے میری تواضع کی گئی۔ سات بجے ہم نے کھانا کھایا ساتھ والے کمرے سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ خاتون نے بتایا۔

"یہ میرے شوہر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک سال سے ہمارے پاس رہتے ہیں کسی سے نہیں ملتے بہت شرمیلے ہیں ملازمت میں ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی، اس وجہ سے مایوس ہو گئے ہیں۔ کوئی دن میں خانقاہ چلے جائیں گے۔"

کھانے کے بعد مجھے کپڑے دکھائے گئے جن پر کرنل صاحب کے چھوٹے بھائی نے پھول بوٹے بنائے تھے۔ لڑکی بھی مجھ سے ذرا بے تکلف ہو گئی اور اس نے مجھے تمباکو کی ایک تھیلی دکھائی جو اس نے اپنے والد کے لئے تیار کی تھی میں نے مصنوعی تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تعریف کی اس پر لڑکی ذرا شرمائی اور پھر ماں کے کان میں کچھ کہا ماں اچھل پڑی اور مجھ سے دوسرے کمرے میں چلنے کی درخواست کی۔ وہاں بڑے بڑے صندوق اوپر تلے رکھے تھے خاتون بولی۔

"یہ میری بیٹی کا جہیز ہے، یہ سب ہم نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔"

ان صندوقوں کا سامان دیکھنے کے بعد میں نے اپنے میزبانوں سے اجازت چاہی۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں وقتاً فوقتاً ان کے ہاں آتا رہوں گا۔

وقت گزرتا چلا گیا اتفاق سے میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ سات برس بعد ایک مقدمے کے سلسلے میں دوبارہ اس قصبہ میں گیا تو کرنل صاحب کی بیوی اور بیٹی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہاں پہنچنے پر انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ ماں پہلے کی نسبت بہت کمزور ہو گئی تھی اس کے بال سفید ہو چکے تھے اور وہ فرش پر بیٹھی کپڑا کاٹ رہی تھی بیٹی پرانے صوفے پر آلتی پالتی مارے کشیدہ کاری میں مصروف تھی، پہلے کی طرح ان کمروں میں ہلکی ہلکی نمی کی بو تھی چاروں طرف کاغذ کے مختلف نمونے بکھرے ہوئے تھے۔ پادری کی تصویر کے پاس کرنل کی ایک تصویر لٹک رہی تھی، ماں بیٹی دونوں ماتمی کپڑوں میں ملبوس تھیں صاف نظر آتا تھا کہ کرنل صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ بیوہ خاتون نے پچھلے واقعات سنانے شروع کئے۔ باتیں کرتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ہم برباد ہو گئے ہیں" یہ کہہ کر وہ رکی "آپ جانتے ہیں کہ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب ہم دنیا میں اکیلے ہیں۔ خانقاہ والوں نے میرے شوہر کے بھائی کو داخلہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ بہت زیادہ شراب پینے لگے تھے۔ مایوسی کی وجہ سے انھوں نے اور زیادہ پینی شروع کر دی ہے۔ سوچتی ہوں ڈپٹی صاحب کے پاس جاؤں اور ان سے مدد مانگوں۔ کیا کروں؟ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ ہمارے صندوقوں کے قفل توڑ چکے ہیں۔ سارا جہیز انھوں نے فقیروں میں بانٹ دیا۔ دو صندوق تو بالکل خالی ہو چکے ہیں۔ یہی حال رہا تو میری بیٹی کا سارا جہیز غائب ہو جائے گا۔"

"امّی یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں،" لڑکی نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ کیا سمجھیں گے...... میں شادی نہیں کروں گی یقین مانئے میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔" یہ کہہ کر وہ چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اس کی آنکھوں سے ابھی تک امید جھلک رہی تھی۔ اس اثنا میں ایک کوتاہ قد آدمی دبے پاؤں برآمدے میں سے گزرا میں سمجھ گیا کہ وہ کرنل صاحب کا چھوٹا بھائی ہے۔

ماں اور بیٹی دونوں بدل گئے تھے۔ بیٹی تو بالکل مرجھا گئی تھی اور یوں نظر آتا تھا جیسے بیوہ خاتون اس کی ماں نہیں بڑی بہن ہے۔ خاتون پھر بولی۔

"میں ڈپٹی صاحب کے پاس جانا چاہتی ہوں۔" اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ یہ بات پہلے بھی کہہ چکی ہے۔ "میں ان سے کہوں گی کہ اب وہ ہماری چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے ہیں۔ ہم جو چیز بناتے ہیں، وہ اسے لوگوں میں خیرات کر دیتے ہیں پوچھتی ہوں تو کہتے ہیں کہ ثواب ملے گا۔ لیکن میری بیٹی کا کیا ہوگا اس کا جہیز کہاں سے آئے گا۔"

لڑکی کا رنگ پھر سے اڑ گیا ـــ لیکن اس مرتبہ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

"مجھے پھر سارا سامان تیار کرنا پڑے گا خدا جانے کہاں سے آئے گا یہ سامان، ہم بہت غریب لوگ ہیں، اس دنیا میں ہمارا کوئی نہیں۔"

"ہاں اس دنیا میں ہمارا واقعی کوئی نہیں ہم بالکل اکیلے ہیں۔" لڑکی نے بھی وہی بات دہرائی۔

ایک سال اور گزر گیا، قسمت کی بات ہے ایک مرتبہ پھر مجھے اس مکان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو خاتون سیاہ ماتمی لباس میں صوفے پر بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ قریب ہی اس کے شوہر کا چھوٹا بھائی زرد رنگ کا ایک میلا سا کوٹ پہنے بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ اچھلا اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر میں خاموش رہا، پھر آہستہ سے پوچھا۔

"یہ آپ کیا بن رہی ہیں؟"

اونی جیکٹ ہے، سوچتی ہوں مکمل ہو جائے تو پادری صاحب کے پاس لے جاؤں۔ آجکل میں بیٹی کے جہیز کی ساری چیزیں پادری صاحب کے پاس رکھتی ہوں ان سے بہت ڈر لگتا ہے ہر چیز لے کر بھاگ جاتے ہیں" اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا اور اپنی لڑکی کی تصویر دیکھنے لگی جو میز پر رکھی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"اب میں دنیا میں بالکل اکیلی ہوں"

میں نے نہیں پوچھا کہ اس کی بیٹی کہاں گئی، پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ غم زدہ خاتون نئے ماتمی لباس میں تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا اور جب جانے کے لئے اٹھا تو وہ لڑکی مجھ سے ملنے نہیں آئی نہ میں نے اس کی سلام کی آواز سنی نہ اس کے قدموں کی نرم آہٹ۔

میں سمجھ گیا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔

واقعات نئی دہلی

انقلاب کے بعد مصری خواتین ترقی کی راہ پر

شخصی حکومت کے خاتمے کے بعد مصر میں عورت کے کردار اور اس کی کامیابیوں کی داستان

۱۹۵۲ء کے مصری انقلاب کے بعد جس میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور مصر کے نوجوان فوجی افسروں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مصری عورت کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، کیونکہ اس انقلاب کے بعد یہاں عورتوں کو ووٹ دینے کے حق سے لے کر عوامی زندگی میں اہم عہدوں پر فائز ہونے تک کے حقوق ملے۔

صدر ناصر کے دور میں ان کی کابینہ میں ایک خاتون وزیر ڈاکٹر حکمت ابوزید بھی شامل تھیں اور غالباً یہ اس ملک میں کسی عورت کو حاصل ہونے والا سب سے بڑا عہدہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے اہم عہدے ایسے ہیں جن پر عورتیں فائز ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سہیرہ القلماوی مصر کے طباعت و اشاعت کے مرکزی ادارہ کی چیرمین ہیں۔ کریم السعید وزارت تعلیم و ثقافت کی انڈر سکریٹری رہ چکی ہیں اور زینب مرزوقی اسکندریہ کے شعبہ سماجی بہبود کی سابق ڈائرکٹر کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔

ان معروف و مشہور شخصیتوں کے علاوہ بہت سی دوسری خواتین بھی ملک کے اونچے عہدوں پر فائز ہیں، مثلاً فاطمہ عنان سکنڈری تعلیم کی ڈائرکٹر جنرل، اور احسان بدران شعبہ اعداد و شمار کی ڈائرکٹر جنرل ہیں۔

انکے علاوہ بھی ڈائرکٹر جنرل کے تین دوسرے بڑے عہدے اور خواتین کی سماجیات اور سائنسی امور کی مشیر کا عہدہ بھی خواتین ہی کے پاس ہے۔

ایڈمنسٹریشن سے تعلق رکھنے والی کئی خواتین اور تین علاقوں کی سکریٹریوں کو وزارت تعلیم کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدوں پر ترقی دی جانے والی ہے ملنے بڑے عہدوں پر عورتوں کی ایک خاص تعداد کی موجودگی کے بعد اس کے ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہیں کہ علاقائی سرد سول میں عورتیں بڑی تعداد میں اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

وزارت تعلیم کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیش نظر امید ہے کہ مستقبل قریب میں صنف نازک کو مزید اہم ذمہ داریاں سونپی جائیں گی۔ وزارت تعلیم و ثقافت میں خواتین ملازمین کی تعداد اس وقت ۶۲۲۱۳ ہے یا کل ملازمین کا ۴۰ء۴ فیصدی۔ انکی اکثریت تعلیمی اداروں میں کام کرتی ہے۔ ایسی خواتین کی تعداد ۴۹۳۴۲ ہے، یا ۷۰ء۵ فیصدی جبکہ ۲۵ء۱ فیصدی یعنی ۵۶۹ خواتین اعداد و شمار سے متعلق عام اداروں میں کام کرتی ہیں۔

عام سکنڈری تعلیمی مراکز میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۲۴ء۰ فیصدی یعنی ۳۵۲۹ خواتین پر مشتمل ہے جبکہ ٹیچنگ ٹریننگ سنٹروں میں یہ تعداد ۹۳۲ یعنی ۴۳ء۸ فیصدی ہے۔ لیکن ٹکنیکل تعلیم کے میدان میں یہ شرح کافی کم ہے۔ یہاں خواتین ملازمین کی تعداد ۱۵۵۴ یعنی ۱۲ء۴ فیصدی ہے۔

عملی انجینیرنگ کے میدان میں کئی نئے چہرے سامنے آئے ہیں جن میں صنعتی سلامتی کے ادارہ کی سربراہ سفینہ الکو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ متحدہ عرب جمہوریہ میں ایک خاص موڑ کی نشاندہی کرتا ہے۔ انجینیرنگ کے میدان میں دوسری ممتاز شخصیت مردینہ رحمت کی ہے جو زیر تعمیر یونٹوں کی الکٹرک منصوبہ بندی کی مکمل انچارج ہیں ظاہر ہے کہ اتنی ذمہ داری کا کام انقلاب سے پہلے کسی بھی عورت کے سپرد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس میدان میں دوسری اہم شخصیت انجینیر عائدہ کی ہے وہ شپ یارڈ پلاننگ کی اکزیکیٹو انجینیر ہیں۔ اس طرح نے علمی کام جو اب تک صرف مردوں کے سپرد ہوتے تھے، اب ان کی ذمہ داریاں عورتوں کو بھی دی جانے لگی ہیں۔ ایسی سربراہ شخصیتوں میں ڈاکٹر عالیہ سراتی کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مصر کی پہلی خاتون ہیں جن کے سپرد اسکندریہ میں دواساز کمپنی کے کیمیائی شعبہ کی سپروائزری کی ذمہ داری ہے۔ انھوں نے اپنی سابقہ ذمہ داری سے نمٹنے کا پوری اہلیت کیساتھ مظاہرہ کیا اور اس لئے اب انھیں طبی ضروریات کا سپروائزر بنا دیا گیا۔ یہ واقعہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال باین کو وزارت صحت میں لیبوریٹریز کا صدر مقرر کیا گیا ہے۔

سیاسی صلاحیت

۱۹۵۲ء کے انقلاب کا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں عورت کے حقوق میں اضافہ کر دیا گیا اس کے نتیجہ میں عورت کو اس کا حق دیا گیا ہے کہ وہ انتخابی مہم میں برابر کا حصہ لے سکتی ہے اور نہ صرف قومی سرگرمیوں میں شریک ہو سکتی ہیں بلکہ قومی اسمبلی کی ممبری کے لئے امیدوار بھی بن سکتی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں جب اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا کہ انہیں دستور کے مطابق مساویانہ حقوق اور جملہ ذمہ داریاں حاصل ہیں تو مصری خواتین کی مزید ہمت افزائی ہوئی اور انھوں نے پوری شدت کے ساتھ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

بعد میں سوشلسٹ یونین کی تشکیل ہوئی اور قومی زندگی میں مصری خاتون کا وجود زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا۔ اس نے تمام ترقیاتی کاموں میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا اور قومی تعمیر کے کاموں میں بہت جلد مردوں کے شانہ بشانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔

وزارت سماجی معاملات میں ڈاکٹر حکمت ابوزید کی شرکت نے عرب تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور عورتوں نے فرداً اہم عہدوں کے لئے اپنی جدوجہد تیز کر دی۔

ماہنامہ نئی دہلی

نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے لئے عورتوں نے بڑی تعداد میں داخلہ لینا شروع کیا بلکہ اپنی سیاسی امنگوں کو پورا کرنے کے لئے بھی انھوں نے قدیم روایات کی دیواریں توڑ دیں۔

ہر علاقہ اور محلہ میں عورتوں کی ایسوسی ایشنیں قائم ہیں اور وہ اپنی صنف کے لئے نمایاں کارنامے انجام دے رہی ہیں۔ ان ایسوسی ایشنوں نے سماجی سرگرمیوں اور خاص طور سے مصیبت زدہ خاندانوں کے لئے ریلیف کے کاموں اور معذور فوجی افراد کے لئے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔

مصر میں عورتوں نے اپنے انفرادی وجود کا مظاہرہ ۱۹۱۹ء کے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا اور ۱۹۵۲ء کے انقلاب سے ان کی سیاسی اور سماجی امنگوں کو بروئے کار آنے کا موقع ملا۔ اب ملک میں ایک ہزار سے زیادہ مقامی ایسوسی ایشنیں عورتوں کی قائم ہیں اور ایک سو سے زیادہ خواتین کی سوسائٹیاں کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔ انقلاب سے پہلے ملک میں جتنی بھی عورتوں کی تنظیمیں تھیں وہ بنیادی طور پر فنڈ جمع کرنے تک اپنی ساری صلاحیتیں محدود رکھتی تھیں۔ لیکن اب یہ تنظیمیں ہر میدان میں متحرک ہیں اور کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔

اس حیثیت سے مصری خاتون ملک کی تمام سماجی اور تنظیمی اصلاحات کے لئے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

جون ۱۹۶۷ء کے بعد ان تنظیموں نے قومی پسپائی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری قوم کو آمادہ کرنے میں زبردست کردار ادا کیا اور اپنی تمام تر توجہات شہیدوں کے خاندانوں کی مدد، پناہ گزینوں کی آبادکاری ان کے لئے بہتر کاموں کی تلاش اور ان کے بچوں کو تعلیم و تربیت مہیا کرنے میں لگا دیں۔ اب مصری عورتوں نے اسکا فیصلہ کیا ہے کہ ان پناہ گزینوں اور جنگ میں کام آنے والوں کے خاندانوں کو بہتر مواقع دینے اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ایک قومی خدمت کی تشکیل کی جائے۔

صحت کے مراکز

۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد ملک کے مختلف علاقوں میں صحت کے مراکز قائم کرنے میں ان خواتین نے زبردست کام کئے ہیں۔ ۵۲ء تک ملک میں ایسے مراکز کی تعداد ۲۰ سے زیادہ نہیں تھی لیکن اب صرف شہروں میں ایسے ۲۰۵ [illegible]

مراکز ہیں۔ اس کے علاوہ تمام دیہی علاقوں میں بھی صحت کے مناسب مراکز قائم ہیں اور ان مراکز کی خدمات تیس لاکھ سے بھی زیادہ بچوں کو حاصل ہیں۔ تنہا ۱۹۵۹ء میں گھروں پر جا کر ان مراکز کے زچگی کے اسٹاف نے ۵۶۰۰۰ ماؤں کی دیکھ بھال کی، اس کے علاوہ انھوں نے حاملہ عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال بھی گھروں پر جا کر کی۔ یہ صحت کے مراکز اور ان کی سہولتیں دیہی علاقوں کو بھی مساویانہ طور پر حاصل ہیں۔

کمیونٹی ہیلتھ سروسز کے ڈائرکٹر کی رپورٹ کے مطابق دیہاتوں میں اس طرح کے مراکز کی تعداد ۱۹۵۲ء تک ۲۲۲ تھی لیکن اب دیہاتوں میں یہ تعداد بڑھ گئی ہے اس میں صحت کے مراکز کی تعداد ۵۰۸ ہو گئی ہے اور کمیونٹی یونٹس کی تعداد ۱۲۰۰ ہو گئی ہے۔ ان مراکز میں ہر طرح کی سہولتیں دی جاتی ہیں اور وہ جدید ترین اوزار سے لیس ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں ان مراکز اور یونٹوں نے ۲ لاکھ ۵۵ ہزار بچوں کی دیکھ بھال کی ان میں ۳۰ لاکھ ۲۸ ہزار ولادتیں ہوئیں۔

نرسنگ کے میدان میں ترقی۔

قدرتی طور پر صحت پر زیادہ زور دینے کا نتیجہ نرسنگ کی بہتر سہولتوں کی شکل میں نکلے گا، چنانچہ ۱۹۵۹ء میں اس کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا۔ اس وقت تک ایسے کالجوں یا اداروں کی تعداد جو اس میدان میں تربیت دیتے تھے صرف ۱۸ تھی ان میں سے ایک ہیلتھ وزیٹرس کے لئے ۹ نرسوں کے لئے اور آٹھ زچگی کی سہولتوں کے لئے تھے۔ ان اداروں میں داخلے کے لئے صرف پرائمری درجے تک تعلیم ضروری تھی۔

لیکن اب نہ صرف اس مقصد کے لئے قائم ہونے والے اداروں کی تعداد بڑھ گئی ہے بلکہ ان کے معیار تعلیم میں بھی بہت فرق آگیا ہے۔

تازہ اعداد و شمار کے مطابق متحدہ عرب جمہوریہ میں میڈیکل کالجوں کی تعداد ۶ ہے اور ان میں ایک ہزار ۲ سو گیارہ طلبا اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بارہ اسکول قائم ہیں جن میں طالبات کی تعداد ۱۵۰۶ ہے نرسنگ کی تعلیم کے لئے ۲۲ کالج ہیں جن میں ۱۸۹۹ طالبات زیر تعلیم ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۹ سب سیڈیری کالج ہیں اور ۱۹ ہی سب سیڈیری میٹرنٹی سنٹر ہیں جن میں علی الترتیب ۵۹۰ اور ۱۴۴۴ طالبات زیر تعلیم ہیں۔ یہ تعداد ان کالجوں یا اداروں کے علاوہ ہے جو پرائیویٹ نگرانی میں چلتے ہیں۔

اس سال ان اداروں سے تعلیم مکمل کر کے نکلنے والی طالبات کی تعداد مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ اسسٹنٹ نرس — ۴۵۰
۲۔ اسسٹنٹ ڈیلیوری انچارج — ۵۰۶
۳۔ میڈیکل اٹنڈنٹس — ۴۳۹

لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ

عورتوں کو مساوی حقوق دیئے جانے کے بعد انقلابی حکومت نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کئی کالج کھولے اور ان کا الحاق عین شمس یونیورسٹی سے کر دیا۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ادارے قائم کرنے کی پہلے بھی کئی کوششیں کی جا چکی تھیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۴ء میں ایک ٹریننگ سینٹر قائم کیا گیا تھا۔ اس سینٹر میں طالبات کی ٹریننگ تین سال تک ہوتی تھی اور اس کے بعد انھیں ڈپلوما دیا جاتا تھا۔ اس ڈپلوما کے ذریعہ وہ پرائمری اسکولوں میں ٹیچر بن سکتی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں یہ ادارہ بڑھا دیا گیا اور اسکا الحاق عین شمس یونیورسٹی کے ساتھ کر دیا گیا۔

اور اس کے بعد لڑکیوں کی تعلیم میں بڑے پیمانہ پر ترقی ہوئی اور تعلیم کے میدان میں انھیں لڑکوں کے برابر لانے کی کوشش کی گئی۔

عورتوں کی تعلیم کے بارے میں سب سے قابل ذکر اقدام یہ تھا کہ ملک کی مذہبی یونیورسٹی الازہر میں لڑکیوں کو داخلہ کی اجازت دی گئی۔ اسوقت الازہر کے تحت ایک مسلم گرلز کالج قائم کر دیا گیا ہے جس میں ضروری مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔

کبھی الازہر روایات میں شدت سے جکڑا ہوا تھا۔ لیکن اب یہاں لڑکیوں کو طب، زراعت، انجینیرنگ اور دینیات سب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے مثال تاریخی واقعہ ہے۔

(طنزیہ)

ہمارا مقصد حیات

حیدر راحت
چکدینوی

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش چھ کروڑ ہے۔ آزاد ہندوستان کے سیاسی دستور کے مطابق انھیں ہندوستان میں بسنے والی دوسری قوموں کی مانند برابر کی مراعات حاصل ہیں اور وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی صلاحیت کے مطابق ابھر سکتے ہیں موجودہ دور میں تو وہ بام ترقی کی انتہائی بلند سطح کو چھو بھی چکے ہیں یعنی صدر جمہوریہ کے عہدہ پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ مرکز کے وزراء میں بھی آپ کو چند جانی پہچانی صورتیں نظر آجائیں گی۔ اس کے علاوہ تجارتی منڈیوں میں بھی ان سیٹھوں پر ضرور نظر جائے گی۔ جن کی پیشانی پر سجدہ کے نشان نمایاں ہیں۔ رہے نوکری پیشہ حضرات تو اگر آپ صوبائی اور مرکزی گزٹوں کی ورق گردانی کریں گے تو جناب محمد علی یا جناب احمد محمود وغیرہ کی اچھی خاصی تعداد پائیں گے۔ جی ہاں ہم مسلمان آزاد ہندوستان میں اپنی خفیہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا مقام قائم کر چکے ہیں اور انشاءاللہ بہت جلد ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کی مانند ابھریں گے۔ چمکیں گے — چونکہ دستور ہند نے ہمیں برابری کا درجہ دیا ہے۔ لیکن ؟

یہ شفیع صاحب ہیں۔ ہائر سیکنڈری پاس۔ اگر آپ ان سے ملیں تو ان کے پاس سینما کے متعلق ایک مکمل کتابچہ تیار ملے گا۔ اب تک انھوں نے کتنی ساری فلمیں دیکھی ہیں۔ کون سے کردار کس فلم میں ابھرے ہیں۔ فلم اسٹاروں کی زندگی کے حالات۔ ان کا ذوقِ طبع اور ان میں مسلمان آرٹسٹ کس طرح اپنا نام روشن کر رہے ہیں۔ بتائیے کیا یہ ایک اہم کارنامہ نہیں ہے۔

میرے ایک پڑوسی ارشد حسین صاحب ہیں۔ ان کی بیگم سینما بینی کو روحانی اور جسمانی معراج سمجھتی ہیں۔ جمشید پور کی فضا مکدر ہے کچھ لوگوں کی پیشانی پر فکر و تردد کے شکن ہیں اور محترمہ رکشہ پر سوار کوثر کو سینا رواں دواں ہیں۔ ظاہر ہے ان کے حالیہ دلنکوں کے نام سنجے اور راجن ہیں۔ اصل نام شاید کچھ اور ہیں لیکن میں کیا سارا محلہ انھیں سنجے اور راجن ہی کہہ کر جانتا ہے۔ اور پھر خدا جھوٹ نہ بلائے ہمارے ایک بزرگ نے آزادی نسواں کی مثال اس طرح قائم کی ہے کہ خود تو یاروں کے ساتھ سینما بینی کا شوق پورا کر لیتے ہیں اور ان کی اہلیہ محترمہ ایک عزیز کے ساتھ فلموں میں جایا کرتی ہیں یعنی محرم اور غیر محرم کا سوال صنف کے لیے جائز ہے۔

عید کی آمد آمد ہے ہر مسلم آبادی میں مسلمانوں کا اژدہام ہے۔ نوجوان، بوڑھے ہر سائز کے بچے اور کالے پیلے اجلے برقعے، پریشان حال، بوکھلائی صورت یوں نظر آئیں گے گویا حشر کے میدان میں جمع ہوں — خدا خدا کر کے عید آئی، جگمگاتے کپڑوں، خوش پوشوں اور رنگین اغوائی توس قزح کے درمیان نماز عید ختم ہوئی۔ پھر تو گویا تانتا بندھ گیا ملنے ملانے والوں کا، بے فکروں، فلم دیمنوں کا اور تان وہاں جا کر ٹوٹی جہاں کوئی انادی پہلو نہیں۔ زندگی کا ایک حسین موقع ایک انتہائی حسین عکس چھوڑ کر آنکھ جھپکتے غائب ہو گیا لیکن اپنے پیچھے شہر شہر میں کروڑوں روپے کے مزار چھوڑ کر۔

وہ دیکھیے ایک بارات گزر رہی ہے یا فضا یہ ہے بسم اللہ ہے۔ نصف درجن فنٹ ٹولی بینڈ باجوں کی جھنڈی پٹاخے اور نوشہ کے سر پر سہرا، دیگ کھنکنانے لگے چوڑیاں بجنے لگیں، گیتوں کے فوارے چھوٹنے لگے اور شادی کے مقدس رشتہ میں دو روحوں کا اتصال ہو گیا لیکن اس طرح کہ اس کے تیسرے ہی دن ایک نوشہ بہادر جن کے ہاتھوں پر حنا کا رنگ ابھی تازہ ہی تھا میرے پاس تشریف لائے اور دس روپے کا سوال پیش کیا تاکہ وہ دسہرہ کے موقع پر سسرال میں اپنی شان امارت دکھا سکیں۔

میرا چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا ہے۔ وہ روز آنہ مجھ سے بحث کرتا ہے کہ میں اسے صرف چار آنے یومیہ دیتا ہوں جبکہ اس کے ساتھیوں میں بہت سارے تو تو کے نوٹ جیب میں رکھتے ہیں۔ عموماً لڑکوں ہی کے لیے ٹریلین ٹری کاٹن اور ٹری اول کپڑے ملوں نے تیار کیے ہیں۔ جبکہ میرے بھائی صاحب سوتی کپڑوں میں اسکول جاتے ہیں میں کوشش کرتا ہوں کہ انھیں حضرت محمد اورنگزیب اور مولانا آزاد وغیرہ کی سادگی دکھا کر مرغوب کروں لیکن وہ تو ایک ہی رٹ جانتے ہیں کہ وہ زمانہ اور تھا یہ زمانہ اور ہے — گویا قیمتی لباس، پاکٹ میں بڑے چھوٹے نوٹ، ایک عدد سائیکل اور تفریح یہی آج کے طالب علموں کا، مسلمان طالب علموں کا اصولِ تعلیم ہے۔ گارجین جس طرح بھی ہو پورا کریں ورنہ عزیزم تو بعد میں پہلے خود ہی جہنم میں چلے جائیں گے۔

میرے محلے میں بہت سے ایسے گھرانے بھی ہیں جہاں فقر و فاقہ کو مصلحتاً نہیں بلکہ مجبوراً راہ دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی جو میں ان کے بچوں کو بلکتے، ان کی عورتوں کو گریہ زاری کرتے دیکھتا ہوں تو خود کو ملعون و مطعون کرنے لگتا ہوں۔ کھانے کا مزہ جاتا رہتا ہے۔

آج سے دس سال قبل اس شہر میں مسلمانوں کی ہزاروں کوٹھیاں تھیں۔ کروڑوں کا کاروبار تھا۔ ان کی امارت اور دولت پر حکام شہر بھی ایمان لے آتے تھے۔ آج نصف سے زیادہ مکانات بک چکے ہیں۔ دولت اس طرح غائب ہو رہی ہے جیسے دھوپ چھاؤں۔ کاروبار بھی ہاتھ سے نکل کر کھسک رہا ہے۔ سو ہٹ گئے تو پانچ ابھر رہے ہیں۔ اور مسلمان اسی حال میں مست ہیں۔ دنیاوی عیش و نشاط

بقیہ صفحہ ۷۲ پر

پاس بلایا اور رک رک کر بڑی مشکل سے بولیں ۔۔۔۔
" بیٹا تو جنتی ہے ۔۔۔۔ تجھ ایسی بیٹیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ۔ تو نے میرے لئے وہ کیا جو پیٹ کی بیٹی بھی نہ کرتی ۔۔۔۔
" اماں میں تمہارے پیٹ ہی کی بیٹی ہوں اماں " سسک کر بولی ۔۔۔۔ تم نے مجھے زندگی دی تھی اماں ۔ اپنا خون پلایا تھا ۔۔۔۔ اور اولاد کسے کہتے ہیں اماں ۔؟
" نہیں بیٹا ۔۔۔۔ پیٹ کی اولاد بھی اتنا نہیں کر سکتی جو تو نے کیا ۔۔۔۔ بیٹا ۔۔۔۔ وہ کراہ کر بڑے آنسو بھرے لہجے میں ۔۔۔۔ بہت رک رک کر بول رہی تھیں ۔۔۔۔ " بیٹا جس دن یوسف کی موت کا خط آیا ۔ میں ساتھ والے کمرے میں صفائی کر رہی تھی اور تو سمجھی کہ میں باورچی خانے میں ہوں ۔ بڑے ماموں کو تو نے خط سنایا اور کہا ۔۔۔۔ ماموں میاں ۔۔۔۔ اماں کو یہ بات معلوم نہیں ہونا چاہئے ۔ ورنہ وہ رو رو کر جان سے چلی جائیں گی ۔۔۔۔
اماں ۔۔۔۔ میں چیخی ۔۔۔۔ مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا ۔۔۔۔ " میں نے سوچا جب بری بیٹی میری جان مجھے دکھی نہیں دیکھنا چاہتی تو مجھے بھی اس راز کو پالنا ہی ہوگا ۔ اور میں نے بھی اپنی وہی پرانی روش قائم رکھی ۔ مرنے والا تو جان سے گیا مگر تیرے لئے میرا دل کیسے کیسے ٹوٹتا تھا بیٹی ۔۔۔۔ لیکن اگر میں کہہ دیتی کہ مجھے سب معلوم ہے ۔ مجھے پتہ ہے کہ یوسف مر گیا ۔ تو تو مجھے غمگین نہ دیکھ پاتی اور میں تیرے آنسو نہ دیکھ پاتی ۔۔۔۔۔
میں پتھر کی مورت بنی سن رہی تھی اور وہ رک رک کر کہے جا رہی تھیں ۔
" میں نے وہ سب زیور دراصل تیرے لئے خرید خرید کر رکھے ہیں بیٹی ۔۔۔۔ پیسہ تو اٹھ ہی جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ تیز رفتار شے میں نے آج تک نہیں دیکھی ۔ دبے قدموں آنے والا تیزی سے جانے والا ۔۔۔۔ کے کارن میرا بیٹا مجھ سے چھٹا !
سوچتی تھی میری بیٹا جو اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر ۔۔۔۔ بھر رہی ہے ۔ اسے فضول نہ گنواؤں ۔۔۔۔ میرا آخری وقت ہے بیٹا ۔۔۔۔ تیرے سامنے تیری ۔۔۔۔

زندگی ہے ۔ خدا کیسے میری دعا پوری نہ کریگا ۔ وہ تجھے ہر خوشی سے نوازے گا بیٹی ۔۔۔۔ تیری ایک آرزو تھی بیٹی کہ مجھے چاندی کے تخت پر بٹھائے گی ۔ تو نے تو مجھے اس تخت طاؤس پر بٹھایا ہے بیٹی جسے دل کہتے ہیں ۔۔۔۔۔ میں اس دل کے آگے اپنا سر جھکاتی ہوں بیٹا ۔۔۔۔
اور اٹھنے کی کوشش میں اماں جو آگے کو ہونے لگیں تو لڑکھڑا کر پیچھے کو آپڑیں ۔۔۔۔ پھر وہ کبھی نہ اٹھ سکیں ۔

میں رونا چاہتی ہوں تو مجھے اماں کی وہ بات یاد آتی ہے ۔۔۔۔ " میں تیری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی ۔۔۔۔ " میں آنسو ضبط کرنا چاہتی ہوں ۔ کر بھی لیتی ہوں لیکن روتے ہوتے دل کو کیسے منع کروں ۔۔۔۔ ؟

بقیہ : ہمارا مقصد حیات

آپس کے اختلافات اور مزاج کے کڑواپن نے انہیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا ۔ ایک طرف ماضی کی شاندار روایات اور دوسری طرف تباہی اور افلاس کا نقشہ ۔۔۔۔ بتائیے مسلمان کیا کریں ۔ کیا اسی حالت میں مست و بیخود رہ کر ماضی اور مستقبل کو بھول کر بیٹھ جائیں یا پھر انہیں کچھ کرنا بھی ہے ۔ اور کیا کرنا ہے ۔ اس کے متعلق ہمارے وہ رہبران ملت دماغ سوزی کریں جن کے دل میں قوم کا درد ہے جو ہمارے لیے جی رہے ہیں اور ہمارے لیے مرنا پسند کرتے ہیں ۔

آج سنیچر ہے یعنی قسمت آزمائی کا ہفتہ ۔ وہ دیکھیے وہ ٹھٹوں کے ٹھٹ جا رہے ہیں ہر رنگ اور ہر سائز کی ۔ لنگیوں میں ملبوس ہمارے بھاری جہاد کو جا رہے ہیں ۔ ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی کتابوں کا اسلحہ ہے ۔ جن میں گھوڑوں کی نسل اور شجرۂ حسب و نسب کو بیان کیا گیا ہے اور وہ بڑے طمطراق کے انداز میں پھولوں اور گجروں کی سیج سجانے میدان جنگ میں رواں ہیں ۔ قسمت ہی تو ہے ۔ ایک غلام سلطان ہند ہو سکتا ہے ۔ تو وہ کیوں نہیں لکھ کے لاکھ ہو سکتے ہیں ۔۔۔۔ زندگی داؤں پر لگانے کا نام ہے ۔ اس لیے آیئے ہم آپ بھی ریس میں شریک ہو کر اپنی قسمت کو داؤں پر لگا دیں ۔ جی ہاں ۔۔۔۔ آیئے بھی !

وہ دیکھیے ، موذن مسجد کے کنگرے پر نمودار ہو کر اللہ اکبر اللہ اکبر پکار رہا ہے اور ہمیں آپ کو خالق دو جہاں کے دربار میں حاضری کی دعوت دے رہا ہے لیکن سچ پوچھیے تو

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یعنی ہم لوگ زندگی کے دوسرے اہم فریضوں میں اس قدر مشغول ہیں کہ اتنا وقت کہاں کہ چودہ سو سالہ پرانے گھسے پٹے سبق کو دہرانے مسجد میں حاضری دیں ۔ نتیجہ ظاہر ہے مسجدیں ویران ہو رہی ہیں اور ہم لوگ دور سے ہی ان کے کنگروں کو دیکھ کر صبر و شکر کر لیتے ہیں ۔۔۔۔ بہر کیف یہ چند باتیں میں نے اس لیے گوش گزار کر دی ہیں تاکہ آپ بھی گواہ رہیں کہ میں نے بحیثیت مسلمان اپنا حق ادا کر دیا ۔ اور ان تمام خوبیوں کو آپ کے سامنے پیش کر دیا جنھیں میں ایسے جراثیم کا نام دیتا ہوں ، جو ہمیں گھن کی طرح کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں ۔ اور ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے خدا نہ کرے وہ دن دور نہیں جب ہم ہم نہ رہیں گے ، اچھوتوں کی آبادی میں زبردست اضافہ کا باعث بن جائیں گے ۔ ◆◆

خبیث

احمد صغیر صدیقی

میں آپ کے سامنے اس وقت جو داستان بیان کر رہا ہوں وہ ایک انتہائی ناقابل یقین قسم کی ہے میں جانتا ہوں کہ اسے پڑھ کر بہت سے لوگ یقیناً برا سا منہ بنائیں گے ان تمام باتوں کو جاننے کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ جو کچھ میں بیان کرنے والا ہوں اس میں ذرا سا بھی جھوٹ شامل نہیں ہے۔ یہ واقعہ پچھلے دنوں کا ہے جب ان دنوں میں مکان نمبر ۵ اسٹریٹ نمبر ۲ میں رہا کرتا تھا۔ یہ مکان کوئی پچھلے دو برسوں سے "آسیب زدہ" مشہور تھا۔ محل وقوع کے اعتبار سے یہ مکان تھا بھی عجیب! اس کے چاروں طرف کسی زمانے میں جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا ان دنوں باغ تو غائب ہو چکا تھا البتہ چاروں طرف جھاڑ جھنکاڑ ضرور موجود تھے قریب ہی ایک چھوٹا سا تالاب بھی تھا اور شہر کے ایک کونے میں واقع ہونے کے باعث ادھر عام طور سے لوگوں کا گزر بھی کم تھا۔ مکان اندر سے کافی وسیع تھا اور کسی زمانے میں کسی بڑے رئیس کا خاندان اس میں آباد ہوا کرتا تھا۔ استداد زمانہ کے ہاتھوں اس کے ورثا اس کو بیچنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اب یہ ایک بیوہ متمول عورت کی ملکیت تھا۔ دو سال قبل اس میں رہنے والے کرائے دار کی موت کے بعد سے ہی اسے آسیب زدہ سمجھا جانے لگا تھا اور بعد کے تمام کرائے دار اسے دو ہی دن رہنے کے بعد چھوڑ گئے تھے۔ آخر ہماری لینڈ لیڈی نے مجبور ہو کر اسے بورڈنگ ہاؤس میں تبدیل کر دیا۔ تب سے مجھے اور میرے دوست کو ملا کر کوئی پانچ چھ آدمی اس میں الگ الگ کمرے کرائے پر لے کر رہ رہے تھے مکان میں اندر کی جانب ایک وسیع ہال تھا جہاں سے اوپری منزل کیلئے سیڑھیاں موجود تھیں۔ میں اور میرا دوست ہارون ایک ساتھ رہتے تھے۔ بلاشبہ ہمارے کمرے الگ الگ تھے لیکن ایک دوسرے کے پاس ہر وقت ہمارا آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔

شروع شروع میں جب ہم وہاں شفٹ ہو کر پہنچے تو اکثر ہمارے درمیان مکان کا آسیب ہی موضوع گفتگو رہتا تھا۔ اتفاق سے ہمارے ساتھ رہنے والے کرائے داروں کے ہاتھوں کہیں سے ایک آسیبی قسم کی کتاب بھی لگ گئی۔ جسے وہ اکثر پڑھ کر ہم کو سنایا کرتے تھے محض ڈرانے کے لئے۔ ان تمام اصحاب کے درمیان میری شخصیت خاصی جاذب توجہ تھی۔ کیوں کہ بھوتوں وغیرہ کے بارے میں شاید میری معلومات ان سب سے زیادہ تھیں۔ اس مکان میں رہتے ہوئے اگر کہیں رات کے وقت کسی کے ہاتھ سے کوئی شیشہ وغیرہ گر کر ٹوٹتا تو ہم سب یوں کھڑے رہ جاتے جیسے ہمیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ آسیب کا خوف کچھ ایسا ہی ہم سب کو گھیرے ہوئے تھا۔

اس حالت میں ہم نے کوئی ایک مہینا گزارا پھر آہستہ آہستہ ہمیں یقین ہونے لگا کہ آسیب وغیرہ کے قصے سب جھوٹے ہیں اور مکان بالکل صاف ستھرا ہے۔

پھر اچانک وہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کے بارے میں سوچ کر مجھے اس وقت بھی پسینہ آنے لگتا ہے۔

رات کا کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اور معمول کے مطابق اس رات بھی میں ہارون کے ہمراہ باغ میں پائپ پینے نکل گیا تھا۔ دراصل مجھے اور ہارون کو افیم پینے کی بھی لت تھی۔ یہ ایک ایسا راز تھا جو صرف ہم دونوں تک ہی محدود تھا۔ ویسے ہم لوگ انتہائی مہذب قسم کے افیونی تھے۔ افیون پینے کے دوران ہم لوگ اکثر جادو ٹونے بھوت وغیرہ کی باتیں کیا کرتے تھے کبھی کبھی ہمارا موضوع سخن سائنس بھی بن جاتی تھی کیونکہ ہارون سائنس کا گریجویٹ تھا اور شہر میں اس کی ڈاکٹری اچھی خاصی چل رہی تھی۔

اس رات بھی معمول کے مطابق ہم نے اپنے پائپ میں تمباکو کے ساتھ افیون کی ایک گولی بھری اور اس کے خوشگوار اثرات میں گم ہو کر ایسی عجیب باتوں میں منہمک ہو گئے۔ باتوں ہی باتوں میں ہارون نے سامنے اندھیرے پر نظر جماتے ہوئے کہا "کیوں راشد تمہارے خیال میں دنیا کی سب سے ڈراؤنی شے کیا ہوگی۔" یہ سوال عجیب سا تھا۔ ہزاروں چیزیں ڈراؤنی ہو سکتی ہیں تیز بہتے ہوئے دریا میں کسی ڈوبتی ہوئی عورت کی چیخیں انتہائی ڈراؤنی ہوتی ہیں۔ اندھیری اور سنسان راتوں میں کسی بھوت کی آمد بھی خاصی خوفناک ہو سکتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ معذرت کے سے انداز میں میں نے کہا۔

"بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں۔"

"ہوں" ڈاکٹر ہارون نے ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ "خود میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ ایسی کونسی شے ہو سکتی ہے۔ ویسے تو ہزاروں چیزیں ہیں لیکن کسی ایسی شے کا ذکر کرو جو ہر شے سے زیادہ ڈراؤنی ہو میرے بس میں کچھ نہیں۔"

"تو پھر چھوڑو۔ ہٹاؤ۔ اس قصے کو خواہ مخواہ وقت!

ڈر لگنے لگا؟" میں نے جھلا کر کہا۔ "دراصل مجھے ہارون کی موجودگی میں بھی باہر خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔" جواب میں اس نے پائپ کو منہ سے لگا کر ایک اور کش لیا پھر دھواں اگلتے ہوئے بولا۔ "خدا جانے آج کیوں میرے دماغ میں طرح طرح کے بھیانک خیالات امڈے چلے آرہے ہیں۔ سچ جانو اگر میں ادیب ہوتا تو آج ضرور ایک انتہائی خوفناک کہانی لکھ ڈالتا۔"

"ہوں" میں نے پھر جھلا کر کہا۔ "بہرحال تم ادیب نہیں ہو، براہِ کرم اس فضول قصے کو ختم کرو۔ افیون پی کر ایسی باتیں سوچنے سے نیند خراب ہونے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

پھر میرے اصرار پر وہ واپس ہوگیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے الوداع کہا۔ پھر دروازہ بھیڑ کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ کپڑے پہننے کے بعد میں نے معمول کے مطابق لیمپ سرہانے رکھا اور قریب پڑی ایک کتاب اٹھا کر بستر میں گھس گیا۔ لیٹ کر میں نے کتاب کھولی لیکن دوسرے ہی لمحے گھبرا کر میں نے اُسے دور پھینک دیا۔ یہ یقیناً میرے پڑوسی کی شرارت تھی۔ کمبخت اپنی بھوتوں کی کتاب میرے کمرے میں ڈال گیا تھا۔

پھر میں نے لیمپ کی بتی نیچی کردی اور اسے پیچھے رکھ دیا۔ میرا کمرہ اب مکمل طور پر تاریک تھا۔ میں نے چادر تان کر سونے کی کوشش شروع کردی لیکن فضول، طرح طرح کے ڈراؤنے قصے یاد آنے لگے تھے۔ میں نے سخت قسم کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحے دم سادھے پڑا رہا اور تب یکایک میرا دل بڑے زوروں سے دھڑکا۔ یوں لگا جیسے کوئی شے چھت پر سے میرے اوپر آگری ہو۔ دوسرے لمحے مجھے اپنے جسم پر زبردست دباؤ سا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی میرے سینے پر چڑھ بیٹھا ہو پھر اس سے پہلے کہ میں صورتِ حال کو سمجھ سکوں۔ دو سخت ہاتھوں نے میرا گلا گھونٹنا شروع کردیا۔ مجھے اپنی سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

میں کسی طرح بھی کوئی بزدل شخص نہیں ہوں جسمانی اعتبار سے بھی میں کمزور نہ تھا۔ البتہ حملہ اچانک ہوا تھا جس نے مجھے گھبرا دیا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں بعد جونہی میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے گلے پر جکڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے مروڑ دیا۔ نتیجتاً میرے حملہ آور کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور میری رکی ہوئی سانس پھر سے چل پڑی۔ پھر مجھ میں اور میرے حملہ آور میں ایک سخت قسم کی جدوجہد کا آغاز ہوگیا۔ اس اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس میرے ہاتھ پیر چل رہے تھے۔ نظر نہ آنے والا حملہ آور بار بار میرے ہاتھوں سے پھسل رہا تھا۔ شاید اس کا سارا جسم ننگا تھا۔ اُسے قابو میں کرنا میرے لئے سخت مشکل ہو رہا تھا کیونکہ شاید وہ بے انتہا پھرتیلا تھا۔

ہم میں کوئی دس پندرہ منٹ انتہائی سخت مقابلہ جاری رہا۔ سچ پوچھئے تو میں پسینے میں بری طرح نہا چکا تھا۔ جگہ جگہ میرے جسم پر خراشیں بھی پڑ گئی تھیں اور اس نے جا بجا مجھے نوچنے اور کاٹنے کی بھی کوشش کی تھی۔

اس انتہائی تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد آخرکار میں نے محسوس کیا کہ میرا مقابل بھی تھک رہا ہے پھر چند ہی لمحوں میں میں نے اسے بستر پر دے مارا اور اسکے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ میری ہی مانند وہ بھی بُری طرح ہانپ رہا تھا اور اندھیرے میں مجھے اس کی چلتی ہوئی سانسیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کے سینے پر چڑھ کر میں نے سوچا اب کیا کرنا چاہئے۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ میرا سلکن رومال تکیے کے نیچے ہوگا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنے تلے دبے ہوئے حملہ آور کو سنبھالا اور جھٹکے سے تکیے کے نیچے سے رومال کھینچ لیا۔

چند لمحوں کی مزید جدوجہد کے بعد میں اس کے دونوں ہاتھ باندھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب میرے پاس صرف ایک کام رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ میں نیچے رکھے ہوئے لیمپ کو اٹھا کر اسٹینڈ پر رکھ دوں اور بتی اونچی کرکے دیکھوں کہ یہ حملہ آور ہے کون۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے کسی کو مدد کیلئے بلائے بغیر اُسے قابو میں کرلیا تھا۔

میں اس پر چڑھے ہی چڑھے تھوڑا سا آگے کو کھسکا اور ہاتھ بڑھا کر سرہانے رکھے ہوئے لیمپ کو جھٹکے سے اٹھا لیا۔ اوپر اٹھا کر میں نے دوسرے ہاتھ سے بتی اونچی کردی یکایک تمام کمرہ روشنی سے نور ہوگیا پھر میں نے نظریں گھما کر جونہی اپنے حملہ آور کی جانب دیکھا مجھ پر قیامت بیت گئی۔ میرا خیال تھا کہ میرے منہ سے یقیناً ایک خوفناک چیخ نکلی ہوگی جس نے سارے مکان کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔

مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دیا تھا۔ یہ ایک انتہائی ڈرا دینے والی حقیقت تھی۔ کوئی شے کوئی مخلوق یقیناً میرے جسم تلے دبی ہوئی تھی۔ کوئی ایسی شے جسے میری آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔

اس کی سانسیں مجھے اب بھی سنائی دے رہی تھیں وہ برابر جدوجہد کئے جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی تھے اور میں بھی اس کی چکنی جلد کو بھی اپنے ہاتھوں سے محسوس کر رہا تھا اور سب سے بڑی چیز تو یہ تھی کہ وہ میرے نیچے کسی پتھر کی مانند پڑا ہوا تھا... لیکن... میرے خدا میں اسے دیکھنے سے قطعی معذور تھا۔ وہ یقیناً کوئی پراسرار اور نادیدہ مخلوق تھی کسی دوسری دنیا کی مخلوق۔

مجھے حیرت ہے کہ میں بے ہوش کیوں نہ ہوا۔ خوف اور دہشت کے تاثر نے یکایک مجھے دگنی قوت بخش دی تھی میری گرفت اس پر اور سخت ہوگئی حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا جیسے میرے تلے دبا ہوا نادیدہ جسم درد سے لرزنے لگا ہو۔

اسی وقت دھماکے سے دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ہارون دوڑتا ہوا میری جانب لپکا "راشد، راشد تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"اوہ... ڈاکٹر" میں نے خدا کے واسطے ہی کہا۔ "خدا کیلئے جلد آؤ۔ مجھ پر خدا جانے کس شے نے حملہ کردیا تھا میں اسے پکڑے ہوئے ہوں۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہے میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔"

جواب میں ہارون کے چہرے پر عجیب غریب تاثر اُبھرا شاید وہ میری باتوں پر سخت متعجب ہوگیا تھا بہرحال میرے کہنے پر وہ چند قدم آگے بڑھ کر میرے قریب آگیا۔ اسی لمحے دوسرے مکین بھی اندر آگئے اور سب کے سب مجھے پاگلوں کی طرح گھورنے لگے۔

"ہارون وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو" میں پاگلوں کی مانند چیخا۔ میرا سینہ دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ "خدا کے واسطے میری مدد کرو مجھ میں دم نہیں کہ میں اسے زیادہ دیر تک پکڑے رہ سکوں۔"

راشد!" آگے بڑھ کر ہارون نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے آج تم نے بعد میں اور زیادہ پی لی ہے۔"

"کیا بکتے ہو" میں چلایا۔ "اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا مگر مجھے تو دیکھو میں آخر کیوں لرز رہا ہوں۔ وہ جدوجہد میں مصروف ہے ادھر آؤ۔ اسے چھو کر دیکھو... ہاں چھو کر دیکھو۔" میں نے اُسے اکسایا۔

میرے چیخنے پر اس نے اپنے ہاتھ بڑھا کر اُدھر رکھ دیئے جدھر میں نے اس سے کہا تھا۔ وہاں غالباً اس نادیدہ شے کا چہرہ رہا ہوگا۔

دوسرے لمحے ڈاکٹر کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ اس نے

جیسے کوئی شے بستر سے اٹھ کر الگ ہو گئی ہو۔
اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ کوئی شے میرے نیچے دبی ہوئی ہے۔ کوئی نادیدہ شے۔

اس نے بھاگ کر سامنے لٹکی ہوئی رسیاں اٹھائیں اور مجھے پلنگ کے ساتھ باندھنے لگا۔ چند ہی سکنڈوں میں اس نادیدہ مخلوق کو بستر پر تک اس نے پلنگ کے ساتھ جکڑ دیا۔ پھر مجھ سے بولا "اب تم اسے چھوڑ کر ہٹ جاؤ، وہ بھاگ کر نہیں جا سکتا۔"

دوسرے اشخاص تماشائیوں کے مانند ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب انھیں بھی ہارون جیسا تجربہ ہوا تو ان میں سے ہر کوئی ایک کمرے سے نکل کر یوں بھاگے جیسے ان کے پیچھے کوئی بلا لگ گئی ہو۔ اب کسی میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ہمیں ہاتھ تک لگا سکتا۔

پھر ہم نے وہ پلنگ ہٹا کر ایک کونے میں رکھ دیا۔ پلنگ سے چپکی ہوئی مخلوق یقیناً چودہ پندرہ برس کے لڑکے کے وزن کے برابر رہی ہوگی۔

رسیوں میں جکڑ جانے کے بعد بھی وہ شے برابر آزاد ہونے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی نتیجہ تمام بستر بری طرح ہل رہا تھا۔ یہ ایک کھلا ہوا ثبوت تھا بستر پر کسی شے کسی نادیدہ مخلوق کی موجودگی کا۔ یہ منظر کچھ ایسا خوفناک تھا کہ سوائے ہارون کے، مکان کے دوسرے لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے کھسک گئے حتیٰ کہ صرف ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ دنیا میں اپنی نوعیت کا شاید یہ پہلا واقعہ ہے" ہارون نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"اور انتہائی خوفناک بھی" میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

"بے شک" اس نے سوچتے ہوئے کہا "لیکن اگر ہم دلائل کی روشنی میں دیکھیں تو یہ واقعہ کچھ ایسا عجیب بھی نہیں۔ ممکن ہے ایسی مخلوق بھی موجود ہو جو دیکھی نہ جا سکتی ہو۔ مثال کے طور پر ہوا ہی کو لے لو۔ ہوا کو ہم دیکھ نہیں سکتے لیکن محسوس کرتے ہیں۔"

"مگر ہوا سانس نہیں لیتی ...... اور یہ شے تو یقیناً ہمارے ہی مانند ہے۔"

"ہوں" اس نے سوچتے ہوئے کہا "ہمیں اس بارے میں کافی چھان بین کرنی پڑے گی۔"

رات بھر ہم نے تماشا کو خوشی کر کے گزار دی ہمارے قریب ہی نادیدہ مخلوق بستر سے جکڑی ہوئی پڑی تھی۔

صبح ہوتے ہی ہمیں تمام ہمسایوں نے گھیر لیا ہر شخص اس نادیدہ قیدی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

وہ نادیدہ مخلوق یقیناً حالت بیداری میں تھی کیونکہ بستر اسکی حرکت سے ہل رہا تھا۔ وہ آزاد ہونے کے لئے متواتر جدوجہد کر رہی تھی۔

رات بھر ہم دونوں دوست سوچتے رہے تھے کہ آخر کس طرح معلوم کیا جائے کہ مخلوق کی شکل کیسی ہے؟ ہم نے کئی بار اس کے بدن پر ہاتھ پھیر کر بھی دیکھا جس سے ہمیں صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس کے نقش و نگار یقیناً انسانوں جیسے ہی ہوں گے جسمانی بناوٹ بھی انسان ہی کے مانند تھی سوائے اسکے کہ عام آدمی کے مقابلے میں اسکے ہاتھ پیر ذرا چھوٹے تھے لیکن یہ معلومات ناکافی تھیں۔ آخر کار ہارون نے ایک عجیب ترکیب سوچی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم پلاسٹر آف پیرس کا استعمال کریں تو شاید اس کے صحیح نقوش کا علم ہو سکے مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ پلاسٹر آف پیرس چڑھاتے وقت وہ حرکت ضرور کرتا جس سے صحیح شکل نہ آنے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے طے کیا کہ اسکا سانچا لیتے وقت اسکو بیہوش کر دیا جائے۔

اچھی طرح سوچنے کے بعد ہم نے طے کیا کہ ڈاکٹر ایکس کو اس کام کے لئے طلب کیا جائے۔ ڈاکٹر ایکس ایک ماہر معالج تھے۔ انھوں نے جب پہلی بار اسے چھوا تو خوف سے ان کا رنگ تبدیل ہو گیا پھر نارمل ہونے میں انھیں کوئی آدھ گھنٹا لگ گیا معمول پر آتے ہی انھوں نے کام شروع کر دیا۔ اس نادیدہ مخلوق کو کلوروفارم کے ذریعے بیہوش کرنے کے بعد ہم نے اس کے جسم سے رسیاں کھول دیں اور ایک بلائے ہوئے موڈلر کے ذریعے پلاسٹر آف پیرس میں اس کا ڈھانچا تیار کیا جانے لگا کوئی پانچ منٹ بعد نتیجہ ہمارے سامنے تھا۔ پلاسٹر میں آنے والی شبیہ کچھ ایسی گھناؤنی اور ڈراؤنی تھی کہ کچھ نہ پوچھئے ایسا لگتا تھا جیسے شیطان کی تصویر کھینچ گئی ہو چہرہ اتنا بھدا اور ڈراؤنا تھا کہ دیکھنے سے ہول آتا تھا ہاتھ اور جسم یقیناً بھرے بھرے تھے اور لمبائی میں اس کا جسم چار فٹ کے قریب تھا مجموعی طور پر اس شکل کو کسی خبیث کی شکل سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔

اس کارروائی کے بعد اب مسئلہ یہ تھا کہ آخر اس کا کیا کیا جائے۔ ابھی تک تو ہم نے اسے پردہ رازی میں رکھ چھوڑا تھا لیکن زیادہ عرصے تک اسے چھپائے رکھنا ممکن نہ تھا

یہ ہمیں ابھی علم نہ تھا کہ اس خوفناک مخلوق کو آزاد کر دیا گیا تو سخت قسم کے عذاب سے دوچار کر دینا ہوگا۔

ہم سب کا خیال تھا کہ اسے ختم کر دینا ہی مناسب ہوگا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آخر یہ کام انجام کون دے گا؟ وہ یقیناً ایک بدنما انسان تھا لیکن تھا تو انسانوں ہی میں سے مگر نادیدہ سہی ہم روزانہ اس سکے پر غور کرتے مگر لاحاصل۔ ہمارے دوسرے پڑوسی اسی مخلوق کی باعث ایک ایک کر کے مکان چھوڑ رہے تھے جس پر ایک روز ہمارا لینڈ لیڈی سے جھگڑا بھی ہوا۔ وہ اپنے نقصان کا ذمہ دار ہمیں ٹھہرانے لگی جس پر میں نے کہا۔ کہ ذمے دار ہم نہیں بلکہ تم ہو۔ یہ مکان تمہارا ہے اور یہ مخلوق بھی اسی مکان میں ہے۔ رہا اسے ہٹانے کا مسئلہ تو تم ہی ہٹوا سکتی ہو تو ہٹوا دو۔ میری بات پر اس نے کئی آدمیوں کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اس نادیدہ شے کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیں مگر ڈر کے مارے ادھر آنے پر کوئی بھی آمادہ نہ ہو سکا۔ مجبوراً بڑھی عورت چیخ چلا کر خاموش ہو گئی۔

اس تمام قصے کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ ہم آخر تک یہ نہ سمجھ سکے کہ آخر اس مخلوق کی غذا کیا تھی؟ ہم نے دنیا بھر کی چیزیں اسکے قریب لا کر رکھیں لیکن اس نے کسی شے کو آخر تک ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ اسکی حرکات و سکنات اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ وہ بھوک سے بلک رہا ہے۔ اس معاملے میں ہم خود کو بے حد مجبور پا رہے تھے۔ راتوں کو ہمیں نیند بھی نہ آتی تھی۔ میں جب بھی یہ سوچتا کہ وہ بھوک سے مر رہا ہے تو نہ جانے کیوں مجھے اپنے دل میں اس کے لئے بیحد دکھ کا احساس ہوتا۔

پھر ایک دن صبح جب ہم نے اسے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ ہاتھوں سے محسوس کرنے پر ہمیں پتہ چلا کہ اس کا جسم اکڑ چکا ہے۔ دل کی حرکت بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔

اسی دن ہم نے ویران باغیچے کے ایک گوشے میں ایک گہرا گڑھا کھود کر اس کی لاش دبا دی۔ ایک لاش جسے ہم محسوس تو کر سکتے تھے لیکن ہماری آنکھیں جسے دیکھنے سے قاصر تھیں اس نادیدہ مخلوق کے جسم کا چربہ ڈاکٹر ایکس کے میوزیم میں آج بھی موجود ہے۔ (خیال ماخوذ)

واقعات شکاد علی

سجاد حیدر کا نام ان ممتاز ادیبوں میں سرفہرست آتا ہے جنہوں نے ادب اردو کو نئی بنیادوں پر استوار کیا پرانی روش سے ہٹ کر طرح نو ڈالی اور اردو افسانے کو مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھالا ——— زیر نظر انشائیہ کا تعارف انکے اپنے لفظوں میں پڑھیے۔

——— ادارہ

ہندوستان کی رقاصہ

سجاد حیدر

۱۹۱۱ء میں جب میں قسطنطنیہ پہنچا تو اسی ہفتہ میں وہاں کے ایک ادبی رسالہ میں خالدہ صالح کا یہ شاہکار ادب شائع ہوا۔ ترکوں نے اس کا لطف اٹھایا ہوگا اور داد دی ہوگی۔ مگر اتفاق کہ ایک ادبیات کا دلدادہ ہندوستانی بھی اس وقت وہاں پہنچا اور اس کی نظر سے یہ مضمون گزرا۔ اس [illegible] نے مجھے اس قدر مسرور کیا کہ میں نے بذریعہ ایک [illegible] کے ہندوستان کی طرف سے خالدہ صاحبہ خانم کی خدمت میں یہ اسلوب آمیز خراج تحسین پیش کیا اور حیرت ظاہر کی کہ ایک ترک خاتون نے کس طرح ہندوستان کو [illegible] کس طرح [illegible] کے جذبات کا ایسا صحیح نقشہ کھینچ سکی ———

میں اس ترجمے کو پیش کرتا ہوں مگر کیا اصل مضمون کا شائبہ بھی اس میں مل سکتا ہے؟ حاشا ———

میں ہندوستان کی سب سے زیادہ حسین رقاصہ تھی۔ میرا نازک جسم سانولا سلونا تھا جس پر حریر کا سلونا پیرہن کے صاف و شفاف اور نرم موتی دمکتے تھے۔ میری ہر جنبش ہندوستان کے چیتوں کی پھرتیلی اور سیاہ ناگ کی حرکتوں سے زیادہ فسوں کار تھی۔ میری بوٹی بوٹی اس کالے سانپ کی طرح بل کھاتی تھی جو جتنا زیادہ زہریلا ہوتا اتنا ہی دلنشین طریقے سے لہراتا ہے۔

میں ایک مخلوق تھی جس نے شعر و حرکت کو اپنے تمام جلال اور نیرنگی کے ساتھ اپنے جسم میں جمع کر رکھا ہے۔ میرے ننگے پاؤں کے گھنگرو، میری ہر ٹھوکر پر، میرے کبھی گرتے کبھی اٹھتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ بندھا میرے تمام آہنگ رقص میں نغمہ کار و مترنم ہو کر شریک ہوتے تھے۔ دنیا کا تمام عشق، نیچر کی تمام رعنائی، تمام خوبصورتی میرے رقص میں۔ کبھی جلا دینے والی کبھی سلگا دینے والی اداؤں کے ساتھ کانپتی ہوئی نظر آتی تھی۔ پھر میرا سر اس کی ایک جنبش ایک اشارے میں میرے سانولے جسم پر جو شور و آہنگ کی جان تھا۔ لمبے لمبے سیاہ ریشمی چمکدار بال بکھر جاتے تھے۔ میری آنکھیں، میرے ابروئے خمدار کے نیچے وہ ایسی بڑی اور روشن آنکھیں تھیں جیسی ان غزالوں کی ہوتی ہیں جو گرمیوں میں جنگل کے محفوظ ترین گوشہ میں پانی پینے کے لئے جھکتے جھجکتے آتے ہیں ———

میرے ان مستی مالیدہ ہونٹوں میں سے جو نہایت گرم ملک میں کھلے ہوئے قرنفل کے پھول کی طرح تھے، صاف شفاف موتیوں کی لڑی چمکتی تھی ———

سارا ہندوستان مجھے رقص کی دیوی سمجھ کر پرستش کرتا تھا۔ میں بڑے بڑے راجاؤں کے سامنے ناچ چکی تھی۔ ناچتے وقت موتیوں، یاقوتوں اور جواہرات کی ایسی بارش ہوتی تھی کہ میرے رونگٹے کے ہر تار میں وہ پروئے جا سکتے تھے۔

مگر میں پھر بھی خوش نہ تھی۔ میری روح میں ایک بارد نقطہ تھا جس تک نہ میرے حسین جسم کا حسن اور نہ اس فسوں کار اور گرم مملکت کی گرمجوشی پہنچ سکتی تھی۔

ان جہنم کی طرح گرم دنوں میں بھی جنگل میں ہاتھی، گینڈے، غزال اور بارہ سنگھے اور کچھار میں شیر، مگرمچھ آپس میں لڑنا یا کلیلیں کرنا بھول جاتے ہیں۔ یہ نقطہ خنک ہی رہتا۔ تمام زمین سے جس وقت شعلے نکلتے ہوتے اور آسمان سے لپٹیں آ آ کر تمام جانداروں کو جھلستی ہوتیں، میں اس نقطۂ بارد کی سردی میں ٹھٹھرتی ہوتی اس لیے کہ عورت کی روح کا یگانہ آفتاب یعنی عشق میری روح پر پرتو فگن نہیں ہوا تھا اس لیے کہ محبوب کی نگاہوں کے چمکدار تارے صرف جن سے عورت کے روح کی فضائے تاریک منور ہوتی ہے، ابھی تک سیاہ بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ایک دن میں شیوجی کے مندر میں گئی کہ اس تاریکی اور برودت کی جو میری روح پر طاری تھی ان سے شکایت کروں اور التجا کروں کہ وہ روشنی اور

گرمی مجھے بخشیں ——

مندر کی تنہائی میں سے ایک نازک اندام نوجوان جس کی آنکھیں آتش سیاہ کی طرح چمک اور حرارت برسا رہی تھیں میری طرف آتا نظر آیا۔ اس کے قیافہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مقدس برہمن ہے۔ میں کہہ چکی ہوں کہ اس کی آنکھوں کی چمک میں بلا کی حرارت تھی۔ اسی لمحہ میں اس کی روح کی سیاہ چمکدار کھڑکیوں میں سے میری روح کے بارد نقطہ پر ایک آفتاب عشق نمودار ہوا اور اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس جہنمی اقلیم کے تمام ذرات میں ایک موانست پیدا ہو گئی۔ آسمان اپنے ستاروں کے ساتھ فضا اپنے لامتناہی طول کے ساتھ۔ زمین اپنے جنگلوں اپنے ذی روح مخلوقات اپنے تمام شاندار دریاؤں اور پہاڑوں کے ساتھ بیدار ہو گئی اور میری روح میں آفتاب عشق سے اس طرح حرارت پیدا ہوئی کہ اس کا ایک ذرہ بھی بارد نہ رہا ——

غرضیکہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دنیا کی ہر شے کو اور مجھے ایک روح افزا آتش گرم کر رہی تھی۔ مگر اس نے اپنی روح نے بجھے ہوئے شرارے سے مجھے اور ایک عالم کو حرارت دیکر اپنی روح کی کھڑکیوں کو اپنی نیم پلکوں سے بند کر لیا اور نکلا چلا گیا۔ وہ تو نکل چلا مگر میری زندگی ان گرمیوں کی آتش ریز راتوں میں زمین کے گرم سینہ پر محوم اور تپ زدہ زندگی تھی۔ دنیا کا سینہ اس عشق سے دھڑک رہا تھا جس کے درختوں اور جنگلوں میں ہر قسم کی مخلوق بستہ فتراک تھی۔ اور اب میں بھی ہر تنفس اور لمحۂ حیات میں دنیا کی ہم آہنگ تھی ——

میں ہر روز مندر کے دروازے تک جاتی تاکہ بھکاریوں کی طرح اس کی ایک نگاہِ غلط انداز کا دان اس سے مانگوں مگر وہ ہرگز ہرگز میری طرف نہ دیکھتا ——

بے نظیر ہیرے دلربایانہ سبزی سے چمکنے والے زمرد آنکھوں کو خیرہ کرنے والی رنگت کے یاقوت وہ موتی و جواہرات جو سنگدل معشوقوں کو موہ لیں اور ان کی نظرِ التفات خرید لیں یہ سب اس کی ایک نظر کے سامنے میرے نزدیک ہیچ و بے رنگ تھے اس نظر کے سامنے جس سے اس نے تمام کائنات کو آفتاب عشق سے سوزاں و فروزاں کر دیا تھا۔ ان ہیرے جواہرات کو میں نے "شیو جی" کے مندر پہ لے گئی اور دیوتا کے قدموں پر میں نے انکو بکھیر کر نچھاور کر دیا کہ وہ اپنے پجاری کا ایک گوشہ چشم میری طرف پھیر دے۔ ایک ذرہ آتش مجھے دلا دے، مگر میں اِک نظر اِک نوازش کو بھی ترسا کی۔

گرمی کی ایک شام تھی، خشک زمین میں ایسے دراڑے پڑے ہوئے تھے جیسے کسی کا پیاس سے منہ کھل گیا ہو۔ دنیا گرمی سے کباب ہو رہی تھی اس وقت میں مندر کے دروازہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ زرد غبار سے آسمان ایک ایسا سنہری گیند معلوم ہوتا تھا جو گرمی سے پگھل رہا ہو۔ اس سنہری گیند میں وہ چاندی کی آنکھیں ایک ایک کر کے کھلنی چمکنی شروع ہوئیں۔ دور سے جنگل کے ہیبتناک درندوں کی آوازیں، دھاڑیں سنائی دیتی تھیں۔ مندر سے ایک کالا ناگ بل کھاتا ہوا نکلا اور چلا گیا۔ چاند ایک سنہری تھال کی طرح درختوں کی سیاہ شاخوں پر سے نکل رہا تھا کہ میں نے اس کے پاؤں کی آہٹ سنی۔ جونہی وہ مندر کے دروازے کے قریب آیا میں اس کی طرف بڑھی اور میں نے اس سے منتیں کیں کہ میرے ساتھ چلے وہ تھوڑی دیر ٹھٹکا، چاروں طرف دیکھا۔ اس تنگ مقام سے خشک میدان کی طرف اور اس کے بعد جنگل کے تاریک اور تناور درختوں کی طرف چاندنی کی روشن لکیر جا رہی تھی، وہ بھی اس پر پڑ لیا میں اس کے پیچھے پیچھے تھی، ہر چیز پر خاموشی اور مدہوشی طاری تھی ——

میدان میں پہونچ کر وہ ایک بڑے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا ——

"اے عورت! بول کیا تو اپنی زینت، اپنے حسن اپنی جوانی کے بل پر کیا اس گناہ فسوں کار کے بل پر جو روح کو پھندے میں پھنسا لیتا ہے میرے دل کو پھسلانا چاہتی ہے۔ میری روح جو اب تک کسی لذت نفس کا دھبہ نہیں لگا ہے وہ پاک و صاف ہے ——

تیری آنکھوں سے لامتناہی جذبات عشق کی لپٹ میری روح کی گہرائیوں کی طرف آ رہی ہے میرے شباب کی بشری آرزوؤں کو جنھیں میں نے اب تک روکا تھا بھڑکا رہی ہے۔ تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟" ——

چاند اس وقت سیاہ جنگلوں کے عین اوپر آ چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیوتاؤں نے ہمارے عشق کو جلا کرنے کے لئے ایک سنہری مشعل بھیجدی ہے۔ میں نے اس کا جواب نہ دیا صرف زرد باریک ریشم کے دوپٹے کو اوڑھے ہوئے جس کی کامدانی پر چاند کی شعاعیں فسفولہ ڈال رہی تھی میں نے اس کے سامنے اپنا بہترین استادانہ ناچ ناچا اور زبانِ رقص سے اپنی حکایتِ عشق کہی۔ اس وقت چمکدار لباس میں میرا جسم، میرے بازو اور جسم ہی نہیں میری روح بھی بلیغ و آہنگ دار تجلیات کے ساتھ اس کے حضور میں رقص کر رہی تھی ——

میں اس وسیع میدان میں چاند کی زرد اور تنہا روشنی میں ایک چاند کا ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی، یا ایک بسنتی پری بنی ہوئی تھی اور میں اپنی روح کے تمام درد و آلام تمام حسرت اضطراب، اپنے اوضاع کے اشعار سے (زبان سے نہیں) اس سے کہہ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی سیاہ آنکھوں کی تابش سے اس کی روح، اس کا دل میری طرف آ رہا ہے، قریب آ رہا ہے، اور قریب آ رہا ہے۔ ——

لیکن عین اس وقت ڈراؤنی آوازیں مجھے سنائی دیں میں نے سر پھرا کر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک غول ایک خوفناک مخلوق کا جن کے چہرے سیاہ جن کی آنکھیں شعلہ تھیں ننگے پاؤں ننگے سر میری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے، ان کی نظروں میں قہر و غضب، ان کی آواز میں تہدید اور ڈپٹ بڑھتی جاتی تھی، وہ میری طرف اور بڑھے چاندنی کے سکوت اس میں سے ایک سوکھی ہوئی ڈراؤنی آواز نے کہا ——

"ایک پاکباز آدمی کو اس نے بہکایا ہے۔ اس کی منحوس روح شیطانی ہے، اسکو اس کے جسم میں سے نکالو اور آگ میں ڈال دو!" ——

اندرا جی سے ملنے گئے تھے۔ وہاں سے
اس حالت میں واپس آتے ہیں -
میں نے انہیں زیادہ جھکنے سے منع کیا تھا

کے آدمی ہیں۔ جس شخص نے چالیس برس سے چپنی کو ہاتھ نہ لگایا ہو وہ کتنے عزم محکم کا مالک ہوسکتا ہے۔ آپ خود سوچئے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی کمزوری کو تسلیم کرنے والے شخص ہیں اور ایسا شخص حالات کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ انتخابات سے قبل ہی انھوں نے اپنی کمزوری کا احساس کرلیا تھا اور اسی لئے جن سنگھیوں اور دوسرے موقع پرستوں کے کندھوں پر بندوق چلانے کی ٹھانی تھی۔ نشانہ غلط ہوگیا تو کیا ہوا۔ یہ پہلا نشانہ تھا دوسرا نشانہ خود وہ پارلیمنٹ میں لگا سکتے ہیں۔ دوسروں کا سہارا لینے کی اب انھیں عادت پڑ گئی ہے۔ جن سنگھیوں نے سابق راجوں مہاراجوں اور سوشلزم کے دشمنوں کی مدد سے ۲۲ سیٹوں پر قبضہ کرلیا ہے اپنے ۱۶ ممبروں کو ۲۲ جن سنگھیوں سے ملادیں، وہ بخوشی مل جائیں گے اس لئے ان کے گروگول والکر نے انھیں مشورہ دیدیا ہے کہ ڈیسائی کے پیچھے چلو۔ ۱۶ اور ۲۲ مل کر ۳۸ ہوجائیں گے۔ پھر ۳۸ کے اس کریلے کو نیم چڑھا بنانے کے لئے تین نام نہاد سوشلسٹوں کی چاشنی اس میں شامل کردیجئے۔ "داروئے تلخ" بن جائے گی جو یقیناً "دافع مرض" یعنی کہ ایوان کی خاموشی کی بیماری کو دور کرنے والی ہوگی۔ ۴۱ کی تعداد اتنی اودھم چوکڑی مچانے والی ہے کہ اندراجی کے لئے کام کرنا مشکل کرسکتی ہے۔

ویسے پچاس ممبروں کی تسلیم شدہ اپوزیشن بنانا ہو تو آٹھ کی بھیک سوتنتر پارٹی سے مانگی جاسکتی ہے۔ مسانی اور رنگا میں سے کوئی بھی اُن آٹھ ممبروں کی قیادت سنبھالنے کے لئے ایوان میں نہیں ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ صدر سوتنتر پارٹی اپنے ممبروں کو ڈیسائی بھائی کی قیادت میں دینے پر کوئی بھی اعتراض نہیں کریں گے — امریکی نوازں پر امریکی نواز سے مل جاتا ہے۔ یہ تعداد ۴۹ تک پہونچے گی۔ ایک کی کمی ہوگی تو واحد جن سنگھی (بی۔کے۔ڈی) کو ملاکر یہ کمی پوری ہوسکتی ہے یا کسی سابق راجا مہاراجا یا کسی کا بھی دست تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے ایک ووٹ لینا کیا مشکل کام ہے اس طرح یہ باقاعدہ اپوزیشن قائم ہوجائے گی جس کے لیڈر مسٹر ڈیسائی ہوں گے۔

اپوزیشن کے اس قیام پر ہم مسٹر ڈیسائی "زندہ باد" کا نعرہ بلند کرسکتے ہیں۔ وزارت عظمیٰ نہ ملی تو کیا ہوا وزارت عظمیٰ کی ٹکر کا عہدہ تو مل گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ ایس۔کے۔ پاٹل منیں گے تو انھیں اپنا بیان واپس لینے پر غور کرنا پڑے گا۔

واقعات نئی دھلی

اور ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ کے پیروں کے نیچے سے تو لوں سمجھیے زمین ہی نکل جائے گی۔ اس لئے کہ پچھلی پارلیمنٹ میں سنا ہے انھوں نے ڈیسائی کو ہاتھ پکڑ کر پیچھے کردیا تھا اور کہا تھا کہ۔

"اپوزیشن کی لیڈرشپ کا حقدار صرف میں ہوں" اب سنیں گے کہ ڈیسائی اپوزیشن لیڈر بن گئے تو انھیں اپنا حق یاد آجائیگا لیکن۔ "اب پچھتائے کا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

بہار جا چکی نقشِ بہار باقی ہے

بندگی کا یہ سوئٹر ہی ٹھیک ہے۔ ہارنے کے بعد
کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔

روز کسی نہ کسی کا کھیت چر جاتا ہے۔ کمبخت
مار مار کر چرن سنگھ بنا دوں گا۔

وہ جیوتشی تو انتخابات کا نتیجہ نکلنے سے
ایک دن پہلے ہی بھاگ گیا۔

جب تک میری ناک ٹھیک نہیں ہو گی
نہیں جاؤں گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ناک کٹ گئی

بند کر دو یہ ریڈیو

ہم بھی اس علاقہ میں اندرا کانگریس کے ٹکٹ پر
الیکشن لڑتے تو ضرور کامیاب ہو جاتے۔

دن میں تارے نظر آ گئے تو کیا ہوا۔
تارا تو ہمارا انتخابی نشان ہے۔

بے چارے راج صاحب کی
ضمانت ضبط ہو گئی۔

میرا شوہر الیکشن ہار گیا ہے۔ اسلیے مجھے لکڑی کا نہیں
بلکہ لوہے کا بیلن چاہیے۔

الیکشن ہارنے سے پہلے میں تمہاری عمر کا تھا تو صرف فلمی اداکاراؤں کی تصویریں لگایا کرتا تھا

اب آپ الیکشن ہار چکے ہیں۔
میرا تو نوٹوں کا ہار واپس کر دیجیے۔

بے اُمید ہو کر......

آپ اس وقت تک لوک سبھا میں داخل نہیں ہو سکتے۔ جب تک مجھے مخالفین
کے جلسوں میں ٹماٹر پھینکنے کا معاوضہ نہیں دیں گے۔

پچھلے دس سال روزگار کے دفتر جا رہا ہوں
میرا نام سب سے اوپر لکھیے۔

واقعات
نئی دہلی

• کیا شام، مصر اور لیبیا کی نئی فیڈریشن زیادہ دیر قائم رہ سکے گی؟

(ڈاکٹر ذاکر حسین کی دوسری برسی کے موقع پر)

پچھتر سالہ فرانکوئیس دوویلیر کا نام تاریخ میں اس بادشاہ کے طور پر روشن رہے گا کہ اس نے بحرِ کیریبین کی اس ننھی سی ریاست کو جو مغربی کرۂ ارض کی جنت بن سکتی تھی ظلم و جبر کا نمونہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کی موت کی خبر عوام نے اور خاص طور سے جلاوطن لوگوں نے سنی تو وہ خوشی سے ناچنے لگے۔

ہیٹی کی آبادی اس وقت ۴۹ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور ان میں اکثریت کالوں کی ہے۔ کالوں کی تعداد اس لئے بڑھی کہ ۱۴۹۲ء میں جب کولمبس نے اس جزیرے کو معلوم کیا تھا تو اس کے بعد جھگڑوں اور دوسرے اسباب کی بنا پر وہاں کے اصل باشندے ریڈ انڈین ختم ہو گئے اور ۱۵۱۰ء میں سپین والوں نے شاہ اسپین سے جس کا اس پر تسلط تھا افریقہ سے کالے غلاموں کو لا کر وہاں پر بسانے کی اجازت طلب کر لی۔ ۱۸۰۴ء میں غلاموں کی بغاوت نے اسے کالوں کی پہلی جمہوریت میں تبدیل کر دیا لیکن جمہوریت میں تبدیل ہونے کے بعد یہ جزیرہ ہمیشہ بد انتظامی کا شکار رہا جس کے نتیجے میں مغربی کرے کا یہ جزیرہ جو کبھی کسی زمانے میں فرانس کی سب سے زیادہ زرخیز آبادی خیال کیا جاتا تھا بنجر زمین میں تبدیل ہو گیا۔ فرانکوئیس دوویلیر کا چودہ سالہ دور حقیقی معنوں میں خوف و دہشت زدگی کا دور تھا جس میں ہر شخص سہما سہما رہتا تھا کہ نہ جانے کب اس پر ظلم کیا جائے۔ یہ جمہوریت نہیں بد ترین ڈکٹیٹر شپ تھی۔ فرانکوئیس دوویلیر جسے عام طور پر "پاپا ڈاک" کہہ کر

۱۹ سالہ جین کلاڈ ۔ ہیٹی کا نیا صدر

پکارا جاتا تھا ایک میڈیکل ڈاکٹر تھے۔ اس جزیرے میں ایک مرتبہ کوڑھ کی بیماری پھیلی جس میں اسی فیصدی لوگ مبتلا ہو گئے اور پاپا ڈاک نے علاج معالجے میں نام پیدا کر کے لوگوں کے دل جیت لئے۔ وہ ۱۹۴۱ء میں مملکت کے وزیر صحت بنائے گئے اور بعد ازاں ۱۹۵۷ء میں فوج کی مدد سے عہدۂ صدارت پر قبضہ کر لیا۔

لیکن ابھی انھوں نے بمشکل اپنے عہدے کا چارج لیا تھا کہ پاپا ڈاک ایک کالے "نیشنلسٹ" سے کالے ہٹلر میں تبدیل ہو گئے۔ انھوں نے ہٹلر کی طوفانی فوج کی طرح "ٹون ٹون میکاؤٹس" نامی دستہ تیار کیا جس نے جزیرے میں ایسی خوف و دہشت پھیلائی کہ ہزاروں لوگ مملکت چھوڑ کر بھاگ گئے۔ "پاپا ڈاک" نے ان تمام ایسے لوگوں کو تختۂ دار پر چڑھا دیا جن سے خطرہ تھا کہ وہ اقتدار چھیننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے اپنے ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنایا اور ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فولادی خود اور گہرے رنگ کے چشموں میں ملبوس دستے کا ہر سپاہی ہیٹی کے باشندوں کے لئے خوف و دہشت کا نشان بن گیا۔

پاپا ڈاک نے عوام پر اپنا غلبہ رکھنے کے لئے جادو ٹونے کا بھی خوب استعمال کیا جس پر عام طور پر جزیرے کے سب ہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے دیہی علاقوں کے جادوگروں کو جو اپنے اپنے علاقوں میں بااثر تھے اپنے دربار میں طلب کیا اور انھیں

جین کلاڈ کی بڑی بہن میری ۔ ۱۹۷۱

اعتماد میں لے کر پروپیگنڈا کرایا کہ "وہ ایک غیر معمولی ... کا مالک ہے"۔ جیسے تیسے پاپا ڈاک کہا کرتا تھا کہ "میرے دشمن مجھے ختم نہیں کر سکتے اس لئے ... سے بنا ہوا انسان نہیں ہوں"۔

یہ سب ڈھونگ اس لئے رچانا پڑا کہ ... ہیٹی کے ۳۶ صدروں میں سے ۲۳ کو قتل کر دیا گیا یا ... سے اتار دیا گیا تھا۔ اسی لئے اس نے ایک طرف تو ... پھیلایا اور دوسری طرف خوف و دہشت کی فضا پیدا کر ... ایک مرتبہ اس کے وزیروں کو اغوا کرنے کی کو...

• ایک مرتبہ میں ایک ساتھی سے [illegible] کے خلاف حکومت کے دفتر گیا۔ ہم نے جنگ کے [illegible] سے ایک پرائیویٹ کینٹین سے قہوہ منگانے کا [illegible] جو لڑکا قہوہ لے کر آیا اس کی عمر مشکل سے بارہ برس ہو گی۔ —

امریکا

امریکن عورتیں بھی اسقاطِ حمل کی دوڑ میں شامل

لیجیے امریکا میں بھی اب اسقاطِ حمل پر بحث چھڑ گئی۔ ایک طبقہ ہے جو چاہتا ہے کہ اسقاطِ حمل کے معاملے میں زیادہ سختی نہیں ہونی چاہیے۔ اور پرانے قانون کے تحت جو پابندی لگائی گئی ہے کہ صرف ماں کی صحت کو خطرہ ہونے کی صورت ہی میں حمل گرایا جا سکتا ہے، وہ ختم ہونی چاہیے اور عورتوں کو حمل گرانے کی مکمل اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن دوسری طرف اسقاطِ حمل کے خلاف بہت سے گروپ اور جماعتیں میدان میں آ گئی ہیں اور انھوں نے پرانے قانون میں ترمیم کے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے ان میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں فرقوں کے لوگ شامل ہیں۔ خود صدر نکسن نے اس بات کی سختی کے ساتھ مخالفت کی کہ ایک عورت کو اس کی مرضی کے مطابق حمل گرانے کی اجازت دی جائے۔

یہ بحث اس لیے شروع ہوئی کہ واشنگٹن میں ہائی کورٹ کے بنچ نے ۲ کے مقابلے میں ۵ ووٹ سے ایک ڈاکٹر ملن ووٹیا کے حق میں فیصلہ دیا۔ انھوں نے آزادانہ طور پر ایک عورت کا حمل گرایا تھا جس پر انھیں عدالت سے سزا ملی۔ اس سزا کو ختم کرنے کے لیے ہائی کورٹ سے یہ دلیل دی گئی کہ پرانا قانون مبہم ہے اور اس میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ عورت کی زندگی کے لیے کب خطرہ پیدا ہو سکتا ہے اس وجہ سے ایک ڈاکٹر کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے معلوم ہو سکے کہ اسقاطِ حمل کے کسی معاملے میں وہ کسی جرم کا مرتکب ہو رہا ہے کہ نہیں۔

دو سرے ججوں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ایک ڈاکٹر آپریشن کرنے سے قبل ماں کی جسمانی صحت اور [illegible] کیفیت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔ ایک جج [illegible] نے اس میں ان الفاظ کا اضافہ کیا کہ [illegible] صورت دینا حکومت کی ذمے داری ہو گی

امریکن ایکٹریس ڈینوا جو اسقاط حمل کے حق میں ہے

کہ اسقاطِ حمل کے وقت ماں کی زندگی خطرے میں نہیں تھی۔

اس وقت سپریم کورٹ میں نصف درجن ایسے مقدمات زیرِ سماعت ہیں جن میں اسے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا عورت کو اس کی مرضی کے مطابق حمل گرانے کی اجازت نہ دینے سے اس کے ذاتی حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے!

ہماری جدید تہذیب نے بھی کیا کیا مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ دراصل یہ روحانیت کی دنیا سے نکل کر کلیتاً مادیت کی دنیا کو اپنانے کا نتیجہ ہے جس میں ہر چیز کو روا اور دولت کی ارتھمیٹک سے ناپا جانے لگا ہے اور کھلی "نسل کشی" کو "سائنسی بحث" کا موضوع بنا لیا گیا ہے۔ —

ویٹیکن

ہمیں آرٹسٹک ننگ پسند نہیں

مغرب کے "آوارہ گرد" آج کل ساری دنیا میں پھیلے نظر آتے ہیں۔ کوئی ہپّی کے نام سے موسوم ہے کوئی موسیقار کے نام سے۔ یہ لوگ آوارہ گردی کرتے ہیں، گاتے بجاتے اور مست رہتے ہیں۔ پوشاک کی ان کے مذہب میں کوئی قید نہیں کبھی مرد زنانہ لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں اور کبھی عورتیں مردانہ لباس میں۔ وہ کبھی کوٹ پہنتے ہیں اور کبھی کرتے پاجامے میں رہتے ہیں۔ ہاف پینٹ ہو یا نیکر جو ان کے ہاتھ آئے گا پہن کر چل پڑیں گے۔ انھوں نے اپنی شکلیں بھی عجیب بنائی ہیں۔ بال یا تو ترشواتے نہیں یا اگر ترشواتے ہیں تو ایسے آرٹسٹک ڈھنگ سے کہ بعض اوقات اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ

پوپ پال
نوجوان
ہپیوں
کیساتھ

[illegible]ں صنف کی مخلوق ہیں۔

ایسی ہی مخلوق سے تعلق رکھنے والے تقریباً سالحہ برٹش نوجوانوں نے ویٹیکن میں پوپ اعظم سے ملاقات کی۔ انھوں نے ان نوجوانوں کی "آرٹسٹک شکلوں" پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھیں اس لیے بھی ناپسندیدگی ہوئی کہ گروپ میں شامل لڑکیاں اپنے اونچے کوٹوں کے نیچے ہاف پینٹ (نیکر کے مشابہ) پہنے اپنی عریانیت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ نیم عریاں رہنے والے آوارہ گردوں کے اس گروپ کے ساتھ پوپ کی ملاقات پر اطالوی اخبارات کافی ناراض ہیں۔ روم کے دائیں بازو کے ایک اخبار نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہم نہیں چاہتے ہیں کہ برگسٹ چیں کہ پوپ نے برہنہ رہنے والے گروپ کے لوگوں کو شرفِ ملاقات بخشا ہے"

لیکن دوسری طرف "آوارہ گردوں" نے پوپ کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بنایا اور ایک موسیقار جان سیڈرسن نے پوپ سے کہا:۔

"آپ اگر مانعِ حمل گولیوں پر پابندی کا اختیار رکھتے ہیں تو فوج میں لازمی بھرتی کو کیوں نہیں روک سکتے؟ آپ تمام کیتھولک لوگوں کو ہدایت نہیں کرتے کہ وہ جنگ میں حصہ نہ لیں۔ آپ اطالوی فوج کو کیوں ختم نہیں کراتے؟"

"یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے" عزت مآب پوپ نے جواب دیا۔

ایک زمانہ تھا کہ پاپائے اعظم کو جنت دوزخ کا مالک سمجھتے تھے لیکن آج اس کی ذات بھی نکتہ چینی سے مبرّا نہیں ہے۔ •

[illegible]

(تائیوان)

جنرل کائی شک کی نیند حرام

چین کے بارے میں امریکی پالیسی میں جو زمی آئی ہے اس سے فارموسا کی حکومت بڑی پریشان نظر آتی ہے اور جنرل چیانگ کائی شیک کی تو نیند ہی حرام ہو گئی ہے۔ دراصل جنرل جو سرزمین خاص کے ۳۴ لاکھ مربع میل کے علاقے سے نکل کر فارموسا (تائیوان) کے ۱۴ ہزار مربع میل کے علاقے پر قناعت کئے ہوئے ہیں ابھی تک آس لگائے بیٹھے ہیں کہ ایک دن آئے گا جب وہ سرزمین چین کے اسی کروڑ کے قریب انسانوں کی قسمت کے مالک بنیں گے۔ (فارموسا کی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ کی آبادی اس کے علاوہ ہے)

فارموسا اصل چین سے تقریباً سو میل کی دوری پر واقع ہے۔ سمندر درمیان میں نہ ہوتا تو چیانگ کائی شیک کو امریکا جا کر ہی پناہ لینی پڑتی۔ لیکن سمندر چیانگ کائی شیک کے کام آ گیا اور کمیونسٹوں کی کامیاب یلغار کے بعد وہ اس بڑے جزیرے میں اپنی حکومت قائم کرکے بیٹھ گئے۔ اپنی حکومت قائم کر لینے میں کوئی ہرج نہ تھا، لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنے آپ کو چین کا مالک و مختار سمجھتے ہیں اور اس بات کے لئے امریکا کی تعریف کرتے رہے ہیں کہ اس نے کمیونسٹ چین کو اقوام متحدہ کا ممبر نہیں بننے دیا۔

لیکن اب جو امریکا نے پلٹا کھایا اور یہ محسوس کرکے کہ چین کے تعاون کے بغیر جنوب مشرقی ایشیا میں امن نہیں رہ سکتا تو اس سے محبت کی پینگیں "بڑھانے کی بات سوچی اور "پنگ پانگ" کی ٹیم بھیج کر اس کا آغاز بھی کر دیا تو چیانگ کائی شیک کا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔

جو ممالک چیانگ کائی شیک کو پرانا قوم پرست مانتے ہوئے ان کا احترام کرتے ہیں وہ بھی امریکا کی پالیسی سے پریشان ہیں۔ مثلاً جاپان کے وزیر خارجہ مسٹر کیچی آئیچی نے کہا کہ:۔

"کمیونسٹ چین کے ساتھ بالفعل تعلقات کے باوجود حکومت جاپان نیشنلسٹ چین ہی کو عوامی حکومت تسلیم کرتی ہے۔" جاپان نے نیشنلسٹ چین کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے اس لئے شاید ابھی تک اس کے دل میں چیانگ کائی شیک کا احترام ہے ورنہ اس وقت ان کی جو پوزیشن ہے وہ سبھی سمجھتے ہیں۔

امریکا بھی انکی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور اس لئے اب اس نے انکی پروا کئے بغیر چین کے ساتھ تعلقات بحال کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ پنگ پانگ ٹیموں کے آنے جانے کے بعد یہ یقینی ہے کہ صدر امریکا مسٹر نکسن بھی چین کے دورے پر جائیں گے اور ماؤزے تنگ کے مہمان رہیں گے امریکی پالیسی اگرچہ ابھی تک واضح طور پر سامنے نہیں آئی لیکن بعض حلقوں کے مطابق اب امریکا اس سوچ میں ہے کہ دونوں چینوں کو الگ الگ ملک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے اور یقین ہے کہ کمیونسٹ چین بھی اس تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ بشرطیکہ سلامتی کونسل میں اسے مستقل سیٹ مل جائے آجکل اس سیٹ پر فارموسا گورنمنٹ قابض ہے حالانکہ چین کا حق ہے جو ایک بڑا ملک ہے۔ اقوام متحدہ کے قیام کے وقت پانچ بڑے ملک تسلیم کئے گئے تھے ان میں سے ایک چین بھی تھا۔ سلامتی کونسل [illegible] امریکا [illegible] [illegible] امریکا [illegible] کے بہت قریب آ جائیں گے۔

(ماخوذ)

آج بنگلادیش کا بچہ بچہ ظلم و ستم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ لوگوں کے سامنے اپنی جان بچانے کیلئے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ وہ ہاتھوں میں بندوق اٹھالیں۔

کلکتہ میں پاکستان کے نائب سفیر جناب حسین علی نے بنگلادیش حکومت سے اپنی وفاداری کا اعلان کردیا اور سفارتخانے کی عمارت پر بنگلادیش کا جھنڈا لہرادیا۔

...تی فوج کے کیپٹن بلال جنگی تیار...
فوج نے جیسور پر قبضہ کرلیا تھ...

بنگلادیش کے عوام آخر دم تک لڑتے رہیں...

...سید نذر الاسلام فوج کی سلامی لے رہے ہیں۔ انکے پیچھے مکتی فوج کے ...چیف کرنل محمد عثمانی کھڑے ہیں۔

بائیں سے دائیں۔ سید نذر الاسلام۔ وزیر اعظم تاج...
کیپٹن منصور علی اور اے۔ ایچ قمر الزمان۔

...دشمنوں سے لڑھا لیتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ وہ درد سے بے چین لڑکھڑاتا ہوا ہیڈ کوارٹر کی طرف آ رہا ہے۔ کرب سے اس کا چہرہ بگڑ چکا تھا۔ ایک ہاتھ میں بندوق تھی اور دوسرے میں ٹوپی۔ اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچ کر نوجوان نے بندوق اپنے ایک ساتھی کو دے دی۔ اور وہ خود زمین پر گر کر ختم ہو گیا۔

نوجوان نے اتنی محنت اس لئے کی تھی کہ اس کی بندوق دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اور اسکے بعد اسکے ساتھی آزادی کے لئے اس بندوق سے لڑتے رہیں۔ ●

اکستان میں جمہوریت کا قتل

بنگلا دیش کے پہلے نائب صدر جناب نذر الاسلام مجیب نگر میں عہدہ کا حلف لینے کے بعد غیر ملکی نامہ نگاروں کو انٹرویو دے رہے ہیں ●

بنگلا دیش کی حکومت نے باقاعدہ طور پر ...لیا۔ وزیر اعظم تاج الدین احمد حلف لینے کے بعد دنیا ...ہ نامہ نگاروں کے ساتھ ●

چیئرمین ماؤ سی تونگ سے ایک خیالی انٹرویو

انقلابی ۔ چیئرمین ماؤ کو انقلابی کا لال سلام مشرقی لال ہو چکا ہے اور طاقت بندوق کی نال سے نکلتی ہے۔

ماؤ ۔ لال سلام ۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میرے ذہن میں کیا ہے؟

انقلابی ۔ طاقت اور حکومت عوام کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔

ماؤ ۔ ہاں یہ میری ہی ایک انقلابی کہاوت ہے۔

انقلابی ۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا چیئرمین کہ تمام انقلابی گروں کو تمام انقلابی گروں کے انقلاب کا استقبال کرنا چاہیئے۔

ماؤ ۔ بالکل کہا تھا۔

انقلابی ۔ چاہے انقلاب کو وقتی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے۔

ماؤ ۔ بالکل!!!

انقلابی ۔ کیونکہ آخر میں فتح انقلابی عوام ہی کی ہوتی ہے، اسی لئے آپ نے امریکا میں نیگرو تحریک کی حمایت کی تھی۔؟

ماؤ ۔ کرنی ہی چاہیئے تھی۔

انقلابی ۔ اور انگولا اور موزمبیق کی عوامی تحریک کی بھی۔؟

ماؤ ۔ بلاشبہ۔

انقلابی ۔ آپ سیاست اور ملکی معاملات میں مذہب کی مداخلت کے بھی خلاف ہیں۔

ماؤ ۔ ہاں! کیونکہ مذہب عوام کے لئے افیم کا کام کرتا ہے جیسا کہ مارکس نے کہا ہے۔

انقلابی ۔ اور آپ فوجی ڈکٹیٹر شپ کے بھی خلاف ہیں۔

ماؤ ۔ ہاں، کیونکہ میں چیانگ کائی شیک کی فوجی ڈکٹیٹر شپ کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

انقلابی ۔ پھر ان حالات میں چیئرمین آپ پاکستان کی حکومت کی حمایت کس طرح کر سکتے ہیں جو فوجی بھی ہے اور جس کی بنیاد بھی مذہب پر قائم ہیں۔؟

ماؤ ۔ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ سوال در سوال کرنا ایک غیر عوامی حرکت ہے لیکن پھر بھی میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔

انقلابی ۔ شکریہ چیئرمین!

ماؤ ۔ اچھا تو اب آپ مجھے بتایئے کہ دنیا کی سب سے زیادہ انقلابی جماعت کونسی ہے۔؟

انقلابی ۔ مجھے معلوم نہیں چیئرمین، ویسے میرے خیال میں یا تو ویت کانگ یا پھر پاتھٹ لاؤ۔

ماؤ ۔ بکواس ۔ دنیا کی سب سے زیادہ انقلابی جماعت کمیونسٹ پارٹی آف چائنا ہے۔

انقلابی ۔ وہ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔

ماؤ ۔ اور یہ پارٹی ہی چائنا پر حکومت کر رہی ہے۔

انقلابی ۔ اس حساب سے چائنا دنیا کا سب سے زیادہ انقلابی ملک ہے۔

ماؤ ۔ بالکل ٹھیک! اب بتاؤ کیا پاکستان چائنا کا دوست نہیں ہے۔؟

انقلابی ۔ بالکل ہے۔

ماؤ ۔ ہماری دوستی کی وجہ سے ہمارا کچھ انقلاب چھوٹ کر پاکستان کو بھی لگ جاتا ہے، اسی لئے پاکستانی حکومت ترقی پسند ہے۔!

انقلابی ۔ جی ہاں!!!

ماؤ ۔ اور وہ سب لوگ جو پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں وہ ری ایکشنری ہیں، امریکا کے ایجنٹ ہیں۔

انقلابی ۔ روس بھی؟۔

ماؤ ۔ روس امریکا کا ہی نہیں سی آئی اے کا بھی ایجنٹ ہے۔

انقلابی ۔ عوامی تحریکیں بھی۔؟

ماؤ ۔ بالکل ۔ وہ تحریکیں جو ترقی پسند حکومت کے خلاف ہوں، وہ بھی۔

انقلابی ۔ لیکن آپ نے تو دنیا بھر کی ان تمام تحریکوں کی مدد کا وعدہ کیا تھا، جو اپنے حقوق کے لئے لڑ رہا ہیں۔

ماؤ ۔ بالکل ٹھیک۔

انقلابی ۔ لیکن آپ ایسے ملک کی حمایت کیسے کر سکتے ہیں جہاں کمیونسٹ پارٹیوں پر پابندی لگی ہو اور جہاں کمیونسٹوں کو جیل میں سڑایا جا رہا ہو۔

ماؤ ۔ تم بے وقوف ہو ۔ وہ نقلی کمیونسٹ ہیں۔

انقلابی ۔ اس کا مطلب ہے مولانا عبدالحمید بھاشانی بھی سی آئی

مجیب الرحمٰن ۔ عوام دشمن ؟؟؟

ماخذات مقصود علی

ماؤ کا عزیز شاگرد
یحییٰ خان

لے کے ایجنٹ ہیں۔

ماؤ۔ بالکل ہیں، اگر وہ بنگلا دیش کے عوام کی مدد کر رہے ہیں تو پکے سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔

انقلابی۔ جنرل یحییٰ خان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ماؤ۔ جنرل نہیں، کامریڈ یحییٰ خان۔

انقلابی۔ معاف کیجئے گا چیرمین۔ کامریڈ خان، یعنی ہمیں مولانا بھاشانی کے خلاف کامریڈ خان کی مدد کرنی چاہیئے۔

ماؤ۔ بالکل۔

انقلابی۔ لیکن پاکستان ایک مذہبی ملک ہے۔

ماؤ۔ جو مذہبی ملک چین کا دوست ہو مذہبی ملک نہیں رہتا۔

انقلابی۔ یعنی، اسرائیل، امریکا اور دوسرے تمام ملک بھی۔۔۔؟

ماؤ۔ بالکل ہم سے دوستی کر کے وہ بھی انقلابی بن سکتے ہیں۔

ماؤ۔ لیکن یاد رہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں طاقت بندوق کی نال سے۔۔۔

انقلابی۔ جی ہاں بندوق کی نال سے نکلتی ہے۔ یحییٰ خان اس بات کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔

ماؤ۔ ہاں یحییٰ میرے ہوشیار طالب علموں میں سے ہیں۔

انقلابی۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے بنگالی عوام بھی آپ کو اپنا گرو بتاتے ہیں، ہزاروں نوجوان آپ کا نام لے کر اپنی جانوں کی قربانی دے دیتے ہیں۔

ماؤ۔ وہ بھی میرے اچھے طالب علموں میں سے ہیں لیکن ان کی بندوقیں ابھی بنی ہوئی نہیں ہیں۔

انقلابی۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ امریکا بنگلا دیش کا ساتھ دے رہا ہے۔

ماؤ۔ ہاں کیونکہ امریکا عوام دشمن ہے۔

انقلابی۔ لیکن آپ نے امریکا کی ٹیبل ٹینس کا تو زبردست سواگت کیا ہے۔؟

ماؤ۔ اگر ہم کسی امریکی ٹیم کو ہرا سکتے ہوں تو اُسے بلانے کی اجازت ہے۔

انقلابی۔ تو آپ فٹبال کی ٹیم کو ملک میں گھسنے کی اجازت

ماؤ۔ کبھی نہیں۔

انقلابی۔ اور ہندوستانی کرکٹ ٹیم کو؟

ماؤ۔ ہم غلاموں کے کھیل نہیں کھیلتے۔

انقلابی۔ لیکن ٹیبل ٹینس بھی تو۔۔۔

ماؤ۔ ٹیبل ٹینس نہیں بلکہ پنگ پانگ، ہم نے اس کا چینی کرن کر لیا ہے اس لئے اب یہ ہمارا کھیل ہے بلکہ ہمارے سائنسداں کا خیال ہے کہ اب سے ہزاروں سال پہلے چانگ کے لوگ مرغی کے انڈوں سے پنگ پانگ کھیلتے تھے۔

انقلابی۔ چیرمین بہت بہت شکریہ ہم نے آپ سے بہت سی قیمتی باتیں سیکھیں۔ دنیا میں انقلاب کا پیمانہ یہ ہے کہ انقلاب چین کا دوست ہے یا نہیں۔

کوئی بھی ملک چین سے دوستی کر کے انقلابی بن سکتا ہے۔ اگر چین کے کسی دوست ملک کے عوام ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں تو وہ سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔

ماؤ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ میرے خیالات کو اپنے عوام دشمن انقلاب دشمن سرمایہ دار، رجعت پسند اخبارات میں شائع کر سکتے ہیں تاکہ عوام کو پتہ لگ جائے کہ چین ان کا دشمن نہیں دوست ہے

انقلابی۔ لال سلام کامریڈ۔

ماؤ۔ لال سلام۔

چینی وزیر اعظم چو این لائی کا پاکستان کا دورہ کرنے کا ارادہ ہے ـــــ ایک خبر

جس میں ایک رکھر ہوا کھانا جدید [illegible]
علاقے کا مضبوط حصہ [illegible] تعلیم جو شہرات
تمام سہولتوں سے آراستہ کیا گیا ہے اور نت نئے
ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے پیش نظر یہ قیاس کیا
جاسکتا ہے کہ آنے والے دس برسوں میں اسے
بین الاقوامی شہروں کی فہرست میں درج کر لیا جائے
گا۔ عصر جدید کی تعلیمی، سائنسی اور سماجی ترقی کے
باوجود لاماؤں کا اثر آج بھی بھوٹانی سماج پر اتنا ہی
گہرا ہے جتنا ہزار سال قبل تھا۔ سماجی یا سیاسی
کوئی بھی جلسہ ہو جلوس ہو لاماؤں کا ان میں شرکت
کرنا ضروری ہے۔ ذاتی اور سرکاری تقریبات میں آج
بھی ان سے دعائیں لی جاتی ہیں۔ انھیں مذہبی پیشوا
کی حیثیت دی جاتی ہے اور ان کی عزت و توقیر کرنے
میں شاہ و گدا سب ہی پیش پیش نظر آتے ہیں۔

بھوٹان کی سرسبز پہاڑیوں، گنجان اور سرسبز
وادیوں، لاماؤں کی پراسرار شخصیتوں میں سب سے
عظیم ترین ہستی وہاں کے شاہ جگمے دورجی ہیں جو بادشاہوں
میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جگمے دورجی جیسا روشن خیال
عاقل، جمہوریت پرست اور ہوشیار بادشاہ نہ کسی دور
میں پیدا ہوا اور نہ شاید مستقبل میں ایسے انقلابی
بادشاہ کے معرض وجود میں آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

نیا بھوٹان دوسرے الفاظ میں موجودہ
بادشاہ کا ہی تحفہ ہے۔ جگمے دورجی نے اپنے باپ کے
استوار کئے ہوئے ہندستان سے تعلقات کو اور
بھی مضبوط بنایا۔ سیاسی گرفت سے نجات دینے
کے لئے انھوں نے [illegible] نیشنل اسمبلی
قائم کی اور [illegible] دیئے گئے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اس کے علاوہ [illegible] اسمبلی کو [illegible]

غیر طاقت سے نوازدیا یعنی سونگ دو اپنے کسی
بھی اجلاس میں معمولی اکثریت سے پاس کی گئی تجویز
کے ذریعے بادشاہ کو معطل کر سکتی ہے۔ دوسرا عجیب
غریب طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا ہے کہ بادشاہ کو ہر
تیسرے سال سونگ دو سے اعتماد کا ووٹ حاصل
کرنا ہوگا۔ اس طرح مطلق العنانی کو جڑ بنیادوں سے
اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔

۱۹۷۰ء میں بھوٹان کو اقوام متحدہ کی رکنیت
پیش کی گئی۔ لیکن بادشاہ نے اس پیشکش کو یہ
کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ ابھی بھوٹان اس قابل نہیں
ہو سکا کہ بین الاقوامی معاملات میں اپنا صحیح کردار
نبھا سکے۔ بہرحال [illegible] بھوٹان اس
قابل ہو [illegible] ۱۲ واں ممبر بنا لیا جائے گا۔
[illegible] چین کے بھوٹان پر قبضہ کر لینے
کے منصوبے سے واقف ہو کر بادشاہ نے سڑکیں
کم سے زیادہ والے ہر بھوٹانی شہری کے لئے
فوجی تربیت لازمی قرار دے کر اپنے ملک کی دفاعی

حیثیت اتنی مضبوط کر لی کہ چین کی فوجیں ایک قدم
آگے نہ بڑھا سکیں۔

بادشاہ اور ولی عہد اکثر و بیشتر ایک ہی کھلی
جیپ میں کھیتوں، سڑکوں اور جنگلوں میں گھومتے
پھرتے ہیں۔ ان کی سلامتی اور حفاظت کے لئے کوئی گارڈ
متعین نہیں ہے۔ ہر شہری کسی وقت بھی ان سے مل
سکتا ہے۔

شاہانہ ترک و احتشام کو ترک کر دینے والے شاہ
بھوٹان نے سونگ دو کے نمائندوں کی ماہانہ تنخواہ تین
ہزار روپے مقرر کی ہے جبکہ بادشاہ کا بینہ کے وزیر
کو صرف ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے۔
بھوٹان کے جگمے دورجی وانگ چک کا یہ
عظیم انسانی کارنامہ عوام سے زیادہ انقلاب پسند اور
شہنشاہیت کے دشمن کہلائے جانے کے [illegible]
سمجھتے ہیں۔ سارک ممالک بلاشبہ دنیا کے ایسے
فرمانروا ہیں جو بیک وقت بادشاہ بھی ہیں اور عام آدمی
بھی۔

بھوٹان ب
بدھ مت
لوگ
ایک مذہ
رقص کر
میں

نشہ آور بوٹی

ذہن و جسم پر اس کے اثرات

میرا ایک غیر ملکی دوست جو کہ ڈاکٹر تھا اپنی بیوی اور لڑکے کے ساتھ میرے پاس چند دن کے لیے ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ وہ بھنگ پینے کا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے اپنے ایک دوست کے ذریعے بھنگ کا انتظام کرایا۔ میرے لڑکے کو بھنگ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی مگر کیونکہ بھنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے اس نے ہر شخص کو عام خوراک سے پانچ یا چھ گنا زیادہ بھنگ دے دی۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی بھنگ پیتے ہی لیے لیے لیٹ گئے۔ ڈاکٹر نے بالکل مدہوش ہونے سے پہلے بھنگ کے اثرات بتانا شروع کر دیئے۔ بدقسمتی سے میرے پاس اس وقت ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا ورنہ میں ڈاکٹر کے تاثرات پوری طرح نوٹ کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ ڈاکٹر نے رنگوں، آوازوں، روشنی اور آواز کے تعلق کے بارے میں بڑی عجیب باتیں بتائیں۔ دوسری طرف اس کی بیوی صرف مسکراتی رہی۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کی آواز سن رہی تھی جو بڑی عجیب باتیں کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ وہ خود بھی اسکی باتوں میں اضافہ کر سکتی ہے لیکن اس کی زبان اسکا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

یہ واقعہ پروفیسر نریندر ناتھ ورگ نے سنایا جنہیں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (W.H.O) کی طرف سے ہندوستان میں بھنگ کی پیداوار اور اس کے اثرات کے بارے میں ریسرچ کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ورگ کے علاوہ ایک دوسرے ہندوستانی نکھانت راٹھوڑ بھی ذہن اور جسم پر بھنگ کے اثرات کے بارے میں ریسرچ کر رہے ہیں۔

دنیا میں بہت کم علاقے ایسے ہیں جہاں بھنگ کا پودا اگ سکتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی پیداوار اور استعمال نامعلوم زمانے سے ہے۔ ہندوستان میں یہ دہلی کے آس پاس اور بنگال کے تالابوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ترکی اور افریقہ میں بھی اس کی پیداوار ہوتی ہے۔ لاطینی امریکہ کے کچھ علاقوں میں بھی اس کا استعمال اور پیداوار ہوتی ہے۔ امریکہ اور تمام یورپ میں اس کی پیداوار پر پابندی لگی ہوئی ہے ویسے بھی وہاں کی زمین اور آب و ہوا اس کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس کا پودا بیج سے پیدا ہوتا ہے۔ پودے میں پھول اور پتے معاون ہی ہوتے ہیں جڑ کے علاوہ پودے کا تمام حصہ کام میں لایا جاتا ہے۔

حشیش، بھنگ، گانجا، چرس، مریجوانا اسی پودے کے مختلف نام ہیں۔ ان کے علاوہ پودے کے اوپری پھول والے حصے سے ایک قسم کا تیل بھی خارج ہوتا ہے جسے جمع کر کے سکھا لیا جاتا ہے۔ یہ تیل سوکھی ہوئی شکل میں چرس کہلاتا ہے۔ بھنگ کھائی بھی جا سکتی ہے اور پی بھی جا سکتی

کے دوران گئے ہیں۔

ڈاکٹر راتھوڑ نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ انہیں ورلڈ ہیلتھ آرگنائیزیشن کی طرف سے چرس اور گانجے وغیرہ پر تحقیقات کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر راتھوڑ اب تک کئی شہروں کا دورہ کر چکے ہیں۔ دہلی اور کلکتے کے علاوہ وہ چندی گڑھ، لکھنؤ، مدراس، بنگلور اور بے پور بھی گئے۔ دہلی میں انہیں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے کافی مدد ملی۔ ان شہروں میں وہ مختلف ڈاکٹروں، سادھوؤں، پاگل خانے کے پاگلوں، غرضیکہ ہر طبقے کے آدمیوں سے ملے۔

ڈاکٹر راتھوڑ نے اپنے تجربے کے بعد بتایا کہ اگرچہ بھنگ وغیرہ کی فروخت پر ہندوستان کے زیادہ تر حصّوں میں پابندی لگی ہوئی ہے لیکن پھر بھی یہ ہر جگہ باآسانی دستیاب ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ اس کا استعمال آیورویدک دواؤں میں بھی کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ یہ جنسی طاقت کو بڑھاتی ہے۔

راجپوتانہ میں خوشی اور تہوار کے موقعوں پر بھنگ کا استعمال عام ہے۔ سکھوں میں چونکہ سگریٹ پینا منع ہے اس لئے پنجاب میں یہ زیادہ تر کھائی جاتی ہے یا پھر گھونٹ کر پی جاتی ہے۔ پنجاب میں اس سے بہت مزیدار مٹھائی بنائی جاتی ہے۔

بنگال میں دیوالی اور شیوراتری کے موقعے پر بھنگ اور دوسری نشہ آور چیزیں ندی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں طریب عزیز

بھنگ کا پودا

لگے دم مٹے غم

لوگ دن بھر کی تھکن اتارنے کے لئے شام کو بھنگ پیتے ہیں۔ بھنگ عام طور پر اکیلے بیٹھ کر نہیں پی جاتی بلکہ چار پانچ آدمی گھیرا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی رہتی ہیں اور چلم ان کے درمیان چکّر لگاتی رہتی ہے۔

اور یہ دور اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ وہ سب بھنگ کے نشے میں دنیا کے تمام دکھ درد نہ بھول جائیں۔

دوسری طرف یورپ اور امریکا کے ہپّی ہیں جو مغرب کی زندگی سے گھبرا کر نروان حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کی طرف آتے ہیں۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ نشہ کرنے سے روح کی شانتی اور نروان حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے، یہ شانتی مصنوعی اور وقتی ہوتی ہے۔ آج تک کوئی بھی ہندوستانی سادھو یا فقیر بھنگ وغیرہ کے نشے سے نروان حاصل نہ کر سکا۔

یہ تو ابھی پوری طرح کہنا کہ بھنگ اور چرس وغیرہ کے اثرات بُرے ہوتے ہیں مشکل ہے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ یہ الکحل کے نشوں سے کم مضر ہیں۔ چوہوں اور خرگوشوں پر تجربے کرنے سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں ان کے پینے سے کسی قسم کے مضر اثرات نہیں ہوتے البتہ بھنگ وغیرہ کا زیادہ استعمال کرنے والے ہر وقت نشے کی سی کیفیت میں رہتے ہیں اور ان کو معمول کے مطابق زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

میرا نام "پانچ سالہ منصوبہ" ہے۔ میں ہر ملک میں کسی نام سے مشہور ہوں۔ منصوبہ میرا خاندانی نام ہے اور یہی میری عمر کی نسبت سے میری عمر پانچ سال ہوتی ہے۔ یعنی ایک بھائی اپنے پانچ سال پورے کرکے دوسرے کو جانشین بنا دیتا ہے۔ ہم سب بھائیوں کا نصب العین عوام کو خوشحال، خرم اور بلند معیار زندگی عطا کرنا ہے، ہم اسی مقصد کی تکمیل میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے ملک نے مجھے ۱۹۵۱ء میں بلایا اور یہی نصب العین عطا کیا۔ اس لئے آج اکیس سال کے عرصے میں ہم بھائی اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مقصد کے حصول کی انتہائی کوشش کی ہے۔ لیکن ہم سب کس طرح اور کہاں تک کامیاب ہوئے اس کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے اپنا مختصر سا تعارف کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ پھر میری اس رام کہانی میں اجنبیت کا احساس نہ ہو۔

میرا خاندان عالمی ہے۔ میں ہر فرد میں، ہر جگہ موجود ہوں اور یہاں تک کہ پورے کائناتی نظام میں تعمیری و تخریبی دونوں طور سے موجود ہوں۔ انگلینڈ، امریکہ، روس، جرمنی اور جاپان جو آج ترقی و خوشحالی کے ایک بلند مقام پر فائز ہیں، اور جنہوں نے قلم کی نب سے لے کر کار تک تمام ضروریات زندگی کی اشیاء پیدا کرکے نہ صرف اپنے بلکہ تمام ممالک کے عوام کی ضروریات و خواہشات کی تسکین کا خیال رکھا بلند منازل کا احساس دلایا، میرے ہی مرہون منت رہے ہیں اور اگر ادھر ابھی حال ہی میں میری ہی حوصلہ افزائی سے انسان چاند پر قدم رکھنے میں کامیاب ہوا ہے اور یہ میری ہی کرشمہ سازی ہے کہ ایک ملک کی چاند گاڑی بغیر کسی انسانی وجود کے چاند پر پہنچ کر وہ تمام کام بخوبی انجام دینے میں کامیاب ہوئی ہے جو انسان کا [illegible]

الغرض وہ میں ہوں جس کی بدولت آج انسان خواب کو حقیقت میں بدلنے کے قابل بنتا جا رہا ہے اور اپنی آرزوؤں کو پورا ہوتے دیکھ کر "دشتِ امکاں" کو بھی "نقشِ پا" سے زیادہ نہیں سمجھتا ہے۔ دوسری بات میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ۱۹۳۰ء کی امریکا کی معاشی بدحالی، مجھ سے غفلت برتنے کا ہی نتیجہ تھی اور آپ کے ملک میں بھی قصباتی طبقہ جس معاشی بدحالی کا شکار نظر آتا ہے اور ایک بے چین و مایوس زندگی گزار رہا ہے وہ درحقیقت مجھے ہی نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ مجھ سے ہی الگ الگ رہنے کا انجام ہے ـــــ آپ مجھے اور قریب سے پہچانئے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کے شعور میں رچا بسا ہوں تو آپ کو ضرور تعجب ہوگا، لیکن ٹھہریئے میں آپ کو احساس دلاتا ہوں۔ آپ نے اکثر و بیشتر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ وہ شخص کتنا سلیقہ مند ہے، کیسا منظم دماغ پایا ہے۔ کیسی ہوشمندی اور سوجھ بوجھ سے کام کرتا ہے۔ اپنے مستقبل کا کتنا خیال ہے۔ حال پر کیسی گہری نگاہ ہے، اس کا گھر کتنا صاف ستھرا رہتا ہے۔ تمام اشیاء زندگی کتنی صاف ستھری اور سلیقے سے رکھی رہتی ہیں۔ تمام افراد کس طرح خوش و خرم اسی کے ساتھ اپنی تمام ضروریات زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔ ہر شخص میں کس قدر وقت کی پابندی کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے تمام کاموں اور فرائض کو کیسا بانٹ رکھا ہے۔ ذمے داریوں کے اس احساس نے محنت و جفاکشی اور ایک مسلسل جدوجہد کے جذبے کو کس قدر بیدار کر دیا ہے ہر فرد اپنی آمدنی اور پیداوار کو بڑھانے میں منہمک نظر آتا ہے تاکہ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ ضروریات و خواہشات کو پورا کرکے زمانے کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنا رہے یا اس کے برعکس آپ یہ دیکھتے ہیں کہ اس گھر میں کیسی بدحالی پھیلی ہوئی ہے۔ ہر فرد کا مزاج الگ الگ۔ کسی کو کسی کے کام یا ذمے داری سے کوئی سروکار نہیں، اس گھر میں آمدنی اور خرچ کا کوئی اندازہ نظر نہیں آتا۔ اگر پیسے آگئے تو وقتی طور پر شاہانہ ٹھاٹ ورنہ مصیبت کا ہر کس و ناکس کے سامنے ہے۔ اس گھر میں افراد کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ بس ہر شخص کی نگاہ حال پر ہے، اپنی ضروریات کا احساس ہے لیکن ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، جس طریقۂ کار کو اپنانا پڑتا ہے، جس ہوشمندی اور سلیقے کی ضرورت پڑتی ہے وہ نہیں ہے۔ اس لئے جب پیسے آگئے تو اپنی چند ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے قابل ہوگئے ورنہ پھر ہر فرد افسردہ، پریشان اور منتشر المزاج نظر آتا ہے۔

تو جناب یہ سب کس کا پرتو ہے۔ خیالات و نظریات کی ہم آہنگی، افراد کی احساسِ ذمے داری، باہوش ذہنیت، تعمیری رجحانات، بلند نصب العین کے ساتھ جدوجہد، وقت کے تقاضوں کا احساس وغیرہ، نہ جانے ایسے کتنے آلۂ کار کی سرگرمیوں کا ایک مجموعی نتیجہ ہی تو ہے جن کے مناسب یا غیر مناسب استعمال کو دیکھ کر آپ کسی گھر کو خوشحال یا بدحال بتانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے تمام آلۂ کار مجھ سے الگ کسی تنظیم کے تحت کام کرتے ہیں ـــــ؟ جی نہیں یہ میں ہوں جس کا سہارا لے کر ایک انسان اپنی تمام ضروریاتِ زندگی، جیسے کھانا، کپڑا، مکان، تعلیم، صحت، آرام و آسائش کی تمام اشیاء کا ایک طرف اور ان کی تسکین کے ذرائع جیسے آمدنی، تعلیم گاہیں، بازار، رسل و رسائل کی سہولتوں، اشیاء کی دستیابی وغیرہ کا دوسری طرف مطالعہ کرتا ہے اور پھر یہ طے کرتا ہے کہ کن ضروریات کو مقدم رکھ کر پہلے پورا کیا جائے اور کن کو بعد میں، یا کن ضروریات کی تسکین کو، یا کن ضروریات کو کم کرکے دوسری ضروریات یا دوسرے ضروریات کو پورا کیا جائے۔ جو محدود آمدنی میں [illegible]

یوپی کے اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والوں کی کوئی قدر نہیں

یوپی

اونچی دوکان پھیکا پکوان

یوپی آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی سب سے بڑی اور رقبے کے لحاظ سے ملک کی دوسری سب سے بڑی ریاست ہے لیکن اس کے باوجود یہ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں بڑی پسماندہ ہے یعنی "اونچی دوکان اور پھیکا پکوان" کی مثل اس ریاست پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس ریاست کے تقریباً ۹ کروڑ باشندے دوسری ریاستوں کے مقابلے میں غربت کی زندگی گزارتے ہیں۔ فی کس سالانہ آمدنی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کم ہے ۶۸-۱۹۶۷ء میں فی کس آمدنی صرف ۴۹۸ روپے تھی جبکہ پنجاب کی فی کس آمدنی ۸۲۸ روپے اور پورے ملک کی آمدنی اوسطاً فی کس ۵۵۱ روپے تھی۔ اس ریاست کی جو بری حالت ہے اس پر نیلسن نے اپنے خطبے میں بڑے اچھے انداز میں کہا ہے:۔

"ریاست اس وقت پسماندگی کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے اس کی بچتیں بھی کم ہیں، وسائل کم ہیں، سرمایہ کاری بھی کم ہے اور اس کی وجہ سے معیار زندگی بھی پست ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایک طرف ریاست کی زرعی پیداوار کو نہ بڑھایا جائے گا اور دوسری طرف دیہی صنعتوں کا جال نہ پھیلایا جائے گا تاکہ فالتو لوگ زرعی میدان سے نکل کر ان صنعتوں میں لگ جائیں اس وقت تک ریاست دوسری ریاستوں کی سطح پر نہیں آسکتی۔

زرعی اور صنعتی میدانوں میں اگر یوپی ابھی تک اطمینان بخش طور پر ترقی نہیں کرسکا تو اس کی بڑی وجہ اس ریاست میں سیاسی عدم استحکام رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں ایسی حکومتیں برسر اقتدار آئی ہیں جنہیں ہمیشہ اپنی کرسی کو بچانے کی فکر رہی ہے اور انھوں نے عوامی فلاح کا کوئی کام نہیں کیا نتیجے میں ریاست کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے اور جو ریاست تمام ریاستوں کے مقابلے میں آگے سمجھی جاتی تھی وہ پیچھے رہ گئی۔ حد یہ ہے کہ تعلیم کے معاملے میں بھی اس ریاست کو دوسروں سے پیچھے سمجھا جاتا ہے۔ اب یوپی کے اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والوں کی کوئی قدر باقی نہ رہی۔

اب ایک عرصے کے بعد یوپی میں ایک مستحکم حکومت قائم ہوئی ہے لیکن ظاہر ہے اس کی کارگزاریاں اتنی جلدی سامنے نہیں آسکتیں، البتہ اس کے انداز بتا رہے ہیں کہ وہ ریاستی ترقی کے سلسلے میں تیز رفتاری سے کام کرنا چاہتی ہے۔ صنعتی ترقی کے لئے قرضہ حاصل کرنے کی پالیسی بھی اس نے جاری کی ہے، اسے اس کی اسی پالیسی کا ایک حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ زرعی میدان میں بھی بہت سے ترقی پسندانہ اقدامات کئے جانے کا منصوبہ ہے۔ اب توقع ہے کہ یوپی کی ریاست بھی جلد دوسری ریاستوں کی سطح پر آسکے گی۔

تامل ناڈو

ریاستی خود مختاری کا مطالبہ

وزیر اعلیٰ مسٹر کروناندھی "ریاستی خود مختاری" کے حامی ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ اخبار "مراسولی" میں جو خطوط انھوں نے شروع کیا تھا ڈی۔ ایم۔ کے چیرمین کی حیثیت میں اپنی پارٹی کے ممبروں کے نام کھلے خطوط لکھ رہے ہیں ایک خاص مقصد کے لئے اس طرح تحریک چلا کر انھوں نے ایک نئی مثال قائم کی ہے۔

ان کے کھلے خطوط میں الفاظ مختلف ہوتے ہیں لیکن انکا بنیادی مقصد ایک ہی رہتا ہے یعنی "جب تک ریاستی خود مختاری حاصل کرنے کے مقصد میں کامیابی نہ ہوگی اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے"۔ اور مسٹر کروناندھی ریاستی حکمراں پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے ایسا کر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ سمجھتے ہیں کہ "ریاستی خود مختاری" کی لڑائی کوئی معمولی نہیں ہے یہ لڑائی ایسے نے پر قطعی ممکن ہے کہ آج جو لوگ خود ریاستی سیٹ پر قابض ہیں کل انھیں پالا کر رہے کے بہانے کو گھروں میں رہنا پڑے۔ (اسی جگہ ۱۹۶۰ء میں ہندی کے خلاف ایجی ٹیشن کے دوران مسٹر کروناندھی کو قید کیا گیا تھا)

مسٹر کروناندھی اپنے کارکنوں کو ڈی۔ ایم۔ کے کی ممبری بڑھانے پر زور دے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی گلی کوئی محلہ اور کوئی گھر ایسا باقی نہ رہے جہاں ڈی۔ ایم۔ کے کا آدمی موجود نہ ہو۔

ڈی۔ ایم۔ کے کے ممبروں کی تعداد اگرچہ دس لاکھ ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ "یہ کافی نہیں ہے کم از کم اس سے تین گنی زیادہ تعداد ہونی چاہیئے"۔

مسٹر کروناندھی اپنے عوام کو ایسے ہی الفاظ میں للکار رہے ہیں جیسے شیخ مجیب الرحمن نے "بنگلا دیش" کے لوگوں کو للکارا تھا۔ "خراب سے خراب صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہو اگرچہ امید رکھو کہ نتیجہ بہترین نکلے گا"۔

اپنے ایک حالیہ خط میں جسکا عنوان تھا "کیا آپ یا میں سوتے رہیں گے" انھوں نے کہا "اگرچہ ہمیں اچھی توقعات رکھنی چاہئیں لیکن مرکز کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کے بارے نا امید ہوں"۔ اور پھر دوسرے ہی خط میں لکھتے ہیں کہ ہمیں آج ہی سے کام شروع کردینا چاہئے۔

ہندوستانی کرکٹ کا ہیرو سنیل گواسکر

(شاہد صدیقی)

فٹ بال کے بعد ہندوستان کا سب سے مقبول کھیل کرکٹ ہے۔ جو مقبولیت کرکٹ کو حاصل ہے وہ شاید ہاکی کو بھی نہیں۔ ویسے لوگ کرکٹ کم کھیلتے ہیں لیکن اس میں دلچسپی زیادہ لیتے ہیں۔ جہاں کہیں ہندوستان میں کرکٹ کا کھیل شروع ہوتا ہے ریڈیو اور اخباروں کے دفتروں کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ہر شخص کی زبان پر ہوتا ہے کہ گواسکر کیا ہوگیا؟ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ممبروں کو تازہ اطلاع سے مطلع رکھا جاتا ہے ورنہ خطرہ یہ رہتا ہے کہ کہیں ممبر اجلاس چھوڑ کر گھوم جا کر کمنٹری نہ سننے لگ جائیں۔ کرکٹ کی اس مقبولیت کے باوجود ہندوستانی کرکٹ ٹیم کا شمار دنیا کی بہت اچھی ٹیموں میں نہیں ہوتا۔

کرکٹ کے میدان ہمیشہ ہی سے انگلینڈ، آسٹریلیا اور ویسٹ انڈیز کے ہاتھ رہے ہیں۔ یہ ملک کسی تیسرے ملک کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ تقریباً پچھلے دس سال سے ویسٹ انڈیز کرکٹ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا۔ ویسٹ انڈیز نے جہاں سوبرز جیسا مکمل بلے باز پیدا کیا

حالات شمار علی

سنیل گواسکر ——— سنہرا مستقبل

اور کنہائی جیسے فلیبے باز پیدا کئے وہاں اس کے ہال، گرفتھ اور گلکرسٹ کا شمار دنیا کے سب سے تیز گیند پھینکنے والوں میں ہوتا تھا۔

ہندوستان دنیا کی تمام کرکٹ ٹیموں کو تقریباً ایک آدھ میچ میں ضرور ہرا چکا تھا لیکن ویسٹ انڈیز کے مقابلے میں کبھی

جاتی تمام میچ ہار کر آتی تھی۔ ویسے تو ہندوستانی کرکٹ ٹیم ہندوستان سے باہر نکلنے کے بعد عام طور پر جیتنا سرے سے بھول ہی جاتی ہے۔ ہندوستانی ٹیم چاہے کتنی بھی مضبوط ہو اور غیر ملکی ٹیم چاہے کتنی بھی کمزور حالت میں کیوں نہ ہو ہار ہندوستان ہی کے حصے میں آتی تھی اس لئے جب پچھلے مہینے ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کے خلاف پہلی بار ربڑ جیتا تو حیرت اور خوشی ایک فطری چیز تھی۔

اب تک ہندوستان کی ناکامی کی وجہ ٹیم میں تیز گیند پھینکنے والوں کی کمی رہی تھی۔ دوسری طرف کنٹریکٹر کے زخمی ہونے کے بعد سے ہندوستان کو کوئی مناسب اوپننگ بلے باز بھی نہیں مل سکا تھا۔ تیز گیند پھینکنے والوں کی کمی تو اب بھی پوری نہیں ہوئی لیکن اب ہمیں عابد علی اور گووندراج جیسے بالر مل گئے ہیں جن پر بھروسا کیا جا سکتا ہے حالانکہ دونوں درمیانی رفتار کی گیند پھینکتے ہیں لیکن پھر بھی نئی گیند کا استعمال کافی اچھے ڈھنگ سے کر کے دو تین وکٹ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اس دورے میں سب سے بڑی کمی جو پوری ہوئی وہ اوپننگ بلے باز کی تھی۔ سنیل گواسکر ہمیں ایک ایسا اوپننگ بلے باز مل گیا جو آتے ہی کرکٹ کی دنیا میں ستارے کی طرح چمکنے لگا۔ یہ ۲۱ سالہ نوجوان کھلاڑی ایک مکمل اوپننگ بلے باز ہے

دلی میں مسز گاندھی سے بات کرتے ہوئے سنیل گواسکر، کپتان اجیت واڈیکر اور بشن سنگھ بیدی ———

[illegible]

ایک مرتبہ انہوں نے [illegible] کہا تھا کہ

اسکالروں اور طالب علموں کی ایک جماعت تیار ہونی چاہیئے جنہیں ایک آزاد اور تعلیم یافتہ سماج کا ذمہ دار رکن تصور کیا جانا چاہیئے۔ جنہیں سوچنے اپنے خیالات کا اظہار کرنے بغیر کا خوف کھائے انکار کرنے عقائد پسندی سے اجتناب کرنے حتیٰ کہ غلطی کرنے تک کی آزادی ہونی چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں ماہر تعلیم کے طور پر ان کی یہ وسیع النظری ایک تحریک کی شکل میں جاری رہی۔

۱۹۶۲ء میں وہ جمہوریہ ہندوستان کے نائب صدر چنے گئے۔ بحیثیت چیئرمین راجیہ سبھا کے صدر کے طور پر انہوں نے اپنے بے پناہ علم و دانش اور غیر جانب داری اور شرافت کے ذریعہ ایوان کا مکمل اعتماد اور احترام جیت لیا۔ انہوں نے ایشیا، افریقہ اور مغرب کے کئی ممالک کا دورہ کیا۔ قوم کے لئے ان کی عظیم خدمات کے عملی احترام کے طور پر ۱۹۶۳ء میں انہیں ملک کے سب سے بڑے خطاب بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا گیا۔

پانچ سال تک نائب صدر کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں ان سے صدر جمہوریہ کے انتخاب میں حصہ لینے کی درخواست کی گئی جسے انہوں نے بخوشی منظور کیا۔ ۱۹۶۷ء کے اس صدارتی انتخاب سے پہلے اور اس کے دوران فرقہ پرست عناصر نے جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا اور جو نعرے لگائے انہیں کوئی سنجیدہ اور شائستہ ہندوستانی فراموش نہیں کرسکتا۔ ملک کی متعدد ریاستوں میں کانگریس کو عبرتناک شکست ہو چکی تھی۔ صدارتی انتخاب میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سبا راؤ بطور امیدوار سامنے آگئے تھے۔ جن کی پشت پناہی ملک کے مختلف با اثر طبقات [illegible] رہے تھے! اور ہر شخص بہ آسانی فیصلہ کرسکتا تھا کہ مقابلہ نہایت حوصلہ شکن اور ہمت شکن ہے خصوصاً اسلئے کہ ذاکر صاحب ایک مسلمان تھے۔ ایسے ملک میں جہاں سات کروڑ مسلمانوں کے ساتھ اڑتالیس کروڑ غیر مسلم رہتے ہیں اور جن کے فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارنے کی مکروہ کوشش بام عروج پر پہونچ چکی تھیں لیکن ان تمام مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کے وطن دوست عوام کی خواہش کا احترام کیا۔ اور جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ "انتخاب لڑوں گا" اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھاری اکثریت سے جمہوریہ ہند کے صدر چنے گئے۔ اس موقع پر اپنی انتہائی اثر انگیز تقریر میں انہوں نے کہا کہ "سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس کے لوگ [illegible] کنبہ ہیں"۔ اپنے دو سالہ صدارتی دور میں ڈاکٹر صاحب کی اہمیت اور [illegible] ان کی ذی شان اصولوں کی شخصیت [illegible] ان کے [illegible]

اعلیٰ ذوق سلیم، ان کے شعور اور انسان دوستی کے اوصاف نے وطن کے اس بلند ترین منصب کو ایک نئی شان بخشی اور انہوں نے عوام کے ہر طبقے سے حتیٰ کہ ان سے بھی جنہوں نے انتخاب صدارت کی مہم میں ان کی شدید مخالفت کی تھی۔ خراج، محبت و ستائش حاصل کیا۔

یہ تھی اس عظیم دانشور، محب وطن، صداقت کے پیکر، جنگ آزادی کے بہادر جرنیل، اعلیٰ اخلاق کے نمونے اور انسانی شرافت کے بہترین وارث کی داستان حیات۔

آخر کار ساری زندگی ملک اور قوم کی خدمت کرنے کے بعد ۳ر مئی ۱۹۶۹ء کو ہندوستان کا یہ مایۂ ناز فرزند اس دنیا سے اٹھ گیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اُن عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جو کبھی نہیں مرتے، جن کی یاد عوام کے دل میں ہمیشہ قائم رہتی ہے پورا ملک ڈاکٹر صاحب کی برسی ہر سال اسی جوش و خروش کے ساتھ مناتا رہے گا اور انکی شخصیت پر عقیدت کے پھول چڑھاتا رہیگا۔ ■■

وہ ایک لمحہ

فائز چشتی
ایم اے بی ایڈ (عثمانیہ)

[illegible]
پی رہے تھے [illegible]
ان دوستوں میں سے ہے جن پر میں بجا طور سے فخر کر سکتا ہوں
وہ ایک [illegible] استاد ہے۔ جس [illegible]
اور طلباء میں ہر دلعزیز رہا۔ اس کی [illegible]
کا معترف [illegible] ہونے کے باوجود مجھے اس کی [illegible]
اور کوتاہیوں سے شکایت تھی۔ وہ رومان کا دلدادہ تھا۔ اس کی رنگین مزاجی نے اس کے ساتھ کئی رومانوں کو وابستہ کر رکھا تھا۔

اورینٹ ہوٹل میں میری اس سے ملاقات کافی عرصے بعد ہوئی تھی۔ میں اس ملاقات پر مسرور تھا۔ چائے نوشی کے دوران وہ نہایت خاموش اور سنجیدہ رہا۔ میرے لئے اس کی یہ سنجیدگی تعجب خیز تھی۔

"مقبول میرے دوست" میں نے کہا "آج تم غیر معمولی طور پر سنجیدہ نظر آ رہے ہو۔ بات کیا ہے پیارے، کہیں پھر کسی رومان کے چکر میں تو نہیں ہو۔"

"نہیں چشتی صاحب" مقبول نے خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "رومان کا لفظ تو میرے لئے ایک خواب بن کر رہ گیا ہے اب کوئی رومان نہیں، کوئی رومان نہیں۔ میں رومانوں کی دنیا سے بہت دور نکل آیا ہوں۔"

"پھر کیا بات ہے، کس کی یاد تمہیں اس وقت بے چین کئے دے رہی ہے؟"

"یقین مانئے چشتی صاحب" مقبول نے کہا "کسی کی یاد نہیں، ہاں یاد ہے تو صرف وہ ایک لمحہ جس نے میری زندگی بدل دی، آہ وہ ایک لمحہ۔ میں اسے زندگی بھر بھول نہ سکوں گا۔"

"مقبول" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک لمحہ کیا میں تو سمجھتا ہوں کہ کئی یادگار لمحات تمہاری زندگی میں آ چکے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ایسے لمحات کے عادی ہو مگر پتہ نہیں دوست ایسے لمحات خود بخود تمہارے لئے پیدا ہو جاتے ہیں یا تم خود ایسے حالات پیدا کر لیتے ہو۔ خواہ بات کچھ ہو مگر میاں مقبول تم ہو بڑے رنگین مزاج۔"

"تم [illegible]" مقبول نے [illegible] ہوئے کہا۔ "تم میری رنگین مزاجی سے واقف ہو نا۔ اسی [illegible]
[illegible]

[illegible]

کے لئے اور [illegible] کے لئے [illegible]

[illegible] میری زندگی [illegible]

آنکھ [illegible]

[illegible]

رہی۔ لیکن [illegible] اس نے میری زندگی

[illegible] میری زندگی میں انقلاب آگیا۔ اب میرے نزدیک

عورت ایک قابل احترام ہستی بن گئی ہے۔ میں اب وہ مقبول

نہیں رہا جو کسی زمانے میں تھا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔ مجھے تفصیلات تو بتاؤ آخر تمہارا یہ انقلاب کیسے رونما ہو گیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اگر تم تفصیلات سننا چاہتے ہو لیکن وعدہ کرو کہ یہ بات صرف تمہاری حد تک ہی محدود رہے گی افسانہ نہ بنا ڈالو گے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "تو سنو!"

اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور کش لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"تم جانتے ہی ہو کہ کن حالات میں میں فرحت نگر پہنچا لیکن بہت جلد فرحت نگر میں حالات میرے موافق ہو گئے اور میں سکون و اطمینان کے ساتھ درس و تدریس کے کام میں مصروف رہا۔ چند مہینے گزر گئے مگر کوئی خاص بات پیش نہیں آئی۔ ایک دن میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا مقبول صاحب! میری ایک عزیزہ نے تمہاری شہرت سن لی ہے، وہ تم سے میٹرک کے امتحان کی تیاری میں مدد لینا چاہتی ہے اگر کچھ وقت دے سکو تو بہتر ہے۔"

میں نے کہا "جناب میں لڑکیوں کو پڑھانا نہیں چاہتا۔ ہاں اگر آپ لڑکوں کو پڑھانے کے لئے فرمائیں تو میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں۔"

"کیوں بھلا؟" انہوں نے پوچھا "تم لڑکیوں کو پڑھانے میں تامل کیوں کر رہے ہو؟"

"دیکھئے" میں نے کہا "یہ اپنا اپنا خیال ہے لیکن [illegible] آپ کے اور میرے سامنے کئی گزر چکے ہیں کہ کس [illegible] لڑکیوں کو پڑھاتے ہیں اور حالات کچھ اس طرح [illegible]

[illegible] میری [illegible]

"واہ صاحب واہ" میرے دوست نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "کیا یہ قاعدہ کلیہ والی بات ہے، کیا سب ہی پڑھانے والے ایسے ہوتے ہیں یا سب ہی پڑھنے والی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔ نہیں صاحب بات کچھ بھی نہیں، یہ تو اپنے اپنے کردار اپنی اپنی افتاد طبع اور اپنے اپنے ماحول پر منحصر ہے۔ میں جس خاتون کا ذکر کر رہا ہوں، تم سے بڑے فخر سے کہوں گا کہ وہ ایک اونچے کردار کی خاتون ہے لیکن وہ ستم رسیدہ بھی ہے میرا مطلب ہے کہ وہ ایک بیوہ ہے چار سال ہوئے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے پانچ سالہ لڑکے احسان کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہے، میٹرک پاس کر کے وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنے لڑکے احسان کے مستقبل کو سنوار سکے۔ اس لئے دوست انکار نہ کرو، مجھے یقین ہے کہ تمہاری رہنمائی میں وہ صرف پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کا مستقبل، احسان کی زندگی، اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں ان کی اس گفتگو سے بیحد متاثر ہوا اور غور کرنے کے لئے کچھ مہلت مانگی۔ امتحان کے صرف دو مہینے رہ گئے تھے، دو دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ آخر کار میں نے پڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ صرف اس معصوم بچے کے مستقبل کے لئے۔ یہ خاتون اگر کسی قابل ہو سکے تو اپنے بچے کے مستقبل کو سنوار سکے گی۔ میں نے اپنے دوست کو اپنے اس فیصلے کی اطلاع دیدی۔

دوسرے دن میں اپنے دوست کے ساتھ اس خاتون کے گھر گیا، تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں آئیں۔ میں نے انہیں دیکھا اور چند لمحوں تک حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ایسا حسن تو میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی دیکھا ہو۔ اس کے حسن میں بلا کی سادگی تھی، عجیب قسم کی شان و تمکنت تھی، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اس کے حسن کی تعریف کرنے کے لئے۔ بے اختیار میں اس کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میرے دوست نے تعارف کروایا۔ اس خاتون کا نام عارفہ تھا، تھوڑی دیر رسمی باتیں ہوئیں، عارفہ نے کہا۔

"مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی ماسٹر صاحب کہ آپ [illegible] سے مجھے پڑھانے کا فیصلہ کیا ہے [illegible] احسان زندگی بھر [illegible] ورنہ سچ تو یہ ہے ماسٹر صاحب کہ اب زندہ رہنے کی خواہش بھی نہیں ہے" اس کی خوبصورت آنکھوں میں تیرتے ہوئے موتی جیسے آنسو چھلکنے لگے۔

"دیکھو عارفہ" میں نے بے تکلفی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں رات کو ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک پڑھایا کروں گا، اب امتحان کے لئے بہت کم دن رہ گئے ہیں جب تیاری کرنا ہی ہے تو سنجیدگی سے کیوں نہ شروع کیا جائے۔"

اس نے جواب دیا۔

"آپ جس وقت اور جب تک چاہیں پڑھا سکتے ہیں میں اس کے لئے تیار ہوں واقعی بہت کم دن رہ گئے ہیں۔"

غرض دوست! اس طرح میں نے عارفہ کو پڑھانا شروع کیا۔ عارفہ بڑی ذہین اور محنتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں زیادہ ذہین اور محنتی ہوتی ہیں رات کو ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک اور کبھی کبھی ایک بجے رات تک میں اسے پڑھاتا اور وہ پڑھتی رہتی، فضول باتوں کے لئے نہ میرے پاس وقت تھا اور نہ اس کے پاس۔ مجھے اس وقت ایک ہی دھن تھی کہ عارفہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے میں جو کہ بقول آپ کے رنگین مزاج واقع ہوا تھا اپنی رنگین مزاجی کو بھول گیا، میں اس کے ملکوتی حسن سے غیر معمولی طور پر متاثر ضرور ہوا مگر میرے دل میں اس کے متعلق کسی قسم کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ پتہ نہیں یہ اس کے حسن کا رعب تھا یا کچھ اور۔۔۔؟

دن گزرتے گئے۔ امتحانات کا مرحلہ بخوبی طے ہو گیا چند ہفتوں بعد نتیجہ نکلا، عارفہ نے امتحان پاس کر لیا تھا اس دن میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس سے قبل کئی لڑکوں کو میں نے پڑھایا اور وہ کامیاب بھی ہوئے تھے مگر عارفہ کی کامیابی سے جو خوشی مجھے ہوئی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ میری محنت ٹھکانے لگی اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ میں کامیابی کی مبارکباد دینے عارفہ کے گھر گیا اور اسے اس کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کی

باقی صفحہ [illegible] پر

وہ احمق تھے، وہ چاہتے تو پوری زندگی ایک کے بعد ایک عشق کر کے گزار سکتے تھے۔ عشق اور شراب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح ایک بادہ نوش اپنی تسکین کے لئے ایک کے بعد جام اپنے ہونٹوں سے لگا سکتا ہے اسی طرح ایک عشق کا مارا بھی شرابِ عشق کے جام پر جام لنڈھا سکتا ہے۔ کچھ ایک محبوب کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور کچھ ایک سے زیادہ محبوب تلاش کر لیتے ہیں۔ ہر انسان کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔"

یہ مباحثہ اور طویل ہو جاتا، اگر ایک شریکِ محفل کی تجویز سے وہ سب کو اپنا ثالث نہ بنا لیتے۔ ایک بوڑھے نیکیل ڈاکٹر کو اتفاقِ رائے سے ثالث بنایا گیا۔ جس نے فیصلہ دیا کہ والی برتران کی رائے سو فیصدی درست ہے کہ یہ سب اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔

اس نے کہا۔ "ویسے آپ جانتے ہیں، دنیائے عشق میں سب سے اتم ہے تو صفر کے برابر ہے۔"

اس پر پوری محفل نے کھل کر قہقہے لگائے۔ سب کے خاموش ہونے کے بعد ڈاکٹر نے کہا ــــــــ

"جب عشق و محبت کا ذکر چل رہا ہے تو اس وقت ایک حقیقی عشق کی داستان آپ حضرات کے گوش گزار کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ مسلسل پچیس سال کے عرصہ تک یہ عشق ایک نوجوان عورت اور ایک مرد کے درمیان چلتا رہا اور عاشق ہو کر مرد کے بجائے عورت تھی کبھی جواب محبت کا سنہری تاج سر کی زینت نہ کر سکی، یہاں تک کہ اس کی زندگی نے اس سے بے وفائی کی اور ابدی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔"

والی برتران کی بیگم نے اپنے خوبصورت ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا ــــــــ

"آفریں ہے!! اس طرح کا عشق تو افسانوں میں ملتا ہے۔ وہ کون خوش نصیب تھا جس کی زندگی میں کسی نے اپنی چاہت کا رنگ بھر دیا تھا۔"

ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

"وہ خوش نصیب موسیو شاکے ہے۔ آپ اسے جانتی ہیں، وہی دوا فروش جس کی دوکان سے آپ دوائیں منگواتی ہیں۔ اور اس عورت سے بھی آپ ناواقف نہیں ہوں گی جو ہر سال کرسیاں بننے آپ کی حویلی میں آیا کرتی تھی۔ وہ شاکے سے بے اندازہ محبت کرتی تھی۔ اپنی پوری زندگی اس کے فراق میں کاٹ کر گزشتہ سال وہ اس جہان سے رخصت ہو گئی ــــــــ اور شاکے پر اس کی موت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ آہ!! کیسے افسوس کا مقام ہے۔"

تمام عورتوں کا جوش و خروش پھیکا پڑ گیا۔ ان امیر عورتوں کو توقع تھی کہ یہ داستان محبت کسی ریاست کے خوبصورت اور عالی وقار شہزادے یا شہزادی کے متعلق ہو گی۔ انہیں ان لوگوں کی محبت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے داستان جاری رکھی ــــــــ

گزشتہ سال اس کو دیکھنے کے لیے جانا ہوا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ میرے لیے گرسبے سپادری بھی آ پہونچا۔ اس نے کمزور لہجے میں کہا کہ وہ ہم دونوں کو اپنی وصیت کی تعمیل کرانے کے لیے مختار کرنا چاہتی ہے اور وصیت کی رو سے اس کی ساری املاک اس کی موت کے بعد دوا فروش شاگے کو پہنچنی تھی۔ ہم کو صد درجہ تعجب ہوا۔ کہاں ایک کرسیاں بننے والی کہاں ایک دواخانے کا مالک۔ جب میں نے سوال کیا کہ تم اپنے کسی رشتہ دار کے نام وصیت کیوں نہیں کرتیں، تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے اپنی داستانِ حیات کہہ سنائی۔ اس کی یہ داستان مختصر ایک داستان نہیں بلکہ درد و فغاں اور کرب کا مسلسل چکر ہے جس میں اس کی زندگی پورے پچپن سال تک گردش کرتی رہی۔

ضعیف کرسیاں بننے والی نے اپنی داستانِ زندگی سناتے ہوئے کہا کہ اس کے ماں باپ کرسیاں بننے کا کام کرتے تھے۔ وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا بچپن غلیظ کپڑوں میں روکھی سوکھی کھا کر گزرا۔

ماں باپ کے پاس ایک گھوڑا گاڑی اور ایک کتا تھا۔ وہ مختلف قصبوں میں گھومتے اور کرسیوں کی مرمت کرتے۔ جب کام کے لیے جاتے تو اس چھوٹی سی بچی کو گھوڑا گاڑی کے پاس چھوڑ دیتے، یہ وہاں اکیلی کھیلا کرتی اور کتا گاڑی وغیرہ کی نگرانی کرتا۔ اس کے ماں باپ جب کام سے فارغ ہوتے تو اس کے پاس آجاتے۔

اس کا باپ بڑے غصیلے مزاج کا تھا، اس کی ماں بھی اس کے غصے سے ڈرتی تھی۔ جب کبھی وہ اس ننھی سی بچی کو بے دردی سے مارتا تو اس کی ماں بھی اُسے بچا نہیں سکتی تھی۔ غرض اس کے کان پیار اور محبت کے الفاظ سے نا آشنا تھے۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو ٹوٹی ہوئی کرسیاں اِدھر سے اُدھر ڈھونے کا کام کرنے لگی۔

یہ لڑکپن کا دور تھا اور اسی دور میں بچے اپنے ہم جولی تلاش کر کے ان کے ساتھ کھیلتے کودتے ہیں۔ جن گلیوں اور محلوں میں روز کا آنا جانا تھا وہاں کے لڑکوں سے اس کی دوستی ہو گئی۔ وہ ان کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلتی لیکن شریف اور ذی عزت گھرانوں کے لڑکوں کے ساتھ ایک

جب کرسیاں بننے والی کا لڑکا [illegible] کھیلنا ایک بات تھی۔ ان کے والدین انہیں اس کے ساتھ کھیلتے دیکھتے تو ان کا کان پکڑ کر گھروں میں لے جاتے۔ یہ دیکھ کر اس کا ننھا سا، نازک دل ٹوٹ جاتا۔ اس نے شریف اور ذی عزت خاندانوں کے نونہالوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا۔ جب وہ گلیوں سے گزرتی تو لڑکے اس پر پتھر مارا کرتے۔ لیکن کبھی کبھار کچھ رحمدل عورتیں اس پر ترس کھا کر اسکو کچھ دے دیتیں اور وہ اس کو اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیتی۔

گیارہ سال کی عمر میں اس کو وہ حادثہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی پلٹ کر رکھ دی۔ ایک دن وہ اس قصبے کی پشت پر واقع قبرستان کے قریب سے گزر رہی تھی، اچانک اس کی نظر ایک چھوٹے سے لڑکے پر پڑی جو ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ یہ شاگے تھا جو اسی قصبے میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو اس کے خیال میں قابلِ رشک زندگی کے مالک تھے اور کبھی کسی مصیبت سے دوچار نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اس کے قریب پہنچی، لڑکے کا چہرہ روتے روتے سُرخ ہو گیا تھا۔ بال بے ترتیب ہو گئے تھے اور آنکھیں سوج گئی تھیں جن سے آنسوؤں کا دھارا بہہ رہا تھا۔ وہ یہ عالم دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے اسکو چمکارا اور اپنی قمیص کے پھٹے ہوئے دامن سے اس کے آنسو پونچھے اور منہ صاف کیا۔ شاگے نے اس کو بتایا کہ اس کے ایک بھائی نے اس کے دو قیمتی لیارڈ (فرانسیسی سکّے) چرا لئے ہیں اور جب اس کی ماں کو پتہ لگے گا تو وہ اس کا منہ تماچوں سے لال کر دے گی۔

"اچھا !! ان لوگوں کی دولت بھی کم ہو جاتی ہے! کیا دو سکّے کم ہونے سے بھی ان کی زندگی میں فرق پڑتا ہے؟" اس نے اپنے دل میں کہا ——

لیکن جلد ہی جذبۂ حیرت پر جذبۂ ہمدردی غالب آگیا اور اس نے اپنے سارے سکّے اپنی جیبوں میں سے نکال کر اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ یہ سکّے اس نے کئی دنوں میں جمع کئے تھے۔ بغیر ہچکچاہٹ کے اس نے وہ پونجی لے لی اور پیسے گننے میں مشغول ہو گیا۔ وہ رونا بھول چکا تھا اور خوشی سے کھلکھلا رہا تھا۔ اس کو خوش دیکھ کر لڑکی بھی خوشی سے جھوم اٹھی اور ایک فوری

[illegible] اس نے آگے بڑھ کر اس کے گالوں کو چوم لیا۔ لیکن چونکہ لڑکا کھوئی ہوئی رقم کے بدلے میں یہ پیسے پا کر بے حد خوش تھا اور پیسوں کو گننے میں اس قدر منہمک تھا کہ اس کو اس کا احساس تک نہیں ہوا۔ اس عدم توجہی نے اس کی ہمت بڑھائی اور اس نے شاگے کے گلے میں اپنی میلی، لیکن پیار بھری باہیں ڈال دیں۔ اور اس کو زور سے بھینچ لیا، مگر فوراً ہی اس کو کچھ خیال آیا اور وہ دوڑتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

اس کے ننھے سے دماغ میں کیا خیالات چکرا رہے تھے؟ —— کیا وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس لڑکے پر دل و جان سے فدا ہو گئی ہے اور اس نے اپنی تمام پونجی قربان کر کے اسے اپنا بنا لیا ہے —— یا یہ خیالات اس کے دل میں موجزن تھے کہ اس نے ایک لڑکے کو پہلا محبت بھرا بوسہ دیا تھا !! لیکن یہ ایسا راز تھا جو دل کی گہرائی میں جذبے کے مخملی غلاف کے اندر پوشیدہ ہر جوان دل میں ہوتا ہے اور جس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مہینوں تک قبرستان کے قریب کا موڑ اور اس کا چہرہ اس لڑکی کے خیالات میں بسا رہا اور وہ اس سے ایک بار پھر ملنے کی تمنا کرتی رہی اور اس کے لئے اس نے کچھ پیسے چرائے —— کبھی کچھ کرسیوں کی بنائی کی مزدوری میں سے اور کچھ سودا سلف میں سے۔ جب وہ قبرستان کے قریب کے اسی موڑ پر پہونچی تو اس کی میلی کچیلی قمیص کی ایک جیب فرانک کے سکوں سے بوجھل تھی۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس وقت بھی وہاں ملتا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا اور جب وہ تھکے قدموں سے واپس ہو رہی تھی تو بازار سے گزرتے وقت اس کی نگاہ شاگے کے باپ کے دواخانہ پر پڑی۔ اس کو شاگے دواخانہ کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کے سر پر دو بجلی کے قمقمے روشن تھے اُنکی روشنی کا عکس اس کے خوبرو اور دلکش چہرے پر پڑ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے دل میں محبت کا دریا اُمنڈ پڑا، اس کو بے ساختہ پیار کرنے کی خواہش کو دل میں دبا کر رہ گئی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہاں سے چل پڑی۔

دن گزرتے گئے اس دوران کچھ عرصہ اس سے ملاقات

ر پہنگی، وہ دوا خانے میں نظر آنے لگی۔

ایک سال کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دن جب وہ
بڑے باغ سے گزر رہی تھی تو اس کو شاکے اپنے
ں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا ہوا نظر آیا، وہ اس کی طرف
نہ دوڑی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پام کے درخت
ں میں لے گئی، اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈالدیں
ں شدت سے بھینچ کر اسے پیار کیا کہ اس کی چیخ نکل
ناید وہ اس کی گرم جوشی کو سمجھ نہیں سکا تھا لڑکی
ر اپنی جیب میں سے مٹھی بھر کر پیسے نکالے اور
بدیے۔ لڑکے نے اپنا ڈر اور ہچکچاہٹ فراموش کر کے
لینے شروع کر دیے۔ کل تین فرانک اور بیس سینٹم
تھی، وہ خوشی سے کھلکھلا پڑا، لڑکی کو مزید حوصلہ
ر اسکو اپنے سے لپٹا کر دیر تک اس کے ہونٹ اور رخسار
میں چومتی رہی۔

اس دن کے بعد سے اس کی طرف سے اجازت
جتنا دل چاہے اس کو پیسوں کے عوض پیار کر سکتی
آئندہ چار سال تک اس کا یہ معمول جاری رہا۔ وہ
یونجی لاتی اور شاکے نہایت صفائی سے بوسوں
ں اسے اپنی جیب کی نذر کر لیتا۔

سال پر سال گزرتے گئے اسکو اپنے ماں باپ کے
کام کاج کے لئے دور دراز کے شہروں اور قصبوں میں
نا تھا۔ اب وہ اپنے محبوب سے سال دو سال میں
تی اور وہ بھی اس کے لئے بے قراری سے اپنے دن
۔ اگر کسی سال وہ تھوڑی بھی کم رقم لے کر آتی تو وہ
رآلود نظروں سے گھورتا جیسے وہ اس کی ازلی
تنیز ہو۔ وہ گلوگیر آواز میں اپنی غریبی کا ذکر کرتی
دہ کرتی کہ آئندہ سال اسکو زیادہ رقم فراہم کریگی
ر شاکے کا غصہ دھیما پڑ جاتا اور وہ اس کو پیار و
ی حسین وادیوں کی رنگینی میں اپنے ساتھ غرق کر لیتی۔
دو سال گزرنے کے بعد ایک مرتبہ جب وہ شاکے
میں آئی تو اسے پتہ لگا کہ شاکے ایک دوسرے شہر
ھنے چلا گیا ہے۔ وہ مایوس ہو گئی لیکن اس نے
ی کو سنبھالا دیا اور بڑی دانشمندی اور سوجھ بوجھ
کام لیکر اس نے شاکے کے والد کو اس بات پر
ر لیا کہ آئندہ چھٹیوں میں جب وہ اسے گھر لائے تو
لمات شاکے ھلی

اسٹیشن سے واپسی میں اس کی طرف سے گزرے۔
لڑکی کے ماں باپ نے قصبے کے مغربی کنارے پر ایک مختصر
سی جھونپڑی بنائی تھی وہی اس کا عارضی گھر تھا۔

شاکے کی چھٹیاں ہوئیں اور اس کا باپ اسے اپنے
ساتھ لیکر قصبے کے مغربی کنارے سے آبادی میں داخل ہوا
وہ جھونپڑی سے باہر آکر سڑک پر کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد شاکے کا باپ ایک دراز قد اور
خوبصورت نوجوان کے ساتھ آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آنے
پر اس نے دیکھا کہ وہ نوجوان شاکے تھا۔ دو سال کے
عرصے میں وہ بالکل بدل گیا تھا، پہلے سے زیادہ صحت مند
ہو گیا تھا جسم پر ایک قسم کی یونیفارم تھی جس میں پتیل
کے سنہری بٹن لگے ہوئے تھے۔ یونیفارم نے اس کی
شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا۔

لڑکی نے اس کی طرف مشتاق نظروں سے دیکھا
اس کی نظروں میں پیار ہی پیار تھا۔ شاکے کی اور اسکی
نظروں کا تصادم ہوا ـــــ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس
نے لڑکی کے چہرے پر سے اس طرح نظریں ہٹالیں جیسے
سرِراہ کسی اجنبی پر پڑ گئی ہوں اور آگے بڑھتا چلا گیا۔
لڑکی کے دل کو زبردست دھکا لگا۔ ساری دنیا اس کے
آگے اندھیری سی ہو گئی وہ جھونپڑی میں گھس کر چارپائی پر
اوندھے منہ گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کئی بار وہ شاکے کے دواخانے اس امید کے ساتھ
گئی کہ کہیں اس کو مغالطہ نہ ہوا ہو اور شاکے سے کچھ بات
چیت ہو سکے لیکن شاکے نے اس کی طلب کی ہوئی دوائیں
جو اس نے ملاقات کی غرض سے خریدی تھیں حوالے
کیں اور اس سے دکانداری کے علاوہ کوئی بات چیت
نہیں کی۔ وہ شکست خوردہ ہو کر واپس چلی آئی۔

ہر سال وہ گھر آیا کرتا اور وہ اس کو قصبے میں
مختلف جگہوں پر آتے جاتے دیکھتی لیکن اتنا حوصلہ نہ ہوتا
کہ اس کو روک کر کچھ بات چیت کر سکتی۔ شاکے
غیروں کی طرح اس کے قریب سے ہو کر نکل جاتا۔

وقت گزرتا گیا، زمانے کی تہیں گہری ہوتی گئیں۔
لڑکی کے ماں باپ انتقال کر گئے اور اس نے ان کا کام
سنبھال لیا۔

ایک دن قصبے میں داخل ہونے پر اس نے شاکے
کو ایک نوجوان عورت کے ساتھ اپنے دواخانے سے باہر
نکلتے دیکھا جو اس کے بازوؤں کا سہارا لئے ہوئے تھی
وہ اس کی بیوی تھی۔ اسی رات اس کرسی بننے والی
نے اپنے آپ کو دریا میں غرق کر دیا، اتفاق سے ایک
شرابی وہاں سے گزر رہا تھا اس نے اس کو کھینچ کر
باہر نکالا اور دواخانے میں لے گیا تاکہ شاکے اسے طبی امداد
دے سکے۔ نوجوان شاکے ڈریسنگ گاؤن پہنے اوپری
منزل سے نیچے آیا۔ اس نے اس کے گیلے کپڑے اتارے
اور اس کے جسم کی مالش کی، سارا عمل اس نے اس طرح
کیا جیسے کسی انجان کے ساتھ ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی
کو ہوش آگیا اور موت کا سایہ اس پر سے ہٹ گیا۔
شاکے نے اس سے ترش لہجے میں کہا ـــــ

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ جانتی نہیں خودکشی کرنا
بڑا گناہ ہے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا!"

اس کی آواز سن کر لڑکی نے بڑی تقویت محسوس
کی، اس کی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھول دیا۔
وہ بہت دنوں تک مسرور رہی کہ اس کے محبوب نے
عرصہ بعد اس سے کلام کیا تھا۔ لڑکی نے شاکے سے
اصرار کیا لیکن اس نے اپنی زحمت کی کوئی فیس نہیں لی۔

"اس کی تمام زندگی اسی طرح گزر گئی۔ وہ اس کے
تصورات میں کھوئی کام کرتی رہتی۔ اس نے اس کے دواخانہ
سے دوائیاں خریدنی شروع کر دیں۔ اس طرح اسکو قریب
سے دیکھنے اور بات چیت کرنے کا موقع مل گیا۔ اس طرح
بھی وہ اسکو پیسے دینے کے قابل تھی۔"

"جیسا کہ میں نے داستان کے شروع کہا کہ گزشتہ موسم
بہار میں وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ اس کو زندگی
بھر اپنی محبت کا کوئی صلہ نہیں ملا لیکن اس نے ضبط کا
دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور کبھی اف نہیں کی۔ اپنی
دردناک کہانی سنانے کے بعد اس نے مجھ سے التجا کی کہ
میں اس کی عمر بھر کی کمائی اور املاک اس ہستی کو پہنچادوں
جس کے غمِ محبت میں وہ پچپن سال کی عمر تک شمع کی طرح
پگھلتی رہی۔ اس نے صرف اسی لئے محنت کی تھی کہ
وہ اس کے لئے کچھ ایسی چیز چھوڑ جائے جس کی بدولت
وہ اس کے مرنے کے بعد اس کو یاد رکھ سکے۔ یہ اس کے
آخری الفاظ تھے جن کے ادا ہونے کے بعد موت کا تیر سوا

شہد ... پادری کو ... کے اخراجات
کے لئے یہ ... کافی ہے۔

دوسری صبح میں مسٹر اور مسز شاگے کے گھر ان سے ملاقات کرنے پہنچا۔ وہ اپنا ناشتہ ختم کر رہے تھے، دونوں بیٹھے تھے اور بہت خوش و مطمئن ہو رہے تھے۔ چہروں سے خود پسندی اور آسودگی کی جھلک رہی تھی۔ انھوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور کافی پینے کو دی جو میں نے قبول کر لی پھر میں نے اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے اس کرسی والی کی داستان جذبات سے لبریز آواز میں شروع کی۔ مجھے یقین تھا کہ ان کے دل پگھل جائیں گے، شاید آنسو بھی نکل آئیں۔ جیسے ہی شاگے نے یہ سنا کہ "ایک آوارہ" "ایک کرسی بننے والی" "ایک خانہ بدوش" عورت اس کی پاکیزہ محبت میں مبتلا تھی تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے اس کا وقار مٹی میں مل گیا ہو۔ جیسے کسی شریف پر کیچڑ اچھال دی گئی ہو۔

اس کی بیوی نے غضب آلود لہجے میں کہا۔ "اس فقیرنی کی یہ مجال! ——— یہ ہمت؟؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاگے کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر پھرنے لگا ———

وہ بڑبڑایا ———

"کیا اس سے بھی زیادہ کوئی کمینی حرکت ہو سکتی ہے لاگر اف ... جب وہ زندہ تھی، اگر اس وقت مجھے معلوم ہو جاتا تو میں اس کو قید کرا دیتا، میں آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ کبھی چھوٹ نہیں سکتی تھی۔"

میں چپ بیٹھا رہا، نہ میری سمجھ میں کچھ آ رہا تھا اور نہ کچھ بول سکتا تھا۔ لیکن مجھے اپنا کام مکمل کرنا تھا ———

"اس نے اپنی ساری املاک آپ کو ورثے میں سونپنے کی وصیت کی تھی جس کی مالیت تین ہزار فرانک ہے، چونکہ جو کچھ میں نے ابھی سنایا آپ کو ناگوار لگا ہے اس لئے شاید آپ یہ رقم غریبوں کو خیرات کر دینا چاہیں گے۔" میں نے کہا۔

دونوں میاں بیوی نے میری طرف خاموش اور حیران نظروں سے دیکھا۔ میں نے رقم کی تھیلی جیب سے باہر نکالی اور ... رکھ دی۔ پھر میں نے دریافت کیا۔

"آپ کا کیا فیصلہ ہے؟"

مادام شاگے نے بولنے میں پہل کی

"وہ ——— چونکہ یہ مرنے والی کی وصیت تھی اسلئے اس کی روح کو تکلیف پہونچے گی اگر ہم اسے ٹھکرا دیں گے۔"

"اس کی مدد سے ہم اپنے بچوں کی زندگی شاندار بنا سکیں گے۔" اس کے شوہر نے بے شرم ہو کر کہا۔

"جیسا آپ چاہیں" میں نے خشک لہجہ میں جواب دیا۔

"خیر بہر حال یہ ہمیں دے دیجئے کیونکہ اس نے آپ سے ایسا کرنے کے لئے کہا تھا، ہم کوشش کریں گے کہ اسکو نیک مقصد کے لئے استعمال کریں۔"

میں نے رقم ان کے حوالے کر دی، سر خم کر کے تعظیم دی اور رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن شاگے میرے پاس آیا اور غیر شائستہ لہجے میں بولا۔ "وہ عورت اپنی گاڑی بھی تو چھوڑ کر مری ہے آپ نے اس کا کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں، اگر خواہش ہو تو لے جاؤ۔"

"یہی میں بھی چاہتا تھا۔" اس نے بات پوری کی اور چل دیا ———

میں نے اسے آواز دے کر واپس بلایا ———

"اس نے ایک بوڑھا گھوڑا اور دو کتے بھی چھوڑے ہیں۔" میں نے کہا "کیا تمھیں ان کی ضرورت نہیں؟"

اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ "بالکل نہیں ——— واقعی میں انکا کیا کروں گا۔"

"بیچ دینا اگر چاہو۔"

وہ زور سے ہنسا اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ میں نے ہاتھ ملا لیا، میں کیا کر سکتا تھا؟ ایک ہی بستی میں ایک ڈاکٹر اور ایک دوا فروش کے درمیان عداوت ٹھیک نہیں۔ میں نے کتے رکھ لئے اور پادری نے بوڑھا گھوڑا۔ گاڑی سے شاگے نے خوب نفع کمایا۔ اس نے اس کو فروخت کر دیا اور اس رقم سے ایک ریل کے شیئر خرید لئے۔

صرف یہی ایک گہری اور سچی محبت ہے جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی۔"

ڈاکٹر نے نظریں اوپر اٹھائیں تو دیکھا وائی کونت کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈبڈبا رہی تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ دنیا کے عشق میں اپنا سب کچھ لٹا کر بھی مسرور و شادکام رہنا صرف عورت ہی کو آتا ہے۔"

اکیسویں صدی کے ڈاکٹر ———

"صبح بخیر ——— اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

اس [illegible] پاس والوں سے [illegible] کا کاوش
[illegible] کھاتے تھے میرے [illegible] میں [illegible]
[illegible] سخت خوفزدہ ہو گئے اور چاروں طرف سے سلاموں کی
[illegible] ہونے لگی، [illegible] نے مسکرا مسکرا کر سب کے سلام کا جواب
دو چار بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا پھر آہستہ آہستہ مکھیا کے
[illegible] پہلے سے میرے آنے کی اطلاع مل گئی تھی،
[illegible] ادب سے میرا استقبال کیا اور مجھے گھر میں لے آیا، کچھ اور لوگ
[illegible] گئے۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، مکانات چھ سات سو کی تعداد میں
[illegible] چھوٹے ایک منزلہ کھپریلوں کے بنے ہوئے تھے، لوگ سب
[illegible] معلوم ہوتے تھے کیونکہ زیادہ تر لوگ آس پاس کے چھوٹے
[illegible] زمیندار تھے۔ مکھیا بااخلاق آدمی تھا آبادی میں ہندوؤں
کی اکثریت تھی، گنتی کے مسلمان گھرانے تھے خیر کچھ دیر ادھر ادھر کی بات
[illegible] کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا کہ میں [illegible] کے سلسلے میں
معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

مکھیا میرا مدعا سن کر خاموش ہو گیا اور دیر تک
[illegible] گھورتا رہا پھر ایک سرد آہ بھری، اس کی بوڑھی آنکھوں سے
[illegible] آنسو بہہ نکلے اجلدا آنسو پونچھ کر اس نے اپنی حالت پر قابو
پایا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

" سرکار شاید میں اس قصبے میں واحد آدمی رہ گیا ہوں جس کے
سینے میں یہ کہانی پوشیدہ ہے۔ قصبے کے لوگ اکثر مجھ سے یہ کہانی
سننے کی فرمائش کر چکے ہیں لیکن میں ہمیشہ ٹالتا رہا ہوں، اور میں کبھی بھی
اس کہانی کو نہ سناتا کیونکہ جو بھی سنے گا اس کا دل ہمیشہ خون کے
آنسو روئے گا، میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو میں آپ سے بھی معذرت
کروں گا کہ آپ بھی نہ سنیں تو بہتر ہے " میرے سخت اصرار پر وہ
راضی ہو گیا، اس نے کہا۔

" کیونکہ قصبے کے بہت سے لوگ اس کہانی کی فرمائش کر چکے
ہیں اس لئے آج رات آپ ہماری چوپال میں آ جائیے تاکہ سب
ایک ساتھ سن لیں "

حالانکہ میں بہت گھبراہٹ میں تھا مگر میں رات کو آنے کا
وعدہ کر کے واپس آ گیا۔ رات کھانا کھا کر [illegible] نے [illegible] کو ساتھ لیا۔
[illegible] کی چوپال جا پہنچا۔ میرے خیال میں سردیوں کے موسم
[illegible] کی چوپال میں جلتی آگ کے گرد بیٹھ کر کوئی پرانی کہانی
[illegible] کے مخصوص انداز میں سننا ایک ایسی آسائش ہے جو
[illegible] ہوٹل یا کلب میں حاصل نہیں ہو سکتی یہ قدرت

کا عطیہ ہے جو اس نے [illegible] لوگوں کو عطا کیا ہے۔

چوپال میں بیٹھ کر بھڑکتی آگ سے ٹکراتی ہوئی، لرزتی ہوئی سی
آواز کا تاثر، وہ کسی بھی آہٹ پر چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھنا اور گاؤں
والوں کا بات بات پر ہو کارا دینا۔ اُف میں اس رات کو کبھی نہیں
بھول سکتا۔ وہ وقفہ وقفہ سے گڑکی چائے کا دور، وہ حقوں کی
گڑگڑاہٹ، وہ گاؤں والوں کا بھولے انداز میں تبصرہ۔ میں
اس تاثر کو بیان نہیں کر سکتا۔ ایک خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں
بھی گاؤں کا کوئی سادہ نوجوان ہوتا۔ خیر آمدم برسر مطلب ـــ
مکھیا نے حقے کی گہری گڑگڑاہٹ کے بعد کہنا شروع کیا۔

" اس قصبے میں مہاراج کا گھرانا شاید سب سے قدیم تھا
اور غالباً سب سے زیادہ خوشحال بھی۔ ایک بڑے مکان کے علاوہ
کافی زمین بھی تھی۔ مہاراج کے سات لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں سب

بیٹے بہت گورے چٹے اور خوب صورت تھے اصل برہمن تھے اس لئے
نسل کا اثر اب تک قائم تھا۔ مہاراج بہت زندہ دل، خوش مزاج
یار باش اور علاقے کے مشہور شکاری تھے شکار کی وجہ سے بڑے
بڑے انگریزوں سے انکی دوستی تھی، آئے دن ناچ رنگ کی محفلیں
منعقد ہوتیں، قہقہے چہچہے اس گھر سے بلند ہوتے رہتے پورا قصبہ انکو
رشک کی نگاہ سے دیکھتا رہتا لیکن حسد کبھی کسی نے نہ کیا کیونکہ گھر
کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا رہتا تھا۔ وہ ان کا گھر نہیں بلکہ
قصبے کے سارے لوگوں کا گھر تھا، میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا
لیکن ساری باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں، میں بھی اکثر ان کے گھر جاتا
اور ناچ وغیرہ دیکھتا تھا۔ لیکن افسوس اس گھر کو لوگوں کی نظر
کھا گئی دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھرا ہوا گھر کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔
جہاں سے کبھی شہنائیوں کی آوازیں اٹھتی تھیں وہاں سے آہوں
اور سسکیوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یہ سب کیوں ہوا کیسے
ہوا؟ اس کے پیچھے ایک پرانی روایت ہے جو مہاراج کے گھر
سے وابستہ چلی آ رہی ہے۔

لوگ کہتے تھے کہ مہاراج کی نسل ہنومان جی کی اولاد سے
ہے (ہنومان جی ہندوؤں کے بندر نما دیوتا ہیں) کیونکہ ایک دن رام

اور راون کی لڑائی کے بعد ہنومان جی کو آدمی بن کر دنیا کی سیر
کرنے کا خیال آیا، انھوں نے کڑی تپسیا کے بعد ایشور بھگوان
سے آشیرواد لی اور آدمی کی جون میں آ گئے، جب خوب سیر کر لی تو
دوبارہ اپنی اصلی جون یعنی بندر کی شکل میں آنے کے لئے منتر
پڑھنا شروع کر دیا لیکن افسوس وہ منتر بھول چکے تھے انھوں
نے بھگوان سے بہت پرارتھنا کی مگر انھیں منتر یاد نہ آیا کیونکہ
بھگوان ناراض ہو چکے تھے، اس واقعے کے بعد سے انکی اولاد ہمیشہ
اس منتر کو یاد کرنے کی کوشش کرتی آئی تھی لیکن کامیاب نہ
ہو سکی، اسی طرح مہاراج کے دماغ پر بھی یہی کہانی سوار تھی، وہ
دور دور سے مشہور سادھوؤں کو بلاتے اور ان سے طرح طرح کے
منتر پوچھتے اسی طرح کوئی مشہور سادھو مہاراج کے گھر مہمان
ہوئے، مہاراج نے انکی بہت آؤ بھگت کی، آخر میں سادھو جی

قصبہ کے لوگوں کو اب بھی کبھی کبھی بندر کی چیخیں سنائی دیتی ہیں
جب کوئی رات کو اس لاٹ کے پاس سے گزرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے کوئی دکھی ہچکیاں لے لے کر سرگوشی میں رو رہا ہو ــــــ۔

نے مہاراج سے کہا۔

" اگر تو مجھے ایک ہاتھی مع چاندی کی زنجیروں کے بلی دان
کر دے گا تو میں تجھے تیرا خاندانی منتر بتا دوں گا جس سے تو دوبارہ
اصلی جون میں آ کر دیوتاؤں کے باکھریوں میں پہنچ جائے گا اور اَمر
ہو جائے گا "

یہ سنتے ہی مہاراج نے انکو ہاتھی بلی دان کرنے کا وعدہ
کر لیا، سادھو جی تو یہ کہہ کر اور اپنا اتا پتا بتا کر رخصت ہو گئے
لیکن اس خوشحال گھرانے کی تباہی کی بنیاد ڈال گئے، مہاراج
کو سب نے سمجھایا کہ اس گھرانے پر رحم کھاؤ کیونکہ وہ ہاتھی اور
چاندی کی زنجیریں خریدنے کے لئے گھر بار اور زمینیں بیچنے والے
تھے لیکن لوگوں کے لاکھ سمجھانے پر بھی نہ مانے اور ایک روز پوری
زمین اور گھر بیچ دیا اور بازوں کے بل بال بچوں کو لے کر جھونپڑی
میں جا بسے لیکن بھگوان کی کرنی ایسی ہوئی کہ جس دن ہاتھی آ کر
گاؤں میں آیا [illegible] کا اچھل گیا، دیکھتے
ہی دیکھتے قصبے کے [illegible] گھرانے کا نام و نشان مٹ گیا
مہاراج کا سب سے پہلے ہاتھی مرا پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب ختم
ہو گئے، صرف مہاراج کا چھوٹا بچہ [illegible] اور تین زندہ رہے باقی سب

واقعات منتہد ھلی

ایک ہی دن میں ختم ہوگئے، جب کال ختم ہوا تو تین چوتھائی آدمی بچے تھے۔ میرے گھر میں بھی چار موتیں ہوئیں۔

کال ختم ہونے کے بعد مہاراج کی بیوی اور شنکر بیچارے ایک جھونپڑی میں رہنے لگے۔ شنکر کی عمر اس وقت چودہ یا پندرہ سال ہوگی، بہت خوب صورت جوان نکل رہا تھا لیکن اس کے دماغ پر بھی بس ایک ہی بھوت سوار تھا کہ کسی طرح وہ منتر اسے معلوم ہو جائے، وہ سادھوجی کے پاس بھی پہونچا لیکن وہ بھی کال میں ختم ہو چکے تھے، کیونکہ مہاراج کے تعلقات نواب صاحب تک تھے اس لئے انھوں نے ترس کھا کر شنکر کو پندرہ سال کی عمر ہی میں سب رینجر کی جگہ دیدی جس سے دونوں ماں بیٹے کرائے کا مکان لے کر رہنے لگے۔

مالک مکان کا نام ... اس کی ایک لڑکی تھی شانتی، جو واقعی حسین تھی، ایک گھر میں رہنا تھا دونوں کا میل جول بڑھنا قدرتی بات تھی، دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی سال میں شنکر ایک کڑیل جوان بن گیا اور شانتی جوان ہو کر کامنی بن گئی، شنکر ترقی کر کے رینجر بن گیا، دونوں کی ملاقاتیں اب چوری چھپے ہونے لگیں، اکثر لوگ دونوں کو پنگھٹ پر باتیں کرتے دیکھتے لیکن نظریں بچا جاتے کیونکہ شنکر بہت شریف لڑکا تھا اور پھر رینجر کی حیثیت سے سرکاری افسر بھی تھا اس لئے لوگوں پر اس کا اثر بھی تھا۔

ان دونوں کی محبت بڑھتی رہی، شانتی کے والدین بھی بہت خوش تھے، لڑکے میں کیا کمی تھی، لیکن افسوس اس گھرانے پر ... ایک دن شنکر اچانک غائب ہو گیا، شنکر کی ماں سخت پریشان تھی، ایک ہفتے بعد شنکر واپس آیا لیکن اس کی حالت عجیب تھی، کپڑے پھٹے ہوئے، داڑھی بڑھی ہوئی اور جوتے غائب تھے، اسے دیکھ کر سب دنگ رہ گئے، ماں نے چھاتی پیٹ لی لیکن وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ سب سے خوش ہو کر کہہ رہا تھا مجھے اپنا خاندانی منتر مل گیا ہے۔ میں عنقریب اپنی جون میں جا کر مہاتما بن جاؤں گا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں عنقریب ہنومان کی جون میں اس قصبے میں آؤں گا اور شانتی کو بیاہ کر لے جاؤں گا، میرے ساتھ برات میں سب دیوتا ہوں گے۔ سبز پری کا ناچ ہو رہا ہوگا اور راجا اندر مست پڑے ہوں گے۔ پھر اس نے بہت ہی خوفناک قہقہہ لگایا اس کی باتوں سے شانتی کے گھر والے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ وہ اسی طرح بڑبڑاتا ماں کو روتا چھوڑ کر جنگل کی سمت پاگلوں کی طرح بھاگ گیا۔

کئی دن گذر گئے اس کا کچھ پتا نہ چلا، اس کی جگہ پر دوسرا رینجر بھی آ گیا، ماں روتے روتے ادھ مری ہو گئی لیکن وہ نہ آیا۔ پھر ایک دن قصبے کے لوگوں نے ایک عجیب تماشا دیکھا، شنکر کی ماں پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی اور لوگوں سے کہہ رہی تھی "میرا بیٹا ہنومان بن گیا ہے میں اسے جنگل میں دیکھ کر آئی ہوں اور وہ یہاں بھی آئے گا۔"

بڑھیا کی باتیں سن کر سب کو یقین ہو گیا کہ بیٹے کے صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور پاگل ہو گئی ہے۔ اس خیال سے کہ شنکر کو ڈھونڈھ کر لائیں بہت سے لوگ جنگل میں شنکر کی تلاش کو نکل گئے لیکن دن بھر کی تلاش کے باوجود شنکر کا کوئی پتا نہ چلا، آخر تھک ہار کر لوگ بیٹھ گئے، شنکر کی ماں پاگلوں کی طرح بکتی اور قہقہے لگاتی رہتی۔ دن بھر گلیوں میں گھومتی رہتی اور رات کو کہیں پڑ جاتی۔

ایک دن قصبے والوں نے ایک عجیب منظر دیکھا، شنکر کی ماں قصبے کے پنگھٹ پر ایک بڑے بندر کے ساتھ بیٹھی اس سے اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے وہ شنکر ہی ہو، بندر بڑے پیار سے اس کی گود میں سر ڈالے بیٹھا تھا۔ سارے قصبے میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی، لوگ اس بندر کو دیکھ کر حیران رہ گئے، اس کی حرکات بالکل آدمیوں کی طرح تھیں، وہ ماں سے اس طرح لپٹا بیٹھا تھا جیسے واقعی چھوٹا بچہ ہو، لوگ دور سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے شانتی کے گھر والے بھی آ کر یہ تماشا دیکھنے لگے، شنکر کی ماں لوگوں سے خوش ہو ہو کر کہہ رہی تھی۔

"لوگو! میرا بیٹا ہنومان بن گیا ہے، یہ تمہارا دیوتا ہے آؤ اس کی پوجا کرو تمھیں سورگ مل جائے گا ورنہ تم سورگ باشی ہونے سے محروم رہ جاؤ گے۔"

لوگ بڑی حیرت اور خوف سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ بندر جسامت میں آدمی کے برابر تھا، اتنی جسامت کا بندر کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا دوسرے مہاراج کے گھرانے سے وابستہ روایت کا بھی اثر تھا کہ لوگ گم صم کھڑے تھے۔ اسی دوران بندر کی نظر شانتی پر پڑی اس نے خوش ہو کر دانت نکال دیے اور تیزی سے دو تین چھلانگیں لگا کر شانتی کے پاس پہونچ گیا۔ لوگ دہشت سے چیخ کر دور بھاگے لیکن اس دوران بندر شانتی کا لہنگا پکڑ چکا تھا وہ بیچاری مارے خوف کے گنگ کھڑی تھی۔ پھر لوگوں نے ایک اور منظر دیکھا بندر شانتی کا لہنگا پکڑے منہ سے عجیب قسم کی آوازیں نکال رہا تھا۔ دیکھنے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا ہے۔ شانتی کے بھائی ہمت کر کے آگے بڑھے اور انھوں نے لاٹھیوں سے اس پر حملہ کر دیا۔ بندر چیختا ہوا دوڑ کر ماں سے چپٹ گیا اور اس نے اس طرح بندر کو چمٹایا جیسے وہ واقعی اس کا بچہ ہو۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بددعائیں دے رہی تھی اور اپنا لہنگا پھاڑ پھاڑ کر بندر کا زخم صاف کر رہی تھی لوگ اس واقعے سے اتنے بوکھلائے کہ ان دونوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے۔ وہ زمانہ سخت سردی کا تھا۔ شام کو لوگوں نے دیکھا کہ شنکر کی ماں پھٹے کپڑوں کے ساتھ روتی ہوئی شانتی کے گھر آئی اور رو رو کر اپنے لڑکے سے شانتی کی شادی کر دینے کو کہنے لگی۔

شانتی کے گھر والوں نے دروازہ بند کر دیا لیکن وہ مسلسل دہلیز پر سر مار رہی تھی اور شانتی کے باپ کو اپنے پرانے تعلقات یاد دلا کر منتیں کر رہی تھی، سخت سردی کا زمانہ تھا لوگ جلد ہی سو رہے رات کے اندھیرے میں نہ جانے کب تک غریب بڑھیا کی درد بھری صدائیں اور التجائیں گونجتی رہیں صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ بڑھیا کا سر خون میں لت پت شانتی کی دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔ بڑھیا کی حسرت آمیز لاش عجب انداز میں پڑی ہے۔ اور وہ بندر اپنا سر محبت سے بڑھیا کی گود میں رکھے بیٹھا ہے۔ شانتی کے گھر والے اور دوسرے لوگ اس منظر کو دیکھ کر اتنے خوفزدہ ہوئے کہ کوئی گھر سے نکلتا ہی نہ تھا لوگ کھڑکیوں میں سے جھانکتے رہے۔ کچھ دیر بعد لوگوں نے بندر کی دلدوز چیخیں سنیں۔

مکھیا نے یہاں اپنی کہانی کو چھوڑا اور اپنی آنکھوں سے دیر تک آنسو پونچھتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ آگ کو کھود رہا تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً سب ہی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے لیکن مجمع پر موت کی سی خاموشی طاری تھی صرف انگاروں کے چٹخنے کی آواز ضرور آ رہی تھی۔ بہت دیر بعد مکھیا کی آواز بلند ہوئی۔

"میں بھی اس زمانے میں اچھا خاصا ہو گیا تھا اس بندر کی چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سعادت مند بچہ اپنی ماں کی موت پر آنسو بہا رہا ہے بہت دیر تک یہ آوازیں آتی رہیں پھر ایسا محسوس ہوا جیسے بندر چیختا ہوا جنگل کی طرف جا رہا ہو پھر کچھ دیر بعد آواز مدھم ہوتی گئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ بندر اور

بڑھیا کی لاش دونوں غائب ہیں۔ جب بڑھیا کی لاش
دیکھنے سے محروم ہوکر بستی کے لوگ گروہ کی شکل میں بڑھیا کی
تلاش میں نکل پڑے لیکن جب تلاش بسیار کے بعد بھی لاش نہ ملی
تو بندر بھی نظر نہ آیا ان واقعات سے شانتی کے
گھر والے اتنے گھبرائے کہ وہ بندر کی غیر موجودگی سے فائدہ
اٹھاکر ... اور چلے گئے۔

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ بندر تنہا واپس آیا
اور گاؤں کے قریب ایک درخت پر خاموش اور اداس
بیٹھ گیا اور وہ اس راستے کو دیکھتا رہا جہاں سے قصبے
کی عورتیں پانی بھرنے آیا کرتی تھیں لیکن اس دن قصبے
کی کوئی لڑکی پانی لینے نہیں گئی مگر دو ہی ڈرتے ڈرتے پانی
لینے گئے تھے ... سے پانی لے کر چلے آئے اس دن سے
بندر کو کسی نے نہیں دیکھا دوسرے دن بھی یہی ہوا تیسرے
دن ... ہوگئی اور قصبے کی لڑکیاں بھی پنگھٹ
پر پانی بھرنے جانے لگیں۔ بندر ہر کنے جانے والی لڑکی
کو ... ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے شانتی کا انتظار ہے
لیکن وہ اس قصبے میں ہوتی تو آتی اس کے گھر والے تو اسے
لے کر غائب ہی ہوگئے تھے
پھر کچھ دن لوگوں نے ایک اور ہی منظر دیکھا کہ بندر
دکھائی دیا ہوگا۔ قصبے کے مرد عورت بچے سب ہی اس کے
کریا کرم میں شریک ہوئے اور یہ کہانی دور دور تک مشہور
ہوگئی۔ قریب کے گاؤں کے ایک سنگ تراش نے اس کی
سمادھی پر ایک بڑے پتھر کو تراش کر اس کی لاٹ بنائی جب
ہی سے شنکر دیو کی لاٹ کی پوجا ہوتی ہے۔

ادھر کچھ دنوں بعد شانتی کے گھر والے بھی واپس آ گئے
لیکن شانتی ان کے ساتھ نہ تھی معلوم ہوا کہ دوسرے گاؤں میں
ان لوگوں نے اس کی شادی کردی ہے پھر ایک دن شانتی بھی
اپنے شوہر کے ساتھ آئی، جب شانتی کا ڈولا شنکر کی لاٹ
کے قریب سے گزرا تو سب نے دیکھا کہ مورتی کی آنکھوں سے
آنسو بہہ رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں نے شانتی کو دیکھا تو شانتی
وہ شانتی نہیں رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گھل کر جلد ہی ختم
ہوگئی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی جوان لڑکی اس
لاٹ پر اکیلی جاتی ہے تو شنکر دیو کی آنکھوں سے آنسو بہنے
لگتے ہیں بعض لوگوں کو اکثر شنکر دیو نظر بھی آجاتے ہیں
قصبے کے لوگوں کو اب بھی کبھی کبھی بندر کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔
جب کوئی رات کو اس لاٹ کے پاس سے گزرتا ہے تو ایسا
محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سسکیاں ہچکیاں لے کر سرگوشی
میں رو رہا ہو۔

شانتی کے گھر کی چھت پر اداس بیٹھا رہتا۔ وہ سب کو تکا کرتا دیکھتا
اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے لیکن بالکل خاموش منہ
سے ایک آواز تک نہ نکالتا۔ اس دن کے بعد کسی نے اس کی آواز
پھر نہ سنی جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔ اب وہ بہت دبلا نظر آنے
لگا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن سے اس نے کچھ کھایا
ہی نہ ہو۔ لوگ بھی اب اس بات کے عادی ہوگئے تھے۔ وہ
شانتی کے گھر کی چھت پر بیٹھا سب کو دیکھتا رہتا اور آنسو بہاتا رہتا
لوگ اپنے کاموں میں مشغول رہتے، سات آٹھ دن تک وہ اسی
طرح بیٹھا رہا نویں دن نڈھال ہوکر چھت پر لیٹ گیا اور اسی
دن شام کو چھت سے لڑھکتا ہوا نیچے عین اسی جگہ گرا جہاں پر
پاگل بڑھیا نے جان دیدی تھی۔ جب لوگوں نے قریب جاکر دیکھا
تو اس کا دم نکل چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہاں لوگ جمع ہونا شروع
ہوگئے ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

لوگوں نے بڑی عقیدت سے اس کی لاش اٹھائی اور
برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے اس کو جلا دیا گیا۔ شنکر کے نام
ہی سے اس کا کریا کرم ہوا اور پورے احترام سے اس کی تمام

"کیا خوب تماشا ہے"

[illegible] نبو صاحب نے منہ ہاتھ دھو کے کپڑے تبدیل کئے۔ اس اثنا میں حکیم بدھن ایک پرتکلف ناشتے اور چائے کا آرڈر دے چکے تھے۔ نبو صاحب کے بیٹھتے ہی ناشتہ پیش کر دیا گیا۔ حکیم صاحب نے مجھے بھی اشارے سے بلا لیا۔ اور بولے۔

"بھائی بہزاد یہ میرے چچا جناب نبو صاحب ہیں، اور والد صاحب قبلہ کے بہترین دوست۔ ان کے گھر بھر کا علاج صرف والد مرحوم ہی کرتے تھے۔ آپ بہت بڑے زمیندار ہیں اور انجکین سے بارہ میل کے فاصلے پر آپ کی بہت بڑی زمینداری ہے۔" میں نے کہا۔

"میں مل کر بہت مسرور ہوا۔"

حکیم بدھن نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"چچا یہ بڑے مشہور شاعر بہزاد لکھنوی ہیں اور میرے بہترین دوست ہیں۔ ان کے بغیر نہ میں کوئی کام کرتا ہوں اور نہ کہیں باہر جاتا ہوں۔"

نبو صاحب نے چائے کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نام سن چکا ہوں۔ اللہ زندہ رکھے۔" چائے اور ناشتے کے بعد بولے۔

"بدھن میاں۔ ہمارے ہاں تو بارش کا نام نہیں ہے میں جس تم سے ملنے کے لئے جب چلا تو بارش کا تخیل تک نہ تھا۔ جنکشن اسٹیشن آتے ہی بارش نظر آئی۔ اب کیا ہو سکتا تھا چارو ناچار اترا تو بارش انتہائی زوروں پر تھی۔ بند ہونے کی امید ہی نہ تھی لہٰذا اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ تمہارا پتہ میرے پاس محفوظ تھا گھر پہنچا تو معلوم ہوا تم یہاں پر ملو گے۔ تمہارے گھر میں روک رہی تھیں لیکن میں سیدھا یہاں آ گیا۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "آپ کو واقعی بڑی زحمت ہوئی۔ خیریت؟" وہ بولے۔

"خیریت ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ تخلیہ ہو تو میں تم کو بتاؤں میری عقل کام نہیں کر رہی ہے اور بے حد پریشان ہوں۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "چچا تخلیہ تو موجود ہے۔ رہے بہزاد تو ان سے میں کوئی بات چھپا کر رکھتا ہی نہیں۔ اگر آپ مجھ سے علیحدگی میں بھی کچھ کہیں گے تو میں ان سے مشورہ کرنے پر مجبور ہوں گا۔ یہ میرے پرانے ساتھی اور جگری دوست ہیں۔"

نبو صاحب نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو کوئی نقصان نہیں۔ سنو! تمہارے بھائی محسن کی شادی کو ماشاء اللہ سے آٹھ برس گزر گئے ہیں۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "میں تو شریک تھا شادی میں ماشاء اللہ آپ نے بڑی شان سے شادی کی تھی۔"

نبو صاحب نے کہا۔ "ہاں بھیا بس اللہ نے کرا دی۔ میری ایک ہی اولاد ہے۔ اب اس کی شادی میں بھی بخل کرتا تو کمال ہی ہوتا۔ ہاں تو بھیا آٹھ سال سے مجھے اور تمہاری چچی کو یہ کوفت کھائے جا رہی تھی کہ محسن کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہو رہی ہے، میری نسل کا خاتمہ ہوا جا رہا ہے۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "بے شک بڑے افسوس کا مقام ہے۔"

نبو صاحب بولے۔ "میں نے اور تمہاری چچی نے کوئی منت کوئی مراد باقی نہیں چھوڑی۔ کوئی پیر کوئی فقیر ایسا نہیں چھوڑا جس کے پاس میں خود نہ گیا ہوں، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پار سال اتفاقاً ایک جوگی ہمارے گاؤں میں آیا اور ٹھاکر جے کشن جی کے ہاں ٹھہرا۔ اس کی شہرت ایک دم سے گاؤں میں پھیل گئی۔ کئی آدمیوں کے کام اس کے گنڈے سے بنے۔"

حکیم بدھن نے حیرت سے کہا۔ "اچھا؟"

وہ بولے۔ "ہاں بھیا۔ میرا دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن جب ٹھاکر (صاحب) خود میرے پاس آئے اور بولے کہ چل کر مہاراج سے گنڈا لے لیجئے تو میں چلا گیا۔ اس جوگی نے مجھے ایک گنڈا سوت کے تاگے کا دیا اور بولا۔

"اس کو استری کے گلے میں پہنا دو۔"

میں نے لیا۔ گھر آ کر بے دلی کے ساتھ تمہاری چچی کو دے دیا انھوں نے بھی انتہائی نفرت اور بے دلی کے ساتھ وہ گنڈا دلہن کے گلے میں ڈال دیا۔ بات گئی گزری ہو گئی لیکن جب دوسرے ہی مہینے حمل کے آثار پیدا ہوئے تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اللہ اللہ کر کے نویں مہینے ایک لڑکا پیدا ہوا۔"

حکیم بدھن نے خوش ہو کر کہا۔ "اللہ مبارک کرے۔"

نبو صاحب نے کہا۔ "اللہ تم کو بھی مبارک کرے بچہ بے حد خوب صورت اور توانا پیدا ہوا۔ میرے خاندان میں کبھی اتنا وزن دار اور حسین بچہ نہیں ہوا تھا۔ سارے اعزہ مجھے مبارکباد پر مبارکباد دینے لگے۔ لیکن دلہن روز بروز بے حد کمزور ہونے لگی۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "اچھا کسی عمدہ قسم کی دوا لیجئے میوہ جات استعمال کرائیے۔ ماشاء اللہ دلہن جلد ہی پھپک جائیں گی۔"

نبو صاحب نے کہا۔ "بھیا میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی ہے۔ تم کو معلوم ہے اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود ہے بہتر سے بہتر غذائیں، پھل، میوہ جات استعمال کرا رہا ہوں لیکن دلہن روز بروز کمزور ہی ہوتی جا رہی ہیں۔ ہر وقت ڈری ڈری سہمی سہمی رہتی ہیں۔ سب کے سامنے کچھ نہیں کھاتی ہیں کھانا اندر کمرے میں رکھوا لیتی ہیں اور وہیں کھاتی ہیں۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "اور وہ کھانا وغیرہ سارا کھا لیتی ہیں بچتا تو نہیں ہے!"

وہ بولے۔ بھیا پلیٹیں تو ایسی صاف ملتی ہیں جیسے کسی نے دھو دی ہوں۔ یہی حیرت ہے۔ بعض اوقات تو غذا اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دو تین آدمی کھا لیں اور بچ بھی رہے مثلاً حلوے کا پورا کونڈا رکھ دیا جاتا ہے کہ اس میں سے تھوڑا سا نکال کر استعمال کر لیں گی باقی رکھا رہے گا لیکن صبح کو وہ پورا کونڈا صاف دھویا ہوا نظر آتا ہے۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "حیرت ہے۔"

نبو صاحب بولے۔ "حیرت کی اور بھی باتیں ہیں۔ دلہن کا دودھ بالکل خشک ہو گیا ہے۔ میں نے اناؤں کو بلوایا اناؤں کی کیا کمی۔ سب کاشتکار بسے ہوئے ہیں۔ ان کی بیویاں آنا شروع ہو گئیں لیکن ایک عجیب بات دیکھی عورت نے جوں ہی لڑکے کے منہ میں دودھ دیا ایک چیخ ماری اور کہا۔

"اس کے منہ میں تو دانت ہیں، سینہ چبائے لیتا ہے۔"

"لڑکے کا منہ کھول کر دیکھا گیا۔ دانت تو کیا مسوڑوں کا صحیح پتہ نہیں۔ ڈیڑھ مہینے کا بچہ ہے۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "تو اس عورت نے ڈھونگ سا کیا"

نبو بولے۔ "پہلے تو میں بھی یہی سمجھا کہ یہ بات ہو گی لیکن بیس پچیس عورتوں نے یہی کہا اور قسمیں کھائیں تو پھر مجھے اس انہونی کا یقین کرنا پڑا۔"

حکیم بدھن بولے۔ "بچہ بھی بغیر دودھ کے کمزور..."

نبو بولے۔ "کمزور؟ ابھی وہ تو پہلوان ہو رہا ہے۔ ڈیڑھ ماہ کا بچہ ہے لیکن گردن ادھر ادھر بخوبی گھما کر دیکھتا نظر سے نظر ملاتا ہے۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "چچا آپ کی گفتگو سن کر تو میں حیرت میں ہوں۔"

وہ بولے۔ "میں نے کئی عاملوں کو بلایا۔ تعویذ باندھے لیکن کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ سارے گاؤں

اس واقعے کی شہرت ہوگئی ہے۔"

حکیم بدھن بولے "مجھے بے حد افسوس ہے۔ سوچ رہا ہوں آخر کیا کیا جائے۔"

وہ بولے "سنو بھیا۔ تمہاری چچی بھی جب تحسین پیدا ہوا ہے تو کچھ کھاتی پیتی نہیں تھیں۔ تمہارے والد اللہ بخشے آئے اور پندرہ دن میرے ہاں ٹھہر کر انھوں نے علاج کیا تھا اور تمہاری چچی درست ہوگئی تھیں۔ تم بھی آخر اسی باپ کے بیٹے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے تم کو مکمل طب پڑھائی تھی۔ تم ان کے مریضوں کے نسخے بھی لکھتے تھے اور ان کا علاج بھی کرتے تھے۔"

حکیم بدھن نے کہا "جی ہاں مجھے یہ پیشہ پسند نہیں تھا میں نے ترک کر دیا۔"

وہ بولے "تو تم میرے ہمراہ بادل پور (زمینداری) چلو وہاں پندرہ دن قیام کرو اور اپنی بھابھی کا علاج کرو ــــــ تمہاری چچی نے مجھ سے کہا تھا کہ دلہن کا علاج صرف حکیم بدھن ہی کر سکتے ہیں۔"

حکیم بدھن نے کہا "چچا مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے لیکن میری طبابت کی مشق چھوٹی ہوئی ہے۔ دوسرے میں یہاں جو کام کر رہا ہوں پندرہ دن کی عدم موجودگی میں بالکل ختم ہو کر رہ جائے گا۔"

وہ بولے "تمہارا تمام نقصان اور ہرجہ میں بھرنے کو تیار ہوں تم کو چلنا پڑے گا اور آج رات ہی کی گاڑی سے ہمیں یہاں سے روانہ ہونا ہے۔"

چلئے جناب آگئی شامت۔ مجھے حکیم بدھن نے دس دس کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"تم ابھی گھر چلے جاؤ اور یہ روپے دے کر کہہ دو کہ تم پندرہ یوم کے لئے میرے ساتھ جا رہے ہو۔ اگر زیادہ وقت لگا تو اور رقم منی آرڈر کے ذریعے پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا "بھیا یہ تم کیا کہہ رہے ہو میری رائے میں تو مجھے یہاں چھوڑ جاؤ۔ تمہاری عدم موجودگی میں فیکٹری کی دیکھ بھال کے لئے ایک آدمی ہونا ہی چاہیئے۔"

حکیم بدھن نے کہا "عالی جناب مولانا بہزاد صاحب لکھنوی آپ مجھ کو کوئی مشورہ نہ دیں۔ میں اپنے معاملات کا خود ذمہ دار ہوں۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے اور بس ـــــ سامان کی کوئی ضرورت نہیں حتیٰ کہ کپڑوں کی بھی۔ بادل پور میں آپ کے لئے کپڑے پاجامے سل جائیں گے۔"

حکیم بدھن جب کبھی مجھے تعظیمی انداز میں مخاطب کرتے تھے میں سمجھ جاتا تھا کہ یہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ چنانچہ تاب دم زدن ہی نہ تھی گھر گیا۔ روپے حوالے کئے اور فوراً ہی واپس آیا۔

بارش خیر سے تھمی ہوئی تھی لیکن مطلع بے حد غلیظ تھا۔ میری واپسی پر حکیم بدھن موجود نہیں تھے۔ وہ تھوڑی دیر بعد ایک تانگے پر لدے پھندے واپس آئے۔ اٹیچی اور ہولڈال کے علاوہ ایک ناشتے دان میں اس وقت کا کھانا تھا ـــــ نبو صاحب، حکیم بدھن اور میں نے وہ کھانا چائے خانے ہی میں کھایا۔ ناشتے دان وہیں چھوڑ کر حکیم بدھن نے تانگا منگوایا اور ہم تینوں آدمی اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ چار باغ سے کانپور کے لئے گاڑی چار بجے چھوٹتی تھی۔ حکیم بدھن نے مجھے دو روپے دیتے ہوئے کہا۔

"تین ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے انجگین تک کے خرید لو۔"

چلئے جناب سیکنڈ کلاس میں ہم تینوں بیٹھ گئے۔ گاڑی چھوٹی اور تیس میل کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ہم لوگ انجگین اترے۔ واقعی لکھنؤ سے کے بعد سے بارش کا کہیں نام تک نہ تھا۔ فضا میں ابھی خاصی گرمی تھی۔ انجگین اترتے ہی ایک مضبوط یکہ نبو صاحب کو دیکھتے ہی بڑھا۔ یکے والے نے سامان پیچھے باندھ لیا۔ ایک سیٹ پر نبو صاحب دوسری پر حکیم بدھن اور یکے والے کے پاس میں بیٹھ گیا ـــــ بادل پور انجگین سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ سڑک نیم پختہ تھی۔ راستے میں تقریباً ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ راستے بھر حکیم بدھن نبو صاحب سے پرانی باتیں اور تذکرے کرتے رہے مجھے چونکہ ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خاموش ذہن ہی ذہن میں شعر کہتا رہا۔ یکہ تقریباً آٹھ بجے رات کو ایک بڑی سی حویلی کے سامنے پہنچ کر رکا۔ کئی ملازم دوڑ پڑے ـــــ ہاتھوں ہی ہاتھوں سامان ایک بڑے سے دالان میں رکھ دیا گیا جہاں متعدد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور کئی عدد پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے لئے فوراً لوٹوں میں پانی اور صابن آگئے۔ ملازمین تولئے لئے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اور حکیم بدھن نے منہ ہاتھ دھو کر فراغت پائی ہی تھی کہ ایک ملازم چائے کی ٹرے لئے ہوئے آموجود ہوا۔ اس میں کچھ لوازمات بھی تھے جن کو حکیم بدھن نے الگ کرنے کے بعد ایک پیالی اپنے لئے تیار کی اور ایک مجھے دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"دیکھا چچا نبو صاحب کا گھر۔ بہت بڑے زمیندار ہیں اور بڑی آن بان اور رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔"

ہم دونوں چائے پی ہی رہے تھے کہ نبو صاحب اندر سے آکر بولے۔

"حکیم صاحب تمہاری چچی تم سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔ چائے پی چکے ہو تو چلو۔"

حکیم صاحب نے ہاتھ سے پیالی رکھ دی اور اندر چلے گئے۔ میں نے چائے کے بعد لیٹنے کا ارادہ کیا اور چارپائی پر دراز ہوگیا۔ بستر قیمتی اور بے حد صاف تھا۔ میں لیٹتے ہی نیند محسوس کرنے لگا۔ اتنے میں حکیم بدھن ایک بچے کو گود میں لئے ہوئے باہر آئے۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ بچہ کسی طرح بھی دو ڈھائی سال سے کم کا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اتنا بھاری اور گداز تھا کہ میں نے حکیم بدھن کے چہرے پر بدمزگی کے آثار دیکھے لڑکا بے حد حسین تھا۔ نقوش تیکھے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں ستواں ناک اور پتلے پتلے ہونٹ۔ میں نے بچے کو دیکھ کر چٹکی بجائی۔ میں حیران رہ گیا جب بچے نے قہقہے پر قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ پوری بھاری بھرکم آواز کے ساتھ۔ حکیم بدھن نے کہا۔

"یہ ہے چچا نبو صاحب کا پوتا۔ اس کی عمر بمشکل دو ماہ ہوگی۔ لیکن ماشاء اللہ۔"

میں نے کہا "بھلا دو ماہ! تم تو کہتے چار سے تھے ہوگے۔"

حکیم اس کو لٹانے جا رہے تھے کہ وہ بیٹھ گیا اور گردن گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اتنے میں نبو صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور بولے "اس کو اندر بھجوا دو حکیم صاحب۔"

حکیم صاحب نے بچے کو ایک نوکر کے سپرد کر دیا اور اس کے جانے کے بعد بولے۔

"چچا معاملہ اتنا پراسرار ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے میں نے اس وقت بھابی کو سرسری طور پر دیکھا ہے۔ صبح نہار منہ نبض دیکھوں گا اور قارورہ رکھوا لیجئے گا۔"

اتنے میں نبو صاحب کے صاحبزادے تحسین صاحب باہر آئے اور آتے ہی حکیم بدھن سے لپٹ گئے۔

تحسین صاحب کی رنگت سیاہی مائل تھی نقش بھی بے حد

[illegible] حکیم صاحب [illegible] دس برس کی ہو گی
طبیعت [illegible] تجن صاحب کے بالکل برعکس کیونکہ ان کی شناخت تو ہونی چاہئے تھی۔

تجن صاحب اور حکیم بدھن کی بچپن کی دوستی تھی۔ بیٹھتے ہی گلے شکوے شروع ہو گئے۔ اتنے میں نبو صاحب نے آکر ان سے کہا

"تجن اب تم دوست کو سنبھالو۔ میں اندر جا رہا ہوں اور اب باہر نہیں آؤں گا۔ خیال رہے ان کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے"

ان کے جاتے ہی تجن صاحب کے چند مصاحبین آگئے۔ سب کے سب قصباتی تھے۔ تاش نکل آئے کورٹ پیس شروع ہو گئی۔ تاش کے بعد کھانا آیا۔ کھانا بہت پر تکلف تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ آتنی جلدی اتنی اقسام کیسے تیار ہو گئیں۔ کھانے کے بعد میں تو لیٹ گیا لیکن حکیم بدھن کی راگ داری شروع ہو گئی جس سے انہیں چڑ تھی۔ خدا جانے یہ راگ داری کی محفل کب تک جاری رہی۔

صبح جب میں [illegible] کے لئے اٹھا تو میرے برابر کے پلنگ پر حکیم بدھن اور ان کے برابر تجن صاحب سو رہے تھے میں [illegible] سے فارغ ہوا ہی تھا کہ حکیم اٹھ بیٹھے۔ غالباً ملازم کو معلوم تھا۔ بیڈ ٹی آ گئی۔ ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ تجن صاحب کو ملازم نے بمشکل ہشیار کیا۔ وہ غالباً دیر تک سونے کے عادی تھے۔ حکیم بدھن کے نام پر چونکے اور کلی کرتے ہی چائے نوشی میں مشغول ہو گئے۔

سات نہیں بجنے پائے تھے کہ ناشتہ آگیا۔ ناشتہ بھی کافی پر تکلف تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد نبو صاحب ادھر آئے اور حکیم بدھن کو لے کر اندر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد ایک ملازم میرے لئے نیا کرتا پاجامہ لے کر آیا تھا نبارات ہی میں سلوایا گیا تھا۔ زمینداری کے بھی کیا ٹھاٹ تھے۔ میں نے غسل کیا، کپڑے بدلے، اور بالوں میں تیل لگا رہا تھا کہ حکیم بدھن واپس آ گئے۔ نبو صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔

حکیم بدھن نے کہا۔ "چچا مجھے بہت پریشان ہو رہے ہیں بیماری کوئی سمجھ نہیں ہے۔ نبض بالکل درست ہے اور طبیعت میں کسی فساد و خرابی کا پتہ نہیں چلتا۔ میری ناچیز رائے میں دلہن بھابی بھوک کا شکار ہیں۔ غذا نہ پہونچنے سے یہ [illegible]

نبو صاحب نے کہا۔ غذا نہ پہنچنے پر ہے۔ آخر کتنی غذا دلہن کو دی جائے۔ اے میکو غذا دلہن کے کمرے سے کھانے کی سینی یہاں لے کر آؤ۔"

تھوڑی ہی دیر میں ایک بڑی سینی لئے ہوئے ملازم باہر آیا۔ نبو صاحب نے سینی کا سرپوش اٹھایا اس میں چار بڑے پیالے اور تین طشتریاں رکھی ہوئی تھیں۔

وہ بولے۔ "بھیا بدھن ان چار پیالوں میں سے ایک میں اچھوانی تھی۔ دوسرے میں خالص دودھ۔ تیسرے میں مرغ کا شوربہ اور چوتھے میں بکری کی یخنی۔ ان تین طشتریوں میں، ایک میں پلاؤ۔ ایک میں میٹھے چاول اور ایک میں تلے ہوئے انڈے تھے۔ روٹیاں بھی غالباً پانچ تھیں۔ خود دیکھ لو ہر پیالہ اور پلیٹ صاف ہے روٹی کا ایک چھلکا تک باقی نہیں ہے۔ اگر دلہن نے نہیں کھایا تو آتنا کھانا گیا کہاں؟ میں نے ضد میں آتنا زیادہ کھانا رکھوانا شروع کیا ہے۔"

حکیم بدھن پھٹی پھٹی آنکھوں سے سینی اور خالی برتنوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"چچا معاملہ بے حد پراسرار ہے، سمجھ کام نہیں کرتی۔ آپ ایک کام کریں۔ گھر میں جا کر چچی جان سے یہ کہیں کہ میں اپنے پوتے کو عسکری بھیا کے پاس لئے جا رہا ہوں۔ مجھے جہاں تک یاد ہے عسکری میاں آپکے چچا زاد بھائی ہیں اور گاؤں کے اس کنارے پر حویلی ہے۔ یا کہیں اور کا بہانہ کر کے گھر سے ہٹا جائیے۔ میں بھابی سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں"

نبو صاحب نے کہا "تمہیں ٹھیک یاد ہے حکیم صاحب کہ عسکری بھیا کی حویلی اس کنارے پر ہے۔ میں بہت دنوں سے گیا ہی نہیں ہوں۔ ارے میکو بہل گاڑی جوت دے۔"

تھوڑی ہی دیر میں بہل گاڑی جت کر آ گئی اور نبو صاحب پوتے کو گود میں اٹھائے اس پر بیٹھ گئے۔

گاڑی روانہ ہوئی۔ گاڑی کی روانگی سے دس منٹ کے بعد حکیم صاحب نے ناشتے کا بھی حکم دیا۔ تجن صاحب نے کچی نیند سے اٹھنے کے باعث ناشتہ نہیں کیا تھا ناشتہ آگیا۔ حکیم صاحب وہ سینی لئے ہوئے اندر زنان خانے میں چلے گئے اور تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد واپس آکر بولے۔

"یار میرا جو خیال میں نے قائم کیا تھا وہ تقریباً درست نکلا۔ بھابی کے سامنے جو نہی میں نے ناشتہ رکھا وہ مریضوں کی طرح کھانے لگیں جب سیر ہو گئیں تو مجھ سے بولیں۔

"وہ حکیم صاحب کچھ بتا نہیں سکتی اور نہ کوئی الجھن کا تم کسی طرح میرے کمرے کے برابر والے کمرے میں بیٹھ کر رات کے وقت اس طرح جا کر کسی کو پتہ نہ چلے اور تو دیکھ لو [illegible] کر دل تک کو اسکی خبر نہ ہو یہ خیال رکھنا"

میں نے کہا "آخر تفصیل کیوں نہیں بتائی دلہن نے؟"

وہ بولے "یار بے حد خوفزدہ معلوم ہوتی ہے۔ اور اس نے انتہائی سرگوشی میں یہ بات مجھ سے کہی ہے۔"

میں نے کہا "پھر؟"

بولے "بھیا آجائیں تو آج میں اور تم برابر والے کمرے میں جا کر یہ تماشہ دیکھیں گے۔ تمہارے سامنے کیلئے بھی اجازت لینا ہو گی"

میں خاموش رہا۔ فاعلاتن فاعلاتن والا شخص ان سب باتوں سے گھبراتا ہے۔ اسکی سمجھ میں سوائے ردیف اور قافیے کے کچھ آتا ہے اور نہ آنے کا امکان ہوتا ہے۔ کوئی تقریباً دو گھنٹے کے بعد نبو صاحب اپنے پوتے کے ہمراہ تشریف لائے اور اندر چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا بھی لاجواب تھا۔

کھانے کے بعد ہی حکیم بدھن اور نبو صاحب دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے تادیر باتیں ہوتی رہیں۔ میں لیٹ کر طلسم ہوشربا کی ایک جلد پڑھنے لگا۔ نبو صاحب کے پاس پورا کا پورا دفتر تھا۔ شام کو چائے پر بھی حکیم بدھن نے مجھے کچھ نہ بتایا اور میں نے بھی نہیں پوچھا یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ حکیم بدھن تجن صاحب اور انکے مصاحبین کے ساتھ گپ شپ لڑاتے رہے اور رات کے کھانے کے بعد پھر نغمہ سرائی میں مشغول ہو گئے لیکن مجھ سے اتنا کہہ دیا۔

"سونا نہیں"

میں نے وقت گذارنے کے لئے پھر ہوشربا اٹھا لی۔ تقریباً بارہ بجے محفل برخاست ہوئی۔ سب کے چلے جانے کے بعد مجھے حکیم بدھن نے اشارہ کیا۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ انھوں نے حویلی کی پچھلی جانب رخ کیا۔ حویلی کی پشت پر ایک دروازہ تھا جو غالباً ملازمین کے لئے تھا دروازے پر خود نبو صاحب کھڑے ہو گئے تھے۔ انھوں نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔

"تمہارے کہنے کے مطابق ملازمین تک کو خبر نہیں ہے کہ تم آرہے ہو۔ ذرا دبے پاؤں چلنا"

ہم تینوں دبے دبے پاؤں ایک دالان میں پہنچے اور وہاں سے ایک پتلی دروازے سے ایک کمرے میں پہنچے

بقیہ صفحہ [illegible]

اس وقت تک فخر نہیں کر سکتے جب تک وہ اپنی تمام مقدم ضروریات جیسے، کھانا، کپڑا اور مکان کو پورا کرتے رہنے کی صلاحیت پیدا نہیں کر لیتے۔ یا وہ لوگ بھی قابلِ تعریف ہیں جو اپنی ضروریات کی تسکین کے محدود وسائل رکھتے ہوئے تعلیم و ہنر پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرتے ہیں تاکہ آج کا خرچہ کل کی مستقل آمدنی بن جائے اور اس وقت پھر اپنی دیگر ضروریات کو آسانی سے پورا کیا جا سکے یہ میں ہوں جس کی ہدایت پر چل کر ایک انسان جائز اور ناجائز اخراجات میں تمیز کرتا ہے اور اپنے گھر میں ہمیشہ کچھ اس طرح کی ہدایت دیتا رہتا ہے کہ دیکھو یہ چیز احتیاط سے خرچ کرنا۔ برسات شروع ہو رہی ہے اس لئے غذا کا اور اسی طرح کی تمام اشیاء کا بندوبست کر لو جو برسات میں ناممکن بن جاتا ہے یا جس کی دستیابی مشکل بن جاتی ہے۔ اس طرح اس لڑکے کو اس طرح کی ٹریننگ دلواؤں گا، تاکہ ملازمت میں کچھ آسانی ہو۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ بھی میں ہی ہوں جس کی بدولت آپ اپنے گھروں پر کی بربادی پر فخر کرتے ہیں، وقت سے پہلے ہی ختم ہو جانے پر فکر مند ہوتے ہیں اور خرچ کرنے وقت آ گیا ہے کا اظہار نہیں لیا جیسے نہ جانے کتنے جملوں کا استعمال کرتے ہیں سب آپ سمجھے کہ کس طرح میں انسان کے شعور میں رچا بسا ہوں۔

انسان کو چھوڑیے میں تو ہر ذی روح میں موجود ہوں۔ میں آپ کو آپ کے مشاہدے ہی سے سمجھاؤں گا کہ کس طرح میں ہر ذی روح کی طبیعت و طینت میں بسا ہوں۔ آپ نے مکڑی کو جالا بنتے تو دیکھا ہی ہوگا، چیونٹیوں کی لمبی قطار پر نظر پڑی ہی ہوگی اور یہ بھی دیکھا ہوگا کہ کس طرح وہ اپنے رزق کا ایک ایک دانا منہ میں احتیاط سے رکھے دیوار پر چڑھتی اور گرتی رہتی ہیں اور یہ بھی آپ کے مشاہدے ہی کی بات ہے کہ گرمیوں میں چڑیاں کس طرح ایک ایک تنکا جمع کرتی ہیں، گھونسلا بناتی ہیں اور کا مناسب ذخیرہ جمع کر کے پرسکون برسات گزارتی ہیں۔ آپ نے غور کیا مکڑی کی اس نفیس صنعت کاری، چیونٹیوں کی اس فوجی تنظیم اور چڑیوں کی اس دور اندیشی و مستقل مزاجی کے پس پشت کون کارفرما ہے۔ جناب یہاں بھی میری ہی روح کارفرما ہے۔

اس تعارف کے بعد اب آیئے میں اپنی کارگزاریوں کی رام کہانی سناؤں۔ میری یہ رام کہانی آپ کی سرگرمیوں کی داستان ہے۔ آپ ہی کی کہانی ہے اور آپ ہی کے ماحول میں جڑ کر سنا رہا ہوں۔

میرا نصب العین جیسا ابھی آپ نے سنا، عوام کو خوش و خرم اور بلند معیارِ زندگی عطا کرنا رہا ہے جس کا سیدھا تعلق انسان کی ضروریات اور خواہشات کی تسکین سے ہوا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی انسان کو نان و نفقہ کی روٹی جیسی اہم اور مقدم ضرورت کو پورا کرتے نہیں دیکھتے تو فوراً مفلس و غریب کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں اور اس کا معیارِ زندگی نہایت پست قرار دے دیتے ہیں، اس کے برعکس جب کسی شخص کو اپنی ہر ضرورت و خواہش، جیسے اچھا کھانا، اچھی صحت، اچھی تعلیم اچھا مکان، عیش و آرام کی ساز و سامان کی فراہمی، وغیرہ کو پورا کرتے دیکھتے ہیں تو فوراً خوشی و خرمی کا طمغہ عطا کر دیتے ہیں، ایک بلند معیارِ زندگی کا حامل قرار دے دیتے ہیں۔ اسی نظریہ کو ملک کی نگاہ سے دیکھئے۔ وہ ملک جو اپنے عوام کی ضروریات کو پورا نہیں کر پاتا غریب ملک کہلاتا ہے، اور جو ہر ضرورت کو مہیا کرنے، زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تسکین کا سامان پیدا کرے ترقی یافتہ ملک کہلاتا ہے۔ امریکہ، روس، جرمنی، جاپان، انگلینڈ وغیرہ اسی لئے ترقی یافتہ ملک کہلاتے ہیں کہ وہ اپنے عوام کی تمام ضروریات کو پورا کرتے رہنے کی طاقت رکھتے ہیں اور اس کے برعکس آپ کا ملک اس لئے غریب ہے کیونکہ وہ اپنے عوام کی تمام ضروریات کو ایک طرف، مقدم اور اہم ضروریات کو بھی پورا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے اور اسی لئے عوام ایک پست معیارِ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

الغرض ضروریات و خواہشات کی تسکین ہی خوشی، خرمی اور بلند معیارِ زندگی کا پیمانہ ہے۔ جو شخص جتنی ضروریات و خواہشات کی تسکین پر قدرت رکھتا ہے اس کو اسی قدر غریب، متوسط یا امیر کبیر کہا جاتا ہے۔ جب ملکی نظریے سے دیکھتے ہیں تو پھر اسی قدر غریب یا ترقی یافتہ ملک کہہ دیتے ہیں۔

ہماری تمام سرگرمیوں کے پس پشت چاہے وہ ہر طرح کے کارخانوں کے قیام کی شکل میں ہوں، یا زراعت کی تمام ترقی کی شکل میں چاہے وہ تعلیمی اداروں کے قیام کی شکل میں ہوں یا ریلوں کا جال، بجلی کے دیوہیکل کھمبے، فولادی بھٹیوں یا ٹرکوں کی شکل میں ہوں یا اسپتالوں اور سماجی خدمات کے اداروں کی شکل میں ہوں، یہی مقصد چھپا ہوتا ہے کہ عوام اپنی بڑھتی ہوئی خواہشات و ضروریات کو پورا کر کے رہیں اور ایک خوش و خرم زندگی گزارنے کے حامل قرار پائیں۔

اب ایک بنیادی سوال اٹھتا ہے کہ انسان اپنی ضروریات کی تسکین کیسے کر سکتا ہے۔ انسان اپنی جملہ خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وسائل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ایک جانور بھی اپنا پیٹ بھرنے کے لئے تمام عمر شکار کی تلاش میں نکلتا ہے۔ انسان تو ضروریات و خواہشات کا مجسمہ ہے۔ ایک کو پورا کرتا ہے تو دوسری کو ختم کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ اس کی آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔

لیکن انسان کے ساتھ ظلم یہ ہے کہ اس کی ضروریات و خواہشات جس تیزی سے بڑھتی ہیں اسی تیزی سے اس کو پورا کرنے کے ذرائع نہیں بڑھ پاتے۔ دنیا میں تمام ہنگامے، تمام گہما گہمی اور تمام زندگی کے آثار بس اسی مقصد کی وضاحت ہی تو کرتے ہیں کہ انسان کس طرح لاتعداد ضروریات و خواہشات کو محدود ذرائع سے پورا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اسی لاتعداد ضروریات اور محدود ذرائع کی جدوجہد سے ہی تو ایک انسان میں، ایک ملک میں اور پوری دنیا میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ آپ خود غور کیجئے کہ اگر انسان کے پاس ضروریات و خواہشات نہ ہوں تو پھر ساری دنیا کیسی ساکت و جامد نظر آئے۔ اسی طرح جس طرح دن بھر کام کرنے اور رات کو اپنی آخری خواہش اور کمائی کو پورا کر کے ایک انسان سکون سے سو جاتا ہے، اس وقت جو کوئی خواہش پوری کرنی نہیں ہوتی اس لئے رات میں کتنا سکوت نظر آتا ہے۔

ہر خواہش اور ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسکا ذریعہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ کھانے کی خواہش پوری کرنا ہے تو غذائی اشیاء پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ تعلیم کی خواہش پوری کرنی ہے تو حسبِ ہدایت اسکے ادارے قائم کرنا ہوں گے۔ گھر تعمیر کرنا ہوگا ہے تو اس سے متعلق تمام ساز و سامان حاصل کرنا ہوگا۔ اس طرح جو خواہش جنم لیتی ہے اسکی تسکین کے لئے مناسب ذریعہ تلاش کرنا ہوتا ہے، اسی کو مختصر میں ہم یوں کہہ دیتے ہیں جو انسان یا جو ملک جتنا پیدا کرتا ہے گویا وہ ضروریات کی تسکین کی ضمانت دیتا ہے۔ اگر کسی ملک کی پیداوار خواہ وہ کارخانوں کی پیداوار ہو یا زراعت کی، سماجی خدمات کی شکل میں ہو یا تمام سہولتوں کی شکل میں، اگر بڑھتی رہتی ہے تو وہ گویا اپنے عوام کی زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تسکین کا باعث ہوتا ہے یعنی ہر ممکن پیداوار اور ہر ممکن سہولت کی دستیابی زیادہ سے زیادہ ضروریات کی تسکین کا ذریعہ اور خوش حالی و بلند معیارِ زندگی کا پیمانہ ہے۔

میرا جو نصب العین ہے اس کا مقصد بس یہی ہے کہ ملک میں پیداوار اور سہولتیں اتنی بڑھ جائیں کہ یہاں کے عوام زیادہ سے زیادہ ضروریات کو پورا کرنے کے قابل بن جائیں۔ میری تمام سرگرمیاں جن کا میں نے ہلکا سا تذکرہ کیا اسی مقصد کے اندر گھوم رہی ہیں،

July 1991 (FIRST HALF) WAQIAT REGD. NO. D-
TELEPHONE :

جلسہ میں لوگوں کی کمی فیملی پلاننگ کی وجہ سے ہے۔

"... صاحب جب کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو ایک آدھ ہفتے کی چھٹی لے لیتے ہیں۔"

NEW DELHI
نئی دہلی

باغی اور غدار کون؟

بانگلادیش کی تحریکِ آزادی کو اب دو ماہ ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں وہاں فوج کے ہاتھوں جو قتلِ عام ہوا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ بعض مبصروں کے اندازے کے مطابق مرنے والوں کی تعداد دس لاکھ تک پہونچ گئی ہے اور بعض کے نزدیک اس سے بھی زیادہ ہے۔ تعداد جتنی بھی ہو یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ اپنی آزادی اور خود مختاری کے بارے میں بنگالیوں نے جو کچھ کہا تھا کر دکھایا اور فوج کے ہاتھوں عوام کا قتلِ عام ان کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکا۔

بنگالی عوام کے اس قتلِ عام پر پاکستان نے پہلے پردہ ڈالنے کی کوشش کی، اخباری نمائندوں کو ملک سے نکال باہر کیا اور خبروں پر سنسر لگا دیا، لیکن اب جبکہ دنیا پاکستانی فوجوں کے مظالم سے واقف ہو گئی ہے اور اسے معلوم ہو گیا ہے کہ نہتے بنگالی عوام کو کس طرح امریکی اور چینی ہتھیاروں کا نشانہ بنایا گیا، تو اس نے سارے الزامات بنگالیوں پر تھوپنا شروع کر دیے کہ انھوں نے پہلے غیر بنگالیوں کا قتلِ عام شروع کیا تھا اور اس کے جواب میں فوج کارروائی کرنے کے لئے مجبور ہو گئی تھی۔

پاکستانی فوجی حکمرانوں کا یہ عذر "عذرِ لنگ" سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اولاً اس لئے کہ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کا بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ بات چیت کے اختتام تک مشرقی بنگال میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کی خبر سامنے نہیں آئی اور ثانیاً اس لئے کہ کسی ایک برائی کو دوسری برائی کے لئے وجہِ جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر بالفرض کچھ بنگالی چند غیر بنگالیوں کے قتل کے ذمے دار بھی ہوں تو یہ کہاں کا انصاف ہے ان کی غیر دانشمندانہ حرکت کی وجہ سے دوسرے بے گناہ لوگوں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے اور اتنے بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا جائے کہ دنیائے انسانیت ہل اٹھے۔

بانگلادیش کے حریت پسندوں کی اگر مکتی فوج میدان میں آئی تو محض مجبوراً آئی ورنہ شیخ مجیب الرحمٰن اس تحریک کو عدم تشدد کی بنیاد پر شروع کرنا چاہتے تھے لیکن پاکستانی فوجوں کے بے جا زیادہ تشدد نے ... مرتا کیا نہیں کرتا کے اصول پر بنگالی عوام کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا اور وہی بنگالی جنھیں فوج کے لئے نا اہل سمجھا گیا تھا ہتھیار بند ہو کر سامنے آ گئے۔

انکی گوریلا جنگ کی تفصیلات روزانہ اخبارات میں آ رہی ہیں۔ گھات لگا کر پاکستانی فوج پر حملے کرنا۔ ریل کی پٹریوں کو اکھاڑنا اور ریلوں کو تباہ کرنا، حمل و نقل اور مواصلاتی نظام کو خراب کرنا اور اسی قسم کی دوسری رکاوٹیں کھڑی کرنا ان کا روزانہ کا معمول بن گیا ہے۔ بظاہر یہ اچھی باتیں نہیں ہیں کیونکہ یہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے ملک کی معیشت کو تباہ کرنا ہے، لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ملک کی معیشت تو اسی دن تباہ ہو گئی تھی جس دن صدر یحییٰ خاں کے حکم سے جنرل ٹکا خاں نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی تھی۔ اور عوام کے خلاف فوجی کارروائی شروع کی تھی۔

اس وقت مشرقی بنگال کے لوگ اپنی ہر چیز کو بھول گئے ہیں اور انھیں صرف اپنی آزادی اور خود مختاری کی بات یاد رہ گئی ہے۔ اپنی آزادی اور خود مختاری کے لئے انھوں نے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا تہیہ کر لیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ آزادی اور خود مختاری ہی انکی زندگی کی بنیاد ہے۔

ان کے اس عزم و ارادے نے انھیں دلیر بنا دیا ہے اور اپنے دیش کو آزاد کرانے کے لئے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے۔

پاکستان کے فوجی حکام ان حریت پسندوں کو غدار یا باغی اور تخریب کار کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہر حکمراں اپنے مخالفین کو اسی قسم کے ناموں سے پکارتا ہے لیکن اگر جمہوریت کے معنی ایسی حکومت کے ہیں جو عوام کے ذریعے منتخب ہوئی ہو اور وہ عوام سے حاصل کردہ اختیارات کے تحت عوام کے لئے کام کرے تو حقیقت میں ایسی حکومت وہ ہے جس نے شیخ مجیب الرحمٰن کو صدر مان کر چند روز قبل مجیب نگر کے آم کے ایک باغ میں حلف لیا تھا، اور غدار وہ ہیں جو اس حکومت کے وفادار نہیں ہیں اور جو اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر عوامی حکومت کے اختیارات کو غصب کئے ہوئے ہیں۔

دراصل عوام کی اکثریت کے منتخب کردہ نمائندوں کو اختیارات منتقل نہ کرنا اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانا ہی آئینی اور جمہوری حکومت سے بغاوت اور غداری کرنا ہے، اور روزِ روشن کی طرح واضح حقیقت سے کوئی خشیہ چشم ہی انکار کر سکتا ہے کہ انتخابات میں پاکستانی عوام کی اکثریت نے شیخ مجیب الرحمٰن اور انکی پارٹی کی عوامی لیگ کو پاکستان کی زمامِ حکومت سونپ دی اور آئینی طور پر انھیں پورے پاکستان کا سربراہ بنا دیا۔ ایسی حالت میں شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کو باغی، غدار اور شر پسند کہنا ڈھٹائی اور زیادتی کی نہایت گھناؤنی مثال ہے۔ یقیناً ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا گیا ہے کہ

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

ہندوستان میں اگر حریت پسندوں کی حکومت کے لئے ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ وہ عوامی حکومت ہے اور اسے پاکستانی عوام کی اکثریت کا پوری طرح اعتماد حاصل ہے۔ اسی لئے عمومی طور پر مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس حکومت کو تسلیم کیا جائے تاکہ بانگلادیش کی عوامی اور جمہوری حکومت کی کھل کر امداد کی جا سکے۔

وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کے حالیہ بیانات اس

باقی صفحہ ۳ پر

باقیات ذیل وصلی

...میں صرف خدا، اپنے عوام اور صرف اپنے سامنے جواب دہ ہوں۔ سادات

راجرس کا دورۂ مشرق وسطیٰ

امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس اپنی پوری پارٹی کے ساتھ آج کل مشرق وسطیٰ کے پانچ ملکوں کا دورہ کر کے واپس جا چکے۔ ان پانچ ملکوں میں متحدہ عرب جمہوریہ، سعودی عرب، اردن، اسرائیل اور لبنان شامل تھے۔ ہر جگہ ان کا شاندار استقبال ہوا اور شاہ اردن نے خود اپنی گاڑی چلا کر انھیں عمان کی سیر کرائی۔ صرف لبنان میں ان کے خلاف مظاہرہ ہوا لیکن یہ بہت معمولی مظاہرہ تھا۔ شاید اس لئے کہ حکومت کی طرف سے وارننگ دے دی گئی تھی کہ ہنگامہ برپا کرنے والوں کو موقع پر ہی گولی مار دی جائے گی۔

اس کے علاوہ بیروت میں صورت حال ایسی دوستانہ تھی کہ مسٹر راجرس لبنانیوں کے ہجوم میں بالکل گھل مل گئے اور انھوں نے ایک جگہ بیٹھے ہوئے نوجوان سے اپنے جوتے پر پالش کرائی۔

متحدہ عرب جمہوریہ کے ساتھ امریکہ کے سفارتی تعلقات نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں کی فضا بڑی دوستانہ تھی۔ راجرس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔

اپنے اس دورے کے بعد مسٹر راجرس نے خود محسوس کر لیا کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور دوسرے عرب ممالک تنازعہ کو طے کرنے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں اور ان کا رویہ واضح اور لچکدار ہے جبکہ اسرائیل کا رویہ بہت سخت ہے۔ انھوں نے اسرائیل کی امور خارجہ سے متعلق کمیٹی کی طرف سے دیئے ہوئے ایک لنچ میں صاف کہہ دیا کہ اسرائیلی کابینہ کی پالیسی "بے لوچ" ہے۔ یہی نہیں بلکہ وضاحت کی کہ "مصریوں نے اپنی پالیسی بالکل واضح کر دی ہے جبکہ اسرائیلی حکومت کی پالیسی غیر واضح ہے۔"

انھوں نے اسرائیلیوں کو خبردار کیا کہ وہ "محفوظ و تسلیم شدہ" سرحدوں کی جو رٹ لگا رہے ہیں۔ وہ دوسروں کیلئے "غیر محفوظ" ہو سکتی ہیں۔ اس لئے انھیں چاہیئے کہ وہ اپنی پالیسی میں لچک پیدا کریں تاکہ سمجھوتہ کی کوششوں میں پیش رفت ہو سکے۔ انھوں نے اسرائیلیوں کی یہ بات تسلیم کی کہ "امن کے لئے رضامند ہونے میں خطرات ہیں" لیکن ساتھ ہی انتباہ کیا کہ "رضامند نہ ہونے کی صورت میں اس سے بھی زیادہ خطرات موجود ہیں۔"

راجرس کے اس دورہ کا مقصد اگرچہ عمومی طور سے سمجھوتہ کے لئے مناسب فضا پیدا کرنا تھا لیکن خاص طور

انور سادات

آہنی انسان

ناصر کی وفات کے بعد ۵۳ سالہ انور سادات نے ابھی عہدۂ صدارت سنبھالا ہی تھا کہ ولیم راجرس (وزیر خارجہ امریکہ) نے مشرق وسطیٰ کے ایک ماہر سے دریافت کیا "یہ عجیب شکل و شباہت کا کس قسم کا شخص ہے؟" دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا جواب انہیں اس وقت ملا جب خود انہوں نے مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا۔ مصری عوام بھی اس کی شخصیت سے زیادہ متاثر نہ تھے۔ طبقۂ امراء میں تو ان کے گہرے رنگ کا کبھی کبھی مذاق بھی اڑایا گیا (ان کی والدہ سوڈانی ہیں) لیکن ان کا رنگ کیسا ہی ہو انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ بڑے آہنی انسان ہیں۔ انہوں نے مصریوں ہی سے نہیں ساری دنیا سے اپنی شخصیت کا لوہا منوا لیا۔

وہ بڑے صابر و شاکر اور خدا پرست ہیں۔ بڑے نمازی ہیں جس کی شہادت ان کی پیشانی کے گٹے سے ملتی ہے۔ ایک زمانہ میں انہیں اسلامک کانگریس کا سکریٹری جنرل بھی بنایا گیا تھا۔

ان کی بڑی خوشگوار گھریلو زندگی ہے۔ انکی پہلی بیوی ڈیلٹا والے گاؤں ہی میں رہتی ہے جس سے بیس سال سے اوپر کی تین لڑکیاں ہیں اور سب شادی شدہ ہیں۔ انکی دوسری اینگلو مصری بیوی جہاں آرا تین لڑکیوں اور ایک لڑکے (جمال) کی ماں ہیں، وہ ان ہی کے ساتھ قاہرہ میں رہتی ہیں۔

سادات — نماز پڑھتے ہوئے

مشرقی کنارے پر مصر کے قبضہ کے بعد ہی نہر سویز کھولی جاسکتی ہے

سے شرم الشیخ اور نہر سویز کی واگذاری کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ شرم الشیخ بحر احمر کی کلیدی چوکی ہے اس اہم مقام پر اسرائیل اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ خلیج عقبہ پر اس کا کنٹرول رہ سکے جبکہ متحدہ عرب جمہوریہ اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اسی طرح نہر سویز کا معاملہ ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ نہر سویز کے مشرقی کنارے کا دعویدار رہے۔ اور اپنے اس مطالبہ پر قائم ہے کہ اسرائیلیوں کے پیچھے ہٹنے اور مشرقی کنارے پر مصر کی حفاظتی فوجوں کے پہنچ جانے کے بعد ہی نہر کو کھولا جاسکتا ہے۔ اسکے علاوہ اسے کھولنے کی کوئی اور شکل نہیں لیکن اسرائیل کا مطالبہ ہے کہ اسرائیلیوں کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد بھی مصری فوجیں مشرقی کنارے پر نہیں آسکتیں۔ وہ امریکہ سے اس بات کا صریح وعدہ لینا چاہتا ہے کہ اگر مصریوں نے نہر سویز سے متعلق سمجھوتہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی فوجیں اور مزائل مشرقی کنارے پر پہنچا دے تو امریکہ اس کی مدد کرے گا۔

مسٹر راجرس نے اسرائیلی لیڈروں سے باتیں کیں اور آخر میں ایسا ظاہر ہوا ہے کہ اسرائیلی اس بات کے لئے رضامند ہیں کہ مصر اپنے ایک معمولی پولیس فورس کو نہر پار تعینات کردے۔ اس کے ساتھ انھوں نے ایک بین الاقوامی فورس سے متعلق سمجھوتہ کے لئے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ فوج اس علاقہ میں امن قائم رکھنے کیلئے تعینات کی جائے گی۔ مسٹر راجرس کا اسرائیلیوں کے اس طرز عمل سے اتنا حوصلہ بڑھا کہ انھوں نے اپنے نائب مسٹر جوزیف سسکو کو دوبارہ قاہرہ بھیجا تاکہ اسرائیلی تجاویز سے انور سادات کو باخبر کیا جاسکے۔

مشرقی وسطیٰ کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اگرچہ ابھی بہت سے مسائل سامنے آئیں گے اور بہت سی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا۔ لیکن ڈپلومیٹک دنیا میں فریقین کی پالیسیوں میں معمولی تبدیلی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس لحاظ سے مسٹر راجرس کہہ سکتے ہیں کہ ان کا دورہ کامیاب رہا لیکن شاید مسٹر راجرس کو مشرق وسطیٰ کا دورہ کرنے اور اسرائیلی لیڈروں سے خود آکر بات چیت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کی ایک معمولی سی وارننگ بھی اسرائیلیوں کے نخرے ڈھیلے کرسکتی ہے اس لئے کہ یہ امریکہ ہی ہے جس کے بل بوتے اسرائیل کود رہا ہے اور اپنی پالیسی بدلنے میں اسے پس وپیش ہے۔ امریکہ اگر آج اسرائیل کی امداد بند کردے تو دوسرے ہی دن اسرائیل کو عالمی رائے عامہ کے ٹھکرانے کی جرأت نہ ہوگی۔

متحدہ عرب جمہوریہ میں "انقلاب"

ایک طرف مسٹر راجرس مشرق وسطیٰ کا دورہ کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف متحدہ عرب جمہوریہ میں سنسنی خیز اقدامات کئے جارہے تھے۔ مسٹر راجرس کی آمد سے صرف دو روز قبل مسٹر علی صبری نائب صدر کو ان کے عہدہ سے

کی عمر ۴۴ برس ہے۔

سادات بڑے اعتدال پسند سمجھے جاتے تھے لیکن اپنے آٹھ وزیروں کو جس طرح انہوں نے سبکدوش کیا اس سے ان کے آہنی ارادوں کا اظہار ہوتا ہے۔ جس دن انہوں نے یہ اقدام کیا، ان کی بیوی کی سالگرہ اور ان کی بیٹی کی شادی کی سالگرہ کی تقریب تھی جسے انہوں نے ملتوی کردیا۔ شاید وہ قبل از وقت اقدام کرنے کے لئے مجبور ہوگئے تھے۔

دراصل خود ان کی صدارت خطرہ میں تھی۔ دو ہفتہ قبل وزیر داخلہ نے ایسا جال پھیلایا تھا کہ سادات ریڈیو پر تقریر نہ کرسکیں۔ وہ ریڈیو اسٹیشن گئے جہاں سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس میں تعینات تھے۔ سادات نے تقریر کا پروگرام منسوخ کرکے مخالفین کی اسکیم فیل کردی۔ اور اس کے بعد ایسا بھرپور وار کیا کہ ان کے تمام نکتہ چیں رو دیئے۔ انہوں نے اپنی حیثیت کو منوالیا۔

ناصر کے بعد بلاشبہ متحدہ عرب جمہوریہ کو ایک بہت بڑے سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن اس بحران کے نتیجہ میں سادات کی جو مضبوط و با اثر شخصیت ابھری ہے اس سے یقین ہے خود مملکت کو استحکام ملے گا۔ اور اسرائیل کی یہ خوشی محض عارضی ثابت ہوگی کہ مصر کے داخلی انتشار سے عربوں کا محاذ کمزور ہوگیا ہے۔

اپنے خاندان کے ساتھ

کر تحقیر کی جو کا ہر وہ کی ایک فوری اسی میں واقع ہے نظر بند کیا گیا۔ اور جب راجرس کا دورہ ختم ہو گیا تو مسٹر صبری کے دو درجن متعدد ساتھیوں کو نہ صرف یہ کہ ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا گیا بلکہ انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان میں وزیر داخلہ مسٹر شعراوی جمعہ، قومی اسمبلی کے اسپیکر مسٹر لبیب شقیر اور دوسرے وزراء اور اعلیٰ فوجی افسران شامل ہیں۔ مسٹر علی صبری کے متعلق مشہور تھا کہ وہ روس نواز ہیں اور امریکہ سے بات چیت کرنے تک کے روادار نہیں جبکہ مسٹر سادات میں ایک طرح کی لچک پائی جاتی ہے اور مشرق وسطیٰ کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے امریکی مخالفت کم کرنے کے حق میں ہیں۔ اسی لئے پہلے دن جب مسٹر صبری اپنے عہدہ سے الگ کئے گئے تو یہ محسوس کیا گیا کہ مسٹر راجرس کے دورے کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہے۔ تاکہ بات چیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ لیکن بعد کو خود مسٹر سادات کے بیان سے ظاہر ہوا کہ ایسا نہیں تھا بلکہ انور سادات کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی منظم سازش کی گئی تھی جس کے سربراہ مسٹر علی صبری تھے۔

دراصل مسٹر صبری کے دل میں مسٹر سادات کیلئے اس وقت سے مخالفانہ جذبات موجود تھے جب ناصر کے بعد ان کو صدارت کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ ناصر کے زمانہ میں دونوں نائب صدر تھے اور دونوں ہی صدارت کے لئے امیدوار تھے۔ انور سادات کامیاب ہو گئے اور صبری ناکام ہو گئے۔ اور اس کے بعد کوئی ایسا موقع نہ ملا کہ جو مخالفانہ جذبات ان کے دل میں تھے انھیں وہ ظاہر کر سکیں۔ مصر، لیبیا، اور سوڈان کے مجوزہ فیڈریشن کے قیام سے متعلق بات چیت کے دوران انھیں یہ موقع مل گیا اور عرب سوشلسٹ یونین کی ۱۵ ممبروں پر مشتمل سینٹرل کمیٹی کے بھرے جلسے میں انھوں نے اپنے صدر کی مخالفت کر ڈالی۔ وہ انور سادات سے پوچھنے لگے کہ "اس فیڈریشن کے لئے رضامند ہونے کے لئے آپ کو کس نے اختیار دیا تھا" جلسہ کی کارروائی کی تفصیلات سامنے نہیں آئیں لیکن ایسا معلوم ہوا کہ جلسہ میں کافی [illegible] ہوئی اور سادات محفل کا رنگ دیکھ کر خاموش ہو گئے لیکن جب پانچ دن بعد حلوان شہر میں یوم مئی کی ایک تقریب میں تقریر کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے مسٹر علی صبری کو نظر انداز کر دیا۔ جو جلسہ میں دوسرے ممتاز اشخاص کے ساتھ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ سادات نے نہایت غصہ میں جیسے کہ انکی پیلی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہوں، حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا "میں صرف خدا، اپنے عوام اور خود اپنے سامنے جوابدہ ہوں"۔ یہ گویا مسٹر علی صبری کے ان سوالات کا جواب تھا جو انھوں نے عرب سوشلسٹ یونین کے جلسہ میں اٹھائے تھے۔ دوسرے ہی دن انھوں نے مسٹر علی صبری کو ان کے عہدہ سے سبکدوش کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ مسٹر صبری عرب فیڈریشن کے اس لئے خلاف تھے کہ اس قسم کا تجربہ اس سے قبل جب شام و مصر کا الحاق عمل میں آیا تھا ناکام ہو چکا ہے علاوہ ازیں فیڈریشن میں لیبیا کی شمولیت انھیں اس لئے بھی ناپسند تھی کہ وہاں کے سربراہ معمر القذافی ایک قدامت پسند مسلمان ہیں جو کمیونزم سے نفرت کرتے ہیں۔ اختلاف کی یہ وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ صدر ناصر کے جانشین بنتے بنتے رہ گئے۔ انھیں اقتدار کی ہوس نے مارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاریوں اور ان کے جیل میں پہونچا دیئے جانے کے باوجود متحدہ عرب جمہوریہ میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس صدر انور سادات کے حق میں مظاہرے کئے گئے اور مظاہروں پر پابندی نہ لگائی جاتی تو شاید ابھی ان کا سلسلہ جاری رہتا۔ عوام کسی ایسی شخصیت کو خواہ وہ کتنی ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو پسند نہیں کرتے جو اقتدار کی بھوکی ہو۔ علی صبری نے اپنے عمل سے ظاہر کر دیا کہ وہ اقتدار کے بھوکے ہیں اسی لئے انھوں نے اپنے آپ کو عوام کی ہمدردیوں سے محروم کر لیا لیکن انور سادات نے یہ اعلان کر کے کہ وہ آئندہ عہدۂ صدارت کے لئے کھڑے نہیں ہوں گے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اقتدار کے بھوکے نہیں ہیں۔ اور ان کا یہی ایثار ان کی ہر دلعزیزی میں اور زیادہ اضافہ کا باعث ہوا ہے۔

دیکھنا ہے کہ داخلی انتشار کے باوجود وہ مشرق وسطیٰ سے متعلق بات چیت کے اس سلسلہ کو کس طرح آگے بڑھاتے ہیں جو مسٹر راجرس کے دورۂ مشرق وسطیٰ سے شروع ہوا۔

واقعات مشہور علی

بحرین نے سعودی عرب اور کویت کی تجاویز منظور کرلیں

نہ ہوتا۔ لیکن تیل نے جو سیال سونے کے نام سے مشہور ہے علاقے کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

موجودہ پروگرام کے مطابق برطانیہ ۱۹۷۱ء کے اختتام تک اپنی بری افواج اور اپنے بحری و فضائی بیڑوں کو اس علاقے سے ہٹالے گا جس کی وجہ سے ایک طاقتی خلا پیدا ہوجائے گا جسے پر کرنے کے لئے فی الحال کوئی طاقت وہاں نظر نہیں آتی۔ صرف امریکی جہازوں پر مشتمل ایک بیڑہ بحرین میں نظر آتا ہے اور یہی جہاز بھی خلیج فارس کا چکر لگاتے اور بصرہ (عراق) کی بندرگاہ پر آتے جاتے رہتے ہیں۔

سب سے بڑی امارت بحرین کی ہے جس کی آبادی ۲ لاکھ اور رقبہ ۲۱۳ مربع میل ہے، یہی ریاست برطانوی فوجوں کا مرکز ہے اور یہیں امریکا کے چھوٹے چھوٹے بحری بیڑے کا صدر مقام ہے۔ تیل صاف کرنے کا کارخانہ جو دنیا کے بڑے کارخانوں میں سے ایک ہے، اسی بحرین میں واقع ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں تعینات امریکی فوجوں کی ضرورتیں اسی کارخانے سے پوری کی جاتی ہیں۔ کچھ جنوب کی جانب قطار کی امارت ہے جہاں روزانہ تین لاکھ ستر ہزار بیرل تیل نکلتا ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے۔

ابوظبی کی امارت جس کی آبادی صرف ۶۰ ہزار ہے دنیا کی مالدار ریاستوں میں سے ایک ہے۔ اس میں روزانہ دو لاکھ بیرل تیل برآمد ہوتا ہے جس سے سالانہ ۱۵۰ کروڑ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔

دوبئی اپنی تجارت کے لئے مشہور ہے اور سونے کی اسمگلنگ کا بھی مرکز ہے۔ اس کی آبادی ۶۰ ہزار ہے لیکن یہاں کے اصل باشندے ۲۰ ہزار ہیں، باقی باہر کے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ یہاں تقریباً ایک لاکھ بیرل روزانہ تیل نکلتا ہے اور ابھی اس میں اور اضافے کا امکان ہے۔

دوسری امارتیں اور ان کی آبادی اس طرح ہے:-
شارجہ - ۳۲ ہزار - ۲- عجمان - ۴۲۰۰ - ۳- ام القوین ۳۷۰۰ - ۴- راس الخیمہ - ۲۴ ہزار - ۵- فجیرہ - ۹ ہزار۔
ایک شخص یہ دیکھ کر حیران ہوگا کہ

آخر الذکر کی امارت جس کا رقبہ ۴۵۰ مربع میل ہے اپنی ۹ ہزار کی آبادی کے ساتھ کس طرح اکیلی رہ سکتی ہے مگر ایسے واقعات مشہور ہیں

باوجود فجیرہ کے سلطان چاہتے ہیں کہ وہ خود مختار رہیں۔ ایسے ہی جذبات دوبئی کے شیخ کے ہیں اور شیخ رشید چاہتے ہیں کہ تجارتی لحاظ سے ان کی امارت کو جو بہت اہمیت حاصل ہے وہ باقی رہے۔ ایک سال سے پورٹ رشید میں جہاز آتے جاتے ہیں اور وہاں مال لادنے اور چڑھانے کی سہولتیں حاصل ہیں۔

دوبئی شہر میں ۴ غیر ملکی بینک ہیں اور بڑے بڑے کاروباری اداروں کے نمائندے رہتے ہیں۔ لیکن ابوظبی میں زیادہ بڑی بندرگاہ تعمیر ہورہی ہے اور ایک ہوائی میدان بھی بنایا جارہا ہے سڑک کی تعمیر کے بعد دوبئی سے صرف ۹۰ منٹ میں ابوظبی پہونچا جاسکے گا۔

دوبئی کے دوسری جانب صرف ۱۲ میل دور شارجہ کی امارت بھی اسی طرح ترقی کر رہی ہے۔ ان امارتوں کے شیخوں میں باہمی رقابتیں موجود ہیں جو انکی یونین کے قیام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ دوبئی کے ایک باشندے نے کہا کہ:

" باہر کے ایک شخص کو یہ رقابتیں بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوں گی لیکن انکے اختلافات کی جڑیں صدیوں پرانی ہیں اور ان کا تانا بانا ان کے قبائلی اختلافات سے جاکر ملتا ہے "۔

۱۸۲۰ء سے قبل جب کہ برطانیہ نے اس علاقے کو اپنی نگرانی میں لیا خلیج فارس کا یہ ساحلی علاقہ بحری قزاقوں کے لئے جنت تھا، ان کے تعمیر کردہ پرانے قلعوں کی بنیادیں جو ابھی تک نظر آتی ہیں اس زمانے کو یاد دلاتی ہیں۔

اس علاقے میں ۱۶ ویں صدی عیسوی میں پرتگالی تاجر بڑے سرگرم تھے اور تجارتی تحفظ کے لئے کئی قلعے تعمیر کئے گئے تھے اس سے قبل زیریں خلیج فارس کے بارے میں بہت کم معلوم تھا۔ اسی سال کے آخر میں راس الخیمہ میں کھدائی کی تیس انچ لمبی اور ۱۸ انچ چوڑی ایک تختی برآمد ہوئی جو شاید کسی قبر کا کتبہ ہے، اس سے اس علاقے کی پرانی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۸۲۰ء میں برطانیہ نے راس الخیمہ میں بحری ڈاکوؤں کے بیڑے کو جلا ڈالا اور ساحلی علاقوں میں قبائلی لیڈروں کے ساتھ معاہدے کئے۔ ان ہی کی وجہ سے ٹروشیل کوسٹ (معاہدہ پابند ساحل) کی اصطلاح اختراع کی گئی۔

تیل کی دریافت سے قبل تک یہ علاقہ بہت پسماندہ رہا اس سے قبل متعدد امارتوں کے شیخ اس بات پر لڑتے تھے کہ اس کے علاقے سے ریت اٹھاکر سرحدی تبدیلیاں کیوں کی گئیں یا کسی نخلستان پر قبضہ کیوں کیا گیا۔ بلکہ کئی معدنی حقوق پر دست و گریباں رہے ہیں۔

[illegible] سے پہلے [illegible] تحصیل
[illegible] کی سماجی حالت بہت
[illegible] اور ضابطے ابھی تک
[illegible] ہے اب بھی شاید عام [illegible]
[illegible] قبول کرنا لڑکی [illegible] نہ پائی گئی
[illegible] ملتے ہیں۔

شیخ رشید کے چند ایمپوراٹرز میں سے طاہر نے بتایا کہ خلیج
پرس نے بہت کم عرصے میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی
ہے انہوں نے بتایا کہ پانچ برس قبل آپ کسی شخص سے اس کی
حکومت کے بارے میں معیانت نہ کر سکتے تھے لیکن آج
شیخ رشید کی حکومت نے ہسپتال کے ایک حصے کو خود ساز سامان
لگا [illegible] ہے۔

[illegible] طاہر [illegible] جن کی بھاری ابروؤں کے
بالوں کا سلسلہ [illegible] پھیلا ہوا ہے اپنی آرام کرسی پر
ٹیک لگا کر بولے:۔

"میں سمجھتا ہوں ان اختلافات کے باوجود جو آپ دیکھ رہے
ہیں فیڈریشن کا قیام اب یقینی ہے۔"

"ذرا دیکھئے مشترکہ یورپین مارکیٹ میں شامل ہونے
کے لئے برطانیہ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ بولے
"ہماری مشکلات تو پھر بھی بہت کم ہیں۔"

لیکن دوسرے کچھ لوگ ہیں جو فیڈریشن کے بارے میں
اتنے زیادہ پر امید نظر نہیں آتے۔ بعض مشاہدین یہ سمجھتے ہیں کہ
شیخوں کے درمیان رقابتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا ختم ہونا
ممکن نہیں ہے اس کے برعکس یہ ممکن ہے کہ جو چند بڑی ریاستیں
ہیں وہ چھوٹی ریاستوں کو ہضم کر لیں۔

زیر تحفظ ریاستوں اور امارتوں کے درمیان اختلافات
کی پیچیدگی میں سعودی عرب اور ایران کے علاقائی مطالبات
سے اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایران جس کی فوجوں کی
تعداد ایک لاکھ [illegible] ہزار ہے خلیج فارس کے علاقے میں سب
سے زیادہ طاقتور ملک ہے اس لئے برطانیہ کی واپسی کے بعد
وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے مطالبات پر قائم رہ سکتا ہے تاہم
یہ بات اطمینان کی ہے کہ ایران خاموشی کے ساتھ چھوٹی امارتوں
سے اپنے تعلقات بڑھا رہا ہے۔

پچھلے سال گزشتہ شاہ ایران کے اس اعلان پر اطمینان
کا اظہار کیا گیا تھا کہ اقوام متحدہ کے اس فیصلے کے بعد کہ بحرین
اپنا نظام حکومت خود چلانا چاہتا ہے ایران اس علاقے پر سے
اپنے حق سے دست بردار ہو گیا ہے۔

دوبئی کے ایک ممتاز شخص نے کہا۔ ہمارے ایک جانب
ایرانی ہیں اور دوسری جانب عرب ہیں۔ اور اس سبب سے
ہم محسوس کرتے ہیں کہ برطانیہ کی واپسی کے بعد ہم محفوظ رہیں گے
کیونکہ عربوں کی طرف سے ہمارے اوپر قبضہ کرنے کی کوئی بھی کوشش
ایرانیوں کو مداخلت کرنے کی دعوت دینے کے مترادف ہوگی۔

واقعات فیچر [illegible]

اب تو پاٹھی جی ۱۳ اور نئے وزیروں کا اضافہ کریں گے کیونکہ گیانی جی نے انکو بتایا ہے کہ ان کا لکی نمبر ۵۱ ہے۔

مسائل

کانگریس
عوامی تحریک

لوک سبھا کے انتخابات کے موقع پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نئی کانگریس کوئی الگ تھلگ جماعت نہیں بلکہ ایک عوامی تحریک بن چکی ہے۔ اس الیکشن میں نئی کانگریس کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور مخالف جماعتوں کی بڑی بڑی توپیں لڑھک گئیں یہاں تک کہ ان ریاستوں تک میں کانگریس کو کامیابی حاصل ہوئی جو سنڈی کیٹ کانگریس کا گڑھ سمجھی جاتی تھیں۔ دلی میں نئی کانگریس نے جن سنگھ سے تمام ساتوں سیٹیں چھین لیں۔ ملک کے مطلع سیاست پر بس نئی کانگریس ہی کا نام چھایا ہوا تھا۔

لیکن دلی کارپوریشن کے انتخابات میں کانگریس کا جو حال ہوا اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔ جن سنگھ نے نہ صرف یہ کہ اقتدار کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا بلکہ اس مرتبہ دو اور زیادہ سیٹیں حاصل کرلیں۔

اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں، مثلاً کانگریسی لیڈروں کے باہمی اختلافات اور باصلاحیت اور معتمد نمائندوں کا کھڑا نہ کیا جانا۔ لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریسی کارکن بے پروا ہو کر بیٹھ گئے، انہیں غلط فہمی تھی کہ کانگریس کے حق میں جو ہوا چلی تھی وہ بدستور موجود ہے۔ اس لئے عوام کو کانگریس کے پروگرام سے زیادہ واقف کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے برعکس جن سنگھ نے بہت بڑے پیمانے پر انتخابی مہم چلائی اور اس نے کانگریس کی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ عوام ان کے گمراہ کن پروپیگنڈہ میں آ گئے اور کانگریس اقلیت میں رہ گئی۔

دلی جیسا کہ سب جانتے ہیں، ہندوستان کا دل ہے اس لئے یہاں کے حالات سے پورا ملک متاثر ہوگا۔ کارپوریشن کے انتخابات کے نتائج سے بھی پورے ملک میں کانگریس

واقعات منہ بولی

کے وقار کو دھچکا لگا۔ لیکن اچھا یہ ہے کہ بروقت اقدام کیا جائے اور تمام کانگریسی کارکن جماعتی مقصد کیلئے کام کریں۔

کانگریس کے نئے جنرل سیکریٹری کے الفاظ میں کانگریس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسے عوامی تحریک میں تبدیل کردیا جائے اور وہ اسی حیثیت سے زندہ رہے اور ترقی کرے۔

ظاہر ہے کانگریس عوامی تحریک کے طور پر صرف اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب ایک طرف کے اس بے لوث کارکن سامنے آئیں، اور دوسری طرف برسر اقتدار ہونے کی صورت میں کانگریس اپنے ان تمام وعدوں کو پورا کرے جو اس نے اپنے منشور میں عوام سے کئے تھے۔ اب وہ دن گئے جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ عوام کی یادداشت بہت کم ہوتی ہے اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کس جماعت نے کیا کہا تھا۔ اب ووٹر لوگ ان لوگوں سے زیادہ ہوشیار ہیں جو اپنے آپ کو کارکن یا لیڈر کہتے ہیں۔ جوں جوں تعلیم کا دائرہ وسیع ہوا ہے عوام میں سیاسی بیداری آگئی ہے۔ اور وہ اپنے ووٹ کی اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں، اور آئندہ جوں جوں تعلیم کا دائرہ وسیع ہوگا ووٹروں کو اپنی اہمیت کا اور زیادہ اندازہ ہوتا جائے گا پس اگر کانگریس چاہتی ہے کہ ایک عوامی تحریک کے طور پر زندہ رہے اور اسی لحاظ سے ملک کی سیاست پر چھائی رہے تو اسے عوام کے جذبات کا اور ان سے کئے گئے وعدوں کا لحاظ رکھنا ہوگا اور اگر وہ اپنے فرائض کو بھول گئی تو عوام بھی اسے بھول جائیں گے۔ ●●

گجرات
سنڈیکیٹ کے دم خم

گجرات سنڈیکیٹ کانگریس کا قلعہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب یہ قلعہ بھی مسمار ہوگیا۔ خود ... مسٹر ہتیندر ڈیسائی نے اقتدار

ہتیندر ڈیسائی

اپنے ہاتھوں میں رکھنے کیلئے جتن کئے اور ممبروں کو مختلف کمیٹیوں کے چیرمین بنانے کے لالچ دیئے لیکن ان کی نہ چلنی تھی نہ چلی اور رفتہ رفتہ اتنے ممبران کی پارٹی سے کٹ گئے کہ ان کے لئے برسر اقتدار رہنا ممکن نہ رہا۔ پارٹی کے چھ ممبروں کے الگ ہوجانے کے بعد ان کی پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۶۸ رہ گئی جبکہ مخالف ممبروں کی مشترکہ طاقت ۸۱ تک پہونچ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء کے انتخاب کے بعد مسٹر ڈیسائی کی وزارت کو ہمیشہ خطرہ بنا رہا اور اگر وہ کسی طرح اپنی اکثریت بنائے رہے تو محض سیاسی چالبازیوں اور ممبروں کو لالچ دیکر۔ لیکن کاغذ کی ناؤ آخر کب تک چلتی، وہ وقت آ ہی پہونچا جب گورنر مسٹر شری من نراین نے مرکز کو لکھ بھیجا کہ:۔

"گجرات میں اب صدر راج قائم کر دیا جائے کیونکہ ڈیسائی وزارت کے دن اب ختم ہوگئے۔"

مسٹر ہتیندر ڈیسائی کو دراصل اسی وقت الگ ہوجانا چاہئے تھا جب احمد آباد میں اور ست... دوسرے علاقوں میں ... کا قتل عام ہوا تھا۔ ... کا حق تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ وزارت اعلیٰ کی گدی سے الگ ہونے سے انکار کردیا اور اگر کسی وقت وہ تیار ہوئے تو ان کی پشت پناہی کے لئے دوسرے ... (مرارجی بھائی) ... احمد آباد پہونچ کر ڈیرہ ڈال لیا۔ لیکن آخر یہ کہاں تک ممکن تھا، ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ مسٹر ہتیندر ڈیسائی خود ہی الگ ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔

ریاست میں اب کے وہاں صدارتی راج قائم ہوگا اور اسکے بعد دوسرے نئے انتخابات عمل میں آئیں گے کوئی پارٹی بھی برسر اقتدار آئے لیکن یہ یقینی ہے کہ سنڈی کیٹ برسر اقتدار نہیں آئے گی۔

بہت ممکن ہے کہ جب تک انتخابات عمل میں آئیں سنڈی کیٹ کا کوئی وجود ہی نہ ہو اسلئے کہ بمبئی میں صدارتی سوال پر مسٹر نجلنگپا جی نے جو ڈراما کھیلا ہے اس سے لیڈر بڑے ناراض ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ صادق علی کو گنتی پر شمار کیا گیا اور الزام سہاگ سنگھ کی پشت میں چھرا گھونپا گیا ہے۔

وزیر اعلیٰ کی طرف سے فوری اقدام کے نتیجے میں ہنگامہ زیادہ نہیں بڑھا لیکن اس سے یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں تک امن و انتظام کا تعلق ہے اس وقت پورے ملک کو ایک بڑے چیلنج کا سامنا ہے اور سنجیدہ عناصر سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ امن و امان قائم رکھنے میں تمام امن پسندوں کے ساتھ تعاون کریں گے۔ وزیر اعظم اور تمام دوسرے سرکردہ سیاسی لیڈروں نے بروقت انتباہ کیا ہے اور کہا ہے کہ اس موقع پر صرف پاکستانی ایجنٹ ہی بدامنی پیدا کر سکتے ہیں۔ بدامنی سے پاکستان کے ہاتھ مضبوط ہوں گے اور جو قتل و غارتگری پاکستانی فوجوں کے ہاتھوں ہو رہی ہے اسکے لئے وجہ جواز پیدا ہوگی۔

آسام

بنگال کی طرح آسام میں بھی مشرقی بنگال سے اجڑے ہوئے لوگوں نے پناہ لے لی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بدقسمتی سے دریائے برہم پتر کی وادی کے متعدد شہروں میں ہنگامے اور تشدد کے واقعات ہوئے ہیں اور ان پر قابو پانے کیلئے گوہاٹی تیزپور اور نوگاؤں وغیرہ شہروں میں اضافی پولیس روانہ کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لمڈنگ جنکشن پر نیم فوجی قسم کے والنٹیروں اور آسام کے آرٹسٹوں کی ایک کلچرل جماعت کے درمیان تصادم ہو گیا۔ آرٹسٹوں کا گروپ "آسوم ساہتیا سبھا" کے جلسے میں شرکت کے بعد واپس آ رہے تھے۔ شبہہ ہے کہ جن نوجوانوں نے یہ ہنگامہ برپا کیا وہ اسی مقصد کے لئے متعین کئے گئے تھے۔

راجستھان

گٹھ جوڑ نے مارا

لوک سبھا کے الیکشن کے موقع پر رجعت پسند فرقہ پرست جماعتوں کا جو "عظیم اتحاد" عمل میں آیا تھا اب اس کا کوئی وجود باقی نہیں ہے۔ سوتنتر پارٹی اس "عظیم اتحاد" کے ڈرامے کی سب سے بڑی ایکٹر تھی وہی اب اس سے الگ ہو گئی ہے اور اس نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ جنوری کے الیکشن میں وہ کسی کے ساتھ گٹھ جوڑ نہیں کرے گی۔

سوتنتر لیڈر راج ماتا گائتری دیوی اس بات سے سخت ناراض ہیں کہ "عظیم اتحاد" میں شامل پارٹیوں نے سوتنتر پارٹی کی قیمت پر اپنی پوزیشن مضبوط کی ہے۔ انھوں نے جن سنگھ کو خاص طور سے اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بنایا جس نے لوک سبھا کے الیکشن کے دوران راجستھان سے اپنی پوزیشن کو بہتر بنا لیا۔ ایس۔ ایس۔ پی بالکل ختم، اور کانگریس کی پوزیشن مضبوط ہو گئی۔ سوتنتر پارٹی کے سات ممبر تھے اس مرتبہ صرف تین رہ گئے، جبکہ جن سنگھ نے اپنی طاقت کو تین گنا کر لیا یعنی دو سے بڑھ کر اس مرتبہ اس کی تعداد پانچ تک پہونچ گئی۔

راج ماتا کا خیال ہے کہ اگر سابق حکمران جن کا تعلق سوتنتر پارٹی سے ہے جن سنگھ کی پشت پناہی نہ کرتے تو وہ ایک سیٹ بھی نہ لے سکتا تھا اس کے برعکس سوتنتر پارٹی کی بڑی بڑی توپیں لڑھک گئیں۔ حد یہ ہے کہ مہاراجہ بھرت پور جنکا کہنا ہے کہ اپنی سابق ریاست میں بڑا اثر ہے اور جنہوں نے پچھلے الیکشن میں مسٹر راج بہادر کو ہرایا تھا اس بار کامیاب نہ ہو سکے۔

سوتنتریوں کو گٹھ جوڑ نے مارا جو ایک "بے جوڑ میل" تھا اس کے ٹوٹنے سے حکمران کانگریس کے حلقے بہت خوش ہیں کیونکہ راجستھان میں آئندہ الیکشن میں اور بھی زیادہ مضبوط جماعت کی حیثیت سے سامنے آئے گی۔

مدھیہ پردیش

باسی کڑھی میں اُبال

سابق وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش مسٹر ڈی۔ پی مصرا کے گروپ کی باسی کڑھی میں یہ ابال آیا ہے کہ انہوں نے ایس۔ سی شکلا وزیر اعلیٰ کے گروپ کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری کر دی ہیں اور یہ مطالبہ شروع کر دیا ہے کہ پردیش کانگریس کمیٹی کی بجائے ریاست کی ایڈہاک کمیٹی قائم کر دی جائے مسٹر مصرا پر چھ سال تک ممبر شپ کے لئے کھڑا ہونے کی پابندی ہے لیکن وہ دور سے بیٹھے تار کھینچ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ شکلا حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ مسٹر شکلا بھی ان چالوں کو سمجھتے ہیں اور اسی لئے انہوں نے ایڈہاک کمیٹی کی تجویز کو بے ہودہ بتایا ہے جبکہ مصرا جی کا کہنا ہے کہ یہ تجویز خود کانگریس کے مفاد میں ہے کیونکہ اسی طرح وہ عوام کی حمایت حاصل کر سکے گی۔

ایک مصرا گروپ کے مقابل بہار دوسرے ہریجنوں مسلم ہی کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے اور جب سے انہوں نے سابق نائب صدر شری ایم۔ ایس۔ وشنا رکو اس نکتہ پر کہا ہے کہ انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں الزام لگایا

باقی صفحہ پر

بنگلہ دیش سے آنیوالے رفیوجی

یحی ہٹاؤ" مجھکو ووٹ دو" ہندوستان مردہ باد" - بھٹو

یئرمین
والفقار علی بھٹو سے
اِنقلابی کا انٹرویو

— آداب عرض ہے بھٹو صاحب

— (سید ھا ہاتھ اوپر اُٹھا کر) ہندوستان مردہ باد

— جی ؟ ؟ ؟ کیا فرمایا آپ نے ؟

— آپ کے آداب کا جواب دیا ہے۔

— لیکن آپ نے تو "ہندوستان مردہ باد" کا نعرہ لگایا ہے

— جی ہاں میں روز صبح اُٹھتے ہی کھانا کھانے سے پہلے کھانا کھانے کے بعد شام 'دوپہر' سہ پہر' سونے سے پہلے' کسی سے ملتے وقت یہی کہتا ہوں۔

— یعنی یہ آپ کے سلام کرنے کا طریقہ ہے؟

— آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔

— پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات پر آپ کے کیا خیالات ہیں ؟

— آئین ساز اسمبلی کا اجلاس فوراً بلایا جانا چاہئے اور سب سے بڑی جماعت ہونے کی بنا پر ہماری جماعت سے حکومت بنانے کی درخواست کرنی چاہئے۔

— لیکن سب سے بڑی جماعت تو عوامی لیگ ....

— (بات کاٹ کر) قطعاً نہیں کیونکہ عوامی لیگ کو غیر قانونی جماعت قرار دیا جا چکا ہے اس لئے اب اس نام کی کسی جماعت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

— لیکن عوامی لیگ کو ملک کے آدھی سے زائد عوام کی حمایت حاصل تھی جبکہ آپ کو ایک چوتھائی لوگوں کی بھی حمایت حاصل نہیں۔ ان حالات میں آپ کو حکومت بنانے کا حق کس طرح پہنچتا ہے ؟

بھٹو — بالکل اسی طرح جس طرح کہ جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں گوری اقلیت کو کالی اکثریت پر حکومت کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ (پھر اچانک گڑ بڑا کر) او ہ معاف کیجئے گا میں کچھ غلط بول گیا تھا۔ پاکستان پر حکومت کرنا ہمارا بنیادی حق ہے۔ ہم ہی لوگوں نے پاکستان بنوایا تھا۔ ہم نے اسے اپنے خون سے سینچا ہے۔ مستقل ۲۴ سال سے ہندوستان سے جنگ کر رہے ہیں۔

انقلابی — چونکہ اب آپ کی جماعت قانون ساز اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت ہوگی اس لئے پاکستان کے اگلے وزیر اعظم آپ ہی بنیں گے۔

بھٹو — یقیناً۔

انقلابی — میری طرف سے پیشگی مبارک باد قبول فرمایئے۔

بھٹو — شکریہ۔

انقلابی — ان حالات میں مشرقی بنگال کی نمائندگی کون کریگا کیونکہ جناب نور الامین کے علاوہ تمام نمائندے عوامی لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔

بھٹو — ٹکا خان۔

انقلابی — لیکن ٹکا خان مشرقی بنگال کی نمائندگی کس طرح کر سکتے ہیں۔ ان کا تعلق بھی تو مغربی پاکستان سے ہی ہے۔

بھٹو — پہلے تھا۔ اب ان کے جسم کا رواں رواں مشرقی پاکستان کے خون سے رنگا ہوا ہے اسلئے اب مشرقی پاکستان کی ان سے بہتر نمائندگی کوئی اور نہیں کر سکتا۔

انقلابی — بجا فرمایا میں پوری طرح سمجھ گیا!!

بھٹو صاحب آپ نے الیکشن سے پہلے اپنی تقریر وں میں کہا تھا کہ اگر آپ ملک کے وزیر اعظم بن گئے تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کشمیر کو آزاد کرالیں گے۔ اب آپ اپنے اس بیان پر کچھ تبصرہ کریں گے

بھٹو — ہم نہ صرف کشمیر بلکہ جونا گڑھ سے حیدرآباد، فیروز پور، گورداس پور، امرتسر، ترکی پور اور مغربی بنگال وغیرہ وغیرہ کو بھی آزاد کرالیں گے۔

انقلابی — وغیرہ وغیرہ سے آپ کی کیا مراد ہے ؟

بھٹو — یعنی کہ باقی ہندوستان۔

انقلابی — آپ وزیر اعظم بننے کے بعد کس طرح سوشلسٹ حکومت قائم کریں گے ؟ آپ کی جماعت کے زیادہ تر لیڈر

روفیسر بلراج مدھوک میرے پسندیدہ لیڈر ہیں" بھٹو

مات نئی دہلی

ہمارے شہروں میں عورتیں کتنی محفوظ ہیں ؟

پچھلے سال اپنے ایک بیان میں بنگال کے گورنر
تی دھون نے کہا تھا کہ کلکتے کی سڑکوں پر عورتیں لو
ے دہلی اور کسی بڑے شہر کی سڑکوں سے زیادہ محفوظ ہیں۔
ن کے اس بیان پر کافی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ ہر شخص
بنے اپنے شہر کی طرفداری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور یہ
ت ثابت کر رہا تھا کہ اس کے شہر میں عورتیں زیادہ
فوظ ہیں لیکن شاید شری دھون نے ٹھیک ہی کہا تھا
کلکتے میں عورتیں کسی اور شہر کی نسبت زیادہ محفوظ
سلوک کیا جاتا ہے۔

دہلی:- سب سے پہلے ہم اس سلسلہ میں اپنے شہر دہلی ہی کو لیتے ہیں جو اس معاملہ میں سب سے زیادہ بدنام ہے۔ زیادہ تر عورتیں جو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی گھوم چکی ہیں ان کا کہنا ہے کہ دہلی سے زیادہ بدتمیزی انہیں کہیں دیکھنے کو نہیں ملی پچھلے دنوں دو ہندوستانی لڑکیاں جنھوں نے اپنا زیادہ تر وقت غیر ممالک میں گزارا تھا دہلی کے ایک بہت مہنگے ہوٹل میں بیٹھی کھانا کھا رہی

پڑھ کر پھاڑ دیا اور تھوڑی دیر بعد اٹھ کر ہوٹل سے باہر نکل آئیں۔ وہ دونوں آدمی بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے اور ان کی کار کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ لڑکیاں بمشکل ان سے پیچھا چھڑا پائیں۔ اس کے بعد انہیں کبھی شام کے بعد کسی ہوٹل میں جانے کی ہمت نہ ہوئی یہ اپنی قسم کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے اس قسم کے واقعات دہلی میں ہر وقت ہر جگہ اور ہر لڑکی کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں۔

Sarobar inquiry

Bid to molest girls in Delhi festival

Allegea ...pe of Harijan girls by policemen in UP

ALLAHABAD, November

Police squad to ch... eve-teasing

IPS officer in trouble: alleged

Police Drive To Eradic... Eve-Teasing Menace

ASSAULT OF WO...

harijan girls

LUCKNOW, November

ہیں اور وہاں ان کی زیادہ عزت کی جاتی ہے۔ اس کی چاہے جو بھی وجہ ہو اس حقیقت کو جھٹلانا ذرا مشکل ہے۔ آیئے ہم ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کو ایک ایک کر کے لیں اور دیکھیں کہ وہاں عورتوں کے ساتھ کیسا

تھیں کہ بیرے نے ان کے سامنے ایک پلیٹ رکھ دی پلیٹ میں ایک پرچہ رکھا تھا جس پر لکھا تھا "کیا ہم دوست نہیں بن سکتے؟" بیرے نے بتایا کہ یہ پرچہ اگلی میز پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے دیا ہے۔ لڑکیوں نے پرچہ

۱۹۶۸ء میں نئے سال کے موقع پر دہلی میں جو کچھ ہوا اس سے تو زیادہ تر لوگ واقف ہیں ہی۔ کناٹ پلیس میں چور مردوں کی ٹولیوں نے کاروں میں سفر کرتے ہوئے لوگوں کو پکڑ لیا۔ ان کی گھڑیاں اتار لیں، عورتوں کے

عورتوں کے ساتھ سب سے زیادہ بے ہودگی دہلی میں ہوتی ہے

بمبئی میں ہر سال ۱۵۰۰ افراد لڑکیوں کے چھیڑنے کے الزام میں گرفتار کیئے جاتے ہیں ــــــــــــ !

بلاؤز اتار لے ساڑیاں پھاڑ ڈالیں اور بھی جتنی بے ہودگیاں کی جاسکتی تھیں کیں۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ اس غنڈہ گردی میں دہلی پولیس نے اپنا حصہ بھی خوب بٹایا یہ اور بات ہے کہ بعد میں آدھے درجن افسروں کو برخواست کر دیا گیا۔

۳ ستمبر ۱۹۶۹ کو بین الاقوامی نوجوانوں کے میلے کے موقع پر رابندر رنگ شالہ میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ نوجوانوں نے دہلی یونیورسٹی کی کچھ لڑکیوں کو گھیر لیا۔ ان کے بلاؤز پھاڑ دیئے کئی لڑکیوں کو زخمی تک کر دیا گیا۔ پوری دنیا سے آنے والے نوجوان مہمانوں کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا گیا۔ اس موقع پر بے ہودگی کی ایک خاص وجہ وہ غیر ملکی جوان بتائے جاتے ہیں جو تقریباً برہنہ حالت میں ادھر اُدھر بے ہودگیاں کرتے پھر رہے تھے۔ اسی اودھم بازی کا یہ نتیجہ ہوا کہ دہلی میں ہر سال ہونے والا یہ میلا ختم کر دیا گیا۔ اور اب شاید اس قسم کے میلے کرنے کی ہمت کسی کو نہ ہو۔

عورتوں اور لڑکیوں کو سب سے زیادہ پریشانی کا سامنا ڈی۔ ٹی۔ یو بسوں میں سفر کرتے وقت ہوتا ہے۔ بس میں چڑھتے وقت مرد عورتوں کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں انھیں دھکے دیئے جاتے ہیں چٹکیاں بھری جاتی ہیں اور اسی قسم کی دوسری بے ہودہ حرکتیں کی جاتی ہیں اس وقت چونکہ ہر شخص بس میں چڑھنے کی فکر میں ہوتا ہے اس لئے نہ تو کوئی دوسرا شخص ان لوگوں کو کچھ کہتا ہے اور نہ لڑکی ہی احتجاج کر پاتی ہے۔ اگر مصیبت کی ماری کوئی لڑکی ان لوگوں کی بدتمیزی کا کوئی جواب بھی دے تو الٹی اسی کی مصیبت آجاتی ہے۔

٭ پچھلے دنوں ڈی۔ ٹی۔ یو کی بس میں سفر کرتے ہوئے ایک لڑکے نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی لڑکی کے چٹکی بھر لی، لڑکی نے غصے میں آکر اس لڑکے کے ایک تھپڑ رسید کر دیا، لڑکا خاموش کھڑا غصے میں اس لڑکی کو گھورتا رہا کسی شخص نے بھی آگے اس لڑکی کی مدد نہ کی۔ کچھ دفتر سے آنے والے ادھیڑ عمر پنجابی باؤں نے اس لڑکی ہی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ جیسا کہ اس عمر کے لوگوں کی عادت ہوتی ہے فوراً اس زمانے کی باتیں چھڑ گئیں جب کسی لڑکی کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مرد پر ہاتھ اٹھائے۔ دو چار دل پھینک قسم کے نوجوانوں نے گندے شعر پڑھنے شروع کر دیے۔ بس سے اترنے سے پہلے وہ نوجوان لڑکی کی طرف بڑھا، بہت اطمینان سے اس کے گال پر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کیا اور پھر اسی اطمینان سے بس سے اتر گیا۔ نہ کسی نے اسے روکا اور نہ کسی نے اسے کچھ کہا۔ ایک ساٹھ ستر برس کے لگ بھگ پنجابی بزرگ نے مسکرا کر کہا:-

"واہ کیا بدلے پر بدلا دیا ہے"۔

چھیڑ چھاڑ تو ہر شہر میں ہوتی ہے لیکن یہ دہلی کی بدقسمتی ہے کہ یہاں لوگ اس بدتمیزی کو روکنے کی بجائے اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔

پولیس کا کہنا ہے کہ عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ۱۹۶۸ء کے بعد سے بڑھی ہے جب سے چوڑی دار پاجامے، کرتے اور اسکرٹ وغیرہ کا رواج ہوا ہے۔ عورتوں کے ساتھ بدتمیزی بھی بڑھ گئی ہے۔ زیادہ تر حالات میں اس بدتمیزی کی ذمے دار خود لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ نیچے گلے کی قمیص، ہپی ناٹکر نیچی ساڑیاں خطرے کو دعوت دیتی ہیں۔ سیدھے سادے کپڑوں میں ملبوس لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے واقعات کم پیش آتے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں جسمانی چھیڑ چھاڑ کے ۱۱۸ واقعات پولیس کے سامنے لائے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں یہ تعداد کم ہو کر ۷۰ رہ گئی لیکن ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۵۵ ہو گئی۔ چھیڑ چھاڑ اور بے ہودگی کے زیادہ تر واقعات چاندنی چوک۔ قرول باغ اور جن پتھ جیسے بھیڑ بھاڑ کے علاقوں میں پیش آتے ہیں۔

٭ پچھلے دنوں دہلی میں ایک غیر ملکی خاتون کو بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ وہ اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ کناٹ پلیس کے ایک سنیما میں فلم دیکھنے گئیں، اندھیرا ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ خاتون کو اپنے جسم پر ایک ہاتھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ غصے میں خاتون نے ہاتھ کو ایک طرف جھٹک دیا کچھ دیر بعد ہاتھ پھر اپنی جگہ واپس آگیا وہ غیر ملکی خاتون اٹھ کر باہر نکل آئی اور فلم دیکھے بغیر ہی گھر واپس چلی گئی۔ اس خاتون کا کہنا ہے کہ کلکتہ اور بمبئی میں اس کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش نہیں آئے۔ دہلی میں وہ جدھر نکلتی ہے لوگ اسے بھوکی نظروں سے گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے تک فقرے کسنے سے باز نہیں آتے۔ یہ صرف اسی خاتون کا تجربہ نہیں ہے بلکہ غیر ممالک سے آنے والی زیادہ تر خواتین کا تجربہ ہے۔

اس بے ہودگی کی ایک خاص وجہ وہ ہپی ہیں جو دن رات دہلی کی سڑکوں اور پارکوں میں پڑے بوس و کنار میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندوستانی ہر غیر ملکی کو ہپی سمجھ

دہلی میں بے ہودگی پھیلانے میں سڑکوں پر بوس و کنار کرنے والے ہپیوں کا کافی ہاتھ ہے ــــــــــــ !

کر اس سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔ دہلی میں اس بڑھتی ہوئی بے راہ روی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کلکتے اور بمبئی کے مقابلے میں زیادہ پابندیاں ہیں۔ کلکتے میں ہاتھ پکڑے ہوئے سڑکوں پر گھومتے نوجوان جوڑے عام نظر آئیں گے جبکہ دہلی میں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ یہاں نوجوان ایک دوسرے سے دو فیٹ دور چلتے ہیں اور اگر غلطی سے ہاتھ پکڑ بھی لیتے ہیں تو لوگ انھیں مریخ سے اتری ہوئی مخلوق سمجھ کر گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔

بمبئی ـــــ زیادہ تر غیر ملکی عورتیں آپ کو بمبئی کی تعریف ہی کرتی ملیں گی۔ نہ تو انھیں وہاں ٹیکسی ڈرائیور پریشان کرتے ہیں اور نہ لوگ گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ فقرے کسنے میں بمبئی بھی پیچھے نہیں ہے لیکن یہ فقرے ایک حد کے اندر ہی رہتے ہیں— غیر ملکی عورتوں کے علاوہ ہندوستانی عورتوں کی بھی یہی رائے ہے۔ دفتر کی ٹائپسٹ لڑکیاں، نرسیں، کالج جانے والی لڑکیاں، شادی شدہ گھریلو عورتیں، سب ہی کی رائے ہے کہ معمولی چھیڑ چھاڑ کے علاوہ عام طور پر وہ بمبئی کی سڑکوں پر محفوظ ہی رہتی ہیں۔ شام کو اکیلے گھومتے یا فلم دیکھنے کے لئے جانے میں انھیں کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان کے اس دوسرے بڑے شہر میں صرف شریف اور مہذب مرد ہی رہتے ہیں، ان کی اس شرافت کی وجہ بمبئی پولیس کا اچھا اور سخت انتظام ہے۔ ہر بھیڑ بھاڑ والی جگہ پر سادہ کپڑوں میں پولیس کے آدمی گھومتے رہتے ہیں جو سڑک چھاپ مجنوؤں کو ان کی ذرا سی بھی نازیبا حرکت پر گرفتار کر لیتے ہیں۔

بمبئی پولیس ایکٹ کے سیکشن ۱۱۰ کے مطابق ان لوگوں کو نہ صرف چھیڑ چھاڑ بلکہ گندے فقرے کسنے پر بھی سزا دی جاتی ہے۔ عام طور پر ان لوگوں کو جرمانہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن زیادہ بدمعاشی کرنے پر جیل کی ہوا بھی کھلا دی جاتی ہے۔

ہر سال بمبئی پولیس تقریباً ۱۵۰۰ افراد کو لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے لے کر جبر و زیادتی تک کے الزام میں گرفتار کرتی ہے۔ یہ بات کافی تشویشناک ہے کہ پچھلے چند برسوں سے زور زبردستی کے کیسوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

بمبئی میں اس بے راہ روی کی ایک خاص وجہ ہندوستان بھر سے آنے والی وہ لڑکیاں ہیں جو ہیروئن بننے کے خواب دیکھتی ہوئی بمبئی چلی آتی ہیں۔ عام طور پر ان کے پاس کافی روپے یا پھر گھر سے بھاگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گاڑی سے اترتے ہی یہ اپنے کسی پسندیدہ فلمی ستارے کا پتہ معلوم کرتی ہیں۔ عام طور پر کافی عرصے تک ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچنے کے بعد ان کی منزل یا تو کوئی کوٹھا ہوتا ہے یا پھر کسی فلم میں ایکسٹرا کا رول۔ اب بمبئی پولیس نے اس معاملے میں بھی کافی انتظامات کر لئے ہیں۔ ہر ریلوے اسٹیشن پر پولیس والے مقرر کر دیے گئے ہیں جو اس قسم کی لڑکیوں کو پکڑ کر پولیس اسٹیشن لے جاتے ہیں جہاں انھیں ایک زوردار لیکچر دیا جاتا ہے اور پھر واپس گھر بھیج دیا جاتا ہے۔

بہر حال عورتوں کو بمبئی پولیس کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ بمبئی جیسا خطرناک شہر بھی ہندوستان کے دوسرے شہروں کی بہ نسبت ان کے لئے کافی محفوظ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہاں ابھی تک کلکتے کے رابندر سرووبار، یا دہلی کے نئے سال کے جشن جیسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

کلکتہ ـــــ اصل بحث چونکہ کلکتے ہی سے شروع ہوئی تھی اس لئے اگر ہم واپس کلکتے آجائیں تو بہتر رہے گا۔ کلکتے میں پیش آنے والے رابندر سرووبار کے واقعے نے عام لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ کلکتہ عورتوں کے لئے قطعی غیر محفوظ ہے، جبکہ معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ رابندر سرووبار کے واقعے کے چاروں طرف ایسی سیاسی دھند چھائی ہوئی ہے کہ اس میں سے گزر کر یہ دیکھنا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ بہت مشکل ہے۔ اس واقعے کی تحقیقات کرنے والے کمیشن نے رپورٹ دی تھی کہ زیادہ تر واقعات کو اخبارات نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، ورنہ اصل میں چند معمولی سے واقعات پیش آئے تھے۔

بہر حال اس ایک واقعے کو چھوڑ کر عام طور پر کلکتے کی سڑکوں پر عورتیں دہلی اور بمبئی کی سڑکوں کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہیں، اور اگر وہاں کے گورنر شری شانتی دھون یہ بات کہتے ہیں تو کسی کو قطعاً ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ وہ سیاسی ماحول ہے جو ہمیں کلکتے کے علاوہ ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں مل سکتا۔ یہاں لوگوں کے ذہن پر نکسلائیٹ بھوت اس طرح سوار رہتا ہے کہ وہ کسی اور نئے جھگڑے یا بیہودگی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں کے لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی سیاسی بھوک ان کی جنسی بھوک پر حاوی رہتی ہے۔

کلکتے میں رہنے والی ۲۹ سالہ جرمن خاتون مسز کرسٹل اوجھا کا کہنا ہے کہ وہ عام طور پر شام یا رات کے وقت بھی اپنے آپ کو کلکتے کی سڑکوں پر محفوظ سمجھتی ہیں۔ اگر کوئی فقرے بھی کستا ہے تو وہ گندے ہونے کی بجائے مذاق والے ہوتے ہیں جیسے ان کے اپنے ملک میں لڑکے کسا کرتے ہیں۔

کلکتہ میں عورتوں سے زیادہ غیر محفوظ ہیں

۲۶ سالہ مس شکلا مکرجی جو ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہیں کہتی ہیں کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد بھی بلاجھجک سڑک پر نکل جاتی ہیں۔ وہ کافی بھیڑ بھاڑ والی ٹراموں اور بسوں میں بھی سفر کرتی ہیں۔ عام طور پر لوگ عورتوں کو دیکھتے ہی اپنی سیٹ انھیں دے دیتے ہیں اس لئے سفر کرتے وقت انھیں پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

۲۲ سالہ طالب علم مس سبھ شری رائے کا کہنا ہے کہ بس یا ٹرام میں اگر لوگ ان کے جسم کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان کا پیر کچل دیتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کلکتے میں لوگ فوراً لڑکی کی مدد کو آجاتے ہیں، اگر لڑکی ذرا بھی شور مچا دے تو ان مجنوؤں کے لئے جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

مس سبھ شری، لندن، روم، لکھنؤ، بمبئی اور دہلی بھی گھوم چکی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ دہلی میں لوگ لڑکی کی مدد کرنے کے بجائے اس پر ہنستے ہیں۔

کلکتے میں ساڑی یا سیدھا سادا لباس پہننے والی لڑکیاں عام طور پر محفوظ رہتی ہیں، لیکن بہت زیادہ فیشن ایبل اور امیر گھرانوں کی لڑکیاں نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کے قہر کا بھی نشانہ بنتی ہیں۔ ان پر طرح طرح کے فقرے کسے جاتے ہیں، ان کے فیشن اور دولت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مس اوشا تریا کے مطابق کلکتے میں دولت مند ہونا کوئی شان کی بات نہیں۔ بلکہ دولت مند لوگ شرمندہ اور چھپے چھپے پھرتے ہیں دولت مند لوگوں کو ہر محفل میں منٹوں میں نکو بنا دیا جاتا ہے۔

ہم یہ بات بڑے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں کے لئے کلکتہ ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں محفوظ ہے، یہاں عورتوں سے زیادہ مرد غیر محفوظ ہیں۔ پولیس اور نکسلائیٹ دونوں کا عتاب مردوں پر ہی نازل ہوتا ہے عورتیں اس سے محفوظ ہی رہتی ہیں۔ ●●

مجیب کی آواز

نازش پرتاپگڑھی

دوستو یہ بھیانک سیہ بدلیاں
صبح کے نام پر صرف تاریکیاں
کتنی بہنوں کے آنچل ہوا ہو گئے
کتنی مانگوں سے سیندور پونچھا گیا
زردیاں چھا گئیں کتنے رخساروں پر
کتنے نورس شگوفوں کو موت آ گئی
ہر طرف سسکیوں کی صدائیں ہیں اب
مامتا جل گئی بھوک کی آگ میں
قدسیوں سے بھی پاکیزہ تر عصمتیں
ماں کی تقدیس پر دام لگنے لگے
سبز کھیتوں پہ ہے بیوگی کا سماں
جس سے گذرے تھے مر مر کے ہم دوستو

کھو گئی جھلملا کر افق پر کرن
زندگی کے لئے صرف دار و رسن
کتنی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے
کتنے سینوں میں چھالے ٹپکنے لگے
کتنی زلفوں کی مہکاریاں کھو گئیں
کتنے بچوں کی کلکاریاں کھو گئیں
ہر طرف تیز شعلے بھڑکنے لگے
لوریوں کے کلیجے دھڑکنے لگے
خوابگاہ ہوس کار میں آ گئیں
بیٹیاں آج بازار میں آ گئیں
اور کلیاں بنیوں کے گھر آ گئے
گھوم کر پھر اسی راہ پر آ گئے

دوستو یہ بھیانک، سیہ بدلیاں
کھو گئی جھلملا کر افق پر کرن
جس کو رہبر سمجھتے رہے آج تک
آئی منزل تو ثابت ہوا راہزن

قید میں تا بکے حسنِ فکر و عمل
کب تک آخر بیانوں سے ہم تن ڈھکیں
دوستو جاگنے کی گھڑی آ گئی
جاگ اٹھو شہر میں گاؤں میں کھیت میں
حریت کی صدائیں ابھرتی رہیں
ہر قدم اور آگے ہی بڑھتے رہو
اپنی سانسوں سے شعلے اگلتے رہو
مسکراتے رہو موت کی گود میں
ہم نے مانا کہ ہر سمت ہے تیرگی
مشعلِ عزم لے کر اٹھو دوستو!
قوتیں چھین لو ظلم کی، جور کی
جاگنے ہی کو ہے آفتابِ سحر

کب تک اپنوں کے ہاتھوں لٹے جائیں گے
پیٹ مردوں سے کب تک بھرے جائیں گے
حشر در گام، طوفاں بکف جاگ اٹھو
اور میدان میں صف بہ صف جاگ اٹھو
چھن چھناتی رہیں آہنی بیڑیاں
سن سناتی رہیں آتشیں گولیاں
اپنے سینوں میں پالے رہو زلزلے
گیت گاتے رہو پھانسیوں کے تلے
ہم نے مانا کہ خوابیدہ ہے قافلہ
دل میں پیدا کرو زیست کا حوصلہ
اس تباہی کے دھارے کا رخ موڑ دو
مردہ چاند اور ستاروں کو اب توڑ لو

یہ بھیانک سیہ رات ڈھل جائے گی
در بہ جلنے تیز اپنا جوشِ جنوں
صبحِ رخشاں کے ذوقِ نمو کے لئے
چاہیئے اور سر اور جسم اور خوں

ساؤ پالو میوزیم کی بلند و بالا عمارت

برازیل کے شہر ساؤ پالو کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وقت اس شہر کی آبادی چون لاکھ تیس ہزار ہے اور بین الاقوامی سطح پر آٹھویں نمبر کی آبادی والا شہر شمار ہوتا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ اگلے بیس سال میں یہاں کی آبادی ٹوکیو اور نیویارک کے بعد تیسرے نمبر پر پہنچ جائے گی کیونکہ یہاں ہر سال بھاری تعداد میں لوگ باہر سے آ کر آباد ہو رہے ہیں۔

ساؤ پالو کا آرٹ میوزیم فن مصوری کا گرانقدر خزانہ ہے۔ اس نایاب میوزیم کو ساؤ پالو کے ایک لارڈ چاٹو نے ۱۹۴۷ء میں قائم کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مصوری قوم کا قیمتی سرمایہ ہے۔ قیام میوزیم کے ابتدائی مراحل میں لارڈ چاٹو نے ایک اطالوی مصور پیترو ماریا باردی کی خدمات حاصل کیں۔ وہ بذات خود ایک دولت مند انسان تھا اور اس وقت تیس اخباروں، انیس میگزینوں، بائیس ریڈیو اور پندرہ ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کا مالک تھا۔ اپنے مشن کو پھیلانے کے لئے لارڈ چاٹو نے اپنے وسیع ذرائع کا دل کھول کر استعمال کیا۔ عوام اور سرکار کا تعاون بھی حاصل کیا۔ نادرات کی خریداری میں حکومت برازیل نے ہر ممکن مالی امداد دینا شروع کر دی۔ وہ فطرتاً تیز انسان تھا ایک مختصر عرصے میں ہی نیویارک کے تمام آرٹ بازاروں پر چھاتا چلا گیا اور امریکا کا کوئی بھی میوزیم نوادرات کی خریداری میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

لارڈ چاٹو کی ایک انتھک لگن نے میوزیم کو حیرت انگیز ترقی دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میوزیم کی عمارت بھی تبدیل ہوتی رہی۔ اس ترقی نے ساؤ پالو کے شہریوں کو کافی متاثر کیا اور عوام نے لاکھوں ڈالر چندہ جمع کر کے میوزیم کی اپنی عمارت تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نئی عمارت کا نقشہ مصور باردی کی مطلقہ بیوی لینا بو نے بنایا۔ لارڈ چاٹو کی موت سے ٹھیک ایک سال بعد ۱۲ر مارچ ۱۹۶۹ء کو اس نئی عظیم

لڑکی غسل کی تیاری میں

معروف نقش کار شاہکار "مشکنی"

مشہور ہندوستانی آرٹسٹ

حسین

ساؤ پالو جا رہے ہیں

ساؤ پالو کی آرٹ آرگنائزیشن ہر سال دنیا کے ایک یا دو بہترین آرٹسٹوں کو نمائش کے لئے ساؤ پاؤ بلاتی ہے۔ اسی سال اس آرگنائزیشن نے ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ محمد فدا حسین اور بین الاقوامی شہرت کے مالک پکاسو کو ۱۴ ستمبر سے شروع ہونیوالی نمائش میں حصہ لینے کیلئے بلایا ہے۔ آرٹسٹ کا ساؤ پاؤ بلایا جانا ایک بہت بین الاقوامی اعزاز ہے۔

حسین نے پچھلے دنوں رامائن پر کچھ تصویریں بنائی تھیں انکا خیال ہے کہ وہ یہی تصویریں نمائش میں پیش کریں گے۔ کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں بھی دسہرا منایا جا رہا ہوگا۔

عمارت کا افتتاح ہوا۔ دور سے دیکھنے پر یہ عمارت چار عظیم ستونوں کے درمیان لٹکا ہوا ایک خوب صورت مستطیل نظر آتی ہے عمارت کے اندر تصاویر آویزاں کرنے کے لئے خصوصی تعیرات کی گئی ہیں۔

ساؤ پالو کا آرٹ میوزیم موجودہ صدی کی دین ہے اس لئے اسمیں کلاسیکل، قرونِ وسطیٰ، اور علوم و فنون کے احیاء کے زمانے کی نمائندگی برائے نام ہے۔

وینس کے مشہور اسکول مصوری ٹیشین (TITIAN) کے دو اعلیٰ شاہکار میوزیم کی زینت ہیں۔ ان میں سے ایک مصور رافیل (RAPHAEL) کی بنائی ہوئی مسیح کی شبیہ ہے اور دوسری مینٹیگنا مصور (MANTEGNA) کی بنائی ہوئی سینٹ جیروم (JEROME) کی ایک شبیہ ہے ان بیش قیمت شاہکاروں کے بعد چند اور نسبتاً کم درجے کے قدیم اعلیٰ مصوری کے نمونے ہیں جن میں سولہویں صدی عیسوی کی ایک تصویر بعنوان "منگنی" قابلِ ذکر ہے۔ جس میں مصور کوینٹن میٹسی (QUENTIN METSY) نے ایک جوان شوہر کے اپنی بدصورت اور مالدار بوڑھی بیوی سے ہم آغوش ہونے کے تاثرات کی عکاسی کی ہے۔

میوزیم کے ذخیرے میں مخصوص اسکول مصوری کے نمائندہ مصوروں کے چار شاہکار کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ بنام زمانہ برہنہ پرست مصور رینوا (RENOIR) کے بہت سے اعلیٰ شاہکار اس کی زینت ہیں۔ ان تمام مشہور تصاویر میں ۱۸۷۰ء کی بنائی ہوئی ایک تصویر خصوصاً قابلِ ذکر ہے جسمیں اس نے اپنی پہلی محبوبہ لیسے تریوہوت کو غسل کی تیاری کرتے ہوئے کینواس پر اتارا ہے۔

مشہور مصور مینٹ کی موت سے آٹھ سال قبل ۱۸۷۵ء میں اس کے قریبی دوست مصور مارسیلن ڈیلیبوتن نے اس کی ایک شاہکار تصویر بنائی تھی۔ یہ پینٹنگ اعلیٰ فن کا نمونہ ہے۔ تصویر میں مینٹ اپنے مخصوص خدوخال سے زندہ نظر آتا ہے اور اس کی مخصوص کشادہ پیشانی نمایاں نظر آتی ہیں۔ دوستی کا یہ گرانقدر ہدیہ میوزیم کی زینت بنا ہوا ہے۔

دیگر اعلیٰ مصوروں کے شاہکاروں میں سیزان (CEZANNE) کی بہت سی پینٹنگ میوزیم میں ہیں۔ سیزان نے تصوراتی مصوری کے اسکول سے تعلق ہے۔ سیزان کی تمام پینٹنگس میں ۱۸۶۶ء کا بنایا ہوا تصوراتی نیگرو خاکہ قابلِ ذکر ہے جسکو دیکھنے کے بعد اسکول کے مصوروں کے زوال کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔ مصور پال گاگن (PAUL-GAUGUIN) کی ایک اہم تصویر بھی میوزیم کی زینت ہے۔ یہ مصور کا اپنا ذاتی عکس ہے۔ ۱۸۹۶ء میں خود پال گاگن نے بنایا تھا۔ اس تصویر میں وہ ایک ضعیف و نادار مصور نظر آتا ہے جس کی معنویت دیکھ کے ہر انسان کا دل بھر آتا ہے۔

مصور ویلارڈ (VUILLORD) انسکرپٹ استادوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی کی ہر پینٹنگ میں ہم بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے پیرس کی حسین ایکٹریس کا بیڈروم پینٹ کیا ہے۔ یہ بلاب بھی میوزیم میں موجود ہے۔

مصور شہزادی لاتریک (LAUTRAC) کی مشہور تخلیق کار تھی۔ ویاد (VIAUD) نام کا ایک شخص کا قریبی دوست تھا جس کو شہزادی نے اپنے اپانچ کا نگہداشت پر مامور کر رکھا تھا۔ شہزادی ویاد کو بہت پسند کرتی تھی۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لئے اس نے ۱۹۰۱ء میں ویاد کو بطور امیرالبحر پینٹ کرنے کیا اور متواتر دو ہفتے تک بوڑھے ویاد کو ماڈل بن کر کھڑا رہنے پر مجبور کیا۔ لاچاری میں ویاد نے جبراً حکم کی مگر یہ تصویر جوان العمر شہزادی کی ناگہاں موت کے سبب مکمل نہ ہو سکی۔ یہ نامکمل تصویر ساؤ پالو کا قیمتی خزانہ ہے۔

چھوٹی لڑکی آرام کرسی پر
"میری کاسٹ"

کو آئی جی (انسپکٹر جنرل پولس مدھیا پردیش) کی سپریم کمانڈ کے تحت اپریشنل کمانڈر بنا دیا گیا جو وقتاً فوقتاً اپریشنل ہیڈ کوارٹرز میں قیام کیا کرتا تھا۔ بارش کے زمانہ میں بلاوقفہ آپریشن جاری رہتا تھا۔

روپا کی کہانی دوسروں سے مختلف نہ تھی۔ ۱۹۵۴ء میں سُنا گیا کہ دو کانسٹبلوں کو مان سنگھ کی جماعت نے جنگل میں گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔

ہرگز اس کا تصور نہیں تھا کہ روپا مان سنگھ کا جانشین اور اس کی جماعت کا لیڈر ہوگا۔ کانسٹبلوں کے خوفناک قتل کی چونکا دینے والی تفصیلات کا انکشاف ڈاکو لعل سنگھ نے کیا جسکو ارجا میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

جب کانسٹبلوں نے اپنے ہاتھ باندھے جانے پر مزاحمت کی تو مان سنگھ کے دوسرے بیٹے تحصیلدار سنگھ نے روپا کو آنکھ ماری کہ انکا کام تمام کر دے۔ روپا ان کو قریبی بانس کے جنگل میں لے گیا اور درخت سے باندھ کر ٹامی گن سے ہلاک کر دیا۔ مان سنگھ چمبل وادی کا "رابن ہڈ" تھا کہ اس نے کسی بے گناہ کو کبھی ہلاک نہیں کیا ایک خیالی قصہ ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکو روپ رام شرما ۱۹۲۳ء میں آگرہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ چُپ رام ڈاکو مان سنگھ کا خاندانی پُجاری تھا۔ گاؤں کے ساہوکار اور اس کے خاندان کو (جس نے قرضہ ادا نہ کرنے پر برسرعام گالی دی تھی) قتل کر کے مان سنگھ فرار ہو گیا۔ اور قانون شکن بن گیا۔ ۱۹۴۲ء میں روپا اس کی جماعت میں شریک ہو گیا۔

روپا ستارہ شناسی کی فطری صلاحیت رکھتا تھا علاوہ بہت ذہین اُن تھک اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کی نقل و حرکت میں بڑی پھرتی تھی جسکی بدولت وہ مان سنگھ کا معتمد علیہ لفٹننٹ بن گیا۔

اگست ۱۹۵۵ء میں ضلع بھنڈ میں ایک مقابلہ کے دوران مان سنگھ اپنے بیٹے صوبہ دار سنگھ کے ساتھ گولی کا نشانہ بن گیا مگر ڈاکوؤں نے پانچ پولس والوں کو ہلاک کر دیا انھوں نے روپا کی رہنمائی میں صحیح نشانہ لگایا تھا۔

مان سنگھ کی ٹولی منتشر ہو گئی تھی۔ مگر روپا نے ڈاکوؤں کو از سرِ نو منظم کیا ٹولی کے باقی لوگ بابو گوجر (فتح آباد آگرہ) سے جا ملے تاکہ گوجر فرقہ کی حمایت حاصل ہو جائے۔ مگر ان کے لیڈر بابو لوہاری کو پولس نے گولی کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا اور روپا سردار بن گیا۔

روپا اپنی ٹیلسکوپ لگی ہوئی رائفل سے چھپی ہوئی پولس پارٹی کے کسی آدمی کی کھُلی کرن اُنگلی کو اڑا دے سکتا تھا۔ روپا کی ٹولی ڈاکوؤں کی ۱۳ ٹولیوں میں سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ ۱۹۵۶ء میں اُسنے بھنڈ اور مورینا میں انتہائی دہشت پیدا کر دی۔ صرف موضع انبا ضلع مورینا میں اس نے ۲۵ خوفناک جرائم کا ارتکاب کیا۔

اس زمانہ میں لکھن سنگھ کی ٹولی روپا کے ساتھ تھی انکی متحدہ طاقت ۔۔ تک پہنچ گئی۔ اُنھوں نے آگرہ مالی پور سرحد پر یوپی پولس کے سب انسپکٹر اور ایک کانسٹبل کو ہلاک کر دیا۔

۲۰ مارچ ۱۹۵۸ء کو بھنڈ میں پولس کے ساتھ ایک مقابلہ میں روپا شدید زخمی ہو گیا اور کئی ماہ تک اونٹ کی پیٹھ پر پھرتا رہا۔

بالآخر ۱۲ مئی ۱۹۵۸ء کو مسٹر بی جی گھاٹے انسپکٹر جنرل پولس کی سپریم کمانڈ میں مخالف ڈکیتی آپریشن مہم شروع کی گئی۔

اس مہم کے دوران پولس نے روپ رام شرما کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس کے بعد روپا اور لکھن سنگھ کی متحدہ قوت کمزور اور منتشر ہو گئی ☆

جنرل سر آرتھر سلوگٹ کے دل کے بیچوں بیچ گولی لگی تھی ۱۸۹۸ء میں گولی لگنے کے بعد بھی جنرل ۴۱ سال زندہ رہے اور ۷۲ سال کی عمر میں مرے۔

پَروں کی داڑھی امریکن شخص ہنکل کی تھوڑی میں گولی لگ گئی تھی۔ تھوڑی کے گوشت پر مرغی کی کھال چڑھا دی گئی تھی۔ اب اس کی داڑھی کی جگہ مرغی کے پَر نکلتے ہیں۔

مونا لیزا کا خالق لیونارڈو جس کا باپ پہلی تصویر دیکھتے ہی ڈر گیا تھا

رئیس الدین احمد

مونا لیزا دنیا کی وہ مشہور اور واحد تصویر ہے جسکے لبوں پر پھیلی ہوئی پراسرار مسکراہٹ کل بھی ایک معمہ تھی اور آج بھی ایک معمہ ہے۔ ہوسکتا ہے مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لئے بھی معمہ ہی رہے گی۔ جتنی شہرت آرٹ کے اس بے مثال شاہکار کو ملی اتنی ہی شہرت اس کے خالق کو بھی ملی اور رہتی دنیا تک ملتی رہے گی۔ اس کی تخلیق کا سہرا لیونارڈو۔ ڈا۔ ونچی کے سر ہے۔ جہاں تک اس کی پیدائش کا تعلق ہے وہ فلورنس کے قریب ونچی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ سررشتہ جات کی تصدیق کرنے والا افسر تھا۔ وہ صرف چہرے کا ہی خوب صورت نہ تھا بلکہ بے پایاں حسین شخصیت کا مالک بھی تھا۔ اس دور میں لوگ لمبے چوغے پہنا کرتے تھے، اس وجہ سے لیونارڈو اکثر لائن دار گلابی رنگ کی گھٹنوں تک لمبی قمیص پہنا کرتا تھا۔

لیونارڈو کے ہاتھ کافی لمبے تھے، اسے چڑیوں سے بہت ہی زیادہ محبت تھی جس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ جب بھی وہ کسی جگہ چڑیاں فروخت ہوتی دیکھتا انہیں خرید کر آزاد کر دیا کرتا تھا۔ اسے گھوڑوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ان ایام میں جب اس کی غربت کا دور گزر رہا تھا اس نے ہمیشہ کوشش کی کہ کسی طرح ایک گھوڑے کا مالک بن جائے، لیکن نہ بن سکا۔ اس ناامیدی کے باعث اس نے گھوڑوں کی ایسی شاندار تصاویر پینٹ کیں کہ ان جیسی پینٹنگ کوئی مصور نہیں بنا سکا۔ لیونارڈو کا استاد

ٹھورناشن اپنے دور کے سب سے قیمتی اور مشہور اسٹوڈیو کا مالک تھا۔

لیونارڈو کے بارے میں جب وہ جوانی کی حدود سے گزر رہا تھا ایک کہانی بہت مشہور ہے۔ ایک بار لیونارڈو کے باپ کے فارم میں رہنے والے ایک دیہاتی نے لیونارڈو سے گزارش کی کہ وہ ایک گول لکڑی پر جو انجیر کے درخت سے کاٹی گئی تھی ایک حسین تصویر پینٹ کر دے۔

اس کی آرزو سنکر لیونارڈو نے طے کر لیا کہ وہ اس لکڑی پر ایک ایسی تصویر بنائے گا جو اتنی ڈراؤنی اور خوفناک ہوگی کہ لوگوں کو اس پر حقیقت کا گمان ہوگا۔

اس نے اپنے کمرے میں لاتعداد سانپ، چمگادڑیں، ٹڈے

لیونارڈو

اور کیچوے جمع کئے، ان سب سے اس نے ایک ایسا خوفناک اور عجیب خیز ماحول پیدا کیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ سانس کے ساتھ ہوا زہر آلود ہو کر آگ میں بدل جاتی ہے۔ لیونارڈو نے اس تصویر کو اس طرح پینٹ کیا تھا کہ ایک ناہموار اور تاریک پتھریلے جسکا منہ کھلا ہوا ہے اور اس میں سے ڈنک کے ساتھ زہر نکل رہا ہے اور آنکھوں سے آگ کے شعلے اور نتھنوں سے دھواں خارج ہو رہا ہے۔ جب یہ تصویر مکمل ہو گئی تو لیونارڈو نے اپنے باپ کو بلایا۔ تصویر دیکھ کر اس کے باپ پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ فوراً ڈر کر واپس چلا گیا۔ کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ پینٹنگ نہ ہو بلکہ حقیقت میں کوئی عفریت ہے۔ یہ دیکھ کر لیونارڈو قہقہہ مار کر ہنس پڑا کیونکہ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

اس کے بعد اس کے باپ نے ایک بساطی سے لکڑی کا ایک گول تختہ خریدا جس پر ایک خوب صورت پینٹنگ بنی ہوئی تھی وہ بہت معمولی قیمت میں اسے مل گئی۔ بعد میں لیونارڈو کی یہ پینٹنگ ایک بھاری قیمت میں فروخت ہوئی۔

جہاں تک لیونارڈو کی مشہور تخلیق طعام شب "The Last Supper" کا تعلق ہے وہ ملن کے چوک میں اس وقت کے مشہور بھکشو کی خانقاہ میں کھانے کے کمرے کی دیوار پر بنی ہوئی ہے۔ جب لیونارڈو یہ تصویر بنا رہا تھا تو اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ صبح سے شام تک کام کرتا رہتا، اس دوران نہ کچھ کھاتا نہ پیتا اور نہ ایک لمحے کو ہاتھ سے پنسل رکھ کر آرام کرتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ کبھی کبھی تین چار دن تک اسے بالکل ہاتھ نہیں لگاتا تھا جتنی تصویر مکمل ہو جاتی اس پر ناقدانہ نظر ڈالتا رہتا اور پھر دو ایک گھنٹے اس کی نوک پلک سنوارنے میں گزار دیتا۔

انقلابات زمانہ کے ساتھ ساتھ اگرچہ اس تصویر کو بہت نقصان پہنچا ہے لیکن اب بھی یہ تصویر اس دیوار پر دیکھی جا سکتی ہے۔ پہلے اس تصویر کو دیوار کی نمی نے خراب کیا پھر ملن پر نپولین کے قبضے کے بعد اسکی فوج نے نقصان پہنچایا۔ گو نپولین نے فتح کے بعد فوج کو یہ حکم دیدیا تھا کہ اس تصویر کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے لیکن اس کا کمانڈر بہت لاپرواہ تھا، یہی وجہ تھی

مونا لیزا

ہاتھ پھیر کر امراض دور کرنیوالی

دنیا میں بہت سے ایسے عجیب وغریب مسئلے ہوتے ہیں کہ نہ تو سائنس داں ہی حل کر پاتے ہیں اور نہ مذہبی علماء اور لوگ طرح طرح کی کہانیاں گڑھتے ہیں، قصے بناتے ہیں لیکن سب کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک کیپٹن جبار کا قصہ آپ واقعات میں پڑھ چکے ہیں جہاں سائنس کے بڑے آلات بھی زمین کے نیچے پانی کا کھوج لگانے میں ناکام ہوجاتے ہیں وہاں کیپٹن جبار منٹوں میں پانی کا کھوج لگا لیتے ہیں۔ اب آپ اسی طرح کی ایک اور شخصیت مسز بیتی چکرورتی سے ملئے۔

مسز بیتی چکرورتی کے بارے میں لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ جادوگرنی ہیں، کوئی انھیں الیکٹرو بائیولوجسٹ کہتا ہے۔ لیکن حقیقت کیا ہے یہ خود مسز چکرورتی کو بھی معلوم نہیں۔ ان میں ایک قدرتی صلاحیت اور طاقت ہے جسے وہ صرف نیک انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ انھیں یہ طاقت نہ تو کسی پیر فقیر نے دی ہے، نہ ان کو خواب میں کوئی بزرگ نظر آتے ہیں اور نہ وہ کسی سنت سادھو کی چیلی ہیں۔

مسز چکرورتی ایک سیدھی سادی سی گھریلو بنگالی عورت ہیں جن کے ماننے والے اور جن کے لئے دعا کرنے والے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مسز چکرورتی نے دنیا بھر میں ہزاروں ایسے مریضوں کا علاج کیا ہے جن کو ڈاکٹر لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ ہڈیوں، دل، گردوں اور نروس سسٹم کی کمزوری اور دوسرے درد وغیرہ مسز چکرورتی چند دن کے اندر بغیر کسی آلے یا دوا کی مدد کے دور کر دیتی ہیں۔ بہت زیادہ الجھے ہوئے کیسوں میں وہ ڈاکٹروں کی مدد بھی کرتی ہیں۔

آپ سوال کریں گے کہ وہ یہ سب کیسے کرتی ہیں۔ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ جب مسز چکرورتی کے یہاں کوئی مریض پہنچتا ہے تو وہ اس سے آرام سے لیٹ جانے کو کہتی ہیں

اس درمیان وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی ہیں، انکا ہاتھ آہستہ آہستہ مریض کے جسم پر گردش کرتا رہتا ہے جیسے ہی ان کا ہاتھ درد والی یا بیماری والی جگہ کو چھوتا ہے ہاتھ میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ بیماری اگر معمولی ہے تو ہاتھ ہلکے ہلکے کانپتا ہے لیکن اگر بیماری خطرناک اور پرانی ہے تو ہاتھ بہت تیزی سے کانپنے لگتا ہے، ہاتھ میں سے ہلکی ہلکی گرمی نکلتی ہے جسے مریض محسوس کر سکتا ہے۔ مریض کو اگر درد محسوس ہو تو مسز چکرورتی درد والی جگہ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی ہیں اور چند منٹ میں درد دور ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہتا ہے، بیماری اگر معمولی ہو تو تین چار روز کے علاج سے ہی ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن اگر خطرناک ہو تو ایک دو ہفتے بھی لگ جاتے ہیں۔

مسز چکرورتی کا کہنا ہے کہ جیسے ہی وہ درد والی جگہ کو چھوتی ہیں ان کے تمام جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑ جاتا ہے۔ کرنٹ کی ایک لہر بائیں ہاتھ سے شروع ہو کر جسم سے ہوتی ہوئی دائیں ہاتھ میں پہونچ جاتی ہے۔ کبھی کبھی انکو پورے جسم میں جھٹکا سا بھی لگتا ہے لیکن ان جھٹکوں سے انکی اپنی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جیسے جیسے مریض کا درد کم ہوتا جاتا ہے ان کے ہاتھ کا ارتعاش بھی کم ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت ارتعاش بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

دہلی کے درجنوں اسپتال اور ڈاکٹر مسز چکرورتی سے مدد لیتے ہیں۔ ہزاروں مریض علاج کے لئے ان کے گھر پہونچتے ہیں لیکن وہ کسی سے کوئی فیس نہیں لیتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں گی وہ دوسروں کے دکھ اور تکلیفیں دور کرنے کے لئے جو کچھ کر سکتی ہیں کرتی رہیں گی۔

مسز بیتی چکرورتی

مسز چکرورتی ایک فوجی کرنل کی بیوی ہیں جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ مسز چکرورتی اپنے شوہر کے ساتھ دہلی کی ڈیفنس کالونی میں رہتی ہیں۔

۴۳ سالہ مسز چکرورتی دنیا کے بیشتر ممالک کا دورہ کر چکی ہیں جہاں انھوں نے ہزاروں ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کے سامنے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ مسز چکرورتی کو دنیا کے سامنے شام کے سفیر ڈاکٹر عمر ابوریش لائے۔ شروع میں مسز چکرورتی کو صرف ان کے جان پہچان والے اور رشتے دار ہی جانتے تھے۔ ڈاکٹر عمر کا علاج کرنے کے بعد انکو شہرت ملنی شروع ہو گئی۔ اب مسز چکرورتی کی شہرت دنیا کے بہت سے ملکوں میں پھیل چکی ہے اور وہاں کے بڑے بڑے ڈاکٹر اور سائنس داں مسز چکرورتی کو اپنے ملک آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسز چکرورتی سے علاج کے بعد مرض ایک بار پھر ابھر آتا ہے اس لئے مسز چکرورتی کا کہنا ہے کہ مریض کو ان کے علاج کے ساتھ ساتھ ڈاکٹری علاج بھی جاری رکھنا چاہیئے۔

"میرا کام مرض کی صحیح صحیح تشخیص کرنا ہے مکمل علاج ڈاکٹروں کا کام ہے"۔

ویسے معمولی اور عام بیماریاں عام طور پر مسز چکرورتی کے علاج سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہیں۔ ■

فیشن
۱۹۷۱
مشرق میں

فیشن ۱۹۷۱
مغرب
میں

خواب جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا

مورخوں سے چنگیز خاں اور اس کی شخصیت کے سمجھنے میں یا تو غلطی ہوئی ہے یا جان بوجھ کر انھوں نے چنگیز خاں کے حقیقی حالات اور اس کے سیاسی تصورات سے چشم پوشی کی ہے۔ تاریخ میں جگہ جگہ ہمیں اس کی دہشت اور بربریت کے واقعات ملتے ہیں جنہیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ مورخوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی کثیر تعداد کے بل بوتے پر ہی ہر جگہ فاتح اور غالب رہتا تھا۔ حالانکہ حقیقت اسکے برخلاف ہے۔ ایک مشہور چینی سیاح ژٹ سنگ اپنے سفرنامے میں چنگیز خاں کے متعلق لکھتا ہے کہ "بلاشبہ اس کے ساتھیوں کی تعداد کم تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی ہر مہم اور ہر معرکہ میں کامیاب رہتا تھا۔"

چنگیز خاں کو بھی سکندر اعظم کی طرح ساری دنیا پر حکومت کرنے کا بے پایاں شوق تھا مگر جو بات چنگیز خاں کو سکندر سے الگ کر کے ایک منفرد حیثیت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ چنگیز ساری دنیا کو صرف فتح کرنا چاہتا تھا بلکہ اسکی تنظیم کر کے اسے ایک ورلڈ اسٹیٹ (ایک متحد آفاقی ریاست) کی حیثیت دینا چاہتا تھا۔

اگرچہ تیرھویں صدی عیسوی میں بیشتر اقوام عالم تہذیب و تمدن کی دنیا میں اپنا مقام بنا چکی تھیں لیکن اُن میں ایک اچھی حکومت اور اچھے نظم و نسق کا فقدان تھا۔ ایسے وقت میں چنگیز اور اسکے منگول ساتھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ساری دنیا کو فتح کرنے اور اسے ایک متحد دنیا کا روپ دینے کے لئے چل دیتے ہیں۔ چنگیز خاں کا سیاسی نظریہ تھا کہ ہر مفتوحہ ملک یا ریاست کو پوری پوری مذہبی آزادی دی جائے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس ملک کے کلچر، فنون لطیفہ اور روایات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ چنگیز خان ایسا آدمی علماء اور پنڈتوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ منگولوں کا دستور یہ تھا کہ وہ مفتوحہ ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔ خود منگولوں کا ایک کوڈ آف لاء (مجموعۂ قوانین) تھا جس کی وہ بڑی سختی سے پیروی کرتے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ منگول اپنے کوڈ آف لاء کو اپنے مفتوحہ ممالک پر کبھی مسلط نہ کرتے تھے۔ چنگیز خاں کا مقصد یہی تھا کہ الگ الگ تہذیبوں پر مشتمل ایک ورلڈ اسٹیٹ کی تنظیم کی جائے۔ جس پر منگول اور صرف منگول حکومت کریں۔

چنگیز خان نے ۲۰ سال کی عمر میں اپنی مہمات کا آغاز کیا اور جب وہ اپنے تمام منگول ساتھیوں کو منظم کر کے اپنی مہم پر روانہ ہوا تو اسکی عمر کافی ہو چکی تھی، وہ بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔

چنگیز خاں کے ابتدائی حالات کے بارے میں ہماری معلومات کم ہیں۔ مگر اس کی ابتدائی زندگی کا ایک صاف اور واضح واقعہ

آرتھر آس بورن

تلخیص:۔ سید عارف نعمانی

ایسا ملتا ہے جس سے ہمیں اسکے بے پناہ اقتدار کا اندازہ ہوتا ہے یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

چنگیز خاں کے لڑکپن کا ایک ساتھی اتفاق سے منگولوں کا ایک اعلیٰ مذہبی پیشوا بنا دیا گیا۔ ایک دن نہ جانے کیوں اس پیشوا کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اسے وہ عزت نہیں ملی ہے جس کا وہ مستحق تھا۔ لہٰذا اپنے اس غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے اُس نے چنگیز خان کے ایک بھائی کو پھانسی پر لٹکا دینے کا حکم جاری کیا۔ چنگیز کا بھائی بھاگ آیا اور چنگیز کے گھر میں پناہ گزین ہو گیا۔ مذہبی پیشوا بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا چنگیز کے

پیشوا کا تقاضا تھا کہ اس کے احکامات کے مطابق چنگیز کے بھائی کو فوراً سولی پر لٹکا دیا جائے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس دور میں منگولوں کے قانون کے مطابق روحانی اقتدار کو شاہی اقتدار پر فوقیت حاصل تھی چنگیز خاں کو مذہبی حکم کے آگے تسلیم خم کرنا تھا، وہ مجبور اور چپ چاپ پیشوا کے آگے کھڑا رہا۔ اپنے نازک اور فیصلہ کن موڑ پر چنگیز کی معمر ماں نے چنگیز کو بغاوت پر اکسایا اور اس سے کہا " دیکھو وہ تمہارا بھائی ہے۔ اُس نے بھی تمہاری طرح میرا دودھ پیا ہے، کیا تم اس عالم پیشوا کو اس بات کی اجازت دے دو گے کہ وہ تمہارے سگے تمہارے بھائی کو پھانسی پر چڑھا دے ؟ یہ تم کیسے بادشاہ ہو ؟ چنگیز نے اپنی ماں کی باتوں کو سنا۔ اب اس کے اندر ایک سرکش جذبے نے سر اٹھایا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ مذہبی پیشوا کو پھانسی پر لٹکا دیں یا اس کا گلا گھونٹ دیں یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ منگول اپنی عملداری میں خون دیکھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ واقعہ ایک بڑے انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے چنگیز اس دور انقلاب کا محرک تھا۔ اس نے روحانی انقلاب کو چیلنج کر کے ایک نئے عہد کا آغاز کیا تھا اور خود ایک مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے اُبھر آیا تھا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد اس نے فرمان جاری کیا " خدا ایک ہے اور وہی زندگی اور موت کا دینے والا ہے۔ تمام مذہب سچے اور تمام تہذیبیں قابل قدر ہیں۔ منگول ساری دنیا کو فتح کرنے اور اُس پر حکومت کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ہر منگولی ایک بہترین سپاہی ہونے کے علاوہ ایک آزاد آدمی بھی ہے۔ منگولوں کے لئے امن اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کے دشمن پوری طرح ان کے ماتحت نہ ہو جائیں۔ ہر مفتوحہ ملک کے مذہب، کلچر اور فن کا پورا پورا تحفظ ہوگا۔ پجاریوں اور عالموں سے ٹیکس وصول نہ کیا جائے گا! اور نہ ان سے کوئی جسمانی کام لیا جائے گا۔ چوری کرنے والے کو موت کی سزا دی جائے گی زانیوں کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے جائیں گے۔ ہر فرد کو آزادی دی جاتی ہے کہ وہ جتنی چاہے اتنی بیویاں رکھے مگر شرط یہ ہے کہ ہر بیوی کو الگ مکان میں رکھا جائے۔"

منگول بڑے پُر اعتماد ہوتے تھے۔ ان کو ہر جگہ اپنی کامیابی کا عین الیقین ہوتا تھا ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا کو فتح کرنا ان کا ایک مقدس فریضہ ہے شکست کے امکانات پر منگول غور کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

چین منگولی حملہ کا سب سے پہلا نشانہ بنا۔ صدیوں سے منگول چین سے پُرامن تجارتی تعلقات قائم کئے ہوئے تھے مگر اب چنگیز کی رہنمائی میں انہوں نے چین پر حملہ کر دیا۔ ہر سال وہ ایک نہ ایک چینی شہر کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے، اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ چین جیسا مضبوط ملک کمزوری کا شکار ہو گیا ملک بھر میں جب سیاسی انتشار پھیل گیا تو منگول آسانی سے چین پر قابض ہو گئے۔ چین میں منگولوں کو چند ایسے اسلحہ کا علم ہوا جن سے وہ واقف نہ تھے۔ منگول بڑی تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ وہ ہمیشہ ہلکے اور کم وزن ہتھیاروں کا استعمال کرتے تھے اور سواری کے لئے چھوٹے قد کے گھوڑوں کو استعمال میں لاتے تھے تاکہ دشمن یہ جان نہ سکے کہ وہ کس رُخ سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ان کا نشانہ ہمیشہ مخالف بادشاہ اور اس کی خاص فوج ہوتا۔ وہ بادشاہ اور اس کے محافظین پر اس طرح اچانک ٹوٹ پڑتے کہ انہیں دفاع کا موقع ہی نہ ملتا۔

منگولوں کی یہ عادت تھی کہ وہ پہلے ہی سے اپنی وحشت اور بربریت کے قصے مشہور کر دیتے تاکہ مقابلہ سے گھبرا کر مخالف بادشاہ ان کو حاکم مان لے۔ منگولوں کا ایک باقاعدہ محکمہ راز بھی تھا جس کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ دشمن کی سیاسی حالت، اور اس کی فوجی طاقت کا پتہ چلائے۔

منگولوں کا دوسرا نشانہ ہندوستان تھا۔ منگول یکایک دلی میں گھس آئے۔ محمد بن تغلق جو اس وقت دلی کا سلطان تھا ان کی کارروائیوں سے گھبرا اٹھا۔ اس نے منگولوں سے اپنی کارروائی روکنے کی گذارش کی اور ایک کثیر رقم کے علاوہ سونے، چاندی اور جواہرات کے نذرانے دیئے۔ منگولوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان سے لوٹ گئی مگر خود چنگیز خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ رکا رہا۔ اس نے اپنے ایک جنرل کو روس کی طرف روانہ کیا یہ منگولی جنرل وہاں سے کامیاب واپس آیا منگول جنرل اور اس کے ساتھیوں کی برق رفتاری ہی ان کی کامیابی کا راز ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ چنگیز خاں کو موسم کا بھی بڑا خیال تھا حملے کے لئے اس نے موسم گرما کے بدلے موسم سرما کو منتخب کیا۔ جبکہ کریمیا کے میدان برف سے ڈھکے رہتے ہیں منگولی جنرل کو حکم تھا کہ وہ موسم بہار سے پہلے ہی وہاں سے لوٹ آئے۔

براعظم یورپ کا پہلا ملک جس پر منگولوں نے حملہ کیا وہ ہنگری تھا جو پورے براعظم میں ایک انسانی ٹانگ کی طرح چلا گیا ہے۔ ہنگری کے دو شہر پولینڈ اور لتھونیا پر منگولوں نے پے در پے حملے کئے۔ شروع شروع میں اہل ہنگری کا خیال تھا کہ چنگیز خاں اور اس کے ساتھیوں کا مقصد ہنگری میں صرف لوٹ، غارتگری اور ہنگامے مچانا ہے مگر بعد میں ان کو پتہ چل گیا کہ چنگیز خاں ہنگری کو ہمیشہ کے لئے لنگڑا کر کے چھوڑنا چاہتا ہے۔ یورپ پر حملے کے تیسرے سال منگولوں نے بیک وقت ہنگری اور پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ منگولی فوجیں متوازی طور پر پولینڈ اور ہنگری میں داخل ہو گئیں منگولوں کے حملے سے گھبرا کر جرمنی کے حکمران نے تمام یورپ کے عیسائی ممالک کے حکمرانوں سے اپیل کی کہ وہ متحد ہو کر حملہ آور کا مقابلہ کریں۔ مگر عیسائی ممالک اس وقت گروہ بندی اور فرقہ پرستی کا شکار تھے۔ چنانچہ جب جرمن حکمران کی اپیل کارگر ثابت نہ ہوئی تو اس نے تنہا چنگیز خاں سے مقابلہ کی ٹھانی اور ایک بھاری فوج کی تنظیم کر کے مقابلہ کے لئے نکل پڑا۔ جنگ کے پہلے ہی دن منگولی فوج جرمن فوج کو تتر بتر کرنے میں کامیاب ہو گئی مگر اصل کامیابی ابھی دور تھی منگولی فوج نے اس جنگ میں اپنی تمام صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور خاص طور پر تیر کمان کے وہ جوہر دکھائے کہ جرمن فوج میں دہشت کی ایک لہر سی دوڑ گئی ۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی کہ جرمن فوجوں نے اچانک منگولوں کے کیمپوں پر حملہ کر دیا مگر وہاں تمام منگولی کیمپ خالی پڑے تھے منگولی فوج راتوں رات پر اسرار طور پر غائب ہو چکی تھی۔ اس واقعہ کے تیسرے دن منگولوں نے پورے ہنگری کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہنگری شعلوں کی نذر ہو گیا اور انہیں شعلوں میں کہیں شاہ ہنگری کی لاش بھی جل رہی تھی۔

چنگیز خاں اپنے مقصد میں ہر جگہ کامیاب رہا مگر اب اس کی عمر کے دن ختم ہو چکے تھے۔ ایک رات وہ ایسی نیند سو یا کہ پھر اُٹھ نہ سکا۔

چنگیز کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام منگولوں میں پھیل گئی۔ منگولی اپنے تمام کام دھندے چھوڑ کر اپنے پایہ تخت قراقرم میں جمع ہونے لگے۔ ان کے سامنے اب ایک ہی مسئلہ تھا، چنگیز خاں کا جانشین کون ہوگا ؟ انہیں اب ایک ایسے جانشین کو منتخب کرنا تھا جو چنگیز کے خاندان ہی کا فرد ہو اور چنگیز جیسا بہادر اور قابل بھی ہو۔ آخر کار منگول سرداروں نے قبلائی خان کو چنگیز کا جانشین مقرر کیا۔ دو صدی تک منگول حکمران رہے۔ قبلائی خان نے چین پر ایک بار پھر اپنا تسلط جمایا مگر چنگیز کا خواب پورا نہ ہو سکا۔

منگول ایک وسیع سلطنت کے حکمران تھے مگر ان کے

ایک ووٹر کی سرگذشت

(طنزیہ)

ڈی۔ کے۔ کنول

میں نہ سادھو ہوں اور نہ شیطان۔ میرا نام فقیر چند ہے اور میرے باپ کا نام بھولا چند تھا۔ میں گنڈیریاں بیچا کرتا ہوں۔ اور میرا باپ بھی گنڈیریاں بیچا کرتا تھا۔ آزاد ہونے سے پہلے بھی ہمارا یہی پیشہ تھا اور آزاد ہونے کے بعد بھی یہی ہے ——— ۔

میں نہ سادھو ہوں اور نہ شیطان۔ میرا نام فقیر چند ہے اور میرے باپ کا نام بھولا چند تھا۔ میں گنڈیریاں بیچا کرتا ہوں، میرا باپ بھی گنڈیریاں بیچا کرتا تھا۔ آزاد ہونے سے پہلے بھی ہمارا یہی پیشہ تھا اور آزاد ہونے کے بعد بھی یہی ہے۔

میرا باپ بہت ہی بھولا تھا، شاید اسی لئے اس کے ماں باپ نے اس کا نام بھولا چند رکھا تھا۔ اس نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا اور بیچارہ مارا گیا۔ مرتے سمے اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اکھڑی اکھڑی سانسوں میں بولا :۔

" بیٹا فقیر چند میں جا رہا ہوں! تمھیں چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے جا رہا ہوں۔ زندگی بھر میں نے مکھیاں ماری ہیں! (کیونکہ گڑ اور مکھی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے) اس لئے میں کوئی جائداد نہ بنا سکا، مگر مرتے مرتے تمھارے لئے ایک ایسی جائداد چھوڑ رہا ہوں جسے حاصل کرنے کے لئے مجھے جان کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ وہ جائداد "آزادی" ہے اسے سنبھال کر رکھنا "

اتنا کہہ کر اس کی آواز خاموش ہوگئی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیے ۔

میں نے اپنے مرحوم باپ بھولا چند کی آخری خواہش کے مطابق آزادی کو سینے سے لگا یا۔ آزادی جو ایک چوسی ہوئی گنڈیری ہے، میں نے اس گنڈیری کی حفاظت کی اور ایک بھی مکھی کو اس پہ بیٹھنے نہیں دیا۔ میں نے محلے کے ایک ودیارتھی کو اس لئے پیٹا تھا کہ وہ پانی پی پی کر آزادی کو کوس رہا تھا، اور اس کے دانت توڑنے کے جرم میں مجھے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔

چودھری ظالم سنگھ جس نے ہمارے محلے سے الیکشن لڑا تھا ایک مرتبہ (الیکشن سے پہلے) میرے پاس آیا اور میرے پاؤں پکڑ کر بولا :۔

" بابو فقیر چند جی ! میں عوام کے جائز مطالبات منوانے کے لئے، انھیں جائز حقوق دلانے کے لئے، بیروزگاروں کو روزی، بھوکوں کو پوری کچوری اور ننگوں کو کپڑا لتا مہیا کرانے کے لئے پارلیمنٹ میں جا رہا ہوں، آپ مجھے ووٹ دیں گے تو میں آپ کی سیوا کر سکوں گا۔ فقیر چند جی میں آپ کی ریڑھی کو بہت بڑی دوکان میں تبدیل کرادوں گا۔ آپ مجھے ووٹ دیجئے۔ آپ مجھے ووٹ دیں گے نا۔ بولو فقیر چند " ؟

وہ رونے لگا " اگر مجھے ووٹ نہ ملے تو میں مارا جاؤنگا میں برباد ہو جاؤں گا۔ میری ضمانت ضبط ہو جائے گی "۔

میں نے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے سر پہ پیار بھرا ہاتھ پھیرا اور کہا :۔

" ظالم سنگھ نہ رو۔ میں تمھیں ہارنے نہیں دوں گا۔ میں تمھیں ووٹ دونگا۔ اطمینان رکھو "۔

وہ میرے پاؤں سے لپٹ گیا اور اس نے میرے تلووں کے چٹ پٹ کئی بوسے لے لئے ——— ہائے لیڈری !۔

میں نے اپنا ووٹ ظالم سنگھ کو دے دیا۔ اپنے محلے میں اس کے حق میں پروپیگنڈا کیا۔ ظالم سنگھ کامیاب ہوگیا اور پارلیمنٹ میں پہونچ گیا ——— اس روز کے بعد میں نے اسے پھر کبھی نہ دیکھا۔

پانچ برس بعد وہ میرے پاس پھر آیا اور ایک بار پھر میرے پاؤں پکڑ لئے اور تلوے چاٹنے لگا۔

" فقیر چند جی ! آپ میرے ماں باپ ہیں، آپ ہی میرے بھگوان ہیں۔ پچھلے الیکشن میں مجھے آپ کے ووٹوں نے ہی جتایا تھا۔ اس بار بھی "۔

" اس بار آپ کا پروگرام (مینی فیسٹو) کیا ہے "؟

" سوشلزم "۔

" نہیں سیکولرازم۔ تم جنتا کے سیوک تھے۔ تم ننگوں کو کپڑا، بھوکوں کو روٹی اور بے روزگاروں کو روزگار دلانے گئے تھے نا "۔

" ہاں میں گیا تھا مگر میں خود بھوکا اور ننگا تھا اس لئے پہلے مجھے خود اپنے آپ کو ڈھانپنا پڑا۔ اپنا پیٹ بھرنا پڑا "۔

" تو تم اپنا پیٹ بھرتے رہو۔ اپنا تن کو ڈھانپتے رہو۔ لیکن سوشلزم کو گالی نہ دو۔ جنتا کو دھوکا نہ دو۔ لوگ سیدھے سادے ہیں، بھولے بھالے ہیں اسی لئے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ تم لوگ

واقعات مشہور ہیں

کیا پروفیسر ہمیں نظر نہ آنے والی سیاہی کا راز بتائیں گے ؟

بکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں، میرا باپ بھی بھولا تھا
ی لئے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

ظالم سنگھ رونے لگا۔ ■ مگر مجھے کے آنسو رو رہا تھا اور
سکرا رہا تھا۔ اس پر شماتت آمیز قہقہے لگانا چاہتا تھا۔ اس
ہوئے آنسو مجھے دھوکا نہیں دے سکتے تھے کیونکہ لیڈر ایک
ہے، ایکٹر جو ناٹک کرتا جانتا ہے، سوانگ رچانا جانتا ہے
ں کی آنکھوں سے اصلی آنسو نہیں بلکہ گلیسرین کے آنسو
ہیں۔

ظالم سنگھ کے مقابلے میں نہال چند نے الیکشن لڑا۔
یاب ہو گیا۔ میٹھے سبھاؤ، ٹھنڈے مزاج کا نہال چند
برسوں اہنسا کی سیوا کی تھی، جس نے بے روزگار اندولن میں
ے کھائے تھے (کیونکہ وہ خود بھی بے روزگار تھا) آزادی
طرح وہ کئی بار جیل بھی گیا تھا اس لئے ووٹ کا اصلی حقدار
ہی تھا۔

جب میرے چار ننگ دھڑنگ بچوں کی ماں نے
یہ پوچھا۔
"کیوں جی کب آئے گا یہ سوشلزم"!
"سوشلزم"۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "میرے
ہ دھڑنگ بچوں کی ماں، سوشلزم آئے گا اور بہت جلد
سوشلزم لانے والا نہال چند سوشلزم لے کر ہی آئیگا۔"
میری اکلوتی بیوی نے تھالی میرے سر پر ماری اور
پر ایک چپت مار کر بولی :۔
"گھر میں آٹے دال کا کال ہے اور تم سوشلزم کی رٹ
ہے ہو۔ میں کہتی ہوں تم احمق ہو۔ گدھے ہو نرے گدھے"
خوب بھلی کٹی سن کر میں اپنا سر سہلاتا ہوا باہر چلا گیا
دفعتاً مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ نہال چند سے پوچھا جائے
زم کب آئے گا۔

جب چپراسی نے مجھے نہال چند کے کمرے میں پہنچا دیا
چند نے میرے سراپا کا بغور جائزہ لیا اور میری طرف
اہوں سے دیکھ کر بولا۔
"کون ہو تم"!
"میں نقیر چند ہوں۔"
"نقیر چند!۔ کون نقیر چند؟"
"میں آپ کی جنتا ہوں، میں نے آپ کو ووٹ
تھا آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ سوشلزم
لائیں گے۔ میرے گھر میں آٹا دال نہیں، ایک طرف قرضدار
میری جان کے لاگو ہو چکے ہیں اور دوسری جانب میری بیوی
مجھے زندہ درگور کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ مجھے بتائیے کہ سوشلزم
کب آئے گا۔ کب آئے گا ---؟

نہال چند کے تیور بدل گئے اور وہ میری طرف تیکھی
نظروں سے دیکھ کر بولا۔
"میں پچھلے چند مہینوں سے سوشلزم کے معنی تلاش کر رہا ہوں
ابھی تک مجھے سوشلزم کے معنی معلوم نہ ہو سکے اگر تمہیں اس کے
معنی معلوم ہوں تو مجھے بتا دو تاکہ میں آواز بلند کر سکوں۔"
میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے
لیکن میں انہیں پی گیا۔ میرے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ
پھیل گئی اور میں نہال چند کی طرف تحقیر اور نفرت بھری نظروں
سے دیکھتا رہا قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں ایک رنگین تتلی نہال چند
کے کمرے میں داخل ہوئی اور نہال چند کی طرف لپکی۔ نہال چند نے
اس انگریزی تتلی کو گود میں بٹھایا اور میری طرف ایسی نگاہوں
سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔
"کیوں کباب میں ہڈی بننا چاہتے ہو، سوشلزم کے
متوالے۔ سوشلزم ایک دھوکا ہے ایک فریب ہے۔ ڈھکوسلا
ہے۔ سوشلزم ایک نعرہ ہے عمل نہیں۔ ایک خواب ہے لیکن
حقیقت نہیں۔"

میں نے اپنے خوابوں کے کفن سے اپنی آرزوؤں کو ڈھانپا
اور ٹوٹا ہوا دل لے کر گھر پہنچا۔ دروازے پر میری بیوی کھڑی
تھی۔ میری ستری بسی رانی مجھے دیکھ کر وہ میری جانب لپکی
اور میرے پاؤں پر گر کر بولی :۔
"مجھے شما کر دو منے کے باپو، مجھے معاف کر دو اگر تم مجھے معاف
نہیں کرو گے تو میں اپنی جان دے دوں گی گلے میں پھندا ڈال کر
خودکشی کر لوں گی۔"
"نہیں نہیں ایسا نہ کرنا منے کی ماں ورنہ میں رنڈوا ہو جاؤنگا
رنڈوا ہو جاؤں گا۔"

میں اپنی بیوی سے لپٹ کر رونے لگا۔ ایک شیر خوار بچے
کی طرح زار و قطار رونے لگا۔ میری بیوی نے اپنی پھٹی پرانی ساڑی
کے پلو سے میرے آنسو پونچھے اور مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔
"غم نہ کرو منے کے باپو۔ بھول جاؤ سوشلزم کو۔ بھول جاؤ
ان فریبیوں کو، پانچ سال بیت جانے دو۔ یہ لوگ پھر ووٹ
مانگنے آئیں گے۔ جس طرح ہمیں رلا چکے ہیں، تڑپا چکے ہیں اسی
طرح ہم بھی انہیں تڑپائیں گے انہیں رلائیں گے اگلے الیکشن میں
میں بھی کھڑی ہو جاؤں گی اور سوشلزم لے کر ہی دم لوں گی۔"
میں نے اپنی بیوی کی طرف گردن اٹھا کر دیکھا۔ میری ستری
بسی بیوی مجھے اس وقت بڑی دل آویز اور خوب صورت لگی۔
میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ ■

چاند کا ایک کا جب آسمان پر گھا کر تار کی چلتی سڑک کے
کنارے کنارے کھڑے فلک بوس درختوں نے چاندنی کو اپنی لمبی
باہوں میں سمیٹ لیا اور وہ اپنے خیالوں میں شہلا کے خیالوں کی
چاندنی جانے چلا جا رہا تھا۔ کرتار کی طویل سڑک پر پھیلی ہوئی چاندنی
کی چلمن سے گزرتا ہوا وہ انجانی دنیا میں پہنچ گیا جہاں سبھی اجنبی
تھے صرف ایک چہرہ جانا پہچانا تھا اور وہ اس چہرے کو دیکھ رہا تھا
جو غالب کا کوئی حسین شعر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس جسم کو دیکھ
رہا تھا جو چاندنی میں بھیگا کھڑا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا
جیسے چاندنی پگھل کر شہلا بن گئی ہو۔ تخیل کی دنیا میں انسان بھٹک
رہا ہو۔ کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہ تھی۔ کوئی بات اس پر

کرتا تھا۔ جھیل خاموش تھی شہلا کی آنکھوں کی طرح۔ چاندنی
جھیل کے سینے پر رقصاں تھی وہاں وہ بیٹھ گیا۔ گزرے ہوئے
لمحوں کو سمیٹا، یادوں کے کنول جھیل میں کھل اٹھے۔

"جھیل کتنی گہری ہے؟" ایک دن شہلا نے پوچھا تھا۔

"تمہاری محبت جتنی گہری ہے۔" گہرے سوال کا گہرا
جواب دیا گیا۔

لیکن انسان زندگی کے وسیع دائرے میں ایک ایٹم کی طرح
ہے۔ ایک ننھا سا ذرہ ہے جو وقت کے ریگستان میں پڑا تپ
رہا ہے۔ ریگستان میں اٹھتے ہوئے بگولوں کے سامنے اس ننھے سے
ذرے کی حقیقت کیا ہے؟ ہو سکتا ہے پوری دنیا ایک ایٹم ہو

لگا۔ پھر بھی اسے سکون نہ ملا۔ اس نے سگریٹ بجھا دیا اور چھوٹی
چھوٹی کنکریاں اٹھا کر دریا میں پھینکنے لگا۔ خاموش جھیل
میں ترنگیں پیدا ہونے لگیں۔ جب وہ انتظار سے بالکل اکتا
گیا تو تھکے ہارے جسم سے اٹھا اور بوجھل قدموں سے چل پڑا۔
چاند آ گیا تھا، چکور ہی نہ آ سکا۔ اب چاند چکور کی تلاش
میں جا رہا تھا۔

آرکسٹرا گنگنا رہا تھا۔ کلب کے بلوریں فرش پر مرمریں جسم
مضبوط بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھرک رہے تھے۔ تسکین کی
تلاش میں جسم سے جسم لپٹے ہوئے تھے لیکن تسکین ملتی کہاں
ہے! پیاس بجھتی نہیں بڑھتی ہے۔ ان جسموں میں کیا رکھا ہے

الف، اے، بادشاہ

زہر کی شیشی

اثر انداز نہ تھی۔ بس وہ تھا، اس کے حسین خیال تھے۔ عرصہ دراز سے
چلتی ہوئی اس دنیا میں کتنے طوفان اٹھے ہیں، کتنے انقلاب آئے
ہیں پھر بھی زندگی کا کارواں وقت کے کارواں کے ساتھ منزل کی طرف
بڑھتا ہی رہا ہے۔ لیکن منزل کہاں ہے؟ یہ کیسا فریب ہے
جو انسان اپنے آپ کو ہزارہا سال سے دیتا آ رہا ہے۔ یہ خاموش
طویل راستے کہاں جاتے ہیں کوئی بھی نہ جان سکا، ہزاروں
لوگ اس پر آتے ہیں اور نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔ اور وہ
انہی راستوں پر زندگی کی تصویر بنا رہا تھا۔ ہوا کا ایک لطیف
جھونکا آیا اور چاندنی کی چلمن جنبش کرنے لگی اور اسے محسوس ہوا
جیسے شہلا اپنے دلفریب رنگین چلمن کی اوٹ میں آ گئی ہو۔
وہ جھیل کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ اکثر اپنی محبوبہ سے ملا

جو پورے یونیورس میں حرکت کر رہی ہو۔ وقت کے ہاتھوں زندگی
کی ناکامیاں کتنی دل شکستہ ہوتی ہیں لیکن وہ خیالوں کے
رنگین تانے بانے بنتا رہا۔ دل کی دھڑکنوں نے ساز چھیڑ رکھا
تھا اور ہونٹ محبت کے گیت گنگنا رہے تھے۔ لیکن دل کی
دھڑکنوں کا کیا بھروسہ کب تھم جائیں! دل کی رگیں کب پھٹ
جائیں کسے معلوم۔ پھر بھی وہ انتظار کر رہا تھا۔ لیکن انتظار کی
بھی حد ہوتی ہے، وہ انتظار سے اکتا رہا تھا۔ فضا کا سناٹا،
چاندنی کا سکون، جھیل کی خاموشی بے چین کر رہی تھی۔ آج
ہر شے گم صم تھی۔ شہلا جب آتی تھی تو اسے ہر شے بولتی
ہوئی محسوس ہوتی تھی، ہر طرف زندگی رقصاں ہوتی نظر آتی تھی
اس نے سگریٹ نکال کر جلایا اور فضا میں دھواں بکھیرنے

ہاں! ان میں آنند رس کی گہرائی میں اترو اور سوچو کہ تم
کیوں ہو۔ موت پر ہمیشہ کے لئے قابض ہو جاؤ تاکہ زندگی
کے بندھنوں سے آزاد ہو جائے۔

وہ کلب میں داخل ہوا۔ آرکسٹرا کی الجھی ہوئی دھنوں
الجھے ہوئے جسموں میں شہلا کو تلاش کیا۔ شہلا اجنبی بانہوں
میں گھری ہوئی رقص کر رہی تھی۔ اسے دل کی رگیں پھٹتی
محسوس ہوئیں وہ وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔ تیزی سے
نکل آیا۔ عرصہ دراز سے خوابوں کا بت اپنی بے نور آنکھوں
سے بس ایک ہی خواب دیکھتا آ رہا ہے۔ اندھیرا اجالا
اندھیرے اور اجالے سے گھری ہوئی زمانے کے نشیب
سے گزر رہی ہے۔ کبھی ٹھوکر کھا کر سنبھلتی ہے اور کبھی

ور کہانی ہے۔

سڑک کے کنارے کنارے اداس اور مضمحل وہ جا رہا تھا

بیار بکھری ہوئی زندگی میں ہنستے ہوئے آنسو روتی ہوئی

ی تھی۔ بھوک سے نڈھال بے جان سسکتے ہوئے جسم تھے

ایہ دلدوں کا پھیلا ہوا بھیانک قہقہہ تھا۔ یہ کونسی دنیا ہے!

سا نظام ہے۔ فریبی دنیا کے سبھی لوگ دھوکے کے غلاف میں

ہوئے ہیں۔ انکی ہنسی ان کے قہقہے کھوکھلے ہیں صرف۔

ں پر یہ لرزتے ہوئے درد بھرے آنسو حقیقت ہیں لیکن عارضی

اکی ہر شئے عارضی ہے زندگی کا ٹمٹماتا ہوا دیا ایک دن بجھ جائے

۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی وہ شہلا کے کمرے میں بیٹھا ہوا

کا انتظار کر رہا تھا۔ شہلا گنگناتی ہوئی داخل ہوئی اسے

دیکھ کر پہلے ٹھٹکی پھر سنبھل کر بولی۔

"ہیلو اعظم!"

"آج تمہارا ہمرقص کون تھا؟"

"وہ میرا منگیتر ہے۔ کل ہی لندن سے آیا ہے اور اب

ہم لوگ بہت جلد شادی کرنے والے ہیں"

"اپنے منگیتر کے بارے میں تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"جب وہ لندن میں تھا تو اس نے میرے پاس ایک

بھی خط نہیں لکھا۔ میں نے سمجھا کر وہ مجھے بھول گیا اسلئے اسکے

بارے میں بتانا ضروری نہیں سمجھا"

"اور تم مجھے آج تک دھوکا دیتی آئیں"

"اس میں دھوکہ کہاں ہے اعظم میں نے تو تمہیں

اپنا دوست بنایا تھا!"

"دوست سے اقرار محبت نہیں کیا جاتا"؟

"کیوں نہیں، دوستی کی محبت کا اقرار کیا جا سکتا ہے"

"اور شادی کا"!

"میں نے ایسا وعدہ نہیں کیا"

"تمہارے خطوط اب تک میرے پاس محفوظ ہیں

شہلا" اعظم کی زہریلی آواز کمرے کے سناٹے میں شہلا کو

بڑی بھیانک لگی تھی۔

"اور وہ تصویریں بھی حفاظت سے رکھی ہوئی ہیں جو تم

نے میرے ساتھ کھنچوائی تھیں" اور اس کے کچھ بولنے

سے پہلے ہی وہ کمرے سے جا چکا تھا۔

اب وہ تنہا کھڑی سوچ رہی تھی کیا اعظم اسے بلیک میل

کرے گا؟ تو پھر اس کا مستقبل کیا ہوگا اسے اپنا مستقبل

تاریک نظر آ رہا تھا وہ اپنے بستر پر رات دیر تک کروٹیں بدلتی

رہی لیکن نیند نہ آئی اور جب صبح ہوئی تو اس کے ہاتھ

میں زہر کی شیشی کانپ رہی تھی۔ آنکھوں میں دیوانگی سی

تھی۔ ہونٹوں پر زہر سے بجھی ہوئی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اس وقت عورت اپنے اصلی روپ میں کھڑی تھی جب وہ اپنا

مقام بھول جاتی ہے۔ اپنی زندگی سنوارنے کے لئے وہ کچھ نہیں

دیکھتی۔ وہ ہاتھ میں دبی زہر کی شیشی کو دیکھ رہی تھی جسکا ایک

قطرہ کسی کی سانسوں کا تسلسل توڑ دینے کے لئے کافی تھا۔

اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی اس نے جلدی سے

اس ہاتھ کو پیچھے کر لیا جس میں زہر کی شیشی تھی۔ وہ دھیرے

دھیرے دروازے کی طرف بڑھی اور قریب پہونچ کر کواڑ کھول

دیا لیکن وہاں اعظم کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اعظم

اس کا ارادہ بھانپ گیا ہو۔ اس نے بغور اس کے چہرے کو

دیکھا اسکا چہرہ سپاٹ تھا۔

"شہلا!" اعظم کی یہ آواز اسے بہت دور سے آتی ہوئی

محسوس ہوئی۔

"یہ دو لفافے ہیں، ایک میں تمہارے خطوط ہیں اور دوسرے

میں تصویریں!" شہلا نے انہیں کانپتے ہاتھوں سے لے لیا۔

"شہلا" اس نے پھر کہا۔ "محبت جسم نہیں ایک پاک

جذبہ ہے، ایک مقدس خیال ہے جسے صرف دل کی دھڑکنیں

ہی سمجھ سکتی ہیں، پرکھ سکتی ہیں!" اور وہ تیز تیز قدموں سے

چلا گیا۔ شہلا کے ہاتھ میں دبی ہوئی زہر کی شیشی چھوٹ کر

گری اور زہر فرش پر پھیل گیا اسے محسوس ہوا جیسے اعظم نے

اس کے حلق میں زہر کی پوری شیشی انڈیل دی ہو ■

گدھوں کی بین الاقوامی انجمن کی بنیاد

ومزاح)

ویہ فاطمہ

آخرکار سالہاسال کے بعد گدھوں کی محنت رنگ لائی اور "گدھستان" آزاد ہوگیا۔ آزادی کے بعد اس کا نیا نام "ڈنکی لینڈ" DONKEYLAND رکھا گیا۔ یہ نیا نام موڈرن قسم کے گدھوں نے تجویز کیا تھا۔ مسٹر جیکسن ڈنکی لینڈ کے پہلے صدر تھے۔ مسٹر جیکسن کو چونکہ اپنے وطن سے بیحد محبت تھی اسلئے انھوں نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی سب سے پہلے باغیوں یعنی ظالم قسم کے دھوبیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اور باقی دھوبیوں کو ان کے نرم رویہ کے عوض "ڈنکی لینڈ" سے جلد سے جلد نکل جانے کا حکم دیدیا۔ ڈنکی لینڈ کے دھوبی جب قطار در قطار کپڑوں کی گٹھری لئے کوچ کر رہے تھے تو بہت سے فسادی اور شرپسند گدھوں نے ان پر دھاوا بول دیا اور قیمتی قیمتی کپڑوں کی گٹھری لیکر فرار ہو گئے۔ ویسے بھی ابھی نئی آزاد مملکت میں فسادیوں کیلئے کوئی قانون جاری نہیں ہوا تھا اس لئے گدھا پولیس نے فسادی گدھوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور انکی شرارت کو نظرانداز کردیا گدھوں کی یہ شرپسندی صرف دھوبیوں تک ہی محدود تھی ورنہ ڈنکی لینڈ کے تمام گدھوں میں آپس میں اتفاق رائے تھا اور آزادی کے بعد ابتک گدھوں کی کسی جماعت نے نہ بغاوت کی کوشش کی اور نہ آپس میں خونریزی کی نوبت آئی جیساکہ عام طور سے ہوتا آیا ہے، اسلئے یہاں کی امن پسندی سے متاثر ہوکر یہاں کے سرکاری اخبار "ڈنکی ٹائمز" کے ایڈیٹر مسٹر کلائیو نے ڈنکی لینڈ کو اپنے اخبار میں "پیس لینڈ" "PEACE LAND" کا خطاب دیدیا۔

دھوبیوں کی آخری جماعت جب کوچ کرنے لگی تو ڈنکی لینڈ میں سرکاری تعطیل کا حکم دیدیا گیا۔ تعطیل کے روز "یوم گدھا" منانے کا بھی اعلان کر دیا گیا اتفاق سے اس روز اپریل کی پہلی تاریخ تھی۔ تمام ڈنکی لینڈ جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ ڈنکی لینڈ کے دارالسلطنت کا نام (DON KEY CITY) ڈنکی سٹی رکھا گیا۔ اس شہر کو گدھوں نے رنگ برنگی جھنڈیوں اور بجلی کے قمقموں سے دلہن کی طرح سجایا تھا۔ تمام شہر کے گدھے اور گدھے کے بچے خوبصورت لباس زیب تن کئے ہوئے خوشی کے مارے فضا میں ڈھینچوں ڈھینچوں کی صدائیں بلند کر رہے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو دولتیاں بھی جھاڑ رہے تھے۔

ڈنکی سٹی کے سب سے بڑے میدان "ڈنکی پارک" میں ایک بہت بڑا اور خوبصورت سا پنڈال بنایا گیا کیونکہ یہاں صدر ڈنکی لینڈ تشریف لانے والے تھے۔ سہ پہر ہوتے ہی تمام شہر کے گدھے چھوٹے چھوٹے جلوسوں کی شکل میں "انقلاب زندہ باد" "ڈنکی لینڈ ہے آئندہ" کا نعرہ لگاتے ہوئے ڈنکی پارک میں جمع ہوگئے۔ شام کے ٹھیک چھ بجتے ہی صدر ڈنکی لینڈ کی کار ڈنکی پارک میں داخل ہوئی اپنے صدر کی کار کو دیکھکر مجمع بے قابو ہوگیا۔ منتظم گدھوں نے بڑی مشکل سے گدھوں کو قابو میں کیا اور کچھ ہی منٹ بعد صد[ر] کار سے باہر آگئے وہ جدید طرز کے سوٹ میں ملبوس تھے انکی سامنے کی بائیں ٹانگ پر نئی گھڑی بندھی ہوئی تھی جسے دیکھا ہر گدھا بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ صدر وقت کے بڑے ہی پابند ہی[ں] صدر کو اپنے قریب دیکھکر گدھے ایک بار پھر نعرے لگانے لگ[ے] "صدر ڈنکی لینڈ زندہ باد"

صدر اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف بڑھ گئے۔ سب سے پہلے انھوں نے ڈنکی لینڈ کا قو[می] جھنڈا لہرایا۔ جھنڈا سفید رنگ کا تھا جس میں ایک گدھا ایک میدان میں گھاس پر لوٹتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ چھ بجکر دس م[نٹ] پر صدر کی تقریر تھی اسلئے وہ اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈالکر سیدھے مائیک پر آکر کھڑے ہوگئے۔ مسٹر کلائیو نے صد[ر] کے گلے میں پھولوں کا گجرا پہنایا۔ (فوراً ہی نامہ نگار گدھو[ں] کے کیمروں کا رُخ صدر کی طرف ہوگیا) صدر نے فاتحانہ اندا[ز] میں مسکرا کر مسٹر کلائیو کو دولتی جھاڑ کر اُن کا شکریہ ادا کیا ا[ور] پھر مجمع سے مخاطب ہوئے۔

میرے پیارے ہموطنو! آج کا دن ہمارے لئے بہت ہ[ی] مبارک دن ہے، آج ہم نے ظالم دھوبیوں سے نجات حا[صل] کرلی۔ آج ہمیں ہمارا حق مل گیا وہ حق جسے ازل سے د[ھوبیوں] نے چھین رکھا تھا۔ آج ہم "ڈنکی لینڈ" کی آزاد فضا میں سا[نس] لے سکتے ہیں اور آزادی کی گھاس کھا سکتے ہیں۔ کل تک [ہم] انسانوں کے غلام تھے اُن کے لئے ہم محنت کرتے تھے ا[ور] رہتے تھے اور پھر مر جاتے تھے۔ آج سے ہم اپنے لئے محن[ت] کریں گے اور اپنے لئے ہی جئیں گے اب ہماری قسمت میں سوکھی نہیں ہری ہری گھاس ہوگی۔ مجمع نے پھر ایک بار "زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔

صدر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے پیارے بھائیو! اب ہمیں بھول جانا چاہیئے کہ ہم کبھی انسانوں کے غلام تھے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کی بجائے اپنے مستقبل کی طرف نظر رکھیں اور ا[پنے] مستقبل کو زیادہ سے زیادہ شاندار اور روشن بنانے کی ک[وشش] کریں۔ آیئے آج ہم عہد کریں کہ آج سے ہمارا ہر قدم ترقی [کی] منزل کیجانب بڑھے گا۔ آج سے ہماری پیٹھ پر دھوبی [...]

گھڑی کا بوجھ نہیں بلکہ ڈنکی لینڈ کی ترقی کی ذمہ داری کا بوجھ ہوگا۔ میرے ڈنکی بھائیو! جب ہم ترقی کی منزل کیطرف گامزن رہیں گے تو تمام دُنیا کے گدھے یقیناً ہمارے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ اُس وقت ہمارا فرض ہوگا کہ ہم بھی تمام دُنیا کے گدھوں کی مدد کے لئے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھیں۔ چاہے اسکے لئے ہمیں "ایٹم بم" اور ہائیڈروجن بم" ہی کیوں نہ بنانا پڑیں۔ ہم ہر صورت سے دُنیا کے تمام گدھوں کی امداد کریں گے۔ مجمع نے جوش و خوشی میں ڈھینچوں ڈھینچوں کا نعرہ بلند کیا۔

صدر دو منٹ کیلئے خاموش ہو گئے جب مجمع کی ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز بند ہوئی تو انھوں نے پھر کہنا شروع کیا "بھائیو! آپ کو تو معلوم ہے کہ آج سے ہماری اپنی بحری، برّی اور ہوائی فوج ہوگی۔ میں اپنے سائنسداں گدھوں سے اُمید کرتا ہوں کہ وہ ہماری تینوں قسم کی افواج کیلئے نئے نئے اور خطرناک سامانِ جنگ تیار کرنے میں ہماری زیادہ سے زیادہ مدد کریں گے۔ اگرچہ ہمارے یہاں ابھی اعلیٰ دماغ کے ڈنکی سائنسداں موجود نہیں ہیں پھر بھی ہم اپنے سائنسدانوں کی مدد کیلئے دوسرے ملکوں سے اعلیٰ دماغ سائنسدانوں کا اغوا کرائیں گے اور ضرور کرائیں گے کیونکہ ہم اُس وقت تک تمام اخلاق کو بالائے طاق رکھدیں گے جبتک کہ ہم خود کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت نہیں کہلوا لیتے دُنیا ہمیں پست اخلاق کہے بلا سے۔ دنیا سے ہمیں کچھ لینا نہیں ہمیں صرف اپنی ترقی مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ ہم اپنی بھلائی کیلئے دنیا میں خون کی ندیاں بہانے سے بھی نہیں چوکیں گے کیونکہ اب ہم انسانوں کے غلام نہیں رہے بلکہ اب ہم ساری دنیا کو اپنا غلام بنالیں گے۔ (مجمع سے بیشک بیشک اور ضرور ضرور کی صدائیں بلند ہوئیں) دنیا کے انسانوں نے ابتک ہمیں صرف ایک ہی رُخ سے دیکھا ہے اسلئے ہمیں بے وقوف اور احمق سمجھتے رہے ہیں اب وہ ہمارا دوسرا رُخ بھی جلد ہی دیکھ لیں گے کیونکہ اب ہم بھی انسانوں کی طرح وحشت اور بربریت پر اتر آئینگے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اب دنیا میں بھی سچائی، انسانیت اور اخلاق نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے اسلئے میرے ڈنکی بھائیو جب انسانوں میں انسانیت باقی نہیں تو ہم تو ہر لحاظ سے جانور ہیں ہمیں انسانیت دکھلانے کی کونسی غرض پڑ گئی ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم خود کو بھی اور اپنی نئی نسل کو بھی انسانیت نام کی چیز سے

شری جگجیون رام نے کہا ہے کہ ہندوستان ابھی سوشلزم کے لئے پوری طرح تیار نہیں ہے۔
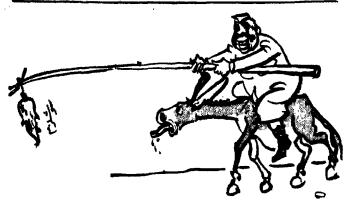
دور رکھیں تاکہ دنیا ہمارے قدموں میں ہو۔

اب صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم آپس میں اتفاق اور اتحاد سے رہیں اور "ڈنکی لینڈ" کی ترقی کیلئے جان و مال کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں۔

صدر کی تقریر ختم ہونے کے بعد مجمع نے جوش میں آکر پھر نعرے بلند کئے۔ اسکے بعد نائب صدر مسٹر ولیم تقویر کے لئے کھڑے ہوئے۔

"برادرانِ ڈنکی آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم نے صدیوں کی جد وجہد کے بعد آزادی حاصل کی ہے۔ اب ہمارے عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنی آزادی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں اور کسی باغی یا کسی غیر ملکی گدھے کی چال میں آکر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جس سے ہماری آزادی خطرے میں پڑ جائے۔ میں نے آپ لوگوں کو اس لئے متنبہ کیا ہے کہ ہم پھر بھی گدھے ہیں یعنی احمق اور بیوقوف گدھے اور اپنے اس احمق پن سے ہم خود کو اور اپنی مادرِ وطن "ڈنکی لینڈ" کو کبھی بھی خطرے میں ڈال سکتے ہیں کیونکہ ہم خود کو اپنی زبان سے لاکھ عقلمند کہیں پھر بھی ہم اپنی فطری عادت (یعنی احمق پن) سے کبھی منھ نہیں موڑ سکتے اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم خود کو بہت ہوشیار رکھیں ویسے باغیوں کیلئے حکومت نے بہت سخت قانون نافذ کر دیا ہے۔ اب میں حکومت کی طرف سے ایک اعلان کرتا ہوں جو ساری دنیا کے گدھوں کے لئے ہے" نائب صدر ایک منٹ کے لئے خاموش ہوئے۔ مجمع پر ایک خاموش نظر ڈالی اور پھر کہنا شروع کیا "آج یعنی پہلی اپریل سے ڈنکی لینڈ میں گدھوں کی ایک بین الاقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ جو تمام دنیا کے گدھوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کریگی۔ ہمیں اُمید ہے کہ تمام دنیا کے گدھے اس انجمن کے ممبر بنکر دانشمندی کا ثبوت دیں گے کیونکہ اسی میں اُنکی سلامتی ہے، ویسے اس انجمن میں ہر جانور خواہ وہ شیر ہو یا گیدڑ شریک ہوکر ممبر بن سکتا ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، کیونکہ یہ دراصل جانوروں کی ہی انجمن ہے البتہ کوئی انسان اس کا ممبر ہرگز نہیں بن سکتا۔ اب اعلان ختم ہوتا ہے"۔ نائب صدر کی تقریر کے بعد فوجی گدھوں نے پریڈ کی پریڈ کی سلامی لینے کے بعد صدر اور نائب صدر "ڈنکی ہاؤس" روانہ ہو گئے جہاں ڈنر کیلئے خاص قسم کی گھاس کا انتظام کیا گیا تھا۔

آج ہر گدھا خوش تھا۔ تقریر سننے کے بعد گدھوں کی کوئی جماعت ہوٹلوں میں گھس گئی جہاں آج گھاس "فری" (FREE) تھی اور کوئی جماعت سینما ہال میں سینما دیکھنے کے لئے چل پڑی کیونکہ آج فلم بھی فری دکھائی جا رہی تھی۔ ہر سینما میں ایک ہی فلم دکھائی جا رہی تھی جس کا نام تھا "ساون کا گدھا" اس فلم کو اُس فلمساز گدھے نے فلمایا تھا جسنے اپنے ملک کی آزادی سے بڑی دلچسپی لی تھی اور جو بڑی مدت سے ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔

رات کے بارہ بجنے کے بعد "ڈنکی لینڈ" کے گدھے آزادی کی گہری نیند کے مزے لینے لگے اور اس طرح وہ انجمن وجود میں آگئی جو آگے چل کر بڑے بڑے کارنامے دکھانے والی ہے۔

واقعات فہمیدہ علی

روایتی شاعر اور فلمی شاعر

اندازِ بیاں اور

(عبدالبصیر نعیمی)

مرزا غالب نے اپنی شاعری کے بارے میں دعویٰ کیا تھا کہ۔ ع۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب کا یہ دعویٰ ہوسکتا ہے خود ان کے دور تک ہی درست رہا ہو۔ مگر آجکل اس دعوے کو حقیقت بھلا کیسے کہا جاسکتا ہے کیونکہ آج کا دور فلمی دور ہے۔ اور اگر غالب آج زندہ ہوتے تو چشم حیرت بنے دیکھتے ہی رہجاتے اور فلمی شعرا اپنا کام کرجاتے ہمارے فلمی گیت غالب سنکر بے اختیار کہہ اُٹھتے کہ میرا اندازِ بیاں اور ہو نہ ہو پر انکا ہے اندازِ بیاں اور۔ غالب کے ایک مُرید سے ملاقات ہوئی فرمانے لگے "غالب صاحب بہت بڑے ساعر ہیں۔ چلم مرجا گالب ہیں وہ دھانسلو گیت لکھے ہیں کہ بس مجا آگیا"! اب انکی عقل کا ماتم کیجئے یا اپنے مقدر کو رو دیجئے وہ تو حسب توفیق غالب کی تعریف کر ہی گئے

صرف غالب ہی نہیں اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس نتیجہ پر پہونچینگے کہ قدیم شعرا کے مقابلہ میں فلمی شعرا کہیں زیادہ داد وتحسین کے مستحق ہیں۔ جو کام ادبی شعرا ساری زندگی نہ سکے وہ فلمی شعرانے چٹکی بجاتے ہی کر دکھایا۔ اب دیکھیئے نا غالب فرماتے ہیں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کتنی مایوسی اور کتنی بدنصیبی جھلکتی ہے اس شعر میں۔ بچے پڑھینگے تو ان کے نشوونما پہ ظاہر ہے برا اثر پڑیگا۔ ویسے بھی شعر گوئی ایسا کام کا نہیں۔ اس کے برخلاف فلم "دلّی کا ٹھگ" کے شاعر محترم فرماتے ہیں ع

سی اے ٹی کیٹ کیٹ معنی بلی، آر اے ٹی ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا
دل ہے تیرے پنجے میں تو کیا ہوا ہے

اور فلم "دل دیکے دیکھو" کے شاعر فرماتے ہیں۔ ع

دو اکم دو، دو دونی چار ہ تھوڑا تھوڑا دیدے میرے دلکو قرار

یہ دو گیت کتنے کارآمد ہیں۔ موسیقی کے ساتھ لطف اٹھائیے اور کچھ سیکھنے کا موقع الگ۔ فرض کیجئے آپکے بچوں کو پڑھانے کے لئے معلم نہیں مل رہا ہے۔ آپ ذرا بھی نہ گھبرائیں اور نہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے فکرمند ہوں۔ بس یہ کیجئے کہ بازار سے یہ دو ریکارڈ خرید لایئے اور بچوں کو دیدیجئے۔ آپ یہ دیکھ کر حیران رہجائینگے کہ بچے صرف دو دن میں نہ صرف انگریزی فرفر بولنے لگے ہیں بلکہ پہاڑا بھی یاد ہوگیا ہے۔ اسے کہتے ہیں ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

صرف یہ ہی نہیں کہ فلمی شعرا قوم کے لئے معلوماتی گیت لکھ کر قوم کو اپنے احسان کے بوجھ سے دبا رہے ہیں بلکہ شاعری میں نئی نئی ترکیبوں کا استعمال فرماکر قدیم شعرا کی ارواح کو شرمسار بھی کرتے جارہے ہیں۔ مثال کے طور پر فلم "جوانی کی ہوا" میں شاعر موصوف فرماتے ہیں۔ ع۔

چندا کے پاس اک تارا ہ ڈر ڈر ڈڈار ڈر ڈارہ۔

ملاحظہ فرمایا۔ ایسا سحر کا شعر قدیم شعرا بھلا کاہے کو کہہ سکتے تھے ہوسکتا ہے اس شعر کے لئے آپ کہدیں کہ یہ کوئی زیادہ نئی بات نہیں ہوئی۔ مطلب صاف ہے تو پھر فلم "آشا" کا یہ شعر دیکھئے۔

اینا مینا ڈیکا ڈین ڈائی ڈامنیکا ہ چھیکا پھیکا رولا ریکا رم پم پو

اب آپ کیا کہتے ہیں۔ بتایئے ہے نہ بالکل نیا فلسفہ اب اگر آپ یہ شکایت کریں کہ اس کا تو کچھ مطلب ہی نہ ہوا تو اس کا صرف یہ جواب ہے کہ فلسفہ ہر کسی کی سمجھ میں آجائے تو ہر کوئی فلاسفر نہ ہوجائے۔

ہمارے اکثر فلمی شعرا نے یہ سوچا کہ قدیم شعرا اپنی شاعری میں بڑی بڑی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ کیوں نہ ان غلطیوں کی اصلاح کیجائے تاکہ قوم کے ساتھ ادب پر بھی احسان ہو۔ پس یہ سوچ کر چند فلمی شعرا نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور قدیم شعرا کی غزلوں پر اصلاح کرنی شروع کردی۔

مجاز لکھنوی نے اپنی نظم "خاتونِ مشرق سے خطاب" میں ایک شعر کہا۔ ع۔

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

فلم "ماڈرن گرل" کے شاعر کو یہ شعر غلط معلوم ہوا اور اُنھوں نے اصلاح فرمائی۔

تیرے ماتھے پہ لہراتے ہوئے آنچل کا کیا کہنا
تو اس آنچل سے اک گھونگھٹ بنالیتی تو اچھا تھا

مجاز لکھنوی فرماتے ہیں۔ ع۔

مجھ سے مت پوچھ تیرے عشق میں کیا رکھا ہے
سوز کو ساز کے پردے میں چھپا رکھا ہے

اور فلم "انارکلی" کے شاعر کہتے ہیں۔ ع۔

مجھ سے مت پوچھ میرے عشق میں کیا رکھا ہے
ایک شعلہ ہے جو سینہ میں دبا رکھا ہے

مجاز اپنی ایک اور نظم میں کہتے ہیں۔ ع۔

چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکے تیرے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

یہ تین مصرعے فلم "آرز د" کے شاعر کو بری طرح کھٹکتے ہیں اور وہ ان کو اس طرح فرماتے ہیں۔

چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
کھلتے رہیں ہونٹوں کے گلاب اور زیادہ
تو عشق کے طوفان کو باہوں میں جکڑلے
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

اور یہ سب کچھ سنکر یقیناً روحِ مجاز تڑپ اٹھی ہوگی اور سوچتی ہوگی کہ ہائے ہم نے بھی کیسی کیسی غلطیاں کی تھیں۔ خدا بھلا کرے فلمی شعرا کا ورنہ قیامت کے دن نجانے کیا منہ لیکر اُٹھتے

باقی ص ۴۳ پر

بندروں کا خوفناک انتقام

چیتا ایک بے رحم خونخوار درندہ ضرور تھا مگر مجھے ایکبار اس زخمی چیتے پر رحم آ گیا جبکہ غضبناک بندر اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کی تکا بوٹی کر دی۔

محمد اکبرالدین صدیقی
بی۔ ایس۔ سی
(عثمانیہ)

افریقہ میں ہمارا مکان ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا جہاں بندروں کی ایک چھوٹی سی نوآبادی تھی۔ جنوبی افریقہ کے بندر شمالی افریقہ کے بندروں کی بہ نسبت بہت چلبلے اور شور مچانے والے تھے۔ یہ بندر ہر وقت چٹانوں پر کودتے اُچھلتے رہتے تھے۔

دن بھر کی گرمی کے بعد شام کی ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لئے اونچی اونچی چٹانوں پر نظر آنے لگتے تھے۔ بڑے بندر پہاڑی کی چوٹیوں پر مجسموں کی طرح بیٹھے نگہبانی کیا کرتے اور کسی خطرہ کی علامت پر سب کو چوکنا کر دیتے تھے۔ نوجوان بچے اُچھلتے کودتے اور ان کی مائیں آپس میں لڑتی جھگڑتی اور بک بک کرتی تھیں۔ ننھے بچے پانی کے چھینٹے اُڑاتے، بے تحاشہ بھاگتے اور اودھم مچاتے تھے۔

بہرحال ہم لوگ ان سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ اگر وہ وہاں نہ پائے جاتے تو ہمیں ذرا بے چینی ہوتی تھی۔ ان کے بچوں کو اونچی چٹانوں پر کھیلتے ہوئے دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ان کی شرارتیں بڑی دلچسپ اور لطف انگیز ہوا کرتی تھیں اور جب انہیں کھیلتے وقت طمانچہ لگایا جاتا یا چھیڑا جاتا تو ان کی خوفناک چیخوں سے ہمیں ڈر محسوس ہونے لگتا تھا۔

نگہبان بندر کسی خطرہ کی علامت پر "واخ" کی آواز نکالتے جس سے سارے بندر چوکنا ہو جاتے اور وہ اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے اِدھر اُدھر دوڑنے لگتے۔ اور بچے اُچھل کر اپنی ماؤں کے سینے سے چمٹ جاتے تھے۔

رات کا اندھیرا شروع ہوتے ہی چیتوں اور شکاریوں کے خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے نوجوان بندر بچوں کو اپنی پناہ گاہوں کی طرف لے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اکثر اوقات زیادہ میل جول سے بے اعتنائی اور لاپروائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب بندر ہم سے اور ہم ان سے مانوس ہو گئے تو وہ ہم سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ چپکے سے ہمارے باغ میں پہنچ جاتے اور پھلوں کو برباد کرنے لگتے تو ہم بھی خاموش رہ جاتے۔

میرے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام پیٹرک اور چھوٹے کا میک تھا۔ چلتے وقت بڑے لڑکے کی ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں چھوٹے بچے کے پاس ایک دوغلی نسل کے کتے کا بچہ تھا۔ یہ تینوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا کرتے اور ارد گرد وادی میں گھوما کرتے تھے۔

ایک روز صبح اچانک پپ (کتے کا بچہ) کے غائب ہو جانے پر تشویش لاحق ہو گئی۔ اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر ہمارے ایک ملازم نے اس کا کھوج لگایا۔ ایک مقام پہنچے

واقعات نئی دہلی

طاقت بندوق کی نالی سے
واپس بھی لی جاتی ہے۔

"کیا یہ بھی ماؤ نے کہا ہے"

پنجوں کے نشانات، درخت کی چھال کے ٹکڑے اور بالوں کے گچھے پائے گئے۔ یہاں پر ایک خوفناک چیتا رہتا تھا۔ اب یہ شبہ ہونے لگا کہ اس چیتے ہی نے پپ کو کھا لیا ہوگا۔ چونکہ کتے کا گوشت چیتا بڑے شوق سے کھاتا ہے۔

پپ کی اس افسوسناک ہلاکت پر ہم سب ہی بہت پریشان تھے۔ پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس حادثہ کے وقت تینوں کھلنڈرے ایک ساتھ نہ تھے۔ ورنہ خدا جانے میرے دونوں ننھے بچوں کا کیا حشر ہوتا۔

میرا بڑا لڑکا پیٹرک ڈرا اور سہما ہوا تھا۔ اور چھوٹے لڑکے کا روتے روتے برا حال ہو گیا تھا۔ اور اس کا پیٹ سسکیوں سے اچھل رہا تھا۔ میری بیوی مجھے غصہ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اب میں نے بندوق سے چیتے کا شکار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور چیتے کو پکڑنے کے لئے بون (لکڑی کا پنجرہ) بنانا ہی مناسب سمجھا۔ چونکہ چیتا نہایت طاقتور اور خوفناک درندہ ہوتا ہے۔ اس کو بون میں پکڑنا بھی آسان کام نہ تھا۔

میں نے بون تیار کروا کے اس کے اڈے پر رکھوا دیا۔ دو دن کے بعد خبر ملی کہ چیتا بون کو توڑ کر بھاگ گیا اور زخمی بھی ہو گیا۔ یہ سنتے ہی مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ چونکہ زخمی چیتا بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

میں اپنے دونوں بچوں کو گھر میں بند کر کے اپنی ۱۲ بور بندوق لیکر چیتے کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں مسلسل پانچ گھنٹے تک اسے تلاش کرتا رہا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ میں مایوس ہو کر گھر واپس ہوا لیکن شام کو جب میں باغ میں ٹہل رہا تھا اچانک مجھے بندر کے "واخ" کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ چونکہ میں روزانہ ان کی ایسی آوازیں سننے کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر اس دفعہ ان کی آوازوں سے ڈر اور خوف کی بجائے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر بھی میں حالات معلوم کرنے کے لئے پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ دامن کوہ میں اچھلتے کودتے اور چیختے چلاتے بندروں کا ایک سیلاب امڈا چلا آ رہا تھا۔ وہ خوشی اور جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ وہ جھاڑی میں پتھر اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ مجھے وہاں چیتے کے کھانسنے اور غرانے کی آواز سنائی دی۔ میں ایک قریبی چٹان پر چڑھ کر اس کا نظارہ کرنے لگا۔

چیتا جھاڑی میں بے بس اور لاچار پڑا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ طاقت لگا کر بون توڑ کر نکل تو گیا لیکن اس کوشش میں اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں زخمی ہو گئیں اور وہ مضمحل اور کمزور ہو کر گھسٹتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا۔ اس بے دم اور زخمی چیتے پر سارے بندر پتھروں کی مسلسل بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اب وہ بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ اس میں جوابی حملہ کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔

مجھے چیتوں سے نفرت تھی اور ان سے ڈر بھی لگتا تھا۔ لیکن اس وقت اس مجبور اور زخمی چیتے پر رحم آ رہا تھا اور مجھے خود پر اور اس بون پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ میں اس کی ہلاکت کا باعث بن گیا۔ اس کے بعد پھر میں نے کوئی بون نہیں بنایا۔

ادھر سارے بندر اپنے زخمی دشمن چیتے پر بڑی بے رحمی سے حملے کر رہے تھے وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ وہ غراتا اور اپنے اگلے پنجوں کو زمین پر مارتا تھا۔ پھر بھی اس کا غصہ اور غراہٹ اس قدر ہیبتناک تھی کہ حملہ آور بندر ڈر کے مارے رک جاتے۔ پھر اس کے زخمی جسم کو نوچنے لگتے۔ زخمی چیتا خوفناک دہاڑیں مار رہا تھا اور بندروں کا خوفناک انتقام ہیبتناک منظر پیش کر رہا تھا۔

میں اپنی رائفل لانے کے لئے گھر کی طرف بھاگا مگر راستہ ہی میں میری بیوی سے مڈبھیڑ ہو گئی جو رائفل لیکر پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ یہ بڑی دلچسپ اور تعجب کی بات ہے کہ خوفناک مقامات پر عورتوں میں بھی کیسی زبردست ہمت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مفاجاتی حالتوں میں از خود مناسب معقول کام کر جاتی ہیں۔

جب میں رائفل لیکر نشانہ پر پہنچا تو میری بیوی میرے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ گولی ٹھیک نشانہ پر لگی اور چیتا تڑپ کر بجلی کی طرح جھاڑی سے باہر نکل پڑا۔ ہم ہیبت زدہ ہو کر گھر کی طرف بھاگنے لگے۔

ایک طرف بندر ہیبتناک چیخیں لگا رہے تھے تو دوسری طرف چیتا اپنی آخری دہاڑیں مار رہا تھا۔ یہ منظر اتنا خوفناک تھا کہ زندگی بھر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تھوڑی دیر بعد چیتے نے دم توڑ دیا اور سارے بندر انتقام لینے کے لئے اس کی نعش پر ٹوٹ پڑے اور اس کی تکا بوٹی کر کے ہی دم لیا۔

چند دنوں کے بعد بندروں نے پھر اپنا پرانا کھیل شروع کر دیا۔ بڑے بندر چٹانوں پر بیٹھ کر نگہبانی کرتے تھے بچے ماؤں کے ساتھ کھیلتے۔ اچھلتے کودتے اور ان کے سینوں سے چمٹ جاتے۔

لیکن ہمارے کانوں میں اس وقت بھی زخمی چیتے کی دردناک چیخیں گونج رہی ہیں، جو بندروں کے خوفناک انتقام کا شکار بن گیا تھا۔

گزشتہ سے پیوستہ

حکیم بڈھن اور بھیروں کی روح

بہزاد لکھنوی

ہم دونوں پلنگ پر جا کر لیٹ گئے لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ میری سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آرہا تھا میں باوجود بھوت پریت پر یقین رکھنے کے اس حد تک بھوت یا شیطان کی قوت کا قائل نہیں تھا۔ ان ہی خیالات میں تھا کہ مجھے آخر کار نیند آگئی جسب عادت نماز فجر کے لیے اٹھا حکیم بڈھن بھی میرے اٹھنے کے ساتھ ہی تھوڑی دیر بعد اٹھ بیٹھے نجن صاحب البتہ بڑی دیر تک سو لیے۔ ناشتے کے ساتھ ہی نبو صاحب بھی باہر آئے اور ناشتہ میں شریک ہوئے ناشتہ کے بعد حکیم بڈھن نے کہا۔

"چچا، حقیقت یہ ہے کہ کوئی آسیب ہے جو آپ کے پوتے میں حلول کر گیا ہے اور وہ شب میں اٹھ کر سارے کا سارا کھانا کھا جاتا ہے اور بھابی کو بھوکا رہنا پڑتا ہے۔"

نبو صاحب نے کہا "پھر کیا کیا جائے؟ میں کئی عالموں کو بلا چکا ہوں وہ تو کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے بچہ کو کئی ڈاکٹروں کو دکھایا، اُن کا بیان ہے کہ خون کی روانی اور نبض کی رفتار وہی ہے جو ایک دو ماہ کے بچے میں ہونا چاہیے۔ بچے کے قد و قامت اور حرکات کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ قدرتی امر ہے۔"

حکیم بڈھن نے کہا "ڈاکٹروں کو بکنے دیجیے، فی الحال ایک کام کیجیے۔ صبح اور شام پوتے کو ساتھ لے کر گھر سے باہر چلے جایا کیجیے اور اس کی عدم موجودگی میں بھابی کو دونوں وقت کھلا پلا دیجیے، لیکن شب کو کھانا حسب دستور ان کے کمرے میں ضرور رکھوا دیا کیجیے۔ اس سے یہ ہوگا کہ بھابی کی قوتیں پھر عود کر آئیں گی۔"

نبو صاحب بولے "لیکن اس بلا کے دفیعے کی کیا صورت ہوگی؟"

حکیم بڈھن نے کہا "فی الحال تو میرے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ بجائے عامل کے کسی کامل سے رجوع کیا جائے تب ہی کامیابی ہوگی ورنہ نہیں۔"

نبو صاحب روہانسے ہو کر بولے "بھیا سوائے تمھارے میرا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔ مجھے روپے پیسے پر بڑا غرور تھا۔ لیکن یہ دولت بھی بے کار نظر آرہی ہے جس کو کوئی کھا رہا ہے اور نہ کوئی غم دور کر سکتا ہے۔ خدا کے لیے تم ہی

واقعات منو دھلی

کوئی فکر کرو۔ اخراجات کے معاملہ میں ہزار دو ہزار کے پیلے میں بند نہیں ہوں۔"

حکیم بڈھن نے کہا "یہ بہزاد پیروں فقیروں کے بڑے معتقد ہیں اور واقف بھی ہیں میں اور یہ دونوں مل کر ادھر اُدھر تلاش کرتے ہیں آگے اللہ مالک ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک صاحب نے لکھنؤ میں مجھ سے ایک بزرگ کا تذکرہ کیا تھا جو کالپی میں رہتے ہیں۔ میں اور بہزاد دونوں آج ہی کالپی روانہ ہوں گے۔"

نبو صاحب اس گفتگو کے بعد زنان خانے میں چلے گئے۔ اور اندر سے ایک بند لفافہ حکیم بڈھن کو لا کر دیتے ہوئے گویا ہوئے۔

"بھیا بڈھن اس وقت تو یہ موجود ہیں، جو میں دے رہا ہوں لیکن تمھیں میری قسم اخراجات کا خیال نہ کرنا اور فوراً ہی تار دے دینا انشاء اللہ اسی دن تار سے پہلے پہنچ جائیں گے اور میں یہاں تمھاری ہدایات پر کاربند رہوں گا۔"

اسی دوپہر کی گاڑی سے ہم دونوں کانپور پہنچے اور وہاں گاڑی بدل کر ایک آٹھ بجے دن پر کالپی کے لیے روانہ ہو گئے۔

گاڑی کالپی صبح کے وقت پہنچی، ہم دونوں ٹھہر گئے وہاں ہم کسی سے واقف نہ تھے بجز معلوم کیا کہ یہاں کوئی شاعر بھی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کا پتہ مل گیا جن کی خدمت میں ہم پہنچے تو معلوم ہوا کہ شہر کے کسی چائے خانہ میں ہوں گے۔ حکیم بڈھن نے کہا۔

"یار شاعر اور چائے خانے کیا لازم و ملزوم ہیں؟"

میں نے کہا "معلوم تو یہی ہوتا ہے۔"

ہم لوگ اُن کے گھر سے بازار پہنچے جہاں ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ ہم لوگ چائے باز تو تھے ہی چائے خانے میں گھس پڑے۔ وہاں ایک صاحب ایک جانب بیٹھے ہوئے شعر خوانی کر رہے تھے۔ ہم دونوں ان کے اشعار کی تعریف کرنے لگے۔ وہ بھی ہماری طرف زیادہ راغب ہو گئے۔ غزل کے خاتمہ پر حکیم بڈھن نے میرا تعارف کرایا۔ میرا نام سن کر وہ چونکے اور بولے۔

ارے یہ ہیں بہزاد لکھنوی۔ ارے بھئی چائے لاؤ۔

چائے پیتے ہوئے جب حکیم بڈھن نے اپنی آمد کا

سہارا ہوتے۔

جناب یہاں تو کئی بزرگ موجود ہیں اور سب کے سب باقیض ہیں۔ آپ کس خاص بزرگ کی تلاش میں آئے ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے علاوہ صاحب جنات بزرگوں کے مشاہیر اولیائے کرام کے مزارات بھی ہیں۔ جہاں ہر روز زائرین کا مجمع لگا رہتا ہے۔ آپ چائے پی لیں تو میں آپ کی رہنمائی کرتا ہوں۔"

میں حکیم بڑھن سے پوچھ نہیں سکا تھا کہ بغیر اتے پتے کے یہ کلیجی کا سفر کیوں کر رہے ہو محض ایک صاحب سے کسی بزرگ کی کرامت سننے کے بعد یوں سفر کرنا کون سی عقلمندی ہے جبکہ ان بزرگ کا نام اور پتہ بھی نہیں معلوم ہے لیکن حکیم بڑھن کے کسی فعل میں دخل دینا ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ لہٰذا کون بولتا۔ سفر باغرض ہو یا بے کار سیر سپاٹے اور تفریح سے خالی نہیں ہوتا۔ چائے نوشی کے بعد وہ شاعر صاحب غالباً خلیق تخلص تھا ہمیں لیے ہوئے کئی بزرگوں کے پاس پہنچے جو صورۃً اور اخلاقاً بھی واقعی بزرگ تھے۔ حکیم بڑھن نے سب سے اظہارِ مدعا کیا لیکن سب نے یہ کہا:۔

"ہم یہاں تو دعا کر سکتے ہیں لیکن اس کام کے واسطے سفر سے معذور ہیں۔ نہ ہم پیشہ ور ہیں نہ طالبِ شہرت۔"

چلیے صاحب چھٹی ہوئی۔ تقریباً پورا دن اسی میں تمام ہوا۔ اب حکیم بڑھن کی رائے ہوئی کہ رات کی گاڑی سے کالن پور چلا جائے وہاں شاید کوئی بزرگ مل جائیں۔ مجالِ دم زدن کب تھی خلیق صاحب سے رخصت ہو کر ہم دونوں پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ بازار سے اسٹیشن کا فاصلہ دو فرلانگ سے کم ہی تھا۔ ریل چھوٹنے میں ابھی کافی وقت تھا ہم دونوں خراماں خراماں چل رہے تھے کہ راستے میں لڑکوں کا شور سن کر رک گئے۔

لڑکوں کا ایک گروہ ایک مجہول الحواس قسم کے آدمی کے پیچھے تالیاں بجا رہا تھا اور آوازے کس رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ تنگ آ کر ڈھیلا پتھر اٹھا لیتے ہیں مگر ان لڑکوں کو مارتے۔ ان کے پتھر اٹھاتے ہی لڑکے دور بھاگ جاتے ہیں اور جیسے ہی وہ آگے بڑھتے پھر لڑکوں کا شور بلند ہوتا۔ بالآخر میں نے ان لڑکوں کو آگے بڑھ کر [illegible]

لیا۔ میرے اشارے پر حکیم بڑھن ان کے برابر آ گئے۔ اب ایک طرف میں درمیان میں وہ اور دوسری طرف حکیم بڑھن۔ ہم ان کی ہمراہی میں آگے بڑھے۔ لڑکے غالباً اب ان کو چھیڑنا خطرناک سمجھ کر جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ میں ان کو لے کر آگے بڑھا اور اسٹیشن کے قریب پہنچ کر ایک چائے خانے میں داخل ہو گیا۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد میں نے ان پر نگاہ ڈالی۔ یہ ایک چالیس سالہ مجہول الحواس قسم کے انسان تھے آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سر اور داڑھی کے بال بے تکان بڑھے ہوئے تھے وہ کرسی پر بیٹھ کر بولے:۔

"مسٹر کیا چائے پلاؤ گے۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا: "چائے بھی پیجیے اور ناشتہ بھی کیجیے پیسوں کی آپ فکر نہ کریں!"

انھوں نے میرے جواب پر مجھے بغور دیکھا اور میرے ہاتھوں کی گردش دیکھ کر قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"میاں تم کیا مجذوب ہو؟"

میں نے کہا: "جی نہیں، نہ مجذوب ہوں نہ سالک اختلاج کا مریض ہوں اور اسی کی یہ کیفیات ہیں۔"

وہ پھر ہنسے اور بولے "تم کو کیا پتا، ہاں جی چائے منگاؤ، پھر باتیں ہوں گی۔"

اتنے میں ہوٹل کا لڑکا چائے اور بسکٹ لے کر آ گیا۔ تین پیالیاں تھیں جو اس نے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھ دیں۔ ان صاحب نے فوراً وہ دونوں پیالیاں جو ہمارے سامنے تھیں اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیں اور بسکٹوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ خدا کی پناہ جلدی جلدی انھوں نے سارے بسکٹ کھا لیے اور چائے کی پیالیاں یکے بعد دیگرے ایک ہی سانس میں چڑھا کے بولے:۔

"یار پان سگرٹ"

میں نے پانوں کا آرڈر دیا اور سگرٹ کا پیکٹ منگوایا تین عدد پان آئے جنھیں وہ بغیر ہم دونوں کا خیال کیے ہوئے ایک ساتھ منہ میں رکھ گئے اور سگرٹ کا پیکٹ کھول کر ایک سگرٹ سلگائی — اور اس طرح دم مارنے لگے گویا چرس کی چلم پی رہے ہوں۔ سگرٹ کی بساط ہی کیا تھی چند منٹ میں ختم ہو گئی۔ اب دوسری نکالی اور پھر

تیسری وہ چین اسموکنگ کر رہے تھے۔ حکیم بڑھن ان کی ان حرکات سے متنفر نظر آ رہے تھے ان کے چہرے پر عجیب آثار تھے۔ جب وہ صاحب پورا پیکٹ پھونک چکے تو قہقہہ مارتے ہوئے بولے:۔

"یار مجذوب! کہو کوئی ملا یا نہیں یا سارا دن خراب ہی ہوا؟"

ان کی اس بات سے میں اور حکیم بڑھن دونوں حیران رہ گئے۔ میں نے کہا۔

"حضرت کوئی بھی نہیں ملا!"

وہ پھر قہقہہ مار کر بولے: "یار مجذوب ملتا کہاں ہے بھیروں کا مقابلہ ہے۔"

میں نے کہا "حضرت میں سمجھا نہیں۔"

وہ بولے:۔ "سمجھو گے کیا خاک۔ اجی پرانی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے کسی نے بھیروں کو اس گھر میں بٹھا دیا ہے۔ اور بھیروں سارے خاندان کو ختم کر کے ہی واپس جائے گا۔"

میں نے کہا: "جنابِ والا! اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے اہل اللہ کی حاجت ہے اسی کی تلاش میں ہم دونوں یہاں آئے تھے۔"

وہ پھر قہقہہ مار کر بولے: "بھئی میں تو اہل سگریٹ ہوں (قہقہہ) کیا میں چلوں۔ لیکن یار مجذوب سگرٹیں پلانا پڑیں گی۔ اور صرف تمہارا مال کھاؤں گا (قہقہہ) مجذوب کا مال، ان صاحب کا نہیں۔"

میں نے کہا: "آپ تشریف تو لے چلیں میں اپنا ہی مال کھلاؤں گا کسی اور کا نہیں۔"

وہ بولے: "چلو تو یار مجذوب گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔"

ہم تینوں باہر نکلے میں نے ایک دوکان سے پیڈرو سگریٹ کی پچاس ڈبیاں خریدیں اور اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی جلد ملی۔ انجن کے تین ٹکٹ خرید کر ہم تینوں سیکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ ڈبا خالی تھا۔ وہ صاحب ایک سیٹ پر لیٹ کر فوراً سو گئے۔ خراٹے بلند ہونے لگے۔

حکیم بڑھن نے مجھ سے کہا۔

"بھتیا بہرحال میرا تو دل ٹھیک نہیں رہا ہے۔"

میں نے کہا: "مجھے یقین کامل ہے۔"

وہ بولے۔ "یار تم خود بھی دیوانے قسم کے آدمی ہو اور
بیٹھ جاتے ہو جو خود دیوانہ ہو"
میں نے کہا۔ ان کو لیے چلتے ہیں اگر ناکامی ہوئی تو
نقصان ہے۔ کچھ تو بات بنے گی"
حکیم بڈھن نے کہا۔ "ہاں کہنے کو بات ہو جائے گی۔
ن پور دوبارہ پلٹنا پڑے گا"
میں نے کہا۔ "ابھی خدا جانے کتنی جگہ جانا پڑے
یا کان پور کو لیے پھرتے ہو"
حکیم بڈھن اور میں نے کھانے کے وقت ان کو جگانے
کوشش کی لیکن وہ جاگے ہی نہیں لہٰذا ہم دونوں نے کھالیا
درازوں کی چٹخنی لگا کر سو رہے۔ گاڑی تقریباً ایک بجے
پہنچی۔ شور و غل سے میری آنکھ کھل گئی۔ اٹھا۔ یہاں
بدلنا تھی میں نے پہلے حکیم بڈھن کو جگایا۔ اور پھر اُن
صاحب کو۔ انھوں نے آنکھ کھولتے ہوئے کہا۔
"سگریٹ"
میں نے پورا پیکٹ حوالے کر دیا۔ کوئی پندرہ منٹ میں
سگریٹیں پھونک کر اُٹھے اور بولے:۔
"کہو آگئی جگہ مجذوب صاحب"
"میں نے کہا۔" حضرت اب دوسری گاڑی بدلنا ہے
سویرے پہنچیں گے۔ گاڑی چار بجے چھوٹے گی"
وہاں وہ ہمارے ساتھ ہی اُترے، دوسری گاڑی
ہی کھڑی تھی۔ اس کے ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں ہم
بیٹھ گئے۔ خالی ڈبے میں میاں صاحب پھر ایک سیٹ
بیٹھ کر خراٹے لینے لگے۔
حکیم بڈھن نے کہا "یار بہزاد عجیب آدمی کو ساتھ لائے
اس کو سوائے سونے اور سگریٹ پینے کے اور کوئی
ہی نہیں ہے"
میں نے کہا۔ "پھر آخر میں کیا کروں"
وہ بولے:۔ "مجبوری ہے"
گاڑی جس وقت انجن پہنچی صبح صادق ہو رہی تھی
میاں صاحب کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ اٹھے اور اٹھتے ہی
مار کر بولے:۔
"یار مجذوب سگریٹ"
میں نے سگریٹ کا پیکٹ دیتے ہوئے کہا:۔
"حضرت گاڑی سے اتر کر پیجیے۔ ورنہ گاڑی چل
واقعات متعین ہوگی"

دے گی"
وہ میرے کہنے پر اتر آئے۔ گاڑی چھوٹ بھی گئی۔
لیکن وہ برابر چین اسموکنگ کرتے رہے۔ میں باہر ایک
یکے کا انتظام کر کے جب واپس آیا تو وہ خالی پیکٹ پھینک
رہے تھے۔ میرے اشارے پر وہ باہر نکلے اور یکے پر
بیٹھتے ہوئے قہقہہ مار کر بولے:۔
"یار مجذوب ہوائی جہاز لے آئے، ہوائی جہاز۔ اب
مزہ آئے گا سفر میں"
یکہ روانہ ہوا اس ڈھائی گھنٹے کے سفر میں بھی وہ
بیٹھے ہی بیٹھے سوتے رہے۔ ان کے خراٹے صاف بتا رہے
تھے کہ وہ بے خبر ہیں لیکن مجھے حیرت یہ تھی کہ ان کی گرفت
یکے کے ڈنڈے پر بدستور سختی سے قائم تھی۔ میرا خیال تھا
کہ وہ کہیں دھچکوں سے گر نہ پڑیں لیکن وہ پتھر کی طرح اپنی
جگہ پر جمے ہوئے سوتے رہے یہاں تک کہ نبو صاحب کی
حویلی پہنچا۔
اس وقت دن کے نو بج رہے تھے نبو صاحب کو
خبر ملتے ہی وہ فوراً باہر آئے اور ان میاں صاحب کو دیکھ
کر کچھ اچھے آثار ان کے چہرے پر پیدا نہیں ہوئے۔ حکیم
بڈھن نے ان کو الگ لے جا کر کہا۔
"یہ صاحب بہزاد صاحب کی دریافت ہیں میری نہیں
ان کو ٹرائی کے لیے لائے ہیں"
وہ بولے:۔ "کیا حرج ہے مجبوری ہے"
حکیم بڈھن نے پوچھا:۔ "کیا ٹھاکر صاحب سے آپ
کی پرانی دشمنی ہے؟"
وہ بولے:۔ "کون ٹھاکر!"
حکیم بڈھن نے کہا:۔ "وہی ٹھاکر صاحب جنھوں نے
آپ کو لے جا کر جوگی سے گنڈا دلوایا تھا"
وہ بولے "بڑی پرانی بات ہے یہ زمینداری جس
پر میں قابض ہوں شاہی زمانے میں ان کے خاندان میں تھی
اور ان کے پردادا سے ضبط کر کے میرے پردادا کو دلوادی
گئی تھی اور یہ خاندان امارت میں ہم سے بہت کمتر ہو گیا تھا
میرے دادا اور ان کے دادا کے درمیان تو عداوت کھلم کھلا
رہی لیکن ان کے والد اور میرے والد کے درمیان ہمیشہ مکمل
صفائی رہی۔ اور میرے زمانے میں تو ہم دونوں میں بھائی
چارہ ہے"

حکیم بڈھن نے کہا "ان میاں صاحب نے کالی۔۔
اس بات کو ظاہر کر دیا تھا کہ پرانی دشمنی کی بنا پر بھیڑیوں کو
اس خاندان پر مسلط کیا گیا ہے۔ حالانکہ میں نے اور بہزاد
نے ایک حرف بھی ان سے نہیں کہا تھا"
جب وہ لوٹے تو میاں صاحب سگریٹ کے کش پر
کش لگا رہے تھے۔ ناشتہ لگتے ہی بولے:۔
"یار مجذوب میں تو تمھارا مال کھاؤں گا ان کا نہیں"
میں نے کہا بہت اچھا ابھی منگاتا ہوں، لیکن یہ گاؤں
ہے یہاں چنوں کے سوا کیا ملے گا"
بولے:۔ "وہی منگالو"
میں نے مجبوراً چنے منگائے جن کو انھوں نے اس مزے
سے کھانا شروع کیا گویا پلاؤ زردہ کھا رہے ہیں۔ چنے
کھانے کے بعد انھوں نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔
"یار مجذوب کیوں دیر کر رہے ہو ایک سفید مٹی کی
بوتل منگالو"
تھوڑی ہی دیر میں ایک سفید بوتل کسی شربت
کے رکھنے کی منگالی گئی:
وہ بولے:۔ "اس کو گرم پانی سے دھلواؤ یار
مجذوب"
میں نے گرم پانی سے صاف کرا دی۔
انھوں نے پہلی بار نبو صاحب سے خطاب کیا اور بولے

دیکھو اگر بھیڑیں کو گرفتار کر لوں گا تو تمھارا پوتا
مر جائے گا۔ سمجھ لو۔ دراصل اس جوگی کے گنڈے کا یہ
موکل بھیڑیں ہے جس کو تمھارے خاندان کی تباہی کے لیے
مامور کیا گیا ہے"
نبو صاحب بے یقینی کے لہجے میں بولے:۔
"لیکن یہ میرے پوتے میں کیوں گھس گیا"
وہ بولے "حلول کہو حلول، بات یہ تھی کہ تمھاری
بہو کو قدرتی حمل تھا۔ پیدائش کے وقت بچہ پیدا ہوتے
ہی مر گیا تھا۔ اسی کے گرم جسم میں یہ ہنومان حلول کر گیا
گنڈا تمھاری بہو کے گلے میں تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ پہلے
ماں کو پھر باپ کو اور پھر تم کو چٹ کر جائے گا"
یہ کہہ کر انھوں نے زور کا قہقہہ مارا۔

"اگر تم کو وہ نے کلر جا قبول ہو تو میں اسکو اتار دوں۔ میں تو ان جیسا مجذوب کی بدولت چلا آیا۔ ان کے ہاتھ پٹوں پر خوب چلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے پھر قہقہہ مارا اور ایک نیا پیکٹ کھول کر پھر اسموکنگ شروع کر بیٹھے۔ نبو صاحب اور حکیم بڈھن بڑکا نا پھوی ہوئی پھر نبو صاحب نے کہا۔

"مجھے منظور ہے"

میاں صاحب بولے "تو ابھی ایک بکرا منگاؤ اور اس کو ابھی ذبح کراؤ میرے سامنے"

حکم کی دیر تھی ایک بکرا فوراً منگایا گیا۔ میاں صاحب کے حکم سے ایک کافی گہرا گڑھا کھودا گیا۔ جب بکرا ذبح ہو گیا تو میاں صاحب نے اس کی کلیجی نکلوا کر ایک کاغذ پر رکھدی اور کچھ پڑھنے کے بعد زور زور سے تین تالیاں بجائیں اور بولے:۔

"بھیرلیا جلدی حاضر ہو، بھیرلیا جلدی حاضر ہو، بھیرلیا جلدی حاضر ہو۔"

نبو صاحب حکیم صاحب، میں اور تمام ملازمین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے جب نبو صاحب کا پوتا اپنے پیروں پر چلتا ہوا میاں صاحب کے سامنے آگیا۔ میاں صاحب نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"بھیرلیا یہ تیری بھینٹ موجود ہے، کھالے اور اس بوتل میں اُتر آ۔"

نبو صاحب کا پوتا تیزی کے ساتھ اس کلیجی کی طرف بڑھا اور اس نے کلیجی کو کھانا شروع کر دیا۔ بڑا گھناؤنا اور ڈراؤنا منظر تھا۔ سکتے کے عالم میں ہر ایک دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کلیجی کھا چکا تو میاں صاحب نے وہ بوتل اس کے منہ کے پاس لگا دی اور بولے:۔

"اب اتر آ اس میں۔"

ایک دھواں سا اس بوتل میں نظر آنا شروع ہوا جوں جوں دھواں سماتا جاتا تھا نبو صاحب کا پوتا کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا جسم بے جان ہو کر گر پڑا اور میاں صاحب نے بوتل پر ڈاٹ لگا دی۔ ڈاٹ لگا کر اپنے ہاتھ ہی سے میاں صاحب نے اس گڑھے میں اس بوتل کو رکھ دیا اوپر سے بکرے کا سارا گوشت مع کھال سر اور پیر کے اس گڑھے میں ڈلوا دیا اور اوپر سے مٹی ڈلوا کر اس گڑھے کو پاٹ دیا مجھ سے بولے:۔

"یار مجذوب سگریٹ"

ان کی اس آواز سے ہم لوگوں کے تحیر کا عالم شکست ہوا۔

نبو صاحب فوراً پوتے کی تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مشغول ہو گئے۔ میں بھی میاں صاحب کو چھوڑ کر کمرے میں گیا تاکہ میاں صاحب کے دوپہر کے کھانے کا انتظام کروں۔ میں جب باہر آیا تو میاں صاحب کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں نے ملازمین سے پوچھا تو سب حیران رہ گئے۔

کسی نے ان کو جاتے نہ دیکھا۔ گاؤں بھر تلاش کرنے کے لیے آدمی دوڑائے لیکن بے سود۔ ان کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ دوسرے دن صبح نبو صاحب نے حکیم بڈھن کا اور میرا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم کو رخصت کیا۔ رخصتی کے وقت نبو صاحب نے ایک لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"بہزاد صاحب دراصل یہ ساری محنت آپ کی ہے یہ ناچیز نذر قبول فرمائیے۔"

حکیم بڈھن کو مجھے نہیں معلوم کیا ملا۔ وہ شخص تو بڑے بھاری پیٹ کا آدمی تھا۔ جب وہ پیکٹ میں نے راستے میں کھولا تو اس میں ایک عدد سو کا نوٹ تھا۔ ■

بقیہ:۔ بھٹو سے انٹرویو

اور ارکان یا تو زمیندار ہیں اور یا پھر بڑے بزنس مین

بھٹو — میں بالکل اسی طرح سوشلزم قائم کروں گا جس طرح مسز گاندھی نے ہندوستان میں کیا ہے۔

انقلابی — یعنی کہ نعروں والا "سوشل ازم"

بھٹو — لیکن ہمارا سوشلزم ہندوستان سے بہتر ہو گا کیونکہ عظیم چیئرمین ماؤ ہمارے دوست ہیں۔

انقلابی — لیکن آپ کا سوشلسٹ پروگرام کیا ہو گا؟

بھٹو — "غریبی ہٹاؤ" "مجھکو ووٹ دو" "ہندوستان مردہ باد" وغیرہ وغیرہ۔

انقلابی — لیکن ہندوستان مردہ باد کا سوشلزم سے کیا تعلق

بھٹو — آپ جیسے صحافی ان چیزوں کو کیا سمجھیں گے ہمارے سوشلزم کی اصل بنیاد تو یہی ہے۔

انقلابی — زبان کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں، ملک میں کون سی زبان رائج کیجائے گی۔

بھٹو — اُردو۔

انقلابی — لیکن اُردو تو صرف ملک کے ایک چوتھائی لوگوں کی زبان ہے جبکہ بنگالی آدھے سے زائد لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔

بھٹو — ہم بنگالی کا اُردوکرن کر لیں گے مشرقی پاکستان کی زبان بنگالی ہی رہے گی کیونکہ ہم کسی پر کوئی چیز ٹھونسنا پسند نہیں کرتے۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ بنگالی کو لکھا اور بولا اُردو ہی میں جائے گا۔

انقلابی — بالکل اسی طرح جس طرح بھارت کے کچھ لوگ مسلمانوں کا بھارتیہ کرن اور اُردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنے کی باتیں کر رہے ہیں۔

بھٹو — آپ بالکل ٹھیک ہے۔

انقلابی — آپ ہندوستانی لیڈروں میں کس کو پسند کرتے ہیں؟

بھٹو — جی ہاں صرف ایک کو۔ پروفیسر بلراج مدھوک کو

انقلابی — اس پسند کی وجہ۔

بھٹو — ان کی باتیں اور تقریریں مجھے پاکستان میں مقبولیت حاصل کرنے میں کافی مدد دیتی ہیں۔

انقلابی — جس طرح آپ کی باتیں اور تقریریں بلراج مدھوک کو ہندوستان میں مقبولیت حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

بھٹو — اس کے بارے میں آپ زیادہ جانتے ہوں گے۔

انقلابی — اچھا بھٹو صاحب اب اجازت دیجئے۔ آپ کے وزیر اعظم بن جانے کے بعد میں آپ سے پھر ملاقات کروں گا۔

بھٹو — مجھے آپ سے ملکر بہت خوشی ہوگی اصل میں مجھے انقلابیوں سے ملکر ہمیشہ ہی خوشی حاصل ہوتی ہے کیونکہ میں خود بھی انقلابی ہوں۔

انقلابی — لیکن میں تو صرف نام ہی کا انقلابی ہوں ویسے بھی میرا تعلق کمیونسٹ پارٹی اندرا گاندھی سے ہے

بھٹو — انقلابی صاحب آپ بہت بھولے ہیں۔ میں بھی تو صرف نام ہی کا انقلابی ہوں۔ ویسے یہ بات کسی سے کہیئے گا نہیں۔

انقلابی — اچھا شکریہ۔ آداب عرض ہے۔

بھٹو — "ہندوستان مردہ باد"۔

واقعات

یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے لہٰذا خاموش منتظر رہا۔

"میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں؟"

اس نے نہ جانے کس خیال سے پوچھا۔ اس کا چہرہ اس کے واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔

"بالکل نہیں۔ میں اس گھڑی کا مشتاق تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غم خواری کریں گے۔" اس نے مسترحمانہ لہجے میں کہا ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی۔

ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے دنیا کے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی، دونوں کی زندگی ایک مسلسل لطف و مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لئے وقف کر دی۔

وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری میں اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا، اس نے میری تصویریں بنائیں اور ان میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ شام کو جب ہم باغ میں گشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اسے پہناتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ یکایک زمانے نے ایسی کروٹ لی کہ بات کی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے پردہ رکھتا تھا میں نہ صرف اس کے رشتے داروں اور دوستوں کے سامنے ہوتی تھی بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے نقاب رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آجایا کرتے تھے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتے داروں میں فیروز جو اس کا شدید اشتہور تھا ہم کو دیکھنے اکثر آتا رہتا تھا اور ہفتوں آ کر رہا کرتا تھا۔

فیروز کی طبیعت متبذل اور عامیانہ تھی اس کی نفسانیت نا استائیں اکثر سنی گئی تھیں مگر جمال اس کی ہوسناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کیا کرتا تھا شاعر یا صناع انسان کو مطیت کل کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھ لے جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گزرتی تھیں اس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھیں۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار

بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے۔ مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کرے گا اور چونکہ وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لئے اور بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا جمال کو کسی اشد ضرورت سے سیتاپور جانا پڑا رات کو آٹھ بجے جب کہ اس کی واپسی کا وقت تھا، میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے سے متصل ہے بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی، دفعتاً مجھ کو کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "روشنی کیوں گم کر دی" میں سوال ختم نہ کر پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں کہ کمزور سے کمزور دل میں مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں نے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ مگر کم ہمت پر "آہنی" کا دیو مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں اس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لئے نہیں بلایا کہ ان میں اس واقعے کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی، اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے ہیبت ناک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی، اس کے آنے میں تاخیر ہوئی فیروز پھر میری سمت بڑھا تھا کہ جمال نے مجھے پکارا، فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی، میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم و کاست سب ماجرہ کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی، مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا معلوم ہوتا تھا کہ جس وقت اس نے یہ دیکھا اسی وقت میں نے فیروز کی گرفت سے اپنے کو چھڑایا تھا۔

جمال اُف اُف کرتا ہوا اپنے اسٹوڈیو میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی اتنا غضبناک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوشِ غضب میں مسخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے بھوکے شیر کی طرح میری کلائی پکڑ لی اور کہا۔

"دغاباز! تیری زندگی کا اب ایک ایک پل میری روح کو ناپاک کر رہا ہے۔"

مجھ میں پندار ایسا تھا کہ میں نے دغاباز کا خطاب پانے کے بعد اپنی برأت کے لئے ایک لفظ بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال انتہائی مغلوب الجذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس کے عضلات پھڑک رہے تھے، اس کا دم گھٹ رہا تھا، اس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لئے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا، اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب کچھ ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"تباہی کا شیطان" فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا، اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور یہ ہو گیا کہ مجھ کو کسی دشمن نے قتل کر دیا لیکن جمال کی زندگی اتنی الم ناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اعتراف کر لیتا۔"

ناہید کے آنسو گرنے لگے، میں تڑپ گیا، چاہتا تھا کہ اس کے آنسو پوچھوں لیکن اس نے اشارے سے منع کر دیا اور پھر سلسلہ یوں شروع کیا۔

آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی، یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہونے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ شیکسپیر کے مشہور ڈرامے "آتھیلو" کا ترجمہ کر کے سنایا تھا، میں گھنٹوں "ڈسڈیمونا" پر رشک کرتی رہی، میں نے جمال سے کہا کہ "کاش مجھے اس کا پارٹ ہی نصیب ہوتا۔" اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔ آہ۔۔!"

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی، وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھی۔ چلتے چلتے اس نے کہا۔

"ہاں ایک بات بھول گئی، جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے مجھے مار کر اس کو تسکین نہ ہوئی تو اس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کر دیا۔

وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

اس کو آخری وقت تک مغالطہ رہا، اب آپ اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے۔

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام
گر بجور ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی نصیب ہو جائے گا اور میں سکون کی سانس لے سکوں گی، آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں اگر آپ کا جی

چاہیے تو چاہا کہ اس پیش بیش کو بھی دیکھ لیجئے جس نے ناہید کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا اور جو اسٹوڈیو میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہے۔"

یہ کہہ کر نا ہید نے الوداع کہا۔ میں نے صحن زار تک اس کو جاتے دیکھا جہاں وہ نگاہوں سے غائب ہوگئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا اور اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا اسٹوڈیو رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر پڑی وہ ایک شکستہ صندوق تھا، اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ پیش بیش ملا جو بادجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا "اس گھر میں جتنے افراد ہیں، ان میں ایک تم ہی ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں اس لئے کہ تم کبھی مجھ کو دیوانہ یا فاتر العقل نہیں سمجھوگی۔" میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ نہیں سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرا دیا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی لیکن اس کا وہی جواب ملا جس کی مجھے امید تھی یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی مضحکہ اڑایا گیا۔ مجھکو افسوس ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں، میں اس کے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں، کیونکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے، میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہونچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہیں ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطقی اپنے اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ لئے ہوئے بیٹھا رہ جاتا ہے اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ ضدین "کا اجتماع اور نقیضین" کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو ہل اسپنسر یا ابن سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔

اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اسکو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ نہ ہوگا ——— وہ خود فریبی کے ذریعہ سے اپنے کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مایگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانے کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی بنائی نہیں ہے جسکا نام مجھے بتایا گیا بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے جسکا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

بقیہ :- انداز بیان اور

جگر مراد آبادی کا ایک شعر ہے۔ ع۔

میرا نہ کچھ خیال کر برق نظر گرائے جا
میں یوں ہی نالہ کش رہوں تو یونہی مسکرائے جا

فلم "وہ کون تھی" میں شاعر مکرم فرماتے ہیں۔

شوخ نظر کی بجلیاں دل پہ میرے گرائے جا
میرا نہ کچھ خیال کر تو یوں ہی مسکرائے جا

اقبال نے حسین ترانہ کی تخلیق کی اور ہندوستان کے بارے میں کہا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

فلم "پھر صبح ہوگی" کے شاعر جو خدا کے فضل سے کمیونسٹ نما ہیں بھلا یہ کیسے برداشت کر لیتے۔ سو جھٹ کہہ اٹھے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا

جیبیں ہی اپنی خالی کیوں دے نہ ہمکو گالی
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گویا اس طرح سے شاعر موصوف نے ترانے کو "سرخیا" لیا کہ سامع بس سنا کرے اور منہ سے اف بھی نہ کر سکے اس طرح کی سیکڑوں مثالیں آسانی سے ملجاتی ہیں جہاں ہمارے فلمی شعرا نے قدیم شعرا کی ارواح کو شرمندہ کیا۔ اب ایسے جانفشاں شعرا کو ادبی شعرا پر اگر ترجیح دیجائے تو کیا غلط ہوگا؟ ✗

بقیہ :- گوتم گاندھی کا دیس

کہ حکومت نے سابق حکمرانوں کو پناہ دے رکھی ہے، اس وقت سے وہ ان کے خلاف ہوگئے ہیں۔

مدھیہ پردیش کی ۴ کروڑ ۱۶½ لاکھ کی آبادی میں ۴۴ فیصدی آبادی ہریجنوں پر مشتمل ہے اور اسمبلی کے ۲۹۶ ممبروں میں سے ان کے ممبروں کی تعداد ۱۳۱ ہے۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ مخالفت کی صورت میں وزارتی توازن خراب ہو سکتا ہے۔

ایک طرف کانگریس کے اندر اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف سابق حکمرانوں نے مدھیہ پردیش کے علاقے میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں۔ پچھلے الیکشن میں سابق مدھیہ بھارت کے علاقے سے ان لوگوں کو جو کامیابی ہوئی ہے اس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ جن سنگھ سابق حکمرانوں کی پشت پناہی کر رہا ہے اور دونوں کے گٹھ جوڑ نے خاص طور سے ہریجن علاقوں میں خوف و دہشت کی ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ آئندہ ہونے والے الیکشن میں شاید ہریجن لوگ اپنا ووٹ ہی استعمال نہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ حکمراں کانگریس کی بہت بڑی کمزوری کہلائی جائے گی۔

بنگلادیش۔

محترمی۔ تسلیم!

بانگلادیش کے معاملے میں آپ نے بہت ہی مناسب رویہ اختیار کیا ہے۔ مشرقی بنگال میں پیش آنے والے واقعات واقعی بہت زیادہ شرمناک اور المناک ہیں۔ پاکستان جو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا ایک ایک کر کے تمام اسلامی اصولوں کو بھلا چکا ہے۔ اسلامی معاشرہ ہمیشہ ہی سے جمہوری بنیادوں پر کام کرتا رہا ہے۔ اسلام کی رو سے اکثریت کے منتخب نمائندے ہی کو حکومت کرنے کا حق دیا گیا ہے پاکستان میں غداری اور بغاوت شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساڑھے سات کروڑ حامیوں نے نہیں بلکہ مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے اور ان کے حامیوں کی اقلیت نے اکثریت کے ساتھ بے انصافی کر کے کی ہے۔ ملک کا نظام چلانے کا حق دینے تو سب ہی کو پہونچتا ہے لیکن مشرقی پاکستان کے عوام کا اکثریت میں ہونا قیادت کا حق انھیں کو دیتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ عام طور پر تمام ہندوستانی اور خاص طور پر ہم مسلمان اس حقیقت کو اسلامی اور سیاسی نقطۂ نظر سے سمجھینگے اور پوری طرح بانگلادیش کے عوام کی حمایت کرینگے۔ محمد جاب۔ لکھنؤ

جناب ایڈیٹر صاحب۔ تسلیم!!

میں واقعات کا مطالعہ پہلے شمارے ہی سے کرتا آرہا ہوں۔ معاشی اور سیاسی مشکلات کے باوجود آپ نے واقعات کو جسطرح آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا ہے وہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔

ہر دردمند انسان کا دل پاکستان میں پیش آنے والے واقعات سے پھٹا جارہا ہے۔ مجھے آج اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ فلسطین میں ہزاروں بے گناہ فلسطینی مجاہدوں کا قتلِ عام ہی کیا کم تھا کہ سرزمین پاکستان پر لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا۔ تاریخ اس قتلِ عام کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔

اپریل کے شمارے میں جناب سعادت صدیقی کا "فرقہ وارانہ فسادات" بہت پسند آیا۔ مسلمانوں نے ایک ہو کر اندرا حکومت " کی پشت پناہی کی۔ اب وقت آگیا ہے کہ کانگریس اپنی آنکھیں کھولے اور وعدوں اور نعروں کی منزل سے آگے بڑھ کر واقعی کچھ کام کرے۔ حکیم بدھن کا سلسلہ بھی بہت دلچسپ ہے اسے جاری رکھیئے۔

واقعات فین دھلی

خیرانداندیش۔ نعیم الدین پلیجر

سیلون اور بانگلادیش۔

اپریل کے شمارے میں "گولیوں سے دل نہیں جیتے جاتے" حقیقت سے بہت قریب ہے۔ نہ تو یحییٰ خاں گولیوں سے بنگالیوں کے دل جیت سکتے ہیں اور نہ مسز بندرانائیکے اپنے عوام کا۔ سیلون کے سلسلے میں حکومتِ ہند کی مذبذب پالیسی خود اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کا مذاق اُڑاتا ہے۔ ایک طرف تو کانگریسی حکومت بانگلادیش کے عوام کی حمایت کر رہی ہے اور دوسری طرف سیلون میں عوام کے قتلِ عام میں مسز بندرانائیکے کی مدد کر رہی ہے۔

خود سیلونی حکومت کا کہنا ہے کہ ستر ہزار سے زائد نوجوان باغی بن چکے ہیں۔ سیلون جیسے چھوٹے سے ملک میں ۷۰ ہزار نوجوانوں کا باغی ہوجانا کوئی معنی رکھتا ہے۔ ان نوجوانوں کو گاؤں میں رہنے والے زیادہ تر عوام اور مزدوروں کی حمایت حاصل ہے، اس طرح سے یہ تحریک بھی عوامی تحریک ہے۔ سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ سیلون میں عوامی تحریک کو دبانے میں ہندوستانی اور پاکستانی فوجیں کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑ رہی ہیں۔ جیتندر سنگھ آوارہ۔ چندی گڑھ

جناب والا۔ تسلیم۔

واقعات میں آٹھ صفحات کا اضافہ کر کے تو آپ نے ہم پڑھنے والوں پر احسان کیا ہی تھا اس کو تھوڑی سی ادبی چاشنی دے کر اس میں اور چار چاند لگا دیئے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ واقعات کے ذریعے ہمیں واجدہ تبسم جیسی افسانہ نگار کے شاہکار پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ تازہ شمارے میں "حکیم بدھن" اور "وہ آخری لمحہ" بھی بہت پسند آیا۔

اپریل کے پہلے شمارے میں جناب نازش پرتاپ گڈھی کی نظم "خونیں لمحوں کے نام" بہت پسند آئی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ہماری ملاقات نازش صاحب سے کراتے رہیں گے۔

ایک شکایت ہے کہ پرچہ وقت پر نہیں مل رہا ہے۔ ہم لوگ ایک پرچہ ملنے کے فوراً بعد ہی دوسرے پرچے کا انتظار شروع کر دیتے ہیں اس لئے انتظار کی گھڑیاں کاٹنا ہمارے لئے بہت دشوار ہوتا ہے۔

آپ کے مخلص و مداح۔ رفیق الدین انصاری۔ محمد شفیق جوتے والے۔ امین الدین انصاری۔ جمیل الرحمٰن صدیقی۔ گیا۔ (بہار)

محترمی! تسلیمات!

مئی کا شمارہ ملا۔ ماؤ سے انقلابی کا انٹرویو بہت پسند آیا ماؤ کے چیلوں کے لئے یہ ایک سبق ہے۔ اس مرتبہ مزاحیہ مضامین کی کمی ذرا کھٹکی۔ کارٹون بھی کم تھے اور ذرا خشک بھی۔ کارٹون زیادہ سے زیادہ دیجئے۔

ہندوستانی کرکٹ کے نئے ہیرو سنیل گواسکر پر مضمون بھی بہت عمدہ ہے، اب دیکھئے ہندوستانی ٹیم انگلینڈ میں جا کر کیا کرتی ہے۔ فلموں پر اور جنسیات پر بھی مضامین دیجئے، دونوں موضوع آج کل کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی ہیں۔ ضمیر احمد۔ بمبئی

نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی۔

محترمی السلام علیکم۔

فلم انڈسٹری کے خداؤں کی بددیانتی نے آج کے نوجوان طبقے کو جو شدید نقصان پہونچایا ہے اس کی تلافی غیر ممکن معلوم ہوتی ہے جنسی معلومات عمر کے ایک خاص حصے میں انتہائی مؤثر اور مفید ہوتی ہیں لیکن عمر کے اس SPAN کو کم کرنے میں ہماری فلموں نے جو افسوسناک رول ادا کیا ہے، اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے نوعمر فلم بین طبقہ اور خصوصاً بچے جنسیاتی طور پر اس قدر MATURE ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی طبعی عمر سے پہلے ہی ایک SLEEPING PARTNER چاہتے ہیں یا یوں کہیے کہ SENUAL GRATIFICATION ان کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہو گیا ہے جتنا ایک بالغ مرد کے لئے ہوتا ہے، لیکن حالات اور وقت کے تقاضے اس کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ یہ طبقہ ابھی بالغ نہیں

باقی ص ۵۰ پر

[illegible] حکمران کہتے ہیں
[illegible] اور اتنا ہی نہیں بلکہ وہ چینی تہذیب تمدن [illegible] رنگ گیا۔
شمع چنگیز خاں کچھ اور دن جیتا رہتا اور اس کے [illegible] کا خواب حقیقت کا روپ دھار لیتا۔۔

بقیہ۔ مونا لیزا

جو اس نے اس ہال کو پہلے گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال کیا اور بعد میں گھاس کے لئے اسٹور روم بنا دیا۔ آج کل اس تصویر کی بہت نگہداشت کی جا رہی ہے تاکہ اسے مزید نقصان نہ پہنچنے پائے لیکن پھر بھی اب یہ تصویر خوابیدہ سی ہو کر رہ گئی ہے۔

لیڈی لیزا کو فلورنس میں پینٹ کیا گیا تھا۔ وہ بے مثال حسینہ تھی اس لئے لیونارڈو کی خواہش ہوئی کہ اس کی مسکراہٹ کو صفحۂ قرطاس پر لایا جائے۔ لیڈی لیزا ہمیشہ لیونارڈو کے ساتھ رہتی۔ وقت گزاری کے لئے ہمیشہ ایسے ہی لوگ اس کے ساتھ رہتے تھے جو ہنستے گاتے اور باتیں کرتے رہیں تاکہ لیڈی لیزا خوش رہے اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہے۔

جب وہ پینٹنگ مکمل ہو گئی تو فرانس کے شہنشاہ نے اسے بھاری قیمت دے کر خرید لیا اور یہ تصویر آج تک حکومتِ فرانس ہی کی ملکیت ہے گو ایک بار یہ انگلینڈ کے ہاتھوں پہنچتے پہنچتے رہ گئی۔

ایک بار بکنگھم (Buckingham) کا ڈیوک اپنی بیوی شہزادی "ہنریٹا ماریا" سے ملنے فرانس گیا وہاں وہ اس تصویر کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ بادشاہ چارلس یہ تصویر اپنے دلدار کو دے دیتا مگر لوگوں نے اسے مجبور کیا کہ یہ فرانس کی حسین ترین تصویر ہے لہٰذا اسے ملک فرانس سے باہر نہ جانے دیا جائے۔

لیونارڈو اٹلی کے بہت سے شہروں میں رہا۔ وہ جنگ کے سلسلے میں قیصر بورگیا (Casal Borgea) کے ساتھ رہا اور [illegible] آرٹ کے نمونے پیش کئے جو اس نے حرم میں ملکہ قیصر کی بیگم ایزابیل (Isabell) کے متعلق لباسوں [illegible] اس نے کچھ وقت روم میں پوپ کے لئے کام کرتے [illegible]۔

اپنی زندگی کے آخری ایام اس نے فرانس میں ہی گزارے

[illegible]

رہا۔ وہ چیف انجینئر، چیف آرٹسٹ اور چیف مجسمہ ساز تھا۔ بادشاہ کے محل کے برابر اس کا بڑا مکان تھا جہاں اکثر بادشاہ فرانسس آیا جاتا تھا۔ فرانسس اس سے بہت محبت کرتا تھا اور اسے اپنے دربار میں بے پایاں عزت دے رکھی تھی۔ ایک حکایت اس طرح بھی بیان کی جاتی ہے کہ۔

• جب لیونارڈو کا انتقال ہوا تو کنگ فرانسس اس کی بالیں پر موجود تھا اور جس وقت کنگ فرانسس نے اسے اپنے سینے سے لگایا اس وقت لیونارڈو کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

لیونارڈو ایک مسلم حقیقت تھا۔ ہے۔ اور رہے گا۔ اس نے آرٹ کی دنیا کو وہ سب کچھ دیا جو اس کے نام کو قیامت تک زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

بقیہ:۔ قارئین کے خطوط

ہوا ہے اور نہ SELF SUFFICIENT ہے۔ یہ نوعمر طبقہ زیرِ تعلیم ہے لیکن فلموں نے اسے اسقدر جنسی ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ اب کسی بھی ذریعے سے اپنے اس جذبے کی تسکین کے متلاشی ہیں۔ ظاہر ہے جب وہ صحیح طریقے پر اس چیز کو حاصل نہیں کر پائیں گے جو کہ اس وقت ناممکن ہے تو غلط راہ اختیار کریں گے اور برائیوں کا پیش خیمہ ہوں گے۔

ان تمام باتوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، خود لذتی، ہم جنسی اور دوسری گندگیوں کی مثالیں ہمارے سامنے آئے دن آتی رہتی ہیں آج کل نوجوانوں کی اوسط تندرستی دیکھئے کہ وہ جسمانی طور پر کس قدر کمزور نظر آتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل بے حد ضروری ہے۔ فلم بینی تفریح کا ایک واحد اور مقبول ترین ذریعہ ہے، اور فلمیں دن بدن ننگی ہوتی جا رہی ہیں اور پھر ایسے وقت میں فلموں میں بوسہ بازی کی حمایت کرنے والوں کا کیا کہنا۔!

قارئین سے استدعا ہے کہ وہ اس مسئلے پر اپنے قیمتی COMMENT ضرور دیں اور یہ بھی کہ اس مسئلے کو کیونکر حل کیا جا سکتا ہے۔؟

اور ہاں واقعات پڑھ کر لگا کہ اس پرچے کی واقعی بے حد ضرورت تھی۔

آپکا مخلص شبیر ظفر (بھوپالی)

برادرِ محترم۔ خلوص بے کراں!

میں "واقعات" کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ اور بلاخوف تردید پورے یقین اور وثوق سے یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ "واقعات" کا ہر شمارہ گزشتہ شمارے کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بہتر اور خوبصورت ہوتا ہے۔

رسالے کی مقبولیت روزافزوں ہے، وہ دن دور نہیں جب آپ کا یہ جریدہ ترقی کے بامِ عروج پر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپکے عزم اور ارادے کو اور توانائی بخشے۔ آمین۔ آپکا بھائی۔

عدیل عباسی جامی چڑیا کوٹی۔

بقیہ:۔ اداریہ

امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حکومتِ ہند کو بنگلا دیش کی آزاد حکومت کے ساتھ گہری دلچسپی ہے اور وہ بڑی سنجیدگی سے اسے تسلیم کرنے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔

مسز اندرا گاندھی کو بجا طور پر اس بات کی بھی شکایت ہے کہ بہت سے وہ ممالک جو جمہوریت کی دہائی دیتے ہیں، اب بنگلا دیش کی جدوجہد آزادی کے معاملے میں خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خوشحال ممالک پناہ گزینوں کی مدد کرنے کے لئے بھی آگے نہیں بڑھے اور اس طرح تیس لاکھ کے قریب (جلد ہی اس تعداد کے ۵۰ لاکھ تک پہونچنے کا امکان ہے) پناہ گزینوں کا بار اکیلے ہندوستان پر پڑ گیا، لیکن متذکرہ ممالک کی یہ خاموشی سچائی پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ سچائی یہ ہے کہ مشرقی بنگال میں جمہوریت اور عوامی حقوق کو پامال کیا گیا ہے اور اگر ہندوستان نے ان کے تحفظ کیلئے کوئی قدم اٹھایا ہے تو اس نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں یقین ہے کہ وہ کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے گا۔ وزیر اعظم کے یہ الفاظ کہ۔ "جن لوگوں نے ہندوستان میں آکر پناہ لی ہے انہیں ہم نکال نہیں سکتے"، انکی ہمت و جرأت کے مظہر ہیں تباہ حال لوگوں کے حوصلے انکے ان الفاظ سے بلند ہوں گے اور وہ محسوس کرینگے کہ ابھی دنیا کے بعض گوشوں میں انسانیت اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ زندہ ہے۔ جو ممالک اس وقت خاموش ہیں وہ بھی اگر آج نہیں تو کل اپنی مہرِ سکوت توڑ دیں گے اور انہیں تسلیم کرنا ہوگا کہ جو فوجی حکام دوسروں کو غدار اور تخریب کار بتا رہے ہیں حقیقت میں وہ خود غدار اور تخریب کار ہیں۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب زمامِ اقتدار عوامی نمائندوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔ "یقیناً ظلم کی شاخ نے کبھی پھل دیا ہو نہ دیگی۔"

نئی دہلی

نئی دہلی

جولائی ۱۹۷۱ء

نصف اوّل

سال ـــــــ سولہواں شمارہ

مدیر

عبدالوحید صدیقی

صدر دفتر

نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۳

ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵

قیمت ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۸ روپے

قیس
رام پوری

اے میرے دیس کے معصوم مسلمان سنبھل

تجھ کو کیا ہو گیا جینے کی ادا بھول گیا
اس قدر بھٹکا کہ خود اپنا پتا بھول گیا
اپنے اسلاف کی لکھی ہوئی تاریخ اٹھا
اور پھر سوچ کہ کیا یاد ہے کیا بھول گیا

کیا ہوا آج ترے قلب کا وہ سوز و گداز
کانپ اٹھتا تھا کبھی جس سے دلِ قہر طراز
کیا ترے جسم میں اس خون کا قطرہ بھی نہیں
جو کہ پڑھواتا تھا تلوار کے سائے میں نماز

آج کیوں تیری زباں کرنے لگی مدحِ رقیب
آج کیوں کہنے لگا اُن کو تو لوگوں کو نقیب
کیا ہوئی آج وہ حق گوئی و بے باکی تری
جگمگا اٹھتی تھی سن سن کے جسے راہِ صلیب

عظمتِ کہنہ کو ایسے نہ گنوایا ہوتا
گنجِ بے مایہ کو یوں بھی نہ لٹایا ہوتا
دیکھ کس درجہ امنڈ آئے ہیں آنکھوں میں اشک
روحِ اسلاف کو اتنا نہ رُلایا ہوتا

زندہ رہنا ہے تو یوں قصۂ پارینہ نہ بن
عزم کو راس بھی آ جائے گا اک دن یہ چلن
صرف اک بار بس اک بار سلیقے کو سنبھال
رُخ بدل دیں گی ترے واسطے گنگ و جمن

تو کسی پائے گنہگار کی زنجیر نہ بن
تو کسی مفلس و نادار کی تقدیر نہ بن
تجھ کو تاریخ کے صفحات پہ جینا ہے ابھی
صبح کا مہر تو بن، نالۂ شب گیر نہ بن

اے میرے دیس کے معصوم مسلمان سنبھل

غزل

ناظر الحسینی

مرا غرورِ ملوکِ بُتاں کی نذر ہوا
ابھر کے ساغرِ بادہ کشاں کی نذر ہوا
سمجھ لیا تھا جسے اک امانتِ ہستی
وہ دردِ منتِ چارہ گراں کی نذر ہوا
تمہاری یاد نے بخشا تھا کچھ سکون مگر
کشا کشِ غمِ سود و زیاں کی نذر ہوا
جبینِ شوق میں برسوں سے بے قرار تھا جو
وہ ایک سجدہ ترے آستاں کی نذر ہوا
نظر نظر کا تصادم جو سانحہ تھا کبھی
حدیثِ سوزشِ بزمِ دیگراں کی نذر ہوا
مرا خلوص جو لبریز تھا محبت سے
وہ نازکیٔ دلِ دوستاں کی نذر ہوا
وہ سر فروش وہ دلدادۂ
نگارخانۂ ہندوستاں کی ندر

ایک جرأتمندانہ قدم
ایک نیک فال

یوپی میں اردو کی تعلیم کا انتظام

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ وسط مدتی انتخاب میں کانگریس نے اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں اُردو کو اس کا آئینی حق دلانے کا جو وعدہ کیا تھا مرکزی حکومت اسکی روشنی میں اقدامات کر رہی ہے۔ گذشتہ ہفتہ وزیر اعظم ہند نے اُردو ایڈیٹروں کے ساتھ ملاقات میں انکشاف کیا کہ انھوں نے اُردو کو اس کا آئینی حق دلانے کے سلسلے میں بعض ریاستی وزراء اعلیٰ سے بات چیت کی ہے اور یوپی کے وزیر اعلےٰ اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ ہر پرائمری اسکول میں خواہ اُردو کا کوئی طالب علم وہاں ہو یا نہ ہو ایک اُردو ٹیچر کا تقرر لازماً کیا جائے گا۔ یوپی کے بعد وزیر اعظم کو توقع ہے کہ بہار وغیرہ میں بھی ایسا ہی ہوگا۔

اب تک اُردو کی تعلیم کا انتظام کرنے کے لئے پورے اسکول میں چالیس اور ایک کلاس میں دس طالب علموں کا ہونا ضروری تھا۔ یہ شرط اُردو کی تعلیم کے راستہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ اس شرط کی بنیاد پر مخالفین اُردو کو ایسا ماحول تیار کرنے کا موقع مل جاتا تھا کہ اُردو طلبار کی مطلوبہ تعداد ایک اسکول میں جمع نہ ہو سکے۔ نتیجہ میں شمالی ہند کی ان تمام ریاستوں میں اُردو ختم ہو گئی جہاں اُسنے جنم لیا تھا اور وہ پلی بڑھی تھی۔

وزیر اعظم ہند مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں ایک اہم اور بنیادی قدم اٹھایا اگر ہر پرائمری اسکول میں ایک اُردو ٹیچر مقرر کرنے کی پالیسی کو ایمانداری کے ساتھ نافذ کیا گیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خواہشمند اپنی اس محبوب زبان سے محروم رہیں۔ اُمید ہے کہ اُردو ٹیچروں کی تقرری کے سلسلے میں جلد کوئی سرکاری اعلان کیا جائے گا اور ان اسکولوں کے دروازے اُردو تعلیم کے لئے کھولدیئے جائیں گے جو گذشتہ ۲۴ سال سے بند تھے۔

اُردو تعلیم عام ہونے اور اس کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد ہم یہ توقع بھی رکھ سکتے ہیں کہ اُسے دلّی، یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش جیسی ریاستوں میں جہاں اُردو بولنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے اُردو کو دوسری زبان کا درجہ دیدیا جائے گا۔ آئین ہند میں اُردو کو ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک تسلیم کیا گیا ہے اس لئے اگر اسے ان علاقوں میں جہاں اس کے بولنے والے دس سے بیس فیصدی تک رہتے ہیں دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے کا اعلان کیا جائے تو یہ آئین کی منشا کے عین مطابق ہے۔ لیکن سردست ہم ایسا ماحول نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آسانی کے ساتھ اسے دوسری زبان تسلیم کر لیا جائے ــــ ہم وزیر اعظم ہند اور ریاستی حکومتوں کی ان مشکلات کو سمجھتے ہیں جو ان کی راہ میں حائل ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ جس طرح آج یہ بات تسلیم کی گئی کہ اُردو زبان کی تعلیم پر شرط و قید لگا کر بے انصافی کی گئی تھی اسی طرح کل یہ احساس بھی یقیناً پیدا ہوگا کہ اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہ دینا ایک بہت بڑی آبادی کے ساتھ بے انصافی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جب اُردو تعلیم کا حاصل کرنا آسان ہو جائے گا اور اس کا دائرہ وسیع ہوگا تو اسے دوسری سرکاری زبان بنانے کا ماحول خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ اور اُردو کے مخالفین خود محسوس کریں گے کہ اُردو ملک کا ایک بہت بڑا ورثہ ہے جو ضائع نہ ہونا چاہئے۔ اُردو ایک خوبصورت اور دلکش زبان ہے اور جس طرح ہر خوبصورت اور دلکش چیز خود بخود دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اُردو بھی یقیناً دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔ موجودہ حالات میں اُردو کی تعلیم عام کرنا ایک جرأتمندانہ اقدام ہے اور اسے ہم اردو کے لئے فال نیک سمجھتے ہیں۔

مکتوب قاہرہ

پھر غلط فہمیاں

شاہ حسین قاہرہ کا دورہ کرنیوالے ہیں

قاہرہ کے سرکاری حلقوں میں بتایا گیا ہے کہ اردن کے شاہ حسین عنقریب قاہرہ آنے والے ہیں جہاں وہ صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انور سادات سے بات چیت کریں گے۔ اس سے قبل سعودی عرب کے شاہ فیصل قاہرہ کا دورہ کر چکے ہیں ان کے اور انور سادات کے درمیان بات چیت کے بعد خصوصی ایلچی کے لئے دونوں سربراہان مملکت کی طرف سے ایک پیغام شاہ حسین کو بھیجا گیا تھا اسی کے بعد شاہ اردن قاہرہ آرہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور اردن کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور دونوں ملکوں میں اب اتنا اشتراک و تعاون باقی نہیں رہا ہے جتنا کہ اس سے قبل چھ دن کی جنگ کے بعد پایا جاتا تھا۔ اس کی تصدیق شاہ حسین کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے حال ہی میں ایک امریکی نامہ نگار کو دیا ہے۔

انھوں نے کہا: "چھ روز کی جنگ کے بعد ہم نے متحدہ عرب جمہوریہ کے ساتھ ملکر کام کیا۔ لیکن جب مصر نے راجرس پلان منظور کر لیا تو صورتِ حال تبدیل ہونے لگی۔ پلان میں تجویز کیا گیا تھا کہ اسرائیل اپنی محفوظ سرحدوں کے بدلے میں مقبوضہ علاقے خالی کر دے گا۔ یہ تجویز ہمارے لئے حیرت انگیز تھی۔ اس بارے میں نہ ہمیں پہلے سے اطلاع دی گئی اور نہ مشورہ کیا گیا۔ اس کے بعد سے مصر کے اور ہمارے درمیان کوئی تعاون نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں کہ ہمارے مصری دوست کیا کر رہے ہیں۔"

دراصل شاہ حسین نہر سوئز کے علاقے سے اسرائیلیوں کی جزوی واپسی کو عربوں کی کوئی کامیابی نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں اس سے اسرائیل کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل جائے گا کہ اس کا طرزِ عمل تعمیری ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں کرے گا اور عربوں کے مسائل درمیان میں لٹکے رہ جائیں گے۔

توقع کی جا رہی ہے کہ شاہ حسین اور انور سادات نئے حالات کی روشنی میں تفصیلی بات چیت کریں گے اور اس کا امکان ہے کہ وہ نہر سوئز کی واگذاری اور اسرائیل کے ساتھ عبوری تصفیہ کے سلسلے میں کسی پالیسی پر متفق ہو جائیں گے۔ ایک ایسے موقع پر جبکہ امریکا کا سفارتی مشن قاہرہ پہنچا ہے تاکہ نہر سوئز کی واگذاری اور عبوری تصفیے کے سلسلے میں اپنی تجاویز پیش کرے۔ دونوں عرب سربراہوں کی بات چیت بڑی مفید ثابت ہوگی۔ اور اس سے وہ غلط فہمی دور ہو جائے گی جو اس وقت دونوں ملکوں میں نظر آتی ہے۔

شاہد صدیقی

تینوں خلاباز سویوز ۱۱ میں

پوری خلائی سائنس پر نظرثانی کی ضرورت ہے

[illegible] روسی خلائی جہاز سویوز-۱۱ کو پیش آنے والا حادثہ [illegible] خلائی تاریخ کا تیسرا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ پہلا [illegible] پیش آیا تھا جب ۱۹۶۷ء میں تین امریکی خلا [illegible] راکٹ کے اندر ہی جل کر ہلاک ہو گئے تھے [illegible] ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ کو روسی خلاباز کوماروف کو [illegible] تھا۔ کوماروف نے بھی اپنا خلائی مشن پوری کامیابی [illegible] کیا تھا لیکن زمین پر اترتے وقت ان کے راکٹ [illegible] نے ٹھیک طرح کام نہیں کیا اور وہ ہلاک [illegible] سویوز-۱۱ کو پیش آنے والا حادثہ انسانی خلائی [illegible] سب سے بڑا حادثہ ہے۔

[illegible] تینوں روسی خلابازوں نے مرنے سے پہلے [illegible] پوری طرح کامیابی حاصل کر لی تھی۔ کمانڈر [illegible] فلائٹ انجینئر ولادی سلاف وولکوف [illegible] نے خلا میں جو تجربات کئے وہ خلائی سائنس میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۶ جون کو خلائی جہاز سویوز-۱۱ نے خلائی اسٹیشن سیلوت سے رابطہ قائم کیا۔ اور پہلی بار انسان خلا میں اڑنے والے کسی مصنوعی سیارے میں داخل ہوا۔ اس کے بعد خلابازوں نے خلائی اسٹیشن میں انسانوں اور پودوں کی زندگی پر بے وزنی کے اثرات پر کئی تجربے کئے۔ زمین کے ان زاویوں سے تصویریں لیں جن سے اب تک نہیں لی گئی تھیں۔ اس طرح خلابازوں نے ۲۴ روز کے عرصے میں کئی ایسے تجربات کئے جن کی مدد سے انسان کے لئے دوسرے سیاروں پر جانا اور خود اپنے سیارے زمین پر قدرتی آفتوں سے بچنا آسان ہو سکے گا۔

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اپنے مشن کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے بعد خلابازوں کو موت کے منہ میں جانا پڑا۔

ایک قدم آگے کی طرف —
یا ایک قدم پیچھے کی طرف؟

انسانی ترقی اور سماج کی معماری میں چند انسانوں کی موت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اس سے پہلے کہ انسان نے اڑنا سیکھا سیکڑوں لوگوں نے اڑنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوائیں۔ آج کی انسانی ترقی ان لاکھوں لوگوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے بغیر کسی لالچ کے انسان اور سائنس کی ترقی کے لئے دن رات کام کیا۔ اہمیت ہے تو ان سوالوں کی جن کے جواب اب ہمیں اس حادثے کے بعد ڈھونڈنے ہوں گے۔ ان سوالوں کے جواب پر ہی انسان کی خلائی ترقی کا دار و مدار ہوگا۔

- اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ یہ حادثہ کیوں پیش آیا؟
- حادثہ کسی تکنیکی کمزوری کی وجہ سے پیش آیا یا پھر اس کی وجہ انسانی جسم کی کوئی کمزوری ہے؟
- کیا انسانی جسم لمبے عرصے تک بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد زمین کی کشش میں نارمل ہو سکتا ہے؟

واقعات نئی دہلی

جیورجی
ڈبرووسکی

ولادی سلیو
ولکوو

وکٹر پٹساوییو

کیا اس حادثے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے امریکا
روس کو اپنے خلائی پروگرام میں کسی قسم کی
بلی کرنی پڑے گی ؟

ان میں سے زیادہ تر سوالات ایسے ہیں جن کے صحیح جوابات
الحال ممکن نہیں ہیں۔ ان سوالوں کے جواب صرف
رقت ہی دئے جا سکتے ہیں جب روسی سائنس دا ں
ت کو واضح کر دیں کہ خلابازوں کی موت کس وجہ سے
ہ روسی سائنس دانوں نے جس تیزی سے پوسٹ مارٹم
ہ مکمل کر کے لاشوں کو تجہیز و تکفین کے لئے دے دیا
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ نتائج پر پہنچنے میں کامیاب
ئے ہیں۔

لیکن اب تک ملنے والی معلومات کی بنیاد پر کچھ اندازے
ئے جا سکتے ہیں۔ حادثے کی وجوہات کے طور پر کئی
ریاں پیش کی جا رہی ہیں ۔

زیادہ تر سائنس دانوں کا خیال یہ ہے کہ خلابازوں
رت دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے ہوئی۔ ایک لمبے
ک بے وزنی کی حالت سے وزن کی حالت میں داخل
ے پر خلابازوں کے دل کو ایسا جھٹکا لگا جو ان سے برداشت
ہ سکا۔

یا پھر خلائی جہاز کے آکسیجن سسٹم میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی
خلابازوں کا دم گھٹ جانے سے موت کا شکار ہو گئے۔
جس وقت خلائی جہاز زمین کی فضا میں داخل ہوتا ہے۔
فضا کے ساتھ رگڑ (FRICTION) کی وجہ سے جہاز
ونی سطح بہت زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک خاص
کے ذریعے اندرونی فضا کو نارمل رکھا جاتا ہے۔ ہو سکتا
ہے کہ اس نظام میں کوئی خرابی ہو گئی ہو اور خلاباز جل کر مر
گئے ہوں۔ ویسے جہاز کے اندر جلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔
یا پھر اس کے پیچھے کوئی ایسی خاص وجہ ہو جس سے سائنس
اب تک ناواقف ہے۔

اس سے پہلے سویوز ۹ کے خلاباز نکولائی اور
سوستیانوف خلا میں سب سے لمبے عرصے یعنی ۱۸ دن رہ چکے
ہیں۔ واپسی کے سفر کو انھوں نے بہت تکلیف دہ بتایا تھا۔
زمین پر آنے کے کئی مہینے بعد تک یہ لوگ عام طریقے سے
چل پھر نہیں پائے تھے۔ امریکن خلاباز آرم اسٹرانگ کی
قوت سماعت ابھی تک نارمل نہیں ہوئی ہے اور وہ اب بھی
اپنے کانوں میں راکٹ کا شور محسوس کرتے ہیں۔ اب تک
سائنس دانوں کا تجربہ یہ تھا کہ خلائی بے وزنی سے انسانی
جسم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اس مرتبہ پہلی بار انسان
۲۴ دن تک خلا میں رہا۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک خاص عرصے
کے بعد انسانی جسم میں کچھ اس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی
ہوں کہ اس کے لئے واپس کشش ثقل میں آنا نا ممکن ہو جائے۔

امریکن سائنس دانوں نے کہا ہے کہ وہ فی الحال اپنے
پروگراموں میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے
کہ خلابازوں کی موت کسی تکنیکی غلطی کی وجہ سے ہوئی ہو۔
اس لئے جب تک یہ پتہ نہ چل جائے کہ اس حادثے کے پیچھے کیا
وجوہات ہیں سائنس دانوں کو زیادہ پریشان ہونے کی
کوئی ضرورت نہیں۔

لیکن ہو سکتا ہے کہ روس کو اپنے خلائی پروگرام میں
کسی قسم کی تبدیلی کرنی پڑے۔ ویسے اس خلائی تجربے
میں روسی سائنس دانوں کا مقصد تو کافی حد تک پورا
ہو گیا۔ ان حادثات کے بعد دنیا بھر کے لوگوں کے ذہن میں
جو بہت سے سوالات اٹھ رہے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی
ہے کہ کیا روس اور امریکا خلائی دوڑ میں ایک دوسرے
سے آگے نکلنے کے لئے انسانی جانوں سے کھیل رہے ہیں؟

- **کیا وہ انسانوں کو تجرباتی چوہوں کے طور پر استعمال کر رہے ہیں؟**
- **کیا وہ اپنے جھوٹے وقار کی خاطر غیر دانشمندانہ خطرات مول لے رہے ہیں؟**

یہ بات اس سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ابھی پچھلے
ہی دنوں چاند پر جانے والے امریکی مشن کے تین خلابازوں
کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔
یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ سائنس داں ان خلابازوں
کو بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

خلائی تجربوں کے دوران پہلے خلائی ہوا باز
یوری گیگرن کی موت بھی اس ہی کہانی کی ایک کڑی ہے۔

ضروری ہے کہ بڑی طاقتیں ان حادثات سے
کچھ سبق سیکھیں۔ اور خلائی تحقیقات کو اپنے وقار کی
جنگ نہ بنائیں۔ مشترکہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ
مل کر کام کریں اور ایک دوسرے کی معلومات کا فائدہ
اٹھائیں۔ کیونکہ کسی بھی بیرونی سیارے پر انسان کی
فتح کسی ایک ملک کی فتح نہیں بلکہ پوری انسانیت کی
فتح ہوگی۔ یہ فتح کسی ایک ملک کی کوششوں کا نتیجہ نہیں
ہوگی بلکہ دنیا بھر کے ان اربوں انسانوں کی کوششوں کا
پھل ہوگی جنھوں نے پچھلے ہزاروں برسوں میں ترقی
کی طرف ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھایا۔

قصات نتمہ دملی

محمد علی کی فتح حق اور سچائی کی فتح ہے

امریکی عدالتوں کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ [illegible] ہیں۔ اب تک ان کا کام عوام کے حقوق سے زیادہ جائداد اور جائداد رکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت کرنا رہا ہے۔ لیکن اب لگتا ہے کہ امریکی عدالتوں کے انداز فکر میں کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ جیسا کہ امریکن سپریم کورٹ نے بلیک پینتھر (امریکن کمیونسٹ تحریک) کو بری کر کے، نیویارک ٹائمز کے حق میں فیصلہ دے کے اور محمد علی کلے کو فوجی خدمات سے بری کر کے ظاہر کر دیا ہے۔

محمد علی کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اس نے جسطرح امریکا کے سرمایادار نظام اور وہاں کی جنگجو حکومت سے ٹکر لی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ امریکا میں ۱۸ سال سے زائد عمر کے ہر نوجوان کے لئے کم از کم دو سال کی فوجی خدمات انجام دینا ضروری ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں کلے نے لسٹن کو شکست دے کر اس سے بین الاقوامی ہیوی ویٹ چیمپین کا خطاب چھین لیا تھا۔ کلے کے مذہب کی تبدیلی کے اعلان کے فوراً بعد ہی سارا امریکا کلے کا دشمن ہوگیا۔ اسے چیمپین ماننے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر بے ایمانی کے الزامات لگائے گئے۔ لیکن ایک بار پھر جب اس نے لسٹن کو ایک ہی گھونسے میں ڈھیر کر دیا تو بین الاقوامی باکسنگ ایسوسی ایشن کو مجبوراً اسے ہی چیمپین ماننا پڑا۔

اس کا حق اس سے چھیننے کے اب دوسرے طریقے ڈھونڈے جانے لگے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ اُسے فوج میں بلاکر ویتنام بھیج دیا جائے۔ لیکن جب کلے فوجی خدمات کے لئے امتحان میں بیٹھا تو معلوم ہوا کہ ذہنی طور پر کلے فوجی خدمات کے لائق نہیں ہے۔ اخبارات نے اس پر بہت شور مچایا۔ ان کا کہنا تھا کہ کلے جیسا آدمی جو عمدہ شاعر اور بہت ہی حاضر جواب شخص ہے ذہنی طور پر ناکارہ نہیں ہو سکتا۔ ایک بار پھر ٹیسٹ لیا گیا اس بار پھر کلے ناکام رہا۔ لگ رہا تھا کہ کلے کے دشمنوں کی اسے ویتنام بھیجنے کی چال ناکام ہو جائے گی۔ لیکن جب تیسری بار کلے کا امتحان لیا گیا تو پتہ چلا کہ کلے اب تک ڈاکٹروں کو بیوقوف بنا رہا تھا۔ ورنہ وہ دماغی طور پر بہترین ذہن کا مالک ہے۔ لیکن اب کلے نے ویتنام کی جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

اس کا کہنا ہے کہ وہ کالے مسلمانوں کا مذہبی پیرو ہے اس لئے اسے فوج میں بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اسے ویتنام کی جنگ سے بھی اختلاف تھا۔ جو بات آج پورا امریکا کہہ رہا ہے وہی بات آج سے پانچ سال قبل کلے کہہ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ویتناموں سے امریکنوں کی کوئی دشمنی نہیں۔ اس لئے وہ ان کا خون کرنے کے لئے ویتنام کیوں جائے؟۔ ویتنام کی عوام اپنے جائز حقوق کے لئے لڑ رہی ہے اور امریکا کو ان کے ان حقوق کو چھیننے کا کوئی حق نہیں۔

ویتنامی عوام اپنے
جائز حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ امریکا کو
ان کے حقوق چھیننے کا کوئی حق نہیں ہے

سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار نسلی نابرابری میں یقین رکھنے والے امریکن کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کلے سے چیمپین کا خطاب چھین لیا۔ لیکن دنیا جانتی تھی کہ اصل چیمپین کلے ہی ہے۔ اس کے بعد کلے کو پریشان کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے گئے۔ اس پر ہزاروں ڈالر فائن کیا گیا، درجنوں مقدمے چلائے گئے۔ لیکن اس نے ظلم کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ کلے نے جس طرح ڈٹ کر پورے امریکن سماج کا مقابلہ کیا اس نے اس کی عزت کم کرنے کی بجائے اس میں اضافہ ہی کیا۔ آج کلے لڑنے مرنے والا ایک باکسر ہی نہیں بلکہ امریکا کے لاکھوں پسے ہوئے کالوں کا لیڈر بھی ہے۔

ویسے تو کلے نے درجنوں فتوحات حاصل کیں لیکن اس کی سب سے بڑی فتح ۲۸ جون ۱۹۷۱ کو ہوئی۔ یہ صرف کلے کی ہی فتح نہیں تھی بلکہ حق، انصاف اور سچائی کی فتح تھی۔ اپنے جائز حقوق کے لئے لڑنے والے لاکھوں امریکن عوام کے حقوق کی فتح تھی۔ ۲۸ جون کو امریکن سپریم کورٹ نے ۰-۸ کے فیصلے میں کلے کو فوجی خدمات سے بری کر دیا۔ حالانکہ پچھلے چار پانچ سالوں میں کلے کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود اسنے امریکن حکومت سے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔

مقدمہ جیتنے کے بعد جب اخباری نمائندوں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنی فتح کا جشن کب منائے گا۔ تو کلے نے جواب دیا کہ وہ اپنی فتح کا جشن پہلے ہی منا چکا ہے "اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو کے اور اس کا شکر ادا کر کے"۔

کلے اب ایک بار پھر فریزر سے ٹکر لینے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر خدا کی مدد اس کے ساتھ رہی تو وہ اس مرتبہ فریزر کو مارنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ کلے کی فتح صرف ایک شخص کی جیت نہیں بلکہ دنیا بھر کے پسے ہوئے مظلوم عوام کی جیت ہو گی۔ ہماری نیک خواہشات اس عظیم انسان کے ساتھ ہیں۔ ☆☆

واقعات نئی دہلی

اداریے

نئے تجربات، اقدام کی دعوت دیتے ہیں

(محمد ولی رحمانی)

آزادی کے بعد ہندوستانی صحافت نے نمایاں ترقی کی۔ ہمارے ملک میں ایسے بہت سے روزنامے، ہفت روزے اور ماہنامے شائع ہو رہے ہیں جو عالمی صحافت کے اعلیٰ معیار کو چھوتے ہیں۔ اُردو پریس نے بھی ترقی کی اور ہندوستان کے طول و عرض میں اتنے اخبارات نکلنے لگے کہ ۲۰ سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ۱۹۶۸ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں اُردو اخبارات و رسائل کا دوسرا نمبر ہے، ان کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ ایک دن وزارتِ نشر و اشاعت کی رپورٹ ہمیں یہ بتائے کہ سب سے زیادہ اخبارات اُردو زبان میں چھپتے ہیں۔

اُردو اخبارات و رسائل کی کثرت ان لوگوں کو بڑی آسانی سے دھوکا دے سکتی ہے جو حقیقی صورتِ حال سے ناآشنا ہیں۔ وہ یہ سمجھیں گے کہ ہندوستان میں اُردو کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور اسے پھلنے پھولنے کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ خود وہ حضرات بھی جو حقیقت آشنا ہیں اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ کچھ بھی ہو تعداد کے اعتبار سے تو اردو کا نمبر دوسرا ہے۔

لیکن اگر اس مسحور کن تعداد کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو تلاش کیا جائے تو مایوسی ہوگی۔ بلاشبہ اُردو کے اخبارات و رسائل نے گنتی کے اعتبار سے بڑی ترقی کی ہے، لیکن اس کے باوجود اُردو پریس ایک مضبوط پریس کی حیثیت نہیں رکھتا۔ نہ اس کی آواز میں جان ہے اور نہ اونچے ایوانوں میں اسے کوئی اہمیت دی جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو اخبارات کی اشاعت بہت تھوڑی ہے سرکاری ریکارڈ کے ذریعے ہمیں ہندوستان بھر کے اخبارات کی تعداد اشاعت معلوم ہو سکتی ہے۔ یہاں ہندوستان کے کثیر الاشاعت اخباروں کی فہرست دی جا رہی ہے جس سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے پریس کی قوت سامنے آئے گی۔ یہ سرکاری اعداد و شمار آنکھ بند کر کے یقین کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بسا اوقات اخبار والے اپنی مصلحتوں کی وجہ سے تعداد اشاعت زیادہ بتاتے۔ اس مرض میں ہر زبان کے اخبار والے مبتلا ہیں۔ اُردو اخبارات شاید اس مرض کا کچھ زیادہ شکار ہیں۔ ایسے بھی اخبار مل سکتے ہیں جو پریس میں دس سو بھی نہیں چھپتے مگر رجسٹر پر روزانہ دس ہزار چھپتے اور ڈسپیچ ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں کوئی اُردو روزنامہ ایسا نہیں ہے جس کی اشاعت اونچے درجے کے انگریزی یا ہندی روزنامے کے برابر ہو۔ یہی نہیں بلکہ اُردو کا کوئی بھی اخبار اشاعت کے اعتبار سے کسی دوسرے درجے کے انگریزی روزنامے کے مقابلے میں نہیں چھپتا۔ ہندوستان بھر کے اُردو روزناموں کا تجزیہ بتاتا ہے کہ کچھ کو چھوڑ کر کوئی بھی روزنامہ ایسا نہیں ہے جس کی اشاعت ۱۰ ہزار سے زیادہ ہو۔ عام طور پر اردو روزنامے چھ ہزار سے زیادہ شائع نہیں ہوتے اور ایسے بھی روزنامے ہیں جن کی اشاعت دو تین سو سے آگے نہیں بڑھتی۔

اور ہفت روزوں کی صورت حال کچھ کم مضحکہ خیز نہیں ہے ہزار سے اوپر چھپنے والے ہفت روزے تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ عام طور پر چار پانچ سو کی تعداد میں ہفت روزے چھپتے ہیں اور خاصی تعداد ایسے ہفت روزوں کی بھی ہے جن کی طباعت صرف سالگرہ ہے۔ بہت سے ہفت روزے خالص برساتی قسم کے ہیں جو خاص موسم میں نظر آتے ہیں اور موسم ختم ہوتے ہی ان کی بساط سمیٹ کر رکھدی جاتی ہے۔ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس کے پاس بھی کاغذ کے چند ٹکڑے، قلم پکڑنے کا سلیقہ اور بے کاری کا مشغلہ ہے وہ ایڈیٹر بن بیٹھا ہے۔ اس صورت حال نے اخبارات کی گنتی ضرور بڑھا دی ہے مگر اردو اخبار پڑھنے والوں کی گنتی میں نمایاں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ نہ کوئی اخبار مضبوط پریس کی شکل میں ابھر سکا۔

بلاشبہ آزاد ہندوستان میں اُردو کی حیثیت سوتیلی بیٹی کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اردو اخبارات کے ساتھ حکومت کا رویہ اچھا نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ خود اردو داں طبقے نے بھی اردو صحافت کو آگے بڑھانے کی کوئی اچھی کوشش نہیں کی ہے بہت سے ایسے اُردو روزنامے موجود ہیں جنکا ادارتی اسٹاف ایک یا دو افراد پر مشتمل ہے۔ آنا مختصر اسٹاف جیسا روزنامہ نکال سکتا ہے

انگریزی روزنامے

اخبار	تعداد اشاعت	مقامات
۱۔ انڈین ایکسپریس۔	۴۰۸۴۷۶	(دہلی، بمبئی، احمد آباد، بنگلور، مدراس، مدورائی اور وجے واڑہ)
۲۔ ٹائمس آف انڈیا۔	۱۸۸۶۲۹	(دہلی، بمبئی اور احمد آباد)
۳۔ اسٹیٹسمین۔	۱۶۶۸۳۵	(دہلی، کلکتہ)
۴۔ ہندو۔	۱۴۲۵۱۱	(مدراس)
۵۔ ہندوستان ٹائمس۔	۱۲۲۸۶۴	(دہلی)
۶۔ امریتا بازار پتریکا۔	۱۲۱۸۳۱	(کلکتہ اور کٹک)

دوسری زبانوں کے روزنامے

اخبار	زبان	تعداد اشاعت	مقامات
۱۔ دینا تھانتھی	(تامل)	۲۶۴۶۵۹	(کوئمبٹور۔ مدراس۔ مدورائی۔ ترچناپلی، ترونلویلی)
۲۔ ماتھروبھومی	(ملایالم)	۲۲۰۵۴۱	(کالی کٹ اور اُرناکلم)
۳۔ انند بازار پتریکا۔	(بنگلا)	۲۱۱۲۶۳	کلکتہ
۴۔ ملیالا منورما۔	(ملایالم)	۲۰۹۰۰۵	(کالی کٹ اور کوٹایم)
۵۔ نوبھارت ٹائمس	(ہندی)	۱۶۸۵۲۷	(دہلی اور بمبئی)
۶۔ دنمانی۔	(تامل)	۱۴۱۸۴۹	(مدراس اور مدورائی)

بقیہ صفحہ ۵ پر

واقعاتِ نو دہلی

فردوس بر روئے زمین

کشمیر

آیئے باغِ کشمیر کی سیر کریں۔

دھرتی کا سورگ۔ بھارت کا تاج۔ پھولوں کا دیش بے نظیر حسین و جمیل دوشیزاؤں کی دنیا۔ اندر کی نگری۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی خواب گاہ۔ نوجوانوں کے خوابوں کا محل۔ دیش بدیش کے ہزاروں لاکھوں صاحبِ نظر اور صاحبِ دل سیاحوں کا مرکزِ نگاہ۔ خوب صورت جھیلوں اور دلکش باغات کا خطہ عشق اور رومان پرور قدرتی مناظر کی مقدس سرزمین۔ نگاہوں کی جنت اور روح و قلب کو سکون بخشنے والا ہندوستان کے سر کا حسین تاج۔ کشمیر۔ جس میں جموں بھی شامل ہے۔ ۸۵ ہزار مربع میل رقبے پر مشتمل ہے۔

جموں اور کشمیر کو جغرافیائی اعتبار سے چار حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

شمال اور شمال مشرق میں ۱۰ اور ۱۵ ہزار فیٹ کی بلندی پر لداخ ہے۔ شمال مغرب میں گلگت کا پہاڑی خطہ ہے جنوب میں جموں اور سری نگر کی ۸۴ میل لمبی وادی کشمیر واقع ہے۔ یہ وادیٔ کشمیر ہزاروں لاکھوں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کو گرمیوں کے زمانے میں دور دراز مقامات سے حسن، دلکشی اور رعنائی کی مقناطیسی قوت سے اپنی آغوش میں کھینچ لاتی ہے۔

کشمیر کی ندیوں، جھیلوں، پہاڑی سلسلوں، باغات اور رنگ برنگ کے نرم و نازک پھولوں میں بے پناہ سحر انگیز حسن ہے جو ہر نظر اور ہر نگاہ کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔

پانچ میل لمبی اور دس مربع میل پر پھیلی ہوئی ڈل جھیل سری نگر کے قریب واقع ہے۔ اسے ایک بند کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے بڑی ڈل، اور چھوٹی ڈل سری نگر سے ۲۵ میل کی دوری پر ولر جھیل ہے جس کا پانی اپنی شیرینی اور تازگی کے لئے ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔ فلک بوس پہاڑوں کے درمیان ۱۵ میل کی یہ وسیع جھیل بیا شیر مچھلی کے شکار کے لئے بھی کافی شہرت رکھتی ہے شکار کے شوقین سیاح اس جھیل میں مچھلی کا شکار کھیل کر لطف اٹھاتے ہیں۔ ڈل جھیل کے بعد سب سے خوب صورت، دلکش اور نظر افروز جھیل۔ مانس بل، سری نگر سے ۱۸ میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہ جھیل ہمیشہ کنول کے پھولوں سے بھری رہتی ہے۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نیلے آکاش پر بے شمار تارے بکھرے پڑے ہوں۔ یہ جھیل ہر سیاح کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

اتنا ہی نہیں، اس جھیل میں رنگ برنگ کے خوشنما چہچہاتے ہوئے پرندوں، بطخوں اور مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اور گروہ کے گروہ ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ جھیل چڑیوں کی بہت اچھی شکار گاہ ہے۔

ہر مکھ پہاڑ کے قریب ۱۴۷۱۱ فیٹ کی اونچائی پر واقع گنگا بل جھیل بھی سیاحوں کے لئے کم کشش کا باعث نہیں ہے۔

سری نگر میں برفباری کا ایک دلکش منظر

اس کے گہرے نیلے رنگ کے صاف شفاف پانی کو پی کر ساری تھکان دور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شیش ناگ، چاند سر اور ہوک ہیں۔ جھیلوں کے قدرتی مناظر بھی دل کو کافی لبھاتے ہیں ان جھیلوں کے علاوہ ۱۲ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع کوسر ناگ ونڈ بھی کشمیر کے بے حد پرکیف اور روح افزا مقامات میں سے ایک ہے۔ ۵۰ فیٹ گہرے اس روور میں ہمیشہ تیرتے ہوئے برف کے ٹکڑے ایک عجیب دلکش اور خوشنما منظر پیش کرتے ہیں جو دل پر عجیب کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔

سری نگر : ——— جموں اور کشمیر کی راجدھانی ہے اسکا شمار ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ یہ حسین شہر دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر بسا ہوا ہے۔ دریا شہر کے بالکل بیچ سے ہو کر سانپ کی طرح لہراتا ہوا بہتا ہے، آمد و رفت شکاروں کے ذریعے ہوتی ہے ایک سیاح شکارے میں بیٹھ کر پورے سری نگر کی سیر کر سکتا ہے شکارے یک منزلہ بھی ہوتے ہیں اور دو منزلہ بھی، اکثر سیاح تو شکارے میں ہی رہائش اختیار کرتے ہیں۔

سری نگر میں مغل شہنشاہ اکبر کا بنوایا ہوا ہری پربت کا قلعہ بھی ہے۔ یہ قلعہ تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے یہاں کے مغل باغات بھی دلکشی اور خوبیوں میں اپنی مثال آپ ہیں مغل بادشاہوں نے ان باغات میں جابجا چشمے، نہریں کھدوائیں اور فوارے نصب کرا کے ان کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔ ان باغات میں نشاط باغ، شالیمار باغ، نسیم باغ اور چشمۂ شاہی شہرت دوام کے حامل ہیں۔

نشاط باغ سری نگر سے سات میل کے فاصلے پر ہے ۱۶۳۰ء میں شاہجہاں نے اسے لگوایا تھا۔ یہ باغ ۱۷۸۵ فیٹ لمبا اور ۱۱۰۷ فیٹ چوڑا ہے۔ باغ کے مرکزی حصے میں سنگ اسود سے بنا ہوا ایک نہایت خوبصورت تالاب ہے جس میں مسکراتے ہوئے کئی فوارے لگے ہوئے ہیں۔ ڈل جھیل کے بالکل قریب شالیمار باغ ہے۔ اس میں بھی بارہ دری، فوارے اور تالاب بنے ہوئے ہیں۔ ڈل جھیل کے ایک کنارے پر حضرت بل کا تاریخی مقبرہ ہے۔ اس مقدس زیارت گاہ کے پاس ہی شاہجہاں کا بنوایا ہوا نسیم باغ ہے۔ اس [illegible] میں سیکڑوں چنار کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ یہ درخت باغ کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ شاہجہاں نے خود اس باغ میں ایک ہزار سے زیادہ چنار کے پودے لگوائے تھے۔ ویری ناگ اور اچھابل باغات اور چشموں کے سبب قابل دید مقامات ہیں۔

گل مرگ : ——— کشمیر کا ایک نہایت پرکیف اور قابل دید مقام ہے۔ گولف کھیلنے والوں اور شہسواری کے شائقین کے لئے تو یہ مقام گویا جنت ہے۔ گل مرگ کی سات میل لمبی درختوں سے گھری ہوئی سڑک سیاحوں کے لئے قدرت کا ایک نادر تحفہ ہے۔ گل مرگ ۸۷۰۰ فیٹ کی بلندی پر ہے

دو رخ

محمد فاروق تسنیم

مکرمی! تسلیم۔

دو رخ ارسالِ خدمت ہے۔ توقع کے خلاف اور نادانستہ طور پر شاید قلم کہیں کہیں بہک گیا ہے لیکن خاص کر دوسرے رُخ کو بیان کرنے میں مجھے بڑا محتاط رہنا پڑا تھا۔ کیونکہ اس رُخ کا تقاضہ یہ تھا کہ قلم کی نوک پر روشنائی نہیں بلکہ غلاظت لگا لی جائے لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی، پھر بھی اگر کوئی لفظ تہذیب کے دائرے سے ذرا ہٹ گیا ہو تو نظرانداز کر دیجئے گا۔ دو رُخ میں نے دو مختلف کرداروں سے لئے ہیں۔ مضمون کے اندر کوئی تبصرہ نہیں ہے کیونکہ دونوں رُخ پڑھنے کے بعد پڑھنے والے کے دماغ کی تمام [illegible] ہی کھل جاتی ہیں۔ لاکھوں سوالیہ نشان نظر کے سامنے لرزنے لگتے ہیں ——

میں ان دنوں گاؤں اور قصبوں میں گھومتا پھر رہا تھا مقصد صرف تفریح تھا۔ شہر کے ماحول سے فرار، مشینی زندگی سے چھٹکارا اور مصنوعی روشنی سے دوری چاہتا تھا۔ سچ پوچھئے تو گردشِ روزوشب سے فرار چاہتا تھا۔

میں ایک پرفضا قصبے میں پہنچا۔ یہ قصبہ سطحِ سمندر سے تقریباً سات ہزار فیٹ بلند ہے۔ سرد اور سرسبز۔ مئی جون کی گرمی میں بھی ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالنے سے کپکپی دوڑ جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ سرسبز و شاداب پہاڑیاں۔ صنوبر، چنار اور سرو کے سدا بہار درخت۔ سفیدے کے لمبے لمبے درخت۔ پھر خودرو جھاڑیاں اور پھول۔ پہاڑی چشمے اور چشمے میں تیرتے ہوئے برسوں پرانے گھونگھے۔ سب زندگی کے رموز کو آشکار کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روح سے بوجھ اتر چکا ہے۔ ذہن بالکل صاف ہو گیا ہو۔ میں کسی پتھر پر جا بیٹھتا اور ماحول کی اس رنگینی کو [illegible] روح میں اتارتا رہتا۔ ٹھنڈی ہوا سے

س طرح لگتی جیسے میں منظر سے مسل کر رہا ہوں۔ بھی
مے کے متحرک پانی کو دیکھ کر نہ جانے کس سوچ میں کھو
س خاموشی کو کبھی کسی چرواہے کی صدا توڑتی۔ وہ ڈھیلے
یں ملبوس، بانسری ہونٹوں سے لگائے ایسا پرسوز نغمہ
کہ میرے جسم کا رواں رواں اس آواز میں ڈوب جاتا
ان وادی میں بانسری کی آواز کی بازگشت اور بھی کیف
کر دیتی۔ کسقدر زندگی تھی اس آواز میں۔ اکثر وہ چرواہا
سے گزرتا۔ اس کے دو چار دن بعد تو مجھے اس کا انتظار
لگا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ کسرتی اور سڈول بدن خوبصو
دیہاتی لباس، سر پر پگڑی، پاؤں میں چپل۔ ٹخ ٹخ کی صدا
بس پر اس کی بھیڑیں اپنا رُخ بدل لیتی تھیں اور میں سوچنے
انسان آج کل کتنا بدل گیا ہے۔ شہر میں اگر یہ لڑکا اسی
بہ پہونچ جائے تو یقیناً لوگ اس پر قہقہے لگائیں گے۔ کیونکہ
بہت ترقی کر چکا ہے اور یہ ابھی تک اسی پرانی ڈگر پر چل
ہے۔ انسان چاند پر پہونچ گیا ہے اور یہ ابھی تک ڈھیلا
لباس پہنے اس سے بے خبر اس حسین وادی میں بھیڑیں
رہا ہے۔ اسے علم نہیں کہ انسان کتنی ترقی کر چکا ہے۔ اسے
ان مدارج کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں انسان نے ترقی کا
زینہ اس وقت طے کیا تھا جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تھی
سرا زینہ اس وقت طے کیا جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی
سرا زینہ اس وقت طے کیا جب ہیروشیما پر بم گرایا گیا۔ اور یہ
ہے کہ یہ سب کچھ انسان نے اپنی ترقی کا ثبوت دینے کے لئے
بار پھر انسانیت کی ترقی بڑھ گئی۔ پہلے اور دوسرے زینے کے
درمیان برسوں کا وقفہ تھا۔ لیکن تیسرے زینے کے بعد انسان نے
نی جلدی سیڑھیاں طے کیں کہ عقل حیران رہ گئی۔ ویت نام کی
ہوائیں اور فلسطین کے خانماں برباد ابھی تک اس ترقی کو حیرت
سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ چرواہا اس ترقی یافتہ انسان کو دیکھ
لے تو یقیناً دنگ رہ جائے۔

خیر میں اسے دیکھتا۔ اس کی سادگی نے مجھ پر گہرا اثر کیا
اور پھر ایک دن میں چشمے پر بیٹھا پانی کی روانی دیکھ رہا تھا کہ
مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری
آنکھیں خیرہ ہوگئیں ـــــ قدرتی حُسن کا انمول شاہکار۔ ایک
دوشیزہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ لمبی اور ڈھیلی قمیص، پورے پائنچوں
کی شلوار، کھجور کے پتوں کی چپل۔ سر پر موٹی سی چادر۔ بالوں میں
موتی۔ ماتھے پر جھومر نما زیور۔ کانوں میں بالے۔ ہاتھ میں موتیوں
سے جڑے۔ میری جیب کی طرح ... [illegible]
یا توتی ہونٹ۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی جھینپ گئی اور کچھ میں
بھی کترا گیا۔ پرایا شہر نہ کوئی دوست نہ آشنا اگر کوئی اونچ نیچ
ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی
اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔

وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر شاید واپس ہوئی جب اس کے
قدموں کی آواز دور ہوگئی تو میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ ایک پتھریلی
ڈھلان پر سے اتر رہی تھی۔

میں وہیں بیٹھا اس کے حسن کا جائزہ لے رہا تھا۔ کس قدر
نکھار تھا اس کے حسن میں۔ جیسے شبنم سے دھلا ہوا پھول، صدف
سے نکلا ہوا انمول موتی۔ وہی آب و تاب وہی نکھار۔ میں شہر کا
رہنے والا، مصنوعی آرائش و زیبائش کا عادی، اس موتی کو دیکھ کر
دنگ رہ گیا۔

پھر چشمے پر جانا میری عادت بن گئی بے اختیاری طور پر
شام کو میرے قدم چشمے کی طرف اٹھ جاتے اور وہ لڑکی اکثر چشمے پر آتی۔
آہستہ آہستہ تکلفات کے پردے اٹھنے لگے۔ حجاب کم ہوتا گیا
ایک دن وہیں سے بیٹھے ہوئے میں نے اس سے پوچھا:۔

"کیا نام ہے تمہارا"

"ریشماں" زندگی سے بھرپور باریک آواز گونجی۔ جیسے دریا کے
میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

"کہاں رہتی ہو"؟ میرا دوسرا سوال تھا۔

"پہاڑی کے پیچھے" وہی دلکش آواز پھر گونجی۔

"یہاں کیوں آتی ہو"؟ سوال بے تکا سا تھا اس لئے
میرا دل دھڑکنے لگا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھری اور پھر چہرہ
سُرخ ہوگیا۔ کان کی لوئیں تک لال ہوگئیں نظریں جھک گئیں اور
وہ چادر کا کونا مروڑنے لگی۔

میں نے سوال دہرایا تو وہ الٹے قدموں بھاگ گئی۔

میں نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔

دوسرے دن وہ پھر وہاں پر موجود تھی۔ اس دفعہ میں
اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ وہ سہمی سمٹائی کھڑی تھی۔ جوں جوں میں
نزدیک پہونچ رہا تھا اس کا رنگ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرے
لمحے میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک دم چونک
پڑی اور پھر کسمسا کر میرا ہاتھ شانے پر سے گرا دیا۔ میں آگے بڑھا
اور اس دفعہ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا:۔

"ہاتھ ہٹاؤ" اس نے کہا۔

میں نے کہا: "ریشماں ایسی بھی کیا بے مروتی"

ریشماں نے کہا: "بابو جی میں ایک دیہاتی لڑکی ضرور ہوں
لیکن اپنے جسم کو ہاتھ لگانے کی اجازت کسی مرد کو نہیں دے
سکتی۔ میرا جسم کوئی غیر مرد نہیں چھو سکتا۔ تم غلط فہمی میں پڑ گئے
تھے بابو جی۔ میں اس محبت کی قائل ہوں جس کے درمیان شرم کا
پردہ رہے۔ میرے کندھے پر سے ہاتھ ہٹاؤ میں جا رہی ہوں۔ تم نے
میرے جسم کو چھو کر میری بے عزتی کی ہے"

"ریشماں" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"چھوڑ دو مجھے" دفعتاً اس کا چہرہ بدل گیا۔ اس کی آواز
میں بادل کی گرج تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیرنی غصے میں آگئی
ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ چلی گئی۔

اس کے بعد بارہا میں اس چشمے پر گیا لیکن وہ نہ ملی۔ وہ
شرم و حیا کی پتلی نہ جانے کہاں جا چھپی تھی۔ میں اس سے معافی
بھی نہ مانگ سکا۔ اس کے دل سے اپنے متعلق پیدا ہونے والے
غلط تاثرات کو بھی دور نہ کر سکا۔

دوسرا رخ

کیفے بٹر فلائی میں میرا آنا جانا تھا۔ شام کو تھکے ہوئے
ذہن سے وہاں چلا جاتا اور رات گئے تک وہاں دوستوں کے
ساتھ گپ شپ ہوتی رہتی۔ ہوٹل کا معیار بہت اونچا تھا۔ اونچے
طبقے کے لوگ ہی آتے جاتے تھے۔ ان میں مرد بھی ہوتے اور عورتیں
بھی۔ میرے کچھ دوست شراب سے بھی شغل کرتے تھے اور بارہا
مجھے بھی اس کے لئے مجبور کر چکے تھے لیکن میں نے شراب کو ہاتھ
نہ لگایا تھا۔ بس ایک ضد سی تھی شراب کے ساتھ۔ میں چائے
یا کافی پر اکتفا کرتا تھا۔ میرے دوستوں میں سے کئی دوست
عورتوں سے بھی مراسم قائم کئے ہوئے تھے۔ ان گرل فرینڈز کی
موجودگی میں تو ان کی شراب نوشی انتہا کو پہونچ جاتی۔ شاید وہ
صنف مخالف پر اپنے "پلکڑ" ہونے کی دھاک بٹھانا چاہتے تھے
نازو سے میری ملاقات یہیں ہوئی۔ وہ بھی اتفاقاً ـــ
وہ شاید اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ہماری میز پر آگئی تھی۔ اسکی
وہ سہیلی خالد کی گرل فرینڈ تھی۔ اس کی سہیلی تو خالد سے
بات چیت کرنے لگی اور نازو میری طرف متوجہ ہوگئی۔ ہم باتیں
کرتے رہے اس کے بعد ہماری ملاقاتیں بڑھتی گئیں ـــ نازو
دانستہ یا نادانستہ طور پر میری طرف جھکتی چلی گئی لیکن اس کے
باوجود میں یہ کہنے میں قطعاً عار نہ محسوس کروں گا کہ میں نے اس سے

کہاں منتقل ہوجاتی ہے۔ بس کبھی کبھار گھوم لیتی۔

ایک دن میں بیٹھا تھا۔ دوستوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا کہ نازو سامنے آئی اور بولی۔

"ہلو ساجد آج اکیلے !؟"

"ہلو نازو۔ بس یونہی" میں نے کہا "آؤ بیٹھو"

"کہیے کیسے مزاج ہیں" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے"

"کمال ہے آپ تنہا ہو کر بھی وقت گزار لیتے ہیں۔ ایسے مجھے تو ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں"

"اس میں تعجب کی کونسی بات ہے، میں ویسے بھی تنہائی پسند ہوں۔ صرف ہنگاموں پر نظر رکھنا چاہتا ہوں۔ ہنگاموں میں شامل نہیں ہونا چاہتا"

"عجیب بات ہے" اس نے کہا۔

"آپ سنائیے" میں نے بات جاری رکھنے کے لئے کہا۔ "کچھ کیا پئیں گی، کافی یا چائے"!

نازو نے کہا "مسٹر ساجد چائے اور کافی بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔ اور پھر اس ماحول میں جہاں چاروں طرف رنگینی ہو۔ موسیقی ہو"؟

"تو پھر" میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے کہا "اور مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ آپ ایسے لونچے ہوٹل میں صرف چائے پر اکتفا کرتے ہیں"

"آپ کیا پیجئے گا محترمہ" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"شیری۔ شیمپئن۔ ووڈکا۔ رم۔ بیئر۔ وسکی، کچھ بھی سہی" اس نے شراب کی دوکان پر کام کرنے والے سیلز مین کی طرح سارے نام سنا دیے۔

میں نے پوچھا "وسکی چلے گی"؟

"ضرور چلے گی" اس نے کہا۔

"خالص یا سوڈے کے ساتھ"؟ میں نے وضاحت چاہی۔

"سوڈا بھی" اس نے کہا۔

میں نے آرڈر دیا۔ اس نے وسکی کی چسکیاں لیں اور چند لمحے بعد وسکی اس کی آنکھوں میں پہنچ گئی۔ ایک تو ویسے ہی بڑی بڑی آنکھیں، پھر اس پر وسکی کا نشہ۔ دو آتشہ والی بات تھی۔ اس نے بوجھل پلکیں اٹھائیں اور کہا۔

"تم بھی پیا کرو، ڈیر ساجد"

"مجھے تو نشے میں آ پینے والوں کو دیکھ کر ہی جھوم اٹھتا ہوں" میں نے معذرت چاہی۔

"جب پی نہیں سکتے تو اتنی اونچی سوسائٹی کیوں move کرتے ہو" اس نے لپک کر پوچھا۔

"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اس سوسائٹی پر تمہاری اجارہ داری ہے تو بلا خوف و خطر مجھے اس سوسائٹی سے نکال دو"

ادھر نازو نشے میں ڈوبی اُدھر موسیقی کا ریکارڈ بجنے لگا۔ قافی جوڑے آہستہ آہستہ پھسل کر ڈانس فلور پر بیٹھنے لگے۔ نازو کا دل بھی مچل گیا۔ اس نے خمار آلود نظریں اٹھائیں اور کہا۔

"چلو ہم بھی ناچیں گے"

"کیا اس کے بغیر لشرادھورا رہ جائے گا"

"ساجد تم سمجھتے کیوں نہیں۔ جب تم زندگی کے اس رُخ سے محظوظ ہونا چاہتے ہو، لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو پھر یہ تکلف کیسا؟"

"خیر جیسی تمہاری مرضی" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اس کی کمر میں ایک ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ناچتے ہوئے جوڑوں میں شامل ہو گیا۔

نازو نشے میں ضرور تھی لیکن اس کے قدم صحیح پڑ رہے تھے اسے ڈانس میں کمال حاصل تھا۔ کوئی قدم بھی غلط نہ پڑا تھا۔ میں نے ازراہ تعریف کہا۔

"تم بہت اچھا ناچ لیتی ہو"

"اور نچانے والے کے متعلق کیا خیال ہے"؟

"اس کے بارے میں لاعلم ہوں۔ جب یہ بات میرے علم میں آئے گی تو رائے دیدوں گا"

"بڑے خشک قسم کے آدمی ہو"

"خشک نہیں بلکہ انتہائی خشک" میں نے خشک پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ صرف میری طرف گھور کر رہ گئی۔

چند لمحوں بعد نازو کا تنفس بدل گیا، سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی، آنکھوں میں پڑے ہوئے ڈورے پھیل گئے۔ نشے میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے بوجھل پلکیں اٹھائیں مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "ساجد"

"ہوں" میں نے کہا۔

"میں چاہتی ہوں تم گستاخیاں کرو۔ جارحانہ اور ظالمانہ گستاخیاں" اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔

"کیا یہ بھی ناچ کا جزو ہے" میں نے پوچھا۔

"تم کس قدر خشک ہو" اس نے طنز کا تیر چلایا۔ "تم آخر مجھے کیوں نہیں"!

میں نے کہا "نازو میں سب سمجھتا ہوں لیکن افسوس کہ تمہارے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ میں جذبات کے دھارے پہ بہنے کا قائل نہیں ہوں، کیونکہ اگر میں تمہاری باتیں مانتا چلا گیا تو جب تمہارا نشہ اترے گا اس وقت تمہارے پاس کچھ بھی نہ رہے گا"

"تم کس زمانے کی باتیں کرتے ہو" اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی "زندگی میں مسرت کے لمحات بہت کم آتے ہیں اور تم انہیں بھی ضائع کر دینا چاہتے ہو"؟

میں نے کہا "ان مواقع سے آپ ہی فائدہ اٹھائیے"

وہ بہت مچلی، تڑپی۔ جھلائی پھر ایک بربط کی شکل اختیار کر گئی وہ نغمے اٹھنے کے لئے صرف میری انگلیوں کی طلبگار تھی۔ لیکن میں ان تاروں کو نہ چھیڑ سکا۔ جب اس کے جذبات میں بہت زیادہ ہلچل ہوئی تو میں نے اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور بل ادا کر کے ہوٹل سے باہر آ گیا۔ میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ لیکن ندامت کے احساس کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ میرا دماغ کھول رہا تھا۔ نازو نے مجھے عورت کا ایک ایسا رُخ دکھایا تھا کہ اس رخ کو میں اپنے ذہن سے جلد از جلد محو کر دینا چاہتا تھا۔ میں بھول جانا چاہتا تھا نازو کو۔ اس کی تڑپ کو۔ اس کی جھلاہٹ کو۔ اس کی نشیلی آنکھوں کو۔ کیونکہ ——— مجھے ڈر ہے کہ مجھے عورت سے نفرت ہو جائے گی۔

اس کے بعد میں کبھی کیفے بٹر فلائی میں نہ گیا۔

کتوں کے ذریعہ سراغ رسانی

ع۔ ع جامی

ابتداء میں صرف چند یورپین ممالک میں کتوں کے ذریعہ سراغ رسانی کا کام لینے کا تجربہ کیا گیا۔ نتیجہ توقع سے زیادہ حوصلہ افزا رہا۔ اب تو دنیا کے اکثر و بیشتر ملکوں میں کتوں کے ذریعہ جاسوسی کا کام لیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۹۵۲ء میں مدراس کے محکمہ پولیس نے جاسوس کتوں کا ایک دستہ تیار کیا۔ اس دستہ میں ۹ تربیت یافتہ جاسوس کتے تھے۔ اس وقت تقریباً ہر صوبے میں پولیس ڈپارٹمنٹ کے تحت کتوں کو سراغ رسانی کی تربیت دی جاتی ہے اور ہر صوبے کے محکمہ پولیس کے پاس جاسوس کتوں کے مختلف اسکواڈرن موجود ہیں۔

موقع واردات پر جب مجرم چالاکی سے ایسا کوئی نشان نہیں چھوڑتا جس کی بنا پر اس کا صحیح پتہ لگایا جا سکے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی انگلیوں کے نشان بھی مٹا کر فرار ہو جاتا ہے اور عقل انسانی مجرم کا صحیح پتہ لگانے میں ناکام نظر آنے لگتی ہے تو یہ تربیت یافتہ جاسوس کتے مجرم کی جسمانی مہک کو سونگھ کر جو موقع واردات کی فضا میں لہراتی رہتی ہے۔ مجرم کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عام طور پر کتے اپنے مالک کے بہت وفادار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مالک کی خوشی حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں صرف اسی ایک خصوصیت کی بنا پر کتوں کو جاسوسی کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ کوشش کی جائے تو دیسی کتے بھی کچھ باتیں سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ـــ

ہندوستان کی آب ہوا اور یہاں کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جاسوسی کے لئے السیشین بر ڈوبر، رٹریور، باکر اور ڈوبرمین ذات کے کتے زیادہ سودمند تصور کئے جاتے ہیں۔

ڈوبرمین گٹھے ہوئے چکنے اور چمکیلے جسم والا چست و چالاک قسم کا کتا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ۱۸ ویں صدی میں جرمنی کے ایک شخص، مسٹر ڈوبرمین نے کتوں کی چار مختلف قسموں کے میل اور ملاپ سے خاص طور پر فوج اور پولیس کے کام آنے کے لئے ہی اس نسل کی افزائش کی تھی۔

صبر، ہوشیاری، فرمانبرداری، اپنے مالک کے حکم کی بجا آوری کی چستی اور تندہی کا جذبہ ڈوبرمین میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

عام طور پر چھ ماہ کے پلوں کو ٹریننگ کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ نر پلوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ انتخاب سے پہلے ہر پلے کی جسمانی بناوٹ، صحت، عادات، اہلیت کمزوریت اور رنگ کو دھیان میں رکھتے ہوئے خوب جانچ کر لی جاتی ہے۔

سراغ رساں کتے کو ٹریننگ دی جا رہی ہے

صرف کتوں پر ہی نہیں بلکہ تربیت دینے والے کی ذاتی اہلیت اور قابلیت پر بھی کامیابی منحصر ہوتی ہے۔

کتوں کی کارکردگی کی کل مدت چھ ماہ سے آٹھ سال تک ہوتی ہے۔

معمولی حالات میں کتے کو تربیت دینے والا جب تک ٹریننگ مکمل نہ ہو جائے بدلا نہیں جاتا۔ ان کتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور انکو کارآمد بنانے کا انحصار تربیت دینے والے پر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ تربیت

ہ والا بنات خوردہ صحت مند اور دلچسپ ہو اور اس کے دل
توں کے لئے سچا پیار ہو تاکہ وہ آسانی سے کتوں کو اپنے
مانوس کر سکے۔

سراغ رسانی کا کام شروع کرنے سے پہلے کسی کتے کو
او کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اسی عرصہ میں پٹے اور بغیر
، کے ساتھ ساتھ چلنا، حکم دینے پر بھونکنا، بیٹھنا، کھڑے
ا جھکنا، پاس آنا، واپس جانا اور اپنی جگہ پر ٹھہرنا وغیرہ
دی باتوں کے علاوہ پیچھا کرنا، چھپی ہوئی چیز دل یا مجرموں
لاش، کسی آدمی یا سامان کی رکھوالی کرنا، مطلوبہ شخص کو
ست پکڑ لینا، اپنے مالک کی حفاظت اور مرحلہ سر کرنے
ور راستے کی رکاوٹوں کو ہمت اور جرأت سے دور کرنا
یا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں کتے کو رفتہ رفتہ نہایت نرمی
ر سکھائی جاتی ہیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا
ہے کہ تربیت دینے والے کی کسی حرکت یا برتاؤ سے
لتے کے دل میں ڈر یا بغاوت کے جذبات پیدا نہ ہو جائیں۔

اگر کسی بھولے بھالے دیہاتی کو بمبئی یا کلکتہ جیسے شہر میں
رکھ دیا جائے تو وہ فطری طور پہ وہاں کی بھیڑ، سواریوں
ا ہر لمحہ آمد و رفت اور ہجوم کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جائے گا۔
اسوس کتوں کے ساتھ بھی کہیں ایسی ہی صورت پیش نہ آئے
یں کبھی کبھی بھیڑ اور ہجوم سے بھری اور سواریوں کی آمد
ت سے پر سڑکوں پر ٹہلایا جاتا ہے تاکہ وہ اس کے عادی
ہو جائیں اور وقت پڑنے پہ اپنے حواس نہ کھو بیٹھیں۔

کتے کی لاپروائی اور سستی کو کسی طرح کی ڈھیل نہیں
ینی چاہیئے۔ حکم ہمیشہ ایک انداز اور بلند آواز میں دینا چاہئے
واز بدل کر یا نئے طریقے سے حکم دینے سے کتا غلط فہمی میں
بتلا ہو سکتا ہے اور اپنی حیوانی فطرت کے سبب بگڑ
سکتا ہے۔

اگر کبھی کسی غیر معمولی وجہ سے کسی کتے کا تربیت دینے
والا تبدیل کیا جاتا ہے تو نیا تربیت دینے والا ۱۵ یا ۲۰ دن
ک کتے کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے
ی طرح سے واقف ہو جائیں۔ اچھی تربیت اور مشق
ے کتوں میں خود اتنا اعتماد اور بھروسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ
خطرناک حالات میں یہاں تک کہ بندوق
کتے بھی اپنی ڈیوٹی پہ بہادری اور جرأت سے
ہیں اور اپنے کام کو کبھی ادھورا یا نامکمل نہیں

میں نے پہلے سال میں داخلہ لیتے ہی قرضے کیلئے درخواست دیدی ہے تاکہ پاس ہوجاؤں تو قرضہ مل جائے

چھوڑتے۔

ایسے کتے کو یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ صرف اپنے
مالک کا حکم مانے اور اس کے ہاتھ سے دیا ہوا کھانا کھائے۔
کسی اجنبی کا نہ حکم نہ مانے بلکہ حکم عدولی کرے اور کسی غیر شخص
کی دی ہوئی کوئی چیز نہ کھائے۔

اگر کوئی کتا حکم عدولی کرتا ہے تو اسے جسمانی تکلیف
نہیں دی جاتی اور نہ اسے زدکوب کیا جاتا ہے۔ اس
طرح کتے کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ تربیت دینے والا
صرف اپنے آواز کے اتار چڑھاؤ سے اپنی ناراضگی اور خفگی
کا اظہار کرتا ہے۔ غلطی سرزد ہونے کے کچھ دیر بعد اگر کتے
کو ڈانٹا جائے تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ اس کی سمجھ میں ہی
نہ آئے گا کہ اُسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ جس وقت
کتا غلطی کرے اُسے اسی وقت ڈانٹنا چاہیئے۔ حکم کی پوری
پوری تعمیل کے بعد کتے کی پیٹھ یا سینا تھپتھپا کر اُسے
ضرور شاباشی دینی چاہیئے۔ رفتہ رفتہ کتا اس قدر ٹرینڈ
ہو جائے گا کہ بغیر بولے ہوئے صرف اشارہ یا سیٹی کی آواز
پر ہی کام کرنے لگے گا۔

جاسوسی کے کام کے لئے ایک تربیت یافتہ کتا آسانی
کیساتھ اپنے مالک کی مدد سے چودہ فٹ اونچی دیوار پر چڑھ سکتا ہے
سترہ فٹ لمبی کھائی یا نالا پھاند سکتا ہے۔ ساڑھے چار
فٹ تک کی رکاوٹ کو چھلانگ لگا کر پار کر سکتا ہے اور
ضرورت پڑنے پر ایک منزل اونچے مکان سے نیچے کود
سکتا ہے۔

ٹریننگ کے بعد ان جاسوس کتوں کے کھانے پینے
اور صحت کا پورا خیال کیا جاتا ہے۔ ہر کتے کی میڈیکل رپورٹ
تیار کی جاتی ہے۔

ہر روز صبح کے وقت اور باہر سے لوٹنے کے بعد کتے
کی آنکھ، ناک، کان، اور پیر صاف کئے جاتے ہیں۔ ہفتہ
میں ایک دن دانت اور کام ختم ہونے پر ہر شام اُن کا جسم
برش سے صاف کیا جاتا ہے۔ ایسے کتوں کو مہینے میں صرف
ایک دو بار نہلایا جاتا ہے۔ روزانہ نہلانے سے اُن کے
جسم کا چمڑا کٹ جاتا ہے اور بیماری میں مبتلا ہونے کا
خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

ایک جاسوس کتے کے کھانے پر روزانہ ۵ روپے سے
کم خرچ نہیں ہوتا۔ کھانا وقت مقررہ پر ہی دیا جاتا ہے۔
نہ پہلے اور نہ بعد میں۔ اس سے کتے میں وقت سے کھانا
کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور دوسروں سے پھر
وہ کوئی چیز نہیں کھاتا۔

مجرم کی تلاشی یا کسی کا پیچھا کرنے کے لئے باہر جانے
سے پہلے کتے کو قلیل مقدار میں ضرور کچھ کھلا پلا دیا جاتا ہے
تاکہ وہ اپنی بھوک اور پیاس پر قابو رکھے۔ گرمی کے زمانے
میں تربیت دینے والے اپنے ساتھ گلوکوز کا پانی رکھتے
ہیں اور جب کتا دوڑ بھاگ نے کے بعد ہانپنے لگتا ہے
تو وہی پانی پلا کر اُسے تر و تازہ رکھا جاتا ہے۔

درحقیقت ایسے کتوں کو تربیت دینے والا ہی
اُن کا سب کچھ ہوتا ہے۔ مالک۔ استاد۔ دوست۔ ✽

گریس کا چل چلاؤ

جسٹس سنجیوا ریڈی کے استعفے اور تارکیشوری سنہا کی تنقید نے نیم جاں کر دیئے

ڈت نہرو نے ایک بار کہا تھا "تاریخ ان شہزادوں
ں اور رہارانیوں کی کہانی ہے جنہوں نے الگ تھلگ زندگی
خاص فضا میں محصور رہے"
ہرو جی کے یہ جملے جن میں مختلف ادوار کی مشترکہ دھڑکنیں
ہی ہیں آج سنڈیکیٹ کانگریس کے لیڈروں پر اتنے
آتے ہیں کہ گویا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کے لئے کہے گئے
جب اخباروں میں سنڈیکیٹ کانگریس کے بمبئی میں
ہونے والے اجلاس کی خبریں نظر سے گزریں تو میں
نے سوچا کہ گزشتہ چناؤ میں کمر ٹوٹنے کے اسباب پر غور، زمانے
کی بدلتی قدروں کو مدنظر رکھ کر پارٹی پروگرام میں تبدیلی،
ملکی حالات کا جائزہ لے کر جنہوں نے الیکشن کے بعد نیا روپ
دھارن کیا ہے، سنڈیکیٹی چودھری اندھیری (بمبئی) کے
ودھیا بھون کی چھتوں کے نیچے مل بیٹھ کر کچھ نئے فیصلے کرینگے۔
مگر جب اجلاس میں زیر بحث آنے والی تجویزوں، اور اٹھائے
ہوئے سوالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ان جنادری پنڈتوں
اور راج سنگھاسن کے چاہنے والوں کی ذہنی حالت ہنوز ویسی
ہی ہے جیسے لکھنؤ اجلاس سے قبل یا الیکشن میں حصہ لیتے
وقت تھی۔ البتہ اس تجویز کا خیر مقدم کیا جائے گا جو انھوں نے
کسی محاذ میں شامل نہ ہونے کے متعلق پاس کی تھی۔
اجلاس میں پاس ہونے والی یہی ایک تجویز ایسی تھی جسے حالات
کے مطالعے کا لازمی نتیجہ اور عوامی شعور کے بدلتے دھاروں کا
اولین تقاضہ کہا جا سکتا ہے۔
باقی دو تجویزیں جو مخالفین اور موافقین کے شور و ہنگامے
کے بیچ پاس ہوئی تھیں ان میں اس کے علاوہ اور کوئی خاص

لیا۔ اتولیہ گھوش — سینے میں چبھنے والے بہتر یہ ہے کہ انہیں باہر نکال پھینکا جائے اور حالات کا سختی سے مقابلہ کیا جائے تاکہ ہمیں کے دولہے نصیب ہو سکیں

بات نہیں تھی کہ مسز اندرا گاندھی کو تمام مصیبتوں کی جڑ، موجودہ تکالیف اور دشواریوں کی ذمے دار، نیز لیے ہوئے داخلی اور خارجی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہنے والی شخصیت کے خطابات سے نوازا گیا۔

گزشتہ سال دسمبر کے ابتدائی ہفتے میں اتر پردیش کی راجدھانی میں سنڈی کیٹی راج بہادروں کا اجلاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں بحث و مباحثہ اور لیڈروں کی تقاریر کے لیے جتنی بھی میٹنگیں ہوئیں ان میں عوام سے زیادہ پولیس والے تھے۔ وجہ ظاہر ہے کہ سنڈیکیٹی لیڈر اندرا جی کی مخالفت میں اتنے منہ پھٹ اور گستاخ ہو گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا انہیں عوام کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر سی۔بی گپتا نے جو مجوزہ اجلاس کے کرتا دھرتا تھے عوام کے تیور دیکھ کر اپنے اور عوام کے درمیان پولیس کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اس کے باوجود امین الدولہ پارک میں تقریر کرتے ہوئے جب مسٹر مرارجی نے حسب عادت اندرا جی پر کیچڑ اچھالا تو اتنا ہنگامہ ہوا، اتنے نعرے کسے گئے کہ انہیں اپنا لہجہ قابو میں رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔

دراصل یہ سنڈیکیٹی لیڈروں کی غلطی نہیں تھی انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ماضی میں اقتدار میں شریک ہونے کی حیثیت سے عوام ان کی ہر بات کو سو فیصد صحیح سمجھ لیں گے اس لئے اپنا مفاد حاصل کرنے کے لئے وہ ہر اس اقدام پر آمادہ تھے جو انہیں منزل مقصود سے ایک انچ بھی قریب کر دیتا ہو۔ اسلئے جب صدارتی انتخاب میں انکے نمائندے نیلم سنجیوا ریڈی کو شکست ہوئی تو انتقام لینے کی غرض سے مسز اندرا گاندھی کو ذلیل کرنے کی مہم شروع کی۔

یہی وجہ تھی کہ جب شیو نرائن اور نول کشور جیسے لوگوں نے دونوں کانگریس میں مفاہمت کا رزولیوشن پیش کیا تو پورا ہائی کمان ان پر برس پڑا، پھر اسی ہائی کمان نے نجلنگپا جی کو پورا اختیار دیا کہ اندرا سرکار کو مٹی میں ملانے کے لئے کسی بھی پارٹی سے گٹھ جوڑ کریں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مرارجی ڈیسائی سے لے کر ہائی کمان اور سنڈی کیٹ کے ہر ممبر نے سنڈیکیٹ کانگریس کو ایک مضبوط فعال تحریک اور ہندوستانی عوام کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کی کوشش کی مگر مرارجی ڈیسائی نے جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی سے ساز باز کرنے کا مشورہ دے کر غیر شعوری طور پر اس امر کا اعتراف کر لیا کہ بغیر فرقہ پرست اور رجعت پسند (PRE - [illegible]OKED) جماعتوں کے تعاون کے اقتدار حاصل نہیں کر سکتے ——— اسی شہر لکھنؤ میں ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۵ء میں کانگریس کے دو اجلاس ہوئے تھے، اس وقت بھی کانگریس میں دو گروپ تھے جس کے لیڈر تحریک آزادی کو اپنے پروگرام کے مطابق ترتیب دینا چاہتے تھے، مگر ان اجلاس کے اختتام پر نہ صرف ان میں مفاہمت ہو گئی بلکہ آپسی تنازعات کو ختم کر کے جنگ آزادی میں ایک دوسرے کے ساتھ شامل بھی ہو گئے۔ غالباً لکھنؤ کی اسی خوبی سے متاثر ہو کر شیو نرائن اور ان کے دوستوں نے دوستی کی بات منہ سے نکالی تھی مگر۔۔۔

چنانچہ اسی تاریخ ساز غلطی کا نتیجہ تھا کہ اس وقت جتنا فاصلہ سنڈی کیٹ کانگریس کے لیڈروں اور عوامی امنگوں میں تھا کم و بیش اتنا ہی فاصلہ بمبئی اجلاس کے بعد عوام میں اور ان میں رہ گیا ہے۔

اگرچہ ان لوگوں نے آپسی تعلقات اور بدگمانیوں کو ختم کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر لیڈروں کی روایتی تنگ نظری اور سیاسی غیر دانشمندی کی وجہ سے ناکام رہے البتہ اپنے بے زبان مگر وفادار سکریٹری مسٹر صادق علی کو صدر نامزد کر کے پھوٹ کو کم کرنے کی کوشش کی، مگر اسی اجلاس کے ایک ہفتے بعد پرانی سنڈی کیٹی سنجیوا ریڈی نے ہائی کمان اور اس کی ممبرشپ سے اپنا استعفیٰ روانہ کر کے پارٹی لیڈروں کے فیصلے کو جس طرح ٹھکرایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اختلافات ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ رہے ہیں۔

سنجیوا ریڈی نے اپنے استعفیٰ نامے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ سنڈیکیٹی ہائی کمان کے فیصلوں کو نہ صرف غلط اور فرسودہ تصور کرتے ہیں بلکہ اس پالیسی کو بھی ناپسند کرتے ہیں جو اس اجلاس میں معاشی اور سیاسی قرارداد کے متعلق پاس ہوئی تھی۔ اگرچہ اس استعفے کو مسٹر صادق علی نے "سنجیوا پر دباؤ کا نتیجہ" کہا تھا مگر اخباری نمائندوں کے پوچھنے پر بھی دباؤ ڈالنے والوں کا نام نہیں بتلایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنڈی کیٹی چودھریوں میں نہ صرف صحت مند سیاسی شعور کا فقدان ہے بلکہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں سے بھی نابلد ہیں۔ دراصل اسی ذہنیت نے ان کی حالت ریگستان کے اس ناتجربہ کار مسافر کی طرح بنا دی ہے جو راستہ بھٹک کر سراب کے پیچھے دوڑتا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ اس اجلاس کے دو روز قبل پیش آیا۔ آٹھ دن کے مکمل آرام کے بعد اندرا جی کی بے رحم نقاد شریمتی تارکیشوری سنہا نے ایک خط تمام اخبارات میں شائع کرایا جس میں سنڈیکیٹی بہادروں کی تنگ نظری، کوتاہی اور غلط فیصلوں پر شدید تنقید کرتے ہوئے ان کی فرسودہ پالیسی اور غلط رہنمائی پر سخت تنقید کی تھی۔ اس تنقید کا مطلب بھی یہی تھا کہ اجلاس یا پالیسی وضع کرتے وقت ان حقائق کو سامنے رکھا جائے جن کی کوکھ سے حالات کو اتھل پتھل کرنے والے واقعات نے جنم لیا ہے۔ مگر افسوس کہ ان لوگوں نے مسز سنہا کے بیانات کو نہ صرف حیرت اور تعجب کا باعث قرار دے کر اپنے ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا بلکہ پاس ہونے والی تجویزوں کے ذریعے ثابت بھی کیا کہ ان میں دور اندیشی، فہم اور اونچ نیچ کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے جو اتحاد باہمی (CO-ORDINATION) کو قائم رکھنے اور ملک کے پیش آمدہ مسائل (RISING PROBLEMS) کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

سنجیوا ریڈی کا استعفیٰ اور شریمتی تارکیشوری سنہا کی تنقید کیا اور بدلتے رجحانات کو نظر انداز کرنے یا ان پر پردہ ڈالنے کی بجائے سنڈی کیٹی لیڈروں اور ہائی کمان کے معزز ممبروں کو چاہیے کہ وہ غور کریں کیونکہ وقت گزشتہ واقعات کے نتائج کی ایک تاریخ مرتب کر رہا ہے جہاں بدلتی قدروں کو تانگے کی دیوار کے اندر بند کرنے والوں کے لئے مطلق جگہ نہیں ہے، نہ ہی ان لوگوں کے لئے کوئی مقام ہے جو عوامی رجحانات اور وقت کی آواز کو سمجھنے اور سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

ہٹلر کا نائب

ہیس

گزشتہ دس مئی کو ہیس نے اپنی قید کے تیس برس
ے کر لئے۔ وہ بوڑھا جرمن لیڈر ہے جو قید تنہائی بھگت
ہے۔اس وقت اس کی عمر ۷۷ برس ہے۔ کسی زمانے
وہ ہٹلر کا نائب تھا اور جرمنی میں اس کا طوطی بولتا تھا
اس وقت برلن کے ایک فوجی جیل خانے میں جس کی
الی برطانیہ، امریکہ، فرانس اور روس کی فوجیں کرتی
، اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے۔

جون ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا اور دوسری جنگ عظیم کو
زوع ہوئے پورے دو برس گزر چکے تھے کہ ہیس اچانک
راشوٹ کے ذریعے اسکاٹ لینڈ میں جا اترا۔ وہ برطانیہ
ر جرمنی میں صلح کرانے کے لئے گیا تھا تاکہ دونوں ملکر
دس پر حملہ کرسکیں لیکن برطانوی حکومت نے ہیس پر نازئر
، ایک دیہی حویلی مشیٹ پلیس میں قید کردیا۔ اس حویلی
دیکھ کر اسے میونک میں اپنا گھر یاد آتا تھا۔

برطانیہ کے نفسیات دانوں نے ہیس کو تشدد پر کری توجہ رکھی
لما اس کے دماغ کی صفائی میں لگ گئے تاکہ اس سے نازیوں
کے خفیہ راز معلوم کرسکیں۔ برطانوی سراغ رسانوں کو توقع
تھی کہ شہری ہنگاموں سے دور دیہات کی خاموش فضا میں
وہ ہیس سے نازی جرمنی کے خفیہ راز معلوم کرسکیں گے۔

اسکاٹ لینڈ میں اترنے کے بعد ہیس کے چند ابتدائی
ہفتے بڑے ہیجان آمیز گزرے تھے اور اس نے ویلز قلعے میں
بڑا سکون محسوس کیا تھا۔ مشیٹ پلیس میں ڈرائنگ اور
میوزک روم کے دروازے ایک خوبصورت پارک کی طرف کھلتے
تھے جس میں رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ان
ہی پھولوں میں محصور ہیس کچھ لکھا کرتا تھا لیکن وہ پھولوں میں
ہی نہیں بلکہ کانٹے دار تاروں اور پہرے داروں میں بھی محصور
تھا جو سیکڑوں کی تعداد میں محل کے چاروں طرف تعینات تھے
جسکا شاید اسے علم نہ تھا اور وہ غالباً یہ بھی نہ جانتا تھا کہ
اس محل کے چاروں طرف خندقیں بھی کھود دی گئی ہیں تاکہ
نہ تو وہ فرار ہونے کی کوشش کرے اور نہ کوئی اسے قتل کرسکے۔

مشیٹ پلیس میں اسے ایک سال قید رکھا گیا اور اسکی
زبان سے جو لفظ بھی نکلا وہ ریکارڈ ہوگیا۔ مکان میں ہر
جگہ پوشیدہ طور پر مائکروفون لگا دیے گئے تھے۔ ہیس کے
لئے پہلی منزل پر دو کمرے مخصوص کردیے گئے تھے جن کی
کھڑکیاں گولی پروف تھیں۔

ہیس سے خفیہ باتیں اگلوانے کا چوہے بلی کا کھیل جاری
رہا اور برطانوی سراغرسانوں کی ایک ٹیم کرنل فرینک فولے
کی قیادت میں کام کرتی رہی۔ کرنل فولے مغربی جرمنی میں
پاسپورٹ افسر رہ چکے تھے اور جرمن زبان بڑی روانی
سے بولتے تھے۔ فولے اور کیپٹن ڈگلس پرسیول اسکے دوست
بن گئے تاکہ اس کے راز معلوم کرسکیں۔ ہر رات کو لندن سے
ایک شخص موٹر سائیکل سوار ان سوالات کی ایک فہرست لیکر
آتا جو حکومت دریافت کرنا چاہتی تھی اور ہر صبح وہ پرانے
زمانے کے کم سے کم ۸۰ ریکارڈ لے کر واپس لندن چلا جاتا۔
کہتے ہیں چرچل مسٹر ہیس کے ان ریکارڈوں کو پوری طرح
سنا کرتے تھے۔

لیکن ان میں سے انگریز سراغرسانوں کو کچھ نہ مل سکا
سوائے اس وارننگ کے کہ گوئرنگ نے دنیا کا سب سے زیادہ
مضبوط اور عمدہ فضائی بیڑہ بنا لیا ہے جو برطانیہ کو تباہ
کرسکتا ہے اور جرمن یو بوٹیں انگریزوں کو بھوکا مار دیں گی
اور انھیں جرمنی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

آخر میں برطانوی وزیروں نے ہیس سے انٹرویو
لئے۔ پہلے لارڈ سائمن نے ان سے ملاقات کی اور اس کے
بعد لارڈ چانسلر نے سر آئیون کرک پیٹرک بھی ان سے ملے
جو برلن میں برطانوی ڈپلومیٹ رہ چکے تھے اور جو ہیس سے
متعارف تھے۔ بعد میں چرچل نے لارڈ بیور بروک کو اس سے
ملاقات کرنے کے لئے بھیجا۔

ہیس نے تجویز کیا کہ برطانیہ کو چاہیے کہ وہ جرمنی کے
ساتھ صلح کرلے اور اس کے ساتھ ملکر روس پر حملہ کرے جس کی طرف
سے حقیقی خطرہ ہے۔ لارڈ سائمن کے ساتھ ملاقات کے بعد

...میں استعمال ہوتی تھا اور وہ کئی روز تک پریشان رہا۔

کیپٹن پرسیول نے اس سے کہا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا مشن ناکام ہو گیا۔" ہیس نے کوئی جواب دیے بغیر کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا اور بولا:۔

"میں سمجھتا ہوں وہ اب مجھے واپس بھیج دیں گے۔"

کیپٹن نے اسے یاد دلایا کہ ہٹلر نے اسے غدار قرار دے دیا ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ اگر وہ واپس گیا تو اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ ہیس پر خاموشی طاری ہو گئی۔

کچھ دن بعد اس نے خودکشی کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

جوالوں کہ رات کے دو بجے اس نے ڈاکٹر ہنری ڈکس کو طلب کیا۔ ایک سارجنٹ نے جو ڈیوٹی پر تھا دروازہ کھولا تاکہ ڈاکٹر ہیس کے کمرے میں جا سکے۔ لیکن جوں ہی ڈاکٹر ہیس کے کمرے میں داخل ہوا ہیس پھرتی کے ساتھ دروازے سے نکل گیا۔ اس وقت وہ جرمن فضائیہ کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ہیل ہٹلر کا نعرہ بلند کیا اور مکان کے فرش پر نیچے چھلانگ لگا دی۔

ایک دوسرا سارجنٹ جو زینے پر چڑھ رہا تھا، اس نے اپنا ریوالور نکال لیا اور قریب تھا کہ وہ فرش پر پڑے ہیس پر گولی چلا دے لیکن ڈاکٹر ڈکس چلائے۔

"گولی نہ چلانا۔"

ہیس بچ گیا۔ صرف اس کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا اور چار ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ اس کے بعد سے اس کے کمرے میں ایک فوجی کی ڈیوٹی لگا دی گئی جو دن رات وہاں رہتا تھا۔ اس کے پاجامے کی ڈوری اس سے لے لی گئی اور اسے چھری کانٹے سے کھانے کی اجازت نہیں تھی۔

موسم گرما کے دن آئے تو ہیس کا طرزِ عمل بدل گیا۔ وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا۔ کئی دن تک اس نے بھوک ہڑتال رکھی۔ کہتا تھا: "میں اس لیے کھانا نہیں کھاتا کہ مجھے زہر دیا جائے گا۔"

برطانوی سراغرسانوں نے ماہرین نفسیات کی خدمات حاصل کیں اور ان سے کہا کہ وہ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر کے معلوم کرنے کے لئے نئے طور طریقے اپنائیں۔ ہیس ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ "میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں۔" لیکن وہ یہ ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی یادداشت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

وہ صرف نازی رازوں کو افشا نہ کرنے کے لئے یہ بہانا کر رہا تھا۔

جنگ کے بعد ہیس نے اپنی بیوی کے نام ایک خط میں لکھا "سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مجھے نشہ آور دوائیں دی جاتیں اور نشے کے وقت مجھ سے بہت سے سوالات کے جوابات حاصل کئے جاتے۔ اس طرح مجھے دو خطرات کا سامنا تھا۔ اول یہ کہ میں ان رازوں کو افشا کر دیتا جو ایک جرمن کی حیثیت سے مجھے ہر حالت میں راز ہی رکھنے چاہئیں تھے، اور دوئم یہ کہ یادداشت کھو جانے کا جو عذر کیا تھا اس کا بھانڈہ پھوٹ جاتا۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اپنے آپ کو بے ہوش کرنے کے باوجود میں اپنی قوت ارادی سے اپنے ہوش کو قائم رکھ سکا، حالانکہ انھوں نے معمول سے زیادہ نشیلی اشیاء کھلائی تھیں۔

ہر سوال کے جواب میں میں پاگلوں کے انداز میں بول کر یہی کہہ دیتا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ یہ بڑا عجیب ڈراما تھا جو پوری طرح کامیاب رہا۔ انھیں پکا یقین ہو گیا کہ میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں۔

بہت دنوں بعد جب میں نے اپنی اس حیلہ گری کی بات ڈاکٹروں کو بتائی تو انھوں نے یقین کرنے سے انکار کر دیا، لیکن جب میں نے تمام سوالات دہرائے اور بتایا کہ میں بالکل ہوش میں تھا تو انھوں نے تسلیم کیا کہ انھیں اچھی طرح سے بے وقوف بنایا گیا تھا۔"

مشیٹ پیلیس میں ایک سال کی پوچھ گچھ کے بعد ہیس کو جون ۱۹۴۲ء میں ویلز کے مینڈف کورٹ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک رہا۔ یہ پورا دور ہیس کے لئے دہشتناک تنہائی کا دور تھا۔ اسے ہسپتال کے احاطے میں ایک بنگلے میں قید رکھا گیا۔

کچھ عرصے بعد اسے ایک افسر اور دو پہریداروں کی موجودگی میں گھومنے پھرنے کی اجازت مل گئی۔ پھر کبھی کبھی اسے کار میں بھی سیر کرائی جانے لگی۔

اس کی ایک پسندیدہ جگہ "وہائٹ کیسل" تھی۔ یہ چاروں طرف پانی سے بھرپور خندق سے محصور تھا۔ جب موسم صاف ہوتا تو وہ اس خندق میں کسی ٹیلے پر پہنچ جاتا اور وہاں گھنٹوں بیٹھا لکھتا اور تصویر کشی کرتا رہتا۔ ہیس نے اس عمل کے نگراں مسٹر جونس سے دوستی کر لی اور ملاقات کے آخری دن اسے اپنا عادت کے... تحفہ دیا۔

ستمبر ۱۹۴۳ء میں یہ سیر تفریح اچانک بند ہو گئی۔ شاید اس افواہ پر کہ اوٹو اسکورزنی نام کا جو شخص سولینی کو فرار کر لے گیا تھا وہی ہوائی جہاز کے ذریعے مینڈف کورٹ سے ہیس کو اڑا لے جانے کی کوشش میں ہے۔ لیکن جیسے جیسے اتحادی آگے بڑھتے گئے اور جرمنی کو شکست کا یقین ہوتا گیا ہیس کو نکال لے جانے کے امکانات ختم ہوتے گئے اور جب اتحادیوں کی فتوحات کی خبریں آئیں تو وہ بددل اور بالکل مایوس ہو گیا۔

۱۹۶۷ء میں جب ہیس کا لڑکا اولف برطانیا پہنچا تاکہ اپنے باپ کے زمانۂ جنگ کی یادداشتوں کو قلمبند کرے تو ڈاکٹر جونس نے اس سے کہا:۔

"تمہارے والد ہر روز صبح اخبارات پڑھا کرتے تھے اور افریقی مہم کی ناکامی تک پڑھتے رہے اور اس کے بعد انھوں نے جنگ کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا۔ صرف ان خطوط کو ضرور پڑھتے رہے جو ان کو گھر سے موصول ہوتے تھے۔"

جب ہیس جرمنی سے بھاگ کر آئے تھے تو ان کا لڑکا صرف تین برس کا تھا۔ باپ کی عدم موجودگی ہی میں اس نے پرورش پائی۔

"اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح میرا چھوٹا لڑکا مجھے ڈیڈی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔" ہیس نے کہا "باپ کی نگرانی کے بعد وہ اپنی زبان کو خود ترقی دے سکے گا یہ موقع مجھے نہ مل سکا تھا۔"

جب لڑائی کے خاتمے کا اعلان کیا گیا تو ہیس نے اس اعلان کو دلیرانہ طور پر سنا اور ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آخر تک ہٹلر کا وفادار رہا۔

۱۹۴۲ء میں روسیوں کو جب معلوم ہوا کہ ہیس اس لیے برطانیا پہنچا تھا تاکہ برطانیا کو جرمنی کے ساتھ مل کر روس پر حملہ کرنے کی ترغیب دے سکے تو اس نے مطالبہ کیا کہ ہیس پر "مجرم ہٹلری گروہ" کے لیڈر کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جائے۔

۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو آخر "روز حساب" آپہنچا اور ہیس کو ایک برطانوی ہوائی جہاز میں ایک برطانوی مسلح گارڈ کی نگرانی میں جرمنی بھیج دیا گیا جہاں نورمبرگ میں اس کے خلاف جنگی جرائم کے سلسلے میں مقدمہ چلایا گیا۔

واقعات نئی دھلی

ساحر لدھیانوی
بلاوا
دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا
جاگو اے مزدور کسانو!
اٹھو اے مظلوم انسانو!
دھرتی کے ان داتا تم ہو جگ کے پران ودھاتا تم ہو
دھینوں کی خوشحالی تم سے کھیتوں میں ہریالی تم سے
اونچے محل بنائے تم نے شاہی تخت سجائے تم نے
ہیرے، لعل نکالے تم نے نیزے بھالے ڈھالے تم نے
ہر بگیا کے مالی تم ہو اس سنسار کے والی تم ہو
وقت ہے دھرتی کو اپنالو آگے بڑھو، ہتھیار سنبھالو
اٹھو اے مظلوم انسانو!
جاگو اے مزدور کسانو!
دھرتی کانپ رہی ہے
چہرے ڈھانپ رہی ہے
جوالا پھوٹ پڑی ہے
ہے تھوڑا جنگ کڑی ہے
رہے ہیں کال کے گھیرے
اپنے سرخ پھریرے
جنتا کے سینک
کے ناشک ستیہ کے رکشک
کے عادی ظلم کے پالے
للیاؤں کے اجالے
رکے گی تم کو شاہی
بہادر سرخ سپاہی
جاگو اے مزدور کسانو!
اٹھو اے مظلوم انسانو!
دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سُ

اخبارات نے مشرقی بنگال میں ہونے والے ظلم کی مذمت کی

اردو اخبارات و صحافیوں کا سیمنار

اردو ایڈیٹروں نے حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لیا

(واقعات کے نمائندۂ خصوصی کے قلم سے)

مشرقی بنگال سے پناہ گزیں اگر اسی طرح آتے رہے جیسا کہ اب تک آتے رہے ہیں تو برصغیر ہند و پاک کے امن کے لئے ایک خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ وہ متفقہ رائے جس کا اظہار ہندوستان کے اردو ایڈیٹروں کے سیمنار (مجلس مذاکرہ) میں کیا گیا۔

یہ سیمنار اس لئے طلب کیا گیا تھا تاکہ بنگلا دیش سے متعلق پیدا شدہ مسائل کی روشنی میں تازہ حالات کا جائزہ لیا جائے اور ان شکوک و شبہات کو دور کیا جائے جو اردو پریس کے بارے میں بعض حلقوں میں نظر آتے ہیں۔

آل انڈیا اسمال اینڈ میڈیم نیوز پیپرز فیڈریشن اور پریس انسٹیٹیوٹ آف انڈیا انٹرنیشنل قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اسّی سے زیادہ اردو ایڈیٹروں اور صحافیوں کو ایک جگہ جمع کر کے وقت کے اہم ترین مسائل پر تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ سیمنار کے انعقاد کے سلسلے میں کنوینر صاحب کو حکومتِ ہند کے پریس انفارمیشن بیورو کا بھی پورا پورا تعاون حاصل رہا اور خود پرنسپل انفارمیشن بیورو جناب ... مارواج صاحب بہ نفسِ نفیس سیمنار کی بحثوں میں شریک رہے اور انھوں نے حالاتِ حاضرہ پر اردو ایڈیٹروں کے خیالات کو توجہ کے ساتھ سنا اور اردو اخبارات کی جو مشکلات زیرِ بحث آئیں ان سے بھی وہ واقف ہوئے۔

سیمنار جو گیان بھون کے ایک کمیٹی روم میں منعقد ہوا دو روز ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ جون تک چلا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت بنگال کے مشہور ادیب پروفیسر نہار رنجن رائے نے کی۔ مقررین میں حیات اللہ صاحب انصاری (قومی آواز لکھنؤ) جناب تابش (پاسبان بنگلور) اور مسز نندنی ست پتی (وزیر اطلاعات) شامل تھیں۔

اردو ایڈیٹروں کو مسٹر حیات اللہ انصاری نے جو نصیحتیں فرمائیں ان میں سے بیشتر ایسی تھیں جن پر اردو اخبارات پہلے ہی سے عمل پیرا ہیں، لیکن ان کے ان الفاظ پر سب کو حیرانی ہوئی کہ "اردو جرنلسٹ کچھ بہک گئے ہیں"۔ علاوہ ازیں انھوں نے حالات کی ایک ڈراؤنی شکل پیش کر کے جس طرح اردو جرنلسٹوں کو ایک خاص پالیسی پر چلنے کی تلقین فرمائی وہ بھی حاضرین کو ایک عجیب اور غیر جمہوری بات نظر آئی۔ اس لئے کہ اردو جرنلسٹ اگر بنگلا دیش کی آزادی کی حمایت اور پاکستانی فوج کے ہاتھوں عوام کے قتلِ عام کی مذمت کر رہے ہیں تو کسی ڈر اور خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ پاکستانی فوج کے مظالم شرمناک اور قابلِ مذمت ہیں۔

وزیر اطلاعات مسز نندنی ست پتی نے افتتاحی اجلاس میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ان کا عمومی طور پر خیر مقدم کیا گیا اور ان کے الفاظ کی عمومی طور سے تائید کی گئی کہ اس نازک موقعے پر جبکہ پوری قوم ایک سنگین بحران سے گزر رہی ہے حکومت کو مکمل قومی پشت پناہی کی ضرورت ہے۔ بے احتیاط تحریروں کا نام لے کر انھوں نے جو یہ بات کہی کہ "حکومت کو بعض ناخوشگوار اقدامات کے لئے مجبور نہ کیا جائے"۔ اسے عمومی طور پر ایک دھمکی سے تعبیر کیا گیا۔

اس قسم کے الفاظ وزیر اطلاعات نہ کہتیں تو اچھا تھا کیونکہ جیسا کہ اوپر ذکر آیا، اس سیمنار کو طلب کرنے کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ اردو اخبارات کے بارے میں بعض حلقوں میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں انھیں دور کیا جا سکے۔ جب اردو اخبارات خود ہی ضبط سے کام لے رہے ہوں اور مشرقی بنگال میں انسانیت کے قتلِ عام پر ان کے جذبات دوسروں سے بھی زیادہ شدید ہوں تو ناخوشگوار اقدامات کے الفاظ سے

ان کی گوشمالی کرنا ایک بے معنی بات ہے۔

پاسبان (بنگلور) کے جناب کے۔ ایم عظیم تابش نے یہ کہہ کر حقیقت میں اردو پریس کی ترجمانی کی کہ اردو اخبارات قومی دھارے میں برابر کے شریک ہیں اور اس وقت بنگلا دیش میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر انکی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان سے کسی قسم کا مطالبہ کرنا حب الوطنی اور قوم پرستی پر عدم اعتماد کا اظہار کرنا ہے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی (ایڈیٹر واقعات) اور دوسرے متعدد ایڈیٹروں نے بھی مشرقی بنگال میں عوامی مظالم کی مذمت کی اور صاف کہا کہ جنرل یحییٰ خاں کی فوجی حکومت نے اسلام

ڈر یا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانیت کے ناطے لڑے

کی تاریخ پر ایک بدنما داغ لگایا ہے۔" اور یہ کہ مشرقی بنگال میں جو بیمانہ مظالم ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں وہ دنیائے انسانیت پر کلنک کا ٹیکا ہیں۔"

ایسے ہی خیالات کی روشنی میں سیمینار کے اختتام پر جاری شدہ

متفقہ اظہار رائے سے متعلق بیان میں اس "شرارت آمیز" پروپیگنڈہ کی مذمت کی گئی جو بعض مفاد پرستوں کی طرف سے ہندوستان اور دوسرے مقامات پر اردو پریس کے خلاف جاری ہے۔"

تاہم اردو پریس کے بارے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے ایسے اخبارات کی خواہ وہ اردو کے ہوں یا دوسری زبان کے مذمت کی گئی جو قومی امنگوں کی عکاسی کرنے میں ناکام رہے ہیں۔"

اس سے بھی آگے بڑھ کر پاکستان کی "جنگجویانہ پالیسی" کو امن کے لئے خطرہ قرار دیتے ہوئے حکومت سے کہا گیا "اب وقت آگیا ہے کہ وہ عالمی برادری اور خاص کر بڑی طاقتوں کو خبردار کر دے

کہ وہ اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے لئے بادل نخواستہ ضروری اقدامات کرنے کے لئے مجبور ہے۔"

سیمینار کا بڑا مصروف پروگرام تھا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ منتخب ایڈیٹروں کی ملاقات بھی اسی پروگرام کا ایک حصہ تھی۔ یہ ملاقات شروع دن ہی شام ۴ بجے پارلیمنٹ ہاؤس کے ایک وسیع کمرے میں ہوئی۔ جہاں وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں اخبارات سے اپیل کی کہ وہ عوام کی صحیح طور پر رہنمائی کریں اور ہمیشہ بنیادی یکجہتی کے مقصد کو اپنے پیش نظر رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری اصل دشمن غریبی ہے، جب تک یہ غربت دور نہ ہوگی ہمارے بہت سی مشکلات باقی رہیں گی۔"

قدرتی طور پر وزیر اعظم نے بنگلادیش کے مسئلے کو بڑی اہمیت دی اور اگرچہ انھوں نے ۶۰ لاکھ پناہ گزینوں کی آمد پر تشویش ظاہر کی لیکن مولانا عبدالوحید صدیقی کے سوال کے جواب میں اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ خواہ کوئی غیر ملک مدد کرے یا نہ کرے، ہم اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ ان پناہ گزینوں کی آمد کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹ سکیں۔

وزیر اعظم نے انکشاف کیا کہ شروع میں مشرقی بنگال سے صرف مسلمان آنا شروع ہوئے تھے لیکن بعد میں غیر مسلم بھی آئے اور انکی تعداد بڑھ گئی۔

مشرقی بنگال میں غیر بنگالیوں کے ساتھ مبینہ برے سلوک کے بارے میں جب ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا۔ شروع میں ایسی خبریں آئیں تھیں کہ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کے ساتھ جن میں بہار اور اتر پردیش کے لوگ شامل تھے زیادتی کی ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ہم اس کی بھی مذمت کرتے ہیں اور ہم ہر طرح کے قتل کی مذمت کرتے ہیں۔

اس ملاقات میں جو چھوٹی سوٹی پریس کانفرنس ہو گئی تھی، وزیر اعظم کو اردو اخبارات کی خستہ حالی اور خود اردو کے ساتھ امتیازی سلوک کی طرف توجہ دلائی گئی۔ پاسبان کے ایڈیٹر جناب تابش صاحب نے وزیر اعظم کو بتایا کہ انکی ریاست میسور میں ایک ہزار اردو کے اسکول ہیں لیکن خود ان کے گھر میں اردو ختم ہو رہی

ہے۔" دوسرے اصحاب نے کہا۔ جب اردو کا بیس (Base) ہی ختم ہو گیا تو اردو کہاں رہے گی۔ لیکن وزیر اعظم نے خوشخبری سنائی کہ ان کے گھر (یوپی) میں اردو کا Base ختم نہیں ہو رہا ہے بلکہ وزیر اعلیٰ مسٹر کملاپتی ترپاٹھی کے ساتھ بات چیت کے دوران یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اب یوپی کے ہر پرائمری اسکول میں خواہ اردو پڑھنے والے بچے ہوں یا نہ ہوں ایک اردو ٹیچر ضرور رکھا جائے گا۔"

سیمینار میں جن دوسرے ذمے داروں کے خیالات سننے میں آئے ان میں مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ مسٹر کے سی پنت شامل تھے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو پریس نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے اور آج بھی ہندوستانی جرنلزم میں اردو اخبارات و رسائل کو ایک اہم مقام حاصل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی کے بعد سب سے زیادہ اخبارات و رسائل اردو میں ہی شائع ہوتے ہیں۔

مسٹر اندرجیت گجرال وزیر مملکت برائے ورکس اینڈ ہاؤسنگ نے اردو ایڈیٹروں سے اپیل کی کہ وہ نئے تخیلات اور سوسائٹی کے بدلتے ہوئے رجحانات پر اپنے اخبارات اور رسائل میں روشنی ڈالیں۔

سیمینار کے آخری اجلاس میں اخبارات کو پیش آنے والی مشکلات بھی زیر بحث آئیں اور اس سلسلے میں کاغذ کے کوٹے اور سرکاری اشتہارات کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اردو جرنلسٹوں کی حالت زار کا معاملہ محمد سلیمان صابر (الجمعیۃ) نے اٹھایا اور اپیل کی کہ اردو اخبارات میں کام کرنے والے جرنلسٹوں کو حکومت کے منظور کردہ شیڈول کے مطابق اجرتیں ملنی چاہئیں۔ آپ نے کہا کہ اگر اخبارات اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ مناسب اجرتیں نہیں دے سکتے تو بہتر ہے کہ وہ بند کر دیئے جائیں۔ کم اخبارات رہ جائیں تو کوئی بات نہیں لیکن وہ اچھی حالت میں نکلنے چاہئیں تاکہ کام کرنے والے اردو صحافی اچھی حالت میں رہ سکیں اور اچھے مضامین لکھ سکیں۔"

آپ کی اس تجویز کو عام طور پر پسند کیا گیا لیکن تقلید

باقی صفحہ ۵۶ پر

واقعات نئی دہلی

اسرائیل

بُرے دن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں سے لڑے بغیر ہی اسرائیل کے بُرے دن قریب آرہے ہیں۔ اس کی اقتصادی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ سالانہ آمدنی میں صرف ۷ فیصدی کا اضافہ ہے لیکن اس وقت غیر ملکی قرضہ دو ارب سات کروڑ روپے تک پہونچ چکا ہے۔ اس میں ایک ارب ۲۰ کروڑ ڈالر کا صرف اسی سال کا تجارتی نقصان شامل ہے۔ آمدنی کا ساٹھ فیصد حصہ جنگی مقاصد پر خرچ کیا جا رہا ہے اور اسی لئے جتنے ٹیکس اسرائیل میں لگائے گئے ہیں کسی ملک میں نہیں لگائے گئے۔

۲۰ فیصدی آبادی غربت کی زندگی گزار رہی ہے (اسرائیلیو کے آٹھ ممبروں پر مشتمل خاندان کی آمدنی اگر ۴۵ ڈالر ماہوار سے کم ہو تو وہ غریب سمجھا جاتا ہے) جرائم کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ گزشتہ سال سے اب تک تل ابیب (آبادی ۸ لاکھ) میں ۱۲۵ چوریوں کی وارداتیں ہوئی ہیں پرس چھین کر لے جانے کے واقعات عام ہو گئے ہیں اور ۲۰۰ طوائفیں سڑکوں پر نظر آتی ہیں۔

سب سے بڑی مصیبت یہ آئی ہے کہ کالے اور گوروں میں کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایشیائیوں اور افریقیوں کی تعداد اگرچہ ساٹھ فیصد ہے لیکن اقتدار گوروں کے ہاتھوں میں ہے جو صرف ۴۰ فیصدی ہیں۔ اس امتیازی سلوک کے خلاف "بلیک پنتھرس" کے نام سے ایشیائی اور افریقی یہودیوں نے اپنی ایک تنظیم قائم کی ہے۔ تاکہ ان کے خلاف جو ناانصافیاں ہو رہی ہیں ان کو ختم کرایا جا سکے۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام مخالفانہ مظاہرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ تنظیم کا لیڈر ایک ۲۰ سالہ نوجوان سعدیا مرسیانو ہے جو مارسلز (فرانس) میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب اس کا باپ مراکش سے ترکِ وطن کر کے اسرائیل کی طرف جا رہا تھا۔ اسرائیل میں اس کی پرورش یروشلم کے مصرارہ علاقے میں ہوئی جو سلم (گندہ) کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ ۱۸ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا لیکن اپنی سات ماہ کی ملازمت کا تقریباً نصف حصہ اس نے جیل میں گزارا اور پھر بعد میں اسے نااہل قرار دے کر فوج سے نکال دیا گیا۔ بعد ازاں وہ اپنے علاقے

باقیات صفحہ ...

سعدیا مرسیانو

میں عربی بولنے والے نوجوانوں کے ساتھ وقت گزاری کیا کرتا تھا اور اسی لئے کئی جرائم میں پولیس نے اسے مشتبہ قرار دے کر گرفتار کر لیا۔

لیکن آخر کار اس نے غیر یورپین باشندوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک جماعت بنا ڈالی جسے "بلیک پنتھر" کا ہی نام دیا گیا ہے، جو امریکا میں کالوں کی جماعت کو دیا گیا ہے۔ سعدیا مرکا دعویٰ ہے کہ اس وقت اس جماعت کے ممبروں کی تعداد ۹ ہزار ہے۔

اس جماعت کی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اسرائیل کے پولیس منسٹر ہلیل کو (یہ ایک عراقی یہودی ہے ——) کو اقرار کرنا پڑا کہ اسرائیل کو اب تین محاذوں پر خطرہ درپیش ہے۔ ایک دفاعی محاذ، دوسرا اقتصادی اور تیسرا سماجی وا ان کے خیال میں دو آخر الذکر محاذوں پر صورتِ حال زیادہ سنگین ہے۔ آئندہ یہ صورتِ حال اور زیادہ سنگین ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ غیر یورپین یہودیوں کو جن میں مقامی عرب یہودی بھی شامل ہیں، یہ احساس اب شدت سے ستانے لگا ہے کہ یورپ اور امریکا سے آنے والے جس اسرائیل میں بود و باش اختیار کئے ہیں وہ اسرائیل اور ہے اور جس میں وہ خود رہتے ہیں وہ اسرائیل اور ہے۔

اوکی ناوا

غیر اطمینان بخش معاہدہ

امریکہ نے اوکی ناوا جزیرہ جاپان کو واپس کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ یہ دستخط واشنگٹن اور ٹوکیو میں ایک ساتھ منعقد ہونے والی تقریبات میں ہوئے۔ واشنگٹن میں اس وقت ۸ بج کر ۱۷ منٹ اور ٹوکیو میں شب کو ۹ بج کر ۱۷ منٹ ہوئے تھے۔ گویا واشنگٹن میں ناشتے پر کافی پی جا رہی تھی اور ٹوکیو میں شب کو فرانسیسی شراب کا دور چل رہا تھا۔ جو کچھ بھی ہو مقصد دونوں تقریبات کا ایک ہی تھا یعنی کہ اوکی ناوا کی واپسی سے متعلق معاہدے پر دستخط کرنا۔

اوکی ناوا جزیرے پر امریکا نے دوسری جنگِ عظیم میں قبضہ کر لیا تھا اور اب ۲۶ برس بعد اس کی واپسی عمل میں آرہی ہے۔ واشنگٹن میں امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس نے سو مہمانوں کے روبرو معاہدے پر دستخط کئے۔ اور ادھر ٹوکیو میں وزیر خارجہ جاپان مسٹر کیچی آئیچی نے دستخط کئے۔ ٹیلی ویژن پر یہ سب کارروائی ایک دوسری جگہ اور پورے امریکا اور پورے جاپان میں دیکھی جا رہی تھی۔ اسے لاکھوں کروڑوں لوگوں نے دیکھا (مصنوعی سیارے کے ذریعے جو امریکا نے ۹ سال قبل فضائے آسمانی میں پہنچایا تھا اب ہر جگہ کے ٹیلی ویژن پروگرام دیکھنا ممکن ہو گیا ہے۔)

واشنگٹن میں دستخط کرنے کی اس تقریب میں مسٹر نکسن شرکت نہیں کی۔ حالانکہ اوکی ناوا کے معاہدے میں انھوں نے ذاتی دلچسپی لی تھی۔ سرکاری طور پر بتایا گیا کہ چونکہ وہ سربراہ حکومت ہی نہیں بلکہ سربراہِ مملکت بھی ہیں۔ اس لئے وہ صرف اسی صورت میں آسکتے تھے جب دوسری طرف ٹوکیو میں شہنشاہ جاپان بھی تقریب میں حصہ لیتے۔

اوکی ناوا کا جزیرہ جاپان کے پانچ سو میل جنوب مشرق جاپانی جزیرے کیوشو اور فارموسا کے درمیان واقع ہے اور مشرق کے علاقے میں بڑی جنگی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں امریکا کے نیوکلیائی اسلحے کے اڈے واقع ہیں۔ کافی عرصے سے جاپانی باشندے اس کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

وزیر اعظم جاپان نے معاہدے پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ بحر الکاہل میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ لیکن ... کی ایک بڑی تعداد واپسی سے متعلق معاہدے پر مطمئن نہیں

معاہدے پر دونوں ملکوں کے نمائندوں نے دستخط کئے

جس وقت معاہدے پر دستخط ہو رہے تھے اس وقت بھی ۱۰ ہزار جاپانی اس بات کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے کہ معاہدے میں اوکی ناوا سے نیوکلر یا ایٹمی ہتھیاروں کے اڈے ہٹا لینے کی شرط موجود نہیں ہے۔ ان مظاہروں کے دوران پولیس کے ساتھ تصادم بھی ہوئے جس میں بہت سے لوگ مجروح ہو گئے۔ ان میں پولیسمین اور طلبا شامل تھے۔ چھ سو اشخاص گرفتار کئے گئے۔ مخالف پارٹیوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ جاپانی پارلیمنٹ میں اس معاہدے کی تصدیق کی مخالفت کریں گی۔ ان کا مطالبہ ہے کہ معاہدے میں ایٹمی اڈے ہٹا لینے کی وضاحت ہونی چاہیے۔ دوسری طرف امریکی سینٹ کے بعض ممبران بھی ناخوش ہیں — خاص طور پر جنوبی ریاستوں کے ممبران۔ انھوں نے کہا کہ اگر جاپان نے اپنے کپڑے کی برآمد پر روک نہ لگائی تو وہ اس معاہدے کی تصدیق کرنے کی مخالفت کرینگے۔ (غالباً اگلے سال مارچ اس کی تصدیق کیجائیگی۔)

۴۵۴ مربع میل کے اس جزیرے میں امریکا کے ۸۸ فوجی اڈے ہیں جن پر نیوکلر اسلحہ نصب ہے۔ ایک اعلیٰ امریکی افسر نے کہا۔ اگرچہ معاہدے کے بعد امریکا کا جزیرے کے صرف کچھ حصے پر کنٹرول رہ جائے گا لیکن وہ تمام فوجی اڈے باقی رہیں گے جو ضروری ہیں۔ جاپان صرف ۴۶ چھوٹی چھوٹی تنصیبات کو اپنے کنٹرول میں لے گا اور آئندہ پانچ سال کے دوران ان کا ۳۲ کروڑ ڈالر معاوضہ ادا کرے گا لیکن باقی تنصیبات بدستور امریکی کنٹرول میں رہیں گی۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ اوکی ناوا پر سے امریکہ کی بالادستی ختم ہو گئی ہے لیکن اس کا حلقۂ اثر متاثر نہیں ہوا ہے۔

میکسیکو

طلبا کا قتل

میکسیکو شمالی امریکا اور جنوبی امریکا کے درمیان ایک آزاد ریپبلک ہے۔ رقبہ ۷۶۱۳۷۵ مربع میل اور آبادی تقریباً ۴۸۱۰۰۰۰۰۔ سولہویں صدی عیسوی سے ۱۸۱۰-۲۱ کی انقلابی جنگ تک جس میں مختلف اوقات میں امریکا، آسٹریا اور فرانس ملوث رہے اس پر اسپین کا قبضہ رہا اور بالآخر ۱۸۶۷ء میں آسٹریا کے شہنشاہ فرڈیننڈ کے قتل کے بعد موجودہ جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ سینیٹ کے ۶۰ ممبر چھ سال کے لئے اور ایوان عام کے ۲۱۰ ممبر تین سال کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔

میکسیکو تند و تیز مظاہروں کا گڑھ رہا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں اتنے زبردست مظاہرے ہوئے کہ وہاں منعقد ہونے والے اولمپک کھیل خطرے میں پڑ گئے تھے۔

ابھی گزشتہ ہفتے دس ہزار طلبا نے انقلاب کی عظیم یادگار کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ اس بات کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے کہ جن ۴۰ طلبا کو اکتوبر ۱۹۶۸ء کے مظاہروں میں گرفتار کیا گیا تھا وہ ابھی تک نہیں چھوڑے گئے ہیں (ان مظاہروں میں پچاس اشخاص کی جانیں گئی تھیں) مظاہرین ابھی مشکل سے نصف میل ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ پولیس نے ان کا راستہ روک لیا۔ یکایک جیسے کسی کے اشارے پر نوجوانوں کی ٹکڑیوں کی ٹکڑیاں اس موقعے پر نمودار ہو گئیں۔ یہ سب نوجوان جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور لاٹھیاں تھیں خاکستری رنگ کی بسوں سے اتر کر آئے تھے جو وہاں کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ فیلکونس فیلکونس کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ دراصل ایک جماعت ہے جو بائیں بازو کے رجحانات کے حامل طالبعلموں کے خلاف غالباً سرکاری طور پر بنائی گئی ہے۔ ان نوجوانوں نے طالب علموں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اور ابھی طالب علموں کی پٹائی جاری تھی کہ نوجوانوں کی ایک اور پلٹن آ گئی، وہ سب پستول اور چھوٹی مشین گنوں سے مسلح تھے۔ انھوں نے اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ ان کا طرزِ عمل بالکل فوجیوں جیسا تھا۔

طلبا ادھر اُدھر بھاگے اور بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے مکانوں کے دروازے کھول کر انھیں پناہ دی۔ لیکن چند ہی منٹوں میں ۱۰ طلبا ہلاک ہو چکے تھے۔ فیلکون نوجوانوں نے اس کے بعد قریب کے ایک ہسپتال پر حملہ کیا جہاں مجروح طلبا کو داخل کیا گیا تھا۔ وہ ان سب مجروح طالب علموں کو جو اٹھ سکتے تھے اپنے ساتھ فیلکون ہیڈ کوارٹر لے گئے جہاں اندیشہ ہے کہ مزید طالب علموں کو قتل کر دیا گیا ہوگا۔

یہ فیلکون کون ہیں —؟

صدر میکسیکو کے ایک ترجمان نے اس کا الزام دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طلبا کے ایک گروپ پر عائد کیا ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کو شبہ ہے کہ اس معاملے میں سٹی گورنمنٹ ملوث ہے اور غالباً اسی لئے طلبا نے شہر کے میئر کو الگ کر دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

اٹلی

پھر فاشزم کی طرف

اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے اپنے آخری ایام میں شمالی اٹلی کی پہاڑیوں میں جب نام نہاد ''ریپبلک'' قائم کی تھی تو اس کے ایڈی کانگ میں ایک اخباری ایڈیٹر جارجیو المیرانتے بھی شامل تھا۔ مسولینی کی گرفتاری اور پھر اسے پھانسی دی جانے کے بعد المیرانتے روپوش ہو گیا اور ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ صابن فروخت کرتا تھا اور ریلوے اسٹیشنوں پر سوتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں یہ سمجھ کر کہ فاشزم کا قلع قمع ہو چکا ہے اٹلی نے مسولینی کے غیر اہم ساتھیوں کو عام معافی دیدی۔ المیرانتے اب روم واپس آ گیا جہاں اس نے اپنے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لے گا۔ کافی دن اس نے حصہ نہیں لیا لیکن اب یکایک فاشزم کا جذبہ اس کے اندر عود کر آیا۔ اور دو ہفتے قبل جب اس کی نئی فاشی جماعت اٹالین نوشل موومنٹ (M.S.I.) صوبائی اور میونسپل انتخابات میں سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی تو سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

لوگوں کو پریشانی ہے کہ جس قسم کے حالات اٹلی میں اس وقت تھے جب مسولینی کو کامیابی حاصل ہوئی تھی، ایسے ہی حالات مختلف قسم کی ہڑتالوں کی بنا پر جو گزشتہ دو برس سے چل رہی ہیں، اس وقت پیدا ہو گئے ہیں۔ عوام میں اس بات سے سخت ناراضگی ہے کہ حکومت ابھی تک حالات کی اصلاح نہیں کر سکی

سسلی میں ایک خاتون دودھ والے نے کہا ''ہم ان ہڑتالوں اور

دس سال کی جنگ نے امریکنوں کو یہ سبق دیا کہ ویت نامیوں کو ہرانا ناممکن ہے

نے عوام کے جرائم سے تنگ آ گئے ہیں۔ نازی حکومت میں یہاں کے محکمات کو اپنے گھروں کے تالے بند کرنا نہیں پڑتے تھے۔ روم کے ایک اوڈیکلوری ورکر نے کہا۔

• یہاں بہت سی باتیں غلط ہو رہی ہیں۔ ہم انھیں روکنا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ سخت قسم کے قوانین بنائے جائیں۔ ایم ایس آئی۔ صرف ایسی تنظیم ہے جس کے رہنما جانتے ہیں کہ ملک کا نظم و نسق کس طرح چلایا جاتا ہے۔"

جناب گولیو (وزیر اعظم اٹلی) کی تین پارٹیوں پر مشتمل کولیشن اٹلی کا نظم و نسق چلانے میں ناکام رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب عوام کی نظریں سولینی کے چیلے المیرانتے کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ■

ویتنام

حقیقت سامنے آ گئی

آج دنیا کی بہادر ترین قوموں میں ویت نامیوں کا نام سرفہرست آتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں کل ملا کر تمام یورپین قوموں نے جتنی جانوں کی قربانی نہیں دی، اس سے کہیں زیادہ جانیں ویتنام میں ضائع ہو چکی ہیں۔

پچھلے ۳۰ سال میں ویتنامیوں نے فرانسیسیوں، جاپانیوں اور امریکنوں سے جس طرح لوہا لیا ہے اس کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ ویت نامیوں نے ثابت کر دیا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی امنگ، حوصلہ اور آزادی کی خواہش کے سامنے ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ ہتھیاروں کی کوئی حقیقت نہیں۔ ویت نام کے گوریلے، ویت کانگوں نے امریکی سامراجیت کا مقابلہ خود ان سے چھینے ہوئے ہتھیاروں سے کیا ہے۔ چین اور روس سے معمولی مقدار میں جو ہتھیار آتے ہیں ویت کانگ انھیں استعمال نہیں کرتے۔ ان ہتھیاروں کو شمالی ویت نام کی باقاعدہ فوجوں کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے۔

سامراجی طاقتوں نے ہمیشہ آزادی، جمہوریت اور تہذیب کا نام لے کر دنیا بھر کی کمزور قوموں کو لوٹا ہے۔ دنیا کو مہذب بنانے کے نام پر یورپ کے لوگوں نے امریکا، افریقہ اور

الزبرل

ایشیا کے کئی کم زیادہ تہذیب یافتہ چین اور ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ ان علاقوں اور ان قوموں کو یورپین (WHITE MEN'S BURDEN) کہا کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی زیادہ مقدار میں بننے والی چیزوں کے لئے مارکیٹ ڈھونڈنے ان ملکوں میں آئے تھے۔ تاکہ ایک طرف یہاں سے خام مال حاصل کر سکیں دوسری طرف اپنا مال بیچ کر یہاں کی دولت سمیٹ سکیں۔ آج کے یورپ اور امریکا کی ترقی اسی بین الاقوامی لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ ہے۔ یہ لوٹ آج بھی بند نہیں ہوئی ہے بلکہ اسی طرح جاری ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کو آزادی اور جمہوریت کا نام دیا گیا۔ دراصل یہ جنگ بھی بہت سے سامراجی ملکوں کے درمیان اس بات پر ہو رہی تھی کہ کونسی مارکیٹ کس کے پاس رہے گی۔ یعنی افریقہ، امریکا، اور ایشیا کے کس ملک کو لوٹنے کھسوٹنے کا حق کس طاقت کے پاس رہے گا۔ اس لئے جاپان بھی سامراجیوں کی اس جنگ میں شامل ہو گیا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایک بڑی سامراجی طاقت بن چکا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سامراجیوں نے ایشیا افریقہ کے ملکوں کو لوٹنے کا ایک دوسرا بہانہ تلاش کر لیا یعنی کمیونزم کا ہوّا۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے زیادہ تر ممالک کے عوام اپنے ملکوں میں کمیونزم اور سوشلزم چاہتے ہیں تاکہ وہ سرمایہ داری اور سامراجیت کے اس جوئے کو اتار پھینکیں۔

لیکن امریکا اور دوسری سامراجی طاقتیں ان کی خیرخواہ اور ہمدرد بن کر انھیں کمیونزم سے بچانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔

ان بدنصیب ملکوں میں سے ایک ملک انڈوچائنا بھی تھا جسے آپ اور ہم ویتنام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہاں امریکا اور اس کے ایجنٹوں نے اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لئے عجیب عجیب چالیں چلیں۔ خود ہی لوگوں کا قتل عام کرایا اور پھر یہ الزامات لگائے کہ کمیونسٹوں نے یہ قتل کرائے ہیں۔ خود شمالی ویت نام پر حملے کئے اور الزام لگایا کہ شمالی ویت نامی جنوبی ویتنام پر حملے کر رہے ہیں۔ امریکی، ویتنام پر حملوں کا جواز تلاش کرنے کے لئے، وہاں اپنی فوجوں کو اتارنے کے لئے اور وہاں کے عوام کا قتل عام کرنے کے لئے ایک کے بعد ایک جھوٹ بولتے رہے۔ لیکن ویتنامی عوام جانتے تھے کہ سچائی کیا ہے۔ اسلئے وہ ظلم سہتے رہے، موت سے مقابلہ کرتے رہے لیکن انھوں نے کمیونسٹوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

امریکی معیشت کا سارا انحصار جنگ پر ہے جس کو انگریزی میں (War Based Economy) کہا جاتا ہے۔ دنیا میں اگر جنگ نہ ہو۔ امن اور شانتی پھیل جائے تو امریکا کی معیشت چار دن میں تباہ ہو جائے۔ ہزاروں کارخانے جو ہتھیار بناتے ہیں بند ہو جائیں۔ مزدور بے کار ہو جائیں۔ اور آج امریکا دنیا کی لوٹ کھسوٹ کے بل پر سب سے زیادہ دولت مند ملک ہونے کا جو دعویٰ کرتا ہے، اپنا سارا وقار کھو بیٹھے۔ اس لئے امریکا کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں جنگ چلتی رہے۔ اور اگر جنگ نہیں ہوتی تو امریکا جنگ کراتا ہے۔ اپنے عوام کو اور دنیا کے عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے امریکا کے واسطے ضروری ہے کہ وہ اپنے ان ناپاک ارادوں پر خوبصورت الفاظ اور خوبصورت خیالات کے پردے ڈالے۔ اس لئے وہ جمہوریت کا نام لے کر لڑتا ہے، آزادی کا نام لے کر لڑتا ہے اور کمیونزم کے خلاف جنگ کا نام لے کر لڑتا ہے۔

امریکی عوام اور دنیا کے وہ ملک جہاں خود بھی سامراجی طاقت قائم ہے، امریکا کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ لیکن سوشلسٹ اور سوشلزم کی طرف بڑھتے ہوئے دوسرے ملک جانتے ہیں کہ

پچھلے بیس سال سے امریکی حکمراں اپنے عوام اور ساری دنیا کو بیوقوف بنا رہے ہیں

ویتنامی اپنا لہو بہا کر بہادری کی ایک تاریخ لکھ رہے ہیں

حقیقت کیا ہے۔

پچھلے بیس سال سے امریکی حکمراں اپنے عوام اور ساری دنیا کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں آئزن ہاور اور کینیڈی سے لے کر نکسن تک سب کے کچے چٹھے کھل گئے۔

ان رازوں کو کھولنے والا تھا، امریکی جنگی محکمہ پینٹاگون کا ایک اہم رکن ڈینیل الزبرگ۔ الزبرگ نے پنٹاگون کے خفیہ اور ٹاپ سیکریٹ کاغذات کی ۴۰ جلدیں نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ اور بہت سے دوسرے اخبارات کے حوالے کر دیں۔ جیسے ہی ان کاغذات پر مشتمل مضامین نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونا شروع ہوئے، پورے امریکا اور پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ نکسن حکومت نے گھبرا کر ان کاغذات کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ الزبرگ کی گرفتاری کا وارنٹ نکال دیا گیا۔

لیکن جو باتیں دنیا بہت پہلے سے جانتی تھی کہ امریکی عوام ان میں سے بہت سی باتیں جان گئے تھے۔ اس لئے جب ان سیکرٹ کاغذات کی اشاعت کا معاملہ سپریم کورٹ کے سامنے آیا اور سپریم کورٹ نے ان کاغذات کی اشاعت کی آزادی دے کر ثابت کر دیا کہ امریکا میں اخبارات آزاد ہیں۔

لیکن امریکا میں اخبارات تعاون کی حد تک ہی آزاد

ہیں۔ ورنہ ہندوستان اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی طرح وہاں بھی تمام بڑے اخبارات چند سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں اور ہمیشہ انھی کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کل تک یہی اخبارات ویتنام میں امریکی مداخلت کی حمایت کر رہے تھے کیونکہ امریکی سرمایہ دار کو اس میں اپنا مفاد نظر آرہا تھا۔ یہ اخبارات ویتنامیوں کے "قاتلوں" کو قومی ہیرو بنا کر پیش کر رہے تھے، ویتنام میں امریکا کے ہر ظلم و ستم کو جائز قرار دے رہے تھے۔ لیکن پچھلے دس سال کی جنگ نے انھیں یہ سبق دیا کہ ویتنامیوں کو ہرانا ناممکن ہے۔ اس کے بجائے کہ امریکا ویت نام سے کوئی فائدہ اٹھائے وہ وہاں جانی اور مالی دونوں قسم کے نقصانات اٹھا رہا ہے۔ اس لئے اب امریکی سرمایہ دار نے محسوس کیا کہ بہتر ہوگا ویت نام سے باہر نکلا جائے اور دنیا کے کسی دوسرے علاقے میں اپنے ہتھیاروں کی مارکیٹ ڈھونڈی جائے۔ اس بات کو محسوس کرنے کے بعد سرمایہ داروں کے اخبارات نے ویت نام جنگ کی مخالفت شروع کر دی جس کی ایک کڑی تازہ ترین امریکی فوجی رازوں کی اشاعت ہے۔

الزبرگ نے بھی یہ کاغذات انسانیت اور انصاف پسندی کے تعلق سے شائع ہونے کے لئے نہیں دیئے ہیں۔ بلکہ اس کا کہنا ہے کہ اب امریکا ویت نام میں نقصان اٹھا رہا ہے اس لئے اسے وہاں سے باہر آجانا چاہیے۔ ورنہ کل تک خود الزبرگ اس جنگ کی حمایت کرتا رہا تھا۔

امریکی اخبارات اور جنگ کے مخالف لیڈر بھی اسی بات پہ زور دے رہے ہیں کہ جنگ منافع بخش نہیں ہے اسلئے اب امریکیوں کو ویتنام سے واپس آجانا چاہئے۔ اس میں امریکیوں کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں حق۔ انصاف۔ انسانیت جیسے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس میں ہر چیز کو نفع نقصان کے پیمانے پر ناپا جاتا ہے۔

ان کاغذات میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہی تمام باتیں حقیقت سے دنیا پہلے ہی واقف تھی۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اب امریکی عوام کو اپنی حکومت کی دروغ گوئی کا پتہ

امریکی عوام کی نظر میں نکسن کسی مسخرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے

چل گیا ہے۔ اب وہ جان گئے ہیں کہ امن اور انسانیت کی باتیں کرنے والے کینیڈی۔ جونسن اور نکسن جیسے بڑے بڑے لوگ کس طرح پوری پوری قوموں کے مستقبل سے کھیلا کرتے تھے۔ اب وہ جان گئے ہیں کہ سچے وہ نہیں بلکہ روس، چین دوسرے سوشلسٹ ممالک اور ویت نام کے بہادر عوام ہیں۔ ظلم کیمونسٹ نہیں بلکہ امریکن کر رہے ہیں۔ دنیا کے امن اور شانتی کے راستے کی رکاوٹ سوشلسٹ ممالک نہیں بلکہ امریکا اور دوسرے سامراجی ممالک ہیں۔

امریکی اخبار نیوز ویک لکھتا ہے کہ ابھی تو امریکن عوام کو جو واقعات کا بھی علم نہیں ہوا ہے۔ اگر پوری طرح سچائی ان کے سامنے آجائے تو انھیں پتہ چلے گا کہ امریکن فوج نے کس طرح لاکھوں انسانوں کا قتل کیا ہے، ہزاروں عورتوں کی عصمتیں لوٹی ہیں۔ اور کروڑوں بچوں کو اپنی سنگینوں پر اچھالا ہے۔ آج دنیا حقیقت سے واقف ہے، کل امریکن عوام حقیقت جان جائیں گے۔ آج امریکا میں صرف نوجوان ہی کمیونزم کی طرف مائل ہیں۔ کل وہاں کے بوڑھے بھی کمیونزم میں یقین رکھنے لگیں گے۔ اس وقت امریکن حکومت کو سوچنا پڑے گا کہ وہ کمیونزم سے کہاں کہاں لڑے۔؟

دنیا میں جنگ نہ ہو تو امریکا کی معیشت چار دن میں تباہ ہو جائے

مسائل

فرقہ وارانہ امن

وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کو جو ملک کی وزیر داخلہ بھی ہیں سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ ملک میں امن و امان قایم رہے اور شرارت پسندوں کو اس بات کا موقع نہ ملے کہ وہ مشرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزینوں کے نام پر کسی طرح کی بھی اشتعال انگیز کارروائی کر سکیں۔

سخت کارروائی کریں اور مشتعل ہجوموں پر فائرنگ کرنا ضروری ہو تو اس میں تامل نہ کریں۔ اسی کے ساتھ ریاستی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے افسروں کو خبردار کر دیں کہ اگر وہ فرقہ وارانہ تشدد کو دبانے کے لیے سخت کارروائی کرنے میں ناکام رہے تو فرائض کی انجام دہی میں اس کوتاہی پر ان کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے گا اور انھیں سزا دی جائے گی۔ ریاستوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ پولیس ایکٹ کی اس دفعہ سے بھی فائدہ اٹھائیں جس کے تحت ان علاقوں پر تعزیری جرمانے کیے جا سکتے ہیں جہاں فسادات ہوں۔

فرقہ وارانہ امن قایم رکھنے کے لیے مرکزی حکومت کا یہ بروقت اقدام ہے بشرطیکہ ریاستی حکومتوں اور ان کے اعلیٰ اور ادنیٰ افسروں نے ایمانداری سے کام لیا۔ بعض اوقات ایمانداری سے کام نہ کرنے کی بنا پر قوانین خود مظلومین کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا اب تک امن کی برقراری کے لئے بھی اندرا سرکار قابل مبارکباد ہے۔ اور آئندہ امن کی برقراری کے لئے وہ جو کچھ کر رہی ہے اسے بھی ہم ایک مستحسن اقدام سمجھتے ہیں۔

فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے والوں کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں گے

مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ شرارت پسند لوگ اپنی شرارت آمیز سرگرمیوں میں اس لئے مصروف نظر آتے ہیں کہ اب تک انھیں اپنی حرکتوں کی بالکل سزا نہیں ملی یا اگر ملی ہے تو بہت کم مل سکی ہے اولاً اس لئے کہ ان کے خلاف شہادتوں کا ملنا مشکل ہوتا ہے اور دوم اس لئے کہ عدالتی ضابطہ کے تحت مقدمات کے فیصلوں میں بہت کچھ تاخیر ہو جاتی ہے اور اس طرح انصاف کا خون ہو جاتا ہے۔

اس خامی کو دور کرنے کیلئے مرکزی حکومت ریاستی حکومتوں کو ایسے اختیارات دینا چاہتی ہے جس سے کہ وہ فساد زدہ علاقوں میں مجرموں کو سزا دینے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کر سکیں۔ یہ عدالتیں مقدمات کی محض سرسری سماعت کرنے کے بعد ان کے فیصلے کر سکیں گی اور جو تاخیر اس وقت ہوتی ہے وہ نہ ہوگی۔ توقع ہے پارلیمنٹ کے اجلاس رواں ہی میں ایک بل اس مقصد کے لئے پیش کیا جائے گا اور ریاستی حکومتوں کو امن و امان قایم رکھنے کے لئے ضروری اختیارات مل جائیں گے۔

ابھی حال ہی ریاستوں کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ جیسے ہی فرقہ وارانہ تشدد کے آثار نمایاں ہوں وہ فوراً [illegible]

بچوں کی فلاح بہبود

بچوں کی مناسب غذا کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اس لئے کہ بچوں کی نشو و نما اور ان کی ذہنی کیفیت کا دارومدار بہت کچھ غذا پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کے نشو و نما پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ ذہنی اعتبار سے کمزور نہ رہ جائیں۔

اس کے برعکس ہمارے یہاں ہندوستان میں زبانی جمع خرچ تو بہت کچھ کیا جا چکا ہے بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق مختلف کمیٹیاں اپنی سفارشات بھی پیش کر چکی ہیں لیکن عملی میدان میں ابھی تک کچھ نہیں کیا جا سکا ہے اور قومی پیمانہ پر بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی مہم نہیں چلائی گئی ہے۔

مرکزی ویلفیئر منسٹر نے حال ہی میں ریاستی ویلفیئر منسٹروں کی کانفرنس میں جو دلی میں منعقد ہوئی اس بات پر زور دیا تھا کہ بچوں کے لئے قومی پالیسی وضع کی جانی چاہئے اور اس سلسلے میں ایک جامع قرارداد منظور کی جانی چاہئے۔

دراصل ایسا بہت پہلے ہونا چاہئے تھا لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا جتنا جلد بچوں کی بھلائی کے لئے قومی پیمانہ پر مہم شروع کی جائے گی اتنا ہی اس ملک کے لئے بہتر ہوگا۔ آج کے بچے ہی کل کی قوم بنیں گے اور اگر بچپن ہی سے ہم نے اپنے بچوں کی طرف توجہ نہ دی تو یوں سمجھئے کہ اپنی قوم کو خراب کرنے کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر ہوگی۔

بنگال

جمہوریت سے مذاق

جمہوریت کا ایک بہت دلچسپ اصول ہے اور وہ یہ کہ جب تک جمہوری حکومت سرمایہ داروں یا انکے ہی خواہوں کے ہاتھ میں رہتی ہے سرمایہ دار اس کے گن گاتے رہتے ہیں لیکن جیسے ہی عوام اپنے ووٹ کا استعمال کر کے حکومت اپنے نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل کرتے ہیں، سرمایہ داروں کے ایجنٹ، قانونی یا غیر قانونی طریقے سے جمہوریت کا خون کرنے

ہندوستان میں آج بھی کروڑوں بچے ننگے بھوکے ہیں

بنگال ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جہاں ہمیشہ جمہوریت کے ساتھ مذاق ۔ کارھاے

...جمہوریت کے ساتھ مذاق کرنے والوں کی ہندوستان میں کمی نہیں۔ بنگال ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جہاں یہ مذاق ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔

مغربی بنگال اسمبلی کے اجلاس میں ابھی کچھ ہی دن باقی تھے کہ بنگال کے وزیر اعلیٰ اشری اجائے مکرجی نے گورنر دھرم ویر سے اسمبلی ختم کرنے کی مانگ کی حالانکہ گورنر صاحب جانتے تھے کہ اسمبلی کا اجلاس چند روز بعد ہی ہونے والا ہے لیکن پھر بھی انھوں نے اس درخواست کو منظور کر لیا اور ایک بار پھر اسمبلی ختم کر دی گئی۔ شری مکرجی کا کہنا ہے کہ ریاست میں حالات ...

... کچھ اس قسم کے ہیں کہ ان کے لئے حکومت کا چلانا ممکن نہیں دوسرے الفاظ میں وہ اپنی نااہلیت کا اعتراف کر رہے ہیں۔

دوسری طرف مارکسٹ لیڈر مسٹر جیوتی باسو کا کہنا ہے کہ اسمبلی اس لئے ختم کی گئی کیونکہ اجائے مکرجی جانتے تھے کہ نئے اجلاس میں اکثریت ان کا ساتھ نہیں دے گی۔ اور ان کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ دوسری طرف اگر شری مکرجی حکومت چلانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے تو گورنر کو جیوتی باسو سے حکومت بنانے کے لئے کہنا چاہیے تھا۔ صدر راج نافذ کرنا اسی وقت مناسب ہوتا جب جیوتی باسو بھی حکومت بنانے میں ناکام ہو جاتے۔

جیوتی باسو کو تشکیل حکومت کی دعوت نہ دے کر گورنر نے خواہ مخواہ اعتراضات کے لئے موقع فراہم کر دیا۔

ایک ایسے موقع پر جبکہ بنگال میں لاکھوں پناہ گزین آئے ہوئے ہیں۔ مغربی بنگال میں سیاسی عدم استحکام قابل افسوس ہے۔ گورنر نے ایک بار پھر الیکشن کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن آئندہ الیکشن کے بعد بھی کوئی مضبوط حکومت بن سکے گی۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیاں کس حد تک اپنے فرائض کو محسوس کرتی ہیں۔ ■

پنجاب
گورنر کی اہلیت کا امتحان

پنجاب میں بادل وزارت کے خاتمہ اور صدر راج کے قیام کے بعد سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے اور تمام سیاسی پارٹیوں نے آئندہ انتخابات کے پیش نظر از سر نو منظم ہونا شروع کر دیا ہے۔

اکالی دل پنجاب میں سب سے بڑی پارٹی سمجھی جاتی تھی لیکن "ہر کمالے را زوالے" کے اصول کے مطابق پورے عروج پر پہونچنے کے بعد وہ اب رو بہ تنزل ہے کسی زمانہ میں سکھوں کے واحد لیڈر آنجہانی ماسٹر تارا سنگھ سمجھے جاتے تھے اور انھوں نے موقع بے موقع اپنی تلوار گھما کر سکھوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا لیکن ان کی لیڈری آخر میں کاغذ کی ناؤ ثابت ہوئی اور سنگھاسن سنت فتح سنگھ کے قبضہ میں آگیا لیکن اب ان کا آخری دور بھی ماسٹر تارا سنگھ کے آخری دور کی شکل اختیار کر رہا ہے اور سنت جی کے چیلے محسوس کر رہے ہیں کہ ایک ایک کر کے ان کے ساتھی ان سے الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اسی لئے بعض اکالیوں نے یہ پتہ لگانا بھی شروع کر دیا ہے کہ کیا پنجاب میں کانگریس اکالیوں کے ساتھ کسی قسم کا انتخابی گٹھ جوڑ کر سکتی ہے۔

دوسری طرف گرنام سنگھ کی قیادت میں باغی اکالی بڑے پیمانہ پر منظم ہو رہے ہیں اور ایسے امکانات پائے جاتے ہیں کہ پھر وہاں اکالی دل اور ماسٹر اکالی دل بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے۔ ایسا ہوا تو سنت اکالی دل کی شکست یقینی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کامیابی کا سہرا گرنام سنگھ اکالی دل کے سر بندھ جائے گا۔ گرنام سنگھ کے کردار سے عوام اچھی طرح واقف ہیں وہ کبھی ماسٹر تارا سنگھ کے ساتھ تھے، پھر سنت جی کو گرو مان لیا اور اب خود گرو بن بیٹھے۔

دو "سرداروں" کی اس "کھٹ پٹ" میں یہ یقینی طور کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب کے عوام اپنے بچنے کی "جھٹ پٹ" یہ صورت نکالیں کہ وہ ایک قومی اور سیکولر جماعت کو اپنا لیں گے۔ جو نئی کانگریس کے علاوہ کوئی اور جماعت نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے ایک فرقہ وارانہ جماعت کے ایڈمنسٹریشن کا مزہ چکھ لیا جس سے کرانھیں کرپشن اقربا پروری اور نا انصافی کے علاوہ کچھ نہ ملا اب وہ نئی جماعت کو آزمائیں گے۔ جس سے یقیناً وہ بہت سی امیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔ پارلیمانی الیکشن میں جو رنگ دیکھنے میں آیا اس سے یہ اندازہ ہوا کہ پنجاب میں بھی اب ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔

در ایں اثنا دیکھنا ہے کہ بادل وزارت پنجاب کے نظم و نسق میں گندگی کا جو ملبہ چھوڑ گئی ہے اسے گورنر ڈی سی۔ پاوٹے کس طرح صاف کراتے ہیں پنجاب کی کوئی ایسی پارٹی نہ تھی جس نے بادل وزارت پر کرپشن کے الزامات عائد نہ کئے ہوں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں نے تو اعلیٰ پیمانہ پر تحقیقات کا بھی مطالبہ کیا تھا۔ گورنر صاحب تحقیقات کرائیں یا نہ کرائیں انھیں بہر حال نظم و نسق میں اہم تبدیلیاں ضرور کرنی ہوں گی کیونکہ اس کے بغیر نہ تو نئی سیاسی فضا پیدا ہو سکے گی جو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے لئے ضروری ہے اور نہ عوام کا وہ اعتماد بحال ہو سکے گا جو بادل وزارت کی بدعنوانیوں کی وجہ سے نظم و نسق پر سے اٹھ گیا تھا۔

دیکھنا ہے کہ گورنر اس اعتماد کو بحال کرنے کے لئے کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ اس وقت نظم و نسق سے متعلق ان کی صلاحیتوں کا امتحان ہے۔ *

کیا پنجاب میں کبھی کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہوگی

فلم نگری کے گوشوں سے

ادھیکار

فیض دکنی

فلم آج کے دور میں محض ایک تفریحی مشغلہ ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی میدانوں میں بھی یہ ایک اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ اشوک کمار کی ادھیکار، اس کا ایک عملی ثبوت ہے۔

ادھیکار کی سب سے بڑی خوبی اس کی کہانی ہے جہاں تک کہ کہانی نویس آر۔ ایس۔ ورما کی کہانی کا تعلق ہے۔ پلاٹ اور کردار اور ڈرامائی عناصر کے اعتبار سے بھرپور ہیں مگر اسکرپٹنگ، ڈائریکشن اور فلم کو دلچسپ بنانے کے سلسلے میں جو چھوٹے بڑے حربے استعمال کئے گئے ہیں خاص کر تفریح طبع کی غرض سے تبسم اور اس کے بوائے فرینڈ پر فلمائے گئے مناظر غیر معیاری ہیں حتیٰ کہ فلمی دنیا کی زرق برق رقاصہ ہیلن کا رقص بھی اس بار پھیکا پھیکا اور بے رنگ ہے۔ اسی طرح فلم کا پہلا گانا، پارک اور سوئمنگ پول کے مناظر بھی بھونڈے اور بھدے ہیں اسی وجہ سے۔ ایک لحاظ سے فلم کچھ حد تک جھول دار اور بوجھل ہو گئی ہے لیکن پروڈیوسر۔ ایس۔ نور اور ڈائریکٹر ایس۔ ایم۔ ساگر نے جس خوبی اور قرینے سے آج کل کے سستے غیر مہذب اور جنسی شہوت انگیز مناظر سے پاک صاف ایک نکھری ستھری فلم بنائی ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

فلم کی کہانی، ہمارے عام گھریلو اور سماجی مسائل کے اردگرد گھومتے ہوئے بھی بڑی دلچسپ اور اثر انگیز ہے اور اس اثر و تاثر میں بنے خاں بھوپالی کے دلچسپ رول میں پران نے مزید اضافہ کیا ہے۔ بنے خاں بھوپالی کا یہ کامیاب اور مثالی کردار پران کی فلمی زندگی کے چند یادگار کرداروں میں سے ایک ہے۔ ایک سیدھے سادے شریف النفس مسلمان دوست کی حیثیت سے خلوص و محبت اور وفاداری کا ثبوت دینا خاص کر ایک ہندو جوان تنہا و نہتا لڑکی کو اپنی بہن بنا کر ہر طرح سے اس کی حفاظت کرنا۔ یہ سب نہ صرف فلم کے مجموعی تاثر میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ قومی یکجہتی کے سلسلے میں ہمارے گنگا جمنی تہذیب کے ہندوستانی سماج پر بھی اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

ہیرو دیب مکرجی نے شاید ہی کہیں متاثر کیا ہو۔ مگر نندا نے ایک تعلیم یافتہ گھر گرست اور آدرش وادی عورت کے اونچے مقام و مرتبہ سے پورا پورا انصاف کرتے ہوئے

"موسم سہانا ہے، دلکش زمانہ ہے"۔ پھر خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ چلو جلدی سے پیڑوں کے آگے پیچھے بھاگ کر محمد رفیع اور لتا کی آواز میں ایک ہٹ گیت گائیں۔ دھرمیندر اور آشا پاریکھ فلم "میری دھرتی میرا دیش" میں۔

اپنے کردار کو خوب نبھایا ہے۔ [illegible]

کی ستائی ہوئی ایک معصوم لڑکی کے [illegible] فنکارانہ صلاحیتوں کو خوب اجاگر کیا ہے۔ [illegible] کہیں [illegible] رول [illegible] ہے۔

[illegible] دو گانوں کے جیسے "کوئی مانے یا نا مانے کل [illegible] اجالے" اور "یہ عام آدمی کا اوروں کے [illegible]" (قوالی) فلم کی [illegible] میں راہل دیو [illegible] محنت نہیں کی ہے۔ مکالمے، فوٹو گرافی [illegible] ہے مگر بہ حیثیت مجموعی ادھیکار، خاصی [illegible] ہر شخص کے دیکھنے کے قابل فلم ہے، اور [illegible] اور علمی اداروں سے اس سے ترغیب حاصل کریں تو ہمارے [illegible] قومی یکجہتی، انسان دوستی، سارے مذاہب کی عزت و احترام کے سلسلے میں آج کے ہندوستان کی بہت بڑی سماجی اور قومی خدمت ہو گی۔

[illegible] فلمیں

میرے سجنا

کمول اجیت پروڈکشن کے تحت ایک نئی فلم "میرے سجنا"

[illegible] — یہ فلم "آدھی رات" کا ہنیں ہے۔ بلکہ سنجیو کی آنے والی فلم "دور ابھی اجالا" ہے۔ فلم کے [illegible] منظور راجہ اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کی ہے۔

کی شوٹنگ جاری ہے۔ کہانی ایک [illegible] سے متعلق ہے۔ راکھی اور نوین نشچل، اجیت اور [illegible] اس کے اہم کردار ہیں۔ ہدایت ڈائرکٹر برج کے تفویض ہے۔ گیت مجروح کے ہیں اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال دے رہے ہیں۔

گورا اور کالا

شنکر موویز کی ڈبل رول کی ایک اور دلچسپ فلم "گورا اور کالا" میں راجندر کمار اور ہیما مالنی کو لیا گیا ہے۔ راجندر کمار نے اس فلم میں دو بھائیوں کا ڈبل رول ادا کیا ہے جو ہر اعتبار سے مختلف ہیں۔ دوسرے اداکاروں میں ریکھا، پریم ناتھ، مدن پوری، سلوچنا، رندھیر قابل ذکر ہیں۔ موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کی ہے۔

شرمیلی

سبودھ مکرجی پروڈکشن کی یہ "شرمیلی" گلشن نندہ کی کہانی پر مبنی ہے، جس میں ششی کپور، اور راکھی ہیڈنگ رول ادا کر رہے ہیں۔ کاسٹ میں ان کے علاوہ نذیر حسین، نریندر ناتھ، افتخار، سلوچنا، کندن، دلاری وغیرہ کو لیا جا رہا ہے۔ فوٹو گرافی این۔ وی سری نواس کی ہے۔ نیرج کے گیت ہیں۔ اور ایس۔ ڈی۔ برمن کی موسیقی ہے۔

بے ایمان

موہن لال کپور ایک بڑی کاسٹ کی فلم "بے ایمان" بنا رہے ہیں جس کی ہدایت بھی خود ہی دے رہے ہیں۔ حال ہی میں دس دن تک اسکی شوٹنگ کی جا چکی ہے۔ جس میں منوج کمار، راکھی، بلراج ساہنی، ناظمہ، پریم چوپڑا اور پران نے حصہ لیا۔ "بے ایمان" کی کہانی سچن بھومک نے لکھی ہے۔ وید راہی نے مکالمے لکھے ہیں اور ورما ملک کے گیتوں پر شنکر جے کشن موسیقی ترتیب دے رہے ہیں۔

ڈیڈی پوچھ رہے ہیں "لڑکا پسند ہے" لڑکی کہہ رہی۔ یوگیتا بالی اور اوم پرکاش فلم "پروانہ" میں۔ نوین نشچل اور امیتابھ بچن فلم کے دوسرے اداکار ہیں

امیتابھ بچن کا مقام نئے آنے والے اداکاروں میں سب سے بلند ہے۔ بچن کی پہلی فلم "سات ہندوستانی" تھی۔ جس نے ایک ہندوستانی کے رول میں بہت متاثر کیا۔ "آنند" میں ڈاکٹر بھاسکر کے رول میں بچن نے جان ڈال کر ظاہر [illegible] ان میں سنجیدہ اداکاری کی قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں۔ فلم "پیار کی کہانی" میں بچن ہیرو بن کر آ رہے ہیں۔ اداکاری [illegible]

چمچہ گیری بھی ایک فن ہے

نیاز احمد ایم اے

رات آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس سے یہ گانا :-

" چھری بن ، کانٹا بن اوما ئی سن ۔
سب کچھ بن کسی کا چمچا نہ بن "

سنا تو سوگا اپنے مرحوم بزرگ کی یاد آگئی ۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ چمچا گیری انسان ہی کی طرح قدیم ہے ۔ انسان جب پڑھا لکھا نہیں جانتا تھا تب بھی چمچے مختلف شکل میں موجود تھے ۔ بہر حال کہنے کا یہ مطلب ہے کہ چمچا گیری ایک قدیمی فن ہے ، گو اس کا پرانے زمانے میں زیادہ رواج نہیں تھا ۔ اِدھر دو تین صدیوں میں اس فن نے کافی ترقی کی ہے ۔ چمچا گیری تو بالکل جدید نام ہے ورنہ اس کے مختلف زمانوں میں مختلف نام تھے ۔ " ہم نشیں " مصاحب ، بی حضوری ، حاشیہ بردار ، اور خمیہ بردار وغیرہ ۔

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ پہلے جتنا بڑا شاعر ہوتا تھا اتنا ہی بڑا چمچا مانا جاتا تھا ۔ چنانچہ اردو کے ایک بلند آہنگ شاعر نے صاحب کے کفِ دست کی چکنی ڈلی کو کیا سے کیا بنا دیا ۔ یہ صرف شاعرانہ تعلی نہیں تھی بلکہ اس میں چمچا گیری کا عنصر بھی شامل تھا ۔

عام طور پر یہ بھی مشہور ہے کہ چمچے اپنے ممدوح کو خوش کرنے کے لئے غلط باتیں زیادہ کرتے ہیں ۔ اگر خدانخواستہ سچی بات زبان سے نکل گئی تو چمچے کی حجامت بن جاتی ہے جیسا لکھنؤ کے نواب کے دربار میں ایک " ہم نشیں " شاعر کا حال ہوا ۔ اتنا بڑا شاعر گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور اول جلول بکتا تھا ۔

پرانے زمانے میں چمچوں یا حاشیہ برداروں میں ایک طرح کی وضعداری ہوا کرتی تھی اور اُردو قصیدے کی طرح ربط و تسلسل اور حفظِ مراتب کے پابند ہوتے تھے کیونکہ ان کی باقاعدہ تنخواہ مقرر تھی اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا ۔ لیکن

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

آج کل کے چمچے جدید شاعری کی طرح بالکل غیر مربوط اور بے ڈول واقع ہوئے ہیں ۔ نہ وضعداری ، نہ عہدِ وفا کا پاس بلکہ چھوٹے بڑے مصرعے والی نظم کی طرح ناہموار کردار سے مزین جب تک باس کے سر پر چاندی جلوہ فگن رہی ساتھ ساتھ رہے جہاں تاریکی نے ڈیرا جمایا کسی دوسری روشنی کی طرف لپکے ۔ میرے دادا نے اپنے دادا سے سنا تھا انھوں نے بھی کسی سے سنا ہی ہوگا کیونکہ وہ بے چارے اتنے مالدار نہیں تھے کہ باتنخواہ حاشیہ بردار رکھتے ۔

" ایک بڑے آدمی کے یہاں ان کا چمچا دوپہر کے وقت پہنچا گھر میں خبر کی ۔ صاحب ڈکارتے ہوئے برآمد ہوئے ۔ چمچے نے کہا " کوئی لذیذ غذا کھائی گئی ہے کیا بڑی خلاصہ ڈکار آرہی ہے " انھوں نے کہا ۔

" آج آلو کی ترکاری بنی تھی " چمچا جھٹ سے بولا ۔

" حضور کے یہاں آلو کی بنی ہوئی ترکاری کے سامنے مرغ مسلم ہیچ ہے " صاحب نے کہا ۔

" ذرا گرم ہوتا ہے " چمچا بولا ۔

" گرم ۔ ارے صاحب آگ ہوتا ہے آگ "

خیر یہ تو پرانی باتیں تھیں ، بہت پیسے والے لوگ ہی چمچے رکھتے تھے ۔ مگر آج کل تو جس نے سال میں پانچ دس ہزار کما لیا دو چار چمچے آگے پیچھے رہنے لگے کیونکہ اس زمانے میں چمچوں نے تنخواہ کی قید اٹھا لی ہے ۔ اب یہ چمچے کی صلاحیت ہے کہ وہ اپنے باس سے کتنا اینٹھ لیتا ہے ۔ آپ کو یہ بھی بتادوں کہ آج کل کے ممدوح " باس " کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں ۔

ہمارے شہر میں دو بھائی غلط چمچے ۔۔۔ میں فرق نہیں دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں ان کے یہاں بھی ان " ذات شریف " کی کمی نہیں ۔۔۔ چار چمچے رہتے ہیں ۔ اگر کسی چمچے کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً صاحب کے پاس جا کر کہتا ہے ۔

" آج میں فلاں ہوٹل میں چائے پی رہا تھا کہ آپ کے " دشمن بھائی " گئے اور آپ کے بارے میں غلط سلط بکواس کرنے لگے ۔ میں نے بھی وہ لتاڑا آتنی کھنچائی کی کہ ان کی ۔۔۔ باس بولے " اچھا کیا ، بہت اچھا کیا "

چمچے نے دیکھا کہ لوہا خوب تپ گیا ہے تو جھٹ اپنا مقصد بیان کرنے لگا ۔

" پار سال گھر بنوایا تھا مگر پتہ نہیں کیا خامی رہ گئی چھت ٹپکنے لگی ۔ دو بوری سمنٹ کی ضرورت ہے کہیں مل نہیں رہا ہے "

باس نے کال بیل دبائی ۔ نوکر حاضر ہوا ۔

" ان کو دو بوری سمنٹ دے دو "

اس قسم کے واقعات آئے دن ہمارے شہر میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور چمچے بڑے فخر سے یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ ۔

" میں نے فلاں صاحب سے اتنا اینٹھ لیا "

آج کل کے باس چمچوں کی رائے کو ذرا اہمیت نہیں دیتے بلکہ عموماً ان کے خلاف ہی کرتے ہیں پتہ نہیں اس میں کیا بھید ہے ، واللہ اعلم ۔ دیکھئے اگر آپ کو کسی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ فلاں کا چمچا ہے تو خدا کے لئے اس کو چمچا کہہ کر مخاطب نہ کیجئے گا ورنہ وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جائے گا ۔ ہاں اگر آپ یہ کہیں کہ تم فلاں کے معاملات میں کافی دخیل ہو تو وہ بہت خوش ہوگا اور مجھے خدشہ ہے کہ کہیں آپ کو چائے یا کوکا کولا کی پیشکش نہ کر دے ۔

بہر کیف آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس نے تمام بالغوں کو بروقت آگاہ کر دیا ہے اب بالغوں کو سوچنا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کو چھری کانٹا بناتے ہیں یا چمچا ۔

میری رضیہ

وہ دیوانہ وار سفید ہیولے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

انوار صدیقی

شہر کو دبیز چادر میں لپٹی ہوئی دسمبر کی وہ آخری رات بہت زیادہ سرد تھی۔ سردی کی لہر نے سر شام ہی سے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا... لوگ اپنی اپنی رہائش

گاہوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ سڑکیں سنسان ہو کر رہ گئی تھیں کبھی کبھی کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز کسی گوشے سے ابھرتی اور پھر ہوا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا الیکٹرک پولز میں لگے ہوئے دودھیا بلب بھی گہری دھند میں سہمے سہمے نظر آ رہے تھے۔ ہوا کے تیز جھکڑوں نے طوفانی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آج کی رات شہر پر کوئی بھیانک قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

ماڈل کالونی کی تیسری شاہراہ بھی گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن بائیں جانب والی ساتویں عمارت کی دوسری منزل پر ابھی تک زندگی کے کچھ اثرات موجود تھے۔

فلوریسنٹ لائٹ کی روشنی میں وہ کمرہ کسی کی خواب گاہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چیز انتہائی سلیقے سے اپنی جگہ پر موجود تھی۔ دیواروں پر جا بجا خوبصورت مناظر والی پینٹنگز کے فریم نظر آ رہے تھے۔ سردی کی شدت کو روکنے کیلئے خواب گاہ کے مشرقی حصے میں بنے ہوئے آتشدان میں لکڑیوں کی آگ روشن تھی جس کی لپٹ سے اٹھنے والے شعلوں کا عکس اس نوجوان کے چہرے پر بھی لہرا رہا تھا جو آتشدان کے قریب رکھی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر بھاری نائٹ گاؤن موجود تھا۔ چہرے کے تاثرات بوجھل بوجھل سے لگ رہے تھے۔

قد و قامت کے اعتبار سے وہ ہٹا کٹا نظر آ رہا تھا۔ کشادہ پیشانی پر بے شمار شکنیں موجود تھیں۔ آنکھوں میں پھیلی ہوئی ویرانی اس کے اندرونی جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی! اپنی کرسی پر ساکت و جامد بیٹھا وہ مسلسل بڑی دیر سے آتشدان میں سلگتی ہوئی لکڑیوں کو ٹکٹکی باندھے گھورے جا رہا تھا!۔

خواب گاہ میں موت کی سی خاموشی طاری تھی لیکن پھر اچانک نوجوان اس طرح چونکا جیسے وہ دستک بیرونی دروازے کے بجائے اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے ابھری ہو!... اس کی نگاہیں آتشدان میں رقص کرتے ہوئے شعلوں سے ہٹ کر دروازے پر جم گئیں۔ کھٹ!۔ کھٹ دروازے پر دوسری بار دستک کی آواز ابھری اور پھر نوجوان کسی حساس اور چالاک چیتے جیسے انداز میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اس نے سیدھا ہاتھ گاؤن کی جیب میں ڈال کر اپنے اعشاریہ تین آٹھ کے بھرے ہوئے ریوالور کے دستے پر مضبوطی سے جمایا پھر قدم بڑھاتا ہوا دروازے کے قریب آ گیا۔ ایک ثانیے کے لئے رکا پھر الٹے ہاتھ سے بولٹ گرائے اور جھپٹ کر بائیں جانب والی دیوار سے چپک گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک تنومند جوان بڑی لاپرواہی سے قدم بڑھاتا ہوا خواب گاہ کے اندر آ گیا اس کے جسم پر سیاہ پتلون اور بھاری جسٹر موجود تھا۔ سر پر فلٹ ہیٹ تھی اور ہاتھوں میں چرمی دستانے نظر آ رہے تھے۔

دیوار سے چپکے ہوئے فرد نے جیسے ہی آنے والے کو دیکھا اس کے چہرے پر نظر آنے والا کھنچاؤ یک لخت ختم ہو گیا سیدھا

تے ریوالور سکھ دستے سے ہٹ کر جیب سے باہر آگیا ایک
ے ایک طویل سانس لی تھی جیسے کسی بڑے خطرے سے چھٹکارا
ل گیا ہو۔

"اوہ!... تم یہاں موجود ہو" چہرہ والے نے گھوم کر
جوان کو دیکھا پھر اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ
بھر آئی "سمجھا!... دستک کی آواز سنکر تم کو شاید پھر اسی خطرے
احساس ہو گیا ہوگا جس نے تمہارے اعصاب کو بہت دنوں سے
لرزہ رکھا ہے، کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

نوجوان نے جواب دینے کے بجائے دوبارہ ایک سرد
آہ بھری پھر دروازے کو بولٹ کرکے دوبارہ اپنی آرام کرسی
پر آگیا! ایکبار پھر اس کے چہرے پر الجھن اور تفکرات کے ملے
جلے تاثرات پھیل کر گہرے ہونے لگے! نووارد نے کپڑے
تبدیل کئے اور پھر وہ بھی آتشدان کے قریب رکھی ہوئی دوسری
کرسی پر آگیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اپنے گرد وہم کا جال بن رہے ہو۔
نووارد نے اپنے ہاتھوں کو آگ پر تاپتے ہوئے نوجوان کو مخاطب
کیا" میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ بھی تم سے کسی قسم کا انتقام لینے
کے تلے ہونگے۔

"تم نہیں سمجھ سکو گے شیرازی" نوجوان نے لرزتی ہوئی
آواز سے جواب دیا" وہ خبیث بوڑھا ابھی تک مجھے اپنی بیٹی
کا قاتل سمجھ رہا ہے۔ رضیہ کی موت جن حالات میں پیش آئی
تھی وہ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس نے بارہا مجھے
فون پر اس بات کی دھمکی بھی دی ہے کہ جب تک وہ رضیہ کی موت
کا بدلہ مجھ سے نہ لے لے چین سے نہیں بیٹھیگا۔

"آئی سی" نووارد جسے شیرازی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا
یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھے ہوئے
سگار بکس کو کھولا پھر ایک سگار نکال کر جلایا اور اس کے
رنگین طویل کش لینے کے بعد کہا" تم نے آج سے قبل مجھے
یہ بات نہیں بتائی تھی۔

"اگر تم مجھے وہمی ہونے کا طعنہ نہ دیتے تو شاید آج
بھی میں اپنی زبان بند رکھتا" نوجوان نے اپنے نچلے ہونٹ
چباتے ہوئے کہا" تمہاری جگہ اگر کسی دوسرے انسپکٹر کو
تفتیش پر معمور کیا جاتا تو ممکن تھا میں اسے پہلی ہی ملاقات میں
تفصیلی حالات سے آگاہ کر دیتا لیکن تم میرے دوست ہو
اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ذاتی مشاہدوں اور تجربات
کی روشنی میں اپنی رپورٹ مرتب کرو۔ دوستی کی آڑ لے کر
میں تمہاری ہمدردیوں کو نہیں حاصل کرنا چاہتا۔

نوجوان کے چہرے پر کربناک سنجیدگی مسلط ہو گئی! اس
نے نظر بھر کر انسپکٹر شیرازی کو دیکھا پھر اٹھ کر اس دروازے
کے قریب آگیا جو بائیں باغ کی سمت بالکونی میں کھلتا تھا۔
دروازہ کھول کر وہ بالکونی میں آیا پھر ماحول سے بے نیاز ہو کر
ریلنگ پر کہنیاں جمائیں اور بائیں باغ کے اس حصے کی طرف
دیکھنے لگا جہاں رات کی رانی کا پودا اس وقت بھی مہک
رہا تھا۔

سردی کی شدت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"اُف... میرے خدا... انسپکٹر شیرازی نے جھرجھری
لیتے ہوئے اپنے آپ سے کہا پھر تیزی سے اٹھا اور لمبے لمبے
قدم اٹھاتا ہوا بالکونی میں آگیا" پلیز صابری۔ رحم کرو اپنی
حالت پر کیا تمہیں ٹھنڈ کا احساس بھی نہیں ہو رہا ہے۔ مائی
گاڈ! کیسی سرد اور طوفانی رات ہے"

"وہ بھی ایک ایسی ہی طوفانی رات تھی" انسپکٹر صابری
نے دردناک لہجے میں کہنا شروع کیا" اس رات بھی سرد ہوا
کے جھونکے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے
تھے میں اس رات کو کبھی نہیں بھول سکتا اس لئے کہ وہ رات
میری زندگی کی سب سے زیادہ منحوس ترین رات ثابت ہوئی
تھی۔ اسی منحوس اور ظالم طوفانی رات نے مجھ سے میری رضیہ
کو چھین لیا تھا" آخری جملہ کہتے وقت صابری کا پورا جسم بید
مجنوں کی طرح کانپ اٹھا۔ پتا نہیں وہ سردی کا احساس تھا
یا رضیہ کی موت کا بھیانک تصور جس نے اس کے پورے جسم
کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔

"صابری! کیا یہ حقیقت ہے کہ رضیہ کی موت کا باعث
رات کی رانی کا پودا ہی ثابت ہوا تھا"

"ہاں میرے دوست! وہ بڑی محبت اور ارمانوں
سے وہ پودا خرید کر لائی تھی۔ نہ جانے کیوں رات کی رانی کے
اس منحوس پودے کو دیکھ کر مجھے ایک انجانے خوف کا احساس
ہوا تھا میں اس احساس کو کوئی نام نہیں دے سکتا لیکن میں
نے رضیہ سے کہا ضرور تھا وہ اس پودے کو تلف کر دے مگر
وہ میری بات کو ہنس کر ٹال گئی!... اس نے خود اپنے ہاتھوں
سے اس پودے کو لگایا اور پھر اس طرح کی نگہداشت کی
جیسے اسے پودے سے گہری عقیدت ہو اور پھر صابری
کی آواز غمناک ہوتی چلی گئی! اس نے رندھی ہوئی آواز میں
تھوڑے توقف کے بعد کہا" اس طوفانی رات میں ہم جلد
ہی سو گئے تھے۔ لیکن!... اف میرے معبود! کس قدر کربناک
انداز میں چیخی تھی رضیہ! اس کی چیخ کی آواز سن کر میں بیدار
ہوا پھر جب میں نے اس کے بستر کو خالی پایا اور دروازہ کھلا
دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی لاہوتی قوت نے میرے
جسم کی تمام قوتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں
کہ میں کس طرح بے تحاشا دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا پائیں
باغ میں پہنچا تھا!... جانتے ہو وہاں میں نے کیا دیکھا تھا؟
میری زندگی!... میری رضیہ اسی رات کی رانی کے پودے
کے قریب بے حس و حرکت تھی اور موت کا دیوتا ایک کالے
ناگ کی صورت میں اس کے قریب کنڈلی مارے بیٹھا اپنی فتح
پر جھوم رہا تھا... " اور پھر صابری کسی معصوم بچے کی

لک کر رونے لگا۔
پکٹر شیرازی بڑی مشکلوں سے اسے سہارا دیکر
س نے بالکونی کا دروازہ بند کیا اور صابری کے
یٹھ گیا۔ مگر ابھی تک اس کے ہونٹوں کے درمیان
تھا۔ صابری کی سسکیوں کی آواز بہت دیر تک
پھر اچانک وہ اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا اور دروازے
کر کے تیز تیز پلکیں جھپکانے لگا جیسے کچھ سننے کی
رہا ہو انسپکٹر شیرازی اسے متحیرانہ انداز میں گھورنے لگا
نے کچھ سنا؟ صابری نے شیرازی کی طرف دیکھ کر
رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ رضیہ کی روح پائیں
جود ہے۔ وہ مجھے آواز دے رہی ہے، سنو
!....
تمہارا وہم ہے۔ شیرازی نے کچھ دیر بعد الجھے ہوئے
یا۔ مجھے طوفانی ہواؤں کی سائیں سائیں کے علاوہ
سری آواز نہیں سنائی دے رہی۔"
تم مت یقین کرو میرے دوست۔... لیکن میں رضیہ
روح کو بارہا پائیں باغ میں رات کی رانی کے پودے
بھٹکتا دیکھ چکا ہوں اور اکثر... صابری نے اچانک
مکمل چھوڑ دیا!... ایک بار پھر وہ ایسی پوزیشن میں آگیا
مدھم آواز کو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔
"یار خدا کے لئے ہوش میں آجاؤ!... میں پھر کہتا ہوں
ب کچھ تمہارا وہم ہے۔
ہش!... آہستہ بولو انسپکٹر!... "صابری نے
ٹوں پر انگلی رکھ کر شیرازی کو خاموش کرنے کا اشارہ
پنجوں کے بل چلتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب آگیا
انسپکٹر شیرازی نے اسے بڑی آہستگی اور خاموشی کے
ٹ گراتے دیکھا!... دوسرے ہی لمحے صابری باہر
یا۔ شیرازی کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھر آئے!
مبل اٹھا اور دبے قدموں چلتا ہوا بالکونی میں کھلنے
دروازے کے قریب گیا اور اُسے کھول کر تیزی سے
آگیا!... خواب گاہ کی روشنی ہر چند کہ ناکافی
س کی بوجود اس نے پائیں باغ میں ایک سائے
کے قریب ٹھٹھک دیکھ لیا!... سرتاپا سفید لباس
ایک انسانی ہیولا رات کی رانی کے پودے
انسپکٹر شیرازی اگر آج کی رات میں

رضیہ کی بے چین روح مجھے نظر آگئی تو میں کل صبح اپنی رپورٹ کو مرتب کر کے حکام کے سامنے پیش کر دوں گا۔

"تم جب چاہو یہاں رہ کر واقعات کا مطالعہ کر سکتے ہو" صابری نے اپنی نظریں آتشدان میں بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہٹا کر شیرازی کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا "جہاں تک میری رضیہ کی روح کا تعلق ہے وہ اب میری خواہشات کے تابع نہیں ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ آج رات بھی تم کو نظر آجائے!... ویسے اب تک یہی ہوا ہے کہ وہ ہر رات بڑی پابندی سے رات کے کسی حصے میں پائیں باغ میں ضرور آتی ہے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رات کی رانی کے پودے سے اس کے گہرے لگاؤ کا نتیجہ ہو جو رات کو اسے وہاں آنے کے لئے مجبور کر دیتا ہو۔

"میں بھی اسی نتیجے پر پہونچا ہوں۔" انسپکٹر شیرازی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر جھرجھری لیتے ہوئے بولا "آج کی رات بھی بے حد سرد ہے!... سردی کی لہر جیسے رگ و ریشے میں سرایت ہوتی جا رہی ہے!... کیا اس وقت میں تم کو کافی کے ایک گرما گرم بیکر (BEAKER) کے لئے زحمت دینے کی جسارت کر سکتا ہوں"

"میں خود بھی اس وقت کافی کی خواہش کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا!... تم بس دو منٹ انتظار کرو میں ابھی بنا کر لاتا ہوں۔" صابری نے کہا پھر اُٹھ کر ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔

انسپکٹر شیرازی پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ دوبارہ وہ اس وقت چونکا تھا جب دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے گیارہ کے عمل کا اعلان کیا تھا۔ ایک منٹ بعد صابری اپنے ہاتھوں میں کافی کے بیکر تھامے دوبارہ خواب گاہ میں داخل ہوا!... کافی کے ایک ہی گھونٹ نے انسپکٹر شیرازی کے اعصاب کو خاطر خواہ سکون بخشا تھا۔

وقت بڑی سست رفتاری سے گزرتا رہا۔ کافی ختم کر کے انسپکٹر شیرازی نے پاؤں پر پڑے ہوئے کمبل کو گھسیٹ کر اوپر کیا پھر قریب رکھی ہوئی گول میز سے انگریزی رسالے کو اٹھا کر ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ صابری نے آتشدان کے قریب رکھی ہوئی لوہے کی سلاخ کو اُٹھایا اور سلگتی ہوئی لکڑیوں کو کریدنے لگا۔ خوابگاہ میں ایک بار پھر بوجھل سکوت طاری ہو گیا لیکن یہ سکوت دیرپا ثابت نہیں ہوا۔

صابری کے ساتھ انسپکٹر شیرازی بھی چونک کر کرسی پر سیدھا ہو گیا۔ وہ کسی قسم کی آہٹ ہی تھی جس نے دونوں کو چونکا دیا! صابری کی آنکھوں میں دہشتناک ادا سی پھیل کر گہری ہونے لگی! چند لمحات تک وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا پھر اچانک اس نے شیرازی سے مدہم آواز میں کہا۔

"سنا تم نے.... قدموں کی آہٹ!.... شاید میری رضیہ کی بے چین روح پائیں باغ میں ٹہل رہی ہو گی۔"

"ٹھہرو!... انسپکٹر شیرازی نے تیزی سے کمبل گھسیٹ کر علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ آج میں بھی تمہارے ساتھ نیچے چلتا ہوں۔

"نہیں!... نہیں میرے دوست تم میرے ساتھ مت چلو ورنہ وہ غائب ہو جائے گی۔" صابری نے ملتجی نظروں سے شیرازی کو گھورتے ہوئے کہا۔ میرے سوا کسی اور کو دیکھ کر وہ ہمیشہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

انسپکٹر شیرازی کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرے تھے لیکن ٹھیک اسی وقت پائیں باغ کی جانب سے ایک گرجدار آواز ابھری تھی۔ "میں کہتا ہوں رُک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"یہ!... یہ کون تھا" صابری نے حیرت سے پوچھا پھر تیزی سے سانس روک کے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اچانک ایک دوسرا ہیولا بھی اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پہلے سائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"صابری... شیرازی نے سوچا پھر جھپٹ کر بالکونی کی خواب گاہ میں آیا!... مغربی گوشے میں بچھی ہوئی مسہری کے تکیے کے نیچے سے اپنا سروس ریوالور نکال کر ہاتھ میں دبایا پھر دوڑتا ہوا خواب گاہ میں سے نکلا اور نیچے جانے والے زینوں پر اترنے لگا۔ لیکن پائیں باغ میں پہنچکر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رات کی رانی کے پودے کے قریب سبزے پر صابری چت پڑا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

سفید پوش ہیولا غائب ہو چکا تھا۔ شیرازی نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر صابری کی نبض ٹٹولی جو تیزی سے چل رہی تھی۔

۲

دوسری صبح ناشتے کی میز پر بھی صابری چپ چپ سا نظر آ رہا تھا اس کے چہرے پر کسلمندی کے تاثرات موجود

تھے! آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں جیسے گزشتہ رات وہ ایک منٹ کے لئے بھی سو نہ سکا ہو! انسپکٹر شیرازی اپنی کرسی پر بیٹھا خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صابری خود ہی گزشتہ رات پائیں باغ میں پیش آنے والے واقعات پر روشنی ڈالے گا لیکن نہ جانے کیوں صابری کی طویل خاموشی نے اسے الجھن میں ڈال دیا!... سفید پوش ہیولا اس وقت بھی اس کے ذہن میں محفوظ تھا!... اس نے اپنی آنکھوں سے اسے رات کی رانی کے قریب کسی بد روح ہی کی طرح بھٹکتے دیکھا تھا۔

ناشتے کی میز پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر انسپکٹر شیرازی ہی نے گفتگو کی ابتدا کی۔

"صابری! تمہارے لئے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس عمارت کو خالی کر کے کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔"

"کیوں..." صابری اس طرح چونکا تھا جیسے انسپکٹر شیرازی کی تجویز سے اس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا ہو۔

"غلط مت سمجھو!... شیرازی نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ حالات کے پیش نظر تمہارا یہ اقدام بے حد مناسب ہوگا! گزشتہ رات کے واقعات سامنے آنے کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔"

"اوہ!..." صابری نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر درد ناک آواز میں بولا "میرے دوست! تم شاید یہ مت سمجھ بیٹھے ہو کہ رضیہ کی بھٹکتی ہوئی روح میرے دل و دماغ پر کوئی غلط اثر ڈال رہی ہے! لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے! مجھے اسکی بے چین روح کو دیکھ کر صدمہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک میرے لئے بے چین ہے!... میری وابستگی کے لئے یہی کیا کم ہے کہ میں اسے دیکھ سکتا ہوں!... اگر میں نے تمہارے مشورے کو قبول کر لیا تو رضیہ کی روح کو اذیت ناک صدمہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے! میں اپنا مشورہ واپس لیتا ہوں" انسپکٹر شیرازی نے دبی زبان میں کہا پھر چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

صابری کے چہرے پر بڑی وحشت ناک افسردگی مسلط تھی۔

"دو چار روز کے اندر میں اپنی رپورٹ مرتب کر کے افسران کی خدمت میں پیش کروں گا" شیرازی نے تھوڑے توقف کے بعد کہا "اسی رپورٹ کی ایک کاپی انشورنس کمپنی کو بھی روانہ کر دی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ میری تفصیلی رپورٹ دیکھ کر تمہارے خسر بھی مطمئن ہونگے اور پھر تمہاری پریشانیوں میں تھوڑی سی کمی ہو جائے گی۔"

"شاید..." صابری نے رندھی ہوئی آواز میں کہا پھر کرسی کی پشت سے ٹیک کر خلا میں گھورنے لگا۔

"کیا یہ درست ہے کہ تم نے رضیہ کے والدین کو اسکی موت کی اطلاع تجہیز و تکفین کے بعد کی تھی؟"

"ہاں!... اس وقت مجھے اتنا ہوش ہی کہاں تھا کہ میں کسی کو مطلع کرتا!... ویسے بھی وہ لوگ شروع سے میرے مخالفین میں سے تھے!... رضیہ سے وہ محض اس لئے ناراض تھے کہ اس نے مجھ جیسے ایک معمولی اسسٹنٹ سے شادی کیوں کر لی"

"جانتے ہو تمہارے خسر نے تفتیش کے سلسلے میں مجھے کیا تجویز پیش کی تھی؟"

"کیا...؟"

"انھوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں مرحومہ کی لاش کو قبر سے نکلوا کر اسکا پوسٹ مارٹم کراؤں" انسپکٹر شیرازی نے سپاٹ لہجے میں کہا پھر صابری کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے بولا "جانتے ہو میں نے کیا جواب دیا تھا!... میں نے انھیں یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ اگر مناسب سمجھا گیا تو یہ کاروائی بھی ضرور کی جائے گی۔"

"اب تم کس نتیجے پر پہنچے ہو..." صابری نے بے چینی سے پوچھا... "کیا اب بھی...."

"نہیں!... شیرازی نے تیزی سے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا "اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

!... یہ درست ہے کہ رضیہ طبعی موت نہیں مری لیکن بہر حال!... میں پورے طور سے مطمئن ہوں کہ اس کی موت میں کسی سازش کا ہاتھ نہیں۔"

صابری نے تشکرانہ انداز میں انسپکٹر شیرازی کو دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"عمارت کی تبدیلی کا مشورہ میں واپس لے چکا ہوں لیکن رات کی رانی کا وہ پودا..." انسپکٹر شیرازی ایک لمحے کے لئے رکا پھر گہری سنجیدگی سے بولا "میرا قیمتی مشورہ ہے کہ تم اسے اپنی پہلی فرصت میں اکھاڑ پھینکو ورنہ...."

"ممکن ہے کہ وہی کالا ناگ جس نے میرے سکون کو ڈس لیا تھا کسی روز میرے وجود کو ختم کر دے گا" صابری نے جملہ مکمل کر دیا پھر اس کی آنکھیں وحشتناک انداز میں چمکنے لگیں "میرے دوست!... میں تمہارا یہ مشورہ بھی قبول نہیں کر سکتا!... ممکن ہے تم اسے میری دیوانگی سے تعبیر کرو لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں اس دن کا بڑی بے چینی سے منتظر ہوں جب موت کا وہ دیوتا مجھے بھی میری رضیہ سے ملا دیگا۔"

"فی الحال میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تمہارے تھکے ہوئے ذہن کو سکون کی سخت ضرورت ہے۔" انسپکٹر شیرازی نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا پھر اٹھتا ہوا بولا "میں اب جا رہا ہوں! دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار مت کرنا ممکن ہے میری واپسی شام سے پہلے نہ ہو سکے۔"

انسپکٹر شیرازی یہ کہہ کر ایڑیوں کے بل گھوما پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا ڈائننگ روم سے باہر نکلتا چلا گیا۔ صابری نے دوبارہ کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

۳

انسپکٹر شیرازی اپنے آفس میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا!... اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط تھی!... ٹہلتے ٹہلتے وہ اچانک رُک کر کچھ سوچتا پھر دوبارہ ٹہلنے لگتا!... یہ کیفیت تقریباً پندرہ منٹ تک طاری رہی پھر اچانک کسی خیال کے تحت وہ تیزی سے اپنی ریوالونگ چیئر پر آ گیا!... اب وہ اپنے ماتحت سارجنٹ غوری کو دیکھ رہا تھا جو بہت دیر سے اس کے آفس میں موجود تھا۔

"آج رات تمہیں صابری کے مکان کی نگرانی کرنی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اندھیرا پھیلتے ہی پائیں باغ میں کسی ایسی محفوظ جگہ میں چھپ کر بیٹھ جاؤ کہ کوئی دوسرا تمہیں دیکھ نہ سکے۔"

"رائٹ سر..." سارجنٹ غوری نے مستعدی سے جواب دیا "میں بہت محتاط ہو کر پلاننگ کروں گا لیکن آپ کسی خاص نتیجے پر پہنچ چکے ہیں؟"

"ہاں!... مگر کسی حد تک، اس کی تصدیق کے لئے میں تم کو یہ کام اہم سونپ رہا ہوں!... تمہیں وہاں چھپ کر کسی ایسی روح پر نظر رکھنی ہوگی جو سرتاپا سفید لباس میں ملبوس پائیں باغ میں اکثر راتوں کو ٹہلتی نظر آتی ہے۔"

"لیکن سر!... کیا آپ روحوں کے وجود کے قائل ہیں؟"

"اگر روح تمہیں نظر آ جائے تو تم اسے روکنے کی کوشش کرو گے!... ہر ممکن کوشش۔ شیرازی نے سارجنٹ غوری

ے بچاؤ کو نظرانداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا جا سکتا ہے
یا تحریات ہیں، ہم اس کیس کی بھی ہوئی کڑیوں کو سلجھانے
میں کامیاب ہو جائیں گے"

...سارجنٹ غوری ...شبہات میں سر کو خفیف سی جنبش دی
...کہنا چاہتا تھا کہ میز پر رکھے ہوئے
فون کی گھنٹی بجی اور انسپکٹر شیرازی کی توجہ اس کی جانب
منتقل ہو گئی۔

"ہیلو...." انسپکٹر شیرازی نے ریسیور اٹھاتے
ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا پھر اچانک سنبھل کر بیٹھ گیا۔...
"جی جناب... میں انسپکٹر شیرازی بول رہا ہوں!... جی ہاں جناب
...گڈ... یہ اطلاع میرے لئے اہم ثابت ہو سکتی ہے۔
...اب تک میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے...
ٹھیک ہے اگر آپ نے مناسب سمجھا تو اسے بھی دیکھ لوں گا
...مجھے افسوس ہے کہ محترم آپ ایک بے بنیاد خیال
کو اپنے ذہن میں جگہ دے رہے ہیں!... درست فرمایا آپ نے
میں اس کی تردید نہیں کروں گا لیکن فرائض کی ادائیگی کے وقت
کم از کم میں نے اپنوں اور پرایوں کی تمیز کو کبھی بھی ملحوظ نہیں
رکھا... تھینکس" انسپکٹر شیرازی نے جھلائے ہوئے لہجے
میں کہا پھر ایک زوردار جھٹکے سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا
"کس کا فون تھا سر...؟"
"رضیہ کے والد کا... اس کا خیال ہے کہ صابری چونکہ
میرا دوست ہے اس لئے میں کیس کے کچھ اہم پہلوؤں کو نظر
انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"
"میرے لئے کوئی اور ہدایت بھی ہے؟"
"نہیں اب تم جا سکتے ہو" انسپکٹر شیرازی نے بدستور
جھلائے ہوئے لہجے میں کہا پھر اپنا نچلا ہونٹ چبانے لگا۔
اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات
نظر آ رہے تھے۔

۴

شروع جنوری کی وہ رات اگرچہ طوفانی تھی لیکن حد
درجہ سرد تھی۔
صابری حسب سابق اس وقت بھی آتشدان کے قریب
...کرسی پر بیٹھا لکڑیوں کے اوپر رقص کرتے ہوئے
...شعلوں کو گھور رہا تھا... دوسری طرف انسپکٹر
شیرازی بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا... خواب گاہ

میں بوجھل سکوت طاری رہا پھر انسپکٹر شیرازی کی آواز
ماحول کے سکوت کو چیرتی ہوئی اُبھری تھی۔
"میں تمہارا شکر گزار ہوں صابری کہ تم نے اپنی چھت
کے نیچے رہ کر حالات کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع فراہم
کیا!... لیکن اب میری تفتیش مکمل ہو چکی ہے!... وہ دروازے
کی طرف لپکا لیکن ابھی وہ دروازے سے باہر ہی نکل رہا تھا
کہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی پھر کوئی بڑی کربناک آواز
میں چیخا!
انسپکٹر شیرازی کی نگاہیں چمک اٹھیں پھر وہ بھی صابری
کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا زینوں کو طے کرتا ہوا پائیں باغ میں
آ گیا جہاں سارجنٹ غوری سبزے پر گھٹنوں کے بل بیٹھا کچھ
دیکھ رہا تھا۔
"رضیہ!... میری روح!... میری زندگی" صابری
سارجنٹ غوری کے قریب پہنچ کر ہذیانی انداز میں چلایا پھر
تیزی سے جھک کر اس جسم سے لپٹ گیا جو سفید لباس میں
ملبوس بے حس و حرکت پڑا تھا۔
انسپکٹر شیرازی نے جیب سے اپنا سروس ریوالور نکالا
پھر صابری کی پشت پر آ کر کرخت لہجے میں بولا۔
"مسٹر صابری!... روح کا فریب اب ختم ہو چکا ہے۔
میں تم کو دھوکا دہی اور جعلسازی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں

تم نے اپنی بیوی کی موت کا جھوٹا ناٹک رچا کر انشورنس کی
بھاری رقم کا وصول کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ کامیاب ہو سکا۔
صابری پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیرازی کو گھورنے لگا۔
"میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے شروع سے لیکر
اخیر تک بڑی شاندار اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دو موقعوں
پر تم سے چوک ہو گئی۔" شیرازی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے
ہوئے کہا۔ "اس روز ناشتے کی میز پر جب میں نے لاش کے
پوسٹ مارٹم کا ضمنی تذکرہ کیا تھا تو تمہارے چہرے کی رنگت
زرد پڑ گئی تھی اور آج!... آج بھی میں نے اپنے اسی شبے
کی بنا پر تم سے کہا تھا کہ اگر رضیہ کی بے چین روح مجھے نظر
آ گئی تو میں اپنی رپورٹ کل مکمل کر دوں گا۔
کافی کا مطالبہ بھی محض ایک بہانہ تھا!... میں اس طرح
تم کو اس بات کا موقع فراہم کرنا چاہتا تھا کہ اگر میرے شبہات
درست ہیں تو تم رضیہ کو روح کے فریب کا ڈرامہ اسٹیج کرنے
کے لئے ضرور اکسا ؤ گے اور وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔
پھر انسپکٹر شیرازی کے اشارے پر سارجنٹ غوری نے
آگے بڑھ کر صابری کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں! رضیہ
سرتاپا سفید لباس میں ملبوس سبزے پر پڑی زندگی اور موت
کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ☆

نکسن سے انٹرویو

انقلابی کے قلم سے

وھائٹ ہاؤس کا ایک گوشہ لان میں ایک سیب کے درخت کے نیچے نکسن بیٹھے ہوئے خلا میں گھور رہے ہیں. چہرے پر اداسی چھائی ہوئی ہے. سکریٹری دبے پاؤں اُنکے قریب آتا ہے اور ہلکے سے کھنکارتا ہے. نکسن چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہیں. سکریٹری مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ سے پوچھتا ہے۔

"کیا بات ہے حضور ، کیا طبیعت ناساز ہے یا پھر ٹریسیا سے جدا ہونے کا غم آپ کو کھائے جا رہا ہے"۔

نکسن ۔ "اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس درخت پر جو لال سیب لٹک رہا تھا اسے کون کھا گیا میں نے بہت دنوں سے اس پر نظر لگا رکھی تھی۔

سکریٹری ۔ "آپ کے داماد ایڈورڈ آئے تھے۔ آتے ہی ان کی نظر اس سیب پر پڑی اور وہ توڑ کر کھا گئے"۔

نکسن ۔ "بہرحال اب یہ بتاؤ کہ اس وقت تم میرا دماغ کیوں چاٹ رہے ہو؟"

سکریٹری ۔ "حضور ایک ہندوستانی اخبار کا نامہ نگار آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ ہم کئی بار اسے بھگا چکے ہیں لیکن وہ پھر بھی نہیں مانتا۔ اب اسنے باہر دھرنا دے دیا ہے۔ کہتا ہے اگر اسے آپ سے نہیں ملایا گیا تو وہ بھوک ہڑتال کر کے جان دے دے گا"۔

نکسن ۔ بھوک ہڑتال سے خیر وہ مریگا تو نہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں ہندوستانیوں کو بھوکا رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ انہیں جتنا زیادہ بھوکا رکھا جائے ان کی صحت اتنی ہی زیادہ اچھی رہتی ہے۔ تاہم اسے جلدی سے بلاؤ۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

(پانچ منٹ بعد) سکریٹری ایک دبلے پتلے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس شخص کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ شیو بڑھی ہوئی ہے، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں، ہاتھ میں ایک ٹوکری ہے، بغل میں ایک بوسیدہ سی کاپی اور پنسل دبی ہوئی ہے وہ شخص قریب آ کر ٹوکری زمین پر رکھ دیتا ہے اور ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے۔

نکسن ۔ (ٹوکری کی طرف اشارہ کر کے) اس میں کیا ہے؟

اخبار کا نامہ نگار (انقلابی) اس میں حضور کے لئے کچھ آم

نکسن خوش ہو کر ٹوکری پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جلدی سے ٹوکری کھول کر ایک آم نکالتے ہیں اور اسے چوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ آم کا رس اڑ کر انقلابی کے کپڑوں پر پڑتا ہے۔ جسے انقلابی چاٹنا شروع کر دیتا ہے (کیونکہ کئی روز سے بھوکا ہے)۔

نکسن ۔ (آم چوستے ہوئے) ہاں بولو کیا کام ہے۔

انقلابی ۔ حضور انٹرویو لینا ہے۔

نکسن ۔ اوہ ! ۔ میں سمجھا تھا کہ تم کچھ ڈالر مانگنے آئے ہو خیر پوچھ لو۔

انقلابی ۔ سُنا ہے کہ آپ کا ارادہ دوبارہ صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کا ہے۔

نکسن ۔ ہاں کیونکہ امریکہ کو میری سخت ضرورت ہے۔

انقلابی ۔ لیکن سُنا جاتا ہے کہ اس مرتبہ آپ کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں ۔ آپ نے ویتنام کی جنگ ختم

امریکا میں دوسری جنگ عظیم کے بعد عقل مند لوگ پیدا ہونا ہی بند ہو گئے ہیں!

سے اسے بڑھا دیا۔ آپ نے امریکی فوجوں کو مار کھانے
لئے کمبوڈیا اور لاؤس بھی بھیج دیا۔ اب امریکی اتنی زیادہ
مار کھا چکے ہیں کہ ان میں اور مار کھانے کی سکت نہیں۔
نے اسرائیل کی اندھی حمایت کر کے مشرق وسطیٰ میں امن
تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آپ کے دور حکومت میں
روزگاری بڑھی ہے۔ مہنگائی بڑھی ہے۔ ڈالر کا وقار
میں ختم ہو گیا ہے۔ ان حالات میں بھی کیا ملک کو آپ کی
ضرورت ہے؟

نکسن۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ مجھ سے بہتر
بھی اس کرسی کے لئے امریکا میں کوئی دوسرا نہیں۔ امریکا
میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے عقلمند لوگ پیدا ہونا ہی
بند ہو گئے ہیں۔ اس لئے مجھ سے بہتر صدر ڈھونڈنا امریکی
عوام کے لئے ممکن نہیں کیونکہ اب یہاں جو عقلمند پیدا بھی
ہوتے ہیں وہ کامیڈین بن جاتے ہیں۔

انقلابی۔ یعنی اندھوں میں کانا راجا۔

نکسن۔ ہاں جیسے موشی دایان۔

انقلابی۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کا ملک دنیا بھر میں ہمیشہ
عوام دشمن اور انسانیت دشمن حکومتوں کا ساتھ دے؟
افریقہ میں آپ جنوبی افریقہ اور رھوڈیشیا کی حکومتوں کا
ساتھ دے رہے ہیں جو کالوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ایشیا میں
آپ عوام دشمن جنوبی ویتنام حکومت اور پاکستان کا ساتھ
دے رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں آپ غاصب اسرائیل کا ساتھ
دے رہے ہیں۔

نکسن۔ جی ہاں یہ بالکل ضروری ہے۔ ہمارا نعرہ ہے
"دنیا بھر کے چورو ایک ہو جاؤ" ہمارا کام ہی دنیا بھر کے لوگوں
کو لوٹنا ہے۔ غریب اور کمزور ملکوں کی کمزوری سے فائدہ
اٹھانا ہے۔ خود اپنے ملک میں ہم کئی سو سال سے کالوں پر
اور ریڈ انڈینوں پر ظلم کرتے آئے ہیں۔ اس حالت میں
دنیا بھر کے ظالموں اور عوام دشمن حکومتوں کا ساتھ دینا کیا
برا ہے۔

انقلابی۔ بجا فرمایا۔ بنگلا دیش کے مسئلے پر تمام امریکی عوام
امریکی اخبارات اور امریکی کانگریس شور مچا رہی ہے۔ سب
کا کہنا ہے کہ بنگلا دیش کے لوگوں پر کیا جانے والا ظلم بند ہونا
چاہئے۔ اسی سلسلے میں آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

نکسن۔ اُن کے شور مچانے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ شور
مچاتے رہے اور ہم ویتنام میں عوام کا قتل عام کرتے رہے۔
یہ لوگ شور مچاتے رہے اور ہم جنوبی افریقہ کی گوری حکومت
کی امداد کرتے رہے۔ اب یہ لوگ شور مچاتے رہیں گے اور
ہم پاکستان کی مدد کرتے رہیں گے۔

انقلابی۔ لیکن ظلم و تشدد سے عوام کو دبایا تو نہیں
جا سکتا۔ آپ ۲۵ سال سے ویتنام کے عوام پر ظلم کر رہے
ہیں لیکن انہیں دبانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

نکسن۔ وہاں ہم سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے
کہ عوام کچھ طاقت حاصل کرے انھیں اتنا مارنا چاہئے کہ ان
میں منہ کھولنے کی بھی سکت نہ رہے۔ ہم نے یہ غلطی پاکستان
میں نہیں دُہرائی۔ وہاں عوام کو اتنا مارا گیا کہ اب دس سال
تک ان میں سر اٹھانے کی بھی سکت پیدا نہیں ہو گی۔

انقلابی۔ کیا اس مسئلے سے ہند و پاک میں جنگ کے امکانات
نہیں بڑھ جائیں گے۔

نکسن۔ بالکل بڑھ جائیں گے۔ ہم تو چاہتے ہی یہی
ہیں۔ آپ خود ہی دیکھئے نا اگر دنیا میں جنگ نہیں ہو گی تو
ہمارے ہتھیار کون خریدے گا۔ ہماری ہزاروں فیکٹریاں
بند ہو جائیں گی۔ لاکھوں امریکی بے روزگار ہو جائیں گے۔
دنیا میں خوشحالی پھیل جائے گی۔ ایشیا اور افریقہ کے ممالک
ہم سے بھیک مانگنا چھوڑ دیں گے یعنی ہماری ساری اہمیت
ختم ہو جائے گی۔ خود ہمارے ملک میں بے روزگاری کی وجہ
سے سوشلزم آجائے گا۔ ان حالات میں ہماری بھلائی اسی میں
ہے کہ کہیں نہ کہیں جنگ چلتی ہی رہے۔ اگر کبھی جنگ نہیں
ہو گی تو ہمیں کرانی پڑے گی۔

میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان اور ہندوستان
میں جنگ چھڑ جائے تو ہمارے ملک میں پھیلی ہوئی بے روزگاری
چند مہینوں میں ختم ہو جائے۔ اور معاشی طور پر ہمارے

اگر دنیا میں جنگ نہیں ہو گی تو ہمارے ہتھیار کون خریدے گا۔ ہماری فیکٹریاں بند ہو جائیں گی۔ لاکھوں امریکی بیروزگار ہو جائیں گے

ملک کی حالت پھر سے بہتر ہو جائے گی۔

انقلابی۔ بالکل بجا فرمایا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کو
اپنے ملک سے اتنی زیادہ محبت ہے۔ واقعی آپ جیسا
شخص ہی امریکا کا صدر بن سکتا ہے۔

نکسن۔ اچھا اب ہمیں بھوک لگ رہی ہے اس لئے تم
اب باہر کی ہوا کھاؤ۔
تم ہمیں اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ابھی ہم ہارورڈ
یونیورسٹی کے صدر کو فون کرتے ہیں کہ تمہیں ایک سال
کے لئے وزیٹنگ پروفیسر لگا لیا جائے۔

انقلابی۔ جی!! بہت بہت شکریہ۔

نکسن۔ تم کمیونسٹ تو نہیں ہو۔

انقلابی۔ حضور آج تک تو تھا لیکن اب نہیں رہوں گا۔

نکسن۔ ٹھیک ہے۔ ویسے بھی ہم نے ہندوستان میں
اپنے سفیر کو حکم دے رکھا ہے کہ جس پر بھی تمہیں کمیونسٹ
ہونے کا شبہ ہو اسے امریکا کی سیر کرا دو۔ اور اُسے
اتنا کھلاؤ پلاؤ کہ وہ کمیونزم کو بھول جائے۔

انقلابی۔ آپ نے ٹھیک کہا مجھے اگر آپ جیسے لوگوں
کی خدمت کا موقع مل جائے تو میں کبھی بھول کر بھی کمیونزم
کا نام نہ لوں۔

نکسن۔ آم چوستے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں۔ انقلابی
بغل میں بائبل دبا کر خوشی سے اچھلتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔

نوٹ:۔ انقلابی چونکہ ابھی کچھ دن امریکا میں رہے
گا اس لئے اس نے ہم سے کہا ہے کہ وہ ہمارے لئے امریکا
کا آنکھوں دیکھا حال لکھ کر بھیجے۔

(ادارہ)

اُردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

اسرار عظمت

اُردو دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ چینی اور انگریزی کے بعد اُردو ہی دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ اقوامِ متحدہ کی کانگریس (United Nation Congress) نے اپنے "نیشنل ڈیفنس ایکٹ، ٹائٹل ۶، سیکشن ۶۰۱ (ب)" National Defence act 'Title VI Section 601) کے تحت اُردو کو متحدہ اقوام کی اہم ترین زبانوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ اس فہرست میں روسی، جرمن اور جاپانی زبانوں کے نام اُردو کے بعد سلسلے وار آئے ہیں۔ پاکستان۔ فجی۔ کینیا۔ جنوبی اور مشرقی افریقہ۔ برطانیہ۔ عدن۔ عراق۔ افغانستان۔ ماریشس۔ برما۔ سنگاپور۔ ملایا اور انڈونیشیا میں اردو بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ یونیسکو UNESCO کے ۱۹۵۴ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں ۱۶ کروڑ اُردو بولنے والے موجود ہیں۔ دنیا کے سبھی اہم ملکوں سے اُردو میں پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ برصغیر کے علاوہ اُردو کتابیں برطانیہ، افریقہ اور سنگاپور میں بھی چھپتی ہیں اور ان ممالک سے متعدد اردو اخبار و رسائل بھی نکلتے ہیں۔ ہندوپاک کے علاوہ اُردو تعلیم اور ریسرچ کی سہولتیں امریکہ، برطانیہ اور روس میں بھی مہیا کی گئی ہیں۔

ہندوستان اردو کا گھر ہے جہاں اس کا جنم ہوا ہے۔ یہیں وہ پھلی پھولی ہے اور یہیں سے دور دراز ملکوں تک پھیلی ہے۔ ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ۲ کروڑ تیس لاکھ کے قریب ہے۔ بلکہ "ملاپ" نئی دہلی کے مطابق اُردو بولنے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ اُردو بولنے والے ہندوستان میں ہی رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُردو کا مستقبل ہندوستان کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اس کی ترقی اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری ہندوستانی عوام پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اُردو نے اپنا ورثہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب سے حاصل کیا ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں اردو نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اُردو کا نعرہ "انقلاب زندہ باد" ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک پہونچا اور اس نے عوام کے دلوں کو گرما دیا جس سے تحریکِ آزادی کو بڑی تقویت ملی۔ اردو نے عوام کو جگایا۔ ان کے دلوں میں انقلاب کی چنگاری پیدا کی۔ بہتر سماج بنانے میں مدد دی۔ اردو ہماری قومی یکجہتی کی جیتی جاگتی علامت ہے۔ اگر اُردو کو ختم کر دیا گیا تو یہ ہماری قوم اور ہمارے ملک کا ایک عظیم نقصان ہوگا۔

دستور

ہمارا دستور تمام ہندوستانی زبانوں اور ان کے رسم الخط کے تحفظ اور ان کی ترقی کا یقین دلاتا ہے۔ اردو اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے اس کے دامن میں علم و ادب کا ایک عظیم خزانہ چھپا ہوا ہے۔ وہ ہمارے ملک کے سیکولر ہونے کی علامت ہے اور ہمارے ملک کے کم از کم دو کروڑ تیس لاکھ عوام کی مادری زبان ہے لیکن پھر بھی آزادی کے بعد اس مقام سے محروم کر دیا گیا جو اسے دہلی۔ یوپی۔ بہار۔ پنجاب اور آندھرا پردیش میں حاصل تھا۔ اس کے ساتھ اس کے اپنے گھر میں جہاں وہ پیدا ہوئی۔ اجنبیوں کا سا برتاؤ کیا گیا اور اسے ہندوستان کے لسانیاتی نقشے پر کوئی بھی صوبہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اردو بولنے والے طبقے کی معاشی پسماندگی نے انھیں مایوس کر دیا ہے۔ وہ شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں اور خود کو بہت ہی حقیر محسوس کرنے لگے ہیں۔ آزادی کے بعد مختلف لسانی اور تہذیبی حلقوں میں خوشی اور مسرت اور زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی لیکن اُردو بولنے والے طبقے کو محرومیوں، مایوسیوں اور ناانصافی کے سوا کچھ نہ ملا۔ تہذیبی ترقی میں ان کا کوئی حصہ نہ رہا جس کے لئے ایک زبان کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کی ہر دوڑ میں وہ پیچھے رہ گئے۔ ملک میں ان کی حیثیت ایک بے تعلق، خشک، مایوس اور ذہنی طور پر منتشر طبقے کی سی ہو گئی۔

کسی ملک کی ترقی وہاں دی جانے والی تعلیم پر منحصر ہوتی ہے اور دنیا کے سبھی بڑے ماہرینِ تعلیمات اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ تعلیم و تربیت اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی جب تک وہ مادری زبان کے ذریعے نہ ہو۔ تعلیم کی جڑیں ملک کی تہذیب میں گہری نہ ہوں تو وہ کسی کام کی نہیں رہتی۔ تعلیم کا مقصد صرف چند کتابوں کو ہضم کر لینا نہیں بلکہ اچھی شخصیتیں بنانا، فرد اور سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور طالب علموں کو سماج و ملک کی ذمے داریاں قبول کرنے کا اہل بنانا ہے۔

ایک عمل

کوئی بھی زبان ایک ایسے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے جس کے ذریعے سماج اپنی تہذیبی اقدار کا تحفظ کرتا ہے جس سے ملک کو اپنی قومی انفرادیت برقرار رکھنے اور اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ملٹن نے ایک بار کہا تھا کہ:

"تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک کو شکست دے کر ایسی صورت میں ترقی سے روک دیا گیا ہو جب اس کے عوام اپنی زبان سے محبت کرتے ہوں اور اس کے تحفظ کے لئے کوشاں ہوں۔ انسان کی ذہنی زندگی کی تربیت کے لئے جو انسان کی صحیح زندگی ہوتی ہے۔ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

جاپان نے مغربی علوم سے استفادہ کرنے اور عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو سکھانے کے لئے ضروری سمجھا کہ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ یہی جاپان کی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان آج تخلیقی میدان اور صنعتی ترقی میں دنیا کے کئی ممالک سے آگے ہے۔

قومی تعلیم کا پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کے لئے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ یہ ایک اس قدر

سیدھا، آسان اور فطری اصول ہے کہ اس کی تشریح کے لئے لمبے چوڑے دلائل کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ اتنا آسان اور فطری ہے جتنا کہ چلنے کے لئے پیروں کا استعمال یا دیکھنے کے لئے آنکھوں کا استعمال۔ لیکن ہمارے ملک میں گزشتہ ۱۴۰ برس کی غلط تعلیمی پالیسی کی وجہ سے اس آسان اور فطری اصول کی بھی تشریح کرنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کہتے ہیں کہ جرمنی میں ان کے سفر کے دوران ان کی ملاقات چرچ کے ایک کارکن سے ہوئی اس نے ان سے پوچھا: "آپ کے ملک میں کونسی زبان ذریعۂ تعلیم ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "انگریزی"، وہ شخص بولا "میرے خدا آپ لوگ ایک ہزار برس میں بھی ترقی نہ کرسکیں گے"

ترقی کی رفتار

ہندوستان میں ترقی کی رفتار بہت ہی سست ہے عوام کی ایک کثیر تعداد ان پڑھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے لوگوں کو ان کی مادری زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے کی وہ سہولت بہم نہیں پہنچائی جس کے وہ مستحق ہیں۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی، جس نے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا تھا اور جس کا مقصد کم تنخواہ والے کلرک اور انگریزی جاننے والے ایسے طبقے کی تخلیق کرنا تھا جو انگریزی سامان خرید سکے۔ ہماری یونیورسٹیوں نے وقت کا چیلنج قبول نہیں کیا اور الگ تھلگ ہاتھی دانت کے میناروں میں مقید رہیں۔ ان میں وقت کا چیلنج قبول کرنے کی ہمت اور سکت نہیں تھی کیونکہ وہ ۱۸۳۵ء سے ۱۹۵۴ء تک غلط پالیسیوں کا شکار رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹیاں قومی روایات اور تہذیبی دھارے سے کٹ گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی تعلیم نے ہم کو روشنی بخشی ہے لیکن اس روشنی کا ہم ایک ایکسپریس ٹرین کی روشنی سے مقابلہ کرسکتے ہیں جو چھوٹے دیہاتوں سے گزرتے ہوئے لوگوں کو ایک لمحے کے لئے روشنی دیتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے انھیں پھر تاریکی میں چھوڑ جاتی ہے جبکہ ٹرین میں بیٹھے ہوئے چند مسافر روشنی سے مسلسل استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ یا اس طریقۂ تعلیم کا مقابلہ بانس کے کھمبے سے بھی کیا جاسکتا ہے جس پر متعدد جوڑ ہوتے ہیں لیکن اوپر صرف چند پتیاں ہی ہوتی ہیں۔"

جہاں تک ہماری پرائمری تعلیم کا تعلق ہے ہندوستانی دستور نے ہر ایک کے لئے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ہماری مادری زبان اُردو ہے، جب تک ملک کا دستور قائم ہے دنیا کی کوئی طاقت بھی ہم کو ہمارے اس حق سے محروم نہیں کرسکتی۔ پرائمری کے بعد وسطانی اور فوقانی تعلیم کے مراحل آتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ طالب علموں کو ان سطحوں پر مادری زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت سے محروم کردیا جائے جب کہ تعلیم کی یہ تینوں سطحیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایجوکیشن کمیشن (Education Commission) نے اپنی ۱۹۶۴ء-۱۹۶۶ء کی رپورٹ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ چونکہ اسکول میں تعلیم کا ذریعہ صوبائی یا مادری زبانیں ہیں تعلیم کی اونچی سطحوں پر بھی انھیں زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہئے۔ (صفحہ ۱۳)"۔ ایموشنل انٹیگریشن کونسل (Emotional Integration Council) نے بھی جون ۱۹۶۶ء میں اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا۔

مادری زبانوں کو یونیورسٹی کی سطح تک ذریعۂ تعلیم بنائے بغیر یونیورسٹیوں کے دانشوروں اور عوام میں ربط پیدا کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں اور ایسا کرنا قومی اتحاد اور سوشل جمہوریت کے قیام کے لئے بیحد ضروری ہے۔

حقوق کا انسداد

ایجوکیشن کمیشن نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندی اور انگریزی کی خاطر دوسری زبانوں کے ترقی کرنے کے حقوق کا انسداد نہ کیا جائے کیونکہ غیر ہندی علاقے کے لوگوں کی ہندی کبھی بھی مادری نہیں بن سکتی اور نہ انگریزی کی وہ حیثیت ہمیشہ کے لئے برقرار رہ سکتی ہے جو آج اسے حاصل ہے۔ ایک عام آدمی کی ضروریات مدِنظر رکھتے ہوئے ایسا ہونا ضروری ہے (صفحہ ۱۴) ایجوکیشن کمیشن نے آگے چل کر لکھا ہے۔

"اردو اگرچہ عام معنوں میں کوئی صوبائی زبان نہیں ہے لیکن یہ ایک "کل ہند اہمیت" کی زبان ہے اور یہ ضروری ہے کہ اُردو کی "ہمت افزائی" کیا جائے" (صفحہ ۱۵) کمیشن مذکور نے اپنی رپورٹ میں ان جملوں کو انڈر لائن کیا ہے۔

اُردو کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔ اُردو میڈیم اسکول اور کالج قائم کئے جائیں تاکہ اردو بولنے والے طبقے کے حقوق کا تحفظ کیا جاسکے۔ (صفحہ ۲۹۲)

اسی طرح آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی (All India Congress Working Committee) کا جو اجلاس اگست ۱۹۴۹ء میں ہوا اس نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کو علاقائی یا صوبائی حیثیت دے کر یونیورسٹی تک تعلیم اُردو میں دینے کی سہولت دی جائے بعد میں ایک قرارداد (مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۵۳ء) میں بھی اس بات پر زور دیا گیا کہ اُردو کو جو دستوری اعتبار سے قبول کی ہوئی زبان ہے ہماری قومی زندگی میں ایک اہم مقام دیا جانا چاہئے ۱۵ مئی ۱۹۵۸ء کی قرارداد میں پھر مرکزی اور صوبائی حکومتوں پر زور دیا گیا کہ اُردو چونکہ ایک اہم قومی زبان ہے اس لئے ان کا فرض ہے کہ اس کی ترقی اور نشر و اشاعت کے لئے سامان بہم پہونچائیں۔ ۲۴ فروری ۱۹۶۵ء کے ایک حکمنامے میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ حکومت ہند کی ملازمتوں کے لئے امتحانات تمام صوبائی اور قومی زبانوں میں لئے جائیں اور امتحان دینے والے کو اس بات کا حق ہو کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی قومی یا صوبائی زبان کا انتخاب کرسکے۔

"آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی" کی منظور کی ہوئی ان قراردادوں کی تائید وقتاً فوقتاً "یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن" "نیشنل انٹیگریشن کونسل" "یونیورسٹی گرانٹس کمیشن" اور "پبلک سروس کمیشن" کے علاوہ "وزارتِ تعلیمات" نے بھی کی۔

حکومت ہند کا ریزولیوشن

اس سلسلے میں سب سے اہم حکومت ہند کا ریزولیوشن ہے جو ۱۸ جنوری ۱۹۶۸ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے منظور کیا۔ یہ ریزولیوشن زبانوں سے متعلق ہماری حکومت کی پالیسی کا چارٹر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری ۱۴ زبانوں کی ترقی کیلئے بھی ہر ممکن اقدام کیا جائے۔ ریزولیوشن میں کہا گیا کہ:

"ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادب کی ترقی تعلیمی تہذیبی اور تمدنی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا لوگ اپنی تخلیقی قوتوں کا استعمال نہ کرسکیں گے۔ تعلیمی معیار بلند نہ ہوگا، عوام علم و ادب کے دھارے سے کٹے رہیں گے۔ اور دانشوروں اور عوام کی درمیانی خلیج اگر وسیع نہیں ہوگی تب بھی موجود ضرور رہے گی"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو ۱۴ ہندوستانی زبانوں میں سے ایک کو ذریعۂ تعلیم کے لئے منتخب کرنا چاہئے۔ انگریزی کے انتخاب کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (آفیشیل لینگویج کمیشن رپورٹ ۱۹۵۶ء کے تحت صفحات

۹۴، ۹۹ اور ۱۰۱)

اس ریزولیوشن پر عملدرآمد بھی شروع ہو گیا ہے گجرات میں گجراتی زبان ہی تعلیم کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح تامل ناڈو میں "تامل"۔ آندھرا کے اُردو کالجوں میں اردو میں تعلیم دی جا رہی ہے۔ پونا اور کرناٹک یونیورسٹیوں نے بھی اپنی صوبائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا ہے پنجاب میں بھی ایسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آچکا ہے جہاں پنجابی تعلیم کا ذریعہ ہے۔

اب اردو بولنے والے طبقے کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کونسی زبان کو تعلیم کا میڈیم بنانا پسند کرے گا۔ دستور کے آٹھویں "شیڈول" میں لکھی ہوئی ۱۴ ہندوستانی زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب اسے کرنا ہوگا۔ وہ اردو کا انتخاب کرینگے یا آسامی، بنگالی، ہندی یا کنڑ کا؟ واضح ہو کہ ۱۴ ہندوستانی زبانوں میں سے ایک کا اسے انتخاب کرنا ہے، جن میں انگریزی شامل نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اردو بولنے والے اُردو کا ہی انتخاب کریں گے کیونکہ اُردو ان کی مادری زبان ہے اور سارے ملک اور ملک کے باہر بولی اور سمجھی جانے والی ایک اہم زبان ہے۔ اسی زبان سے ہم اپنے سماجی، تہذیبی اور تمدنی معیار کو پہونچ سکتے ہیں۔ اپنے اندر چھپی ہوئی تخلیقی قوتوں کو استعمال کر سکتے ہیں اور اپنے تہذیبی و تمدنی ورثے کو ملک کے طول و عرض میں پھیلا سکتے ہیں۔ یہ عوام کا زمانہ ہے ہمیں عوام کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا ہم ان پر کوئی ایسی زبان زبردستی نہیں لاد سکتے جو ان میں سے صرف چند کی مادری زبان ہو۔

اردو یونیورسٹی

ان مقاصد کے حصول کے لئے اردو یونیورسٹی کے قیام کی اشد ضرورت ہے جو نئے ہندوستان میں سائنسی علوم اور فنون کے اہم مرکز کی حیثیت رکھے۔ یہ یونیورسٹی ہماری ملی جلی تہذیب کا حسین اظہار ہوگی۔ اس کا مقصد متحرک ہندوستانی سماج کی تخلیق ہوگا۔ یہ یونیورسٹی ایسے افراد پیدا کرے گی جو مضبوط اخلاق اور تخلیقی فکر کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔ اس یونیورسٹی کے ذریعے نئی زندگی اور نئے عہد کا آغاز ہوگا۔ علمی ترقی کی قدیم روایات کو زندہ کرنا ممکن ہوگا۔

• جمہوریہ ہند کا مستقبل ہمارے نوجوان شہریوں پر منحصر ہے جو تعمیری انداز میں سوچ سکیں اور نئے نئے خیالات اور تخلیقی قوتوں سے مالا مال ہوں۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ:

واقعات نئی دھلی

• "تم اگر ایک نئی قوم بنانا چاہتے ہو تو بچے پیدا کرو"

اس مقصد کے حصول کے لئے ایسی ہی یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس میں ہماری مادری زبان تعلیم کا ذریعہ ہو، جو ہماری ملی جلی تہذیب کا اظہار ہو اور جس پر ہم سب فخر کر سکیں۔ جو ایشیا کے حسن، ہندوستان کے روحانی سکون اور جدید دنیا کے سائنسی علوم کو ایک ہی دھاگے میں پرو دے۔ اردو کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے جس سے ہم میں تخلیقی فکر جاگ اٹھے گی۔

وسیع امکانات

حصول آزادی کے بعد ترقی کے اتنے وسیع امکانات پیدا ہو گئے ہیں کہ ان حدود کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ یہی بات اردو کے بارے میں بھی ہے۔ تعلیم کا شوق اسقدر تیز رفتار سے عام ہو رہا ہے کہ کوئی عجیب بات نہیں۔ دہلی شہر میں جہاں سات یونیورسٹیاں موجود ہیں، آٹھویں یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس سے اردو بولنے والوں کی اس اہم ضرورت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دو کروڑ تیس لاکھ لوگوں کے لئے ایک یونیورسٹی کا قیام بے حد ضروری ہے۔ تعلیم ایک مسلسل عمل ہے اگر ہم پچاس سال کے لئے اپنی ضروریات کا اندازہ کریں تو محسوس ہوگا ہمارا مطالبہ بے حد ضروری اور اہم ہے اردو یونیورسٹی کا قیام ناگزیر ہے۔

ہندوستان میں ہماری پہلی ذمے داری ایک "متحرک ہندوستان" اور "متحرک ہندوستانیوں" کی تخلیق ہے۔ اس مقصد کے حصول میں اُردو ایک اہم رول ادا کر سکتی ہے کیونکہ اُردو ایک "انڈو آرین" زبان ہے۔ اس نے سیکولر ماحول میں جنم لیا ہے اور سیکولر ماحول میں ہی پروان چڑھی ہے۔ ہندوستان کا کارواں بھی "سیکولرزم" اور جمہوریت کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ دونوں باتیں متوازی ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ متضاد ہندوستانی زبانوں میں اُردو کا جو اہم مقام ہے وہ اسے یوں ہی اتفاقاً حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے ضروریات کا ایک تاریخی عمل رہا ہے۔ اردو کا یہ مقام صدیوں کا تاریخی پس منظر لئے ہوئے ہے۔ اردو "کھڑی بولی" سے بنی ہے اور اس میں اسی فیصد الفاظ سنسکرت سے لئے گئے ہیں۔ ۲۰ فیصد الفاظ فارسی، عربی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی سے آئے ہیں۔

(جواہر لال نہرو — The Discovery Of India)

باقی آئندہ

ہندوستان کی قلوپطرہ شہزادی گوبند کور

ریاست کپورتھلہ کی شہزادی گوبند کور کو ہندوستان کی کلوپیٹرا کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ اپنے بے مثال حسن و جمال اور اپنی بے پناہ جنسی بوالہوسی کے اعتبار سے گوبند کور کلوپیٹرا سے مکمل طور پر مماثلت رکھتی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مصر کی کلوپیٹرا کی داستانِ حیات کو دنیا بھر میں زبردست شہرت حاصل ہو گئی اور ہندوستان کی گوبند کور کے واقعات کی اتنی بڑے پیمانے پر تشہیر نہ ہو سکی۔ یوں تو دیوان جرمنی داس نے اپنی انگریزی کتاب مہاراجہ میں ہندوستان کی اس جنس زدہ ملکۂ حسن کے کردار کو بھرپور طریقے پر بے نقاب کیا ہے لیکن اردو داں طبقہ ابھی اس کی تفصیلات سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔

شہزادی گوبند کور کپورتھلہ کے مہاراجہ نہال سنگھ کی بیٹی تھی جسکی پرورش شاہی عیش و آرام کے ماحول میں بڑے ہی ناز و نعم کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ تو بہ شکن حسن و جمال کی ملکہ تھی اور کچھ اس قسم کی جنسی کشش رکھتی تھی کہ اُسے دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا تھا۔

گوبند کور کے والد نے اس کی شادی کرتار پور کے ایک رئیس اور معزز شخص سے کر دی تھی لیکن گوبند کور اس شرط پر شادی کے لئے رضامند ہوئی تھی کہ وہ کرتار پور میں نہیں رہے گی بلکہ اس کے شوہر کو بھی اس کے ساتھ کپورتھلہ ہی میں رہنا پڑے گا۔ چنانچہ مہاراجہ نہال سنگھ نے بیٹی اور داماد کی اقامت کے لئے شاہی محل کے نزدیک ہی ایک چھ منزلہ محل تعمیر کرا دیا تھا۔ جس میں گوبند کور بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کے اس رہائشی محل میں داخلے کے لئے صرف ایک ہی داخلہ تھا۔ جس پہ ہر وقت مسلح فوجی پہریدار تعینات رہتے تھے۔

شہزادی گوبند کور حد درجہ عیاش طبع تھی اور اسکی جنسی خواہش اتنی زیادہ تھی کہ اس کا بدصورت اور کمزور شوہر اُسے جنسی آسودگی دینے سے قاصر تھا۔ وہ خوبرو اور تندرست و توانا مردوں کو مختلف بہانوں سے اپنے محل میں بلوا کر انھیں اپنے بستر کا ساتھی بنایا کرتی تھی۔ محل کے دروازے پر پہرہ دینے والے فوجیوں کو بھی وہ نہیں چھوڑتی تھی اور جب کہیں سے کوئی اور مرد دستیاب نہیں ہوتا تھا تو انھیں کے ساتھ شب بسری کرتی تھی۔ اس کا شوہر ان حرکتوں سے واقف تھا اس لئے وہ دل برداشتہ ہو کر محل سے باہر ایک بارہ دری میں رہنے لگا تھا اور ان دونوں کے درمیان زن و شوہر کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔

گوبند کور کے لاتعداد معاشقوں میں سے دو معاشقے انتہائی سنسنی خیز ثابت ہوئے۔ اول: ریاست کے وزیراعظم غلام جیلانی سے، اور دوئم، ریاستی فوج کے ایک عہدے دار کرنل ورِیام سنگھ سے۔ (جنسی بوالہوسی کا جذبہ ہندو، مسلمان، یا سکھ میں تمیز نہیں کرتا۔)

کپورتھلہ ریاست کے وزیراعظم غلام جیلانی ایک خوبصورت اور دراز قد انسان تھے۔ ریاست کے دستور کے مطابق وہ دیوان خانے کے ایک حصے میں وزرا کی میٹنگ بلوایا کرتے تھے اور وہیں بیٹھ کر مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ گوبند کور کا محل دیوان خانے کے سامنے تھا۔ ایک دن غلام جیلانی نے اُسے محل کی سب سے اوپری منزل پر بال سکھاتے ہوئے دیکھا اور فی الفور اس کے تیرِ نظر کا نشانہ بن گئے۔ اُسی روز سے وہ شہزادی سے ملنے کی ترکیبیں ڈھونڈنے لگے چونکہ شاہی گھرانے کی خواتین سے ملاقات ایک امر دشوار تھا اس لئے انھیں اس سلسلے میں بڑے بڑے جتن کرنے پڑے۔

ریاست کپورتھلہ کی شہزادی گوبند کور کو ہندوستان کی کلوپیٹرا کا لقب دیا جا سکتا ہے اپنے بے مثال حسن و جمال اور بے پناہ جنسی بوالہوسی کے اعتبار سے وہ کلوپیٹرا سے مماثلت رکھتی تھی۔

انھوں نے گوبند کور کی ایک کنیز ہولو کو زبردست رشوت دیکر پیغام رسانی کا وسیلہ نکالا۔ محبوبہ کی طرف سے پیامِ محبت کا جواب حوصلہ افزا ملا۔ پھر دو دلوں کے ملن کی صورت یہ نکالی گئی کہ دیوان خانے سے شہزادی کے محل تک ایک زمین دوز سرنگ کھودی گئی جس میں سے گذر کر منزلِ وصل تک رسائی ہونے لگی۔

غلام جیلانی نے ریاستی مقدمات سننے اور ان پر اپنے فیصلے دینے کا ایک انوکھا طریقہ اپنا رکھا تھا۔ وہ حضرت دیوان خانے میں اپنی نشست گاہ میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اُن کے سامنے پردہ پڑا ہوتا تھا۔ جسکے پیچھے ریاست کے دیگر وزرا اور کارندے بیٹھا کرتے تھے۔ ہر وزیر اپنے محکمے کے مقدمات کی تفصیل اور ان کے بارے میں اپنی تجویزیں سُنایا کرتے تھے۔ اور غلام جیلانی صاحب فیصلے یوں صادر فرمایا کرتے تھے کہ جب وہ کسی مقدمے کی بابت "ہاں" کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھیں مقدمہ پیش کرنے والے کی تجاویز سے اتفاق ہے اور اگر وہ خاموش رہیں تو پھر وزیر موصوف کی رائے

واقعات تھا دھلی

تو منسوخ سمجھا جائے۔ گوبند کور کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد ہوتا یہ تھا کہ اُدھر تو مقدمے سُنائے جا رہے ہیں اور اِدھر غلام جیلانی سرنگ سے گزر کر شہزادی کے محل میں پہنچ چکے ہیں یا اُسے اپنے ہمراہ لاکر وہیں دیوان خانے میں پردے کے پیچھے دادِ عیش دے رہے ہیں۔ ان کی مسلسل خاموشی کی وجہ سے زیادہ تر مقدمات کے بارے میں وزرا کی رائیں منسوخ ہو جاتی تھیں۔ مگر انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی نتیجہ یہ ہوا کہ بےگناہ پھانسی پانے لگے اور سنگین سے سنگین جرم کرنے والے بے داغ چھوٹنے لگے حکومت کی آمدنی گھٹنے لگی اور خزانہ خالی ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ وزرا اور عوام دونوں وزیر اعظم سے متنفر ہوتے گئے۔

وزیر اعظم غلام جیلانی ہر سنیچر کو جالندھر جاکر اپنے کنبے والوں کے ہمراہ چھٹی کا دن گذارا کرتے تھے کپور تھلہ سے جالندھر کا فاصلہ بارہ میل کا تھا جسے وہ گھوڑے گاڑی بیٹھ کر طے کیا کرتے۔ یوں تو سرنگ کے ذریعے موصوف گوبند کور سے روز ہی ملا کرتے تھے مگر یہ ملاقاتیں اتنی طویل نہیں ہوسکتی تھیں کہ وہ شب و روز کی قید سے بے نیاز ہوکر خود کو آغوشِ محبوب میں مکمل طور پر غرق کر سکیں چنانچہ انھوں نے یہ پلان بنایا کہ گوبند کور کو اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ جس گاڑی میں بیٹھ کر وہ سفر کیا کرتے تھے اسے دو گھوڑے کھینچتے تھے۔ گاڑی کے درمیانی حصے میں یعنی اگلی اور پچھلی سیٹ کے بیچ میں ایک بکس بنا ہوا تھا جس میں گھوڑوں کے لئے چارہ رکھا جاتا تھا۔ اور وہ بکس ان جگہوں پر کھولا جاتا تھا جہاں گاڑی سفر کے دوران گھوڑوں کو آرام دینے کے لئے رکی جاتی تھی۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سنیچر کے دن وزیر اعظم غلام جیلانی کی روانگی سے کچھ دیر قبل شہزادی گوبند کور اپنے محل سے ایک جھاڑو دینے والی عورت کے بھیس میں چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے نکلی اور جاکر گاڑی کے اسی بکس میں چھپ گئی جو چارہ رکھنے کے لئے بنا ہوا تھا۔ (اس معاملے میں وہی کنیز اس کی ہمراز تھی جس کے ذریعے سب سے پہلے غلام جیلانی نے پیغام رسانی کی تھی) حسب معمول گاڑی وزیر اعظم کو لیکر روانہ ہوئی اور جیسے ہی وہ شہر کی حدود سے باہر نکلی، وزیر اعظم نے بکس کھول کر شہزادی کو نکال لیا اور اپنی باہوں میں لیکر بوس و کنار شروع

واقعات نئی دہلی

کردیا۔ اس طرح پورا راستہ پیار و محبت کے کھیل میں کٹا اور جالندھر میں تمام رات شراب و ساغر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وصل یار میں گذرتی۔ پھر تو یہ دونوں کا معمول بن گیا اور کئی ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن گوبند کور کی رازدار کنیز کی وجہ سے بات کھل گئی اور ریاست کے ایک معمر وزیر رام جس صاحب کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اپنی مالکہ کی طرح وہ کنیز بھی عشق کی ماری ہوئی تھی۔ اسے شاہی خانساماں امانت خاں سے محبت تھی۔ ایک دن اس نے یہ راز اپنے عاشق کو بتادیا۔ امانت خاں نے اسے اپنے خاص دوست علی محمد سے کہہ ڈالا جو رام جس صاحب کا ایک معتمد ملازم تھا۔ علی محمد نے اس راز کو اپنے آقا تک پہنچادیا۔ ریاست کے تمام وزرا غلام جیلانی سے ناراض تھے مگر کوئی ایسی بات ان لوگوں کو نہیں مل رہی تھی جس کی بنا پر وہ لوگ ان کے خلاف کسی طرح کا اقدام کرا سکیں۔ رام جس صاحب نے اس راز سے واقف ہوتے ہی وزرا کی ایک خفیہ میٹنگ کی اور وزیر اعظم کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرانے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ اگلے سنیچر کو پہلے ہی سے ایک فوجی دستہ شہر کے باہر تعینات کردیا۔ حسب معمول جب وزیر اعظم صاحب گوبند کور کے ہمراہ اپنی گاڑی میں سوار ہوکر جالندھر کے لئے روانہ ہوئے اور شہر کی حدود سے نکلنے کے بعد جب انھوں نے محبوبہ سے چوما چاٹی شروع کی تو سپاہیوں نے انھیں گرفتار کرلیا۔ نتیجہ میں غلام جیلانی صاحب تو ریاست بدر کئے گئے اور گوبند کور کو اس کے محل میں اس طرح مقید کردیا گیا کہ کئی ماہ تک اسے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ رہی۔

گوبند کور کے انگنت معاشقوں میں سے دوسرا سنسنی خیز معاشقہ غلام جیلانی کے ریاست بدر ہونے کے کچھ دنوں بعد شروع ہوا۔ کرنل وریام سنگھ شہزادی گوبند کور کے محل کے فوجی کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں اس کے حسن پر نظر پڑی تو دل دے بیٹھے۔ انھیں بھی محبوبہ سے ملنے کے لئے بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے نامہ و پیام کا ذریعہ گوبند کور کی ایک دوسری کنیز بنی جس کا نام بسنتی تھا اور ملاقات کا طریقہ ایسا نکلا جو بڑا ہی دشوار گزار تھا۔ گوبند کور کے محل کی حدود میں ایک کنواں تھا جس سے محل کے مکینوں کے استعمال کے لئے پانی نکالا جاتا تھا۔ اتفاق سے محل کی باہری دیوار ہی اس کنوئیں کی دیوار بھی تھی

وریام سنگھ نے اس دیوار میں باہر سے شگاف پیدا کیا اور اندر سے گوبند کور نے پانی کھینچنے والی رسی پھینک دی تھی جسے پکڑ کر وہ حضرت کنوئیں میں لٹک گئے۔ بعد از آں شہزادی نے اپنی معتمد کنیزوں کی مدد سے انھیں کھینچ کر نکال لیا۔ اسی ترکیب سے کرنل صاحب روز شب میں گوبند کور تک پہنچنے لگے اور ساری ساری رات اس کی مرصع خواب گاہ میں گذارنے لگے۔

دو سال تک وریام سنگھ اور گوبند کور کی یہ روح پرور شبانہ ملاقاتیں اس طرح جاری رہیں کہ زمانے والوں کو خبر نہ ہوسکے۔ لیکن آخر کار ریاست کے وزیر داخلہ سردار دانشمند صاحب کو اسکی بھنک مل ہی گئی چونکہ وہ وریام سنگھ سے پہلے ہی سے عداوت رکھتے تھے اس لئے انھوں نے اس راز سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ رات کو جیسے ہی بیچارہ عاشق محبوبہ کے محل میں داخل ہوا دانشمند صاحب کے مخبروں نے اسے اطلاع دے دی اور انھوں نے ریاست کے آئی جی اور بارہ سپاہیوں کو ساتھ لیکر محل پر دھاوا بول دیا۔ پولیس والے ابھی باہری دروازے پر زور آزمائی کر رہے تھے کہ گوبند کور اور وریام سنگھ کو ان کی آمد کی اطلاع مل گئی اور وہ دونوں ایک خفیہ سرنگ کے ذریعے فرار ہوگئے جس کا آخری سرا محل سے باہر سو گز کے فاصلے پر ایک کنوئیں میں تھا۔ انھوں نے ساری رات اسی کنوئیں کے ٹھنڈے پانی میں گذاری اور صبح تڑکے وہاں سے بھاگ نکلے۔ پاپیادہ سفر کرتے ہوئے دونوں نے ریاست کپور تھلہ سے بیس میل دور جاکر ایک گاؤں میں قیام کیا جس کا نام کلیان تھا۔ یہ گاؤں انگریزی حکومت کے زیر اختیار تھا جس میں کپور تھلہ کی پولیس اُن پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ چونکہ دونوں اپنی تمام دولت سے محروم ہوچکے تھے اس لئے وہ اسی گاؤں میں ایک کچے مکان میں رہنے لگے اور محنت مزدوری کرکے زندگی گذارنے لگے۔ کرنل وریام سنگھ کھیتوں میں کام کرتا تھا اور شہزادی گوبند کور گوبر سے کنڈے بناتی تھی اور اپنے عاشق کے لئے خود ہی کھانا تیار کرتی تھی۔

اس طرح گوبند کور کو کلوپٹرا تو ضرور کہا جاسکتا ہے لیکن مصر کی کلوپٹرا نہیں بلکہ ہندوستان کی کلوپٹرا کیونکہ وہ بہرحال ایک ہندوستانی عورت تھی۔ ✻

یس نجمی امروہوی

ابھی حال میں سونیا (مدھیہ پردیش) کے دو مشہور ڈاکو منھو سنگھ اور موہر سنگھ نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے سامنے جاکر اپنے جرم کا اقبال کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک شرط بھی تھی اور وہ یہ کہ انکے تمام جرائم کی سزا جو ان سے اب تک سرزد ہوچکے ہیں پھانسی کی صورت میں نہ دی جائے۔ اس کے برعکس انھیں عمر بھر قید خانے میں رہنا گوارا نہ ہوگا۔

اس اطلاع کا تعلق دہلی میں نوادرات کے تاجر شری بی۔آر۔شرما سے ہے وہ خاصی طویل جد و جہد کے بعد کچھ ہی دنوں پہلے اپنے رشتے داروں کے توسط سے ۲۵ ہزار روپے کی رقم ادائگی کے بعد ڈاکو منھو سنگھ کے چنگل سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ گوالیار سے تقریباً ساٹھ میل دور مورینا کے آس پاس کسی مقام پر پورے چار ماہ غیر قانونی قید میں گزار چکے ہیں۔ ان ڈاکوؤں نے انھیں اپنی قید سے رہا کرنے کے بدلے میں پہلی مانگ آٹھ لاکھ روپے کی کی تھی لیکن بعض حالات کے تحت یہ رقم بعد میں کم کر دی گئی۔ ڈاکوؤں کا یہ اقبال جرم کرنے کی خواہش کا جذبہ اور مسٹر شرما کو آزاد کرنے کے لئے مطلوبہ رقم میں تخفیف اس بات کا ثبوت ہیں کہ جرائم پیشہ لوگوں کی دنیا میں بھی سب کچھ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔

یہ لوگ اب اپنے مفلس پڑوسی علاقوں سے نکل کر اپنے مخصوص شکار کی تلاش میں دہلی اور دوسری جگہوں پر بھی جانے لگے ہیں۔ مسٹر شرما کے اغواء کی داستان بڑی دلچسپ اور پر اسرار ہے۔ وہ ان خطرناک ڈاکوؤں کے نرغے میں دہلی کے ہی رہنے والے دو ٹیکسی ڈرائیوروں کی سازش سے پہنچے تھے۔ ان میں کا ایک ڈرائیور کچھ دنوں تک منھو سنگھ کی سرپرستی (قید) میں رہ چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لئے چھ ہزار روپے نقد دینے کے ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ کسی نہ کسی موٹی آسامی کو پکڑ کر لانے میں اس کی پوری پوری مدد کرے گا۔

شرما جی نے بتایا کہ وہی ٹیکسی ڈرائیور چند ماہ پہلے ان کی دوکان پر آیا جو "جور باغ" میں واقع ہے۔ اس نے ابتدائی بات چیت میں انھیں یہ بتایا کہ گوالیار کا ایک ریٹائرڈ [illegible] اپنے کچھ نوادرات فروخت کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے بغیر کسی شک و شبہ کے اسی وقت اپنے دوست مسٹر رمیش کو اس ٹیکسی ڈرائیور کے ہمراہ روانہ کر دیا تاکہ وہ ان نوادرات کا [illegible] اسکیں اور قیمت کا اندازہ بھی لگا سکیں۔

اس کے بعد مسٹر رمیش کی ٹیکسی گوالیار ہوتی ہوئی شیو پوری کے ایک گھنے جنگل کی طرف روانہ ہوگئی جہاں اس وقت ڈاکو منھو سنگھ کی عارضی قیام گاہ تھی۔ جب وہ وہاں پہنچے تو مسٹر رمیش کے سینے پر بندوق رکھ دی گئی اور اس کو [illegible] کے لئے مجبور کیا گیا کہ وہ شرما جی کو گوالیار بلانے کا [illegible] تیر نشانے پر لگا اور منصوبہ [illegible] وہ گوالیار کے لئے روانہ ہوگئے اور وہاں منھو سنگھ نے [illegible] انھیں بھی اغواء کرلیا۔

پھر انھوں نے بتایا کہ گوالیار ایئرپورٹ سے تقریباً [illegible] میل دور چلنے کے بعد چار آدمی خاکی وردی پہنے اور [illegible] میں لئے ان کے ساتھ ہوگئے۔ ان ہی لوگوں نے ان کے ہاتھ کپڑے کے ٹکڑوں سے باندھے۔ وہ ان کے ساتھ تین میل تک گھنے جنگلوں میں چلتے رہے جب وہ ایک خاص مقام پر پہنچے تو ڈاکو منھو سنگھ کے کیمپ میں ان کی ملاقات ان کے دوست مسٹر رمیش سے بھی ہوگئی اور تب جاکر انھیں تمام حالات سے آگاہی

پاکستان کو اب ہتھیار بالکل نہیں دیے جائیں گے۔ پکی بات ۔

سورن سنگھ اور جے پرکاش نرائن جہاں بھی گئے انکی باتوں کو غور سے سنا

وہاں مہمان نوازی کے طور پر سب سے پہلے انھیں دودھ
س دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ باور کرایا گیا کہ وہ اپنے
ہیں انھیں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔
دوسرے دن جائداد اور نقدی کے بارے میں ان سے
ات پوچھے گئے۔ پوری تفصیل بتانے کے بعد انھیں مجبور
دہ اپنے بھائی کو جو لکشمی نگر میں رہتے ہیں آٹھ لاکھ
کے لئے خط لکھ کر دیں۔ اس کے بعد ڈاکو منھو سنگھ کے
نے دو بار خفیہ طور پر ان کے بھائی سے دہلی میں ملاقات
ں انھی دنوں ان میں سے ایک آدمی مقامی پولیس کے
گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں گوالیار پولیس نے بھی ایک
تین اور آدمیوں کو پہچان لیا۔
ادھر مسٹر شرما کے بھائی ڈپٹی ہوم منسٹر شری کے۔ سی
سے بھی ملے اور ان تمام کوششوں کے نتیجے میں ۲۵ ہزار
کی ادائگی کے بعد شرما جی کو آزاد کر دیا گیا۔ یہ رقم اصل
رقم کا بہت چھوٹا حصہ تھی اور اس کی ادائگی مسٹر شرما
ائی کے ذریعے ڈاکوؤں کے کیمپ میں پہونچ کر کی گئی تھی۔
رہائی کے بعد ڈاکوؤں کی روزمرہ کی زندگی اور انکے
کے طور طریقے بیان کرتے ہوئے شرما جی نے اخبار نویسوں
یا کہ وہ لوگ صبح سویرے پوجا پاٹ کے لئے اٹھ جاتے ہیں
دیوی یا دیوتا کی پوجا نہیں کرتے بلکہ صرف اپنی رائفل
ا کرتے ہیں جو انکی روزی کا خاص اوزار ہی نہیں ان کی
محافظ بھی ہے۔ انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ڈاکو
نکھو شادی شدہ ہے اور تین بچوں کا باپ بھی ہے۔ اسکی
اور بچے گوالیار میں کسی جگہ رہتے ہیں۔ وہ ان کے پاس
ں کم سے کم دو بار ضرور جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اسکے
بلکہ ہتھیاروں سے لیس کوئی نہ کوئی آدمی اس کے
گارڈ کی شکل میں ہوتا ہے۔ ان دنوں بیوی کے حاملہ ہونے
سے وہ کافی جلدی جلدی گوالیار کے چکر لگاتا رہتا ہے
آخر میں انھوں نے یہ بات بھی بتائی کہ ڈاکو خانہ بدوشوں
زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا کیمپ ایک جگہ پر بہت کم
کے لئے رہتا ہے۔ کھانے وغیرہ کا انتظام پاس کے
والے کر دیتے ہیں جنھیں ضرورت کے مطابق روپے دیدیے
ہیں۔ اکثر جگہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ پولیس کے آدمی
ان کو گاہے بگاہے خبر کرنے کے لئے موجود رہتے ہیں گاؤں
اور پولیس سے اچھے تعلقات ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی

زندگی سے مطمئن نہیں رہتے۔ روزمرہ کے معمولات میں معمولی سے
معمولی احتیاط سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ ضرورت سے زیادہ
چوکنا زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر رات
کے وقت وہ اپنے خیموں میں معمولی روشنی تک نہیں جلاتے۔
مسٹر شرما کے بیان کے مطابق وسط مدتی انتخابات میں
ان ڈاکوؤں نے کچھ مخصوص سیاست دانوں کی مدد بھی کی تھی۔
ایسے ثبوت موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں کی طرف
سے ایسی دھمکیاں دی گئیں کہ فلاں مخصوص امیدوار کو ووٹ

دیے جائیں۔ منھو سنگھ جیسے ڈاکو اپنی علاقائی حد
ہیں۔ آخر میں انھوں نے مال کی تقسیم کے بارے میں
لوٹ کا ساٹھ فیصدی مال گروہ کا سردار یعنی ڈاکو
لے لیتا ہے اور بقایا حصہ دوسرے ممبران کو ان کی رائے
کے مطابق تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ منھو سنگھ کی طرح ہر ڈاکو
باخبر اور دور اندیش ہوتا ہے۔ طبیعت کے لحاظ
حساس ہوتے ہیں۔ ان کا اپنا ضمیر ہوتا ہے۔ وہ لوگ
کبھی بے حرمتی نہیں کرتے اور نہ کبھی معصوم بچوں پر

اگلا بچہ ہونے سے پہلے

ذرا سوچیے!

کیا آپ اس بچے کی
پرورش اچھی طرح
نہیں کرنا چاہیں گے؟

آپ چاہیں گے کہ اُسے دودھ، اچھی خوراک، کپڑے، کھلونے اور کتابیں ملیں۔ لیکن اگر اگلا بچہ جلدی ہو جاتا ہے تو یہ سب آپ کے لئے آسان نہ ہوگا۔ کیا آپ ایسے حالات سے بچنا نہیں چاہتے؟

دنیا بھر میں لاکھوں لوگ یہی کر رہے ہیں۔ وہ اگلے بچے کی پیدائش اس وقت تک ٹالتے ہیں جب تک وہ اس کے لئے خود تیار نہیں ہو جاتے۔ نرودھ کی مدد سے آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ ربڑ سے بنا ہوا نرودھ حمل روکنے کا وہ ذریعہ ہے جو دنیا بھر میں اس کا استعمال نہایت آسان ہے۔ اس سے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ آج ہی ایک پیکٹ نرودھ خریدیں۔

یہ ہر جگہ ملتا ہے - 15 پیسے میں 3 (سرکاری امداد کی وجہ سے)

جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

▼ نرودھ

لاکھوں میں مقبول بے ضرر اور آسان

....کنووکیشن کا دن۔ منجو کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔
خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مُفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹروں سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔
خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے
پُر مسرّت
دن

غیر بنگالیوں کا قتل

محترم جناب مدیر صاحب۔ سلام مسنون

واقعات پڑھنے کا موقع کئی بار ملا، اور یہ خوشی ہوئی کہ آپ نے ترقی کی جانب ایک اور قدم بڑھایا، جو خدا کرے کامیاب ہو۔ اور بھلا کامیاب کیوں نہ ہوگا، کیونکہ ناکامی ان لوگوں کی قسمت میں ہوتی ہے جن کا حوصلہ پست ہے۔

بہرکیف غرض لکھنے کی یہ ہے کہ ماہ مئی کا نصف دوم شمارہ پڑھا جس میں آپ نے بنگلہ دیش پر شیخ مجیب الرحمٰن کے متعلق بہت سی باتیں لکھی تھیں، اور پھر اس ماہ یعنی جون کا نصف اول شمارہ میرے سامنے ہے جس میں براج ڈھولک جیسے کٹر جن سنگھی کی روداد جناب سہیل تنویر انصاری صاحب نے لکھی ہے۔

آج ڈھولک جی ایک طبقے کے مانے ہوئے اور قابل احترام لیڈر ہیں اور ان کی عزت بھی خوب ہے بلکہ ہر پڑھا لکھا آدمی ان کے نام نامی سے واقف ہے۔ لیکن یہی شخصیت دوسرے اقلیتی فرقے کی طرفداری کا دم بھرے۔ اور کیوں نہ ہو۔ بھلا کسی ایک طبقے یا کسی ایک فرقے کو نوازنے سے کوئی کہاں تک لیڈر کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے اور پھر ایسا شخص اگر وزیر اعظم بنے تو سوائے چنگیز، ہٹلر یا ہلاکو وغیرہ کی داستان دہرانے اور کچھ کر ہی کیا سکتا ہے۔

ہاں تو عرض یہ ہے کہ آپ نے بنگلہ دیش پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس مضمون سے ذرا مشابہت رکھتا ہے اور اس ڈھولک جی جیسے کردار سے مسٹر شیخ مجیب الرحمٰن کا کردار بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ادھر شیخ جی سوائے بنگالی کے اور کسی کو برداشت نہیں کر سکتے اور ادھر ڈھولک جی مسلمانوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجیب میاں سے کئی درجہ بہتر ڈھولک جی ایک

واقعات شمارہ [illegible]

پہلو سے نظر آتے ہیں وہ یہ کہ کم از کم ڈھولک جی ہندو دھرم سے تعلق رکھتے ہیں، اور اگر وہ اپنے مذہب کی حفاظت کے لئے یا اس نظریے کے تحت رام راج قائم کریں، یا اکھنڈ بھارت بنائیں بہت حد تک درست ہے۔ چونکہ اکثریت تو انہی کی ہے، اگر وہ چاہیں تو انھیں ایسا کرنے کا حق ہے اور اس پر ہم اقلیتی فرقے اگر واویلا مچائیں تو نامناسب ہی ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے مشرقی پاکستان میں بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کو ناقابل برداشت سمجھا اور سیاسی یا ثقافتی پوزیشن دینے سے انکار کیا اور اکھنڈ بنگلہ دیش کی آواز بلند کی اور اس کو عملی جامہ پہنایا بھی تو وہ اس طرح کہ اپنے ہی بھائی کا جو کندھے سے کندھا ملا کر پاکستان حاصل کرنے میں ساتھ تھا قتل عام کرایا اور وہ بھی اس طرح کہ شاید ہٹلر کی فوج اور اسرائیل کی فوج بھی اتنی تعداد میں مسلمانوں کا خون نہ بہا سکی ہوگی۔

آپ نے شیخ جی کو نہ جانے کن کن خطابوں سے نوازا ہے اور آپ جیسے کچھ کرسی کے خواہاں مستند مسلم صاحب اقتدار حضرات نے بھی ان کو کافی اچھالا ہے جو میری ہی نظر میں کیا، بلکہ ہندوستان اور دنیا کے جتنے بھی مسلم باشندے ہیں سب ہی کی نگاہ میں قابل تحقیر ہے۔ دیکھیے تو نام مسلمان کا ہی رکھ چھوڑا ہے لیکن وہ شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جو اپنے ہی بھائیوں کا خون کرے جبکہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون حرام ہے۔

جو مظالم عوامی لیگیوں نے ڈھائے، اس کو سن کر اور دیکھ کر قیامت بھی شرما جائے۔ پھر بھلا ڈھولک جی جو کئی اعتبار سے مجیب میاں پر فوقیت رکھتے ہیں کہ کم از کم انھوں نے زبان سے تو بہت کچھ کہا ہے اور یہ تو ضرور ہی انسانی ہمدردی کے تحت بولتے کہ یہاں کے جتنے مسلمان ہیں وہ سب پاکستان چلے جائیں یا پھر ہندو دھرم کے تحت ہی وہ ہندو بن کر رہیں، یہ تو ایک اچھا سا اشارہ ہے اور مسلمانوں کو ہندوستان سے چلے جانے کا کافی وقت انھوں نے دیا، مگر ایسا نہ ہو کہ اگر مسلمان جانے سے انکار کریں تو یہاں کی ہندو پارٹی عوامی لیگیوں کی طرح مسلمانوں کا قتل عام کریں جس کا مظاہرہ ہم آپ دیکھ چکے ہیں مختلف صوبوں میں اور پھر دوبارہ دیکھنے کا موقع ملتا ہی رہے گا۔

رہا مجیب میاں کے ساتھ ہمدردی کا سوال تو یہ کسی صورت میں جائز نہیں۔ اس لئے کہ سب سے پہلے مجرم تو وہ اس لئے ہیں کہ انھوں نے پاکستان سے الگ ایک بنگلہ دیش بنانے کی غداری کی، دوئم یہ کہ غیر بنگالیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے سوئم یہ کہ غیر بنگالیوں کو قتل کروانا شروع کیا اور ہندوؤں کا ساتھ دے کر اپنے ہی بھائیوں کا قتل عام کروایا۔ بھلا اس طرح کے کردار کا آدمی، ظالم، غدار اور منافق کے سوا اور کچھ کہلانے کا مستحق ہے۔ اگر ہم ہندوستانی مسلمان بنگالی مسلمان کی ہمدردی رکھتے ہیں اور پناہ دے کر ہر طرح کی امداد دینے کے لئے تیار ہیں اور اپنے ہم وطن سے اپیل کر کے ہر طرح سے حمایت کرتے ہیں تو کیا وہ بنگالی مسلمان نہیں ہے۔ کیا وہ رسول کی امت نہیں ہے کیا اس پر اسلامی مذہب کے فتوے نافذ نہیں ہوتے۔! تو پھر کیوں انھوں نے اپنے ایک قرآن، ایک خدا، ایک رسول کے پابند بھائی کو گولیوں سے چھلنی کرا دیا جو نہتے بھی تھے اور معصوم بھی۔ نہ اقتدار میں تھے نہ اکثریت میں۔ نہ ظالم تھے نہ فوجی تھے بلکہ سوائے اپنی ہاں میں ہاں ملانے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اور پھر یہ کہ جب شیخ مجیب میاں اپنے ہی بھائی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے تو پھر ایسا شخص وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھے۔!

اب تو مشرقی پاکستان کی کل کہانی آپ کے سامنے آ چکی ہے اور پاکستان کو آدھا تیتر آدھا بٹیر کرنے والے مجیب میاں پرلوک سدھار گئے، اور شاید اس سے متعلق آپ کے سامنے بہت سے مضامین آ گئے ہوں جن کے مقابلے میں یہ حقیر سا خط آپ کو ناگوار گزرے لیکن میں پھر بھی آپ کو اس خط سے یاد کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اس کو قابل اشاعت سمجھیں گے اور میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو اپنے واقعات میں جگہ دے کر مجھے شکریے کا موقع دیں گے۔

میں اس امید پر کہ اردو جریدے ہم مسلمانوں کی زبان اور آواز کے ترجمان ہوتے ہیں اور ہر کس و ناکس کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کرتے ہیں، آپ کو یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔

خیر اندیش محمد [illegible]

اور یہ بھی حقیقت ہے

محترمی۔ آداب عرض

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ بعض لوگ چند غیر بنگالیوں پر ہونے والے نام نہاد مظالم کا سہارا لے کر لاکھوں بنگالیوں پر ہونے والے ظلم کو کیوں جائز قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا اس لئے کہ وہ لوگ خود بنگالی نہیں ہیں یا پھر وہ بنگالیوں کو انسان سے کم درجے کی کوئی چیز سمجھتے ہیں جس پر ظلم کرنا یا جس کا قتل کرنا جائز ہے۔ مشرقی بنگال کے لوگ زیادہ تر غریب اور پسے ہوئے تھے۔ وہ لوگ پاکستان میں اس لئے شامل ہوئے کہ ان کا مستقبل سنور سکے، وہ اپنے آپ کو انسان کہنے کا حق حاصل کر سکیں۔ لیکن بہار سے جانے والے لوگ اور پنجاب سے آنے والے سرمایہ داروں نے ان کے تمام معاشی نظام پر قبضہ کر لیا۔ جو لوگ مشرقی پاکستان جا چکے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ تمام جوٹ انڈسٹری، ٹیکسٹائل انڈسٹری، پیپر انڈسٹری وغیرہ پر مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ پاکستان کے بائیس سرمایہ داروں میں سے ایک بھی بنگالی نہیں ہے۔ بہار سے آنے والے لوگوں نے ان کے پچھڑے پن کا فائدہ اٹھا کر تمام پولس اور سرکاری نوکریوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ بنگالیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں تہذیب سکھائی ہے۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ پورے برصغیر میں سب سے زیادہ بہتر معاشرت بنگال ہی کی ہے۔

مجھے ان لوگوں کے انسان ہونے پر شبہ ہوتا ہے جو چند [illegible] کے قتل پر تو پریشان ہیں لیکن لاکھوں لوگوں پر فوجیوں، [illegible] اور جاسوسوں سے ہونے والے قتل عام کو خدائی قہر کا [illegible] دیتے ہیں اور اگر بنگال میں دو چار غیر بنگالی مرے بھی ہیں تو اس کی ذمہ داری یحییٰ خاں کی حکومت پر ہے۔ حکومت غیب [illegible] نہیں تھی، تمام ملک پر یحییٰ کی فوجوں کا قبضہ تھا [illegible] کی لاکھوں فوج مشرقی بنگال کے شہروں میں دندناتی پھر رہی تھی۔ سول نافرمانی کرنے والوں پر جگہ جگہ گولیوں کی [بوچھاڑ] کی گئی۔ صرف ۔۔ مارچ کو چاٹگانگ اور ڈھاکہ میں [ہزاروں] پر امن مظاہرین کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا [جب] مارچ کو جبکہ مذاکرات چل رہے تھے

[فوج] نے ۱۵۰ آدمیوں کو گولی چلا کر ہلاک کر دیا تھا۔ [سول] نافرمانی کے دوران اگر بنگالی غیر بنگالیوں کا قتل کر رہے [تھے تو] فوج کہاں تھی؟ پاکستان ریڈیو کیوں خاموش تھا؟

ہندوستان میں ان کے چاہنے والے اخبارات کیا کر رہے تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ بنگال میں ہونے والے واقعات نے دو قومی نظریے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیا ہے، اور یہ حقیقت سامنے آ گئی ہے کہ قومیں معاشی، تہذیبی، جغرافیائی بنیادوں پر بنتی ہیں نہ کہ مذہب کی بنیاد پر۔ اگر قومیں مذہب کی بنیاد پر بنا کرتیں تو آج تمام مسلم ممالک جو [illegible] ہوتے شاہ حسین ہزاروں فلسطینیوں کا خون نہیں کرتے۔ ترکی اور ایران مسلمانوں کے دشمن ملک اسرائیل کو تسلیم نہ کرتے اور اس کا ساتھ نہ دیتے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا میں جنگ نہ چلتی۔ لیکن سچ حقیقت یہ ہے کہ قومیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بنتیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں جو لوگ اس دو قومی نظریے میں یقین رکھتے تھے ان کی سیاست کی بنیادیں ہل کر رہ گئی ہیں۔ جن بنیادوں پر مسلم لیگ نے پاکستان بنوایا تھا خود پاکستان کے حکمرانوں نے ان بنیادوں کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ لیکن جو لوگ پچھلے تیس چالیس سال سے اس تھیوری پر یقین رکھتے آئے ہیں ان کے لئے اس حقیقت کو ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے اب وہ اپنے اس غلط طریقہ فکر پر پردہ ڈالنے کے لئے بہاری مسلمان اور بنگالی مسلمان کا ہوا کھڑا کر رہے ہیں۔ قتل چاہے بنگالی کا ہو یا بہاری کا، مسلمان نے مسلمان کا قتل کیا ہے اس بات سے ہی دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے ہندوستانی مسلمان اپنے ذاتی مفاد یا اپنے چند رشتے داروں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر بنگلہ دیش کے مسئلے کا مطالعہ نہیں کریں گے۔ وہ اس مسئلے کو تاریخی حقائق اور شعور کی روشنی میں دیکھیں گے ایک انسان کی حیثیت سے دیکھیں گے، ایک مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں گے اور ایک ہندوستانی کی حیثیت سے دیکھیں گے۔

آپ کا۔ محمد نافع۔ دہلی۔

یحییٰ اسلام اور جمہوریت کے غدار ہیں

محترم ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم

آپ نے اپنے اداریہ "باغی اور غدار" [illegible] میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ کسی ایک برائی کو دوسری برائی کا جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ باغی ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بغاوت آئینی حکومت سے کی جاتی ہے، عوام کی منتخب حکومت سے کی جاتی ہے۔ یحییٰ خاں کو پاکستان کے عوام نے منتخب نہیں کیا۔ وہ صرف عوام کے حقوق دبا کر صدر بن بیٹھے ہیں، اس حالت میں ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنے جمہوری اور اسلامی حقوق کے لئے لڑے۔ اسلام نے مسلمانوں کو اپنے میں سے اپنا امیر چننے کا حق دیا ہے۔ یحییٰ خاں نہ تو جمہوریت کی رو سے، نہ اسلامی رو سے اور نہ ہی انسانیت کی رو سے پاکستان پر حکومت کرنے کا کوئی حق رکھتے ہیں۔ غداری ساڑھے سات کروڑ بنگالیوں نے نہیں کی بلکہ حکومت کے محافظین چند فوجی حکمرانوں نے کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج مغربی پاکستان کے لوگوں کو حقائق کا علم ہو جائے تو وہ بھی اپنی اس جابرانہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

میری اللہ سے دست بدعا ہے کہ پاکستان میں جلد از جلد جمہوری و آئینی اور اسلامی حکومت قائم ہو جس میں ایک طبقہ دوسرے طبقے کا حق نہ چھین سکے جس میں چند لوگ پورے ملک کے مستقبل کے ساتھ نہ کھیل سکیں۔

مخلص۔ محمد بابر بالدین۔ نیویارک (امریکہ)

انقلابی کا انٹرویو

بھائی صاحب۔ آداب عرض

گزشتہ شمارے میں آپ نے جو زایان کا انٹرویو شائع کیا تھا اسے ہم بھی انقلابی کے قلم سے اپنی جگہ آپ ایک بڑا ہی دلچسپ اور [illegible] تھا پڑھ کے بہت مزہ آیا۔ آپ کا شائع کردہ انٹرویو [illegible] حقیقت سے نزدیک تر ہوتا ہے، اس کے لئے میں آپ کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کا۔ محمد طلیل بنگلور

واقعات [illegible] رہے۔

[illegible] کمالی قمر۔ تسلیمات

ویسے تو آپ کے کالم سے شائع ہونے والے سبھی [illegible] میرے خیال میں سچ ہی [illegible] بھی ہوں لیکن [illegible]

[illegible]

[illegible] جب بھی نکلے بہتر تھا [illegible] کر سکے۔ [illegible]

واقعات [illegible]

بقیہ:۔ صحافیوں کا سیمینار

بو پر عملی جامہ نہ پہن سکے، اس لئے کہ اردو کے بیشتر اخبارات ایسے ہیں جن کے ساتھ ناشرین کے ذاتی مفادات وابستہ ہیں۔

دلی میں اردو ایڈیٹروں کا یہ سیمینار جو اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا بے حد کامیاب خیال کیا جا رہا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا اس کے کنوینروں مسٹر لے ستار شیر دہلی صدر آل انڈیا اسمال نیوز پیپرز فیڈریشن اور مسٹر منور مادیوالا (ایڈیٹر پریس ایشیا انٹرنیشنل) کے سر ہے۔ انھوں نے اور ان کے ساتھی جناب ظفر پیامی صاحب نے اور پریس ایشیا انٹرنیشنل کے دوسرے کارکنوں نے سیمینار کو کامیاب بنانے کے لئے دن رات ایک کر دیئے۔ اس سے اردو ایڈیٹروں کو نہ صرف حالات حاضرہ اور خود اپنے مسائل کا جائزہ لینے کا موقع ملا بلکہ وہ ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اور بنگلا دیش کے سلسلے میں جو وقت کا سب سے اہم مسئلہ ہے، اردو اخبارات کی ایک واضح پالیسی سامنے آگئی۔

اب کوئی اردو اخبارات کی طرف انگلی اٹھا کر نہیں کہہ سکتا کہ ان کا راستہ قومی دھارے سے الگ ہے۔

بقیہ:۔ اردو پریس

اس میں کچھ بھی کہنا فضول ہے۔ اردو پریس کے معیار کو بلند کرنے کے لئے سرمایہ اور سلیقہ کی ضرورت ہے۔ تھوڑا سا سرمایہ اور سلیقے کے چند افراد، اچھا اور معیاری روزنامہ نکال سکتے ہیں اور ایسا روزنامہ جلد ہی عوام کی نظروں میں جگہ پا سکتا ہے۔

ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے اردو داں لوگوں میں ایسے افراد ضرور ملیں گے جو مشترکہ سرمائے سے معیاری روزنامہ نکال سکیں۔ ہندوستان کے مختلف اہم شہروں سے ایسے روزنامے نکل سکتے ہیں جو انگریزی روزناموں کے مقابلے میں رکھے جا سکیں۔ ابھی عام طور پر اردو پریس لیتھو کا رہین منت ہے جس کی طباعت پیسے کم ضرور لیتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی پڑھنے والوں کی نگاہ میں اس کا وزن بھی کم ہی ہوتا ہے۔ لیتھو کی جگہ آفسیٹ کا طباعت کا طریقہ اپنایا جائے تو بہت سی دشواریاں آسانی کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں۔ ایسا اخبار ابتدائی دشواریوں سے گزرنے کے بعد اگر چل نکلے تو ایک دو سال میں اپنے پیروں

پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عام اردو داں حضرات اردو پڑھنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہاں وہ ایسے اخبار کو پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس میں اچھے مضامین، سلیقہ اور حسن ذوق کی کمی ہو۔

"اردو ڈائجسٹوں" نے حال کے چند برسوں میں خوشگوار نتیجے پیش کئے ہیں۔ "واقعات" کی کامیابی بھی اردو صحافت کو پڑھنے والوں کے مزاج سے آگاہ کرتی ہے۔ یہ نئے تجربات اقدام کی دعوت دیتے ہیں۔ ایسا اقدام جو اردو صحافت کو باوقار بنائے اور مضبوط اردو پریس کو جنم دے۔

بقیہ:۔ کشمیر

ہوتا ہے۔ یہاں سے پوری وادی کشمیر کا دلفریب نظارہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ گل مرگ کے پاس ہی کھلن مرگ نام کا ایک مقام ہے۔ ننگل نالا اور فیروزپور نالا بھی قریب ہی ہے۔ یہ جگہیں مچھلی کے شکار کے لئے کافی مشہور ہیں۔

پہل گام:۔ ہر وہ سیاح جو کشمیر کی سیاحت کرتا ہے یہاں ضرور آتا ہے۔ کشمیر جا کر پہل گام نہ جانا کشمیر کی نامکمل سیاحت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ سات ہزار فیٹ کی بلندی پر بسا ہوا یہ پرسکون اور جاذب نظر مقام سیاحت کے نقطۂ نظر سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں مشہور و معروف ہے۔ اسے عالمی شہرت حاصل ہے۔ پہل گام اور سلکن کے درمیان لدرندی ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کا مرکز بھی جاتی ہے۔ پہل گام سے صرف ۱۸ میل کے فاصلے پر شیش ناگ جھیل اور کلیشیر ہے۔ ۲۱ میل کی دوری پر تارسر جھیل ہے۔ اس کے علاوہ کاسرناگ کرکن سونامرگ وغیرہ بھی وادی کشمیر کے نہایت دلچسپ اور قابل نظارہ مقامات ہیں جہاں پہونچ کر جی کی روحانی اور قلبی خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔

امرناتھ:۔ ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے۔ یہاں ہر سال ہندو زائرین ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں۔

پہل گام سے امرناتھ تک صرف پیدل یا گھوڑے پر جانا ممکن ہو سکتا ہے گھوڑے کے علاوہ کوئی دوسری سواری وہاں تک نہیں پہونچ سکتی۔ یہاں کا شیو مندر بہت مشہور ہے۔ اس مندر میں قدرتی طور پر برف کی بنی ہوئی شیولنگ مخصوص ہے۔ اس کا درشن کرنے کے واسطے جولائی اور اگست کے مہینوں میں ہزاروں تیرتھ کرنے والے سادھو سنت اور جوگی دور دراز مقامات سے آکر یہاں جمع ہوتے ہیں۔

پہل گام سے امرناتھ تک کے راستے میں چندن باری اور شیش ناگ کا پڑاؤ جیسے اہم مقام بھی ہیں۔ ان کو دیکھے بغیر آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ چندن باری برف کا پل دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے دیکھ کر ایک عجیب کیف و سرور کا احساس ہوتا ہے۔ چھیری بھوانی اور پشن وغیرہ جگہیں ہندوؤں کی مذہبی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مقامات بھی کافی اہم ہیں۔

ضلع ادھم پور میں دلشیرڈول دیوی کا نہایت قدیم مندر ہے۔ یہ مندر ۵۳۰۰ فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

کشمیر کی گھریلو صنعت، دستکاری اور کشیدہ کاری کے انمول نمونوں کو ایک سیاح کبھی بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ یہاں کی ہاتھ کی بنی ہوئی خوبصورت، دلکش اور دیدہ زیب قیمتی شالیں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ کشمیری قالین بھی لاجواب ہوتے ہیں۔ اخروٹ کی لکڑی پر کشمیری فنکار اتنے پرکشش نقش و نگار بناتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ان بے جان لکڑی کے ٹکڑوں میں کسی نے جان ڈال دی ہو۔

کشمیر کی سیاحت مکمل کرنے کے بعد زبان سے بے ساختہ یہ پکار اٹھنے کے لئے ایک صاحب دل اور صاحب نظر سیاح مجبور ہو جاتا ہے۔

خطۂ کشمیر تیرے کوہساروں کو سلام
تیری وادی کے حسیں دلکش نظاروں کو سلام

اگلے شمارہ میں

مشرقی بنگال کے حالات کی نزاکت اور متضاد بیانات اور اطلاعات کے پیش نظر مدیر دوا مولانا عبدالوحید صدیقی نے موقع پر کر پناہ گزینوں کے کیمپوں اور ان کے حالات بچشم خود معائنہ اور مطالعہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ تقریباً ایک ہفتہ تک مختلف کا معائنہ کرنیکے بعد دہلی واپس آ گئے ہیں۔ آئندہ شمارہ میں انکے مشاہدات و تاثرات کی قارئین کیخدمت میں پیش کیجائینگی۔ (ادارہ)

قمر سنبھلی

نہر کی بھیڑ میں ملتا نہیں چہرا کوئی
اب کے اپنا ہے کس کو پرایا کوئی؟

پنے دل میں بھی کبھی سوچتا آتا کوئی
زندگی کیسے گزارے گا اکیلا کوئی

ونا سونا سا پڑا ہے مری یادوں کا نگر
کاش اس راہ سے ہوکر بھی گزرتا کوئی

بطِ باہم ہی نے مفہوم دیا ہے ورنہ
حرف معنی ہی نہیں رکھتا اکیلا کوئی

رورق آج بھی سادہ ہے کتابِ دل کا
یہ تمنا ہی رہی نقش ابھرتا کوئی

ھائے جاتا ہے یہ تنہائی کا احساس مجھے
اس بھرے شہر میں کاش اپنا بھی ہوتا کوئی

رطرف یوں تو بہت بھیڑ ہے انسانوں کی
مجھ کو لیکن نہ نظر آیا شناسا کوئی

بیٹھی بیٹھی سی ہے یادوں کی کسک دل کے قریب
اے قمر جھنجھ گیا درد کی دنیا کوئی

غزل

رضی بھولوی

سالِ حسن دیکھیں کوئی شمعِ انجمن دیکھیں
وہ دیوانے کہاں جو اب مرادِ لوا نرین دیکھیں

قیقت میں وہی ہیں آشنائے لذتِ منزل
جو ہر ہر گام پر قید و قفس دار و رسن دیکھیں

نونِ عشق نے ایسا کیا بے گانۂ ہستی
نہ مجھ کو راہبر دیکھے نہ مجھ کو راہزن دیکھیں

نہیں ہر خار میں پھولوں کی رعنائی نظر آئے
چمن کو جب بہ اندازِ چمن اہلِ چمن دیکھیں

ستم تو کلی کا اہلِ گلشن نے بہت دیکھا
ہلے آشیاں کی شاخِ گل کا بانکپن دیکھیں

طلبِ انتظارِ سحر روشن میں جو بیٹھے ہیں
نمودِ صبح کی تاریک ذروں میں کرن دیکھیں

م ان کے چراغاں ہیں فروزاں بے لگن ابھی
جو منزل بعد میں طوفان سے پہلے موجزن دیکھیں

رضی حیرت ہے نقادوں کو غیرت کیوں نہیں آتی
جو اپنے سامنے برباد ہوتا اپنا فن دیکھیں

ایک رات اور

فیض احمد فیض سے معذرت کے ساتھ

ایک رات اور مرے دوست! فقط ایک ہی رات!

یہ سیہ رات جو ناگن کی طرح کالی ہے
کتنے مظلوم غریبوں کا لہو چاٹ چکی
اس کے سائے میں نجانے کتنی ہی جانیں گئیں
کتنے معصوم ارادوں کا گلا کاٹ چکی!

چھن گیا کتنی ہی پاکیزہ نگاہوں کا حجاب
لٹ گیا کتنی ہی دوشیزہ بہاروں کا شباب
چند لمحے ہی مگر اور ہیں خونی حالات
ایک رات اور مرے دوست! فقط ایک ہی رات

آتش و خون کی برسات گزر جائے گی
ان الم ناک اندھیروں کا فسوں ٹوٹے گا
شب کے تاریک دریچے سے سحر جھانکے گی
وقت کے ہاتھ پہ یوں رنگ حنا پھوٹے گا

زندگی سازِ تمنا پہ غزل گائے گی
تیرے افسردہ لبوں پر بھی ہنسی آئے گی
جو گزرنے ہوں گزر جائیں وہ ہم پر صدمات
ایک رات اور مرے دوست! فقط ایک ہی رات

پھر فضا بار فضاؤں سے محبت کی شراب
اتنی برسے گی کہ بہہ جائیں گے نفرت کے محل
مرمریں صبح کے ہونٹوں پہ تبسم ہوگا،
زندگی وقت کے ہر تار پہ چھیڑے گی غزل

تیرے افسردہ لبوں پر بھی ہنسی آئے گی
پھر کسی ہاتھ سے شمشیر نہ اٹھ پائے گی
صبح کے ہونے تلک اور ہے بے رنگ حیات
ایک رات اور مرے دوست! فقط ایک ہی رات

JULY 1971
(FIRST HALF)

WAQIAT

REGD. NO.
TELEPHONE :

"منسٹر صاحب نے جو پہلا کام کیا ہے وہ رہنے کے لائق پائپ ڈالنے کا کیا ہے"

۱۵۰ میں ۹۱۵ میل کے دس ٹکٹ خریدو

واقعات
گلادیش کے پناہ گزینوں کی چ

ماہنامہ نقاد دہلی

تلوار اور اتحاد

شاہ فیصل نے گذشتہ ماہ متحدہ عرب جمہوریہ کے دورے پر گئے تو انھوں نے صدر انور سادات کو ایک قیمتی تلوار پیش کی۔ شاید اس کا مطلب تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ عربوں کے حقوق کی بحالی اور مقامات مقدسہ کی واپسی کے لئے عرب ممالک مل کر تلوار اٹھا لیں اور اپنے تمام وسائل کو ایک جگہ مجتمع کر لیں۔

شاہ فیصل شروع سے ہی عرب اتحاد کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کی سرگرمیوں کا دائرہ عالم اسلام کے اتحاد تک وسیع رہا ہے۔ عرب اتحاد کی کوششوں میں مرحوم صدر ناصر کو ہمیشہ ان کا تعاون حاصل رہا اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اب وہ صدر انور سادات کی معاونت کر رہے ہیں۔

لیکن یہ دنیائے عرب کی بدقسمتی ہے کہ ان کی یہ کوششیں ابھی تک بار آور نہیں ہو سکیں اور ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا جب عرب ممالک فخر کے ساتھ کہہ سکیں کہ ہم سب ایک ہیں۔ بات بات میں غلط فہمیاں، بات بات میں تنازعات اور بات بات میں مسلح تصادم یہ عربوں کا طرز عمل رہا ہے اور ان کی وہ توانائی جو عرب حقوق کی بحالی اور مقامات مقدسہ کی واپسی کے لئے مشترکہ دشمن کے خلاف خرچ ہونی چاہئے تھی ایک دوسرے کے خلاف خرچ ہو رہی ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کہ اندرونی خلفشار اور فوجی انقلابات عربوں کے لئے مقدر ہو کر رہ گئے ہیں۔ عراق، شام، مصر، لیبیا، الجزائر اور سوڈان وغیرہ سب ہی فوجی انقلابات کا شکار ہو چکے ہیں اور اب مراکش بھی ان ہی کی صف میں شامل ہو گیا ہے اگرچہ وہاں فوجی انقلاب ناکام ہو گیا اور شاہ حسن بال بال بچ گئے لیکن بہر حال دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ اندرونی خلفشار سے کوئی عرب ملک بچا ہوا نہیں ہے۔

اردن نے اس خلفشار میں تمام دوسرے ملکوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور ایسا نظر آتا ہے جیسے کہ اس نے فلسطینی گوریلا تحریک کا قلع قمع کرنے کو اپنا منصب بنا لیا ہو۔ یہ وہ فلسطینی گوریلا ہی ہیں جنھوں نے اسرائیل کا ناطقہ بند کر دیا تھا اور جو طویل چھاپہ مار جنگ لڑ کر اپنے دشمن کا کچومر نکال سکتے تھے لیکن جو کام اسرائیل نہ کر سکا اسے خود اردن انجام دے رہا ہے۔ وہ فدائین کے خلاف بکتر بند دستے اور فضائی طاقت استعمال کر رہا ہے اور دنیا تماشہ دیکھ رہی ہے، حتیٰ کہ وہ عرب لیگ بھی تماشہ دیکھ رہی ہے، جو عربوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع رکھنے کا وسیلہ ہے۔ کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔

یہ موقع تھا کہ تمام عرب ممالک اپنے باہمی تنازعات اور اندرونی خلفشار کو کسی آئندہ وقت کے لئے اٹھا رکھتے اور اپنی پوری طاقت اپنے مشترکہ مقاصد کی تکمیل میں لگا دیتے اس لئے کہ اتحاد و یکجہتی ہو تو انسان تلوار اور اسلحہ کے بغیر بھی دشمن سے لڑ سکتا ہے لیکن اگر اتحاد نہ ہو تو تیز سے تیز تلوار بھی ناکارہ ہو جاتی ہے۔

خدا کرے عرب طاقتیں اس حقیقت کو محسوس کریں اور پوری طرح متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمن کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو کامیابی یقیناً ان کے قدم چومے گی اور وہ عربوں کے ان حقوق کو حاصل کر سکیں گے جنھیں اسرائیل نے امریکہ کی پشت پناہی سے غصب کر رکھا ہے۔

آگ اور پانی

ایک امریکی کالم نویس کو اس بات پر حیرت تھی کہ صدر امریکا مسٹر نکسن بنگلادیش کے معاملہ پر خاموش ہیں۔ مگر پھر اس نے خود ہی اس خاموشی کی یہ وجہ دریافت کر لی تھی کہ چونکہ صدر نکسن اور ان کے مشیر عملی انسان ہیں اس لئے وہ پاکستان میں صرف جنرل یحییٰ خاں سے "معاملہ" کریں گے کیونکہ وہاں اس وقت ان ہی کا عمل دخل ہے۔

وہ معاملہ کیا تھا اس وقت کسی کو معلوم نہ ہو سکا لیکن ڈاکٹر کیسنجر نکسن کے مشیر نے صدر یحییٰ کے اشتراک سے جو کھیل کھیلا اور راولپنڈی سے ایک جاسوس کی طرح پیکنگ پہنچ کر جس طرح ماؤزے تنگ اور صدر نکسن کے درمیان ملاقات کا انتظام کیا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ معاملہ کیا تھا اور بنگلادیش کے مسئلہ پر امریکا کیوں خاموش تھا۔

دراصل جنگ ویٹ نام میں حصہ لینے کی بنا پر امریکا ان حالات میں پھنس گیا ہے ان سے نکلنے کی ضرورت سمجھ رہا تھا کہ کمیونسٹ چین کے ساتھ مصالحت کی جائے لیکن اس کے لئے اسے ایک بچولیا کی ضرورت تھی دونوں کی ملاقات کے لئے راہ صاف کرنے میں مدد دے اور پاکستان اسے ایک بچولیا مل گیا اس نے جو خدمت انجام دی ہے شاید یہ اسی کا صلہ ہے کہ مسٹر نکسن اور ان کے مشیر نہ صرف یہ کہ بنگلادیش کے معاملہ میں خاموش ہیں بلکہ امریکی کانگریس کے بہت سے ممبروں کی سخت مخالفت کے باوجود پاکستان کو اسلحہ بھی مہیا کر رہے ہیں۔ اسلحہ کی یہ سپلائی ایک تشویشناک معاملہ ہے جس کے لئے ایک الگ مضمون درکار ہے اس وقت تو نکسن ماؤزے تنگ ملاقات کی خبر ہمارے پیش نظر ہے جس نے بین الاقوامی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی ہے یہ ایک ایسی خبر ہے جس پر ہلچل پیدا ہونی ہی چاہئے تھی۔ دو ایسی طاقتوں کا قریب آنے کے لئے تیار ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے جنھیں نظریاتی اعتبار سے بعد المشرقین ہو۔ یہ حقیقت میں آگ اور پانی کا میل ہے اس کا بین الاقوامی سیاست پر گہرا اثر پڑے گا خاص طور سے ایشیا اور مشرقی ایشیا کی سیاست پر جہاں دونوں طاقتیں اپنا اثر قائم رکھنا چاہتی ہیں۔

ماہنامہ نقاد دہلی

شاہ فیصل صدر سادات کو تلوار پیش کر رہے ہیں

قارئین کے

خطوط

[illegible] اندھیروں سے باہر آؤ۔

محترم صدیقی صاحب۔ سلام و نیاز

[illegible] نے ایک دم دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے [illegible] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں میں پھر سیاسی [illegible] کا آغاز ہوا ہی چاہتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد [illegible] نہیں رہی۔ مسلمان اب تک اندھیرے میں ہی [illegible] مار رہا ہے۔ یہ بیمار قوم ایک کٹھ پتلی کی مانند [illegible] کی محتاج رہی ہے۔ جہاں اب تک سلطان [illegible]۔ آپ نے واقعات کے ذریعے پھر بیدار کئے [illegible] جناب سے دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

آپکا خیرخواہ۔ عتیق اللہ۔ (آجین)

[illegible] مایوس کن۔

مولانائے محترم۔ تسلیمات

[illegible] کا تازہ شمارہ ملا جو جون کا نصف اول ہے [illegible] کے لئے اور جاذب نظر [illegible] اور اس کے اوپر [illegible] عوام کو انعام کی سوغات یا خوب ہو [illegible] بالکل صحیح لکھا ہے کہ نیا بجٹ قطعی مایوس کن [illegible] بارے میں ناوک [illegible] اندرا گاندھی سے [illegible] صاحب نے کیا ہے معمولی ہے اور اس [illegible] جو [illegible] کا اعلان کیا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible] سال [illegible] کہ اب

[illegible] کا انتخاب [illegible] بھوتہا اور بدی کے ساری ابھر جائیگی۔ والسلام مخلص۔

نجیب الرحمٰن (جھنگ)

حقیقت کیا ہے؟

محترم ایڈیٹر صاحب۔ تسلیمات

آپکا اداریہ "باغی یا غدار کون" پر نظر سے گزرا۔

جہاں آپ اسلامی جمہوری نظام کے حامی نظر آتے ہیں وہیں آپ اسلام کی قوت اتحاد کو پامال کرتے ہوئے اسلام کے اصول اتحاد سے منحرف بھی نظر آتے ہیں۔ اسلام بلا امتیاز، زبان و نسل اور رنگ ہر مسلمان کو آپس میں بھائی بھائی کہتا ہے اور اسلام کی نظر میں ایک مسلمان کا قتل کرنے والا دوسرا مسلمان، مسلمان نہیں بلکہ کافر ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اس بات کو جانتے ہوئے بھی کالعدم عوامی لیگ کے دہشت پسندوں کے منافقانہ روش کے مداح ہیں تو یہ محض آپ کی کوتاہ علمی کا باعث ہے۔

حقیقتاً آپ کو ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مجیب کے دہشت پسندوں اور غنڈوں نے غیر بنگالیوں کے ساتھ کونسا غیر اسلامی اور وحشیانہ سلوک کیا۔ ویسے کہانی تو نہایت ہی دردناک اور ناقابل بیان ہے، مگر پھر بھی چند باتیں عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ آپ کی غلط فہمی کا علاج ہو سکے۔ مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک سے ہی مجیب کے دہشت پسند حامیوں نے غیر بنگالیوں کو چن چن کر ختم کرنا شروع کر دیا۔ کشتیا میں جمعے کی نماز کے وقت نماز میں مسجد میں مسلمانوں پر محض زبان کی بنا پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے ایک خاصی تعداد کو ہلاک کر دیا۔ متعدد مقامات کے غیر بنگالیوں اور کنبے کے سارے افراد کو گرفتاری کے بعد نہایت ہی ایذا رسانی کے بعد موت کے منہ میں ڈال دیا گیا۔ بعض مقامات مثلاً سانتاہار، دیناجپور، میمن سنگھ، دھیورے کے مرد، عورت اور بچوں تک کو نہ بخشا گیا اور انہیں بڑی ہی سفاکی اور بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

[illegible] اور چاٹگام کے غیر بنگالی مردوں کو گرفتاری کے بعد نہایت ہی بے دردی سے پیٹتے ہوئے کسی نامعلوم مقام پر لے جا کر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ سب کچھ [illegible] کی [illegible] کے [illegible] انصار [illegible] کے [illegible] بنگالی [illegible]۔ اس بات کا ثبوت مہیا کرنے والے بہار اور بنگال میں سرحد پار کئے ہوئے غیر بنگالی [illegible] ہیں جن [illegible] پناہ گاہوں میں [illegible] کی تفاصیل کو حذف کر کے محض اس بات کا ذکر کیا ہے کہ غیر بنگالی مسلمانوں کو اپنی ہی قوم کے دہشت پسند بنگالیوں نے کس طرح قتل عام کیا۔

مزید یہ کہ مجیب کی تقاریر اسلام کے اصول کے منافی تھیں مجیب کہا کرتا تھا: "قرآن نہیں کی بجات۔ آمرا ہو تمہم بانگالی، تار پو جالی کیچو" (قرآن چاہئے یا بجات۔ ہم پہلے بنگالی ہیں بعد ازاں جو کچھ بھی)۔

ہم پاکستان کی فوجی کارروائی کی مذمت اسی وقت کر سکتے تھے جبکہ دہشت پسند بنگالیوں نے اپنے ہم مذہبوں پر محض زبان کے اختلاف کی بنا پر ایسے مظالم نہ کئے ہوتے جو جمہوری تحریک کے منافی ہیں۔ اس معاملے میں ہندوستان کے اخبارات اور عوام کا جو رویہ رہا ہے وہ نہایت ہی افسوسناک ایک طرفہ رویہ ہے آج تک کسی اخبار نے تصویر کے دوسرے رخ کو دیکھنا ہی گوارا نہیں کیا اور غیر بنگالیوں پر فوجی کارروائی سے پہلے ڈھائے ہوئے مظالم کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔

کیا جمہوری تحریک کے لئے ایک فرقے کو مظالم کا نشانہ بنانا آپ کے نزدیک تحسین آمیز اقدام ہے۔ آج وہ غیر بنگالی جن کے لئے مشرقی پاکستان کی زمین تنگ ہو گئی ہے ہماری ہمدردیوں کے مستحق نہیں ہیں۔؟ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دہشت پسند بنگالیوں کے مظالم آپ کی نظر میں ستودہ صفات کے حامل بن جائیں اور جب ان کے ظلم کے خلاف کارروائی کی جائے تو وہی ظالم مظلوم بھی بن جائیں، نیز ساری ہمدردیوں کے سزاوار بھی۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں پاکستان کی فوجی کارروائی خدائی قہر کی ایک شکل ہے، اور جب خدا کا قہر نازل ہوتا ہے تو ظالموں کے ساتھ کچھ اچھے لوگ بھی اس کی لپیٹ میں محض اس وجہ سے آجاتے ہیں کہ انہوں نے ظلم کے خلاف صف آرائی کیوں نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے انصاف پسند عوام مجیب کی نام نہاد جمہوری تحریک کے حامی نظر نہیں آسکتے اس لئے کہ اس تحریک میں غیر بنگالیوں کے قتل عام کی سازش اور علاحدگی پسند گھناؤنے رجحانات کا دخل تھا۔ اسلام وحدت و اخوت کی تعلیم دیتا ہے۔ وحدت و اخوت کو پارہ پارہ کرنے والے اسلام کے [illegible] ظالم ہیں اور ظالموں کو ظلم کی سزا ملنی ہی چاہئے۔ فقط

محمد قاسم [illegible]

بنگلادیش کے پناہ گزینوں کی آنکھوں دیکھی رپورٹ

اقتباسات نئی دہلی

کیمپوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔

کیمپوں کا دورہ کرنے کے بعد ایک بات کا اندازہ ہوا کہ جن کیمپوں میں ہم گئے وہاں کے پناہ گزینوں کا تعلق مشرقی بنگال کے اندرونی علاقے سے خال خال ہی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق بارڈر کے اس پار پچاس میل کے اندر اندر کے علاقے سے تھا۔ لیکن ان میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو کئی کئی سو میل کا سفر طے کر کے مصیبتیں جھیلتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ آج بھی سرحدیں کھلی پڑی ہیں، جسکا دل چاہے وہ ہندوستان آسکتا ہے اور جس کی مرضی ہو وہ واپس جا سکتا ہے۔ کم از کم ہندوستان کی طرف سے ان لوگوں کی واپسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

آنے والوں میں چار قسم کے لوگ ہیں۔ پہلے وہ جنکے پاس نہ تو مشرقی بنگال میں ہی کچھ تھا اور نہ یہاں کچھ ہے۔ اگر ان کو کھانے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ملتا رہے تو ان کے لئے مشرقی اور مغربی بنگال، دونوں برابر ہیں۔ ان لوگوں کو واپس جانے کا کوئی ایسا زیادہ شوق نہیں ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کی مشرقی بنگال میں اپنی زمینیں تھیں، مکان تھے، مویشی تھے، دولت تھی۔ اور اب جنکے پاس تن ڈھکنے کو کپڑا تک نہیں ہے۔ ان لوگوں میں واپس جانے کا جذبہ زیادہ ہے۔ تیسرے نمبر پر وہ لوگ ہیں جو ہندوستان آتے وقت اپنا سارا اثاثہ سمیٹ لائے ہیں۔ بلکہ کچھ تو ایسے بھی ہیں جو اپنے ساتھ نہ صرف گھر کا سارا فرنیچر بلکہ اپنا لکڑی کا بنا ہوا گھر تک بیل گاڑی پر لاد لائے ہیں۔ کیونکہ ان کے گاؤں سرحد سے زیادہ دور نہیں ہیں اس لئے واپس جاتے وقت یہ لوگ ایک بار پھر اپنی ساری دولت لاد کر واپس اپنے گاؤں لے جائیں گے۔ آخری نمبر پر آتا ہے بنگلا دیش کا پڑھا لکھا نوجوان طبقہ۔ اس طبقے میں جذبۂ آزادی اور مادرِ وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان لوگوں کا ارادہ اپنے خون کی آخری بوند تک ملک کی آزادی کے لئے بہانے کا ہے۔ ان کے پاس اپنے علم کے علاوہ اور کوئی دولت نہیں ہے۔

پناہ گزین کب اور کس طرح واپس جائیں گے؟

اس سوال کو اٹھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اس

واقعات تفصیل

بڑے بوڑھوں کو بھی نہیں بخشا گیا

سوال کا جواب حاصل کریں کہ پناہ گزین اپنا وطن، اپنا گھربار، دھن دولت چھوڑ کر ہندوستان کیوں آگئے۔ ہم نے اس سلسلے میں سیکڑوں لوگوں سے سوالات کئے، گفتگو کی بحث کی۔ لیکن سب نے ایک ہی کہانی سنائی، ایک ہی جواب دیا کہ مغربی پاکستان کی فوجوں کے ظلم و ستم کا۔ امین الحق نے جو جناح پور گورنمنٹ کالج میں لیکچرر تھے بتایا کہ فوجیوں نے جناب خادم الاسلام ہیڈ ماسٹر پلشا پاؤں ہائی اسکول اور ان کے بھائی ظہیر الاسلام کو نہایت بے رحمانہ طریقے پر بے دردی سے مار ڈالا۔ روہیا ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رحیم الدین احمد نے بتایا کہ "وہ پاکستانی فوجوں کے ظلم و ستم

سے گھبرا کر ہندوستان بھاگ آئے۔ ان کے ... جس کی آبادی ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی اب ... کو چھوڑ کر زیادہ تر لوگ یا تو مارے گئے ہیں یا ... بھاگ گئے ہیں۔ مولانا عبدالاول صاحب ... میں امامت کرتے تھے رو رو کر بتایا کہ ...

وہ جان و مال کی قربانی کو برداشت کر سکتے ... لیکن جب سڑکوں پر ننگا کر کے ان کی عورتوں کی ... لوٹی گئی تو ان کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ پاکستانی فوجیوں نے عورتوں کے ساتھ آوارہ کتوں سے ... سلوک کیا۔

دس دس بیس بیس فوجیوں نے مل کر ایک ایک عورت کی ... لوٹی اور پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

فوجیوں نے شروع میں تو بغیر کسی تفریق کے پوری ... آبادیوں کا قتلِ عام کیا۔ لیکن بعد میں یہ قتل زیادہ منظم ... ہو کیا جانے لگا۔ تمام پڑھے لکھے نوجوان لوگوں کو بلا ... مذہب و ملت گولی سے اڑا دیا گیا۔ فوجی عوامی لیگ اور ... پاکستان راکفل کے ممبروں اور حامیوں کی لسٹ لے کر گھر ... میں آتے تھے۔ ان لوگوں کو ڈھونڈ نکالنے میں وہ الیکشن ... شکست کا منہ دیکھنے والی جماعتوں کے ممبروں اور غیر بنگالیوں ... کی مدد حاصل کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کے ممبروں ... سے بچتے ہوئے انکی مدد کرنی پڑتی تھی، ورنہ یہ فوجی ... عورتوں اور لڑکیوں کو اٹھا کر لیجاتے تھے۔

عوامی لیگ کے ممبروں اور ایسٹ پاکستان رائفلز ... جوانوں کو دیکھتے ہی بے دریغ گولی مار دی جاتی تھی۔ ... کے گھروں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ ان کی عورتوں کو سر ... بے عزت کیا جاتا تھا اور بعد میں خود ان جماعتِ اسلامی ... کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

... گاؤں سے جماعت اسلامی کے امیدوار ڈاکٹر ... کے لڑکے کو بھی اب پاکستانی فوجوں کے ظلم و ستم سے تنگ ... ہندوستان میں پناہ لینی پڑی ہے۔

ہندوستان آنے والے پناہ گزینوں میں سب ... اور بربریت کا شکار نہیں ہوئے۔ ان میں ...

...ندوبراس کے باعث ہندوستان بھاگ آئے۔ انکا
... انہیں اپنی جان و مال کا اتنا خوف نہیں تھا جتنا کر
... بیٹیوں کی عزت کا تھا۔ ایک بوڑھے پناہ گزین نے
... بتایا کہ کس طرح اس کے سامنے اس کی پانچ جوان
... کی عزت لوٹی گئی۔ اس کی ایک لڑکی کی عمر صرف آٹھ
... ہے کئی نوجوانوں نے اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔
... نے ان لڑکیوں کے ساتھ منہ کالا کرنے کے بعد ان کی
... کے درمیان سنگینیں اتار دیں۔ اسی قسم کی ہزاروں ایسی
... سننے کو ملیں جن کا تذکرہ کرنا کسی بھی انسانیت دوست
... کے لئے ممکن نہ ہوگا۔

... کیمپوں میں جس چیز کو دیکھ کر سب سے زیادہ
... ہوا وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں محبت
... تھی۔ مشرقی بنگال کی بندوقوں اور ٹینکوں نے
... فاصلوں کو مٹا دیا تھا۔ دو قومی نظریہ لاکھوں ہندوؤں
... مسلمانوں کی لاشوں کے نیچے دفن ہو چکا تھا۔

... جن کیمپوں میں ہم گئے وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی
... تعداد برابر تھی۔ شروع میں ہندوستان آنے والے پناہ گزینوں
... میں ہندوؤں کی تعداد ستر فیصدی تھی۔ لیکن بعد میں یہ تعداد
... اسلام پور کے علاقے میں مقامی آبادی ستر فیصدی
... مسلم پر مشتمل ہے۔ اسلام پور کے ایم ایل اے نے
... کہ مقامی آبادی پوری طرح حکومت کی مدد کر رہی ہے
... لوگ مصیبت کو بھگت رہے ہیں ان کا ہاتھ نہ بٹاتے
... اس مسئلے سے نپٹنا ناممکن ہو جاتا۔ حالانکہ یہاں کے
... مقامی لوگ معاشی طور پر بری طرح متاثر ہو رہے
... ہیں مگر جس لگن اور جس جذبے کے ساتھ وہ ان
... پناہ گزینوں کی مدد کر رہے ہیں اس کی جتنی
... کم ہے۔

... بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو پناہ گزین
... ہیں۔ لیکن یہ لوگ مقامی نہیں
... میل کا سفر طے کرکے
... کے لئے یہاں پہنچے
... ان لوگوں نے پاکستان

کا روپیہ تیس پیسے تک میں خریدا ہے۔ تانبے کے برتن ۶-۷ روپے فی سیر کے حساب سے خرید کر پندرہ بیس روپے کے حساب سے فروخت کئے۔ ہندوستان میں دھان کا بھاؤ ۳۰-۳۵ روپے فی من ہے جب کہ ان بنیوں نے پناہ گزینوں سے دھان ۱۵ روپے فی من کے حساب سے خریدا۔ نمک دال، چاول اور دوسری ضروری اشیا کی بلیک کی اور اسے دگنے تگنے داموں پر بیچا۔ لیکن ان ضمیر فروش سرمایہ داروں کو کوئی عزت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ مقامی آبادی بلاتفریق ہندو و مسلم ان سے نفرت کرتی ہے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اب حکومت بھی ان کی اس لوٹ کھسوٹ کو روکنے کے لئے اقدام کر رہی ہے اور اس پر کافی حد تک قابو بھی پا لیا ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی ہر تقریر اپنے ہر بیان میں یہ کہا کہ ان کا مقصد ملک میں ایک سیکولر حکومت قائم کرنا ہے جہاں ہندو، مسلمان، بنگالی، غیر بنگالی بلاتفریق مذہب و ملت چین سے رہ سکیں۔ جہاں انہیں زندگی کی بنیادی ضرورتیں مہیا ہوں۔ ۷ مارچ کو شیخ نے عوام سے پرامن عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے کے لئے کہا۔ اس تحریک کا پانچ نکاتی پروگرام عوام کے سامنے رکھا گیا۔ اس پروگرام کا ایک پوائنٹ یہ تھا:

"میری عوام سے گزارش ہے کہ وہ تحریک کو پرامن طریقے پر پورے ڈسپلن کے ساتھ چلائیں۔ میں عوام کو یاد دلاؤں گا کہ جو لوگ تشدد پر اترنے کی کوشش کریں گے وہ پوری تحریک اور عوام کے دشمن ہیں۔ وہ تحریک کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچائیں گے۔"

اس کے بعد بھی شیخ اپنے گرفتار ہونے تک اپنی ہر تقریر میں لوگوں سے پرامن رہنے اور بنگالی غیر بنگالی کے ساتھ ایک سا سلوک کرنے کی تلقین کرتے رہے۔

بہت سے لوگوں نے غیر بنگالیوں پر ہونے والے مظالم کے مسئلے کو اٹھایا اور خود مجھے بھی اس طرف سے تشویش تھی۔ اس لئے میں نے کچھ غیر بنگالیوں سے کیمپ میں ملاقات کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے بتایا گیا کہ کیمپ میں کوئی غیر بنگالی پناہ گزین نہیں ہے۔ اسلام پور میں ہمیں ایک بنگلا آفس بنا ہوا

یہ مظلوم لوگ کہاں واپس جائیں گے۔ یحییٰ خان کے مشرقی پاکستان میں جہاں بندوقوں کی گولیاں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔

ہے ان کے سکریٹری جناب بکر جمیعت سے ہماری ملاقات ہوئی جو پندرہ سال تک نے پہلے کنسٹرکشن کنٹر کٹ تھے۔ یہاں ہماری ملاقات ایس۔ ایم رضا (اگزیکیٹو انجینئر) اور جناب عالم گیلانی ایم۔ اے (اکنامکس) سے بھی ہوئی۔ ان سے بہاری بنگالی کے مسئلے پر سوال کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ مشرقی بنگال میں عدم تعاون کی تحریک کے دوران کوئی بنگالی غیر بنگالی فساد نہیں ہوا۔ ہمارے ذہن میں بنگالی، بہاری کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ الیکشن میں عوامی لیگ نے غیر بنگالیوں کو بھی ٹکٹ دیا۔ جناب ظہیرالدین

بدلہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن جہاں بھی عوامی لیگ یا ایسٹ پاکستان رائفلز کے ممبر موجود تھے انھوں نے لوگوں کو اس قسم کی غلطیاں کرنے سے روکا۔ اور انھیں بار بار یاد دلایا کہ ان کی لڑائی غیر بنگالیوں سے نہیں بلکہ مغربی پاکستان کی فوجی حکومت سے ہے۔

بہرحال اگر ایک غیر بنگالی پر بھی کسی قسم کا ظلم ہوا ہے تو وہ قابلِ مذمت اور افسوسناک ہے۔ خود پناہ گزینوں کو اس بات پر افسوس تھا۔ انھوں نے کہا کہ اول تو ایسا کہیں بھی بڑے پیمانے پر نہیں ہوا اور اگر کہیں اکا دکا ایسے واقعات پیش بھی

پوری دنیا اور انسانیت کا مسئلہ ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس وقت اس پورے مسئلے سے نپٹنے کا بوجھ ہندوستان کے کاندھوں پہ آ پڑا ہے۔ ہندوستان اس سلسلے میں جو کچھ کر سکتا ہے کر رہا ہے لیکن ہندوستان کے وسائل محدود ہیں اس لئے پناہ گزینوں کے لئے جو کچھ ہونا چاہئے تھا نہیں ہو پا رہا۔ کیمپوں میں ڈاکٹروں اور والنٹیروں کی کمی ہے۔ بہت سی کرسچین مشنریاں، کچھ دوسری پرائیویٹ ہندوستانی مشنریاں اور مقامی مسلمان، ہندو وہاں کام کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی

والنٹیر ایک عورت کو بچے جنوانے کے لئے ہسپتال بھیجتی ہیں کیمپوں میں ڈاکٹروں کی کمی ہے

ہو کر بہاری رئیس بھا کا کے مدد پور ممبر پورے کے علاقے سے عوامی لیگ کے ٹکٹ پر جماعتِ اسلامی کے غلام اعظم صاحب کو شکست دے کر کامیاب ہوئے۔

بہت سے پناہ گزینوں سے سوالات کے بعد اس بات کا اندازہ ہوا کہ کچھ غیر بنگالیوں کا قتل ہوا تو ضرور ہے لیکن یہ قتل مغربی پاکستان کی فوجی کارروائی کے بعد ہوا۔ ایک ادھیڑ عمر پناہ گزین محمد علی نے بتایا کہ فوجی کارروائی کے فوراً بعد ڈھاکا کے ان علاقوں میں جہاں غیر بنگالیوں کی اکثریت ہے بنگالیوں کا قتل شروع کر دیا گیا۔ جب اس قتل کی خبریں دوسرے علاقوں میں پہونچیں تو وہاں لوگوں نے غیر بنگالیوں سے اس کا انتقام لیا

آئے ہیں تو وہ محض وقتی جوش اور جذبے کی وجہ سے پیش آئے ہیں۔ پھر پاکستانی جہازوں کی بمباری نے بھی بنگالیوں کے ساتھ بہت سے غیر بنگالیوں کو بھی موت کی آغوش میں پہونچا دیا۔ کیونکہ بم بنگالی اور غیر بنگالی میں تمیز نہیں کرتے۔

کیمپوں کا انتظام بہت اچھے ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ اتنا بڑا ہے کہ اس سے آسانی سے نمٹنا ممکن نہیں۔ لیکن جس خوبی اور خوش اسلوبی سے مغربی بنگال کے افسر اس مسئلے سے نپٹ رہے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔ یہ مسئلہ صرف ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ

ہے کہ دوسری جماعتیں بھی آگے بڑھ کر اس کام میں ہاتھ بٹائیں

کیمپوں میں دواؤں اور کپڑوں کی کمی بھی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ بہت سی عورتیں صرف اس وجہ سے گھروں سے نہیں نکل سکتیں کہ ان کے پاس پہننے کو کوئی کپڑا نہیں ہے۔

البتہ پناہ گزینوں کو فی الحال کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں ہے ہر پناہ گزین کو پیٹ بھر کھانا مل رہا ہے۔ انھیں چاول، دال اور سبزیاں وغیرہ دی جاتی ہیں۔ پکانے کی ذمے داری خود

لاکھوں، کروڑوں بنگالی عوام مادرِ وطن پر خون کا آخری قطرہ تک بہادینے کے لئے تیار ہیں۔

ہے۔ سیلاب کے وقت جگہ بھی تقریباً سب کو مل گئی ہے۔ دن رات ہونے والی بارش نے تمام نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔
پناہ گزینوں نے بتایا کہ وہ کیمپوں کے انتظام سے مطمئن ہیں۔ وہ ہندوستانی حکومت اور ہندوستانی عوام کے شکر گزار ہیں جنہوں نے انھیں اپنے ملک میں پناہ دی اور دوسری سہولیات زندگی مہیا کیں۔

اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ریفیوجی واپس جائیں گے؟ اور اگر جائیں گے تو کن حالات میں؟ اور بنگلہ آفس میں جب جناب اکبر حسین سے یہی سوال کیا تو انھوں نے اس کا جواب تفصیل سے دیا۔
انھوں نے کہا کہ ہمارا پاکستان سے علیحدہ ہونے کا مقصد نہیں تھا۔ ہم مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تمام باتوں میں برابری چاہتے تھے۔ ہم اپنے حقوق مانگ رہے تھے اور ہم نے اپنے ان حقوق کے لئے جمہوری طریقوں کا استعمال کیا تھا۔

لیکن اب مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے خود ہی ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دس، بیس لاکھ بنگالی عوام کے قتل کے بعد ہمارے جذبۂ آزادی کو کچل دیں گے تو یہ انکی خام خیالی ہے۔ پاکستانی حکمرانوں نے خود ہم پر جنگ تھوپی ہے، اور اب جبکہ ہم میدانِ جنگ میں کود پڑے ہیں تو ہمارے پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم آخری دم تک لڑیں گے۔ اس وقت تک لڑیں گے جب تک اپنے وطن کو پاکستانی فوجوں کے شکنجے سے آزاد نہ کرالیں۔

ہم یحییٰ خاں کے مشرقی بنگال میں واپس نہیں جائیں گے۔ ہم مجیب الرحمٰن کے بنگلہ دیش میں واپس جائیں گے۔ ہم تشدد میں یقین نہیں رکھتے لیکن ہمیں جنگ پر مجبور کیا گیا ہے۔ ہمیں بندوق اٹھانے پر مجبور کیا گیا ہے، اور ظلم کے خلاف ہماری یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ ہم ظلم کے تابوت میں آخری کیل نہ ٹھونک دیں۔

"ہمیں پاکستان کے عوام سے کوئی دشمنی نہیں ہے ہماری لڑائی وہاں کے حکمرانوں سے ہے۔ ہماری دعا ہے کہ پاکستان کے عوام کو بھی جلد سے جلد ان ظالم حکمرانوں سے نجات مل جائے تاکہ وہ اپنے جمہوری حقوق حاصل کر سکیں۔

ہم آزاد بنگلہ دیش بنانے کے بعد پاکستان کے ساتھ ملکر رہیں گے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش مل کر ایک دوسرے کی ترقی و فلاح کے لئے کام کریں گے۔"

پانچویں جماعت کے ایک طالب علم عین الحق نے جس کی عمر مشکل سے بارہ سال ہوگی، ہمیں پورے اعتماد اور جوش کے ساتھ بتایا کہ وہ اب "سوادھین بنگلہ دیش" ہی میں واپس جائے گا، وہ آخری دم تک اپنے بھائیوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑتا رہے گا۔

ایک نوجوان محمد اسماعیل نے بتایا کہ وہ پاکستانی

حکمرانوں کی یقین دہانی پر سرحد پار کر کے مشرقی بنگال گیا لیکن وہاں اس کا استقبال کرنے کی بجائے فوجیوں نے

اسے پکڑ لیا اور بُری طرح مارا (اس کے سارے جسم پر مار کے نشان پڑے ہوئے تھے) اس نے بتایا کہ پنجابی فوجیوں نے تمام گاؤں لوٹ لئے ہیں، لوگوں کو لوٹ لیا ہے۔ گاؤں میں صرف چند جنگلی کتے اور گدھ منڈلاتے رہتے ہیں۔ بہت سی بنگالی عورتوں کو فوجیوں نے پکڑ رکھا ہے۔ دن رات مار مار کر اپنے کام کراتے ہیں اور رات کو ان کے ساتھ منہ کالا کرتے ہیں۔ جو عورت ذرا بھی احتجاج کرتی ہے اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

چند دوسرے پناہ گزینوں نے بھی بتایا کہ پاکستانی حکمرانوں کی یقین دہانیاں فریب ہیں۔ جو لوگ سرحد پار کر کے واپس جاتے ہیں ان کے لئے جان بچا کر واپس آنا ناممکن ہو جاتا ہے اور ان میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جو اپنی جان بچا سکے ہیں۔ اس لئے فی الحال ان کے لئے واپس جانے کے بارے میں سوچنا بھی حماقت ہے۔ اگر وہاں عوام کے نمائندوں کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ واپس جانے کو تیار ہیں۔

پاتھاگورا کیمپ میں ہماری ملاقات ٹھاکر گاؤں سے ریاستی اسمبلی کے لئے منتخب ہونے والے عوامی لیگ کے لیڈر جناب فضل الکریم سے ہوئی۔ انھوں نے جماعتِ اسلامی کے نمائندے ڈاکٹر اسماعیل کو ۳۹ ہزار ووٹوں سے شکست دی تھی۔ جب فضل الکریم صاحب سے واپسی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے بھی وہی جواب دیا۔ یعنی واپسی آزاد بنگلہ دیش میں ہی ممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب مجیب کے چھ نکاتی پروگرام پر سمجھوتے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ واپسی اسی وقت ممکن ہے جب کہ کم از کم تین شرطیں پوری کر دی جائیں۔ پہلی شرط ہے شیخ مجیب الرحمن اور دوسرے عوامی لیگ کے لیڈروں کی رہائی۔ دوسری عوامی لیگ کی سربراہی میں حکومت کا قیام اور تیسرے بنگلہ دیش میں اقوامِ متحدہ کی فوجوں کا تعین۔ پناہ گزین اقوامِ متحدہ کی فوجوں کی دیکھ ریکھ میں ہی وطن واپس جائیں گے۔

جے بنگلہ آفس میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ انھوں نے نتولیا کے مقام پر تحریک کا مرکز اور ٹریننگ سینٹر قائم کیا ہے جہاں نوجوانوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دی جا رہی ہے۔

واقعات نمبر ملی

کیا یہ عمر اتنی مصیبتیں جھیلنے کی تھی---؟

بنگلہ دیش کا ایک ایک نوجوان اس وقت مادرِ وطن پر جان نثار کرنے کے لئے تیار ہے۔ یہ کہتے وقت جناب رضا صاحب اور جناب عالمگیر صاحب کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو ان کے تابناک مستقبل کی نشاندہی کر رہی تھی۔

ہم کلکتے واپس گئے تو معلوم ہوا کہ کلکتے میں بنگلہ دیش کے نمائندے جناب حسین علی ہمارے منتظر ہیں۔ جناب حسین علی پہلے کلکتے میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے لیکن بعد میں انھوں نے بنگلہ دیش حکومت کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کر دیا تھا۔ حالانکہ ہم لوگ بہت تھکے ہوئے تھے پھر بھی طے پایا کہ جناب حسین علی سے فوراً مل لیا جائے۔ وہاں باتوں نے ایسا طول کھینچا کہ رات کے بارہ بج گئے۔

مجیب نگر کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ علاقہ مشرقی بنگال میں ہی ہے۔ یہ علاقہ تین طرف سے ہندوستانی بارڈر سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں مکتی فوج کا قبضہ ہے اور حکومت کا انتظام عوامی لیگ کے ہاتھ میں ہے۔

اس علاقے کا محل وقوع کچھ اس قسم کا ہے کہ پاکستانی فوج کے لئے یہاں حملہ کرنا بہت مشکل ہے اگر انھوں نے اس علاقے میں گھسنے کی کوشش کی تو وہ خود ہی بہت بُری طرح سے گھر جائیں گے۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ مجیب نگر ایک متحرک مرکز ہے۔

مسٹر حسین علی کی قیام گاہ پر ہماری ملاقات جناب طاہر الدین ٹھاکر ممبر نیشنل اسمبلی، جناب خلیل الرحمن ایم۔ اے، جناب مودود علی بیرسٹر ڈھاکا ہائی کورٹ، جناب

میں کیا گیا۔ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرانے کے ذمے دار یحییٰ اور بھٹو ہیں۔ مجیب الرحمٰن نہیں۔

جناب طاہر الدین ٹھاکر نے بتایا کہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے بعد بنگلا دیش میں ایک سیکولر حکومت قائم کی جائے گی جہاں ہندو مسلمان، بنگالی غیر بنگالی مل جل کر رہیں گے۔ ان کے معاشی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ حکومت پاکستان نے اب سمجھوتے کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔ انھوں نے اسلام کے نام پر ہمیشہ بنگالی عوام کو لوٹا ہے اور اپنی تجوریاں بھری ہیں۔

جیسا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی تقاریر سے اور ان کے چھ نکاتی پروگرام سے ظاہر ہے عوامی لیگ کا ارادہ پاکستان میں ایک سوشلسٹ جمہوریت قائم کرنے کا ہے۔ بنگلا دیش ایک غیر جانب دار اور سیکولر ملک ہوگا۔

سید حسین علی سے بات چیت کے دوران سید عبدالحی اور جناب غلام یزدانی پر جاسوسی کے الزام

یہ نہ غلامی کی زندگی نہیں بلکہ ایک آزاد ملک میں آزادی کی زندگی گزاریں گے۔

...پولیس انچی اور جناب رفیق الاسلام سابق فرسٹ ...ات ہوئی۔

...اب حسین علی اور دوسرے لوگوں سے مختلف ...وں پر بہت تفصیلی گفتگو ہوئی۔ جناب مودود علی نے ...یکم مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا ...یں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اجلاس ملتوی کرنے ...صاف تھا کہ یحییٰ خان بھٹو کے سامنے جھک گئے ...رہ شیخ مجیب اور عوامی لیگ سے زیادہ بھٹو کی ...ت کو اہمیت دیتے ہیں۔ شیخ نے پرامن عدم ...ریک پر ہی اکتفا کیا۔

...کستانی رائفلز، پولیس اور انصار کا اصرار تھا ...زادی کا اعلان کر دیں کیونکہ اس وقت مغربی ...صرف ایک ڈویژن بارکوں میں موجود تھا جس ...ٹ پاکستان رائفلز بڑی آسانی سے نپٹ سکتا

تھا۔ لیکن شیخ مجیب الرحمٰن نے ایسا قدم اٹھانے سے انکار کر دیا کیونکہ خود ان کا پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

۷ مارچ کو ان پر آزادی کا اعلان کرنے کے لیے ایک بار پھر زور ڈالا گیا، لیکن انھوں نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ آزادی اور علیحدگی کا اعلان صرف مجبوری کی حالت

"ہم جان کے خوف سے نہیں بلکہ اپنی عورتوں کی عصمت بچانے کے لیے بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں"

کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ حکومتِ مغربی بنگال نے انھیں پاکستان کے لئے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا ہے، جبکہ کمیونسٹ پارٹی مارکسٹ کا جس سے ان دونوں کا تعلق تھا کہنا ہے کہ یہ ایک سیاسی نظربندی ہے، بنگال کی برسرِاقتدار جماعت نے اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے یہ چال چلی تھی۔

سابقہ فرسٹ سکریٹری جناب رفیق الاسلام چودھری نے بتایا کہ سید بدرالدجیٰ سابق ممبر پارلیمنٹ کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ انھوں نے کبھی ان کے متعلق کچھ کاغذات کسی کے حوالے کئے ہیں۔

بہت سے پارلیمنٹ کے ممبروں نے بھی اس سلسلے میں انکوائری کا مطالبہ کیا ہے۔ حکومت کو اس سلسلے میں فوری اقدام کرنا چاہئے۔ اور اگر ان لوگوں پر لگائے ہوئے الزامات غلط ہیں تو انھیں فوراً رہا کر دینا چاہئے۔
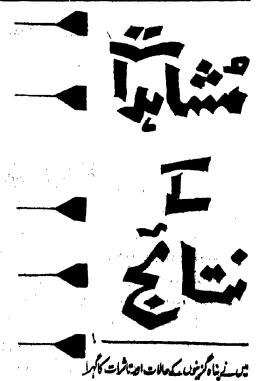
مشاہدات کے نتائج

میں نے پناہ گزینوں کے حالات اور تاثرات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد حسبِ ذیل نتائج اخذ کئے ہیں:

ساٹھ لاکھ سے بڑھ کر اب ستر لاکھ پناہ گزین ایک حقیقت بن چکے ہیں۔ اور یہ پناہ گزین صرف اس وقت واپس جا سکتے ہیں جب بنگلا دیش کو مکمل آزادی مل جائے۔

موجودہ حالات میں مشرقی بنگال کے مسئلے کا کوئی سیاسی حل نظر نہیں آتا۔ شاید بنگلا دیش کے عوام مسئلے کو صرف بندوق کی نال ہی سے حل کر سکیں گے۔

تحریک کی لیڈرشپ آہستہ آہستہ اعتدال پسند لوگوں سے نکل کر انتہا پسند کے ہاتھ میں جا رہی ہے۔ جو مکمل آزادی سے کم کسی بھی شرط کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

حالانکہ جنرل یحییٰ خان نے ہندوستان کو جنگ کی دھمکی دی ہے، لیکن مستقبل قریب میں جنگ کی کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ سرحدوں کے دونوں طرف دور دور تک پاکستانی یا ہندوستانی فوجوں کا نام و نشان نہیں ہے۔

ہندوستان کے لئے پناہ گزینوں کا بار طویل عرصے تک برداشت کرتے رہنا ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کا کوئی فوری حل نہ ڈھونڈا گیا تو یہ ہندوستان کی پوری معیشت کو لے ڈوبے گا۔

بنگلا دیش کی تحریک مکمل طور پر سیکولر ہے۔ کچھ لوگ اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن بنگلا دیش کے عوام پر اس پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی فوجوں کے مظالم کا شکار ہو رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ یا مذہبی بنیاد پر پاکستان کے قیام کا نظریہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

واقعات نئی دہلی

ظہیر حسن

کانگریس الیکشن کے بعد

لوک سبھا کے وسط مدتی چناؤ ہوئے اب تقریباً چار ماہ ہو چکے [illegible] چار مہینوں میں ایسی کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی جسے [illegible]شلزم کے راستے کا سنگِ میل کہا جا سکے سوائے جنرل انشورنس کے [illegible] لئے جانے کے۔ لیکن اس اقدام سے عام لوگوں کا خاطر خواہ [illegible] ہونے کی امید کم ہی ہے۔ کانگریس نے اپنے الیکشن مینی فسٹو [illegible] وعدے کئے تھے وہ صرف سیاسی وعدے ثابت ہوئے [illegible] انہیں پورا کرنے کی اب تک نہ تو کوشش کی گئی اور نہ کانگریس [illegible] اس قسم کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔ اندرا گاندھی نے اپنے [illegible] نعرہ "غریبی ہٹاؤ" کی بنا پر الیکشن تو جیت لیا لیکن [illegible] غریبی کو دور کرنے کی مخلصانہ کوشش نہیں کی۔ آج ہم [illegible] سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جمہوریت میں یہ بات انتہائی خطرناک [illegible] ہوتی ہے کہ کسی سیاسی جماعت کو قطعی اکثریت حاصل ہو جائے۔ [illegible] لوک سبھا میں جبکہ اندرا گاندھی کو قطعی اکثریت حاصل نہیں [illegible] اور وہ حکومت چلانے کے لئے دوسری جماعتوں سے مدد [illegible] پر مجبور تھیں، تب کانگریس پارٹی کے بہت سے اقدامات [illegible]شلزم کے اصولوں کے مطابق تھے۔ اُس وقت اندرا گاندھی [illegible] کیا اور جس قسم کے بیانات دیئے وہ صرف بائیں بازو [illegible] جماعتوں کو خوش رکھنے کے لئے تھے کیونکہ وہ جانتی تھیں [illegible] جماعتوں کی حمایت کے بغیر وہ حکومت نہیں چلا سکیں گی۔ [illegible] وسط مدتی چناؤ میں نئی کانگریس کو بھاری اکثریت [illegible] ہوئی، وہ تمام وعدے جو کانگریس نے عوام سے کئے [illegible] جن کی بنا پر انہیں اکثریت حاصل ہوئی تھی، غائب [illegible] اندرا گاندھی نے بھی وہی سب کرنا شروع کر دیا

جو اس سے پہلے نہرو نے کیا تھا یعنی صرف لفاظی۔

کانگریس کا الیکشن مینی فسٹو یقیناً ایک ایسی دستاویز تھی جس کی حمایت ہر ترقی پسند شہری کو کرنا چاہئے تھی۔ کانگریس نے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے وعدے کئے تھے، اس نے غریبوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے

اندرا گاندھی نے اپنے مشہور زمانہ نعرہ "غریبی ہٹاؤ" کی بنا پر الیکشن تو جیت لیا لیکن حقیقتاً غریبی کو دور کرنے کی مخلصانہ کوشش نہیں کی

کی قسمیں کھائی تھیں، اس نے اُردو کو اس کا جائز مقام دینے کا یقین دلایا تھا۔ اس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کا کوئی حل تلاش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی بھی بات کی تکمیل نہیں ہو پائی اور پہلا جھٹکا تو اس وقت لگا جب نیا بجٹ سامنے آیا۔ یہ بجٹ نہ تو پہلے بجٹوں سے مختلف ہے اور نہ سوشلزم کے اصولوں پر بنایا گیا ہے بلکہ انتہائی سیاسی انداز سے تیار کیا گیا ہے۔ چوہان صاحب نے ملک کے بڑے سرمایہ داروں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تکمیل کی ہے تاکہ انہیں کسی قسم کا نقصان نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ ٹاٹا اور برلا جیسے سرمایہ داروں نے

اس بجٹ کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس کی وجہ سے عام انسان کی بنیادی ضرورتوں کی اشیاء پر ٹیکس بڑھ گئے ہیں اور عوام پر اخراجات کا بار ڈال دیا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ملک کی حالت اتنی ابتر ہے کہ اس میں فوری طور پر کسی طرح کی تبدیلی لانا مشکل ہے لیکن اس نظریہ کی بنا پر تبدیلی لانے کی کوئی کوشش بھی نہ کرنا، عوام سے غداری کرنے کے مترادف ہے۔ سوشلزم ہمارا نصب العین ہے اور اسے پانے کے لئے ہمارا قدم اسی کی راہ میں ہونا چاہئے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج تک اس طرح کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لوک سبھا کے پانچ چناؤ ہو چکے ہیں اور پانچوں بار کانگریس کو لوک سبھا میں حکومت بنانے کا موقع ملا۔ ۱۹۶۲ء کا چناؤ نہرو دور کا آخری چناؤ تھا۔ نہرو کے زمانے میں کانگریس بآسانی اکثریت حاصل کر لیا کرتی تھی اور یہ بات اس لیڈر کی ہر دلعزیزی کا بین ثبوت ہے لیکن صرف عوام میں ہر دلعزیز ہو جانے سے ملک کے مسائل حل نہیں ہو جاتے۔ نہرو کی شخصیت بڑی آسان پسند

چوہان صاحب نے ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تکمیل کی ہے تاکہ انھیں کسی قسم کا نقصان نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ ٹاٹا اور برلا جیسے سرمایہ داروں نے اس بجٹ کا خیر مقدم کیا ہے۔

اندرا جی کا "سوشلزم"

صرف نعرے یا کچھ عمل بھی ـــــ؟

آئی تھیں کانگریس کی پھوٹ کے بعد حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی اور کانگریس کے لئے مشکل تھا کہ وہ آسانی سے حکومت چلا سکے۔ ایسے نازک وقت میں بائیں بازو کی جماعتوں نے اندرا گاندھی کا ساتھ دیا۔ لیکن آج ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے بیشتر لیڈر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انھوں نے دھوکا کھایا ہے۔ اندرا گاندھی بھی اپنے پیشروؤں سے کچھ زیادہ مختلف ثابت نہیں ہوئیں۔ الیکشن کے فوری بعد دہلی کے سیاسی حلقوں میں یہ بات بہت زیادہ سنی گئی کہ اندرا گاندھی کی شاندار فتح سے فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعتوں کا نقصان تو ہوا ہی لیکن ساتھ ہی بائیں بازو کی ترقی پسند جماعتوں کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

اندرا گاندھی کی اس کامیابی میں سب سے بڑا ہاتھ اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کا ہے

اندرا گاندھی نے مسلمانوں کے لئے بہتر رویہ اپنایا تھا اور ان کی جان و مال اور تہذیب و تمدن کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن کیا اس سلسلے میں کسی قسم کا کوئی قدم اٹھایا گیا ہے؟ یقیناً نہیں کیا تھا۔ لیکن کیا ہوا؟ نہ تو اس زبان کی ترقی کے لئے کچھ کیا گیا اور نہ اسے کسی ریاست میں دوسری زبان کا درجہ دیا گیا بلکہ مختلف زبانوں کی ترویج و اشاعت کے لئے دی جانے والی امداد میں اردو کو صرف ایک لاکھ روپے دیئے گئے دوسری زبانوں کو ملنے والی امداد اس سے کہیں گنا زیادہ ہے۔ حکومت کا اردو سے یہ رویہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے اردو ملک کی دوسری زبان ہے اور اس کو صوبائی زبانوں سے کم امداد دی جاتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اس سے ہمدردی کا دم بھی بھرا جاتا ہے کیا اسی کا نام کانگریسی سیاست ہے؟ اسے ریاکاری کہا جائے۔

اب ۱۹۷۲ء میں صوبائی الیکشن ہونے والے ہیں یہ کانگریسی لیڈر پھر "غریبی ہٹاؤ" "سوشلزم لاؤ" قسم کے نعرے لے کر عوام کے سامنے آئیں گے۔ پھر وہی جھوٹے وعدوں کی بھرمار ہوگی اور اقلیتوں کو سبز باغ دکھلائے جائیں گے۔ اب یہ بات عوام کے ہاتھ میں ہے کہ وہ یا تو پھر دھوکا کھا جائیں یا کانگریس کی اس ریاکارانہ سیاست کی دھجیاں اڑا دیں جو پچیس سال سے انھیں دھوکا دیتی آرہی ہے۔ لیکن دوسری بات کی امید

چوان ـــ جگجیون رام ـــ اور گجرال ـــــ کانگریس میں سوشلزم کے علمبردار ـــــ

تھی۔ وہ کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے خطرات قبول کرنے کے عادی نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی دو ٹوک بات نہیں کی ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے کے بیشتر مسائل آج سر ابھار رہے ہیں۔ نہرو کے بعد مختصر عرصہ کے لئے شاستری جی آئے۔ ان کا مختصر دور بڑا ہنگامہ خیز رہا۔ ان اٹھارہ ماہ کے عرصہ میں پاکستان سے جنگ بھی ہوئی اور اس طرح اندرون ملک کے انتظامی کام پیچھے پڑ گئے اس وجہ سے شاستری جی کی انتظامی صلاحیتوں کو پرکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ ۱۹۶۷ء کا عام چناؤ کانگریس کے اقتدار کے لئے خطرے کی گھنٹی ثابت ہوا۔ کانگریس کو کئی ریاستوں میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور لوک سبھا میں بھی وہ معمولی اکثریت کی بنا پر حکومت بنا سکی۔ اس کے بعد کئی اہم واقعات رونما ہوئے اس عرصہ میں اندرا گاندھی نے کئی ایسے کام کئے جن کی وجہ سے وہ عوام میں بے انتہا مقبول ہوگئیں۔ بینک نیشنلائیزیشن، مرارجی ڈیسائی کی وزارت سے علیحدگی، جیب خاص کو منسوخ کرنے کی سعی وغیرہ ایسے اقدامات تھے جن کی بنا پر اندرا گاندھی عوام کے سامنے ایک باہمت اور دانشمند لیڈر کے روپ میں

واقعات کا جائزہ

یہ صحیح ہے کہ چار ماہ کا وقفہ بہت کم ہوتا ہے اور اتنے کم عرصے میں حکومتی پالیسیوں کی افادیت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن پھر بھی حالات بدلتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ علی گڑھ یونیورسٹی پر سے ابتک آرڈیننس نہیں ہٹایا گیا اور نہ مستقبل قریب میں اس طرح کے کسی اقدام کی امید کی جا سکتی ہے۔ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ کانگریس نے اپنے الیکشن مینی فسٹو میں اردو زبان سے ہمدردی کا ڈھونگ رچایا تھا اور اسے اس کا جائز مقام دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اندرا گاندھی نے بھی اپنی کئی تقاریر میں اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا تذکرہ

کم ہے۔ کیوں کہ اندرا گاندھی کی موجودہ بے پناہ مقبولیت کانگریس کی فتح کی ضامن ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان عوام کی اکثریت سیاسی شعور سے بے بہرہ ہے غریب لوگ کانگریس پارٹی میں اندھا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس جماعت کو حکومتی مشنری کی بھی امداد حاصل ہے اور اس طرح انہیں پروپیگنڈہ کرنے کی سہولتیں ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر کانگریس کا الیکشن میں فتح یاب ہو جانا یقینی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ موجودہ حالت ابھی تبدیل ہونے والی نہیں۔ ابھی کچھ دنوں تک ہندوستان سوشلزم کو اپنانے کے قابل نہیں ہوا ہے۔ سوشلزم ـــ جی ہے یہ وہ لفظ کہ

پٹی میں اسرائیلیوں کی وحشت وبربریت کا ننگا ناچ

غزہ

کی پٹی

ں عربوں نے

آزادی

کے لئے

جان کی بازی

گا دی ہے

سنسان سڑک، نہ اس پر کوئی راہ گیر نہ کوئی گاڑی نہ کار، دو کانیں بند مسلح سپاہیوں کا گشت، اور خوف و

دہشت کا ماحول یہ ہے وہ غزہ جہاں ہر وقت چہل پہل تھی اور جہاں زندگی تھی۔ آج وہ زندگی اسرائیلی درندوں نے چھین لی ان صہیونیوں نے چھین لی جنھوں نے اب سے چار سال قبل اس پر قبضہ کیا تھا

بحر روم کے ساحل پر مصری سرحد سے ملحق تقریباً ۱۰۰ ر ۵ میل کی پٹی غزہ کی پٹی کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم فلسطین کی تجویز کے تحت اس علاقہ کو اقوام متحدہ نے نئی عرب ریاست میں شامل رکھا تھا۔ اس میں غزہ کا شہر بھی شامل ہے جو اسرائیلی سرحد سے صرف چھ میل دور ہے۔ مئی ۱۹۴۸ء میں جب مصر، عراق، اردن، لبنان اور شام کی فوجوں نے مجوزہ ریاست اسرائیل کے قیام کو روکنے کے لئے فوجی کارروائی کی تھی تو غزہ کی اس پٹی کو مصر نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ فلسطین کے دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے تقریباً دو لاکھ فلسطینی پناہ گزین بھی غزہ کی پٹی میں ہی اقامت گزین ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کیا تو اسرائیلیوں نے غزہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اقوام متحدہ کے فیصلے اور بڑی طاقتوں کے دباؤ کی بنا پر یہ علاقہ فوراً اسے خالی کر دینا پڑا، غزہ پٹی اور اسرائیلی سرحد کے درمیان اقوام متحدہ کی فوجیں تعینات کر دی گئیں۔ اور ایک مصری گورنر کی دوبارہ تقرری عمل میں لائی گئی۔ لیکن مئی ۱۹۶۷ء میں مرحوم صدر ناصر کی ہدایت پر اقوام متحدہ کی فوجوں نے غزہ خالی کر دیا اور مصری فوجیں محاذ پر پہونچ گئیں۔ جون ۱۹۶۷ء میں چھ دن کی جنگ لڑی گئی اور ایک مرتبہ پھر غزہ کی پٹی اسرائیلیوں کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ اب نہر سویز تک کے پورے صحرائے سینائی پر اسرائیل ہی کا قبضہ ہے۔ اس علاقہ میں اسرائیلیوں کی وحشت و بربریت نے تاریخ کے تمام مظالم کو مات کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود غزہ کے لوگوں کی تحریک مزاحمت جاری ہے اور انھوں نے آزادی کے لئے اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے ان کی جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ وہ اپنے ملک کی ایک ایک انچ زمین دشمن کے قبضہ سے نہ چھڑا لیں گے۔

جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ایک ایک انچ زمین سے دشمن کو نکال نہ دیا جائے

اور بزدلانہ حملہ کرکے غزہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

تین تین اور چار چار کے گروپ میں اسرائیلی سپاہی اب غزہ میں گشت کرتے ہیں، اور محلوں، گلیوں اور چھتوں تک پر ان حریت پسندوں کو تلاش کرتے پھرتے ہیں جن کی جنگ آزادی بدستور جاری ہے اور جو مجبور و مقہور ہونے کے باوجود موقع پاتے ہی تاک لگا کر دشمن کے سپاہیوں کو اپنے دستی بموں کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔

۱۹۷۰ء کا تقریباً نصف سال غزہ میں کرفیو میں گذرا اور ۱۹۷۱ء کے تمام ابتدائی مہینوں میں پناہ گزینوں کے شتی کیمپ پر ۲۴ گھنٹہ کا کرفیو نافذ رہا۔

صرف کرفیو ہی نہیں غزہ کے باشندوں کو اسرائیلیوں کے جن مظالم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ہزاروں لوگوں کو نظربند کر دیا گیا ہے۔ اتنی تعداد میں لوگ نظربند کئے گئے ہیں کہ جیلوں میں جگہ باقی نہیں رہی ہے جس کی وجہ سے ساحل سمندر پر ایک نظربندی کیمپ کھولا گیا ہے۔ جس کے نزدیک اسرائیلی سپاہیوں تک کا جانا ممنوع ہے۔ وہاں سے دلوں کو لرزا دینے والی چیخ پکار کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔

ایک نظربندی کیمپ ریگستان سینائی کے وسطی علاقہ نال میں قائم کیا گیا ہے جس میں بتدریج توسیع کی جا رہی ہے اس کیمپ میں ان عورتوں اور بچوں کو رکھا گیا ہے جن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ مطلوبہ لوگوں کے رشتہ دار ہیں۔ ان مطلوبہ لوگوں کے مرد رشتہ داروں کو جن میں ان کے بھائی، بھتیجے اور چچیرے بھائی وغیرہ شامل ہیں۔ ریگستان سینائی کے ضلع البردویس میں واقع ایک دوسرے کیمپ میں رکھا گیا ہے۔ ان لوگوں کا قصور یہ ہے کہ وہ مشتبہ اشخاص کے رشتہ دار ہیں۔

اب فوجی کیمپوں اور ان کے مخصوص علاقوں میں جس طرح تلاشیاں لی جاتی ہیں اس سے بھی اسرائیلیوں کی دہشت بربریت آشکار ہوتی ہے۔ بعض اوقات عورتوں کو تلاشی کے بہانے بالکل برہنہ کر دیا جاتا ہے اور اس برہنگی کی حالت میں انھیں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا جاتا ہے ایسا ہی سلوک انھوں نے ان عرب نرسوں کے ساتھ کیا جو ہسپتال جا رہی تھیں ...

لیکن بین الاقوامی مداخلت کے نتیجہ میں بڑی شاہراہوں پر ایسا کرنا بند کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں اور محلوں میں اب بھی اس قسم کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ عورتوں کے زیورات اور ان کی گھڑیاں وغیرہ دن دھاڑے چھین لی جاتی ہیں اور بعض اوقات گھر کا تمام سامان تباہ کر دیا جاتا ہے۔

ایک ڈاکٹر نے جو غزہ کی پٹی میں کام کرتا تھا بتایا کہ ایک شخص میرے پاس لایا گیا جس کی دونوں ٹانگوں میں زخم تھا اس کی ایک ٹانگ بے کار ہو چکی تھی میری تجویز تھی کہ اگر اسے اسرائیل کے اشکیلان ہسپتال میں بھیج دیا جائے تو اس کی دوسری ٹانگ بچ سکتی ہے لیکن اسرائیلی فوجیوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا نتیجہ میں اس کی دوسری ٹانگ بھی ضائع ہو گئی۔

اور اسی قسم کے مظالم ہیں جو غزہ کے باشندوں پر توڑے

اسرائیلی فوج عرب مکان میں ... کر اس کے مکین پریشان کر رہے

جا رہے ہیں کسی بھی عرب باشندے کی زندگی محفوظ نہیں۔ پچھلے دنوں سرحدی دستوں کے سپاہیوں کو جنھیں گرین بیرٹ کہا جاتا ہے، پولیس کے فرائض انجام دینے کے لئے غزہ کی پٹی میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ سپاہی اپنے مظالم کیلئے عام طور پر بدنام ہیں۔ سڑکوں پر فائرنگ کرنا، پر امن شہریوں کے مکانوں پر حملہ کرنا اور فائرنگ کرنا ان کے لئے عام بات ہے۔ کفر قاسم میں حال ہی میں انھوں نے ۴۹ اشخاص کو شہید کر دیا۔ جو فوجی افسر (کرنل شادمی) اس ...

صرف ایک گورا (ایک سینٹ) جرمانہ کیا گیا۔

لیکن ان تمام مظالم اور وحشت و بربریت ... اسرائیل کے خلاف سب سے زیادہ جذبہ غزہ میں پایا جاتا ہے۔ غزہ کے لوگ اسرائیل کے خلاف ... لڑ رہے ہیں۔ تازہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے ... پسندوں کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ ... کر اسرائیلیوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اپنے ان حملوں میں ... بموں اور رائفلوں سے کام لیتے ہیں۔

غزہ کے لوگوں کی جنگ آزادی حقیقت میں تمام ... کے لئے حوصلہ افزا ہے۔ اسرائیلی قابض حکام کی ... انتقامی کارروائیوں کے باوجود غزہ کے باشندے دشمن سے ٹکر لے رہے ہیں اس سے ان کی جرأت کا پتا چلتا ہے ان کی یہ تحریک آزادی اپنے پیچھے ایک طویل تاریخ رکھتی ہے۔ برطانوی انتداب کے دور میں تمام فلسطینیوں میں غزہ کے لوگ بھی شامل ہیں آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، اور آج بھی یہ جنگ لڑ رہے ہیں اور اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

"بنگلادیش" کو تسلیم کر دیا جائے

اسرار عظمت

بانگلا دیش کی ٹریجڈی کو شروع ہوئے اب تقریباً پانچ ماہ گزر چکے ہیں۔ اس قلیل عرصے میں قتل و غارت گری کے جو رکارڈ وہاں قائم کئے گئے ہیں انھیں دیکھ کر مہذب دنیا تھرا اٹھی ہے۔ اس قتل عام میں عورتوں اور بچوں تک کو نہیں بخشا گیا۔ عورتوں پر وہ ظلم کئے گئے جنھیں دیکھ کر شیطان بھی شرما جائے۔ پاکستانی فوجیوں نے ظلم و ستم کے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے جنھیں سن کر لرزہ طاری ہو جاتا ہے چنگیز اور ہلاکو کی روحیں بھی قتل و خون کے اس بازار کو دیکھ کر شرما گئی ہوں گی۔ ہٹلر بھی سڑکوں پر سڑتی ہوئی ان انسانی لاشوں کو دیکھتا تو کانپ اٹھتا۔ لاکھوں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار کر بھی پاکستانیوں کی خون کی پیاس نہیں بجھی ہے، اور شاید اس وقت تک نہ بجھے گی جب تک ایک بھی بنگالی زندہ رہے گا۔

اس وحشیانہ قتل عام کو دیکھ کر کوئی بھی انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، چاہے وہ کسی بھی نسل، قوم اور رنگ سے تعلق رکھتا ہو، دنیا کے کسی بھی گوشے میں رہتا ہو۔ پھر ہندوستانیوں اور بنگالیوں کا خون کا رشتہ ہے۔ ملک کی تقسیم سرحد کی یہ چھوٹی سی لکیر دلوں کے ٹکڑے نہیں کر سکتی ... تقسیم کر سکتی ہے۔ اس فرضی لکیر کے وجود میں ... مسئلے کو حل کرتے وقت ہندوستان

آنے سے ہماری اس بے پناہ محبت میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے جو ہمیں اپنے بنگالی بھائیوں سے ہے۔ اپنے بھائیوں کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر ہم لوگوں میں جو ردِ عمل ہوا ہے وہ بالکل مناسب اور فطرت کے عین مطابق ہے۔

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اس نے جنگ آزادی کی، خواہ وہ کسی ملک کی بھی ہو، ہمیشہ حمایت کی ہے۔ چنانچہ بانگلا دیش کے جمہوریت پسند عوام کی آزادی کی جد و جہد میں بھی وہ ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے، جو انسانیت کا تقاضا ہے۔

ادھر کچھ عرصے سے بڑے شور و زور سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان بانگلا دیش کو تسلیم کرے اور اس کی امداد کرے۔ یہ مطالبہ کرنے والوں میں عوام، طلباء، ادیب شاعر، مفکر، مدبّر، لیڈر اور سیاستداں سبھی شامل ہیں۔ آئے دن مختلف سماجی اور تہذیبی اداروں کی طرف سے مسز اندرا گاندھی کو یادداشتیں دی جاتی ہیں۔ ہر روز اخبارات میں کسی نہ کسی اہم شخصیت کا بیان شائع ہوتا ہے جس میں وزیر اعظم سے اپیل کی جاتی ہے کہ بانگلا دیش کو تسلیم کرنے میں ہندوستان پہل کر کے دوسرے ممالک کے سامنے ایک اچھی مثال قائم کرے۔

جہاں تک بنگالی عوام کا تعلق ہے، ہماری محبت اور ہمدردی بالکل فطری ہے۔ اور یہ ہماری دلی خواہش ہے کہ بنگالیوں کو اس عذاب اور پاکستانیوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں اور ان کی جد و جہد آزادی میں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ لیکن بانگلا دیش کو تسلیم کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا ہی ٹیڑھا مسئلہ ہے جسے حل کرنے میں سیاسی سوجھ بوجھ اور سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ سیاسی پالیسی کی بنیاد محض جذبات پر نہیں

کو پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ ہندوستان کی ذرا سی لغزش بھی بین الاقوامی سطح پر اس کی پوزیشن کو سخت نقصان پہنچا سکتی ہے۔

اس مسئلے پر ہندوستان کو بڑی طاقتوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ جو اس مسئلے پر یا تو بالکل خاموش ہیں یا مبہم اور ناقابلِ فہم رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ ملک ہر اعتبار سے ہندوستان سے زیادہ دولت مند اور طاقتور ہیں۔ اپنے کسی مسئلے کے حل کے لئے انھیں دوسروں پر منحصر نہیں رہنا پڑتا اگر بانگلا دیش کے مسئلے پر وہ کوئی غلط اقدام کر بھی جائیں، تو انھیں اس قدر شدید نقصان نہ پہنچے گا جتنا کہ ہندوستان کو پہنچنے کا امکان ہے۔ کیونکہ ہندوستان کو اپنے معاشی مسائل، صنعتی ترقی، غرض کہ ہر مسئلے کے حل کے لئے دوسرے ملکوں کی طرف پر امید نظروں سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس مسئلے پر ان طاقتور اور خود کفیل ممالک کی خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس مسئلے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ بانگلا دیش کے سلسلے میں کوئی غلط اقدام کر کے وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔

ہندوستان کی سرحدیں بانگلا دیش اور پاکستان سے ملتی ہیں۔ اس لئے ہندوستان کو اس سلسلے میں فیصلہ کرنے سے قبل کافی غور و خوض کرنا ضروری ہے۔ اس کے کسی بھی غلط اقدام سے برصغیر کا امن و سکون درہم برہم ہو سکتا ہے۔ چین جو ہندوستان کو اپنا بدترین دشمن سمجھتا ہے بانگلا دیش کو ہندوستانی امداد ملتے ہی پاکستان کی امداد میں اضافہ کر دے گا وہ کسی صورت میں بھی یہ برداشت نہ کر سکے گا کہ اس کے حلقۂ اثر میں ہندوستان اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کرے۔ اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پاکستان کو اپنے آقاؤں سے ذرا سی شہ مل جائے تو وہ ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ حالانکہ اس نے

ر ایسا کیا تو سب سابق سے تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑیگا
بن یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کو
ی شدید مالی اور جانی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا۔
ین اور پاکستان کی پچھلی جنگوں نے جو برے اثرات ہندوستان
، معیشت پر ڈالے ہیں وہ ہی اب تک پوری طرح دور نہیں
ر سکے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر پھر جنگ ہوئی تو ہندوستان
نعتی ترقی میں پھر کم از کم دس سال پیچھے چلا جائے گا غیر و
رش کی اشیاء، کپڑے اور دیگر ضروری چیزوں کی قیمتوں میں
ا اضافہ ہوگا اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان کو چینی امداد کی صورت میں "توازن طاقت"
، خاطر اب ہندوستان کو چین مخالف ممالک سے امداد ملنے
، توقع نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ چین آج کل مغربی ممالک کے
لئے ہوا بنا ہوا ہے۔ اور مغربی ممالک اس کوشش میں ہیں
ین سے کسی معاملے میں نہ الجھیں۔ بانگلا دیش میں پاکستان
ا بربریت کے باوجود مغربی ممالک کی خاموشی یا لاتعلقی اس
ت کا ثبوت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں چین کے بڑھتے
ہوئے اثرات کو دیکھ کر مغربی ممالک کچھ مرعوب سے ہوگئے
یں اور انھوں نے تہیہ کرلیا ہے کہ چین کے اس بڑھتے ہوئے
ر کو روکنے کی کوشش کرنے کی بجائے چین سے سمجھوتہ کرلیں
ریکا جو چین کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتا تھا چین سے
لقات استوار کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اور اب ایسا
سوس ہونے لگا ہے کہ اگلے چند برسوں میں عالمی سیاست
، کوئی غیر معمولی تبدیلی رونما ہوگی۔

اور اگر یہ فرض بھی کرلیا گیا کہ برصغیر میں طاقت کے
توازن کی خاطر کوئی ملک ہندوستان کو امداد دینا شروع کریگا
تب بھی ہندوستان کو جو غیر معمولی نقصانات ہوں گے انھیں
نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ بانگلا دیش یا
ہندوستان اور پاکستان کی جنگ میں چین اور دنیا کی کوئی
دوسری بڑی طاقت شامل ہوجائے گی تو برصغیر دوسرے ویتنام
میں تبدیل ہوجائے گا۔ کیونکہ جب دو بڑی قومیں جنگ میں شامل
ہوتی ہیں وہاں پھر جنگ کا فیصلہ کسی ایک کے حق میں ہونا ناممکن
ہوجاتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ ہندوستان جیسا غریب اور تباہ حال
ملک کسی ایسی جنگ میں الجھ گیا جو ویت نام کی طرح طول پکڑ جائے
تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا تصور ہی لرزہ براندام کردینے کے
لئے کافی ہے۔

بانگلا دیش کو تسلیم کرلینے سے ہندوستان کا دوسرا بڑا
نقصان یہ ہوگا کہ مشرقِ وسطیٰ اور دوسرے مسلم ممالک ہندوستان
کے خلاف ہوجائیں گے۔ یہ ممالک ابھی اتنے روشن خیال نہیں
ہوئے ہیں کہ بانگلا دیش کو تسلیم کرلینے کو ایک انسانی (بلکہ
مذہبی بھی) فریضہ سمجھ سکیں۔ وہ پاکستان کو ہی حق پر سمجھتے ہیں۔
ایک مسلم ملک ہونے کی حیثیت سے ان ممالک میں پاکستان کی ویسے
بھی بڑی اچھی پوزیشن ہے۔ پاکستان ان ممالک میں ہندوستان کے
خلاف ایسا پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے جس سے وہاں کے عوام
پہلے سے ہی ہندوستان سے متنفر ہیں۔ بانگلا دیش کو تسلیم کرنے
اور اُسے فوجی امداد دینے کی صورت میں پاکستان سے ہندوستان
کی جنگ یقینی ہے اور اس صورت میں یہ مسلم ممالک اس مسئلے کو
"اسلام کے تحفظ" کا مسئلہ بنالیں گے، اور ہندوستان کے خلاف
وہاں نفرت کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ اس صورت میں ان مسلم
ممالک سے ہندوستان کی تجارت کا متاثر ہونا یقینی ہے۔ اس
سے جو بھاری نقصان ہندوستان کو پہنچے گا اس کے برے
اثرات ہندوستان کی معیشت پر مرتب ہونگے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس آزمائشی وقت میں ہمکو
مسز اندرا گاندھی کی قیادت حاصل ہے۔ شاید ان سب گمبھیر
مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور سچویشن کی نزاکت کو محسوس
کرتے ہوئے انھوں نے باوجود غیر معمولی سیاسی اور اخلاقی دباؤ
کے، بانگلا دیش کو اب تک تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ
بانگلا دیش کے عوام کے تحفظ کی خاطر ہندوستان کے
کروڑوں عوام کے مفاد کو خطرے میں ڈالنے کا ان کو کوئی حق
نہیں ہے۔ یقین ہے کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی غیر دانشمندانہ
قدم نہ اٹھائیں گی۔

بانگلا دیش کے لئے ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ انکے
لئے اپنی عمیق ہمدردی اور محبت کا اظہار کریں۔ ان پر ہونے
والے مظالم کی تشہیر کرکے ان کے حق میں عالمی رائے کو متحرک
کرنے کی کوشش کریں ــــــ لیکن جہاں تک بانگلا دیش
کو تسلیم کرنے اور اُسے فوجی امداد دینے کا تعلق ہے، ہم اس
سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔ اور اگر ہم اس سلسلے میں اپنی حیثیت
سے زیادہ کچھ کرنے کی کوشش کریں بھی تو یہ ہمارے ساتھ ساتھ
خود بانگلا دیش کے حق میں بھی ضرر رساں ثابت ہوگا۔ جب تک
بڑی طاقتیں اس معاملے میں دخل نہ دیں، یہ مسئلہ ہرگز ہرگز
حل نہیں ہوسکتا۔

بنگلادیش کے بارے میں اردو کے ممتاز صحافیوں کے تاثرات

آخر جون اور آغاز جولائی
ہندوستان بھر
ممتاز مسلم صحافیوں کی جس جماعت نے
کا گزشتہ دورہ
بلا واسطہ ان کے حالات
مطالعہ کیا ——
میں سے بعض محترم صحافیوں نے اپنے تاثر
چھوڑ ہماری درخواست پر واقعات کے لئے
عنایت فرمایا ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ
کے قارئین کر رہے ہیں —— ادارہ

مشرقی پاکستان کے تم رسیدہ پناہ گزین

مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۰۰ لاکھ کے قریب ہو چکی ہے۔ سب سے بڑی تعداد بنگال میں ہے پھر آسام اور تریپورہ میں ایسے لوگ بہار میں ہیں اور کچھ مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر میں منتقل کئے گئے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اس تعداد میں نصف سے زیادہ کیمپوں میں مقیم اور باقی اپنے طور پر بستیوں اور قصبوں میں قیام پذیر ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان کی سرحدوں پر آنے والوں کا چونکہ شمار نہیں ہو سکا اسلئے ان اعداد کی صداقت پر پورا اعتماد کرنا مشکل ہے پھر کیمپوں کے باہر جو تعداد رہ رہی ہے اس کے سلسلے میں مستند تصدیق کرنا اور بھی مشکل ہے تاہم پناہ گزینوں کی کمی بیشی کا اصل سوال کی سنگینی پر اثر نہیں پڑتا۔ جو لوگ بھی مجبور ہو کر ترک وطن پر مجبور ہوئے ہیں انھوں نے یہ اقدام یقیناً بے بسی کے عالم میں کیا ہے اور اس لیے وہ ہندوستان اور دنیا کے ہر شہری کی امداد و ہمدردی کے مستحق ہیں۔

بھارتی حکومت ان پناہ گزینوں کو راشن دے رہی ہے ان کے لیے عارضی مکانات بنا دیے گئے ہیں علاج کا بھی کافی انتظام کیا گیا ہے لیکن یہ امداد کب تک دی جا سکتی ہے اور یہ پناہ گزیں اس سے بہت دیر تک کیسے جی سکتے ہیں اسلئے اصل سوال یہ ہے کہ ان پناہ گزینوں کے مسئلے کا کیا حل ہو۔ ہمارے اندازے کے مطابق کیمپ میں رہنے والے ۹۹ فیصد لوگوں کا یہی خیال ہے کہ اگر ان کے جان و مال کی حفاظت کا یقین ہو تو وہ اپنے وطن واپس جانے کیلئے تیار ہیں۔ ان کیمپوں میں پاکستانی فوجوں کے ہاتھوں بلاواسطہ جبر و قہر کا شکار ہونے والوں کی تعداد بہت کم تھی البتہ زیادہ تر لوگ وہ تھے جو فوج کی آمد کا سن کر گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایسے لوگ بھی تھے جنھیں فوج نے گھیرے میں لے کر ہندوستان کی طرف دھکیل دیا اور جتنا سامان وہ ہاتھوں اور کندھوں پر لا سکتے تھے لے آنے دیا۔ ان سب افراد کو فوج سے خوف ہے اور برابر یہ داستانیں اب بھی ان کے وطن سے آنے والوں کے ذریعے کانوں میں پہنچ رہی ہیں کہ اگر وہ اپنے گھروں کو واپس ہوئے تو ان کا حشر اچھا نہیں ہوگا۔ اس حالت میں ان کا واپس جانا قطعاً محال نظر آتا ہے جب تک کہ کوئی ایسا ملک بیچ میں نہ پڑے جس پر انھیں اعتماد ہو اور جو عزت اور احترام کے ساتھ انھیں ان کے گھروں تک لے جا کر بسا سکے۔

راقم السطور کے خیال میں اصلاح کی ایسی اقوام متحدہ ہو سکتی ہے یا پھر کوئی ایسا ملک جس پر حکومت پاکستان اور حکومت ہند دونوں کو اعتماد ہو یہ کام مسلمانان ہند کے کسی غیر بنگالی وفد کے ذریعہ بھی انجام پا سکتا ہے اور ہم سے یہی آخری بات زیادہ تعلق رکھتی ہے کتنا اچھا ہوتا اگر مسلمانان ہند کے ذمہ دار لیڈروں پر مشتمل کوئی غیر بنگالی وفد پاکستان جاتا اور واپسی کے اس مسئلے کو اطمینان بخش طور پر حل کرنے کی کوشش کرتا۔

ہند پاک تعلقات اس وقت کشیدگی کے نقطۂ عروج پر ہیں۔ مگر اس تلخی کو بہرحال کم ہونا چاہیے۔ اور اس کا آغاز اسی طرح ہو سکتا ہے کہ پناہ گزینوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہو۔ ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی امنگیں پوری ہوں تو اسکا بھی امکان اسی وقت ہے جب وہ باشندے اپنے وطن واپس ہوں اور وہیں رہ کر پر امن جدوجہد کریں ان عوام کی امنگوں کو زیادہ دیر تک دبایا نہیں جا سکتا اور جب بھی جمہوری نظام وہاں قائم ہوگا انکی تمنائیں پوری ہو کر رہینگی۔ ہاں جلاوطنی کے عالم میں ان کی تکمیل آسان نہیں۔ ان پناہ گزیں بھائیوں اور بہنوں کی حالت بہت دردناک ہے اور وہ ہماری ہمدردیوں کے پورے پورے مستحق ہیں۔ اسوقت انھیں کپڑوں، دواؤں، ڈاکٹروں اور رضاکارانہ خدمت انجام دینے والے کارکنوں کی شدید ضرورت ہے۔ اور انکی یہ ضرورت جلد از جلد پوری کی جانی چاہئیے۔ اس وقت جگہ جگہ امدادی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں انکے ساتھ تعاون کی ضرورت ہے اور کمیٹیوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی امداد لیتے وقت مدات مقرر کریں تاکہ جو شخص جس ضرورت کو زیادہ اہمیت دے اس کی رقم وہیں صرف کی جا سکے۔ محمد مسلم (ایڈیٹر سہ روزہ دعوت دہلی)

ہمیں ہماری مسکراہٹیں واپس کرو

لٹے ہوئے ان قافلوں کو میں نے دیکھا ہے جو مشرقی بنگال سے پاکستانی فوجیوں کی بربریت اور سفاکی کا شکار ہو کر تہذیب و شرافت اور اخلاق و انسانیت کو حسرت بھری نگاہوں سے تک رہے تھے ——— ان قافلوں کی دردناک داستانوں سے انسانیت و شرافت کے مدعی بہرے بنے، بہت کوشش کی گئی کہ یہ جگر خراش کہانیاں "پدما" اور "میگنا" کی گہرائیوں میں خاموش ہو جائیں، کوئی نہ جانے ——— لیکن اتنا بڑا گناہ کہاں چھپایا جا سکتا ہے "انسانیت کے قتل پر" پردہ ڈالنے کی کوشش کیسے

کامیاب ہو سکتی ہے ــــــ دنیا نے جان لیا ہے کہ مشرقی بنگال میں مغربی پاکستان کے بے دماغ فوجی حکمرانوں کی دہشت پسندانہ پالیسی نے تباہی و بربادی کے ایسے الاؤ جلا رکھے ہیں جہیں سب کچھ جل چکا ہے، اس انسانیت سوز آتش زنی میں جان و مال، عزت و آبرو، سبھی کچھ نذر آتش ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئے ــــــ جب انسان بھڑیے بن گئے، معصوموں کا تقدس تار تار ہو گیا، اور جب ماؤں کی گودیں ویران ہو گئیں، پالنے سونے پڑ گئے، اور سہاگ کی چوڑیاں عفت و شرافت اور معصومیت کے خون میں نہا کر ٹوٹ گئیں تو پھر باقی کیا رہا ــــــ

لیکن کیا انصاف کی طاقتیں ظلم و ہوس کی اس بھیانک خون آشام سفاکی پر خاموش رہ سکیں گی؟ کیا ظلم و گناہ کی اس بدترین انسانیت سوز شرمناک کارروائی برداشت کر لیا جائے گا..

ــــــ نہیں، ہرگز نہیں ــــــ تاریخ کی عدالت میں یہ مجرم کبھی بخشے نہیں جائیں گے، کبھی معاف نہیں کیے جائیں گے۔ اب تک یہی ہوتا آیا ہے کہ ظلم کی بنیادوں سے مزاحمت کی قوتیں ابھری ہیں، جبر کی سطوت سے انھوں نے پالا لیا ہے، اور بالآخر مظلومیت کی پکار کو فتح حاصل ہوئی ہے، ظفر و کامرانی نے اس کے قدم چومے ہیں۔

اور پھر ــــــ برباد بستیوں کے خاکستر میں ابھی چنگاریاں باقی ہیں، جو ظلم و جبر کے لیے آتش فشاں بننے کو مچل رہی ہیں ــــــ میں نے ان نوجوانوں کو دیکھا ہے، جو اپنی بربادی پر دل گرفتہ ضرور ہیں، لیکن جن کے دلوں میں لاوا ابل رہا ہے۔ میں نے ان کے وہ تیور بھی دیکھے ہیں، جن کے عزم و ارادے کا استحکام بڑی سے بڑی ظالمانہ قوت کے لیے شکست و ریخت کا سامان پیدا کر سکتا ہے ــــــ کیا بچے، کیا بوڑھے اور کیا جوان سبھی تیار ہیں۔ سبھوں نے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ پاکستانی بربریت کے جبر و تشدد کو ختم کر کے رہیں گے ــــــ مشرقی بنگال کے عوام کی مرضی کی مانگ کے شعلوں کو زیادہ دبایا نہیں جا سکتا ــــــ ان کے استحصال پر پاکستانی حکمرانوں کی کرسی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی ــــــ ظلم سے جو حق ہوا کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ اُسے گناہ ہے، اور اس کے کھنڈر پر عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کی نئی تعمیر ہونی ہے ــــــ

کوئی بتلائے کہ کیا یہ کہنا جرم ہے کہ "ہمیں ہمارا حق دیجیے" "ہمیں ہماری محنت دیجیے" اور ہمیں ہماری مسکراہٹیں واپس کیجیے ــــــ شیخ مجیب الرحمٰن نے اور ان کے ساتھیوں نے مشرقی بنگال

باقی صفحات آخر پر

کے جہاں کے عوام نے اور اس کے سوا کیا کہا تھا؟ ــــــ اس جرم کی اگر یہ پاداش ہے تو مشرقی بنگال کے عوام شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت میں یہ گناہ بار بار کرتے رہیں گے اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک کہ ظلم کی تقدیر اپنے کیے کی سزا نہ پالے اور مظلومیت کی پامردی فوجی آمریت کے نشے کو چکنا چور کر دے۔

سید احمد ہاشمی (الجمعیۃ دہلی)

جہاں انسانیت سرنگوں ہو گئی

مغربی بنگال کے اسلام پور سب ڈویژن میں اصل آبادی سے ۱۴ میل دور مشرقی بنگال کی سرحد سے متصل ناگر ندی کے کنارے مورا گنج کیمپ میں سرحد پار سے لٹ پٹ کر آئے ہوئے تباہ حال لوگ ۲۰ ہزار کی تعداد میں پناہ گیر ہیں۔ جن کو الگ الگ جھونپڑوں میں چھپروں اور چٹائیوں سے بنے مکانوں میں رکھا گیا ہے۔ جھونپڑوں کی قطار در قطار چلی گئی ہے ہر جھونپڑے میں ایک خاندان آباد ہے۔ اور جو سرحد پار کر ان جھونپڑوں میں پناہ گیر ہونے کے بعد اپنے جان و مال اور اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت و آبرو کے سلسلے میں کسی خوف اور اندیشے میں مبتلا نہیں اور تمام کٹھنائیوں کا سامنا کرنے کے باوجود اس یقین کی شمع اپنے دلوں میں روشن کیے ہوئے ہیں کہ ان کا پیارا وطن اُن کا "سونا بنگلہ دیش" ضرور آزاد ہو گا۔ اور وہ اپنی دلکش اور سرسبز سرزمین پر جا کر دوبارہ عزت، فخر اور سکون کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار سکیں گے۔ یہ بھولے بھالے لوگ نہ تو سیاست کی فسوں کاری کا شکار ہیں یا وہ زبان و مذہب کے نام پر کسی سے نفرت کرنے والے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ انہیں ایسی کسی بات کا پتا ہی نہیں مگر پھر بھی پاکستانی فوج نے ان پر بے پناہ مظالم توڑے، ان کی بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں اب وہاں کوئی جاندار شے حرکت کرتی نظر نہیں آتی۔ انسانی جانوں کا بے دریغ اتلاف، تباہی اور غارت گری کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ پناہ گزینوں کی حالت دیکھ کر پاکستانی فوج کے خلاف ان کے دلوں میں پلنے والی شدید نفرت کا اندازہ ہوا۔ انھیں اس کا غم تھا کہ بہت سارے لوگ بے قصور مارے گئے انھیں سب سے زیادہ غصہ اس پر تھا کہ ان کی ماؤں بہنوں کی آبرو لوٹی گئی۔ اور ظالم فوجیوں کا کلیجہ پھر بھی نہیں بھرا۔ فوج جس جس گاؤں سے گزری، قتل و غارت گری کا سلسلہ قائم کرتی چلی گئی۔ جو جانے گولی کا نشانہ بن گیا، کیا عالم کیا جاہل، کیا سیاست داں اور کیا ان پڑھ کسان۔ فوج نے کوئی تمیز نہیں رکھی۔ گھروں کو پھونک دیا گیا اور سامان لوٹ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے گاؤں والے بھی خوف و دہشت کے عالم میں بھاگ کر ہندوستان آ گئے۔ مورا گنج کا کیمپ بہت ہی صاف ستھرا تھا۔ مقامی ایڈمنسٹریشن کے کارکنوں اور خود پناہ گزینوں نے بڑی محنت سے اس کیمپ میں صفائی رکھی ہے۔ ان پناہ گزینوں سے مل کر مجھے اس کا یقین ہو گیا کہ پاکستان کی فوجی حکومت سے ان کے دلوں میں جو نفرت بیٹھ گئی ہے اسے کوئی طاقت دور نہیں کر سکتی۔ ان کو بس اسی سے اطمینان ہو سکتا ہے کہ ان کا بنگلا دیش آزاد ہو جہاں ان کی اپنی حکومت ان کے جان و مال اور عزت کی ضمانت دے سکے گی۔ انھیں اس بات کا شدت سے انتظار ہے اور اسی صورت میں وہ اپنے وطن واپس جانے کا عزم مصمم دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ پاکستانی حکمرانوں کی ٹولی کے انسانیت سوز مظالم پر بلاشبہ پوری انسانیت شرمسار اور سرنگوں ہو گئی ہے۔

شمس الزماں (آنند بازار پتریکا، کلکتہ)

ایڈگر ایلن پو اپنی شاعری اور پراسرار کہانیوں کے سبب انگریزی ادب میں ایک منفرد مقام کا مالک ہے اسے امریکی ادب کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اسے ورجینیا یونیورسٹی سے اس لئے نکال دیا گیا کہ وہ شراب اور جوئے کی علت میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا۔ بعد میں ویسٹ پوائنٹ اکیڈمی میں اس کا بار بار کورٹ مارشل کیا جاتا اور انجام کار اسے وہاں سے اس بنا پر نکال دیا گیا کہ وہ ملٹری کے تمام ضوابط نظر انداز کر کے اپنے کوارٹر میں بیٹھا شعر لکھتا رہتا تھا اور کبھی پریڈ پر حاضر نہ ہوتا تھا۔

پو ابتدائی زندگی میں ہی یتیم ہو گیا تھا۔ تمباکو کے ایک

کا خیال ہے کہ وہ بھی نیم پاگل تھا۔ وہ عمر میں اپنی بیوی سے دوگنا تھا۔ وہ ۲۶ برس کا تھا اور اس کی بیوی ۱۳ سال کی۔ لوگوں کی پیش گوئیوں کے مطابق اس کی شادی کا رشتہ جلد قطع ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن ایسا نہ ہوا اور وہ بڑی کامیاب بیوی ثابت ہوئی۔ پو اپنی بیوی کا بچے کی پرستش کرتا تھا اور اس کی غیر فانی محبت نے اس سے بعض ایسی نظمیں لکھوائیں جو انگریزی ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور جنہوں نے انگریزی ادب میں ایک نیا اضافہ کیا۔

ایڈگر ایلن پو نے ایسی کہانیاں اور نظمیں لکھیں جو ادبی خزانہ تصور کی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود ان غیر فانی شہ پاروں کے

پو اپنی نظموں کے پہلے مجموعے "زاغ" پر دس برس تک محنت کرتا رہا۔ وہ اس مجموعے کی نظموں پر بار بار نظر ثانی کرتا۔ اس کے باوجود اس نے مجبوراً یہ مجموعہ فقط دو پونڈ میں فروخت کر دیا۔ بالی وڈ کا نامور ایکٹر جون بیری مور اپنی ایک منٹ کی خدمات کا معاوضہ اس سے زیادہ لیتا تھا۔

پو کو "زاغ" کے فقط دو پونڈ ملے لیکن حال ہی میں پو کا اصلی مسودہ ایک لاکھ پونڈ میں فروخت ہوا ہے۔ ایسا کیوں؟ اس لئے کہ ہماری عظیم شخصیتیں اپنی زندگی میں تو فاقے کرتی ہیں لیکن جب وہ مر جاتی ہیں تو ان کے شہ پاروں کو لوگ گراں قیمتوں پر خریدنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

ایڈگر ایلن پو

دنیا کے نامور مصنفین سے ملاقات

چھبیس برس کی عمر میں وہ اپنی بیوی سے دوگنی عمر کا تھا۔ اسے اپنی دس برس کی محنت کا معاوضہ صرف دو پونڈ ملا

بیوپاری نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ آخر تاجر بھی اس کی عیب جوئی کے باعث اس کے خلاف ہو گیا اور اس نے پو کو گھر سے نکال دیا۔ اسے اپنی جائداد سے الگ کر دیا اور اپنے وصیت نامے میں لکھ گیا کہ اسے اس کے سرمائے میں سے حصہ نہ دیا جائے۔

پو کی شادی کی کہانی غریب صورت اور کہانیوں میں شمار ہے۔ اس نے اپنی چچازاد بہن ورجینیا کلم سے شادی کی۔ شادی کے وقت وہ مفلوک الحال تھا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور اسے آمدنی کی امید بھی نہ تھی۔ وہ ہماری شراب کا عادی تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ پاگل تھا اور بعض لوگوں

غرض اسے اتنے پیسے بھی نہ ملتے تھے کہ وہ روٹی کا ٹکڑا بھی خرید سکے۔ مثلاً اس نے دنیا کو ذیل کی بے مثال نظم دی۔

میرے مکان کے دروازے کے پاس
پالاس کے مجسمہ گنبد پر
کوا ابھی تک بیٹھا ہوا ہے
وہ اڑنے کا نام نہیں لیتا
اس کی آنکھیں خواب دیکھنے والے کسی عفریت
سے مشابہ ہیں
اس کے سر پر لیمپ کی روشنی
فرش پر اس کے سائے کو نمایاں کر رہی ہے

نیویارک میں گرینڈ کنکورس میں وہ مکان ابھی تک موجود ہے جہاں پو اور اس کی بیوی ورجینیا رہا کرتے تھے۔ سو برس پہلے جب پو نے وہ مکان کرائے پر لیا تو اس کی حالت بہت خستہ تھی اور وہ گرنے کے قریب تھا لیکن اب یہ چند قابل ذکر خوبصورت عمارتوں کے درمیان کھڑا ہوا ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا اور اسے سیب کے درختوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اور جب جنوب سے کارولینا کی ہوا پھولوں کی مہک لے کر چلتی اور ہر طرف شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ سنائی دیتی تو یہ جگہ جنت کا جزیرہ معلوم ہوتی۔ پو نے یہ مکان اس لئے کرائے پر لیا تھا کہ

بقیہ صفحہ

ارشاد پنجتن جس کا جسم ایک مصور کا برش ہے

شاہد صدیقی

ارشاد پنجتن پتنگ اڑا رہے ہیں

اسکول سے واپس آتے وقت ہماری بس کناٹ پلیس سے گزرا کرتی تھی۔ کناٹ پلیس میں ہر دو قدم پر لال بتی لگی ہوئی ہے۔ بس ذرا چلی اور لال بتی روشن ہو گئی۔ بس کو رک جانا پڑا۔ ہم لوگ باہر گردن نکال کر سڑک پہ لگے ہوئے بے شمار پوسٹروں کو دیکھنے لگتے تھے۔ ان پوسٹروں میں ایک دن ہمیں ایک بڑا عجیب پوسٹر نظر آیا۔ پوسٹر پہ ایک انسان کی بڑی مضحکہ خیز شکل بنی ہوئی تھی۔ جس کے نیچے موٹے موٹے حرفوں میں انگریزی میں لکھا ہوا تھا "ارشاد پنجتن آپ کے شہر میں" پورے کناٹ پلیس کی دیواریں اس پوسٹر سے چھپی پڑی تھیں۔ اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لیکن نام کچھ ایسا عجیب و غریب تھا کہ ذہن سے چپک کر رہ گیا۔

کئی سال بعد پہلی بار ارشاد پنجتن سے ملنے کا اتفاق دہلی کے سپرو ہاؤس میں ہوا۔ چھوٹا سا قد۔ دبلا پتلا جسم۔ گھنگریالے بال۔ چھوٹا سا چہرہ، شکنوں اور جھریوں سے بھرا ہوا۔ بڑی سی ناک۔ یہ تھے دنیا کے مشہور مائم (Mime) آرٹسٹ سے ملاقات نہ رہا۔ ارشاد پنجتن۔

آپ میں سے کتنے ہی لوگ "مائم" لفظ پڑھ کر چونکے ہوں گے۔ آیئے آپ کو پہلے اس عجیب و غریب آرٹ کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے۔ مائم نہ تو ڈراما ہے، نہ ڈانس اور نہ مونو ایکٹنگ۔ یہ ان سب سے علیحدہ ایک آرٹ ہے۔ اس میں آرٹسٹ کے پاس صرف ایک اوزار ہوتا ہے، اور وہ اوزار ہے اس کا جسم۔ آرٹسٹ نہ تو قسم قسم کے لباس پہنتا ہے، نہ اسٹیج پر کسی قسم کی سیٹنگ ہوتی ہے اور نہ کوئی موسیقی۔ خالی اسٹیج ہوتا ہے جس پر آرٹسٹ جسم سے چپکا ہوا لباس پہن کر آتا ہے۔ لیکن یہ آرٹسٹ کا کمال ہوتا ہے کہ چند ہی لمحوں میں آپ کو اس کے چاروں طرف دیواریں، فرنیچر اور ہر وہ چیز نظر آنے لگتی ہے جو آرٹسٹ آپ کو دکھانا چاہتا ہے۔ وہ پتنگ اڑاتا ہے تو آپ کو پتنگ نظر آتی ہے۔ وہ گھوڑا سواری کرتا ہے تو آپ گھوڑا دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کا بوسہ لیتا ہے تو آپ کو واقعی اسکا محبوب نظر آنے لگتا ہے۔ وہ کمرے میں بیٹھتا ہے تو آپ کو اس کے چاروں طرف رکھا ہوا فرنیچر نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن ٹھہرئیے! ہم نے شاید کچھ غلط کہا۔ آپ کو ان میں سے کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ آپ ان چیزوں کو محسوس کرتے ہیں۔ آرٹسٹ اپنے جسم کی حرکتوں سے آپ کو ان چیزوں کا احساس دلاتا ہے۔ وہ فرضی پتنگ اس خوبصورتی

ارشاد پنجتن کے آرٹ کو سمجھنے کے لئے ان کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھنا ضروری ہے

سے اُٹھاتا ہے کہ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس کے ہاتھ میں پتنگ اور اس کی ڈور موجود ہے۔ وہ اپنے کو جیل کی کال کوٹھری میں بند کر لیتا ہے تو آپ کو لگتا ہے جیسے واقعی اس کے چاروں طرف اونچی اونچی مضبوط دیواریں ہیں اور وہ ان سے باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہے۔ لیکن باہر نکل نہیں سکتا۔

ارشاد پنجتن صحیح معنی میں ہندوستان کا پہلا مائم آرٹسٹ ہے۔ ارشاد کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ ۱۹ سال کی عمر میں اس نے حیدرآباد فلائنگ کلب سے گراؤنڈ انجینئر کا کورس پاس کیا لیکن وہ فلموں میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے بمبئی چلا گیا اور اور وہاں خواجہ احمد عباس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں ارشاد کو مائم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے شوقیہ مائم کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۵۸ء میں اس کی ملاقات اتفاقیہ طور پر فرانس کے مشہور مائم آرٹسٹ تھیو سے ہوگئی۔ تھیو سے ارشاد نے بہت کچھ سیکھا۔ دہلی میں ارشاد دنیا کے مشہور مائم آرٹسٹ مارسل مارسیو سے ملا۔ آج سے دس سال پہلے وہ پہلی بار اسٹیج پر آیا۔ اس کے آرٹ کو اتنا زیادہ پسند کیا گیا کہ اس کے بعد اس نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنے آرٹ کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ارشاد ابھی اپنے آرٹ سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے بہتر آرٹ کی تلاش میں بیس روپے لے کر دنیا کے سفر پر نکل پڑے۔ وہ پاکستان، افغانستان، عراق، شام، ترکی، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، آسٹریلیا اور جرمنی ہوتے ہوئے فرانس پہنچے۔ جہاں ان کے گرو مارسل مارسیو رہتے تھے۔ ارشاد نے مارسل مارسیو سے باقاعدہ تربیت لینے کی خواہش ظاہر کی لیکن مارسیو نے انھیں بتایا کہ وہ اب اس اسٹیج پر پہونچ چکے ہیں جہاں تربیت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے ارشاد کو اسٹیج پر دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ وہ کس طرح صرف اپنے جسم، منہ اور آنکھوں کے استعمال سے ایک دندان ساز کی دوکان کا منظر پیش کرتا ہے۔ کیونکہ ارشاد نے بھارت ناٹیم کی تعلیم بھی حاصل کی ہے اسلئے جسم اور آنکھوں کا استعمال دنیا کے دوسرے مائم آرٹسٹوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ ارشاد راشن کی دوکان کے باہر لگی ہوئی لائن کا منظر بہت [illegible] پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس طرح ڈرامے میں دیکھنے والوں کے لئے تمام الفاظ سننا بہت ضروری ہیں۔ اسی طرح مائم میں ان کے لئے آرٹسٹ کے جسم کی معمولی سی حرکت کو دیکھنا بھی بہت ضروری ہے۔"

راشن کی لائن والے مائم میں ارشاد اسٹیج پر آتے ہی ایک بہت ہی گھبرائے ہوئے شخص کا کیرکٹر پیش کرتا ہے جو تیزی سے راشن کی دوکان کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اچانک رک جاتا ہے اور اس کی نگاہ اس طرح سے دوڑتی ہے جیسے معلوم ہو کہ اس کے سامنے ایک بہت لمبی لائن لگی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور لٹکا ہوا جسم اس کے ناامید ہو جانے کا تاثر دیتا ہے۔ پھر اسی طرح لائن میں لگے لگے دوکان تک پہونچنے کے وقت تک لائن میں لگے ہوئے لوگوں سے جھگڑے اور پھر آخر میں دوکان کے دروازے تک پہونچتے پہونچتے اس آدمی کی جسمانی حالت کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔

پنّے اور تتلی کا مائم بھی ارشاد نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ایک ایسے بھوکے انسان کا تصور بھی جسے کئی روز کے بعد کھانے کو ملا ہو ارشاد نے حقیقت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ارشاد کا جسم ایک ایسا برش ہے جس کی مدد سے وہ منٹوں میں اسٹیج پر تصویریں بناتا چلا جاتا ہے۔ آپ ان تصویروں کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں۔ یعنی محسوس کرتے ہیں۔

ارشاد کے آرٹ میں مزاح کا عنصر بھی کافی حد تک شامل ہوتا ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت پر لوگ قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے ہر مائم کے خاتمے کے بعد ایک لمبے عرصے تک ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجتا رہتا ہے۔ لیکن ارشاد کا مزاح ہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مزاحیہ حرکات سے اس کو تالیاں اور قہقہے تو زیادہ مل جاتے ہیں لیکن اس سے اس کے آرٹ میں حقیقت کا رنگ کم ہو جاتا ہے۔ ایک مائم آرٹسٹ کی سب سے بڑی خوبی اس کے جسم کی ہر جنبش کا حقیقت سے قریب تر ہونا ہے۔ 'تتلی اور لڑکا' میں ارشاد نے ایک دس گیارہ سال کے لڑکے کی حرکات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ایک تتلی کو دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوتی ہے، وہ کیسے اس کے پیچھے بھاگتا ہے، تتلی ہاتھ نہ آنے پر اسے کس طرح مایوسی ہوتی ہے اور جب تتلی ہاتھ آجاتی ہے تو وہ کس طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن جب تتلی مر جاتی ہے تو بچے کی کیا حالت ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا مطالعہ ارشاد نے بہت گہرائی سے کیا ہے لیکن اس میں مزاح پیدا کرنے کے [illegible] وہ Over Act کر گیا ہے۔

ارشاد اگر چاہے تو وہ اپنے آرٹ کے ذریعے ہمارے موجودہ سماج کے انتشار اور موجودہ انسان کے ذہنی خلفشار کو بہت خوبصورتی سے پیش کر سکتا ہے۔ اس آرٹ سے شاید اس کے مداحوں میں تو کمی آجائے لیکن وہ موجودہ اسٹیج آرٹ میں ایک اہم مقام حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ ویسے آج بھی ارشاد کا شمار دنیا کے چند گنے چنے مائم آرٹسٹوں میں ہوتا ہے۔ ■

اگلا بچہ ہونے سے پہلے

ذرا سوچیے!

کیا آپ اس بچے کی پرورش اچھی طرح نہیں کرنا چاہیں گے ؟

ایسا لگے کہ آپ کے ایسے دودھ، اچھی خوراک، کپڑے، کھلونے اور کتابیں بھی ملیں۔ لیکن اگر اگلا بچہ جلدی ہو جاتا ہے تو یہ سب آپ کے لیے
نہ ہوگا۔ کیا آپ ایسے حالات سے بچنا نہیں چاہتے ؟
میں لاکھوں لوگ یہی کر رہے ہیں۔ وہ اگلے بچے کی پیدائش اس وقت تک ٹالتے ہیں جب تک وہ اس کے لیے خود تیار نہیں
تے۔ نرودھ کی مدد سے آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ ربڑ سے بنا ہوا نرودھ حمل روکنے کا وہ ذریعہ ہے جو دنیا بھر میں مقبول ہے
استعمال نہایت آسان ہے۔ اس سے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ آج ہی ایک پیکٹ کیوں نہ خریدیں۔

ملتا ہے - 15 پیسے میں 3 (سرکاری امداد کی وجہ سے)

جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

نرودھ

لاکھوں میں مقبول بے ضرر اور آسان

مالک جہاں ہر سال فوجی انقلاب آتے ہیں مراقش کی ناکام بغاوت

ٹیلیوویژن کی نظر سے

مراکش

ناکام انقلاب

۱۰ جولائی ہفتہ کے دن کا واقعہ ہے۔ شام کے سات
اور بحیرہ روم کی لہریں راجدھانی سے پندرہ میل دور سکریت
شاہی سے ٹکرا رہی تھیں۔ محل کے اندر بڑی چہل پہل تھی۔
بار غیر ملکی سفراء، اعلیٰ فوجی اور غیر فوجی افسران اور دیگر
لوگ وہاں جمع تھے۔ وہ سب شاہ حسن کی ۴۲ ویں سالگرہ
میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔
ایک پر لطف محفل تھی خوبصورت گارڈن اور شاہی سوئمنگ
قریب جہاں ہری ہری دوب مخمل کو شرما رہی تھی مشروبات کا دور
تھا۔ شاہ حسن کو مبارکباد دی جا رہی تھی۔ اور تمام شرکا محفل
ہرے کے ساتھ بے تکلف مصروف گفتگو تھے۔
ٹھیک اس وقت جب تمام لوگ کھانے میں مشغول تھے،
کی آواز سے محل گونجنے لگا۔ مہمانوں کے چہروں پر خوشی و مسرت
نمایاں ہونے لگے۔ اس لیے کہ انھوں نے اس فائرنگ کو
سالگرہ کی تقریبات کا ایک حصہ سمجھا تھا۔ اور سچ پوچھو تو ابتدا
فائرنگ نے محفل کے رنگ کو دوبالا کر دیا تھا۔
لیکن جب فائرنگ مسلسل ہوتی رہی اور کچھ لوگوں کو زمین پر گرتے
لیا تو سب کے ہوش اڑ گئے۔ خود شاہ حسن بھی پریشان ہوئے
اس کے کہ وہ کوئی حکم دیتے چند نوجوان فوجی آئے اور انھیں
ایک کمرے میں لے گئے جہاں وہ دو گھنٹے تک یوں ہی بیٹھے
رہے۔
گولیاں چلتی رہیں، محل شاہی میں لوگ زخمی ہو ہو کر گرتے رہے
تمام تماشا موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اور بہت

سے مجروح ہو گئے۔ ہلاک شدگان میں تین فوجی جنرل تھے۔ بغاوت کے
۴۴ سالہ لیڈر جنرل محمد مدبوح بھی کسی غلطی کی بنا پر خود اپنے ہی
آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ جنرل شاہ کا بہت زیادہ مقرب تھا۔
اور محل شاہی کے فوجی امور کا انچارج اور ملٹری ٹریننگ اسکول کا ڈائرکٹر
تھا۔ بغاوت میں حصہ لینے والے زیادہ تر وہی سپاہی تھے جو فوجی ٹریننگ
حاصل کر رہے تھے۔ اس جنرل نے شاہ حسن کو بچا کر نکال لے جانے
اور باغیوں کے ساتھ بات چیت کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن شاہ حسن
اس کی عیاری کو تاڑ گئے اور اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا پھر چند ہی
منٹ میں وہ اپنے ہی سپاہیوں کی گولی لگنے سے زمین پر تڑپنے لگا۔
شاہ حسن کسی طرح محفوظ رہے اور شمالی افریقہ کی ان کی بادشاہت کا
قصہ تمام ہونے سے بال بال بچ گیا۔

مراقش کے شاہ حسن

دعوت کے بعد مہمان ساحل کے کنارے کنارے بھاگ رہے ہیں

شاہ حسن اب تک ایک مطلق آمر رہتے چلے آئے ہیں اور گو
انھوں نے ملک کی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے کافی اقدامات کیے
ہیں لیکن ۱۹۶۵ء میں انھوں نے مراکش کا آئین معطل کر کے ملک
میں ایک طرح سے ڈکٹیٹری قائم کر دی۔ سال گذشتہ انھوں نے
ایک پارلیمنٹ قائم کی لیکن جو آئینی ڈھانچہ بنایا اسے بمشکل ہی
جمہوری کہا جا سکتا ہے۔
مہدی بن برکا اپوزیشن کے مشہور لیڈر تھے لیکن ۱۹۶۵ء
میں شاہ کے ایجنٹوں نے ان کا اغوا کر لیا بعد میں شاہ نے انھیں قتل
کرایا اور گذشتہ ماہ ۱۹۳ ان اشخاص پر جو ان کے نظام حکومت پر نکتہ چینی
کرتے تھے اس الزام میں مقدمہ چلایا گیا کہ انھوں نے شاہ کو قتل کرنے
کی سازش کی تھی۔
شاہ کے خلاف کافی عرصہ سے مواد پک رہا تھا۔ خاص طور پر
اس لیے کہ شاہ شروع ہی سے مغرب نواز رہے ہیں اور ۱۹۶۷ء میں انھوں
نے اسرائیل کے خلاف عرب ملکوں کی امداد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

...بعد موت ان کی بغاوت کامیاب — اور پھر ناکام

...یشکاے کو بیورے نے پاکستانی فوج کا ناطقہ بند کیا ہے

بغاوت ناکام ہوجانے کے بعد یہ قدرتی تھا کہ شاہ بہت سخت
ی کاروائی کریں تمام ان افسروں کو جنھوں نے بغاوت میں حصہ
سرسری سماعت کے بعد گولی سے اُڑا دیا گیا، اور ابھی تک
لوگوں کی پکڑ دھکڑ ہورہی ہے اور ان پر مقدمات چلائے جا
ہیں۔

لیکن شاہ حسن جو بھی اقدامات کریں اس حقیقت سے کوئی
یں کرسکتا کہ بغاوت کا منصوبہ تیار کرنے والوں نے شاہ حسن
یشن کو کمزور کردیا ہے اور اس کے ساتھ یہ توقع بھی باقی نہیں
ہے کہ مراکش میں جمہوری اصلاحات نافذ ہوسکیں گی مطلق العنان
اخلہ جنرل محمد مفکیر کو وسیع اختیارات دینے کے معنی یہ ہیں کہ
ل قریب میں اصلاحی اقدامات کی کوئی توقع نہیں۔ لیکن اصلاحی
ت نہ کرنے اور عوام کی امنگوں کے مطابق نظام حکومت میں
ی نہ کرنے کے خطرناک نتائج بھی ظہور میں آسکتے ہیں۔ ●

سوڈان

ایک انقلاب اور

سوڈان فروری ۱۹۵۳ء میں آزاد ہوا تھا لیکن
رہ سال کے اس قلیل عرصہ میں وہاں چوتھی بار فوجی
ب آیا ہے۔ پہلا انقلاب ۱۹۵۸ء میں آیا جب جنرل
سپریم کونسل کے صدر اور وزیر اعظم بن گئے ایک
ا عرصہ تک سیاسی بحران رہا اور بالآخر اپریل اور
۱۹۶۵ء میں دستور ساز اسمبلی کے لئے انتخابات عمل
ئے اور ان کی جگہ اسماعیل الازہری صدر اور
حمد محجوب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ حکومت اور
ٹی این یو پی (نیشنل یونینسٹ پارٹی) کی مخلوط
یتی اور الازہر کی ۱۷۳ مقابلہ شدہ سیٹوں میں سے ۸۵
اخر الذکر نے ۵۲ سیٹیں حاصل کی تھیں کمیونسٹوں
سیٹیں ملی تھیں۔ جولائی ۱۹۶۶ء میں محجوب کی جگہ
صادق المہدی وزیر اعظم بنائے گئے جو اُما پارٹی
کے اکثریتی گروپ کے لیڈر تھے لیکن جنوب میں سیاسی
بے چینی بدستور موجود رہی اور دسمبر ۱۹۶۶ء میں اچانک
کمیونسٹ انقلاب آگیا۔ نتیجہ میں پارٹی کو توڑ دیا گیا اور
ایک نئے دستور کا نفاذ عمل میں آیا ۱۹۶۷ء میں این۔ یو پی
کولیشن سے الگ ہوگی اور اسمبلی نے محجوب کو نئی کولیشن
حکومت بنانے کی دعوت دی ہے۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں
عام انتخابات عمل میں آئے جس میں این۔ یو۔ پی کی ہر دلعزیزی
کا ثبوت ملا ڈیموکریٹک یونین پارٹی کی حیثیت سے جس
میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی بھی شامل تھی اس نے ۱۰۱
سیٹوں پر قبضہ کرلیا۔ باقی سیٹیں مختلف پارٹیوں نے حاصل کیں
اسمبلی کی ۲۳۲ سیٹوں میں سے صرف ۱۹۷ کے لئے مقابلہ
ہوا تھا۔ لیکن ڈیموکریٹک یونین کی حکومت زیادہ دن
نہیں چل سکی اور ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء کو کمیونسٹوں کی امداد سے
کرنل جعفر النمیری نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ دستور ساز
اسمبلی توڑ دی گئی اور اس کی جگہ ایک قومی انقلابی کونسل
کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر خود کرنل نمیری تھے۔
ابوبکر عبداللہ سابق چیف جسٹس وزیر اعظم مقرر کئے گئے۔
اور جنرل عطا نائب وزیر اعظم بنائے گئے۔ لیکن بعد میں کرنل
نمیری سے اختلافات کی بنا پر وہ الگ ہوگئے اور اب انھوں
نے کرنل نمیری کی حکومت کا تختہ الٹ کر زمام اقتدار اپنے
ہاتھ میں لے لی۔ نئی حکومت کی پالیسی کیا ہوگی اس کے بارے
میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن ۳۵ سالہ جنرل ہاشم عطا نے
اعلان کیا ہے کہ وہ سب کے ساتھ دوستی کی پالیسی پر چلیں
گے جنرل عطا سوڈان کی انقلابی کونسل کے سابق کمیونسٹ
ممبر تھے اس لئے تمام ایسی جماعتوں پر سے جو کمیونسٹوں
کے زیر اثر ہیں پابندی کا ختم کیا جانا قدرتی تھا۔ انھوں
نے ریڈیو سے اعلان کرتے ہوئے کہا کہ یہ انقلاب ۲۵ مئی
۱۹۶۹ء کے انقلاب کی اصلاح کے لئے کیا گیا ہے تاکہ جنرل
نمیری کی ڈکٹیٹر شپ کو ختم کیا جاسکے۔

سوڈان اگرچہ افریقہ کی سب سے بڑی مملکت ہے
اور اس کا رقبہ نو لاکھ ۶۷ ہزار مربع میل کے قریب یعنی ہندوستان
سے صرف تین لاکھ مربع میل کم ہے لیکن اس کی آبادی
(۱۹۶۷ء کی مردم شماری کے مطابق) ایک کروڑ سولہ لاکھ
۲۵ ہزار ہے جس میں ۷۰ فیصدی لوگ کھیتی کرتے ہیں۔

سوڈان ۶۰ برس تک مصر کے زیر نگیں رہا جبکہ ۱۸۸۴ء
میں مہدی نے بغاوت کرکے اعلان آزادی کردیا۔ لیکن
اس کے مظالم خود اسے لے ڈوبے اور ۱۸۹۸ء میں مصری اور برطانوی
فوجوں نے کھوئے ہوئے علاقہ کو واپس لے لیا بعد ازاں
مصر اور برطانیہ کا سوڈان پر اقتدار رہا دونوں ملکوں
کے جھنڈے وہاں لہرایا کرتے تھے۔ لیکن ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء
دونوں ملکوں نے سوڈان کی خود مختاری سے متعلق تجویز
کی تصدیق کردی اور یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو وہ آزاد ملک
کی حیثیت سے وجود میں آگیا۔

سوڈان ۹ صوبوں پر مشتمل ہے جس میں سے شمال
کے چھ صوبوں کی پوری آبادی مسلمانوں (سنّی) پر مشتمل
ہے اور جنوبی صوبوں میں غیر ترقی یافتہ بت پرستوں کی اکثریت
ہے دوسرے لوگوں میں عیسائی چرچوں سے تعلق رکھنے والے
لوگ ہیں ان جنوبی صوبوں کو جون ۱۹۶۹ء میں اندرونی
خود مختاری دی گئی تھی اور نئی فوجی حکومت نے بھی اس
کا اعادہ کیا ہے۔ لیکن اب ایسا نظر آتا ہے کہ عرب
وفاق میں سوڈان کی شرکت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے
گا۔ جنرل نمیری کا ہونا اگر اس بات سے متفق تھے کہ مصر لیبیا
اور شام کے وفاق میں شامل ہوجائیں۔ انھوں

جنرل نمیری

ایک بار پھر حکومت پر قابض

...ی کی ایم نے ساری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے

فوجی ورنامی ٹیکل سے متعلق بات چیت میں کافی دلچسپی کھی تھی لیکن بلا بعد لوریمہ شیدا ندرونی خلفشار کی بنا پر ملک کو اس میں شکستہ کرسکے تھے اور اب نئے انقلاب نے ان کے تمام اسکیموں پر پانی پھیر دیا۔

پاکستان

مجاہدوں کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں

"مجھے آپ کو بتاتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ فوج نے اب مشرقی پاکستان کی صورت حالات پر پوری طرح کنٹرول کرلیا ہے" یہ وہ الفاظ ہیں جو صدر پاکستان نے اپنی آخری تقریر میں حال ہی میں پاکستانی عوام سے کہے تھے لیکن حالات کا اگر بغور جائزہ لیا جائے اور خود پاکستانی حکمرانوں کے بیانات کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو معلوم ہوگا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مشرقی پاکستان میں ابھی تک امن نہیں مجاہدوں کی سرگرمیاں ابھی گھٹی نہیں بلکہ بڑھی ہیں۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ غیر ملکی نامہ نگار لکھ رہے ہیں جو اس وقت مشرقی بنگال میں ہیں جو مختلف مقامات پر گھوم پھر کر حالات کا اندازہ لگا رہے ہیں۔ چھاپہ ماروں کی تعداد اس وقت تیس ہزار کے قریب ہے۔ یہ چھاپہ مار ایک منصوبے کے تحت جنگ کر رہے ہیں اور انہوں نے پاکستانی فوجوں کا ناطقہ بند کر دیا ہے حالات کس درجہ سنگین ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنرل ٹکا خاں اپنی چار ڈویژن فوج کو ناکافی سمجھ رہے ہیں اور انھوں نے مزید دو ڈویژن کے لیے درخواست کی ہے۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ فوجی حکمراں کتنی ہی فوج لے آئیں مجاہدوں کے حوصلوں پر اثر پڑنے والا نہیں ہے اس وقت صورت یہ ہے کہ ڈھاکہ تک میں آئے دن دھماکے ہوتے رہتے ہیں اور گولیاں چلتی رہتی ہیں۔

گذشتہ پیر کی شب کو ایک زور کا دھماکا ہوا جس نے پاور ہاؤس کی تنصیبات کو نقصان پہونچا کر پورے شہر پر تاریکی مسلط کردی اس تاریکی میں مزید دھماکے بھی ہوئے اور گولیاں بھی چلیں۔ دوسرے شہروں میں حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہے مواصلات کے نظام کو بالکل معطل کر دیا گیا ہے جگہ جگہ پل اڑائے گئے ہیں اور سڑکوں اور ریل کی پٹریوں کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ جہاں کہیں موقع ملتا ہے چھاپہ مار [illegible]

یہ چھاپہ مار کون ہیں؟

وہ بنگالی جنہیں پاکستانی حکمراں ناکارہ قرار دیکر فوج کیلئے نااہل سمجھتے تھے جنہیں فوج میں کبھی بھی دس فیصدی سے زیادہ نمائندگی نہیں دی گئی لیکن آج مکتی فوج سو فیصدی بنگالیوں پر مشتمل ہے اور وہ ایک کامیاب چھاپہ مار لڑائی لڑ رہی ہے ایک مغربی ڈپلومیٹ نے کہا "ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ مکتی فوج ایک سنگین فوجی خطرہ ثابت ہوگی لیکن اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ ایک خونی اور عرصہ دراز تک جاری رہنے والی چھاپہ مار لڑائی کا پہلا مرحلہ ہے"

کرلی لیکن اس کے باوجود ایک ہی ہفتہ کے اندر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

حمید کو سرِراہ دن دہاڑے گولی ماردی گئی اور غلام کے مکان پر اچانک حملہ کیا گیا اور مکتی فوج والے اس کو اپنے ساتھ لے گئے۔ لیفٹیننٹ ٹکا خاں نے اس کے خلاف بہت سخت انتقامی کارروائی کی جیکنس کا کہنا ہے کہ دوسرے

مکتی فوج کے جوان فوجی ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔

بغاوت کو کچلنے کے لئے پاکستانی فوج نے ظلم وتشدد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا یہی سلوک مکتی فوج والے بھی ان لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں جو ان کے خیال میں ملک کے باغی ہیں اور جو فوجی حکمرانوں سے تعاون کر رہے ہیں۔ نیوزویک کے نامہ نگار مسٹر جینکنس نے لکھا کہ دو بنگالی افسروں غلام سرور ملّا اور عبدالحمید کے بارے میں لکھا ہے کہ مکتی فوج نے انھیں تنبیہ کی کہ اگر فوج کے ساتھ ان کا تعاون جاری رہا تو انھیں ختم کر دیا جائے گا۔ دونوں نے محافظین کی ایک دیوار اپنے چاروں طرف کھڑی

دن صبح جو مزدور ملوں میں کام کرنے کے لئے کھلنا جارہے تھے انھوں نے ستر لاشیں ریلوے اسٹیشن کے سامنے پڑی دیکھیں ان سب کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے اور پھر ہر شخص کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ ۴۸ گھنٹے تک یہ لاشیں اپنی جگہ پڑی رہیں تاکہ ہر شخص ان کو دیکھ کر "عبرت" حاصل کرلے۔ لیکن اس قسم کے ہزار واقعات بھی ہوجائیں گے تو شاید اب عبرت حاصل نہ ہوسکے گی۔ ایک مغربی ڈپلومیٹ کے بیان کے مطابق "یحییٰ خان" اور جوجی ہائی کمان کا خیال تھا کہ وہ بنگالیوں کو خوفزدہ کردیں گے اور وہ اپنی سرگرمیوں سے باز آجائیں گے لیکن اسکا نتیجہ الٹا نکلا ہے۔ وہ بیشک خوفزدہ ہیں اور فوج سے براہ راست مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں لیکن ان کے اندر فوجی حکمرانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اتنا بڑھتا جارہا ہے کہ اس سے قبل کبھی اتنی نفرت

پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہر بنگالی یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ وہ صرف تشدد کے ذریعہ ہی اپنی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔

اس اثنا میں جنرل یحییٰ خاں نے اپنے جس نام نہاد آئین کا اعلان کیا ہے اس کی طرف کسی بنگالی نے توجہ نہیں دی ہے۔ اپنی جس تقریر میں صدر یحییٰ خاں نے اس آئین کا اعلان کیا اس پر بلاشبہ لوگوں کی نظریں تھیں اور یہ توقع کی جا رہی تھی کہ شاید یحییٰ خاں ایسا حل پیش کر سکیں جس سے بنگلا دیش کے لوگ مطمئن ہو سکیں لیکن اس تقریر پر عام بنگالیوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ تقریر نہیں تھی بلکہ یہ ایک فوجی حکم تھا۔"

اس قسم کا تبصرہ کرنے کے لئے بنگالیوں کے پاس وجہ جواز موجود ہے جنرل یحییٰ بجائے اس کے کہ وہ بنگالیوں کو مطمئن کرتے کہ متحدہ پاکستان میں ان کا مستقبل محفوظ ہے انھوں نے بنگالی لیڈروں کو ملعون کرنا شروع کر دیا اور شیخ مجیب الرحمٰن پر الزام عائد کر دیا کہ انھوں نے ملک کو تقسیم کرنے کی سازش کی تھی۔ اس وقت سازش کی تھی یا نہیں اس پر تحقیق بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس وقت حالات اس منزل پہ پہونچ گئے ہیں کہ بنگالی عوام مکمل آزادی سے کم پر رضامند ہوتے نظر نہیں آ رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ سمجھوتہ کا وقت گذر گیا [illegible] کر لیا ہے کہ وہ ایک لمبی گوریلا جنگ ہی جنگ جیسی کہ ویٹ نام میں لڑی جا رہی ہے۔

کیا فوجی حکمران اس طویل گوریلا جنگ کا مقابلہ کر سکیں گے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب آنے والے دنوں میں ملے گا۔ ●●

امریکا

نہ اگلے بنے نہ نگلے

امریکہ میں اب ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ امریکی حکومت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا ہے کہ وہ ویٹ نام سے اپنی تمام فوجیں واپس بلالے۔

اس وقت بحث یہ نہیں ہے کہ امریکہ اپنی فوجیں واپس بلائے یا نہ بلائے بلکہ سوال یہ ہے کہ انہیں ایک سال میں بلایا جائے یا نو مہینہ میں یا پھر اس سے بھی کم عرصہ میں۔ وزیر دفاع مسٹر لیرڈ چاہتے ہیں کہ انھیں ایک سال کا موقع دیا جائے جبکہ امریکی کانگریس کے دوسرے ممبروں کا کہنا ہے کہ تمام فوجیں نو ماہ کے اندر اندر واپس بلالی جائیں۔

فوجوں کی واپسی کے بعد امریکی حکومت کے لیے نیا مسئلہ پیدا ہوگا کہ گیارہ لاکھ ۱۵ ہزار افسران اور سپاہی سب بے روزگار ہو جائیں گے۔ اس وقت بھی سابق بے روزگار فوجیوں کا تناسب قومی بے روزگاری [illegible] گذشتہ زیادہ یعنی ۱۲ء۳ فیصدی ہے۔ مزید [illegible] گا۔

جس سے قدرتی طور پر امریکی حکام پریشان ہیں۔

جنگ ویتنام یوں کہیے کہ امریکہ کیلئے ایک درد سر بن گئی ہے اور اسے یہ جنگ نہ نگلے بن رہی ہے اور نہ اگلے۔ جنگ میں شریک رہتا ہے تو ساری دنیا سارے امریکی عوام خلاف، اور جنگ سے علیحدگی اختیار کرتا ہے تو بے روزگاری کا ہوا ___ امریکی وزیر دفاع فوجوں کی واپسی کے لیے ایک سال کی مدت طلب کر رہے ہیں کیا اس مدت میں کوئی اور محاذ جنگ کھولنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔؟ ●

بنگلا دیش کے مجاہد ایک پاکستانی فوجی کو گرفتار کر کے لئے جا رہے ہیں

ترکی

افیون کی پیداوار پر پابندی

مغربی ترکی کی پہاڑیوں اور میدانوں میں افیون کی کاشت اس طرح کی جاتی ہے جس طرح ہمارے یوپی یا پنجاب میں غلہ کی گذشتہ چار سو برس سے دنیا کی بہترین قسم کی پوست تنگ میں پیدا ہو رہی ہے افیون کی یہ پیداوار ترکی کے ۸۰ ہزار کسانوں کا خاص ذریعہ معاش ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ حکومت ترکی اس افیون کے ذریعہ سالانہ دس لاکھ ڈالر کا زر مبادلہ کماتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ افیون اندرون ملک خواب آور یا نشیلی اشیاء کی تیاری میں استعمال نہیں کی جاتی۔ ترکی میں کسی کے "افیمی" بننے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ خام افیون کا بڑا حصہ یعنی ۱۵۰ ٹن کی کل پیداوار میں سے تقریباً ۹۰ ٹن پیداوار خاص طور پر فرانس کو برآمد کر دی جاتی ہے۔ جہاں اس میں سے ہیروئن (ست افیون) اور دوسری نشیلی اشیاء تیار کر کے ان سب کو امریکا بھیج دیا جاتا ہے۔

امریکا پریشان ہے کہ وہ اپنے ملک میں ان نشیلی اشیاء کی درآمد کو کس طرح روکے۔ اندازہ یہ ہے کہ ۸۰ فیصدی افیونی اشیاء کی نکاسی ترکی ہی سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا نے حکومت ترکی کو اس طرف متوجہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں حکومت ترکی نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۹۷۲ء کے وسط تک پوست کی کاشت بند کر دے گا۔

وزیر اعظم ترکی مسٹر نہات ارم کے اس فیصلہ کا امریکا میں خیر مقدم کیا گیا ہے اور اسے ان کے ایک جرأتمندانہ اور مدبرانہ فیصلے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ نے حکومت ترکی [illegible]

برادری کے مفاد کے لئے کیا گیا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شہروں میں چھوٹے بچے ہیروئن کے نشے سے ہلاک ہو رہے ہیں تو ہم حکومت ترکی کے اس فیصلہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے دوسرے ملکوں سے بھی ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ بھی بین الاقوامی ذمہ داریوں کو محسوس کریں گے۔

نشیلی اشیاء کی عادت کا مسئلہ امریکہ میں اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ گذشتہ ماہ وائٹ ہاؤس میں نشیلی اشیاء سے متعلق ایک کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ترکی میں مامور امریکی سفیر مسٹر ولیم جے۔ ہنڈلے نے شرکت کی۔ سفیر موصوف نے بتایا کہ ترکی شروع ہی سے افیون کی پیداوار پر پابندی لگانے کے لئے تیار تھا لیکن "اب دیکھنا یہ ہے کہ افیون کی پیداوار پر پابندی عائد کرنے سے ترکی کی معیشت پر جو اثر پڑے گا اس کا ازالہ کرنے کے لئے امریکہ کس حد تک مدد کر سکتا ہے۔"

وزیر اعظم ترکی نہت ارم نے اعلان کیا ہے کہ افیون پیدا کرنے والے کسی کسان کو مالی نقصان سے زیر بار نہ ہونے دیا جائے گا۔ ۱۹۷۲ء کے وقت کا تعین اس لئے کیا گیا ہے کہ اس دوران افیون کی جگہ دوسری اشیاء کی فصل پیدا کرنے کے تجربات کئے جائیں گے۔

کہتے کب تک جب اُلّو بے وقوف ہوتا ہے۔؟

راجستھان

سیکولر پالیسی

کچھ عید

بن مانگے موتی ملے ، مانگے ملے نہ بھیک

بالکل یہی حال راجستھان میں دیکھنے میں آیا جہاں
کی ممبران اسمبلی کے مختلف گروپوں کے جوڑ توڑ اور
نے امیدواروں کو وزارت اعلیٰ کی کرسی دلانے کی
تمام کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں اور قرعہ
مسٹر برکت اللہ خاں کے نام نکلا۔ ان کا نام نہ تو کسی
پر تھا اور نہ خود مسٹر برکت اللہ نے اس کی خواہش
کی تھی۔ انھیں بن مانگے "موتی" مل گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ان کا نام پیش کیا گیا تو
اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا حالانکہ اس سے قبل امیدواروں
سے جو کنویسنگ ہو رہا تھا اس سے یوں ظاہر ہوتا
تھا کہ اب راجستھان میں کانگریس نام کی کوئی چیز باقی نہ
رہے گی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر سوتنتری، جن سنگھی
راجگان اور جاگیردار خوش ہو رہے تھے کہ وہ ایک مرتبہ پھر
آنے والے ہیں اور راجاؤں کے راجستھان کی تکمیل
ان کے ہاتھوں ہونے والی ہے لیکن بیچاروں کا خواب
شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس سب کا کریڈٹ مسٹر سکھاڈیا
کو ہے جنھیں پارٹی کا پہلے ہی کی طرح اعتماد حاصل رہا ہے۔
انھوں نے اعلیٰ کمان پر زور دیا اور اپنے استعفیٰ سے
ان کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے ان سے کسی
نام کی سفارش کرنے کی تھی اسے امید تھی کہ مسٹر سکھاڈیا
اعلیٰ کمان کے مشورے سے جس نام کی سفارش کریں گے
پارٹی منظور کر لے گی۔

مسٹر برکت اللہ کا نام وزارت اعلیٰ کے امیدوار کی
شکل میں

کے لئے ایک دھماکے سے کم نہ تھا لیکن مختلف گروپوں کے
جوڑ توڑ اور رقیبانہ سرگرمیوں سے وہ اتنے تنگ آ چکے
تھے کہ انھوں نے ایک ایسے امیدوار کا دلی خیر مقدم کیا جو
اب تک کی تمام سرگرمیوں سے بےتعلق رہا تھا ان کی غیر
جانبداری انصاف پسندی ان کے کام آ گئی۔ اتفاق رائے سے
مسٹر برکت اللہ کا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں
صرف مسٹر سکھاڈیا ہی کا نہیں بلکہ تمام ممبران کا اعتماد حاصل
ہے اور اس لئے عام طور پر سمجھا جا رہا ہے کہ ان کی حکومت

برکت اللہ خاں

ایک مضبوط حکومت ہوگی جو تمام مسائل سے حسن و خوبی نمٹ
سکے گی۔ سیاسی کارکنوں کے خیال میں ان کے انتخاب سے
ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ راجستھان میں ان فرقہ پرستوں اور
رجعت پسندوں کی حوصلہ شکنی ہوگی جن کی سرگرمیاں
پچھلے دنوں ریاست میں کافی بڑھ گئی تھیں۔ مسٹر برکت اللہ
اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لحاظ سے ان کی کامیابی
حقیقت میں سیکولر پالیسی کی کامیابی ہے کانگریسی حلقوں
کے خیال کے مطابق مسٹر سکھاڈیا جنھیں وزیر اعلیٰ کا تعاون
حاصل رہے گا ریاست میں کانگریس کے استحکام کے لئے
بڑا مفید کام کر سکیں گے اور آنے والے انتخابات میں جس کے
اب بہت سے ماہ باقی رہ گئے ہیں کانگریس ایک مضبوط و مستحکم
جماعت بن کر سامنے آ سکے گی۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر برکت اللہ کی
تقرری بطور وزیر اعلیٰ اگرچہ عارضی ہے لیکن اس کے بڑے مفید
نتائج نکلیں گے۔

بہار

پرگتی شیل ودھایک بھی خطرے میں

مختلف ریاستوں میں جہاں کہیں بھی ودھایک
دل کی حکومت بنی وہ ساجھے کی ہنڈیا ثابت ہوئی اور بیچ
چوراہے پر پھوٹ گئی۔ لیکن اس مرتبہ بہار میں صرف ودھایک
دل ہی کی نہیں بلکہ "پرگتی شیل ودھایک" یعنی کہ ترقی پسند
ودھایک دل کی حکومت بنی. لیکن "ترقی پسندی" کی
ایسی دوڑ لگی کہ چلتی گاڑی پٹری پر سے اتر گئی کمیونسٹ
پارٹی نے اعلان کر دیا کہ وہ وزارت کی حمایت نہیں کرے گی
کیونکہ اس وزارت نے دیہی زمین کی اور شہری جائداد کی
زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنے سے متعلق بل اسی سیشن
میں منظور نہیں کئے۔

وہ تو کہئے اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ کے لئے ملتوی
کر دیا گیا ورنہ اس اجلاس میں دو دو ہاتھ ہو جاتے تاہم کوئی
یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ اجلاس میں صف آرائی
نہ ہوگی اور اگر کچھ دن کے لئے پرگتی شیل ودھایک دل
کی حکومت قائم بھی رہی جس کے لئے کوششیں کی جا رہی
ہیں تب بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس دل میں کمیونسٹ
پارٹی شامل رہ سکے گی۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کانگریس
پر الزام لگا رہی ہے کہ اس نے مفاد پرستوں کے سامنے
ہتھیار ڈال دئے ہیں اور کانگریس نے کمیونسٹ پارٹی کو
اس بات کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے کہ وہ بھی جاگیرداروں

زیادہ سخت سمجھا جاتا ہے ۔۔۔ ایک مدت سے پرانا منحرف
کا یہ سلسلہ جاری تھا تو ہو سکتا ہے کہ ان امکانات کا جو ابھی
ختم ہو جائے کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان اشتراک کی کوئی
صورت باقی نہ رہے اور چونکہ پاسوان وزارت میں کانگریس
اور کمیونسٹ یہ دونوں خاص بڑی پارٹیاں ہیں اس لئے ان
دونوں میں اختلاف کی صورت میں وزارت کا قائم رہنا مشکل
ہو گا اس کا قائم رہنا اس لئے بھی مشکل نظر آتا ہے کہ پی ایس پی
کے ممبروں کو حکمراں کولیشن سے الگ ہو جانے کی ہدایت کی گئی
ہے اگرچہ امکان یہ ہے کہ نصف ممبر حکمراں کولیشن کے
مقابلے میں خود پی ۔ ایس پی سے الگ ہو جانے کو ترجیح دیں
اور اس کے بعد شاید کانگریس میں شامل ہو جائیں لیکن اس
صورت میں بھی یہ وزارت خطرے سے نہ بچ سکے گی ۔ ●

جامعہ اسکول آف سوشل ورک

ایک مستحسن اقدام

حصولِ آزادی کے بعد مسلم اقلیت میں جو جمود پیدا ہو گیا
تھا اس کا احساس اب خود اقلیت کو ہو رہا ہے یہ اس بات
کی علامت ہے کہ اس جمود کو ختم کرنے کا وقت آ گیا ہے
اور یہ جمود اب ختم ہو کر رہے گا ۔ نوجوانوں میں اس وقت
ہم جو جوش و خروش دیکھ رہے ہیں اس سے ان کے عزائم
کا پتہ چلتا ہے اگر ان کی صحیح قیادت کی جائے تو کوئی وجہ
نہیں ہے کہ وہ کسی میدان میں پیچھے رہ جائیں ۔ جہاں تک
ضروری وسائل کا تعلق ہے ان کی کمی نہیں صرف انھیں مجتمع
کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے بالکل ساز گار ہے
اگر عملی قدم اٹھایا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ وسائل
مجتمع نہ ہو سکیں ۔

اس سلسلے میں جامعہ اسکول آف سوشل ورکس کی
سرگرمیاں بہ نظر استحسان دیکھی جائیں گی گذشتہ سال
اکتوبر میں اس اسکول کے زیر اہتمام ایک سیمینار (مجلس
مذاکرہ) کا انعقاد عمل میں آیا تھا جس میں مسئلے کے مختلف
پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا اور نتیجہ میں ایک ایڈہاک کمیٹی قائم
کر دی گئی جو ایک ایسی تنظیم کے قیام کے لئے تجاویز مرتب
کرے گی جو قومی فلاحی کاموں کے حصے کے طور پر مسلم
اقلیت کے لئے فلاحی کام کر سکے ۔ اس مقصد کی تکمیل
کے لئے کل ہند مسلم فلاحی کانفرنس کے انعقاد کا پروگرام
بھی ہے جس کے لئے ایک سب کمیٹی مسٹر ایم ایم اے ام فاروقی (وزیر
صحت آندھرا) کی صدارت میں قائم ہو چکی ہے اور ایک
اور کمیٹی ڈاکٹر عابد حسین (جامعہ نگر) کی صدارت میں قائم
کی گئی ہے جو یقین ہے کہ اگست کے دوسرے ہفتہ تک اپنا
کام مکمل کر لے گی اور اس کے بعد غالباً کانفرنس طلب کر لی
جائے گی ۔

کانفرنس کے فیصلوں کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل
از وقت ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اب صرف کانفرنس
کا انعقاد ہی کافی نہیں ہے بلکہ جو بھی فیصلے کئے جائیں انہیں
عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے ۔ اس لئے کہ یہ عمل اور
جدوجہد ہی ہے جس کی بدولت ایک انسان کامیابی و
کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے ۔
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ۔ ●●

کیرالا

سوشلزم بدستور تقسیم رہے گا

سمیکت سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ ادغام پرجا سوشلسٹ
پارٹی کو کچھ راس نہیں آ رہا ہے ۔ بہار میں بھی چند باغی سامنے
آ گئے اور انھوں نے حکمراں اتحاد سے الگ ہونے سے انکار
کر دیا اور کیرالا میں بھی ہائی کمان کی یہ ہدایت ردی کی ٹوکری
کی نذر کر دی گئی کہ حکمراں متحدہ محاذ سے پرجا سوشلسٹ
ممبران الگ ہو جائیں ۔

" باغی ممبران " کی دلیل یہ ہے کہ سمیکت سوشلسٹ
پارٹی کے ساتھ الحاق کے معنی پرجا سوشلسٹ پارٹی
کے وجود کو ختم کرنا اور ان لوگوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا
ہے ۔ جنھوں نے اندرا سرکار کو ہٹانے کی پالیسی بنائی ہوئی ہے ۔
کیرالا کے ۱۳۳ ممبروں کے ایوان میں اگرچہ پرجا سوشلسٹ
ممبروں کی تعداد صرف ۴ ہے لیکن طاقت کا توازن اس
کے ہاتھ میں ہے ۔ ارنا کلم میں حال ہی میں جو ریاستی
کنونشن منعقد ہوا اس میں ۷۰ ریاستی لیڈروں میں سے
صرف ۱۴ ایسے تھے جو موجودہ حکومت سے ناطہ توڑنے
کے حق میں تھے ۔ باقی سب کا مشورہ یہ تھا کہ حکومت
کے ساتھ تعاون کیا جائے ۔
لیکن ہائی کمان نے کنونشن کے فیصلہ کو نظر انداز
کر دیا اور آٹھ ریاستی لیڈروں کو پارٹی کی پرائمری
ممبرشپ سے الگ کر دیا ۔ ۲۰ اگست کو بلند شہر میں نیشنل
ایگزیکیٹو کا اجلاس ہو گا اس میں اس کارروائی کی توثیق
کی جائے گی ۔ اس اثنا میں کیرالا کے ریاستی لیڈر ایک
الگ آل انڈیا پرجا سوشلسٹ پارٹی کی داغ بیل ڈال
رہے ہیں اور انہیں امید ہے اسے بہار اور بنگال کی یونٹوں
کا تعاون حاصل ہو گا ۔ اور اس طرح سوشلزم متحد ہونے
کی بجائے بدستور تقسیم رہے گا ۔ جو کچھ بھی ہو وزیر اعلیٰ
مسٹر اچوتا مینن خوش ہیں کہ پرجا سوشلسٹ ممبروں کی
علیحدگی کے امکان پر کیرالا کانگریس کی طرف سے وزارت
میں شمولیت کے لئے جو دباؤ ڈالا جا رہا تھا اس میں اب
کمی ہو جائے گی ۔ ●●

اُردو یونیورسٹی کا خاکہ

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
گذشتہ سے پیوستہ   اسرار عظمت

سیکولر مزاج

اردو یونیورسٹی خود کو کسی مذہبی جماعت سے منسلک نہیں کرے گی۔ اردو مزاج کے اعتبار سے ایک سیکولر زبان ہے مسلمان ہندو، سکھ اور عیسائی سب نے اس کی ترقی میں برابر کا حصہ لیا ہے اور یہی سیکولر مزاج اردو یونیورسٹی کی امتیازی خصوصیت ہوگا۔ اس یونیورسٹی کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہوں گے جو اپنی اس مادری زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو۔ پھر چاہے وہ شخص کسی بھی مذہب، ذات، نسل یا فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔

اس یونیورسٹی کا مقصد صرف اُردو کی ہی تعلیم دینا نہ ہوگا بلکہ یہ یونیورسٹی دوسری زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام کرے گی ہی نہیں بلکہ اس یونیورسٹی میں دنیا کے تمام علوم و فنون کی بھی تعلیم دی جائے گی۔ مثال کے طور پر ہم بیکن کو بھی پڑھ سکتے ہیں انگریز بیکن کو انگریزی میں ہی پڑھتے ہیں لاطینی میں نہیں۔ اسی طرح ہم بھی بیکن کو اُردو میں پڑھیں گے۔ ہم اپنی یونیورسٹی میں مغرب کے دور کا نظامِ نصاب رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے جس طرح انگریز شاپن ہاور اور نطشے کو انگریزی میں پڑھتے ہیں ہم بھی ان کو اُردو میں پڑھیں گے۔ اگر ہم پرانے دہلی کالج سرسید سائنٹفک سوسائٹی، تھامسن سول انجینئرنگ کالج رڑکی، میڈیکل کالج آگرہ، عثمانیہ یونیورسٹی اور ان دوسرے متعدد اداروں کی مثالیں سامنے رکھیں جنہوں نے کسی زمانے میں اردو کو میڈیم بنایا تھا تو ہم محسوس کریں گے کہ اُردو کی صرف ادبی روایات ہی عظیم نہیں ہیں بلکہ اس میں جدید علوم و فنون کی تعلیم کا ذریعہ بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

اُردو کو مزید بہتر بنانے کے لئے ایسے باصلاحیت اساتذہ کا انتخاب کرنا چاہیے جو اُردو میں بہترین نصابی کتابیں لکھنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر دیں۔ حکومت ہند نے ترقی اُردو بورڈ کے لئے ایک کروڑ روپے کی منظوری دی ہے تاکہ اُردو میں کالج اور یونیورسٹی کی معیاری کتابیں شائع کی جا سکیں یہ کتابیں یا تو کسی دوسری زبان سے ترجمہ کی ہوئی ہوتی ہیں یا اردو میں ہی لکھی ہوئی ہیں۔

حکومت اس بات پر بھی غور کر رہی ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں اچھی کتابیں لکھنے والوں کو پی۔ ایچ۔ ڈی Ph. D کی ڈگری سے نوازا جائے۔ یہ سبق ہماری حکومت نے مغربی ملکوں سے سیکھا ہے۔ حکومت ترجموں سے زیادہ نئی لکھی جانے والی کتابوں کی ہمت افزائی کر رہی ہے۔ نصابی کتابوں کے بعد سب سے خراشیدہ اصطلاحوں کے ترجمے کا ہے اس سلسلے میں ترقی اُردو بورڈ کافی مستعدی دکھا رہا ہے۔ مختلف اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے وقت ان کے تاریخی پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب اقدامات کئے جاتے ہیں۔ جہاں ضروری سمجھا جاتا ہے انگریزی یا بین الاقوامی اصطلاحوں کو بغیر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی کس قسم کی ہو؟

یہ ایک اہم سوال ہے کہ اُردو یونیورسٹی "ریزیڈنشیل" (Residential) ہو یا عام یونیورسٹیوں کی طرح دور دراز علاقے کے کالجوں کو بھی اس سے منسلک کیا جائے۔ ریزیڈنشیل یونیورسٹیوں میں یونیورسٹی سے منسلک تمام کالج اور دیگر ادارے، ہوسٹل وغیرہ یونیورسٹی کے قریب ہی ہوتے ہیں۔ اس پورے علاقے کو یونیورسٹی کیمپس کہتے ہیں۔ میری اپنی رائے میں اُردو یونیورسٹی کو عام یونیورسٹیوں کی طرح ہونا چاہیے اس میں شک نہیں کہ ریزیڈنشیل یونیورسٹیوں میں ایک خاص قسم کا ماحول ہوتا ہے جس کی وجہ سے قومی اتحاد کو تقویت ملتی ہے لیکن اردو یونیورسٹی کو ریزیڈنشیل نہ بنانے کی صورت میں ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ سارے ہندوستان کے اُردو کالجوں کو اس سے منسلک کیا جا سکے گا۔ اس طرح وسیع پیمانے پر قومی تہذیب کی تعمیر ہو سکے گی۔

اُردو یونیورسٹی کے طالب علموں کو اُردو پڑھنے پر بالکل مجبور نہ کیا جائے گا بلکہ انگریزی اور ہندی ضروری مضامین کی حیثیت سے رکھی جائے گی۔ مادری زبان کا اچھا علم رکھنے والا اس کی مدد سے بڑی آسانی سے دوسری زبانیں سیکھ سکتا ہے۔ ہالینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن وہاں کے بچے عام طور پر اپنی مادری زبان ڈچ کے علاوہ فرانسیسی، جرمن اور انگریزی بھی جانتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایک بچے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تین زبانیں جانے۔ سب سے پہلے اسے اپنی مادری زبان آنی چاہئے۔ مادری زبان جاننے سے یہ مراد نہیں کہ وہ اسے ٹوٹے پھوٹے انداز میں بول اور سمجھ سکے، بلکہ اسے اپنی مادری زبان پر پورا عبور ہونا چاہئے۔ اسے اپنی مادری زبان سے اس قدر قریب ہونا چاہیے کہ وہ اس کے دماغ کا ایک حصہ بن جائے۔ مادری زبان کے علاوہ صوبائی زبان کا جاننا ضروری ہے جس میں سرکاری کام ہوتا ہو جہاں تک ہندی کا سوال ہے، ملک کی کوئی دوسری زبان ہندی سے اتنی قریب نہیں ہے جتنی کہ اردو۔

اگر ہم اپنے ملک کی جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کرانا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے اور قریب آئیں۔ دستور کی دفعہ نمبر ۳۵۱ میں لکھا ہے کہ ہندی کی بہت ترقی ہونی چاہیے۔ اور اسے اس قدر جامع ہونا چاہئے کہ وہ ہندوستان کے تمام طبقوں کے کلچر کے اظہار کا ذریعہ بن جائے۔ یہاں اُردو کے لئے بھی بہت سی سہولتیں اور مواقع ہیں۔ اُردو جو الفاظ کے لحاظ سے بہت امیر ہے اور جو عوام کی ایک کثیر تعداد میں استعمال کی جاتی ہے، ہندی کو اور اس کے ترقی کے دھارے کو متاثر کر سکتی ہے۔ مادری اور سرکاری زبانوں کے جاننے کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم کو کسی ایک بیرونی زبان پر پورا عبور حاصل ہو تاکہ جدید علوم و فنون سے متعلق ہمیں معلومات حاصل ہوتی رہیں اور ہم دنیا کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں۔ اس لحاظ سے انگریزی سیکھنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ سائنس اور صنعتی ترقی کی دنیا کے ایک بڑے حصے میں یہی زبان استعمال ہوتی ہے۔

جدید علوم

کسی بھی حکومت کی یہ ایک اہم ترین ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عوام کے لئے دنیا کے نئے علوم کے دروازے وا کر دے اور انہیں سہولتیں بہم پہنچائے تاکہ وہ جدید علوم سے استفادہ حاصل کر کے تہذیب و تمدن کی اس دوڑ میں دنیا کے ساتھ رہ سکیں۔ یہ اہم ترین کام حکومت اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ عوام کو مالی امداد نہ دے۔ جدید سائنس پڑھنے میں کافی کثیر اخراجات ہوتے ہیں اور حکومت کی مالی امداد کے بغیر عوام کی اکثریت کے لئے سائنس پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ اعداد و شمار سے ثابت ہو چکا ہے، پہلے سائنس کے ایک گریجویٹ پر جتنے اخراجات آتے تھے وہ رقم اب پانچ فیصد ہر سال بڑھ رہی ہے یہ اضافہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے مسلسل ہو رہا ہے۔ اردو دو کروڑ نیس لاکھ لوگوں کی مادری زبان ہے جن میں قریب

لوگوں کی اکثریت ہے۔ کشمیر کو چھوڑ کر اردو کسی اسٹیٹ کی علاقائی زبان بھی نہیں ہے، اس لئے اُردو کے تحفظ، اس کی ترقی اور اسکے ذریعے تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کی تمام ذمے داریاں مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہیں۔

ہماری تاریخ میں پہلی بار ایک قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا ہے جس کو ملک کی ترقی سے دلچسپی ہے اور جو عوام کے خیالات اور انکی خواہشات کے مطابق کام کرتی ہے، اس لئے ہم امید کرتے ہیں کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کی ذمے داری حکومت ہند ایک قومی فرض سمجھ کر قبول کرے گی، کیونکہ اردو یونیورسٹی صرف ایک اونچے معیار کی مرکزی یونیورسٹی ہی نہ ہوگی بلکہ یہ ایک قومی اہمیت کا حامل ادارہ ہوگا۔

غالب نے کہا ہے " وہ دل جو چاہنے والوں کی پرواہ نہیں کرتا، آسمانی عنایتوں کے باوجود مسرور نہیں ہو سکتا" اردو بولنے والے لوگ انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں کرتے جبکہ اب ان کے لئے اُردو میں ہی تعلیم حاصل کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن نے آل انڈیا سروسز کے لئے تمام امتحانات اُردو میں دیے جانے کی سہولت بہم پہنچائی ہے اور یہ اس لئے ہوا ہے کہ ترقی اُردو بورڈ کو یونیورسٹی کی کتابیں اُردو میں شائع کرنے کے لئے ایک کروڑ روپے کی امداد دی گئی ہے۔

معاشی مسئلہ

یہ ایک بہت ہی قابل مذمت بات ہے کہ آج ہم لوگ ہر اہم چیز کو دولت کی ترازو میں تول کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہمارا یہی عمل جاری رہا تو ہم بہت جلد غیر مہذب ہو جائیں گے ہم اپنی مادری زبان میں تعلیم لیتے ہوئے اس لئے ڈرتے ہیں کہ ملازمتوں کے دروازے ہمارے لئے بند ہو جائیں گے۔ ایسی ذہنیت صرف اُردو والوں میں ہی نہیں ہے بلکہ دوسری زبان والے بھی اسی زاویے سے سوچتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم تعلیم و تربیت کے ان اونچے عناصر کی پرواہ نہیں کرتے جو زندگی کو بامعنی اور با مقصد بناتے ہیں۔ اور ہم اس کی اہمیت کو بھی نہیں سمجھتے کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے ہماری اور ہماری قوم کی تہذیبی زندگی پر برے اثرات پڑتے ہیں۔

روزی کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ بارھویں صدی عیسوی سے جدید یونیورسٹیوں کی بنیادیں رکھی جانے لگی ہیں ماہرین تعلیمات نے ہمیشہ ملازمتوں کے مسئلے پر نظر رکھی ہے لیکن ہماری تہذیبی و تمدنی ضروریات اور فنی حیثیت بھی روٹی سے کم اہم نہیں ہیں۔ بے روزگاری کا مسئلہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ ایسا کہ دینا کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ فلاں زبان پڑھنے سے بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ یہ ایک معاشی مسئلہ ہے اور ملک کی ترقی، ملک میں بنائی جانے والی اشیاء اور درآمد برآمد اور دوسری متعدد باتوں پر اسکا انحصار ہے نہ کہ یونیورسٹی میں پڑھائی جانے والی زبانوں پر۔

صنعتی ہندوستان میں ہندو اور مسلم، آسامی اور بنگالی ہندی اور اُردو اور دوسری اسی قسم کی جو متعدد تفریقات ہیں انہیں ختم ہونا چاہئے۔ جب صنعتی ترقی کی رفتار بڑھ جائے گی، تب شاید "کام کرنے کی اہلیت" کے علاوہ دوسری تمام چیزوں کو نظر انداز کردیا جانے لگے گا۔ کسی بھی ڈاکٹر یا انجینئر کو محض اسی خصوصیت کی بنا پر کسی دوسرے ڈاکٹر یا انجینئر پر ترجیح دی جائے گی۔ اور اس وقت یہ بات قطعی غیر اہم سمجھی جائے گی کہ کسی ڈاکٹر یا انجینئر نے اپنی تعلیم اُردو میں حاصل کی ہے یا کسی اور زبان میں۔ اہم سوال یہ ہوگا کہ وہ اپنے کام میں کس حد تک مہارت رکھتا ہے۔ چونکہ اردو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے اس لئے اُردو میں تعلیم حاصل کئے ہوئے یہ ڈاکٹر اور انجینئر سارے ہندوستان میں جذب کئے جا سکیں گے۔ بشرطیکہ وہ اپنے کام میں ماہر ہوں اور اچھی طرح کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح اُردو یونیورسٹی میں سارے ہندوستان سے طالب علم لئے جائیں گے جس کی وجہ سے قومی اتحاد کو تقویت پہنچے گی۔ یہ بات کسی دوسری صوبائی زبان والی یونیورسٹی میں نہیں پیدا ہو سکتی کیونکہ عام طور پر اُردو کو چھوڑ کر کوئی بھی دوسری صوبائی زبان دوسرے صوبوں میں نہیں بولی جاتی، اس لئے کسی بھی صوبائی یونیورسٹی میں دوسرے صوبوں کے طلباء نہیں آتے۔ جبکہ اُردو کیساتھ یہ بات نہیں ہو سکتی۔ اُردو سارے ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ اس لئے اُردو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے سبھی صوبوں کے طلباء آئیں گے۔

پہلا قدم

اگر اُردو یونیورسٹی قائم ہو گئی تو ہمارے اس مطالبے میں زور پیدا ہو سکے گا کہ اُردو کو کسی صوبے میں صوبائی زبان کی حیثیت دی جائے اور اُردو یونیورسٹی کی وجہ سے تمام صوبوں میں اُردو کی اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا جس کی وجہ سے اُردو کی ترقی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اردو یونیورسٹی کا قیام اُردو کو علاقائی یا صوبائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرانے میں ہمارا پہلا قدم ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ حکومت ۲ کروڑ ہمارے لوگوں کی روزگار کی ضرورتوں کو نظر انداز کر دے گی۔

میری یہ بھی خواہش ہے کہ اُردو یونیورسٹی اپنی تعلیمی پالیسیوں میں دہلی، بنارس، کیمبرج اور ہارورڈ یونیورسٹی کی طرح خود مختار رہے۔ حکومت سے مالی امداد قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ہمیں چاہیے کہ حکومت کو اس کی ذمے داریوں کا احساس دلائیں۔ اگر اردو بولنے والے لوگوں کو آزاد فضاء میں سانس لینے کا، اپنے انداز میں سوچنے سمجھنے کا اور ملک و قوم کی فلاح و بہبودی کے لئے اپنے انداز میں جدوجہد کرنے کا حق ہے تو اُردو یونیورسٹی کو چاہئے کہ اپنی تعلیمی پالیسیوں کے سلسلے میں کسی قسم کا بھی دباؤ یا اثر قبول نہ کرے۔ اگر ہم نے ہندوستان کی ترقی میں یقین رکھتے ہیں اگر یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد تعلیم یافتہ اور مہذب بنے تو اُردو یونیورسٹی ایک اہم ضرورت بن جاتی ہے۔ اُردو بولنے والے اُردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ کیونکہ اس یونیورسٹی کی بنیادیں ان کی اپنی خواہشات اور ان کی اپنی تمناؤں پر ہوں گی۔ یہ یونیورسٹی صحیح تعلیمی اصولوں پر کھڑی ہوگی۔ ان اصولوں پر جن پر ملک و قوم کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ان اصولوں سے عوام کی ایک کثیر تعداد کی بھلائی ہوگی اور یہ اصول جمہوریت کے مقاصد سے ہم آہنگ بھی ہیں۔

اُردو یونیورسٹی ایک خواب بھی ہے اور ایک حقیقت بھی۔ جو قومیں خواب دیکھنا چھوڑ دیتی ہیں وہ مر جاتی ہیں اور وہ قومیں بھی جن کی نظریں ستاروں سے بہت نیچے رہتی ہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایسے ہی خواب دیکھے تھے جن نے حقیقتوں کا روپ دھار لیا۔ آئنسٹائن کہتا ہے کہ:۔

"اخلاقی قوت اور قوت ارادی وہ ایسی قوتیں ہیں جن پر کوئی فتح حاصل نہیں کر سکتا"

اگر ہم اُردو یونیورسٹی کے قیام کا ارادہ کر لیں اور اپنے ارادوں کو اس مقصد کی طرف متوجہ کر کے جدوجہد شروع کر دیں تو اُردو یونیورسٹی حقیقت کا ایک روشن مینار بن کر ظاہر ہوگی۔

یار بہزاد! کیا خواب ہوتے ہیں

بہزاد لکھنوی

حکیم بدھن کے لیے مدلقا کا ساتھ مبارک ثابت ہوئی۔ وہ اب سچ مچ کے بدل گئے تھے اور اُن کا عالم یہ ہو گیا کہ وہ دن رات میں شاید چند گھنٹے گھر کے باہر رہتے ہوں۔ ورنہ مہ لقا تھیں وہ تھے اور مکان۔ میں نے بھی جانا آنا بہت کم کر دیا تھا۔ فیکٹری تو اب تھی نہیں جس میں روزانہ حاضری ضروری تھی۔ میری شہرت بھی بڑھ رہی تھی اور مجھے مہینے میں ایک مشاعرہ بیرون ضرور مل جایا کرتا تھا۔ جس کی فیس سے میری گزر اوقات ہو رہی تھی۔ ایک دن حکیم بدھن سویرے ہی سویرے میرے گھر وارد ہوئے اور مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ مجھے دیکھتے ہی مہ لقا نے کہا۔

"ایسے بے مروت کو گھر کیوں لائے جس کے دل سے تمہاری محبت بالکل دور ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بھابی یہ بات نہیں ہے۔ میں حکیم بدھن کا ویسا ہی نیاز مند ہوں جیسے پہلے تھا۔ لیکن مجھ سے حکیم بدھن کی تباہی [illegible]"

وہ چیخ کر بولیں۔

"ان کو کون تباہ کر رہا ہے؟ کیا یہ چوٹ مجھ پر ہے؟"

میں اتنا صاف گو نہیں ہوں لیکن اس وقت خدا جانے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے کہا۔

"جی ہاں بھابی آپ پر۔"

ان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور وہ مجھ سے بولیں۔

"میں ان کو کیوں کر تباہ کر رہی ہوں صاف صاف بتاؤ ورنہ میں تمہارے ٹکڑے کر ڈالوں گی۔"

میں نے کہا۔ "تو مہربانی فرما کر میری صاف گوئی معاف کیجئے گا۔ شمشیر جو ماہانہ اخراجات ہوتے ہیں، اپنی کاپی پر لکھتا رہتا ہے۔ ان اخراجات کو دیکھ کر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔"

وہ بولیں۔ "اس حرامزادے کو تو میں آج ہی نکال دوں گی وہ کون ہوتا ہے اخراجات لکھنے والا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دھوبی پر بس نہ چلا اور گدھیا کے کان اینٹھ دیئے۔ وہ تو حکیم بدھن کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔"

حکیم بدھن نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔

"یار بہزاد کچھ تفصیل تو بتاؤ۔"

میں نے کہا۔

"تم بھابی اور شمشیر تین آدمی اس گھر میں رہتے ہیں [illegible] کے لئے زائد سے زائد ڈیڑھ سیر آٹا پکنا چاہئے [illegible] تم دونوں کم خور ہو۔ اس کے بجائے یہاں تین سیر آٹا [illegible] تم تینوں کے لئے زائد سے زائد ڈیڑھ پاؤ گوشت کافی [illegible] دال اور پاؤ بھر چاول دونوں وقت کے لئے کافی [illegible] ہیں۔ لیکن میں حساب میں دیکھتا ہوں کہ روزانہ ایک سیر گوشت اور سیر دال اور تین پاؤ چاول پکتے ہیں؟"

وہ جل گئیں اور بولیں۔

"میں تمہاری طرح کنجوس مکھی چوس نہیں ہوں۔ سب مجھے اہل محلہ کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میری کئی سہیلیاں ہیں۔ ان کو روزانہ کھانا بھیجتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بہت خوب میری رائے میں یہ تعداد کم کر لیجئے تو سہیلیوں کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔ اور ہاں جناب بھابی جان آپ پان بہت زیادہ کھاتی ہیں۔ اور حکیم بدھن اتنے پان باز نہیں۔ کہ بیچ میں چھ سیر چھالیا، دو سیر کتھا، ایک سیر تمباکو اور ایک ڈھولی پان روز استعمال ہوں۔"

وہ مارے غصے کے بے حال ہو کر بولیں۔

[illegible] ے خاندان سے نہیں ہوں، چھپایا آنے کے [illegible] تیاں نقصان دہ ہوتا ہے میں اتنا زخوا تی [illegible] چھ سیر کے نین سیر رہ جاتی ہے۔ کتھا لگوا نے کے [illegible] چھیلے دلواتی ہوں اور اتنا دھلواتی ہوں [illegible] نا ہے۔ رہا تمباکو تو میری سہیلیاں اکثر مجھ سے [illegible] آدھ پاؤ سے کم دینا میں اپنی توہین سمجھتی ہوں [illegible] دو سو پان کی اوقات ہی کیا ہے۔ چار چار [illegible] ایک گلوری بنتی ہے۔

[illegible] کہا۔

[illegible] ان نکات سے میں بے خبر تھا ورنہ اعتراض نہ کرتا۔ [illegible] دن ڈومنیوں اور میراثنوں کا ناچ کس تقریب [illegible] ہوتا ہے۔

وہ بولیں۔ "بہزاد بھائی آپ اپنی حدود تک رہیے۔ [illegible] کے دوست ہیں۔ ان کے دوست رہیے میرے [illegible] نہ اڑائیے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کا فرمانا بجا ہے آپکے اصرار پر میں نے [illegible] لیا ہے لیکن میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ حکیم بڈھن [illegible] نہیں ہے۔ جائداد وہ اپنے لڑکوں کے نام منتقل [illegible] نگر کی کمائی کی آمدنی ہے جو چل رہی ہے اور [illegible] تک چلتی رہے گی۔ میں اجازت چاہتا ہوں [illegible] حکیم بڈھن کا دوست ہوں اور انہی کا دوست [illegible] ہے اور اس گھر کے پان اور چائے پر میرا [illegible]

[illegible] اپنے گھر چلا آیا۔ حکیم بڈھن مجھے روکنا چاہتے تھے۔ [illegible] خاموش بیٹھے رہے۔ قریب شام کے وہ میرے [illegible] بولے۔

[illegible] معاف کر دو میری وجہ سے تم کو بہت کچھ سننا [illegible] لیں جتنے اعتراضات کئے سب کے سب [illegible] مجھے اس عورت نے اکو کھلا دیا ہے کہ میری [illegible] ہی نہیں۔ میرا حال دیکھا ہے۔

[illegible] باغباں دیکھا کئے

آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

میں نے کہا۔ "بیٹا ابھی کیا ہے جب بھیک مانگنے کی نوبت [illegible] تمہارے سر سے پیار عشق کا بھوت اترے گا۔"

[illegible]

حکیم بڈھن نے کہا۔ "یار اثر رہا ہے میرے پاس اب کل پانچ سو روپلے رہ گئے ہیں۔ میں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ کل اثاثہ بیوی کے نام لکھ دیا ہے۔ تم سے ڈر کے مارے نہیں کہا۔ کہ تم کو کھا جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "استاد ان پانچ سو سے اور مزہ کر لو۔ مجھے دیکھو دلچسپ نگر کی کمائی میں نے بینک میں جمع کرادی ہے۔ گھر کے خرچ کا ایک معیار رکھا ہے وہ ہر مہینے بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں اور بیرونی شاعری کی کمائی خاموشی سے لاکر بینک میں داخل کر دیتا ہوں۔"

وہ بولے۔ "یار میرے تم ہو تو بڑی سودائی لیکن بڑی عقلمندی سے گزارا کر رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی تمہاری طرح چاندانی کا انگرکھا دوپلی ٹوپی اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر اور ہاتھ میں ریشمی رومال لے کر چوک کے چکر لگا سکتا ہوں۔ لیکن کتنے دن؟ لہٰذا میں نے اپنی وضع نہیں بدلی۔"

وہ بولے۔ "یار ناصح بننے کے بجائے کوئی ترکیب بتاؤ کہ کسی ذریعے سے آمدنی ہو اور گاڑی آگے چلے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے سوچنے کا موقع دو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں تمہاری تباہی نہیں دیکھ سکوں گا۔ بہرحال میرا اندوختہ تمہارے لئے حاضر ہے تم جب کہو میں حاضر کر سکتا ہوں۔"

وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگے اور بولے۔

"یار تم واقعی سچے دوست ہو۔"

(۲)

پندرہ دن گزر گئے نہ میں حکیم بڈھن کے وہاں گیا نہ حکیم بڈھن میرے ہاں آئے۔ سولہویں دن سویرے ہی سویرے حکیم بڈھن آدھمکے۔ میں ناشتہ کر رہا تھا وہ ناشتے پر میرے ساتھ جٹ گئے اور ناشتے کے بعد بولے۔

"یار بہزاد۔ تم تو صوفی ہو۔ یہ بتاؤ کیا خواب سچے ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ خواب کی نوعیت پر موقوف ہے۔"

وہ بولے۔ "آج ایک ہفتے سے روزانہ خواب میں ایک شاہی زمانے کے امیر کو دیکھتا ہوں جن کی مونچھوں کے بال سفید ہیں۔ وہ پرانے زرکار لباس میں ملبوس ہیں۔ ان کی کمر سے ایک مرصع تلوار لٹکی ہوئی ہے اور وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ صولت نگر آؤ اور صولت محل میں آکر مجھ سے ملو۔ اگر یہی خواب میں روزانہ نہ دیکھتا تو میں تم سے کبھی نہ کہتا۔"

میں نے کہا۔ "اس خواب میں جان ہے لیکن صولت نگر نام کا کوئی محلہ لکھنؤ میں موجود نہیں ہے۔ تمہارے پاس رقم کتنی رہ گئی ہے؟"

وہ بولے۔ "یار کل سو روپلے رہ گئے ہیں تمہاری بھاوج کے جاکے جشن صحت میں مجھے چار سو روپلے دینا پڑے۔"

میں نے کہا۔ "دولت تو ضائع ہو گا لیکن شہر میں ادھر ادھر گھوم کر بڑے بوڑھوں سے صولت نگر کا پتا پوچھ کر دیکھو شاید کوئی بتا سکے میرے خیال میں یہ بہت مدتوں پہلے کا کوئی محلہ ہے جس کا نام ہی بدل کر اب کچھ اور ہو گیا ہو گا۔"

وہ بولے۔ "یار تمہارا خیال تو صحیح ہے لیکن یہی روپلے ہیں جن میں ساری تفتیش کے اخراجات ہونے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یار پاگل ہو گھنٹوں کے حساب سے ایک یکہ کر لو اور دور دراز محلوں کا رخ کرو شاید کامیابی ہو جائے اور گھنٹوں کے حساب سے یکہ بھی سستا پڑے گا۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "یار یکے پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہونا پشتینی نواب۔ جب ہی یکے پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تمہارے والد محترم تو قارورے دیکھا کرتے تھے تم کہاں کے نواب آئے ہو۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔

"بات یہی ہے لہٰذا ہم عالی جناب حکیم بڈھن صاحب تم کو معاف کرتے ہیں چلو یکہ کرو۔"

ہم دونوں نخاس آئے۔ میں نے ایک جان پہچان والے کا یکہ گھنٹوں کے حساب سے طے کر لیا اور شہر سے باہر کا رخ کیا یکہ گول دروازے سے ہوتا ہوا ٹھاکر گنج کی طرف روانہ ہوا ٹھاکر گنج پار کرتے ہی مجھے دور سے ایک بڑے میاں نظر آئے جن کی کمر جھکی ہوئی تھی اور وہ لکڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ میں نے یکہ رکوایا اور ان کی طرف لپک کر سلام کیا وہ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر سیدھے ہوئے اور بولے۔

"عمر دراز ہو جیتے رہو بیٹا۔ مجھ سے تمہارا کیا کام ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی حضور ایک بات معلوم کرنا ہے۔ شرط لگی ہوئی ہے اسی لئے میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔"

وہ بولے۔ "کیا بات ہے بیٹا؟"

میں نے کہا۔ "لکھنؤ میں کوئی محلہ صولت نگر بھی ہے؟"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے اور بولے۔ "ہاں بیٹے کبھی تھا۔ میں نے اپنے دادا سے سنا تھا [illegible]

تو ایک میل چلنے کے بعد ایک ٹوٹا ہوا شاہی احاطہ پڑتا ہے جس کے درمیان شاہی محل کی ایک محراب رہ گئی ہے، وہی صولت نگر کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام شکوہ آباد ہے۔ اس احاطے میں کافی تعداد میں کچے مکانات بنا کر غریب شرنارتھی آباد ہو گئے ہیں۔"

میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یکے پر آ بیٹھا اور یکے والے کو آگے چلنے کو کہا۔

حکیم بڈھن نے کہا۔ "کہو کچھ پتا چلا؟"

میں نے کہا۔ "صاحبزادے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کچھ پتا تو چلا ہے۔ اگر وہ محل مل جائے تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھو۔"

یکہ کوئی پندرہ منٹ بعد اس جگہ پہنچا جہاں ایک پرانے زمانے کا ایک شاہی احاطہ بنا ہوا تھا۔ جس کے درمیان ایک محراب نظر آ رہی تھی۔ میں نے یکہ رکوا دیا اور حکیم بڈھن کے ساتھ احاطے میں داخل ہوا۔ اس احاطے کا دروازہ تو باقی نہیں تھا لیکن ادھر ادھر کی دیواریں بتا رہی تھیں کہ کسی زمانہ میں یہ بڑا پھاٹک ہوگا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے چاروں جانب کچے مکانات کی قطاریں دیکھیں جن کے درمیان تنگ گلیاں چھوڑ دی گئی تھیں۔ ہم دو نئے آدمیوں کو دیکھ کر تمام اہل محلہ باہر نکل آئے اور ایک شخص نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کو کس کی تلاش ہے؟"

میں نے کہا۔ "بھائی میرے ایک غریب دوست کو تھوڑی سی جگہ درکار ہے۔ وہ بھی کچا مکان بنا کر رہنا چاہتے ہیں۔ یہاں کی زمینیں بکتی ہیں یا یونہی جو چاہے مکان بنا لے۔"

وہ بولے۔ "جناب یہاں اب رتی برابر بھی زمین نہیں ہے صرف وہی محراب باقی رہ گئی ہے جو مبارک حسین کی ملکیت ہے۔ وہ اس محراب کے برابر میں رہتے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں لیکن شاید وہ محراب بیچنا پسند نہ کریں حالانکہ محراب میں اتنی گنجائش ہے کہ ایک اچھا مکان بن سکے۔"

میں محراب کی طرف بڑھا۔ حکیم بڈھن جو ہنوز حیران تھے ان کی سمجھ میں میری یہ کارروائی نہیں آ رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد ہم محراب کے پاس جا پہنچے۔ یہ محراب لکھوری اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ اس محراب کے اوپر لکھوری گنبد بھی تھا اور اس کا فرش بھی لکھوری اینٹوں سے ہی بنا ہوا تھا اور واقعی اتنی جگہ تھی کہ ایک مکان بن سکے۔ میں نے برابر کے مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ ایک لڑکا باہر نکلا اور بولا:

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مبارک حسین صاحب ہیں؟"

وہ بولا۔ "جی ہاں موجود ہیں۔ میں اطلاع دیتا ہوں۔"

چند منٹوں کے بعد ایک ادھیڑ عمر کے قبول صورت آدمی باہر نکلے وہ بنیان اور لنگی میں ملبوس تھے۔ ایک مدیا حقہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حقہ زمین پر رکھ کر دوڑے اور مجھ سے بغل گیر ہو کر بولے۔

"میرے ایسے نصیب کہاں کہ بہزاد سا شاعر مجھے نوازے۔"

میں نے کہا۔ "یہ آپ کی بندہ پروری ہے۔ یہ میرے ہمراہ جناب حکیم بڈھن صاحب ہیں ان سے ملئے۔"

وہ حکیم بڈھن سے بھی گلے ملتے ہوئے بولے۔

"آپ اور بہزاد ایک دوسرے کے ہمزاد ہیں یہ سارا شہر جانتا ہے۔ بہزاد مجھے پہچان نہیں رہے ہیں۔ میں امریکن مشن [illegible] مڈل اسکول میں ان کے ساتھ ایک ہی درجے میں پڑھتا تھا اور یہ مجھے برکو برکو کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔"

مجھے وہ دن یاد آ گئے اور میں نے دوبارہ بڑھ کر ان کو گلے لگایا اور کہا۔

"واقعی تمہاری یادداشت کا جواب نہیں ہے۔"

وہ بولے۔ "دو منٹ ٹھہرو۔ میں اندر سے چارپائی لے آؤں اور تمہاری بھاوج سے چائے اور کبابوں کے لئے کہہ دوں۔ مجھے یاد ہے کہ اسکول کے زمانے میں بھی تم کبابیے کی دکان پر سب پیسوں کے کباب کھا جایا کرتے تھے۔"

یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے اور دو بانس کی کھٹیاں لے کر باہر نکلے۔ لڑکے کے ہاتھ میں دو دریاں تھیں جو کھاٹوں پر بچھا دی گئیں۔

ہم دونوں بیٹھ گئے۔ مبارک نے میرے ہاتھ میں حقہ دیا تھماتے ہوئے کہا۔

"کیسے آنا ہوا بھیا۔"

میں نے کہا۔ "یار صاف صاف بات تو یہ ہے کہ نہ تم مجھے یاد تھے نہ تمہارا مکان۔ مدتیں ہو گئیں کہ ساتھ چھوٹا ہوا ہے۔ بلکہ اگر تم نہ پہچانتے تو میں تم کو پہچانتا بھی نہیں۔ دراصل ہم لوگ محلہ صولت نگر کی تلاش میں نکلے ہیں اور شگفتے میں کیا ہے کہ یہی محلہ صولت نگر ہے۔"

مبارک نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ نام تو تین سو برس قبل کا ہے آج کل نام شکوہ آباد تو یہ شکوہ آباد کے نام سے مشہور ہے۔ تم نے نہ جانے کیونکر پتا چلا لیا۔ اب بتاؤ کہ تم کو صولت نگر کی کیوں تلاش ہے۔ تم جس جگہ بیٹھے ہو یہ ایک زمانے میں صولت محل تھا۔ دبیر الدولہ، نظام الملک صولت جنگ کا محل تھا۔ میں ان کی اولاد میں سے تنہا باقی رہ گیا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کچھ اور تفصیل بتا سکتے ہو؟"

وہ بولے۔ "کیوں نہیں صولت جنگ بہادر شجاع الدولہ کے سپہ سالار تھے۔ اور حافظ رحمت خاں کے ساتھ جنگ میں شریک تھے۔ یہ انہیں کی چالیں تھیں جن کی وجہ سے شجاع الدولہ کامیاب ہوئے اور یہی نہیں شجاع الدولہ پر ایک روہیلہ سردار نے ایسا حملہ کیا تھا کہ اگر صولت جنگ درمیان میں نہ آ جاتے تو شجاع الدولہ قتل ہو جاتے۔ اسی کے صلے میں شجاع الدولہ نے ان کو دبیر الدولہ، نظام الملک اور صولت جنگ کا خطاب دیکر یہ تمام اراضی ان کو دے دی تھی۔ مال غنیمت میں سے بھی بہت کچھ ان کے ہاتھ لگا تھا۔ انہیں نے یہاں محل بنوایا جس کی یادگار یہ محراب نظر آ رہی ہے۔ یہی ان کی خواب گاہ تھی جیسا کہ امرا کا قاعدہ ہے یہ بھی عیاشی میں مبتلا تھے۔ دولت لٹی اور بری طرح لٹی ان کے بعد ان کی اولادوں نے بھی اڑانا شروع کیا۔ کمانا کسی کو نہ آیا۔ جائداد بکتی رہی۔ خرچ ہوتی رہی، لٹتی رہی۔"

میں نے کہا۔ "افسوس۔"

وہ بولے۔ "افسوس کاہے کا بھیا لکھنؤ کا ہر نواب اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ یہاں تک کہ جب میں پیدا ہوا تو خاندان میں صرف والدہ رہ گئی تھیں اور آمدنی کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ محل سرا کی اینٹیں اور ملبہ بیچ بیچ کر انہوں نے گزر اوقات کی۔ ان کے انتقال کے بعد میرے ہاتھ صرف احاطے کی زمین اور یہ محراب باقی رہ گئی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے کیا کیا؟"

وہ تلخ ہنسی کے ساتھ بولے۔

"وہی کیا جو باپ دادا نے کیا تھا۔ احاطے کی زمینیں فروخت کر رہا تھا اور روٹیاں کھا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کب تک چلتا۔ آخری زمین تک ایک عرصہ ہوا بک چکی ہے۔ اب میرے پاس بجز اس محراب کے اور کوئی چیز قابل فروخت نہیں ہے۔ اس کو بھی بیچوں گا۔ مگر کوئی خریدار مل گیا۔ تم جانتے ہو ہم نواب ہیں بغیر توڑے اور بالائی کے نوالہ ہی نہیں توڑتے۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہاری صاف گوئی کا ممنون ہوں لیکن تم سے ایک التجا ہے اگر تم وہ قبول کر لو۔"

لے۔ "یار بغیر کچھ ہوئے منظور ہے۔ یار تم میرے
ہو کہیں میں تمہاری بات رد کر سکتا ہوں"
نے کہا۔ "میں اور حکیم بڈھن ایک رات اس محراب
چاہتے ہیں"
لے۔ "بس اتنی سی بات ایک رات نہیں دس راتیں
یک شرط ہے تمہیں کرایہ ادا کرنا پڑے گا"
نے کہا۔ "بتاؤ میں تیار ہوں"
لے۔ "کرایہ یہ ہے کہ شام کا کھانا آپ دونوں
یں کھائیں گے۔ گلاوٹ کے کباب زعفرانی پراٹھے
ڑے آپ دونوں کو ٹھونسنا پڑیں گے۔ ورنہ آپ
ہو سکتے"
نے کہا۔ "پاگل ہو گئے ہو تمہاری غربت کا حال
خواہ مخواہ کیوں پیسے برباد کرو گے گھر کی دال اور
ہو گی"
لے۔ "تم شاہ ہو کر ایک نواب کی توہین کر رہے ہو
کہتے ہیں جو لنگوٹی میں پھاگ کھیلتا ہے"
کہا۔ "یار یہ کرایہ بہت زبردست ہے"
لے۔ "تو آج کہیں اور سو رہو۔ میرے پاس
لیا ہے"
کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ دو بستر تیار ملنے چاہئیں
لوٹا ایک مراد گا سرہانے ہونا ضروری ہے اور
بی چھوٹا بچہ بھی ہے"
سلے۔ "ماشاء اللہ ہے ڈیڑھ سال کا ہے اور
ش ہے۔ ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ بے اختیار پیار
ہے"
نے کہا۔ لے کر آؤ نا"
چلے گئے۔ میں نے حکیم بڈھن سے دس دس کے
اپنی جیب میں رکھ لیے اتنے میں وہ بچے کو لیکر
بے حد قبول صورت اور موٹا تازہ تھا مجھے دیکھ کر
ک کر میری گود میں آگیا۔ میں نے جیب سے دو
کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ مبارک بولے
نا یہ کیا"
نے کہا۔ "میں اپنے بھتیجے کو سلام کرائی دے
رکون ہو"
سلے۔ "یار چوٹ کر گئے استاد یہ پھر کبھی مجھ
لی

گا۔ رات کے آٹھ بجے تک آجاؤ گے نا"
میں نے کہا۔ "ہاں"

—————(۳)—————

حسین آباد کے گھنٹا گھر میں آٹھ بج رہے تھے جب ہم لوگ مبارک کے مکان پہنچے۔ مبارک نے واقعی اہتمام کیا تھا۔ محراب کی زمین کا فرش دھلا ہوا صاف نظر آرہا تھا اس کے ادھر اُدھر دو چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر سوتی قالین اور تکیے بچھے ہوئے تھے سرہانے ایک میز تھی جس پر لالٹین صراحی گلاس اور ولایار رکھا ہوا تھا مبارک ہم دونوں کو دیکھ کر بے انتہا مسرور ہوئے محلے کے دو ایک حضرات اور بھی آگئے جو غالباً مدعو تھے۔ اندر سے مبارک نے لاکر دسترخوان بچھایا جس پر کھانا چن دیا گیا گلاوٹ کے کباب، زعفرانی پراٹھے اور شاہی ٹکڑوں کے علاوہ ستارہ پلاؤ بھی تھا اور قورمہ بھی۔ محلے کے حضرات بھی شریک طعام ہو گئے۔ گیارہ بجے تک حکیم بڈھن کے لطائف اور ظرائف اور قہقہے بازیوں میں وقت اس طرح گزر گیا کہ پتا بھی نہ چلا۔ گیارہ بجے کے بعد مبارک پانوں کی ڈبیا میرے حوالے کرنے کے بعد چلے گئے۔

ہم لوگ شہر کے رہنے والے تھے جہاں ساری رات چہل پہل رہتی ہے۔ یہاں کے سناٹے سے طبیعت گھبرانے لگی تقریباً بارہ بج رہے تھے کہ میں تو سو گیا۔ حکیم بڈھن نے مجھے تین بجے رات میں جھنجھوڑ کر کہا۔

"اٹھو اور جلدی سے چھالیا اور تمباکو پھانکو تاکہ تمہارا دماغ صاف ہو جائے۔ میں نے ابھی ابھی جو خواب دیکھا ہے مجھے حرف بحرف یاد ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح ہوتے ہی میں بھول جاؤں"

میں نے بٹوے سے چھالیاں اور تمباکو نکال کر پھانکی، کتھا اور چونا چاٹا اور کہا۔

"سناؤ تم نے کیا خواب دیکھا ہے"

وہ بولے۔ "ہیبا خواب میں مجھے وہی صاحب نظر آئے جن کا تم سے پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے "میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم یہاں تک پہنچ گئے۔ اب سنو میرا نام صولت جنگ ہے۔ میں ہی شجاع الدولہ کی فوج کا سپہ سالار تھا میرے متعلق بہت سے لوگوں نے تم سے یہ بیان کیا کہ میں نے شجاع الدولہ کی جان ایک روہیلہ سردار سے بچائی تھی حالانکہ یہ غلط ہے۔ اصل میں جان اپنی جان دے کر تمہارے مکرم دادا سید مہاور حسین نے بچائی تھی۔ لیکن چونکہ میں بھی برابر ہی تھا اور روہیلہ سردار کی تلوار سے اس کو مارنے کے بعد قریب مرگ تھے میں انعام

مجھ مل گیا جس کے صلے میں میرے خطابات نوابی ہو گئے میں بھی اس بات کو چھپا گیا۔ لیکن میرا ضمیر برابر مجھے ملامت کرتا رہا۔ میں نے اس ضمیر کی ملامت کے تحت کچھ زیورات اور کچھ اشرفیاں اس غرض سے زمین میں دفن کر دیں کہ میں سید مہاور حسین مرحوم کی اولاد کو دے دوں گا۔ لیکن عیش و عشرت میں پھنس کر میں نے کوئی تگ و دو اس خاندان کو تلاش کرنے کی نہ کی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ میں تباہ ہوا۔ میری اولاد میرے بعد برباد ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ یہ ایک لڑکا مبارک رہ گیا ہے جس کو غالباً اب اور بھی تباہ ہونا پڑے۔ میرے ضمیر کی خلش نے مجھے چین نہیں لینے دیا۔ میری روح اس خاندان کی متلاشی رہی۔ یہاں تک کہ مجھے معلوم ہوا کہ تم اس خاندان کے جانشین ہو میں ایک ہفتے تک تمہارے خواب میں اسی لیے آتا رہا کہ تم کسی طرح یہاں تک پہنچ جاؤ۔ میں وہ دفینہ تم کو بتا دوں تم نکال لو اور میرے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ لیکن اتنا ضرور کرنا کہ تھوڑا بہت میرے بچے مبارک کو بھی دے دینا تاکہ وہ اس سے کچھ تجارت کر لے اور اپنی گزر اوقات کر سکے۔

میں نے کہا۔ "دفینہ کہاں بتایا ہے؟"

وہ بولے۔ "جہاں میری چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ بالکل یہیں۔ قد آدم نیچے ایک صندوقچہ ہے!"

میں نے کہا۔ صبح ہونے دو تمہیں مبارک کو حصہ دینا ہی ہے لہٰذا اس کو اس راز میں شریک کر لو اور نہ کھدائی ہم دونوں کے بس کی چیز نہیں ہے"

وہ بولے۔ "ٹھیک کہتے ہو بھئی"

صبح ناشتا لے کر جب آئے تو حکیم بڈھن نے ان سے اپنا خواب بیان کیا وہ اچھل پڑے اور بولے۔

"حکیم صاحب واقعی کچھ دنوں میں میری نوبت فاقوں کو پہنچ جائے گی۔ اگر یہ خواب سچا ہے تو شاید میری زندگی بن جائے رازداری کی ترکیب یہ ہے کہ میں یہ محراب آپ کے ہاتھ بیچ ڈالوں اور مزدوروں کو بلا کر آپ کھدائی کا کام شروع کرائیں۔ جب قد آدم سے ایک فٹ زمین باقی رہ جائے تو پھر رات کے وقت میں آپ اور بھائی جان اور پھاوڑے بازی کریں"

میں نے کہا۔ "بہت معقول تجویز ہے"

اس دن جتنا روپیہ تھا سب دے دیا حکیم بڈھن نے وہ محراب خرید لی۔ اور دوسرے ہی دن تین مزدور لگا کر کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ محلے والوں کو کوئی شک نہ ہوا۔ دو دن میں تقریباً قد آدم سے کچھ کم گہرا فرش کھد چکا تو حکیم بڈھن نے رات

لال قلعہ سے
قطب مینار تک

پارلیمنٹ کے اجلاس میں کوئی دن نہیں جاتا جب بنگلا دیش کا کسی نہ کسی صورت سے ذکر نہ کیا جاتا ہو۔ اس سے معاملہ کی سنگینی کا اظہار ہوتا ہے۔ وزیر خزانہ مسٹر چوہان نے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کی میٹنگ میں اعلان کرکے ممبروں کو چونکا دیا کہ ۶۰ کروڑ روپے کی جو رقم پناہ گزینوں کے لئے بجٹ میں رکھی گئی تھی وہ خرچ ہو چکی ہے اور اب وہ اجلاس سرما کے اختتام سے قبل ایک ضمنی بجٹ اس مقصد سے پیش کر سکیں گے تاکہ پناہ گزینوں کے اخراجات کے لئے مزید ٹیکس کے ذریعہ رقم حاصل کی جا سکے

ہندوستانی عوام جو پہلے ہی ٹیکسوں کے بار میں دبے ہوئے ہیں مزید ٹیکسوں کی خوشخبری سن کر یقیناً پریشان ہوں گے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نظر نہیں آتا کیونکہ ان پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کا انتظام ہندوستان خود اپنے وسیلوں سے کرے۔ دنیا کا ضمیر بنگلا دیش کے نام پر نہیں جاگ سکا اس لئے اب زیادہ بوجھ خود ہندوستان کو ہی برداشت کرنا پڑے گا۔

بنگلا دیش کا معاملہ وزارت خارجہ کے مطالبات کی بحث کے دوران بھی زیر بحث آیا اور اگرچہ انہوں نے بنگلا دیش کو تسلیم کرنے اور اس معاملہ کو اقوام متحدہ میں اٹھانے کی تجویز کو مسترد کر دیا لیکن انہوں نے بنگلا دیش کے کاز کی پوری طرح حمایت کی اور اعلان کیا کہ "ہندوستان اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ ہر ملک کے باشندوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے اور اس کا اطلاق بنگلا دیش کے لوگوں پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ویت نام یا فلسطین کے باشندوں پر ہوتا ہے۔"

مسٹر سورن سنگھ وزیر خارجہ نے اس بات پر تشویش [illegible] پاکستان شیخ مجیب الرحمن کے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری کر رہا ہے اور بڑے ملکوں سے اپیل کی کہ وہ پاکستان پر شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ مصالحت کرنے کے لئے دباؤ ڈالیں کیونکہ صرف وہی بنگلا دیش کے عوامی لیڈر ہیں۔ یہ بات وزیر خارجہ نے جنرل یحییٰ خاں کی اس پیشکش کے سلسلہ میں کہی کہ وہ وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یحییٰ خاں کی پیشکش محض دنیا کو گمراہ کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ ہند اور پاکستان کا معاملہ نہیں ہے بلکہ خود پاکستان اور بنگلا دیش کا معاملہ ہے اور بنگلا دیش کے مسئلہ پر شیخ مجیب الرحمن ہی بات چیت کرنے کا حق رکھتے ہیں جن کے خلاف اب پاکستانی حکمراں مقدمہ چلانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

شیخ مجیب الرحمن کے بارے میں صرف پارلیمنٹ ہی میں تشویش ظاہر نہیں کی گئی بلکہ پارلیمنٹ سے باہر بھی اس تشویش کا اظہار کیا گیا اور اس سلسلہ میں منعقدہ دو کنونشنوں نے پاکستان کے فوجی حکمرانوں پر اس مسئلہ کا سیاسی حل تلاش کرنے پر زور دیا۔ ان دو کنونشنوں میں سے ایک جمعیۃ علماء صوبہ دلی اور دوسرا فرقہ پرستی کے خلاف [illegible] کے زیر اہتمام منعقد ہوا اور دونوں میں مسٹر مودود ایڈووکیٹ ڈھاکا ہائی کورٹ نے جو شیخ مجیب الرحمن کے وکیل رہ چکے ہیں۔ شیخ صاحب کے بارے میں مختلف ممالک سے اپیل کی کہ وہ ان کا تحفظ کریں۔ لیکن ابھی تک پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سر پر بدستور "فوجیت کا بھوت" سوار ہے۔ جو آج نہیں تو کل انہیں لے ڈوبے گا۔

یحییٰ خاں نے اپنے ایک انٹرویو میں ہندوستان کے خلاف اعلان جنگ کرنے کی جو دھمکی دی ہے ہندوستانی وزیر خارجہ نے اس کا بھی تذکرہ کیا اور انھوں نے پاکستان کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو ہندوستان اس کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے تیار ہے۔

بین الاقوامی سیاست میں امریکہ اور چین کے سربراہوں کی مجوزہ ملاقات کے بارے میں جو اعلان کیا گیا ہے اس کا ذکر بھی پارلیمنٹ میں آنا یقینی تھا۔ بعض ممبروں کو بین الاقوامی سیاست میں اس تبدیلی کے اندر ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی نظر آئی لیکن دوسرے ممبروں نے کہا کہ یہ تو ہندوستانی پالیسی کی عین کامیابی ہے اس لئے کہ ہندوستان کا ہمیشہ یہ موقف رہا ہے کہ 75 کروڑ کی آبادی والے ملک چین کو الگ تھلگ نہیں رکھا جا سکتا — اور اب اگر مسٹر نکسن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ انہیں چین سے مفاہمت کرنا چاہیئے تو یہ گویا انہوں نے ہندوستان کی پالیسی کے مطابق اقدام کیا۔

بنگلا دیش کے معاملہ میں ہر جماعت اور ملک کا ہر فرد حکومت ہند کے موقف کا حامی ہے وہ بین الاقوامی حالات کو سامنے رکھ کر جو بھی قدم اٹھا رہی ہے یا اٹھائے گی پورا ہندوستان اس کی پشت پناہی کرے گا لیکن جن سنگھ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی کٹیا الگ بنا رہا ہے۔ خبر ہے کہ وہ بنگلا دیش کے نام پر کوئی تحریک شروع کرے گا۔ اسٹنٹ بھی چل رہا ہے لیکن عابد علی کے مین شخص نے بھی اس اسٹنٹ کے بارے میں سنا وہ ہنس دیا اور پوچھنے لگا کہ جو لوگ خود انسانیت کے دشمن ہوں اور جن کا عملی کردار خود اپنے ملک میں انسانیت دشمنی کا ہو انہیں کیا واقعی بنگلا دیش کے ان انسانوں سے ہمدردی ہو سکتی ہے جو پاکستانی فوجوں کے مظالم کا شکار ہوئے ہیں۔

یہ واقعہ میں نے داروغہ مبارک علی سے سنا تھا جو لشکر کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ اُن کا انتقال پاکستان جا کر ہوا۔ مقامات کے نام وہی ہیں البتہ افراد کے نام بدل دیئے گئے ہیں۔ ان واقعات سے کوئی ہولناک کہانی مرتب ہوتی ہے یا نہیں یہ فیصلہ قارئین کرام ہی کریں گے۔ (س۔ ح)

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میں عمومی روزگار سندھیا سٹیٹ میں بہ حیثیت پلیڈر ملازم تھا اور لشکر میں تعینات تھا میری
ست نئی دہلی

شادی نہیں ہوئی تھی۔ جسم میں نوجوان خون دوڑ رہا تھا۔ چھوٹے موٹے خطرے کو دھیان میں نہ لاتا تھا۔ حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اور میرے ملنے جلنے والوں میں سب ہی قسم کے افراد تھے۔ نوکر پیشہ بھی اور تاجر حضرات بھی بلا امتیاز مذہب و ملت دوستوں میں ہندو، مرہٹے، مسلمان سب ہی شامل تھے۔ خاص ملنے والوں میں کوئی سات یا آٹھ افراد ہوں گے۔ مگر ان سب میں جیلر صاحب "سرفہرست" تھے سب لوگ اپنی ڈیوٹیوں اور نجی کاروبار سے فراغت پاتے تو انہی جیلر صاحب کے مکان پر جا پہنچتے ہر ایک کے ذوق کی چیز ان کے یہاں موجود تھی۔ مثلاً مجھے ہی لے لیجئے۔ کتابیں پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ چنانچہ ان کی خاصی بڑی لائبریری کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے۔ کچھ احباب شطرنج وغیرہ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے لئے جیلر صاحب کے یہاں معقول انتظام تھا۔ یہ فالتو اوقات میں پچیسی، شطرنج وغیرہ میں ایسے مشغول ہو جاتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی خود جیلر صاحب کو تین شوق تھے۔ کتب بینی، شطرنج اور شکار بڑے بذلہ سنج اور وضع دار انسان تھے۔ جو بات کہہ دیتے اس پر ہمیشہ قائم رہتے۔ جو عہد کر لیتے اسے ہمیشہ نبھاتے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنی زندگی اس طرح خوش و خرم گزارتے چلے جا رہے تھے۔ شادی سے ہمیشہ بچتے رہے نتیجۃً کنوارے تھے۔ ہوٹل بازی کا رواج تو اب جا کر ہوا ہے۔ ان دنوں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لوگ عموماً اپنے گھروں خود پکاتے تھے اور کھاتے تھے جیلر صاحب بھی اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ غرض ان کی معیت میں دن ہنسی خوشی گذر رہے تھے۔ زندگی کو نہ کوئی روگ تھا نہ ملال۔

اچانک میرا تبادلہ وہاں سے ایسے مقام پر کر دیا گیا جو شہر سے کوسوں دور تھا اور جنگل کے قریب سڑک کے کنارے واقع تھا۔ سندھیا اسٹیٹ ریلوے کا اسٹیشن پنیار آبادی سے کافی فاصلے پر تھا۔ اسٹیشن پر ایک بابو صاحب تعینات تھے جو بیک وقت اسٹیشن ماسٹر

پھر سُننے لگے۔ اچھا صاحب [illegible] داخل ہونا ہے ساڑھے
چھ بجے سے پہلے ہمیں حویلی میں داخل ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ باہر
کتوں کی طرح پھرنے لگیں گے۔"

حویلی تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ وقت نہ لگا۔ کہیں دور سے فقیر کے دھاڑنے کی آواز آرہی تھی۔ دو منزلہ حویلی میں تین اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ صرف سامنے کے رُخ پر صدر دروازہ تھا۔ بیچ میں بہت بڑا صحن تھا جس میں ایک طرف پرانی باؤلی تھی جو ڈھک دی گئی تھی۔ ہمارا بڑا کمرہ صدر دروازے کے برابر تھا اس کے بالکل دوسرے سرے پر وہ کمرہ تھا جس میں تینوں اشیاء رکھی ہوئی تھیں جگن ہمیں لیکر کمرے تک گیا اس نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گیا۔ یہ کمرہ بالکل صاف تھا۔ دیواروں پر البتہ کہیں کہیں جالے نظر آرہے تھے۔ شیشے کی ایک الماری میں کچھ نوادرات جھانکتے ہوئے نظر آئے۔ وہی پیتل کی مورتی، کاٹھ کا شیر اور سفید چکنی مٹی کا بنا ہوا سر جو واقعی انسان کی کاریگری کا ایک نادر نمونہ تھا۔ جیلر صاحب اس سر کو بغور دیکھتے رہے پھر بولے

"ناصر اس سر کو اس کمرے میں لے چلو میں کچھ تفصیل سے دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بے چون و چرا شیشے کا وہ کیس الماری سے نکال لیا جس میں سر موجود تھا۔

جگن خوف زدہ ہو کر باہر نکل گیا اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے تالا لگا کر چابی جیب میں رکھی ہی تھی کہ جگن چلایا۔

"وہ دیکھئے وہ۔ آپ کے کمرے میں — بچاؤ…. بچاؤ—" اس نے اشارہ کیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر چند قدم جا کر گر پڑا۔ شام کا جھٹپٹا تھا جیلر صاحب کے ہاتھ میں کیس تھا۔ میں نے لپک کر جگن کو اٹھایا وہ بے ہوش ہو چکا تھا اسے کمرے میں لا دا اور چل پڑا۔ جیلر صاحب جگہ جگہ دیکھتے جاتے پھر چل پڑتے۔

"کیا دیکھ رہے ہیں" میں نے پوچھا۔

"یہ نشان۔ پاؤں کے نشان۔ دو چھوٹے دو بڑے" انھوں نے جواب دیا میرے دل میں خوف کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ نشان ہمارے کمرے تک پہنچ کر غائب ہو گئے تھے۔ کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ تھی۔ فرش پر جگن کو لٹا کر میں نے ٹارچ ہاتھ میں لی جیلر صاحب نے کیس کارنس پر رکھا ہی تھا کہ اچانک لیمپ گل ہو گیا۔ ساتھ ہی ایک مہیب چیخ کے ساتھ دھماکا ہوا۔ میں نے ٹارچ روشن کر دی کہ اندر چلا یا کون ہے۔ سامنے آئے۔ او بچے ہتھیار کیوں استعمال کرتا ہے۔ میں لیمپ جلانے کی غرض سے دو قدم ہی چلا ہوں گا کہ لیمپ روشن ہو گیا۔ ہم نے کواڑ بند کر دیئے اور جگن کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ جلد ہی اُسے ہوش آگیا۔

"میں کہاں ہوں صاحب؟" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ "وہ سر کٹا آدمی کہاں ہے جو اس کمرے میں آیا تھا۔"

"نہیں یہاں کوئی نہیں آیا۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جو بیٹھے ہیں۔ جاؤ سو جاؤ۔" جیلر صاحب نے اور میں نے عشاء کی نماز پڑھی۔ میں تو لیٹ گیا البتہ جیلر صاحب عملیات پڑھتے رہے۔ انھوں نے چاروں طرف حصار کھینچ دیا اور پھر لیٹ گئے۔ نہ جانے کب مجھے اور انھیں نیند آگئی۔

رات میں کسی وقت میری آنکھ کُھلی۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ پھر لگا جیسے دو تین شخص آپس میں دھینگا مشتی کر رہے ہوں۔ پھر کسی کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔ یکایک ایک مہیب چیخ سُنائی دی۔ ساتھ ہی کسی کے ہولناک قہقہے کی آواز بھی۔ اچانک دروازہ کُھلا ہوا کا ایک سرد جھونکا اندر آیا اور لیمپ بجھ گیا جیلر صاحب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے انھوں نے بندوق سنبھال لی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ کمرے سے باہر دیکھا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ لیمپ پھر روشن کر دیا گیا۔ اور رات بھر جاگتے رہے جگن گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا ہم نے اسے نہیں اٹھایا۔

صبح ہوئی تو جگن نے ہم سے رخصت چاہی۔ ہم نے اجازت دے دی۔ وہ شہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا۔ شام کو چار بجے کے بعد جب واپس آیا تو جیلر صاحب غائب تھے — شیشے کے کیس پر نظر ڈالی تو عجیب ہی صورت نظر آئی۔ وہ مٹی کے سر کے بجائے ایک انسانی سر تھا۔ عورت کا کٹا ہوا سر۔ ناک نقشہ خوبصورت تھا۔ زمانے کی دست برد سے نہ صرف اس کا چہرہ بلکہ بال تک محفوظ تھے۔ کارنس کے نیچے سفید چکنی مٹی کا ڈھیر تھا قریب ہی چاقو پڑا ہوا تھا جس سے مٹی کھرچی گئی تھی — دن بھر جیلر صاحب یہی کرتے رہے مگر اب کہاں گئے میں نے سوچا۔ معاً قدموں کی آہٹ سُنائی دی جیلر صاحب کا ہنستا ہوا چہرہ کمرے میں نمودار ہوا ان کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا جو خون اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ خنجر کا دستہ بڑا خوبصورت بنا ہوا تھا۔

"یہ آپ نے کہاں سے لیا؟" میں نے پوچھا۔

"باؤلی کے پاس سے" انھوں نے جواب دیا۔ "اس سے بہت کچھ مدد ملے گی۔" جیلر صاحب نے شیشے کا کیس وہیں کارنس پر ہی رہنے دیا اور خود اپنا اور میرا پلنگ ایک کونے میں لے گئے دروازے کی چٹخنی لگا کر تالا ڈال دیا گیا۔ لیمپ بجھا دیا گیا۔ یہ اہتمام کر کے وہ بندوق لے کر بیٹھ گئے۔ میں ٹارچ لے کر قریب ہی بیٹھ گیا۔

"دیکھو جب تک میں نہ کہوں ٹارچ مت جلانا۔" رات کے بارہ بجے ہوں گے دروازے پر دستک ہوئی پھر کسی نے دروازہ جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ اچانک کسی کی گھٹی گھٹی دبی دبی چیخیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ پھر کسی نے دروازے کو متعدد بار دھکے دیئے۔ کمرہ میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پھر ایک زوردار دھماکے سے دروازہ کھل گیا۔ آگ کے شعلے کارنس کی طرف لپکے۔ چھن سے ٹوٹنے کی آواز کمرے میں گونجی وہ شعلے کمرے میں گردش کرنے لگے اور تیزی سے نارنجی دھوئیں میں تبدیل ہونے لگی۔ ہلکی دودھیا روشنی کمرے میں پیدا ہوئی اس میں ایک عورت و مرد کا ہیولا نمودار ہوا اور پھر دھوئیں کے مرغولوں میں تبدیل ہو کر دروازے کے راستے باہر نکل گیا۔ پھر ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا دروازے کے پٹ زور سے بند ہو گئے

لیمپ روشن کیا گیا تو ہر بات ناقابل یقین تھی۔ دروازہ بند تھا اس میں بدستور تالا لگا ہوا تھا۔ شیشے کا کیس جو گر کر ٹوٹ گیا تھا کارنس پر جوں کا توں موجود تھا۔ خنجر اور سر غائب تھا۔ بس اسی بات سے پتا چلتا تھا کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا وہ خواب نہ تھا۔

جگن کے بیان کی روشنی میں جیلر صاحب کو واقعات کی کڑیاں ملانے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

راجکماری اور ان کا منگیتر جب رقیب روسیاہ کے غیظ و غضب اور حسد کا نشانہ بن گئے۔ تب بھی رقیب کے انتقام کی آگ سرد نہ ہوئی اس نے راجکماری کا سر کاٹ کر سفید چکنی مٹی کی تہیں چڑھا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا تاکہ راجکماری کی روح اپنے سر کو جسم سے جدا دیکھ کر ہمیشہ بے چین رہے۔ وہی ہوا صدیاں گزر گئیں قلعہ کھنڈر بن گیا حویلی زمین بوس ہو گئی سر مٹی میں دفن ہو گیا مگر راجکماری کی روح اپنے سر کی تلاش میں بے چین رہی آج وہ سر مل گیا تھا اور وہ خنجر بھی جس سے قتل کیا گیا تھا مدتوں کے بعد آج اس کی بے چین روح کو قرار آگیا تھا۔

ایک کلرک کی سرگزشت

ڈی۔ کے کنول

جی ہاں میں ایک کلرک ہوں۔ وہ بھی لوئر ڈویژن۔ میرا نام کنگال چند ہے جو میرے لئے موزوں اور مناسب ہے۔ میرا باپ مایا چند بھی کلرک ہی تھا۔ وہ کلرک ہی پیدا ہوا تھا اور کلرک ہی مر گیا۔ اس لئے کلرکی مجھے ورثے میں ملی ہے۔

میری ماہانہ آمدنی (اوپر والی نہیں) ڈیڑھ صد روپیہ ہے جس سے میں چار بدنصیب بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ اپنی لوتی بیوی کے ناز نخرے برداشت کرتا ہوں، اس کی جھڑکیاں سنتا ہوں۔ کیونکہ وہ ایک لوئر ڈویژن کلرک کی بیوی ہے، اور لوئر ڈویژن کلرک کی بیوی کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے خاوند کو گھوڑ کے جھڑکے۔

میرے پڑوس میں ایک اپر ڈویژن کلرک رہتا ہے۔ خوشی رام۔ اس کے گھر میں ریفریجریٹر ہے۔ ریڈیوگرام ہے۔ ٹیپ رکارڈر ہے۔ درجنوں سوٹ اور درجنوں ٹائیاں ہیں۔ اس کی بیوی کوئلے سلگاتے وقت اپنے نصیبوں کو نہیں کوستی بلکہ فلمی گانے گاتی ہے۔ اور نت نئی ساڑیاں پہنکر وہ محلے کی عورتوں کو جلاتی رہتی ہے۔

خوشی رام چونکہ اپر ڈویژن کلرک ہے اس لئے وہ افسروں کا لاڈلا ہے۔ وہ اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ پیتا ہے اور دھواں لوئر ڈویژن کلرک کے منہ پر اڑاتا ہے۔ وہ دیر سے دفتر آتا ہے اور پہلے نکل جاتا ہے۔ کیا مجال کہ کوئی اسکی شکایت کرے۔ وہ افسروں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتا ہے اور بل اپنی جیب سے چکا دیتا ہے۔ اس کی بیوی کلب کی ممبر ہے، وہ ہر روز کلب جاتی ہے اور بیرے کو دو روپے ٹپ دے دیتی ہے۔

اقصات نئی دہلی

میری بیوی گیلی لکڑیاں جلاتی ہے اور لکڑیوں سے اٹھنے والے دھوئیں سے اس کی بینائی اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ اب وہ مجھے پہچاننے میں بھی دھوکا کھانے لگی ہے۔ میں نے اس کے لئے نظر کی عینک بنوائی۔ اس کی عینک بنوانے کے لئے مجھے سوا سو روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ جب وہ گیلی لکڑیاں جلاتی ہے تو میرا بائی کا یہ دوہا گاتی ہے۔

لکڑی جل کوئلا بھئی۔ کوئلا جل بھیا راکھ
میں پاپن ایسی جلی۔ کوئلا بھئی نہ راکھ

جب وہ یہ دوہا گاتی ہے تو اس کی آواز میں اسقدر سوز ہوتا ہے کہ مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ ہائے میری رکمنی جو بابل کے گھر سے بھرپور جوانی اور بھرپور شباب لیکر آئی تھی۔ سب اس گھر پر نچھاور کر گئی۔ جب وہ اس گھر سے ارتھی میں سوار ہو کر نکلے گی تو ہڈیوں کا ڈھانچا لے کر ہی جائے گی اور اسکا مردہ مجھ سے کہے گا " دیکھو جی! تمہارے گھر سے کچھ بھی لے کر نہیں گئی۔ پھر نہ کہنا رکمنی تمہارا کچھ لے گئی ہے۔ ایک پنجر ہڈیوں کا لے جا رہی ہوں۔ یہ بھی نہ لیتی، پر کیا کروں چتا جلانی پڑے گی۔ وہاں کچھ نہ کچھ ہونا ہی چاہیے "

میں جواب میں ہچکیوں کے بیچ میرا بائی کا یہی دوہا گانے لگوں گا۔

لکڑی جل کوئلا بھئی۔ کوئلا جل بھیا راکھ
میں پاپن ایسی جلی۔ کوئلا بھئی نہ راکھ

نہ جانے میرا جنم کیسی بری ساعت کو ہوا تھا۔ میری جنم کنڈلی بھی بتاتی ہے کہ میرا جنم کسی اشبھ (منحوس) گھڑی کو ہوا ہو گا اور نحوست میرے پیچھے یوں لگی ہے جیسے قاتل کے پیچھے پولیس۔ اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ مجھے نوکری سے جواب مل چکا ہے۔ مگر میں اس کتے کی طرح ہوں جو مالک کے ڈنڈے کھانے کے باوجود بھی اسی کے دروازے پر دم ہلانے چلا آتا ہے۔

چھٹی لینے کے لئے مجھے ہزاروں جھوٹ تراشنے پڑتے ہیں۔ کبھی اپنی بیماری کا بہانہ کبھی رکمنی کی بیماری کا۔ کبھی نانی کی قبر اکھیڑ ڈالی۔ نہ جانے کتنی مرتبہ نانی کو نانا کو، دادی اور دادا کو مار چکا ہوں۔

ایسا کیوں ہے۔ خوشی رام میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ وہ بھی ایک انسان ہے اور میں بھی ایک انسان ہوں۔ یہ ایک پر کرم اور ایک پر ستم کیوں ہے۔

میرا باپ مایا چند مجھے جس کرسی پر بٹھا گیا تھا۔ یگ بدلے۔ دنیا بدلی، مگر میں وہاں سے نہیں ہلا۔ شاید مرتے دم تک مجھے اسی کرسی کے ساتھ چپٹا رہنا پڑے گا۔

بقیہ صفحہ ۵۰

.... کنووکیشن کا دن۔ بڑا فخر اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہوگیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔
خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹرز سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔
خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے
پُر مسرت
دن

...س الدین ۔ دہلی

س ۔ مسلمانوں کو صحیح لیڈری کب نصیب ہوگی ۔؟

ج ۔ یہ تو مسلمانوں کے عقل و شعور پر منحصر ہے کہ وہ کب تک خود ساختہ لیڈروں کو مرغ و ماہی پیش کرتے رہیں گے اور کب تک ترقی کے راستوں کو تاریک بنائے رکھیں گے دراصل لیڈر خود پیدا نہیں ہوتے بلکہ قوم پیدا کرتی ہے۔

س ۔ ہندوستان کے کچھ مشہور اشخاص نے غالب ہی کو اپنا موضوع کیوں بنا لیا ہے ۔؟ جب کہ اردو ادب میں بہت سی ایسی شخصیات بھی ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

ج ۔ دراصل غالب کے نام پر حکومت سے ذرا معقول خیرات مل جاتی ہے ۔ ورنہ یہ بات تو ان لوگوں کو بھی معلوم ہے کہ غالب کی زندگی کے ہر گوشے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب مزید رقم طرازی کی ضرورت نہیں ہے۔

...اللہ شریف ۔ بہار

س ۔ آزادی کے بعد اب تک ہندوستان میں لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کیا جا چکا ہے ۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی انسانیت جو اب نام نہاد بنگلہ دیش پر جاگ اٹھی ہے وہ کہاں دفن ہو گئی تھی ؟۔

ج ۔ ہندوستانیوں کے سیکولر اور ترقی پسند حلقوں نے ہمیشہ ان فسادات کے خلاف آواز اٹھائی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر ہندوستانی اپنی جاہلیت اور غریبی کی وجہ سے جذبات میں بہہ کر فرقہ پرست لیڈروں کے جھانسے میں آ جاتے ہیں ۔ فرقہ پرستی سے لڑنے کی ذمے داری ہم سب کی ہے اور اس سے لڑنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم اور ذہنی بیداری پیدا کی جائے اور ان کے معاشی حالات کو بہتر بنایا جائے ۔

س ۔ جب ہم خود کشمیر ، ناگا لینڈ ، میزو لینڈ کو فوج کے بل بوتے پر کنٹرول کر رہے ہیں تو پاکستان کو کیونکر الزام دے سکتے ہیں کہ وہ مشرقی پاکستان کے عوام کو فوج کے بل بوتے پر ... ہوا ۔

پر کچل رہا ہے ؟۔

ج ۔ ان میں سے کسی علاقے میں حکومت فوج کے ہاتھ میں نہیں ہے ۔ یہاں پر لوگوں کی جمہوری حکومتیں قائم ہیں ۔ ویسے بھی کسی ایک برائی کو دوسری برائی کا جواز نہیں بنایا جا سکتا ۔

میر احمد علی قیصر ۔ کریم نگر

س ۔ نواب آف پٹودی دوبارہ کھیل کے میدان میں کیا بن کر آئیں گے ؟۔

ج ۔ کرکٹ کے بعد نواب صاحب نے سیاست سے کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ انھوں نے اور انکی والدہ نے جن سنگھ اور سوتنتر جیسی فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعتوں کا سہارا لیا لیکن اس کھیل میں وہ بری طرح ناکام رہے اب نواب صاحب کا ارادہ پیسے سے کھیلنے کا ہے ۔ یعنی وہ بزنس شروع کر رہے ہیں ۔

محمد وسیم الدین ۔ کلکتہ ۱۳

س ۔ مشرقی پاکستان میں مکتی فوج کے سورماؤں نے جو نہتے اور مظلوم غیر بنگالیوں کا قتل عام کیا ۔ اس پر آپ خاموش کیوں ہیں ؟۔

ج ۔ ظلم بہر حال ظلم ہے ۔ ہم نے سیلون میں ہونے والے ظلم ، بنگلہ دیش میں غیر بنگالیوں اور بنگالیوں پر ہونے والے ظلم کی مخالفت کی ہے ۔ لیکن آپ ہو بہو جہاندوں اور مکتیوں کے ذریعہ کئے جانے والے قتل عام کا جواز چند غیر بنگالیوں پر کئے گئے ظلم میں تلاش نہیں کر سکتے ۔ کوئی ایک شخص اس قتل عام کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ اس کی جڑیں پچھلے ۲۰ سال کی ہند و پاک کی تاریخ میں کھوجنی پڑیں گی ۔

غلام رسول ۔ کلکتہ

س ۔ یحییٰ خان بنگلہ دیش کے لئے تیمور اور مجیب الرحمن غیر بنگالیوں کے لئے ہلاکو خان ۔؟

ج ۔ نہ یحییٰ خان تیمور ہیں اور نہ مجیب الرحمن ہلاکو ۔ جھگڑا معاشی اشخاص کا نہیں بلکہ دو طبقوں کا ہے سرمایہ دار طبقہ کا اور غریبوں کا ۔ مسئلہ معاشی ہے اسلئے اس کا کوئی معاشی حل ہی ممکن ہے ۔

س ۔ مغربی پاکستان کی مسلم ملٹری نے مشرقی پاکستان کی مسلم آبادی پر قتل ، عصمت دری اور لوٹ مار کو جائز جانا ۔ مشرقی پاکستان کی مسلم آبادی نے مہاجرین غیر بنگالی آبادی پر قتل ، عصمت دری اور لوٹ مار کو جائز سمجھا ۔

ج ۔ اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ ، یہ تو شاید وہ ہی جانتے ہیں جن پر یہ ظلم ہوا ہے ۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جو بھی ہوا برا ہوا ۔ اب ان مظلوم لوگوں کی مدد کرنا ہمارا اور آپ کا فرض ہے ۔

سید ارشد علی ۔ رامپور

س ۔ ایک خیال ہے کہ نئی دہلی کو صرف سجانے کے لئے جو رقم خرچ کی گئی ہے وہ کئی چھوٹے شہروں کی ترقی کے لئے کافی تھی ۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟۔

ج ۔ جی ہاں یہ خیال درست ہے ۔ اور یہ بھی درست ہے کہ چند لوگوں کے ہاتھوں میں جمع شدہ دولت کی اگر مناسب تقسیم ہوتی ۔ تو کروڑوں ہندوستانیوں کی حالت سدھر سکتی تھی ۔ لیکن کیا آپ سرمایہ داروں کی حکومت سے کسی بہتری کی توقع رکھتے ہیں ؟۔

س ۔ کفایت شعار کس حد تک ہونا چاہئے ۔

ج ۔ جس حد تک بھی ہو بہتر ہے ۔ لیکن یہ نسخہ اختیار کرتے وقت دماغ کو حاضر رکھنا چاہئے ۔ ویسے اس سلسلے میں یہ واقعہ سن لیجئے ۔

" ایک صاحب شام کو دفتر سے گھر واپس آئے تو غیر معمولی طور پر ہانپ رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے ۔ بیوی کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ آج ہم نے ۲۵ پیسے کی کفایت کی ہے ۔ اور وہ ایسے کہ میں بس میں بیٹھا نہیں بلکہ بس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آیا ہوں ۔ بیوی نے منہ بنا کر کہا ۔ کیا خاک کفایت کی ہے ۔ اگر ٹیکسی کے پیچھے بھاگ کر آتے تو پانچ روپے کی کفایت ہوتی ۔

میری ترقی کی فائل بھی ... سفر پر نکلی تھی سات سال پہلے پر پہنچ گئی مگر میری فائل ڈائریکٹر کی ٹیبل تک نہ پہنچی۔ میری فائل کو ایک میز سے دوسری میز تک جانے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ نہ جانے اس فائل کا سفر کب ختم ہونے کو آئے گا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں پروموشن کی حسرت لئے کہیں مر جاؤں گا۔ اور باقی حسرتوں کی طرح یہ حسرت بھی حسرت ہی رہے گی۔

ہمارے محلے میں افسر لال رہا کرتا تھا۔ اس کی ماں اکثر میری ماں سے ملنے آیا کرتی تھی اور میری ماں سے کہا کرتی تھی "میرا لال بہت بڑا افسر بنے گا۔ اس کے دائیں بائیں موٹریں ہی موٹریں ہوں گی۔ اس کی جنم کنڈلی بتاتی ہے کہ وہ کوئی بڑا افسر بنے گا" میری ماں جواباً کہتی:۔

"تیرا بیٹا اگر افسر بنے گا تو میرا لال کوئی للو چار نہیں بنے گا۔ وہ بھی کوئی بڑا افسر بنے گا۔ اس کی جنم کنڈلی بتاتی ہے کہ وہ کوئی بہت ہی بڑا بابو بنے گا۔ اس کے آگے پیچھے سرکاری کاغذ ہی کاغذ ہوں گے"

جیوتشی کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ افسر لال محکمہ ٹریفک میں ملازم ہوگیا اور ایک ایسے چوک میں اس کی ڈیوٹی لگ گئی جہاں چاروں اطراف گاڑیاں ہی گاڑیاں دوڑتی بھاگتی رہتیں۔ افسر لال ان گاڑیوں کو ہاتھ دکھا دکھا کر راستہ دیتا تھا ــــــ میں ایک سرکاری محکمے میں کلرک بھرتی ہوا۔ ہیڈ کلرک: آگے پیچھے فائلیں ہی فائلیں۔

آزادی کی بدولت ملک نے کس قدر نمایاں ترقی کی ہے مگر ابھی تک کسی سائنسدان نے کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں کی جو فائل کو ایک ٹیبل سے دوسری ٹیبل تک پہنچا سکے۔

جس طرح کوئی سائنسداں ایسی مشین ایجاد نہ کر سکا اسی طرح یہ آزادی بھی ہمارے دلوں میں حب الوطنی اور فرض شناسی کا جذبہ پیدا نہ کر سکی۔ خوشی رام آزادی کے گن گاتا ہے کیونکہ یہ آزادی اس کے لئے رحمت بن کر آئی ہے۔ جب کہ یہاں آزادی زمانے بھر کے جور و ستم مجھ پر توڑ چکی ہے۔ خوشی رام کے گھر میں آسودگی اور خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ میرے گھر میں زمانے بھر کی نیرنگیوں اور شکستوں نے ڈیرہ جما رکھا ہے۔ جب خوشی رام کا ریڈیو گرام یہ نغمہ گاتا ہے "جھوم اور جھوم لوٹ" مجھے ایسا لگتا ہے جیسے خوشی رام کا ایک ایک روپیہ مجھ پر پھبتی کس رہا ہو۔ میری مجبوریوں کا مذاق اڑا رہا ہو بھائی یہ ہے میری سرگزشت۔ ■

بقیہ [illegible]

لیکن اس میں اتنا سا بھی کرایہ ادا کرنے کی بھی سکت نہیں تھی بعض اوقات کو وہ کئی ماہ کا کرایہ ادا ہی نہ کرتا۔ اس کی بیوی بیمار تھی، اسے تپ دق ہو گئی تھی، بیوی کا علاج تو ایک طرف رہا اس کی بہتر غذا کے لیے بھی پو کے پاس پیسے نہ ہوتے تھے بعض اوقات وہ کئی دن کچھ کھائے پیے بغیر گزار دیتے۔ جب ان کے باغ میں چقندر پر پھول آتے وہ انہیں ابال کر کئی کئی دن اپنی گزر اوقات کیا کرتے۔

جب ہمسایوں کو معلوم ہوا کہ پو اور اس کی بیوی بھوکے مر رہے ہیں تو وہ ان کے لئے کھانا لاتے۔ کتنی قابل رحم بات ہے ان سب تلخیوں کے باوجود پو کے پاس گیت لکھنے اور ورجینیا کے پاس محبت کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اسی لئے اپنی مفلسی کے باوجود وہ خوش تھے۔

ورجینیا نے اسی مکان میں وفات پائی۔ اپنی موت سے کئی ماہ قبل وہ علالت کی حالت میں کھاٹ پر لیٹی رہتی۔ اس کے تن پر اتنے کپڑے بھی نہ ہوتے کہ اسے گرم رکھ سکیں۔ جب وہ زیادہ سرد ہو جاتی تو اس کی ماں اس کے ہاتھ اور پو اس کے پاؤں ملنے لگتا۔ پو اپنے پرانے فوجی کمبل سے اس کا کانپتا ہوا جسم ڈھانپ دیتا۔ رات کے وقت وہ بلی کو اس کے پاؤں کے درمیان سونے پر مجبور کرتا۔

جب وہ فوت ہو گئی تو پو کے پاس تجہیز و تکفین کے لئے ایک آنہ بھی نہ تھا۔ آخر ہمسایوں نے مل کر یہ رسم ادا کی۔

کئی برس پہلے نیویارک کی حکومت نے وہ مکان خرید کر اسے ایک زیارت گاہ بنا دیا ہے۔

ورجینیا جنوری میں فوت ہوئی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ موسم بہار آتا اور چلا جاتا۔ چاند سیب کے درختوں پر لٹکتا رہا، اور ستارے مغربی افق پر ٹمٹماتے رہے۔ لیکن پو بیٹھا اپنی بیوی کی محبت میں جلتا رہتا۔ اس تپش کی بدولت اس نے ایک ایسی پیاری نظم لکھی۔ جو محبت کا لازوال تحفہ ہے۔

" چاند جب بھی آیا
اپنے ہمراہ اینابل لی کے حسین خواب لے کر آیا
ستاروں کی چمک سے
مجھے اینابل لی کی
خوبصورت آنکھوں کی چمک یاد آ گئی
میں ساری رات اندھیرے کی چادر میں ملفوف
سمندر کے کنارے
اپنی زندگی، اپنی پیاری بیوی کی قبر میں
اس کے پہلو میں سویا رہتا ہوں "

بمبئی میں ایس۔ ایس۔ پی کا بمبئی بند ناکام ہو گیا۔

ہم نے اپنی امن پسند پالیسی پر عمل کرتے ہوئے
سوامی جی کے ہاتھ میں سے تلوار لے کر زردہ پکڑا
HISTORY OF INDIA
۱۔ پنجابی ریوجی
۳۔ سیلونی ریوجی
۴۔ بنگلادیش کے ریوجی
سکیں

واقعات
پندرہ روزہ
نئی دہلی

کیا شاہ حسین

فلسطینی مجاہدوں کو ختم کر کے دم لیں گے ؟

قیمت
0-80
پیسے

واقعات

پندرہ روزہ — نئی دہلی

اگست سنہ ۱۹۷۱ء

نصف اوّل

دوسرا سال ۔ اٹھارھواں شمارہ

مدیر

عبدالوحید صدیقی

صدر دفتر

۱۰۔ نظام الدین ایسٹ ۔ نئی دہلی

ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵

ایک کاپی کی قیمت ۵۰ پیسے سالانہ ۱۸ روپے

مدیر طابع اور ناشر عبدالوحید صدیقی
مطبع الجمعیۃ آفسٹ پریس۔ دہلی ۶

ساحل سلطانپوری

"اس سے پہلے بھی زمیں
خونِ انساں سے ہوئی ہے لالہ رنگ
ہاتھ ظلم و جبر کے
اس سے پہلے بھی اٹھے، خنجرِ براں لئے
اس سے پہلے بھی جلے گلشن کئی
اس سے پہلے بھی لٹے آنگن کئی
ہیروشیما، ناگاساکی، ویتنام
کوریا، ارضِ فلسطیں
ہر جگہ انسانیت کچلی گئی
ہر جگہ تہذیب کو روندا گیا
قتل ہوتے ہی رہے اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ وفا
آج بنگلا دیش میں
ظلم کا عفریت پھر
پی رہا ہے آدمیت کا لہو
کل مگر

یہ لہو
یہ عورتوں، بچوں کا، بوڑھوں کا، جوانوں کا لہو
یہ لہو محنت کشوں کا اور کسانوں کا لہو
ایک سیلِ بیکراں بن جائے گا
اور یہ لاشوں کا ڈھیر
دیکھتے ہی دیکھتے آتش فشاں بن جائے گا
اس گھڑی
جب نہ ہوگی کوئی بھی جائے اماں
تنگ ہوگی یہ زمیں۔ دُور ہوگا آسماں
ظلم جائے گا کہاں۔؟

کہاں حسنِ عالم ... پایا

یہ کیسی ہے بزمِ خرد کی تجلّی۔؟
اندھیروں کا کوئی مسیحا نہ پایا
ہر اک سمت خوف و خطر کا ہے پہرا
ہر اک سمت قاتل ہر اک سمت رہزن
کئی قافلے لٹ گئے بے لبسی میں
جدھر دیکھئے ہے لٹیروں کا مسکن
کہاں ظلم آرائیوں کی نمائش
کہاں آگ اور خون کی واردا تیں
چمن کے نگہباں ہی صیاد نکلے
ستم کے ارادوں کی سنگین گھاتیں
حجابات کے سلسلے ختم کر دو
نئی روشنی لاؤ شمس و قمر سے
یوں ظلمت کدوں میں نہ اب منہ چھپاؤ
کہ ذوقِ نظر لے لو حسنِ سحر سے
تمہیں سب مسیحائے دوراں کہیں گے
غموں کی اذیت کو محدود کر دو
یہ آنسو تہہِ خاک ہونے نہ پائیں
ستم کی حدیں آج مسدود کر دو
کوئی ماں نہ پھر روئے
کوئی باپ ڈھونڈے نہ لا

اقبال ...

دستور میں ترمیم دستور کے خلاف!

انسان کے وضع کردہ قوانین یا ضابطے کسی وقت بھی خامیوں سے پاک نہیں رہے ہیں۔ ان میں حالات کے مطابق ہمیشہ ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ اس لیے اگر ہندوستان کے دستور میں ترمیم و تنسیخ ہوتی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن تعجب کی یہ بات ضرور ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبروں میں احساس برتری حد سے تجاوز کر رہا ہے اور وہ سپریم کورٹ کی اتھارٹی کو چیلنج کر رہے ہیں۔ حالانکہ سپریم کورٹ ہندوستان کی سب سے بڑی عدلیہ ہے اور اسے وہی درجہ حاصل ہے جو برطانوی دور میں لندن کی پریوی کونسل کو حاصل تھا۔

عدالت کا احترام آج سے نہیں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اس زمانے سے ہوتا آیا ہے جب مطلق العنان بادشاہ اپنے اشارہ چشم و ابرو سے جس شخص کی چاہتے گردن اڑا دیا کرتے تھے لیکن انھوں نے بھی کبھی اپنے زمانے کی عدالتِ عالیہ کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا۔ تاریخ میں ایسی شہادتیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے ظالم اور جابر بادشاہ عدالت میں آکر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے تھے اور عدالت کے فیصلوں کا احترام کرتے تھے خود ہمارے اس زمانے میں صدر جمہوریۂ ہند نے جو ملک کے سربراہ ہیں، سپریم کورٹ کا احترام کیا اور جب ان کے خلاف الیکشن پٹیشن کا مقدمہ سماعت کے لیے پیش ہوا تو عدالتِ عالیہ کے احترام میں وہ خود بنفس نفیس اسی طرح عدالت میں حاضر ہوئے جس طرح کوئی عام شہری حاضر ہو سکتا تھا۔

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج پارلیمنٹ میں معدودے چند کو چھوڑ کر ہر ممبر سپریم کورٹ کو مطعون کر رہا ہے۔ دستور میں ترمیمی بلوں پر بحث کے دوران انھوں نے زیادہ زور اسی پر صرف کیا کہ سپریم کورٹ پر واضح کر دینا چاہیے کہ وہ سپریم نہیں واقعات نگاری یا

دفعات میں جن میں بنیادی حقوق بھی شامل ہیں ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل ہے۔

اپنے "حقوق" کے بارے میں ممبران پارلیمنٹ کے جذبات اس وقت اس قدر مشتعل نظر آتے ہیں کہ اگر ہم کچھ کہیں تو شاید وہ اسے سننا بھی گوارا نہ کریں اور ممکن ہے وہ ہمیں سابق حکمرانوں اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ قرار دے دیں کیونکہ بنیادی حقوق میں ترمیم کا فی الحال خاص مقصد سابق حکمرانوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا ہے جو سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق بنیادی حقوق کے دائرے میں آتے ہیں لیکن محض جائدادوں کے خاتمے کو سامنے رکھ کر جلد بازی میں کوئی ایسا قدم اٹھانا جس سے آئندہ چل کر خطرناک نتائج برآمد ہونے کا خدشہ ہو کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

سپریم کورٹ کا واضح فیصلہ ہے کہ پارلیمنٹ کو بنیادی حقوق میں ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں۔ یہ فیصلہ اب بھی قائم ہے اور اگر اس فیصلے کے باوجود پارلیمنٹ نے ترمیم کر ڈالی تو اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہوگا کہ وہ اپنے سامنے سپریم کورٹ کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ سپریم کورٹ کا وقار گر جائے گا بلکہ عوام کے اس اعتماد کو بھی ٹھیس پہونچے گی کہ ملک میں عدلیہ کا ایک ایسا ادارہ موجود ہے جو اس بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ کوئی بھی قانون ساز اسمبلی کوئی ایسا قانون وضع نہ کر سکے جو ہندوستان کے آئین کے خلاف ہو۔ ریاستی قانون ساز اسمبلیوں نے گذشتہ برسوں میں کتنے ہی قانون پاس کیے جنھیں سپریم کورٹ نے بنیادی حقوق کے خلاف سمجھ کر کالعدم قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ کا یہ طرز عمل متعلقہ طبقوں کے لیے اطمینان کا باعث تھا۔ اس سے ہندوستان کی سیکولرڈیموکریسی پر ان کا اعتماد اور پختہ ہو گیا لیکن بنیادی حقوق میں ترمیم کا چکر چلا کر اگر سپریم کورٹ کو بے اثر بنا دیا گیا تو ریاستوں میں کیا ہوگا، اس بارے میں کچھ کہنا عبث ہے۔

ہم نے جیسا شروع میں کہا انسان کے بنائے ہوئے قوانین احکام خداوندی نہیں ہیں کہ ان میں ترمیم نہ ہو سکے۔ اگر دستور میں حالات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے تو یہ ترمیم ضرور ہونی چاہیے۔ مگر یہ ترمیم صرف ایک دستور ساز اسمبلی ہی کر سکتی ہے، قانون ساز پارلیمنٹ خاص دستور کے تحت تشکیل پائے اور اس دستور کی وفاداری کا حلف اٹھائے، وہی پارلیمنٹ اسی دستور کی ان دفعات کی دھجیاں اڑا دے جن کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے کہ ان میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔

حکومت یا پارلیمنٹ کی اکثریت اگر یہ محسوس کرتی ہے کہ بنیادی حقوق سے متعلق دفعات میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہے تو اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے یا اس مسئلے پر کم از کم ریفرنڈم کرایا جائے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ کسی ایک پارٹی نے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر دستور میں ایسی ترمیم کر ڈالی جو بنیادی نوعیت کی تھی۔ کوئی ایک پارٹی، خواہ اس کی کتنی ہی اکثریت کیوں نہ ہو قابل اعتراض طریقے پر اگر کوئی دستوری ترمیم کرے گی تو وہ اس الزام سے نہیں بچ سکتی کہ اس کا طرز عمل آمرانہ ہے۔ اور کسی ایک پارٹی کا آمرانہ طرز عمل کسی فرد کے آمرانہ طرز عمل سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بنیادی حقوق سے متعلق دفعات میں ترمیم خاص طور سے اس لیے کی جا رہی ہے کہ سابق والیانِ ریاست کی جائدادیں ختم کی جا سکیں لیکن بنیادی حقوق میں جائیدادوں ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تقریباً ایک درجن دوسری باتیں بھی ہیں جن کا تحفظ کیا گیا ہے۔ مثلاً اظہار خیال کی آزادی اور کلچر و مذہب کی آزادی، پیشہ کی آزادی اور مذہبی اور خیراتی مقاصد کے لیے ادارے قائم کرنے کی آزادی وغیرہ۔

ہمیں کانگریس گورنمنٹ پر بھروسہ ہے اس لیے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی ہمیشہ علمبردار رہی ہے اور اس سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کوئی ایسا اقدام کرے گی جس سے اقلیتوں کے حقوق سلب ہوتے ہوں۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہمیشہ کانگریس گورنمنٹ ہی برسراقتدار رہے گی اور کوئی ایسی پارٹی برسراقتدار نہیں آئے گی جس کا اقلیتوں کے معاملے میں رویہ معاندانہ ہو، بلکہ جو اکثریت اور اقلیت کے سوال ہی کو بے معنی سمجھتی ہو اور سب کو ڈنڈے کے زور سے ایک رنگ میں رنگنے پر یقین رکھتی ہو۔

بنیادی حقوق میں ترمیم کا حق لے لیا جانے کے بعد کبھی حکومت اور کوئی بھی قانون ساز اسمبلی ... ایک و
بقیہ صفحہ

ب بم شاہ حسن کے قدموں میں آکر گرا...

شاہ مراکش کی ۴۲ویں سالگرہ کی تقریبات میں تین
ہیتوں نے حصہ لیا تھا ان کی زبانی اب اس قتل عام کی تفصیلات
زہی ہیں جو شاہ کے موسم گرماں کے محل میں ہوا تھا۔ بلوط
،اور اسی طرح کے اونچے اونچے درختوں میں محصور یہ محل رباط
رہ میل کے فاصلے پر سمندر کے کنارے سکرات میں واقع ہے۔
سالگرہ کے موقع پر محل میں جو ضیافت ہو رہی تھی اس میں
فراد اعلیٰ فوجی یا غیر فوجی حکام اور دیگر سرکردہ لوگ پانچو کے قریب
ں شریک تھے۔ شاہ کے خدمتگار مثلاً درزی اسب کے
طالوی، موچی اور ڈاکٹر (تین فرانسیسی اور ایک آسٹریلین)

بہترین قسم کی سالمن مچھلی تک۔
اٹلی کے سفیر امبد لوگلیت دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے۔ اسی
لیے وہ لانج میں ایک زردشتی آرام کرسی پر دراز ہو کر "ہیٹر ہیر لیسنل"
نامی رسالہ پڑھ رہے تھے۔ دوسرے تمام مہمانوں کو حفظ مراتب
کے ساتھ ضیافت میں بٹھایا گیا تھا۔ شاہ حسن اپنے سات سالہ ولیعہد
سیدی محمد کے ساتھ جو پانچ بچوں میں سے ایک ہیں ایک خصوصی
شامیانے میں ماحضر تناول فرما رہے تھے۔ قریب ہی تیونس کے
صدر مسٹر حبیب بورقیبہ کے صاحبزادے مسٹر حبیب بورقیبہ جونیئر

جارہی ہے لیکن اطالوی سفیر نے جو کہ فوجی سپاہی رہ چکے تھے،
پہچان لیا کہ یہ رائفل کی گولیاں چلنے کی آواز ہے۔ اور پھر فوراً ہی
اس فائرنگ نے ایک دہشتناک شکل اختیار کر لی۔
امریکی سفیر مسٹر ڈبلو. راک ویل شاہ کی طرف بڑھ رہے
تھے کہ انھوں نے ایک مہمان کو اپنے سامنے خون میں لت پت
زمین پر گرتے دیکھا۔ اس کی ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا، ایک اور
مراکشی مہمان زخمی ہو کر اطالوی سفیر کے قریب اس طرح گرا کہ
اس کی خون آلود انگلیوں کے نشانات ان کی قمیص پر پڑ گئے۔

رباط کی ایک چٹھی

شاہ کے محل میں

قتلِ عام کی کہانی

شرکاءِ ضیافت کی زبانی

شاہ حسن —— دوم

ضیافت میں مدعو تھے۔ اسلامی روایات کے مطابق تو ہیں شریک
نہ تھیں۔
دوپہر کا وقت تھا اور آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک
رہا تھا اگرچہ بحرِ اوقیانوس کی طرف سے آنے والی پُرنم ہواؤں نے
اس کی تمازت کو کافی کم کر دیا تھا۔
محل میں ایک شاندار ضیافت ہو رہی تھی، جس میں انواع و اقسام
کے کھانوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ بھیڑ کے بھنے ہوئے گوشت سے لیکر

تشریف فرما تھے۔
محل شاہی کے گارڈ کے کمانڈر جنرل محمد مدبوح جو شاہ
حسن کے قریب ترین مصاحبین میں تھے مہمانوں کی تواضع کرنے
میں پیش پیش تھے۔ لیکن چہرے سے مسرت و شادمانی کے ان
جذبات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا جو ایسے مواقع پر ہوا کرتا تھا، شاید
اس لیے کہ بغاوت کے اصل لیڈر وہی تھے۔
اچانک محل کے دروازے کے قریب سے پپ پپ پپ کی
آوازیں سنائی دیں۔ اکثر مہمانوں نے سمجھا کہ یہ آتشبازی چھوڑی

اس شخص کے منہ سے خون آ رہا تھا اور فوراً ہی وہ موت کے آغوش
میں تھا۔
اب محل میں صرف رائفلیں ہی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی توپیں
بھی چل رہی تھیں اور دستی بموں کے دھماکے بھی ہو رہے تھے۔ بہت
سے مہمان اس افراتفری میں شاہ کے کمرے یا ساحل سمندر کی
طرف بھاگے لیکن ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ایک دستی بم
شاہ کے قدموں میں آکر گرا جسے حبیب بورقیبہ جونیئر نے بڑی جرأت

... لیکن حبیب بورقیبہ جونیئر نے اُسے وہاں سے ہٹا دیا

سولی پر چڑھنے سے پہلے ہر باغی کو شاہ کے ہاتھ کا بوسہ لینے پر مجبور کیا گیا۔

سے کام لیکر اٹھایا اور دوسری طرف اٹھاکر پھینک دیا۔ شاہ کی جان بچ گئی۔ محل میں ہر طرف کیڈٹ نظر آرہے تھے جنھیں تیس موٹر ٹرکوں میں بھر کر محل میں پہنچایا گیا تھا۔

اس گڑبڑ اور انتشار میں شاہ حسن کسی طرح تخت شاہی والے کمرے میں پہنچ گئے اور وہاں سے ایک اور کمرہ یا غسل خانے میں چلے گئے، یہی موقع تھا جب انھوں نے اپنے محل کے گارڈ کے کمانڈر جنرل مدبوح سے بات چیت کی تھی۔ اس بات چیت کی صحیح تفصیل نہیں معلوم لیکن کہا جاتا ہے انھوں نے شاہ کو کسی محفوظ مقام پر لے جانے اور باغیوں کے ساتھ بات چیت کرانے کی پیشکش کی تھی جسے شاہ نے نامنظور کر دیا۔ اس کے چند ہی منٹ بعد مسٹر مدبوح کو گولی لگی اور وہ زمین پر گر گئے۔ ان ہی کے آدمیوں نے غالباً غلطی سے انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔

باغیوں نے مہمانوں کو چمکتی دھوپ میں زمین پر لٹا دیا بعد ازاں دیوار کے سہارے کھڑا کیا اور اس کے بعد انھیں گولی کا نشانہ بنایا۔ شاہ کے بھائی پرنس مولائے عبداللہ کے بازو میں گولی لگی لیکن انھیں نشانہ بنانے والوں نے اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ انھیں زمین پر پڑا دیکھ کر سمجھے کہ وہ ہلاک ہو چکے ہیں۔

لیکن اس ہنگامہ کے باوجود یہ دیکھنے میں آیا کہ باغی نوجوان کیڈٹ شاہ کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر نہ یہ باغی

شاہ کی پناہ گاہ پر قابض ہو گئے اور دوسرے مہمانوں کے ساتھ انھیں باہر نکالا۔ اس وقت وہ اپنے سر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے تھے ایک نوجوان سپاہی جو گھبراہٹ کے ساتھ اپنی رائفل کے گھوڑے پر انگلی رکھے ہا تھا بادشاہ کو الگ لے گیا جہاں اس نے شاہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا جسے دیکھ کر شاہ حیران اور متعجب رہ گئے۔ کیڈٹ نے کہا "ہم سے کہا گیا تھا کہ محل میں ایک سازش ہو رہی ہے۔ جس کا مقصد بادشاہ کی جان لینا ہے نیز یہ کہ باغیوں نے محل پر قبضہ کر لیا ہے اور آپ کی جان خطرے میں ہے ہم محل میں اسلیئے داخل ہوئے تاکہ آپکو بچا سکیں۔"

تجہیز و تکفین کے موقعے پر
حسن اور حسین

لڑائی جس تیزی سے شروع ہوئی تھی اسی تیزی سے ختم بھی ہو گئی۔ وفادار سپاہی بڑی تعداد میں محل میں پہنچ گئے انھوں نے باقی باغیوں سے ہتھیار رکھوالیے ۲½ گھنٹے کی لڑائی میں ۲۵ مہمان اور شاہ حسن کے عملہ کے ۷۵ اشخاص ہلاک ہوئے۔ مرنے والوں میں تین فرانسیسی ڈاکٹر اور بلجیم کے سفیر مارشل ڈوبیرے بھی شامل تھے اسکے علاوہ ۱۶۰ باغیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان میں جنرل مدبوح بھی شامل تھے۔ مجروحین کی تعداد ۱۳۳ تھی۔

جو سفارتی نمائندے ضیافت میں شرکت کے لیے گئے تیزی کے ساتھ واپس رباط پہونچے تاکہ اس ناکام بغاوت میں زخمیوں کے ساتھ... سکرات کے محل سے نکلنے کے بعد ایک نھوں نے دیکھا کہ مراکشی مجمع سے ٹرک پر مچھلیاں لیے بیٹھے تھے ضمیان کے ساتھ انھیں فروخت کر رہے تھے۔ شاید بغاوت کے ناکام ہو جانے کا انھیں کوئی علم نہ تھا۔

یہ بغاوت کیوں ہوئی؟

اس بیرونی ... کا ... حد سے بڑھ جانے والا کرپشن ہے جو اعلیٰ طبقوں میں پایا جاتا زراء تک رشوت خوری میں مبتلا ہیں۔ خبر ہے کہ جنرل مدبوح اہ کو اس طرف توجہ دلائی تھی لیکن انھوں نے کوئی پرواہ نہ خر بغاوت کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

بغاوت ناکام ہو گئی لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ طرح کی بغاوت نہ ابھرے گی جب تک شاہ کا ڈکٹیٹرانہ طرز عمل گا بغاوت کی تلوار سر پر ہر وقت لٹکی رہے گی۔ عام نوجوانوں کو یہ ہے کہ ایک دن آئے گا کہ زمام اقتدار ہم اپنے ہاتھوں میں در شاہ کو اپنے راستے سے ہٹا دیں گے۔"

اد فقیر — حسن کا دایاں بازو۔ جو اپنے ظلم و تشدد کے لیے مشہور ہے۔

پُرمسرت دن
70/242

جیکی کنیڈی جو آج کروڑوں میں کھیلنے والی جیکی اوناسیس ہے

دنیا کا سب سے زیادہ خرچ کرنیوالا جوڑا

۲۰،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر کا ہنی مون

روزانہ ۵۴،۰۰۰ ڈالر کا خرچ

سابق صدر امریکا آنجہانی کنیڈی کی زندہ دل بیوی جیکی (JACKIE) نے جب ایرسٹاٹل سکراٹیس اوناسس (ARISTOTLE SOCRATES ONASSIS) سے شادی کرلی تو برطانوی اخبار نے جلی حرفوں میں یہ سرخی لگائی تھی کہ :

" جیکی ایک بلینک چیک سے شادی کر رہی ہے "

کس قدر سچائی ہے اس سرخی میں۔ آج جیکی اور ایری اسقدر روپیہ خرچ کر رہے ہیں کہ تاریخ میں کرۂ ارض پر آج تک شاید ہی کسی جوڑے نے اتنا روپیا خرچ کیا ہو۔ ان کا سالانہ شخصی خرچ ——— ۲۰،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر ہے۔ یہ ملکہ الزبتھ اور پرنس فلپ کیلئے برطانوی حکومت کے خرچ سے کہیں زیادہ ہے۔

ایری اپنے اور اپنی نئی بیگم جیکی کے لئے اس اندازسے روپیا بہا رہا ہے کہ زار روس بھی ہوتا تو یہ دیکھ کر عش عش کرنے لگتا۔ اور جیکی کے تزک و احتشام کو دیکھ کر مصر کی مشہور زمانہ ملکہ قلوپطرہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پھر بھی جیکی کی تعیش پسند زندگی کے مقابلے میں قلوپطرہ کے خرچ میں کچھ رفاہی پہلو نکل آتا تھا۔ جیکی اور ایری کے اس بے دریغ اور بے حساب خرچ سے انھیں کسی مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ صرف

جہازوں سے ایری کی سالانہ آمدنی ۵۰،۰۰۰،۰۰۰
کے علاوہ مختلف صنعتوں میں اس کے مختلف حصے
چند برس پہلے ایری نے ایک اخبار نویس کی
درخواست کو یہ کہہ کر مسترد کردیا تھا کہ " میرے
نہیں ہے۔ میرے وقت کی قیمت دو ہزار ڈالر فی
بہرحال جیکی اور ایری کے روزانہ پانی کی طرح
کے باوجود وہ اپنے زمانہ ضعیفی کے لئے بھی بہت
کرتے ہیں۔ کئی ملکی اور غیر ملکی ماہرین مالیات کا
مسٹر اوناسس اپنے تمام حصے کاروبار سے ہٹالیں
۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ تا ایک بلین ڈالر ہوگی۔ اگر کم از کم
ڈالر ہی کو لیا جائے اور انھیں کسی دوست پڑوسی
میں رکھا جائے تو اس سے ۵٪ کی عام شرح سود
۲۵،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر کی آمدنی ہوگی۔

آیئے اب ذرا اوناسس کے محلات و ملازم
لوازمات پر بھی نظر ڈالیں۔ مانٹے کارلو (MONTE CARLO)
میں ایک شاندار ولا ہے جہاں سات ملازمین ہمیشہ
تیار رہتے ہیں۔ پیرس میں ایک خاص کوٹھی

ویڈو (Montevideo) میں ایک شاندار محل اور ادر تیسم
بن ہیں۔ ایتھنز کے شہر گلی ناوا میں ایک خوب صورت ولا
بلت ذکر۔ نیویارک میں جیکیز ففتھ ایونیو۔ پانچ ملازمین۔
بینو جیسن میں ایک ذاتی جزیرہ اسکارپیس اور ۷۲ ملازمین
ں خوبصورت جہاز کرسٹینا (CHRISTINA) ۶۵ آدمی
ندی جہاز راں اور ایک ہمہ وقتی ڈاکٹر۔

اگر یہ سب ناکافی ہوں تو دنیا کے مشہور ہوٹلوں جیسے
ارکس پیبرر (NEW YORKS PIERRE) اور لندنسر
رڈس میں مستقل کمرے بھی ہیں۔

مسٹر اوناسس کی ہر ایک کوٹھی میں ان کے کپڑے او
بدیات کی تمام چیزیں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں تاکہ وہ کسی بھی
ں کہیں سے بھی کسی جگہ جاکر رہ سکیں۔ بہت جلد ہی جیکی
یتی ملبوسات اور دیگر ساز و سامانِ آرائش سے بھی بہرہ کم
راستہ کیا جائے گا۔

قبض الوصول کے مطابق ایری کے ۲۰۳ ملازمین ہیں جنکی
ہوں کا ماہانہ خرچ ۶۰۶۰۰ ڈالر ہے۔ ایری کے بیشتر ملازمین
مات خود لی

اور متعلقہ لوگوں کے خور و نوش اور بے روزگاری بھتہ وغیرہ۔۔
سلسلے میں ماہانہ ۲۵،۲۵۰ ڈالر کا خرچ آتا ہے۔ ان کے علاوہ
ملک کے ہر چرچ اور خیراتی ادارے سے ہمیشہ امداد، عطیات اور
چندوں کی اپیلیں آتی ہی رہتی ہیں۔

اب یہ حقیقت عام ہو چکی ہے کہ جیکی نت نئی چیزیں خریدنے
میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ نہ صرف اپنی ذات کے
لئے بلکہ آئے دن اپنے بنگلوں کی نت نئے انداز سے آرائش اور
سجاوٹ کا ذوق اب اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

خود انھیں اپنے گھر کو پہچاننے میں تامل ہوا۔

جب سے جیکی نے اوناسس سے شادی کی ہے وہ اسکے
سارے محلات کو نئے سرے سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی
خواہشمند ہے۔ شادی کے آٹھ مہینے بعد ہی جیکی نے ایتھنز کے محل
گلی فاڈا (GLY-FADA) کی از سر نو آرائش و زیبائش کا کام
شروع کروا دیا اور اس سلسلے میں نیویارک کے شہرۂ آفاق
آرائش کار بلی بالڈ ون کی خدمات حاصل کی گئیں جو دنیا کا انتہائی
گراں ٹھیکیدار ہے۔ اس محل کی آرائش کے خرچ کا اندازہ یوں
لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے لئے جو اعلیٰ قسم کی سیڑیں خریدی گئی ہیں
وہ دس ہزار ڈالر کی ہیں اور چونکہ مسٹر ایری عجلت میں تھے اسلئے
انھیں بذریعہ ہوائی جہاز ایتھنز بھیجا گیا تھا۔ جدید مصری کرسیوں
اور صوفوں پر جو خرچ آیا وہ ۲۲۰۰۰ ڈالر ہے۔ خود مسٹر ایری
کے لئے جو خاص قسم کی کرسیاں اور صوفے خریدے گئے ان کی
قیمت ۱۴۶۶ ڈالر ہے جو گلی فاڈا کے لئے خریدی گئیں اشیا میں
سب سے کم قیمت ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس محل کی
آرائش کی لاگت تقریباً ۷۵۰،۰۰۰ تا ۱،۲۵۰،۰۰۰ ڈالر ہوگی۔

جیکی کا یہ واحد خرچ طلب پروگرام نہیں ہے بلکہ یہ تو محض
ابتدا ہے۔ وہ تو اسکارپیس میں بالکل جدید طرز کا ایک شاندار
بنگلا بنوانے کا بھی ارادہ رکھتی ہے۔ اس پر تقریباً ۱،۶۰۰،۰۰۰ ڈالر
کا خرچ آئے گا۔

بنگلادیش کے ڈاک ٹکٹ

محمد شاہد عظیم

Official First Day Cover

First Issue Of Stamps From The Government Of Bangla Desh

مسٹر بمن ملک اور جسٹس ابو سعید چودھری وائس چانسلر ڈھاکا یونیورسٹی (درمیان میں) برطانیہ کے سابق پوسٹ ماسٹر جنرل مسٹر جان اسٹون ہاؤز ممبر پارلیمنٹ کو برطانوی دارالعلوم میں بنگلادیش اسٹامپس کی نوٹو کاپیاں پیش کر رہے ہیں۔

بنگلادیش کے ڈاک ٹکٹ کے اجرار کی خبر ساری دنیا میں بڑی دلچسپی سے پڑھی گئی۔ یہ خبر ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والے شائقین کے لئے سنسنی خیز بھی تھی اور حیرت انگیز بھی کیونکہ ابھی حریت پسند بنگلادیش میں ایک طویل جنگ لڑ رہے ہیں۔

ایک ایسی حکومت کے ڈاک ٹکٹ جاری ہونے والے تھے جسے ابھی دنیا کے کسی بھی ملک نے تسلیم نہیں کیا ہے، جس کی کوئی راجدھانی بھی نہیں ہے نہ خود کی اپنی کرنسی ہے اور نہ ڈاک وتار کا انتظام لیکن ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والے اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ عبوری حکومتوں کے ڈاک ٹکٹ نہ صرف قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ انتہائی قیمتی اور نایاب ہو جاتے ہیں۔

کاغذ کے ان حقیر ٹکڑوں کی قیمت کئی ہزار روپے بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے وہ بے چینی کے ساتھ ۲۹ جولائی کے منتظر تھے جو صرف دو دن بعد تھی۔

واقعات نئی دہلی

• جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ ڈاک ٹکٹ کا ایک عام مصرف یہ ہے کہ انھیں خطوط پر چسپاں کرتے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا ہے اور وہ منزل پر پہونچنے کے بعد بے کار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دراصل ڈاک کے ٹکٹ ایک خاموش سفیر کا رول انجام دیتے ہیں۔ وہ کام جو اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن انجام نہیں دے سکتے ڈاک کے ٹکٹ انجام دیتے ہیں۔ حالیہ عرصے میں یمن کے شاہ پرستوں سے لے کر آسام کے میزو باغی تک اسے آزما چکے ہیں۔ بنگلادیش کی انقلابی حکومت نے بھی اس سفیر کو آزمانے اور بنگلادیش کی جد و جہد آزادی کے پیام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بالآخر ۲۶ جولائی کو بنگلادیش کے ۸ ڈاک ٹکٹ اور خصوصی لفافہ (فرسٹ ڈے کور) کی اجرائی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ ٹکٹ ۲۹ جولائی کو جاری ہونے والے تھے۔ یعنی صرف دو دن بعد۔

۲۹ جولائی کا دن آ پہنچا۔ بنگلادیش مشن کلکتہ پر انھیں خریدنے کے لئے قطاریں لگ گئی تھیں۔ مکمل سیٹ کی قیمت ۲۲ روپے ہونے کے باوجود شائقین نے ہزاروں سیٹ خرید لئے۔ جو لوگ وہاں نہیں پہونچ سکے انھوں نے قبل از وقت قیمت روانہ کر کے اپنے ٹکٹ ریزرو کرائے۔ بیرونی ممالک سے بھی بے شمار آرڈر۔

ان ٹکٹوں کو ڈیزائن عالمی شہرت یافتہ مسٹر بمن ملک نے جنھوں نے برطانوی پوسٹ آفس کے لئے ۱۹۶۹ء میں گاندھی میموریل ڈاک ٹکٹ کا ڈیزائن تیار کیا تھا اور جو دو گولڈ میڈل حاصل کر چکے ہیں تیار کیا ہے اور انھیں لندن کی ایک فرم سے چھپایا ہے۔

بنگلادیش مشن کے سربراہ مسٹر حسین علی کے مطابق بنگلادیش کی حکومت آئندہ بھی لندن میں ایسے ہی نئے یادگاری ٹکٹ جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ ان کی قدر و قیمت ہونے والی آمدنی بنگلادیش پر صرف کی جا سکے۔ بنگلادیش کی کرنسی جاری کرنے کے سوال کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔ مسٹر حسین علی نے ۲۶ جولائی کو کلکتہ میں بتایا کہ قبل ازیں ان ٹکٹوں کی اجرائی اس لئے ممکن نہ ہو سکی کہ حکومت کی ساری توانائیاں بنگلادیش پر قابض پاکستانی فوجوں سے مقابلہ کرنے پر صرف ہو رہی تھیں۔ حکومت بنگلادیش کو قوی امید ہے کہ ہندوستان

واقعات
کے سالانہ چندہ میں رعایت
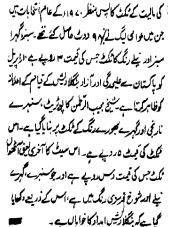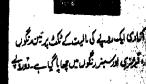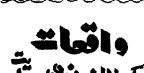
۳۱ر جولائی تک کے لیے ۱۸ روپے سالانہ کی بجائے ۱۵ روپے سالانہ کی گئی تھی ۔۔۔ اب اس رعایت میں ۔۔۔ ۳۱ر اگست تک توسیع کردی گئی ہے۔

آج ہی ۱۵ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجکر اس رعایت سے فائدہ اٹھایئے ۔۔۔ وی۔پی طلب کرنے والے اصحاب اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

سرکولیشن منیجر واقعات۔ ڈی ۱۔ نظام الدین ایسٹ
نئی دہلی ۱۳

ممالک کو خطوط کی ترسیل کے لئے مکمل سہولتیں فراہم ... نے بتایا کہ بنگلا دیش کے ڈاک ٹکٹ کو ڈاک ... بین الاقوامی یونین (U.P.U) سے منظور کرانے کی بھی ... کی جارہی ہے۔

... بنگلا دیش کے رنگا رنگ اور خوب صورت ٹکٹ آٹھ مختلف ... کے ہیں جن کے ذریعے بنگلادیش کی جدوجہد آزادی کو ... ہے۔ دس پیسے کی قیمت کے ٹکٹ پر جو نیلے قرمزی ... کی رنگوں میں ہے، بنگلادیش کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ زرد ... اور گہرے سبز رنگ کا بیس پیسے والا ٹکٹ ڈھاکا ... میں قتل عام کی کہانی سناتا ہے۔ ۵۰ پیسے کی مالیت ... چار رنگوں میں ہے جس پر ۷۵ کا ہندسہ نمایاں ہے ... دیش کی ۷۵ کروڑ آبادی کو ظاہر کرتا ہے۔ بنگلا دیش

... کی مالیت کے ٹکٹ کا پس منظر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات ہیں جن میں عوامی لیگ نے ۹۷٪ ووٹ حاصل کئے تھے۔ سبز گہرا سبز اور نیلے رنگ کا ٹکٹ جس کی قیمت ۳ روپے ہے ۱۰ اپریل کو پاکستان سے علیحدگی اور آزاد بنگلا دیش کے قیام کے اعلان کو ظاہر کرتا ہے۔ شیخ مجیب الرحمن کا پورٹریٹ سنہرے نارنجی اور گہرے بھورے رنگ کے ٹکٹ پر بنایا گیا ہے۔ اس ٹکٹ کی قیمت ۵ روپے ہے۔ اس سیٹ کا آخری یعنی آٹھواں ٹکٹ جس کی قیمت دس روپے ہے اور جو سنہرے، گہرے نیلے اور شوخ قرمزی رنگ میں ہے، اس کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ بنگلا دیش امداد کا خواہاں ہے۔

... آزادی ایک روپے کی مالیت کے ٹکٹ پر تین رنگوں ... قرمزی اور سبز رنگوں میں چھاپا گیا ہے۔ دو روپے

کیا ہم آزاد ہیں؟

شمس الاسلام

● آج بھی ہمارے ملک کی آدھی سے زیادہ جنتا ننگی بھوکی ہے!

● آج ہمارے ملک کا ہر شخص 275 روپے کا قرض دار ہے!

● ہر ہندوستانی فی کس صرف ۲۸ روپے خرچ کرتا ہے!

● ملک کے ایک فی صد لوگ ۴۸٪ زمین پر قابض ہیں!

● ملک کی دولت پر صرف ۷۵ خاندان قابض ہیں!

● ملک کی آزادی کے بعد سے آج تک 7500 ہندو مسلم فسادات ہو چکے ہیں —

لیکن پھر بھی کیا ہم آزاد ہیں...؟

...عظمت کی بلندیوں کو چھونے کا سبب ...کے بغیر نہیں۔ پستی کی گہرائیوں تک پہنچی ...جاتی ہیں۔ وہ آزادی ہی ہے جس نے ...قوم کو ترقی کی ان بلندیوں پر پہنچایا ہے ...ملک اس سے دوستی کا خواہشمند ہے۔ لیکن ...نہیں ملجاتی۔ آزادی بھیک میں نہیں ملتی بلکہ اسکے ...جاتی ہے۔

...تاریخ جدوجہد آزادی کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے۔ بزدل قومیں ہمیشہ غلام بنی رہتی ہیں۔ الجزائر نے آزادی حاصل کی سوغات میں تحفتہً نہیں دی گئی۔ اس قوم نے اپنے دس لاکھ سپوتوں کی قربانی دے کر ایک لمبی جدوجہد کے بعد ہی آزادی حاصل کی۔ فلسطین ہی کو لیجئے، حالانکہ انہیں آزادی ملنے کی امید دور دور تک نہیں ہے لیکن آزاد رہنے اور باعزت زندگی گزارنے کی خواہش فلسطینیوں کو قربانی دینے پر مجبور کر رہی ہے۔

کیوبائی عوام نے آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے ظلم و ستم برداشت کئے۔ اور انہیں ان گنت قربانیاں دینے کے بعد

ہندوستانیوں کو بھی جو آزادی چوتھائی صدی پہلے ملی کسی کی طرف سے دان میں نہیں ملی۔ یہ ہمیں بھیک میں نہیں ملی تھی اسکے لئے ۴۰ کروڑ عوام نے کندھے سے کندھا ملا کر محنت کی تھی ظلم سہے تھے اور جانیں گنوائی تھیں۔ یہ بات بالکل واضح ہو جانی چاہئے کہ ہمیں آزادی احسانے نہیں بلکہ قربانیوں نے دلوائی تھی۔ یہ آزادی مادر وطن کے ان جیالے بیٹوں اور بیٹیوں کی دین تھی جو پتہ نہیں کہاں کہاں اپنی ہی سرزمین پر خاک میں مل گئے۔ خون بہا تب جا کر آزادی ملی۔ نہ جانے کتنے بھگت سنگھ اور سولی پر چڑھے تو ہمیں آزادی نصیب ہوئی اور جب آزادی ملی تو ہم چالیس کروڑ ہندوستانی

...گنگا دھر تلک نے ۱۹۱۸ء میں کہا: "دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ کسی حکمراں نے انسانی جذبے سے متاثر ہو کر اپنی مرضی سے اپنی سلطنت کا اختیار کر دیا ہو یا اپنی حکومت رعایا کے سپرد کر دی ہو۔" واقعات نے ان الفاظ کو ہمیشہ سو فیصدی صحیح ثابت

آزادی کی دلہن کا وصال حاصل ہوا۔

آج جو کچھ بھی ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، بنگلادیش، اور لاطینی امریکا میں ہو رہا ہے، وہ کیا ہے؟ وہاں کے عوام آزادی چاہتے ہیں۔ وہ سب غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ آزادی کے ساتھ زندہ رہنا ان کا ایمان ہے۔

اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے تھے۔ یہ آزادی کی ہی خوشی تھی کہ ہم نے تقسیم ہند کے فوراً بعد رونما ہونے والے قتل عام کو حوصلہ اور ہمت کے ساتھ برداشت کیا۔

جب ہندوستانی عوام آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے اور دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے بڑے سامراجی ملک انگلینڈ سے

لوالے رہے تھے تب قومی لیڈرشپ نے انہیں یقین دلایا تھا کہ آزاد ہندوستان میں ایک ایسے سماج کی تشکیل کی جائے گی جہاں حقیقی معنوں میں عوام کی حکومت ہوگی۔ معاشی اور سماجی نابرابری ختم کرکے مساوات پر عمل کیا جائے گا۔ سب کو برابر کے حقوق دیئے جائیں گے، کوئی بھوکا نہیں رہے گا، کسی کی جان غیر محفوظ نہ ہوگی سب لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ فراہم کی جائے گی۔ یہ سب وعدے پنڈت نہرو، ڈاکٹر راجندر پرساد اور سردار پٹیل وغیرہ جیسے کانگریسی لیڈروں نے اپنی بہت سی تقریروں اور تحریروں میں کیے۔ ان سب کے علاوہ آئین ہند کے دیباچے میں بھی وعدہ کیا گیا کہ ہندوستان کے ہر شہری کو سماجی معاشی اور سیاسی انصاف مہیا کیا جائے گا۔ ہر شہری کو تحریر و تقریر کی اور مذہبی آزادی ہوگی۔ سب کو برابر کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ لیکن آج پورے ۲۵ سال گزرنے کے بعد کیا نظر آرہا ہے۔ ساری امیدیں اور توقعات خاک میں مل گئیں۔ سارے وعدے جھوٹے ثابت ہوئے۔ آج کے ہندوستان میں نابرابری، ناانصافی اور بے ایمانی کا دور دورہ ہے جس ملک کی آزادی کے وقت یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ وہاں معاشی مساوات ہوگی۔ وہاں آج یہ حالت ہے کہ ۵۰ فیصدی عوام کے لئے دوسرے وقت کی روٹی کھانا مشکل ہے۔ شہری علاقوں میں ۴۰ فیصدی عوام بے روزگار ہیں۔ ۴۴ فیصد عوام کی ماہانہ آمدنی صرف ۱۸ روپیہ ہے۔ ہر ہندوستانی فی کس ۲۸ روپے مہینہ خرچ کرتا ہے۔ ہندوستان کا دیہی علاقہ جہاں کل آبادی کا ۷۰ فیصدی حصہ رہتا ہے، وہاں حالت یہ ہے کہ ۸۵ فیصدی لوگ مزدوری کی حد سے گری ہوئی زندگی گزارنے کے لئے مجبور ہیں۔ ہم نے آزادی کے وقت معاشی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ لیکن آج پورے ۲۵ سال کے بعد بھی یہ حالت ہے کہ گاؤں میں دو کروڑ لوگوں کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ ۶ کروڑ لوگوں کے پاس کل زمین کا ایک فیصد حصہ ہے۔ ۲۷ کروڑ ۲۰ لاکھ لوگ صرف ۱۹ فیصدی زمین کے مالک ہیں جبکہ ایک کروڑ چالیس لاکھ لوگوں کے پاس ششیر کا حصہ یعنی کل زمین کا ۸ء۴ فیصدی ہے۔ کیا معاشی مساوات اسی کا نام ہے؟ ایک طرف تو ہندوستانی عوام کو یہ غربت ملی ہے اور دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام کو شاندار ترقی حاصل ہوئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ کس تیزی سے ہندوستان کے ۲۰ بڑے سرمایہ دار گھرانوں کا سرمایہ بڑھا ہے:۔

واقعات نئی دہلی

	سرمایہ دار گھرانے کا نام	مونوپلی انکوائری کمیٹی کے مطابق ۱۹۶۳-۶۴ء میں کل سرمایہ (کروڑوں میں)	انڈسٹریل لائسنسنگ پالیسی انکوائری کمیٹی کے مطابق۔ ۱۹۶۶ء میں کل سرمایہ	۱۹۶۸-۶۷ء میں کل سرمایہ	۱۹۶۳-۶۴ء کے سرمایہ پر ۱۹۶۷ء میں فیصد اضافہ
۱۔	برلا	۲۹۲٫۷۲	۴۵۷٫۸۴	۵۷۵٫۶۰	۹۶٫۶٪
۲۔	ٹاٹا	۴۱۷٫۷۲	۵۰۵٫۳۶	۵۸۴٫۶۳	۳۹٫۹٪
۳۔	مارٹن برن	۱۴۹٫۶۱	۱۵۳٫۰۶	۱۷۴٫۲۹	۱۶٫۵٪
۴۔	بنگور	۷۷٫۹۱	۱۰۴٫۳۱	۱۲۴٫۸۱	۶۰٫۳٪
۵۔	اے سی سی	۷۷٫۳۶	۸۹٫۸۰	۱۰۵٫۸۴	۳۶٫۸٪
۶۔	تھاپر	۷۱٫۹۰	۹۸٫۸۰	۱۰۳٫۳۰	۴۳٫۷٪
۷۔	ساہو جین	۶۷٫۶۹	۵۸٫۷۵	۷۹٫۶۸	۱۷٫۷٪
۸۔	برڈ ہیلز	۶۰٫۱۷	۶۸٫۶۲	۷۸٫۶۲	۳۰٫۸٪
۹۔	جے۔کے	۵۹٫۲۰	۶۶٫۸۴	۷۸٫۷۵	۳۳٪
۱۰۔	سورج مل ناگر مل	۵۷٫۳۷	۹۵٫۶۲	۱۰۷٫۳۴	۸۷٫۱٪
۱۱۔	والچند	۵۵٫۱۷	۸۱٫۱۱	۸۶٫۲۴	۵۴٫۷٪
۱۲۔	شری رام	۵۴٫۶۸	۷۴٫۱۳	۱۰۷٫۴۱	۹۶٫۴٪
۱۳۔	سکنڈیا	۴۶٫۹۶	۵۵٫۹۸	۶۵٫۴۴	۳۹٫۴٪
۱۴۔	گوئنکا	۴۶٫۹۵	۶۵٫۳۴	۴۶٫۵۵	۲۷٫۵٪
۱۵۔	مفت لال	۴۵٫۹۱	۹۲٫۷۱	۱۳۵٫۸۷	۱۹۵٫۹٪
۱۶۔	سارا بھائی	۴۳٫۱۶	۵۶٫۷۱	۷۲٫۵۸	۶۸٫۲٪
۱۷۔	انڈیا لیور	۴۱٫۹۸	۴۶٫۷۵	۵۴٫۱۲	۲۹٫۲٪
۱۸۔	آئی۔سی۔آئی	۳۵٫۸۹	۵۰٫۰۶	۵۱٫۱۱	۳۸٫۵٪
۱۹۔	کلک	۴۱٫۵۰	۵۱٫۰۷	۶۲٫۱۰	۴۹٫۶٪
۲۰۔	کلاچند	۳۵٫۱۳	۳۷٫۲۲	۳۹٫۷۲	۱۳٫۱٪
					۵۴٫۶٪

۱۹۴۷ء میں برلا کا کل سرمایہ صرف ۳۷ کروڑ روپے تھا جو ۱۹۷۱ء میں بڑھ کر ۹۵۰ کروڑ روپے تک پہونچ گیا ہے جبکہ ٹاٹا کا کل سرمایہ ۱۹۷۰ء میں ۹۰۰ کروڑ روپے ہے۔

ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ان ۲۰ خاندانوں کی دولت میں، ۴ سال میں کل ملاکر ۵۴٫۶٪ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ حیرت میں نہ پڑیے گا اگر آپ کو یہ بتایا جائے کہ آج ہمارے ملک کی تقریباً ۶۰ فیصدی دولت پر صرف ۷۵ خاندان قابض ہیں۔ ۶۴-۱۹۶۳ء میں ان گھرانوں کی تعداد جنکا سرمایہ ۲۰ کروڑ یا اس سے زیادہ تھا صرف ۳۳ تھی۔ آج یہ تعداد بڑھ کر ۵۰ سے تجاوز کر چکی ہے۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور دوسری طرف تمام ہندوستان غریب ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی قوت خرید نہ ہونے کے برابر ہوگئی ہے۔ اس کا اثاثہ چھن کر اجارہ داروں

...میں پہونچ چکا ہے۔ کیا ہم نے ایسا ہی شالی سماج بنانے
...دی حاصل کی تھی۔ کیا آزادی کا مقصد یہ تھا کہ ایک
...سے نجات دلا کر دوسرے معاشی طبقے کو بھوکے ننگے
...عوام پر مسلط کر دیا جائے۔ کیا جنگ آزادی صرف اس
...کی آزادی کے لئے لڑی گئی تھی۔؟ یا یہ لڑائی تھی
...طبقوں کے درمیان کہ کون حکومت کرے اور کون اپنے
قائم کرنے کی اجازت مل رہی ہے۔"

کیا ہم اسی طرح سے اجارہ داری کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟ کیا حقیقی طور پر ہم معاشی مساوات لانا چاہتے ہیں؟ ایک طرح سے دیکھا جائے تو سوشلزم آ رہا ہے۔ لیکن یہ سوشلزم اجارہ داروں اور سرمایہ داروں کے لئے ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان سب کو برابر کر دیا جائے۔

سرمایہ دار ممالک سے ہندوستان کے معاشی معاہدے

ملک کا نام	۱۹۵۷-۶۰ء	۱۹۶۰-۶۶ء
امریکا	۸۱	۳۶۹
انگلینڈ	۲۲۳	۴۸۰
مغربی جرمنی	۷۹	۲۹۰
جاپان	۵۱	۱۶۵
دوسرے سرمایہ دار ممالک	۲۶۶	۴۳۵

حالانکہ حکومت کی طرف سے اس بات کا بار بار اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم ملکی صنعت پر غیر ملکی سرمائے کا اثر کم کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ غیر ملکی سرمائے کو ملک سے نکال باہر کر دیا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا غیر ملکی سرمایہ ہندوستان میں بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ انگریزی روزنامہ "اسٹیٹسمین" کے مطابق: "حالانکہ حکومت نے اس بات کا فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان صنعتی میدانوں میں جن کے لئے بھارت میں ہی سوجھ بوجھ (Technical Know how) موجود ہے غیر ملکی اشتراک سے کوئی صنعت قائم نہیں کی جائے گی۔ لیکن ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں اس فیصلے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔"

مہاتما گاندھی کے خواب کیا کبھی شرمندۂ تعبیر ہوں گے ۔۔۔؟

...ات سے دستبردار ہو۔؟
آج ہمارا ایک اور نعرہ ہے۔ سوشلسٹ سماج کی تعمیر
... اس سوشلسٹ سماج کی بنیاد کیسے پڑے گی۔ وہ بھی ملاحظہ
... پچھلے آٹھ مہینوں میں ہماری سوشلسٹ حکومت نے بیستہ
... خاندانوں کو ۴۰ لائسنس اور جاری کئے ہیں۔ انگریزی
... اسٹیٹسمین کے مطابق
... مونوپلی ایکٹ اور گورنمنٹ کی نئی لائسنس پالیسی کے باوجود
... کی صنعتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور انھیں نئی صنعتیں

ہمیں غیر ملکی حکومت سے تو نجات مل گئی لیکن غیر ممالک کے معاشی شکنجوں سے ہم نجات حاصل نہیں کر سکے۔ غیر ملکی سرمائے کا اثر ہماری ملکی معیشت پر بڑھتا چلا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم معاشی میدان میں چند یورپین ممالک کے غلام بن کر رہ گئے۔ ان ممالک نے کس طرح ہندوستان کی معیشت پر تسلط جمایا ہے وہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہو جائے گا۔

مولوی برکت اللہ ان لاکھوں لوگوں میں سے تھے جنہوں نے طرح طرح کی قربانیاں دیکر ملک کو آزاد کرایا۔

یہ چیز اس بات سے صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ ۱۹۵۷ء میں ان معاہدوں کی کل تعداد ۱۴ء تھی جبکہ ۱۹۷۱ء میں یہ بڑھ کر ۳۵۰۰ تک پہونچ گئے ہیں۔

اسی اخبار کا نامہ نگار آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکی سرمایے کے اشتراک (Foreign Collaboration) کو گھٹایا نہیں جا رہا ہے بلکہ غیر ملکی کمپنیاں حکومت ہند کے بڑھاوا دینے پر اور زیادہ سرمایہ ہندوستان میں لگا رہی ہیں۔ چائے کی صنعت میں تو یہ حالت ہے کہ ساری ۱۲۴ کمپنیاں غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہیں۔ جس حساب سے یہ کمپنیاں ہندوستان کی دولت نفع کی شکل میں لوٹ کر لیجا رہی ہیں اس پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلیے۔

روزنامہ اسٹیٹسمین کے مطابق اوسطاً ان کمپنیوں نے ۱۹۶۹-۷۰ء میں ۳ء۱۵ فیصد نفع کمایا۔ ان میں سب سے زیادہ نفع امریکن کمپنیوں کو حاصل ہوا۔ ان کی نفع کی درن ۹٪ ۶ تھی اس کے بعد انگریزی کمپنیوں کا نمبر آتا ہے جنہیں ۵٪ ۱ نفع حاصل ہوا۔ اس طرح ہم ابھی تک اپنی دولت اور سرمایا غیر ممالک کے حوالے کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کا سونا سمٹ کر یورپ پہنچ رہا ہے۔ دادا بھائی نوروجی نے آج سے تقریباً ۷۵ سال پہلے جب ہم غلام تھے (DRAIN THEORY) پیش کی تھی۔ اس میں انھوں نے بتلایا تھا کہ کس طرح بھارتی دولت تجارت کے ذریعے انگلینڈ اور یورپ کی طرف بہائی جا رہی تھی۔

آج حالات بہت مختلف معلوم نہیں دیتے۔ آج بھی ہمارے ملک کی دولت یورپ کو DRAIN کی جا رہی ہے۔ ان حالات میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ معاشی طور پر ہم آزاد ہیں۔ کیا اس غلامی کو آزادی کہتے ہوئے دل نہیں دکھتا۔

جنگِ آزادی کے دوران، آزادی ملتے وقت اور اس کے فوراً بعد ہندوستانی عوام سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ آزاد ہندوستان کی بنیاد جمہوری اصولوں پر رکھی جائے گی۔ جمہوریت ملا اور ہم پھولے نہ سمائے۔ ہم سب نے یقین کر لیا تھا کہ ہماری جمہوریت دنیا کی جمہوری تاریخ میں سب سے بڑا تجربہ ہوگی۔ لیکن افسوس یہ خیال خام ہی رہا۔ ہندوستانی لیڈرشپ نے جمہوریت کا سبق بھلا دیا اور وہ گھناؤنی حرکتیں کیں کہ جمہوریت کا سر شرم سے جھک گیا۔ Internal Security ایکٹ اور Preventive Detention ایکٹ کی موجودگی میں آج ہندوستانی جمہوریت سسکیاں لیتی ہوئی لب دم ہے۔ یہ دونوں کالے قانون، کالے قانونوں کی تاریخ میں بدترین مثالیں ہیں۔ یہ اور جمہوریت دو متضاد چیزیں ہیں۔

گاندھی جی کی تعلیمات یاد رفتہ ہوگئیں۔ ان کی تصویر تو پوجی جاتی رہی لیکن اپنے افکار و اعمال میں ہمارے لیڈروں نے اس کے

ہم نے نہ جانے کتنے ہر دیالوں کی قربانیاں دے کر ملک کو آزاد کرایا ہے

بالکل برعکس کیا۔ ہم جیسے جیسے سماج وادی نعروں اور ڈھول کو بڑھاتے گئے عوام اور لیڈروں کے درمیان فرق بھی بڑھتا گیا عام لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ بھی نہ ملی جبکہ گورنروں اور وزیروں نے ان گھروں، محلوں اور کوٹھیوں میں رہنا شروع کیا جن کی دیکھ بھال پر ہی کروڑوں روپیا خرچ ہوتا ہے۔ ہماری لیڈرشپ کے مطابق اس سے پہلے کہ ہندوستان میں روٹی اور بھوک کا مسئلہ حل ہو جمہوریت کا آغاز ضروری تھا۔

عوام سے یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ آزادی کے بعد نابرابری اور ناانصافی کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی [illegible] لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ نکلا۔ پچھڑے ہو[ئے] طبقات کے لوگ ابھی تک وہیں ہیں جہاں وہ پہلے تھے۔ [ہم]ارے عوام کے ایک بڑے حصے کے ساتھ چھوت چھات برتی جا[تی ہے] انھیں کنوؤں سے پانی نہیں بھرنے دیا جاتا۔ انکو عبادت گا[ہوں] میں جانے سے روک دیا جاتا ہے۔ ابھی تک اچھوتوں کو ز[ندہ] پکڑ کر جلایا جاتا ہے۔ آج آزادی کے ۲۵ سال بعد بھی [؟] بھنگی کالونیوں کی حالت بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ آزا[دی سے] پہلے تھی ابھی تک اقلیتوں کو جائز حقوق نہیں مل سکے۔ غیر[سرکاری] اطلاعات کے مطابق آزادی کے بعد سے اب تک تقریباً [؟] مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں۔ ابھی تک گروگولوالکر کی کت[اب] "Bunch of Thought" بازاروں میں بکتی [؟] ہے۔ آزادی نے اقلیتوں کو کیا دیا ہے؟ سیدھا سا جواب "کچھ نہیں"۔

یہ سب زندہ حقائق ہیں۔ بہت ہی افسوسناک اور شرم[ناک] آزادی کے بعد بھی ہم آزاد نہیں ہوئے۔ سماجی، سیاسی او[ر معاشی] آزادی ابھی تک ایک خواب ہی ہے۔ دنیا میں کم ممالک ایسے [ہیں] جہاں کے عوام عام طور پر اپنی آزادی سے اسقدر مایوس [ہوں۔] اکثر لوگ یہی سوال کرتے ہیں "یہ کیسی آزادی ہے آخر [ہمیں] کیا ملا"؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ شاید وقت اس کا جواب دے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ وقت کب آئے گا۔ جب ہم [صحیح] معنوں میں آزاد ہو جائیں گے۔ ہندوستان کے ۵۵ کروڑ [عوام] ملکر سوشلزم اور معاشی و سماجی برابری کے خوابوں میں [حقیقت] کا رنگ بھر دیں گے۔ وہ وقت اب شاید بہت دور نہیں ہ[ے۔] عوام بیدار ہو رہے ہیں اور یہ بیدار عوام بہت جلد ہی [؟] صحیح عوامی جمہوریت کی بنیاد ڈال دیں گے۔

اپولو ۱۵ کا مشن

"میری خواہش تھی کہ ہم یہاں بیٹھتے اور کچھ دیر یہاں کے چٹانی ٹکڑوں سے کھیلتے۔ یہ کتنے صاف شفاف اور چمکیلے ہیں۔"

یہ الفاظ اپولو ۱۵ کے خلا باز۔ ڈیوڈ آر اسکاٹ (۳۹ برس) نے کہے جب وہ اور ان کے ساتھی جیمز بی اروِن (۴۱ برس) چاند کے اپی نائن نامی پہاڑی سلسلے تک، اپنی چاند کار میں پہنچے۔

چاند کی سطح کو اپنے پیروں سے روندنے کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ انسان نے اس کی سطح پر چاند گاڑی چلائی۔ یہ کار آٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلائی جا سکی۔ ٹیلی ویژن پر خلا بازوں نے بتایا کہ: "ایسا معلوم ہوتا ہے، ہم پہاڑی علاقوں میں چل رہے ہیں۔" پیل کیا رہے ہوں گے اچھل رہے ہوں گے اس لئے کہ چاند پر زمین کی طرح سڑکیں نہیں ہیں۔ لیکن سائنسدانوں نے چاند کار کو اس انداز پر بنایا ہے کہ وہ جھٹکوں کو برداشت کر سکے

اپولو ۱۵: ۲۶ر جولائی کو صبح ۹ بج کر ۱۵ منٹ پر خلا میں داغا گیا تھا اور اس کے مشن کی مدت ۱۲ دن، گھنٹے اور ۱۲ منٹ تھی۔ پچھلے تمام تجربات کے مقابلے میں یہ تجربہ سب سے زیادہ کامیاب رہا اور اس میں کئی نئی باتیں دیکھنے میں آئیں۔ مثلاً پہلی بار چاند کار چاند پر لیجائی گئی۔ پہلی بار ایک انسان بردار خلائی جہاز سے ایک غیر انسان بردار مصنوعی سیارہ چھوڑا گیا جو چاند کے مدار میں ایک سال تک گردش کرتا رہے گا۔ اور خلا باز پہلے سے زیادہ دیر تک چاند پر رہے۔

چاند پر خلا بازوں نے صرف چٹانیں ہی جمع نہیں کیں بلکہ انھوں نے چاند کی سطح پر سوراخ بھی کیے تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ چاند کے اندرونی حصے میں کتنی گرمی ہے۔ اسکاٹ دس فیٹ گہرے سوراخ کرنا چاہتا تھا لیکن پہلا سوراخ وہ صرف پانچ فیٹ سے کچھ زیادہ کر سکا اور دوسرا سوراخ ۳ ½ فیٹ سے زیادہ نہ ہو سکا۔ خلا باز اپنے اس کام میں جٹے ہوئے تھے کہ کنٹرول روم سے انھیں ہدایت کی گئی کہ وہ اور زیادہ خطرہ مول نہ لیں۔

خلا بازوں نے جو جولائی کو چاند پر اترنے اور ۲ اگست کو واپس روانہ ہونے کے درمیان جو دن گزارے وہ اس کرہ کی ۴ ½ ارب سال کی تاریخ "میں عجیب ترین" تھے۔ اور اسی کے ساتھ ان خلائی مسافروں نے دنیا میں بے شمار لوگوں کے لیے ہفتے کے آخری دنوں میں جو پروگرام پیش کیے وہ نہایت ہی غیر معمولی تھے۔

انھوں نے ایک ٹیلی ویژن شو پیش کیا جس میں خود چاند کا کام سب سے نمایاں رہا۔ قریب قریب پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ٹیلی ویژن دیکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے تاریخ کی تشکیل ہوتے دیکھی، اور انھوں نے خلا باز ڈیوڈ اسکاٹ اور جیمز بی اروِن کو چاند پر پیچیدہ آلات نصب کرتے اور ان پر کام کرتے دیکھا۔

اپولو ۱۵ کے مشن کی نمایاں خصوصیت ایک ٹیلی ویژن کیمرہ تھا جسے بذریعہ ریڈیو زمین سے کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ جب یہ ٹیلی ویژن کیمرہ دائیں بائیں یا کبھی کبھی پورے دائرے میں گھومتا تو زمین پر دیکھنے والوں کو ایسے وسیع مناظر دیکھنے کو ملتے جنہیں آج سے پہلے کسی انسان نے نہیں دیکھا۔ لوگوں نے اپی نائن پہاڑیوں کی فلک بوس چوٹیاں دیکھیں جن کے دامن میں دونوں خلا باز مختلف تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

جس دوران خلا باز اسکاٹ اور اروِن چاند پر تھے ان کے تیسرے ساتھی خلا باز الفریڈ ایم۔ وارڈن چاند کے مدار میں کمان گاڑی میں چکر لگا رہے تھے اور الگ اپنے مشاہدات میں مصروف تھے۔ وہ چاند۔ زمین اور ستاروں کا براہ راست عینی اور آلجاتی مشاہدہ کر رہے تھے۔

اپولو ۱۵ کے مشن میں جو طریقے اپنائے گئے وہ یقیناً ان تکنیکوں کا پیش خیمہ ہیں جو اس صدی کے بقایا حصے میں لازماً وسیع پیمانے پر استعمال کی جائیں گی۔ ■

واقعات نئی دہلی

سب سے زیادہ ہر دل عزیز مہماتی کہانی کون سی ہے؟ رابنسن کروسو؟ ڈون کیخوتے؟ خزانے کا جزیرہ؟" نظری طور پر اس بارے میں ہماری رائیں مختلف ہیں، لیکن میں تو صرف "تین بندوقچی" کے حق میں ووٹ ڈالوں گا۔

"تین بندوقچی" کا شمار تقریباً ایک صدی سے سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں ہے۔ اس وقت بھی سیکڑوں لوگ مختلف زبانوں میں اس ناول کو پڑھ رہے ہوں گے۔

ناول نویسی کی صنف میں "تین بندوقچی" کا مصنف الیگزینڈر ڈوما ایک عجوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے یہ شیخی بگھارنے میں بڑا

واقعات نئی دہلی

مزا آتا تھا کہ وہ پانچسو سے زیادہ بچوں کا باپ ہے۔ ممکن ہے اس نے یہ اندازہ لگاتے ہوئے کچھ زیادہ ہی رعایت سے کام لیا ہو۔ لیکن اپنے مٹاپے اور بے تکے چہرے مہرے کے باوجود وہ عورتوں کو موہ لینے کا گر جانتا تھا۔ اس نے بار بار یہ دعویٰ کیا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔ لیکن اس سلسلے میں اس کی لاف زنی کچھ بے طرح بڑھ گئی تھی اور ایک محبوبہ نے اس کی سب ہیکڑی نکال دی۔ اس نے اپنے سرپرست سے کہا کہ وہ ڈوما کے تمام قرضے قرض خواہوں لو زیادہ رقم دے کر خرید لے۔ ان دنوں مقروض آدمی کو جیل بھیجا جاسکتا تھا۔ چنانچہ عظیم عاشق ڈوما کو شائستگی کے ساتھ مطلع کر دیا

یا جیل چلا جائے۔ ڈوما نے شادی کر لی۔

ڈوما کی شکل وصورت بھی عجیب تھی۔ اس کی رگوں
چوتھائی خون تو گوروں کا تھا اور ایک چوتھائی حبشیوں کا
دادی جزائر غرب الہند کے ایک گنے کے فارم پر حبشن با
حیثیت سے رہتی تھی۔ اس کا نام میری ڈوما تھا۔ اس
ان جاہل عورت نے گمنامی کی زندگی گزاری اور اسی
فوت ہوئی۔ اس بچاری نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سو
کہ اس کے پوتے کی شہر یار اور شاعر اور امرا تعظیم و تکریم
اور وہ اس کا نام چار دانگ عالم میں روشن کرے گا۔

ڈوما اپنی حبشی دادی سے خاصی مشابہت رکھتا
ویسے اس کا رنگ تو بالکل گورا تھا۔ اور آنکھیں جزائر
کے آسمان کی طرح نیلی تھیں۔ لیکن اس کے ہونٹ مو
نتھنے چوڑے اور چپٹے تھے۔

اس نے تلواروں اور پستولوں سے مسلح ہو کر بہ
ڈوئیل لڑے۔ اس کے بال تھے تو گیندے کی طرح زر
بالکل اپنی حبشی دادی پر گئے تھے یعنی گھنے ہوئے اور گھونگھریا

خوش خوراک ہونے کے باعث وہ ہر قسم کی میٹھی بنا
یا مرغ وغیرہ بھوننے میں اتنا ہی مشہور تھا جتنا ناول لکھ
قابلیت میں۔ وہ بیک وقت مچھلی کی کئی پلیٹیں، کئی تیمے
تیتر، نصف درجن کے قریب مختلف سبزیاں اور بہت
کھا جایا کرتا تھا۔ جب وہ کھانے پر آتا تو اس قدر کھا
اگر مشہور زمانہ بسمارک اسے دیکھ لیتا تو... شرمن
لیکن اپنی اس پرخوری کے باوجود اس نے نہ تو کبھی شراب پیا
نہ کبھی سگریٹ پی تھی۔ جب وہ لکھنے میں مصروف ہو
کی بھی پروا نہ کرتا۔ بعض دفعہ تو کھانا تناول کرنا بھی بھو
جب وہ کام میں مصروف ہوتا اور کوئی دوست ملنے آجا
فقط اپنا بایاں ہاتھ دراز کر کے اُسے خوش آمدید کہتا۔ اور
میں مشغول ہو جاتا۔

لیکن وہ جس قسم کا کاغذ یا قلم استعمال کرتا تھا۔ ا
انتہائی جذباتی ہوتا۔ مثلاً وہ ناول صرف نیلے کاغذ پر اور
کے قلموں سے لکھا کرتا تھا۔ شعر لکھتے وقت وہ زرد کاغذ
قسم کے قلم استعمال کرتا۔ کسی رسالے کے لیے مضمون لکھ
وہ گلابی کاغذ کے سوا کوئی دوسرا کاغذ استعمال نہ کرتا۔ خواہ
کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ اسے کبھی نیلی سیاہی استعمال نہ کی

ے لئے ... اس ... کی ...

... ہوجاتا اور اپنی ...

... کرلیتا۔

... ادبیات؟ جی ہاں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ آپ اس پر ... میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس نے زندگی میں کیا کچھ کیا۔ ... ایک سو بارہ تاریخی ناول اور تاریخی کتابیں ... لیکن آج جب اس کی تمام نگارشات جمع کی گئی ہیں تو ... جلدیں بنی ہیں۔ ذرا سوچیے! بارہ سو جلدیں۔ اگر جون ... جارج برنڈ شا، رابرٹ لوئس سٹیونسن، ایچ جی ویلز ... کپلنگ، امیری رو برٹس، ہارٹ اور زین گرے ... کی نگارشات جمع کرلی جائیں تب بھی ڈوما نے ... ان سے زیادہ لکھا ہے۔

... نے دس لاکھ سے زیادہ پونڈ کمائے۔ اپنے زمانے کے ... سے بہت زیادہ۔ درحقیقت ادبی تاریخ میں شاید ہی ... مصنف نے اپنی نگارشات سے اتنا روپیہ کمایا ہو۔ اس کے ... اس قدر غریب تھا کہ جب اس کا پہلا ڈراما اسٹیج ہونے ... تو اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اپنی قمیص کیلئے ... کالر خرید کر اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے واقعہ ... شرکت کرسکے۔

اس ... ڈوما کو اپنی ماں سے بے حد پیار تھا۔ اسکا ... ڈراما اسٹیج ہونے سے تین دن پہلے اس کی ماں فالج کا ... ہوگئی۔ لہٰذا پیرس میں اپنی عظیم کامیابی کی پہلی رات کے ... ڈوما اپنے ڈرامے کے ہر ایکٹ کے اختتام پر بھاگ ... ماں کے پاس جاتا اور اس سے پوچھتا کہ اسے کسی چیز کی ... تو نہیں ہے اور اس رات جبکہ سارے پیرس میں اسکا نام ... رہا تھا، وہ ایک چٹائی پر اپنی ماں کے قدموں میں سویا تھا۔

ڈوما کے ناولوں کے کردار اسکے نزدیک بیحد حقیقی تھے ... ان کے خواب دیکھتا اور ان کے متعلق یوں باتیں کرتا جیسے ... بالکل حقیقی ہوں۔ وہ ان کے متعلق ایسے شوق اور رغبت ... لکھتا کہ آج بھی ایک سو سال بعد آپ کو مسحور کر دیتے ہیں۔ ... کردار نگاری کرتے وقت وہ کہانی میں اس قدر محو ہوجاتا کہ ... میں قہقہے لگانے اور اپنے کرداروں سے مذاق کرنے لگتا ... وہ اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہوں۔ بہت سے مصنفوں ... لکھنے کا عمل اذیت ناک ہوتا ہے۔ مگر ڈوما کے ساتھ معاملہ ... برعکس تھا۔ اسے لکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔

... اس سے ... ایک ... اپنا ...

وہ بیس برس قسط وار اخبارات میں شائع ہوتے تھے تاکہ ... کے پاس اتنا وقت نہ ہو تاکہ اپنی کتابیں پڑھ سکے۔ لیکن اسکے پاس اتنا وقت ضرور تھا کہ تلواروں اور پستولوں سے بیس ڈوئیل لڑسکے۔

جوں جوں وہ بوڑھا ہوتا گیا، وہ شراب، عورتوں اور موسیقی کی طرف مائل ہونے لگا۔ نہیں نہیں میں نے غلط کہا ہے۔ اس نے تو شراب ہی پی، اور نہ موسیقی کی طرف راغب ہوا۔ لیکن وہ لڑکیوں کا بے حد متوالا ہو گیا تھا۔

پیرس میں اگر کوئی خوبی ہے تو یہ ہے کہ بڑا وسیع القلب شہر ہے۔ اس شہر میں خواہ کچھ بھی ہوتا ہے، لوگ توجہ نہیں دیتے۔ لیکن پیرس جیسے شہر تک میں ڈوما کی حیات معاشقہ ایک سنسنی خیز واقعہ بن گئی تھی۔ انجام کار اس کے عشق سے تنگ آکر اسکا بیٹا بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت اس کا ایک دوست ملنے آیا تو اسے لڑکیوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک اس کے گھٹنے پر بیٹھی تھی دوسری لڑکی اس کے قدموں پر بیٹھی تھی ایک اور لڑکی اس کے سر پر جھکی اس کے موٹے موٹے ہونٹ چوم رہی تھی اور ان تینوں لڑکیوں نے اس قدر لباس نہ پہن رکھا تھا کہ کسی کے سامنے آسکیں۔

لوگ اس کی دولت لوٹتے اور اسے چھوڑ کر چلے جاتے۔ ڈوما نے اپنا بڑھاپا مفلسی اور تنہائی میں گذارا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مکان کا کرایہ ادا کرنے کے لیے اسے اپنے زیورات حتیٰ کہ اوورکوٹ تک گروی رکھنا پڑا۔ اس کا بیٹا اگر اس کی مدد نہ کرتا تو اسے بھوکوں مرنا پڑتا۔

موت سے تھوڑی دیر پہلے اس کے بیٹے نے دیکھا کہ وہ اپنا مشہور ناول "تین بندوقچی" پڑھ رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے پوچھا۔ "ابا! آپ کو یہ ناول کیسا لگ رہا ہے؟" "اچھا ہے" اس نے مختصر جواب دیا۔

اچھا ہے؟ میں بھی یہی کہوں گا۔ اگر آپ تفریح طبع کے خواہاں ہیں تو یہ ناول پڑھیے۔ اس ناول کے بعد آج تک لاکھوں ناول لکھے گئے ہیں مگر وہ سب اس کے سامنے ماند پڑ گئے ہیں۔ "تین بندوقچی" ایک غیر فانی ناول ہے۔ آج سے دو سو سال بعد بھی آپکے بچوں کے بچے پھر انکے بچوں کے بچے رات کی خاموشی میں مزے سے یہ ناول پڑھ رہے ہوں گے۔

...

کیلی کا ساتھی نہ ملے تو؟

I

II

III

ہمارے گاؤں میں اس کا نام چرچا ہے۔ اگر رامپور کے چھوٹے سے گاؤں میں اخبار ہوتا تو یہ خبر جلی سرخی سے چھپتی۔

بسنتی کی ہمت کی سب داد دیتے ہیں ... عمر پچاس کے لگ بھگ ... دُھن کی پکی ... سلائی مشین خرید رکھی ہے۔ گاؤں کے بنک نے اسے قرضہ دیا تھا۔ پڑوسیوں کے کپڑے سی کر وہ گھر کا خرچ چلانے میں اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتی ہے ... کتنی ان تھک ہے۔

گھر کے کام دھندے سے فارغ ہو کر وہ کپڑے سیتی ہے۔ کیوں نہ ہو، جھونپڑی میں بجلی لگی ہوئی ہے۔

بجلی دیہات میں بھی پہونچ چکی ہے ... چھوٹے چھوٹے کارخانے ... مشینیں ... پمپ وغیرہ ... یہ سب اسی کی کرامات ہے اور تو اور اب کولہو بھی بجلی سے چلتا ہے۔ تیلی نے بیل فروخت کر دیئے ہیں۔ اب اس کا لڑکا پالی ٹیکنیک میں پڑھتا ہے۔ کون جانے کسی دن وہ تیل کے لئے کھدائی کرنے لگے۔

آج، کل سے بہتر ہے *
کل، آج سے بھی بڑھ کر ہوگا۔

* "آج کا بھارت" کتابچہ کی مفت کاپی کے لئے ڈی۔ اے۔ وی۔ پی، بی۔ ٹی ۲۷۲ ای۔ بلڈنگ، پارلیمنٹ اسٹریٹ۔ نئی دہلی۔۱ کو لکھیے۔

بسنتی رات میں سلائی کرتی ہے

ریت کی دیوار

موپاساں
محمود حمزہ پوری

سفید داڑھی والے ایک بوڑھے فقیر نے ہم سے بھیک مانگی۔ میرے دوست جوزف داوراں نے اس کی ہتھیلی پر پانچ فرانک رکھ دیئے۔ مجھے متعجب دیکھ کر کہنے لگے "اس غریب بوڑھے نے ایک یاد تازہ کر دی جو تمہیں سناتا ہوں۔ اگر ۔۔۔ خیر، وہ قصہ آپ سے کہے دیتا ہوں۔"

میرے ماں باپ ہاورے کے رہنے والے تھے۔ وہ امیر نہیں تھے۔ بس کسی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میرے والد دفتر میں ملازم تھے۔ خوب محنت کرتے اور گھر دیر سے لوٹتے لیکن پھر بھی زیادہ پیسے انھیں نہ مل پاتے تھے۔ میری دو بہنیں تھیں۔ جس افلاس میں ہماری زندگی بیت رہی تھی اس سے ہماری ماں بہت دکھی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ والد کو بہت سخت سست سناتی اور بری طرح کوستی ایسے موقعوں پر میرے والد کی صورت بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آج بھی انکی صورت یاد کر کے میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ ایک لفظ بھی بولے بغیر وہ اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر پھیرنے لگتے تھے۔ ان کی اس بے بسی کے کرب کو میں محسوس کر سکتا تھا۔

ہر مد میں ہم بڑی کفایت شعاری برتتے تھے کہیں کھانے کی دعوت ہم منظور نہیں کرتے تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ بدلے میں دعوت دینا ہوگی۔ دوکانداروں کے ہاں بیچ باچ لینے کے بعد جو چیزیں بچ جاتی تھیں انھیں میں سے ہم اپنے کھانے پینے کی چیزیں خریدتے تھے۔ میری بہنیں اپنے کپڑے خود سی لیتی تھیں اور پندرہ سنٹ کے کسی گوٹے کے لئے گھنٹوں بحث و مباحثہ کرتی تھیں۔ ہمارے کھانوں میں گاڑھا چربی دار شوربہ رہتا تھا۔ جب کبھی میرا اپنا پتلون پھاڑ آتا تو گھر میں محشر خیز ہنگامہ برپا ہو جاتا۔

لیکن ہر اتوار کو ساحل پر ٹہلنے کے لئے جانے کو ہم لوگ اپنے سب سے بڑھیا کپڑے پہنتے تھے۔ فراک، کوٹ، ٹوپ، ہیٹ اور دستانے پہن کر میرے والد میری ماں کی بانہہ میں بانہہ ڈال کر شان سے چلتے تھے۔ میری ماں بھی خوب سج دھج کر نکلتی تھی۔ میری بہنیں تو سب سے پہلے ہی جانے کو تیار ہو جاتی تھیں۔ لیکن ٹھیک چلنے کے وقت والد کے کوٹ پر لگے کسی دھبے پر کسی کی نگاہ پڑ جاتی اور تب ماں اپنے دستانے اتار کر اور چشمہ ہٹا کر انھیں صاف کرنے میں لگ جاتی۔ والد کھڑے کھڑے دھبے کے صاف ہونے کا انتظار کرتے رہتے۔

غرضیکہ ہم لوگ بڑی سج دھج کے ساتھ روانہ ہوتے بہنیں بہت بانہہ میں بانہہ ڈالے چلتیں۔ وہ شادی کے لائق ہو گئی تھیں۔ اور یہ بات پورے شہر کو جتا دینا چاہتی تھیں۔ میں اپنی ماں کے بائیں اور والد ان کے دائیں چلتے تھے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ ان اتواروں کو میرے ماں باپ کتنے اہتمام سے نکلتے تھے وہ اپنے چہروں پر سنجیدگی طاری کئے رہتے، چلتے تو بالکل نپے تلے ڈگ بھرتے ہوئے۔ جسم بالکل سیدھا تنا ہوا۔ پاؤں اکڑے ہوتے جیسے ان کی چال ڈھال پر کسی اہم بات کا انحصار ہو۔

اور ہر اتوار کو جب ہم لوگ دور دیس سے آتے ہوئے کسی جہاز کو دیکھتے تو ہمارے والد بول اٹھتے "جہاز پر اگر ژول ہو تو مزہ آجائے۔ واہ!"

میرے چچا ژول کسی وقت خاندان کے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ لیکن اب ہم لوگوں کے لئے امید کی آخری کرن تھے۔ اپنے بچپن سے ہی میں ان کے بارے میں سنتا آیا تھا۔ میرے تصور میں ان کی شکل اتنی واضح تھی کہ مجھے یقین ہے کہ پہلی نظر پڑتے ہی میں ان کو پہچان گیا ہوتا۔ ان کے امریکا جانے سے پہلے کی انکی زندگی کے بارے میں ذرا ذرا سی بات جان چکا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے کوئی بڑی رقم برباد کر دی تھی جسے غریب خاندان کے لئے بڑا عذاب مانا چاہیے۔ امیر خاندان کے مستی میں زندگی گزارنے والے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "بے وقوفی کر رہا ہے" ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے "پاجی یا شریر" کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن غریب خاندان میں جب کوئی نوجوان اپنے ماں باپ کو ان کی پونجی میں ہاتھ ڈالنے کے لئے مجبور کرتا ہے تو وہ کمینہ کہلاتا ہے حالانکہ دونوں معاملے یکساں ہیں، لیکن دونوں میں فرق کیا جانا مناسب ہے کیونکہ کسی بھی فعل کی اہمیت اس کے نتیجے سے ظاہر ہوتی ہے۔ قصہ مختصر چچا نے اپنے حصے کی آخری کوڑی تک لٹا کر ...

واقعات نئی دہلی

...کے بعد میرے والد بھی بہت...
...ن لاتا تھا اور ایک دن وہ بادشاہ سے تیار کیے جانے
...جہاز سے امریکا چلے گئے۔
چچا ... نے وہاں پہونچتے ہی کوئی تجارت شروع کر دی
...بد ہی ایک خط لکھا کہ وہ خوب کما رہے ہیں اور امید
...ہیں کہ انھوں نے میرے والد کا جتنا نقصان کیا ہے
...کی تلافی کر دیں گے۔ اس خط نے میرے گھر میں بڑی
...ل مچا دی۔ چچا ایک چھین کبر شتا ایک نکھٹو آوارہ نوجوان
...ایک شریف ایماندار اور ہمارے خاندان کی ساری عظمتوں
...شان بن گئے۔ اسی درمیان میں ایک جہاز کے کپتان
...بھی خبر دی کہ انھوں نے ایک بڑی دوکان لے لی ہے
...دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے میں مصروف ہیں۔
دو سال کے بعد ایک دوسرا خط پہنچا۔ خط میں لکھا تھا
...ارے فلپ! میں بخیریت ہوں میرے لئے مطلق فکر
...ن۔ تجارت بھی خوب چل نکلی ہے۔ کل میں ایک لمبے سفر
...جنوبی امریکا کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ
...ئی برسوں کے بعد تمھیں میرا خط ملے۔ تم فکرمند نہ ہونا۔
...دولت کمانے کے بعد میں ایک بار ہاور ضرور آؤں گا
...امید ہے کہ اس میں کچھ زیادہ عرصہ نہ لگے گا اور تب ہم
...ئی عیش کے دن گزاریں گے۔

وہ خط ہمارے لئے مذہبی آیت بن گیا تھا۔ زرا سا
...ی بہانہ ملنے پر اسے نکال کر پڑھا جاتا اور لوگوں کو دکھایا جاتا
...س سال تک چچا ... نے اپنی کوئی خیریت نہ لکھی لیکن،
...رت کے اس طویل بہاؤ نے میرے والد کی امیدوں کو
...ور بڑھاوا ہی دیا۔ میری ماں بھی اکثر کہتی تھیں: "جب
...ڑتے آئیں گے تو زندگی کچھ اور ہی ہوگی۔ یہی تو ایک ایسا
...آدمی نکلا جس نے دنیا میں کچھ ترقی کی ہے"۔
...بڑے بڑے کالے
جہازوں کو دھوئیں کا پہاڑ اگلتے نزدیک آتے دیکھتے تو کہا
...کرتے تھے "اگر اس جہاز سے اترے تو کتنا مزہ آجائے"
...وہ ... ایسا لگتا تھا کہ رومال ہلاتے ہوئے اب اگلے ہی
...ے چچا جہاز سے اترنے والے ہیں۔

چچا کی واپسی کا یہ والد کو اتنا یقین تھا کہ
انھوں نے اسی بھروسے پر کئی منصوبے باندھ رکھے تھے۔
انھیں کے روپوں سے والد نے ایک مکان خریدنا بھی طے
کر لیا تھا۔ اب یہ قسم کھا کر کہنے کی ضرورت نہیں کہ والد صاحب
نے مالک مکان سے بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔

میری دونوں بہنوں میں سے بڑی بہن اس وقت
اٹھائیس برس کی تھی اور چھوٹی ۲۶ برس کی۔ ان کی شادی
ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس لئے گھر کا ہر
فرد متفکر تھا۔ آخر چھوٹی بہن کے لئے ایک رشتہ نکل آیا
وہ کرانی تھا۔ امیر نہ تھا لیکن معزز تھا۔ میرا اپنا ہمیشہ
یہی یقین رہا ہے کہ چچا ... کے اس خط نے جسے میرے
ہونے والے بہنوئی نے ایک شام دیکھ لیا تھا، اس کے
دبدھے کو دور کر دیا تھا اور شادی کر گزرنے کو تیار
بھی کر دیا تھا۔

وہ رشتہ بڑی خوشی سے ہم نے جھٹ پٹ منظور کر لیا
طے ہوا کہ شادی کے بعد سارے لوگ جرسی کی سیر کرائیں
... یہاں جرسی کی سیر ایک غریب خاندان کی سب سے
بڑی آرزو ہوتی ہے۔ وہ کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔
بس سمندر کو اسٹیمر سے پار کرنا ہوتا ہے، اور چونکہ وہ جزیرہ
انگریزوں کا ہے، ایک بار آپ وہاں پہونچے نہیں کہ گویا
آپ بدیس چلے گئے۔

جرسی کا یہ سفر ہم پر سنک کی طرح سوار ہو گیا ایک
خواب جس کی تعبیر کا ہم بڑی بے قراری سے انتظار کر رہے
تھے۔ اور آخر وہ دن آ ہی گیا۔

میں آج بھی ساری باتیں جوں کی توں دیکھ رہا ہوں
جیسے یہ ساری باتیں ابھی کل ہی ہوئی ہوں۔ گرین ول
کی گھاٹ پر جہاز کا بیار کھڑا رہنا۔ والد صاحب کا بڑی
مستعدی سے ہمارے تینوں بکسوں کو لادنا۔ ماں کا
گھبراہٹ کے ساتھ غیر شادی شدہ بہن کا ہاتھ پکڑے
رہنا۔ یہ بے چاری دوسری بہن کی رخصتی کے بعد سے
مرغی خانے کے آخری چوزے کی طرح اداس رہتی تھی۔

... جہاز کے پیچھے ... تھا اور میں گھوم کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ آخر
وہ کر کیا رہے ہیں۔

ہم لوگ جہاز پر سوار ہو گئے تھے۔ جہاز نے سیٹی
دی اور سبز رنگ مرمر کی طرح چکنے سمندر پر بہتا گیا
جن لوگوں کو سفر کا بہت کم موقع ملتا ہے انھیں لوگوں
کی طرح ہم لوگ کناروں کو اوجھل ہوتے ہوئے بہت
دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میرے والد کی توند ان کے
فراک کوٹ کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔ اچانک ان کی
نظر دو حسین نوجوان عورتوں پر پڑی جن کے لئے دو مرد
گھونگھے خرید رہے تھے۔ میلا کچیلا بوڑھا چاقو سے گھونگھے
کے چھلکے اتار کر مردوں کے ہاتھ میں دے رہا تھا جسے وہ
عورتوں کی طرف بڑھا دیتے تھے۔ اور وہ بڑی نفاست
سے کھا رہی تھیں۔ چھلکوں کو وہ چمکدار رومال میں پکڑے
ہوئے تھیں اور ذرا آگے کی طرف سر کو جھکا کر کھا رہی
تھیں۔ تاکہ کپڑے گندے نہ ہو جائیں۔ پھر انھوں نے
عجیب ڈھنگ سے جھک کر پانی پیا اور چھلکوں کو سمندر
میں پھینک دیا۔

ایسا لگتا تھا کہ میرے والد کو یوں چلتے جہاز پر
گھونگھے کھانا بڑا اچھا لگا۔ وہ میری ماں اور بہنوں
کے پاس پہونچے اور پوچھا کہ کیا وہ ان لوگوں کے لئے بھی
کچھ گھونگھے خرید دیں۔ میری ماں خرچ کا خیال کر کے ذرا
ہچکچائیں لیکن بہنوں نے فوراً ہاں کہہ کر للچائی ہوئی
نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میری ماں نے تاسف
بھرے لہجے میں کہا: "مجھے ڈر ہے کہ اس سے میری طبیعت
خراب ہو جائے گی۔ ہاں تم چاہو تو بچوں کے لئے خرید سکتے
ہو لیکن دیکھو انھیں بھی زیادہ نہ کھلانا، ورنہ ان کی طبیعت
خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے"۔ تب میری طرف مڑ کر والد
نے کہا: "جوزف کو ضرورت نہیں ہے۔ لڑکوں کی عادت
بگاڑنی نہیں چاہئے"۔ اس لئے میں ماں کے پاس ہی رک
گیا اور اس دو نظری پر دل ہی دل میں کڑھتا رہ گیا۔ میں

نے دیکھا کہ والد بڑی اکڑ کے ساتھ اپنی دونوں لڑکیوں
اور داماد کو اس میلے کچیلے ملاح کے پاس لے گئے۔

پہلی دونوں عورتیں ابھی ابھی وہاں تک گئی تھیں۔ والد نے میری بہنوں کو بتانا شروع کیا کہ کس طرح پانی کو چھلکنے سے بچانا چاہیئے۔ یہ بتانے کے لئے انھوں نے گھونگھے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ دونوں عورتوں کی نقل کرنے میں پانی سے ان کا فراک کوٹ بالکل بھیگ گیا اور میں نے والدہ کو بڑبڑاتے سنا۔ "اچھا ہوتا کہ وہ خاموش ہی رہے ہوتے۔"

لیکن اچانک والد کے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ گھونگھے بیچنے والے کو خوب غور سے دیکھا اور بجلی کی سی تیز رفتاری کے ساتھ ماں کے پاس چلے آئے۔ وہ بالکل پیلے پڑگئے تھے اور انکی آنکھوں سے عجب مایوسی جھانک رہی تھی۔ بہت دھیمے لہجے میں انھوں نے میری ماں سے کہا۔

"یہ کیسی قیامت کی بات ہے کہ گھونگھے بیچنے والا نُرتے سے بہت ملتا جلتا لگتا ہے۔" ماں نے چونکتے ہوئے پوچھا: "کون نُرتے۔؟"

"میرا بھائی اور کون۔ ہاں سچ! اگر مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ امریکا میں ہے اور خوب دولت بٹور رہا ہے تو میں کہتا کہ یہ آدمی نُرتے ہی ہے۔"

"واہیات بات ہے۔" ماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ وہ نہیں ہے تو پھر ایسی بے ہودہ بات نہیں نکالنی چاہیئے۔"

والد اپنی بات پر اڑے رہے۔ "کلیسی ذرا تم خود جاکر اپنی آنکھوں سے تو دیکھ آؤ تاکہ اطمینان ہوجائے۔"

وہ اٹھ کر لڑکیوں تک گئیں۔ میں بھی اس آدمی کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ بوڑھا گندا اور جھری دار تھا۔ اپنے کام پر سے اس نے اپنی نگاہ کبھی اوپر نہیں اٹھائی۔ ماں لوٹ آئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ جلدی جلدی اور تقریباً ہانپتے ہوئے اس نے والد سے کہا:

"میرا خیال ہے یہ وہی ہے۔ ذرا جاؤ اور کپتان سے اس کے بارے میں پوچھو۔ لیکن ہوشیار رہنا۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہ بیکار سا آدمی پھر ہمارے سر آپڑے۔"

میرے والد کپتان سے ملنے چلے تو میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ میری حالت بھی عجیب ہوکر رہ گئی تھی۔ لمبا دبلا اور بڑی بڑی مونچھوں والا کپتان پل کے نیچے اوپر بڑی شان کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ میرے والد انکساری کا لبادہ اوڑھے اس کے پاس پہونچے۔ بیچ بیچ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے والد نے ادھر ادھر کے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ "جرسی کیسی ہے۔ اس کی آبادی کتنی ہے۔ وہاں کی مٹی کیسی ہے۔ وہاں کی خاص پیداوار کیا ہے"؟ جیسے کئی سوالات کئے۔ گفتگو میں ان کا انہماک دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے اہم مسئلے پر تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔

جس جہاز اسپریس پر ہم لوگ سوار تھے اس کے بارے میں باتیں ہوئیں پھر جہاز کے عملے پر گفتگو ہوئی اور آخر میں والد نے ذرا اٹکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "وہ اس طرف آپ کا ایک گھونگھے بیچنے والا ہے۔ وہ تو عجیب مضحکہ خیز لگتا ہے۔ کیا آپ اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے؟"

کپتان اس طویل گفتگو سے پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔ اس نے ذرا تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ "وہ ایک پرانا فرانسیسی بھکنگا ہے۔ پچھلے سال امریکا میں تھا۔ میں نے اسے اس کے دیس واپس بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہاورے میں اس کے کچھ رشتے دار ہیں لیکن یہ ان کے پاس جانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس پر ان کا کچھ قرض ہے شاید۔ اس کا نام نُرتے ہے۔ ہاں نُرتے دادواں یا اسی طرح کچھ اور۔ امریکا میں کسی وقت وہ پیسے والا تھا ــــ لیکن اب ذرا اسے دیکھئے تو ــــ"

میرے والد نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ان کا گلا خشک ہوگیا تھا اور آنکھیں بے رونق ہوگئی تھیں۔

"اچھا یہ بات ہے۔ ٹھیک ہی ہے۔" وہ بڑبڑائے "مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کپتان۔" اور وہ وہاں سے چل دیئے۔

کپتان انکی طرف تعجب سے دیکھتا رہ گیا۔ ماں کے پاس والد ناگفتہ بہ حالت میں پہنچے اور اپنا بیسٹ پر تقریباً گرتے ہوئے بڑبڑائے:

"یہ وہی ہے۔ یہ وہی ہے۔ ہم اب اس دنیا میں جی کر کیا کریں گے۔ کتنی بڑی مصیبت ہے۔" ماں ناراض ہوتی ہوئی بولی:۔

"میں جانتی تھی کہ وہ گرہ کٹ کبھی کچھ نہ کر پائے گا ــ داوراں خاندان کے لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں کہ ان سے کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔" والد اپنی پیشانی پر لمبی سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ جیسا کہ وہ ماں کے کوسنے پر ہمیشہ کیا کرتے تھے۔

"جوزف کو پیسے دیدو تاکہ وہ گھونگھے کے پیسے دے آئے۔" ماں کہتی گئی۔ "اس بد نصیب کے ہمیں پہچان لینے کی دیر ہے، تب جہاز پر اچھا تماشا ہوجائے گا۔ ہم لوگ اس طرف چلیں اور جو کچھ بھی ہو ہم اس آدمی کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔" ماں اٹھی۔ مجھے پانچ فرانک دیئے اور دونوں وہاں سے ہٹ گئے۔

میری بہنیں جو والد کی راہ دیکھ رہی تھیں تعجب میں پڑ گئیں۔ میں نے کہا۔ جہاز کے ہلنے ڈولنے سے ماں کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی ہے۔ گھونگھے والے سے میں نے پوچھا کہ اس کے کتنے پیسے ہوتے ہیں۔ اس کو "چچا" میں تقریباً کہہ ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے پانچ فرانک دیے اور اس نے باقی ریزگاری لوٹا دی۔ میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی وہ ایک غریب جھری دار ملاح کا ہاتھ تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر تکان، درد اور محرومیوں کی داستان لکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا یہ میرے چچا ہیں۔ میرے والد کے حقیقی بھائی۔ میرے حقیقی چچا۔ میں نے اسے پچاس سنٹائم ٹپ میں دیدیئے اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

"خدا آپ کو خوش رکھے بڑے بابو۔" اس نے ٹھیک بھکاریوں کے سے انداز میں کہا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ امریکا میں ضرور اس نے بھیک مانگنے کا کام کیا ہوگا۔

میری بہنیں میری اس سخاوت پر متعجب ہوئیں

"ٹائمز اسکوائر کی تتلیاں"

امریکا

ٹمز اسکوائر۔ فاحشگی کا مرکز

حشگی کسی ایک یا دوسرے ملک کے لئے مخصوص نہیں ہے
مار اور غریب ملک کا بھی سوال نہیں ہے۔ ہندوستان میں
لیس گی اور جرمنی میں بھی۔ امریکہ کے ان شہروں میں بھی
ت پرستی ہے اور لاکھوں کروڑوں ڈالر کا لین دین ہوتا
احشگی پر بڑی بڑی سماجی پابندیاں لگا دی گئیں۔ لیکن کیا
یں ذرا فرق آیا ہو۔ اس کے برعکس اس بیماری کو جتنا
وشش کی گئی اتنی ہی بڑھتی گئی۔ قانون سازوں سے
ری شکن ہوشیار ہیں۔ اور وہ اپنے بچنے کی صورت نئی نئی
سے نکال لیتے ہیں۔

حشگی ہندوستان کی طرح امریکا میں بھی ممنوع ہے لیکن
ہیں۔ خاص نیویارک کے "نیویارک ٹائمز اسکوائر" میں
ہ بلد کا ہمیشہ کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے
شہ عورتوں کا دن دہاڑے جمگھٹ لگا جو بلا خوف
ل سے باتیں کرتی نظر آئیں گی۔
لے دنوں ان کا زور اتنا بڑھا کہ تاجروں، سیاحوں اور

مقامی باشندوں کا چلنا پھرنا دو بھر ہو گیا۔ ہر طرف جال بچھے ہوئے
تھے جن سے نکلنا بڑے ہوشیار آدمی ہی کا کام تھا۔ ایک بڑے
ہوٹل کے سامنے ایک شخص کو اس لئے قتل کر دیا گیا کہ اس نے
بیسواؤں کی کچھ رقم روک لی تھی۔ ایک جرمن کو جو مغربی جرمنی کی
کابینہ کا ممبر رہ چکا تھا فاحشہ لڑکیوں کی ایک ٹولی نے لوٹ لیا
ہو اور اسی قسم کے واقعات روزہ پیش آنے لگے اور جب فاحشگی
حد سے زیادہ بڑھی تو پولیس بھی حرکت میں آگئی اور ایک اعلیٰ
پولیس افسر کیپٹن ڈینیل میک گووان کو فاحشگی پر کنٹرول سے
متعلق ڈائرکٹر مقرر کر دیا گیا۔ جس نے پورے علاقے میں سادہ
کپڑوں میں ملبوس سپاہیوں کو گشت پر مامور کر دیا اور ان میں
سے بہت سوں کو عمدہ کیمرے دیدیے تاکہ وہ گاہکوں کو ترغیب
دینے والی لڑکیوں کے فوٹو موقعہ پر لے سکیں۔

بہت سی گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں اور اس طرح شارعِ
عام پر فاحشگی کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ آخر میں پولیس نے فرضی
دلالوں کا ایک گروہ تیار کیا جس نے بڑے پیمانے پر فاحشہ عورتوں
کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ اس چہار جہتی یلغار سے
گھبرا کر تتلیوں نے نیویارک ٹائمز اسکوائر سے اڑنا شروع
کر دیا۔ جو دولت مند تھیں (بعض لڑکیاں تین سو یا اس سے

بھی زیادہ ڈالر روزانہ کما لیتی ہیں) انھوں نے لوس اینجلس، سان
فرانسسکو اور اٹلانٹا جیسے شہروں کی طرف رُخ کیا جو آب و ہوا
کے لحاظ سے بہت اچھے شہر سمجھے جاتے ہیں۔ جو ذرا غریب تھیں وہ
مان ہٹن کے مشرقی سمت چلی گئیں۔ لیکن زیادہ تعداد ان کی تھی جنھوں
نے اپنے گھروں ہی میں بند رہ کر چھٹیاں گزارنے کو ترجیح دی۔

بظاہر بہت بڑی آفت ختم ہو گئی۔ نیویارک کے شہریوں نے
اطمینان کا سانس لیا۔ ٹائمز اسکوائر میں انھیں اب دامِ فریب میں

لاٹری ۔۔ بار والے روپوش ہوگئے اور لڑکیوں کے
زرق برق کارڈ بھی مفقود ہوگئیں۔ کچھ لوگوں کے خیال
میں شہر بے رونق ہوگیا۔

بے رونقی عدالت میں بھی نظر آئی جہاں کچہری کے ایک
ملازم نے بتایا کہ پہلے روزانہ ۴۰ تک رنڈیوں کے مقدمے
یہاں آتے تھے۔ لیکن پندرہ برس میں آج پہلی بار یہ صورت
سامنے آئی ہے کہ ایک مقدمہ بھی نہیں۔

لوگ سماجی اصلاح پر سب خوش تھے۔ اخبارات کو بھی
مطلب کا لکھنے کے لئے بڑا اچھا مسالہ مل گیا لیکن چند ہی
دنوں بعد ظاہر ہوگیا کہ یہ بالکل ایسی ہی لیپاپوتی تھی جیسی کہ دوسری
مہموں میں مختلف موقعوں پر انحطاط پسندوں کو ہوتی تھی۔ بازار حسن
سب بارہ آگئی اور ایک مرتبہ پھر اسکوائر پھر دل چسپیوں کا
مرکز بن گیا۔ وہی اشارے، وہی سودے بازی، وہی دلال اور
آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی اونچی کاریں۔

اس قسم کی سماجی برائیاں محض قانون سے نہیں دبا کرتیں
جب تک کہ قوم کے ایک ایک فرد کے ضمیر کو بیدار کرنے کی
ضرورت ہوتی ہے۔

لائبیریا

مقبول ترین ڈکٹیٹر چل بسا

مسٹر ٹب مین کا پورا نام ولیم ویکینات شادرچ ٹب مین
تھا لیکن اپنی ریاست لائبیریا کے پندرہ لاکھ باشندوں کے لئے محض
سیدھے سادے "اولڈ ڈیڈی" تھے۔ لائبیریا کی ریاست مغربی افریقہ
میں سیرالیون اور آئیوری کوسٹ کے درمیان واقع ہے اور اس کا
رقبہ ۴۳ ہزار مربع میل ہے۔ پندرہ لاکھ کی آبادی میں پندرہ ہزار
کے قریب امریکی نژاد حبشی ہیں۔ انہی امریکی حبشیوں نے جو امریکا میں
غلام تھے لیکن آزاد کر دیے گئے تھے، یہ ریاست ۱۸۲۲ء میں قائم
کی تھی۔ زمین امریکی نوآبادیاتی سوسائٹی نے مقامی سرداروں سے

ٹب مین

خریدی تھی۔

ریاست کا دستور قدرتی طور پر امریکی طرز کا ہے اور ریاست
کی زبان انگریزی ہے۔ مسٹر ٹب مین کی ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ
وہ ۲۷ برس تک اپنے ملک کے صدر رہے اور صرف ان کی موت
انھیں ان کے عہدے سے الگ کر سکی۔ وہ گزشتہ ہفتے لندن کے
ایک اسپتال میں ایک غدودی آپریشن میں پیچیدگی پیدا ہو جانے
کی وجہ سے چل بسے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ برس تھی۔

وہ اپنے ملک کے مالک کل تھے۔ ساٹھ لاکھ ڈالر کے محل میں
رہتے تھے جو روشنی سے بقعۂ نور بنا رہتا تھا لیکن اس کے باوجود
عوام میں گھلے ملے رہتے تھے اور عوام کے ساتھ اکثر قومی رقص میں حصہ
لیا کرتے تھے۔

مسٹر ٹب مین نے جن کی حکومت بڑی مستحکم تھی، مقامی حبشیوں
اور امریکی نیگروؤں میں فرق کو دور کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی
اور اس مقصد کے لئے تعلیم کو عام کیا اور بہت سی اصلاحات
جاری کیں۔

اپنے زمانۂ نظم و نسق میں انھوں نے اپنی ریاست کے بجٹ کو
دس لاکھ ڈالر سے ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر تک پہونچا دیا۔ انھوں نے
اپنے ملک میں سڑکیں تعمیر کرائیں اور ریلوے نظام قائم کیا۔ لیکن یہ
سب کچھ انھیں پریس کی آزادی کا گلا گھونٹ کر کرنا پڑا۔ شاید افریقہ
کے مزاج کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری تھا، ورنہ شاید ان کی
ریاست اتنی ترقی نہ کر سکتی تھی جتنی کہ اس وقت کی ہے۔

بعض زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کو ٹب مین کے آمرانہ نظام حکومت
سے شکایت ہوتی تھی اور وہ اس پر سخت اعتراض کرتے تھے لیکن
ووٹنگ میں نتیجہ ۹۹ فیصدی ٹب مین کے حق میں نکلتا تھا۔ عوام کے
دلوں پر اس کا قبضہ تھا۔

نئے صدر کے لئے عام انتخابات آئندہ جنوری میں ہوں گے
اور اس وقت تک ٹب مین ہی کا سکہ چلے گا۔

مشرقِ وسطیٰ

عربوں کا افسوسناک انتشار

"اگر ہم خود کو متحد نہیں کرتے تو کبھی سرزمین عرب سے صیہونیوں
کو نہ نکال سکیں گے۔"

یہ الفاظ گزشتہ ہفتے صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر سادات
نے ایک اجتماع میں کہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے جو انھوں نے اس طرح
کی اپیل کی ہو۔ وہ شروع سے عرب اتحاد پر زور دیتے رہے ہیں۔
عرب فیڈریشن کے لئے ان کی کوششیں اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔
لیکن گزشتہ چند ہفتوں میں مشرق وسطیٰ میں جو حالات دیکھنے میں
آئے وہ اس امر کا مظہر ہیں کہ عرب ممالک سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن
وہ اپنا انتشار ختم نہیں کر سکتے کوئی عرب ملک ایسا نہیں جہاں اندرونی
خلفشار نہ ہو اور جہاں ریشہ دوانیاں اور بغاوتیں نہ ہوں اور جہاں
خود عرب ایک دوسرے کو بندوق کا نشانہ نہ بنا رہے ہوں۔
سوڈان ہو کہ مراکش، اردن ہو کہ عراق، سب ہی جگہ باہمی تفاوتیں
اور ہوس اقتدار پائی جاتی ہے اور ان ملکوں کی بھری توانائی کسی
تعمیر پر نہیں بلکہ خود اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے پر خرچ ہو رہی ہے۔
سوڈان میں جنرل نمیری کے خلاف بغاوت ہوئی اور ۔۔۔
میجر ہاشم العطا نے صدارتی گارڈ اور ایک ٹینک کی ۔۔۔ مدد

سے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ یہ کارروائی اتنی تیزی کے ساتھ عمل میں آئی کہ میجر ہاشم عطا نے بڑے فخر کے ساتھ ام درمان ریڈیو سے اعلان کیا کہ صرف ۴۵ منٹ میں انقلاب مکمل ہو گیا اور اب ملک میں ایک جمہوریت کا قیام عمل میں آ گیا ہے۔

لیکن جتنی تیزی کے ساتھ یہ انقلاب آیا اتنی ہی تیزی کے ساتھ جوابی انقلاب آیا۔ اور لیبیائی فوجوں کی مدد سے صرف چار دن بعد میجر ہاشم العطا کے انقلاب کو ناکام بنا دیا گیا۔ ۴۱ سالہ جنرل نمیری پھر برسر اقتدار آ گئے۔ پہلا انقلاب کسی خون خرابے کے بغیر ہوا لیکن دوسرے انقلاب میں خرطوم کی سڑکیں اور گلیاں لاشوں سے پُر تھیں اور ہسپتال زخمیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

عطا نے جنہیں ان کے دو دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گزشتہ سال نومبر میں سات افراد پر مشتمل حکمراں انقلابی کونسل سے الگ کر دیا گیا تھا، ۳۷ سالہ لفٹیننٹ کرنل ابوبکر النور عثمان کو نئی انقلابی کونسل کا صدر اور خود کو نائب صدر نامزد کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انقلاب اس لئے لایا گیا ہے تاکہ عام گرانی کم ہو سکے۔ کیمونسٹوں اور دوسرے لوگوں کو آزادی نصیب ہو سکے اور جنوبی سوڈان کے غیر مسلم باغی خودمختاری حاصل کر سکیں۔

میجر ہاشم کو اپنے اس انقلاب میں سوڈان کی کیمونسٹ

جنرل نمیری
کامیابی ـــ لیکن کس قیمت پر؟

پارٹی کی حمایت حاصل تھی جو افریقہ میں سب سے مضبوط جماعت ہے اور جس کے سرگرم ممبروں کی تعداد سات ہزار سے زیادہ ہے۔ فوج میں بھی کم از کم ڈھائی سو افسران کمیونسٹ نواز ہیں اور دو لاکھ ٹریڈ یونینسٹ کیمونسٹ پارٹی کے حامی ہیں۔

جس وقت ہاشم کا انقلاب کامیاب ہوا لفٹیننٹ کرنل [illegible] عثمان، میجر فاروق عثمان حمداللہ اور کیمونسٹ لیڈر عبدالخالق [illegible] بھائی میجر محمد محبوب عثمان لندن میں تھے۔ انہیں خرطوم سے [illegible] اور وہ تینوں اپنے معاونین کے ساتھ بی۔ او۔ اے۔ سی کے [illegible] جہاز میں خرطوم کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ جہاز لیبیا کے علاقے میں پرواز کر رہا تھا اور مالٹا کے ایر کنٹرول سے اس کا رابطہ تھا کہ کیپٹن رلئے نوبر کو بنغازی کے ہوائی اڈے کا ایک پیغام جس میں انہیں ہدایت کی گئی کہ بنینا کے ہوائی اڈے پر اتر [illegible] ورنہ ہم تمہیں شوٹ کر دیں گے۔

سواریوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک جیٹ طیارے کو جہاز کا پیچھا کرتے دیکھا ہے۔

جہاز میں ۱۰۹ مسافر تھے۔ نوبر کوئی خطرہ مول لینا نہ [illegible] تھے اور نہ اس بات کے لئے تیار تھے کہ لوگ جھک جائیں۔ کرنل نور اور میجر حمداللہ خود اپنے آپ کو لیبیا کے حکام کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لندن ڈیلی ٹیلی گراف کے نامہ نگار [illegible] کے بیان کے مطابق جو اسی جہاز میں سفر کر رہے تھے، میجر [illegible] فرسٹ کلاس کے پیشں خدمت کو طلب کیا اور بولے: "قذافی (سربراہ لیبیا) کا ملک "خشک" ہے۔ [illegible] ایک اور بوتل لے آؤ"۔

ہوائی جہاز علی الصبح بنینا کے ہوائی اڈے پر [illegible] سیکورٹی افسر اور ایک سپاہی آگے بڑھے۔ انہوں نے کرنل [illegible] دس منٹ بات کی۔ نور نے پائلٹ سے کہا کہ وہ ہوائی [illegible] اتر رہے ہیں۔

پائلٹ: "کیا آپ اپنی مرضی اور کسی جبر کے بغیر جا رہے [illegible]"
"جی نہیں" سالنور نے جواب دیا۔ "ہمیں زبردستی [illegible] جا رہا ہے"۔

لیبیا کے فوجی، کرنل النور عثمان اور میجر حمداللہ [illegible]

صدر قذافی اور سادات ـــــــــ عرب وفاق کے حامی

کراموجونگ قبائلی۔ جن کی غذا منجمد خون اور دودھ کا مکسچر ہے۔

اس لیے کہ یہ عرب فدائین ہی تھے جو اس ملک کے لیے مصیبت تھے اور جو اس پر مسلسل ضربیں لگا کر اس کی فوجی طاقت کو کمزور کر رہے تھے۔ انھیں اور زیادہ مضبوط بنانے اور انھیں جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی ضرورت تھی لیکن اردن نے جو شروع سے اسرائیل کے خلاف نبرد آزما ہے ان سب کا قلع قمع کر ڈالا۔ جس اسرائیل کے خلاف اردن کا ایک ہوائی جہاز بھی نظر نہیں آیا اس نے کمزور فدائین کو بمباری کا نشانہ بنایا اور امریکی ٹینکوں کے ذریعے ان کے اڈے تباہ کر ڈالے جو شمالی مغربی اردن میں واقع تھے۔ ایک ہفتے سے بھی کم عرصے کی لڑائی کے دوران ایک ہزار سے زیادہ

کے سوا کوئی اور دولت نہیں۔ عورتیں کھال کا کوئی معمولی سا پردہ جسم پر ڈال لیتی ہیں لیکن مرد لوہے کی ٹوپی، بالوں میں لوہا پر اور گردن میں تانبے کی مالا کے علاوہ کوئی اور چیز پہننا پسند نہیں کرتے۔

اس بات سے پریشان ہو کر کہ اس قسم کے رہن سہن سے یوگنڈا کو سب سے زیادہ پسماندہ ملک سمجھا جائے گا صدر جنرل عیدی (بڑے ڈیڈی) امین نے حکم جاری کیا کہ قبائلی لوگوں کو چاہیے کہ وہ قمیص پاجامہ اور جوتے پہنیں۔ لیکن کراموجونگ قبیلہ کو یہ حکم "ظلم و زیادتی کا ننگا ناچ" نظر آیا اور جب اس حکم کو پڑھ کر سنایا گیا تو لوگوں نے اسے سننے تک سے انکار کر دیا اور وہ شور و غل میں دب کر رہ گیا۔ جنرل امین نے یہ حکم جاری کرتے ہوئے قبائلیوں سے کہا تھا کہ "برہنگی نہ تم لوگوں کے مفاد میں ہے اور نہ ملک کے مفاد میں"۔ جن لوگوں نے کپڑے پہن لیے ناراض قبائلیوں نے انھیں پیچھے سے پھاڑ ڈالا۔ اور اس سلسلے میں مراٹو شہر کے قریب جو ایک ضلع کا صدر مقام ہے اتنا بڑا فساد برپا ہوا کہ اسے دبانے کے لیے فوج کو طلب کرنا پڑا۔

جنرل امین جنھوں نے گذشتہ جنوری میں ابوٹے سے اقتدار چھینا تھا خود اس علاقے کا دورہ کرنے پہنچے اور لوگوں کو سمجھایا کہ وہ پوشاک پہنیں۔ کچھ قبائلیوں کی سمجھ میں ان کی بات آ گئی لیکن چند ہی دن بعد بغاوت پھوٹ پڑی جس سے اس قدیم قبائلی کی بات کی تصدیق ہو گئی کہ ان کے کپڑوں میں ہتھیار پوشیدہ ہیں۔ مذکورہ قبیلے کے صرف ۴۰ آدمیوں کو اب تک کپڑے پہننا سکھایا گیا ہے مگر یہ وہ لوگ ہیں جنھیں مراٹو میں فساد برپا کرنے پر چھ چھ ماہ کی سزا دی گئی ہے اور وہ جیل کے کپڑے پہننے پر مجبور ہیں!

اردن

کیا شاہ حسین فلسطینی مجاہدوں کو ختم کر کے دم لیں گے؟

سوڈان کے خلفشار کے بعد دیکھئے اردن میں کیا ہوا اور وہاں کس طرح ایک بھائی نے دوسرے بھائی کا گلا کاٹا۔ جو کچھ ہوا اس پر اسرائیل خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ ایک اسرائیلی افسر نے کہا:

"ہمیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن فدائین کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ اور خود عرب حکومتیں ان کا قلع قمع کر دیں گی۔ آخر کار اردن نے یہ کر دکھایا۔"

اسرائیل کو اس صورت حال پر خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔

جارج حباش۔ حسین کا دشمن نمبر I

کر دیے گئے اور ۲۳۰۰ کو گرفتار کر کے پوچھ گچھ کے لئے فوراً لیجایا گیا جہاں ۱۵۰۰ کو غیر مسلح کر کے اردن، شام، لبنان اور دوسرے عرب ملکوں کو جانے کی اجازت دے دی گئی کہ اردنی افسروں کے خیال میں وہ اچھے فدائین تھے، کیونکہ یاسر عرفات کی تنظیم الفتح سے تھا جو شاہ اردن سے لڑنا نہ چاہتی تھی۔ باقی ۸۰۰ کا تعلق انتہا پسند جارج حباش کی تنظیم سے تھا

اسرائیل میں کسی جگہ گرفتار شدہ فلسطینی مجاہدوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا رہا ہے۔

...مجاہدین کو صرف اسرائیلی حملے سے نہیں بلکہ دنیا
...تمام سامراجی طاقتوں سے ٹکر لینی ہے۔

...سائل جگر وزیر اعظم وصفی تل نے تربیت فدائین قرار دیا
...جیل خانے میں ڈال دیا۔

اردنی افسران اپنی اس کامیابی پر خوش تھے۔ لڑائی کے وقت
...نامہ نگار علاقے جنہیں میدان جنگ میں جانے کی اجازت نہ تھی
...افسروں نے ایک ایسے وقت جبکہ مطلع صاف تھا تعجب
...کہا۔

"یہ توپوں کی آواز جو آپ سن رہے ہیں، یہ حقیقت میں بجلی
...کی ہے" اور پھر ایک افسر نے بڑے طنزیہ انداز میں
...جلد ہی بارش ہوگی"

یہ وہی بزدل افسران تھے جو بیت المقدس کو اسرائیل
...والوں کے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے اور جنہیں آج تک
...طرف کا رخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

لیکن یہ کمزور فدائین کے خلاف وحشی بن گئے اور جب
ان کا صفایا نہ کر پائے چین سے نہ بیٹھے۔ فدائین کے ساتھ اردنی
...افسروں کا ظالمانہ اور بزدلانہ سلوک کیا اس سے ظاہر ہے کہ
...ت سے فدائین نے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی بجائے
...اسرائیل میں داخل ہو کر ہتھیار ڈالنے کو ترجیح دی۔

...کو ملتہ بنتے جب دریائے اردن اور اس کے معاون دریا...
...ہو کر گئے ... جبل جیسے علاقے میں صبح نمودار ہوئی اور اسرائیل

شاہ حسین جس پر امریکا، اسرائیل اور پاکستان کی مدد سے، فلسطینی مجاہدوں کے قتل کا الزام ہے۔

لے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے فلسطین کو آزاد کرانے کی قسم
کھائی تھی اور جنہوں نے اپنے وطن کی آزادی کی خاطر اپنی جان کی
بازی لگا دی تھی۔ لیکن آج وہ اردن کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی
کی بنا پر اسرائیل کے روبرو ہتھیار ڈالنے کے لئے مجبور ہو گئے۔
ایک فدائی نے غصے میں کہا۔

" ہم نے عرب بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی بجائے
اسرائیلیوں کے ہاتھوں شہید ہونا پسند کیا۔"

افسروں نے ۹۶ فدائین کو دریا پار کرتے دیکھا تو وہ حیران رہ گئے
یہ فدائین تھکے ہوئے اور بھوکے نظر آ رہے تھے۔ اسرائیلی انہیں
انکی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر نابلس میں کسی جگہ پوچھ گچھ کے لئے

حسین نے عرب ممالک کے احتجاج اور نکتہ چینی کی پرواہ
کئے بغیر چھاپہ ماروں کو کچل دیا۔ اس وقت وہ بہت خوش ہیں
لیکن ان کی یہ خوشی کسی وقت بھی رنج میں بدل سکتی ہے۔ اس لئے
کہ اب بھی شام میں بیس ہزار اور لبنان میں ڈھائی ہزار فلسطینی

سان فرانسسکو کی طرح جو امریکا کی رانی کہلاتا ہے ہم بمبئی کو بھی ہندوستان کی رانی کہہ سکتے ہیں۔ ایک خوب صورت شہر جس سے وسیع سمندر کی لہریں ٹکراتی ہیں۔ حد نظر تک پھیلے ہوئے جب اس سمندر پر نظر پڑتی ہے تو خدا کی شان نظر آتی ہے۔ قدرتی مناظر نے بمبئی کو قدرت نے اس طرح مالا مال کیا ہے کہ دور دور سے لوگ انھیں دیکھنے کے لئے وہاں پر پہونچتے ہیں۔

بمبئی ایک رنگا رنگ شہر ہے۔ میٹرو پولیٹن سٹی جہاں بھانت بھانت کی شکلیں اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں۔ یہ ایک بین الاقوامی شہر ہے جہاں ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ پوری دنیا کی نمائندگی ہے۔

ہر جگہ کی طرح بمبئی میں بھی ہر طبقے کے لوگ رہتے ہیں یہاں سرمایہ دار بھی ہیں اور مزدور و محنت کش بھی۔ یہاں بڑی بڑی عمارتیں بھی نظر آئیں گی اور ان لوگوں کی جھونپڑیاں جو دن بھر محنت مزدوری کر کے شام کو اپنی سب آمدنی شراب، چرس اور بھنگ میں اڑا دیتے ہیں۔ یہاں غربت امارت دونوں ہیں۔ دونوں میں تفاوت یا ہم ہے۔ یہاں گاڑی چلانے والے مزدوروں سے لے کر فلمی دنیا کے مشہور ستارے تک جمع ہیں۔ کوئی عالیشان فلیٹ میں سوتا ہے اور کوئی سڑک کی پیٹری پر۔

بمبئی ایک کاروباری شہر بھی ہے۔ یہاں ہر قسم کا کاروبار ہوتا ہے۔ جائز بھی اور ناجائز بھی۔ "سفید" بھی اور "کالا" بھی دوسرے ملکوں سے مال آتا ہے اور جاتا ہے۔ تجارت برآمد و درآمد کے بڑے بڑے کروڑپتی اور لکھپتی تاجر بمبئی میں ملیں گے جو لاکھوں کروڑوں کا لین دین کرتے ہیں۔ بعض ایسی برادریاں ملیں گی جو کاروبار ہی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئیں ہیں خواہ کیسا ہی کاروبار ہو مگر ہو نفع بخش۔ اس معاملے میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں۔ ان سب کا واحد مقصد بس پیسے کمانا ہے اور اس میں وہ ایک دوسرے سے خوب تعاون کرتے ہیں۔

ایک منافع خیز کاروبار ہے قحبہ خانے چلانا۔ یہ ایسی ٹولیوں اور گروہوں (گانگسٹروں) کا کاروبار ہے جو ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ ان کی پشت پناہی سود خور پٹھانوں اور منافع خور مارواڑیوں دونوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ دونوں کو پیسہ چاہیے اور قحبہ خانوں کے مالکوں سے خوب پیسہ ملتا ہے۔

قحبہ خانے چلانا اور فاحشہ لڑکیوں یا عورتوں کے ذریعے کمائی کرنا قانوناً جرم ہے۔ لیکن دنیا میں ایسا کونسا جرم ہے جو نہیں ہوتا۔ بمبئی اس معاملے میں سب سے آگے نظر آتا ہے اس لئے نہیں کہ بمبئی کی پولیس کسی دوسری جگہ کی پولیس کے مقابلے میں کمزور یا نااہل ہے۔ بلکہ اس لئے کہ قانونی عدالت میں سزا پائے بغیر ہر شخص کو بے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور قحبہ خانے کے گانگسٹروں کو سزا دلانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں

[illegible]

پیچھے وہ خود پولیس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

قحبہ خانوں کے کاروبار کا انحصار لڑکیوں پر ہے۔ یہ لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں؟ کسی ساہوکار، مارواڑی یا سود خور سے پوچھئے تو وہ جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کرتا ہے "کیا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟"

اس کا آسان طریقہ غنڈوں نے دریافت کیا ہے۔ وہ گاؤں اور گلیوں میں جاتے ہیں اور لڑکیوں اور عورتوں پر نظر رکھ کر اپنا من پسند شکار منتخب کرتے ہیں اور پھر ان کے لئے قرضے کی رقم کا چارہ ڈالتے ہیں۔ خود اسے قرض لینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس کی کسی سہیلی یا کسی رشتے دار یا کسی "بوائے فرینڈ" کے ذریعے اس پر دباؤ ڈالتے اور بعض اوقات اس کے شوہر تک کو قرض لینے کے لئے اس فریب میں پھانس لیتے ہیں۔

[illegible]

تو اس سے کاغذ لکھوایا جاتا ہے جس میں نہ تاریخ لکھی ہوتی ہے اور نہ رقم۔ سود اتنا لگایا جاتا ہے کہ اس کی ادائیگی ایک شخص کے لئے ممکن نہیں رہتی۔ جب ایسا ہو تو عورت پر ڈورے ڈالے جاتے ہیں اور اسے سمجھایا جاتا ہے کہ اگر وہ "بازارِ حسن" میں اپنا حسن فروخت کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو اس کے سارے دلدر دور ہو سکتے ہیں۔ قرض لی ہوئی رقم سے سیکڑوں گنا زیادہ کمائے گی۔ وہ اگر رضامند ہو گئی تو اسے ایک "قدیم ترین" پیشے کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور اگر اس نے ناراضگی کا اظہار کیا تو غنڈوں کے گروہ کے پاس اپنے آدمی موجود ہیں جن کے ذریعے اس عورت پر دباؤ ڈالا جاتا ہے اور اسے دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ اور اگر عورت یا اس کے اعزا پولیس میں شکایت کرتے ہیں تو دھمکیاں دینے والے غائب ہو جاتے ہیں۔ پٹھان، مارواڑی یا ان کے ایجنٹ موقع پر

[illegible]

رقمیں بہت بڑھا چڑھا کر دکھائی جاتی ہیں۔

یہ کاغذ بالکل قانونی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں سود خور ساہوکار کے لائسنس کا نمبر لکھا ہوتا ہے جس کے تحت یہ گروہ اپنا کاروبار کرتا ہے۔ دھمکیاں دینے والوں اور ساہوکاروں یا ان کے ایجنٹوں میں بظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اور پولیس شبہ رکھنے کے باوجود ان لوگوں کا کچھ نہیں کر سکتی۔

بمبئی شہر کے علاوہ غنڈوں کا گروہ بنگلور، مدراس، جے پور اور کلکتے سے لڑکیوں کو لاتا ہے۔ جب کوئی لڑکی باہر سے آتی ہے تو کسی ایک یا دوسرے قحبہ خانے میں رکھا جاتا ہے۔ "لانے والے" کو سپلائی شدہ مال کی کوالٹی کے مطابق ایک ہزار سے پانچ ہزار روپے تک دے دیے جاتے ہیں۔ لڑکی کو کپڑوں اور بناؤ سنگھار کے لئے پیشگی روپے دے دیے جاتے ہیں۔ پرانے طریقے پر ایک نیا سرکاری کاغذ لکھوایا جاتا ہے، لیکن اس مرتبہ کسی نئے ساہوکار کے نام پر۔ ایک مرتبہ لڑکی کے قحبہ خانے میں ہو چکنے کے بعد اسکا وہاں سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا ہے کیونکہ قحبہ خانوں کے مالکان ایسے طریقے اپناتے ہیں جن کے بعد لڑکی کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ قحبہ خانے کے علاوہ اس کے لئے اور کوئی بہتر جگہ نہیں ہے۔ یہ لڑکی کبھی اپنے قرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی حالانکہ وہ اس رقم سے جو اس پر خرچ کی جاتی ہے سیکڑوں گنا زیادہ کما کر دیتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ لڑکیاں ایک قحبہ خانے سے دوسرے قحبہ خانے کے ہاتھ فروخت بھی کر دی جاتی ہیں۔ مویشیوں سے زیادہ انکی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ اس سودے بازی میں کسی مرحلے پر بھی لڑکی بول نہیں سکتی اور نہ وہ کچھ پوچھ سکتی ہے۔ ان کی قیمت انکی خوبصورتی اور جسمانی صحت کے مطابق حاصل کی جاتی ہے۔

قحبہ خانے کے مالکان لڑکیوں کے ذریعے کمائی ہوئی رقم میں سے نصف حاصل کر لیتے ہیں اور باقی نصف میں سے لڑکیاں کچھ اپنی ذات کے لئے لے سکتی ہیں۔ انہیں ہم تھکڑوں یعنی غنڈوں اور بدمعاشوں کی ٹولیوں کا معاوضہ بھی دینا ہوتا ہے۔

چند سکوں کے عوض نہ جانے کتنی عورتوں اور بیٹیوں کو خریدا جاتا ہے۔

بیورت ۔۔۔
۔۔۔ نے اٹھا کر مجھ کو دو فرانک واپس کر دو
۔۔۔ نے حیرت سے کہا۔
۔۔۔ تم نے جیں فرانک خرچ کر دیئے ۔۔۔ آ تم نے
۔۔۔ ہو گا۔!
۔۔۔ اس منٹ میں نے اسے چپ ہم اسے دیکھ
۔۔۔ بھیک کہا۔
۔۔۔ پاگل ہو۔ اس آدمی کو اس ناکارے کو تم نے
۔۔۔ شنا ش دے دیئے۔

والے نے جنہیں ہم نے بتا کہ ان کا ۔۔۔
سن لے ہماری طرف کچھ اس طرح گھور کر دیکھا کہ
وہ چپ ہو گئیں۔ ماحول پر بوجھل سی خاموشی طاری ہو گئی۔"
ہمارے آگے افق پر سمندر سے ایک بھورا سا
سایہ اٹھتا نظر آیا۔ یہی جرسی تھا
جیسے ہی ہم زینے پر پہونچے ، میرے دل میں بڑی
شدت کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ایک بار
میں پھر اپنے چچا کو دیکھ آؤں۔ ان کے پاس جا کر ہمدردی
کے کچھ الفاظ ہی ان سے کہوں۔ لیکن چونکہ اب
وہاں پر کوئی گھونگھا کھانے والا نہ تھا اس لئے وہ

غالب ہو چکے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ تب سے
کی بدبودار کوٹھری میں چلے گئے ہوں گے جہاں گھونگھوں
نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔
ہم لوگ سینٹ پاموں کے راستے سے لوٹے ، تاکہ
راہ میں کہیں ان سے پھر ہماری مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔
راستے بھر میری ماں گھبرائی گھبرائی سی رہیں۔
میں نے پھر کبھی اپنے چچا کو نہیں دیکھا۔ اور یہی وجہ
ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو (اور اس نے کہا۔ آپ
کبھی کبھی مجھے بھیک منگوں کو پانچ فرانک دیتے ہوئے
دیکھتے ہوں گے۔

ضرورت کے وقت دوست ہی کام آتا ہے

"یحییٰ خاں کا خیال ہے کہ مجیب الرحمٰن کو پھانسی دی جائے گی" ۔۔ ایک خبر

غلط روش

بعض مفاد پرست پارٹیاں بنگلہ دیش کے مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش میں مصروف ہیں اور وہ یہاں کے بعض مقامات پر فرقہ وارانہ فساد برپا کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی ہیں۔ اس قسم کی صورتحال انتہائی افسوسناک ہے۔ اس سے بنگلہ دیش کے کاز کو سخت نقصان پہنچے گا اور پاکستان کو فرقہ وارانہ بنیاد پر پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جائے گا۔

بنگلہ دیش کی تحریک کی ہندوستان اگر حمایت کرتا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ یہی ہے کہ اس کی بنیاد سیکولرزم پر ہے مشرقی بنگال کے عوام ایک ایسا سماج قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں سب لوگوں کو بلا تخصیص مذہب و ملت یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اسی بنیاد کو لے کر وہ آگے بڑھے اور اسی بنیاد پر انھوں نے الیکشن میں کامیابی حاصل کی ہندو مسلمان سبھی لوگوں نے شانے سے شانہ ملا کر اس تحریک میں حصہ لیا اور الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔

اور اس کے بعد سبھی ہندو مسلمان فوجی مظالم کا شکار ہوئے اور دونوں ہی نے ہندوستان آکر پناہ لی۔ تمام پناہ گزین کیمپوں میں ہندو مسلمان ایک ساتھ بھائی بھائیوں کی طرح حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

اس نازک موقع پر بھی کچھ پارٹیاں اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے میں تو یہ ایک غلط روش ہے اور یہ ملک کی اور پوری قوم کی بدقسمتی ہے۔ تاہم خوشی کی بات ہے کہ اس معاملہ میں نہ صرف یہ کہ مرکزی حکومت بلکہ ریاستی حکومتیں بھی پوری طرح چاق و چوبند ہیں اور امن و امان قائم رکھنے کا عزم رکھتی ہیں۔ امید ہے کہ وہ ان فرقہ پرستوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں گی اور بنگلہ دیش کے مسئلہ پر پاکستان کو فرقہ وارانہ پالیسی کو بڑھاوا دینے نہ دیں گی۔

بنگال

دہی حالت بے ڈھنگی

مغربی بنگال کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ جو بے ڈھنگی حالت عرصے سے چلی آ رہی تھی وہی اب بھی ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ مار دھاڑ اور قتل کے واقعات نہ ہوتے ہوں۔ اس وقت تک اگر مرکزی حکومت کو کچھ کا اس وقت بنگال پر کنٹرول ہے کوئی کامیابی حاصل ہوئی ہے تو یہ کہ اس نے ریاست کی تمام ۲۰ پارٹیوں کو ایک چار نکاتی پروگرام پر متفق کر لیا ہے۔ جو یہ ہے (۱) قتل اور دہشت انگیزی کی پوری قوت سے مذمت کی جائے (۲) تمام سیاسی پارٹیوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ قتل اور خونریزی کے سلسلے کو بند کر دیں (۳) ایڈمنسٹریشن کو چاہیے کہ وہ قتل کے واقعات کا پوری جرات کے ساتھ انسداد کرے (۴) حکومت کو چاہیے کہ وہ ایڈمنسٹریشن کے تمام عناصر کے خلاف خواہ وہ پولیس ہو سخت قدم اٹھائے جو جرائم کو روکنے میں تساہل سے کام لیں اور اپنا فرض ادا نہ کریں۔

مختلف سیاسی پارٹیوں کی طرف سے اس پروگرام کی منظوری کے بعد امید بندھی ہے کہ بنگال میں امن قائم ہو سکے گا۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ قتل و غارتگری میں حصہ لینے والے کسی ایک یا دوسری پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کے بعد بھی امن قائم نہ ہوا اور قتل و غارتگری کی سیاست چلتی رہی تو حکومت کو کھوج لگانا ہوگا کہ اس کے تار کہاں سے کہاں ملے ہوئے ہیں یہی نہیں بلکہ مجرموں کے خلاف سخت اقدامات بھی کرنے ہوں گے۔ اس لیے کہ لاتوں کے بھوت اکثر باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ ■

یوپی

صنعت اور زراعت

چند ماہ قبل وسط مدتی انتخابات کے دوران اندرا کے حق میں جو ہوا چلی اس کے نتیجے میں یوپی کی کچھڑی حکومت کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ اور ٹی این سنگھ کی جگہ مسٹر کملاپتی ترپاٹھی برسر اقتدار آ گئے جو ایک فلاسفر بھی ہیں اور جرنلسٹ بھی۔ وہ تین ماہ سے برسر اقتدار ہیں اور اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انکی حکومت ایک مستحکم حکومت ہے۔ مخالفین کے دم خم بالکل ختم اور ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں کہ مسٹر کملاپتی ترپاٹھی کو چیلنج کر سکیں۔

سدھارتھ شنکر رے۔ مغربی بنگال پر فوج کی حکمرانی

لیکن ایک معاملہ میں مسٹر کملاپتی ترپاٹھی بدقسمت ہیں کہ انہیں اقتدار کے بھوکے دو ڈھائی لیڈروں کی طرف سے ایک تباہ شدہ معیشت وراثت میں ملی ہے۔ گذشتہ دس برس سے ریاست میں کوئی بڑی ترقیاتی اسکیم شروع نہیں ہوئی نتیجہ میں ایک طرف ریاست کی معیشت اپنی جگہ قائم رہی اور دوسری طرف بے روزگاری کی فوج بڑھتی گئی۔

یوپی بنیادی طور پر ایک زرعی ریاست ہے۔ اس لیے ریاستی حکومت کو خوراک کے معاملے میں خود کفیل بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیئے تھی۔ لیکن سابقہ حکومتیں غالباً اپنے عدم استحکام کی بنا پر اس طرف زیادہ توجہ نہ دے سکیں لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ ترپاٹھی گورنمنٹ اس طرف خصوصی توجہ دے

اسکیموں کو بہت [illegible] زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ہوسکے۔ یوپی میں قابل کاشت رقبہ ۲۱،۱۹۵ لاکھ ہیکٹر ہے۔ فی الوقت اسکا پروگرام ہے کہ ۸۰ لاکھ ہیکٹر مزید رقبہ کو زیر کاشت لایا جائے۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں یوپی میں زرعی پیداوار ۳۳ لاکھ ۴۴ ہزار ٹن تھی اور ۷۱-۱۹۷۰ء کیلئے اسنے ۹۰ لاکھ ٹن کا نشانہ مقرر کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے کسانوں کو فراخدلی کے ساتھ قرضے دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

تریاٹھی گورنمنٹ زراعت کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی کی طرف بھی توجہ دے رہی ہے کیوں کہ وہ سمجھتی ہے کہ بے روزگاری کے مسئلہ پر قابو پانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ریاست کے تمام حصوں میں صنعتوں کا جال بچھا دیا جائے۔ سرکاری طور پر بتایا گیا ہے کہ قرضہ جات، زمین، مکانات، خام اشیاء اور بجلی کا کسی تاخیر کے بغیر انتظام کیا جائیگا۔

وزیر مملکت برائے صنعت وحرفت نے اعلان کیا ہے کہ صنعت وحرفت شروع کرنے والوں کی درخواست پر فوراً توجہ دی جائے گی اور ۴۵ دن کے اندر کاروائی کو مکمل کر دینگے" لیکن اس قسم کے اعلانات ماضی میں بھی ہوتے رہے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ان پر کس حد تک ایمانداری کے ساتھ عمل ہوتا ہے اگر عمل ہوا تو یقین ہے کہ یوپی کی ریاست بہت حد تک اپنی ضرورتوں کو پورا کرلے گی اور جلد ہی یوپی بھی دوسرا پنجاب بن جائیگا۔ جو نہ صرف زرعی میدان میں بلکہ صنعتی میدان میں بھی باقی ریاستوں سے آگے ہے۔

[illegible] کر [illegible] جیسا کہ یہ ہیں جن کا سر سے کوئی وجود ہی نہیں [illegible] جو لوگ گزند ہیں انکی ضمانتوں کی راہ میں طرح طرح کی اڑچنیں ڈالی جارہی ہیں۔ انصاف کے اس خون پر سب حیران ہیں۔ سچ پوچھئے تو پولیس نے اپنے رویہ سے دہشت گردی کا ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ اس علاقے میں اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ بھلا پاسوان کی حکومت کیا کر رہی ہے اور اس نے مصیبت زدوں کی مصیبت دور کرنے کے لیے کیا قدم اٹھائے ہیں یہ ابھی معلوم نہ ہوسکا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ جس طرح ہمارے نام نہاد "قومی پریس" نے مذکورہ دیہات کے واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دی اسی طرح شاید پاسوان صاحب کی وزارت بھی انھیں کوئی اہمیت نہیں دے رہی ہے بھولا پاسوان صاحب کانگریس پارٹی کی حمایت سے وزارت اعلیٰ کی گدی پر براجمان ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کانگریس کب تک اس بے انصافی کو دیکھتی رہے گی۔

[illegible] کر کے اپنے والنٹیروں کو گرفتار کرایا۔ یہ والنٹیر دلی کے بھی تھے اور باہر سے بھی آتے ہوتے تھے۔ شہر میں انکی ویلی ٹولیوں میں جلوس دیکھا جا سکتا تھا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان والنٹیروں کو ستیا گرہ میں حصہ لینے کے مقابلہ میں راجدھانی میں سیر سے زیادہ ہی دلچسپی تھی بلکہ وہ ستیاگرہ کو بھی ایک سیر ہی سمجھتے تھے اور اسے سیر ہی سمجھ کر انھوں نے اس میں حصہ لیا۔ ایک نام نہاد والنٹیر سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا "دلی تک آنے کا کرایہ بچ رہا تھا۔ ریل میں خوبصورت علاقے دیکھتے اور آج کل کے موسم برسات کی ٹھنڈی ہوا کھاتے چلے آئے اور اب بیسیوں میل میں پھیلی ہوئی دلی کو مفت دیکھنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر آرام سے سیر کرتے اور نئے نئے نگروں کو دیکھتے وہاں تک اس کے ساتھ چلے جائیں۔ دو چار دن کے بعد تہاڑ جیل تو کوئی کرڑ کی عمارت دیکھنے کو ملے گی —

وزیر اعظم کی کوٹھی کے باہر۔ نماز کا ایک منظر۔ جو بنگلا دیش کو منوانے کے سلسلے میں جن سنگھ کے مظاہرے کا حصہ تھی

بہار

انصاف کا خون

ایک ایسے زمانے میں جب کہ حکومت کی تمامتر توجہ بنگلا دیش سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کے مسائل کو حل کرنے کی طرف لگی ہوئی ہے بہار کی حکومت کی پیشانی پر کلنک کا یہ ٹیکا لگا ہے کہ ضلع مظفر پور کے تین دیہات۔ اوا پور۔ سولا نگر اور ملکپور میں فرقہ وارانہ ہنگامہ برپا ہوا اور پولیس نے شرپسندوں کی حوصلہ افزائی کر کے انھیں اقلیتی افراد کو تباہ و برباد کر ڈالنے کی کھلی چھٹی دیدی اور اب انھیں اقلیتی افراد کو جو مظالم کا شکار ہوئے انصاف مند واقعات نئی دہلی

یا کرایوں (؟) ... [illegible] آجائیں گے۔ مطلب بیر
سے بے ہودہ ہوگئی ہے۔"

لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ ستیہ گرہ کیوں ہو رہا ہے۔ پناہ گزین بنگال میں ہیں جہاں ان کی خدمت کی ضرورت ہے نہیں روٹی کپڑے اور مکان کی ضرورت ہے اور دوسری ضروری اشیاء ان کے لیے درکار ہیں۔ جن سنگھ اس کے لیے کچھ نہیں کرتی یقیناً اس لیے کہ اس میں تفریح یا سیر کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ حقیقی خدمت کا سوال ہے اور جن سنگھ ظاہر ہے سب کچھ کر سکتا ہے خدمت نہیں۔ خدمت کرنا اس نے کانگریس جیسی سنستھاؤں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

ستیہ گرہ کے اس اسٹنٹ کی اہمیت جتانے کے لیے دلی میں پوسٹروں کی وہ بھرمار کی گئی ہے کہ توبہ بھلی کبھی ہندوؤں سے اس کی اپیل کی جاتی ہے اور کبھی مسلمانوں کو ہوشیار و خبردار کیا جاتا ہے۔ اور کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ مظاہرین کے جلوس میں شامل ہوں اور وزیر اعظم کی کوٹھی پر نماز جمعہ ادا کریں۔"

لیکن یہ سب ہوائی باتیں ہیں حقیقی نہیں حقیقی بات تو یہ تھی کہ اس موقع پر حکومت کے ہاتھ مضبوط کئے جاتے تا کہ آزادی پسند بنگالیوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے اور جلد ایسے حالات پیدا ہو جاتے کہ بنگلا دیش کی حکومت کو ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک بھی منظور کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے۔ لیکن جن سنگھ کو واقع یہ ہے کہ بنگلا دیش کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے دلچسپی نہیں ہے اور اسے اس سے بھی دلچسپی نہیں ہے کہ پاکستان کی حکومت مشرقی پاکستان کے عوام کو اقتدار منتقل کرے گی یا نہیں انہیں صرف دلچسپی ہے اسٹنٹ چلانے سے کیونکہ انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی کہ آج کل اسٹنٹ چلانے ہی سے ایک جماعت مضبوط بنتی ہے۔

لیکن یہ اس کا خیال خام ہے۔ آج کل اسٹنٹ چلانے والوں سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو اس قسم کے اسٹنٹوں کو سمجھتے ہیں۔

واقعات نئی دہلی

بھارتی بھرکم درازقد، ہنس مکھ چہرہ، مسٹر ایم ایل بھاردواج دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق ان "زندہ دلان پنجاب" سے ہے جو آزاد ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبے میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ مگر کسی بے جا رعایت کے طفیل نہیں بلکہ اپنی محنت اور لگن سے۔ بھاردواج صاحب بھی شروع سے محنتی اور انتھک کام کرنے والے رہے ہیں اور ان کی اسی محنت نے انہیں جرنلسٹ کی کرسی سے انفارمیشن بیورو کے پرنسپل انفسر کی کرسی تک پہنچایا۔

تقسیم کے نتیجے میں وہ دلی آئے اور انفارمیشن بیورو سے وابستہ ہو گئے۔ اس وقت وزارت امور خارجہ سے ان کا تعلق تھا۔ شام کو عام طور پر ان کا کمرہ نامہ نگاروں سے بھرا رہتا تھا۔ بلاشبہ اس لیے کہ وہ امور خارجہ اور خاص طور سے پاکستان کے بارے میں خبریں حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے جس کے ساتھ اس وقت بھی ایسی ہی کشیدگی تھی جیسی کہ آج کل ہے۔ لیکن اسلئے بھی کہ بھاردواج جیسا ہنس مکھ اور ملنسار سرکاری ترجمان کوئی اور نہ تھا۔ نامہ نگاروں کے لیے بھاردواج صاحب کا کمرہ دلچسپیوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ درمیان میں کچھ عرصہ کیلئے بھاردواج صاحب نے پریس رجسٹرار جیسے ذمہ داری کے عہدہ پر بھی خدمات انجام دیں لیکن وہ پھر پریس انفارمیشن بیورو میں واپس آ گئے اور اسی دفتر سے ریٹائر ہوئے۔

پریس انفارمیشن بیورو کے بارے میں نامہ نگاروں میں گرچہ کبھی کبھی مخالفانہ رجحان دیکھنے میں آتا ہے اور وہ اسے "پرائیویٹ پریس انفارمیشن بیورو" کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں لیکن اخباری نمائندوں میں بھاردواج صاحب کا ہمیشہ احترام رہا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خود ایک جرنلسٹ رہے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ تعلقات عامہ کی بنیاد حقیقت میں ذاتی تعلقات پر ہے۔ اخباری دنیا کے لوگوں میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جن کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات نہ ہوں۔ پریس انفارمیشن بیورو کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود ہر سینیر یا جونیر اخباری نمائندے کے لیے ان تک رسائی کوئی مشکل نہ تھی ان کے دروازے سب کے کیلیے کھلے رہتے تھے۔ ان کی اسی سادہ مزاجی نے اخباری برادری میں انھیں مقبول عام بنا دیا تھا۔

بھاردواج صاحب کا آئندہ پروگرام کیا ہوگا۔ اسکی وضاحت انھوں نے نہیں کی لیکن یقین ہے کہ وہ پروگرام ضرور بنائیں گے۔ اسلئے کہ وہ ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں بلکہ جوانوں سے زیادہ کام کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنے بہی خواہوں کا یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ وہ سیاست میں پڑ کر کسی قانون ساز اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے، لیکن بہرحال ان کے تمام دوست احباب اس وقت کے منتظر ہیں جب وہ مرکزی حکومت میں ہونگے اور قومی حکومت ان کے تجربات سے فائدہ اٹھائیگی۔

جب پرتگالیوں کو گوا سے نکال باہر کیا گیا تھا اس وقت گوا میں صرف ۵ روزنامے شائع ہوتے تھے۔ یہ روزنامے دستی آلہ کار تھے۔

لیکن اس کے برخلاف اب صرف چودہ لاکھ افراد پر مشتمل چھوٹی سی آبادی کے اس شہر میں مختلف قسم کے کوئی ۲۰ روزنامے اور رسالوں کی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ گوا کے باشندوں میں اپنے بنیادی حقوق کا مطالبہ کرنے کا جذبہ بڑھا دیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے گوا کے عوام کو اخبارات اور رسائل سے کتنی دلچسپی ہے۔

ایک ایسے علاقے کے عوام سے جہاں مشرق میں پہلی بار جوہانس گٹن برگ کے پریس ایجاد کرنے کے تقریباً سو سال بعد چھاپہ خانہ قائم کیا گیا تھا یہی توقع کی جا سکتی تھی۔

پرتگالی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے بعد گوا کے عوام میں اپنے حقوق کے تحفظ کا شعور پیدا ہوا اور ان کے دلوں میں اپنی آواز کو دوسروں تک پہنچانے کی خواہش اور تحریک پیدا ہوئی۔ اس خواہش کے زیر اثر انھوں نے معمولی سی ترغیبات کی بنا پر نئے اخبار جاری کئے۔

پرتگالی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کی آہنی گرفت کی وجہ سے گوا میں صحافت زبوں حالی کا شکار رہی ہے۔ لیکن آنے والے برسوں میں اس بات کی امید ہے کہ گوا کے اخبارات عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے اور عوام تک خبریں پہنچانے کا عمدہ ذریعہ بنیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ گوا کے تاجر تجارت کے بارے میں اپنے قدیم اور روایتی نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کریں اور تجارت میں اشتہار بازی کی اہمیت کو سمجھیں۔

جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی زمانۂ سابق میں گوا کی صحافت میں بے باکی اور جرأتمندی کی چند علامات نمایاں ہوئیں۔ اس لئے کہ وہ ایک غیر ملکی قوم کی ناانصافیوں اور مظالم کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں عالم وجود میں آئی ہے۔ فرانسس لوئس گومس، پیڈرو افانسو اور منزیز گنترا جیسے ادیبوں اور مقرروں نے اپنی تقریروں، پمفلٹوں اور صحافت کے ذریعے آہستہ آہستہ لیکن پراثر طریقے پر پرتگال کی ظالم حکومت کے خلاف جنگ کی ہے۔

گوا کی صحافت کی داستانِ حیات پرتگالی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کی طویل داستان ہے۔ گوا میں سب سے پہلی چھاپے کی جدید مشین عیسائی پادریوں نے گوا پر پرتگال کے مکمل قبضے کے ۴۰ سال بعد نصب کی۔ اس مشین کی تنصیب سے پہلے گوا میں لکڑی کے ذریعے چھپائی کا قدیم طریقہ رائج تھا۔ جو بے حد غیر موزوں تھا۔ یہ طریقہ اس زمانے میں ایشیا کے سبھی ترقی یافتہ ممالک میں رائج تھا۔

ہندوستان کے تمام حصوں میں چھپائی اور صحافت نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ اس کے برخلاف پرتگال کے پنجۂ استبداد میں پھنسا ہوا یہ علاقہ مختلف وجوہات کی بنا پر اس سلسلے میں کافی پسماندہ رہا۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ حکومت نے صحافت پر زبردست پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ان پابندیوں کی وجہ سے صحافت برباد ہو کر رہ گئی۔ وہ حکومت کا آلۂ کار بن گئی اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ اس کا فرض انسانی حقوق اور سچائی کے تحفظ کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا ہے۔

۱۶ ویں صدی عیسوی میں گوا ہندوستان اور مغربی ممالک کے درمیان تعلق کی ایک اہم کڑی بن گیا تھا۔ یہاں سب سے پہلا چھاپہ خانہ عوام کو عیسائی مذہب کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ عیسائی مبلغین نے دیکھا کہ اہلِ مشرق کو عیسائی بنانے اور ان میں عیسائی مذہب کے اصول کو عام کرنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔ چنانچہ ابتدائی مطبوعات کے موضوعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا تک جو کتابیں چھاپی گئیں وہ مذہبی اور فلسفیانہ تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم کانکلوسس فلاسفیکاس تھی جسے جان دی بستامنٹی نے ۱۵۵۶ء میں شائع کیا تھا۔ کمپنڈیو اسپرچول ڈاوی ڈا کرسٹا جسے گوا کے سب سے پہلے آرچ بشپ کاسپر ڈی لیو نے ۱۵۶۱ء میں شائع کیا تھا اور کولوکیس دوس سمپلیس اے ڈروگوس جسے ۱۵۶۳ء میں گارسیا ڈی نے شائع کیا تھا۔

ان مطبوعات میں جو ۱۶۰۰ء کے بعد منظر عام پر آئیں ٹراٹاڈو کانٹرا اوس جوڈیس۔ (یہودیوں کے خلاف معاہدہ) CONSTITUTIONS (دستور) پرائیمرو کونسیلو پروونشیل (سب سے پہلی صوبائی کونسل) پرانا کرسٹا (عیسائی پران) جارڈم دی پاسٹورس (چرواہوں کا باغ) یہ کتاب کونکنی زبان میں ہے اور ایک کونکنی زبان کا قواعد جس کا نام آرتے ڈی لنگوا ناریم ہے اور جس کا مصنف فادر تھامس اسٹیفنس ہے، شامل ہیں۔

جیسے جیسے سیاسی شعور ترقی ہوتا گیا اور قومی احساسات

[illegible]
گوا میں جیسوٹ [illegible] کر دیا گیا اور چھاپہ خانہ ایسی
کتابیں شائع ہوئیں جن سے غیر ملکی حکمرانوں اور عیسائی پادریوں
کے وجود کو خطرہ پیدا ہو گیا۔

عظیم گوانی ادیبوں کے یہ تحریری کارنامے سیاسی استبداد
کا شکار ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ ان تحریروں کو ان
لوگوں نے تلف کر دیا جن کے مفادات ان کی وجہ سے خطرے
میں پڑ گئے تھے۔ اپنے آپ کو چاروں طرف خطرات میں گھرے ہوئے
محسوس کرنے کے بعد پرتگالی حکمرانوں نے مناسب یہ سمجھا کہ
گوا میں ہر قسم کی اشاعتوں پر پابندی کا قانون نافذ کر دیں۔
اس طرح انھوں نے حکومت کے خلاف اٹھنے والی آوازوں
کو دبانے کی کوشش کی۔

اسی زمانے میں فرانسیسی انقلاب کی وجہ سے سارے
یورپ میں آزادی اور مساوات کے نئے سیاسی تصورات کی
اشاعت عمل میں آ رہی تھی۔ اس کا اثر جلد ہی گوا میں بھی محسوس
کیا گیا۔ ان نئے رجحانات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے دنیا میں
ہر جگہ آزادی کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ ان حکومتوں کو سب
سے اچھا سمجھا جانے لگا جو عوام کو اپنے اعتماد میں لیں۔ ان
نئے حالات کے زیر اثر پرتگالی حکمرانوں نے مناسب یہ سمجھا کہ
کتابوں رسالوں اور اخباروں پر سے پابندی اٹھا لی جائے۔

۲۲ر دسمبر ۱۸۲۱ء میں گوا کا سب سے پہلا ہفتے وار
گزیٹا ڈی گوا۔ شائع ہوا۔ سیاسی اور دوسرے موضوعات پر
آزادانہ اظہارِ خیال کے روز افزوں جذبے کے نتیجے میں دستوری
حکومت اور نظم و نسق کے بارے میں عوام کے خیالات میں جلا
پیدا ہوئی۔ گوا کے تعلیم یافتہ عوام نے سیاسی اصطلاحات اور
سیاسی آزادیوں کے لئے ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کیا۔ لیکن
حکومت ان آمنیوں [illegible] عوام پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑی جو اس
کی نظر میں قوم کے دشمن تھے۔ ان کے ترقی پسندانہ خیالات
نے پرتگالی حکومت کو متزلزل کر دیا۔

سیاسی استبداد اور قید و بند کے خوف سے ان میں
بہت سے لوگوں نے گوا سے بھاگ کر بمبئی میں پناہ لی جہاں
اخبارات جاری کئے اور سیاسی آزادی کے حصول کے لئے
اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ ان کے باغیانہ جذبات نے
پرتگالیوں کے سیاسی استبداد کے خلاف ایک طویل جنگ کی
داغ بیل ڈال دی۔

[illegible]
اور ان اخبارات پر سنسر کرو ۱۸۳۶ء اور ۱۸۵۵ء کے درمیان
شائع ہونے سنسر نے بند کر دیا۔

ان میں "ا کرانیکا کانسٹی ٹیوشنل ڈی گوا"، "ا کوڈی
لیوسی تانیا"، "ادبی لیبانٹے"، "اے بائبلونیکا ڈی گوا"
"وادا آزر ویڈر"، "ا انسائیکلو پیڈیکو"، "او کامپیلا ٹدو"
"ا دکور لیوڈی نوو اگوا" اور "دی وسٹا السٹریٹیو" وغیرہ
شامل ہیں۔

سرکاری اخبار "بولے تیم ڈو گورنو ڈو ایسٹاڈو ڈا انڈیا"
جسے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا گیا تھا ۱۹۶۲ء تک مسلسل پابندی
سے شائع ہوتا رہا۔

۱۸۵۹ء میں "الٹرامار" نامی روزنامے کی اشاعت
نے گوانی صحافت میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ نہ صرف یہ کہ اس
نے اخبارات کے لئے لکھنے والوں کی بصیرت میں اضافہ کیا
اور انھیں ایک اہم مقصد سے روشناس کرایا بلکہ ان میں اپنی
تحریروں کے ذریعے عوام کے حقوق کا مطالبہ کرنے کا جذبہ بھی پیدا
کیا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کے بعد کم از کم کوئی ۹۶ روزنامے
اور ہفتہ وار شائع ہوئے لیکن زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکے
یا تو وہ مالی نقصان کی وجہ سے بند ہو گئے یا پھر پرتگالی حکومت
کی نامناسب پابندیوں کا شکار ہوئے۔

آخر کار جب پرتگالیوں کو گوا سے نکال باہر کیا گیا تو اس
وقت گوا میں صرف ۵ اخبار شائع ہو رہے تھے جن کا معیار بہت
پست تھا۔ ان کے نام "دی ہیرالڈو"، "ڈیاریو ڈا نائٹے"،
"اے انڈیا پورچو گیزا" اور "اے ویدا" ہیں۔ پرتگالی حکومت
کے خلاف ایک اداریہ لکھنے کی وجہ سے "اے وور ڈا انڈیا"
نامی اخبار کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور اس کے
ایڈیٹر نے بھاگ کر بمبئی میں پناہ لی تھی۔

کونکنی زبان میں شائع ہونے والے ایک مذہبی ماہنامے
کی اشاعت پر جسے پلکر نامی مقام کے پادری شائع کرتے تھے
۱۹۶۰ء میں پرتگالی گورنر نے تین ماہ تک پابندی لگا دی۔
لیکن اس طرح کی رکاوٹوں اور ناسازگار حالات کے
باوجود گوانی صحافت کا یہ کارواں برابر آگے بڑھتا رہا اور اس کا
یہ عظیم سفر آزادی کی اس منزل کی طرف برابر جاری رہا جس کے لئے
ہمارے آبا و اجداد نے اپنے گھر اپنے خاندان اور اپنی زندگیاں تک
قربان کر دی تھیں۔

میں اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا سامنے سے جاتی ہوئی ایک حسین جمیل سی نازک اندام کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیڈی کپڑے میں کسا اس کا جسم ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کپڑے پھاڑ کر باہر نکل پڑے گا۔ وہ کچھ ہی دور گئی تھی کہ ایک گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا ایک گدھی کا پیچھا کئے چلا آ رہا تھا۔ وہ اس گدھی سے عشق لڑانا چاہتا تھا اور گدھی اپنی دولتی جھاڑتی انکار کرتی بھاگی جا رہی تھی۔ وہ گدھا بار بار اپنی چھاتی پر ہاتھ مار مار کر یہ گیت گا رہا تھا ؎

رُک جا او جانے والی رُک جا، میں تو عاشق ہوں ترے حسن کا

میں اس گدھے کو انسانوں کی طرح گاتا دیکھ کر چونک گیا اور دوڑتا ہوا اُس گدھے کو پکارنے لگا۔

"ارے! او میاں گدھے۔ ذرا سنو گے بھائی۔"

اس گدھے نے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی! میں میاں نہیں بلکہ میں تو ایک ہندو دھوبی کا گدھا ہوں اس لئے مجھے مہاشے کہہ کر بلایئے۔"

میں بھی گدھے کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا اور پھر پکار کر کہا "اجی مہاشے گدھے صاحب ذرا رکئے تو آپ سے ایک ضروری کام ہے۔" وہ دوڑتا ہوا بولا۔ "بھائی میرے میں تو ابھی نہیں آؤں گا کیونکہ مجھے ابھی اس گدھی سے عشق لڑانا ہے۔ عشق لڑانے کے بعد ہی آؤں گا۔" میں نے اسے پھر آواز دی اور کہا۔ "میرے دوست! تمہیں صرف عشق لڑانا ہے جیسی گدھی چاہو گے میں مہیا کر دوں گا۔ جمشید پور میں گدھوں کی کمی نہیں ہے۔ بوڑھی چاہو گے تو بوڑھی، جوان چاہو گے جوان، شادی شدہ چاہو گے تو شادی شدہ، بچے والی چاہو گے تو بچے والی۔ مگر میری بات تو سنو!"

گدھی تیز تیز دوڑ رہی تھی اور وہ گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا اور . . . . . .

رُک جا او جانے والی رُک جا، میں تو عاشق ہوں ترے حسن کا

گاتا ہوا پیچھا کر رہا تھا۔ اس لئے میں بھی چلاتا ہوا تیزی سے دوڑنے لگا مگر ہر لمحہ دونوں کی دوری بڑھتی ہی جا رہی تھی گدھا دور ہوتے ہوئے بولا

"میرے دوست! ابھی تو مجھے اسی کنواری گدھی سے عشق لڑا لینے دو اس کے بعد تمہارے پاس آؤں گا"

اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند راہ گیروں نے یہ سمجھ کر میں اس گدھے کا مالک دھوبی ہوں مگر وہ لاخیرہ گدھا اپنے مالک

چلا گیا اور سوچنے لگا کہ اس بولنے والے گدھے سے کس طرح ملا جائے، کمبخت کہاں ملے گا۔؟ میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا مسلسل دو گھنٹے تک اس کا انتظار کرتا رہا کہ وہ عشق لڑنے کے بعد اب واپس آئے گا اور تب واپس آئے گا۔ مگر کمبخت گدھا نہیں آیا۔

وہ سنیچر کی اک شام تھی۔ بقول اختر اورینوی "سنیچر کی شامیں خصوصاً فلم کدوں میں ہندوستان کے شہریوں کے لئے مسرت نہیں بلکہ فریب کا سامان مہیا کرتی ہیں۔"

اس شام میں نٹراج میں ایک فلم دیکھنے گیا، فلم کے شروع ہونے میں کافی دیر تھی اس لئے ٹکٹ لے کر میں ریگل گراؤنڈ کی طرف چلا گیا۔ دیکھتا کیا ہوں میدان میں بہت بڑا مجمع لگا ہوا ہے میں بھی اس مجمع کی طرف بڑھا۔ دیکھا وہی انسانوں کی طرح بولنے والا گدھا مجمع کے بیچ میں کھڑا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہے اور وہ کہہ رہا ہے۔

"بھائیو! نہ میں امریکی سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ ہوں نہ روس کی تاس خبر رساں ایجنسی کا کوئی کارکن، نہ چین کے بائیں بازو والا کمیونسٹ اور نہ خالص کانگریسی ہی بلکہ میں تو صرف ہندوستان کا ایک باسی یعنی ہندوستانی ہوں ہندوستان کے صوبہ یو پی میں پیدا ہوا، بمبئی میں پلا، بڑھا اور جوان ہوا۔ کبھی میں رستم بھائی کے ریس کا گھوڑا بنا، کبھی سیٹھ بھسوڑی مل کا گر، کبھی فلم کا پروڈیوسر، کبھی فلم کی ہیروئن سے عشق لڑایا، کبھی جان گنواتے گنواتے بچا۔ کبھی نیفا کی سیر کو نکلا کبھی میں نے اپنے پیٹ میں ٹھرے کی چھ چھ بالٹیوں کو ماہم کریک کے کراس سے بلا روک ٹوک کچھ دئے بغیر اسمگل کیا۔ اور اب آپ کے سامنے جمشید پور کے ایک پارک میں کھڑا ہوں۔"

"ایک مرتبہ میں ہندوستان کے مشہور و معروف افسانہ اور ناول نگار کرشن چندر سے ملا۔ انھیں اپنی کہانی سُنائی۔ انھوں نے میری کہانی لکھ کر ہزاروں روپیہ کمایا۔ اور اوپر سے مجھ پر احسان بھی جتایا۔ میں اُن کے افسانے کا ہیرو بنا، اور آپ نے دل میں دبی چنگاری کو کرید کر نکالا اور شروع سے آخر تک سارا قصہ سنایا۔ جسے انھوں نے آپ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اُسے آپ میں سے بہت سے لوگوں نے پڑھا بھی ہوگا کرشن چندر کی طرح میں بھی عظیم ہو گیا [illegible]

ں کی طرح [illegible]

ہی ہوتا ہے۔ [illegible]......

مجمع سے ایک مترنم آواز ابھری۔" اے عظیم ڈنکی اپنے گدھا کہہ کر اپنی توہین مت کرو۔ تم تو ایک عظیم ڈنکی ہو"۔ گدھا ایک پھیکی مسکراہٹ ہنسا اور بولا: "محترمہ ڈنکی نی خچر اور گدھا ہوتا ہے۔ مگر ہاں ہندی اور انگریزی ہم ور ہے۔ انگریزی لفظ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو، ہم کو بھلا ہی معلوم ہوتا ہے"۔

"تو جی ہاں میں اپنی کہانی سُنا رہا تھا کہ میں گدھا... اور وئی میں ڈنکی ڈنکی ہی رہ گیا۔ لاکھوں ہاتھ آیا اور ریس میں سب گنوا دیا۔ پھر کنگال ہو گیا تو سوچا کہ اب بمبئی میں مزہ نہیں رہا۔ اس لئے

دل کہیں اور چل۔ اب تو بمبئی کی دنیا سے دل بھر گیا ہیں بمبئی سے بھاگا لیکن ادھر کچھ ایسی بپتا آن پڑی میں پھر بمبئی جانا چاہتا ہوں اور اپنی کہانی کرشن چندر سنا کر انکی بانسری سے اپنے لئے ایک پکار اگ نکلوانا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے پاس بمبئی جانے کا ہی نہیں ہے جو جاؤں اور اپنی کہانی کرشن جی کو اؤں۔ اپنا دُکھ سنا کر آپ لوگوں سے کچھ مدد مانگ دل۔ میری مدد کیجئے، بھگوان آپ کی مدد کرے گا:

مجمع آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ مگر خاص طور پر لڑکیاں ں۔ اتنے میں ایک حسین سی پیاری سی لڑکی نے سوال کیا۔

"آپ انسانوں کی طرح بولنے کیسے سیکھ گئے؟"۔

گدھے نے پھر کہنا شروع کیا۔

"شروع ہی سے میں انسانوں کے ہمراہ رہا۔ مگر انسانو ہمراہ تو سبھی گدھے رہتے ہیں، وہ کیوں نہیں بولتے؟ ے نے خود ہی سے سوال کیا اور خود ہی بولنے لگا: مجھ اس قسم کا ماحول ملا کہ میں انسانوں کی طرح بولنے ۔ نزدیک ہی ایک کتاب والا تھا جو ترف ڈی سوزا کے ہاں اکثر اکثر چرایا کرتا تھا میں اکثر اس کے بک اسٹال چلا جاتا۔ کتابوں کے ٹائٹل کو پڑھنا شروع کیا اور پھر ستہ پڑھنا بولنا دونوں سیکھ گیا۔ گدھوں نے میری اس باری کو دیکھ کر مجھے گدھے سماج سے نکال باہر کر دیا۔ ی گدھی مجھ سے عشق نہیں لڑاتی۔ خواہ وہ چارلن یا [illegible]

پتہ مجھے ہے۔ [illegible] کا انسان گدھا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ نہ انسان ہی مجھے اپنے پاس بیٹھنے دیتے ہیں اور نہ گدھے اپنے سماج میں شامل کرتے"۔

مجمع میں سے ایک مترنم آواز پھر ابھری
"آپ اخبار وغیرہ بھی پڑھ لیتے ہیں"؟
"جی ہاں!"
"تو پڑھ کر دکھایئے!" ایک بنگلا اخبار گدھے کے سامنے رکھ دیا گیا۔

گدھے نے کہا: "زمانہ کا حال دیکھ دیکھ کر اور فاقہ پر فاقہ، پیدل پہ پیدل چل چل کر میری آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی ہے"۔ ایک صاحب نے فوراً اپنا چشمہ اُتار کر گدھے کی آنکھوں پر لگا دیا اور کہا اب دیکھیے۔

گدھے نے اخبار کو دیکھا اور کہا: "بہت خوب! اس سے تو صاف نظر آتا ہے۔ مگر یہ تو بنگلا اخبار ہے میں اُردو اچھی طرح جانتا ہوں اور ہندی بھی۔ کیونکہ ہندی تو ہماری راشٹر بھاشا ہے اور انگریزی بھی تھوڑا بہت"۔

داڑھی والے ایک مولوی صاحب نے اُردو کا اخبار سامنے رکھ دیا اور بولے: "اب تو پڑھیے"۔

گدھے نے فراٹے کے ساتھ اخبار کی موٹی سُرخی کو پڑھ دیا تب مجمع نے جانا کہ گدھا بھی پڑھ لیتا ہے۔ پھر گدھے نے اُن چشمے والے بابو کو مخاطب کیا جنھوں نے اپنا چشمہ گدھے کی آنکھ پر لگا دیا تھا۔

"بھائی جان! آپ اپنی عینک لے لیجئے۔

وہ عینک والے بھائی جان بولے: "جی نہیں اب آپ ہی رکھئے آپ کی آنکھوں پر پورا اترا ہے۔ اخبار وغیرہ پڑھنے میں آپ کو آسانی ہوگی۔ رکھیئے! میں دوسرا خرید لوں گا"۔

گدھے نے کہا: "آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ نے رحم کھا کر اس غریب پر مہربانی کی"۔ اور پھر بولا: "آپ لوگ میری کچھ مدد کر دیجئے۔ تاکہ میں بمبئی پہنچ جاؤں"۔

مجمع نے کہا: "ڈنکی صاحب آپ روپیہ کہاں رکھیں گے یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور بڑے ہی چھٹے مارے ہیں اور جیب کترے بھی یہاں بہت زیادہ ہیں وہ آپ سے روپے چھین لینگے اور آپ اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے"۔

مجمع کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اور جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ زور سے بولا: "ہاں بھائی جان! آپ ہی آیئے، روپیہ جمع کر لیجئے اور مجھے گاڑی پر بٹھا دیجئے گا"۔

مجمع میں سے کسی نے کہا: "ڈنکی صاحب! آپ کو ان پر پورا اعتماد ہے؟

"ہاں بھائی ہاں"، گدھے نے جلدی سے کہا۔

اور پھر روپے پیسے کی بارش سی ہونے لگی۔ اٹھنی چونی ایک آدھ کا نوٹ وغیرہ۔ جس سے جو بن پڑا اس نے دیا اور چلا گیا۔ لڑکیوں نے بھی خوب دل کھول کر گدھے مہاشے کو پیسے دیئے اور جب پورا میدان صاف ہو گیا تو گدھے نے کہا: "بھائی جان ذرا گنیئے تو کتنے روپے ہوئے؟"

میں نے سبھی نوٹوں اور ریزگاریوں کو گنا تو وہ سب کل ملا کر ستاسی روپے چار آنے تھے۔

"یہاں سے بمبئی کا کرایہ کتنا ہوگا؟" گدھے نے دریافت کیا۔

"یہی چالیس اور پچاس کے بیچ"۔

"تب ٹھیک ہے" گدھے نے پھر کہا: "ایک چھوٹا سا منی پرس خرید لیجئے۔ میں اسے اپنے منہ میں دبائے رہوں گا۔ نہیں تو کوئی روپیہ چھین لے گا اور ہاں! ذرا آپ اتنی تکلیف کیجئے کہ اسٹیشن تک چل کر ٹکٹ کٹا کر مجھے بمبئی کی ٹرین پر سوار کرا دیجئے گا۔ میں چلا جاؤں گا۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی"۔

میں نے کہا: "میرے یار میرے پاس تو سینما کا ایک روپیہ چھ پیسہ کا ٹکٹ ہے۔ میرا ایک پکچر برباد ہو جائے گا۔

"اسے بلیک کر دو، نفع بھی ہو جائے گا"۔ گدھے نے بڑے ہی مزے میں منہ چلاتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹکٹ خرید دام میں ہی ایک تماشبین کو دے دیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن آ گیا۔ ٹکٹ کٹایا اور ٹرین میں گدھے کو بٹھا کر کہا۔ "اچھا! ڈنکی برادر اب تم جاؤ بائی بائی:

گدھے نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "معاف کر دو گے بھائی۔ اُس دن تم نے مجھے بلایا تھا مگر میں نے اُس گدھی کے عشق لڑانے کے چکر میں نہیں سُنا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی نہیں ہو سکا"۔

گاڑی نے سیٹی دی اور وہ آنکھیں صاف کر کے بولنے لگا۔

رشید الدین۔ بی اے

ناگپور تعلقہ ہاڑولی کے درمیان گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ ایک نواب کا مستقر تھا اور بہت ہی متمدن اور آباد قصبہ تھا اور یہ بات چنداں غلط بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ ناگپور میں آج بھی بڑے بڑے مندر موجود ہیں جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں عالیشان عمارتیں تھیں۔ خود نواب کے محل کے کھنڈر بھی موجود ہیں جسے عرف عام میں ڈیوڑھی کہتے ہیں۔ نواب کا دیوان تھا اس کا مکان آج بھی ٹوٹی پھوٹی حالت میں ندی کے کنارے کھڑا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ باون دروازے تھے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام باون دروازے والی کوٹھی پڑ گیا اور اب کثرتِ استعمال سے بطور اختصار صرف کوٹھی رہ گیا ہے۔ یہاں سے بہنے والی ندی قریب ہی کی پہاڑیوں سے نکلتی ہے۔

اس ندی پر آبپاشی کے لئے کسی زمانے میں ایک چھوٹا سا بند باندھا گیا تھا مگر اب تو وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور آبپاشی کا کام نہیں دے سکتا۔ تاہم اس گئی گزری حالت میں بھی وہ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس نے ندی کے پانی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جس کے دائیں بائیں سے ندی نے اپنا راستہ بنا لیا ہے۔ ندی کے ایک کنارے پر خوب صورت اور قدیم مگر ویران مندر ہے جس کی اونچائی کی مناسبت سے اسے اونچا مندر کہا جاتا ہے۔ اونچے مندر کے پیچھے ایک کھلا میدان ہے جہاں گاؤں کے جانور وغیرہ ٹھہرتے ہیں، نیچے کھیتے میں اور کبھی کبھی خانہ بدوش لوگ وقتی طور پر آکر اپنے ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔

اس میدان کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس میدان اور کھیتوں کے درمیان املی کا ایک بڑا ہی قدیم گھنا درخت ہے جس پر چمگادڑوں نے اپنے ڈیرے جما لئے ہیں۔ اور الو بھی اپنا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کا عام خیال ہے کہ یہاں کوئی بھوت رہتا ہے اور مغرب کے ذرا بعد سے لے کر صبح ہونے تک اس راستے پر اس کا قبضہ رہتا ہے تب کوئی شخص اس کے چنگل سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس لئے گاؤں کے وہ لوگ جنہیں اپنے کھیتوں سے لوٹتے ہوئے دیر ہو جاتی ہے چکر کاٹ کر دوسری طرف سے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں اور اگر مغرب کے بعد باہر جانا ہو تو وہ بھی ایک لمبا چکر کاٹ کر جاتے ہیں۔ یہ روایت برسہا برس سے چلی آ رہی ہے مگر کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا کہ بھوت نے کسی کو بالقصد پکڑا ہو یا بھوت کسی کو ستایا ہو۔ مگر اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اس بات کا اتنا چرچا ہو گیا ہے کہ کوئی رات میں ادھر سے گزرتا ہی نہیں اس لئے کسی واقعے کے پیش آنے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

کسی زمانے میں ناگپور ایک بڑا قصبہ تھا مگر آج افتادِ زمانہ سے وہ ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے جہاں کے لوگوں کا پیشہ یا تو محنت مزدوری ہے یا پھر کھیتی باڑی۔ برسات اور سرما کے موسم میں یہاں کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں مگر گرمی کے موسم میں انھیں کوئی کام نہیں رہتا کیونکہ ان دنوں کھیت

[illegible] نہیں پایا جا سکتا۔ ان دنوں بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ چوپال میں بیٹھے چلمیں پیتے ہیں، پرانے راجاؤں، نوابوں اور گاؤں کے متمول لوگوں کے قصے دہرائے جاتے ہیں۔ نوجوان شادی شدہ لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ گھروں میں ہوتے ہیں اور جو نوجوان شادی شدہ نہیں وہ ندی کی ریت پر بیٹھے گپیں ہانکتے ہیں۔

ان میں کبھی کبھی آپس میں کشتیوں کے ذریعے طاقت کے مظاہرے ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی بہادری آزمانے کے لئے شرطیں بندھ جاتی ہیں۔ شرطیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں کہ رات کے دس بجے (جی ہاں، گاؤں میں دس بجے کو بہت زیادہ رات تصور کیا جاتا ہے) کوئی اونچے مندر میں جا کر دیوی کے درشن کر آئے یا دیوان کی کوٹھی کا ایک چکر لگا آئے یا نواب کی ڈیوڑھی میں اگے ہوئے ایک مخصوص پودے کا پتا توڑ لائے مگر ناگپور کے نوجوانوں میں اس قسم کی شرط کبھی نہیں بندھی کہ کوئی گاؤں کے باہر والے املی کے درخت کے نیچے سے ہو آئے۔ اگر کوئی نوجوان اپنی بہادری منوانے پر بہت زیادہ مصر ہی ہوتا اس سے کہا جاتا کہ وہ رات کو املی کے درخت کے نیچے سے ہو آئے اور یہ سن کر وہ نوجوان اپنی ساری بہادری بھول کر ایک دم خاموش ہو جاتا۔

ایک مرتبہ ناگپور میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے جس کا نام ساونت تھا اچانک ہی گاؤں کے سب لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا کیونکہ ایک بار انجانے میں وہ رات کے وقت اس درخت کے نیچے سے ہو کر آیا تھا اور چوپال میں بیٹھے ہوئے بہت سے لوگوں نے اسے ادھر سے آتے بھی دیکھا تھا۔ اسی وقت گاؤں کے مکھیا نے (جس کے یہاں وہ مہمان آیا ہوا تھا) اس کے یہ بتلانے پر کہ وہ املی کے درخت کے نیچے سے آ رہا ہے اسے سخت تنبیہ کی تھی۔

ساونت قریب کے ایک گاؤں میں کھیتی باڑی کرتا تھا اور بہت [illegible] بے باک تھا، اپنے گاؤں میں بھی وہ بہادری کے لئے بہت مشہور تھا اور جب [illegible] ناگپور کے نوجوانوں سے اس کی دوستی بڑھی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ ساونت دنیا میں کسی چیز سے ڈرتا ہی نہیں۔ ابتدا میں انھوں نے اس کی باتوں کو محض اپنی بڑائی پر محمول کیا۔ مگر جب انھوں نے اس کی بہادری کا عملی طور پر امتحان لیا تو وہ واقعی اس کے قائل ہو گئے۔

اسے سب سے پہلے اونچے مندر میں بھیجا گیا۔ اندھیری رات
میں اکیلے ایک ویران مندر میں جانا بڑے دل گردے کی بات تھی
وہ وہاں سے ہشاش بشاش واپس لوٹا۔ پھر اسے نواب کی
ڈھی کے ویران کھنڈروں میں بھیجا گیا جہاں سے اس نے
ور نشانی ایک مخصوص پودے کا پتا بھی لاکر دکھایا۔ اسے
ت میں ویران کوٹھی میں بھیجا گیا، وہ قندیل لے کر وہاں پہونچ
اور اس ویرانے میں ایک شیطان کی طرح گھوم کر واپس
یا۔ ایک کھڑکی میں سے (جو ندی کی طرف کھلتی تھی) قندیل ہلا کر
نے ساتھیوں کو بتا بھی دیا کہ وہ وہاں پہونچ چکا ہے۔ اس
پر گاؤں کے بہت کم نوجوان پورے اترے تھے۔

ساونت بہت قدآور اور طاقتور انسان تھا۔ اس کے
ہمت اور طاقت دونوں کی فراوانی تھی، کشتیوں میں بھی
اس نے ناگپور کے تمام نوجوانوں کو ہرا دیا اور ایک دن باتوں
باتوں میں اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ رات کے وقت وہ اکیلا
کے درخت کے نیچے جاکر بھی آ سکتا ہے۔ بعض نوجوانوں نے
اس کی ہمت اور طاقت سے جلنے لگے تھے بات کو طول دیا
بھی بھی وہاں نہیں جا سکتا، اور اگر جائے گا بھی تو بھوت
نیچے سے زندہ نہیں آ سکتا کیونکہ آج تک کسی مائی کے لال
وہاں جانے کی ہمت نہیں کی۔ ساونت نے انھیں بتایا کہ
ایک بار رات کے وقت ہی اس درخت کے نیچے سے گزر چکا ہے
والے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ اگر وہ واقعی بہادر ہے تو آج اور ابھی
وقت املی کے درخت کے نیچے سے ہو آئے۔ اس وقت رات
ن بج رہے تھے، ساونت فوراً تیار ہو گیا، مگر سوال یہ تھا
واقعی وہ وہاں گیا تھا، اس کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ گاؤں
املی کے درخت تو بہت تھے اس لئے اگر اس سے املی کا
نے کے لئے کہا جاتا تو وہ کسی بھی املی کے درخت سے توڑ
اگر اس کے پیچھے پیچھے جاکر نگرانی کی جاتی تو پھر اس کے لئے
جانے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ آخر بہت سوچنے کے بعد یہ
بات نکالی گئی کہ ساونت اپنے وہاں جانے کے ثبوت میں املی
درخت کے تنے میں ایک کیل ٹھونک کر آئے جسے دوسرے دن
جاکر سب لوگ دیکھ لیں گے۔ ایک نوجوان دوڑ کر اپنے گھر سے
لے آیا سب لوگوں نے غور سے کیل کی ساخت دیکھی اور
وہ کیل ساونت کو تھما دی گئی جسے لے کر وہ بڑے اطمینان
[illegible]

روانہ ہو گیا جس کے آگے املی کا درخت تھا۔

ادھر ندی کی ریت پر بیٹھے ہوئے تمام نوجوانوں کے دلوں
کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ برسوں سے چلی آنے والی روایت کا آج
فیصلہ ہونے والا تھا۔ بہت سارے لوگ ندی پر بیٹھ کر ہی اس
سے اپنے بدن میں کپکپی محسوس کر رہے تھے۔ کافی دیر ہو گئی مگر
ساونت نہیں آیا حالانکہ یہ سارا عمل بمشکل آدھے گھنٹے کا ہو سکتا
تھا۔ بعض نوجوان سمجھے کہ شاید بھوت اور ساونت میں مقابلہ
ہو رہا ہے۔ دو گھنٹے گزر گئے اب تو سب کو تشویش ہوئی کہ
کسی نے کہا ہو سکتا ہے کہ وہ گھر جاکر مزے سے سو رہا ہو اور ہم
یہاں بے وقوف بن رہے ہوں۔ بات معقول تھی چنانچہ ایک صاحب
کو مکھیا کے گھر بھی اسے دیکھنے کے لئے بھیجا گیا۔ مگر معلوم ہوا
کہ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد سے باہر گیا ہے۔ اب تو تمام
نوجوان بہت سٹپٹائے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں کے بڑے
لوگوں کو اس کی اطلاع دینی چاہیے اور پھر سب کے ساتھ املی
کے درخت کے نیچے جاکر دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ وہ ندی سے اٹھ کر
چوپال میں آئے، خوش قسمتی سے گاؤں کے کچھ بوڑھے اور ادھیڑ عمر
کے لوگ وہاں موجود تھے جن میں مکھیا شامل تھا۔ انھوں نے
انھیں پورا قصہ سنایا، اور لوگ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

کچھ لاٹھیاں اور لالٹینیں ساتھ لی گئیں۔ گاؤں کے کچھ آوارہ
کتے بھی ساتھ ہو گئے اور ناگپور کے بوڑھے، ادھیڑ اور جوان
لوگوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مع کتوں کے آسیب زدہ املی
کے درخت کی جانب بڑھا۔ لوگ اشلوک پڑھنے لگے تاکہ اگر
بھوت ہو بھی تو بھاگ جائے۔

املی کے درخت کے کچھ قریب پہونچ کر انھوں نے دیکھا کہ
ساونت تنے کے قریب اوندھے منہ پڑا ہے۔ شاید بھوت نے اسے
مار ڈالا ہے۔ تمام لوگوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا۔ مگر
کسی نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ تمام جسموں کے رونگٹے
کھڑے ہو گئے تھے۔ کتوں نے دور سے کوئی سفید سی چیز دیکھ کر
بھوں بھوں کا شور بلند کیا۔ گاؤں کے بہادر نوجوان مارے
ڈر کے ایک دوسرے کی آڑ لینے لگے۔

رات کے وقت چمگادڑیں تو سب جا چکی تھیں مگر الوؤں
کے چیخنے کی آوازیں املی کے درخت سے نکل کر تمام جنگل میں دہشت
پھیلا رہی تھیں۔ درخت کے بالکل قریب جاکر تمام لوگ رک گئے
کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ آگے بڑھے۔ نوجوان تو سب سے
پیچھے تھے۔ آخر گاؤں کا مکھیا ہی لالٹین لئے آگے بڑھا اس کے
پیچھے گاؤں کے کچھ اور بوڑھے ہو گئے، پھر ادھیڑ عمر کے لوگ اور
سب سے پیچھے نوجوان۔ بوڑھے مکھیا نے کپکپاتے ہاتھوں سے
ساونت کے الٹے جسم کو سیدھا کیا کسی نے لالٹین اس کے
منہ کے آگے کر دی۔ سب نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں ساکت و
جامد تھیں۔ وہ مر چکا تھا۔

"کیا گبرو جوان تھا!" بوڑھے مکھیا سے نہ رہا گیا۔ بعض
لوگ مارے خوف کے ادھر ادھر دیکھ رہے کہ کہیں بھوت آکر
انھیں نہ دبوچ لے۔

"چلو اب اٹھاؤ بھی چودھری سٹی کا تو دا۔ جو ہونا تھا سو وہ
ہو چکا۔" گاؤں کے مکھیا کو گم سم کھڑے دیکھ کر ایک بوڑھے
نے کہا۔ کچھ آدمی لاش کی طرف بڑھے مگر اسی اثناء میں درخت
پر سے ایک زور کی چیخ سنائی دی اور تمام لوگ سہم کر پیچھے ہٹ
گئے۔ کوئی الو اپنے پر پھڑپھڑاتا روشنی کو دیکھ کر اڑ گیا۔ لوگوں
نے زور زور سے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ بمشکل تمام مکھیا
لالٹین لے کر آگے بڑھا اور اس نے مرے ہوئے ساونت کی گردن
کو سیدھا کیا جو ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ اس کو دیکھا دیکھی کچھ
اور لوگ آگے بڑھے اور لاش کو اٹھانا چاہا۔ مگر یہ کیا ---؟
وہ تو املی کے درخت کی جڑ سے چپٹی ہوئی تھی۔ "بھوت اپنا شکار
کبھی کسی کے حوالے نہیں کرتا" یہ سب کے دل میں ایک ہی خیال آیا۔
مکھیا نے جب لالٹین قریب لے جاکر دیکھا تو ساونت کی دھوتی
ایک کیل میں پھنسی ہوئی نظر آئی جو املی کی جڑ میں ٹھکی ہوئی
تھی اور اس وجہ سے اس کی لاش اس سے چپٹی ہوئی معلوم
ہو رہی تھی۔

تمام چیزوں پر غور کرنے کے بعد وہاں موجود لوگوں کو
اس نتیجے پر پہونچنے میں دیر نہیں لگی کہ ساونت نے گڑبڑاہٹ
یا سہواً املی کے درخت کی ابھری ہوئی جڑ میں کیل ٹھونکتے ہوئے
اپنی دھوتی کا خیال نہیں رکھا اور وہ کیل کے ساتھ املی کی جڑ
میں دھنس گئی۔ جب وہ کیل ٹھونک کر جانے کے لئے اٹھنے لگا تو
دھوتی کی وجہ سے وہ اٹھ نہ سکا اور اس خیال سے کہ بھوت نے
پیچھے سے اسے پکڑ لیا ہے اور یہاں بھوت موجود ہے تو مارے
خوف کے اس کی جان نکل گئی۔

اور دوسرے دن ناگپور کی آسیب زدہ املی کے
درخت پر پڑے ہوئے برسوں کے اسرار کے پردے اٹھ گئے۔
اور لوگ آزادی سے رات میں بھی اس املی کے درخت کے
نیچے سے گزرنے لگے۔

چوروں کی انجمن

البرنرڈ کریپن

خورشید حیدری

جولائی کی گرمیوں کی ایک شام تھی۔ ماسکو شہر گرمی کی [illegible] سے جل رہا تھا۔ یہ علاقہ اپنی سردی کے لئے تمام عالم میں [illegible] ہے مگر اس علاقے میں تھوڑی سی بھی گرمی ناقابلِ برداشت [illegible] ہے۔ سمندر سے آنے والے بادِ سموم کے جھونکے چہروں کو [illegible] رہے تھے۔ سمندر کے کنارے پتھروں کی قدیم طرز کی ایک [illegible] میں وکیلوں کی فرم کا ایک دفتر تھا جہاں کچھ وکیل صاحبان [illegible] مقدمے پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ اس فرم کا ایک سینئر [illegible] ایک کرسی پر بے دلی سے بیٹھا سامنے رکھی ہوئی فائلوں کی [illegible] ردانی کر رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کے دل میں یہ خیال چکر لگا رہا [illegible] وہ کب گھر پہنچے اور کب کپڑے اتار کر غسل خانے کے ٹب [illegible] لیٹے۔ غسل خانے کے ٹھنڈے پانی کا تصور اس کو اس [illegible] کے عالم میں بے چین کئے ہوئے تھا۔

"جناب! آپ سے سات آدمی ملنا چاہتے ہیں" اردلی نے [اط]لاع دی۔

سینئر وکیل نے اپنے ساتھیوں کے چہروں کو سوالیہ نظروں [سے دیکھا] گویا ان سے پوچھ رہا ہو "کیوں! یہ سات آدمی کیوں ہیں" مگر ان کے چہروں پر سوائے بیزاری کے اور کچھ نہ [تھا۔] سب خاموش ہی رہے۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور یکے بعد دیگرے سات آدمی [د]اخل ہوئے۔ سب سے آگے ایک مضبوط، ہنس مکھ اور خوش [پوش] آدمی تھا۔ آنکھوں پر سنہرے فریم والا گہرے رنگ کا [چشمہ] تھا۔ ہاتھوں میں بھورے رنگ کے دستانے تھے۔ انگلیاں [قیم]تی انگوٹھیوں سے مزین تھیں۔ گلے میں ایک پتلی سی طلائی [زنجیر تھ]ی۔ دائیں ہاتھ میں سنہرے منہ والی چھوٹی سی ہلکی چھڑی تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک قیمتی رومال۔ اس کے برعکس باقی چھ آدمی میلے کچیلے اور گندے لباسوں میں تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں سے عیاری اور چہروں پر جرم کی بھیانک داستانیں لکھی ہوئی تھیں۔ خوش پوش آدمی جو بظاہر ان چھ آدمیوں کا لیڈر نظر آرہا تھا سینئر وکیل کے آگے بڑے ادب سے جھکا اور یوں گویا ہوا۔

"جناب محترم! ہم لوگ "یونائیٹڈ رسپوت فارکوف اینڈ اوڈیسہ" کی تنظیم "چوروں کی انجمن" کے نمائندے ہیں"

وکیل صاحبان اپنی اپنی جگہوں پر بری طرح کسمائے۔ سینئر وکیل نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔

"کون سی انجمن"

"جناب "چوروں کی انجمن" سنجیدگی سے جواب ملا۔ "مجھے تنظیم کی جانب سے یہ عزت بخشی گئی ہے کہ میں ملک کے نامور وکیلوں کے آگے اپنی تنظیم کے کچھ مسائل رکھوں اور انصاف طلب کروں۔ امید ہے کہ آپ لوگ ہمیں مایوس نہیں کریں گے"

"خوب۔ بہت خوب" سینئر وکیل اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"جناب من! میں اپنی صاف گوئی کے لئے آپ سے معافی چاہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے مگر اس قیمتی وقت میں سے ہمیں بھی کچھ وقت ملنا چاہئے"

"کہو بھئی کیا کہنا چاہتے ہو" سینئر نے بیزاری سے کہا

"شکریہ جناب کا۔ آپ کو علم ہوگا کہ کچھ دنوں سے چند گھٹیا اخباروں نے ہمارے خلاف مہم چلا رکھی ہے۔ ہمیں غنڈے بدمعاش اور سماج کے ناسور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم قانون کی نظروں میں سماج کے دشمن ہیں ـــــ لیکن جناب من کیا یہ ظلم نہیں کہ ہمیں ایسے خطابات سے نوازا جاتا ہے جو ہم سے اور ہماری فطرت سے بعید ہوں" خوش پوش آدمی کچھ دیر کیلئے رکا۔

وکیلوں نے استعجابیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا خاموش خاموش آنکھوں میں متعدد سوالات تھے۔

"جو کچھ بھی کہنا ہو صاف صاف کہو"

"جناب!" خوش پوش چور نے پھر کہنا شروع کیا "میں یہاں اخلاقیات پر بحث نہیں کروں گا اور نہ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالوں گا لیکن پھر بھی یہاں ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوگا کہ ہم ظالم نہیں ہیں"

"فرض کیجئے کہ ایک ایسے آدمی کی موت ہوگئی ہے جس نے غریبوں کا خون چوس چوس کر دولت جمع کی ہے۔ اس کی موت کے بعد دولت ایک ایسے شخص کے پاس چلی جاتی ہے جو گنوار، اجڈ اور جاہلِ مطلق ہے۔ مگر غریبوں کے حق میں جابر اور ظالم ہے۔ اسے غریبوں پر ظلم کرنے سے راحت ملتی ہے۔ غریبوں کے آنسوؤں پر قہقہے لگاتا ہے، ان کی بربادی پر خوش ہوتا ہے اور ان کو ستانے کے لئے وہ نت نئے ڈھنگ اختیار کرتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے، ہم نے اس کی دولت ہتھیا کر کیا اس کے ظلم و ستم کی [illegible] کو نہیں روک دیا؟

میرے عاقل بزرگ۔ مجھے علم ہے کہ آپ کا وقت انتہائی قیمتی ہے لیکن آپ نے ہمیں کچھ وقت دے کر ہماری انجمن پر عظیم احسان کیا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ

ہم ظلم و ستم کے پورے [illegible] کرتے ہیں ہم لوگ اپنے [illegible] سماج نے ہمیں کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ سماج [illegible] ہمارے فن کے اعتبار سے ہمیں [illegible] فنکار [illegible] [illegible] دنیا جانتی ہے [illegible] خطرات سے کھیلنا [illegible] ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں [illegible] خطرات سے کھیلنا ہی سچی مردانگی ہے۔ سماج تو اپنی حفاظت کے لئے قانون، پولیس، بندوق، پستول اور جدید ترین ہتھیاروں کا اپنے گرد ایک حصار قائم کئے ہوئے ہے۔ ہر طرح کی حفاظت اس کے ہمراہ ہے مگر اس کے مقابلے میں ہمارے پاس کیا ہے۔ صرف ذہانت اور دلیری ہی نا۔ یا کچھ اور بھی ہے" کچھ دیر کے لئے وہ رکا۔

"محترم جناب! یہ سچ ہے کہ ہم بھیڑیے ہیں۔ مگر خونی نہیں۔ ہم شیر ہیں مگر گوشت خور نہیں۔ ہم سانپ ہیں مگر زہریلے نہیں۔

[illegible]
کے لئے خونخوار کتے مقرر ہیں۔ اگر ہم اس چوزے کو نہیں کھائیں گے تو یہ کتے اسے چیر پھاڑ دیں گے۔"

جناب والا! ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم علم نفسیات کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔ قدم قدم پر ہمیں علم نفسیات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے کے لئے سالہا سال گزار دیتے ہیں پھر بھی ہمیں غنڈوں، بدمعاشوں اور لفنگوں کی صف میں کھڑا کیا جاتا ہے کیوں۔ آخر کیوں"!

"ہم چور ہیں صرف چور۔ میں آپ کی اجازت سے اپنے فن کے کچھ نمونے پیش کرنا چاہوں گا۔ تاکہ آپ حضرات بھی ہمارے فن کا اعتراف کر کے ہماری فنکاری کا لوہا مان لیں اور ہمارے فن کے اعتبار سے ہمیں سماج میں ایک ممتاز مقام دے سکیں"

یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"اے شیلسوف اِدھر آؤ" جواب میں ایک گٹھیلے بدن کا مضبوط آدمی آگے بڑھا۔

"مہربانِ من! یہ ہماری تنظیم کا ایک ادنیٰ سا ممبر ہے جو سیف (تجوری) توڑنے میں ماہر ہے۔ افسوس، اس وقت یہ کوئی بڑا کارنامہ پیش نہ کر سکے گا کیونکہ اپنے مخصوص اوزار ہمراہ نہیں لایا ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ ملاحظہ فرمائیے۔

"کیا وہ دروازہ مقفل ہے" خوش پوش نے سینیٹر سے سامنے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

ہاں، ہے تو" سینیٹر نے دلچسپی سے جواب دیا۔

"اچھا تو شیلسوف تم"۔۔۔ اس نے شیلسوف کی طرف مبہم سا اشارہ کیا۔

کیوں نہیں جناب، ابھی لیجئے، یہ تو ایک معمولی سا کام ہے" شیلسوف بے ڈھنگے پن سے مسکرایا۔

شیلسوف دروازے کی جانب بڑھا۔ چند ساعت تک وہ دروازے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا، پھر اس نے جیب سے ایک پتلا سا چمکدار اوزار نکالا اور تالے کے سوراخ میں اسے ڈال کر آہستگی سے گھمایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ بغیر کسی آواز کے کھل گیا اور وکیلوں کے منہ بھی حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"اتنا مضبوط تالا اور اتنی آسانی سے کھل گیا"! کسی نے بھنکنے کے لئے حیرت ظاہر کی۔

"کیا تالا پھر سے بند کیا جا سکتا ہے" سینیٹر نے سوال کیا۔

[illegible]

کیوں شیلسوف کیا خیال ہے۔ لیڈر شیلسوف کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

جواب میں شیلسوف خاموشی سے دروازے کی جانب بڑھا اور پھر اسی عمل کو دہراتے ہوئے دروازے کو اپنی جانب زور سے کھینچا۔ دروازہ ایک بار پھر سے بند ہو گیا۔

"حضور والا۔ اب میں ایک نوآموز فنکار کو آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ یہ ایک جیب کترا ہے، ذرا اس کے ہاتھ کی صفائی ملاحظہ فرمائیے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس فنکار کو داد و تحسین سے نوازیں گے۔ ویسے تو اس کا نام تورد شسکی ہے، مگر ہم اسے پیارے یاشا کہتے ہیں"

"یاشا" لیڈر نے یاشا کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ کیا آپ حضرات میں سے کوئی صاحب بطور تجربہ خود کو پیش کریں گے" لیڈر نے پوچھا۔

وکیلوں میں سے ایک ٹھگنے سے قد کا وکیل آگے بڑھا۔ یاشا نے گلے سے اپنا اسکارف نکالا اور اسے اپنے ہاتھوں پر ڈال لیا۔ لیڈر نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں تو صاحب! آپ کسی مجمع، یا کسی بھرے بازار، عدالت یا عبادت گاہ میں ہیں، ایسا تصور کیجئے، یہ آپ کو ایک نظر دیکھتا ہے۔ اس کی ایکس رے ٹائپ نظریں یہ بھانپ لیتی ہیں کہ آپ کا پرس کس جیب کی زینت ہے۔ یہ نوجوان آپ سے آکر پوچھتا ہے "صاحب آپ کے پاس ماچس ہو گی" آپ ماچس نکالتے ہیں، آپ کی ٹائی پن بہت قیمتی ہے۔ یہ آپ کو باتوں میں لگا لیتا ہے۔ آپ جھجکتے ہیں پھر مسکراتے ہیں اور۔ اور۔ اور۔ بس۔ وہ انگلیاں اپنا کام کر گزرتی ہیں۔ آپ اس نوجوان کی باتوں پر مسکراتے ہیں۔ مگر یہ مسکراہٹ شکست خوردگی کی مسکراہٹ ہوتی ہے"

"یاشا! الگ ہٹ جاؤ" لیڈر نے یاشا کو حکم دیا۔ "اور ہاں وکیل صاحب آپ کی گھڑی کہاں ہے"

ٹھگنے قد والا وکیل اپنی جیبوں کو بے چینی سے ٹٹولتا ہے مگر وہاں تو گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی۔

"جناب من! دیکھا آپ نے آپ کی سونے کی گھڑی کس صفائی سے غائب ہو گئی" یہ انسانی دماغ کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ دو ماہر اور مشاق پتلی پتلی انگلیاں اور ایک شوخ رنگ کا اسکارف

"یاشا۔ وکیل صاحب کی گھڑی واپس کر دو" وکیل صاحب گھڑی لیتے ہوئے بڑبڑائے۔ "واقعی کمال ہے مجھے تو گھڑی جانے کا پتہ تک نہ چلا"

"ہاں تو صاحبان! اب میں آپ کو بینکوں [illegible] کی دوکانوں پر ہی اپنے کام کا مظاہرہ کر سکتا ہوں"

سینیئر وکیل نے اپنی گھڑی دیکھی اور کہا: "ہم نے آپ کے فن کا لوہا مان لیا۔ آپ کے ہنر کے قائل ہو گئے وقت کم ہے اور ہمارے وقت کی دقت قیمت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہے تو بتائیے"

"بہت اچھا حضورِ والا! جو حکم، میں نے عرض کیا تھا کہ ہم لوگ فنکار ہیں، اپنے فن میں ماہر ہیں۔ ہم اچھی اور عمدہ رسموں کی قدر کرتے ہیں، مذہب کے ہم پابند ہیں، صحت مند خیالات رکھتے ہیں۔ ہم عورتوں کے دلال نہیں اور نہ انھیں غلط راستوں پر چلا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ہم معصوم بچوں کا اغوا نہیں کرتے اور نہ ماؤں کی گود اجاڑتے ہیں۔ ہم غداری کر کے ملک و قوم کا سودا نہیں کرتے ہم انصاف و ظلم میں تمیز کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ پھر ہمیں غنڈوں کی صف میں کیوں کھڑا کیا جاتا ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے آپ لوگ ہم پر لگائے جانے والے غلط اور بے بنیاد الزاموں کی دھجیاں بکھیر دیں۔ میں اپنی تنظیم کی جانب سے حضور کا ممنون ہوں کہ آپ نے ہمیں اپنا قیمتی وقت دیا اور ہمارے خیالات سنے"

یہ کہہ کر خوش پوش چور اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک وکیلوں کا ناطق بند رہا پھر سینیئر وکیل نے کہنا شروع کیا۔

"ہم لوگ آپ کے فن اور آپ کے خیالات سے محظوظ ہوئے میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ لوگوں کے خلاف بے بنیاد الزامات کو غلط ثابت کرنے کے لئے ہم سب آپ کی انجمن سے پورا پورا تعاون کریں گے"

سینیٹر نے خوش پوش لیڈر سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور وہ ساتوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔

دوسرے وکیل بھی گھر جانے لگے۔ سینیئر وکیل نے بھی گھر جانے کے لئے اپنے کوٹ اور ہیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ہیٹ غائب تھا اس کی جگہ ایک میلی سی بھدے رنگ کی پرانی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔

"یاشا!" سینیٹر نے باہر جاتے ہوئے لیڈر کی آواز سنی۔

"لعنت ہے تم پر، تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ ساتھ ہی خوش پوش لیڈر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سینیٹر صاحب کا ہیٹ تھا

"محترم جناب! میں معافی چاہوں گا کہ میرے ایک ساتھی نے غلطی سے جناب کا ہیٹ اٹھا لیا ہے۔ یہ پرانی ٹوپی مجھے واپس دے دیجئے"

"شکریہ!" وہ ادب سے قدرے جھکا اور مسکراتا ہوا پروقار انداز میں باہر نکل گیا۔

■

بمبئی کا سراغرساں

گوردیال سنگھ والیہ

گرگام میں فرنچ پل کے شمال میں ایک کرائے کا بنگلا لے کر میں رہتا تھا۔ میری بیوی کافی عرصے سے پتھری کے موذی مرض میں مبتلا تھی۔ اس سال میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کسی اچھے ہسپتال میں ہوشیار اور تجربہ کار سرجن کے ذریعے آپریشن کرا کر اُسے روز روز کی تکلیف سے نجات دلوائی جائے۔ لہٰذا کافی غور و خوض اور خط و کتابت کے بعد میں نے وکٹوریا جوبلی ہسپتال امرتسر میں اُس کے علاج معالجے کا انتظام مکمل کر لیا۔ گو بمبئی جیسے بڑے شہر میں بھی اچھے ہسپتالوں اور تجربہ کار سرجن ڈاکٹروں کی کمی نہیں تھی مگر مریضہ کی تیمارداری جس خوش اسلوبی سے بہتر طور طریق سے امرتسر میں ہو سکتی تھی۔

بدھ وار کی رات کو میں اپنی بیوی کے ... بوری بندر کے اسٹیشن کو روانہ ہوا۔ جاتے وقت بنگلے کے ہر ایک ... پر میں نے مضبوط تالے لگانے کا خاص خیال رکھا تھا۔ اور نیشنل بینک کا دیوالہ نکل جانے پر میرا کسی بینک پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ اپنے پاس کے چار پیسے دوسروں کو قرض دے کر پھر انہیں کا منہ دیکھتے رہنا میرا اصول نہیں تھا اور پھر اس لئے بیں لے کر دینا ذرا مشکل سا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اسی بات کو سوچ کر میں نے بیس ہزار روپے کا کھرا سونا خرید کر تجوری میں رکھ چھوڑا تھا۔ سفر کی تیاری کرتے وقت تجوری میں چابی لگا کر تین بار اس کا امتحان کر لیا اس کے چھید پر کاغذ چپکایا اور آخری بار اس پر حسرت کی نگاہ ڈالی اور روانہ ہوا۔

سات دنوں کے بعد واپس آنے پر میں نے دیکھا در کھلا پڑا ہے اندر جا کر دیکھا تو سارا سامان اِدھر اُدھر ہوا تھا اور تجوری کھلی پڑی تھی۔ اندر کا سارا قیمتی غائب تھا۔ میں وہیں دھم سے بیٹھ گیا۔ جیسے میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ میرا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا اور میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اور کیا نہ کروں۔ میرے حواس ہی اُڑ گئے تھے۔ سوائے گہری سانسیں لینے کے چارہ نہیں تھا۔ کمرے میں دو چار خوبانی آم کے چھلکے اور دو کاغذ کے پرزے نظروں کے سامنے پڑے ہوئے منہ چڑا رہے تھے۔

درا شہر جاکر انگریزی، مراٹھی، ہندی اور اُردو کے
روزانہ اخبارات میں چوری کا ایک نوٹس چھپوا دیا۔

دو ہزار روپے نقد انعام

ے گھر پر واقع گرگام میں تین چار دنوں کے اندر اندر
نی خیز چوری ہوئی ہے۔ اس لئے مجھے ایک نہایت تجربہ
س کی مدد چاہئے جو کہ فن سراغ رسانی میں ماہر ہو اور
کا جلدی پتا لگا سکے۔ کامیابی کے بعد مبلغ دو ہزار
لور انعام پیش کئے جائیں گے۔"
لت رام بنگلہ نمبر ۳۴۳ گرگام بمبئی۔" ہم
کام کرنے کے بعد میں فوراً گھر لوٹ آیا۔ سفر کی تھکاوٹ
کے باوجود بھی فکر کی وجہ سے نیند اچھی طرح سے نہیں آ
ئی۔ آخر کسی طرح آنکھ لگ گئی۔

ل اسباب سیٹھ دولت رام، دولت رام صاحب
از سن کر میں جاگ اُٹھا۔ باہر نکل کر دیکھا کہ ایک شخص
رٹ پہنے آنکھوں پر قیمتی فریم کا چشمہ لگائے سامنے
یٹھ دولت رام کا پتا پوچھ رہا تھا۔
آپ سے کیا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔
صاحب کچھ پرائیویٹ قسم کا کام ہے۔"
کیا مجھے معلوم نہیں ہو سکتا؟" میں نے پوچھا۔
اور صاحب آپ نے میرا ڈیڑھ منٹ کا انمول وقت
رد یا۔" گھڑی کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔
مجھے فوراً اپنے نوٹس کی یاد آگئی جو کہ میں نے متعدد اخبارات
دیا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا آپ کوئی جاسوس ہیں؟
"او وہ ہیں۔ سمجھا بھی۔ کیا شری دولت رام آپ ہی
اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"جی ہاں آئیے جناب۔" پھر اسے اندر لے جاکر میں
نے کہا "دیکھئے یہی وہ کمرہ ہے اور یہی تجوری ہے۔ اس میں میرا سارا
تھا۔ چوری کا پتہ کیسے لگایا جائے سمجھ میں نہیں آتا۔"
سراغ رساں نے سارے کمرے کا سرسری طور پر جائزہ
پھر جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "
ری ہو جانے کے بعد آپ نے اس کمرے کا سامان اٹھوا دیا
ہے؟"
"نہیں صاحب، سارا سامان جوں کا توں ہے۔" میں نے

"آپ کا چوری کا پتا ضرور چل جائے گا۔ کیونکہ چوری کا پتہ
لگانے میں چوری کی خاص جگہ کے سامان کا جائزہ اور مشاہدہ
کرنے سے کافی مدد ملتی ہے۔ اگر آپ نے واقعی کسی چیز کو ہاتھ
نہیں لگایا تھا تو آپ کا مال جلد ہی واپس مل جائے گا۔
یہ کہہ کر اُس نے تجوری کے اوپر ایک مربع انچ پر جمی ہوئی
دھول اکٹھی کی اور جیب سے ایک چھوٹا سا خوشنما ترازو نکال
کر دھول کا وزن کیا۔ پھر ڈائری میں کچھ لکھ کر کہا "ایک گھنٹے
میں ایک انچ کے تیس ہزار دیں حصے کے حساب سے آپ کے ہاں
چوری شکروار (جمعہ) کی رات کو دو بج کر ساڑھے بائیس
منٹ کے آس پاس ہوئی ہوگی۔"
میں یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ اب تک میں نے صرف رابرٹ
بلیک اور جیمز بانڈ کے بارے میں سنا تھا۔ سنا نہیں بلکہ پڑھا
تھا۔ اب ہندوستان میں بھی ایسے تیز طرار اور انوکھی عقل
والے سراغ رساں کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ میں نے
دل ہی دل میں کہا "قابل فخر ہے یہ بھی، جہاں ایسے قابل جاسوس
نے جنم لیا۔"
میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے کمرے میں پڑے ہوئے آم
کے چھلکوں کا مشاہدہ کرنا شروع کیا۔ پھر جیب سے ایک شیشہ
نکال کر اُن کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد
زور سے قہقہہ لگا کر اس نے کہا "یہ چوری شاید تین آدمیوں
نے مل کر کی ہے۔ اس میں ایک عورت بھی شامل ہے اور ایک پچپن
سال کی عمر کا آدمی ہونا چاہیئے۔"
میری حیرانی کی حد ہو گئی۔ میں نے پوچھا "صاحب آپ
نے یہ کیسے جانا؟"
اس نے کہا "دیکھئے ان آم کے چھلکوں پر تین طرح کے دانتوں
کے نشانات ہیں۔ اس لئے وہ آدمی یقیناً بوڑھا ہوگا۔ اور جو
عورت اُن کے ساتھ تھی وہ کافی خوبصورت ہوگی۔ شاید وہ
کوئی طوائف قسم کی ہوگی کیونکہ اپنے چہرے کو دیکھنے کیلئے
اس نے بار بار آئینہ پونچھا ہے۔ اس پر مٹی کی تہہ نظر نہیں آتی
اور یہ دیکھئے آئینے کے سامنے پڑی ہوئی کنگھی اس بات کا
ثبوت پیش کرتی ہے کہ عورت کے بال سیاہ اور گھنگھریلے
ہیں ان لوگوں نے سامان کی بانٹ بھی یہیں کی ہے۔ بانٹ کرتے
وقت ان میں مارپیٹ بھی ہوئی ہے۔ یہاں کے بکھرے ہوئے
سامان کی حالت دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے۔ مارپیٹ کے

ہوئی جس سے اس کتاب پر خون کے دھبے ابھی تک موجود ہیں۔
سونا آپ نے ایک پرانے مگر اُجلے کپڑے میں باندھ کر
رکھا تھا؟ سراغ رساں نے لاپرواہی سے کہا۔
ہاں! میں نے جواب دیا۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" وہ
سونا میں نے ایک پرانی دھلی ہوئی چادر میں لپیٹا تھا۔"
"وہ زیر لب مسکرایا! "نشانات جناب نشانات۔
میرا کام چھوٹے چھوٹے نشانات سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔
میں نے دانتوں تلے انگلی دباتے ہوئے کہا "آپ نے تو کمال کر دیا
لیکن یہ تو بتلائیے کہ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ خون اُس
بوڑھے ہی کا ہوگا؟"
"اجی جناب خون کے چھینٹوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی
نحیف اور بوڑھے شخص کے خون کے ہیں۔ جوان لوگوں کے
خون سے اُن کا رنگ مختلف ہے۔"
تب میں نے پوچھا "وہ یہاں سے کب گئے ہوں گے؟"
اُس نے کمرے میں پڑے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر ہنستے
ہوئے کہا "وہ یہاں سے صبح چار بج کر تیس منٹ والی میل
گاڑی سے پونا گئے ہیں۔"
میں نے پوچھا "صاحب آپ کوئی جادوگر تو نہیں؟
"حد ہوگئی! یہ تو ایک بچہ ڈیٹیکٹو بھی بتا سکتا ہے پھر
میں تو اس کام میں کافی ایکسپرٹ ہوں۔ دیکھئے یہ کاغذ کا پرزہ
اس پر انھوں نے روپوں پیسوں میں کچھ حساب لکھا ہے۔
یہ رقم انھوں نے ٹکٹ کا خرچ نکالنے کے لئے لکھی ہے پہلے لکھی
ہوئی ایک رقم انھوں نے کاٹ دی ہے پھر دوسری رقم
جو انھوں نے لکھی ہے وہ پہلی سے قریب قریب دوگنی ہے۔
اتنا کرایہ یہاں سے صرف پونا جانے میں ہی صرف ہو سکتا ہے
اُن کا سفر سیکنڈ کلاس میں ہوا ہوگا۔ سیٹھ جی آپ مجھے
فی الحال پانچ سو روپے دیجئے میں ان نادان چوروں کا
پیچھا کر دوں گا۔"
گھڑی دیکھنے سے معلوم ہوا کہ پونا گاڑی جانے میں
صرف بیس منٹ باقی ہیں۔ میں نے جلدی سے یہاں وہاں
سے روپے اکٹھے کرکے پانچ سو کی گڈی اس کے حوالے کردی
اور وہ فوراً ٹیکسی میں سوار ہو کر چل دیا۔
اس حیرت انگیز سراغ رساں کو گئے ہوئے آج پورے
چھ مہینے ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اس کا پتا نہیں چلا۔

ہیلن اور کیبرے ڈانس

ہندوستان کے مایۂ ناز پروڈیوسر ڈائریکٹر محبوب
، اور بڑے نام کی فلموں میں سے ایک تھی۔ اس فلم
صیات کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس فلم
ں مزاج اور انداز کی اداکارہ نادرہ کو فلمی دنیا میں
۔ اس زمانے کی مشہور رقاصہ "ککو" اپنے پرانے انداز
رنگ رقص کے ساتھ فلمی دنیا سے رخصت ہو رہی تھی
ہ بھی تھا کہ اپنے وقت کی پسندیدہ رقاصہ "ستارہ"
ں کے فلم میں طبقے کے دلوں کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ مگر
ایسا بھی آیا کہ پسندیدگی اور مقبولیت کا یہ مقام سانولے
ب، چھریرے بدن کی رقاصہ ککو کو مل گیا۔ پھر زمانے
رخ بدلا کہ ہندوستان کے پردۂ سیمیں کی زرق برق
ں نے اپنے جاذبِ نظر خدوخال، متوازن جسم اور ہمہ رنگ
ہارت کے بدولت ستارہ سے زیادہ مقبولیت اور ککو
شہرت حاصل کی۔ آج بھی ہندوستان کے تقریباً ہر خطے
یکھنے والے کسی بھی اچھی اُردو یا ہندی فلم میں ہیلن کے
رقص کو دیکھنے کے اس قدر مشتاق اور عادی ہو گئے ہیں
، وجہ سے ہیلن نظر نہ آئے تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے
ی خوبصورت انگوٹھی کا کوئی نگینہ گم ہو گیا ہو۔

ہیلن کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ ایک تو وہ فطری رقاصہ
، قدرت نے رقص کی بے پناہ صلاحیت ودیعت کی ہے
ے یہ کہ وہ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی رقصوں پر اتنی
ہے کہ آج تک اس کے فنی کمال میں نہ کوئی جھول پیدا
، اور نہ کسی بے لطفی کا احساس ہوتا ہے۔ کلاسیکی رقص سے
ے ڈانس تک ہر جگہ ہر سطح پر ہیلن تقریباً ہر فلم اور ہر رقص
، دلکش روپ اور ایک دل آویز انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے
ے ڈانس سے متعلق ایک حالیہ گفتگو میں ہیلن نے جن باتوں
ر کیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رقص کو ایک فن اور ایک
دونوں خیال کرتی ہے۔

فن میں جہاں وہ فنی خصوصیات کی قائل ہے وہیں پیشے
یشے کی مصلحتوں کی منکر بھی نہیں۔ آج کل کے سستے اور
ی قسم کے کیبرے اور کیبرے ڈانسرز کے بارے میں ایک
، کا جواب دیتے ہوئے ہیلن نے کہا۔

" سڑکوں پر یا کھیتوں میں مزدوری کرنے اور کچھ کمانے کھانے کی نیت سے کپڑے اِدھر اُدھر کرنے یا جھٹکنے والوں اور پیراکی کے مقابلے میں حصہ لینے کی غرض سے سوئمنگ سوٹ زیب تن کرنے والی حسیناؤں کو ایک صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔"

باکس آفس فارمولے کی فلموں میں جا اور بے جا کیبرے ڈانس میں کم و بیش عریاں اور نیم عریاں جسموں کی نمائش کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے ہیلن نے کہا۔

" اگر دیکھنے والوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بات ایک ہی معلوم ہوتی ہے مگر دراصل اس کے دو پہلو ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ کوئی بھی ہوشیار ہدایت کار یا پروڈیوسر یہی چاہے گا کہ اس کی فلم باکس آفس پر کامیاب ہو اور اس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ اس لئے وہ ایسی ہی چیز پیش کرے جس کی بازار میں مانگ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی بھی فنکار یا ڈانسر کے پیشِ نظر یہ چیز رہتی ہے کہ وہ اپنے رول یا اپنے پارٹ میں جو چیز بھی پیش کرے وہ کچھ اس انداز سے اور اس طرح پیش کرے کہ سبھی لوگوں کی توقعات پوری ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ مقبول ہوں۔"

ہیلن نے اس بات کا اعتراف کیا کہ کیبرے ڈانس بے حیائی سے عریاں جسم کی نمائش یا بھونڈے اور بھدے انداز میں غیر فنکارانہ طور پر کولھے مٹکانے، کمر لچکانے جنسی جذبات اُبھارنے کی غیر مہذب کوشش ہی نہیں بلکہ رقص کا ایک خاص فن ہے جو کافی مہارت، ریاضت اور سلیقہ چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں ہیلن نے فلم "انتقام" کے اپنے رقص کی مثال دی جو جذبات انگیز ہونے کے باوجود بھی غیر مہذب نہیں۔ کم و بیش عریاں حالت میں کسی جذبات انگیز کیبرے ڈانس کے لئے کیمرے کے سامنے آنے میں کسی قسم کے حجاب یا ہچکچاہٹ کے متعلق ہیلن نے بڑے دلچسپ انداز میں یہ بتایا کہ:

" برسوں سے پیشے ... فن کے مظاہرے میں حجاب یا ہچکچاہٹ کی کیا بات ہے۔ رہا کپڑوں کا معاملہ۔ وہ جیسے بھی ہوں جس قدر بھی ہوں۔ زرق برق ہوں یا رنگا رنگ ہوں۔ ان سب باتوں کا انحصار رقص کے موقع محل پر ہوتا ہے۔ کیونکہ پیراکی کے مقابلے میں حصہ لینے والی حسینائیں ساڑیاں پہن کر کس طرح تیر سکتی ہیں۔

تلخ و شیریں

ظفر اللہ خاں سکلاسپوری

سیاست ایک ویران تھیٹر ہی سہی لیکن اس تھیٹر کے سٹیج پر اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرنے والے مشاق کردار بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ ویسے انکی زندگی ایک ضخیم خشک ناول جیسی ہوتی ہے لیکن اس ناول کے بعض صفحات پر کہیں نہ کہیں تلخ و شیریں واقعات سب کی نگاہ کا مرکز ضرور بنتے ہیں۔ ایسے ہی چند صفحات کی تلخیص پیش خدمت ہے۔

چرچل ـــــ "ہاؤس آف کامنس" میں ایک مباحثے کے دوران ایک مقرر سامعین کو بڑی دیر سے بور کر رہا تھا۔ چرچل نے دیکھا کہ ایک معمر بہرا رکن، آلہ سماعت لگائے بڑی بیزاری اور اداسی سے تقریر سن رہا ہے۔ تو چرچل کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ اس نے اپنے دوست انتھونی ایڈن کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"کون ہے وہ بے وقوف جو ایک عظیم قدرتی عنایت سے فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے" چاروں طرف قہقہے بکھر گئے اور تقریر چند ہی لمحوں میں ختم ہو گئی۔

جارج برنارڈ شا نے جو چرچل کے گہرے دوست تھے ایک ڈرامے کی نمائش کے دن چرچل کو ایک لفافے میں شو کے ٹکٹ روانہ کئے۔ ساتھ ہی یہ پیغام درج کر دیا:۔

میرا کھیل دیکھنے ضرور آؤ اور اپنے کسی دوست کو بھی لیتے آنا۔ اگر تمہارا کوئی دوست ہو"

چرچل بھلا کیسے چوکتے۔ اس نے شکریے کے ساتھ وہ لوٹا دیئے۔ اور ساتھ ہی یہ جواب لکھ کر رکھ دیا۔ "آج مصروف ہوں۔ دوسرے شو میں ضرور آؤں گا۔ اگر دوسرا شو بھی کیا جاسکے"

خروشچیف ـــــ مئی ۱۹۶۴ء کو اسوان ڈیم کی تعمیر کے پہلے مرحلے کے اختتام پر حکومت مصر نے اسوان میں ایک تقریب منعقد کی اس میں روس کے سابق وزیر اعظم خروشچیف اور عراق کے سربراہ عبدالسلام عارف بھی شریک تھے۔ خروشچیف نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"میں چاہتا ہوں کہ عرب اپنا یہ نعرہ ترک کر دیں کہ "اے عربو! متحد ہو جاؤ" اور اس کے بجائے یہ نعرہ اپنائیں کہ:۔ "اے محنت کشو متحد ہو جاؤ" مصر کے سوشلسٹ لیڈروں نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ مگر عبدالسلام عارف نے اسی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے اس نئے نعرے کی مخالفت کی اور اسے عربوں کی عربیت پر ایک حملہ سمجھا۔ عبدالسلام عارف نے جب اپنی تقریر کا آغاز تمام مقررین کے برعکس حمد و ثنا سے کیا اور ارکان اسلام پر زور دیا، قرآن کی آیات کا حوالہ دیا تو مصری عوام نے اس پر خوب تالیاں بجائیں۔ خروشچیف بھی تالیوں میں شریک ہو گئے۔ لیکن ترجمان نے جب ان کے کان میں تقریر کے اس حصے کا مفہوم بتایا تو ان کی پیشانی پر شکن آ گئی اور انھوں نے منہ بسور کر ہاتھ پشت کی جانب کر لیے اور سر ہلا ہلا کر اپنی غلطی کی تلافی کرنے لگے۔

شیرِ بنگال مولوی فضل الحق چودھری جن کے متعلق مولانا ظفر علیخاں ؒ نے کہا تھا۔

"میں فضل الحق کے حق میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہہ دوں کہ اس کو دیکھ لینے ہی سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے"

وہ ۱۹۳۸ء میں متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ایک دن وہ ریل گاڑی سے چٹاگانگ تشریف لے جا رہے تھے۔ انکی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ جب کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو لوگ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر ان کے ڈبے کو گھیر لیتے اور آپ ہر ایک کے ساتھ مصافحہ یا معانقہ کرتے۔ یہ سلسلہ رات تک جاری رہا۔ آدھی رات کے قریب آپ نے گارڈ کو بلا کر کہا:۔

"اب مجھے پریشان نہ کیا جائے کیونکہ میں بہت تھک گیا ہوں" اتنے میں گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم اپنے محبوب لیڈر کے دیدار کے لئے بیتاب تھا اس ہجوم میں ایک ستر سالہ بوڑھا بھی تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک مدھم سی لالٹین اور بغل میں چھاتا اور چھڑی تھی۔ یہ بوڑھا چلا چلا کر کہہ رہا تھا "خدا کے لئے مجھے فضل الحق کی ایک جھلک دیکھ لینے دو۔ میں اسے دیکھنے کے لئے ۲۵ میل کا سفر طے کر کے آ رہا ہوں"

جب یہ آواز فضل الحق کے کان میں پہونچی تو آپ دروازہ کھول کر پلیٹ فارم پر کود پڑے اور دیر تک اس بوڑھے سے بغلگیر رہے۔ دونوں کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

ترکی کے شہید ملت۔ مجاہد اعظم انور پاشا نے عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ترکی فوج کے تیسرے جیش میں داخلہ لیا جو ترکی سلطنت کے یورپی حصے میں متعین تھا۔ آپ عثمانی فوج کا ایک فرد ہونے پر بڑا فخر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف سٹر ای۔ ایف۔ نائٹ نے ترکی کی بیداری پر ایک کتاب لکھتے ہوئے انور سے انکی تصویر حاصل کی اور پوچھا کہ تصویر کے ساتھ کونسی عبارت موزوں رہے گی۔ تو آپ نے کہا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ:۔

"یہ وہ فرد ہے جسے عثمانی فوج کا ایک فرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ جو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں آزاد سلطنتِ عثمانیہ کی حقیقی محافظ ہے"

شخص بیت کی اس دن مشکار کے لیے نکلو تو کے

شخص کی خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے حبس میں ڈالدیا

ر شکار مل گیا تو اسے چھوڑ دیں گے، ورنہ سوچیں گے

اقا اس دن خلیفہ کو بے حد شکار ملا۔ شام کو واپس

نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کانے کو حبس سے نکلوایا

، اور کہا۔

اللہ تم آج میرے لئے مسعود ثابت ہوئے " یہ سن کر کانا

۔" اے امیر المومنین گستاخی معاف ۔ آج صبح آپ نے

ورت دیکھی اور میں نے آپکی ۔ میں آپ کے لیے مسعود

اور آپ میرے لئے اسقدر منحوس ثابت ہوئے کہ میں

یہ میں سڑتا رہا۔"

یفہ نے یہ گستاخی خوشدلی سے برداشت کرتے ہوئے

تمہارے دن کا آغاز برا تھا لیکن انجام برا نہیں ہے۔

بھی تمہارے لیے مسعود ہی ثابت ہوئے " اس کے بعد اسے

زر اسے انعام دے کر رخصت کیا۔

۱۹۶۷ء کو شاہ حسین ایک بے حد خفیہ دورے پر قاہرہ

ہے۔ فوجی ہوائی اڈے الماظہ پر جمال عبدالناصر نے

ستقبال کیا۔ صدر ناصر کے چاروں نائب صدر اور وزیر اعظم

محمود صدقی سلیمان بھی موجود تھے۔ اس وقت مصر اور

ن کے تعلقات میں قدرے تلخی پائی جاتی تھی۔ صدر ناصر

سکراتے ہوئے حسین سے پوچھا:

" آپ نے یہ سفر مخفی رکھا ہے۔ کیا کوئی خاص رکاوٹ تھی ؟"

" نہیں لوگوں کو زود یا بدیر پتہ چل ہی جائے گا" حسین

واب دیا۔ پھر ناصر نے پوچھا۔

" آپ مسلح اور فوجی وردی میں نظر آ رہے ہیں !" ۔

" میرے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ کپڑے

نے آٹھ دس دن پہلے سے پہن رکھے ہیں " شاہ حسین

جواب دیا۔ پھر صدر ناصر نے پرمذاق لہجے میں کہا۔

" آپ کا یہ دورہ خفیہ ہے۔ اگر ہم آپ کو گرفتار کر لیں تو

ہ ہے گا ؟"

" مجھے تو خیال تک نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے " !

حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر شاہ حسین اور صدر ناصر

بلند آہنگ قہقہوں سے الماظہ ایرپورٹ گونج اٹھا۔ ●

بات نئی دہلی

کی اکثریت سے اقلیتوں کے اسکولوں، کالجوں اور خیراتی اداروں

کو ختم کر سکتی ہے۔ ممکن ہے ایسا نہ کیا جائے لیکن خدشات

تو بہر حال ہیں۔ ان خدشات کو دور کرنے کے لیے پارلیمنٹ نے

کیا سوچا ہے ؟

وزیر اعظم نے اقلیتوں کو جو یقین دہانی کی ہے ہم اس

کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ان یقین دہانیوں کی کوئی قانونی

حیثیت نہیں ۔۔ اردو کے بارے میں ہمارے آنجہانی وزراء اعظم

پنڈت جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری اور اب خود

مسز اندرا گاندھی نے کتنی یقین دہانیاں کیں، لیکن کیا کبھی

ہماری مرکزی، یا کسی بھی ریاستی حکومت نے ان یقین دہانیوں

کی طرف توجہ دی ۔ ان سب کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا

حد یہ ہے کہ وسط مدتی انتخابات تک کی یقین دہانیوں کو ابھی

تک عملی جامہ نہیں پہنایا گیا پھر کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی

حقوق میں ترمیمات سے متعلق وزیر اعظم کی یقین دہانیوں کی کوئی

حیثیت باقی رہے گی۔

بنیادی حقوق میں ترمیم کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ عوام

سے اس کا فیصلہ حاصل کیا جائے۔ اور اگر پارلیمنٹ خود اپنی

" برتری " ظاہر کرنے پر تلی ہوئی ہے تو کم از کم ایسے بنیادی حقوق

کے بارے میں جن کا تعلق خصوصی طور سے اقلیتوں کا تحفظ کرنا

ہے، سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو قبول کر لیا جائے کہ وہ

ناقابل ترمیم اور ناقابل تنسیخ ہیں۔ اس قسم کے واضح اعلان

کے بغیر اقلیتوں میں ہر وقت بے اطمینانی کی کیفیت رہے گی

اور ایک سیکولر ڈیموکریسی کے لیے یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ

اقلیتیں غیر مطمئن رہیں۔ ●●

ریل کا کرایا بڑھنے

سے اب پنکھے اور

بلب چراتے وقت

اب ضمیر کو تکلیف

نہیں ہوتی ۔

" چین کو اقوام متحدہ

میں بیٹھنسٹ

چین کی جگہ

دی جائے گی

ایک

ریاست جموں اور کشمیر ــــ ترقی کی ایک جھلک

جموں اور کشمیر ہندوستان کی ان چند ریاستوں میں سے ایک ہے جہاں تعلیم کنڈر گارٹن سے لیکر پوسٹ گریجویٹ تک مفت ہے۔ ۶ سے ۱۱ سال کے درمیان کی عمر کے ۳۰.۸۷٪ لڑکے اور ۳۲.۶٪ لڑکیاں اسکول جاتی ہیں۔ جبکہ تعلیم پر فی کس خرچہ ۱۹۵۰-۵۱ میں ۸ پیسے سے ۱۹۷۰-۷۱ میں ۲۰ روپے تک پہنچ گیا ہے۔ یہ خرچہ پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے جو کہ صرف ۱۸ روپے ہے۔

حفظانِ صحت پر فی کس خرچہ ۱۹۴۷ء میں ۴ پیسے سے بڑھ کر اب ۱۰ روپے ۵۷ پیسے تک پہنچ گیا ہے۔

آج ریاست میں ہر پانچ ہزار آدمیوں کے لئے ایک ڈاکٹر ہے جبکہ ۱۹۴۷ء میں ۳۲ ہزار آدمیوں کے لئے صرف ایک ڈاکٹر

ریاست میں بجلی کی پیداوار ۱۹۴۷ء میں ۴ MWS سے بڑھ کر اب ۳۵.۴۰ MWS تک پہنچ گئی ہے۔

آٹھ ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے جنگلات ایک خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ریاست کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ۱۹۶۶-۶۷ میں یہ آمدنی ۴.۷ کروڑ تھی جبکہ ۱۹۶۹-۷۰ میں یہ بڑھ کر ۵.۲ کروڑ روپے ہوگئی۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۷۱-۷۲ میں ۶.۷۵ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔

پھلوں کی برآمد ۱۹۶۰-۶۱ میں ۲۲۰۶۴ ٹن تھی جبکہ ۱۹۷۰ میں یہ ایک لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہوگئی۔

زراعت کے میدان میں ریاست کے اندر ایک قسم کا انقلاب آگیا۔ ۱۹۶۸-۶۹ کے آخیر تک تقریباً ۱۱,۱۰۰۰ ایکڑ سے زراعت کے کام میں لائی جانے لگی۔ بہتر بیجوں اور عمدہ کھاد کے استعمال سے غلے کی پیداوار بھی بڑھ گئی۔ منتخب علاقوں میں دو ہر مشینوں کا استعمال بھی کیا گیا۔ ۱۹۶۹-۷۰ میں ۹.۹ لاکھ کوئنٹل زائد غلہ پیدا ہوا۔ ریاست کی کل آمدنی کا ۳۰٪ حصہ زراعت سے حاصل ہوتا

فی کس آمدنی (۱۹۵۵-۵۶ کی قیمتوں پر) ۱۹۵۰-۵۱ میں ۱۸۸ روپے سے بڑھ کر ۱۹۶۸-۶۹ میں ۲۹۹ روپے تک

پہلے پلان سے لے کر ۱۹۷۰-۷۱ تک ریاست میں کل ۲۸۱.۲ کروڑ روپیہ لگایا جا چکا ہے۔ چوتھے پلان میں ۱۵۸ کروڑ لگانے کی تجویز ہے۔

ریاست میں آنے والے سیاحوں کی تعداد ۱۹۴۷ء میں ۴۳,۰۰۰ سے بڑھ کر ۱۹۷۰ء میں ۱۲۱,۰۰۰ تک پہنچ گئی میں ۳.۳۲ لاکھ یاتریوں نے جموں کے شری ویشنو دیوی مندر کی زیارت کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

ڈائریکٹوریٹ آف انفارمیشن جموں اور کشمیر گورنمنٹ

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS R. N. NO. 10881

AUGUST 1971 WAQIAT REGD. NO. D. 629
(FIRST HALF)
TELEPHONE : 619895

"آج ہم نے پہلے ہی دن اسکول میں 'ب' سے 'بم' اور 'ت' سے 'توپ' پڑھا ہے

بش آجائے تو چھتری لگا کر نہائیے

ایک بتھ ذو کا ج

جب سے میں نے کمروں میں
تصویروں کی جگہ بیلن اور
جھاڑو وغیرہ ٹانگے ہیں
ان کے دوستوں نے آنا ہی
چھوڑ دیا ہے۔

اصول گیا تھا

ہفت روزہ نئی دہلی

اگست ۱۹۷۱

نصف دوم

دوسرا سال۔ انیسواں شمارہ

مدیر

صدر دفتر

ڈی-۱۰، نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۱۳

ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵

ایک کاپی کی قیمت ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۱۸ روپے

مضامین نثر و نظم ہمراہ کسی ذریعہ سے وصول ہوں ان کے سلسلہ میں خط و کتابت کرنے کی ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی مواد کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا مدیر کو کلی اختیار ہے۔ مضامین کے مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ ذمہ دار نہیں ہے۔

انتظامی اور ادارتی امور متنازعہ کے فیصلہ کا اختیار صرف نئی دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا

مدیر طابع اور ناشر عبدالوحید صدیقی

مطبع۔ وشنو آفسٹ پرنٹرس

کیا ہندوستان و پاکستان میں جنگ ہوگی؟

فوجی طاقت میں ہندوستان کی برتری

۱۹۶۵ء کی جنگ کا خاتمہ تاشقند معاہدے کے بعد ہوا ـــــ فوجی جوان ـ شاستری اور ایوب تاشقند میں کوسیجن کے ساتھ ـ

"کیا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہوگی؟" یہ سوال سیاسی حلقوں میں پوچھا جا رہا ہے ـ پاکستان کے صدر جنرل یحییٰ خاں نے گزشتہ ہفتے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں کہا "ہندوستان کے ساتھ ایک مکمل جنگ بہت قریب ہے ـ صبر و ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے "

خطرے سے آگاہ حلقوں کے خیال میں یہ عین ممکن ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں ـ لیکن دونوں ملکوں کی راجدھانیوں میں غیر ملکی ڈپلومیٹوں کا خیال ہے کہ لڑائی کے امکانات "ففٹی ففٹی" ہیں ـ

لڑائی کا یہ خطرہ اقوام متحدہ تک میں محسوس کیا جا رہا ہے اور اس لئے سکریٹری جنرل او تھانٹ نے سلامتی کونسل کو انتباہ کیا ہے کہ ہندوستان کی سرحد پر جو جھڑپیں ہو رہی واقعات نئی دہلی ہیں وہ کسی وقت بھی بڑھ کر جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہیں ـ

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس نے انتہائی صبر ضبط سے کام لیا ہے لیکن ... یحییٰ خاں ہی کے الفاظ میں "صبر و ضبط کی حد ہوتی ہے"

صبر و ضبط جب ایک حد کو پار کر جاتا ... ہو جاتی چھڑ جاتی ہے ورنہ لڑائی کوئی اچھی چیز نہیں ہے ـ اس سے میدان جنگ میں جان و مال کے ساتھ ہر لڑنے والے ملک کی پوری معیشت بھی تباہ ہو جاتی ہے اور آنے والے طویل زمانے تک اس کی ترقیات ختم ہو جاتی ہیں ـ جیتنے والا ملک بھی ہار جاتا ہے اور جو ہارتا ہے وہ مر جاتا ہے ـ

۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ میں دونوں طرف کے ... ہزار آدمی ہلاک اور گیارہ ہزار کے قریب مجروح ہوئے ـ صرف ہندوستان کو پچاس کروڑ کا نقصان برداشت کرنا پڑا ـ اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ نقصان پاکستان کا بھی ہوا ہوگا اور اس کے بعد ترقیات کے معاملے میں کتنی دشواریاں پیش آئی ہوں گی اسے صرف دونوں ملکوں کی حکومتیں ہی سمجھ سکتی ہیں ـ اس کے باوجود اگر جنگ کا خیال دل میں لایا جائے اور کہا جائے کہ مکمل جنگ قریب ہے تو اسے پاگل پن ہی کہا جائے گا ـ

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی یوم آزادی کے دن لال قلعے کے تاریخی چبوترے سے اعلان کر چکی ہیں کہ "ہماری پالیسی امن و آشتی کی پالیسی ہے اور ہم کسی کو دھمکی نہیں دیتے ـ لیکن دھمکی دے کر ہمیں مرعوب بھی نہیں کیا جا سکتا ـ

جنگ اگر تھوپ دی جائے تو یقیناً اس کا مقابلہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے ـ کوئی ملک بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی آزادی اور سلامتی خطرے میں پڑ جائے ـ وزیر دفاع کہہ چکے ہیں کہ اگر مکتی فوج کی سرگرمیوں کو روکنے کے بہانے پاکستان نے کوئی جارحانہ قدم اٹھایا تو اس کا دندان شکن جواب دیا جائے گا اور بڑے پیمانے پر جنگ چھڑ جائے گی ـ

پاکستان کے فوجی حکمراں اگر اس وقت جنگ کی طرف مائل نظر آتے ہیں تو بظاہر اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں ـ اوّل یہ کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستان نے اپنی فوجی طاقت تقریباً دوگنی کر لی ہے اور دوم یہ کہ امریکا اور چین اس کی برابر حوصلہ افزائی کر رہے ہیں ـ امریکا اسلحہ مہیا کر رہا ہے اور چین پاکستان کی حمایت کا دم بھر رہا ہے اور اسے نقدی اور قرضہ کی مدد بھی دے رہا ہے ـ

لیکن ہندوستان کی حکومت بھی ...

[illegible] نے بھی اپنے ملک کے بہت سے استقامات کئے ہیں۔ وزیر دفاع مسٹر جگجیون رام نے تو حال ہی میں یہاں تک کہا ہے کہ ہندوستان کی فوجی طاقت سے پاکستان کی فوجی طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ہندوستان کو ہر لحاظ سے پاکستان پر برتری حاصل ہے۔

آیئے دونوں ملکوں کی فوجی طاقتوں کا مختصراً جائزہ لیں تاکہ یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہو کہ پاکستان کتنے پانی میں ہے۔ پاکستان کی بری فوج تین لاکھ ہے جبکہ ہندوستان کی آٹھ لاکھ ہے۔ دو پیدل ڈویژنوں کو چھوڑ کر جنہیں اس وقت پاکستان چین کی مدد سے منظم کر رہا ہے۔ پاکستان کے پاس اس وقت گیارہ ڈویژن پیدل فوج ہے جس میں سے چار ڈویژن اس وقت مشرقی پاکستان میں ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کی فوج پندرہ ڈویژنوں پر مشتمل ہے اور دس ڈویژن فوج اس کے علاوہ ہے جو شمال کے پہاڑی علاقوں میں تعینات ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کے چھ ڈویژن مغرب میں اور ایک ڈویژن مشرق میں تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس وقت کے ہندوستانی کمانڈر انچیف جنرل جے این چودھری کے بیان کے مطابق مغربی محاذ پر ہندوستان کی فوج تقریباً اتنی ہی تھی جتنی کہ پاکستان کی تھی لیکن اس بار ایسا نہیں ہو سکے گا کیونکہ پاکستان کا ایک تہائی حصہ بنگلہ دیش میں رہنے کے لئے مجبور ہو گی۔ بکتربند فوج کے معاملے میں پاکستان کی طاقت تقریباً برابر ہے۔ ہندوستان کے پاس دو بکتر بند ڈویژن ہیں۔ لیکن اس مرتبہ ہندوستان کو نفسیاتی طور پر اس کم کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا

جو گزشتہ جنگ میں پاکستان کے پیٹن ٹینکوں کے مقابلے میں کرنا پڑا تھا۔ توپ خانے میں پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کا پلڑا بھاری ہے۔ پاکستان کے پاس ۹ سو اور ہندوستان کے پاس تین ہزار توپیں ہیں۔

جہاں تک فضائی طاقت کا تعلق ہے ہندوستان کے پاس اس وقت لڑاکا ہوائی جہازوں کے تیس اسکواڈرن (ایک اسکواڈرن میں ۱۲ سے ۱۶ تک طیارے ہوتے ہیں) موجود ہیں۔ جبکہ پاکستان کے پاس ۱۶ یا ۱۷ اسکواڈرن ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندوستان کے پاس ۲۵ اور پاکستان کے پاس صرف دس اسکواڈرن تھے۔ لیکن ہندوستان کے ان ۲۵ اسکواڈرنوں کے بارے میں ایک خاص بات قابل ذکر ہے کہ گیارہ اسکواڈرن ویمپائر اور مسٹیئر جیسے پرانے قسم کے طیاروں پر مشتمل تھے جبکہ پاکستانی اسکواڈرنوں میں

ایف۔۸۶ اور سوپر سونک ایف ۱۰۴ قسم کے طیارے شامل تھے۔ اس کمی کو اب مِگ ۲۱ حاصل کر کے دور کر لیا گیا ہے لیکن سالِ گزشتہ پاکستان نے فرانس سے ۵۶ مریج (MIRAGE) قسم کے طیارے حاصل کر کے اپنے فضائیہ کو نئے ڈھنگ سے ترتیب دیا ہے۔ ان طیاروں کی رفتار آواز کی رفتار سے دوگنی ہے۔ اور انکی مار کا دائرہ بھی ۸۶۰ میل تک ہے جبکہ مِگ۔ ۲۱ کا دائرہ صرف ۳۷۵ میل تک محدود ہے اور اس کی رفتار بھی مقابلتاً کم ہے۔ اس لحاظ سے پاکستانی فضائیہ کو کسی قدر برتری حاصل ہے۔ لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندوستان کے تیار کردہ ناٹ طیاروں نے جس طرح پاکستان کے سیبر جیٹ طیاروں سے ٹکر لی ہے اگر اسے اور ہندوستانی ہوابازوں کی اعلیٰ ٹریننگ کو پیش نظر رکھا جائے تو یقیناً مریج طیارے ناقابلِ شکست ثابت نہیں ہونگے۔ ہندوستان کے پاس مِگ طیاروں کی تعداد سرکاری طور پر ۱۵۰ بتائی گئی ہے۔ ہندوستانی فضائیہ کے جوانوں کی تعداد ۹۰ ہزار ہے جبکہ پاکستان میں ۱۵ ہزار ہے (دو ہزار جوان ریزرو میں ہیں)

بحریہ میں ہندوستان کی طاقت پاکستان سے کہیں

شہید ہندپاک سرحد کا معائنہ کر رہے ہیں

کھیم کرن میں تباہ شدہ پاکستانی پیٹن ٹینک

یہ کسی فلم کا سین نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان
ے درمیان ہونے والی دوسری جنگ کا ایک منظر ہے

ہے۔ ہندوستانی عملے کی تعداد ۴۰ ہزار اور پاکستانی
تعداد ۹۳۰۰ ہے۔ ہندوستان کے پاس ۱۶ ہزار ٹن
کا ایک طیارہ بردار جہاز موجود ہے جب کہ پاکستان
س اس قسم کا کوئی جہاز موجود نہیں ہے۔ ہندوستان
س ڈسٹرائر (جنگی جہاز) ہیں اور پاکستان کے پاس صرف
زر (بامر) ہے۔

پاکستان کے پاس سب سے مہلک ہتھیار اس کی
بدوز کشتیاں ہیں اور وہ اٹلی اور فرانس سے اس قسم
ی آبدوز کشتیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے
تان کے پاس بھی چار ہی آبدوز کشتیاں ہیں۔ بنگلا دیش
ارت ہونے کی بنا پر پاکستانی بحریہ کو سخت نقصان
ہے۔ اس لئے کہ بحریہ میں بنگالیوں کی تعداد زیادہ ہے
مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ہندوستان کو پاکستان
لے میں ہر لحاظ سے برتری حاصل ہے۔ لیکن نقطۂ نظر اسکے
طاقت میں برتری کس کو حاصل ہو سکی ہے۔ جنگ میں
کو زبردست نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ غالباً اسی بنا
ت ہند بڑی محتاط پالیسی پر چل رہی ہے اور ملک کے
طالبے کے باوجود اس نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا ہے

شدی دہلوی

جس سے کہ بین الاقوامی دنیا میں اس کی سا کھ خراب ہو۔ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ جس وقت مشرقی بنگال میں پاکستان کی لڑنے والی صرف ۱۴ بٹالین فوج تھی اور چار بنگالی بٹالینوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا تھا اس وقت حکومت ہند مکتی فوج کی مدد کر دیتی یا خود آگے بڑھ کے فوجی کارروائی کرتی تو مشرقی پاکستان کا وجود نقشے سے مٹ چکا ہوتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت کا الزام اپنے سر نہیں لیا۔ اس کے باوجود پاکستان ہندوستان پر اس کے داخلی معاملات میں مداخلت کا الزام لگا رہا ہے اور کشیدگی پیدا کر کے بنگلا دیش کے معاملے کو ہند اور پاکستان کے درمیان معاملہ بنانے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔

اسی مقصد کے پیشِ نظر پاکستان نے سرحد کے دونوں جانب آبزرور مقرر کرنے کی تجویز منظور کی اور اسی مقصد سے گذشتہ ہفتے جنرل یحییٰ خاں نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل اوتھانٹ کے نام چٹھی لکھ کر تجویز پیش کی کہ سلامتی کونسل اپنی ایک کمیٹی مقرر کرے اور اس کے ممبر دونوں ملکوں کا دورہ کر کے کشیدگی کم کرائیں۔

لیکن یہ واضح طور سے پاکستان اور بنگلا دیش کے لیڈروں کے درمیان معاملہ ہے، اور جیسا کہ حال ہی میں امریکی سنیٹر ایڈورڈ کنیڈی نے نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ :-

"شیخ مجیب الرحمٰن کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے عام انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔"

جس لیڈر نے زبردست اکثریت حاصل کی اور جو اپنے دیش کا واحد لیڈر ہے اسے جیل میں ڈال کر اس کے خلاف خفیہ فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے اور ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈا کر کے بین الاقوامی دنیا سے کشیدگی کم کرانے کے لئے کہنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ مسئلے کا ایک حقیقی سیاسی حل تلاش کرنے ہی سے صورتِ حال بہتر ہو سکے گی۔ اور مسٹر کنیڈی کے الفاظ میں :-

"سیاسی حل قطعی ممکن ہے۔" عوامی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کرنے کی بات اگر پاکستان کی فوجی جنتا "آج نہیں" تو کل سمجھے گی۔ اور نہیں سمجھے گی تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کا ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ صدر نکسن نے چین کے دورے کا پروگرام صدارتی انتخابات جیتنے کے لئے بنایا ہے

غزل

دشت سے نکلا ہوں منزل آشنا ہوں
مثل نکہت اسیرِ ہوا ہوں
وہ بیاکل ہوں جو حسن سے بچھڑ کر
خود اپنے شہر میں تنہا ہوا ہوں
مری آنکھوں کی خشک تر زمیں جانو
کبھی صحرا، کبھی دریا نما ہوں
چمن میرا نہیں، پھر بھی چمن میں
میں تنہا رنگ و نکہت آشنا ہوں
بھرے احساس کی توقیر کرنا
تری مشکل سے میں زندہ ہوا ہوں
نہ جانے کس لئے ہے ناز مجھ کو
ذرا سا ہوں مگر تجھ سے بڑا ہوں
تمہارا کیوں نہیں کوئی کہ اب میں
کہاں ہوں کس طرف کو جا رہا ہوں
میں اس گزرے ہوئے پل کا ہوں ہر سو
جو مجھ سے کہہ سکے میں بے خطا ہوں
ہوائے کوئے جاناں الحفیظ سے
صدا ہے سرخ کچھ نہ کہا ہوں
سلا دو رے ہوا اب سلا دو
بہت راتوں کا میں جاگا ہوا ہوں

معاہدۂ امن ایک تاریخی اق

گرومیکو اور اندرا گاندھی

ہندوستان اور روس کے درمیان حالیہ معاہدۂ امن اس بات کا ضامن ہے کہ ہندوستان نے پہلی بار اپنی خارجہ پالیسی میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ لکیر کے فقیر نہ بنتے ہوئے ہندوستانی حکومت نے حالات کے تقاضے کو سمجھا اور اس طرح اس تاریخی معاہدے کا قیام عمل میں آیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ معاہدہ تاریخ میں اپنی قسم کا ایک ہی معاہدہ ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ کچھ اخبارات نے اس معاہدے کو فوجی معاہدے کا نام دیا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدے میں باہمی فوجی تعلقات سدھارنے پر کافی زور دیا گیا ہے لیکن معاہدہ صرف فوجی تعلقات پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ معاہدے کی عبارت پر ایک نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں دونوں ملکوں کے درمیان تکنیکی، سائنسی، تعلیمی ادبی، صحت عامہ، پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما اور کھیل کے میدانوں میں بھی تعلق بڑھانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس معاہدے میں کل ملا کر بارہ دفعات ہیں اور ان میں سے صرف تین دفعات میں دونوں ملکوں کے فوجی اور دفاعی معاملات پر بحث کی گئی ہے۔ حالانکہ اس معاہدے میں روس کی طرف سے یہ یقین بھی دلایا گیا ہے کہ ہندوستان پر حملے کی صورت میں وہ اس کی مدد کرے گا۔ لیکن دونوں میں سے کسی پر کوئی مستقل پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ سرکاری ترجمانوں نے اس بات کی بھی شدت کے ساتھ تردید کی ہے کہ اس معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد ہندوستان ایک غیر جانبدار ملک نہیں رہا۔ معاہدے کی دفعہ IV میں روس کی طرف سے اس بات کا واضح اعتراف کیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان

واقعات نئی دہلی

کی غیر جانبدارانہ پالیسی کا احترام کرتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندوستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی نے عالمی امن کو برقرار رکھنے میں بہت مدد کی ہے۔

اس معاہدے کو ہم صرف فوجی معاہدہ اس لئے بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے تحت نہ تو کسی غیر ملک کو ہندوستان میں فوجی اڈے قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور نہ غیر ملکی فوجوں کو سرزمین ہند پر آنے کی اجازت دینے کا خیال ہے۔ اس معاہدے میں صرف اس بات کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جنگ کی صورت میں روس ہندوستان کو ہتھیار اور جنگی ضروریات کی دوسری چیزیں فراہم کرے گا۔

یہ معاہدہ موجودہ حالات میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ امریکا اور چین کے بڑھتے ہوئے تعلقات اور پاکستانی ڈکٹیٹر یحییٰ خان کی "مکمل جنگ" کی دھمکی نے اس معاہدے کی جلد تکمیل کرانے میں مدد کی۔ اس معاہدے کے ذریعے روس نے ہندوستان کی حمایت میں یحییٰ خاں کو یہ وارننگ دی ہے کہ ہندوستان کے خلاف "مکمل جنگ" کی صورت میں روس چپ نہیں رہے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کو روس کے ساتھ معاہدۂ امن کی ضرورت کا احساس اس وقت اور زیادہ ہوا جب کہ امریکا اور چین کے تعلقات نے ایک دلچسپ موڑ لیا اور صدر نکسن نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی چین کا دورہ کریں گے۔ روس اور چین سے تعلقات پر مسز اندرا گاندھی کے مشیر اعلیٰ مسٹر ڈی۔ پی۔ دت (پرو وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی) نے اس معاہدے کا ذکر مسٹر گرومیکو کے دہلی آنے سے کئی ہفتے پہلے ہی کر دیا تھا۔ "ہندوستان ٹائمز" میں اپنے ایک مضمون "چین وامریکی تعلقات اور ہندوستان" میں انھوں نے لکھا تھا کہ جب امریکا اور چین قریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں تو ہمیں روس سے اپنے تعلقات اور زیادہ بڑھا لینا چاہئیں۔ انہیں کے الفاظ میں۔ امریکا اور چین کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے سب سے زیادہ سوویت یونین پریشان ہے۔ ایشیا میں روسیوں کے زیادہ دوست نہیں ہیں اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ہمارے اور روسیوں کے مفادات ایشیا بالکل ایک سے ہیں۔ ہندوستان کو اس موقع اٹھانا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ دونوں کے زیادہ صحت مند اور باہمی تعلقات قائم ہوں۔"

اس معاہدے کا خیر مقدم ساری دنیا میں کیا گی ہندوستان میں ایک دو سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر تقریباً تمام گروپوں نے اسے خوش آئند کہا۔ امریکا میں ملا جلا رد عمل ہوا۔ عام طور پر امریکی اخبار اس سے پریشان نظر آتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں نکسن کی غلط پالیسی نے اس معاہدے کو جنم دلوایا اور اس طرح نے ہندوستان کھو دیا"۔ اب امریکا کے عوام اور کانگریس میں بھی یہ احساس شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ کی طرف امریکا کی پالیسی غلط ہے۔ خود سینیٹر ایڈو نے کہا ہے کہ موجودہ حالات میں روس سے معاہدہ کر ہندوستان نے بہت صحیح قدم اٹھایا ہے۔ لگتا ہے اور روس کی طرف ہندوستان کا جھکاؤ دیکھتے ہوئے نکسن کو ہندوستان کی طرف اپنے رویّے پر نظر ثانی

موجودہ حالات میں روس سے ہندوستان کا ہندوستان کے حق میں فائدہ مند نظر آ رہا ہے۔ اب اس بات کی ہے کہ ہندوستان چین کی طرف بھی دو اٹھائے تاکہ اس کی شمالی سرحدیں محفوظ ہو سکیں۔ وقت دنیا کے تمام بڑے غیر جانبدار ممالک جیسے کہ یوگوسلاویہ وغیرہ کا جھکاؤ روس ہی کی طرف ہے اب ہندوستان بھی شامل ہو گیا ہے۔ ہندوستان کو سامراجی طاقتوں کی خوشامد چھوڑ کر آزادی کی جنگ قوموں کی مدد کرنی چاہئے۔ اس طرف پہلا قدم ہند کا شمالی ویت نام کی عوامی جمہوریت کو تسلیم کرنے اس صورت میں یہ ممالک بھی کھل کر ہندوستان کے لئے سامنے آ جائیں گے۔

امریکا کے نکسن کا دورہ چین

بین الاقوامی سیاست پر اس کے اثرات

شاہد صدیقی

امریکا واپس لوٹنے پر نکسن کیسنجر کا استقبال کر رہے ہیں

ک بار پھر بھی انسان چاند پر گئے۔ یہ اس سال کی
اہم خبر ہے؟ لیکن شاید ایسا نہیں ہے۔ پوری دنیا
ور پوری دنیا کے اخبار انسان کے چاند کے سفر سے زیادہ
صدر نکسن کے چین کے سفر کو اہمیت دے رہے ہیں۔
ہی ا پلی

اور واقعی یہ سفر پوری دنیا کے لوگوں کے لئے ہوگا بھی چاند کے
سفر سے زیادہ اہم۔ نکسن کے اس دورے کا اثر نہ صرف امریکا
اور چین کے تعلقات بلکہ پوری بین الاقوامی سیاست پر پڑے گا۔
اس دورے کا اثر وقتی نہیں بلکہ بہت دور رس ہوگا۔ کل

کی پوری بین الاقوامی سیاست کا انحصار اس دورے پر ہے

حریت پسندوں کی فتح

سوال یہ ہے کہ آخر اس دورے کو اتنی اہمیت کیوں دی جا رہی ہے؟ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی اور سب سے اہم وجہ ہے۔

کیسنجر۔ چاؤ این لائی کے ساتھ

امریکی اور دوسری سامراجی طاقتوں کا سوشلسٹ اور عوامی طاقتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینا۔ آج بیس سال سے امریکا اور دوسری سامراجی طاقتیں چین کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھیں چین کے ایک بہت چھوٹے سے جزیرے کو جہاں امریکا کی پٹھو حکومت قائم تھی اصل چین تسلیم کیا جاتا تھا جبکہ ستر کروڑ کی آبادی والے عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا تھا امریکا اور اس کے ساتھی ملک پچھلے بیس سال سے چین کو اقوام متحدہ کا ممبر بننے سے رد کئے رہے۔ حفاظتی کونسل پر چین کی جگہ تائیوان کی حکومت کو دی گئی۔

امریکا کمیونزم کو روکنے کے نام پر ویت نام، کمبوڈیا لاؤس اور کوریا کے عوام پر ظلم ڈھاتا رہا۔ ایٹم بم کو چھوڑ کر دنیا کا کوئی ایسا مہلک ہتھیار نہیں ہے جو امریکا نے ویت نام کے حریت پسند عوام پر استعمال نہ کیا ہو۔ پچھلے دس سال میں ویت نام پر اتنے بم گرائے گئے جتنے پوری دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی، جاپان، انگلینڈ، فرانس، اٹلی اور امریکا نے مل کر نہیں برسائے تھے۔ پوری پوری آبادیوں کو زہریلی گیس چھوڑ

لڑائیوں میں موت کی نیند سلادیا گیا۔ لیکن ویتنام کے بہادر عوام اپنے جائز حقوق کے لئے، اپنی آزادی کے لئے اور اپنے ملک میں ایک جائز سوشلسٹ حکومت قائم کرنے کے لئے دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکر لیتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے امریکا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ اب امریکا کے سامنے صرف یہی باعزت راستہ رہ گیا ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ ویت نام سے باہر نکل جائے اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق ویتنام کے عوام کے ہاتھوں میں چھوڑ دے۔ دوسری حالت میں ویت نام کے انقلابی عوام امریکی فوجوں کو بے آبرو کرکے اپنے کوچے سے نکال باہر کریں گے۔

پینٹاگون پیپرز کے سامنے آنے سے یہ بات پوری دنیا پر نہیں بلکہ خود امریکی عوام پر بھی اچھی طرح واضح ہوگئی ہے کہ ویتنام، لاؤس، کوریا اور کمبوڈیا میں جنگ کے ذمے دار سوشلسٹ یا کمیونسٹ ممالک نہیں بلکہ امریکا اور دوسرے سامراجی ممالک تھے۔

امریکا اور دوسرے سرمایہ دار ممالک نے ہمیشہ سوشلسٹ ممالک پر جنگجو ہونے کا الزام لگایا ہے، لیکن خود امریکی کاغذات اور فائلوں نے ثابت کردیا ہے کہ بھڑکانے والی تمام کاروائیاں امریکا نے کی تھیں۔ سوشلسٹ ممالک کو مجبوراً جنگ میں کودنا پڑا۔ لیکن امریکا اور دوسری سرمایہ دار طاقتیں، اخبارات اور نشر و اشاعت کے ذرائع پر اپنے کنٹرول کی وجہ سے پوری دنیا میں غلط پروپیگنڈا کرنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ اب جب کہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ امریکا کے چہرے سے جمہوریت اور شخصی آزادی جیسے خوبصورت الفاظ کا نقاب اٹھ گیا ہے اور سرمایہ دار طاقتوں کا حقیقی روپ اپنے اصل رنگ میں برہنہ ہوکر دنیا کے سامنے آگیا ہے۔

نکسن چین کی دعوت پر چین نہیں جا رہے ہیں بلکہ پہلے انھوں نے اپنے خاص نمائندے مسٹر کیسنجر کو پاکستان کے ذریعے چین بھیج کر چینی رہنماؤں سے ملنے کی درخواست کی اور چینی لیڈروں کے اس درخواست کے منظور کرلینے پر نکسن نے چین کے دورے کا اعلان کیا۔

مغربی اخبارات کے مطابق چینی لیڈروں نے نکسن کی درخواست اپنی کچھ شرطیں منوانے کے بعد منظور کی ہے۔ نیوز ویک کے پبلشر ولیم ایٹ وڈ نے لکھا ہے:

"چواین لائی نے نکسن کے دورۂ چین کے لئے یہ شرط رکھی تھی: تائیوان سے تمام امریکی فوجوں کی واپسی اور تائیوان کے مسئلے کو عوامی جمہوریہ چین کا اندرونی مسئلہ تسلیم کیا جانا"

جاپانی اخبار اساہی بھی لکھتا ہے:

"صدر نکسن کے خاص ایلچی کیسنجر نے ایک بہت اہم بات منظور کرلی ہے یعنی۔ چین صرف ایک ہے اور عوامی جمہوریہ چین پورے چین کی نمائندگی کرتا ہے"

چین کی معاشی ترقی

امریکا کے چین کے آگے جھکنے کی ایک اہم وجہ چین کی معاشی ترقی بھی ہے۔ آج سے چند سال پہلے تک مغربی ماہرین معاشیات کا کہنا تھا کہ چین معاشی طور پر بہت پچھڑا ہوا ہے اور اس کی معاشی حالت کا مستقبل قریب میں سدھرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن آج یہی لوگ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ انڈسٹری اور دوسرے تمام میدانوں میں چین نے بہت ترقی کی ہے۔ چین کا بہتر اور سستا مال آہستہ آہستہ افریقی، ایشیائی اور لاطینی امریکا میں امریکی مال کی جگہ چھینتا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ ویت نام میں ہر روز کے ہونے والے خرچے نے بھی امریکا کی کمر توڑ دی ہے۔ تازہ ترین مالی بحران اسی جنگ کا نتیجہ تھا۔

ان تمام وجوہات نے مل کر امریکا کو مجبور کردیا ہے کہ وہ دنیا کے ساتھ ساتھ دوسرے سوشلسٹ ممالک سے تعلقات ہموار کرے۔

چین کی یہ جیت صرف چین کی ہی فتح نہیں بلکہ لاطینی امریکا، افریقہ، مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے پسے ہوئے عوام کی جیت ہے۔ یہ جیت صرف ویتنام کے بہادر عوام ہی کی نہیں بلکہ بنگلا دیش کے مظلوم عوام کی بھی جیت ہے۔ ویتنامی عوام نے امریکا جیسی ناقابل تسخیر طاقت کو ناکوں چنے چبوا کر پوری دنیا کے حریت پسند عوام کے سامنے ایک مثال قائم کردی ہے۔ انھوں نے دکھا دیا ہے کہ اگر عوام میں جوش اور جذبہ ہو تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ آج پاکستان، اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی حکومتوں کو امریکا چاہے کتنے بھی ہتھیار کیوں نہ دے وہ وہاں کے بہادر عوام کو جھکنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت جلد امریکا اور دوسری سامراجی طاقتوں کو دنیا بھر کے آزادی پسند عوام کے جذبۂ آزادی کے سامنے جھکنا ہوگا۔ بہت جلد بنگلا دیش آزاد ہوگا، فلسطین آزاد ہوگا، جنوبی افریقہ اور روڈیشیا آزاد ہوں گے اور پوری دنیا کے جمہوریت پسند اور آزادی پسند عوام آزاد ہوں گے۔

ویتنام، کمبوڈیا اور لاؤس کے عوام کے ہاتھوں امریکا کی ہار سامراجیت کے تابوت میں ٹھونکی جانے والی پہلی کیل ہے۔ باقی کیلیں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے عوام مل کر ٹھونکیں گے۔

چیانگ کائی شیک

گھبراؤ مت جانِ من ——— تمہارے اور ہمارے درمیان کوئی نہیں آسکتا۔

ہو ایک دفعہ ایک جل پری ساحل پر آئی اور ایک شہزادے
ے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ یہ زمین کا رہنے والا اور وہ سمندر کی رہنے
لی۔ عہد و پیماں ہوئے مگر شہزادہ جلد ہی ایک دوسری زمینی عورت
عشق میں پڑ کر جل پری کو بھول گیا۔ جب جل پری کو شہزادے
بے وفائی کا علم ہوا تو وہ غم کے مارے سمندر کی ہواؤں اور
ں میں گھل مل گئی اور اس کی روح آج بھی بھولے بھٹکے خوفزدہ
ننھے ننے بچوں کو اپنے مشفق ہاتھوں سے ساحل پر پہنچا دیتی ہے۔"
یہ کہانی تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے ہنس کرسچین اینڈرسن
لکھی تھی۔

۱۹۰۹ء میں ننھی جل پری" ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ جل پری
ل اس وقت کی مشہور بیلے رقاصہ ایلن پرائس نے ادا کیا
ایک لکھ پتی کارل جیکب سن، جو آرٹ کا قدر داں تھا،
نے یہ ڈراما دیکھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی
ہ اس جل پری کو یادگار بنا دیا جائے۔ چنانچہ مجسمہ بنانے
ڈنمارک کے مشہور مجسمہ ساز ایڈورڈ اپرکسن کی خدمات
ی گئیں۔ اور رقاصہ ایلن پرائس کو بطور ماڈل تقریباً
مجسمہ ساز کے سامنے بیٹھنا پڑا۔ اس مجسمے کی تیاری
ریباً تین سال لگے۔ یہ مکمل برونز (کانسے) کا بنایا
پھر اگست کی چوتھی تاریخ کو یہ تاریخی مجسمہ کوپن ہیگن
حل پر ایک بڑے پتھر پر نصب کر دیا گیا۔ وہی غمگین چہرہ
ظریں ساحل پر جمی ہیں کہ شہزادہ لوٹ آئے۔

جلد ہی یہ مجسمہ عالم گیر شہرت حاصل کر گیا۔ سیاح یہاں
آتے اور جل پری کا آشیرواد حاصل کرتے کہ ان کا سفر کامیابی
سے طے ہو۔ حسین و جمیل جوڑے یہاں آتے کہ عشق کی لافانی یادگار
کے سامنے اپنے عشق کو پائدار کریں۔ دل جلے اور منچلے نوجوان
بھی جل پری سے مذاق کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے
یہ کوئی جیتی جاگتی پری ہے جو سب کو خوش رکھنا چاہتی ہے۔
وہ کون شخص ہوگا جو ڈنمارک آیا ہو اور جل پری سے ملے بغیر چلا
گیا ہو۔ لاکھوں لوگ اس کا دیدار کرتے تھے۔ یہ ڈنمارک کی
ایک شالی اور غیر مقدمی جل پری تھی۔ سیاح جل پری کی یاد
کے لئے چھوٹے چھوٹے برونز کے مجسمے خرید کر لیجاتے تھے۔
نصف صدی تک یہ سوگوار ہمدرد جل پری اپنی جگہ رہی۔
لیکن ۲۴ اپریل ۱۹۶۲ء کی رات ڈنمارک اور دنیا کے لئے حیرت
اور غم و غصے کی رات تھی۔ اس رات کسی پتھر دل نے معصوم و سوگوار جل پری
کا خوبصورت سر کاٹ لیا۔ یہ کام اس قدر صفائی اور مہارت سے
کیا گیا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مجسمے کا خالق سر بنانا بھول گیا ہو۔
یہ خبر آناً فاناً آگ کی طرح پھیل گئی۔ ساحل کوپن ہیگن پر اتنا ہجوم
ہوا کہ پولیس کو کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ لوگ یوں سوگوار تھے کہ کوئی
ان کا عزیز چل بسا ہو۔

ایف۔ بی۔ آئی، اسکاٹ لینڈ یارڈ کے مشہور عالم جاسوس
اس انوکھی چوری کا پتہ نہیں لگا سکے اور نہ چوری کی اصل وجہ
سمجھ میں آسکی۔
کٹے ہوئے سر والے مجسمے پر کپڑا ڈھانک دیا گیا۔ پھر یہ چار
ٹن وزنی پتھر مجسمے کے ساتھ ڈنمارک کی رائل فونڈری (Royal
FOUNDRY) لیجایا گیا جہاں چھ ہفتے کی جانفشانی کے بعد دوبارہ
سر لگایا گیا۔ اور ساحل پر نصب کر دیا گیا۔ اس کی ... بتہ یہ کہ
اگر سر تراشنے والا مجسمے کے خالق ایڈورڈ اپرکسن کا بیٹا
پال راسمن تھا۔

با عرب ممالک ر روس کے علقات خراب وجائیں گے۔؟

سادات اور پدگورنی ـــــ ہم دوست ہیں۔

اسرار عظمت

حال ہی میں کمیونسٹوں نے سوڈان میں انقلاب
وشش کی تھی لیکن سازش ناکام ہو گئی۔ جنرل نمیری
ور پر حالات پر قابو پا لینے کے بعد کمیونسٹوں کو قتل
ع کر دیا۔ اس سازش کے بانی عبدالخالق، کرنل نور
ر اللہ وغیرہ کو پھانسی دے دی گئی۔ اور دوسرے
لیڈروں کے علاوہ بہت سے عام کمیونسٹوں کو بھی
کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹوں
ی سازش ناکام ہو گئی۔ سوڈان میں کمیونسٹوں کے اس
کے خلاف روس نے شدید احتجاج کیا لیکن جنرل نمیری
پ کوئی توجہ نہیں دی بلکہ جواباً انھوں نے دھمکی دی کہ
ن سے تمام روسیوں کو نکال باہر کریں گے۔ انھوں
سازش کی ذمہ داری بلغاریہ پر عائد کی ہے اور روس
معاون قرار دیا ہے۔ ماسکو اور صوفیہ سے اپنے
کو انھوں نے فوری واپس بلا لیا۔

سوڈان سے کمیونسٹوں کا خطرہ عارضی طور پر تو ٹل گیا
مستقبل میں ایسی ہی سازش کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے
وڈان میں کمیونسٹوں کا اثر آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے
ق میں تو کمیونسٹوں کا اچھا خاصا اثر ہے ہی لیکن
یمن میں بھی ان کا اثر تیزی سے پھیل رہا ہے خیال ہے
[illegible] کے قریب کمیونسٹ ہیں سوڈان
[illegible] ہزار کمیونزم کی حامی ہے

اس لیے صورت حال تشویشناک ہے ویسے اکثریت کمیونزم
مخالفوں کی ہے اور عوام کمیونسٹوں سے سخت نفرت کرتے
ہیں لیکن دو لاکھ ۲۰ ہزار کی اس اقلیت کو بھی آسانی سے
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

روسی کمیونسٹوں کی اس ناکام سازش سے چینی کمیونسٹوں کی
اس سازش کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو چھ برس قبل انڈونیشیا
میں کی گئی تھی۔ لیکن جنرل سوہارتو نے فوج کی مدد سے
بروقت اس سازش کو کچل دیا۔ اور بعد میں انھوں نے چن چن
کر کمیونسٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس سازش کی ذمہ داری
کھلے الفاظ میں چین پر رکھی گئی اور چونکہ انڈونیشیا میں چینی کثیر
تعداد میں مقیم تھے اس لیے کمیونسٹوں کے اس قتل عام کو دوسرے
الفاظ میں چینیوں کا قتل عام کہا جا سکتا ہے چینیوں کی یہ سازش
بے نقاب ہونے کے بعد نہ صرف انڈونیشیا بلکہ مشرق بعید کے
جنوبی علاقے کے دوسرے ممالک میں بھی چین کا اثر کم ہو
گیا۔ اسی قسم کی صورت حال سے روس آج مشرق وسطیٰ میں
دوچار ہے۔ سوڈان کے علاوہ، مراکش لیبیا اور مصر میں بھی
روس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مصر کے صدر انور السادات
نے جنھوں نے حال ہی میں روس کے صدر پودگورنی کے ساتھ
روس اور مصر کے پندرہ سالہ دوستانہ معاہدہ پر دستخط کیے ہیں۔
اپنی ایک تقریر میں کہا ہے "اپنے دوست ملکوں کے داخلی معاملات
میں کسی دوسرے ملک کی مداخلت کو ہم برداشت نہیں کر سکتے"
یہ صحیح ہے کہ انھوں نے کھل کر روس کا نام نہیں لیا۔ لیکن ظاہر ہے
کہ اشارہ روس کی طرف ہی ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے
اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلی ایک دہائی میں روس نے عرب ممالک سے
اور خصوصاً مصر سے جو اچھے تعلقات قائم کیے تھے وہ جلدی ختم
ہو جائیں گے۔ کیونکہ مشرق وسطیٰ میں روس کا اثر اس قدر تیزی
سے کم ہوا ہے کہ دوسری جنگ کے بعد اب تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

لیکن چند حقائق پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وقتی طور پر
مشرق وسطیٰ میں روس کا اثر کم ہونے کے باوجود مستقبل قریب میں
عرب ممالک کے ساتھ روس کے تعلقات استوار ہو جائیں گے۔ اور
عنقریب روس پھر سے عرب ممالک کا اعتماد حاصل کرے گا۔ یا کم از
کم عرب ممالک اس پر اعتماد کا اظہار کرنے پر مجبور ہوں گے۔

مصر میں ۱۹۵۲ء میں برسر اقتدار آنے کے بعد صدر ناصر نے
کمیونسٹوں پر پابندیاں عائد کر دی تھیں اور کمیونسٹ پارٹی کو غیر
قانونی جماعت قرار دے دیا تھا۔ اس لیے روس ان سے
ناراض ہو گیا تھا۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ مصر
سے ناراضگی اس کے لیے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے
آہستہ آہستہ اس نے اپنا رویہ تبدیل کیا اور مصر سے تعلقات
استوار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مصر کے مشہور اسوان بند کی
تعمیر میں امریکی امداد کے بند ہونے کے بعد روسی امداد کا
بحال ہونا دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ صدر ناصر
نے بھی روس کے دوستی کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو قبول کر
لیا۔ اور مصر میں کمیونسٹوں کے تعلق سے انھوں نے اپنے رویے
کو قدرے تبدیل بھی کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ سابق کمیونسٹ
پارٹی کے کئی لیڈروں کو انھوں نے ملک کی واحد برسر
اقتدار جماعت عرب سوشلسٹ یونین میں بھی شامل کر لیا

سا دوستانہ تعلقات مضبوط ہونے لگے۔
انتقال کے بعد جب انور السادات مصر کے
ملک میں کمیونسٹ عناصر کے بڑھتے ہوئے
ئے علی صابری اور دوسرے ان کو نواز
بند کر دیا۔ روس کو اس پر سخت تشویش ہوئی
کی قیادت میں روسی لیڈروں کا ایک وفد
اس نے انور السادات کے سامنے روسی
کے پندرہ سالہ معاہدے کی تجویز رکھی جو

کوششوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ روس کی طرف سے اسلحہ
اور دیگر جنگی سامان کی فراہمی اور تکنیکی امداد بھی اس بات کی
تائید کرتی ہے کہ روس عرب ممالک سے تعلقات کو بڑی
اہمیت دیتا ہے۔

عرب ممالک بھی اسلحہ اور تکنیکی امداد کے لیے روس کے
محتاج ہیں۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جب سے نہر سویز بند
کر دی گئی ہے، مغربی ممالک کو بڑی تجارتی دشواریوں کا سامنا
کرنا پڑ رہا ہے۔ اس عرصے میں مغربی ممالک کا مجموعی طور پر

سکتا۔ انور السادات نے دھمکی دی ہے کہ اگر سال رواں
کے اواخر تک سمجھوتہ نہ ہو سکا تو طاقت کا استعمال کیا جائے
گا۔ مشرق وسطیٰ کی صورت حال تشویشناک ہے اور جنگ ناگزیر
معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے عرب ممالک اور خصوصاً مصر روس
سے تعلقات خراب کرنا نہیں پسند کرے گا تاکہ روس بدستور
اسے اسلحہ اور تکنیکی امداد فراہم کرتا رہے۔ ادھر روس بھی مصر
کی امداد کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑا ہے اور ہر قیمت پر مصر
میں اپنا اثر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ گویا دانتوں کو جبڑوں کی ضرورت

بائیں سے دائیں۔ کوسیجن۔ پدگورنی اور دیگر روسی لیڈر

کر لی۔ روس کے اس طرز عمل سے اب
ہے ہر حال میں اچھے تعلقات کا خواہاں
ثبوت ہے کہ روس نے یورپ کے کمیونسٹ
اب تک کسی ملک سے بھی اس قسم کا معاہدہ
۔ ایک غیر کمیونسٹ ملک سے روس کا ایسا
ثبوت ہے کہ وہ ہر قیمت پر مصر سے اچھے
ہے۔ ایسے غیر کمیونسٹ ملکوں کو جن میں

تو ستو کروڑ روپوں کا نقصان ہو چکا ہے۔ اس لیے مغربی
ممالک خصوصاً امریکہ کوشاں ہے کہ کسی نہ کسی طرح جنگ کا خطرہ
ٹل جائے اور نہر سویز تجارتی جہازوں کے لیے کھول دی جائے
لیکن اسرائیل نے امریکہ کی تمام پیش کشوں کو ٹھکرا دیا ہے۔
اگر یہی صورت حال کافی عرصے تک رہی تو مغربی ممالک
کی معاشیات پر بڑا اثر پڑنے کا خطرہ لاحق ہے۔ اس
لیے روس اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں،

ہے اور جبڑوں کو دانتوں کی۔ روس کے خلاف نفرت اور غصے کی لہریں
تمام عرب ممالک کے عوام میں اٹھی ہیں لیکن سوڈان کے علاوہ کسی
ملک نے بھی سفارتی سطح پر کوئی کارروائی روس کے خلاف نہیں
کی۔ سبھی ملکوں کے سربراہ مصلحتاً سفارتی سطح پر کچھ کرنا نہیں
چاہتے۔ ظاہر ہے کہ عوام کے سامنے کی ہوئی تقریریں سفارتی
تعلقات پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں اس لیے یہ سوچنا فضول ہے
کہ روس کے تعلقات عرب ممالک سے بگڑ جائیں گے۔

مجھے بار بار ڈارلنگ مت کہو۔ یہ لوگ ہمیں
غیر شادی شدہ سمجھیں گے۔

کے درمیان ہونے والا معاہدہ۔ ٹائمز (نیویارک) کے کارٹونسٹ کی نظر میں۔

خلیجِ فارس کا علاقہ

چھ عرب امارتوں کا فیڈریشن

بحرین نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا

[illegible] کے بعد [illegible] ۱۹۷۱ء [illegible]

[illegible] تقریباً ۳ سال سے اس سلسلے میں بات

چیت [illegible] بالآخر کامیاب ہو گئی۔ جن ریاستوں کے

حکمرانوں نے اس معاہدے پر دستخط کئے ان کے نام ہیں:

۱۔ ابو ظہبی۔ ۲۔ دبئی۔ ۳۔ الشارقہ۔ ۴۔ عجمان۔ ۵۔ ام القوین

اور ۶۔ الفجیرہ۔

چھ ریاستوں پر مشتمل اس علاقے میں یہ ایسی وفاقی

اسٹیٹ ہو گی جس میں آئینی اعتبار سے تمام بنیادی اجزائے

ترکیبی موجود ہوں گے۔ اس کا عربی نام "دولت الامارات

العربیہ" ہو گا۔ اس کے قیام کے بارے میں جو اعلان ہوا

اس سے پوری دنیائے عرب میں خصوصیت کے ساتھ خوشی

کی لہر دوڑ گئی۔ خوشی اس لئے زیادہ ہوئی کہ اتحاد کے

قیام کے لئے دبئی میں جو میٹنگ جاری تھی اس میں آخر وقت

تک اختلاف موجود تھا۔

نئی اسٹیٹ کے قیام سے متعلق اعلان میں بتایا گیا

کہ نئی اسٹیٹ کے عبوری دستور میں دستخط کئے جا چکے ہیں اور

ضروری قوانین کی تیاری کے لئے کمیٹیاں بنا دی گئی ہیں۔ رقبہ

(۳۰ ہزار مربع میل) اور آبادی (مجموعی طور پر صرف دو لاکھ)

کے لحاظ سے یہ ریاستیں بہت چھوٹی ہیں اس لئے ماضی کی

اپنی پوری تاریخ میں خلافتِ عثمانیہ کے کمزور ہونے تک یا تو

کسی نہ کسی عرب ملک یا کسی حملہ آور کے ماتحت رہی ہیں۔

اس وقت بھی انھیں برطانیا کا تحفظ حاصل تھا اور وہی

ان ریاستوں کے امورِ خارجہ کے لئے ذمّے دار تھا۔ لیکن اس

نے جنوری ۱۹۶۸ء میں اعلان کیا کہ وہ ۱۹۷۱ء کے اختتام

تک اس علاقے کو خالی کر دے گا۔ اس لئے انھوں نے

ایک وفاق قائم کر لیا ہے تاکہ برطانوی انخلا سے جو

طاقتی خلا پیدا ہو گا اس کی کسی حد تک تلافی ہو سکے۔

برطانیا کو ۱۸۵۳ء اور ۱۸۹۲ء کے معاہدوں کے تحت

ان ریاستوں کے تحفظ کی ذمّے داری سونپی گئی تھی۔

راس الخیمہ کی ایک اور چھوٹی ریاست ہے جو ابھی

وفاق میں شامل نہیں ہوئی ہے۔ اس کی یہ وجہ بتائی گئی ہے

کہ اس کی طرف سے کچھ ترمیمات پیش کی گئی تھیں جو منظور

نہیں کی گئیں۔

مثلاً ایک ترمیم یہ تھی کہ تیل پیدا کرنے والی حکومتوں کی

[illegible]

...طریقے پر کسی طرف سے کوئی انحراف نہ ہو۔ اس کے علاوہ

اس اتحاد میں شریک ہو جانے کے [illegible] ابو ظہبی کے حاکم شیخ

زاید بن سلطان آل نہیان اتحاد و یکجہتی کے سلسلے میں

بڑی نمایاں دلچسپی لے رہے ہیں اور خلیج فارس کی تمام

ریاستوں کے اتحاد پر زور دے رہے ہیں۔

جغرافیائی اعتبار سے اس نئی عرب اسٹیٹ کو فوجی

نقطۂ نظر سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گی۔ اس کی اس

اہمیت میں اس کے بری، فضائی اور بحری مواصلات کا

بڑا دخل ہے کیونکہ اس اسٹیٹ کا علاقہ جزیرہ نمائے عرب

سے بحرِ ہند میں داخلے کے لئے ایک اہم گزرگاہ کی حیثیت رکھتا

ہے۔ اس نو مولود اسٹیٹ کی سرحدیں عمان سے ملی ہوئی

ہوں گی۔ ابو ظہبی ریاست سے شروع ہو کر خلیج کے ساحل عرب

طول میں پھیلی ہوں گی۔ دوسری طرف خلیج کے مدخل سے

گزر کر خلیج عمان کے ساحل پر واقع ریاست فجیرہ تک

پھیلی ہوں گی۔

اقتصادی اعتبار سے یہ نئی ریاست دنیا کے مالدار ترین

ممالک میں سے ایک ہو گی۔ اس لئے کہ یہ علاقہ آمدنی کے قدرتی

ذرائع سے مالا مال ہے۔ اندازہ ہے کہ ایک فرد کی آمدنی

کا سالانہ اوسط ڈھائی ہزار ڈالر ہو گا۔

راس الخیمہ کے علاوہ بحرین اور قطار کی دو اور ریاستیں

ہیں جو ابھی تک فیڈریشن میں شامل نہیں ہوئی ہیں۔

اوّل الذکر کے متعلق یقین ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ جلد شامل

ہو جائے گی۔ لیکن دوسری دو ریاستوں کی شمولیت کا کوئی

امکان نظر نہیں آتا۔

اس کے برعکس بحرین نے ۱۵ اگست کو اپنی مکمل آزادی

کا اعلان کر دیا اور اس کی اس آزادی کو ایران، متحدہ عرب

جمہوریہ اور امریکا تک نے تسلیم کر لیا۔ دوسرے ممالک

بھی توقع ہے اسے تسلیم کر لیں گے۔

بحرین مجوزہ فیڈریشن میں اس لئے شامل نہ ہو سکا کہ

مجوزہ وفاقی کونسل میں اس نے مناسب نمائندگی کا جو مطالبہ

کیا تھا اسے مسترد کر دیا گیا۔ اسے شاید اس لئے منظور نہیں

کیا کہ اس طرح کونسل دراصل سب ریاستوں کی نہیں بلکہ

بحرین کی کونسل بن کر رہ جاتی اور اس میں دوسری ریاستوں

کی کوئی آواز نہ ہوتی، اس لئے کہ اکیلے بحرین کی آبادی دوسری

ریاستوں کی مجموعی آبادی کے برابر ہے۔ یعنی دو لاکھ [illegible]

بقیہ صفحہ [illegible]

راس الخیمہ کو اصرار تھا کہ ووٹنگ بالاتفاق ہو جب کہ

دوسرے نمائندوں نے اکثریت کی بنیاد پر ووٹنگ کو

منظور کر لیا۔

شاہد صدیقی

آپ گنجے سر پر بال اُگا سکتے ہیں

. شیر، دریائی گھوڑے، مگرمچھ، بلی، گھونس، بارے
انپ کی چربی لے کر اسے ملا لیجئے اور آہستہ آہستہ اپنی چاند
ے یہ تھا گنجے سر پر بال اگانے کا پہلا محفوظ نسخہ۔
جسے پانچ ہزار سال پہلے کسی گم نام مصری نے لکھا
اور جو آج بھی ایبس پائیپرس میں محفوظ ہے۔
اس نسخے میں صرف ایک کمزوری ہے (تمام چیزیں
نے کی دشواری کے علاوہ) اور وہ یہ کہ یہ کامیاب
ہے۔ لیکن بہت سے گنجے کئی سو سال تک اس نسخے پر
نے کی کوشش کرتے رہے۔

یران میں (۶ سو سال قبل مسیح) بچے کے مونڈن کے
رہبی پیشوا بہت سی دعائیں پڑھتے تھے تاکہ بچہ کبھی
و۔ فی تیبلے کے کچھ قبائلی جادوگر ڈاکٹروں نے قبیلے
ار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بال کٹوانے کے بعد ہمیشہ
ن کھایا کرے تو وہ کبھی گنجا نہیں ہوگا۔ اس عمل
دار کے بال تو محفوظ نہ رہ سکے البتہ وہ بہت
مرا۔

باکے دولت مند ترین آدمی روک فیلر نے بال اگانے
نئی دوائی۔

کی دواؤں پر کروڑوں ڈالر خرچ کر دیئے لیکن اسے کوئی
فائدہ نہیں ہوا تاآخر مجبور ہو کر اسے وگ کا سہارا لینا پڑا جو اس
کے سر پر ۵۰ سال تک جمی رہی۔

آج امریکا کے ۴۳ فیصدی مردوں اور ۸ فیصدی عورتوں
کو بالوں کے اڑنے کی شکایت ہے۔ یہ امریکن بال محفوظ رکھنے
کی دواؤں پر اتنے روپے خرچ کرتے ہیں جتنے تمام طبی
تجربات اور معلومات پر بھی نہیں ہوتے۔ یہ لوگ کروڑوں ڈالر
طرح طرح کے لوشن، تیل، کریم، دوائوں، انجکشنوں، بجلی
کے تولیوں، لیمپوں، گرم گدوں اور طرح طرح کے شعاعی اور
بجلی کے علاجوں پر صرف کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں سے معلوم کیا
جاتا ہے کہ ہیٹ پہنا جائے یا نہ پہنا جائے۔ سر کو دھوپ لگنے
دی جائے یا نہ دی جائے۔ بالوں کو جلدی جلدی کٹوایا جائے
یا بالکل نہ کٹوایا جائے۔ بالوں کو دھویا جائے یا نہ دھویا جائے
اور اگر دھویا جائے تو کس چیز سے۔ صابن، شیمپو یا صرف
سادے پانی سے۔ شادی کی جائے یا زندگی بھر کنوارے ہی
رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ تمام قدیم اور جدید تدبیریں
اور ترکیبیں ایک بال بھی اگانے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ لیکن پھر
بھی وہ لوگ جن کے سر ابھی تک محفوظ ہیں اپنے بالوں کے بارے
میں فکرمند رہتے ہیں۔ خاص طور پر تیس سال کی عمر سے اوپر کے
۱۸ میں سے آٹھ آدمی، جن میں سے تین بالکل گنجے، تین آدھے
گنجے اور گنجے ہونے کی منزل کی طرف گامزن ہیں ہر وقت اس
فکر میں گھلتے رہتے ہیں۔

حالانکہ انسانی جسم کے لئے بالوں کی کوئی اہمیت نہیں
ہے پھر بھی بالوں کو عورت کی خوب صورتی کی نشانی اور مرد
کی طاقت اور جوانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ پھر گنجے آدمی
کو لوگ چین بھی نہیں لینے دیتے۔ شاعر، سیاستداں، ناول
نویس، مزاح نگار، آرٹسٹ غرضیکہ سب ملکر ہر وقت
چمکتی چاند والوں کی مانگ کھینچنے کی فکر میں رہتے ہیں حالانکہ
یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر شاعر، آرٹسٹ اور سیاستدان
خود بھی گنجے ہوتے ہیں۔

جب بال گرنے شروع ہوتے ہیں تو مرد بہت زیادہ
پریشان ہو جاتے ہیں اور انکی راتوں کی نیند تک اڑ جاتی ہے
بہت سی دوائیاں استعمال کرنے کے بعد انھیں پتا لگتا ہے
کہ ان کے گرتے ہوئے بالوں کو صرف ایک چیز روک سکتی ہے
اور وہ ہے زمین۔

گنجوں نے پریشان ہو کر اب جگہ جگہ اپنے کلب اور
ایسوسی ایشن بنالی ہے۔ پچھلے دنوں دہلی میں گنجوں کی بین الاقوامی
انجمن کی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت نیم گنجے ڈاکٹر دیویندر
اندر کمار گجرال نے کی۔

گنجوں کا کہنا ہے کہ گنجا ہونا انسانیت کی نشانی ہے

بقیہ صفحہ ۵۵ پر

شہزادی زیب النساء کی حاضر جوابی

تاریخ کے صفحوں پر مغل شہنشاہوں اور خواتین کی بیشمار کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ شاہان مغلیہ کی چھ نسلوں نے ہندوستان پر تین سو سال تک حکومت کی ہے۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں سے تاریخ ہند کے اوراق منور ہیں۔

شہنشاہ بابر کی خود نوشت سوانح حیات "تزک بابری" کا بہترین ادبیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ ہمایوں خود شاعر و ادیب تھا۔ اس نے نہایت خوبصورتی پیار اور خلوص سے ہندوستان کے دلکش مناظر کے گیت گائے ہیں۔ صرف اکبر اعظم ہی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن علم حاصل کرنے کا اسے بے حد شوق تھا۔ اس کے دربار میں عالم و فاضل، شاعر و ادیب، مصور و مورخ کی قدر کی جاتی تھی۔ اور انہیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔

واقعات نئی دلی

۱۶۰۵ء میں جب اکبر کا دور ختم ہوا تو جہانگیر تخت نشین ہوا۔ شہنشاہ جہانگیر نے بھی مختلف زبان کے شعراء و ادباء کی سرپرستی فرمائی۔ بعد ازاں شاہجہاں کا سنہری دور شروع ہوتا ہے۔ شاہجہاں کو حسن و علم کی نفاست بہت پسند تھی چنانچہ وہ عالموں، شاعروں، مصوروں اور سنگ تراشوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے شاہی خزانے سے انعام و اکرام دیا کرتا تھا۔ شاہجہاں کے انتقال کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کا عہد شروع ہوا۔

شہزادی زیب النساء شہنشاہ اورنگ زیب کی چہیتی بیٹی تھی۔ جو فارسی زبان کی مایۂ ناز باکمال شاعرہ تھی۔ جس کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور علمی و ادبی کارناموں کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دُور دراز ملکوں تک پہونچ چکی تھی۔ شہزادی نہایت ہی خوبصورت اور ذہین تھی۔ جو باتیں ایک سراپا حسن عورت میں ہونی چاہئیں وہ سب اس میں بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ طبع سلیم، ذہن رسا، فکر بلیغ اور نکتہ سنج اس سے بہتر شاہی خاندان میں کوئی عورت نہ تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب اور ملکہ دلرس بانو اپنے دوسرے بچوں سے زیادہ اس کی ناز برداری کیا کرتے تھے۔

مورخین کے بیانات سے زیب النساء کی ذہانت و ذکاوت اور اس کے ادبی ذوق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ و ادب کی چند معتبر کتابوں مثلاً "بحر الفصاحت" "کنز الادب" سے شہزادی کی حاضر جوابی کے چند دلچسپ واقعات پیش ہیں۔

(۱) ایک خادمہ کا شوہر فوج میں ملازم تھا۔ اور وہ معمولی درجہ کا پست ہمت اور بزدل تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے شوہر کی جرأت و شجاعت کے افسانے بیان کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میدان جنگ سے اطلاعات موصول ہوئیں تو اس خادمہ نے حسب عادت کہا میں نے سنا ہے کہ آج میرے شوہر نے میدان جنگ میں سیکڑوں دشمنوں کے سر کاٹ لئے۔

شہزادی نے مسکرا کر کہا۔

ہاں ضرور کاٹے ہوں گے۔ کیونکہ میدان جنگ میں بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

(۲) ایک مرتبہ شاہی باغ میں ایک سڑک بن رہی تھی۔ اور وہاں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ "اس راستہ سے آہستہ جایئے" ایک دن زیب النساء گھوڑے پر سوار ہو کر اسی راستے سے گذری اور گھوڑے کو اس قدر تیز بھگایا کہ بے قابو ہو کر گر پڑی۔ بادشاہ بہت ہی فکر مند ہوا۔ اور اسی وقت بغرض عیادت شہزادی کے کمرے میں داخل ہو کر زیب النساء سے مخاطب ہوا بیٹی کیا تم نے یہ اعلان لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ کہ اس راستہ سے آہستہ چلئے۔

زیب النساء نے کہا۔

جی ہاں! ابا حضور اعلان پڑھا تھا۔ مگر میں نے سمجھا کہ یہ اعلان اُن لوگوں کے لئے ہے۔ جو پیدل چلتے ہیں۔

(۳) ایک استانی زیب النساء کو تاریخ ایران پڑھا رہی تھی کمرے میں ایران کا نقشہ آویزاں تھا۔ استانی نے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا دیکھو یہ ایران کا نقشہ ہے۔ بتاؤ اس میں شیراز کہاں ہے؟ زیب النساء نے نقشے کی طرف دیکھ کر کہا شیراز ایک بڑا شہر ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اتنے چھوٹے نقشے میں آجائے۔

(۴) ایک رئیس کی بیوی اکثر زیب النساء کی خدمت میں حاضر ہوتی تھی۔ اس عورت کو اپنے متعلق یہ غلط فہمی تھی کہ وہ ایک باکمال شاعرہ ہے اور اس کا کلام لاجواب ہے۔ حالانکہ اس کے اشعار نہایت مہمل اور بے معنی ہوتے تھے۔ شہزادی اس کے اشعار سننا بالکل پسند نہ کرتی تھی۔ لیکن وہی خاتون حاضر ہوئی اور کہنے لگی شہزادی صاحبہ آج میں نے ایک بہترین نظم آپ کو سنانے کے لئے لکھی تھی لیکن اتفاق سے جس کاغذ پر نظم تحریر کی تھی، میرے بچے نے اس کاغذ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔

زیب النساء نے کہا! تمہارا بچہ پیٹ ہی سے سخن شناس پیدا ہوا ہے۔

(۵) ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب اپنی جائے نماز پر دو اشرفیاں بھول گیا۔ اور زیب النساء نے وہ اشرفیاں اٹھالیں ملکہ دلرس بانو بھی اُن اشرفیوں کو دیکھ چکی تھیں ملکہ نے زیب النساء سے کہا بیٹی زیب النساء! تمہارے والد کی جائے نماز پر دو اشرفیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ غائب ہیں۔ جائے نماز کے قریب تم گئی تھیں یا میں۔ سوائے ہم دونوں کے کسی اور کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ اشرفیوں کو ہاتھ لگائے۔ زیب النساء نے کہا۔

امی جان! یہ بات فضول ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ایک اشرفی آپ حلال رکھ دیجئے اور ایک میں رکھ دوں۔

(۶) ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک ایرانی عورت ملکہ دلرس بانو کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور اس نے ملازمت کے لئے درخواست پیش کی۔ ایرانی عورت حد سے زیادہ سیاہ فام تھی ملکہ نے دریافت کیا۔ تو ایران کی رہنے والی ہے۔ لیکن رنگ اس قدر سیاہ کیوں ہے؟ زیب النساء اس موقع پر موجود تھی۔ اس نے فوراً کہا۔

امی جان! شاید اسے رات کی تاریکی میں پیدا کیا ہے بچھنے۔

مکرمی و محترمی صدیقی صاحب سلام و خلوص

زیرِ نظر داستان "ٹھنڈے شعلے" میری اپنی اُپج نہیں ہے بلکہ واقعی قصہ سندیلا کے بزرگوں کی زبانوں سے صدیوں سے سُنی جاتی رہی ہے اور آج بھی وہاں کے بزرگ اس قصے کو بڑے وثوق اور بڑی عقیدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ میں نے جو کچھ مختلف اشخاص کی زبان سے مختلف انداز میں سُنا ہے اسے اپنے لفظوں میں پیش کر رہا ہوں۔

سلیم عادل۔

عشق کے دو متوالے شہیدوں کی یہ حسرت انگیز داستان صدیوں سے سندیلا کی بستی میں زبان زدِ خاص و عام ہے اور مختلف زبانوں سے مختلف انداز میں سنی جاتی ہے۔ بنگال کے مشہور مصنف اور عظیم کردار نگار جناب سپیندر مجومدار نے محبت کے بارے میں کہا ہے:۔

"یہ وہ جذبہ ہے جو آپ ہی اپنی تقدیر ہے اور اپنے مستقبل کے نقوش خود کھینچتا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انجام کی پروا کیے بغیر شعلوں کو ہوا دیتا رہتا ہے۔"

کوئی نہیں جانتا کہ اس عجیب و غریب داستان میں کتنی حقیقت ہے اور گزری ہوئی صدیوں نے اس میں پرپرزے لگا کر کہاں تک مبالغے کی آمیزش کی ہے۔ لیکن جب میں اس داستان کو لکھنے بیٹھا ہوں تو میں نے تھوڑی دیر کے لئے اسے حقیقت تسلیم کر لیا ہے تاکہ جو کچھ بھی میں نے سُنا ہے اسے انصاف کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دوں۔

اقصات نئی دہلی

وہ نہایت شرمیلا، معصوم اور خاموش صفت تھا۔ اس کی کم گوئی اس کے ہم جماعتوں میں ایک داستان کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب طالب علم چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنے معلم سے درس لیا کرتے تھے اور اس کے بعد دوسرا درجہ دیا جاتا تھا۔ سندیلا کے ایک صاحب جو معلم بھی تھے اور لپشکر داری کی وجہ سے اور بستی کے لوگ انکا بیحد احترام کرتے تھے۔ وہ حکیم صاحب کا شاگرد تھا۔ اور چونکہ بچہ ذہین اور منکسر المزاج تھا اس لئے حکیم صاحب اس پر مہربان تھے۔

اس کا نام رضوان لیکن اپنے رکھ رکھاؤ میں اتنا سادہ اور نیک تھا کہ لوگ اسے مولوی کہہ کر پکارتے

[illegible]

…بھی تیز

…شریف اور سعادت مند تھا۔ آٹھ برس سے
…تھا کہ صبح ناشتہ کرنے کے بعد بستہ بغل میں
…سے نکلتا اور سر جھکائے ہوئے ٹھیک وقت پر
…کے مکان کے سامنے سے گزرتا ہوا حکیم صاحب
پہونچ جاتا۔ حصولِ علم کے ساتھ ہی حکیم صاحب کے
…کا ہاتھ بٹانا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔

سردیوں کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات تھی۔ رضوان کو
…حکیم صاحب کے یہاں سے واپسی میں بہت دیر ہو گئی
…تھا اس کے جسم پر صرف ایک باریک کرتا اور پاجامہ تھا
…سردی سے کانپ رہا تھا۔ یہ بھی بالکل اتفاق تھا کہ خلافِ
…معمول مرغ راستہ طے کرتے ہوئے اس کی نظریں
…کے چبوترے کی طرف اٹھ گئیں۔

…ہی حلوائی کی نوجوان لڑکی تارا کھڑی ہوئی تھی۔
…میں مانجھنے مانجھنے تھک کر یوں ہی ستانے کے لئے
…پر نکل آئی تھی۔ راکھ اور کالک میں لتھڑے ہوئے
…ہاتھ جسم چاندنی میں چمک رہے تھے۔ رضوان کی نظریں
…سے ٹکرائیں اور وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا ہی
…کیوپڈ تیر چلا چکا تھا۔ رضوان محسوس کر رہا تھا جیسے
چاندنی سمٹ کر چبوترے پر اتر آئی ہو یا پھر دودھیا
…کی یہ کرنیں اس نوخیز حسینہ کے چہرے سے پھوٹ
…کائنات پر بکھر رہی ہوں۔ وہ بے خودی میں ٹکٹکی باندھے
…دیکھتا رہا۔ تارا کی نگاہیں بھی اس کے چہرے پر جم کر
…گئیں۔ دونوں خاموش تھے اور بت بنے ہوئے
…نگاہوں سے ایک دوسرے کے دل میں اتر جانے کی
…کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اضطراری طور پر تارا کا
…ہاتھ اٹھ کر پیشانی تک چلا گیا اور اس کی چوڑیاں گنگنا اٹھیں
…چوڑیوں کی کھنک پر چونکا۔ کچھ دیر تک جھلملاتی ہوئی
…نیلے خلا میں گھورتا رہا پھر سر جھکا کر خاموشی سے
…راستے پر چل پڑا۔

گھر پہونچ کر وہ خاموشی سے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کا
جسم پسینے سے اس طرح شرابور تھا جیسے ابھی تک وہ کسی
…چٹان سے لگا رہا ہو، کمزور اور بیمار ہو۔ ماں نے اسے آواز
…دی تو چونکا۔

بات بھی ایسی تھی وہ ہمیشہ اپنی ناک ہی اٹھا اس کے
پاس پہونچ جانے کا عادی تھا۔

"کیا بات ہے رضوان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تیری؟"
ماں نے سوال کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا ہی تھا
کہ چونک پڑی۔

"ارے تو تو پسینے میں نہایا ہوا ہے۔ کیا ہو گیا ہے تجھے؟" وہ
رضوان کا جسم ٹٹولنے لگی۔

"میں پگھل رہا ہوں امی۔ میرے اندر سویا ہوا جہنم جاگ پڑا
ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"بخار ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب سے دوا کیوں نہیں لیتا
آیا۔" ماں نے اسے ڈانٹا لیا۔

"یہ بخار نہیں ہے امی۔ میری آزمائش کا دور شروع ہو رہا
ہے۔ خدا نے مجھے زبردست آزمائش میں ڈال دیا ہے۔"

صبح اٹھا تو رضوان کی طبیعت ٹھیک تھی۔ جیسے رات بھر
میں وہ اپنی ذہنی کشمکش پر قابو پا گیا ہو۔ اپنے معمول کے مطابق
اس نے ناشتے کے بعد کچھ کتابیں بغل میں دبائیں اور حکیم صاحب
کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ چندر کے گھر کے قریب پہونچ کر اس کے
قدم خود بخود رک گئے اور نظریں چبوترے پر جا ٹھہریں۔ تارا
وہاں مجسم انتظار بنی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ چند لمحوں تک ساکت
و صامت کھڑا ہوا اس ملکوتی حسن کے پیکر کو تکتا رہا۔ دونوں
کی نظریں ایک دوسرے کے پرسکون چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔
لیکن عجیب بات تھی کہ نہ تو رضوان کی آنکھوں میں تارا کے لئے کوئی
اضطراب تھا نہ تارا کی نگاہوں میں کسی قسم کا سوال۔ ایسا لگتا تھا
جیسے سوال و جواب کی حدود کو وہ ایک ہی جست میں پار کر گئے
ہوں۔ ایک ہی نگاہ نے دونوں کو عشق کی اس منزل سے آگے
پہونچا دیا ہو جہاں تک عقل راہ نمائی کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد
رضوان نے نظریں جھکا لیں اور آہستہ سے آگے بڑھ گیا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے لیکن
رضوان کے دستور میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہر صبح حکیم صاحب
کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے کچھ دیر چندر کے گھر کے
سامنے کھڑا ہوتا جہاں حسبِ معمول تارا اسے کھڑی ہوئی نظر آتی۔
دونوں کی نظریں ٹکراتیں اور کچھ دیر تک خاموش سوال و جواب
ہوا کرتے۔ اس کے بعد رضوان اپنی راہ چلا جاتا اور تارا گھوم کر
گھر کے اندر داخل ہو جاتی۔ لیکن اس طویل عرصے میں دونوں میں

[illegible]

رفتہ رفتہ ان گونگے عاشقوں کی بات محلے میں پہلے پہلے
بازار تک پہونچ گئی۔ ساری بستی میں چرچے ہونے لگے کہ رضوان
چندر کی موہنی پیکر تارا پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اب لوگوں کی یہ چہ میگوئیاں
کانا پھوسی کی حد سے گزر کر بلند بانگ طعنوں تک پہونچ گئی تھیں۔
لوگ چندر پر لعنت ملامت کی بوچھار کر رہے تھے لیکن وہ بیچارا
کیا کر سکتا تھا اس نے ایک مرتبہ بھی تو تارا کو رضوان سے قریب
ہوتے ہوئے یا رضوان کو تارا سے گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا
تھا۔ حد یہ تھی کہ کوئی اس بات کا شاہد نہ مل سکا جو کہتا کہ
دونوں نے کبھی دور ہی سے ایک دوسرے کو اشارے کئے ہوں۔
دوسری طرف رضوان بھی نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ لوگ رفتہ رفتہ
اس کے مخالف ہو رہے تھے۔ ایک مرتبہ تو خود حکیم صاحب
بھی اس پر کافی برہم ہوئے۔ لیکن رضوان کے ابرو پر کوئی بل
نہیں تھا۔ وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح خاموش و پرسکون تھا۔ اس کا
یہ اطمینان ہی دراصل اس کے مخالفوں کو غصہ دلانے لگا تھا
وہ ہر ایک طنز اور سرگالی کو سن کر خندہ پیشانی سے مسکرا دیتا
تھا۔ لیکن اپنے اصول میں اس نے کوئی فرق نہیں آنے دیا۔
حکیم صاحب کی سرزنش جب حد سے بڑھ گئی تو ایک دن اس
نے کہا:۔

"میرے محترم بزرگ! میری مجال نہیں کہ آپ کے سامنے
زبان کھولوں۔ آپ ہی کی پاپوش کے طفیل مجھے جنت کی بشارت
ملی ہے۔ آپ کا غصہ بجا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت
خود بخود آپ کے سامنے سورج کی طرح روشن ہو جائے گی
اس لئے میں چپ ہوں۔" حکیم صاحب نے غور سے اس کی طرف
دیکھا اور چپ ہو گئے۔

اسی دن کچھ دیر کے بعد ایک واقعہ رونما ہوا کہ حکیم صاحب
کی آنکھیں حیرت کے مارے پھیل گئیں اور آنکھوں کے سامنے
اندھیرا چھانے لگا۔ ہوا یوں کہ وہ مولوی کو کوئی نسخہ لکھوا رہے
تھے کہ اچانک ایک لمبی "سی" کی آواز کے ساتھ قلم رضوان
کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے رضوان؟" حکیم صاحب حیرت
سے اسے دیکھنے لگے۔

"انگلیوں میں سوزش ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں
جل گیا ہوں۔ جیسے میرا ہاتھ کھولتے ہوئے تیل میں ڈوب گیا

کالے شیطان کی اولاد ہوتے ہیں

لڑکی جس نے رنگ بدل لیا۔

برطانیہ کے ایک اخبار کی رپورٹر مس اینتھیا ڈسنکز نے کالوں کے ساتھ گوروں کا برتاؤ دیکھنے کے لئے کچھ دن کیلئے اپنا رنگ بدل لیا اور لندن کی سیر کی۔

بات حیرت انگیز ضرور ہے لیکن سائنسی معلومات رکھنے والوں کے لئے زیادہ اہم نہیں۔ آج جبکہ عورت کو مرد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور مرد کو عورت میں تو رنگ تبدیل کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ بلکہ امریکا میں کالے لوگوں کی کافی بڑی تعداد ایسی موجود ہے جو دواؤں کے استعمال سے اپنے کالے رنگ کو بھورے یا گندمی رنگ میں تبدیل کر لیتے ہیں ——— اینتھیا کو برطانیہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کے مسائل سے کافی دلچسپی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان کے مسائل کا مطالعہ باہر سے نہیں بلکہ ان کے اندر جا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کام کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنا رنگ تبدیل کرے۔

رنگ کی تبدیلی کے لئے اینتھیا نے پورٹو ریکو میں ڈاکٹر

واقعات نئی دہلی

لارنس فلیشر سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر فلیشر نے جو کھال کی بیماریوں کے بہت بڑے ماہر ہیں اینتھیا کو کھانے کو کچھ گولیاں دیں۔ اینتھیا نے ہر روز بارہ کیپسول کھائے اور گھنٹوں دھوپ میں بیٹھ کر گذارے۔ اینتھیا کا رنگ کچھ ہی دنوں کے بعد حیرت انگیز طور پر گورے سے گہرا سانولا ہو گیا۔ اینتھیا نے اپنے بال اور بھویں کالی رنگ لیں اور اب وہ مکمل ہندوستانی لڑکی بن چکی تھی۔

لندن واپس آ کر اینتھیا ایک ہندوستانی لڑکی کے بھیس میں ہندوستانیوں کے علاقے میں رہنے لگی۔ اس طرح اس نے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو پیش آنے والے بہت سے مسائل کے بارے میں معلومات حاصل کیں، بہت سے سبق سیکھے اور تجربات حاصل کئے۔ بہت سے ہندوستانیوں نے اس سے محبت تک کا اظہار کیا مگر گوروں اور خود کالوں میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مکان حاصل کرنے میں اسے بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک عورت نے اسے کالے شیطان کی اولاد بتایا۔ اینتھیا نے اپنے تجربات کو قسط وار لندن کے کچھ اخبارات میں شائع کیا جسے لوگوں نے بہت دلچسپی سے پڑھا۔

لیکن کچھ دن بعد اینتھیا پھر اپنے اصلی رنگ میں لوٹ آئی اور اسے ایک بار پھر ہندوستانی سے انگریز بن جانا پڑا۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے اپنا ہندوستانی رنگ روپ زیادہ پسند تھا۔

اکثر ... کے ... اقلیتوں کے مسائل [illegible]

ہندوستانی لڑکی کی صورت میں میری ملاقات بہت سے ہندوستانی لڑکوں سے ہوئی۔ وہ لوگ میرا اصل روپ نہیں پہچان پائے دو تین نے تو محبت تک کا اظہار کر دیا۔

کیونکہ ہندوستانی بہت زیادہ غریب ہوتے ہیں اس لئے بہت
زیادہ تول مول کے بھی عادی ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی خریداری
کرتے وقت خوب بھاؤ تاؤ کیا۔
جس طرح چاند گرہن کے موقع پر چاند آہستہ آہستہ کالا پڑتا جاتا ہے۔
بالکل اسی طرح میرا رنگ بھی دھیرے دھیرے کالا ہوتا چلا گیا۔
اس ساری بلاؤز کے اندر کیا میرے ہندوستانی ہونے میں کچھ شک ہے؟
کمال تو ہندوستانی ہے لیکن کپڑے۔۔۔؟

کناڈا کے وزیر اعظم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ امریکا کے ساتھ رہنا گویا ہاتھی کے ساتھ رہنا ہے کہ وہ کتنا ہی دوست اور کتنا ہی خلیق بن جائے مگر بہر حال ہے پھر بھی جانور ہی ۔ جب بھی چھینکے گا یا دھاڑے گا ہر آدمی چونک پڑے گا۔"

امریکا ڈالر کے معاملے پر چوکا ہے اور اس نے تمام دنیا کو چونکا دیا ہے ۔ تمام بین الاقوامی مارکیٹوں میں ایک ہلچل مچ گئی ہے ۔ ہر ملک اپنی اپنی اقتصادی حالت کا جائزہ لے رہا ہے ۔ باہم مشورے ہو رہے ہیں ۔ یورپین مارکیٹ تک میں الٹ پلٹ ہو گئی ہے کیونکہ کسی معمولی بلی کی آواز نہیں بلکہ یہ ہاتھی کی چنگھاڑ تھی ۔ ورنہ کوئی دوسرا ملک اپنی کرنسی میں رد و بدل کرتا ہے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی ۔

کہتے ہیں امریکا نے یہ کارروائی اس لئے کی ہے تاکہ ڈالر کی بگڑتی ہوئی حالت کو بچایا جا سکے ۔ اور بین الاقوامی دنیا میں امریکا کی ساکھ کو نہ گرنے دیا جائے ۔ بعض ممالک کے خیال میں یہ قدم قدر زر میں کمی کے مترادف ہے ۔ صاف اس لئے نہیں کہا گیا کہ اس سے امریکا کی ساکھ گرتی ۔

ایسے اقدام کی ضرورت کیوں پیش آئی ۔

دراصل گذشتہ ۲۰ برس سے امریکی تجارت کا توازن مجموعی طور سے اس کے حق میں نہ تھا اسے امریکا برداشت کرتا آ رہا تھا ۔ لیکن پچھلے دنوں جب اس نے دیکھا کہ تجارتی توازن ہر ماہ امریکا کے خلاف جا رہا ہے تو امریکی ماہرین اقتصادیات کے کان کھڑے ہوئے ۔ اور ایک ہفتے کے چوٹی کے مشوروں کے بعد صدر نکسن نے "اقتصادیات کے میدان" میں وہ دھماکہ چھوڑا کہ سب بھونچکے رہ گئے ۔

اپنی اقتصادی حالت کو درست کرنے کے لئے امریکا نے کئی اقدامات کئے ہیں ۔ مثلاً انھوں نے ڈالر کو سونے میں تبدیل کرنے کے لئے امریکا کے ۳۰ سالہ وعدے کو کالعدم قرار دے دیا ۔ اب غیر ملکی خزانے اور سنٹرل بینک ڈالر کو [illegible] ے ہوئے کی فی آونس ۳۵ ڈالر کی قیمت میں کوئی تبدیلی کا اعلان نہیں کیا ۔ یہ قیمت ۱۹۳۴ء میں روز ویلٹ نے مقرر کی تھی)

۲۔ ایسی درآمدات پر جن پر ڈیوٹی لگتی ہے دس فیصدی کا سرچارج وصول کیا جائے گا ۔

۳۔ ۹۰ دن تک تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا ۔

۴۔ اس وقت جو غیر ملکی امداد (سالانہ تقریباً ۱½ ارب ڈالر) دی جا رہی ہے اس میں دس فیصدی کی تخفیف کی جائے گی ۔

۵۔ چالو مالی سال کے اخراجات کے بجٹ میں ۴ ارب ، کروڑ ڈالر کی کمی ہوگی ۔ اس میں سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں ۵ فیصدی کی تخفیف شامل ہے ۔

نکسن صاحب کہتے ہیں اس سے ان کا مقصد ملک کی اقتصادیات کو بہتر بنانا ہے ۔ لیکن ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سیاسی اعتبار سے وہ اپنی بگڑتی ہوئی پوزیشن کو بچا سکیں ۔ ایک دھماکا انھوں نے چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر کیا تھا اور دوسرا دھماکا اب اقتصادی دنیا میں کیا ہے اور ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے ایسا نظر آتا ہے جیسے وہ وزیر اعظم ہند کی نقل کر رہے ہوں جنہوں نے پچھلے دنوں ہندوستانی اقتصادیات کو مضبوط کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے تھے اور پورے ہندوستان کی ہمدردی حاصل کر کے اپنی پوزیشن کو مضبوط و مستحکم کر لیا تھا ۔

شاید مسٹر نکسن بھی اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء کے صدارتی الیکشن میں اگر خود نہ بچ سکیں تو کم از کم ڈالر تو بچا لے جائیں ۔

اس ڈالر کو ویت نام کی جنگ کھا گئی اور جو بچا ہے اسے اب بنگلا دیش کھا جائے گا ۔

مراکش

وعدے ہی وعدے

گزشتہ ماہ مراکش میں انقلاب لانے کی کوشش ان نوجوانوں کی تھی جو ملک میں پھیلی ہوئی کرپشن سے سخت نالاں تھے ۔ خود شاہ حسن نے اپنی ڈرامائی تقریر میں اقرار کیا ہے کہ

واقعی ملک بدعنوانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اصلاحی اقدام کریں گے۔ اور انھوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اچانک اپنی کابینہ کو برخاست کر دیا۔ ان میں ان کے معتمد وزیر داخلہ محمد عفکیر بھی تھے جنھوں نے بغاوت کو انتہائی سختی کے ساتھ کچل دیا تھا۔

شاہ حسن نے ملک میں وسیع پیمانے پر اصلاحات جاری کرنے کا بھی فیصلہ کیا اور وعدہ کیا کہ وہ بے زمینوں کو زمین دیں گے اور عوام کے لئے بڑے پیمانے پر تعلیم کا انتظام کریں گے (تاکہ وہ محض ٹیلی ویژن پر اپولو کو نہ دیکھیں بلکہ خود بھی خلاباز بن سکیں۔) نیز ایسے اقدامات کریں گے کہ کرپشن کا قطعی طور پر خاتمہ ہو سکے۔

ملک میں موجودہ برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے شاہ حسن نے مراکش کی سیاسی پارٹیوں، یونینوں، ممتاز شخصیتوں اور عام لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی اپیل کی۔ لیکن دوسرے ہی دن شاہ نے محمد کریم لمرانی کی قیادت میں ایک نئی کابینہ کے قیام کا اعلان کر دیا اور ترقی پسندوں کے متحدہ محاذ کو نظر انداز کر دیا۔ انھیں کابینہ میں کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس طبقۂ امراء سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کو وزیر اعظم بنا کر محمد عفکیر کو وزیر دفاع بنا دیا جس سے کہ عوام انکی سخت گیرانہ پالیسی کی بنا پر بے حد نفرت کرنے لگے ہیں۔

محمد عفکیر کی وزارت میں شمولیت کا عوام یہ مطلب لے رہے ہیں کہ شاہ نے اصلاحات کا جو وعدہ کیا ہے وہ محض ایک فریب ہے۔ جب تک حسن پارلیمنٹ کو توڑنے اور اپوزیشن کے کچھ مطالبات کو منظور کرنے اور رفتہ رفتہ اپنی مطلق العنان "شہنشاہیت" کو ایک "آئینی شہنشاہیت" میں بدل دینے کے لئے اقدام کریں گے اس وقت تک عوام مطمئن نہیں ہوں گے اور نئی حکومت اس سے زیادہ مقبول نہ ہو سکے گی جتنی کہ پہلی حکومت تھی اور جس کے خلاف "بغاوت" بس یوں سمجھیے کہ شاہ کی خوش قسمتی سے کامیاب نہ ہو سکی۔

لیکن مراکش جیسے چھوٹے سے ملک کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمیشہ ہی بغاوت کو دبایا جا سکے گا۔ پچھلی بغاوت چند ناراض فوجیوں کی طرف سے کی گئی تھی۔ لیکن اس مرتبہ ناراضگی عوامی ہے اور عوام کا سیلاب جب طوفانی شکل اختیار کرتا ہے تو بڑی سے بڑی شہنشاہیتوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔

شمالی آئرلینڈ

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے

برطانوی حکومت تشدد کے ذریعے آئرش عوامی تحریک کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اس میں ناکام ہو چکی ہے۔

انگریز نے ہندستان آکر ہندو مسلمانوں کو لڑایا۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی اپنائی اور اس پالیسی کے طفیل ہندستان دو سو برس تک دندناتا رہا۔ خدا کی شان دیکھئے کہ جو انگریز ہندوستان میں آکر لڑاتا تھا وہ اب خود اپنے گھر میں لڑ رہا ہے۔ گویا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ ایک طرف پروٹسٹنٹ ہیں اور دوسری طرف کیتھولک دونوں عیسائی ہی ہیں لیکن دونوں الگ الگ فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور شمالی آئرلینڈ میں اس وقت یہ صورت ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔

آئرلینڈ کی ایک لمبی کہانی ہے ۱۱۷۵ء تک آئرلینڈ میں کئی بادشاہوں کی سلطنتیں تھیں۔ ایک بادشاہ نے اینگلو نارمنوں کی مدد حاصل کی اور پہلی بار انگریزوں کو جزیرے پر آنے کا موقع مل گیا۔ لیکن آئرش باشندے ہمیشہ انگریزوں کے خلاف رہے۔ خاص طور سے انگلش چرچ کے معرض وجود میں آنے کے بعد وہ اور زیادہ مخالف ہو گئے کیونکہ وہ بدستور کیتھولک تھے۔ اس لئے بھی نفرت تھی کہ ملک کی نصف آمدنی انگریز جاگیرداروں کو چلی جاتی تھی وہ انگلینڈ میں رہتے تھے اور کسان ان کے لئے کام

۱۹۲۰ء میں جب آئرلینڈ آزاد ہوا تو شمالی آئرلینڈ کو اس سے الگ کر دیا گیا۔ وہاں پروٹسٹنٹوں کی اکثریت ہو گئی تھی کیونکہ کرامویل نے شمالی کاؤنٹیز کو کیتھولکوں سے خالی کرایا تھا۔

شمالی آئرلینڈ براہ راست انگلینڈ کے ماتحت ہے اگرچہ وہاں صوبائی حکومت قائم ہے جس کی راجدھانی بلفاسٹ ہے۔ یہ صوبائی حکومت بے حد متعصب ہے اور کیتھولک باشندوں کے ساتھ امتیاز برتتی ہے۔ دو سال قبل برطانیا کی لیبر حکومت نے صوبائی حکومت کو تیار کیا تھا کہ کیتھولک باشندوں کی بے چینی دور کرے اور انھیں ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں حصہ دے۔ لیکن وہاں یونینسٹ پارٹی کی حکومت ہے جو کیتھولکوں کے معاملے میں بیحد متعصب ہے اس پارٹی میں کیتھولکوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ یونینسٹ پارٹی کے والنٹیروں کی اشتعال انگیز پریڈیں ہوتی ہیں جن میں نفرت کا پرچار ہوتا ہے۔ نتیجے میں اس پارٹی کی حکومت میں کیتھولک اپنے آپ کو دوسرے درجے کا شہری سمجھنے لگے ہیں اور بڑی تعداد میں جنوبی آئرلینڈ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی انتہا پسند کیتھولک حکومت سے

کرتے تھے۔ انیسویں صدی کا ہی زمانہ تھا جب آئرلینڈ کے کیتھولک باشندے بڑی تعداد میں امریکا کے لئے ترک وطن کر گئے تھے (آنجہانی صدر امریکا مسٹر کنیڈی کے خاندان والے بھی غالباً اسی زمانے میں امریکا پہونچے تھے)

[illegible]
...ـسٹ مہاجرین کے خلاف صرف
...لیے انھوں نے گذشتہ دو سال سے حکومت
...کھا ہے۔ رسائی نہ کرنا کے مصداق وہ جہاں،
...وں کو مجبور کر رہے ہیں۔ بلفاسٹ
...حال اس وقت بالکل ایسی ہے جیسی انگریز
...ں ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کے وقت
...تی تھی۔
...ٹسٹنٹ محلوں کو چھوڑ کر آ رہے ہیں اور پروٹسٹنٹ
...محلوں سے منتقل ہو رہے ہیں اور مکانوں کو آگ
...ہیں۔ بعض اوقات لوگ خود ہی اپنے مکانات کو
...آگ لگا دیتے ہیں۔ جب سے حکومت نے
...مقدمہ چلائے بغیر عرصۂ غیر معین کے لئے نظر بند
...قانون نافذ کیا ہے اور مشتبہ لوگ بڑی تعداد میں
...لئے گئے ہیں اس وقت سے صورتِ حال اور زیادہ
...گئی ہے۔

...ی آئرلینڈ کی ریپبلک نے حکومتِ برطانیہ کو تنبیہ کی
...صورتِ حال درست نہ ہوئی اور تارکین وطن کا
...اسی طرح آتا رہا تو وہ شمالی آئرلینڈ کے سول
...ے والوں کی حمایت کرنا شروع کر دے گی۔
...یر اعظم برطانیہ مسٹر ہیتھ نے اسے ملک کے اندرونی
...لی آئرلینڈ کی مداخلت سے تعبیر کیا ہے اور سخت
...ہے کہ وہ اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑائے۔
...ک زمانہ تھا جب آئرلینڈ کے باشندے تاج برطانیہ
...ادار تھے اسی لئے آئرش ریپبلک سے الگ رہے
...ب وہ اس ریپبلک سے ملنے کے لئے بے چین ہیں اور
...مقصد کے لئے انھوں نے مسلح گوریلا جنگ کی سرگرمیاں
...کر دی ہیں۔ حکومت تشدد سے تحریک کو کچلنے کی
...کر رہی ہے۔ لیکن یقیناً وہ تشدد سے آئرش عوام
...ی کے جذبے کو نہ دبا سکے گی۔ بلکہ صرف انھیں مطمئن
...ر حکومت میں ان کا جائز حصہ دے کر ہی انھیں اپنے
...ھ سکے گی۔

اردن
بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی

اردن ایک مرتبہ پھر امریکا کی گود میں چلا گیا ہے ایک ایسے وقت جبکہ عرب ممالک نے اس کا عملی بائیکاٹ کر دیا ہے اور شام نے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی ختم کر لئے ہیں یہ قدرتی تھا کہ وہ مغرب کے ان ممالک کی طرف امداد کے لئے دیکھے جو اب تک اس کی عرب دشمن سرگرمیوں کو شہ دیتے رہے ہیں۔

تازہ خبر یہ ہے کہ امریکا نے ڈیڑھ سو کے قریب ڈالر کا ہوائی جہاز اردن کو دیئے ہیں تاکہ اگر شام کی طرف سے حملہ ہو تو اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے جب شاہ اردن نے امریکا سے امداد حاصل کی ہے۔ بلکہ ہر ایسے موقعے پر جبکہ وہ عرب اتحاد کے حلقے کو توڑ کر باہر آئے ہیں۔ انھوں نے امریکا اور برطانیا کی سرپرستی حاصل کی ہے۔

فلسطینی فدائیں کو جو آزادیٔ فلسطین کے لئے قربانیاں دے رہے تھے انھوں نے جس طرح ختم کیا ہے اس کو عرب دنیا کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ شام کو مقابلتاً غصہ اس لئے زیادہ ہے کہ وہاں پہلے ہی سے بیس ہزار کے قریب فدائین موجود ہیں۔ اور وہ بے قرار ہیں کہ انھیں اردن کی طرف بڑھنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ ایک رجعت پسند اور مغربی ممالک کے نمک خوار نام نہاد بادشاہ کی بادشاہت کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں۔

اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر ہی غالباً شاہ حسین امریکا کے سامنے ہوائی جہازوں کے لئے گڑگڑائے ہوں گے تاکہ ان بے وطن فلسطینی باشندوں کا جنھوں نے اپنے وطن کی واپسی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے خون بہانے کا جو ناپاک بخار ابھی ان کے اندر باقی ہے اسے نکال سکیں لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ جلد وقت آ رہا ہے جب مشرقِ وسطیٰ کی سیاست سے اردن کی شہنشاہیت کے ناسور کو نکال پھینکا جائے گا۔ اور اس کے بعد اس مشترکہ دشمن سے ٹکر لی جائے گی جو بالواسطہ طور پر اردن کو استعمال کر کے اپنے شیشے کے محل میں بیٹھا ہوا قہقہے لگا رہا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ
تین بچوں کی عرب فیڈریشن

نیل ڈیلٹا کے ایک قصبے دمن ہور میں ایک مصری خاتون نے بیک وقت تین لڑکوں کو جنم دیا۔ اس نے ایک کا نام رکھا انور سادات۔ دوسرے کا قذافی اور تیسرے کا اسد۔ جس دن یہ تین بچے تولد ہوئے اسی دن اور غالباً ٹھیک انکی ولادت کے وقت مصر، لیبیا اور شام کے سربراہ (انور سادات، قذافی اور حافظ الاسد) دمشق میں اپنے ملکوں کی مجوزہ فیڈریشن کے دستور کی نوک پلک درست کر رہے تھے۔ شاید قدرت دنیائے عرب کو عملاً بتانا چاہتی تھی کہ تینوں ملک ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور عرب فیڈریشن حقیقی معنوں میں انکی ماں ہے۔ اب تینوں کو ملکر رہنا اور ماں کے حکم پر چلنا چاہیے۔

آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ تینوں عرب ملکوں کا اتحاد ایک پختہ اتحاد ہوگا اور یہ ٹوٹے گا نہیں بلکہ اس میں دوسرے عرب ممالک بھی شامل ہو جائیں گے۔ کم از کم ایک ملک سوڈان اس میں شامل ہونے کے لئے بالکل تیار ہے۔ دوسرے شاید ابھی تیار نہ ہوں اور اپنی آزادی کو عرب اتحاد کے اوپر قربان نہ کریں لیکن ایک دن آئے گا کہ وہ اس عرب اتحاد میں شامل ہونے کے لئے مجبور ہوں گے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ نہ صرف یہ کہ اسرائیل سے اپنے مقبوضہ علاقے واپس نہیں لے سکتے بلکہ اپنی آزادی کا تحفظ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔

عمر کی قید

دستور میں مذکور ہے کہ ہندوستان کے سب شہریوں کا درجہ مساوی ہے۔ اور سب کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ لیکن عملی میدان میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ زیادہ تر کھاتے پیتے گھرانوں کے بچوں کو ہی آگے بڑھنے اور اچھی ملازمتیں حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے اور غریب طبقے کے لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر پبلک سروس کمیشن کے تحت ہونے والی ملازمتوں کے امتحانات کے لیئے ۲۴ برس عمر کی شرط ہے۔ لیکن بہت سے غریب بچے جنہیں میٹرک کے بعد ہی کوئی کام تلاش کرنے اور والدین کی مدد کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے دو چار سال کے وقفے کے بعد اپنے تمام حقوق سے محروم ہوجاتے ہیں۔

قانون کا ڈنڈا سب کے لئے یکساں بنایا گیا ہے اور اس میں ایک خاندان کے حالات کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ نتیجے میں مالدار گھرانے کے بچے جو سرپٹ دوڑتے ہوئے آتے ہیں سرپٹ ہی دوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں اور ایک غریب بچہ ۲۴ سال کی قید میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

غالباً اسی صورتِ حال کی اصلاح اور غریب بچوں کی پریشانی کے پیشِ نظر کیرالا جیسی چند ریاستی حکومتوں نے سروس کمیشن کے امتحانات میں بیٹھنے کے لیئے ۲۴ سال کی عمر کو بڑھا کر ۳۰ سال کر دیا ہے۔ اس لیئے کہ ۲۴ سال کی قید جن توقعات کے ساتھ لگائی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئیں۔ ۳۰ سال کی عمر تک غریب بچوں کو اپنے دلوں کی حسرت نکالنے کا موقع ملے گا اور وہ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ انکی اہمیت اور قابلیت قانونی پابندیوں کی نذر ہوگئی۔

لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک یونین پبلک سروس کمیشن نے عمر کے معاملے میں نرمی نہیں کی۔ جس قسم کی گزیٹڈ پوسٹوں کے لیئے یہ امتحانات ہوتے ہیں ان کے لئے تیس سال کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ اس عمر میں اضافہ کرکے پبلک سروس کمیشن نہ صرف یہ کہ غریبوں کے ساتھ انصاف کرے گا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ قابلِ اشخاص کو منتخب کر سکے گا۔ اسے جلد عمر میں اضافے کا اعلان کرنا چاہئے۔

واقعات نئی دہلی

آندھرا پردیش

برہمانند ریڈی کی وزارتِ اعلیٰ خطرے میں

آندھرا کے وزیر اعلیٰ مسٹر برہمانند ریڈی نے ۱۹۶۹ء میں جبکہ تلنگانہ سے متعلق ایجی ٹیشن اپنے ابتدائی مرحلے میں تھا اعلان کیا تھا کہ اگر علیحدگی پسند لوگ الگ تلنگانہ ریاست کا مطالبہ ترک کردیں تو وہ وزارتِ اعلیٰ کی گدی سے الگ ہونے کے لئے تیار ہیں۔ اس وقت یہ محض ایک فرضی تجویز نظر آتی تھی لیکن آج ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ وہ ایک سیاسی حقیقت نظر آرہی ہے۔

الگ تلنگانہ ریاست کی تحریک کے لیڈر ڈاکٹر چنا ریڈی اور مرکزی لیڈروں کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کے نتیجے میں اوّل الذکر الگ تلنگانہ ریاست کا مطالبہ ترک کرنے کے لئے تیار ہوگئے ہیں بشرطیکہ تلنگانہ کے لئے ایک الگ پردیش کانگریس کمیٹی قائم کر دی جائے اور ریاستی لیڈرشپ کو بدل دیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ دس برس تک ریاست کا وزیر اعلیٰ تلنگانہ کے علاقے کا ہونا چاہیے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ مرکزی حکومت اس مطالبے کو منظور کرنے والی ہے۔ ہوا کا رخ دیکھ کر ریاستی لیڈر شپ میں کھلبلی مچ گئی ہے اور اب وزیر اعلیٰ کے لئے مشکل ہو رہا ہے کہ وہ اپنے وعدے سے کس طرح پھریں۔ ریاستی لیڈروں کی دلی میں آمدورفت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر حالت میں مسٹر برہمانند ریڈی کو ریاست میں رکھنے کے حق میں ہیں۔ کانگریس اسمبلی پارٹی کے ممبروں کی اکثریت بھی اس بات کی حامی ہے کہ اس مرحلے پر قیادت میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے۔ تاہم آندھرا سے منتخب ہو کر آنے والے ممبران پارلیمنٹ کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ریاستی پارٹی کے ممبروں کی اکثریت کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں۔ تلنگانہ کے علاقے سے جو ۱۴ ممبر منتخب ہو کر آئے ہیں ان میں سے دس تلنگانہ سمتی سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری طرف خود تلنگانہ سمتی میں اس بات پر بے چینی نظر آتی ہے کہ ڈاکٹر چنا ریڈی محض لیڈرشپ کی تبدیلی سے تلنگانہ کے مطالبے کو خیر باد کہنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں لیکن توقع ہے کہ مسٹر چنا ریڈی سمتی میں اکثریت کی حمایت حاصل کر سکیں گے۔ ان حالات میں مرکزی حکومت کو فوری طور پر کوئی دلیرانہ اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ آندھرا کی تقسیم کو رد کیا جا سکتا ہے لیکن صرف اس طرح کہ مسٹر برہمانند ریڈی کو وزارت اعلیٰ کی قربانی دینا ہوگی۔ تاہم یقین ہے کہ اس قربانی کا بدل انھیں مرکز میں کسی عہدے کی صورت میں مل جائے گا۔ ●

مہاراشٹر

شیوسینا کی باسی کڑھی میں ابال

شیوسینا کی باسی کڑھی میں پھر ابال آیا ہے اور اس نے پھر مہاراشٹری اور غیر مہاراشٹری کے سوال پر ہنگامے کھڑے کرنا شروع کر دیے ہیں۔ ایک مشہور بینک کے سامنے شیوسینا کے والنٹیروں نے اس بات کے خلاف مظاہرہ کیا کہ بھرتی کے معاملے میں مہاراشٹریوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس مظاہرے کے بعد شیوسینا کے والنٹیر دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگے اور خاص قلب شہر میں پٹریوں پر بیٹھے خوانچے والوں پر حملے اور ان کے سامان کی لوٹ مار کرتے گئے۔ یہ خوانچے والے زیادہ تر کیرالا کے رہنے والے ہیں جن کے کان شیوسینا والے وقتاً فوقتاً مروڑتے رہتے ہیں۔

اس قسم کی حرکتیں شیوسینا کے کارکنوں نے لوک سبھا کے وسط مدتی الیکشن سے پہلے کی تھیں اور انھوں نے ریاست

[illegible] سنگھ کی بھی
اس کے ساتھ ساز باز تھی۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ سال گذشتہ
بھیونڈی اور جلگاؤں میں فسادات برپا کرانے میں دونوں
نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ لیکن جب
لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات عمل میں آئے تو دونوں میں
کھٹ پٹ ہو گئی۔ شیو سینا نے جنرل کریاپا کی حمایت کی اور
جن سنگھ نے اپنے امیدوار کی۔ دونوں ناکام ہو گئے اور
شیو سینا تو ایسی بیٹھ کر گھر میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ اس کے
بعد تعلقات بد سے بدتر ہو گئے، ان کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوئے
اور حوصلے بھی پست ہو گئے۔

لیکن اب جبکہ اگلے برس کے شروع میں اسمبلی کے
عام انتخابات عمل میں آنے والے ہیں، شیو سینا کے لیڈر
بال ٹھاکرے نے اپنی جنگجویانہ یا مجنونانہ وطن پرستی کے نام
پر اپنی بکھری ہوئی طاقت کو پھر سے مجتمع کرنا شروع کر دیا
ہے اور بمبئی کے سامنے مظاہرہ کر کے غریب خوانچے والوں کو
اپنی مجنونانہ جارحیت کا نشانہ بنایا ہے۔ فرقہ پرست جماعتیں
نفرت کا پرچار کر کے ہی اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کی
کوشش کرتی ہیں۔ لیکن وزیر اعلیٰ مسٹر نائک کو توقع ہے
کہ جس طرح شیو سینا کو لوک سبھا کے وسط مدتی الیکشن میں
منہ کی کھانی پڑی اسی طرح اسے ریاستی اسمبلی کے انتخابات
میں بھی شرمندگی کا سامنا کرنا ہوگا۔ عوام سمجھ گئے ہیں کہ جارحانہ
اور مجنونانہ فرقہ پرستی یا علاقائی وفاداری میں انتہا پسندی
کی گاڑی زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتی۔

بہار

سیلاب سے تباہی

بہار میں سیلاب سے ۱۶ لاکھ سے زیادہ اشخاص
متاثر ہوئے ہیں اور وہ ایک ہی رات میں گھر سے بے گھر ہو گئے
ہیں۔ ان میں سے بارہ لاکھ مرد عورتیں اور بچے اسکولوں، دھرم
شالاؤں، سرکاری عمارتوں اور خیموں میں پناہ گیر ہیں باقی
چار لاکھ یا تو سڑکوں پر پڑے ہیں یا ریلوے لائنوں اور اسی
قسم کے دوسرے مقامات پر۔

جن لوگوں نے سیلاب کے علاقے نہیں دیکھے ہیں وہ

[illegible] نئی دہلی

اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کتنی زبردست تباہی آئی ہے۔ گنگا
سون اور پون پون دریاؤں نے سیکڑوں دیہات کو ڈبو دیا
ہے۔ مکانات کی چھتوں تک پانی بھرا ہوا ہے۔ دریائے
گنگا کے تین سو میل کی گزرگاہ میں ہر جگہ تباہی آئی ہوئی ہے

کا اعلان کر دیا گیا ہے اور امداد پہونچانے کے سلسلے میں تمام
ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

انتظامی مشنری کو اس سلسلے میں زیادہ مشکل اس لئے
پیش آ رہی ہے کہ سیلاب اچانک آیا۔ جب سیکڑوں دیہات

بہار کے سیلاب زدہ علاقے کا ایک فضائی فوٹو۔

سیکڑوں پشتے ٹوٹ گئے ہیں، سڑکیں تباہ ہو گئی ہیں اور
نہری نظام معطل ہو گیا ہے۔ سرکاری عمارتیں ٹوٹ پھوٹ
گئی ہیں، کنویں اور ٹیوب ویل خراب ہو گئے ہیں، بہت سے
دیہات میں اسّی سے نوّے تک مکانات گر گئے ہیں۔ نوّے
فیصدی مکئی اور ۶۵ فیصدی دوسری فصلیں تباہ ہو گئی
ہیں۔ آٹھ ہزار مربع میل کے علاقے میں چاول کی بوائی ممکن
نہ ہوگی اس لئے کہ پانی بہت دھیمی رفتار سے اتر رہا ہے اور
دھان کے پودے دستیاب نہیں ہیں۔ انسان اور جانور
دونوں بھوکے مر رہے ہیں۔ صرف نقصان کا اندازہ ڈیڑھ ارب
روپئے لگایا گیا ہے۔ ہریانہ اور پنجاب سے جانوروں کو چارہ
بھیجنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن جب تک وہ پہونچے گا
شاید مویشیوں کی بہت بڑی تعداد تباہ ہو چکی ہوگی۔

تمام سیلاب زدہ علاقوں میں قحط کا خطرہ پیدا ہو گیا
ہے۔ حکومت نے ۲۳۲ بلاکوں میں ہنگامی صورت حال

دریائے گنگا کی لپیٹ میں آنے اس وقت کابینہ کے گیارہ
ممبروں میں سے نو دہلی میں امداد کے سلسلے میں مشورہ کرنے
کے لئے نہیں بلکہ کابینہ میں توسیع پر مشورہ کرنے کو دہلی
آئے ہوئے تھے۔ بہت سے کانگریسی لیڈر بھی پٹنہ سے باہر
تھے لیکن اب انتظامی مشنری کے کام میں کافی تیزی آ گئی
ہے۔ پھر بھی امداد بڑی حد تک کم ہے۔

سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے برونی کے تیل
صاف کرنے کے کارخانے کو بند کر دینا پڑا ہے کیونکہ دریائے
گنگا کا پانی علاقے میں پھیل گیا ہے۔

حکومت بہار کو صورت حال پر قابو پانے کے لئے بہت
بڑے سرمائے کی ضرورت ہوگی اس وقت اس نے مرکز سے
۱۳۴ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کی امداد طلب کی ہے تاکہ ایک
طرف سڑکوں، پشتوں اور سرکاری عمارتوں کی مرمت
کی جا سکے اور دوسری طرف سیلاب زدہ لوگوں کو مدد

دی جائے۔ اس میں سے ۴۳ کروڑ روپے کی رقم صرف سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کی مرمت کے لئے درکار ہوگی۔

یہ ایک ایسی زبردست تباہی آئی ہے جو انسان کیلئے عبرتناک ہے لیکن انسان اس صدی اتنا مادہ پرست بن گیا ہے کہ وہ کسی چیز سے عبرت نہیں پکڑتا۔

یوپی

منصف کو پیٹ ڈالا

یوپی ریاست بھی خوب ہے، کہنے کو پسماندہ ریاست ہے اور اب اس پر فخر کرتی ہے لیکن ایک معاملے میں سب سے آگے نظر آئی ہے، یعنی سرکاری نظم و نسق میں ممبران اسمبلی، ان کے اعزا اور سماجی ورکروں کی مداخلت بے جا۔ پہلے خبر آئی تھی کہ افسروں کے تبادلے جو کسی زمانے میں انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر ہوا کرتے تھے اب سیاسی مصلحتوں کا نشانہ بن کر رہ گئے ہیں۔ وزیروں، اسمبلی کے ممبروں اور اعلیٰ سول افسروں کا بیشتر وقت ان ہی تبادلوں کے سلسلے میں صرف ہوتا ہے۔ افسران پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔

معاملہ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ پچھلے دنوں جب کانگریس اسمبلی پارٹی کی میٹنگ ہوئی تو کئی ایسے ممبروں نے جو صاف ستھرا نظم و نسق چاہتے تھے اس معاملے کو اٹھایا اور پارٹی کے بیشتر ممبروں کی طرف سے تبادلوں کے سلسلے میں مداخلت بے جا کی مذمت کی۔ ایک ممبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "اس بار معلوم ہوتا ہے کہ وزیروں کا واحد کام بس یہ رہ گیا ہے کہ تبادلوں کا حکم دیں یا انھیں روکیں" یہی نہیں بلکہ اس نے تجویز کیا کہ "اگر تبادلوں کا معاملہ اتنا ہی اہم ہے تو اس مقصد کے لئے ایک الگ وزیر کیوں نہ مقرر کر دیا جائے"

ایک اور ناراض ممبر جو شاید گھر کا بھیدی بھی تھا بولا کہ "ہم میں سے بعض محض دلال بن کر رہ گئے ہیں، تبادلے کراتے یا تبادلے رکواتے ہیں اور اس کے لئے پیسے وصول کرتے ہیں"

وزیروں نے اعتراف کیا کہ ان کا ۸۰ فیصدی وقت اسمبلی یا پارٹی کے ممبروں سے تبادلے رکوانے یا تبادلے کروانے کے سلسلے میں گزر جاتا ہے۔ ودھان سبھا میں الزام لگایا گیا کہ پندرہ دن تک سیتاپور میں دو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے، ان میں سے ایک کا تبادلہ چیف سکریٹری نے کیا تھا اور دوسرا تبادلہ مبینہ طور پر وزیر اعلیٰ کے کسی رشتے دار کے ذریعے عمل میں آیا تھا۔ اسی طرح میرٹھ میں دو انگریکلچر آفیسر اور گورکھپور میں دو سول سرجن ایک ہفتے سے زیادہ مدت رہے۔ جس کا داؤ چل گیا وہ رہ گیا اور دوسرا چلتا بنا۔ ہر ملازم جہاں غیبی یافت ہو پہونچنے کی فکر میں رہتا ہے اور اس کے لئے ایم۔ ایلوں اور ان کے عزیزوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ غالباً اسی صورت حال سے متاثر ہو کر ایم۔ ایل۔ اے، صاحبان اور ان کے بیٹے پوتوں اور اعزاء کے دماغ چڑھ گئے ہیں اور اب وہ کسی افسر کی حیثیت ہی نہیں سمجھتے۔ گزشتہ دنوں (۱۹ اگست) اسمبلی میں سوالات کے گھنٹے میں اس بات پر بڑا ہنگامہ ہوا کہ ایک ایم۔ ایل۔ اے، کے بیٹے اور ایک ممبر پارلیمنٹ کے بھائی نے ملکر ایک منصف کو پیٹا ہے۔ نائب وزیر داخلہ آر کے دویدی نے اس واقعے کی جو ۲۶ جون کو ہوا تھا تفصیل بتائی اور ممبران کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ "سی۔ آئی۔ ڈی، معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے" لیکن ممبران اس بات پر ناراض ہوئے کہ وزیر موصوف نے متعلقہ پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبروں کے نام نہیں بتائے، اور آخر میں اسپیکر کی مداخلت پر انھیں نام بتانے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ ممبر پارلیمنٹ کا نام ہے مسٹر کرشن چند پانڈے اور اسمبلی کے ممبر کا نام ہے مسٹر دھنش دھاری پانڈے۔ دونوں کے بارے میں یقین ہے کہ واقعے سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا لیکن دونوں کے عزیزوں نے ایک بُری حرکت کر کے انھیں بدنام ضرور کیا ہے۔ ایک کے بھائی اور دوسرے کے بیٹے نے ملکر اگر ایک منصف کو پیٹا تو یقیناً یہ ہمت انھیں اسی لئے ہوئی کہ ان کا تحفظ کرنے والے موجود ہیں۔

سی۔ آئی۔ ڈی، کیا رپورٹ دیتی ہے اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے، لیکن الزام کے صحیح ثابت ہونے پر اگر مجرمین کو سزا نہ ملی اور ان کا تحفظ کیا گیا تو قدرتی طور پر اس کا نظم و نسق پر اثر پڑے گا۔

جمہوریت اور آزادی کے معنے یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ایک شخص اپنے آپ کو ہر قسم کے قانون اور ضابطے کی گرفت سے آزاد کر لے۔ اگر مسٹر کملاپتی ترپاٹھی نے اس سلسلے میں فوری قدم نہ اٹھایا تو انکی حکومت بدنام ہو کر رہ جائے گی جسکے نتیجے میں سیاسی ہوا کا رخ پلٹ سکتا ہے۔

وزیر اعظم کا مجوزہ دورہ

یہ اعلان غیر متوقع نہیں ہے کہ وزیر اعظم ہند مسز گاندھی کچھ یورپین ملکوں کا دورہ کریں گی۔ روس بھی جائیں گی اور امریکا بھی۔ بنگلا دیش سے آنے والے پناہ گزینوں کے نتیجے میں جو صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے اس سے دنیا کو واقف کرانے کے لئے مختلف وزراء مختلف ممالک کا دورہ کر رہے ہیں۔ ممبران پارلیمنٹ تو چاہتے تھے کہ وزراء کے علاوہ ان کے بھی کچھ وفود دنیا کے بعض ممالک میں جائیں۔ اگر وزیر شہری فضائیہ ڈاکٹر کرن سنگھ، اسپیکر مسٹر ڈھلون کی دو جمبو جیٹوں کے لئے درخواست منظور کر لیتے تو شاید یہ وفود اس وقت دنیا کی سیر کر رہے ہوتے۔ لیکن ممبران پارلیمنٹ کی یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی اور شاید آئندہ کی توقع بھی ختم ہوگئی، کیونکہ وزیر اعظم کے دورہ کرنے کے بعد شاید دوسرے وفود کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ضروری اطلاع

انگلستان کی مشہور عالم کرکٹ ٹیم پر ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی شاندار تاریخی فتح کی دلچسپ کہانی اور انگلستان میں اُن کے کھیلے ہوئے تمام میچوں کی مکمل روداد۔

تصویروں کے ساتھ

واقعات کے آئندہ شمارے میں پڑھئے

(ادارہ)

لال قلعہ سے — قطب مینار تک

دہلی میں ایڈورڈ کینیڈی اور اندرا گاندھی

سینیٹر کینیڈی

[illegible] ایڈورڈ کینیڈی آئے اور چلے گئے۔ انھوں نے [illegible] پناہ گزینوں کے کیمپوں کو دیکھا۔ مشرقی [illegible] چاہتے تھے لیکن فوجی حکمرانوں نے اس علاقے [illegible] ان کے لئے بند کردیئے۔ مجبوراً وہ نئی دلی واپس [illegible] اور وزیر خارجہ سے باتیں کیں۔ ایک [illegible] اپنے خیالات ظاہر کئے اور چلے گئے۔ [illegible] امریکی کانگریس کے ان ممبروں میں [illegible] جب تک مشرقی بنگال میں حالات [illegible] تک کسی قسم کی مدد پاکستان کو [illegible] جب وہ بول رہے تھے [illegible] عوام کی ترجمانی کررہے تھے۔ امریکی کانگریس یا دوسرے معنوں میں امریکی عوام سنٹر کینیڈی کے ہی ہم خیال ہیں۔ کانگریس نے پاکستان کیلئے بطور خاص ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر (۳۳ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے) کی امداد کو روکنے کے حق میں رائے دی لیکن نکسن ایڈمنسٹریشن نے کانگریس کے اس فیصلے کو نظر انداز کردیا۔ پورا امریکی پریس بھی ایڈمنسٹریشن کی موجودہ پالیسی کے خلاف ہے۔ نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ جیسے اخبارات سرکاری پالیسی کی مذمت کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ہندوستان یا برطانیا میں پارلیمنٹ اس طرح کا کوئی فیصلہ دے دیتی یا چوتھا رکن حکومت " مخالف بن جاتا تو وہاں کے وزیراعظم کو اپنی گدی چھوڑ دینی پڑتی۔ لیکن امریکا کے صدر ہیں کہ نہ عوامی نمائندوں کی سن رہے ہیں اور نہ پریس کی۔ کسی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ امریکی آئین نے انھیں عملاً ڈکٹیٹر بنا دیا ہے۔

ابراہیم لنکن نے کسی زمانے میں کہا تھا کہ "جو عوامی حکومت عوام کے ذریعے عوام کے لئے کام کرے۔ وہی جمہوری حکومت ہوتی ہے۔ لیکن آج ایسا معلوم ہوتا ہے امریکا میں جمہوریت کی قدریں بدل گئیں ہیں اور وہاں کی جمہوریت "نکسن کی حکومت، نکسن کے ذریعے، نکسن کے لیے" بن کر رہ گئی ہے"۔

واشنگٹن میں ہندوستان کے سفیر مسٹر ایل۔ کے جھا نے ٹیلی ویژن انٹرویو میں نکسن ایڈمنسٹریشن پر اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔ لیکن امریکی عوام کے بارے میں کہا کہ "وہ ہمارے دوست ہیں۔ دراصل یہ اس بات کے اظہار کا ایک ڈپلومیٹک طریقہ ہے کہ مسٹر نکسن عوام کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔

سنٹر کینیڈی جس انداز سے نئی دلی کی پریس کانفرنس میں بول رہے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ امریکی عوام کے حقیقی نمائندے وہی ہیں۔ دراز قد، بڑا سر، کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ۔ وہ بالکل اپنے مقتول بھائی مسٹر کینیڈی سابق صدر کے مشابہ نظر آرہے تھے اور سچ پوچھئے تو امریکی صدر کی طرح بول رہے تھے۔ بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ۔

ایک نامہ نگار اپنے دوسرے ساتھی سے آہستگی سے بولا :۔ "یہ امریکا کے مستقبل کے صدر معلوم ہوتے ہیں"۔ دوسرا۔ "مگر ان کے خاندانی افراد انھیں صدارتی الیکشن کب لڑنے دیں گے، ان کے دو بھائی تو صدارتی چکر میں پھنس کر جان بحق ہو چکے ہیں"۔

کینیڈی خاندان ایک آئرش نژاد ہے اور کیتھولک ہے۔ امریکا کی تاریخ میں پہلی بار کیتھولک عیسائی صدر بنا اور وہ گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ دوسرا بھائی ابھی صدارت کے لئے لڑ ہی رہا تھا کہ اسے بھی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ خاندان والے کہتے ہیں کہ ہم بے صدارت ہی اچھے ہیں۔ سنیٹر بن کر ہی کام کرتے رہو۔ اور سنیٹر کی حیثیت سے ایڈورڈ کینیڈی اس [illegible]

...کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں اس کا اظہار انھوں
...کانفرنس میں کردیا۔ یہ کتنی بڑی انسانی خدمت ہے
...نے اعلان کیا کہ وہ فوجی حکمرانوں کو جو اس برصغیر
...کے خرمن امن کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اسلحہ
...نہیں ہیں اور اس کے لیے برابر امریکی سنیٹ
...رہیں گے۔

جن سنگھ کا تحفۂ گندگی

دلّی میں اس مرتبہ مچھروں کی بھرمار ہے۔ فصیل کے اندر کا شہر اس وبا سے محفوظ رہا کرتا تھا لیکن جن سنگھ کے ایڈمنسٹریشن کے جہاں دوسرے تحائف دلّی والوں کو ملے ہیں ان میں ایک محلّوں کی گندگی اور اس گندگی کے طفیل مچھروں کا تحفہ بھی ملا ہے۔

جس طرح جن سنگھ پھوٹ پھیلاتا ہے اسی طرح مچھر ملیریا پھیلاتا ہے۔ چنانچہ دلّی میں ملیریا کا زور شروع ہو چکا ہے اور کارپوریشن ابھی اسکا مقابلہ کرنے کی صرف تیاریوں میں مصروف ہے۔ اگر تیاریوں میں بھی وہ مصروف نہ ہوتی تو اس کا کوئی کیا بگاڑ لیتا۔

محلّوں میں گندگی، جگہ جگہ گڈھے۔ ان میں پانی اور مچھر۔ اللہ کی پناہ۔ ایک جن سنگھی ممبر کارپوریشن کو توجہ دلائی گئی تو فرمانے لگے۔

"یہ حکومت کے خاندانی منصوبے کی حوصلہ افزائی ہے۔ دلّی کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔

دہلی میں خوب صورت فوّارے تو بن گئے لیکن پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ ذرا سی بارش میں تمام شہر پانی اور گندگی سے بھر جاتا ہے۔

ہندوستان اور نیپال میں دوستی کا معاہدہ ہوگیا ہے - ایک خبر

نیپال

ہندوستان

...رحمن پر مقدمہ شروع ہوگیا ہے - ایک خبر

شیخ مجیب کے خلاف مقدمہ

امی لیگ لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف مقدمے تک حکومت پاکستان خاموش تھی عجیب عجیب قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں۔ ایک ساں ایجنسی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شیخ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور مقدمے کا ڈھونگ کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لئے رچایا جارہا ہے لاب پہلی بار پاکستان نے اپنی مہر سکوت توڑی ہے ہ کہا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف گذشتہ کی پہلی پیشی ہوئی اور انھوں نے اپنی وکالت لئے تین وکلاء کے نام پیش کئے جن میں مسٹر بروہی کا نام سر فہرست تھا۔ چنانچہ حکومت نے رابطہ قائم کرکے انھیں مقدمے کی پیروی کرنے نے دی اور وہ شیخ سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔

شیخ کے خلاف اس مقدمے پر اس وقت ساری دنیا ئی ہوئی ہے اور دنیا کا کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے جو ناپسندیدگی کا اظہار نہ کررہا ہو۔

لمی سیاستدانوں کی دلچسپی اور تشویش کا اس بات ہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب سٹر ایڈورڈ کنیڈی سے پریس کانفرنس میں کسی نامہ نگار نے اس بارے سے سوال نہ کیا اور جب منٹ کی پریس کانفرنس ختم تو انھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا اور خود ہی جلسے میں اظہار خیال کرکے حکومت پاکستان کے پر نکتہ چینی کی۔

سٹر ایڈورڈ کنیڈی ہوں یا کوئی اور عالمی سیاستداں ۔۔۔ کے بارے میں اس لئے اعتراض ہے کہ شیخ اپنے ملک اور اپنی قوم کے ہردلعزیز لیڈر ہیں اور کے الفاظ میں ان کا قصور صرف یہ ہے کہ انھوں نے ۔۔۔ میں زبردست اکثریت حاصل کی تھی۔ ایسی اکثریت کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے باوجود ان پر وہ لوگ مقدمہ چلائیں جو عوامی نمائندے نہیں ہیں۔ اس سے بڑی اور کوئی زیادتی نہیں ہوسکتی۔

شیخ کے خلاف مقدمے پر جن ممالک یا جن عالمی سیاستدانوں نے تشویش کا اظہار کیا، انھیں پاکستانی حکمرانوں نے مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اس کے برعکس انھوں نے سوڈان اور مراکش جیسے ان ملکوں کی مثال دے کر، جہاں فوجی لیڈروں نے مخالف فوجی لیڈروں کو گولی کا نشانہ بنادیا اپنے اقدام کو جائز قرار دینے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ انھوں نے بہت نرم پالیسی اختیار کی ہے لیکن شاید انھیں نہیں معلوم کہ مذکورہ ممالک کے فوجی لیڈروں میں جنھیں گولی کا نشانہ بنایا گیا، اور شیخ مجیب الرحمٰن میں بڑا فرق ہے اول الذکر نمائندے نہیں تھے اور نہ انھوں نے الیکشن لڑکر اپنی ہردلعزیزی اور عوام کے نمائندہ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ جبکہ شیخ مجیب الرحمٰن مسلمہ جمہوری طریقے پر منتخب ہوکر آئے تھے اور انھیں اقتدار حاصل کرنے کا پورا حق تھا لیکن جب اقتدار کی منتقلی کا وقت آیا تو انھیں گرفتار کرکے ان پر مقدمہ بھی چلانا شروع کردیا گیا۔ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور جمہوریت کا خون ہے جسے جمہوریت نواز دنیا کسی حالت میں معاف نہیں کرے گی۔

اگر پاکستانی حکمرانوں نے دنیا کی تاریخ پڑھی ہے تو وہ محسوس کریں گے کہ جب کبھی کسی قوم کے ہیرو کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے تو اس سلوک سے وہ قوم مری نہیں بلکہ اور زیادہ طاقتور بن کر ابھری ہے۔ وقتی طور پر توپوں اور سنگینوں کے ذریعے کسی قوم کو دبایا جاسکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں ہوسکتا۔

رفتہ رفتہ جس طرح مشرقی پاکستان کے باشندے مرکزی فوجی حکومت سے بغاوت کررہے اور مختلف ممالک میں تعینات بنگالی ذمہ داران حکومت اپنے عہدوں سے الگ ہوکر بنگلادیش کی حکومت کے ساتھ اظہار وفاداری کررہے ہیں، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی ہردلعزیزی کسی طرح بھی کم نہیں ہوئی ہے اور بنگالی عوام کے دلوں پر بدستور ان کا قبضہ ہے۔ ایسے شخص کے خلاف مقدمہ چلانا اور اس کے ساتھ مفاہمت کی کوئی بات چیت نہ کرنا فوجی حکمرانوں کی سیاست و تدبر کے دیوالیہ پن کی علامت ہے۔ وہ جو کچھ کررہے ہیں اسے بے تدبیری اور دھاندلی تو کہا جاسکتا ہے دانشمندی نہیں اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ موجودہ حکمرانوں کے حق میں کچھ اچھا نہیں نکل سکتا۔ حالات کو معمول پر لانے کا اس وقت صرف ایک ہی طریقہ تھا، وہ یہ کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف مقدمے کو واپس لیا جاتا اور ان کے ساتھ بات چیت کرکے بنگلادیش کا کوئی ایسا حل نکالنے کی کوشش کی جاتی جس سے مشرقی بنگال کے عوام مطمئن ہوسکیں، اور اس حل کی کنجی صرف شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس ہے۔ لیکن پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی یہ کتنی نادانی ہے کہ یہ اسی شخص کو مارنے کی فکر میں ہیں جو انھیں اس دلدل سے نکال سکتا ہے جس میں وہ اس وقت پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ مجیب کو درمیان میں سے ہٹا کر مشرقی بنگال کے مسئلے کو حل کرسکیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی بھول ہے۔ شیخ کے خلاف فوجی حکومت کے کسی غلط اقدام سے عوامی جذبات اس قدر مشتعل ہوسکتے ہیں کہ صرف مشرقی بنگال ہی کا نہیں بلکہ پورے پاکستان کا وجود خطرے میں پڑسکتا ہے۔ لیکن شاید پاکستان کا فوجی ٹولا اس وقت بہرا ۔ گونگا بن گیا ہے۔ انسان کی عقل پر جب پردہ پڑجائے تو وہ کسی کی بات نہیں سنتا بلکہ اسے خودکشی کرنے میں مزہ آتا ہے۔ پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی حالت بھی یہی ہے۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف کارروائی نہیں کررہے ہیں بلکہ خود اپنی موت کو آپ دعوت دے رہے ہیں۔

الف۔ اے۔ بادشاہ

میں اپنے سامنے کھڑی شخصیت کو قتل کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ میرے لئے اجنبی ہے پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس سے برسوں کی شناسائی ہو۔ ایک عرصے سے میں اسے قتل کر دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، لیکن اس کے لئے میرے دل میں ہمدردی کا جذبہ نہ جانے کیسے پیدا ہو جاتا ہے کہ میں آج تک اس کا خاتمہ نہ کر سکا۔ میں اس سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ اس کے خدوخال مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ چہرے پر بنی ہوئی لکیروں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ ویسے اس کا سارا وجود بھیگی بلی کی طرح ہے۔ ماحول سے خوف کھایا ہوا سہما سہما سا رہتا ہے۔ مجھے اس کی بزدلی سے بھی نفرت ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔

ازل سے وسیع و عریض صحرا میں بھٹکا ہوا مسافر آج بھی ہونٹوں پر وہی پرانی تشنگی لئے عمر کی آخری دہلیز پر کھڑا ہانپ رہا ہے اور اس کی ڈولتی ہوئی پرچھائیں پانی پہ۔ بنا عکس نہیں صرف سراب ہے۔ اور آج تک یہ اسی سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ خود فریبی میں مبتلا، زمانے والوں سے ہراساں، اپنوں سے نظریں چرائے، غیروں سے دہشت زدہ نہ جانے کون سی منزل کی سمت چلا تھا کہ سفر کے اختتام پر بھی منزل کا دور تک پتا نہیں۔ شعلوں کا رقص جب سرد ہوتا ہے تو راکھ کا ڈھیر آگ لگنے کی گواہی دیتا ہے۔ طوفان گزر جانے کے بعد اجڑے ہوئے مکانات اس کی داستان کہتے ہیں۔ سمندر کی بھیانک لہریں موت کے کھیل سے تھک کر جب ساکت ہو جاتی ہیں تو زخم خوردہ ساحل ان کے پاگل پن کا نشان بن جاتا ہے لیکن اس بدنما ہیولے کے پیچھے صرف ریت ہی ریت ہے جس پر ایک ننھا سا دھبہ بھی نہیں۔ کون کہے گا کہ یہ اس طویل مسافت سے آ رہا ہے۔ کون مانے گا کہ اتنے لمبے سفر میں اس کا کوئی ہمسفر نہ تھا۔ وہ صلیب جو صدیوں پہلے کھو گئی تھی آج ملی بھی تو اس پر ایسا عیسیٰ چڑھا ہوا تھا جس کا کوئی شناسا نہیں کوئی پجاری نہیں۔ وقت کے کینوس پر بنی ہوئی یہ دھندلی تصویر آج بھی ایسے فنکاروں کی منتظر ہے جو اس کے رنگ کو گہرا کر سکتے ہوں۔ اس کی خاموشی کو زبان دے کر اس کے وجود کا بھی لوگوں کو احساس دلا سکتے ہوں۔ لیکن ریگستان میں کہیں بھی سایہ دار درخت نہیں۔ صرف دھوکا ہی دھوکا۔ فریب ہی فریب۔ اور یہ خود کو ہی دھوکا دیتا آیا ہے۔ اپنے آپ سے ہی فریب کرتا رہا ہے۔ اس امید پر کہ کوئی اسے دھوکا نہیں دے گا۔ کوئی اس کے ساتھ فریب نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے یقین پر خراشیں پڑتی ہی رہیں اور امید کی کمزور روشنی اندھیرے کے سمندر میں ڈوبتی ہی چلی گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے اپنے ہونٹ سی لئے۔ چہرے پر حماقتوں کا غلاف ڈال لیا۔ لوگ اسے بیوقوف سمجھنے لگے۔ بہن اسے بیوقوف بنانے لگی۔ وہ بہن جو اس سے عمر میں دو سال چھوٹی تھی اسے بدھو سمجھتی۔ وہ دوست جس کا اس نے بچپن کے معصوم لمحوں میں بھی ساتھ دیا تھا اور جوانی کے سنہرے دنوں میں بھی اسے حماقتوں کا مجسمہ سمجھتا تھا۔ اور یہ چپ چاپ دوستی کے پاک دامن پر غلاظت کی پڑتی ہوئی ان چھینٹوں کو دیکھ رہا تھا اور بہن اور دوست کے بیچ نامہ بر کا کام کر رہا تھا۔ بالکل انجان کی طرح جیسے کچھ نہ جانتا ہو۔ کچھ نہ سمجھتا ہو۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کی لیکن لوگ اس سے شکایت کرنے چلے آتے تھے۔ یہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوا لیکن اسے دیکھتے ہی لوگوں کے ماتھوں پر بل پڑ جاتے اور یہ مجرموں کی طرح سر جھکائے ان کے قریب سے گزر جاتا تھا جیسے یہ بیچ کوئی بڑا گناہ کر کے آ رہا ہو۔ ایسی حالت میں میری خواہش ہوتی کہ اسے چلتی ہوئی ٹرین کے آگے دھکیل دوں اسے بھاری پتھروں سے جکڑ کر دریا کے حوالے کر دوں۔

میں اس کی بے وقوفی کے وہ دن آج تک فراموش نہ کر سکا جب یہ امتحان کے دنوں میں اپنے نوٹس (Notes) دوستوں کو دے دیا کرتا تھا اور اپنے پڑھنے کے لئے کچھ نہ رکھتا۔ وہ نوٹس جن کو تیار کرنے میں مہینوں لگ جاتے دن رات ایک کر کے کئی کتابوں کے مطالعے کے بعد کوئی نوٹس بنتا تھا، اور اتنی جگر سوزی سے تیار کئے [illegible] دوست چھین لے جاتے اور بعض تو ایسے غائب ہوتے کہ پھر نظر نہ آتے۔ اور یہ صرف اپنے آپ پر جھنجھلا کر رہ جاتا۔ کسی سے کچھ نہ کہتا۔ کچھ نہ پوچھتا۔ اور اگر اس کے بعد بھی کوئی نوٹس آ جاتا تو یہ بغیر کچھ کہے نوٹس دے دیتا۔ اس میں انکار کی عادت نہ ہونے کے باعث یہ لوگوں کے لئے مذاق بن گیا۔ اس کی بے لوث خدمت کے جذبات مجروح ہوتے رہے زندگی آہستہ آہستہ بربادی کی طرف بڑھتی گئی۔ لیکن اس ہونٹوں پر چپ کی مہر لگی رہی۔ اس کے ہونٹ اس دن وا نہیں ہوئے جب اس کے خوابوں نے سسک کر دم توڑا تھا۔ اس کے سامنے سے اس کی آرزوؤں کا جنازہ گزرا۔ اپنی تمناؤں کی لاش کو کاندھا بھی نہ دے سکا۔ کسی کے ہو جانے کا خوف تھا۔ ڈر تھا کہ اس کی ایک ہلکی سی لغزش سے بھی سماج کی گندی انگلیاں اٹھیں گی اور اس کے دل پر دھڑکنوں میں پوشیدہ خوب صورت تصویر پر غلاظت کی کھینچ دیں گی۔ فریم ٹوٹ جانے کے بعد تصویر نہیں کھونا چاہتا تھا۔ خاموش، چپ چپ آگ کے شعلوں میں گھرا جلتا رہا۔ آگ جو اس کے دل سے اٹھی تھی اور سارے وجود پر چھا گئی اپنے ہی احساسات کے تیزابی اثر سے گھلتا رہا اور اف تک نہ کی۔ اس کا یہ آخری خواب بھی جب ریت کی دیوار ثابت ہوا تو اس نے تنہائیوں کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ لیکن تنہائیوں میں بھی تلخیوں کا سارا زہر میں پیتا رہا۔ اس کی خاموشی کا سارا دکھ میں نے سہا۔ کمرے کے اندھیرے میں روشنی کی لکیریں ٹٹولتا رہا لیکن ایک ہلکی سی کرن بھی ہاتھ نہ آئی۔ صرف گھٹن بڑھتی گئی۔ تاریکی میرا گلا دبا رہی تھی۔ میری سانسیں رک رہی تھیں اور میں چیخ رہا تھا۔ لیکن کوئی آواز میری طرف نہ لپکی۔ دل و دماغ کے بند دریچوں پر کسی نے دستک نہ دی۔ کوئی ہاتھ سہارا دے

...ت تو اُن کے گرد معاملات سے بندھا ہوا ہے اور
...کا منصوبہ میں جکڑا ہوا جسم وقت کے ٹوٹ جانے کا
...ہے لیکن میں اس سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر دینا چاہتا
...اسے ابدی اذیت سے نجات مل جائے۔ اس کے باوجود
...سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ اس کے لئے میرے دل ..
...کا جذبہ نہ جانے کہاں سے آجاتا ہے۔ شاید اسلئے
...اپنی شخصیت ہے۔ میرا اپنا وجود ہے۔
لیکن آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنا وجود ختم کر دونگا
دھڑکتا ہوا تجربہ کرنے سے کوئی خاتمہ ... ک
لئے نہیں۔ کوئی قدرت کوئی آواز نہیں تو یوں سسک سسک کر
کر یا یار مرنے سے ایک بدتر جانا اچھا ہے۔ اب تو زندگی کے
ایسے موڑ پر ہوں جہاں کوئی امنگ باقی نہیں رہتی۔ جذبات
سرد ہو جاتے ہیں۔ سامنے دھندلکا پھیلا ہوتا ہے۔ کمزور و
ناتواں جسم کو صرف ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔
جس کے ذریعے آدمی بچی ہوئی زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ لیکن
میرے پاس صرف دیواروں کا سہارا ہے۔ اور میں جو زم د
...بھی کی زندگی کے ... نہیں اسلئے خود کو ہمیشہ کی نیند
سلا دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔
لیکن ۔۔ میں جانتا ہوں کہ میں صرف سوچ سکتا ہوں کچھ
کر نہیں سکتا۔ آج تک صرف سوچتا ہی تو آیا ہوں۔ کہاں کچھ
کر سکا۔ بزدل ہی جو ٹھہرا۔ اور اب تنہائیوں سے لپٹ کر
رونا چاہتا ہوں۔ ایسے وقت میں جب آنسو بھی ساتھ
نہیں دیتے ہیں۔

...کانگریس نے
...ان کو دی جانے
...ام امداد پر
...لگا دی ہے۔
...ایک خبر

...یحییٰ خان نے
...ہے کہ بنگلادیش
...نے کے بعد
...ستان اور زیادہ
...ط ہو گیا ہے۔
...خبر

روشن آرا نیّر / ا

صبح کاذب کا اُجالا آسمان کے بیضوی کناروں پر
پھیلنے لگا تھا۔ ہر جگہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سید باڑے
کی قدیم عمارتوں میں بھی کہیں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ شکست
و ریخت کے باوجود سید باڑے کی شان دم بخود کر دینے کیلئے
بڑی حد تک کافی تھی۔ کہتے ہیں کسی نواب نے ایک شب کے قیام
کی بدولت باڑہ بنوایا تھا۔ اور سیّدوں کی خدمت سے خوش
ہو کر ایک بہت بڑی جاگیر بھی عطا کی تھی۔ اس وقت یہاں
کی تہذیب کا بول بالا تھا اور روح القدس کی برکتوں
سے سارا محلّہ خوشحال تھا۔ مگر یہ ماضی کی باتیں تھیں۔ سید
باڑے کے ماضی سے لوگوں کی عقیدتیں اب بھی وابستہ تھیں۔
کچھ قابلِ رہائش کوٹھریوں کو کرائے پر اٹھا دیا گیا تھا۔
پہلے جن کوٹھریوں سے تلاوتِ کلامِ پاک کی روح پرور آوازیں
سنائی دیتی تھیں۔ اب ان سے فلمی نغمے ابھرتے رہتے تھے۔
ترقی پسندوں نے باڑے کو وہ رنگ دیا تھا جس کا تصور کرتے
ہی ہمیں اپنی سسکتی تہذیب اور پسماندہ اخلاق کا شدید
احساس ہوتا ہے۔

زینت بیگم تلاوت کے بعد کوٹھری سے باہر آئیں۔
اور انھوں نے آنگن میں دیکھا۔ صبح کی تازہ ہوا میں پھول
کے پودے جھوم رہے تھے۔ اسی لیے آنگن کے آخری سرے
پر بنی ہوئی ملازم کی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اور صاف
رنگ کا ایک نیم بالغ چھوکرا باہر آیا۔ اس نے نیندیاسی
آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ وقت کا احساس ہوتے
ہی اس نے جلدی جلدی کرتے اور پاجامے کی سلوٹوں کو
دور کیا اور نل سے پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ اس سے
فارغ ہو کر وہ قمیص کے دامن سے منہ پونچھتا باورچی خانے
کی طرف بڑھا۔ زینت بیگم نے پکارا :-

"شوکت

شمو نے جھک کر انکی طرف دیکھا۔ زینت بیگم پلنگ پر لیٹی تھیں شلوار اور قمیص پر انھوں نے ہلکا گلابی سا لستر چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ انکے قریب جاکر بولا۔

"جی چھوٹی بیگم۔"

"تو آج پھر دیر سے اٹھا ہے۔ جلدی سے چولہا سلگا کر چائے بنا دے۔" زینت بیگم نے کہا۔ "میں بھی آتی ہوں سید صاحب کو باہر جانے میں دیر ہو جائے گی۔"

شمو گردن ہلاتا ہوا چلا گیا اور تیزی سے کام نپٹانے لگا۔ بھی وہ چور نگاہوں سے زینت بیگم کو دیکھ لیتا تھا۔ دہلیز پر بیٹھی زینت بیگم۔ جانے خلاء میں کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ یہ بات شمو کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے اپنی چھوٹی بیگم سے بڑی انسیت [illegible] بڑی بڑی آنکھیں اور سرخی مائل رنگت والی چھوٹی بیگم پر بے حد رحم آتا تھا۔ خوبصورتی کے علاوہ ان کے اندر بہت ساری خوبیاں بھی تھیں۔ پھر بھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ [illegible] شمو کے دل میں آتا کہ وہ اس کی وجہ چھوٹی بیگم سے پوچھے۔ لیکن پھر اپنی حیثیت کا احساس ہوتے ہی وہ اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیتا۔ وہ دو سال سے باڑے کا ملازم تھا۔ ان دو سالوں کے عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کے لئے ایک خاص نظریہ قائم کیا تھا، اور زینت بیگم کے لئے اس کے دل میں کافی عقیدت تھی۔ اس عقیدت کی وجہ زینت بیگم کا خلوص اور اخلاق تھا۔

سید صاحب بیدار ہو چکے تھے۔ سید باڑے کے مالک [illegible] سید صاحب کہا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ اب بھی قائم تھا حالانکہ اس لفظ کا اب کوئی وقار نہیں رہا تھا۔ وہ کوٹھری سے باہر نکل آئے۔

"ناشتہ جلدی لے آرے شمو۔"

"ابھی لایا حضور۔" شمو جواب دے کر تیزی سے ناشتے کی سینی لے کر بھاگا۔ سید صاحب ناشتے سے فارغ ہو کر باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی وہ پانی گرم کرنے لگا۔ کوئی بھی موسم ہو بڑی بیگم نیم گرم پانی سے غسل کرتی تھیں۔ ان کی عادتیں بھی نواب زادی سے کم نہ تھیں۔ مخاطب کرنے کا انداز بھی [illegible] تھا۔ باہر سے آئی ہوئی عقیدت مند عورتوں کے ساتھ گپ شپ لڑانے کے علاوہ انھیں اور کوئی کام نہ تھا۔ دونوں بچے [illegible] شمو کی نگرانی میں رہتے تھے۔ زینت بیگم کا رتبہ [illegible] ان سے کم نہیں تھا، مگر بڑی بیگم کی نگاہوں میں انکی کوئی وقعت نہ تھی اور یہی وہ خاص وجہ تھی جس سے شمو کو سخت نفرت تھی۔ خاموش کھوئی کھوئی سی رہنے والی چھوٹی بیگم پر اسے بےحد ترس آتا تھا۔ اس کے دماغ میں ہمیشہ یہی بات رہتی "آخر ان کی شادی کیوں نہیں ہوتی" اور ایک بار اتفاق سے اس نے بڑی بیگم کی باتیں سنیں، لیکن جن سے کچھ حقیقتیں اس پر ظاہر ہو گئیں۔

بڑی بیگم اس روز سید صاحب پر اس لئے بگڑ رہی تھیں کہ وہ زینت بیگم کا رشتہ باہر سے لائے تھے۔ بڑی بیگم کو یہ رشتہ اس لئے ناپسند تھا کہ لڑکے کی ماں سیدانی نہیں تھی اور سید باڑے کا یہ ایک قدیم اصول تھا کہ وہ لڑکیوں کا رشتہ خالص سید لڑکوں سے کرتے تھے۔ لڑکوں کو تو خیر یہ آزادی تھی کہ وہ اپنی پسند کی شادی وہ باہر سے بھی کر سکتے تھے۔ لڑکی کی شادی اگر کسی صورت سے نہیں ہوتی تو باہر سے آئے ہوئے ان رشتوں پر توجہ دی جاتی جہاں ماں باپ دونوں خالص سید ہوتے۔ وہ زمانہ اور تھا جب یہ رسم پروان چڑھی ہوگی لیکن اب اس نئے دور میں جب کہ ذات کی کوئی قید نہیں رہی تھی، خالص سید کہاں سے آتے۔؟

دن چڑھ آیا تھا۔ بڑی بیگم ناشتہ کر چکی تھیں، زینت بیگم بھی اپنی کوٹھری میں جا چکی تھیں۔ وہ چائے لے کر زینت بیگم کی کوٹھری کے پاس آیا اور بولا:۔

"چھوٹی بیگم چائے لایا ہوں۔"

"اندر لے آؤ شمو۔"

شمو اندر داخل ہوا۔ زینت بیگم پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں انھوں نے پیالا لے لیا۔ شمو کھڑا رہا تو زینت بیگم نے سمجھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مسکراتے ہوئے انھوں نے پوچھا:۔

"کیا بات ہے شمو۔ تجھے کچھ کہنا ہے۔؟"

"ہاں چھوٹی بیگم۔" شمو کے منہ سے یکایک نکلا۔ جس بات کی کرید اس کے دل میں ایک عرصے سے تھی، اور آج جب کہ یہ موقع خود چھوٹی بیگم نے دیا تو وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا وہ ہمت کر کے بولا:۔

"مگر ڈر لگتا ہے۔ آپ غصہ نہ ہو جائیں۔"

"نہیں نہیں۔ میں غصہ نہ کروں گی۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ۔" زینت بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"چھوٹی بیگم۔" شمو نے کہا۔ "یہ خالص سید کسے کہتے ہیں۔"

زینت بیگم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگیں شمو یہ کیوں جاننا چاہتا ہے۔

شمو کے معصوم چہرے پر تجسس اور خوف کی جھلک تھی۔ زینت بیگم کو وہ ایک ایسے معصوم ضدی بچے کی طرح لگا جو ہر نئی بات جاننے کے لئے مچل جاتا ہے۔ مگر اس کے آگے بھی تو ممکن ہے وہ کچھ جاننا چاہے۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتی رہیں اور پھر دھیرے سے بولیں:۔

"خالص ایک کفن ہے جو ارمانوں کی لاش پر ڈالا جاتا ہے" پر تو یہ سب جان کر کیا کرے گا شمو؟۔

"چھوٹی بیگم۔ ایمان کی بات کہوں۔"

"ہاں ضرور کہہ۔" زینت کی دلچسپی بڑھی۔

"چھوٹی بیگم محلّے میں اکثر براتیں آتی ہیں۔ آپ کی عمر کی ساری لڑکیاں بیاہی گئیں۔" شمو نے اٹک اٹک کر کہا۔ "مگر آپ کی شادی نہیں ہوتی، حالانکہ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ اور پھر آپ کسی ہیروئن سے کم خوب صورت بھی نہیں۔"

شمو کے سوال نے زینت بیگم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا سوال تھا لیکن اس کے اندر جو طاقت تھی اس کی دھمک سے وہ کراہ اٹھیں انھیں محسوس ہوا جیسے شمو نے ان کے چہرے پر بھرپور طمانچہ مار دیا ہو۔ ایسا سوال کر کے اس نے زینت بیگم کو بے نقاب کر ڈالا تھا۔ ایک ملازم کی یہ ہمت! ان کے چہرے پر غصے کی سرخی چھا گئی۔

چھوٹی بیگم کا چہرہ دیکھ کر شمو کا رجود لرز گیا۔ مگر اس کے بھولے چہرے کو دیکھ کر دھیرے دھیرے زینت بیگم کا غصہ اتر گیا اور چہرے کی سرخی کی جگہ ایک عجیب قسم کا پھیکا پن چھا گیا انھوں نے کہا۔

"تو بہت باتونی ہو گیا ہے رے شمو۔ لیکن۔۔ یہ ہیروئن کیا ہوتی ہے؟"

"یہ خوب رہی۔" شمو کا حوصلہ واپس آیا تو اس نے چہک کر کہا:۔

"آپ ہیروئن نہیں جانتیں۔ اجی فلم میں کام کرنے والی خوب صورت عورتوں کو ہیروئن کہا جاتا ہے۔"

فلم کے متعلق زینت بیگم کی معلومات صفر کے برابر تھیں ان کی دنیا تو بس سید باڑے کی چہار دیواری تک محدود تھی اور اس چہار دیواری سے آج تک ان کے قدم باہر نہیں نکلے تھے۔ انھوں نے پوچھا:۔

[illegible] رسالے دیکھ کر چھوٹی بیگم۔" شمو جلدی سے بولا۔ "پروفیسر صاحب کی لڑکیاں مجھ سے برابر رسالے منگواتی ہیں۔ اور تین چار بار فلم بھی دیکھی ہے میں نے۔"

شمو کے انداز بیان نے زینت پر اثر ڈالا۔ اور قدرتی طور پر ان کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ ان کے دل میں آیا۔ آخر وہ رسالے کیسے ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھنا چاہئے۔ انھوں نے کہا۔

"پیسے لے کر آج ایک رسالہ لا دینا۔ لیکن دیکھ خبردار جو کسی کے سامنے ذکر کیا۔"

"قسم لے لیجئے چھوٹی بیگم۔ زبان میں کیڑے پڑ جائیں جو کسی سے کہوں۔"

شمو کے جاتے ہی زینت بیگم خیالوں میں گم ہو گئیں۔ زینت بیگم کو اگر ایک حنوط شدہ لاش کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا وہ ایک زندہ لاش ہی تو تھیں جس کے جذبات اور ارمان مر چکے تھے۔ وہ خود سید باڑے کے کھنڈر سے کم نہ تھیں۔ اگر وقت نے باڑے پر اثر ڈالا تھا تو خاندانی اصولوں نے عفریت کی طرح انکی جوانی کو نگل لیا تھا۔ وہ ایک صاف ستھرے خیالات کی لڑکی تھیں عمر کے ساتھ ساتھ انکی آنکھیں کھلتی گئیں اور جب انھیں سید صاحب اور بڑی بیگم کی نیت کا احساس ہوا تو بڑی حیرت ہوئی۔

باہر والوں کے لئے سید باڑے کی چار دیواری سنگِ کوہلی کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر چار دیواری کے پیچھے بھائی جان اور بھابی جان کی ناپاک حرکتوں سے زینت بیگم کو سخت نفرت ہو گئی۔ ان لوگوں نے ان کے جذبات کی کوئی قدر نہ کی تھی۔ خاندانی روایت پر مٹتے ہوئے ان لوگوں سے زینت کو اسلئے نفرت تھی کہ روایت کی آڑ میں انھوں نے ڈھکوسلا کر رکھا تھا دراصل وہ نہیں چاہتے تھے کہ سید باڑے کا کوئی حصے دار باہر سے آئے۔ اور خاندان میں کوئی لڑکا تھا نہیں جس سے شادی کر کے یہ دولت بچائی جاتی۔ زینت بیگم ایک مجبور اور بے کس لڑکی تھیں۔ تلاوت اور احکام خداوندی کے لئے انھوں نے اپنی جوانی وقف کر دی تھی انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ زندگی کو دنیاوی اصول کے تحت گزاریں۔ نہ تو وہ خودکشی کر سکتی تھیں اور نہ غلط قدم اٹھانے کی ان میں ہمت تھی وہ تو جیسے موت اور حیات کے بیچ میں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے خواب کے محل کھنڈر ہو گئے تھے اور ان میں ان کے جذبات اور احساسات دفن ہو چکے تھے۔ محلے میں آنے والی براتوں کے شادیانے انھیں بے چین کر ڈالتے اور وہ دیر تک پلنگ پر کروٹیں بدلتیں اور آنسو بہا کر رہ جاتیں۔

شمو کی باتوں نے آج زینت بیگم کو بے چین کر ڈالا۔ مدت کے سوئے ہوئے جذبات میں چنگاری پڑ گئی اور جذبات و ارمان سلگنے لگے۔ وہ جن باتوں کو یاد کرنا نہیں چاہتی تھیں اب اس کی یاد سے وہ عجیب قسم کی بے چینی محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ ابھی خیالوں میں غرق تھیں کہ شمو آ گیا۔ زینت بیگم کے دل میں آیا اسے منع کر دیں اور سختی سے ڈانٹ دیں تاکہ پھر کبھی وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ مان لیا وہ رسالے پڑھ لے اور اسے بہت ساری باتوں کا علم ہو جائے۔ پھر اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ وہ اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلنے لگیں گی۔ لیکن پھر انھوں نے سوچا۔ پڑھنے میں نقصان ہی کیا ہے۔ وہ تو پہلے ہی سے جلتی آ رہی ہیں اور اب بھی جلتی رہیں گی۔ انکی قسمت میں کوئی سویرا تو ہے نہیں۔ اور یہ سوچتے ہی انھوں نے پوچھا۔

"کتنے پیسے دوں؟"

"ایک روپیا چار آنے۔"

پیسے لے کر شمو چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ آیا اور قمیص کے اندر سے ایک رنگین رسالہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے جاتے ہی زینت بیگم نے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا اور بے چینی کے ساتھ رسالہ دیکھنے لگیں۔ سب سے پہلے ہی صفحہ پر ایک تصویر دیکھ کر ان کا دل دھڑک اٹھا۔

ایک دل کش عورت نیم عریاں لباس میں بستر پر لیٹی مسکرا رہی تھی۔ پلٹنے سے اس کا سینہ عریاں ہو گیا تھا۔ زینت بیگم نے دل میں کہا "ہائے اللہ کیسی بے شرم عورت ہے"۔ انھوں نے دوسرا صفحہ الٹا، پھر تیسرا اور چوتھے صفحے کی تصویر دیکھ کر ان کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا۔ ایک مرد ایک ایسی عورت کو سینے سے لپٹائے ہوئے تھا جس کی پنڈلیاں اور بانہیں ننگی تھیں۔

زینت بیگم کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ تصویر کے ساتھ تحریریں پڑھنے لگیں۔ اس طرح وہ کتاب کے ایک ایک لفظ کو پڑھ گئیں۔ جب وہ ان تحریروں کو پڑھتی تو انھیں ہر بار نئی لذت ملتی تھی۔ اس وقت انکا چہرہ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا انکی نس نس میں چنگاریاں پھوٹتی رہتی تھیں۔

زینت بیگم کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ شمو سے کتابیں منگواتیں [illegible] کے بڑے حصے تک اس کا مطالعہ کر [illegible] اور ہیجان انگیز کہانیوں نے ان کی نگاہوں سے وہ پردہ ہٹا [illegible] جو ایک محدود دائرے نے ڈال رکھا تھا گناہ و ثواب۔ مگر اب زینت بیگم کو ایک نئی دنیا سے روشناس [illegible] تھا۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جس کے لئے کوئی محدود نظریہ [illegible] اسے تو وہی اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں جنھیں ایسی دنیا پانے کی تمنائیں ہوتی ہیں۔ اور نئی دنیا کے احساس [illegible] زینت بیگم کے جذبات لبریز پیمانے کی طرح چھلکنے لگے۔ دل چاہتا ان ہی تصویروں کی طرح وہ اپنے کو بدل ڈالیں افسانے کے ہیرو کی طرح کسی کی مضبوط بانہوں میں جکڑ [illegible] اور اس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر وہ [illegible] کو بھول جائیں۔ جہاں صرف [illegible] تھیں۔ اور ایسے وقت جب زینت کو یہ خیال آتا کہ یہ گناہ ہے تو ان کا دل کانپ [illegible] اپنے باغیانہ خیالات سے وہ ڈر جاتیں۔ پھر انکا دل کہتا [illegible] سے تمھیں خوف ہے تو ثواب نے تمہاری زندگی میں یہ خوفناک خلا کیوں قائم کر رکھا ہے۔ کیا دیا تھا ثواب نے انھیں [illegible] تڑپ اور آہوں کے سوا انکی زندگی میں اور تھا ہی کیا۔ اگر ایک وہ گناہ کر لیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اور یہ سوچتے [illegible] دوبارہ کتابوں کی دنیا میں کھو جاتیں۔

زینت بیگم کھڑکی سے لگی آنگن میں دیکھ رہی تھیں۔ [illegible] میں کوئی برات آنے والی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر بج رہا تھا۔ اس وقت بے حد اداس تھیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کاش ان کی بھی برات آتی اور کوئی انھیں سپنوں کے دیس میں لے جاتا یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ انکی نظر غسلخانے میں گئی۔ شمو نہا رہا [illegible] وہ لمبے گورے بدن کو مل کر نہانے میں مصروف تھا پرکشش جسم گوری گوری بانہیں اور چوڑی چھاتی دیکھ کر زینت کو پہلی بار احساس ہوا کہ شمو بھی ایک مرد ہے۔ یہ سوچتے ہی [illegible] آنکھوں میں ایک انجانی چمک چھا گئی۔ جس دن سید صاحب [illegible] اس کے مرد ہو جانے کا یقین ہو جائے گا اسی دن شمو ہمیشہ کے لئے اس چار دیواری سے باہر کر دیا جائے گا۔ کیوں نہ [illegible] سے قبل ہی وہ شمو کو اپنی بانہوں میں جکڑ لے۔؟

یہ سوچتے ہی زینت بیگم کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ دیر تک شمو کو دیکھتی رہیں اور اس وقت چونکیں جب شمو نہا کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

زینت بیگم اپنی کوٹھری میں آئیں اور دیر تک پلنگ [illegible]

[illegible]
[illegible] آواز میں پکارا۔
"شمو۔"
"چھوٹی بیگم۔"
[illegible] کی آواز آئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ کھیس پہنا [illegible] ان کے پاس کھڑا ہوا۔ زینت بیگم کی نگاہوں کو [illegible] لگ رہا تھا۔ وہ اُسے بڑی پیاری نظروں سے دیکھتی رہیں۔
"[illegible] سب سو جائیں تو چپکے سے آنا۔ تجھ سے ایک کام ہے۔"
"اچھا۔" شمو نے کسی قدر تعجب سے جواب دیا اور چلا گیا [illegible] سید صاحب کی کوٹھری کا دروازہ بند [illegible] کنڈی لگا کر اس نے چاروں جانب [illegible] اطمینان ہو گیا تو وہ دبے پاؤں زینت [illegible] کی طرف بڑھا۔ وہ ان کے کہنے کے مطابق جاتا [illegible] اس طرح رات کے ایک حصے میں چپکے سے بلانے پر [illegible] حیرت ہو رہی تھی۔
زینت بیگم [illegible] سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسکو [illegible] انھوں نے کہا۔
"[illegible] کواڑ بند کر دے۔"
[illegible] کو حیرت ہوئی۔ کہنے کے مطابق کواڑ بند کر کے وہ [illegible] قریب گیا۔ لیمپ کی ہلکی روشنی کوٹھری میں پھیلی ہوئی تھی [illegible] آئینے سے ٹکرا کر روشنی کا عکس ان دونوں پر پڑ رہا [illegible] شمو نے محسوس کیا کہ چھوٹی بیگم بہت خوش ہیں۔ ان کے [illegible] جوش ہے۔
"تم نے ایک بار کہا تھا" زینت بیگم نے شمو سے کہا "میں ہیروئن لگتی ہوں۔"
"جی چھوٹی بیگم" شمو نے جھٹ جواب دیا "جھوٹ تھوڑی کہتا ہوں۔ آپ تو ہیروئن ہیں۔"
شمو کی بات سے وہ [illegible]۔ ایک فلمی پرچے [illegible] ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔
"[illegible] اس تصویر کی طرح ہوں؟"
[illegible]

شمو نے سوچا چھوٹی بیگم اب لباس کہاں سے لائیں گی؟ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے بکس سے ویسا ہی لباس نکالا۔ تب اس کی سمجھ میں آیا کہ پچھلے دنوں انھوں نے کپڑا کیوں منگوایا تھا۔
زینت بیگم پردے کی اوٹ میں کپڑے بدل رہی تھیں شمو نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ بھلا اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ چھوٹی بیگم کی طرف دیکھتا۔ وہ تو ایک ملازم تھا اور ایک ملازم کی حیثیت کیا ہوتی ہے وہ بخوبی جانتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک مرد تھا۔ مالک۔ نوکر اور احترام، خوف کے باوجود وہ نفس پر قابو نہ رکھ سکا۔ اپنے تجسس کو نہ روک سکا جو مرد کے اندر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی عورت لباس تبدیل کرتے وقت جسم کے کسی حصے سے ننگی ہو جائے۔ اس نے چور نگاہوں سے آئینے میں دیکھا۔ وہ جمپر اتار کر بلاؤز پہن رہی تھیں۔ اُف کس قدر خوب صورت تھا جسم۔ پھر شلوار اتار کر وہ اسکرٹ پہننے لگیں۔
زینت بیگم لباس بدل کر مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آئیں تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہا۔ وہ تو تصویر سے بھی زیادہ حسین تھیں۔ گلے کے نیچے سے جذبات کی وہ دہلیز شروع ہوتی تھی جہاں شمو کی معصوم نگاہیں اٹک گئیں۔ شمو کے اندر دھیرے دھیرے گرمی بڑھنے لگی۔ "یہ کیسی گرمی ہے؟" وہ سوچنے لگا۔ چھوٹی بیگم کو اس لباس میں دیکھ کر اس کے اندر یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوہ آتش فشاں کے قریب ہو اور جل رہا ہے۔ چھوٹی بیگم بہر حال اس سے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کا بدن تپ رہا تھا۔ اس نے بدن چھوا اور گھبرا کر کہا۔
"آپ کو تو بخار ہے۔"
"شمو،" چھوٹی بیگم نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "یہ تو ایک زمانے سے ہے۔"
شمو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ وہ اس سے دم بدم سٹتی جا رہی تھیں۔ اس پر بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکا تو زینت بیگم نے بہت ہی جذباتی آواز میں کہا۔
"شمو۔ تو بدھو ہے کیا؟"
بدھو۔ نہیں وہ بدھو تو نہیں۔ چھوٹی بیگم نے تو اسے کبھی [illegible] تک آئی تھیں۔ [illegible]
وہ ایک دم سے چھوٹی بیگم کی باتوں کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کانپ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔
"نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"
وہ خوف سے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہ چھوٹی بیگم سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ یہ حق تو خالص سید کو ہے اور وہ تو ایک نچلے طبقے کا فرد تھا۔ یہ گناہ ہے۔ یہ گناہ ہے۔ وہ اپنے سے جنگ کر رہا تھا کہ بڑی بیگم کی آواز آئی۔ وہ اسے پکار رہی تھیں۔ شمو جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔
"چھوٹی بیگم میں جاتا ہوں۔"
"فوراً آجانا" زینت بیگم نے اپنے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "میں تیرا انتظار کروں گی۔"
وہ جواب دیے بغیر تیزی سے کوٹھری سے نکل گیا۔
زینت بیگم نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ان کی حالت اس وقت ٹھیک ایسے انسان کی طرح تھی جو شدید پیاس سے بے چین ہو اور کنویں کے پاس پہنچ کر بھی پانی نہ پی سکے۔ وقت کے ساتھ جذبات کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ہیں تو ایسے انسان کے قدم کسی وقت بھی ڈگمگا سکتے ہیں۔ اس وقت نہ اُسے خاندانی وقار کا خیال رہتا ہے اور نہ گناہ و ثواب کا احساس۔ یہی حالت زینت بیگم کی تھی۔ مگر اب اگر انکی جلتی آنکھیں دروازے پر تھیں تو کان آہٹ پر۔
لیکن شمو نہیں آیا۔ وہ دیر تک انتظار کرتی رہیں اور بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے جانے کب نیند آگئی۔ صبح بڑی بیگم کے پکارنے پر انکی نیند ٹوٹی۔ وہ جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگیں۔ اسی دوران انھیں رات کی باتیں یاد آئیں تو چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ شمو سے بے حد خفا تھیں۔ انھوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ شمو کو خوب جھاڑیں گی۔ اس سے بات نہیں کریں گی۔
زینت بیگم باہر آئیں تو بڑی بیگم نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔
"ناشتہ جلدی سے تیار کرو۔ شمو بھاگ گیا ہے۔"
"کب؟" انھوں نے دھڑکتے ہوئے دل سے چار دیواری کی جانب دیکھا جو ان کے دل کے لیے سنگِ بوسی کی حیثیت رکھتی تھی تو اس کے واسطے سنگِ زنداں سے کم نہ تھی۔
زینت بیگم کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ان کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔
■

عبدالصبر نعیمی

بنگلا دیش کی حسین اداکار ابھی یہیں

کابیری چودھری اپنے دو بچوں کے ساتھ۔

بنگلا دیش کی حسین اداکار کابیری چودھری بھی دوسرے بنگالی ریفیوجیوں کی طرح ہندوستان چلی آئی ہے۔ کابیری چودھری کے ہمراہ اس کا شوہر اور دو بچے ہیں۔ کابیری ڈھاکہ سے کس طرح فرار ہوئی اور کیسے کیسے دکھ جھیل کر ہندوستان کی سرزمین تک پہنچ سکی یہ سب بذاتِ خود ایک فلمی کہانی معلوم ہوتی ہے اور اس حقیقی کہانی کو فلمساز، ہدایت کار، اداکار آئی۔ ایس۔ جوہر اپنی نئی فلم "جے بنگلا دیش" میں پیش کر رہا ہے۔

کابیری بنگالی اداکار ہے مگر اس کی مقبول فلمیں اردو کی بنی ہیں۔ پہلے پہل وہ اردو سے بالکل ناواقف تھی مگر فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد دھیرے دھیرے اس نے اردو سیکھنی شروع کر دی اور اس طرح وہ بنگلا اداکار سے اردو اداکار بن گئی۔ کابیری اب تک پچاس فلموں میں کام کر چکی ہے جن میں سے صرف پینتالیس فلمیں نمائش کے لئے پیش ہو چکی ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور و معروف اردو فلمیں [illegible] ہیں "بہانہ"، "تیتا"، "نور شاہ جہاں"۔ مؤخر الذکر فلم [illegible] کے فلمی میلے میں دکھائی گئی تھی۔ کابیری کا زیادہ تر فلموں میں ہیرو رزاق نے کام کیا ہے جو بقول کابیری پاکستانی وحید مراد ہے۔ ہندوستانی فلم "گنگا دھرا" کی کہانی سے ملتی جلتی ایک فلم [illegible] میں کابیری نے مرکزی رول ادا کیا ہے۔

چٹاگانگ میں پیدا ہونے والی اداکار کابیری چودھری رقص کی ماہر ہے۔ اس نے فی الحال آئی۔ ایس۔ جوہر کے علاوہ کسی کی فلم میں کام کرنے کا کنٹریکٹ نہیں کیا ہے۔ وہ کہتی ہے ہندوستان کا عظیم ہدایت کار ستیاجیت رائے ہے۔ میں ان کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایسے وقت میں جب کہ میں بے سہارا ہو چکی ہوں مجھے سہارا دیا۔ وہ عالمی شہرت کے ہدایت کار ہیں اگر میں ان کی کسی فلم میں کام کروں تو یہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہوگی۔

اداکاری اور رقص سے تعلق رکھنے والے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا: "ہمارے بنگال میں اداکاری یا رقص کا کوئی اسکول نہیں ہے ہم سب کچھ خود ہی سیکھتے ہیں۔ میں نے بھی اداکاری اور رقص کی تعلیم خود ہی حاصل کی۔ میں یقین رکھتی ہوں کہ انسان جب کسی کام کو پسند کرتا ہے۔ اس کو کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہ خود بخود اس کام کا ماہر ہو جاتا ہے۔

کابیری چودھری فی الحال بمبئی میں "جے بنگلا دیش" کی تکمیل میں مصروف ہے۔ امید ہے کہ بہت جلد یہ فلم مکمل ہو جائیگی۔

انتخاب: نسیم محمد علی

راکھی کی اداکاری کے بارے اگر زیادہ کچھ نہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ ویسے راکھی آج کی مقبول ترین اداکاروں میں سے ہے۔ راکھی اس وقت آدھی درجن سے زاید فلموں میں کام کر رہی ہے۔ یہ سین ہے فلم "شرمیلی" کا۔

اپٹون سنکلر

دنیا کے نامور مصنفین سے ملاقات ۳

اپٹون سنکلر نے ۸۰ کتابیں اور پانچ سو سے زائد
کتابچے لکھے ہیں۔ اس کی کتابوں کی بیس لاکھ جلدیں جرمنی
یں اور تیس لاکھ جلدیں روس میں فروخت ہو چکی ہیں۔ اسکے
صلاح پر مبنی ناولوں نے انقلاب روس لانے میں ایک
ڑنک مدد کی ہے۔ اگرچہ وہ ایک امریکن تھا لیکن امریکا
بجائے اس کی کتابیں یورپ میں زیادہ مقبولِ عام ہیں۔
ں دن میں فرنچ ریویرا پر ایک بک اسٹال پر گیا۔ وہاں اپٹون
نکلر کی کتابیں دوسرے تمام انگریز اور امریکی ادیبوں کی
ابوں سے زیادہ موجود تھیں۔ اس کی کتابیں ۴۴ زبانوں
یں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

اپٹون سنکلر نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ ان زبانوں
یں سے اکثر کے نام سے ناواقف تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہ
تھا کہ وہ کن ملکوں میں بولی جاتی ہیں۔ آج کل کے زمانے
یں اس کی کتابیں دوسرے تمام مصنفین سے زیادہ پسند
کی جاتی ہیں۔

سنکلر نے ۱۶ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور
مسلسل ساٹھ برس تک لکھتا رہا۔ اس نے لاکھوں کی تعداد
میں صفحات سیاہ کئے ہیں۔ اس نے اتنے الفاظ لکھے ہیں کہ
اگر نئی اور پرانی بائبلوں کو ملا دیا جائے تو ان کے الفاظ
سے بھی زیادہ۔

اپٹون سنکلر کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا
وہ دنیا سے افلاس ختم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ تجربات کی بنا
پر وہ جانتا تھا کہ مفلسی کس قدر بے رحم ہوتی ہے۔ اس نے
مجھے بتایا کہ ایک زمانہ اس پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ وہ چھ
سال مفلسی کے ظالم پنجے میں گرفتار رہا۔

اس کا باپ ایک شراب فروش، اور خود بھی زبردست
شرابی تھا جب وہ لڑکا ہی تھا تو وہ رات کے وقت اپنے
باپ کی تلاش میں ایک شراب خانے سے دوسرے شراب
خانے میں گھوما کرتا، اور پھر وہ اپنے شرابی باپ کو کسی
شراب خانے سے اٹھا کر اپنے بازوؤں کے سہارے آہستہ آہستہ
گھر لے آتا اور اسے اس کے بستر میں لٹا دیتا۔ اسکی ماں
اپنے شرابی خاوند کی جیبیں ٹٹولتی اور جس قدر نقدی ملتی
اسے چھپا لیتی تاکہ اگلے دن وہ اس نقدی سے کھانا
پکا سکے۔ وہ اسقدر غریب تھے کہ انھیں ٹوٹے پھوٹے اور
اندھیرے مکانوں میں رہنا پڑتا تھا۔ اسقدر غریب کہ انھیں
مسلسل مکان تبدیل کرنا پڑتا، کیونکہ وہ مکان کا کرایا دینے
سے قاصر رہتے تھے۔

بڑا ہو کر اپٹون سنکلر شراب کے سخت خلاف ہو گیا۔
وہ شراب کے خلاف گھنٹوں لیکچر دیتا رہتا۔ باپ کی زندگی کا
اس پر یہ ردِ عمل ہوا کہ سنکلر بڑا ہو کر چائے تک نہ پیتا تھا۔
اور نہ کبھی اس نے سگریٹ کو ہاتھ لگایا۔

دس سال کی عمر سے پہلے اسے اسکول جانے کا
موقع نہ ملا۔ اس نے لکھنا پڑھنا خود ہی سیکھا۔ اسکول جانے
سے پہلے اس نے بہت سے مشہور انگریز ناول نگاروں کے
کئی ناول پڑھ لئے تھے اور اسی طرح انسائیکلوپیڈیا کا بیشتر
حصہ ازبر کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہائی اسکول کی تعلیم
فقط دو سال میں ختم کر لی۔

جب وہ کالج میں داخل ہوا تو اس کے باپ کا ... بہلا
نہ تھا۔ اس کی والدہ اس کے پاس رہا کرتی تھی اور ... سارا
خرچ بھی سنکلر ہی برداشت کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے سستے
قسم کے رسالوں کے لئے کہانیاں اور ناول لکھنے شروع کر دیئے
اور اس طرح اپنے اور اپنے کالج کے اخراجات کو پورا کرنے
لگا۔ وہ ہر رات ایک کہانی یا ناول کا ایک باب لکھتا۔ ایک
مہینے میں وہ دو ناول مکمل کر لیتا۔ اس کے علاوہ اسے یونیورسٹی

استانی دہلی

ہے۔" رضوان اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہوا پرسکون لہجے میں بولا اور حکیم صاحب جھک کر اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگے۔

" اوہ واقعی یہاں چھالے ابھر رہے ہیں۔" حکیم صاحب چیخ پڑے۔

پھر انھیں اپنا چالیس برس کا تجربہ ناکام ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ کیونکہ رضوان کا مرض ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ کچھ دیر وہ رضوان کی انگلیوں پر ابھرنے والے چھالوں کو دیکھتے رہے پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔

" اچھا رضوان۔ تم اپنی انگلیوں پر یہ دوا لگالو اور گھر جاؤ۔ سیدھے گھر ہی جانا بیٹے۔ میں کچھ دیر کے لئے تنہائی چاہتا ہوں۔" تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے کہا اور رضوان خاموشی سے اٹھ کر رخصت ہو گیا۔

لیکن آج حکیم صاحب پر حیرتوں کے پہاڑ ہی ٹوٹ پڑنے والے تھے۔ ابھی رضوان کو گئے ہوئے مشکل سے بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ حکیم صاحب نے دیکھا چندر حلوائی اپنی لڑکی تارا کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسے سنبھال کر لا رہا تھا۔ تارا کی انگلیوں پر موٹے موٹے چھالے ابھرے ہوئے تھے، اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے جیسے وہ تکلیف کو برداشت کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ چندر نے حکیم صاحب کو بتایا کہ پوریاں تلتے ہوئے تارا کی انگلیاں تیل میں ڈوب گئیں۔

مولوی صاحب سکتے کے عالم میں تارا کی انگلیوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل پڑ رہی تھیں۔ رضوان کا جملہ اب بھی ان کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ " جیسے میں جل گیا ہوں۔" پھر ان کے ذہن میں رضوان اور تارا کے خاموش عشق کی بازگشت ٹھوکریں مارنے لگی۔

" خداوند! کیا ایسا بھی ممکن ہے میرے معبود!۔ آج ہی تو اس نے کہا تھا کہ حقیقت خود بخود سورج کی طرح روشن ہو جائے گی ...... روشن ہو جائے گی۔" بدحواسی میں بڑبڑاتے ہوئے انھوں نے اپنا سر تھام لیا۔

" جی حکیم صاحب! مجھ سے کچھ کہا آپ نے۔" گھبرایا ہوا چندر حکیم صاحب کی بڑبڑاہٹ پر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

" نہیں چندر۔ تم سے کچھ نہیں کہا۔ میں تو... میں تو بس یوں ہی کچھ سوچ رہا تھا۔" کہتے ہوئے انھوں نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور تارا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

تارا کی انگلیوں پر مرہم کا لیپ کرتے وقت ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ لیپ کرنے کے بعد انھوں نے کن انکھیوں سے تارا کو دیکھا تو اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے بھولے پن اور آنکھوں میں تیرتی ہوئی معصومیت کے علاوہ انھیں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر وہ اس انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے تنہائی میں چندر سے گفتگو کرنا چاہتے ہوں۔

" چندر!" مطب سے باہر آکر انھوں نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا:

" میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری بستی میں کوئی بہت ہی عجیب واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ ایک حادثہ سمجھ لو۔ ایسا حادثہ جو اگر بخیر و خوبی گزر گیا تو سندیلے کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دے گا۔ ورنہ...... ورنہ قیامت بھی ٹوٹ سکتی ہے ہم لوگوں پر۔"

" میں نہیں سمجھا حکیم صاحب۔ آپ عالم ہیں بہت دور کی بات سوچ سکتے ہیں، لیکن وضاحت کیجیے اپنی بات کی۔" چندر ہکلا گیا۔

" تم ہندو ہو چندر۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندو اور مسلمان کے ڈھکوسلے ختم ہونے کو ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم تارا کی شادی رضوان کے ساتھ کر دو۔ وہ رضوان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔" حکیم صاحب نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

" نہیں حکیم صاحب یہ کیسے ممکن ہے۔ برادری میں رہی سہی عزت بھی ختم ہو جائے گی۔ ویسے بھی کیا کم بدنامی ہو چکی ہے۔"

" یہ رتنیں میرے سامنے بھی ہیں درست۔ مگر شاید تم یقین نہ کرو گے کہ تارا کی تقدیر بدل رہی ہے۔ اور مستقبل میں کوئی ایسا معجزہ رونما ہونے والا ہے جسے دیکھ کر تمہاری آنکھیں حیرت سے پھٹ جائیں گی۔ دلوں کی دھڑکنیں بند ہو جائیں گی۔ چندر! بندر میرے بیٹے۔ تقدیر کے اس چکر کو سمجھنے سے میں بھی قاصر ہوں۔ میرا علم، عقل اور میرا تجربہ سب حیران ہیں۔ تم یقین کرو گے چندر، لیکن جب تمہاری تارا کی انگلیاں تیل میں ڈوب رہی تھیں تو یہاں میری آنکھوں کے سامنے رضوان کی انگلیوں پر چھالے ابھر رہے تھے۔ عشق کی گرمی جہنم کی تپش سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اگر اس کا علاج نہ کیا گیا تو جسم راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو جائیں گے۔"

" میں مر جاؤں گا حکیم صاحب! میرا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ بچا لیجیے حکیم صاحب۔ میری عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ہی ہمارے سب کچھ ہیں۔ ہمارے آڑے وقت پر کام آتے ہیں۔ کوئی ترکیب بتائیے۔" چندر حکیم صاحب کے پاؤں پکڑے ہوئے گڑگڑا رہا تھا۔

" اٹھ جاؤ دوست۔ تقدیر کے نیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی بھی دخل نہیں دے سکتا۔ میں حالات کو جان گیا ہوں اس لئے دخل دے کر اپنی عاقبت خراب نہیں کر سکتا۔ تم خود اگر کچھ کر سکتے ہو تو سوچو اور انجام کے منتظر رہو۔" حکیم صاحب نے کہا اور مطب کے اندر چلے گئے۔

تارا پر پابندی لگا دی گئی۔ وہ گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی لوگ دیکھ رہے تھے کہ اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صبح کے وقت وہ ہر ایک کو اپنے چبوترے پر کھڑی نظر آتی اور رضوان راستے سے گزرتے ہوئے چند منٹ کے لئے وہاں کھڑا ہو کر تارا کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا۔ دونوں کی خاموش نظریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجلیاں پیدا کرتی رہتیں۔ اس کے بعد رضوان وہاں سے ہٹ جاتا لیکن کسی کی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر رضوان کو روک دیتا۔ چندر نے جب سے حکیم صاحب کی زبانی سنا تھا اس وقت سے ہر وقت وحشت زدہ سا رہتا اور اس کا رنگ کسی یرقان زدہ شخص کی طرح پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

ایک دن چپکے سے تارا کی شادی ہو گئی اور وہ اس طرح اپنے سسرال چلی گئی کہ محلے والوں تک کو خبر نہ ہو سکی۔ جب یہ بات چندر نے حکیم صاحب سے بتائی تو وہ صرف ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

لیکن لوگوں نے دیکھا کہ رضوان پر تارا کی شادی کا ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح مطمئن نظر آتا تھا۔ اس کے مشاغل میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حد یہ تھی کہ وہ اب بھی چندر کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند لمحوں کیلئے ٹھہر کر چبوترے پر اسی طرح نظریں گاڑ دیتا جیسے تارا وہاں موجود ہو۔

لوگوں میں ایک بار پھر کانا پھوسی شروع ہو گئی تھی لیکن اس بار افواہوں کا رخ بدلا ہوا تھا۔ بستی میں یہ خبر گرم ہونے لگی تھی کہ رضوان پاگل ہو گیا ہے۔ تارا کی شادی نے اسے سٹری بنا دیا ہے۔

چندر کو یہ افواہیں پاگل کئے دے رہی تھیں۔ اس کا گھر سے باہر نکلنا دشوار ہو گیا تھا۔ ایک دن تو اس کی پریشانی اتنی بڑھی کہ صبح ہی صبح اس نے حکیم صاحب کے گھر جا کر ان کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑا کر رونے لگا۔

اور تارا سے اسقدر مشغول تھا کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حکیم صاحب نے چندر کو رخصت کر دیا۔ چندر کے چلے جانے کے بعد وہ رضوان سے مخاطب ہوئے۔ ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"تمہارا علم کیا کہتا ہے رضوان۔ کیا تارا اچھی ہو جائیگی؟" انھوں نے پوچھا۔

"مشفق استاد! آپ کے علم کے سامنے میری عقل ناقص ہے۔ میں تو آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ وہ صرف دعاؤں کی محتاج ہے۔ مجھے تو بس راکھ کے ڈھیر نظر آ رہے ہیں۔" اس نے کچھ اس انداز میں مسکراتے ہوئے کہا جیسے اس پر تارا کی حالت کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ حکیم صاحب کی بات کا جواب دیتے ہوئے مسکرایا تھا۔

دوسرے دن جب وہ آیا تو اس کا چہرہ اسقدر پرسکون تھا جیسے وہ دنیا کے تمام غموں سے نجات پا گیا ہو۔ لیکن اس کے اطمینان نے حکیم صاحب کا اضطراب اور بڑھا دیا۔

"چندر ابھی تک دوا لینے نہیں آیا رضوان؟" رضوان کو دیکھ کر انھوں نے سوال کیا۔

"اب وہ دوا کس کے لئے لے جائیگا حضور"؟ اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

"کک... کیا مطلب"؟ حکیم صاحب کا سانس گلے میں پھنس گیا۔ "کیا تارا...... نہیں نہیں وہ زندہ ہے۔ اگر مر گئی ہوتی تو چندر کے گھر میں طوفان مچ گیا ہوتا۔"

"کیا چند اکھڑی ہوئی سانسیں زندگی کی ضامن ہیں۔ تارا کب کی مر چکی ہے۔"

"تم نے اسے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں چبوترے پر اس کی لاش کھڑی ہوئی رکھی تھی۔" رضوان نے کہا۔ پھر قبل اس کے کہ حکیم صاحب کچھ کہتے ان کے کانوں میں بھونچال سا آ گیا۔ قریب ہی گریہ و زاری کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

حکیم صاحب نے محسوس کیا جیسے انھیں اب غش آیا ہی چاہتا ہے۔ وہ رضوان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ جس نے ابھی ابھی اپنی محبوبہ کے مرنے کی خبر انھیں نہایت پرسکون انداز میں سنائی تھی اور اس وقت نہایت اطمینان سے ان کے سامنے سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ ذہن پر اتنا بوجھ پڑ گیا تھا کہ حکیم صاحب کو اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

واقعات تیزی [illegible]

"نہیں نہیں۔ یہ تارا کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ محبوبہ کی موت کا اظہار اتنے پرسکون انداز میں۔ ناممکن۔ خداوند قدوس میرے معبود۔ مجھ ضعیف پر رحم کر۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔" حکیم صاحب اپنے آپ بڑبڑا رہے تھے۔ پھر وہ آنکھیں بند کرکے مسند پر نیم دراز ہو گئے اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔

"حضور تارا آپ کی مریضہ تھی۔ کیا آپ اس کی آخری رسوم میں شریک ہو کر اس کی روح کو سکون نہ بخشیں گے" اچانک رضوان نے خاموشی کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہا اور حکیم صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔

"رضوان۔ تیرا یہ اطمینان مجھے مار ڈالے گا۔ یعنی تیرے اوپر اس کی موت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ تیرا لہجہ اسقدر ٹھنڈا اور خشک ہے جیسے کوئی بنجر چٹان بول رہی ہے۔"

"آپ گھبرائے ہوئے ہیں۔ لیکن میری مجال نہیں کہ آپکو استقلال کا درس دوں۔ میرے شفیق تحمل سے کام لیجئے۔ روح کی آنکھیں جب کھلتی ہیں تو ساری حقیقتیں آئینہ بن جاتی ہیں۔ آئیے اب چلیں۔ میں مطب بند کرتا ہوں۔ آپ کو ابھی بہت سے کام انجام دینا ہیں اور وقت بہت کم ہے۔" رضوان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور کھڑا ہو گیا۔

چندر کی نظر جیسے ہی حکیم صاحب پر پڑی اس نے دوڑ کر ان کے قدم پکڑ لئے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ غم سے پاگل ہو رہا تھا۔

"آپ یہاں ہیں حکیم صاحب۔ آپ کی آنکھوں نے وہ سب کچھ پہلے ہی دیکھ لیا تھا جسے سوچ کر میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ تارا کے لئے دعا کیجئے حضور۔ آپ کی دعائیں اس کی آتما کو شانتی دے سکتی ہیں۔" وہ ان کے قدموں پر لوٹتا ہوا بولا۔

"صبر کرو چندر! تارا صرف تمہاری ہی بیٹی نہیں تھی۔ [illegible]روں سے تو کوئی بھی واقف نہیں ہے۔ کون جانتا ہے کہ اسے اتنی جلدی کیوں اٹھا لیا گیا اور ہم ناکارہ بوڑھے اپنی جوان اولاد کو مرتے دیکھنے کے لئے کیوں زندہ رکھے گئے ہیں۔ کون جانے کہ ابھی ہمیں اور کیا کیا دیکھنا پڑے۔" حکیم صاحب تھرتھرائی ہوئی آواز میں بولے اور ان کے آنسو داڑھی سے ٹپکنے لگے۔

تین بجے تک تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور تارا کی ارتھی کو شمشان گھاٹ کی طرف لیجایا جا رہا تھا۔ حکیم صاحب رضوان کے کندھے کا سہارا لئے ہوئے ڈگمگا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔

چار بجے کے قریب جب چتا میں آگ لگائی گئی تو مرگھٹ شمشان بھومی کانپ اٹھی۔ چندر بیٹی کی چتا میں جانے کے لئے مچل رہا تھا۔ حکیم صاحب کی داڑھی سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی لوگوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ [illegible] سے اٹھتے ہوئے شعلوں نے ماحول پر ہراس کی چادر [illegible] رکھی تھی۔ گریہ و زاری کے شور سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اس ماحول میں بھی ایک آدمی سارے غموں سے بے نیاز اور پرسکون تھا۔ رضوان چتا سے کچھ فاصلے پر خاموش بیٹھا ہوا نیم وا آنکھوں سے اس انداز میں چتا سے اٹھتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں سے آگ کی ساری حرارت کھینچ کر اپنے اندر جذب کر لے گا۔

رفتہ رفتہ شعلے ختم ہوئے اور انگاروں پر راکھ جمنے لگی۔ بہت سے لوگ واپس جا چکے تھے اور کچھ لوگ اب جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ لیکن رضوان اس اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا جیسے اب اسے اٹھ کر کہیں نہیں جانا ہے۔ رات کافی بڑھ چکی تھی اور چاند کی زرد روشنی میں پوری کائنات بجائے خود ایک چتا معلوم ہو رہی تھی۔ اب وہاں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ محض ایک راکھ کا ڈھیر تھا جس کے کنارے کچھ لوگ ابھی تک بیٹھے سسکیاں لے رہے تھے۔

کافی دیر بعد حکیم صاحب ایک کراہ کے ساتھ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھے۔ چندر بھی ان کے ساتھ ہی دھوتی کے ایک کونے سے اپنا چہرہ پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ حکیم صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے رضوان کی طرف کچھ اشارہ کیا اور چندر آہستہ آہستہ رضوان کی طرف بڑھنے لگا۔ مدھم چاندنی میں بیٹھا ہوا رضوان کوئی مجسمہ لگ رہا تھا۔

"چلو بیٹا۔ یہاں کیا رکھا ہے اب۔ سب کچھ تو ختم ہو گیا۔ میری دنیا لٹ گئی۔ کاش میں نے دھرم کرم کا چکر چھوڑ کر پہلے ہی حکیم صاحب کی بات مان لی ہوتی۔۔۔۔ مگر نہیں۔ مجھے تو [illegible] بھر رونا تھا۔ پھر میری سمجھ میں حکیم صاحب کی بات کیسے آتی۔ اٹھو بیٹا۔ اب یہ غم تو زندگی کے ساتھ ہے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے رضوان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مگر۔۔۔ مگر۔ اوہ۔ ہراس ہراس۔ وہ لمحہ بھر کو سارے غم بھول گیا۔ دہشت زدہ آنکھوں سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا جس پر راکھ کے ذرے چپک کر رہ گئے تھے۔

"حکیم صاحب" اس کی چیخ بڑی کربناک تھی خوف دہشت

وہ بھی یارو عجیب زمانہ تھا

بہزاد لکھنوی

بے کار مباش کچھ کیا کر کپڑے ہی ادھیڑ کر سیا کر

یہ شعر کس کا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں اس کی کیا شانِ نزول ہے۔ میں قطعی لاعلم تھا۔

ایک دن حکیم بڈھن کہہ بیٹھے کہ یہ ان کے پردادا مرحوم و مغفور کا شعر ہے۔ اب ان سے اس کے معنی اور مطلب کا پوچھ لینا آسان کام نہ تھا۔ یہ مجھ فقیر کی ہی ہمت تھی کہ پوچھ بیٹھا وہ بولے۔

"استاد ابھی نہیں کسی دن تم کو اس کے معنی بتاؤں گا ہوالیوں کر دلجیت نگر کی واپسی پر

جو کر بیچے تھے روائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ہم دونوں جب شناس دتن صاحب کے ہوٹل پہنچے تو وہاں اُلّو بول رہا تھا۔ نہ ہوٹل کا پتا تھا اور نہ خریداروں کا معلوم یہ ہوا کہ کسی دشمن نے دتن صاحب کے ہوٹل کو آگ لگا دی اور اس شان سے آگ لگی کہ اندر کا فرنیچر جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ہماری واپسی سے ایک ماہ پیشتر وقوع پذیر ہوا تھا ہم دونوں نے سوچا کہ اب یہ فیکٹری بازی ختم کی جائے دونوں اللہ کے فضل سے کافی کما لائے تھے۔ لہٰذا یہ روز روز کی جھک جھک سے نجات ہی اچھی چیز ہے چنانچہ حکیم واقعات نئی دہلی

بڈھن نے کہا۔

"بھیا بہزاد! اب کٹرہ ابوتراب والے مکان ہی میں برائے نام فیکٹری کھلی رہنے دو۔ اگر کوئی گاہک آیا تو دیکھا جائے گا۔"

میں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ دل جیت نگر سے لائی ہوئی دونوں انگوٹھیاں میں نے اپنے دوست رام پرشاد ستوگی کے حوالے کیں۔ اس نے مجھے تین ہزار کی رقم ان کے عوض دیتے ہوئے کہا۔

"بھیا بہزاد اس رقم کو دفن کر دو۔"

میں نے کہا۔ "کیا زمین میں گاڑ دوں؟"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔

"واہ رے شاعر! ایک ذرا سی بات سمجھ میں نہ آئی ارے بھائی یہ رقم بینک میں جمع کرا دو۔ میں تمہارا تعارف کرائے دیتا ہوں۔ تمہیں چیک بک اور پاس بک مل جائے گی۔ اپنی ضرورت کا روپیا ہر مہینہ نکال لو۔ باقی کو ہاتھ نہ لگاؤ ورنہ تم ہی کو تکلیف ہوگی۔" یہ روپیا اڑ کر برابر ہو جائے گا۔"

بات معقول تھی میری سمجھ میں آ گئی اس کی دکان کے سامنے ہی بینک تھا۔ میں نے رقم جمع کرا کر سا تھ روپے نکال لئے اور چلا آیا۔

واپسی پر جب میں حکیم بڈھن کے ہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ ایک مکان کی خریداری کی بات چیت کر رہے ہیں دو ہزار پر طے ہوا اور حکیم بڈھن مالک مکان کو لے کر رجسٹری آفس چلے گئے۔ شام کو ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا بڈھن ابھی ایک عدد مکان کے مالک بنے ہیں۔ دوسرے سویرے ہی وہ مجھے لئے ہوئے اپنے نئے مکان پہنچے مکان مرزا جعفر کے باغ میں واقع تھا۔ خاصی بڑی حویلی دو ہزار میں سستا مل گیا تھا۔ دہیں حکیم بڈھن نے ایک ٹھیکیدار کو بلوا کر اس کی مرمت اور صفائی کا ٹھیکہ دے دیا۔

ایک ہفتے کے بعد جب ہم دونوں پہنچے تو وہ دیکھنے کے لائق تھی۔ مرمت اور صفائی نے اس کو بنا کر رکھا تھا۔ اسی دن نیا فرنیچر بھی پہنچ گیا۔ غالباً حکیم بڈھن آرڈر دے چکے تھے۔ وہ فرنیچر سلیقے سے لگنے سے مکان منہ سے بولنے لگا۔

دوسرے دن جب میں وہاں پہنچا تو شمشیر کے علاوہ تین چار ملازم اور نظر آئے اور لکھنؤ کے بے فکروں کا مجمع حکیم کو گھیرے بیٹھا نظر آیا جو حکیم بڈھن کی ہر بات پر سبحان اللہ کے نعرے بلند کر رہا تھا اور حکیم کی تعریف میں رطب اللسان ہو رہا تھا۔ ان کے لئے کھانے پک رہے تھے

تھی کہ حکیم بڈھن کا سا سمجھدار آدمی ان لوگوں میں کیونکر پھنس گیا ہے۔ یہ لوگ دل پھینک مشہور تھے اور ہر نو دولتیے کے پاس پہنچکر اس کو تباہی کی منزل پر پہنچا کر دم لیا کرتے تھے۔ میں سمجھ گیا۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت

والی منزل سامنے آرہی ہے۔ دلبیت نگر سے لائی ہوئی دولت آخر کار اڑنا ہے۔ لہٰذا میں بھی خاموش رہا۔ دن بھر تاش گنجفہ پچیسی اور خدا جانے کیا کیا کھیل ہوتا رہا۔ رات کو گانے بجانے کی محفل قائم ہوگئی جس میں حکیم بڈھن شمع محفل بنے رہے۔ میں کھانا کھا کر اپنے گھر چلا آیا لیکن مجھے حکیم بڈھن کی تباہی کا افسوس تھا۔ حکیم بڈھن نے کبھی مجھے اپنے راز دل میں شریک نہ کیا تھا اس کا پتا نہ تھا کہ ان کو کتنی رقم ہاتھ لگی ہے اس حویلی کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک مکان تھا جس میں کوئی آغا تقی رہا کرتے تھے۔ ایک دن دوپہر کے وقت حکیم بڈھن کے مصاحبین کھانا کھا کر سونے کے لئے کمروں میں چلے گئے میں نے گنگنانا شروع کیا

آغا تقی کے باغ میں گپھا انار کا
چھاتی پٹخ کے مر گیا لڑکا سنار کا

وہ بازاری شعر تھا جس کو لکھنؤ کا بچہ بچہ چیخ کر گایا کرتا تھا۔ آغا تقی کا باغ چونکہ ملحق تھا لہٰذا میں بھی خدا جانے کیوں یہ مہمل شعر گنگنانے لگا۔ یکایک حکیم بڈھن نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ظالم! تجھے کیونکر پتا چل گیا ہے ارے اس شعر کے آخری مصرع میں اگر بجائے لڑکا سنار کا کے لڑکا حکیم کا ہو جائے تو حقیقت ہو جائے گی۔

میں نے فوراً کہا۔

"یہ کیا بڑی بات ہے لو سنو

آغا تقی کے باغ میں خوشہ انیم کا
چھاتی پٹخ کے مر گیا لڑکا حکیم کا

وہ بولے۔ "یار اب تم سے کیا چھپاؤں برابر کے مکان میں جو آغا تقی رہتے ہیں ان کے یہاں ایک عورت ہے ایک آفت ہے۔ اک جلوہ ہے اک تجلّی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اسے صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ خوبصورت عورت ہے۔"

وہ بولے۔ "خوبصورت؟ استاد اگر ایک نظر دیکھ لوگے بے ہوش ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "پھر کیا ارادے ہیں۔"

وہ بولے۔ "یار شادی تو کرنا ہے سوچتا ہوں پیام دے دوں اور اس کے لئے تم سے زیادہ موزوں آدمی مجھے نظر آتا نہیں۔ ان نئے دوستوں پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے میں آج شام کو آغا تقی سے مل کر ان کا عندیہ لے لوں گا دیکھوں گا کیا کہتے ہیں؟"

حکیم بڈھن نے بڑھ کر میرے قدم پکڑ لئے اور کہا۔

"یار کامیاب آنا ورنہ مر جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "اللہ مالک ہے شام ہونے دو مجھ سے آغا تقی کی ملاقات تو نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ انھیں راضی کر لوں۔"

مجھے شام کا دو بجانا دوبھر ہو گیا۔ حکیم بڈھن گھڑی کو گھڑی گھڑی دیکھتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے۔

"یار کب پانچ بجیں گے۔"

باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسماۃ روزانہ شام پھول چننے کے لئے باغیچے میں آجاتی ہیں اور ہمارے بھائی حکیم بڈھن چھپ کر ان کی دیدار بازی کیا کرتے ہیں۔ وہیں سے یہ مرض عشق لگا ہے۔

شام کے پانچ بجے میں مکان سے نکل کر آغا تقی کے مکان پہنچا وہ دروازے کے باہر مونڈھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے دو تین مونڈھے خالی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بغور دیکھا آغا تقی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں رنگ سیاہی مائل تھا۔ بشرے سے چالاکی اور مکاری صاف نمایاں تھی! مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر تقریباً کھڑے ہو گئے مجھ سے صاحب سلامت کے بعد ایک مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"فرمایئے! کیسے تکلیف کی؟"

میں نے کہا۔ "میں جناب آغا تقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

وہ بولے۔ "یہ ناچیز ہی کا نام ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو ایک بات عرض کروں"

وہ بولے۔ "فرمایئے فرمایئے۔"

میں نے کہا۔ "میرا نام بہزاد لکھنوی ہے۔"

وہ میرا نام سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولے۔

"تو آپ بہزاد صاحب ہیں میں بڑا نام سنتا تھا۔ ماشاءاللہ شہر میں آپ کی شاعری کی بڑی شہرت ہے میں تو مشاعروں میں جاتا نہیں ہوں۔ عرصہ ہوا یہ شوق چھوڑ چکا ہوں لیکن پھر بھی آپ کی شہرت میرے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ آپ کی بندہ نوازی ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔"

وہ بولے۔ "اب خدا کے لئے آپ تکلف چھوڑیئے اور مجھے صاف صاف بتایئے کہ میرے لائق کیا خدمت ہے۔"

میں نے کہا۔ "آغا صاحب! بات یہ ہے کہ برابر کے مکان میں جو صاحب آکر فروکش ہوئے ہیں میں ان کا دوست ہوں۔"

وہ بولے۔ "میں جانتا ہوں یہ حکیم بڈھن ہیں حکیم سید اولاد حسین کے صاحبزادے خود یہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آغا صاحب میں ان کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"او" وہ چھوٹتے ہی بولے۔

"کہیں میرے گھر پیام لے کر تو آپ نہیں آئے ہیں مجھے معلوم ہے حکیم بڈھن تین نکاح کر چکے ہیں اور تینوں کو طلاقیں دے چکے ہیں۔"

میں نے کہا "جناب آغا صاحب ان طلاقوں کے ساتھ واقعی بدحالات ایسے تھے کہ حکیم بڈھن صاحب مجبور ہوئے ورنہ کون پسند کرتا ہے کہ اپنا بسا بسایا گھر برباد کر دے۔"

وہ بولے۔ "یہ تو میں سمجھتا ہوں اب تک جتنے واقعات میں نے سنے ہیں وہ یک طرفہ ہیں اور حکیم بڈھن کے کردار کو ایک ظالم کا کردار ثابت کرتے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی بات دوسری جانب سے بھی ہوگی جس کا کسی نے اظہار نہیں کیا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ آدمی سمجھدار ہیں حکیم بڈھن سیدھے ہیں۔ کماؤ ہیں سیدھے آدمی ہیں۔"

وہ بولے۔ "ان باتوں کا علم مجھے بھی ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر اُن کی طرف سے یہ معروضہ پیش کروں گا کہ آپ ان کو شرف غلامی عطا فرما دیں۔"

وہ بولے۔ "بہزاد صاحب میں برا نہیں مانتا جہاں بیری ہوتی ہے وہاں ڈھیلے آتے ہیں۔ لیکن میری ایک ہی لڑکی ہے۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر اس کے معاملے میں قدم اٹھانا ہے یہی وجہ ہے کہ ماشاءاللہ پچیسویں سال میں داخل ہو چکی ہے لیکن میں نے ہزاروں پیام رد کر دیئے۔ میں سوچ لوں سمجھ لوں آپ پرسوں جواب کے لئے تشریف لائیں۔"

میں نے کہا۔ "میں بے حد ممنون ہوں۔"

بولے۔ "بہزاد صاحب میں صاف انکار کرتا لیکن
جیسا مشہور و معروف آدمی پیام لے کر آئے تو انکار
کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔"
بولے۔ "خدا جانے پرسوں اسی وقت کرم فرمایئے انشاءاللہ
آپ مل جائے گا۔"
میں ان سے رخصت ہوا اور جوں ہی حکیم بڈھن کے وہاں
بڈھن بے چینی سے میرا انتظار دروازے پر کر رہے تھے
دیکھتے ہی بولے۔
"جلد بتاؤ شیشہ کہ پتھر؟"
میں نے کہا۔ "یار آدھا شیشہ آدھا پتھر۔"
وہ بولے۔ "ارے صاف صاف بتاؤ میرا تو دم نکلا جا رہا ہے
شاعری فرما رہے ہو۔"
میں نے کہا۔ "میری خاطر سے پیام منظور کر لیا ہے لیکن
بتائی جائیں گی۔"
حکیم بڈھن کی باچھیں فرطِ مسرت سے کھل گئیں اور بولے
"تجھے میری جان کی قسم وہ جو جو شرطیں کہیں وہ منظور
خواہ مجھے بھیک ہی کیوں نہ مانگنا پڑے۔"
میں نے کہا۔ "بیٹا کیوں مرے جا رہے ہو پرسوں کا
انتظار کرنے دو۔"
خدا خدا کر کے پرسوں کا دن آ ہی گیا۔ حکیم بڈھن صبح سے
میرے سر ہو گئے کہ جاؤں اور شرطیں معلوم کر آؤں۔
کسی طرح پانچ بجے شام سے پہلے جانے پر رضامند نہ ہوا
پانچ بجتے ہی جب میں آغا تقی صاحب کے
وہ میرے منتظر تھے ایک مونڈھے پر پانوں کا خاصدان
رکھا تھا مجھے دیکھتے ہی تپاک سے بولے۔
"تشریف لایئے جناب بہزاد صاحب۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ
وقت کے انتہائی پابند ہیں۔ ابھی ابھی چھوٹے نواب کی حویلی
میں پانچ کا گجر بجا ہے۔"
میں نے کہا۔ "آغا صاحب وقت مقرر تھا لہٰذا قبل آنا
نامعقول تھا۔"
وہ بولے۔ "پان نوش فرمایئے۔ پھر میں آپ کو آپ کی بات
کا جواب دوں گا۔"
پان کھلانے کے بعد انھوں نے کہا۔
"بہزاد صاحب! آپ سے کوئی پردہ نہیں ہے یہ میری
اکلوتی بیٹی ہے اور ماشاءاللہ سے صورت شکل خانہ داری
اور سلیقے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اگر آپ اس کے ہاتھ کا پکا
ہوا کھانا کھائیں تو حیران رہ جائیں گے۔"
میں نے کہا۔ "کیوں نہ ہو آخر آپ کی صاحبزادی ہیں۔"
وہ بولے۔ "یہی وجہ ہے کہ مجھے اس سے بے پناہ محبت
ہے اور ماشاءاللہ اس وقت اس کی عمر پچیس سال ہو گئی لیکن
میں نے ہزاروں پیام ٹھکرا دیئے میں اس کا مستقبل تاریک
نہیں دیکھ سکتا۔"
میں نے کہا۔ "درست ہے۔ آپ کی محبت کا تقاضا
بھی یہی ہونا چاہیئے۔"
وہ بولے۔ "بہزاد صاحب نوابین کے پیام آئے میں
نے انکار کیا۔ میں جانتا ہوں نواب صاحبان اپنی بیویوں سے
دو تین ماہ کے بعد بے پرواہ ہو جاتے ہیں اور بازاری تفریح
میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"
میں نے کہا۔ "درست فرمایا۔"
وہ بولے۔ "امرا کے پیام آئے۔ مجھے امرا کا حال معلوم
ہے یہ حضرات ایک بیوی پر قناعت نہیں کرتے۔ میں اپنی بیٹی
پر سوت کیوں گوارا کرتا۔"
میں نے کہا۔ "آپ نے بہت اچھا کیا۔"
وہ بولے۔ "دیہاتی حضرات کے پیام آئے لیکن ان
کے وہاں میری لڑکی کا کوئی تحفظ ممکن نہیں تھا۔"
میں نے کہا۔ "درست ہے۔"
وہ بولے۔ "بہزاد صاحب! حکیم بڈھن کئی عورتوں
کو طلاق دے چکے ہیں۔ میں ہرگز ان کا پیام منظور نہ کرتا لیکن
آپ آئے ہیں لہٰذا مجھے منظور کرنا پڑ رہا ہے۔ میری پہلی شرط یہ
ہے کہ وہ یہ حویلی مع ساز و سامان میری لڑکی کے نام لکھ دیں
دوسری شرط یہ ہے کہ مہر پانچ ہزار روپے معجل ہو گا نکاح
ہوتے ہی یہ رقم ادا کرنا ہو گی۔ میری تیسری شرط یہ ہے کہ
میں روز اپنی لڑکی کو دیکھنے آؤں گا۔ حکیم بڈھن مانع نہیں
ہوں گے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ نکاح میں کوئی دھوم دھڑکا
نہیں ہو گا۔ کل پانچ آدمیوں کے ساتھ حکیم بڈھن آئیں گے
حقیقت یہ ہے بہزاد صاحب میری مالی حالت کمزور ہے
اور میں شادی بیاہ کے بے جا اخراجات اٹھانے کے قابل نہیں
ہوں یہ آپ سے کہہ رہا ہوں آپ حکیم بڈھن سے نہیں کہیں گے۔"
میں نے کہا۔ "اور کوئی شرط ہے!"
وہ بولے۔ "نہیں۔"
میں نے کہا۔ "اس کا جواب میں کل اسی وقت پیش کروں گا"
یہ کہہ کر میں ان سے رخصت ہوا۔ حکیم بڈھن بیقراری
کے ساتھ دروازے کے باہر میرا انتظار کر رہے تھے مجھ سے شرطوں
کا معاملہ سنتے ہی بولے۔
"تم نے وہیں یہ شرطیں منظور کیوں نہ کر لیں میں تم کو اجازت
دے چکا تھا۔"
میں نے کہا۔ "پاگل نہ بنو۔ دو ہزار کی حویلی ہے چار پانچ
سو میں تم نے مرمت کرائی ہے اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو
ہزار بارہ سو کا ساز و سامان بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی
ساتھ پانچ ہزار روپے نقد کا بھی معاملہ ہے۔ پھر تمہیں دلہن
کے زیورات اور جوڑوں میں بھی ہزار بارہ سو روپے خرچ
کرنا ہوں گے۔ میں کیونکر بغیر سمجھے بوجھے اقرار کر آتا۔"
وہ بولے۔ "استاد تم سدا کے کنجوس مکھی چوس ہو ارے
کمبخت میری تو جان پر بنی ہے اور تو اخراجات جوڑ رہا ہے۔"
میں نے کہا۔ "بیٹا! اس وقت تم تو عشق کے پھندے
میں ہو اور مال بھی حرام ہی کا تمہارے ہاتھ لگا ہے لہٰذا تم
بے دردی سے تباہ کرنا چاہتے ہو۔"
حکیم بڈھن نے کہا۔
"تم اپنے صوفی پن اور ملاپن کو کنارے رکھو میاں یہ شرطیں
فوراً منظور کر لو۔ تم نے ایک بار مجھ سے میرے پردادا مرحوم
کے ایک شعر کے معنی پوچھے تھے اور وہ شعر یہ تھا۔
بیکار مباش کچھ کیا کر
کپڑے ہی اُدھیڑ کر سیا کر
تقریباً تین بیویوں کو طلاق دے چکا ہوں۔ تین کپڑوں کو
ادھیڑ چکا ہوں۔ اب چوتھا کپڑا سی لینے دے۔ اپنے پردادا
کی وصیت کو پورا کرنا میرا فرض ہے۔"
میں نے کہا۔ "واہ بیٹا ارے تباہ ہو جاؤ گے۔"
وہ بولے۔ "تم پرواہ نہ کرو۔"
چنانچہ دوسرے دن میں نے جا کر شرطیں منظور کر لیں اور
ایک ہفتے کے بعد عصر و مغرب کے درمیان نکاح طے پایا۔ یہ
ہفتہ بڑی گہما گہمی میں گزرا۔ حکیم بڈھن نے سات عدد سونے
کے زیورات جلد تیار کرائے گھر پر درزیوں کو بٹھا کر سات
بھاری جوڑے سلوائے اور نکاح کے دن پانچ مصاحبین اور مجھے

[illegible] وقت [illegible] آغا تقی کے مکان پر پہنچے۔ حکیم بڈھن اطلس کی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے اور نادری صافہ میں بہت حسین لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جو سہرا پڑا ہوا تھا وہ پانچ روپے کی لاگت کا تھا۔ ہم چھ آدمی جوں ہی پہنچے آغا صاحب خود پیشوائی کے لئے دروازے پر ملے ہمیں اندر لے جایا گیا۔ اندر صحن پار کرنے کے بعد ایک دالان میں سفید چاندنی کا فرش لگا ہوا تھا۔ جس پر ایک زرکار مسند بچھی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کے علاوہ چھ سات آدمی اور بھی تھے جن کو میں نہیں پہچانتا تھا۔ دو مولوی صاحبان بھی تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی ایک وکیل اور دو گواہ اندر دلہن سے اجازت لینے کے لئے گئے۔ ان کے باہر آتے ہی نکاح پڑھایا گیا۔

نکاح کے اختتام پر آغا تقی صاحب کی طرف سے تمام مہمانوں کی خدمت میں گرما گرم کشمیری چائے اور شیر مالیں پیش کی گئیں۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت آگیا۔ مولوی صاحبان اور دیگر حضرات رخصت ہو گئے۔ حکیم بڈھن کو زنان خانے میں طلب کیا گیا۔ باہر دلہن کو لے جانے کے لئے میں نے پالکی اور کہاروں کا بندوبست کر لیا تھا۔

مغرب کے آدھ گھنٹے بعد حکیم بڈھن دلہن کو گود میں لئے ہوئے پالکی تک آئے۔ دلہن سوار کی گئی اور ہم چھ براتی دولہا کے ساتھ منٹوں میں حویلی پہنچ گئے۔ حکیم بڈھن نے دولہن کو اتروا لیا۔ اور زنان خانے میں لے گئے۔ سوائے میرے پانچوں براتیوں کو رخصت کر دیا گیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جہیز کے نام سے کوئی شے بھی آغا صاحب نے نہیں دی تھی۔ غریب سے غریب بھی کم از کم گیارہ برتن ضرور دیتا ہے۔ حکیم بڈھن دلہن کو اندر پہنچا کر باہر آئے۔ اندر دو تین خادمائیں ملازم رکھ لی گئی تھیں۔ وہ میرے پاس آ کر بولے۔

"بہزاد! آج میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے میں کئی ماہ سے جس عورت کے عشق میں تڑپ رہا تھا اللہ نے مجھے وہ عطا کر دی ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"لیکن استاد قیمت بڑی تگڑی دینی پڑی۔ تقریباً دس ہزار کا ٹیکا آخر تم کو پڑ ہی گیا۔ اور مزید یہ کہ گیارہ عدد برتن بھی تم کو جہیز میں نصیب نہ ہوئے۔"

وہ بولے "یار تم اپنی جلی کٹی باتوں کو چھوڑ دو۔ میں جہیز لے کر کرتا بھی کیا۔ اللہ کا دیا میرے پاس سب کچھ موجود ہے۔"

میں نے کہا۔ "بیٹا دل خوش کر لو۔ تو میں اب چلوں نا۔"

وہ بولے۔ "جاؤ خدا حافظ لیکن سویرے ہی سویرے آجانا۔"

میں مرزا جمعہ کے باغ سے پیدل ہی گھر کو روانہ ہوا۔ سر شام گھر جانے کا عادی نہیں تھا۔ لہٰذا مجھے کوفت سی ہوئی میں بغیر ارادے کے سعادت گنج مڑ گیا۔ وہاں ایک شاعر رہتے تھے۔ فراق مجھے کئی بار بلا چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج ان پر احسان بھی رکھ دوں اور وقت بھی کاٹ لوں۔ میں نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ وہ باہر نکلے اور مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ جلدی سے گھر میں گئے اور باہر دو مونڈھے لا کر بولے۔"

"بھیا بہزاد آج تو تم کو کھانا کھا کر ہی جانا ہوگا میں نے کوفتے پکوائے ہیں اور کڑھی کھا کر مزہ آجائے گا۔"

میں نے تکلفاً کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے بھیا فراق۔ لیکن تمہارا نمک کھانے میں مجھے عذر نہیں ہے۔"

وہ بولے۔ "یہ آج تم کو اتنی جلدی حکیم بڈھن نے کیسے چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا۔ "آج حکیم بڈھن نے نکاح کیا ہے۔ چوتھا نکاح۔ لہٰذا مجھے چھٹی مل گئی ہے۔"

وہ بڑے اشتیاق سے بولے۔

"کہاں کیا ہے نکاح؟"

میں نے کہا آغا تقی صاحب کی صاحبزادی سے ابھی ابھی نکاح ہوا ہے۔"

فراق نے دو زانو بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھیا۔ آغا تقی صاحب کی کوئی لڑکی ہی نہیں ہے مجھے خوب معلوم ہے۔ وہ میرا دور کا عزیز ہے اور اوّل نمبر کا چار سو بیس ہے۔ وہ اتنا بڑا کمینہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ دوسروں کا نکاح کر دیتا ہے۔ پھر میاں بیوی جب دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ لیتے ہیں تو بیوی آغا تقی کے گھر جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ نکاح کرنے والا دعویٰ نہیں کر پاتا اس لئے کہ شادی شدہ عورت سے نکاح کرنا جرم ہے۔ لہٰذا لٹ لٹا کر خاموش ہو جاتا ہے۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔

"تو حکیم بڈھن غریب پھنس گیا۔"

وہ بولے۔ "اور کیا۔"

میں نے کہا۔ "اس نے عورت کے نام [illegible] سامان لکھوا لی ہے۔ اور پانچ ہزار روپے نقد مہر کے [illegible] وقت وصول کر لئے ہیں۔"

وہ بولے۔ "ارے توبہ۔ آغا تقی نے پہلے [illegible] کر دیا۔ وہ ایسی شادی میں کہ بند سے لوگ [illegible] بھی اس سے طے ہوئے ہوتے ہیں۔ باہر بات میں [illegible] پسند نہیں کرتا۔ یہ اس کی بڑی چالاکی ہے۔ لیکن [illegible] بلا کی حسین بے حد خوش سلیقہ وہ حکیم بڈھن کا [illegible] لے لے گی۔ روزانہ آغا تقی آئیں گے اور ان کی [illegible] تھوڑی تھوڑی سی حوالے کرتی جائے گی تاکہ ایک دم [illegible] کا اندازہ نہ ہو سکے۔ یہ کھیل زیادہ سے زیادہ چار پانچ [illegible] چلے گا اور پھر چڑیا اڑ کر اپنی ڈال پر بیٹھ جائے گی۔ تم [illegible] طرح سے حکیم بڈھن کو سمجھاؤ کہ جتنا گیا ہے اس پر صبر کر [illegible] آئندہ لٹنے سے بچیں۔"

میں نے کہا۔ "یار فراق یہ ناممکن ہے حکیم بڈھن [illegible] میں مبتلا ہیں کہیں سے اس کو دیکھ لیا ہے۔ میری کیا بات [illegible] اعتبار نہ کریں گے۔ خواہ مخواہ میری دوستی میں بھی [illegible] پڑے گا۔"

وہ بولے۔ "تو تم فاتحہ پڑھ لو اور میری بات [illegible] چھ مہینے کے اندر اندر حکیم بڈھن کوڑی کوڑی کو [illegible] ہو جائیں گے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فراق کا لڑکا باہر آیا اور [illegible]

"دسترخوان تیار ہے۔ اندر تشریف لائیے۔"

میں اور فراق دونوں اندر پہنچے۔ صحن میں [illegible] پر دسترخوان چنا ہوا تھا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ کوفتے [illegible] خوب تھے کڑھی بھی بے مثل پکی ہوئی تھی لیکن میں [illegible] نہ کھا سکا کیونکہ میرا دماغ حکیم بڈھن میں الجھا ہوا [illegible] کھانے کے بعد جب گھر پہنچا تو مجھے رات بھر ہول [illegible] نہ آئی۔ حکیم بڈھن میرا دوست تھا اور اس کی تباہی [illegible] لئے پریشانی کا باعث تھا۔

سویرے ہی ناشتے کے بعد جب میں حکیم بڈھن کے [illegible] پہنچا تو وہ میری آواز سنتے ہی باہر نکل آئے مجھے [illegible] گلے لگانے کے بعد بولے۔

"استاد دعا تھی میری قسمت کھل گئی [illegible]

[illegible]

[illegible] سے کہہ دیا تھا

[illegible] کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ والدین [illegible] تحفوں کا [illegible] ہوا تھا۔ جس [illegible] جسم کی بے حد [illegible] سے کی [illegible] اچھی طرح [illegible] کر رہی تھی۔ مجھے [illegible] میں نے [illegible] نکال لیا۔ حکیم بدھن نے مجھے [illegible] تخت پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا [illegible] تمہاری بھاوج [illegible] اور میں واقعی خوش نصیب [illegible] ساتھ ہو گیا؟"

میں نے بھی [illegible] کہا۔

"واقعی بھائی [illegible] میری امیدوں سے زیادہ بہتر نظر آ رہی [illegible] مبارک کرے میں تمہاری پہلی بیویاں دیکھ چکا ہوں [illegible] کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کہاں راجا [illegible] گنگو تیلی۔"

میری [illegible] بات پر مساة مسکرائیں اور بولیں۔

"بھائی بہت زیادہ مجھے بنا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بھابی میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ آپ میری تعریف [illegible] زیادہ بہتر ہیں۔"

وہ بولیں۔ "کھانا کھا کر جائیے گا۔ میں ابھی شامی کباب [illegible] پسند سے اور ارہر کی دال پکانے جا رہی ہوں [illegible] میرے ساتھ کا مزہ بھی چکھ لیجئے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "ارے بھابی آپ کھانا پکائیں گی آپ کے نوکر نیاں کس واسطے ہیں۔" حکیم بدھن نے کہا۔

"بھیا ہزار دفعہ میں نے لاکھ روکا۔ مانتی ہی نہیں کہتی ہیں مجھے کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند ہی نہیں آتا۔"

[illegible] بھابی یہ کر دیں کیا پکائیں گی۔"

میں نے کہا بھابی۔ پہلے ہی دن کی دلہن کام کاج کرتے ہوئے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔"

وہ بولیں۔ "بس بیٹھے رہیئے۔ آخر میرا وقت کیسے گزرے گا۔"

میں خاموش رہا اور حکیم بدھن کے ساتھ باہر نکل آیا۔

حکیم بدھن کے عشق کا یہ عالم تھا کہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد [illegible] کی صورت دیکھ آتے تھے یہ عالم دیکھ کر مجھے [illegible] حکیم بدھن کو آغا تقی کی اس چالبازی سے

[illegible] عالم [illegible] دوسرے یہ کہ حکیم بدھن خود بھی چالاک نفیس اور سمجھدار آدمی تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی نہ کسی طریقہ سے وہ اس جال سے نکل جائے گا۔

دوپہر کے وقت جب میں اور حکیم بدھن کھانے کے لئے اندر داخل ہوئے تو آغا تقی بھی موجود تھے۔ دسترخوان پر ہم تینوں مرد بیٹھ گئے۔ واقعی کھانا بے حد لذیذ تھا۔ میں نے ایسا لذیذ کھانا کم کھایا ہوگا۔ کھانے کے بعد میں اور حکیم بدھن باہر آ گئے۔ حکیم بدھن رات بھر کے جاگے تھے لہٰذا ان کو نندیا بیگم نے گھیر لیا۔ اور میں ان سے رخصت ہو کر شام کو آنے کا وعدہ کر کے گھر آ گیا۔

شام کو جوں ہی پہنچا حکیم بدھن میرے منتظر تھے اور مسرتوں سے اتنا پھولے ہوئے تھے کہ سوائے اپنی بیوی کے ذکر کے ان کو کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر میں گھر چلا آیا۔

دو ماہ اسی عالم میں گزر گئے۔ ایک دن حکیم بدھن نے مجھ سے کہا۔

"بھیا سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری بھاوج کو زیورات سے اتنا عشق کیوں ہے۔ میں کئی کئی جوڑ زیورات بنوا کر دے چکا ہوں۔ لیکن ہر روز کوئی نہ کوئی فرمائش ٹھکتی ہی جا رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور کپڑوں کے شوق کا کیا حال ہے۔"

وہ بولے۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی دو مہینے میں چوبیس جوڑے بنوا کر دے چکا ہوں اور اب میں ڈر رہا ہوں کہ میری مالی حالت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ میں ان نئے تقاضوں کے ساتھ روپیہ خرچ کر سکوں۔"

میں نے کہا۔ "کیوں۔ کیا ساری دولت ختم ہو گئی۔"

وہ بولے۔ "تم سے کیا پردہ ہے بینک میں دو چار سو روپے پڑے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "استاد تم ذرا میرے ساتھ نخاس تک چلو۔ دو مہینے سے تم نے گھر کے باہر قدم نہیں نکالا ہے مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

وہ گھر کے اندر گئے۔ انگرکھا پہنا اور بیوی سے اجازت لے کر میرے ہمراہ باہر نکلے۔ میں ان کو لئے ہوئے سیدھا فراق کے گھر گیا۔

فراق مجھے اور حکیم بدھن کو دیکھ کر کھل گئے۔ خاطر تواضع [illegible]

"بھیا بدھن تم بری طرح تباہ ہو چکے ہو۔ تم ایک جال میں پھنس چکے ہو۔ مجھے نکاح کے بعد ہی علم ہو چکا تھا لیکن مجھے تم سے کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ تم پر ایک ایسا جادو تھا اور یہ غالباً بھی اسی جس کے تحت تم میری بات کا یقین نہ کرتے۔"

وہ گھبرا کر بولے۔ "یار صاف صاف بتاؤ آخر کیا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ فراق بیٹھے ہیں میں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ تم نے جس مساة سے نکاح کیا ہے وہ آغا تقی کی بیٹی نہیں بیوی ہے۔"

انہوں نے حیرت سے کہا۔ "ہائیں یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں حقیقت کہہ رہا ہوں۔ شادی میں جتنے ان کی طرف سے لوگ شریک تھے۔ وہ سب کے سب چار سو بیس ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شادی میں تمہاری طرف سے کل پانچ آدمی بلائے گئے تھے۔"

وہ بولے۔ "بھائی یقین نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اتنے بڑے چالاک اتنے بڑے سمجھدار ہونے کے بعد تم نے یہ غور نہ کیا کہ چٹھی تم سے لکھوائی گئی۔ پانچ ہزار روپے نقد مہر کے وصول کر لئے گئے۔ اس کے علاوہ زیورات کی فرمائشیں کپڑوں کی فرمائشیں کرنے کے بعد تمہیں دیوالیہ کر دیا گیا ہے کس لئے؟"

وہ بولے۔ "یار بات تو کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "گھر کی بیویاں کیا شوہروں کو اس طرح لوٹتی ہیں جس طرح تم لوٹے گئے ہو۔" حکیم بدھن نے کہا۔ "تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تمہاری بھاوج آغا تقی کی بیٹی نہیں آغا تقی کی بیوی ہے۔" میں نے کہا۔ "فراق کے ہاتھ میں حلف دے کر پوچھ لو۔" فراق نے کہا "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مساة آغا تقی کی بیوی ہے آغا تقی کی لڑکی نہیں۔ آغا تقی کے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔ اور حکیم صاحب آپ پہلے ہی نہیں جو لوٹے گئے۔ آپ کا نمبر تیسرا ہے۔ پہلے نواب مجو صاحب تھے۔ دوسرے مرزا صاحب عالم تھے۔ دونوں کو فقیر کرنے کے بعد تیسرا داؤ آپ پر مارا گیا ہے۔"

حکیم بدھن نے سر پکڑ لیا اور بولے۔

"یہ آغا تقی اب میری سمجھ میں ایک بات آ رہی ہے۔ روزانہ آغا تقی آتے ہیں اور میں نے بغور دیکھا ہے کہ جاتے وقت"

کے ہاتھ میں ایک تھیلا ضرور رہتا ہے آتے وقت وہ خالی ہاتھ
ہیں۔"

فراق نے کہا۔ "جی ہاں وہ آپ کا گھریلو سامان ہے۔ جو
اتھوڑا کر کے منتقل ہوتا ہے۔ یہ احتیاطی تدبیر ہے۔ آپ نے
زیورات بنائے ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی سیٹ آپ کے
ہو۔ آپ نے جتنے جوڑے بنائے ہیں۔ ان میں سے شاید ہی
جوڑا آپ کے گھر میں ہو۔ آپ نے جتنے برتن خریدے ہیں۔
سوائے ضروری برتنوں کے اور سب آغا تقی کے ہاں
چکے ہوں گے یہی اگلے دو صاحبان کے ساتھ بھی ہوا تھا۔۔
م صاحب آغا تقی میرے عزیز ہیں۔ مجھے ان کے گھر کے رتی
کا حال معلوم ہے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "بھائی فراق صاحب! مجھے اس کا
نہیں ہے کہ میں لٹ گیا۔ میرے پاس حلال کی کمائی نہیں تھی
تھی۔ حرام ہی میں چلی گئی۔ میں ہزاروں بار کما کر اڑا چکا
لیکن مجھے افسوس یہ ہے خود ستائی معاف میرا جیسا سمجھدار
یسا معاملہ فہم کیوں کر اتنا بڑا دھوکا کھا گیا۔"

میں نے کہا۔ "بیٹا! یہ عشق کا کھیل ہوتا ہی ایسا
ـــــ وہ بولے۔

استاد بہزاد اب میرا آخری عہد دیکھ لو۔ ابھی اللہ کا شکر
رے پاس چار پانچ سو روپے ہیں۔ وہ روپے لے کر میں
ہیں پردیس چلے چلتے ہیں تاکہ میرا غم غلط ہو جائے۔ کہو
بہزاد میرے ساتھ چلنے کے لئے۔"

میں نے کہا۔ "بیٹا یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو۔
قدم پیچھے ہو میں دو قدم آگے۔

یہ سنکر حکیم بڈھن کھڑے ہو گئے اور مجھے سینے سے لگا کر
بر تک روتے رہے۔ اور بولے۔

بہزاد تم سے مجھے یہی توقع تھی۔ اب میرے ساتھ چلو۔
آغا تقی رات کے کھانے پر خاص طور پر مدعو ہیں۔ ان
کی چیزیں پکائی گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی چل
نے میں شریک ہو جاؤ۔ اس کے بعد دیکھ لو کہ میں کس
ن کو شرمندہ کرتا ہوں۔

مجھے کیا عذر تھا حکیم بڈھن کے ساتھ واپس ہوا۔
موشی سے کٹا۔ گھر پہنچتے ہی حکیم بڈھن مجھے لئے ہوئے
گئے۔ آغا تقی گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہوئے تھے حکیم
نے کہا۔

"میں بہزاد کو بھی لیتا آیا ہوں۔ آج بڑے سال پکے ہیں
سا نے سوچا کہ اس جنونی شاعر کو بھی کھلا دوں۔"

یہ کہہ کر حکیم بڈھن نے قہقہہ مارا۔ میں ڈر گیا۔ قہقہہ بڑا ہی
خوفناک تھا۔ کھانا چنا گیا۔ متعدد چیزیں تھیں۔ حکیم بڈھن نے
اصرار کر کے بیوی کو بھی دستر خوان پر بٹھا لیا۔ کھانا واقعی لذیذ
تھا۔ میں نے دیکھا کہ حکیم بڈھن نے اصرار کر کے مجھے بھی خوب کھلایا
اور خود بھی سیر ہو کر کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد جب سب
پان کھا چکے تو حکیم بڈھن نے کہا۔

"آغا صاحب! آپ واقعی صاحب کمال آدمی ہیں اور اتنے
بڑے صاحب کمال کہ آپ اپنی نکاحی بیوی کا نکاح دوسروں
کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ آپ دیوث ہیں دیوث کمائی کے
لئے یہ راستہ وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن میں غیرت حیا اور شرم
نام کو بھی نہیں ہوتی۔ معاف کیجئے گا آپ میں بھی بالکل شرافت
نہیں ہے آپ سے چور اچکا ڈاکو بہتر اور جیب کترا افضل ہے۔
وہ اپنی آبرو نہیں بیچتا۔ آپ نے جس انداز سے مجھے بے وقوف
بنایا۔ مجھ حکیم بڈھن کو، وہ آپ کا کمال ہے۔ میں داد دیتا ہوں
آپ کی یہ بیوی بھی صاحب کمال ہیں کہ متعدد مردوں کی بیوی
بننے کے بعد بھی آپ کی وفادار رہیں۔ آپ دونوں ایک ہی خمیر
سے بنے ہوئے ہیں۔

یہ کہہ کر حکیم بڈھن نے تھوڑا سا پانی پیا۔ ان کا چہرہ غصے
سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آغا تقی اور مسماۃ دونوں
کے چہرے فق ہوئے تھے۔ حکیم بڈھن نے کہا۔

"اگر میں چاہوں تو بدمعاشوں کو بلوا کر آپ کا اور آپ
کی ان بیوی جمال پری کا حلیہ بگاڑ دوں۔ ناک کٹوا دوں۔
جو دولت آپ چالاکی سے مجھ سے حاصل کر چکے ہیں میرے
پاس بھی حرام ہی میں آئی تھی۔ مثل مشہور ہے۔ مال حرام
بود بجائے حرام رفت۔ مجھے اس کا کوئی ملال نہیں ہے۔
لے جائیے۔ میں صبح صرف اپنے کپڑے وغیرہ لیکر یہ حویلی چھوڑ
دوں گا اس لئے کہ یہ حویلی آپ کی ہو چکی ہے۔ لیکن یہ یاد
رکھئے کہ میں اس کا انتقام لوں گا۔ اور ایسا انتقام لوں گا
آپ موت مانگیں گے اور آپ کو موت نہیں آئے گی۔ آپ
نے اچھے گھر بیعانہ دیا ہے۔

آغا تقی کچھ بولنے ہی والے تھے کہ حکیم بڈھن نے کہا۔
"خاموش بیٹھے رہیئے ایسا نہ ہو میرا پانہ صبر چھلک جائے مہربانی
فرما کر اپنی پری جمال بیوی کو جو آپ کو با حضور تی ہیں اپنے ہمراہ
لے جائیے۔ میں رات ان کی موجودگی میں بسر کرنا نہیں چاہتا
زیورات آپ پہلے ہی پار کر چکے ہیں۔ کپڑوں کے جوڑے آپ
پہلے ہی لے جا چکے ہیں۔ میں اس گھر سے کوئی شے نہیں لوں گا
بجز اپنے کپڑوں کے۔ صبح نو بجے آکر اس حویلی میں اپنا قفل ڈال
دیجئے یا اس میں قیام کیجئے۔ یہ آپ کی مرضی۔ جائیے اس وقت
میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جائیے۔ آپ دونوں
صاحبان دور ہو جائیے۔"

وہ دونوں خاموشی سے باہر چلے گئے۔ ان دونوں کے
جانے کے بعد حکیم بڈھن نے اندر جا کر ہارمونیم اٹھا لیا۔ صحن
میں بیٹھے اور گانا شروع کیا۔

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا۔ ہم ناتواں دیکھا کئے۔

1
2
3
Raq

خوبصورت جوڑا بنانے کا آسان طریقہ۔

...سر پر بال اگ سکتے ہیں

...جو جتنا زیادہ جنگلی ہوتا ہے اس کے اتنے ہی
...بال ہوتے ہیں۔ زیادہ بال ہونا جنگلی پن کی نشانی ہے
...کے علاوہ امریکا کے مشہور ڈاکٹر سورمن براؤن کا کہنا
ہے کہ گنجوں کو بال والوں کی بہ نسبت کینسر ہونے کا زیادہ
...رہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ہیارمن ینگ نے ۲۰ سال کے مطالعے کے بعد کہا کہ
...زیادہ تر عالم گنجے ہوتے ہیں جبکہ بے وقوفوں کے ساتھ ایسا
...بہت کم ہوتا ہے۔

اب گنجوں کا دواؤں اور تیلوں پر سے اعتبار اس قدر
اٹھ گیا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر کو یہ پتا نہیں ہے کہ آج
گنج کے کئی علاج ممکن ہیں۔

گنج دور کرنے کا پہلا کامیاب تجربہ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر نورمن
نے نیویارک میں کیا تھا۔ ڈاکٹر نورمن نے بال اگانے کے لئے بالکل
وہی طریقہ استعمال کیا ہے جو مالی بنجر زمین پر گھاس اگانے کے
لئے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نارمن نے بنجر بالوں والے حصے میں کچھ
بہت ہی باریک سوراخ کئے اور بالوں والے حصے میں سے کچھ
بال نکال کر ان سوراخوں میں گاڑ دیے۔ خوش قسمتی سے
یہ تجربہ کامیاب رہا اور تین مہینے کے اندر اندر پچاس میں سے
پندرہ مریضوں کے سر پر نئے بال اگنے شروع ہو گئے۔ یہ
بال بالکل پرانے بالوں کی طرح تھے اور مضبوطی سے اپنی جگہ
پر قائم تھے۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر کلیگ مین اور ڈاکٹر پاپا نے بال
اگانے کے معاملے میں ایک قدم اور اٹھایا۔ انھوں نے علاتاتی
طور پر ایسی دوا دریافت کر لی جو تیس تیس سال پرانے گنجوں
کے سر پر بال اگا سکتی تھی۔ ڈاکٹر پاپا بالکل مختلف چیز پر
تجربہ کر رہے تھے لیکن جب انھیں اپنے ہارمون ڈرگ
ٹیسٹوسٹورون کی مدد سے بال اگانے میں کامیابی حاصل ہوئی
تو انھوں نے کچھ قیدیوں کے سروں پر اس کا تجربہ شروع کر دیا۔
ان قیدیوں کی عمر ۳۸ اور ۸۰ سال کے درمیان تھی۔ ان میں
کچھ قیدی ایسے تھے جو تیس تیس سال پرانے گنجے تھے۔ حیرت انگیز
طور پر چند مہینوں کے اندر اندر ان کے سر بالوں سے بھر گئے
ایسے سر جن پر بالوں کا نام و نشان بھی نہ تھا بالوں سے
بھر گئے۔ اس تجربے میں ایک اور بات کا بھی اندازہ ہوا کہ
بالوں کے اگنے یا نہ اگنے پر عمر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بوڑھے
اور جوان دونوں ہی کے اس ہارمون کی مدد سے بال اگائے
جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر پاپا کے تجربات ابھی جاری ہیں اور بہت
جلد انکی بنائی ہوئی یہ دوا بازار میں عام ملنے لگے گی۔ پھر
جلد ہی بنجر سروں پر بال لہرانے لگیں گے لیکن --- آپ کی اور
ہماری تفریح کا ایک عمدہ ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ بہر حال
ڈاکٹر پاپا کے تجربات دنیا بھر کے گنجوں کے لئے خوشی کا
پیغام لے کر آئے ہیں۔

بحرین کی آزادی

بحرین پر ایران کا قبضہ رہا ہے اور اس پر اس کا
بدستور مطالبہ بھی تھا لیکن سال گزشتہ جب اقوام متحدہ کے
ایک تحقیقاتی مشن نے اپنی رپورٹ پیش کی کہ اس ریاست کی
زبردست اکثریت آزاد رہنا چاہتی ہے، تو ایران نے اپنا
مطالبہ واپس لے لیا۔ اور اب اس نے آزاد بحرین کو تسلیم
کر لیا۔ یہ اس کی فراخدلی کا ثبوت ہے۔ بحرین کے موجودہ
امیر شیخ عیسیٰ بن سلمان آلخلیفہ کے ایران کے ساتھ بڑے
دوستانہ تعلقات ہیں۔ بحرین عرب لیگ میں شمولیت کے
بعد اسکا پندرھواں ممبر ہوگا۔

اگر بحرین اور قطار دونوں فیڈریشن میں شامل ہو جاتے
تو نہ صرف یہ کہ خلیج کے علاقے میں یہ حکومت تعمیر و ترقی کے
سلسلے میں شاندار رول ادا کر سکتی تھی بلکہ عالم عرب کے
وسیع تر اجتماعی مفادات کے سلسلے میں دوسرے عرب ملکوں
کے شانہ بشانہ چل کر عرب دنیا کے لئے مزید قوت و توانائی
کا باعث بھی بنتی۔ (قطار کی آبادی ۷۰ ہزار ہے) لیکن
اب طاقت تقسیم ہو گئی اور اس علاقے کی تمام نو ریاستوں
کا مشترکہ فیڈریشن معرض وجود میں نہ آ سکا۔

اگر عرب امراء اپنے ذاتی مفادات کو خیر باد کہہ کر باہمی
مفادات کو پیش نظر رکھیں تو یقیناً سب ایک کڑی میں منسلک
ہو سکتے ہیں۔ لیکن آج نہیں تو کل یہ وقت آئے گا جب
تمام ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہو جائیں گی۔

جو کچھ ہو، اس علاقے میں آزاد حکومتوں کا ابھرنا
خلیج فارس یا خلیج عرب کی تاریخ کا ایک انتہائی عظیم
واقعہ ہے۔

مرکزی وزیروں نے
۱۵ اگست
اپنی تنخواہوں میں
دس فیصدی
کمی کا اعلان
کیا ہے۔
ایک خبر

AUGUST 1971

WAQIAT

REGD. NO. D

(SECOND HALF)

TELEPHONE 619035

بہت [illegible] کتاب ہے مادام۔ گھر پر کھانا
نہ پکانے کی ۱۰۰ وجوہات۔

ریلے ٹیم کی
شاندار فتح

عرب وفاق

اتحاد کی طرف ایک اہم قدم

مصر، لیبیا اور شام کے وفاق کے قیام کے سلسلے میں تمام ابتدائی انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور یقین ہے کہ اسی ماہ اس کے قیام کا باضابطہ طور پر اعلان کر دیا جائیگا مشرقِ وسطیٰ میں عرب وفاق کے قیام کی یہ خبر حقیقی معنوں میں ایک دل خوش کن خبر ہے کیونکہ یہ عرب اتحاد کی طرف ایک اہم اور ٹھوس قدم ہے۔ لیکن عربوں کی انفرادیت پسندی کی جو روایت ہمیشہ سے رہی ہے اس کے پیشِ نظر وفاق کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

اسی قسم کی ایک کوشش مرحوم صدر ناصر نے کی تھی جب ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کے الحاق کے نتیجے میں "متحدہ عرب جمہوریہ" کا قیام عمل میں آیا تھا یہ جمہوریہ تین برس بھی نہ چل سکی اور اس کے بعد محض نام کی "متحدہ عرب جمہوریہ" رہ گئی۔ ایک متحدہ عرب جمہوریہ کی بات نہیں، عربوں کے باہمی تنازعات کو ختم کرنے کے بارے میں جو سمجھوتے ہوئے وہ کتنی بار ٹوٹے۔ ہر بار دیکھا گیا کہ عرب ممالک ایک دوسرے کے خلاف میدان میں آ گئے۔

لہٰذا فوجی انقلاب اور قتل و غارت گری اور باہمی دشمنی یہ عرب ممالک کی خصوصیتیں بن کر رہ گئی ہیں، اسی لئے جب عرب اتحاد سے متعلق کوئی خبر سامنے آتی ہے تو تمام حلقوں کی طرف سے اس پر شکوک و شبہات ایک قدرتی امر ہے۔

لیکن آثار و قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مرتبہ جو وفاق قائم ہو رہا ہے اس کی بنیادیں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ اس کی تائید میں کئی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ اول یہ کہ تینوں ملکوں کے عوام نے ریفرنڈم میں ۹۶ فیصد سے ۹۹ء۹ فیصد تک [illegible] ثابت کر دیا ہے [illegible] ممالک کی آبادی اور عرب ممالک کی منتشر طاقت کو مجتمع کرنے کے حق میں ہیں۔

دوم یہ کہ وفاق کا جو آئین وضع کیا گیا ہے وہ ایک ڈھیلا ڈھالا جمہوری آئین ہے اور اس میں ہر ملک کی آزادی و خود مختاری کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگرچہ تینوں ملکوں کی خارجہ پالیسی یکساں ہوگی ان کا جھنڈا اور ترانہ بھی ایک ہوگا لیکن ہر ایک ملک اقوامِ متحدہ کا الگ الگ ممبر رہ سکے گا۔ آئین میں سب سے بڑی یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ قومی اسمبلی میں تینوں ممبر ملکوں کو مساوی نمائندگی دی گئی ہے۔ ہر ملک اپنے ۲۰۔ ۲۰ ممبر اسمبلی میں بھیجے گا اور اس طرح وفاق میں شامل ملکوں میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہ کی جا سکے گی۔ آبادی کے لحاظ سے مصر شام سے چار گنا اور لیبیا سے تین گنا بڑا ہے لیکن محض عرب اتحاد کی خاطر وہ اپنی عددی اکثریت کا سوال زیرِ بحث نہیں لایا یہ اس کی بہت بڑی قربانی ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ عرب اتحاد اس کے لئے ہر چیز پر مقدم ہے۔ تینوں ملکوں کے سربراہوں ۔ انور سادات ۔ کرنل قذافی اور حافظ الاسد نے تمام عرب سوشلسٹ اور جمہوری ملکوں سے اپیل کی ہے کہ وہ وفاق میں شامل ہونے کے لئے قدم اٹھائیں۔ یہ اپیل صرف سوشلسٹ اور جمہوری ملکوں ہی سے کی گئی ہے۔ اس لئے کہ جن ملکوں میں شاہی حکومتیں قائم ہیں ان سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ وفاق میں شامل ہو کر اپنی آمریت کو ختم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔ لیکن سوشلسٹ اور جمہوری حکومتیں بھی ابھی خاموش نظر آتی ہیں۔ "عرب اتحاد کی علمبردار" عراق کی حکومت نے تو وفاق کی مخالفت کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہے لیکن ایک وقت آئے گا جب دوسری عرب طاقتیں بھی وفاق کی طرف آنے کے لئے مجبور ہوں گی۔ اور محسوس کریں گی کہ وہ اپنی متحدہ طاقت ہی کے ذریعے ایک جارح قوت کو اپنی سرزمین سے بے دخل کر سکتی ہیں۔ نئی وفاقی حکومت اپنی آبادی اور وسائل کے لحاظ سے ایک بڑی حکومت ہوگی۔ وہ اس وقت چار کروڑ ۲۰ لاکھ یعنی تقریباً نصف عربوں کی نمائندگی کرتی ہے اور اگر سوڈان اس میں شامل ہو گیا جیسا کہ توقع ہے جلد شامل ہو جائے گا تو وہ عرب اکثریت کی نمائندہ حکومت ہوگی اور اس لحاظ سے عربوں کے مسائل میں زیادہ قوت کے ساتھ بول سکے گی نئی حکومت نہ صرف مشرقِ وسطیٰ بلکہ پورے ایشیا میں بھی ایک بڑی طاقت بن سکتی ہے بشرطیکہ وفاق میں شامل سب ممالک پوری طرح متحد رہیں اور اپنے ذاتی مفادات کو درمیان میں نہ آنے دیں۔

قدرتی طور پر اسرائیل اور امریکا وفاق کے قیام سے بے چین ہیں اور اس پر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ انھیں بے چینی اس لئے اور زیادہ ہے کہ نئی حکومت نے اسرائیل کے ساتھ کسی قسم کی بات چیت یا سمجھوتہ نہ کرنے کی پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ اس کے دوسرے معنے یہ لئے جا سکتے ہیں کہ اگر اسرائیل نے عرب علاقے خالی نہ کئے اور اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کی برابر خلاف ورزی کرتا رہا تو وفاقی حکومت طاقت کے ذریعے تمام علاقے واپس لینے کے لئے قدم اٹھائے گی۔ اس کے معنی ایک اور جنگ کے بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں ممالک پہلے سے اس کے لئے تیار ہیں اور جنگ کے امکانات کو سامنے رکھ کر ہی انھوں نے اپنے وفاق کی داغ بیل ڈالی ہے۔ لیکن شاید اسرائیل سے نمٹنے سے پہلے وفاقی حکومت کو اردن کی شاہی حکومت سے نمٹنا پڑے جو بقول انور سادات "اسرائیل کے خلاف عرب محاذ" سے الگ ہو گئی ہے اور جس نے اپنی فوجیں اسرائیلی سرحد سے ہٹا کر شامی سرحد پر لگا دی ہیں۔ کرنل قذافی کا یہ نشری اعلان کہ عرب وفاق مراکش اور اردن کے لوگوں کی نجات کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وفاقی حکومت کے ذریعے شاید شاہی حکومتوں کے خلاف کارروائی کی جائے جو قذافی کے خیال میں عرب اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ہیں وفاقی حکومت کے مقابلے میں اردن یا مراکش کی کوئی فوجی طاقت نہیں۔ لیکن اگر امریکہ نے ان ممالک سے اپنے مقصد کیلئے کام لینا چاہا تو وہ وفاقی حکومت کے لئے بہت سی پریشانیاں پیدا کر سکتی ہے۔

حقیقت میں یہ عرب لیڈروں کے تدبر کا امتحان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس امتحان میں کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔

خطوط

بنگلہ دیش اور ہندوستانی مسلمان

مکرمی تسلیم

"واقعات" کا جولائی ۱۹۷۱ء کا نصف دوم شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں بنگلہ دیش سے متعلق آپ کے کسی سابق اداریے پر محمد قاسم صاحب کا نہایت جذباتی مراسلہ نظر سے گزرا۔ اسی مسئلے کے بارے میں بعض مطبوعہ سوالات کا اندازہ بھی ہوا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ نے سوالات کے جوابات بڑے توازن، وقار اور بصیرت کے ساتھ دیے ہیں غالباً آپ کے اس اداریے کا بھی یہی مقصد ہوگا جس پر محمد قاسم صاحب معترض ہیں۔

اس طرح کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے دوسرے لوگ بھی جذباتی انداز اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فائدہ۔ مسئلے کو ہمیشہ عملی اور معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آج بنگلہ دیش میں جو کچھ ہو رہا ہے بلاشبہ اس کی اصل ذمے داری مغربی پاکستان کے حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہی سے مغربی پاکستان کے ارباب اقتدار کا مشرقی بنگال کے عوام (بشمول مسلم اکثریت) کے ساتھ جو غیر منصفانہ برتاؤ رہا اس میں "اسلامی اتحاد" کا [illegible] بھی پایا جاتا تھا۔ پاکستان کے حالیہ انتخابات [illegible] شیخ مجیب الرحمٰن کو [illegible] کامیابی حاصل ہوگئی اس کے بعد عدل و انصاف کے کسی بھی معیار کے مطابق جنرل یحییٰ خاں کو یہ حق تھا کہ وہ اقتدار فوراً انھیں منتقل نہ کر دیتے۔ جب یحییٰ خاں کی فوجوں نے مشرقی بنگال پر چڑھائی کی تو اس سے پہلے کسی اعلامیے یا نشریے میں یہ بات کہی گئی تھی کہ یہ فوجیں غیر بنگالی مسلمانوں پر بنگالیوں کے مظالم کو روکنے یا ان کا بدلہ لینے کے لئے وہاں بھیجی جا رہی ہیں؟۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ محض ایک AFTER THOUGHT ہے جو خود اپنے مظالم پر پردہ ڈالنے کے لئے پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے ایجاد کیا ہے۔ عوامی لیگ کے نام نہاد دہشت پسندوں کے مبیّنہ مظالم کی جو روداد محمد قاسم صاحب نے لکھی ہے اگر وہ صحیح بھی ہو تو کیا عوامی جوش کے غلط راستہ اختیار کرنے اور منظم فوجی ظلم و تعدی کے پلڑے انصاف کی ترازو میں مساوی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا نام محمد قاسم صاحب نے جس طرح لکھا ہے وہ بھی سخت تکلیف دہ اور غیر مہذبانہ ہے جو تقسیم ہند سے پہلے کے مسلم لیگی طرز کی یاد تازہ کرتا ہے، اور انھوں نے قرآن اور اسلام کے بارے میں جو خیالات شیخ کی طرف منسوب کئے ہیں وہ تو خالصاً پاکستانی پروپیگنڈے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔

اگر پاکستان کی فوجی کارروائی خدائی قہر کی ایک شکل ہے، تو مجھے اندیشہ ہے کہ خدائی قہر کا یہ سلسلہ بہت دراز ہوگا اور کہیں جا کر رکے گا نہیں۔ کیا کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کے سواد اعظم نے مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے علمائے اسلام کی جو بے حرمتی کی تھی اس کی وجہ سے ان پر "قہر الٰہی" "فرقہ وارانہ فسادات" کی صورت میں نازل ہوتا رہتا ہے اور اس لئے فساد کرنے والے اس وبال سے بری الذمہ ہیں؟ لیکن جو لوگ قانونِ الٰہی کے رموز سے ذرا بھی آشنا ہیں وہ اس قسم کے لاطائل دلائل کو ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح عدالت کے بعد ایک اور عدالت بھی تو ہے جہاں اصلی اور حقیقی انصاف ہونے والا ہے۔ اگر محمد قاسم صاحب کے نزدیک شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے حامیوں کو سزا ملنی ہی چاہیے تھی جو جنرل یحییٰ خاں اور ان کے فوجیوں نے دیدی تو اس عدالت میں جہاں جھوٹی توجیہات ذرا کام نہیں دیں گی بلکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ ہو کر رہے گا۔ نہ معلوم کس کس کے چہرے قرآنی وعید کے مطابق سیاہ ہو کر رہیں گے۔ اس دن سے اور اس دن کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔

"اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا و من سیئاتِ اعمالنا"

نیاز مند ریاض الرحمٰن شیروانی۔ علی گڑھ

"واقعات" جانبدار ہے

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ تسلیمات

آپ کے ادارے سے جتنے بھی پرچے نکلتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان جیسا ہندوستان میں ایک پرچا نہیں نکلتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے تمام پرچوں کا بڑے غور و خوض سے مطالعہ کرتا ہوں اور جب تک شروع سے آخر تک نہیں پڑھ لیتا سکون میسر نہیں آتا ہے۔

میں آپ کو ایک قابلِ احترام شخصیت اور بے باک صحافی سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جو کچھ بھی لکھتے ہیں غیر جانبداری سے لکھتے ہیں، لیکن میں دو تین ماہ سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ جانبداری سے کام لے رہے ہیں اور بنگلہ دیش کے جھوٹے واقعات کو اچھال کر لکھ رہے ہیں اور ہمارے محبوب رسالے "واقعات" کو داغدار کر رہے ہیں۔ حالانکہ بنگلہ دیش کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بنگلہ دیش کوئی ملک ہے تو ہم ہندوستانی [illegible] ہندوستان کے [illegible]

بھی کا ساملہ ہے۔ مقدر وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمن ہندوستانی کا لیڈر ہے احساس کے ساتھ ہی آپ بھی حکومت کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں اور بنگلا دیش بنگلا دیش چلا رہے ہیں، شیخ مجیب الرحمن کی تعریف وتوصیف کر رہے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ شیخ مجیب الرحمن نے بنگلادیش میں کیا کیا گل کھلائے ہیں اور غیر بنگالیوں کا کس طرح قتل عام کیا ہے، کس طرح معصوم لوگوں پر ظلم کا پہاڑ توڑا ہے۔ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ آخر ان معصوم غیر بنگالیوں کا کیا قصور تھا کہ ان کے خاندان کا صفایا کر دیا گیا۔ انکی معصوم دوشیزاؤں کی آبرو لوٹی گئی، ان کی عورتوں کا حمل چاک کیا گیا اور شیر خوار بچوں کو سنگینوں اور بھالوں پر اچھالا گیا۔ ان کے نوجوان مردوں کو مشین گنوں سے بھون دیا گیا اور ضعیفوں کو پاؤں پکڑ کر گھسیٹا گیا۔ آخر شیخ مجیب الرحمن کے ساتھیوں نے غیر بنگالیوں پر اس قدر ظلم کیوں کیا؟ آپ خاموش کیوں ہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔ آج تک آپ نے ان مظلوموں کے متعلق کیوں نہیں لکھا۔ کیا آپ کی زبان ان مظلوموں کے لئے گنگ ہوگئی تھی۔ کیا آپ کے ہاتھ کو کچھ ہوگیا تھا کہ آپ غیر بنگالیوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھ رہے تھے۔ بتائیے آپ ان سب باتوں کا کیا جواب دیں گے۔

کیا آپ کو صرف بنگالیوں سے محبت ہے اور غیر بنگالیوں سے کوئی رشتہ نہیں۔ میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپ اس قدر جانبداری سے کام لیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ آئندہ کے لئے غیر جانبدار بن جایئے۔ آپ کا اپنا۔

محمد جمالیوں صدیقی۔ دربھنگا

ہندوستانی سماج واد ــــ عوام سے مذاق

مکرمی۔ تسلیم

ملک کو آزادی ملے ہوئے تقریباً ۲۵ سال گزر چکے ہیں۔ آزادی سے پہلے عوام کو بہت سے سبز باغ دکھائے گئے تھے جو حقیقت نہ بن سکے۔ دیہی علاقوں میں جیسی افراتفری زمینداری کے دور میں تھی وہی آج بھی ہے بلکہ آج کل تو گاؤں میں بے روزگاروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ چند لوگوں نے فرضی ناموں کے ذریعے ہزاروں ایکڑ زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ہمارے حکمراں بھی اسی زمیندار اور سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی وجہ سے آج تک امید ہے۔

ہر بجٹ میں عوام پر نئے نئے ٹیکس لگائے گئے۔ تمام نئے لائسنس چند سرمایہ داروں کو دیے گئے۔

بنگال میں آج بھی جمہوریت کا مذاق اڑایا جارہا ہے ۹۵ فیصدی ووٹ حاصل کرنے والی جماعت کو منظم سازش کے ذریعے حکومت سے محروم رکھا گیا۔ جمہوریت کے ساتھ مذاق دیکھنا ہو تو ہندوستان میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہماری حکومت کو بنگلا دیش سے سبق حاصل کرنا چاہئے وہاں پاکستان کی فوجی حکومت نے عوام کے حقوق کو سلب کیا، ان پر ظلم ڈھائے، تو مجبوراً عوام کو ایسی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے پڑے۔ وہ دن دور نہیں جب ہندوستانی عوام خوابِ غفلت سے جاگیں گے اور ملک میں اسی طرح کا انقلاب لے آئیں گے۔

آج ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ ملک میں سماج واد کا نعرہ لگانے والی سرمایا داروں کی پٹھو برسر اقتدار جماعت کی پول کھولی جائے۔ باقی تمام کام ہندوستانی عوام پورا کر دیں گے۔ آپکا۔ (ڈاکٹر) محمد قاسم بہارنچ

"واقعات" سیاسی شعور پیدا کر رہا ہے۔

مکرمی صدیقی صاحب۔ سلام ونیاز

"واقعات" کا اجرا کر کے اردو داں طبقے کو آپ دنیا کے سیاسی حالات سے جس طرح واقف کرا رہے ہیں، وہ لائق ستائش ہے۔ دراصل اس طبقے کو شعوری اعتبار سے بیدار کر کے اصلیت تک پہونچانے کی شدید ضرورت ہے ہم میں سے بعض حضرات صرف روزناموں کے مطالعے تک اپنے ذہنوں کو محدود کر کے عالمی حالات و واقعات سے قطعی ناواقف رہتے ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں وہ سیاسی شعور پیدا نہیں ہوسکا جس سے کسی طبقے کی سیاسی بیداری کا پتا لگایا جاتا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ "واقعات" کے ذریعے آپ اس گہرے شعور کو پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہیں جو ایک بیدار قوم کے لئے ضروری ہے ــ آپکا۔ عزیز انصاری

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ سلام ونیاز

یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا کہ آج "واقعات" ہی وہ واحد پرچا ہے جو قوم پر چھائے ہوئے برسوں کے جمود کو توڑنے کے لئے کوشاں ہے اور بہت حد تک کامیابی سے آپ جیسی بلند نیت، عالی دماغ اور قابلِ ستی نشین ـ قابلِ پرستش ہے وہ شخصیت جسے واقعات کی شکل میں صورِ اسرافیل پھونکنے کا مبارک اعزاز بخشا گیا۔ ہم سب آپ کی آواز کے ساتھ ہم آواز اور بارگاہِ ایزدی میں کامیابی کے لئے دعاگو ہیں۔ ناچیز۔ ایم سیٹھ

محترمی۔ السلام علیکم۔

"واقعات" پر نظر کئی ماہ قبل بک اسٹال پر پڑی تھی اسکے بعد اکثر وبیشتر نظر سے گزرتا رہا ہے۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کے سیاسی موضوعات بالخصوص مسلمانوں کے مسائل سے متعلق پالیسی ہے ــ بنگلادیش کے المیے کے بارے میں "واقعات" کا جو رویہ رہا ہے وہ یقیناً بہت صحیح۔ ایماندارانہ اور قابل ستائش ہے۔ کئی بار سوچا کہ اس کے بارے میں آپکو مبارکباد کا خط لکھوں آج خدا خدا کر کے وہ موقع ملا۔ مخلص۔ محمد سلیم تنہا

"واقعات" کو واقعات ہی رہنے دیں۔

محترمی۔ السلام علیکم

ایک گزارش ہے۔ شاید کہ شرف قبولیت بخشیں۔ ـ "پندرہ روزہ واقعات" اگر صرف واقعات ہی سے بھرا رہے تو کیا حرج ہے۔ آپ تو اس کو تصویروں سے مزین کر کے تصویری البم بنا دیتے ہیں۔ آپ سے آپ کے حساس اور جدید ہونے کی وجہ سے میری التجا یہی ہے کہ اس پرچے کو بازاری بنا کر مخرب اخلاق لٹریچر میں شامل نہ کریں۔ امید ہے آئندہ احتیاط برتیں گے۔ واقعات کا ایک خریدار۔

محترمی۔ سلام وخلوص۔

جولائی کا شمارہ نظر سے گزرا، بہت پسند آیا۔ آپ کی محنت قابلِ تعریف ہے جو قلیل مدت میں ایسے پرچے کو منظر عام پر لائی جس کی اشد ضرورت تھی۔ "واقعات" میں ہر طرح کے سیاسی واقعات ملتے ہیں، حتیٰ کہ آپ نے فلمی دنیا کو بھی اس میں سمو دیا ہے جسکا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں ہر مزاج کے پڑھنے والوں کو دلچسپی مل جائے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کی کوششوں کی تعریف کروں بلکہ صرف اتنا کہوں گا کہ اپنے قلم کو رواں رکھیں کہ وہ دن دور نہیں جب "واقعات" تمام پرچوں سے بالاتر حیثیت رکھے گا۔ آپ کا۔ اقبال

قبرص

نشستند و گفتند و برخاستند

قبرص میں یونانیوں اور ترکوں کے درمیان تنازعے کو دور کرنے کے لئے گذشتہ تین سال سے بات چیت ہو رہی ہے۔ دونوں کے درمیان بے شمار نشستیں (پیرس کی امن کی بات چیت سے ۴۰ زیادہ) ہو چکی ہیں لیکن ہر میٹنگ "نشستند و گفتند و برخاستند" پر ختم ہو جاتی ہے۔ یونانی نمائندہ گلیفکوس اور ترک نمائندہ رؤف ڈنگناش تین تین سال سے ایک ساتھ بیٹھتے بیٹھتے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان گئے ہیں اور انکی دشمنی "دوستانہ دشمنی" میں تبدیل ہو گئی ہے۔ لیکن کیا مجال اپنے اپنے موقف سے ہٹ جائیں۔ دونوں ذہین و ہوشیار ہیں اور دونوں نے قانون کی تربیت برطانیا میں پائی ہے۔ دونوں تمباکو نوش ہیں اور خوب باتیں کرنے والے ہیں۔ دونوں ایکدوسرے کو جب خط لکھتے ہیں تو "ڈیر گلیفکوس" اور "ڈیر رؤف" سے خطاب کرتے ہیں لیکن کیا مجال کہ انکے اپنے اپنے موقف میں تبدیلی آجائے۔ دونوں ابھی تک کوئی ایسا آئینی حل نہ نکال سکے کہ جزیرے کے پانچ لاکھ یونانی اور ایک لاکھ ۱۸ ہزار ترک کس طرح دوست بن کر رہ سکتے ہیں۔ دونوں طرف کے لوگ ابھی دوستانہ دشمنی سے اسقدر تنگ آگئے ہیں کہ کہنے لگے ہیں کہ اب مسئلہ بات چیت کے ذریعے نہیں بلکہ طاقت کے ذریعے میدان جنگ میں ہوگا۔"

[illegible]

یونانی اکثریت ہی ہم پر حکومت کرے گی۔ ترک یونانیوں کی ذہنیت کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ لوگ "جیسے کو تیسا" کی بات سمجھتے ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔

۸۵ سالہ پادری میکاریوس اور ان کے ساتھی اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ پورے جزیرے کیلئے ایک حکومت رہنی چاہیئے جو ظاہر ہے اکثریت کی حکومت ہوگی جس میں میکاریوس کے کہنے کے مطابق اقلیت کے حقوق محفوظ رہیں گے۔ لیکن ترک کہتے ہیں کہ ہم "تحفظات" پر یقین نہیں رکھتے ہم اپنی حکومت الگ چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے جزیرے کو تقسیم کیا جانا چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ انتظامی مشنری الگ الگ ہو اور دونوں حصوں کی ایک مشترکہ پارلیمنٹ بنا دی جائے جس میں دونوں حصوں کے نمائندے خود مختار حصوں کے نمائندوں کی حیثیت سے

[illegible]

کہ سپریم کورٹ میں ہمارے چار یا پانچ جج لے جائیں بلکہ خود ہمارا وجود اس وقت خطرے میں ہے۔"

اور اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ترکوں نے ضروری اقدامات شروع کر دیئے ہیں اور اس مقصد کے لئے ترک لڑکیوں تک کو فوجی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ کیونکہ ترک سمجھتے ہیں کہ اگر بات چیت ناکام رہی تو میدان جنگ میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی اس مرتبہ ترکوں کو غفلت میں نہ رہنا چاہیئے۔

دنیا دور بین کی نظر میں

قبرص کی ترک لڑکیاں جو اپنی اور قوم کی حفاظت کے لئے فوجی ٹریننگ حاصل کر رہی ہیں۔

بولیویا

ایک انقلاب اور

بولیویا نے ۱۸۲۵ء میں اسپین سے آزادی حاصل کی تھی اس کے بعد سے اب تک ۱۸۰ بغاوتیں ہو چکی ہیں جن میں سے بیشتر کامیاب ہو چکی ہیں۔ گزشتہ سال اکتوبر میں پچاس سالہ جنرل جوآن تورسے اچانک انقلاب لا کر اور بائیں بازو کی حکومت قائم کر لی۔ اس وقت دائیں بازو کا فوجی گروپ الفریڈو اوونڈو کینڈیا کو ان کے عہدۂ صدارت سے الگ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ تورس نے خاموشی کے ساتھ فضائیہ کی حمایت حاصل کی اور محل میں داخل ہو گئے۔ لیکن گذشتہ ہفتے تورسے کو ایک انقلاب کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ بغاوت اس وقت شروع ہوئی جب تورس نے تیس فوجیوں اور غیر فوجیوں کو اس الزام میں گرفتار کیا کہ انھوں نے انکی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی تھی۔ اس پر سانتا کروز کے مشرقی شہر میں دائیں بازو کے افسران نے بغاوت کر دی اور وہ ملک کے ۹ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں فوج کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان باغیوں نے جنرل ہوگو بنزر کو اپنا صدر مقرر کر دیا انہیں ایک ماہ قبل ہی تورسے کے حکم سے جلا وطن کیا گیا تھا۔

بائیں بازو کے فوجی ولالکوسعت پر قبضہ کرنے کیلئے شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔

لاپاز میں توریس نے عہد لیا تھا کہ وہ آخر تک" اپنی حکومت کا دفاع کریں گے اور" فسطائیوں کی بغاوت" کو کامیاب نہ ہونے دیں گے انھیں بائیں بازو کے فوجیوں کی حمایت حاصل تھی اور وہ ریل اور سڑک کے ایک اہم جنکشن اورورو پر جو لاپاز کو ٹین کی کانوں کے تمام اہم مرکزوں کو باہم ملاتا ہے کنٹرول کرنے میں کامیاب بھی ہوگئے تھے لیکن میدانِ جنگ میں دائیں بازو کے فوجیوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ راجدھانی لاپاز کی جنگ میں ملٹری اکیڈمی کے کیڈٹ باغیوں کے ساتھ مل گئے اور توریس کی وفادار فوجوں کی قوتِ مزاحمت کمزور پڑگئی۔ یہی وقت تھا جب باغی فوجوں کے نمائندے نے توریس کو الٹی میٹم دیا کہ" استعفےٰ دیدو" لیکن توریس نے جواب دیا کہ" تم یہاں سے میری لاش ہی کو نکال سکوگے"۔ تاہم جب باغی ٹینک صدارتی محل کی طرف بڑھے تو وہ وہاں سے نکل کر پیرو کے سفارت خانے میں چلے گئے اور پناہ لے لی۔ آخر میں باغیوں نے انھیں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ پیرو جانے کی اجازت دیدی۔

کوئی عرب ملک ہوتا تو شاید صدر اس طرح ملک چھوڑ کر باہر نہ جاسکتا تھا۔

"او ہو، ہم برطانوی سپاہیوں سے نفرت کرتے ہیں جی ہاں ہم نفرت کرتے ہیں۔ ہم نفرت کرتے ہیں"۔ یہ تھے وہ نعرے جو چار سو کیتھولک عورتیں اور لڑکیاں لندن ڈیری (شمالی آئرلینڈ) میں اس وقت لگا رہی تھیں جب پروٹسٹنٹ لوگ شمالی آئرلینڈ میں یونین جیک لہرائے جانے کی سالگرہ کی تقریب منا رہے تھے مظاہرے کی قیادت ۲۳ سالہ برناڈیت ڈیولین کر رہی تھیں وہ مڈاسٹر کے حلقے سے پارلیمنٹ کی سب سے کم عمر ممبر ہیں۔

غیر شادی شدہ ممبر پارلیمنٹ — جو حاملہ ہے —

شمالی آئرلینڈ

بدستور احتجاج مظاہرے اور کشیدگی

واقعات نئی دہلی

یہ گزشتہ سے پیوستہ ہفتے کی بات اسی وقت وہ حاملہ تھیں بس لے پیدل چلنے کی بجائے لاؤڈ اسپیکر والی کار پر سوار

تھیں (گزشتہ ہفتے ان کے ہاں لڑکی تولد ہوئی ہے جس کے باپ کا نام انھوں نے بتانے سے انکار کردیا)

برطانوی سپاہیوں کے خلاف عوام کے اندر کتنا جذبہ پایا جاتا ہے اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ لوگ تک پتھر اور بوتلیں جمع کرتے ہیں اور جب بھی کوئی برطانوی سپاہی نظر آتا ہے اس پر پھینک دیتے ہیں۔

کیتھولکوں میں یہ غم و غصہ چھایا کہ اس سے قبل ملک جاچکا ہے اس لئے ہے کہ شمالی آئرلینڈ کے وزیر اعظم مسٹر برین فولکنر نے احتیاطی نظر بندی کا قانون نافذ کردیا ہے اور کسی شخص کو بھی مقدمہ چلائے بغیر نظربند کیا جاسکتا ہے۔ برناڈیت نے اعلان کیا ہے کہ ہم اس قانون کے خلاف اتنی گرفتاریاں دیں گے کہ ہمارے جیلوں میں جگہ نہ رہے گی۔

ناراضگی اور کشیدگی گھٹنے کی بجائے اور بڑھتی جارہی ہے، دھماکے اور فائرنگ روزانہ کا معمول بن کر رہ گئے ہیں۔ بیلفاسٹ کے ایک مزدور نے جب سنا کہ اس کا باپ مارا گیا تو وہ بولا۔" خدایا یہ ملک تو اب جہنم بن گیا"۔ ایک ۴۰ سال کا کیتھولک پادری جو کسی دم توڑتے شخص کے پاس آخری مذہبی رسوم انجام دینے کے لئے پہونچنے کی کوشش کر رہا تھا ہلاک کر ڈالا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس شخص کے پاس وہ پہنچنا چاہتا تھا وہ بچ گیا۔

وزیر اعظم جمہوریہ آئرلینڈ نے شمالی آئرلینڈ کی اس صورتِ حال پر تشویش ظاہر کی ہے اور حکومتِ برطانیا کو لکھا ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک خاموش بیٹھے نہیں دیکھتے رہیں گے۔ برطانوی حکومت بھی سخت ناراض ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ کئی برطانوی سپاہی سرحد کی فائرنگ میں مارے جاچکے ہیں۔ حکومتِ برطانیا نے اس بات کا سخت نوٹس لیا ہے اور وزیر اعظم مسٹر ہیتھ نے اس بات پر ناراضگی ظاہر کی ہے کہ وزیر اعظم جمہوریہ آئرلینڈ نے انھیں جو مراسلہ لکھا ہے اس میں انھوں نے سپاہیوں کے ہلاک ہونے پر اظہارِ افسوس تک نہیں کیا۔

برطانیا ہمیشہ دوسروں کی آگ میں کودا کرتا تھا۔ اب خود اس کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اونٹ اب کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

بنگلا دیش مشن

دہلی کے بنگلادیش مشن میں بنگلادیش کا جھنڈا لہرایا جا رہا ہے۔

لیجیئے دہلی میں اب "بنگلادیش ہائی کمیشن" بھی بن گیا۔ گزشتہ ہفتے جب موتی باغ کے قریب آنند نکیتن کی عمارت پر بنگلادیش کا جھنڈا لہرایا گیا۔ یہ بنگلادیش مشن تھا لیکن اب بنگلادیش کی حکومت نے اسے "بنگلادیش ہائی کمیشن" کا نام دیا ہے۔ اس کے انچارج ہیں مسٹر کے۔ ایم شہاب الدین۔ یہ وہی ڈپلومیٹ ہیں جنہوں نے پاکستان ہائی کمیشن کو خیر باد کہہ کر ہندوستان میں سیاسی پناہ لی تھی۔ جو انھیں مل گئی۔ بنگلا مشن پر انھوں نے ہی بنگلادیش کا جھنڈا لہرایا تھا۔ جھنڈا لہرانے کی یہ دلچسپ تقریب تھی بڑے بڑے لوگ اس میں شامل تھے لیکن سرکاری افسر اس میں شامل نہیں تھے اس لئے کہ ابھی ہماری حکومت نے بنگلادیش کو تسلیم نہیں کیا ہے اور جب تک اسے تسلیم نہ کیا جائے حکومت ہند عملاً اس سے تعلق رہے گی۔ لیکن بنگلادیش کے ڈپلومیٹوں کو ہندوستان کی اخلاقی ہمدردیاں حاصل ہیں۔

پاکستان بنگلادیش کے مشن کے قیام سے ناخوش ہے۔ اس کے خلاف اس نے ایک احتجاج بھی دے مارا اقدامات نئی دہلی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہندوستان بنگلادیش کے حریت پسندوں کو کچھ نہ کرنے دے۔ لیکن کیا خود پاکستان اس پوزیشن میں ہے کہ وہ بنگلادیش کی سرگرمیوں کو روک دے؟۔ بنگلادیش میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ وہ جو کچھ خود نہ کر سکا اسے ہندوستان سے کرانا چاہتا ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے۔

قابلِ رحم حالت :-

پاکستان ہائی کمیشن والوں کی حالت آج کل بہت قابلِ رحم ہے۔ بنگالی ملازمین ایک ایک کرکے اس سے رخصت ہو رہے ہیں۔ مسٹر امجد علی پانچویں بنگالی ہیں جو ہائی کمیشن کی عمارت کو خیر باد کہہ کر باہر آگئے ہیں۔ وہ اپنی بیوی ریحانہ اور تین ماہ کی چھوٹی بچی کے ساتھ اس کا فوٹو کھنچوانے کی اجازت لے کر باہر نکلے۔ پاکستان انٹیلی جینس کا آدمی ان کے ساتھ تھا لیکن انھوں نے ایسا چکما دیا کہ وہ دیکھتا رہ گیا۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہائی کمیشن میں شاید اور بھی بنگالی ہیں جو باہر آنے کے لئے تڑپ رہے ہیں اور یقین ہے جب بھی موقع ملے گا وہ باہر آجائیں گے۔ ان کا نعرہ یہ ہے کہ اب وقت آگیا ہے ہم اپنی خدمات بنگلادیش کی آزاد حکومت کے حوالے کر دیں۔

مظاہرے :-

ایک طرف اندرون ہائی کمیشن بے چینی ہے اور دوسری طرف اس کے باہر لوگوں کی یلغار ہے۔ جتنے مظاہرے اب تک ہو چکے ہیں شاید ان کی گنتی کرنا بھی مشکل ہو۔ تازہ مظاہرہ بمبئی کے اردو اخبارات کے ایڈیٹروں نے کیا ہے۔ اس سے قبل آندھرا کے اردو اخبارات کے ایڈیٹروں نے کیا تھا۔ دلی کے اردو اخبارات ابھی میدان میں نہیں آئے۔ شاید اس لئے کہ حالیہ اردو سیمینار میں جو رائے عامہ بنی تھی بنگلادیش کی حمایت کے لئے وہ اسے کافی سمجھتے ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بنانا چاہتے بلکہ سب زبانوں کے اخبارات کے ساتھ جس دن سب اخبارات کے ایڈیٹر اپنی "قلمی جنگ" کے ساتھ ہائی کمیشن پہنچ کر نعرے لگانا ضروری سمجھیں گے اس دن اردو اخبارات کے ایڈیٹر ان کی قیادت کریں گے۔

مقابلے :-

آپ نے بہت سے مقابلوں کے نام سنے ہوں گے دوڑنے کا مقابلہ۔ مضامین لکھنے کا مقابلہ، ہنسی ہنسنے کا مقابلہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن عمارتوں کا مقابلہ کبھی نہ سنا ہوگا ایک طرف لاکھوں کروڑوں عوام ہیں جو اپنی جھونپڑیاں تک نہیں ڈال سکتے۔ لیکن دوسری طرف نئی دلی کی فلک بوس عمارتیں جو بننی شروع ہوئیں تو بنتی ہی چلی جا رہی ہیں اور کناٹ پلیس تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ سات آٹھ منزل تک کسی نے نوٹس ہی نہ لیا لیکن جب پندرہ اور بیس منزلوں تک نوبت جا پہنچی اور اب نئی دہلی میونسپل کمیٹی کی ۲۲ منزلہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی تو وزیرِ اعظم تک کو تشویش پیدا ہونے لگی۔

ان لٹک پلس عمارتوں میں ایک دنیا ساتی ہوگی وہ بار
آئے گی تو کہاں چلے گی۔ ٹریفک کہاں سے گزرے گا؟
یہ ہے وہ سوال جو سب کے لئے پریشان کن ہے۔
کناٹ پلیس کا سارا سکون جاتا رہے گا اور بڑے فوارے
کی خوبصورتی کے باوجود اس کی خوبصورتی فضا میں
پہونچ کر غائب ہو جائے گی۔
دیکھیں اس خوب صورتی کو بچانے کے لئے ماہرین کیا
نسخہ تجویز کرتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد لکھنؤ میں اتنا زبردست سیلاب کبھی نہیں آیا۔ اوپر کی تصویر میں لکھنؤ یونیورسٹی کی بلڈنگ سیلاب کے پانی میں گھری ہوئی نظر آرہی ہے۔ نیچے حسین آباد امام باڑا۔ جہاں ۶-۶ فیٹ پانی بھر کر

کناٹ پلیس کا ایک منظر۔ اونچی اونچی عمارتیں جس کی خوبصورتی دیمک کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔

کناٹ پلیس کے موجودہ نقشے کا ایک ماڈل

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی تاریخی فتح

شاہد صدیقی

کپتان واڈیکر

انگلستان کے پچ پر انگلستان کو عبرت ناک شکست

۱۹۳۲ء میں پہلی بار ہندوستانی کرکٹ ٹیم، کرکٹ کے ملک یعنی انگلینڈ میں کھیلنے کے لئے گئی۔ اس وقت ہندوستانیوں کے لئے یہ بات ہی قابل فخر تھی کہ اسے انگلینڈ جیسے ملک سے زور آزمائی کا موقع ملا۔ اس کے بعد ہر سال یا تو انگلینڈ کی ٹیم ہندوستان آتی رہی یا ہندوستان کی ٹیم انگلینڈ جاتی رہی۔ ہندوستانی کھلاڑی ہندوستان میں تو انگلش ٹیم کا مقابلہ کر لیتے تھے لیکن انگلینڈ پہنچ کر ان کی حالت بگڑ جاتی تھی۔ اس کی ایک اہم وجہ انگلینڈ کا موسم اور وہاں کرکٹ کھیلنے کے حالات تھے۔ انگلینڈ کا موسم اور وہاں کے پچز ہندوستان سے بالکل مختلف ہیں۔ ابھی دھوپ نکلی ہوئی ہے تو منٹوں میں سارے میدان میں پانی بھر گیا۔ جو پچ آدھ گھنٹے پہلے بلے باز کی مدد کر رہی تھی، بالر کی مدد کرنے لگی۔ دوسرے انگلینڈ میں پچیں زیادہ تر بالروں کے لئے بنائی جاتی ہیں جن کی ہندوستان میں کمی ہے۔ اس لئے ہندوستانی ٹیمیں ان پچوں کا پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتیں۔ انگلینڈ میں کرکٹ کو کھیل سمجھ کر نہیں بلکہ پیشہ کے طور پر کھیلا جاتا ہے۔ تین تین مہینے تک مستقل کھیل [illegible] کھلاڑی کو صرف اتوار کی چھٹی ملتی ہے ہندوستانی [illegible] کھلاڑیوں کو بھی انگلینڈ جاکر اسی طرح کھیلنا پڑتا ہے جس کے وہ عادی نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ہی ہفتوں میں ہمارے کھلاڑیوں کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور وہ جلدی سے جلدی واپس بھاگنے کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔

ان حالات میں ہندوستانی کرکٹ ٹیموں کا انگلینڈ میں ناکام رہنا کوئی زیادہ تعجب خیز بات نہیں تھی۔ ۱۹۳۲ء کے بعد ہندوستان نے انگلینڈ میں ۲۲ ٹیسٹ میچ کھیلے جن میں سے زیادہ تر میں ہندوستان ناکام ہوا یا پھر وہ ڈرا ہو گئے۔ اب تک ہندوستان اور انگلینڈ نے ۴۰ ٹیسٹ میچ کھیلے ہیں جنمیں سے چار ہندوستان جیتا، ۱۸ انگلینڈ جیتا اور ۱۸ ڈرا ہوئے۔ ہندوستانی کھلاڑیوں کی ہمیشہ سے یہ تمنا رہی تھی کہ انگلینڈ کو خود انگلینڈ میں ہرایا جائے لیکن ہمیشہ ہوتا اس کے برخلاف تھا۔ ٹیسٹ میچ میں ہرانا تو ایک طرف رہا، ہندوستانی انگلش کاؤنٹی ٹیموں سے بھی مات کھا جاتے تھے۔ اور ہار بھی معمولی نہیں ہوتی تھی، ہندوستان کے لئے دس وکٹ یا ایک اننگز سے ہارنا معمولی بات تھی۔

واڈیکر کی ٹیم بہتر تھی۔ اس مرتبہ جب ہندوستانی ٹیم انگلینڈ جانے کے لئے تیار ہوئی تو سب کا اندازہ تھا کہ یہ ٹیم پہلی ٹیموں سے کافی بہتر ہے۔ چند ہی ہفتے پہلے یہ ٹیم ویسٹ انڈیز جیسی طاقت ور ٹیم کو ہرا چکی تھی۔ حالانکہ ویسٹ انڈیز کو ہندوستانی ویسٹ انڈیز میں تو دور رہا خود ہندوستان میں بھی ہرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ موجودہ ویسٹ انڈیز ٹیم کافی کمزور ہے اس لئے اسے ہرانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہندوستانی ٹیم کی عظمت کا اقرار اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب یہ ٹیم اس وقت کی سب سے زیادہ مضبوط ٹیم یعنی انگلینڈ کو ہرا دے۔ بہتر ٹیم ہونے کے باوجود کسی کو یقین نہیں تھا کہ ہندوستانی انگلینڈ کو ہرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ چند مہینے پہلے ہی انگلینڈ آسٹریلیا جیسی طاقتور ٹیم کو بری طرح سے شکست دے چکا تھا۔ انگلینڈ کے پاس النگورتھ جیسا ہوشیار کپتان اور اسنو جیسا طوفانی بالر موجود تھا۔ اور اس کی بیٹنگ بھی جتنی مضبوط اب تھی شاید پچھلے کئی برسوں میں کبھی نہیں تھی۔ ۱۹۶۸ء سے انگلینڈ ۲۵ ٹیسٹ میچ کھیل چکا تھا جن میں سے اسے ایک میں بھی شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

سارڈیسائی نے ہندوستان کی پہلی باری میں ۵۰ رن پورے کئے تو تماشائی اسے مبارک باد دینے کے لئے پچ پر آگئے۔ ڈیسائی انھیں بیٹ سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہندوستانی اسپنر کسی سے کم نہیں ہے لیکن ہندوستانی کھلاڑیوں نے انگلینڈ پہنچتے ہی اپنا شاندار کھیل دکھا کر تمام ڈیرے ڈھیلے کر دیئے۔ شروع ہی سے ہندوستانی کھلاڑیوں نے ثابت کر دیا کہ ان کی ٹیم کسی بھی طرح انگلینڈ سے کم نہیں ہے۔ اگر انگلینڈ کے پاس دنیا کے بہترین تیز بالر ہیں تو ہندوستان کے پاس بھی بیدی، راگھون، چندر شیکھر اور پرسنا کی شکل میں دنیا کے بہترین اسپنر (SPINER) موجود ہیں۔ لارڈز میں پہلا ٹیسٹ کھیلنے سے پہلے ہندوستان نے مختلف کاؤنٹی ٹیموں سے ۸ فرسٹ کلاس میچ کھیلے۔ جن میں سے چار برابر رہے اور چار میں ہندوستان نے فتح حاصل کی۔ یہ بات بذات خود بہت ہی عجیب اور انوکھی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے عام طور پر ہندوستان کاؤنٹی ٹیموں کے مقابلے میں بھی بری طرح سے شکست کھاتا تھا۔ لارڈز کے پہلے ٹیسٹ میں بھی ہندوستان آخری روز تک انگلینڈ پر چھایا رہا لیکن آخری دن کمزور بیٹنگ کی وجہ سے ہندوستان نے جیتا ہوا میچ ہاتھ سے نکال دیا، اور ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرا ٹیسٹ بارش کی نذر ہو گیا۔

آخری اور تاریخی ٹیسٹ ۔ تیسرے ٹیسٹ میں پہلے دو میچوں کی طرح واڈیکر ایک بار پھر ٹاس ہار گیا۔ انگلینڈ نے بیٹنگ شروع کی۔ ابھی پانچ رن بھی نہیں بنے تھے کہ لکہرسٹ جیسا عظیم بلے باز سولکر کی گیند پر بولڈ ہو گیا لیکن اسکے بعد جیمسن اور ایڈرچ جم کر کھیلے اور اسکور ۱۱۱ تک پہنچا دیا لیکن ایک بار پھر ہندوستانی اسپنر انگلش بلے بازوں پر چھا گئے۔ اور کچھ ہی دیر میں ۱۴۳ رن دیکر ۵ وکٹ لے لئے۔ ۱۷۵ پر چھٹا وکٹ نکلا تو خیال ہوا کہ انگلینڈ کی ٹیم زیادہ سے زیادہ سوا دو سو یا ڈھائی سو رن بنا کر آؤٹ ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور ناٹ اور ہٹن فیلڈ میں میخوں کی طرح گڑ گئے کچھ ہی دیر میں انگلینڈ خطرے سے باہر نکل چکا تھا اور اگلے دن انگلینڈ ۳۵۵ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا۔

ہندوستانی اوپنر گواسکر اور منکڈ انگلینڈ کے تیز بالروں کے آگے جم نہ پائے اور ذرا ہی دیر میں گواسکر سنو کی گیند پر اور منکڈ پرائس کی گیند پر آؤٹ ہو گیا۔ ۲۱ رن پر ہندوستان کے دو کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے لیکن سارڈیسائی اور کپتان واڈیکر نے آکر کھیل کو ذرا سنبھالا دیا۔ دونوں جم کر اعتماد سے کھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ اسکور ۱۱۴ پر پہنچ گیا۔ اب ہندوستان کی حالت ذرا محفوظ ہو چکی تھی لیکن فوراً ہی پھر بلے بازوں کی لائن لگ گئی سارڈیسائی ۵۴ رن بنا کر انڈرووڈ کی گیند پر بولڈ ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی وشوا ناتھ بھی بغیر کوئی رن بنائے ہوئے انڈرووڈ کا شکار ہو گیا۔ چائے سے ۵ منٹ پہلے واڈیکر کو بھی انڈرووڈ نے آؤٹ کر دیا۔ واڈیکر نے ۴۸ رن بنائے تھے۔ اس طرح چائے کے وقفے تک ہندوستان کا اسکور ۵ وکٹ پر صرف ۱۲۵ ہو سکا۔ ہندوستان کی حالت انگلینڈ سے بھی زیادہ خراب تھی اور اس سے باہر نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ کمنٹیٹر بار بار فالو آن کی بات کر رہے تھے۔

سولکر اور انجینیر نے کھیل میں جان ڈال دی۔

لیکن اب بمبئی کے واڈیکر اور سارڈیسائی کی جگہ بمبئی ہی کے سولکر اور انجینیر نے سنبھال لی۔ دونوں نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دونوں ہی دن ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے آؤٹ ہو گئے۔ سولکر نے ۴۴ اور انجینیر نے ۵۹ رن بنائے۔ اگلے دن عابد علی اور راگھون نے ملکر اسکور میں ۵۰ رن کا اضافہ کیا اور ہندوستان ۲۸۴ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا حالانکہ ہندوستان فالو آن سے بچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بیچ اور ۷۱ رن کی لیڈ کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا کہ ہندوستان شاید یہ میچ ہار جائے گا اور اس طرح ہندوستان کا انگلینڈ میں انگلینڈ کے خلاف ٹیسٹ جیتنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

چندر نے کھیل کا رخ پلٹ دیا۔ لیکن ذرا سی دیر میں کھیل کا رخ ہی بدل گیا۔ انگلینڈ کا پہلا وکٹ ۲۳ پر گرا، جب جیمسن ۱۶ رن بنا کر رن آؤٹ ہو گیا۔ لنچ ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے اس لئے چندر شیکھر کو ایک اوور اور دیا گیا۔ تمام لوگ یہ سوچ کر کہ اس ایک اوور میں کیا ہو سکتا ہے! لنچ کے لئے اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے لیکن چندر نے لگاتار دو گیندوں میں ایڈرچ اور فلیچر کو آؤٹ کر کے انگلینڈ کے ہوش گم کر دیئے۔ اس دن کو اگر چندر شیکھر کا دن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے بعد ایک بھی کھلاڑی چندر شیکھر کی گیند نہ کھیل سکا بہترین فیلڈنگ اور بہترین بالنگ کی مدد سے ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے ذرا ہی دیر میں انگلینڈ جیسی مضبوط ٹیم کی کمر توڑ دی اور پوری ٹیم صرف ۱۰۱ رن بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ چندر نے ۳۸ رن دے کر

سارڈیسائی

مسلسل صفحہ

لکھرسٹ ایک گیند پر اسکوائر کٹ لگا رہا ہے پیچھے انجینئر کھڑا ہے۔

وکٹ لئے۔ راگھون نے ۴۴ رن دے کر دو وکٹ اور بیدی نے ایک رن دے کر ایک وکٹ لیا۔ ہندوستانی بالروں نے صرف ۴۵ اوور میں انگلینڈ کی پوری ٹیم کو آؤٹ کر دیا۔

کامرانی کا سفر:- اب ہندوستان کو میچ جیتنے کے لئے ۱۷۴ رنوں کی ضرورت تھی۔ انگلینڈ نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی اور ہندوستان کو اس سے کم اسکور پر آؤٹ کرنے کے لئے کمر باندھ لی تھی۔ انگلینڈ کی بہترین بالنگ اور فیلڈنگ دیکھتے ہوئے ہندوستان کا ۱۷۴ رن بنانا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ لیکن ہندوستانی بلے بازوں نے جس قسم کے کھیل کا مظاہرہ کیا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ابھی دو رن بھی نہیں بنے تھے کہ گواسکر سنو کی بال کا شکار ہو گیا۔ ۳۷ رن پر ہندوستان کے دو وکٹ نکل چکے تھے لیکن ایک بار پھر سارے کھیل کا بوجھ ہندوستانی کپتان واڈیکر اور سردیسائی نے اپنے کندھوں پر سنبھال لیا واڈیکر نے دونوں اننگز اور پوری سیریز میں بہترین کھیل کا مظاہرہ کر کے کپتانی کا حق پوری طرح سے نبھایا۔ بدقسمتی سے واڈیکر ۴۵ رن بنا کر رن آؤٹ ہو گیا۔ لیکن اس نے سردیسائی کا ساتھ وشواناتھ نے دیا۔ سردیسائی بہت خوبی اور احتیاط سے آہستہ آہستہ اسکور فتح کی طرف کھینچتا رہا۔ سردیسائی نے ۱۲۰ منٹ میں ۴۰ بہت ہی قیمتی رن بنائے۔ اسکور ۱۲۴ ہی تھا کہ سردیسائی آؤٹ ہو گیا۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد وشواناتھ بھی سولکر آؤٹ ہو گیا۔ جس وقت سولکر آؤٹ ہوا ہے اس وقت ہندوستان کو جیتنے کے لئے ۲۹ رنوں کی ضرورت تھی اور اس کے پانچ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ ویسے ۲۹ رن زیادہ نہیں ہیں لیکن اس وقت جس قسم کے حالات تھے ان میں یہ بھی پہاڑ معلوم ہو رہے تھے۔ ڈر تھا کہ کہیں انجینئر بھی آؤٹ ہو گیا تو باقی کھلاڑیوں کے لئے جیتنا مشکل ہو جائے گا۔ انگلینڈ نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی اور اس کی پوری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح ہندوستان ہار جائے لیکن انجینئر کے پُر اعتماد کھیل نے جلد ہی ظاہر کر دیا کہ اب ہندوستان کو جیتنے سے کوئی نہیں روک سکتا ابھی جیتنے کے لئے صرف تین رن ہی چاہئیں تھے کہ وشواناتھ آؤٹ ہو گیا۔ اب اس کی جگہ عابد علی نے لی اور خوش قسمتی سے جیت کا ہاتھ مارنے کا شرف عابد علی کو حاصل ہوا۔ عابد نے لکھرسٹ کی دوسری گیند پر ہی زوردار چوکا لگا کر ہندوستان کا اسکور ۱۷۴ پر پہنچا دیا — اس طرح ہندوستان ۱۹۷۱ء کی سیریز کا تیسرا اور آخری ٹیسٹ چار وکٹ اور ایک رن سے جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔

فتح کی وجہ ٹیم اسپرٹ تھی:- اس شاندار فتح میں اچھی بالنگ، عمدہ فیلڈنگ اور پُر اعتماد بیٹنگ کے علاوہ ملے جلے مضبوط ٹیم ورک کا بھی کافی دخل تھا۔ ہندوستان کی اسپن بالنگ تو ہمیشہ سے اچھی تھی ہی لیکن اب ہندوستان نے بیٹنگ اور فیلڈنگ کے میدان میں بھی بہت ترقی کی ہے۔ سولکر، عابد، راگھون، واڈیکر اور گواسکر کا شمار دنیا کے بہترین فیلڈروں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اس جیت میں کپتان واڈیکر کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ کھلاڑیوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بہت ہی دوستانہ ہے۔ جس کی وجہ سے کھلاڑیوں میں اعتماد اور ٹیم اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ پوری ٹیم ایک ہو کر جیتنے کے لئے کھیلتی ہے۔ یہ واڈیکر کی پیدا کی ہوئی ٹیم اسپرٹ ہے جس کی بدولت آج ہندوستان ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ جیسی طاقتور ٹیموں کو ہرانے میں کامیاب ہوا ہے۔

دنیا کے عظیم ترین کرکٹ کھلاڑی سر ڈان بریڈمین نے ہندوستان کی فتح پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ ہندوستانی کرکٹ ٹیم اس وقت دنیا کی سب سے عمدہ ٹیم ہے۔ دوسرے اخبارات اور کھلاڑیوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ انگلینڈ کے اخبارات نے بھی کھل کر ہندوستانی ٹیم کی تعریف کی۔ سب کا کہنا تھا کہ ہندوستان نے انگلینڈ کے خلاف یہ سیریز اپنی محنت اور عمدہ کھیل سے جیتی ہے۔ ہندوستانی ٹیم انگلش ٹیم سے ہر چیز میں بہتر تھی۔

۱۹۷۱ء کا سال ہندوستانی کرکٹ کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ یہ عظیم فتح پانے سے پہلے ہندوستان کے لئے ایک ... میں ... ہی ...

کھلاڑی [illegible] کھیل کا مظاہرہ کرتے رہیں گے
وڈاڈیکر اور گواسکر دونوں نے انگلینڈ کے اس دورے میں ایک ایک
ہزار رن پورے کرلئے ہیں۔ انجینئر، سولکر اور وشواناتھ نے
بھی عمدہ بلے بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انجینئر کو اگر اس
وقت کا سب سے عمدہ وکٹ کیپر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا
ویسے اس کی بیٹنگ بھی اب پہلے کے مقابلے میں بہت سدھر
گئی ہے۔ گواسکر کے کھیل کو رنوں سے نہیں تولا جاسکتا انگلینڈ
کے تمام اخبارات کی رائے ہے کہ گواسکر کا شمار بہت جلد
ہی دنیا کے گنے چنے بلے بازوں میں ہونے لگے گا۔ واڈیکر
اپنے فرائض کو جس طرح سے نبھایا ہے اس کا ذکر کرنا ہی
ہے۔ کپتانی کے بھاری بھرکم بوجھ کے باوجود واڈیکر نے
بیٹنگ یا فیلڈنگ پر کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔

تیز بالروں کی کمی:۔ حالانکہ ہمارے پاس چندر شیکھر
راگھون، بیدی اور پرسنا جیسے بہترین اسپنرز موجود ہیں لیکن
کبھی تیز بالروں کی کمی سختی سے محسوس کی جارہی ہے۔ یہ
طے ہے کہ ہندوستانی ٹیم اپنے کو پہلے نمبر پر اس وقت تک
قائم نہیں رکھ سکے گی جب تک کہ چند اچھے تیز بالر ٹیم میں
نہ لیں۔ ہوسکتا ہے مستقبل میں کچھ اچھے تیز بالر سامنے آئیں
اگر ایسا ہوا تو یہ ہندوستانی کرکٹ کے حق میں بہت بہتر
اور اس وقت دنیا کی کسی بھی ٹیم کے لئے ہندوستان کو شکست
دینا بہت مشکل ہوجائے گا۔

تاریخی تصویر۔ عابد علی (چہرہ کالا ہوگیا۔
چوکا مارنے کے بعد بھاگ رہا ہے۔ ا
چوکے نے ہندوستان کو فتح نصیب کرا

چین اور ہندوستان ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ
بڑھانے کی کوشش کررہے ہیں ــــــ ایک خبر

ہند روس معاہدہ ہندوستانی ڈپلومیسی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وقت اور موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر وزیر اعظم اندرا گاندھی کا یہ اقدام نہ صرف برمحل ہے بلکہ دوراندیشی، حکمتِ عملی، تدبر اور سیاسی بصیرت کا غماز ہے۔ داخلی سیاست میں وزیر اعظم کی قوتِ فیصلہ اور اچھی قیادت کا ملک قائل ہے ہی، خارجہ پالیسی میں بھی اس پیش قدمی سے ان کی کارکردگی کی زبردست صلاحیت کا پتا چلتا ہے۔ ہندوستانی خارجہ پالیسی میں لچکیلا پن وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔

اس بیس سالہ معاہدے پر ۹ اگست کو سوویت سوشلسٹ جمہوریہ کی طرف سے سوویت وزیر خارجہ اے اے گرومیکو اور جمہوریۂ ہند کی جانب سے ہندوستان کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے دستخط کئے جس کے ذریعے دونوں ملکوں کے درمیان امن، دوستی اور تعاون کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ گزشتہ پندرہ سولہ سال سے ہی ہندوستان اور روس کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔ لیکن اب انکا باہمی تعاون ایک نئی رفتار اختیار کرلے گا۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روس نے نازک وقتوں میں بارہا ہندوستان کی مدد کی ہے۔ مثال کے طور پر کشمیر کے معاملے میں اینگلو امریکی طبقہ بندی کی سامراجی سازشوں کو روس نے اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں ویٹو یا حق نامنظوری کا استعمال کرکے ناکام

(باقی صفحات ٹی وی پر)

بنادیا۔ ہندوستان کو اس کی حفاظت کیلئے وقتاً فوقتاً فوجی امداد ہی نہیں دی بلکہ مِگ لڑاکا طیارے بنانے کا کارخانہ قائم کرنے کے اسباب و ذرائع مہیا کیے۔ مزید برآں روس نے آب دوز کشتیوں سے بھی ہندوستان کی مدد کی۔ بھلائی اور بوکارو میں اسپات کے بھاری کارخانوں کی تعمیر میں تعاون کیا، نیز بھوپال اور ہری دوار میں بجلی سے متعلق بھاری کل پرزے بنانے کے کارخانوں کے قیام میں ہندوستان کا ہاتھ بٹایا۔ پھر معدنی تیل کی دریافت اور معدنی تیل صاف کرنے کے کارخانے کی تعمیر میں بھی اشتراکِ عمل سے کام لیا جس کے نتیجے میں ہندوستان معدنی تیل کی پیداوار کے معاملے میں خودکفیل ہونے کی سمت آگے بڑھ رہا ہے اور معدنی تیل کی پیداوار کے عالمی نقشے پر ایک مقام حاصل کرتا جارہا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں چین کے حملے کے وقت روس نے کچھ تاخیر ہی سے سہی لیکن چین کی پالیسی پر نکتہ چینی کی اور ہندوستان کو چینی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے شبے چلانے پرائسلحے فراہم کئے۔ آج بھی روسی بار بردار طیارے لداخ کی سرحد پر تعینات ہندوستان کی فوج کو رسد بہم پہونچاتے ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ نے ہر موقعے پر پاکستان کو بمبار اور لڑاکا طیارے دے کر ہندوستان کے خلاف جنگی کارروائی کے لئے برانگیختہ کیا۔ ہند روس تعلقات میں عارضی اور مختصر عرصے کے لئے تناؤ اس وقت پیدا ہوگیا تھا جب روس نے پاکستان کو اسلحہ فروخت کرنے کی

ٹھان لی تھی، لیکن جلد ہی یہ کھنچاؤ ختم بھی ہوگیا۔ [illegible] نے ایک سال سے زائد عرصہ ہوا پاکستان کو کسی طر[illegible] فوجی مدد دینے سے گریز کیا ہے۔

بنگلادیش کے معاملے میں روس کا رویہ تقریباً ہ[illegible] کی طرح ہمدردانہ ہے۔ روس نے پاکستان کے حکم[illegible] یہ بات واضح کردی ہے کہ وہ نسل کشی کے سدباب [illegible] کے مناسب سیاسی حل کی حمایت میں ہے۔ ہندوست[illegible] جانب سے بھی بارہا سیاسی حل کا مطالبہ کیا جاچکا [illegible] بنگلادیش کی تحریکِ آزادی کے پس منظر میں [illegible] معاہدہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی رو سے [illegible] اور بھارت جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کی [illegible] اسلام آباد، واشنگٹن اور پیکنگ کی گھبراہٹ اس [illegible] ثبوت ہے کہ ان کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور [illegible] اور ہندوستان کے خلاف اب وہ اپنے جارحانہ [illegible] کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچا سکیں گے کیونکہ پاک[illegible] اور امریکا کی مشترکہ سازشوں کا مقابلہ کرنے کے [illegible] ہندوستان اکیلا نہیں رہ جائے گا۔ اگر ہندوستان [illegible] پاکستان حملہ کرے گا تو ایسی حالت میں روس [illegible] ہندوستان کی مدد کرے گا، پھر اگر امریکا یا چین [illegible] پر حملہ کربیٹھے تو روس اور ہندوستان دونوں [illegible] کریں گے۔ بھارت پر کسی طاقت کے حملہ کرنے [illegible] ہوں گے کہ اس کو ہندوستان اور روس دونوں [illegible]

[illegible] ہندوستان [illegible] معاہدے کے ذریعے [illegible] پر حملہ کرنے کا فیصلہ [illegible] گیا ہے۔ یہ معاہدہ فوجی معاہدوں جیسے شمالی اوقیانوس معاہداتی تنظیم "نیٹو"، جنوب مشرقی ایشیا معاہداتی تنظیم "سیٹو" اور مرکزی معاہداتی تنظیم "سینٹو" یا روس کی رہنمائی میں کئے ہوئے معاہدے وارسا سے مختلف ہے کیونکہ اس میں یہ بات نہیں ہے کہ بھارت پر حملہ روس پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ لیکن دونوں ملکوں کے درمیان امن و سلامتی کے اس تاریخی معاہدے کی دفعہ ۹ میں کہا گیا ہے:-

"معاہدے میں شریک ہر ایک عظیم فریق یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ کسی تیسرے فریق کو جو عظیم فریقین میں سے کسی ایک سے مسلح تصادم میں مصروف ہو کوئی بھی مدد دینے سے احتراز کرے گا۔ ایسی صورت میں جبکہ دونوں میں سے ایک فریق پر حملہ ہو یا حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو معاہدے میں شریک عظیم فریقین فوراً آپس میں صلاح و مشورہ کریں گے تاکہ ایسے خطرے کو دور کیا جائے اور اپنے ملکوں کے امن اور سلامتی کو یقینی بنانے کی غرض سے مؤثر اقدامات عمل میں لائے جائیں۔"

یہ معاہدہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عالمی سیاست میں ایک نیا موڑ لائے گا۔ ایسے معاہدے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ امریکا اور چین کی شہ پر پاکستان کے فوجی آمر جنرل یحییٰ خاں ہندوستان کو بار بار جنگ کی دھمکی دے رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان تنہا رہ جائے گا اور اس لئے خوفزدہ ہو جائے گا۔ اسی خیال سے متاثر ہو کر امریکا نے بھی یہ دھمکی دی تھی کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی اور چین میدان جنگ میں پاکستان کی حمایت میں اترا تو امریکا ہندوستان کی مدد کے لئے نہیں آئے گا۔ اس معاہدے سے صورت حال بدل چکی ہے اور پاکستان کے علاوہ امریکا اور چین بھی یہ سمجھ چکے ہیں کہ اگر بھارت پر حملہ ہوا تو روس بھارت کی مدد کو ضرور آئے گا۔

روس اور بھارت کے درمیان یہ معاہدہ دراصل بھارت [illegible] کے خلاف ایک طرح کی ضمانت [illegible] ہو گیا ہے

ان دونوں ملکوں پر حملہ کرنے والے کو دونوں میں سے کوئی ملک بھی اسلحہ بہم نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان اور چین جب ہندوستان پر حملہ کریں گے تو روس انہیں کسی طرح کے ہتھیار برآمد نہیں کرے گا۔

یہ معاہدہ ہندوستان ہی کے حق میں مفید نہیں بلکہ اس سے روس کو بھی فائدہ پہونچے گا۔ روس کچھ عرصے سے اپنی سرحد پر چینی جارحیت کے خطرے سے متردد ہے۔ امریکی صدر مسٹر نکسن کے مجوزہ دورۂ چین سے روس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ اس معاہدے کی رو سے روس پر چینی حملے کے دوران بھارت روس کا ساتھ دے گا۔ ہندوستان جنوب کی سمت میں چین کا مقابلہ کر سکتا ہے اس لئے چین جنوب کی سمت سے اپنی ساری فوج ہٹا کر روس کے خلاف صف آرائی نہیں کر سکے گا۔

اس معاہدے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اب ہندوستان نے غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور سوویت روس کے فوجی بلاک میں داخل ہو گیا ہے۔ معاہدے کے ذریعے کسی بھی طرح ہندوستان نے خود کو سوویت روس کے فوجی بلاک سے منسلک نہیں کیا ہے۔ اس باہمی معاہدے کے ذریعے ہندوستان کی آزادی، اقتدار اعلیٰ اور علاقائی سالمیت پر کسی قسم کی آنچ نہیں آئی۔

یہ معاہدہ کسی تیسرے ملک کے خلاف نہیں ہے [illegible] میں کوئی ایسی دفعہ یا شرط نہیں ہے جو کسی بھی [illegible] ملک کے خلاف ہو۔ دراصل یہ معاہدہ جنگ کے امکانات کو دور کرتا ہے اور ہندوستان کی امن کی پالیسی کو کمزور اور ناکام ہونے سے بچاتا ہی نہیں بلکہ اس کے دائرۂ [illegible] کرتا ہے اور ایشیا اور ساری دنیا میں امن کی قوتوں کو مضبوط بنانے میں معاون ہے۔ صحیح معنوں میں یہ معاہدہ امن ہے نہ کہ دفاعی معاہدہ۔ معاہدے کی دفعہ ۴ میں روس نے ہندوستان کی عدم وابستگی کی پالیسی یعنی فوجی معاہدوں کے معاملے میں اس کے غیر جانبدارانہ رویے کا احترام کرتے ہوئے اسے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ غرضیکہ اس معاہدے اور ہندوستان کی عدم وابستگی کی پالیسی کے درمیان تضاد نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاہدہ ہندوستانی ڈپلومیسی کا تازہ ترین شاہکار ہے۔ ہندوستان کے چوبیس سالہ آزاد سیاسی وجود میں روس کے ساتھ ہمارا یہ معاہدہ سیاست خارجہ سے متعلق سب سے اہم قومی فیصلے کی حیثیت رکھتا ہے۔

[illegible] آپ کی مدد کر سکتا ہوں

پھر کون آئے گا جب فاحشائیں تائب ہو جائیں گی

واقعات کے نمائندے کے قلم سے

مترجم ۔ تسلیمات

واقعات کی گذشتہ سے پیوستہ اشاعت میں امریکا میں فحاشی کے بارے میں جو مضمون شائع ہوا ہے وہ یہاں کی اصل صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے کچھ اور تفصیلات مہیا کی ہیں جو مجھے یقین ہے کہ قارئین "واقعات" کے لئے باعث دلچسپی ہوں گی۔

امریکا میں فاحشاؤں کی صحیح صحیح تعداد بتانا تو ذرا [illegible]کل ہے لیکن اندازہ ہے کہ انکی تعداد پانچ لاکھ سے کم نہ [illegible]گی مختلف رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آبادی کے لحاظ [illegible]ان کا تناسب یکساں چلا آرہا ہے

امریکا میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو ہر [illegible]ملے کی ریسرچ کرتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر الفریڈ کنسے نے جو اب [illegible]س دنیا میں موجود نہیں ہیں اب سے ۲۳ برس پہلے فحاشی کے [illegible]پہلو کے بارے میں لکھا تھا۔

"ہم نے جن لوگوں سے انٹرویو لئے ان میں سے ۶۹ فیصدی [illegible]یسے تھے جو کم از کم ایک بار کسی طوائف کے کمرے پر جا چکے تھے [illegible]ن میں سے بیس فیصدی تک وہ تھے جو سال میں کئی کئی بار [illegible] تھے۔ ریسرچ کرنے والے اب کہتے ہیں جو سماجی امور میں [illegible] آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے [illegible] کہ جنسی کاروبار کے واقعات کی سالانہ تعداد [illegible] ہے۔ جن میں وہ اب ۲۵ کروڑ ڈالر کا [illegible]

[illegible] کہ امریکا کی سب سے بڑی ریاستوں میں بدکاری [illegible]

قانوناً جرم ہے لیکن ایسی کوئی ریاست نہیں جو دعوی کر سکے کہ وہاں اس قانون کی پابندی کی جاتی ہے۔ سان فرانسسکو میں بعض سڑکیں ایسی ملیں گی جہاں بیسوائیں چلتے پھرتے مردوں کو روک کر اپنا تعارف کرانے لگتی ہیں۔ شاید ایسے ہی واقعات کے پیش نظر گذشتہ ماہ کیلی فورنیا میں بدکاری کو قانونی طور پر جائز قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ ریاستی اسمبلی کے بعض ممبروں کا کہنا تھا کہ جب قانون کی خلاف ورزی حد سے زیادہ بڑھ جائے تو مناسب یہی ہے کہ قانون کو بدل دیا جائے۔ علاوہ ازیں انھوں نے یہ بھی دلیل دی کہ [illegible] کروں سے آکے بے دخلی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ گلیوں اور محلوں میں پھیل گئی ہیں اور سیفلس کے واقعات ۲۲ سو سالانہ سے بڑھ کر چھ ہزار تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن یہ تحریک ریاستی اسمبلی میں مسترد کر دی گئی کیونکہ ممبروں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ اس سے بہت سی دوسری پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی [illegible]

نے کہا کہ یہ مردوں کی ایک تفریح ہو سکتی ہے لیکن اس سے جو اخلاق و کردار بنے گا اس کی ہمیشہ مذمت کی جائے گی۔ بدکاری عورتوں کو ذلیل و رسوا کر دیتی ہے اور خاص طور سے غریب عورتیں بالکل ہی قعر مذلت میں گر جاتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جس کا ذکر جارج برناڈ شا نے اپنے ناٹک "مسز وارنس پروفیشن" میں کیا ہے کہ ہمارا سماج عورتوں سے سخت بے انصافی کرتا تھا ان سے بے انتہا کام لیا جاتا تھا اور بہت کم اجرت دی جاتی تھی نتیجے میں وہ اپنے جسم اور روح کو زندہ رکھنے کے لئے بدکاری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔"

لیکن آج ایسی بات نہیں ہے پھر بھی یہ بدکاری ہے [illegible] ایسا کیوں ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نشیلی اشیاء کی لت اپنے پیچھے لگا رکھی ہے۔ اس لت کو پورا کرنے کے لئے انھیں کثیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے [illegible]

[illegible]
لڑکی کی غیر اخلاقی
حرکتیں تھی نیپلز کی
فاحشائیں ۱۸ ویں
صدی کی ایک
آرٹسٹ کی نظر میں۔

کچھ فاحشائیں (چہرے
چھپائے ہوئے ہیں)
گرفتار کر کے لیجائی
جا رہی ہیں۔

کثیر رقم انھیں صرف بدکاری کے ذریعے ہی مل سکتی ہے۔ ایک سابق مس ڈنمارک نے صرف ایک رات کی تفریح کے لئے پندرہ سو ڈالر فیس وصول کی تھی۔

بوسٹن کے ساؤتھ اینڈ بازار میں ایک نیگرو فاحشہ تک پندرہ ڈالر فیس وصول کرتی ہے۔ تاہم مالی ضروریات کے علاوہ بعض دوسری نفسیاتی وجوہ بھی ہیں جن کی وجہ سے عورتیں اپنے آپ کو فروخت کرتی ہیں۔ جنسی سیاست میں کیٹ ملیٹ لکھتے ہیں:۔

" جب مالی ضروریات سے فحاشی کا تعلق نہ ہو تو اُسے ایک نفسیاتی لت قرار دیا جا سکتا ہے جس کی بنیاد خود اپنے آپ سے نفرت ہے "

جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لئے حکومت کی طرف سے سخت اقدامات کئے جا رہے ہیں جیسا کہ اس بات سے ظاہر ہے کہ سال میں ایک لاکھ کے قریب فاحشاؤں کو گرفتار کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بیماری اسقدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس پر قابو پانا مشکل نظر آتا ہے۔ جدید تہذیب نے اس کے پھیلاؤ میں بہت کچھ مدد دی ہے اور خاص طور سے ان رسائل اور اخبارات نے جو برہنہ اور نیم برہنہ فوٹو شائع کر رہے ہیں اور جو نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے فوٹو البم کی زینت بن رہے ہیں۔

پھر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اس برائی سے سخت پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ بدکاری کے سب اڈے ختم ہو جائیں۔ مجھے متعدد ایسے مذہب پرست لوگوں سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا جو بدکاری اور بڑھتی ہوئی فحاشی پر بے چین تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم کچھ سننے کے لئے تیار نہیں۔ بائیبل میں صاف طور پر بدکاری کی مذمت کی گئی ہے اور ہر حال میں بدکاری کو ختم ہو جانا چاہیئے۔

متعدد اصلاحی تنظیمیں بھی ہیں جو فحاشی کو ختم کرنا چاہتی ہیں لیکن امریکا جیسے ماڈرن ملک میں اگر فحاشی ختم ہو گئی تو یوں سمجھیے کہ وہ اس صدی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا مگر کچھ لوگ ہیں جو مایوس نہیں ہیں۔ انھیں امید ہے کہ جس طرح ۱۸ ویں صدی میں نیپلز میں فاحشاؤں نے جنسی بے راہ روی سے توبہ کی تھی اسی طرح آج کی فاحشائیں بھی تائب ہو جائیں گی اور اس طرح سوسائٹی کی ایک بہت بڑی برائی دور ہو سکے گی۔

غیر ملکی مزاح

کنکریٹ کی دیوار برلن کے بھوت کے باوجود ابھی نہیں ٹوٹی

محمد سلیمان صابر

چند برس پہلے جب میں نے ایک پریس پارٹی کے ساتھ برلن کی دیوار کا چکر لگایا تو جرمن قوم کی بے بسی پر رونا آگیا۔ ملک تقسیم ہوتے تو سنا تھا، خود ہمارا ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا لیکن ایک شہر کے دو حصے جرمنی میں ہی آکر دیکھے یا پھر بیت المقدس کے دو حصے تھے (جس کے دوسرے حصے پر بھی اب اسرائیل نے قبضہ کر لیا ہے) کنکریٹ کی چھ فیٹ سے بھی زیادہ اونچی اس دیوار نے مکانوں تک کو تقسیم کر دیا ہے۔ ایک مکان کا اگلا حصہ اگر مشرقی شہر میں واقع ہے تو اس کے عقبی حصے کا تعلق مغربی شہر سے ہے۔ لوگ دیوار کے گرد کھڑے ہو کر اچک اچک کر دوسری طرف دیکھتے ہیں اور دل مسوس کر رہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یہ کیسی دنیا ہے جو دو دلوں کو ملنے نہیں دیتی"۔

۲۸ میل لمبی یہ دیوار جسے مشرقی جرمنی کے فوجیوں نے اب سے دس برس پہلے چند گھنٹوں کے اندر کھڑا کر دیا تھا، ایک بد ہیئت اور بدنما دیوار ہے اگرچہ تصاویر میں اسکی بدہیئتی اور بدنمائی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس دیوار نے سیکڑوں ہزاروں خاندانوں کو تقسیم کر دیا ہے۔ اپنے ہی وطن میں اور اپنے ہی شہر میں لوگ ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ چند منٹوں کا فاصلہ وہ برسوں میں طے نہیں کر سکتے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے روتے ہیں تڑپتے ہیں۔ حقیقت میں یہ انکی تڑپ ہی تھی جس نے ان کو دیوار پھاندنے یا اس کے نیچے سے سرنگ لگا کر مغربی برلن میں پہنچنے کے لئے مجبور کر دیا۔ دس برس کے اس عرصے میں ۲۸ ہزار کے قریب لوگ دیوار کے پار پہنچنے میں کامیاب ہوگئے لیکن ۱۴۳ اپنی جان گنوا بیٹھے۔ وہ یا تو پہرے داروں کی بندوقوں کا نشانہ بن گئے یا کسی مکان کی چھت سے مغربی حصے کی طرف کودتے وقت جان بحق ہوگئے۔ انھوں نے ایک مجبور و بے کس زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ جن جگہوں پر انھوں نے دم توڑا وہاں لوگ آج بھی پھول چڑھاتے ہیں اور دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر مرنے والے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

دیوار کے ساتھ ان لوگوں کی قبریں ہیں جنھوں نے دیوار پار کرنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوا دیں۔

میں نے جب جرمنوں کو اپنے مرنے والے شہریوں کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے دیکھا تو ہٹلر کا وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ طوفان کی طرح اٹھا تھا اور طاقت کے نشے نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ اس نے ہر کمزور قوم کو پامال کر ڈالا فرانس تک نے اس کی غلامی قبول کر لی۔ ہٹلر فخر سے اعلان کیا کرتا تھا "میں آریہ ہوں۔ میری قوم سب سے افضل و برتر ہے۔ صرف مجھ ہی کو حکومت کرنے کا حق ہے اور کسی کو نہیں"۔ اس کی طوفان خیز پیش قدمی اور کامیابی سے شبہ ہونے لگا کہ وہ واقعی برتر قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ساری دنیا پر چھا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ غرور اور تکبر اسے لے ڈوبا اور ایک ایسا وقت آیا کہ وہ برلن کے ایک تہ خانے میں اپنی محبوبہ ایوا براؤن کے ساتھ خودکشی کر کے اپنی قوم کو ان ہی کا غلام بنا گیا جو اس کی نظر میں اس کی قوم کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں۔

میری خواہش تھی کہ میں ہٹلر کا وہ تہ خانہ دیکھوں جہاں اس نے زہر کی شیشی اپنے منہ میں انڈیلی تھی لیکن جرمن گائڈ نے اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر دیوار کے پار کے مشرقی حصے میں ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ "یہ ہٹلر کی آرام گاہ ہے"۔ اس پر گھاس اگی تھی ——— اور جب ہم مشرقی برلن میں پہنچے تو ٹیلے کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان [illegible] کی پوری عمارت زمین بوس تھی ہٹلر کا [illegible]

[illegible] دہلی

رنی جرمنی ... [illegible]

دیگینڈ ہاؤس ... [illegible] جیسے سوالات کا نشانہ بنا ہو
انہ جنگ کی بمباری سے اسی طرح ٹوٹے پھوٹے پڑے
ہے جیسے کہ ان پر آج ہی بمباری ہوئی ہو۔ روسیوں نے
میں شاید اس لئے دوبارہ تعمیر نہ ہونے دیا ہوگا تاکہ
نئ باشندوں کو معلوم ہو سکے کہ جنگ کیا چیز ہے۔ یہ بات
۱۹۶۰ء کی ہے۔ اب نہیں معلوم کہ مسمار شدہ ان عمارتوں
ی جگہ دوسری عمارتیں وجود میں آئیں یا نہیں۔

جرمن قوم جو جنگ جنگ کا نعرہ لگاتی تھی اس کے لئے
نگ وہ تباہی لائی کہ تاریخ میں ایسی جنگ کی تباہی کی
ثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اسی تباہی و بربادی اور بے کسی و
مجبوری کا ایک حصہ یہ تھا کہ صرف جرمنی ہی دو حصوں میں
قسیم نہ ہوا بلکہ اس کی راجدھانی برلن شہر بھی دو حصوں
یں بانٹ دیا گیا جہاں ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے
ساری دنیا یا کم سے کم پورے یورپ کو اپنے تسلط میں لانے
کے خواب دیکھے تھے۔ ۳۰ لاکھ آبادی والے اس شہر میں
۲۰ لاکھ مغرب میں اور دس لاکھ مشرق میں "نظر بند" کر دیے
گئے۔ یہ نظر بندی آج تک چل رہی ہے لیکن اسے جرمنوں
کی خوش قسمتی کہیے یا بین الاقوامی حالات کا اقتضاء کہ چار
وہ ممالک جو اپنے آپ کو بڑے کہتے ہیں۔ امریکا، روس
فرانس اور برطانیہ۔ وہ سترہ اٹھارہ ماہ کی تگ و دو
اور نازک بات چیت کے بعد ایک سمجھوتے پر متفق ہو گئے ہیں
جس میں انھوں نے مغربی برلن کے باشندوں کے مشرقی برلن
اور مشرقی جرمنی کے ۱۱۰ میل لمبے راستے سے گزر کر مغربی
جرمنی آنے جانے اور ایک دوسرے حصے میں [illegible] کے
گزرنے کے حق کو تسلیم کر لیا ہے اب تک روس کے
اس موقف کی بنا پر سمجھوتہ نہ ہو سکا تھا کہ یہ معاملہ صرف
جرمنیوں سے تعلق رکھتا ہے لیکن گزشتہ موسم بہار میں
اس نے اپنا بھی رویہ تبدیل کیا اور افہام و تفہیم کے نتیجے
کے ساتھ بالآخر چاروں مذکورہ ملکوں کے سفراء نے
[illegible] ۳۳ گھنٹے کی لگاتار میٹنگوں کے بعد ایک
سمجھوتے پر دستخط کر دیے۔ متعلقہ حکومتیں اس سمجھوتے
کی تصدیق کریں گی اور اس کے بعد [illegible] جرمن حکومتیں
[illegible] کی دونوں میں تفصیلات طے کریں گی۔
[illegible]

کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہاں روس اپنا قونصل خانہ قائم
کر سکے گا جس میں عملے کے لوگ زیادہ سے زیادہ ۲۰ ہوں گے
لیکن برلن سے مغربی جرمنی کی حکومت کے تعلق کو تسلیم
کیا گیا ہے اور یہ بات مان لی گئی ہے کہ وہاں اس کے
دفاتر برقرار رہیں گے جن میں کام کرنے والوں کی تعداد
۲۳ ہزار کے قریب ہے۔ یہی نہیں بلکہ مغربی جرمنی کی
پارلیمنٹری کمیٹیوں اور سیاسی پارٹیوں کو شہر کے مغربی
حصے میں جمع ہونے اور اپنے جلسے کرنے کا حق حاصل ہوگا
نیز بیرون ملک مغربی برلن کے باشندوں کی نمائندگی
مغربی جرمنی ہی کی حکومت کرے گی اور مغربی برلن کے
باشندے مغربی جرمنی کی حکومت کی طرف سے جاری کردہ
پاسپورٹوں پر سفر کریں گے۔

مغربی جرمنی یا مغربی برلن کے باشندوں کو وہ سب
کچھ نہیں ملا جو وہ چاہتے تھے۔ یعنی دیوار نہیں ٹوٹی۔ لیکن
بہرحال اس سمجھوتے کا یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ اس وقت
تک جو بحرانی کیفیت یا کشیدگی چل رہی تھی اس کے ختم
ہونے میں مدد ملے گی، ایک دوسرے علاقے کے اندر
آ جا سکیں گے اور اگر متحدہ جرمنی نہیں تو دو جرمنی الگ الگ

دیوار کے ساتھ ساتھ
ایک بوڑھی عورت
اس وقت کی یادوں
میں گم ہے جب دنیا
میں یہ دیوار نہیں
تھی۔

کی خاطر دوستی کا ہاتھ بڑھایا، روس کا رویہ بدلا اور مفاہمت
کی ایسی فضا پیدا کی کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے
قریب آ گئے لیکن مغربی جرمنی کا ایک جنگ باز طبقہ ان
سمجھوتے کے اب بھی خلاف ہے شاید ہٹلر اور مسولینی کے
جانشین ابھی موجود ہیں جو صرف مغربی جرمنی میں ہی نہیں
بلکہ ہر جگہ پھیل گئے ہیں اور وقت کی حقیقتوں کو نظر انداز
کر کے اپنی اپنی قوم اور اپنے اپنے ملک کو تباہی کی طرف
لے جا رہے ہیں۔ تاہم ولی برانٹ کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ
انھوں نے اپنے عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کرایا کہ
"جرمن قوم ایک شکست خوردہ قوم ہے" اور ایک شکست
خوردہ قوم مفاہمت ہی کے ذریعے مراعات حاصل کر سکتی
ہے، لڑ کر اسے کچھ فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔

مغربی جرمنی کو اس سمجھوتے سے بڑا فائدہ پہونچے گا
اور بقول لارڈ میئر مغربی جرمنی "یہ معاہدہ برلن کے
باشندوں کے حقوق کی پوری طرح حفاظت کرتا ہے"
اور وہائٹ ہاؤس (امریکا) کے پریس سکریٹری رانلڈ زیگلر
کے قول کے مطابق:۔

"جب آخری سمجھوتے پر دستخط ہو جائیں گے تو دنیا کی

بین الاقوامی برادری میں آہستہ آہستہ اپنا صحیح مقام حاصل
کر سکیں گے۔

اس سمجھوتے کی اصل کنجی اگرچہ روس نے دیا جس نے
یورپ میں کشیدگی کو کم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا
لیکن مغربی جرمنی کے چانسلر مسٹر ولی برانٹ کو بھی اس
سمجھوتے کا کچھ کم کریڈٹ حاصل نہیں ہے جنہوں نے روس

کشیدگی دور کرنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی"

"ہٹلر کو اس کے غرور و تکبر نے مارا
طاقت کے نشے نے اسے پاگل بنا دیا تھا"
جرمن قوم جنگ کا نعرہ لگاتی تھی۔
لیکن جنگ اس کے لئے جو تباہی لائی
اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔"

ترقی پذیر ملکوں میں بے روزگاری کا مسئلہ

ایوب ظفر

تقریباً تمام ترقی پذیر ملکوں میں بے روزگاری کا مسئلہ روز بروز سنگین اور پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ تمام حکومتیں پریشان ہیں کہ ہر سال اسکولوں اور کالجوں سے فارغ ہو کر نکلنے والی خوبصورت نسل کو کہاں کہاں کام پر لگائیں۔ بے کاری کے نتیجے میں بغاوت پر آمادہ نوجوان قانون کے لئے ایک چیلنج بنتے جا رہے ہیں۔ ٹریڈ یونینیں الگ پریشان ہیں کہ اس مسئلے کو کس طرح حل کریں۔ صنعت کار نئی نئی منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں تاکہ پیداوار کو بڑھائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کام پر لگایا جا سکے۔

ماہرین اقتصادیات نے کم ترقی یافتہ ملکوں کے بارے میں سوچا کہ جیسے جیسے ان کی صنعتیں بڑھیں گی ملازمت کے مواقع بھی بڑھتے جائیں گے لیکن تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ برخلاف اس کے صنعتوں کا فروغ اور ترقیاتی اسکیموں کے باوجود بے روزگاری بھی روز افزوں ہے۔

اصولاً اقتصادی ترقی سے سب سے پہلے غریبوں کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن عملاً بہت بڑی تعداد اس فائدے سے محروم رہتی ہے۔ کمیشن آن انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ کے صدر مسٹر پیرسن نے اپنی رپورٹ میں یہ وضاحت کی ہے کہ غیر ملکی امداد سے جو ترقیاتی پروگرام شروع کئے گئے ہیں ان میں سماجی بہبودی کے تصور کو جگہ نہیں مل سکی اور یہ سمجھنے میں غلطی ہوئی کہ اقتصادی فروغ کے ساتھ ملازمت کے مواقع خود بخود فراہم ہوں گے۔ ورلڈ بینک کے صدر مسٹر رابرٹ مکنامارا نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اقتصادی ترقی بے روزگاری کا مکمل حل نہیں ہے۔

[illegible] ضروری ہے کہ اس مسئلے کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ اقتصادی پروگراموں کے ساتھ سماجی ضروریات کو شامل کئے بغیر سماجی اور اقتصادی استحکام پیدا نہیں ہوگا۔ بے روزگاری کے ضمن میں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم بے روزگار کسے کہہ سکتے ہیں۔ مغربی اصطلاح میں وہ شخص جو لیبر فورس کا ممبر ہو یعنی کام کرنے کے لائق ہو۔ مرد، عورت، بچے سبھی کام کرنے کے لائق ہوتے ہیں۔ لیکن دیہی زندگی اور شہری زندگی میں ایک بہت بڑا امتیاز یہ ہے کہ عورتیں باہر کے کاموں کے علاوہ گھروں کے کام کاج دیکھتی ہیں۔ بچوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ والدین کے زیر کفالت ہوتے ہیں۔ اب نوجوانوں کا طبقہ رہ جاتا ہے۔ اس طبقے میں بڑی تعداد ایسی ہے جو تعلیمی دور سے فارغ ہو چکی ہے یا تعلیم حاصل نہیں کرتی۔ تعلیم یافتہ طبقے میں اکثریت ایسی ہے جو اپنی تعلیمی قابلیت اور معیار کے مطابق ہی معیاری کاموں کی خواہاں ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو حالات سے مجبور ہو کر کچھ بھی نہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی بے روزگاری کے زمرے میں رکھنا ہوگا۔ ایک مکمل صنعتی ملک میں حکومتیں بے روزگاری کا الاؤنس دیتی ہیں، لیکن غیر ترقی یافتہ یا نیم ترقی پذیر ملکوں میں اس قسم کے افراد کی زوج جو اپنے طور پر گزر بسر کے لئے کوئی بھی کام کرنے لگتی ہے مسئلہ اکا ہے۔ اقتصادی ترقی کا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔

دیہی علاقوں میں بے روزگاری کا سبب ایک تو یہ ہے کہ زمین کو کاشت کے لئے پورے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ روائتی طور پر سال میں ایک دو بار فصل کاٹ کر لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو قطعی بے زمین ہیں۔ شہری علاقوں میں بھاگ [illegible]

[illegible]

ہے ملازمت کی تلاش میں شہر کی طرف نکلتے ہیں اور وسائل کی کمی کے سبب بے کار ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اسکولوں کی تعلیم مکمل کر کے یا چھوڑ کر بیٹھے ہیں۔ یونیورسٹی اور کالجوں سے فارغ التحصیل کو تیسرے درجے میں رکھا ہے۔ ان کے علاوہ ایک بہت بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو خود کار (Self Employed) ہیں یا نیم بیکار ہیں۔ ان میں وہ لوگ ہیں جو باکری کرتے ہیں۔ بار برداری کا کام کرتے ہیں۔ ٹیکسی اسٹینڈ کی دلالی کرتے ہیں یا جوتے پر پالش کرتے ہیں۔ خوانچہ فروشی میں یا چھوٹی موٹی دستکاری میں مصروف ہیں۔

ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایک فلاحی اسٹیٹ کی حکومت مسائل کو حل کرنے کا پروگرام طے کر سکتی ہے۔ دیہاتوں میں زمین کی ملکیت اور نظام میں تبدیلی لا کر یہ زمین بے زمین لوگوں میں تقسیم کی جائے۔ بے کار اور غیر مزروعہ زمین کو زیر کاشت لایا جائے۔ کو آپریٹو طریقے سے کھیتی اور دستکاری کے کاموں کو فروغ دیا جائے۔ دیہی علاقوں میں ترقیاتی اسکیمیں چلائی جائیں۔ سڑکیں، نہریں، کنویں وغیرہ تعمیر کرائے جائیں۔ زراعت کے جدید طریقے اپنا کر زیادہ سے زیادہ فصل اگانے کی مہم چلائی جائے۔

شہری علاقوں میں بے روزگاری کے مسئلے کو حل کرنے سے پہلے شہر و دیہات کے مابین روابط کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں معیار زندگی پست ہے اور جہاں کثرت آبادی کے تحت زمین کے ٹکڑے روز بروز چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتے جا رہے ہیں لوگ بہت کم ہی دیہات میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اگر شہر میں ملازمت کا چانس ہوتا ہے تو لوگ دیہات کو خیر باد کہہ کر نکل پڑتے ہیں۔ اس لئے شہری بے روزگاری کے مسئلے سے نپٹنے سے پہلے حکومت کو چاہئے کہ وہ دیہاتوں میں لوگوں کے معیار زندگی کو اونچا کرنے کی کوشش کرے۔ دیہاتوں میں چھوٹی صنعتوں کے کام کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ گھریلو دستکاری اور چھوٹے پیمانے کی انڈسٹری کھولنے کا مقصد لوگوں کو روزی کی خاطر شہر کی طرف بھاگنے سے روکنا ہے۔ پیداواری کا دباؤ کم ہو [illegible]

پلاننگ کمیشن [illegible]

قدم اٹھائے [illegible]

آپ سے ملئے!

...ہندوستان کی شہ سے ہوئی۔ نادر شاہ
نے دلی میں قتلِ عام کیا تھا اور یحییٰ خان نے بنگال میں
...کا قتلِ عام اپنی جگہ بہت بڑا قتلِ عام تھا لیکن بنگلہ دیش
کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ جو باپ نہ کر سکا
اسے بیٹے نے پورا کر دیا۔ تاریخ میں ان کا نام "روشن"
رہے گا۔ اس قتلِ عام پر یحییٰ خان کا سر اونچا ہو گیا
ہے۔ اپنے فوجیوں پر انھیں کتنا فخر ہے۔ فرماتے ہیں:۔
"جب میرے سپاہی مارتے ہیں تو بڑی "صفائی" سے مارتے
ہیں"۔ اس صفائی کا مظاہرہ صرف نہتے لوگوں پر ہوتا ہے
جن کے ساتھ "جنگ" میں بقول نکسن "پھول نہیں پھینکے جاتے"
بے شک پھول نہیں گولے پھینکے جاتے ہیں، مادرساں گولوں
نے نہ جانے کتنے بے گناہوں کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔
یحییٰ خان کے حوصلے بہت کچھ بڑھے معلوم ہوتے
ہیں اپنے بڑھے ہوئے ان "حوصلوں" کی بنا پر ہی شاید
انھوں نے وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی پر "لفظی گولے"
پھینکے ہیں اور ہر قسم کے اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر
اپنی فوجی بولی میں مسز گاندھی پر خوب لے دے کی ہے
اور فرمایا ہے: "ان کے اندر ان کے والد جیسا تدبر نہیں
ہے"۔ اس حد تک ہی کہتے تو غنیمت تھا اس سے آگے
بڑھ کر کہتے ہیں: "یہ مسز گاندھی اگر ملیں تو میں ان

سے کہوں گا "شٹ اپ" آپ ...
ٹانگ نہ اڑائیں اور ہمیں اکیلا چھوڑ دیں...
ساری دنیا کو للکار رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں...
"اگر ہندوستان نے پاکستان کا کوئی...
مکمل جنگ شروع کر دوں گا"۔
مگر انھوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہند...
کا کوئی حصہ لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہند...
کا کوئی حصہ لینے کی ضرورت نہیں ہے...
نہیں لیتا۔ پاکستان تو خود ہی ختم ہوتا نظر آ...
بنگلا دیش میں تو وہ یقیناً ختم ہی ہو چکے...
کے زور سے آخر کب تک حکومت کا کاروبار...
بنگالیوں کے دلوں پر تو حکومت حقیقت میں...
(شیخ مجیب الرحمٰن) کی ہے جس کے بار...
تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر کہتے ہیں:
"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں"...
نے اتنا تسلیم کر لیا کہ وہ زندہ و سلامت...
یقیناً زندہ و سلامت رہیں گے خواہ پاک...
یا نہ رہے۔
یحییٰ خان اگر پاکستان کو زندہ رکھنا...
تو شیخ سے بات کریں۔ اس کے علاوہ کوئی...
نہیں۔ شیخ بنگالیوں کے دلوں کا بادشاہ...

یحییٰ خان نے کہا ہے کہ
رحمٰن کے مقدمے سے میں
خود ہی نبٹوں گا۔ اس میں
کسی غیر ملکی طاقت کو
ٹانگ اڑانے کی ضرورت
نہیں ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے مقدمے کا قانونی جائزہ

از :- جسٹس ایس راج گوپالن اینگر

ترجمہ :- سلمان ہاشمی

حکومت پاکستان کے شیخ مجیب الرحمٰن پر مقدمہ دائر کرنے کے سلسلے میں [illegible] جو خیالات کا اظہار ہوا ہے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ اس مقدمے کے ذریعے انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون کا استعمال کیا گیا ہے جبکہ دوسرا خیال اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ یہ مسئلہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے جس کا بین الاقوامی قانون سے کوئی تعلق نہیں۔

زیر نظر مضمون میں ان خیالات پر اظہار رائے نہ کرتے ہوئے میں ان ہی پہلوؤں پر اپنے تاثرات پیش کروں گا جو قانونی طور پر بحث کا موضوع ہیں۔ اس مسئلے کو پاکستان کا اندرونی معاملہ قرار دینے کے باوجود جو نکات سامنے آئے ہیں ان پر غور کرنا ہر قانون داں اور دانشور کے لئے بہت ضروری ہے۔

آج آزاد دنیا کا ہر صاحب شعور انسان شیخ مجیب الرحمٰن کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہے۔ مقدمہ تو دائر کیا گیا ہے مگر ان پر کیا الزامات عائد کئے گئے ہیں اس کے متعلق تفصیلی معلومات نہیں کی گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ "پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانا" اس الزام کے تحت ان پر مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں اس گناہ کے لئے انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت پھانسی ہے یہی سزا پاکستان پینل کوڈ میں بھی ہے کیونکہ برصغیر کی تقسیم کے بعد وہاں بھی یہی قانون نافذ ہوا تھا

سفید جھوٹ :

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی شب میں مجیب کی گرفتاری کے بعد [illegible] کے خلاف پرتشدد تحریک شروع کرنے کا [illegible] اور ان کے [illegible] شیخ [illegible] الزام [illegible]

بھی کہ عوامی لیگ کے ممبران اپنے مخالفین کا قتل عام کر رہے تھے۔

اگرچہ الزامات عائد کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ بات سراسر جھوٹ ہے، مگر مجیب الرحمٰن کو پرتشدد تحریک شروع کرنے کا ذمّے دار قرار دینے کے لئے یہ جھوٹ ناگزیر تھا حالانکہ ۲۵ مارچ کی شام تک صدر یحییٰ خاں مجیب الرحمٰن سے تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ ۲۵ مارچ سے قبل ہی عوامی لیگ والوں نے قتل عام شروع کیا تھا ایک شرمناک بہتان ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں موجود کسی بھی غیر ملکی نامہ نگار نے قتل عام کی اطلاع نہیں دی۔ پھر یحییٰ خاں نے اپنی نشری تقریر میں ملکی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے صرف یہی کہا تھا کہ عوامی لیگ کے چھ نکات ملکی سالمیت اور اندرونی سلامتی کو نقصان پہنچانے کا باعث ہیں اس لئے پارٹی لیڈر مجیب الرحمٰن کو غدار وطن قرار دیا جاتا ہے۔

خبروں کے ان ذرائع کا مطالعہ کرنے پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان پر مقدمہ دائر کرنے کا فیصلہ ابھی حال ہی میں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود مقدمہ کھلی عدالت میں اسی لئے پیش نہیں کیا گیا کہ ان پر عائد کردہ الزامات کو صحیح ثابت کرنا دشوار ہو جاتا۔ یہ سب سوچ کر فوجی حکمرانوں نے بند کمرے میں کارروائی انجام دینے کا فیصلہ کیا۔

خفیہ مقدمہ :

اب بند کمرے کے مقدمے کو لیجئے۔ اگر شیخ مجیب الرحمٰن پر عائد کردہ الزامات سچ ثابت کرنا ہوتا تو [illegible] عام کیا بلکہ پوری دنیا کے لوگ بھی [illegible] جو الزامات عائد کئے گئے [illegible] فوجی [illegible]

[illegible] کے مطابق عمل کریں گے ایک عجیب [illegible] ہو سکتا ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ یہ مقدمہ عام عدالت میں نہیں بلکہ فوجی عدالت میں پیش ہوا ہے۔ اس عدالت میں ان کے حسب منشا فیصلہ ہو۔ یہ فوجی صدر یحییٰ خاں کی اسکیم ہے۔ اسی اسکیم کے تحت گذشتہ ماہ ایک غیر ملکی نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر پاکستان نے کہا کہ :-

"شیخ مجیب کی جان کو خطرہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ انہیں پھانسی کی سزا ہو جائے۔"

اس کا یہی مطلب ہوا کہ فوجی عدالت کو جس نہج پر فیصلہ دینا ہے وہ یحییٰ خاں کی مرضی کے مطابق ہو۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مقدمہ ایک فراڈ ہے؟

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو ان کی مرضی کے مطابق وکیل فراہم نہیں کیا گیا۔ پاکستان کی موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی وکیل یہ نہیں چاہے گا کہ مجیب کا دفاع کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالے لہٰذا جب وکیل ہی اپنی پسند اور مرضی کا نہ ہو تو کارروائی کس ڈھنگ سے انجام دی جائے گی نیز فیصلہ کس نہج پر کیا جائے گا اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وکیل ان کی مرضی کا ہوتا تو عائد کردہ الزامات کو غلط ثابت کرنا مشکل نہیں تھا لیکن جب مقدمے کی بنیاد ہی جھوٹے الزامات پر استوار کی گئی ہو تو انصاف کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

یہ مقدمہ ایک دردناک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہے کیونکہ چارج شیٹ میں جو الزامات عائد کئے گئے ہیں انہیں سچ ثابت کرنا فوجی ٹولے کا مقصد ہے۔ ایسی حالت میں اگر مجیب الرحمٰن اپنے دفاع کی بھرپور کوشش کریں تو بھی کامیابی ممکن نہیں۔

میرا خیال ہے کہ مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن کو پھانسی کی سزا سنائی جائے گی [illegible]

[illegible]میں انصاف کا خون

بھیونڈی کے سات سو مسلمانوں پر ابھی تک مقدمے چل رہے ہیں

[illegible]سا د برپا کرنے کے لئے کوئی سازش کرسکتی۔ اگر [illegible]ی کے ۲۲۰۰ مسلمانوں نے فساد کی سازش تیار کی تو [illegible]جا سکتا ہے کہ یہ لوگ کیا فائدہ حاصل کرنے کی توقع [illegible] تھے؟ اور جو فساد ہوا اس میں ان لوگوں کو کیا [illegible]پہونچا؟

لیکن ان سوالوں سے قطع نظر خود سرکاری گواہوں [illegible]ان کمیشن کے روبرو اس الزام کی تردید کر دی کہ مسلمانوں [illegible]سا د کی کوئی سازش تیار کی تھی۔ ایک پولیس انسپکٹر [illegible] [illegible]ان کمیشن کے روبرو یہ سنسنی خیز انکشافات کر کے سب [illegible]تے میں ڈال دیا کہ سی۔ آئی۔ ڈی کو میرے نام سے جو بیان [illegible]ادہ نہ میری موجودگی میں دیا گیا اور نہ کبھی مجھے پڑھ کر [illegible]لیا۔ دوسرے گواہوں نے بھی ایسے ہی بیانات دیئے [illegible]ضح طور پر کہا کہ ابراہیم مرحوم نے کوئی اشتعال انگیز تقریر [illegible]ہاں کی تھی۔

اپنے کیس کی کمزوری دیکھ کر حکومت نے سازش کے [illegible]یس کو واپس لے لیا۔

مقدمہ واپس لے کر حکومت نے گویا بالقول خود بہت [illegible]ے انصاف سے کام لیا ہے۔ پہلے اس نے سازشی کیس [illegible]الو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اس میں ملوث کر کے [illegible]ن کو پریشان کیا اور اب وہی مقدمہ واپس لیکر کریڈٹ [illegible]حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بہت خوب! ادہی [illegible]ے بھی کہہ سنتے ہے دہی لے ثواب اُلٹا۔

سوال یہ ہے کہ جن ۲۲۰۰ مسلمانوں کو سوا برس تک [illegible] [illegible]

دکھا جائے اسے اقتصادی مار نہ دی جاتی، مالی نقصان سے قطع نظر جو لاکھوں تک پہنچتا ہے صرف مقدمہ کے جھگڑوں میں بھیونڈی کے مسلمانوں کے اب تک اکتالیس ہزار روپیہ خرچ ہو چکے ہیں اور برابر ہو رہے ہیں اس لئے کہ ابھی سات سو افراد ایسے ہیں جنہیں اگرچہ ضمانت پر چھوڑنے کا کرم کیا گیا ہے لیکن عنقریب ان کے خلاف سیشن میں مقدمات شروع ہونے والے ہیں (ڈھائی سو رہا ہو چکے ہیں اور دو ہزار کو جنہیں کرفیو کی خلاف ورزی میں پکڑا گیا تھا، جرمانہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔) مقدمات شروع ہونے کے بعد کب تک ملزموں کو کچہری کی خاک چھاننی پڑے گی اور کتنی رقم کیلئے انہیں زیر بار ہونا پڑے گا کوئی نہیں کہہ سکتا، یہ سب ایک طبقہ کو اجاڑنے اور برباد کرنے کی باتیں ہیں۔ اس طرح اگر قوم کا کوئی حصہ پریشان ہوتا رہے گا تو کیا اس کی معیشت کبھی ٹھیک ہو سکے گی ——— اور کیا اس سے بالآخر ملک کی مجموعی معیشت متاثر نہ ہوگی — بھیونڈی کے لوگ کپڑا تیار کر کے پیداوار کو بڑھانے اور ملک کی معیشت کو مستحکم کرنے پر لگے ہوئے تھے۔ اگر آج ان کے وسائل ختم ہو جانے کی بنا پر اس پیداوار میں رکاوٹ پڑ گئی تو یہ نقصان کس کا ہے؟

کیا یہ صرف ان ہی لوگوں کا نقصان ہے جن کے کارخانے تباہ و برباد کر دیئے گئے اور جن کے پاور لوموں کو اکھاڑ پھینکا گیا، یہ اس ملک کا بھی نقصان ہے جس کی اقتصادیات کو مستحکم کرنے میں وہ لوگ لگے ہوئے تھے۔

فساد کے بعد فساد زدہ لوگوں کی خاص پریشانی اپنے کاروبار کو بحال کرنے کی تھی حکومت کا فرض تھا کہ وہ تباہ شدہ لوگوں کی فراخدلی کے ساتھ مدد کرتی۔ انہیں اس قابل بناتی کہ وہ پھر سے اپنا کاروبار شروع کر سکتے لیکن پولیس کی بے ایمانی دیکھو [illegible] [illegible] اسی سے تعلق رکھنے والے افراد کے خلاف مقدمات قائم کر کے انہیں کچہری کی الجھنوں میں پھانس دیا گیا تاکہ [illegible] [illegible]

یہ مقدمات اسی سی۔ آئی۔ ڈی اور پولیس کا کارنامہ تھیں جس نے سازش کیس گھڑا تھا۔ سازش کیس کے جھوٹا ثابت ہو جانے کے بعد کون ان کے چلائے ہوئے مقدمات پر یقین کرے گا۔

> معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جس اقلیت کو یہ معلوم ہو کہ فساد اس کے لئے تباہ کن ہوگا وہ فساد برپا کرنے کے لئے سازش کریگی۔

ان مقدمات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کہ انصاف کا جو خون اب تک ہوتا رہا ہے وہ بند ہو سکے۔ حکومت مہاراشٹر جتنا جلد ان مقدمات پر نظر ثانی کرے گی اتنا ہی جلد وہ ناانصافی کے ان دھبوں کو دھو سکے گی جو اس کی پیشانی پر لگ گئے ہیں۔ اور اگر ان مقدمات پر نظر ثانی نہ کی گئی اور بے سوچے سمجھے ان مقدمات کو جاری رکھا گیا تو ایک عام آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ اس شہر کے اقلیتی طبقہ کو برباد کرنے کی جو سازش پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی نے تیار کی تھی اس میں خود حکومت بھی شریک تھی اور اسی لئے وہ بھیونڈی کا تماشہ خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔

> یہ مقدمے پولیس کی سازش کا نتیجہ ہیں
> مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری نائک کو
> فوراً مستعفی ہو جانا چاہیئے۔

> ۱۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ زندگی کے سبق ہمیں اس وقت ملتے ہیں جب وہ ہمارے لئے بیکار ہو جاتے ہیں۔
>
> ۲۔ جس سے محبت کی جائے اس کے ساتھ راست باز رہنا بہت مشکل ہے۔

[illegible] کی [illegible]
[illegible] حقیقت سے
[illegible] والا چلے گی
[illegible] کی اور میں سزا کا مستحق
[illegible] شکست تسلیم کرنے والا نہیں
[illegible] گواہی کیش بنا دیا
[illegible] دونوں طرف کے ممبران ہوں گے میرے
[illegible] میری حمایت کریں گے اور دوسرے ممبر الٹا کسی
[illegible] سے راضی کر لیا جائے گا سے
[illegible] زندگی میں [illegible] گواہی کیش اپنا فیصلہ سنا دے
اور مجھے بے قصور ثابت کر کے مخالفین پر ہتک عزت
جرم میں چارج شیٹ لگا دے گا پھر میری دوبارہ
[illegible] کی ہار۔

جیسے۔

میرے اپنے پرائے، رفیق و رقیب، دوست و دشمن،
ایسے بخیر و خوبی مجھے قبر میں لٹا کر اوپر سے تختے
کی مٹی سے ڈھک کر اپنے ایک مقدس فریضہ کی تکمیل سمجھ
تشریف لے گئے اور میں قبر کے تاریک گوشے میں دل کے
چراغ جلائے سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی سے قوم کے لیے نصیحت
کام لکھ رہا ہوں منکر نکیر حضرات بیچ میں مخل ہو گئے۔
[illegible] طور پر میں برا مان گیا۔ برا مانتا بھی کیوں نہیں جبکہ
ایک کام کر رہا ہوں اور دوسرا آدمی کباب میں ہڈی
گیا۔ میں طیش میں آ گیا اور قلم کی تحریک کا سر کچلنے پر مجبور
گیا۔ میری گرم گرم تیز تیز چلتی ہوئی سانس نے کاغذ کے
[illegible] کو مرغ بسمل کی طرح تڑپنے پر مجبور کر دیا۔ میرے دل
[illegible] نے جنم لیا میرے ہاتھ تڑپتے ہوئے کاغذ کے
[illegible] کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر بائیں جیب سے [illegible]
[illegible] اور کاغذ [illegible] شروع ہو گئی [illegible]
[illegible] اور قلم [illegible] کی طرح [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] کے بعد ملک [illegible] معلوم ہے [illegible]
سے پوچھا۔
"آپ کو کس نے بتایا؟" میں نے پوچھا
"میرے پاس فہرست ہے۔" جواب ملا
"باپ رے باپ" میری زبان سے نکلا
"تمہارے ابا جان نکسلی کے شبہ میں جیل میں قید ہیں۔"
"ہاں"
تمہارا بھائی ایک لڑکی کا خون کرتے پکڑا گیا اور پولس
کی گولی کا نشانہ بنایا گیا۔
"ہاں"
"اس لیے تم بھی نکسلی ہو"
"نہیں بالکل نہیں؟"
"تم جھوٹ بولتے ہو"
"ارے واہ کیا زبردستی ہے۔"
"تمہارا باپ نکسلی تمہارا بھائی نکسلی اس لیے تم بھی نکسلی۔"
"حضرت میں تو ایک افسانہ نگار ہوں۔" میں نے کہا۔
"تم نکسل باڑی کے ہوتے ہوئے افسانہ نگار کیسے ہو گئے"
"یہ ایک لمبی داستان ہے جس کو سنانے کے لیے نہ میرے
پاس وقت ہے اور نہ سننے کے لیے آپ کو فرصت ہوگی۔"
میں نے مزید بھاتے ہوئے اور چہرے پر رنج و ملال
کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔
میں یہ جانتا بھی نہ تھا کہ مستقبل قریب میں افسانہ نگار
بن جاؤں گا مجھے تو یہ بھی امید نہ تھی کہ ڈیڑھ سو روپے پر
معمولی کلرک کی نوکری بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ مگر بھلا ہو اس
قوم کا اور قوم کے نالائق سپوتوں کا جن کی غلط روش زندگی
اور سماج کی بگڑی ہوئی حالت نے مجھے افسانہ نگار بننے پر مجبور
کر دیا تاکہ میں اپنی زور بیانی سے اوراق سیاہ کر دوں اور قوم
کی تقدیر بدل سکوں مگر قسمت نے ایک ڈرامائی کھیل کھیلا جس
کے نتیجہ میں افسانہ نویس اور طنز نگار بن گیا مگر قوم کی قسمت نہ
بدل سکا میں خون جگر سے اوراق سیاہ کرنے میں منہمک رہا
[illegible] اور جسم و جاں کا خون نچوڑ کر قلم میں بھر کر تحریری
تحریک میں جان [illegible] کہ یہ قوم [illegible] زندہ لاش
سے کم نہ ہونے۔ مجھ پر قنوطیت نے غلبہ کر لیا میری انا نے مجھے
[illegible] دیا۔
[illegible] سے کس نے [illegible] تم کس سے کس بھلاؤ۔"

لہٰذا میں فوراً اٹھ سے [illegible] ہو گیا اور [illegible]
کر قبر میں آ رہا تاکہ ابدی نیند سو سکوں مگر یہاں بھی [illegible]
نے سونے نہیں دیا اور قلم کاغذ سنبھال کر قلمکار ہو گیا۔
پھر منکر نکیر حضرات میری حالت زار پر ترس کھاتے
ہوئے رفو چکر ہو جائیں گے لیکن ۔۔
اب پتہ چلا کہ حقیقت اور خیال میں بہت فرق ہوتا ہے۔
میں یہ لوہے کی سلاخ دیکھ کر نروس ہوا جا رہا تھا اور
وہ لوہے کی سلاخ پکڑے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے
جا رہے تھے (میرا نروس ہونا بھی حق بجانب تھا کیونکہ میں
خالی ہاتھ تھا اور وہ ہتھیار سے لیس۔
انھوں نے جلدی جلدی کئی سوال کر ڈالے اور میں ایک لفظ بھی
نہ سن سکا۔ ذہن پر زور دیا تو معلوم ہوا کہ ذہن کی فیکٹری بند
ہے اور ملازمین ہڑتال پر ہیں۔ یادداشت پر زور دیا کیونکہ
یادداشت کی بنیاد پر میں ہزاروں سال کی تواریخ فوراً
بیان کر دیا کرتا ہوں) تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے
کرمچاری چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ اور گیٹ پر سنتری
سے پہرہ دینے والا دربان اونگھ رہا ہے۔
مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ میں پل صراط پر ہوں اور
ذرا سی جنبش ہست نیست کا فیصلہ کرنے کی ابھی میں اس
محسوس ہی سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک آواز پردہ
سماعت سے ٹکرائی۔ ع
تیری ہستی اور نیستی میں فرق ہی کیا ہے
اور میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ میرا جسم ۱۰۵
ڈگری سینٹی گریڈ کے بخار میں مبتلا مریض کی طرح جلنے لگا۔
پیشانی سے جو تقدیر کی لوح محفوظ ہے پسینے کے آبشار
پھوٹنے لگے۔
فوراً میرے ذہن کے ایک کونے میں ہلچل مچی معلوم
ہوا کہ ایک ملازم ہڑتال کی پرواہ کیے بغیر کام پر چلا آیا ہے
میرے من کے مندر میں خوشی کا چراغ جلا اس ملازم
نے کہا۔
"میں حضرت شاعر ہوں۔"
میں نے اس کے ایما پر ایک شعر باآواز بلند بغرض
رہائی و آزادی واسطے ہمیشگی بحضور منکر نکیر عرض کیا ۔
دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

[illegible] اڑے ہوئے فائن آرٹ جو جانے کب سے [illegible]
بعد [illegible] کی منزل خود بخود آجائے گی کیونکہ
مہذب [illegible] میں بہت سے ایبسٹریکٹ آرٹ
کی طرف مائل [illegible] یا تنگ موری والی پتلون
پہلاؤ جیسے ٹی شرٹ ہو یا الجھے بال۔ کیبرے ڈانس
یا [illegible]۔ یہ سب ایبسٹریکٹ آرٹ کے زندہ [illegible]
ہیں ۔۔ تو ٹھہرے!

بکواس کرنے اور آنسو بہانے کے فائن آرٹ کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی کو مرعوب کرنا ہو یا شکست دینا ہو۔ اس خلائی دور میں ہر شخص ایک دوسرے پر رعب ڈالنا ضروری سمجھتا ہے۔ جنتا اپنے حلقے کے امیدواروں پر رعب ڈالنا ضروری سمجھتی ہے کیونکہ ہار جیت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ جیتنے کے بعد امیدوار جب [illegible] بن جاتا ہے تو وہ خود اپنے حلقے کی جنتا پر رعب ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس ناری یگ میں بیویاں اپنے شوہروں کو مرعوب کرنے کے لیے چاروں کو تگنی کا ناچ نچاتی ہیں اور جب امتحان ہال کے نگران کار کی سختیوں سے برافروختہ ہو کر نقل کرنے والا طالب علم نگران کار کو چھرا گھونپ دیتا ہے تو دوسرے تمام نگران کار اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ نگرانی کو سلام کر کے نقل کرنے والوں کی مدد میں اپنی جان کی امان سمجھتے ہیں۔

لیکن ذرا ٹھہریے، ہماری بکواس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم آپ کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے بستر پر کھٹمل قابض ہو گئے ہیں۔ کانوں میں ہمارے پہلوان شاعر کی آزاد نظم کے اشعار گونج رہے ہیں۔ نیند کا کہیں کوسوں دور تک پتا نہیں ہے، اس پریشانی کے عالم میں ہم کاغذ قلم لے بیٹھے ہیں کہ چلو کچھ دیر کے لیے بکواس ہی سہی!۔۔

خدا کی کارسازی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے کھٹمل جیسے سرخ کیڑوں کو کیوں پیدا کیا۔ سفید دودھ جیسا پلنگ پوش میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ جدھر دیکھو ادھر سرخ سپاہی۔ ہم سرمایہ دار بھی تو نہیں جو ہمارے خون کے پیچھے پڑ گئے ہیں یہ موذی جانور۔ ہمارا تو دل چاہتا ہے کہ ان کے خلاف "سول وار" شروع کر دی جائے۔ ساری دنیا کے بڑے بڑے [illegible] عظیم الشان جلسے منعقد کیے جائیں اور سارے عوام متحد ہو کر کھٹملوں کے خلاف ایک سخت ترین قرارداد پاس کریں۔ نیویارک۔ واشنگٹن۔ لندن۔ ٹوکیو۔ دہلی۔ اسلام آباد۔ اور قاہرہ کے بڑے بڑے اخبارات کھٹملوں کے خلاف ولولہ انگیز اداریے لکھیں۔ اگر یہ تحریک کوہ انڈیز سے کوہ ہمالیہ تک، بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک چل پڑے تو انسان کا نصیب ہی جاگ جائے۔ اس لئے جمہوری مملکتوں کے سربراہوں کو اگر یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ فیملی پلاننگ کی تحریک کو چھوڑ کر "کھٹمل کشی" کی خارجہ پالیسی اختیار کریں تو ہم حق بجانب ہوں گے۔ دنیا کی تمام سیاسی پارٹیاں، ریپبلکن پارٹی سے لے کر کنزرویٹو پارٹی تک برسر اقتدار کانگریس پارٹی سے لے کر جن سنگھ تک سب کے سب اس مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو [illegible] دنیا کے دکھیارے باسیوں کو میٹھی نیند آئے گی۔

اوہ!! ہم نہ جانے کیا کیا بکواس کر گئے۔ یہ خیال ہمیں ایک دم اس لئے آیا کہ ایک کھٹمل نے زور سے ہمیں کاٹ لیا۔ کم بخت نے سرخ خون بڑے مزے سے پی لیا۔ آجکل خون بنتا ہی کہاں ہے۔ ہماری غذاؤں میں ملاوٹ کی اتنی بہتات ہے کہ پاک صاف خون بلڈ بینک میں بھی نہیں ملتا۔ اگر ہم یہ اندیشہ ظاہر کریں کہ انسان بھی اب اصلی نہیں رہا، وہ بھی سر سے پاؤں ملاوٹ میں ڈوبا ہوا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ ملاوٹ کا یہ خون جو کچھ بدن میں رہتا ہے اس میں سے تقریباً دو تہائی ان ہی کھٹملوں کے حوالے ہو جاتا ہے۔ روایت کی جاتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد سیروں غذا ہضم کر جاتے تھے۔ گھی میں ڈوبتے تھے اور دودھ میں نہاتے تھے۔ اب ان کے پوتوں پڑپوتوں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ ملاوٹ کی غذا کھاتے کھاتے قبرستان کی تیاری کرنے لگ جاتے ہیں۔ کینسر۔ السر۔ ہارٹ اٹیک اور سیریبرل ہیمرج کی شکل میں دوسری دنیا کا پاسپورٹ اور ویزا ملنے لگتا ہے۔ آدھی بھوک مرتی ہے آدھی تڑپتی ہے۔ تڑپتی ہوئی آدھی بھوک، جنسی بھوک کا الاؤ دہکا دیتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک مریل، نیم جان بچہ اس دنیائے رنگ و بو میں چیختا چلاتا آنکھیں کھول دیتا ہے۔ حالانکہ چاروں طرف فیملی پلاننگ کے نعرے۔ بسوں، دیواروں، ریستورانوں، پوسٹروں پر لکھے ہوئے نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور کھٹمل میں ایک ریس ہو رہی ہے [illegible]

[illegible] ہم کھٹملوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلی قسم میں وہ کھٹمل شامل ہیں جن کا رنگ سرخ سفید ہوتا ہے۔ یہ بڑے بھاری بھرکم ہوتے ہیں۔ ترقی پسندوں کی ڈکشنری میں ان کا تعلق بورژوا طبقے سے بتایا جاتا ہے ان کا خیال ہے کہ ان کے پاس ڈالروں کی جھنکار ہوتی ہے۔ نئے نئے پلان بنتے ہیں نئے نئے معاہدے اور میثاق وجود میں آتے ہیں۔ نیوکلیر بموں، نیپام بموں اور ایٹم بموں کی شکل میں یہ ساری دنیا کو کاٹتے رہتے ہیں۔ کبھی ان کا بہایا ہوا خون ہیروشیما اور ناگاساکی میں دکھائی دیتا ہے کبھی ویت نام کے جنگلوں میں اور کبھی سینائی کے ریگستانوں میں۔ کھٹملوں کے اس گروہ میں وہ چالاک کھٹمل بھی اپنے آپ کو شامل کر لیتے ہیں جن کا سورج کبھی کا ڈوب چکا ہے۔

دوسری قسم کے کھٹمل ذرا سے نوعمر اور جوشیلے واقع ہوئے ہیں۔ ان میں طوفانوں کا سا جوش۔ دریا کا سا استقلال۔ شیر کی سی بہادری۔ لومڑی کا سا فریب اور چٹانوں کی سی سختی ہے۔ یہ کاٹتے جاتے ہیں اور "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگاتے جاتے ہیں۔ خون بھی سرخ ہوتا ہے اور انقلاب کا نعرہ بھی سرخ۔ صدیوں تک ان پر بے ہوشی طاری تھی۔ اس وقت دنیا چین کی بنسری بجا رہی تھی۔ اب یہ جاگے ہیں تو دنیا کا چین اپنی ٹوٹی ہوئی بنسری کو ڈھونڈ رہا ہے۔

یہ دراصل دو قسم کے کھٹمل ہی بحر و بر میں فساد برپا کیے ہیں۔ دنیا والوں کے خون سے غالباً ان کا جی بھر گیا ہے کیونکہ وہ مریخ اور چاند میں بسنے والی مخلوق کا خون چوسنے کے منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔ خفیہ معاہدوں اور فوجی معاہدوں کے ذریعے خون چوسنے کی طاقت کو متوازن کر رہے ہیں۔

بہرحال ہمیں اس دن کا شدید انتظار ہے جس دن کوئی ایک نتیجہ نکل آئے گا۔ یا تو دونوں کھٹمل ہلاک ہو جائیں گے اور ساری دنیا میٹھی نیند سو جائے گی، یا بوڑھا بھاری بھرکم کھٹمل، نوعمر کھٹمل کو کان پکڑ کر بٹھا دے گا، یا نوعمر اور جوشیلا کھٹمل بوڑھے کھٹمل کو ایک ہی مکا مار کر ہلاک کر دیگا یا پھر یہ دونوں گرما گرمی کسی ٹھنڈی سی رات میں دوستی کی پینگیں بڑھائیں گے۔ اس وقت نہ کھٹمل ہمیں کاٹیں گے اور نہ نیند نہ آنے کی شکایت باقی رہے گی۔ پھر ہم آپ کو اپنی بے معنی بکواس سے پریشان بھی نہ کریں گے

دو ڈالی محفل سے

اختر بستوی

فی البدیہہ مصرعے

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی طرف سے مجھے دعوت نامہ ملا کر ۲۲ جون کو ساڑھے تین بجے دن میں وہاں پہنچ کر اپنا تازہ کلام ریکارڈ کرا دوں۔ چنانچہ میں بستر باندھا اور ایک روز قبل ہی لکھنؤ میں وارد ہو کر ایک پارک ویو ہوٹل کا ایک کمرہ آباد کر دیا۔ دوسرے دن جب میں تین بجے دن میں ریڈیو اسٹیشن جانے کے لیے نکلا تو میرے ہمراہ جناب والی آسی اور جناب سعادت علی صدیقی بھی تھے جنھیں میں نے اصرار کر کے ساتھ چلنے کے لیے رضامند کر لیا تھا۔ اس روز دھوپ بہت ہی تیز تھی۔ اور گرمی اپنے پورے شباب پر تھی۔ اتفاق سے لکھنؤ جیسے بڑے شہر میں اس وقت ہمیں کوئی رکشا نہ مل سکا اور ہم تینوں کو ریڈیو اسٹیشن تک پیدل ہی جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریکارڈنگ روم میں داخل ہوتے وقت ہم سب پسینے میں شرابور تھے۔ اور ہمارے چہرے لال بھبوکا ہو رہے تھے۔ وہاں شفاعت علی صدیقی صاحب میرے منتظر تھے (جنھیں ریکارڈنگ کے فرائض انجام دینے تھے) اور ان کے پاس ہی کیف احمد صدیقی بھی تشریف فرما تھے۔ (جنھیں میرے ساتھ اپنی غزلیں ریکارڈ کرانا تھیں) ہم لوگوں پر نظر پڑتے ہی کیف احمد صدیقی نے کہا۔ ع

"اختر کے ساتھ حضرت والی بھی آئے ہیں"

والی آسی نے جواباً فرمایا۔ ع

"اور دونوں اپنے ساتھ سعادت کو لائے ہیں"

شفاعت صاحب ہمارے چہروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولے

"لیکن بفیضِ موسمِ گرما یہ حال ہے
تینوں کے چہرے سرخ ہیں اور تمتمائے ہیں"

تشریح

بستی کے نوجوان شاعر جناب شکیل احمد شکیل شاعری کے ساتھ وکالت بھی کرتے ہیں چنانچہ ان کے بے تکلف دوستوں کو جب ان کا نام لینا ہوتا ہے تو صرف شکیل ہی نہیں کہتے بلکہ "شکیل وکیل" کہا کرتے ہیں۔ ایک بار موصوف ایک قتل کے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ ان کے ایک گواہ کو اپنے بیان میں یہ جملہ کہنا تھا "ملزم نے مقتول کو حلق دبا کر ہلاک کر ڈالا" لیکن وہ بے چارہ عدالت میں پہنچ کر ایسا نروس ہوا کہ گھبراہٹ میں یوں بول گیا "ملزم نے مقتول کو حلق دبا کر حلاق کر ڈالا" مخالف وکیل ذرا پُر مذاق آدمی تھے۔ انھوں نے مسکرا کر شکیل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیوں وکیل صاحب بھلا حلاق کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

شکیل صاحب بھی جواباً مسکرائے اور بولے "تعجب ہے آپ کو اتنی سی بات بھی نہیں معلوم! اجی حضرت جب کسی کو حلق دبا کر مار ڈالا جاتا ہے تو اسے "حلاق" کرنا کہتے ہیں۔"

نقطہ اور گپتا

کانگریس پارٹی جب سنہ ۱۹۶۷ء میں دو حصوں میں بٹی تو ملّوپی اسمبلی کے ممبروں میں سے جو حضرات "انڈر گروپ" میں چلے گئے ان میں قاضی جلیل عباسی اور رام کمار شاستری بھی شامل تھے سی بی گپتا مخالف گروپ کے لیڈر تھے۔ رام کمار شاستری صاحب نے اس زمانے میں یہ روش اختیار کر لی تھی کہ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت گپتا جی کو برا بھلا کہا کرتے تھے اور اس کے لیے عجیب و غریب طریقے اپنایا کرتے تھے مثلاً۔ ان کے بچے اگر کسی قسم کا بے ہودہ پن کرتے تھے تو انھیں یوں ڈانٹتے تھے "نالائقو! یہ کیا گپتا پن کر رہے ہو؟" یا اگر کسی شخص کے بارے میں انھیں یہ کہنا ہوتا تھا کہ اس نے بڑے چھچھورے پن کا مظاہرہ کیا تو اسے یوں کہتے تھے "بھئی فلاں شخص نے بڑے گپتا پن کا ثبوت دیا۔" اسی زمانے کی بات ہے کہ ایک روز قاضی جلیل عباسی صاحب بغرضِ ملاقات ان کے گھر تشریف لے گئے۔ جلیل صاحب کا نام اگر ہندی رسم الخط میں لکھا جائے اور اس کے نیچے غلطی سے ایک نقطہ لگ جائے تو جلیل کے بجائے ذلیل پڑھا جاتا ہے۔ اسی معاملہ میں ہندی کے ایک اخبار میں موصوف کا نام چھپتے وقت یہ حادثہ گزر چکا تھا جس وجہ سے ان کے بے تکلف دوست احباب انھیں چھیڑتے رہتے مثال کے طور پر اگر کسی دوست کو ان کی کوئی بات ناگوار گزرتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ "یار جلیل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے نام کے نیچے نقطہ لگ گیا ہے — "ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ جلیل صاحب رام کمار شاستری کے دولت خانے پر تشریف لے گئے۔ وہاں کسی ایسے سیاسی مسئلے پر گفتگو چھڑ گئی جس کے بارے میں شاستری صاحب کی رائے جلیل صاحب کی رائے سے مختلف تھی کچھ دیر تک تو ان دونوں میں خوب گرما گرم بحث ہوتی رہی آخر رام کمار شاستری صاحب مصنوعی غصے سے بپھر کر بولے "جلیل بہت اُلٹی سیدھی باتیں نہ کرو ورنہ لگا دوں گا نقطہ اور ہو جاؤ گے گپتا"

لکھنؤ پیروں میں

ایک بار میں گونڈا گیا تو اپنے عزیز دوست محمد علی صدیقی کے یہاں ٹھہرا جو اس زمانے میں بسلسلۂ ملازمت وہاں مقیم تھے۔ ان کے دوستوں میں جو لوگ شام کو ملنے آیا کرتے تھے ان میں ایک صاحب مقبول احمد مقبول بھی تھے جو انتہائی باذوق آدمی تھے لیکن ان کی ایک خاص ادا یہ تھی کہ وہ گفتگو ہمیشہ بھوجپوری یا پوربی زبان میں کیا کرتے تھے۔ اور لہجے کو جان بوجھ کر گنواروں جیسا بنا لیتے تھے۔ دو ایک دن کے بعد میں ان سے خاصا بے تکلف ہو گیا۔ ایک روز حسبِ معمول وہ شام کو ملاقات کے لیے تشریف لائے تو پیروں میں بہت ہی نفیس قسم کا ناگرا پہنے ہوئے تھے جسے دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے کہا "واہ جناب واہ! بولتے ہیں بھوجپوری زبان میں اور پہنتے ہیں لکھنؤی ناگرا!"

مقبول صاحب نے خلافِ توقع بہت ہی شستہ اور شیریں لہجے میں کہا "حضور! میں لکھنؤ کو منہ لگانا نہیں چاہتا اسے لب و دہن پر لانے کے بجائے ہمیشہ پیروں ہی میں رکھتا ہوں۔"

میدانِ جنگ میں بیت بازی

[illegible] وہ ہوسٹل گیا تو [illegible]
اختر شیرانی صاحب سے [illegible] کے لیے [illegible] جا رہے تھے میرے ساتھ چند احباب بھی تھے جس وقت ہم لوگ ہسپتال کے گیٹ میں داخل ہو رہے تھے ہماری نظر سامنے لگے ہوئے ایک بڑے سے بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا: "رکت دان مہا دان۔ فوجی جوانوں کے لیے خون دیجیے" اس بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے ایک بے تکلف دوست نے کہا: "اختر صاحب! کیوں نہ آپ بھی تھوڑا سا خون دے ڈالیے۔"

ابھی میں ان کو جواب دینے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ محمد ابراہیم علوی صاحب بیچ ہی میں بول اٹھے: "ارے اختر صاحب کہیں ایسا غضب نہ کر ڈالیے گا۔ آپ اپنا خون فوجی جوانوں کے لیے ہرگز نہ دیجیے گا ورنہ مصیبت ہو جائے گی۔"

سب نے متحیر ہو کر ان کی طرف دیکھا اور ایک صاحب نے پوچھا: "کیوں؟"

علوی صاحب نے جواب دیا: "دوستو! یہ شاعر ہیں شاعر اگر ان کا خون کسی سپاہی کی رگوں میں پہنچ گیا تو وہ میدانِ جنگ میں گولہ باری کرنے کے بجائے بیت بازی شروع کر دے گا۔"

ہم قافیہ

[illegible]

ایک مشاعرہ تھا اس میں شریک ہونے کے لیے [illegible] بھی گیا میرا ایک اسٹیشن پر اترا تو [illegible] دی کہ باہر کار میں انور مرزاپوری صاحب بیٹھے انتظار کر رہے ہیں میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹیشن کی عمارت سے باہر گیا تو دیکھا کہ انور صاحب کار سے منہ نکالے جھانک رہے ہیں۔ میں نے لپک کر کہا: "اخاہ انور صاحب بھئی خوب ملاقات ہوئی۔"

انھوں نے فرمایا: "میں گھنٹے بھر قبل ایک ٹرین سے آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ایک اور گاڑی آنے والی ہے چونکہ یہاں سے قصبہ کافی فاصلے پر ہے اس لیے میں نے سوچا کہ اتنا لمبا راستہ تنہا طے کرنے کے بجائے اس ٹرین کو بھی دیکھ لوں۔ اگر اس سے کوئی شاعر دوست آ جائے تو اس کے ساتھ قصبے تک کا سفر ذرا دلچسپ رہے گا۔ دل میں یہ بھی دعا کرتا رہا تھا کہ کوئی عمدہ آدمی اترے تاکہ حقیقتاً لطف آئے کیونکہ یہ ایک شاعر کی دعا تھی اس لیے شاعرانہ طور پر مقبول بھی ہوئی۔ انور کے ساتھ چلنے کے لیے اختر آیا۔ یعنی خدا نے ایک ہم قافیہ بھیج دیا۔"

شبہ سے بالاتر

بنارس میں محمود احمد ہنر کی رہائش گاہ پر شام کو حسبِ معمول [illegible] ہوتے [illegible] یہاں [illegible] کتاب [illegible] پڑھا جا رہا تھا۔ آپ لوگوں کی آمد شروع ہوتا آئی [illegible] نے کتاب بند کر کے میز پر رکھی پھر جب [illegible] سب چلے گئے تو میں آیا تو دیکھنے لگا لیکن کتاب نہیں ملی۔"

حفیظ بنارسی بولے: "یار وہ تو بہت [illegible] مطلب ہے"

ہنر صاحب نے کہا: "ہاں بھئی اسی لیے تو اس کے غائب ہونے کا افسوس ہے ویسے میں جانتا ہوں کہ اسے کون لے گیا ہوگا لیکن چونکہ کوئی ثبوت نہیں ہے اس لیے نام لینا مناسب نہیں سمجھتا۔"

ہنر صاحب کے ایک سیدھے سادے گریجویٹ دوست جنھیں لوگ اکثر و بیشتر مذاق کا نشانہ بنایا کرتے تھے بولے: "کہیں آپ کا اشارہ میری طرف تو نہیں ہے؟"

ہنر صاحب نے فرمایا: "جی نہیں آپ کے متعلق تو شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

حفیظ بنارسی نے پوچھا: "کیوں؟"

ہنر صاحب نے جواب دیا: "اس لیے کہ وہ کتاب انگریزی میں تھی اس لیے ان کے بارے میں شک بے سود ہے۔ ہاں اگر اس کے ساتھ کوئی فلمی بھی غائب ہوتی تو سوچا جا سکتا تھا۔" اس پر دوستوں کی محفل میں بلند و بالا قہقہہ پڑا اور وہ بے چارے جھینپ کر رہ گئے۔

چین نے ہندوستانی پنگ پانگ ٹیم کو چین آنے کی دعوت دی ہے۔ — ایک خبر

یک ... ہے ... جانب کی سمت ...

آواز ... ہے۔ "بیبدی بالا مجھکو سیدا سن یاد کرتا ہے" اور کبھی دوسری سمت کا دوسرا گلوکار کان کو پھاڑتا، دماغ کو چاٹتا اور ہوش و حواس کے خرمن پر بجلیاں گراتا ہوا سنائی دے رہا ہے۔

"جادوگرستیاں چھوڑ میری بیاں"

اب آپ ہی غور کیجئے۔ چار گھنٹے سے مسلسل سن رہا ہوں کبھی جلیبو گھونگرو قسم کی تھاپ۔ کبھی ڈھولک کی دھن دھن کبھی پیانو کی ٹن ٹن، کبھی سارنگی کی ریں ریں۔ کبھی شہنائی کی پیں پیں کبھی۔ کبھی۔ اف کیا کروں کہاں جاؤں۔

اس وقت اس "جادو گرستیاں" اور "بیبدی بالا" نے اس قدر زچ کیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ میرے کسی دماغ چاٹو یا بڑبولے دوست کی آواز نہیں کہ جب بوریت اپنی انتہا کو پہنچنے لگے تو پیٹ میں شدید درد کا بہانہ کرکے اس کی حد سماعت سے دور ہو جاؤں سنا ہے کہ صور اسرافیل صرف چند منٹوں ہی کے لئے پھونکا جائے گا۔ مگر یہ آواز۔ خدا کی پناہ، چار گھنٹوں سے میری سماعت پر مسلط ہے۔ اور اب تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اس بے پناہ گھن گرج سے صور اسرافیل کے زیر و بم حسین ہوں گے

یہ بات نہیں کہ مجھے فلمی گیتوں سے نفرت ہے۔ میں فلمیں دیکھتا ہوں اور فلمی گیت بھی بڑے شوق سے سنتا ہوں۔ اکثر رات کو جب آخری شو دیکھنے کے بعد پیدل اور تنہا گھر واپس لوٹتا ہوں تو "راستہ کٹ جانے کے خیال سے" کوئی فلمی گیت گنگنا ہی لیتا ہوں۔ رات کے وقت اندھیری سڑکوں پر جب تخیل کے پیدا کردہ سائے بھوت بن کر کبھی آگے اور کبھی پیچھے ظاہر ہوتے ہیں تو اس وقت یہ فلمی گیت بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں اگر چہ ایسے مواقع پر گنگنائے جانے والے گیت کی نے کچھ اتنی تیز بھی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی انگریزی گیتوں کی دھنوں سے بھی مشابہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس نامعقول انگریزیت سے قطع نظر بھوتوں کا مسئلہ تو بہر حال حل ہو ہی جاتا ہے۔ حقیقت میں ایسے مواقع پر فلمی گیتوں کی افادیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

کچھ ... بھی ہو ... رات کے وقت ... کے ... اس گیت کے ... اختیار کر گئی۔

...

بلائے فلماں

ہمایوں قدیر

حلق سے کئی آوازیں بیک وقت مختلف سروں اور مختلف والیوم کے ساتھ نکلنے لگیں اور یقین جانئے کہ ہم محض اس فلمی گیت کے باعث کتوں کے حملے سے محفوظ ہو گئے۔ دراصل ہمارے منہ سے نکلنے والی ان عجیب اور ہیبتناک آوازوں کو سن کر سارے حملہ آور کتے اس درجہ خائف ہو گئے کہ ہم کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق سمجھ کر ہمارے سامنے سے دم دبا کر بھاگ گئے۔

اگر اس قسم کے حالات سے کبھی آپ کو بھی سابقہ پڑا ہو تو آپ یقیناً ہماری اس بات کی تائید کریں گے۔ ایسے موقعوں پر ان فلمی گیتوں کے لکھنے والوں اور ان کے لئے موسیقی تیار کرنے والوں کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ مگر اس کے برعکس موجودہ حالات میں۔؟

آپ ہی سوچیے کہ مجھے کسی کلو، بدھو یا خیراتی کی شادی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو یہ بلاخواہ مخواہ میرے سر پر مسلط کر دی گئی۔ ٹھیک ہے اگر کسی کی شادی ہے اور اس کو فلمی گیت سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو میری دعا ہے کہ وہ تمام عمر فلمی گانے ہی سنتا رہے۔ لیکن اپنے اس نامعقول شوق کی بنا پر کسی شریف آدمی کو اس درجہ تنگ کرنا کہاں کی شرافت ہے کہ وہ بے چارہ تنگ آکر عالم بالا کی طرف کوچ کر جانے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دے۔

ذرا ایک پیراگراف ملاحظہ فرمایئے۔ طبیعت پر جبر کرکے کچھ لکھنے کے لئے بیٹھا تھا، مگر جگہ جگہ ذہن بہک گیا اور نتیجے کے طور پر فلمی گیتوں کا ایک ایسا شاندار مرقع تیار ہو گیا کہ جسکو ... کر ہر کسی کے دل میں ... کی خواہش انگڑائی لے سکتی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے ستم یہ کہ یہاں پہلے ہی اس ادارے سے پوچھ لیا جاتا ہے۔)

"انسان نے بڑی تیزی سے ارتقاء کی منازل کو طے کیا وحشی سے مہذب بننے میں اس کو کچھ زیادہ عرصہ نہ لگا، کیونکہ جب دل ہی ٹوٹ گیا۔ ہم جی کر کیا کریں گے۔ ڈارون کی تھیوری کے مطابق سب سے پہلے اس کی دم غائب ہوئی۔ بندر سے انسان بننے کی سب سے پہلی سیڑھی پر اس کے ... کہتے تھے استاد ہمارے، نام تھا جنکا مچھندر، انسان تھا پہلے بندر۔ حیوانیت کے جانے سے انسانیت کے جانے میں آنے کے ... نے ...... یہ دنیا گول ہے اوپر سے پول ہے ....."

اب آپ ہی سوچیے کہ کسی بہت ہی سنجیدہ مضمون کا ایک پیراگراف لکھنے کے بعد غلطیوں کے امکانات کے پیش نظر اس پر دوبارہ نظر ڈالی جائے اور وہ پھر اس طرح کا نکلے تو بیچارے لکھنے والے کی کیا حالت ہوگی۔ حالانکہ لکھتے وقت اسکو بالکل ہی محسوس نہیں ہو پایا کہ وہ انسان سے بندر اور بندر سے استاد مچھندر پر چھلانگ لگا چکا ہے، اور اب دنیا کے گول ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔

ایک اہم انٹرویو میں تاریخی حقائق کے متعلق سوالات کے جوابات دینا تھے۔ لہٰذا اس بیکار وقت میں میں نے چاہا کہ تاریخ پر ہی نظر ثانی کر لوں۔ لیکن کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد میں ان حقیقتوں کا اعتراف کر رہا تھا۔

* سکندر کی محبوب ملکہ نورجہاں تھی۔

بابر نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے۔

شیر شاہ سوری شاہ جہاں سے شکست کھا کر ایران بھاگ گیا تھا۔

اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ جب حالات اس قسم کے ہوں تو ایک شریف آدمی دو چار قتل کرنے کے بعد پھانسی پر چڑھ جانے تک کے خیالات پر تو آسانی سے غور کر ہی سکتا ہے۔

خدا میری مغفرت فرمائے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایسا نامعقول ذوق رکھنے والے حضرات کا اور اپنا سر ایک کر دوں۔ اب آپ بھی اجازت دیجئے، کیونکہ حالت یہ ہے کہ بھیجا صبح کو لاؤڈ اسپیکر کے چوکھٹے سے آؤٹ ہو رہا ہے۔ اور اگر ایسے میں کوئی ناشائستہ بات قلم سے نکل گئی ہو تو اس کے لئے معاف فرمایئے گا۔ خدا جانے ابھی اور کتنی دیر تک صبر و تحمل کے اس جان لیوا مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ خدا حافظ۔

لے اور انکی اشاعت عام ہی اسٹوڈیو کی صورت تک پہنچا ہے
ں۔ تصویر کی نمائش کا یہ اہتمام یہیں اختتام پذیر نہیں
اگر یہ صاحب اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلینڈ جا رہے
اور وہ حضرت بیرون ملک جا کر ایم۔ اے کرنے کا ارادہ
ہے رہیں بلکہ یہ بات بھی نہایت اہم سمجھی جاتی ہے کہ ہر جوڑی تقریب
شرکت کرنے والی حسین و جمیل خواتین کی تصاویر کی اشاعت کا
دلبست بھی ضرور کیا جائے جسقدر ہو سکے پرچے میں انھیں نمایا
م ملنا چاہئے۔ یہ ضروری نہیں کہ انکا نام لکھا جائے یا انکا
ہ کے لئے پتا درج کیا جائے یا بتایا جائے کہ ان معزز مہمانوں
صویر کس خوشی میں چھپ رہی ہے۔ بس یہی ظاہر کر دینا کافی
ما جاتا ہے کہ یہ دو خواتین ہیں اور انکی یہ تصویریں ہیں۔ مل
ا خاص بات نہیں جو تحریر کی جائے۔

شوکت تھانوی مرحوم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں اخبار
تا ہوں تو فوراً اشتہارات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور بات
نیاق سے ایک ایک اشتہار کا بالتفصیل مطالعہ کرتا ہوں
سارے اشتہارات دیکھ لیتا ہوں تو ابتداء سے از سرِ نو
مطالعہ شروع کر دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کچھ عرصہ پہلے ایڈیٹر
تھا حسن قابلیت اور لیاقت اشتہارات کی دل پذیری کا پہ صرف
لے ہوں اور انھیں انتہائی دل کش بنا دیتے ہوں۔ آج کل تو
رات میں سوائے تصاویر کے اور کوئی چیز دامنِ دل اپنی
نب نہیں کھینچتی۔ انسان، اخبار ہاتھ آتے ہی تصاویر دیکھنے
دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ پھر ورق الٹ کر خبروں پر ادھر ادھر نظریں
ڈالتا ہے اور پھر تصویریں دیکھنے لگتا ہے۔ گویا تازہ ترین اور اہم
یر کے روپ میں ڈھل گئی ہے۔ بعض اخبارات میں آجکل
یر کا ایک الگ صفحہ بھی قائم کر دیا گیا ہے اور اب لوگ ایک
ہے ... بھی خبر کیا ہے ... جائے یہ پوچھنے لگے ہیں کہ

عام قارئین تو پھر بھی بے فکری زندگی کا ثبوت دیتے ہیں اور
ایسی رنگین اور دلفریب تصاویر دیکھنے کے بعد اخبار ادھر ادھر
پھینک دیتے ہیں مگر بھلا ہو زلف تراشوں کا جو ان نادر دستاویزات
کی قدر جانتے ہیں اور انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں
اور یادگار کے طور پر اپنے سیلونوں کی دیوار پر چسپاں کر لیتے ہیں۔ اب
حالت یہ ہو گئی ہے کہ باربر سیلون اچھے بھلے تصویر خانے بن گئے ہیں
گاہک تصویریں دیکھنے میں لگا رہتا ہے اور حجامت بن جاتی ہے۔

اخبارات فی زمانہ اتنے ضخیم ہوتے جا رہے ہیں اور مختلف موضوعات
کی بھرمار اور تصاویر کی بوقلمونی سے اتنے لامحدود ہو گئے ہیں کہ جب
قاری کا سامنا کسی اخبار سے ہوتا ہے تو بے چارے کو کچھ سمجھتا
ہی نہیں کیا پڑھے اور کیا نہ پڑھے، کیا دیکھے اور کیا نہ دیکھے۔
ہر روز جب اسے اسی طرح کا ایک نیا ہفت خواں طے کرنا پڑتا
ہے تو اپنی مختصر زندگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ دن دور
نہیں جب اخبارات کے ساتھ یا انکی اشاعت سے پہلے لوگ اخبار
کے خلاصہ جات اور MADE EASY بھی چھاپا کریں گے۔
اس طرح قاری کی مشکل کچھ آسان ہو جائے گی۔

کچھ اخبارات واقعی اتنے متنوع اور طویل مضامین اپنے
دامن میں لئے طلوع ہوتے ہیں کہ ان کو اخبارات کا نام دینا
مستوجب دکھائی دیتا ہے۔ قاری حیران ہوتا ہے کہ اگر یہ اخبار
ہیں تو رسائل کسے کہتے ہیں اور اگر رسالے ہیں تو اخبارات کیونکر ہوئے
شاید اسی الجھن کو دور کرنے کے لئے بعض ہفت روزہ رسائل
نے اپنا نام اخبار رکھ لیا ہے تاکہ اس قسم کے بے معنی اعتراضات
نہ کئے جا سکیں۔ البتہ بعض ایڈیٹروں نے یہ دعوی ضرور کیا ہے
کہ اس دور میں جب رسالے موٹی موٹی کتابوں کی شکل میں
نمودار ہونے لگے ہیں انصاف کا تقاضا ہے کہ اخبار رسالے بن کر
نکلیں۔ خدا جانے پھر اخبارات کی جگہ کونسی چیز لے گی۔ ■

[illegible]

[illegible] عجیب سی کیفیت

کر رہا تھا۔ یہ ایک تصویر کی آنکھیں تھیں جیسے وہ کسی جیتے

جاگتے آدمی کی آنکھیں ہوں۔ پرویز نے بے ساختہ [illegible]

ہاتھ پھیر کر دیکھا مگر وہ تو بالکل سپاٹ تھا اور وہ خوف

زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور وہ لوگ پیچھے ہی کھڑے

[illegible] چکے تھے۔ وہ بے تحاشہ دوڑتا رہا۔ اسے یہ بھی فکر نہ

تھی کہ اس کی قیمت ادا کر چکا ہے۔ وہ اسی طرح دوڑتا رہا اور

[illegible] میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ سامنے والے ہوٹل کا ملازم لڑکا

[illegible] صفائی کا کام کر دیا کرتا تھا جیسے اس کا منتظر ہی تھا فوراً کہنے

"صاحب! وہ مالک مکان آئے تھے کہنے لگے کہ کرایہ دو

ورنہ سامان باہر پھینک دوں گا۔"

پرویز نے ہاتھ ہلا کر اطمینان سے جواب دیا۔

"اس سے کہہ دینا کہ فکر نہ کرے مجھے رقم مل چکی ہے۔" یہ

کہہ کر اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا فوراً ہی اسے خیال آیا کہ

وہ ساری رقم تو دکاندار کو دے چکا ہے چشم زدن میں سارا

واقعہ اس کے سامنے آ گیا۔ میں بھی بے وقوف ہوں خواہ مخواہ

وہم سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا۔ خیر کل جا کر رقم واپس لے

لوں گا۔ مجھے اتنی فضول خرچی نہیں کرنی چاہئے۔

کمرے کی کھڑکیوں میں سے چاندنی پرویز کے بستر، فرش

اور سامنے کی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں

زبان حال سے اپنے مالک کی غربت اور بے کسی پر اظہار افسوس

کر رہی تھیں۔ اچانک پرویز کی نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ عین

درمیان میں وہی بوڑھے آدمی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

پرویز نے فوراً چیخ کر ملازم لڑکے کو آواز دی۔

"میرے کمرے میں کوئی آیا تھا۔۔۔؟"

"نہیں تو۔ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ مالک مکان نے بھی ہوٹل

[illegible] آ کر مجھے کہہ دیا تھا۔ جب سے چابی میرے ہی پاس ہے۔"

پرویز حیرت زدہ سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور باہر جھانکنے

[illegible] کے بعد اس

[illegible] تصویر پر نظر ڈالی۔ چاندنی، وہ دھیا اور اس

[illegible] بوڑھے کی آنکھوں کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چاہا لیٹ گیا مگر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اب بھی بوڑھے کی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہوں۔ اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو دور پھینکا اور بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنی غربت کا نقشہ، مالک مکان کے تقاضے اور اس کی ادھوری تصویریں گھوم رہی تھیں۔ یہ سوچتے سوچتے اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ تب اس نے دیکھا کہ تصویر کا فریم یوں ہٹ گیا جیسے دروازہ کھل جائے اور اس سے بوڑھا نکل کر اس کے بستر کے قریب آنے لگا۔ پھر وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ پرویز کا سانس رکنے لگا اس نے چاہا کہ اُٹھ کر بیٹھ جائے مگر اس کا جسم تو جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ بوڑھے کی آنکھیں مردہ ہوتی ہوئی آگ کی طرح سرد روشن تھیں۔ اور وہ اپنی تمام تر مقناطیسی قوت کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھ سے مت ڈرو۔" بوڑھے نے کہا پرویز کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے لب مسکرا رہے ہوں۔

"مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم اب تک جو کچھ کرتے رہے ہو وہ بڑی حماقت تھی۔ آخر اس طرح وقت گنوانے سے کیا فائدہ؟

کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح تم ایک عظیم مصور بن جاؤ گے یا تمہیں کوئی اور فائدہ حاصل ہو سکے گا؟ ہاں ایک فائدہ ضرور حاصل ہو گا۔" بوڑھے کے چہرے کی جھریوں میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ "تم ایک دن کسی پل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لو گے۔ یہ حماقت ختم کر دو۔ دنیا کی ہر چیز فائدے کے لئے ہے۔ وقت کی قدر سیکھو دن رات میں بے شمار تصاویر بناؤ۔

یہ تنگ و تاریک کمرہ چھوڑ کر کوئی اچھا سا فلیٹ لو۔ مجھے تم اچھے لگتے ہو اس لئے میں تمہیں یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ میں تمہیں دولت بھی دوں گا۔ تم میرے پاس آؤ۔" ایک بار پھر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ پرویز نے ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔ اور بالآخر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر بوڑھے کی شبیہ دھندلی ہوتے ہوئے دوبارہ فریم میں جا کر غائب ہو گئی۔ پرویز ان عجیب و غریب واقعات کے بارے میں سوچتے سوچتے پھر سو گیا

صبح ہی صبح مالک مکان نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی آنکھ کھلی۔ مالک مکان کے ساتھ پولیس انسپکٹر بھی تھا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ قانونی کارروائی کیجئے۔"

"کیا چکر ہے! تو جناب آپ کے ذمے چھ ماہ کا کرایہ واجب الادا ہے؟"

"جی ہاں [illegible] مگر میرے پاس اتنی رقم نہیں کہ [illegible] سکوں تو۔۔؟"

"تو پھر مالک مکان کو حق ہو گا کہ وہ آپ کے سامان میں سے کچھ اشیاء فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لے۔"

"آپ جو جی چاہے یہاں سے لے سکتے ہیں۔" انسپکٹر نے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا۔

"ہاں یہ ادھوری تصاویر بھی بری نہیں ہیں۔ اور وہ کیا ہے۔۔۔ کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی تصویر ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر تصویر کے قریب گیا۔ اس نے کاغذ ہٹا کر اسے دیکھا اور آنکھوں کی حیرت انگیز چمک سے متاثر ہو کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے فریم کو پکڑ رکھا تھا۔ اچانک فریم پر دباؤ پڑا اور بوسیدہ لکڑی چٹخ گئی۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر نیچے گرا اور ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے بہت سارے سکے زمین پر گرے ہوں۔ تینوں نے چونک کر نیچے دیکھا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس ایک پیسہ نہیں پھر یہ سونے کے سکے کہاں سے آئے؟"

"یہ سکے میرے مرحوم والد کی امانت ہیں۔ بہر حال تم اپنا کرایہ تو وصول کر لو۔"

یہ کہہ کر اس نے چند سکے ان کی طرف اچھال دیئے۔ مالک مکان اور انسپکٹر کا رویہ یکسر بدل گیا۔ مالک مکان نے کہا کہ یہ تو سب مذاق تھا۔ مگر اب پرویز ان سب باتوں سے اکتا چکا تھا۔ اس نے اس مکان کو خیر باد کہہ کر اسی دن ایک آراستہ و پیراستہ فلیٹ خرید لیا۔ اس مکان میں آئے ہوئے اسے دوسرا ہی دن تھا کہ دروازے پر گھنٹی بجی اور ایک مہذب اور فیشن ایبل خاتون کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

"میں آپ کو زحمت دینے آئی ہوں۔" خاتون نے بڑے پرتکلف لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ کی فنی مہارت کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔" (پرویز کیلئے یہ بات بڑی حیرت انگیز تھی کہ وہ اتنی جلدی اتنا مشہور ہو چکا ہے) "میں آپ سے اپنی لڑکی کی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔"

لڑکی نے اپنا چہرہ پرویز کی طرف پھیرا۔ پرویز کو چہرے کے تاثرات پڑھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس نے لڑکی کے زرد چہرے کو دیکھا اور فوراً اندازہ لگا لیا کہ لڑکی کو

[illegible]

... اندر ... [illegible] ... اس

[illegible]

... ہوتا ہے ... اس نے ... کیا۔ اس خیال
... اس ... وغیرہ۔ مگر
... اس کے ... آخر اس کی
... بیٹھ گئے۔ ... کھڑا ہوا۔

پھر ... بے حس و حرکت
... رہا تھا ... ایک بار پھر تعجب کا اظہار
... رہی تھی۔ جیسے ... ہو۔

"آ ... نقصانی
... ہے۔ میں نے اپنے اندر کے ... کے ڈھیر تلے
... دفن کر دیا ہے اب میں اسے دوبارہ زندہ کروں گا"

یہ کہہ کر اس نے کینوس اٹھایا اور برش کی مدد سے ایک
... خوردہ فرشتے کی تصویر بنانے لگا۔ یہ اس کی ذہنی
... فیت کی صحیح غماز تھی۔ مگر آہ۔ اس کا برش اب حقیقت
... سے بہت دور جا چکا تھا۔ اس پر نمائش اور دکھاوے کا رنگ
... چڑھ چکا تھا۔ وہ جو بھی تصویر بناتا وہ ایک ہی روپ
... پیش کرتی اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے اور
... آخر اسے ایک خوفناک بیماری نے گھیر لیا۔ تین ہی
... روز میں اس کا حلیہ بدل گیا۔ اب وہ ... نہیں بلکہ اس کا
... سایہ معلوم ہوتا تھا۔ مردہ اور زرد۔

تیمار دار اور عیادت گزار اس کے قریب آتے تو اسے
... ایک تصویروں کے روپ میں نظر آتے۔ اسے دیواروں
... اور کونوں ... سے سیکڑوں ... آنکھیں گھورتی
... [illegible] ... اس کی حالت سے
... [illegible] ... وہ بہت
... [illegible] ... آنکھوں والی تصویر کو
... [illegible] ... مگر وہ تصویر
... [illegible]
... [illegible]
... [illegible]
... [illegible]

... کا نام ہو گیا۔ اور وہ عالم ... [illegible]

اس بڑی سی عالیشان عمارت میں آج ایک مصور کے
تمام شاہکاروں کا نیلام ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی شاندار کاریں
گھر کے سامنے قطاروں میں کھڑی تھیں۔ سب لوگ اتر کر اندر
جا رہے تھے۔ ابھی نیلام کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ کچھ لوگ تصاویر
دیکھ رہے تھے۔ کچھ صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے
ایک تصویر کے آگے بڑی بھیڑ تھی۔ اچانک مجمع میں ہل چل
مچ گئی۔ جب کسی نے چلا کر کہا "میں اس تصویر سے واقف
ہوں" سب لوگ اس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ ایک
سنجیدہ اور باوقار شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جو سب کو
اپنی طرف متوجہ پایا تو کہنے لگا "اس تصویر سے ایک عجیب
کہانی وابستہ ہے" لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے تو اس نے
کہنا شروع کیا۔

کئی سال پہلے کا ذکر ہے کہ جب یہ شہر اتنا ترقی یافتہ
اور خوشحال نہیں تھا یہاں غریبوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں
آباد تھیں جنہیں دو وقت کی روٹی کے لئے سخت جدوجہد
کرنا پڑتی تھی۔ اسی زمانے میں یہاں ایک دولتمند رہتا
تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ لوگوں کو مدد دینے
میں بڑا سخی ہے۔ لوگ اپنی ضرورت کے وقت اگر اس سے
قرض حاصل کرتے جس پر وہ بہت کم شرح سے سود لیا
کرتا تھا لیکن جب بھی لوگ رقم واپس کرنے آتے تو معلوم
ہوتا کہ رقم کئی گنا بڑھ چکی ہے حساب لگایا جاتا۔ تو تخمینہ
صحیح ثابت ہوتا۔ کئی طریقوں سے کھوج لگایا گیا۔ مگر
اس کی جعل سازی کو گرفت میں نہیں لایا جا سکا۔

اسی زمانے میں میرے والد ایک عظیم مصور کی حیثیت سے
شہر میں پہچانے جاتے تھے لیکن فن کے باب میں ان کی شہرت بھی
انہیں معاشی امور سے بے فکر نہ بنا سکی۔ وہ ہر وقت ... رہتے
مگر کبھی کسی کڑی آزمائش نے بھی انہیں اس سود خور کے آگے
ہاتھ پھیلانے سے باز رکھا۔

اور تب ہی زندگی ... کی کڑی آزمائش آ پہنچی جب اس حیرت
انگیز کہانی کا آغاز ہوا۔ گھر میں پیسے کی سخت ضرورت تھی بہت
... مجبور ہو کر انھوں نے ... کے پاس جانے کی ٹھانی۔
... [illegible]
... [illegible]

دروازہ کھولا اور ان کو لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچا جہاں
بوڑھا بستر علالت پر دراز تھا۔ میرے والد کو دیکھتے ہی
وہ بیقرار ہو گیا اور بولا "آ جناب میں آپ ہی کا منتظر تھا"
بڑے حیران ہوئے وہ تو توقع کر رہے تھے کہ وہ ایک سود
خور کے روپ میں ان سے ملے گا۔ مگر اس وقت تو ایسا معلوم
ہو رہا تھا جیسے وہ خود ان سے کچھ طلب کر رہا ہو۔ "میری تصویر
بنا دیجئے" میرے والد اس خواہش پر بہت حیران ہوئے
انھوں نے سمجھایا یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ اس وقت تو آپ
خدا سے لو لگائیں۔ مگر بوڑھا ضد کئے گیا۔ تنگ آ کر وہ راضی
ہو گئے۔ ملازم نے انہیں کینوس اور برش وغیرہ لا کر دیئے
ان کا خیال تھا کہ آئندہ یہ چہرہ پھر کسی شاہکار میں استعمال
کر سکیں گے۔

بوڑھے کی زندگی لمحہ بہ لمحہ مختصر ہو رہی تھی۔ میرے
والد نے جلدی جلدی خاکہ بنایا اور بہتر یہی سمجھا کہ پہلے
آنکھوں کا عکس منتقل کر لیں، کہیں بوڑھے کی آنکھیں بند نہ
ہو جائیں۔ مگر یہ کام بہت مشکل تھا۔ ان آنکھوں میں عجیب
سا تاثر تھا جسے بیان کرنا مشکل ہے وہ ایک گھنٹے کی کوشش
کے بعد ... کامیاب ہو ہی گئے۔ مگر جب انھوں نے خود اسے
... تو خوفزدہ ہو گئے۔ ان آنکھوں میں ایک زندہ ...
کی آنکھوں کی چمک تھی۔ خوف زدہ ہو کر وہ دروازے
کی سمت بھاگے مگر بوڑھے نے اچانک بستر سے اٹھ کر اپنا
استخوانی ہاتھ ان کے کندھے پر رکھ کر ان سے تصویر مکمل کرنے
کی درخواست کی۔ والد نے انکار کر دیا۔ تو اس نے
جھک کر ان کی قمیص کے دامن کو بوسہ دیا۔ اور التجا کرنے
لگا۔ مگر جب والد اس کے باوجود تیار نہ ہوئے تو اس نے
لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "آپ کو اپنے بچوں کا واسطہ اپنی بیوی
کا واسطہ۔ خدا کے لئے تصویر کو مکمل کر دیں۔ میں آپ کو ایک راز
سے آگاہ کرتا ہوں: موت کی پرچھائیوں کا رقص اور تیز
ہو چلا تھا۔ "کہیں آپ اس راز سے کسی اور کو آگاہ نہ کر دیں
ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔ اگر آپ مجھ پر رحم کرنا نہیں چاہتے
تو میں اب مزید درخواست نہیں کروں گا۔ میں بہت جلد
مرنے والا ہوں۔ مگر میری خواہش ہے کہ جب تک دنیا قائم
ہے میں زندہ رہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اگر میری تصویر
بنا دی جائے تو میں زندہ رہوں گا۔ میری آنکھیں ... آپ
... [illegible]

محمد حسن ہاشمی

انگلستان کی سیکرٹ سروس کا چیف آئیسٹر کلیمر اپنے کمرے میں بیٹھا بے چینی سے "چارلس" کا منتظر تھا۔ کمرے کے سکوت میں انٹرکام کا بزر گونج پڑا۔ اس کی سکریٹری اس سے مخاطب تھی "مسٹر چارلس" پہنچ چکا ہے" چیف نے اطمینان کی سانس لی۔ دوسرے لمحے "چارلس" چیف کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

"چارلس" تیئیس سالہ خوبرو نوجوان تھا۔ اس کا جسم مردانہ حسن کا پیکر تھا۔ اس کی آنکھیں چمکیلی اور اعضا مضبوط تھے۔ ہر وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرتی رہتی اور ہر وقت ہی وہ مسکراتا رہتا تھا۔ اس کا شمار سیکرٹ سروس کے [illegible]

"چیف کلیمر" نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ چارلس کو [illegible] کسی اہم مسئلے کی وجہ سے چیف [illegible]

[illegible]

مسکراتے ہوئے کہا۔

"چارلس مجھے اچھی طرح معلوم ہے ان دنوں تم ایک کیس کی تفتیش میں مصروف ہو۔ لیکن ایک بہت اہم معاملے میں تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔" چارلس خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

کلیمر کچھ دیر تک آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ چارلس بہتر یہ ہے کہ میں تمہیں شروع سے سب کچھ بتا دوں۔ میں تمہیں محکمے کا ایک بہت اہم راز بتانا چاہتا ہوں۔ جسے صرف چند خاص لوگ ہی جانتے ہیں۔ کلیمر کہہ رہا تھا۔ محکمے کی سب سے اہم فائل ایکس (X 11) کے متعلق تمہیں علم ہوگا۔ یہ انتہائی خفیہ فائل ہے . . . . . اور یہ فائل کہاں ہے یہ اب تک یہ راز تھا۔ دراصل ایکس فائل ہمارے محکمے کی دو لڑکیوں کے دماغ میں پوشیدہ ہے۔"

یہ سن کر چارلس حیران رہ گیا۔ چیف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حیرانی کی کوئی بات نہیں چارلس یہ سب کچھ

صرف فائل کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اکثر غائب رہنے لگی ہے۔ محکمے کے سیکورٹی والوں نے ہمیشہ اس کی نگرانی کرنی چاہی۔ لیکن ہر دفعہ انہیں ناکامی ہوئی۔ آج بھی تین دنوں کی غیر حاضری کے بعد وہ آئی ہے اس عرصے میں وہ کہاں رہی یہ بات کسی کے علم میں نہیں۔ کلیمر اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"چارلس تم ان لڑکیوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان کی قیمت کروڑوں پونڈ سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے دماغ میں ہمارے سائنسدانوں کی برسہا برس کی کوشش کے فارمولے محفوظ ہیں۔ اور یہ سب کچھ میرے ایما پر ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب سے محفوظ طریقہ ہے۔"

وہ ابھی کچھ اور کہنے والا تھا کہ درمیان میں انٹرکام پر اس کی سکریٹری نے "وشنی" کی آمد کی اطلاع دی۔ وشنی نے بارہا چارلس کے مددگار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

کلیمر نے چارلس کو مخاطب کیا۔ میں نے تمہاری مدد کیلئے وشنی کو بھی بلوا لیا ہے۔ اور اسی وقت وشنی کمرے میں داخل ہوا۔ چیف نے ٹیلیفون پر کسی سے گفتگو کی اور اس سے مخاطب ہوا۔ اس وقت دونوں لڑکیاں لیبوریٹری میں موجود ہیں۔ بہتر ہے تم بھی ان دونوں کو دیکھ لو۔ کیونکہ اب تک ان کی حفاظت کی خاطر "سیکرٹ سروس" میں ان کی شمولیت کو پوشیدہ راز میں رکھا گیا تھا۔ اور صرف چند خاص آدمیوں کے علاوہ وہاں دونوں کے متعلق کسی کو علم نہیں تھا۔

لیبوریٹری کے استقبالیے پر ہی انہیں لیبوریٹری کا انچارج مل گیا۔ وہ کلیمر ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید کلیمر نے اسی سے فون پر بات چیت کی تھی۔ چند کمروں سے گزرتے ہوئے وہ لیبوریٹری میں داخل ہوئے جہاں ہلکا سرخ بلب روشن تھا۔ لیبوریٹری کا ایک گوشہ ابھی تک تاریکی میں تھا۔ سنبھلتے ہوئے وہ لوگ تاریک گوشے کی جانب بڑھے وہاں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ خاموشی سے وہاں بیٹھ گئے۔ لیبوریٹری کا انچارج انہیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد لیبوریٹری کا دوسرا اندرونی دروازہ کھلا۔ اور چارلس نے دیکھا دو حسین لڑکیاں آپس میں گفتگو کرتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ چارلس ان دونوں کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکیاں واقعی حسین تھیں۔ چارلس نے غور سے دیکھا۔

[illegible] ایک [illegible] مشکل صورت بات کرنے [illegible] دوسرے سے حیرت انگیز حد تک مشابہ تھی۔

کلیمر نے سرگوشی کی۔ "داہنی طرف والی لڑکی کا نام تائیرا ہے۔ یہی لڑکی اکثر غائب ہوجاتی ہے اور دوسری ہے اسکی [illegible] ٹیکل۔"

دونوں لڑکیاں لیبوریٹری میں پڑی میز کے قریب کھڑی تھیں۔ دروازہ پھر کھلا اس دفعہ داخل ہونیوالا ایک مرد تھا سفید لباس میں ملبوس لڑکھڑاتا ڈاکٹر لیبوریٹری میں داخل ہو رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں رائٹنگ پیڈ اور دوسرے میں پنسل تھی میز کے قریب پہنچ کر ڈاکٹر نے لڑکی سے کچھ کہا۔ جواباً لڑکی بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ کلیمر نے چارلس سے سرگوشی کی۔

"ڈاکٹر ٹیکل اس سے کسی فارمولے کے متعلق دریافت کررہا ہے۔"

سیکرٹ سروس کا چیف آفیسر چارلس بتا رہا تھا۔

"ایکس" دو حصوں میں تقسیم ہے۔ فارمولے کا نصف حصہ تائیرا کے دماغ میں ہے اور نصف "ٹیکل" کے دماغ میں یہ لڑکیاں بہترین فائل ہیں انھیں خود علم نہیں کہ ان کے دماغ تک اتنے اہم فارمولے رکھے گئے ہیں۔ انھیں پہلے ہپناٹائز کیاجاتاہے اور اس کے بعد فارمولا ذہن نشین کرادیا جاتاہے۔"

رات کا ایک بج رہا تھا۔ دسمبر کی سرد رات تھی پورا شہر سنسان تھا۔ چارلس کی سیاہ امپالا کو نتارک کی چکنی سڑک پر تیزی سے دوڑی جارہی تھی۔ اسٹیرنگ پر بیٹھا چارلس بہت دور سرخ لائٹ پر اپنی نگاہیں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ شام ہی سے وہ تائیرا کے تعاقب میں تھا۔ مختلف مقامات پر وقت گزارنے کے بعد اب وہ شہر سے باہر جارہی تھی۔ دونوں گاڑیاں شہر کی حدود سے باہر نکل چکی تھیں۔ تعاقب جاری تھا۔ چارلس نے اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھادی تھیں۔ آگے ایک قصبہ تھا چارلس پہلے بھی یہاں اکثر اپنی تعطیلات گزارنے آیا کرتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک چھوٹے پل کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

یکایک اگلی گاڑی رک گئی۔ چارلس نے بھی رفتار کم کرلی قریب پہنچکر اس نے دیکھا۔ پل کے دوسری طرف تائیرا کی گاڑی سے ایک کار نے ٹکر لگائی تھی گاڑی کا اگلا حصہ تھوڑا پچک گیا تھا اور داہنی جانب کی لائٹ بھی ٹوٹ گئی تھی تائیرا کو دو تین آدمی گھیرے ہوئے تھے۔ وہ شخص جس کی گاڑی [illegible] تھی کافی غصے میں تھا۔ چارلس کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر [illegible]

"تائیرا" اس کے قریب [illegible] بڑی مشکل سے چارلس نے [illegible] دیکھ کر تائیرا کو وہاں سے چھٹکارا دلایا۔

تائیرا کی گاڑی سڑک کے کنارے لگادی گئی اور وہ بھی چارلس کی کار میں آگئی۔ چارلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"قریب ہی ریسٹوران ہے۔ میں نے ابھی کھانا بھی نہیں کھایا ہے لہٰذا رات گزارنے کا انتظام بھی کرنا ہے اگر آپ میرا ساتھ دینا چاہیں تو بہت بہتر ہے ورنہ اگر آپ کو کہیں پہنچنا ہے تو میری گاڑی حاضر ہے۔"

تائیرا نے جواب دیا۔ "نہیں اب رات میں کہیں جانا ٹھیک نہیں۔ آیئے ریسٹوران میں چلتے ہیں۔ مجھے جہاں جانا ہے وہاں صبح کو چلی جاؤں گی۔"

دوسرے دن تقریباً صبح نو بجے چارلس بیدار ہوا اس نے دیکھا بستر پر وہ تنہا پڑا ہے۔ وہ رات بھر اس کے قریب ہی تھی۔ ابھی تک بستر اس حسین لڑکی کے جسم کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس نے انگڑائی لی رات کی تھکان ابھی تک برقرار تھی اس نے سمجھا شاید تائیرا ڈرائنگ ہال میں ہو۔ جب وہ تیار ہوکر نیچے آیا تو وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ ریسٹوران کے مالک نے بتایا کہ وہ صبح چھ بجے ہی یہاں سے جاچکی۔ چارلس کو غصہ آگیا ساری محنت برباد گئی۔ لڑکی پھر غائب تھی۔ چارلس نے ٹیلی فون پر کلیمر کو اطلاع دی کہ تائیرا پھر غائب ہوگئی ہے کلیمر نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"چارلس اسے تلاش کرو وہ جہاں بھی ہے اسے تلاش کرنا تمہارا کام ہے۔ تمہیں ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا ہے۔" اتنا کہہ کر کلیمر نے لائن بند کردی۔

ایک ہفتہ سے چارلس اس کی تلاش میں تھا لیکن ابھی تک تائیرا کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ چارلس گم سم بیٹھا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب سے دشمنی مخاطب تھا۔

"جناب دوسری لڑکی کو بھی اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن ہم لوگوں کی بروقت مداخلت نے ان کے ارادے کو ناکام بنادیا۔ تعاقب کے باوجود وہ لوگ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ویسے میں نے ان میں سے ایک شخص کو پہچان لیا ہے۔ اسے اکثر "زاگورا" کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔" اتنا کہہ کر دشمنی نے لائن بند کردی۔

"زاگورا"... چارلس زیر لب بڑبڑایا تو گویا اس میں "زاگورا" کا ہاتھ ہے۔

زاگورا کے متعلق [illegible] معلوم تھا وہ ایک بہت بڑا ماہر علم نجوم اور روحانیت ہے۔ شہر کے اونچے طبقے کی عورتیں اس کی بے انتہا معتقد اور اس کے حکم کی غلام ہیں۔ زاگورا بہت کم کہیں باہر دیکھا گیا تھا اس کے معتقدین خود اس کے پاس جاتے تھے۔ اور وہاں کیا ہوتا تھا یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ سرکاری حکام کا خیال تھا کہ زاگورا غیر ملکی ایجنٹ ہے اور سوسائٹی کے اونچے طبقے کی عورتوں پر اپنا جادو چلا کر حکومت کے راز اڑایا کرتا ہے۔ مستقل نگرانی کے باوجود پولیس اسکے خلاف کوئی ثبوت حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی اور بغیر کسی ثبوت کے اس پر ہاتھ ڈالنا مشکل تھا کیونکہ بڑے بڑے افسران کی بیویاں اسکی معتقد تھیں اور اس سے روحانی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

ٹیلیفون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا تانا بانا توڑ دیا دوسری طرف اس کا چیف کہہ رہا تھا۔

"چارلس، زاگورا کے متعلق بھی کچھ اہم اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ تم فوراً یہاں آجاؤ کیونکہ دشمنی کے بیان کے مطابق "ٹیکل" کو اغوا کرنے والوں میں زاگورا کا بھی ایک آدمی شامل تھا اور مجھے شک ہے کہ تائیرا، زاگورا کے چکر میں پھنس گئی ہے۔"

"کلیمر کے دفتر میں داخل ہوتے ہی چارلس کی نظر عمر رسیدہ شخص پر پڑی۔ چیف نے اس شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"چارلس، یہ مسٹر کارڈن ہیں فرانس میں ہماری سیکرٹ سروس کے نمائندے۔ ان کی اطلاع کے مطابق" زاگورا دو دن قبل فرانس پہنچا ہے اور یقیناً تائیرا بھی وہیں ہے۔ تمہیں فوراً ان کے ساتھ فرانس جانا ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں "ٹیکل" کی نگرانی "دشمنی" کے سپرد رہیگی۔ فرانس میں تمہیں اپنے طور پر اس کیس کو نبٹانا ہے۔ ویسے مسٹر کارڈن تمہیں ہر طرح کی مدد پہنچائیں گے۔"

ایئر فرانس کا طیارہ محو پرواز تھا اگلی نشست پر صرف دو شخص بیٹھے تھے چارلس اور کارڈن۔ کارڈن سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر چارلس، میں سمجھتا ہوں کہ آپ زاگورا [illegible] سے قبل اس کے متعلق ساری معلومات حاصل [illegible] ویسے آپ کی ذہانت سے مجھے بڑی امید ہے کہ [illegible]

متعلق آپ کو کافی معلومات حاصل ہوں گی۔ میرے خیال میں یہ معلومات آپ کے لئے سود مند ثابت ہوں اور ویسے بھی سفر کاٹنے کے لئے اس سے دلچسپ اور کون سا موضوع ہوگا۔

چارلس کے ایما پر کارڈن نے کہنا شروع کیا۔

"ہم اگر زاگورا کو صرف یہ کہیں کہ وہ فطرتاً تخریب پسند ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ یورپی ممالک کے اہم راز دوسرے ملکوں تک پہنچائے اور مختلف ممالک کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دے اگر دو ممالک کے تعلقات آپس میں بہتر ہو رہے ہوں اور یہ بہتری اگر زاگورا کے خیال میں غلط ہو تو تعلقات کی بہتری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر سب سے بڑی مشکل اس راز کو جاننا ہے کہ زاگورا اصل میں کس ملک کا ایجنٹ ہے اور وہ کون اشخاص ہیں جو اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ زاگورا جہاں بھی جاتا ہے اس کے ساتھ ایک منظم جماعت ہوتی ہے۔ جس میں جاسوس بھی ہوتے ہیں اور بدمعاش بھی۔ زاگورا کی جماعت سے منسلک لوگوں کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ انھیں بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں ان کا مقام اعلیٰ سوسائٹی میں ہوتا ہے۔ انھیں ہر قسم کی سہولیت بہم پہنچائی جاتی ہے اور یہ سارا کام اتنے منظم طریقے سے انجام پاتا ہے کہ آج تک "زاگورا" پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا ہے۔ زاگورا کا کوئی ایجنٹ اگر گرفت میں آتا ہے تو خاموشی سے خودکشی کر لیتا ہے۔

کارڈن نے دوسری سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "زاگورا بہت عیاش ہے وہ جہاں بھی جاتا ہے وہاں کی اونچی سوسائٹی میں مقام پیدا کر لیتا ہے پھر اونچی سوسائٹی کی عورتیں اس کی معشوقہ بن جاتی ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ زاگورا ان عورتوں کو جبراً اپنے دباؤ میں لا کر اپنے لئے کام لیتا ہے لیکن یہ غلط ہے عورتیں اور لڑکیاں جو کچھ بھی کرتی ہیں وہ خود اپنی مرضی سے کرتی ہیں۔ زاگورا کا قرب حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہو جاتی ہیں ابھی حال ہی میں ایک عورت نے جو یہاں کے سب سے بڑے تاجر کی بیوی تھی، دم توڑتے وقت صرف اتنا کہا تھا "زاگورا میرے آقا" ڈاکٹروں کی رائے میں یہ ہارٹ فیلیر کا کیس تھا موت سے قبل اس پر ہنسی کا دورہ پڑا اور ہنستے ہنستے ہی اس نے دم توڑ دیا بعد میں پتہ چلا کہ وہ زاگورا کے معتقدین میں سے تھی۔ کارڈن نے کچھ دیر رکتے ہوئے کہا جہاں تک مجھے واقفیت ہے

معلوم ہے پیر پر زاگورا کے قاتل ہیں پایا جاتا ہے جس کی ڈبلو میں ایک خاص قسم کا پاؤڈر ملا ہے جس کے استعمال سے انسان ہنستے ہنستے اپنی جان دے دیتا ہے۔ کارڈن نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا "ابھی تک یہ بات زاگورا کے ریکارڈ پر نہیں آسکی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ زاگورا قاتل بھی ہے"۔

تھوڑی دیر بعد طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا ائرپورٹ سے باہر آکر چارلس نے ٹیکسی لی اور "زاگورا" کے محل کی جانب ہو لیا۔ اس کے پاس "زاگورا" کی ایک معتقد عورت کا تعارفی خط تھا جو اسے کارڈن نے دیا تھا۔ ٹیکسی شہر سے نکل کر ویرانے کی جانب بڑھ رہی تھی دور پہاڑی پر چارلس نے بڑا سا سفید دھبا دیکھا۔ پہاڑی پر محل کا بڑا مینار دور ہی سے نمایاں تھا۔ محل کے آگے خوبصورت درخت اگے ہوئے تھے اور ایک طرف چشمہ بہتا تھا جو پاس ہی واقع جھیل سے جا ملتا تھا۔ محل کی پشت پر پہاڑی کی بڑی چوٹی سایہ کئے ہوئے تھی۔ محل تک سڑک پتھر کاٹ کر بنائی گئی تھی۔

ٹیکسی نے اسے محل کے پھاٹک پر اتارا اور واپس ہو گئی پھاٹک پر مسلح پہرے دار تعینات تھا۔ تعارفی خط دکھانے کے بعد اندر جانے کی اجازت ملی ایک فرلانگ چلنے کے بعد اسے تین لڑکیاں نظر آئیں جو اس کے استقبال کو موجود تھیں تینوں نے قدرے خم ہوتے ہوئے اس سے درخواست کی عظیم زاگورا کے دیدار سے پہلے غسل ضروری ہے اور پھر آناً فاناً انھوں نے چارلس کے کپڑے اتار ڈالے صورت حال ایسی اور اتنی جلدی رونما ہوئی تھی کہ چارلس کچھ سمجھ نہ سکا وہ مادر زاد برہنہ کھڑا تھا اس کے کپڑے لڑکیوں کے قبضے میں تھے اور وہ تینوں اس قدر سنجیدہ تھیں گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ ان میں سے ایک نے اس کا بازو پکڑا اور سوئمنگ پول کی جانب اشارہ کیا چارلس نے بھی اسی میں بھلائی سوچی اور تالاب میں کود گیا۔ اچھی طرح نہا چکنے کے بعد جب وہ باہر آیا تو ان میں ہی سے ایک لڑکی اس کے لئے تولیہ لئے کھڑی تھی بدن خشک کرنے کے بعد اسے نیلے رنگ کا ایک ریشمی گاؤن پیش کرتے ہوئے لڑکی نے کہا آپ کے کپڑے احتیاط سے رکھ دیئے گئے ہیں مقدس زاگورا سے ملاقات کے وقت آپ کو اسی پوشاک میں جانا ہوگا لڑکی اسے لئے ہوئے ایک نفیس کمرے میں آئی یہاں عجیب قسم کی مدہوش کن خوشبو اٹھ رہی تھی۔ فرش پر بہترین قالین بچھا تھا اور دیواروں پر مصوری کے نادر نمونے ترتیب سے سجے

ہوئے تھے چارلس وہاں ٹھیک ایک گھنٹہ رہا تھا کمرے کا پورا ماحول اسے مسحور کئے دے رہا تھا لڑکی اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر جا چکی تھی اسے اس وقت ہوش آیا جب "زاگورا" اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ تو دیکھا زاگورا پادریوں جیسی پوشاک پہنے تمکنت سے کھڑا تھا ہندو پنڈتوں کی طرح اس کے سر کے بال کٹے ہوئے تھے اور درمیان سے بالوں کی ایک لمبی سی لٹ پیچھے گردن کی جانب لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کا تقدس تھا اور اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک تھی۔ باوجود کوشش کے چارلس اس سے نظریں ملانے سے قاصر رہا مسکراتے ہوئے زاگورا نے کہا "میرے بیٹے ہماری معتقد نے لکھا ہے تم روحانی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

"ہمیں بڑی خوشی ہے لیکن اس کے لئے تمہیں کچھ دن ہمارا مہمان بننا پڑے گا۔ چارلس کی چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ وہ اس وقت خطروں میں گھرا ہوا ہے، زاگورا کہہ رہا تھا میرے بیٹے تمہیں اس مقدس فریضے کے لئے قربانیاں پیش کرنی ہوں گی تم یہاں نئی نئی چیزیں دیکھو گے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ان ساری باتوں سے تمہاری روح کو تسکین ملے گی۔ اسے دوسری جانب متوجہ پا کر زاگورا نے کہا میری طرف دیکھو بیٹے۔ چارلس نے دیکھا زاگورا کی آنکھیں اس کے ذہن میں پیوست ہوتی جا رہی ہیں وہ سمجھ رہا تھا کہ زاگورا اسے ہپناٹائز کرنا چاہ رہا ہے وہ اپنی پوری قوت ارادی سے مدافعت کر رہا تھا۔ زاگورا نے مسکراتے ہوئے تالی بجائی اور دوسرے ہی لمحے ایک عجیب الخلقت انسان کمرے میں داخل ہوا ایسا انسان چارلس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اس کا سر چپٹا جیسا تھا۔ قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا وہ کسی ہاتھی کی طرح مضبوط تھا۔ رنگ اتنا سیاہ کہ تاریکی کا جز لیکن آنکھیں معلوم ہوتا تھا چہرے پر دو دہکتے ہوئے انگارے رکھے ہیں زاگورا نے کہا "میرے بیٹے گھبراؤ نہیں یہ میرا خاص غلام ہے یہ دنیا کی کوئی زبان نہیں سمجھتا سوائے میرے حکم کے میں نے اسے زنگی سے خریدا تھا اس کی شکل قدیم مصری دیوتا سے ملتی جلتی ہے یہ کسی ارنے بھینسے کی طرح مضبوط اور کتوں سے زیادہ ذکی الحس ہے۔ ویسے یہ چڑیلوں کے سدھانے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا زاگورا کے اشارے پر اس جانور نما انسان نے میز پر شراب سجا دی بہترین نفیس قسم کی شراب کے بعد زاگورا اسے لئے ہوئے

[illegible]

رنگین قالینوں پر نیم برہنہ لباس پہنے کنیزیں [illegible] موجود تھیں۔
[illegible] نے غور کیا ان میں ہر رنگ اور ہر نسل کی لڑکیاں شامل تھیں۔
اور سب کھانے سے چارلس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ
کسی [illegible] شاہزادے کا مہمان ہو لیکن ان لڑکیوں میں تائیرا
موجود نہیں تھی۔ کھانے کے بعد ایک لڑکی نے چارلس کو اس کے
کمرے میں پہنچا دیا۔ یہاں اس کے کپڑے ایک طرف احتیاط سے رکھے
تھے چارلس نے تلاشی لی ساری چیزیں جوں کی توں موجود
تھیں حتیٰ کہ اس کا ریوالور تک ویسے ہی اس کے کوٹ کی
جیب میں پڑا تھا۔

آدھی رات گزر جانے کے بعد چارلس آہستگی سے اپنے کمرے
سے نکلا پتلی سی راہداری سے ہوتا ہوا وہ داہنی جانب
مڑ گیا۔ بڑے سے کمرے میں نیلی روشنی ہو رہی تھی۔ چھپ کر
چارلس نے دیکھنا شروع کیا۔ کمرے کا عجیب ہی منظر تھا۔ مقدس
گروہ "زاگورا" برہنہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا۔ شراب
کا دور چل رہا تھا اور گروہ پر اس وقت شیطان سوار تھا۔

چارلس غور سے ایک ایک لڑکی کو دیکھ رہا تھا لیکن ان میں
بھی تائیرا نہیں تھی چارلس بڑے انہماک سے یہ کھیل دیکھ رہا
تھا کہ ایک آہٹ ہوئی اور چارلس جھپٹ کر دوسری جانب
ہو گیا اس نے دیکھا ایک لڑکی زاگورا جیسا لباس پہنے کمرے میں
داخل ہو رہی تھی اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر ساری
لڑکیاں ادب سے ایک جانب ہو گئیں۔ زاگورا نے کھڑے
ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے اسے کپڑوں سے آزاد کیا اور اپنی آغوش
میں سمیٹ لیا۔ اسی وقت چارلس نے دیکھا ایک سایہ راہداری
سے گزرا یہ زاگورا کا خاص غلام جانور نما انسان (بلیک) تھا اسے
دیکھ کر چارلس کو پسینے چھوٹ گئے شاید اس کو پتا چل گیا تھا کہ
چارلس اپنے کمرے میں نہیں ہے اور اب وہ اس کی تلاش
میں تھا۔ بلیک دوسری جانب مڑ گیا۔ اسے مڑتا دیکھ کر چارلس
بھی خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیا بہت دور ایک کمرے
میں روشنی ہو رہی تھی۔ بلیک نے وہاں کھڑے ہو کر کمرے
کی آہٹ لی اور پھر آگے بڑھ گیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل
ہو گیا تو تیزی سے چارلس اس کمرے کے پاس پہنچا جہاں ابھی
بلیک کھڑا تھا۔ چارلس نے ادھر ادھر دیکھا یہاں روشنی راہداری
سے [illegible] رہی تھی اس نے شیشوں سے جھانک کر دیکھا سامنے
مسہری پر تائیرا سو رہی تھی نیند میں اس کا بدن [illegible]

[illegible]

[illegible]
پھر [illegible]
پھر جھپٹ کر دروازہ کھول دیا کمرے میں داخل ہوتے ہی چارلس
نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم اپنی خوشی سے یہاں آئی ہو۔
نہیں۔ تائیرا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ تو نکل چلو
چارلس نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا وقت بہت کم ہے
زاگورا کو شاید اب تک اطلاع مل چکی ہو۔ چارلس نے سوچا
راہداری سے نکلنا بہت مشکل ہے اس نے کمرے کی دوسری
طرف روشندان سے فرار ہونا بہتر سمجھا احتیاط سے کمرے کا
دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے مسہری کو دیوار
سے لگایا اور دوسرے [illegible] روشندان سے باہر اس کی [illegible]
تھی وہ اس وقت لان میں آسانی سے اتر سکتا تھا۔ واپس کمرے
میں آ کر پہلے اس نے تائیرا کو چلنے کا اشارہ کیا اور اس کے پیچھے خود
آیا نیچے آجانے کے بعد وہ تیزی سے دوڑتا ہوا تائیرا کو لئے جھاڑیوں
میں چھپ گیا اس نے ایک ہاتھ میں ریوالور تھام رکھا تھا اور
دوسرے ہاتھ میں تائیرا کو بازوؤں میں سمیٹے ہوئے تھا۔ تائیرا
خوف سے کانپ رہی تھی۔ محل کی چار دیواری سے باہر
پہنچنا ناممکن سی بات تھی اب ایک ہی راستہ تھا پھاٹک
کا، چارلس چھپتا ہوا پھاٹک تک پہنچ گیا۔ تقریباً دس گز دور
محل کا پھاٹک تھا۔ اس نے تائیرا کو وہیں جھاڑیوں میں چھپے
رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا تم یہیں انتظار کرو میں آگے
جاتا ہوں اگر میں آواز دوں تو آجانا اور اگر مجھے مصیبت میں
گرفتار دیکھو تو خاموشی سے محل میں واپس چلی جانا۔ پھاٹک پر
سنتری کھڑا تھا چارلس نے ایک پتھر اٹھایا اور جھاڑیوں میں
اچھال دیا پتھر کی آواز سن کر سنتری چوکنا ہو گیا۔ دوسرے ہی
لمحے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف آ رہا تھا چارلس پوری طرح
تیار تھا سنتری کے قریب آتے ہی اس نے جھپٹ کر ایک ہاتھ
اس کے منہ پر رکھا اور ریوالور کا دستہ تیزی سے اس کے سر پر
مارا۔ سنتری بے ہوش ہو کر جھاڑیوں میں لڑھک گیا چارلس ہانپ
رہا تھا اور تائیرا اس کے قریب کھڑی دہشت سے کانپ
رہی تھی اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا تمہیں تو چوٹ نہیں
آئی چارلس خاموش! چارلس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے
سرگوشی کی ابھی خطرہ موجود ہے۔ اسی وقت محل میں کہیں گھنٹے
بجنے کی آواز آئی [illegible]
[illegible] نہیں ہے۔ چارلس [illegible] پھاٹک [illegible]

[illegible]
چاہا [illegible] چارلس نے [illegible] چند لمحوں
[illegible] ورنہ گرفتاری
[illegible] تائیرا
دہشت سے چارلس سے چمٹ گئی اسی وقت چارلس کے سر پر ایک زبردست
چوٹ لگی اور وہ لڑکھڑا کر بلیک کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

آنکھ کھلی تو چارلس نے دوبارہ خود کو اسی کمرے میں پایا
زاگورا اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا صبح
بخیر چارلس "تم یہ سمجھ رہے تھے" زاگورا کی آنکھوں میں دھول
جھونک دو گے یہ تمہاری خام خیالی ہے تمہارے متعلق ہمیں
پوری خبر تھی۔ ہم خود تمہاری تلاش میں تھے اور تم نے
ہماری مشکل آسان کر دی خود میرے قدموں میں چلے آئے۔
غصے میں زاگورا کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ چارلس تمہیں یہ جان کر
واقعی دکھ پہنچے گا کہ میں نے تمہارے لئے موت کا حکم دے دیا ہے
خوف سے چارلس کی زبان گنگ تھی اس کا واحد سہارا ریوالور
بھی اب اس کے پاس نہیں تھا۔ سر میں ابھی تک بہت تکلیف
تھی خون کافی مقدار میں نکلا تھا اور چارلس کو نقاہت محسوس
ہو رہی تھی اس کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ معلوم
تائیرا کس حال میں ہے پھر خود ہی اس نے اپنے خیال کی تردید
کر دی اسے اچھی طرح معلوم تھا جب تک زاگورا تائیرا کے
ذہن میں قید فارمولے کو حاصل نہیں کر لے گا اسے کوئی نقصان
نہیں پہنچائے گا یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ زاگورا کہہ رہا
تھا۔ چارلس تم نے کبھی پارسیوں کو دیکھا ہے؟ تمہیں معلوم
ہے وہ اپنے مردے کو گوشت خور پرندوں کے حوالے کر دیتے
ہیں میں نے بھی تمہارے لئے ایسی ہی موت کا انتظام کیا ہے
لیکن اس میں ایک جدت ہے گوشت خور پرندے تمہارے
متحرک جسم کی بوٹیاں نوچیں گے میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا
کہ بلیک پرندوں کو سدھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا [illegible]
اس نے اسی کام کے لئے یہ گوشت خور پرندے سدھائے
ہیں [illegible] مجرم کو "زاگورا" کے انتقام کی بھینٹ چڑھانے [illegible]
کے بدن میں [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

... [illegible] ... تھا اس

نے ... [illegible] ...

چند ... [illegible] ... گیا

چلا گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرہ ... [illegible] ... تک لیٹا تھا اس نے اٹھنا چاہا لیکن نہ اٹھ سکا اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے سینے پر رکھے تھے۔ اور اس کے دونوں پاؤں بھی سخت ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے نظریں گھمائیں وہ ایک کھلی چھت پر پڑا تھا اس کی داہنی جانب کچھ فاصلے پر ایک بند دروازہ تھا دوسری طرف ایک درخت کی شاخ چھت پر جھول رہی تھی۔ گویا شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا کر زاگورا نے اسے یہاں ڈلوا دیا تھا ابھی وہ صورت حال سے نبٹنے کے لئے تیار بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک بہت بڑا پرندہ اس پر جھپٹتا ہوا نکل گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، اتنا خوفناک پرندہ اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے بندھے ہاتھوں سے مدافعت کر رہا تھا اور پرندے اس پر حملہ کر رہے تھے۔ ایک نے اس کے سینے پر چونچ ماری اور گوشت کی بوٹی لے اڑا۔ تکلیف سے چارلس دیوانہ ہو گیا وہ پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھ چلا رہا تھا لیکن بے سود دوسرے حملے میں اس کے بائیں ہاتھ میں پرندے کی چونچ نشتر کی طرح چبھی اس دفعہ دو تین پرندوں نے بیک وقت حملہ کیا اس نے پھر بے قراری سے اپنے ہاتھ گھمائے ایک کی چونچ چھلتی ہوئی اس کے چہرے پر پڑی اور دوسرے نے اس کے ہاتھ پر حملہ کیا چارلس کی قسمت اچھی تھی پرندے کی چونچ نے ہاتھ میں بندھی ہوئی ڈوری کی گرہ کھول دی تھی چارلس کے ہاتھ پر رسی ڈھیلی ہوتی معلوم ہوتی اس نے ہاتھ اٹھا کر دیکھا اور خوشی سے آنکھوں میں آنسو آگئے موت سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ تیار تھا اس نے ہاتھ آزاد کئے اور پھر دونوں پیروں کی ڈوری کھولی اس کی قمیض خون سے تر ہو رہی تھی ہاتھ میں بھی بہت تکلیف تھی لیکن اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اسے اٹھتا دیکھ کر پرندے بھی دور ہٹ گئے شاید اس سے خوف زدہ ہو گئے تھے تیزی سے اٹھ کر چارلس دروازے کی طرف لپکا ... [illegible] ... وہ

[illegible]

... [illegible] ... شاید ... [illegible] ... وہ یہاں لایا گیا ہوگا مکان کچھ ... [illegible] ... دیواریں کھڑی تھیں اور دیوار کے ساتھ ہی پہاڑی قطار کھڑی تھی۔ چارلس نہیں سمجھ سکا وہ کہاں ہے لیکن اسے اتنا یقین تھا کہ یہ جگہ یقیناً شہر سے دور اور خود زاگورا کے محل سے بھی دور ہوگی۔ ورنہ اسے بے ہوشی کی حالت میں یہاں نہیں لایا جاتا چارلس جانتا تھا یہاں بلیک بھی موجود ہوگا۔ اور اس وقت اس کی آنکھیں اس کی تلاش میں تھیں۔ ملازمین کی کوارٹرز کی جانب سے اسے دھواں اٹھتا دکھائی دیا چارلس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ وہ چھپتا چھپاتا اس طرف بڑھنے لگا۔ وہ نہتا تھا اس نے زمین پر ادھر ادھر نظر دوڑائی جلد ہی اسے ایک بڑا سا پتھر مل گیا اس نے پتھر اٹھایا اور دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ کوارٹر کا کواڑ آدھا کھلا ہوا تھا اسے "بلیک" کی پشت نظر آئی نہ معلوم کس قسم کے کاغذات تھے جنہیں وہ بیٹھا جلا رہا تھا چارلس نے اپنی پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر اس کے سر پر دے مارا ایک بھیانک چیخ کے ساتھ بلیک کا بھیجا فرش پر بکھر گیا اس کا جسم فرش پر اچھل رہا تھا اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔ اف کتنا بھیانک نظر آ رہا تھا وہ اسکے چہرے کی ہیئت اتنی بھیانک ہو گئی تھی کہ دیکھ کر خوف معلوم ہونے لگتا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے ملک کے سفارت خانے میں بیٹھا سیکرٹ سروس کے چیف آفیسر کلیمر سے گفتگو کر رہا تھا۔ اسکی بات سن کر ایجنٹ نے کہا اچھی بات ہے چارلس یہاں سے چند ایجنٹ آج ہی تمہاری مدد کو پہنچ رہے ہیں یہ سب لوگ اسی ہوٹل میں ٹھہریں گے جہاں تمہارا قیام ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق جیکل بھی اسی طیارے سے روانہ ہوگی لیکن اس کے دوسرے ساتھی اس کے لئے اجنبی کی طرح ہوں گے وہ دور سے اس پر نگاہ رکھیں گے اور تمہیں صورت حال سے آگاہ کریں گے جیسا کہ تم نے خدشہ ظاہر کیا ہے۔ زاگورا کے آدمی فارمولے کے دوسرے نصف حصے کے لئے جیکل کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گے اگر وہاں پہنچنے سے قبل ایسا کیا گیا تو مداخلت کی جائے گی ورنہ وہاں تم خود صورت حال سے نبٹو گے۔ کلیمر سے گفتگو کے بعد چارلس ہوٹل ... [illegible] ... سے آ کر بستر پر گر گیا اس کے زخموں میں تکلیف

بات کے ... [illegible] ... میں اپنے ... [illegible] ... کے ساتھ بیٹھا تھا جیکل بھی وہاں موجود تھی۔ چارلس انہیں سمجھا رہا تھا ہم سب لوگ ایک پل کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ زاگورا کے آدمی اسے اغوا کی کوشش کریں گے اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے ہم زاگورا تک پہنچیں گے کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے فرار کے بعد زاگورا اب اپنی پرانی جگہ موجود نہیں ہے۔

دو دن گزر گئے اور کچھ نہیں ہوا جیکل بے فکر سے گھومتی پھرتی لیکن کوئی بھی اس کے پیچھے نہیں تھا۔ اسی رات ایک شخص جیکل کا تعاقب کرتا ہوا ہوٹل میں آیا۔ چارلس کے ساتھیوں نے آپس میں اشارے کئے چارلس نے بہت غور کیا لیکن اس شخص کو اس نے پہلے زاگورا کے محل میں نہیں دیکھا تھا۔ جیکل جس میز پر بیٹھی تھی اسی کی برابر والی میز پر وہ بھی آ بیٹھا چارلس نے جیکل کو اشارہ کیا اور وہ دوبارہ باہر کو چل گئی دروازے تک پہنچتے وقت اجنبی بھی اس کے قریب پہنچ گیا پورچ میں آ کر اجنبی جیکل سے چپکا کھڑا کچھ کہہ رہا تھا چارلس نے دیکھا کا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ہے اور جیب کا ابھار کچھ نیا ہے۔ پوری بات اسکی سمجھ میں آگئی کھیل اب اس کی مرضی کے مطابق شروع ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جیکل اس اجنبی کے ساتھ کار میں بیٹھی شہر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی اور دور دور آبادی کا نام نہیں تھا۔ چارلس کی کار برابر اگلی کار کے تعاقب میں تھی اس کے ساتھ اس کے باقی ماندہ ساتھی بھی تھے۔ اور سب اسلحوں سے لیس۔ شہر سے دور جا کر اگلی کار جھیل کی طرف مڑ گئی پھر اس کار کا رخ کچے راستے کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور چل کر کار تاریکی میں یکلخت رک گئی اگلی کار کو رکتے دیکھ کر چارلس نے بھی اپنی گاڑی [illegible] کی آڑ میں کھڑی کر دی۔

کار جہاں رکی تھی وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اجنبی جیکل کو لئے تیزی سے مکان میں داخل ہو گیا چارلس نے اپنے سارے ساتھیوں کو مکان کے گرد پھیلا دیا سب کے پاس اسٹین گنیں تھیں چارلس نے بھی کار سے اسٹین گن نکالی اور مکان میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ مکان کے پشت کی دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ چارلس نے اسٹین گن کندھے سے لٹکائی اور ٹوٹی دیوار کے سہارے اوپر چڑھنے لگا [illegible]

[illegible]

[illegible] ہیبت ناک [illegible] سے [illegible] تھا

[illegible] ایک [illegible] زندگی کے [illegible] کی [illegible] رہا تھا۔ چارلس نے دروازے سے کان لگائے اندر کچھ [illegible] گفتگو کر رہے تھے اور اس نے زاگورا کی آواز پہچان [illegible] آنکھوں میں خوف [illegible] وہ کہہ رہا تھا ٹھیک ہے جیک [illegible] کام ہو چکا ہے۔ ہم صبح سویرے ہی ان دونوں بہنوں کو لے کر یہاں سے برلن چلے جائیں گے اور وہاں ہمارے سائنسدان جلد ہی اس فارمولے پر تجربہ شروع کر دینگے۔ اسی لمحے چارلس نے دروازے کو دھکا دیا اور دندناتا اندر پہنچ گیا۔ یہاں زاگورا کے علاوہ ابھی تائیرا اور نیکل موجود تھیں۔ تائیرا اور نیکل کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ چارلس کو دیکھ کر زاگورا اٹھ کھڑا ہوا لیکن وہ ابھی اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے جا رہا تھا کہ اسٹین گن کی گولیوں نے اس کا جسم چھلنی کر دیا۔ زاگورا دم بخود بیٹھا تھا۔ چارلس نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا زاگورا تم نے دنیا کا کوئی جرم ایسا نہیں جو نہ کیا ہو لیکن ہمیشہ قانون کی گرفت سے بچتے رہے۔ اور اگر آج بھی تمہیں گرفتار کیا جائے تو اپنی معقولیت کی وجہ سے تم باعزت رہا ہو جاؤ گے میں تم پر کوئی جرم ثابت نہیں کر سکوں گا۔ زاگورا اس کی بات سن کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے چارلس نے کہا مجھے معلوم ہے کہ تم قاتل بھی ہو تم نہ جانے کتنی زندگیوں کا خون کر چکے ہو اس لئے میں تمہیں معاف بھی نہیں کر سکتا اور یہی بہتر ہے کہ تمہارا کام تمام کر دوں۔ تم اب تک اپنے ہی انتقام پر نازاں تھے۔ [illegible] سے انتقام لونگا۔ جس کے لئے مجھے اپنی زندگی داؤ پر لگانی پڑی۔ زاگورا اور اس کی انگلی ٹریگر پر دبتی چلی گئی، زاگورا کا بے جان جسم فرش پر لڑھک گیا۔ تائیرا اور نیکل دہشت سے خاموش تھیں۔

دوسرے دن ایئر فرانس کا طیارہ تیزی سے بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔ اور چارلس تائیرا کے ہاتھوں پر سر رکھے آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

[illegible] علی

خلیفہ ہارون رشید کے عہد کی ایک المیہ داستان

حیدر راحت چک جھمروی

خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں ایک عرب اپنی حسین و جمیل بیٹی کو بے سہارا چھوڑ کر چل بسا۔ یہ لڑکی بے حد حسین اور الہڑ تھی۔ اسے اس کے چچا نے بے حد ناز و نعم سے پالا۔ اس لڑکی کا نام لطیفہ تھا۔ اس کے چچا کی سوائے ایک لڑکے کے اور کوئی اولاد نہ تھی۔ لڑکے کا نام واصف تھا۔ واصف لطیفہ کا ہم سن اور ہم مکتب تھا۔ دونوں ایک ساتھ رہتے تھے اور پرورش پاتے تھے۔ لطیفہ جوں جوں جوان ہوتی گئی اس کی شگفتگی اور خوبصورتی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس پر خطر دور کے شروع ہوتے ہی جسے عہد شباب کہتے ہیں۔ لطیفہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی وہ واصف سے بے پناہ محبت کرنے لگی۔ اس کے چہرے سے شگفتگی اور بشاشت غائب ہوتی گئی۔ وہ اظہار محبت سے خوف کھاتی تھی۔ واصف کی صورت کو دور سے ہی دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ اس کا چچا اس کا یہ حال دیکھ کر بڑا سراسیمہ ہوا، علاج کے لئے اطباء کی طرف رجوع کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار اس کی چچی نے جو ہوشیار اور زمانہ شناس خاتون تھیں مرض کو سمجھ لیا۔ اس نے اپنے شوہر سے اس امر کا ذکر کر دیا۔ آخر کار لطیفہ اور واصف کی شادی کر دی گئی، پھر کہاں کا مرض اور کہاں کی بیماری۔ اس کے گل رخسار اب پہلے سے بھی زیادہ شگفتہ ہو گئے، نرگسی آنکھوں میں بے پناہ رسیلا پن پیدا ہو گیا۔ واصف بھی لطیفہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا ہمیشہ اسے آراستہ اور پیراستہ رہنے کی تاکید کرتا۔ لطیفہ نے بھی اپنے شوہر کے ہر حکم کی تعمیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اس نے ایسا بننا سنورنا اور نکھرنا شروع کیا کہ جنت کی حور اور کوہ قاف کی پری کو بھی دو قدم پیچھے چھوڑ دیا۔ مگر افسوس! لطیفہ کی اس محبت نے حسرت ناکامی کی شکل اختیار کر لی اس آرزو مندی کی زندگی کو چند ہی برس گزرے تھے کہ واصف سخت بیمار پڑا اور پھر چند روز کے بعد لطیفہ کو داغ مفارقت دے گیا۔ مرض اب اس کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ رات

[illegible] محبوب شوہر کی قبر پر بیٹھ کر اشک [illegible] رہتی تھی کہ عرب کے ایک مشہور شاعر اور مورخ اصمعی کا بصرے سے گزر ہوا۔ وہ لطیفہ کو اس حالت میں دیکھ کر ششدر رہ گیا، اس کی رگ تجسس پھڑکی۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ لطیفہ نے ایک دردناک المیہ گیت گانا شروع کیا۔ اصمعی شام تک اسی درخت کی آڑ میں چھپا رہا، یہاں تک کہ رات ہو گئی اور غم نصیب لطیفہ زار و قطار روتی ہوئی قبر سے اٹھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئی۔

اصمعی نے یہ تمام واقعہ ہارون رشید سے جا کر جوں کا توں بیان کر دیا۔ خلیفہ ہارون رشید نے پوری داستان کو سن کر کہا "آہ دنیا میں سبھی نعمتیں حاصل ہو سکتی ہیں لیکن ایسی وفا شعار بیوی نصیب والوں کو ہی مل سکتی ہے"۔ پھر ہارون رشید نے اصمعی کے سامنے لطیفہ سے اپنی شادی کی تجویز رکھی اور شادی کی تمام کاروائیاں مکمل ہو گئیں۔

لیکن افسوس خلیفہ ہارون رشید نے لطیفہ کی قدر تو کی لیکن اس نے یہ نہیں جانا کہ ایک ایسی محبت والی بیوی جس کی ایک بار بھر چکی سوائی کی بھر چکی پھر اس کے بعد کسی دوسرے کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہو سکتا۔

گورنر بصرہ نے لطیفہ کو دس ہزار درہم پیش کئے اس کے چچا نے بصد شوق قبول کیا اور نہایت اہتمام کے ساتھ گورنر بصرہ لطیفہ کو لے کر بغداد کی طرف روانہ ہوا۔

اب لطیفہ سے اس کے محبوب کی پیاری قبر بھی چھن گئی جو اس کے جینے کا سہارا تھی۔ جس کے سامنے وہ بناؤ سنگھار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھی۔ وہ خلیفہ ہارون کی دلہن بننے جا رہی تھی، لیکن اس کا دل مرحوم محبوب کی یاد سے لپٹا ہوا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ ابھی مدائن کے تک ہی پہنچی تھی کہ نا گہاں اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ سب انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ اصمعی اور ہارون رشید دونوں [illegible] لیکن افسوس [illegible] اصمعی کہتا ہے کہ لطیفہ کے گزر جانے [illegible] خلیفہ ہارون کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ لطیفہ کی یاد خلیفہ کے دل سے [illegible] بھلائی جا سکی، اور جب بھی لطیفہ کی یاد [illegible] خلیفہ کی آنکھوں سے آنسو [illegible] جاتے۔

پیارہ نہ تھا۔ وہ ایک نہایت ہی کثیف اور مفلس کوچے کی پیچدار گلیوں میں سے گزرتا ہوا مجھے ایک تنگ و تاریک مکان کے اندر لے گیا۔ یہ میری بھاوج کا مکان تھا۔ مریضہ کا کمرہ مفلسی اور فلاکت زدگی کا بدترین نمونہ تھا۔ تاہم سب سے پہلی چیز جو میری آنکھوں کے سامنے آئی نہایت خوب صورت اور دلآویز تھی۔ مریضہ کی پٹی سے لگی ہوئی اس کی حسین بچی کھڑی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی ننھی سی حور، اس کے سیاہ گھنگریلے گھرا لے ہوئے اور گرد آلود بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ معصوم چہرے پر بچپن کی شگفتگی اور ماحول کی پیدا کی ہوئی قبل از وقت سنجیدگی کی آمیزش نے ایک ایسی پر درد کیفیت پیدا کر دی تھی کہ دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی تھی۔ ایک نظر دیکھتے ہی اس خوشرو معصومہ کو گود میں لینے کے لئے میرا دل بے اختیار تڑپ اٹھا مگر میں نے فوراً ہی اس کو سختی کے ساتھ دبا دیا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر مریضہ سے کچھ کہا۔ جب میں بستر کے قریب گیا تو نحیف و نزار خاتون نے اٹھنے کی کوشش کی جسے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے ضعف نے پورا نہ ہونے دیا۔ اسکے مرجھائے ہوئے سانولے چہرے کا وقار آزردگی اور ندامت کے مشترکہ نقوش بتا رہے تھے کہ اپنے وقار اور خودداری کو شکست دے کر مجھ سے امداد کی استدعا کرنے میں اس کی روح نے کتنا بڑا صدمہ برداشت کیا ہے اور ایسا کرنے کے لئے میرے سامنے اپنی سب سے زبردست اور مدلل مجبوری پیش کرتے ہوئے اس نے کانپتی ہوئی کمزور انگلی سے اپنی بچی کی طرف اشارہ کیا اور بڑی نحیف اور گلوگیر آواز میں کہا:۔

"دیکھئے۔۔۔ اس کے لئے۔۔۔ تھوڑے دنوں بعد یہ دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔ اسے۔۔۔" اور بڑھتی ہوئی رقت نے اسے خاموش کر دیا۔

مجھے ندامت کے ساتھ ماننا پڑتا ہے کہ اس پر درد استدعا نے بھی میرے پتھر دل پر کچھ اثر نہ کیا اور میں نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔

"آپ کو ایسے خیالات دل میں نہیں لانے چاہئیں۔ آپ ابھی کم عمر ہیں اور آپ کے معالج نہایت قابل اور رحم دل معلوم ہوتے ہیں، ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں" حالانکہ کوئی مجھ سے کم خودغرض شخص ہوتا تو اتنا اضافہ ضرور کرتا کہ آپ کی خبرگیری کے لئے آپ کا یہ بھائی موجود ہے جو آپ کی ہر خدمت بجا لانے کو تیار ...

میں تو اس پیش آمدہ مصیبت اور اس کے اخراجات سے بچنے کی کوئی آسان تدبیر سوچ رہا تھا۔

ننھی لڑکی جو اس وقت تک ٹکٹکی باندھے منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی میرے قریب آئی اور مینا کی سی میٹھی آواز میں کہنے لگی۔

"کیا آپ بیٹھ نہ جائیں گے! اس طرح تو میں آپ کو پیار بھی نہیں کر سکتی آپ مجھ سے لتنے لمبے ہیں!"

میں قریب پڑی ہوئی ایک ٹوٹی چارپائی پر بیٹھ گیا اور ننھی میری گود میں آ بیٹھی۔ اس نے اپنی ننھی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور پھر میرے رخسار پر آہستہ سے ایک بوسہ دے کر بولی۔

"آپ میرے ابا بنیں گے؟ میں آپ کو بڑا ہی پیار کروں گی کیا آپ بھی ویسے ہی اچھے ہیں؟" ذرا میرا جواب ملاحظہ ہو۔ اس کے متواتر سوالوں سے گھبرا کر میں نے اس بھولی سی بچی کے پرخلوص بازوؤں کو قدرے سختی سے اپنی گردن سے الگ کر دیا اور اسے گود سے اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا۔ وہ جیسے سن ہو گئی اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سہمی ہوئی سی خوبصورت آنکھیں حسرت و ناامیدی سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے سے ایک جگر پاش آہ اٹھی جس نے ان ننھے ننھے ہونٹوں کو نیم وا کر کے اسے حسرت اور مایوسی کی مکمل تصویر بنا دیا اور دو موٹے موٹے آنسو پھول جیسے رخساروں پر آہستہ آہستہ لڑھکتے ہوئے نظر آئے۔ آہ اس نے زبانِ بے زبانی نے اس کے دلی جذبات کی ایسی ترجمانی کی جو اس بھولی گڑیا کی مینا کی سی میٹھی باتوں سے بڑھ کر تھی۔ اف، میں نے دیکھا اور میرے دل پر غضب کا دھچکا سا لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا اس کی پرنم آنکھوں میں میرے مرحوم بھائی کی سوگوار روح بیٹھی ہوئی مجھ پر نفرین کر رہی ہے۔ میں کانپ اٹھا۔

جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر میری قلب ماہیت کر دی اور ایک آن واحد میں میری مکروہ شخصیت اور میرے اندر کی وحشیانہ اور ننگِ انسانیت اصلیت کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ کسی غیر معلوم قوت نے مجھے مرعوب کر دیا میں خود اپنی ذات کے لئے ایک احساس تنفر کے زیر اثر کانپ اٹھا اور فوراً اس ننھی حور کے سامنے اعتراف شکست کیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے آغوش میں لے لیا اور اس کے اشک آلود رخساروں کے بوسے لینے لگا ... سے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ننھی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم میری پیاری بیٹی ہو میں ہمیشہ تمہاری خبرگیری کروں گا"

اس خوشی کو میں کن لفظوں میں بیان کروں جو میری بھاوج کو میرے اس وعدے سے ہوئی۔ اسوقت تک وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے خاموش پڑی تھی۔ اور ... مایوس سی تھی مگر میرے لفظوں نے اس پر عجیب کیفیت طاری کر دی۔ اس کی اضطراری کیفیت پر میں اور ڈاکٹر دونوں ڈر گئے مگر تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی حالت پر قابو پالیا اور ... سی آواز میں کہا۔

بھائی، میرے عزیز بھائی۔ میرے خیالات نے آپ کے ... کسقدر غلط نقشہ میرے دماغ میں قائم کر رکھا تھا میں ... چاہتی ہوں مجھے معاف کر دیں۔ اس کے اظہار ممنونیت نے میرے ضمیر پر ... نیشتر کا کام کیا اور مجھے ایسی روحانی اذیت پہونچائی کہ سخت ترین نفرین و ملامت بھی نہ پہونچا سکتی تھی۔ میں نے جلدی سے گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے ڈاکٹر کے سامنے نقل مکان کا خیال پیش کیا کہ مریضہ کے لئے کسی ... اور فرحت بخش مکان کا بندوبست ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر نے ... کام اپنے ذمے لیا کیونکہ ایک اجنبی کی حیثیت سے تیمارداری ... خدمت کو بطرز احسن انجام نہ دے سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے دوسرے ہی دن ہمارے لئے بر لبِ دریا ... خوبصورت اور پرآرام وہ بنگلہ لے لیا اور ہم فوراً وہاں منتقل ... کوئی تین مہینے تک ہم وہاں رہے۔ میں نے حتی المقدور ... دیکھ بھال میں کوئی فروگذاشت نہ کی مگر مشیت ایزدی ... کہ تیسرے مہینے کے اخیر میں وہ نہایت سکون و اطمینان کے ... اپنی ننھی بچی کو میری سپردگی میں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ... تب سے میری ننھی حور میرے دل کا آرام اور ... بن کر ... پاس رہتی ہے۔ اس کی خوشی میری خوشی ہے اور اس کی ... زندگی۔ کیا اس کا مجھ پر کچھ تھوڑا احسان ہے؟ اس ... ملکوتی آنسو۔ ایک معصومہ کی صفائے روحانی سے نکلے ... وہ پاکیزہ موتی جنہیں میرے تہی دامن دل نے اپنی گہرائی ... جذب کر لیا تھا وہ آنسو میرے لئے بارانِ رحمت ... سے میرا ... مردہ زمین کی طرح اجڑا پڑا تھا جی اٹھا ... وہ ... دل کی مرجھائی ہوئی کھیتی کے لئے ایسے ہی ... تھے جیسے غنچۂ ناشگفتہ کے لئے شبنم کے جاں بخش قطرے ... کھلا کر پھول بنا دیتے ہیں۔ اس کی دلفریب مہک اور ...

اگر میں اسے آج ٹیلی ویژن پر دیکھ لوں گا تو کل سیلاب زدہ علاقے کے ہوائی دورے میں کیا مزا آئے گا ---؟

کیا آپ کے پاس ماچس ہوگی ---؟

بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ کرکٹ یا ہاکی نہیں کھیلتے

شاباش بیٹے تم پر فخر ہے

میرا وقت برباد کرنے سے پہلے تم نے کیوں نہیں بتایا کہ تم ایک اسکول ٹیچر ہو

پہلی جنگ عظیم کا آغاز بھی یورپ سے ہوا تھا اور دوسری جنگ کا بھی لیکن اس مرتبہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ ایشیا میں لڑی جائے گی۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ہی سے ایشیا کے حالات ایسے تشویشناک چل رہے ہیں کہ اگر ابھی تک ایشیائی ملکوں کی لڑائیاں یا جھڑپیں کسی بڑی جنگ میں تبدیل نہیں ہوئیں تو یہ محض قدرت کا کرشمہ ہے۔

جنگ کا ماحول اس وقت خاص طور سے دو میدانوں میں ہے۔ ایک مشرق وسطیٰ میں اور دوسرا برصغیر ہند و پاک میں۔ دونوں علاقوں میں گذشتہ بیس سال کے زائد عرصہ سے کشیدگی موجود ہے۔ یہ کشیدگی کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ دونوں علاقوں میں تین تین خاصی بڑی لڑائیاں بھی ہوئی ہیں، لیکن ان لڑائیوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تمام مسائل بدستور موجود رہے بلکہ کچھ نئے مسائل پیدا ہوگئے، کشیدگی اور دشمنی بڑھ گئی اور آئندہ کی لڑائیوں کے لئے نئی بنیادیں قائم ہوگئیں۔

یورپ کے ممالک امن چین سے اپنی ترقی میں لگے ہوئے ہیں پرانی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ جرمنی اور فرانس کے درمیان ان کی روایتی دشمنی جس پختہ دوستی میں تبدیل ہوئی ہے وہ دوسروں کے لئے ایک سبق ہے۔ مغربی جرمنی اور روس ایک دوسرے کے کتنے بڑے دشمن تھے لیکن آج دونوں ملکوں کے لیڈر ایک دوسرے ملک کا دورہ کر رہے ہیں اور چانسلر مغربی جرمنی مسٹر ولی برانٹ کے الفاظ میں جو حال ہی میں روس کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں، دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہت کچھ بہتری پیدا ہوگئی ہے خود جرمنی کے دو حصوں مغربی اور مشرقی جرمنی کے درمیان گذشتہ دس برس سے کتنی زبردست دشمنی تھی کہ برلن شہر کے بیچوں بیچ سمنٹ کی دیوار کھڑی کر دی گئی اور ایک ہی شہر کے رہنے والوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا لیکن اب دوستی کا جذبہ اس حد تک اُبھرا ہے کہ مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی کی الگ حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے اور اگر مغربی جرمنی کے ساتھ ساتھ مشرقی جرمنی کو بھی اقوام متحدہ کا ممبر بنا لیا جائے تو اسے اس پر اعتراض نہیں ہے۔

یہ یورپ کی حالت ہے وہاں بچھڑے ہوئے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں، پرانی عداوتیں ختم کی جا رہی ہیں "ناٹو" اور "وارسا پیکٹ" کے ممالک ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کے لئے بے چین ہیں اور یورپین سلامتی کے استحکام کے لئے ایک نمائندہ کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں ہو رہی ہیں، لیکن اس کے برعکس ایشیا میں مختلف ممالک ایکدوسرے کے دشمن بلکہ خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ ان کے درمیان بداعتمادی کی فضا ہے اور وہ اس بات کے لئے تیار نہیں کہ ایک میز پر بیٹھ کر بات چیت کریں اور اپنے تمام مسائل کو افہام و تفہیم اور رواداری کے جذبہ کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں۔

اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ بڑی طاقتوں کے محتاج ہیں اور بڑی طاقتوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ اپنے زیر اثر ممالک کے درمیان ایسی کشیدگی باقی رکھیں کہ اسے جب چاہیں جنگ میں تبدیل کرا دیں تاکہ ان کی وہ چپقلشیں جن کا دار و مدار جنگ اور کشیدگی پر ہے برابر چلتی رہیں۔ چھوٹے ممالک اگر باہم دست و گریباں نہ ہوئے تو بڑے ممالک میں تیار شدہ اسلحہ کی کھپت کہاں ہوگی؟ اور اسلحہ ساز فیکٹریوں کا کیا مصرف باقی رہ جائے گا؟

کبھی کبھی اسلحہ کی دوڑ کا رونا رویا جاتا ہے تخفیفِ اسلحہ کی باتیں بھی ہوتی ہیں لیکن معاملہ جوں کا توں رہتا ہے جینوا میں تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کا سلسلہ دس برس سے بھی زیادہ عرصہ سے قائم ہے لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ اسلحہ کی دوڑ اور بڑھ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ کشیدگی میں بھی اضافہ ہوگیا، اور ایشیا خاص طور سے اس کی پیٹ میں زیادہ آیا۔ ایشیائی ممالک جن میں اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک اور ہند اور پاکستان شامل ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہوں جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ امریکہ جیسے سامراجی ممالک انہیں اور شہ دے رہے ہیں اور ہتھیار مہیا کر کے ان کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ مبادا وہ ایک دوسرے کے قریب ہو کر ان کی معیشت کو کمزور کر دینے کا باعث بن جائیں جس کی بنیاد فوجی ساز و سامان کی تجارت پر ہے۔

سامراجی ملکوں کی ان چالوں کو اگر ایشیائی ممالک نہیں سمجھتے تو یہ دنیا میں سب سے بڑے براعظم کے باشندوں کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ ایشیا اس وقت جنگ کی لپیٹ میں ہے اور اگر ایشیائی ممالک نے ابھی ترقیات میں یورپ اور دوسرے مغربی ممالک کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پیچھے ہیں حالات کو نہیں سمجھا تو وہ کسی اور کا نہیں بلکہ خود اپنا نقصان کریں گے جنگی یا دفاعی معاملات پر جو کثیر رقمیں ایشیائی ممالک بشمول ہند اور پاکستان خرچ کر رہے ہیں کاش وہ ان ملکوں کے بھوکے ننگوں کا پیٹ بھرنے کے لئے خرچ کی جا سکتیں، ایسا ہوتا تو ہم اب تک کہیں آگے پہنچ چکے ہوتے۔ کاش اب بھی ایشیائی قومیں حقیقت شناسی سے کام لیکر جنگ کی [illegible]

فاطمہ جناح کا فرمان

خون دینے سے ڈرتے ہو تو آزادی کے گیت کس لیے گاتے ہو ؟

انسانیت کی تاریخ اربوں انسانوں کی محنت، ہمت اور جنگ کی تاریخ ہے۔ ایک طرف قدرت سے جنگ اور دوسری طرف ان لوگوں سے جنگ جو کروڑوں لوگوں کے پھل کو اکیلے ہی ہڑپ کر جانا چاہتے تھے۔ تاریخ کے آغاز سے موجودہ دور تک پورا معاشرہ دو حصوں میں بٹا رہا ہے۔ ایک وہ لوگ تھے جن کے ہاتھ میں طاقت اور دولت تھی دوسرے وہ جن کے پاس دولت نہیں تھی۔ جو لوگ دولت اور حکومت پر قابض تھے انھوں نے کبھی اپنی دولت اور حکومت رضاکارانہ طور پر نہیں چھوڑی۔ عوام کا ایک طبقہ مسلسل جنگ کے بعد ہی اس طاقت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ غلام معاشرے کی جگہ جب زمیندارانہ معاشرے نے لے لی تب بھی پوری دنیا میں جنگ ہوئی۔ زمیندارانہ نظام کی جگہ جب سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے ساتھ جمہوریت آئی تو اسے بھی بادشاہت اور زمینداری کے خلاف جنگ کرنی پڑی، اور جب موجودہ دور میں دنیا کے بہت سے ملکوں نے غلامی سے نجات پائی تب بھی آزادی انھیں تحفے میں نہیں ملی۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے انھیں جنگ کرنی پڑی۔ ہزاروں قربانیاں دینی پڑیں تب کہیں جاکر وہ حکمراں طبقے کو نکال باہر کرنے میں کامیاب ہوئے آج بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں آزادی کی یہ جنگ جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ ملک آزاد نہ ہو جائیں۔

تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ کہنا بے وقوفی ہوگا کہ معاشرے کو [illegible] اس وقت کے نظام کو [illegible] طریقوں سے بدلا جا سکتا ہے۔ معاشرے کو بدلنے [illegible] عوام کو ان لوگوں سے جنگ کرنی پڑتی ہے [illegible] میں حکومت اور دولت ہے۔ اور یہ جنگ ہمیشہ [illegible] ہوتی ہے۔ دعاؤں، تقریروں اور نعروں کی جنگ [illegible] پاکستان میں بھی کچھ اسی طرح کی حالت [illegible] پچھلے ۱۵ سال سے حکومت پر فوج کا قبضہ [illegible] میں تو یہ فوج ملک کو بدعنوان سیاست دانوں [illegible] چھٹکارا دلانے آئی تھی۔ لیکن ایک بار طاقت [illegible] کے بعد یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ حکومت عوام [illegible] میں لوٹا دے۔ عوام نے جب بھی اس [illegible]

...کو جمہوریت اور آزادی کے سبز باغ دکھائے
...ن کو کرتے گئے لیکن فوجی حکمرانوں کا اقتدار عوام
...نُندوں کے حوالے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگر
...یا کر دیتے تو یہ تاریخی حقائق کے خلاف ہوتا۔
...تاریخ گواہ ہے کہ جس طبقے کے ہاتھ میں حکومت
...ہے اس نے کبھی اسے رضاکارانہ طور پر چھوڑا
...ہیں ہے۔

> مجھے بتاؤ، کیا تاریخ میں کوئی ایسی مثال
> موجود ہے کہ حکمرانوں نے عوام کے غصب
> کردہ حقوق خوشی خوشی عوام کو لوٹا دیے ہوں۔
> (مادر پاکستان)

یہ پاکستانی عوام کی بھول تھی کہ وہ فوجی ڈکٹیٹروں
...پرامن طریقوں سے ہٹانے کے خواب دیکھ رہے تھے
...ن فوجی ڈکٹیٹروں نے خود پاکستانی عوام کی آنکھیں
...ول دیں، اور انھیں بتا دیا کہ الیکشن اور پارلیمنٹ سب
...ھوکا ہیں۔ اگر وہاں کے عوام، عوامی حکومت قائم کرنا
...ہتے ہیں تو انھیں برسرِ اقتدار طبقے کے خلاف ہتھیار
...ٹھانے ہوں گے۔ عوامی لیگ کی غلطی صرف اتنی تھی کہ
...وہ اکثریت میں آکر حکومت کی دعوے دار بن بیٹھی۔ اگر
بھٹو کی پیپلز پارٹی اکثریت میں آتی تو یقیناً فوجی ڈکٹیٹر
...س کا بھی یہی حشر کرتے۔ اگر مجیب الرحمٰن کے خلاف
...غداری کا الزام لگ سکتا ہے تو یہی الزام بغیر کسی
ہچکچاہٹ کے بھٹو کے خلاف بھی لگایا جا سکتا تھا۔
ویسے بھی بھٹو کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔
انکا کمیونسٹ ہونا ہی انکی اور انکی جماعت کی گوشمالی
کے لئے کافی تھا۔ تاہم اب مجیب کے بعد حکومت کے
سب سے بڑے دعوے دار بھٹو ہی ہیں اور یقیناً
بہت جلد یحییٰ خان انکو بھی وہی سبق دینے والے
ہیں جو وہ مجیب اور عوامی لیگ کو دے رہے ہیں۔

ملک کے سچے بہی خواہ اور علمبردار سیاست داں
...س طرح ملکی سیاست کی رگ رگ سے واقف ہوتے
ہیں اس کا اندازہ مادر پاکستان محترمہ فاطمہ جناح کے
ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۷ء

ان کے الفاظ کتنے سچے تھے اس کا اندازہ آج بنگلا
دیش میں ہونے والے حالات کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ آج
بنگال کا ایک ایک باشندہ مادر پاکستان کے دیے
ہوئے سبق پر عمل کر رہا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے
کہا تھا

"اگر پاکستان کے عوام حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہونا
چاہتے ہیں تو انھیں خون دینا ہوگا۔ غاصبوں سے حق لینا آسان
نہیں ہوتا ہے۔"

اور آج مادر پاکستان کی روح مطمئن ہوگی کہ مشرقی بنگال
کے کونے کونے میں، چپے چپے پر خون بہہ رہا ہے ——
عوام کا خون —— غاصبوں کے ہاتھوں
مشرقی بنگال کے بہادر عوام محترمہ فاطمہ جناح کے
فرمان پر عمل کر کے پاکستان کی تاریخ اپنے خون سے لکھ
رہے ہیں۔ بنگالی غدار نہیں ہیں بلکہ وہی پاکستان کے اور
وہاں کے عوام کے سچے ہمدرد ہیں۔ کیونکہ آج صرف وہی
جان اور مال کی قربانیاں دے کر پاکستان کو فوجی غاصبوں
کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

> اور آج مادر پاکستان کی روح مطمئن ہوگی
> کہ مشرقی بنگال کے کونے کونے میں چپے چپے پر
> خون بہہ رہا ہے۔ عوام کا خون غاصبوں کے
> ہاتھوں۔ مشرقی بنگال کے بہادر عوام محترمہ
> فاطمہ جناح کے فرمان پر عمل کر کے پاکستان کی
> تاریخ اپنے خون سے لکھ رہے ہیں۔

محترمہ فاطمہ جناح سے انٹرویو لیتے ہوئے جب
سوال کیا گیا:۔
"کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ پاکستان کے عوام سچی آزادی
سے کیوں محروم رہے، وہ اپنے ملک کے حاکم کیوں نہ بن
سکے؟"۔ تو مدیر "اردو ڈائجسٹ" الطاف حسین قریشی
لکھتے ہیں کہ اس سوال سے:۔
محترمہ کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا ان کی
آنکھیں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، ان کے بازو جوانوں
کی طرح تن گئے، صوفے کے دونوں بازوؤں پر ان کے

آواز میں کہا:۔
پاکستان کے عوام نادانی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ ان کے
حاکم جو انکی مرضی کے بغیر عنانِ اقتدار سنبھالنے میں
کامیاب ہو گئے تھے خود بخود اختیارات عوام کو منتقل
کر دیں گے۔ یہ خود فریبی قوم پر فالج کی صورت میں
نازل ہوئی اور اس کے ہر عضو کو ناکارہ کر گئی۔ مجھے
بتاؤ، کیا تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود ہے کہ
حکمرانوں نے عوام کے غصب کردہ حقوق خوشی خوشی
لوٹا دیے ہوں۔
انگلستان کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ لہو سے
رنگین تاریخ۔ وہ تاریخ جس میں صدیوں خون بہا
عوام کا خون۔ ظالم حکمرانوں کا خون۔ وہاں
کے عوام نے آزادی، جمہوریت اور بنیادی حقوق خون
دے کر حاصل کئے ہیں۔ اگر خون نہ بہتا تو آج انگلستان
آمریت کے جنگل میں سسک رہا ہوتا۔ بادشاہوں نے
استبداد کی روش پر تلواروں کی مدد سے چلنے کی پوری
پوری کوشش کی لیکن عوام نے قدم قدم پر مزاحمت
کی۔ انکی جائدادیں ضبط ہوئیں، ان کے گھر بار لٹے، انکو
سولی پر لٹکایا گیا، فوج بھی میدان میں کود پڑی لیکن
عوام نے بنیادی حقوق کا پرچم اٹھائے رکھا۔ اگر
پاکستان کے عوام حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہونا چاہتے
ہیں تو انھیں بھی خون دینا ہوگا۔ غاصبوں سے حق
واپس لینا کچھ آسان نہیں۔ خون دینے سے ڈرتے
ہو تو حقیقی آزادی کے گیت کس لئے گاتے ہو"؟

(اُردو ڈائجسٹ لاہور۔ اگست ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۴)

دنیا دور بین کی نظر میں

فرعون مزاجی آخرکار رنگ لائی

"بیٹے تمہارا وزیر اعظم بول رہا ہوں لائن کاٹ دو"

"اور میں محسن الحرازی ہوں، آپ خود کیوں نہ اسے
کاٹ دیں"

یہ سوال و جواب اس وقت ہوئے جب گزشتہ ہفتے
۲ سال حسن العمری (وزیر اعظم یمن) نے اپنے کسی گارڈ
ڈر سے بات کرنے کے لئے ٹیلیفون اٹھایا۔ اتفاق سے
فون محسن الحرازی سے جا ٹکرایا جو اپنے کسی دوست
ہ بات چیت کر رہے تھے۔ پہلے انھوں نے سمجھا کہ انکا
ست ہی اپنے آپ کو وزیر اعظم بتا کر مذاق کر رہا ہے
س لئے انھوں نے قہقہہ لگایا۔ لیکن بعد کو جب
علوم ہوا کہ ٹیلیفون پر کوئی تیسرا شخص بھی مداخلت
ر رہا ہے تو ٹیلیفون پر دونوں میں خوب ترش کلامی
وئی۔ حسن العمری نے الحرازی کا پتا معلوم کیا اور اس
یوقوف نے غصے میں اپنا پتا بتا دیا۔ دراصل اسے
قین نہیں تھا کہ ٹیلی فون کی دوسری جانب واقعی وزیر
عظم یمن موجود ہیں۔

وزیر اعظم حسن العمری اپنی تیز مزاجی کے لئے مشہور
ہے۔ بعض اوقات خود اس کے ایڈی کانگ اس کا غصہ
دیکھ کر دفتر سے بھاگ جاتے تھے۔ اپنے ماتحت
افسروں کے ساتھ اسکا یہ سلوک تھا تو راجدھانی صنعاء
کے ایک معمولی فوٹو گرافر کی کیا حقیقت تھی۔ چند ہی منٹوں
میں فوجی سپاہیوں نے الحرازی کی دوکان کو گھیر لیا
اور اسے کھینچ کر فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گئے جہاں لوہے
کی موٹی سلاخوں سے اسے مار لگائی گئی۔ حسن العمری
وہاں خود موجود تھا۔ اس نے فوجیوں کو حکم دیا "اس
بدمعاش کو قتل کردو" لیکن فوجیوں نے یہ حکم ماننے سے
انکار کر دیا۔ اس پر خود حسن العمری نے ایک سپاہی
سے رائفل چھینی اور الحرازی کے سر میں گولی داغ کر انھیں
موت کی نیند سلا دیا۔

العمری بیروت روانہ ہونے سے پہلے ہوائی اڈے پر

وحشت و بربریت کی یہ خبر بجلی کی طرح شہر میں پھیل
گئی۔ الحرازی کے رشتے داروں نے اعلان کیا کہ "جب
تک العمری کے خلاف کارروائی کرنے کا یقین نہ دلایا جائے
گا ہم الحرازی کی میت کو نہ دفنائیں گے"

انھیں حکومت کی طرف سے یقین دلایا گیا بلکہ صدر
عبدالرحمن العریانی نے ارادہ ظاہر کیا کہ وزیر اعظم کو انکے
جرم کی پاداش میں عام پبلک کے سامنے تختۂ دار پہ
لٹکایا جائے گا۔ مجلس شوریٰ کے ممبروں کی اکثریت
بھی چاہتی تھی کہ حسن العمری کو عبرتناک سزا دی جائے
کیونکہ انسانوں کو اس طرح ہلاک کر دینا جیسے جانوروں
کو بھی ہلاک نہیں کیا جاتا ان کے لئے ناقابل برداشت
ہے۔ لیکن قبائلی لیڈروں نے جو وزیر اعظم سے ہمدردی
رکھتے تھے انھیں جلاوطن کرنے پر رضامند کر لیا۔

ابھی فرعون مزاجی آخرکار رنگ لائی ہے

حسن العمری ۱۹۶۷ء میں برسر اقتدار آئے
تھے اور اس عرصے میں کئی بار کسی مسئلے پر اپنے ساتھیوں
سے اختلاف رائے ہونے کی بنا پر مستعفی ہوئے
اور ہر مرتبہ بیروت یا قاہرہ بھاگ گئے اور اپنی
شرطوں پر واپس آئے۔

عام لوگ شاید یہ سوچیں کہ وہ ایک مرتبہ پھر واپس
آجائیں گے۔ لیکن اب ایسے حالات ہیں کہ انکی واپسی
ممکن نظر نہیں آتی۔ وہ اس وقت اپنے بارہ سال کے
لڑکے کے ساتھ بیروت میں ہیں اور سنا ہے کہ تیز مزاجی
کا بھوت اب بھی کبھی کبھی ان پر سوار ہو جاتا ہے۔
البتہ وہ اپنی حرکت پر کچھ پشیمان ضرور ہیں لیکن انکی
یہ پشیمانی اب انھیں پھر یمن واپس نہ لا سکے گی۔
مسٹر حسن العینی جمہوریۂ یمن کے نئے وزیر اعظم
مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ حسن العمری کی وزارت میں
وزیر خارجہ تھے۔

وزارت خارجہ کا محکمہ اب بھی انھوں نے اپنے
پاس ہی رکھا ہے۔

مشرق وسطیٰ کے حالات خراب ہو رہے ہیں اور کشیدگی
بڑھ رہی ہے۔ گزشتہ ہفتے نہر سوئز کے علاقے میں اسرائیلیوں
نے ایک مصری ہوائی جہاز کو گرا کر گویا جنگ جیسی صورت
حال پیدا کر دی۔ مصری کب خاموش رہنے والے تھے انھوں
نے بھی ایک اسرائیلی ہوائی جہاز گرا لیا۔ جس پر اسرائیل
نے چراغ پا ہو کر جارحانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اور
دونوں ملکوں نے اپنی اپنی فوجوں کو نہر سوئز کے علاقے میں
تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

ابھی باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہوئی ہے لیکن حالات
ایسے ہیں کہ کسی وقت بھی جنگ کا بگل بج سکتا ہے۔
صدر انور سادات کے الفاظ ہیں۔

"اب جنگ کو زیادہ عرصے تک نہیں ٹالا جا سکتا"

کے مذاکرات کے ناکام ہونے کی صورت میں اس کے
ہ کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ عرب ممالک فوجی اقدام
اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لیں۔
لیکن کیا عربوں کے پاس اتنی طاقت ہے کہ وہ اپنے
ئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں ہ" اسکا جواب
والے زمانے میں لگے گا۔ لیکن مصر کے تیور بتا رہے
وہ اسرائیل کے لئے تر نوالہ نہیں ہے۔ اسرائیلی
کو راکٹ سے گرانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جدید ہتھیاروں
سے مسلح ہے اور اسرائیل سے زبردست ٹکر لینے کے
تیار ہے۔ اسے اس کی بہت بڑی قیمت دینا ہوگی
اس سے بھی بڑی قیمت اسرائیل کو ادا کرنا پڑیگی
اسی ماہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس
شروع ہو رہا ہے جس میں دیگر اہم مسائل کے علاوہ
مشرق وسطیٰ کا اہم مسئلہ بھی معمول کے مطابق زیر بحث
آئیگا۔ اگر اس سال بحث کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ
نکلا اور اقوام متحدہ کا ادارہ یا بڑی طاقتیں کوئی اطمینان
بخش فیصلہ کرنے میں ناکام رہیں تو حالات بتا رہے
ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں انتہائی سنگین صورت حال
پیدا ہو جائے گی۔

ترکی

قسطنطنیہ کا بڑا حرم سرا

ترکی کے سلاطین عثمانیہ کا دائرہ حکومت بڑا وسیع تھا
اور دنیا تک پر پورے چار سو برس انکی حکومت کا ڈنکا
بجا۔ یورپ کی ہر بڑی طاقت عثمانی سلطنت ... سے
... نظم و نسق کے جو جوہر انھوں نے دکھائے اس ...
... یا پر ان کا سکہ بٹھا دیا۔
لیکن جب وہ عیاشی میں پڑے اور حکومتی ذمے داریوں
سے غافل ہوئے تو قدرت نے انھیں ایسی سزا دی کہ انکے
لئے ملک کی آزادی کو قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ ان سلاطین
کی عیاشیوں کی جیتی جاگتی تصویر قسطنطنیہ کا وہ حرم سرا ہے

قسطنطنیہ کے حرم سرا کا ایک اندرونی منظر۔
تصویر ۱۸۸۵ء

جو ہفتے سیاحوں کے دیکھنے کے لئے کھول دیے گئے ہیں۔
کسی زمانے میں یہ حرم سلاطین عثمانیہ کی داشتاؤں کا
مسکن تھا اور وہ یہاں داد عیش دیا کرتے تھے۔
سترھویں صدی کا ایک سلطان ابراہیم جو "پاگل"
کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے پاگل پن کا اظہار اس
بات سے ہوتا ہے کہ وہ اپنا زیادہ وقت اپنے محل کے
قریب باسفورس میں مچھلیوں کے لئے سمندر میں اشرفیاں
پھینکا کرتا تھا۔ اس کے حرم میں ایک ہزار ایک
داشتائیں تھیں۔
لیکن اپنے پاگل پن کے باوجود ابراہیم اور دوسرے
سلطانوں نے اپنے محل کو آرٹ اور آرکیٹکچر کے بہترین
نمونے میں تبدیل کر دیا اور اسی لئے آج ان کے محل
اور حرم کے کمرے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز سمجھے گئے ہیں۔
وہاں سیاح سلاطین عثمانیہ کے زمانے کے وہ نوادرات
دیکھیں گے کہ وہ حیران رہ جائیں گے۔ ترکی کی حکومت
اس محل کو دلچسپی کے ایک اہم مرکز میں تبدیل کرنے
کی کوشش کر رہی ہے۔

اردن

فدائین کو اردن کا دورہ کرنیکی پیشکش

اردن نے جدہ کانفرنس میں فدائین کو اردن کا دورہ کرنیکی
اور اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مشترکہ محاذ بنانے
کی پیشکش کی ہے۔ جس اردن نے امریکا کی مدد سے فدائین
کے خلاف ایسی سخت کارروائی کی کہ ان کے تمام اڈے
ختم کر دیے تھے اس کی طرف سے اس قسم کی پیش کش
حیرت ناک نہیں ہے۔ کیونکہ
"اسکو بھولا نہ چاہئے کہنا۔ صبح ہو جائے اور آئے شام"
اگر اب بھی اردن اس بات کو محسوس کر لے کہ فدائین اسرائیل
کے خلاف جنگ کے لئے ایک قیمتی ہتھیار ہیں تو وہ اسرائیل
کے خلاف اپنے مورچے کو بہت کچھ مضبوط بنا سکتا ہے
جنگ فلسطین میں کامیابی حقیقت میں فدائین ہی کے
تعاون سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ شاہ
اردن اسرائیل سے لڑتے لڑتے خود فدائین سے لڑ پڑے
اور جو کام اسرائیل کیلئے ممکن نہ تھا وہ خود انھوں نے پایۂ تکمیل
کو پہونچا دیا۔
سعودی عرب اور مصر کے توسط سے اردن اور فدائین
کے درمیان صلح کی بات چیت جاری ہے مشرق وسطیٰ
کے مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں اس بات چیت کی
بڑی اہمیت ہے۔

طالب علموں کی "زندہ دلی" بسوں کو آگ لگادی

پارلیمنٹ کا اجلاس نہ ہونے کے باوجود راجدھانی میں اس پکھواڑے اچھی خاصی دلچسپی رہی اور اگر تھوڑی کمی واقع ہوئی تو وہ طالب علموں نے پوری کردی۔ سچ پوچھیے تو ان طالب علموں ہی سے دِلی کی رونق ہے۔ دلی کے طلبا بہت دلچسپ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ زندہ دل بھی۔ زندہ دل اس لئے ہیں کہ کسی نے انکے کان میں کہہ دیا ہے کہ "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" طالب علموں نے اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ وہ وقتاً فوقتاً ڈی، ٹی، یو کی بسوں کو آگ لگاتے رہے، چلتی بسوں پر سنگباری کی اور ایک دن جو دل میں آیا تو کئی بسوں کو اغوا کر کے لے گئے۔ اور صرف اسوقت انہیں چھوڑا جب یقین حاصل کرلیا کہ حکام ان کے لئے زیادہ بسیں چلائیں گے۔ لیکن بسیں ہیں کہاں جو زیادہ تعداد میں چلائی جا سکیں گی۔ وہی رفتار بے ڈھنگی جو روز اوّل تھی بدستور موجود ہے، اور خدا معلوم کب تک رہے گی۔ بلکہ ہمیں تو خدشہ یہ ہے کہ یہ ہمیشہ رہے گی اس لئے کہ اگر ڈی، ٹی، یو نے مزید بسیں چلانے کی ہمت بھی کی تو اس دوران میں اسی حساب سے آبادی بھی بڑھ جائے گی اور معاملہ وہیں رہے گا جہاں پہلے تھا اور پھر وہی سنگباری اور بسوں کو آگ لگانے کے واقعات۔ یعنی ہمارے طلبا اپنی زندہ دلی کو باقی رکھیں گے۔

ایک زندہ دلی کا مظاہرہ طالب علموں نے کیا اور دوسری زندہ دلی جن سنگھی ایڈمنسٹریشن کے ڈائرکٹریٹ تعلیمات نے دکھائی۔ اور بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ اس نے چھٹے درجے سے سنسکرت کو لازمی زبان قرار دے دیا ہے۔

سنسکرت کو کیوں لازمی کیا گیا؟ کیا وہ کسی صوبے یا ریاست کی زبان ہے؟۔ کیا کسی علاقے میں بولی جاتی ہے۔؟ جواب مِلا کہ "وہ سب زبانوں کی ماں ہے۔ ماں سے سب زبانوں کا تعلق رہے اس لئے سنسکرت کو لازمی کیا گیا۔"

آپ نے بہت اچھا اقدام کیا۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک بہن کو چوٹی پر پہونچا دیا اور دوسری بہن یعنی فارسی کو زندہ درگور کردیا۔ اسے اختیاری مضامین تک سے نکال دیا۔ اور پھر کیا ڈائرکٹریٹ کے نام نہاد ماہرین تعلیم بتائیں گے کہ جس بچے یا بچی کو ہندی کی ٹھیک طور پر شدھ بدھ بھی نہ ہو کیا اسے ایک دم سنسکرت کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ یہ سنسکرت نوازی نہیں بلکہ "سنسکرت دشمنی" ہے۔ اس لئے کہ جس طالب علم پر اس کی اہلیت کا لحاظ کئے بغیر سنسکرت کو زبردستی تھوپنے کی کوشش کی جائیگی اسے اس زبان سے دلچسپی نہیں نفرت پیدا ہوگی۔

جن سنگھی ایڈمنسٹریشن سنسکرت کو ٹھونس کر حقیقت میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش میں ہے وہ چاہتا ہے کہ ایک طرف سنسکرت کو فروغ حاصل ہو اور دوسری طرف اُردو ایک زبان کی حیثیت سے ختم ہو جائے۔ اس نے اُردو میڈیم ختم کرنے کا اعلان نہیں کیا بلکہ ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ خود اردو والے پکار اٹھیں کہ اے اردو میڈیم کو ختم کرو۔

اردو نصاب کی کتابیں مہیا نہ کر کے حقیقت میں دلی ایڈمنسٹریشن نے ایک طبقے کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے سے انکار کیا ہے۔ ماہرین قانون بتائیں کہ کیا یہ دستور ہند کی کھلی خلاف ورزی نہیں ہے؟۔

اور سنئے۔ اعلان یہ ہے کہ اُردو کو ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں۔ اس کی تعریف بھی کی جاتی ہے کہ وہ بڑی خوبصورت زبان ہے۔ لیکن اسی راجدھانی میں بلکہ خاص پارلیمنٹ کے قریب واقع کچہری میں ایک مجسٹریٹ صاحب ہدایات جاری فرمارہے تھے کہ "کوئی درخواست بھی اردو میں نہ لی جائے۔"

اردو کے ساتھ اس قسم کی بے انصافیاں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ جب تک اردو کو سرکاری حیثیت نہ دی جائے گی اور اسے دوسری سرکاری زبان قرار نہ دیا جائے گا اسکا تحفظ نہ ہو سکے گا سہولتیں مہیا کرنے کی بات محض "ڈھونگ" ہے، اور اس ڈھونگ کے پردے میں اُردو کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔

تصحیح فرمائیے

جولائی نصف اوّل کے "واقعات" میں جناب اختر بستوی کے مضمون "گوبند سرور" پر موصوف کا اسم گرامی کاتب کے سہو سے نہیں لکھا گیا۔

پروفیسر صاحب سے ڈاکٹر صاحب تک

ہندوستانی مسلمانوں کو بھارتیانے کا مسئلہ

"میرا ہندو دوست تو ہندوستان کو اپنا مذہب سمجھنے پر خواہ مخواہ مجبور تھا۔ میں مجبور نہیں تھا لیکن میرا ایمان میری مجبوری بن چکا تھا۔ وہ مجبوری اب بھی میرے ساتھ ہے۔ اس لئے سیکولرزم اور جمہوریت کے ساتھ میری وابستگی اور اس ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دینا میرے ہندو دوست کے لئے اتنا نہیں جتنا میرے ایمان کا جزو بن چکا ہے۔"

مسلمانوں کے ایک "دوست" ہیں پروفیسر بلراج مدھوک۔ بیچارے مسلمانوں کے بارے میں اتنے زیادہ پریشان رہتے ہیں کہ دن رات مسلمان ان کے دل و دماغ پر بھوت کی طرح سوار رہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو یہ بات ثابت کرنے کا خبط ہے کہ وہ صرف نام ہی کے نہیں بلکہ کام کے بھی پروفیسر ہیں۔ اس لیے وہ وقت بے وقت مختلف نئی نئی تھیوریاں پیش کرتے رہتے ہیں۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ یہ تمام تھیوریاں ہوتی بھی مکمل طور پر نئی (ORIGINAL) ہیں۔ اس لیے مان لینا پڑتا ہے کہ واقعی مسلمانوں کے یہ ہمدرد صرف نام ہی کے پروفیسر نہیں بلکہ سچ مچ پروفیسر ہیں۔ ان پروفیسر صاحب کا ایک شوق الیکشن لڑنا بھی ہے۔ کئی بار الیکشن لڑا جس میں سے ایک آدھ بار کامیاب بھی ہوئے۔ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد کچھ اس طرح سے پھولے کہ خوف محسوس ہونے لگا کہیں یہ جلد ہی پھٹ نہ جائیں۔ اور ایسا ہی ہوا بھی۔ ۱۹۷۱ء کے انتخاب میں بیچاروں کے پرزے پرزے ہو گئے۔ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد پروفیسر صاحب نے ایک تھیوری رکھی تھی یعنی ہندوستانی مسلمانوں کے "بھارتیاکرن" کی تھیوری۔ پہلے تو پروفیسر صاحب زبانی ہی شور مچاتے رہے لیکن پھر پبلک کے بے حد اصرار پر انہوں نے بھارتیاکرن کے بارے میں انگریزی میں ایک کتاب لکھ ماری — "INDIA NISATION"۔ لیکن اس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب مسلمانوں کا بھارتیاکرن کرتے، جنتا نے ان کا [illegible] الیکشن میں ناکام ہونے کے بعد ہمارے پروفیسر صاحب

پروفیسر بلراج مدھوک

سے ایک اور بات بھی جمہوری عوام کے سامنے رکھی. یعنی نظر نہ آنے والی سیاہی کی کہانی ـــــ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے پروفیسر صاحب بھی اس نظر نہ آنے والی سیاہی کی طرح غائب ہو گئے ہیں۔ اور عوام کو کچھ دنوں کے لیے اس بے سُرے باجے سے نجات مل گئی ہے۔

یہ تو تھی پروفیسر صاحب کی بات۔ ہمارے ایک اور دوست ہیں ڈاکٹر عابد رضا بیدار انہوں نے بھی ایک کتاب لکھی ہے' اردو میں "سیما کی تلاش ـــــ ہندوستانی مسلمانوں کے بھارتیا کرن کا مسئلہ"۔ ڈاکٹر بیدار نے مسئلے کو ایک دوسرے پہلو سے اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر بیدار ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں مسلمانوں سے سچی ہمدردی ہے۔ لیکن یہ ہمدردی کوئی جذباتی درد نہیں بلکہ باشعور لگاؤ ہے' ڈاکٹر بیدار نے اپنی کتاب میں بہت سی باتیں کہی ہیں جو حالانکہ کڑوی ہیں پھر بھی کافی حد تک سچی ہیں۔ ڈاکٹر بیدار کا کہنا ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کا بلکہ ـــــ دوسرے تمام ملک دشمن اور انسانیت دشمن عناصر جیسے کہ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس وغیرہ کا بھی بھارتیا کرن ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کو اپنے آپ کو ہندیانا ہوگا نہ کہ ہندوانا۔

ہندیانے کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں۔

"میں ہندوستانی مسلمان، ہر اس مسئلے کو جو میرے ملک کے سیکولر خوش حال جمہوریہ بننے میں رکاوٹ ڈالتا ہو، سلجھانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا چکا ہوں۔ یہ بازی میں نے اس وقت لگائی تھی، جب پاکستان بنا تھا، اور میرے لیے راستہ کھلا ہوا تھا۔ میں وہاں زیادہ ترقی کر سکتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر، اپنے مذہب کی ہدایات کے مطابق حکومت اور سیاست کو ڈھالنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن میں وہاں نہیں گیا اس لیے کہ شعوری طور پر میرا ایمان سیکولرازم اور جمہوریت کے ساتھ تھا۔ میرا ہندو دوست تو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنے پر خواہی نخواہی مجبور تھا۔ میں مجبور نہیں تھا، لیکن میرا ایمان میری مجبوری بن چکا تھا، وہ مجبوری اب بھی میرے ساتھ ہے۔ اس لیے سیکولرازم اور جمہوریت کے ساتھ میری وابستگی اور اس ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لیے اپنے آپ کو داؤں پر لگا دینا میرے ہندو دوست کا اتنا نہیں جتنا میرے ایمان کا جزو بن چکا ہے۔ اور اسی لیے میں ہر اس ننھی کرن کی طرف لپکتا ہوں جو اس گھور اندھیرے میں مجھے ذرا سا بھی راستہ دکھا سکتی ہے، ہندیانے کی بات بھی مجھے کچھ ایسی ہی لگی۔"

ڈاکٹر عابد نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک حد تک مسلمانوں کو اپنے رہن سہن اور طریقۂ فکر میں تبدیلی لانی ہوگی۔ اس کے لیے انہوں نے بعض بہت ہی ٹھوس دلائل اور مثالیں دی ہیں۔ ان کی اس بات سے ہمیں بھی اختلاف نہیں ہے کہ تبدیلی کی ضرورت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تبدیلی کس قسم کی ہوگی اور اسے کون لائے گا۔ یہ مسئلہ بہت ٹیڑھا اور غور طلب ہے۔ اس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اس پر پوری قوم، قوم کے لیڈروں، دانشوروں، مفکروں اور ہمدردوں کو سوچنا ہوگا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ یہ تبدیلی نہ تو جن سنگھ کے کہنے سے آئے گی اور نہ یہ مسئلہ قوم کو لعن طعن کرنے سے حل ہوگا۔ یہ تبدیلی اگر لائے گا تو خود مسلمان لائیگا۔ اس بات کا فیصلہ بھی مسلمان ہی کرے گا کہ یہ تبدیلی کس نوعیت کی ہوگی۔ اس کی 'سیما' یا حد کیا ہوگی، اور یہ تبدیلی کب لائی جائے گی۔ کسی سیاسی جماعت یا لیڈر کو ان مسائل کے حل ڈھونڈنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اگر مسلمان اس قسم کی کوئی تبدیلی لائیں گے تو وہ خود ان کے اپنے فائدے کے لیے ہوگی نہ کہ جن سنگھ یا کانگریس کو خوش کرنے کے لیے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر بیدار کا تعلق مسلمان قوم سے ہے اور انہیں قوم سے پوری ہمدردی ہے، لیکن قوم سے ان کا خطاب ایک ایسے مفکر کے انداز میں ہے جو کسی پہاڑ کی چوٹی سے چوٹی کے نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو خطاب کر رہا ہو۔ اگر ہمیں قوم کے مسائل کو حل کرنا ہے تو ہمیں ان کے ساتھ چلنا ہوگا۔ ان میں رہ کر ان کی نفسیات کو سمجھنا ہو گا۔ ڈر، خوف، شبہ، جذباتیت اور اندھی تقلید کی جو نفسیات پچھلے پچاس سال میں بنی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہم بہت سنبھل کر قدم اٹھائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری کسی سچی مگر کڑوی بات سے عوام کے جذبات کو ٹھیس پہنچ جائے۔ اور وہ ہماری بات ہی سننا چھوڑ دیں۔ عام طور پر ہوتا بھی کچھ اسی طرح ہے۔ کبھی قوم کا کوئی سچا ہمدرد بھی قوم کی کسی غلطی کوتاہی کی طرف اشارہ کرتا ہے تو عوام اس کی بات سننے سے پہلے ہی اس پر حکومت کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو بھی اس بات کی شکایت ہے۔ جو کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ اور ہمیں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر بیدار لکھتے ہیں۔

"سوچ بچار کرنے والے طبقے میں سے کچھ تو اس لیے خاموش رہے کہ اگر کوئی ایسی بات کہی جائے جو مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگاتی ہو اور انہیں خوش نہ کرتی ہو تو سیدھا سادا ایک لیبل سرکار پرستی کا لگا دیا جاتا ہے اور چھا گلاجی کی جانشینی کا افتخار بخش دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگ اس لیے خاموش رہے کہ ان کے خیال میں بات تو ٹھیک ہے، لیکن اصل اہمیت اپنی انفرادیت کو بچائے جانے کی ہے۔ اور یہ کہ اگر اس وقت میں عمارت کی ایک اینٹ بھی تم نے کھسکائی تو پوری عمارت آن گرے گی، دوایک نے اقبال کی یاد بھی دلائی کہ بحرانی دور میں تقلید ہی راہ عمل ہے۔ جس سے روایت اور وراثت کا تحفظ ہو سکتا ہے۔"

میں نے پچھلے پیراگراف میں ایک بات کہی تھی کہ ایسی بات نہ کہی جائے جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اس سے میرا مطلب تھا کہ سچی بات کہا تو ضرور جائے لیکن اس طرح کہا جائے کہ اس سے کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس فرد کو بھی قوم یا ملک سے سچی ہمدردی ہوگی وہ سچی بات کہنے میں ہچکچائے گا نہیں۔ چاہے بولنے کے لیے قوم وقتی طور پر جذبات میں بہہ کر اس سے نفرت ہی کیوں نہ کرنے لگے۔ اسی بات کو ڈاکٹر

نے آگے صاف کیا ہے۔" اپنی ذاتی فکر ہو تو پُرخلوص
شخص اس بات کی پروا نہیں کیا کرتا کہ اس پر کونسا
ہل لگ جائے گا۔ دل کی آگ اسے یہ سوچنے کی مہلت
ہی کب دیتی ہے۔ اور اتفاق بخت سے اگر حکومت
وقت کے لیے ایسے شخص کی کوئی بات پسندیدہ
ٹھہرے بھی تو زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ اس کی
کوئی دوسری بات سخت ناپسندیدہ قرار دیدی
جائے گی۔ محض اسلیے کہ ایسا شخص اپنے قلم کو گروی
نہیں رکھے گا۔"

میرے خیال میں مسئلہ صرف مسلمانوں کو
ہندیانے کا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں غلط، بوسیدہ
اور مفاد پرست لیڈروں سے آزاد کرانے کا بھی ہے۔
ان میں سیاسی اور سماجی شعور کو بیدار کرنے
کا ہے۔ ان میں یہ احساس پیدا کرنے کا ہے کہ
وہ صرف ایک مسلمان ہی نہیں، ایک ہندوستانی
ہی نہیں بلکہ ایک انسان بھی ہیں، وہ انسان جو
مزدور ہے، جو کسان ہے، جو ٹیچر ہے، قلم کار ہے،
یعنی ایک لفظ میں جو مظلوم ہے۔ اور اگر وہ ایسے
انسان ہیں تو پھر ان کا کوئی "کرن" کرنے کی
ضرورت نہیں۔ وہ ایک سچے مسلمان بھی ہیں۔
اور ایک سچے ہندوستانی بھی۔ مسلمانوں کو اس
حقیقت کا احساس کرنا ہوگا کہ ان کا تعلق اقلیت
سے نہیں بلکہ اکثریت سے ہے۔ اس اکثریت سے
ہے جو ننگی بھوکی ہے، جو بے روزگار ہے، جو ہندوستان
کو آزادی ملنے کے باوجود بھی آزاد نہیں ہے! اور
مسلمان اس طبقے کے سب سے زیادہ پسے ہوئے
حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے یہ مسلمان کا فرض
ہے کہ وہ نہ صرف خود صحیح راہ پر چلے بلکہ دوسرے
پسے ہوئے لوگوں کو بھی راستا دکھائے۔ ہندوستان
کی اس غریب مظلوم اکثریت کی لیڈرشپ مسلمانوں
کو اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی۔ اس لیے کہ وہ اسی
اکثریت کے سب سے زیادہ پسماندہ طبقے سے تعلق
رکھتے ہیں۔

آسام میں نئی تیل ریفائنری لگانے کے لیے
تحریک شروع ہوئی ہے۔ پانچ لاکھ لوگ اس
تحریک میں اپنی گرفتاری دیتے ہیں۔ تحریک ایک
معاشی تحریک ہے جس سے صوبے کے تمام غریب
اور پسماندہ عوام کا بھلا ہوگا۔ اس لیے عوام بڑھ
چڑھ کر اس کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانی دینے
کے لیے تیار ہیں۔ میرے ایک دوست مجھ سے سوال
کرتے ہیں کہ ان پانچ لاکھ لوگوں میں کتنے مسلمان
تھے؟ جب کہ آسام میں مسلمانوں کی بہت بڑی
تعداد رہتی ہے۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں!!

حیدرآباد سے ہمارے ایک دوست آتے
ہیں۔ ان کے ساتھ وہاں کے کچھ دوسرے مسلم لیڈر
ہیں جن میں سے ایک اسمبلی کے ممبر بھی ہیں میں
ان سے سوال کرتا ہوں کہ "تلنگانا تحریک کے بارے
میں تلنگانا کے مسلمانوں کا کیا رویہ ہے؟ (یہ ان
دنوں کی بات ہے جب تلنگانا تحریک شباب پر
تھی۔) وہ بہت فخر کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ
مسلمانوں کو اس تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔
میں ان سے پوچھتا ہوں ایسا کیوں ہے؟ تو وہ
جواب دیتے ہیں کیوں کہ یہ مسلمانوں کی تحریک نہیں ہے۔
میں ان سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ مسلمانوں
کی تحریک کیوں نہیں ہے؟ کیا تلنگانا میں رہنے والے
مسلمان تلنگانا کا ایک حصہ نہیں ہیں؟ کیا تلنگانا کے
مسائل ان کے مسائل نہیں ہیں؟ کیا تلنگانا کی تحریک
معاشی طور پر پچھڑے ہوئے لوگوں کی تحریک نہیں
ہے؟ کیا یہ تحریک تلنگانا کی معاشی بحالی کے لیے
نہیں ہے؟ اس کا جواب شاید کچھ اس طرح سے
دیا جائے کہ اگر تلنگانا کی معاشی ترقی ہوگی تو اس
سے مسلمانوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ ان کے ساتھ تعصب
اسی طرح قائم رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ جب مسلمان
کسی تحریک کو اپنی تحریک نہیں سمجھیں گے کسی علاقے
کو اپنا علاقہ نہیں سمجھیں گے، وہاں کی خوش حالی
کو اپنی خوش حالی نہیں سمجھیں گے تو وہاں کے
دوسرے لوگ تحریک کے نتیجے میں ملنے والے پھل میں
انہیں کس طرح حصہ دار بننے کی اجازت دیدیں گے؟
میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان تلنگانا یا
کسی دوسرے تحریک میں کوئی حصہ لیتے ہی نہیں۔
یقیناً ایسے ہزاروں مسلمان ہیں جو اس طرح کی تحریک
کو اپنی تحریک اور اس کی کامیابی کو اپنی کامیابی
سمجھتے ہیں۔ قصور تو کچھ ہمارے لیڈروں کا ہے۔
جو ہمیں اس قسم کی تحریک سے دور رکھنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ان تحریکوں میں شامل
ہونے کی حالت میں ان تحریکوں کے لیڈر ہمارے
لیڈر بن جائیں گے نہ کہ ہمارے زنگ خوردہ قائد۔

مسئلہ کا اصل حل اس وقت ہی ممکن ہے
جب ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ ہمیں ہر حال میں یہیں
رہنا ہے۔ ہم نے ۱۹۴۷ء میں یہاں رہنے کا فیصلہ
اپنی مرضی سے کیا تھا، ہم پیدا یہیں ہوئے اور
مریں گے بھی یہیں، ہمیں اپنے جائز حقوق بھی یہیں
حاصل کرنے ہیں۔ یہ حقوق ہم اکیلے رہ کر نہیں بلکہ
ہندوستان کے دوسرے مظلوم باشندوں کے ساتھ
ملکر حاصل کرینگے۔ اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے
لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی نہیں چوکینگے۔

اس وقت ہماری آواز صرف مسجد اقصیٰ کے
مسئلے ہی پر نہیں اٹھے گی بلکہ بنگلا دیش کے مسئلہ پر
بھی اٹھے گی، اردن میں فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم
کے خلاف بھی اٹھے گی۔ مراکش اور ایران میں عوامی
حقوق کے کچلے جانے کے خلاف بھی اٹھے گی، امریکہ
میں کالوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف بھی اٹھے
گی، ویٹ نام کے بہادر عوام کے لیے بھی اٹھے گی۔
غرض کہ ظلم کے ہر اٹھتے ہوئے ہاتھ کے خلاف اٹھیگی۔
پھر کسی میں ہمت نہ ہوگی کہ وہ ہمارے بھارتیانے
یا ہندیانے کی بات کرے۔ اور اگر کوئی ایسی بات
کرے گا بھی تو اس کی بات پر کوئی کان نہ دھریگا۔
پھر ہمارے "قائدین" کو پانچ پانچ، دس دس کی
ٹولیاں بنا کر پاکستان ایمبیسی کے باہر دکھاوے کے
مظاہرے کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔
ان کی آواز ظلم کے خلاف سارے ہندوستان سے
اٹھنے والی آواز کا ایک حصہ ہوگی۔ ایک ایسا حصہ
جسے حکومت کے اشارے پر مختلف لباس پہننے کی
ضرورت نہ ہوگی۔ اور یقیناً یہ آواز خود ایسی حکومت
کے خلاف بھی ہوگی جو انسانیت نواز نہ ہو۔ ★

رٹ — عوام کے لیے اہم آئینی قانون

محمد رضی الدین معظم

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آں جہانی جواہر لال نہرو ہندوستان کے آخری گورنر جنرل سے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کا حلف لیتے ہوئے

دنیا کے جمہوری نظام میں عوام کو ہر قسم کی [آز]ادیاں FREEDOMS حاصل ہوتی ہیں جنہیں [اص]طلاحی زبان میں بنیادی حقوق FUNDAMENTAL RIGHTS کہا جاتا ہے جس کا ذکر [ا]ن ممالک کے متعلقہ آئین یا دستور میں پایا جاتا ہے۔ بعض ممالک میں آئین یا دستور کے ذریعہ ان حقوق [ک]ی ضمانت بھی دی جاتی ہے۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک کے ماہرین قانون نے بھی آئین کی تیاری کے [و]قت ان حقوق کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہوئے ان کا واضح طور پر تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح ہمارے [آئ]ین میں ان کے حذف کر دئے جانے یا ان حقوق میں [illegible]

کار کی گنجائش قانون رٹ کے ذریعہ فراہم کی گئی ہے۔

قانون رٹ WRIT کا مقصد دراصل اڈمنسٹریشن (انتظامیہ) کی غلطیوں کا تدارک ہوتا ہے۔ اور اس طرح انتظامیہ کو عوامی حقوق کی قربانی دیئے بغیر عمدہ کارکردگی کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

ابتداء سے ہی رٹ کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن تیرہویں صدی عیسوی سے اس کی افادیت بہت زیادہ ہو گئی ہے، برطانیہ کے بادشاہوں خصوصاً ٹیوڈر حکمرانوں کے عہد میں رٹ آج کی طرح عوام کے حقوق کی حفاظت کا ضامن تھا۔ آپ چونکہ ابتداءً [illegible]

PREROGATIVE WRITS کہا جاتا تھا اور ان کا اجرا کیا جانا بادشاہوں کے اختیار تمیزی پر منحصر تھا۔ دھیرے دھیرے دنیا کے مختلف ممالک میں رٹ کسی نہ کسی صورت میں نافذ ہوتے رہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں کو محدود پیمانے پر ہی سہی اٹھارہویں صدی عیسوی سے یہ طریقہ حق و انصاف انگریزوں نے اپنے مطلب کے لیے جاری کیا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی سے ویلفیر اسٹیٹ کا واضح تصور ابھر آیا۔ جسکے باعث حکومتی مشنری میں بیحد توسیع ہو گئی اور انہیں جامع ترین اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس طرح عوام کے حقوق کے لیے رٹ لازمی [illegible]

ماہرین قانون نے ہی ہمارے دستور میں
دی حقوق کے ساتھ ساتھ رٹ کے لیے جو نہ
ف اڈمنسٹریشن اور ایگزیکیٹو کے خلاف بلکہ
یلیٹو کے تحت حتیٰ کہ دیگر مقاصد کے لیے بھی
ی کو ضروری سمجھا اور اس کی اہمیت وافادیت
مدنظر دستور کے آرٹیکل ۳۲، ۲۲۶ (226 ،
ART) میں عوام کو اس کا حق دلایا تاکہ وہ
یم کورٹ اور علاقائی ہائی کورٹ میں موزوں
ٹ داخل کرنے کا حق حاصل کر سکیں۔ اسی طرح
ری آزادیوں میں دخل کا بنیادی حق متاثر
ہیکے اقانونی حق کو سلب کرلے یا ان پر کسی قسم کی
ید عائد کرنے وغیرہ پر رٹ کی درخواست
WRIT PETITIO) دی جاسکتی ہے۔ یہی نہیں
حقوق کے سلسلہ میں ہمارے آئین کے پارٹ
(PART : III) میں مندرجہ حقوق کے علاوہ
ی ہائی کورٹ اپنے وسیع اختیارات کے تحت
ر۔۔۔ امور پر بھی غور کر سکتی ہے۔ رٹ کے لیے
ر قوانین کی طرح کوئی خاص علیٰحدہ قانون
نود نہیں بلکہ رٹ کی درخواستیں ہمارے آئین
آرٹیکل کے تحت ہی گزرانی جاسکتی ہیں۔ گو
سلسلہ میں انتظامی نوعیت کے کچھ قواعد بعض
ستوں میں لاگو ہیں۔ چھوٹا رٹ کے لیے سب سے
بات درخواست گزار کا نجی معاملہ ہونا ضروری
اور پھر حق اس کا اپنا حق ہونا چاہئے۔ ہائی کورٹ
سپریم کورٹ میں چھ اقسام کی رٹ پیش ہوتی ہیں
ہر قسم کے قوانین کو چیلنج بھی کیا جاسکتا ہے۔ گرجا
کے پادری کو چرچ کی تعمیر اور اس کے مجاور کو
اکرنے کے لیے دیئے گئے عطیہ کی رقم پر انکم ٹیکس
ہر دن نے ٹیکس لگا دیا جسکے خلاف رٹ منظور کی
یونیورسٹی کے باضابطہ قوانین کی بھی غلط تاویلات
باعث اکثر رٹ کی درخواستیں داخل ہوتی ہیں۔
آباد یونیورسٹی کے چانسلر نے ایک ریٹائر ہونے
لے پروفیسر کو کونسل کی اکثریت سے محروم کرنا چاہا۔
خلاف رٹ داخل کی گئی اور منظور کی گئی۔
سرکاری دفاتر کے اسٹاف کی رٹ بھی وافر

تعداد میں ہوتی ہیں جن میں درخواست گزار کو وجہ
نمائی کا نوٹس نہ دینا SHOW CAUSE NOTICE
انصاف کے اصولوں کے خلاف عمل کرنا، جلد نہ فیصلے
کرنا، شہادت قبول کئے بغیر فیصلے کرنا، دشمنی سے حق
متاثر کرنا، برطرف کرنا یا تنزل کرنا، قابلِ ذکر ہیں۔
دشمنی کی حد تک تو منسٹر بھی آتے ہیں۔ ایک بار بہار
کے یونیو منسٹر کے خلاف لائسنس کے منسوخ کرنے میں
دشمنی کا جواز اٹھایا گیا تھا۔ جبکہ متذکرہ منسٹر نے ایک
فرم کے معائنہ کے بعد قانون کے تحت لائسنس منسوخ
کردیا تھا۔ اسکی رٹ اسی بنا پر منظور کر لی گئی۔

جن حالتوں میں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ رٹ
کے ذریعہ حقوق میں مداخلت نہیں کرتے، بعض کا ذکر
آئین میں خود موجود ہے اور بعض ہائی کورٹ یا سپریم
کورٹ نے وضع کئے ہیں۔ مثال کے طور پر آرٹیکل ۷۳
(ART : 73) کی رو سے صدر و نائب صدر کے
انتخابات کے اعتراضات صرف سپریم کورٹ کو سننے
کا اختیار ہے اور اسکے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ
پیش نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح آرٹیکل ۷۴ (ART)
کی رو سے صدر کو وزراء نے کیا رائے دی تھی، رٹ
کے ذریعہ کسی عدالت میں اٹھایا جاسکتا ہے۔

پارلیمنٹ اور لیجسلیچرس میں ہونے والی کارروائیوں
کو یا ان کے کام کی انجام دہی کے خلاف رٹ جاری
نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح اسپیکر کے فیصلہ پر نظر
ثانی کرنے یا پارلیمنٹ میں پیش کردہ کسی قانون کو
روکنے (جو کتنا ہی غیر قانونی کیوں نہ ہو) کے لیے رٹ
پیش نہیں کی جاسکتی۔ مزید یہ کہ ایوان بالا کے لیے
علماء، سائنسدانوں، ادیبوں وغیرہ کا انتخاب اختیاری
ہوتا ہے۔ اسکے خلاف بھی رٹ قابلِ سماعت نہیں
ہوتی۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی کے اراکین کو ایوان
میں مخصوص آزادی حاصل ہے۔ ان کو بھی رٹ
کے ذریعہ چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح صدر جمہوریہ
نیز گورنروں کے سرکاری کاموں کے خلاف بھی
رٹ کے ذریعہ TUDICIAL REVIEW
ممکن نہیں۔

رٹ اپنی اہمیت افادیت اور دائرہ عمل کے
پیش نظر الگ الگ ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں۔
CERTIORARI رٹ جوڈیشیل ایکٹس
TUDICIAL ACTS کی غلطیوں کے لیے (جن سے
بنیادی حقوق متاثر ہوتے ہیں) پیش کیجا سکتی ہے۔
اور اسکی عملداری (نیچے کی عدالتوں، ایڈمنسٹریٹیو
ٹریبونل، لوکل اتھارٹی اداروں، آفیسروں نیز دوں
اور ڈپارٹمنٹس پر ہوتی ہے جو انکے اختیارات کے غلط
استعمال اور انصاف رسانی کے منافی کام کرنے قانون
یا حقائق وریکارڈ بالا کے بالائے طاق رکھکر حکم جاری کرنے)
پر اجرا کی جاتی ہے۔ اسکو عام طور پر سرشوری رٹ کے
نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سرشوری رٹ کی طرح PROHIHITION
رٹ بھی ہے جو متذکرہ دفاتر اور ادارہ جات وغیرہ
کے خلاف اسوقت منظور کی جاتی جبکہ غیر قانونی، غیر
اختیاری یا غیر مجازی طور پر کی جانے والی کارروائیوں
کو فوری روکنا متصور ہوتا ہے۔ اور ——
MANDAMUS رٹ پبلک ڈیوٹی کے فرائض کی
تکمیل کرنے کے لیے جاری کی جاتی ہے اور اسکی اجرائی
کے بعد اس رٹ میں بتلائے ہوئے حکم کے ذریعہ طریقہ
کار انجام دینا پڑتا ہے HABEAS CORPUS
رٹ بھی شخص کو غیر قانونی طور پر حراست میں رکھنے پر
جاری کیجاتی ہے —— QUO-WARRANTO
رٹ عوام کے اس حق کی تکمیل کا ذریعہ ہیں جو کسی عوامی
خدمت کے عہدہ پر غیر موزوں شخص کے تقرر کے خلاف
عوام کو حاصل ہے۔ ایسی صورت میں ——
QUO-WARRANTO رٹ پیش کیجا سکتی ہے۔

رٹ کی درخواستیں سوا روپیہ کے رسوم پر داخل
کی جاتی ہیں۔ یہ ابتداءً ہائی کورٹ سماعت کے لیے
قبول کرتے ہیں۔ اور اگر ہائی کورٹ موزوں سمجھے تو
اسکے ذریعہ حکم التوا بھی جاری کیا جاتا ہے۔ فریقین
کو نوٹس دیا جاتا ہے اور فریقین کی بحث کی سماعت
کے بعد فیصلہ دیا جاتا ہے جسکے خلاف اپیل کی گنجائش
بھی فراہم کی گئی ہے۔ سپریم کورٹ اس سلسلہ میں
اپیل کے لیے بعض صورتوں میں رٹ سماعت کے
لیے قبول کرتی ہے۔

★★

کرکٹ کے فاتحوں کا شاندار استقبا

WELCOME CRICKET HERO
I BOW (L) TO THE

پالم ہوائی اڈے پر ایرانڈیا کے "مہاراجا" نے کھلاڑیوں کا استقبال اس دل چسپ بینر سے کیا۔

دہلی میں فاتح ٹیم کو مسز گاندھی نے ریسپشن دیا۔ اجیت واڈیکر اور مسز گاندھی کسی دل چسپ مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں۔

پالم ہوائی اڈے پر بیدی اپنی بہن کے ساتھ

امریکا کی بدعہدی

جس نے ہزاروں انسانوں کو موت کی بھٹی میں جھونک دیا

وہ محض اس بنا پر ہار گئے کہ امریکا نے ان سے جو وعدہ کیا تھا سیاست کی تیز تلوار نے اس کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور انھیں میدانِ جنگ میں امریکی سربراہوں کی یقین دہانی کے باوجود ہوائی تحفظ فراہم نہ کیا جا سکا۔ انھوں نے اپنی تمامتر خوش فہمیوں کے ساتھ جنگ مول لی اور انجام کار ہار گئے۔

یہ اتوار کی صبح تھی۔ کیوبا کے پناہ گزینوں کا یہ فوجی دستہ جسے ریاستہائے متحدہ امریکا نے تربیت دی تھی۔ اسلحہ سے لیس خفیہ طور پر آہستہ آہستہ سمندری راستے سے فیڈل کاسترو کے کیوبا پر حملہ آور ہونے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ صدر کینیڈی نے چند گھنٹے قبل اس دستے کو حملہ کرنے کے لئے آخری اجازت دے دی تھی۔

اس حملے سے صرف ایک دن قبل ۱۵ اپریل ۱۹۶۱ء کو امریکا کے بی۔۲۶ بمباروں نے اچانک حملہ کر کے فیڈل کاسترو کی چھوٹی سی ہوائی طاقت کو تہس نہس کر دیا تھا اور اب کاسترو کے پاس صرف سات ہوائی جہاز باقی رہ گئے تھے۔ کیوبا پر دوسرے ہوائی حملے کی تاریخ ۱۷ اپریل کی صبح مقرر ہوئی۔ اس ہوائی حملے کے ساتھ ہی یہ بھی طے پایا تھا کہ کیوبا پر چھاتہ بردار فوج اتار دی جائے تاکہ کاسترو کی باقی ماندہ ہوائی طاقت بھی دیا جا سکے۔ امریکا کی ہوائی کمک کے بلبے میں ... کے بھروسے پر ہی حملہ آور دستہ آگے بڑھتا رہا اور دو شنبہ ۱۷ اپریل کی صبح کو ساحل پر اتر گیا۔ ایک ہزار چار سو افراد پر مشتمل کاسترو مخالف کیوبیوں کا یہ دستہ آہستہ آہستہ خلیج خنزیر (Bay of Pigs) تک پہونچ گیا۔ یہی مقام تصادم کے لئے مقرر تھا۔

تصادم کے وقت حملہ آوروں کا پلہ بہت بھاری تھا۔ کاسترو فوجوں کو شروع میں بھاری نقصان پہنچا۔ کاسترو کے پاس ہوائی طاقت نہیں کے برابر تھی اور اس کے دبالوں کی اہمیت امریکا کے ہوائی حملوں کے سامنے ایسی ہی تھی جیسے کسی شکاری کے سامنے پانی کے کنارے بیٹھی ہوئی بے فکر بطخیں ہوں۔ جنگ جاری تھی اور حملہ آوروں کا یہ دستہ بڑے بھروسے کے ساتھ امریکا کی ہوائی کمک کا انتظار کر رہا تھا۔

اتوار کی صبح امریکا کے بی۔۲۶ بمباروں کا چھوٹا سا گروپ طاقت ور دستہ خلیج خنزیر سے پانچ سیل دور ایک ہوائی اڈے پر حملہ کرنے کے لئے اڑان بھرنے کو بالکل تیار کھڑا تھا۔ ان ہوائی جہازوں کو اڑانے کے لئے بھی کیوبا کے ہوا باز مقرر کئے گئے تھے لیکن یہ ہوائی جہاز بروقت اڑان نہ بھر سکے کیونکہ عین وقت پر صدر کینیڈی نے انکی اڑان پر پابندی لگا دی تھی۔

دو شنبے کی صبح جب حملہ شروع ہوا تو ہوائی تحفظ کا سوال اٹھا۔ واشنگٹن میں بیٹھے ہوئے وہ غیر فوجی سربراہ جنہوں نے اس حملے کا نقشہ مرتب کیا تھا پریشان ہو کر صدر کینیڈی کے پاس دوڑے اور صدر سے استدعا کی کہ وہ اپنے سابقہ فیصلے پر نظرِ ثانی کریں یا فوراً کوئی نیا فیصلہ کریں۔ انھوں نے صدر کو مشورہ دیا کہ امریکا کے ایک ہوائی جہاز بردار بحری بیڑے کو فوراً حملہ آوروں کی مدد کو پہونچنے کی ہدایت دی جائے کیونکہ اس وقت دو بحری جہاز لڑاکا ہوائی جہازوں سے لدے ہوئے بالکل تیار کھڑے تھے اور ایک اشارے پر حملہ آوروں کی مدد کو پہونچ سکتے تھے۔

اس حملے کا نقشہ مرتب کرتے وقت صدر آئزن ہاور اور ریاستہائے متحدہ کے چیف آف اسٹاف نے یہ طے کیا تھا کہ امریکا کاسترو مخالف کیوبیوں کو حملے کے دوران مکمل ہوائی تحفظ فراہم کرے گا، لیکن صدر کینیڈی نے اس وقت بھی اس اسکیم کو ویٹو کر دیا تھا اور بضد تھے کہ کاسترو مخالف اور جلاوطن

واقعات نئی دہلی

[illegible] سلام میں امریکا کو براہ راست کسی کی پشت پناہی
[illegible] اب بہت کے اختلاف رائے کی بنا پر حملہ آور
[illegible] ہوائی تحفظ دینے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تو
[illegible] کینیڈی کا کام دوسرے بہانے تلاش کرنے لگے تاکہ
[illegible] کو راہ راست سے ہٹایا جا سکے لیکن ۱۸ اپریل کو پھر
[illegible] اپنے سابقہ فیصلے کو دہراتے ہوئے کہا کہ حملے
[illegible] ہوائی جہاز شرکت نہ کریں گے۔

ایک طرف صدر کینیڈی اپنے فیصلے پر اڑے ہوئے
دوسری طرف باغی کیوبائی کاسترو فوجوں سے نبرد آزما
انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ خلیج خنزیر سے ایک ہزار میل دور
واشنگٹن میں صدر کینیڈی بحیثیت مقتدر اعلیٰ انکی
[illegible] کے بارے میں عجیب اور بھیانک فیصلہ کر چکے ہیں،
انھوں نے ہوائی تحفظ کی فراہمی کے سابقہ فیصلے کو
بحال رکھا تھا۔

ہوائی کمک کی عدم موجودگی نے حملہ آوروں کو بے بس
[illegible] پسپا کر رکھا تھا۔ کاسترو نے اپنے باقی ماندہ ہوائی جہاز
میدان میں بھیج دیا تھا۔ یہ کاسترو جیٹ جو امریکا میں بنے
حملہ آوروں پر بمباری کرنے لگے۔ بمباری کرکے کاسترو حامی فوجوں
[illegible] حملہ آوروں کے پانچ بحری جہازوں کے بیڑے میں سے دو
جہاز کو غرق آب کر دیا۔ ان جہازوں میں سے ایک تو وہ تھا
جس پر حملہ آور دستے کے اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا
دوسرا جہاز رسل و رسائل کا واحد ذریعہ تھا۔ کاسترو کے
[illegible] بھی جو اب ہوائی حملوں سے محفوظ تھے میدان میں آکر
[illegible] جانے لگے۔

ان حالات کی خبر جب امریکا پہونچی تو وہاں کے فوجی
اور غیر فوجی رہنماؤں میں کھلبلی سی مچ گئی اور ایک مرتبہ پھر
صدر کینیڈی کو حالات سے آگاہ کرنے اور انھیں جلد ہی
کوئی نیا فیصلہ دینے پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی، اس بار
صدر کچھ نرم ہوئے اور انھوں نے محدود ہوائی کمک دینے پر
رضامندی ظاہر کی لیکن بدقسمتی سے موسم بہت خراب تھا
اس لئے فوری طور پر جہازوں کی اڑان میں بہت بڑی رکاوٹ
پیدا ہو گئی تھی۔ پھر یہ طے ہوا کہ منگل کی صبح کو یہ ہوائی جہاز
کیوبا پر حملہ کرنے کے لئے اڑان بھریں گے۔

منگل تک حملہ آوروں کی حالت بگڑتی ہی رہی پھر بھی
[illegible] ایک معدوم سی امید پر ہوائی تحفظ کے بغیر دشمن کا مقابلہ
[illegible]

گرتے اور مرتے رہے۔ لیکن اب انھیں کاسترو کی فوجوں نے
کافی پیچھے دھکیل دیا تھا۔ ۱۸ اپریل کی رات کو حملہ آور جنگ
بازوں کے سر پر بدقسمتی کا ایک طوفان خیمہ زن تھا۔ انکی حالت
بے حد ابتر ہو چکی تھی، انھیں اب تک ایک لمحے کا بھی آرام
میسر نہ ہوا تھا۔ مسلسل فائرنگ کرتے رہنے کی وجہ سے ان کی
انگلیاں سوج گئی تھیں۔ بھوک اور پیاس نے انھیں جاں کنی کی
حالت کو پہونچا دیا تھا۔ پھر بھی کسی خوش گمانی کی بنا پر انکے
حوصلے بہت بلند تھے۔

جنگ کی اس صورت حال کی اطلاع جب صدر کو پہونچائی
گئی تو وہ وہائٹ ہاؤس کی ایک ضیافتی پارٹی میں مشغول تھے
پھر بھی یہ اطلاع پاکر انھوں نے مہمانوں سے اجازت چاہی
اور اپنے فوجی اور غیر فوجی معاونوں سے مشورہ کرنے چلے گئے۔
انکے معاونوں نے پھر ایک مرتبہ یہی رائے دی کہ حملہ آور
کیوبائیوں کو ہوائی مدد ملنا ضروری ہے۔ اس بار پھر صدر نے
ان کا مشورہ مانتے ہوئے یہ حکم دیا کہ بدھ کی صبح ایک گھنٹے کے
لئے امریکا کا ایک ہوائی بیڑہ اس مقصد کے لئے کام میں لایا
جاسکتا ہے۔ ایک گھنٹے کے اس ہوائی پروگرام میں حملہ آوروں
کو فضائی تحفظ دینا، انھیں ضرورت کی چیزیں فراہم کرنا اور ساتھ
ہی کیوبا کے ہوائی جہازوں پر شدید وار کرکے انھیں تباہ کرنا شامل
تھا لیکن صدر اب بھی اس بات سے متفق نہ تھے کہ کیوبا کے
زمینی مورچوں کو بھی نشانہ بنایا جائے۔

یہ فیصلہ ہوا بھی تو بدقسمتی سے بہت دیر میں، اور ساتھ ہی
مکمل طور پر اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا کیونکہ کیوبا کے ہوائی جہازوں
نے دخل اندازی کرکے حملہ صحیح وقت پر نہ ہونے دیا اور ساتھ ہی
نشریات میں بھی مسلسل رخنہ اندازی ہوتی رہی۔ حملے کی سب
سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ ہوا بازوں کو صرف ایک گھنٹے کا وقت
دیا گیا تھا جو اتنے بڑے کام کو انجام دینے کے لئے نہیں کے
برابر تھا، اور یہ وقت بھی مسلسل کیوبائی جہازوں کی خلل اندازی
کی وجہ سے نکل گیا۔

۱۹ اپریل کی شام تک حملہ پورے طور پر ناکام ہو چکا تھا،
حالانکہ حملہ آوروں نے کاسترو کی فوجوں کو کافی نقصان پہونچایا تھا اور
امریکن تخمینے کے بموجب کاسترو کے دو ہزار فوجی کام آئے تھے
جب کہ حملہ آوروں کی طرف صرف سو جانیں ضائع ہوئی تھیں۔
لیکن ثابت قدمی کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جنگ کسی توقع
کی بنا پر لڑی جاتی ہے۔ امریکا کی طرف سے ہوائی مدد کی امید
ختم ہوتے ہی حملہ آوروں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور ان کی
اب تک کی ثابت قدمی اور بہادری ان کا مذاق اڑاتی ہوئی
رخصت ہو گئی۔ سارے کے سارے سلامت اور زخمی حملہ آور کاسترو
کے قیدی ہو گئے۔ لاشوں کو سڑنے یا پرندوں کی غذا بننے کے
لئے چھوڑ دیا گیا۔

امریکا کے جن فوجی سربراہوں نے اس حملے کو ترتیب دیا
تھا ان کا کہنا ہے کہ فتح کا پانسہ صرف ایک بال کے برابر فرق
سے پلٹ گیا۔ اگر ابتداً ہوائی طاقت کو بروئے کار لے آیا
جاتا تو کاسترو کے باقی ماندہ ہوائی جہازوں اور دبابوں کو آسانی
سے تباہ کیا جا سکتا تھا، اس طرح حملہ آوروں کا دباؤ کاسترو
فوجوں پر بڑھ جاتا، ساتھ ہی کاسترو کی فوج میں جو پھوٹ پڑ گئی
تھی اس میں اضافہ ہو جاتا اور اس صورت حال کو دیکھ کر
کیوبا کے اندر چھپے ہوئے باغی جو فتح کی خوش کن خبر کا انتظار
کر رہے تھے خود بھی اندرونی طور پر کاسترو سے نبرد آزمائی کیلئے
اٹھ کھڑے ہوتے لیکن انھیں مجبوراً روپوش ہی رہنا پڑا کیونکہ
انھیں حملے کا انجام معلوم ہو چکا تھا۔

وہائٹ ہاؤس میں موجودہ ریکارڈ میں صدر کینیڈی کے
اس فیصلے کا جو جواز موجود ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر
نے محض اس خوف سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر وہ ہوائی حملے کی
کھلی اجازت دے دیتے تو اس سے بہت اہم خطرہ یہ پیدا ہوتا
کہ لاطینی امریکا کی عوامی رائے اور اقوام متحدہ کی خصوصی رائے
امریکی پالیسی کی طرف سے خراب ہو جاتی، اور شاید اسی خطرے
کے پیش نظر ابتدا ہی سے اس بات پر ہمیشہ زور دیا گیا کہ امریکا
اپنے کسی کمزور پڑوسی کے خلاف طاقت کا استعمال نہ کرے گا
اسٹیٹ سکریٹری ڈین رسک بھی صدر کے پرزور حامی تھے اسی
لئے اس حملے کے دوران نہ امریکا کے جوائنٹ چیف آف اسٹاف
نے کوئی سرگرمی دکھائی اور نہ اعلیٰ فوجی عہدے داران ہی میدان عمل
میں آسکے حالانکہ ان سب کی رائے یہی تھی کہ جب امریکا ہی نے
نقشہ مرتب کرکے کیوبا پر حملہ کروانے کا فیصلہ کیا ہے تو اسے
عملی طور پر ان باغیوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ لیکن آخیر تک
ان کے مشوروں کو نظر انداز کیا جاتا رہا اور صرف امریکی خفیہ ایجنسی
اور وہائٹ ہاؤس کی مرتبہ پالیسی پر ہی عمل کیا گیا جسکا نتیجہ
ناکامی کی شکل میں ظاہر ہوا اور چند ہی دنوں میں ہزاروں مظلوم
بلا مقصد وہائٹ ہاؤس کی چہار دیواری کے اندر مرتب کئے ہوئے
کاغذی نقشے کی بھینٹ چڑھ گئے۔

محمد غلام رسول

برطانیہ میں فٹ بال

ازمنہ وسطیٰ میں بغرضِ تفریح ایک قسم کا کھیل کھیلا جاتا تھا
ی حد تک فٹ بال سے مشابہت رکھتا تھا لیکن اس دور
ہ اس کھیل کی کوئی منظم شکل تھی اور نہ اسکے قاعدے قانون
. دیکھا جائے تو منظم شکل میں فٹبال کھیلنے کی ابتدا ایک صدی
ہی ہوئی جبکہ اسے دو مختلف طریقوں سے کھیلنے لگے۔ ایک
میں کھلاڑی صرف پیروں کا ہی استعمال کرتے تھے لیکن
ے طریقہ میں نہ صرف پیروں کا استعمال ہوتا تھا بلکہ کھلاڑی
کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے اور پکڑتے بھی تھے۔
طریقۂ اول آج دنیا میں ازحد مقبول ہے۔ جسے دنیا
ل کے نام سے جانتی ہے اس طریقہ کی ابتدا ۱۸۵۵ء میں
رج میں ہوئی تھی۔ دوسرے طریقے کی ابتدا RUGBY
SCHOOL رگبی اسکول میں ہوئی اور ۱۸۵۹ء میں اسے
BLACKHELTH FOOTBALL CLUB نے اپنایا تھا جب
سے اس کھیل کو رگبی فٹبال کہا جانے لگا۔

فٹ بال ایسوسی ایشن۔

انگلینڈ میں یوں تو کھیل کود کی ترقی و ترویج کیلئے بہت
سی تنظیمیں ہیں۔ لیکن فٹبال کے کھیل کی نگرانی اور ترقی کیلئے
ایک علیحدہ تنظیم ہے جسے نہ صرف جزائر برطانیہ کے ہی عوام بلکہ
دنیا بھر کے اسپورٹس کے شائقین فٹبال ایسوسی ایشن (F.A)
کے نام سے جانتے ہیں۔ ۱۸۶۳ء میں اس تنظیم کا قیام عمل میں
آیا اور آج یہ عالم ہے کہ ساڑھے تین سو سے زائد فٹ بال
کلب اس تنظیم سے منسلک ہیں۔ جن میں مستقل ممبر کلب ۲۰۰ سے
زائد ہیں اور باقی کلبوں کی حیثیت عارضی ہے۔ ذیل میں F.A
کے اغراض و مقاصد پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) F.A کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ عوام الناس
میں فٹبال سے دلچسپی بڑھائی جائے اور زیادہ سے زیادہ اسے
مقبول بنایا جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے متعلقہ قوانین
کا احترام کیا جائے اور اس کی خلاف ورزی کسی بھی صورت میں نہ
ہونے پائے۔ کیوں کہ کسی بھی کھیل کے قوانین و شرائط کی پابندی
کھلاڑیوں کا فرض اولین ہے۔

(۲) مذکورہ ایسوسی ایشن کا دوسرا اہم مقصد ملک کے
ہونہار اور باصلاحیت کھلاڑیوں کو کوچنگ اور موزوں تربیت
دینا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایسوسی ایشن کی جانب سے

تقریباً ۱۰ ہزار پونڈ کی کثیر رقم سالانہ صرف کی جاتی ہے۔ اور کھلاڑی مذکورہ تربیت کے بعد نہ صرف ملک کی قومی ٹیم میں اپنا مقام حاصل کرتے ہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

(۳) (F.A) فٹبال ایسوسی ایشن ہر سال متعدد ٹورنامنٹ اور فٹبال کے مقابلوں کا انعقاد کرتی ہے۔ جن میں چند اہم ٹورنامنٹ یہ ہیں۔ امیچر کپ AMETURE CUP نیشنل یوتھ کمپٹیشن NATIONAL YOUTH COMPETITION) لیکن سب سے زیادہ اہمیت اور ملک گیر مقبولیت کا جو مقابلہ وہ فٹ بال ایسوسی ایشن چیلنج کپ ہے۔ اسے شائقین F.A. CUP کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اس میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

فٹبال ایسوسی ایشن تمام ٹورنامنٹ اور مقابلوں کے اختتام پر اچھے کھلاڑیوں کا انتخاب کرتی ہے۔ جن سے انگلینڈ کی قومی فٹبال ٹیم بین الاقوامی مقابلوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ انگلینڈ کی فٹبال ٹیم دنیا میں ایک بہت بڑی طاقتور ٹیم مانی جاتی ہے۔ ۱۹۶۶ء کے ورلڈ کپ فٹبال ٹورنامنٹ میں اسی ٹیم نے چمپین شپ حاصل کی تھی اور اس مرتبہ ۱۹۷۰ء کے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں انگلینڈ کی ٹیم نے بہتر کھیل کا مظاہرہ کیا۔

انگلینڈ کی طرح اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور ویلس میں بھی فٹبال کی نگرانی کے لئے علیحدہ علیحدہ تنظیمیں ہیں جن کے نام بالترتیب Scottish football association. Irish football association اور Football association of Wales. [illegible] F.A کے اغراض و مقاصد کی کم و بیش پیروی کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں انگلستان میں کئی علاقائی اور صوبائی ایسوسی ایشنس ہیں جن سے منسلکہ کلبوں کی تعداد تقریباً پچیس ہزار ہے۔

ان تمام تنظیموں کے علاوہ انگلینڈ اور ویلس کے تقریباً ۹۰ پیشہ ورانہ فٹبال کلبوں پر مشتمل ایک الگ تنظیم ہے جو FOOT BALL LEAGUE کہلاتی ہے۔ اس لیگ کے زیر اہتمام انگلینڈ اور ویلس میں خصوصی نوعیت کے متعدد پیشہ ورانہ مقابلوں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔

اسی طرح اسکاٹ لینڈ میں اسکاٹش فٹبال لیگ میں ۳۷ کلب بحیثیت ممبر شامل ہیں۔ اور آئرلینڈ میں بھی ایک آئرش فٹبال لیگ ہے۔ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں جو فٹبال لیگ ہیں یہ ہر سال اپنے ممالک میں لیگ چمپین شپ کے مقابلوں کا انعقاد کرتی ہیں۔ جن میں لیگ سے متعلقہ ٹیمیں شرکت کرتی ہیں۔ ان ٹیموں کو دو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے مقابلوں کے درمیان گروہوں کی ٹیم کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا پڑتا ہے۔ مقابلوں کے اختتام پر سب سے زائد پوائنٹس حاصل کرنیوالی ٹیم کو چمپین ٹیم کا اعزاز دیا جاتا ہے۔ ان مقابلوں کے دوران تقریباً ۳ کروڑ شائقین لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور جس سے آمدنی ۵۰، ۶۰ لاکھ پونڈ کے درمیان ہوتی ہے۔

انگلستان میں F.A کی جانب سے جو F.A CUP ٹورنامنٹ کا انعقاد ہوتا ہے۔ وہ بہت ہی دلچسپ طور پر جاری رہتا ہے۔ FA CUP کا فائنل لندن کے قریب واقع ویمبلی اسٹیڈیم WEMBLEY STADIUM میں کھیلا جاتا ہے۔ اس اسٹیڈیم میں ایک لاکھ شائقین کے لئے گنجائش ہے اسیطرح اسکاٹش کپ کا فائنل گلاسگو میں HAMPDEN PARK ہمپڈن پارک میں کھیلا جاتا ہے۔

انگلستان میں پیشہ ور کھلاڑیوں کی بنسبت شوقیہ کھلاڑیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ شوقیہ کھلاڑیوں کی تعداد بشمول اسکولی طلباء اور نوجوانوں کے ۶ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ جبکہ پیشہ ور شوقیہ کھلاڑی صرف سات یا آٹھ ہزار کی تعداد میں ہیں۔ انگلستان میں ایک پابندی یہ ہے کہ شوقیہ کھلاڑیوں کی ٹیمیں پیشہ ور کھلاڑیوں کی ٹیموں کے ساتھ مقابلوں میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیشہ ور کھلاڑیوں کی تربیت مخصوص طریقے سے کی جاتی ہے اور ان پر ایک کثیر رقم صرف کی جاتی ہے۔ شوقیہ کھلاڑیوں کی ٹیموں کیلئے ایک علیحدہ ٹورنامنٹ ہوتا ہے جو فٹبال ایسوسی ایشن امیچر چیلنج کپ کے نام سے مشہور ہے۔

اسی طرح انگلستان میں رگبی فٹبال (جسے RUGGER بھی کہا جاتا ہے) کی نگرانی کے لئے بھی ایک رگبی فٹبال یونین ہے۔ اس یونین کا قیام ۱۸۷۱ء میں عمل میں آیا تھا چونکہ رگبی فٹبال کا کھیل موجودہ فٹبال کے کھیل سے قطعی مختلف ہے۔ اس لئے اس کے قواعد و قوانین بھی فٹبال کے قواعد و قوانین سے قطعی مختلف ہیں۔ رگبی ٹیم میں بجائے گیارہ کھلاڑیوں کے پندرہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، ویلس آئرلینڈ اور فرانس کی رگبی فٹبال ٹیموں کے مابین وقتاً فوقتاً بین الاقوامی سطح پر مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ لندن تو رگبی فٹ بال یونین کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ انگلینڈ کی رگبی فٹبال ٹیمیں اکثر نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کا دورہ کرتی ہیں۔ اور اس کے جواب میں ان ممالک کی ٹیمیں بھی انگلستان کا دورہ کرتی ہیں۔ ان بیرونی طرز کے مقابلوں کے علاوہ بھی RUGGER کے متعدد ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔ جن میں کاؤنٹی چمپین شپ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے درمیان ہونے والے سالانہ مقابلے بھی عوام کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

انگلستان کے شمالی علاقوں میں رگبی فٹ بال لیگ کے مقابلے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ اس مقابلے کیلئے ہر ٹیم میں ۱۲ یا ۱۳ کھلاڑی شامل رہتے ہیں۔ اس مقابلے میں پیشہ ور اور شوقیہ کھلاڑیوں کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ اس مقابلے کے علاوہ انگلستان کا سب سے بڑا مقابلہ رگبی لیگ چیلنج کپ RUGBY LEAGUE CHALLENGE CUP کا فائنل ہے جو کہ ویمبلی اسٹیڈیم میں کھیلا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ کئی سال سے اس اسٹیڈیم میں فائنل دیکھنے کے لئے ۹۵ ہزار شائقین موجود رہتے ہیں۔

جزائر برطانیہ کے مختلف ممالک کی فٹبال اور رگبی ایسوسی ایشن کی کارکردگیوں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس معیار کی ایک بھی فٹ بال ایسوسی ایشن ہمارے ملک میں نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کے نوجوان ابھرتے ہوئے کھلاڑیوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارے ملک میں کوئی باقاعدہ تربیتی کیمپ نہیں لگتا۔ بیشمار کھلاڑی خواہ وہ کسی بھی کھیل سے تعلق رکھتے ہوں ایسے ہیں جنہیں مستقبل میں کوئی بھی سہولت میسر نہیں ہوتی جسکی وجہ سے انکی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ملک کی قومی فٹبال ٹیم جو کہ بین الاقوامی مقابلوں کیلئے منتخب کی جاتی ہے کبھی پہلے راؤنڈ یا دوسرے راؤنڈ سے آگے نہیں بڑھتی۔ آج سے دس سال قبل ہماری قومی فٹبال ٹیم نے روم اولمپک میں نمایاں کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔

کاش کہ ہمارے ملک میں بھی غیر ممالک جیسی سہولتیں میسر ہوں تو عجب نہیں کہ عالمی فٹبال میں ہندوستان بھی اپنا مقام بنا لے۔

سقاط حمل اب قانونی طور پر جائز قرار دیدیا
ہے۔ یہ نیا قانون ۲ اگست کو لوک سبھا میں
ت رائے سے پاس کیا گیا۔ راج سبھا پہلے ہی
تجویز کے حق میں رائے دے چکی تھی۔ اس تجویز کے
تحت صحت اور فیملی پلاننگ کے وزیر ڈاکٹر ڈی پی
دھیا ہے۔ جب سے یہ قانون پاس ہوا ہے طرح
ح کی چہ میگوئیاں ہونے لگی ہیں۔ بعض لوگوں
ل ہے کہ اس نئے قانون سے عوام کے اخلاق
ت برا اثر پڑے گا جب کہ بعض لوگ اسے ایک
ضرورت سمجھتے ہیں۔

یہ موضوع کافی غور و توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے اصحاب فکر و نظر اس پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ سنجیدہ اور اہم مضامین کو غیر جانبداری سے "واقعات" کے کالموں میں جگہ دی جا سکے۔ (ادارہ)

گیا ہے۔ یورپ اور امریکا سے ہزاروں کی تعداد میں
لڑکیاں محض اسی مقصد کے لئے برطانیا آنے لگی ہیں
امریکا میں اس سلسلے میں مختلف صوبوں میں مختلف

"ہم کم خرچ پر اسقاطِ حمل کی سہولتیں فراہم کرتے
ہیں"۔ سویڈن میں بھی اسقاطِ حمل قانونی طور پر
جائز ہے۔ سنگاپور میں عرصے سے اس کی مخالفت
کی جا رہی تھی لیکن ۱۹۷۰ء میں وہاں بھی اسقاطِ حمل
کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا۔

فرانس میں معزز خواتین کا سنسنی خیز انکشاف

پچھلے دنوں فرانس کی کئی معزز خواتین نے ایک
پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں انھوں نے یہ سنسنی خیز
انکشاف کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی اس
جرم میں ملوث رہ چکی ہیں۔ فرانس میں اسقاطِ حمل
اب بھی جرم ہے اور وہاں اسقاطِ حمل کو قانونی حیثیت

اسقاط حمل کی آزادی

مرار عظمت

ممالک میں اسقاط حمل

یا کے تقریباً سبھی ترقی یافتہ اور پسماندہ ممالک
س مسئلے پر غور کیا جا رہا ہے کہ اسقاط حمل کی
، ہونی چاہئے یا نہیں؟۔ کچھ ممالک میں اس
میں عوام کو کافی "چھوٹ" دے دی گئی ہے
کچھ ممالک میں اسے جرم سمجھا جاتا ہے اور سخت
یں دی جاتی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں برطانیا میں
حمل کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا
ب بھی وہاں اس قانون کی مخالفت جاری ہے
کا کہنا ہے کہ اس نئے قانون کی وجہ سے اب
ا۔ اخلاق۔ کرداری اور فحاشی کا اڈا بن

قانون نافذ ہیں۔ نیویارک میں اسقاط حمل پر کوئی
پابندی نہیں جبکہ منی سوٹا میں یہ ایک سنگین جرم ہے
لیکن وہاں کچھ ایسی باتیں ہیں جو ہمارے ملک کے
لوگوں کے لئے حیرت انگیز ہیں۔ وہاں ایسی جماعتوں
کا انتظام کیا گیا ہے کہ اس میں عورتوں کو اس
سلسلے میں تمام معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

جاپان میں اس سلسلے میں پوری "چھوٹ" دی
گئی ہے اور ایک اندازے کے مطابق وہاں ہر سال
دس لاکھ عورتیں اس سہولت سے فائدہ اٹھاتی ہیں
یوگوسلاویہ میں تو اسقاطِ حمل کے لئے اخبارات میں
اشتہارات شائع ہوتے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ

دلانے کے لئے آئے دن تحریکیں چلائی جاتی رہتی ہیں
یہ پمفلٹ اسی قسم کی تحریک کی ایک کڑی ہے
اس "اعتراف" پر فرانس کی ۳۴۳ معزز خواتین کے
دستخط ہیں جن میں ملک کی مشہور ادیب، شاعر
اداکار اور متعدد دوسری معزز خواتین شامل ہیں
اس میں سے سمون ڈی لو، مارگریٹ ڈیورس
فرینکوئی ساگان، کرسچین روچیفرڈ، جان مورو
اور کیتھرین ڈینیوب قابلِ ذکر ہیں۔ اس انکشاف
نے فرانس میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اب اسقاط حمل
کو قانونی طور پر جائز قرار دینے کے بارے میں
بڑی سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ اس تحریک

...کی لولی ہے جو مشہور فرانسیسی ... سارتر کی ساتھی ہے۔
...تر نے اپنے ناول "سیکنڈ سیکس" میں اسی قسم ...ات کا اظہار کیا ہے۔ اس مسئلے پر تبصرہ ...ہوئے کمیونسٹوں کے روزنامہ "ایل ہیومینیٹے" ...ھا ہے:۔
...ب تک صرف حسبِ خواہش بچوں کو جنم دینے ...نہیں دی جاتی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔"
...یک اور مشہور روزنامے نے لکھا ہے:۔
...س سلسلے میں فوری کوئی اقدام نہ کرنا چاہئے ...س مسئلے کو جڑ سے سلجھانے کی کوشش کی جانی ...ہئے۔"

اسقاطِ حمل ہمارے ملک میں۔

اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس کے دو ارکان نے حمل کو قانونی حیثیت دینے کی مخالفت کی تھی۔ وہ دو ارکان رنجن ورما اور بند دستی داس تھے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں میں اسقاطِ حمل کو بہت بڑا گناہ بتایا گیا ہے اس لئے ہمارے ملک میں اسقاطِ حمل کی اجازت قطعی نہیں دی جانی چاہئے۔"

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ قدیم کتابیں جو آج سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال قبل لکھی گئیں کیا آج کی زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہیں تو یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک نہیں ہے بلکہ یہاں کئی مذاہب اور فرقوں کے لوگ رہتے ہیں اور یہاں کوئی مذہبی حکومت نہیں بلکہ سیکولر حکومت ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں لکھے ہوئے قوانین دیگر مذاہب کے لوگوں پر بھی لادنے کی کوشش کی جائے۔ اگر رنجن ورما کے زاویے سے سوچا جانے لگے تو سارے ہی قوانین بدلنے پڑیں گے اور ایک ہندو حکومت کا قیام کرنا ہوگا۔ اس طرح ایسے قانون نافذ کرنا ہوں گے جو ہزاروں سال قبل بنائے گئے تھے، اور اس وقت وہ ٹھیک بھی تھے لیکن اب اگر انھیں نافذ کر دیا گیا تو ہندوستان ہزاروں

اسقاطِ حمل کے آپریشن کا ایک منظر

سال پہلے کے دور میں چلا جائے گا اور ظاہر ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ تو درکنار خود ہندو بھی اسے پسند نہ کریں گے۔ اس لئے کسی مسئلے کو صرف قدیم مذہبی کتابوں کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرنا درست نہ ہوگا۔

اس تجویز کی مخالفت میں شریمتی بندومتی داس نے جو بحث کی وہ قدرے جاندار تھی۔ انھوں نے کہا کہ آج کا ہندوستان تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے ان ممالک سے قطعی مختلف ہے جہاں اسقاط حمل کی آزادی دی گئی ہے۔ جنسی بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ میں ہم ابھی اس درجے کو نہیں پہونچے ہیں جہاں جاپان اور مغرب کے چند ممالک پہونچ چکے ہیں۔ اسلئے اگر ہمارے ملک میں اس قسم کی "چھوٹ" دے دی گئی تو ہمارا ملک اخلاقی طور پر دیوالیا ہو جائے گا۔ بدکردار لوگ اس قانون کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

لیکن کیا اخلاقی اعتبار سے اپنے ملک کو دیگر ممالک سے بلند سمجھنا خوش فہمی نہیں ہے۔ جنسی بے راہ روی میں ہندوستان کسی بھی مغربی ممالک سے پیچھے نہیں ہے بلکہ ہمارے بعض بڑے شہر تو مغربی شہروں سے کچھ آگے ہی ہیں۔ اسٹرپٹیز اور دوسرے قسم کے عریاں رقص جو بہت سے مغربی ممالک میں قانونی طور پر بند کر دیئے گئے ہیں، بمبئی، مدراس، کلکتہ اور دہلی کے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ عوامی زندگی سے قریب ہیں انھیں بداخلاقی، بدکرداری اور ناجائز جنسی تعلقات کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنھیں دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

اگر اسقاط حمل کو جائز قرار نہ دیا جائے تب بھی بدکار لوگ اپنا مقصد پورا کر ہی لیتے ہیں، غیر قانونی طور پر ہی سہی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں ہر سال ۲۰ لاکھ ایسے معاملے ہوتے ہیں، اور کچھ ذمے دار لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تعداد ۲۰ لاکھ نہیں بلکہ ۱۲۰ لاکھ ہے۔ ماں بننے والی عورتوں میں سے ۲۰ فیصدی حمل ساقط کر دیتی ہیں۔ ویسے ان عورتوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ... کے زیر مجبور

کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۶ء کے ایک سروے کے مطابق شادی شدہ عورتوں میں حمل ساقط کروانے والی عورتوں کی تعداد ۳ء۹ فیصد تک تھی۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ حمل ساقط کروانے والی عورتوں میں ۱۷ سے ۲۰ فیصدی تک غیر شادی شدہ ہوتی ہیں

متعدد مسائل کا حل :۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہ اسقاط حمل کو اگر قانونی طور پر جائز قرار دے دیا جائے تب بھی ایسی عورتیں اپنا مقصد پورا کر ہی لیتی ہیں اسلئے یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ اس نئے قانون سے عوام کے اخلاق پر برا اثر پڑے گا۔ اس کے خلاف اس نئے قانون سے متعدد مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات جائز حمل کی صورت میں بھی بچے کی پیدائش سے ماں کے جسم پر یا ذہن پر خطرناک اثرات پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے اور کبھی کبھی طبی وجوہات کی بنا پر پیدا ہونے والے بچے کی جسمانی یا ذہنی صحت مشکوک ہو جاتی ہے ان دونوں صورتوں میں بچے کی پیدائش کی بجائے حمل ساقط کر دینا مناسب ہوتا ہے۔ پہلے ایسے حمل ساقط کرنے کے لئے بھی بڑی قانونی پیچیدگیوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا لیکن اب ایسے مسائل آسانی سے حل ہو جایا کریں گے۔ اور بھی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں جب حمل ساقط کرنا ناگزیر ہو جائے۔ اس لئے اس قانون سے نقصان کی بجائے فوائد زیادہ ہیں۔ جسطرح سانپ کا زہر انسانی زندگی کے لئے انتہائی خطرناک بھی ہے اور وہی زہر مختلف قسم کی دواؤں میں استعمال ہو کر انسان کو نئی زندگی بھی بخشتا ہے اسی طرح یہ نیا قانون مضر بھی ہے اور فائدہ مند بھی۔ اہم چیز یہ قانون نہیں بلکہ اسے برتنے کا شعور ہے۔

ماہرین کی رائے :۔

اس قانون پاس کئے جانے سے قبل مقررہ کمیشن نے پچاس اہم ڈاکٹروں سے اس سلسلے میں گفتگو کی تھی ان میں سے اکثریت نے اسے ایک مناسب قانون اور ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ :۔

" چونکہ ملک میں اسقاط حمل ایک سنگین جرم سمجھا جاتا ہے اس لئے یہ کام چوری چھپے ہوتا ہے۔ ... نصف عورتیں جن میں اکثر مظلوم اور مجبور بھی ہوتی ہیں نیم حکیموں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں اور اکثر اپنی صحت بلکہ جان تک گنوا بیٹھتی ہیں۔ جو عورتیں حمل ساقط کرانے آتی ہیں ان کے کئی مسائل ہوتے ہیں۔ وہ بخوشی ایسا نہیں کرتیں بلکہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتی ہیں ان مجبور و بے کس عورتوں کو مکمل سہولتیں ملنی چاہئیں"

بڑھتی ہوئی آبادی کا مطالعہ کرنے کے لئے جو بین الاقوامی ادارہ قائم کیا گیا ہے اس کے چیرمین ڈاکٹر اگروال نے کہا کہ یہ نیا قانون آبادی پر قابو پانے کے سلسلے میں ایک موثر قدم ہوگا۔

جسٹس کھوسلا نے کہا کہ اگرچہ اسقاط حمل کا تصور بڑا ہی گھناؤنا ہے لیکن چند صورتوں میں یہ فعل ناگزیر ہوتا ہے اور اسقاط حمل کی آزادی سے کئی مظلوم، مجبور اور بے بس عورتوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں، کئی زندگیاں تباہ ہونے سے بچائی جا سکتی ہیں۔ اس قانون سے ان ماؤں کو سہولت ملے گی جو غیر ضروری بچوں کے بوجھ سے بچنا چاہتی ہیں۔ ان کنواری ماؤں کو سہولت ملے گی جو نہیں چاہیں گی کہ ان کے کئے ہوئے گناہ کا کفارہ انکے معصوم اور بے گناہ بچوں کو ادا کرنا پڑے۔

بچے اسی وقت نعمت ہیں جب وہ خوشی سے اور اپنی خواہش سے پیدا کئے گئے ہوں۔ ان چاہے بچے دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہیں۔ اپنے ماں باپ، اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے ہی نہیں بلکہ خود اپنے لئے بھی۔

کیتا خروشچیف

اس صدی کا عظیم ترین سیاستداں

سپریم سوویٹ کی میٹنگ ہو رہی تھی، پورا
عوام کے نمائندوں سے بھرا ہوا تھا۔ نکیتا خروشچیف
ئے ہوئے اسٹالن کی غلطیوں اور اس کے ظلم
پول کھول رہے تھے۔ ابھی خروشچیف نے اپنی بات
بھی نہیں کی تھی کہ پیچھے آواز آئی ——— جب
الن یہ سب کر رہے تھے تب آپ کہاں تھے ——
وشچیف بولتے بولتے رک گئے اور پھر گرج کر بولے
ون ہے یہ بدتمیز" پورے ہال پر سناٹا چھا گیا۔ خروشچیف
ایک بار پھر پوچھا" سوال کس نے پوچھا تھا سامنے
ہ سب خاموشی سے بیٹھے رہے۔ اس پر خروشچیف نے
نس کر کہا "دوست میں اُس وقت تمہاری
گہ پر تھا۔"

۱۹۵۳ء میں اسٹالن کی موت پر روسی کمیونسٹ
رٹی کے فرسٹ سکریٹری بننے سے پہلے نکیتا خروشچیف
ے روس کے باہر شاید ہی کوئی واقف تھا۔ لیکن
۱۹۵ء سے ۱۹۶۴ء تک خروشچیف نہ صرف روس
سیاست پر بلکہ پوری دنیا کی سیاست پر چھائے
ہے۔ خروشچیف نے نہ صرف روس کی سیاست کو
ر بین الاقوامی سیاست کو بھی بہت سے نئے موڑ
ئے۔ روس میں اسٹالن کی سخت گیر پالیسی کو ختم

کریملن میں اسٹالن کے ساتھ (درمیان)

کے ساتھ (درمیان)

کاسترو کے ساتھ

خروشچیف ہی کے دور میں روس خلائی دوڑ میں
امریکہ سے آگے نکل گیا۔

خروشچیف نے کئی بار دنیا کو جنگِ عظیم کے دہانے
میں پہونچنے سے روکا۔ خروشچیف نے ہی سامراجی
طاقتوں کے ساتھ بات چیت کے ذریعے مسائل کو حل
کرنے کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ ان کی اسی پالیسی
کی وجہ سے چین اور روس میں نظریاتی اختلافات
پیدا ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری بین الاقوامی
کمیونسٹ تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

جون کینیڈی سے ملاقات کے بعد خروشچیف سیدھے
چین گئے جہاں انہوں نے چیرمین ماؤزے تونگ
سے ملاقات کی اور انہیں اپنی نئی پالیسی کے بارے
میں سمجھایا۔ کہا جاتا ہے کہ خروشچیف کی باتیں سننے
کے بعد ماؤ نے کہا کہ "سامراجی طاقتیں کاغذی شیر
ہیں"۔ اس کے جواب میں خروشچیف نے کہا "لیکن اس
کاغذی شیر کے دانت ایٹمی ہیں"۔ کہا جاتا ہے کہ
خروشچیف سے اس بات چیت کے بعد ماؤ نے انہیں
باہر نکل جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

خروشچیف نے جہاں روس کو بہت کچھ دیا وہاں
انہوں نے کچھ غلطیاں بھی کیں۔ خروشچیف کے والد
ایک کھان مزدور تھے اور خود خروشچیف نے بہت
سخت زندگی گزاری تھی۔ اپنے بارے میں ان کا
کہنا تھا کہ "میں نے اسی وقت سے کام کرنا شروع
کر دیا تھا جب سے کھڑا ہونا سیکھا تھا"۔ خروشچیف
کا ڈیل ڈول اور چہرہ مہرہ بالکل روسی کسانوں جیسا
تھا۔ ان کے بات کرنے کا طریقہ کچھ اس قسم کا تھا کہ
عوام ذرا ہی سی دیر میں ایسا محسوس کرنے لگتے تھے
کہ وہ عوام ہی کا ایک حصہ ہیں۔
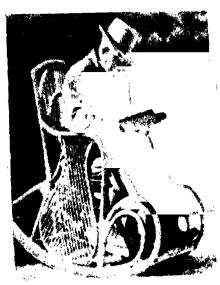
کومت چھینی گئی تو ان پر الزام تھا کہ انہوں نے
تالن کی طرح اپنی شخصیت کو ضرورت سے زیادہ
بھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے زیادہ سے
یادہ طاقت اپنے ہاتھوں میں جمع کر لی۔ انہوں نے
ہین کے ساتھ روس کے نظریاتی اختلاف کو
اؤ کے ساتھ اپنا ذاتی اختلاف بنا لیا۔ امریکہ اور
وسرے سرمایہ دار ممالک کی طرف ان کی پالیسی
ضرورت سے زیادہ نرم تھی۔ ان میں سے بہت
الزامات میں کافی حد تک سچائی بھی ہے۔ اپنے
دورِ حکومت کے آخری چند برسوں میں خروشچیف
اس قسم کی بہت سی خرابیاں پیدا ہونی شروع
گئی تھیں۔

فرصت کے
اوقات میں
کتب بینی

صدر نکسن کے ساتھ
جنہیں وہ بالکل ناپسند
کرتے تھے۔

پھر بھی یہ کول مٹول ہنس مکھ لیڈر روسی اور
لاقوامی سیاست پر ایک عرصے تک نہ مٹنے والی
چھوڑ گیا ہے۔

خروشچیف اپنے آخری دنوں میں سیاست سے
الگ رہے لیکن انہوں نے یہ دن کافی آرام
سے گزارے۔ ماسکو کے قریب ایک گاؤں میں
حکومت کی طرف سے ایک عمدہ مکان، کار
وغیرہ ملے ہوئے تھے۔ ان کے دوست اور
ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کے
وں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے آخری دن بہت
خوشی کے ساتھ گزارے۔
ستمبر ۱۹۷۱ء کو ۷۷ برس کی عمر میں دنیا کے

اس عظیم سیاست داں اور مدبر کی موت ہو گئی۔
لیکن خروشچیف ان شخصیتوں میں سے ہیں جن کی
چھاپ بساطِ سیاست ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ★

راجندر سنگھ بیدی کی دستک

ابوالفیض

فلمی دنیا کا

ایک اہم تجربہ — ایک سنگ میل — یا — ایک سوا
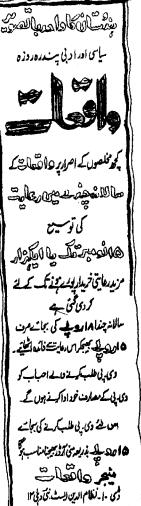
راجندر سنگھ بیدی اردو ادب کے ایک مایہ ناز افسانہ نگار ہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کے مقام سے ساری اردو دنیا بخوبی واقف ہے۔ دوسرے فنکاروں کی طرح، بیدی کا فلمی دنیا کی طرف رجوع کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ فنکار، فن کی تخلیق اور اس کی بہتر سے بہتر پیش کش کیلئے نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کی تلاش میں رہتا ہے اس جدید ترقی یافتہ دور میں دوسری باتوں کے علاوہ ہماری تہذیبی، سماجی اور قومی زندگی کی تہذیب و ترتیب، اس کی اصلاح اور اس کی تعمیر کے لیے، مادی اور مالی وسائل کے ساتھ ساتھ فکر و دانش اور جاں سوزی کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کامیاب فلم کے پروڈکشن کے لیے ان دونوں عناصر کا حسن ترتیب سے اکٹھا ہونا ضروری ہی نہیں لازمی بھی ہے۔ ان میں سے کسی ایک عنصر کی کمی سے بھی فلم گویا ایک ایسا خام تصور بن جاتی ہے جس میں اگر نقش ہو تو رنگ نہ ہو اور رنگ ہو تو نقش نہ ہو۔

"دستک" کی پیش کش، راجندر سنگھ بیدی کا واقعی ایک جرأت مندانہ اقدام ہی نہیں بلکہ معرکہ بھی ہے۔ مالی حیثیت سے کم مائگی اور طرح طرح کی حوصلہ شکن دشواریوں کے باوجود بیدی نے اپنے ایک نہایت موثر اور رگ احساس کو جھنجھوڑنے والے افسانے کو سلولائیڈ پر اسی خوبی اور اسی کامیابی سے پیش کیا ہے جس طرح ان کا قلم فنکارانہ شان اور لطافت سے، سعد کا قدر جاندار اور معنی خیز الفاظ اور جملے بکھیر جاتا ہے۔ ماحول کی سچی عکاسی احساسات و جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ، فنکارانہ حسن لطافت اور نقادانہ حسن بصیرت بھی۔

فلم کی کہانی، ہندوستانی دیہی علاقے کے ایک نوجوان حمید کی شادی اور پھر بمبئی جیسے پُر فن شہر میں جہاں وہ ملازم ہے، کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں منتقلی سے شروع ہوتی ہے حمید (سنجیو کمار) جو کسی کمپنی میں ایک معمولی ملازم ہے۔ راست باز اور شریف النفس ہے مجبوری کے عالم میں اور انجانے میں اس نے ایک ایسا مکان کرایہ پر لے لیا جس میں اس سے پہلے کوئی طوائف (شکیلہ بانو بھوپالی) رہتی تھی ایک ایسے بدنام ٹھکانے پر ایک شریف نوجوان رہنا کس قدر دشوار اور تکلیف دہ اس کا اندازہ فلم دیکھ کر ہی لگایا جا مکان (انور حسین) کی مجرمانہ کوشش کی تاک جھانک اور تیکھی نظریں، گا جانا۔ یہ سب کچھ ایک نوشادی شدہ کے لیے اور خاص کر حمید کی بیوی سلم سلطان) کے لیے جس کو، دن میں پڑتا ہے۔ کس قدر غضب ناک مسئلہ شدت اور گہرائی سے پیش کرنا راجند ہی حصہ تھا۔

یہ مختصر فلم، کہانی کی روانی کے سا ہے مگر سطحی ذوق رکھنے والے یا عام

دستک کا ایک سین

رمولا فلموں کا ذوق رکھنے والے تماشائیوں کے لیے
بی اکتاہٹ کا باعث بن جاتی ہے لیکن اس میں
تو بیدی کا کوئی قصور ہے اور نہ فلم ہی کا بلکہ اس
ذمہ دار خود تماشائیوں کا معیارِ ذوق، اور پسند
ہے۔ کہانی کے ہر موڑ پر احساسات و جذبات کے
وج اور تلاطم کو بیدی نے اسی کامیابی سے پیش
یا ہے جو کہ ان کے قلم کا طلسم ہے۔ خاص کر سلمیٰ
ا جان لیوا انتہائی گھٹن، گھبراہٹ اور نفسیات
، شدید کشمکش اور ایسے عالم میں گائے جانے
ے ایک گیت کے پس منظر میں پیش کیے گئے
لکے، جن کی مثال اس سے پہلے کبھی نہیں ملتی؛
ینناً ہماری فلم انڈسٹری کے کامیاب تجربے ہیں۔
اتھ ہی شہری زندگی کی الجھنیں، کالے دھندے،
نتروں کی بدعنوانیاں، مکانوں کی قلت اور حوصلہ
کن کرائے اور پگڑیاں، مسلمانوں کو کرایہ پر بھی مکان
دینے کا انسانیت سوز رجحان، شہری زندگی کے غیر
انی عادات و اطوار۔ دوسری طرف دیہی زندگی
خلوص و پیار اور کیا کیا کچھ ——— یہ نہ صرف
نی بلکہ ہدایت کاری کی بھی جان ہے۔
لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام خوبیوں کے باوصف
ستک" کو علمی، ادبی حلقے، دانشوروں اور فنکاروں
ہٹ کر تمام لوگ کیوں زیادہ پسند نہیں کرتے؟
دراصل اعلیٰ قدریں، اعلیٰ معیار ہی کی دین
تی ہیں جو اعلیٰ ظرفی اور اعلیٰ ذوقِ نظر کی طلب گار
تی ہیں۔ عوام میں کچھ ہی افراد یا ایک خاص طبقہ
ان معیاروں پر پورا اتر سکتا ہے۔ یعنی عوام معیار
ام کی باتوں سے بڑی حد تک بے بہرہ ہی رہتے
، اور ان سے اس قسم کے ذوق کا مطالبہ کرنا
ا میری نظر میں ایک طرح کی زیادتی ہے۔ اور
فلمیں (خواہ وہ کسی افسانوی یا تاریخی کتاب یا
نی پر مبنی ہوں) فلمیں ہی ہوتی ہیں۔ ان کے بعض
اضے، کچھ ضرورتیں اور چند مصلحتیں بھی ہوتی
ا۔ زندگی کے تعلق سے کسی بھی حقیقت پسندانہ
ط نظر رکھنے والے فن کار، ادیب یا شاعر یا پروڈیوسر
ڑیکٹر کو ان چیزوں پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔

جہاں تک کہ فلم کے حقیقی فنی پہلو کا تعلق ہے
سنجیو کمار اور ریحانہ سلطان نے بیدی کی کہانی کے
کرداروں کو اپنی پوری فن کارانہ صلاحیتوں سے
اجاگر کیا ہے۔ کاروباری پنواڑی کے روپ میں
انور حسین اور طوائف کے کردار میں شکیلہ بانو بھوپالی
نے بھی اچھی اداکاری کی ہے۔ رنجو مہیندر و من موہن
کرشن اپنے مختصر اور خاموش کردار میں ناکام نہیں
ہیں۔ موسیقی بھی گوارا ہے۔ خاص کر "ہم ہیں متاعِ
کوچہ و بازار کی طرح" والی غزل کی دھن بڑی
پیاری ہے۔ مجروح کا کلام کم سہی مگر وقیع ہے۔

سارے مکالمے تو نہیں مگر چند مکالمے یقیناً ...
ہیں۔ فلم بندی میں بیدی صاحب ... ناظر
کی بجائے ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ کرتے تو
"دستک" اس سے زیادہ کامیاب ہوتی۔
بحیثیت مجموعی راجندر سنگھ بیدی کی ا...
پہلی کامیاب پیش کش کو ہندوستان ... انڈسٹری
میں نیا تو خیر نہیں مگر قابلِ قدر تجربہ اور ایک اہم
سنگ میل ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن ...
کے ارباب حل و عقد اور عوامی حلقوں ...
کے لیے ایک غور طلب سوال بھی ہے۔

دستک اور ... ریحانہ سلطان نے ثابت کر دیا ہے کہ اس میں ... [illegible]

لیتے تھے کہ پانی زیادہ مقدار میں مہیا کیا جائے اور
بچے ہسپتالوں کا انتظام ہو۔ لیکن ایک عرب بزرگ
کا کہنا تھا کہ "۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل لڑائی میں عربوں
کی جو جائدادیں ختم ہوئی ہیں وہ واپس دلائی جائیں"
اسپر دایان بولے۔ مہربان میں ایک مصروف آدمی ہوں
اور میرے پاس ماضی کی تاریخ سننے کا وقت نہیں ہے
دایان کے پاس ۲۳ برس پہلے کی تاریخ سننے کا
وقت نہیں ہے لیکن فلسطین پر اپنے ڈھائی ہزار سال
کے حق کو دہراتے ہوئے انکی زبان نہیں تھکتی۔ یہ سب
طاقت کے کرشمے ہیں۔ اگر عربوں کی کوئی منظم طاقت
ہوتی اور وہ کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم ایک مشترکہ
دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو گئے ہوتے تو آج
حالات کا رخ دوسرا ہوتا اور موسٰی دایان کو "ماضی
کی تاریخ" سننے سے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔
وہ عربوں کو بے بس سمجھتے ہیں اس لئے اگر انکی فوری
ضرورت کے مسائل پر توجہ دے لی تو یوں سمجھئے کہ
انھوں نے عربوں پر بہت بڑا احسان کر دیا۔

حالات کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ مقبوضہ عرب علاقوں
کے لوگوں کی ایک خاصی تعداد اپنے آپ کو بے بس
سمجھنے لگی ہے۔ اردنی دریا کے مغربی کنارے پر
رہنے والے عربوں کو اردن اور اردن کے اڈوں سے
لڑنے والے فدائین سے بڑی توقعات تھیں، لیکن
حسین کی ظالم بدّو فوج کی ظالمانہ کارروائیوں
سے جو فدائین کے خلاف کی گئی تھیں ان کے دل ٹوٹ
گئے۔ نتیجے میں اسرائیل کی ان کوششوں کو بہت
کچھ کامیابی حاصل ہوئی جو وہ عربوں کا تعاون
حاصل کرنے کے لئے شروع سے کرتا رہا ہے۔

> حکمراں قوم کو ہر جگہ ایسے "ہم کار" مل
> جاتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کیلئے قومی
> مفادات کو قربان کرنے کے لئے تیار
> رہتے ہیں۔ اسرائیلی حکومت کو بھی ایسے
> "ہمکار" مل گئے ہیں اور ان میں خاص
> طور سے "مذہبی رہنما" شامل ہیں۔

عرب امور سے متعلق شعبے۔

مختلف محکموں میں اسرائیل نے پہلے ہی "عرب
امور سے متعلق خصوصی شعبے" قائم کر رکھے ہیں
اور شعبوں کو چلانے کے لئے اسرائیل بہت
سے عربوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب
ہو گیا ہے۔ حکمران قوم کو ہر جگہ ایسے "ہم کار"
مل جاتے ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کے لئے
قومی مفادات کو قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں
اسرائیلی حکومت نام نہاد مذہبی رہنماؤں کو جن میں مسلمان
عیسائی اور دروزی شامل ہیں خریدنے میں کامیاب
ہو گئی ہے۔

۶۷ سال کے محمد علی جباری ان ہی "رہنماؤں" میں
سے ایک ہیں۔ کسی زمانے میں وہ اردن کی حکومت
میں وزیر رہ چکے ہیں اور ۱۹۴۰ء سے ہیبرون کے
میئر چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں تقسیم فلسطین کے
بعد اگرچہ انھوں نے مغربی اردن کے علاقے کو اردن
کے ساتھ ملانے کی تحریک چلائی تھی لیکن جنگ جو
عرب اس بات کو بھی نہیں بھولے کہ ۱۹۶۷ء میں
انھوں نے ہیبرون میں اسرائیلی فوجوں کا استقبال
کیا تھا۔ اس کے بعد ہی سے مسٹر جباری، موسٰی
دایان کے مقربین میں شامل ہیں اور دایان انھیں ایک
"دانشور" کہتے ہیں۔ دو ہفتے قبل جب جباری تل ابیب
پہونچے تو انکا وہاں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور انہیں
تل ابیب کے میئر یہوشوا رابنو شہر کا مہمان بنایا گیا
اور موسٰی دایان نے ان سے کھل مل کر باتیں کیں۔

مسٹر جباری پر دایان کو خاصا اعتماد ہے۔ اس کا
اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ گزشتہ ماہ انھیں ۲۳
شہروں اور دیہات کے سربراہوں کی ایک میٹنگ
منظم کرنے کی اجازت دیدی۔ اس میٹنگ کا مقصد
لبنان کی اس اپیل کے خلاف احتجاج کرنا تھا جس
میں عرب لیگ سے مغربی ساحل کی سبزیوں، پھلوں اور
مصنوعات کا اس بنیاد پر بائیکاٹ کرنے پر زور دیا
گیا تھا کہ عربوں کے اس سامان میں اسرائیلی سامان

کے دوران یہ اپنی نوعیت کی پہلی میٹنگ تھی جس کے لئے
اسرائیلی حکام کی طرف سے سخت ہدایت تھی کہ اس
میں سیاست زیر بحث نہ لائی جائے۔

> حریت پسند فلسطینیوں نے طے کیا ہے کہ
> خوف وذلّت کے حلوے پر وہ آزادی کی
> "خشک روٹی" کو ترجیح دیں گے۔ خاص تل ابیب
> میں بموں کے دھماکے ظاہر کر رہے ہیں کہ ہوا
> کا رُخ کدھر ہے۔

اس میٹنگ کے بعد جباری صاحب نے دایان کا
اس حد تک اعتماد حاصل کر لیا ہے کہ اب انھیں سیاسی
بحث و مباحثے کے لئے میٹنگ طلب کرنے کی اجازت
دیدی گئی ہے۔ لیکن جباری صاحب کی مشکل یہ ہے
کہ انھیں اپنے مطلب کے لیڈر نہیں مل رہے ہیں۔ عرب
لیڈر اس قسم کی میٹنگ میں شرکت سے جھجک رہے ہیں
اوّل اس لئے کہ اس قسم کی میٹنگ کا انتظام دایان
کے نمک خواروں کے ہاتھوں میں ہے اور دوسرے
اس لئے کہ چھاپا ماروں نے سیاسی بحث پر خود اپنی
پابندی لگادی ہے اور مغربی ساحل کے عرب لیڈروں
کو تنبیہ کی ہے کہ اگر وہ اسرائیلیوں کے آلۂ کار
بنے تو انھیں اس کا نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔
چھاپا مار اعلان کے حامی عرب اپنی آزادی کا
کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جباری صاحب کا مقصد
بقول خود اسرائیل کے فوجی قبضے کو ختم کرنا ہے
امریکی نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے انھوں نے
ساحل اور بیت المقدس (یروشلم کا عرب
کے لئے اقوام متحدہ کی پانچ سال کی نگرانی اور
کے بعد اپنی حیثیت کا خود فیصلہ کرنے کا
کی تجویز پیش کی۔ لیکن فلسطینی حریت پسند
طویل عمل کو پسند نہیں کرتے۔ وہ اسرائیل
دو دو ہاتھ کرنے کے لئے بے چین ہیں اور خا
تل ابیب میں بموں کے دھماکے ظاہر کرتے
کا رخ کدھر ہے۔ دہشت پسند جان کی با

... ایڈسن ارنٹیس ڈونا سیمنٹو
(EDSON ARANTES DONA SEIMENTO)
ہے۔ اس تیس سالہ نوجوان کھلاڑی کی پیدائش ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ریو ڈی جینرو (جنوبی امریکا) سے ۱۷۰ میل مغرب بمقام ٹریس کوراکوس (TRES CORACOES) حبشی خاندان میں ہوئی۔ یہ سابق پروفیشنل فٹ بالر "ڈون ڈن ہو" (Don Din Ho) کی تین اولا میں سب سے بڑا ہے۔ پیلے کی عمر جب چار سال کی تھی اس کے والد کو گھٹنے میں سخت چوٹ آئی اور فٹ بال کھیل کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔

ناقابلِ تلافی حالت کے تحت پیلے فیملی کو "ٹریس کوراکوس" سے ہجرت کرکے یہاں سے مغرب کی جانب ایک بڑے شہر "باؤرو" (Bauru) میں قیام پذیر ہونا پڑا۔ ظاہر ہے جس گھر میں فٹ بال کھیل کا ماحول رہا ہو وہاں اس سے دلچسپی اور شوق پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ شروع ہی سے شہنشاہِ فٹ بال پیلے نے پھٹے پرانے موزوں کی بال بنا کر ننگے پاؤں کھیلنا شروع کیا۔ اس زمانے میں لوگ اس کو "ڈون ڈن ہو" کا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔

دوسرے لاطینی امریکنوں کی طرح اس نے بھی فٹ بال کو اپنی زندگی کا ایک اہم جزو سمجھا اور "باؤرو" کی ایک نوجوان ٹیم میں کھیلنا شروع کیا وہاں اس کی ملاقات ولدی مارڈی سی برٹو (Vel-de-mor-de-Brito) سے ہوئی۔ وہ اسے لے کر سانٹوس کلب میں آیا۔ اسوقت اس کی عمر صرف ۱۴ سال تھی۔ ۴۰ منٹ پریکٹس کے بعد پیلے نے ایک کنٹریکٹ پر دستخط کئے۔ پہلے انٹرنیشنل کھیل کے بعد ہی اس نے ایک لاکھ ملین اسٹرلنگ تک یورپین ٹیم کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور آج تک اپنے محبوب کلب سانٹوس سے منسلک ہے۔

اس کھلاڑی نے ۱۹۵۰ء سے سانٹوس میں کھیلنا شروع کیا اسے ریٹائر ہونے تک ۱۰۸۶ گول بنائے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے گول سخت ترین بین الاقوامی مقابلوں میں اسکور کیے ہیں۔

۱۶ سال کی عمر میں پیلے برازیلین انٹرنیشنل کھلاڑی بنا۔ اس تیز۔ شاندار کھلاڑی نے بین الاقوامی فٹبال مقابلوں میں وہ چیزیں پیش کیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ شاندار گول بنانے والا پیلے جس کے دونوں پیروں میں غضب ناک شاٹ زبردست بال کنٹرول۔ بال میں شاٹ لگانے کے بعد بجلی کوندجانے والی کیفیت ان تمام اوصاف کی سند کے لیۓ برازیلین پوسٹل اسٹامپ موجود ہے۔ اس عظیم کھلاڑی کا کہنا ہے کہ:-

"کھلاڑی کا گول پوسٹ پر صحیح شاٹ یقینی گول کی دلیل ہوتی ہے۔"

۱۹۵۸ء سے پیلے نے ۴ بار ورلڈکپ مقابلوں میں شرکت کی جن میں سے تین بار برازیل ورلڈکپ ہولڈر رہا۔ اس کے کارنامے کو دنیا کے ہر بڑے اخبار کی شاہ سرخیوں کی جگہ دی۔ شہزادوں، سیاست والوں، پارلیمنٹرین میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ عظیم کھلاڑی ہونے کی وجہ سے دولت مند ممالک نے اپنے شہر کی سڑکوں کے نام بدل کر پیلے کے نام پر رکھے۔ یادگاریں تعمیر کیں۔ نیشنل ٹورسٹ ایگزیبیشن کا ایک حصہ پیلے کی تصویروں کا ہے۔ صدر برازیل نے پیلے کو "قومی ملکیت" قرار دیا ہے۔ اسکی زندگی پہ ایک فلم بھی ریلیز ہونے والی ہے۔

کھیل کے میدان کے علاوہ وہ میدان عمل میں بھی اپنی شریکِ حیات روزمیری (ROSE MARRY) کے لئے بہت اچھے شوہر اور بچوں (لڑکیاں) کیلی کرسٹینا (۴ سال) اور ایڈسن ہو (۹ ماہ) کے لئے اچھے والد ہیں۔ انکی شادی ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ وہ مقامی بینک میں پبلک ریلیشن آفیسر (PUBLIC RELATION-OFFICER) ہیں۔ اس کے علاوہ ایک الاسٹک فیکٹری کے مالک بھی ہیں۔ مستقبل قریب میں پیلے ڈرامے میں اداکاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ ایک برازیلین میگزین کی اشاعت کے تحت پیلے ۲۱ ہزار اسٹرلنگ ماہانہ آمدنی کے مالک ہیں۔

۱۹۷۱ء کے بعد پیلے نے "ماراکانا" اسٹیڈیم میں یوگوسلاویہ انٹرنیشنل کے خلاف کھیلتے ہوئے ہاف ٹائم کے وقفے پر ایک لاکھ اڑتیس ہزار فٹ بال تماشائیوں کے سامنے بین الاقوامی فٹ بال مقابلوں سے اپنی علیحدگی کا اعلان اپنی مشہور جرسی نمبر ۱۰ اتار کر ایک بچہ "امراؤ" کے ہاتھ میں دے کر کیا۔ اس وقت پورا اسٹیڈیم " علیحدہ نہ ہو۔ علیحدہ نہ ہو " کی صدا سے گونج اٹھا۔

بین الاقوامی فٹ بال مقابلوں سے علیحدگی کے بعد وہ مزید تین سال تک اپنے محبوب کلب سانٹوس کی طرف سے کھیلتا رہے گا، اس کے بعد پورے طور پر ریٹائر ہوجائے گا۔

...چہ حرارت جب نقطۂ انجماد سے نیچے آتا ہے تب
...نے لگتا ہے۔ لیکن میرے جسم کا درجہ حرارت
...تو نہیں پھر بھی لہو نسوں میں منجمد ہوتا ہوا محسوس
...ہے۔
...لت پہونچنے سے تازہ بہتے ہوئے خون کی سُرخی سیاہی
...جاتی ہے اور ہوا کے میل میں آنے سے خون جمنے
...ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار یہ منظر دیکھا تھا اگر
...آنکھوں میں یہ منظر تکرار کے ساتھ اب تک کیوں
...ہے؟۔ شاید یہ بات صحیح ہے کہ آدمی اپنی طبعی موت
...پہلے بھی ہزاروں بار مر چکا ہوتا ہے۔ میرا یہ احساس میرا
...نہیں ہو سکتا۔ کہ۔ میں مر چکا ہوں۔ کس کو معلوم
...دوں کی قوتِ احساس زندوں کی بنسبت زیادہ شدید
...زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی اس تجربے کا اظہار
...بار صرف ایک بار کر سکتا تو شاید یہ حقیقت
...نہ رہتی۔
لیکن یہ موت کیسی ہے کہ وہ مر کر بھی جی رہی ہے۔
...کی بھی تو کئی اقسام ہوتی ہیں۔ اس کی موت کس
...سے میں آتی ہے، یہ فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہے۔
...موت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وقت ایک ایک
...ایک ایک لمحے کا سفر طے کر کے موت اور زندگی کو
...دوسرے سے ملاتا ہے اور اس میں برسوں لگتے
...یہ الگ بات ہے کہ ہر لمحہ انسان اپنے اندر مرتا رہتا
...مگر مکمل موت میں تو برسوں لگ جاتے ہیں لیکن
...کی موت نہ لمحوں کی موت تھی نہ برسوں کی۔ لمحوں لمحوں
...مٹتا ہوا آدمی پوری طرح مدت پر جا کر بکھر جاتا ہے
...کی موت کچھ ایسی ہی تھی جیسے تیز آندھی میں کوئی
...سبز شاخ سے ٹوٹ کر گرے اور شاخ سے
...ق ہو جانے کے باوجود زرد نہ ہو۔ زندگی اور موت
...میانی منزل۔ اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب
...سی طرف سے دلوں میں نفرت کی آندھیاں چلنے
...یں۔
...جیسے دن ڈھلتا ہے اسایا بڑھنے لگتا ہے
...میرے سارے وجود کو اپنی آغوش میں دبوچ
...ہے۔ میں کانپ اٹھتا ہوں۔ ہنگاموں میں گھر جاتا
...چاروں طرف صرف شور ہی شور سنائی دیتا ہے

ناسور

حسن رہبر

خوف۔ دہشت۔ سراسیمگی۔ عجب بھیانک منظر ہے
فضاؤں میں پھیلی ہوئی سسکیاں اور آہ وزاری دماغ
پر پے در پے ضربیں لگا رہی ہیں۔
لمبے چھرے کی نوک سے خون ٹپک رہا ہے۔
انگریزی ہٹاؤ تحریک کا میں مخالف ہی سہی، پھر
بھی میں نے اس کی حمایت میں نکلنے والے جلوس کا ساتھ
دیا۔ لمبا جلوس اونچے نعرے لگاتا ہوا عام شاہراہوں
سے گزرتا رہا۔ راہ میں جہاں بھی انگریزی میں لکھے سائن
بورڈ۔ پوسٹر یا نیم پلیٹ ملے۔ تارکول پھیر پھیر کر انکی
ہیئت بدل دی گئی۔ لیکن راستے میں ایک جگہ جب
جلوس کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو ہجوم مشتعل ہو گیا
نیا خون۔ نئی جوانی۔ آن واحد میں آدمیت کے جو
صدیوں پرانے رشتے تھے ٹوٹ گئے۔ اور شدید
طوفان میں بڑے بڑے پیڑ اکھڑ گئے، شاخوں اور
پتوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ہوا نے کچھ نہ چھوڑا۔
سب کچھ گرد وغبار بن کر اڑ گیا۔ سائے اتنے طویل
ہوئے کہ ہر چیز سیاہی کی تہہ میں چھپ گئی۔
اور وہ ایک برگ نوخیز۔ سنا ہے۔ ہوا اسے کہاں اڑا کر
لے گئی۔ میری صداؤں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔
اس کی بازیافت تو نہیں ہوئی، مجھے اپنی بازگشت ملی اور
تب مجھ میں کا وہ فنکار مر گیا جو خوب صورت علامتوں
اور دل کش استعاروں کا اسلوب رکھتا تھا۔
میرا اور اسکا رشتہ کتنا گہرا اور نزدیکی تھا۔ اسکی
گمشدگی نے ذہن میں بگولے بھر دیے۔ اب تو کچھ بھی
باقی نہ رہا تھا۔ جسطرف نگاہ اٹھتی چیزوں کی ہیئت
بدلی بدلی سے لگتی۔ ہر شے سُرخ خون میں ڈوبی نظر
آتی۔ پتا نہیں منظر بدل گیا تھا یا میری نظر۔
ساری بستی چھان ماری۔ اپنے پرایوں سے
معلوم کیا لیکن اس کا کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ تھک
ہار کر ٹرین سے واپس ہو رہا تھا کہ اچانک میرے

اب ڈھونڈھ انہیں

بنگالی کہانی

رناتھ متر
رجمہ
رشید شیخ

جود نہ رہنے پر جو ہوتا ہے، ٹھیک وہی
کان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ سامنے کے
، چبوترے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ کنوئیں
ن مُرخ گئی ہے۔ مکان کا اندرونی حصہ بھی
نہیں۔ باورچی خانہ مرمت طلب ہے۔
یں داخل ہوتے ہی مرگانک موہن بابو
ب آن واحد میں تاڑ لیا۔ اس کے فوراً بعد
مالی پر بگڑنا شروع کیا "یہ سب بھی تو نہیں
تو پھر تیرے رہنے سے کیا فائدہ؟ ہر ماہ
یہ جو بھیجتا ہوں، وہ کس لئے"؟
پکے بالوں کو کھجلاتا ہوا بولا "بابو! میرا تو
ور نہیں ہے، میں تو سب دیکھتا ہوں"۔
ن بابو نے اسے پھر ڈانٹا "خاک دیکھتے ہو؟
لیا یہی حالت ہوتی؟"
ا شوہر کا یہ طیش کھڑکی میں سے جھانک کر
ی تھی۔ اس بار وہ برآمدے میں آکھڑی
لہجے میں، طنزیہ شیرینی لیے ہوئے بولی "یہ
ا ہو رہا ہے؟ ابھی تو گاڑی سے اترے
ن سامان بھی نہیں کھلا۔ اور تم مکان کے
پنے لگے"؟
ن بابو بیوی کی طرف دیکھ کر لمحہ بھر کیلئے
ا ہوگئے۔ پھر غصّہ کو ضبط کرتے ہوئے
بولے "چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہا کر
یں اور پھر گھر بنائیں تو تم بھی تڑپ

اٹھتیں۔ تب تمہارے دل میں بھی مکان کی ایک ایک اینٹ، ڈھانچے کی ایک ایک ہڈی کے مول کی ہوتی"۔

نیلیما بولی "باپ رے! کلکتے میں تمہارا ایک تین منزلہ مکان ہے۔ یہ دوسرا۔ دونوں مکانوں کی ہر ایک اینٹ کو ڈھانچے کی ہڈی سمجھنے سے تو میں رہی۔ انسان کے پنجر میں کیا اتنی ہڈیاں ہوتی ہیں؟ موہن بابو بولے "تم مذاق اڑا لو۔ میری دولت کا احساس تمہارے دل میں ہے ہی نہیں۔ مکان کا نام بے کار ہی "نیلیما" رکھا"۔

"یہ تو ٹھیک ہی ہے۔ اس بار معمار سے کہہ کر میرا نام مٹا دو"۔

موہن بابو وہاں سے ہٹ گئے۔ نیلیما میں بس یہی ایک بات ہے۔ غصہ آتے ہی بس "مٹا دو"۔ جیسے مٹا دینا اتنا آسان ہی تو ہے!

نیلیما بسترے وغیرہ کھول چکی تھی۔ جھاڑ پونچھ کر سامان ترتیب سے رکھ دیا تھا اور غسل کر کے کھانا پکانے میں جٹ گئی تھی۔ بیوی کے سلیقے کو دیکھ کر موہن بابو بہت مطمئن ہوئے! آج کل شاید ہی بیوی پر کبھی نظر جاتی ہے۔ ۳۲ سال سے دیکھتے آرہے ہیں۔ اب تو عادت سی پڑ گئی ہے۔

اولاد نہیں ہے۔ نیلیما کا پچاس سالہ جسم اب بھی سڈول ہے۔ مقابلتاً ذرا سخت اور مردانہ لگتا ہے۔ اولاد کے بغیر ہی کیوں! ایک خاص عمر کے بعد عورت اور مرد سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ یکسانیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر کیا محبت اور رفاقت کا احساس بھی بڑھتا ہے؟ موہن بابو کی سوچیں یہیں آکر دم توڑ دیتی ہیں!

دنوں کے ساتھ ساتھ آپس کے تفرقے بڑھ رہے ہیں۔ اولاد کا نہ ہونا ہی کیا اس کی وجہ ہے؟ یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ اولاد والے جوڑوں کو بھی موہن بابو نے لڑتے جھگڑتے دیکھا ہے۔ صرف اور صرف نفسانی خواہش نے ان کا ناطہ بنا رکھا ہے۔ وکیل ہیں، خود ہی نے کئی جوڑوں کو قانون کے سہارے جدا کیا ہے۔ لیکن انتہائی خوفناک تنازعوں کے باوجود ان کا اور نیلیما کا ملاپ باقی ہے۔ اس میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا دکھاوا کون جانے!

موہن بابو آگے بڑھ آئے "لاؤ کچھ مدد کر دوں! سبزی کاٹ دوں یا مسالا پیس دوں؟ کہاں ہے سِل بٹّا؟"

"رہنے دو، اتنے ناز اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے"! موہن بابو نیلیما کی ناراضگی کو تاڑ گئے۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک خادمہ ساتھ آجاتی لیکن موہن بابو نے انکار کر دیا۔ وہی تو چاہئیں ہیں، وہ بھی بوڑھی۔ خود ہی سارا کام کیا جا سکتا ہے۔ ہاتھ کا کھانا زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ خادمہ کا خرچ بڑھ جاتا بس۔ وہ ویسے ہی بہت موٹی ہے اور یہاں کی آب و ہوا اسے اور کاہل بنا دیتی۔ اس لیے دونوں ہی آگئے ہیں۔ کوئی جھنجھٹ ساتھ ہی نہیں لائے۔

"فکر نہ کرو، کھانا پکانے سے اُوب جاؤ تو مجھے کہنا۔ میں بھی ہاتھ بٹاؤں گا۔ مجھے یہاں کام ہی کیا ہے؟ نہ عدالت نہ مؤکل!" موہن بابو بولے۔

نیلیما چڑ کر بولی "بڑا افسوس ہے۔ تعطیل میں بھی کلکتہ کی عدالت یہاں لے آتے تو اچھا تھا"

بھپور گیا کا سکتا۔ چوروں کی طرح ہاتھ میں اٹھی لیے ہوئے انکے سامنے سے ہٹ گیا۔

موہن بابو کی آتش غضب ابھی سرد نہ ہوئی تھی۔ سوچنے لگے "پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر! موہن کو تم جانتے نہیں ہو میاں!"

دوپہر میں سلیل رسی اور بالٹی لے آیا۔ موہن بابو خوش ہوئے۔ زبان کتنی ہی چلائے لیکن در اصل ان سے ڈرتا ہے۔ ان کی بات ٹالنے کی ہمت چھوکرے میں نہیں ہے۔

آج سہ پہر میں ان کی نظر برآمدے کے سامنے لگے شریفوں کے پیڑ پر گئی! کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بڑے بڑے پھل، پکے، ادھ پکے سب غائب! مالی کہیں نظر نہیں آیا۔ اندر جا کر بیوی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ مطالعہ میں مصروف تھیں "اچھا تو کتاب پڑھی جا رہی ہے۔ ادھر کیا ہو گیا، پتہ ہے؟ شریفے کے پیڑ میں ایک بھی پھل نہیں ہے"! نیلیما ہنس پڑی۔ "ہیں جی ہیں! ان کے لیے تمہیں خاک چھاننی نہیں پڑے گی۔ وہ دیکھو! چارپائی کے نیچے اشارہ کر دیا۔ موہن بابو جھانکنے لگے۔ سچ مچ وہاں ڈھیر سارے شریفے پڑے تھے۔ "لیکن بڑے بڑے پکے پھل کہاں گئے؟ سب یہی ہیں کیا؟ نیلیما بولی "سب کیوں ہونگے؟ کچھ سلیل لے گیا ہے۔ اسی نے تو توڑے ہیں! اس کا ایک دوست آیا تھا، وہ بھی کچھ کھا گیا ہے۔"

موہن بابو بولے "اچھا کیا۔ اور کسی کو نہیں بلا سکا کیا؟ خود تو درویش ہیں اور چلے ہیں خیرات کرنے! نیلیما بولی "اے بس کرو ہائے ہائے! ساتھ لے جاؤ گے کیا"؟ موہن بابو مسکرا کر بولے "لیکن جانتی ہو، دولت انسان سے پیاری ہے"! نیلیما بولی "لیکن کیوں"؟

موہن بابو نے کہا، ذرا سوچو! یہ میز کرسیاں، پلنگ، الماری، میں جتنے دن ہوں، اتنے دن رہیں گے۔ یہ میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ محبت اور خلوص سب ڈھکوسلے ہیں۔ دنیا دی دولت ہی امر ہے۔

محبت کے قائل نہیں موہن بابو۔ انسان کی چاہت میں رکھا ہی کیا ہے؟ وہ ایک پریم کے مجسمے کو روز چلتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ ریتا اپنوں سے بے غرض محبت کرتی ہے۔ روز ہی سب ٹہلنے جاتے ہیں۔ آج دیو گھر، کل سمل تلا، تو پرسوں مدھوپور۔ جس دن کہیں جاتے، اس دن موہن بابو کے مکان ہی کو مدھوپور بنا لیتے ہیں۔ مکان ہی کیوں، سارا سنسار ہی ان لوگوں کے لیے مدھوپور ہے۔ کبھی کبھار موہن بابو رشک و حسد کے مارے جل اٹھتے ہیں۔

ریتا موہن بابو کے برآمدہ میں بچے کو شانے سے لگائے ہوئے گھوم گھوم کر لوری گاتی ہے۔ اور اس وقت وہ موہن بابو کو یشودھا کا اوتار دکھائی دیتی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس کا روپ بدل جاتا ہے۔ شوہر کے ساتھ کیا کد کڑے لگاتی ہے لڑکی! کمرے کے اندر بھی اور کمرے کے باہر بھی! موہن بابو کے سے ساٹھ سالہ بزرگ کی موجودگی کا انہیں جیسے احساس ہی نہیں ہوتا! کرایہ پر تو صرف دو کمرے لئے ہیں لیکن اچھل کود اور شرارت ایسی کرتے ہیں جیسے سارا مکان ہی ان کا ہے۔ نوعمر سلیل بالکل بچہ بن جاتا ہے۔ پیڑوں پر چڑھنا، پتے نوچنا، ٹہنیوں کو جھنجھوڑنا اسے بہت بھاتا ہے۔ موہن بابو سوچتے "کاش! اس کے ہاتھ پیر ٹوٹ جائیں اور کم از کم چھ ماہ بستر پر پڑا رہے" لیکن ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ اور بیوی تو کم بخت جیسے وحشی ہرنی ہو! پشت پر موٹی سی چوٹی جھلاتی ہوئی، کمر میں آنچل اڑس کر کبھی میاں کے پیچھے دوڑتی ہے تو کبھی میاں کو اپنے پیچھے دوڑاتی ہے۔ کچے پکے پھلوں کے لیے چھینا جھپٹی۔ ایک دن تو دیکھا کہ ایک ہی امرود کو دونوں منہ لگائے کاٹ رہے ہیں!

ان لوگوں کا ایک دوست بھی ہے۔ منحنی سا جسم لمبوترا چہرا بڑا تیز ہے۔ اس کے ساتھ بھی ریتا کی خوب بنتی ہے۔ ... کے ساتھ شوخیاں جیسے اور بڑھ جاتی ہیں بھاگ دوڑ چھینا جھپٹی، ہنسی مذاق سب کچھ چلتا ہے۔ ایسے غیر قانونی محبت کے رشتے موہن بابو کو نہیں سہا

وہ تھے تو پندرہ روزہ کرایہ دار لیکن نیلیما ان سے روحانی رشتہ جوڑ بیٹھی تھیں۔ ریتا گوشت پکاتی اور "ماسی ما" کو دیتی۔ ماسی ما ریتا کے بغیر مچھلی نہیں کھاتی۔ کبھی کبھار ان کی سبزی موہن بابو کی تھالی میں بھی پڑتی ہے "یہ کیا ہے! مچھلی کا سر ہے، کھا کر دیکھو، ریتا نے بنایا ہے"۔ "اوں ہوں یہ سب مجھے مت دو۔" "او ہو! کھاؤ نا، لڑکی کھانا اچھا پکا لیتی ہے"۔

اس دن نیلیما سلیل کے ننھے کو گود میں لیے آ کھڑی ہوئی۔ "کتنا خوبصورت بچہ ہے دیکھو تو!" "تمہیں دیکھو۔ میرے لیے سب بچے یکساں، ماس لوتھڑے ہیں"۔ "اری ماں یہ کیا کہتے ہو۔ اگر اولاد ہوتی تو ہم نانا نانی بن جاتے۔ لیکن بھگوان بھی شکر خورے کو ہی شکر دیتے ہیں تم نہ بچوں کو چاہو نہ انسانوں سے پیار کرو۔ تمہیں صرف چاہئے روپیہ۔ تمہارا اتنا روپیا کون کھائے گا؟" موہن بولے "کیوں میں کھاؤں گا"۔

اسی درمیان ایک اور آفت ٹوٹی۔ موہن نے محسوس کیا کہ ان کے پھول غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ بعض اوقات ریتا شوق سے ایک دو پھول اپنے بالوں میں لگا لیتی تھی لیکن باغ اجاڑنے کا حق اسے کس نے دیا؟ ریتا کے گلدان میں پھول بستر پر پھول تھے اور اس کے بالوں میں ایک بڑا سا گلاب چمک رہا تھا۔ اس سرخ گلاب کو دیکھ کر موہن بابو کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن بولے ہنس کر ہی "آج تمہارے بیاہ کی سالگرہ ہے؟" ریتا دھیرے سے بولی "جی نہیں" موہن بابو نے "پھر باغ اجاڑ کر گھر کیوں بھر لیا ہے؟ کلیاں کہیں توڑی جاتی ہیں؟" "کلی تو ایک بھی نہیں ہے موہن جی سب پھول ہیں"!

ت ھوٹ ہیں ہی کی بیسملنے چھیاں
فل جاتی تھیں، موہن بابو کو۔ وقت کس
ائیں یہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ تاش
ں نہ جوا، سگریٹ نوشی بری لگتی تھی عورتوں
ر بھاگتے تھے۔ اپنی بیوی کے علاوہ انہوں
ں دوسری عورت کے جسم کو چھوا تک نہ
بڑے ہی بے حس اور بدشوق!

ہ پہر کو باغ میں گھوم رہے تھے اور شریفے
ر دے لدے درخت دیکھ رہے تھے۔
یسا جھاڑ جھنکاڑ ہو رہا ہے باغ۔ روشوں
دونوں جانب لگے گلابی اور زرد موسمی
ں کی ٹہنیوں کو چھانٹنا ہوگا۔ درختوں
ستہ پر ٹریس پاس کیا ہے، ان کا بھی
رنا ہوگا؟"

یک اجنبی نوجوان مکان کے سامنے آکھڑا ہوا۔
ن خالی ہے"؟ موہن بابو خوش ہو کر بولے
ہاں، کتنے کمرے چاہئیں؟ نوجوان "ایک
فی ہے۔ ہم دونوں اور ایک ننھا" موہن
ھیک ہے۔ پھر بھی جب گھومنے کے لیے
یں تو ذرا آرام سے رہئے۔ میرے پاس جو
ے خالی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے منسلک
ایک لیا تو دوسرا لینا ہی ہوگا۔" نوجوان "
ہے، دونوں ہی لے لوں گا۔ کرایہ کتنا ہوگا؟"
بابو ہنس کر بولے "پہلے پسند تو کیجئے کمرے۔
بعد میں طے ہو جائے گا" کمرے نوجوان کو
گئے۔ مشرق اور مغرب میں بڑی بڑی کھڑکیاں
صاف ستھرے وسیع کمرے۔ لیکن کرایہ کی بات
جوان کی بھنویں سکڑ گئیں "دو کمروں کے
روپے . . . . کچھ کم . . . ." "جی نہیں۔
کم ہی کہا ہے۔ اس سیزن میں یہاں مکان
کل ہے" "میں صرف پندرہ روز رہوں گا۔
یہ کچھ . . . ."
ی نہیں، آپ دو ہفتے قیام کریں یا ایک۔
مہینہ بھر کا ہی دینا ہوگا۔ یہاں یہی قانون
نوجوان "ٹھیک ہے لیکن کمرہ میں کوئی

فکر نہ کیجئے۔" نوجوان نے کہا "تو ٹھیک ہے موہن بابو" "اس کی فکر نہ
کیجئے۔ میں سب انتظام کروا دوں گا۔ آپ اپنی
فیملی لے آئیے۔"

اس کے چلے جانے کے بعد نیلیما شوہر سے بولی۔
"یہ کیا ہنگامہ مچا رہے ہو؟" موہن بابو بولے
ہنگامہ کہاں مچایا؟ "نیلیما نے کہا کرایہ دار کیوں
رکھ رہے ہو؟ کلکتہ میں ان کی آفت تو لگی ہی
رہتی ہے۔ یہاں کچھ دنوں کے لیے سکون سے رہنے
آئی ہوں اور تم یہاں بھی انہیں میرے سر پر مسلّط
کر رہے ہو۔" موہن بابو کہنے لگے کمروں کو یوں ہی
رکھنے سے کیا ہوگا بھلا؟ مکان کی مرمت میں بھی
تو خرچ ہوتا ہے۔ اس کے لیے کچھ روپیہ اگر آجاتا
ہے تو فائدہ ہی ہے۔ نقصان نہیں۔ تھوڑی دیر
چپ رہ کر موہن بابو ہنسے اور بولے "اسکے
علاوہ اکیلی منہ لٹکائے بیٹھی رہو گی۔ ان کے آنے
سے کوئی بات چیت کرنے والا تو ملے گا۔ نیلیما نے
جواب دیا، بات چیت کے لیے تم کیا کم ہو؟ موہن
بابو بولے میں؟ میں تو صرف اب تمہارے جھگڑے
کا ساتھی رہ گیا ہوں۔ مدعی اور مدعا علیہ ہی
ہیں ہم دونوں۔"

تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ آگئے۔ نوجوان
بہت تندرست تھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین
اور دوسرے میں سوٹ کیس۔ ساتھی تھی ایک
دراز قد چھریری خوب صورت لڑکی جس کی
گود میں بچہ تھا۔ پیچھے سر پر بستر اور صندوق لئے
قلی تھا۔

ان کے کمرے میں جانے کے کچھ لمحوں بعد ہی
اپنے کمرے میں جاکر موہن بابو ربوینو سٹیمپ لگا
ہوا ایک سادہ کاغذ لے آئے اور ہنس کر بولے
"کچھ خیال مت کیجئے گا۔ ٹرینزیکشن ابھی ہی ہو
جانا اچھا ہے۔ میں اسی لیے ہر چیز تیار رکھتا ہوں"۔
نوجوان نے بیگ سے ساٹھ روپے نکال کر ان
کے ہاتھ میں رکھ دئے۔ موہن ہنس کر بولے،
"اچھا آپ کا نام تو ــــــ" "سلیل دت" اس
کے بعد دراز قد لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے۔

"کیوں پسند آیا آپ کو؟" رینا ہنس کر بولی "ہاں"۔
لڑکی کا سڈول اور چھریرا بدن اس کے
نوبیاہتا ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ اسی درمیان
وہ ایک لڑکے کی ماں بھی بن گئی۔ شاید پرانے
خیالات کے ہیں یہ لوگ۔

دوسرے دن سے مکان کی مرمت میں لگ
گئے موہن بابو۔ مزدوروں اور بڑھئیوں سے
کام لینے میں انہیں بڑا مزا آتا تھا۔ وہ سامنے
بیٹھکر کاموں کی نگرانی کرتے اور ضرورت
پڑنے پر ان کا ہاتھ بٹاتے اور ان کے جوش
میں اضافہ کرتے۔

صبح کی سیر سے لوٹے ہیں موہن بابو برآمدے
میں پڑی کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں اچانک
ان کی نظر کنویں سے پانی بھرتے ہوئے سلیل دت
پر پڑی "پانی بھر رہا ہے بھرلے۔ پانی نہیں
بھرے گا تو کیا کھائے پئے گا۔ منہ کس طرح دھوئیگا
لیکن موہن بابو کی بالٹی سے کیوں؟ ایک بالٹی
بھی نہیں مل سکی اسے"؟ موہن بابو چائے کا کپ
خالی کر کے برآمدہ سے کنوئیں کی طرف بڑھے۔
"ارے سلیل بابو پانی بھر رہے ہیں؟" سلیل
"ہاں موہن بابو۔ آپ کا کنواں بہت اچھا ہے۔
بہت پانی ہے" موہن بابو دل ہی دل میں ہنسے "
چھوکرا سوچتا ہے کہ اسی طرح پر چالوں گا" بولے
"بہت پیسہ خرچ کر کے بنوایا ہے۔ آس پاس کے
کسی مکان میں اتنا گہرا کنواں آپ کو نہیں ملے گا۔
لیکن آپ کے پاس کیا اپنی بالٹی ڈوری نہیں
ہے؟" سلیل بولا "بالٹی تو ہے لیکن ڈوری
نہیں ہے۔" موہن بابو ہنس کر بولے "تو خرید
لیجئے۔ بازار میں میرے واقف کار کی ایک دکان
ہے وہ سستے میں دے دیں گے۔" سلیل بولا "اس
کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ سوچا تھا رہنا ہی کتنے
دن ہے جو یہ سامان کروں اس سے تو اچھا تھا
کہ ڈوری بالٹی کا کرایہ دے دوں۔" موہن بابو
فوراً جواب نہ دے سکے۔ شعلہ بار نگاہوں سے
دیکھتے رہے اس کی طرف۔ ان نگاہوں کی تاب

موہن ہنتے چلے گئے۔ سوچا اس موسم میں بیاہ تو نہیں اسلیے شادی کی سالگرہ کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ممکن ہے یہ ان کی پہلی محبت کا دن ہو۔ نیلیما نے بھی تو بتایا تھا کہ ان لوگوں نے پریم بیاہ کیا ہے۔

موہن بابو کے گھر بجلی نہیں ہے۔ اور کرسی بھی ایک ہی ہے۔ خود اسپر براجمان ہو جاتے ہیں۔ کسی ملاقاتی کو کرسی پیش نہیں کرتے۔ ان کی بھگت سے تو سو جانا بہتر ہے۔ ایک چائے کا پیالہ پیئے بغیر ٹلیں گے نہیں۔

میز کی طرف بڑھتے ہی ٹھٹک گئے موہن بابو۔ پھولوں اور پھلوں کا انبار لگا تھا۔ یہ سب کس نے دیئے ہونگے؟ مقدمہ جیت جانے پر اکثر موکلوں سے قیمتی تحفے وصول کئے ہیں۔ ان پھولوں پھلوں اور ساگ سبزی جیسے PERISHABLE چیزوں کے لیے انکے دل میں کوئی موہ نہیں ہے۔ "یہ کس نے دئے ہیں"؟ موہن بابو نے پوچھا۔ نیلیما بولی "مجھے تنگ نہ کرو، یہ سب تمہارے باغ کے پھل پھول ہیں۔ رینا سب واپس دے گئی ہے"۔ موہن بابو بھڑک کر بولے "واہ! کیا صفائی دی ہے چوری کا مال واپس کر دینے سے ہی جیسے قانون معاف کر دیتا ہے۔ اسکی نظر میں چور بے گناہ ہو جاتا ہے!" نیلیما چپ رہ گئی۔

موہن بابو باہر آئے، رینا کے کمرہ میں حسب معمول موسیقی کی محفل جمی تھی۔ رینا جیسی گرہستن کے ساتھ ایک دوست بھی رہتا ہے! کوئی گا رہا تھا "تو مار گھرے باتی۔ تو مار گھرے ساتھی" کہیں جیسے یہ گانا سنا تھا۔ کہاں؟ ٹھیک یاد نہیں کر پائے وہ!

اسوقت دونوں برآمدے خالی تھے۔ آس پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ آدمی ہی کیا، کیڑے مکوڑے بھی نہیں تھے، گہری تاریکی۔ تاریکی ہی تاریکی! کیا تاریکی ہی حقیقت ہے؟

قریب ہی اسٹیشن ہے، وہاں کچھ روشنی ہے۔ لوگوں کی چہل پہل ہے۔ ایک گاڑی آکر کئی منٹ رکی رہی۔ اسکے بعد وہ پھر تاریکی کا ایک حصہ بن گئی۔ اس کا کوئی ساتھی نہیں۔ یہ لمحہ بھر کا آرام جیسے ایک نازک سا ریشمی لمس ہو! موہن بابو نے سوچا "ہم لوگ ایک دوسرے کو شاید لمحہ بھر کے لیے چھوتے ہیں۔ اسکے بعد کوسوں دور کا فاصلہ! بیوی ہو یا بیٹا یا رفیق۔ ہمارا ملاپ وہی تل بھر کا! درمیان میں جو نہیں ملتے ان میں لامحدود فاصلے حائل ہو جاتے ہیں!"

آسمان کی طرف دیکھا موہن بابو نے۔ ان گنت تارے ٹمٹما رہے ہیں۔ کتنے پُراسرار، بے نام اور اجنبی اجنبی سے! لیکن تعجب تو یہ ہے کہ جیسے وہ پراسرار وجود انہیں ہاتھوں کے اشارے سے بلا رہے ہیں۔ وہ انسے پوچھتے ہیں "کیوں؟ کیوں؟ یہ قید کیوں؟ خواہشات کے طلسمی سلسلے اور دنیا کی چاہت کیوں؟ یہ تنہائی کیوں؟ روح کا ——— کھوکھلا پن کیوں؟

لیکن یہ سب سوالات بیہائی ٹرینوں کی مانند ہیں۔ ایک ڈیڑھ منٹ سے زیادہ اسٹیشنوں پر نہیں ٹھہرتے۔ اوں! قربانی، قربانی! قربانی کی عظمت کے گن سبھی کو گاتے دیکھا، عمل کرتے نہیں۔ بلندیوں کی معراج کو پانے کے لیے نفس کو مارنا ہوگا۔ اوپر اٹھنا ہوگا اس دلدل سے۔ لیکن یہ سب کیسے کروں؟ وکالت کی پریکٹس میں بالوں پر سفیدی آگئی۔ یہ قربانی بھی کیا کسی طرح کی پریکٹس ہوتی ہے؟ اس عمر میں کیا نئے سرے سے "جونیئر" ہونا ممکن ہے؟

بیوی بلانے آئی۔ کھانا لگ گیا تھا۔ بیوی سے پوچھا "کہاں تھیں اتنی دیر تک"؟

نیلیما بولی "رینا کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ کل صبح ہی چلے جائیں گے وہ لوگ!"

"کس ٹرین سے؟ بنارس ایکسپریس سے"؟

"ہاں شاید!"

چلو ہم لوگ بھی کل چلے جائیں!" "نا بھئی! اتنی جلدی میں نہیں جا سکوں گی۔ سامان سب پھیلا پڑا ہے"۔ موہن بابو بولے "تو مغلسرائے سے چلو۔ سہ پہر کی گاڑی ہے"؟

نیلیما بے زاری سے بولی "دیکھا جائیگا!"

کھانا ختم ہونے کے بعد ٹارچ ہاتھ میں لے کر پھر باہر نکلے موہن بابو۔ گھوم گھوم کر انہوں نے کئی بڑے بڑے شریفے اور رام وِد دیکھے اور دھیرے سے توڑ لیے جیسے اپنے ہی باغ میں چوری کر رہے ہوں۔ موسمی پھول بھی چنے۔ اور ان کا ایک گلدستہ بنایا۔ اب تک تو ردیپوں کا ہی گچھا باندھا ہے انہوں نے۔ پھولوں کے گلدستہ کا یہ پہلا موقع تھا۔

کمرے میں آئے۔ ایک خوبصورت سبز رنگ کی نئی باسکٹ میں ان سب چیزوں کو رکھا۔ وہ پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ بچوں کا کوئی بھی کھلونا کمرہ میں نہیں تھا۔ میز پر قانون کی کچھ کتابیں تھیں اور کچھ فائلیں۔ ایک رنگین کاغذ کا ٹکڑا دبا پڑا تھا۔ اسے باسکٹ میں ڈال دیا۔ اور تھا انکے چشمے کا ایک کیس۔ اس دن رینا کا ننھا اسے جھپٹ جھپٹ کرلے رہا تھا۔ بہت طیش آیا تھا موہن بابو کو۔ بہت دنوں سے بے کار پڑا تھا۔ اسے بھی باسکٹ میں رکھ لیا۔

اسکے بعد نیند آگئی۔ صبح ہی آنکھ کھلی۔ نیلیما اٹھ چکی تھی۔ بیوی سے کہا "چلو ہم لوگ انہیں سی آف کر آئیں۔ بنارس ایکسپریس صحیح وقت پر آرہی ہے یا نہیں، یہ معلوم کرنا ہوگا۔ کل تو دو گھنٹے لیٹ تھی" نیلیما بولی "کن لوگوں کو سی آف کروگے"؟

موہن بابو نے کہا "کیوں؟ وہی تمہاری بہنا بہو وغیرہ کو!"

نیلیما "ارے ماں! وہ لوگ تو آدھی رات تب ہی چلے گئے!"

موہن بابو بولے "یہ کیوں؟ رات میں تو کوئی گاڑی نہیں تھی؟ نیلیما نے کہا "اے بس رہنے دو۔ پنکج بہت چالاک لڑکا ہے۔ وہ کہیں سے ایک جیپ لے آیا تھا۔ اسی میں وہ لوگ گئے ہیں مدھوپور۔ اس کے بعد خوب گھومیں گے اور پھر کلکتہ"!

موہن بابو کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بید کی ٹوکری کو مسلسل دیکھتے رہے! ★★★

گلاب داس بروکر

وینو بھائی بولے۔ اگر آپ کو ایسی ہی تمنا ہو تو مجھ سے بے تکلف کہیئے۔ حسین سے حسین پریاں خدمت میں حاضر کر دوں گا۔ ایکدم فرسٹ کلاس کلچرڈ۔ اس سے آپ کے ارمان بھی پورے ہونگے اور دامن بھی داغدار نہ ہوگا۔

ل سے تین یا چار سیڑھیاں طے کر پایا ہونگا کہ سیٹھ جی
ی پکار سنکر کھڑا ہوگیا۔ دیکھا وہی میری طرف چلا آ رہا
ی بول پڑا۔
اسے آپ مجھے پہچان نہیں پا رہے ہیں۔ پہچانیں گے
بھلا بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں کی پروا ہی کب
"
اف کیجیے گا میں نے آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے لیکن
اسے یہ یاد نہیں آ رہا ہے۔"
ئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے

کہا۔ صاحب میں آپ کے صرف پانچ منٹ لینا چاہتا ہوں۔"

"لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں رک نہیں سکتا۔ مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"نہیں سیٹھ جی ایسا نہ کہیں۔ صرف پانچ منٹ کے لئے میری بات سن لیجئے۔"

میں نے سوچا کہ بار بار اس مردود سے ملنے کی بجائے یہی اچھا ہوگا کہ آج اس سے نمٹ ہی لیا جائے۔ اس لئے میں نے پوچھا۔ "کہئے کیا کام ہے۔" اس نے کہا:۔

"میری لڑکی اس بار بھی پاس ہوگئی۔"

"خوشی کی بات ہے۔" میں نے فوراً جوابدیا۔

"اب یوں لگتا ہے کہ آپ مجھے پہچان گئے ہیں۔ میں اسی کے لئے آیا ہوں۔ فیس کا تو کسی صورت سے انتظام ہوگیا ہے لیکن کتابوں کے لئے کچھ پیسے گھٹ رہے ہیں۔"

تو آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟

"آپ مدد نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا صاحب! آپ کی مدد کے بغیر میری لڑکی بھٹک جائے گی۔"

"دیکھو جی۔ میں نہ تمھیں جانتا ہوں اور نہ تمہاری لڑکی کو ان فضول باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے"

اتنا سنا تھا کہ اس نے اپنی جیب سے پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا

"یہ میری لڑکی کی تصویر ہے۔"

میری نگاہ خود بخود تصویر کی طرف گئی۔ وہ ایک خوبصورت حسین و نازک لڑکی کی تصویر تھی۔

"لیکن میں اسے دیکھ کر کیا کروں گا۔" تصویر جیب میں رکھتے ہوئے اس نے عاجزی سے کہا۔

"دیکھیے سیٹھ جی۔ آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ آپ کس کی

مدد کریں گے کچھ سنبھلو تو آپ کو کتنا ہی ہوگا۔" میں نے پنڈ چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"اچھا کتابوں کی مدد میں کر دوں گا۔ میرے پاس بہت سی پرانی کتابیں ہوں گی۔"

"کتابوں کا انتظام ہوگیا ہے صرف نقد مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن ابھی آپ نے کہا تھا کہ فیس کا انتظام ہوگیا ہے اور۔۔۔ خیر چھوڑیے۔ لیکن روپے میرے پاس نہیں ہیں۔"

"آپ یقین کیجئے آپ کے روپے مفت ضائع نہیں ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کونسی بات ہے۔"

"یعنی کیا مطلب۔"

"یعنی والی کچھ نہیں۔" اس نے میرے بہت قریب آکر کہا۔ "اس لڑکی کا نام لیلا ہے۔ عمر بیس سال ہے۔ اس سے ایک اور بڑی بھی ہے اس کا نام شیلا ہے۔"

"یہ سب کیا بکواس ہے۔" میں نے بگڑ کر کہا۔

"بکواس نہیں حقیقت ہے۔" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "آپ کبھی غریب خانے پر تشریف لا یئے، ذرا چائے وائے چلے گی اور اس کے بعد شیلا سیانی لڑکی ہے، سب کچھ سمجھتی ہے پرکھا ہے پری۔"

اتنا سننا تھا کہ میرے غصّے کی حد نہ رہی۔ میں نے اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"چپ رہ۔ پاپی۔ شیطان کمینے۔"

میں چل پڑا لیکن وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پھر وہ کہنے لگا۔

"صاحب! بات یہ ہے کہ۔۔۔"

"کچھ نہیں مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا، میں مجبور ہوں۔"

"خیر کوئی بات نہیں آپ کچے دل کے آدمی ہیں مجھے صرف پانچ روپے دے دیجئے۔"

"میں کچھ نہیں دوں گا۔"

"تو ایک ہی روپیا دے دیجئے۔"

"کہہ دیا کچھ نہیں دوں گا۔"

"لیکن کچھ نہ کچھ تو آپ کو دینا ہی ہے۔"

جب میں نے دیکھا کہ بدمعاش بغیر کچھ لئے ٹلے گا نہیں تو ایک روپیا تھما کر اس سے نجات حاصل کی۔

زینے سے اتر کر جیسے ہی موٹر کے پاس پہونچا کہ سامنے سے دینو بھائی آتے دکھائی دیے۔ آتے ہی نمستے کی۔ میں نے پوچھا کیا حال ہے دینو بھائی؟"

"سب ٹھیک ہے، اچھا وہ آدمی جو ابھی آپ سے مل کر گیا ہے اسے آپ جانتے ہیں کیا؟" دینو بھائی نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"نہیں تو۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"سالا ایک نمبر کا کائیاں ہے۔ کہاں آیا تھا؟"

"لڑکی کی پڑھائی کے لئے مدد چاہتا تھا۔"

"تو آپ نے کیا کیا؟"

"کیا کرنا تھا۔ کورا جواب دے کر واپس کر دیا اور کیا کرتا۔"

"بس ٹھیک کیا وہ حرامی بڑا گندا آدمی ہے۔"

"آپ کیسے جانتے ہیں اسے؟"

قصّہ طویل ہے لیکن خیر۔۔۔ دینو بھائی کہنے لگے "یہ سالا آپ جیسے شریفوں کو بہکا کر گھر لیجاتا ہے، اس کی دو کنواری لڑکیاں ہیں، جوان اور خوب صورت، ایک کالج میں پڑھتی ہے دوسری گھر پر ہی رہتی ہے۔ آنے والے کو دونوں لڑکیوں کے ساتھ چھوڑ کر خود وہاں سے ہٹ جاتا ہے۔"

دینو بھائی ذرا چپ ہوئے تو میں نے اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "پھر۔"!

دینو بھائی نے بات آگے بڑھائی۔ "مت پوچھئے یہ بمبئی ہے، یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ بدمعاش تھوڑی دیر بعد لوٹ آتا ہے اور شور مچانے لگتا ہے۔ "بھلے آدمی آپ بھی آستین کے سانپ ہی نکلے۔ میں نے شریف سمجھ کر ذرا گھر میں بٹھا کیا دیا کہ حضرت میری معصوم لڑکیوں کی عصمت لوٹنے پر آمادہ ہوگئے۔ کیا آپ نے اس مکان کو رنڈی خانہ سمجھا ہے۔۔۔ شور سنکر کچھ لوگ اکٹھا ہوجاتے ہیں، یہ لوگ بھی بدمعاش غنڈے ہی ہوتے ہیں۔ لڑکیاں بھی بالکل بھینٹی ہوئی ہیں سسکیاں بھرنے لگتی ہیں۔ بس پھر کیا ہے آپ جیسے شریف آدمی سَو دو سَو روپے دے کر اپنی عزت بچا کر بھاگ نکلنے کو ہی غنیمت جانتے ہیں۔"

"ایسی بات ہے۔" میں نے تعجب ظاہر کیا۔

"جی ہاں اللہ کا شکر ادا کیجئے جو آپ اس کے پھندے سے بچ نکلے۔ پھنس گئے ہوتے تو پیسوں کی بربادی تو ہوتی ہی سماج میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتے۔"

آپ ٹھیک کہتے ہیں دینو بھائی۔ آپ نے مجھے ان باتوں سے آگاہ کیا اس کے لئے میں آپ کا تا عمر شکر گزار رہوں گا اتنا سن کر دینو بھائی میرے اور نزدیک چلے آئے، دھیمی آواز میں بولے :۔

"اگر آپ کو ایسی ہی تمنا ہو تو مجھ سے بے تکلف کہیے حسین سے حسین پریاں خدمت میں حاضر کر دوں گا۔ ایک دم فرسٹ کلاس، کلچرڈ۔ اس سے آپکے ارمان بھی پورے ہوں اور دامن داغدار بھی نہ ہوگا۔"

مجھے یوں لگا جیسے آسمان زمین سب گھومنے لگے ہوں میں ایک ٹک دینو بھائی کو دیکھتا رہ گیا۔ اتنے میں دینو بھائی پھر بولنے لگے :۔

"جی ہاں ایک سے ایک بڑھ کر چھوکریاں پیش کر سکتا ہوں اس پر طرّہ یہ کہ خطرہ ذرا بھی نہیں۔ بولئے کیا کہتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ بت سا۔ دیوار کی طرح۔

مستقبل کے اسکول کی ایک جھلک

(تلخیات نئی دہلی)

میں ایک منسٹر ہوں

ہمایوں قدیر

جی ہاں! چونکئے مت۔ عرف عام میں آپ بھی مجھے اسی نام سے جانتے ہیں اور اچھی طرح پہچانتے بھی ہیں۔ لیجئے آج آپ کے بیحد اصرار پر میں اپنی رام کہانی سناتا ہوں۔ اس کہانی کی سچائی ثابت کرنے کے لئے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ کرسئ وزارت کی قسم یہ کہانی بالکل سچی ہے۔

میرے منسٹر بننے کی کہانی بڑی طویل ہے اور طویل ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی بھی ہے کہ جسکو سناتے ہوئے ہر شریف آدمی کو شرم محسوس ہوگی کیونکہ آپ جانتے ہی ہونگے کہ شرم اور شریف آدمی کا ساتھ چولی دامن کا ہوتا ہے۔ اگر شریف آدمی شرمائے نہیں تو اسکو شریف ہی کون کہے۔

ہاں تو مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میں حلقہ...... سے اسمبلی کے لئے کامیاب ہوا۔ اب آپ یہ پوچھیں گے کہ کامیاب کیسے ہوا۔ تو جناب یہ سوال ذرا ٹیڑھا ہے لیکن میں اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں تاکہ کہیں آپ میری دیانتداری اور ایمانداری پر شک نہ کرنے لگ جائیں۔

ہوا یوں کہ میرے مقابلے پر میرے حلقۂ انتخاب میں ایک سرپھرا لیڈر کھڑا ہوا۔ میں نے پہلے تو اس کو ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی دی۔ وہ دھمکی کیا تھی۔ یہ میں اس وقت نہیں بتاؤنگا کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو ڈر ہے کہ قانون کی زد میں آجاؤنگا (اس لئے اس ضمن میں مجھے معاف فرمائیے گا کیونکہ قانون کی زد میں نہ آپ آنا چاہتے ہیں اور نہ میں۔)

لیکن وہ شخص بھی ایک ہی سرپھرا تھا۔ میری اس دھمکی کو ایسے ہضم کر گیا جیسے آپ دودھ سے بھرا ہوا گلاس منٹوں میں ہضم کر جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکل رہا ہے تو مجبوراً انگلی ٹیڑھا کرنا پڑا۔ چنانچہ میں نے اس کو سبز باغوں کے ساتھ سبز نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں بھی دکھائیں۔ بس پھر کیا تھا۔ نوٹوں کی ان سبز قطاروں کو دیکھ کر اس سرپھرے کی آنکھوں میں سبزی چھاگئی اور اس کے بعد وہ لگا میرے اسٹیج سے میرے حق میں تقریریں کرنے۔

پہلے میں اس کی نظر میں سماج کا بہت بڑا مجرم تھا تو اب دیوتا ہوگیا۔ پہلے ذخیرہ اندوز تھا تو اب ان داتا بن گیا۔ پہلے بے رحم تھا تو اب غریبوں کا ہمدرد اور سب سے بڑا سہارا بن گیا۔ پہلے قانون کا باغی تھا تو اب جمہوریت کا رکھوالا قرار پایا۔ غرض ہرے ہرے نوٹوں نے وہ کرشمہ کر دکھایا جو بڑی سے بڑی دھمکی سے نہ ہوسکا۔

ہمارے ملک کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تو ہے کہ ہم لوگ شانتی پسند ہیں۔ جو کام شانتی اور امن سے ہوسکتا ہے بھلا اس کے لئے دھینگا مشتی اور آپس میں جوتم پیزار کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو اگر کسی چیز کی حاجت ہے یا آپ اپنا کوئی کام کرانا چاہتے ہیں تو بجائے اس کے کہ کسی پر رعب جمایا جائے یا دھونس گانٹھی جائے چپکے سے متعلقہ فرد کی جیب میں امن و شانتی کا ایک ہرکارہ حسب حیثیت و توفیق سرکا دیجئے اور پھر اس امن کے ہرکارے کی کرامات دیکھئے۔ واہ کتنے عظیم ہیں امن و شانتی کے یہ نوٹ۔ بظاہر کاغذ کے معمولی، حقیر اور بے بضاعت ٹکڑے لیکن ایسے طاقتور کہ کٹر سے کٹر دشمن بھی اگر انکی صرف ایک جھلک دیکھ پائے تو آپ کا دم بھرنے لگے۔

میں اصل موضوع سے ذرا بہک کر لیکچر بازی پر اتر آیا تھا کیونکہ ایک وزیر کے لئے بات بات پر لیکچر دینا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ خیر آمدم برسر مطلب۔ اس سرپھرے کے بعد میدان میں میرے مقابل جتنے بھی حریف باقی بچے تھے وہ بیچارے پہلے ہی لنگڑے اور لولے تھے۔ لہٰذا میرا ایک ہی سیاسی دھکا برداشت نہ کر پائے اور چاروں خانے چت زمین پر گر پڑے۔ تو صاحب اس طرح میں اسمبلی پہنچا۔

اسمبلی میں مجھے ایک عجیب و غریب تماشا نظر آیا۔ وہاں ہر شخص خواہ وہ تربوزی توند کا مالک ہو یا خربوزی اپنے طور پر جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ اکثریتی پارٹی کے سارے ممبر ہر وقت اس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح منسٹری ہاتھ آجائے۔ منسٹروں کی یہ خواہش کہ بس کیبنٹ رینک کے وزیر ہو جائیں۔ اپوزیشن کی بینچوں پر بیٹھنے والا ہر فرد اس فکر میں غلطاں تھا کہ کسی صورت حکمراں پارٹی کو ایوان حکومت سے ناک آؤٹ کر دے اور خود اپوزیشن کے لیڈر اس چکر میں تھے کہ کسی طرح حکمراں جماعت کے دس پندرہ افراد کو توڑ موڑ کر اپنی حکومت قائم کرلیں۔ غرض ایک طرفہ تماشا تھا۔ نیچے سے اوپر تک ریشہ دوانیوں اور چکر سازیوں کا ایک ایسا سمندر لہریں لے رہا تھا کہ جس کا کوئی اور نظر آتا تھا اور نہ چھور۔

اس سمندر کی لہریں گنتے گنتے خوش قسمتی سے ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے محسوس کیا کہ اب اس سمندر میں جوار بھاٹا آیا ہی چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے خیالات کی کمند لگائی اور اس میں ایک ایسے گروپ کے لیڈر کو پھنسا لیا جو میری دانست میں اس طوفان کے بعد وزارت بنا سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے ایسا ہی ہوا جیسا میں نے سوچا تھا۔ طوفان آیا اور اپنے ساتھ اچھے اچھوں کو بہا لے گیا مگر اپنی حکمت عملی کے باعث میں نہ صرف اس طوفان کی زد میں آنے سے بچ گیا بلکہ یہ میرے لئے وزارت کی آرام دہ گدی کا پیغام لے کر آیا۔

اب صاحب اگر آپ یہ پوچھیں کہ اپوزیشن کے اس لیڈر کو میں نے کتنی مقدار میں مسکا لگایا اور کن کن ترکیبوں سے اسکو رام کیا۔ تو جناب میرا یہ ایک قیمتی راز ہے جسکو میں ہرگز ظاہر نہیں کرسکتا کیونکہ اگر میں نے اسکو افشا کر دیا تو پھر ہر کوئی اس پر عمل کر کے منسٹر کی گدی حاصل کرسکتا ہے ——— تو صاحبو! یہ ہے میری رام کہانی۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے مفت میں کرسئ وزارت حاصل کی ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے لئے کسقدر لیاقت، سوجھ بوجھ اور بصیرت کی ضرورت ہے۔ یہ اصل واقعات میں نے نہایت صاف گوئی سے کام لے کر آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں کیونکہ اکثر لوگ ہم وزیروں کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم کبھی سچ نہیں بولا کرتے اور ہر وقت ایک تین تیرہ کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔ امید ہے کہ میری اس صاف گوئی، سچائی، دیانتداری اور ایمانداری سے متاثر ہوکر آپ مجھ خاکسار ہی کو دوبارہ منسٹر کی گدی کا اصل اور صحیح حقدار سمجھیں گے اور مجھ کو ووٹ دے کر جمہوریت کی بنیادوں کو ملک میں مزید مستحکم بنائیں گے۔

واقعات نئی دہلی

...کنووکیشن کا دن۔ منّو کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مُفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹرس سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔

خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے

پُرمسرّت دن

davp 70/242

اگر آپ خودداری کی بلند مگر سنگلاخ چوٹی سے چند قدم نیچے اترنے کو تیار ہوں تو آئیے آپکو کامیابی اور ترقی کی ایک آسان راہ دکھائیں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ انسانوں کی بہت کم تعداد اپنی شخصیت اور ذات سے کلی طور پر مطمئن ہوتی ہے۔ انسانوں کی اکثریت اپنی بڑی سے بڑی کامیابیوں اور اختیارات کے حصول کے باوجود پوری ذہنی آسودگی حاصل نہیں کر پاتی۔ تقریباً ہر انسان اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کی ذات، صفات اور کامیابیوں کی بار بار تعریف و توصیف کر کے یقین دلاتے رہیں کہ وہ ایک لاجواب شخصیت اور بے مثل انسان ہے۔ احساس کمتری کے جراثیم کے ڈنکوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہ خوشامد کی قلعی بار بار چھڑکوانا پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے مطلق العنان شہنشاہ تک اپنے درباروں میں ...

ان کو یقین دلایا جاتا رہے کہ ان کا ہر فعل و عمل لاجواب ہے۔ اسی لیے شاعر قصیدے لکھتے رہے ہیں۔ آج بھی دولت مند اور بلند مرتبوں پر فائز انسانوں کے گرد آپ کو ایسے لوگ ضرور ملیں گے جو محض خوشامد کر کے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ اس انسانی کمزوری سے آپ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کامیابی اور ترقی کے مختلف زینوں میں خوشامد سب سے آسان اور مختصر زینہ ہے لیکن اس میں پھسلن بہت ہے۔ اگر آپ نے ایک بھی غلط قدم رکھا تو انجام کار آپ سب سے نچلی تہہ پر نظر آئیں گے اور آپ پر ہنسنے والوں میں نہ صرف تماشائی بلکہ اس راہ کے مسافر بھی شامل ہوں گے۔

خوشامد کے لیے ایک وسیع مطلب والے لفظ "مکھن بازی" کی ابتدایوں تو زیادہ ذہین اور عقلمند ...

طالب علمانہ زندگی میں اس ہنر کو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور نصابوں کے طالب علموں کو جن میں (SESSIONAL MARKS) ہوتے ہیں۔ مکھ کے ماہرین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ علم مکھن سب سے اچھا ہوتا ہے اور وہاں تربیت یافتہ طالب علم اس آرٹ کے ما... مکھن بازی کا استعمال آپ والدین سے استادوں تک اور محبوبہ سے لے کر افسروں ہی پر کر سکتے ہیں۔ مکھن بازی کے مبتدی کو پہلے اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ مکھن نہ زیادہ ہو نہ کم۔ مکھن صرف اتنا لگنا چاہیے آئے نہ انگلیوں پر چپکے بس اتنا ہو کہ کھپ جا... اسی میں ہے کہ اس فعل کو شروع کرنے سے ...

رہ لطیف ہو اسی پر مکھن لگائیے جن لوگوں
النا ہو ان ہی پر مکھن لگائیے جس سے کوئی
صل نہ کرنا ہو ان پر مکھن اور وقت برباد نہ
پ کے شکار کو اس بات کا احساس ہو جاتا
اس پر مکھن لگا رہے ہیں تو یہ آپ کے اناڑی
ت ہے، اور اس صورت میں آپ کو خاطر
رہ پہونچنے کی امید کم رہجاتی ہے۔

وقت کئی آدمیوں پر مکھن لگایا جانا ایک
ئلہ ہے اور اس کی اجازت صرف اسی
میں دی جاسکتی ہے جب وہ لوگ ایک
ے سے قطعی غیر متعلق اور ناآشنا ہوں، اگر
دہ یا استادمیں سے کسی کو بھی معلوم ہو گیا کہ
دوسرے افسر، لڑکی یا استاد پر بھی مکھن لگا
تو آپ کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔
افسروں یا استادوں پر بیک وقت مکھن
والوں کی عقل پر صرف ماتم ہی کیا جاسکتا
پر مکھن لگانا ہو اس کو یقین دلائیے کہ آپکی
دنیا میں صرف وہی شخص قابلِ تقلید و
ن اور توصیف ہے۔ باقی سب اس کے آگے
ں۔ اس کے لیے آپ اسکے طور طریقوں کی نقل
ع کر دیجئے مثلاً اگر وہ پان کھاتا ہو، شکار کھیلتا
ونچھ رکھتا ہو، نسوار سونگھتا یا ٹوپی پہنتا ہو
خرافات میں مبتلا ہو تو آپ بھی ان کو اختیار
یجئے، اگر یہ شخص استاد یا افسر ہے تو اس کی ذہانت،
، انصاف پسندی، قابلیت اور پرکشش شخصیت
عریف کیجئے خواہ وہ ان سب سے بالکل ہی محروم
پ کی ہنرمندی اسی میں ہے کہ اس کے اعمال،
لوں اور باتوں کی مثال دیدے کر ان اوصاف کا
ثابت کر دیجئے۔ اس کے معمولی مذاق پہ زور شور
ہنسئے اور خوب داد دیجئے، جن لوگوں سے اس کی
ن اور مخالفت ہو ان کی برائیاں کیجئے۔ اس کی
بیوں کی خوب شہرت کیجئے۔ اور اس کی موجودگی
دوسرے لوگوں سے اس کا بار بار ذکر کیجئے جیسے
کی کامیابی ہو، اپنے آپ کو کمتر اور اس کو عظیم تر
کی ہنری لائے سے کھلانے تک کی

خدمات سرانجام دیجئے۔ (بچہ اگر شیرخوار ہو تو ہر وقت
چوکنا رہئے) اس کی خامیوں اور کمزوریوں کی طرف
باتوں کا رخ کبھی نہ جانے دیجئے۔

استادوں کے گھر کے جتنے چکر لگائے جائیں اتنا ہی
وہ خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح انہیں گھریلو کام
کرانے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ نئی پروفیسروں پر مکھن
لگانے میں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت پڑتی ہے۔
لیکن ان کی سنک سے بددل نہیں ہونا چاہئے۔ پھلوں
اور گھی وغیرہ کو بازار سے خرید کر اور اپنے گھر کا بنا کر
استادوں کو خوش کرنا آسان کام ہے۔ یاد رکھئے ہر
استاد کا ایک کمزور ترین پہلو ہوتا ہے۔ وہ ہے اسکی
بیوی۔ اگر آپ بیوی سے سفارش کرا سکیں تو استاد
اس سفارش کو ٹالنے کی ہمت کبھی نہیں کرسکے گا۔

افسروں والے معاملہ میں ہر فیصلے اور حکم پر "بہت
بہتر" اور "جی حضور" کہنا بہترین پالیسی ہے اپنے آپ
کو افسر سے زیادہ لائق اور قابل کبھی نہ ظاہر کیجئے بلکہ
اگر آپ اپنی لیاقت کو بھی افسر کی لیاقت بنا دیں تو
وہ یقیناً بے حد خوش ہوگا۔ افسر کی رائے اگر آپ کو
احمقانہ معلوم ہو تو بھی اس سے بحث نہ کیجئے۔ افسر سے
ضد بحث کرکے آپ کبھی کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتے
ہیں۔ اپنی کارکردگی سے حاصل شدہ کامیابیوں کو
بھی افسر کے نام منسوب کرنے کا ایثار اگر آپ کرسکیں
تو یاد رکھئے کہ ہوشیار ترین اور سنجیدہ ترین افسر بھی
اس مکھن کے اثر سے بچ نہیں سکے گا۔ افسر کی غلطیاں
نکال کر اس کو شرمندہ کرنا اپنے پیروں پر کلہاڑی
مارنے کے برابر ہے، اس سے باز رہئے افسر جس چیز کو
پسند کرتا ہو اس کے سامنے اس چیز کے گن گائیے۔
اور جب وہ اسی چیز کو ناپسند کرنے لگے تو آپ بھی فوراً
بدل جائیے۔ آخر آپ افسر کے نوکر ہیں بیگن کے نہیں
دوسرے لوگوں کے سامنے افسر سے بے تکلفی کا اظہار
نہ کیجئے بلکہ اپنے خادم ہونے کا اظہار کیجئے۔

عورتوں پر مکھن لگانا مردوں پر مکھن لگانے سے
زیادہ آسان ہے۔ انپر مکھن جلد اور آسانی سے پھیلتا
ہے، چونکہ عورتیں عقل و فہم سے تہی دامن ہوتی ہیں
اس لیے انکی عقل مندیوں، ذہانت اور فراست کا
دوران کا تنہائی کو ش کرتا ہے۔ دنیا کی اور ہر
(عورت کی) کی مناسبت سے ان کے حسن، ذہانت،
انتظامی قابلیت اور سلیقہ کی تعریف کیجئے۔

شادی شدہ عورتیں آپ پر اعتماد قائم ہونے کے
بعد جلد ہی اپنے شوہروں کی بدسلیقگی، لاپرواہی
اور بے اعتنائی کی شکایت کریں گی۔ اس وقت
ان کی مظلومی اور بے قدری پر آنسو بہائیے اور
دبی زبان سے ان کے شوہروں کی مذمت بھی کیجئے
مگر سخت احتیاط سے کام لیجئے، یاد رکھئے کہ شادی
شدہ عورتوں کو خالہ یا چچی کہنے سے بہتر ہے کہ آپا،
بہن جی یا زیادہ سے زیادہ بھابھی کہئے۔ اگر آپ
عورت کی پکائی ہوئی ہر چیز کی مبالغہ آمیز اور شور و
غل مچا کر تعریف کرنے کو تیار رہیں تو سوائے بے حد
کنجوس گھروں کے ہر جگہ آپ کی خاطر و مدارات ہونے
میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہر گھر میں ہر کھانے کی تعریف
کرتے ہوئے کہئے کہ "اتنا لذیذ کھانا تو کبھی کھایا ہی
نہیں" بشرطیکہ وہ کھانا نوکرانی کا پکایا ہوا نہ ہو۔
جس گھر کی مرغیوں کے انڈے کھانے کا آپ کو شوق
ہو اس گھر کی مالکہ سے ہر ملاقات پر مرغیوں کی
مزاجی کیفیت اور خیر و عافیت دریافت کرتے رہا
کیجئے۔ دھیان رہے کہ جو وقت عورت اپنی پڑوسن
یا شوہر سے لڑ رہی ہو اس وقت آپ کی غیر موجودگی
بہتر ہے۔ ایسے مواقع پر غائب ہو جائیے۔

غیر شادی شدہ لڑکیاں اپنے حسن کے ذکر سے
زیادہ کسی چیز سے خوش نہیں ہوتی ہیں۔ ان پر مکھن
لگانے کے لیے حسن کی تعریف لازمی ہے، اس کے
علاوہ ان کی زبانی ان کی سہیلیوں کی برائیوں
کا ذکر، ممی اور پاپا کی تعریف، بے حد چھوٹی چھوٹی
معمولی غیر اہم باتوں کے طویل قصے اور انکی فرمائشوں
کی فہرست کا صبر و شکر سے سننا بھی مکھنوں کے
برابر ہے۔ اگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپکی محبوبہ
آپ کی بیوی میں تبدیل ہو جائے تو مکھن لگانا بند
کر دیجئے کیونکہ سب سے کم فائدہ اور سب سے
زیادہ نقصان بیوی کو مکھن لگانے کی حماقت
سے ہوتا ہے۔ ★★

لکھنؤ کے شب و روز

حکیم بڈھن کی ہنگامہ خیزیاں

بہزاد لکھنوی

واضح رہے کہ اب سے چالیس برس قبل سراغ رسانی اور جاسوسی کے فن کو اتنا عروج نہیں تھا اور نہ ایسے آلات تھے جیسے اس دور میں ہیں۔ پھر ایک شوقیہ سراغ رساں اپنے بل بوتے پر کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ یہ کہانی قدیم مشرقی ماحول میں گھوم رہی ہے اگرچہ صاحبان اسے محض تخیلی کہانی سمجھیں تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

بہزاد لکھنوی

بنّا صاحب کا چائے خانہ سلامت تھا۔ چائے ویسی ہی مزیدار تھی۔ میں اور حکیم بڈھن باقاعدگی کے ساتھ آرہے تھے۔ فیکٹری کے اوقات کی پوری پابندی کی جارہی تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن خریدار کا پتا نہ تھا۔ خدا جانے کیا ہوگیا تھا۔ ایک دن حکیم بڈھن نے مجھ سے کہا:۔

"یار بہزاد۔ کیا فیکٹری کسی نے کیل دی ہے!"

میں نے کہا:۔

"میں وہم نہیں پالتا، لیکن حالات کچھ ایسے ہی نظر آرہے ہیں۔"

وہ بولے۔ "تمہیں تعجب ہوگا آج دو مہینے سے ایک پیسے کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ اپنے پاس سے خرچ کررہا ہوں۔"

میں نے کہا "یار فکر کیوں کرتے ہو۔ اللہ مالک ہے ایک در بند سو در کھلے۔"

وہ جل کر بولے۔ "یار کیوں سلاپن کی باتیں کرنے لگے ہو"!

میں کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ بنّا صاحب چائے خانے میں داخل ہوئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور حکیم بڈھن کے پاس لپک کر پہونچ لیے۔

بنّا صاحب کبھی اس فیکٹری کے خریدار تھے لیکن کئی برس سے مشاعرے ترک کرچکے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ نواب وزن صاحب کے پاس مصاحبت میں ملازم ہوگئے ہیں۔ وہ کچھ دیر حکیم بڈھن سے کاناپھوسی کرتے رہے، یکایک حکیم بڈھن ان کے ہمراہ کھڑے ہوگئے، مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے فیکٹری سے باہر آگئے۔ بنّا صاحب کے اشارے پر ایک تانگا آگیا۔

بنّا صاحب اور حکیم بڈھن پیچھے بیٹھے میں کوچوان کے برابر بیٹھ گیا۔ تانگا اکبری دروازے سے ہوتا ہوا محمود نگر اور محمود نگر سے منصور نگر کی چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ چڑھائی تمام کرنے کے بعد بائیں جانب نو بستے والی سڑک پر روانہ ہوا اور تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک عالیشان حویلی کے سامنے رک گیا۔ راستے بھر حکیم اور بنّا صاحب میں کوئی گفتگو نہ ہوئی سارا راستہ خاموشی

ہی میں کشاں کشاں جنّا صاحب نے پیشوائی اختیار کی۔ عالیشان پھاٹک کے اندر داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا صحن نظر آیا جو ایک بہت چوڑے دالان پر ختم ہوا۔ دالان میں کچھ حضرات بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ جنّا صاحب اور ہم لوگ جب دالان کے پاس پہونچے تو میں نے دیکھا کہ دالان میں دودھیا سفید چاندنی بچھی ہوئی ہے جا بجا گاؤتکئے قرینے سے لگے ہوئے ہیں۔ ہم تینوں آدمی جوں ہی اندر داخل ہوئے دو باوردی ملازمین نے پیشوائی کی۔ ہم کو عزت کے ساتھ بٹھانے کے بعد فوراً کشمیری بالائی دار چائے اور شیرمالیں پیش کی گئیں۔ چائے کے خاتمے پر پانوں کا خاصدان پیش کیا گیا۔

پان کھانے کے بعد میں نے نظر دوڑائی۔ دالان کے داہنی جانب ایک شہ نشین تھا جو ایک ریشمی پردے سے بندھا ہوا تھا۔ میں پان کھا کر پنسل نکالنے کی فکر میں تھا کہ وقت گزاری کروں۔ جنّا صاحب اور حکیم بدّھن دونوں خاموش رہنے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ یکایک شہ نشین کا پردہ ہٹا اور ایک باوردی ملازم نے آواز لگائی:۔

"ہوشیار باادب! حضور نواب دام اقبالہٗ نزول اجلال فرما رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ شہ نشین کے بیچ میں ایک کارچوبی مسند بچھی ہوئی ہے جس پر ایک کارچوبی ہی گاؤتکیہ لگا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے ایک صاحب نکلے جن کے ہمراہ دو خوبصورت خواصیں تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں سونے کا خاصدان تھا اور دوسری کے ہاتھ میں سونے کا اگالدان۔ ان صاحب کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ گٹھے ہوئے جسم کے ایک پچاس سالہ انسان تھے۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل تھا جس پر چیچک کے اتنے گہرے داغ تھے کہ چہرہ بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مونچھ اور داڑھی دونوں منڈی ہوئی تھیں۔ بالوں میں بیچ سے کنگھی تھی۔ چار پٹیاں ایک مانگ میں اور چار دوسری مانگ میں تھیں۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ دونوں کلّوں میں پانوں کی گلوریاں تھیں۔ ان کے ہونٹ مسّی مالیدہ نظر آتے تھے۔ وہ

نیچے سے انکی سفید ریشمی بنیائن جھلک رہی تھی۔ وہ جو پاجامہ پہنے ہوئے تھے وہ شرعی تھا۔ چوڑے۔ ان کے پیروں میں لال رنگ کی مخملی جوتی تھی۔ سب لوگ انکی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور جھک جھک کر تسلیمیں بجا لانے لگے۔ نواب صاحب تسلیمات تسلیمات، آداب آداب کہتے ہوئے گاؤتکئے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ خواصوں نے ان کے سامنے خاصدان اور اگالدان رکھ دیئے اور واپس چلی گئیں۔

میں ان کے نام سے واقف تھا ان کے متعلق شہر میں بہت سے افسانے مشہور تھے۔ انکا اصلی نام سیّد دلدار علیخاں تھا لیکن یہ نواب دِدّن صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ یہ آخری بادشاہ کے بھائی کی اولاد میں سے تھے، بڑے وثیقے داروں میں سے تھے۔ انکی املاک شہر میں بہت زیادہ تھیں اس کے علاوہ یہ لاتعداد گاؤں کے مالک تھے۔ میں کبھی ان کے ہاں نہیں گیا تھا۔ انکا ایک مخصوص حلقہ تھا اور یہ شہر میں کنجوس کہے جاتے تھے۔

یکایک ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا:۔ "حضور جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔"

نواب صاحب نے انتہائی مترنم آواز سے جواب دیا:۔

"خان صاحب فرمائیے۔ میں نے جان بخشی۔"

وہ بولے:۔ "حضور! نواب اکبر شکوہ بہادر سے کنکوے کے میدان کی تاریخ سر پر آگئی ہے، اگلے اتوار کو مقابلہ ہونا ہے۔ گومتی کے کنارے اس طرف حضور اور ڈالی گنج کے نواب اکبر شکوہ پیچ لڑائیں گے۔ اس میدان کے لئے اخراجات کی ضرورت ہے۔"

نواب صاحب نے گھبرا کر کہا۔ "ارے بھئی۔! اب تک خان صاحب آپ نے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔"

وہ بولے:۔

"حضور رستم ثانی (بٹیر) کی بیماری سے بے حد پریشان

خدا خدا کرکے کل اس کا غسل صحت ہوا ہے تب میری ہمت پڑی کہ میں حضور کے گوش گزار کروں۔"

نواب صاحب نے کہا۔

"بھئی خاں صاحب اللہ نے بڑا فضل کیا ورنہ میں تو کہیں کا نہ رہتا۔ میں آپ کی نمک حلالی سے بہت خوش ہوں۔ آپ داروغہ صاحب سے پانچ سو روپیے لے لیجئے اور اتوار کے لئے پورا سامان ہونا چاہیئے۔ ہماری طرف سے لڑانے والوں اور تماشائیوں کے لئے شامیانہ اور ان کے لئے صاف قسم کا کھانا تیار ہونا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ کسی اچھے طائفے سے بھی کہہ دیجئے گا اور ضرورت ہو تو اور لے لیجئے۔"

وہ بولے "حضور یہ رقم کافی ہے۔ کنکوے اور ڈور سے تو کئی کوٹھریاں بھری ہوئی ہیں خریدنے کی کوئی حاجت نہیں ہے محض اوپری اخراجات کے لئے ضرورت ہے"

وہ سلام کرکے بیٹھے ہی تھے کہ نواب صاحب کی جنّا صاحب پر پڑی۔ انھیں دیکھتے ہی نواب صاحب۔ مترنم آواز میں کہا:۔

"دربار اس وقت برخاست ہو رہا ہے۔ آپ حضرات اپنی عرضیاں شام کو پانچ بجے پیش کریں ... تخلیہ....!"

لفظ تخلیہ کے ساتھ ہی دربار کا ہر شخص باہر روانہ صرف ہم تینوں بیٹھے رہ گئے۔ جب آخری آدمی بھی چلا گیا تو نواب صاحب کے اشارے پر جنّا صاحب ہم دونوں کو ساتھ لے کر شہ نشین تک گئے۔ مسند کے قریب پہونچتے ہی ہم تینوں نے جھک کر تسلیمیں بجا لائیں، خود نواب بھی نیم تعظیم کے لئے اٹھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی انھوں نے حکیم بدّھن سے کہا:۔

"حکیم صاحب میں آپ کی تشریف آوری کا ممنون ہوں۔" حکیم بدّھن نے کہا۔

میرے لئے اس سے بڑھ کر فخر کا اور کیا مقام ہو سکتا ہے کہ آپ جیسی ہستی نے مجھ کو یاد فرمایا۔"

نواب صاحب نے میری طرف نگاہ کرتے ہوئے

"آپ کی تعریف؟"

جنّا صاحب نے جواب دیا۔

... مشہور شاعر ہیں۔

نواب صاحب نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ حکیم بڈھن کے ہمزاد ہیں ان کے بغیر حکیم بڈھن کوئی کام ہی نہیں کرتے۔"

ہم تینوں نے بھی نواب صاحب کے قہقہے میں ساتھ دیا۔ نواب صاحب نے کہا۔

"حکیم صاحب میں ایک بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں جو پراسرار ہے۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر جب جنا صاحب سے کیا تو انھوں نے چھوٹتے ہی آپ کا نام اور آپ کی سوجھ بوجھ کا تذکرہ مجھ سے کر دیا۔ میں مشتاق ہوا اور میں نے آپ کو زحمت دی۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔

"گو میں کسی قابل نہیں۔ لیکن اگر کسی صورت سے بھی آپ کے کام آسکوں تو یہ میرے واسطے باعث صد افتخار ہوگا۔"

وہ بولے۔ "صاحب معاملہ عجیب پیچیدہ ہے، ایک کاغذ چوری ہوگیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو دوبارہ کیونکر حاصل کروں۔"

حکیم بڈھن نے چھوٹتے ہی کہا۔

"حضرت گنج کوتوالی میں نصراللہ خاں تھانیدار حال ہی میں بدل کر آئے ہیں۔ میں جانتا ہوں بڑے عمدہ سراغ رساں ہیں منٹوں میں جرائم کا حال معلوم کر لیتے ہیں۔ آپ انکو بلوالیں۔"

نواب صاحب بولے۔

"حکیم صاحب میں پولیس کو بلوا کر اپنی بدنامی نہیں چاہتا اور نہ اپنے اہل خانہ کو پریشان کرنا چاہتا اور معاملہ کچھ اس قدر پراسرار ہے کہ شاید کوئی بھی نہ سمجھ سکے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "حضور والا جب تک آپ تفصیل سے واقعہ بیان نہ فرمائیں کسی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

وہ بولے۔ "مجھے تو بیان کرنا ہی ہے۔ رہا رازداری کا معاملہ تو میرا ایمان یہ ہے کہ آپ تینوں حضرات شریف ہیں یہاں کی بات یہیں چھوڑ کر تشریف لیجائیں گے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "آپ اس سے اطمینان رکھیں۔"

وہ بولے۔

"حکیم صاحب! میرے والد ماجد کو انتقال کئے بیس سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ انھوں نے مرتے وقت مجھے لوہے کی ایک چھوٹی سی تجوری دیتے ہوئے کہا تھا

اس تجوری میں میری ساری زندگی موجود ہے۔ میرے مرنے کے بعد تم ان کاغذات کو پڑھ لینا۔"

میں نے ان سے تجوری کی چابی لے لی اور وہ فوراً ہی انتقال کر گئے۔ مجھے ان کے انتقال کے بعد جائداد کے معاملات اور خاندانی تنازعات سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ میں اس کو کھول کر دیکھتا یہاں تک کہ میں انکی وصیت بھی بھول گیا۔ بہرنوع میں نے وہ تجوری آرام گاہ میں اپنے سرہانے رکھوادی اور وہ اب تک وہیں موجود ہے۔"

حکیم بڈھن نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اور اس کی چابی؟"

نواب صاحب بولے۔

"اس کی چابی میں نے اپنے گھر میں حوالے کر دی تھی جو ہمیشہ ان کے ازاربند میں بندھی رہتی ہے وہ بہت محتاط خاتون ہیں سال گزشتہ میں نے وہ تجوری کھولی۔ اندر والد مرحوم کی چند بیاضیں تھیں۔ ایک دیوان تھا غزلوں کا۔ ایک بیاض تھی نوحوں اور سلاموں کی۔ میں نے چند قلمی مرثیے بھی دیکھے۔ ایک بیاض ان سب کے علاوہ تھی جس میں والد مرحوم کے معاشقے تھے۔ حکیم صاحب میں نے انکو تھوڑا تھوڑا پڑھ کر چھوڑ دیا۔ مجھ کو شرم آئی۔ ان کتابوں کے علاوہ ایک روغنی کاغذ تھا جس پر ایک چڑیا کی تصویر اس انداز سے بنی ہوئی تھی کہ دور سے وہ ۸۴۰ کا عدد نظر آتی تھی۔ یہ معمہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے وہ کاغذ سب بیاضوں کے اوپر رکھ کر تجوری کو مقفل کر دیا۔ کچھ دنوں ۸۴۰ کے سلسلے میں فکرمند رہا پھر بات دماغ سے نکل گئی۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "۸۴۰ کا معاملہ پراسرار ہے۔"

نواب صاحب بولے۔

"معاف فرمائیں، میں تو اس کو والد صاحب مرحوم کی سنک کا ثمرہ سمجھتا ہوں۔ اللہ بخشے بہت شوقین تھے چنیا بیگم کے۔ لیکن پرسوں جب میں نے اتفاقاً تجوری کھولی تو وہ روغنی کاغذ لاپتا تھا۔ تمام بیاضیں موجود تھیں میں حیران رہ گیا۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "نواب صاحب کہیں آپ نے کاغذ کسی دوسری جگہ تو نہیں رکھ دیا تھا اور آپ کو میں تجوری میں رکھنا یاد رہا ہو۔"

وہ بولے۔ "جی نہیں حکیم صاحب میں اس بات پر حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ میں نے وہ کاغذ تجوری میں رکھا، کہیں اور رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

حکیم بڈھن نے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔

"اور چابی بیگم صاحبہ کے پاس ہی رہی۔"

وہ بولے۔ "جی ہاں یہی وجہ ہے کہ میں پولیس کو نہیں چاہتا۔ وہ بیگم صاحبہ سے سوالات کریں گے، ملا سے سوالات کریں گے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "جی ہاں یہ تو ہوگا۔"

وہ بولے۔ "حکیم صاحب اصولاً تو مجھ کو بھی پریشان نہ ہونا چاہئے۔ ایک مہمل کاغذ ہے جو میرے لئے بے ہے۔ اس کی گمشدگی یا بازیابی سے مجھے کیا نقصان کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "حضور نواب صاحب! آخر وہ بے اور مہمل کاغذ یقینی کچھ معنی اور حقیقت رکھتا ہوگا ورنہ اس کو کیوں چرایا جاتا؟"

وہ بولے۔ "بہزاد صاحب آپ نے میرے دل کی کہدی میں اس بھید کو جاننا چاہتا ہوں اور اس کے اخراجات کثیر کے لئے تیار ہوں۔ اسی لئے میں نے صاحب کو زحمت دی۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔

"نواب صاحب کیا اس کا امکان ہے کہ میں اس تجوری کو ایک نظر دیکھ لوں۔"

نواب صاحب نے کہا۔

"جی ہاں۔ جی ہاں کوئی دشواری نہیں ہے۔ نشین سے ملحق میری آرام گاہ ہے میں بیگم کو ہٹوائے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر نواب صاحب نے تالی بجائی ایک قبول صورت خواص اندر داخل ہوئی حکیم بڈھن کا

خواص کو دیکھنے میں محو ہو گئے۔ نواب صاحب نے
…سے کہا۔
"ذرا بیگم صاحبہ سے کہو کہ صحن میں تشریف لے جائیں
…ان حضرات کے ساتھ آرام گاہ میں آرہا ہوں۔"
وہ بولی: "حضور عالیہ تو اس وقت کوٹھے پر تشریف
…رہی ہیں۔ آرام گاہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ چلئے تشریف
…لے چلئے۔"

نواب صاحب کے ساتھ ہم لوگ ملحقہ کمرے میں
…داخل ہو گئے۔ آرام گاہ بڑی مکلّف تھی۔ چھت پر کئی
قیمتی جھاڑ اور دیواروں پر فانوس آویزاں تھے۔ زمین
پر دبیز قالینوں کا فرش تھا۔ بائیں جانب دو نواڑی
مسہریاں بچھی ہوئی تھیں جو قدیم آرٹ کا نمونہ تھیں۔
ان مسہریوں کے سرہانے ایک آہنی تجوری رکھی ہوئی تھی۔

نواب صاحب نے کہا۔
"یہی وہ تجوری ہے حکیم صاحب"
حکیم بدھن نے کہا:۔
"اور اس کی چابی!"

نواب صاحب کے اشارے پر ایک نازک اندام
خواص اندر داخل ہوئی اور چند ہی لمحوں میں ایک چابی
لے کر واپس آئی۔

حکیم بدھن نے چابی لے لی۔ اس کو دیکھا۔ چابی پر
گلاب کا پھول بنا ہوا تھا۔ حکیم بدھن نے نواب صاحب
سے اجازت لے کر اسے تجوری میں لگا دیا۔ تجوری میں بھی
قفل کا منہ گلاب کے پھول جیسا تھا۔ چابی اس میں
لگی اور تجوری کھل گئی۔ واقعی اس تجوری میں سوائے
کتابوں کے اور کچھ نہ تھا۔ نواب صاحب بولے:۔
"میں حلفاً کہتا ہوں کہ میں نے وہ موٹی کاغذ ان کتابوں
کے اوپر رکھا تھا۔"

حکیم بدھن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا آتشی شیشہ
مل سکے گا؟"

نواب صاحب کے اشارے پر نازک قدم خواص
ایک آتشی شیشہ لئے ہوئے آئی جو ایک ہینڈل کے
ساتھ آویزاں تھا۔ حکیم بدھن نے وہ آتشی شیشہ لے کر
بیاضوں کو اندر سے دیکھا اور کہا۔
"ذرا [illegible] واقعی وہ کاغذ چرا لیا گیا ہے، آپکا
گمان صحیح ہے۔"

وہ پراشتیاق لفظوں میں بولے:۔
"یہ آپ نے کیسے جانا حکیم صاحب؟"
حکیم بدھن نے کہا۔
"بہت معمولی بات ہے آپ اس کو ملاحظہ فرمائیں
اس پر کتھے چونے کا ہلکا سا نشان ہے۔ چور غالباً
چھالیا تمباکو کھانے کا عادی تھا اور انگلیوں سے کتھ
چونا چاٹتا تھا۔ اس نے اپنے اعصاب کو قابو میں
کرنے کے لئے چٹکی سے کتھ چونا چاٹا تھا۔ اس کی
انگلیوں کا پورا نشان جلد پر نمایاں ہے۔"

میں نے کہا:۔
"ممکن ہے یہ نشان پرانا ہو۔"
حکیم بدھن نے کہا: "نہیں بہزاد پرانے کتھے چونے
کا نشان سوکھ کر کب کا ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ یہ
تازہ ہے اور غالباً چار پانچ دنوں سے زیادہ کا نہیں
ہو سکتا ہے۔"

نواب صاحب نے کہا:۔
"حکیم صاحب آپ کی سوجھ بوجھ نے میرا دل
خوش کر دیا اور مجھے پر امید کر دیا ہے۔"
وہ بولے: "میرا کام خدمت کرنا ہے براہ کرم
اپنے والد کی وہ ڈائری جس میں انکی زندگی کے
واقعات ہیں اور یہ چابی مجھے عاریتاً دے دیجئے
اگر مجھ پر اعتماد ہو۔"

نواب صاحب نے کہا:۔
"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں حکیم صاحب۔ آپ
بشوق ڈائری بھی لے جائیں اور چابی بھی اور اخراجات
کے لئے فی الحال سو روپے قبول فرمائیں۔"

ہم تینوں دس منٹ بعد محل سرا سے باہر نکلے
سواری کا دور دور تک پتا نہیں تھا پیدل چلتے ہوئے
مظفر نگر کی چڑھائی تک آئے جہاں سے ایک یکے
پر میں اور حکیم روانہ ہو گئے۔ خاں صاحب وہیں ٹھہر گئے
محمود نگر کے پاس حکیم بدھن نے مجھے اتارتے ہوئے
کہا: "یہ لو کنجی اور مرزا دینا کی مسجد کے نیچے جو دو تین
دوکانیں ہیں وہ چابی بنانے والوں کی ہیں۔ ان سے
اس کنجی کی ایک نقل بنوا لو۔"

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے پانچ روپے کا نوٹ دیا اور
چلے گئے۔ کوئی پانچ منٹ کی مسافت پر مرزا دینا کی مسجد
تھی اس کے نیچے دو دو دکانیں واقعی موجود تھیں کبھی
میں نے غور نہیں کیا تھا میں جوں ہی پہلی دوکان میں
داخل ہوا ایک بڑے میاں بیٹھے ہوئے تھے میں نے وہ
کنجی ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا:۔
"اس کی ایک نقل مجھے بنا دیجئے۔"
کنجی ہاتھ میں لیتے ہوئے ان کے چہرے پر غصے
کے آثار پیدا ہوئے اور بولے:۔
"تمہیں چھتن صاحب نے بھیجا ہوگا۔ پہلے میرا بقیہ
روپیہ لے آؤ پھر بناؤں گا۔"
میں نے پوچھا: "کون چھتن صاحب"
وہ جھنجھلا کر بولے:۔
"کون چھتن صاحب۔ کیا بھولے بن رہے ہیں۔ وہ
چھتن صاحب جو میوے والی سرائے کے پھاٹک کے
داہنی طرف شالوں کی مرمت کرتے ہیں، جن کے دونوں
کلوں میں گلوریاں ٹھنسی رہتی ہیں اور جو کولہے مٹکا مٹکا کر
چلتے ہیں۔"
میں ان سے واقف تھا۔ میں نے کہا۔
"نہیں جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے وہ یہ چابی
لے کر نہیں آئے ہوں گے۔"
انھوں نے کہا: "ناممکن۔ یہی چابی تھی۔ دیکھ لو
داہنی طرف غلطی سے مجھ سے ذرا سی ریتی لگ گئی تھی
اس کا نشان بھی موجود ہے۔ ابھی پانچ روز ہوئے
مجھ سے دو روپے پر دوسری کنجی بنوائی۔ مجھے ایک روپیہ
نکال کر دوسرا روپیہ قرض کر گئے۔ اور آج تک صورت
نہیں دکھلائی۔ آج تم کو بھیجا ہے۔ میں یہ چابی ہرگز
نہیں دوں گا۔"
معاملہ ٹیڑھا تھا۔ میں نے پانچ روپے کا نوٹ
نکال کر انکو دیا اور کہا۔
"آپ چابی بنائیے۔ دو روپے اس کے اور ایک [illegible]
بقیہ لے لیجئے۔"
وہ فوری کام میں مشغول ہو گئے میں سامنے
چائے خانے میں بیٹھ کر وقت گزاری کرنے لگا۔ کوئی آ…
گھنٹے میں وہ چابی بن کر تیار ہو گئی۔ میں چابی اور …

دو روپے لے کر حکیم بڈھن کے پاس پہنچا۔ میں ڈر رہا تھا کہ شاید حکیم بڈھن ایک روپیا فالتو خرچ کرنے پر کچھ جز بز ہوں لیکن وہ یہ واقعہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے :۔

"بہزاد تم نے بڑا کام کر لیا۔ اب بھیّا میرا ایک کام اور کر دو۔"

میں نے کہا :۔ "وہ بھی بتا دو۔"

وہ بولے :۔ "سیدھے نوبستے چلے جاؤ۔ وہاں کسی ایسے مقام پر بیٹھو جہاں سے نواب دڈن صاحب کی گلی سامنے ہو۔ سہ پہر کے وقت میرے خیال میں نازک قدم خواص کی ڈیوٹی ختم ہو گی، جب اس کو سڑک پر دیکھو تو اس سے کافی فاصلے پر اس کا تعاقب کرو اور دور سے اس کا مکان دیکھ کر آ جاؤ۔ یہ دو روپے وقت گزاری کے لئے رکھ لو۔"

کام واقعی تکلیف دہ تھا لیکن مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ نوبستے میں لبِ سڑک ایک چائے خانے میں بیٹھ کر میں نے وقت گزاری شروع کر دی۔ چار بجے تک انتظار کرتے کرتے مجھے سخت کوفت ہونے لگی تھی کہ اتنے میں نازک قدم بہ ہزار انداز گلی سے نکل کر سڑک پر آئی اور محمود نگر کی طرف روانہ ہوئی۔ میں نے بھی کافی فاصلہ دے کر دوسری پٹی پر تعاقب شروع کیا۔ اصغر کبابی کی دوکان پر وہ رکی اس نے کباب خریدے اور داہنی جانب مڑ گئی۔ یہ سنگی بیگ کا علاقہ تھا۔ مڑتے ہی وہ تھوڑی دور جا کر ایک مکان کے سامنے جا کر رکی۔ اس نے کنڈی کھٹکھٹائی اور مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ مجھے یہ فکر ہوئی کہ یہ اسی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کے مکان میں داخل ہوئی ہے۔ میں سامنے لکڑی کی ٹال پر گیا۔ ٹال پر ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اکنی پھینکتے ہوئے کہا :۔

" یار یہاں کوئی نواب صاحب کے یہاں کی خواص رہتی ہے ؟"

وہ بولا :۔ "وہ کیا سامنے کا مکان ہے۔ اور نازو نام ہے اس کا۔"

میں وہاں سے سیدھا حکیم بڈھن کے پاس پہونچا اور ان کو پوری روداد بتانے کے بعد تھک کر کرسی پر گر گیا۔

حکیم بڈھن نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"[illegible] کے باوجود آدمی کام کے نکلے۔ اب تم گھر جاؤ۔"

میں اپنے گھر چلا آیا۔ دن بھر تکان کے باعث بیٹھک میں چارپائی پر لیٹ گیا میری آنکھ لگ گئی۔ میں بمشکل آدھ گھنٹا سویا ہوں گا کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ حکیم بڈھن مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ میرے بیدار ہوتے ہی بولے۔

"یار بہزاد معاف کرنا ایک ضروری کام نکل آیا اور اس کو ابھی کرنا ہے۔"

میں تاؤ کھا کر اٹھ گیا اور وہ بولے :۔

" یار غصہ تھوک دو اور نخاس سے آمد و رفت کا ایک یکّا لے کر نظیر آباد چلے جاؤ۔ جا بلنگ مارٹ کے مقابل جو عمارت ہے اس کی پہلی منزل پر بنگالی کلب کا دفتر ہے وہاں جا کر میرا ایک خط دو اور جو کچھ وہ دیں اسے لے کر فوراً چلے آؤ۔"

میں باہر نکلا۔ یکّا لیا اور فوراً نظیر آباد پہونچا۔ بنگالی کلب کا دفتر بآسانی مل گیا وہاں جو صاحب تھے انھوں نے رقعہ پڑھ کر مجھ سے کہا۔

"بیٹھ جائیے آپ کو دس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔"

دس منٹ کے بعد وہ ایک چھوٹی سی اٹیچی لئے ہوئے واپس آئے اور میرے حوالے کر دی۔ میں سیدھا گھر آیا حکیم بڈھن چائے زہر مار کر رہے تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہوئے لپکے۔

"یار اندر سے آئینہ لے آؤ اور ایک لوٹے میں پانی۔"

مطلوبہ چیزیں آنے کے بعد انھوں نے اٹیچی کھولی، اس میں سے کچھ روغن نکالے اور اپنے چہرے پر ملنا شروع کیے۔ ایک دوا نکالی، سفید بالوں کی مصنوعی داڑھی چپکائی پھر اٹیچی میں سے ایک عبا نکالی اور ایک چوڑا پاجاما نکالا اور پہن کر تیار ہو گئے۔ ان کا حلیہ دیکھ کر میں بے اختیار قہقہے مار رہا تھا۔ میرا غصہ فرو ہو گیا میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"واہ صاحب زادے کیا بہروپ دھارا ہے۔"

وہ بولے :۔ "استاد اندھیرا ہو چکا ہے اب مجھ کو گلیوں ہی گلیوں سنگی بیگ کے احاطے لے چلو۔"

میں ان کے ہمراہ ہو لیا۔ گلیوں ہی گلیوں ہوتے ہوتے وہ نازو کے مکان کے سامنے نکلے اور مجھ سے کہا :۔

" مکان کے دائیں طرف کھڑے ہو جاؤ اس انداز سے کہ لوگوں کی نظر تم پر نہ پڑے۔"

مجھے ہٹا کر انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے نازو کی آواز آئی۔

"کون صاحب ہیں؟"

"میں چھبّن کا باپ ہوں۔"

حکیم بڈھن کی آواز میں لرزش تھی میں انکی اداکاری پر حیران رہ گیا۔

فوراً دروازہ کھل گیا اور نازو کی آواز آئی :۔

"آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی اندر سے پلنگ لا رہی ہوں۔"

باہر مکمل اندھیرا تھا۔ میونسپلٹی کی لالٹین بہت دور بنّے صاحب سنار کے مکان کے قریب لگی ہوئی تھی یکایک حکیم بڈھن کی آواز آئی۔

"بیٹی یہ پچیس روپے قبول کر لو چھبّن میاں نے بھیجے ہیں۔" وہ بولی :۔

"مجھ سے تو پچاس کا وعدہ کیا تھا انھوں نے اور پچیس کیوں بھیجے ہیں۔ میں تو نہ لوں گی۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "بیٹی ذرا سے کام کا یہ معاوضہ کم نہیں ہے۔"

وہ بولی :۔ "چچا جان بیگم کے ازاربند میں سے کنجی اڑا، پھر دوبارہ ازاربند میں باندھ کر تجوری کھولنا اور تجوری سے کاغذ لا کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں نے جان جوکھوں کا کام کیا ہے۔"

حکیم بڈھن نے جلدی سے کہا۔

"مجھے اتنی تفصیل معلوم نہیں تھی۔ میں جا کر اس کو سمجھاتا ہوں۔ تم اطمینان رکھو دو چار روز میں وہ رقم آ جائے گی۔ خدا حافظ۔"

حکیم بڈھن جب اصغر کبابی کی دوکان پر پہونچ گئے تو میں گلی سے باہر نکلا۔ چند منٹوں میں میں نے حکیم بڈھن کو جا لیا اور پوچھا :۔

"استاد یہ تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ وہ کاغذ نازو نے چرایا ہے اور چھبّن کی تحریک تھی۔"

وہ بولے :۔ "یار تم بھی کہو گے کہ میں آدمی ہوں۔ خواہ دو کتنے ہوتے ہیں ۔، ارے بھئی چار ہی تو ہوتے ہیں

ں کا کام ہے، ڈرجانی ہونے والا چین سے اور چوری
مالی کسی کی ہو سکتی ہے۔ سوائے نازو کے اور کون
ہے۔ تجوری سے کاغذ کون اڑا سکتا ہے۔ باہر والا
ہی نہیں سکتا۔ اس مفروضہ کی بنا پر میں نے یہ
کھیلا اور تم نے دیکھا کہ میرا نظریہ کتنا ٹھیک نکلا۔"
میں نے کہا۔ "ہاں"
وہ بولے "میں تمہارے گھر سوؤں گا۔ مجھے نواب کی
ں پڑھنا ہے، میرے گھر میں تمہاری بھاوج مجھ کو
ے نہیں دیں گی"
میں نے کہا "اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات
تی ہے۔ یہ تو تم مجھے عزت بخش رہے ہو استاد"
گھر پہونچ کر میں نے دو پلنگ صحن میں ڈلوا دیے۔
ت پر بچے سونے کے لئے چلے گئے تھے۔ کھانے کے بعد
م بڈھن نے لالٹین کی روشنی میں وہ بیاض پڑھنی
روع کی اور تقریباً آدھ گھنٹے پڑھنے کے بعد بولے۔
یار بہزاد۔ اس بیاض میں محض بیس صفحوں میں نواب
ن صاحب کے والد نے ایک بے سر و پا واقعہ لکھ مارا
سکا کوئی مقصد اور کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا معمولی
عاشقی کی داستان ہے، اس کو آخر ایک بیاض میں
محفوظ کرنے کا سبب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ باقی تقریباً
ستی صفحات بیاض میں سادے پڑے ہوئے ہیں جن پر
یک حرف بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ واقعہ نا تمام
وتا تو میں کہتا کہ آگے کچھ اور لکھنا مقصود تھا لہٰذا
وراق سادے چھوڑ دیے گئے ہیں"
میں نے کہا۔
"یار کیوں دماغ کھپا رہے ہو۔ یہ امراء صحیح الدماغ
کب ہوتے ہیں۔ اپنی دماغی اپج میں کچھ سوچا ہوگا"
حکیم بڈھن جواب دینے ہی والے تھے کہ ان کا ہاتھ
بے خیالی میں بیاض کے پاس رکھے ہوئے پانی کے گلاس
سے ٹکرا گیا۔ گلاس پورا الٹ گیا اور بیاض کے اوراق
بھیگ گئے۔
حکیم بڈھن نے بے حد تعجب سے کہا۔
"یار یہ بڑا برا ہوا"
میری نگاہ جوں ہی بھیگے ہوئے اوراق پر پڑی
مجھے سادے اوراق پر کچھ حروف نمایاں نظر آئے
میں نے کہا۔
"یار دیکھو تو یہ اوراق کسی کیمیائی محلول میں ڈوبے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بھیگنے کے بعد ان پر عبارت
نمایاں ہو گئی ہے"
حکیم بڈھن نے گھبرا کر ان کاغذات کو دیکھا۔ وہ
عبارت کچھ یوں تھی :-
مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے ایک ایسا جرم
ہو گیا ہے جس کی تلافی میرے امکان میں نہیں
ہے۔ مجھے اس جرم کی سزا مل گئی ہے ہیں
بھگت رہا ہوں۔ واقعہ یوں ہے کہ جب
میرے والد کا انتقال ہوا اور میں جائداد
پر قابض ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد
کا ایک لڑکا ایک مسماۃ سے بھی ہے جن کو
ایک دور دراز مقام پر والد ماجد نے رکھ چھوڑا
ہے۔ ان مسماۃ کے ساتھ نکاح یا متعہ کا کوئی
ثبوت نہیں ہے اور نہ میں نے اس کی چھان
بین کی۔ وثیقہ اور جائداد میں بلا شرکت
غیرے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نکاح کی خبر
مجھے ننا صاحب نے دی تھی جو چوک میں دو شالوں
کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ اس خاندان سے
بھی واقف تھے۔ ان کا منہ بھرنے کے بعد میں
نے انھیں کے ذریعے اس خاندان کو اسقدر
دھمکایا کہ وہ لوگ کہیں دور دراز مقام پر چلے
گئے، لیکن میرے ضمیر پر اس حق تلفی کا بار
رہا اور اس احساس نے اسقدر شدت اختیار
کی کہ میں بے چین رہنے لگا۔ میں نے اس
خاندان کو تلاش کرایا لیکن مجھے اس کا کوئی
پتا نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ میں ایک ایسے مرض
کا شکار ہو گیا کہ جسکا کوئی حکیم علاج نہ کر سکا
میرے جسم پر ایک بڑا سا سرخ رنگ کا داغ
پڑ گیا جس میں ہمہ وقت آگ سی لگی رہتی تھی۔
بعض اوقات جلن اتنی زیادہ بڑھ جاتی کہ مجھے
کسی کروٹ چین نہ آتا تھا۔ اس مرض نے مجھے
یہ یقین دلا دیا کہ میں نے جو جرم کیا ہے قدرت
کی طرف سے اس کی یہ سزا مجھے ملی ہے۔
اس احساس نے اسقدر شدت اختیار کی کہ
مجھے ایک لمحہ بھی سکون ملنا دشوار ہو گیا۔ میں نے
آخر کار طے کیا کہ کسی نہ کسی طرح حق دار کو اسکا
حق ملنا ہی چاہیے لیکن میرے سامنے میری
واحد اولاد دونوں کا مسئلہ بھی تھا۔ میں اسکو
کیونکر باور کراتا کہ اس کے ایک چچا کو جس کے
پاس کوئی ثبوت جائز اولاد ہونے کا نہیں
ہے میں نے آدھی جائداد تقسیم کر دی۔ باوجود
یہ جاننے کے میں مہینوں اس مسئلے پر غور
کرتا رہا، آخر کار ایک ترکیب ذہن میں آئی میں
نے اس جائداد کی قیمت کا اندازہ لگایا۔ مجھے
اتفاقاً تہہ خانے کے ایک طاق میں چھوٹی سی
صندوقچی مل گئی۔ میں اس وقت بالکل تنہا
اس صندوقچی میں کچھ ہیرے اور یاقوت
تھے۔ میں نے ان جواہرات کو بیچا۔ آپ شاید
یقین نہ کریں گے کہ انکی جو قیمت مجھے ملی وہ
میری کل جائداد کی قیمت کی لاگت تھی۔ میں نے
اس کو غیبی اشارا سمجھا اور میں نے وہ تمام رقم
سونے کی شکل میں ایک صندوقچے میں محفوظ کی
اور اس کو اپنے ہاتھوں سے ایک ایسے مقام
پر محفوظ کیا جسکا مکمل پتا ۸۴۰ ہے۔ میں
نے اس مقام کی تصویر بھی بنائی اور ایک
مومی کاغذ پر اپنے ہاتھوں سے اتاری، اس
کام کے بعد آپ یقین نہ کریں گے کہ میں نے اس
داغ کی تکلیف میں انتہائی کمی محسوس کی۔
وہ داغ جسکا علاج لکھنؤ میں کوئی نہیں
کر سکا تھا۔ میرے احساسات میں کمی
ہوئی۔ لیکن ابھی بڑا مسئلہ تھا حقدار کو پہچاننے
کا۔ میں نے ننا صاحب کو بلایا اور ان سے صرف
اتنا کہا۔
" ننا صاحب میں نے اپنے بھائی کے لئے
جائداد کی نصف قیمت سونے کی شکل میں محفوظ
کر دی ہے۔ اس کا پتا ہے ۸۴۰"
اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس خاندان
کا پتا چلائیے اور میرے بھائی سے صرف اتنا

[illegible]

مل لیں اور وڈن سے صرف موٹی کاغذ کی تصویر
مانگ لیں انکی امانت ان تک پہونچ جائے گی۔"
ض میں یہاں تک تو عبارت موجود تھی اس کے بعد
روف کچھ گڈ مڈ سے تھے میں نے اور حکیم بڈھن نے بہت
شش لیکن کچھ پلے نہ پڑا۔ آخر کار حکیم بڈھن نے
مک بار کر کہا۔
"آپ کیا سمجھے؟"
میں نے کہا "کچھ نہیں سمجھے" وہ زوردار قہقہہ
رتے ہوئے بولے۔
" تم سے خدا سمجھے۔ یار معاملہ روزِ روشن کی طرح
اف ہو چکا ہے، تھوڑی سی کڑیاں اور ملانا ہیں۔"
میں نے کہا: "مجھے بھی اپنی صفائی میں شریک فرمائیں
بڑی عنایت ہو۔"
وہ بولے: "استاد لکھنوی ہوتے ہوئے بھی تم
ھنو والوں سے بے خبر ہو۔ ارے ظالم یہ چھپن صاحب
ولے نے تصویر چرائی ہے نبا صاحب کے صاحبزادے
یا نبا صاحب کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔
با مرتے وقت وہ یہ راز صاحبزادے پر کھول گئے
با اور صاحبزادے کی نیت خراب ہو گئی ہے۔"
ہلنے کہا:۔
" لیکن اس ۴۰ ۸ کا حل کیا ہوگا"؟
وہ بولے: "یہ تو بہت آسانی سے سمجھ میں آجکا
ے لیکن بتاؤں گا نہیں۔"
میں نے کہا: "مجھے غرض بھی نہیں ہے معلوم کرنے
، اب پروگرام کیا ہے؟"
وہ بولے: "کل نواب وڈن سے ملنا ہے۔"

میں اور حکیم بڈھن جب نواب وڈن کے پہونچے
دربار برخاست ہو چکا تھا۔ نواب صاحب نے
ر ابھی ہم دونوں کو تخلیے میں طلب کر لیا اور حکیم بڈھن
ے پورا بیان سننے کے بعد بولے:۔
حکیم صاحب آپ واقعی صاحب کمال ہیں، جنا
ے جو کچھ کہا تھا آپ اس سے کہیں بڑھ کر نکلے۔ مجھے
ے والد ماجد کے فیصلے سے کوئی انکار نہیں۔ انھوں نے

[illegible]
نے میرے پیشِ نظر ایک حقدار کو کیوں محروم کیا اور
اس جرم کی سزا تاحیات بھگتی۔"
حکیم بڈھن نے کہا: "نواب صاحب کیا آپ
بتا سکتے ہیں کہ آپ کے دادا کس گاؤں میں زیادہ
آیا جایا کرتے تھے"؟
نواب صاحب نے کہا:
جب دادا جان مرحوم کا انتقال ہوا میری عمر
دس سال تھی۔ ان کو بٹیروں کے شکار کا بڑا شوق
تھا وہ اکثر گنیش پور گاؤں میں زیادہ جایا کرتے
تھے اور قیام بھی زیادہ تر وہیں رہا کرتا تھا۔ حکیم بڈھن
نے کہا:۔
" نواب صاحب مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس
خاندان کو تلاش کروں۔"
وہ بولے:۔
آپ بصد شوق تشریف لے جائیں اور اخراجات
کے لئے یہ دو سو روپے کی رقم اور قبول فرمائیے۔
گنیش پور نیپال کی ترائی میں ہے اور اب تک میری
ہی ملکیت ہے۔ میں ضلع دار کو ایک رقعہ بھی
لکھے دیتا ہوں۔

رات کے نو بجے والی گاڑی سے ہم لوگ گونڈے
روانہ ہو گئے۔ صبح پہونچتے ہی بہرائچ کی گاڑی
تیار ملی اس پر بیٹھ کر ہم ساڑھے سات بجے گنیش پور
اترے۔ اسٹیشن سے اترتے ہی ہم دونوں ضلع دار
کے گھر پہونچے جس کو حکیم بڈھن نے نواب صاحب
کا پرچا دے دیا۔ پرچا پڑھتے ہی اس نے انتہائی
خاطر تواضع کرنا شروع کر دی۔ یہ ایک چھوٹا سا
گاؤں تھا لیکن انتہائی زرخیز۔ حکیم بڈھن کے سوالات
پر اس نے کہا:۔
" آپ پرانی باتیں پوچھ رہے ہیں میں ایک بڑے بوڑھے
کو بلوائے لیتا ہوں اس سے آپ کو صحیح صحیح معلومات
مل جائیں گی۔ لیکن وہ دوپہر کے بعد آسکے گا۔ گاؤں
میں سب سے بوڑھا آدمی ہے۔"
حکیم بڈھن خاموش ہو رہے دوپہر کا وقت

[illegible]
کی پرسکون زندگی مزہ دے گئی سہ پہر کو پانچ بجے
ایک بیل گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ ضلعدار نے غور سے
دیکھتے ہوئے کہا۔
" حکیم صاحب۔ وہ دیکھئے گلو چچا آگئے۔"
اتنے میں بیل گاڑی سے ایک اسّی سالہ آدمی اترا
باوجود اس عمر کے وہ صحت کے اعتبار سے جوانوں
سے بہتر تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی حکیم بڈھن نے اس
سے سوالات کئے، ان کے جواب میں اس نے کہا۔
" حکیم جی بات بہت پرانی ہے لیکن مجھے اچھی طرح یاد
ہے کہ میرے مکان کے پاس بھوپال کا ایک خاندان
آکر بس گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور ایک
جوان لڑکی۔ ان صاحب نے یہاں کھیتی باڑی شروع
کر دی تھی۔ دیہات میں پردے وغیرہ کا کوئی رواج
نہیں ہے۔ اسی لڑکی پر نواب صاحب کی نظر پڑ گئی،
پھر کیا ہوا مجھ کو نہیں معلوم۔ نواب صاحب ان کے
گھر میں آنے جانے لگے۔"
حکیم بڈھن نے کہا:۔
" کیا نواب صاحب نے نکاح کر لیا تھا۔"
وہ بولے: "ٹھیک سے معلوم نہیں ہے صاحب
لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس لڑکی سے نواب صاحب
کے ایک لڑکا ہوا جسکا نام ذوالفقار تھا۔ وہ لڑکا
بارہ یا چودہ سال کا تھا کہ نواب صاحب گزر گئے اور
اس واقعے کے ایک ماہ بعد وہ خاندان واپس چلا
گیا اس کے بعد سے اب تک ان کی کوئی بھی اطلاع
نہیں ملی۔"
حکیم بڈھن نے پھر پوچھا:۔
" کچھ ان کا اتا پتا یاد ہے؟" وہ غور کرنے
کے بعد بولے:۔
" کسی شہر کو بتاتے تھے جسکا نام ہردا تھا اس کے
علاوہ کچھ یاد نہیں۔"
گفتگو یہاں تمام ہو گئی۔ صبح ہوتے ہی ہم دونوں
پہلی گاڑی سے روانہ ہو گئے اور تقریباً ڈھائی بجے
رات کو ہم لکھنؤ پہونچے۔ حکیم بڈھن بجائے شہر جانے
کے سیدھے چارباغ اسٹیشن اتر پڑے۔

[illegible]
ے [illegible] ہے [illegible] بجے ایکسپریس چھوٹے
[illegible] جائیں گے۔
...نے کہا: تمہیں ٹھیک سے پتا بھی ہے یا خواہ
...ات کو ہلکان کروگے۔
...ہ بولے:۔ یار مجھے اچھی طرح یاد ہے جھانسی اور
...ل کے درمیان ایک اسٹیشن ہوتا ہے جہاں کی
جامنیں مشہور ہیں۔ گلاب جامنوں ہی کی وجہ
یہاں پر ٹرین ٹھہرتی ہے۔ مجھے بھی صرف اسٹیشن
...گی۔

مجھے کوفت تو بہت ہوئی لیکن کیا کرتا مات بیٹھ کر
رنا پڑی۔ ساڑھے پانچ بجے ٹکٹ خرید کر بمبئی
ایکسپریس میں جا بیٹھے۔ میں تو ٹرین میں بیٹھتے ہی
گیا جب میری آنکھ کھلی تو ٹرین کانکی اسٹیشن پر
وہاں ہم نے اور حکیم بدھن نے کھانا کھایا اور
گاڑی ساڑھے نو بجے جھانسی پہونچ کر ختم ہوگئی
اسٹیشن پر ٹرین ہی میں رات کاٹنے کے بعد صبح
ایکسپریس میں یہ ڈبا اٹیچ ہوگیا گاڑی ہردا پہنچی
دن کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ واقعی پلیٹ فارم
ہر طرف گلاب جامن بیچنے والوں کا مجمع تھا۔ ہم
دونوں نے گلاب جامنیں کھانے کے بعد باہر کا رخ کیا
اسٹیشن شہر سے ملا ہوا تھا۔ ہم لوگ بازار میں آئے۔ بازار
میں ایک ہوٹل میں چائے کا آرڈر دے کر ہم انتظار کر ہی
رہے تھے کہ ایک نوجوان ایک میز سے اٹھ کر ہماری میز
کے پاس آیا اور حکیم بدھن سے بولا۔

"کیا آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں؟"

حکیم بدھن نے کہا: "جی ہاں! میری وضع قطع
ہی کہے دے رہی ہے۔"

وہ بولا:۔ صاحب آپ کی وضع قطع ہی دیکھ کر میں
بے چین ہوگیا۔

یہ ایک تیس پینتیس سال کا شریف صورت آدمی تھا،
پڑھا لکھا بھی معلوم ہوتا تھا اس کا لباس بھی شیروانی
اور پاجامہ تھا۔

حکیم بدھن نے کہا۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا نہیں
[illegible]

ہے اور وہ اس سے قبل بہرائچ کے ضلع میں ایک گاؤں
میں رہتے تھے۔"

وہ صاحب چونکے اور بولے:۔

"جناب آپ میرے والد مرحوم کو پوچھ رہے ہیں
میں نے سنا ہے کہ میرے دادا کوئی بہت بڑے
لکھنؤ کے نواب تھے لیکن والد مرحوم نے کبھی ان کا
تذکرہ کھل کر نہ کیا۔"

"کیا ان کا انتقال ہوچکا ہے؟"

"جی ہاں۔ کوئی دس برس ہوئے۔ مجھے اپنی والدہ
کی زبانی معلوم ہوا کہ میرے والد اکثر یہ کہا کرتے تھے
کہ اگر ان کے نانا گھبراہٹ سے کام نہ لیتے تو ہم
لوگ تنگ دست نہ رہتے۔ لیکن اس کے باوجود
انھوں نے مجھے تعلیم دلوائی اور آج اللہ کے فضل سے
میں اسکول میں ماسٹر ہوں۔"

حکیم بدھن نے کہا۔

میں اسی خاندان کی طرف سے آیا ہوں جس کی
بے پروائی کے ہاتھوں آپ کے والد ماجد نے عسرت
میں زندگی کاٹی۔ لیکن آپ مجھ پر اعتبار کریں اور لکھنؤ
ایک ہفتے کے لئے چل سکیں تو شاید آپ کی زحمتوں کی
تلافی ہو جائے۔"

وہ راضی ہوگیا۔ اس کا نام مختار تھا۔ وہ ہم کو
اپنے گھر لے گیا۔ چھوٹا موٹا سا آرام دہ گھر تھا جہاں
ہم دونوں کو دو دن مہمان رکھنے کے بعد مختار نے دس
دن کی چھٹی لی اور ہمارے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوگیا۔

نواب دولن صاحب مختار کو دیکھ کر بہت خوش
ہوئے۔ مختار بھی نواب دولن صاحب کی شان و شوکت
دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور جب حکیم بدھن نے اس
دفینے کا حال سنایا تو دولن صاحب نے کہا۔

"حکیم صاحب آپ کا تمام بیان حقیقت پر مبنی
نظر آتا ہے، لیکن یہ ۴۰ ۸ کا حال کیونکر معلوم ہو کہ
میرے بھائی مختار کو ان کا حق مل سکے، یوں بھی
میں انکی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

حکیم بدھن نے کہا۔

نواب صاحب یہ معاملہ سے زیادہ آسان ہے

یہ عدد ۴۰ ۸ نہیں بلکہ آٹھ اور چالیس ہے۔"

نواب دولن نے کہا۔

"تسلیم کرلیا لیکن اس کا حل کیا ہے؟"

حکیم بدھن نے کہا۔

"آپ اپنے والد مرحوم کی عبارت پڑھئے۔ انھوں نے
بیاض میں صاف صاف لکھا ہے کہ انھوں نے تن تنہا
یہ صندوقچہ دفن کیا ہے۔"

دولن صاحب نے کہا:۔

"اور وضاحت فرمائیے۔"

حکیم بدھن نے کہا۔

یہ ظاہر ہے کہ تن تنہا وہ دور نہیں جا سکتے تھے اپنے
محل سے آٹھ گز کے فاصلے پر کے حساب سے انھوں نے
لفظ "آٹھ" لکھا ہے۔

نواب دولن نے پوچھا:۔ "اور پھر لفظ چالیس سے
کیا مراد ہے؟"

وہ بولے:۔ اگر آپ بغور تاریخ کا مطالعہ کریں تو
یہاں ایک عمارت تھی جسکا نام چالیس درہ تھا اور جو
امتداد زمانہ سے مٹ مٹا کر میدان کی شکل اختیار کر
گئی ہے۔"

"نواب دولن صاحب یہ جملہ سن کر اچھل پڑے
اور جلدی سے بولے:۔

"ابھی رات کے گیارہ نہیں بجے ہیں، گیس کا ہنڈا
منگوا لیجئے، ہم سب ابھی چلتے ہیں۔"

حکم کی دیر تھی۔ ہنڈا منٹوں میں آگیا۔ ہم سب
جب حویلی کے باہر نکلے اور میدان میں پہونچے تو ہمیں
تھوڑی دور پر ایک لالٹین جلتی ہوئی نظر آئی۔

نواب دولن نے غصے سے کہا:۔

"یہ میری ملکیت میں کون شخص داخل ہو رہا ہے؟"

ہم لوگ تیزی سے بڑھے اور دیکھا لالٹین ایک
تازہ کھدے ہوئے گڑھے کے کنارے رکھی ہوئی تھی یہ
گڑھا کافی چوڑا اور گہرا تھا۔ میں نے ہنڈے کی روشنی
گڑھے میں ڈالی چھٹن صاحب اندر پڑے ہوئے کراہ
رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے۔

"مجھے نکالو۔ سانپ نے مجھے ڈس لیا ہے۔ ارے
میں مر رہا ہوں۔"

باقی صفحہ ۵۰ پر

اگلا بچہ ہونے سے پہلے
ذرا ٹھہریئے!
کیا آپ اس بچے کی
پرورش اچھی طرح
نہیں کرنا چاہیں گے؟

[illegible] بی میں پڑے سے اگولوں نے خطرناک صورت اختیار کرلی اور مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر میں نے ڈبے سے چن چن کر مسافروں کو پھینکنا شروع کر دیا۔ کسی کو دروازے سے اور کسی کو کھڑکی کے ذریعے باہر دھکیل دیا۔ جب ہمارا ڈبہ بالکل لوگوں سے صاف ہو گیا تو میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ نیچے خون میں لت پت کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں مجھے اطمینان حاصل ہوا۔ میں نے رادھا کا بدلہ لے لیا تھا۔ اب میں خوش تھا۔ بہت خوش۔

چیزوں کی پراسرار ہیئت اپنے اصلی رنگ پر آئی تھی کہ رادھا لوٹ آئی۔ بالکل لٹی پٹی۔ ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی۔ اپنے آپ سے غافل۔ زمانے سے بے خبر گھر والوں نے دیکھا تو چھاتی پیٹ لی۔

اس تیز طوفان میں ایک تیز پتے ایک برگ سبز کو پناہ دی تھی۔ مریم نے رادھا کو اپنے آنچل میں چھپانا چاہا تھا مگر سیاہیوں کے سناٹے میں مریم کو مریم ہونے کی سزا ملی اور وہ اپنے محور مرکز سے ہمیشہ کے لئے الگ کر دی گئی تھی لیکن رادھا بھی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ رادھا اس اعلان کے باوجود کہ وہ رادھا تھی بچ نہ سکی۔ طوفان جب اٹھتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی راہ میں کس کا گھر ہے۔

میری نگاہوں میں تکرار کے ساتھ وہ منظر رقص کر رہا ہے۔ تازہ بہے ہوئے خون کی سرخی سیاہی میں بدلتی جا رہی ہے۔ اور ہوا کے سیل میں آنے سے خون جمنے لگا ہے۔ آدمی طبعی موت سے پہلے بھی کئی مرتبہ مرتا ہے۔

■

بقیہ بھٹو۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کبھی کوئی غاصب کسی کا حق بخوشی اس کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اسے غاصب سے چھیننا پڑتا ہے۔ شاید کل تک بھٹو صاحب بہت سی غلط فہمیوں کا شکار تھے لیکن اب وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو چکی ہونگی۔ بھٹو کی جذباتی تقریروں اور بھڑکانے والے بیانات میں بریک لگ گیا ہے غالباً اب انھوں نے جذبات سے زیادہ عقل سے کام لینا شروع کر دیا ہے امید ہے کہ وہ عقل سے کام لے کر فوجی حکمرانوں کی چالوں کو پوری طرح سمجھیں گے اور اپنے عوام کی حقیقی آزادی کے لئے جنگ شروع کرینگے آزادی نہ صرف فوجی حکمرانوں کے چنگل سے، بلکہ سرمایہ داری سے، اجارہ داری سے، غربت اور بھوک بیماریوں اور سیلابوں سے جو آج بھی اس برصغیر کے عوام پر اسی طرح مسلط ہیں جس طرح سیاسی آزادی سے پہلے تھے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر نہ صرف بنگلادیش کا مسئلہ بلکہ کشمیر اور ہند و پاک کے تمام دوسرے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے اور پھر بھٹو کو اپنی لیڈری قائم رکھنے کے لئے جذباتی تقریروں کی ضرورت نہیں پڑیگی ■

بقیہ حکیم بدھن۔ ۹۴

ملازمین نے جلدی سے اسکو باہر نکالا۔ اندر ایک صندوقچہ نظر آیا لیکن اترنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی۔ حکیم بدھن بے خطر گڑھے میں اتر گئے اور بولے:۔

"میں سانپ کا عامل ہوں مجھے سانپ کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ دوسرے میں مجرم نہیں ہوں۔ چھبن نے جرم کیا اس کو سزا مل گئی۔"

یہ کہہ کر انھوں نے صندوقچہ اوپر اٹھا لیا اور نواب صاحب اور ملازمین نے ہاتھ بڑھا کر وہ صندوقچہ باہر نکال لیا۔

اس صندوقچے میں سے کیا نکلا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ صندوقچہ کھلتے وقت صرف تین آدمی۔ نواب صاحب۔ مختار اور حکیم بدھن۔ حکیم بدھن کو کیا بلا مجھ کو نہیں معلوم۔ اس بارش کی کچھ چھینٹے مجھ پر بھی آ گئیں۔

واقعات ایرانی شہنشاہیت

کی ڈھائی ہزار سالہ

اداریہ

ایرانی شہنشاہیت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن

ایران نے شہنشاہیت کے قیام کا ڈھائی ہزار سالہ جشن اتنے بڑے پیمانے پر منایا ہے کہ ایران ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کی تاریخ میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ دس کروڑ ڈالر کی رقم اس جشن پر خرچ کر دینا ایران ہی کے دل گردے کی بات ہے۔ شاید کسی جمہوری ملک میں اس قسم کا اسراف نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن شاہِ ایران اپنے ملک کے شہنشاہ ہیں، وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کس کو ہمت ہے۔؟

ایرانی حکومت کے ایک سرکاری ترجمان کا بیان ہے کہ "یہ جشن اتنے تزک و احتشام سے اس لئے منایا گیا کہ اہلِ ایران اپنے ماضی سے باخبر ہو جائیں اور دنیا والے بھی جان لیں کہ ایران کیا ہے اور وہ کن پالیسیوں پر عمل پیرا ہے۔" لیکن ایران کے جمہوریت پسند اس سے متفق نہیں ہیں۔ اس کا اظہار ان اشتہارات سے ہوتا ہے جو تہران پر گرائے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک "باغی گروہ" کی حرکت تھی جس نے ایک ہوائی جہاز کرائے پر لے کر اشتہارات گرائے۔ لیکن "باغی گروہ" جو کچھ کہہ رہا ہے جمہوریت پسند دنیا میں اس کی تائید کی جائے گی۔ ایران جیسے غریب ملک میں جہاں ایک امریکی نامہ نگار کے خیال کے مطابق "اگر آپ پہاڑیوں میں چلے جائیں تو یوں محسوس ہوگا جیسے زمانۂ قدیم کے ایران میں پہونچ گئے۔" اس اسراف کو مجموعی طور پر اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ بلاشبہ جو سڑکیں اور ہوٹل وغیرہ اس موقع پر تعمیر کئے گئے ہیں ان سے ایرانی عوام کو فائدہ پہونچے گا اور ملک کی معیشت کے استحکام میں مدد ملے گی، لیکن بیشتر رقم محض وقتی کر و فر پر ہی خرچ کی گئی۔ مثلاً یہ کہ شاہی گارڈ کے ہر سپاہی کی وردی پر ۱۲ سو ڈالر خرچ کئے گئے۔ یا معزز مہمانوں کے لئے ۲۵۰ مرسڈیز کاروں کا انتظام کیا گیا۔ جمہوریت پسندوں کا کہنا ہے کہ یہ رقم عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جا سکتی تھی۔

ایران کے موجودہ شاہ، محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں بلاشبہ ایران نے بہت کچھ ترقی کی ہے اور انھوں نے بہت سی اصلاحات جاری کی ہیں، خاص طور سے کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے انھوں نے بڑے ٹھوس اقدامات کئے۔ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ایک فرمان کے ذریعے اعلان کیا کہ: "میری ذاتی ملکیت میں جتنی بھی زمینیں ایسی ہیں جن میں دو ہزار سے زیادہ گاؤں ہیں انکو بے زمین کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔" خود شاہِ ایران کے بیان کے مطابق ۱۹۶۰ء تک ۲۵ ہزار کاشتکاروں میں تقریباً پانچ لاکھ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی۔ ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا۔ تعلیمی میدان میں اہم قدم اٹھائے گئے، اقتصادی ترقی کے لئے مفید منصوبے تیار کئے گئے اور اب پورے بجٹ کا ۲۴ فیصد دفاع کے لئے وقف کیا جا رہا ہے تاکہ خلیج فارس سے برطانیہ کے انخلا کے بعد کوئی دوسری طاقت اس خلیج پر آ کر قبضہ نہ جما سکے۔ لیکن جیسا کہ ایک مغربی مبصر نے "یہ سب کچھ "وَن مین شو" (ایک آدمی کا تماشا) ہے۔" ایرانی امور پر شہنشاہ کی گرفت اتنی مضبوط رہی ہے کہ ایران کا ایک ایڈیٹر تک یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ "شہنشاہ ہی ایسی ذات ہے جو عوام کی حالت کو بہتر اور اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ ایرانی ہونے پر فخر کر سکیں۔" شہنشاہیت کا جو ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا گیا ہے اس کا ایک اہم مقصد اسی قسم کے خیالات و رجحانات کو تقویت دینا ہے۔

لیکن محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایران نے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کی ہو اور گزشتہ دس سال کے اندر معاشی طور پر ایران کی حالت کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو گئی ہو اس سے "مطلق العنانیت" کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اور انفرادی آزادی سلب ہوئی ہے حالانکہ شاہِ ایران انفرادی آزادی کے حامی ہیں اور اس کے لئے جمہوریت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی خود نوشت کتاب "وطن کے لئے میرے عزائم" میں لکھتے ہیں: "انفرادی آزادی صرف وہیں حاصل ہو سکتی ہے جہاں جمہوری طرز کی حکومت ہو یعنی اس طرح کی حکومت جس میں عوام کے ہاتھوں میں تمام انتظامی اور اداراتی امور ہوں۔" لیکن اس کے باوجود حیرت ہے کہ انھوں نے اپنے ملک میں جو جمہوری ڈھانچہ بنایا ہے اس میں بھی انفرادی آزادی نظر نہیں آتی۔ ہاں خود ان کے اپنے آہنی پنجہ کی گرفت ضرور مضبوط ہوتی ہے۔ کسی ایسے ملک میں جہاں مخصوص طریقے پر انتخاب کرایا جاتا ہو، جہاں سیاسی پارٹیوں پر پوری طرح کنٹرول ہو، جہاں پریس پر کڑا سینسر ہو اور جہاں مخالفین کو بڑی بے رحمی کے ساتھ کچل دیا گیا ہو، سب کچھ ہو سکتا ہے جمہوریت نہیں ہو سکتی۔ جمہوریت اس وقت قائم ہو گی جب اقتدار حقیقی معنوں میں عوام کے سپرد ہو گا، اور کورش اعظم کی (جس کی ڈھائی ہزار سالہ یادگار منائی گئی) رواداری اور صلح جمی کی پالیسی کو اپنایا جائے گا جس کے لئے وہ تاریخ میں مشہور ہے۔ پر شکوہ جشن منا کر شہنشاہیت کی بنیادیں محض عارضی طور پر مضبوط کی جا سکتی ہیں مستقل طور پر نہیں۔ جشن سے پہلے اور جشن کے خلاف پمفلٹوں کی بارش اس امر کا مظہر ہے کہ جمہوری جذبات اندر ہی اندر فروغ پا رہے ہیں اور جمہوریت پسندوں سے شاہِ ایران جو خود بھی اپنے کو جمہوریت نواز کہتے ہیں جتنی جلد مصالحت کر لیں گے اتنا ہی ایران اور ایرانی عوام کے لئے بہتر ہو گا۔

—

شاہ فیصل کو فوجی شہر خاسں مشیت میں فوجی تنصیبات دکھائی جارہی ہیں۔

سعودی عرب میں مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا شہر

جس کا افتتاح شاہ فیصل نے کیا

سعودی عرب کے شاہ فیصل نے گزشتہ ماہ اپنی مملکت کے جنوبی حصے میں ایک فوجی شہر خاسں مشیت کا افتتاح فرمایا ہے۔ سعودی عرب کے وزیر زراعت و آب ہز ایکسیلنسی شیخ حسن المصری کے الفاظ میں اس شہر کا منصوبہ ان بہت سے منصوبوں میں سے ایک ہے جو سعودی عرب کی حکومت نے ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے عوام کی خوشحالی کے لئے شروع کئے ہیں۔

جنوبی حصہ ملک میں ایک اہم چھاؤنی کے قیام سے نہ صرف یہ کہ یہاں کے لوگوں کو اپنے دفاع کے سلسلے میں یک گونہ اطمینان ہوگیا ہے۔ بلکہ وہ مطمئن ہیں کہ ترقی کی دوڑ میں وہ کسی حصۂ ملک کے باشندوں سے پیچھے نہ رہیں گے۔

جنوبی عرب میں ایک اہم فوجی چھاؤنی کا قیام وزیر مواصلات محمد عمر توفیق کے الفاظ میں نظریہ اسلام کے تحفظ کے لئے ایک اہم قدم ہے۔ فوجی ضروریات کی تمام تنصیبات اس شہر میں موجود ہیں اور وہیں جدید ترین اسلحے رکھے ہیں۔ چھاؤنی کا افتتاح کرنے کے بعد جب شاہ فیصل جدہ جانے کے لئے روانہ ہوئے تو انھوں نے جنوبی صوبے کی مسلح افواج کا شکریہ ادا کیا اور انکے فوجی معیار کی تعریف کی۔

شاہ فیصل کے اس فوجی شہر میں مسلح افواج نے جس شاندار پریڈ کی اس پر پرنس بدر الدین عبد العزیز ... نیشنل گارڈس نے اپنے پورے اطمینان کا اظہار کیا اور فوجی شہر کے بارے میں کہا کہ یہ ایک بہترین شہر ... افواج سعودی عرب کے لئے اطمینان و سکون کا باعث ... اس شہر کے قیام سے اس علاقے کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا۔

خاسں مشیت کے اس فوجی شہر کو پورے مشرق وسطیٰ میں سب سے بڑا فوجی شہر قرار دیا گیا ہے۔

سعودی عرب کے سرکردہ اخبارات نے اس شہر ... کا خیر مقدم کیا ہے اور اس کے لئے حکومت کو مبارکباد ... ہے۔ المدینہ رقمطراز ہے کہ ...

واقعات نئی دہلی

ہ شہر کی تعمیر پر جو لاکھوں کروڑوں ریال خرچ کئے گئے ہیں اس سے پورے ملک کو فائدہ پہنچے گا اور اس سے پورے ملک کی حفاظت ہوگی۔"

جن دوسرے اخبارات نے نوتی شہر کے افتتاح کا خیر مقدم کیا ہے ان میں الندوۃ، الیمامہ، البلاد اور عکاظ شامل ہیں۔

شہر میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ شاندار عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ سڑکیں بنوائی گئی ہیں، اسپتال اور اسکول قائم کئے گئے ہیں، اور آب پاشی کے لئے بند اور دوسری اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔

البلاد لکھتا ہے: "یہ شہر دوسرے شہروں جیسا نہیں ہے۔ شاہ عرب بھی دوسرے شاہوں جیسے نہیں ہیں، جو تحفہ سعودی عرب کے لوگوں کو دیا گیا ہے وہ بھی بے مثال ہے اور جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ایک معجزہ ہے۔"

برناقابل قبول ہیں۔ مصر جس اعتدال پسندی سے کام لے رہا ہے اس کا اقرار برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈگلس ہیوم تک نے کیا ہے جو حال ہی میں اس ملک کے دورے پر گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے میزبان (مصری) مستقل معاہدہ امن کے حق میں ہیں۔ لیکن جب تک اسرائیلیوں کا یہی رویہ نہ ہو کسی سمجھوتے کا امکان نہیں۔ اس وقت ایسا نظر آتا ہے کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کی کامیابی کا جو نشہ انھیں چڑھا تھا وہ ابھی تک نہیں اترا ہے۔ وہ اپنے اس نشے میں کسی کی نہیں سن رہے ہیں اور اقوام متحدہ کے فیصلوں تک کو پامال کر رہے ہیں۔ نتیجے میں صورت حال خراب اور ایسی ہوتی جا رہی ہے جسے زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

کو لازمی طور سے یا تو امن کے ذریعے حل کرنا ہوگا یا پھر جنگ کے ذریعے ۔۔۔ امن کے ذریعے مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ تو کیا پھر جنگ کے ذریعے اسے حل کیا جائے گا؟ اس کا انحصار روس کے رویے پر ہے اس لئے کہ جنگ لڑنے کے لئے جن ہتھیاروں کی ضرورت ہے ان میں مصر یا عرب وفاق خود کفیل نہیں ہے بلکہ روس کا محتاج ہے اور اب تک کا تجربہ ہے کہ اس کی امداد وقت پر نہیں بلکہ بعد از وقت پہونچتی ہے۔

۱۹۶۷ء کی جنگ میں اگر روس صدر ناصر کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالتا تو اسرائیل کو اچانک حملہ کر کے مصری فضائی بیڑے کو قطعی طور پر تباہ کر دینے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

مشرق وسطیٰ

کیا مسئلہ جنگ کے ذریعے طے ہوگا؟

مصریوں اور اسرائیلیوں کے درمیان اگرچہ کسی نئی جھڑپ کی کوئی خبر نہیں آئی ہے لیکن فضا میں کشیدگی بدستور موجود ہے۔ وزیر اعظم روس مسٹر کوسیگن نے گذشتہ ہفتہ رباط میں ایک لنچ کے موقع پر جس کا اہتمام وزیر اعظم مراکش مسٹر کریم لمرانی کی طرف سے کیا گیا تھا، خبردار کیا کہ مشرق وسطیٰ کی صورت حال بہت سنگین ہے اور کسی وقت بھی اس علاقے میں جنگ کے شعلے بھڑک سکتے ہیں۔"

صورت حال کی اس سنگینی کے لئے انھوں نے اسرائیل کو ذمے دار قرار دیا جو مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کرنے میں اپنے جارحانہ رویے پر قائم ہے اور انھیں خالی کرنے کے لئے ایسی شرائط پیش کر رہا ہے جو عربوں کے لئے قطعی طور

واقعات نئی دہلی

متحدہ عرب وفاق کے صدر مسٹر انور سادات صورت حال کی اس سنگینی کے پیش نظر روس کے دورے پر گئے ہیں جہاں وہ روسی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کریں گے اور انھیں مقبوضہ علاقوں کو واپس لینے کے اپنے منصوبے سے مطلع کریں گے۔

مصری وفد میں حافظ محمد اسمٰعیل قومی سلامتی کے مشیر محمد عبدالسلام الزیات سکریٹری جنرل عرب سوشلسٹ یونین اور وزیر خارجہ ڈاکٹر محمود ریاض جیسی سرکردہ شخصیتیں شامل ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ بات چیت فیصلہ کن ہوگی۔

پچھلے دنوں مسٹر انور سادات نے اعلان کیا تھا کہ یہ سال مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن سال ہوگا اور مسئلے

عرب وفاق

اسرائیل کے خدشات

عرب وفاق کے قیام کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ مصر کے صدر انور سادات اس وفاقی حکومت کے پہلے صدر منتخب کئے گئے ہیں۔ وہ دو سال تک اس عہدے پر فائز رہیں گے اسکے بعد وفاق میں شامل کسی دوسرے ملک کا سربراہ عرب وفاق کا صدر منتخب کیا جائے گا۔ طے یہ کیا گیا ہے کہ وفاق میں شامل ہر ملک کا سربراہ وفاقی حکومت کا سربراہ منتخب کیا جایا کرے گا۔

قاہرہ کو عرب وفاق کی راجدھانی بنایا گیا ہے

مصر کے نائب صدر مسٹر حسین الشافعی نے بتایا کہ مصر شام اور لیبیا کے سہ رکنی وفاق کی پارلیمنٹ آئندہ نومبر میں قائم ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد وفاق کے دوسرے اداروں اور شعبوں کے قیام کے لئے بھی مؤثر اقدامات کئے جائیں گے۔ آئین کے تحت وفاقی پارلیمنٹ ساٹھ ممبروں پر مشتمل ہوگی اور اس میں ہر ممبر ملک کے بیس بیس نمائندے ہوں گے ۔۔ یہ ممبران ہر ملک کی عوامی مجلسوں سے منتخب کئے جائیں گے۔ شام میں پہلے ہی عوامی مجلس موجود ہے جو اپنے نمائندے منتخب کرے گی۔ مصر کی عوامی مجلس اسی ماہ قائم ہونے والی ہے

لیبیا میں بھی پارلیمنٹ قائم کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے لیکن اس کے لئے ابھی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی ہے۔

عرب وفاق (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) نصف سے زائد عربوں کی نمائندگی کرے گا۔ اس کی مجموعی آبادی ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ اور رقبہ ۲۹ لاکھ ۳۴ ہزار مربع میل ہوگا۔ آبادی کے لحاظ سے یہ دنیا کی تیرھویں نمبر کی مملکت ہوگی۔ سمندر پر واقع ہونے والے متوسط ممالک میں جن کی تعداد بارہ ہے اس وفاق کو تیسرا درجہ حاصل ہوگا۔

جغرافیائی اعتبار سے وفاق میں شامل تینوں ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہیں۔ اس طرح یہ وفاق دو بازوؤں پر مشتمل ہے۔ ایک چھوٹا بازو شام ہے جو مثلث نما ہے اور دوسرا بڑا بازو مستطیل شکل کا لیبیا اور مصر کا ہے جن کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی ہیں۔ دونوں بازوؤں کے درمیان خشکی کا راستہ نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت ان کے درمیان ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف مقبوضہ فلسطین اور اس کے ارد گرد کا کچھ علاقہ ہے۔ لیکن زمین کا مذکورہ فصل وفاق کی کمزوری کا باعث نہیں ہے اس لئے کہ زمینی فصل علاقے کی جغرافیائی ترتیب کا اصل جزو نہیں بلکہ ایک عارضی چیز ہے جس کا جلد یا بدیر ختم ہونا ایک فطری امر ہے۔

وفاقی اسٹیٹ کو قدرت نے اپنے وسائل سے مالا مال کیا ہے۔ یہاں عمدہ روئی کی پیداوار سالانہ پانچ لاکھ ٹن ہے پوری دنیا میں جو ریشہ دار روئی پیدا ہوتی ہے یہ اس کا نصف ہے۔ اجناس کی پیداوار کا تناسب اسّی لاکھ ٹن ہے۔ اس کے علاوہ پیٹرول کی جو دولت پیدا ہوتی ہے اس کی مقدار تقریباً سترہ کروڑ بیرل ہے۔ یہ پیٹرول زیادہ تر لیبیا کے علاقے میں نکلتا ہے لیکن مصر کے مغربی علاقے میں بھی جو لیبیا کی سرحد سے ملتا ہے، پچھلے دنوں بڑی مقدار میں تیل برآمد ہوا ہے جس سے اس نقصان کی بڑی حد تک تلافی ہو گئی ہے جو نہر سویز کے بند ہونے سے ہوا ہے۔ ان سب چیزوں کی پیداوار سے مجموعی طور پر سالانہ آمدنی سات ارب مصری پونڈ ہوگی۔

یہ امر قدرتی ہے کہ اسرائیل عرب وفاق کے قیام سے کافی پریشان ہے۔ حال ہی میں اسرائیلی حکومت کی طرف سے جو بیان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا ہے کہ عرب وفاق جنگ کی طرف ایک قدم ہے۔"

اس کے برعکس صدر سادات نے گزشتہ ماہ کے آخر (۳۱ اگست) کو اپنی ایک گھنٹے کی ٹیلی ویژن تقریر میں کہا کہ "عرب کنفیڈریشن، عرب اتحاد اور آزادی کی جنگ کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

وفاق میں شامل تینوں ملکوں کے سربراہ چاہتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے مسئلے کا جلد از جلد کوئی نہ کوئی حل نکلنا چاہئے۔ دمشق کے ایک اخبار "البعث" کو انٹرویو دیتے ہوئے نائب صدر مسٹر حسین الشافعی نے صدر انور سادات کے اس اعلان کو دہرایا کہ:

"اس سال کے ختم ہونے سے پہلے مشرق وسطیٰ کے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالنا ہے۔"

انھوں نے بتایا کہ اس وقت مصر کے پاس آٹھ لاکھ کی مضبوط فوج موجود ہے جو پورے طور پر معرکے کے لئے تیار ہے۔ اقوام متحدہ میں مشرق وسطیٰ کے مسئلے کا کوئی اطمینان بخش حل نکالنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، اگر وہ کامیاب نہ ہو سکیں تو بہت ممکن ہے کہ یہ معرکہ اسی سال ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۷۱ء کا سال مشرق وسطیٰ کے لئے ایک فیصلہ کن سال ہوگا۔ ■

جاپان | ڈھائی ہزار سالہ روایت ٹوٹ گئی

ستر سالہ شہنشاہ جاپان ہیروہیٹو نے جو اپنے شاہی خاندان کے ۱۲۴ ویں شہنشاہ ہیں غیر ملکی دورے پر روانہ ہو کر اپنے ملک کی پرانی روایات کو توڑ دیا۔ ۲۶۰۰ برس کے عرصے میں وہ پہلے شہنشاہ ہیں جو جاپان سے باہر نکلے ہیں۔ ان کی ۶۸ سالہ ملکہ ناگاکو ان کی شریک سفر ہیں۔ شہنشاہ نوجوانی کی عمر میں جب وہ ولیعہد تھے باہر کا دورہ کر چکے ہیں۔ لیکن انکی ملکہ نے زندگی میں پہلی بار اپنے وطن سے باہر قدم نکالا۔

شہنشاہ کو اپنے ملک سے باہر نکلنے اور ڈھائی ہزار سالہ روایت کو توڑنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ ایک قیاس یہ ہے کہ امریکا نے جاپان کو تجارتی میدان میں جو آنکھیں دکھانی شروع کی ہیں اور اس نے غیر ملکی تجارت پر دس فیصدی سرچارج لگا کر اپنے قریب ترین ساتھی جاپان کو جو زک پہنچائی ہے اس کی بنا پر جاپان یورپ میں نئے دوستوں یا ساتھیوں کو تلاش کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے اور اس کے لئے فضا پیدا کرنے کی غرض سے شہنشاہ کو سات یورپی ممالک کے دورے پر بھیجا گیا ہے۔ اس دورے کے لئے شہنشاہ سے بہتر کوئی اور شخصیت نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کہ وہ سیاست سے الگ رہنے کے باوجود مملکت جاپان اور جاپانی عوام

اتحاد کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

راستے میں وہ الاسکا کے ہوائی اڈے ایلمنڈورف پر اترے جہاں امریکی صدر مسٹر نکسن نے انکا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ شہنشاہ سونٹ تک وہاں رہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا باتیں ہوئیں لیکن یقین ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کو قائم رکھنے کا مسئلہ ضرور زیر بحث آیا ہوگا۔

شہنشاہ ہیرو ہیٹو جہاں کہیں گئے انکا پر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن کہیں کہیں انکی کار پر پتھر بھی پھینکے گئے غالباً یہ حرکت ان جاپانیوں کی تھی جو اپنے ملک سے باہر رہنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔ وہ شہنشاہ پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہوں گے کہ اب شہنشاہیت کا زمانہ ختم ہوگیا ہے، اور اب کسی بادشاہ یا شہنشاہ کو اپنے محل کی بالکونی پر آکر محض درشن ہی کے لئے نہیں بلکہ پتھر کھانے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔

شہنشاہ جاپان سال میں دو مرتبہ یعنی ۲ رجنوری اور ۲۹ جولائی کو اپنے محل کی بالکونی پر آکر اپنی رعایا کو اپنے درشن کراتے ہیں اور انکا سلام قبول کرتے ہیں۔

کیا ہیرو ہیٹو جنگی مجرم ہیں۔؟

حسنِ اتفاق دیکھئے کہ عین اس وقت جب شہنشاہ جاپان سرزمین امریکا پر قدم رکھ رہے تھے ایک سرکاری مطبوعہ کتاب میں انھیں جنگی مجرم قرار دیا گیا تھا۔ کتاب کا نام ہے "جاپانی شہنشاہ کی سازش" اور اس میں صاف کہا گیا ہے کہ ہیرو ہیٹو نے ذاتی طور پر پرل ہاربر پر حملے کی حمایت کی تھی۔ وہ پھانسی کے پھندے سے صرف اس لئے بچ گئے کہ جنرل میک آرتھر کو جاپان پر اتحادی قبضے کے دوران امن و انتظام قائم رکھنے کے لئے ایک بین الاقوامی اقتدار اعلیٰ کی ضرورت تھی۔

کتاب کے لکھنے والے ۴۳ سالہ ڈیوڈ برگامنی ہیں جو "لائف" میگزین کے نامہ نگار رہ چکے ہیں۔ وہ امریکی والدین سے جاپان میں پیدا ہوئے اور انکا بچپن جاپان ہی میں گزرا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں انکا کافی وقت جاپان کے قید خانے میں گزرا۔

۱۹۶۵ء میں برگامنی ٹوکیو واپس پہونچے اور چھ سال تک انھوں نے وہاں ہزاروں جاپانی دستاویزات کا مطالعہ کیا اور سیکڑوں سابق افسروں سے انٹرویو لئے۔

واقعات نئی دہلی

۱۲۳۹ صفحات پر مشتمل ان کے مضمون میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ "شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے کس طرح جاپان کو مغرب کے خلاف جنگ میں ملوث کیا۔"

ایک صدی سے زیادہ عرصہ قبل جب کوموڈور پیری کے جنگی جہاز خلیج ٹوکیو میں داخل ہوئے تھے تاکہ امریکی تجارت کے لئے جاپان تک راستہ کھول دیں۔ تو اس وقت کے جاپانی شہنشاہ کومی نے اسکا بڑی سختی سے مقابلہ کیا تھا لیکن وہ ناکام رہا۔ ایسی ہی پالیسی ہیرو ہیٹو کی تھی، اور انھوں نے ایشیا کو سفید فام لوگوں سے پاک رکھنے کا مشن اپنے جد امجد سے ورثے میں ملا تھا۔

اسکالر برگامینی کے خیال کے مطابق ۱۹۲۱ء میں جب اپنے باپ کی علالت کی بنا پر ہیرو ہیٹو ریجنٹ مقرر کردیے گئے تو انھوں نے نوجوان افسروں کے ایک دستے کی تنظیم کی اور اس میں خاص طور سے میجر ہیکی ٹوجو کو شامل کیا اس دستے کا فرض شاہی تخت سے صادر ہونے والے احکام کو بجالانا تھا مسٹر برگامینی لکھتے ہیں کہ :-

"جنگ شروع ہونے سے دو سال قبل ہیرو ہیٹو نے ذاتی طور پر اپنے جنرل اسٹاف کو جنگ کا منصوبہ تیار کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اس منصوبے کو اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ وزیر جنگ مسٹر ٹوجو تک کو اسکا علم نہ تھا۔ اسے صرف حملے کے دو ماہ قبل اس وقت علم ہوا جب وہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔"

مصنف کے خیال کے مطابق اس منصوبے کا واحد ہیرو ہیرو ہیٹو تھا جس نے تمام بڑے بڑے فوجی احکام پر دستخط کیے یہی نہیں کہ اپنے چچا پرنس اساکا کو اس بات کے لئے اعزاز عطا کیا کہ اس نے چین میں ایک نمایاں کام انجام دیا اور اس کی قیادت میں جاپانی فوجوں نے پیکنگ کی طرف یلغار کرتے ہوئے ڈیڑھ لاکھ غیر مسلح چینیوں کو تہہ تیغ کردیا۔ لیکن جنگ ختم ہوئی تو شہنشاہ اور اس کے مصاحبین نے یہ ظاہر کرنا شروع کردیا کہ جنگ کی ذمہ داری ایک فوجی ٹولے پر تھی۔ اتحادیوں نے بھی اس پر یقین کرلیا اور انھوں نے ۲۸ اعلیٰ افسران کے خلاف مقدمات چلائے جن میں سے سات کو پھانسی دیدی گئی۔

بنارس ہندو یونیورسٹی | لاقانونیت انتشار | اور ہنگامے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی ایک مرتبہ پھر طالب علموں کی ہنگامہ آرائی کی بنا پر عرصۂ غیر معینہ کے لئے بند کردی گئی ہے۔ شاید دیوالی کے بعد کھل سکے گی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر شری مالی چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی کے ۱۲ ہزار کے قریب طلبا اپنا دھیان تعلیم کی طرف رکھیں لیکن یونیورسٹی کے اندر بعض جماعتوں کے سیاسی اکھاڑوں نے انکے لئے کام کرنا مشکل کردیا ہے۔

دوبارہ بھی پریشد جو آر۔ایس۔ایس کی تنظیم ہے پہلے ہی یونیورسٹی کے بعض ذمہ داروں کیلئے پریشانی کا باعث تھی کہ نام نہاد سوشلسٹ راج نرائن کے حامی طلبا نے آر۔ایس۔ایس کی تنظیم کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے ایسی صورت حال پیدا کردی کہ یونیورسٹی کو بند کردینا ناگزیر ہوگیا۔

آر۔ایس۔ایس والے اس لئے ناراض ہیں کہ وائس چانسلر یونیورسٹی کیمپس میں انکی عمارت کو مسمار کرانے اور یونیورسٹی کے اندر آر۔ایس۔ایس کی شاکھائیں قائم کرنے پر پابندی لگانے کی کوشش کررہے ہیں۔ آر۔ایس۔ایس کے نوجوانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہورہی ہے لیکن دوسری طرف ڈاکٹر شریمالی طلبا میں ڈسپلن قائم رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہیں، اور اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے بعض طلبا کے خلاف قدم بھی اٹھایا ہے۔ انھوں نے ۵۰ طلبا کو جن میں آر۔ایس۔ایس کے سرکردہ لیڈر شامل ہیں یونیورسٹی سے خارج کردیا ہے، پولیس کے دستے متعین کردیے گئے ہیں اور دفعہ ۱۴۴ کے تحت ہر قسم کے جلوس اور مظاہرے پر پابندی لگادی گئی ہے۔ شہر میں بھی بھاری پولیس کا گشت جاری ہے اور ۱۴ طلبا گرفتار کرلئے گئے ہیں

ڈاکٹر شریمالی کے بیان کے مطابق ۱۲ ہزار طلبا میں سے مٹھی بھر ایسے طلبا ہیں جو یونیورسٹی میں ہنگامہ اور فساد برپا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ یونیورسٹی کیمپس سے لاقانونیت کو ختم کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر کچھ اور طالب علموں کا اخراج عمل میں آیا تو

باقی صفحہ

انی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال

مالک رام

لیے صفحۂ دنیا پر ایسا کوئی دوسرا ملک نہیں، جو ایران
ج اس بات کا دعویٰ کر سکے کہ اس میں پچھلے ڈھائی ہزار
ے ایک ہی نظامِ حکومت قائم ہے۔ ایران میں اس
رمانے میں ملوکیت کا دور دورہ رہا ہے۔ اسکی ابتدا
ش سے ہوئی۔ کوروش اپنی بزرگی اور داد و دہش
عث کوروش اعظم کہلاتا ہے۔ شیراز اسکا پایۂ تخت
یہاں تختِ جمشید کے کھنڈر اور آثار آج بھی زبانِ
سے اس کی سطوت و عظمت کی داستان بیان کرتے
۔ اس کا زمانۂ حکومت حضرت عیسیٰ سے ۵۵۰ سال
پہلے سے اور وہ ۵۲۹ قبل مسیح تک حکمراں رہا۔ جس
خاندان کی اس نے بنیاد رکھی، یہ ہخامنشی کہلاتا ہے۔
اس خاندان کے گیارہ بادشاہوں نے دو سو سال تک
حکومت کی۔ کوروش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے
اپنی سلطنت کے تمام باشندوں کو، مذہب و ملت کی
تفریق کے باوجود، پوری آزادی اور حفاظت عطا فرمائی۔
یہ غالباً دنیا کا پہلا منشورِ آزادی ہے۔ ہخامنشیوں
نے ایران سے باہر ایشیائے کوچک تک اور یورپ میں
بلقان تک کے علاقے پر اپنا تسلط وسیع کر لیا تھا

آہستہ آہستہ سلطنتِ ہخامنشی کمزور ہوتی گئی اور
بالآخر یونانیوں نے اسکندر مقدونی کی قیادت میں
ایرانی جو اکثر جھولوں سے آ ٹکرا پٹکا۔ اسکندر نے
مصر اور ایشیائے کوچک پر قبضہ کر لینے کے بعد ایران
پر حملہ کر دیا اور ۳۲۹ ق م میں ملک کو فتح کر کے اسے
نذرِ آتش کر دیا۔

اسکندر چاہتا تھا کہ وہ ہخامنشی خاندان کا وارث
تسلیم کر لیا جائے تاکہ وہ ان کی وسیع و عریض سلطنت
پر قابض ہو سکے۔ اسی لیے اس نے اس خاندان کے

شہنشاہ ایران کی اپنے اہل خاندان کے ساتھ ایک یادگار تصویر

آخری تاجدار دارا یوش سیوم کی بیٹی سے شادی کرلی۔ لیکن اس کی آرزو بر نہ آئی۔ تاخت و تاراج کرتے ہوئے وہ مشرق میں ہندوستان تک چلا گیا۔ وہاں سے واپس لوٹا تو، بابل میں ایک جشن میں بہت زیادہ شراب پی جانے سے بیمار پڑ گیا۔ اسی میں ۳۲۳ ق م میں اس کی موت ہو گئی۔

اسکندر کی موت کے بعد اس کی وسیع سلطنت کے تین ٹکڑے ہو گئے، جن پر اس کے جرنیل حکمرانی کرنے لگے۔ ایران جرنیل سیلوکس نیکاتور کے حصے میں آیا۔ لیکن یونانی زیادہ عرصے تک ایران کو اپنے قبضے میں نہ رکھ سکے۔ اشکانی خاندان نے انھیں نکال باہر کیا اور ملک پر خود قابض ہو گئے۔ یہاں ان کی حکومت کوئی پونے پانچ سو سال یعنی ۲۲۴ عیسوی تک رہی۔ حضرت مسیح اسی خاندان کے پندرھویں بادشاہ فرہاد پنجم کے عہد (۲ ق م تا ۴ عیسوی) میں پیدا ہوئے اور ایک دوسرے بادشاہ اردوان سوم کے زمانے میں عیسائیت کا وسیع پرچار عمل میں آیا۔ اشکانی خود زردشتی دین کے معتقد اور پیرو تھے۔

رفتہ رفتہ اشکانی امرا کے اندرونی اختلاف اور مذہبی (زردشتی) طبقے کی مخالفت نے اس حکومت کی جڑیں کمزور کر دیں اور اس کا زوال شروع ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اردشیر بابکان نے بغاوت کر دی۔ اس نے آخر اشکانی بادشاہ اردوان پنجم کو معزول کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اردشیر ساسانی خاندان سے تھا؛ اور یہ لوگ ہخامنشی نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔

ساسانی خاندان (۲۲۴ء–۶۵۱ء) میں بعض مشہور بادشاہ ہوئے ہیں۔ بہرام گور اسی خاندان کا فرد تھا۔ اس کے باپ یزدگرد اوّل نے اس کی کمسنی میں پرورش کے لئے اسے اپنے ماتحت ایک عرب امیر کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ یہ شاہی محل کے ناز و نعم سے دور صحرا میں رہ کر دلیر، شجاع اور جفاکش بن سکے۔ بہرام شہسواری اور تیراندازی، پہلوانی اور شکار کے فنون میں یکتائے زمانہ تھا۔ وہ خاص طور پر گورخر کے شکار کا بہت دلدادہ تھا، اسی لئے اسکا نام بہرام گور پڑ گیا۔ خیام نے بھی ایک رباعی میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

آں قصر کہ بہرام در و جام گرفت
آہو بچہ کرد و روبہ آرام گرفت
بہرام کہ گور می گرفتے ہمہ عمر
دیدی کہ چگونہ گور بہرام گرفت

نوشیروان (خسرو اوّل) بھی اسی خاندان کا گل سرسبد تھا، جو اپنے داد و عدل کے باعث عادل کہلایا۔ پیغمبرِ اسلامؐ اسی کے عہدِ سلطنت (۵۳۱ء–۵۷۹ء) میں پیدا ہوئے تھے، اور اسی مناسبت سے ایک حدیث میں اس کا نام بھی آیا ہے۔ خسرو پرویز (۵۹۰ء–۶۲۰ء) اسی نوشیروان کا پوتا تھا، جس کا نام فارسی ادب میں شیریں کے ساتھ شہرتِ دوام کا مالک ہے۔ ان دونوں کی داستانِ محبت بیان کرنے میں متعدد ادبا و شعرا نے اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔

نیز یہ وہی خسرو پرویز ہے جس کے نام حضرت رسولِ کریمؐ نے خط لکھ کر اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ خسرو اس پر بہی خفا ہوا۔ اسے حیرت تھی کہ عرب کے سے غیر مہذب ملک کے کسی شخص کو اسے یوں خطاب کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی۔ خسرو نے خط پڑھ کر چاک کر دیا اور نامہ بر سے جو اسے لے کر آیا تھا کہا کہ "جاؤ یہی ہمارا جواب ہے"۔

اس واقعے کے ۱۴ سال بعد مسلمانوں نے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران پر حملہ کر دیا۔ اس وقت یہاں کا حکمراں یزدگرد سیوم تھا۔ خدا کی شان، اپنے زمانے کی یہ عظیم الشان سلطنت ان صحرائی عربوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی، ساسانیوں کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور تختِ کیان پر ان بادیہ نشینوں کا قبضہ ہو گیا۔

فردوسی مسلمان ہونے کے باوجود، اپنی قوم پرستی اور ایرانِ قدیم سے اپنی محبت پر پردہ نہیں ڈال سکا۔ چنانچہ جہاں اس واقعے کا ذکر آیا ہے، کہتا ہے:

زشیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو

ساسانیوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں زردشتی مذہب کے فروغ کی بہت سعی کی تھی۔ اس ملک پر اب مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا، ایرانیوں نے زردشتی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ یہ نیا دور کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے۔ اوائل میں تھوڑی تھوڑی مدت کیلئے بہت سے خاندانوں نے یکے بعد دیگرے یہاں حکومت کی ہے۔ طاہری آئے (۸۲۳ء–۸۷۲ء) صفاری آئے (۸۷۸ء–۹۰۰ء) سامانی آئے (۹۰۱ء–۹۹۸ء) زیاری آئے (۹۲۸ء–۱۰۴۰ء) بویہی (دیلمی) (۹۹۳ء–۱۰۵۵ء)، اور سب سے آخر میں غزنوی آئے (۹۷۶ء–۱۰۴۰ء) اور ہر ایک اپنی نوبتِ پنج روزہ بجا کر چلا گیا۔ یہ زمانہ فارسی علم و ادب کی ترقی کے پہلو سے سنہری زمانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ فارسی شاعری کا باوا آدم رودکی سامانی عہد ہی میں پیدا ہوا۔ فردوسی طوسی (شاہنامے کا مصنف) سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر تھا۔ مشہور فیلسوف اور ریاضی دان اور ہیئت دان ابوریحان بیرونی بھی اسی عہد میں پیدا ہوا۔ فارسی کی شہرہ آفاق کتاب "قابوس نامہ" کا مصنف ایک زیاری شاہزادہ تھا۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا اپنے زمانے کا سب سے بڑا طبیب اور فلسفی تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی دانشگاہوں میں اسکی کتابیں نصاب میں شامل تھیں۔ ان کے تراجم یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں، اور اس کا نام آج تک دنیا بھر میں عزت و احترام سے لیا جاتا ہے؛ وہ دیلمی دربار سے وابستہ تھا۔

غزنویوں کے زوال کے بعد سلجوقی آئے۔ یہ نسلاً ترک تھے۔ اسلام کے بعد ایران میں سب سے بڑی حکومت ان سلجوقیوں نے ہی قائم کی (۱۰۳۷ء–۱۱۵۷ء) ان کی حکمرانی ترکستان سے بحیرۂ روم کے پورے علاقے پر تھی۔ یورپ کی صلیبی افواج سے مسلمانوں کی پہلی مڈبھیڑ سلجوقی عہد ہی میں ہوئی۔

سلجوقی عہد کئی لحاظ سے بہت اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ عمر خیام جس کی رباعیاں مشرق و مغرب کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں، ملک شاہ سلجوقی کے زمانے میں ہوا۔ آج بیشتر دنیا اسے صرف شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن وہ اس کے علاوہ بہت بڑا ریاضی دان اور ہیئت دان بھی تھا۔ اس نے ایران کی تقویم کی اصلاح کی شیخ الموت حسن بن صباح بھی جس نے اسماعیلی فرقے

کی بنیاد رکھی۔ اور جس کے فدائیوں نے ایشیا اور یورپ کی بعض نامور ہستیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کا ہمعصر تھا۔

اس سلسلے کا آخری مشہور خاندان خوارزم شاہی کہلاتا ہے (۱۱۲۷ء۔ ۱۵۲۱ء) ان کے ہمعصر فارسی کے دو ایسے شاعر اور ادیب ہوئے ہیں جنکا جواب آج تک ایران پیدا نہیں کر سکا۔ اوّل مولانا جلال الدین رومی جن کی تصنیف مثنوی معنوی، دنیائے اسلام میں فارسی قرآن کے نام سے مشہور ہے، اور دوسرے شیخ سعدی شیرازی جن کی گلستاں اور بوستاں کی خوشبو ایران سے نکل کر چار دانگ عالم کے مشام کو آج تک معطّر کر رہی ہے۔

خوارزمیوں کا تختہ چنگیزی (ایلخانی) مغلوں (۱۲۲۰ء۔ ۱۳۳۵ء) کے ہاتھوں الٹ گیا۔ اور انکے بعد ۱۳۸۱ء میں تیمور گورگان تاتاری آیا۔ تیمور کا نام اس لحاظ سے مشہور ہے کہ اس کے ہاتھوں خلقِ خدا کا جتنا خون بہایا گیا شاید اور کسی کے ہاتھ سے نہ بہا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ایک شہر اصفہان میں اس کے مقتولوں کی تعداد ستّر ہزار تھی۔ لیکن اس سے قطع نظر وہ انتظامِ مملکت میں یگانۂ روزگار تھا۔ ایک وقت تھا کہ تیمور کی سلطنت ایک طرف سائبیریا سے خلیج فارس تک اور دوسری طرف دریائے سندھ سے دمشق تک تھی اور کسی جگہ بھی نظم و نسق میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ علم اور اہلِ علم کا قدردان تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں متعدد مساجد اور مدارس قائم کئے، جن کی دیکھ بھال حکومت کے ذمّے تھی۔ فارسی غزل کا بہترین شاعر حافظ شیرازی ایلخانیوں اور تیمور کے زمانے میں ہوا ہے بلکہ ایک روایت کے مطابق اس کی تیمور سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ یہاں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا بانی ظہیر الدین بابر اسی تیمور کی نسل سے تھا۔ تیموریوں کا ۱۵۰۵ء تک دور دورہ رہا۔

تیموریوں کے جانشین صفوی تھے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شیخ صفی الدین شیعیانِ اثنا عشر کے چھٹے امام حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد میں تھے۔ شیخ صفی الدین کا مقبرہ اردبیل میں ہے۔ صفوی خاندان کے بزرگ اسی باعث شیعوں کے مذہبی پیشوا تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جب تیموریوں کی طاقت کمزور ہوئی تو صفویوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی قوت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسماعیل صفوی نے کچھ قبائل کی مدد سے، جو بعد کو قزلباش کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۵۰۲ء میں صفوی خاندان کی حکومت کی بنا ڈالی۔ انھیں کے عہد میں یورپی حکومتوں نے ایران کے معاملات میں دخل اندازی شروع کی۔

مسٹر انتھونی جان کنسن انگریزی تاجر ملکہ انگلستان الیزبتھ کی طرف سے اس خاندان کے دوسرے بادشاہ شاہ طہماسپ اوّل کے عہد میں آئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھی شاہ طہماسپ اہمیت رکھتا تھا۔ بابر کے جانشین ہمایوں کو جب شیر شاہ سوری نے شکست دی ہے اور وہ یہاں سے ایران گیا ہے تو اس نے اسی طہماسپ کے دربار میں پناہ لی۔ بعد کو اس نے طہماسپ ہی سے فوجی کمک حاصل کرکے اپنا تاج و تخت واپس لیا تھا۔ اس کے تقریباً ایکسو سال بعد شاہ عباس دوم کے زمانے میں دربار ایران میں روسی سفیر تعینات ہوا تھا۔

صفویوں کے آخری زمانے میں ایک فوجی سردار نادر قلی افشار بہت طاقت پکڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی شجاعت اور کارکردگی سے شاہ خراسان کی فوج میں بہت ترقی کی۔ لیکن جلد ہی وہ اس کی ملازمت سے کنارہ کش ہو گیا۔ چندے بعد اس نے اپنا ایک جتھا بنالیا اور انھیں ساتھ لے کر شاہ طہماسپ دوم کی خدمت میں حاضر ہوا جو افغانیوں کی دست اندازیوں سے تنگ آچکا تھا اور کسی طرح اپنی موروثی طاقت ان کے چنگل سے واپس لینے کی فکر میں تھا۔ طہماسپ نے خیال کیا کہ نادر اس کے مقصد کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ اس نے نادر کو سپہ سالاری کے عہدے پر سرفراز کر دیا۔ نادر نے اپنے زورِ بازو سے افغانوں کو تو ملک سے مار بھگایا، لیکن اب اس کی طاقت اس درجے تک پہونچ چکی تھی کہ اس نے اپنے شاہ طہماسپ کا نائب السلطنت ہونے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ کی نااہلی سے حکومت کا کاروبار روز بروز خراب ہوتا جارہا تھا، خلقِ خدا تنگ آچکی تھی۔ بالآخر خواص و عوام نے متفقہ نادر سے

بقیہ صفحہ ۷۴۴

ملکہ فرح دیبا

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

یہ مضمون ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی کتاب "سیما کی تلاش -

ہندوستانی مسلمانوں کو بھارتیانے کا مسئلہ"

میں سے اخذ کیا گیا ہے۔ مضمون بہت غور طلب ہے اس لیے قارئین واقعات کی خاص

توجہ کا مستحق ہے

ڈاکٹر بیدار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان بین الاقوامی رہ کر بھی

پوری طرح ہندوستانی ہے۔ بین الاقوامیت اور ہندوستانیت دو ایسے دائرے ہیں

جن میں ٹکراؤ ممکن ہی نہیں

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر گری لال جین جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے معاملات پر ماہر خصوصی کا درجہ حاصل کر لیا ہے اپنی ایک تازہ تحریر میں لکھتے ہیں:۔

"جن سنگھ کے اس نظریے میں اب لوگوں کو اچھا خاصا وزن محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ فرقہ اپنے قومی تشخص کے بجائے اپنے اسلامی تشخص سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔"

معروف قوم پرست اور پاکستان میں ہمارے سابق ہائی کمشنر شری پرکاش کا کہنا ہے کہ:۔

"مسلمانوں میں بھاری تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمان پہلے ہیں اور ہندوستانی بعد میں۔ یہ بھاؤنا ہے جس نے پاکستان کو جنم دیا۔"

ایڈیٹر پرتاپ مسٹر زیندر کا کہنا ہے کہ:۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنکا دھرم اس دیش سے باہر شروع ہوا اور جو کسی نہ کسی کارن اس دیش سے باہر کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسے ہیں جو باہر سے پریرنا (انسپریشن) لیتے ہیں چاہے راج نیتک معاملات پر ہو اور چاہے دھارمک اور چاہے ادھیاتمک۔ یروشلم میں اقصیٰ کی مسجد کو ایک جنونی عیسائی نوجوان آگ لگانے کی کوشش کرتا ہے اور ہندوستان کے مسلمان تڑپ اٹھتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں گلیوں اور بازاروں میں جلسے کرتے ہیں جلوس نکالتے ہیں اور ان میں نعرے لگاتے ہیں۔ "جو ہم سے ٹکرائے گا وہ چورچور ہو جائے گا۔" یہ ودیشی کونشٹھا ہے جو فرقہ پرستی کی بنیاد ہے۔۔۔ ان ہندوستانی مسلمانوں کو ودیشوں میں رہنے والے مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہمدردی ہے بہ نسبت ان ہندوؤں کے جن کے ساتھ انھیں اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کی موجودگی میں کیا سورگیہ مولانا محمد علی کے وہ الفاظ یاد نہیں آتے جب انھوں نے کہا کہ "حقیر سے حقیر مسلمان کو بھی آپ گاندھی جی پر ترجیح دیں گے۔" ان الفاظ کا اگر کچھ مطلب ہے تو یہ کہ مسلمانوں کے لئے انکا دھرم پہلے ہے انکا دیش بعد میں۔"

بلراج مدھوک نے گنگا جل اور گنگا جمنا کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ایک دوسری طرح اس ذرخ کو چھیڑا ہے کہ:۔

"وہ گنگا جل سے نفرت کرتے ہوئے بدیشی چیزوں کو رٹ لگاتا، ملک کے باہر اعتقاد رکھتا ہے۔ اس طرح کا جذبہ مٹانا ہوگا۔ مسلمانوں کے دلوں میں گنگا جمنا یا دوسرے متبرک دریاؤں کے لئے وہی احترام ہونا چاہیے جو بھارت کے دوسرے طبقوں کے دلوں میں ہے۔ دراصل بھارتیہ کرن ان سنسکاروں کا ہی دوسرا نام ہے۔ جہاں تک الگ سنسکرتی کا تعلق ہے، سنسکرتی کسی ملک کی ہوتی ہے، مذہب کی نہیں۔ سارا یورپ عیسائی ہے مگر جرمنی اور فرانس کے نواسیوں کی سنسکرتی الگ الگ

پلٹن بازار دہرہ دون کی خوبصورت مسجد

بھوجلا پہاڑ پر دہلی کی جامع مسجد جو چاروں طرف سے کباڑی بازار سے گھری ہوئی ہے۔
جامع مسجد شاید دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔

ہے۔ اسی طرح مغربی ایشیا میں سب مسلمان ہیں مگر ترکی اور عرب کی اپنی اپنی الگ الگ سنسکرتی ہے۔ اسی طرح بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی وہی سنسکرتی ہے جو بھارت میں رہنے والے دوسرے طبقوں کی ہے۔ بھارتیہ کرن کا یہ مطلب ہے کہ ہر بھارتی اپنے آپ کو پہلے بھارتی جانے بعد میں کچھ اور۔ عام طور پر بہت سے لوگ اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں کی بھاشا سے پیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک سے باہر دوسرے ملکوں کی سیاسی پارٹیوں کے ممبر بھی ہو سکتے ہیں؛ مگر یہ باتیں راشٹر کی نشٹھا میں رکاوٹ نہیں۔ اس بات کا دھیان ضرور رکھنا چاہیے۔ غرضیکہ بھارتیہ کرن کا مطلب ہے راشٹریہ بھاؤنا جگانا۔"

واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں فرقے، باوجود بلند بانگ دعووں کے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر رہے ہیں کہ ایک کو دوسرے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا۔ مختلف جذبوں کی نوعیت کا۔ انکی گہرائی یا پھیلاؤ کا ذرا بھی علم نہیں ہے۔ پان اسلامزم کے سلسلے میں یہی ہوا ہے بات قطعی بے بنیاد بھی نہیں، لیکن ہونے کو جو دیو قامتی عطا کر دی گئی ہے، وہ اپنی جگہ پر ہے، اور اگر میں ہندو دوستوں کے جذبات اور اسلامی رشتے کی نوعیت دونوں سے واقفیت کا حقیر سا دعویٰ کرنے کے بعد عرض کروں کہ میرے دوستوں کے شکوک و شبہات، اندیشے اور ڈر سے واقعی کم ہیں، خیالی زیادہ تو غلط نہ ہوگا۔

اگر دو دائرے کسی جگہ بھی ٹکراتیں نہیں اور پھر بھی اس پہ اصرار کیا جائے کہ تم یا تو اس دائرے میں رہ سکتے ہو یا اُس دائرے میں تو اسے سوائے اس کے کہ بدنیتی پر محمول کیا جائے اور کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ تم پانی پسند کرتے ہو یا ہندوستان۔ اور اس کا جواب میں یہ دوں کہ مجھے پانی بھی پسند ہے اور ہندوستان بھی، اور اس پر تم پھر کہو کہ نہیں یہ بتلائیے بہتر کیا ہے تو میں اسے حماقت کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہنے لگے کہ تمہیں کونسی چیز بہتر لگتی ہے، آم یا برف کا پانی، یا تم ان دونوں امور میں کسے ترجیح دو گے، سونے کو یا کھانے کو۔

پان اسلامیت کا ایک جز ہے، اور بس جذبہ ہی واقعات کی کہانی ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے آپ مثلاً افرو ایشیائی جذبہ تشکیل دینا چاہ رہے ہیں۔ اور آپ یوں کیوں نہیں سوچتے کہ اوّل الذکر جذبے کو آخر الذکر میں ڈھال دیجیے۔ اس طرح یہ آپ کے لئے ایک سرمایہ بن جائے گا۔

اس بات کو سمجھانے میں ذرا مشکل پڑے گی کہ ہندوستان کے مسلمان کا باہر کے مسلمان سے کیا رشتہ ہے۔ جو لوگ ہندو یا جین اندازِ زندگی کو درست سمجھتے ہوں انکی سمجھ میں اس بات کا آنا آسان نہیں ہے کہ کمیونزم یا اسلام کی طرح کوئی آئیڈیا بھی مذہب یا امت بن سکتی ہے جس میں اور قومیت میں یا تو سرے سے کوئی رشتہ ہی نہیں یا پھر سرے سے ٹکراؤ ہی نہیں۔

جس نے نمک کا مزہ نہ چکھا ہو وہ اس کا مزہ بتا ہی نہیں سکتا۔ سمجھ بھی نہیں سکتا کوئی اسے سمجھا بھی نہیں سکتا۔

اسلام کو ماننے کے بعد جغرافیائی حدبندیاں اس کیلئے ہیچ ہوجاتی ہیں۔ وہ نہ کسی نسل سے وابستہ رہتا ہے، نہ فرقے سے نہ قوم سے نہ سرزمین سے۔ اسکا تو کوئی خون کا رشتہ بھی نہیں رہتا۔ نہ اسکے کسی خاص جھنڈے سے نسبت باقی رہتی ہے۔ وہ کسی بھی ملک کی فتح یا شکست پر خوش یا غمگین نہیں ہوتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہ نکالئے کہ میں رامپور میں رہتا ہوں تو مجھے اس سے نفرت ہوگی (میرے تو رگ رگ میں میرا ملک بس گیا ہے) یا یہ کہ ہندوستان کے مقابلے میں عراق یا مصر سے زیادہ محبت کروں گا۔ نہیں کوئی اسکی طرف دیکھے گا تو میں اس کو گولی مار دوں گا۔

رام پور کی جامع مسجد ۔ ہندوستان کی سب سے زیادہ مزیّن مسجد

مطلب اگر ہے تو صرف اتنا کہ اپنے گھر، محلہ، شہر اور ملک کے ساتھ ساتھ تصوراتی طور سے سلمان پوری دنیا کا شہری بھی ہے۔ اور یہ میرے خیال میں کوئی برائی کی بات نہیں سیکھنے کی بات ہے۔

نہرو سے ذاکر حسین تک اور رسل سے رادھا کرشنن تک سب اس انسانی تصور کو عام کرنے میں لگے رہے کہ "ہم سب ایک ہیں" اور یہ کہ یہ رنگ و نسل اور ملک و ملّت کی دیواریں جہاں تک اور جتنی تیزی سے گرائی جا سکیں گرا دو۔ لیکن محدود اور تنگ نظر والے انسان دوستوں پر حاوی آتے رہے جاتے جاتے رسل نے یہ دل دوز جملے یوں ہی نہیں لکھے تھے۔

"سکھایا تو یہ جاتا ہے کہ اپنے ملک سے محبت کرو، لیکن صرف اپنے ملک سے اور کسی سے نہیں، اور ہیرو ... سے وجود میں صرف انھیں کو نمایاں مقام دیا جاتا ہے جنہوں نے بدیشیوں کو مارنے میں سب سے زیادہ صلاحیت اور اہلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالانکہ آدمی کا یہ تصور کہ سب ایک ہی خاندان ہے، عام کرنے اور سکھانے کے لیے اتنی ہی محنت کی ضرورت ہے جتنی اس کے قطعی مخالف تصورات پر صرف ہو رہی ہے۔ اس کے لئے نئے انداز کی تعلیم سے نئے اخلاقی اقدار کو جنم دینا ہوگا جس سے یہ خواب کبھی حقیقت بن سکے کہ دنیا میں چار سو امن و سلامتی کا دور دورہ ہے"

ہم سب بنیادی طور سے انسان ہیں، اور سب ایک ہیں؛ الگ الگ گروہوں میں ہم اس لئے منقسم ہوتے رہے کہ اس سے پہچان میں آسانی ہو جاتی ہے اور اس طرح GROUP PERSONALITY کے اظہار میں سہولت ہو جاتی ہے۔

قومیت ہماری شخصیت اجتماعی کے اظہار کا ایک محدود وسیلہ ہے جس طرح اس سے محدود تر سطح پر شہر اور محلہ اور خاندان کے ساتھ وفاداریوں کا بھی ایک درجہ ہے اب دو باتیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ اپنے خاندان کے ساتھ میری وفاداری ریاست کے ساتھ وفاداری سے کہیں ٹکراتی ہی نہیں، اور دوسرے یہ کہ اگر کسی کو اپنے یا کسی دوسرے کے معاملے میں ایسا محسوس ہوتا ہے تو یہ بات صاف ہے کہ چھوٹی وفاداری کو کسی بھی طور سے بڑی وفاداری سے ٹکرانا نہیں چاہیئے۔ نہ اس کے آڑے آنا چاہیے۔ بس یہ ایک تنہا کسوٹی ہے۔ باقی پوری آزادی ہے جو جسے چاہے اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنائے۔

اب مسئلہ اس شکل میں آتا ہے کہ:۔

ہم پہلے ہندوستانی ہیں یا پہلے انسان ہیں۔ میرے خیال میں رادھا کرشنن کی اس معاملے میں تنہا آواز نہیں ہوگی اور کوئی احمق ہی ہوگا جو اپنی انسانیت کے شرفِ برتر کو ہندوستانیت پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اگر کہیں ایسی قربانی کا موقع آ پڑے، لیکن اس سے بھی پہلے کیا واقعی کسی ایسے ٹکراؤ کا امکان بھی ہے۔؟

غالباً نہیں۔ اور یہ امر کہ ہندوستانیت کے ساتھ عالمیت بھی پہلو بہ پہلو کسی کے ذہن میں جنم لے چکی ہو، نہ بعید از قیاس ہے نہ قابلِ گرفت۔ اگر ہے تو قابلِ ستائش ہی ہے۔ ہندوستانیت انسانی تہذیب اور تاریخ کے بڑھتے ہوئے سمندر میں کوئی اہم دھارا نہیں۔ یہ کوئی نظریہ نہیں کوئی فکر نہیں۔ یہ تو ہمارا سہارا ہے، ہمارا گھر ہے ہمارے سانس لینے کی فضا ہے، ہمارا پیار ہے، ہماری نیند ہے، ہماری دوستی ہے، ہمارا درد ہے، ہمارا خواب ہے۔ لیکن یہ تازہ افکار کا سرچشمہ اور ترقی پذیر معاشرہ کی بنیاد تو نہیں بن سکتا۔ کپڑے کو آپ صرف پہن سکتے ہیں کھا نہیں سکتے۔ روٹی کو کھا سکتے ہیں پہن نہیں سکتے۔ ہر دو چیزوں کی میرے نزدیک اہمیت ہے۔ اور کوئی ایک دوسرے سے ٹکراتا نہیں۔

ہندوستانیت اور عالمیت کے یہی دو دائرے ہیں جن میں امتیاز نہ کر سکنے کے باعث قومیت کے خول میں گھرے ہوئے ذہن عالمی نظریوں کے حاملوں کو ہندوستانیت کا نقیض جانتے ہیں۔ عالمی نظریوں سے کسی کی رشتے داری

نہیں۔ میرے باپ نے اسلام ایجاد نہیں کیا۔ نہ بھوپیش گپت کے دادا نے کیمونزم کی تخلیق کی تھی۔ اگر میں یا بھوپیش اپنی ہندوستانیت کو عزیز جانتے ہوئے اس بات پر اصرار کریں کہ اسلام کے عالمی نظریے یا کیمونزم کے عالمی نظریے دونوں کا نصب العین انسان کو انسانیت کی سطح پر متحد کرنا ہے اور اس کے لئے انھوں نے کچھ اصول وضع کئے ہیں، تو ان اصولوں سے اختلاف کرکے کچھ اور عالمی اصول برتر انسانی معاشرہ کی تخلیق و تشکیل کے لئے بھی پیش کر سکتا ہے اور ان پر اصرار کر سکتا ہے۔ دوسروں کو انکی طرف دعوت دے سکتا ہے لیکن کسی بھی عالمی نظریے پر غیر ہندوستانی کا لیبل لگا کے ملک بدر تو نہیں کر سکتا۔ نظریے انسان کی مشترک ملکیت میں کسی کے باپ دادا کی جاگیر نہیں ہوا کرتے۔ نظریوں کا کسی ارضی رشتے کے ساتھ ٹکراؤ نہیں ہوا کرتا۔ اور نظریات و افکار پیدا کرنا اور انکو اپنانا یا اختلاف کرنا انسان ہی کا شرف ہے۔ پتھر اور جانور اس سے محروم ہیں۔ نظریوں سے اختلاف کرنا اس کا حق ہے لیکن نظریوں سے آنکھیں چرانا یا انھیں زندہ دفن کرنا انسانی شرف و عظمت کی دلیل نہیں انسان کے اندر چھپے ہوئے جانور کی پستی کی دلیل ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم اب تک اقبال بمقابل حسین احمد مدنی کے وراثتی دور میں چل رہے ہیں جب کہ یہ محض ذہنی شق ہے عملی وجود ہی نہیں رکھتا۔ آج کوئی ایسی بات کرتا ہے تو مجھے اس کی مثال بالکل ایسی لگتی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ نارنگی اچھی ہے یا اسلام۔ یا پھر ہندوستان عزیز ہے یا کرکٹ۔

> یہ اپنے پڑوسی سے زیادہ سمندر پار سے یا دور دراز سے آئڈنٹٹی کی مصنوعی کوشش۔ یہ سب اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ یہاں کوئی پیار سے بات کرنے والا نہیں ملتا۔ آپ کے دوار پر کھٹکھٹانے والا جب دروازہ پیٹتے پیٹتے تھک جائے، اور دروازہ نہ کھلے تو اب وہ ایسی جو کم آپ بھی نہیں کہ بندگی میں گھٹ کر رہ جائے اور دوار کا کتا بن کر دم ہلاتا رہے۔

یہ تو پاں اسلام کا وہ پہلو ہوا جس کی آج ہمیں ہی

واقعات نئی دہلی

- نہیں پورے جہاں کو ضرورت ہے۔ لیکن جب یہ حدود سے اس طرح بڑھنے لگیں کہ اپنے پڑ، پرائے کو فوقیت دی جانے لگے تو جان لیجیے کہ کچھ فتور ہے۔ اور اس لیے اسکی فکر کرنی ہوگی۔ مسلمان عالمی نقطہ نظر ضرور رکھے گا لیکن اس کے پیر تو اپنی زمین پر ہی ہوں گے۔ پھر وہ زمین کہاں کی ہوگی۔ اور اپنی زمین سے تو جانور کو بھی پیار ہوتا ہے انسان تو بڑی چیز ہے۔ تصوراتی یا نظریاتی طور سے البتہ اظہار میں بعضوں کے یہاں کچھ ایسی بات بھی نکلی اور اب بھی نکلتی ہے جیسے کہ ISLAMIC IDENTITY کو NATIONAL IDENTITY پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کا اپنا فائدہ دوسری IDENTITY میں ہے، پھر بھی یہ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ یہاں اکثریت کو تھوڑا سا سوچنا چاہیے کہ کیا وہ ایسے ہی برادرانہ رویے کے حامل رہے ہیں، جیسے ہونا چاہیے۔ اکثریت کی رواداری مشہور رہی ہے لیکن وہ اسی قدر اپنی ناروادار ی کے لئے بھی بدنام حد تک معروف رہے ہیں۔ وہ بیرونی اثر سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے بھوت پریت سے۔ رشتہ ناتہ بھی کرتے ہیں تو اپنے پڑوسی یا رشتے دار کے بجائے ۲۵ میل دور کے خاندان سے۔ مسلمان ان کے لئے نوٹس آمیز کہنے کی چیز نہ ہو تو وہ کیا کرے۔ نتیجے میں وہ اپنے مذہب والوں پر جا پڑتا ہے۔ ۵۰ سال پہلے خلافت کی احمقانہ تحریک اسی طرح چلی (افغانستان کی ہجرت بھی اسی کا ایک باب تھا۔) اب پچاس سال بعد رباط قسم کے مواقع پر لاکھوں کے جلسے جلوس کا سلسلہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

مرے طائرِ نفس کو نہیں باغباں سے رنجش
ملے گھر میں آب و دانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

> ہم پہلے ہندوستانی ہیں یا پہلے انسان۔ میرے خیال میں رادھا کرشنن کی اس معاملے میں تنہا آواز نہ ہوگی۔ اور کوئی احمق ہی ہوگا جو اپنی انسانیت کے شرفِ برتر کو ہندوستانیت پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو۔

اپنے پڑوسی سے زیادہ سمندر پار سے یا دور دراز علاقوں

سہارنپور کی جامع مسجد بھی
مغل فنِ تعمیر کا ایک
عمدہ نمونہ ہے۔

ہے آئیڈنٹٹی کی مصنوعی کوشش۔ یہ سب اسی وجہ سے
ہوتی ہیں کہ یہاں کوئی پیار سے بات کرنے والا نہیں ہوتا
آپ کے دوار پر کھٹکھٹانے والا جب دروازہ پیٹتے پیٹتے
تھک جائے اور دروازہ نہ کھلے تو وہ اب ایسی جوئے کم
آب بھی نہیں کہ بندگی میں گھٹ کے رہ جائے اور دوار کا کتا
بن کے دم ہلاتا رہے۔

اور بات رابطہ ہی کی نہیں۔ جماعتِ اسلامی اور تبلیغی
تحریک کا اور انکے واسطے سے ظلمت پسند علماء کا غیر معمولی
اثر و نفوذ۔ یہ سب آزاد ہندوستان میں کیا ظاہر کرتے
ہیں۔ یہی نا کہ دوار ابھی تک بند ہے۔ میں تو اردو کے
لئے بھی مسلمانوں میں حدِ اعتدال سے بڑھا ہوا جوش و
خروش اور اسی کے ساتھ ہندی کے لئے نفرت کا جذبہ
(جسکا وہ اظہار نہیں کرتے ہیں) یہ بھی اسی امر کی علامت
سمجھتا ہوں کہ ان کے وجود کو خوش آمدید نہیں کہا جا رہا
ہے اس لئے THEY ARE INCREASINGLY
JEALOUS OF IDENTITY - اور پھر بند دوار سے
EXTRATERRITORIALISM پر IDENTITY اس
کے تو سے بلند ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس کی واقعی نوعیت

اور گہرے یا اتھلے پن سے ذرا سی بھی واقفیت نہیں ہوتی۔
دوسری طرف مسلمانوں کو بھی سنجیدگی اور تفصیل سے اس
مسئلے پر اس طرح سوچنا چاہیئے کہ وہ کون سا نقطہ ہے جہاں
پان اسلام یا جذبۂ اخوتِ اسلامی غلط موڑ لے لیتا ہے اور
اور کہاں تک وہ صدود ہیں جو صحیح بلکہ ناگزیر ہیں۔ اور اگر امور
بہت صاف نہیں ہیں تو سر جوڑ کے اس سلسلے میں وضاحت
کے ساتھ سوچنا ہوگا کہ :۔

HOW TO EVOLVE A NEW
PAN-ISLAMISM ?

> مسلمانوں کو بھی سنجیدگی سے اور تفصیل سے اس
> مسئلے پر اس طرح سوچنا چاہیئے کہ وہ کونسا نقطہ ہے
> جہاں پان اسلام یا جذبۂ اخوتِ اسلامی غلط موڑ
> لے لیتا ہے، اور کہاں تک وہ صدود ہیں جو صحیح بلکہ
> ناگزیر ہیں۔

پان اسلام کا وہ متوازن رخ جو ہم ہندوستانی مسلمان
اختیار کر سکتے ہیں دو بنیادوں پر مبنی ہوگا:۔

اوّل تو یہ کہ الہامی سلسلۂ مذاہب میں اسلام تاریخی طور سے
آخری مذہب ہے۔ اس لئے قدرتی طور سے اپنے عہد تک کی ساری
اچھی اقدار کو اس نے اپنے اندر سمو لیا ہے اور خدا اور انسان
کے رشتے سے ہٹ کر انسانی سطح پر ان اقدار میں سب سے
اہم اخوت اور مساوات کی اقدار ہیں۔ تو ہم جب بہت
اونچے ہو کے اپنے بین الاقوامی کردار کی عظمت کے بلند
بانگ دعوے کریں تو اس وقت یہ کیوں بھول جائیں کہ
مسلمانی رشتے سے آگے بڑھ کر خود اسلام ہی کا سکھایا
ہوا ایک انسانی رشتہ بھی ہے۔ اور اگر اسلام کی بخشی
ہوئی عالمی نظر کو ہم واقعی کچھ اہمیت دیتے ہیں تو کیا
وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے رابطہ کے مسئلے پر، اور
مسجدِ اقصیٰ کے معاملے پر لاکھوں آدمیوں کے سمندر کو ہندوستان
کے گوشے گوشے میں منظم احتجاج پر اکسایا لیکن ویتنام
کے مسئلہ پر من حیث الملت آج تک صدائے احتجاج بھی
بلند نہیں ہو سکی ہے؟ یا تو اپنے پان اسلامی جذبہ کو بین الاقوامی
کا مقدس نام دے کر دافدار نہ کیجئے یا پھر اسے صحیح معنے
میں انسانیت کا خادم بنائیے۔ ظلم اور جبر کہیں بھی ہو
وہ مسلمان کا غم ہے۔ اور اسلام انسانیت کی آواز ہے

واقعات نئی دہلی

اس سے کم درجے کے اسلام پر راضی ہوجانا، اسلام کی صحیح تعلیمات کی توہین کرنا ہے۔

> کپڑے کو آپ صرف پہن سکتے ہیں کھا نہیں سکتے روٹی کو کھا سکتے ہیں پہن نہیں سکتے۔ ہر دو چیزوں کی میرے نزدیک اہمیت ہے اور کوئی ایک دوسرے سے ٹکراتا بھی نہیں۔

دوسرے درجے پر یہ بات آتی ہے، اس درد کے رشتے، یا انسانی رشتے میں پروئے ہوئے قریب ترین وہی لوگ ہیں جو ایک ہی راستے سے اس رشتے میں بندھ گئے ہیں۔ ان میں ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک قبلہ۔ ایک طریق عبادت اور روزہ رکھنے کا انداز مشترک ہوگا۔ چھٹی صدی ہجری سے پہلی جنگ عظیم تک ان سب کی تاریخ میں ایک باب مشترک باب ہوگا۔ ان کے مذہبی ادب کا پورا ورثہ مشترک ہوگا۔

لیکن بس اتنا ہی۔ اس کے آگے داڑھی اور لباس سے لے کر کھانے اور گانے تک میں ان میں آپس میں کوئی قدر مشترک نہیں ہوگی۔ تاہم جس حد تک اشتراک ہے اُسے ہندوستانی مسلمان اپنے ملک کے فائدے کے لئے کام میں تو لا ہی سکتا ہے۔ اس طرح کہ اس کے ملک کو فائدہ ہو اور ان مسلمان ملکوں کو بھی (تباہی کا سامان کسی کے لئے نہ ہو!) مشترک سیاسی پالیسیوں اور تجارتی امور میں اسکا وجود ہر دو اطراف کے لئے رحمت کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی پان اسلامی کے جذبے کے ایک حصّہ میں پاکستان بھی آجاتا ہے۔

میں ہندوستانی مسلمان، اس ملک کی فضاؤں اور ہواؤں کا اس کی تاریخ اور تقدیر کا ایک ناگزیر حصّہ بن چکا ہوں۔ مگر جب ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہیں کہ ہمیں واقعی اپنا بنالو۔

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

تو میں ٹھٹک کے سوچنے لگتا ہوں کہ اپنانے میں کیا کھوٹ ہے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ میر عرب کے ملک کا بادشاہ میرے وطن پر حملہ کردے تو میں اسے خوش آمدید کہوں گا۔ میرے گھر ہی کو کوئی چھیننے لگے یا میرے شہر پر برابر کے شہر والے دھاوا بول دیں تو اس تک کو تو میں گوارا کروں گا نہیں۔ پھر اپنا ملک کیسکو جیتے جی دے سکوں گا۔ پھر کھوٹ کہاں ہے۔

زینت مسجد دریا گنج دہلی۔ اس میں نسوانی نزاکت ہے۔ اسے ایک مغل شہزادی نے بنوایا تھا۔

> عالمی نظریوں سے کسی کی رشتے داری نہیں۔ میرے باپ نے اسلام ایجاد نہیں کیا، نہ بھوپیش گپتا کے دادا نے کمیونزم کی تخلیق کی تھی۔

پاکستان میں میرے جگری دوست، قریبی عزیز اور ساتھی ہیں۔ الگ ملک ہوتے ہوئے بھی اسکا تصور نہیں ہوپاتا کہ وہ کوئی الگ چیز ہے۔ وہاں کی حکومت کی احمقانہ پالیسیوں کی اور بات ہے لیکن وہاں کے عوام کے لئے دل محبت سے اسی طرح دھڑکتا ہے جیسے خود اپنے دیس کیلئے کبھی جی نہیں چاہتا کہ دنیا کی کوئی آفت اور برائی وہاں کے لوگوں پر آئے کہ وہ اپنے ہی جگر کے ٹکڑے ہیں۔

جب ہند و پاک جنگ ہوئی تو پاکستان کی فتحمندی کے لئے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا۔ ہندوستان کی فتحمندی کے لئے بھی دل سے دعا نہ نکلی۔ جی چاہا تو بس یہی کہ دونوں اپنی اپنی سرحدوں پر لوٹ جائیں اور امن ہوجائے۔

اب جب کوئی کہتا ہے کہ آخری معرکہ تو ابھی ہونا ہی ہے تو دل رونے لگتا ہے اور جب کوئی کہتا ہے زمین پر لکیر کھینچنے دو، دلوں کو کیوں تقسیم کرتے ہو تو دل بڑھ جاتا ہے۔

واقعات نئی دہلی

چوک مسجد لکھنؤ۔ لکھنوی نزاکت کا شاہکار

شاید کھوٹ یہاں ہے، یا شاید اپنے ہی وطن اور اپنے ہی لوگوں کے لئے محبت ــــ محبت کی کمزوری سب سے کھوٹ سمجھا جاسکتا ہے!۔ اس کے حل کی دو ہی صورتیں ہیں۔ نفرت یا محبت۔ نفرت ایسی کہ پاکستان اور پاکستانیوں کا ایک ایک نقش، ایک ایک یاد اس میں بھسم ہوجائے۔ اور پھر صرف بارود کی بو باقی رہ جائے۔ اور یا پھر محبت ایسی کہ اس مشن پر جان ہتھیلی پر رکھ لی جائے کہ دونوں ملکوں کو دوست بنانا ہے۔

ظلم و جبر کہیں بھی ہو، وہ مسلمان کا غم ہے، اس لئے کہ وہ انسان کا غم ہے، اور اسلام انسانیت کی آواز ہے۔ اس سے کم درجے کے اسلام پر راضی ہوجانا، اسلام کی صحیح تعلیمات کی توہین کرنا ہے۔

طرف بغیر حکومت کے اقدام کا انتظار کئے آٹھ دس مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جو اپنے کو اس کام کے لئے وقف کردینے کا اعلان کرے اور کم سے کم ایک سال کے لئے وہ پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہوں پر مسلسل چکر لگائے۔ مجھے نہیں معلوم دونوں حکومتیں اور سرحدی آرپار قواعد کس حد تک رخنے ڈال سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر کچھ من چلے جو کچھ عرصے کے لئے اپنے گھروں کی طرف سے بے پروا ہوسکیں اس کام کے لئے تیار ہوجائیں تو راستے کی مشکلات دور ہونا کوئی بہت دشوار گزار مرحلہ نہیں ہوگا۔

کام مشکل ہے لیکن کرنے کا ہے۔ اس لئے کرنے کا ہے کہ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ سارے مسئلوں کی تہہ میں یہی کار فرما ہے۔ بعضوں کا تو تجسس یہی ہے کہ اصل

جب ہند و پاک جنگ ہوئی تو پاکستان کی فتحمندی کے لئے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا۔ ہندوستان کی فتحمندی کے لئے بھی دل سے دعا نکلی۔ جی چاہا تو بس یہی کہ جلد سے جلد دونوں اپنی اپنی سرحدوں پر لوٹ جائیں اور امن ہوجائے۔

مسئلہ نفسیاتی ہی ہے۔ تقسیم کی توہین اور سبکی، اس میں سب سے پہلے آتی ہے جس کے زخم کافی بھر چلے تھے اور خانہ بدوش پناہ گزیں نئے گھروں میں بس کے بہت کچھ بھول چکے تھے کہ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک آویزش نے سب کچھ از سر نو تازہ کردیا۔ اور پھر اب تو یہی طے سا ہوگیا ہے کہ ایک آخری فیصلہ کن ہند پاک معرکہ تو ہونا ہی ہے۔ ■

شاہ ہمدان کی مسجد۔ سری نگر۔ یہ مسجد بڑے بڑے لٹھوں سے تعمیر کی گئی ہے

مجھے اندازہ ہے کہ پاکستان کی حکومت (نہ کہ عوام!) اور ہمارے عوام کا ایک خاص طبقہ (نہ کہ حکومت) اس بات کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے کہ یہ مشن کامیاب ہو لیکن کرنے کا کام ہے تو یہی ہے۔

اس کی ایک صورت تو یہی ہے کہ میری حکومت پاکستان میں اپنا اگلا سفیر (اتنے ہندوستانی مسلمانوں میں سے کوئی ایک تو ایسا قابلِ اعتماد ہوگا ہی جسے وہ اس کے لئے منتخب کرسکے۔) کسی ایسے مسلمان ہی کو مقرر کرے جو اس مشن کی خاطر اپنی جان دے دینے کا تہیہ کرچکا ہو۔ دوسرے

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

عبدالبصیر نعیمی

۲۳ جنوری ۱۸۸۴ء کو لدھیانہ میں تقریر کرتے ہوئے سرسیدؒ نے فرمایا :۔ "میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔"

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو سرسید اور انکے رفقاء کی تاریخ آفریں خدمات کی زندہ یادگار ہے۔ جسے ہمارے اسلاف نے خونِ جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا۔ جو آزاد ہندوستان میں مسلمانانِ ہند کی تمناؤں کا مرکز اور ہندوستانی سیکولرازم کی زندہ تصویر ہے۔ آج ایک بھیانک دور سے گزر رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی بنیاد فرقہ پرستی پر ہرگز نہ تھی۔ اس کے دروازے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کیلئے بھی ہمیشہ کھلے رہے۔ مگر فرقہ پرستوں نے اس پر ہمیشہ بے بنیاد الزامات لگائے۔ ان بے بنیاد اور بے لگام الزاموں سے جب مسلم یونیورسٹی کی دیواریں لرزنے لگیں تو وزیر تعلیم شریمالی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جو پروفیسر جی۔ سی چٹرجی۔ پروفیسر آر۔ سوادیا جناب کرتار سنگھ ملہوترا۔ جناب آر۔ بی نائک۔ جناب بی۔ ایم سعید، اور جناب شاہ میری جیسے غیر جانبدار افراد پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں نے تمام حالات کی تحقیق کی اور اپنی رپورٹ میں کہا :۔

"مسلم یونیورسٹی کے طلباء کا ڈسپلن دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں کافی بلند ہے۔ طلباء کی یونین۔ کھیلوں

عبدالبصیر نعیمی

کے کلب سیال کونسلیں اتحاد اور اتفاق سے کام کر رہی ہیں۔ طلبار میں غیر متعلق باتوں کے بارے میں مطالبات پیش کرنے اور دباؤ ڈال کر منوانے کا ذہن نہیں پایا جاتا۔ ہم خصوصیت سے اس بات سے متاثر ہوئے کہ طلبار کی تنظیموں نے ہمارے سامنے نہ کوئی عرضداشت پیش کی اور نہ کوئی مطالبہ کیا۔ یہ چیز اس کے برعکس ہے جو بنارس ہندو یونیورسٹی اور دوسری جگہوں میں ہوئی ہے"

اس رپورٹ سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی فرقہ پرستی کا گڑھ ہرگز نہیں ہے جیسا کہ چند مسلم دشمن لوگ سمجھتے ہیں۔ بدقسمتی سے جناب چھاگلا وزیر تعلیم نے تو مسلم یونیورسٹی کے دشمن بن بیٹھے اور ۲۵ر اپریل ۱۹۶۵ء کے ایک ناخوشگوار حادثے کو بنیاد بناکر ایک غیر منصفانہ آرڈی نینس مسلم یونیورسٹی پر مسلط کر دیا گیا۔

اس آرڈی نینس کا مطلب کیا تھا۔ جناب چھاگلا نے الزام لگایا کہ "یونیورسٹی میں وائس چانسلر کو قتل کرنے کی باقاعدہ سازش کی گئی ہے" اس الزام کے دو حصے ہیں۔ نمبر ۱۔ تیاری۔ نمبر ۲۔ سازش۔ اس حادثے کے بعد جتنی بھی رپورٹیں پیش کی گئیں ان میں یہ کہیں نظر نہیں آتا کہ طلبار چاقو، چھری، یا پستول سے لیس تھے۔ اگر طلبار غیر مسلح تھے تو بھلا یہ کس طرح ثابت ہوسکتا ہے کہ وہ قتل کے لئے تیار ہوکر آئے تھے۔ اب رہی بات سازش کی تو ڈاکٹر زیڈ احمد اور ان کے ساتھیوں نے کافی تحقیقات کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس احتجاج میں اساتذہ کی شرکت ثابت نہیں ہوتی ہے اگر سازش ہوتی تو اسلحہ ہونا ضروری تھا۔

اگر سازش بھی نہیں تھی اور قتل کی تیاریاں بھی نہیں تھیں تو پھر آرڈی نینس کیوں نافذ ہوا۔ آرڈی نینس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مسلم یونیورسٹی میں طلبار سے لے کر اساتذہ تک یونیورسٹی کورٹ سے لے کر یونیورسٹی کونسل تک یونیورسٹی کا ہر گوشہ بے حد خراب ہوچکا ہے اس لئے پوری مشین کو مجبوراً بند کرنا پڑا۔

۸ر جون ۱۹۶۵ء کو ایوان پارلیمنٹ میں وزیر تعلیم مسٹر چھاگلا نے فرمایا کہ "میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کوئی بات نہیں کہ یونیورسٹی میں عام حالات کے بحال ہوتے ہی اس کے دستور کو بحال کر دیا جائے"

نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر نے فرمایا "مختلف اقسام کی غلط فہمیوں کے باوجود میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آرڈی نینس ہرگز مسلم یونیورسٹی کے کردار (اقلیتی و ثقافتی) اور اسکی تعلیمی خود مختاری پر اثر انداز نہیں ہوگا" ۔۔۔

ان تمام یقین دہانیوں کے باوجود آرڈی نینس نے مسلم یونیورسٹی کے کردار کو مسخ کر دیا۔ یہ آرڈی نینس کیا تھا۔ ایک تازیانہ تھا جو مسلمانوں کی متاع پر لگایا گیا۔ اس آرڈی نینس کی رو سے یونیورسٹی کورٹ وزیٹر (صدر جمہوریہ ہند) کی مشاورتی کمیٹی کی شکل اختیار کرگیا۔ یونیورسٹی کورٹ کے اکیاون ممبروں میں سے ۳۰ ممبر وزیٹر کے نامزد ہیں۔ ایگزیکیٹو کونسل کے چیرمین وائس چانسلر بنے۔ ان کے علاوہ ۹ ممبروں میں سے سات ممبر وزیٹر نے نامزد کئے۔ اس کونسل کو یونیورسٹی کے متعلق تمام اختیارات دے دیے گئے۔ دوسرے الفاظ میں مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں سے چھین لیا گیا۔

مسلمانوں نے قانون کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کا کوئی حق نہیں ہے حالانکہ ۱۹۲۰ء میں جب ایم۔ اے۔ او کالج کے لئے مسلم یونیورسٹی بل مرکزی اسمبلی میں پیش ہوا اس وقت وزیر تعلیم نے اپنی تقریر میں کہا تھا:۔

"یہ نیا تجربہ جسے حکومت اور مسلم قوم کا اعتماد حاصل ہے مسلم قوم کی ترقی کا باعث بنے گا، اور سر سید کی اعلیٰ امیدوں کی تکمیل کا ذریعہ ہوگا"

"اس بل کو پیش کرکے ہم ایک تعلیمی ادارہ یعنی یونیورسٹی کا اضافہ کررہے ہیں۔ جدید طرز کی یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوگی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود مسلمانان ہند کی ترقی کی تاریخ میں اہم پارٹ ادا کرے گا۔ مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کا قیام جس کے دروازے عالمگیر علم کے لئے کھلے ہوں مسلم قوم کی ترقی کی ضامن ہوگی"

لیکن سپریم کورٹ کے فیصلے نے تمام بنیادی حقائق پر پانی پھیر دیا لوگ کہتے ہیں انصاف اندھا ہوتا ہے، لیکن اس قدر اندھا ہوتا ہے یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

کچھ خود غرض لوگوں نے مسلم یونیورسٹی پر الزام لگایا کہ "مسلم یونیورسٹی پاکستان حامی سرگرمیوں کا مرکز ہے' اور مسلم یونیورسٹی سے فارغ ہوکر طلبار پاکستان چلے جاتے ہیں" اس کے بارے میں سابق وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ نے فرمایا تھا۔

"کچھ طلبار اگر پاکستان یا دوسرے ممالک کو گئے تو اس کا سبب روزگار کے مواقع کی کمی ہے۔۔ دوسرے لوگ بھی ملک کے باہر روزگار کی تلاش میں جاتے ہیں"

اگر مسلم یونیورسٹی کے طلبار روزگار کی تلاش میں پاکستان جاتے ہیں تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکلتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی پاکستان حامی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہاں کے طلبار تو امریکا، عرب، کناڈا، تنزانیہ وغیرہ بھی جاتے ہیں تو کیا مسلم یونیورسٹی غیر ممالک حامی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔؟

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ہندو یونیورسٹی بنارس کے لئے یکساں ایکٹ کا ہونا لازمی ہے؟ جس وقت مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں پاس ہوا اس وقت دستور ہند مرتب نہیں ہوا تھا اور بنارس ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے یکساں قوانین بنائے گئے تھے۔ جب دستور ہند مرتب ہوا (آزادی کے بعد) تو دستور ہند کے آرٹیکل ۳۰(۱) کے ذریعے بنیادی حقوق کے تحت اقلیتوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور انکو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ اکثریتی فرقے کو اس قسم کا کوئی حق نہیں دیا گیا کیونکہ ایک جمہوری نظام حکومت میں اکثریتی فرقے کی تہذیب و زبان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ ہاں اگر اقلیتی فرقے کے اپنے تعلیمی ادارے نہ ہوں تو انکی مقدس مذہبی روایات، تہذیب و تمدن اور زبان کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں رہتی۔ اس لئے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ دستور ہند کے نفاذ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کی قانونی و آئینی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق آگیا ہے۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود بھی اگر کوئی یہ کہے کہ دونوں یونیورسٹیوں کے لئے یکساں قانون بننا چاہیے صرف ہٹ دھرمی ہے اور کچھ نہیں۔

۱۹۶۵ء سے لے کر آج تک مسلم یونیورسٹی کی کشتی طوفانی لہروں کے تھپیڑے برداشت کررہی ہے۔ بار بار یقین دہانیوں کے باوجود مرکزی حکومت مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک مستقل بل کے مسئلے کو ٹال رہی ہے۔ آخر کب تک؟۔

اندرا کانگریس جب [illegible] اس وقت انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو انکا حق دلانے کی پوری کوشش کریں گی۔ ہم جانتے ہیں کہ وزیراعظم [illegible]

جب کوئی فیصلہ کرلیتی ہیں تو مخالفتوں کی پروا کئے بغیر اس کو تکمیل کے مرحلے تک پہونچا کر دم لیتی ہیں۔ بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں انھوں نے بے پناہ جرأت کا ثبوت دیا ہے مثلاً۔ بینکوں کو قومیانے کا مسئلہ، پاپیر پرس پر سز (راجگان کا گزارہ) کو ختم کرنے کا مسئلہ۔ سپریم کورٹ نے ان کے ارادوں کے خلاف فیصلہ سنایا لیکن ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ تو پھر مسلم اقلیت کے مسائل پر صرف زبانی وعدہ کب تک۔؟

محترمہ اندرا گاندھی کو برسر اقتدار ہونے کے لئے ہماری مدد کی ضرورت تھی اور اس مقصد کے لئے اقلیت نے سر دھڑ کی بازی لگادی صرف اس امید پر کہ اندرا ہمارے حقوق کا تحفظ کریں گی ۔۔ مگر اقلیت کا بھروسا اب ڈگمگانے لگا ہے۔

جناب ظفر احمد صدیقی اپنے ایک مضمون بعنوان "سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت زندگی گزارنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ انکی نوخیز نسلیں اعلیٰ سائنس کی تعلیم اور جدید تعلیم اسلامی معاشرہ کے لئے سازگار ماحول میں حاصل کرسکیں۔ موجودہ حالات میں اس کی واحد ضمانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی ہے۔ مسئلہ محض ایک تعلیمی ادارے کے تحفظ کا نہیں بلکہ مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ جدید تعلیم یافتہ نسلوں میں اسلامی شعار کے بقا و تحفظ کا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے پر ہمیں سنجیدگی سے دھیان دینا چاہئے۔"

ابھی حال میں بہار کے دورہ کے موقع پر محترم فخرالدین علی احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں حکومت کے جن ارادوں کا تذکرہ کیا اور جو یقین دہانی کرائی ہے ان سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ راقم الحروف ان مذاکرات میں شریک رہا ہے جو شروع سے لے کر اب تک اولڈ بوائز کے نمائندگان اور مرکزی حکومت کے سربراہوں کے درمیان ہوئے۔ راقم الحروف بیگ کمیٹی کا ایک رکن تھا۔ بیگ کمیٹی نے ذیل کی سفارشات کی تھیں:۔

۱۔ بیگ کمیٹی کی سب سے اہم بنیادی سفارش یہ تھی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے سے جو دشواری پیدا ہوگئی ہے اس کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایکٹ کی دفعہ ا میں ضمنی دفعہ (۲) کا اضافہ کرکے یہ وضاحت کردی جائے کہ [illegible] کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی قائم کردہ سمجھی جائے گی اور اسکا نظم و نسق بموجب آرٹیکل ۲۹۔ ۳۰ دستور ہند ہوگا۔

۲۔ یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۵۱ء کی دفعہ ۸ کی رو سے یونیورسٹی افسران کے لئے (جن میں وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، رجسٹرار وغیرہ شامل ہیں) مسلمان ہونا ضروری نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ چیز مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے منافی ہے۔ لہٰذا الفاظ "To hold any office Therein" حذف کردیئے جائیں۔

۳۔ ایکٹ کی دفعہ (۸۔ ۱۲) جس کی ذریعے یونیورسٹی کو کالجوں کے الحاق یا ان کے طلباء کو یونیورسٹی کے طلباء کے مساوی حقوق دینے کا اختیار دیا گیا ہے، منسوخ کردی جائے کیونکہ اس سے یونیورسٹی کا اقامتی کردار متاثر ہوگا۔

۴۔ چوتھی اہم سفارش یہ تھی کہ یونیورسٹی کورٹ میں مسلم نمائندوں کے غلبے کو قائم رکھنے کے لئے ۱۶ مسلم ممبران قانون ساز مختلف منطقوں سے لئے جائیں اور اولڈ بوائز کی نمائندگی میں اضافہ کردیا جائے۔"

اب تک جو اطلاعات ملی ہیں ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حکومت دفعہ ۱۲ (اے) کو حذف کرنے کے لئے تو آمادہ نظر آتی ہے لیکن بیگ کمیٹی کی بقیہ بنیادی سفارشات کو مطلق نظر انداز کر رہی ہے۔ محترم فخرالدین علی احمد صاحب سے لوک سبھا کے انتخاب سے دو تین ماہ قبل ان مسائل پر تفصیلی تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ تلخ نوائی معاف خود موصوف کا ذہن ان معاملات میں صاف نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے مجوزہ بل موصوف کے نزدیک قابلِ قبول ہو مگر محبانِ مسلم یونیورسٹی کے لئے قابلِ قبول نہ ہوگا۔"

قومیانے کا جذبہ اگر ملک کی بہتری کے لئے ہو تو ایک بہترین قدم ہے۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اقلیت کے تعلیمی اداروں کو سرکار اپنی تحویل میں لے لے۔ آزادی کے بعد سرکاری اداروں میں اکثریت کی تہذیب و تمدن اور زبان خطرات میں گھری ہوئی نہیں ہے اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے پاس ابھی تہذیب و تمدن کا صرف اثاثہ ہی باقی رہ گیا ہے۔ اگر حکومت اسکو بھی اپنے اختیار میں لے لے گی تو اقلیت کی تہذیب مٹ جائے گی سکیا یہ سمجھ لیا جائے کہ اس طرح سے حکومت اقلیت کی تہذیب و تمدن کو فنا کردینا چاہتی ہے ۔۔؟ اندرا سرکار کو اپنا وعدہ نبھانا چاہئے جو اس نے الیکشن سے قبل کیا تھا۔ محترمہ اندرا گاندھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ انکی کانگریس کی فتح کے لئے کتنی ہی جگہ اقلیت نے جان و مال کی قربانی دی ہے۔ اقلیت نے طرح طرح کے مصائب اور تکلیف دہ حالات کو خاموشی سے برداشت کرلیا صرف اس امید پر کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی ہمارے حقوق ہمیں واپس کردیں گی۔ ہماری خوشیاں لوٹا دیں گی۔ مگر لگتا ہے اقلیت نے ایک حسین خواب دیکھا تھا اور جب آنکھ کھلی تو بدستور اندھیری رات تھی۔ ہندوستان کی مسلم اقلیت کے سامنے بس ایک ہی سوال ہے کہ ہم کب تک انتظار کریں؟

سرسید احمد خاں نے اپنے عزم و ارادے کا ایک بار اسطرح اظہار کیا تھا:

" تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے! ہماری رائے میں اسکا جواب صاف ہے۔ استقلال استقلال۔ استقلال۔ ہمت ہمت ہمت۔ کوشش کوشش۔ کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہ کرنی چاہئے۔ اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ (Self Respect) کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔"

اور ہندوستان کے تمام مسلمان سرسید کے ان جملوں پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر۔ کبھی کبھی یہ اپنے ماں اور باپ میں فرق محسوس نہیں کر پاتا۔"

روسی جیمس بانڈوں کی واپسی

جاسوس دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں لیکن آج کل کی دنیا کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ انکا پھیلاؤ بھی بہت زیادہ بڑھ گیا ہے ۔ نئے نئے ٹیکنیک ، نئے نئے طریقے جاسوسی کے معلوم کرلئے گئے ہیں اور جاسوسی کے ان محکموں پر لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں برطانیا نے روس کے ۱۰۵ افسروں اور ڈپلومیٹوں کو اپنے ملک سے یہ الزام لگا کر نکالا ہے کہ وہ جاسوسی اور تخریب کے کاموں میں ملوث تھے اس کی توضیح برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ڈگلس ہیوم نے یہ فرمائی کہ :۔

برطانیا کو روس کی جاسوسی سرگرمیوں کا علم کیسے ہوا اور اس نے اتنی بڑی تعداد میں جسکی کہ ڈپلومیٹک دنیا میں مثال نہیں ملتی روسی نمائندوں کو اپنے ملک سے کیوں خارج کیا ۔؟ اس کے بارے میں مغربی دنیا کے اخبارات و رسائل نے اپنے کالم کے کالم سیاہ کئے ہیں ۔ ایک امریکی میگزین نے اس بارے میں جو تفصیلات بہم پہونچائی ہیں ان کے مطابق روس کے شعبۂ تجارت ۳۴ سالہ افسر اولیگ لیالن (OLEG - LYALIN) نے برطانیا میں روس کے جاسوسی نظام کا بھانڈا پھوڑ دیا ۔ یہ شخص بڑا لاابالی بتایا جاتا ہے کہ بظاہر وہ تجارتی افسر کی حیثیت سے کام کرتا تھا ، مگر اصل میں وہ کے جی بی (KGB) میں کپتان کے عہدے پر مامور تھا کے جی بی ، روس کا ایسا ہی محکمۂ سراغرسانی ہے جیساکہ امریکا کا مرکزی محکمۂ سراغ رسانی (C.I.A) غالباً "وائن اینڈ ویمن" (شراب اور عورت) کے چکر میں وہ برطانوی سراغ رسانی کے افسروں سے مل گیا اور اس نے برطانیا میں سراغرسانی کے روسی نظام کا بھانڈا پھوڑ دیا ۔

جاسوسی کی سرگرمیاں سب ہی ملکوں میں ہوتی ہیں اور ہر حکومت انھیں انگیز کرتی ہے لیکن جب معاملہ ایک حد

کے ۔جی بی ، کے سربراہ ۔ اینڈ روپوو

DAILY EXPRES
Britain expels 1(
Russian diploma
SPY PURGE
Mirror
GET OUT!
Daily Mai
CONCOR
SABOTA
Sun
BRITAIN KICKS OUT 105 SPIES

برطانوی وزیر خارجہ ڈگلس ہیوم

" ایسا روس کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے کیا گیا ہے "

جواب میں وزیر خارجہ روس مسٹر گرومیکو نے کہا ۔

" تعلقات کو بہتر بنانے کا یہ بہت اچھا انداز ہے "

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس اقدام سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر نہیں ہوئے بلکہ بگڑے ہیں ۔ دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی ہے ۔ اس کا اظہار روس کی جوابی کارروائی سے ہوتا ہے جو اس نے برطانیا کے اٹھارہ ڈپلومیٹوں کو اپنے ملک سے نکالنے کے سلسلے میں کی ۔

بڑا خرچیلا اور شراب اور عورت کا رسیا ۔ کہتے ہیں اس کی کھانے کی میز پہ ۸۰ پونڈ (۱۳/۲ سو روپئے) کا بل اسکے لئے کوئی بات نہ تھی ۔ اس کی بیوی اور اس کا سات سال کا بچہ ماسکو میں ہے لیکن برطانوی اخبارات نے لندن میں پانچ عورتوں کے ساتھ اسکا نام وابستہ کیا ہے ۔ ایک اسرائیلی طالبہ ، ایک چیک طالبہ ، دو انگلش سکریٹریز اور ایک روسی شوخ حسینہ جو کسی دوسرے روسی افسر کی بیوی تھی ۔

یہ روسی افسر بظاہر برطانیا سے لوکرے اور دوسرے بے سلائے کپڑے خریدتا تھا تاکہ انھیں برطانیا سے برآمد

سے گزر جائے تو کسی بھی حکومت کے لئے وہ ناقابل برداشت ہے ۔ چنانچہ ہیتھ (وزیراعظم) ڈگلس ہیوم (وزیر خارجہ) لارڈ کیرنگٹن (وزیر دفاع) اور دوسرے اعلیٰ ذمہ دار ایک جگہ بیٹھے اور انھوں ۱۰۵ روسی افسروں اور ڈپلومیٹوں کو ملک سے نکال دینے کا فیصلہ کر دیا ۔

اس سے قبل اس سلسلے میں روسی حکومت کو لکھا گیا تھا لیکن اس نے جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی نتیجے میں روسی افسران برطانیا سے نکال دیے گئے ۔ روسیوں کو ایک برطانوی باشندہ کم فلبائی (Kim Philby) نے

جس نے ۱۹۶۳ء میں اپنے ملک سے غداری کرکے روس میں پناہ لے لی تھی، بیس برطانوی ڈپلومیٹوں کے نام بتا دیئے جو برطانوی محکمۂ سراغرسانی کے ایجنٹ تھے۔ یہ بھی روس سے نکال دیئے گئے۔

روس کے محکمۂ سراغرسانی کے۔ جی۔ بی کے سربراہ اسوقت ۵۰ سالہ یوری اینڈروپوف ہیں جو کہتے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی لیڈر مسٹر برزنیف کے خاص آدمی ہیں ۶ فیٹ لمبے اینڈروپوف اپنی شقاوت قلبی کا ثبوت اس وقت اچھی طرح دے چکے ہیں جب ۱۹۵۶ء میں ہنگری میں بغاوت ہوئی تھی۔ وہ جاسوسی کے محکمے کے لئے بالکل موزوں ہیں، اس محکمے میں رحم دل لوگوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگرچہ روس میں اب وہ زمانہ نہیں رہا جب بڑے پیمانے پر جلاوطن یا قتل کیا جاتا تھا۔ لیکن کے۔ جی۔ بی کا محکمہ روس میں اب بھی ایک مضبوط اور طاقتور محکمہ ہے اینڈروپوف کا بجٹ کتنا ہے یہ کسی کو معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس کے پاس تین لاکھ آدمیوں کی ایسی فوج ضرور موجود ہے جو روسی قیادت کا تحفظ اور ایک گروپ کے لئے دوسرے گروپ کی جاسوسی کرتی ہے۔ ہر جگہ اس محکمے کے آدمی نظر آئیں گے اور اس طرح کسی ادارے یا کسی شخص کی سرگرمیاں اس ادارے سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔

اس کے ۹ ہزار افسروں میں ۳½ ہزار غیر ممالک میں تعینات ہیں۔ امریکی حلقوں کی اطلاع تو یہ ہے کہ غیر ممالک میں روس کے جتنے افسر تعینات ہیں ان میں سے پچاس سے پچھتر فیصد کے۔ جی۔ بی، کے ایجنٹ ہیں۔ انکی سرگرمیاں بہت وسیع ہیں مثلاً وہ فوجی، سیاسی اور دوسری معلومات حاصل کرتے ہیں اور صنعتی تخریب کاریوں میں مصروف رہتے ہیں۔ کبھی کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی ناکام۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں بیروت میں کے۔ جی۔ بی کے ایجنٹوں نے لبنانی فضائیہ کے ایک فرانسیسی ساخت کے مراج ۳ ۔ ۱۱۱ طیارے کو چرانے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے ایک لبنانی افسر کو ۲۰ لاکھ ڈالر (۱۴۰ لاکھ روپے) کی رقم اس بات کے لئے بطور رشوت پیش کی کہ وہ طیارے کو اڑاکر باکو میں لے جائیں لیکن افسر نے اس معاملے کی اطلاع اپنے سینئر افسر کو دیدی اور روسی ایجنٹ جو دو لاکھ ڈالر کا چیک بطور پیشگی ادا کرنے کے لئے آئے تھے موقع پر پکڑے گئے۔

روسی، مراج طیارے کو اس لئے اغوا کرنا چاہتے تھے تاکہ سوویت مگ طیاروں کے مقابلے میں اس کی افادیت اور طاقت کا اندازہ لگا سکیں۔

۱۹۷۰ء میں مغربی جرمنی میں ۶۸، روسی ایجنٹ پکڑے گئے، اس کے بعد بھی جرمنی گورنمنٹ کا اندازہ ہے کہ وہاں ۱۶ ہزار روسی جاسوس کام کر رہے ہیں۔

مغربی جرمنی میں جاسوسی سرگرمیاں جاری رکھنے کی کئی وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ تقسیم شدہ جرمنی کا حصہ ہے اور دوم دو لاکھ دس ہزار امریکی فوجوں کا اڈا ہے۔

مشرقی برلن کے ایک نواحی علاقے سے کبھی کبھی رات کو شارٹ ویو میں کوڈ الفاظ میں آواز سنائی دیتی ہے اور اسکا جواب جاسوس اپنے ٹرانسمیٹر سے دیتے ہیں۔ سگریٹ کی تین ڈبیوں کے برابر والے ٹرانسمیٹر سے بول بھی سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔

روس کے مقابلے میں امریکی محکمہ سراغرسانی (سی آئی اے) کے آدمیوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے، اور اس محکمے کا بجٹ تین ارب پچاس کروڑ ڈالر سالانہ کے قریب ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں سی۔ آئی۔ اے کے آدمی نہ ہوں۔

سی۔ آئی۔ اے کے یہ آدمی ہر طبقے کے لوگوں کو اپنے دام میں پھانستے ہیں اور انھیں بڑے بڑے لالچ دیتے ہیں۔ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں جاسوس نہ ہوں۔ جاسوسوں کا یہ جال ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ خاص کر بڑے ملکوں کا جو ایک ایک چپہ زمین کی پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔ جاسوس ہر شعبۂ زندگی میں گھسے نظر آتے ہیں۔ دروغ برگردنِ راوی، کہتے ہیں امریکی پنگ پانگ کی جو ٹیم پیکنگ گئی تھی، اس میں ۵۰ فیصدی سی، آئی۔ اے، کے کھلاڑی شامل تھے۔ ■

فلپائن کے صدر مارکوس کی بیگم
شادی سے پہلے ایک معمولی ٹائپسٹ
تھیں لیکن اب فلپائن کی سب
سے زیادہ ہر دل عزیز خاتون ہیں
غالباً صدر مارکوس کے ریٹائر
ہونے کے بعد مسز مارکوس ہی
فلپائن کی صدر منتخب ہونگی
تصویر میں مسز مارکوس صدر
گری اور مسز گری کے ساتھ۔

"پچھلے دنوں دہلی میں ایک بہت دلچسپ قصہ پیش آیا جب کہ ریلوے کے چیرمین مسٹر گنگولی نے ریل کے ایک ڈبے میں دھرنا دیدیا۔ مسٹر گنگولی دورے پر پونا جا رہے تھے لیکن وزیر ریلوے کے حکم پر انکے ڈبے کو چلتی گاڑی سے علیحدہ کرکے دہلی میں لٹکا دیا گیا۔

واقعات نئی دہلی

دہلی میں دیوالی کے موقع پر درجنوں میلے لگتے ہیں۔ تال کٹورا گارڈن کا مینا بازار بہت مشہور ہے۔ یہاں بیچنے والی تمام لڑکیاں ہوتی ہیں، اس لئے قدرتی بات ہے کہ خریدنے والے سب مرد ہوتے ہیں۔

تصویر میں جُڑے ہوئے شیشوں کی دوکان کا ایک منظر ہے۔

ہمایوں رشید چودھری جو پاکستان ہائی کمیشن میں کونسلر اور چانسلری کے مہتمم تھے وہ بہت دشواری کے بعد ایمبیسی سے باہر نکل آئے اور انھوں نے بنگلا دیش ہائی کمیشن میں پناہ لے لی۔

تصویر میں ہمایوں رشید، اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔

جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہٹو پہلے جاپانی شہنشاہ ہیں جو یوروپ کے دورے پر گئے ہیں۔ جگہ جگہ ہیرو ہٹو کے خلاف مظاہرے کئے جا رہے ہیں۔ امریکن ان پہ الزام لگاتے ہیں کہ پرل ہاربر پر سیکڑوں لوگوں کے قاتل وہی تھے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں لاکھوں انسانوں کی موت کا الزام چچا سام کی پیشانی پر ہے۔

پین۔ٹی۔بوٹ (PAN-T-BOOT) نے اب پینٹ کی جگہ لے لی ہے۔ یہ عجیب و غریب پینٹ طرح طرح کے خوبصورت ڈیزائنوں میں آتی ہے اور جسم پر پوری طرح چپک جاتی ہے، یعنی اسکو پہننے کے بعد بھی آپ اپنے قدرتی لباس میں ہی رہتے ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پہننے کے بعد آپ کو جوتا پہننے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ جوتا بھی اس کے ساتھ جُڑا ہوتا ہے۔

ماؤزے تونگ کی موت کی تمام خبریں غلط ثابت ہوئیں پچھلے دنوں چیرمین ماؤ نے بہت گرم جوشی سے اتھوپیا کے
ہیل سلاسی کا استقبال کیا۔ ماؤ پہلے سے زیادہ صحت مند معلوم ہو رہے تھے۔

امن پائلٹ ۔ یہ ا
امن پائلٹ سوانند سوا
وشنو۔ اپنے رنگ بر
چھوٹے پائنیر جہاز
یہ دنیا بھر کے لوگوں کو ا
کا پیغام دیتے پھرتے
پچھلے دنوں انھوں
اپنے جہاز میں نہر سوئز پا
اور تمام علاقے پر پرچے
گرائیں، جن میں عرب
اسرائیل سے جنگ بند
کی درخواست کی گئی تھ

واقعات میں آپ ہر موضوع پر خط بھیج سکتے ہیں۔ تعریفی خطوط کی بجائے مختلف مسائل سے تعلق رکھنے والے خطوط کو ترجیح دی جائے گی۔ یہ آپ کا صفحہ ہے اس لئے آپ بلا کسی جھجک کے اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ خط لکھتے وقت ان باتوں کا خیال ضرور رکھئے:۔

۱۔ خط کاغذ کے ایک طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھنا چاہیے۔

۲۔ خط میں آخر میں اپنا پورا نام اور پتا صاف صاف لکھئے ورنہ خط شائع نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ خط میں گری ہوئی بازاری زبان استعمال نہ کیجئے۔ ہم آپ کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتے ہیں مگر غیر شائستہ خطوط شائع کرنا ہمارے لئے ممکن نہ ہو سکے گا۔

ادارہ

اعلان:۔ "ادارہ واقعات مختلف اوقات پر قارئینِ واقعات کی خدمت بہت سے مسائل رکھے گا جس پر قارئین کی رائے کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس مرتبہ کا مسئلہ یہ ہے:۔

"کیا ہندوستانی مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت ہے؟"

آپ کی رائے زیادہ طویل نہیں ہونی چاہیے، ورنہ ہم اسے شائع کرنے سے قاصر رہیں گے"

آپ کے خط

محترمی جناب۔ آداب

میں واقعات کے ہر شمارے کا شوق سے مطالعہ کرتا رہتا ہوں اور خاص طور پر "آپ کے خطوط" کا۔ آپ نے ایک لحاظ سے ان صفحات کو "فورم" بنا دیا ہے، جس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

میں بھی اس "فورم" میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے ذیل کے مراسلے کو شائع فرما کر ممنون کریں گے۔ بات کچھ کڑوی ہے مگر حقیقت کا ایک عکس ہے۔ مسٹر ہمایوں احمد یعنی کے خط کو پڑھنے کے بعد اس مراسلے کو مرتب کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"جناب شمیم احمد شمیم رکن پارلیمنٹ (کشمیر) نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جو ہند و پاک کے کسی بھی مسئلے پر پاکستان کی پالیسیوں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے اور ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کو جائز قرار دیتا ہے۔ چنانچہ میرے خیال میں ہندوستانی مسلمانوں کا یہ وہی گروہ ہے جو پاکستانی حکمرانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بنگلا دیش میں فوج کی جانب سے روا کردہ جنگ اور ظلم و ستم کو نہ صرف جائز بلکہ "مقدس جہاد" کی حد تک اسلامی طرز قرار دینے پر بضد ہے۔ اور یہ وہ گروہ ہے جو تقسیم کے بعد وطن کی محبت یا سیاسی نظریہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ مالی یا خاندانی مصلحتوں اور الجھنوں میں گرفتار ہو کر مجبوراً ہندوستان میں ٹھہر گیا ہے اور بنیادی طور پر تقسیم سے قبل کے پرانے فرسودہ انداز فکر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور ان زبردست تبدیلیوں کو جو تقسیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی افق پر ہوئی ہیں سمجھنے اور اپنے خیال و عمل کو ان سے مطابقت دینے سے معذور ہے۔

میں اس گروہ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان ناانصافیوں کی ابتدا کس طرف سے ہوئی اور آج ان ناانصافیوں کا ردِ عمل ان نام نہاد پاکبازوں اور ایمانداروں، مریض ذہنوں اور پتھر دلوں پر کچوکے لگاتا ہے تو جھنجھلاہٹ اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے پڑوسی ملک کو موردِ الزام قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ صرف ان کی افلاس زدہ ذہنیت اور فرسودہ اندازِ فکر کی علامت ہے۔

یہ گروہ اور ان کے امام اپنے خود ساختہ فلسفے سے ایک عجیب دھندلا سا پھیلا رہے ہیں جس میں انھیں خود کوئی چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا ہے اور انکی شامت یہ ہے کہ اس دھندلکے کو روشنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس روشنی کو جو خود ان کے دل میں ہے محسوس کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہ "جہل مرکب" اس قدر راسخ ہو گیا ہے کہ بظاہر کوئی انسانی کوشش اسے دور نہیں کر سکتی۔

لیکن یہ دھند اور کہر چھٹ جائے گی۔ ایک نیا انسان آئے گا۔ ایک سورج جو ابھی مقید ہے افقِ زندگی پر نمودار ہوگا اور یہ نیا انسان جب سورج بن کر چمکے گا تو آج کے اندھیرے بھاگ بھاگ کر غاروں میں جا چھپیں گے اور چمگادڑیں جنکا آج راج ہے جھاڑیوں میں پناہ لیں گی۔ پھر عقاب اور شاہین جاگ اٹھیں گے۔ بگلوں اور عندلیب کے ترانوں سے فضا گونج اٹھے گی۔

آج بظاہر بنگلا دیش کے عوام کو شکست ہو رہی ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ حق ہمیشہ مغلوب ہونے کے بعد غالب آتا ہے"

نیاز مند۔ ایم عزیز حسین۔ ایم اے
عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدر آباد

واقعات نئی نسل

محترمی صدیقی صاحب! سلام و احترام

واقعات کا ہر شمارہ اپنی انفرادیت کو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اردو صحافت میں آپ نے واقعات کا اجرا کرکے ایک اہم کام انجام دیا جو اردو کے دوسرے رسائل نہیں کر پائے، اور لوگ مجبوراً انہی کو خرید کر پڑھتے ہیں۔ لیکن اس طرح آپ نے واقعات کے ذریعے نئی نسل کے لئے بھی اُردو کی راہ ہموار کی ہے۔

تقریباً ایک سال سے برابر واقعات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ سلیم عادل کا مضمون "ٹھنڈے شعلے" اپنی انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ حضرت بہزاد لکھنوی کے قلم کا کیا کہنا، جو بھی لکھتے ہیں بہت خوب۔ شہزادی زیب النساء، ایثون سنکار بھی بہت خوب ہے۔ امید ہے کہ واقعات کی رفتار برابر بڑھتی رہے گی۔ آپکا اپنا۔ سلیم عمر لکھنؤ

بنگلادیش اور ہندوستانی مسلمان

مکرمی! السلام علیکم

جناب ریاض الرحمان شیروانی کے مراسلے پر کمترین کا جواب حاضرِ خدمت ہے اشاعت کا کرم فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں۔

"بنگلادیش اور ہندوستانی مسلمان پر لکھتے ہوئے ہمارے مراسلے پر عالیجناب ریاض الرحمان صاحب شیروانی، علی گڑھ نے جو اعتراضات فرمائے ہیں اسکا جواب دینا میرا اخلاقی فرض ہے۔ شیروانی صاحب کی نظر میں نام نہاد بنگلادیش بننے کی تمام تر ذمے داری مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جو انصاف کے نقطۂ نگاہ سے یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں متعدد وزارتیں بنیں اور بگڑیں جنکی تمام تر ذمے داری وہاں کے لیڈران پر عائد ہوتی ہے۔ جن میں ہمارے شیخ صاحب بھی گنے جا سکتے ہیں۔ آخر مجبوراً فوج کو اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ حالیہ الیکشن سے پیشتر جناب شیخ مجیب الرحمٰن اور مولانا بھاشانی صاحبان کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو منظم منصوبے کی قلعی خود بخود کھل جائے گی۔ کیا کوئی صاحب اقتدار اپنے ملک کے ٹکڑے کرنے کی اجازت دے سکتا ہے جیسا کہ چھ نکاتی پروگرام جناب شیخ مجیب الرحمان صاحب نے پیش کیا تھا جس میں ایک کروڑ ۵۸ لاکھ سے زائد مہاجرین کے تحفظ کا تذکرہ کہیں نہ تھا۔ میں مانتا ہوں کہ پاکستان کے حالیہ الیکشن میں جو عظیم کامیابی شیخ صاحب کو حاصل ہوئی تھی اس کی بنا پر فوجی حکومت کا فرض تھا کہ اقتدار انکے حوالے کردیں۔ مگر جب یحییٰ خان برائے گفتگو جون ہی ڈھاکا پہونچے تو شیخ صاحب نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیکے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی کہ میں طاقت کے ذریعے اقتدار حاصل کرسکتا ہوں۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ مہاجرین کے قتلِ عام کا بازار گرم کردیا گیا، خواہ اسباب جو کچھ بھی ہوں۔ مجبوراً فوج کو مداخلت کرنا پڑی۔ اس تباہی کی تمام تر ذمے داری ہر دو فریق پر عائد ہوتی ہے جیسا کہ شیخ عبداللہ صاحب نے قبل الیکشن اظہار کیا تھا اور اسی کو مدِ نظر رکھ کر الیکشن لڑنے کی خواہش ظاہر کی تھی کیا اسے ملک سے غداری کے نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ آج مکتی فوج کو اتنے اسلحہ کہاں سے میسر آگیا جو روزانہ سیکڑوں تربیت یافتہ فوجیوں کو ہلاک کرتی پھر رہی ہے اور خود کبھی ہلاک نہیں ہوتی۔

دوسرے اسے ہوائی اور بحری جہاز کہاں سے میسر آگئے جن کے سہارے آج وہ بحری اور ہوائی حملے کی دھمکی دیتی ہے۔ اس سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ضرور کوئی تیسرا فریق ہے جو اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ جس کے بل پر آج وہ نازاں ہے۔

یہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے، اگر کسی تیسرے فریق نے اس میں ذرہ برابر بھی مداخلت کی تو تیسری عالمی جنگ کی شکل میں یہ نمایاں ہوگا۔ اس میں مداخلت کی جرأت وہی حکومت کرسکتی ہے جسکا اسمیں ذاتی مفاد پنہاں ہو۔ اگر مغربی پاکستان کی حکومت قابلِ مذمت ہے تو عوامی لیگ کو بھی بخشا نہیں جاسکتا۔ اور یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا جب تک دونوں فریق گفتگو کے ذریعے طے کرنے کو تیار نہ ہوں۔ کیا حکومتِ بھارت کشمیر کے عوام یا لیڈران کو اسکی اجازت دے سکتی ہے کہ وہ خود مختاری کا اعلان کرکے اپنی الگ حکومت قائم کرلیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ شاید ہی کوئی بھارتی اسکو گوارا کرے۔ وہ مرجانا بہتر سمجھیں گے مگر یہ ہرگز گوارا نہ کریں گے۔ والسلام

(ڈاکٹر) محمد قاسم۔ محلہ کلس۔ بہرائچ۔

ظلم و بربریت کیخلاف آواز بلند کیجئے

محترمی۔ سلام و خلوص۔

ستمبر کا تازہ شمارہ نظروں سے گزرا، بہت پسند آیا۔ "ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ یہ مذاق کب تک چلتا رہے گا؟" خاص طور سے پسند آیا کیونکہ اس عنوان سے حکومت کو باخبر کیا گیا ہے کہ آج کے دور میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و تشدد کا برتاؤ ہو رہا ہے وہ حکومت کے لئے اچھا نہیں ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ جب بھی کسی حکومت نے عوام کے ساتھ ظلم و بربریت کا سلوک کیا ہے وہ حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔ اگر حقیقی معنوں میں اندرا گاندھی اپنی حکومت کو بچانا چاہتی ہیں اور ملک میں امن چین برقرار رکھنا چاہتی ہیں تو ان کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ شر پسندوں کی پالیسی کو اپنے ہی ہاتھوں سے کچل ڈالیں اور انکی شکل ایسی کردیں کہ آئندہ وہ کبھی اپنی منحوس شکل دنیا کو دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ اگر وہ شرپسندوں کو رعایت اور چھوٹ دیتی رہیں تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہی لوگ انکی حکومت کے گرد منڈلانا شروع کردیں گے اور آہستہ آہستہ انکی حکومت کو کمزور اور کھوکھلا بناتے چلے جائیں گے۔ اور پھر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے بعد حکومت کی کیا شکل ہوگی۔ بھیونڈی میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم ہو رہا ہے اس سے مہاراشٹر کی حکومت کو بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ عدالتی کارروائی کرکے حقیقت کو سامنے لانا چاہئے۔ اور بے جا طور پر وہاں کے لوگوں کو جو جانی اور مالی نقصان ہو رہا ہے اسے حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آخر میں مدیر واقعات سے بھی میری درخواست ہے کہ وہ ظلم و بربریت کے خلاف آواز بلند کرتے رہیں تاکہ ہندوستان کا اقلیتی فرقہ حقیقت سے روشناس ہوتا رہے۔ اگر وہ سلسلہ اپنی اس خدمت کو انجام دیتے رہے تو قوم اور ملک پر بہت بڑا احسان ہوگا جو رہتی دنیا تک قائم رہیگا۔

اقبال عالمی ـــــ رانچی

.... کنووکیشن کا دن۔ منجو کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچّوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچّوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔
خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مُفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹروں سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔
خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لیے
پُر مسرّت
دن
70/242

گیانسٹک

گیانسٹک ہر اس بات کو کہتے ہیں جس کو عقل قبول نہ کرے۔ چنانچہ غالباً آپ سمجھتے ہیں ایک گیانسٹک کو سوا کچھ نہیں ہے ازل سے آج تک ہر وہ بات گیانسٹک سمجھی گئی ہے جسے عقل نے قبول نہیں کیا۔ پہلے بجلی کا تخیل گیانسٹک تھا کہ ایک بٹن دبایا اور چار جانب روشنی پھیل جائے ناممکن، خلافِ عقل۔ لیکن جب یہ گیانسٹک سامنے آگئی، تو حقیقت بن گئی۔ ٹیلیفون کو لیجئے، ٹیلی ویژن کو لیجئے، سب گیانسٹک ہی تھی ابتدا میں اور اب کیا ہے۔ حقیقت، ناقابلِ انکار حقیقت۔ تو حضرات یہ بھی ایسی ہی ایک گیانسٹک ہے پڑھ لیجئے اور کہہ دیجئے

جمن خاں

جمن خاں

مجھے نہیں معلوم میرے ماں باپ کون تھے، کیا تھے۔ مجھے اپنا بچپن کچھ صحیح طور پر یاد نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں محض ایک اصطبل میں رہا کرتا تھا اور ایک بوڑھا دونوں وقت مجھے روٹی کھلا دیا کرتا تھا جسکو میں نانا نانا کہا کرتا تھا وہ مجھے جمن کہہ کر بلایا کرتا یوں مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام جمن ہے۔ میں دس برس کی عمر تک اصطبل کے قریب بیٹھا ہوا زیادہ تر خاموش سوچا کرتا تھا۔ میں کیا سوچا تھا اب یہ مجھے قطعاً یاد نہیں ہے۔ صرف اتنا تو یاد ہے کہ میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں بہت کم شریک ہوتا تھا۔ اور یہ بھی مجھے یاد ہے کہ میری تندرستی حیرت انگیز تھی۔ میں دس برس کے سن میں ۱۴ برس کا ٹانٹھا اور مضبوط لڑکا نظر آتا تھا۔

ایک دن جب میں سوکر اٹھا تو میں نے بوڑھے کو مردہ دیکھا اصطبل کے لوگوں نے اس کی تجہیز و تکفین کی اور مجھے زمیندار صاحب کے مکان پر پہنچا دیا جہاں میں زنان خانے میں کام پر لگا دیا گیا۔ مجھے اپنی زندگی کے اس انقلاب پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اصطبل کی زندگی میں بے کار رہتا تھا یہاں جھاڑو برتن اور خدمتگاری کے فرائض میرے ذمے آگئے۔ مجھے حیرت ہے کہ میں اور نوکروں کے برخلاف ہر کام کو دل لگا کر کرنے لگا تھا جس کی وجہ سے چودھرائن کی گالیاں مجھے کبھی نصیب نہ ہوئیں چودھرائن صاحبہ کی زبان سے ہر شخص نالاں تھا، بجز میرے مجھ پر انکی زبان کبھی کھلی ہی نہیں۔ اور کھلتی کیوں۔ بے تعداد برتن جن کو دو ملازم مانجتے مانجتے تھک جاتے میں منٹوں میں مانجھ دیتا تھا۔ زنان خانے کی جھاڑو جسکو نوکر عذاب کہتے تھے میرے لئے کوئی دشوار شے نہ تھی۔

چودھری صاحب کے دو صاحبزادے گھر پر ہی تعلیم پاتے تھے جن کو پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر صاحب حویلی میں ہی مقیم تھے یہ دونوں لڑکے میرے ہی ہم عمر تھے اور ان دونوں کے پڑھنے کے وقت میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں اسی کمرے میں بیٹھا رہوں تاکہ پڑھنے کے وقت انکی ضروریات پوری کر دیا کروں۔ میں ماسٹر صاحب کو تعلیم دیتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ یہ دونوں لڑکے ابھی تک اُردو کا پہلا قاعدہ اور سنو تک گنتی ہی سیکھ رہے تھے۔ پڑھائی لکھائی سے انکو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بہر نوع صبح و شام ان کی پڑھائی ضرور ہوتی تھی۔

ان بڑے اور چھوٹے بھیا کے ساتھ ڈیوٹی لگنے کے تیسرے ہی دن جب میں نے ماسٹر صاحب کو الف سے یے تک کا سبق فر فر سنا دیا تو وہ حیران رہ گئے۔ انھوں نے سلیٹ پر لکھ کر بار بار مجھ سے حروف پچھوائے اور میں نے پہچان دیا۔ یہی نہیں جب میں نے ان حروف کو سلیٹ پر لکھ کر بھی دکھایا تو انکو حیرت ہوئی۔ انھوں نے ایک ردی کاپی اور پنسل مجھے دیکر پڑھانا شروع کر دیا۔

چھوٹے اور بڑے بھیا تو وقت گزاری کیا کرتے تھے لیکن میں پڑھ رہا تھا۔ مجھے چار ماہ میں اردو پڑھنے اور لکھنے پر حیرت ہوتی ہے اور یہی نہیں گنتی اور حساب بھی سیکھ گیا تھا۔ دس تک پہاڑے مجھے ازبر ہوگئے تھے میں سادی جمع ضرب اور تقسیم بھی کرنے لگا تھا۔ یہ ماسٹر صاحب نیک آدمی تھے انھوں نے مجھے پرانی کتابیں خود لا کر دیں اور میں پڑھنے لگا۔ میرا خط اردو اور انگریزی دونوں میں قدرتاً بے حد پاکیزہ ہوگیا اور ساتھ ہی ساتھ پختہ بھی باوجود اس کے کہ میں صرف اُن اوقات میں پڑھتا تھا جب دونوں بھیا پڑھتے تھے۔ لیکن میں تین سال کے عرصے میں اسکول لیونگ تک کی تعلیم حاصل کر گیا۔ تاریخ، جغرافیہ، الجبرا، حساب اور انگریزی میں برق ہوگیا جبکہ ان تین برسوں میں دونوں صاحبزادے اُردو کی چوتھی کتاب تک پہونچے اور حساب میں مشکل روپے آنے پائی کی ضرب اور تقسیم تک پہونچے۔ ان کا عالم یہ تھا کہ ماسٹر صاحب کے سامنے کتابیں کھولے بیٹھے رہتے اور ایک گھنٹہ پورا ہونے کا انتظار کرتے۔ ماسٹر صاحب بھی ان حالات میں وقت گزاری پر مجبور تھے۔ [illegible] سکتے تھے خود صاحبزادوں کو کوئی [illegible] نہیں۔ ماسٹر صاحب کی تمام توجہ کا مرکز میں تھا۔ [illegible]

انھوں نے میرا داخلہ میری لاعلمی میں پرائیویٹ حیثیت سے اسکول لیونگ، کلاس میں خود اپنے پاس سے فیس وغیرہ کرادیا۔ جب امتحان کی تاریخیں قریب آئیں تو ماسٹر صاحب نے مجھے مطلع کیا۔ امتحان شہر میں ہونا تھا اور شہر گاؤں سے ۱۵ میل کے فاصلے پر تھا۔ نہ جانے ماسٹر صاحب نے کیونکر ایک ہفتے کی چھٹی چودھری صاحب سے دلوادی۔

چھٹی ملنے کی غالباً یہ وجہ تھی کہ میں نے ۴ برس میں ایک دن کی بھی چھٹی نہیں لی تھی۔ چودھرائن صاحبہ مجھ سے بےحد خوش تھیں۔

شہر پہونچ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، وہاں کے مکانات بازار اور چہل پہل دیکھ کر جو میرے تصورات سے بھی زیادہ حسین نکلیں میں نے ایک ہفتے میں آٹھوں پرچوں کا امتحان دے دیا اور نویں دن ماسٹر صاحب کے ساتھ واپس آگیا واپسی پر میں نے دیکھا کہ گھر کا سارا کام میری عدم موجودگی میں چوپٹ تھا۔ میں نے دو ہی دن میں تمام کام پھر سے درست کردیا۔ یہ لکھنا میں بھول گیا کہ باوجود پندرہ سال کی عمر کے میں مکمل جوان نظر آنے لگا تھا میرے ہاتھ پیر چوڑے چکلے نکل آئے تھے میری مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ میرے برخلاف چودھری صاحب کے دونوں لڑکے ابھی تک لڑکے ہی نظر آتے تھے۔ کمزور ناتواں اور مرجھلے۔ واپسی کے ۱۵ دن بعد ہی میرا زنان خانے میں آنا جانا بند کردیا گیا۔ میں جوان سمجھا گیا باوجود چودھرائن کی ضد کے چودھری صاحب نے اب مجھ سے پردہ کرانا ہی مناسب سمجھا۔ میں باہر آگیا اور بیرونی کام کرنے لگا۔ باہر بھی میری قدر و منزلت بڑھ گئی۔ سارے پلنے خدمتگاروں میں میں سب سے زیادہ محنتی ثابت ہوا۔

دو ماہ بخیر و خوبی گزر گئے میں اب بھی ماسٹر صاحب سے برابر پڑھتا رہا۔ وہ اب مجھے انگریزی کی غیر نصابی کتابیں دینے لگے۔ صاحبزادوں کی تعلیم کے وقت مجھے اپنی ڈیوٹی پھر بھی دینا پڑتی تھی۔

دو ماہ گزرنے کے بعد یونیورسٹی سے میرا نتیجہ چودھری صاحب کے بیٹے پر ڈاکیا لے کر آگیا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے امتحان کے پرچوں میں اپنا صحیح پتا لکھ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ میری تباہی کا باعث بن جائے گا۔ وہ خط چودھری صاحب کے ہاتھ میں پہونچا۔ چودھری صاحب چونکہ

بلوا کر خط پڑھوایا گیا تو چودھری صاحب کا غصہ ایکدم آسمان پر پہونچ گیا۔ میں یونیورسٹی بھر میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تھا چودھری صاحب نے نہایت غصے میں مجھے بلایا اور کہا۔

" کیوں بے جمن اب تیری یہ مجال ہوگئی کہ تو امتحان پاس کرے اور بالو بنے۔ حرامزادے تو اپنی اوقات بھول گیا!"

میں نے کہا۔ "حضور یہ تو کوئی ناراضگی کی بات نہیں ہے آپ کے ٹکڑے کھا کر اگر میں کوئی عزت حاصل کرلوں تو اس میں حرج کیا ہے"۔

میرے خوشامدانہ جملوں نے بھی ان پر کوئی اثر نہیں کیا اور وہ گرج کر بولے۔

"حرامخور تو نے کتابیں کہاں سے پائیں تجھے پڑھایا کس نے؟ اور تیری فیس کس نے بھری؟"

میں کیا کہتا۔ مجبوراً میں نے کہا۔

میں نے ماسٹر صاحب سے پڑھا ہے۔ کتابیں بھی انھوں نے ہی مجھے دی ہیں اور فیس بھی انھوں نے اپنے پاس سے بھری ہوگی مجھے نہیں معلوم"۔

وہ بولے۔

جبھی میرے لڑکے ابھی تک نہیں پڑھ پائے۔ وہ تجھے پڑھاتے رہے، میرے لڑکوں پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ بھی حرام خور نکلے اور تو تو سب سے زیادہ حرام خور نکلا۔ تو میرے لڑکوں سے بڑھکر بننا چاہتا ہے۔ کہاں ہیں وہ ماسٹر صاحب بلاؤ۔

اتفاق سے ماسٹر صاحب ایک ماہ کی چھٹی پر گئے ہوئے تھے ان کے نہ ملنے پر چودھری صاحب نے کہا۔

" تمہاری سزا یہ ہے کہ فوراً یہ گاؤں چھوڑ دو اور نکل جاؤ تم کو ایک پیسا بھی نہیں ملے گا اور نہ کوئی سامان۔ جاؤ اور بالو گیری کا کمال دکھاؤ۔ نکلو۔ کوئی ہے!!"

دو خدمتگار آگے بڑھے جن کو دیکھ کر چودھری صاحب نے غصہ سے کہا۔

" اس نمک حرام کو اسٹیشن لے جاکر بلاٹکٹ ریل میں بٹھا دو خبردار بھاگنے نہ پائے اور خبردار اس کے ساتھ کوئی سامان نہ جانے پائے نہ بستر، نہ کپڑے، اور ہاں اسکی تلاشی لے کر اگر کوئی پیسا اسکی جیب میں ہو تو چھین لو"۔

میری تلاشی لی گئی۔ میرے پاس تھا کیا۔ تنخواہ تو ملتی نہیں تھی، چوری میں کرتا نہ تھا۔

پہونچے۔ اتفاقاً گاڑی کا وقت بھی تھا۔ انھوں نے ایک ڈبے میں مجھے بٹھادیا۔ ان میں سے ایک نے دو روپے مجھے دیتے ہوئے کہا:۔

بیٹا اس کو رکھ لو۔ کام آئیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھیں بے خطا نکالا گیا ہے۔

میں نے بادل ناخواستہ وہ دو روپے رکھ لئے۔ ٹرین چل پڑی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ریل کہاں جارہی ہے سب سے زیادہ پریشانی بلاٹکٹ ہونے کی تھی گاڑی غالباً ڈاک تھی کئی کئی اسٹیشن چھوڑکر رک رہی تھی۔ یہاں تک کہ ساری رات گزر گئی۔ صبح جب گاڑی ایک بڑے جنکشن پر رکی تو ایک داڑھی والے ٹی ٹی آئی ڈبے میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی اور مجھے دیکھتے ہی کہا۔

" باہر آجاؤ۔ تم بلاٹکٹ معلوم ہوتے ہو"۔

میں باہر آگیا۔ میرے اترتے ہی گاڑی نے وسل دی اور روانہ ہوگئی وہ مجھے لئے ہوئے گیٹ پر آئے اور بولے۔

" باہر نکل جاؤ صورت سے شریف معلوم ہوتے ہو پولیس میں دے کر کیا کروں"۔

میں باہر نکل گیا اسٹیشن غالباً شہر کے اندر ہی تھا باہر نکلتے ہی مجھے بھرا پرا بازار نظر پڑا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی میں ایک ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ جا بجا میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں ایک خالی میز پر بیٹھ گیا اور میں نے اپنی جیب کے پیش نظر ایک کپ چائے اور دو بسکٹوں کا آرڈر دیا۔

یکایک سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے تین آدمی لپکتے ہوئے میرے پاس آئے اور برابر کی کرسیوں پر بیٹھ گئے یہ تینوں خوش پوشاک اور درمیانے قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے دو معمر اور ایک نوجوان تھا۔ نوجوان نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

" ارے بھیا جمیل تم یہاں کہاں۔ کب آئے؟"

میں نے حیرت سے کہا۔

" جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام جمیل نہیں جمن ہے"۔

انھوں نے کہا: "یار کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ تم سلطان بھیا کے بیٹے ہو میں پہچان گیا ہوں۔ آخر ایسی

بھی کیا دشمنی ہے کہ سلطان بھیا نے تم کو یہاں بھیجتے ہوئے عزیزوں کا پتا نہیں دیا۔"

میں نے کہا۔" جناب والا میں بخدا کہتا ہوں کہ آپ غلط فہمی میں ہیں۔ میں سلطان صاحب سے بھی ناواقف ہوں۔ آپ یقین کیجئے۔"

وہ بولے:" تم لاکھ جھوٹی قسمیں کھاؤ مجھے یقین نہیں آسکتا۔ چلو چلو گھر چلو۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ تم یہاں آؤ اور عزیزوں میں نہ ٹھہرو۔"

ان دو معمر صاحبان نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں حیران رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے میں خاموش رہا۔ چائے آتے ہی میں نے چائے پینا شروع کردی۔ ان صاحبان کی بھی تواضع کی لیکن وہ چائے پی چکے تھے۔ چائے کا بل اس نوجوان نے بہ اصرار خود ادا کیا اور مجھے زبردستی ساتھ لے کر ایک تانگے پر بیٹھ گیا۔ دونوں معمر صاحبان بھی ہمراہ رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے مگر تن بہ تقدیر چلتا رہا۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ تانگا تقریباً ایک فرلانگ چلنے کے بعد کچھ گلیوں میں مڑا اور ایک گلی کے آخر میں ایک مکان کے پاس ٹھہر گیا۔ یہ مکان بے حد پرانے قسم کا تھا۔ غالباً شاہی زمانے کی یادگار تھا۔ بڑا سا دروازہ کھلتے ہی اندر ایک چھوٹا سا احاطہ نظر آیا جس کے جھاڑ جھنکاڑ صاف بتا رہے تھے کہ مدتوں سے یہاں کوئی رہتا نہیں ہے۔ اسی جھاڑ جھنکاڑ میں اس مکان کا دروازہ نظر پڑا جس کی سیڑھیاں پتھر کی تھیں اور دروازے میں زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ میں حیران حیران یہ نظارہ کرتا رہا۔ دنیا کا تجربہ نہ ہونے پر بھی مجھے کچھ پراسراریت نظر آرہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں ان لوگوں کے واسطے قطعی اجنبی ہوں۔ یہ کیوں مجھ سے زبردستی شناسائی ظاہر کر رہے ہیں۔ مجھے کیوں لائے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آرہا تھا کہ میرا نقصان کیا ہے۔ میری کوئی منزل نہیں ہے۔ میرا مقصد حیات صرف پیٹ پالنا اور کہیں رہ پڑنا ہے۔ میں جسم کا توانا اور بے حد مضبوط تھا۔ باوجود عمر ۱۵ سال ہونے کے میں ۱۸۔ ۱۹ سال کا کڑیل جوان لگتا تھا۔ خوف اور ڈر سے قطعی ناآشنا تھا۔ تنہائی، کم آمیزی اور خاموشی طبعی کے باعث مجھ میں ایک قوت موجود تھی جس کا نام اطمینان تھا۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نوجوان نے دروازے کا قفل کھولا۔ کچھ دیر اندر کی بند ہوا کے نکلنے کا انتظار کیا

اور پھر مجھے اندر لے کر داخل ہوا۔ یہ ایک ڈیوڑھی تھی جس میں بند ہوا کے باعث حبس کی کیفیت تھی۔ ڈیوڑھی سے گزر کر مجھے ایک بہت بڑا صحن نظر پڑا جس کے چار جانب دالان در دالان تھے۔ سامنے کی طرف دالان کے بعد ایک بڑا کمرہ تھا۔ وہ کمرہ مقفل نہیں تھا۔ صرف دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ وہ کمرہ کھلا اندر سے کافی سجا سجایا تھا، لیکن تمام سجاوٹ پرانے قسم کی تھی۔ ایک طرف ایک مسہری بچھی ہوئی تھی جس میں قیمتی قسم کا قالین بچھا ہوا تھا۔ چھ عدد پتلے پتلے تکئے سرہانے رکھے ہوئے تھے۔ اسی مسہری سے ملا ہوا تختوں کا ایک بڑا چوکا تھا جس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ صدر میں ایک زرنگار مسند تھی اور ایک زرنگار گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا دیواروں پر پرانے قسم کے دیواری لیمپ آویزاں تھے۔ اس نوجوان اور ان معمر آدمیوں نے ایک دستی جھاڑو لے کر تختوں کا چوکا اور مسہری جھاڑی۔ محض گرد تھی۔ اس نوجوان نے مجھ سے کہا۔

بھیا جمیل یہاں آرام سے بیٹھو اور جب تک جی چاہے قیام کرو۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے، میں ابھی تمہارے لئے کھانا لے کر آتا ہوں۔

میں نے کہا۔

" جناب والا۔ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، میرا نام جمیل نہیں جمن ہے۔ میں ایک غریب لڑکا ہوں اور ملازمت کی تلاش میں نکلا ہوں۔"

وہ بولا:۔" اجی اب بے وقوف بنانا چھوڑو۔ میں تم کو پہچان گیا ہوں۔ تم کو بہر نوع یہاں ٹھہرنا ہے خواہ تم جمیل ہو یا نہ ہو۔"

میں خاموش ہو رہا۔ وہ دونوں معمر آدمی میرے پاس ہی بیٹھے رہے، وہ نوجوان چلا گیا، جس کا نام بعد میں مجھے سلیم معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر میں سلیم کھانا لے کر پلٹا ایک سینی میں سالن۔ دال۔ چاول اور کھیر تھی۔ میں رات سے بھوکا تھا۔ میں نے ان تینوں کے ساتھ خوب سیر ہو کر کھایا کھانے کے بعد جب میں نے پھر سلیم کی غلط فہمی دور کرنا چاہی تو وہ بولا:۔

" اس مسئلے پر میں کچھ نہ سنوں گا۔ تم میرے قریبی عزیز ہو اور جب تک تم کو ملازمت نہیں مل جاتی تم کو یہیں قیام کرنا ہوگا۔ میں جو کچھ دال دلیا ہوگا پیش کر دیا کروں گا

اب سو جاؤ۔ دوپہر ہو چکی ہے، موسم گرم ہو گیا ہے اور لو چلنا شروع ہو گئی ہے۔"

میں چار و ناچار قسمت پر شاکر ہو کر خاموش ہو گیا اور اسی مسہری پر لیٹتے ہی سو گیا۔ میری آنکھ قریب ۵ بجے شام کو کھلی۔ ان دو معمر آدمیوں میں سے مجھے ایک آدمی تختوں پر سوتا ہوا ملا۔ دوسرا غالباً میرے سونے کے بعد چلا گیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مجھے تنہا دیکھ کر بولا:۔

"کیا دُلّے میاں چلے گئے"

میں نے کہا۔

" اگر آپ کی مراد دوسرے صاحب سے ہے تو وہ کہیں نظر نہیں آرہے ہیں غالباً چلے گئے"

وہ صاحب یہ سن کر ایکدم سے اٹھ بیٹھے اور بولے:

" یہ اچھا ہوا کہ دُلّے میاں چلے گئے۔ میں صبح سے اس کوشش میں تھا کہ کسی صورت سے تنہائی ملے تو میں تم کو حالات سے باخبر کروں۔ تم بڑی جان جوکھم میں پھنسنے والے ہو جس طرح بھی ممکن ہو یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

میں نے کہا:" اس کا اندازہ تو مجھ کو بھی ہے کہ ایک عجیب غلط فہمی کی بنا پر میں یہاں روکا گیا ہوں لیکن کسی مصیبت کا اندازہ مجھے واقعی نہیں ہے۔"

وہ بولے:" میاں جمن! غلط فہمی کوئی نہیں ہے، تم کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے، تم سے زبردستی کی ملاقات اور زبردستی کی عزیز داری کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ ان کا اس میں ایک بڑا مقصد ہے۔"

میں نے کہا:" اگر زحمت نہ ہو تو بیان کیجئے۔"

وہ بولے:۔" ابھی وقت ہے سات بجے شام سے پہلے سلیم اور دُلّے میاں پلٹیں گے نہیں، وہ لوگ لڑکی لینے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ مجھ سے ان کو یہ امید ہی نہیں کہ میں تم کو خبردار کردوں گا۔ اس لئے مجھے تمہاری نگرانی کے لئے چھوڑ گئے ہیں میں پھر تم سے کہتا ہوں ابھی وقت ہے تم بھاگ کر اپنی جان بچا لو ورنہ بڑی مصیبت کا شکار ہو جاؤ گے۔

میں نے کہا:۔

" بھاگ جاؤں۔ کہاں بھاگ جاؤں۔؟ میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے مجھے دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ آپ مہربانی کر کے مجھے پورا بتا دیں۔ مجھے جانا تو ہے ہی، اگر واقعی کوئی مصیبت

ہے تو میں یقینی چلا جاؤں گا۔"

اس شخص کے اصرار میں بھی کوئی چھپا ہوا مقصد رہا تھا۔

بولا: "میاں اگر تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو مجھ سے لو میں ابھی دیے دیتا ہوں، تم کہیں ساڑھے ۶ بجے ایک گاڑی نیلم نگر کو جائے گی اس پر میں بہانہ کردوں گا کہ میں پاخانہ کرنے گیا ہوا تھا چلیے۔"

اس کی یہ بات اور بھی شکوک نظر آئی، میں نے کہا۔ "کرم پورا واقعہ بیان کیجئے ابھی تو ساڑھے چھ بجنے میں وقت ہے۔"

بولے: "معاملہ یوں ہے کہ یہ حویلی دُتے میاں کی ہے انکے بھتیجے ہو۔ دُتے میاں کے علاوہ اس حویلی کے تھوڑی سی جاگیر بھی ہے۔ یہ حویلی دُتے میاں کے سگڑدادا شاہی زمانے میں اس قصبے میں جو کبھی شاہی قلعہ تھا قلعدار تھے اور بے حد ظالم و جابر آدمی تھے۔ انھوں نے آدمیوں کو اسی حویلی کے ایک تہ خانے میں قتل کیا۔ انکا ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ اس لڑکی پر اس ایک نامی گرامی پہلوان عاشق ہوگیا اس نے جب صاحب کی لڑکی کے لیے پیغام بھیجا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

بولے: "پھر کیا ہوا۔ قلعہ دار صاحب اس پہلوان سے ڈرتے تھے اس لیے کہ اس کے مقابلے میں کوئی بہادر اور طاقتور ان کی ساری فوج میں نہ تھا۔ اسی دھوکے سے انھوں نے اسکا پیغام قبول کرلیا۔ لیکن یہ انکی چال تھی بارات لے کر اسی حویلی میں آیا۔ نکاح سے پہلے باراتیوں کو شربت پلایا گیا اس میں بے ہوشی کی کوئی دوا ملی ہوئی تھی۔ اس کو پیتے ہی پہلوان اور اسکے باراتی بے ہوش ہو گئے۔ بے ہوشی کے عالم میں ان سب کو قید کرلیا گیا اور ان کے سامنے ہی لڑکی کا نکاح ایک دوسرے سردار سے کردیا گیا جو سپہ سالار تھا۔"

میں نے کہا: "پھر کیا ہوا۔"

وہ بولا: "پہلوان اور باراتی قید کی حالت میں نکاح کے منظر کو دیکھتے رہے۔ نکاح کے بعد ایک ایک باراتی اس پہلوان کے سامنے تہ خانے میں قتل کیا گیا۔ اس پہلوان کا نمبر آخری تھا۔ قتل ہونے سے پہلے پہلوان نے کہا۔

"اپنے قتل ہونے کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہے قلعہ دار صاحب لیکن یہ یاد رکھیے کہ میرے مرنے کے بعد میرا بھوت آپ کو آپ کے بعد آپ کی اولاد، اور اولاد در اولاد سے انتقام لیتا رہے گا۔ آپ کی اس لڑکی اور اس کے بعد آپکی اولاد میں جب کسی لڑکی کی شادی ہوگی تو اسکا شوہر میرے انتقام کا شکار ہوتا رہے گا۔"

قلعہ دار صاحب نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔ "اگر میری اولاد میں ہونے والی لڑکی کی شادی نہ کی جائے تو...؟"

وہ بولا: "۱۵ سال کی عمر ہوتے ہی اگر لڑکی کی شادی نہ کی گئی تو وہ لڑکی اندھی ہوجائے گی اور آپ کے خاندان پر ایسی بلائیں نازل ہوں گی کہ آپ کی روح قبر میں آرام نہ پائے گی۔"

میں نے کہا:

"عجیب بات ہے!"

وہ بولے "عجیب سے عجیب تر۔ قلعہ دار صاحب نے اسکی اس بات کو بکواس سے زیادہ نہ سمجھا اور اسکو قتل کرادیا۔ اسی رات اس پہلوان کے بھوت کی بات سچ نظر آئی۔

وہ سپہ سالار جس کی شادی ہوئی تھی صبح کو دلہن کے پہلو میں مردہ پایا گیا اور سب سے زیادہ حیرت خیز بات یہ دیکھی گئی کہ اس سپہ سالار کے تمام بال سفید ہوگئے تھے اور باوجود اسکی نوعمری کے اس کی مونچھیں اور داڑھی بھی نمایاں نظر آئیں جو بالکل سفید تھیں۔"

میں نے حیرت سے کہا:

"لاش کے داڑھی اور مونچھیں نکل آئیں اور کل بال سفید!"

وہ بولا: "ہاں بھیا۔ اور اس دن سے یہ واقعہ آج تک ہوتا چلا آرہا ہے۔ قلعہ دار کی بیٹی تاعمر بیوہ بیٹھی رہی۔ قلعہ دار کے بعد اسکا بیٹا قلعہ دار ہوا، اس کے بھی دو اولادیں ہوئیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکی پندرھواں سال لگتے ہی مکمل عورت ہوگئی اور جب ۱۵ سال کی عمر میں اسکی شادی کی گئی تو اس کے شوہر کا بھی وہی حال ہوا اور قلعہ داری بھی شاہی حکم سے چھوٹ گئی محض جاگیرداری رہ گئی۔"

میں نے کہا۔

"یعنی وہ بھی پہلی رات ہی مرگیا، اس کے بال بھی سفید ہوگئے۔ اور قلعہ داری بھی جاتی رہی۔"؟

وہ بولا۔ "ہاں اس کے بعد دُتے میاں کے دادا جاگیر دار ہوئے۔ انکی بھی دو اولادیں ہوئیں۔ ایک دُتے میاں کے باپ اور پھوپھی۔ دُتے میاں کے باپ تاکر میاں نے اپنی لڑکی کی شادی نہ کی۔ ۱۵ سال کی عمر میں وہ بھی جوان ہوگئی تھی۔ پندرہ سال ہوتے ہی لڑکی ایک دم نابینا ہوگئی اور یہی نہیں بلکہ اس پر فالج کا اثر بھی ہوگیا۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ "ارے"!

وہ بولے۔ "ہاں بھیا۔ یہی نہیں بلکہ جاگیر پر بھی تباہی آگئی ساری فصلیں ٹڈیوں کی نذر ہوگئیں۔ لگان کی ادائیگی، اور اخراجاتِ خانہ کے سلسلے میں جاگیر کا آدھا حصہ بکا۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا"

انھوں نے کہا: اس دن سے اس گھر پر آفتوں کی بھرمار شروع ہوگئی مجبوراً جاگیر کے حصے بکنا شروع ہوگئے یہاں تک کہ دُتے میاں کا دور آگیا۔ دُتے میاں کے والد نے ایک نکاح خفیہ کرلیا تھا جس سے سلیم کے والد ہوئے تھے لیکن انکو خاندان میں کسی نے قبول نہیں کیا، وہ غربت ہی کے عالم میں سلیم کو چھوڑ کر مرگئے۔ دُتے میاں نے سلیم کو لے کر پال لیا۔"

(اس کے بعد کی داستان آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے)

مشرقی بنگال تاریخ کے آئینے میں

جنید عالم ـ مظفرپوری

آج سارا مشرقی بنگال خود مختاری کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ اب تک لاکھوں لوگ موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ لیکن ان لاکھوں سرفروشوں کی قربانیوں اور ان گنت مصائب کے باوجود بھی مشرقی بنگال کے عوام ڈکٹیٹر حکومت سے نبرد آزما ہیں۔

مشرقی بنگال میں بغاوت کی یہ آگ کوئی نئی نہیں ہے۔ صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں بھی شدید مظاہرے ہوئے تھے۔ سرکاری احکامات کی خلاف ورزیاں کی گئی تھیں۔ عمارتوں کو خاکستر کیا گیا تھا۔ ریلوے لائنوں کو اکھاڑا گیا تھا۔ لیکن کیا صدر ایوب خاں نے بھی یحییٰ خاں کی طرح کوئی وحشیانہ قدم اٹھایا تھا؟ ان کے ہاتھ میں بھی یحییٰ خاں کی طرح فوجی قوت تھی۔ وہ بھی اپنے مخالفین کو فوجی قوت سے سرنگوں کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے تدبر سے کام لیتے ہوئے اپنے مخالف پاکستانیوں کو فوجی قوت سے نہیں دبایا بلکہ خاموشی سے صدارت کا منصب یحییٰ خاں کو تفویض کر کے عہدے سے دستبرداری اختیار کر لی۔

اس کے برخلاف صدر یحییٰ خاں نے مشرقی بنگال کی سول نافرمانی کی تحریک سے برانگیختہ ہو کر اور حسبِ مرضی معاملات طے نہ ہونے کی بنا پر ۲۵ مارچ سے اپنے ملک کے ایک حصے میں ایسا خونی ڈراما کھیلنا شروع کیا جس میں اب تک بے شمار لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور ۹۰ لاکھ سے زیادہ لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں آج میں یحییٰ خان کے ظلموں کی داستان سنانے نہیں جا رہا ہوں بلکہ میں اس مضمون میں مشرقی بنگال کی واقعات نئی دہلی

قدیم مسلم تاریخ پر روشنی ڈالنے کی سعی کروں گا تاکہ قارئین یہ جان لیں کہ ابتدا میں مسلمانوں نے کس زمانے میں اس پر قبضہ کیا تھا۔ تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محمد بن بختیار خلجی کے حملے سے قبل تقریباً ۱۶ ہندو راجاؤں نے لگ بھگ ساڑھے چار ہزار سال تک مشرقی بنگال پر حکمرانی کی ہے۔

اسلامی تاریخ میں بنگال کو فتح کرنے والا سب سے پہلا شخص جرنیل محمد بن بختیار خلجی تھا۔ یہ سلطان شہاب الدین کے دورِ حکومت میں جرنیل کے عہدے پر فائز تھا۔ قطب الدین ایبک اس وقت سلطان شہاب الدین غوری کی جانب سے نائب السلطنت تھا۔ اسی زمانے میں قطب الدین ایبک کو بہار و بنگال کی تسخیر کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ بختیار خلجی نے ۱۱۹۷ء میں دو سو سواروں کے ساتھ پہلے بہار پر حملہ کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس نے بہار پر فتح و نصرت کا جھنڈا نصب کر دیا۔ اس کے بعد جلد ہی اس نے بنگال کو بھی فتح کر کے دہلی کی مرکزی حکومت سے ملحق کر دیا۔ بختیار خلجی کے اس عظیم کارنامے پر اسے اعلیٰ درجے کا خلعت عطا کیا گیا اور بنگال و بہار کا حاکم بھی اسی کو بنا دیا گیا۔

قطب الدین ایبک کو سب سے زیادہ خوشی بنگال کی تسخیر پر ہوئی کیونکہ یہ سب سے بڑی اور مضبوط حکومت تھی۔ لیکن اس بات سے آپ کو سخت حیرانی ہوگی کہ خلجی نے بنگال جیسی ریاست کو صرف اٹھارہ آدمیوں کے ذریعے فتح کیا تھا۔ اس نے کس طرح فتح حاصل کی اس کی کہانی آپ بھی سماعت فرمایئے۔

محمد بن بختیار خلجی نے بنگال پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک فوج تیار کی۔ فوج کی تیاری کے بعد اس نے بنگال کی راجدھانی ندیا کی طرف رخ کیا۔ نکلا تو اس برق رفتاری سے کہ ساری

فوج پیچھے رہ گئی۔ صرف اٹھارہ آدمی خلجی کے ہمراہ تھے۔ اسی طرح وہ راجا رائے لکشمن کے قلعے کے پاس پہنچ گیا۔ فوج کا انتظار کئے بغیر اس نے قلعے کے محافظوں پر حملہ کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ راجا اس کے ساتھیوں کی قلیل تعداد کا کوئی خیال نہ کرے گا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ بہت بڑی فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا ہے تبھی تو اس بہادری سے حملہ کر رہا ہے اور اسکا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔

حملے کے وقت راجا رائے لکشمن قلعے کے اندر کھانے میں مصروف تھا۔ باہر سے لوگوں کی چیخ پکار جب اس کے کانوں میں پہونچی تو حواس باختہ ہو کر محل کے عقبی دروازے سے فرار ہو گیا اور راجہ کی ساری فوج نے بغیر کسی مزاحمت کے ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں خلجی پورے بنگال پر قابض ہو گیا۔ اب خلجی بنگال اور بہار دونوں کا حاکم تھا لیکن اس کے باوجود بنگال کے حاکم برائے نام ہی مرکزی حکومت کے وفادار رہے۔

بنگال کے حاکموں کی خودسری جب حد سے تجاوز کر گئی تو بادشاہ غیاث الدین بلبن کو ان کی سرکوبی کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ غیاث الدین بلبن نے اپنے فرزند بغرا خان کو بہار و بنگال کا حاکم نامزد کیا اور بنگال و بہار کے خود مختار حکمراں طغرل خان کو سخت سزا دی۔ بغرا خاں کے بعد اس کے جانشین زمانہ دراز تک بنگال و بہار پر حکمرانی کرتے رہے لیکن وہ بھی تقریباً خود مختار ہی رہے۔

مذکورہ بالا سطور پڑھنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں بنگال و بہار کے جتنے بھی حکمراں ہوئے ان سبھوں میں خود مختاری کا جذبہ کار فرما تھا۔ اس لئے وہ کبھی بھی مرکزی حکومت کے فرمانبردار نہیں رہے۔

سلاطین خلجی اور غیاث الدین تغلق کے دورِ حکومت تک تو بنگال کے حاکموں نے زبانی اطاعت میں کوئی کمی نہیں کی مگر سلطان محمد تغلق کی حکومت میں زبانی اطاعت نام کی بھی کوئی شے نہ رہی۔ سلطان محمد تغلق کے دورِ حکومت میں بنگال کا حاکم قدر خاں تھا لیکن اس کے انتقال کے بعد اسکے نائب فخر الدین نے ۱۳۴۰ء میں بنگال پر قبضہ کر کے مکمل خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنا دارالسلطنت سنارگاؤں کو بنایا لیکن فخر الدین چند ہی سال حکومت کر سکا کیونکہ بنگال کی حکومت کا ایک دوسرا دعویدار پیدا ہو گیا تھا۔ اس شخص کا اصلی نام ملک الیاس تھا لیکن اس نے اپنا لقب شمس الدین اختیار کر کے فخر الدین پر حملہ کر دیا۔ اور جنگ میں فخر الدین کو شکست دیکر خود بنگال کا خودمختار بادشاہ بن بیٹھا۔ اس طرح شمس الدین بہار و بنگال کا اوّل خودمختار بادشاہ ہوا جس نے ۱۳۴۰ء میں مرکزی حکومت سے بغاوت کر کے اپنی ایک آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ ۱۶ برس بڑی بےفکری سے حکومت کرنے کے بعد ۱۳۵۷ء میں شمس الدین اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا لیکن اس کے دورِ حکومت میں ایک بار بھی مرکزی حکومت نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ البتہ فیروز شاہ تغلق نے ایک بار بنگال پر حملہ کر کے اسے شکست دی تھی۔ لیکن فیروز شاہ تغلق کے بنگال سے واپس جاتے ہی وہ پھر برسرِ اقتدار آ گیا۔

سلطان شمس الدین کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سکندر شاہ تخت نشین ہوا۔ سکندر شاہ کے بعد غیاث الدین بادشاہ بنا۔ اس کے بعد سلطان السلاطین تخت پر بیٹھا۔ سلطان السلاطین کے انتقال کے بعد اس کے خوردسال بیٹے سلطان شمس الدین نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسکا نگران کینس نامی ایک ہندو مقرر ہوا۔ ۱۳۸۶ء میں سلطان شمس الدین بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ سلطان کی وفات کے بعد کینس ہی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کینس پوری طرح بنگال کی حکومت پر چھایا ہوا تھا نیز عوام کو بھی کینس کے راجا بننے پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ کینس نام کا ہندو تھا، اس کے عقائد بڑی حد تک اسلامی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ سات سال حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا تو اسکی تجہیز و تکفین اسلامی ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ کینس کا لڑکا جیت مل تو پکّا مسلمان تھا۔ اسکا لقب جلال الدین تھا۔ کینس کے انتقال کے بعد وہی تخت نشین ہوا۔ تقریباً ۱۰ برس حکومت کرنے کے بعد جلال الدین اللہ کو پیارا ہو گیا۔ چنانچہ ۱۴۳۱ء میں اس کا لڑکا سلطان احمد تخت پر بیٹھا۔ لیکن سلطان احمد کے بعد سابق شاہی خاندان کے ایک فرد ناصر الدین کو بنگال کا حکمراں بنایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان احمد کی کوئی اولاد نہ تھی۔ جب ناصر الدین بھی ۱۴۲۸ء میں انتقال کر گیا تو اس کے لڑکے باربک شاہ نے بنگال کی باگ ڈور سنبھال لی باربک شاہ کے انتقال کے بعد یوسف شاہ۔ سکندر شاہ اور سلطان فتح شاہ نے بھی حکومت کی۔

سلطان فتح شاہ کے دورِ حکومت میں خواجہ سراؤں اور حبشیوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں چنانچہ یہ بادشاہ خواجہ سراؤں کے ایک سردار کے ہاتھوں قتل ہوا اور خواجہ سراؤں کے سردار نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ لیکن بھلا حبشی قوم کب خاموش رہنے والی تھی۔ حکومت سنبھالنے کے چند ہی روز بعد ملک اندیل حبشی نے خواجہ سراؤں کے سردار کو قتل کر دیا اور خود اقتدار پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد کئی حبشی تخت نشین ہوئے۔ حبشیوں کا آخری بادشاہ شیدی بدر تھا۔

۱۵۵۸ء میں پہلا بنگالی بادشاہ امیر محمود بنگالی تخت نشین ہوا۔ اس نے ۱۸ برس حکومت کی لیکن جب شیر شاہ سوری حملہ آور ہوا تو حکومت چھوڑ کر ہمایوں کے پاس بھاگ گیا۔ شیر شاہ کے امرائے سلطنت میں سے سلطان بہادر نے ۱۵۷۶ء میں بنگال پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ بھی زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکا۔ سلیمان کرانی نامی ایک شخص سلطان بہادر کی حکومت کا تختہ الٹ کر خود حکمراں بن بیٹھا۔

بنگال کے خودمختار بادشاہوں کا خاتمہ ۱۵۷۷ء میں اس وقت ہوا جبکہ سلیمان کرانی کے لڑکے داؤد خان کو اکبری لشکر نے تخت سے اتار کر بنگال کو مغلیہ حکومت سے ملحق کر دیا تھا۔

۱۳۴۰ء سے ۱۵۷۷ء تک (تقریباً ڈھائی سو برس) جتنے بھی بادشاہوں نے بنگال پر حکومت کی ان سبھوں میں خودمختاری کا جذبہ کارفرما تھا۔

راقم الحروف کے اس مضمون کا مقصد بھی یہی ہے کہ قارئین یہ جان لیں کہ مجیب الرحمٰن نے جو آج خودمختاری کا نعرہ بلند کیا ہے یہ بنگال کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ تاریخ گذشتہ واقعات کو دہرا رہی ہے۔

اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے تک تو بنگال مغلیہ حکومت کے ماتحت رہا لیکن اس کے بعد انگریزوں نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔ قاسم بازار اور کلکتے میں انگریزوں نے قلعے تعمیر کر لئے تھے۔ محبِ وطن سراج الدولہ سے انگریزوں کا اس طرح بڑھ جانا نہ دیکھا گیا۔ چنانچہ سراج الدولہ نے انگریزوں کو کلکتے اور قاسم بازار سے نکالنے کے لئے تحریک چلائی یہ تحریک کچھ ہی دنوں کے بعد جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو انگریزوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ جنگ میں انگریز فتحیاب ہوئے اور سراج الدولہ قتل کر دیا گیا۔

سراج الدولہ کے بعد بنگال میں کئی نام نہاد بادشاہ تخت نشین ہوئے مگر یہ سب نام کے بادشاہ تھے۔ اس کے بعد انگریزوں نے نام نہاد مغل بادشاہ، شاہ عالم سے ۳۶ لاکھ روپے سالانہ پر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی مختاری حاصل کر لی۔

بنگال بہار اور اڑیسہ کے مختارِ مطلق بننے کے بعد انگریز رفتہ رفتہ پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے لیکن دن بدن انکی حکومت مستحکم ہونے کی بجائے کمزور ہی ہوتی چلی گئی۔ آخر ۱۹۴۷ء کو انگریز ہندوستان سے چلے گئے لیکن جاتے جاتے ہندوستان کو دو حصّوں میں بانٹ گئے۔ ایک حصّہ ہندوستان اور دوسرا حصّہ پاکستان کے نام سے موسوم ہوا۔

ملک کی اس تقسیم کے وقت بنگال کو بھی دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ مغربی بنگال۔ اور مشرقی بنگال۔ مغربی بنگال ہندوستان کے حصّے میں آیا اور مشرقی بنگال پاکستان میں چلا گیا۔

آج اسی مشرقی بنگال میں خودمختاری اور آزادی کی تحریک چل رہی ہے۔ پاکستان بھی دو حصّوں میں منقسم ہے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہاں کی کل آبادی ساڑھے سات کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ مغربی پاکستان کی کل آبادی ساڑھے چار کروڑ ہے۔ اس لئے مغربی پاکستان کے حکمراں اس بات کو ذہن نشین کر لیں کہ ۷½ کروڑ کی اکثریت کو ۴½ کروڑ کی اقلیت کے ذریعے سرنگوں کرنا ایک فعلِ عبث ہے۔

واقعات نئی دہلی

ہندوستانی فلم ڈائریکٹر کی سُنہری تمغے سے عزّت افزائی

فلم یادِ وطن کا یاس انگیز احساس پیدا کر رہی تھی اس کا روپ اور انداز پُراثر تھا۔ کیمرے سے گاؤں کی فلم اتاری گئی تھی جو ایک آبائی گھر کے گرد پروان چڑھا تھا۔ کہیں کسی کے چہرے پر اتاری گئی تھی تو کہیں کسی منظر کی۔ اِس سے ایک بصری تاثر دیا جا رہا تھا۔ اس طرح گاؤں اور اُس کے قدیم گھر کے بارے میں ایک خاموش کہانی بیان کی جا رہی تھی۔

یہ فلم تھی آشیانہ جسے اٹلانٹا فلمی میلے میں (جو حال ہی میں اٹلانٹا ''جارجیا'' میں منعقد ہوا تھا) طلائی تمغہ اور اِسکی ڈائریکٹر شمع حبیب اللہ کو خصوصی جیوری اعزاز ملا تھا۔ پروگرام کے مطابق یہ فلم امریکہ میں ٹیلی ویژن پر بھی دکھائی جائیگی۔

مِس حبیب اللہ نے بتایا کہ یہ نہایت ذاتی قسم کی فلم ہے۔ آبائی گھر میرے کُنبے کا ہے اور یہ میرے لئے کچھ معنی رکھتا ہے۔ میں نے اُسے جب چھوڑا تھا تو میں ابھی ایک بچّی تھی۔ میرا کنبہ اب سے انگلینڈ میں مقیم ہے۔ میں کوئی بیس برس کے بعد اپنے آبائی گھر گئی تھی اور اُسی کا نتیجہ یہ فلم ہے۔

فلم آشیانہ مکمل کرنے میں تین برس لگے اور یہ امریکی ادارہ برائے ٹیکنیکی امداد سے تیار کی گئی تھی۔

لندن میں سکولی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مِس حبیب اللہ امریکہ کے ایک کالج میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ ''میں نے اپنی ڈگری کے لیۓ امریکی تاریخ کا نصاب لیا تھا۔ اور ضمنی طور پر صدر ریوللک کے متعلق ایسی کوئی بات نہیں جس کا مجھے علم نہ ہو۔'' لیکن ان دنوں بھی مجھے فلمیں بنانے سے بڑی دلچسپی تھی۔ لہٰذا میں نے یونیورسٹی میں ایک فلم یونٹ شروع کیا۔ اگرچہ یہ محض ایک کوشش تھی لیکن تھی بڑی عظیم الشان۔

فلموں میں اُن کی دلچسپی اُس وقت مزید بڑھی جب وہ اپنے کُنبے کے ایک دوست فلم اداکار سیلوین ڈگلس کے ساتھ قیام کرنے کیلئے نیویارک گئیں۔ ''اِنہی دِنوں میں نے ورجینیا کی جارج واشنگٹن یونیورسٹی کی شاخ ایرلی فاؤنڈیشن میں شمولیت کی۔ فاؤنڈیشن میں سب قسم کی کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ جن کے نتیجے میں تعلیمی فلمیں تیار ہوتی ہیں۔

''ہم نے معیشت کے متعلق ایک فلم تیار کی۔ اُس وقت اِس موضوع کو اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی جتنی اب ہے۔ ہوائی آلودگی کے متعلق ہماری فلم کو واشنگٹن ایمی انعام حاصل ہوا جو ٹی وی کے ''آسکر'' اعزاز کے برابر ہے۔ ہم نے کینسر کی تحقیق اور جراحی سے اعضا لگانے کی فلمیں بھی بنائی ہیں۔''

کسی کام کی سپردگی کے سلسلے میں اُنہیں ہندوستان واپس آنے کا موقع مِلا۔ اُنہوں نے نیویارک میں جیمز آئیوری اور اسمٰعیل مرچنٹ سے مُلاقات کی۔ اور اُن کی ہند امریکی فلموں کی ٹیم ''مرچنٹ آئیوری پروڈکشنز'' میں شامل ہو گئیں۔

مِس حبیب اللہ نے بتایا کہ میں نے اِن دونوں کاموں کے سلسلے میں ہندوستانی فلم سازی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ یہاں فلم سازی کے طریقے امریکی فلم سازی کے طریقوں سے بہت مختلف ہیں۔ سہولیات اور ساز و سامان بھی بہت زیادہ مختلف ہے اور آپ لیبارٹریوں اور ماہروں کی نسبت خود پر زیادہ انحصار رکھنا سیکھتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ان تمام ضابطوں اور ترتیبوں میں سے گذری ہُوں۔

اِس نوعمر ڈائریکٹر کی سب سے بڑی خواہش ہندوستان کی آئندہ ٹیلی ویژن منڈی کے لیۓ تعلیمی فلمیں تیار کرنا ہے۔ لیکن اِس اثنا میں وہ اِشتہاری فلموں میں مصروف ہیں۔ اُنہوں نے مسکرا کر کہا کہ ''میں نے کوکا کولا کے متعلق اپنی فلم کے لئے بھی اعزاز حاصل کیا ہے۔''

مِس حبیب اللہ کی صلاحیتیں اُن کے باصلاحیت کُنبے کی روایات کے مطابق ہیں۔ اُن کی والدہ نامور مصنفہ عطیہ حسین ہیں جن کی تازہ ترین کتاب ''سن لائٹ آن اے بروکن کالم'' (SUNLIGHT ON A BROKEN COLUMN) بھی اُن کے آبائی گھر سے متعلق ہے۔ اُن کے بھائی وارث حسین ہالی وُڈ کے ایک کامیاب فلم ڈائریکٹر ہیں جن کی تازہ ترین فلم میں شرلے مکلین کام کرتی ہے اور جو ایک ناول ''دی پوزیشن آف جول ڈیلینی'' (THE POSSESSION OF JOEL DELANEY) پر مبنی ہے۔

واقعات نئی دہلی

عقل حیران ہے

ہی زندگی کے چند عجیب و غریب واقعات

ماری زندگی میں بعض مرتبہ ایسے عجیب و
واقعات پیش آتے ہیں کہ عقل انسان حیران و
مد رہ جاتی ہے بعض لوگ ان واقعات کو۔
ت پر محمول کرتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں بلکہ
ل یقین ہے کہ ایسے معاملات میں نہ صرف اللہ
کا فضل و کرم اور اس کی مدد شامل حال
ہے بلکہ بسا اوقات وہ ہماری کوتاہیوں،
یوں اور خامیوں پر پردہ ڈال کر ہمیں دنیا کی
ں میں رسوا ہونے سے بھی بچا لیتے ہیں اسی لیے
ریعت کی زبان میں ستار العیوب کہا گیا ہے
زندگی میں بھی چند اسی قسم کے واقعات پیش
مکن ہے ان کا اعادہ قارئین کے لیے دلچسپی کا
ث ہو۔

یں اسٹیشن پر پہنچا تو دور انجن کا دھواں نظر
تھا۔ گاڑی پانچ سات منٹ میں یہاں پہنچنے
تھی لیکن ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ابھی اچھی خاصی
لگی ہوئی تھی اور ٹکٹ خرید نا محال نظر آ رہا تھا۔
لی کے قریب مجھے ایک شناسا نظر آئے، میں جھپٹ کے
کے قریب پہنچا اور انہیں پیسے دیکر کہا کہ ایک
ٹ میرے لیے بھی خرید لیں۔ وہ ٹکٹ لیکر آئے تو فرمانے
کہ ہم دونوں ایک ہی منزل کے مسافر ہیں چلئے
وقت اچھا گزرے گا، ہم دونوں صرف اگلے
اسٹیشن تک جا رہے تھے، جو یہاں سے صرف دس
گیارہ میل کے فاصلے پر تھا ہم نے ٹکٹ تیسرے درجے
کا خریدا تھا اور میرا ٹکٹ بھی انہیں کے پاس تھا۔
ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو گاڑی بالکل قریب آ چکی تھی۔
وہ پیچھے کی طرف جانے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ آئیے
آگے چلتے ہیں اگلے ڈبوں میں راستے کا گرد و غبار ذرا
کم آئے گا۔ ہم اگلے ڈبوں کی طرف جا رہے تھے کہ کسی
نے میرا نام لے کر مجھے پکارا، میرے ایک دوست انٹر
کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھے ہوئے مجھے بلا رہے تھے
میں نے اپنے ہم سفر سے کہا کہ آپ کہیں چل کر بیٹھیں میں
ابھی آتا ہوں، میں ان دوست کے پاس پہنچا تو وہ
دریافت کرنے لگے کہ کہاں جانے کا ارادہ ہے، میں
نے انہیں بتایا کہ اگلے اسٹیشن تک جا رہا ہوں فرمانے
لگے یہیں آ جائیے میں نے کہا ہمارے پاس تھرڈ
کلاس کے ٹکٹ ہیں، کہنے لگے بیٹھ بھی جائیے، کون
پوچھتا ہے، اور پھر سفر ہی کونسا لمبا ہے۔ میں متردد سا
ہوا لیکن انکے اصرار پر انکے ساتھ بیٹھ گیا انسے باتوں
میں ایسا مصروف ہوا کہ میں یہ قطعی بھول گیا کہ میری
حیثیت اب اس مسافر کی سی ہے جو بغیر ٹکٹ لیے
سفر کر رہا ہو، گاڑی چلی تو مجھے اپنی حیثیت کا
احساس ہوا اور وہ بھی اس وقت جب اگلے ڈبوں
کی طرف مجھے ایک ٹکٹ چیکر نظر آیا۔ گاڑی کے ڈبے
ایک ایک کر کے سرکتے رہے اور چیکر صاحب کھڑے
دیکھتے رہے لیکن جونہی ہمارا ڈبہ انکے سامنے آیا وہ
لپک کر اس میں سوار ہو گئے۔ انٹر کلاس کا یہ ڈبہ
جس میں ہم لوگ سفر کر رہے تھے پورا ڈبا تھا اور
اس میں مجھ سمیت سات آدمی موجود تھے، پہلی نشست
پر میں اور میرے دوست اور دو صاحبان بیٹھے
ہوئے تھے جو مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ دوسری
سیٹ پر جو صاحب تشریف فرما تھے وہ مجھے نہیں
جانتے تھے، تیسری سیٹ پر ہمارے اسٹیشن ماسٹر
اور انکے نائب باتوں میں مصروف تھے، یہ حضرات
بھی مجھے بخوبی جانتے تھے میں نے اپنی جیب پر نظر
ڈالی جس میں سات روپے موجود تھے۔ اسکا مطلب
یہ تھا کہ میں پچھلے جنکشن سے اگلے جنکشن کا کرایہ بخوبی
ادا کر سکتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میری عزت
خطرے میں تھی، پانچ چھ واقف حضرات کی موجودگی
میں بغیر ٹکٹ پکڑے جانا یہ ایک ایسا حادثہ تھا جو
مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ پیش آ رہا تھا میں بظاہر
ایک رسالے کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا لیکن
میرا دل اندر ہی اندر شرم سے کٹا جا رہا تھا کہ یہ لوگ
کیا خیال کریں گے، بہرحال ٹکٹ چیکر صاحب نے

۔۔۔نے پہلے مسافر کا ٹکٹ دیکھا پھر ہمارے دوست کی باری آئی، لیکن ہمیں وہ صاحب صاف نظرانداز کر گئے، ہماری بجائے انہوں نے ان صاحب کا ٹکٹ طلب کیا جو درمیانی نشست پر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے ہماری خوش قسمتی ملاحظہ فرمائیے یا ان صاحب کی بدنصیبی کہ ان کے پاس تیسرے درجے کا ٹکٹ نکلا اس ٹکٹ کو دیکھ کر چیکر صاحب فرمانے لگے کہ آپ کا ٹکٹ تیسرے درجے کا ہے اور آپ درمیانہ درجے میں سفر کر رہے ہیں آپ اب اپنا ٹکٹ اسی درجے کا بنوا لیجئے، یہ کہکر متعلقہ کاغذات انہوں نے جیب سے نکالے ایک لمحا انکو ملاحظہ کیا، پھر رقم طلب کی اور ٹکٹ بنانے لگے۔ اسوقت نصف سے زیادہ سفر طے ہو چکا تھا۔ ٹکٹ بنانے کے بعد چیکر صاحب ہمارے اسٹیشن ماسٹر صاحب اور ان کے نائب سے باتیں کرنے لگے۔ پانچ سات منٹ بعد یہ سفر تمام ہوا اگلے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو ہم بھی بڑے اعتماد کے ساتھ چیکر کے ساتھ گاڑی سے اُتر گئے اگرچہ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ واپسی پر ہم نے پہلے سفر کا کفارہ یوں ادا کیا کہ ٹکٹ انٹر کلاس کا لیا اور بیٹھے تھرڈ کلاس میں۔ اتفاق ملاحظہ فرمائیے کہ وہی ٹکٹ چیکر صاحب ہمارے ڈبے میں پھر تشریف لے آئے میرا ٹکٹ ملاحظہ فرمایا تو کہنے لگے "عجیب بات ہے کہ لوگ اب انٹر کلاس کا ٹکٹ خرید کر تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں" میں نے انہیں اپنا قصہ سنایا تو وہ ہنسنے لگے اور فرمانے لگے واقعی میں خود حیران ہوں کہ میں نے آپکو چیک کیوں نہیں کیا؟"

گزشتہ رمضان شریف کا ذکر ہے، میرا قیام ان دنوں بسلسلۂ ملازمت ایک معمولی سے قصبے میں تھا، اس قصبے میں اشیائے ضرورت کی چند دکانیں موجود تھیں۔ دودھ اور گھی بھی ان دکانوں پر مل جاتا تھا لیکن ناقص اور ناخالص پھر ان دکانوں پر صفائی کا نام و نشان تک نہ تھا دیہات میں دودھ اور گھی کیلئے عام شہرت یہی ہے کہ یہ چیزیں شہروں کی نسبت یہاں عمدہ اور خالص مل جاتی ہیں لیکن اس نگری میں اس سہولت کا بھی فقدان تھا۔ اس لیے میں دودھ بجائے بازار سے خریدنے کے یہیں کے ایک زمین دار گھرانے سے منگا لیا کرتا تھا اور کبھی اپنی ضرورت کیمطابق مضافات سے خرید لیتا۔ اس روز دسواں روزہ تھا جب میں فرائض سے فارغ ہوا تو اسوقت پانچ بجنے والے تھے اور روزہ افطار کرنے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ گھی صبح سحری کے وقت ختم ہو چکا تھا لیکن دن میں مجھے بوجہ مصروفیت خیال ہی نہ آیا کہ آج گھی ختم ہو چکا ہے۔ میرے ملازم کو بھی نہ جانے کیا کام آ پڑے تھے کہ وہ بھی اپنے گھر سے ابھی ابھی آیا تھا۔ میں نے اس سے جلدی سے سبزی منگوائی، آٹا گندھوایا اور دودھ لانے کیلئے بھیج دیا ساتھ یہ بھی کہا کہ گھی بالکل ختم ہو گیا ہے اگر کہیں سے اچھا گھی مل سکے تو لیتا آئے۔ تھوڑی دیر میں ملازم واپس آیا اور کہنے لگا کہ گھی تو اچھا ملتا نہیں اور دودھ اسلیے نہیں لا سکا کہ زمین دار کی بھینس بیمار ہے، یہ خبر سنکر تو طبیعت کو بڑی کوفت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں اپنی ناشکرگزاری پر نادم ہوا اور سوچا کہ کیا میں ایک روز وقت روکھا سوکھا کھا کر روزہ نہیں رکھ سکتا جب کہ اللہ کے کتنے ہی بندے ایسے ہیں جنہیں یہ روکھی سوکھی روٹی بھی باقاعدگی سے میسر نہیں۔ میں نے اپنے ملازم سے کہا کہ وہ جلدی سے پہلے روٹی پکالے اور اس کے بعد تھوڑی سی چٹنی بنالے۔ گزارا ہو جائے گا۔ ملازم نے توے پر پہلی روٹی ڈالی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی ملازم دروازہ کھولنے کے لیے باہر گیا جب وہ واپس آیا تو اسکے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔ اسنے پلیٹ میرے سامنے رکھدی، میں نے دیکھا کہ پلیٹ میں بھنا ہوا قیمہ اور مٹر اور دو چپاتیں پڑی ہوئی تھیں، میں نے ملازم سے دریافت کیا کہ کون صاحب تھے کہنے لگا میں نہیں جانتا، میں نے روزہ افطار کیا دونوں چیزیں بڑی مزیدار پکی ہوئی تھیں میں انسے لطف اندوز ہوتا جاتا تھا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا جاتا تھا کہ اس ذات کریم نے غیب سے یہ سامان نعمت بہم پہنچایا، وہ پلیٹ دو دن تک میرے پاس پڑی رہی، تیسرے روز ایک صاحب آئے اور پلیٹ طلب فرمائی، میری انسے ایسی کوئی شناسائی بھی نہ تھی۔ میں نے ہنس کر ان صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے یہ کرم کیسے فرمایا فرمانے لگے کہ ایسے ہی دل میں آگیا تھا ورنہ کوئی خاص بات نہ تھی، میں نے انہیں صورت حال سے مطلع کیا تو وہ بے چارے حیرت زدہ سے ہو گئے۔

سرکاری ملازمت کے قواعد وضوابط کے تحت ایک سرکاری ملازم اس امر کا پابند ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے بعد بھی اپنے اس مقام سے جہاں وہ بسلسلۂ ملازمت تعینات ہے۔ کسی دوسرے مقام کو خواہ عارضی طور پر ہی سہی نقل مکانی نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ افسر مجاز سے اپنے اس اقدام کی اجازت پیشگی طور پر حاصل نہ کرلے، سرکاری ملازم اس اصول کو عموماً توڑتے رہتے ہیں لیکن میں اپنے تمام عرصۂ ملازمت میں اس اصول کا سختی سے پابند رہا تاہم ایک دفعہ مجھے بھی اپنے ایک بچے کی شدید علالت کے پیش نظر یہ اصول توڑنا ہی پڑ گیا، میں اپنے افسر اعلیٰ سے رخصت کی اجازت تو ضرور حاصل کر لیتا لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ میں ٹیلی فون ہی پر ایسا کروں کیونکہ ٹیلی فون کرنیکے وقفے میں میری گاڑی نکل جانے کا خدشہ تھا اور اگلی گاڑی مجھے غیر معمولی تاخیر سے ملتی، خیر میں گھر پہنچا، بچے کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا اب اسکی حالت قدرے اطمینان بخش تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھا تھا کہ مجھے اچانک ایک ایسا کام یاد آگیا جہاں کے میرے ہم محکمہ دفتر سے متعلق تھا۔ میں اس دفتر پہنچا تو وہاں ایسی باقاعدگی کے آثار نظر آئے جو کسی اعلیٰ افسر کی آمد آمد کی خبر دے رہے تھے، میں ذرا آگے بڑھا تو اس دفتر کے سربراہ نظر پڑے، انہوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنے لبوں پر انگلی رکھ لی تاکہ میں چپ رہوں۔ پھر ملحقہ کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور آہستہ سے فرمانے لگے کہ افسر اعلیٰ دورے

ئے ہوئے ہیں اور اندر آرام فرما رہے ہیں۔ نے یہ صورت حال دیکھی تو وہاں سے اسلئے ں لوٹنا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے ان سے کہا ے کی علالت کے سلسلے میں آیا تھا وہ ٹھیک اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں عنقریب والی گاڑی سے واپس چلا جاؤں، اس پر نے لگے چونکہ افسر اعلیٰ ابھی شام کی گاڑی سے تشریف ا رہے ہیں اس لیے میں اس گاڑی سے نہ جاؤں ح سویرے لوٹ جاؤں، مجھے انکے اس مشورے سے طمینان نہ ہوا، اور میں گھومتا ہوا اسٹیشن کی ف چل پڑا، لیکن وہاں پہنچ کر میں نے پھر اپنا پروگرام ل کر لیا۔ گاڑی آئی اور چلی گئی، اب دل نے رام یہ بنایا کہ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ہوا نہر کے پل پر پہنچ جاؤں جو وہاں سے کوئی میل کے فاصلے پر تھا، کچھ دیر وہاں آرام کروں ڈھلتا ہو پھر گھر آجاؤں، چنانچہ میں نہر کے پل پر گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا، میں نے کپڑے اتار ڈالے آرام سے نہر کے کنارے لیٹ کر ایک رسالے کا مطالعہ کرنے لگا۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد سورج غروب گیا، میں اٹھا اور ریلوے لائن کے متوازی راستے چل پڑا اور آہستہ آہستہ گھر پہنچ گیا، اس واقعے تیسرے روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے افسر اعلیٰ سے ازت حاصل کر کے گھر پہنچا، گھر کے کاموں سے رغ ہو کر میں مقامی دفتر گیا تو اس دفتر کے نائب ربراہ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ آپ تو اس روز پس جانے کے لیے کہہ رہے تھے لیکن ہم نے آپ کو ی شام کو نہر کی طرف سے آتے ہوتے دیکھا۔ انکے ں جملے پر سربراہ صاحب بھی ہنسنے لگے اور کہنے لگے اس شام کو ہم دونوں اور ہمارے افسر اعلیٰ سیر غرض سے اسی طرف گئے تھے جدھر سے آپ آرہے تھے ہم دونوں نے آپکو دیکھ لیا اور پہچان لیا لیکن جب ہے کہ افسر اعلیٰ جو ہمارے ہمراہ ہی تھے آپکو دیکھ سکے اور نہ پہچان سکے، حالانکہ ہمارے اور پکے راستوں کے درمیان فاصلہ سو ڈیڑھ سو گز کا تھا، اور آپ متواتر پانچ منٹ تک ہماری نظروں کے سامنے رہے، انکی یہ باتیں سنیں تو میں بڑا حیران ہوا کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ میں نے بھی ان تینوں صاحبان کو بالکل نہیں دیکھا تھا حالانکہ فاصلہ بہت ہی کم تھا، وقت جھٹپٹے کا تھا اور تاریکی نے ماحول پر اپنا تسلط قائم نہیں کیا تھا۔

سخت گرمی کا موسم تھا غالباً جولائی کا مہینہ تھا اور جمعے کا دن تھا، دفتر میں اس روز میرے پاس کام اسقدر زیادہ تھا کہ جب میں نے اسے ختم کیا تو اسوقت ایک بجنے کو تھا اور دفتر کے تمام اہل کار جا چکے تھے، میں نے جلدی جلدی دفتر بند کیا، اور اپنی سائیکل کا رخ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پچھلے پہیئے کی ہوا نکل چکی ہے، ہوا بھروانے لگا تو شوں شوں کی آواز آنے لگی پنکچر درست کرنیکا سامان میرے پاس موجود نہ تھا۔ جیب پر نظر ڈالی تو وہ بھی خالی تھی، ہمارا دفتر چھاؤنی کے علاقے میں واقع تھا اور وہاں دکانیں نہ ہونے کے برابر تھیں تاہم سائیکلوں کی مرمت کرنیکی ایک دکان میرے علم میں تھی جو یہاں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی، قہر درویش کے مصداق میں دھوپ میں جلتا ہوا اس دکان پر پہنچا، دکان کھلی ہوئی تھی اور ایک لڑکا وہاں کام کر رہا تھا۔ دکان کے مالک جن سے میری تھوڑی بہت علیک سلیک تھی، جمعے کی نماز کیلئے جا چکے تھے، میں نے لڑکے سے پنکچر لگانے کے لیے کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ پیسے پھر ملینگے اس پر لڑکے نے کہا کہ استاد صاحب نے ادھار کرنے کے لیے منع کیا ہے لہٰذا وہ پنکچر لگانے سے معذور ہے، میں نے حالات کے پیش نظر اصرار بھی کیا لیکن لڑکا اصول کا پکا نکلا اور اپنی بات پر ڈٹا رہا، مایوس ہو کر میں سائیکل لیکر چل پڑا، میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ ذرا فاصلے پر مجھے کوئی چیز سڑک پر چمکتی ہوئی دکھائی دی، میں نے قریب جا کر دیکھا تو یہ ایک بالکل نئی چونی تھی، میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا، اسے پانے میں جو خوشی حاصل ہوئی وہ کچھ نہ پوچھئے، بہرحال خدا کا شکر ادا کیا، سائیکل کو لوٹایا اور پھر اسی دکان پر لے گیا میں نے جاتے ہی لڑکے کے ہاتھ پر چونی رکھ دی اور کہا کہ بھائی اب تو پنکچر بنا دو۔

دو ڈھائی سال کا ذکر ہے میرا لڑکا عبدالنعیم جسکی عمر تین سال تھی، اچانک گم ہو گیا، بہتیرا تلاش کیا مگر نہ ملا اور اس سعی ناکام میں، چار پانچ گھنٹے گزر گئے۔ میری پریشانی کی انتہا نہ رہی اور دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگے، اسکی والدہ کا مجھ سے بھی برا حال تھا، آخر میں منادی کرنے والے کے گھر پہنچا، وہاں معلوم ہوا کہ ٹاؤن کمیٹی گیا ہوا ہے میں نے ٹاؤن کمیٹی جانے کی بجائے ایک مرتبہ پھر لڑکے کی تلاش میں شہر کا چکر لگایا وہ نہ ملا آخر میں پھر منادی کرنے والے کے گھر پہنچا، وہ ابھی تک ٹاؤن کمیٹی سے واپس نہ آیا تھا مجبوراً میں بھی ٹاؤن کمیٹی گیا اور اسے سرسری طور پر تلاش کیا وہ نہ مل سکا تو ٹاؤن کمیٹی سے نکل کر اب منادی کرنیوالے اور لڑکے دونوں کو تلاش کرنے لگا مگر ان دونوں کو نہ ملنا تھا نہ ملے، تھک ہار کر میں پھر منادی کرنیوالے کے گھر پہنچ گیا۔ لیکن وہاں سے اب بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ ٹاؤن کمیٹی گیا ہوا ہے۔ آخر ایک مرتبہ پھر ٹاؤن کمیٹی گیا اس مرتبہ وہ مجھے مل گیا، میں نے دیکھا کہ وہ اور ٹاؤن کمیٹی کا ایک چپراسی دفتر کے باہر کھڑے ہوتے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے جاتے ہی اس سے کہا کہ میرا بچہ پانچ گھنٹے سے گم ہے منادی کر دو۔ بجائے اسکے کہ منادی کرنیوالا بچے کے کوائف مجھ سے دریافت کرتا چپراسی میری طرف متوجہ ہوا، اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپکے لڑکے کی عمر کیا ہے اور اسکا لباس کیسا ہے، میں نے بتایا تو کہنے لگا کہ آپ کا بچہ میرے گھر پر موجود ہے، آئیے آپ اسے لیجائیے، پھر منادی کرنیوالے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ میں اس سے کافی دیر سے منادی کرنے کیلئے کہہ رہا تھا مگر اسکا مطالبہ تھا کہ منادی کرنیکا معاوضہ مبلغ دو روپے میں پیشگی ہی اسے اپنی جیب سے ادا کر دوں حالانکہ میں اس سے کہہ رہا تھا کہ جس کا بچہ گم ہوا ہے میں یہ رقم اس سے دلا دوں گا مگر یہ نہیں مانتا تھا اچھا ہوا کہ آپ خود ہی آگئے میں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے بڑا کرم کیا اور مزید پریشانیوں سے بچا لیا۔ ★★

واقعات نئی دہلی

موھنی اور اس کے پتی دیپک' جوں ہی
اٹری پر چڑھے' سرلا کے بنگلے کی بتیاں جلتی ہوئی نظر آئیں
یں اطمینان ہوگیا کہ سرلا ان کے انتظار میں جاگ رہی ہے۔
کتنا پیارا ہے سرلا کا گھر" موہنی بولی "وہ تو بہت
ہ لیکن اس میں مکانیت کافی ہے۔"
"لیکن یہاں اس علاقے میں جو رہے اس کے پاس
رہو نا ضروری ہے' ورنہ کچھ دن میں لوگ یہاں آنا
ھوڑ دیں گے۔"
"کبھی ہو ہی نہیں سکتا، سرلا کے ہاں تو دوست
یشہ بھرے رہتے ہیں۔"
"نوجوان لڑکے ہی ہوتے ہیں یہ نا نہیں سرلا کو ان میں
یا خوبی نظر آتی ہے میرے الفاظ یاد رکھو، ایک دن
ی کھٹائی میں پڑ جائے گی، اس عمر میں نوجوان لڑکوں
ں گھرے رہنا بہت خطرناک ہے۔"
اب وہ بنگلے کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے، گیٹ کھلا
ا تھا، وہ اندر داخل ہو کر روش پر چلنے لگے، روشنیوں
ں نہایا ہوا سفید پتھروں کا یہ بنگلہ بہت خوبصورت
ل رہا تھا۔
دیپک نے دروازے پر پہنچ کر پتنی کی طرف دیکھا
ر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔
بیل کی آواز نے نوجوان آدمی کو چونکا دیا، اس
نے جلدی سے بلب بجھا دیا، جو کوئی بھی ہے واپس
لا جائے لیکن ایک بلب بجھانے سے کیا ہوتا ہے،
رے بنگلے میں بتیاں جل رہی تھیں۔
بیل دوبارہ بجی، نوجوان نے اپنے حواس درست
ئے، دروازہ تو کھولنا ہی پڑے گا، کہیں آنے والا
شتبہ نہ ہو جائے، بنگلے کا پچھلا دروازہ، پہاڑی کی
مت نکلتا تھا، اگر وہ لوگ کچھ بھانپ لیں تو اس کو
آسانی پکڑا جا سکتا تھا۔
نوجوان نے لاش کندھے پر اٹھائی، اچانک
وفے کی لٹکی ہوئی جھالر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا
س نے لاش جلدی سے صوفے کے نیچے دھکیل دی اور
ھالر پھر لٹکا دی۔ اب لاش کا سر اور ہاتھ وغیرہ میز
ر پڑے تھے، نوجوان نے بالوں سے پکڑ کر سر اٹھایا اور
سے قریبی میز کی دراز میں ڈال دیا۔ ٹانگوں کے کچھ

حصے صوفے کے نیچے ڈال دیئے۔ میز پر خون پھیلا ہوا
تھا، نوجوان نے ایک کشن اٹھا کر میز کو رگڑ ڈالا،
وہ کشن اٹھا کر صوفے پر رکھ دیا۔
بیل بہت زور سے بجی اور بجتی چلی گئی، اب میز
پر صرف ایک ہاتھ رہ گیا تھا، اس نے جلدی سے وہ
ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا، اس سے زیادہ
محفوظ تو کوئی جگہ نہ تھی۔
اس نے دروازہ کھولا تو باہر ایک مرد اور عورت
کو کھڑے پایا، ان کے چہروں پر فکر جھلک رہی تھی۔
"سرلا اندر ہیں؟" مرد نے پوچھا۔
"نہیں!"
"ہم ان کے دوست ہیں، آپ شاید منوہر ہیں۔"
"اوہ! یس! میں منوہر ہوں" نوجوان بولا۔
"مگر ہیں! یہ منوہر کون ہے۔"
"سرلا کہاں ہے؟"
"وہ! جی وہ ذرا شہر گئی ہیں۔"
"انہیں دیر تو نہیں ہو جائے گی۔"
"پتا نہیں مجھے معلوم نہیں۔"
"اچھا تو ہم انتظار کر لیں گے۔" عورت نے کہا۔
نوجوان کو جال کی ڈوریاں اپنی گردن میں
کستی ہوئی محسوس ہوئیں۔

وہ دونوں دروازے میں سے گزر کر ہال میں
سے ہوتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے آئے اور
بڑے آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، نوجوان کا
ارے بے چینی کے برا حال تھا۔ سرلا کے جسم کا کوئی
ٹکڑا تو نظر نہیں آ رہا۔
صوفے کے نیچے سے خون کا ایک دھبہ نظر آ رہا
تھا۔ اُف! اب کیا ہوگا، نوجوان نے جلدی سے
آگے بڑھ کر پیر خون کے دھبے پر رکھ دیا، اب وہ
باتیں بھی کرتا جاتا تھا اور دھیرے دھیرے پیر سے
فرش کو رگڑ بھی رہا تھا۔
"کمرہ ذرا کباڑ خانہ بنا ہوا ہے۔" وہ بولا۔ "اس
وقت ہمیں کسی مہمان کے آنے کی توقع نہیں تھی۔"
اسے سارا دھیان اپنی گفتگو کی طرف لگانا تھا اور
صوفے کے نیچے جو کچھ بھی پڑا تھا، اس کے ذہن سے
نکال پھینکنا تھا، اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے
ورنہ وہ پکڑا جائے گا۔"
"لیجے سگریٹ پیجئے۔" مرد نے سگریٹ کیس نوجوان
کی طرف بڑھایا اور ماچس کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔
نوجوان نے جھٹ خود اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب
میں ڈال کر ماچس تلاش کی، اس کا ہاتھ سرلا کے یخ
بستہ نرم گوشت سے ٹکرایا، اس کا پورا جسم کانپ گیا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید" عورت نے ہمدردی سے پوچھا "سرلا آپ کی دیکھ بھال کر رہی ہوگی۔"

"جی ہاں! بڑی مہان عورت ہیں وہ۔" نوجوان بولا اور سرلا سے اپنی جدوجہد کا منظر اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ وہ سرلا کی گردن پر اس وقت تک ضرب لگاتا رہا تھا جب تک سر کٹ کر دھڑ سے الگ نہ ہو گیا تھا، اب وہ مر چکی تھی۔ اب وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی، کسی کو نہیں۔

خون اس کے جوتوں کی ایڑیوں میں چپک گیا تھا

مرد اور عورت اب خاموش ہو چکے تھے، پھر مرد نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا، اپنی بیتی سے کچھ سرگوشیوں میں کہا اور نوجوان سے کہا۔

"سرلا کافی دیر کے لئے گئی ہیں کیا؟"

"پتا نہیں! میرا خیال ہے کہ آپ کا انتظار کرنا فضول ہے، آپ ان کی عادت تو جانتے ہی ہیں۔"

عورت مسکرائی "انتظار کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہم تو یہاں ٹھہرنے آئے ہیں، سرلا نے آپ کو بتایا نہیں۔"

"ٹھہرنے ــــ"

"شاید وہ بھول گئی ہوں۔"

"حیرت ہے۔"

"تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ، فوراً چلے جاؤ۔" نوجوان اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا، اس کا ہردے کتنی بُری طرح دھڑک رہا تھا، اگر یہی حالت رہی تو وہ تو مارا جائے گا۔

گھنٹی پھر بجی۔

"ہمارا سامان آیا ہوگا۔" مرد بولا "میں دیکھتا ہوں۔"

عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی، نوجوان نے جلدی سے اپنا پیر خون کے دھبے سے ہٹا لیا۔

ہال میں سامان گھسیٹے جانے کی آواز بلند ہو رہی تھی، نوجوان نے جلدی جلدی چاروں طرف دیکھا، خون کا دھبّا اب بھی نظر آ رہا تھا اس نے جیکٹ اتاری اور صوفے کے بازو پر ڈال کر اسے اس طرح لٹکایا کہ دھبّا چھپ گیا۔

"آپ کس کام میں لگ گئے۔" عورت نے کمرے میں آ کر پوچھا۔

"بس ذرا چیزوں کو ڈھنگ سے رکھ رہا تھا۔"

"آپ شاید زخمی ہیں، دیکھیے کتنا خون نکلا ہے۔"

واقعی اس کے ہاتھوں اور پتلون کے گھٹنوں پر خون لگا ہوا تھا۔

"جی ہاں، میرے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی تھی۔"

وہ گھبرا سی گئی۔ "لائیے ذرا میں دیکھوں۔"

"جی نہیں۔ میں خود ڈریسنگ کر لوں گا۔"

"تکلف مت کیجئے۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔" کہہ کر عورت سرلا کا سا ہمدردانہ چہرہ لئے آگے بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں سرلا جیسی شفقت نظر آ رہی تھی۔

اس نے عورت کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "آپ رہنے دیں۔" اس کا لہجہ بڑا تند تھا۔

وہ جلدی سے کمرے سے باہر چلا گیا، قمیص اس کی پیٹھ پر چپک رہی تھی، خون آستینوں میں سے اندر تک چلا گیا تھا، وہ کتنا ڈرا ہوا تھا، اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے ورنہ ــــ

مرد اور عورت دونوں کھانا کھا رہے تھے، وہ بڑے حیران تھے، آخر سرلا، اب تک کیوں نہیں آئی تھی، نوجوان اوپر کمرے میں تھا۔

"مجھے یہ نوجوان پسند نہیں آیا۔"

"بہت کم عمر ہے۔" عورت بولی۔

مرد اپنی جگہ سے اٹھا، اس کا ہاتھ لگتے ہی نوجوان کی جیکٹ نیچے گر پڑی۔

"اوہ! بے چارے کی جیکٹ۔"

"تھرڈ کلاس سی تو ہے۔"

عورت نے آگے بڑھ کر جیکٹ اٹھالی اور صوفے کی پشت پہ ڈال دی

"میری جیکٹ کو ہاتھ مت لگائیے۔" نوجوان دوڑتا ہوا آیا۔

"یہ نیچے گر گئی تھی۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"آپ میری چیزوں کو ہاتھ مت لگائیے۔ میں یہ بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔"

"آئی ایم سوری"۔ عورت بولی

نوجوان نے جیکٹ اٹھائی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا، ہاتھ محفوظ تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے وہ اوپر بیڈروم میں سونے چلے گئے، اور نوجوان نیچے ہی رہا، جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ دونوں سو چکے ہیں تو اس نے ڈائننگ روم کے دروازے میں تالا لگایا۔

تین بجے تک وہ لاش کے ۱۲ ٹکڑے کر چکا تھا، وہ اب ہانپ رہا تھا، پھر اس نے آری اور چاقو دھو کر میز کی دراز میں ڈال دیئے۔

اتنے میں اوپر کسی کے قدموں کی آواز آئی۔

میز پر ۱۲ پارسل پڑے تھے۔ سرلا کے نرم نرم گوشت کے ۱۲ پارسل۔

اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے، ورنہ وہ بچ کر نہ نکل سکے گا۔

قدموں کی آواز اب سیڑھیوں کی طرف آ رہی تھی، اس نے تالا کھول کر چٹخنی گرا دی اور جلدی جلدی پارسل صوفے کے پیچھے ڈال دیئے۔ وہ ہال میں داخل ہوا۔

"میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔" عورت بولی وہ سرلا کی طرح بول رہی تھی۔

"نہیں میں جاگ رہا تھا۔"

"سرلا کے بارے میں پریشان ہوں گے۔"

سرلا کے بارے میں پریشان تھا۔"

عورت نے ڈائننگ روم کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"اس کمرے میں مت جائیے۔"

وہ حیران ہو گئی۔

"مجھے شما کر دیجئے۔ اس سمے میرا ذہن بڑا پریشان ہے۔"

عورت دروازہ کھول کر اندر چلی گئی، ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔

"میں آپ کے لئے چائے بناتی ہوں۔" وہ بولی۔

وہ تو خود اسے کمرے سے باہر نکالنا چاہتا تھا اس نے سر ہلا دیا۔ وہ رسوئی کی طرف چلی گئی، کہیں رسوئی میں تو کوئی دھبّا وغیرہ نہیں ہے نہیں۔ ذرا سا بھی نہیں۔ اسے پورا یقین تھا۔

اس نے پھر صوفے کی طرف جھانک کر دیکھا پارسل اسی طرح پڑے ہوئے تھے۔

منے میں مرد کمرے میں داخل ہوا، اس کی آنکھوں
بھری ہوئی تھی۔
ہ کہاں ہے؟"
رلا ـــــ سرلا ـــــ نوجوان بے جان لاش کی طرح
ہو گیا، اس کے پیر کانپنے لگے، اسے بتادو کہ
چکی ہے، بتادو، تو سب کچھ ختم ہو جائے۔
پ نے میری پتنی کو دیکھا ہے؟"
دہ؟"
ورسوئی کی طرف بڑھتا چلا گیا، چائے کا پانی سن
رہا تھا، نوجوان کرسی پر بیٹھ گیا، ہر چیز بالکل درست
تھی، پھر ڈر کا ہے کا۔
س نے سگریٹ نکالی، جیکٹ کی جیب میں سے
نکال کر سگریٹ سلگائی اور جب ماچس واپس رکھنے
سے خیال آیا کہ جیب میں تو ایک چیز اور بھی تھی۔
سرلا کا ہاتھ، سرلا کا مردہ ہاتھ۔"
سے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے، ورنہ وہ پکڑا
گا۔

ہاتھ کہیں گم ہو چکا تھا۔
وہ نیچے جھک کر ہاتھ تلاش کرنے لگا، فرش پر صوفے
کے نیچے۔ کہیں بھی نہ تھا۔
" ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں ؟ مرد دروازے میں
کھڑا پوچھ رہا تھا۔
"جی نہیں جیب میں سے ایک چیز گر گئی تھی، وہ
ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
تو سب کچھ ٹھیک تھا، ہاتھ سامنے نہیں تھا کہیں
کسی کرسی کے پیچھے یا میز کے نیچے گر گیا ہو گا، اسے اپنے اوسان
بحال رکھنا تھے ورنہ ـــ"
وہ دونوں چائے لئے ہوئے اندر آئے، میز پر چائے
رکھی اور کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے اور بیتے دنوں کی باتیں
کرنے لگے، جب وہ اسی طرح آدھی رات کو اٹھ کر چائے
پیا کرتے تھے۔
دو چہرے اسے دیکھ رہے تھے۔
مرد کا ہاتھ، بیوی کے ہاتھ پر، کرسی کی پشت پر لٹکا
ہوا تھا اور اس کے قریب ہی کشن پر سرلا کا ہاتھ رکھا
ہوا تھا۔
انہوں نے اب تک سرلا کا ہاتھ نہیں دیکھا تھا ابھی
تک نہیں۔
اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے، ورنہ وہ پکڑ لیا
جائے گا، اسے اس طرح برتاؤ کرنا تھا جیسے سرلا کا ہاتھ
وہاں تھا ہی نہیں، وہ اسے وہاں سے اٹھا تو نہیں سکتا
تھا، اسے تو چپ چاپ بیٹھ کر چائے پینا تھی۔
اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے، اپنی توجہ مرکوز
رکھنی تھی۔
کشن پر چائے دودھ، شکر، یہی چیزیں تو سامنے
تھیں، چائے اور دودھ تو اس کے قریب تھا، پھر ـــ
شکر دان عورت کے ہاتھ میں تھا، اس نے شکر ڈال کر
اسے میز پر رکھ دیا۔
وہ آگے جھکا، وہ اس سے کیا مانگنا چاہ رہا تھا۔
شکر! شکر! شکر! اسے شکر ہی تو چاہئے تھی۔
"ذرا ہاتھ ادھر بڑھائیے گا!"
اور پھر وہ بیک وقت ہنسنے اور رونے لگا عورت
کے ملنے سے کشن پر رکھا ہوا ہاتھ، عورت کی گود میں جا پڑا۔

روپلوں کی ایک اور بربادی۔
سورج تک جانے والی اس
سڑک کی کیا ضرورت تھی؟۔

"لگتا ہے کالج یہیں کہیں
آس پاس ہے۔"

درخواست کی کہ وہ سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس پر ۱۷۳۶ء میں وہ شاہ طہماسپ کی جگہ تخت نشین ہوکر نادر قلی سے نادر شاہ افشار بن گیا یہی نادر ہے جس نے ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں ہندوستان پر حملہ کیا اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور جس کی سپاہ نے قتل عام کرکے دِلّی کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہادی تھیں۔ لیکن نادر شاہ کے بعد اس کا کوئی قابل جانشین پیدا نہیں ہوا۔ اس کے بعد تھوڑی مدت کے لئے کریم خان زند اور اس کے خاندان کے بعض امرار نے بھی ایران پر حکومت کی۔

افشاریوں اور زندیوں کی حکومت کے بعد ۱۷۷۹ء میں یہاں قاچاری خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ اس خاندان کا بانی آغا محمد خاں قاچاری تھا۔ شروع میں وہ زندی خاندان ہی کا ملازم تھا۔ لیکن اپنی دماغی قابلیت اور قوت ارادی کے باعث بہت جلد اپنے ساتھ کے تمام امیروں پر غالب آگیا۔ اور جب کریم خاں کی وفات کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی اور اس بات کا اندیشہ پیدا ہوگیا کہ ملک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے گا تو اس نے تمام مخالفوں کا قلع قمع کرکے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اب تک ملک کا پایۂ تخت کبھی تیسفون (مداین) کبھی شیراز، کبھی کرمان رہا تھا۔ آغا محمد خاں نے پہلی مرتبہ ایران کے شمال کے ایک قصبے تہران کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کے بعد یہ شہر روز بروز ترقی کرتا گیا حتیٰ کہ یہ آج ایران کا سب سے بڑا شہر بن گیا ہے اس وقت بھی ملک کا دارالخلافہ یہی ہے۔

قاچاری عہد اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یورپ کے مختلف ملکوں نے ایران میں اپنی ریشہ دوانیاں اسی زمانے میں شروع کیں۔ انگریز ہندوستان میں پہونچ چکے تھے۔ یورپ میں ان کے سب سے بڑے حریف فرانسیسی تھے اور یہاں کا حکمراں نپولین انکا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اسی طرح روس بھی انگریزوں کی ایشیا میں ترقی کو روکنا چاہتا تھا اب گویا انگلستان اور فرانس اور روس میں رسہ کشی شروع ہوگئی اور تینوں نے ایران میں [illegible] جمانا چاہا۔ یہ کشمکش مدتوں جاری رہی۔ آخیر میں فرانسیسی اپنے حریفوں کے مقابلے میں ناکام رہے اور ان کا ایران میں اثر و رسوخ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد انگریزوں اور روسیوں نے آہستہ آہستہ اپنے قدم جمالئے۔ یہ اس خاندان کے چوتھے حکمراں ناصرالدین شاہ کے زمانے میں ہوا۔

یورپی ممالک کے اثر و نفوذ کا البتہ ایک فائدہ ہوا کہ یہاں ریل، ڈاک، تار، ٹیلیفون، اخبار وغیرہ کا رواج ہوگیا فوج بھی مغربی طریقے پر تربیت یافتہ ہوگئی۔ لیکن یہ سب چیزیں خرچ چاہتی تھیں۔ چونکہ ملک میں کافی دولت نہیں تھی اس لئے ایران کو ان ملکوں سے قرض لینا پڑا اور اسے چکانے کے لئے ناصرالدین شاہ کے جانشین مظفرالدین شاہ کو انھیں ایران میں غیر معمولی حقوق دینا پڑے۔ مثلاً شمال و جنوب میں ملکی درآمدات پر تمام محصول کے وصول کرنے کا حق روسیوں کو دے دیا گیا اور جنوب میں تیل کے چشموں سے تیل نکالنے کا ٹھیکا انگریزوں کے حوالے ہوگیا، اسی طرح بحیرۂ خزر میں ماہی گیری کا حق بھی روسیوں کو ہی دینا پڑا۔

اس سے لوگوں میں بے چینی پھیلنے لگی اور ملک کے مختلف حلقوں نے حکومت کے ان اقدامات کی سخت مخالفت کی۔ پوری کوشش کے باوجود یہ اضطراب کسی طرح کم نہ ہوا اور بادشاہ کے خلاف تحریک روز افزوں زور پکڑتی چلی گئی۔ بالآخر محمد علی شاہ آخری قاچار تاجدار اپنے بارہ سالہ بیٹے احمد شاہ کے حق میں دستبردار ہوگئے چونکہ احمد شاہ کو تعلیم کی ضرورت تھی اس لئے نوجوان بادشاہ اپنا بیشتر وقت یورپ میں گزارنے لگے۔ یہاں ملک کا خزانہ خالی تھا۔ فوج کو مہینوں تنخواہ کی شکل دیکھنا نصیب نہیں ہوتی تھی ایسے میں انھوں نے قزاقی اور رہزنی کا پیشہ اختیار کیا۔ ہر طرف قحط اور وبا کا دور دورہ تھا۔ مرکزی حکومت کمزور اور بے بس تھی اور کوئی اقدام کرنے سے قاصر تھی، دور دست علاقے خودمختاری اور آزادی کے خواب دیکھنے لگے غرض ایران تباہی کے غار کے کنارے پہونچ گیا۔

ایسے میں رضا خاں سپہ سالار افواج نے ملک کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح ۱۹۲۵ء میں موجودہ پہلوی دور شروع ہوا۔

رضا شاہ پہلوی نے اپنے سولہ سالہ دورِ حکومت میں زندگی کے ہر ایک شعبے میں اصلاح جاری کی صنعت و حرفت اور تجارت، دستکاری اور بنکاری، فوجی تنظیم اور مالی امن، طبّی امداد اور تعلیم، وسائل نقل و حمل ریل اور تار، سڑکیں ـــــ غرض کوئی میدان ان کی نگاہِ دور رس سے بچا نہیں۔ انھوں نے ہر جگہ ترقی کا رویہ اختیار کیا۔

ایران نے دوسری عالمی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا اور وہ غیر جانبدار رہا۔ اس کے باوجود انگریزوں اور روسیوں نے اس پر جرمنی کی طرفداری کا الزام [لگا کر] اپنی فوجیں ملک میں اتار دیں۔ اس پر رضا شاہ پہلوی [نے] ۱۹۴۱ء میں اپنے فرزندِ جلیل یعنی موجودہ شاہنشاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کے حق میں دستبرداری دے دی۔

موجودہ دورِ حکومت میں واقعی ملک میں انقلاب [آیا] ہے۔ عہدِ حاضرہ میں زندگی کی رفتار بہت تیز ہوگئی [ہے]۔ جب تک تمام حصوں میں ترقی نہ ہو اور وہ بھی موزوں [اور] یکساں پیمانے پر، ملک بحیثیت مجموعی آگے نہیں [بڑھ] سکتا۔ اسی لئے ایران کے موجودہ حکمراں محمد رضا شاہ نے تمام شعبوں پر برابر کی توجہ کی ہے۔ جو کام ان [کے] والد رضا شاہ پہلوی کے زمانے میں شروع ہوچکے [تھے] ان میں مزید سرگرمی پیدا کردی ہے اور جن پر وہ اپنے زمانۂ حکومت میں توجہ نہیں کرسکے تھے ان میں اب کام شروع ہوا ہے۔ مثلاً پہلوی عہد سے پہلے پورے [ملک] میں ریل کی پٹری صرف ۲۰۸ کیلومیٹر تھی، آج یہ [...] کیلومیٹر تک پہونچ چکی ہے۔ ہوائی جہازوں کے اترنے کا پہلے کوئی انتظام ہی نہیں تھا۔ اب ملک میں دو بین [الاقوامی] ہوائی اڈے ہیں، دو درجۂ اوّل کے اور چودہ درجۂ [دوم] کے۔ خود ایرانی ہوائی کمپنی وجود میں آگئی ہے یہی حال بندرگاہوں اور کشتی رانی کا ہے۔ بحیرۂ خزر اور خلیج [فارس] کی تمام پرانی بندرگاہوں کو زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق بنا دیا گیا ہے۔

اسی طرح کا زبردست انقلاب صنعت و حرفت کے میدان میں ہوا۔ آج ملک میں ۱۰،۲۰۰ کارخانے [ہیں] جن میں دو لاکھ سے زیادہ کاریگر کام کرتے ہیں۔ تیل کو ملک کی سب سے بڑی دولت ہے یہ مدتوں غیروں کے مفاد کے لئے استعمال ہوتی رہی لیکن بالآخر ۱۹۵۰ء [میں ایران] نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اگرچہ اب بھی بیرونی کم[پنیاں...]

بقیہ صفحہ

ڈوبنے سے پہلے

اسرار عظمت

نیلوفر جب اپنی سہیلی کے گھر سے گھر لوٹتا ڈھل چکی تھی۔ سورج کو رات کا تاریک اژدہا نگل یا اژدہا پہ نگل چکا تھا، آج اگرچہ چاند کی چودہ تاریخ تھی لیکن کالے کالے دیو پیکر بادلوں میں چاند نے کسی مقروض شخص کی طرح منہ چھپا لیا تھا۔ اور رات کی تاریکی قبر کی تاریکی کو مات دے رہی تھی۔ برکھا کی سرد ہوائیں ہڈیوں کے گودے تک کو ٹھٹھرائے دے رہی تھیں۔

اس نے فر کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ پھر بھی اس پر کپکپی طاری تھی۔ آج شام ہی سے موسم کے تیور خراب تھے۔ اس لیے سرِ شام ہی سڑکیں سنسان ہو گئی تھیں بازار ویران ہو گئے تھے۔ اور اکا دکا جو دکانیں کھلی رہ گئی تھیں اب وہ دھڑا دھڑ بند ہو رہی تھیں۔ اگلے چوراہے پر رک کر اس نے چاروں طرف طائرانہ نظریں ڈالیں لیکن دور دور تک کسی ٹیکسی یا آٹو رکشا کا پتہ نہ تھا، آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں اب ہل چل سی مچ گئی تھی۔ بجلی کی تیز تلوار رہ رہ کر ان کے سینوں کو چاک کرتی اور بادل ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑنے لگتے۔ اب اس نے مزید رکنا مناسب نہ سمجھا اور پیدل ہی چل پڑی۔ لیکن ابھی وہ نصف فاصلہ بھی طے نہ کر پائی تھی کہ بادلوں کی چادر پھٹ گئی اور موسلادھار بارش نے اسے پل بھر میں سر سے پیر تک بھگو دیا۔

جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچی تو سردی سے اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے کپ بورڈ میں سے برانڈی کی بوتل اٹھائی اور دو ایک پیگ پی کر خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔

اس کی خواب گاہ سے ملا ہوا دوسرے فلیٹ کا بیڈ روم تھا۔ درمیانی دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ جسے لوہے کی پٹیاں ٹھونک کر مستقل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے پڑوس کا کمرہ اس کے لیے باعث عذاب بنا ہوا تھا۔ اس میں نیا نیا شادی شدہ جوڑا ٹھہرا تھا۔ دونوں رات گئے تک قہقہے لگاتے اور باتیں کرتے رہتے اور نیلوفر کی نیند حرام ہو جاتی وہ لاکھ کوشش کرتی کہ اس کے خیالات نہ بھٹکنے پائیں لیکن پڑوس کی سرگوشیاں اسے بے چین کر دیتیں۔ وہ اپنے آپ کو نہ روک سکتی تھی ایسا لگتا

جیسے کوئی مقناطیسی قوت کھڑکی میں موجود ہے۔ جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اس کے قدم خود بخود کھڑکی کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ کھڑکی کی جھریوں سے دوسری طرف جھانکنے لگتی۔ پھر وہ ہلکی ہلکی سی نیلی روشنی کے پس منظر میں جو کچھ دیکھتی وہ اسکے تن بدن میں آگ لگا دینے کے لیے کافی ہوتا۔ اسکے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں، سانس پھولنے لگتی۔ گلا خشک ہو جاتا اور اس کا دل ایک انجانی سی آگ میں جلنے لگتا۔ وہ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیتی اور دوڑ کر بستر پر گر جاتی تکیے کو پوری قوت سے سینے میں بھینچ لیتی۔ اور سونے کی کوشش کرتی لیکن پڑوس سے سنائی دینے والی سرگوشیاں جیسے جلتے پر تیل کا کام کرتیں، اور اس کے دل و دماغ میں لگی ہوئی آگ ہر لمحہ بھڑکتی ہی جاتی۔ وہ اس طرح تڑپتی جیسے اسے بستر پر نہیں انگاروں کی سیج پر لٹا دیا ہو۔ لیکن آخرکار جب پڑوس کی سرگوشیاں سناٹے کے اتھاہ ساگر میں کھو جاتیں تو نیند کی دیوی اسے بھی اپنی آغوش میں لے لیتی۔

آج بھی جب اس نے بتی بجھا کر چادر کھینچ لی تو پڑوس سے ایسی ہی آوازیں سنائی دینے لگیں اس نے لاپرواہی سے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں لیکن جب آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو کان اور زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ وہ پڑوس سے آنے والی ہلکی سے ہلکی آواز کو اس طرح صاف سن رہی تھی جیسے کوئی اسکے کانوں کے قریب بول رہا ہو، دھیمی دھیمی سرگوشیاں طوفانی ہوا کی طرح اس کے کانوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے کانوں میں کوئی جادوگر سحر پھونک رہا ہو آہستہ آہستہ اس پر وہی پُراسرار قوت غالب آتی جا رہی تھی۔ اپنے آپ سے کشمکش کرنے کی قوت اس میں ہر لمحہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور جب پڑوس کے کمرے سے سوئچ آف کرنے کی ہلکی سی چٹ کی آواز سنائی دی اور کھڑکیوں کی جھریوں سے کمرے میں داخل ہونے والی پتلی سی لکیر بھی غائب ہو گئی تو اس کی قوت مدافعت بھی پوری طرح ختم ہو چکی تھی۔ وہ غیبی قوت اب پوری طرح اس پر غالب آ چکی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک اپنے بستر پر لیٹی اپنے دھڑکتے دل کی صدا سنتی رہی۔ پھر اٹھ کر پنجوں کے بل چلتی ہوئی کھڑکی قریب پہنچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی ایک آنکھ کھڑکی کی جھری سے جا لگی۔ کچھ عجیب سا منظر تھا جیسے نیلے کاغذ پر ایک تصویر کھینچ دی گئی ہو۔ دو گلے ملتے ہوئے طوفان کی تصویر، ایک دوسرے میں سمائے ہوئے انسانوں کی تصویر۔

آج وہ خلاف معمول بہت دیر تک وہاں کھڑی رہی، اور جب وہ وہاں سے ہٹی تو اس کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی، اور وہ اس طرح ہانپ رہی تھی جیسے میلوں کا سفر اس نے دوڑ کر طے کیا ہو، اسکی سانسیں آندھیوں کی طرح چل رہی تھیں۔ اور سینہ اس قدر تیزی سے پھول پچک رہا تھا جیسے ساری دنیا کے لوگ بیک وقت اس کے پھیپھڑوں سے سانس لے رہے ہوں۔ خون پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اسکی رگوں میں گردش کر رہا تھا اور آنکھیں تپ کر انگارا ہو گئی تھیں۔ اس نے ٹھنڈے پانی کے پے در پے کئی گلاس چڑھا لیے۔ اور تکیے کو مضبوطی سے بھینچے ہوئے لیٹ گئی۔ وہ اتنی زور سے تکیے کو بھینچے ہوئے تھی جیسے اسے اپنے آپ میں سمو لینا چاہتی ہو۔ لیکن آج یہ طوفان پوری شدت کے ساتھ ابھرا تھا۔ اور اس پر قابو پانا اسے ناممکن سا لگ رہا تھا۔ کچلے ہوئے جذبات کا سرکش دھارا اسکے قدم اکھاڑنے کے لیے کوشاں تھا۔ گلا گھونٹ گھونٹ کر ذہن کی عمیق گہرائیوں میں دفن کی ہوئی خواہشات بھوت بنکر نکل آئی تھیں۔ اور حصار باندھے اسکے گرد رقص کر رہی تھیں۔ اور اس حصار کو توڑنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اسنے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ ایسے موقعوں پر ٹھنڈے پانی کا غسل مفید ہوتا ہے۔ وہ تکیہ پھینک کر غسل خانے میں گھس گئی۔ کپڑے اتار کر جب وہ شاور کھولنے لگی، سانچے میں ڈھلا، اپنا دودھیا جسم اسے بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ شاور کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ اور خود اسکے نشیب و فراز میں رینگنے لگے۔ جب بھی اس کی انگلیاں جسم کے کسی حصے کو چھوتیں تو اسے ایسا لگتا جیسے سارے جسم میں برقی رویں دوڑ گئی ہوں۔ اسے عجیب سی لذت محسوس ہوتی۔ اور اس لذت سے اسکی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ اور وہ سوچنے لگتی کہ کاش اس کی انگلیاں اتنی نرم و نازک ہونے کے بجائے سخت کھردری ہوتیں۔

طوفان اب اسے دور اڑا لایا تھا۔ سرکش جذبات کے تیز و تند دھارے نے اسکے قدم اکھاڑ دیئے تھے۔ اور وہ اس سیلاب میں بہنے لگی تھی۔ خواہشات کے بھوتوں نے اس پر پوری طرح فتح پا لی تھی۔ غسل کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ باہر نکلی۔ نائیلون کا پتلا سا گون جسم پر ڈالا اور شہزاد کو فون کرنے لگی۔ شہزاد جو اپنی بے راہ روی کے لیے کالج میں ہی نہیں بلکہ سارے شہر میں مشہور تھا۔

شہزاد کیا تم فوراً میرے کمرے میں پہنچ سکتے ہو؟ وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی، اور دوسری طرف شہزاد کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی جا رہی تھیں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کل تک جو لڑکی اس سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتی تھی آج اسے اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اور وہ بھی رات کے گیارہ بجے؟

تھوڑی دیر بعد نیلوفر کے کمرے کی لائٹ بھی آف ہو چکی تھی۔ اور وہ شہزاد کی باہوں میں جکڑی ہوئی کیف و سرور کی انجانی سی دنیا میں کھو گئی تھی۔ شہزاد نے اسے پوری قوت سے اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ بے جان تکیے اور جاندار سینے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اس کے دماغ میں مکمل تاریکی چھا گئی تھی۔ اور گناہ و ثواب کے تمام احساسات ختم ہو گئے تھے۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے پڑوس کے کمرے سے کچھ آوازیں آ رہی ہوں۔

"میں اب آپ کے پاس نہیں آؤں گی" بیوی شوہر سے کہہ رہی تھی۔

"کیوں؟"

بقیہ صفحہ [illegible]

والے کے پیچھے لگا ہوا بٹن دباتے ہی چھت کی کھڑکی کھلی اور سرخ سرخ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے گرنے لگے

دو فیصد۔ لوشیدا نے آخری مرتبہ تمام چیزوں کا جائزہ
دلو کی ناک میں نالکی لگی ہوئی تھی۔ خون کی بوتل بھی اپنی جگہ
دی تھی۔ رولو کی نبض دھیمے دھیمے انداز میں چل رہی
۔ وہ بے ہوش تھا اور اسکی دائیں کنپٹی پر ایک گہرا سا گھاؤ
لوشیدا نے چیلمی اٹھا کر دائیں طرف رکھی ہوئی بوتل میں سے
عنصر ریڈیم کا ایک ٹکڑا نکالا۔

چند سال پیشتر لوشیدا نے لندن ٹائمز میں ایک سائنسی رپورٹ
تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ نایاب عناصر آثار قدیمہ کے مطالعے
میں حیرت انگیز طور پر مدد گار ثابت ہوئے ہیں۔ دراصل
یکا عنصر کی ایک تہ ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت ذرات خارج

کرتا رہتا ہے اور جتنے ذرات کم ہو ... اس عنصر کی عمر معلوم
کی جا سکتی ہے۔ زمین کی جس پرت میں وہ عنصر پایا جاتا ہے اسکی
عمر کا اندازہ بالکل ٹھیک طور پر لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی
پرت اگر جانوروں کی ہڈیاں اور انسانی کھوپڑیاں وغیرہ برآمد
ہوں تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس خبر کو پڑھتے ہی لوشیدا کے ذہن میں ایک عجیب خیال
پیدا ہوا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان لمبے لمبے اور تھکا دینے
والے طریقوں کے بجائے انسان خود ماضی میں سفر کر سکے اور
ہر دور کا نقشہ کھینچ دے۔

کئی سال کے طویل غور کے بعد یہ منزل آ پہنچی تھی کہ

لوشیدا کے دوست ماہر آثار قدیمہ رولو نے خود کو تجربات کے لئے
پیش کر دیا تھا۔ لوشیدا نے اس کے جسم میں مختلف دوائیں
انجکشن کے ذریعے داخل کر کے اس کے سر کا آپریشن کیا تھا
اور ریڈیم کا کوئی ٹکڑا ڈال کر نتائج کا منتظر تھا
سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق یہ ٹکڑا کئی کروڑ سال
پرانا تھا اور لوشیدا کا نظریہ تھا کہ تابکار عنصر جس قدر پرانا ہوگا
اس دور کے حالات معلوم ہو جائیں گے۔

لوشیدا نے دائیں ہاتھ سے خون پہنچانے والی نلکی کا کارک
کھولا اور دوسرے ہاتھ سے ریڈیم کا ٹکڑا اس شگاف کے اندر
رکھ دیا۔

ریڈیم کے گوشت سے مس ہوتے ہی رولو کی حالت میں
تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ اس کی رنگت زردی مائل سفید سے
بدل کر سیاہ پڑنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی پیشانی
اور ٹھوڑی پر خوب بال اگ گئے ہوں۔ سر کے بال بھی اپنے
آپ بکھر گئے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں، ناک کی ہڈی کچھ
اور ابھر آئی تھی۔ جبڑے پر کھنچ گئے تھے اور دانت نظر آنے
لگے تھے لیکن لمبے لمبے دانت تھے، اور اس کے منہ سے عجیب
سی آواز نکل رہی تھی۔

"خی... خی خی... خوں... خوں... خی خی..."

سفید چادر کے نیچے چھپے ہوئے ہاتھ حرکت کر رہے تھے
لوشیدا نے چادر ہٹا دی۔

اف... دونوں ہاتھ سیاہ بالوں سے اٹ گئے تھے
اور ناخن یوں لمبے لمبے ہو گئے تھے جیسے یہ انگلیاں کسی انسان
کی نہیں بلکہ گوریلے کی ہوں۔

یقیناً یہ ابتدائی انسان تھا جو بول نہیں سکتا تھا۔
لوشیدا کی تجربہ گاہ ایک مربع میل کے احاطے میں پھیلی
ہوئی تھی چاروں طرف بہت اونچی دیوار تھی جس کے اوپر
خار دار تار لگے ہوئے تھے جن میں رات کے وقت برقی کرنٹ
دوڑتا رہتا تھا۔

پانچ کمرے لوشیدا کے لئے مخصوص تھے جن میں کسی
پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہ تھی
ان ہی پانچ کمروں میں سے ایک میں لوشیدا اس وقت
بے ہوش رولو کے ساتھ موجود تھا۔ رولو کو تین گھنٹے سے
پیشتر ہوش نہیں آ سکتا تھا اور ہوش آنے سے پہلے
اسکا یہاں سے ہٹا دیا جانا ضروری تھا کیونکہ رولو اب آج

سے چار کروڑ سال پہلے کی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

لوشیدا نے مصنوعی طور پر چار کروڑ سال قبل کے ماحول کو پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اور رونو نے مل کر چاروں کمروں کو مختلف انداز سے ترتیب دیا تھا۔ ایک کمرے میں درختوں اور گھاس پھوس کی مدد سے کروڑوں سال پہلے کا ماحول دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح باقی تین کمروں میں پتھر کا دور اور دھات کا دور وغیرہ تھے۔

لوشیدا نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے خون پہنچانے والی نلکی کا کارک بند کیا، نلکی علیحدہ کی اور اسٹریچر کو دھکیلتا ہوا کمرہ نمبر ۲ کی طرف چلا۔

اسٹریچر کو بٹن دبا کر نیچے لانے کے بعد اس نے رونو کو اٹھا کر گھاس پر لٹا دیا اور اسٹریچر دوبارہ پہلے کمرے میں رکھ دیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ابتدائی دور کا انسان کیسی حرکات کیا کرتا تھا۔

بے ہوشی کے تین گھنٹے مکمل ہو گئے تو رونو کی پلکوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لوشیدا دروازے کی آڑ میں کھڑا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

آنکھیں کھولتے ہی رونو نے حلق سے نعرہ بلند کیا۔

غاؤ ــ غاؤ ــ غاؤ، غاؤ ــ

شاید اسے بھوک لگی تھی۔ لوشیدا نے اس کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ دروازے کے پیچھے لگا ہوا بٹن دباتے ہی چھت پر بنی کھڑکی کھلی اور گوشت کے سرخ سرخ ٹکڑے گرنے لگے۔ رونو نے لپک کر دو ٹکڑے اٹھائے۔ انھیں سونگھا اور نیچے پھینک دیا اور پھر زور سے چیخا۔

"غاؤ ـــ غاؤ غاؤ"

اور چاروں طرف ہاتھ مارنے لگا۔ پھر اس کے لمبے لمبے ہاتھ ایک درخت سے ٹکرائے۔ اس نے کچھ پتے توڑے اور کچر کچر چبانے لگا۔ بیچ بیچ میں رک کر وہ حلق سے عجیب عجیب آوازیں بھی نکالتا۔ "خی ـ خا ـ خی ہی ـ خو"

اس کے کھانے کی رفتار دیکھ کر لوشیدا کو تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں وہ کمرے کے درختوں کا صفایا نہ کر دے لیکن آخر اس نے گوشت کیوں پھینک دیا تھا۔ شاید وہ اس کے ذائقے سے ناآشنا تھا یا ممکن ہے وہ جانوروں کو پکڑ کر انھیں ہلاک کر کے فوراً کھانے کا عادی ہو۔

یہ سوچ کر لوشیدا آہستہ آہستہ باہر کی طرف کھسکنے لگا۔ اس نے مویشیوں کے باڑے میں جا کر ایک گائے کی رسی کھولی اور اسے ہنکاتا ہوا کمرہ نمبر ۲ میں لے آیا۔ گائے کو اندر دھکیل کر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اندر سے دروازے پر جھاڑیاں چھپا دی گئی تھیں اور دیواروں کا بھی یہی حال تھا۔

لوشیدا نے دروازے میں بنے ہوئے سوراخ سے جھانکا تو اندر کے خوفناک منظر نے اسے دہلا دیا۔

رونو نے گائے کو دیکھتے ہی پرجوش نعرہ مارا تھا۔

"غاؤ ـ غاؤ ـ آ ـ ہا"

پھر اس نے لپک کر گائے کی گردن دبوچ لی اس کا جبڑا کھل گیا۔ رونو نے داہنا بازو گائے کے حلق میں اندر تک گھسیڑ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ چیر ڈالا۔

ذرا سی دیر میں گائے کا ڈھانچہ زمین پر پڑا تھا اور رونو اپنے تیز تیز دانتوں سے اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔

لوشیدا کراہیت سی محسوس کر کے وہاں سے ہٹ گیا۔

ایک ہفتے تک ابتدائی انسان کی حرکات و عادات کا تفصیلی مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے بعد جب لوشیدا نے اپنی رپورٹ تیار کر لی تو دروازے کے اسی سوراخ سے بے ہوش کر دینے والی گیس اندر داخل کر کے رونو کو بے ہوش کر دیا اور اسے اٹھا کر پھر اسٹریچر کے ذریعے کمرہ نمبر ۳ میں لے گیا۔

ریڈیم کا ۱۸ لاکھ سال پرانا ٹکڑا جوں ہی رونو کی کنپٹی میں بنے ہوئے نشان میں رکھا گیا اس کے چہرے اور جسم کے سیاہ بال جھڑنے لگے۔ اب اس کی پیشانی بھی نسبتاً چوڑی ہو گئی تھی یہ دور پتھر کا دور تھا جب انسان پتھروں کے اوزار بناتا تھا۔

کمرہ نمبر ۳ میں پتھروں کا ڈھیر جمع کر دیا گیا تھا۔ رونو کو اس کمرے میں پہنچانے کے بعد لوشیدا نے کاغذ پنسل سنبھال لی اس کا خیال تھا شاید اس دور کا انسان گفتگو کرنا سیکھ چکا ہو۔

رونو نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے اپنے جسم کی طرف دیکھا۔ اس دور میں شاید انسان کو اپنی برہنگی کا احساس ہو چکا تھا کیونکہ رونو ہاتھوں سے جسم چھپا کر ایک درخت کی جانب دوڑا اور چار بڑے بڑے پتے توڑ کر رکھے اور ایک بیل کی لچکیلی شاخ کی مدد سے انھیں کمر پر باندھ لیا۔ پھر اس کی نظر ایک طرف پڑے پتھروں کے ڈھیر پر پڑی۔ اس نے فوراً دو پتھر اٹھائے اور انھیں آپس میں رگڑنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رک کر دیکھتا اور پھر رگڑنے لگتا۔ جب پتھر نوکیلے ہو گئے تو اس نے انھیں ایک طرف رکھ دیا یہ شاید اس دور کا ہتھیار تھا۔

پھر اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بے ہنگم سی صدا بلند کی۔ لوشیدا کو اس کے نوکیلے دانت دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔

"باوان ـ بورتیا ـ باوتیاش"

اب وہ اس طرح ڈکرا رہا تھا جیسے بھوکی بھینس ڈکراتی ہے۔ لوشیدا نے بکری کو اندر دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا۔ رونو نے بکری کو دیکھتے ہی نوکیلا پتھر اٹھایا اور پتھر تاک کر مارا۔

پتھر کی نوک بکری کے سر میں گھس گئی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔

رونو نے اسی پتھر کی مدد سے بکری کے حلق میں شگاف سا بنایا اور خون پینے لگا۔

اچھی طرح سیر ہو جانے کے بعد اس نے بکری کی کھال ادھیڑی اور اسے جسم پر لپیٹ لیا۔ گوشت کو ہاتھوں سے کاٹ کاٹ کر بڑے بڑے پارچے بنا کر ایک طرف رکھ دیے۔ شاید ۱۸ لاکھ سال قبل کا انسان گوشت سکھا کر محفوظ کرنے کا طریقہ جانتا تھا۔

اگلے ہفتے میں لوشیدا کو ۱۸ لاکھ سال قبل کے انسان کے بارے میں حیرت انگیز معلومات حاصل ہوئیں۔ اس دور میں انسان اجتماعی زندگی گزارنے لگا تھا۔ یہ لوگ دبلے پتلے اور پستہ قد ہوا کرتے تھے۔ وہ اوزاروں سے کام لینے والے پہلے انسان تھے۔ ان کی گفتگو بہت ٹوٹی پھوٹی اور ذخیرہ الفاظ محدود تھا۔

دوسرے ہفتے رونو اپنے سر میں دھات کے دور کا ریڈیم رکھے کمرہ نمبر ۴ میں بے ہوش پڑا تھا اور لوشیدا اس کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔

رونو کے بال اب بھی لمبے اور گھنے تھے جسم کا رواں البتہ کافی کم ہو چکا تھا۔ اب اس میں پوری طرح انسان کی شباہت پیدا ہو گئی تھی لیکن موجودہ دور کے انسان سے وہ اب بھی مختلف تھا۔

کمرہ نمبر ۴ میں درختوں اور گھاس پھوس کے بجائے ایک کھوہ سی بنائی گئی تھی۔ اس کھوہ کے اندر تاریکی تھی اور لوشیدا نے لوہے کا ایک کلہاڑا خاص طرز کا بنوا کر وہاں پر رکھ دیا تھا جو بالکل ابتدائی دور کا کلہاڑا معلوم ہوتا تھا۔ اور احتیاطاً اس نے رونو کو لباس پہنا دیا تھا۔

لیکن اس مرتبہ ایک عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ رونو کی رنگت ایسی سیاہ ہو گئی جیسے افریقی باشندوں کی ہوتی ہے۔

یوشیدا کو معلوم تھا کہ یہ لوگ گوشت خور ہوتے تھے اس لئے اس نے ایک گائے پہلے ہی کمرے میں چھوڑ دی تھی جو کھوہ کے باہر ادھر اُدھر منہ مار رہی تھی۔

ردونو اٹھا۔ اٹھ کر کھوہ سے باہر آیا۔ یوشیدا کو معلوم تھا کہ ردونو کو شدید بھوک لگی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کو کچھ کھائے پیئے چھ گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے۔ لیکن یوشیدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ردونو نے گائے کی طرف مطلق توجہ نہ دی اور کلہاڑا لے کر ادھر اُدھر گھومتا رہا کبھی کھوہ میں جاتا کبھی باہر آتا۔

جب بہت دیر اسی طرح چکر لگاتے ہو گئی تو یوشیدا نے یہ خیال کیا کہ ممکن ہے۔ دھات کے دور کے آدمی گوشت بھون کر کھاتے ہوں۔ اس وقت کمرہ [illegible] میں آگ [illegible] یوشیدا نے عالم [illegible] جا کر فریج میں سے گوشت نکالا۔ جلدی جلدی بھون کر اسے چھت کے میکنزم کے ذریعے کمرے میں گرا دیا۔

ردونو نے ایک گرم ٹکڑا اٹھایا اسے سونگھا اور جھلا کر دور پھینک دیا۔

یوشیدا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے ادھر ردونو نے اچھل پھاند شروع کر دی تھی۔ شاید یہ کسی قسم کا رقص ہو۔

تھوڑی دیر میں وہ بے دم ہو کر گر پڑا۔ کلہاڑا اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس کی سانس دھیمی ہوتے ہوتے بہت آہستہ ہو گئی تب یوشیدا کو تشویش ہونے لگی کہیں ردونو کو کوئی نقصان نہ پہونچ جائے۔ وہ کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر سکے گا۔ ردونو اس کا بچپن کا ساتھی تھا دونوں ہی جاپان کے صف اوّل کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے شہنشاہ جاپان نے کئی بار انکی خدمات کو خطابات سے نوازا تھا اور اب وہی ردونو بے دم سا ہو کر گر پڑا تھا۔

یوشیدا بے چین ہو کر کمرے میں چلا گیا اور ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر وہ ردونو کے قریب پہونچ کر نیچے بیٹھ گیا۔

آہٹ پا کر ردونو نے آنکھیں کھولیں۔ سرخ سرخ خون میں ڈوبی ہوئی آنکھیں۔ یوشیدا کو دیکھتے ہی ان میں چمک سی ابھری اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یوشیدا جانے کیوں سہم کر کھڑا ہو گیا۔ ردونو نے بھی جست لگائی اور کلہاڑا اٹھا کر یوشیدا کی طرف لپکا۔

جب وہ کلہاڑا اس پر بلند کئے اس کی طرف بڑھ رہا تھا تب یوشیدا کی سمجھ میں آیا کہ ردونو دراصل پتھر کے عہد کے آدم خور قبائل میں پہونچ گیا ہے۔

بقیہ۔ ڈوبنے سے پہلے

"جی... جی... جی... وہ میں"

وہ خاموش ہو گئی شاید کچھ کہتے ہوئے شرما گئی تھی۔

"میں ماں بننے والی ہوں" وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

آواز اگرچہ دھیمی تھی لیکن نیلوفر کو ایسا لگا جیسے اس کے ذہن پر ہتھوڑا پڑا ہو۔ اس کا سارا وجود جھنجھنا گیا اور وہ جیسے طویل نیند سے یکایک جاگ گئی۔ طوفان رک گئے۔ جذبات کا سیلاب ماند پڑ گیا۔ اور اس کے قدم زمین پر جم گئے اس کے دماغ میں پھیلی ہوئی تاریکی ایک دم ختم ہو گئی اور اس کا دماغ منور ہو گیا۔ خواہشات کے بھوت بھاگ کر اپنی قبروں میں جا سوئے اور وہ انکے حصار سے آزاد ہو گئی۔

وہ تڑپ کر شہزاد کی گرفت سے نکل گئی کرسی کے ہتھے پر پڑا ہوا تولیا اس نے اپنے سینے پر ڈال لیا۔

"تم..... تم کمرے سے نکل جاؤ شہزاد" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"مگر" شہزاد نے کچھ کہنا چاہا۔

اسکی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ چیخ پڑی۔

"میں کہتی ہوں کمرے سے نکل جاؤ، ورنہ ——
ورنہ میں شور مچا دوں گی"

اور پھر ——— وہ جلتے ہوئے جہاز کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی ذات کی تہوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

★ ★

بقیہ۔ ایرانی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال

ہی تیل کشی اور اس کی صفائی کا کام کرتی ہیں لیکن اب اس کے منافع کا تین چوتھائی ایران اور اس کے باشندوں کے حصے میں آتا ہے۔ آج ایران اپنا مال براہ راست بین الاقوامی منڈیوں میں [illegible] کرنے کا مجاز ہے جب کہ پہلے یہ اس کے لئے غیروں کا دست نگر تھا۔

ایران کے خام تیل کی صفائی کے لئے دوسرے ملکوں کی شرکت میں وہاں کارخانے بھی تعمیر کئے۔ اسی طرح کا ایک کارخانہ مدراس (ہندوستان) میں بھی قائم ہو چکا ہے۔

لیکن سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جسے انقلاب سفید شاہنشاہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آج ایران کے عوام زندگی کے ہر شعبے میں سرگرم عمل ہیں۔ زمین اور کارخانوں اور صنعتی اداروں کی ملکیت، انتخاب کا قانون اور عورتوں کا حق رائے دہندگی، تعلیم و تدریس پر ہر ایک کا حق (جس کے لئے [illegible]

لئے سپاہ بہداشت کی تنظیم (ولی) عدالتی نظام غرض ہر میدان میں ہر ایک شہری بلا امتیاز برابر کا حصے دار بنا دیا گیا ہے۔

بقیہ بنارس یونیورسٹی

کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

اس وقت سماج وادی یووجن سبھا کا راج [illegible] زیادہ بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا ہے [illegible] ہے کہ اس طرح وہ اسٹوڈنٹس یونین پر قبضہ [illegible] کے انتخابات ۲۸ نومبر کو ہونے والے ہیں۔ [illegible] کے ساتھ اس گروپ کا گٹھ جوڑ اس چار جماعتی گٹھ جوڑ [illegible] دلاتا ہے جو لوک سبھا کے عام انتخابات سے قبل ہوا تھا۔ لیکن جس طرح اس چار جماعتی گٹھ جوڑ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اسی طرح یقین ہے کہ یونیورسٹی میں بھی گٹھ جوڑ کرنے والوں کو ناکامی ہوگی۔

وائس چانسلر ڈاکٹر شریمالی اگر اپنی مضبوط پالیسی پر قائم رہے اور انتشار پسندوں کا ڈٹ کر مقابلہ [illegible] کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہوں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کافی بدنام ہو چکی ہے۔ اگر ڈاکٹر شریمالی اس کی اس بدنامی کو نیک نامی میں تبدیل کر سکے تو یہ انکی بہت بڑی کامیابی ہو

چست لباس — آج ہمارے
شرے ایک مسئلہ کی شکل اختیار
کر گیا ہے۔ جس کا ذکر آتے ہی
طرح کے سوالات ہمارے ذہنوں
میں ابھرتے ہیں جن کا تعلق نہ صرف
انسان کی تہذیب، نفسیات، اخلاق
اور سماج سے ہے بلکہ بڑی حد
تک صحت سے بھی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں

قیمت 80 پیسے

بیخود دہلوی کا اصل اسم گرامی سید وحید الدین تھا۔ ۲۰ رمضان ۱۲۷۹ھ کو بھرت پور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم دہلی میں پائی۔ زانوئے تلمذ حضرت داغ کے سامنے تہ کیا۔ داغ کے چیدہ چیدہ شاگردوں میں انکا شمار ہوتا ہے انکی تصانیف میں گفتار بیخود اور شہسوار بیخود قابل ذکر ہیں۔ پہلی کتاب ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی اور دوسری ۱۳۳۸ھ میں۔

تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

شمع مزار تھی، نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دلِ مرحوم کے لئے
کم بخت نامراد لڑکپن کا یار تھا

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شئے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہماری سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں
نقشِ قدم کسی کا سرِ رہگذار تھا

اس وقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق
تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

• بیخود دہلوی

دسمبر ۱۹۷۱ء

نصف دوم

سال ـــــ پچیس واں شمارہ

مدیر

بدالوحید صدیقی

صدر دفتر

۱۰، نظام الدین ایسٹ، نئی دہلی ۱۳

ٹیلیفون ـــ ۶۱۹۰۹۵

پی کی قیمت ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۱۸ روپے

ین کار ـــــ ای روز ـــــ بہزاد راہی
ـــ طابع و ناشر: عبدالوحید صدیقی ـــــ
ہوعہ: بیبل آرٹ پریس، روڈگراں، فراشخانہ دہلی

جنگ اور مسلمان

۳۲ سال پہلے ہٹلر نے اپنے سیاسی وجود کو باقی رکھنے کے لئے "جرمن ریخ" کے نام پر عالمِ انسانیت کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا تھا لیکن ہٹلر نے جنگ شروع کرنے سے پہلے جرمنی کو صنعتی اور اقتصادی اعتبار سے کافی مستحکم بنالیا تھا۔

آج ۳۲ سال بعد پاکستان کے جنرل یحییٰ خاں نے بھی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے "اسلام" کے نام پر جنگ چھیڑی ہے لیکن پاکستان کو صنعتی، اقتصادی، فوجی اور اخلاقی اعتبار سے مضبوط و مستحکم ملک بنانے کے بعد نہیں بلکہ اسے کمزور سے کمزور تر بنانے کے بعد۔

ہٹلر اور جنرل یحییٰ خاں میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر کو اپنے عوام کی مکمل حمایت حاصل تھی اور ثانی الذکر اپنے عوام کی اکثریت کی حمایت سے محروم ہے، ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہٹلر نے اپنی نسل کے لوگوں کا خون بہاکر اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کی کوشش نہیں کی تھی جبکہ یحییٰ خاں نے خود اپنوں ہی کے خون سے اپنے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہم یحییٰ خاں کا ہٹلر سے موازنہ نہیں کرنا چاہتے کہ تاریخ خود اس کا فیصلہ کرے گی کہ ان میں کون اچھا تھا اور کون بُرا۔ لیکن ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پاکستان بڑی بے دردی سے اسلامی اصولوں اور اسلام کی اعلیٰ قدروں کو پامال کرنے کے بعد بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسلام ہی کا نام لیکر اصل مسئلہ کو عوام کی نگاہوں سے چھپانے کی کوشش کررہا ہے۔ پاکستان کی پروپیگنڈا مشینری موجودہ لڑائی کو اس انداز میں کفر و اسلام کی لڑائی ثابت کرنے کی کوشش کررہی ہے گویا سارا اسلام پاکستان میں ہے اور سارا کفر ہندوستان میں، جیسے پاکستان بننے سے پہلے دنیا میں اسلام تھا ہی نہیں اور پاکستان کے ختم ہونے کے بعد دنیا سے اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ جبکہ حقیقت کچھ اور ہی ہے اور اسلام کے نام پر پاکستان میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا ہے اس کی کوئی اور مثال اسلام کی پوری تاریخ میں نہ ملے گی۔

کیا یہی اسلام ہے کہ اپنے ہی بھائیوں کے سر قلم کئے جائیں؛ ـــــ اپنی ہی بہنوں کو سر بازار رسوا کیا جائے ـــــ اپنے ہی بچوں اور اپنی ہی ماؤں اور بیویوں کو در در کی خاک چھاننے پر مجبور کیا جائے؟ اور کیا یہی اسلام ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کہی جانے والی ریاست میں شراب و کباب عام ہو، عصمت فروشی اور اغوا ثواب ہو، ناچ رنگ کی محفلیں جمانا کارِ خیر سمجھا جائے، اور کوئی شخص تو اتنا کھائے کہ اس کا پیٹ پھٹ جائے لیکن دوسرا شخص اس کے پڑوس میں دانے دانے کو ترسے؟

اسلام بازیچۂ اطفال نہیں، یہ ایک طرزِ حیات ہے جس میں فرائض ہی فرائض ہیں، ماں کے فرائض، باپ کے فرائض، بھائی کے فرائض، پڑوسی کے فرائض ـــــ حقوق ہی حقوق ہیں ـــــ انسانی حقوق جن کو کچل کر، جنہیں فراموش کرکے اور جنہیں نظر انداز کرکے اسلام ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ پاکستان کے حکمرانوں کو اسلام کا نام لینا زیب نہیں دیتا۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلام کا مقدس نام پاکستان والے کیوں لیتے ہیں۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں، خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن کو مشکوک بناکر اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں ـــــ لیکن اب ہندوستان بدل چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کا مسلمان بھی بدل چکا ہے، اس نے محسوس کرلیا ہے کہ وہ پاکستان جو حسین نعروں اور دلکش اصولوں کے پردے میں بنایا گیا تھا، دراصل چند خان بہادروں، سروں، نوابوں، راجاؤں اور رئیس زادوں کی شکارگاہ ہے جہاں غریب مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہندوستان کی رجعت پسند طاقتیں بھی پاکستان کے وجود کو باقی رکھنے میں اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ کافی اہم کردار ادا کررہی تھیں لیکن وسط مدتی انتخابات کے بعد اس ملک میں ان طاقتوں کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے اس لئے اب پاکستان کے حکمرانوں کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے جنگ کے سوا کوئی اور راہ نہیں نظر آرہی ہے اسی

لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔

پاکستان کی عددی طاقت ہندوستان کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اقتصادی طور پر وہ آج بھی امریکا، برطانیا اور فرانس کا طفیلی ہے، حب الوطنی کے فقدان کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہوسکتا ہے کہ پورا بنگلا دیش پاکستان کے حکمرانوں سے بدظن ہوچکا ہے اور مغربی پاکستان بھی بلوچوں۔ سندھیوں، پنجابیوں پٹھانوں اور "مہاجروں" کے خانوں میں تقسیم ہوچکا ہے۔ فوجی اعتبار سے بھی پاکستان دوسروں کا محتاج ہے ان حالات میں پاکستانی حکمرانوں نے ہندوستان سے جنگ چھیڑ کر خود ہی اپنی ریاست کی تباہی کا انتظام کرلیا ہے۔

ہم ان لوگوں میں ہیں جنہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی حبُّ الوطنی پر کبھی شبہ نہیں رہا ہم نے ہمیشہ ہندوستانی مسلمانوں کے ردیہ کو کرب کے اظہار کی علامت سمجھا ہے لیکن ہندوستان میں رجعت پسندوں کے خاتمہ کے بعد اب اس کرب کا بھی خاتمہ ہوچکا ہے۔ ہاں چند ظلمت پسند، مفاد پرست اور جاہل افراد جو بدقسمتی سے مسلمانوں کی قیادت کے دعویدار ہیں انہیں گمراہ کرسکتے ہیں اس لئے مسلمانوں کو ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کے خلاف حکومت کی کارروائیوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا اس موقع پر اگر خود مسلمان اچھے اور بُرے کی تمیز کرلیں اور ان عناصر کو اپنی صفوں سے خارج کردیں تو ہم پورے یقین کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آنے والا دَوران کے لئے انتہائی شاندار دَور ہوگا۔ اگر اسّی لاکھ سکھ ہندوستان کی قسمت میں دخیل ہوسکتے ہیں تو ۹۰ کروڑ مسلمان کیوں نہیں ایسا کرسکتے؟ اس سوال پر خود مسلمان غور کریں اور اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کریں ہمیں اس سے انکار نہیں کہ انہیں وقتی طور پر مشکلات کا سامنا ہوسکتا ہے لیکن بنگلا دیش کی آزادی کے بعد ہندوستانی سیاست کا جو نقشہ اُبھر رہا ہے اس میں یہ مشکلات خود بخود دور ہوجائیں گی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک نئے دَور کا آغاز ہوگا اور یہ دور یقینی طور پر نفرت و تعصب کے بطن سے جنم لینے والے فسادات، اشتعال انگیز نعروں اور تشدد آمیز ہنگاموں سے پاک ہوگا کیونکہ بنگلا دیش کی آزادی کے ساتھ ہندوستان میں جس نئی سیاسی فکر کو استحکام حاصل ہوگا اسمیں اس قسم کی تخریبی اور نفرت انگیز سیاست کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی

آزاد بنگلا دیش کے قیام کے بعد

جس وقت یہ سطور سپردِ قلم کی جارہی ہیں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان زبردست تصادم جاری ہے — مشرقی محاذ پر پاکستان کی فوج تقریباً پسپا ہوچکی ہے۔ لیکن مغربی سیکٹر کی صورت حال واضح نہیں ہے پھر بھی اتنا کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کو اس محاذ پر بھی ہزیمت کا سامنا ہے اسی اثنا میں سلامتی کونسل میں دوبار روس کا ویٹو جنگ بندی کی دو قراردادوں کو ناکام بناچکا ہے۔ لیکن جنرل اسمبلی نے جنگ بندی کی قرارداد منظور کرلی ہے، ادھر پاکستان میں نورالامین اور ذوالفقار علی بھٹو بالترتیب وزیراعظم اور نائب وزیراعظم و وزیر خارجہ نامزد کئے جاچکے ہیں۔ ان کی نامزدگی کا سبب واضح طور پر یہ ہے کہ پاکستان "سول گورنمنٹ" کے پردے میں بنگلا دیش کے مسئلہ کو چھپانا چاہتا ہے۔ قیاس تو یہی ہے کہ جنرل اسمبلی کی قرارداد بے اثر رہے گی لیکن آنے والے پندرہ دن چند حیرت انگیز واقعات سے پُر ہوں گے۔

حکومت ہند بنگلادیش کی عوامی جمہوری سرکار کو تسلیم کرچکی ہے۔ بھوٹان نے ہندوستان کی پیروی کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ روس بھی اس حکومت کو تسلیم کرلے لیکن مشرقی یورپ کے ممالک بالخصوص مشرقی جرمنی کی حکومت عوامی جمہوریہ بنگلا دیش کو یقینی طور پر تسلیم کرلے گی اور اگر جنگ بندی ہوتی بھی ہے تو یہ مشرقی بنگال میں کافی اندر، اور مغربی پاکستان میں سرحد سے کافی دور پاکستان ہی کے علاقے میں ہوگی۔

امریکہ کی شکل بگڑ گئی

دنیا کے کسی اور ملک میں امریکہ کی شکل چاہے جیسی ہو کم از کم ہندوستان میں آئندہ پندرہ بیس برسوں تک امریکہ کی بگڑی ہوئی شکل نہ بدل سکے گی۔

آج ہندوستان میں امریکہ کے حکمرانوں کے خلاف نفرت کا وہی جذبہ پیدا ہوگیا ہے جو پاکستانی حکمرانوں کے خلاف ہے اور روس نے سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں

[illegible] ہر ہندستا[illegible] اپنی جگہ بنالی ہے۔

سفارتی حلقوں کا خیال ہے کہ امریکہ نے گھڑی پر پاکستان اور چین کا ساتھ دے کر ان تم کو ملیامیٹ کردیا ہے جو اس نے اقتصادی تکنکی امداد کی شکل میں اب تک ہندوستان پر کئے تھے یہ سمجھا جارہا ہے کہ صدر نکسن نے ڈلز کی اس مُردہ کیا ہے جس کا مقصد برصغیر میں سرد جنگ کو سواد جنگ میں بدلنا اور اس علاقہ میں دائمی اضطر کے امریکی مفادات کی حفاظت کرنا تھا۔ اسی پالیہ پیکٹ کو جنم دیا تھا اور یہی پالیسی سیٹو کے قیام کا امریکہ نے ہندوستان کی اقتصادی امداد کا اعلان کیا ہے۔ قدرتی طور پر امریکہ کے اس اعلا میں کچھ بے چینی پائی جاتی ہے لیکن ہندوستان کی یہ رہی ہے کہ وہ مادّی امداد کے سوتے کھلے رکھنے امداد دینے والے ملک کا طفیلی نہ بنے گا اس لئے ا بند ہونے سے کچھ پریشانیاں تو پیدا ہوسکتی ہیں لیکن کے ارادوں اور پائے استقلال میں کوئی جنبش نہ

جن سنگھ کی مایوسی

ہندوستان میں جن سنگھ کو امریکی مفادات کا ترجمان سمجھا جاتا تھا جن سنگھ کے قائدین دیش کے پردے میں سامراجی پٹھوؤں کا رول اس خوبصورتی ادا کر رہے تھے کہ ان پر شک کرنے والوں پر فوراً غدا لگ جاتا تھا لیکن اب جن سنگھ کی حالت ایک ایسی کشتی جو جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی ہو اور طوفانوں کے تھپیڑے کرنے کی سکت نہ رکھتی ہو۔ پاکستانی حملہ سے پہلے جن حکومتِ ہند کے خلاف وسوسے پیدا کررہی تھی اور بیانات بھی دے رہی تھی جن سے یہ شبہ ہو کہ ہند جارحیت کرنے والا ہے۔ جنگ کے بعد جن سنگھ کے توپ خانے کا گولہ بارود بالکل ختم ہوگیا ہے اور د کے ذریعہ اپنے سیاسی وجود کو برقرار رکھنے کی کوشش

ملی، پنجاب، یوپی اور مدھیہ پردیش میں جن سنگھ کی
نڈہ مشینری پوسٹروں اور پمفلٹوں کے ذریعہ عوام کو
ش بھگتی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ خون دینے والوں
بڑی فہرستیں شائع کی جا رہی ہیں۔ جیسے صرف جن سنگھ
لک کے حصہ میں ساری حب الوطنی آگئی ہے اور دوسرے
ں نعمت سے محروم ہیں۔

دھکے رہے نہ اُدھکے رہے

وک سبھا اور راجیہ سبھا دونوں نے سابق دیسی ریاستوں
ں کے وظائف اور دیگر مراعات ختم کرنے کا بل منظور
ے۔ اب یہ بل ریاستی اسمبلیوں کے سامنے پیش ہوگا۔
لیا جاتا ہے کہ ریاستی اسمبلیاں بدلے ہوئے حالات
ن دبیش کے بغیر پارلیمنٹ کے اس فیصلہ کی توثیق
، اس کے بعد صدر جمہوریہ ہند کے دستخط ہونگے
قانون کی شکل اختیار کرے گا۔ ہندوستان میں
کو عملی شکل دینے میں اسابق والیانِ ریاست
ادر دیگر مراعات ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت رکھتی
یمنٹ میں جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی نے اس بل کی
ت نہیں کی جس سے عوام ایک بار اور ان کی ظلمت
قف ہو گئے ہیں۔ ابتداء میں جب سابق راجاؤں
طور پر ان مراعات سے سبکدوش ہونے کی بات
امکانات تھے کہ انہیں کچھ معاوضہ بھی دیا جائیگا
یا جائیگا کیونکہ نئے قانون میں معاوضہ کی کوئی شق
راجاؤں نے "افہام و تفہیم" سے کام لینے
مراعات سے سبکدوشی کا اعلان کر دیا
میں کبھی ان کا وقار بڑھتا اور حکومت
معاوضہ دیتی لیکن وسط مدتی انتخابات
تھے کہ ملک کی ترقی پسند قوتوں کو وہ
کو برسرِ اقتدار لے آئیں گے اور ان
اری رہے گا لیکن وقت بڑا بے رحم
اجاؤں کا یہ حال ہے کہ سہ
منم: نہ ادھکے رہے نہ اُدھکے رہے

اردن کے وزیر اعظم کا قتل

اردن کے شاہ حسین جو الاکمی کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں فی الحال قاہرہ میں ان کے وزیر اعظم مسٹر وصفی تال کو ہلاک کئے جانے کے واقعہ پر اس کے علاوہ کوئی اور تبصرہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ واقعہ ایک بڑے دھماکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسٹر وصفی عرب لیگ کی دفاعی کونسل میں شرکت کے لئے قاہرہ گئے تھے۔ جہاں انہیں فلسطینی مہاجروں کے لئے غضبناک فدائین نے ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو اس وقت گولیوں کی بارش کر کے موت سے ہمکنار کر دیا جب وہ کانفرنس سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں جا رہے تھے۔

اس سلسلہ میں جن فلسطینیوں کو گرفتار کیا گیا ہے انہیں اس واقعہ پر ندامت کا ذرہ برابر احساس نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے کہا ہے کہ فلسطینیوں کے کاز سے غداری کرنے والوں سے انتقام لینے کے منصوبہ کی پہلی کڑی ہے اور فلسطینی کاز سے غداری کرنے والے کسی بھی شخص کو نہ چھوڑا جائے گا۔"

ظاہر ہے کہ اس واقعہ کا عرب دنیا پر گہرا اثر پڑا ہے۔ بہت سے عرب حکمرانوں بالخصوص شاہ حسین نے اب یہ محسوس کر لیا ہے کہ اگر انہوں نے فلسطینی مہاجروں سے لاپروائی برتی تو ان کی حکومت کی اور خود ان کی خیریت نہیں ہے۔ مصر کے صدر سادات نے اس المناک واقعہ کی سخت مذمت کی ہے مگر شاہ حسین کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہے۔ اور ان کے اس احساس نے شدت اختیار کر لی ہے کہ ان کے اقتدار کو حقیقی خطرات لاحق ہیں۔

یہ دنیا کا غالباً پہلا واقعہ ہے کہ کسی ملک کے وزیر اعظم کو
[illegible]

کارروائی فلسطینی مہاجرین کے ساتھ اور زیادہ سخت ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی بڑی فوجی کارروائی کر کے فلسطینیوں سے اس قتل کا انتقام لیں لیکن کیا کوئی حکمران اپنے ملک کی آبادی کے اکثریتی طبقہ کے خلاف ظلم و ستم کا چکر چلا کر اطمینان سے حکومت بھی کر سکتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اسی کے جواب پر اس ہاشمی سلطنت کا انحصار ہے۔ گزشتہ اگست میں شاہ حسین نے فلسطینی مہاجرین کے خلاف جو مسلح بغاوت پر آمادہ تھے اور گوریلا جنگ کے ذریعہ اردن کی بادشاہت کی چولیں ہلانے میں مصروف تھے سخت اقدامات کئے تھے۔ ان اقدامات ہی کے نتیجہ میں لیبیا، شام، عراق اور چند دوسرے عرب ملکوں نے اردن سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تھے اور اردنی حکومت کے اقدامات کی شدید مذمت کی تھی۔ خود مصر کے صدر سادات نے بھی شاہ حسین پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔ اور اسی وقت سے اردن اور مصر کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ اب مسٹر وصفی کے قتل پر صدر سادات کے مذمتی بیان اور اظہار تاسف و معذرت کے باوجود تعلقات کی کشیدگی بڑھے گی جس کے نتیجہ میں یقینی طور پر اسرائیل کو میدان جنگ میں سزا دینے کی خواہشات بھی مجروح ہوں گی

چونکہ اسرائیل کے حکمرانوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اردن میں کسی ایسی حکومت کو برداشت نہ کریں گے جو فلسطینی فدائین یا ان کے مددگاروں کی ہو اس لئے اگر شاہ حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش ہوتی ہے تو اسرائیل کی مداخلت اور اس کے نتیجہ میں نئی جنگ

دہلی کی ڈائری

نمائش کی خاص عمارتوں کے ماڈل۔ قومی ہال اور تین چھوٹے ہال جہاں ہندوستان کی رفتار کے مختلف مناظر کی عکاسی کی جائیگی۔

ایشیا-۷۲- ہندوستان کی سب سے بڑی نمائش

تلک برج سے شروع ہوکر متھرا تک جانے والی سڑک شمار دہلی کی سنسان ترین سڑکوں میں ہوتا ہے۔ اس سڑک کے نوں طرف دہلی کا کل اور آج پوری فیاضی سے بکھرا ہوا ہے۔ ل برج سے ذرا آگے بڑھتے ہی سڑک کے ایک طرف سپریم کورٹ عظیم الشان عمارت ہے اور اس کے سامنے دور دور تک پھیلا وا نمائش کا میدان۔ نمائش کے میدان سے لگی ہوئی ہلکا صاحب درگاہ ہے جس سے ذرا آگے پرانا قلعہ ہے۔ اس کے بارے میں ہا جاتا ہے کہ پہلے یہاں کوروؤں کا قلعہ تھا۔ بعد میں یہاں ہمایوں نے اپنا قلعہ تعمیر کیا جسے شیرشاہ سوری نے آخری شکل دی جہاں کبھی پہلے ایشین کھیل ہوتے تھے اور جو ہندوستان میں اپنی قسم کا واحد اسٹیڈیم ہے۔ قلعے سے لگا ہوا بالکل ماڈرن انداز پر بنا ہوا دہلی کا چڑیا گھر ہے جسے ہندوستان کا سب سے بڑا اور خوبصورت چڑیا گھر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چڑیا گھر سے ذرا آگے بڑھتے ہی دہلی کا سب سے مہنگا رہائشی علاقہ سندر نگر شروع ہو جاتا ہے۔ سندر نگر میں اگر آپ بہت خوش نصیب آدمی ہیں تو تین کمرے کا مکان ۳ سے ۴ ہزار روپے مہینے تک کرایہ پر حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک کمرے کی برساتی کا کرایہ ۸ سو روپے سے اوپر ہی ہوتا ہے۔ اس سے ذرا آگے بڑھ کر ہندوستان کا دوسرا رخ ــ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سیکڑوں جھگیاں پھیلی ہوئی ہیں جن کے درمیان میں کھڑا ہوا ہمایوں کا مقبرہ ہمیں اس بات کی یاد دلا رہا ہے کہ ہندوستان کے لوگ آج بھی وہیں ہیں جہاں آج سے ہزار سال پہلے تھے (یہ اور بات ہے کہ ہندوستان بذات خود کافی ترقی کر چکا ہے) ہمایوں کے مقبرے کے سامنے سڑک کے دوسری طرف حضرت نظام الدین اولیا کا مزار ہے۔ یہ وہ عمارت ہے جس کی چوکھٹ پر سیکڑوں شہنشاہوں کے سر جھکے لیکن جو آج خود اپنی بوسیدہ دیواروں کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے۔ یہاں بھی آزاد ہندوستان پوری طرح اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ ایک طرف نظام الدین کی خوبصورت کالونی ہے اور دوسری طرف بستی نظام الدین ہے جس کے ہر بوسیدہ اور بدبودار مکان کی دیوار پر لکھا ہوا ہے "غریبی ہٹاؤ"۔ سنا ہے کارپوریشن اس بستی کو ہٹانے کے بارے میں غور کر رہی ہے!!

اس طرح دہلی کی یہ شہ رہ متھرا روڈ میلوں دوڑتی چلی گئی ہے۔ دنیا اور اپنے وجود سے بے خبر ــ اس کے پاس اپنے سینے پر تیرنے والی کاروں کے لئے بھی اتنی ہی جگہ ہے جتنی کہ اپنے کلیجے سے لپٹ کر سونے والے ہزاروں بے گھر لوگوں کے لئے۔

جیسے ہی سڑک ذرا آگے بڑھتی ہے بڑی بڑی فیکٹریوں اور دھواں اڑاتی ہوئی چمنیوں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ فیکٹریوں اور جھونپڑیوں کا یہ سلسلہ (کیونکہ بڑی بڑی فیکٹریوں اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے) ہریانا میں فریدآباد تک چلا گیا ہے۔

بات ذرا کچھ لمبی کھنچ گئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سڑک اپنی خاص سچویشن کی وجہ سے عام طور پر سنسان رہتی ہے۔ جہاں ذرا شام ہوئی سڑک سونے کی تیاری شروع کر دیتی ہے۔ نمائش گراؤنڈ میں ۱۹۶۴ء میں بین الاقوامی نمائش لگی تھی۔ اس کے بعد سے یہ میدان سونا اور اجاڑ پڑا ہے۔ میدان میں درجنوں خوبصورت عمارتیں بکھری ہوئی ہیں جو آہستہ آہستہ دیمک اور بہتے ہوئے وقت کی نذر ہوتی جا رہی ہیں لیکن اب اس سڑک پر ایک بار پھر گہما گہمی شروع ہو گئی ہے ــ وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں ہونے والی ایشین نمائش جو ہندوستان میں اب تک ہونے والی نمائشوں میں سب سے بڑی ہوگی۔ دن رات لگ کر نمائش کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سوئی ہوئی عمارت کو پھر سے جگانے کی کوشش کی جا رہی ہے، مٹی ہوئی تصویروں میں پھر رنگ بھرے جا رہے ہیں۔ لیکن یہاں صرف گزرے ہوئے کل کو نہیں جگایا جا رہا ہے بلکہ آنے والا کل بھی تعمیر کیا جا رہا ہے۔

ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے نمائش پر کروڑوں روپے خرچ کیا جانا چاہئیں یا نہیں۔ یہ تو ایک سیاسی سوال ہے جس کا جواب دینے کی کوشش یہاں نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ نمائش کا پروگرام بن چکا ہے اور اس کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ اس لئے ہمیں اس بات سے دلچسپی ہے کہ یہ نمائش کس قسم کی ہوگی۔ اس سلسلے میں ہم نے مسٹر محمد یونس سے ملاقات کی جو اس نمائش کے مہتمم خاص ہیں۔ آپ وزارت تجارت میں سکریٹری اور اسٹرنگ کمیٹی کے چیرمین ہیں۔ یونس صاحب نے ہمیں پورے میدان میں سیر کرائی۔ ہر جگہ مشینی رفتار سے کام ہو رہا ہے۔ پرانی عمارتوں اور سڑکوں کو توڑا جا رہا تھا۔ اس کی جگہ نئی عمارتوں کی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں۔ یونس صاحب نے ہمیں بتایا کہ اس مرتبہ ایسی عمارتیں بنائی جائیں گی جو مستقل قائم رہیں اور ہمیشہ کام آتی رہیں۔ دہلی کا شمار دنیا کے اہم ترین شہروں میں ہوتا ہے اس لئے یہاں کسی ایسی جگہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جس میں ہر سال مختلف قسم کی نمائشیں اور میٹنگیں وغیرہ کرائی جا سکیں اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر ایک بہت بڑے کمپلیکس کی تعمیر کی جا رہی ہے۔ اس کمپلیکس میں ایک بہت بڑا "قوموں کا ہال"، "انڈسٹریل کا ہال"، "اسمبلی ہال"، ریسٹورانٹ، تھیٹر، خوبصورت باغ اور نمائش کا مرکزی دفتر ہوگا۔ نمائش کی

یت اس لئے زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ ۱۹۷۲ء میں ہندوستان
آزادی کی سلور جوبلی منائی جا رہی ہے۔ اس موقع کا خاص
یلین "ہندوستان کا ارتقاء" ہوگا۔ اس میں تصویروں
نموں اور فلموں کے ذریعے ہندوستانی تاریخ کی عکاسی
جائے گی۔ اسے بنانے کے لئے ہندوستان کے بہترین آرٹسٹوں
نیروں اور معماروں کی مدد حاصل کی جا رہی ہے۔ اس
ین کے چاروں طرف باہر کی دیواریں، فلمی اسکرین کا کام
یں گی جن پہ ہر وقت ہزاروں انسانی جسموں اور چہروں کی
ویریں بدلتی رہیں گی۔ اس پویلین میں یہ دکھایا جائے گا کہ
ہندوستان کتنا مختلف ہونے پر بھی ایک ہے۔ اس نمائش کا
سرا خاص پویلین جواہر لال نہرو پویلین ہوگا جس میں نہرو اور
رو کے ہندوستان کی عکاسی کی جائے گی۔

اب تک ۲۶ ملک اس نمائش میں حصہ لینے کی دعوت
طور کر چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے تمام ملکوں کو اس نمائش
حصہ لینے کی دعوت دی گئی ہے۔ لیکن اب تک چین کو دعوت
نہیں بھیجا گیا۔ امید ہے کہ جلد ہی چین کو بھی دعوت نامہ
ج دیا جائے گا کیونکہ بغیر چین کے حصہ لئے "ایشیا ۷۲"
مکمل رہے گی۔ آج تک ہندوستان کی کسی نمائش میں
تنے زیادہ ملکوں نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ ان تمام ممالک کے
یلین الگ الگ ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے
ختلف صوبوں، بڑے بڑے اداروں اور کمپنیوں کے پنڈال
علیحدہ لگیں گے۔ نمائش میں درجنوں تھیٹر، ریسٹورانٹ،
وں کے کھیل کود کے سامان اور ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بھی
ہوگا۔ ہوٹلوں میں ہندوستان کا ہر کھانا ملے گا۔ یونس صاحب
نے بتایا کہ مسز گاندھی نمائش میں بذات خود دلچسپی لے رہی ہیں
وہ چاہتی ہیں کہ یہ نمائش ایک نمونہ بن جائے، ایک یادگار ہو جائے
س میں دکھایا جا سکے کہ ہندوستان نے پچھلے پچیس سال میں کتنی
ترقی کی ہے۔

نمائش کے میدان میں ابھی نئی خوبصورت عمارتیں تو
نہیں کھڑی ہوئی ہیں البتہ یہاں کام کرنے والے مزدوروں
ی جھگیوں کی قطاریں ضرور لگ گئی ہیں۔ میں جھگیوں کے پاس
سے گزرا تو مزدور شام کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے
بٹوں پہ ابلتا ہوا ان کا کھانا، درجنوں بیماریوں کے شکار ان
کے بچے۔ ٹھنڈ میں سکڑتی ہوئی ان کی عورتیں اور سرد ہواؤں یا
گردتی ہوئی ان کی جھونپڑیاں چیخ چیخ کر ہندوستان کی ترقی اور
خوش حالی کا اعلان کر رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا
واقعی ہمیں دنیا کو دکھانے کے لئے ایک نمائش کی ضرورت
ہے۔ ایسی نمائش جہاں ہندوستانی نہیں بلکہ ان کی خوبصورت
تصویریں ہوں۔

کھیل کا کھیل:۔ دہلی میں کھیلوں کے ساتھ بھی کھیل کھیلا
جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ڈی۔ سی۔ ایم فٹبال ٹورنامنٹ کے منتظمین
نے فٹبال کے شائقین کے ساتھ ایک کھیل کھیلا۔ فٹبال
طاقت کا کھیل ہے اور طاقت کے استعمال میں اس کے شائقین
بھی کچھ پیچھے نہیں رہتے۔ فٹبال میچوں میں دنیا کے ہر ملک میں
جھگڑے ایک عام چیز ہیں۔ دہلی کے ڈی سی ایم فٹبال ٹورنامنٹ
میں محمڈن اسپورٹنگ کلکتہ اور بارڈر سکورٹی فورس کے
درمیان کچھ جھگڑا ہوا جو بہت جلد تماش بینوں کا باہمی جھگڑا
بن گیا۔ ریفری راؤ نے محمڈن کے حق میں گول دیا لیکن بارڈر
سکورٹی فورس نے اور کچھ تماش بینوں نے ریفری کا فیصلہ
ماننے سے انکار کر دیا۔ تماش بینوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔
اور کھیل ملتوی کر دیا گیا۔ ہو سکتا ہے ریفری غلط ہو لیکن
کھلاڑیوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ریفری کے فیصلے کا
احترام کریں۔ کھلاڑی تو ایک طرف رہے۔ خود ڈی۔ سی۔ ایم
کے منتظمین نے فیصلے کا احترام نہیں کیا اور میچ دوبارہ کھلانے
کا فیصلہ کر لیا۔ محمڈن نے دوبارہ میچ کھیلنے سے انکار کر دیا
جس کے نتیجے میں بی۔ ایس۔ ایف کو فاتح قرار دے دیا گیا۔

ٹورنامنٹ کے منتظمین کے فیصلے کے پیچھے جو کہانی ہے
وہ کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ منتظمین ہمیشہ مقبول ٹیموں
سے زیادہ سے زیادہ میچ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محمڈن
اس وقت ہندوستان کی مقبول ترین ٹیم ہے اور اس کے میچوں
میں منتظمین کو سب سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ بی۔ ایس۔ ایف
اور محمڈن کا کھیل ملتوی ہونے کی صورت میں منتظمین کو آمدنی
کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ محمڈن کے ایک میچ میں منتظمین
کو تقریباً ۴۵ ہزار روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ محمڈن نے
منتظمین کی اس حرکت کو دیکھ کر ان سے ۵ ہزار کی جگہ جو ان
کے لئے منظور کئے گئے تھے، ۹ ہزار روپے کا مطالبہ کیا جو منتظمین
نے دینے سے انکار کر دیا۔ محمڈن نے اس بنا پر کھیل میں حصہ لینے
سے انکار کر دیا اور بی ایس ایف کو فاتح قرار دے دیا گیا۔
کھیل ملتوی ہو جانے کی صورت میں ہار جیت یا گول کے
صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ آل انڈیا فٹبال فیڈریشن کو کرنا چاہئے
تھا لیکن ڈی سی۔ ایم نے اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے غلط
راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی جو اس قسم کے ٹورنامنٹ کے
لئے خطرناک ہے۔ موہن بگان نے پہلے ہی اس ٹورنامنٹ
میں حصہ لینا چھوڑ دیا ہے۔ اور اب شاید بنگال کی دو دوسری
مقبول ٹیمیں ایسٹ بنگال کلب اور محمڈن اسپورٹنگ بھی اس
میں حصہ لینا چھوڑ دیں گی۔

بال یوگیشور کے چیلے — اہنسا کے پجاری؟

پچھلے کچھ دنوں سے دہلی کے ہر گلی کونے اور پتھر چٹان، کالی
اور لال سیاہی سے کچھ جملے لکھے نظر آ رہے ہیں۔ جملے کچھ اس قسم کے
ہیں "پالم چلو — بال بھگوان آ رہے ہیں"، یا "رام لیلا میدان
میں امن بم پھٹنے والا ہے — بال بھگوان آ رہے ہیں" یہ جملے
ہندی، اردو اور انگلش تینوں زبانوں میں لکھے ہوئے ہیں —
۱۴ سالہ بال یوگیشور دنیا کے سفر کے بعد — دنیا کو امن کا پیغام دینے
کے بعد — ہندوستان واپس آئے تھے۔ دہلی کے ہندی اور
روزنامہ نو بھارت ٹائمز نے بال بھگوان سے ہوائی اڈے پر
لیا ہوا ایک انٹرویو شائع کیا جس سے بھگوان کے بہت سے
چیلے ناراض ہو گئے۔ چیلوں کی ایک بھیڑ نے بہادر شاہ ظفر
روڈ پر واقع ٹائمز آف انڈیا اور نو بھارت ٹائمز کے دفتر پہ حملہ
کر کے درجنوں لوگوں کو زخمی کر دیا۔ دفتر کے شیشے توڑ ڈالے
فائل اور دوسری چیزیں نکال کر پھینک دیں۔ ایک درجن سے
زائد لوگ (جن میں دفتر کا چوکیدار بھی شامل تھا) بہت بری طرح
زخمی ہوئے۔ اگلے روز ایک کانسٹبل محمد لطیف زخموں کی تاب
نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ چوکیدار کی حالت ابھی تک خطرے میں ہے
چیلوں کے خلاف قتل کا الزام درج کر لیا گیا ہے۔ کچھ
گرفتاریاں بھی عمل میں آئی ہیں۔ پولیس کی طرف سے محمد لطیف
کی بیوی اور بچے کو ڈھائی ہزار روپے دیئے گئے ہیں صحافیوں
کی انجمن نے بھی اس حملے کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔ انہوں
نے کہا ہے کہ اگر اس طرح کی حرکتیں ہوتی رہیں تو اخباروں کی
آزادی خطرے میں پڑ جائے گی —

امن کے پجاریوں کا یہ کارنامہ دیکھنے اور کچھ دوستوں سے
ملنے میں بھی ٹائمز آف انڈیا کے دفتر گیا۔ کارنامہ دیکھ کر یقین
آ گیا کہ جو کچھ سنا تھا واقعی سچ ہے۔ کانوں سنی جھٹلائی جا سکتی
ہے۔ پر آنکھوں دیکھی نہیں۔ ●●

پھر کبھی پشیمان نہ ہوئے۔ بہادر وہ ہے جو
ست کو خندہ پیشانی سے تسلیم کرلے اور دوبارہ کامیابی
رنے کی سنجیدہ کوشش کرے۔ جو لوگ اپنی کھلی ہوئی
کو بھی کسی کیمیائی عمل کا نتیجہ قرار دیں اور آنکھیں بچتے
ی حقائق کا مطالعہ نہ کریں انہیں دور اندیش کون
گزشتہ وسط مدتی انتخابات کے دوران ملک کی
پسند طاقتوں نے برسر اقتدار آنے کا ایک حسین خواب
تھا لیکن جب بیلٹ بکس کھلے تو اس حسین خواب کی
بھیانک تعبیر برآمد ہوئی۔ رجعت پسندوں کو زبردست
امنا کرنا پڑا اور اس شکست کی خفت مٹانے کے لیے
نے طرح طرح کے بہانے تراشے۔ سب سے پہلے شیو سینا کے
اکرے صاحب نے یہ اعلان فرمایا کہ رجعت پسندوں کو یہ
ت روسی بیلٹ پیپروں کی وجہ سے ہوئی۔ دہلی میں شری
مدھوک نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور بڑے کروفر
تھ فرمایا کہ ان بیلٹ پیپروں پر ایسا کیمیائی عمل کیا گیا تھا
ت پسندوں کے لیے لگائی جانے والی مہریں اڑ گئیں۔
نگریسی امیدواروں کے نام کے خانے میں پہلے سے لگائے
، نہ نظر آنے والے نشانات اُبھر آئے ــــ اس طرح
ں نے اپنے حامیوں اور ہمدردوں کے حوصلے بلند کرنے
شش کی۔

لیکن میسور اور دہلی کی ہائی کورٹوں نے جب یہ فیصلہ
ہ یہ سب غلط ہے کہ بیلٹ پیپروں پر کوئی کیمیائی عمل کیا
تھا تو ایک بار پھر ان رجعت پسندوں اور ظلمت پرستوں
لے چانٹوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اب سنا گیا ہے کہ شری
مدھوک دہلی ہائی کورٹ کے اس فیصلے سے مطمئن نہیں
ظاہر ہے کہ عدالتیں انصاف کرنے کے لیے ہیں نہ کہ ان
ں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو تمناؤں کو
نت کا نام دیتے ہیں۔ جو لوگ عدالتوں کے فیصلوں کا

بھی احترام نہ کر سکیں ان سے کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات کا احترام کریں گے۔ در اصل رجعت پسندی نام ہی ہے "ہٹ دھرمی" اور ضد کا اور نئے ہندوستان میں ان چیزوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

جرم و سزا : جرائم کے سلسلہ میں ضوابط کی اصلاح کے لیے اس اصول کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ سزا جرم کے مطابق ہو اس لئے لاء کمیشن کی اس سفارش کو بروقت اور برمحل سفارش کہنے میں ہمیں کوئی عار نہیں ہے کہ اقدام خودکشی کو جرم نہ قرار دینا چاہیئے۔

تعزیراتِ ہند پر چونکہ انگریزوں کی زبردست فکری چھاپ ہے اس لیے ہمارے ملک کے بہت سے قوانین اور ضابطے فوری تبدیلی اور ترمیم کے متقاضی ہیں۔ انہی ضوابط میں خودکشی کی کوشش کو جرم قرار دینے کا ضابطہ بھی شامل ہے مروجہ قانون کے مطابق خودکشی کی کوشش کرنے والا ایک سال کی قید محض یا جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا مستحق ہے۔ حالانکہ خودکشی کوئی جرم نہیں ہے یہ ایک ایسی کوشش ہے جو انسان کسی دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ خود اپنے خلاف کرتا ہے۔ تعزیراتِ ہند نے اس حقیقت کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے کہ خودکشی صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے یا جو دماغی مریض ہوتے ہیں، حالات کی سختیاں، مقصد کے حصول میں ناکامی اور امید پر یاس کا غلبہ یہیں وہ اسباب جو کمزور ــــ دل و دماغ کے لوگوں کو خودکشی پر ابھارتے ہیں اسلیے ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرہ کی اصلاح کی جائے اور یاس کا شکار ہونے والوں کا علاج کیا جائے۔

گجرات اور دوسرے علاقوں میں جو سروے کیا گیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ خودکشی کرنے والوں میں بڑی تعداد ان عورتوں کی ہوتی ہے جو ناخوشگوار ازدواجی زندگی کی وجہ سے شدید مایوسی کا شکار ہو جاتی ہیں لہٰذا اس قسم کی اصلاحات نافذ کی جانی چاہئیں کہ ہندو میرج ایکٹ کے تحت شادی کی عمر بڑھا دی جائے اور بچپن کی شادیوں پر پابندی کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ لاء کمیشن نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ موت کی سزا برقرار رکھی جائے۔ ہمارے خیال میں یہ سفارش بھی ایسی ہے جسے مان لینا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں دہشت انگیزی اور تشدد پسندی کا ماحول ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ مارنے اور مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، اگر موت کی سزا نہ رہی تو قتل کے واقعات بڑھ جائیں گے ــــ بلاشبہ پھانسی کا تصور بہتوں کو دوسروں کی جان لینے سے روکنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ اس لیے اس تصور کو باقی رکھنا ابھی ضروری ہے۔

کہانی جنتر منتر روڈ کی : ۱۴ نومبر کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر ۷۔ جنتر منتر روڈ کو نئی دہلی کے ایک مجسٹریٹ مسٹر اے جی کٹنگ کے حکم سے "سربمہر" کر دیا گیا اور اب عدالت ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ ۱۹۴۷ء سے غیر منقسم کانگریس کا "صدر مقام" رہنے والی یہ تاریخی عمارت کس کو ملے گی۔ ۷۔ جنتر منتر روڈ کو سربمہر کرنے کا حکم عدالت نے پرانی کانگریس کے جنرل سکریٹری مسٹر منو بھائی پٹیل کی درخواست پر دیا ہے۔

جس وقت عدالت کا ایک کارندہ پولیس کی ایک ٹکڑی کے ساتھ عمارت میں تالا لگانے کے لئے پہنچا۔ اس وقت مسٹر صادق علی صدر پرانی کانگریس عمارت کے ایک رہائشی کوارٹر میں عمارت پر نئی کانگریس کے کارکنوں کے قبضے کے خلاف بھوک ہڑتال پر تھے۔

عدالت کے اس فیصلہ کے بعد انہوں نے اپنا چار روزہ برت توڑ دیا اور کہا کہ "جس مقصد کے لئے انہوں نے بھوک ہڑتال شروع کی تھی وہ کافی حد تک حاصل ہو گیا ہے"

چونکہ یہ معاملہ اب عدالت کے دائرہ اختیار میں چلا گیا ہے اسلئے اس کے محاسن پر بحث نہیں کی جا سکتی لیکن یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کی روشنی میں کانگریس وہی ہے جس کے صدر مسٹر سنجیویا ہیں۔ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ انتخابی نشان کے کیس میں دیا ہے۔ الکشن کمیشن نے وسط مدتی انتخابات سے کچھ پہلے "دو بیلوں کی جوڑی" کا نشان اندرا کانگریس کو دیا گیا تھا جس کے خلاف پرانی کانگریس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ پھر یہ نشان "منجمد" کر دیا گیا تھا۔ اور نئی اور پرانی دونوں کانگریسوں نے نئے نشانات سے کر الکشن لڑا تھا۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ پرانی کانگریس پر ایک اور ضرب سے کسی طرح کم نہیں۔ اب کم از کم یہ بات تو طے ہی پا چکی ہے کہ اصل کانگریس ہونے کا اس کا دعویٰ غلط تھا۔ اگر پرانی کانگریس کے لیڈروں میں کھلاڑیوں کی اسپرٹ ہوتی تو وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی معقول

صادق صاحب کا انتقال

سید میر قاسم

واقعات کی آخری کاپیاں پریس جارہی تھیں کہ وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر خواجہ غلام محمد صادق کے انتقال کی اطلاع ملی۔ موصوف گزشتہ ایک ماہ سے چنڈی گڑھ کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں زیر علاج تھے۔ صادق صاحب سیکولرزم اور سوشلزم کا ایک اہم ستون تھے انہوں نے ہمیشہ فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کے خلاف خود کو سرگرم عمل رکھا اور ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان سے قریب تر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ فروری ۱۹۶۴ء میں ریاست کی زمام حکومت سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنی متوازن آزادانہ اور نرم پالیسی کے ذریعہ کشمیریوں اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو پہلے سے زیادہ مستحکم بنایا اور ظاہری رکاوٹوں مثلاً وزیر اعظم اور صدر ریاست کے عہدوں کو ختم کر کے ملک کی دوسری ریاستوں کی طرح وزیر اعلیٰ اور گورنر کے عہدے قائم کئے ——— وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ۱۲ ردسمبر کو رام لیلا میدان میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے ٹھیک ہی کہا ہے کہ صادق صاحب ہماری جنگ آزادی کے ایک بڑے رہنما تھے ——— ان کے جانشین سید میر قاسم بھی مضبوط ارادوں کے انسان ہیں اس لئے امید کی جاسکتی ہے کہ صادق صاحب کے انتقال سے ریاست میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ جلد پورا ہو جائے گا۔

کا خود ہی احساس کر لیتے اور پیچھے ہٹ جاتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اب بھی عدالتوں کے چکر کاٹ رہے ہیں مگر سوال یہ ہے عدالتوں کے فیصلوں کی بنیاد پر وہ اپنے سیاسی وجود کو کب تک برقرار رکھ سکیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ سیاسی مقبولیت عوامی طاقت سے حاصل ہوتی ہے۔ عدالتی فیصلوں سے نہیں اس لئے اب بھی وقت ہے کہ پرانی کانگریس کے "بزرگ رہنما" اپنی حکمت عملی بدلیں

وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم رہ کر اپنا اہیج نہیں بنا سکتے انہیں حال کے مسائل کو سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ اور درخشاں مستقبل کا صاف نقشہ بنانا ہوگا کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے وہ ماضی کی زندگی میں خود کو جکڑ کر زندگی گزارنا نہیں پسند کرتے اور حال کو بہتر بنانے اور مستقبل کے سنوارنے کے متمنی ہیں۔

●●●

جنتر منتر روڈ پر عدالت کے حکم سے تالا لگانے کا منظر

واقعات کا نیا دو

واقعات کا یہ شمارہ غیر معمولی تاخیر سے
ہو رہا ہے لیکن واقعات کو ناظرین کی خواہشات
پسند کے مطابق بنانے کے لئے یہ تاخیر ناگزیر تھی
ہمیں امید ہے کہ ناظرین ہمیں اس تاخیر کے لئے مع
فرمائیں گے۔

آپ دیکھیں گے کہ زیر نظر شمارہ میں کچھ انقل
تبدیلیاں کی گئی ہیں اور بہت سے نئے دلچسپ عنوا
کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ہم کچھ اور تبدیلیاں بھی کرنا چا
تھے لیکن مزید تاخیر شاید آپ کے صبر کے پیمانہ کو لبریز
اور حالات بھی اس کے متحمل نہ ہو سکتے، اس لئے ہم
یہی مناسب سمجھا کہ جلد از جلد واقعات آپ کے ہاتھ
میں پہنچ جائے لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ شما
شمارہ سے بھی کہیں زیادہ بہتر دلچسپ اور پُرکشش ہو
ہمیں یقین ہے کہ آپ اس شمارہ کے سلسلہ میں اپ
سے ہمیں ضرور مطلع فرمائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وا
حالات کے تقاضوں کے مطابق آپ سب کی خدمت
لیکن اس کے لئے آپ کے تعریفی خطوط سے زیادہ آپ
بے لاگ تبصروں کی ضرورت ہے تاکہ ہم ان تبصروں کی
میں واقعات کو آپکی توقعات کے مطابق بنا سکیں۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ موجودہ حالات میں
معیاری جریدے کو باقاعدگی سے جاری رکھنے کیلئے فو
عزائم اور بے پناہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ
اور وسائل اس وقت تک کیسے پیدا ہو سکتے ہیں جب
ہمیں اپنے سرپرستوں، خیر خواہوں اور ہمدردوں کا
مکمل تعاون نہ حاصل ہو، ہمیں یقین ہے اور ہم
وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تعاون ہمیں پہلے
ملتا رہا ہے اور آئندہ بھی ملتا رہے گا۔

انشاء اللہ اب "واقعات" پابند
وقت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا
گا اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش
جاری رکھی جائیں گی۔ ●●

ایک فوجی بغاوت

• ٹائم میگزین (نیویارک)

آج کل ہم بنگلا دیش کے مسئلے پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کئے ہوئے ہیں اور اپنے ارد گرد کے دوسرے بہت سے اہم ترین حالات تک سے ناواقف ہیں۔ حال ہی میں تھائی لینڈ میں فوجی بغاوت ہوئی لیکن اس اہم مسئلے پر ہماری کوئی توجہ نہ مبذول ہوئی۔ اس واقعہ پر ٹائم میگزین (نیویارک) نے ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے: "فوجی بغاوت تیزی کے ساتھ اور خون خرابے کے بغیر وجود میں آئی۔ خصوصی فوجی دستوں اور چند ٹینکوں نے بنکاک پر نیشنل سیکورٹی کمان کے ارد گرد مورچے سنبھال لئے اور تھائی لینڈ کے باشندوں سے کہا گیا کہ وہ ریڈیو پر ایک خصوصی اعلان سننے کا انتظار کریں پھر انھیں یہ خبر سنائی گئی ہے۔

تھائی لینڈ کے تین سالہ آئین اور پارلیمنٹ کو کالعدم قرار دیدیا گیا ہے اور وزیر اعظم تھانوم کتی کاچورن کی قیادت میں ایک فوجی حکومت برسر اقتدار آگئی ہے۔ ظاہری امن و سکون کیلئے فوجی حکومت نے سخت فوجی ضوابط نافذ کر دیئے ہیں سارے ملک میں مارشل لا لگا دیا گیا ہے سرسری سماعت کے بعد موت تک کی سزا دینے کے احکامات جاری کر دیئے گئے اور ۴ سے زیادہ افراد کے سیاسی اجتماع کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ نئی حکومت عملی طور پر اسی ٹولی سے مشابہ ہے جو سابقہ حکومت پر قابض تھی۔ اس میں نرم گفتار وزیر اعظم تھانوم کے ساتھ ہی سخت مزاج پرا پہاس چاروساتھین بھی شامل ہے جو رائل تھائی آرمی کمانڈر انچیف ہونے کی وجہ سے ملک کا سب سے طاقتور شخص ہے۔ بظاہر تو امریکا سے تھائی لینڈ کے پرانے دوستانہ تعلقات میں کوئی ضعف پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے لیکن وزیر اعظم تھانوم نے اسوقت تک امریکی سفیر لیونارڈ کو ٹیلی فون پر فوجی بغاوت کا سبب نہیں بتایا جب تک ریڈیو پر اسکا اعلان نہیں ہو گیا۔ اس فوجی بغاوت کا خاص سبب تھانوم نے یہ بتایا ہے کہ اب چین اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا ہے اور تھائی لینڈ کے تیس لاکھ چینی — آبادی کا دسواں حصّہ — اس کا خاص اثر قبول کریں گے لیکن انکی اصل خفگی پارلیمنٹ کے خلاف تھی جس کے بہت سے ارکان نے دھمکی دی تھی کہ اگر کابینہ نے ان کے ۵۰ ہزار ڈالر سالانہ بھتوں کو دوگنا نہ کر دیا تو وہ فوجی بجٹ منظور نہ ہونے دیں گے۔ یہ فوجی انقلاب ایسے وقت میں آیا ہے جب تھائی لینڈ کی معیشت میں امریکا کے فوجی اخراجات اور امداد میں کمی کی وجہ سے ضعف آ رہا ہے اور اس ملک کی خاص برآمدی اشیاء ربر، ٹین اور چاول کے دام گر رہے ہیں۔ جرائم جن میں رہزنی اور آبروریزی کے واقعات شامل ہیں بڑھ رہے ہیں۔

برطانیہ نے گھٹنے ٹیک

• (انڈین ایکسپ

حکومت برطانیا اور روڈیشیا کی سفید فام حکو

درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اسپر سب سے بھرپور تبصرہ

کے وزیر اعظم مسٹر ایان اسمتھ نے معاہدے کے خیر مقد

میں کیا ہے۔ انکی خوشی جائز بھی ہے کیونکہ عملی طور پر ا

کی وجہ سے روڈیشیا میں سفید فام اقلیت کی برتر

بنانے میں مدد ملے گی۔ مسٹر اسمتھ نے بہت ہوشیاری ک

کو سمجھوتا قرار دیا ہے دراصل وہ برطانیا کی طرف سے

کا اقدام ہے۔ سر ایلک ڈگلس ہوم نے سیلسبری میں م

سے مذاکرات کے لئے لندن سے روانہ ہونے سے قبل ا

تھا کہ روڈیشیا سے جو بھی معاہدہ ہوگا وہ چھ سال قبل

سے پیش کردہ ۵ نکات کی حدود ہی میں ہوگا۔ لیکن اب

آئی ہیں کہ برطانوی وزیر خارجہ کے دورۂ روڈیشیا

سے قبل ہی معاہدے کا مسودہ تیار کیا جا چکا تھا حالانکہ

کو برابر یہی اطلاع دی جاتی رہی کہ ابھی تک برطانیا اور ر

کے درمیان بہت سے نازک سوالات پر اختلافات پایا

معاہدوں کی شرطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور ۵ نکا

اہم اصولوں کو قطعی ٹھکرا دیا گیا ہے لیکن اکثریت کی حک

لئے جب تک کوئی میعاد مقرر نہ ہو اسوقت تک رفتہ ر

اکثریت کی حکومت کی راہ ہموار کرنے کی بات با

افکار و آثار

مصر کی طاقت میں اضافہ

• نیوز ویک (نیویارک)

جب سے گزشتہ گرمیوں میں امریکا نے اسرائیل کو فینٹم طیاروں کی فراہمی روکی ہے تب ہی سے یروشلم کی حکمراں ٹولی امریکا کا ذہن بدلنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہے۔ اسرائیلیوں نے فینٹم کے سوال کو اپنی مہم کے حصہ کے طور پر سیاسی رنگ دینے کی بھی کوشش کی اور امریکا میں آباد یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارے لیکن ابھی تک وہائٹ ہاؤس اس زبردست دباؤ کے سامنے نہیں جھکا ہے۔ حال ہی میں اس دباؤ کو کم کرنے کی واضح کوشش کے طور پر وزیر خارجہ ولیم روجرس نے ایک میگزین انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ "اسوقت فینٹم طیاروں کی ڈلیوری ضروری نہیں ہے کیونکہ روس نے مصر کو اپنی مغربی امداد میں ضبط" کا مظاہرہ کیا ہے۔"

لیکن ان کے اس انٹرویو کی اشاعت کے چند دنوں بعد ہی وزیر خارجہ نے خفیہ اطلاعات کی بنیاد پر یہ تسلیم کر لیا کہ روسیوں نے مصر کو فوجی امداد دینے میں احتیاط اور ضبط کا مظاہرہ قطعی نہیں کیا ہے۔ دفتر خارجہ نے یہ بیان اس اطلاع پر دیا کہ حال ہی میں روسی پائلٹوں نے "چھ تا آٹھ" ٹی یو ۱۶ بمبار طیا

مصری ہوائی اڈوں پر پہنچا دیئے ہیں اور ان سے نہ صرف

کی زمینی تنصیبات بلکہ امریکا کے چھٹے بیڑے کیلئے بھی خطر

مصر کے اسلحہ خانے میں ان طیاروں کے اضافے

کے حوصلے پست ضرور کئے ہیں لیکن اکا دکا اسرائیلی ہی یہ کہے

ملک فوجی اعتبار سے مصر سے پیچھے ہے۔ ایک اسرائیلی فو

کا کہنا ہے کہ "اس کے نتیجے میں صرف یہ ہوگا کہ اگر جنگ چھ

تو ہم جیت تو جائیں گے لیکن ہمارا خون زیادہ بہے گا اور یہ

واشنگٹن کے سر ہوگا۔"

جیسور کو آزاد کرانے کے بعد ایک ہندوستانی ٹینک ڈھاکا کی جانب بڑھ رہا ہے

◀ گریٹر کیلاش نئی دہلی میں عوامی جمہوریہ بنگلا دیش کی چانسری بنگلا دیش کا پرچم لہرایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے جو خوشی سے ناچ رہے تھے۔

نئی دہلی میں بنگلا دیش مشن کے چیف کی اہلیہ ہندوستان کی ◀ جانب سے بنگلا دیش کی عوامی جمہوریہ کو تسلیم کرنے کے اعلان کے بعد بنگلا دیش مشن میں شیخ مجیب الرحمٰن کی فوٹو کی گلپاشی کرتے ہوئے

ہے۔ ملک کی پارلیمنٹ میں افریقی باشندوں کی (جو اکثریت میں ہیں) نمائندگی بڑھانے کے لئے جو ضوابط طے کئے گئے ہیں وہ انتہائی الجھے ہوئے ہیں۔ موجودہ ریپبلکن آئین نے افریقی ووٹروں کے لئے جائداد اور آمدنی کی شرطیں لگا رکھی ہیں۔ برطانوی وزیر خارجہ کو مسٹر اسمتھ سے افریقیوں کے لئے جو واحد رعایت حاصل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اب افریقی ووٹروں کے لئے آمدنی اور تعلیم کی شرطیں ہوں گی۔ معاہدے کی رو سے افریقی نمائندوں کی تعداد میں اضافے کی رفتار المناک حد تک سست ہو گئی ہے اور پچاس لاکھ سیاہ فام باشندوں کے نمائندوں کی تعداد پانچ لاکھ سفید فام اقلیت کے نمائندوں کی تعداد کے برابر ہی ہو سکے گی۔ اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اگر برطانیا نے اس معاہدے کی روشنی میں سفید فام روڈیشیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا تو سیلسبری کی حکومت ان قواعد میں مزید ترامیم کر کے افریقیوں کو نقصان پہونچانے والے اقدامات نہ کرے گی۔ ساتھ ہی جب روڈیشیا قانونی طور پر آزاد ملک بن جائے گا تو وہ آزادانہ اقدامات کریگا

اور برطانیا سے کسی معاہدے کا پابند نہ رہ جائے گا ایسے روڈیشیا کے افریقی باشندوں کو انکے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہاں اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ سیلسبری میں جو معاہدہ ہوا ہے اسکا صحیح جواب افواہ متحدہ کی سیاسی کمیٹی نے برطانیا کی مذمت کر کے دیا ہے کہ وہ روڈیشیا

کی سفید فام اقلیتی حکومت کو ختم کر کے افریقی اکثریت [illegible] اقتدار سپرد کرنے کی کوشش کرنے سے منکر ہے۔ اب برطا[illegible] جو معاہدہ کیا ہے وہ دنیا کو گمراہ کرنے کے لئے ہے اور ا[illegible] معاہدے کے بعد افریقی باشندوں کو اس بات پر یقین ہ[illegible] کہ وہ اپنے حقوق صرف طاقت کے استعمال سے ہی چھین [illegible]

ائٹ ہاؤس نے صدر یحییٰ خاں پر دباؤ ڈالا ہے کہ
ں کے لیڈروں سے بات چیت کریں۔
لین جنرل صاحب تو مورچہ پر جانے کا اعلان کر چکے
ت چیت کیسے شروع ہوگی۔
رانتی دل نے دوسروں کے تعاون سے ایک نئی
ز کا اعلان کیا ہے۔
رانی کانگریس والوں کو یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے
ز اور فوراً جن سنگھ سے مل کر اس بیل کو منڈھے
ں کوشش کرنا چاہئے تاکہ سیاسی جمود انہیں ناکارہ
۔
سٹر چوان کو امید ہے کہ صارفین کی زبردست تحریک
ھنے سے روکے گی۔
یکن مسٹر چوان کو ہوشیار رہنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ
نہیں ہی ہڑپ کر جائیں۔
رلیمنٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ چھ ریاستوں میں
قربانی کے واقعات ہوئے۔
ہیں خوش ہونا چاہئے کہ کم از کم ایک میدان میں تو
سب سے آگے ہے۔

——— صدر یحییٰ خاں نے کہا ہے کہ چین پاکستان کی مدد کریگا۔

★ لیکن یہ امداد اقوام متحدہ میں ہمدردی کی تقریروں کے انجکشن ہی ہوں گے اور صرف ہمدردی کے انجکشن کسی کی طاقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔

——— غازی آباد میں جن سنگھ کے اجلاس میں پارٹی کے صدر مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے اعلان کیا ہے کہ جنگ کی صورت میں ان کی پارٹی حکومت کی مکمل حمایت کرے گی۔"

★ معاف کیجئے باجپئی جی! اندرا سرکار کو آپ کی حمایت نہ چاہئے کیونکہ ۱۹۶۵ء میں آپ کی حمایت کا نمونہ دیکھا جا چکا ہے۔ آپ کا کام غلط فہمیاں پھیلانا ہے۔ لگے رہئے اس کام میں۔ بھگوان بھلا کرے گا۔

——— جن سنگھ شہری جائدادوں کی حد مقرر کرنے کے حق میں ہے۔

★ لیکن سرمایہ داروں کی تجوریوں کی بھی کوئی حد مقرر کی جائے، یہ اسے تسلیم نہیں ہے کیونکہ اس کا کام ہی ان تجوریوں کی وسعت سے چلتا ہے۔

——— تامل ناڈو کی ڈی ایم کے سرکار نے حکم دیا ہے کہ مندروں میں "ارچنا" کے لئے تامل زبان استعمال کی جائے۔

★ جن سنگھ والوں کے لئے اب ہندی میں نماز ادا کرنے کا حکم دینے کے لئے آسانی پیدا ہو جائے گی۔ دیکھئے لسانی تعصب ہمیں کہاں لے جاتا ہے۔

——— دہلی میں ایک بیوی نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا۔

★ یہ بھی ترقی کی ایک علامت ہے۔ کتا تو انسان کو کاٹتا ہی ہے، اہمیت اس واقعہ کی ہوتی ہے کہ آدمی کتے کو کاٹ لے۔

——— جیل میں تصادم کی تحقیقات کلکتہ کا ایک جج کریگا۔

★ جیل سے جج کا کیا تعلق؟ یہ کام تو کسی قیدی کے سپرد کرنا چاہئے جو جیل کے حالات سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔

——— دہلی پولیس نے فیصلہ کیا ہے کہ پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران اخباری نمائندوں کو جرائم کے اعداد و شمار نہ بتائے جائیں گے۔

★ فیصلہ مناسب ہے لیکن کیا دہلی پولیس پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران جرائم کو بھی روک سکے گی؟

——— جن سنگھ کی لیڈر شپ کا ایک طبقہ سابق دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کے وظائف ختم کرنے کا حامی ہو گیا ہے۔

★ ضرورت کے لئے لوگ مذہب تک بدل لیتے ہیں اس لئے اگر سیاسی فائدہ کے لئے کچھ جن سنگھیوں نے اپنا بنیادی نظریہ بدل دیا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ حیرت تو اس وقت ہوگی جب جن سنگھ والے رجعت پسندی ترک کر کے ترقی پسندی کی راہ اختیار کریں گے۔ ★

مشرقِ وسطیٰ میں جنگ کا بگل بجنے لگا

مشرقِ وسطیٰ میں گزشتہ چند ماہ کی خاموشی بالکل ایسی خاموشی تھی جیسے کہ طوفان سے پہلے ہوا کرتی ہے۔ یہ بات صدر انور سادات کے اس بیان سے ظاہر ہوگئی ہے جس میں انھوں نے اعلان کیا ہے کہ "اب اسرائیل کے ساتھ جنگ ناگزیر ہے"

دراصل اب سے چند ہفتے قبل جب انھوں نے مصری فوجوں کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لینے کا اعلان کیا تھا اسیوقت ڈپلومیٹک حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ صدر انور سادات کوئی اہم قدم اٹھانے والے ہیں۔

عید کے موقع پر وہ نہر سوئز کے علاقے میں پہونچے مصری دفاعی مورچوں کا جائزہ لیا اور فوجی جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "جنگ کی گھڑی آپہونچی ہے اپنے ملک کا دفاع کرنے کے لئے تیار ہوجاؤ"

صدر انور سادات کا یہ اعلان ان کے اس عزم کا اعادہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کا مسئلہ اسی سال کے اختتام تک پرامن طریقے پر یا جنگ کے ذریعے حل ہوجانا چاہیے۔ گزشتہ جولائی میں انھوں نے اس سال کو ایک فیصلہ کن سال قرار دیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ موجودہ غیر یقینی صورتِ حال کو زیادہ عرصے نہیں چلنے دیا جاسکتا۔ ہر حالت میں اسی سال کے دوران مسئلے کا حل نکلنا چاہیئے۔ اس وقت شاید انکے اس اعلان کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور نام نہاد بڑی طاقتیں یوں ہی معمولی سی کوششیں کرکے رہ گئیں۔

امریکا نے چار بڑی طاقتوں کے "ڈیرہ" سے الگ ہوکر ایک انقلابی قدم اٹھایا اور امریکی وزیرِ خارجہ دکھاوے کے لئے قاہرہ اور تل ابیب بھی گئے لیکن معاملہ جوں کا توں رہا مسٹر راجرس چپ سادھ کر بیٹھ گئے اور مشرقِ وسطیٰ کے مطلعِ سیاست پر خاموشی اور سکون کے بادل چھاگئے۔

اس دوران افریقی اتحاد کی تنظیم میں کچھ حرارت ضرور پیدا ہوئی جس کے ایک وفد نے جو سینیگال کے صدر لیوپولڈ سینگھور کیمیرون کے صدر احمد واحد جو، نائجیریا کے صدر یعقوب گووان اور زیر (سابق کانگو) کے صدر جوزف موبوتو پر مشتمل تھا اسرائیل اور مصر دونوں ملکوں کا دورہ کیا۔

ان چاروں سیاستدانوں کا خیال تھا کہ عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان صلح صفائی کرانے کے لئے ان پر زیادہ ذمےداری عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ افریقہ کے ایسے بہت سے ممالک ہیں جن کے دوستانہ تعلقات اسرائیل کے ساتھ بھی ہیں اور عرب ممالک کے ساتھ بھی۔ سینیگال کے صدر لیوپولڈ سینگھور نے کہا "جب آپ کے دو دوستوں کے درمیان اختلافات ہوں تو سب سے بڑی ذمے داری آپ پر ہے کہ ان میں صلح صفائی کرا" اس خیال سے افریقی تنظیم کی طرف سے ایک وفد دونوں ملکوں کے دورے پر بھیجا گیا لیکن اس دورے کے بعد کچھ پتا نہ چلا کہ صلح کے میدان میں کس حد تک پیش رفت ہوئی۔ فضا میں ایک مرتبہ پھر خاموشی چھاگئی۔

اور اب اس خاموشی کو صدر انور سادات نے اس دھماکے سے توڑا ہے کہ "اسرائیل کے ساتھ جنگ ناگزیر ہے"۔ انھوں نے اپنی تمام بری اور فضائی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دیدیا ہے اور پرامن کوششوں کے سلسلے میں امریکا کے ساتھ اپنے تمام رابطے ختم کرلئے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ امریکا نے اپنی پالیسی بدل لی ہے اور اب وہ اسرائیلی مقاصد کے لئے کام کر رہا ہے۔

صدر سادات کے اس اعلان پر امریکا میں تشویش کا اظہار ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اظہار تشویش کے علاوہ امریکا کے بس میں اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اسرائیل کو اس بات کیلئے رضامند نہ کرسکا کہ وہ نہر سوئز کی واگذاری کیلئے بات چیت کرنے سے قبل مقبوضہ علاقوں کو خالی کردے وہ اسے رضامند کر بھی نہ سکے گا بلکہ یقین ہے کہ اسرائیل کو مزید فینٹم طیارے مہیا کرنے پر رضامند ہوجائے گا جنکے لئے اسرائیل مطالبہ کر رہا ہے اسلئے کہ ۱۹۷۲ء صدارتی انتخاب کا سال ہے جب امریکا کی ہر پارٹی یہودی وو[ٹ] کے لئے روایتی طور پر "اسرائیل نواز" بن جاتی [ہے] بھی اسرائیل نواز تھے اور اب اور بھی بن جائینگے۔

سادات کے اعلانِ جنگ پر امریکا نے ابھی [...] اٹھایا ہے لیکن افریقہ کے چار دانشور دوڑے د[...] پہونچے جہاں انھوں نے صدر سادات اور وزیر[...] ڈاکٹر محمد فوزی سے خصوصیت کیساتھ بات چ[یت ...] تنازعہ کو پرامن طور پر حل کرنے کے لئے کچھ تجاوی[ز ...] لیکن خبر ہے کہ مصری لیڈروں نے صاف کہہ دیا کہ [...] اسرائیل اقوامِ متحدہ کے نمائندہ ڈاکٹر گنار یارنگ [...] فروری کے سوالنامے کا تسلی بخش جواب نہ دے [...] عرب علاقوں کو خالی نہ کرے گا اس وقت تک ا[...] بات چیت نہیں ہوسکتی نہ کسی تجویز پر غور ہوسکتا [...] لیکن کیا اسرائیل ان شرائط پر بات چیت کر[نے کو] تیار ہوجائے گا۔؟

وہ بات چیت کے لئے نہیں جنگ کے لئے تیا[ر ...] اسی تیاری کے سلسلے میں وزیرِ اعظم اسرائیل مسز گو[لڈا مئیر ...] کے دورے پر روانہ ہورہی ہیں۔

یہ ایشیاء کی بدقسمتی ہے کہ یورپین ممالک با[...] جنگیں بڑھا رہے ہیں اور ایشیائی ممالک ایک [...] خون کے پیاسے ہورہے ہیں۔ ❋

یا
ندوستان
ار
سلمان

ظہیر محسن

حال ہی میں "عصری ہندوستان اور مسلمان" کے موضوع پر ایک آل انڈیا سروے کروایا گیا تھا جس کے بعد بہت سی چونکا دینے والی باتیں سامنے آئی ہیں اس سروے کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ فرقہ واریت کا زہر ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے خون میں رچ بس گیا ہے، دونوں فرقوں کے لوگ معاشی مشکلات سے دوچار ہیں لیکن مسلمان معاشی طور پر کچھ زیادہ ہی پست ہیں۔ ایک سال تک ملک کے مختلف حصوں میں گھومنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ نام نہاد مسلم سماجیات کے ماہروں کو حقیقت کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ اپنے بنگلوں میں بیٹھ کر ایک ایسے فرقے کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہیں جس کے مسائل بہت زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہیں۔ یہ اسکالرز اونچے اور تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں بھوک، احتیاج، بے غیرتی اور پولیس کی ناانصافیوں سے دُور کا بھی تعلق نہیں جبکہ عام مسلمانوں کے لئے یہ دن رات کی باتیں ہیں۔ ان اسکالرز میں اگرچہ بہت سے مسلمان بھی ہیں لیکن انہیں ان معنوں میں مسلمان نہیں کہا جاسکتا جس سے ایک پریشان حال اور پچھڑے ہوئے طبقے کے معنی مقصود ہوں۔ یہ لوگ صاف ستھرے بنگلوں میں رہتے ہیں اپنے بچّوں کو کانونٹ اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، انگریزی اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں، گھریلو بات چیت تک میں انگریزی کا استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح کی بہت سی "خوبیاں" ان کے رہن سہن میں پائی جاتی ہیں جن کے بارے میں ایک عام مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے ان اسکالرز کے طریقۂ زندگی سے قطعاً نفرت نہیں ہے۔ مجھے اعتراض ہے تو صرف اتنا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے اتنی دُور ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مسلم سماجیات کے ماہر کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ جو کچھ بھی مسلمانوں کے متعلق لکھتے ہیں وہ زیادہ تر انگریزی میں لکھتے ہیں جبکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت انگریزی سے ناواقف ہے۔ یہ ایک طرح کی سعیٔ لاحاصل ہے۔ اگر انہیں مسلمانوں سے واقعی دلچسپی ہے اور یہ اس فرقے میں کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اس فرقے کی زبان ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کریں نہ کہ کسی دوسری زبان میں۔ اس کے علاوہ ان اسکالرز نے کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ مسلمانوں کے حقیقی مسائل کو جاننے کے لئے ان کی گندی بستیوں میں جاکر صورتِ حال معلوم کی جائے۔ کسی بھی فرقے کے سماجی اور معاشی مسائل کے متعلق لکھنا اور صوفوں پر بیٹھ کر کسی افسانے کا پلاٹ مرتب کرنا دو جداگانہ کام ہیں پہلے کام کے لئے ضروری ہے کہ مصنف کو حقیقت کا پوری طرح اندازہ ہو اور وہ جو کچھ بھی بات لکھے، پوری ذمّہ داری سے لکھے۔ افسانہ لکھنے کے لئے یہ سب کچھ ضروری نہیں۔ آپ جس طرح چاہیں، جو چاہیں وہ لکھ سکتے ہیں۔

ہندوستان کے کسی بھی فرقے کے مسائل کو عمومی حیثیت نہیں دی جاسکتی اور یہی حال مسلمانوں کے مسائل کا بھی ہے۔ اب تک بہت سے لوگوں نے تمام ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ ایک ہی زاویۂ نگاہ سے لیا ہے۔ اس طرح کا رویہ نہ صرف غلط ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ کیونکہ اُترپردیش کے مسلمان کے مسائل کیرالا میں رہنے والے مسلمان سے قطعی مختلف ہوں گے۔ اس چیز کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ مسلمان بہت زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں لیکن اس سے کیا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ زور صرف اس بات پر دیا جاتا ہے کہ مسلمان کیا ہیں، یہ جاننے کی کوشش بہت کم کی جاتی ہے کہ وہ ایسے کیوں ہیں۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ مسلمان تعلیمی میدان میں بہت زیادہ پیچھے ہیں لیکن تعلیمی پچھڑے پن کا تعلق معاشی پچھڑے پن سے ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان کٹّر قسم کے مذہبی لوگ ہوتے ہیں اسی لئے وہ جدید تعلیم حاصل نہیں کرتے بلکہ صرف دینی تعلیم پر ہی زور دیتے ہیں۔ یہ پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی پریشانیاں انہیں تعلیم کی طرف راغب ہی ہونے نہیں دیتیں۔

مسلمان آج کے ہندوستان کا شاید سب سے غریب طبقہ ہے۔ چھ افرادِ خاندان کی اوسط آمدنی مشکل سے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کے قریب آتی ہے۔ جب میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول کیوں نہیں بھیجتے تو انہوں نے جو جواب دیا وہ نہ صرف چونکا دینے والا تھا بلکہ افسوس ناک بھی۔ اس جواب کو سننے کے بعد مسئلہ کا بالکل نیا پہلو سامنے آیا۔ انہوں نے کہا

کہ ہم بچوں کو اسکول میں پڑھانے کی سکت نہیں رکھتے اس لئے نہیں کہ ہم معمولی سی فیس یا کتابوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے بلکہ ایک بچے کو اسکول میں بھیجنے کے بعد ہم اس کی آمدنی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ایک کم عمر کا لڑکا مختلف قسم کے کام کرسکتا ہے مثلاً پالش کرنا، اخبار بیچنا یا ہوٹلوں میں نوکری کرنا، جس سے وہ کم از کم آٹھ بارہ آنے یومیہ کما لیتا ہے اس طرح اس کے خاندان کو بیس پچیس روپیہ ماہوار کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اب اگر وہ اسی لڑکے کو اسکول میں پڑھاتے ہیں تو نہ صرف اخراجات بڑھ جائیں گے بلکہ انہیں اس لڑکے کی آمدنی ملنی بھی بند ہو جائے گی۔ اس طرح یہ ان کی معاشیات کا مسئلہ ہے جو ان کے بچوں کی تعلیم کے آڑے آرہا ہے نہ کہ ان کی کٹر مذہبی ذہنیت ـــــــ جیسا کہ بہت سے لوگ سوچتے ہیں۔

اسی ضمن میں مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا سوال بھی آتا ہے۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے، اس کا سیکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ اسے سیکھے بغیر جدید علوم سے واقفیت حاصل کرنا ناممکن نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسکولوں میں مادری زبان پڑھائی جانی چاہئے۔ تعلیمات کے ماہروں کا خیال ہے کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے بچے کی دماغی صلاحیت تیز رہتی ہے اور وہ ان خیالات کو جنہیں وہ سوچتا رہتا ہے بہ آسانی بیان بھی کرسکتا ہے۔ آجکل کے کانونٹ اسکولوں میں صرف انگریزی ہی میں تعلیم دی جاتی ہے اور طالب علم کی مادری زبان کو یکسر بھلا دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہماری تہذیبی جڑیں کس قدر کھوکھلی ہو چکی ہیں! اسی کے ساتھ اُردو زبان کی ترقی و ترویج اور اُردو کے مدارس کے قیام کا مسئلہ ہے۔ بیشتر مقامات پر اُردو تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ آندھرا پردیش اور یو۔ پی میں اردو کو خاص رعایتیں دینے کے صرف وعدے کئے گئے ہیں لیکن ان وعدوں کو عملی صورت دینے کی فرصت کسی کو نہیں۔ یہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے اور اس کی ذمہ داری حکومت کے ساتھ ساتھ محبانِ اُردو پر بھی عائد ہوتی ہے جو حکومت تک صحیح طور سے نمائندگی نہیں کرتے۔

نصابی کتابوں اور خصوصاً علمِ تاریخ کی کتابوں میں غلط بیانی سے کام لینا آجکل عام ہوگیا ہے۔ جب سے مسٹر اوک نے تاج محل کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ تاج محل شاہ جہاں نے نہیں بنوایا تھا بلکہ یہ ایک راجپوت راجہ کا محل تھا تب سے اس قسم کے بہت سے "تاریخ داں" پیدا ہو گئے ہیں جو مغلوں کے دورِ حکومت کو بہت زیادہ مسخ کرکے پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں خصوصاً اورنگ زیب نشانہ بنایا جاتا ہے اور غلط قصوں سے فرقہ وارانہ جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔ بچوں کے ذہنوں کو گندگی سے بھر دینے کی یہ کوشش یقیناً مضرت رساں ہے۔ اس طرح یہ تاریخ داں ان بادشاہوں سے انتقام نہیں لے سکتے بلکہ خود اپنی آنے والی نسل کو اندھیرے میں رکھ رہے ہیں۔ جب تک ہمارے بچوں کو اپنی صحیح تاریخ معلوم نہ ہوگی وہ ہندوستان کو صحیح طور پر کس طرح سمجھ سکیں گے۔ آج اسکول کی یہ کتابیں پڑھ کر ایک بچہ صرف ہندو اور مسلمان ان دو لفظوں میں سوچتا ہے اور اس کا ذہن نفرت اور تعصب کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور یہی نفرت آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں پھوٹ پڑتی ہے۔

معاشی پچھڑے پن سے ہندو بھی اتنے ہی پریشان ہیں جتنے کہ مسلمان۔ یہ مسئلہ کسی ایک فرقے کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ جب تک ملک معاشی طور پر مستحکم نہیں ہو جاتا تب تک وہاں کے عوام کی معیشت کس طرح سدھر سکتی ہے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے معاشی پچھڑے پن کی کچھ خاص وجوہات بھی ہیں اور ان وجوہات کا تعلق ہماری تاریخ کے چند ناخوشگوار واقعات سے ہے۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کے دورِ حکومت میں مسلمان معاشی طور پر اتنے زیادہ پریشان نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں۔ اس زمانے میں زمین داری قائم تھی اور انگریزوں کی نظرِ کرم کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت اس زمین دارانہ ماحول میں خوشحال تھی لیکن آزادی کے بعد نقشہ بالکل بدل گیا۔ زمین داری سسٹم ختم کر دیا گیا اور مسلمانوں کو بیشتر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان بحیثیت ایک اسلامی "ملک کے صفحۂ ہستی پر نمودار ہوا اور اس طرح یہاں کے مسلمانوں کی پوزیشن بہت زیادہ نازک ہوگئی ـــــ زمین داری کے زمانے میں مسلمانوں نے آنے والے دنوں کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا۔ انہوں نے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور نتیجہ میں وہ سائنسی اور ٹکنیکل علوم میں پیچھے رہ گئے۔ اس لئے انہیں ملازمتیں حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں کچھ تو اس لئے کہ انہوں نے ضروری تعلیم حاصل نہیں کی اور کچھ پاکستان بن جانے کی وجہ سے ان پر بلاوجہ شک کیا جانے لگا ہے۔ آج ہمارے لیڈر اگر یہ کہہ دیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ملازمتوں کے حاصل کرنے میں تعصب نہیں برتا جاتا ہے اور اس سیکولر ہندوستان میں سب کو برابری کے حقوق حاصل ہیں تو اس سے کام نہیں بنتا۔ اس سروے کے دوران اکثریت نے (جن میں ہندو بھی شامل تھے) اس بات کا اقرار کیا کہ مسلمانوں کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور ملازمتوں میں خصوصاً پولیس اور فوج میں انہیں نہیں لیا جاتا۔ کیا مسز اندرا گاندھی اس بات سے انکار کرسکتی ہیں؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے انہیں پولیس اور فوج میں ملازمتیں دی جائیں تبھی وہ ملک کی ترقی میں صحیح طور پر ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس سکھ رجمنٹ ہے مراٹھا رجمنٹ ہے حتیٰ کہ مہار رجمنٹ بھی ہے لیکن افسوس مسلمانوں کی کوئی رجمنٹ نہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ

اس بات پر سنجیدگی سے غور کرے اور مسلمانوں کی ایک علیحدہ رجمنٹ قائم کرے۔ بی۔ ایم۔ کول نے بھی اپنی حالیہ تصنیف (CONFRONTATIONS WITH PAKISTAN) میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ یونین پبلک سروس کمیشن کے جو امتحانات ہوتے ہیں ان میں بھی مسلمان امیدواروں کو بہت کم کامیاب کیا جاتا ہے اور وہ اچھے عہدے حاصل نہیں کر پاتے۔ آزادی کے بعد ہونے والے تمام I.A.S. امتحانات کی فہرست اکٹھا کر دیکھی جائے تو پتا چلے گا کہ ان میں مسلمان امیدواروں کا اوسط فیصد ایک سے بھی کم ہے۔ یہ کارنامہ ہے اس ذہنیت کا جو مسلمانوں کو اپنا تاریخی دشمن سمجھے ہوئے ہے اور انہیں معاشی میدان میں پچھاڑ دینے کے درپے ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی اقتدار

کو بچانے کا سوال ہے تو یہ مسئلہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک سی نوعیت کا نہیں ہے کیونکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی ایک تہذیب نہیں ہے۔ اُردو کے مسئلہ کو لیجئے، یہ یو۔ پی، بہار اور آندھرا پردیش کے مسلمان کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے لیکن تامل ناڈ، کیرالا اور بنگال کے مسلمان کے لئے یہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہندوستان میں اردو کے ساتھ سوتیلی اولاد کا سا سلوک کیا جانے لگا ہے۔ کانگریسی حکومت اس کے ساتھ تعصب کا برتاؤ جاری رکھے ہوئے ہے اور اسے وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی یہ زبان مستحق تھی۔ اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ میرے نزدیک صرف یو۔پی کے مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ مسلمان ہندوستان کے ہر حصہ میں آباد ہیں اور وہاں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں، پھر ان کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ مسلمانوں کی جذباتیت نہیں تو اور کیا ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کو پورے ملک کے مسلمانوں کے وقار کا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ اس طرح کی جذباتیت یقیناً مضر ہوتی ہے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ حکومت اس یونیورسٹی کے ساتھ جانب دارانہ رویّہ اپنائے ہوئے ہے اور اس پر آرڈی ننس کا نفاذ غیر جمہوری ہے لیکن اس مسئلہ کو مذہبی رنگ دے کر جذبات میں بہنا غیر عقلی ہے۔ اس کے لئے اس یونیورسٹی کے طلباء اور یو۔ پی کے لوگوں کو چاہئے کہ وہ حکومت سے اپنی بات منوالیں۔

مسلم پرسنل لا کا تعلق یقیناً ملک کے تمام مسلمانوں سے ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم اور نازک مسئلہ ہے اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ غور و خوض کے بعد کوئی قدم اٹھانا چاہئے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس بات کی خواہاں ہے کہ ان کا علیحدہ قانون رکھا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا کا تعلق شریعت سے ہے اور شریعت میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مسلمانوں کا اس طرح سوچنا بالکل صحیح ہے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں کا جذباتی ہونا غیر فطری نہیں۔ عملی طور پر بہت کم مسلمان چار شادیاں کرتے ہیں اور اکثر جائداد وغیرہ کے جھگڑے بھی شرعی قانون سے طے نہیں کئے جاتے لیکن علیحدہ قانون کے لئے ان کی یہ ضد صرف اس لئے ہے کہ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور مذہب نام ہے اندھے اعتقاد کا!

جب ایک شخص سے یہ پوچھا گیا کہ کیا چار شادیاں کرنے کے رواج کو ختم کر دینا چاہئے تو اس نے بہت دلچسپ بات کہی۔ اس نے رائے دی کہ چار شادیاں کرنے کے قانون کو ہندوؤں پر بھی لازم کر دینا چاہئے اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ اگر ایک شخص چار عورتوں سے شادی کرتا ہے تو اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ آٹھ یا دس بچوں کا باپ بنے گا۔ اب اگر یہی چار عورتیں چار مختلف گھرانوں میں جائیں گی تو ہر ایک سے اوسطاً پانچ یا چھ بچے پیدا ہوں گے اور اس طرح ان چار عورتوں سے پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد چوبیس یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ اس طرح اس شخص کے نزدیک چار شادیاں کرنے کا قانون ایک طرح سے بڑھتی ہوئی آبادی کا حل ہے! یہ تعجب خیز منطق ایک عام مسلمان کے ذہن کی نشاندہی کرتی ہے جو زندگی کے ہر اصول کو شریعت کے چوکھٹے میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ملک کے نامور اسکالرز میں بھی اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ کھلم کھلا پرسنل لا میں تبدیلی کی بات کریں۔ بدرالدین طیب جی نے اپنی تصنیف (THE SELF SECULARISM) میں تبدیلی کی بات کی تو ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ تبدیلی مسلمانوں کی مرضی سے کی جانی چاہئے نہ کہ حکومت کی مرضی سے۔ اے۔ اے۔ اے فیضی نے بھی مکمل تبدیلی کی وکالت نہیں کی بلکہ چند تبدیلیاں کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان باتوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ کس قدر اہمیت کا حامل ہے اور مسلم پرسنل لا میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ حکومت مسلمانوں سے ربط پیدا کرے۔

آئے دن کے ہندو مسلم فسادات مسلمانوں کا ایک اہم اور پریشان کن مسئلہ ہے اور اس ضمن میں مسلمان بہت کم قصوروار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فساد صرف ایک فرقے کی شر پسندی سے نہیں ہوتا لیکن ایک فرقے کی حد سے بڑھی ہوئی شر پسندی دوسرے فرقے کو اس بات پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ فساد کرے۔ حکومت نے اگر یہ کہہ دیا کہ ملک کے تیئس بڑے فسادوں میں سے بائیس کی ابتدا مسلمانوں نے کی تھی تو کیا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان فسادی ہیں؟ اگر ایک پتھر مار دینے پر، یا کسی گائے کو معمولی زخم لگ جانے پر یا کسی مسلمان لڑکے کی ہندو لڑکی سے شادی ہو جانے پر ہزاروں آدمیوں کا قتل و خون ہو سکتا ہے اور لاکھوں کی املاک جلائی جا سکتی ہے تو اس میں زیادہ قصور کس کا ہے! پتھر مارنے والے کا یا قتل و خون کرنے والے کا؟ یہ کہنا بھی

درست نہ ہوگا کہ مسلمان فرقہ پرست نہیں ہیں فرقہ پرست ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی لیکن ہندوؤں کی فرقہ پرستی اپنے اندر تخریبی ذہنیت لئے ہوئے ہے اور مسلمان اکثر اپنے بچاؤ کی خاطر جھگڑا کرتے ہیں۔ اکثریت کی فرقہ پرستی اقلیت کی فرقہ پرستی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیونکہ دس انسانوں کا ایک ساتھ پاگل ہو جانا ایک انسان کے پاگل ہونے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ فرقہ پرستی ہمارے ملک کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ اس نے ملک کے تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اس طرح ملک کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس لعنت کو بڑھاوا دینے میں آر۔ ایس۔ ایس اور جماعتِ اسلامی دونوں کا ہاتھ ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس کی فرقہ پرستی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس جماعت کے کارندے ہندوستان میں رام راجیہ کا قیام چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو ہندو طریقۂ زندگی میں ڈھالنے کی فکر میں ہیں۔ گرو گولوالکر فرماتے ہیں کہ اگر مسلمان رام کو اپنا ہیرو ماننے لگیں تو فرقہ وارانہ فسادات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اپنے مذہبی عقائد کو کسی دوسرے فرقے پر زبردستی ٹھونسنے کی یہ کوشش فسادات کا باعث بنتی ہے۔

جماعتِ اسلامی کے کارندے اپنے آپ کو فرقہ پرست نہیں سمجھتے اور اگر انہیں فرقہ پرست کہا جائے تو وہ اس بات کا ثبوت مانگتے ہیں کہ کب اور کس فساد میں جماعتِ اسلامی کا ہاتھ تھا یا کبھی جماعت نے ہندوؤں کے خلاف کسی قسم کا پروپیگنڈا کیا ہے؟ ان کا یہ کہنا یقیناً درست ہے لیکن فرقہ پرستی کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ جماعت کے کارندوں کا کہنا ہے کہ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے ہیں لیکن کیا کبھی انہوں نے ہندوؤں کی بھلائی کے لئے بھی کوئی کام کیا ہے؟ جماعتِ اسلامی (ہند) کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کا جماعتِ اسلامی (پاکستان) سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کیونکہ دونوں جماعتوں کے مقاصد ایک ہیں، دستور ایک ہے۔ دونوں حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتی ہیں پھر بھی یہ دو الگ الگ جماعتیں ہیں! پاکستان میں جماعتِ اسلامی الیکشن میں حصہ لیتی ہے یہاں نہیں لیتی۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ یہاں جماعت کو خاطر خواہ کامیابی کی اُمید نہیں ہے۔ جماعتِ اسلامی دراصل جمہوری طرزِ حکومت میں یقین ہی نہیں رکھتی۔ اس بات کا اظہار مولانا مودودی صاحب نے اپنی ایک تقریر میں کیا تھا جو مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند دہلی سے شائع کی گئی ایک کتاب "دعوتِ اسلامی" میں شامل ہے۔ اس تقریر میں مولانا نے صریحاً اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ سیکولرزم، قوم پرستی اور جمہوری اُصولوں میں یقین نہیں رکھتے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ان اصولوں کو مٹا کر دوسرے اسلامی اصول قائم کئے جائیں۔ اس طرح جو جماعت سیکولرزم اور جمہوریت میں یقین ہی نہ رکھتی ہو۔ (جو ہمارے دستور کی بنیادی باتیں ہیں۔) اور جمہوری طرزِ حکومت کو ختم کرنا چاہتی ہو ایسی جماعت ملک اور قوم کے لئے یقیناً خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آج جب آر۔ ایس۔ ایس اور جماعتِ اسلامی دونوں پر پابندی لگانے کی باتیں کی جا رہی ہیں تو ایسی زیادہ غلط بھی نہیں ہیں۔ پابندی لگ جانے کے بعد دونوں فرقوں کے لوگوں کو ان جماعتوں کی نسطائی تعلیمات سے نجات ملے گی اور ملک میں قومی یکجہتی کے لئے راستہ ہموار ہو سکے گا۔ قومی یکجہتی ایک قومی دھارے میں زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اگر دونوں فرقے اپنی بندوں پر اڑے رہیں اور بظاہر ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہیں تو اسے قومی یکجہتی نہیں کہا جا سکتا اور نہ اس طرح ایک قومی تہذیب کا جنم ہو سکتا ہے۔ اس کیلئے دونوں فرقوں کو اپنا کچھ نہ کچھ قربان کرنا ہوگا تب کہیں ہم مستقبل میں ایک ایسی نسل کو جنم دینے میں کامیاب ہوں گے جو ان فرقہ وارانہ جھگڑوں سے کوسوں دُور ہو۔

★★

کچھ آپ کے بارے میں

- انسانی جسم میں اتنی بجلی ہوتی ہے کہ اس سے تقریباً منٹ تک ۲۵ واٹ کا ایک بلب روشن رہ سکتا ہے۔
- انسان کے بال اس کے خون کے شریانوں کی نشاندہی کرتے ہیں جس شخص کے بال چمکیلے نہیں ہوتے اس کے خون کی گردش سست ہوتی ہے۔
- ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا موٹاپا کم کرنے کے لئے مفید ہوتا ہے کیونکہ سردی سے جسم کی توانائی گھٹتی ہے اور جسم یہ توانائی فاضل چربی سے حاصل کرتا ہے اس طرح چربی صرف ہونے سے موٹاپا بھی کم ہو جاتا ہے۔
- قوتِ گویائی میں زیادہ تر تین یا آٹھ سال کی عمر کے درمیان خرابی پیدا ہوتی ہے۔
- چونکہ خوف کے نتیجے میں دورانِ خون کا نظام متاثر ہوتا ہے اور انسان کی کھال سکڑ جاتی ہے اسلئے کھال سکڑنے سے خوف کی وجہ سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
- خوف اور تفکرات سے انسان کے دانت کمزور ہو جاتے ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹروں نے نیوجرسی کے ایک شخص کی مثال دی ہے جس کے مضبوط دانت اس کی بیوی کی شدید علالت کے دوران تین ہفتوں میں کمزور ہو گئے تھے۔
- انسان کا کاٹنا کتے بلی اور گھوڑے کے کاٹنے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ انسانی منہ میں زیادہ اقسام کے اور زیادہ تعداد میں خطرناک جراثیم ہوتے ہیں۔
- جب آپ سو جاتے ہیں تو آپکا دماغ کچھ چھوٹا ہو جاتا ہے اور جسم کچھ بڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ سوتے ہیں تو آپ کے جسم میں زیادہ خون جاتا ہے اور دماغ میں کم خون پہونچتا ہے۔
- ایک دن میں آپ جتنی ہوا نکالتے ہیں اسکا وزن اس دن آپ نے جتنا کھانا کھایا ہو اس سے زیادہ ہوتا ہے۔
- اگر آپ کے دماغ میں خون کی روانی ۴۵ سیکنڈ بند رہنے کے بعد دوبارہ شروع ہو جائے تو آپ کے دماغ کی رگیں اس قدر متاثر ہو جائیں گی کہ آپ اگر پاگل نہ ہوئے تو کم از کم سنکی ضرور ہو جائیں گے۔

اس کی سہیلیاں راز کو جاننا چاہتی ہیں

سنیتا اپنے خاوند اور بچوں کے تئیں اپنے فرض کو پہچانتی ہے۔
وہ جانتی ہے کہ صحت مسرت کی کنجی ہے۔

بچوں کی پیدائش میں وقفہ ہونے پر:

بچے صحت مند ہوتے ہیں
ماں تندرست رہتی ہے۔

خاوند کی طرف بہتر توجہ
دی جاتی ہے۔

باقاعدہ جانچ پڑتال کے لئے وہ بچوں کو
قریب ترین صحتی مرکز میں لے جاتی ہے۔

اس کی سہیلیاں اس پر اور اس کے کنبے پر رشک کرتی ہیں۔

davp 71/344

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو!

• نقی ظریفی

کس کے نمائندہ

ایک دفعہ کی بات ہے کہ بنگال کے گورنر جناب آر جی کیسی راج بھون میں مہاتما گاندھی سے گفتگو کرنے میں اس طرح محو تھے کہ وہ کھانا بھی کھانا بھول گئے۔ گاندھی جی رخصت ہونے لگے تو گورنر کیسی انکے پیچھے پیچھے انھیں پہونچانے آئے۔ مگر راج بھون کے بڑے ہال سے گزرتے وقت برٹش گورنر کو بڑا تعجب ہوا۔ راج بھون کے تقریباً سبھی کارکن، مالی، باورچی، خبر بردار اور دھوبی جن کی تعداد دو سو تھی پرامن دو لمبی قطاروں میں کھڑے تھے۔ انھوں نے اپنے پیارے باپو کو مؤدبانہ سلام عرض کیا، ان میں سے کچھ ننگے بدن تھے کچھ ایسی پوشاکیں پہنے تھے جن میں گورنر کے سامنے آنا غیر مہذبانہ تھا گورنر کیسی نے مسکرا کر کارکنوں کی طرف اشارہ کیا اور باپو سے بولے:

"یہ دیکھئے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے ان سب کو آپ کی خوش آمدید کے لئے یہاں نہیں بلایا تھا۔" باپو جواب میں صرف مسکرا دیے۔ دوسرے دن گورنر کیسی نے کہا۔

مجھے زندگی میں پہلی بار تعجب ہوا۔ کیونکہ راج بھون کے زیادہ تر کارکن مسلمان ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ گاندھی جی نے اس دیش کے مسلمانوں کے دل میں اسطرح کیسے جگہ بنالی۔

میرا فائدہ ملک کا فائدہ

ستر سالہ ہر دت سنگھ گریٹیا مزدور تھا۔ جنوبی افریقہ میں ستیاگرہ کی جنگ چھڑی تو گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو جیل جانے کیلئے کہا۔ اس وقت جیل جانے والوں کی قطار میں ایک بڈھا ہردت سنگھ گریٹیا بھی چپ چاپ آکھڑا ہوا گاندھی جی نے اس سے دریافت کیا۔ "تم بوڑھے ہو بھلا تمہارے جیل جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

بوڑھے کے چہرے کی جھریاں یک بیک تن گئیں۔ اس نے کہا۔ "جب آپ سب مرد، عورت اور جوان جیل جا رہے ہیں تب میں باہر رہ کر کیا کروں گا۔ میں قطار سے الگ ہو جاتا ہوں تو بھی میرا فائدہ کیا اور نقصان کیا۔ فائدہ تو ملکی بھائیوں کو ہونا چاہئے۔" اور بعد میں اس بوڑھے کو جنوبی افریقی سرکار نے سخت سزا دی — ہردت سنگھ گریٹیا نے ہنس ہنس کر جیل کاٹی اور جیل میں ہی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

میں کچھ نہیں لیتا

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں ہندی ستیاگرہیوں کا قافلے کے نیٹال سے ٹرانسوال کی طرف کوچ کیا تھا۔ راہ میں کچھ ایسے ایماندار اور ہمدرد گورے بھی ملے جنہیں ہندیوں کی تکلیف صبر و استقلال اور انکی محبت سے متاثر ہوا ٹھے۔ ایک جگہ پر چند گوروں نے گاندھی جی کو دودھ، انڈے اور سردی سے بچنے کیلئے کمروں میں رہنے کی جگہ کی پیشکش کی۔ گاندھی جی نے اس پیشکش کو منظور کرنے میں مجبوری ظاہر کی تو گورے اور بھی ہمدردانہ گزارش کرنے لگے۔ اس پر گاندھی جی نے نرمی سے کہا:

"انڈے تو میں کھاتا نہیں۔ رہا دودھ اور کمرے میں رہنے کا سوال تو میں اس سفر کے دوران کوئی ایسی چیز بھی قبول کرنے سے قاصر ہوں جسے اپنے ساتھیوں کے لئے مہیا نہ کر سکوں — وطنی بھائی میری رہنمائی پر اعتماد کر کے ساتھ آئے ہیں اور انہیں تکلیفوں میں چھوڑ کر خود کوئی آرام اٹھانا میرے اصول و مذہب کیلئے دھوکا ہی ہوگا۔

بیرسٹری کا شوق

بائیس سالہ جوان حسین داؤد جنوبی افریقہ میں پرورش پا کر جوان ہوا۔ وہ ایک ہندوستانی تاجر کا نور نظر تھا۔ اس کی پیدائش تو ہندوستان میں ہوئی لیکن ہوش سنبھالنے سے قبل ہی وہ جنوبی افریقہ چلا گیا مگر اپنے وطن کی پیاری زمین اور اس کے باشندوں (ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی) کی خدمت کا جذبہ اس کے دل میں موجزن رہا۔ خدمت کا یہ شوق جب پروان چڑھا تو حسین نے بیرسٹری پڑھنے کے لئے انگلینڈ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ایک دن گاندھی جی نے اس سے دریافت کیا۔ "بیرسٹری کا یہ شوق تم پر کیوں سوار ہو گیا، کیا وکالت کر کے پیسے کمانا ہیں؟" حسین نے قدرے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ "کمانا ہوتا تو میں والد کیطرح تجارت نہ کرتا۔ میں بیرسٹر بن کر وہی کمائی کروں گا جو آپ نے کی ہے۔ میں قانون پڑھوں گا اور اس کے ذریعے اپنے لاکھوں ہم وطنوں کی خدمت کروں گا۔"

وائسرائے گھر جائے گا

کیبنٹ مشن ہند کی آزادی دینے کے منصوبے پر غور و خوض کرنے دلی پہونچا تو دیش کے بہت سے سیاستدانوں اور شہریوں میں کوئی خاص امنگ نہ دکھائی دی۔ کیبنٹ مشن کو برٹش گورنمنٹ کی ہندی خواہشوں کو ٹالنے اور جھٹلانے کے لئے متعدد بار کی ہوئی کوششوں کی ایک کڑی سمجھا جاتا تھا۔ مشن کے ایک ممبر سر اسٹیفرڈ کرپس مضبوط خیالات اور صاف طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ ہندیوں کے دل میں بیٹھی ہوئی غلط فہمی کو دور کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

دلی میں ایک دن مشہور تاجر شری گھنشیام داس برلا نے اپنے گھر پر کیبنٹ مشن کے تینوں ممبروں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ دوستانہ اور اخلاقی گفتگو کے دوران شری برلا نے ممبروں سے کہا۔

"اس بار ہر آدمی کو یقین ہے کہ آپ لوگ ہند چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ لیکن اگر وائسرائے نے آپ کے ساتھ تعاون نہ کیا تو آپ کیا کریں گے؟"

سر اسٹیفرڈ کرپس نے ہنس کر کہا۔ "اگر ایسا ہوا تو ہم وائسرائے کو اپنے ساتھ ہی واپس لیتے جائیں گے۔"

ہنسی میں کہی ہوئی کرپس کی بات مستقبل میں سچی ثابت ہوئی ہند کی آزادی کا کام ٹھیک ٹھیک نہ کر سکنے کی بنا پر وائسرائے لارڈ ویول کو واپس بلا کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔

ق ہی کہے گا اس وقت ان کی عمر تقریباً دو ہی تھی جو
لاہور سیشن میں کانگریس کا صدر منتخب ہوتے وقت
نہرو کی تھی۔
یسے انقلابی سال میں فیروز گاندھی کے ساتھ ان کی
ری کے معاملے میں بھی یہ اپنی رائے پر جمی رہیں اور چند
یدا اختلاف کو کبھی قابل اعتنا نہ سمجھا۔ یاد رہے بات ہے
نیال میں ان کی ازدواجی زندگی زیادہ خوشگوار ثابت

) سے انہیں بے حد پیار تھا۔ ماں کے مقام کو وہ خوب
ہیں کہ آزادی کے قبل ہی نہ صرف یہ کہ گورنر وجے پنڈت
ما ویر مہاتما گاندھی نے بھی انہیں اتر پردیش کی
از کی رکنیت کے لئے انتخاب لڑنے کا مشورہ دیا تھا
نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب
نا دوسرے بڑے لوگوں کے لئے بھی قانون کی حیثیت
ا اندرا گاندھی نے صاف کہہ دیا کہ ان کے بچے چھوٹے
لسلکے پیار کی ضرورت ہے۔
اندرا گاندھی وقت کی بڑی پابند ہیں۔ ایچ۔ ایم۔ ٹی کی
ہتی ہیں۔ اور ہر کام وقت پر اور پورے انہماک سے
ری ہیں۔
لی پختگی ان کی فطرت میں داخل ہے۔ بینکوں کے قومیانے
ہاراجاؤں کے جیب خرچ کا تصفیہ ہو وہ تجربات طے
ا پر اٹل رہتی ہیں اور دشواریوں سے ہراساں ہونے
اریوں پر ہر ممکن صورت سے قابو پانے کی کوشش کرتی
مانہ وہ تھا جب سنڈیکیٹی لیڈر انہیں بے چاری بی ”
ردفاتون“ کہا کرتے تھے۔ آج وہی لوگ انہیں ضرورت
ا نتور بلکہ تاناشاہ کہتے نہیں تھکتے۔
جنگ کے حالات میں مسز گاندھی کو ملک کی تمام
رتمام افراد کا مکمل اعتماد حاصل ہے اور وہ انتہائی
کے ساتھ رہنمائی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔
ہنہیں ہیں، عزم کی پختہ ہیں اور ارادوں کی مضبوط
پاک جنگ کے دوران انہوں نے عوام کو کھو کھلے
ں دیئے ہیں۔ نہ ہی مضحکہ خیز بیانات جاری کر کے
بذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس نازک
ا بڑی سلامت روی کے ساتھ وہ ملک کی رہنمائی

فرما رہی ہیں۔
اندرا گاندھی کی دوسری خصوصیت ہمیشہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی
کے لئے کوشاں رہنا بھی رہی ہے۔ یہ کہنا بے محل نہیں ہوگا کہ ملک کو
اس نازک وقت میں جتنا زیادہ اس کی ضرورت ہے اتنا اس سے پہلے
نہیں تھی۔ اور موجودہ ہندوستانی لیڈر شپ میں کسی فرد واحد میں
ہندوستان کو متحد رکھنے کی جتنی صلاحیت اندرا گاندھی میں ہے اتنی
شاید کسی دوسرے میں نہیں ہے۔

دلی کا تقریبات بال ٹورنامنٹ رفتہ رفتہ تجارتی مصلحتوں کا نذر ہوتا جا رہا ہے۔ ۴۴ سال پہلے جب اس ٹورنامنٹ کا آغاز ہوا تھا تو اسے فٹ بال کے شائقین کے لئے تفریح کا اور ملک کے مشہور و معروف فٹ بال کلبوں کے لئے اپنے جوہر دکھانے اور اپنے کھیل کو بہتر بنانے کا بہترین ذریعہ سمجھا گیا تھا اور بہت کم مدت میں اس ٹورنامنٹ نے قومی ٹورنامنٹوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ لیکن گزشتہ تین برسوں سے یہ ٹورنامنٹ اپنی کشش کھوتا جا رہا ہے اور گمان غالب ہے کہ اگر ہندوستان سے باہر کی ٹیموں کو لانے کا موجودہ رجحان جاری رہا تو ۲-۴ سال بعد ہندوستان کی ٹیموں کے لئے اس ٹورنامنٹ میں کوئی کشش باقی نہ رہ جائے گی۔ اور غالباً غیر ملکی ٹیموں کو خوش کر کے کپڑے کی تجارت کو فروغ دینے کے اس رجحان کی وجہ سے گزشتہ سال ہندوستان کے چند مشہور و معروف کلبوں نے اس ٹورنامنٹ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ دلی والوں کو خوش کرنے والا فٹ بال کا کھیل اب صرف کلکتہ ہی میں رہ گیا ہے۔ کلکتہ کی ٹیمیں شارٹ پاس کمبی نیشن، فرائض حسین چالوں اور صاف ستھرا کھیل پیش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں جبکہ پنجاب کی ٹیموں میں یہ خصوصیات نہیں ہیں۔ وہ

بہت رف گیم کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اپنا دماغی توازن کھو دیتی ہیں۔ ریفری کے ہر فیصلہ پر آتش زیر پا ہو جاتی ہیں اور کھیل کے میدان کو گویا میدان کارزار سمجھ لیتی ہیں۔ راقم الحروف نے پنجاب کی چند معروف ٹیموں کا کھیل دیکھا ہے اور اب تو یہ حالت ہے کہ ان ٹیموں کے کھیل کو دیکھنا تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ ان ٹیموں کے گنے چنے کھلاڑی مثلاً اندر سنگھ اور گورکرپال ایسے ہیں جو صاف ستھرا کھیل پسند کرتے ہیں لیکن اکثریت ایسے کھلاڑیوں کی ہے جو تکنک سے زیادہ قوت پر تکیہ کرتے ہیں۔

اسی طرح دلی کے بکثرت شائقین بھی کھلاڑیوں کی اسپرٹ سے محروم ہیں۔ وہ کھیل نہیں دیکھتے بلکہ تمناؤں کو حقیقت کی شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اور ان کی اسی ذہنیت نے اس سال دلی کلاتھ مل فٹبال ٹورنامنٹ کی خامیوں میں ایک خامی کا اضافہ کیا۔

میرا اشارہ ٹورنامنٹ کے محمڈن اسپورٹنگ کے اخراج کی جانب ہے۔ یوں تو محمڈن اسپورٹنگ میں صرف لفظ محمڈن سے ایک فرقہ کے ساتھ ایک تعلق کا اظہار ہوتا ہے جبکہ اس کے کھلاڑیوں کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم کھیل کے میدان میں بھی سیاست کے میدان والی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر ہمارے ریفری (خاص طور پر دہلی کے ریفری) دو چار کو چھوڑ کر سب کے سب "ماشاء اللہ" ہی ہیں۔ یہ حالات کو سنبھالنے سے زیادہ حالات کو بگاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زیر بحث ٹورنامنٹ میں لیڈر کلب جالندھر اور محمڈن اسپورٹنگ کے درمیان مقابلہ میں جہاں شائقین کی ذہنیت کو مورد الزام قرار دیا جا سکتا ہے وہیں ریفری کے رویہ کو بھی زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ جس کے فیصلے نے حالات کو ابتر کر دیا۔ محمڈن نے لیڈر کے مقابلہ میں اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے لیڈر کے خلاف ایک گول کر لیا۔ ریفری نے گول مان بھی لیا۔ لیکن شائقین کے شور و غل اور اپنی مقبولیت گھٹنے کے خیال سے اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی جانبداری تھی اور کوئی بھی اچھی ٹیم اس قسم کی جانبداری کو برداشت نہیں کر سکتی۔ محمڈن نے ریفری کے فیصلہ کو مان بھی لیا لیکن ریفری نے کھیل ہی منسوخ کر دیا اور ٹورنامنٹ کمیٹی نے دوسرے دن جب محمڈن سے کھیلنے کو کہا تو اس نے اس نا انصافی کی وجہ سے کھیلنے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ ایسے ٹورنامنٹوں میں ہندوستان کی اچھی ٹیموں کو حصہ نہ لینا چاہئے جن کا مقصد ایرا لنکا یا نیپال کو خوش کرنا ہو۔ اور جن کے ریفری رواداری برت سکتے۔

ایمان کا تاج کلب تیسرے سال بھی فائنل جیت کر کپ کا مالک ہو گیا ہے اس سے ڈی سی ایم کے آقاؤں کو تو خوشی ہو سکتی ہے لیکن غیر جانبدار شائقین کو ذرہ برابر خوشی نہیں ہو سکتی۔

ہاکی : برسلونا میں عالمی ہاکی کپ ٹورنامنٹ میں پاکستان کے ہاتھ ہندوستان کی ہار کے بعد ایک بار پھر ہم باہمی چپقلش کا شکار ہو گئے ہیں۔ ہاکی فیڈریشن کے ذمہ دار عہدیداران کے درمیان الزامات اور جوابی الزامات کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ اس شکست کے لئے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ بحث و مباحثہ بالکل بیکار ہے۔ "ہم ہار گئے" یہ ایک حقیقت ہے اور چونکہ کھیل میں ایک فریق کی ہار اور دوسرے فریق کی جیت ہوتی ہی ہے اس لئے ہمیں اپنی ہار کو کھلاڑیوں کی طرح تسلیم کر کے سنجیدگی کے ساتھ اس شکست کے اسباب پر غور کرنا چاہئے۔ اور جو خامیاں اس شکست کے جلو میں آتی ہیں انہیں دور کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہئے۔ جہاں تک ہندوستان کے کھیل کے طریقہ کا سوال ہے مجھے اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ کھیل کے موجودہ طریقہ میں جو ۱-۲-۳-۵ سسٹم کہلاتا ہے معمولی سا رد و بدل کیا جا سکتا ہے لیکن اس سسٹم کو بالکل ترک کر دینے کا مشورہ مجھے

ہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی کے کھیل کا سسٹم ایک
ں ہے۔ اگر سسٹم میں کوئی خرابی ہوتی تو پاکستان کو بھی چیمپین نہیں بننا تھا
ملہ ان ٹیموں میں سے کوئی ٹیم جیت جاتی جن کا سسٹم بدلنے کا مشورہ
یا جا رہا ہے۔ برسلونا میں تین سرفہرست ٹیمیں پاکستان، ہندوستان
ر کینیا کی تھیں اور ان تینوں ٹیموں کے کھیل کا طریقہ قریب قریب یکساں
ہے۔ اس لئے میں پھر یہی کہوں گا کہ اگر کھیل کا یہ سسٹم غلط ہوتا تو اس سسٹم
و اختیار کرنے والی ٹیمیں سب پر برتری کیسے حاصل کر سکتی تھیں۔
ان دو شہادتوں سے سسٹم کی خرابی کا دعویٰ غلط ثابت ہو رہا ہے تیسری
شہادت حال ہی میں برطانیہ کے خلاف ہندوستان نے ہاکی ٹسٹ کے
چاروں میچ جیت کر پیش کی ہے۔ بدقسمتی سے ۱۹۶۸ء ہی سے جب پاکستان
نے میکسیکو میں ہندوستان سے اولمپک اعزاز چھینا تھا ہمارے کھلاڑیوں
کا معیار بلند نہیں ہوا ہے۔ میں یہ تو نہیں مانتا کہ سلکشن کے وقت سفارشوں
اور جانبداری سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہاکی
فیڈریشن سنجیدگی کے ساتھ اچھی ٹیم بنانے کی کوشش نہیں کر رہی ہے
اور مختلف ریاستوں اور دفتروں کو نمائندگی دینے کی کوشش میں اکثر ایسے
کھلاڑیوں کو لیا جاتا ہے جن سے بہتر کھلاڑی بھی موجود ہوتے ہیں۔
لیکن انہیں اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں مل پاتا۔ ●

اصل میں دہلی تو وہی ہے جو فصیل کے اندر آباد ہے جسے عرف عام میں پرانی دہلی کہا جاتا ہے اور یہ پرانی دہلی ابھی تک قدیم روایات کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ وہی بستیوں کی صدائیں۔ ٹھنڈا ہے میٹھا ہے، جی بھر کے پیو۔ وہی قلعی کئے ہوئے تانبے کے کٹوروں کی کھنک، وہی نہاری اور حلیم کی خوشبو، وہی پراٹھوں اور سیخ کے کباب کی مہک اور وہی تانگے اور تانگے والے جو "ذرا ہٹ کے، ذرا بچ کے" کی صدا لگاتے ہوئے اس گنجان آبادی میں زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح کھینچے جا رہے ہیں۔ لیکن اس پرانی دہلی میں تانگے والے دو طرح کے ہیں۔ ایک تانگے والا تو محمد احمد ہو سکتا ہے جو سیلم پور کی گندی بستی میں زندگی گزارتا ہے۔ جامع مسجد سے فراش خانے تک دن بھر اپنا تانگا ہانکتا ہے اور ہمیشہ یہی سوچتا رہتا ہے کہ کس طرح اتنی رقم کما لے کہ اپنی جوان بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دے۔ لیکن تانگے کا کرایہ نکال کر وہ اتنی بھی رقم نہیں بچا پاتا کہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے۔ پھر اپنی بیٹی کو دلہن کیسے بنا سکیگا۔

محمد احمد ان تمام تانگے والوں کی نمائندگی کرتا ہے جو مفلس اور کنگال ہیں۔ جو زندہ ہیں محض امیدوں کے سہارے، جو مرنا چاہتے ہیں لیکن موت نہیں آتی۔ جو مزدور ہیں، محنت کش ہیں اور حالات کی سختیوں کا شکار ہیں۔

دوسرا تانگے والا محمد شفیع ہو سکتا ہے جو شوق کی تسکین کیلئے گھوڑا پالتا ہے۔ محمد شفیع ان تانگے والوں کی نمائندگی کرتا ہے جو خوشحال ہیں کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں کا کاروبار کرتے ہیں اور شام کو اپنے کاروبار سے فرصت پانے کے بعد رنگین تہہ بند اور چکن کا کرتا زیب تن کرکے سیر کے لئے اپنے تانگوں پر نکلتے ہیں، جو اپنے تانگوں کی دوڑ میں ہر ہفتہ ہزاروں ہارتے اور جیتتے ہیں جو اپنے گھوڑوں کی شکست کو اپنی شکست سمجھتے ہیں اور لکھنؤ کے بانکوں کی طرح بات بات پر اکڑ جاتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے دہلی ایڈمنسٹریشن قدیم روایات کو زندہ رکھنے میں لگی ہوئی ہے اور اس سلسلے میں دہلی اسپورٹس کونسل ہر سال تانگا دوڑ بھی کراتی ہے اور اس دوڑ میں بے چارہ محمد احمد حصہ نہیں لے سکتا کیونکہ اس کے پاس اپنا گھوڑا اور اپنا تانگا نہیں ہوتا۔ اس میں حصہ لیتے ہیں محمد شفیع جیسے تانگے والے جو اس دوڑ کے لئے سال بھر تیاری کرتے ہیں۔ اس کو "چیتک دوڑ" کا نام دیا گیا ہے۔ چیتک مہارانا پرتاپ سنگھ کے گھوڑے کا نام تھا۔ دوڑ بدرپور سے راج گھاٹ تک ۲۴ کلومیٹر لمبے راستے پر ہوتی ہے۔ اس سال محمد شفیع کے گھوڑے "جھونے" نے اول آ کر دہلی چیک کا خطاب حاصل کیا۔ اس نے یہ فاصلہ ۴۴ منٹ ۳۰ سیکنڈ میں طے کیا۔ چمن میاں کے گھوڑے موتی نے دوسرا اور روپ چند کے گھوڑے راجکمار نے تیسرا مقام حاصل کیا۔

دہلی والے بڑے زندہ دل ہیں۔ وہ اس دوڑ میں بھی اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مقابلے میں اترنے والے گھوڑوں کے مالکان کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں، انہیں کافی جوش و خروش ہوتا ہے اور وہ کسی بھی نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو کر جاتے ہیں۔

اس مقابلے میں محمد شفیع کو ۱۵۰۰ روپے نقد اور "چیتک" کی سونے کی مورتی۔ چمن میاں کو ایک ہزار روپے نقد اور "چیتک" کی چاندی کی مورتی۔ اور روپ چند کو ۵۰۰ روپے نقد اور "چیتک" کی کانسے کی مورتی بطور انعام ملی۔

لیکن محمد احمد تو صرف تماشائی کی طرح "دوڑ کا جلوہ" ہی حاصل کر سکا۔

فیشن ایک سماجی برائی ہے

تحریر: محمد [illegible]

عورت کو قدرت نے نہ صرف کشش اور جاذبیت کا مرکز بنایا ہے بلکہ سماج میں بھی اُسے ایک ممتاز مقام بخشا ہے ہر دور اور ہر سماج میں عورت کو اونچے سے اونچا مقام دیا گیا ہے۔ عورت کے بغیر انسانی زندگی ادھوری اور بے مزہ سمجھی جاتی ہے ——— لیکن فیشن کی دوڑ میں آج کی عورت جس تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے اس نے ایک سماجی مسئلہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ہمارے ملک میں زیادہ لوگ ایسے ہیں جنہیں غریب کہا جا سکتا ہے، ان کے مقابلہ میں بہت کم لوگ صحیح معنوں میں امیر ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ سماج انہیں مسائل سے اثر پذیر ہوگا جن کا تعلق زیادہ لوگوں سے ہے۔ موجودہ معاشرہ میں عورت نے جس ماڈرن فیشن کو اپنایا ہے ——— وہ ہے چست لباس۔ یہ فیشن کسی خاص طبقہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر سب ہی پر برابر کا پڑ رہا ہے۔ ہر عورت کی یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حسین اور پُرکشش دکھائی دے یہ جذبہ قدرتی ہے لیکن قدرت کا یہ اصول بھی تو ہے کہ جب بھی کوئی بات حد سے گزر جاتی ہے تو اچھی ہوتے ہوئے بھی وہی بات بُری اور نقصان دہ بن جاتی ہے۔ عورت کا خوبصورت اور پُرکشش نظر آنے کا جذبہ آج حد سے تجاوز کر کے ایک سماجی برائی کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

جب ہم اس مسئلہ کو نفسیاتی پہلو پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواتین کا شوق کیوں بڑھ رہا ہے؟ ہر عورت نقل کے فن میں ما ہوتی ہے۔ آج فیشن کی نقل کرنا تو ایک رواج سا بن گیا یہ شوق اس وقت بڑھتا ہے جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچتی۔ وہ اپنے ماحول کا جائزہ لیتی ہے اپنی ماں بہن اور بھاوج طرف دیکھتی ہے اور جب اسکول یا کالج یا انسٹی ٹیوٹ میں کسی کلاکار کے آرٹ کا اشتہار بنی ہوئی اپنی استانی یا لکچرار کو د ہے تو دل ہی دل میں فیصلہ کر بیٹھتی ہے کہ آج وہ کسی طرح ا طرز کے کپڑے سلوائے گی اور جدید فیشن کے فن میں مہ حاصل کرے گی۔ کلاس روم میں اس کی نظر کتاب پر نہیں لیکچرر کی نئے انداز سے کٹی ہوئی زلفوں پر ہوتی ہے ———

مذاق کا موضوع بن گئی ہے۔ اور اس کے لئے ہر حالت میں
وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جدید فیشن کے
باعث درمیانی طبقہ کو بے حد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

جب کوئی ایسی لڑکی جس کا تعلق امیر طبقہ سے ہے ـــ جدید
فیشن کو اپناتی ہے تو فیشن کے نام پر وہ ہزاروں روپے صرف
کرتی ہے لیکن اس کی نقل جب ایک درمیانی طبقہ کی لڑکی کرتی
ہے تو اسے عجیب قسم کے امتحان سے گذرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی اپنے
آپ کو پہلی قطار میں کھڑا کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔
لہٰذا اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں
کامیابی کے لئے ذرائع بھی تلاش کرے۔ چنانچہ ایسی کئی مثالیں
ملیں گی کہ جدید فیشن کی دلدادہ کتنی ہی ایسی لڑکیاں ہوسائٹی
گرل بن کر رہ گئی ہیں۔

قومی نقطۂ نظر سے اگر مسئلہ پر غور کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ
قوم کی بنیادیں لرز رہی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان نے
بے شمار ایسی خواتین کو جنم دیا ہے جنہوں نے زندگی کے مختلف
پہلوؤں میں اپنا ایک اہم ممتاز و منظم مقام بنایا ہے۔ ہندوستان
کی تہذیب و تمدن پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش چھوڑے
ہیں۔ ان کا کردار آج بھی ہمارے لئے ایک بے نظیر نمونہ ہے۔
ان کی زندگی کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بچپن ہی
سے اپنے بلند خیالات و جذبات سے اپنی زندگیوں کی مضبوط
بنیاد قائم کی تھی ـــ لیکن اس کے برعکس آج کی معزز خواتین
اپنی تمام تر توجہ صرف فیشن پر ہی مرکوز کئے ہوئے ہے۔ کلاس روم
میں، گھر میں، راہ چلتے اس کی زندگی کا مقصد صرف سجنا سنورنا
ہی رہ گیا ہے۔ پھر ہم اس سے یہ امید کیسے کر سکتے ہیں کہ اپنے
بلند کیرکٹر اور بلند خیالات سے وہ قوم کی تعمیر ترقی میں اہم پارٹ
ادا کرے گی۔

سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی فیشن کا پورا پورا

کے بلاؤز کے کٹ اور ساڑی کے ڈھال پر ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ جہاں سے بھی وہ نیا پن حاصل کرتی ہے اُسے عملی شکل میں
بدلنے کے لئے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر گھنٹوں ریہرسل کرتی
ہے۔ اسی طرح ہر لڑکی فیشن کی دوڑ میں سب سے آگے بڑھنے کی
کوشش کرتی ہے۔ کسی بھی کالج یا ایسے دوسرے ادارے میں
آپ چلے جائیے ـــ ہر لڑکی آپ کو نمائش میں رکھا ہوا "ماڈل"
نظر آئے گی۔ اس سے شخصیت کا اصل وقار پس پشت جا پڑتا ہے۔
اور سطحیت غالب آ جاتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی صدیوں
پرانی تاریخ جس عورت کی پوجا کرتی آئی ہے آج وہ عورت

پڑجاتا ہے۔ جب ہم قومی کیرکٹر کی بات کرتے ہیں تو اس کے لئے ان صاف الفاظ میں ہم نوجوانوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ لیکن کبھی اس عظیم ترین مسئلہ کی گہرائی میں جانے کی کوشش ہم نے کی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارا اس ڈھنگ سے سوچنا کسی حد تک درست بھی ہو لیکن اس بات سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نوجوانوں کی اس کمزوری کا سبب عموماً نئی تہذیب و فیشن کی دلدادہ یہ عورت ہی ہے۔ عورت اور مرد میں ایک دوسرے کے لئے کشش و جاذبیت غیر فطری نہیں۔ ہر دور میں عورت کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ صنف مقابل کے لئے کشش کا باعث بنے۔ اس جذبہ کی نفسیاتی تعبیر بھی یہی ہے کہ وہ مرد کو راغب کرنے کے لئے ہی زیادہ بنتی اور سنورتی ہیں مگر اس کی کوئی حد ہو اور سماجی اقدار کو ملحوظ رکھ کر عورت اس ہتھیار کا استعمال کرے تو ایسا حسن اور یہ جاذبیت گنگا کی طرح مقدس سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اس حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو یہی مقدس جذبہ ہوس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آج کی عورت جب شوکیس کا ماڈل بن کر ایک مخصوص انداز میں کسی نوجوان کے سامنے سے گزرتی ہے تو اس کا دل بیتاب ہو اٹھتا ہے۔ ہوس کی آنکھیں نہیں ہوتیں اور ہوس سے اندھا انسان اپنے جذبات کی تسکین کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی عورت میں وہ کشش نہیں ہے جو گنگا کی طرح مقدس ہے بلکہ ایک ایسی کشش ہے جسے کہتے ہیں ہوس انگیز اپیل ہے

آج جدید فیشن کی روشنی میں ہمیں ایک نہایت اہم سماجی مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے۔ اور یہ مسئلہ ہے روز بروز بڑھتی ہوئی گرانی کا۔ درمیانی طبقہ گرانی سے پسا جا رہا ہے۔ کئی مقامات پر اناج اس قدر گراں ہے کہ قحط کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود فیشن کی دوڑ کی رفتار مدھم نہیں پڑی۔ بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا مرض بن گیا ہے جو حملہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ فیشن پر تو ہم ہزاروں روپے صرف کر سکتے ہیں لیکن ضروریات زندگی کا جہاں سوال پیدا ہوتا ہے وہاں ہم شور وغل بپا کر دیتے ہیں۔ اگر ہم سادہ زندگی گزاریں تو کیا فیشن پر خرچ ہونے والی رقم سے ہم اپنی نصف ضروریات زندگی کو پورا نہیں کر سکتے؟ پرکشش اور جاذب نظر رہنے کے سیکڑوں ذرائع ہیں جو یقیناً کم خرچ اور آسان ہیں۔ گرانی کے اس اہم مسئلہ پر فیشن کی روشنی میں نہایت سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہئے۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو ازدواجی زندگی ہے۔ آج کتنی خواتین ایسی ہیں جو باوجود شادی شدہ ہونے کے ناکام ازدواجی زندگی کی شکایت کرتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کیا ہے کہ ازدواجی زندگی کی ناکامی کی اصل وجہ کیا ہے؟ اپنے شوہر سے آپ مطمئن کیوں نہیں ہیں؟ اپنے آپ کا نفسیاتی جائزہ لیجئے تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس ناکامی کی دراصل بنیادی مرض فیشن ہے۔ شادی سے قبل آپ کی تمام تر توجہ فیشن ہی پر مرکوز رہتی تھی۔ ہر لمحہ آپ کی یہی کوشش رہتی تھی کہ فیشن میں سب لڑکیوں کو مات کر دیں۔ پھر آپ کی جان پہچان والی کسی لڑکی کی شادی کسی ایسے نوجوان سے ہو جاتی ہے جو امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے ——— جس کے پاس اپنی موٹر کار ہے۔ لیکن جس کے پاس اتنے ذرائع نہیں کہ اپنی بیوی کی خواہشات کی تکمیل بآسانی کر سکے۔ جب آپ اسے اس رنگ میں دیکھتی ہیں تو پھر اس کی نقل کرنا چاہتی ہیں بلکہ دو قدم اس سے بھی آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اپنے تصور میں آپ ایک ایسے شوہر کی خواہش کرتی ہیں جو جان پہچان والی لڑکی کے شوہر سے بھی زیادہ امیر ہو۔ اپنے اس تصوراتی شوہر کو ایک باقاعدہ شکل دے کر آپ اسے اپنے ذہن میں اچھی طرح محفوظ کر لیتی ہیں ——— لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے ——— کیونکہ آپ نے اپنی جان پہچان والی لڑکی کی صرف نقل کی ہے جبکہ آپ کا تعلق ایک اوسط گھرانے سے ہے۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ جب آپ اپنی ازدواجی زندگی میں قدم رکھتی ہیں تو اپنے شوہر کو ویسا نہیں پاتیں جیسے شوہر کو آپ نے اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا ہے۔ جس کی بنا پر آپ کے نفسیاتی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون آپ اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھ رہی ہیں۔ پھر دل ہی دل میں اپنے آپ کو ہی نہیں بلکہ اپنے نیم خدا شوہر نامدار کو بھی کوسنے لگتی ہیں۔ دراصل آپ نے اپنے آپ کو اس قابل تو بنایا ہی نہیں کہ حالات سے سمجھوتا کر سکیں کیونکہ اس پر کبھی آپ نے غور ہی نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے شوہر سے ——— اپنی ازدواجی زندگی سے بالکلیہ آپ غیر مطمئن ہو جاتی ہیں اور اپنے آپ پر یہ کلیہ اختیار کر کے اپنی مقدس ازدواجی زندگی کو خواہ مخواہ ناکام بنانے کا سبب بنتی ہیں۔

اب ذرا فیشن اور صحت کے اثرات پر غور کیجئے! جہاں تک نفسیاتی صحت کا تعلق ہے اس کا ذکر آپ نے اوپر پڑھ لیا جسمانی صحت حسن و دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ اگر جسمانی طور پر آپ صحت مند نہیں ہیں تو فیشن کے بنیادی ذرائع بھی آپ کو حسین و دلکش نہیں

سکتے۔ لیکن آج فیشن کے جن ذرائع کا استعمال آپ کرتی ہیں ان سے خود ہی اپنی جسمانی صحت و دلکشی کو آپ برباد کر دیتی ہیں۔ سب سے پہلے ہم چست لباس ہی کو لیتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ اسی وقت تندرست رہ سکتی ہیں جب آپ کے جسم میں خون کا دوران نارمل ہو اور اس فعل میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اسی طرح سانس کے فعل کی بھی خاص اہمیت ہے۔ سانس کے ذریعے آپ تازہ ہوا اور آکسیجن اپنے جسم میں داخل کرتی ہیں جو نہ صرف آپ کے خون کو صاف کرتی ہے بلکہ آپ کے مختلف جسمانی اعضاء کی خوراک بھی ہے۔ سانس کے ذریعہ ہی آپ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو اپنے جسم سے خارج کرتی ہیں جو اپنے ساتھ جسم کی گندگی کو باہر لے آتی ہے۔ اس طرح سانس کا یہ فعل نہایت

اہم ہوتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جب آپ چست لباس پہنتی ہیں تو اس کا دباؤ دل اور تمام جسم کے دوسرے اعضاء پر پڑتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ چست لباس پہن کر خون کے قدرتی دورے اور فعل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ خون بآسانی جسم میں گردش نہیں کر سکتا اور کئی ایسے اعضاء میں خلل پڑ جاتا ہے جنہیں خون دستیاب نہیں ہوتا کیونکہ خون ہی دراصل مختلف اعضاء کی پرورش کرتا ہے۔ کئی بار معمولی معمولی بیماریاں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ آپ اپنے حسن کو مکمل طور پر کھو بیٹھتی ہیں۔

اب ذرا سانس کے فعل پر غور کیجئے۔ آپ جتنا اونچا سانس لیں گی اتنی ہی زیادہ آکسیجن آپ کے جسم میں داخل ہو کر خون میں شامل ہو گی اور اعضاء کی پرورش قدرتی طور پر ہو سکے گی اور اتنی ہی زیادہ کاربن ڈائی آکسائیڈ سانس کے ذریعہ جسم سے خارج ہو گی۔ اور خون کی باقاعدہ صفائی ممکن ہو گی۔ اس کے برعکس جب آپ تنگ و چست لباس زیب تن کرتی ہیں تو اس کا دباؤ سب سے پہلے پھیپھڑوں پر پڑتا ہے۔ نتیجتاً آپ گہرا سانس لینے کے قابل نہیں رہتیں جس کے سبب نہ آکسیجن زیادہ مقدار میں جسم میں داخل ہو سکتی ہے اور نہ کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں اعضاء کی پرورش صحیح طور پر نہیں ہو پاتی وہیں خون میں گندگی باقی رہ جاتی ہے جو بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ گہرا سانس لینے سے پھیپھڑوں کی ورزش بھی ہوتی ہے اور چھاتیوں کے ابھار پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ چست لباس کے باعث ان افعال میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ چست لباس کے زیادہ دباؤ کی وجہ سے اعضاء کی مکمل نشوونما بھی ناممکن ہے۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ اپنے آپ کو زیادہ حسین و دلکش بنانے کے لئے آپ مختلف اشیاء کا استعمال کرتی ہیں جیسے پاؤڈر، کریم، اسنو، لپ اسٹک، خوشبویات وغیرہ۔ ان اشیاء کے استعمال کے بارے میں ایک تحقیقی رپورٹ قابلِ سماعت ہے۔ یورپ کی جہاں ان اشیاء کا سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے ایک ممتاز لیڈی ڈاکٹر ڈی ایس جیریا کہتی ہیں کہ ان اشیاء کے استعمال سے وقتی طور پر اپنے حسن کو دوبالا کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے نتائج انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے دوررس نتائج انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں ——— ان کے متواتر استعمال سے جلد کی مختلف بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور چہرہ کالا اور بدنما ہو جاتا ہے۔ چونکہ ان اشیاء کا استعمال زیادہ تر چہرہ ہی پر کیا جاتا ہے اس لئے ان کا اثر چہرے پر ہی پڑتا ہے۔ انہوں نے مزید ایسے کیس کا بھی ذکر کیا ہے جنہیں اپنی بدصورتی دور کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری کا سہارا تک لینا پڑتا ہے۔ خوشبودار تیل اور عطر استعمال کرنے سے نہ صرف بال کمزور ہو کر گرنے لگتے ہیں بلکہ نزلہ زکام وغیرہ مختلف بیماریاں دماغی کمزوری کی وجہ سے شدت اختیار کر جاتی ہیں۔

اب ذرا گہرا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ ڈائٹنگ بھی آج ایک فیشن بن گیا ہے۔ ایک مرتبہ لندن میں ڈاکٹروں کے ماہرین کے عالمی جلسے میں ایک ہی سوال کو زیادہ لوگوں نے پوچھا کہ آج کل کونسی بیماری کے مریض آپ کے پاس زیادہ آتے ہیں تو ان ماہرین میں سے ہر ایک کا کہنا یہی تھا کہ وہ مرض تو وہی ہیں جو آج سے پچاس سال قبل بھی ہوتے تھے۔ ہاں اب ایک ڈائٹنگ کا مرض ضرور نیا پیدا ہو گیا ہے ——— اور اس بیماری میں زیادہ تر نوجوان کنواری لڑکیاں مبتلا ہیں ——— یہ معلوم کر کے میری آنکھوں کے سامنے آجکل کی ——— بہت سی نوجوان لڑکیوں کی مثالیں گھومنے لگیں جنہوں نے جان بوجھ کر ڈائٹنگ کے مرض کو سینہ سے لگا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں آنے لگا کہ آج کل مائیں یہ شکایت کیوں کرتی ہیں کہ اس کی لڑکی کچھ کھاتی نہیں۔ کیوں ہر روز گھروں میں اس بات پر جھگڑا ہوتا ہے کہ ناشتہ پر لڑکیاں دودھ اور مکھن کو چھوتی تک نہیں۔ ایک سوکھا توس اور کم دودھ کی چائے آج کی لڑکیوں کا محبوب ترین ناشتہ بن چکا ہے۔ دوپہر اور رات کے کھانے کا وقت آتا ہے تو نوالوں کی گنتی شروع ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر میں ذرا سا کام کر لیں، اسکول یا کالج میں تھوڑا سا پڑھ لکھ لیں یا کھیل کود لیں تو ان لڑکیوں کو اتنی تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے کہ چکر آنے لگتے ہیں۔ والدین پریشان ہو کر ڈاکٹروں کے پاس بھاگتے ہیں۔ ڈاکٹر ایسی لڑکیوں کو دیکھ

کہ اکثر یہی کہتے ہیں کہ ان میں خون کی کمی ہے انہیں طاقت والی خوراک کھانی چاہئے۔ مریضہ چونکہ خوراک کھانا نہیں چاہتی اس لئے اسے دواؤں پر گزر بسر کرنی پڑتی ہے جو ظاہر ہے مہنگا نسخہ بھی ہے اور اتنا سودمند بھی نہیں۔ دوا غذا کی جگہ کہاں لے سکتی ہے۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو یہ کہیں کہ لڑکیوں کو خوبصورت نظر نہیں آنا چاہئے یا اپنے جسم کا خیال نہیں رکھنا چاہئے۔ خوبصورت جسم لڑکی کے لئے سب سے بڑی دولت ہے۔ موٹاپا حسن کا بھی دشمن ہے اور صحت کا بھی لیکن آج کل کی لڑکیاں اس حسن کو محض پتلا پن سمجھ کر اپنی صحت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہیں۔ وہ یہ بھول رہی ہیں کہ اچھی صحت سے بڑھ کر کوئی حسن نہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ انسان اچھی طرح کھائے پئے اور خوب ڈٹ کر محنت کرے تو اسے موٹاپا دور کرنے کے لئے ڈائٹنگ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ میں نے اکثر گھرانوں میں دیکھا ہے کہ دھان پان نظر آنے کی تمنائی لڑکیوں سے اگر کہا جائے کہ وہ گھر کا کام کاج کریں تو وہ ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ گھر میں جھاڑو سے صفائی کرنا انہیں اچھا نہیں لگتا لیکن جب وہ بیوٹی سیلونوں میں پہنچتی ہیں تو انہیں دبلا پتلا کرنے کیلئے ماہرین حسن ان سے سخت قسم کی ورزش کراتے ہیں سو سو بار اٹھک بیٹھک کرائی جاتی ہے رسی پھندوائی جاتی ہے اور دوڑیں لگوائی جاتی ہیں۔ ان مرحلوں کو وہ ہنسی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ تمام ورزشیں گھر کا کام کاج میں مصروف ہونے سے پوری نہیں ہو سکتیں؟ درحقیقت ہم ہر چیز میں مغرب کی نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ڈائٹنگ کے معاملہ میں بھی ہم نقالی میں پیچھے نہیں رہے لیکن ہم یہ بھول گئے ہیں کہ مغرب والوں کے سر سے ڈائٹنگ کا بھوت اترے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ فیشن اور دوسرے معاملات میں ہم مغرب کی نقل اس وقت کرتے ہیں جب وہ اسے چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ آج مغرب میں حسین لڑکی کا تصور ایک دبلی پتلی زرد چہرے والی بیماری لڑکی کا نہیں ہے۔ اب وہاں تو حسن کا مطلب ہے اچھی صحت۔ ایسی لڑکی ہی کو حسین سمجھا جاتا ہے جس کے گال بھرے بھرے ہوں جسم سے صحت جھلکے۔ مغربی رسالوں میں بھی اشتہار دیکھنے میں آتے ہیں کہ زیادہ دودھ پینے سے حسن نکھر آتا ہے۔ حسین لڑکیوں کے ہاتھ میں دودھ کی بوتلیں، مکھن یا کریم کے ڈبے دکھائے جاتے ہیں۔ آج مغربی لڑکے ان لڑکیوں سے محبت اور شادی کرنا پسند نہیں کرتے جن کی صحت اچھی نہ ہو لیکن اس کے برعکس ہماری ہندوستانی لڑکیاں جسم کو سینک سلائی بنانے کے لئے ہر وقت فیشن ماڈلوں یا فلم ایکٹریسوں کی طرف دیکھتی ہیں۔ چونکہ فلاں ماڈل نے چست لباس پہنا ہوا تھا اور دیکھنے والی خود بھی ویسا لباس ہی پہننا چاہتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ بھی اپنے جسم کو اتنا پتلا بنائے۔ یہی حال فلم ایکٹریسوں کی نقل کرنے والیوں کا ہوتا ہے لیکن نقل کرنے والیاں یہ بھول جاتی ہیں کہ فیشن ماڈلوں یا فلم ایکٹریسوں کا تو پیشہ ہی یہی ہے کہ وہ اپنے جسم کو پتلا رکھیں۔ لیکن ایک معمولی لڑکی جسے گھر کا کام کاج بھی کرنا چاہئے اور کالج کی پڑھائی یا پھر نوکری کس طرح اپنے جسم کو اتنا ہی دبلا پتلا رکھ سکتی ہیں۔ لڑکیاں اس اندھی دوڑ میں قدرت کے تمام اصول نظرانداز کر کے اندھا دھند ڈائٹنگ کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ آج یہ مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب اگر کسی لڑکی کی صحت اچھی ہوتی ہے اور وہ ڈائٹنگ کرنے والی لڑکیوں کی طرح سوکھی لکڑی نہیں ہوتی تو اسے موٹاپا یا بھدا کہہ کر چڑھایا جاتا ہے۔ پھر اچھی بھلی صحت والی لڑکیاں بھی ڈائٹنگ کے چکر میں پڑ جاتی ہیں۔ آج ڈائٹنگ اس اصول پر قائم ہے کہ انسان کو اپنا جسم کپڑوں کی تراش کے مطابق ڈھالنا چاہئے حالانکہ اب تک ہم یہی سنتے آئے تھے کہ لباس جسم کے مطابق تیار کرایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اگر آپ کی خوراک چڑیا سے زیادہ نہیں ہے تو پھر لذیذ کھانے کے مقابلے آپ کے لئے بیکار ہیں۔ کیونکہ ہر روز صبح سویرے وزن کرنا اچھا ہے۔ مگر فاقہ کر کے وزن گھٹانے سے۔ اکثر اوقات دعوتوں میں یہ سنا گیا ہے کہ خواتین مشروب سے پیٹ بھر لیتی ہیں تاکہ کھانے کے لئے جگہ ہی نہ رہے۔ حال ہی میں حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور شادی کے دوسرے روز شوہر کو معلوم ہوا کہ ان کی بیوی صرف ہوا اور پانی پر جیتی ہے۔

اب آپ بخوبی اندازہ لگا سکتی ہیں کہ فیشن آپ کی خوبصورتی کا راز ہے یا آپ کی جسمانی و نفسیاتی زندگی کا دشمن؟ نہایت سنجیدگی سے اس اہم ترین مسئلہ پر غور و فکر کیجئے اور ایسا راستہ اپنائیے جس سے آپ کے اوصاف زندہ رہیں اور آپ ایک صحتمند خاندان، قوم اور سماج کی بنیاد قائم کر سکیں۔ ●●

داؤدی بوہرا
مسلمانوں کا ایک منظم فرقہ

• احمد مصطفیٰ راہی

زیرِ نظر مضمون کی ترتیب میں یہاں بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے وہیں جہوڈلد پی رائٹ جونیر کے ایک مضمون سے بھی کافی مدد لی گئی ہے۔ مسٹر جونیر ہندوستان کے مختلف مسلکوں کے طرزِ حیات اور آدابِ زندگی پہ گہری نظر رکھتے ہیں اور ان مسلکوں کے متعلق ان کے قلم سے نکلی ہوئی تحریروں کو سند سمجھا جاتا ہے۔

دنیا کے مسلمان مختلف اکائیوں میں بٹے ہوئے ہیں ایسی ہی ایک اکائی داؤدی بوہرہ مسلمانوں کی بھی ہے بدقسمتی سے عام مسلمانوں کو ایک ہی درخت کی متعدد شاخوں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں اور ان کے درمیان تعصب اور غلط فہمیوں کی دیواریں حائل ہیں۔ داؤدی بوہرہ مسلمانوں کے سلسلہ میں بھی عام طور پر بوہرہ مسلمانوں کی معلومات بہت کم ہیں اور لے دے کر وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ "وہ گول سنہری ٹوپیاں اوڑھتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں"۔

اگر آپ داؤدی بوہرہ مسلمانوں کا قریب سے جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کم معروف لیکن انتہائی منظم اسلامی فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے۔ عام طور پر دوسرے اسمٰعیلیوں کی طرح مثلاً خوجہ مسلمانوں کی طرح بوہرہ مسلمان بھی قرآن

بوہروں کے موجودہ مذہبی پیشوا تقدس مآب ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین صاحب

کے ظاہری معنوں کے پس پشت پوشیدہ معنوں پر عقیدہ رکھتے ہیں اور بارہویں صدی میں مصر اور سولہویں صدی میں یمن میں اقتدار سے محروم ہونے کے بعد انھوں نے تقیہ کر کے اپنے باطنی عقیدہ کو چھپائے رکھا۔ تقیہ اس عمل کو کہتے ہیں جو انہیں انتہائی خراب حالات میں اپنی حیثیت و شخصیت اور عقائد پر پردہ ڈالنے اور انہیں پوشیدہ رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔

عام مسلمانوں اور بوہروں کے درمیان امتیاز کو سمجھنے کے لئے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ عملی طور پر مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اختلاف کا آغاز امت کی مذہبی قیادت کے سوال پر ہوا تھا۔ بوہرہ مسلمانوں کا پورا نام "شیعہ اسمٰعیلی طیبی داؤدی مسلمان" ہے یہ وہ مسلمان ہیں جو (۱) دوسرے شیعوں کی طرح پہلے تین منتخبہ خلفاء پر حضرت علی کو افضلیت دیتے ہیں اور انہیں وارث رسولؐ سمجھتے ہیں (واضح رہے کہ حضرت علیؓ، رسول اللہ صلعم کے چچیرے بھائی اور ان کی بیٹی بی بی فاطمہ زہرا کے شوہر تھے۔) (۲) جو ساتویں امام کی حیثیت سے اسمٰعیل کے دعووں کو برحق مانتے ہیں (۳) جو مستعلی کو مصر کا جائز فاطمی خلیفہ سمجھتے ہیں (۴) جن کا عقیدہ یہ ہے کہ امام طیب تقریباً ۱۱۳۰ء میں ایک داعی مطلق کو امام کے دوبارہ ظہور کے وقت تک اپنا نائب بنا کر پردہ غیب میں چلے گئے تھے اور (۵) داؤدی وہ ہیں جو ۱۵۸۹ء میں سلیمان ابن حسن کے مقابلہ میں جسے سلیمانی بوہروں کی بنیاد رکھی تھی، داعی داؤد ابن قطب شاہ کی قانونی وراثت کو تسلیم کرتے ہیں۔

دینی فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں بوہرہ مسلمانوں اور عام مسلمانوں کے درمیان بہت کم فرق ہے۔ وہ دن میں ۵ وقت کی نمازیں تین بار میں پڑھتے ہیں یعنی ظہر اور عصر کی نماز اور مغرب و عشاء کی نماز الگ الگ نہیں پڑھتے بلکہ ساتھ پڑھتے ہیں، چونکہ ان کا امام پردۂ غیب میں ہے، اس لئے جمعہ کی نماز کے بعد خطبہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر ماہ کے آغاز کا تعین کرنے کے لئے چاند کے طلوع و غروب ہی کا سہارا لیتے ہیں، اور مرنے والے کو دفن کرتے وقت اس کے ہاتھ میں ایک "رقعہ" رکھ دیتے ہیں۔

ہندوستان میں :۔ ہندوستان میں پہلا اسمٰعیلی مبلغ ۱۰۶۷ء میں مسلمانوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے ۱½ سو سال پہلے بہت پُرامن اور پُرسکون طور پر گجرات میں آیا تھا۔ ۱۵۳۹ء میں داعی طیبی کا مرکز بھی یمن سے ہندوستان منتقل ہو گیا تھا اس کے بعد پھوٹ پڑی اور خوجوں اور بوہروں (جو اسمٰعیلی شاخ ہی کا حصہ ہیں) کے دو الگ الگ فرقے بن گئے۔

اسمٰعیلی مبلغوں کی کوشش سے بڑی تعداد میں ہندوؤں نے اپنا مذہب بدلا اور وہ بوہرہ مسلمان بن گئے تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی ہے کہ شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں مغربی ہندوستان کے ہندوؤں نے اتنی بڑی تعداد میں اپنا مذہب کیوں تبدیل کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سُنی مبلغین کے مقابلہ میں اسمٰعیلی مبلغین ہندو رسم و رواج کے سلسلہ میں زیادہ سخت نہیں تھے اور انھوں نے رواداری کا مظاہرہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ اب بھی بوہروں کے یہاں ہندوؤں کے بہت سے رسم و رواج پر بالخصوص شادی کے سلسلہ میں ہندوا[نہ] کی روایات پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شادی کی دعوت میں بوہرہ دلہن کچا ناریل توڑتی ہے۔ بوہروں کو تجارت کا فن ورثہ میں ملا ہے۔ حالانکہ بنکاری اور انشورنس کے سلسلہ میں اُن کو رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اسلام سود لینے اور دینے کی مخالفت کرتا ہے لیکن ان کو شروع ہی میں قدامت پسند ہندوؤں پر یہ عارضی فوقیت حاصل ہو گئی کہ سمندر پار کا سفر ممنوع نہیں رہ گیا تھا اور انہوں نے انیسویں صدی ہی میں پوری دنیا سے کاروبار شروع کر دیا تھا۔

بوہرے مسلمانوں کے بعض فرقوں کی طرح خاندانی نجابت اور شرافت کے مصنوعی فخر کا بھی شکار نہیں ہیں۔ وہ لیکن دیانت، شرافت، صفائی، تعلیم اور سخت محنت کرنے کی صلاحیتوں سے لیس ہیں اور چونکہ کاروبار میں کامیابی کے لئے یہ صلاحیتیں انتہائی ضروری ہیں اسی لئے وہ کامیاب کاروباری ہیں گجرات میں اپنے مستقر (سورت، کھمبات، بھڑوچ، احمد آباد اور کپڈوانج وغیرہ) سے نکل کر داؤدی اور سلیمانی دونوں فرقوں کے بوہروں نے برطانوی راج کے بعد انیسویں صدی میں بمبئی کے لئے ہجرت شروع کر دی تھی۔ جلد ہی سورتیوں نے جہازی تجارت کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور دوسرے علاقوں سے آنے والوں نے درآمد و برآمد کی تجارت میں پارسیوں کے [بعد] دوسرا مقام حاصل کر لیا۔ اور پھر ان لوگوں نے بحیرہ ہند، خلیج فارس، مشرقی افریقہ۔ لنکا۔ برما۔ تھائی لینڈ۔ ہانگ کانگ [اور] جاپان کی بندرگاہوں تک کا سفر کیا اور اپنی تجارت کو خوب چمکایا۔ ان کے بعد بمبئی آنے والے بوہروں نے ہارڈویئر، رنگ و روغن۔ صابن۔ چمڑے۔ پلمبنگ۔ اسٹیشنری اور سوڈا [واٹر] کے اپنے روایتی کاروبار میں قسمت آزمائی شروع کر دی۔ [ان] کے کاروباری اداروں کے نام ایسے ہیں کہ متعصب لوگوں کو ملکیت کا علم نہیں ہو پاتا۔ بوہرہ مسلمان ان چند مسلمانوں میں ہیں جن کی عرفیت بالکل دیسی ہے اس لئے روزگار اور [کاروبار] میں ان کے ساتھ مذہبی تعصب برتے جانے کا بہت امکان رہتا ہے۔

ہندوستان اور سمندر پار کے ملکوں میں داؤدی بوہروں
ز کا اندازہ تین لاکھ سے دس لاکھ تک لگایا جاتا ہے
ران بوہروں میں رفتہ رفتہ داڑھی اور ٹوپی کا رواج
ا ہے اور وہ عام مروجہ لباس زیب تن کرنے لگے
لئے بمبئی میں اب رفتہ رفتہ ان کی انفرادی شخصیت
امتیاز ختم ہوگئی ہے لیکن بوہرہ عورتوں کی اکثریت
روایتی لباس زیب تن کرتی ہے۔

ں پہلے ہی یہ بتا چکا ہوں کہ بوہروں اور خوجوں میں
لم ہے اور وہ تمام مسلم فرقوں میں سب سے زیادہ
، بوہروں کے ہاں نجات صرف اسی وقت ممکن ہے
ا تا اس کے رسول حضرت محمدؐ تا حضرت علی تا ائمہ تا
ب امام کے ساتھ پردۂ غیب میں ہیں) تا داعی المطلق
اؤں کے پورے سلسلہ پر عقیدہ رکھے اسکے داعی (جنہیں
اجی کہا جاتا ہے) کے بعد ماذون کا درجہ ہے جو عام
ی کے ولیعہد ہوتے ہیں۔ پھر مکسر شیوخ اور ملا ہوتے
نا کے نمائندوں یا عاملوں کا انتخاب شیوخ میں سے
ہے جو تقریبات میں سیدنا کی نمائندگی کرتے ہیں اور
برہ وصول کرتے ہیں تمام بوہرے میثاق یا حلف کے
نا کی وفاداری کا اعلان کرتے ہیں اس کی خلاف ورزی
دں پر جرمانے کئے جاتے ہیں اور برات تک سے کام لیا
عام طور پر تمام بوہرے سیدنا سے وفاداری کا عہد کرتے
۔ ایک بڑے اور منظم فرقہ کی رکنیت حاصل کرکے وہ نہ
سیاتی بلکہ مالی فائدہ میں بھی رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو
ے دیئے جاتے ہیں۔ کاروبار میں قرض کی سہولیات حاصل
۔ خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ انجمن شیعیان علی سیفی
ل۔ برہانیہ کالج آف کامرس۔ طاہرہ وظائف۔ طلبکے
سیفی ہسپتالوں۔ سورت والا مسافر خانہ۔ کواپریٹو بینک
نی اداروں سے تعاون ملتا ہے۔

بہروں سے نجی ٹیکسوں کی وصولیابی کا سسٹم بہت اچھا
یں عام طور پر شادی اور موت کے وقت سارے کے
سول ہوجاتے ہیں۔

پلے بوہروں کے داعی کا مرکز سورت میں تھا لیکن سیدنا
ف الدین نے جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۵ء تک داعی مطلق
مرکز بمبئی منتقل کردیا تھا، وہ ارادے کے پکے اور لاتعداد

مرحوم ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین جو نصف صدی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۵ء تک بوہروں کی مذہبی قیادت فرماتے رہے

خوبیوں کے مالک تھے اس لئے ان کے دور میں بوہروں نے خوب ترقی کی اور انہوں نے اپنے فرقہ کے اوقاف کو اپنے قابو میں کرنے کے بعد داعی مطلق کے اختیارات کو حقیقت کا روپ دیا۔ آجکل ان کے صاحبزادہ سیدنا محمد برہان الدین اس منظم برادری کے داعی ہیں۔

ابتدا میں سیدنا طاہر سیف الدین نے بوہرہ رسم ورواج میں تبدیلیوں کی سخت مخالفت کی لیکن اپنی زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے اپنے ماننے والوں میں بہت سی جدید تبدیلیاں برداشت کرلیں۔ بوہرہ بچوں نے انگریزی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کردیا اور عورتوں میں پردہ کم ہوگیا۔

ایک صدی قبل داعی مطلق کے سوال پر بوہرہ فرقہ میں زبردست پھوٹ پڑگئی جس کے نتیجہ میں کئی گروہ پیدا ہوگئے تھے جن میں مہدی باغ والے اور اٹرتالیس والے کافی مشہور ہوئے۔ حال ہی میں ایک تنظیم پرگتی منڈل نے اس فرقہ میں کافی بے چینی پیدا کی لیکن اس منڈل کے اثرات محدود ہیں اور موجودہ داعی مطلق سیدنا ڈاکٹر محمد برہان الدین کی قیادت پر بوہروں کی واضح اکثریت کو مکمل اعتماد ہے۔ سیدنا طاہر سیف الدین کے مزار پر آج بھی بمبئی کے بوہرہ محلہ میں ہزاروں عقیدتمندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

سلیمانی بوہرے:۔ بوہروں میں ۹۰ فیصدی داؤدی ہیں اور ۱۰ فیصدی کے قریب سلیمانی ہیں۔ ان دونوں کے رسم ورواج اور عقائد تقریباً یکساں ہیں اور ان کے درمیان بنیادی اختلافات ۱۵۹۱ء میں ۲۶ ویں داعی داؤد بن عجب شاہ کے انتقال کے بعد پیدا ہوا تھا ہندوستان کے بوہرے داؤد بن قطب شاہ کو اپنا ۲۷واں داعی سمجھتے ہیں جبکہ سلیمانی بوہرے جن کے روحانی پیشوا کا مرکز یمن میں ہے سلیمان بن حسن کو ۲۷واں داعی مانتے ہیں۔ سلیمانی زیادہ تر یمن میں آباد ہیں اور ہندوستان میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ داؤدی بوہروں کے داعی ملاجی کی طرح ہندوستان کے ہوتے ہیں لیکن سلیمانی بوہروں کا ہمیشہ

بارگاہ ایزدی میں دست بدعا بوہرے بچے

▲ یحییٰ سی مرچنٹ

▲ بدرالدین طیب جی

▲ ڈاکٹر دائی نجم الدین

عبدالطیب اسماعیل جی

ڈاکٹر سالم علی

▼ آصف فیضی

یمن ہوتا ہے۔ صرف ایک بار جب علی بن محسن کا جو ۴۰ دیں سلیمانی داعی تھے، انتقال ہو گیا تھا۔ ایک ہندوستانی غلام حسین کو جو بمبئی کے رہنے والے تھے سلیمان بوہروں کے داعی مطلق کا عہدہ ملا تھا لیکن ان کا موجودہ داعی عرابی النسل ہے اور وہ یمن میں رہتا ہے۔ جن مقامات پر کافی تعداد میں سلیمانی بوہروں کی آبادی ہے وہاں وہ اپنے نمائندے مقرر کرتے ہیں اور یہ نمائندے چیف ملّا جی صاحب کی نیابت میں مذہبی امور انجام دیتے ہیں۔

سلیمانی بوہرے زیادہ تر کاروبار کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے آرٹ، قانون، طب اور تعلیم کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور امین طیب جی کا خاندان سرفہرست ہے۔

بوہرہ حضرات چاہے وہ داؤدی ہوں یا سلیمانی حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ سے بے انتہا عقیدت رکھتے ہیں اور زندگی میں ایک بار نجف اور ایک بار کربلا کی زیارت کرنے کے لئے ہر وقت بے چین سے رہتے ہیں۔

یہ لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اور اختلافات سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔

قابل ذکر ہستیاں :- ڈاکٹر دائی نجم الدین جو فاطمی کلچر، تاریخ اور علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں، بوہرہ علماء میں بہت ممتاز ہیں۔ وہ بہت سے عوامی اوقاف کے رکن ہیں اور سورت میں الازہر (مصر) کے خطوط پر قائم "الجمعیۃ الصوفیاء" کے روح رواں ہیں۔ مشہور آرکیٹکچر یحییٰ سی مرچنٹ، ممتاز تاجر اور صنعت کار عبدالطیب اسمٰعیل سفطی پارلیمنٹ کے ممبر اور جنگ آزادی کے مانے ہوئے سپاہی صالح عبدالقادر، بمبئی مرکنٹائل کو آپریٹو بینک کے روح ر[...] زین جی۔ زگون والا مشہور پینٹر اور فلمساز طیب مہتہ [...] مواصلات کی دنیا کے گنے چنے ماہروں میں شمار ہونے [...] امیر ابراہیم حسین۔ شاہ حبشہ ہیل سلاسی کے دست [...] اسمٰعیل محمد علی کنگا۔ بمبئی کی سماجی زندگی میں اہم مقا[م رکھنے] والے اور ہندوستانی کرکٹ کی ترقی میں پیش پیش [...] وال مشہور معمار اور سماجی خدمت گار شیخ محمد علی، اللہ بخش [...] اورنگ آباد کی سیاسی و علمی سرگرمیوں کی جان ذوالفقا[ر ...] چند ایسے نام ہیں جو محتاج تعارف نہیں۔ ان پر نہ صرف بوہروں کو بلکہ پورے ہندوستان کو ناز ہے۔ سلیمانی بوہ[روں] میں بدرالدین طیب جی، محمد فدا حسین آرٹسٹ، فط[رت] شناس ظفر آر فتح علی اور تاریخ اسلام پر گہری نظر رکھنے آصف اے۔ اے فیضی کی شہرت پوری دنیا میں ہے۔

رسم ورواج :- بوہرے عام طور پر اپنے فرقہ کے شادی کرتے ہیں۔ نکاح یا تو ہز ہولی نس پڑھتے ہیں یا دولہا اور دلہن پہلے عامل سے یہ سند حاصل کرتے ہیں [کہ انہوں] نے اپنے فرقہ کو تمام واجبات ادا کرائے ہیں، پھر شاد[ی کی] تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ اجتماعی شادیاں بھی ہوتی [ہیں جو] "سمو لگن" کہلاتی ہیں۔ مہر ۱۰۱ روپے مقرر ہے۔

بوہرہ دولہن اپنے چچا کی رہنمائی میں اپنے نئے [گھر میں] داخل ہوتی ہے جو ایک دیا جلا کر زمینی راستہ دکھا[تا ہے]۔ دولہا اور دولہن کے دائمی اتحاد اور رفاقت کی عل[امت کے] طور پر دونوں کو ایک دوپٹہ میں باندھ دیا جاتا ہے۔

▼ آرٹسٹ، مقبول فدا حسین

ہرہ فرقہ میں بوقتِ عقد مذہبی رہنما یا اس کے نمائندے کی موجودگی لازم ہے

بوہروں میں شادی سے پہلے مذہبی رہنما سے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہے

ہے بلکہ خالص ہندوؤں کی رسم ہے اسی طرح
د رسم پر عمل ہوتا ہے۔ داخلہ کے دروازہ پر دولہن
ن دولہن کے سر پر پانی سے بھرا ہوا ایک تانبے
اتارنے کے لئے گھماتی ہے۔ دولہن اپنی ساس
، پیروں کو اپنی آنکھوں، ماتھے اور ہونٹوں سے
ہے۔

ولادت کے چھٹے دن اس کا نام رکھنے کی رسم
ہے۔ بچے کی چچی خالص گھی کا دیا رکھ کر ایک
زعفران کا پانی چھڑکا ہوا سفید کپڑوں کا جوڑا
تے ہے۔ ۲۱ ویں دن عقیقہ کی رسم ادا کی جاتی
بال کاٹے جاتے ہیں۔ اس موقع پر بکری کی
تی ہے۔ سالگرہ کے موقع پر بچے کے سر سے ناریل
ہے۔ بچوں کو گھوڑے پر سوار کرنے کی رسم بھی ادا
، اور اسے دولہا بنا کر رنگا رنگ جلوس کی شکل
اتا ہے۔ جب بچہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو ——
ملاّجی صاحب سے وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے
کی تقریب کہتے ہیں۔ عام طور پر بہت سے بچوں
و ملاّجی کی خدمت میں لے جا کر یہ رسم ادا کی جاتی
اس موقع پر بچہ پابندی سے نماز پڑھنے، ملاّجی کے
ضابطۂ اخلاق پر عمل کرنے اور ملاّجی کے مخالفوں
ق کرنے کا عہد کرتا ہے۔ اگر وہ لڑکا ہے تو وہ ایک
بچے ملاّجی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ عہد کرتا ہے

اور اگر وہ لڑکی ہے تو ایک ڈوری پکڑ کر جس کا ایک سرا ملاّجی
صاحب کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وفاداری کا عہد کرتی ہے
عہد کرنے کے بعد بچے ملاّجی صاحب کے قدموں کو بوسہ
دیتے ہیں ——

مرنے کے بعد متوفی کی قبر میں ایک رقعہ، چٹھی رکھنے
کا رواج ہے جو ہیڈ عامل کا جاری کیا ہوا ہوتا ہے۔

ایک روایت :- آجکل کے تمام بوہرے کسی زمانہ
میں ہندو برہمن تھے اور تقریباً ۹۰۰ سال قبل دائرۂ
اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

روایت ہے کہ ۱۸ ویں داعی کے زمانہ میں دو مبلغین
ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ یہ تھے مولائی احمد اور مولائی عبداللہ
کھمبات میں جہاز سے اترنے کے بعد مولائی عبداللہ جو بہت
بڑے عالم تھے وہاں کے لوگوں کے حالات کا جائزہ لینے
کے لئے وہیں ٹھہر گئے تھے۔ ان کی ابتدائی تبلیغی کامیابیوں
کے سلسلہ میں بہت سی روایات بیان کی جاتی ہیں ایک
روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک خشک کنویں کو میٹھے پانی
سے بھر کے وہاں کے کاشت کاروں کے دل جیت لئے
تھے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ کھمبات کے ایک
سمندر میں ایک فولادی ہاتھی ہوا میں معلق تھا۔ جیسے
انہوں نے زمین پر گرا کر کچھ پجاریوں کو اپنے دائرۂ عقیدت

آرتی اُتارنے
کا رواج
بوہروں
میں بھی
پایا جاتا ہے
لیکن یہ
آرتی دیپک
کے بجائے
کے ذریعے
اتاری جاتی
ہے

بھنڈی بازار (بمبئی) میں مرحوم طاہر سیف الدین کے مز

خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بوہرے

مرحوم سیدنا طاہر سیف الدین کے جنازے کا جلوس

بوہروں کی ایک مذہبی تقریب میں (دائیں سے بائیں) مرحوم سیدنا طاہر سیف الدین، اور پنڈت جواہر لال نہرو۔ موجودہ مذہبی قائد سیدنا برہان الدین اور دوسرے

میں شامل کرلیا تھا۔

اس کے بعد وہ پٹن کے لئے روانہ ہوگئے جو اس زمانہ میں گجرات کی راجدھانی تھا۔ شہر کا راجا سدھ راج جے سنگھ ([illegible]) نے اس اجنبی کو پکڑ لانے کے لئے مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا لیکن ان سپاہیوں نے دیکھا کہ ان کے چاروں طرف آگ کی دیوار کھنچی ہوئی ہے اس لئے وہ پریشان ہوکر واپس چلے گئے اور انہوں نے راجا کو سارا قصہ بتایا۔ پھر خود راجا گیا اور مولائی عبداللہ کے حکم پر آگ کی دیوار ہٹ گئی اور راجا آگے بڑھ گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر راجا بہت حیران ہوا اور اس نے مولائی عبداللہ سے کہا کہ وہ اپنے مذہب کی فضیلت کے ثبوت میں کوئی اور کرامت دکھائیں۔ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی اور راجا کی ایک مقدس ترین مورتی "نے اعلان کیا کہ "سچا مذہب عربوں کا ہے" مورتی کے منہ سے یہ فقرہ سننے کے بعد راجا اور اس کی رعایا مسلمان ہوگئی۔

تیسری روایت کھمبات میں مولائی عبداللہ کے ورود کے سلسلہ میں ہے۔ اس زمانہ میں گجرات کے لوگوں کو اسلام کے پیغام کا کوئی علم نہیں تھا اور ان کی اکثریت ایک ہندو سادھو پر عقیدہ رکھتی تھی۔ مولائی عبداللہ نے یہ سوچ کر ہندو سادھو کی کھلی ہوئی مخالفت خطرناک اور ناممکن ہے

خود کو سادھو کے چیلوں میں شامل کرلیا۔ چونکہ وہ ذہین آدمی تھے اس لئے جلد ہی انہوں نے عوامی زبان سیکھ لی اور سادھو کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس سے بحث شروع کردی۔ ان کی بحث اتنی مدلل تھی کہ سادھو کے بہت سے چیلے مسلمان ہوگئے۔ بالآخر راجا سدھ راج کو یہ اطلاع ملی کہ اس کا منتری بھی مسلمان ہوگیا ہے۔

تھیوڈور، پی رائٹ جونیئر جو ہندوستانی معاشروں پر گہری نظر رکھتے ہیں

راجا نے اپنے منتری کو نماز پڑھتے دیکھا تو اس سے
کیا کہ وہ کیا کر رہا ہے اس نے جواب دیا کہ وہ قالیہ
نیچے سانپ تلاش کر رہا ہے۔ اسی وقت ایک گوشہ
سانپ نمودار ہوا اور یہ کرامت دیکھ کر راجا اسی
مسلمان ہوگیا لیکن اس نے اسے راز ہی رکھا
سے پہلے اس نے حکم دیا کہ اسے مسلمانوں کی طرح
جائے۔ سدھ راج کے دونوں جانشین کمار پالا
اور اجے پال (الیعقوب) ([illegible]) اور سدھ
جین گورو ہیم اچاریہ ترمل بھی مسلمان ہوگئے۔
مبلغین اور ان کے ہاتھوں سب سے پہلے مسلما
والوں، کنوئیں کے مالک اور اس کی بیوی کے مز
میں ہیں اور ہندوستان کے بوہرے ان کی زیا
ہیں۔ کنوئیں کا مالک کاکا اکیلا اور اس کی بیو
کے نام سے مشہور ہیں۔

ہندو راشٹر سے سوشلزم تک

• واقعات کے مبصر کے قلم سے

یہ آخری ہفتہ میں یوپی کے صنعتی شہر غازی آباد میں بھارتیا
لاس میں ہونے والی بحث اور فیصلوں سے یہ اندازہ لگانا
ہے کہ گزشتہ وسط مدتی انتخابات میں ترقی پسند قوتوں کے
ہار کے بعد جن سنگھ اپنے سیاسی وجود کو بحال رکھنے اور
ت میں دوبارہ پاؤں جمانے کے لئے اب نئے ہتھکنڈے
روالی ہے۔

مبصروں کا خیال ہے کہ جن سنگھ کے غازی آباد اجلاس سے
کہ وہ ہندو راشٹر سے سوشلزم کی طرف آرہی ہے اور لی
نہار نے جو اس پارٹی کا بڑا ہمدرد سمجھا جاتا ہے جن سنگھ
اس تبدیلی کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اب اسے
)، میں مسز سبھدرا جوشی کو شامل کر لینا چاہئے۔ اور
ے صدر محمد اسمٰعیل صاحب کو اپنا نائب صدر بنا لینا چاہئے
نا ہوں کہ جن سنگھ کے بنیادی مقاصد میں کوئی تبدیلی
۔ اس کا دل نہیں بدلا ہے۔ اس کی روح میں کوئی تغیر
لہے۔ اور اس کا باطن پہلے ہی جیسا ہے۔ اس نے یہ
ب کے نام پر اقتدار نہیں حاصل ہو سکتا۔ اور عوام کو
ے نعروں کے بغیر سیاسی استحکام حاصل کرنا ناممکن ہے
اہری رنگ روپ کو بدلا ہے۔ دراصل شراب وہی پرانی
ول اور لیبلوں کو بدل دیا گیا ہے جس کی تصدیق خود
صدر شری اٹل بہاری باجپئی نے اجلاس کے اختتام
بان سے کر دی ہے کہ ”کچھ سجنوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ جن سنگھ
ارٹی بن گئی ہے۔ ان کی پارٹی نہ تو بائیں بازو کی بن رہی ہے
لی بلکہ سیدھے اور درست راستہ پر چل رہی ہے۔
نگھ نے راجاؤں کے وظائف بند کرنے، بنکوں کو قومی
ئے جانے اور جنرل انشورنس کے نیشنلائزیشن کی زور
ہ کے اب تک تو یہی ثبوت دیا ہے کہ اس کا راستہ نہیں بدلا
یے اٹل بہاری باجپئی کی وضاحت کو من وعن تسلیم کر لینے
ت نہیں نظر آتی۔

جن سنگھ اب خود کو اس نئے سوشلسٹ بنا کر پیش کر رہی
ے کے عوام سوشلزم اور سیکولرزم کے علاوہ کچھ پسند نہیں کرتے
رعمل میں جو فرق ہے اسے سب محسوس کرتے ہیں۔ خاص
ان کے غریب عوام نے اب اس بات کو اچھی طرح محسوس
قومیں زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہتی ہیں جو مذہبی
باہمی افتراق پیدا کرنے والی کہانیوں اور افسانوں کو
جزو ایمان سمجھتی ہیں۔

عوام نے یہ بھی سمجھ لیا ہے کہ سرمایہ دار دنگی طرف لے اپنے
مفادات کی حفاظت اور لوٹ کھسوٹ کے لئے نفرت کی آگ بھڑکائی
جاتی ہے۔ اور انہوں نے یقین کر لیا ہے کہ جن سنگھ نے انتہائی اہم
سوشلسٹ اصلاحات کی مخالفت کر کے گویا سرمایہ داروں کے کاز
کی حمایت اور عوام کے کاز کی مخالفت کی ہے اسلئے وہ اس سے دور ہو
گئے ہیں۔

جن سنگھ کی ہندوستان میں ترقی اور ترویج میں وسط مدتی
انتخابات سے پہلے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی ڈھیلی ڈھالی پالیسی
نے بڑی مدد دی تھی۔ اس پارٹی نے اپنی تنظیم، مظاہروں، جلسوں
اور جلوسوں کے ذریعہ کم از کم شمالی ہند میں برسر اقتدار طبقہ اور پارٹی
کو جس کی قیادت ”پرکھوں“ کے ہاتھ میں تھی کافی مرعوب کر رکھا تھا
ان میں کچھ پر پاکستان کے حملے کے وقت اور نام نہاد گئو کشی بند
کرانے کے لئے پارلیمنٹ پر زوردار مظاہرے کر کے جن سنگھ نے اپنی
دھاک جما دی تھی لیکن وقت کی رفتار تیزی سے بدلی ہے اور اب
ملک پر ایسے عناصر کی حکومت ہے جو کسی معاملہ میں بھی جن سنگھ
کو منہ لگانے کے لئے تیار نہیں نظر آتی۔ اس لئے جن سنگھ کو اپنا چولا
بدلنا پڑا ہے۔ لیکن اس کی وسوسہ انگیز سیاست نہیں بدلی ہے۔
اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی باطنی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں
ہے جو ”بنچ آف تھاٹ“ کو آسمانی کتاب سمجھتے اور اپنے دماغ کو
”آریہ“ اور ”غیر آریہ“ کے خانوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔

بنارس میں دین دیال اپادھیائے (جن سنگھ کے سابق صدر)
کی موت کو پر اسرار بنانے اور ڈاکٹر فریدی اور مسلم مجلس مشاورت
کو قتل کی سازش میں ملوث قرار دینے کی کوششیں جن سنگھ کی اسی
وسوسہ انگیز سیاست کا ایک جزو تھیں اور بنگلا دیش کو تسلیم کرنے
کا مطالبہ بھی اسی انداز میں کیا گیا کہ ایک طرف مرکزی
حکومت کے لئے مسائل پیدا کئے جائیں اور دوسری طرف عوام کو حکومت
کے خلاف وسوسوں اور شکوک وشبہات میں مبتلا کیا جائے۔ غازی آباد
اجلاس میں جو قرارداد بنگلا دیش اور ہند پاک تعلقات کے سلسلہ میں
منظور ہوئی ہے اس کا ایک ایک لفظ منافقانہ ہے۔ اس قرارداد
میں یہ ۹ نکاتی مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان ایٹمی طاقت بنے،
دفاعی طاقت دگنی کی جائے۔ نیوی کو بحر ہند کے علاقہ میں سب سے مضبوط
بنایا جائے۔ سلامتی کونسل میں ہندوستان کے لئے مستقل جگہ حاصل
کی جائے۔ دفاعی ملازمین کی شرح تنخواہ پر نظرثانی کے لئے ایک
خصوصی کمیشن مقرر کیا جائے۔ جنگ کے خطرہ کی انشورنس سکیم
شروع کی جائے تخریبی کارروائی کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دی
جائیں اور مسز گاندھی کی حکومت یہ حلف لے کہ اس وقت تک چین
سے نہ بیٹھے گی جب تک مقررہ تاریخ تک عام پناہ گزین اپنے وطن
کو واپس نہ ہو جائیں۔ ایک ہی سانس میں اتنے بہت سے مطالبات
کر دینا آسان ہے۔ لیکن ان تمام توقعات کی تکمیل کرنا کس قدر مشکل
ہے اس کا اندازہ خود جن سنگھ کے لیڈروں کو بھی ہے۔ ان کا مطلب
یہ نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں ہوں بلکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان
جیسے ملک کے لئے ایک ساتھ یہ سب کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا جب
یہ نہ ہو سکے گا تو وہ عوام سے کہیں گے کہ حکومت کمزور ہے۔ قیادت
نکمی ہے۔ دیش کی باگ ڈور جن سنگھ کو سونپی جائے۔

اس قرارداد میں وسوسہ انگیزی اس جملہ سے عیاں ہے کہ جنرل
کونسل کو افسوس ہے کہ حکومت ہند حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے
جو اقدامات کر رہی ہے وہ معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ مکتی واہنی
کو محدود امداد دینے کی اس کی موجودہ پالیسی غیر ضروری طور پر
بنگلا دیش کے مصائب میں اضافہ کر رہی ہے اور پناہ گزینوں کی
تعداد بڑھا رہی ہے۔

جن سنگھ والوں کو میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ وسوسہ
انگیزی کی راہ ترک کر دیں اور صرف اقتدار حاصل کرنے یا برسر اقتدار
طبقہ کو رسوا کرنے ہی کے لئے لمبے چوڑے مطالبات نہ کریں بلکہ اپنے
انداز فکر کو مثبت بنا کر خود کو اندر سے بدلیں ورنہ ان کی حالت آئندہ
پانچ سال میں اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔

امیر خسرو اور موسیقی

اس سرزمین سے حضرت امیر خسرو جیسا صاحب ذوق ذی کمال اور جامع صفات شخص اب تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ استاد غزل شیخ سعدی سمانے ہوئے ہیں لیکن اگر کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ ہوا ہے تو وہ حضرت امیر خسرو ہیں۔ ان کے کلام کی فصاحت روانی اور خاص کر سوز و گداز جس میں تصوف کی چاشنی بھی شامل ہے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یوں تو ہر اہل زبان کو اپنی زبان کا غرہ ہوتا ہے لیکن اہل ایران اس معاملہ میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ وہ کسی غیر ایرانی کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن حضرت امیر خسرو کے سامنے انہیں بھی جھکنا پڑا۔ تذکرہ نویسوں اور خسرو کے سوانح نویسوں نے ان کے حالات کلام اور تبصرے میں اس امر کو بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ فن موسیقی کے بھی نہ صرف استاد کامل بلکہ موجد تھے۔ لیکن کسی نے تفصیل سے یہ نہیں لکھا کہ آپ نے کیا کیا اختراعات اور ایجادات کیں۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی ترویج اور ترکیب میں کون کون سے راگ ایجاد ہوئے۔ اس مختصر مضمون میں تمام تفصیلات کا بیان کرنا ممکن نہیں تاہم ناظرین کی تفریح طبع کی غرض سے بعض حالات درج کئے جاتے ہیں:-

حضرت امیر خسرو دہلی کے سات بادشاہوں کے درباروں میں ملازم رہے۔ جہاں علاوہ ہندوستان کے عربی اور عجمی موسیقار بھی ملازم تھے۔ اور اس حامی کو محسوس کر کے کہ ہندی راگوں میں جو اس وقت رائج تھے خمسہ، غزل، رباعیات اور حمد و ثناء گانے کی گنجائش مطلق نہیں ہے۔ بذات خود عربی عجمی اور ہندی موسیقی سے واقفیت حاصل کر کے بارہ راگ ایجاد کئے جن کے نام یہ ہیں:

راگ رنگولہ، راگ غنم، راگ باغرد، راگ سرپردہ، راگ فرغانہ، راگ زیلف ــــ راگ موافق، راگ عشاق ــ راگ ایمن، راگ سازگری اور راگ مجیب یا مجیر۔

یہ راگ ایسے مقبول ہوئے کہ ہندوستان کے ہر حصہ سے بکثرت موسیقار دہلی میں آکر سیکھتے اور مجالس حال و قال میں شریک ہوتے آج جو موسیقی ہند و پاکستان میں مقبول ہے وہ امیر خسرو ہی کی مرہون منت ہے۔

امیر خسرو کے زمانے کا سب سے بہتر موسیقار نایک گوپال تھا جس کے تقریباً بارہ سو شاگرد تھے۔ جب سلطان علاء الدین نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو اپنے دربار میں طلب کیا۔ امیر خسرو موجود تھے۔ اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ یہ بھی کمال دکھائیں۔ امیر نے کہا کہ میں مغل ہوں آپ پہلے گائیں مناسب ہے۔ نایک گوپال نے کئی راگ گائے اور ہر راگ پر یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ یہ تو میری ایجاد ہے۔ اور جب امیر خسرو نے راگ سنائے تو نایک گوپال حیرت زدہ رہ گیا۔ چونکہ خسرو عجم سے بھی واقف تھے اس لئے ہندی اور عجمی موسیقی کو ملا کر نیا عالم پیدا کر دیا۔

نایک گوپال دکن سے آیا تھا اور مدتوں خسرو کی صحبت میں رہ کر کمال حاصل کیا۔ مطلع العلوم میں مذکور ہے کہ سادو نے بھی جو اسی زمانہ کا ماہر فن تھا خسرو کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ وہ ہندی عالم بھی لکھتے ہیں کہ امیر خسرو فی الواقع ہندی اور عجمی راگوں کے موجد تھے۔ افسوس ہے کہ جو جامع اور مکمل تصنیفات انہوں نے موسیقی پر لکھیں وہ انہیں کی زندگی میں بلووں اور قتل و غارت گری کی نذر ہو گئیں۔

امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا اور اس کے قواعد مرتب کئے۔ مردنگ کو ڈھولک میں تبدیل کیا۔ ایرانی تنبورے کی ایجاد کیا اور ان سب کے بھی قواعد مقرر کئے۔ گانے کی صنف مجیر، غزل، غارہ، خیال، قول، قلبانہ، ترانہ وغیرہ نقش و نگار، کافی، قوالی کا بھی اضافہ کیا۔ اسی لئے ان کے پیر حضرت نظام المشائخ نے ان کو مفتاح السماع کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

عبدالحمید لاہوری نے بھی بادشاہ نامہ میں تصریح کی ہے کہ ہند کی موسیقی کو عروج پر پہنچانے میں امیر خسرو کا بڑا حصہ ہے ورنہ امیر سے قبل ہندی گانے صرف مندروں اور عبادت گاہوں تک ہی محدود رہتے اور ان کا مدار گیتوں، چھند، دھرپد راگوں تک ہی محدود تھا اور یہ طرزیں مسلمانوں کے ذوق سے مختلف تھیں۔ ان کی بجائے قول، قلبانہ اور قانون وغیرہ جو آج بھی مقبول عام ہیں۔ بو علی سینا، سلطان حسین شرقی کے بعد بھی یہ فن لطیف مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔

امیر خسرو کی جدت پسند طبیعت تقلید اور سپاس گزاری سے نیاز تھی۔ مشکل سے مشکل بحر میں بلا تکلف شعر کہتے!

برصغیر میں مسلمانوں نے ہر فن میں صاحب کمال پیدا کئے ہیں!

اجزاء اعظم ہے۔ بحر، معروف اور قوالی کے بعد تال قدیم کا نمبر آتا ہے۔ چونکہ ڈھولک اور طبلہ امیر خسرو کی ایجاد ہے اس لئے خسرو نے ان کے بجانے کے قواعد بھی مقرر کئے۔ مثلاً پشتو، زد بحر قوالی، سول فاختہ، جھپ تالا، سواری، آڑا چوتالا، جھومر، ننانی سواری، داستان نسہ، فرو دسعت، تید، پہلوان، پٹ تال، چیک تال وغیرہ کل اٹھارہ ہیں۔ اس کے بعد ان کی مختلف شاخیں ہیں۔ ان ٹھیکوں کے نام فارسی ہیں۔

امیر خسرو نے جب ستار ایجاد کیا تو اس میں صرف تین تار تھے اس لئے اس کا نام ستار تھا اس کے بعد رفتہ رفتہ چار تاروں کا اور اضافہ کیا۔

امیر خسرو ہمہ صفت موصوف تھے۔ اگر آپ ان کو میدان عمل میں دیکھنا چاہیں تو وہ میدان کارزار میں ایک بہادر سپاہی تھے جو اپنی تلوار کے جوہر دکھاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ شاہی درباروں میں بلحاظ قابلیت کام ان کا کوئی دوسرا نہ تھا۔ حلقۂ مشائخ میں ایک ممتاز صوفی کی حیثیت حاصل تھی۔ شاعری میں ان کا ثانی کوئی نہ تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ فارسی میں چار لاکھ شعر کہے ہیں۔ اردو اور ہندی شاعری میں بھی کئی دفتر لکھے مگر بدامنی کے بھینٹ چڑھ گئے۔ علم التواریخ کا بھی شوق تھا جس کی جھلکیاں جا بجا ان کی تصانیف میں پائی جاتی ہیں۔ رمل اور نجوم سے بھی واقف تھے۔ موسیقی میں جس قدر خسرو کے بعد ماہرین فن پیدا ہوئے انہوں نے ان کے راگوں کا نہ صرف طباع کیا۔ بلکہ تان سین وغیرہ نے نائک ہونا بھی تسلیم کیا جو اس زمانے کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ واضح رہے کہ محفل سماع کی صحبتیں بزرگوں کی تفریحی مشاغل نہ تھے بلکہ حمد و ثنا اور رموز عشق الٰہی کے اشعار سے جن کو لطف و سرور حاصل ہوتا تھا اس کو عبادت کا درجہ حاصل تھا۔

برخلاف اس کے اس آخرت فراموش دور میں جبکہ نفسانی خواہشات نے راگ رنگ اور لہو و لعب کو انسانیت کے لئے مستقل فتنہ بنا دیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اکابر اور اسلاف کے مشاغل موسیقی کے واقعات کو کبھی حیلہ جو طبیعتیں حجت بنا کر اخلاقی حدود سے نہ گزر جائیں۔

حضرت امیر خسرو کے والد سیف الدین مغل ترک تھے اور گمان غالب ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں ہزارہ چین قبیلے کے ساتھ ہندوستان میں بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ جسے مومن آباد بھی کہتے ہیں آن کر آباد ہوئے تھے۔ سلطان تغلق کے دربار میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھے۔ حضرت امیر خسرو اپنے پیر نظام الدین اولیاء سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ پیر کے وصال کے چھ ماہ بعد خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ●●

آپ کے ستارے

انسانی زندگی پر ستاروں کی گردش کا کافی اثر پڑتا ہے۔ اس موضوع پر کافی تحقیق ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ جدید سائنس بھی اس حقیقت سے منکر نہیں ہے کہ شب و روز کی گردش کے نتیجہ میں موسموں کی تبدیلی وغیرہ کا انسانوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوئی غیب داں نہیں ہیں۔ غیب کا حال صرف خدا کو معلوم ہے۔ ہم تو صرف اپنی معلومات کی بناء پر یہ پیش گوئی شائع کر رہے ہیں۔

● قسمت شناس

۱۶ر دسمبر سے ۳۰ر دسمبر تک پندرہ دن آپ کے لئے کیسے ہوں گے۔ اپنے نام کا پہلا لفظ دیکھ کر معلوم کیجئے۔

ا۔ ع۔ ل۔ ن:۔ اتوار کا دن خطرناک ہے۔ دوستوں سے زیادہ توقع نہ کیجئے۔ غیر متوقع امداد ملنے سے کوئی پرانا کام پورا ہوگا۔ حکام سے اچھے تعلقات رہیں گے۔ ان کے مشوروں پر عمل کریں۔

ب۔ پ۔ م:۔ سفر سے گریز کریں۔ کوئی خوشخبری ملے گی۔ کاروبار میں منافع ہوگا۔ گھر کے حالات خوشگوار ہوں گے۔ خرید فروخت میں نقصان کا ڈر ہے، پڑوسی سے اذیت کا خدشہ ہے۔

ہ۔ ح۔ ھ۔ و:۔ رشتہ داروں سے خوشی حاصل ہوگی۔ محبت میں ناکامی کا امکان ہے، جلد بازی سے بچیں منگل کے دن اپنے کاروبار کو وسیع کرنے کی کوشش کریں۔ صحت ٹھیک رہے گی لیکن سنیچر کے دن نقصان کا اندیشہ ہے، یہ پندرہ واڑہ آپ کیلئے ملے جلے اثرات کا حامل ہے۔

ث۔ س۔ ش۔ ص:۔ اتوار کے دن چند نئے مسائل پیدا ہونے کا امکان ہے۔ دوشنبہ اور منگل خوشگوار رہیں۔ بگڑا کام بننے کی امید ہے۔ دوستوں سے فائدہ کی امید ہے کسی خاص دوست سے برسوں بعد ملاقات ہو سکتی ہے۔ افسران سے تعلقات رہیں گے کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیجئے۔ اخراجات میں کمی ہوگی۔

د۔ ذ۔ ر۔ ڑ۔ ط:۔ خوف ستائے گا۔ دشمنوں سے گزند پہنچنے کا اندیشہ رہے گا۔ دوستوں سے بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ رات کو سفر نہ کریں، بیوی سے تعلقات میں کشیدگی ہو سکتی ہے محبت میں ناکامی ہوگی۔ آپ جس کو اپنا قریبی دوست سمجھتے ہیں وہی آپ کے خلاف کسی خطرناک سازش میں شامل ہو سکتا ہے، اس لئے محتاط رہئے۔ کاروبار میں مندا چلے گا۔ منافع کم ہوگا اخراجات بڑھیں گے۔

ز۔ ظ۔ ض۔ ی:۔ صحت اچھی رہے گی۔ دوستوں سے مدد ملے گی۔ دشمن زیر ہوگا منگل کے دن مالی معاملات طے کرنے کی کوشش کریں۔ لوگ بعض معاملات میں آپ سے اختلاف کریں گے۔ بیوی سے سنیچر اور اتوار کو جھگڑے کا اندیشہ رہے گا۔ اخراجات کم ہوں گے لیکن سفر میں احتیاط برتیں۔

ج۔ چ۔ خ۔ غ۔ ف:۔ کچھ نئے واقعات رونما ہونے کا امکان ہے۔ سیاسی سرگرمیوں میں نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ کوئی غمناک اطلاع آ سکتی ہے۔ مختصر سفر کریں۔ کاروبار میں جی جان سے لگے رہیں، صحت کا خیال رکھیں، بزرگوں سے شفقت ملے گی۔ بچوں کی طرف سے فکرمند رہیئے۔ دوستوں سے مدد ملے گی۔ کچھ غیر ضروری اخراجات ہوں گے۔ چوری کا ڈر نہیں ہے۔

ت۔ ٹ۔ ق۔ ک۔ گ:۔ دولت ملے گی۔ محبت میں کامیابی ہوگی۔ آمدنی کے ساتھ خرچ بھی بڑھے گا۔ تنگدستی کچھ کم ہوگی۔ سفر میں فائدہ ہوگا۔ مصروفیت بڑھ جائے گی۔ دوستوں سے نقصان کا اندیشہ ہے لیکن اتوار کو سفر نہ کریں تو اچھا رہے گا۔ غیر متوقع حالات رونما ہوں گے۔ سوموار اور منگل کے دن خوشیوں کے ہوں گے۔ ایام ملے جلے اثرات کے ہوں گے۔●

طنز و مزاح

بارہ بنکی کا چور

• پروانہ ردولوی

چوروں کے متعلق آپ نے بہت کچھ پڑھا اور سنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے ایک دو چور پکڑے بھی ہوں اور اگر گستاخی معاف فرمائیں تو یہ بھی عرض کر دوں کہ خود آپ بھی چور یا سابق چور ہو سکتے ہیں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ چوری کے سلسلے میں فنکاری کے ساتھ زندہ دلی شرافت، متانت، سنجیدگی اور رحمدلی میں ہمارے بارہ بنکی کے چور بھائی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ہمارے اس بھائی نے سپریم کورٹ، ہائی کورٹ، انکم ٹیکس آفس اور مرکزی وزارتوں کے دفتروں سے چوری کی ہے اور اُسکا دعویٰ ہے کہ "ان دفتروں سے کوئی بھی فائل نکلوانا ہو تو جتنے کا معاملہ ہو اس کا ۱۰ فیصدی مجھے دیدیں میں فائل نکال کر دیدوں گا"۔ بارہ بنکی کے اس پچیس سالہ چور کا نام ہے "پرتاپ سنگھ"، اور عرفیت ہے پرتاپ اور اسے دہلی کے وسطی علاقہ کی پولیس نے صرف ۳۸ چوریوں کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔

آج کل بھائی پرتاپ سنگھ بڑی دیانتداری کے ساتھ پولیس کو وہ جگہیں دکھا رہے ہیں جہاں جہاں انہوں نے چوری کی تھی اور بڑے فخر کے ساتھ چوری کر کے دکھا بھی رہے ہیں۔ بارہ بنکی کے اس چور سے جب یہ پوچھا گیا کہ جناب آپ نے خود کو اس ٹریڈ میں کیوں سنٹرل پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ۔ وزارت سماج کلیان۔ وزا[رت] محنت و روزگار۔ وزارت دفاع اور وزارت قانون۔ ٹیلی فون ا[...] اور راشٹرپتی بھون تک میں کر چکا ہوں لیکن واقعی سب ہی [...] اطلاع یا نوٹس کے نکال دیتے ہیں۔"

میرا بھائی پرتاپ عام چوروں کی طرح ظالم اور بے رحم [...]

ناظرین واقعات کو دعوت دی جاتی ہے کہ کسی حقیقی واقعہ پر مبنی ایسی ہی مزاحیہ واردات اگر ان کے علم میں ہو تو ہمیں ارسال فرمائیں۔ ہم بخوشی شائع کریں گے۔ (ادارہ)

ڈالا تو اس نے مسکرا کر جو جواب دیا وہ ہمارے معاشرہ پر بھرپور طنز بھی ہے اور بارہ بنکی والوں کی ذہانت کا ثبوت بھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"صاحب کیا کرتا کہیں کوئی نوکری نہیں دیتا جتنے بھی "اپائنٹمنٹ لیٹر" ملتے ہیں اُن پر انگریزی میں صاف صاف لکھا ہوتا کہ "تمہاری نوکری ایکدم عارضی ہے کسی بھی وقت بغیر کسی نوٹس کے نوکری ختم ہو سکتی ہے"۔ نویں جماعت میں دو بار فیل ہو گیا گھر والے ڈانٹتے رہتے تھے۔ بھاگ نکلا۔ پھر دوبارہ گھر کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ دلی آکر شاستری بھون میں چوکیداری کر کے راجستھان بورڈ سے میٹرک کیا مزدور اور چوکیدار کی نوکری سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کے دفاتر ڈائرکٹوریٹ جنرل ہیلتھ سروس۔ سنٹرل گورنمنٹ ہیلتھ سروس۔

ہے۔ چونکہ وہ بارہ بنکوی ہے اس لئے ہر کام میں کوئی نہ کوئی نیا [...] پیدا کرتا ہے، اس کا فلسفۂ چوری یہ ہے کہ کسی کے گھر سے کوئی [...] نہ لو کیونکہ صبح چوری کا علم ہونے پر گھر والے رو تے پیٹتے ہیں اسلئے [...] میں ہاتھ کی صفائی دکھاؤ تاکہ بابو لوگوں کو جو عام طور پر گھر [...] بیویوں سے لڑ کر آتے ہیں تفریح کا ذریعہ ملے اور کچھ ٹینس کردہ صحت ٹھیک کر لیا کریں لیکن ایکبار اسے ایک ذخیرہ اندوز پر [...] غصہ آگیا تھا اس لئے اس نے "غیر سرکاری چوری" کر لی تھی [...] پرتاپ ہی کی زبان سے یہ واقعہ سنئے اور بارہ بنکی والوں کی [...] پر سر دھنیئے۔

"ایک بار میں شاستری بھون کی تیسری منزل پر کینٹین میں گ[یا] اور ایک روپیہ کا نوٹ دے کر ایک پناما سگریٹ اور ماچس [...] کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی نے جو بڑی بدشکل تھی لیکن خود کو بڑی حسین سمجھ[تی] بڑی ادا سے کہا "چینج نہیں ہے"، اور نوٹ واپس کر دیا۔ مجھ[ے] غصہ آیا اور اسی روز رات میں میں کینٹین میں گھسا اور ایک بو[ری] سگریٹ اور جیبوں و تھیلوں میں ریزگاری بھر کر چلا آیا۔ دو[سرے دن] وہ ریزگاری لے کر بس میں بیٹھا تو ایک مسافر سے کنڈکٹر کا [...] کے لئے جھگڑا ہو رہا تھا۔ بغل کے ایک صاحب نے مجھ سے [...] کہ آخر یہ ریزگاری کہاں چلی گئی ہے۔ میں نے ڈٹ کر کہا [اس] سلسلہ میں مجھ سے مت پوچھئے"، اور قطب روڈ پر جا کر ترا[زو سے] تول کر چوری کی ہوئی ساری ریزگاری نوے روپے میں بیچ د[ی]۔

دیکھا آپ نے بارہ بنکی کے چور کی ذہانت کتنی خوبصورت ریزگاری کے مسئلہ پر مدلل روشنی ڈالی ہے۔

ایک بار میرے بھائی پرتاپ سنگھ کو وگیان بھون [...] کی صفائی دکھانے کی سوجھی رات کو پیتل کی کنڈیاں اتاریں [...]

باہر چلا گیا۔ ایک دفتر کھول کر سستانے کو جی چاہا۔ ٹھنڈی ہوا
اور سگریٹ پیتے پیتے نیند آگئی۔ صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی اور جب
کھڑکی سے باہر دیکھا تو کاریں ہی کاریں اور پولیس ہی پولیس۔ بھائی
پرتاپ نے سمجھا کہ پکڑے گئے لیکن جہاں کے گدھے تک اپنی ذہانت
کا جھنڈا گاڑ چکے ہیں وہاں کا چور بھلا کب چوکنے والا تھا۔ اس نے کپڑے
کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور شیشے پونچھنے لگا۔ اسی طرح وہ پہلی منزل تک
گیا اور پیچھے کی ایک کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگا۔ لیکن رات کو
اپنی چھپائی ہوئی گٹھڑیاں لے آیا۔ جن کا وزن پندرہ من نکلا۔

آپ سوچیں گے کہ بھلا ایک آدمی اتنا وزن کیسے اٹھا سکتا ہے
لیکن یاد رکھئے کہ یہ بارہ بنکی کا چور تھا۔

ایک دن بھائی پرتاپ کے دل نے کہا یار سپریم کورٹ میں ہاتھ
صفائی دکھاؤ جب مانوں کہ تم بارہ بنکی کے فنکار ہو اور وہ سپریم
کورٹ کی طرف چلا گیا۔ عدالت میں بہت بڑا تالا لگا ہوا تھا۔ اس
نے ہاتھ کے لوہے کے موٹے ڈنڈے میں کپڑا لپیٹا اور تالے کے
بیچ میں اسے ڈال کر دبایا۔ پل بھر میں تالا کسی حسینہ کی نازک کلائی
کی طرح ٹوٹ گیا۔ پرتاپ کہتا ہے کہ بھلا تالا بھی کوئی رکاوٹ
ہے۔ لوہے کی چھڑ اور تھوڑا سا تیزاب بھی ساتھ ہے تو منٹ بھر میں
تالا کھل جائے گا۔

ایسا لگتا ہے کہ بارہ بنکی والے جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اس
میں قسمت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے۔ ایک بار بھائی پرتاپ وگیان
بھون کے "ڈی" بلاک سے ایک ٹائپ رائٹر لے کر کھمبے کے
سہارے نیچے اتر رہے تھے کہ ٹائپ رائٹر ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا
نیچے آکر دیکھا کہ چوکیدار صاحب سو رہے تھے اور ان کے سر کے
بالکل قریب ہی ٹائپ رائٹر آکر گرا تھا۔ بھائی پرتاپ یہ منظر دیکھ
کر گھبرائے کہ اگر تھوڑی گڑبڑ ہو جاتی تو چوکیدار کی جان چلی جاتی۔ پھر
وہ ٹائپ رائٹر اٹھا کر چل دیئے۔ اور چوکیدار صاحب خواب خرگوش
ہی میں مبتلا رہے۔

پرتاپ سنگھ نے پولیس کو ہنس ہنس کر بتایا۔ جب میں
ٹائپ رائٹر لے کر بھاگ رہا تھا تو ۵۔۶ چوکیدار چور چور کرتے
میرے پیچھے دوڑے مگر میں پکڑا نہ جا سکا۔ ابھی صاحب اسب
چور چور کرتے ہیں تب دیکھ کوئی نہیں آتا۔

بارہ بنکی کے اس ستم ظریف میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری
ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے پاس پیسے چاہے جتنے ہوں
وہ کھانا ہمیشہ گوردوارے میں کھاتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اتنے
پریم سے کوئی کھانا نہیں کھلاتا۔

پرتاپ کے دل میں دفتر کے بابوؤں کے لئے محبت کوٹ کوٹ
کر بھری ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ بارہ بنکی والے ہوتے ہی غریب
پرور ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ دفتروں سے ٹائپ رائٹر اسی لئے
چوری کرتا ہوں تاکہ بابو لوگوں کو خوشی ہو اور وہ کم از کم ایک دن کی
چھٹی مفت مار دیں۔

بارہ بنکی کا یہ چور — میرا بھائی پرتاپ اب گرفتار ہو گیا ہے
لیکن اسے امید ہے کہ جیل سے یہ کچھ اور فنکاری کر سکے گا۔ اور اس
کی یہ امید بھی ہمارے جیلوں کی حالت پر بھرپور طنز سے کسی طرح
کم نہیں ہوگی
●●

دنیا کا حیرت انگیز پرندہ فن فٹ

بچوں کو تھیلی میں رکھ کر اڑتا ہے

جنوبی اور وسطی امریکا کے دریاؤں اور پہاڑی ندیوں
کے قریب سب سے الگ تھلگ خاموشی کی زندگی گزارنے والے
آبی پرندہ "فن فٹ" کے متعلق ایک فطرت شناس میکسیکن مسٹر
الواریز نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ اس پرندہ کے جسم میں ایک
تھیلی ہوتی ہے جس میں یہ اپنے بچوں کو رکھ کر اڑتا رہتا ہے۔

الواریز کے اس انکشاف نے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے
کیونکہ اب تک کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کوئی پرندہ بھی کنگارو کی
طرح اپنے بچوں کو اپنے جسم میں بنی ہوئی تھیلی میں چھپا سکتا ہے۔

الواریز نے "فن فٹ" کے متعلق یہ حیرت انگیز بات کافی جدو
جہد اور چھان بین کے بعد معلوم کی۔ "فن فٹ" کے عادات و اطوار
کا جائزہ لینے کی مہم پر روانہ ہونے کے بعد اس نے جنوبی میکسیکو
کی ایک ندی کے کنارے ایک ویران جگہ پر "فن فٹ" کا ایک
گھونسلا دیکھا جس میں دو انڈے رکھے ہوئے تھے۔

ایک دن انڈے سے بچے نکلنے کے بعد جب وہ پھر اس
گھونسلے کی طرف گیا تو ایک نر "فن فٹ" جو ندی میں تیر رہا تھا
بڑی تیزی سے اڑتا ہوا گھونسلے پر آگیا اور چند لمحوں کے بعد ہی
گھونسلے سے اڑ کر دوبارہ ندی میں چلا گیا اور طویل ڈبکی مار لی
الواریز جب گھونسلے کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر سخت حیران ہوا کہ
گھونسلے میں انڈے کے چھلکے تو پڑے ہیں لیکن ان سے نکلنے والے
بچے نہیں ہیں۔ گھونسلے میں مادہ "فن فٹ" بھی موجود تھی۔ اتفاق
سے نر "فن فٹ" پانی سے نکل کر سطح پہ تیرنے لگا۔ الواریز نے
دوربین سے اس نر "فن فٹ" کو غور سے دیکھا تو اس کے
پنکھ کے نیچے سے دو ننھے ننھے سر نظر آئے۔ پہلے تو الواریز کو
اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا لیکن "فن فٹ" تیر کر کنارے پہنچ
گیا تھا اور وہ بمشکل ۲۰ گز کی دوری پر تھا۔ اب دونوں سر
بالکل صاف نظر آرہے تھے جو "فن فٹ" کے دونوں بچوں کے تھے
ایک ملاح کی مدد سے الواریز نے نر "فن فٹ" کو پکڑ لیا یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت

سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ نر "فن فٹ" کے بائیں پنکھ کے نیچے
ایک تھیلی ہے جس میں دونوں بچے آرام سے بیٹھے ہوئے چوں چوں
کر رہے ہیں۔

الواریز اب یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ کیا مادہ
"فن فٹ" کے بھی تھیلی ہوتی ہے یا اس کا کام صرف انڈے دینا
ہے اور بعد کی تمام خدمات نر کے ذمہ ہوتی ہیں۔ وہ یہ پتا بھی
لگائے گا کہ نر "فن فٹ" کتنے دنوں تک اپنے بچوں کو تھیلی میں رکھتے
ہیں اور مادہ "فن فٹ" بچوں کی پرورش کی ذمہ داری کیوں نہیں قبول کرتی

۴۱ سالہ بال کرشنا ساونت کا اسٹوڈیو بمبئی کے ساتھ ساتھ میلوں تک پھیلا ہوا ساحل ہے۔ ساونت ہر روز ساحل کے کنارے بچھی ہوئی ریت پر مجسمے بناتا ہے۔ کبھی کبھی تیز لہریں آتی ہیں اور اس کے آرٹ کو بہا لیجاتی ہیں۔ ساحل کے کنارے آنے والے لوگ ساونت کے کام کو دیکھتے ہیں اور اسے کچھ پیسے دے جاتے ہیں۔ اچھے دنوں میں ساونت کو پانچ چھ روپے روز کی آمدنی ہو جاتی ہے۔

ساونت کا باپ مہاراشٹر کے شہر ستارہ میں مجسمہ سازی کا کام کرتا تھا۔ ساونت کو بچپن ہی سے مٹی کے مجسمے بنانے کا شوق تھا اور اب اس نے اس شوق کو پیشہ بنا لیا ہے۔

ساونت کو اس بات کی شکایت ہے کہ لوگ اس کے آرٹ کی قدر نہیں کرتے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک تھرڈ کلاس گانے والا بھی گا بجا کر مجھ سے زیادہ پیسے جمع کر لیتا ہے۔ میں سارے دن کڑی دھوپ میں محنت کر کے ریت میں جان ڈالتا ہوں لیکن پھر بھی مجھے کچھ نہیں ملتا۔ برسات کا موسم میرے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ریت میں جان پھونک دیتا ہے

"حکومت سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ غریبوں کی ہمدرد ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ مجھے اپنا کام شروع کرنے کے لئے کچھ پیسہ ادھار چاہیئے لیکن میں بینکوں کے چکر لگاتے لگاتے تھک گیا اور مجھے کچھ نہیں ملا۔ اس کی بجائے ہماری جھونپڑیوں کو اجاڑ دیا جاتا ہے۔ ایک دن میں نے ریت پر نہرو کے خاندان کی تصویریں بنائیں، رات کو کسی نے تمام تصویریں خراب کر دیں۔ لینن کی سو سالہ برسی کے موقع پر میں لینن کی تصویر بنا رہا تھا اسی دن مجھے ایک شخص نے آکر دھمکی دی کہ اگر میں نے لینن کی تصویر بنائی تو وہ میری جھونپڑی میں آگ لگا دے گا۔ ہندوستان میں اس طرح آرٹ کی قدر کی جاتی ہے۔"

لیکن صرف ساونت ہی کیوں، ہندوستان کے گاؤں گاؤں کونے کونے میں ایک سے ایک اچھا آرٹسٹ، کاریگر پڑا ہوا سڑ رہا ہے۔ اس کی صلاحیتوں کو زنگ لگ رہا ہے۔ چند لوگ ان کمزور آرٹسٹوں کو چند سکوں میں خرید کر کروڑوں بناتے ہیں۔ آرٹسٹ بھوکے مرتے ہیں اور آرٹ کے دلال عیش کرتے ہیں

مسلم خواتین اور موجودہ سماج

• عبدالبصیر نعیمی

اس ترقی کے دور میں جہاں دوسرے بہت سے مسائل انسان کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں وہیں خواتین کی آزادی بھی ایک عظیم مسئلہ بن کر سامنے آئی ہے۔ مغربی ممالک میں جہاں عورت کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے اس کے بھیانک نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہندوستانی خواتین نے مغربی خواتین کے نقش قدم پر چلنے کی ٹھان لی ہے۔ ظاہر ہے عورت بھی انسان ہے۔ اس کے بھی جائز حقوق ہیں جو اس کو ملنے ہی چاہئیں مگر بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی تقلید کرنا دانشمندی تو نہیں ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ اس ملک میں عام بیداری پیدا ہو۔ مرد کے ساتھ عورت بھی اپنے فرائض کو جانے اور ملک کی ترقی کے لئے مردوں کے ساتھ شانہ سے شانہ ملا کر جدوجہد کرے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے فرائض فراموش کر کے مردوں کے فرائض انجام دینے کی کوشش کرے کیونکہ عورتوں کا دائرہ عمل مردوں کے دائرہ عمل سے مختلف ہے۔ اور عورتوں کو یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ چند

۲۷ر اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو پونا میں مسلم خواتین کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے۔ مسلم خواتین کو بھی وہ بہت سے حقوق جو بقول ان کے دوسرے فرقوں کی خواتین کو حاصل ہیں ملنے چاہئیں اس کانفرنس میں مسلم خواتین کے مسائل پر غور کیا جائیگا اور کچھ نام نہاد "حقوق" کے حصول کے لئے پروگرام مرتب کیا جائے گا۔ اس کانفرنس کا مقصد اس مراسلے سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے جو مورخہ ۲۱ر نومبر کے "ہندوستان ٹائمز" میں چار خواتین کی طرف سے شائع ہوا۔ اس مراسلہ میں یہ چار مسلم خواتین فرماتی ہیں۔

"آزادی کے ۲۵ سال گزر جانے کے بعد بھی مسلم خواتین ابھی تک جدید اخلاقی سانچے میں نہیں ڈھل پائی ہیں۔ کیونکہ ان کو جدید سماجی معاشی اور مساوی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ ہندو کوڈ ۱۹۵۶ء کی رو سے ہندو خواتین کو شادی، طلاق اور وراثت کے معاملہ میں مردوں کے مساوی حقوق دیئے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے (ہندو عورتوں کے) سارے مسائل سلجھ چکے ہیں مگر مسلم خواتین کی خود اعتمادی اور ان کے مسائل کے حل کے بارے میں اب تک کوئی ضمانتی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ مسلم شوہر اپنی بیوی کو صرف تین بار "طلاق" کی گردان کر کے علیحدہ کر سکتا ہے۔ اور اس سے ہمیشہ کے لئے سبکدوشی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے بدلے میں اسے صرف تین ماہ کا خرچہ برداشت کرنا ہوگا۔ ایک مسلم مرد ایک وقت میں چار چار بیویاں رکھ سکتا ہے مگر مظلوم مسلم عورت اپنی طلاق کے سلسلے میں بھی کوئی رائے تک نہیں دے سکتی۔ وراثت کے معاملہ میں لڑکی اپنے بھائی کے مقابلہ میں آدھے حصہ کی مستحق ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ اپنے شوہر سے علیحدہ ہوجائے تو اسے اپنے بچوں کے ولی ہونے کا بھی حق نہیں ملتا ہے۔ چاہے بچے کمسن ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسرے ترقی پسند فرقوں کے برخلاف مسلمانوں میں کئی شادیوں اور طلاق کا رواج ہے نتیجہ کے طور پر مسلم خواتین کی حالت ہندوستان میں قابل رحم ہے اور تقریباً آج بھی غیر قانونی طور پر غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ شوہر کی وراثت کے سلسلہ میں بیوہ مرحوم شوہر کی جائداد کا صرف چوتھا حصہ ہی پاسکتی ہے مگر اس کے بچے ہیں تو صرف آٹھویں حصہ کی مستحق ہے۔ حکومت ہند کو بہت پہلے ایسا قانون پاس کرنا چاہئے تھا جس کی رو سے عورت اور مرد کو مساوی حقوق حاصل ہوتے۔ اور یہ قانون تمام فرقوں کے لئے ہوتا۔ بہرحال مسلم ووٹروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ حکومت ہند کی انصاف پسند پالیسیوں میں اعتماد رکھتے ہیں۔ اور مسلم سیاسی جماعتوں سے کسی قسم کی توقع بیکار ہے۔ مسلم خواتین کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے خود میدان میں آنا ہوگا۔

اب وقت آگیا ہے کہ اپنی حالت سدھارنے کے لئے مسلم خواتین متحد ہوکر آگے بڑھیں اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کریں۔ انڈین سیکولر سوسائٹی اور مہاراشٹر مسلم ستیا شودھک منڈل ۲۷-۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پونا میں ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں جس میں مسلم خواتین کی سماجی اور معاشی حالت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے گا اور اس سلسلہ میں پروگرام مرتب کیا جائے گا کہ ہم کو کیا کیا قدم اٹھانے چاہئیں حالانکہ اس کانفرنس کے دروازے صرف مہاراشٹر کی مسلم خواتین کے لئے ہی کھلے ہیں لیکن ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کانفرنس ہندوستانی مسلم خواتین کی آزادی کے سلسلہ میں ایک نیا باب کھولے گی۔ اس میں دوسرے صوبوں کے مبصرین بھی شامل ہوسکتے ہیں۔

ہم مہاراشٹر میں رہنے والی تمام مسلم خواتین کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے محترمہ مریم شیخ سے منڈل آفس کے پتہ پر رجوع کریں۔

منجانب: محترمہ مریم شیخ۔ شمیم اطہر۔ نجمہ شیخ۔ شاہین اطہر۔

پونا میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ نمبر ایک "مسلم" اور نمبر دو "خواتین کے حقوق" مسلم خواتین کے لئے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں ابتدا میں اس چیز پر غور کریں جس کے نتیجہ میں ان پر "مسلم" کا لیبل چسپاں ہوتا ہے یعنی اسلام۔

اسلام سے پہلے عورت کو محض پیر کی جوتی سمجھا جاتا تھا عرب میں لڑکی پیدا ہوتے ہی قتل کر دی جاتی تھی۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے عورت کو موجودہ مقام دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسری قوموں نے بھی عورت کو عزت دی۔ اسلام پر جو بے بنیاد الزام لگایا گیا ہے کہ ایک مرد چار بیویاں رکھ سکتا ہے مگر عورت طلاق کے مسئلہ پر اپنی رائے تک نہیں دے سکتی یکسر تنگ نظری کی مثال ہے۔ اسلام نے طلاق کو کبھی بہتر نہیں سمجھا۔ اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جتنا بھی ہوسکے تحمل کرو۔ اگر ساتھ رہنا بہت ہی مشکل اور تکلیف دہ ہوجائے

ترقی تو ہوئی ہے...

* قومی آمدنی
1960-61ء
13,292 کروڑ روپے
1969-70ء
17,955 کروڑ روپے
اضافہ
35.1 فیصدی

* فی کس آمدنی
1960-61ء
306.3 روپے
1969-70ء
330.4 روپے
اضافہ
10.8 فیصدی

لیکن
آبادی میں اضافہ
اقتصادی ترقی کی راہ میں
بھاری رکاوٹ بنا ہے۔

* 1960-61ء کی قیمتوں کے مطابق

تو مناسب ہے کہ الگ ہو جاؤ۔ جہاں مرد کو اختیار ہے کہ وہ عورت کو طلاق دے دے وہیں عورت کو بھی حق دیا گیا ہے کہ وہ بھی مرد سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اسلام نے صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ اگر۔

۱۔ شوہر اپنی بیوی کو ماں یا بہن سمجھنے لگے۔

۲۔ شوہر بیوی پہ بے بنیاد الزام لگائے۔

۳۔ شوہر چار سال سے غائب ہو۔ اور بیوی کو پتہ نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔

۴۔ شوہر دو سال تک بیوی کے جملہ اخراجات نہ اٹھائے۔

۵۔ شوہر شادی کے وقت سے لے کر موجودہ وقت تک نامرد ہو۔

۶۔ شوہر دو سال سے خطرناک قسم کی بیماریوں کا شکار ہو۔

۷۔ عورت کی شادی نابالغی کے دور میں اسکے والد یا سرپرست نے کر دی ہو۔

۸۔ شوہر کا رویہ بیوی کے ساتھ ظالمانہ ہو۔

۹۔ شوہر بیوی کو غلط قسم کی زندگی گزارنے پر مجبور کرے۔

۱۰۔ شوہر کی کئی بیویاں ہوں مگر سب کے ساتھ مساوی سلوک نہ کرے۔

۱۱۔ شوہر بیوی کو مذہبی احکام کی تعمیل سے روکے۔

تو بیوی قانونی طور پر اپنے شوہر سے طلاق لینے کی مجاز ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ چار چار بیویاں رکھنے کی اجازت کے باوجود بہت ہی کم ایسے مرد ملتے ہیں جو ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم خواتین کا ایک حق ایسا ہے جو انہیں دوسرے فرقوں کی خواتین سے ممتاز کرتا ہے۔ یعنی حق مہر۔ ہندو شوہر اگر بیوی کو طلاق دیتا ہے تو بیوی گھاٹے میں ہی رہتی ہے۔ مگر مسلم مرد اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اسے بیوی کا مہر ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور مہر کی رقم کے لئے مسلم خاتون آزاد ہے کہ وہ جتنا چاہے نکاح کے وقت مقرر کر سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بیوی کو شوہر کی جائداد میں مساوی حصہ نہیں ملتا ہے۔ اس باب میں یہ کہنا کافی ہے کہ وہ شوہر کی جائداد سے مہر کی شکل میں اچھا خاصا حصہ پہلے ہی وصول کر لیتی ہے۔ اس کے بعد مساوی حصہ کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ ایک باپ اپنی اولاد پر جتنا بھی خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایک بینک کی سی ہے۔ بینک میں آپ روپیہ جمع کرتے ہیں۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب آپ تمام روپیہ معہ سود کے وصول کر لیتے ہیں۔ باپ اپنے بیٹے پر روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اور بیٹا جب کسی قابل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کرتا ہے۔ اپنی دولت اس پر خرچ کرتا ہے۔ اس کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ مگر ایک بیٹی کو یہ سب کچھ نہیں کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو اپنی سسرال چلی جاتی ہے۔ اور والدین سے اس کا تعلق تقریباً ختم سا ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اسے والدین کی جائداد میں حصہ ملتا ہے۔ لڑکے کو صرف والدین ہی کی جائداد میں حصہ ملتا ہے جبکہ عورت کو والدین کی جائداد سے اور شوہر کی بھی جائداد سے حصہ ملتا ہے۔ اس طرح سے عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ حصہ پاتی ہے۔ اور اسے کچھ کرنا بھی نہیں پڑتا حالانکہ لڑکے کو والدین کا قرضہ بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ جو ہو سکتا ہے بہن کی شادی کے سلسلہ میں لیا گیا ہو۔

اس طرح مسلم خاتون تمام تفکرات سے آزاد کر دی گئی ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی وہ یہ کہے کہ اسے جائز حقوق نہیں ملے تو یہ صرف اس کی ہٹ دھرمی ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا حقیقت میں عورت مرد کے برابر ہے اور اسے مرد کے برابر حقوق ملنے چاہئیں؟ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال لکھتے ہیں "میں مرد اور عورت کی مساوات کا مطلق حامی نہیں ہوں۔ قدرت نے ان دونوں کو جدا جدا خدمتیں تفویض کی ہیں اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادہ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے ــــ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں کو آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا۔ اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی" (حکمت پیغام اقبال نظر-۳۸)۔

قدرتی طور پر عورت مرد میں جو فرق ہے اسے بھلا کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ آج عورت ہر اس کام کو کرنے کی آرزو رکھتی ہے جس کو مرد کرتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ہیری کیمپ بل نے لندن انسٹی ٹیوٹ آف ہائجین میں تقریر کرتے ہوئے کہا "عورت کے پھیپھڑے مردوں سے چھوٹے اور خون کے جراثیم مردوں سے کم ہوتے ہیں۔ عورتوں کے جسم پر آگ اسقدر تیزی سے نہیں جلتی ہے۔ اس سے صاف طور واضح ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ محنت و مشقت کا کام نہیں کر سکتیں"۔

اس لئے اسلام نے مسلم خواتین کو گھروں کی رانی بنایا ہے۔ مرد باہر کے سخت کام کرنے کے لئے اور عورت اپنے بچوں کی پرورش کرنے کیلئے ہے۔ مگر آج مغربی خواتین کی تقلید میں مسلم خاتون بھی اپنے بچوں کو صرف اس لئے اپنا دودھ پلانے سے کترانے لگی ہے کہ کہیں اس کی جسمانی خوبصورتی پر اثر نہ پڑے۔

ہندوستانی نام نہاد ترقی پسند خواتین حقوق کے سلسلہ میں اکثر مغربی ممالک میں بسنے والی خواتین کا حوالہ دیتی ہیں کہ وہاں عورت مرد کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ آج کل نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی اور ان کا تخریبی حرکات کو اپنانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو بچپن میں وہ پیار نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ بچے کا ابتدائی اور سب سے بڑا اسکول آغوش مادر ہے۔ یہیں پر بچہ پہلی بار آنکھ کھول کر دنیا کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ ابتدا میں وہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے۔ ماں کو جو کچھ بھی اور جس طرح بھی کرتے دیکھتا ہے اسی طرح وہ خود بھی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اسے اس ابتدائی دور میں ماں کا پیار نہ ملے تو اس کی روح ہمیشہ پیار کے لئے ترستی رہتی ہے۔

مغربی ممالک میں جہاں عورت کو مرد کے مساوی حقوق حاصل ہیں عورت مردوں کے شانے سے شانہ ملا کر دفتروں میں، ملوں میں اور کارخانوں میں کام کرتی ہے اور بچوں کی پرورش ایک عظیم مسئلہ بن کر آیا ہے۔ شام کو ماں تھک ہار کر کام سے واپس آتی ہے اس وقت وہ قابل ہرگز نہیں ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کے لئے تھوڑا سا وقت نکال سکے۔ اور بچہ ماں سے مایوس ہو کر پیار کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے جہاں اس جیسے اور بہت سے بچے مل جاتے ہیں۔ بچہ میں اچھائی کے بہ نسبت برائی سیکھنے کا زیادہ رجحان موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ بری حرکتوں میں ایک عجیب قسم کا سکون، آرام اور لطف حاصل ہوتا ہے۔ جب بہت سے بچے مل جاتے ہیں تو وہ جلد برائی کی سمت راغب ہو جاتے

واقعات اپنے نئے روپ میں

آپ کے سامنے ہے ــــ اس کے متعلق ہمیں اپنی رائے لکھئے۔ اور مخلصانہ مشوروں سے نوازیئے۔ ہم ارباب نظر کے نیک مشوروں کو بقدر طاقت و استطاعت عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں کمی نہ کریں گے۔ (ادارہ)

…ان کی پیاسی روح چین کی جستجو میں بھٹکتی رہتی ہے اور وہ بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا اور برطانیہ جیسے امیر ترین ممالک میں جہاں سب کچھ مل جاتا ہے مگر بچوں کو ماں کا پیار نہیں ملتا نوجوانوں میں عام طور پر بے چینی پائی جاتی ہے۔ نوجوان طبقہ اس پیار اور سکون کو جسے بچپن میں ماں کی آغوش سے نہ پا سکے ہپی بن کر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہیں ہرے رام ہرے کرشنا کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور کہیں تخریبی حرکات اپناتے نظر آتے ہیں۔ اور زندگی بھر بے چین رہتے ہیں۔

اگر مغربی خواتین کی تقلید میں ہندوستانی عورت بھی ان کے ہی نقش قدم پر چل نکلی تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے ہندوستانی نوجوان بھی اپنا ملک چھوڑ کر جنگلوں میں سکون کی تلاش میں بھٹکتے پھریں گے۔ آج عورت کے سر پر جو مساوی حقوق کا بھوت سوار ہے یہ ایک دن ملک کو برباد کر سکتا ہے۔ آئرلینڈ کی مشہور خاتون مضمون نگار میڈم مارگریٹ نارمن لا اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں "عورت دنیا میں سکون و اطمینان پیدا کرنے کے لئے آئی تھی لیکن میں دیکھتی ہوں کہ یورپ کی عورت دنیا کے ہنگاموں اور بے چینی کا سبب بنی ہے۔

موجودہ زمانہ کے مردوں کی بے بسی قابل رحم ہے کہ عورت جو کبھی مردوں کے زخموں پر مرہم رکھا کرتی تھی آج مردوں کے سینوں کا زخم بن گئی ہے۔ یہ سب موجودہ تہذیب و تمدن کی لعنت ہے ــــ اگر یورپ کی عورت نے اپنے آپ کو یونہی رکھا اور ان میں عورت کی اعلیٰ صفات نمایاں نہ ہو سکیں تو میں نہیں سمجھتی کہ یورپ کی آئندہ نسلیں ملک کے لئے کیا مفید ہو سکتی ہیں اور ایک شریف عورت اور فاحشہ میں کیا فرق رہ جائے گا ــــ میری آزاد خیال بہنیں یقینی طور پر مجھ سے ناراض ہوں گی۔ اگر میں ان سے صاف صاف کہہ دوں کہ تم نے عورت کو دنیا میں ذلیل کر دیا ہے۔ تم نے اس بلند وقار کو خاک میں ملا دیا ہے جو بنی نوع انسان کی ترقی کا سب سے بہتر ذریعہ تھا"

مغربی خواتین بھی اپنی آزادی کے نتائج سے باخبر ہوتی جا رہی ہیں۔ اور اس حد سے زیادہ بڑھی ہوئی آزادی کے نتائج سے خوف زدہ ہیں۔ ایسے حالات میں مسلم خواتین کانفرنس کے لئے بہترین موقع ہے کہ وہ اس بات کو جاننے کی کوشش کریں کہ وہ کون کون سے عمل ہیں جن پر چل کر وہ ملک کی خدمت کر سکتی ہیں۔ اگر ان کی نظر میں مسلم خواتین کی ترقی و آزادی کا یہ مطلب ہے کہ اپنے مفاد کے لئے بڑھے ہے جو قدم اٹھایا جائے۔ اپنے فرائض کی طرف سے آنکھیں بند کر کے مردوں کی برابری کے لالچ میں مردوں کی ذمہ داریاں اٹھائی جائیں۔ ہندوستانی سیتا اور مریم کے تقدس کو چھوڑ کر امریکی خواتین کی طرح سڑکوں پر "وہ عمل گرانے کی اجازت دو" کا شرم ناک نعرہ بلند کرنے لگیں۔ اگر وہ قرآنی حکم سے نافرمانی کرنا چاہتی ہیں تو اس کانفرنس کو مسلم خواتین کانفرنس کا نام کیوں دیا گیا ہے۔ کیونکہ جب تک وہ مسلم ہیں اس وقت تک ان پر لازم ہے کہ وہ ایسے کام کریں جس سے ملک و قوم کے لئے ترقی کی راہ کھلے نہ کہ پیچیدگیاں پیدا ہوں۔

مسلم خواتین کو اپنا مرتبہ پہچاننا چاہئے اور اس کے بعد کوئی قدم اٹھانے میں ہی بھلائی ہے۔ خدا کرے پونا میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں مسلم خواتین ان باتوں پر بحث کریں جو خود ان کے لئے اور ملک کے لئے نیک ثابت ہوں۔ ایسی باتیں جن سے ملک کے نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی دور ہو۔ اور ایسا ہرگز نہ ہو کہ کہنا پڑے۔ ع

اپنی ہستی کا بھی انسان کو عرفاں نہ ہوا
خاک پھر خاک تھی اوقات سے آگے نہ بڑھی

یہاں بھی اضطراب ہے وہاں بھی انتشار ہے
نہ شہر میں سکون ہے نہ شانتی ہے گاؤں میں

لٹے لٹے سے قافلے چمن چمن بہار کے
روش روش خزاں زدہ گھٹن سی ہے ہواؤں میں

نظر نظر چبھن چبھن، نفس نفس جلن جلن
بسی ہے دشمنی کی دھوپ شفقتوں کی چھاؤں میں

تھکے تھکے سے حوصلے کٹھن کٹھن سے مرحلے
لگے ہیں بے بسی کے زخم ولولوں کے پاؤں میں

ہے موج موج اک بلا کہ اب یقیں ہے موت کا
نہیں ہے کوئی حوصلہ ہمارے ناخداؤں میں

اُجاڑ اُجاڑ مجلسیں اُداس اُداس تذکرے
نہ محفلوں میں روح ہے نہ زندگی سبھاؤں میں

نہ ولولے نہ جستجو نہ حسرتیں نہ آرزو
نہ حسن میں ہے دلبری نہ شوخیاں اداؤں میں

رواج ہیں، محض روایتیں ہیں اور کچھ نہیں
اگر نہ رنگ ہو خلوص کا بھی کچھ وفاؤں میں

خدا کو سونپ دو ہر اک مریض کو کہ ان دنوں
شفا نہیں دواؤں میں اثر نہیں دعاؤں میں

یزیدیوں کے ہاتھ اب بھی خوں سے ہیں رنگے ہوئے
ہیں حق پرست آج بھی شہید کربلاؤں میں

قدم قدم پہ منتظر ہیں نت نئی مصیبتیں
ہر ایک آدمی گھرا ہوا ہے ابتلاؤں میں

نظر میں بدگمانیاں تو دل میں بے یقینیاں
سکون و ضبط جل چکا ہے وقت کی چتاؤں میں

اے راہی کس طرح ملیں ہمیں یقیں کی منزلیں
نہیں شعورِ رہبری جب اپنے رہنماؤں میں

● محبوب راہی

عشق اِدھر ہے چاک گریباں حسن اُدھر سو سو بل کھائے
محوِ فغاں بلبل کو پاکر، پھول ہنسے غنچے مسکائے

عقل پر اپنی سیٹھ مگن ہے بنجر کھیت ہوا دہقاں کا
آج یہاں ہر چیز گراں ہے ارزاں ایک ہوا انساں کا

کیا اپنا احوال سنائیں ہم سے روٹھ گئی ہے قسمت
چارہ گر و دم ساز ہمارے، رنج و محن دکھ درد مصیبت

شمس نظر جس شخص پہ ڈالو درد مجسم پیکرِ بے جاں
جیسے کوئی وہ مرغِ قفس ہو آنکھ ہراساں روح پریشاں

ننھے ننھے بچے روئیں کس ڈائن نے چلایا جادو
ماں کی چھاتی سوکھ گئی ہے سوکھ گئے آنکھوں میں آنسو

گاندھی روئے گوتم روئے سیتا روئے مریم روئے
چنڈالوں کے ہاتھوں پڑ کر ستیہ اہنسا ہر دم روئے

جانے کیوں رشیوں کی دھرتی ڈوب گئی پاتال میں جاکر
اور چھپا بھگوان گگن میں ہم دکھیوں سے آنکھ بچاکر

پیتم اتم کس دیش بسے ہو اب بھی بہرِ خدا آجاؤ
جان بس آنکھوں میں اٹکی ہے ایک جھلک اپنی دکھلاؤ

شاید بیچ بھنور سے نیا ساحل تک ہلکورے کھاکر
آن لگے، جیون مسکائے آشاؤں کی منزل پاکر

● شمس بمن گرامی

کفن بدوش چلے بن کے جاں نثار چلے
جسے ہو زندگی پیاری وہ سوئے دار چلے

چلے ہیں اہلِ جنوں پوچھنے مزاجِ خرد
جسے ہماری روش پہ ہو اعتبار چلے

ہر ایک آدمی اپنی جگہ خدا ہو جائے
جو آدمی کا ہر اک شے پہ اختیار چلے

دیا ہے سب کو بہاروں نے کچھ نہ کچھ تحفہ
ہم اپنے ساتھ لئے حسرتِ بہار چلے

یہ ذکر تھا مرے دل کا کسی کی بات نہ تھی
یہ کیا ہوا کہ سبھی چشمِ اشکبار چلے

شعورِ فن نہیں میراث تاجداروں کی
یہاں اسی کی چلے جس کا اختیار چلے

لہو کی بات، شب خوں کی بات، قتل کی بات
تمہاری بات چلے، اور بار بار چلے

کوئی نہیں ہے تو محسن ہمیں سہی منصور
مگر شہر میں کہیں رسمِ گیر و دار چلے

● محسن جلگانوی

کپور خاندان کو اس خوشی کے موقع پر مبارکباد دینے والوں میں بہت سے سفارتی نمائندے بھی تھے۔ نواب پٹودی خاص طور پر دولہا کو مبارکباد دینے آئے تھے کہ ان کی بیوی شرمیلا ٹیگور کی کپور خاندان سے پرانی دوستی ہے۔ سائرہ سے دلیپ کی شادی کے بعد ببیتا سے رندھیر کی شادی ہی فلمی دنیا کی سب سے شاندار شادی کہا جا سکتا ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں مہمانوں نے شرکت کی۔ دعا ہے کہ دو اداکاروں کی یہ نئی جوڑی مسرت و شادمانی کے ساتھ زندگی گزارے۔ ●

دیوکی بوس چل بسے

مشہور بنگالی فلم ڈائرکٹر مسٹر دیوکی بوس اچانک حرکتِ قلب بند ہونے سے ۱۷ نومبر کو کلکتہ میں اپنے مکان پر انتقال کر گئے۔

مسٹر بوس کی عمر ۷۳ سال تھی۔ اور ۱۹۵۷ء میں انہیں پدم شری کے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ دیوکی نے زیادہ تر نیو تھیٹر کے لئے فلمیں بنائیں۔ انکی مشہور فلمیں پورن بھگت (۱۹۳۳ء) زلزلہ کے بعد اور ودیاپتی (۱۹۳۷ء) تھیں۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے خود اپنی ایک فلم رتن دیپ میں ہدایت دی تھی۔ فلمی دنیا میں ان کی موت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا ناممکن ہے۔

پھول کی آغوش میں کلی

پرتھوی راج کے پوتے اور راجکپور کے بیٹے رندھیر کپور (ڈبو) کی شادی ۶ نومبر کو اداکارہ ببیتا سے ہو گئی۔ گویا ایک پھول کی آغوش میں وہ کلی آ گئی جس کی مہک اب کپور خاندان میں نئی مہک پیدا کرے گی۔ اب وہ غسلِ ماہتاب کے لئے اردن جائے گا۔

شادی سے پہلے رندھیر اور ببیتا نے باقاعدہ عشق کی پینگیں بڑھائی تھیں اور ایک دوسرے کا جیون بھر ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ فلمی شادیاں اکثر کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتی ہیں۔ لیکن کپور خاندان میں یہ روایت نہیں ہے اس لئے امید کی جاتی ہے کہ یہ شادی بھی پائیدار ثابت ہوگی اور دو جوان دلوں کی دھڑکنیں ہمیشہ ایک دوسرے کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔

شادی کی اس تقریب پر پرستان کی کسی شادی کا گمان ہوتا تھا۔ گھر کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ مہمانوں میں غریب چوکیدار بھی تھا، اور مہاراشٹر کے گورنر اور متعدد وزراء بھی شامل تھے۔ فلمی دنیا کی تمام اہم شخصیتوں کی موجودگی میں شیو سینا کے بانی لیڈر بال ٹھاکرے کی موجودگی موقع پر موجود کچھ لوگوں کو عجیب سی لگی۔ لیکن کپور خاندان صرف فلم سازی و اداکاری ہی میں منجھا ہوا نہیں ہے بلکہ سیاسی داؤ پیچ سے بھی بخوبی واقف ہے اس لئے بال ٹھاکرے کی موجودگی زیادہ حیرت انگیز نہیں کہی جا سکتی۔